نیا دور

اپریل سنہ ۱۹۹۴ء



نیا محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامّہ - اتر پردیش

3.00



اتر پردیش کے وزیر [illegible] محکمہ اطلاعات کی جانب سے شائع کردہ [illegible]
[illegible]

(فوٹو: جاوید ہاشمی)



نیا دور

جلد ۴۹ — نمبر ۱

اپریل سنہ ۱۹۹۴ء

ایڈیٹر
سید امجد حسین

فون نمبر ۲۴۵۶۶۰

معاونین
محمد الیاس خاں ۔ مبین احمد صدیقی

پبلشر
اتل بگائی
(ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش)

مطبوعہ
یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس، لکھنؤ

شائع کردہ: محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش لکھنؤ

زرِ سالانہ: تیس روپے

عام شمارہ: تین روپے

ترسیلِ زر کا پتہ
سپرنٹنڈنٹ پرکاشن بھاگ
انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ، اترپردیش لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر نیا دور پوسٹ بکس نمبر ۱۴۶ لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات	ایڈیٹر	۲
احساس کی تنویر تھے بابا صاحب (رُباعیات)	رباب رشیدی	۳
کچھ اپنی مدح میں (خود نوشت)	خلیق انجم	۴
درد کی سرحدوں سے پرے (نظم)	زاہرہ زیدی	۱۲
اندیشہ (نظم)	اقبال ماہر	۱۲
اودھ کی نمائندہ مثنوی گلزارِ نسیم کی تدوین	رشید حسن خاں	۱۳
غزلیں	عرفی آفاقی ۔ سعید عارفی	۲۲
	بسنت کمار بسنت	۲۲
اودھ کے چند ممتاز علماء (۲)	سبط محمد نقوی	۲۳
زندگی (قطعے)	عبدالمنان صدیقی	۳۱
غزلیں	شفق طاہری ۔ وصیہ جائسی	۳۲
	افتخار اعظمی ۔ سیدہ شان معراج	۳۲
اودھ کا انصرام: تاریخ کے آئینے میں	وقار ناصری	۳۳
غزلیں	تجور نگرامی ۔ اختر عمر اختر	۴۱
	محمد علیم خالب صبا لکھنوی	۴۱
	خوشبیر سنگھ شاد ۔ نسیم رہبر	۴۱
قہقہوں کا درد (افسانہ)	م.ک. مہتاب	۴۲
نقد و تبصرہ	نامی انصاری ۔ امیر حسن نورانی	۴۵
	قطب اللہ ۔ نہال احمد صدیقی	۴۶
	مخمور کاکوروی ۔ سہیل احمد	۴۷
	اخلاق احمد	۴۸

اپنی بات

ہر زمانے کی یاد اس عہد کے کسی مشہور واقعہ کی وجہ سے ہوتی ہے۔ آج سے ۵، سال قبل جلیان والا باغ میں بھی ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا تھا، جب ہندستان کی آزادی کے متوالوں نے اپنا لہو دے کر تاریخ کو نئی سُرخی اور نیا عُنوان عطا کیا تھا اور یہ عنوان، یہ سُرخی ۱۹۴۷ء سے پہلے جتنی اہم تھی اتنی ہی اہم آج بھی ہے، اور آنے والے دَور میں بھی رہے گی۔ اس لیے کہ جو خون بہا تھا وہ مشترکہ خون تھا وہ کسی ایک فرقے یا کسی ذات یا کسی سیاسی پارٹی کا نہیں تھا بلکہ پورا ہندستان اس لہو میں نہاکر اُٹھا تھا اور اس نے یہ سکھایا تھا کہ ہم ایک ہیں۔

ہماری ایکتا کی کہانی اور ہمارے اندر قربانی دینے کی تمنّا اور تڑپ اس واقعے سے ہر سال تازہ ہوتی رہتی ہے اسی کے ساتھ یہ بھی عرض کرنے کو دل چاہتا ہے کہ ان محترم رہنماؤں کو بھی یاد کرتے رہنا چاہیے جو اس وقت کے ہیرو تھے جن میں لالہ لاجپت رائے، ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ست پال کے نام تاریخ کے صفحات میں ملتے ہیں۔

ہم جلیان والا باغ کے شہیدوں کو بھی سلام کرتے ہیں اور اپنے ان ہیروز کو بھی جنھیں نے قربانی کا راستہ دکھایا تھا۔
اقبال نے جلیان والا باغ کے حادثے پر جو لکھا تھا اسے دُہرانے کو جی چاہتا ہے ؎

ہر زائرِ چمن سے یہ کہتی ہے خاکِ باغ — غافل نہ رہ جہاں میں تو گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خونِ شہیداں سے اس کا تخم — تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس نہال سے

ابھی مارچ کے مہینے میں ہولی اور عید کے تہوار پُورے ملک میں منائے گئے تھے، اب اپریل کے مہینے میں گڈ فرائی ڈے اور ایسٹر کے تہوار منائے جارہے ہیں جو ہمارے عیسائی بھائیوں کے مقدس تہوار ہیں اور قومی حیثیت کے حامل ہیں۔ ہمارے ملک کی تہذیبی رنگارنگی کی یہی امتیازی خصُوصیت ہے کہ ہر تہوار سب کا ہوتا ہے اور کسی نہ کسی شکل میں وہ ہمارے قومی مزاج کی عکاسی کرتا ہے

ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر ۱۴ر اپریل کو پیدا ہوئے۔ وہ ہمارے آئین کے معماروں میں تھے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے ہندستان کے پسماندہ اور پچھڑے ہوئے لوگوں کو ایک نیا ولولہ اور نیا حوصلہ دیا تھا اپنی نظریاتی جدوجہد سے آج وہ ایک علامت کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ ان کے یوم پیدائش پر انھیں خراجِ عقیدت پیش کرنے والوں کی ہمنوائی کرتے ہوئے اس کا اظہار بھی ضروری ہے کہ انھیں سب سے اچھا اور مناسب اور موزوں خراجِ عقیدت یہی ہے کہ جس سیکولر، غیر طبقاتی ہندستان کا جو تصوّر آئین میں انھوں نے پیش کیا تھا اس پر ہم کاربند رہیں اور عمل پیرا ہوکر ان کی یاد منائیں۔

——— ایڈیٹر

رباعیات

احساس کی تنویر تھے بابا صاحب

کیچڑ کی زندگی کنول میں ڈھونڈیں
جو آج کی بات ہے وہ کل میں ڈھونڈیں
پستی بھی وراثت میں ملا کرتی ہے؟
یہ سچ نہیں، سچ علم و عمل میں ڈھونڈیں

بھارت کا سربلند کرنے والے
آزاد فضا پسند کرنے والے
پیغام مساوات سنانے کے لئے
نفرت کے دروں کو بند کرنے والے

اور علم جلاتا ہے گھروں میں وہ چراغ
جن سے کہ جلا پاتے ہیں تاریک دماغ
اس کے ہی فیض سے حرارت پاکر
مٹ جاتے ہیں دامنوں سے ذلت کے داغ

پستی کو بلندی میں بدلنے والے
کانٹوں کو پاؤں سے کچلنے والے
اک فرد منفرد تھے بابا صاحب
شعلوں سے بھری آگ پہ چلنے والے

امبیڈکر آئے تو کچھ ایسے آئے
تپتے ہوئے صحرا پہ گھٹا چھا جائے
یا جیسے صبا لائے وہ تاثیر خرام
جو خشک لبوں پر بھی تبسم مہکائے

طوفان حیات کے شناور وہ تھے
بچھڑے ہوئے رہروؤں کے رہبر وہ تھے
کس شان سے منزل پہ انھیں پہنچایا
سچ یہ ہے کہ بے مثل بہادر وہ تھے

ماحول کو فکر کا اجالا بخشا
آئین بھی کیا دیکھنے والا بخشا
غاروں سے بھی خورشید نکل سکتا ہے
تاریخ کو ذات کا حوالا بخشا

اب ملک جو سرخرو نظر آتا ہے
ہر بزم میں ممتاز جگہ پاتا ہے
کیا چیز ہے یہ نظام جمہوری میں
جو خود تری عظمت کی قسم کھاتا ہے

اک صاحب توقیر تھے بابا صاحب
احساس کی تنویر تھے بابا صاحب
دستور بنایا کہ مسیحائی کی
اکسیر ہی اکسیر تھے بابا صاحب

جو دور اب آئے گا وہ تیرا ہوگا
خوشیوں سے بھرا نیا سویرا ہوگا
ہر ایک کو جینے کا دیا جائے گا حق
کٹیوں میں بھی روشنی کا ڈیرا ہوگا

رباب رشیدی
۱۲۶ - تازی خانہ - لکھنؤ

خود نوشت

خلیق انجم
اُردو گھر، راؤز ایونیو، نئی دہلی
۱۱۰۰۰۲



کچھ اپنی مدح میں

میں نے اپنے آبا و اجداد کے بارے میں خاندان کے بزرگوں سے جو سنا اور بعض شواہد سے جو نتائج اخذ کیے، وہ یہ ہیں کہ ہم روہیلے پٹھان ہیں۔

ہمارے خاندان کے ایک بزرگ ہندستان آئے تھے۔ یہ سپاہی پیشہ تھے۔ ہندستان آکر شاہی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ خاندان کے کچھ افراد لاہور میں رنجیت سنگھ کے ملازم تھے۔ ہمارے پردادا ثمر خاں کے بارے میں روایت ہے کہ بہت بہادر اور جری سپاہی تھے۔ پڑھے لکھے تھے لیکن زیادہ نہیں۔ دادا (اصغر خاں) اور ان کے بھائی رام پور میں مقیم ہو گئے۔ اپنے چچا اور تایا سے اتنا سنا تھا کہ دونوں بھائی صاحب حیثیت تھے۔ کسی بات پر دونوں میں اختلاف ہوا اور ہمارے دادا ساری جائداد چھوڑ کر دہلی آ گئے اور پھر کبھی رامپور نہیں گئے۔ ہمارے خاندان کے کچھ افراد اب بھی گھیر ملّا غیرت خاں میں رہتے ہیں۔

میرے والد محمد احمد مرحوم ریلوے میں انجینیر تھے۔ بہت اچھے آرٹسٹ بھی تھے، دولت مند تو نہیں تھے لیکن اتنی آمدنی ضرور تھی کہ زندگی آرام سے گزر رہی تھی۔ ہمارے نانا پروفیسر عزیز الرحمٰن انگریزوں کو اُردو پڑھاتے تھے۔ دلّی کے لال قلعہ میں انگریزوں کو اردو پڑھانے کا ایک کالج تھا، منشی عزیز الرحمٰن صاحب اس کے پرنسپل تھے، فارسی اور اُردو کے عالم تھے۔ انھوں نے سات جلدوں میں "علم مجلس" کے نام سے اُردو شعروں کی ڈکشنری مرتب کی تھی جو بہت مقبول تھی۔ انگریزی پر انھیں غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ انھوں نے انگریزوں کو اردو پڑھانے کے لیے کئی نصابی کتابیں لکھی تھیں۔ ان کتابوں میں انگریزی فقروں کا اردو ترجمہ رومن میں لکھا گیا تھا۔ ان کی دو تین تیار کی ہوئی نصابی کتابیں انگریزی اور اُردو میں میری ذاتی لائبریری میں موجود ہیں۔ انھوں نے دہلی کی جامع مسجد پر انگریزی میں ایک کتاب لکھی تھی جس میں جامع مسجد کی مستند تاریخ بیان کی گئی تھی۔ اس کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

میری والدہ قیصر سلطانہ صاحبہ غیر معمولی صلاحیتوں کی خاتون تھیں۔ چونکہ نانا مرحوم ہر وقت انگریزوں کے ساتھ رہتے تھے اس لیے وہ عورتوں کی تعلیم کے بہت حامی تھے۔ انھوں نے اپنے تمام لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کو بھی باقاعدہ تعلیم دلائی تھی۔ میری والدہ نے دہلی کے فرانسیسی گرلز ہائی اسکول میں اس زمانے میں تعلیم پائی جب مسلمان لڑکی کو تعلیم کے لیے گھر سے باہر بھیجنے کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ والدہ نے مڈل تک پڑھا تھا کہ شادی ہو گئی۔ ہمارے بچپن میں والدہ اور والد انگریزی میں بے تکلف بات کرتے تھے۔ والد کا انتقال ہو گیا اور کوئی ایسا نہیں رہا جس سے وہ انگریزی میں بات کر سکیں۔ اس لیے مشق نہیں رہی۔ والدہ مرحومہ غیر معمولی ذہین خاتون تھیں۔ ہمارے بچپن میں گھر میں ایسے اُردو رسالے تھے۔ جن میں والدہ کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ یہ مضامین عورتوں کے سماجی مسائل پر تھے۔ والدہ قیصر سلطانہ عزیزی کے نام سے لکھتی تھیں۔ ان کے ابھی دس بارہ مضامین ہی شائع ہوئے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا اور پھر وہ آلامِ روزگار میں ایسی گھریں کہ سر اٹھانے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ والد کا تیس بتیس سال کی عمر میں تقریباً ایک سال کی بیماری کے بعد انتقال ہوا تھا، گھر میں جو معمولی سا اثاثہ تھا، وہ سب ڈاکٹروں کی نذر ہو گیا والد کا انتقال ہوا تو پانچ بچے تھے۔ ایک لڑکا یعنی میں اور چار لڑکیاں

بعد میں جب والدہ نے ملازمت کرلی اور ہمارے حالات بہت خراب نہیں رہے تو والدہ نے ایک اور بچی کو گود لے لیا۔ اب گویا ہم چھ ہو گئے ایک بھائی اور پانچ بہنیں۔

والد کی وفات سے ہمارے خاندان پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں رہا تھا۔ والدہ کی خودداری نے یہ گوارا نہیں کیا کہ کسی کے آگے دستِ سوال دراز کرتیں۔ ایک دولت مند خاندان میں نازونعم میں پلی ہوئی ایک لڑکی نے سلائی کا کام شروع کیا۔ گھروں پر جاکر ٹیوشن کیے اور اس کے ساتھ ہی دوبارہ تعلیم جاری رکھی۔ پرائیویٹ امتحان دینے شروع کیے۔ پانچ چھ سال میں اعلا تعلیم حاصل کی اور پھر اساتذہ کی تربیت حاصل کر کے دہلی کے ایک اسکول میں پہلے ٹیچر اور کچھ دن بعد ہیڈ مسٹریس ہوگئیں۔ والد کی وفات کے بعد والدہ کو سخت نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا اس لیے وہ کہتی تھیں کہ لڑکیوں کو اس قابل ضرور کردو کہ اگر وہ چاہیں تو اپنے پیروں پر کھڑی ہوسکیں۔ اسی لیے مفلسی اور غربت کے باوجود انھوں نے مجھے اور میری پانچ بہنوں کو اعلا ترین تعلیم دلوائی۔

میں ۲۲ر دسمبر ۱۹۳۲ء کو دہلی میں پیدا ہوا۔ دہلی میں اینگلو عربک اسکول میں تعلیم پائی۔ تیرہ سال کا تھا اور ساتویں کلاس میں تھا کہ ۱۹۴۷ء کے ہنگامے ہو گئے۔ اسکول بند ہو گیا۔ چھ مہینے بعد اینگلو عربک اسکول کی اجمیری گیٹ شاخ کھل گئی۔ داخلے کے لئے گیا۔ اس وقت نویں کلاس میں طلبار کی تعداد بہت کم تھی۔ اس لیے پرنسپل صاحب نے معمولی سے سوال و جواب کے بعد مجھے نویں میں داخل کرلیا۔ اس اسکول میں پہلے دن میری ملاقات محمد اسلم خاں سے ہوئی۔ یہ نویں جماعت میں مجھ سے کچھ ہی دن پہلے داخل ہوئے تھے۔ محمد اسلم خاں سے میری دوستی ایسی ہوئی کہ پینتالیس سال گزرنے کے باوجود آج بھی ہم ایک دوسرے کے بہترین دوست ہیں۔ ہماری دوستی کی اصل بنیاد' ادب میں دلچسپی تھی۔ ہم دونوں ناول، افسانے اور شاعری کا بہت مطالعہ کرتے تھے۔ اسکول میں ہمارے ایک استاد تھے' رہبر پرتاپ گڑھی مرحوم۔ اچھے شاعر تھے۔ زبان پر بہت اچھی قدرت تھی۔ ادب میں دلچسپی رکھنے والے طلبا پر بہت مہربان رہتے۔ ہم دونوں' محمد اسلم خاں اور میں' ان کے قریب آگئے۔ وہ غالب کے عاشق تھے۔ غالب کا پورا اردو دیوان انھیں یاد تھا۔ اکثر غالب کے اشعار کا مطلب سمجھاتے۔ ان کا ایک دلچسپ طریقہ یہ تھا کہ غالب کا ایک شعر دے دیتے۔ چھٹی کے بعد ایک درخت کے نیچے محفل جمتی۔ رہبر صاحب میرِ محفل اور حاضرین میں پانچ چھ طلبا ہر طالب علم غالب کے دیئے گئے شعر کا مطلب بتاتا۔ جس کا بتایا ہوا مطلب صحیح ہوتا، اسے رہبر صاحب جیب سے نکال کر گڑ کی ڈلی انعام میں دیتے۔ میں نے اور اسلم نے باد ہا گڑ کی ڈلی حاصل کی بلکہ اکثر گڑ کی ڈلی مجھے ملتی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے اردو بازار سے بیخود کی شرح غالب خریدلی تھی۔ بازار میں کئی شرحیں تھیں لیکن میرے اور اسلم کے علاوہ اور کسی طالب علم کو ان کا علم نہیں تھا۔ کبھی کبھی صورتِ حال دلچسپ ہو جاتی کہ میں شعر کا مطلب تو بالکل صحیح بتاتا لیکن لفظوں کا مطلب غلط ہوتا۔ بہت عرصے تک رہبر صاحب پر یہ راز نہیں کھلا۔ طلبار میں اسکول لائبریری کا سب سے زیادہ استعمال میں اور اسلم کیا کرتے تھے۔ اسلم شعری مجموعوں کا مطالعہ کرتے، مجھے شاعری سے زیادہ نثر اور وہ بھی ناولوں کا بہت شوق تھا۔ میں نے لائبریری کے تقریباً سب ناول پڑھ لیے تھے۔

ہم دسویں کلاس میں پڑھتے تھے کہ رہبر صاحب کی صحبت بلکہ ان کی ترغیب نے ہمیں شاعر بنادیا۔ محمد اسلم خاں، اسلم پرویز ہوگئے میرا معاملہ دلچسپ تھا۔ والد مرحوم نے میرا نام غلام احمد خاں رکھا تھا۔ اسکول میں لڑکے غلام غلام کہہ کر چھیڑتے تھے۔ اسی لئے والدین نے میرا نام خلیق احمد خاں کردیا۔ شاعری کا شوق ہوا تو خلیق اقبال ہوگیا۔ مجھے یہ نام بہت پسند تھا لیکن اسلم پرویز کو خلیق انجم پسند تھا۔ کئی مہینے کے بحث ومباحثے کے بعد میں خلیق اقبال سے خلیق انجم ہوگیا۔ رہبر صاحب کا مشورہ تھا کہ میں نثر نگاری کی طرف توجہ کروں، چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔

ہمارے اسکول کے اساتذہ میں ممتاز مزاح نگار فرقت کاکوروی اور مشہور شاعر شمیم کرہانی صاحب بھی تھے۔ اسکول سے "اعتمادیہ" نام سے ایک میگزین شائع ہوتا تھا جو ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں بند ہوگیا تھا۔ میری کوشش اور اصرار سے پرنسپل صاحب اسے

دوبارہ جاری کرنے پر راضی ہو گئے۔ فرقت صاحب کو انچارج اور مجھے ایڈیٹر بنا دیا گیا۔ اس طرح میں فرقت صاحب سے قریب ہو گیا۔ فرقت صاحب اسکول کے ایک کمرے میں رہتے تھے۔ میں اکثر ان کے پاس بیٹھا رہتا۔ میں نے فرقت صاحب مرحوم کی رہنمائی میں "اعتمادیہ" کا کام شروع کیا، مضامین اکٹھا کیے اور اداریہ لکھا۔ اداریہ کا خاکہ فرقت صاحب نے بنایا تھا اور لکھا میں نے۔ اعتمادیہ کا یہ اداریہ میری وہ پہلی تحریر تھی جو چھپی۔ اسی زمانے میں ایک افسانہ لکھا جو علی گڑھ سے شائع ہونے والے ماہنامہ "جھلک" میں چھپا۔ افسانے کی اشاعت سے ہمت بڑھی۔ میں نے دو تین افسانے اور لکھے جو جھلک میں ہی شائع ہوئے۔ دسویں کے امتحان کا واقعہ سن لیجیے۔

میں حساب میں ہمیشہ سے بہت کمزور تھا۔ ہماری کلاس میں ایک لڑکا تھا، اس کا نام تو یاد نہیں، اسے خلیفہ پیدل کہتے تھے۔ اس نام کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ خلیفہ پیدل پہلوانی کرتے تھے، اس لیے اکھاڑے والے خلیفہ کہتے تھے۔ اسکول سے ان کا گھر بہت دور تھا۔ لیکن وہ اسکول پیدل آتے اور جب بھی موقع ملتا، پیدل چلنے کے فوائد پر لیکچر شروع کر دیتے، اس لیے ان کا نام خلیفہ پیدل ہو گیا۔ خلیفہ پیدل حساب میں بہت اچھے تھے۔ نویں کلاس میں انھوں نے مجھے نقل کرادی تھی اور میں حساب میں اچھے نمبروں سے پاس ہو گیا۔ چوں کہ میں دوسرے مضامین، خاص طور سے اُردو، فارسی اور انگریزی میں بہت اچھا تھا اس لئے میرا رزلٹ خلیفہ پیدل کے مقابلے میں بہت اچھا تھا۔ اس کا بدلہ انھوں نے اس طرح چکایا کہ سال بھر تک وعدہ کرتے رہے کہ امتحان میں نقل کرادیں گے۔ لیکن جب امتحان کا وقت آیا تو وہ امتحان کے کمرے میں مجھ سے بہت دُور جاکر بیٹھ گئے۔ آس پاس بیٹھے ہوئے طلبا سے بس اتنی مدد مل سکی کہ میں بہ مشکل تمام پاس ہوا۔

اسلم پرویز بھی حساب میں کچھ زیادہ اچھے نہیں تھے۔ رزلٹ آنے کے بعد پرنسپل صاحب نے کچھ طلبا کو دفتر میں بُلاکر مشورہ دیا کہ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں انٹرمیجیٹ میں داخلہ لے لیں۔ کیوں کہ اس طرح حساب سے نجات مل جائے گی، ورنہ ہائر سکنڈری کا امتحان بورڈ کا ہوگا اور اس میں پاس ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ ہم حساب سے بہت عاجز تھے اس لیے میں اور اسلم دونوں علی گڑھ چلے گئے۔ علی گڑھ میں ماہنامہ "جھلک" کے مالک نے مجھے ساٹھ روپے مہینے پر ایڈیٹر مقرر کر لیا۔ ساٹھ روپے تنخواہ مجھے ملتی تھی، لیکن رسالے کا سارا کام میں اور اسلم دونوں کرتے تھے اور رسالے کا پیٹ بھرنے کے لیے ہم کہانیاں، لطیفے، فلمی واقعات اور سوال و جواب غرض سب ہی کچھ لکھتے۔ اس سے فائدہ یہ ہوا کہ ہمیں نثر لکھنے پر خاصی قدرت حاصل ہو گئی۔ ہمارا داخلہ ممتاز ہاسٹل میں ہوا تھا۔ ہمارے سینیر پارٹنر ابو سعید زیدی صاحب تھے۔ کمرے میں دو صاحبان اور تھے، خلیل الرحمٰن اعظمی اور انجم اعظمی ___ دونوں شاعر تھے لیکن خلیل بہت پڑھے لکھے تھے۔ ہر وقت مطالعے میں مصروف رہتے۔ وہ جدید اور کلاسیکی ادب دونوں کا مطالعہ کرتے۔ لیکن مجھے کلاسیکی ادب سے زیادہ دل چسپی نہیں تھی۔ اب تک میں نے معمولی قسم کے ناول اور افسانے پڑھے تھے۔ خلیل صاحب کی صحبت میں مجھے اور اسلم کو سنجیدہ ادب میں دل چسپی پیدا ہو گئی۔ علی گڑھ کی لائبریری میں اُردو کتابوں کا زبردست ذخیرہ تھا، ہم نے لائبریری سے استفادہ شروع کر دیا۔ دو سال گزر گئے۔ ہم نے اچھے نمبروں سے انٹر کا امتحان پاس کر لیا اور بی۔اے میں داخل ہو گئے۔

اس دوران ایک بڑا واقعہ یہ ہوا کہ "جھلک" بہت اچھا چل رہا تھا۔ دس بارہ ہزار کی اشاعت تھی، اشتہار بھی اچھے مل رہے تھے کہ "جھلک" کے مالک اور ان کے بھائی میں "جھلک" پر کچھ جھگڑا ہوا اور رسالہ بند ہو گیا۔ اسلم کے گھر سے تو ہر مہینے اچھی خاصی رقم آتی تھی لیکن میری والدہ صرف بیس روپے مہینہ بھیجتی تھیں۔ حالات خاصے پریشان کن ہو گئے۔ ہم نے مجبور ہو کر علی گڑھ کی شمشاد بلڈنگ میں دہلی کیفے کے نام سے ایک ریستوراں شروع کیا جو بہت اچھا چل پڑا چوں کہ ہم یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ اس لیے ہمارے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ اسی حلقے کی وجہ سے یہ ریستوراں خوب چلا۔ لیکن ان دوستوں پر اتنا قرض ہو گیا کہ ریستوراں بند کرنا پڑا۔ علی گڑھ یونیورسٹی بھی عجیب و غریب تعلیمی ادارہ ہے، اپنے طالب علموں کو بھوکا نہیں رہنے دیتا۔ یونیورسٹی کے مختلف اداروں سے فیس کا انتظام بھی ہو ہی جاتا ہے۔ والدہ نے بیس روپے بڑھا کر تیس روپے کر دیئے اور کچھ یونیورسٹی سے مدد مل گئی۔ کام چل پڑا۔ ہم بی۔اے فائنل میں آ گئے۔ اس سال ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے مجھے باقاعدہ ادیب

بنا دیا۔

ہوا یہ کہ معین احسن جذبی صاحب نے کلاس میں ٹیوٹوریل دیا اور کہا کہ جو طالب علم جس موضوع پر چاہے مضمون لکھ کر لائے۔ میں ان دنوں سراج اورنگ آبادی کی "بوستان خیال" پڑھ رہا تھا۔ سراج اورنگ آبادی اور مثنوی بوستان خیال پر خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب سے دیر تک گفتگو بھی ہوئی تھی، اس لیے میں اس مثنوی پر مضمون لکھ کر لے گیا۔ معین احسن جذبی صاحب نے مضمون کے دو تین صفحے ہی پڑھے تھے کہ ناراض ہو کر بولے کہ "میں نے کہا تھا کہ آپ مضمون خود لکھ کر لایئے کسی کا مضمون نقل کر کے لانے کو نہیں کہا تھا۔"

یہاں ایک بات سن لیجئے:

ہماری کلاس میں بیشتر طلبا یوپی اور بہار کے قصبات کے تھے اس لیے ان کی اُردو زیادہ اچھی نہیں تھی۔ میں اور اسلم ایک تو دلی کے، دوسرے راہبر برتاپ گڑھی، فرقت کاکوروی صاحب کے تربیت یافتہ، اس لیے کم عمری میں جو غلط قسم کی خود اعتمادی اور بے جا گھمنڈ پیدا ہوتا ہے، وہ ہم دونوں میں تھا۔ یہ گھمنڈ کبھی کبھی بدتمیزی کی حد تک پہونچ جاتا۔ کلاس میں غلط تلفظ پر لیکچرر تک کو ٹوک دیا کرتے تھے۔ پھر میں "جھلک" کا ایڈیٹر رہا تھا۔ ان سب کی وجہ سے ہمارے ہم جماعت ہم سے بہت مرعوب رہتے تھے۔ اب جو جذبی صاحب نے مجھ پر ادبی چوری کا الزام لگایا تو کلاس میں تمام طلبا نے انتقاماً زور کا قہقہہ لگایا۔ میں نے جذبی صاحب کو بتایا کہ مضمون میں نے لکھا ہے۔ انھوں نے غصے سے کہا — "ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری" اور کاپی زور سے میری میز پر پٹخ دی۔

اس بے عزتی پر میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ شام کو میں ہاسٹل کے کمرے میں اُداس بیٹھا تھا۔ ابوسعید زیدی صاحب آئے تو اسلم نے انھیں کلاس کا واقعہ سنایا۔ انھیں معلوم تھا کہ مضمون میں نے لکھا ہے۔ انھوں نے مجھے گلے سے لگا کر کہا کہ جذبی صاحب بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں، اگر انھوں نے تمھارے مضمون پر شبہ کیا کہ وہ کسی بڑے نقاد کا ہے تو اس سے بڑھ کر تمھارے مضمون کی اور تعریف کیا ہو سکتی ہے۔ انھوں نے زبردست حوصلہ افزائی کی اور کیفے ڈی پھوس میں لے جا کر برفی اور نمک پارے کھلائے اور چائے پلائی۔ میں اس وقت تک بہت کچھ لکھ چکا تھا لیکن سنجیدہ موضوع پر یہ میرا پہلا مضمون تھا۔ ایم اے کرنے کے بعد میں نے یہ مضمون ماہنامہ "زندگی" کراچی کو بھیجا، جہاں فوراً چھپ گیا۔

بی اے فائنل کا امتحان ہوا اور میں اور اسلم دونوں اچھے نمبروں سے پاس ہو گئے۔ اور ہم نے ایم اے سائکلوجی میں داخلہ لے لیا۔ چند روز بعد مجھے محسوس ہوا کہ مالی حالت علی گڑھ میں مزید قیام کی اجازت نہیں دیتی۔ میں دلی واپس آگیا اور میری وجہ سے اسلم بھی دہلی آگئے۔ میں نے ملازمت کی تلاش شروع کر دی۔ مشکل یہ ہو گئی تھی کہ سب بہنیں تعلیم پا رہی تھیں۔ والدہ کی آمدنی اتنی نہیں تھی کہ اعلا تعلیم کا خرچ برداشت کر سکتیں۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ ملازمت کر کے اقتصادی طور پر والدہ کی مدد کروں گا۔ دلی اسکول آف اکنامکس میں گریٹر دلی سروے ہو رہا تھا، جس کے لیے ایسے لوگوں کی ضرورت تھی جو گھر گھر جا کر اطلاعات حاصل کر سکتے ہوں۔ اس سلسلے میں ایک فارم بھرنا ہوتا تھا۔ فارم میں ڈیڑھ سو کے قریب سوال تھے۔ جواب کوڈ میں لکھنا ہوتا تھا۔ مثلاً اگر کوئی جواب دیتا کہ وہ یوپی سے دلی آیا ہے تو یوپی کا نمبر دو تھا۔ اس خانے میں ہم "۲" لکھ دیتے تھے۔ ڈیڑھ سو کوڈ یاد کرنا آسان نہیں تھا اس لیے صرف ان لوگوں کو ملازم رکھا جاتا تھا جو اکنامکس میں ایم اے ہوں، تعلیمی بہت ذہانت ہو اور حافظہ بہت اچھا ہو۔ دلی کالج (جو اب ذاکر حسین کالج ہے) کے استاد ہلدر صاحب میرے مہربان تھے۔ ان کے قریبی دوست پروجیکٹ کے ڈائرکٹر تھے، چوں کہ یہ پروجیکٹ دو تین سال کا عارضی تھا، اس لیے قاعدہ قانون زیادہ سخت نہیں تھے۔ ہلدر صاحب نے میری سفارش کی اور ڈائرکٹر صاحب نے یہ کہہ کر مجھے ایک انویسٹی گیٹر کے حوالے کر دیا کہ پندرہ دن تک میں ان کے ساتھ فیلڈ پر جا کر تربیت حاصل کروں، پھر میرا ٹسٹ ہو گا۔ اگر کامیاب ہو گیا تو مجھے رکھ لیا جائے گا۔ مجھے ملازمت کی سخت ضرورت تھی۔ دس دن بعد ہی میں نے ٹسٹ دیا اور کامیاب ہو گیا۔ کچھ دن بعد اسلم بھی وہیں آگئے۔ ہم دونوں ایک تو دلی کے اور پھر علی گڑھ یونیورسٹی کی خراد پر اُترے ہوئے۔ چند ہی روز میں یہ حال ہو گیا کہ جو کام کسی سے نہ ہوتا وہ ہم دونوں میں سے کسی ایک کو دیا جاتا۔

میں جس زمانے میں "جھلک" کا ایڈیٹر تھا تو ایک خاص نمبر کے لیے مضمون کی فرمائش کرنے پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کی خدمت

میں حاضر ہوا تھا۔ اس زمانے میں خواجہ صاحب ذاکر حسین کالج کے ہاسٹل میں رہتے تھے۔ خواجہ صاحب نے بہت دیر تک گفتگو کی۔
جب انھیں اندازہ ہوا کہ میری ادبی معلومات خاصی ہیں تو بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے وعدہ لیا کہ میں جب بھی دہلی آؤں گا، ان کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔ لیکن میری بدتوفیقی کہ یہ وعدہ وفا نہیں ہوسکا۔ گریٹر دہلی سروے کا دفتر دلی یونیورسٹی کیمپس میں تھا۔ ایک دن یونیورسٹی میں خواجہ صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ انھوں نے اردو ایم۔اے میں داخلے کا مشورہ دیا۔ بات سمجھ میں آگئی۔ گریٹر دہلی سروے میں وقت کی پابندی نہیں تھی کسی وقت بھی فیلڈ میں جاسکتے تھے۔ چنانچہ اسلم اور میں نے اردو ایم۔اے میں داخلہ لیا۔ دفتر کی ذمہ داریاں کچھ ایسی بڑھ گئیں کہ دو سال میں مشکل سے دو تین دفعہ ہی کلاس جا سکا۔ اساتذہ بھی چشم پوشی کرتے۔ میں نے انھیں اپنی مجبوریاں بتادی تھیں۔ میں کلاس میں تو نہیں جاتا تھا، لیکن پڑھتا بہت تھا۔ امتحان ہوا۔ تیس کے قریب پرائیوٹ اور ریگولر طلبا میں سب سے زیادہ نمبر آئے، اگرچہ چار نمبر سے فرسٹ کلاس رہ گئی۔
رزلٹ کی تیاری کے وقت رجسٹرار آفس میں موڈریشن کمیٹی ہوتی تھی جس میں اگر کسی طالب علم کی فرسٹ کلاس دو چار نمبر سے رہ رہی ہوتی تو اتنے نمبر دے دیئے جاتے تھے۔ میرا دکنی کا پرچہ سب سے اچھا ہوا تھا اور میں سوچتا تھا کہ سو میں سے نوّے نمبر آئیں گے۔ لیکن آئے کل چالیس ——!! میں پی ایچ ڈی کے مقالے کے مواد کی تلاش میں حیدرآباد گیا ہوا تھا۔ ادارہ ادبیات اُردو میں مقیم تھا۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ ایک صاحب، جو اس وقت انٹر پاس تھے، کچھ پرچے جانچ رہے ہیں۔ دیکھنے پر معلوم ہوا کہ دلی یونیورسٹی کے ایم۔اے (اردو) کے دکنی کے پرچے ہیں۔ ان صاحب نے فخریہ بتایا کہ سات آٹھ سال سے وہ یہ پرچے دیکھ رہے ہیں۔ اصل ممتحن ڈاکٹر قادری محی الدین زور مرحوم تھے، مگر مصروفیات کی وجہ سے انھوں نے ادارہ ادبیات اردو کے ایک صاحب کو یہ کام سونپ دیا تھا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ اس پرچے میں میرے کل چالیس نمبر کیوں آئے تھے۔
دلی کالج کے پرنسپل ایم۔ ایم بیگ مرحوم (خدا ان کو جنت نصیب کرے) صرف کالج کے پرنسپل ہی نہیں، ایک اعلا درجے کے انسان بھی تھے —— انھوں نے بلا مبالغہ ہزاروں ہندو مسلم لڑکوں اور لڑکیوں کو ملازمت دلائی تھی چوں کہ میں نے دلی کالج سے ایم۔اے کیا تھا، اس لیے بیگ صاحب میری ملازمت کے لیے کوشاں تھے۔ ایک رات کو کوئی بارہ بجے ان کے ملازم نے آکر بتایا کہ بیگ صاحب نے صبح چھ بجے بلایا ہے۔ میں پونے چھ بجے ہی پہونچ گیا۔ انھوں نے بتایا کہ کل رات کو کہیں ڈنر پر کروڑی مل کالج کے پرنسپل ڈاکٹر سروپ سنگھ (جو آجکل گجرات کے گورنر ہیں) سے ملاقات ہوئی تھی، ان کے کالج میں اردو کے ایک پارٹ ٹائم لیکچرر کی ضرورت ہے۔ بیگ صاحب نے یہ بھی بتایا کہ ڈاکٹر صاحب کی تین شرطیں ہیں: ایک تو یہ کہ امیدوار مسلمان ہو، دوسرے دلی کا ہو اور تیسرے شاعر ہو۔
میں نے عرض کیا کہ شروع کی دو شرطیں تو پوری کرتا ہوں لیکن میں تیسری شرط پر پورا نہیں اترا، یعنی شاعر نہیں ہوں۔
بیگ صاحب نے پوچھا: "اسلم نے کتنی غزلیں کہہ رکھی ہیں؟"
جواب دیا کہ "چالیس، پچاس"۔
"تو بھائی! آدھی ان کی اور آدھی تمھاری"——
بات سمجھ میں آگئی۔ میں اسلم کی آدھی غزلیں لے کر دس بجے کالج پہنچ گیا، اور پرنسپل کے کمرے میں بے دھڑک داخل ہوگیا۔
مجھے دیکھتے ہی ڈاکٹر سروپ سنگھ نے گھنٹی بجاکر چپراسی کو بلایا اور چیخ کر کہا:
"کمرے سے باہر نکال دو۔ داخلہ لینا ہے تو دفتر میں ہیڈ کلرک سے ملو—— میں کیا کروں!"
میں نے جواب دینے کے لئے زبان ہی کھولی تھی کہ انھوں نے اور بھی زور سے ناراض ہوکر کہا:
"میں کہتا ہوں نکل جاؤ میرے کمرے سے"——
چپراسی میری طرف بڑھا۔ اس سے پہلے کہ چپراسی ہاتھ پکڑ کر مجھے باہر نکالتا، میں خود کمرے سے باہر آگیا۔ علی گڑھ کا تھا، اس لئے ہر گُر سے واقف تھا۔ باہر آکر میں نے چپراسی کو پوری بات بتائی اور اس کے ہاتھ بیگ صاحب کا خط ڈاکٹر صاحب کو بھیج دیا۔ خط پڑھتے ہی ڈاکٹر

سروپ سنگھ کمرے سے باہر بھاگے ہوئے آئے۔ بہت معافی تلافی کی اور بتایا کہ داخلے کے لیے طلبا نے بہت پریشان کر رکھا ہے۔

ڈاکٹر صاحب مجھے اپنی میز پر لے گئے اور اپنے پاس بٹھا کر کچھ دیر تک بڑی محبت اور شفقت سے باتیں کیں۔ میرے بارے میں کچھ سوالات کیے اور ایک کلرک کو بلا کر کہا کہ انھیں ٹائم ٹیبل دے دیجئے۔ میں نے اسی دن سے کلاس لینی شروع کردی۔ شام کو بیگ صاحب سے ملا اور انھیں خوش خبری دی تو انھوں نے کہا کہ تم ابھی مطمئن نہ ہو۔ لائبریری سائنس کا کورس بھی دلی یونیورسٹی سے کرلو۔ کیوں کہ موجودہ جگہ ایک تو پارٹ ٹائم ہے اور دوسرے عارضی ـــــ بیگ صاحب ہی کے کہنے پر لائبریری سائنس میں داخلہ مل گیا اور میں نے بہت ہی اچھے نمبروں سے یہ امتحان پاس کرلیا۔ اسی دوران رام جس کالج میں بھی ایک پارٹ ٹائم جگہ نکلی۔ ڈاکٹر سروپ سنگھ نے وہاں بھی میرا تقرر کر دادیا۔ جس کی وجہ سے میں غیر معمولی طور پر مصروف ہوگیا۔ دو کالجوں میں کلاس لینا اور یونیورسٹی میں لائبریری سائنس کی کلاس میں شرکت کرنا۔ لائبریری سائنس میں ایسے دوست تھے جو پروکسی کردیا کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے میری حاضریاں بھی پوری ہوگئی تھیں۔ میں نے کروڑی مل کالج میں کچھ مشاعرے کیے، ایک آدھ جمتا ہوا سیمینار کیا، جس کی وجہ سے سروپ سنگھ صاحب اور کنور محمد اشرف بہت محبت کرنے لگے۔ میرا مستقل طور پر تقرر کیسے ہوا، یہ لمبی داستان ہے اور پھر کبھی سناؤں گا۔ مختصر یہ کہ میں کلاس میں مستقل لیکچرر ہوگیا۔ اب ذرا مجھے فرصت ملی اور میری ادبی مصروفیات شروع ہوگئیں۔ میری سب سے پہلی کتاب "معراج العاشقین" ہے جسے مکتبہ شاہراہ دہلی نے شائع کیا تھا اور جس کی رائلٹی مجھے ایک سو پچاس روپے ملی تھی۔ یہ کتاب ایک ناتجربہ کار طالب علم کی کوشش تھی، جس میں خاصی غلطیاں تھیں لیکن اس کتاب کی بہت پذیرائی ہوئی جس سے میرا حوصلہ بلند ہوا۔ ان دنوں میں میرے عزیز ترین دوستوں میں اسلم پرویز کے علاوہ نثار احمد فاروقی صاحب بھی تھے جو اب ماشاءاللہ اردو، فارسی، انگریزی اور عربی کے زبردست عالم اور مصنف ہیں۔ ہم تینوں ہر وقت ساتھ رہتے۔ اس وقت نثار صاحب صرف میٹرک پاس تھے۔ لیکن ان کی علمیت کا حال یہ تھا کہ انھوں نے پی ایچ۔ڈی کے لیے بہت سے لوگوں کی رہنمائی کی اور ایک آدھ طالب علم کا تحقیقی مقالہ اس طرح دیکھا کہ اگر وہ خود اپنے لیے پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھتے تو اس سے بہت کم وقت میں لکھ لیتے۔ نثار صاحب نے انٹر میں داخلہ لیا اور غیر معمولی شاندار نمبروں سے پاس ہوئے۔ بی اے کیا۔ ایم اے کیا۔ پی ایچ۔ڈی کیا اور اب ماشاءاللہ دلی یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر ہیں۔ ہم ایک ریستوراں میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ نثار صاحب نے مشورہ دیا کہ غالب کی جو تحریریں مختلف رسالوں میں چھپی ہوئی ہیں، میں انھیں مرتب کرکے شائع کردوں۔ میں نے سینکڑوں رسالے کھنگالے اور غالب کی تحریریں اکٹھا کرکے "غالب کی نادر تحریریں" کے نام سے شائع کردیں۔ یہ دراصل ایک چھوٹا سا کام تھا۔ لیکن یہ پیش قدمی تھی میرے اس بڑے کام کی، جو چار جلدوں میں "غالب کے خطوط" کے نام سے شائع ہوا، اور جس کو ہندستان اور پاکستان کے بہت سے ادیبوں اور نقادوں نے خراج عقیدت پیش کیا

لیکچرر ہوتے ہی میں نے پی ایچ۔ ڈی میں داخلہ لے لیا۔ میرا موضوع تھا "مرزا مظہر جانِ جاناں" ـــــ دراصل یہ موضوع مجھ پر شعبۂ اردو نے تھوپا تھا۔ مجھے اس میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن "حکم حاکم مرگِ مفاجات" کے تحت میں نے اسی موضوع پر کام شروع کردیا، لیکن ساتھ ہی اپنے پسندیدہ شاعر مرزا محمد رفیع سودا پر بھی کام شروع کردیا۔ اور پی ایچ۔ ڈی کے مقالے کے لیے میں نے ہندستان کے بہت سے شہروں کا دورہ کرکے وہاں کی لائبریریوں سے استفادہ کیا۔ مرزا مظہر جانِ جاناں کے لئے جو قلمی اور مطبوعہ تذکرے پڑھتا، ان میں سے سودا کے حالات بھی نوٹ کرلیتا۔ اس لیے جب میں نے پی ایچ ڈی کا تھیسس مکمل کرکے داخل کیا تو سودا پر کام شروع کیا اور سال بھر میں کتاب مکمل ہوگئی۔

میری خوش نصیبی تھی کہ ایک دن پروفیسر آل احمد سرور آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے پوچھا کہ ان دنوں میں کیا کر رہا ہوں۔ میں نے بتایا کہ سودا پر کام مکمل کیا ہے تو انھوں نے مسودہ دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ کچھ ہی دن بعد میں نے وہ مسودہ سرور صاحب کو علی گڑھ بھیج دیا۔ اور دس پندرہ دن بعد سرور صاحب کا خط آیا کہ اگر میں چاہوں تو یہ کتاب انجمن ترقی اردو شائع کرسکتی ہے۔ انھوں نے

اس خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ اگر آپ راضی ہوجائیں گے تو آپ سب سے کم عمر ادیب ہوں گے جس کی کتاب انجمن ترقی اُردو شائع کرے گی۔

سرور صاحب کو شاید اس کا علم نہیں تھا کہ میرے لیے اس سے بڑا دنیا میں کوئی اعزاز نہیں ہوسکتا تھا کہ میری کتاب انجمن ترقی اردو شائع کرے۔

سودا بہت خوبصورت انجمن ترقی اُردو سے شائع ہوگئی، جس کی وجہ سے اُردو میں مجھے خاصی شہرت حاصل ہوگئی۔

یہاں ایک قصہ بیان کردوں کہ گورنمنٹ کا سرکلر کلاس میں آیا کہ دو لیکچرر این۔سی۔سی کی ٹریننگ کے لیے فوراً درکار ہیں۔ میں اس وقت اتنا دبلا پتلا تھا کہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا لیکن نہ جانے کیوں سروپ صاحب نے کالج کے ایک اور لیکچرر ڈاکٹر تارک ناتھ بالی کے ساتھ میرا نام بھی بھیج دیا اور میں اپنی چرب زبانی کی وجہ سے منتخب ہوگیا۔ کامپٹی میں جب ٹریننگ کے لیے گیا تو میڈیکل چیک اپ ہوا۔ میرا وزن کم نکلا۔ جو صاحب وزن تول رہے تھے انھوں نے کہا، آپ کو تو دہلی واپس جانا ہوگا۔ میں نے ان کے سامنے ہاتھ پیر جوڑے اور نہ جانے کس طرح سے میں نے درخواست کی کہ انھیں مجھ پر رحم آگیا اور مجھے پاس کردیا۔ تین مہینے کی زبردست ٹریننگ ہوئی اور میں سکنڈ لیفٹننٹ ہوکر اور بہت اچھی صحت لے کر دہلی آگیا۔ یہاں تقریباً روز ہی پریڈ کرتا، جس سے صحت اور بھی اچھی ہوگئی۔ میں کیپٹن ہوچکا تھا اور میجر ہونے والا تھا کہ شادی ہوگئی اور پھر این۔سی۔سی کی مصروفیات خاصی پریشان کن ہوگئیں۔ میں نے تنگ آکر استعفا دے دیا۔

استعفے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ میں آل انڈیا ریڈیو پر فارسی کا مترجم اور براڈکاسٹر ہوگیا۔ مہینے میں پندرہ دن ریڈیو پر میری ڈیوٹی ہوتی تھی۔ چوں کہ مجھے اس کام میں بہت دلچسپی تھی اس لیے میں نے این سی سی سے استعفا دے دیا۔

۱۹۷۲ء میں ڈاکٹر سروپ سنگھ دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے اور گجرال کمیٹی کے رکن تھے۔ کمیٹی کو ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو رپورٹ لکھنے کے سلسلے میں علی جواد زیدی صاحب کی مدد کرسکتا۔ ڈاکٹر سروپ سنگھ کی سفارش پر مجھے وزارت تعلیم میں ڈپٹی ڈائرکٹر کے عہدے پر لے لیا گیا اور کچھ دن بعد میں ڈائرکٹر بنادیا گیا۔ گجرال صاحب، بنّے بھائی اور مالک رام صاحب وغیرہ میرے کاموں سے نہ صرف مطمئن بلکہ بہت خوش تھے۔ اس زمانے میں پروفیسر نورالحسن وزیر تعلیم تھے۔ ایک میٹنگ ہورہی تھی جس کی صدارت نورالحسن صاحب کررہے تھے۔ وہاں میٹنگ میں کسی کام کا ذکر آیا۔ نورالحسن صاحب نے کہا:

"ایسا مشکل کام کون کرے گا؟"

گجرال صاحب نے میرا نام لیتے ہوئے کہا کہ آپ کوئی کام بتائیے یہ صاحب کریں گے اور پانچ چھ منٹ تک ایسا ماحول بن گیا کہ سب اراکین نے میرے لیے کلمۂ خیر کہا۔ دوسرے دن نورالحسن صاحب نے مجھے بلاکر کہا کہ آپ ترقی اُردو بورڈ میں ڈائرکٹر ہوکر چلے جائیے اور اگر چاہیں تو منسٹری میں رہ جائیے۔ کالج واپس جاکر کیا کریں گے۔ میں نے منسٹری کو ترجیح دی۔ کچھ دن بعد انجمن ترقی اُردو میں سکریٹری کی جگہ نکلی اور اس کی مجلس عاملہ میں تمام لوگ تقریباً وہی تھے۔ جو گجرال کمیٹی میں تھے، ڈاکٹر سروپ سنگھ نے بنّے بھائی، مالک رام صاحب اور دوسرے لوگوں سے بات کی، اور اس طرح بات کی کہ سب میرے حق میں ہوگئے اور باوجود اس کے کہ اس وقت کے بڑے سینیر لوگ اس عہدے کے طلب گار تھے۔ میرا تقرر ہوگیا۔ میں جب انجمن میں آیا تو اُردو گھر کا ایک معمولی ساڈھانچہ بنا ہوا تھا۔ دو سال سے کام بند تھا اور دو ڈھائی لاکھ کے بلوں کی ادائیگی کرنی تھی۔ تقریباً ایک سال تک میں اندھیرے میں بھٹکتا رہا اور پھر کرنل بشیر حسین زیدی اور جسٹس آنند نرائن مُلّا صاحب کی سرپرستی میں ایسا راستہ نکل آیا کہ خدا کا شکر ہے کہ یہ پانچ منزلہ عمارت مکمل ہوگئی۔

زندگی کی داستان بہت لمبی ہے۔ میں نے یہاں صرف چند مختصر باتیں کہی ہیں۔ دو ایک باتیں میں اپنے ادبی ذوق کے بارے میں عرض کردوں کہ میں پہلے تنقید کے میدان میں آیا تھا لیکن شاید خدا کو میرا نقاد ہونا منظور نہیں تھا، جب میں نے تنقیدی کتابیں پڑھنا شروع کیں تو خلیل الرحمٰن مرحوم نے مجھ سے کہا کہ میں ایسا مضمون لکھوں جس میں بتایا جائے کہ اردو نقادوں نے انگریزی تنقید سے کیا کچھ لیا ہے۔ میں نے اعظمی صاحب کی رہنمائی میں کام شروع کیا اور پانچ چھ مہینے میں ملک کے بڑے بڑے معتبر نقادوں کی پول کھل گئی۔ میں نے وہ اقتباس حاصل کرلیے جن کو اپنے نام سے ہمارے اُردو نقادوں نے اپنے مضامین

میں شامل کیا تھا۔ یہ کام میں کافی عرصے تک کرتا رہا اور اتنا میٹریل اکٹھا ہوگیا کہ ڈھائی سو سے تین سو صفحات کی کتاب مرتب ہوجاتی۔ مگر مشکل یہ تھی کہ اس میں ایسے ایسے بڑے بڑے لوگوں کے نام تھے اور ان میں سے بیشتر حضرات یونیورسٹیوں کے تھے۔ اگر وہ کتاب چھپتی تو مجھے ڈر تھا کہ میرا کیریر ختم ہوجائے گا۔ اس لئے اپنی خود غرضی کی وجہ سے میں نے وہ کتاب شائع نہیں کی۔

میں نے تحقیق کو اپنا میدان بنایا اور پتہ نہیں کہ میں نے کچھ کیا یا نہیں۔ لیکن یہ اطمینان ضرور ہے کہ خدا نے مجھے جتنی صلاحیتیں دی تھیں، میں نے ان کا پورا استعمال کیا ہے اور میں نے قلم کے تقدس کا ہمیشہ احترام رکھا ہے اور کبھی کچھ ایسا نہیں لکھا، جس سے ذاتی مفاد حاصل ہو۔ حالاں کہ میں نے اپنے بیشتر ہم عصروں کو اس مرض میں مبتلا پایا۔

ہر انسان شہرت اور مقبولیت کا متمنی ہوتا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ مجھے بھی اپنی شہرت کا خیال رہا ہے لیکن میں نے شہرت حاصل کرنے کے لئے کبھی غلط طریقے اختیار نہیں کیے۔ کبھی کوئی مضمون لکھ کر دوسروں کے نام سے نہیں چھپوایا۔

اس وقت میری چالیس کے قریب کتابیں ہیں۔ تقریباً ساری کتابوں کا فرسٹ ایڈیشن ختم ہو چکا ہے۔ کئی کتابوں کے دو دو تین تین ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔ اور یہ سب میری ماں کی دعاؤں کا اثر ہے۔

□□

وزیر اعلا اترپردیش

محترم ملائم سنگھ یادو

کے

۱۲ر اپریل ۱۹۹۴ء سے، سوچنا بھون میں
یو۔ این۔ آئی، کی

اُردو ٹیلی پرنٹر سروس

شروع کرنے کے اُردو نواز اقدام پر ادارۂ نیا دور انھیں پُرجوش مبارک باد پیش کرتا ہے

ادارے کو یقین ہے کہ یو۔ این۔ آئی کی اُردو سروس کو مقبول بنانے کی وزیر اعلا کی کوششیں بارآور ثابت ہوں گی، اور اس ریاست میں اُردو بولنے والوں کی بڑی آبادی خبروں کی دُنیا میں اس سروس سے مستفید ہو سکے گی۔

اس قابل ستائش اقدام پر ادارہ نیا دور ایک بار پھر محترم وزیر اعلا کو مبارک باد پیش کرتا ہے اور اپنے اشاف کی طرف سے اظہار تشکر کرتا ہے۔

——— ایڈیٹر

تہنیت: اترپردیش اُردو اکادمی کی جانب سے سال ۱۹۹۳ء کی شائع شدہ ۹۹ کتابوں پر انعامات کا اعلان کیا گیا——
مولانا ابوالکلام آزاد انعام (پندرہ ہزار روپے) جناب اختر الایمان کو ان کی مجموعی ادبی خدمات کے اعتراف میں۔ اسکے علاوہ جناب اوپیندر ناتھ اشک۔ پروفیسر سید مجاور حسین رضوی۔ پروفیسر ملک زادہ منظور احمد اور جناب شہریار کو دس دس ہزار روپے کے انعامات—— اُردو کی ترویج و اشاعت کیلئے —— ڈاکٹر سعادت علی صدیقی مرحوم کو دس ہزار روپے کے خصوصی انعام کا اعلان کیا گیا۔

ادارہ نیا دور ان تمام حضرات کو مبارک باد پیش کرتا ہے اور اپنی نیک خواہشات کا اظہار کرتا ہے۔

ایڈیٹر

درد کی سرحدوں سے پرے

دُور تک مٹگجی ریت پر
نارسائی کے قدموں کے دُھندلے نشاں
اُجلے پردوں سے چھَن چھَن کے آتا ہوا
خاک آلودہ جذبوں کا مَیلا دُھواں
وقت کی غیر محسوس چکّی میں پِستا ہوا
حوصلوں کا بدن
لمحۂ فکر و اعجاز
آلودۂ زنگ رنج و محن —
بے بسی زرد ماحول میں
کسمساتی ہوئی —
کوہ پیما ارادوں کی سنگین دیوار پر
بے دلی اپنے پنجے جماتی ہوئی
شام کی بے نوائی —
کفن آزردہ کو پہناتی ہوئی
درد کی سرحدوں سے پرے
بہتی صدیوں کی موہوم آواز آتی ہوئی
ذہن و دل کے دریچوں سے
نمناک پردے ہٹاتی ہوئی
پھر مجھے —
شعر و نغمات کی سرحدوں میں بُلاتی ہوئی

□□

زاھدہ زیدی
آبشار-۴، ایچ. آئی. جی فلیٹ
سرسید نگر،
علی گڑھ

اندیشے

ترے ضمیر کی آواز، رُوح کا نغمہ
نگاہِ ناز کی ہر گفتگو سمجھتا ہوں
یہ بے قرارِ تحمّل، یہ اضطرابِ سکوں
لبِ خموش کی ہر آرزو سمجھتا ہوں
میں جانتا ہوں محبّت عجیب جذبہ ہے
فسردگی تری اے خوبرو سمجھتا ہوں

امید و بیم کے ہنگامہ خیز عالم میں
تری نظر مری دُنیا بدل تو سکتی ہے
ترے کرم کے سہارے یہ ہستیِ مغموم
حدودِ رنج و الم سے نکل تو سکتی ہے
تری حسین عنایت اگر رہی مجھ پر
مری اُداس طبیعت بہل تو سکتی ہے

نظامِ جبر میں مجھ سے نباہ کا وعدہ
زمانہ آئے اگر درمیاں تو کیا ہوگا
حیاتِ شوق کو میں وقفِ جستجو کر دوں
اگر ملا نہ ترا آستاں تو کیا ہوگا
میں تجھ کو حاصلِ اُلفت بنا تو لوں لیکن
ادھوری رہ گئی یہ داستاں تو کیا ہوگا

وہ میری پہلی محبت کا دل شکن انجام
جسے میں بھولنا چاہوں بُھلا نہیں سکتا
سُنا ہے ٹھوکریں کھانے سے عقل آتی ہے
میں تاب دوسری ٹھوکر کی لا نہیں سکتا
میں تیرا ہمدم و ہمدرد بن تو سکتا ہوں
مگر یہ بارِ محبت اُٹھا نہیں سکتا

وجودِ عشق تو مانی ہوئی حقیقت ہے
مجھے خبر ہے محبت کوئی گُناہ نہیں
غلط نہیں مگر اندیشۂ مآلِ وفا
جہاں میں شبنم و خورشید کا نباہ نہیں
نگاہِ ناز مجھے مرکزِ کرم نہ بنا
مرے لئے یہ محبت کی بارگاہ نہیں

□□

اقبال ماهر
۲۳۶ . نخاس کہنہ . الہ آباد

اودھ کی نمائندہ مثنوی گلزار نسیم کی تدوین

رشید حسن خاں
ڈی-۹، گوائر ہال، دہلی یونیورسٹی
دہلی ۱۱۰۰۰۷

مثنوی گلزار نسیم پہلی بار لکھنؤ کے مطبع میر حسن رضوی میں چھپی تھی۔ یہ ایڈیشن کمیاب ہے۔ اس کا ایک نسخہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے میں نے اسی نسخے سے استفادہ کیا ہے۔ اس ایڈیشن کے آخر میں نسیم کے کہے ہوئے دو قطعات تاریخ ہیں۔ پہلے قطعے کا عنوان ہے:۔
"تاریخ اختتام تصنیف از مصنف": آخری مصرعے سے تاریخ نکلتی ہے۔ مصرع یہ ہے: "توقیع قبول روزیش باد" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی ۱۲۵۴ھ (۳۹-۱۸۳۸ء) میں مکمل ہوئی تھی۔

دوسرے قطعے کا عنوان ہے: "قطعۂ تاریخ طبع مثنوی از طبع زادِ مصنف"۔ اس کا آخری شعر یہ ہے ؎

گلزارِ نسیم شد چو مسموع　　　گل گفت کہ تازہ گشت مطبوع
۱۲۶۰ھ

"تازہ گشت مطبوع" مادۂ تاریخ ہے، اس سے سالِ طباعت ۱۲۶۰ھ (۱۸۴۴ء) نکلتا ہے۔ اس نسخے کے آخر میں خاتمت الطبع کی جو عبارت ہے اس کا آخری جملہ یہ ہے:

"بہ تصحیح و مقابلۂ مصنف حلیۂ طبع پوشید"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کاپیوں کی تصحیح خود مصنف نے کی تھی۔ دوسرے لفظوں میں اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ نسخہ مصنف کی نگرانی میں شائع ہوا تھا۔ اسی بنا پر اس مثنوی کا یہ واحد معتبر نسخہ ہے۔ اسی لیے یہ لازم ہوگا۔ اب اگر اس مثنوی کے متن کو اصولِ تدوین کے مطابق مرتب کیا جائے تو متن کی بنیاد اسی اشاعتِ اول کو بنایا جائے۔

نسیم کی زندگی میں چھپے ہوئے ایسے کسی نسخے کا حال اب تک معلوم نہیں ہو سکا، جس پر انھوں نے نظرِ ثانی کی ہو۔ اس کا امکان بھی کم ہے؛ یوں کہ ۱۲۶۱ھ میں نسیم کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس مثنوی کا قدیم ترین مطبوعہ نسخہ جو میری نظر سے گزرا ہے، وہ مطبع مسیحائی لکھنؤ کا ہے، جس کا سالِ طباعت ۱۲۶۲ھ ہے۔ مقابلہ کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ لفظ بہ لفظ اشاعتِ اول کے مطابق ہے۔

پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی نے اس مثنوی کو مرتب کیا تھا۔ ان کا مرتب کیا ہوا نسخہ "مطبع منشی جے نرائن ورما، خیالی گنج، لکھنؤ" میں چھپا تھا۔ اس اشاعت کا ایک نسخہ رام پور کی رضا لائبریری میں ہے اور اس کا عکس میرے سامنے ہے۔ (اشاعتِ اول اور اشاعتِ چکبست، ان دونوں کے عکس عزیز مکرم ڈاکٹر شعائر اللہ خاں کی عنایت سے حاصل ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔)
ایک خاص بات یہ کہ اس نسخے کے اول یا آخر میں کہیں بھی سالِ طباعت کا ذکر نہیں۔ اس کے زمانۂ اشاعت کا تعین شرر کے معروف تبصرے کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔ رسالہ "دل گداز" کے شمارۂ مارچ ۱۹۰۵ء میں چکبست کے مرتب کیے ہوئے نسخے پر شرر کے تبصرے کی پہلی قسط شائع ہوئی تھی۔ یوں یہ فرض کر لیا گیا کہ یہ نسخہ ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ بعید از قیاس تو نہیں بہرطور، قطعیت کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ نسخہ مارچ ۱۹۰۵ء سے پہلے چھپ چکا تھا۔

چکبست نے یہ صراحت کر دی ہے کہ انھوں نے طبعِ اول کو متن کی بنیاد بنایا ہے، مگر یہ دلچسپ بات ہے کہ انھوں نے متعدد مقامات پر متن میں تصرف کیا ہے اور بعض جگہ غلط قرأت کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ اب تک کی معلومات کے مطابق سب سے پہلے شرر نے اس پر تبصرہ کیا۔ اس سلسلے کی خاص بات یہ ہے کہ شرر نے طبعِ اوّل کو نہیں دیکھا تھا بلکہ یوں کہیے کہ اس کی ضرورت ہی نہیں محسوس کی تھی۔ حالاں کہ طبعِ اول کو سامنے رکھنا ضروری تھا کیوں کہ اس کے بغیر صحتِ متن سے متعلق رائے دی ہی نہیں جا سکتی تھی۔ شرر نے اپنے تبصرے میں خود ہی اس کی صراحت کر دی ہے، لکھا ہے:

"مسٹر چکبست صاحب نے اس نئے ایڈیشن کو خود مصنف صاحب کے اصلی ایڈیشن کے مطابق درست کر کے شائع کیا ہے۔ میں نے اس کا اندازہ کرنے کے لئے مطبع نامی لکھنؤ کی آخر ۱۹۰۲ء کی چھپی ہوئی مثنوی گلزار نسیم منگوائی اور اس سے مقابلہ کر کے دیکھا۔"

(دلگداز۔ اپریل ۱۹۰۵ء)

۱۸۴۴ء میں چھپی ہوئی کتاب کے متن کا مقابلہ ۱۹۰۲ء میں چھپے ہوئے نسخے سے کیا جائے گا تو صحتِ متن کا جیسا اندازہ ہو سکے گا، اس کا تصور بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ صحتِ متن سے متعلق شرر کے کچھ اعتراضات اسی وجہ سے ناقابل قبول ہو گئے ہیں۔ مشکل یہ تھی کہ جن لوگوں نے اس بحث میں حصہ لیا ان میں سے کسی ایک نے بھی اشاعتِ اول کو نہیں دیکھا تھا اور اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طبع اول اور نسخۂ چکبست میں متن کے جو واقعی اختلافات ہیں، وہ سامنے نہیں آ سکے۔

حقیقتِ حال یہ معلوم ہوتی ہے کہ شرر نے جو تبصرہ لکھا، تو اس کا محرک کچھ اور تھا۔ اس میں قیاس آرائی کی ضرورت یوں نہیں کہ شرر نے خود ہی اس کی وضاحت ان الفاظ میں کر دی تھی:

"واقعی یہ افسوس کی بات ہے کہ اس ریویو میں نسیم کے مقابل میں لکھنؤ کے بعض مشہور و معروف اور مستند شعرا کے مٹانے کی کوشش کی گئی ہے اور محض ان غیر معتبر کہانیوں کی بنیاد پر جس سے (کذا) یہاں کے تمام شعرا بر حال ناآشنا ہیں، ممکن ہے کہ وہ کسی خاص حلقے میں شہرت رکھتی ہوں، مگر محققین کے نزدیک بالکل بے بنیاد ہیں۔"

(دلگداز۔ مارچ ۱۹۰۵ء)

شرر کی یہ شکایت بے بنیاد نہیں تھی۔ چکبست نے اپنے مرتبہ نسخہ پر جو مقدمہ لکھا تھا، اس میں کئی غیر معتبر اور بے اصل کہانیاں، واقعات کے طور پر اس طرح لکھی تھیں جن سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ نسیم اپنے زمانے میں سب سے اعلیٰ اور برتر شاعر تھے۔ ظاہر ہے کہ اس پر جھگڑا تو ہونا ہی تھا اور ہوا، اور اس سلسلے میں گلزار نسیم پر بجا اور بے جا اعتراضات کو وسیلہ بنایا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ توازن اور اعتدال کا دامن جانبین کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا اور وہ مقولہ یاد آ گیا کہ عشق اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔

کلاسیکی مثنوی کو اصولِ تدوین کے مطابق مرتب کرنے کا جو نیا سلسلہ شروع کیا گیا ہے، اس میں مثنوی گلزارِ نسیم بھی شامل ہے۔ اس سے پہلے اس سلسلے کی دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں: فسانۂ عجائب اور باغ و بہار۔ اب تیسری کتاب کے طور پر اس مثنوی کا متن مرتب کیا جا رہا ہے۔ اس جدید زیرِ ترتیب نسخے میں ایک ضمیمہ تشریحات کا بھی ہوگا جس میں اور امور کے علاوہ، معرکۂ چکبست و شرر کی ضروری تفصیلات بھی شامل ہوں گی اور ان پر محاکمہ بھی ہوگا۔ اس ضمیمے کے چند متفرق اندراجات اس تحریر میں پیش کیے جاتے ہیں۔

پوری مثنوی کے اشعار پر نمبر شمار ڈالے گئے ہیں۔ اصل ضمیمے میں تو صرف نمبر شمار کا اندراج کیا گیا ہے، مگر اس تحریر میں اشعار بھی نقل کیے گئے ہیں، اور ہر شعر یا مصرعے کے آگے نمبر شمار لکھا گیا ہے۔ مثنوی گلزار نسیم پر شرر کے علاوہ اوروں نے بھی اعتراضات کیے تھے، ان میں سے ایک نام "نقاد" کا بھی ہے۔ ان کے مضمون کی دو قسطیں چھپی تھیں، جنھیں معرکۂ چکبست و شرر میں شامل کر لیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ نقاد فرضی نام ہے البتہ پوری بحث پڑھ کر یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ صاحب حیدرآباد میں تھے۔ ایک شعر پر ان کا اعتراض بھی اس تحریر میں بہ طور مثال شامل کر لیا گیا ہے۔

شرر کا تبصرہ دل گداز میں چھپا تھا اور اس کا جواب جو چکبست نے لکھا تھا وہ حسرت موہانی کے رسالے "اردوے معلیٰ" (علی گڑھ) میں چھپا تھا یہ سب متعلقہ شمارے میرے سامنے ہیں اور اعتراض و جواب کی عبارتیں انہی سے نقل کی گئی ہیں۔ نقاد کا اعتراض معرکۂ چکبست و شرر مرتبہ محمد شفیع شیرازی کی اشاعتِ اول سے منقول ہے۔

معرکۂ چکبست و شرر کے مرتب مرزا محمد شفیع شیرازی نے اس کتاب کے آخر میں مثنوی گلزار نسیم کو بھی شامل کیا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ بہت سے اشعار پر حاشیے لکھے ہیں۔ متعدد مقامات پر اعتراضات کا جواب اس طرح دیا ہے کہ اصل متن میں ایسے مقامات پر تحریف کی گئی ہے۔ کس نے تحریف کی، یہ کہیں نہیں لکھا۔ لفظ "گُل" (بہ فتحِ اول و دوم) کی بحث میں "شیرازی" کے نام سے جو عبارت نقل کی گئی ہے وہ انہی کی ہے —

اور اسی کتاب سے منقول ہے۔

قاضی عبدالودود صاحب نے مثنوی گلزارِ نسیم کا مکمل متن اپنے قلم سے نقل کیا تھا (دراصل انھوں نے اس متن کو برائے اشاعت تیار کیا تھا)۔ لفظ "صاد" کی بحث میں قاضی صاحب کے نام سے جو حوالہ آیا ہے، وہ اسی نسخے کا ہے۔ یہ نسخہ مکمل صورت میں اور عکسی شکل میں رسالہ 'معیار و تحقیق (پٹنہ) کے شمارہ ۱۲ میں شائع ہو چکا ہے۔ یہی میرے سامنے ہے۔

اس تحریر میں شامل پہلا شعر (شعر ۱۰۲) اس موقعے کا ہے جب تاج الملوک کو معلوم ہوتا ہے کہ دلبر بیسوا چوسر کے کھیل میں اس طرح جیت جاتی ہے کہ اس نے ایک بلّی سدھار کھی ہے اور ایک چوہا پال رکھا ہے۔ جب ہارنے لگتی ہے تو اس کے اشارے پر بلّی چراغ کو گرا دیتی ہے اور چوہا باہر آکر پانسے کو پلٹ دیتا ہے۔ تاج الملوک نے راستے میں دیکھا کہ ایک بلی ایک چوہے کو دیکھ کر جھپٹی تو ایک نیولے نے سانپ دکھا کر اسے بھگا دیا۔

ایک بلّی جو جھپٹی، چوہے کو بھانپ
نیولے نے بھگا دیا، دِکھا سانپ

شرر: "سانپ کو نیولا مار ڈالا کرتا ہے، مگر یہ 'دِکھا سانپ' کیا؟
آخر نیولے نے مداری کا تماشا کیوں دکھایا؟"

چکبست: "اعتراض ہے کہ 'سانپ کو نیولا ....' اگر بہ فرضِ محال یہ اعتراض تسلیم بھی کر لیا جائے، تب بھی گلزارِ نسیم کا مصنف اس کا ذمے دار نہیں ہو سکتا۔ نسیم نے محض بکاولی کا قصہ نظم کر دیا ہے، جو کہ بیشتر نثر میں موجود تھا۔ اگر یہ اعتراض ہے تو اُس غریب پر، جس نے قصے کے واقعات کو ترتیب دیا۔

لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو حضرت شرر کا یہ اعتراض کسی حالت میں جائز نہیں ہے۔ کیوں کہ اس شعر کے بعد دوسرے شعر کا پہلا مصرع، 'دیکھا تو یہ ہے شگوں نرالا' اس بات کا اشارہ کرتا ہے کہ مصنفِ قصہ نے اس واقعے کو خود 'نرالا' یعنی حیرت انگیز مانا ہے۔ یعنی وہ خود تسلیم کرتا ہے کہ 'نیولے کا سانپ دکھانا' خلافِ واقعہ ہے۔ پس اس حالت میں سیاقِ کلام کو نظر انداز کر کے درمیان سے ایک شعر چن لینا اور اس پر اعتراض کرنا، آئینِ تنقید کے خلاف ہے اور لفظی شعبدہ پردازی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔"

چکبست نے یہ جو لکھا ہے کہ "گلزارِ نسیم کا مصنف اس کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا" تو یہ درست نہیں۔ نسیم نے ابتدائے مثنوی میں صراحتاً لکھا ہے کہ انھوں نے اُردو کے نثری حصے کو نظم کیا ہے اور یہی چکبست نے بھی کہا ہے، لیکن اُردو کے نثری قصے (یعنی مذہبِ عشق) میں اس نرالے شگون کا مطلق ذکر نہیں۔ اس میں اس موقعے پر صرف یہ لکھا گیا ہے:

"تاج الملوک جب یہ بات دریافت کر چکا، بازار میں گیا اور نیولے کا بچّہ مول لے کر، اسے آستین میں رکھ کر، یہ سکھانے لگا کہ جوں ہی وہ چٹکی کی آواز پائے، وہیں بچۂ پلنگ کی طرح آستین سے کود کر باہر آئے۔"

(مذہبِ عشق۔ مجلس ترقیِ ادب، لاہور)

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ "نرالا شگون" نسیم کا اضافہ ہے اور یوں وہ اس کے لیے ذمہ دار ہیں۔ یہاں شرر کی گرفت درست ہے۔

اس سلسلے میں مزید وضاحت بھی بے محل نہ ہوگی۔ یہ معلوم ہے کہ مذہبِ عشق ترجمہ ہے اس فارسی داستان کا جسے عزت اللہ بنگالی نے لکھا تھا۔ اصل فارسی داستان میں بھی اس نرالے شگون کا ذکر نہیں۔ متعلقہ عبارت یہ ہے:

"تاج الملوک چوں ایں حقیقت گوش کرد، بہ بازار رفت و راسو بچۂ خرید۔ در آستینِ خویش بعادتے پرورد کہ ہر گاہ آواز انگشتک شنودے، چوں بچۂ پلنگ دواز آستین بیروں کشودے۔"

(قصۂ گل بکاولی، مخطوطہ، مخزونۂ ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری کلکتہ)

اس فارسی داستان کا ایک اچھا خطی نسخہ انڈیا آفس لندن کے کتب خانے میں ہے (وہاں اس کے دو نسخے ہیں) اور ایک نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ

میں بھی ہے۔ ان نسخوں سے بھی اس عبارت کا مقابلہ کرلیا گیا ہے (ان تینوں نسخوں کے عکس میرے سامنے ہیں)۔

یہ بھی معلوم ہے کہ نسیم سے پہلے ریحان نے اس اُردو قصّے کو نظم کیا تھا۔ یہ مثنوی چھپی نہیں، مگر اس کے دو خطی نسخوں کا علم ہے۔ ایک نسخہ کراچی کے نیشنل میوزیم میں ہے اور مشفق خواجہ صاحب کی عنایت سے اس کا عکس میرے سامنے ہے۔ اس میں بھی اس شگون کا ذکر نہیں۔ متعلقہ اشعار یہ ہیں ؎

دریافت یہ کر وہ صاحبِ ہوش — ہے کھیل میں رخنہ گر وہی موش
معلوم تھا شاہ زادے کو خوب — نیول سے ڈرے ہے موشِ مغلوب
لوگوں کو تلاش میں لگایا — اک نیول آخرش منگایا
شہ زادہ اسے اسی نہج پر — پالا کیا آستیں میں رکھ کر
نیول کو بھی فن وہی سکھایا
آواز پہ چٹکی کی لگایا

ہاں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ چکبست نے اُردو کے نثری قصّے مذہبِ عشق کو دیکھا تھا یا نہیں۔ اگر نہیں دیکھا تھا، تو انھیں یہ نہیں لکھنا چاہیے تھا کہ اصل قصّے میں اسی طرح ہے۔ اگر اسے دیکھا تھا تو غلط بیانی سے کام نہیں لینا چاہیے تھا۔

ایک بات اور۔ نسخۂ چکبست میں پہلا مصرع اس طرح ہے:۔
اک بلّی جو چھیپٹی چوہے کو بھانپ
اشاعتِ اول میں "جو" موجود نہیں۔ اس میں مصرع اس طرح ہے:
"اک بلّی چھپٹی چوہے کو بھانپ"
ظاہر ہے کہ "جو" چکبست کا اضافہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اصل مصرعے کو ساقط الوزن خیال کیا ہو اور بہ خیالِ خویش وزن پورا کرنے کے لیے "جو" کا اضافہ ضروری سمجھا ہو۔ بہ ہر صورت، یہ اضافہ قطعی طور پر غیر ضروری ہے، مصرع اپنی اصل شکل میں بھی بحر کے اندر ہے۔ اس اضافے کا حق مرتب کو حاصل نہیں تھا۔ چوں کہ اشاعتِ اوّل شرر کے سامنے نہیں تھی، اس لیے انھوں نے اس مصرعے کو اسی طرح نقل کیا جس طرح وہ نسخۂ چکبست میں تھا۔ چوں کہ یہ مصرع "جو" کے بغیر بھی بآسانی بحر کے ساتھ بھی بحر کے اندر رہتا ہے، یوں کسی طرح کا شک بھی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

شرر:۔ "کھاتے ہی حمل کا ڈھنگ پایا" اور "وہ بانجھ تھی جب حمل قبولی" ان دونوں مصرعوں میں "حَمل" کی جگہ "حَمَل" نظم کر دیا گیا ہے، جو قطعاً غلط ہے۔

بادل سا وہ بحر آسماں جوش
بجلی سی لہر سے تھا ہم آغوش

قطع نظر اس کے کہ پہلا مصرع بہت بھونڈا ہے "لہر" کی جگہ "لہَر" یعنی ہائے متحرک کے ساتھ موزوں کر دیا گیا ہے، جو اُردو میں غلط ہے۔

چکبست:۔ "یہ اعتراض اس اصول سے بے خبری ظاہر کرتا ہے کہ شاعر الفاظ اسی صورت پر نظم کرتا ہے، جس صورت سے وہ اہلِ زبان کی زبان پر جاری ہوتے ہیں۔ محض لغت کے تلفظ کی پیروی شاعر کے لیے ضروری نہیں ہوتی۔ یہ مانا کہ لغت کی رو سے "حَمل" درست ہے، لیکن شعرائے لکھنؤ کی زبان پر اس لفظ کا یہی تلفظ جاری ہے۔ واجد علی شاہ (آخری فرماں روائے اودھ) سے ایک مثنوی موسوم بہ دریائے تعشق یادگار ہے۔ اس مثنوی کی تصنیف کا زمانہ "گلزارِ نسیم" کے زمانے سے بہت زیادہ ہے۔ "دریائے تعشق" میں بھی "حَمَل" ہی نظم ہے ؎

گھر میں میرے بھی اے خوش اطوار
آثار حمل کے ہیں نمودار

اس مثنوی میں چاہے اور شاعرانہ محاسن نہ ہوں، لیکن جہاں تک زبان اور محاورے کا تعلق ہے، اس کا ہر شعر سند کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ اس زمانے میں واجد علی شاہ سے بڑھ کر کس کی زبان مستند ہو سکتی تھی۔ علاوہ بریں، جان صاحب نے بھی "حَمَل" نظم کیا ہے، جیسا کہ ذیل کے شعر سے ظاہر ہے ؎

دائی! یقین دل کو ہے گر جائے گا حمل
ننھا سا لڑکا خواب میں کل پیٹ گر گیا

متقدمین کے یہاں بھی "حَمَل" ہی نظم ہوا ہے چنانچہ سودا کہتے ہیں:

اسقاطِ حمل ہو، تو کہیں مرثیہ ایسا
پھر کوئی نہ پوچھے میاں تسکین کہاں ہے

لفظ "حمل" پر موقوف نہیں، متعدد الفاظ ایسے ہیں جن کا تلفظ لغت کی رو سے کچھ اور ہے اور نظم عام محاورے کے مطابق کیا جاتا ہے مثلاً اصل لفظ "کلِمہ" ہے یعنی لام بالکسر ہے، لیکن محاورے میں چوں کہ بہ سکونِ لام بولتے ہیں اس لیے شعرا نے اس طرح نظم کیا ہے":

بادل سا وہ بحرِ آسماں جوش
بجلی کی لہر سے تھا ہم آغوش

اعتراض ہے کہ "لہَر" کی جگہ "لہْر" نظم کر دیا گیا ہے، جو غلط ہے۔ اس اعتراض کے لیے بھی ایک حد تک وہی جواب ہے، جو اس سے پیشتر کے اعتراض کے بارے میں لکھا گیا ہے اور دو شعر سنداً نسیم کی تائید میں درج ہیں ؎

شب نہاتا تھا جو وہ رشکِ قمر پانی میں
کیسے مہتاب سے اٹھتی تھی لہر پانی میں

——— میر

پھر لہر چڑھ رہی ہے کالوں کی
بو سنگھا دو تم اپنے بالوں کی

——— نواب مرزا شوق"

سب سے پہلے یہ عرض کرنا ہے کہ "لہَر" کی سند میں شوق کا شعر اور "حمل" کی سند میں واجد علی شاہ کا شعر جو پیش کیا گیا ہے، تو یہ دونوں قابلِ قبول نہیں۔ مجھے خاص کر تعجب ہے اس پر کہ چکبست نے غور کیے بغیر شوق کے شعر کو کس طرح پیش کیا۔ یہ ادنا تامل یہ خیال دل میں آنا چاہیے تھا کہ شاید مصرع اس طرح ہو:

لہر پھر چڑھ رہی ہے کالوں کی

اور یہ عرض کر دوں کہ درحقیقت یہ مصرع ہے بھی اسی طرح۔ یہ شعر مثنوی زہرِ عشق کا ہے۔ اب تک کی معلومات کے مطابق یہ مثنوی پہلی بار ۱۸۶۲ء میں چھپی تھی۔ یہ اڈیشن میرے سامنے ہے، اس میں پہلا مصرع اسی طرح ہے:

لہر پھر چڑھ رہی ہے کالوں کی

(مطبوعہ مطبع شعلۂ طور، کان پور۔ تاریخ طبع: ۴ ماہ جنوری ۱۸۶۴ء)

واجد علی شاہ کا شعر پڑھ کر بھی ایسا ہی خیال میں آیا کہ دوسرا مصرع کہیں اس طرح تو نہیں:

آثارِ حمل ہیں نمودار

یہ مثنوی میری دسترس سے باہر تھی۔ میرے خط کے جواب میں ڈاکٹر نیر مسعود رضوی نے مطلع کیا:

"اس شعر کی تفصیل یہ ہے کہ واجد علی شاہ نے یہ مثنوی اپنے دادا امجد علی شاہ کے عہدِ سلطنت (۱۲۵۳ھ تا ۱۲۵۸ھ) میں لکھی تھی۔ اس وقت امجد علی شاہ ولی عہد تھے۔ پہلا اڈیشن غالباً اسی زمانے میں مطبع سلطانی، لکھنؤ میں چھپا تھا۔" پھر (بہ حوالہ 'یادداشت ادیب') "بادشاہ ہونے کے بعد انھوں نے اس پر نظرِ ثانی کی اور ترمیم شدہ صورت میں اس کو دوبارہ شائع کیا۔" یہ اڈیشن واجد علی شاہ کے مطبعِ سلطانی لکھنؤ میں چھپا۔ مطبع نول کشور نے بعد میں اس کے ایک سے زیادہ اڈیشن شائع کیے۔

ہمارے یہاں دونوں سلطانی اڈیشن، مارچ ۱۸۸۵ء کا نول کشوری (کان پور) اڈیشن اور محمد وزیر خاں کا مکتوبہ مخطوطہ (۲۸ شوال ۱۲۷۴ھ) موجود ہیں۔ اولین متن میں اس محل پر وزیر، بادشاہ سے کہتا ہے:

اس نے بھی یہ عرض کی کہ شاہا
ہے حمل کا میرے گھر میں دھڑکا (ص۲۶)

دوسرے سلطانی اڈیشن میں اس کی جگہ یہ شعر ہو گیا ہے:

گھر میں میرے بھی اے خوش اطوار
آثار ہیں حمل کے نمودار

نول کشوری اڈیشن میں آپ والی قرأت ہے:

گھر میں میرے بھی اے خوش اطوار
آثار حمل کے ہیں نمودار

اور وزیر خاں کے مخطوطے میں بھی "آثار حمل کے" ہے (ص۱۹)۔ یعنی آپ کا قیاس صحیح ہے کہ واجد علی شاہ اس

لفظ کا تلفظ "تَحَمُّل" بہ سکون اوّل اختیار کرتے تھے۔ "تَحَمُّل" بہ فتح میم کاتبوں کی تحریف ہے:

——— (مکتوب نیر مسعود صاحب)

چکبست کی حمایت میں یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ان کے سامنے اِن دونوں مثنویوں کے جو ایڈیشن تھے (موقر اور غیر معتبر) ان میں یہ دونوں شعر اسی طرح چھپے ہوئے تھے جس طرح انھوں نے نقل کیے ہیں۔ مگر ان کے ساتھ ساتھ یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ زبان و بیان کی بحث میں حصہ لینے والوں کو یہ بات ضرور معلوم ہونا چاہیے کہ تذکیر و تانیث اور تلفظ کی بحث میں جب بھی کوئی شعر پیش کیا جائے تو یہ اطمینان کرلیا جائے کہ معتبر نسخوں میں وہ اسی طرح ہے۔ اور یہ دونوں شعر تو ایسے تھے کہ ذرا سے غور و تامل کے ساتھ یہ بات ذہن میں آسکتی تھی کہ شاید ان میں لفظوں کا تقدم و تاخر ہو۔ اس میں واقعتاً لطیفہ یہ ہے کہ اس بحث میں حصہ لینے والوں میں سے کسی ایک نے بھی اس طرف توجہ نہیں کی اور ضرورت نہیں سمجھی کہ اور نہیں تو زہرِ عشق ہی کے شعر کے متن کی تصدیق کرلی جائے۔

"لہر" کی بحث میں دوسرا شعر میر کا ہے۔ یہ شعر کلیات مرتبہ آسی میں موجود ہے۔ مگر کلیات میں دوسرا مصرع یوں ہے:

ع گنتی مہتاب سے اٹھتی تھی لہر پانی میں (ص۱۹۳)

صاف ظاہر ہے کہ مرجح صورت یہی ہے۔ (یہ بات بھی نظر میں رہنا چاہیے کہ آسی کا مرتبہ کلیات ۱۹۴۱ء میں چھپا ہے اور یہ بحث اس سے پہلے کی ہے)۔ بہرحال یہ درست ہے کہ میر نے "لہَر" بہ فتح تین نظم کیا ہے۔ میر کا ایک اور شعر بھی میری یادداشت میں محفوظ ہے جس میں "لہَر" آیا ہے،

ابر! مت گورِ غریباں پہ برس غافل، آہ!
ان دل آزردوں کے جی میں بھی لہر آوے گی
(کلیات مرتبہ آسی ص۱۴۹)

"تحمّل" کی بحث میں جان صاحب کا جو شعر پیش کیا گیا ہے، وہ ان کے دیوان میں موجود ہے (مطبوعہ مطبع حیدری، لکھنؤ، سال طبع ۱۲۶۲ھ صفحہ ۱۷)۔

شرر نے گلزارِ نسیم کے ایسے دو مصرعوں پر اعتراض کیا ہے جن میں "تحمّل" آیا ہے۔ اس مثنوی کے ایک اور شعر میں بھی یہ لفظ اسی طرح آیا ہے:

اِک بار تحمّل میں پھر حمل تھا
وہ شاہ کہ ظلم میں مثل تھا (شعر ۱۴۲)

اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ "تحمّل" اردو میں قطعی طور پر صحیح ہے۔ یہی احوال "لہر" کا ہے۔ ان دونوں لفظوں پر شرر کا اعتراض درست نہیں تھا لہَر اور لہِر دونوں مستعمل صورتیں ہیں۔ کوئی صاحب "لہِر" استعمال کرنا، یا "تحَمُّل" کہنا مناسب نہ سمجھیں، تو یہ ان کی پسند اور مرضی کی بات ہے اور ان کو اس کا حق حاصل ہے، لیکن "تحمّل" اور "لہر" کو غلط کہنے کا حق کسی کو حاصل نہیں۔

چکبست نے یہ جو لکھا ہے کہ "متقدمین کے یہاں بھی تحمّل ہی نظم ہوا ہے۔" تو یہ اندازِ بیان درست نہیں، اس سے تو یہ مطلب نکلتا ہے کہ متقدمین نے صرف "تحمّل" نظم کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ان کا مقصود نہ ہوگا۔ اس جملے میں "ہی" کے اضافے نے ان کے مفہوم کو بگاڑ دیا ہے۔ اسی طرح شرر نے "قطعاً غلط ہے" اور "اردو میں غلط ہے" لکھ کر خود اپنی بات کو بگاڑ لیا۔

چکبست نے ایسے الفاظ کے تلفظ کے سلسلے میں استعمالِ اہلِ زبان کی جو بات لکھی ہے وہ بالکل درست ہے۔ اس پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے، میں صرف ایک حوالہ لکھنے پر اکتفا کروں گا۔

آرزو لکھنوی مرحوم اپنے زمانے کے بڑے زبان داں تھے اور اہلِ زبان تو تھے ہی، انھوں نے لفظ "نَفَی" کو بہ کسرِ دوم نظم کیا ہے اور بہ ترکیب فارسی ؎

آرزو اک بے بضاعت آدمی   جس کا کل سرمایہ اک لائے نفی

اور اس پر حاشیہ لکھا ہے:

"یہ لفظ ساکن الاوسط ہے۔ میں نے جن وجوہ کی بنا پر ساکن الآخر لانا اور پھر اضافت فارسی کے ساتھ استعمال کرنا جائز جانا ہے، وہ حسب ذیل ہیں: اردو بولنے والوں کے لہجے میں یہ ساکن الآخر ہے۔ متقدمین نے "نشأ" وغیرہ کے استعمال میں اس اعتبار کو ہر جگہ دخل دیا ہے ..... وہ جاہل نہ تھے اور نہ میں اس لفظ کی حقیقت سے بے خبر

ہوں۔ عربی کے لئے ساکن الاوسط صحیح و فصیح ہے، مگر اُردو کے لئے ساکن الآخر ہی صحیح بھی ہے اور فصیح بھی، خاص کر آخر کلام میں۔"

(جہانِ آرزو طبع اوّل ص ک)

جو صورت "نقش" کی ہے وہی "تخل" کی ہے اور "لہر" کو بھی اسی پر قیاس کرنا چاہیئے۔ "مضامینِ چکبست" میں سوداؔ کے شعر کا دوسرا مصرع اس طرح چھپا ہوا ہے:

پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہیں (ص ۱۹۰)

معرکہ میں یہ صحیح صورت میں چھپا ہے ؎

"پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہے" (ص ۹۲)

لفظ "کلمہ" بہ کسر لام کی سند میں چکبست نے حاشیے میں تین شعر لکھے ہیں چونکہ اس لفظ کا بہ کسر لام مستعمل ہونا مختلف فیہ نہیں، اس لیے حاشیے کے ان شعروں کو نقل کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا۔

شیرآزی نے اپنے مرتبہ نسخے گلزارِ نسیم میں ان دونوں لفظوں پر حواشی لکھے ہیں اور حسب معمول یہ لکھا کہ "لہر" اور "تحمل" دراصل تحریف کا نتیجہ ہیں "لہر" کے تحت فرماتے ہیں:

"دوسرے مصرعے میں 'بجلی سی لہر سے تھا' تحریف ہے 'تھا بجلی سی لہر سے ہم آغوش' کی۔ کیونکہ بغیر حالتِ مجبوری کے کسی شعر میں ساکن کا متحرک کرنا جائز نہیں۔"

لفظ "تحمل" جن تین مصرعوں میں آیا ہے، ان تینوں مصرعوں کے متعلق بھی انھوں نے یہی لکھا ہے کہ یہ بھی نتیجۂ تحریف ہے۔ "اک بار محل میں پھر حمل تھا" اس کے حاشیے میں لکھا ہے:

"اس شعر کے دونوں مصرعوں میں تحریف بین ہوئی ہے۔ ورنہ نسیم سا محقق، اس پر خواجہ آتش جیسا اصلاح دہندہ اور پھر ایسی فاش غلطی رہ سکے کہ "تحمل" بالتحریک جائز رکھے ایسے قابل ولائق شعرا کے کلام میں وہی اغلاط قابلِ تسلیم ہوا کرتے ہیں جن کی اصلاح صحیح الفاظ میں متعذر نہ ہو، اور ایسے اغلاط، جن کی ہمارے وقت کے اوراہم ایسے کج مج زبان بادی النظر میں اصلاح کر سکیں، ہرگز تسلیم نہیں ہو سکتے

کہ بغیر تحریف ہیں۔ اور اس شعر کے اصل الفاظ قریب قریب الفاظِ ذیل کے ہوں گے ؎

اک بار محل میں حمل تھا پھر
اور شاہ جو تھا ستم کا جابر (معرکہ ص ۲۹۸)

دوسرا مصرع ہے، "کھاتے ہی حمل کا ڈھنگ پایا" اس سے متعلق لکھا ہے:

"ظاہراً مصرع اوّل تحریف ہے 'کھاتے ہی وہ ساگ حمل پایا' کی۔ یا 'کھاتے ہی ساگ حمل پایا' کی کیونکہ جب دو دو طور سے لفظ "تحمل" بہ سکونِ اوسط موزوں ہو سکتا تھا، تو ایسے ماہرِ فن شاگرد و استاد، دونوں کو یہ عجز پیش آنا قرینِ قیاس نہیں ہے۔" (معرکہ ص ۲۹۹)

تیسرے مصرعے کے متعلق لکھا ہے:

"مصرع اول تحریف ہے 'وہ بانج تھی حمل جب قبولی' کی۔"

(ایضاً)

ظاہر ہے کہ شیرآزی صاحب کی یہ تاویلات اور ان کے یہ مفروضات کسی بھی حیثیت سے قابلِ قبول نہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ موصوف نے یہ کہیں نہیں بتایا کہ ان تحریفات کا ذمہ دار کون ہے۔

صاد آنکھوں کے دیکھ کر پسر کی
بینائی کے چہرے پر نظر کی

طبع اول میں پہلا مصرع یوں چھپا ہوا ہے:

"صاد آنکھوں کی دیکھ کر پسر کے"

چکبست نے اپنے نسخے میں اسے یوں لکھا ہے:

"صاد آنکھوں کی دیکھ کر پسر کی"

یعنی انھوں نے آخری "کے" کو تو "کی" بنا دیا (اور صحیح بنایا) لیکن پہلے ٹکڑے کو "آنکھوں کی" رکھا۔ نسخۂ طبع اول میں تو اس زمانے کے رواج کے مطابق، آخر لفظ میں واقع یائے معروف و مجہول کی کتابت میں صورت کا امتیاز ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ اس پر اعتراض بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ اس زمانے کی عام روش تھی، مگر چکبست کے نسخے میں کتابت کے

اس امتیاز کو بطور عموم مرتا رکھا گیا ہے، اس بنا پر ان کے مرتب کیے ہوئے نسخے میں چھپے ہوئے اس مصرعے کی بنا پر "صاد" کو مونث ماننا ہوگا۔

نئے نسخے کے مرتب (چکبست) کی یہ ذمے داری تھی کہ وہ متعین کرتے کہ اس مصرعے کی صحیح قرأت "صاد آنکھوں کی" ہے یا "صاد آنکھوں کے"۔ اس کا واحد طریقہ یہ تھا کہ یہ معلوم کیا جاتا کہ "صاد" مذکر ہے یا مونث۔ "صاد" مذکر تھا اور ہے، ایسی ایک مثال بھی نہیں ملتی جس کو اس کی تانیث کی سند کے طور پر پیش کیا جا سکے۔ اس بنا پر اس شعر میں "صاد آنکھوں کے" لکھا جانا چاہیے تھا۔

مجھے خاص کر تعجب اس پر ہے کہ نسخۂ قاضی عبدالودود میں بھی "صاد آنکھوں کی" ہے۔ اسے لغزشِ قلم کے بجائے سہوِ نظر کہنا چاہیے۔

یہ عجیب صورتِ حال ہے کہ ہمارے متعدد لغت نویسوں نے نسیم کے اسی ایک شعر کی غلط قرأت کی بنیاد پر یہ فرض کر لیا کہ یہ لفظ مونث بھی ہے۔ جلال نے (اپنے رسالہ "تذکیر و تانیث" مفید الشعرا میں اسے صرف مذکر لکھا ہے۔ معین الشعرا میں بھی اسے صرف مذکر لکھا گیا ہے۔ مگر مؤلفِ آصفیہ نے اس کو "اسمِ مذکر و مونث" لکھ کر مثال میں یہی زیرِ بحث شعر درج کیا ہے اور صراحت بھی کی ہے کہ "تانیث کی مثال بھی اس شعر سے ثابت ہے"۔ نور اللغات اور رشحاتِ صفیر میں بھی اسی ایک شعر کو تانیث کی سند میں لکھا گیا ہے۔ انہی اندراجات کی بنا پر ارمغانِ احباب میں بھی اسے مذکر و مونث، دونوں طرح لکھا گیا ہے۔ پہلے کسی ایک شخص نے "صاد آنکھوں کی" پڑھ کر، غور کیے بغیر، یہ مان لیا کہ یہ لفظ مونث بھی ہے۔ بعد کو دوسروں نے محض تقلید کا حق ادا کیا۔ ایک ایسے شعر کو تانیث کی سند میں پیش کیا گیا جس کو پیش نہیں کیا جا سکتا تھا اور قبول بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

کراچی کے اردو لغت کی بارھویں جلد میں بھی "صاد" کو مذکر و مونث، دونوں طرح لکھا گیا ہے۔ ہاں اتنی احتیاط ضرور کی گئی ہے کہ مونث کے ذیل میں "شاذ" لکھ دیا گیا ہے۔ تانیث کی سند میں ایک شعر پیش کیا گیا ہے۔

مختصر یہ کہ اسی ایک شعر کو اب تک تانیث کی سند میں پیش کیا جاتا رہا ہے۔ مگر جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، یہ نتیجہ ہے شعر کی غلط قرأت کا۔ اس ایک مفروضہ سند کے سوا کوئی دوسری سند موجود نہیں۔ پرانی مطبوعہ کتابوں اور بعض نسخوں میں "کی" یا "کے" کی چھپی ہوئی یا لکھی ہوئی شکل کو تذکیر و تانیث کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔ اگر کوئی شخص کوئی ایسی مثال پیش کرے تو اسے قبول نہیں کیا جا سکتا۔ "صاد آنکھوں کی" چھپا ہوا ہو تو اُسے "صاد آنکھوں کے" بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے مواقع پر "کی" یا "کے" کا تعین اسی بنا پر کیا جائے گا کہ اس وقت تک تذکیر و تانیث کے لحاظ سے اس خاص لفظ کا کیا احوال رہا ہے۔ چوں کہ یہ قطعی طور پر معلوم ہے کہ "صاد" مذکر تھا اور بالاتفاق اس میں کسی طرح کا اختلاف نہیں ملتا، اس کی تانیث کی کوئی مثال بھی نہیں ملتی، اس لیے لازمی طور پر "صاد آنکھوں کے" پڑھا جائے گا۔

شرر نے اس پر اعتراض نہیں کیا، یوں کہ اس پہلو تک ان کی نظر پہنچی ہی نہیں، لیکن اس شعر کے دوسرے مصرعے پر انھوں نے اعتراض کیا تھا۔ ان کی مکمل عبارت یہ ہے:

"بعض اشعار کا مطلب ہی سمجھ میں نہیں آتا، ممکن ہے کہ میری فہم کا قصور ہو۔ ایسی صورت میں، جن صاحبوں کی فہم رسائی کرتی ہو، وہ مجھے سمجھا دیں،

صاد آنکھوں کی دیکھ کر پسر کی
بینائی کے چہرے پر نظر کی

بینائی کے چہرے پر نظر کرنے سے کیا مراد ہے؟"

چکبست: — "حضرت شرر نے گلزارِ نسیم کے اکثر اشعار کو بے معنی قرار دیا ہے، ایسے اشعار سلسلے وار لکھے جاتے ہیں۔ صاد آنکھوں کی...

.... 'چہرے پر نظر کرنا'۔ شاہی دفاتر کی اصطلاح ہے۔ "چہرہ" نام کے معنی میں استعمال ہوتا تھا اور یہ اسی لیے کہ جس شخص کا نام دفتر میں لکھا جاتا تھا، اسی کے ساتھ اس کا خط و خال بھی لکھ لیا جاتا تھا۔ "نظر کرنا" دوسری اصطلاح ہے۔ اگر کسی شخص کا نام دفتر سے کاٹ دیا جاتا تھا تو اصطلاحاً یہ کہا جاتا تھا کہ اس کے چہرے پر نظر کر دی گئی ہے۔ اب "بینائی کے چہرے پر نظر کی" کے معنی صاف ہیں، یعنی بینائی کا چہرہ کاٹ دیا گیا ہے۔ جس کا مطلب سادہ الفاظ میں یہ ہوا کہ بینائی کو کھو دیا۔ نسیم کے علاوہ مختلف شعرا نے اس اصطلاح کو نظم کیا ہے:

نرگس پہ نظر کیجیے دوبارہ کہ وہ کٹ جائے
ہو جائے نظرِ ثانی میں اس کی نظری آنکھ

—— خواجہ وزیر

قلم نے چہرے حسینوں کے لوح پر لکھ کر
کچہریوں کو کیا خط و خال سے واقف

—— آتش

پھر آئے رنگ رفتہ جو رُخ پر عجب نہیں
اکثر ہے چہرۂ نظری، صاد ہو گیا

—— آتش

برطرفِ غم کر دیا، دکھلا کے اس نے صادِ چشم
چہرۂ عشاق کو حکمِ بحالی ہو گیا

—— صبا

غیاث اللغات ص۴۸۲ : "نظری : آنچہ بداں نظر کنند و منظور نبود۔ لفظ "نظر" برائے بطلان باشد۔ ایں اصطلاحِ اہلِ دفتر است۔"

مجھ کو حیرت ہے کہ حضرت شرر نے ایک عام اصطلاح سے ایسی بے خبری ظاہر کی اور گلزارِ نسیم کی ایک لاجواب زد کو کیوں نظری بنا دیا۔"

شرر نے "بعض اشعار" لکھا تھا، چکبست نے "بعض" کو "اکثر" سے بدل دیا اور اس طرح یہ لکھا کہ "حضرت شرر نے گلزارِ نسیم کے اکثر اشعار کو بے معنی قرار دیا ہے۔" یہ شرر کے ساتھ زیادتی کی گئی، کیوں کہ اس طرح ان سے وہ بات منسوب کی گئی جو انھوں نے نہیں کہی تھی۔

شرر کے اعتراض کا جواب انھوں نے وضاحت کے ساتھ لکھا اور بات صاف ہو گئی کہ نسیم نے ایک دفتری اصطلاح کو اپنے انداز سے نظم کیا تھا —— آنکھ، بینائی، نظر، چہرہ — ان کی باہمی مناسبت ظاہر ہے۔ اصطلاح میں اسے "مراعات النظیر" کہیں گے۔ ساتھ ہی "صاد" کا لفظ بھی آنکھ سے خاص طور پر نسبت رکھتا ہے، کیوں کہ آنکھ کو صاد سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ شرر کا اعتراض درست نہیں تھا۔

چکبست نے سند کے جو اشعار پیش کیے ہیں، اصل دواوین سے ان کے متن کا مقابلہ کر لیا گیا ہے۔

انگلی لبِ جو پہ رکھ کے شمشاد
تھا دم بخود، اس کی سُن کے فریاد

نقاد :— "شمشاد مارے حیرت کے دم بخود تھا، مگر ایسا حواس باختہ ہو گیا تھا کہ انگلی بجائے اپنے ہونٹوں پر رکھنے کے، دوسرے کے لب پر رکھ دی۔ نسیم کو سوجھی بڑی دور کی ہے۔"

—— معرکہ ص۲۰۲

بات تو نقاد کی ٹھیک ہے۔ شمشاد، لبِ جو (نہر کنارے) کھڑا ہے۔ ہوا بند تھی، یوں اس کی پتیاں نہیں ہل رہی تھیں۔ اس طرح وہ شاعر کے الفاظ میں دم بخود تھا۔ (دم بخود یعنی حیران و ساکت)، اس لیے تھا کہ اسی باغ سے پھول چوری ہو گیا تھا۔ منظر ٹھیک ہے، مگر "لبِ جو" کی خواہ مخواہ کی رعایت نے شاعر سے یہ غلطی کرائی۔ انگلی ہونٹوں پر رکھنا تھی۔ اس کے لیے "لب" کا لفظ لانا ضروری خیال کیا۔ لبِ جو میں دوہری رعایت ہے۔ لب کے معنی کنارہ بھی ہیں۔ نہر (جو) سے نسبت ہے اور لب کے معنی ہونٹھ بھی ہیں، جنھیں انگلی سے نسبت ہے۔ اس دوہری رعایت کے پھیر میں شاعر نے یہ نہیں دیکھا کہ شمشاد نے انگلی دوسرے کے لب پر رکھ دی۔ یہ ساری خرابی غیر ضروری رعایتِ لفظی کے اہتمام نے پیدا کی ہے۔

□□

حواشی :

ل مجھے ان مرزا صاحب (مرزا محمد شفیع شیرازی) کے حالاتِ زندگی کی تلاش ہے میں اب تک اس سلسلے میں کچھ بھی معلوم نہیں کر سکا۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ فرضی نام تھا یا اصلی۔ اگر کوئی صاحب اس سلسلے میں میری مدد کریں گے تو میں بہت ممنون ہوں گا۔ براہ راست بھی اطلاع دی جا سکتی ہے اور رسالہ نیا دور کی معرفت بھی مطلع کیا جا سکتا ہے۔ (ر۔ ح)

۲ فسانۂ عجائب میں بھی یہ اسی معنی میں آیا ہے :

"میں تمھیں اپنا عاشق کبھی نہ سمجھوں گا، نہ معشوقوں کے دفتر میں آپ کا چہرہ لکھوں گا۔"

(فسانۂ عجائب، انجمن ترقی اردو ہند اڈیشن ص۱۲۵، مرتبہ راقم الحروف)

غزلیں

رنگ اس گل کا دیکھ کے اور نہ دیکھا رنگ
اس کے رنگ سے ہم نشیں پیارا کس کا رنگ

جھونکے آئے ہواؤں کے کھل گئی میری آنکھ
اس کوچے کی گرد تھی میں نے جانا رنگ

جھلکی چلمن اوٹ سے اس مکھڑے کی جوت
بے رنگی سنسار کی ہو گئی رنگا رنگ

دھنک سماعت میں کھلی ہلے جو اس کے ہونٹ
چٹکی جب نورس کلی کیا کیا برسا رنگ

رنگ بھرے سنسار میں رادھا رنگ نہ پوچھ
گئی تھی ہولی کھیلنے، ہوئی کنھیا رنگ

جلوہ عید شنید کی، نغمہ نشاطِ دید
ڈھنگ دوانے کے عجب، طرفہ تماشا رنگ

بوندوں کی رم جھم تھی نیند میں پچھلی رات
دیکھا صبح تو شہر تھا خونِ تمنا رنگ

عرفی آفاقی غزل کس گلشن کا پھول
ایک طلسم آہنگ کا کیا خوشبو کیا رنگ

عرفی آفاقی
۲۰ ۔ سی ۱ ۔ ریلوے کالونی
بادشاہ نگر ۔ لکھنؤ

حصارِ جور میں گھر کر جو بچ گیا ہوں میں
لہو لہو ہر اک منظر کو دیکھتا ہوں میں

ضیا سے جن کی ہے روشن تمام قصرِ حیات
انھیں چمکتے چراغوں کا سلسلہ ہوں میں

یہ مسلوں کی کڑی دھوپ کیا بگاڑے گی
سلگتی ریت پہ چلنا بھی جانتا ہوں میں

مٹا نہ پائے گی میرے وجود کو دنیا
کسی فقیر کی مانگی ہوئی دعا ہوں میں

یہ کم نہیں کہ صداؤں کے اس ہجوم میں بھی
الگ جو رکھتی ہے پہچان وہ صدا ہوں میں

مرا سخن مری پہچان بنتا جاتا ہے
کہ لفظ لفظ پسِ شعر بولتا ہوں میں

زمانے پر بھی نظر ہے مری سعید اگر
کبھی خود اپنا تماشا بھی دیکھتا ہوں میں

ڈاکٹر سعید عارفی
قانون گو پورہ ۔ بہرائچ ۲۷۱۸۰۱

خوشبو ہو تیرے پیار کی جس میں وہ بات ہے عزیز
تو نے بنا دیا ہو دن جس کو وہ رات ہے عزیز

سن کر ہو جس کو آنکھ نم کیوں کر سنوں وہ داستاں
ہنس دیں وہ جس کو سن کے سب مجھ کو وہ بات ہے عزیز

فرقہ و قوم و نسل و دیں، میری نظر میں کچھ نہیں
پھول کوئی چمن کا ہو، سب کی حیات ہے عزیز

صبح ہو دوپہر کہ شام، مجھ کو نہیں کسی سے کام
گزرے جو تیرے ساتھ ساتھ مجھ کو وہ رات ہے عزیز

طالب مدد کے جو بھی تھے ان کو بسنت کی مدد
خلق سے ہم کو پیار ہے کا یہ ذکات ہے عزیز

بسنت کمار بسنت
۲۵۱/۳۹ ۔ ٹیڑھی بازار،
رکاب گنج ۔ لکھنؤ

سبط محمد نقوی
دفتر ہماری توحید ۔ عزاخانہ غفرانمآب
چوک لکھنؤ

اودھ کے چند ممتاز علماء

—(۲)—

علامہ فضل حق خیرآبادی

فضل حق فاروقی شیوخ کے ایک ایسے خانوادے سے تعلق رکھتے تھے جس کے شمس الدین و بہاء الدین نامی دو بزرگ جو حقیقی بھائی تھے، ایران سے ہند وارد ہوئے اور مختلف منازل سے گزر کے ہرگاؤں (ضلع سیتاپور) میں طرحِ اقامت ڈالی۔ خیرآباد کو علامہ فضل حق کے دادا شیخ محمد ارشد نے مسکن بنایا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ان بزرگوں کے والد مشیر الملک ایران کے کسی خطے میں صاحب ملک و مال تھے۔ یہ دونوں برادر ہندوستان تشریف لائے تو ایک رہتک (ہریانہ) دوسرے بدایوں (اترپردیش) میں مقیم ہوئے۔ ان بزرگوں کی نسل میں سرمایۂ علم کئی پشتوں تک چلا اور حکومت سے ربط رہا۔ قلمی خدمات کی روایت بھی دیرینہ ہے علامہ کے پردادا کے والد ملا عبدالواجد کے والد فاضل متبحر تھے جنہوں نے کافیہ کی شرح اور تحریر اقلیدس پر حواشی لکھے۔ ملا عبدالواجد کے صاحبزادے حافظ محمد صالح یعنی علامہ کے پردادا بھی صاحبِ قلم تھے اور تذکرۃ الاولیاء ان سے یادگار ہے۔ آپ عہد محمد شاہ میں منصب دار بھی تھے۔ حافظ صاحب کے صاحبزادگان شیخ محمد جعفر ہرگانوی اور شیخ محمد ارشد ہرگانوی کے علمی فتوحات کا کوئی ذکر نظر قاصر سے نہیں گزرا۔ البتہ شیخ محمد ارشد کے خلف مولانا فضل امام یعنی علامہ عبدالحق کے دادا نے عالمانہ حیثیت پائی اور صدر الصدوری کے منصب پر انگریزوں نے دہلی میں متعین کیا۔

آپ کی کتاب "آمد نامہ" فارسی کے قواعد و علما، جوار لکھنؤ کے تذکرے میں بڑی شہرت کی حامل ہے۔ شیخ صاحب معقولاتی تھے اور ان سے بہت سی چیزیں یادگار ہیں۔ "مرقاۃ" نامی کتاب نے اپنی افادی حیثیت کی بدولت درسی کتاب کی منزلت پائی۔ آپ منصبی فرائض کی بجاآوری اور تصنیفی مشاغل کے باوجود تدریس سے بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ آپ کی بزم درس ہمیشہ گرم رہتی۔ تقریر اتنی جاذب اور دلچسپ ہوتی کہ جو طالب علم حلقۂ درس میں شامل ہوتا وہ آپ کا ہی ہو رہتا۔ آپ کے ایک صوفی منش شاگرد شاہ غوث علی نے استاد کے ساتھ پٹیالہ نقل مکان کیا وہ ابھی اٹھارہ سال ہی کے تھے کہ مولانا فضل امام کا سفر حیات پورا ہو گیا پھر شاہ غوث عالم نے تعلیم ہی کو خیرباد کہہ دیا کہ :- "نہ ایسا شفیق و قابل استاد ملے گا نہ پڑھوں گا۔" [1]

اس وقت دہلیِ مرحوم کی بزم درس دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ منقولات میں شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر مرجع تھے تو معقولات میں مولانا فضل امام۔ کیفیت یہ تھی کہ مولانا کے صاحبزادے عبدالحق نے منقولات میں شاہ عبدالعزیز کے حضور میں زانوئے ادب تہ کیا۔ ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۰۹ء میں تیرہ سال کی عمر تھی کہ تمام مروجہ تدریسی مراحل سے کامیاب گزر چکے تھے۔ اس عمر میں مسند تدریس پر بھی فائز ہو گئے۔ جو مکی یا بیرونی طلبا، مولانا فضل امام سے استفادے کے لیے آتے، والد صاحب کے ارشاد کے مطابق علامہ بھی انہیں درس دیتے۔ یہی سبب تھا کہ درسیات پر ایسی قدرت ہو گئی تھی کہ شطرنج کی بازی، حقہ نوشی اور تلامذہ کا سبق بیک وقت جاری رہتے۔ یہ سلسلہ نصف صدی تک چلا۔ منصبی فرائض، ملکی کاروبار اور تصنیف و تالیف کسی شغل کو بھی تدریس میں حائل نہیں ہونے دیا۔

انگریز شدت کے ساتھ اس کے خواہش مند تھے کہ اعلیٰ خاندان

اور ارباب وجاہت کمپنی سے متعلق ہو جائیں تاکہ حکومت کو تقویت میں اضافہ ہو۔ اسی انداز فکر کی بدولت مولانا فضل امام صدر الصدور کے منصب پر فائز ہوئے تھے اور ان کے شاگرد رشید مفتی صدر الدین خاں آزردہ بھی۔

چناں چہ والد ماجد کے ایما سے علامہ بھی ۱۸۱۵ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے حلقہ ملازمت میں شامل ہو گئے۔ جب والد ماجد کا انتقال ہوا تو علامہ ریزیڈنٹ کے دفتر میں سر رشتہ دار تھے، پھر کمشنری ریزیڈنسی میں بدلی کرائی۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، انگریز نمایاں اور روادار مسلمانوں کو اپنانے کی پالیسی پر کاربند تھے لیکن اپنے احساس برتری اور حکومتی فوقیت پر کیسے قابو پاتے۔ اس صورت حال کا علامہ جیسا جری و غیور کیسے تحمل کرتا اس لئے والد ماجد کی وفات کے بعد یہ رشتہ منقطع ہو جانے ہی میں سہولت دیکھی۔ اس امکان کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا کہ انگریز ایسے دور اندیش، بیدار مغز اور جرأت مند ہندستانی سے خود ہی پیچھا چھڑانے کی تدبیر میں رہے ہوں۔ راقم ناکارہ یہ بات اس بنا پر عرض کرتا ہے کہ اس بات کے شواہد موجود ہیں کہ علامہ انگریزوں کی کارروائیوں کی کھلم کھلا مخالفت میں باک نہیں کرتے تھے۔ سر چارلس مٹکاف نے دہلی پر ٹیکس لگایا، جس کے خلاف علامہ نے اکبر شاہ ثانی کے محضر مبارک میں احتجاجی عرضداشت پیش کی۔ یہ عرضی دہلی کے ہندو مسلمان شہریوں کی طرف سے پیش کی گئی تھی۔[۱] ظاہر ہے کہ انہی سرگرمیوں نے انڈمان میں اسیری کی راہ دکھائی۔ تفصیل آگے آتی ہے۔

کمپنی سے قطع علائق کے بعد ایک مدت جھجر میں گزار کے مہاراجہ الور کی طلب پر وہاں چلے گئے۔ پھر نواب ٹونک کے یہاں رہے۔ پھر رام پور سے تعلق ہوا جہاں نواب اور ولی عہد نے زانوئے ادب بھی تہ کیا۔ انھیں رسوخ و روابط کی بنا پر دربار میں مرزا غالب کا رسوخ بڑھا اور نواب نے مشورۂ سخن کیا۔

مولوی عبدالشاہد خاں شروانی الثورة الهندية کے ترجمہ "باغی ہندوستان" میں علامہ کے اٹھائیس تلامذہ کے نام گناتے ہیں[۲] جن میں مولانا ابوالکلام آزاد کے والد ماجد مولانا خیر الدین، شمس العلماء مولانا عبدالحق کان پوری اور امام اہل سنت مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے استاد مولانا عبدالقادر خاں ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ اسی ناشر مصنف نے علامہ کی مشہور تصنیف کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان میں سے "ہدیہ سعیدیہ" درس نظامی کے نصاب میں شامل ہے۔ اس کے علاوہ ۱۸۵۷ء کی پہلی انقلابی تحریک کے احوال میں الثورة الهندية ایک اہم تاریخی ماخذ کا مقام حاصل کر چکی ہے۔ اس کا اردو ترجمہ مفید و معلوماتی حواشی کے ساتھ مولوی شروانی صاحب مذکور الصدر نے شائع کر دیا ہے۔ ایک منظوم کوشش قصائد الفتنة الهندية ہے۔ مگر خود علامہ اپنی شرح سلم کو اپنی یادگار کتاب سمجھتے تھے[۳] مگر بیشتر سرمایہ غیر مطبوعہ رہا۔ مطبوعات کی تعداد چار پانچ سے زائد نہیں۔

دو ازواج سے تین صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں پیدا ہوئیں، جن میں زوجۂ اولیٰ کے بطن سے مولانا عبدالحق خلف الصدق ثابت ہوئے۔ علامہ کے ذکر میں ابھی بہت کچھ عرض کرنے کی گنجائش تھی بلکہ بعض پہلوؤں کی پیش کش ضروری تھی لیکن اب اسیری کے مطالعے کے لیے ہمیں انڈمان کی طرف توجہ کرنا چاہیے۔

علامہ کی گرفتاری ۳۰ جنوری ۱۸۵۹ء کو خیرآباد میں عمل میں آئی۔ ۱۲ فروری کو ایف۔ اے۔ ہربرٹ کی عدالت میں مقدمہ کی کارروائی شروع ہوئی۔ ایک ہفتے کی سرسری سماعت کے ۲۸ فروری کو مقدمہ جوڈیشری کو سپرد کر دیا گیا۔ جوڈیشیل کمشنر جارج کیمبل اور میجر بیرو قائم مقام کمشنر کی بنچ نے تین دن کے اندر ۴ مارچ کو عمر قید بہ عبور دریائے شور "بہ حیثیت قیدی سرکار انگلشیہ" اور ضبطی جائیداد کی سزا سنائی۔ بنچ نے اپنی تجویز میں مقدمے کی جو تفصیل بیان کی ہے اسے حسب ذیل اقتباس سمجھنے میں بہتر مدد دے گا:

> "اس شخص (فضل حق) کے مقدمہ کو دو حصوں میں منقسم کر کے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ شخص ۱۸۵۸ء میں باغی سردار کے مشیر خاص کی حیثیت سے مانا جاتا تھا دہلی میں اس کے تعلقات تھے۔ دہلی کے کمشنر کے خط کے ذریعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے تقریباً وہی رویہ وہاں بھی رکھا تھا۔ اس مقدمے کا جہاں تک دہلی سے تعلق ہے وہ ثابت نہیں کیا جا سکا کیوں کہ گواہیاں نہیں پیش کی جا سکیں۔



△ اترپردیش کے وزیراعلا شری ملائم سنگھ یادو باباصاحب بھیم راؤ امبیڈکر جینتی کے موقع پر ۱۴ اپریل
کو باباصاحب کے مجسمہ کی گل پوشی کرتے ہوئے ۔

وزیراعلا شری ملائم
کو تعلیمی اصلاحات نیز
تعلیم کے معیار کو بہتر
بنانے کے سلسلے میں
کمیٹی کی رپورٹ
پیش کرتے ہوئے
شری ہری کرشن او

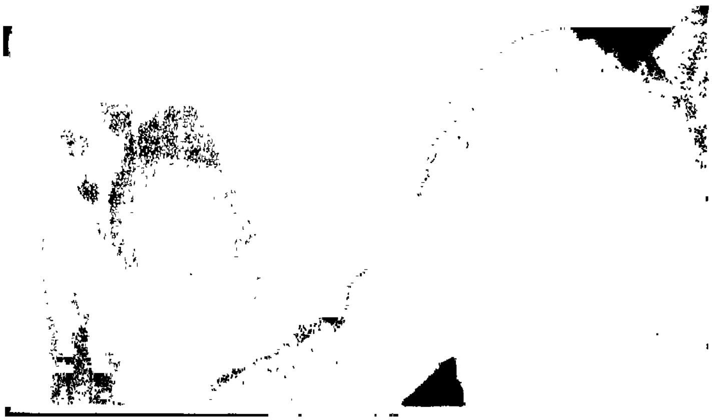
▷





وزیر اعلیٰ شری ملائم سنگھ یادو نئی دہلی میں
سی۔ آئی۔ آئی کے بیسویں سالانہ جلسہ کو خطاب
کرتے ہوئے







△ دیہی علاقوں میں تعلیم اور بے روزگاری کے مسئلے کے حل کے موضوع پر منعقدہ سمینار کے موقع پر وزیر [illegible] شری ملائم سنگھ یادو نے چودھری چرن سنگھ کی تصویر کی گل پوشی کی۔

تصاویر: جاوید ہاشمی

اس سمینار کا افتتاح وزیر اعلیٰ نے شمع روشن کر کے کیا۔ ▽



تعمیرات عامہ و پارلیمانی امور کے وزیر شری بینی پرشاد ورما کی صدارت میں منعقدہ وزارتی کونسل کے ممبران کی میٹنگ کا ایک منظر





گورنمنٹ پالی ٹکنیک
بارہ بنکی کے سالانہ
جلسے میں بحیثیت
مہمانِ خصوصی
وزیر تعمیرات عامہ
و پارلی مانی امور
شری بینی پرشاد ورما

اور مجرم کو اس بات کا موقع نہیں ملا کہ وہ الزامات کو قبول کر سکے یا انھیں جھٹلا سکے۔ مگر چونکہ اس شخص کے خلاف اودھ کے الزامات ثابت کیے جا چکے ہیں اس لئے اس کا رویہ دہلی میں بھی کم و بیش اسی قسم کا اخذ کیا جا سکتا ہے۔

مندرجۂ ذیل الزامات اس ملزم پر عائد کیے گئے:

۱۔ پوری بغاوت کے دوران اس شخص نے عام طور پر لوگوں کو گمراہ کیا اور

۲۔ خاص طور پر اودھ میں ۱۸۵۸ء میں لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کیا۔

پہلے کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عدالت کے لئے ملزم کو قتل کے لئے اکسانے کے الزام پر سزا دینا ممکن نہ ہوگا۔ کیوں کہ جن لوگوں کے لئے یہ کہا جاتا تھا کہ ملزم نے انھیں قتل کرانے کی کوشش کی وہ واقعتاً قتل نہیں کیے گئے۔ اور یہ بات بھی بالکل واضح نہ ہوئی تھی کہ ملزم نے انھیں کچھ شرائط پر چھوڑ دیا ہو مگر پھر بھی عدالت کا یہ خیال ہے کہ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ ملزم نے اس موقع پر بالکل صریحاً اور اپنی سرکاری حیثیت میں کچھ ایسے اصولوں کی اشاعت کی جن سے لوگ قتل کے لئے آمادہ ہوئے اس نے قرآن سے اقتباسات پیش کیے اور یہ کہا کہ جو لوگ سرکار انگلشیہ کی ملازمت میں رہ چکے ہیں وہ ملحد ہیں اور یہ کہ اسلامی قانون کے اعتبار سے ان کی سزا موت ہے۔ اور اس نے یہاں تک کہا کہ اگر باغی سردار نے یہ سزا سرکار انگلشیہ کے نوکروں کو نہ دی تو وہ خود خدا کی نگاہ میں گنہ گار ہوگا۔

عدالت نے شبہ کی بنا پر ملزم کو اس الزام سے بری کیا کہ ملزم نے سزائے موت کے بدلے سرکار انگلشیہ کی نوکری چھوڑنے کو کہا ہو لیکن یہ بات بالکل صاف اور واضح ہے کہ ملزم نے جن اصولوں کی اشاعت کی تھی ان سے ایسے خونی مناظر دیکھنے میں آئے جو بغاوت کے جزو خاص تھے

اور تمام گواہوں کے بیانات سے عدالت یہ سمجھتی ہے کہ ملزم ایک مشہور اور بغاوت کو اکسانے والا شخص تھا۔ اس نے اپنا یہ رویہ دہلی میں بھی رکھا اور یقیناً اودھ میں اس جرم کا مرتکب تھا۔ اس نے ایک بار اس بات کی بھی کوشش کی کہ وہ یہ بات ثابت کر سکے کہ وہ فضل حق ہیں جو کہ اودھ کی بغاوت میں منسلک رہے تھے مگر یہ بات بالکل صاف ہے کہ ایک تحصیلدار بریلی تھا جو کہ بعد کو باغیوں کے ساتھ ایک جتھے کا لیڈر تھا جبکہ ملزم بالکل مختلف شخص ہے۔ یہ شخص کبھی جتھے کے ساتھ نہیں رہا اور کبھی اس نے تلوار ہاتھ میں نہیں لی یہ شخص باغی سردار کے دربار میں تھا اور باغیوں کی عدالت عالیہ کا سب سے زیادہ با اثر ممبر تھا۔ یہ بات مشتبہ ہے کہ آیا یہ عدالت واقعی کوئی حیثیت رکھتی تھی اور آیا ملزم اس عدالت میں کوئی مستقل مقام رکھتا تھا۔ لیکن یہ بات بالکل ثابت ہو چکی ہے کہ کچھ لوگ بیگم اور باغی سردار کو مشورہ دیتے رہتے تھے اور باغیوں کے کیمپ میں انھیں اربعہ شوریٰ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس مجلس کو کبھی کبھی انگریزی نام کچھری پارلیمنٹ بھی کہا گیا ہے۔ اسی مجلس کا ملزم ایک سرگرم اور سربراہ لیڈر تھا۔

براہ راست شہادت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ملزم کو ممو خاں کا اعتماد حاصل تھا اور یہ کہ ملزم سے براہ راست ممو خاں مشورہ لیا کرتا تھا اور اس موقع پر ملزم نے ایسے اصولوں کی اشاعت کی جن سے قتل کے امکانات ہو سکتے تھے۔

قیدی، ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک بہت عقلمند شخص ہے جس نے طاقت اور مشہور ہونے کی ہوس میں یا بے انتہا شدید باتوں سے اثر انداز ہو کر باغیوں کی مجلس میں اپنی اس قدر اثر انداز جگہ بنالی تھی۔ وہ ایک بہت خطرناک ہستی ہے۔ وہ کسی بھی وقت لامحدود نقصانات پہنچا سکنے کا اہل ہے

ٹھیک ایسا انسان ہے جس کا ہندوستان سے ہٹا دیا جانا انصاف اور امن کے لئے ضروری ہے۔ وہ اودھ کا رہنے والا ہے مگر ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتا ہے جو سب کچھ کے لئے سرکار انگلشیہ کے مرہون منت رہے ہیں اور وہ بذاتِ خود سرکار انگلشیہ میں ایک اچھی حیثیت رکھتا تھا مگر اس نے بہت دنوں سے سرکار انگلشیہ کی نوکری چھوڑ دی تھی اور بالذّات جگہوں پر اودھ، رامپور اور الور کی ریاستوں پر مامور رہا ہے۔ وہ ہمیشہ ایک مشہور انسان رہا ہے اور جن گواہوں نے اسے دیکھا بھی نہیں تھا، انھوں نے بھی مولوی فضل حق کے متعلق پہلے سے بہت کچھ سُن رکھا تھا وہ خود سے دہلی آیا تھا اور اس نے تب ہی سے بغاوت میں حصّہ لینا شروع کیا ہے۔ وہ ایک ایسا انسان ہے جسے سخت سزا دینا چاہیے اور جسے بہت احتیاط سے ہندوستان سے الگ کر دینا چاہیے۔ لیکن اس کی ضعیف عمر اس کی زندگی میں پوزیشن اور اس کے اودھ کے باشندے اور کئی برس تک مختلف دیسی ریاستوں میں کام کرنے کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ وہ ایک سرکاری قیدی تصور کیا جائے نہ کہ ایک معمولی مجرم۔" [۵]

انڈمان کے لئے لکھنؤ سے روانگی کی قطعی تاریخ معلوم کرنے میں ناکامی ہوئی۔ لیکن آپ انڈمان کے کوائف بھی شروانی صاحب کی زبانی ملاحظہ کریں:

"..... علامہ جزیرۂ انڈمان پہونچے۔ مفتی عنایت احمد کاکوروی، مفتی مظہر کریم دریابادی اور دوسرے مجاہد علماء وہاں پہلے پہونچ چکے تھے۔ ان کی برکت سے یہ بدنام جزیرہ دارالعلوم بن گیا۔ ان حضرات نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ وہاں بھی قائم رکھا۔ خرابی آب و ہوا، تکالیف شاقہ اور جدائی احباب و اعزا کے باوجود علمی مشاغل جاری رہے۔ مفتی صاحب نے علم الصیغہ جیسی صرف کی مفید کتاب جو آج تک داخل نصاب ہے، وہیں لکھی۔ سرکاری ڈاکٹر حکیم امیر خاں کی فرمائش سے تواریخ حبیب اللہ بھی تالیف کی۔
۱۲۷۵ھ

ان دونوں کتابوں کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان حضرات کے سینے علم کے سفینے بن گئے تھے۔ تاریخی یادداشت ترتیب واقعات، قواعد فنون، ضوابط علوم سبھی حیرت انگیز کرشمے دکھا رہے ہیں۔ ایک انگریز کی فرمائش پر تقویم البلدان کا ترجمہ کیا، جو دو برس میں ختم ہوا اور وہی رہائی کا سبب بنا۔

واپسیٔ ہندوستان پر شاگرد رشید مفتی لطف اللہ علی گڑھی نے تاریخ لکھ کر پیش کی ؎

چو بفضل خالقِ ارض و سما　　　اوستادم شد ز قید غم رہا
بہر تاریخ خلاص آں جناب　　　بر نوشتم ان استاذی نجا

مفتی مظہر کریم نے میجر جان ہارٹن کمشنر جزائر دریائے شور کی فرمائش پر مراصد الاطلاع کا ترجمہ کیا۔ ۱۲۷۷ھ سید اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی نے ۵ اشعار میں تاریخ لکھی۔ آخری شعر ہے ؎

منیر اس کی کہی تاریخ یوں سال مسیحی میں
یہی سیر جدید بوستان ہفت کشور ہے

علامہ نے بھی کئی مفید تصانیف لکھیں، انھیں میں سے رسالہ الثورۃ الہندیہ اور قصائد فتنۃ الہند ہیں۔ یہ رسالہ اور قصائد جہاں تاریخی ہیں وہیں عربی ادبیت کے بھی شاہکار ہیں۔ علامہ کا کمال یہ ہے کہ اشعار اور جملوں میں ایک مادے کے مختلف صیغے، متعدد معنوں میں بے تکلف استعمال کرتے چلے جاتے ہیں۔ نظم اور نثر دونوں میں اس کا ظہور برابر نظر آتا ہے۔" [۶]

علامہ کا آفتاب حیات غروب ہو گیا جس کو معین وقت پر غروب ہونا ہی تھا۔ لیکن افادات کا سلسلہ خلف الرشید مولانا عبدالحق کی بدولت جاری رہا۔ ۲۳ شوال ۱۳۱۶ھ (اپریل ۱۸۹۹ء) کو رحلت کے وقت عمر بہتّر سال تھی۔ آپ کے صاحبزادے مولانا اسدالحق کا شمار بھی علماء میں تھا۔ جن کے بعد روایت علمی کی وہ آب و تاب باقی نہ رہی۔

مولانا حکیم سیّد عبدالحیٔ

ہر چند کہ مولانا حکیم سید عبدالحیٔ صاحب کی بزم درس کی روایت نہیں ملتی، لیکن ندوۃ العلماء کو استحکام بخشنے میں ان کی خدمات صدر بزم درس پر بھاری ہیں۔

ہندستان ہجرت کرنے والے آپ کے مورث امیر سید قطب الدین محمد المدنی ، ۶۰۰ھ میں ہزاروں مریدوں کی جمعیت کے ساتھ آئے تو سلطان شمس الدین التمش کی بادشاہی تھی۔ اس نے شیخ الاسلام کا منصب پیش کیا۔ روایت یہ ہے کہ یہ ہجرت عالم رویا میں حضور انور صلعم کا اشارہ پاکے ہوئی تھی۔

دہلی سے شیخ الاسلام نے مشرق کی طرف رُخ کیا اور کڑا مانک پور میں طرحِ اقامت ڈالی۔ آپ کے ایک صاحبزادے قاضی تاج الدین بداؤں کے قاضی ہوئے۔ پوتے رکن الدین پسر نظام الدین کڑا مانک پور کے قاضی رہے۔ امیر قطب الدین کی اولاد مسلسل علم و فضل سے مالامال اور عہدۂ قضا پر مامور رہی۔ نصیرآباد (رائے بریلی) کی قضاوت تو کئی پشتوں تک چلی یہاں تک کہ ایک فریقِ مقدمہ کے یہ کہنے پر کہ "میں ایسے حکم شرعی سے بیزار ہوں" اتنا دل برداشتہ ہوئے کہ قاضی سید احمد ہجرت کر کے نصیرآباد سے رائے بریلی چلے آئے مگر اولاد نصیرآباد ہی میں رہی۔ یہ قاضی سید احمد امیر قطب الدین کی پانچویں چھٹی پشت میں تھے۔ قاضی سید احمد کے پوتے قاضی محمد فضیل کے ساتھ بھی یہی وقوعہ ہوا۔ آپ نے "دیارِ بے ادباں" میں "بود و باش حرام" قرار دے کر مدینہ منورہ ہجرت کی۔

شاہ سید علم اللہ جن کا دائرہ آج اسلامی دنیا میں معروف ہے انھیں قاضی سید فضیل احمد کے فرزند تھے۔ آپ کی ولادت ۱۲ ربیع الاول ۱۰۳۳ھ کو نصیرآباد میں ہوئی۔ تحصیل علم گھر ہی پر کی۔ پھر شاہ جہاں کے لشکر میں شامل ہو گئے۔ پھر ایک واقعے سے متاثر ہو کے دُنیا سے منھ موڑ کے انقطاع الی اللہ کی سعادت نصیب ہوئی۔ نصیرآباد چلے آئے عیال کو بھی عُسرت و تنگ دستی کی زندگی بسر کرنے پر راضی کر کے جو مال اسباب تھا، راہِ خدا میں تقسیم کر ڈالا۔ پھر کسی بات سے متاثر ہو کے ہجرت کے ارادے سے چل پڑے۔ آپ کے شیخ طریقت آدم بنوری نے ہجرت کی اجازت دیتے ہوئے فرمادیا تھا کہ "جاسکتے ہو لیکن اگر کوئی مرد خدا روکے تو ٹھہر جانا"۔ ہوا بھی ایسا ہی۔ آپ کے مرید صوبہ دار نواب جہاں خان نے برسات تک اپنے پاس قیام پر راضی کر لیا۔

جس دن نواب کے یہاں سے روانگی کا دن تھا، ایک مجذوب شاہ عبدالشکور آپ کو اس ویرانے میں لے گئے جہاں آج تکیہ کی آبادی ہے۔ [ملہ] مسجد، مدفن کی جگہیں بتاتے ہوئے آپ سے آپ کے پیر کی مشروط اجازت کا حوالہ دیتے ہوئے عزم ہجرت فسخ کر کے وہیں ٹھہر جانے کی تجویز رکھی۔ آپ تکیہ کے محل وقوع اور وہاں کے آج کے حالات کی منظر کشی ڈاکٹر حافظ ہارون رشید صدیقی کی زبانِ قلم سے ملاحظہ فرمائیں:

> شہر رائے بریلی سے پچھم تقریباً تین فرلانگ پر ایک گاؤں لوہانی پور ہے، وہاں سے تقریباً اتنے ہی فاصلے پر پچھم ایک بہت ہی پرفضا و پُرسکون مقام، علم ظاہر و باطن کا مرکز، قیام گاہ سادات حسنی موسوم بہ دائرہ شاہ علم اللہ معروف بہ تکیہ کلاں، یا بڑی تکیہ ہے، جہاں آج بھی چھ سات گھر آباد ہیں۔ جس کے پورب اور اُتر لہلہاتے کھیت، آم امرُود کے باغات، دکھن دریائے سئی، جس کے اُس پار درختوں کے جھنڈ، اِس پار کعبہ نما مربع مسجد، اس کے سامنے روضہ شاہ علم اللہ، بے تکلف و سادہ ماحول، قدرتی فضا بہت ہی خوش نما، روح افزا اور دل کش منظر پیش کرتے ہیں، جہاں آج بھی مضمون نگار کو رنگینی و جدت، شاعر کو جولانی طبیعت، سالک کو بلندی و رفعت، صاحب دل کو نزول رحمت، شکستہ دل کو سکون و اطمینان، حتیٰ کہ ایک عامی کو بھی احساس روحانیت ہوتا ہے۔ کیوں نہ ہو ابتدائے آبادی سے اب تک یہ سادات کرام کی قیام گاہ اور کتنی ہی برگزیدہ ہستیوں کی آرام گاہ ہے۔[ملکہ]

انھیں شاہ علم اللہ کے پوتے کے پوتے عظیم مجاہد آزادی سید احمد ہوئے جو اَب سید احمد شہید کے نام سے تاریخِ آزادی کا ایک روشن عنوان ہیں۔ سید صاحب کی اب اردو میں بڑی مفصل سرگزشت و سوانح موجود ہیں، اس لیے اس مضمون میں آپ کا ذکر غیر ضروری معلوم ہوا اور شاید طبقہ علماء میں سید صاحب کا شمار ہوتا بھی نہیں۔ قاضی محمد فضیل کے بھائی یعنی شاہ علم اللہ کے چچا سید محمد اسحاق بڑے بزرگوں میں تھے۔ ان کی اولاد کو بھی علم کی دولت ارزانی ہوتی رہی مولانا حکیم سید عبدالحیٔ ان کے ایک صاحبزادے سید ہدایت اللہ کی نسل میں ہیں حکیم صاحب کے دادا مولانا عبدالعلی، سید احمد شہید کے مرید و مجاز تھے۔ تحصیل داری کے منصب پر فائز ہوتے ہوئے درویشانہ زندگی بسر کی۔ ان کے صاحبزادے مولانا حکیم سید فخرالدین خیالی اپنے وقت کے ممتاز عالم، معالج

اور شامل ہوئے۔ انھیں بزرگ کے گھر میں ۱۸ر رمضان ۱۲۸۶ھ مطابق ۲۲ر دسمبر ۱۸۶۹ء کو سید احمد کی ولادت ہوئی۔ یہ بدھ کا دن تھا۔ یہی سید احمد عبدالحئیؒ کے نام سے شہرۂ آفاق ہوئے۔

ہوش کی آنکھیں کھولیں تو گرد و پیش علماء، ادباء، شعراء، صاحبانِ ورع وتقویٰ کو دیکھا۔ اسی فضا میں ابتدائی تعلیم کی منزل سے گزرے۔ گھر کے علاوہ رائے بریلی کے مدرسہ اسلامیہ میں بھی پڑھا۔ پھر الٰہ آباد جاکے مولانا محمد حسین صاحب اور دوسرے علماء سے استفادہ کیا۔ الٰہ آباد سے فتحپور پہونچے اور کچھ دنوں مولانا نور محمد صاحب کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ پھر والد بزرگوار کی خدمت میں بھوپال جانا ہوا۔ وہاں بھی سلسلۂ تعلیم چلتا رہا۔ ۱۸۸۵ء مطابق ۱۳۰۳ھ میں لکھنؤ آنا ہوا۔ کچھ دنوں کانپور جاکے مدرسہ جامع العلوم میں مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا فتح محمد تھانوی سے کچھ کتابیں پڑھیں۔ پھر لکھنؤ واپس آئے۔ لکھنؤ میں مولانا امیر علی، مولوی الطاف حسین، مولوی فتح محمد تائبؔ، مولوی احمد شاہ، مولوی فضل اللہ کے علاوہ شمس العلماء مولانا محمد نعیم فرنگی محلی سے مستفید ہوئے۔ لکھنؤ کے اس قیام میں شفقت مادری کے سائے سے محرومی کا سامنا ہوا جس نے اتنا متاثر کیا کہ ترکِ دنیا پہ آمادہ ہوگئے۔ لیکن عالم باپ کی حکیمانہ فہمائش سے سنبھل گئے۔ گھر آئے اور اسی سال ۱۳۰۹ھ/ ۹۲-۱۸۹۱ء میں ماموں کی دختر کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں بندھ گئے۔ مگر اس تعلق نے تکمیل تحصیل کی راہ مسدود نہیں کی۔

دوبارہ بھوپال کا سفر کیا۔ جہاں ریاضی میں مولانا سید احمد دہلوی، ادب میں مولانا شیخ محمد عرب اور حدیث میں شیخ حسین یمانی سے استفادہ رہا۔ باقی درسیات مولانا قاضی عبدالحق کی خدمت میں گزارے۔ درس وتدریس، تقریر وتحریر کی اجازت مولانا یمانی سے حاصل کی۔ مولانا قاضی ایوب صاحب بھلتی کے درس میں بھی شریک ہوئے۔

دہلی اور اس کے اطراف کی سیاحت بھی کی۔ مولانا رشید احمد گنگوہی اور حکیم عبدالعزیز لکھنوی کی خدمت میں بھی استفادہ کیا۔ طب کی تحصیل کی ابتدا بھوپال میں قاضی عبدالعلی کے محضر میں کرچکے تھے۔ اب حکیم صاحب لکھنؤ تشریف لاچکے تھے یہیں درس کی تکمیل اور مطب کی شروعات کی۔ اصلاح نفس کا ذوق ہمیشہ سے تھا۔ مہاجر مکی حاجی امداد اللہ سے رجوع کیا جنھوں نے بیعت عثمانی میں داخل کیا اور نہایت پرشفقت خط لکھا۔ مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کی خدمت میں حاضری دیتے رہے۔ آپ نے بے مانگے اپنی بیعت کا شرف دیا۔

حکیم سید عبدالحئیؒ کی تحصیل علمی اور علی گڑھ تحریک کا دور شباب ایک ہی تھا۔ آپ تحریک اور سر سید کی شخصیت دونوں سے متاثر تھے۔ لیکن یہ تاثر حدود غیر وخرد میں تھا۔ چنانچہ سر سید کو ایک مفصل خط لکھ کے ان کی خدمتوں کو سراہا ساتھ ہی ساتھ جو کمزوریوں اور دینی نقطۂ نظر سے مضر باتوں کی نشاندہی بھی کردی۔

وہ مبارک سال ۱۳۱۲ھ/ ۹۴-۱۸۹۳ء تھا جب آپ ندوہ سے متعلق ہوئے۔ ۱۵ر دسمبر ۱۸۹۵ء کو مددگار ناظم مقرر ہوئے۔ ندوہ کے بانی اور ناظم مولانا محمد علی مونگیری کے معتمد تھے۔ تقریباً اسی زمانے میں جب ندوہ کو بڑے سخت انتشار واختلاف کا سامنا تھا تو آپ کی ثابت قدمی اصلاح حال میں بہت کام آئی اور اسی لیے ۱۳۳۴ھ/ ۱۹۱۵ء میں آپ ناظم منتخب ہوئے تو پھر موت ہی نے یہ سلسلہ منقطع کیا۔ قابل ذکر یہ ہے کہ ندوہ کی نظامت، مطب اور قلم وقرطاس سے گہری وابستگی کے ساتھ ساتھ تدریس کا خیر جاری رہا۔ ندوہ کی خدمت اور تدریس کا سلسلہ فی سبیل اللہ تھا۔ معاش کا وسیلہ مطب کو بنا رکھا تھا۔ اس سے قبل کہ ہم اس مصنف جلیل کے قلمی خدمات کی طرف رجوع کریں وہ مولانا ابوالکلام آزاد نے حکیم صاحب کے خدمات ندوہ کی جو قدرشناسی فرمائی ہے اسے یہاں نقل کردینا چاہتے ہیں تاکہ قصۂ پارینہ کی بازخوانی کا مزہ اور منفعت دونوں حاصل ہوں:

> ”مولانا عبدالحئیؒ صاحب کا ذکر چوں کہ آگیا ہے اس لیے یہ کہے بغیر قلم آگے نہیں بڑھتا کہ مولانا شبلی نعمانی کے بعد وہ دوسرے بزرگ ہیں جنھوں نے ندوۃ العلماء کی خدمت گزاری میں قابل تحسین ایثار نفس سے کام لیا ہے۔ اور جو آغاز کار سے اس وقت تک ندوے کی تاریخ میں ایک مثال رہے ہیں ایک ایسے زمانے میں جبکہ فرض اور ضمیر کے معانی سے قوم بیگانۂ محض ہورہی ہو اور قومی ترقی کے عام شور وغوغا میں ایک آواز بھی خلوص اور ایثار کی سنائی نہیں دیتی، ایک ایسے شخص کی تعریف کیوں نہ کی جائے جس نے ابتدا سے ندوے کا ساتھ دیا اور اس وقت بھی جبکہ غایت درجے کی

کس مپرسی اور بے کسی کے عالم میں ندوہ چھوڑ دیا گیا تھا اور اسے اغراض شخصیہ کے لئے مفید نہ پاکر تمام مدعیان کار ایک ایک کر کے الگ ہو رہے تھے، وہ اس کی خدمت میں برابر سرگرم رہا۔ اور پھر اتنا ہی نہیں بلکہ باوجود مالی بے اطمینانی و ضروریات معاش کے جو قلیل رقم ندوہ پیش کرتا تھا اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا وجود بے غرضی اور ایثار کے جوش کا کتنا موثر نمونہ ہے"! ۵۵

حکیم صاحب کے مصنفات

کیا ہیں، مضامین نو کے انبار ہیں جن سے خوشہ چینی کا سلسلہ جاوید جاری رہے گا۔ سب سے اہم تصنیف نزہۃ الخواطر ہے۔ آٹھ جلدوں میں بڑی تقطیع کے تین ہزار صفحات پر مشتمل۔ علماء مشاہیر اسلامیان ہند کا اتنا جامع تذکرہ نہیں ہے۔ راقم عاجز کو اس کے بالاستیعاب مطالعے کی سعادت نہیں حاصل ہو سکی۔ پھر بھی جو مقامات نظر سے گزرے ہیں ان سے یہ محسوس ہوا کہ کتاب کشادہ نظری سے لکھی گئی ہے اور مسلکی عصبیت سے محفوظ ہے

حکیم صاحب کی دوسری کتاب "الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند" ہے۔ اس میں ہندستان کے مسلم حکمرانوں کے دور میں اسلامی علوم و فنون کی کیفیت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور اپنے انداز کی غالباً سب سے جامع کتاب ہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ایک نامور فرزند مولانا ابوالعرفان خاں ندوی نے اس کو اُردو کا روپ دیا ہے اور "اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں" کے نام سے دارالمصنفین (شبلی اکاڈمی) اعظم گڑھ سے شائع ہوئی۔ یہ بات ذہن نشین رہنا چاہیے کہ اصل نام جناب مصنف نے "معارف العوارف" تجویز کیا تھا۔

ہندستان کی علمی تاریخ کے طور پر حکیم صاحب نے دو عربی کتابیں بھی یادگار چھوڑی ہیں۔ ایک "الہند فی عہد الاسلامی" دوسری "تہذیب الاخلاق" ان کے علاوہ اور بہت کچھ ہے لیکن اُردو دنیا میں حکیم صاحب کو "تذکرہ گل رعنا" نے شہرت عام و بقائے دوام بخشی۔ اس تذکرے میں البتہ دہلی اسکول کی برتری کا اظہار بین السطور میں ہے۔

خلاقِ عالم نے حکیم صاحب کو دو فرزندوں اور دو دختروں سے نوازا۔ بڑے فرزند مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی بڑے باکمال بزرگ تھے۔ چھوٹے صاحبزادے مولانا ابوالحسن علی ندوی (علی میاں صاحب) اسلامی دنیا کے مشاہیر میں ہیں۔ لڑکیوں کی اولاد بھی صاحب علم و فضل اور اپنے نقطۂ نظر سے دین کی خدمت میں منہمک رہی اور ہے۔

اس عالم بزرگ نے ۱۶ر جمادی الثانی ۱۳۴۱ھ / ۲ر فروری ۱۹۲۳ء کو جان جان آفریں کو سونپی۔ دائرہ شاہ علم اللہ کے خاندانی حظیرہ میں مٹی نصیب ہوئی۔

ندوہ کے تعلق سے سید سلیمان ندوی نے تحریر فرمایا،

"مولانا سید محمد علی صاحب ناظم تھے۔ ان کی نگاہِ انتخاب فوراً اس جوہر قابل پر پڑی۔ وہ دن اور ان کی وفات کا دن ہے کہ ندوہ ان کی خدمات سے کبھی محروم نہیں رہا۔ ندوہ پر کیا کیا انقلابات آئے، کتنے ارکان بدلے، کتنے منتظمین آئے اور کتنے گئے۔ کتنے معتمد عزل و نصب ہوئے کتنے فتنے اور حوادث پیدا ہوئے مگر ان تمام حالات و حوادث کے طوفان میں ثبات اور استقلال کی صرف ایک چٹان تھی جو اپنی جگہ پر تھی اور وہ مولانا عبدالحی مرحوم کی ذات تھی"۔ ۵۶

اسی حسن خدمت نے منصب کو ایک طرح موروثی بنا دیا، جس پر مولانا کے خلف اکبر ڈاکٹر عبدالعلی صاحب بھی فائز ہوئے اور مولانا علی میاں خلف اصغر بھی۔ آج علی میاں صاحب اور ندوہ ایک دوسرے کے مرادف بن گئے ہیں۔

اس مطالعے کے آغاز میں بربنائے کوتاہ نظری راقم کا خیال تھا کہ مرحوم کو تدریس کا زیادہ وقت نہیں ملا۔ مگر یہاں پہونچتے پہونچتے خود ان کے فرزند ارجمند مولانا علی میاں کی تحریر نظر سے گزری۔ آپ اس کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

"ادب، حدیث، قرآن اور طب کا درس دیتے تھے۔ ایک زمانے میں فلسفہ کی انتہائی کتابیں بھی پڑھائی تھیں ادب کا درس برسوں سے، طب کا درس چند سال سے چھوٹ گیا تھا مگر قرآن و حدیث کا درس وفات کے دن تک جاری رہا۔ زندگی کی بڑی آرزو یہ تھی کہ اسی شغل میں زندگی بسر ہو جائے۔ آخر میں سب چھوڑ چھاڑ کے بجائے بریلی میں قیام کرنے اور حدیث کے درس میں مشغول رہنے

کی تمنا تھی۔" [9]

اب قلم کا مسافر نگرام کا رخ کرتا ہے۔ اودھ کا یہ قصبہ کبھی علمی روایت شاندار رہا ہے۔ اس سرزمین نے ایسے علماء و افاضل کو جنم دیا ہے جن کی خدمات کی اپنی تاریخ ہے مگر ہم جن بزرگ کا ذکر کرنے جا رہے ہیں ان کا اسم گرامی ہے ——

مولانا عبدالرحمان ندوی (نگرامی)

آپ کی ولادت مسعود ۱۸۹۹ء/ ۱۷-۱۳۱۲ھ میں حافظ خلیل الرحمٰن کے گھر میں ہوئی۔ گھر پر ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۹۰۷ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل کئے گئے۔ ۱۹۱۵ء تک تعلیم حاصل کی۔

مولانا ان نوابغ میں سے تھے جن کا شعور کم عمری ہی میں بالغ ہو جاتا ہے اس لئے مولانا نے تقریر پر قدرت حاصل کر لی تھی مولانا کے استاد علامہ سید سلیمان ندوی بتاتے ہیں:

"اسی زمانے سے جب وہ مدرسہ میں بہت چھوٹے تھے اچھی، صاف اور سلجھی ہوئی تقریر کرتے تھے، چھوٹی سی عمر اور چھوٹے سے قد میں ان کی یہ ادا ایسی دلفریب تھی کہ وہ جلسوں میں تماشہ بن جاتے تھے"۔

آپ نے ۱۹۱۵ء تک ندوہ میں تحصیل علم کی۔ مولانا شبلی نعمانی کا انتقال کچھ دنوں پہلے ہو چکا تھا۔ ان کے رشید تلامذہ کی ایک جماعت ان کے پس ماندہ کاموں کو پورا کرنے پر مستعدی کے ساتھ آمادہ ہوئی۔ ارشد تلامذہ میں مولانا سید سلیمان ندوی سیرۃ النبیؐ کی تکمیل اور دارالمصنفین کی تاسیس کے لئے کچھ رفقاء کے ساتھ مشغول ہوئے۔ دوسری طرف شبلی کے قریبی رشتے کے بھائی اور شاگرد مولوی حمید الدین فراہی نے مولوی شبلی متکلم کو مدرسۃ الاصلاح سرائے میر (اعظم گڑھ) کی باگ ڈور سنبھالنے کے لئے تیار کیا جناب نگرامی صاحب بھی شریک کار ہوئے اور چار سال تک مسند درس آراستہ رکھی۔

پھر مولانا ابوالکلام آزاد کی طلب پر جناب نگرامی کلکتہ تشریف لے گئے۔ غایت سفر میں دو روایتیں ہیں۔ ڈاکٹر محمد یونس نگرامی کا بیان ہے کہ یہ طلبی جامع مسجد کلکتہ میں قائم کیے گئے مدرسۂ اسلامیہ کی صدر مدرسی کیلئے تھی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کا بیان ہے کہ مولانا آزاد ایک اخبار "پیام" نامی نکالنا چاہتے تھے اور نگرامی صاحب کو اس کے لئے لے گئے تھے۔[11]

علامہ سید سلیمان ندوی کی یادِ رفتگاں میں بھی عبدالرحمان نگرامی پر اچھا سوانحی و تاثراتی مضمون ہے مگر افسوس کہ اس وقت وہ پیش نظر نہیں ہے، اس لیے قیاس پر قناعت کرنا پڑ رہی ہے۔ اس کا قرینہ یہ ہے کہ دونوں روایتیں ادھوری ہیں اور مولانا آزاد اخبار کے اجراء اور مدرسے کی تاسیس کے مشترک مقصد کے لئے نگرامی صاحب کو لے گئے ہوں گے۔

ڈاکٹر نگرامی کلکتہ میں مولانا کی گرفتاری و اسیری کا ذکر نہیں کرتے، جناب دریابادی اسیری کا محض ذکر ہی نہیں کرتے۔ رہائی کا زمانہ تک بتاتے ہیں —— ملاحظہ ہو:-

"مولانا ابوالکلام نے ۱۹۲۰ء میں ایک اخبار پیام کے نام سے نکالنا چاہا اور اس کے لئے بہت موزوں ثابت ہوئے خلافت کے ہنگامۂ رستخیز میں پریس تک کا قائم رہ جانا ممکن تھا۔ پرچہ بند ہوا اور مولانا ابوالکلام کی طرح یہ نگرامی بھی اسیر قید فرنگ ہوئے اور اس درمیان میں طرح طرح کی مصیبتیں بہ خندہ پیشانی جھیلتے رہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ ایک نہیں دو دو تین تین وقت فاقے سے گزر گئے! اور اس سے کم درجے کے اتفاق تو بار بار پیش آئے۔ مجال کیا جو کبھی جبینِ ہمت و استقلال پر شکن آ جائے۔

قید سے چھوٹے (شروع ۱۹۲۲ء میں) تو اپنے پرانے دارالعلوم ندوہ میں مدرس ہو کر آئے۔ استادوں میں سب سے چھوٹے تھے، قد کے لحاظ سے بھی اور عمر کے لحاظ سے بھی، لیکن چند ہی روز میں بڑے بھی انھیں اپنا بڑا ماننے لگے۔ علم و فضل، صلاح و تقویٰ، تواضع و مسکنت، ایثار ہر لحاظ سے مستحق بھی اسی کے تھے، ہر وقت خندہ رو رہتے، ہر ایک کی خدمت کر کے خوش ہوتے، اپنے ندوی ہونے پر فخر کرتے، اور اس سے زیادہ خود ندوہ ان پر فخر کرتا۔ اتنا بے لوث، اتنا بے شر، دنیوی آلودگیوں سے اتنا بلند و برتر نمونۂ انسانیت کمتر ہی دیکھنے میں آیا ہے۔ بے ہمہ و باہمہ کی عملی تفسیر"۔[12]

کلکتہ کا تعلق منقطع ہوا تو نگرامی صاحب اپنی مادر درسگاہ ندوہ واپس آ گئے۔ ڈاکٹر یونس نگرامی کا کہنا ہے کہ ایسا سید سلیمان ندوی کے اصرار پر ہوا تھا۔[13]

حیاتِ مستعار کے آخری سال سے کچھ مہینے پہلے مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولوی ظفرالملک علوی کے ساتھ ہفت روزہ "سچ" کا اجرا کیا اخبار نیم سیاسی، نیم مذہبی تھا۔ مذہبی عنوانات نگرامی صاحب ہی کے ذمے رہتے۔ اس اخبار سے نگرامی صاحب کے تعلق کے بارے میں سید سلیمان ندوی کا کہنا ہے:

"عزیز مرحوم کے اصلاحی خیالات کا سب سے بڑا مظہر "سچ" لکھنؤ تھا جس کے وہ شریک انشا، تھے دو سال سے ہر ہفتہ وہ کسی نہ کسی مفید عنوان پر نہایت سادہ عبارت اور پر تاثیر انداز میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ چوں کہ مولانا نگرامی کا اصل ذوق اصلاحی و تجدیدی تھا، اس لیے علامہ ابن تیمیہ کی تصانیف کے بے حد شائق تھے۔ مولانا نگرامی انجمن تبلیغ اسلام نگرام کے بھی صدر تھے اور اس کے کاموں میں بڑی دل سوزی سے حصہ لیتے تھے۔" [14]

"سچ" میں جو کچھ لکھا اس کے علاوہ عربی میں "قاموس الحکم"، "نورالحق" اور "جغرافیۃ الہند" آپ سے یادگار ہیں۔ ان کے علاوہ عربی میں متفرقات کی معقول مقدار رہے۔

مولانا عبدالرحمان صاحب کا مزاج ہر چند علمی و دینی تھا مگر کبھی کبھی خدمت دین کے لیے سیاست کا مزہ چکھ لیتے تھے۔ ۱۹۱۸ء میں آریہ سماجیوں نے شدھی کی تحریک چلائی۔ مولانا شبلی نعمانی نے "انجمن خدام الدین" بنا کے دفاعی کارروائی کی۔ نگرامی صاحب بھی اس مہم میں شریک رہے۔ کلکتے میں خلافت کمیٹی کے صدر رہے۔ وہاں خلافت کانفرنس ہوئی تو مجلس استقبالیہ کی سربراہی کی۔

نگرامی صاحب گٹھیا کے پرانے مریض تھے۔ پھر جگر و معدہ خراب ہوئے۔ دارالعلوم سے رخصت لے کر اپنے عزیز حکیم محمد نعیم صاحب کے پاس گئے۔ اچانک پاؤں میں سرطانی پھوڑا ہوا۔ عمل جراحی کیا گیا جو بظاہر کامیاب رہا، لیکن رات جیسے تیسے گزری۔ نماز صبح کی حالت میں طائرِ جان چھوٹ گیا۔ یہ ۱۹۲۶ء کی چھٹی مارچ تھی (شعبان ۱۳۴۴ھ)

اس جوانا مرگ کا ملت نے جی کھول کے ماتم کیا۔ ۳۷ سال کی عمر میں یہ منزلت و مقبولیت خداداد بات تھی۔ (باقی آئندہ)

حواشی:

1. سوانح علامہ فضل حق نوشتہ محمد عبدالشاہد خاں شروانی مشمولہ باغی ہندوستان ترجمہ الثورۃ الہندیہ ص۱۳۸ بحوالہ تذکرہ غوثیہ ص۱۵
2. باغی ہندوستان ترجمہ عبدالشاہد خاں شروانی ص۵۲-۱۵۱
3. ایضاً ص۲۴۰-۲۴۱، 4. ایضاً ص۲۹۸
5. ایضاً ص۲۵۳-۵۶ 6. ایضاً ص۲۲۵-۲۶
7. حکیم سید فخرالدین خیالی: حیات و کارنامے۔ ڈاکٹر حافظ ہارون رشید صدیقی ص۱۹ 8. ایضاً ص۲۳
9. ایضاً ص۲۶، بحوالہ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ بابت فروری ۱۹۲۳ء
10. تعارف و تذکرہ مصنف نوشتہ ابوالحسن علی ندوی۔ اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں، حاشیہ ۲ ترجمہ ابوالعرفان ندوی ص۸
11. ہندوستان میں عربی علوم و فنون کے ممتاز علما اور ان کی علمی خدمات، ڈاکٹر محمد یونس نگرامی ص۱۱
12. معاصرین۔ مولانا عبدالماجد دریابادی
13. ہندوستان میں عربی علوم و فنون ص۲۲۱
14. ایضاً ص۲۲۲ بحوالہ یادرفتگاں۔ سید سلیمان ندوی ص۹۶-۹۷

زندگی

کچھ سمجھ میں آ نہیں سکتا حسابِ زندگی
پڑھ رہا ہر شخص ہے لیکن کتابِ زندگی
کیا بھروسہ ہو بھلا انساں کو اپنی زیست کا
ٹوٹتا چشم زدن میں ہے حبابِ زندگی

ہے نفس کی آمد و شد پر قیامِ زندگی
کس قدر کمزور ہے انساں کا دامِ زندگی
بادۂ غفلت سے ہو جاتا بشر مخمور ہے
جبکہ دم بھر میں چھلک جاتا ہے جامِ زندگی

امیر علی ... صدیقی

دل کا دروازہ کھول دیتے تھے
اس کے سب نام کتنے اچھے تھے
مرنے والا یہ سوچتا ہوگا
ہم کرائے کے گھر میں رہتے تھے
جلوۂ رنگ بھی تھا اک آواز
فلسفے پتّیوں پہ لکھے تھے
سب کے منہ میں زبان تھی لیکن
بولنے کے لئے ترستے تھے
رات یادوں کی دُھند کے اس پار
دل کے دیوار و در چمکتے تھے
وہ بھی کیا ماہ و سال تھے جب ہم
روز اک آئینہ بدلتے تھے
شاخ سے شاخ جل رہی تھی شفیق
پیڑ بھی دل میں درد رکھتے تھے

شفیق طاہری
محلہ بازار شاہ، قصبہ میر انپور کٹرہ
شاہجہاں پور

□□

پھر رہی سوزِ دُرونی پھر رہی باتیں تمام
یاد کیوں آنے لگیں بیتی ملاقاتیں تمام
آتشِ گُل سے نہ جل جائے کہیں گلشن کوئی
بس اسی اُلجھن میں کٹتی ہیں مری راتیں تمام
حال و ماضی میں ذرا سا فرق اب باقی نہیں
ہے وہی صحرا نشینی اور وہی گھاتیں تمام
تنگیٔ داماں کا شکوہ خود مجھے ہونے لگا
ہوگئیں مقبول جب میری مناجاتیں تمام
ہم تو خاموشی سے بیٹھے تھے تعجب ہے مگر
ہوگئیں مشہور کیسے آپ کی باتیں تمام
خود ہی کب چاہا وصیہ نے کہ ملتا کچھ صلہ
درد نے بخشی تو ہیں اس دل کو سوغاتیں تمام

فاطمہ وصیہ جائسی
۳۰۶ ساکیت (؟) ...
لکھنؤ

□□

پردے نہیں، چراغ نہیں، پاسباں نہیں
یہ سب جہاں پہ ہو وہ ہمارا مکاں نہیں
ہوتا نہیں ہے ختم تمنّا کا سلسلہ
منزل جسے ملی وہ مرا کارواں نہیں
ہر لفظ جس کا شمع کی مانند لَو نہ دے
وہ داستانِ دردِ مری داستاں نہیں
روشن کسی نظر میں نہیں شمعِ التفات
تم مہرباں نہیں تو کوئی مہرباں نہیں
تقسیم تیغ کرتی ہے جینے کا حوصلہ
چشمک جو برق سے نہ کرے آشیاں نہیں
اس شب جو ہم نے مقتل و زنداں کا فاصلہ
طے کرلیا تو اور کوئی امتحاں نہیں
بیٹھے ہیں افتخارؔ خدا کی زمین پر
جز آسمان سر پہ کوئی سائباں نہیں

——— افتخار اعظمی
۹- سونو رام چالی، دنو پاڑہ
مرول ناکہ - بمبئی - ۹

ماضی کو بھول آئے ہم صورتِ حال کے سبب
چہرہ غبار ہوگیا گردِ ملال کے سبب
روز طلوعِ مہر سے پھوٹی اُمید کی کرن
روز ہی آئی شامِ غم اس کے زوال کے سبب
ربِّ کریم کو بھی کیا میری دُعا سے بیر تھا
ہجر نصیب کردیا شوقِ وصال کے سبب
یہ بھی ہوا ہے بارہا بھول گئے ہیں راستا
چھوٹ گئی ہیں منزلیں اس کے خیال کے سبب
اس نے کچھ اس ادا سے آج پوچھ لیا مرا مزاج
اشک پلک تک آگئے پرسشِ حال کے سبب

——— سیدہ شانِ معراج
تارین گلی۔ مقابل موہن زنگ ہوم
شاہجہاں پور

وقار ناصری
شیش محل۔ حسین آباد۔ لکھنؤ

اودھ کا انصرام تاریخ کے آئینے میں

۱۷۲۲ء سے ۱۸۵۶ء

ہندوستان کی قدیم روایت و ثقافت کا وارث تاریخ میں تہذیب و نفاست کا وطن، صوبۂ اودھ اپنے محل و وقوع اور اپنے وافر وسائل کی بدولت ہر دور میں ایک مخصوص کردار کا مالک رہا ہے۔ اس کا دارالحکومت بنگلہ (فیض آباد) ہو یا لکھنؤ صدیوں سے اس صوبہ نے ملک کی سیاست میں اپنی حیثیت برقرار رکھی ہے۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد جب مغلیہ سلطنت نے سمٹنا اور صوبجات نے پھیلنا شروع کیا اس وقت اس صوبہ نے بھی اپنے شہپروں میں اڑانیں بھر کر آسمان چھونے کی کوشش کی۔ اس کی یہ کوشش گوکہ ایک مختصر مدت تک آسمانوں کو محیط رہی لیکن اس مختصر وقفہ میں اس کی ہر آرزو کی اس طرح تکمیل ہوئی کہ خواب حقیقت بن گیے۔ اٹھارویں صدی کے نصف آخر سے انیسویں صدی کے نصف تک تقریباً سو برس تک یہ صوبہ خوشحالی و فراوانی کی وہ مثال رہا جس کے لئے صدیاں درکار ہوتی ہیں۔

سعادت خاں برہان الملک کا صوبہ دار ہونا گویا اودھ کے سر پر سایۂ ہما تھا۔ روز بروز اس صوبہ کا اقبال بلند ہوتا گیا بنگلہ (فیض آباد) میں سارے جہاں کی رونق سمٹ آئی۔ برہان الملک کی وفات کے بعد صفدر جنگ اور صفدر جنگ کے بعد شجاع الدولہ نے اس کو وہ شان و شوکت عطا کی کہ یہ فیض آباد رشک اصفہان و شیراز بن گیا۔ شجاع الدولہ کے جانشیں نواب آصف الدولہ نے دارالحکومت فیض آباد سے لکھنؤ منتقل کر دیا۔ دارالحکومت بنتے ہی لکھنؤ کے ذرے ذرے سے شان و شوکت ٹپکنے لگی۔ اور ایک ایسی تہذیب محل سراؤں سے بازاروں تک گلی کوچوں سے ایوانوں تک پروان چڑھی جس نے اپنی نفاست، آداب و تمیز اور وضع داری سے لکھنؤ کو مرقع تہذیب بنا دیا۔ نواب وزیر آصف الدولہ سے نواب واجد علی شاہ کے عہد تک آتے آتے اس تہذیب نے اپنے نقش و نگار اتنے پختہ کر لیے تھے کہ آج تک مٹتے مٹتے بھی ان کے نشانات کسی نہ کسی صورت سے اس شہر کے اطراف میں نمایاں ہیں۔

ہر چند کہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ ملک میں خانہ جنگی تباہی اور بربادی کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ مرہٹہ، ابدالی، جاٹ اور سکھ افواج اقتدار کی جنگ میں مصروف تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کے مختلف صوبوں پر اپنا تسلط جمانا شروع کر دیا تھا اور بکسر کی جنگ (۱۷۶۴ء) کے بعد اودھ ہی ان کی سازشوں کا اکھاڑہ بن چکا تھا اور شجاع الدولہ کو مجبوراً معاہدہ کرنا پڑا تھا۔ ان سب کے باوجود بھی نوابین اودھ نے ہمیشہ رعایا کی فلاح و بہبود کی کوشش کی حتی المقدور اپنے صوبے کے نظم و نسق کو سنبھالا اور رفاہی کاموں کی طرف توجہ کی۔ نوابین کے علاوہ ان کی بیگمات اور منصب داروں نے بھی اپنی بساط بھر خدمت خلق میں جو کار نمایاں انجام دیے ہیں وہ آج بھی تاریخ میں محفوظ ہیں۔ نواب وزیر سے بادشاہ اور بادشاہ سے قیدی ہونے تک انگریزوں نے جس طرح اس صوبہ کا امن و سکون غارت کیا اور یہاں کے نوابین کو بدنام کرنے کے لیے جو ہتھکنڈے اپنائے اس کو دیکھتے ہوئے یہ رفاہی اقدامات اس بات کا ثبوت ہیں کہ اگر یہاں کے نوابین کو آزادانہ حکومت کا اختیار مل جاتا تو اس صوبہ کا نظام مثالی ہوتا۔

سعادت خاں برہان الملک نے اودھ کی صوبہ داری کو اس حسن انتظام سے چلایا کہ پہلے ہی سال اس کی آمدنی ستر لاکھ سے بڑھ کر ایک کروڑ سات لاکھ ہو گئی۔ انھوں نے بنارس، جونپور، غازی پور، اعظم گڈھ، بلیا کی سرکاروں اور مرزاپور کے مشرقی حصہ کو شامل کر کے صوبۂ اودھ کی سرحدوں میں توسیع کی ورنہ مغلیہ عہد میں یہ صوبہ شمال مشرق میں دریائے گنڈک سے جنوب و مغرب میں گنگا تک اور شمال میں نیپال کی ترائی سے جنوب میں سئی ندی تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کی لمبائی سرکار گورکھپور سے قنوج تک ۱۳۵ کوس اور چوڑائی جنوبی پہاڑیوں سے سدھ پور سرحد صوبۂ الہ آباد تک ۱۱۵ کوس تھی۔ (آئین اکبری) بعد میں فرخ سیر کے عہد میں مرادآباد کے قریب چند علاقے بھی اودھ میں شامل کر دیے گئے تھے۔

مؤرخین کی نظر میں سترھویں صدی کے ربع آخر سے اودھ کا انتظام کسی صوبہ دار نے برہان الملک سے بہتر نہیں کیا۔

برہان الملک کی وفات کے بعد ان کے جانشین صفدر جنگ نے اودھ کو منظم کرنے میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ صفدر جنگ نے اجودھیا سے دو تین کوس کے فاصلے پر اپنے قیام کے لئے کچی دیواریں کھنچوا کر بنگلہ بنایا تھا جو اسی نام سے مشہور بھی رہا۔ اسے فیض آباد کا نام عہد صفدر جنگ کی دین ہے۔ یہی فیض آباد بعد میں اودھ کی راجدھانی بنا۔

مولوی عبدالحلیم شرر، منشی فیض بخش کے حوالے سے گذشتہ لکھنؤ میں فیض آباد کے بارے میں لکھتے ہیں

"جب نواب صفدر جنگ کا زمانہ شروع ہوا تو یہ بستی فیض آباد مشہور ہوئی یہ ہے بنیاد شہر فیض آباد کی جس نے اپنے بننے اور بگڑنے کی سرعت میں لکھنؤ کو بھی مات کر دیا۔ اب ان دنوں اس کچی چار دیواری کے گرد اکثر مغل سرداران فوج نے اپنی دلچسپی کے لئے باغ اور پر فضا فرحت بخش نزہت گاہیں بنائیں اور شہر کی رونق ترقی کرنے لگی۔ اس کچے احاطے کا پھاٹک دلی دروازہ کہلاتا تھا جو مغرب کی طرف تھا۔ اس کے باہر آغا مرام کے بیٹوں نے ایک شاندار بازار بنوایا اور اسی کے سلسلے میں رہنے کے لیے مکانات بھی تعمیر کرائے۔ اسی طرح اسماعیل خاں رسالدار نے بھی ایک بازار بنوایا اور چار دیواری کے اندر خواجہ سراؤں اور مختلف فوجی لوگوں کے بھی بہت سے مکانات تیار ہو گیے۔"

لکھنؤ جس کو برہان الملک نے بزور شمشیر شیوخ لکھنؤ سے حاصل کیا تھا صفدر جنگ نے اس کی ترقی کی طرف بھی توجہ دی۔ گذشتہ لکھنؤ میں شرر تحریر کرتے ہیں۔

"شہر سے تین میل کی مسافت پر انھوں نے قلعہ جلال آباد تعمیر کرایا اور مچھی بھون کے اندر پنج محلے کی جو قدیم عمارت تھی اسے بھی شیخ زادوں سے لیا اور اسکے عوض میں دو گاؤں میں سات سو بیگھہ زمین شیخ زادوں کو رہنے اور بسنے کے لئے عطا کی۔ جس سے اگرچہ شیخ زادوں پر ظلم ہوا مگر لکھنؤ کی آبادی کو وسعت اور ترقی حاصل ہوئی۔ مچھی بھون کو صفدر جنگ نے از سر نو تعمیر کرایا اور اسے بہت درست کیا"۔

صفدر جنگ کے نائب راجہ نول رائے نے مچھی بھون کے سامنے دریائے گومتی پر ایک پل تعمیر کرانے کا ارادہ کیا۔ پایوں کی بنیاد ڈالنے کے لیے گہرے کنویں کھدوائے لیکن پائے بننا شروع نہیں ہوئے تھے کہ اسے صفدر جنگ کی طلب پر احمد خاں بنگش کے مقابلہ کے لیے جانا پڑا۔ جنگ میں وہ مارا گیا اور پل کا کام ناتمام رہ گیا۔

شجاع الدولہ نے بھی لکھنؤ اور فیض آباد کی آبادکاری کے لیے بہت کچھ کیا۔ بکسر کی جنگ (۱۷۶۴ء) میں شکست کھانے کے بعد شجاع الدولہ نے فیض آباد واپس آکر ریاست کے انتظام اور فوج کی درستی پر پوری توجہ دی۔ شجاع الدولہ کی بڑھتی ہوئی طاقت نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو مشتبہ کر دیا لہٰذا پچھلے معاہدے میں ترمیم کی گئی اور نیا معاہدہ بمقام بنارس ۹ر نومبر ۱۷۶۸ء کو ہوا جس کے ذریعہ شجاع الدولہ پر پابندی لگائی گئی کہ باقاعدہ اور بے قاعدہ فوج کی تعداد پینتیس ہزار سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے۔

شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد کے متعلق ڈاکٹر صفدر حسین لکھنؤ کی تہذیبی میراث میں رقم طراز ہیں۔

"شجاع الدولہ کو عمارت بنانے اور باغات لگانے کا بھی بڑا شوق تھا۔ انھوں نے پانڈیچری سے ایک فرانسیسی معمار بلایا تھا جس نے اینٹوں کے ایک خوبصورت محل کا نمونہ بنایا تھا..... اس کے کچھ زمانے بعد انھوں نے بنگال گورنمنٹ کی معرفت سوئزرلینڈ کے ایک انجینیر میجر پولو کی خدمات حاصل کیں۔ اور اس کی نگرانی میں انھوں نے برہان الملک کے کچے قلعے کی دیواریں دوبارہ تعمیر کرائیں اور ایک محل اور دو مٹی کے قلعے بنوائے۔ تمام عمارتوں اور محلوں کو رنگین نقش و نگار سے سجایا قلعہ کے ایک طرف دریائے گھاگھرا واقع تھا باقی تین اطراف دو دو میل تک میدان چھوڑ کر چاروں طرف خندق بنوا دی۔ اس میدان کے بیچ میں ان کے رشتہ داروں، فوجی افسروں اور عملہ کے ملازمین نے مکانات اور دیوان خانے تعمیر کرائے تھے۔ یہاں چونکہ ہر نسل اور ہر قوم کے سپاہیوں، شہریوں اور تاجروں کے آنے کا تانتا بندھ گیا اس لئے بہت جلد یہ وسیع زمین تنگ نظر آنے لگی تھی..... کچھ عرصے بعد تمام شہر کے چاروں طرف ایک فصیل بنوا دی گئی جس کی چوڑائی درمیان میں دس گز اور منڈیر پر پانچ گز ہوگی۔ شجاع الدو نے شہر کی زیبائش کے خیال سے ترپولیا اور چوک بازار بھی بنایا۔ یہ بازار قلعہ کے جنوبی دروازے سے الہ آباد کے ناکے تک چلا گیا تھا اور چوڑائی اتنی تھی کہ دس گاڑیاں بیک وقت گذر سکتی تھیں۔"

حصار شہر کے اندر ہی چار باغ جو ایرانی انداز پر لگائے گئے تھے۔ ان میں موتی باغ چوک بازار کے وسط میں واقع تھا۔ لال باغ جو رقبہ میں تمام باغوں سے بڑا تھا اپنے پھولوں کے تنوع اور خوبصورتی کی وجہ سے تمام صوبے میں مشہور تھا۔ یہ اتنا دلکش باغ تھا کہ جب شاہ عالم الٰہ آباد سے فیض آباد آئے تو انھوں نے اسی باغ میں قیام کیا۔ ان باغوں کے علاوہ آصف باغ اور بلند باغ لکھنؤ کی سمت حصارِ شہر کے اندر ہی تھے۔ انگوری باغ محل میں واقع تھا اور اس میں قلعہ کا ایک چوتھائی حصہ آگیا تھا۔ ان باغات کی دیکھ بھال کے لیے ایک ہزار مالی ملازم تھے۔

شرر گذشتہ لکھنؤ میں لکھتے ہیں۔

"نواب شجاع الدولہ کو شہر کی درستی کا اس قدر شوق تھا کہ صبح و شام سوار ہو کے سڑکوں اور مکانوں کا معائنہ کرتے۔ مزدور پھاوڑے اور کدالیں لیے ہوئے ساتھ ہوتے جہاں کسی مکان کو ٹیڑھا اور اپنی حد سے بڑھا ہوا پاتے یا کسی دوکاندار کو دیکھتے کہ اس نے سڑک کی زمین بالشت بھر دبالی ہے فوراً کھدوا کر کے برابر سیدھا کرا دیتے۔"

میر حسن دہلوی ۱۷۸۶ء-۱۷۴۲ء اس وقت فیض آباد میں موجود تھے اپنی مثنوی گلزار ارم میں وہ فیض آباد کا اپنے مخصوص شاعرانہ انداز میں جو نقشہ کھینچتے ہیں اس سے اس وقت کی طرز معاشرت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

نہیں بنگلہ یہ ہے جنت کا بنگلا   ہر اک بستی ہے جس کے آگے جنگلا
یہ فیض آباد یاں جس نے بنایا   بہشت اس کے عوض دیجیو خدایا
جہاں کو کر گیا آباد و معمور
شجاع الدولہ مرحوم و مغفور

محمد فیض بخش نے فیض آباد کی تجارتی اور اشیائے خورد و نوش کی سرگرمیوں کا چشم دید واقعہ بیان کیا ہے۔ اس کے بقول یہ بازار ہر قسم کی تجارت کا مرکز تھا اور خاص طور سے چوک کا بازار جہاں توران، فارس، چین اور یورپ کے تجار خرید و فروخت میں منہمک نظر آتے تھے۔ وہ اپنے ممالک کی اشیاء یہاں لاتے اور اپنی خواہش کے مطابق منافع کماتے تھے۔

نواب آصف الدولہ نے فیض آباد سے ہجرت کر کے ۱۱۸۸ ہجری میں لکھنؤ کو اپنا دارالحکومت اور ویرانے میں وہ شہر بسایا کہ جس کی تہذیب کا آوازہ چار دانگ عالم میں بلند ہوا۔ آصف الدولہ کی فیاضی، رعایا پروری اور عمارات بنوانے کے اتنے تذکرے کتب میں موجود ہیں کہ ان کی تفصیل ممکن نہیں دولت خانہ، رومی دروازہ، باغ آصف الدولہ، مسجد آصفی، بڑا امام باڑہ، صوفی بیبی اور عیش باغ وغیرہ عمارتیں بنوائیں۔ دیہات میں قیام کے لیے بی بی پور اور چنہٹ میں دو کوٹھیاں بنوائیں اور ان کے دور حکومت میں بہت سے محلے بھی لکھنؤ میں آباد ہوئے۔

بڑا امام باڑہ جو اپنی تعمیر کے لحاظ سے دنیا میں اپنے طرز کی تنہا عمارت ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کی تعمیر کا سبب بھی آصف الدولہ کی رعایا پروری کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔ ۱۷۸۴ء میں جب اودھ میں قحط پڑ گیا اور ہر طرف کہرام مچ گیا تو نواب آصف الدولہ نے اہل لکھنؤ کی امداد کے لئے اس امام باڑے کی تعمیر شروع کرادی۔ چنانچہ رات کو شرفاء لکھنؤ کام کرتے جس کو دن میں مزدور گرا دیتے اور دوبارہ بناتے اس طرح ۱۷۹۰ء میں اس کی تعمیر مکمل ہوئی۔

اس کے علاوہ نواب آصف الدولہ نے عراق میں زواروں کے قیام کے لیے ایک اعلیٰ کارواں سرا بنوائی۔ دریائے فرات سے نجف اشرف تک نہر نکلوائی۔

تجارتی اور زرعی حیثیت سے اودھ کا صوبہ جس طرح برہان الملک، صفدر جنگ اور شجاع الدولہ کے عہد میں ترقی پر تھا آصف الدولہ کے زمانے میں بھی اس میں ایسی کوئی خاص تنزلی نہیں ہوئی کہ جسے زوال کہا جائے۔ رعایا خوشحال اور لوگ آسودہ حال تھے۔ دریا آباد اور خیر آباد کے منقش کپڑے اور چھینٹ مشہور تھی۔ جونپور اونی اور ریشمی کپڑوں کی منڈی تھا۔ نیل، عطریات اور تیل کشی کا بھی کام ہوتا تھا۔ گورکھپور، مرزا پور اور فیض آباد کپڑے، میوہ جات اور روئی کے تجارت کے اہم مقام تھے۔ آصف الدولہ کے زمانے میں لکھنؤ میں زردوزی کا عمدہ کام ہونے لگا تھا اور مٹی کے کھلونوں کی دلفریبیاں بڑھ گئیں تھیں۔ مگر ایسٹ انڈیا کی دخل اندازی کی وجہ سے اقتصادی نظام میں کچھ کچھ ابتری پیدا ہو چکی تھی۔ تجارت پر ٹیکس کی وجہ سے مقامی تاجر خرید و فروخت میں وہ توازن کھو بیٹھے تھے جو کمپنی کے اقتدار سے پہلے تھا۔

آصف الدولہ کے بعد وزیر علی آصف جاہ سریر آرائے سلطنت ہوئے کہا جاتا ہے کہ یہ آصف الدولہ کے پسر صلبی نہ تھے مگر نواب نے ان کو اپنا فرزند ثابت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں فرمایا اور یہ ہی نہیں کہ وزیر علی کی شادی پر بیس لاکھ روپیہ خرچ کیا بلکہ برات کے جلوس میں نوشہ کے تخت رواں کے آگے عام لوگوں کی طرح پا پیادہ چلے۔ جب سوار ہونے کی درخواست

کی گئی تو فرمایا میری خواہش ہے کہ میں ملازموں کی طرح وزیر علی کی سواری کے آگے چلوں۔ فوج اور عوام میں وزیر علی کی مقبولیت انگریزوں کو پسند نہیں آئی۔ افغان فوج کی بھرتی نے اور ستم ڈھایا۔ لہٰذا حیلوں اور بہانوں سے بی بی پور کوٹھی میں طلب کر کے قید کر لیا اور بنارس لے جایا گیا۔ نواب جو انگریزوں کا سخت دشمن تھا اس نے بھی حوصلہ نہیں ہارا فریڈرک ولیم چیری اور دوسرے دو انگریزوں کو جان سے مار کے جنگلوں میں نکل گیا۔ انگریزوں کی فوجیں تعاقب میں لگی رہیں لیکن وزیر علی ہاتھ نہ آیا۔ آخر انہوں کی دغا رنگ لائی اور وزیر علی کو گرفتار کر کے کلکتہ بھیج دیا گیا۔ جہاں سترہ سال تین ماہ اور چار روز ایک قیدی کی زندگی گذار کر ۳۶ برس کے سن میں ۱۸۱۷ء میں وزیر علی کا بعارضہ تپ انتقال ہوا اس بدقسمت نواب نے اودھ پر صرف چار ماہ ۵ یوم حکومت کی۔

وزیر علی کی اسیری کے بعد نواب سعادت علی خاں مسند نشیں ہوئے چونکہ نواب انگریزوں کی عنایت سے صاحب حکومت ہوئے تھے اس لئے انگریزوں نے اپنی کارگذاری کے معاوضہ میں مصارف فوج پورا کرنے کے حیلہ سے نصف ملک اودھ کہ جس کی آمدنی ایک کروڑ ۳۵ لاکھ روپئے سالانہ تھی اپنے قبضہ میں کر لیا نواب نے راضی بہ رضا ہو کر سولہ برس تک کمال دوراندیشی، تدبر، کفایت شعاری اور تندہی سے حکومت کی۔ ۱۱ جولائی ۱۸۱۴ء کو یخنی میں زہر دے کر ان کا خاتمہ کر دیا گیا بروقت انتقال انھوں نے خزانہ میں سترہ کروڑ روپئے بقول دیگر چودہ کروڑ روپئے چھوڑے انھوں نے قیصر باغ اور دلکشا کے درمیان بہت سی عمارتیں تعمیر کرائیں اور بہت سے محلے بھی ان کے دور حکومت میں آباد ہوئے۔ جنرل مارٹن کی کوٹھی کی خریداری، لال بارہ دری، دلکشا، حیات بخش، خورشید منزل، چوپڑ کا اصطبل انہیں کے ذوق تعمیر کی یادگاریں ہیں۔ تجارتی مرکز کی حیثیت سے سعادت گنج، رکاب گنج، جنگلی گنج، مقبول گنج، مولوی گنج، گولہ گنج، رستوگی ٹولہ رفاہ عامہ کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔

اودھ کے بادشاہ اول کہلانے والے نواب غازی الدین حیدر سعادت علی خاں کے بعد صوبہ دار نواب وزیر ہوئے مگر انگریزوں کے بہکاوے میں آکر ۱۹ اکتوبر ۱۸۱۹ء کو انھوں نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور دلی دربار سے اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا برائے نام رشتہ بھی توڑ لیا۔ بادشاہت کی یادگار میں شاہ زمن غازی الدین حیدر نے دو محلے حیدر آباد اور بادشاہ نگر آباد کیے۔ اس کے علاوہ متعدد عمارتیں تعمیر کرائیں جن میں روضۂ شاہ نجف، شاہ منزل، مبارک منزل، ولایتی باغ، قدم رسول، مقبرۂ سعادت علی خاں وغیرہ ہیں۔ غازی الدین حیدر کے عہد میں لکھنؤ کی علمی سرگرمیوں میں تیزی آئی۔ چھاپا خانوں کا رواج ہوا۔ کتابوں کی اشاعت ہوئی جس میں تاج اللغات بھی ہے۔ خود بادشاہ نے دو سال کی مسلسل محنت اور جانفشانی سے علم لغت پر ایک مبسوط کتاب ہفت قلزم ترتیب دی۔

شاہ نصیر الدین حیدر نے اپنے عہد حکومت میں رعایا کی بہبودی اور ریاست کی ترقی کے لیے بہت سے رفاہی اقدامات کیے۔ ۱۹ر اکتوبر ۱۸۲۷ء سے ۷ر جولائی ۱۸۳۷ء تک وہ اودھ کے حکمراں رہے۔ ان کا سب سے بڑا منصوبہ گنگا سے گومتی تک نہر بنوانا تھا۔ جس کے ذریعہ دونوں دریا مل کر ریاست کو پانی کا ذخیرہ دیتے جس سے زراعت کو ترقی ہوتی اور گنگا سے فاصلہ پر رہنے والوں کو گنگا جل بھی مہیا ہو جاتا۔ مگر بدقسمتی سے ان کا یہ منصوبہ پورا نہ ہو سکا۔ انگریز جو اودھ کو ہتھیانے کی فکر میں تھے وہ کب اس کارنامے کو برداشت کر سکتے تھے۔ چنانچہ جب لاکھوں روپئے کے خرچ سے تقریباً ۵۰ میل کھدائی ہو چکی تو ریذیڈنٹ نے مداخلت کی اور بیان دیا "چونکہ گنگا کمپنی سے ہو کر گذرتی ہے لہٰذا سارا سرحدی علاقہ کمپنی کا ہے۔" اس طرح یہ کام پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔

اودھ کی لوٹ میں برڈ لکھتے ہیں:۔

"اگر ریذیڈنٹ کی بات سچ بھی تھی تو اس کا فریضہ تھا کہ کام شروع ہونے سے پہلے ہی ساری کیفیت سے بادشاہ کو آگاہ کر دیتا لیکن ریزیڈنٹ نے ایسا نہیں کیا اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ریزیڈنٹ کا مقصد ہی یہ تھا کہ بادشاہ کے اقتصادی ذرائع کو بے دست و پا کر دے جس سے بادشاہ پوری طرح ان کے بس میں ہو جائے اور ملک کی ترقی رک جائے۔"

رعایا کے علاج و معالجہ کے خیال سے نصیر الدین حیدر نے دو شفاخانے قائم کیے۔ ایک انگریزی دوسرا یونانی، ان کے لیے کمپنی کے نوٹ خریدے اور آج بھی یہ دونوں اسپتال قائم ہیں اور خدمت خلق میں معروف ہیں۔ اسی طرح غریبوں کے لئے ایک محتاج خانہ بھی قائم کیا۔ رصد خانۂ سلطانی کی داغ بیل پڑی۔ ایک انگریزی درس گاہ کی بنا ہوئی اور اس کے طلباء کے وظائف کے لیے تین ہزار ماہوار کی گراں قدر رقم منظور ہوئی۔ ڈالی گنج کی کربلا

کی تعمیر ہوئی۔ کوڑھیوں کے لیے ایک صحت خانہ کی بنیاد بادشاہ نگر کے قریب ڈالی گئی۔ دو محلے گنیش گنج اور چاند گنج آباد کئے۔

شاہ نصیر الدین حیدر کی وفات کے بعد ان کی سوتیلی ماں بادشاہ بیگم نے مرزا فریدوں بخت عرف منا جان کو کمپنی کی مرضی کے خلاف لال بارہ دری میں تخت پر بٹھادیا اور ریزیڈنٹ کرنل لو پر دباؤ ڈالا کہ وہ انھیں بادشاہ تسلیم کریں اس پر بارہ دری میں بڑی خوں ریزی ہوئی۔ بادشاہ بیگم اور منا جان مغلوب کر کے قلعہ چنار گڑھ بھیج دئے گئے اور کمپنی نے نصیر الدین حیدر کے چچا نواب نصیر الدولہ محمد علی خاں کو اپنی شرائط پر تخت حکومت سونپ دیا۔ اب نواب محمد علی، محمد علی شاہ ہوئے۔ بر وقت تخت نشینی آپ کی عمر تریسٹھ سال تھی لیکن باوجود کبر سنی اور معذوری حکومت کا انتظام بڑی جاں فشانی اور ہوشمندی سے کیا۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ امام باڑہ حسین آباد کی تعمیر ہے اس کے علاوہ حسین آباد میں بازار، عجائب گھر، تالاب وغیرہ بنوائے ست کھنڈے کی تعمیر شروع کی مگر چار ہی کھنڈ بن کر ختم ہوئے تھے کہ ۱۷ مئی ۱۸۴۲ء کو بادشاہ خود ختم ہو گئے۔ آصف الدولہ کے امام باڑے سے حسین آباد تک سڑک بھی ان کی دین ہے۔ امام باڑہ حسین آباد کے لئے ۳۶ لاکھ روپیہ انگریزوں کو دے کر ایک ٹرسٹ قائم کیا تاکہ امام باڑے اور ایام عزا کے اخراجات پورے ہوتے رہیں۔

انیس و دبیر کے ہم عصر مشہور مرثیہ گو شاعر چھنو لال دلگیر نے حسین آباد اور اس کے بازار، تالاب وغیرہ کی خوب تعریف اپنی منظومات میں کی ہے۔ اور اس عہد کی ایک جیتی جاگتی تصویر پیش کی ہے۔

تا قیامت بہ فضل رب عباد — رہے آبادی حسین آباد
ہوا تیار یہ مکاں جب سے — خلق معروف وصف ہے تب سے
سب سے بہتر ہے گو بہشت بریں — بہتر اس سے مگر بہشت نہیں

لکھنؤ کس قدر خوشحال اور تجارت میں ترقی کر چکا تھا۔ نہ صرف یہ کہ یہاں ایسے خوشنما بازار تھے بلکہ ۵۲ گنج تھے جن میں غلہ بکتا تھا ۵۲ ترکاری منڈیاں تھیں اور مہاجنوں کی ۱۱۰ کوٹھیاں تھیں۔ نیز یہی سے نواز گنج تک ۱۸۴ ڈیوڑھیاں امیروں کی تھیں جن کی سرکار میں ہزاروں ملازم نوکر تھے اور فراغت سے زندگی گذار رہے تھے

۱۷ مئی ۱۸۴۲ء کو محمد علی شاہ کی رحلت کے بعد ولی عہد امجد علی تخت نشیں ہوئے۔ ہر چند کہ امجد علی شاہ کا رجحان مذہب کی طرف تھا مگر امور سلطنت سے غافل نہ تھے۔

نجم الغنی خاں کہتے ہیں:۔

"ان کے وقت میں انتظام کا یہ حال تھا کہ صبح سے دوپہر تک کاغذات ملکی و مالی اور دادخواہوں کی عرضیاں سنتے اور خود بھی ملاحظہ کرتے سہ پہر کے وقت اور رات کو پرچہائے اخبار اور مستغیثوں کی عرضیاں جوالا پرشاد سے سنتے اور ان پر حکم لکھواتے۔"

امجد علی شاہ کی ایک خوبی یہ تھی کہ بیجا اسراف سے گریز کرتے تھے بہت سے مؤرخین نے اس کو بخل اور کنجوسی کہہ کر بہت کچھ طنز کیا ہے۔ اگر بادشاہ شاہ خرچ اور فضول خرچ ہوتا تو یہی مورخین امجد علی شاہ پر حکومت کے زوال سے عیش و عشرت کا سامان مہیا کرنے کی تہمت رکھتے۔ دراصل امجد علی شاہ نے وقت کی نزاکت کو سمجھا اور جہاں دولت کا خرچ مناسب سمجھا وہیں اس کو خرچ کیا۔

رعایا کی بہبودی کے لیے امجد علی شاہ نے بہت سے کام کیے اور ان میں سب سے اہم دریائے گومتی پر لوہے والے پل کی تعمیر ہے۔ اس کے بارے میں مولانا شرر گذشتہ لکھنؤ میں تحریر کرتے ہیں۔

"اس پل کی تعمیر کا واقعہ یہ ہے کہ اس کے اجزا و پرزے غازی الدین حیدر نے انگلستان سے منگوائے تھے مگر وہ پرزے جب تک پہنچیں بادشاہ راہی ملک عدم ہو چکے تھے۔ نصیر الدین حیدر کے عہد میں جب وہ پرزے ولایت سے آئے تو انھوں نے اپنے دربار کے انجینیر مسٹر سنکلیر کو ان پرزوں کے جوڑنے اور پل کو بنا کے کھڑا کر دینے کا ٹھیکہ دیا اور حکم دیا کہ وہ پرزے ریزیڈنسی کے سامنے دریا کے کنارے ڈال دئے جائیں۔ جس مقام پر پل کے پرزے ڈالے گئے تھے۔ اس کا پتہ دینے کے لیے گہرے کنوئیں کھدوائے اور ستونوں کی جڑائی بھی کرلائے مگر اس کے بعد ان سے کچھ کرتے دھرتے نہ بنی اور پل کی تکمیل میں ناکامی ہوئی۔ محمد علی شاہ کے زمانے میں یہ پل ناتمام پڑا رہا مگر امجد علی شاہ نے اپنے عہد میں اس کی جانب توجہ کی اور پل بن کے تیار ہو گیا۔"

امجد علی شاہ نے لکھنؤ سے کانپور کے گنگا گھاٹ تک ایک سڑک بھی عوام

کی بہبودی کے لیے تعمیر کرائی جس کی تیاری میں تین لاکھ روپئے خرچ ہوئے۔

لکھنؤ کا سب سے بارونق اور مشہور بازار حضرت گنج بھی اسی بادشاہ کی یادگار ہے۔ اس گنج میں انواع واقسام کے اسباب کے اجناس کی مناسب فراہمی کا انتظام کیا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے بہت مختصر مدت میں یہ بازار رونق پا گیا۔

رہزنوں اور بدمعاشوں سے رعایا کی حفاظت کے لیے سرحدی پولس دستہ قائم کیا جس کا خرچ سالانہ ستر ہزار نو سو باسٹھ روپئے تھا بعد میں واجد علی شاہ نے اس میں اور اضافہ کیا۔

واجد علی شاہ اور اودھ راج کا پتن میں پربپور نانند ورما لکھتے ہیں۔

"بادشاہ امجد علی شاہ نے ۱۸۴۵ء میں اپنے دیس کی سرحد پر کمپنی سرکار کی طرف سے آنے والے چور ڈاکوؤں سے حفاظت کے لیے سرحدی پولس تعینات کی تھی اس میں پانچ سو جوان تھے"

رعایا کی بہتری کے لیے شراب خانے منہدم کرادئے، بھنگ، چرس اور تاڑ کے پیڑ اجاڑ دئے گئے۔ کچھ مؤرخین کی نظر میں یہ سب مذہب کے زیر اثر تھا لیکن ہم دیکھتے ہیں آج بھی نشہ ایک لعنت ہے اور حکومت وقت نشہ بندی کے لیے کتنی کوشاں ہے۔

نصیر الدین حیدر کے قائم کردہ رصد خانہ کی تکمیل میں بھی امجد علی شاہ نے سرگرمی سے حصہ لیا۔

مولانا مرتضیٰ حسین فاضل تحریر فرماتے ہیں:

"اب تک جو چیزیں قائم ہو چکی تھیں ان کو فروغ دیا گیا، رصد خانہ چھ سات لاکھ کے خرچ سے مکمل ہوا اور کچھ کتابیں بھی چھپیں جس میں سائنس کی کچھ کتابوں کے ترجمے کمال الدین حیدر نے کئے۔ ایک جنتری شائع ہوئی... اس میں ملک اودھ کا جغرافیہ اور اس سے متعلق کچھ چیزیں ہیں اس کے علاوہ دوسرے فنون کی کتابیں طبع ہوئیں۔ شاہی پریس نے بہت سی کتابیں مفت شائع کیں... اس کے علاوہ رصد خانہ مقناطیسی قائم ہوا... بادشاہ محلے کو خلعت اور انعام دیتے تھے۔ چھ ہزار روپئے اشاعت کیلئے عطا کیے گئے۔ رصد خانے سے زوال شمسی کی توپ چلتی تھی۔ بابو ورشنک موہن بنگالی نے ایک گھڑی بھی بنائی تھی۔"

مدرسہ سلطانیہ کا قیام بھی اسی بادشاہ کے عہد میں ہوا جو وقف حسین آباد کی بدولت آج بھی دینی اور علمی خدمات انجام دے رہا ہے۔

عراق و عرب میں نہر آصفی، تعمیر روضۂ مسلم وہانی اور حرم حضرت عباس کے دروازوں کی نقرہ کاری کے لیے اول مد میں ڈیڑھ لاکھ دوم میں پندرہ ہزار اور روضہ کے لیے بیس ہزار روپئے عنایت کیے۔

پانچ سال حکومت کرنے کے بعد ۱۳ فروری ۱۸۴۷ء کو امجد علی شاہ نے وفات پائی۔ واجد علی شاہ تخت سلطنت پر جلوہ گر ہوئے۔ اپنی ولی عہدی کے زمانے سے ہی واجد علی شاہ امور سلطنت میں دلچسپی لیتے تھے۔ اس وقت انھوں نے فوج کی ترتیب وتنظیم پر خاص توجہ دینا چاہی جو انگریزوں کے حسب منشا نہ تھی لہذا امجد علی شاہ پر دباؤ ڈال کر ولی عہد کی فوجی سرگرمیوں کو موقوف کرا دیا۔ عشق نامہ فارسی میں خود واجد علی شاہ لکھتے ہیں۔

"میری طبیعت فرقۂ سپاہ سے بہت مالوف اور اس کی نگہداشت کی طرف متوجہ تھی لیکن آمدنی کی کمی خرچ کی زیادتی اور والد کی ممانعت کی وجہ سے اس کی نوبت کہاں آسکتی تھی۔"

تخت سلطنت پر جلوہ گر ہونے کے تیسرے دن سے ہی واجد علی شاہ نے سلطنت کے کاموں میں تیزی کے ساتھ دلچسپی لینا شروع کردی۔ ایک بار پھر انھوں نے فوج کی تنظیم کی طرف توجہ فرمائی۔ بادشاہ نے کئی پلٹنیں اور رسالے بھرتی کیے اور ان کے نام بانکا، ترچھا، گھنگھور، اختری، نادری وغیرہ رکھے اور خود ان کے ساتھ تین تین چار چار گھنٹے قواعد اور دیگر سرگرمیوں میں حصہ لیتے۔

ان کا اصول تھا کہ دفتر روز جاتے تھے۔ پابندی کے ساتھ دوپہر تک دفتر کا کام دیکھتے تھے۔ ہر ایک محکمہ کا افسر اعلیٰ اپنے کام پر موجود

رہتا تھا۔ مظلوموں کی دادرسی کے لیے چاندی کے دو مقفل صندوق جس پر مشنلہ سلطانی عدل نوشیروانی کے الفاظ کندہ تھے بادشاہ کی سواری کے ساتھ چلتے تھے تاکہ ہر شخص اپنی عرضی بے روک ٹوک ان میں ڈال دے بادشاہ ان صندوقوں کو خود کھولتے تھے اور عرضیوں پر مناسب احکام صادر فرماتے تھے جن کی فوراً تعمیل کی جاتی تھی۔ واجد علی شاہ نے رعایا کی بہبودی کے لیے ہر کوشش کرنا چاہی مگر بہت سے اقدام بددیانت اہلکاروں کی وجہ سے پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکے۔

تواریخ نوادرالعصر کا مولف لکھتا ہے:۔

"اول سال جب بادشاہ تخت نشیں ہوئے۔ یہ منظور تھا کہ تمام علاقہ جات قلمرو سلطانی حضور تحصیل ہو جائیں۔ زمیندار اور تعلقہ دار اپنے وکلا کی معرفت زر آمدنی داخل خزانہ سلطانی کیا کریں۔ ناظم اور چکلہ دار موقوف ہو جائیں کہ یہ علاقوں پر جاکر زیادہ ستاتے اور تنگ طلبی کرتے ہیں۔ رعیت تباہ اور نقصان سرکار بھی ہوتا ہے۔ لیکن اہل کاروں نے کہ ان کی حاصلات روپئے کی جاتی تھی اس حکم کو جاری نہ ہونے دیا"

واجد علی شاہ کو عمارتیں بنوانے کا بھی بڑا شوق تھا۔ شرر گذشتہ لکھنؤ میں لکھتے ہیں:۔

"دنیا میں عمارت کے شوقین ہزاروں بادشاہ گذرے مگر غالباً اپنی ذات سے کسی تاجدار نے اتنی عمارتیں اور اتنے باغ نہ بنوائے ہوں گے جتنے واجد علی شاہ نے اپنی ناکام زندگی اور برائے نام شاہی کے مختصر زمانے میں بنائے۔"

حضرت باغ، حضور باغ، سکندر باغ، عالم باغ، بنارسی باغ، اور ان سب سے بڑھ کر قیصر باغ کہ جس کی تعمیر میں اسی لاکھ روپیہ صرف ہوا اور سب سے پہلے جو عمارت واجد علی شاہ نے بنوائی وہ اپنے والد مرحوم امجد علی شاہ کا مقبرہ سبطین آباد ہے جس کی تعمیر پر دس لاکھ روپئے صرف ہوئے۔

ہر چند کہ ریزیڈنٹ نے واجد علی شاہ پر دباؤ ڈال کر انکے فوجی اور نظم و نسق کے مصارف میں تخفیف کرادی تھی۔ اس پر بھی بادشاہ نے محدود ذرائع اور آمدنی کے باوجود سلطنت کے کاموں کو بخوبی انجام دیا۔ پربھو پرناتندورما "واجد علی شاہ اور اودھ راج کا پتن" میں تحریر کرتے ہیں:۔

"لکھنؤ میں ۵۲، تھانے تھے جن میں دو ہزار کانسٹبل یا سپاہی تھے۔ کوتوالی ہی میں عدالت لگتی تھی۔ بادشاہ خود ان کے قواعد فارسی زبان میں کراتے تھے۔ بادشاہ کے کل اہلکاروں کی تعداد ستاسی ہزار تھی۔"

واجد علی شاہ نے اپنی زندگی میں جو سب سے اہم کارنامہ انجام دیا وہ موسیقی کی سرپرستی اور ڈرامے کا وجود ہے ولی عہدی کے زمانے میں پری خانہ واجد علی شاہ نے ترتیب دیا تھا اس کو بادشاہ ہوتے ہی برخاست کر دیا تھا لیکن موسیقی سے وہ کبھی بھی کنارہ کش نہ ہوئے اور جس طرح انھوں نے ہندوستانی موسیقی کو پروان چڑھایا اس کی مثال مشکل ہے، موسیقی ناچ اور گانوں کو لے کر طرح طرح کی تہمتیں اس نیک دل بادشاہ پر لگائی گئیں جو کہ دراصل انگریزوں کے اشارے پر بادشاہ کو بدنام کرنے کی سازش تھی، فنون لطیفہ کی سرپرستی تو ہندوستان کے راجاؤں کا طرۂ امتیاز رہا ہے اگر واجد علی شاہ نے بھی اس کے فروغ کی کوشش کی۔ تو وہ کیوں موردِ الزام ٹھہرائے گئے؟

سید مسعود حسن رضوی ادیب "لکھنؤ کا شاہی اسٹیج" میں فرماتے ہیں:۔

"اس میں شک نہیں کہ واجد علی شاہ اپنے زمانہ میں موسیقی اور رقص کے سب سے بڑے سرپرست تھے ہندوستان کی پیچیدہ اور مشکل کلاسیکی موسیقی کو آسان اور عام پسند بنانا ان کا خاص کارنامہ ہے اور لکھنوی ٹھمری اور بھیرویں کی مقبولیت انھیں کی مرہون منت ہے لیکن ناٹک کے فن پر ان کا احسان موسیقی سے بھی زیادہ ہے یہ فن ہمارے ملک میں بالکل ذلیل ہو چکا تھا اور صرف ادنیٰ طبقوں میں بہت بگڑی ہوئی حالت میں باقی رہ گیا تھا۔"

"واجد علی شاہ نے اس کو ذلت کے گڈھے سے

اٹھا کر عزت سے سنگھاسن پر بٹھایا اور گلی کوچوں سے نکال کر شاہی محل میں پہنچایا۔ یہاں صرف ایک بات کہنا ہے۔ واجد علی شاہ سر سے پاؤں تک پکے ہندوستانی تھے۔ انگریزوں سے انھیں مطلق انس نہ تھا۔ ان کے دربار میں انگریزوں کا ذرا بھی دخل نہ تھا۔ کلکتہ اور بمبئی میں انگریزی طرز کے اسٹیج مدت سے قایم تھے اور ان کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کر لینا ان کے لیے کچھ مشکل نہ تھا مگر انھوں نے لکھنؤ میں جس اسٹیج کی بنیاد ڈالی وہ خالص ہندوستانی تھا۔ اس میں ہندوستان کے قدیم اسٹیج کی پیروی قدم قدم پر نظر آتی ہے۔"

آگے مسعود صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"واجد علی شاہ کے زمانے تک اردو میں ڈرامے کا وجود نہ تھا۔ اس اہم صنف کی بنیاد ڈالنے پر فخر ان کے لیے اٹھ رہا تھا۔ انھوں نے ولی عہدی کے دنوں میں رادھا کنہیا کی داستان محبت پر مبنی ایک چھوٹا سا ناٹک لکھا تھا جو ہماری خوش قسمتی سے اب تک موجود ہے۔ فنی اعتبار سے اس کا درجہ کچھ بھی ہو، اردو کا پہلا ڈرامہ ہونے کی حیثیت سے وہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ حضرت مصنف ڈرامے کے ساتھ ساتھ اداکاروں کے لیے ہدایتیں (Stage Direction) بھی لکھتے گیے ہیں جس سے اس ادب پارے کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ ..... واجد علی شاہ موسیقی اور رقص کے صرف سرپرست ہی نہ تھے بلکہ انھوں نے ان فنون کو بڑی محنت سے حاصل کیا تھا۔ ممکن ہے وہ استادی کا درجہ نہ رکھتے ہوں، لیکن ان کی متعدد تصنیفیں گواہ ہیں کہ ان کو ان فنون میں اچھا خاصہ دخل ضرور تھا۔ لکھنؤ کے مشہور باکمال رقاص مہراج بندادین فخر یہ کہا کرتے تھے کہ رقص کی بہت سی صورتیں خود بادشاہ نے مجھکو سکھائی تھیں..... واجد علی شاہ موسیقی کو مزے کے لیے نہیں بلکہ علم کی حیثیت سے سیکھنا سکھانا چاہتے تھے وہ اس کے لیے خود بھی اظہار یا ض کرتے تھے اور دوسروں سے بھی اس کی توقع رکھتے تھے۔ ڈوم ڈھاریوں کا سا مزاج انکو بہت ناپسند تھا۔"

شیخ عظمت علی کاکوروی مرقع خسروی میں واجد علی شاہ کی مثنوی عشق کے رہس کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:۔

"رہس کے مکانات نئے پری خانے جدا جدا تیار ہوئے۔ ایجاد طبع نازک خیال سے عجیب عجیب قطعیں نکلتیں طرح طرح کی ایجادیں ہوتیں۔ پھر مطابق ان کے ہر محل ہر محل ومقام کے نام رکھے گیے۔"

ممتاز مورخین و محققین کے ان چند اقتباسات سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ واجد علی شاہ عوام میں مقبول اور امور سلطنت سے غافل نہ تھے مگر انگریزوں کو تو کسی صورت ریاست اودھ ہتھیانا تھی چنانچہ سلیمن کی رپورٹ کو بہانہ بنا کر ۱۱ر فروری ۱۸۵۶ء کو تہذیب و تمدن کے اس چراغ کو آندھیوں نے تہس نہس کر دیا جس کی روشنی سے سارا ہندوستان جگمگا رہا تھا۔ بادشاہ کو مجبور کر کے کلکتہ لے جایا گیا۔ بادشاہ کی والدہ ملکۂ کشور، بھائی مرزا اسکندر حشمت جواد علی عرف جرنیل صاحب، ولی عہد پرنس مرزا حامد علی اور مولوی مسیح الدین کاکوروی لندن گئے۔ تاکہ ملکۂ انگلستان سے مل کر اصل حالات گوش گذار کریں اور سلطنت کی واپسی پر زور دیں مگر اسی دوران، ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی چھڑ گئی۔ لہذا کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔ ملکۂ کشور اور سکندر وہیں فوت ہو گئے پرنس حامد علی ناشاد و نامراد واپس لوٹے۔ اودھ کا تاجدار کلکتہ میں اکتیس برس وطن کی یاد کو سینے سے لگائے تڑپتا رہا آخر ۲۱ر ستمبر ۱۸۸۷ء عالم غربت میں وفات ہو گئی۔

اہالیان لکھنؤ نے ۵ رجولائی ۱۸۵۷ء کو برجیس قدر کو تخت سلطنت پر بٹھا کر حضرت محل کی کمان میں جو جنگ چھیڑی وہ ۱۸۵۸ء تک جاری رہی مگر فوج کی بد نظمی اپنوں کی بے حسی اور جنگی حکمت عملی کے فقدان کی وجہ سے ان کو پسپا ہونا پڑا۔ انگریزوں نے فتح حاصل کی۔ ۱۴ر مارچ ۱۸۵۸ء کو انگریزوں سے لڑتی بھڑتی حضرت محل برجیس قدر اور سے بچے

(باقی صفحہ ۶۱ پر)

آبرو لٹتی رہی اور گل مہکا کیے
مسکرا کر غربت گلچیں باوفا دیکھا کیے
لغزشیں ہوتی رہیں اور قدم بہکا کیے
رہزن عقل و خرد کارواں لوٹا کیے
کر سکے زلف گیتی کی نہ پیمائش ابھی
آسماں تجھ پہ کمندوں پر کمند پھینکا کیے
اپنے دامن سے پسینہ خشک وہ کرتے رہے
زخم کے انگار دامن کے تلے دہکا کیے
یوں شراب عشق سے ہر قلب کا ساغر بھرا
سرخوشی میں آپ بیخود اس طرح بہکا کیے

—— انور جمال بیخود نگرامی
۱۲۶ قطب پور، ڈالی گنج لکھنؤ

تکیہ گاہ حسن بر غم ناز بر اندازہ تھا
دل نگار عاشقی منت پذیر غازہ تھا
سجدہ ریزی سے تری ٹوٹا نگاہوں کا طلسم
ارمغان حسن جب صورت گر خمیازہ تھا
گرمی حسن مجسم سے تھے شعلے ملتفت
پاکباز محتسب کا حلق بے اندازہ تھا
لن ترانی سے دل شوریدہ میں تھا افتراق
خندۂ بیباک رستا خیز میں شیرازہ تھا
غالب فن کار دریوزہ گری میں مر مٹا
بے کفن مقتول زلف دختر بزازہ تھا

—— محمد عظیم غالب
محلہ سفیانہ۔ رودولی (بارہ بنکی)

خاموش برق و باد کا طوفان ہو چکا
ہونا تھا ساحلوں پہ جو نقصان ہو چکا
دیتے ہو آ کے راز دروں دل پہ کیوں صدا
مدت ہوئی یہ شہر تو ویران ہو چکا
ایک ایک کر کے اڑ گئیں خوابوں کی تتلیاں
میں خواہشوں کے شہر میں ہلکان ہو چکا
اٹکا ہوا تھا دل میں جو کانٹا نکل گیا
دشوار تھا جو کام وہ آسان ہو چکا
آیا نہ شعر کہنے کا اب تک اسے شعور
کہنے کو شاد صاحب دیوان ہو چکا

—— خوشبیر سنگھ شاد
۲۲۰۔ رام نگر۔ عالم باغ، لکھنؤ

غزلیں

بہکا ہوا ہوں اور نہ بکھرا ہوا ہوں میں
تیری جبین ناز پہ لکھا ہوا ہوں میں
میں جانتا ہوں کس طرح رہتا ہوں تیرے پاس
چادر کی طرح ذہن پہ پھیلا ہوا ہوں میں
پھر اور آئے دور وہی جام و مے ملیں
اب تک اسی فراق میں بیٹھا ہوا ہوں میں
میں نے کسی جگہ پہ پڑاؤ نہیں لیا
تاریخ کہہ رہی ہے کہ پرکھا ہوا ہوں میں
اک عمدہ شعر جیسے ہو اختر اسی طرح
اب تک تری کتاب میں جلوہ نما ہوں میں

—— اختر عمر اختر
محمود نگر، لکھنؤ

دنیائے رنگ و بو میں کچھ ایسے بشر ملے
جو پھول بن کے ہنستے ہوئے دار پر ملے
کیا جانے کیا جنوں تھا کس امید پر ملے
ملنا نہ چاہتے تھے ہم ان سے مگر ملے
یوں میرے ذوق عشق کو یارب اثر ملے
دل سے ملے جو دل تو نظر سے نظر ملے
ہم کو جبین شوق کی تسکین چاہیے
نقش قدم ملے کہ ترا سنگ در ملے
جن کو تلاش منزل جاناں رہی صدا
کچھ اپنی زندگی سے وہی باخبر ملے

—— مرزا محمد ہادی صدا لکھنوی
تکیہ پیر جلیل (اترا) گولہ گنج لکھنؤ

شکوہ نہیں بہار سے کلیوں سے پھول سے
تنگ آ چکا ہوں اپنے ہی بوئے ببول سے
بے جا ذرا تمہاری میں کرتا تو کس طرح
مجبور تھا یہاں میں اپنے اصول سے
ہمراز اپنا اس کو سمجھتے ہو ٹھیک ہے
پھر بھی تم اصل بات بتانا نہ بھول سے
دیکھو تمہارے درد کو سمجھیں گے صرف وہ
خود کو جلا چکے ہیں جو اشکوں کے پھول سے
رہزن سے بدگمان تھا رہبر سے بھی ہوں اب
منزل کو پوچھتا ہوں میں راہوں کی دھول سے

—— نسیم رہبر
محلہ احسن نگر، ترکھیا
گاندھی نگر۔ بستی

افسانہ

م۔ک۔ مہتاب
۱۔ ۸ پچھم وہار نئی دہلی

قہقہوں کا درد

ہاہا۔ ہی ہی ہی

مریضوں کی سسکیوں، کراہوں اور دبی دبی چیخوں کے ساتھ اسپتال کے اس لمبے کمرے میں نسوانی قہقہوں کی کھنک ایک عجیب سا احساس پیدا کر رہی تھی۔

بخار کے زور میں اونگھ رہے گردھاری نے پلک جھپکا کر دیکھا تو دو نوجوان خوبصورت لڑکیاں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے برآمدے سے کمرے میں چلی آ رہی تھیں۔ ان کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اکثر مریض چند لمحات کے لیے اپنی اپنی تکلیف بھول کر حسن و صحت اور خوشی و مسرت کے ان مجسموں کی جانب دیکھنے لگے۔

" اوہو ہو۔ یہاں تو بہت مریض ہیں۔" کالے کوٹ والی لڑکی نے اپنا خوشبودار گلابی رومال ناک پر رکھتے ہوئے کہا۔

" وینا۔ تم فکر مت کرو۔ سیٹھی کی کیا مجال ہے کہ ہمارے ساتھ چلنے سے انکار کرے"۔ گھونگھرالے بالوں والی لڑکی کالے کوٹ والی لڑکی کا ہاتھ دباتے ہوئے بولی۔

" لیکن یہاں تو اتنے مریض ہیں۔ سیٹھی فارغ کیسے ہوگا؟ کالے کوٹ والی لڑکی نے، جس کے گلے میں بڑے بڑے پھولوں والا ریشمی رومال بندھا ہوا تھا، حیرانی سے پوچھا۔

" مریضوں کو مارو گولی۔ مریض تو یہاں ہر روز داخل ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن تم ڈاکٹر سیٹھی کے پاس ہر روز کب آؤ گی"۔ پہلی لڑکی نے سر جھٹک کر کہا اور پھر وہ دونوں دروازے پر بیٹھے چپراسی سے پوچھے بغیر پردہ اٹھا کر ڈاکٹر سیٹھی کے کمرے میں داخل ہو گئیں۔

کمرہ نقرئی قہقہوں سے گونج اٹھا۔ اندر بیٹھا ایک مریض ایکدم اٹھ کر یوں باہر آگیا جیسے ڈاکٹر نے زخم پر رکھا ہوا روئی کا پرانا پھاہا اٹھا کر گندگی کے ڈبے میں پھینک دیا ہو۔ باہر اسٹول پر بیٹھے چپراسی کے ہاتھ میں مریضوں کی پرچیاں تھیں۔ سب سے اوپر گردھاری کی پرچی تھی۔ وہ ہاتھ میں ایک شیشی پکڑے اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔

گھنٹی بجی۔ گردھاری اٹھ کھڑا ہوا۔ چپراسی اندر چلا گیا۔ پھر باہر آیا اور گردھاری کے کندھے کو دباتے ہوئے بولا:

" ابھی آرام سے بیٹھو۔ صاحب کے دوست آئے ہیں۔ میں ان کے لئے چائے لینے جا رہا ہوں"۔

گردھاری کو سردی کے سبب بخار ہو رہا تھا۔ وہ دیوار کے ساتھ سر ٹکائے اونگھنے لگا۔ اس نے سوچا کہ وہ اٹھ کر کینٹین سے گرم چائے کا ایک کپ پی آئے۔ لیکن اس کے جسم میں لرزہ ہو رہا تھا دوسرے اسے ڈر تھا کہ اگر وہ قطار سے اٹھ کر چلا گیا تو اس کی باری جاتی رہے گی، اس لیے وہ دونوں ہاتھ بغلوں میں دبا کر وہیں بیٹھا رہا۔

کمرے میں متواتر قہقہے لگ رہے تھے۔ گردھاری کے کان ان آوازوں پر لگے ہوئے تھے کہ کب بات چیت ختم ہو اور کب اس کی باری آئے لیکن قہقہوں کی ایک لہر سمندر کی لہر کی طرح آہستہ آہستہ ساحل سے ٹکرا کر ختم ہوتی کہ ایک اور قہقہہ گونج اٹھتا اور ایک نئی بات چھڑ جاتی۔ دونوں لڑکیاں چہک رہی تھیں اور ڈاکٹر ہنس ہنس کر ان کی بات کا جواب دے رہا تھا۔ چائے آئی تو پیالوں کی دلفریب کھنک بھی ان قہقہوں میں شامل ہو گئی۔ باتوں میں کسی پکنک کے پروگرام کی آواز سنائی دینے لگی۔

" سیٹھی! تم اس بات کی فکر مت کرو۔ تم چلو تو سہی میں بیئر کے پورے کریٹ کا انتظام کر دوں گا"۔ کمرے کے اندر بیٹھا ایک اور نوجوان

ڈاکٹر سے کہہ رہا تھا۔

"اور ڈبوں میں بند کھانا تو ہوٹل سے آجائے گا" ایک لڑکی یقین دلا رہی تھی۔

"نہیں شششی! کھانا تو ہم تمہارے ہاتھ کا بنا ہوا کھائیں گے۔ مجھے پنجور کی وہ دوپہر کبھی نہیں بھول سکتی جب تم نے ہمیں کباب تل کر کھلائے تھے۔ آہا ہا۔ کیا چیز تھی" ڈاکٹر اس لڑکی سے کہہ رہا تھا۔

"اوں ہوں..." وہ لڑکی بڑی ادا سے کہہ رہی تھی۔ "نہیں جی۔ اب کے تو میں ٹھاٹھ سے بیٹھی رہوں گی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں چولہا چوکا کرتی رہوں اور آپ موج مستی کرتے رہیں۔ اس بار تو آپ کی نرملا بھی ساتھ ہوگی۔ اس کا فون آیا تھا کہ اگر پروگرام طے ہو گیا تو وہ ہم سے پہلے ہی وہاں پہونچ جائے گی۔"

"ہاہاہا۔ ہاہاہا" زور کا قہقہہ بلند ہوا اور دوسرا نوجوان کہنے لگا۔

"اس میں شرمانے کی کیا بات ہے ڈاکٹر؟ جو لطف شادی سے پہلے کی ملاقاتوں میں ہوتا ہے وہ پھر کہاں۔ شادی کے بعد تو زندگی زندگی نہیں رہتی پابندی ہو جاتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ اس پکنک میں کھانے پکانے کی پوری ذمہ داری نرملا کے سپرد ہوگی۔ وہی مچھلی کے پکوڑے تلے گی اور وہی روغن جوش تیار کرے گی۔ میں اور ششی تو بیٹھ کر ٹرانسسٹر پر فلمی نغمے سنیں گی یا دھوپ میں لیٹ کر ماؤتھ آرگن بجائیں گی" دوسری لڑکی ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔

گردھاری کو کھانا کھائے آج چوتھا دن تھا۔ مچھلی اور مرغ کی باتیں سن کر اس کی بھوک اور بھی بھڑک اٹھی۔ نتھنے خوشبو کے تصور سے پھڑکنے لگے۔

لیکن گردھاری کا یہ حسین تصور ایک دلدوز چیخ نے توڑ دیا۔ یہ چیخ اس کے قریب بیٹھی عورت کی تھی جس کا ایک بازو سوزش کی وجہ سے پھول کر سرخ غبارے کی طرح ہو رہا تھا۔ اس کے بازو میں ٹیس اٹھ رہی تھی اور وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد درد کی شدت سے چیخ اٹھتی تھی۔ وہ ہونٹ بھینچ لیتی اور بند آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگتے۔ اس کے پیچھے دو مریض چھوڑ کر ایک جوڑا کھڑا تھا۔ میاں نے بچے کو کمبل میں لپیٹ رکھا تھا اور اضطرابی حالت میں ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔ بچہ اچھل کر ہاتھوں سے نکل جانا چاہتا تھا کبھی شوہر اور بیوی بچے کو کندھے سے لگا کر ٹہلنے لگتے۔

"بس بس۔ میرے راجے۔ ابھی ڈاکٹر صاحب تمہیں دیکھ لیں گے ان کا ہاتھ لگتے ہی تیرا درد بند ہو جائے گا۔ میں تمہیں ایچی اور غبارے لے کر دوں گی۔"

ان کے پیچھے ایک بوڑھا بیساکھیوں کے سہارے کھڑا مالا پر جاپ کر رہا تھا۔ اس کی پیشانی زرد تھی۔ آنکھوں میں سخت کمزوری کے آثار تھے۔ اس کی پوری ٹانگ پر پلستر چڑھا ہوا تھا۔ وہ بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ کھڑے رہنے کے لئے پاؤں بدل رہا تھا اور منہ میں بڑبڑا رہا تھا۔

اس بوڑھے کے پیچھے دماغی بیماری کا کوئی مریض تھا جسے دو آدمیوں نے تھام رکھا تھا۔ وہ بار بار ان کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرتا تھا لیکن دونوں آدمی اسے جکڑے ہوئے تھے۔ یہ لوگ شاید اس آدمی کے پاگل ہونے کا سرٹیفکیٹ لینے آئے تھے۔

اس سے کچھ دور گردھاری کے بالمقابل لائن کی دوسری جانب ایک بڑھیا اور اس کی جوان لڑکی بیٹھی تھی۔ بڑھیا بے تابی سے اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اگر دیر ہو گئی تو وہ گاؤں کیسے واپس جائے گی۔ پھر وہ جوان لڑکی کو لے کر ٹھہرے گی کہاں۔؟

ایک نرس وہاں سے گزری تو بڑھیا نے ہاتھ جوڑ کر التجا کی

"ڈاکٹرنی۔ ہماری گاڑی نکل جائے گی۔"

"تو میں کیا کروں۔؟ اگر جلدی تھی تو جلدی آجاتیں۔" برف کی تلفی جیسی سفید پوش نرس روکھا سا جواب دے کر آگے نکل گئی۔

بخار کی شدت سے گردھاری کی آنکھیں پھٹ رہی تھیں۔۔۔ اس نے ایک بار پھر سب مریضوں کے چہروں کی جانب دیکھا جہاں درد کے بگولے اٹھ رہے تھے۔ اکتاہٹ تھی۔۔۔ مایوسی تھی۔۔۔ اس کے قریب بیٹھی عورت جس کا بازو سوزش سے سرخ ہو رہا تھا، آنکھیں بند کیے ہائے ہائے کر رہی تھی۔

گردھاری نے ہاتھ باندھ کر چپراسی سے کہا۔

"بھائی! میں مر رہا ہوں۔ میری پرچی اندر بھیج دو۔"

"بیٹھ جا بے بڈھے! دیکھتا نہیں صاحب کے دوست آئے ہوئے

[illegible] نارمل کر دیا۔

[illegible] کر بیٹھ گیا۔ اندر قہقہے گونج رہے [illegible] رہی تھی ۔ [illegible] تھا۔ [illegible] عورت گروہ بستی کے ذریعے وقت سے پہنچ گئے [illegible]۔ ان کی کار مل ہی جائے گی۔ پھر چندی گڑھ سے تمہاری محبوبہ نرملا بھی تو اپنی کار میں ہی آئے گی۔ ہائے کیا بات ہے ڈاکٹر تمہارے انتخاب کی بھی۔ کار کے اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھتی ہے تو گویا کار کو پر لگ جاتے ہیں۔"

"لیکن ڈاکٹر اور نرملا کو تو ابھی الگ الگ کار چاہیے" ایک لڑکی نے مذاق کیا اور کمرہ پھر قہقہوں سے گونج اٹھا۔

پھولے ہوئے سُرخ بازو والی عورت کی چیخ قہقہوں کا تعاقب کرتی ہوئی دور تک چلی گئی ۔ بیساکھیوں والے بڈھے نے تھک کر سر دیوار سے لگا دیا۔

"اچھا۔ تم ابھی ہمارے ساتھ چلو، بیئر کا انتظام تو ہو جائے ۔ ملٹری کینٹین میں تمہاری جان پہچان ہے" دوسرا نوجوان کہہ رہا تھا۔

"مجھے مریض دیکھنے ہیں اور شاید ایک آپریشن کے لئے بھی جانا پڑے" ڈاکٹر نے معذرت چاہی۔

"چھوڑو یار آپریشن کو۔ زندگی بھر کرتے رہو گے۔ ششی اور وینا پھر کب تمہارے پاس آئیں گی۔ اُٹھو چلو"۔

اور کرسیوں کی کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ وہ سب اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"یہ سامان الماری میں رکھ دو اور مریضوں سے کہہ دو کل آ جائیں" ڈاکٹر نے چپراسی سے کہا۔

"کیا نکما پروفیشن ہے ششی ۔ میں تو کبھی کسی ڈاکٹر سے شادی نہیں کروں گی۔ چاروں طرف بو ہی بو۔ درد ہی درد" وینا ششی سے کہہ رہی تھی۔

میں نے نہیں کہا تھا کہ ڈاکٹر سیٹھی اپنا دوست ہے۔ خواہ صبح سے شام تک اس کے پاس بیٹھے رہو۔ دیکھو کیسے ہمارے ساتھ

[illegible] نے کہا۔ اور وہ لوگ [illegible] رہے ہے۔

"ڈاکٹر! میرا بچہ ۔ میرا بچہ ۔ ؟"

"ڈاکٹر! میرا بستر [illegible]"

"ڈاکٹر! ہمارا مریض شام تک مر جائے گا"

گردھاری ایک بہری دیوار کی طرح وہاں بیٹھا رہا۔ سُرخ بازو والی عورت کے آنسو گرنے لگے۔ اس نے زور سے چیخ ماری اور بیتاب ہو کر اپنے دانت بازو کے سُرخ گوشت میں گاڑ دیئے۔

□□

اودھ کا انصرام .... صفحہ ۴۴ کا بقیہ

کچھ ساتھیوں کو لے کر نیپال کی طرف روانہ ہو گئیں۔ مولوی احمد اللہ شاہ کو بھی میدان چھوڑنا پڑا شہر پر قبضہ ہوتے ہی انگریزوں نے خوب لوٹ کھسوٹ اور غارت گری کی۔ شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی ۔ لٹ گیا وہ لکھنؤ جو آصف الدولہ کی سخاوت سے شاد و آباد تھا، جو راجہ جھاؤلال، راجہ ٹکیٹ رائے، مہاراجہ میوہ رام، نواب شرف الدولہ جگن ناتھ، امین الدولہ تحسین علی خاں، الماس علی خاں، کپتان فتح علی کی فیاضیوں سے سرسبز و شاداب تھا۔ وہ علماء کا مسکن، مفتیوں کی بستی، شاعروں کا شہر وہ لکھنؤ جو میر کی غزل، سودا کا قصیدہ، انشاء کی شوخی، آتش کا بانکپن، ناسخ کا سخن اور انیس کا مرثیہ تھا۔

اور رہ گئیں تاریخ میں اس شہر کی پرچھائیاں اور اسکے تذکرے۔

ماخذ:

تاریخ لکھنؤ	مولانا سید آغا مہدی
مرقع خسروی	شیخ عظمت علی کاکوروی، مرتب ذکی کاکوروی
اٹھارویں صدی میں ہندوستانی معاشرت	ڈاکٹر محمد عمر
امجد علی شاہ	سبط محمد نقوی
حزن اختر	واجد علی شاہ، مرتب امجد علی خاں
بیگمات اودھ	شیخ تصدق حسین
منظومات دلگیر	چھنولال دلگیر، مرتب ڈاکٹر اکبر حیدری

نقد و تبصرہ

تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: پگھلتے پتھر (شعری مجموعہ)
شاعر: گیان کرتار سنگھ گویا   قیمت: پچاس روپئے
ملنے کا پتہ: دفتر گنگ و جمن۔ ۲۶/۱ ویسٹ کاٹ بلڈنگ
مال روڈ، کان پور۔ ۲۰۸۰۰۱

زیر تبصرہ کتاب "پگھلتے پتھر" گیانی کرتار سنگھ گویا کا مجموعۂ کلام ہے جو غزلوں، نظموں، گیتوں اور قطعات پر مشتمل ہے اور ان کے پر خلوص جذبات و احساسات کا آئینہ دار ہے۔

گیانی کرتار سنگھ سرزمین پنجاب کے فرزند ہیں اور اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس کی مادری زبان پنجابی اور تحریر و تقریر کی زبان اُردو تھی۔ شعر و شاعری کا چرچا عام تھا۔ ماحول سے متاثر ہو کر گویا صاحب بھی شاعری کی طرف مائل ہو گئے۔ اب عمر کے آخری حصے میں انھوں نے اپنے کلام کا انتخاب "پگھلتے پتھر" کے نام سے شائع کیا ہے۔

اس مجموعے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ گیانی کرتار سنگھ انسانیت اور اخلاق کے پرستار ہیں اور انہی قدروں کو اپنے اشعار میں سموتے ہیں۔ ان کے اشعار میں فکر و فلسفے کی گہرائی تو نہیں ہے مگر سادگی و لطف آمیزی ضرور ہے جو پڑھنے والوں کو متوجہ کر لیتی ہے۔ اس مجموعے کا بڑا حصہ اگرچہ رسومیاتی شاعری سے متاثر ہے مگر جہاں جہاں شاعر نے اپنے حقیقی محسوسات کو شاعری کا جامہ پہنایا ہے وہاں ایسے اشعار کہہ گئے ہیں جو دامن دل کو کھینچ لیتے ہیں۔ شعر ملاحظہ ہو ؎

قسمت کھلی تو زینت میخانہ بن گیا
برسوں سے راستے میں جو پتھر پڑا رہا

گیانی جی کا رنگ سخن اگرچہ غزل ہی میں کھلتا ہے مگر اس کتاب میں شامل ان کے قطعات بھی خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ان قطعات میں ایسی کوئی بات ضرور ملتی ہے جو شاعر کے تجربات کا نچوڑ ہے اور اسی لیے ہر شخص کو اپنی ہی بات معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً ؎

عمر کتنی گزر گئی گویا
آئے دن جوڑنے سے کیا حاصل

گیانی کرتار سنگھ گویا شعر و ادب کی رعنائیوں سے اب بھی سرشار رہتے ہیں اگرچہ وہ عمر کی پچھترویں منزل پار کر چکے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ان کا یہ شعری مجموعہ اہل ذوق حضرات کی توجہ کا مرکز بنے گا۔

—— نامی انصاری

نام کتاب: "دکھنی درپن"
مُصنّف: ڈاکٹر شیو پرشاد جاوید وششٹ
ملنے کا پتہ: سادھنا پبلی کیشنز۔ ڈی۔ ۴۱ گل مہر پارک۔ نئی دھلی

"دکھنی درپن" ڈاکٹر جاوید وششٹ کے بارہ طویل مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان مضامین میں دکھنی شاعروں، ادیبوں اور ان کی تصانیف اور دکھنی ادبیاتِ اُردو کے سارے گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

دکھنی شاعری میں ہندوستانیت۔ دکھنی غزل۔ دکھنی مرثیہ۔ اردو مثنوی کا ارتقا دکن میں۔ مثنوی قطب مشتری۔ مثنوی سیف الملوک۔ رنگا رنگ جھلکیاں دکھنی مثنویات کے آئینے میں۔ صوفیائے کرام کا ورثہ ادبیات میں۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز۔ ملا وجہی: حیات و خدمات۔ کیا ملا وجہی شیعہ تھا؟ اور سراج کی شاعری پر ہندی کا اثر "دکھنی درپن" کے موضوعات ہیں۔

جاوید صاحب کو اُردو زبان و ادب اور خصوصی طور سے دکھنی ادب کے رموز و نکات اور قواعد و لغات پر مہارت حاصل ہے۔ انھوں نے ۱۹۵۰ء سے ۱۹۸۰ء تک دلی کالج (دہلی یونیورسٹی) میں دکھنی ادبیات کی تدریس کی خدمت انجام دی۔ وہ "بابائے اُردو" مولوی عبدالحق کے شاگرد رہے ہیں۔

جاوید صاحب نے لکھا ہے کہ مولوی عبدالحق اپنے شاگردوں کو بار بار یہ ہدایت کرتے تھے کہ تم میں سے کسی کو استطاعت ہو تو دو کام ضرور کرنا ایک قصۂ حسن و دل کی ایڈیٹنگ۔ دوسرے سب رس سے مُلّا وجہی کے

مضامین مرتب کرنا۔ جاوید صاحب نے اپنے محترم استاد کی دونوں ہی خواہشات پوری کردیں اور تیس سال سے زیادہ عرصہ تک دلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں دکھنی ادبیات کی تدریس کی خدمات انجام دیں۔

"دکھنی درپن" میں دکنی ادبیات کی ہر صنف کا تحقیقی انداز میں جائزہ لینے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں دکنی ادب کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ "دکھنی درپن" تمام اہل ذوق اساتذہ اور طلباء کے لئے مشعل راہ ہے جن کو دکنی ادب سے دلچسپی ہے۔ "دکھنی درپن" کے خوش نما سرورق کے علاوہ کتابت وطباعت زیدہ زیب ہے۔

———— امیر حسن نورانی

نام کتاب: شہر میں کرفیو
مصنف: وبھوتی نرائن رائے مترجم: ڈاکٹر رفیق احمد خاں
قیمت: پچاس روپے
ملنے کا پتہ: ۱۰۶/۳۶۴ - پھاٹک ملک گیتی - بانسی کی مسجد لکھنؤ

"شہر میں کرفیو" آگ و خون میں لتھڑی ہوئی ایک داستان ہے ملک میں اکثر بھڑکے ہوئے فرقہ وارانہ فسادات اور ان کے بعد لگنے والے کرفیو کی عکاس وغماز ہے۔

جن لوگوں نے بھی فسادات کو قریب سے دیکھا اور سمجھا ہے انھیں معلوم ہے کہ ان فسادات سے عام آدمی پر کیا گزرتی ہے اور اس کا فائدہ چند افراد کیسے اٹھاتے ہیں۔ اس پر مصنف نے بڑی خوبصورتی سے روشنی ڈالی ہے۔

حقیقت عموماً تلخ ہوتی ہے۔ "شہر میں کرفیو" میں مصنف نے حقیقت پسندی سے کام لیا ہے جو یقیناً بعض جگہ پر بہت تلخ ہوگئی ہے۔

اردو میں ترجمہ کی روایت بہت قدیم ہے۔ عرصہ سے اردو میں ملکی زبانوں کے علاوہ غیر ملکی شہ پاروں کے تراجم ہوتے رہے ہیں۔ جن سے ہماری زبان کو خاطر خواہ فائدہ پہنچا ہے۔

"شہر میں کرفیو" کا اردو ترجمہ ڈاکٹر رفیق احمد خاں نے کیا ہے۔ انھوں نے وبھوتی نرائن رائے کے اس ناولٹ کا ترجمہ کرکے خود اپنی نیک نیتی حقیقت پسندی اور دیانتداری کا ثبوت دیا ہے۔ اس قسم کے شہ پاروں کا ملک کی ہر زبان میں ترجمہ ہونا چاہیے۔ باہمی یگانگی، قومی یکجہتی اور رواداری کے عنوان پر مبنی ناولٹ کا ترجمہ کرکے ڈاکٹر رفیق احمد خاں نے ایک بہت ہی اہم کام کیا ہے۔

———— قطب اللہ

نام کتاب: جگن ناتھ آزاد: حیات اور ادبی خدمات
مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم قیمت ۲۵۰/- روپے
ملنے کا پتہ: انجمن ترقی اردو۔ اردو گھر۔ راؤز ایونیو نئی دھلی

اردو میں آزاد کی ایک روایت اور انفرادیت رہی ہے۔ محمد حسین آزاد، ابوالکلام آزاد۔ شمس و قمر کے ساتھ اب ایک درخشندہ ستارہ جگن ناتھ آزاد بھی ہیں جن کے علمی اور تخلیقی اکتسابات افسانوی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ خصوصی طور پر اقبال کے سلسلے میں اقبال سے ان کا والہانہ عشق اور ہر رخ سے اقبال کا مطالعہ اور اقبال کے پیغام کی ساری دنیا میں اشاعت کی فکر ——— ان کے ایسے کارنامے ہیں کہ اب اقبال کے ساتھ ان کا نام ضرور لیا جاتا ہے۔ وہ خود نظم وغزل کے بہت اچھے شاعر ہیں اور تلوک چند محروم جیسی عظیم شخصیت کے فرزند ہیں۔ ان کے تمام کارناموں کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ حالانکہ کئی یونیورسٹیوں میں ان پر تحقیقی مقالے لکھے جارہے ہیں لیکن وہ کب مکمل ہوں گے اور کب منظر عام پر آئیں گے نہیں کہا جاسکتا۔

ڈاکٹر خلیق انجم مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے تین سو تیس ۳۳۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب مرتب کی ہے۔ اس میں شخصیت، شعریات، اقبالیات، نثریات، منظومات اور انٹرویو شامل ہے اور تمام تحقیق کرنے والے، طالب علموں کے لیے یہ بہت مفید اور پر از معلومات ہے۔ شخصیت پر جو مضامین لکھے گئے وہ شاید بہت سیر حاصل نہیں ہیں۔ شعریات پر قاضی عبدالغفار، علامہ سیماب اکبرآبادی کی بہت مختصر تحریریں بھی طویل مضامین پر بھاری ہیں، اقبالیات کے سلسلے میں بھی صباح الدین عبدالرحمن کا اختصار میر کی چھوٹی بحر کا ایک شعر معلوم ہوتا ہے۔ نثریات میں رشید حسن خاں کا مضمون حاصلے کی چیز ہے

جگن ناتھ آزاد کی منظومات اور ان کے انٹرویو سے ان کی شخصیت کے بہت سے گوشے ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ سرورق پر ڈاکٹر تاثیر، پروفیسر احتشام حسین مولانا عبدالماجد دریابادی اور نیاز فتحپوری کے مختصرات اپنے اندر معنی و مفاہیم کی ایک دنیا آباد کیے ہوئے ہیں اور جگن ناتھ آزاد کے فکر و فن اور ان کے علمی اکتسابات پر بھرپور روشنی ڈالتے ہیں۔

اس کتاب میں آرٹ پیپر پر مشتمل اسّی صفحات ہیں۔ تصاویر، کچھ اہم یادداشتیں، ان کی زندگی کے حالات، با اثر شخصیتوں کے ساتھ ان کی تصاویر بھی نظر آتی ہیں۔ تصاویر میں بہت سارے اقبال شناس بھی ہیں اور ہیم وتی نندن بہوگنا، ایل کے ایڈوانی اور محترمہ اندرا گاندھی بھی۔ حیرت انگیز طور پر ان کی کوئی تصویر جوش ملیح آبادی اور مرتب ڈاکٹر خلیق انجم کے ساتھ نہیں ہے۔ راقم الحروف نے بہت پہلے "آجکل" یا "بساطِ عالم" کے فائل میں جوش کے ساتھ ان کی تصویر دیکھی تھی۔ کاغذ، کتابت اور طباعت معیاری ہے۔

ـــــــــ ڈاکٹر نہال احمد صدیقی

نام کتاب : "اعتبارِ فن" (شعری مجموعہ)
شاعر : خلش گونڈوی   قیمت : ۲۵/- روپے
ملنے کے پتے : (۱) بزمِ اردو ۔ سیتاپور
(۲) محمودیہ کتب خانہ ۔ بٹس گنج ۔ سیتاپور

جناب خلش گونڈوی بزرگ، کہنہ مشق شاعر اور صوفی منش انسان ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب "اعتبارِ فن" خلش گونڈوی کا پہلا مجموعہ کلام ہے جو ان کی نصف صدی سے زائد کی شعری کد و کاوش کا مظہر ہے۔

"اعتبارِ فن" میں حمد و نعت کے بعد ۵۰ غزلیں اور ۱۰۰ قطعات ہیں۔ روایتی مضامین حسن و عشق، گل و بلبل، جام و پیمانہ اور شمع و پروانہ وغیرہ کثرت سے نظم کیے گئے ہیں۔ آپ نے اپنے شعروں میں جذبات و خیالات پیش کر دینے کو ہی کافی سمجھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں فکر و فن کا فقدان ہے۔ کلام میں عروضی اور فنی غلطیاں در آئی ہیں۔ خلش صاحب بڑے مزے سے بندشِ زبان و بیان، مؤنث و مذکر اور واحد و جمع کی آزادی کے ساتھ اپنی بات اشعار کے پیکر میں ڈھال کر اعتبارِ فن قائم رکھے ہوئے ہیں

شعر ملاحظہ ہوں ؎

یہ لعل و گہر جن کے لیے جلاد رہیں گے
بیکار نہ خونِ دلِ برباد رہیں گے

ـــــــــ

ہے عجب کاٹ ترے تیرِ نظر کا قاتل
زخم سلتے پڑے ناسور نظر آتے ہیں

کاغذ، کتابت اور طباعت بہت معمولی ہیں۔

ـــــــــ مخمور کاکوروی

نام کتاب : "دوسرا شجر"
شاعر : شجاع خاور   قیمت : ۲۵/- روپے
ملنے کا پتہ : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ۔ ۳۱۰۸ گلی عزیز الدین کوچہ پنڈت ۔ لال کنواں ۔ دہلی

شجاع خاور ایک صاحبِ طرز غزل گو کی حیثیت سے معروف ہیں، ان کی یہ طویل رزمیہ نظم تقریباً چھ سو مصرعوں پر مشتمل ہے جو "دوسرا شجر" کے نام سے کتابی صورت میں پہلی بار ۱۹۷۰ء میں چھپی اور اب دوسری بار ۱۹۹۳ء میں شائع ہوئی ہے۔ یہ نظم نقلِ آدم کے محور پر گردش کرتی ہے۔ انور صدیقی کے لفظوں میں :

"شجاع خاور نے دوزخ، جنت، شجرِ ممنوعہ، گناہِ اوّلیں اور زوالِ آدم کی مسیحی تمثیل کو اس نظم میں استعمال کیا۔ اس لحاظ سے نظم اپنے ڈھانچے کے اعتبار سے مسیحی ہے۔ انھوں نے اس تمثیل سے صرف ایک طرح تخلیقی استفادہ کیا ہے۔ تخلیقی استفادے سے مراد یہ ہے کہ انھوں نے ایک جدید صورتِ حال کی ترسیل کے لیے ایک قدیم مسیحی تمثیل کو اختیار کیا ہے۔ اس نظم میں اس تمثیل کی صرف علامتی یا استعاراتی اہمیت ہے۔ جدید فنکاروں میں قدیم اساطیر کے استعمال کا جو رجحان ہے یہ نظم بھی اس کی نمائندگی کرتی ہے۔"

خود شجاع خاور اس تخلیق کے بارے میں کہتے ہیں :

منی جون ۱۹۶۸ء میں بی۔اے آنرز کے دوسرے سال کا امتحان دینے کے بعد گرمیوں کی سالانہ چھٹیوں میں "دوسرا شجر" کے بنیادی خیال کو رخت سفر میں ڈال کر میں بارہ مولہ (کشمیر) پہونچ گیا اور وہاں چھ ہفتے مقیم رہا (وہاں میری حقیقی خالہ اپنے گھر بار کے ساتھ اب سے تقریباً تیس سال پہلے سے سکونت پذیر ہیں) جولائی ۱۹۶۸ء میں جب مکمل نظم کشمیر سے اپنے قلیل سامان میں باندھ کر لوٹا تو جونشہ مجھ پر طاری تھا، وہ خدا ہر شاعر پر طاری کرے۔"

یہ طویل نظم شجاع خاور کی اولین تخلیقات کا ایک اہم حصہ ہے۔ جب شاعر جواں سال تھا اور اس کی شعری عمر پانچ چھ برس کی تھی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ اس نظم کے بعد ہی غزل گو کے روپ میں جانے پہچانے گئے مگر اس نظم میں بہت سے مصرعے ایسے ملتے ہیں جو ان کے مستقبل کی طرف واضح اشارہ کرتے ہیں:

رقابت کا ابھی بھی کچھ یہیں آغاز کرنا تھا

مگر اس نے ہماری آن کو مجروح کر ڈالا

یہ پھر بھی نقش اول ہے وہ پھر بھی نقش ثانی ہے

نظم سے غزل کی طرف شجاع خاور کا سفر معنی خیز ہے۔ مذکورہ طویل نظم کو پڑھے بغیر ہم اس فن کار کی شخصیت کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتے۔ یہ نظم شاہکار نہ ہوتے ہوئے بھی بڑی اہم ہے۔ طویل نظموں کی بات جب بھی آئے گی تو "دوسرا شجر" کا ذکر ناگزیر ہے۔ کتابت، طباعت، کاغذ معیاری ہے اور کتاب کا گٹ اپ پُرکشش۔

——— سہیل احمد

نام کتاب: "آب و رنگ" (شعری مجموعہ)
شاعر: سید محمود الحسن قیصر امروہوی
قیمت: ۸۵/- روپے۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اُردو بازار، جامع مسجد، دہلی

امروہہ (ضلع مرادآباد) عہد قدیم سے علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے اس گہوارۂ شعر و ادب میں ایسی ایسی شخصیتوں نے جنم لیا ہے جس پر اُردو دُنیا بجا طور پر فخر کرتی ہے۔ سید محمود الحسن قیصر امروہوی کا تعلق بھی اسی مقام سے ہے۔

قیصر امروہوی نے بقول خود ان کے، شاعری کی ابتدا چھ برس کی عمر سے ہی کر دی تھی، ان کا مجموعہ "آب و رنگ" ان کے ۶۵ سالہ شعری سفر کا پڑاؤ ہے۔

"آب و رنگ" قیصر امروہوی کی فنی پختگی اور شاعرانہ صلاحیت کا واضح عکس ہے۔ اس مجموعہ کو موضوع کے لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں رومانی نظمیں اور غزلیں ہیں جن میں انھوں نے داخلی کیفیات اور جذبات کی بہترین ترجمانی کی ہے ؎

پلکوں سے آئی ٹوٹ کے اشکوں کی جولڑی

دامن کو لالہ زار بناتی چلی گئی

غزلوں کے علاوہ نظمیں: ساون کی گھٹا۔ آؤ سکھی برسات منائیں! ہم سے چُھٹ کر جی نہ کڑھانا۔ دُلہن کا پیام دُولھا کے نام وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جو قیصر امروہوی کے انفرادی لب ولہجہ کی عکاسی کرتی ہیں۔

ان کے کلام میں بے انتہا تاثیر ہے۔ ان کی امتیازی خصوصیت ان کا طرزِ بیان ہے۔ انھوں نے مناظر قدرت کے بہترین نقشے بھی اپنی نظموں میں پیش کیے ہیں۔

مجموعہ کا دوسرا حصہ قصائد، مراثی و منقبت پر مشتمل ہے۔ اس میں قیصر امروہوی نے اپنی عقیدت کے پھول کھلائے ہیں۔

——— اخلاق احمد

اپنے معاونین سے

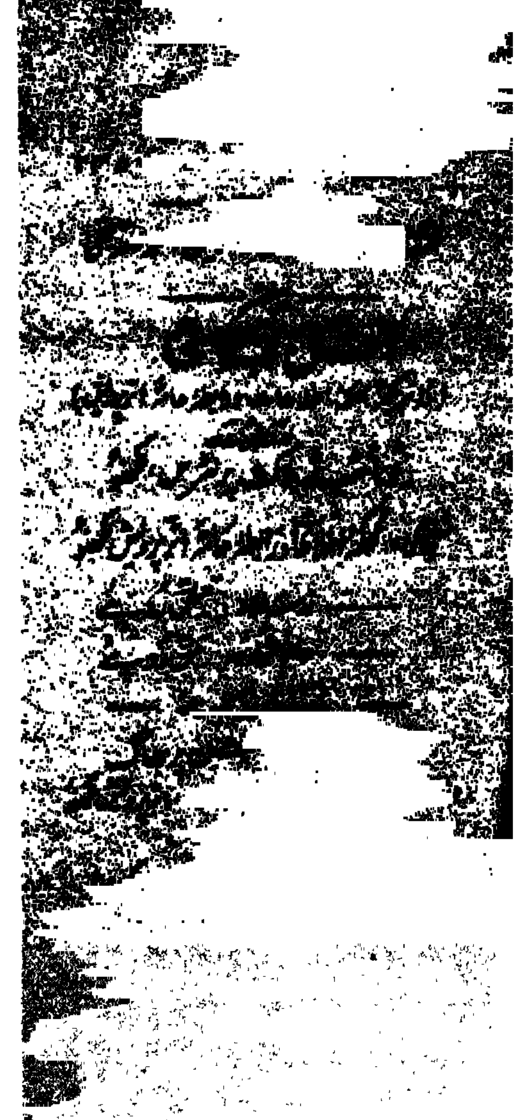
(۱) اہل قلم حضرات اپنی تخلیقات فل اسکیپ کاغذ کے ایک ہی طرف تحریر کریں اور بغرض اشاعت ادارے کو اصل کاپی ہی بھیجیں زیراکس کاپی اپنے پاس محفوظ کرلیں۔

(۲) شعراء حضرات سے گزارش ہے کہ وہ ایک کاغذ پر ایک ہی غزل / نظم تحریر کریں۔ تحریر کا صاف اور خوش خط ہونا ضروری ہے۔

——— ایڈیٹر

جلد نمبر (۲)

مئی ۱۹۹۴ء



عنوانات

اپنی بات	ایڈیٹر	۲
تیری آواز (نظم)	(انجہانی) جاوید وششٹ	۳
مختصر سوانحی خاکہ	راج بہادر گوڑ	۴
غزلیں	مظفر حنفی	۹
	بشیر بدر	۹
	خورشید افسر بسوانی	۹
ہندستان کا پہلا شہید صحافی : مولوی محمد باقر	پروانہ ردولوی	۷
غزلیں	شبنم نقوی	۱۱
	شاہد ماہلی	۱۱
	تسنیم فاروقی	۱۱
اودھ کے چند ممتاز علماء (۳)	سبط محمد نقوی	۱۲
غزل	انور ندیم	۱۹
غزلیں	منصور عثمانی	۲۰
	سلمان عباسی	۲۰
	جوہر بجنوری	۲۰
لکھنؤ کی پھبتیاں	اظہر مسعود	۲۱
غزل	ملک زادہ جاوید	۲۳
جرم (نظم)	تشید قریشی	۲۴
دہلیز "	رؤف صادق	۲۴
مشورہ "	رزاق افسر	۲۴
لکھنؤ دو سو برس پہلے	ڈاکٹر شاہ عبدالسلام	۲۵
غزلیں	واصف عابدی۔ فوق کرہی	۲۹
	ظفر اقبال۔ اسلم سیتاپوری	۲۹
رشتے (افسانہ)	صبیحہ انور	۳۰
غیر متوقع (نظم)	عارف ایوبی	۳۳
تضاد "	عامر ریاض	۳۳
معصوم تلاش "	نیر جلالپوری	۳۳
لکھنؤ کے چند عربی ادباء و شعراء	ڈاکٹر احمد نسیم صدیقی	۳۴
غزل	وجاہت علی سندیلوی	۳۶
اودھ کے نوابی عہد میں سائنس اور تکنیک کا فروغ	ڈاکٹر تقی علی عابدی	۳۷
غزلیں	افتخار احمد زیدی۔ مسعود کلیم	۳۹
	سلیمان صدیقی۔ نظر لکھنوی	۳۹
	محمود الحق محمود۔ وصی جونپوری	۳۹
بیگم اختر	عطیہ بانو علوی	۴۰
نقد و تبصرہ	عمر انصاری۔ امیر احمد صدیقی۔ احمد ابراہیم علوی	۴۴
	علی باقر زیدی۔ رضوان حیدر۔ اقبال احمد اعجازی	۳
	ماہناز رضوی۔ سیما رضوی۔ لئیق رضوی	۴۸

اپنی بات

یوں تو "یکم مئی" عالمی برادری میں مزدوروں کا مقدس تہوار سمجھا جاتا ہے لیکن اسی کے ساتھ ہندستان کی جنگِ آزادی کا نقطۂ آغاز ماہِ مئی ۱۸۵۷ء ہے۔ اس جنگِ آزادی کے مجاہدین میں رانی لکشمی بائی، بیگم حضرت محل، مولوی احمد اللہ شاہ، نانا صاحب وعندیہت جنرل بخت خاں، تاتیا ٹوپے اور اسی طرح کے ہزاروں لاکھوں افراد تھے جنھوں نے آزادی کی خاطر مادرِ وطن کے حضور میں اپنی جانوں کا نذرانہ ہنستے کھیلتے پیش کیا تھا اور اس زمانے کی مخصوص اصطلاح میں "سربلند" ہوئے تھے۔ اس جہدِ آزادی نے دُنیا کی تمام اقوام کو متاثر کیا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں ہندستان کو آزادی ملی تھی۔ آج اسی تاریخ کو یاد کرتے ہوئے بین الاقوامی منظرنامے پر جب نظر پڑتی ہے تو یہ خوش گوار احساس ہوتا ہے کہ اسی مئی کے مہینے میں جنوبی افریقہ نے سیکڑوں برس کی بدترین نسل پرستی سے چھٹکارا حاصل کرکے مئی کے اِس مہینے کو یادگار بنادیا ہے۔ اور اسی مہینے میں فلسطینیوں کی جدوجہد بھی ایک منزل تک پہونچی ہے۔ اور ہزاروں فلسطینی عوام نے اندرونی خود مختاری حاصل کرتے ہوئے آزادی کی لذّت سے ہمکنار ہوکر اسی مہینے کو عالمی تاریخ میں بھی اہم ترین تاریخ بنادیا ہے۔

ہم ۱۸۵۷ء کے شہیدوں کو یاد کرتے ہوئے افریقہ کے بہادر عوام کو بھی خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے انھیں یاد دلانا چاہیں گے کہ ہمارے ہی ملک کے عظیم فرزند مہاتما گاندھی نے تقریباً ایک صدی قبل نسل پرستی کے خلاف جہاد کا آغاز کیا تھا اور اس موقع پر ہم فلسطینی عوام کو بھی خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں اور دُعا کرتے ہیں کہ وہ اپنی منزلِ تمنّا تک جلد سے جلد پہونچیں۔ اس لیے کہ مولانا آزاد کے لفظوں میں "اندھیرا چھٹ گیا ہے سورج چمکنے والا ہے" اور کاروانِ منزل قریب آپہونچا ہے۔

□ زبان کے پس منظر میں تہذیب ہوتی ہے اور زبان کا فروغ اور ترویج سماج کو صحت مند فکر کے ساتھ ضروری معاشی مضبوطی بھی عطا کرتا ہے اگر زبان کی ترقی نہیں ہے تو پھر وہ معاشرہ گونگا ہو جاتا ہے۔ اُردو بھی اس ملک کی ایک زبان ہے اور ہندستان کی اس تہذیب کی علامت ہے جس کی بنیاد محبّت پر ہے۔ یہ اور بات ہے کہ محبتوں کی اس زبان کو ابھی تک اترپردیش میں وہ کچھ نہ ملا تھا جس کی یہ مستحق تھی۔

اترپردیش، جو ہندستان کا دل ہے، وہ اُردو زبان وادب کا بھی دل رہا ہے اس کی ہر دھڑکن ہندستان کے مزاج کی آئینہ دار رہی ہے۔ ہندستان کی تمام ریاستوں کے مقابلے میں اترپردیش میں اُردو بولنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یہ بڑی خوشی اور مسرت کی بات ہے کہ موجودہ ریاستی حکومت نے جناب ملائم سنگھ یادو کی سربراہی میں جہاں بہت سارے فلاحی پروگرام پیش کیے ہیں وہاں اُردو کا رشتہ روزی روٹی سے جوڑنے کے لیے مناسب، برمحل اور موزوں اقدامات کیے ہیں۔ ان اقدامات کی بنیاد پر تمام سرکاری دفاتر میں بلاک سطح سے لے کر صدر دفاتر تک ایک ایک اُردو مترجم کا تقرر کیا جائے گا تمام پرائمری اسکولوں میں ایک ایک اُردو ٹیچر مقرر کیا جائے گا۔ ان اقدامات کے نفاذ کے بعد ہمیں یقین ہے کہ اُردو کے فروغ اور اس کی ترویج کے ساتھ بہت سے اہم مسائل بھی حل ہوسکیں گے۔

□ اودھ نمبر کی اشاعت میں تاخیر ہوئی لیکن بقول غالب: "ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا" ہماری ہندستانی روایت کے مطابق دیرآید درست آید کے مصداق اس کا پرجوش خیر مقدم کیاگیا۔ انشاء اللہ آئندہ شمارہ میں آپ اودھ نمبر کے سلسلے میں ایک دوسرے کے تاثرات سے واقف ہوسکیں گے۔ ہم یقین دلاتے ہیں کہ نیا دور اپنی عظیم اور سُنہری روایات کی پاسداری کرتے ہوئے اسی طرح اہم موضوعات پر یادگار دستاویزی نمبر پیش کرتا رہے گا۔

——— ایڈیٹر

تیری آواز

ڈاکٹر جاوید وشِشٹ نے یہ نظم اکتوبر ۱۹۹۳ء میں ارسال کی تھی لیکن تخلیقات کی زیادتی کی وجہ سے اس کا نمبر نہیں آسکا تھا۔ افسوس ہے کہ اب وہ اسے شائع شدہ شکل میں دیکھنے کے لئے ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔

—— ایڈیٹر

(۱)

وادیِ گل سے
کبھی تو نے پکارا تھا مجھے
خارزاروں نے سُنی تیری صدائے دمساز!
پھُول ہی پھُول کھِلے
دُور تلک راہوں میں
ایک اک خار تھا جیسے کوئی شاداب گلاب

(۲)

تیری آواز
ابھی گونج رہی ہے دل میں
نغمگی سے
تری آواز کے جادو میں ابھی
تیری آواز
ابھی گھولے ہے رس کانوں میں
شہد کی بوند ٹپکتی ہو کنول پر جیسے
سوم رس جیسے پیسے چندر کرن لہرا کر
جھُوم کر
جھیل کی موجوں میں تھرکتی جائے
دُور
موجوں سے نمودار گندھرو کوئی
جل پری ساتھ لیے
ہاتھ میں چاندی کا ستار
تیری آواز سے ہر ساز ہم آہنگ ہوا
راگنی سجنے لگی
سج گئے سُر سرگم کے

(۳)

تیری آواز نے بخشا ہے مرے دل کو سکوں
تیری آواز پہ رقصاں ہے ، دل کی دھڑکن
ہر نفس نغمہ سرا
سازِ جنوں پر پیہم
تیری آواز میں مدغم ہے وجودِ شاعر
تیری آواز مرے گیت میں ڈھل جاتی ہے
سازِ انفاس پہ سنگیت میں ڈھل جاتی ہے

(۴)

تیری آواز ستاروں کو چمک دیتی ہے
تیری آواز ہی پھولوں کو مہک دیتی ہے
پیار کی پیاس میں تجھی کو چھک دیتی ہے
اور برسات کے منظر کو دھنک دیتی ہے

(۵)

جب بھی ہر قطرۂ شبنم پہ کرن سورج کی
جگمگاتی ہے تو جلتے ہیں کنول یادوں کے

(۶)

آتشِ گل سے چمن جلوۂ صد طُور ہوا
موج در موجِ صبا
نکہتِ گل کے ہمراہ
کاروانِ رنگِ بہاراں کا لیے ساتھ چلی
بھیرویں چھیڑ دی
لہرا کے عروسِ گل نے
ہو گئی بزمِ سحر رنگ فشاں، نور فشاں
اور پھر
تیری صدا گونج کے لہرا اُٹھی

(۷)

ہمکلام آج بھی ہے جام سے پھر تشنہ لبی
ہو گئی اور فزوں شام سے پھر تشنہ لبی
تیری آواز سے
میخانۂ دل گونج اٹھا
پھر وہی کیف برستا ہے صدا سے تیری

(۸)

تیری آواز
رگ و پے میں سرایت کر کے
میرے احساس کو پُر نور بنا دیتی ہے
جذبۂ عشق کو مغرور بنا دیتی ہے
درد کو عشق کا دستور بنا دیتی ہے

(۹)

تیری آواز
سکوتِ شبِ تنہائی میں
خود کلامی کے نئے دیپ جلا دیتی ہے

□□

(آنجہانی) ڈاکٹر جاوید وشِشٹ
وشِشٹ آشرم ۔ نچولی بلوچ
فرید آباد ۔ ۱۲۱۰۰۴

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ
چینلی کا نشٹر دان ۹۹-۱/۱۰-۱۰-۱ سوریہ نگر
حیدرآباد

سوانحی خاکہ

نام: راج بہادر گوڑ
ولد: رائے محبوب رائے گوڑ
تعلیم: ایم۔ بی۔ بی۔ ایس (عثمانیہ)
پیدائش: گولی پورہ، حیدرآباد شہر۔ ۲۱، جولائی ۱۹۱۸ء

میرے دادا رائے ہری پرشاد گوڑ اپنے دو چھوٹے بھائیوں رائے بدری پرشاد گوڑ اور رائے جمنا پرشاد گوڑ اور چھوٹی بہن گومتی بی بی کے ہمراہ ۱۸۵۰ء کے آس پاس حیدرآباد آئے اور یہیں شادی بھی کی اور ملازمت بھی۔ سب سے بڑے بھائی رائے کاماتا پرشاد گوڑ اور بہن شریمتی گوداوری بی بی آبائی موضع کشن پور گوسائیں گنج ضلع فیض آباد میں رہ گئیں۔ اسی گاؤں سے متصل دوسرا گاؤں ہے جہاں گوداوری بی بی رہتی تھیں۔ سرجوندی ہمارے گاؤں سے کچھ ہی فاصلے پر بہتی ہے۔

میرے والد اور چچا سب کے سب یہیں پیدا ہوئے۔ میرے والد کی شادی کیتھولی ضلع بنارس میں رائے ونایک پرشاد کی بیٹی امراوتی بی بی سے ہوئی اور میرے ماموں رائے جگدمبا پرشاد کی شادی کامتا پرشاد کی بیٹی سے ہوئی۔

مجھ سے بڑی ایک بہن تھی اور چھوٹا ایک بھائی۔ ان دونوں کا انتقال ہوگیا، اور میری ماں بھی رحلت فرما گئیں۔

میرے والد نے ۱۹۳۰ء کے آس پاس رائے منوہر راج سکینہ ایڈوکیٹ کی بہن شریمتی گرجا بی بی سے دوسری شادی کرلی۔ ان سے میرے تین بھائی اور تین بہنیں ہیں۔

میں ۱۹۳۶ء میں میٹرک اول درجے میں کامیاب ہوا اور ۱۹۳۸ء میں انٹرمیڈیٹ کیا۔ پھر میڈیکل کالج میں شریک ہوگیا۔ مجھے اپنے سارے تعلیمی دور میں برسوں وظیفہ تعلیمی ملتا رہا۔

اردو ادب کا ذوق میرے اندر دو وجہوں سے پیدا ہوا۔ ایک تو میٹرک کی کلاسوں میں میرے استاد تصدق حسین صدق جائسی تھے۔ یہ تھے تو قدیم کلاسیکی اسکول کے شاعر لیکن شعر فہمی کا ذوق اور شعر کی تہہ تک پہونچنے کی کاوش انھیں کی دین ہے۔ انھیں الفاظ کے کھلواڑ بہت پسند تھے مگر کھلواڑ میں مطلب بھی ہو۔ یہ شعر ہے

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائیگا

انھیں اس لئے پسند تھا کہ اس کی معنویت پر گہری رومانیت چھائی ہوئی تھی اور اس لئے بھی کہ "یاد" اور "بھلا" کے تضاد کو خوب نبھایا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ میرے چچا رائے محبوب نارائن گوڑ شستہ ادبی ذوق رکھتے تھے اور میں ان ہی کے ساتھ رہتا تھا۔ مگر انھیں بھی مرصع اور مقفیٰ عبارت پسند تھی۔

اپنے تعلیمی وظیفے سے پیسے بچا کر میں نے اپنے گھر پر ہی ایک دارالمطالعہ قائم کر رکھا تھا۔ یہاں اخبارات اور رسائل آتے تھے۔ روزنامہ 'پیام' نے ہمارے سیاسی اور ادبی ذوق کو سنوارا۔ میں قاضی عبدالغفار کو اس معاملے میں اپنا استاد سمجھتا ہوں۔

اس کے علاوہ الہ آباد سوشلسٹ بک کلب کی مطبوعات اس زمانے میں نظر سے گزریں۔ ایم۔ این۔ رائے کا ہفتہ وار 'انڈی پنڈنٹ انڈیا'، اور اشوک مہتا کا ہفتہ وار کانگریس سوشلسٹ یہیں پڑھنے کو ملے۔

نیاز فتحپوری کا رسالہ "نگار" ہم نوجوانوں میں بہت مقبول تھا۔ اس رسالے نے ہمارے اندر شستہ سیاسی اور سماجی شعور بیدار کیا۔ سیکولرازم اور ریشنلزم کے سبق سکھائے۔

میٹرک میں پہونچتے پہونچتے جواہر لال نہرو سیاسی منظر پر چھائے ہوئے

تھے اور ان کی خود نوشت سوانح حیات شائع ہوئی تھی۔ اسی وقت اسے پڑھ ڈالا۔

اسی زمانے (۳۶-۱۹۳۴ء) میں جامعہ عثمانیہ کے حصول تعلیم کے بعد روزگار کے طالب نوجوانوں نے ملکی تحریک شروع کی۔ بات یہ تھی کہ حیدرآباد میں فارسی اور پھر اُردو سرکاری اور عدالتی زبانیں ہیں۔ دارالترجمہ قائم ہوا۔ ان سب آسامیوں کو پُر کرنے کے لئے یوپی اور بہار سے اُردو داں حضرات کو بلایا گیا اور جب حیدرآباد میں خود تعلیم یافتہ نوجوان آگے آئے تو انھیں جگہیں پہلے سے پُر ملیں۔ اور ویسے بھی اعلیٰ درجوں میں کامیاب ہونے والے متوسط طبقے کے نوجوانوں پر اعلیٰ عہدوں کے لئے نوابوں اور جاگیرداروں کے کمتر درجوں میں کامیاب امیدواروں کو ترجیح دی جاتی تھی۔

حیدرآباد کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ یہ ایک دیسی ریاست تھی اور اقتدار اعلیٰ برطانوی سرکار کو حاصل تھا۔ ایسے میں دو سیاسی رجحان عام تھے ایک تو وہ تھا کہ اقتدار اعلیٰ آصف جاہی بادشاہوں کو حاصل ہو۔ اس میں زیادہ تر اعلیٰ طبقات کے لوگ تھے۔ سر نظامت جنگ اس کے سربراہ تھے اور ادارے کا نام "جمعیت رعایائے نظام" تھا۔ دوسرا رجحان جمہوری تھا اقتدار اعلیٰ عوام کو منتقل ہو۔ یہ کانگریسی رجحان تھا اور ذمہ دارانہ حکومت اور شہری آزادیوں کے لئے ۱۹۳۸ء میں شروع ہوئی۔

کانگریس کی تحریک سے پہلے ہی تلنگانہ کے علاقے میں زمینداری نظام کے خلاف جدوجہد پھیلنے لگی تھی۔

یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ریاست حیدرآباد کی عوامی تحریک کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں تین دھارائیں چلتی تھیں۔ ایک تہذیبی دھارا تھی تلگو، مراٹھی اور کنڑی زبان و تہذیب کی حفاظت اور اس کا فروغ، دوسری سیاسی جمہوری دھارا اور تیسری دھارا زرعی اصلاحات کی تھی۔

۱۹۴۸ء میں پولیس ایکشن کے ساتھ جاگیرداری نظام کے خاتمے سے اور بالآخر زرعی اصلاحات اور ۱۹۵۶ء میں ریاست کے ٹوٹنے اور متحدہ تلگو، مراٹھی اور کنڑی ریاستوں کے وجود میں آنے سے اس تحریک کو کامیابی نصیب ہوئی۔

میں نے اسٹیٹ کانگریس کی ستیہ گرہ کے واپس لے لیے جانے کے بعد کامریڈز ایسوسی ایشن میں شرکت کرلی۔ اسے کچھ نوجوانوں نے قائم کیا تھا۔ پھر ۱۹۳۹ء میں کمیونسٹ پارٹی میں شریک ہوگیا۔

ٹریڈ یونین تحریک سے میرا تعلق ۱۹۳۹ء میں ہی ہوگیا تھا جبکہ میں ابھی میڈیکل کالج میں پڑھتا تھا۔ میں نے ایم بی بی ایس ۱۹۴۳ء میں کیا۔ ۱۹۳۸ء میں اورنگ آباد میں منعقدہ لیبر کانفرنس میں شرکت کی۔ ۱۹۴۲-۴۰ء میں جو ہڑتالیں ہوئیں ان میں کام کیا۔ متعدد یونینوں سے تعلق تھا اور پھر ۱۹۴۶ء (۱۹ اگست) میں آل حیدرآباد ٹریڈ یونین کانگریس کی بنیاد ڈالی جس کے صدر مخدوم محی الدین تھے اور جنرل سکریٹری میں تھا۔ اس کانفرنس کا افتتاح ملک کے نامور بزرگ ٹریڈ یونین رہنما این۔ ایم۔ جوشی نے کیا تھا۔

اسی سال ۱۶ اکتوبر کو ریاستی حکومت کے استبداد کے خلاف یوم مخالفِ استبداد منایا گیا۔ عام ہڑتال بھی ہوئی۔ بس اسی کے بعد روپوش ہونا پڑا لیکن نومبر ۱۹۴۶ء کو جواد رضوی اور میں گرفتار ہوگئے۔ اب کمیونسٹ پارٹی پر پابندی عائد ہوچکی تھی۔

پھر ہم دونوں ۷ مئی ۱۹۴۷ء کو براہ دواخانہ عثمانیہ جیل سے فرار ہوگئے۔ نظام سرکار کے خلاف جدوجہد تیز سے تیز تر ہورہی تھی جسے دہلی میں ۱۹۴۶ء میں ستمبر میں نہرو کی قیادت میں مشترکہ عارضی حکومت کے قیام سے مزید تقویت حاصل ہوئی۔

میں ۱۹۵۰ء میں گرفتار ہوا اور ۱۹۵۲ء میں راجیہ سبھا کا ممبر منتخب ہونے کے بعد رہا کر دیا گیا۔

۱۹۵۲ء کے بعد آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کا خازن، سکریٹری اور نائب صدر بھی رہا۔ آندھرا پردیش ٹریڈ یونین کانگریس کا جنرل سکریٹری اور صدر بھی رہ چکا ہوں۔

۱۹۵۴ء کے آس پاس پروفیسر آل احمد سرور نے مجھے کل ہند انجمن ترقی اردو کی مجلس عام کا ممبر منتخب کرلیا۔ اس وقت سے دوامی رکن ہوں اور حتی المقدور اُردو کی خدمت کر رہا ہوں۔

قریب قریب اسی زمانے سے حیدرآباد کی انجمن سے بھی متعلق ہوں۔

اُردو زبان میں لکھتا بھی ہوں۔ کچھ تبصرے، تنقیدی مضامین اور اردو زبان کے مسائل اور قانونی موقف پر مضامین لکھے ہیں جو حیدرآباد کے روزنامے سیاست میں، دہلی کے ہفتہ وار 'حیات' میں۔ انجمن کے ترجمان 'ہماری زبان' میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ماہنامہ 'آجکل' دہلی اور نیا دور لکھنؤ میں بھی
(باقی ص۱۰ پر)

غزلیں

کب تک اُڑتی، بیٹھ گئی
سرکش موج، بیٹھ گئی

ہمت ہو یا تیری سوچ
سب میں سردی بیٹھ گئی

بستی میں آیا سیلاب
تُربت میری بیٹھ گئی

گھر اپنا تھا پہلو میں
کِس کی برچھی بیٹھ گئی

جتنی شاخیں جلتی تھیں
ان پر بجلی بیٹھ گئی

حاکم چُپ ہیں ظالم خوش
آخر چوڑی بیٹھ گئی

اس کی قسمت میں ہے تیر
جو مُرغابی بیٹھ گئی

وہ آزادی بنجر ہے
جس پر عرضی بیٹھ گئی

طاق بنایا سینے میں
پھر تاریکی بیٹھ گئی

شعر مظفر خوب کہے
لیکن چھاتی بیٹھ گئی

ڈاکٹر مُظفر حنفی
پروفیسر اقبال چیئر، کلکتہ یونیورسٹی
کلکتہ ۔ ۷۳

دلوں کی گرد کو ہم لوگ صاف کرتے نہیں
عجب مزاج ہے اپنا طواف کرتے نہیں

یہ بے تعلقی چھت لے کے بیٹھ جائے گی
بہت دنوں سے کوئی اختلاف کرتے نہیں

ہر ایک لفظ میں دس بیس لفظ ہوتے ہیں
ذہین لوگ کبھی بات صاف کرتے نہیں

ہمیں اصولوں نے پتھر بنا دیا کیسا
ہم اپنے آپ کو دل سے معاف کرتے نہیں

وہ میرِ وقت ہو یا غالبِ زمانہ ہو
کہ ’ڈیلی کیٹ‘ کا ہم اعتراف کرتے نہیں

سخن جو میر کا ہے میر کو مبارک ہو
کسی کے مال پہ ہم ہاتھ صاف کرتے نہیں

بشیر بدر کے لہجے میں اب وہ کاٹ کہاں
غزل سے دل میں وہ گہرا شگاف کرتے نہیں

بشیر بدر
اے ۱۰، بادشاہ اپارٹمنٹ، کوہ فزا
بھوپال

ساتوں رنگ کھلا نہیں پائے ہم بھی تو
موسم اس کے لا نہیں پائے ہم بھی تو

ڈوبتے کیسے برف جمی تھی دریا میں
سانسوں سے گرما نہیں پائے ہم بھی تو

جس کی تہمت رکھی اپنے بزرگوں پر
وہ دیوار گرا نہیں پائے ہم بھی تو

لڑکے ہم سے پوچھ رہے تھے کون ہیں آپ
برسوں گھر تک جا نہیں پائے ہم بھی تو

کیسے منہ سے ہم اس کو سمجھاتے افسر
دل کا بوجھ اٹھا نہیں پائے ہم بھی تو

خورشید افسر بسوانی
بسواں ضلع سیتاپور
۲۶۱۲۰۱

پروانہ ردولوی
پوسٹ بکس ۲۰۹۳ - بٹلہ نگر، نئی دہلی - ۱۰

ہندستان کا پہلا شہید صحافی مولوی محمد باقر

مولوی محمد باقر ایڈیٹر دہلی اردو اخبار شمالی ہند میں اردو صحافت کے بانی ہی نہ تھے بلکہ ہندوستان کے پہلے شہید صحافی بھی تھے۔ انھوں نے صحافت کے پیشہ کو مجاہدہ میں تبدیل کرنے کا کارنامہ انجام دیا اور اس عمل کی پاداش میں خود اپنا سر قلم کروا دیا۔ اپنے لیے اپنے اہل خاندان کیلیے اور اپنے آقا کے لیے تو سبھی قربانی دیتے ہیں مگر یہ قربانیاں تاریخ میں کوئی نمایاں جگہ نہیں حاصل کرتیں وہی قربانیاں یاد رکھی جاتی ہیں اور تاریخ عالم میں نمایاں جگہ حاصل کرتی ہیں جو اجتماعی میں دی جاتی ہیں۔ جن کا مقصد اپنی ذات یا اپنی ذات سے وابستہ افراد کو فائدہ پہنچانا ہوتا ہے۔ ان قربانیوں میں تاریخ کے لیے کوئی کشش نہیں ہوتی۔

مولوی محمد باقر کا تعلق دہلی کے ایک خوش حال اور مشہور و معروف علمی گھرانے سے تھا۔ ان کے والد ماجد مولانا محمد اکبر صاحب پائے کے مجتہد تھے اور ان کے کاشانہ اجتہاد ہی میں دینی علوم کا ایک مدرسہ بھی قایم تھا جس سے نہ صرف دہلی کے طلبہ بلکہ ملک کے مختلف گوشوں کے طلبہ بھی علوم دینیہ سے اپنی وابستگی اور تعلق کو اپنے لیے فخر و مباہات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

انیسویں صدی کے آغاز کے برسوں میں انگریز کی چھوٹی موٹی ملازمت ہی کو بہت بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ جبکہ وہ تحصیل دار کے عہدے پر فائز تھے لیکن ان کے اندر صحافت کی جو آگ روشن تھی اس نے اور کچھ خاندان اجتہاد سے تعلق ہونے کے سبب نے بھی انھیں تحصیل داری چھوڑنے پر اکسایا۔ یقیناً وہ ملک و ملت کی خدمت کا ایک تعمیری تصور رکھتے تھے لہذا وہ تحصیل داری کو لات مار کر اپنے والد گرامی مولانا اکبر علی مجتہد کے ساتھ علوم دینیہ کی ترویج میں معروف ہوگئے۔

۱۸۳۶ء میں انھوں نے "دہلی اردو اخبار" کے نام سے ایک ہفت روزہ شروع کر دیا اور اردو کے نثری ادب کو باقاعدہ شکل دینے کے ساتھ ہی آنے والی اردو کی ادبی اور صحافتی نسلوں کے لیے کچھ ایسے معیارات قایم کر دیے جن کو آج تک توڑنے کی ہمت کسی میں نہیں پیدا ہوسکی ہے

مولوی باقر نے اردو صحافت کے وسیلہ سے اردو ادب کی آبیاری کرنے میں جو قائدانہ کردار ادا کیا ہے اس سے انکار کوئی بے بصیرت شخص ہی کر سکتا ہے سچ تو یہ ہے کہ جدید نثر کے معماروں میں انھوں نے اپنے لیے جو جگہ بنائی اسے آج تک کوئی دوسرا شخص حاصل نہیں کر سکا ہے۔ اور اردو عبارت کی تنظیم میں انھوں نے جو قائدانہ کردار ادا کیا ہے اس سے انکار کی جرأت آج تک کوئی بھی نہیں کر سکا ہے۔

مولوی باقر نے اپنے اخبار کے ذریعہ عبارت کی تنظیم ہی کا کارنامہ نہیں انجام دیا بلکہ اصلاح معاشرہ، قومی وقار کے اظہار، فرقہ وارانہ فسادات کی مذمت اور سرکاری عملہ کی بدعنوانیوں کو طشت از بام کرنے، جرائم کی روک تھام میں ذمہ داروں کی ناکامی، اور ہندوستان عملہ کو ناحق بدنام کرنے والوں کی قلعی کھولنے کی خدمات بھی انجام دیں۔ انھوں نے صرف ادبی اور سیاسی خبروں یا مضامین ہی کو اپنے اخبار میں جگہ نہ دی بلکہ اصلاح معاشرہ اور تعلیمی اداروں کی خبروں کو بھی نمایاں طور پر شایع کیا۔

غالب اور ذوق کے گروہوں میں باہمی کشمکش کو دہلی اردو اخبار نے جس انداز میں پیش کیا اس سے مولوی باقر کی جدت پسندی کا بھی اظہار ہوتا ہے اور ان کے دور کی سماجی کشمکش پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

غالب جتنے اچھے شاعر تھے اتنے اچھے انسان نہ تھے۔ ان کے کردار میں جو خوبیاں آج نظر آتی ہیں وہ ان کے دور میں برائیاں سمجھی جاتی تھیں۔ مثلاً جوا، شراب، آشنائی اور شیخی بگھارنا وغیرہ وغیرہ۔ اور غالب ٹھہرے اپنے زمانے کے ترقی پسند انسان۔ ذوق کے گروہ سے غالب کے گروہ کی کشمکش کے جہاں دوسرے اسباب تھے وہیں ایک بڑا سماجی سبب بھی تھا۔ غالب اور غالب والے، ذوق اور ذوق والوں کو فکری طور پر پسماندہ، روایت پرست اور نئی تہذیب سے ناآشنا قرار دیتے ہوئے غیر متمدن سمجھتے تھے جب کہ ذوق اور ذوق والے غالب اور ان کے گروہ کو ہر محاذ پر بدنام کیا کرتے تھے۔ غالب اور ان کا گروہ خاص طور سے دہلی کے مذہب پسند اور حریت پسند حلقوں میں بھی کافی

پسند کیا جاتا تھا مذہب پسندوں اور حریت پسندوں کے اس گروہ میں خاندانی اجتہاد پیش پیش تھا جس کی ایک نمایاں فرد مولوی باقر بھی تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب غالب کے مکان پر پولس نے چھاپہ مارا اور غالب سمیت جواریوں کے ایک گروہ کو گرفتار کرلیا تو صالح بنیادوں پر معاشرہ کی تعمیر کے خواہاں طبقات اور حریت پسندوں میں کافی مسرت کا اظہار کیا گیا۔ اور دہلی اردو اخبار میں مولوی باقر نے ایسی خبر کو تفصیل سے شائع کیا تاکہ اپنے حلقۂ اشاعت کے لوگوں یعنی اپنے قارئین کو تمام حالات سے باخبر کیا جاسکے۔

عبدالسلام خورشید نے اپنی کتاب "صحافت پاکستان و ہند میں" کے ایک باب میں لکھا ہے کہ دہلی اردو اخبار کی خبر کا انداز معاندانہ تھا۔ لیکن ہمارے خیال میں ان کا یہ تبصرہ حقیقت پسندانہ نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے خبر کافی تفصیل سے چھاپی گئی تھی اور اس میں ایسی حقیقت کا ذکر کر دیا گیا تھا کہ مرزا نوشہ کے گھر سے اکثر قمار باز پکڑے گئے ہیں؟ اگر یہ معاندانہ الزام ہوتا تو غالب ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کرتے۔ مگر ان کی جانب سے ایسا نہ کیا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ غالب کا گھر اس دور کے حساب سے "برائی کے اڈے" کے طور پر مشہور ہو چکا تھا۔ مبصرین کا خیال ہے کہ مولوی باقر کی صحافت میں "تمناؤ" کے عنصر کو تلاش کرنا اردو صحافت کے ابتدائی حسن کو مسخ کرنے کے مترادف ہے مرد ہر کے بیباک صحافیوں پر اس طرح کے الزامات لگتے رہے ہیں۔

یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ اردو صحافت اور اردو صحافیوں کی قسمت میں ازل ہی سے عذاب لکھ دئے گئے ہیں۔ اس کی وجہ وہ صحافتی مزاج ہے جو ایک حد تک تو کسی کا رعب برداشت کر سکتا ہے مگر جب یہ حد ٹوٹ جاتی ہے تو انجام سے بے پرواہ ہو کر قلم چل پڑتا ہے اور قلم چلتا ہے تو دوست اور دشمن میں کوئی فرق نہیں کرتا۔

عبدالسلام خورشید نے غالب کی گرفتاری کے سلسلے میں تو مولوی باقر پر معاندانہ روش اختیار کرنے کا الزام لگا دیا لیکن حکیم شریف الدین کو ہٹا کر حکیم احسن اللہ خاں کو شاہی طبیب بنائے جانے پر مولوی باقر کے اخبار "دہلی اردو اخبار" نے جو خبر شائع کی تھی اس پر اس طرح کا کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

دہلی اردو اخبار کے ۲۲ر فروری ۱۸۴۰ء کے شمارے میں اس سلسلہ میں یہ خبر شائع ہوئی تھی "ایک حکیم قدیمی سالہا سال کا جو مدت ہائے مدید سے مزاج دان حضور والا کا ہے وہ پسپا ہو جائے اور راضی پڑے اور یہ شخص غالب آوے

اور اس شخص کو [illegible] سے دیکھا جائے تو غالب والی خبر سے زیادہ سخت یہ خبر ہے وہ خبر تھی اور یہ تبصرہ ہے اور اس کا انداز کسی حد تک معاندانہ بھی کہا جاسکتا ہے مگر چونکہ ایسی خبریں جو ان میں پوشیدہ ہیں وہ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کی ناکامی کے بعد صحیح ثابت ہوئے تھے اور حکیم احسن اللہ خاں نے جن کو بہادر شاہ ظفر نے حکیم شریف الدین کو برطرف کر کے شاہی طبیب مقرر کیا گیا تھا انگریزوں کا جاسوس اور گواہ بن کر اپنے محسن کو جلاوطن کرانے، بادشاہت ختم کرانے اور شاہ زادوں کو گرفتار کروا کر ان کی گردنیں اڑوانے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا اس لیے ہمارے کسی بھی ناقد اور محقق نے آج تک ایسی خبر کے انداز کو معاندانہ قرار دینے کی جرأت نہ کی۔ ہمارے خیال میں دہلی اردو اخبار کی یہ دونوں خبریں مولوی باقر کی سیاسی بصیرت اور صحافتی دیانت داری کی مظہر ہیں اور اظہار رائے کی آزادی کے بنیادی اصول کے عین مطابق ہیں۔

جب انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں نے علم بغاوت بلند کیا تو اردو اخباروں کی زبان میں بھی تیزی اور تندی آگئی۔ اور اردو صحافت بڑی حد تک بغاوت کی زبان بن گئی۔ اس تبدیلی کے عمل میں مولوی باقر کا دہلی اردو اخبار اور سید جمیل الدین خاں کا صادق الاخبار پیش پیش تھے۔

دہلی اردو اخبار میں جو خبریں ۲۴ر مئی کے شمارے میں شائع ہوئیں ان کے تیور کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباسات سے لگ سکتا ہے۔

> "کول: سنا گیا ہے کہ چار کمپنیاں کول کی بھی انگریزوں کا کالا منہ کر کے حضور سلطانی میں حاضر ہوئیں۔ یعنی جو انگریز پایا اسے موت کے گھر پہونچایا اور خزانہ خوب لٹایا۔ تمام رعایا نے وہاں کی خوب لوٹا اور جس نے پایا خوب کمایا۔"

> لکھنؤ: سنا جاتا ہے کہ لکھنؤ میں انگریزوں کا وہی حال ہوا جو کہ یہاں دیکھا گیا۔ یہ بھی افواہ ہے کہ وہ بھائی گدی نشین معزول کا، جو کہ دیوانہ مشہور تھا۔ گدی پر بیٹھا اور عمل داری اس کے نام ہے۔ لیکن یہ نہیں معلوم کہ خود وہ شاہ رقص دوست و سرور پسند کس خیال میں ان دنوں میں ہیں اور سرمایۂ دولت کہاں ہے۔"

دہلی اردو اخبار نے تحریک آزادی کی بھرپور حمایت کی اور حضرت حضور اقدس ظل سبحانی بہادر شاہ ظفر کی قیادت اور حکومت کو بحال کرنے میں بھی پورا تعاون دیا۔ اس سلسلہ میں ۲۴ر مئی ۱۸۵۷ء کی یہ خبر پیش کی جاسکتی ہے۔

العبد ۃ علی الروی : سنا گیا کہ بسبب بدی رعایا اور ظلم و زیادتی مفسدین اور بسبب اشتعال شہر اور ڈاکو میں اہل شہر سن کر حضرت حضور اقدس ظل سبحانی نے ایک تحریر پر تاثیر بایں مضمون جاری فرمائی کہ اکثر اہل سپہ و اہل زور رعایائے شہر اور تنگ پروردگان شاہی کو ستاتے اور نہایت تکلیف دیتے ہیں۔ پہلا اس سے اہل فرنگ حسب دل خواہ اپنے جو احکام چاہتے تھے جاری کرتے تھے اور رعایائے عابدولت ہمیشہ پریشان حال اور حیران رہتی تھی اب تم لوگ اس کو ستاتے اور لوٹتے ہو۔ اگر ایسا ہی تمہارا حال ہے تو خیر۔ اس آخری وقت میں عابدولت کچھ ملک و مال سے غرض نہیں۔ بہ طرف خواجہ صاحب حضور نہضت فرماویں گے کہ رعایائے حضور بھی ہم رکاب اپنے آقائے ولی نعمت کے چلی جائے گی اور بہ طرف کعبۃ اللہ ہجرت فرمائیں گے کہ بقیہ عمر عزیز صورتاً و معناً و سراً و علانیہ یاد الٰہی میں بسر ہو جائے۔ سنا گیا کہ یہ تحریر جو پڑھی گئی تمام سامعین اس تحریر پر اثر کو سن کر آبدیدہ ہوئے.....»

اس خبر کا مزاج بنیادی طور پر بادشاہ کے حق۔ انگریزوں اور مفسدین کے خلاف ہے بلکہ ان دونوں کو اس خبر میں ایک ہی درجہ پر رکھا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان تحریروں اور اس طرح کی دوسری تحریروں نے مولوی باقر کو انگریزوں کی آنکھ کا کانٹا بنا دیا تھا۔ ان سے انگریزوں کی دشمنی کا ایک اور سبب بہادر شاہ ظفر سے ان کی گہری وابستگی بھی تھی اور ۱۲ جولائی ۱۸۵۷ء کو بہادر شاہ ظفر کی خواہش پر جب دہلی اردو اخبار کا نام بدل کر "الظفر" رکھا گیا تو انگریزوں کے غصہ میں مزید اضافہ ہو گیا۔ الظفر کا آخری پرچہ ۱۳ ستمبر کو شائع ہوا۔ ۲۰ ستمبر کو دہلی پر انگریزوں کا تصرف ہو گیا اور دہلی کے سارے اخبار بند ہو گئے۔ پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد اردو صحافت کے مجاہد اول مولوی محمد باقر کو کسی باقاعدہ سماعت کے بغیر ہی اس الزام میں گولی سے اڑا دیا گیا کہ وہ دہلی کالج کے پرنسپل ٹیلر کے قتل کی سازش میں شریک تھے۔ حالانکہ یہ بالکل جھوٹا الزام تھا اور سچ تو یہ ہے کہ مولوی باقر نے اسے پناہ دی تھی اور حتی المقدور اسکی حفاظت بھی کی تھی۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کی کتاب "مرحوم دہلی کالج" اور جہاں آرا بیگم نقوی کی کتاب "محمد حسین آزاد" کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹیلر میگزین میں اپنے گھر سے بھاگ کر اپنے خانساماں کے گھر میں پناہ گزیں ہوا خانساماں نے اسے مولوی باقر کے گھر میں پہنچا دیا۔ مولوی باقر نے اسے اپنے گھر میں چھپا لیا لیکن انقلابیوں کو خبر مل گئی کہ ٹیلر ان کے گھر میں ہے اور انھوں نے مولوی باقر کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ انقلابیوں نے دھمکی دی کہ اگر ٹیلر ان کے حوالہ نہ کیا گیا تو وہ مکان کو جلا دیں گے مولانا نے اسے ہندوستانی لباس پہنا کر اپنے گھر سے روانہ کر دیا کہ کہیں اور جا کر چھپ جائے مگر باغیوں نے اسے پہچان لیا اور لاٹھیاں مار مار کر ہلاک کر دیا جہاں آرا بیگم نقوی نے اس واقعہ میں یہ اضافہ کیا ہے کہ جب باغیوں نے مولانا کے گھر کا محاصرہ کر لیا تو ٹیلر نے پہلے دو لاکھ روپئے کے نوٹ اس تحریر کے ساتھ مولانا (مولوی عبدالحق) کے حوالہ کیے کہ میں یہ رقم اپنی مرضی سے مولانا کے حوالہ کر رہا ہوں۔ اس کے بعد ٹیلر باہر نکلا۔ باغیوں نے اسے ہلاک کر دیا جب انگریز فوج نے دہلی پر قبضہ کر لیا تو مولانا انگریز کمانڈر ہڈسن کے پاس پہنچا اور اسے نوٹ اور ٹیلر کی تحریر دکھائی۔ انھوں نے کہا ٹیلر کہاں ہے؟ مولانا نے جواب دیا کہ وہ قتل ہو چکا ہے۔ اس پر کمانڈر نے انھیں فوراً گولی سے اڑا دیا۔

مگر سر عبدالقادر نے اپنی کتاب FAMOUS URDU POETS AND WRITERS (معروف اردو شعراء اور ادباء) میں مولوی باقر کے فرزند مولوی محمد حسین آزاد کے حوالے سے یہ روایت بیان کی ہے۔ ٹیلر نے مولانا کے مکان سے نکلنے سے پہلے انھیں کاغذات کا ایک بنڈل دے کر کہا کہ اگر دہلی پر انگریز فوج کا قبضہ ہو جائے تو جو انگریز پہلے ملے اسے یہ بنڈل دے دیا جائے۔ جب مولوی باقر نے یہ بنڈل انگریز کرنل کے سپرد کیا تو کرنل نے بنڈل پر لاطینی زبان میں ٹیلر کی لکھی ہوئی یہ سطور دیکھیں "مولوی محمد باقر نے پہلے پہل مجھے اپنے مکان میں پناہ دی لیکن پھر حوصلہ ہار بیٹھے اور میری زندگی بچانے کی کوشش نہیں کی۔" اس پر کرنل نے فوراً مولوی باقر کو گولی مار دی۔

ٹیلر کے قتل کے سلسلہ میں جو رپورٹ دہلی اردو اخبار کے ۱۷ مئی ۱۸۵۷ء کے شمارے میں شائع کی تھی اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ۲۰ ستمبر کو دہلی پر انگریزوں کا تصرف قائم ہونے سے بہت پہلے ٹیلر کو قتل کیا جا چکا تھا۔ اخبار کی رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ :-

"سنا گیا ہے کہ ٹیلر صاحب پرنسپل مدرسہ بھی یہیں (میگزین میں) بند تھے۔ اس دن تک کچھ آب و دانہ باقی تھا اور کوئی دن دنیا کی ہوا کھانی تھی کہ دوسرے دن یوم سہ شنبہ قریب دوپہر اسی تھانہ کے علاقہ میں

جانتے تھے کہ یہ شخص مذہب میں [illegible] متعصب تھا [illegible]
[illegible] کا خون اسی کی
گردن پر رہا۔ عجب شان ایزدی ہے کہ یہ شخص نہایت مالدار تھا
قریب دو لاکھ کے روپیہ اس کا بنگ گلکتہ و دہلی میں جمع تھا اور چند
بنگلہ وغیرہ کرایہ کشمیری دروازے کے جہاؤنی میں تھے۔ اور یہ روپیہ بھی اس قدر سعی
وکوشش سے جمع کیا تھا کہ ڈیڑھ آنہ یا چار پیسے روزانہ اپنی ذات کے صرف
طعام میں لاتے تھے اور باقی سب داخل بنک۔ دن رات میں جو وقت
فرصت ہوتا تھا اسے حساب کتاب زر بینک میں صرف کرتے تھے۔
کپڑے بھی صرف ضرورتاً قابل جلسہ اہل جلسہ کے پہنتے تھے لیکن قابل عبرت
یہ حال دنیا نے دول کا کہ باوجود اس زرکثیر کے کہ دن بھر لاش
برہنہ خاک وخون میں غلطاں پڑا رہا۔ دیکھنے والے کہتے ہیں کہ فقیری
لباس اس وقت تھا اور منہ پر خاک ملی ہوئی تھی۔"

گمان غالب یہ ہے کہ دہلی اردو اخبار کی یہ خبر مولوی باقر کی شہادت کا سبب بنی جس میں ٹیلر کی متعصب ذہنیت، کنجوسی، اغوا کاری کا ذکر تھا اور ڈاکٹر چمن لال کے قتل میں بھی اس کے ملوث ہونے کا الزام تھا۔ اگر ٹیلر نے مولوی باقر کے گھر میں پناہ لی ہوتی اور ان کے پاس اپنی کوئی امانت رکھوائی ہوتی تو دہلی اردو اخبار میں اس کا ذکر ضرور ہوتا۔ مولوی باقر کی شہادت کے دوسرے اسباب دہلی اردو اخبار کی اس خبر کی موجودگی میں مشکوک قرار پاتے ہیں۔

جب تک صحافت زندہ ہے اس وقت تک ہندوستان کے اس پہلے شہید صحافی کو عزت و احترام کے ساتھ یاد رکھا جائے گا۔ مولوی باقر نے اپنے قلم سے علم وادب کی جو خدمت کی وہ ایک الگ موضوع ہے جس پر ابھی تفصیلی کام نہیں ہوا ہے۔ جو کام بھی ہوا ہے وہ شمالی ہند میں اردو صحافت کے آغاز، ارتقاء اور زوال کے تناظر ہی میں ہوا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انکی انفرادی ادبی خدمات پر تفصیل سے کام کیا جائے۔ □□

مختصر سوانحی خاکہ ــــــــ صفحہ ۹ کا بقیہ

شائع ہوتے ہیں۔

میرے مضامین کے تین مجموعے "ادبی مطالعے"، "ادبی جائزے" اور "ادبی تناظر" شائع ہو چکے ہیں۔

[illegible] انگریزی میں بھی سیاسی اور تہذیبی موضوعات پر لکھتا رہتا ہوں
۱۹۴۰ء میں ایک کتابچہ TRI COLOUR SHALL FLY OVER
THE GLORIOUS HYDERABAD شائع ہوا تھا۔ پھر
TELANGANA STRUGGLE شائع ہوا جس میں چندر گپت چودھری کا مضمون "مرہٹواڑے کی جدوجہد" پر، غلام حیدر کا مضمون "جدوجہد میں مسلمانوں کا حصہ" اور ڈاکٹر پرا نجپے کا مضمون جدوجہد کے دوران طبی امداد کی فراہمی پر شامل ہیں۔ ان کے علاوہ مخدوم پر ان کی موت کے بعد ایک کتابچہ بھی شائع ہوا جس کا نام "مخدوم" MAKHDOOM تھا۔

انعامات واعزازات

اُردو کی خدمت کے سلسلے میں اُردو اکادمی آندھرا پردیش، اور اُردو اکادمی بہار سے انعامات حاصل کیے ہیں اور اُردو اکادمی دہلی کا قابل فخر بہادر شاہ ظفر ایوارڈ بھی ۱۹۹۰ء میں حاصل کیا ہے۔

فی الحال انجمن ترقی اُردو ہند کی مجلسِ عاملہ کا رکن ہوں اور جنوبی ہند کی شاخوں کے لیے کنوینر ہوں۔ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کا نائب صدر اور اُردو اکادمی آندھرا پردیش کی اور ادبی ٹرسٹ کی عاملہ کا رکن ہوں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین سے بھی وابستہ ہوں۔

یہ ہے میری زندگی کا احوال۔ جتنے کام ہاتھ میں لیے ہیں سبھی تکمیل طلب رہ گئے ہیں۔ یہی ایک المیہ ہے جو جان کھائے جا رہا ہے۔

□□

"نیا دور"

کے ماہ جون ۱۹۹۴ء کے شمارے میں ان مقتدر اہل قلم حضرات کے مضامین شائع ہوں گے جو "اودھ نمبر" میں بعض وجوہات کی بنا پر شامل نہ ہو سکے۔ اس طرح جون ۱۹۹۴ء کا شمارہ "گوشۂ اودھ" کے نام سے منسوب ہوگا۔

ــــــ ایڈیٹر

غزلیں

کرب تنہائی کا احساس نہ اتنا ہوتا
کوئی مرتے ہوئے لمحوں کا مسیحا ہوتا

تبصرہ یوں نہ مرے حال پہ اتنا ہوتا
اس کو نزدیک سے دُنیا نے نہ دیکھا ہوتا

یہ جو آہٹ کی طرح ساتھ مرے رہتا ہے
بن کے تصویر کبھی سامنے آیا ہوتا

میں کہ جیسا ہوں بہرحال نظر میں رہتا
مجھ کو احساس کی نظروں سے تو دیکھا ہوتا

دے گیا جو مجھے تپتے ہوئے لمحوں کا گداز
کاش وہ درد مرے واسطے تنہا ہوتا

ایسا لگتا ہے دوبارہ نہ ملے گا مجھ سے
اس طرح ٹوٹ کے وہ یاد نہ آیا ہوتا

کیا ملا جاگ کے بتلایئے شبنم صاحب
اس سے اچھا تھا کوئی خواب ہی دیکھا ہوتا

شبنم نقوی
۱۸۸- بہت گنج
الہ آباد

پھیلا ہے فضاؤں میں اک آواز کا جادُو
بج اُٹھے ہیں رہ رہ کے مرے کان میں گھنگرو

اک چہرہ کہیں دل کے نہاں خانے میں گُم ہے
اک سایہ لرز اٹھتا ہے ہر گام پہ ہر سُو

ہر شام سنور جاتی ہیں اشعار کی زُلفیں
ہر صبح بکھر جاتے ہیں افکار کے گیسُو

کھل جاتے ہیں ہر رات کو خوابوں کے دریچے
در آتی ہے چپکے سے تیری یاد کی خوشبُو

دریا کے کناروں کی طرح ساتھ چلے ہم
میں آج تلک میں ہی رہا تو بھی رہا تو

وہ ناز نہ انداز نہ تیور نہ وہ جوبن!
سب چھین لیا وقت نے باقی ہے مگر تُو

پامال ہیں سب مدح کے الفاظ لکھوں کیا
گل جیسے یہ لب، نرگسی آنکھیں، رم آہو

شاہد ماہلی
کے۔۲۰ سی، شیخ سرائے، فیس ۱۱
نئی دہلی ۱۷-۱۱۰۰

روشنی ہر کس و ناکس سے وفا کرتی ہے
لوگ سوتے ہیں مگر شمع جلا کرتی ہے

کب مری رُوح تجھے مجھ سے جُدا کرتی ہے
فکر میری تجھے ہر وقت لکھا کرتی ہے

یوں تری یاد بکھرتی ہے مرے آنگن میں
چاندنی جیسے درختوں سے چھنا کرتی ہے

آج تک اس پہ میں حاوی نہیں ہو پایا ہوں
ہے کوئی شے مرے اندر جو خطا کرتی ہے

عشق ہر آنکھ کی شبنم کو بنا دیتا ہے پھُول
عقل ہر وقت ستاروں کو گنا کرتی ہے

ماں کی آنکھیں درِ مسجد کی طرح کھُلتی ہیں
ورنہ ہر آنکھ بس اک رسم ادا کرتی ہے

زرد پتوں کو بتا دو کہ چمن کے اندر
دائرہ بن کے بھی کچھ گرد اُڑا کرتی ہے

جل گیا دل تو نئی بات نہیں ہے تسنیم
ایک بستی یہاں ہر روز جلا کرتی ہے

تسنیم فاروقی
تلسی داس مارگ نزد اسپتال
لکھنؤ

سبط محمد نقوی
دفتر ہماری توحید، عزاخانہ غفرانمآب
لکھنؤ

اودھ کے چند ممتاز علماء

— ۳ —

مولانا حسین احمد مدنی ؒ

آپ کی ولادت قصبہ بانگرمئو ضلع اناؤ (یوپی) میں مولوی سید حبیب اللہ صاحب کے گھر میں ۱۹ر شوال ۱۲۹۶ھ/۶ر اکتوبر ۱۸۷۹ء میں ہوئی "چراغ محمد" تاریخی نام نکلا۔ سید حبیب اللہ قصبہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد سے ملحق گاؤں اللہ دادپور (اب ٹانڈہ کا ایک محلہ) کے رہنے والے تھے۔ ایسے قبیلے کے فرد تھے جو علم و فضل سے مالا مال اور مشیخت و طریقت کا امتیاز رکھتا تھا۔ اس قبیلۂ سادات کا شجرۂ نسب حضرت حسین اصغر کے ذریعہ حضرت امام سجاد علی ابن الحسین پر منتہی ہوتا ہے۔ آپ کے بزرگوں میں حضرت سید احمد تو خستہ تمثال رسول (علیہ السلام) متوفی ۶۰۲ھ لاہور تشریف لائے۔ ان کی اولاد میں سے شاہ نورالحق آپ کے مورث تھے۔ انھوں نے اللہ دادپور میں قدم رنجہ فرماکر خانقاہ کی بنا ڈالی۔

مولوی حبیب اللہ صاحب نے بانگرمئو سے ٹانڈہ، تنخواہ میں تخفیف کا گھاٹا اٹھا کے اپنی بدلی اس لیے کروائی کہ معاشی حالات کو سدھاریں اور باغات وغیرہ لگوا کے جائداد کو زیادہ نفع بخش بنایا لیکن یہ منظور مشیت نہ تھا۔ ہوا یہ کہ مولوی حبیب اللہ صاحب کے پیر شاہ فضل الرحمان صاحب کے اچانک انتقال کا حادثہ ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۸۹۵ء میں پیش آیا۔ ہر چند کہ شاہ صاحب ایک سو پانچ سال کی طویل عمر پا چکے تھے، پھر بھی مولوی صاحب جو فرطِ عقیدت سے فنافی الشیخ کا درجہ پا چکے تھے، اس حادثے کی تاب نہ لاسکے۔ ان کے دل کی دنیا اجڑ گئی۔ سارے حوصلے پست اور منصوبے درہم برہم ہو گئے دن آہ وزاری اور راتیں اختر شماری میں بسر ہونے لگیں۔ مولوی سید حبیب اللہ کے بطون میں جو آگ سلگ رہی تھی اس کو ان کے منجھلے صاحبزادے مولوی سید احمد کے مشورے نے ہوا دی۔ مولوی سید احمد بھی شاہ فضل الرحمٰن کے ہی پروردہ تھے۔ ان کے مشورے سے عشقِ نبوی کی آگ بھڑک گئی۔ ہر چند کہ اور صاحبزادے اور اعزا و اقربا اس سے متفق نہ تھے لیکن مولوی صاحب نے آخر شعبان ۱۳۱۶ھ مطابق جنوری ۱۸۹۹ء میں رخت سفر باندھ ہی لیا۔

مدینۂ طیبہ کے قیام میں مولانا کی سرگذشت کی طرف توجہ سے پہلے مولانا کی تعلیم و تربیت کا ایک ہلکا و مختصر خاکہ پیش کر دینا ضروری ہے

کلام پاک والدین سے پڑھا۔ آمدنامہ، دستور الصبیان اور گلستاں سعدی کا کچھ حصہ بھی گھر ہی پر پڑھا۔ سرکاری اسکول کی دوسری جماعت میں تھے۔ اور خود مولانا کے الفاظ میں:۔

> " اس وقت اسکول میں فنون اور کتب بہت زیادہ تھیں تمام اقسام حساب و جبر و مقابلہ تک، مساحت اور اقلیدس مقالہ اولیٰ، تمام جغرافیہ عمومی و خصوصی، تاریخ عمومی و خصوصی، مساحت اور عملی (تختہ تجریب وغیرہ سے زمین ناپ کر باقاعدہ نقشہ بنانا) تحریر املا، شکست لکھنا اور پڑھنا، اردو کورس وغیرہ سب اس عمر میں پوری طرح یاد اور مشق کر چکا تھا اور ہر چیز میں اس قدر مہارت ہو چکی تھی کہ ان پر بخوبی جواب دے سکتا تھا۔"

مولانا حبیب اللہ صاحب اولاد کی تربیت میں نہایت سخت تھے۔ بچوں کا کھیل کود میں پڑنا یا ادھر ادھر آنا جانا ناپسند فرماتے۔ مولانا حسین احمد کھیل کود کے شائق تھے۔ لیکن ۱۸۹۱ء میں ان کے بڑے بھائی سید احمد

صاحب بھی دیوبند چلے گئے (سب سے بڑے بھائی صدیق احمد صاحب پہلے سے ہی وہاں تھے) تو حسین احمد کو کسی قدر آزادی کا احساس ہوا اور اعزا و اقربا کے گھروں میں آمد و شد بڑھی تو مولوی حبیب اللہ صاحب نے ان کو بھی دیوبند بھیج دیا۔ ان بھائیوں کا قیام شیخ الہند مولانا محمود حسن کے آستانے کے سامنے تھا، اس لئے گھر پر جانا آنا تھا۔ مولانا حسین احمد کے ساتھ شیخ الہند مولانا محمود حسن کی اہلیہ معظمہ بڑی شفقت کا سلوک کرتیں۔ بڑے بھائی مولوی صدیق احمد شیخ الہند کی خدمت میں انہماک و اطاعت سے حاضر رہتے۔ شیخ الہند کے بھتیجے منشی حبیب حسن، جو سایۂ مادری سے محرومی کے بعد حضرت شیخ کی خصوصی شفقت کا مرکز تھے، حسین احمد صاحب کے ہم جماعت تھے۔ یہ وہ اسباب ہوئے جن کی بدولت حسین احمد صاحب بھی شیخ کا تقرب پانے میں کامیاب ہوئے اور شیخ نے ان کو وہ کتابیں پڑھائیں جو ضابطے سے ان کے دائرۂ تدریس میں نہ تھیں۔ ان کا درس شیخ اکثر خارج اوقات میں مدرسہ میں دیتے تھے۔ حسین احمد خود بھی ذہین و ذکی، علم کے بے حد شائق، حاضر باش، نظم و ضبط کے ساتھ مطالعے، مراجعے کے پابند تھے۔ یعنی ؎

نہ کم نگاہ تھا ساقی نہ تنگ ظرف تھا رند

اس لئے تحصیل علم بحد کمال ہوئی۔ لیکن مولانا کے سوانح نگار اور قریبی رشتے سے پوتے مولوی فرید الوحیدی کا کہنا ہے کہ:

"ابھی علم کی پیاس باقی تھی بلکہ کتاب و حکمت کے چشمۂ آب حیات پر پہونچ کر تشنگی اور بھی تیز ہو گئی تھی، اس لیے روحانی اشتغال و ریاضت و عبادت اور درس و تدریس کے ساتھ مزید تعلیم حاصل کرنے کا بھی مشغلہ جاری رکھا۔ اس وقت مدینۂ طیبہ میں ایک مشہور استاد ادب مولانا عبد الجلیل براده صاحب موجود تھے۔ حضرت نے ان سے ادب عربی کی کچھ کتابیں پڑھیں، درس و تدریس کے مشاغل کے ساتھ ساتھ تعلیم و تعلم کے لئے بھی وقت نکال لینا معمولی سطح کے انسان کے بس کی بات نہیں ہو سکتی۔"

اس کے ساتھ وحیدی صاحب نے حضور اکرم سے براہ راست روحانی و باطنی اکتساب کا ذکر کیا ہے۔ ہر چند یہ ایک اعتقادی مسئلہ ہے، مگر آپ اسے فرید صاحب کے لفظوں میں دیکھ لیں:

"یوں تو حضرت مدۃ العمر اپنے کو طالب علم کہتے رہے اور سمجھتے رہے۔ مگر درحقیقت ظاہری طالب علمی کا دور جو چار یا پانچ برس کی عمر میں ٹانڈہ میں شروع ہوا تھا، اب جا کر مالٹا میں قرآن پاک کے حفظ اور ترکی زبان پر عبور کے ساتھ ختم ہوا۔ اس جگہ وہ واقعہ ایک بار پھر یاد آتا ہے کہ: سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میاں حسین احمد جو چاہو مانگ لو۔ ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ حضور! علم اور صرف علم الٰہی کا طلبگار ہوں۔ بیاسی برس کی طویل زندگی میں یہی تمنائیں زندگی کی پہلی اور آخری تمنائیں رہی ہوں گی۔ اس لئے کہ حضرت کی زندگی میں دنیاوی خواہشات، آرزوؤں اور تمناؤں کا کوئی خانہ نہیں تھا۔"

اواخر شعبان ۱۳۱۶ھ میں جب مولوی شاہ حبیب اللہ پانچ ہزار کی پونجی کے ساتھ اہلیہ، پانچ بیٹوں، تین بہوؤں، ایک بیٹی اور ایک پوتے پر مشتمل بارہ نفری قافلے کو لے کر کم و بیش ایک ہزار سال بعد وطن موروثی مدینہ طیبہ کے لیے روانہ ہوئے تو طاعون کی وبا کے مارے ساری بندرگاہیں بند تھیں۔ صرف چاٹگام کی گودی تھوڑی بہت کھلی ہوئی تھی اس لیے مسافروں پر طرح طرح کی قدغن تھی، جن کی تاب نہ لا کر بہتیرے ہمت ہار بیٹھے تھے۔ لیکن اس اخلاص پیشہ کارواں نے اپنے کو حد مراد تک پہنچا کر ہی دم لیا۔ اگرچہ پہلی منزل 'الٰہ آباد' سے ہی قرنطینہ کیمپ میں جن شدتوں اور سختیوں کا سامنا ہوا ان کی داستان دردناک ہے۔ لیکن اختصار کی زبردست خواہش کے پیش نظر ہم تفصیلات کو قلم انداز کرتے ہیں۔ یہ بھی ہے کہ ان مشکلات و مسائل سے مولانا مدنی کا کوئی تخصیص تعلق بھی نہیں۔ بہرحال اس کارواں کو ذیقعدہ کی چوبیسویں یا پچیسویں تاریخ کو مکہ کی خاک سرمہ نظر بنانے کا موقع ملا۔ حج کی سعادت کے ساتھ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے فیضان صحبت سے بہرہ یاب ہوئے۔ بارہ دن کے سفر کے بعد مدینۂ نبویؐ میں پچیس ذی الحجہ ۱۳۱۶ھ مطابق ۸ر مئی ۱۸۹۹ء کو ورود ہوا۔

مولوی حبیب اللہ اور ان کے اخلاف ان وسائل سے گزر ان نہیں

چاہتے تھے جو خواہشمند ہے یا حاجیوں کا تھا۔ اس لیے انھوں نے ملازمت داری کی طرح ڈالی۔ جس میں اپنے بڑے بھائی مولوی سید احمد صاحب کے ساتھ مولانا حسین احمد صاحب کو بھی بیٹھنا پڑتا تھا۔

تحصیل علم کے جو مواقع مولانا کو ملے ان کی طرف اشارہ ہوچکا ہے، اس سلسلے میں تدریس کی تفصیل ہم یہاں مولانا کی لفظوں میں پیش کریں گے۔ لیکن اس سے پہلے آپ یہ معلوم کرلیں کہ دکان بڑھادیے جانے کے بعد مولانا نے کسبِ معاش کے لیے اُجرت پر نقل نویسی کا کام بھی کیا۔ اب آپ مولانا کی زبانِ قلم سے سلسلۂ درس کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں:

"درس و تدریس کی تفصیل یہ ہے کہ اواخر شعبان ۱۳۱۶ھ میں جبکہ ہم تینوں بھائی دیوبند سے آخری طور پر روانہ ہوئے تو منجملہ رخصت کرنے والوں کے خود حضرت شیخ الہند قدس اللہ العزیز ساتھ ساتھ اسٹیشن دیوبند تک پیدل تشریف لائے تھے۔ راستہ میں پرزور طریقہ پر ہدایت فرمائی کہ پڑھانا ہرگز نہ چھوڑنا۔ چاہے ایک دو ہی طالب علم ہوں۔ اس لیے تعلیمی مشغلہ کا خیال بہت زیادہ ہوگیا تھا۔ مدینۂ منورہ پہونچنے کے بعد بعض طلباء ہندستانی اور عرب بعض کتابوں کی تدریس کے خواستگار ہوئے۔ اگرچہ عربی زبان میں عرصہ تک کتابیں پڑھنے کی نوبت آئی تھی مگر بولنے کی مشق نہ تھی اس لئے اشکال کا سامنا ہوا۔ مگر حسبِ ہدایت حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اوقات کتابت کے علاوہ دوسرے اوقات میں اس کام کو شروع کردیا (اس زمانے میں بہت سے علماء اعزازی طریقہ پر حرم محترم نبوی (مسجدِ نبوی علیہ السلام) میں پڑھایا کرتے تھے۔ اس سے مجھ کو ایک تو یہ فائدہ ہوا کہ ابتدائی کتابیں صرف ونحو و فقہ وغیرہ کی محفوظ ہوگئیں۔ اور دوسرے یہ کہ زبان صاف ہوگئی۔ اہلِ علم میں عموماً اور علماء حجاز میں خصوصاً حسد اور رقابت کا مادہ بہت ہوتا ہے اس لیے جب کوئی عالم آتا ہے تو اس کی طرف آنکھیں بہت اٹھتی ہیں اور تنقیدی معاملات اکثر پیش آتے ہیں۔ علماء ہند چونکہ عربی بولنے کے عادی نہیں ہوتے اس لیے ان اوقات شکست کھا جاتے ہیں۔ اگرچہ مدینۂ منورہ میں پہلے سے علماء ہند کی ایک جماعت بیٹھی ہوئی تھی کیوں کہ حضرت شیخ محمد عابد انصاری سندی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے بعد حضرت شاہ عبدالغنی نقشبندی دہلوی رح اور ان کے بعد حضرت مولانا حبیب الرحمٰن ردولوی رح اور مولانا محمد اسحٰق صاحب امرتسری رحمۃ اللہ علیہ جیسے پایہ کے علماء گزرے تھے جن کے غیر معمولی علم اور اعلیٰ استعداد و قابلیت کا سب کو اقرار تھا۔ بہت سی تصانیف اور بہت سے شاگرد ان کے وہاں موجود تھے۔ آخر الذکر ہر دو حضرات اس زمانے میں زندہ تھے۔ اگرچہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی جلالی اور زاہدانہ طبیعت کی وجہ سے عام طور پر لوگوں کو استفادہ ممکن نہ ہوسکا تھا مگر ان کی اعلیٰ استعداد اور انتہائی قابلیت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا"

مولانا اور ان کے بڑے بھائی سید احمد سفر مدینہ سے قبل مولانا رشید احمد گنگوہی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوچکے تھے۔ ابھی مولانا حسین احمد کو مدینۂ نبوی میں حاضر ہوئے دو سال بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ ان کے شیخ حضرت گنگوہی کا مکتوب مبارک ۱۳۱۸ھ میں وارد مدینہ ہوا کہ "اگرچہ وہاں سب کچھ ہے مگر بہتر ہو تاکہ تو ایک مہینے کے لئے گنگوہ آجاتا"۔ اس طلبی پر حسین احمد کو سر اطاعت خم کرنا ہی تھا۔ مگر روانگی اور ورودِ خدمت میں سبقت ان کے بھائی صدیق احمد نے حاصل کی۔ کیوں کہ حسین احمد صاحب نے پہلے دیوبند میں حاضری دی اور اپنے مرشد کی بارگاہ میں پاپیادہ حاضری کا شرف چاہتے تھے اور ان کے بڑے بھائی صاحب پیادہ روی کی ریاضت پر تیار نہ تھے۔

مولانا نے گنگوہ میں حاضری کی کیفیت تفصیل کے ساتھ لکھی ہے مگر طلبی کی غایت کے بارے میں ان کے سوانح مستفاد نہیں ہوتا کہ شیخ نے اس حضوری میں ذاتِ صحبت کا مراقبہ تعلیم فرمایا اور دونوں بھائیوں کو دستارِ خلافت اور اجازت مرحمت فرمائی۔

تقریباً سات مہینے ہندستان میں گزار کر اب آخر شوال ۱۳۱۹ھ میں پھر دیارِ نبوی کا رُخ کیا۔ شرفِ حج حاصل کرنے کے بعد اوائل ۱۳۲۰ھ میں پھر مدینۂ منورہ پہنچے۔ شیخ گنگوہی نے طلب تو حضرت مولانا ہی کو فرمایا تھا

لیکن حج بدل کا زادِ راہ دونوں بھائیوں کو دیا۔ اس سے مراجعت آسان ہوگئی۔ مدینہ میں حاضری ہوئی تو پھر وہی پڑھنے پڑھانے کی مصروفیت نے گھیر لیا۔ مولوی فرید وحیدی نے اس طرح یہ روایت کی ہے:

"مدینہ پہونچنے کے فوراً بعد تدریس اور اسباق کا مشغلہ شروع فرمایا۔ طالبین علوم اسلامیہ اور تشنگانِ حدیث و قرآن کی تعداد میں روزافزوں اضافہ ہونا شروع ہوا اور حضرت رحمۃ اللہ نے تدریسی قلیل آرام اور بشری ضروریات کے لئے گنجائش چھوڑ کر شب و روز کا سارا وقت قال اللہ و قال الرسول کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔ حتیٰ کہ مشاغل طریقت اور سلوک و تصوف کے لئے بھی وقت پوری طرح فارغ نہیں ملتا۔ روزانہ چودہ پندرہ اسباق پڑھاتے تھے اور تعطیل کے ایام میں بھی آرام نہیں فرماتے تھے۔ تفسیر، حدیث، معانی و کلام، فقہ، ادب اور عقائد کی وہ کتابیں جو پڑھ چکے تھے وہ تو تھیں ہی مگر ایسے علوم کی کتابیں زیرِ درس رہیں جن کے مطالعے اور پڑھانے کا موقع اس سے پہلے نہیں ملا تھا، گویا صحیح معنوں میں اس مصرعے کے مصداق ہوگئے کہ

پگھلنا علم کی خاطر مثالِ شمع زیبا ہے"

مدینۂ منورہ سے مولانا کا دوسرا سفرِ ہند ۱۳۲۷ھ میں پیش آیا۔ مدینہ طیبہ سے سیدھے دیوبند آئے اور ترمذی اور بخاری کے بالالتزام درس کے لیے پھر شیخ الہند مولانا محمود حسن کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ دارالعلوم دیوبند تعلیمی اور تنظیمی دونوں اعتبار سے انتشار و بدحالی کا شکار تھا۔ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے یہ طے کیا کہ مولانا کو مدرس مقرر کر دیا جائے اور جب بھی مولانا کی مدینہ منورہ سے ہندستان واپسی ہوئی تو تجدیدِ اجازت کے بغیر انھیں تدریسی فرائض پورے کرنے دیئے جائیں۔ دیوبند کے اس قیام میں جلسۂ دستاربندی بھی ہوا جس میں شیخ الہند اور دوسرے علماء نے مولانا کے سر پر بھی دستارِ فضیلت باندھی۔ ۱۳۲۹ھ کے آخر میں مدینۂ طیبہ واپسی ہوئی۔ اس بار بھی زادِ راہ ایک حج بدل کا وسیلہ بنا۔ مدینہ گئے تو قرآن و سنت کی خدمت زیادہ محنت و مصروفیت کے ساتھ جاری ہوگئی۔

تین سال بعد ہندستان کا ایک اور سفر پیش آیا۔ یہ قیام مختصر رہا۔ ۱۳۳۱ھ کے آخر میں ہی چوتھی بار مدینہ طیبہ کو واپسی ہوئی اور مصارفِ سفر کا وسیلہ پھر حج بدل بنا۔

اس بار مولانا کی توجہ تعلیم و تصوف کے دائروں کے ساتھ آگے بڑھی۔ سامراجی طاقتیں ایک ایک کر کے مسلم علاقوں اور ممالک کو ہڑپ کئے جا رہی تھیں۔ اب ایک گوشہ نشین عالم و محدث کی شخصیت اپنی خانقاہی فضا سے برآمد ہو کے برطانوی سامراج کے خلاف ایک فیصلہ کن مجاہدے کی مہم میں شریک ہوئی۔ جس طرح عالمانہ زندگی میں فیضان شیخ الہند سے حاصل کیا، اسی طرح سیاسی فیضان کا سرچشمہ بھی انھیں کی ذات ہوئی۔ چار سال کے قیام کے بعد ۱۳۳۵ھ یا ۱۳۳۶ھ میں مولانا ہندستان واپس تشریف لائے۔ اس بحث کو قدرے تفصیل سے دیکھنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی ایک جھلک دیکھ لی جائے۔

"حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہٗ العزیز، جن کو تحریکِ خلافت میں مسلمانوں کی طرف سے لقب شیخ الہند دیا گیا تھا، قصبہ دیوبند ضلع سہارنپور کے باشندے تھے۔ ان کے والد ماجد حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ۱۸۵۰ء میں بعہدہ ڈپٹی انسپکٹر مدارس بانس بریلی میں ملازم تھے۔ وہیں ۱۸۵۰ء کے اخیر یا ۱۸۵۱ء کی ابتداء میں مولانا شیخ الہندؒ کی پیدائش ہوئی۔ حضرت مولانا صغیر السن ہی تھے کہ ان کے والد ماجد کی تبدیلی شہر میرٹھ ہوگئی جبکہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی عمر چھ یا سات برس کی تھی، میرٹھ میں ہنگامۂ انقلاب آزادی ۱۸۵۷ء واقع ہوا۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات کو اگرچہ صغر سنی کی وجہ سے پوری طرح نہیں دیکھ سکے تھے مگر اجمالی طور سے یاد تھے۔ بڑے ہونے کے بعد اپنے والدین اور اساتذہ اور گرد و پیش سے وہ انسانیت سوز مظالم اور درندگی و بربریت کے معاملات جو انگریزوں نے ہندستانیوں کے ساتھ کیے تھے، سنتے اور معلوم کرتے رہے۔ ذہن ثاقب، طبیعت غیور، حافظہ نہایت قوی، جرأت بے مثال قدرت نے عطا فرمایا تھا۔ بنابریں تاریخی

اطلاعات اور ان کی کمزوری و تلاش اور ان کی یادداشتیں
اور علم سینہ بسینہ بار کر میں جاگزیں ہوتی گئیں۔ پھر قدرت نے حضرت شمس الاسلام والمسلمین مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور حضرت شمس العلماء والفضلاء مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ اسرارہما کے در دولت تک پہونچا کر شرفِ شاگردی اور حاضر باشی بارگاہ عطا فرمایا۔ یہ ہر دو حضرات ۱۸۵۷ء میں جہادِ حریت کے شاملی، تھانہ بھون وغیرہ میں علمبردار رہے تھے اور حضرت قطب عالم مولانا الحاج امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہ العزیز کی سرپرستی میں بڑے بڑے کارہائے نمایاں کر چکے تھے۔ اگرچہ برطانوی درندگی ان دونوں حضرات کو بھی مثل دیگر مجاہدینِ حریت صفحۂ ہستی سے مٹانا چاہتی تھی اور اگرچہ غدارانِ ملت نے ان کو بھی اپنی ناعاقبت اندیشی سے پھنسانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا مگر قدرت کے خفیہ ہاتھوں نے ان دونوں حضرات کی کھلی خوارقِ عادات کراماتوں سے حفاظت کی تھی۔ بہر حال حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ان دونوں بزرگوں اور بالخصوص حضرت نانوتوی قدس اللہ اسرارہما کی صحبت اور شاگردی اور خدمت کی وجہ سے وہ تمام اطلاعات جن کی وجہ سے انقلاب ۱۸۵۷ء کی کوششیں ہندستانیوں نے کی تھیں اور وہ واقعات جو اس جنگِ آزادی میں پیش آئے تھے، معلوم ہو کر محفوظ ہو گئے تھے جن کی بنا پر وہ جذبۂ حریت و ایثار اور اس کی آگ اور امورِ حکومت پر تنقیدانہ نظر پیدا ہو گئی تھی، جس کی نظیر بجز قرونِ اولیٰ عالم اسلام میں پائی جانی تقریباً ممتنع ہے۔"

ان بزرگوں نے یہ مجتہدانہ فیصلہ کیا کہ اب جو ہندستان اور عالم اسلام کی حالت ہے اور جس طرح ان کے وجود سازشوں، دراندازیوں غلام بنانے اور بنائے رکھنے کی سازشوں کی آماجگاہ ہیں، انھیں دیکھتے ہوئے اب دانش گاہ و خانقاہ سے نکل کر آزادی و استقلال کے لیے میدانِ عمل میں اتر کر سر دھڑ کی بازی لگانا اولیٰ ہے۔ چنانچہ آپ نے بڑے پیمانے پر، مگر پوری رازداری اور احتیاط کے ساتھ مجاہدوں کی جماعت کی

تعلیم و تدریس میں مشغول تھے اور مولانا حسین احمد صاحب شیخ الہند کے معتمد و مقرب تھے لیکن ان کے قیام مدینہ کے باعث ہندستان آنے پر بھی اس بارے میں انھیں کچھ نہیں بتایا گیا تاکہ حسین احمد صاحب کا ذہن تشویش سے محفوظ رہے لیکن مولانا کو شریکِ کارواں کر لینے کا وقت جلد ہی آ گیا۔

ہوا یہ کہ مولانا کی کارروائیوں اور منصوبوں کی خبر حکومتِ ہند کو لگ گئی اور کارروائی کے لیے آمادہ ہوئی۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے کچھ روابط مرکزی حکومت میں ایسے تھے جن کی بدولت انھیں سرکار کی خفیہ کارروائیوں کی خبر ہو جایا کرتی تھی۔ چنانچہ شیخ الہند محمود حسن اور ان کی جماعت کے خلاف مجوزہ اقدام کی اطلاع بھی ڈاکٹر صاحب کو ہوئی۔ انھوں نے شیخ کو صرف متنبہ نہیں کیا بلکہ یہ صورت بھی کر دی کہ وہ بخیریت ہندستان سے حجاز نکل جائیں اور گرفتاری کے وارنٹ ان حضرات پر تعمیل نہ ہو سکیں۔ چنانچہ مولانا محمود حسن مکۂ مکرمہ پہونچ گئے اور اب ان کی گرفتاری بہت آسان نہ رہی۔

مکۂ مکرمہ میں سلطنتِ عثمانیہ کے گورنر غالب پاشا سے ملاقات کر کے اور انھیں تعاون پر آمادہ کر کے آپ مدینہ منورہ چلے گئے۔

مدینہ منورہ پہونچ کر آپ نے اپنے اس روحانی فرزند کے مکان پر قیام کیا۔ اس طرح وہ موقع آیا کہ مولانا محمود حسن اس جہادِ آزادی میں مولانا حسین احمد کو شریک کر سکے۔ چنانچہ شیخ نے انھیں اور مولوی خلیل احمد کو تخلیے میں سب سے توقف طلب فرما کے منصوبوں اور اقدامات سے باخبر کیا اور یہی مولانا حسین احمد صاحب کی پرشور اور سرگرم سیاسی زندگی کی بقول خود مولانا کے بسم اللہ تھی۔

تحریکِ آزادی کا یہ ابتدائی باب اس قابل تھا کہ پوری تفصیل سے پیش کیا جاتا لیکن اول تو ہمارے موضوع کے حدود اس کی اجازت نہیں دیتے، پھر یہ بھی ہے کہ اس بارے میں اردو میں کافی مطبوعہ مواد مہیا ہے جس کی طرف طلاب و مشتاقین رجوع فرما سکتے ہیں، لہٰذا ہم تفصیلات کو یکسر قلم انداز کرتے ہیں۔ ربطِ بیان کے لئے اتنا ضرور عرض کرنا ہے کہ جس وقت شیخ الہند، مولانا عزیز گل اور مولانا حسین احمد اور ان کے بھتیجے مولانا وحید احمد مدنی کے ساتھ طائف میں مقیم تھے، شریف حسین نے عثمانی سلطنت کے خلاف بغاوت کر دی اور اہم فوجی مرکزوں پر حملہ کر دیا۔ چنانچہ طائف شریف کی فوجوں کے گھیرے میں آ گیا۔ پھر بھی یہ چھوٹا سا قافلہ کسی طرح مکۂ مکرمہ پہونچا اور ہندستان واپسی کی تدبیر کرنے لگا۔ مکہ سے روانہ ہونے والے ہی تھے کہ شریف حسین

کے آدمی شیخ الہند کی خدمت میں پہونچے اور ایک ایسے اعلان پر دستخط کا مطالبہ کیا جس میں ترکوں کی تکفیر اور شریف حسین کے باغیانہ اقدام کی تحسین کی گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے بیان پر شیخ الہند کے لئے دستخط کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ چنانچہ آپ نے انکار کر دیا۔ شریف نے گرفتاری کے احکام جاری کیے۔ مگر اس درمیان شیخ مولوی وحید احمد مدنی کے ساتھ روپوش ہو جانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ مگر مولانا حسین احمد گرفتار کر کے جیل پہونچا دیے گئے اور ان کو یہ بتا دیا گیا کہ یہ سرکار برطانیہ کی مخالفت کا انجام ہے۔ لیکن جب شیخ الہند کی تلاش میں شریف کی پولیس کسی طرح کامیاب نہ ہو سکی تو شریف نے یہ حکم دیا کہ شیخ کے ساتھیوں کو گولی سے اڑا دیا جائے اور ان کے مطوف کو معزول کر کے تازیانے لگائے جائیں۔ شیخ الہند نے اپنے رفیقوں کو ہلاکت میں ڈالنے کے بجائے اپنے کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔

اور ۲۳ صفر ۱۳۳۵ھ کی رات کو بعد عشاء مولانا عزیز گل، مولوی وحید احمد مدنی اور حکیم نصرت حسین کے ساتھ اونٹوں پر سوار کر کے جدہ بھیج دیے گئے۔ جب مولانا اس پر مطلع ہوئے تو انھوں نے کوشش کی کہ وہ بھی شیخ کے پاس بھیج دیے جائیں۔ چنانچہ شریف کو یہ کہا یا گیا کہ مولانا حسین احمد شیخ کے خاص ساتھیوں میں ہیں۔ شیخ کے رفیق کو ان سے الگ رکھنا خطرناک ہے۔ اس میں سرکار برطانیہ کی ناخوشی کا بھی اندیشہ ہے۔ یہ دلیل کارگر ہوئی۔ دوسرے دن ایک خچر کے ذریعہ جدہ کے لیے روانہ کر دیے گئے۔

جدہ سے یہ قافلہ قاہرہ بھیجا گیا اور وہاں قید کیا گیا۔ قاہرہ میں تین انگریز افسروں پر مشتمل عدالت کے سامنے یہ حوالاتی پیش کیے گئے۔ ان تین افسروں میں سے دو اردو داں تھے اور صاف زبان بولتے تھے۔ اس عدالت کے سامنے حوالاتیوں کے بیان ہوئے۔ مولانا حسین احمد کا بیان دو دن تک ہوا، اور اتنا کارگر رہا کہ وہ مقدمہ جو پھانسی کی سزا کے لئے چلایا جا رہا تھا، اور مولانا عزیز گل نے تو گلے میں پھندا کسنے کی مشق بھی شروع کر دی تھی، مولانا کے مدلل اور موثر بیان کی بدولت مالٹا میں قید رکھے جانے کی سزا پر ختم ہوا۔

۱۴ فروری ۱۹۱۷ء کی صبح کو یہ مجاہد قیدی گورا فوجیوں کی نگرانی میں قاہرہ سے اسکندریہ کے لئے روانہ ہوئے اور وہاں سے جہاز پر سوار کر دیے گئے۔

یہ جہاز جو جنگ آزادی کے ان سورماؤں کو لا رہا تھا، پانچ دن رات کا مسلسل سفر کر کے ۲۱ فروری ۱۹۱۷ء کو مالٹا کے ساحل پر لنگر انداز ہوا۔

مالٹا کا قصہ ہم یہاں دہرا سکتے تو داغہائے سینہ کو تازہ رکھنے میں آسانی ہوتی۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہے اس لئے مولانا حسین احمد مدنی صاحب کے تعلق سے دو باتیں عرض کرنا ضروری ہیں۔ ایک تو یہ کہ جب ڈاک ملی تو گھر کے خطوں کے ذریعہ نہ صرف بوڑھے باپ اور دو جوان بھائیوں کے قید ہو کر ترکی بھیج دیے جانے کی اطلاع ملی بلکہ پانچ یا چھ افراد خاندان کے انتقال کی سنائی بھی ملی۔

دوسری بات جو مالٹا کے قید کے زمانے کا تاریخی واقعہ ہے وہ یہ ہے کہ مولانا کی طالب علمی کا ظاہری دور پایۂ تمامی کو پہونچا۔ یہاں آپ نے قرآن پاک حفظ فرمایا اور ترکی زبان پر عبور حاصل کیا۔ اس کے علاوہ جو حضرات مالٹا کی روداد جاننے اور سمجھنے کے خواہاں ہوں انھیں مبسوط ماخذوں کی طرف توجہ کرنا چاہیے۔ وسط فروری ۱۹۲۰ء میں رہائی کی اطلاع ملی تھی، تیسرے ہفتے میں روانگی ہوئی اور ۸ جون ۱۹۲۰ء کو بمبئی لا کے یہ اسیر ستم رہا کیے گئے۔

مولانا نے ہندوستان آتے ہی اپنے کو انڈین نیشنل کانگریس کی تنظیم اور خلافت کی تحریک سے وابستہ کر لیا۔ یہ سرگذشت تفصیل سے لکھی جائے تو ایک کتاب تیار ہو سکتی ہے اس لیے ہم یہاں صرف اس حلف نامے کو نقل کر رہے ہیں جو رڑکی تھانے کے افسر انچارج دار وغہ محمود نے ایک مقدمہ کے سلسلے میں الہ آباد ہائی کورٹ میں داخل کیا تھا۔ یہ فرد جرم مولانا کے سیاسی مجاہدات کی بہت اچھی گواہی ہے کیوں کہ ایک کھلے ہوئے دشمن کی طرف سے ان کی سرگرمیوں کا اعتراف ہے۔ آپ ملاحظہ فرمائیں:

"حلف نامہ مسٹر محمود سابق افسر انچارج پولیس اسٹیشن دیوبند"

۱۔ "میں اس وقت رڑکی پولیس اسٹیشن کا انچارج ہوں۔ جو واقعات اس حلف نامے میں درج ہیں ان سے پوری طرح واقف ہوں۔

۲۔ یہ کہ مولانا حسین احمد مدنی حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ کے مرید خاص ہیں اور ان میں سے ایک ہیں جو تحریک ریشمی رومال کے بانی مبانی تھے۔

۳۔ یہ کہ مولانا حسین احمد مدنی سازش مذکور کے سلسلے میں عرب بھیج دیے گئے تھے اور وہاں سے لوٹتے ہوئے گرفتار کیے گئے اور مالٹا میں نظر بند

۴۔ یہ کہ جب مولانا حسین احمد مدنی ۱۹۲۰ء میں ہندوستان واپس آئے تو تحریک خلافت کے چلانے میں خاص حصہ لیا اور وہ ایک امیدوار تھے امیر الہند کے، تاکہ اس کے ذریعہ جہاد کا فتویٰ دے سکیں اور ۱۹۲۷ء میں خلافت کمیٹی کی مجلس شوریٰ میں بھی منتخب ہوئے تھے۔

۵۔ یہ کہ علی برادران کے ساتھ مقدمۂ کراچی میں بھی سزایاب ہوئے تھے۔

۶۔ یہ کہ مولانا مدنی نے ۱۹۳۰ء کو سہارنپور میں ایک آگ لگانے والی تقریر کی تھی اور خاص تعلق تھا جمعیۃ علماء ہند سے، اس کے ذریعہ تبلیغ کرتے تھے، ولایتی مال کے بائیکاٹ کی۔ جس میں انگریزی مال بھی شامل ہے اور کھدر کے کپڑے کی اشاعت کرتے تھے۔

۷۔ یہ کہ مولانا مدنی نے مراد آباد میں ۱۹۲۸ء میں صوبہ جمعیۃ علماء کی صدارت کی اور صوبہ خلافت کمیٹی کے صدر بھی منتخب ہوئے۔

۸۔ یہ کہ مولانا مدنی نے مئی ۱۹۳۰ء میں نوجوان بھارت سبھا سہارنپور کے جلسے میں شرکت کی اور گورنمنٹ کے خلاف بہت سخت تقریر کی۔

۹۔ یہ کہ مولانا مدنی نے ۱۹۲۸ء میں مجلس احرار کے لئے چندہ جمع کیا اور جمعیۃ علماء ہند کے ڈکٹیٹر مقرر ہوئے جو اس وقت دہلی میں غیر قانونی جماعت تھی اور ان کے اوپر ایک نوٹس اس امر کی تعمیل کی گئی تھی کہ وہ دہلی میں داخل نہ ہوں۔ لیکن انھوں نے اس کی خلاف ورزی کی اور جیل بھیجے گئے اور بعد میں اگست ۱۹۳۲ء میں رہا ہوئے۔

۱۰۔ یہ کہ مولانا مدنی نے ۱۹۳۶ء/۱۹۳۷ء میں عام انتخابات میں کانگریس امیدواروں کو کامیاب بنانے کی پوری کوشش کی۔

۱۱۔ یہ کہ مولانا مدنی نے ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء میں ولایتی مال کے بائیکاٹ کی کوشش کی اور عوام سے اپیل کی کہ وہ آنے والی لڑائی میں اور بادشاہ کے جشن تاجپوشی میں شریک نہ ہوں۔

۱۲۔ یہ کہ ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء میں مولانا مدنی کا داخلہ دہلی بذریعہ تحریری حکم چھ ماہ کے لئے روک دیا گیا۔

۱۳ یہ کہ مولانا مدنی نے ۱۹۳۸ء و ۱۹۳۹ء میں ہری پورہ کانگریس کے اجلاس میں شرکت کی اور آل صوبہ کانگریس کمیٹی کے نائب صدر رہے۔

۱۴۔ یہ کہ مولانا مدنی نے آزاد مسلم کانفرنس ۱۹۴۰ء جونپور کی صدارت کی اور اس میں انگریزوں کے خلاف بہت زبردست تقریر کی۔

۱۵۔ یہ کہ مولانا مدنی نے اگرچہ گاندھی جی کے خاص حکم کے تحت ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۱ء میں انفرادی ستیہ گرہ میں حصہ نہیں لیا لیکن اس سال کانگریس مجلس منتظمہ کے ایک ممبر تھے۔

۱۶۔ اپریل ۱۹۴۲ء میں دو تقریریں کیں، بچھرایوں کی تقریر کے سلسلے میں ۲۴ جون ۱۹۴۲ء کو گرفتار ہوئے اور مقدمہ چلایا گیا اور دفعہ ۲۶ قانون ہند کے ماتحت چھ ماہ کی سزا ہوئی۔

۱۷۔ مولانا مدنی کا نام سنٹرل گورنمنٹ کی فہرست الف پر اور صوبائی گورنمنٹ کی فہرست الف پر درج ہے جو کسی وقت تیار کی گئی تھی۔ اگست ۱۹۴۲ء کی عام گرفتاری سے قبل اس فہرست میں انہی لوگوں کا نام تھا جو خاص طور پر خطرناک سمجھے گئے تھے اور بعد میں پوری تحقیقات کے بعد دفعہ ۲۶ کے تحت گرفتاری کا حکم جاری کیا گیا۔"

اس گرفتاری سے دو سال دو ماہ دو دن قید میں گزارنے کے بعد ۲۶ اگست ۱۹۴۴ء کی شام کو نینی سنٹرل جیل الٰہ آباد سے رہا کر دیا گیا۔ کھلی فضا تو مولانا کو ضرور میسر ہوئی لیکن یہ دور مولانا کے لیے بڑی روحانی اور نفسیاتی اذیت کا رہا۔ ایک تو دارالعلوم دیوبند میں آپ کے خلاف دراندازیاں ہوتی رہیں۔ دوسری طرف مولانا اور ان کی جماعت کی تمام عمر بھر کی کوششوں اور خواہش کے برخلاف ملک تقسیم ہوا۔ آزادی قتلِ آبادی کی بے پناہ تباہ کاریوں کے ساتھ آئی۔ مسلم لیگ کے شوریدہ سر گستاخ نوجوانوں نے شخصی طور پر جو اہانت اور ایذا رسانی کی وہ بھی سوہانِ روح رہا۔ دارالعلوم دیوبند جو آزادی کی تحریک کے مرکز کے طور پر قائم ہوا تھا، آزادی کے بعد تلاشی کے لیے اس میں پولیس درانہ داخل ہوئی۔ پھر بھی مولانا جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے جو کچھ ممکن ہوسکا وہ سب کرتے رہے۔ لیکن حساس دل کہاں تک ان صدمات کی تاب لاتا۔

جولائی ۱۹۵۷ء میں مدراس کے دورے پر تشریف لے گئے۔ پروگرام ڈیڑھ مہینے کا تھا مگر واپسی پندرہ دن کے اندر ہی ہوگئی۔ پتہ چلا کہ سانس لینے میں تکلیف ہے۔ علاج معالجہ جو ممکن تھا سب کچھ کیا گیا۔ ۵ دسمبر ۱۹۵۷ء کو سہ پہر میں وقت موعود آ پہنچا اور تقریباً اٹھتر سال سنہ عیسوی کے

صاحب نے فرمائی۔

آپ نے تین بیٹے اور چار بیٹیاں چھوڑیں، جن میں مولانا سید اسعد مدنی سیاسی اور سماجی خدمات میں باپ کے جانشین ہوئے۔ مسند درس کو آپ کے دوسرے بیٹے حافظ قاری ارشد مدنی صاحب نے سنبھالا، جو فرید وحیدی صاحب کی روایت کے مطابق دارالعلوم دیوبند میں استاد تھے۔ تیسرے صاحبزادے مولوی اسجد مدنی جمعیۃ العلماء ہند میں رفیق کار ہیں۔ (ختم)

□□

حاشیہ

لہ مولانا مدنی کے سوانح کے لئے ہم نے محض دو کتابوں سے استفادہ کیا۔ ایک ہے مولانا کے بڑے بھائی کے پوتے مولوی فرید الوحیدی کی "شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی" یہ تقریباً ساڑھے آٹھ سو صفحات پر مشتمل مولانا کی مبسوط سوانح عمری ہے جو قومی کتاب گھر، ذاکر نگر جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی۔ ۲۵ نے شائع کی ہے۔ ہم اس ماخذ سے جناب مولانا ضیاء الدین اصلاحی ناظم دارالمصنفین اعظم گڑھ کی عنایت سے فائدہ اٹھا سکے۔ سعی بلیغ کے باوجود کتاب بازار میں دستیاب نہ ہو سکی۔

دوسری کتاب، جسے بطور ماخذ کام میں لایا گیا ہے، وہ خود جناب مولانا کی خود نوشت "نقش حیات" جلد (۱) ہے، جسے مولانا کے زمانۂ حیات میں ہی ان کے خلف اکبر مولانا اسعد مدنی نے دیوبند سے ہی شائع کیا تھا۔ اس لیے اقتباسات وغیرہ کے صفحات کا اظہار حاشیہ لکھ کے نہیں کیا گیا۔ مضمون بہت طویل ہو گیا، اس لئے اختصار کے پیش نظر ایسا کرنا پڑا۔ موضوع گفتگو علمائے اسلام کی منزلت دیکھتے ہوئے یہ عرض بجا ہے ؎

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

——— (س.م)

نوٹ: سلسلے کے لئے نیا دور فروری، مارچ ۱۹۹۴ء (اودھ نمبر) اور نیا دور شمارہ اپریل ۱۹۹۴ء ملاحظہ فرمائیں۔

غزل

عشق زندگی کے سوال ہیں، کوئی بات کر، کوئی بات کر
مرے واسطے یہ وبال ہیں، کوئی بات کر، کوئی بات کر

مری حالتوں کو سمجھ گیا، مرے آنسوؤں سے الجھ گیا
یہ شریکِ شام وصال ہیں، کوئی بات کر، کوئی بات کر

میں خلیق تھا، میں شفیق تھا، میں ازل سے جن کا رفیق تھا
وہی لوگ میرا زوال ہیں، کوئی بات کر، کوئی بات کر

مرے جسم و جاں میں شکستگی، مرے واسطے یہی بے کسی
ترے سامنے مہ وسال ہیں، کوئی بات کر، کوئی بات کر

مری حسرتوں کا جواب دے، کبھی اپنے دل کا حساب دے
ترے سامنے بھی سوال ہیں، کوئی بات کر، کوئی بات کر

مجھے رنج ہے، تجھے رنج ہے، اسے رنج ہے، اُسے رنج ہے
سبھی رنج و غم سے نڈھال ہیں، کوئی بات کر، کوئی بات کر

□□

——— انور ندیم
۲۶۱۔ پانچویں گلی، نشاط گنج۔
لکھنؤ

غزلیں

میں کیسے کہدوں کہ مجھ سے بھی بدگمان تھا وہ
سمجھ نہ پائے جسے تم وہ داستان تھا وہ

چھپا رہا تھا ہر اک کرب کو تبسم میں
خوشی کے ساتھ غموں کا بھی میزبان تھا وہ

وہ جس کے پاس ہر اک زخم کا مداوا تھا
تمہارے شہر میں محتاجِ سائبان تھا وہ

یہ دیکھنا ہے بہاروں سے کیا ملا اس کو
یہ اور بات ہے پھولوں کا قدر دان تھا وہ

خموشیوں کے خزانے تھے اس کی قسمت میں
نہ جانے کونسی بستی کا آسمان تھا وہ

اسی کا طرزِ تکلم سبھی نے اپنایا
جسے زمانہ یہ کہتا ہے بے زبان تھا وہ

ہے فاصلوں میں بہت احتیاط کا منظر
سنا تھا ہم نے بہت تم پہ مہربان تھا وہ

—— منصور احمد عثمانی منظر
سی ۲۰۰، منٹو روڈ کامپلکس
نئی دہلی - ۲

چوٹ لگی تھی اوّل شب اور درد اُٹھا تھا آخرِ شب
دل ٹوٹا تھا شام ڈھلے احساس ہوا تھا آخرِ شب

تیرا ذکر ہے تیری فکر ہے، تیرا خیال اور تیری یاد
صبح سے دن بھر دن سے شام اور اوّلِ شب تا آخرِ شب

ایک اک کرکے مجھ سے سارے ساتھی بچھڑے جاتے ہیں
پہلے چراغِ شام بجھا پھر آئینہ ٹوٹا آخرِ شب

ایک زمانہ بیت گیا ہے یہ معمول بنائے ہوئے
دن بھر جاں بخشی کی دعائیں شکر کا سجدہ آخرِ شب

کل بستی کے بازاروں میں میں نے جی بھر کے دیکھا
لمحہ لمحہ رقصِ بسمل، جشنِ تماشا آخرِ شب

سارے خاک نشیں چہرے ایک اک کرکے یاد آتے ہیں
میرے ساتھ میں جاگ رہی ہر ساری دنیا آخرِ شب

—— ڈاکٹر سلمان عباسی
۷۵۔ ڈاکٹر موتی لال بوس روڈ
لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

ترے بغیر کسی پھول پر نکھار نہیں
یہاں بہار کا موسم تو ہے بہار نہیں

کسی طرح سے یہ دنیا سنور نہیں سکتی
ہزار بار جو چاہو ہزار بار نہیں

ہیں بے نیاز اگر مجھ سے قافلے والے
مجھے بھی قافلے والوں کا انتظار نہیں

عبث ہے آپ پر الزام بے وفائی کا
کوئی ہزار کہے مجھ کو اعتبار نہیں

یہ ان کا حصہ ہے جو حق کی بات کہتے ہیں
ہر اک کے واسطے یارو صلیب و دار نہیں

گزر رہے ہیں کچھ اس طرح روز و شب جوہر
مری حیات کے لمحے کسی پہ بار نہیں

چندر پرکاش جوہر بجنوری
۶۰ زیبا بلڈنگ، لیڈر روڈ
الہ آباد ۲۱۱۰۰۳

اظہر مسعود
"ادبستان". دین دیال روڈ
لکھنؤ

لکھنؤ کی پھبتیاں

یادش بخیر ایک زمانہ تھا جب لکھنؤ والے اپنی خوش گفتاری ظرافتِ طبع، شوخی اور بذلہ سنجی کے لئے شہرہ آفاق تھے۔ اثنائے گفتگو میں محاوروں، مثلوں، روزمرّہ، ضلع جگت، رعایتِ لفظی، اشعار کا برمحل استعمال اور موقع موقع سے پھبتیاں کسنا ایسی خصوصیت تھی جس سے دوسرے لوگ محروم نظر آتے ہیں۔ عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں :

"اہلِ لکھنؤ میں شوخی و ظرافت بہت ہے۔ وہ اپنے کلام میں صدہا عنوانوں سے ظرافت پیدا کر دیا کرتے ہیں ...... لطافت کلام کے ساتھ بذلہ سنجی و ظرافت میں جیسا بے تکلف اور ستھرا مذاق ان کا نظر آئے گا، اوروں کا نہیں ہوسکتا۔" [1]

لکھنؤ کے ذکی، فہیم، عقل کے تیز [2] باشندوں کی گفتگو کی لطافتوں اور باریکیوں سے کچھ وہی حضرات پورے طور پر محظوظ ہوسکتے تھے جنھوں نے ایک عمر یہاں کی صحبتیں اٹھائی ہوں۔ لکھنؤ کی پھبتیاں بھی شرر کے مندرجہ بالا بیان کی تصدیق کرتی ہیں۔

پھبتیوں کا ذکر کرنے سے پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ لغت نویس پھبتی کی کیا تعریف کرتے ہیں :

(۱) فرہنگ آصفیہ [3] اسم مؤنث۔ ایسی بات جو کسی پر پھب جائے۔ مشابہت تامہ۔ چپتی ہوئی بات۔ کسی چیز کو کسی چیز سے ظرافتاً تشبیہ دینا۔

(۲) فرہنگ شفق [4] ایسی بات کسی کی شان میں بے ساختہ کہنا جو اس کے (کذا) وضع کے حسب حال ہو۔

(۳) نوراللغات [5] مؤنث۔ تشبیہ، چسپاں تشبیہ، ایسی بات جو کسی پر پھب جائے اور عین مین وہی معلوم ہو ... پھبتی ایک قسم کی تشبیہ ہے جس میں مشبہ پر استہزا کرنا مقصود ہوتا ہے۔ جیسے سیاہ فام چہرے پر چیچک کے داغوں کو گوبر میں اولے پڑنا کہیں۔

(۴) مہذب اللغات [6] تشبیہ کے پردے میں کسی شخص کے متعلق ایسی بات کہنا جو ظرافت کے ساتھ اس پر صادق آتی ہو۔

پھبتی کہنا، پھبتی اڑانا، پھبتی کسنا، پھبتی سوجھنا، پھبتی ہونا محاورہ ہے۔

ایک مشہور ادبی واقعہ ہے کہ شیخ قلندر بخش جرأت نے ایک مصرعہ کہا: ؎

اُس زلف پہ پھبتی شبِ دیجور کی سُوجھی

ان کے دوست سید انشاء اللہ خاں انشا نے اس پر مصرع ثانی لگا کر مطلع کر دیا ـــــ

اندھے کو اندھیرے میں بہت دُور کی سوجھی [7]

مصرعِ ثانی میں حضرت جرأت پر زبردست پھبتی ہوگئی کیوں کہ وہ نابینا تھے۔ انشاء کا مصرع ضربُ المثل بن گیا۔ علاوہ بریں انشاء کا یہ مصرع پھبتی پر پھبتی کسنے کی نادر مثال ہے۔

کچھ اور منظوم پھبتیاں دیکھئے : ؎

کشتہ ہیں آرزو میں تو مدفن ہے دل مرا
پھبتی ہے داغِ دل پہ چراغِ مزار کی
ـــــــــــ سخن

کماں سے دی کبھی تشبیہ ہم نے تیغ سے گاہے
کہی ہیں پھبتیاں اس ابروئے خمدار پر کیا کیا
ـــــــــــ آتش

اس پری رخسار پر پھبتی کہی ہے حور کی
سچ تو یہ ہے کیا ہی مجھ کو سوجھی ہے دُور کی (ناسخ)

کہیں ہم زدیہ پھبتی کہ قسمت ان کو روتی ہے
اگر پیشانیِ زُہّاد سے آبِ وضو ٹپکے

——— رِند

گھر کی چھت بھر میں جو اک آئینہ ہر اے گلِ تر
پھبتی اس پر یہ ہوئی ہے کہ ہے دریا الٹا

——— رشک

صاف تنویر و صفا سے یہی پھبتی سوجھی
چشمِ عالم ہیں وہ آئینہ، زانو دونوں

——— رشک

والد مرحوم مسعود حسن رضوی ادیب بتاتے تھے کہ ان کے ایک ہم جماعت تھے جن کا قد اوروں کی بہ نسبت بہت کم تھا۔ ان پر 'میاں فروری' کی پھبتی کہی گئی۔ کیوں کہ فروری عیسوی سال کا سب سے چھوٹا مہینہ ہوتا ہے۔

ناسخ لکھنوی کو شاعری کے ساتھ پہلوانی کا بھی شوق تھا۔ مندرجہ ذیل مقطع میں اسی طرف اشارہ ہے ؎

لڑتے ہیں پریوں سے کشتی پہلوانِ عشق ہیں
ہم کو ناسخ راجہ اندر کا اکھاڑا چاہیئے

رنگت بھی کالی تھی، اسی رعایت سے ان پر 'دُم کٹا بھینسا' کی پھبتی کہی گئی تھی۔

——— کسی مشاعرے میں ایک سن رسیدہ شاعر غزل خوانی کر رہے تھے، وہاں مجاز بھی موجود تھے، شاعر صاحب نے ایک شعر جو ذرا زور دے کر پڑھا تو ان کی نقلی بتیسی نکل کر فوراً نیچے گر پڑی۔ مجاز نے فوراً داد دی،

"حضور، کیا کہنے۔ خالص زبان کا شعر ہے"

——— مولانا آغا مہدی نے اپنی کتاب 'تاریخِ لکھنؤ' (جلد ۱) میں دو بھائیوں کا ایک واقعہ تحریر کیا ہے:

"بڑے بھائی کا نام مولوی کاظم حسین مرحوم، چھوٹے کا مولوی ناظم حسین مرحوم (تھا)۔ دونوں بھائیوں میں سن و سال کا بہت تھوڑا فرق تھا۔ ان کی کم سنی کا واقعہ ہے۔ دونوں بھائی قبائیں پہنے ہوئے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ عقب سر سے کسی نے پھبتی کہی: "فرزندانِ مُسلم!" مولوی ناظم صاحب نے فوراً جواب دیا: حارث تعاقب میں ہے۔" (ص ۱۳۰)

——— ایک دفعہ ٹھُڈ بہرے آدمیوں کو یک جا دیکھ کر 'بھُسرین' کی پھبتی کہی گئی۔

——— 'بھتنار' اودھ پنچ' نے کسی مہارانی پر جنھیں اپنی تصویر کھنچوانے کا بڑا شوق تھا، پھبتی کہی: "زندہ صورت نیم ساختہ تمثال"۔

——— خود اودھ پنچ پر 'مولانا پنچ' کی پھبتی ہوئی تھی۔

اُردو داستانوں میں بے شمار پھبتیاں مل جائیں گی لیکن ان کے تفصیلی بیان کے لئے دامنِ قرطاس تنگ ہے۔ چند پھبتیاں 'فسانۂ آزاد' سے مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر نقل کی جاتی ہیں،

——— چمّی جان نے میاں آزاد پر پھبتی کہی: "بنڈیلا کسم کے کھیت سے نکل پڑا"

——— ایک مالدار جوہری کا غرق البحر زرک لباس دیکھ کر میاں آزاد کو "مرغ زرّیں" کی پھبتی سوجھی۔

ان کے علاوہ 'نیا رنگ لائی گلہری'، 'نئے بگڑے'، 'پُرانا جُغادری'، 'بچھیا کے تاؤ' وغیرہ سیکڑوں پھبتیاں اس ایک کتاب میں ہی مل جائیں گی

اہلِ لکھنؤ کا فطری چلبلا پن علماء و واعظین و ذاکرین تک پر پھبتیاں کرنے سے نہیں چوکتا تھا۔ غیر معمولی طور پر لمبے قد کے عالموں پر 'ستون الملّت' اور 'کھمبۃ العلماء' کی پھبتیاں کہی گئیں۔ ایک عالم جو تن و توش کے کچھ زیادہ ہی لحیم تھے 'پہلوان العلماء' کی پھبتی سے نوازے گئے۔ ایک فاضل جو بہت کوتاہ قد تھے 'ہوز الفضلاء' کہے گئے۔ (اس پھبتی میں یہ نکتہ پوشیدہ ہے کہ ہائے ہوز (ہ) حائے حطی (ح) کے مقابلے میں قد اور اعداد دونوں کے اعتبار سے چھوٹی ہوتی ہے۔ ایک ذاکر جو دوسرے علماء کے سیاہ رنگ کے ملبوس کے برعکس ہمیشہ سفید رنگ کا عمامہ، عبا و جبہ پہنتے تھے 'فرات کا بگلا' کہلائے۔ ایک دوسرے عالم پر پھبتی ہوئی۔ 'نخّاس کی چیل'

ناموں میں تحریف کر کے بھی پھبتیاں کہی جاتی تھیں۔ نجم الغنی خاں رام پوری سے لکھنؤ والوں کو شکایت تھی کہ انھوں نے اپنی تالیف "تاریخِ اودھ" میں پورے طور پر مورخانہ دیانت داری کا ثبوت نہیں دیا ہے اور انگریزوں کی شہ پر بعض ذاتی اسباب سے شاہانِ اودھ کی تصویر کو مسخ کر کے پیش کیا ہے چنانچہ ان کے نام کی صورت شکل 'نجم الغبی' ہو گئی۔ شیخ ممتاز حسین عثمانی

میرزادہ تیغ نے بجو میرزا کی تصنیف "گنجینۂ تحقیق" کی رعایت سے "گنجینۂ نا تحقیق" کی پھبتی وضع کی۔

یگانہ نے علامہ اقبال پر میرزا ان شکار چڑی مار اِکبال" کی پھبتی کہہ ڈالی پنجابی عموماً ق کا تلفظ بھی ک کرتے ہیں۔

لکھنؤ کے بھانڈ بھی اپنی حاضر جوابی کے لئے مشہور تھے۔ اب تو لکھنؤ سے یہ صنف ہی ناپید ہو گئی ہے۔ کوئی خوشی کا موقع ہو، بھانڈ مبارک باد دینے ضرور آتے ہیں۔ مبارکبادیں گاتے، فقرے چست کرتے اور جب تک متوقع انعام نہ مل جاتا، ٹلنے کا نام نہ لیتے۔

راقم السطور کی ولادت کے وقت والد مرحوم کی عمر پچاس برس کے لگ بھگ تھی، ان کی کاٹھی بھی کچھ ایسی تھی کہ اپنے سِن سے خاصے زیادہ لگتے تھے۔ بھانڈوں نے ڈیوڑھی پر آکر بہ آواز بلند مبارکباد دی:

"نواب صاحب۔ پوتا مبارک!"

اُردو میں کتنے ہی ایسے محاورے اور ضرب الامثال ہیں جن کے بارے میں قیاس کہتا ہے کہ یہ پھبتیوں کی شکل میں ہی عالم وجود میں آئے ہوں گے۔ مثلاً: بوڑھی گھوڑی لال لگام۔ ماں نہ مان میں تیرا مہمان۔ جان جائے خرابی سے ہاتھ نہ اُٹھے رکابی سے۔ جان نہ پہچان بڑی خالہ سلام۔ ناچ نہ آئے آنگن ٹیڑھا۔ آڑا پونے تادا۔ کولھو کا بیل۔ بے دال کا بودم، وغیرہ۔

مشہور حدیث نبوی ہے کہ "کلام میں ظرافت ویسی ہی ہے جیسے کھانے میں نمک [۱۰]" اہل لکھنؤ کے کلام میں جو ظرافت ہوتی تھی اس کے ڈانڈے ملامت یا منقصت سے نہیں ملتے تھے بلکہ وہ فی الواقع کھانے میں نمک کے مانند حدِ اعتدال کے اندر ہی رہتی تھی۔

□□

حواشی:

۱۔ گزشتہ لکھنؤ۔ مرتبہ شمیم انہونوی طبع ۱۹۶۵ء صفحہ ۲۴

۲۔ فسانۂ عجائب۔ از رجب علی بیگ سرور۔ مرتبہ رشید حسن خان (متن)

۳۔ مولفہ سید احمد دہلوی

۴۔ مولفہ لالتا پرشاد شفق

۵۔ مولفہ نور الحسن نیر کاکوروی

۶۔ مولفہ میرزا مہذب لکھنوی

۷۔ اس واقعے کی تفصیل 'آب حیات' (از محمد حسین آزاد) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

۸۔ آب حیات۔ مطبوعہ اتر پردیش اردو اکادمی صفحہ ۳۳

۹۔ بحوالہ گزشتہ لکھنؤ از عبدالحلیم شرر، مرتبہ شمیم انہونوی مطبوعہ ۱۹۶۵ء صفحہ ۳۲

غزل

ایک ہی رُت سے جب ہم سب گھبرا جاتے ہیں
نغمے گانے والے پنچھی آ جاتے ہیں

پیڑوں میں رستے کا بری فکر کیسے سہے
کچے پھل ہی توڑ کے راہی کھا جاتے ہیں

ہو جاتا ہے جب وہ میری آنکھ سے اوجھل
ذہن و دل پر کالے بادل چھا جاتے ہیں

میرے گھر کی ڈیوڑھی میں آوارہ کتے
بارش سے بچنے کی خاطر آ جاتے ہیں

رشتے سینچا کرتے ہیں پودوں کو لیکن
پھول ہری شاخوں پر بھی مُرجھا جاتے ہیں

—— ملک زادہ جاوید
س۔ ۱۳۳۹، اندرا نگر
لکھنؤ

جرم

اپنے حق کے لیے زمانے سے
رحم کی بھیک مانگنے والو
موت بہتر ہے ایسے جینے سے

ایسا جینا جو بوجھ ہو خود پر
ایسا جینا جو قرض ہو جیسے
ایسا جینا جو قرض ہو جیسے
ایسا جینا بھی کوئی جینا ہے

ایسے جینے کے واسطے یارو
لمحہ لمحہ تڑپنا پڑتا ہے
لمحہ لمحہ سسکنا پڑتا ہے
خود کو خود قتل کرنا پڑتا ہے

مانگنے سے کبھی نہیں ملتا
اپنا حق بڑھ کے چھینا جاتا ہے
اپنے حق کے لیے زمانے سے
رحم کی بھیک مانگنے والو
موت بہتر ہے ایسے جینے سے

□□

رشید قریشی
۳۰۔ محمد علی لین، امین آباد
لکھنؤ-۱۸

دہلیز

کبھی اپنے جسم میں
ناخنیں گاڑتی
کبھی جھلاتی ہوئی بچّے کو پیٹتی
کبھی چھاتی سے لگاتی
پیار کرتی دبوچتی
کبھی شرم سے آئینہ چھپاتی
کبھی پھول چنتی ہوئی خود بکھرتی
کبھی اون کے گولے میں الجھتی
کبھی ہنستے ہنستے اچانک ہی روتی
کبھی بڑبڑاتی، گم سم سی رہتی
مگر شام ہوتے ہی دہلیز پر
اِک دیا
جلانا نہیں بھولتی!

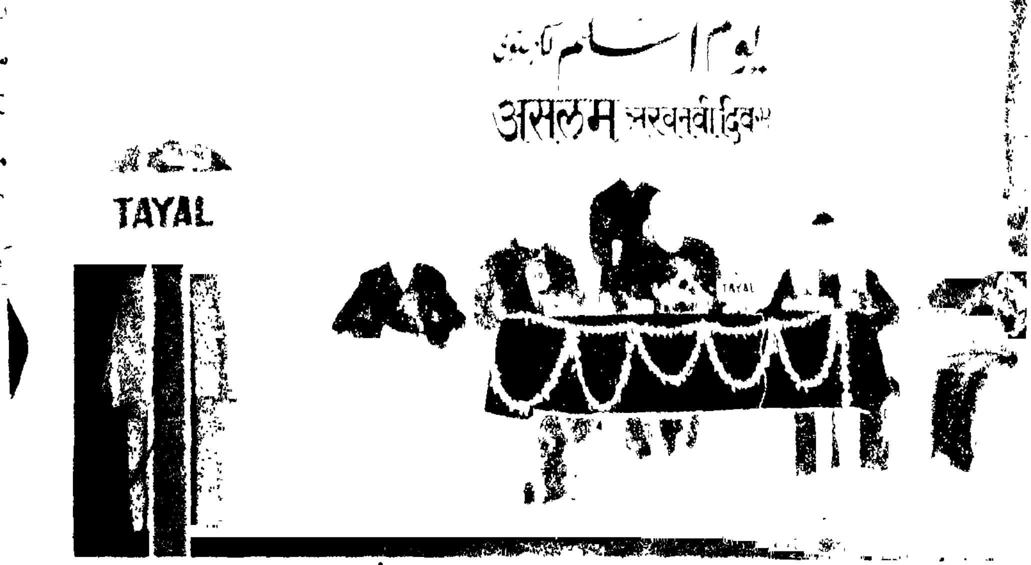
رؤف صادق
اے ٹی۔ ۶ (۵)، لکڑ کمپاؤنڈ
ملاوانی، بمبئی
۴۰۰۰۹۵

مشورہ

سورجوں کو جنم دینے والی
اِسی کوکھ دھرتی میں
اندھیروں کے بیج بو کر
اپنے پُرکھوں کی تپسیا
اور شہیدوں کا لہو اکارت نہ کرو
اس کوکھ دھرتی نے
جو سورج اگائے ہیں
اُن سورجوں کو
اپنی اور اپنے سمے کی آنکھیں سمجھ کر
ان کی رکشا کرو
کہ وہ بجھنے نہ پائیں
ورنہ اندھیروں کے بیج
پہاڑوں کی طرح اُٹھ کھڑے ہوں گے
پھر کچھ سجھائی نہ دے گا
انہونی ہونی بن جائے گی
سمے نکل جائے گا
پچھتاوا باقی رہ جائے گا
سوچو کچھ تو سوچو
ابھی سمے باقی ہے
آنکھوں کے اندھے بن جاؤ
مگر عقل کے اندھے نہ بنو
کیوں کہ اس اندھے پن کی
کوئی دوا نہیں!

رزاق افسر
۲۹۱۳ حیدر علی روڈ
لشکر محلہ میسور

ریاست کے گورنر
شری موتی لال ووہرا
گذشتہ دنوں
راج بھون کے دربار
میں یوم اسلم
کے سلسلے میں
منعقدہ تقریب
کی صدارت
کرتے ہوئے





اترپردیش کے وزیراعلا
شری ملائم سنگھ یادو
یوجنا بھون لکھنؤ میں
گذشتہ ۲۹ اپریل
۱۹۹۵ء کو
فروغ اردو کمیٹی اترپردیش
اردو کو روزی روٹی سے
جوڑنے کے لئے
جلسے کی صدارت
کرتے ہوئے



پردیش کے وزیر اعلا شری ملائم سنگھ یادو. یوجنا بھون میں دسویں مالیاتی کمیشن کے ہ
سے تبادلۂ خیال کرتے ہوئے۔



وزیر امداد باہمی
شری اعظم خاں
زید پور
بارہ بنکی میں،
آل انڈیا مشاعرے
کے موقع پر
سامعین سے
خطاب
کرتے ہوئے



شری کے۔ سی۔ پنت اور دیگر اعلا حکام

"بچوں کی شام سماجی تبدیلی کے نام
کی رسمِ اجرا ادا کرتے ہوئے اُ
کے گورنر شری موتی لال ووہرا۔



وزیر اعلا اترپردیش
شری مُلائم سنگھ یادو
۱۵ مئی ۱۹۹۴ء کو
حیدر آباد میں
آندھرا پردیش کے
وزیر اعلا
شری وجے بھاسکر ریڈی
سے گفتگو
کرتے ہوئے

وزیر اعلیٰ اترپردیش
شری ملائم سنگھ یادو
کی موجودگی میں
پی ایچ ڈی چیمبر آف کامرس
اینڈ انڈسٹریز
کے درمیان
صنعتی ترقی اور
تعاون کے لئے معاہدے
پر دستخط کئے گئے





وزیر اعلیٰ اترپردیش
شری ملائم سنگھ یادو
نمائش میدان حیدرآباد میں
پسماندہ طبقہ کی کانفرنس سے
خطاب کرتے ہوئے



(ڈاکٹر) شاہ عبدالسلام
شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

لکھنؤ دوسو برس پہلے

ایک ایرانی سیاح کی نظر میں

پیش نظر مضمون میر عبداللطیف خاں شوستری کے فارسی سفرنامے "تحفۃ العالم" کے چند اقتباسات کا اردو ترجمہ ہے میر عبداللطیف خاں شوستری نے ۱۷۹۲ء میں پوری دنیا کا سفر کیا تھا اور وہ ہندوستان بھی آئے تھے۔ اس دوران انھوں نے ہندوستان کے مختلف شہروں کی سیر کی۔ وہ نواب آصف الدولہ کی دعوت پر غالبا ۱۷۹۵ء میں بنارس جون پور ہوتے ہوئے لکھنؤ آئے تھے۔ لکھنؤ میں انھوں نے علامہ تفضل حسین خاں اور سید محمد جعفر کے ساتھ قیام کیا تھا۔ انھوں نے اس سفرنامے میں لکھنؤ کے چشم دید حالات وواقعات تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ ان کے یہ چشم دید بیانات اگر ایک طرف اس دور کے لکھنؤ کے رہن سہن، آداب وتہذیب اور دیگر معاشرتی حالات کی عکاسی کرتے ہیں تو دوسری طرف سلطنت اودھ کے سیاسی نشیب وفراز اور ارباب حکومت کی کرشمہ سازیوں پر بھرپور روشنی بھی ڈالتے ہیں۔ اس مضمون کے مطالعے سے قارئین اندازہ کر سکتے ہیں کہ دوسو برس پہلے لکھنؤ کیا تھا۔

سفرنامہ "تحفۃ العالم" مرزا محمد تہرانی کے اہتمام سے مطبع شوکت الاسلام حیدرآباد سے سو سال قبل شائع ہو چکا ہے۔

—— ڈاکٹر شاہ عبدالسلام

لکھنؤ ہائے مکتوبی کے حذف کے ساتھ مشنو کے وزن پر، مدد کے وزن پر صوبہ اودھ کے عظیم شہروں میں سے ہے اور ہندوستان کی قدیم آبادیوں میں سے ہے اس کی تعمیر ہندو مؤرخین چند لاکھ سال سے بتلاتے ہیں۔ بے در اور دالان کی آبادی اور بے سروسامان سواد اعظم ہے۔ حصار، شہر پناہ، قلعہ اور دروازہ بالکل نہیں رکھتا ہے اور اس مملکت کے اکثر بڑے شہروں کا حال ایسا ہی ہے مثلاً کلکتہ، مرشدآباد، عظیم آباد اور بنارس وغیرہ ان میں سے کوئی بھی شہر پناہ نہیں رکھتا ہے۔ ہر شخص جہاں سے چاہتا ہے داخل ہو جاتا ہے۔ بہت زیادہ وسیع ہونے کی وجہ سے تمام شہر کا احاطہ دشوار ہے۔ لکھنؤ جس کی وسعت قیاس کے اندازے سے باہر ہے۔ اس کا عرض خط استوا سے ۲۱، درجہ اور چند دقیقہ ہے، ہوا اچھی اور معتدل ہے۔ اکثر موسم گرما میں ہوا اتنی سخت گرم ہو جاتی ہے کہ بڑے نازک مزاج اور اوسط درجہ کے لوگ بھی اپنے حوصلے کے مطابق خس خانہ بناتے ہیں اور اس سے گرمی کی تکلیف رفع کرتے ہیں۔ لوگ ہوادار وسیع حجرے رکھتے ہیں جن میں بہت سے دروازے بنا رکھتے ہیں اور اس دروازہ کو پنجرے نما ایسا بنا دیتے ہیں کہ جس قدر چاہیں کھلا رکھیں اور جس قدر چاہیں بند رکھیں اور ان پنجروں کو خس سے بھر دیتے ہیں اور اس پر دم بہ دم فواروں کے ذریعہ جو پانی کی مشکوں پر نصب ہوتے ہیں آب پاشی کرتے ہیں ہوا جو اس تک پہنچتی ہے اور اندر داخل ہوتی ہے وہ سرد اور خوشبودار ہوتی ہے اور اس موسم میں جیسا کہ چاہیے تکلف کرتے ہیں اور بغیر اس کے کہ چادر یا کوئی چیز کندھے پر رکھ لیں سردی سے نیند نہیں آتی ہے اور علماء کے گھروں میں خس خانوں کے اندر پانی کی نہر جاری ہے اور ہر دروازہ پر فوارہ نصب ہے کہ خود بخود اس فوارہ سے پانی دروازہ کے پورے حصہ پر جو خس سے ڈھکا ہوا ہے پہنچتا ہے اور اس کی ضرورت نہیں پڑتی کہ سقا یا خادم اندر آئیں اور یہ منظر عجیب کیفیت رکھتا ہے۔ بند گوبھی اور خربوزہ کی قسمیں اس شہر میں بہت ہیں۔ اور اس ملک کے دوسرے شہروں سے بہتر ہیں اور چونکہ ابتدا میں اس شہر کو آباد کرنے والے راجے بے سلیقہ تھے اس لیے اس شہر کی پوری زمین پست اور بلند ہے اور موجودہ عمارتیں اور گھر ایک اعلیٰ درجہ کی بلندی پر اور دوسرا ادنیٰ درجہ کی پستی

ہیں ہے۔ ایک گھر میں اس کے گوشے سے ایک حصہ اتنی بلند ہے کہ اس کے گوشے کی بلندی کے درجہ میں واقع ہے اور دوسری اتنی پست ہے کہ زینے کے ذریعے سے نیچے آتے ہیں۔ گلیاں بازار اور گذرگاہیں بھی اسی نسبت سے پست اور بلند ہیں۔ آصف الدولہ کی سرکار میں بارہوں مہینے اتنی وافر مقدار میں برف ہوتا ہے کہ امراء اعزہ کو روزانہ ان کی سرکار سے پہونچتا ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ شہر کے باہر وسیع میدان جو درختوں سے خالی ہوتے ہیں اس کام کے لیے سطح ہموار کر لیتے ہیں پھر اس پر دھان کی بھوسی یا جو کی بچھا دیتے ہیں۔ اور پھر اس پر بہت سا پانی چھڑکتے ہیں اور نرم مٹی کے بنے ہوئے نازک برتن (کلہڑ) ان کے اوپر بچھا دیتے ہیں اور دس برتن پر ایک آدمی متعین ہے جس کے پاس ایک دیگ رہتی ہے جس میں نیم گرم پانی رہتا ہے۔ آخیر رات کو جب نسیم سحری چلتی ہے تو اس پانی کا تھوڑا سا حصہ ان برتنوں میں وہ ٹپکاتا ہے اور وہ اسی وقت جم جاتا ہے اور آدھی انگلی یا اس سے زیادہ کے بقدر منجمد ہو جاتا ہے اسی وقت اس (برف) کو جمع کرتے اور کوٹتے ہیں۔

میں نے سنا ہے کہ آصف الدولہ کی سرکار میں جا بجا لکھنؤ کے نواح میں چار منزل تک یہ برف بنانے والے متعین تھے جو بارہ ہزار آدمیوں سے زیادہ تھے اور شاہجہاں آباد میں ارباب خیر نے ان فقراء اور مساکین کے لیے جو برف پر دسترس نہیں رکھتے ہر محلہ میں ایک یا دو عدد وسیع کنویں بنوا دئے ہیں اور اس قدر کھدوایا ہے کہ پانی نہ نکلے۔ اور زمین سے پانی نہیں نکلتا ہے۔ زمین اور اس کی دیواروں میں نیچے سے اوپر تک جست سبز کی تختیاں جو ایک مشہور معدنی جوہر ہے اور پانی کو ٹھنڈا کرنے میں اپنی نظیر نہیں رکھتا ہے لگا دی گئی ہیں۔ جاڑے کے موسم میں اسے پانی سے بھر دیتے ہیں اور اس کا منھ پتھر اور سار وج سے بند کر دیتے ہیں کہ اس میں ہوا بالکل نہیں پہونچتی۔ اسے گرمی میں کھولتے ہیں۔ پورے گرمی کے موسم میں پانی اسی طرح ٹھنڈا رہتا ہے جیسا جاڑے میں ہوتا ہے۔۔۔ لکھنؤ میں قزلباش شیعہ کی بڑی تعداد رہتی تھی اور حکومت کرتی تھی۔

آصف الدولہ بہادر یحییٰ خاں۔ اگرچہ ریاست اور امور سلطنت کے نظم و نسق میں جیسا کہ چاہئے نہیں تھے اور ذاتی طور پر ریاست کا اہم کام چلانے سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے تھے۔ اور انگریزوں کی مدد سے بالغرض حکومت کرتے تھے لیکن ذاتی سخاوت اور فطری بخشش حاتم زمانہ اور برادری اور اعلیٰ کے ساتھ ایثار کرنے اور خرچ کرنے میں مجبور تھے اور کوئی ایسا نہیں تھا کہ انکی دریا دلی سے بے بہرہ ہوا اور محروم ہو۔ اور ان کی نگاہ میں دنیا کے خزانوں کی مقدار گھاس کے سرے کے برابر بھی نہ تھی۔ زائرین اور حرمین جیسے بلند مرتبہ دیار میں رہنے والوں کے لیے انھوں نے عالی شان سرائیں بنوائیں تھیں کہ جیسے ایک کثیر تعداد اور جم غفیر اس میں رہتی تھی جہاں ایک کا اس کے مرتبے کے بقدر آنے کے روز سے روزینہ مقرر ہو جاتا تھا یہاں تک جس روز سے وہ واپس روانہ ہوتا تھا اس کی قسمت میں جو کچھ ہوتا وہ کم و بیش اسے پہونچ جاتا تھا۔ اور آل سادات ہند کے نیک کاموں میں سے ایک فرات کا پانی لانا ہے۔۔۔ سخاوت ان کے نام نامی کے ساتھ لکھا گیا کہ دنیا اور دنیا والے قیامت کے آغاز اور دوسرے صور کے پھونکے جانے کے وقت تک داستانوں میں ان کا نام لیں گے۔ اور ان کے لیے مغفرت و بخشش طلب کریں گے۔ اور ائمۂ اطہار صلوات اللہ علیہم کے ساتھ فرط محبت اور اس عہد و جہد کی وجہ سے جو سید الشہداء کی تعزیہ داری کے مراسم کے سلسلے میں وہ کرتے تھے ایک تعزیہ خانہ اور اس کے پہلو میں ایک عالی شان مسجد اپنے گھر کے قریب بنوائی اور اس کی تعمیر و تزئین میں بڑی کافی رقم خرچ کی۔ اور اس سرکار کے دفترداروں ثقہ لوگوں سے جو اس کام میں ان کے شریک تھے میں نے سنا کہ دو کروڑ سے بھی زیادہ روپیہ اس کی تعمیر میں خرچ ہوا ہے۔ اس پورے ملک میں کوئی بھی عمارت اتنی بڑی، وسیع اور روح پرور دوسری جگہ نہیں ہے۔۔۔۔۔ یہ تعزیہ خانہ اور مسجد جسے میں نے خود دیکھا دنیا کی عجیب و غریب عمارتوں میں سے ہے اس کے اندر چودہ ستون ہیں کہ ہر گنبد میں چودہ معصوم ائمہ کی مقدس قبروں میں سے ایک کی جگہ ہے اور سب کو خالص چاندی سے بنایا ہے۔ ایام عاشورہ میں جب اس کو سجاتے ہیں تو راتوں کو چار پانچ سو کے بقدر شیشے کے چہل چراغ لٹکاتے ہیں اور دو ہزار مجلسی چہل چراغ اور شیشے کے فانوس کہ سب میں کافوری شمعیں لگی ہوئی ہیں روشن ہوتے ہیں اور ہر قسم کی سونے چاندی کی گھڑیاں اور طلاء مرصع کے ساز و سامان زینت کے لیے جگہ جگہ نصب کرتے ہیں اور اندر کے در و دیوار سب قد آدم آئینے ہیں کہ ان تمام شمعوں اور چراغوں کے عکس سے جو آئینوں اور سونے و جواہرات کے سامان پر پڑتا ہے وہ پورا گھر کوہ نور اور وادی طور کی رونق کو مات کرنے والا ہو جاتا ہے۔ اور بغیر تکلف کے شائبہ کے جس وقت دیکھنے والا تھوڑی دور سے اس تعزیہ خانہ میں دیکھتا ہے تو نور کا ایک دریا مشاہدے میں آتا ہے۔ ان دس دنوں میں خرچ کے لیے تین لاکھ روپے ان کی سرکار سے متعین ہوتا ہے اور اگر کچھ زیادہ آ جاتا ہے تو وہ زائرین و ماتمین کو پہونچتا ہے۔

مختصر آئین لاکھ صاف خوشخط منتخب کتابیں کہ ہر جلد پر ایک آدمی مقرر تھا۔ میں نے ان کے (آصف الدولہ کے) کتب خانے میں دیکھیں۔ عربی فارسی انگریزی نظم و نثر اور تاریخ و دیوان جملہ علوم و فنون کی کتابیں ان میں تھیں اور اول و آخر خوشنویسوں کے قلم سے عمدہ قطعات تھے۔ ایران و ہندستان اور روم و فرنگ کے مصوروں کی تصویریں بہت تھیں۔ علمی کتابوں کی بہت سی جلدیں نگاہ میں آئیں۔ جیسے شرائع، مدارک، مسالک، مفاتیح، کشکول اور بحار الانوار کی بعض جلدیں جو مؤلفین کے اپنے خط میں تھیں۔ میں نے کسی ایسے شخص سے جس کی تحویل میں کتب خانہ تھا سنا کہ علمی کتب کی سات سو جلدیں ایسی ہیں جو مصنفین کے قلم سے ہیں اور تیموری سلاطین کا کتب خانہ بھی زوال سلطنت کے بعد ان کے ہاتھ لگ گیا اور حقیقت یہ ہے کہ وہ تمام خزانے دفینے اور جواہرات و سونے کے اسباب جو ان کے پاس تھے ان کے کتب خانہ کے دسویں حصہ کی برابری بھی نہیں کر سکتے تھے اور وہ (آصف الدولہ) ان تمام رعب و داب کے باوجود بہت چھوٹے دل کے اور سب کے ساتھ خاص طور سے علماء، سادات، مومنین اور زائرین کے ساتھ خواہ وہ کتنے ہی کم درجہ کے ہوں برابری کا سلوک کرتے تھے اور اپنے پاس بٹھاتے تھے اور مذہبی تعصب میں بہت غلو رکھتے تھے۔ میرے وہاں گیے ہوئے تیسرا دن تھا کہ مجھے طلب کیا۔ مرحوم خاں کے ساتھ ان کے پاس گیا۔ مہربانی سے پیش آئے اور جسمانی بیماریوں کے متعلق دریافت کیا اور جو اطبا ان کی سرکار میں تھے سب کو طلب کیا اور دوا علاج کا حکم دیا۔ میرے لیے فرمان دیا کہ روزانہ سرکاری باغات میں سے ایک میں سیر و تفریح میں کیا کروں تقریباً چار سو فرش دار عمارتیں اور درختوں سے بھرے باغات شہر اور اس کے باہر ہیں کہ ہر ایک اپنے موقع سے بے نظیر تھا اور فرنگی کاشتکار اور چینی باغباں ان کی سرکار میں تھے جو جنگلوں کی طراحی اور درختوں کے اتصال میں مصروف رہتے تھے۔ ان باغوں میں سے ایک کے اندر جو عیش باغ کے نام سے مشہور تھا میں نے دیکھا کہ درختوں کی جتنی قسمیں تھیں وہ ہاتھ سوا ہاتھ سے زیادہ قد کی نہیں تھیں اور سب پھلوں سے لدے ہوئے تھے...... کچھ عرصہ بعد آصف الدولہ نے اس دنیا سے قطع تعلق کیا اور حق کے داعی کو لبیک کہا۔ اور چونکہ وہ سب کے ساتھ یکساں مہربانی کے برتاؤ کرتے تھے اس لیے اس روز اس بڑے شہر میں بڑا ہنگامہ بپا ہو گیا جو روز محشر کا نمونہ تھا۔ تمام مخلوق خواہ مرد ہو یا عورت رونے پیٹنے اور نوحہ و بیقراری میں مشغول تھے اور اس شہر کے در و دیوار سے ماتم کی صدا بلند ہو رہی تھی اور ایک عجیب قیامت برپا تھی۔ اسی تعزیہ خانہ (امام باڑہ) میں ان کو دفن کیا گیا اور ان کی جگہ ان کے منہ بولے بیٹے وزیر علی خاں کو بٹھا دیا گیا اس نے کم عمری کم ظرفی اور عدم قابلیت کی وجہ سے اوباشوں کی ایک جماعت کو اپنا یار بنا کر ان سے مشورہ لینے لگا۔ انھوں نے جمع شدہ خزانوں پر دست درازی کی اور کمزوروں اور رعایا کو ایذا دینے میں پیش قدمی کی۔ خاں نے جو اس کا نائب تھا اور انگریزوں نے اسے ناشائستہ حرکتوں سے روکا اور بعض معاملات میں اس کے اختیارات چھین لیے۔ اسے منع کرنا اور ٹوکنا انھیں بھاری معلوم ہوا...... خاں یہ حالات دیکھ کر نیابت سے مستعفی ہو کر بیٹھ گیے......
حالات اتنے خراب ہوئے کہ سرکار کمپنی کے وکیل نے بھی ان کے پاس آنے جانے سے پیر کھینچ لیا۔ اور اس کی سرکشی کے حالات اور خاں کا استعفیٰ کلکتہ بھیج دیا۔ اس وقت اس نے (وزیر علی خاں) آصف الدولہ کی تقلید میں ایک دو بار خلوت میں مجھ سے مشورہ چاہا کہ میرا دوست اور بہی خواہ کون ہے اور وقت کا تقاضا اور کام کا انجام و نتیجہ کیا ہے میں نے اسے جو کچھ کہ اس زمانہ میں اس کی ریاست کی بقا اور درستگی کے لیے مناسب تھا بتایا۔ اس نے میری بات نہ سنی اور نہ اسے سمجھا۔ پھر اسے جو مصیبت پہونچی۔ اور گورنر اس کے واقعات سنتے ہی بڑے بڑے انگریزوں کی ایک جماعت کے ساتھ ڈاک پر نو روز میں کلکتہ سے لکھنؤ پہونچے اور اس کے معاملے کی فکر میں پڑ گیے۔ چونکہ ہنگامہ کرنے والے بعض امرا اور کچھ اوباش اور سپاہی اس کے طرفدار ہو گیے تھے اس لیے انگریزوں نے اسے پکڑنے اور معزول کرنے کی طرف یک بیک توجہ نہیں کی بلکہ تدبیر کے ذریعے کوشش کی کیونکہ اگر اس وقت جھگڑے کی راہ سے داخل ہوتے تو معاملہ طول پکڑ لیتا اور بے قصوروں اور قصورواروں کی ایک جماعت کا خون بہانے اور فساد کا باعث بنتا اور ان کے جھگڑے کے طفیل میں بہت سے کمزور اور شہر کی رعایا حادثوں میں روندے جاتے اور بہت سے نفر تباہ ہوتے اور سب خزانے برباد ہو جاتے گورنر نے اس کے ساتھ نرمی اور محبت سے پیش آتے ہوئے خاں (تفضل حسین خاں) اور کمپنی کے وکیل کی جانب سے معذرت چاہی اور دونوں کو ان کے پاس لے گئے۔ اور اس قدر ان کے ساتھ محبت اور اتحاد کا مظاہرہ کیا کہ وہ (وزیر علی خاں) پورے طور پر مطمئن ہو گیا اور معزولی کی جو بو انھوں نے سونگھی تھی وہ ان کے دل سے بالکل محو ہو گئی۔

کچھ عرصہ کے بعد گورنر نے بیماری کا بہانہ کرتے ہوئے اس کا اظہار کیا کہ شہر کی ہوا میرے مزاج کے موافق نہیں ہے اس لیے میں کچھ عرصہ مزاج کی اصلاح کے خاطر شہر سے باہر میدان میں رہنا چاہتا ہوں بعد میں پھر شہر میں آ جاؤں گا۔ انھوں نے پھر ایسا ہی کیا۔ بی بی پور میں جو شہر اور آباد بستیوں سے دو فرسخ (چھ میل) کے

فاصلہ پر تھا وہاں رہنے لگے اور دہرنگ سرکار کی فوجوں کو ان کے افسروں اور انگریزی سرداروں کے ساتھ وہاں طلب کیا۔ اور آصف الدولہ کی والدہ جو ایک عقل مند خاتون تھیں کے ساتھ اور چند بڑے اور اثر دار لوگوں کی ایک جماعت کے ساتھ جو وزیر علی خاں کے طور طریقے سے شاکی تھے پوشیدہ طور پر سازش کی اور یہ لوگ مزاج پرسی کے بہانے سے بی بی پور آنے جانے لگے۔ وزیر علی خاں نے جب دیکھا کہ لوگ گورنر کے ساتھ شہر کے باہر چلے جا رہے ہیں تو وہ پورے طور پر مطمئن ہو گئے اور خود بھی وہاں روزانہ آمد و رفت رکھنے لگے۔ انگریز ان کے ساتھ ادب سے پیش آتے تھے اس سے وہ اور زیادہ مطمئن ہو گئے۔ بعض امراء جو ان کے موافق تھے انھوں نے بھی وزیر علی خاں کے ساتھ آکر وہاں اقامت کی۔ توپ خانہ، چھوٹا خاص توپ خانہ، تیرانداز فوجیوں اور جنگی سواروں نے جو شہر میں آمادہ و تیار اور ان کے فرمان کے منتظر تھے انھوں نے بھی انگریزوں کے ساتھ ان کی دوستی اور محبت کا مشاہدہ کیا تو یہ سوچ کر کہ اب آپس میں دوستی اور موافقت ہو گئی ہے۔ مطمئن ہو گیے۔

ایک دن گورنر نے وزیر علی خاں سے کہا کہ چونکہ میں انگلستان کے سفر کا ارادہ رکھتا ہوں اس لیے چاہتا ہوں کہ کمپنی کے ان لشکریوں کو جو اس نواح میں ہیں دیکھتا جاؤں اور وہ آپ کے ملاحظے میں بھی آئیں اور حقیقت میں اس علاقہ میں جو فوجیں ہیں وہ اس سرکار کی نوکر ہیں۔ انھوں نے دوراز کار خیالات سے خوش ہو کر لشکریوں کو طلب کرنے کی تاکید کی۔ میں بھی گورنر اور خاں کی تکلیف اور شہر میں فوجیوں کی شورش کے خوف سے دبیں تھا جرت کی نگاہ سے دیکھتا رہا۔ ان کی کج بینی اور بداندیشی پر غمزدہ اور متاثر اور انگریزوں کی تدبیروں، ان کے حوصلے اور بردباری سے متحیر اور متفکر تھا اور دل میں ان کی اور ان کے ساتھ کے لوگوں کی حالت پر جلتا تھا یہاں تک کہ کمپنی کی فوجیں، افسروں اور انگریز سرداروں کے ساتھ سب پہونچ گئیں اور گورنر نے بھی ان امراء کو جو وزیر علی خاں کے طرفدار تھے آصف الدولہ کی والدہ کی مدد اور تعاون سے اپنا موافق بنا لیا۔ وزیر علی خاں شراب غفلت سے سرشار اور غرور و تکبر کی شراب سے بدمست تھے کہ انھیں کسی چیز کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ سرکار کمپنی کی فوجیں گورنر کے سامنے ان کے حکم سے پریڈ کرتی تھیں اور وہ سرداروں اور افسروں میں سے ہر ایک کو زرتار خلعتوں اور نقد و جواہر عطا کر کے نوازش کرتے تھے۔ انگریزوں نے نواب سعادت علی خاں کو جو بنارس میں رہتے تھے اور آصف الدولہ کے حقیقی بھائی تھے فوراً طلب کیا اور گورنر نے جب دیکھا کہ اب وزیر علی خاں کا کوئی طرفدار نہیں رہ گیا ہے تو ایک دن لشکریوں کو حکم دیا کہ پورے لشکر کو نگینہ کی طرح حلقہ میں لے لیں اور دوست دشمن میں سے کسی کو نہ چھوڑیں کہ وہ شہر کی طرف جائے۔ لشکریوں نے پوری ہم آہنگی کے ساتھ بغیر اس کے کہ کسی طرف سے آواز بلند ہو قدم سے قدم ملاتے ہوئے لشکر کا محاصرہ کر لیا۔ شام کا وقت تھا جب کہ فوج کے محاصرے کی خبر وزیر علی خاں کو پہونچی۔ انھوں نے پریشان ہو کر گھوڑا مانگا کہ شہر کے اندر جائیں ..... ان کے مقربین میں سے کسی نے ان کو گھوڑا مہیا کیا۔ انھوں نے سوار ہو کر چاہا کہ چھاونی سے نکلیں لشکریوں نے انھیں روک دیا مجبوراً وہ اپنے خیمے میں لوٹ گیے اور اپنے ان دوستوں کو جن پر پورا بھروسہ تھا طلب کیا۔ ہر ایک نے بہانہ بنا کر ان کے پاس آنے سے معذرت کر دی اور وہ اس وقت ہوش میں آئے جب کہ خود کو یکہ و تنہا اور بے یار و مددگار اپنے خیمے میں مصیبت کے جال میں گرفتار دیکھا یہاں تک کہ ملازموں اور نوکروں میں سے کوئی اسکے پاس باقی نہیں رہ گیا۔ اس نے سمجھ لیا کہ کام ہاتھ سے نکل چکا ہے اور زمانے نے دوسرا قانون وضع کیا ہے۔ ؎

دست بسر زد و لختے گریست
حاصل بیداد بجز گریہ چیست [1]

اس حالت کے متصل ہی ایک پہر رات گذر چکی تھی۔ گورنر کے حکم سے بلند آواز نقارچیوں نے چھاونی میں منادی کی کہ آصف الدولہ کی والدہ کے حکم سے وزیر علی خاں کو معزول کیا گیا اور نواب سعادت علی خاں حکومت پر فائز ہوئے علماء، رؤساء، ارکان و اعیان، امراء، سپاہی اور رعایا سب ان کی فرمانروائی کریں، ریاست کو جان سے قبول کریں اور وزیر علی خاں کو مطلق معزول سمجھیں۔ سعادت علی خاں جو قریب ہی تھے جاہ و جلال کے ساتھ نمودار ہوئے۔ نقارچیوں کی آواز جوں ہی وزیر علی خاں کے کان میں پہونچی وہ اپنی جگہ پر سعادت علی خاں کے دبدبے سے کانپ اٹھے اور اسی میں عافیت دیکھی کہ گورنر کے پاس آکر کمپنی کے دوستوں کی قید پر راضی ہو جائیں اور انھوں نے ایسا ہی کیا۔ اپنے پیروں خود چل کر گورنر کے گھر میں پناہ لی اور اس وقت بھی گورنر استقبال کے آداب کا پاس و لحاظ کرتے گھر کے باہر تک آئے۔

---

[1] اس نے ہاتھ سر پر مارا اور تھوڑی دیر رو دیا۔ ظلم کا حاصل رونے کے علاوہ اور بھی کیا ہے

(باقی صفحہ ۴۲ پر)

غزلیں

نغمۂ شہر بھی لگتا ہے آدمی اس کا
قصیدہ پڑھتا پھرے ہر گلی گلی اُس کا
اندھیرے آنکھ ملاتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں
کہ ایک ربط ہے سورج سے قدرتی اُس کا
وہ میٹھے بول سے سب کو خرید لیتا ہے
بڑا عجیب ہے اندازِ دوستی اُس کا
ہر ایک قد سے وہ اونچا دکھائی دیتا ہے
فلک بدوش ہے کردار واقعی اُس کا
کسے خبر تھی، کہ نفرت کے سُرخ موسم میں
لہو نچوڑ کے لے جائے گا کوئی اُس کا
تمام لوگ تو واصف ہیں بے حسی کا شکار
سوال یہ ہے کہ بہلائے کون جی اُس کا

واصف عابدی
[illegible]

○○

دریا دریا میں پھرا تشنہ لبی لپٹی رہی
میرے قدموں سے ہمیشہ ریت ہی لپٹی رہی
ختم اس کی قربتوں کا ہوگیا موسم مگر
ذہن سے خوشبو بدن سے تازگی لپٹی رہی
ایسا کچھ آنکھوں نے دیکھا تھا کہ نظروں سے مری
عمر بھر اک وحشتِ نظّارگی لپٹی رہی
کس قدر شیریں تھا اسکے لب کا اندازِ سخن
مُدتوں کانوں سے میرے نغمگی لپٹی رہی
چاند اپنی چاندنی کے ساتھ رخصت ہوگیا
اور مرے احساس سے اک روشنی لپٹی رہی
اس طرح سیلاب کی زد میں رہا ہوں اے ظفر
جیسے اک چٹان سے بپھری ندی لپٹی رہی

ظفر اقبال ظفر
[illegible]

○○

کچھ اس طرح بھی بسر ہم نے زندگی کی ہے
کہ جس سے دوستی کی، اس نے دشمنی کی ہے
جہاں جہاں بھی ہٹا ہوں ترے خیال سے میں
وہیں وہیں میری غیرت نے خودکشی کی ہے
کبھی چراغ جلایا کبھی بجھایا ہے
شبِ فراق میں ایسے بھی روشنی کی ہے
تمام جسم میں لہریں سی ہوگئیں پیدا
بلا جھجک جو کسی نے سپردگی کی ہے
یہ کیسا دَور ہے یارو خدا پرستوں نے
خدا کو چھوڑ کے بندوں کی بندگی کی ہے
قدم قدم پہ اُلجھتا رہا ہے دامن فوق!
مری حیات نے کانٹوں سے دوستی کی ہے

[illegible]

○○

ہماری شاخِ خوش فہمی قفس میں بھی ہری رکھنا
الٰہی عمر بھر ہم کو سپئے جامہ دری رکھنا
یہ پتھر کی چٹانیں دوستو! شعلے اُگلتی ہیں
کسی آئینہ خانے میں کرشمہ پیکری رکھنا
ابھی اُمّید ہے شاید فضائے سازگار آئے
ابھی بیدار جذبِ غیرتِ بال و پری رکھنا
ہمارے دوستوں کو بخیہ کاری کا سلیقہ ہے
ہمارے دشمنوں کو خوگرِ جامہ دری رکھنا
فنا کے بعد بھی رکھتی ہے زندہ! یہ عجب شے ہے
خلش کوئی بعنوانِ زمانہ پروری رکھنا
کہیں اسلم تمہاری ذات سے منکر نہ ہوجائے
نہ اتنا بھی تم اپنے کو پسِ پردہ دری رکھنا

[illegible]

○○

افسانہ

صبیحہ انور

رشتہ

عزیزوں اور رشتہ داروں کا معاملہ بھی بڑا عجیب ہوتا ہے کبھی ایسا لگتا ہے جیسے ان کا وجود ہماری زندگی میں کوئی دخل نہیں رکھتا ہے مگر بعض اوقات وہ اپنی موجودگی کا ثبوت اتنی شدت سے دیتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری زندگی میں ان سے زیادہ کوئی اور اہم نہیں۔

شاید پہلے کے وہ دن زیادہ اچھے تھے جب مشترکہ خاندان کا رواج تھا اور بہت سے لوگ ایک ساتھ مل کر رہتے تھے اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ اور پسند اور ناپسند میں شریک ہوتے تھے اور ایک کو دوسرے کی موجودگی کی برداشت اور عادت تھی۔ آج کی تیز رفتار اور مختصر خاندان والی زندگی میں زیادہ لوگوں کی گنجائش ہی نہیں رہ گئی ہے کہ اگر رات کو ۱۲ بجے فون آجاتا ہے تو ہم چکرا کر رہ جاتے ہیں۔ ادھر سے دھیمی سی آواز میں کوئی کہتا ہے۔ ”میں تمہاری صغرا آپا بول رہی ہوں —— بڑودہ سے۔ پہچان رہی ہونا —— انور ٹھیک ہیں؟ ان سے بتا دینا کہ بڑودہ سے صغرا آپا کا فون آیا تھا۔“

”جی“

میں ایک ضروری کام سے پرسوں لکھنؤ آرہی ہوں

”کب آرہی ہیں“؟

بھئی ریزرویشن نہیں ملا ورنہ میں تو آج ہی آجاتی۔ تم نے مجھے پہچان لیا نہ! ابھی تم لوگوں کا کوئی پروگرام تو نہیں ہے۔ تمہارا کالج تو کھلا ہوگا۔“

”جی ہاں مگر —— آپ کب یہاں پہونچیں گی“! میں دن بھر کی تھکی تھی۔ شاید اسی وقت آنکھ لگی تھی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کون صغرا آپا؟ اور کہاں سے بول رہی ہیں؟

گاڑی کا وقت تو بتا دیں ہم لوگ اسٹیشن آجائیں گے۔“ میں نے بمشکل کہا۔

وہ میرے شوہر کی جائیداد وغیرہ کا چکر ہے —— میرے میاں تو شاید تمہیں پتہ نہیں ۲ سال سے باہر ہیں۔ اس لیے مجھے نکلنا پڑ رہا ہے“

”آپ کی ٹرین کتنے بجے لکھنؤ پہونچتی ہے“ میں نے بات کاٹ کر پوچھا۔

”تمہارا پتہ میرے پاس ہے میں نے دلی سے تمہارا پتہ اور فون نمبر رضیہ سے فون کر کے آج ہی لے لیا ہے۔ اسٹیشن آنے کی کوئی ضرورت نہیں میں خود ہی پہونچ جاؤنگی۔ آج کل ٹرین بہت لیٹ چل رہی ہیں۔ تم لوگ پریشان ہوگے —— میں شام تک پہونچونگی —— اچھا خدا حافظ“ انور کو دعا —— بچوں کو پیار کہنا —— ارے ہاں بڑودہ سے کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا د —— خدا حافظ ——“ خدا حافظ کہکر فون رکھ دیا پہلی بار سمجھ میں آیا کہ فون بڑودہ سے آیا تھا —— اور سر پکڑ کر بیٹھ گئی کہ آخر یہ میری کون سی بہن بڑودہ میں ہیں —— بہت یاد کرنے پر بھی یہ دریافت نہ کر سکی کہ صغریٰ نام کی دور دراز کی بھی میری کوئی کزن ہے —— صغریٰ کی ہم قافیہ کبریٰ بھی یاد کر لیں کہ انھیں کی چھوٹی بہن کا نام صغریٰ ہوگا —— میرا کوئی رشتہ دار بڑودہ میں نہیں ہے اس کا تو مجھے یقین تھا۔ آخر یہ کون ہیں؟ اور یہ رضیہ کون ہے جس سے میرا پتہ اور فون نمبر مل گیا —— مجھے تو سرے سے دلی میں کسی رضیہ کا ہی اتہ پتہ یاد نہیں آیا —— لیکن رانگ نمبر تو نہیں تھا؟ مگر انور —— بچے —— میرا کالج جانا یہ سب کیسے غلط ہو سکتا تھا —— ہو سکتا ہے کہ میں صغریٰ آپا کو کسی اور نام سے جانتی ہوں کبھی کبھی ناموں سے بڑی غلط فہمی ہو جاتی ہے —— ناموں پر تو کبھی بھروسہ ہی نہیں کرنا چاہیے۔ جیسے مجھے بہت دنوں تک یہ نہیں معلوم تھا کہ میرے میاں کا اصلی اور تاریخی نام انور نہیں بلکہ قطب الدین ہے ان کے بچپن کے ایک دوست جو انھیں قطب الدین کے نام سے ہی جانتے ہیں، کے بار بار فون کرنے اور فون پر قطب الدین کو بلانے کے اصرار سے تنگ آکر میں نے کہا، وہ تو کئی دن سے قطب نما لیکر قطب مینار پر بیٹھے

ہیں، واپس آئیں گے تو بتادونگی ۔ آپ اپنا نام بتادیں ۔"

انور سے فون کا ذکر کیا اور دوست کا نام بتایا تو پتہ چلا کہ انور کا نام قطب الدین بھی ہے ۔ دوست صاحب تو خیر یہ واقعہ بھول گئے ہونگے کہ کسی بدتمیز سے فون مل گیا ۔ مگر میں آج تک یہ بات نہیں بھولی ہوں اور ناموں کے معاملے میں بڑی احتیاط برتتی ہوں ۔ ایک صاحبہ نگار افروز کے نام سے لکھتی تھیں کافی مقبول بھی تھیں مجھے بھی ان کی تحریر بہت پسند تھی ۔ ملنے کا اشتیاق بھی تھا بہت دنوں بعد پتہ چلا کہ یہ نگار افروز جن سے ہم خاصے مرعوب تھے ہماری خالہ زاد بہن اور بچپن کی دوست نگو تھیں ۔ ہمارا خیال تھا کہ ان کا نام نگہت فاطمہ ہے ۔ کیونکہ ان کی بڑی بہن کا نام نزہت فاطمہ ہے ۔ بڑا تعجب ہوا تھا ۔ یقیناً آج بھی گھپلہ نام کا ہی ہوا ہے ۔ ان صغریٰ آپا سے میری واقفیت یقیناً کسی اور نام سے ہوگی ۔ یہ بات ان بیچاری کو معلوم نہیں ہوگی ۔ بڑی واقفیت اور شناسائی کے بھرم میں اتنی بے تکلفی سے فون کیا ہوگا ۔ کہ پردیس میں تو ذرا سی پہچان بھی رشتہ داری کا سہارا ہوتی ہے ۔ اور نہ یہاں یہ عالم کہ نام تک یاد نہیں آرہا ہے ۔

اچانک خیال آیا یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ صغریٰ آپا میری نہیں بلکہ انور کی رشتے کی بہن ہوں ۔ اب اگر انور یہاں موجود ہوتے تو یہ مسئلہ چٹکی بجاتے حل ہوجاتا ۔ مگر وہ باہر گئے ہیں اور کل صبح لوٹیں گے ۔ خیر صغریٰ آپا تو پرسوں آرہی ہیں ۔ صد فی صد یہ انور کی رشتہ دار ہیں ۔ یہ سوچ کر میں سونے لیٹ گئی مگر رات بھر یہی رشتہ داروں کا موضوع ذہن میں چکر کاٹتا رہا کہ برا ہو آج کی معروف زندگی کا کہ ہم اپنے عزیزوں کے نام سے بھی ناواقف ہیں ۔ کوئی دور دراز سے فون کرتا ہے ۔ غیروں کی طرح گھر آنیکی اجازت چاہتا ہے اور ہم ہیں کہ ہمیں نام تک یاد نہیں ۔ اصل میں یہ بھاگ دوڑ کی زندگی ۔ ملازمت کی فکریں اور متفرق معروفیات نے ان سب باتوں کے لیے وقت ہی کہاں چھوڑا ہے ۔ کسی رشتہ دار سے کہیں ملاقات ہوگئی تو بہت پرانی فرمائشی مسکراہٹ چہرے پر چپکا کر خیریت پوچھ لی ۔ بچوں کے نام اگر یاد آگئے تو ان کے بارے میں پوچھ کر ذرا زیادہ خصوصیت کا اظہار کردیا ۔ بس ہوگئی فرض کی ادائیگی ۔

اب وہ پہلے جیسے دن تو رہے نہیں کہ کسی کی شادی بیاہ ہو تیوہار ہو یا پھر گرمیوں کی چھٹیاں ذرا سا موقع ملا سارا خاندان ایک جگہ جمع ہوگیا ۔ اگلی پچھلی خاندانی باتیں دہرائی جارہی ہیں ۔ رات دن باتیں ۔ بس باتیں ۔ رشتے ناطے کیا سب کی تاریخ پیدائش مع اس سال کے اہم واقعات کے حوالے سے سب کو ازبر ہے ۔ کیا مجال جو کسی فرد کا رشتہ یا نام غلط ہوجائے ماموں زاد، خالہ زاد، چچازاد، پھوپھی زاد ہر لفظ کی کچھ الگ قدریں ہوا کرتی تھیں جس نے "لفظ کزن" میں سمٹ کر خود اپنی اہمیت ختم کردی ۔

مگر ان تمام باتوں کے باوجود صغریٰ آپا کون ہیں یہ سوال اپنی جگہ برقرار تھا ۔ اللہ جانے کیا نکلیں گی یہ صغریٰ آپا ۔ انور آئیں تو یہ مسئلہ حل ہو ۔ انور صبح آئے تو صغریٰ آپا کے فون اور ان کی آمد کی خبر سن کر خوش تو ہوئے مگر سوال اپنی جگہ پر قائم تھا کیونکہ ان کے جاننے والوں میں ایک نہیں تین صغریٰ آپا تھیں ۔ ایک صغریٰ آپا الہ آباد میں ان کی پڑوسن رہ چکی تھیں ۔ جن سے انور کی آخری ملاقات دس سال پہلے ہوئی تھی ۔ دوسری صغریٰ آپا ان کے بہت عزیز دوست کی بہن تھیں ۔ اور تیسری صغریٰ آپا انور کی دور کے رشتے کی بہن تھیں مگر بہت دنوں سے لندن میں تھیں اور ان کا فون بڑودہ سے آنے کا کوئی سوال نہ تھا ان کو یقین تھا کہ آنے والی صغریٰ آپا ان کی نہیں میری رشتہ دار ہونگی ۔

اب تو مجھے صغریٰ آپا سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوچلا تھا ۔ صغریٰ آپا کو ان کے فون کے مطابق کل شام کو لکھنؤ پہونچنا تھا ۔ میں چاہتی تھی کہ ان کی آمد سے پہلے گھر کے متفرق کام سمیٹ لوں ۔ کمروں کی صفائی کرلوں تاکہ ان کو پورا وقت دے سکوں ۔ ابھی میں گھر کے کاموں میں معروف ہی تھی کہ شیرو کے بھونکنے کی آواز پر میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا ۔ باہر پھاٹک پر ایک ادھیڑ عمر کی خاتون سرمئی شال سر سے اوڑھے رکشے والے کو کرایہ دے رہی تھیں ۔ میں جھاڑن ہاتھ سے پھینکتی ہوئی باہر لپکی وہ خاتون پھاٹکوں پر لگی تختیاں غور سے پڑھ رہی تھیں ۔ میں نے ان کا تھیلہ اور چھوٹا سا سوٹ کیس ان کے ہاتھ سے لے لیا ان کے ہاتھ میں بٹوا اور بڑی سی پانی کی بوتل تھی ۔ ہمارا شیرو نو واردوں کو دیکھ کر یوں ہی بہت شور مچاتا ہے خاص کر اس وقت جب ان کے ہاتھ میں کچھ سامان ہو ۔ اس وقت بھی اس نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھالیا ۔ لہٰذا ہم دونوں تیز تیز قدموں سے کمرے کے اندر آگئے ۔

شکان اور گھبراہٹ سے ان کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ وہ کچھ کھوئی ہوئی سی ایک کرسی پر ٹک گئیں۔ کسی مہمان سے یہ پوچھنا تو خلاف تہذیب ہے ہی کہ وہ کل کے بجائے آج ہی کیوں آ ٹپکا۔ خاص کر اس وقت جب سفر کی تھکان اور بد مزاج کتے کی آواز سے ویسے ہی اوسان بجا نہ ہوں۔

صغریٰ آپا کو پانی وغیرہ پلا کر میں چائے بنانے کچن میں چلی گئی۔ میں سوچ رہی تھی کہ میں نے آواز سے صغریٰ آپا کے لیے جو اندازہ لگایا تھا وہ قطعاً غلط ثابت ہوا تھا۔ آواز سے وہ ایک بہت تازہ دم اور اسمارٹ خاتون معلوم ہو رہی تھیں۔ چائے پیتے وقت ہماری بات چیت ابھی سفر کی دقتوں اور موسم کی سختیوں سے آگے نہیں بڑھ پائی تھی کہ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف انور تھے۔ وہ کافی پریشان تھے کیونکہ انھیں ابھی ابھی علی گڑھ سے میرے بھائی کا ٹیلی فون ملا تھا کہ میری امی اچانک غسل خانے میں گر پڑی ہیں۔ ان کی ریڑھ کی ہڈی میں فریکچر ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس وقت ان کے پاس میرے ابا اور چھوٹے بھائی کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ وہ آج صبح ہی ہسپتال میں داخل ہوئی ہیں۔ اور مجھے اسی وقت علی گڑھ کی ٹرین پکڑنا ہے۔ تاکہ رات سے پہلے میں امی کے پاس علی گڑھ پہونچ جاؤں۔ انور نے مجھے مزید تاکید کی کہ میں اسٹیشن کے لیے گھر سے فوراً نکل پڑوں کیونکہ ٹرین کے روانہ ہونے میں صرف ایک گھنٹہ باقی ہے۔ گھبراہٹ میں مجھے انور کو یہ بتانا یاد ہی نہ رہا کہ صغریٰ آپا ایک دن پہلے ہی آگئی ہیں۔ اپنی دبلی کمزور سی امی کا خیال کر کے میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ایک نووارد مہمان جس سے ابھی میرا باقاعدہ تعارف بھی نہیں ہے۔ پہلی بار میرے گھر آیا ہے گھر کے دوسرے انتظامات، کالج سے چھٹی ملنے کا مرحلہ۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ میرا سر چکرانے لگا۔ میں اس صورت حال کیلئے ہرگز تیار نہ تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ فون پر زور زور سے بات کرنے کی آواز سن کر صغریٰ آپا میرے کمرے میں آگئیں۔ انھیں اندازہ ہو گیا تھا کہ میں اس وقت کسی پریشانی میں ہوں وہ بیچاری کچھ گھبرائی۔ کچھ شرمندہ سی لگ رہی تھیں۔ مجھ سے ان کی شکل دیکھی نہ جا رہی تھی۔ میں نے بڑی لجاجت سے ان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ آپا اگر آپ اجازت دیں تو میں علی گڑھ چلی جاؤں۔ آپ تو گھر میں موجود ہیں۔ میں نے انھیں اپنی امی کے ایکسیڈینٹ کی تفصیل بتائی۔ میری بات سن کر ان کا گھبرا جانا تو غیر قدرتی تھا مگر انھوں نے فوراً علی گڑھ روانہ ہونے کی تاکید کی۔ مجھ پہ بہت بھی بندھائی کہ میں گھر اور بچوں کی قطعاً فکر نہ کروں۔ وہ میرے آنے تک گھر کو سنبھال لیں گی۔ موقع کی نزاکت کا خیال کرتے ہوئے بچوں نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی اور میں کالج کے لیے ایک چھٹی کی درخواست میز پر چھوڑ کر فوراً اسٹیشن روانہ ہوگئی۔ اسٹیشن پر انور مجھے چھوڑنے آئے تھے میں نے انور کو صغریٰ آپا کی آمد کی اور گھر کی ذمہ داری ان کے سپرد کر آنے کی بات سنائی تو انھیں بھی اطمینان سا ہو گیا۔

علی گڑھ میں خلاف توقع ایک ہفتہ کے بجائے پندرہ دن لگ گئے میں فون سے روز ہی گھر کی خیریت دریافت کرتی رہی، دل کو اطمینان تھا۔ امی ہسپتال سے گھر آئیں تو میں لکھنؤ کے لیے روانہ ہوئی۔ دل ڈر رہا تھا کہ کیا کہیں گی صغریٰ آپا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ صرف ۳ روز کے لیے لکھنؤ آئی تھیں۔

میں گھر پہونچی تو صاف ستھرا گھر۔ کچن میں تیار کھانا اور تازہ دم بچوں کو دیکھ کر اتنے دن کی تھکن پل بھر میں اتر گئی۔ صغریٰ آپا بخیریت اور خوش تھیں۔ انور نے اپنے وکیل دوست کی مدد سے ان کا کام آسانی سے کروا دیا تھا۔ وہ بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھیں۔ اس کا اندازہ مجھے ان کے تیار سامان سے ہوا وہ تھوڑی دیر بعد ہی رات کی گاڑی سے روانہ ہو رہی تھیں۔ انھیں بس میرا انتظار تھا۔

اسٹیشن پر گلے لگ کر رخصت کرتے ہوئے میں رو پڑی کہ اس مصیبت میں اگر صغریٰ آپا نہ ہوتیں تو کیا ہوتا۔ انھوں نے میرے آنسو پونچھے اور ہم لوگوں کو دعائیں دیتی ہوئی رخصت ہوگئیں۔

اسٹیشن سے واپسی پر انور صغریٰ آپا کے سلیقے اور خیال کی بہت تعریفیں کر رہے تھے وہ بھی ان کے بہت احسان مند تھے۔ میں نے کہا اُس وقت تو تمہاری صغریٰ آپا فرشتہ بن کر آئیں۔ "ارے ہاں یاد آیا" انور نے چونک کر کہا۔ "تمہارے جانے کے دوسرے دن ہی صغریٰ آپا کا بڑودہ سے فون آگیا تھا کہ کسی وجہ سے انھوں نے اپنا پروگرام ملتوی کر دیا ہے۔

"کیا مطلب؟ پھر یہ کون تھیں" میں نے گھبرا کر انور سے پوچھا

"کیا یہ تمہاری صغریٰ آپا نہیں تھیں۔ پھر یہ کون تھیں۔؟"

(باقی ص ۴۶ پر)

عشق محبوب کے حوالے سے
خود اپنی ذات کی
توسیع کا نام ہے
اپنے حواس کو
دو آتشہ کرنے کا عمل ہے
زندگی کی
اس تھرتھراہٹ کی
ترجمانی ہے
جو رگ و پے میں
سیل کی طرح رواں ہے
لیکن جو حسین ہے
اس کے حسن تک
نظر کی رسائی ممکن ہے
اب جو نیک ہے
وہ حسین سے زیادہ حسین ہے
اس لیے کہ
حدودِ حصر سے باہر
وہ طاقت جو
طویل وقت
اور پوشیدہ چیزوں کو
آشکارا کرتی ہے
اور جب وہ آشکارا ہو جاتی ہیں
تو ان پر پردہ
ڈال دیا ہے
جس کے بعد کچھ بھی
غیر متوقع نہیں ہوتا

□□

تضاد

نہ کوئی وعدۂ فردا نہ آرزو نہ طلب
نہ وجہ عیش و مسرت نہ کوئی غم کا سبب

دو ایک سمٹی ہوئی بے ضرر ملاقاتیں
کچھ ایک رسمی سے جملے تھکی تھکی باتیں

ملی نگاہ تو پوچھا مزاج کیسے ہیں
زباں پہ ایک ہی فقرہ جناب اچھے ہیں

پھر ایک غیر ضروری نکات راز و نیاز
ادب کی راہ سے بے کیف گفتگو کا جواز

مگر یہ سایۂ تحت الشعور کیسا ہے
یہ اضطراب میں ڈوبا سرور کیسا ہے

عجیب ذہن کی حالت ہر چند راتوں سے
عنانِ عقل کہیں چھوٹتی ہے ہاتوں سے

کئی دنوں سے بہت جذب کے نظاروں میں
بس ایک عکس ابھرتا ہے ماہ پاروں میں

متاعِ گوہر ادراک کھو رہے ہیں ہم
اسیر جذبۂ بے نام ہو رہے ہیں ہم

□□

(ڈاکٹر) عامر ریاض
یونٹ سیکشن (اردو)
یوپی سکریٹریٹ۔ لکھنؤ

معصوم تلاش

رات ؛ اشکوں سے دامن بھگونے لگی
صبح ؛ ہونے لگی
لو چراغوں کی اب جھلملانے لگی
اوس کی بوند ہر گھاس پر
یا کہ معصوم تارے ہوں آکاش پر
سب کے سب
داستانِ سفر کو سنانے میں مصروف ہیں
اور ادھر ..... !
میرا دل
اپنے ماضی میں گم ہو کے یوں
میرے لہجے کا کھویا ہوا بانکپن
ڈھونڈنے کے خیالوں میں مشغول ہے
جیسے پھر
میرے لہجے کی معصومیت
میری آواز کا بھولا پن
یعنی بچپن کا وہ بانکپن
مجھ کو مل جائے گا
واقعی !؟
کیا وہ دن پھر پلٹ آئے گا ؟
کون ہے - ؟
جو بتائے مجھے
میرے ماضی کا وہ آئینہ پھر دکھائے مجھے
بھول بیٹھا ہوں جو ، یاد آئے مجھے !

□□

نیر جلالپوری
جامعہ سلطانیہ لکھنؤ

ڈاکٹر احمد نسیم صدیقی
شعبۂ عربی۔ لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

لکھنؤ کے چند عربی ادباء و شعراء

دُنیائے عرب اور ہندستان کے تعلقات کا ذکر جب آتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ زمانۂ قدیم میں یعنی طلوع اسلام سے قبل بھی عرب اور ہند کے درمیان تجارتی تعلقات تھے اور بحری راستوں سے ہندستان کا سامان عرب جزیرے کو نیز وہاں سے ہندستان کو بھیجا جاتا تھا، لہٰذا عربی زبان سے واقفیت کا آغاز بھی اسی دور سے ہوتا ہے گوکہ باقاعدہ طور سے عربی زبان کی تعلیم اور تعلّم کی ابتدا ہندستان میں مسلمانوں کی حکومت کے قیام کے بعد ہوئی۔ چونکہ اسلام کی مذہبی کتاب قرآن مجید اسی عربی زبان میں نازل ہوئی اور پیغمبر اسلام حضرت محمد صلعم کی مادری زبان بھی عربی ہی تھی لہٰذا عربی کو ہندستان میں ایک سرکاری زبان کے بجائے ایک مذہبی زبان کی حیثیت سے ترقی اور ترویج کا موقع ملا۔ اسی لئے یہاں خاص کر دینی ادب کا فروغ ہوا۔

ہندستان میں عربی زبان و ادب بالخصوص مذہبی علوم میں، جو خامہ فرسائی کی گئی اس میں صوبہ اودھ اور خصوصی طور پر لکھنؤ کے علماء اور فضلاء نے بھی بھرپور تعاون کیا۔

لکھنؤ میں علم دین کے مرکز کی حیثیت سے فرنگی محل کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے لہٰذا اسی مرکز سے وابستہ افراد کے بارے میں مختصراً تحریر کر رہا ہوں؛

مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی

آپ کی پیدائش ۱۸۴۸ء میں شہر باندہ میں ہوئی۔ پانچ برس کی عمر میں انھوں نے حافظہ شروع کیا اور اسی دوران فارسی کی بعض اہم کتب بھی پڑھیں۔ دس برس کی عمر میں انھوں نے حافظہ مکمل کیا۔ اس کے بعد کی تعلیم مولانا نے اپنے والد اور مفتی نعمت اللہ سے حاصل کی۔ سترہ برس کی عمر کو پہونچتے پہونچتے وہ صرف و نحو، منطق اور فلسفہ کی متعدد کتابیں ختم کر چکے تھے۔

تکمیل تعلیم کے بعد مولانا عبدالحیٔ نے حیدرآباد میں تدریس کا کام شروع کیا۔ اپنی زندگی میں دو مرتبہ حج ادا کیا اور اس دوران مکّہ مکرمہ میں مفتی سید محمد سے نیز مدینہ منورہ میں شیخ محمد المغربی اور شیخ عبدالغنی سے سند حاصل کی۔

کچھ عرصہ بعد انھوں نے حیدرآباد کی ملازمت کو خیرباد کہا اور لکھنؤ چلے آئے جہاں انتقال تک قیام کیا۔ مولانا گوکہ حنفی مسلک کے پیروکار تھے تاہم دوسرے مسالک کے تئیں ان کا احترام کسی طرح کم نہ تھا۔

مولانا عبدُ الباری فرنگی محلی

۱۲۹۵ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مولانا عبدالباقی کے ہاتھوں ہوئی اور اسی دوران دیگر کتب علمیہ بھی پڑھیں۔ کچھ عرصہ مولانا عین القضاۃ کے بھی شاگرد رہے۔ ۱۳۲۲ھ میں جب عازم حج ہوئے تو وہاں سید علی طاہر، سید امیر رضوان اور سید احمد سے حدیث کی تعلیم حاصل کی۔

حصول تعلیم کے بعد مولانا نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ جب فرنگی محل میں مدرسہ نظامیہ کا قیام عمل میں آیا تو مولانا اس مدرسہ میں استاد مقرر ہوئے اور تاحیات اسی سے وابستہ رہے۔ مولانا نے سیاست میں بھی دلچسپی لی اور خلافت تحریک کے زبردست حامی تھے لہٰذا اس سلسلے میں طویل سفر بھی کیے۔ مولانا تازندگی مسلم معاشرہ کے مسائل سے نبرد آزما رہے۔

مولانا کے اوصاف حمیدہ میں مہمان نوازی، بہادری اور شجاعت بھی شامل ہیں۔ مولانا کا انتقال ۱۳۴۴ھ میں ہوا اور تدفین لکھنؤ میں انجام پائی۔ ان کی ایک ہی تصنیف "آثار الاول من علماء فرنگی محل" زبان عربی میں ملتی ہے۔ اس کتاب میں علمائے فرنگی محل کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔

مولانا تراب علی لکھنوی

آپ کے آباء و اجداد دہلی اور امروہہ کے باشندے تھے لیکن بعد ازاں

لکھنؤ آگئے تھے اور یہیں مستقلاً بود و باش اختیار کی۔ مولانا تراب علی ۱۲۱۳ھ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے مولانا مقبول حسین سے زبان عربی کی تعلیم حاصل کی اور منطق، لغوی علوم نیز ادب کی کتب کے لیے شیخ مظہر علی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ جب حج کے لئے مکۂ مکرمہ کا سفر کیا تو وہاں مفتی عبداللہ سراج مکی سے احادیث کی تعلیم حاصل کی۔ وطن واپس آکر تاحیات درس و تدریس میں مشغول رہے۔ ان کی وفات ۱۲۸۱ھ میں ہوئی۔

علم تفسیر میں ان کی کتاب 'ھلالین شرح جلالین' نے علماء میں شہرت و مقام حاصل کیا۔ یہ کتاب قرآن مجید کے آخری پارہ کی تفسیر میں لکھی گئی ہے۔ اسے مولانا نے ۱۲۷۰ھ میں مکمل کیا اور ۱۲۸۰ھ میں کان پور کے نظامی پریس سے شائع ہوئی۔ اس میں بعض مقامات پر لسانی بحث بھی ملتی ہے۔

مولانا سید محمد بن دلدار علی

آپ کی ولادت ۱۱۹۹ھ میں لکھنؤ میں ہوئی۔ اولاً اپنے والد سے تعلیم حاصل کی جو خود ایک ممتاز عالم تھے اور جنھوں نے قلیل عرصے میں ہی سید محمد کو اتنا لائق و فائق بنادیا کہ محض ۱۹ برس کی عمر میں تدریس کی ذمہ داری نباہنے لگے۔ مولانا سید محمد شیعہ فرقے کے ممتاز عالم تھے۔ انھوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں۔ ان کا انتقال ۱۲۸۴ھ میں ہوا۔ ان کی مشہور تصنیف النثار الشال ہے، اس میں تلفظ اور لہجہ پر بحث کی گئی ہے۔ اس میں ۲۰۵ صفحات ہیں اور یہ مخطوطہ رام پور میں دستیاب ہے۔

مولانا سید محمد تقی

سید محمد تقی بن حسین لکھنوی ۱۲۳۴ھ میں لکھنؤ میں ہی پیدا ہوئے انھوں نے ابتدائی اور اعلا تعلیم اپنے والد سید حسین نیز چچا سید محمد سے حاصل کی۔ ان کا شمار شیعہ فرقہ کے مجتہدین عظام میں کیا جاتا ہے۔ نواب امجد علی شاہ نے انھیں ممتاز العلماء کے خطاب سے نوازا تھا یہی نہیں بلکہ مدرسۂ سلطانیہ میں تدریس کی ذمہ داری بھی ان کے سپرد کی۔ انھیں کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا جس کے نتیجہ میں ان کے ذاتی کتب خانے میں کمیاب و نایاب کتب کا اچھا خاصا ذخیرہ ملتا ہے ان کی وفات ۱۲۸۹ھ میں ہوئی۔

مولانا سید تقی نے ینابیع الانوار فی تفسیر کلام اللہ الجبار

تصنیف کی جو چار حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کے کئی نسخے سلطان المدارس نیز مولانا کی ذاتی لائبریری میں موجود ہیں۔

حافظ عبدالعلی نگرامی

حافظ عبدالعلی کی پیدائش ۱۲۳۱ھ میں لکھنؤ کے قصبے نگرام میں ہوئی انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے ماموں حافظ علیم اللہ سے حاصل کی۔ بعد ازاں حافظ کیا پھر لکھنؤ آگئے اور مزید تعلیم سید انور علی نیز دیگر اکابر علماء سے حاصل کی آپ نے حافظ عبدالکریم سے بھی استفادہ کیا۔

حکومت اودھ کے وزیر امین الدولہ حافظ صاحب کے ہم درس تھے اور دربار شاہی میں امین الدولہ کا بہت زور تھا۔ تاہم حافظ عبدالعلی نے کبھی ان سے کسی قسم کی اعانت کا تقاضا نہیں کیا۔ ایک مرتبہ راستے میں ملاقات ہوجانے کے بعد امین الدولہ نے انھیں ضلع اناؤ میں ملکرائل تحصیلدار کا عہدہ دلادیا۔ لیکن حافظ صاحب اس عہدے پر زیادہ دنوں تک برقرار نہیں رہے۔ خود نگرام کے ایک بزرگ خدا بخش نے ان کی توجہ مذہبی اصلاحات کی جانب مبذول کرلوی تو آپ نے اپنے عہدے سے استعفا دے دیا۔
آپ نے اصلاحات کا کام اپنے خاندان سے ہی شروع کیا اور تمام ایسی رسمات کو ختم کرادیا جو غیر اسلامی یا غیر شرعی تھیں۔ انھوں نے اصلاح کا کام بذریعہ خطبات شروع کیا۔ رائے بریلی، بارہ بنکی، فیض آباد اور اناؤ وغیرہ کے عوام نے انھیں اپنا رہنما و قائد تسلیم کرلیا۔

حافظ عبدالعلی کا انتقال ۱۲۹۶ھ میں نگرام میں ہوا اور وہیں تدفین ہوئی وہ تبلیغ و اصلاح کے ساتھ ہی تصنیف و تالیف بھی کرتے رہے اور وقتاً فوقتاً مناظرات میں بھی شریک ہوئے۔ انھوں نے عربی میں کئی تصنیفات چھوڑی ہیں۔

مولانا محمد اویس ندوی

آپ ۱۹۱۴ء میں لکھنؤ کے قصبہ نگرام میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ مولانا محمد سلیم نگرامی، مولانا عبدالجلیل اصلاحی اور مولانا انیس کے شاگرد رہے۔ بعد ازاں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا اور فضیلت کی سند حاصل کی۔ اس کے علاوہ مولانا حسین احمد مدنی سے حدیث کی تعلیم حاصل کرنے دیوبند گئے۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد ندوۃ العلماء میں بحیثیت استاد مقرر ہوئے

میں دارالمصنفین اعظم گڑھ میں منسلک ہو گئے اور ۱۹۴۲ء تک وہیں قیام پذیر رہے۔ اسی دوران مولانا سید سلیمان ندوی سے بھی شرف تلمذ حاصل ہوا۔ وہاں سے واپس آکر ندوہ میں دوبارہ تدریس کا کام انجام دینے لگے۔ اور یہ سلسلہ ان کی وفات ۱۹۴۳ء تک جاری رہا۔

آپ مولانا حسین احمد سے بیعت تھے اور ان کے خلیفہ بھی تھے ان کی تصنیفات میں التفسیر القیم۔ الخیر الکثیر کی شرح فوز الکبیر وغیرہ مشہور ہیں۔

مُفتی عبّاس علی

آپ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور زیادہ تر تعلیم لکھنؤ میں حاصل کی۔ عبدالقوی، مولانا عبدالقدوس، مولانا قدرت اللہ اور سید حسین بن دلدار علی کے شاگرد رہے۔ تعلیم پوری کرنے کے بعد مدرسہ سلطانیہ میں تدریس کے فرائض انجام دینے لگے اور تیس برس تک اس ذمہ داری کو بخوبی پورا کیا اودھ کے حکمراں واجد علی شاہ آپ کی بڑی عزت و توقیر کرتے تھے۔

آپ واجد علی شاہ کے ہمراہ کچھ عرصہ کلکتہ میں بھی رہے۔ بعد ازاں لکھنؤ واپس آئے اور ۳۰۶ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

مولانا کو ادب سے خاص شغف تھا۔ عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ عربی میں ایک دیوان کے علاوہ آپ کے متعدد قصائد بھی ملتے ہیں۔

□□

رشتے

.... صفحہ ۳۲ کا بقیہ

انور نے انکار میں سر ہلایا "میری نہیں میرا خیال ہے کہ تمہاری رشتہ دار تھیں۔ میں نے ان سے اس بارے میں کوئی بات ہی نہیں کی — بے چاری مقدمے کے چکروں میں پریشان تھیں — چلو میرے ذریعے ان کا بھی کام ہو گیا کیا فرق پڑتا ہے اگر وہ صغریٰ آپا نہیں تھیں — یا ہماری رشتہ دار نہیں تھیں — پھر بھی وہ صغریٰ آپا تھیں — تمہارے لیے تو ہر صغریٰ آپا کی حیثیت یکساں ہے۔ بات صرف سوچنے کی ہے"

"پتہ نہیں" میں نے تعجب آمیز سکون سے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ "یہ رشتے میری سمجھ میں کبھی نہیں آئے"

□□

غزل

عتابِ برق کبھی جورِ باغباں دیکھا
کبھی نہ ہم نے نظر بھر کے آشیاں دیکھا

کہاں ہے شہرِ تمنّا، وہ حُسن کی جاگیر
جدھر اُٹھائی نظر خونِ کُشتگاں دیکھا

حکایتِ مہ و انجم سُنی ہے زنداں میں
نہیں ہے یاد ہمیں کب تھا آسماں دیکھا

ہے اس کی شوخیِ گفتار پر چمن نازاں
قفس میں جس کو سدا ہم نے بے زباں دیکھا

جبینِ وقت پہ تاریخ نو ہوئی تحریر
نہ خون تیرے شہیدوں کا رائیگاں دیکھا

قفس میں ہم نے بہاروں کے خواب دیکھے تھے
چمن میں آئے تو شعلوں میں آشیاں دیکھا

وفورِ شوق میں ہم نے جبیں جہاں رکھ دی
غرور و ناز سے جنبش میں آستاں دیکھا

غبارِ راہ چلا اپنی حسرتیں لے کر
نظر کے سامنے جاتا جو کارواں دیکھا

—— وجاہت علی سندیلوی
نصرت منزل۔ سندیلہ ۲۴۱۲۴۳
ضلع ہردوئی

ڈاکٹر محمد تقی علی عابدی
حیدری منزل ۔ فریدس کالونی ۔ نیو منڈی گنج ۔ لکھنؤ

اودھ کے نوابی عہد میں

سائنس اور تکنیک کا فروغ

ہندوستانی تاریخ پر سرسری نظر ڈالنے سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سائنس اور تکنیک ہمیشہ سے ہندوستان کا ایک جزو رہے ہیں قدیم ہندوستانی تاریخ میں آریہ بھٹ، براہمر، برہم گپت، مہاویر، بھاسکر، چرک اور سشروت جیسے مشہور سائنس دانوں کے نام ملتے ہیں۔ جنہوں نے علم ریاضی، ہیئت، طب میں اپنی اپنی یادگاریں چھوڑی ہیں جس سے اس بات کا بخوبی انکشاف ہوتا ہے کہ اس زمانے میں متعدد ہندوستانی سائنس داں، سائنس اور تکنیک کی ترقی میں سرگرم عمل تھے۔

اگر ہندوستان کے عہد قدیم سے نکل کر عہد وسطیٰ پر نگاہ ڈالی جائے۔ تو غلام حسین جون پوری، روشن علی جون پوری، محمد مومن استرآبادی، مدنی مل، محمد زماں دہلوی، آنند رام گوالیاری، اندرمن منشی شاہ جہاں آبادی، لطف اللہ مہندس، خیر اللہ خاں مہندس، رائے بدھ سنگھ، حکیم بہرہ خاں، کیول رام، حکیم امان اللہ خاں آمانی حسینی[1] شیخ محمد علی حزیں[2] میر فتح اللہ شیرازی[3] ملا محمود جون پوری[4] جیسے متعدد ہندوستانی سائنس دانوں کے نام مل جاتے ہیں جنہوں نے مغل حکمرانوں کی سرپرستی میں مختلف سائنسی موضوعات پر کتابیں لکھیں، یا میکانکی ایجادات کیے۔ ان سائنس دانوں نے دہلی، اجین، بنارس، متھرا، جے پور اور دولت آباد میں بنی رصدگاہوں میں تجربات اور مشاہدات بھی کئے جو اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ ہندوستان میں سائنس اور تکنیک کے فروغ کا سنہرا دور مغل عہد تھا جس کی آب و تاب نوابی عہد (۱۷۲۲ء - ۱۸۵۶ء) کے دوران صوبۂ اودھ میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ جہاں:۔۔۔

سائنسی موضوعات پر راجہ کندن لال اشکی نے مصباح النجوم، منتخب استخراج النجوم، مفتاح الحساب، مصباح الحساب، جہاں نما، آثار باقیہ، سبعہ سیارہ وغیرہ[5]۔ منولال فلسفی نے مفردات طب[6]، بہادر سنگھ بھٹناگر نے یادگار بہلوری[7]، راجہ رتن سنگھ زخمی نے حدائق النجوم[8] اور معیار الازمان[9] رجب علی بیگ نے بدیع الحساب[10]، نجم الدین ثاقب کاکوروی نے جبر و مقابلہ[11] آغا احمد بن محمد علی بن محمد باقر فیض آبادی نے اختیارات[12]، خلیل الدین خاں نے مرأۃ الاقالیم[13] شفاء الدولہ حکیم افضل علی نے جامع شفائیہ، کمال الدین حیدر نے حکمت طبیعی جیسی متعدد سائنسی کتابیں تصنیف کیں، جو علم ہیئت، نجوم، ریاضی طب، طبیعاتی فلسفہ، زراعت، فن تعمیر، فن آہنگری، رنگ سازی اور استعمالی آلات وغیرہ موضوعات پر مشتمل ہیں۔

تاریخ اودھ کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ نوابی عہد میں سب سے نمایاں اور ممتاز کام علم ہیئت کے میدان میں کیا گیا۔ غازی الدین حیدر نے اپنے دربار میں کئی نجومیوں کو نوکر رکھا۔ جو موقع بموقع علم نجوم کی نئی نئی معلومات سے غازی الدین کو مطلع کیا کرتے تھے[14]۔ غازی الدین حیدر کے انتقال کے بعد ان کے فرزند نصیر الدین حیدر نے تجربات اور مشاہدات کے لئے لکھنؤ میں ایک رصدگاہ تعمیر کرائی جو تاراکوٹھی یا تاروں والی کوٹھی کے نام سے مشہور تھی۔

اس رصدگاہ سے متعلق ملتا ہے کہ:

" اس تعمیر کو نصیر الدین حیدر نے بہدایت اور سربراہکاری کرنیل ولکوکس صاحب کے جو منجم شاہی تھے تعمیر کروایا تھا اور آلۂ نجوم بھی اوس میں نہایت اچھے رکھے گئے تھے۔
۱۸۴۷ء میں کرنیل صاحب ممدوح مر گئے اور واجد علی شاہ نے عملۂ مرحوم کو برخاست کر دیا اور آلۂ نجوم بحفاظت

سکے گئے جو غدر میں گم ہو گئے۔ کہیں ان کا پتہ نہ لا
اس سے گمان کیا جاتا ہے کہ مفسدین نے ان کو توڑ ڈالا
ہوگا۔ [15]

مذکورہ رصدگاہ سے متعلق یہ بھی ملتا ہے کہ:

"سب سے امر عمدہ یہ کیا کہ رصد موتی محل میں رصدخانۂ
سلطانی بنوایا۔ کپتان ہربرٹ صاحب اُس کے مہتمم ہوئے
مولوی اسمٰعیل سے کردہ طلباء ہوئے۔ ہندستان میں ایسا
رصدخانہ کہاں تھا۔" [16]

نصیرالدین حیدر کا بنوایا ہوا مذکورہ رصدخانہ محمد علی شاہ کے زمانے میں بعض وجوہات کی بنا پر بند کر دیا گیا۔ مگر کرنل صاحب کے مشورہ سے اسے پھر جاری کیا گیا۔ ساڑھے چار لاکھ روپئے اس کی تعمیر میں صرف ہوئے پچاس ہزار روپئے کے پتھر دوربینوں کے لیے مرزاپور اور بنارس سے آئے اور لاکھ روپئے کے آلات لندن سے منگائے گئے۔ [17] بعد میں اس رصدگاہ کی تکمیل امجد علی شاہ کے زمانے میں ہوئی۔ [18] اور صاحب تواریخ نادر العصر کے مطابق ۱۸۴۳ء میں کرنل صاحب کے انتقال کے بعد رصدگاہ سلطانی کے عملہ کو برخاست کر کے اس میں موجود آلاتِ نجوم کو حفاظت سے رکھ دیا گیا۔ جو بعد میں تباہ ہو گئے۔

نوابی عہد میں تجربات کے لئے ہی رصدخانہ کے علاوہ دارالشفاء اور شفاخانہ کی بھی تعمیر ہوئی، جس میں ایسے حکیموں کو جگہ دی گئی جو نہ صرف اپنے پیشے میں ماہر تھے بلکہ وہ تحقیق و تجربات کر کے نئے نئے طریقۂ علاج اور دوائیں اختیار کر کے اپنی مہارت کا ثبوت دیتے رہتے تھے۔

صوبۂ اودھ میں مذکورہ تجربات کے ساتھ ساتھ فنِ تعمیر میں بھی تجربہ کیا گیا جس کی زندہ مثال اودھ کے دارالحکومت لکھنؤ میں آصفی امام باڑہ آج بھی موجود ہے جس کی چھت بغیر لوہے اور لکڑی کی مدد کے محراب دار کفایت اللہ کی تدبیر سے تیار کی گئی جو فنِ تعمیر کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ علاوہ بریں عمارتوں میں گچکاری کا کام بھی صوبۂ اودھ سے شروع ہوا جس کا پہلا تجربہ شیعہ جامع مسجد کی تعمیر میں کیا گیا جسے آج بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس سے اودھ کے مایۂ ناز مہندسین (انجینئرس) کا علم ہوتا ہے۔

اودھ میں سائنسی اور تکنیکی فروغ میں ہی غازی الدین حیدر کے زمانے میں ٹائپ پریس کی تیاری اور اس کی مدد سے چھپائی کا کام شروع ہوا۔ [19] بعد میں نصیرالدین حیدر کے زمانے میں لیتھو گرافک [20] یعنی پتھر کے پریس کا قیام بھی ہوا جس کی وجہ سے کتابوں اور اخباروں کی چھپائی میں بہت آسانی ہوئی۔ آج بھی اس پریس (مطبع سلطانی لکھنؤ) کی چھپی کتابیں متعدد کتب خانوں میں موجود ہیں۔

نوابی عہد میں مذکورہ سائنسی اور تکنیکی کاموں کے علاوہ مختلف دستکاریوں میں بھی قابلِ ذکر کارنامے انجام دیئے گئے جس میں چکن، زردوزی اور جامدانی، چاندی اور سونے کے ورق، مٹی کے کھلونے اور برتن، عطر اور تیل نیز کھانے اور پینے کی بناکو وغیرہ ہے جس کے فن کاروں نے نوابین اودھ کی حوصلہ افزائی، انعام و اکرام اور داد و دہش کی وجہ سے نت نئے تجربے کر کے اپنے فن کا مظاہرہ کیا ان فن کاروں کے بعض اعلیٰ نمونوں کو آج بھی عجائب گھروں میں دیکھا جا سکتا ہے۔

یہاں یہ تحریر کرنا ضروری ہے کہ اس مضمون میں اودھ میں سائنس اور تکنیک کے فروغ سے متعلق صرف کچھ اشارے کیے گئے ہیں جس کی بنیاد پر باقاعدہ تحقیق و جستجو کرنے پر ایک ضخیم کتاب تیار کی جا سکتی ہے۔ نیز یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اودھ کے نوابی عہد میں سائنس اور تکنیک کو خاطر خواہ فروغ ملا۔

□□

حواشی

۱ تا ۲ بعض تفصیلات کے لئے دیکھئے راقم الحروف کی کتاب "فارسی ادب کی شخصیات" نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۹۲ء اور "حزیں اوران کے تذکرے" مضمون، ماہنامہ نیا دور لکھنؤ، جنوری ۱۹۹۲ء

۳ و ۴ تفصیلات کے لئے دیکھئے راقم الحروف کے مضامین "فتح اللہ شیرازی: ایک سائنس داں" اور "ملا محمود جون پوری" ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، اگست ۱۹۹۰ء اور نومبر ۱۹۹۱ء

۵ تا ۸ نوابی عہد کے ہندوؤں کا فارسی ادب میں یوگدان۔ ڈاکٹر نریندر بہادر سریواستو ص ۱۸۵، ص ۱۶۳، ص ۱۹۳ اور ص ۱۶۹، نامی پریس لکھنؤ: ۱۹۸۳ء

۹ ایضاً ص ۱۶۸ و فہرست مشترک نسخہ ہائی خطی فارسی پاکستان، جلد اول، احمد منزوی ص ۳۰۱ مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد ۱۹۸۳ء

۱۰ تا ۱۲ فہرست مشترک نسخہ ہائی خطی فارسی پاکستان، جلد اول ص ۱۹۵، ص ۱۹۴ اور ص ۲۳۳

(باقی ص ۴۴ پر)

زخمِ دل جتنا پُرانا ہو گیا
درد اتنا ہی سہانا ہو گیا
شہرتِ دیوانگی ان تک گئی
اک تعارف غائبانہ ہو گیا
ہم نے جانا تھا چلو بس رسم و راہ
پھر سے چلیے آنا جانا ہو گیا
بس وہاں کو چل پڑے شوریدہ سر
جب جہاں کا آب و دانہ ہو گیا
آپ بھی احمدؔ تھے دل کے بادشاہ
آپ کا بھی اک زمانہ ہو گیا

——— افتخار احمد زیدی
نرولی ہاؤس، لکھنؤ

نقاب رُخ سے بہت کم اُٹھائی جاتی ہے
کبھی کبھی ہمیں صورت دکھائی جاتی ہے
ہر ایک راز سے ہم تیرے آشنا ہیں مگر
وہ بات کیا ہے جو ہم سے چھپائی جاتی ہے
لگے جو آگ تو ہر شے تباہ ہوتی ہے
مگر یہ آگ بھلا کیوں لگائی جاتی ہے
ہمیں کو دیکھ کر ان کو حجاب آتا ہے
ہمیں کو دیکھ کر چلمن اُٹھائی جاتی ہے
پڑے جو تم پہ مصیبت نہ ہو اُداس کبھی
صلیب اپنی یہاں خود اٹھائی جاتی ہے

سُلیمان صدیقی
"آشیانہ"، سی-۲۱۱، راجہ جی پورم
لکھنؤ

درمیاں فاصلے جو بھی ہیں سمٹ جائیں گے
ذہن جاگیں گے تو حالات پلٹ جائیں گے
دیر جو بھی ہے سرِ بغض کچلنے میں ہے
جھگڑے کیسے بھی ہوں لمحوں میں نپٹ جائینگے
ہم وہ انسان ہیں جیسے بھی رہیں گے ویسے
جسم سایوں کے بڑھیں گے کبھی گھٹ جائینگے
آؤ کردار کی مشعل لیے آ گے ورنہ
لوگ تاریخ کے اوراق میں بٹ جائینگے
منہ چھپانے کی جگہ ڈھونڈ رہے ہیں محمودؔ
جو یہ سمجھے تھے کہ ہم خانوں میں بٹ جائینگے

——— محمود الحق محمود
اے ۶۸-بی، برما ریلوے کالونی
لکھنؤ

غزلیں

کشت بے آب ہوں سیراب تمنا کر دے
میرے مولا تو مرے دشت کو دریا کر دے
واسطہ تجھ کو تری وسعت و پہنائی کا
میں ہوں اک ذرّہ مجھے ذرّے سے صحرا کر دے
میری دُنیا ہے ابھی تیرہ و تاریک بہت
بھیج وہ صبح جو ہر سمت اُجالا کر دے
راستے سے نہیں ہٹتے یہ مصیبت کے پہاڑ
نرم ہاتھوں کو مرے اک ذرا تیشا کر دے
قبضۂ غیر میں ہے قبلۂ اوّل میرا
پھر حوالے مرے وہ مسجدِ اقصیٰ کر دے

——— مسعود کلیم
"بلسنز"
مؤناتھ بھنجن، ۱۰

حق صفت شخص قلندر میں بدل جاتا ہے
قطرۂ آب سمندر میں بدل جاتا ہے
کیسے پہچان کریں کس پہ بھروسہ کر لیں
اب لٹیرا بھی تو رہبر میں بدل جاتا ہے
آئینہ دیکھنے والے یہ خبر ہے تجھ کو
آئینہ ٹوٹ کے خنجر میں بدل جاتا ہے
حسنِ اخلاق کی شمشیر سلامت ہے اگر
پھر تو فولادِ گلِ تر میں بدل جاتا ہے
ہے اگر دستِ کرم اس کا حقیقت ہے نظرؔ
ناتواں شخص تونگر میں بدل جاتا ہے

——— عابد نذر نظرؔ لکھنوی
۳۷ - پاٹا نالہ، لکھنؤ

پیغام نیا رکھتی ہے جو ایسی صبا ہوں
پہچان تو انساں کیلئے تاجِ وفا ہوں
کھِل جاتے ہیں جس خاک پہ گر جانے سے دانے
اس شعلہ فشاں ریت پہ صدیوں سے اُگا ہوں
پُر نار نہیں سکتیں بلائیں مرے نزدیک
میں سایۂ دامانِ ہمیشہ کا پلا ہوں
دیکھو نہ مری سمت سمندر ہوں وفا کا
اس ریت کی دُنیا سے بہر حال بڑا ہوں
تھک جانا تو دم لینا مری چھاؤں میں رک کر
اک پیڑ ہوں پتوں سے لیے سایہ کھڑا ہوں

——— ڈاکٹر وصی جونپوری
۲۰۶/۲۲، پیلی کوٹھی پرانی بانس منڈی
سیتاپور روڈ، لکھنؤ

عطیہ بانو علوی
احاطہ شوکت حسین سادہ کار، ٹھاکر گنج
لکھنؤ

بیگم اختر

اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

موسیقی کو فنونِ لطیفہ میں دل کی حیثیت حاصل ہے۔ اگر غور کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ انسانی تقویم میں موسیقی قدیم ترین جبلت ہے۔ گانا دراصل اظہارِ جذبات کا موثر وسیلہ تصور کیا جاتا ہے۔ موسیقی کے ذریعہ جذبات دل کی آواز بن کر ابھرتے ہیں۔ اگر موسیقار موسیقی کی تکنیک اور رموز و نکات سے بھی واقف ہو تو موسیقی میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔

بیگم اختر کو بھی خدا نے کچھ اسی قسم کی صلاحیتیں عطا کی تھیں، جن کی بنا پر وہ ممتاز گلوکارہ بن گئیں۔ وہ فن کے فرائض اور آداب سے بخوبی واقف تھیں اور ان ممتاز فن کاروں میں تھیں جنھوں نے فن اور روایت کے امتزاج سے موسیقی میں ایک نئی روح پھونکی تھی۔

بحیثیت گلوکارہ بیگم اختر ٹھمری، دادرا اور غزل گانے میں مہارت رکھتی تھیں۔ غزل گانے میں انھوں نے اپنا ایک الگ مقام بنالیا تھا اور یہ ثابت کردیا تھا کہ غزل بھی (جس کا تعلق ہلکی پھلکی موسیقی سے ہے) کلاسیکی موسیقی سے کسی طرح کم نہیں۔ الفاظ کی ادائگی میں مغربی اور مشرقی دونوں رنگوں کا امتزاج تھا۔ ان کی آواز بہت ہی مترنم اور پُر درد تھی۔ ان کی ہنسی میں بھی مخصوص کھنک تھی جو فضا میں رس گھولتی رہتی تھی۔

بیگم اختر کے فن پر تو بہت کچھ لکھا جاچکا ہے لیکن ان کی نجی اور گھریلو زندگی کے بارے میں بہت کم لکھا گیا ہے۔ اگر وہ ایک ممتاز اور مشہور فنکارہ نہ بھی ہوتیں تو بھی وہ ایک بہترین انسان ضرور تھیں اور اپنے طور طریقوں اور برتاؤ سے ہر ایک کا دل موہ لیتی تھیں۔

بیگم اختر کی پیدائش ۱۹۱۴ء میں فیض آباد میں ہوئی تھی۔ وہ اپنی والدہ کی اکلوتی اولاد تھیں۔ ان کے آباو اجداد اجودھیا کے ایک گاؤں درشن نگر کے رہنے والے تھے۔ ان لوگوں کا تعلق پیشہ ور گانے والوں میں نہیں تھا۔ حالات کی مجبوری نے بیگم اختر کی والدہ کو گانے کی دُنیا میں داخلے پر مجبور کیا۔ خود بیگم اختر بھی بچپن سے گھریلو گلے نے بڑی پُردرد آواز میں گایا کرتی تھیں۔ کیوں کہ ان کے خاندان میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو ان دونوں کی کفالت کرتا۔ اس لیئے بیگم اختر کو گانے کی تعلیم دی گئی۔ وہ خود کہتی تھیں کہ اپنی ماں کی غربت اور مجبوری کو دیکھ کر انھوں نے یہ طے کرلیا تھا کہ وہ لڑکا بن کر ماں کی کفالت کریں گی۔

تعلیم سے بیگم اختر محروم تھیں۔ اسکول کی تعلیم میں ان کا دل ہی نہیں لگا۔ دو چار کلاس تک ہی پڑھ کر رہ گئیں، لہذا انھوں نے باقاعدہ گانے کی تربیت حاصل کرنا شروع کردی۔ ان کی ماں انھیں کلکتہ لے گئیں اور وہاں انھوں نے بڑے اور ممتاز اساتذہ سے تربیت حاصل کرنا شروع کردی، جن میں عبدالکریم خاں صاحب قابلِ ذکر ہیں۔ موسیقی کی دنیا میں وہ روز بروز ترقی کرتی گئیں اور اس قابل ہوگئیں کہ اسٹیج پر پروگرام کرنے لگیں۔ اس سلسلے میں بھی ان کا ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ کوئٹہ زلزلہ کے سلسلے میں ایک پروگرام کا اہتمام غالباً کلکتہ ہی میں کیا گیا تھا۔ یہ بھی اپنے اساتذہ کے ساتھ پروگرام میں بڑے بڑے فن کاروں کو سننے گئیں۔ اس وقت بیگم اختر (اس وقت کی اختری بائی) کی عمر تقریباً ۱۴ یا ۱۵ سال تھی۔ اتفاق سے گانے والوں میں سے کوئی بھی بڑا فن کار وقت پر نہ پہونچ سکا۔ پبلک نے شور مچانا شروع

گیا تو استاد نے اختری بائی کو اسٹیج پر بلالیا۔ خوف کی وجہ سے ان کی آواز کانپ رہی تھی مگر جلد ہی انھوں نے اس پر قابو پالیا اور اپنی خداداد آواز میں ایک غزل "دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنادے" کی ابتدا کی جو بہت پسند کی گئی۔ اس پروگرام میں سروجنی نائیڈو بھی موجود تھیں۔ انھوں نے اختری بائی کے گانے کی بڑی تعریف کی۔ بہت جلد ہی ایچ۔ ایم۔ وی کمپنی نے ان کے ریکارڈ بنانے شروع کئے اور اس طرح اختری بائی آسمانِ موسیقی کا ایک تابندہ ستارہ بن گئیں۔ بالکل اس شعر کے مصداق ؎

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

بیگم اختر نے بعد میں چند فلموں میں بھی کام کیا تھا جن میں "روٹی" فلم بہت مقبول ہوئی تھی۔

وہ کہتی تھیں کہ میں نے سوچ رکھا تھا کہ جب اتنی دولت جمع کرلوں گی کہ میری ماں آرام سے زندگی گزار سکیں تو میں کسی شریف آدمی سے شادی کرلوں گی تاکہ باعزت زندگی گزار سکوں۔ کسی کے ہو رہنے کے جذبے کے تحت ان کی نگاہیں خوب سے خوب تر جیون ساتھی کی تلاش میں بھٹکتی رہیں۔ ایک ایسے انسان کی کھوج میں وہ سرگرداں رہیں جو انھیں سماج میں باعزت مقام دے سکے۔ آخرکار ان کی نظر انتخاب قاضی اشتیاق احمد عباسی (بار ایٹ لا) پر پڑی جو ایک اعلا خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ بقول بیگم اختر — ان کو دس سال تک عباسی صاحب کو منانا پڑا۔ کیوں کہ عباسی صاحب کی پہلی بیوی جو ان کی حقیقی خالہ زاد تھیں، حیات تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد ہی عباسی صاحب شادی پر رضامند ہوئے۔ وہ کہتی تھیں کہ مجھے مسٹر عباسی سے والہانہ عشق نہیں تھا لیکن یہ یقین ضرور تھا کہ وہ ایک شریف انسان ہیں اور مجھے تمام زندگی نباہ دیں گے۔"

بہرحال عباسی صاحب نے اپنے خاندان والوں سے چھپا کر ان سے شادی کرلی۔ ۲۲ر اکتوبر ۱۹۴۳ء کو ان کی شادی ہوئی۔ کچھ عرصہ وہ لوگ ایک علاحدہ مکان میں رہے پھر وہ عباسی صاحب کے آبائی گھر میں آگئیں۔ اپنی خصوصیات کی بنا پر وہ گھر میں جلد ہی ہر دلعزیز ہوگئیں۔ اب وہ کسی کی بہو تھیں، کسی کی بھابھی تھیں تو کسی کی چچی اور ممانی تھیں۔ باقاعدہ پردے کے ساتھ انھوں نے اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا۔ عباسی صاحب نے ان سے اسی شرط پر شادی کی تھی کہ ان کو گانا چھوڑنا پڑے گا اور ان کی خاندانی روایات کے مطابق اپنے کو ڈھالنا پڑے گا۔ وہ تیس برس تک اس عہد کی پابند رہیں لیکن ان کی صحت خراب رہنے لگی۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ اگر ان پر سے گانا نہ گانے کی پابندی اٹھالی جائے تو شاید یہ سنبھل جائیں گی۔ آخرکار ان کے شوہر نے مجبوراً ریڈیو میں پروگرام کرنے کی اجازت دی۔ بعد میں وہ چھپا کر کانفرنس وغیرہ میں بھی جانے لگیں۔

اختری بائی کو "بیگم اختر" عباسی صاحب ہی نے بنایا اور سوسائٹی میں ان کو بحیثیت اپنی بیوی کے نہ صرف روشناس کرایا بلکہ ہر ایک نے ان کو عزت اور محبت دی۔ خود بیگم اختر اس بات کا اعتراف کرتی تھیں۔ وہ اپنے شوہر کے ہر آرام کا خیال رکھتی تھیں۔ گھر میں نوکروں کی پوری ایک ٹولی تھی لیکن وہ اپنے شوہر کا ہر کام خود کرتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر مجھے اپنی کھال کی جوتیاں بنا کر بھی اپنے شوہر کو پہنانا پڑیں تو میں دریغ نہ کروں گی۔

بیگم اختر جس طرح ملکۂ غزل کہلاتی تھیں، اسی طرح وہ اپنے گھر کی بھی رانی تھیں — وہ ایک وفا شعار بیوی، شفیق بزرگ اور مہربان مالکن کے روپ میں ہر دلعزیز تھیں، وہ اپنے ملازمین سے بھی بہت محبت کرتی تھیں اور ان کے دکھ سکھ کا خیال رکھتی تھیں۔ اگر وہ لوگ بیمار ہوتے تو ڈاکٹر کو گھر پر بلا کر نوکروں کا علاج کرواتی تھیں۔

بیگم اختر کا گھر قومی یک جہتی کا اعلا نمونہ تھا۔ ان کے یہاں ہر مذہب و ملت کے لوگ ہر وقت آتے جاتے تھے۔ ان کی شاگردوں میں ہر مذہب کی لڑکیاں شامل تھیں جن میں بڑے بڑے افسروں کی بیویاں بھی تھیں۔ ان میں سے چند کے نام قابل ذکر ہیں: شانتی ہیرانند (سندھی)، انجلی بنرجی اور دیپتی بوس (بنگالی)، مسز ستھو (پنجابی) اور مسز بھٹناگر وغیرہ موخرالذکر دونوں آئی اے ایس افسران کی بیویاں تھیں۔ ان کے علاوہ بھی دیگر بہت سی شاگرد تھیں۔ بیگم اختر خود اپنے مذہب کی پابند تھیں اور تین مرتبہ حج کرچکی تھیں۔ ان کا قول تھا کہ فن کار اور فن کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ہے۔ مذہب انسان سے محبت سکھاتا ہے، نفرت نہیں۔

بیگم اختر کے یہاں عید بقرعید کے علاوہ دوسرے مذاہب کے تہواروں کا بھی اہتمام کیا جاتا تھا۔ دیوالی میں گھر میں چراغاں ہوتا اور ہولی میں عبیر و گلال اور رنگ کھیلا جاتا تھا۔ رکشا بندھن میں بھی وہ اپنے ہندو بھائیوں کے راکھی باندھتی تھیں

[illegible]
جیسے یہاں الگ بناتے ہیں۔ ہولی میں وہ ہر آنے والے سے ہولی
ملتی تھیں، یہاں تک کہ گھر کی جمعدارن تک سے بھی۔

بیگم اختر سنی العقیدہ تھیں لیکن محرم وہ بالکل اہل تشیع کی طرح مناتی تھیں۔ چاندرات کو وہ کہیں بھی ہوں، گھر پہونچ جاتی تھیں اور اسی رات سے محرم کا اہتمام شروع ہو جاتا تھا۔ بہت بڑا امام باڑہ سجایا جاتا تھا چاندی کے علم دوسری محرم کو سجا دیئے جاتے تھے۔ ۹ روز تک لنگر تقسیم ہوتا تھا۔ شب عاشور کو تو گھر کے سب لوگ جاگتے تھے۔ مرثیہ اور نوحے وہ اور ان کی والدہ بہت ہی پُردرد آواز میں پڑھتی تھیں۔ دس روز تک گھر کے تمام افراد زمین پر سوتے تھے اور پوری طرح سے سوگ مناتے تھے۔ بارہ محرم کو پھول اُٹھائے جاتے تھے، قرآن خوانی ہوتی تھی اور شیرمال اور حلوہ تقسیم ہوتا تھا، اس کے بعد امام باڑہ بڑھایا جاتا تھا۔

اس سلسلے میں یہ تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ محرم کا اہتمام بیگم اختر کے یہاں اس لیے ہوتا تھا کہ ان کے خاندان میں کوئی لڑکا زندہ نہیں رہتا تھا اور پانچ سال کی عمر تک پہونچتے پہونچتے فوت ہو جاتا تھا۔ ان کے پرنانا نے منت مانی کہ اگر میرا بیٹا زندہ رہ گیا تو اس کی منت کا تعزیہ رکھیں گے چنانچہ ان کے دو بیٹے ہوئے اور وہ بڑے ہو گئے لیکن منت نہیں پوری کی گئی۔ ایک روز ان میں سے ایک لڑکے کو سانپ نے کاٹ لیا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ تب ان لوگوں کو منت کا خیال آیا۔ جہاں تعزیے رکھے جاتے تھے درشن نگر اجودھیا میں اسے چوک کہتے تھے۔ اس لڑکے کو اسی جگہ لاکر ڈال دیا اور دُعا مانگی کہ ہمارا بیٹا بچ جائے تو اس کی منت کا تعزیہ رکھیں گے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ بچہ ٹھیک ہو گیا۔

اس واقعہ کے بعد سے ان کے خاندان میں عزاداری کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان کے خاندان میں جو بھی بچہ پیدا ہوتا تھا اس کی منت کا تعزیہ رکھا جاتا تھا۔ اس لیے بیگم اختر بھی بڑی عقیدت سے محرم میں عزاداری کرتی تھیں۔ وہ ماتم بھی کرتی تھیں۔

ہیولاک روڈ کا وہ مکان جو ان کی آخری رہائش گاہ تھا، پہلے کشمیری خاندان والوں کی ملکیت تھا۔ اسے عباسی صاحب نے خرید لیا تھا اور اپنے آبائی مکان (جو نئے گاؤں میں تھا) سے یہاں منتقل ہو گئے تھے۔

ایک روز راجہ صاحب محمود آباد بیگم اختر کی وفات کے بعد عباسی صاحب کے پاس تعزیت کے سلسلے میں آئے تو انھوں نے بتایا کہ اس مکان میں جواہر لال نہرو آکر قیام کرتے تھے کیونکہ یہ مکان جن لوگوں کی ملکیت میں تھا وہ جواہر لال نہرو کے رشتہ دار تھے اور بیگم اختر کے کمرے کو دیکھ کر راجہ صاحب نے بتایا کہ پنڈت نہرو اسی کمرے میں رہتے تھے۔

اپنے گھر کو وہ بہت ہی نفاست اور خوبصورتی سے سجا کر رکھتی تھیں۔ ہمیشہ یہی کوشش رہتی تھی کہ ان کے گھر میں ہر نئی چیز سب سے پہلے آ جائے پھولوں سے انھیں عشق تھا، خاص کر گلاب سے۔

بیگم اختر کی ایک عجیب عادت یہ بھی تھی کہ رات کو سوتے وقت ایک خادمہ مستقل طور پر ان کے پیر دباتی تھی اور کہانی سننے کی بھی انھیں عادت تھی۔ جب تک وہ سو نہ جاتیں یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔ ان دو چیزوں کے بغیر انھیں نیند نہیں آتی تھی۔ غذا ان کی بہت کم تھی لیکن چائے وہ بہت پیتی تھیں دوسروں کی چھپ کر اور غائبانہ مدد بھی وہ کرتی تھیں۔ اکثر ضرورت مند لوگوں کے خطوط ان کے پاس آیا کرتے تھے جن میں طالب علم تک شامل تھے۔ وہ بلا تفریق مذہب و ملت ہر سوالی کی مدد کیا کرتی تھیں جبکہ وہ بعض لوگوں کو پہچانتی بھی نہیں تھیں۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ یاد آ رہا ہے، ایک صاحب کا خط آیا کہ ان کی لڑکی کی شادی ہے۔ سب انتظام ہو گیا ہے صرف گھی خریدنے کے لئے پیسے نہیں ہیں۔ اس کے لئے جتنی رقم درکار تھی وہ بھی انھوں نے لکھ دی تھی۔ بیگم اختر گھر پر موجود نہ تھیں پروگرام کے سلسلے میں شہر سے باہر تھیں۔ ان کی غیر موجودگی میں جتنی ڈاک آتی تھی، واپسی پر سب سے پہلے وہ اس کو دیکھتی تھیں۔ جس روز وہ واپس آئیں اور اپنی ڈاک دیکھی تو اس میں وہ خط بھی تھا۔ غور کیا گیا تو اسی روز شادی تھی۔ فوراً وہ رقم اپنے منشی کے ذریعہ خط میں درج پتے پر انھوں نے بھیجی۔ دو گھنٹے کے بعد منشی جی مع رقم کے واپس آ گئے اور بتایا کہ وہاں تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے اور مہمانوں کی خوب خاطر تواضع ہو رہی ہے، پیسے دینے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ بیگم اختر ان پر بہت ناراض ہوئیں اور اسی وقت منشی جی کو پھر بھیجا کہ یہ رقم ان صاحب کو دے آئیں۔ میری طرف سے شادی میں دینے کے لیے۔ غرض اسی وقت وہ صاحب شادی کا کارڈ لے کر بیگم اختر کو خود مدعو کرنے آئے اور بہت شکریہ ادا کیا۔ بیگم صاحبہ نے

نہ صرف شادی میں شرکت کی بلکہ ان کی لڑکی کو ایک قیمتی تحفہ بھی دیا۔

وہ بہت رحم دل تھیں اور کسی کو تکلیف یا پریشانی دیکھ کر چاہتی تھیں کہ جس طرح بھی ہو سکے اس کی مدد کریں، خواہ وہ شخص ان کے لیے اجنبی کیوں نہ ہو۔

بیگم اختر کہا کرتی تھیں کہ "میں چاہتی ہوں کہ میں گاتے گاتے ہی جان دوں" ان کی تمنا خدا نے پوری کر دی۔ اس کے باوجود کہ ان پر دل کا دورہ پڑ چکا تھا وہ دہلی اور دیگر شہروں سے پروگرام کرتی ہوئی جب احمد آباد پہونچیں تو پروگرام کے اختتام پر ڈھائی بجے رات کو ہوٹل واپس آئیں۔ تقریباً تین بجے رات کو ان پر شدید قلبی دورہ پڑا۔ اس سے قبل بھی ان پر دو مرتبہ قلبی دورہ پڑ چکا تھا اور ڈاکٹروں نے انھیں مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا لیکن انھوں نے اپنے پہلے سے طے شدہ پروگراموں کو منسوخ نہیں کیا مبادا پروگراموں کا اہتمام کرنے والوں کو مالی نقصان اٹھانا پڑ جائے یا پھر وہ یہی چاہتی تھیں کہ وہ زندگی کے آخری لمحہ تک گاتی رہیں۔

دہلی سے بروڈہ، بمبئی ہوتے ہوئے وہ احمد آباد پہونچیں۔ قلبی دورہ پڑنے کے بعد احمد آباد کے ایک اسپتال میں انھوں نے ۳۰ راکتوبر ۱۹۷۴ء کو رات آٹھ بجے بروز بدھ موت کو مسکراتے ہوئے گلے لگا لیا بالکل اس شعر کے مصداق ؎

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں، کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

دوسرے روز ان کی میت لکھنؤ لائی گئی اور وہ اپنی والدہ کے پہلو میں دفن کر دی گئیں۔ ان کا مدفن جس جگہ ہے وہ بھی ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے یہ جگہ "پسند باغ" کے نام سے موسوم ہے جو شاہان اودھ کی بیگمات کی تفریح گاہ تھی، اب یہ بیگم اختر کی ملکیت تھی۔ انھوں نے وہاں ایک مسجد بھی تعمیر کرائی تھی اور اسی کے آنگن میں وہ اپنی والدہ کے پہلو میں ابدی نیند سو رہی ہیں۔

اودھ کی یہ مایہ ناز گلوکارہ اور دلنواز شخصیت ایک معنی میں یادگار زمانہ رہے گی۔ افسوس کہ وہ بھی ان لوگوں میں شامل ہو گئیں ——

اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

□□

لکھنؤ دو سو برس پہلے ...... صفحہ ۲۸ کا بقیہ

دوسری صبح وزیر علی خاں کو تنہا گھر میں چھوڑ کر حفاظت کرنے والوں کا ایک دستہ ان پر مقرر کیا اور تمام انگریز اور عظما سعادت علی خاں کی ہمراہی میں شہر میں آئے اور انھیں حکومت کی مسند پر بٹھا دیا اور وزیر علی خاں کو پھر شریروں کے چند نفر کے ساتھ بنارس روانہ کیا اور ڈیڑھ لاکھ روپیہ سالانہ ان کا وظیفہ مقرر کیا اور انھوں نے کمپنی کے ظل عاطفت میں آرام کے ساتھ زندگی گزاری اور ایک کروڑ روپیہ کے بقدر نقد اور جنس جو انھوں نے آصف الدولہ کے خزانے سے لیا تھا وہ سب بھی گورنر نے انھیں کے پاس چھوڑ دیا۔ اور یہ واقعات ماہ شعبان ۱۲۱۲ھ ۱۷۹۷ء میں پیش آئے حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں انگریزوں نے اس قدر حسن تدبیر سے کام لیا کہ اس کے بیان کا حق ادا کرنا مشکل ہے۔ گمان تھا کہ اس میں طرفین کی بڑی تعداد تلف ہو جائے گی لیکن انگریزوں نے اسے ایسی آہستگی سے طے کیا کہ ایک بھی شمشیر نیام سے اور خون کا ایک بھی قطرہ جسم سے نہیں نکلا۔ اور خان موصوف پھر سعادت علی خاں کی نیابت کے عہدے پر ان کے اور گورنر کے اصرار سے مستقل ہو گئے۔

سائنس اور تکنیک کا فروغ —— صفحہ ۳۸ کا بقیہ

۱۳؎ اودھ کے نوابوں کی سیاسی ابھی رُجحان" مضمون نریندر بہادر سریواستوا لکھنؤ فسٹول میگزین، لکھنؤ ۱۹۸۵ء

۱۴؎ نوابی عہد کے ہندوؤں کا فارسی ادب میں یوگ دان ص۸۲

۱۵؎ تاریخ نادر العصر۔ منشی نول کشور ص۱۲۵، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ ۱۹۹۰ء

۱۶؎ سوانحات سلاطین اودھ۔ جلد اول، سید کمال الدین حیدر ص۲۱۱، منشی نول کشور، لکھنؤ ۱۸۷۹ء

۱۷؎ قیصر التواریخ جلد دوم ص۱۴۱ بحوالہ نوابی عہد کے ہندوؤں کا فارسی ادب میں یوگدان ص۸۶

۱۸؎ نوابی عہد کے ہندوؤں کا فارسی ادب میں یوگ دان ص۸۹

۱۹؎ تاریخ اودھ، حصہ دوم، محمد نجم الغنی خاں رامپوری، تلخیص و مقدمہ ڈاکٹر ذکی کاکوروی ص۱۹۹ نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۷۹ء و گزشتہ لکھنؤ، سید عبدالحلیم شرر ص۳۶ نسیم بک ڈپو لکھنؤ

۲۰؎ گزشتہ لکھنؤ ص۱۲۵ (اس پریس میں ہفت قلزم، زاد المعاد وغیرہ کتابیں چھپیں)

۲۱؎ سوانحات سلاطین اودھ ص۳۱۰

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب، **اُردو انٹرویوز**
مصنف : محمّد خالد عابدی قیمت : پچاس روپے
ملنے کا پتہ : دانش محل۔ امین الدولہ پارک لکھنؤ

دوسری اصنافِ نثر و نظم کی طرح مصاحبہ بھی ایک صنفِ ادب ہی ہے۔ اس کی سب سے بڑی اہمیت ان معنی میں ہے کہ انٹرویو ر مصاحبہ) کے ذریعہ کسی کو بھی ان سوالات کے جوابات فراہم کرنا ہوتے ہیں جو سوال کرنے والا چاہتا ہے، اس میں ایسے مقامات بھی آتے ہیں جب جواب دینے والا کسی بات سے صرفِ نظر کرنا چاہتا ہے اور سوال کرنے والا صاحب موصوف سے اسی کا جواب اگلوانا چاہتا ہے۔

مثال کے طور پر زیر تبصرہ کتاب کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو کہ شمیم جے پوری عام طور پر مشاعروں کے مقبول شاعر تصور کیے جاتے ہیں اور ان سے مشاعروں کے سلسلے میں عابدی صاحب نے سوال پوچھ لیا:

عابدی : "آج کل جو مشاعرے منعقد ہو رہے ہیں ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔؟"

شمیم، "چوں کہ خود مشاعروں میں شرکت پر مجبور ہوں اس لیے اس پر روشنی ڈالنا خلافِ مصلحت ہے۔ صرف اتنا عرض کروں گا کہ ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ آج کا مشاعرہ محض چند متشاعر اور تک بندوں کے اکھاڑے کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔"

اسی طرح بعض نقاد اپنا سارا زورِ قلم اس پر صرف کرتے رہے کہ شاعری مقصدی ہونا چاہیے اور ہر شاعر کو اپنی شاعری کے ذریعہ کوئی بامقصد پیغام دینا چاہیے، اور اگر کسی شاعر کے پاس کوئی پیغام نہیں تو وہ شاعر ہی نہیں، جبکہ شاعری کے لیے یہ بات بالکل ضروری نہیں۔

میرے نزدیک ان مثالوں سے مصنف کی ذہانت اور بالغ نظری کا پتہ چلتا ہے اور اس اعتبار سے کتاب میں خاصی کام کی باتیں اور خاصے اہم نام بھی شامل ہیں۔

مصنف نے ان مصاحبوں کو مراسلاتی انٹرویوز کا نام دیا ہے، یعنی سوال نامہ بھیج کر جوابات حاصل کیے گئے ہیں۔

مراسلاتی انٹرویوز اور بالمشافہ انٹرویو کا خاص فرق کچھ اس طرح پر ہے کہ جہاں مراسلت کے ذریعہ سوال پوچھے جانے پر کسی کو بہت سوچ سمجھ کر بہت نپا تلا جواب تحریر کرنے کا موقع ملتا ہے وہیں سوال کرنے والے کو ان سوالات کے اعادے کا موقع نہیں ملتا جو جواب سے پیدا ہوسکتے ہیں اور یہ بات اس کتاب میں بھی کہیں کہیں دکھائی دے جاتی ہے۔

کتاب کی لکھائی، چھپائی اور گٹ اپ خاصا اچھا ہے۔ قیمت بھی مناسب ہے۔

——— عمر انصاری

نام کتاب : **خوابوں کے ہم سائے**
شاعر : شاھد جمیل قیمت : پچاس روپے
ملنے کا پتہ : راجہ منزل محلہ نیم گندھی۔ سہسرام ضلع روہتاس (بہار)

شاہد جمیل ایک خوش فکر شاعر ہیں جن کے اس کاوش نامے کو دیکھ کر بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ آج کل اردو میں کیسے کیسے خوبصورت، دیدہ زیب اور کتابت و طباعت کے اعتبار سے معیاری شعری مجموعے شائع ہو رہے ہیں۔ ان کو نظم و غزل دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہے اور ان دونوں اصنافِ سخن کے اسرار و رموز سے وہ بخوبی آشنا معلوم ہوتے ہیں۔ انسانی احساسات و جذبات کو خوبصورت شعری پیکر میں ڈھالنے کا ہنر اگر کسی کو آجائے تو اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ اسلوب کی ندرت، منفرد اور پُرکشش لب و لہجہ، تازہ کاری کی فضا، یہ ان کی شاعری کا وصف ہے اپنے اس پہلے شعری مجموعے کی اشاعت پر وہ مبارک باد کے مستحق ہیں اور اس سے ان کا روشن مستقبل سامنے نظر آتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ

"خوابوں کے ہم سائے" سے وہ اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہوں گے۔
امید ہے کہ ادبی حلقوں میں اس شعری مجموعے کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔ ان کا یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

فکرِ محبوب، غمِ دُنیا، خیالِ مسجود
بے خودی ایسے مسائل سے بری رہتی ہے

—— امیر احمد صدیقی

نام کتاب: نقوشِ محسن
مصنف: مولانا احسان المحسن قاسمی   قیمت بیس روپئے
ملنے کا پتہ: جامعہ قاسم العلوم کوٹیرہ مظفرنگر

مولانا محسن قاسمی صاحب ایک سچے عاشقِ رسول ہیں آپ ذی استعداد فاضل جید حافظ بے مثال قاری اور بڑا صاف ستھرا ادبی ذوق رکھتے ہیں۔

قاسمی صاحب کا ایک شعری مجموعہ "گلدستۂ محسن" کے نام سے شایع ہوکر عوام و خواص سے خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے اور اس کے متعدد ایڈیشن جگہ جگہ شایع ہو رہے ہیں۔

قاسمی صاحب ایک متمول زمیندار گھرانے کے رکن ہونے کے سبب فکرِ جہاں سے بے نیاز ہوکر علمی و ادبی ذوق کی آبیاری ہی میں مصروف رہتے ہیں آپ نے عاشقِ رسول کی حیثیت سے دینی علوم کی تبلیغ کے لئے ادارہ قاسم العلوم قایم کر کے درجنوں حفاظ اور قرا پیدا کئے ہیں اسکے بعد اپنا شعری سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔

عشقِ رسول میں ڈوبی ہوئی محسن صاحب کی نعتیں کچھ عجیب ہی حسن و چاشنی رکھتی ہیں خدا نے آپ کو عشقِ رسول عطا کر کے اس کے اظہار کا مستحسن طریقہ بھی عطا کیا ہے اس لیے آپ کی نعتوں کے کیسٹ ہر جگہ بڑی کشش رکھتے ہیں۔

محسن صاحب نے غزلیں بھی کہیں اور نظمیں بھی لکھیں لیکن نعت کو سرمایۂ حیات بنایا اسی لیے آپ کی نعتیں وہ کیفیت رکھتی ہیں جو کہ کسی سچے عاشقِ رسول کے لیے ضروری ہوا کرتی ہے۔ دراصل نعت کہنا بڑا مشکل کام ہے کامیاب نعت وہی کہہ سکتا ہے جو عشقِ رسول رکھتا ہو اور خوب اچھی طرح واقف ہو کہ نعت کہنے کے لیے کتنی احتیاط اور کس قدر خلوص کی ضرورت ہوتی ہے ذرا سی بد احتیاطی بہت بڑے عذاب کی باعث ہو سکتی ہے۔ ایمانداری کی بات یہ ہے کہ کوئی نعت اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی۔ قلوبِ انسانی پر اثر انداز بھی نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ صمیم قلب سے طہارت، عقیدت، اور انکساری سے نہ کہی گئی ہو۔ مولانا محسن قاسمی صاحب کی نعتوں میں عقیدت و انکساری جاری و ساری ہے اس لیے کہ وہ پڑھنے والے کے دل کی کیفیت کو بدلنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

"نقوشِ محسن" نعت سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک بہترین تحفہ ہے۔

—— احمد ابراہیم علوی

نام کتاب: "انیسِ وقت"
(شعری مجموعہ)
شاعر: ڈاکٹر سعید گورکھپوری

"انیسِ وقت" ڈاکٹر سعید گورکھپوری کا مختصر مجموعۂ کلام ہے۔ اس میں زیادہ تر نظمیں ہیں جو مختلف سماجی موضوعات پر لکھی گئی ہیں۔ ان میں دو ایک نظمیں رومانی بھی ہیں۔ شاعری کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سماج کی آئینہ دار ہوتی ہے اور اسی اصول کی ترجمان ڈاکٹر سعید کی شاعری ہے۔ حالی نے اردو شاعری کو گل و بلبل کے فرسودہ نظام سے نکالا اور حقیقی زندگی اور موضوعاتی شاعری کا سنگ بنیاد رکھا تھا جس کو نظیر اکبر آبادی نے پروان چڑھایا۔ اسی راہ پر گامزن ہونے کی ڈاکٹر صاحب نے بھی کوشش کی ہے۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں۔ مثلاً قومی یکجہتی کے سلسلے میں کہتے ہیں ؎

اس قوم کو تاریخ نے بخشا ہی نہیں ہے
جس قوم کی بنیاد میں شامل ہو تعصب

ڈاکٹر صاحب کی رومانی نظموں میں تغزل اور پیکر تراشی کی بھی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً ؎

مسکرائے تو اندھیروں کا وطن جاگ اُٹھے

ڈاکٹر صاحب نے عید، شادی اور سہرے جیسے موضوعات پر بھی نظمیں لکھی ہیں۔ نظم سہرا کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

کسی کے پھول سے چہرے پہ پھول سا چہرہ
جہانِ رسم کے رنگین اصول کا سہرا

ڈاکٹر سعید کے مجموعہ کلام میں کچھ نقائص بھی ہیں۔ مثلاً کتابت کی بے شمار غلطیاں ہیں اور بہت سے مصرعے وزن اور بحر سے خارج ہیں۔ مجموعی طور پر ڈاکٹر سعید کا جذبۂ شاعری قابلِ ستائش ہے۔

———— علی باقر زیدی

نام کتاب: غالب کا ایک مشاق شاگرد
بال مکند بے صبر
مصنف: کالی داس گپتا رضا — قیمت: نوے روپئے
ملنے کا پتہ: وِمل پبلیکیشنز۔ جولی بھون ۱-۱۰ نیو میرین لائنس
بمبئی

غالب کے شاگردوں میں بال مکند بے صبر کا نام ادبی تحقیق میں اضافے کی حیثیت رکھتا ہے اردو کے مایۂ ناز محقق جناب کالی داس گپتا رضا ماہرِ غالبیات بھی ہیں۔ انھوں نے غالب کے کلام کو تاریخی ترتیب سے مرتب کیا ہے۔ یہ ایسا کارنامہ ہے جو بہت سارے التباسات کو دور کرتا ہے ورنہ لوگ ؎

جو میکدہ میں میرے شب غم کا جوش ہے

غالبیات ہی کے سلسلہ کی ایک کڑی ان کے مشاق شاگرد بال مکند بے صبر کے کلام کی بازیافت ہے۔ ایک سو چالیس صفحے کی اس کتاب میں بے صبر کے حالات زندگی غالب کی شان میں ان کے زبردست قصیدے، ان کی مثنوی "اخگر عشق" صنائع بدائع پر رسالہ بدیع البدائع کے اقتباسات شامل ہیں۔

بے صبر سکندر آباد ضلع بلند شہر کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۱۳ء میں پیدا ہوئے ۱۸۸۵ء میں وفات پائی۔ منشی ہرگوپال تفتہ کے بھانجے تھے اور ۱۸۴۷ء میں غالب کی شاگردگی میں آئے اور ۱۸۵۸ء میں غالب نے ان کو دیوان پر اصلاح دی۔

رضا صاحب نے بے صبر کی غزلیات بھی دی ہیں اور مثنوی "لختِ جگر" سے بھی متعارف کرایا ہے۔ "یہاں وہاں سے مثنوی کے اشعار بھی دیئے ہیں۔

ایک غزل ہے جس کی ردیف ہے "ایک نہ دو نہ تین ہزار" بے صبر صنائع و بدائع کے ماہر ہیں۔ رضا صاحب نے ان کے رسالے بدیع البدائع کا تعارف کرایا ہے۔ یہ نہایت کمیاب رسالہ یقیناً بہت معرکہ کا ہوگا۔

بے صبر نے اس میں پونے چھ سو شعر صنعتوں کی مثال میں درج کئے ہیں رضا صاحب لکھتے ہیں۔ "اگرچہ آج صنائع بدائع کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔" یہاں ان سے اختلاف ہے۔ علم ہمیشہ اپنی جگہ اہم ہوتا ہے خصوصاً علم بدیع ——— طالب علموں کے لیے آج بھی یہ علم بے حد اہم ہے اور اردو دنیا پر ان کا بہت بڑا احسان ہوگا اگر وہ بے صبر کے اس رسالے کو شائع کر دیں۔

بے صبر نے حکایتیں لکھی ہیں۔ بڑے شستہ لطیفے لکھے ہیں۔ ان کے پانچ شاگرد تھے جن میں نبواری لال شعلہ بہت مشہور ہوئے۔

بے صبر کا تذکرہ تفتہ کے پانچ خطوط میں ہے۔ تذکرہ نادر۔ تذکرہ سخن شعراء النساخ اور تذکرہ آثار الشعرائے ہنود دیوی پرشاد بشاش میں بے صبر کا تذکرہ ملتا ہے۔

یہ بے حد اہم اور وقیع کتاب ہے اس کی کتابت اور طباعت مناسب ہے

———— ڈاکٹر رضوان حیدر

نام کتاب: فصاحت جنگ جلیل
مصنف: علی احمد جلیلی — قیمت ۱۱۰ روپئے
ملنے کا پتہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس
دہلی

ڈاکٹر علی احمد جلیلی فصاحت جنگ جلیل مانک پوری کے صاحبزادے ہیں خود بھی بلند پایہ شاعر ہیں اور ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ انھیں کو حق پہنچتا ہے کہ وہ جلیل مانک پوری کی شخصیت اور فن پر لکھیں۔

خطیوں کے اعتبار سے اہمیت رکھنے والا مانک پور وہ خطہ ہے جس کی خاک سے ایسے ایسے غواص معنی بھی اٹھے ہیں جنھوں نے ہر بحر پر آشوب کو پایاب بنا دیا تھا۔ حافظ جلیل تو امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ سرسری طور پر انھیں دبستان داغ کا گل سرسبد قرار دیتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جلیل خود اپنی ذات سے ایک ادارہ

تھے انھوں نے پہلی بار اردو شاعری کو یہ مزاج عطا کیا کہ ابتہاجیت، سرخوشی اور نشاطیہ کیفیت بغیر سوقیانہ پن اور بدسلیقگی کے بھی پیدا کی جا سکتی ہے۔ اس کے لیے بے حیائی تو کیا بے حجابی بھی گراں گذرتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ارباب نشاط کے کوٹھوں کی منظر کشی کی جائے اور حسن بے لباس کا چٹخارا لے کر تذکرہ کیا جائے۔ جلیل کے یہاں حسن خود اپنا پردہ دار ہے۔ اور خود اپنا حجاب۔ ان کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

ہم تو نہ ملے تھے تو جدائی کا تھا ملال
اب یہ ملال ہے کہ تمنا نکل گئی

ڈاکٹر جلیلی نے اپنے اس مقالہ میں جلیل کے تقریباً دو سو ستر شاگردوں کی فہرست بھی دی ہے۔ جلیل کی اصلاحوں کا بھی تذکرہ کیا ہے اور ان کے مکاتیب اور معاصرین سے ان کے روابط۔ عروض پر ان کی دسترس ان کے کلام میں صنائع بدائع پر بڑی اچھی بحث کی گئی ہے

ان کی غزلیہ شاعری میں زبان و بیان، سادگی، وصفائی، روزمرہ محاورہ کا بیان ضرور ملتا ہے اور خمریات میں ریاض کے ساتھ تقابلی مطالعہ بھی لیکن جلیل کے یہاں جو خیال کی گہرائی تھی اور ہر لفظ کے پیچھے معنی کی جو دنیا آباد نظر آتی تھی اور جس طرح قرآنی آیات سے استفادے کا سلیقہ ان کو تھا اس پر بھی روشنی ڈالی گئی ہوتی تو خوب ہوتا۔

" وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں " وہی کہہ سکتا ہے جس نے آیۃ شریفہ " وہ آدمی ہے مگر اس پر وحی آتی ہے " کو اپنی روح میں جذب کر لیا ہو۔ اس کتاب میں ۳۲۰ر صفحات ہیں۔

________ اقبالؔ احمد اعجازی

نام کتاب:	" ڈارون کا نظریہ ارتقاء "
مصنف:	شورش صدیقی قیمت چالیس روپئے
ملنے کا پتہ:	ڈی ۲/۴ پیپر مل کالونی - لکھنؤ

دوسری زبانوں کی بہ نسبت اردو میں سائنس پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ اس کا سبب اردو کے ذخیرہ الفاظ میں سائنسی اصطلاحات کا فقدان بھی ہو سکتا ہے۔ جس کی وجہ سے لوگوں نے اس موضوع پر قلم اٹھانا پسند نہیں کیا۔ سائنس اور بائیولوجی سے متعلق کچھ تراجم و مضامین ضرور لکھے گیے مگر سائنسی اصطلاحات کی کمی اور ان کے متبادل الفاظ نہ ہونے کے باعث ان کی صحیح ترجمانی بھی نہ ہو سکی۔ مضامین اور تراجم کی شکل میں جو کتابیں دستیاب بھی ہیں ان کی تعداد نہیں کے برابر کہی جا سکتی ہے۔

اردو میں سائنسی ادب کی شمولیت نیز اس کی ترقی و ترویج کے لئے بعض اردو کے بہی خواہ سائنس داں ایک تحریک کے طور پر کام کر رہے ہیں جس سے یقیناً اردو زبان و ادب کو فروغ حاصل ہوگا۔ انھیں لوگوں میں ایک نام شورش صدیقی کا ہے جن کی کوششوں اور کاوشوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

پوری کتاب ۱۴ر ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب میں مختلف دلائل اور تصاویر کے ساتھ یہی واضح کیا گیا ہے کہ ابتداء سے انتہا تک تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ ماحول، حالات غذا کی فراہمی اور جنس ہی انسان، حیوانات و نباتات کو متاثر کرتے ہیں۔ آج ان کی جو موجودہ شکل نظر آتی ہے وہ انہیں تبدیلیوں کے نتائج ہیں۔

مجموعی حیثیت سے شورش صدیقی نے اس کتاب کے توسط سے ارتقاء حیات انسانی کے ڈارونی نظریے کی وضاحت کی ہے۔ بلاشبہ یہ کتاب اردو قارئین کے لیے کارآمد ثابت ہوگی اور اس کے ساتھ ہی اس کے اچھے نتائج بھی نکلیں گے۔ اردو میں اس روایت کو پروان چڑھانا شورش صدیقی کی کامیاب کوشش ہے۔

________ ماہناز رضوی

نام کتاب:	" عالمی اُردو ادب "
مدیر:	نند کشور وکرم قیمت ۱۵۰ر روپئے
ملنے کا پتہ:	جے ۶ کرشن نگر - دہلی

نند کشور وکرم اردو صحافت کی سربرآوردہ شخصیتوں میں سے ہیں۔ ان کی خدمات کا سلسلہ کئی دہائیوں تک پھیلا ہوا ہے وہ صحافی ہونے کے ساتھ تخلیق کار بھی ہیں ان کا ناول " یادوں کے کھنڈر " اردو ناول کی ذہانت اور خوش ذوقی اور

صحافی کا سلیقہ و ہنرمندی دونوں کی جھلک نظر آتی ہے۔

...وہ ۔۔۔ سال بھر کی بہترین تخلیقات کا انتخاب شائع کر رہے ہیں یہ انتخاب حوالہ جاتی حیثیت بھی رکھتا ہے۔

۹۲ء کے انتخاب میں کہانیاں، نظمیں، غزلیں، ارتحال نامے، سوانحی اشارے، انشائیے، طنز و مزاح کے ساتھ یونیورسٹیوں میں تحقیق کی رفتار، ہندستان میں اردو اخبارات کی ترقی، اردو خبرنامہ، انعامات و اعزازات کی تفصیلات ہیں تنقیدی یا تحقیقی مضمون منتخب نہیں کیا گیا ہے ترتیب کے اعتبار سے یونیورسٹیوں میں تحقیق کی رفتار کے بعد "وفیات" کا عنوان ایسا لگتا ہے جیسے تحقیق کی وفات ہونے والی ہو یہ حصہ اگر انشائیہ کے بعد ہوتا تو بہتر تھا۔

غزلیں عموماً بے کیف ہیں، افتخار عارف، باقر نقوی، راہی معصوم رضا محسن زیدی کی غزلیں بھی خوب ہیں وسیم بریلوی کا ایک شعر یادگار ہے

کبھی لہو سے بھی تاریخ لکھنی پڑتی ہے
ہر ایک معرکہ باتوں سے حل نہیں ہوتا

علی ظہیر (ماں) علی عباس امید (مرثیہ عہد امید)، کمار پاشی (اجودھیا میں آرہا ہوں) نظموں میں یوں تو احمد ندیم قاسمی (مجروح) حیدر قریشی (ایک دراوڑ کا پیغام آریاؤں کے نام۔ راہی معصوم رضا (مشورہ) بہت اچھی نظمیں ہیں۔ لیکن سردار جعفری کی نظم "اقبال خدا کے حضور میں" شاہکار حیثیت رکھتی ہے وہ پرانے اقبال یہاں ہیں جس طرح اقبال کے لہجہ، اسلوب اور شعری آہنگ کو انھوں نے برتا ہے وہ صرف انھیں کا حصہ ہے۔ یہ نظم "خدا کے حضور میں" شعاع، امید یا جوش کی کسان وغیرہ کے ساتھ رکھی جا سکتی ہے: نظم سے پہلے نثر میں ایک نوٹ ہے جس کا ایک فقرہ ناقابل فہم ہے غالباً کوئی لفظ یا سطر چھوٹ گئی ہے لکھتے ہیں۔ "خدا کی تخلیق ناممکن ہے۔ اس کو تکمیل کی طرف انسان لے جاتا ہے"

آخری حصہ معلومات کا خزانہ ہے۔ مجموعی اعتبار سے یہ انتخاب یادگار حیثیت رکھتا ہے جس کے لئے نند کشور وکرم مبارک باد کے مستحق ہیں۔

—————— سیما رضوی

نام کتاب :	دستک	(سہ ماہی)
مدیر :	میر شمیم	قیمت ۲۰ روپئے
ملنے کا پتہ :	۱۵-۱۶ کاونیر گھاٹ روڈ، شیب پور	

—————— ہوڑہ ——————

پچھلے چند برسوں میں ادبی جریدوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ ہر چند کہ اس طرح کے زیادہ تر رسالوں کی زندگی بہت ہی مختصر ہوتی ہے اور اس سے قبل کہ ان کی کوئی انفرادی شکل بن سکے، ان کی سانس اکھڑ جاتی ہے، مگر اس کے باوجود جب بھی کوئی نیا ادبی پرچہ ظہور پر آتا ہے، تمام اردو دنیا اس کے جنم پر خوشیاں مناتی ہے پھر اگر رسالہ تازگی کی چمک کے ساتھ ہی زندگی کی حرارت بھی رکھتا ہو تو خوشیاں دوبالا ہو جاتی ہیں۔

زیر تبصرہ پرچہ "دستک" کا افتتاحی شمارہ اس لحاظ سے کافی اہم ہے کہ اس میں تازگی کے ساتھ ہی ساتھ زندگی کی آگ بھی ہے۔ مشمولات میں نثر بھی او شعر بھی دونوں حصے اپنے اپنے طور پر متوجہ کرتے ہیں۔ منٹو اور عریانی کے موضوع پر اگرچہ کافی کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن گیان چند جین صاحب کا مضمون تازگی لیے ہوئے ہے۔ گوشۂ شانتی رنجن بھٹاچاریہ بھی خاصا وقیع ہے، اور جس نے یقینی طور پر اس شمارے کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیا ہے۔ کہانیوں کا حصہ بھی جاندار ہے۔ اور تمام کہانیاں کم و بیش اپنی جانب متوجہ کرتی ہے۔ ترجمہ کالم کے تحت شامل بنگالی افسانے کے اصل افسانہ نگار کا نام چھپنے سے رہ گیا ہے۔

پرچہ کا شعری حصہ بھی خاصا وقیع اور جاندار ہے۔ مدیر نے اس سلسلے میں کافی محنت کی ہے۔ زیادہ تر نظمیں اور غزلیں اپنی موجودگی کا احساس کراتی ہیں۔ کل ملا کر یہ پرچہ صوری اور معنوی دونوں سطحوں پر اہم اور دلکش ہے۔

اُمید ہے کہ اُردو زبان و ادب سے دل چسپی رکھنے والے اس "دستک" پر دھیان دیں گے۔

—————— لئیق رضوی

جلد ۴۴ نمبر ۳

جون ۱۹۹۲ء

ضمیمہ اودھ

عنوانات

اپنی بات	ایڈیٹر	۲
حسینی ضابطے جینے کا اک دستور دیتے ہیں (نظم)	رباب رشیدی	۳
لکھنؤ کی تہذیب کا آخری نمائندہ شاعر: اثر لکھنوی	پروفیسر شارب ردولوی	۴
لکھنؤ کی ادبی سرگرمیاں	عابد سہیل	۸
امانت کی اندر سبھا:	ابراہیم یوسف	۱۴
تعلقہ داران اودھ اور ان کی ادبی خدمات	سید مسعود حسن رضوی ردولوی	۱۹
کمال الدین حیدر: قلمی مخطوطہ اور مطبوعہ تاریخ اودھ	رئیس آغا	۲۴
اصحاب اہل بیت (سلام)	اختر عمر اختر	۳۲
لکھنؤ میں فن طباعت کا آغاز وارتقاء: ایک مختصر جائزہ	امیر حسن نورانی	۳۳
واجد علی شاہ کا لکھنؤ	مظفر علی	۳۶
شہر نگاراں (نظم)	پیکر جعفری	۴۱
لکھنؤ کی تاریخی عمارتیں	سید احمد حسن رضوی	۴۲
شان حق (نظم)	فاطمہ وصیہ جائسی	۴۶
اودھ نمبر: تاثرات کے آئینے میں	قارئین	۴۷

(سرورق کی تصویر: واجد علی شاہ)

اپنی بات

اودھ نمبر کی مقبولیت اور علمی، ادبی حلقوں میں اس کا گرم جوشی سے خیر مقدم یادگار حیثیت کا مالک ہے۔ جس طرح اس کی حوصلہ افزائی کی گئی اس کا ادارہ کے اوپر گہرا اثر ہے۔

اس تاریخی، علمی اور ادبی دستاویز کی تیاری میں اہل علم نے جس طرح تعاون فرمایا اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اپریل اور مئی کے شماروں میں بھی اور زیر نظر شمارہ میں بھی اودھ سے متعلق بے حد اہم، قیمتی علمی اور ادبی مضامین کا تسلسل برقرار ہے۔ یہ مضامین یقیناً بہت اہم تھے لیکن صفحات کی تنگ دامنی کی بنا پر اودھ نمبر میں جگہ نہ پا سکے۔ بعد کے تینوں شماروں کو اودھ سے متعلق مضامین کی شمولیت کی بنا پر اودھ نمبر کا ضمیمہ ہی تصور کیا جانا چاہیے۔

ہمارے وطن کی تاریخ میں اودھ نے جس طرح اپنا کردار ادا کیا ہے وہ ہماری سنہری روایات کا روشن ترین حصہ ہے۔ سچ یہ ہے کہ عالمی تہذیب کا کوئی تصور ہندستان کے بغیر نامکمل، ادھورا اور کسی حد تک معنویت سے خالی ہے اور ہندستان کا دل اتر پردیش ہے۔ اس طرح رود گنگ و جمن سے اٹھنے والی ہوائیں اور سرجو اور گومتی کے ساحل دراصل تہذیب کے نشریاتی مراکز ہیں جنھوں نے سارے عالم تک اپنی روشنی بکھیر دی ہے۔ اس بات کی کوشش کی گئی تھی کہ اس تہذیب کی جتنی جہتیں اور جتنے روشن نقوش ہیں ان سب کو اجاگر کیا جا سکے۔ اس لیے اودھ نمبر کے سہارے پورے اتر پردیش بلکہ یوں کہیے کہ پورے ہندوستان کی ان روایات اور اس تاریخ کو پیش کیا گیا تھا، جس سے عالمی تہذیب نے فائدہ اٹھایا تھا اور مغرب کے "صاحب لوگوں" نے خود لکھنؤ میں بیٹھ کر اور کلکتہ کے مٹیا برج میں جاکر، ارکاٹ اور حیدر آباد میں اسی تہذیب کے عکس دیکھ کر لباس کی تراش خراش سے لے کر نفاست اور آرائش کے بہت سے اصول سیکھے، انھیں برتا اور انھیں اپنی تہذیب کا جز بنایا۔

جغرافیائی نقشہ بدلتا رہتا ہے۔ کل تک کوئی ملک وجود نہیں رکھتا تھا، آج وہ ایک آزاد ملک کی حیثیت سے عالمی نقشہ پر ابھر آیا۔ حال ہی میں جنوبی افریقہ اور ارض فلسطین کے نئے ممالک وجود میں آئے۔ اسی طرح پہلے یورپ میں پھر ایشیا میں سیاست نے نئی جغرافیائی حد بندیاں قائم کی ہیں۔ اس طرح جغرافیہ بدلتا رہتا ہے۔ زمین پر سیاسی لکیریں کھینچ کر انھیں تقسیم کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن تہذیب اور تاریخ کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا، وہ ایک ناقابل تقسیم وراثت ہے۔ اسی لیے برصغیر میں بہت سی لکیریں کھنچیں، لیکن اتر پردیش کی تہذیب کے روشن نقوش پشاور سے ڈھاکہ تک آج بھی اٹل سچائی کی طرح موجود ہیں۔

اسی تہذیب کا ایک رخ محرم منانے اور عزاداری کے مراسم تھے جس نے آج جغرافیائی دیواروں کو گرا دیا ہے۔ یہ اسی تہذیب کی روشنی ہے جو ہر جگہ پھیلی ہے اور آج ہر جگہ محرم احترام اور عقیدت سے منایا جاتا ہے اور ہر طبقۂ خیال اپنے اپنے انداز سے امام حسینؑ اور شہیدانِ کربلا کی یادگار مناتا ہے۔ جوش ملیح آبادی نے تقریباً نصف صدی سے قبل کہا تھا ؎

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو! ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ

جب بھی انسانی تاریخ پر کوئی برا وقت پڑتا ہے یا برا وقت پڑے گا بے اختیار زبان سے نکلتا ہے اور نکلتا رہے گا ؎

اے زندگی جلالِ شہ مشرقین دے اس تازہ کربلا کو بھی عزمِ حسینؑ دے

ایڈیٹر

حسینی ضابطے جینے کا اک دستور دیتے ہیں

حُسَینیت شعورِ زندگی، رمزِ خودآگاہی
حُسَینیت متاعِ حرّیت، شانِ یداللّٰہی
حُسَینیت غرورِ تشنگی، تہذیبِ دانائی
حُسَینیت حدیثِ درد، ذوقِ آبلہ پائی
حُسَینیت بکھرتے ٹوٹتے رشتوں کی صف بندی
حُسَینیت ہجومِ دشمناں میں حوصلہ مندی
حُسَینیت علائم، معنویت کا رواں دریا
حُسَینیت کرم، لطف و نوازش، خیر کی دُنیا
حُسَینیت ہی رنگِ جاوداں افکارِ دینی کا
حُسَینیت ہی پرتوَ رحمتہ للعالمینی کا
حُسَینیت دُکھی انسانیت کی فصلِ غم خواری
حُسَینیت شبِ دیجور میں پیغامِ بیداری
حُسَینیت رفیقِ اضطرابِ دل، سکونِ جاں
حسینیت کی حد میں آکے ساری مشکلیں آساں
حُسَینیت ہمیشہ ہم سبھی کے کام آئے گی
اِسی کے نام آئے گی جو صبح و شام آئے گی

حسینؑ اک درس دیتے ہیں بہیمیت کے نرغے میں
مقاصد روشنی پاتے ہیں تلواروں کے سائے میں
جہاں میں جب کبھی بے ضابطگی کا دَور آئے گا
حسینیت کا مقصد ہی فضا میں جگمگائے گا
اندھیرا عارضِ اقبال پا کر جب بھی چمکے گا
حسینی عزم پھر رنگِ شفق سے مُسکرا دے گا
ستم سے، شیطنت سے، سرکشی سے دَب نہیں سکتی
حسینیت زمانے میں کسی سے دَب نہیں سکتی

حسینی قافلہ صبر و رضا کا قافلہ ٹھہرا
یہ حد ہے چھ مہینے والا بھی باحوصلہ ٹھہرا
حسینی قافلے والوں میں جینے کی ادا دیکھی
بہ پاسِ شکرِ مولا خشک ہونٹوں پر دُعا دیکھی
سلام ان پر اُجالا جن کے چہروں پر رہا رقصاں
سلام اُن پر جو ہیں تاریخِ عالم کا جلی عنواں
سلام اُن پر جنھوں نے رُوح کو تابندگی بخشی
سلام اُن پر جنھوں نے چشمِ تر کو روشنی بخشی

حسینی ضابطے فکر و نظر کو نُور دیتے ہیں
حسینی ضابطے جینے کا اک دستور دیتے ہیں

□□

رباب رشیدی
۱۲۶ ۔ تاری خانہ ۔ لکھنؤ

آثر لکھنوی

نواب جعفر علی خاں آثر لکھنوی نہ صرف یہ کہ اُردو کے ایک اہم اور بلند پایہ شاعر تھے بلکہ لکھنؤ کی تہذیب، رواداری، نفاست، وضعداری، آداب اور زبان میں ایک روایت کا درجہ رکھتے تھے۔ وہ دبستانِ لکھنؤ کی صحت مند شعری روایت کے آخری نمائندہ شاعر تھے۔ جن سے اُردو شعرا کی کئی نسلوں نے ذہنی و فکری تربیت حاصل کی تھی۔ وہ اُردو کے ایک اچھے نقاد اور نثر نگار بھی تھے۔ لکھنؤ کی زبان اور تہذیب، شائستگی اور نفاست یا اُردو شاعری کی کوئی تاریخ ان کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں کہی جا سکتی۔

آثر لکھنوی ۱۲ر جولائی ۱۸۸۵ء یعنی ۱۰۹ سال پہلے کٹرہ ابو تراب خاں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ وہ لکھنؤ کی آخری بہار تھے۔ زمانہ بہت بدل چکا تھا، انتزاعِ سلطنتِ اودھ کو تقریباً تین دہائیاں گزر چکی تھیں اور ایک نیا سرمایہ دارانہ نظام، نئی تہذیب اور زبان کے ساتھ پورے ملک میں اپنے قدم مضبوط کر چکا تھا۔ دہلی کی تہذیبی شناخت مدھم پڑنے لگی تھی لیکن اودھ میں یہ چراغ ابھی مخالف ہواؤں کی تیزی و تندی کے باوجود روشن تھا۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ یہاں کی تہذیب صرف ایک شہر تک محدود نہیں تھی بلکہ تہذیب کے اس درخت کی جڑیں دُور دُور تک اودھ کے چھوٹے چھوٹے قصبات میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اثر صاحب کہا کرتے تھے:

"میاں ردولی، دریاآباد، سندیلہ، کاکوری، محمود آباد
اَودھ کے قصبات نہیں لکھنؤ کے محلّے ہیں اور لکھنؤ
کی تہذیب انھیں سے زندہ ہے۔"

آثر لکھنوی اسی تہذیب کی نرمی، نفاست، شائستگی، حُسنِ اخلاق، علم دوستی، ادب نوازی، رواداری، زبان و آداب، وضع داری اور دلکشی کی جیتی جاگتی مجسم تصویر تھے۔

آثر لکھنوی نے طویل عمر پائی۔ ڈپٹی کلکٹر سے لے کر کشمیر کے وزیرِ اعلیٰ اور وزیرِ اعظم تک کے مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ۸۲ سال کی عمر میں ۶ر جون، ۱۹۶۷ء کو ان کا انتقال ہوا۔ اس عرصہ میں انھوں نے زندگی، ادب اور تہذیب کے افق پر بہت کچھ بنتے، ٹوٹتے اور بکھرتے دیکھا۔ ایک زمانہ وہ تھا جب کٹرہ ابو تراب خاں، پاٹا نالہ، فرنگی محل، کشمیری محلہ جلیل القدر علما، مجتہدین اور شعرا سے چھلک رہا تھا۔ ہر طرف علم و ادب کا چرچا تھا آثر لکھنوی نے اسی علمی و ادبی ماحول میں ایک رئیس، باوقار اور ذی علم خانوادے میں آنکھ کھولی، یہ ایک ایسا خاندان تھا جہاں دولت کی بھی فراوانی تھی اور علم کی بھی۔ اثر نے مشرقی روایات، زبان اور تہذیب کی وراثت اپنے خاندان سے پائی اور جدید تعلیم اسکول اور کالج سے حاصل کی۔ مغربی علم، لباس اور تہذیب کو انھوں نے کارِ دُنیا کے لیے ہی رکھا۔ وہ کبھی ان کی زندگی کا حصّہ نہیں بن پائی۔ لیکن لکھنؤ کی تہذیب ان کی زندگی تھی۔ لکھنؤ کا یہ زمانہ شعر و ادب کے لحاظ سے بہت اہم زمانہ تھا۔ اثر نے جس وقت شاعری کے میدان میں قدم رکھا اس وقت صفی لکھنوی، ثاقب لکھنوی عزیز لکھنوی اور آرزو لکھنوی کے نام افقِ شاعری پر چھائے ہوئے تھے۔ عزیز لکھنوی سے انھوں نے مشورۂ سخن کیا۔ یہ زمانہ لکھنؤ کی شاعری کا اہم زمانہ ہے۔ یہ دبستانِ لکھنؤ کی شناخت بھی ہے اور اس پر کیے جانے والے اعتراضات کا جواب بھی ہے۔ اس عہد کے بغیر لکھنؤ کی شاعری کو سمجھنا مشکل ہے۔ یہ زبان اور خیال آرائی کے ساتھ فکر کی گہرائی اور

جذبے کی تصویر کشی کا زمانہ ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اس عہد کی شاعری کا مطالعہ نہیں کیا گیا۔ ورنہ ناقدین کو دبستانِ لکھنؤ کے بارے میں اپنی رائے پر نظرِ ثانی کرنی پڑتی۔ اصل میں ایک مشکل یہ ہوتی ہے کہ کسی عہد کے بارے میں اگر کوئی بات کہہ دی گئی تو وہ تاریخ بن جاتی ہے۔ حالاں کہ حالات کی تبدیلی کے ساتھ فکر و اظہار کے زاویے بدلتے ہیں۔ دبستانِ لکھنؤ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ امانت اور خواجہ وزیر کے عہد کے بارے میں جو کچھ کہا گیا وہ اصطلاحات اس طرح تنقید میں چل پڑیں کہ حالات بدلے، فکر و اظہار کے انداز تبدیل ہوئے، لیکن اعتراض اسی طرح باقی رہا۔ حالاں کہ اس عہد کی شاعری اگر دیکھیں تو دبستانِ لکھنؤ کی ایک نئی صورت نظر آئے گی۔ ثاقب لکھنوی کا یہ شعر صرف توجہ دلانے کے لئے پیش ہے ؎

قفس مجھ کو نشیمن ہو گیا خوفِ اسیری سے
کوئی پتا کھڑکتا ہے تو پہروں دل دھڑکتا ہے

قفس اور نشیمن، باغباں اور چمن کہنے کو تو قدیم علامات اور اشارے ہیں لیکن یہ کس معنویت کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور عصری حسیت کے کس پہلو کو پیش کرتے ہیں اس کی طرف توجہ نہ دینا ناانصافی ہے۔ اس کے علاوہ یہ عہد ان سماجی تبدیلیوں کی طرف بھی اشارہ کر رہا ہے، جو لفظی بازیگری اور قافیہ پیمائی کی شاعری کو عصری فکر کی طرف لے جا رہی ہے۔ یہی تبدیل ہوتی ہوئی فضا تھی جس میں اثر لکھنوی کی شاعری کی نشو و نما ہوئی۔ اثر کی نگاہ بدلتے ہوئے حالات پر بھی تھی اور لکھنؤ کی تہذیبی اقدار پر بھی۔ اثر کی شاعری کے یہی دو اہم عناصر ہیں۔

لکھنؤ کی تہذیب اکثر اُن لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا کرتی ہے جنھوں نے اس کے بارے میں سنا ہے یا اِدھر اُدھر کے غیر ذمہ دارانہ تبصرے پڑھے ہیں۔ مثلاً اس طرح کی باتیں بہت سے لوگوں نے لکھی ہیں کہ:

"دبستانِ لکھنؤ کی شاعری میں بھرتی کے مضامین، لکھنؤ کی نسائیت، فارسی کی دلآویز تراکیب کی کمی، خارجی مضامین کی زیادتی داخلی اور رومانی مضامین کا فقدان، تصوف کا فقدان، رعایتِ لفظی کا شوق، معاملہ بندی، ابتذال اور رکاکت، بیہودہ اور مبتذل تشبیہات و استعارات کا استعمال۔"[1]

اور جب کسی نے لکھنؤ کی شاعری کا ذکر کیا تو یہی اعتراضات دُہرا دیئے۔ سوال یہ ہے کہ کس لکھنؤ کا ذکر ہے۔ کیا لکھنؤ اور دبستانِ لکھنؤ آصف الدولہ سے لے کر دولتِ انگلشیہ کا صوبۂ متحدہ آگرہ و اودھ کا مرکز بننے کے بعد تک ایک ہی رہا۔ لکھنؤ کی شاعری کا ایک عہد رعایتِ لفظی اور معاملہ بندی کا عہد ضرور رہا ہے۔ اس فکر کے ذمہ دار اس زمانے کے سیاسی و سماجی حالات تھے اور اس طرح کے حالات جہاں بھی جب کبھی پیدا ہوئے ہیں شعر و ادب میں اس طرح کی باتیں آئی ہیں۔ دہلی میں ایک پورا عہد ایہام گوئی اور اس کے بعد رعایتِ لفظی اور معاملہ بندی کا رہا ہے جس سے بہادر شاہ ظفر اور امیر مینائی جیسے شاعر بھی نہیں بچ سکے۔ لیکن وہاں اس عہد کی عمر اس لیے مختصر رہی کہ دہلی اُجڑ گئی۔ اہلِ علم، اہلِ حرفہ جہاں سکون و تحفظ تھا، عزت و نیک نامی تھی وہاں چلے گئے۔ لکھنؤ اس وقت سب سے زیادہ امن کی جگہ تھی، دولت کی فراوانی تھی، شعر و ادب کی سرپرستی کرنے والے تھے، یہاں پہنچ کر ان اساتذہ نے اس لذت اندوزی اور لفظی بازی گری کو اور ہوا دی۔ بہر حال اس کا سبب کچھ بھی ہو، کوئی بھی تحریک یا انداز ہمیشہ باقی نہیں رہتا۔ فکر، اظہار یہاں تک کہ ہیئت کے سانچے سب، وقت اور سماجی تبدیلیوں یا سماجی مطالبات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ اٹھارھویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی ابتدا سے اس تبدیلی کو لکھنؤ کی شاعری میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اور پھر وقت کے ساتھ تبدیلی کی یہ رفتار تیز تر ہوتی گئی۔ ثاقب، عزیز، صفی اور آرزو کے یہاں تبدیلی نمایاں ضرور ہے۔ خاص طور پر ثاقب کے یہاں فکر کی جو گہرائی اور احساس کی جو شدت ہے وہ ان کے کسی ہم عصر کے یہاں نہیں ہے۔ لیکن یہ تبدیلی اثر کی شاعری میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔
اثر کی شاعری میں کسی طرح کی شدت نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے یہ ان کی شاعری کی کمی ہو۔ لیکن لکھنؤ کی تہذیب کی خصوصیت ہی نرمی، نفاست اور سکون ہے۔ یہاں تیز تیز چلنا، تیز آواز میں بولنا بدتمیزی میں شامل ہے، یہاں کی تہذیب ٹھمری، دادرا اور خیال میں ہے۔ یہاں کی تہذیب کتھک میں ہے، یہاں کی تہذیب غزل میں ہے۔

اثر کی شاعری اسی تہذیب کی نرمی، نفاست اور سلیقے کی تصویر ہے۔ اثر کی زندگی میں بھی ایک سلیقہ، نفاست اور سکون ہے اور ان کی

شاعری میں بھی۔ ان کے یہاں تفکر کی گہرائی کا اظہار بھی سادگی اور شگفتگی کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان کی زبان میں کوئی پیچیدگی، ابہام اور الجھاؤ نہیں ہے! یہی ان کی بہت بڑی خصوصیت ہے۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

مجھ سے روشن ہے شمع دیر و حرم
کبھی آزر، کبھی خلیل ہوں میں

کون ہوں، کیا ہوں اور کیوں ہوں میں
عاجز ادراک و ہوش ہے مجھ سے

خدا معلوم ہستی کیا ہے کیا ہے راز ہستی کا
جہاں تک شرح کرتے جاؤ مبہم ہوتی جاتی ہے

اثر کے ان اشعار میں جو فکری گہرائی ہے اور ایسے فلسفیانہ اور متصوفانہ موضوعات کو جس سلاست اور صفائی کے ساتھ وہ نظم کر دیتے ہیں یہ انھیں کا حصہ ہے۔ خدا، انسان، ازل و ابد، دنیا، حیات اور موت ایسے موضوعات ہیں، جن پر اُردو شعراء نے اکثر اظہار خیال کیا ہے لیکن اثر نے جس طرح اسے نظم کیا ہے اس میں نہ کسی طرح کی پیچیدگی ہے نہ الجھاؤ ہے نہ فلسفیانہ موشگافی ہے۔ "موت سے چند چرائے ہوئے لمحے ہیں کہ زیست" زندگی پر اتنے سادہ اور دل کش انداز میں تبصرہ مشکل ہی سے کسی شاعر کے یہاں نظر آئے گا۔ اظہار و بیان میں یہی سادگی ان کی خصوصیت ہے۔ در اصل لکھنؤ کی تہذیب ان کی شاعری میں زندہ، متحرک اور بولتی ہوئی نظر آتی ہے جس میں کچھ سکوت ہے، کچھ حجاب ہے، جہاں تہذیبِ مجلس نہ بولنے دیتی ہے اور نہ نظر بھر کر دیکھنے دیتی ہے۔ بس ایک کسک ہے جو بیان نہیں کی جا سکتی، محسوس کی جا سکتی ہے ؎

لب پہ آیا نہ اس کا نام کبھی
غم کی پرہیزگاریاں نہ گئیں

سخن نہ آشنا رکھا کسی کی بزم میں مجھ کو
کبھی تہذیبِ مجلس نے کبھی ترتیبِ مجلس نے

اس تہذیبِ مجلس اور ترتیبِ مجلس کا لطف کوئی لکھنؤ تہذیب آشنا ہی لے سکتا ہے۔ اثر تو حرفِ تمنا بھی لب پر نہیں لاتے کہ یہ تہذیبِ عشق اور آدابِ محبت کے خلاف ہے۔ یہاں تو سب کچھ خموشی کی زبان میں کہا جاتا ہے اور زبانِ نگہِ مست، سے سنا جاتا ہے ؎

ہے ہے وہ منتیں نگہِ نیم مست کی
اب اس کے بعد شوق کا اظہار کیا کریں

نگہِ مست کی منتوں میں کیا کچھ ہے جو اثر نے نہیں کہہ دیا۔ اثر کی زبان ایسی سادہ و پرکار ہے کہ وہ بڑی سے بڑی بات اس میں کہہ جاتے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو ان کی شاعری کا بیشتر حصہ سہل ممتنع پر مشتمل ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ بہت آہستہ لب و لہجہ میں بات کر رہے ہیں۔ ان کا پورا کردار ان کی شاعری کی زبان میں پوشیدہ ہے لیکن اس سادگی میں بھی ایسی کسک ہے اور ایسا اثر ہے کہ احساس کے سارے تار جھنجھنا اٹھتے ہیں۔ یہ سادگی اور یہ شائستگی لکھنؤ کی اس کی تہذیب کے ساتھ ختم ہو گئی۔

آج کے عہد اور آج کی زندگی کا چہرہ اثر کے اس شعر کے آئینے میں دیکھئے ؎

اب یہی ہے نباہ کی صورت
ناسزا سنیئے مرحبا کہیئے

اس کے علاوہ ان کے چند اور اشعار اسی سادگی اور پرکاری کے ملاحظہ فرمائیں ؎

آتا ہے ایک رنگ تو جاتا ہے ایک رنگ
لو آئے تھے وہ پرسشِ بیمار کے لئے

کچھ جو کہیے تو ایک آفت ہے
چپ جو رہیے تو بات جاتی ہے

اثر، میر کی شاعری کے زبردست معتقد اور مداح ہیں۔ یوں تو بیشتر شعراء نے میر کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے لیکن اثر کے یہاں یہ صرف خراجِ عقیدت تک محدود نہیں ہے۔ اثر، میر کی سادگی، تاثیر، جذبے کے خلوص اور صفائی کے گرویدہ ہیں۔ رنگِ میر ان کا پسندیدہ رنگ ہے۔ ان کے کلام پر میر کا بہت گہرا اثر ہے اور بار بار وہ اپنی شاعری میں میر کا حوالہ دیتے ہیں

وہ جو ہے میر کی غزل میں اثر
سلکِ گوہر میں آب و تاب کہاں

اور اکثر اثر، میر کے اس ڈھب کو اپنے اشعار میں پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں ؎

شاد تو کیا برباد کرو گے
لو دل لو کیا یاد کرو گے

اثر انھیں سیدھے سادے لفظوں میں ایسی تصویر کشی کرتے ہیں کہ پورا منظر نگاہوں کے سامنے پھر جاتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ ہوا کے تیز جھونکوں میں پھولوں کی ڈالیاں لہرا رہی ہیں جیسے کوئی "سرمستِ مئے ناب" دنیا سے بے خبر جھومتا ہوا چل رہا ہو ؎

امرت بھری آنکھوں میں مدھر آنکھ کی پتلی
رادھا ہے کہ گاگر لیے پنگھٹ پہ کھڑی ہے

فارسی کے ایک جدید شاعر ہوشنگ شفا کی ایک نظم میں سیاہ آنکھوں کے لیے بہت خوبصورت تشبیہ دیکھی تھی ؎

چشمے کہ چوں عصارۂ شب ہا سیاہ بود
چشمے کہ سائبانِ ہزاراں گناہ بود

اسی طرح اثر نے محبوب کی سیاہ زلفوں اور ان کی لمبائی کے لیے جو استعارہ استعمال کیا ہے وہ مجھے کسی دوسری جگہ نظر نہیں آیا ؎

آبشار اک سیاہ بجلی کا
گیسوئے تابدار ارے توبہ

لکھنؤ کی تہذیب کی ایک خصوصیت مذہبی رواداری، میل و محبت اور دوسروں کے جذبات کا احترام ہے۔ آج بھی اس مٹے ہوئے لکھنؤ میں اس کی تصویریں دیکھی جا سکتی ہیں گو کہ اسے ہر سطح پر مٹانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ یہ اسی تہذیب میں ممکن تھا کہ شیعہ علماء کی تعلیم فرنگی محل میں ہو اور سنی علماء اور طلباء درس کے لیے خاندانِ اجتہاد کے سامنے زانوئے ادب تہ کریں۔ مسلمانوں کے علاوہ دوسرے مذاہب کے ساتھ بھی ایسی رواداری اور ایسا احترام کسی دوسری جگہ نظر نہیں آئے گا جس کا نتیجہ ہے کہ سارے ملک میں ہنگامہ و فساد کے باوجود لکھنؤ میں کہیں ہندو مسلم فساد نہیں ہوا۔ آثر لکھنوی اسی تہذیب کے نمائندے ہیں جو کہتے ہیں ؎

نہ تو ہندو کوئی دیکھا نہ مسلماں دیکھا
میں نے انساں کی نظر سے سوئے انساں دیکھا

آثر کی شاعری غزل کی شاعری ہے اور غزل کی شاعری بنیادی طور پر عشقیہ شاعری ہے۔ آثر غزل میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں تغزل کے ساتھ جو بے ساختگی ہے وہ بڑی اثر انگیز ہے:

اِک اچٹتی سی نگہ پر ہے یہ بیتابیِ دل
حال پوچھے کوئی اس وقت تو مشکل ہو جائے

تیری نگاہِ ناز کے قربان جائیے
دل کی جگہ اب اک خلشِ جاں نواز ہے

آثر کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ تشبیہ اور استعارے سے براہِ راست کم کام لیتے ہیں۔ تشبیہ اور استعارے سے عام طور پر اس جگہ کام لیا جاتا ہے جہاں براہِ راست کسی بات سے گریز کر کے اسے حوالے اور اشارے میں بیان کیا جائے تاکہ شعر میں ندرت اور اثر پیدا ہو سکے۔ لیکن آثر لکھنوی مشابہت اور مماثلت سے کام لیتے ہیں اور واقعاتی رنگ دے کر اس سے ایسا امیج بناتے ہیں کہ اس کی اثر انگیزی دوبالا ہو جاتی ہے۔ اثر کا ایک شعر ہے ؎

ان پہ ہنسیے شوق سے جو مائلِ فریاد ہیں
ان سے ڈریئے جو ستم پر مسکرا کر رہ گئے

آثر کے اس شعر میں سادگی، سلاست اور دل نشینی کے ساتھ جو معنی خیز تہ داری اور اثر انگیزی ہے وہ بہت کم کہیں ملتی ہے۔ اس بیان میں آثر کی تہذیبی شناخت نمایاں ہے۔ وہ کچھ نہ کہنے پر بھی بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔ ستم زدہ کی مسکراہٹ کیا کیا معنی رکھتی ہے اسے الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔

آثر لکھنوی تہذیب اور شائستگی کی ایسی تصویر تھے جس کی دوسری مثال کیا اب اس تصویر کی دل کشی اور دیدہ زیبی بیان کرنے والے بھی نہیں رہے لیکن وہ تہذیب آج بھی آثر کی شاعری میں اسی دل کشی اور دلفریبی کے ساتھ زندہ ہے۔ انھوں نے سچ کہا تھا ؎

عابد سہیل
حیدری مارکیٹ، امین آباد لکھنؤ

لکھنؤ کی ادبی سرگرمیاں

لکھنؤ کی ادبی سرگرمیاں یہ عنوان نوکِ قلم پر آتے ہی ذہن اس ماضی کی طرف مڑ مڑ کر دیکھتا ہے جو دیدہ ہے یا اس شنیدہ کی جانب جو کچھ اس طرح شعور کا حصہ بن گیا ہے کہ دیدہ ہی معلوم ہوتا ہے۔

اس شہر میں "انگارے" کی اشاعت وجود میں آئی جس نے معرکۂ چکبست و شرر اور آتش و ناسخ اور ان کے حامیوں کی داد بیداد کی صورت تو اختیار نہیں کی لیکن ایک طوفان ضرور کھڑا کر دیا جو کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا اور شاید اسی طوفان کے سبب ایک ایسی کتاب جو ادبی نقطۂ نظر سے کسی خاص توجہ کی مستحق نہ تھی اگلے بیس پچیس سال کے ادب کی سمت و رفتار کا حوالہ بن گئی۔

رفاہ عام کلب کی عمارت اب بھی اپنے شاندار ماضی کی داستاں سنا رہی ہے۔ معلوم نہیں لکڑی کے فرش کا وہ بیڈمنٹن کورٹ جس پر تیس پینتیس سال ادھر تک کل ہند مقابلے ہوتے تھے اب کس حال میں ہے اور یہ بھی نہیں معلوم کہ انجمن تہذیب نو کی لائبریری کے بیش قیمت مسودات اور کتابیں اب موجود بھی ہیں یا دیمک کی غذا بن چکی ہیں۔ لیکن یہ عمارت زمین دوز ہو جائے اور اسکا نشان تک باقی نہ رہے پھر بھی اس کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا کہ اس کی چشم حیراں نے ملک کی سب سے بڑی ادبی تحریک کو جس کا دوسرا نام انجمن ترقی پسند مصنفین تھا چند نوجوانوں کے خواب سے حقیقت کی شکل اختیار کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس تحریک کے افکار و نظریات کے حامیوں میں کون سا نابغۂ روزگار اس وقت کا تھا جو شامل نہ تھا، رابندر ناتھ ٹیگور، مولوی عبدالحق، پنڈت جواہر لال نہرو، سروجنی نائڈو، ولاتھول، شری شری، جے پرکاش نرائن، اچاریہ نریندر دیو اور اسی پائے کے نہ جانے کتنے دوسرے۔ سجاد ظہیر، ڈاکٹر عبدالعلیم، پریم چند، ڈاکٹر اشرف، ڈاکٹر محمود الظفر، ڈاکٹر رشید جہاں اور متعدد دوسرے نوجوان ادیب اور شاعر تو خیر ابتدا ہی سے اس تحریک سے متعلق تھے لیکن تیس پینتیس برسوں کے ادبی منظر نامے پر نظر ڈالیے تو صف اول کے سارے نہیں تو تقریباً سارے ہی اہم ادیبوں کو اور شاعروں کو اس انجمن نے اپنے دامن میں سمیٹ لیا اور جب اس نے خود کو ایک سیاسی جماعت کے ماتحت کی شکل میں اسیر کر لیا تو ایک جونے کم آب بن گئی۔ لیکن اس دور میں بھی کسی قسم کی تنگ نظری کا سایہ تک لکھنؤ میں اس انجمن پر نہ پڑا اور اس کے ہفت روزہ جلسوں میں جو باقاعدگی سے سرور صاحب کے بیرو روڈ اور بعد میں نعمت اللہ روڈ کی قیام گاہ اور کبھی کبھی حضرت گنج میں یونیورسٹی ڈیلیگیسی بلڈنگ میں جو علیم صاحب کی قیام گاہ تھی باقاعدگی سے ہوتے تھے شہر کا شاید ہی کوئی ادیب، شاعر اور علوم و فنون کا ماہر ہو جس نے شرکت نہ کی ہو۔ ان جلسوں میں جعفر علی خاں اثر نے اپنی غزلیں سنائیں، مسعود حسن رضوی ادیب نے واجد علی شاہ پر اپنا معرکۃ آرا مضمون پڑھا۔ بین اقوامی شہرت کے مالک پروفیسر ڈی مکھرجی نے معاشی نظریات پر مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر محمد نصیر نے جو بعد میں اقوام متحدہ سے متعلق ہو گئے تھے۔ ہندوستان کی معاشی صورت حال پر مضمون پڑھا۔ ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی نے دورۂ روس کے تاثرات بیان کئے۔ یشپال نے اپنی ہندی کہانی سنائی، امرت لال ناگر نے "یہ کوٹھے والیاں" کا ایک باب پڑھا اور شہر کے اپنے وقت کے ایمبسڈر نامی ریسٹورینٹ میں انجمن کی کانفرنس کے موقع پر جگر مرادآبادی نے اپنی مشہور غزل ؎

فکر جمیل خواب پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزلخواں ہے آج کل

سنائی اور داد کے ڈونگرے بٹورے۔

علی عباس حسینی اور مولانا اختر علی تلہری، "پیروی مغربی" کی تحریر پر احتشام صاحب سے بحث و تمحیص کے باوجود کبھی کبھی انجمن کے جلسوں میں شریک ہوتے اور نظریاتی اختلافات کے باوجود ان کا خیر مقدم کیا جاتا۔ حیات اللہ انصاری

کئی جنہیں ترقی پسندوں نے اس قدر چڑھا رکھا تھا کہ ان کے خلاف مضامین میں انہیں طنز و تمسخر کا نشانہ بنایا جاتا تھا نہ صرف کبھی کبھی انجمن کے جلسوں میں آتے بلکہ ترقی پسندوں کے خلاف اور گاندھی واد کی حمایت میں مضامین بھی پڑھتے۔ گرما گرم بحثیں ضرور ہوتیں لیکن انجمن کے دروازے ان جیسوں پر بھی کبھی بند نہ کئے گئے۔ بمبئی کی انجمن کی شاخ کی طرح نہ یہاں منٹو کو کبھی ناٹ باہر کیا گیا نہ خواجہ احمد عباس کو اور نہ سردار جعفری اور فراق کے مناقشہ میں ایک باقاعدہ سرکلر کے باوجود فراق گورکھپوری کے خلاف کوئی تجویز ہی منظور ہوئی۔

مجاز، سلام، شوکت صدیقی، نیاز حیدر، ڈاکٹر محمد حسن، باقر مہدی، رام لعل، مسیح الحسن رضوی، مکین احسن کلیم، حبیب احمد صدیقی اور منظر سلیم مجید پرویز اور برج موہن ناتھ کاتیر تو تقریباً ہر جلسے میں شریک ہوتے تھے۔ اس دور میں جب انجمن کو سیاسی جماعت قرار دے دیا گیا تھا سلام مچھلی شہری اور ایاز انصاری تک جو آل انڈیا ریڈیو سے متعلق تھے تقریباً ہر جلسہ میں شرکت کرتے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں کے علاوہ شہر میں ادبی سرگرمیوں کے چند دوسرے مراکز بھی تھے۔ پرانے لکھنؤ میں فرنگی محل سے تقریباً ملحق اس ہوٹل کو مرکزی اہمیت حاصل تھی۔ جس میں سراج لکھنوی، سالک لکھنوی، نہال رضوی لکھنوی، شارب لکھنوی اور متعدد دوسرے شعراء روزانہ ہی آتے۔ امین آباد میں دانش محل میں جعفر علی خاں اثر کبھی کبھی اور احتشام حسین، ممتاز حسین، عبادت بریلوی اور وقار عظیم اکثر آتے۔ ادبی محفلیں تو وہاں نہ ہوتیں لیکن گفتگو کا مرکز ادب ہی رہتا۔ نوجوان ادیبوں کا مرکز نظیر آباد میں کتابوں کی مشہور دوکان کتابی دنیا تھی۔ جس کے مالک اظہر نگرامی خود تو ادیب نہ تھے لیکن ان کی شخصیت میں نہ جانے کیسا جادو تھا کہ شہر کے سارے ہی نوجوان ادیبوں کے علاوہ کرشن چندر، شمع کے مدیر، یوسف دہلوی، وہیلر کے جنرل منیجر حمید صاحب اور متعدد دوسرے ادیب جب بھی لکھنؤ آتے گھنٹوں ان کی چھوٹی سی دوکان پر بتاتے۔

شہر میں ادیبوں اور ادیب گروں کا ایک اور حلقہ تھا جس کی مرکزی شخصیت تھی نسیم انہونوی۔ اس میں شوکت تھانوی، صباح الدین عمر، امین سلونوی، عمر انصاری، سلامت علی مہدی، وحشی محمود آبادی وغیرہ شامل تھے۔ ان میں سے بیشتر نے سرپنچ گروپ بھی دیکھا تھا۔ ان کا مرکز امین آباد کا نفوری ہوٹل جسے یاران طریقت ہوٹل ٹسے مزبہ الشمس کہتے اور نوری ہوٹل تھے۔ ان دونوں ہوٹلوں کی اب صرف یادیں ہی باقی رہ گئی ہیں۔

حضرت گنج کا کافی ہاؤس اب بھی ہے، اپنے وجود کا عکس بنا ہوا۔ ملگجی ملگجی سی فضا اور داستان پارینہ کی یاد دلاتے ہوئے رنگ و روغن سے تقریباً محروم در و دیوار لیکن وہ روشن ستارے اب کہاں جن کے دم سے اس کا سارا بھرم ساری اہمیت قائم تھی۔ ان دنوں اس کی دنیا کچھ اور ہی تھی۔ ایک کونے میں اردو کے چند ادیب بیٹھے ہیں۔ پنڈت آنند نرائن ملا داخل ہوتے ہیں اور مسکراتے ہوئے اس میز کی جانب بڑھتے ہیں جہاں اس سرو قد اور خوبصورت شاعر، ماہر قانون اور بعد میں یو پی ہائی کورٹ کے جج کا خیر مقدم کرنے کے لئے سارے ہی لوگ کھڑے ہوگئے ہیں۔ ملا صاحب یہ دیکھ کر اپنی رفتار تیز کر دیتے ہیں اور کسی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے بھی بٹھا دیتے ہیں اور خود بھی بیٹھ جاتے ہیں اور گفتگو کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ملا صاحب جن کا یہ جملہ "میں اپنا مذہب تبدیل کر سکتا ہوں لیکن زبان نہیں بدل سکتا" آج تک کسی نہ کسی طور پر زبان کے مسئلے پر ہونے والے جلسوں اور کانفرنسوں میں دہرایا جاتا ہے۔ چابی کا گچھا ایک انگلی میں ڈالے دھیرے دھیرے گھما رہے ہیں۔ دو میزیں چھوڑ کر تیسری میز پر آل احمد سرور، ڈی پی مکرجی، نیشنل ہیرالڈ کے ایڈیٹر ایم چلاپتی راؤ مصروف گفتگو ہیں اور ایک میز پر یشپال، بھگوتی چرن ورما، امرت لال ناگر، کے این ککڑو، شری لال شکل۔ کافی ہاؤس باقاعدگی سے آنیوالوں میں چند ایسے بھی ہیں جو ادیب اور شاعر تو نہیں لیکن انکے ذکر کے بغیر تصویر کا وہ خاکہ بھی تیار نہیں ہو سکتا جس میں رنگ بھرا جا سکے۔

یہ ہیں بھیلا اسٹیٹ بینک آف انڈیا میں ملازم سدا سرن مصرا، سابق صحافی شیو پوری اور وضع قطع سے مولوی اور یو پی میں سگریٹوں کے ایک بہت بڑے تھوک فروش یم قسیم جو دوستوں کی خاطر مدارات کرنے میں بچھے جاتے ہیں۔ بھیلا بلیک پرنس کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ ان کے سلسلے میں مشہور رہے کہ ہر صبح سو روپئے کا ہرا نوٹ لے کر حضرت گنج آتے ہیں (اس نوٹ کو آج کے نہیں ۱۹۹۰ کی قیمتوں کے پیمانے سے ناپئے) اور رات گئے گھر واپس جاتے وقت کسی دوست سے دو روپیہ قرض لیتے ہیں اور کوئی ایسا نظر نہ آئے جس سے بے تکلفی ہو تو حضرت گنج سے نرالا محل روڈ تک پیدل مارچ کر دیتے ہیں۔ سدا سرن مصرا اور بھیلا کا ذکر آئے تو ایک نیم ادبی بلکہ غیر ادبی حوالہ سے مجاز کا ذکر ضروری ہے کہ یہ دونوں ان کے رزم و بزم کے ساتھیوں میں بھی ہیں لیکن کافی ہاؤس کا ذکر اب بھی مکمل نہیں کیونکہ ڈاکٹر علیم کا نام تو آیا ہی نہیں۔

بارش دھواں دھار ہو رہی ہے اور ایک میز پر شوکت صدیقی، کمال احمد

صدیقی، مجید پرویز، خلیق ابراہیم، اور ایک سہ نوواردان یہاں لا ہوتے دل اس افسانے پر گفتگو کر رہے ہیں جس پر ہے اتوار کو سرور صاحب کے بیرہ روڈ والے مکان پر ہنگامہ خیز بحث ہوئی تھی کہ مجید پرویز شپ سے بول اٹھے "ایسی بارش میں علیم صاحب کیسے آئیں گے۔" شوکت صدیقی نے جو کاروبار تو جنگلوں کی لکڑی کا کرتے تھے لیکن افسانے "تانتیا" "دوسرا آدمی" اور "غم دل اگر نہ ہوتا" لکھتے ہیں اپنے گر گئے اور ابھرے ابھرے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہیں اور کہتے ہیں "ضرور آئیں گے"۔ لیکن بارش دیکھ رہے ہو ایک آواز ابھرتی ہے۔ شوکت کھڑکی سے باہر دیکھتے ہیں جہاں ایک کار دو رنگ چھینٹے اڑاتی گذر رہی ہے۔ اور اپنی بات دہراتے ہیں "ضرور آئیں گے"۔ شرط تیار ایک ایک کانی۔ لیجئے بحث ختم ساری آنکھیں کافی ہاوس کے دروازوں پر ٹک جاتی ہیں۔ پھر سب ہی کسی بحث میں الجھ جاتے ہیں اور یکایک جو پلٹ کر دیکھتے ہیں تو علیم صاحب موجود ہیں۔ سرخ و سپید رنگ فرینچ کٹ داڑھی، ہونٹوں میں سگار۔

سگار کی خوشبو پھیل جاتی ہے اور کونے کی ایک میز پر کئی دنوں بعد، شاید کئی ہفتوں بعد، سلام مجاز سے پوچھتے ہیں۔ "جاوید" کا نیا شمارہ آیا۔ ابھی نہیں تمہاری نظم آ رہی ہے؟ سلام کی صحت ان دنوں خراب ہے۔ ان دنوں انکے منظوم خطوط کی دھوم مچی ہے۔ ایک بار زور سے کھانستے ہیں اور کہتے ہیں بس یہ نظم چھپی ہوئی دیکھ لوں۔۔ زندگی اتنی مہلت تو دے دیگی نا! "مجاز جواب تو نہیں دیتے لیکن اداس ہو جاتے ہیں۔

مولانا آزاد علی گڑھ یونیورسٹی کی بحرانی کیفیت دور کرنے کے لئے ڈاکٹر ذاکر حسین کا انتخاب کرتے ہیں اور چند ہی دنوں بعد شہر کے ادبی حلقوں میں خبریں گشت کرنے لگتی ہیں کہ علیم صاحب علی گڑھ جا رہے ہیں۔ لیکن علیم صاحب خاموش ہیں۔ پھر اس خبر کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ اسٹیشن پر سارے ہی ادیب اور شاعر انہیں رخصت کرنے کیلئے موجود ہیں۔ اب شہر کے نوجوان ادیبوں کی آنکھیں صرف سرور صاحب اور احتشام صاحب کے چہروں پر جمی رہتی ہیں۔ سرور صاحب کی شخصیت میں محبوبیت کے عنصر اور احتشام صاحب کے علم، تدبر، خلوص اور غم کی ایک ہلکی سی کیفیت اور غیر رسمی انداز نے انہیں شہر کے سارے ہی ادیبوں کا مرکز نگاہ بنا دیا ہے البتہ علیم صاحب کی سوچتی ہوئی آنکھیں اور بقول خلیل الرحمٰن اعظمی "مشکل کشا حیثیت" کی کمی ہر شخص محسوس کرتا ہے۔

ایک دن انجمن کے جلسے میں یکایک احساس ہوتا ہے کہ پرانی شخصیتیں رخصت ہو رہی ہیں اور نئے چہرے ابھرتے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن یہ ابن کنول، وقار عبدالستار، محمود الحسن رضوی، عابد سہیل، اقبال مجید، انیس، شہاب ردولوی، وارث کرمانی اور کئی دوسرے۔

رتن سنگھ اپنی پہلی کہانی بادی سناتے ہیں تو سناٹا چھا جاتا ہے بادی سے کون واقف نہیں۔ شہر کا ہر کھلاڑی نہ صرف ان کا مداح بلکہ معنوی شاگرد ہے لیکن اپنے افسانہ میں رتن سنگھ نے بادی کو جس طرح زندہ جاوید کر دیا ہے ایسے وہ شاید زندگی میں بھی نہ تھے۔ سینیر یا بزعم خویش سینیر ادیب پہلی ہی دوڑ میں ایک سکھ کو ملکھا سنگھ کی طرح سب سے آگے نکل جاتے ہوئے دیکھتے ہیں تو شکوک ان کی آنکھوں میں چغلیاں کھاتے ہیں اور رام لال کی جانب نظریں اٹھاتے ہیں جو پنجابی کے اس شاعر کو اردو کا افسانہ نگار بنا دیتے ہیں، یوں مسکرا رہے ہیں جیسے یہ سکوت سخن شناس انہیں کے لیے ہیں۔ کئی ماہ بعد اقبال مجید نے "مدوجزر" سنا کر داد تحسین وصول کی۔ پھر ایک دن عابد سہیل اپنی کہانی "دو نقش ایک تصویر" سناتے ہیں اور صدر جلسہ باقر مہدی کی جانب دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں ان سے بحث کا آغاز کرنے کے لئے کہتے ہیں تو افسانہ نگار کی اندر کی سانس اندر اور باہر کی سانس باہر رہ جاتی ہے۔ باقر مہدی، عابد سہیل اور دوسرے کو، صدر جلسہ کی طرف اپنی ہمیشہ بے قرار رہنے والی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، سگریٹ کا ایک لمبا سا کش لگاتے ہیں، راکھ جھاڑتے ہیں اور بحث کا آغاز کرتے ہیں "صرف موضوع کی اہمیت کے پیش نظر میں نے اپنا ایک گھنٹہ ضایع کیا" یہ جملہ امین آباد کے چوراہے اور کافی ہاؤس کی میزوں پر گردش کرنے کے بعد جس اتوار کو نخاس میں پرانے سامان کے ساتھ فروخت ہوتا ہے اس اتوار کی شام میں احمد جمال پاشا اپنا مزاحیہ سناتے ہیں "مجھے نہیں معلوم کہ میں نے سگریٹ پہلے پینا شروع کی یا ہوش پہلے سنبھالا لیکن اتنا خوب یاد ہے کہ جب ہوش سنبھالا تو سگریٹ پی رہا تھا"۔

احمد جمال پاشا انجمن میں تنہا نہیں آتے۔ اپنے ساتھ شوکت عمر، حسن عابد، سبط اختر، اقبال مجید، ذکی فیرازی، شکیب رضوی، عارف نقوی اور عثمان غنی کو بھی لائے۔ ان نوجوانوں نے اپنی تنظیم ادارہ ایوان ادب کو جس کے سکریٹری عثمان غنی تھے انجمن میں ضم کر دیا ہے۔

[illegible] جعفری کی ادارت میں ترقی پسندوں کے ایک پرچے کا نام "نیا دور" بھی تھا جس کے ایڈیٹر کے طور پر نام تو علی عابد زیدی کا شائع ہوتا تھا لیکن سارا کام صاحب طرز نثر نگار فرحت اللہ انصاری دیکھتے تھے۔ حضرت گنج میں اس زمانے کے ایمپریس ہوٹل کے سامنے فٹ پاتھ پر فرحت صاحب کو دیکھ کر مجاز نے نہایت ادب سے سلام کیا۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں فرحت اللہ اور علی سردار جعفری ایک ہی ہوسٹل میں رہتے تھے اور مجاز ان دونوں سے جونیر تھے۔ اس فرق کا پاس مجاز نے ہمیشہ کیا۔ فرحت صاحب نے انہیں دیکھ کر کہا۔

"شاعری بھی کر رہے ہو یا محض؟"

ایک غزل کہی ہے لیکن ابھی نامکمل ہے" مجاز نے کہا

جلدی سے مکمل کر لو "نیا دور" کے اگلے شمارے میں اسے شامل کرونگا۔

مجاز خاموش کھڑے ہیں

"اور سہیل تم مجاز سے غزل لے لینا۔ ہر روز تقاضہ کرنا"

نیا دور کے کئی شمارے شائع ہو گئے۔ مجاز کی غزل کے بغیر ہی۔ پھر ایک دن مجاز نے وہ غزل عابد سہیل کو دی اور فوراً ہی شائع بھی ہو گئی۔ تین اشعار یاد رہ گئے ہیں۔

اشارہ ہے تیر طوفاں کی جانب
مگر میں ہوں کہ ساحل دیکھتا ہوں
تری آواز آئی آسماں سے
مگر میں جانب دل دیکھتا ہوں
مجاز اور میکدے میں سر بہ زانو
مآل زعم باطل دیکھتا ہوں

یہ اس کڑکڑاتے جاڑے کی رات سے چند ہی مہینے قبل کی بات ہے جس نے ایسا ستم توڑا کہ سارا شہر غم واندوہ میں ڈوب گیا۔ صرف دو دن پہلے مجاز نے اپنی مشہور نظم "آوارہ" اور "زمیں کی چارہ گری" کل ہند اردو کانفرنس کے مشاعرے میں سنائی تھی اور آج وہی شاعر شہر نگاراں نیو حیدر آباد کے اپنے مکان میں آخری سفر کے لئے ایسے تیار ہیں جیسے کبھی اس دنیا میں تھے ہی نہیں جنازہ آہستہ آہستہ قبرستان کی طرف بڑھ رہا ہے اور اردو کے درجنوں ممتاز شاعر اور ادیب جو حیدرآباد اردو کانفرنس میں شرکت کے لئے آئے تھے رنج وغم کی صورت بنے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے انھیں ان کی آخری آرام گاہ تک پہنچا رہے ہیں لیکن "آنسو ہیں کہ تھمتے نہیں"

ملکی بروج پر (موجودہ ہنومان سیتو کے قریب کا سابق پل) اب رات گئے "ماں، ماں" کی آواز کبھی نہ گونجے گی جو عالم بے خودی میں مجاز کے ہونٹوں سے اکثر بلند ہوتی تھی۔

بنّے بھائی (سجاد ظہیر) کے پاکستان میں جیل سے رہائی کے بعد ہندوستان آنے کی خبریں بہت دنوں سے گرم تھیں۔ کہ ایک دن معلوم ہوا کہ وہ پرسوں لکھنؤ پہنچ رہے ہیں۔ شہر کے تقریباً سارے ہی ادیب ان کے خیر مقدم کیلئے اسٹیشن پر موجود ہیں۔ روپوش زندگی اور جیل کی صعوبتوں کے نقوش ان کے چہرہ پر نمایاں ضرور ہیں لیکن دلوں کو جیت لینے والی مسکراہٹ اور عزم واارادہ کی دو قندیلوں نے ان نقوش کو دھندلا دیا ہے۔ چند دنوں بعد انھیں خوش آمدید کہنے کے لئے سرور صاحب کی صدارت میں انجمن کا جلسہ ہوا۔ نعمت اللہ روڈ والے ان کے مکان کا وسیع ہال کھچا کھچ بھر گیا۔ پھر برآمدہ میں بھی تل رکھنے کی جگہ نہ رہی پھر یہی حال پورٹیکو کا ہوا۔ اس جلسہ میں احتشام صاحب اور سرور صاحب نے تقریریں کیں۔ بنّے بھائی نے پاکستان کی ادبی فضا پر تفصیل سے روشنی ڈالی لیکن ان کی تقریر میں کسی قسم کی تلخی نام کو نہ تھی۔ پاکستان کے حکمرانوں کے لئے ایک کلمۂ ناملائم بھی نہ تھا۔

پھر ایک دن معلوم ہوا کہ سرور صاحب بھی علی گڑھ جا رہے ہیں۔ اس وقت انجمن کے سکریٹری عارف نقوی تھے۔ اگلی نشست احتشام صاحب کے یہاں ہوئی۔ جلسوں میں دھیرے دھیرے بے قاعدگی پیدا ہونے لگی۔ تنظیم بس برائے نام رہ گئی۔ عارف نقوی یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں، کرکٹ کھیلتے ہیں، کیرم اور شطرنج کے اچھے کھلاڑی ہیں کبھی کبھی افسانے بھی لکھ لیتے ہیں لیکن کوئی کام جم کر نہیں کرتے۔ ان نشستوں کو باقاعدگی بخشنے کے لیے کسی نئے سکریٹری کی تلاش ہو رہی تھی کہ معلوم ہوا احتشام صاحب پروفیسر اور صدر شعبہ کی حیثیت سے الٰہ آباد جا رہے ہیں۔ انجمن کا سارا شیرازہ درہم برہم ہو گیا۔ بنّے بھائی دہلی منتقل ہو گئے اور کچھ دنوں بعد رضیہ سجاد ظہیر بھی جو کرامت حسین ڈگری کالج میں اردو پڑھاتی تھیں دہلی چلی گئیں۔ کبھی کبھی انجمن کے جلسے برگنگٹن ہوٹل یا کسی دوسری جگہ ہوتے۔ ہر جلسہ میں نشستوں اور تنظیم کو وقار بخشنے کے منصوبے بنائے جاتے۔ کبھی کبھی نئے سکریٹری کا انتخاب بھی عمل میں آتا لیکن نیک ارادوں کے علاوہ ہاتھ کچھ نہ آتا اور یہی صورت آج تک برقرار ہے۔

شہر کی ادبی سرگرمیوں میں "قومی آواز" کا بھی اہم رول رہا ہے۔ ادبی اور ثقافتی جلسوں کی رودادیں ان دنوں تفصیل سے شائع ہوتیں۔ منظر سلیم نے میگزین سیکشن کو ادبی وقار بخش دیا ہے۔ اخبار کے مراسلات کے کالموں میں ادبی مسائل پر خوب خوب بحثیں ہوتیں۔ ایک بحث لفظ غنڈہ اور گنڈا کے سلسلے میں تھی اور بالآخر مسعود حسن رضوی ادیب نے اپنے مدلل مراسلے کے ذریعہ گنڈا کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ اسی طرح کی ایک بحث میر انیس کے ایک شعر

سرخی اڑی تھی پھولوں سے سبزہ گیاہ سے

پانی — سایہ

سایہ کنویں میں اترا تھا پانی کی چاہ سے

پر ہوئی۔ محمد عسکری صاحب کا اصرار تھا کہ "سایہ کنویں میں اترا تھا" صحیح ہے کہ "پانی کنویں میں اترا تھا"۔ کم و بیش دو ماہ تک بحث کا سلسلہ جاری رہا جس میں پروفیسر جی۔ایل بھارتی، سید مصطفیٰ حسین زیدی، ایم غلام حسین، شورش صدیقی، محمد لیٰسین بہیروی، محمد انیس، محمد اسحاق صدیقی، ایم۔ایچ صدیقی، کاظم علی خاں، حکیم شکیل شمسی اور متعدد دوسرے لوگوں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ دلائل پیش کئے لیکن کنویں کے ساتھ چاہ کے استعمال کی جانب کسی نے اشارہ بھی نہ کیا۔

قومی آواز اور مولانا عبدالماجد دریاآبادی کے صدق جدید کے درمیان مختلف مسائل پر بحث و تکرار کا سلسلہ برابر جاری رہتا لیکن حیات اللہ صاحب قومی آواز سے سبکدوش ہوئے تو مولانا نے ان کی ادبی اور صحافتی خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اپنے شذرہ کا اختتام اس مصرعے سے کیا ۔

لذت ستم نہ رہی یار کے اٹھ جانے سے

اور اس کے بعد مرتے مرگئے کبھی قومی آواز کا نام تک صدق جدید میں نہ لیا۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کی سرگرمیاں تو سرد پڑ گئیں لیکن متعدد دوسری ادبی انجمنوں کے تحت ادبی جلسے برابر ہوتے رہے۔ اور سلسلہ اب بھی قائم ہے۔

اس ضمن میں "صحافت کلب" کا ذکر بھی ضروری ہے جس کے روح رواں پریس انفارمیشن بیورو کے انفارمیشن آفیسر ببّو ماتھر تھے۔ اتوار کی شام میں ہونے والے اس جلسہ میں شرکاء کی تواضع خوش مزاج، خوش اقدار، اور خوب رو ببّو ماتھر کچھ اس فراخ دلی سے کرتے کہ چند ہی دنوں بعد یہ "صحافت کلب" صحافت کلب کے نام سے مشہور ہو گیا لیکن ان کے تبادلے کے بعد اتوار کی اس ادبی نشست کی جگہ کلوس ہوٹل کے سرفرازے کلب نے لے لی۔ اردو اور ہندی کے مشہور ادیب امیر راجیندر سنگھ کے اس ہوٹل میں دن بھر کیسٹ میں رہا کرتے تھے، بیروں کو ہدایتیں دیتے، ہوٹل میں آنے والوں کی سہولتوں کا خیال رکھتے اور افسانہ بھی لکھتے جاتے۔ سنیچر کی رات میں یہ جلسہ ۹ بجے شروع ہوتے اور بارہ بجے تک جاری رہتے۔ حیات اللہ انصاری، بھگوتی چرن ورما، امرت لال ناگر، رام لال، یشپال، رضیہ سجاد ظہیر، سجاد ظہیر اور دوسرے ادیب جب بھی لکھنؤ آتے سرفرازے کلب کے جلسے میں ضرور شرکت کرتے لیکن یہ سلسلہ بھی دیر پا ثابت نہ ہوا۔

اردو اکادمی کی دعوت پر فیض احمد فیض، قرۃ العین حیدر، ظ انصاری، آل احمد سرور، قاضی عبدالستار، پنڈت آنند نرائن ملا، شہریار، خمار بارہ بنکوی، مجروح سلطان پوری، سردار جعفری، کیفی اعظمی اور متعدد دوسرے ادیبوں اور شاعروں نے مختلف سیناروں اور مشاعروں میں شرکت کی۔ ڈاکٹر محمد حسن جن دنوں اردو اکادمی کے چیرمین تھے پورے سات دن تک ایک جشن منایا گیا جس میں نیشنل بک ٹرسٹ کی اعانت سے کتابوں کا میلہ بھی لگا۔ خسرو سے لے کر اس وقت تک کے مشہور اور ممتاز ادیبوں کی تصاویر کی نمائش کا بھی اہتمام کیا گیا۔ سات دنوں تک اکادمی کا ماہنامہ خبرنامہ روزنامہ کی شکل میں شائع ہوا اور اردو کے آغاز اور ارتقا پر "روشنی اور آواز" کا پروگرام بھی چار پانچ دن تک جاری رہا۔ جسے بلامبالغہ لاکھوں لوگوں نے دیکھا اور پسند کیا اور ایک مشاعرہ بھی ہوا جس میں شرکاء کی فہرست دیکھ کر کسی نے فون پر دریافت کیا "مشاعرہ کتنے دن چلے گا"۔

اس دوران ایسی ادبی انجمنیں بھی قائم ہوئیں جنہوں نے فیض، بیدی، اور مجاز پر دو دو تین تین دن کے سمینار کئے جن میں روس سے لے کر برطانیہ، کینڈا، ناروے اور دوسرے ممالک کے اردو ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی۔ متعدد شاعروں اور ادیبوں کو انعامات و اکرامات سے بھی نوازا گیا۔

جدیدیت کی تحریک نے مقبولیت حاصل کی تو انیس اشفاق، نیر مسعود، شہنشاہ مرزا، قمر احسن اور کئی دوسرے ادیب یکایک ابھر کر پیش منظر میں آ گئے۔ شہر میں اس تحریک یا رجحان کو مزید تقویت اس وقت حاصل ہوئی جب شمس الرحمٰن فاروقی محکمۂ ڈاک و تار میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز ہو کر یہاں آ گئے لیکن کم و بیش دس سال جب وہ اس محکمہ کے اعلیٰ ترین عہدیدار کی حیثیت

ہے وہ بارہ آنے [illegible] مجسٹریٹ بل ہو چکی تھی اور وہ خود بھی [illegible] ہو سے
داستانوں اور غالب اور میر کی غزلوں کی جانب ملتفت ہو چکے تھے۔

اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کے لیے چھوٹے بڑے جلسے اور تحریکیں بھی چلتی رہیں لیکن ان میں اہم ترین حیثیت غیر مسلم اردو ادیبوں کی ان دو شاندار کانفرنسوں کو حاصل ہے جن کے روح رواں رام لال تھے۔ ایک کانفرنس کے موقع پر انھوں نے غیر مسلم اردو ادیبوں کی ایک طویل فہرست بھی شائع کی جسے دیکھ کر کسی نے (نام لینے سے حاصل؟) کہا کہ مسلمان یہاں بھی اقلیت میں ہیں۔ کانفرنس تو ختم ہو گئی۔ لیکن یہ جملہ ایک عرصہ تک فضا میں گونجتا رہا۔

شہر کی ادبی اور ثقافتی زندگی کا ذکر نامکمل قرار پائے گا اگر میر اکادمی کا ذکر نہ کیا جائے۔ یہ ادارہ ہر دوسرے تیسرے سال اس دوران شائع ہونے والی کتابوں کے مصنفین اور درجنوں دوسرے ادیبوں کو انعامات و اکرامات سے نوازتا ہے۔

اردو زبان اور اس کی درس و تدریس کے مسائل اس طرح ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے ہیں کہ ایک کا ذکر دوسرے سے صرف نظر کر کے ممکن نہیں۔ لکھنؤ یونیورسٹی کا شعبہ اردو جس میں کم و بیش ڈھائی سو طلبہ زیر تعلیم ہیں صرف ڈیڑھ کمروں پر مشتمل ہے۔ ایک کمرہ میں صدر شعبہ بھی بیٹھتے ہیں۔ اسٹاف کے باقی اراکین اور کلاس بھی ہوتے ہیں۔ باقی آدھے کمرے کی نوعیت یہ ہے کہ شعبہ علوم مشرقیہ کا علیحدہ کمرہ جب خالی ہوتا ہے تو اردو طلبہ کے کام آجاتا ہے یونیورسٹی کے مالی حالات ایسے ہیں کہ نئی عمارت کی تعمیر ممکن نہیں اور کبھی اس کی نوبت آتی بھی ہے تو دوسرے اداروں کو اولیت مل جاتی ہے اور شعبۂ اردو کی یہ گوشہ نشینی کسی طرح ختم ہونے کو نہیں آتی۔ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق یونیورسٹی کے وائس چانسلر مسٹر سوڈھا نے مقبول احمد لاری ایسرچ اردو سینٹر کی تعمیر کے لئے مالویہ ہال کے سامنے اس جگہ پر جہاں پی اے سی اور پولس کے کیمپ لگے ہیں پانچ کمروں کی ایک عمارت کی تعمیر کے لئے لاری صاحب کی پیش کش قبول کر لی ہے۔ یونیورسٹی کی اصل عمارت کے طرز پر بنایا جانے والا یہ سینٹر فی الحال پانچ کمروں پر مشتمل ہوگا جن میں سے ایک کمرہ صدر شعبہ کے لئے وقف ہوگا۔ ایک اساتذہ کے لیے، ایک شعبہ کی لائبریری کے طور پر استعمال ہوگا۔ اور دو کمرے تعلیم و تدریس کے لیے استعمال ہوں گے۔ امید ہے کہ تعمیر کا کام جولائی میں شروع ہو جائے گا۔

ایسی ادبی انجمنیں جن میں کسی مروت اور میلان خاطر کے بغیر تخلیقات پر بحث و مباحثہ ہوتا ہو، اب تقریباً ناپید ہیں لیکن متعدد انجمنوں کے تحت ادبی جلسے ضرور ہوتے رہتے ہیں۔ شعری نشستیں ان کے علاوہ ہیں، ان نشستوں میں پیش کی جانے والی تخلیقات سُن کر احساس ہوتا ہے کہ جدید و قدیم اور ترقی پسندی اور جدیدیت کی دیواریں منہدم ہو چکی ہیں۔ پچھلے پچیس تیس برسوں کے دوران ان رسمی اور غیر رسمی نشستوں میں پیش کیے جانے والے چند اشعار آپ بھی سنیے:

ڈوبتے جاتے ہیں تارے بجھتے جاتے ہیں چراغ
یا بدلتے جا رہے ہیں سرخیِ افسانہ ہم
——— سالک لکھنوی

ذہن کچھ بکھرا گئے، اور کچھ نے وہ باتیں گڑھیں
جن کو سُن کر لفظ پچھتائے کہ کیوں پیدا ہوئے
——— منظر سلیم

اب تو اک مدت سے ہیں دیوار و در کی قید میں
ساتھ رہتے تھے کبھی صحرا، سمندر اور ہم
——— والی آسی

زباں کو خوش نہیں آتا کسی کا آب و نمک
عجب تبرکِ نانِ جویں ملا ہے مجھے
——— عرفان صدیقی

آنکھوں سے مری مجھ کو سمجھتا ہے شرابی
واعظ کو ابھی رند کی پہچان نہیں ہے
——— شارب لکھنوی

شہر کی ادبی فضا میں حسب سابق شاعری کو بالادستی حاصل ہے لیکن ایسا بھی نہیں کہ افسانوی ادب اور تنقید و تحقیق کے میدان میں بالکل سناٹا ہو۔ کاظم علی خاں اور ڈاکٹر اکبر حیدری کے تحقیقی مضامین ملک بھر کے ادبی جرائد میں برابر شائع ہوتے رہتے ہیں اور افسانوی ادب کو ڈاکٹر مسعود، غضنفر اور وقار ناصری نئی جہتوں سے روشناس کرا رہے ہیں۔ مسرور جہاں نے بھی اپنے نئے ناولوں سے اپنے قارئین کے حلقے کو وسیع کیا ہے۔ □□

ابراہیم یوسف
۲۱- نیم روڈ، امامی گیٹ، بھوپال ۴۶۲۰۰۱

ایک تاریخ ساز تخلیق، امانت کی اندر سبھا

امانت کی اندر سبھا نہ صرف اس لئے تاریخ ساز ہے کہ اس نے اردو ڈرامے کی بنیاد رکھی بلکہ اس لئے بھی تاریخ ساز ہے کہ اس نے ہندستانی تھیٹر میں ایک انقلاب پیدا کردیا۔ سنسکرت ڈرامے کے اسٹیج خالی کر دینے کے بعد لوک ناٹکوں نے اسٹیج پر قبضہ کر لیا تھا۔ بالخصوص راس لیلا، رام لیلا اور بھگت وغیرہ کے کھیل عام طور پر کھیلے جاتے تھے مگر ان کی نوعیت مذہبی تھی۔ اندر سبھا نے اس رجحان کو بدلا اور سماجی و معاشرتی ڈراموں کے لئے راہ ہموار کی۔ اس تبدیلی سے ہندستانی تھیٹر کی کایا پلٹ ہوگئی۔ آو بارنگا جاری لکھتے ہیں: ؎

The year 1853 is noteworthy for two things. One was the Urdu play called Inder Sabha. This was written by Amanat, a court-poet of Wajid Ali Shah, the last Nawab of Oudh. It was all in verse, in stanzas of different metres and songs. It was produced in Lucknow. It was both an opera and a costume play with fairies dressed in different colours. There was no theme and no message but tuneful music and the eye-filling spectacle had such an appeal that, because of its popularity, many others were 'inspired' to write their own Inder Sabhas. The other notable event of the year was the founding of the first dramatic club, the Parsi Natak Mandali. The impact of these two events on the modern Indian theatre was to make it-self felt some two decades later.

باوجود تاریخ ساز ہونے کے اندر سبھا غلط فہمیوں کا شکار رہی اور تنقید کا نشانہ بنتی رہی۔ غلط فہمیاں یہ پیدا کی گئیں کہ یہ واجد علی شاہ کے حکم سے لکھی گئی اور وہ خود اس میں راجا اندر بنتے تھے اور یہ کہ اندر سبھا کا کھیل تیار کرنے کا خیال کسی فرانسیسی نے واجد علی شاہ کے سامنے پیش کیا تھا۔ یہ غلط فہمیاں پیدا کرنے کا سہرا مصنفین ناٹک ساگر نور الٰہی اور محمد عمر صاحبان کے سر ہے۔ چنانچہ یہ لکھتے ہیں کہ:

"اندر سبھا کا تیار ہونا تھا کہ قیصر باغ میں اسٹیج تیار ہوگیا جس میں فرانسیسی ہدایت کے مطابق ہندوستانی حرفت نے اپنے جوہر دکھائے۔ مہ جبینان قیصر باغ پریوں کے لباس میں جلوہ گر ہوئیں۔ واجد علی شاہ اندر کے تخت پر براجمان ہوئے باقی پارٹ با مذاق اہل دربار کو ملے۔ عوام کو اس محفل میں بار نہ مل سکا۔" ؎

مولانا عبدالحلیم شرر تحریر فرماتے ہیں:

"سری کرشن کی معشوقانہ روش عاشقی اس قدر پسند آئی کہ اس رہس سے ڈرامے کے طور پر ایک کھیل ایجاد کیا جس میں خود کنھیا بنتے، مخدرات عصمت مآب گوپیاں بنتیں اور ناچ رنگ کی محفل گرم ہوتی۔" ؎

نور الٰہی و محمد عمر صاحبان اور مولانا شرر کے مندرجہ بالا بیانات میں ایک بات مشترک ہے کہ واجد علی شاہ ڈرامے میں پارٹ ادا کرتے تھے۔ اختلاف صرف یہ ہے کہ نور الٰہی و محمد عمر انہیں اندر کے تخت پر لا بٹھاتے ہیں تو شرر انہیں کنھیا بنا دیتے ہیں۔ رادھا کنھیا کا قصہ جو واجد علی شاہ نے اپنی ولی عہدی کے زمانے میں اسٹیج کیا تھا، اس کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں:

"سلطان پری نے رادھا کا، ماہ رخ پری نے کنھیا کا اور یاسمین پری، عزت پری، دل ربا پری اور حور پری نے گوالنوں کا پارٹ کیا تھا۔" ؎

اور جب یہی رہس تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ مٹیا برج میں کھیلا گیا تو نواب عباسی بیگم کنھیا بنی تھیں۔ اس قدر واضح ثبوت کے بعد مولانا عبدالحلیم شرر کا واجد علی شاہ کو کنھیا بنا دینا مضحکہ خیز ہے۔

نورالہی و محمد عمر صاحبان اندر سبھا کو واجد علی شاہ کے ایما پر تحریر کیا جانا قرار دیتے ہیں لیکن امانت شرح اندر سبھا میں لکھتے ہیں کہ:

"ایک روز کا ذکر ہے کہ صاحبی مرزا عابد علی، یگانۂ ازلی، رفیق شفیق، مؤنس و غمخوار، قدیمی جاں نثار، شاگرد اوّل، موزون طبیعت، تخلص عبادت، عاشق کلام امانت، انھوں نے ازراہ محبت کہا کہ بے کار بیٹھے بیٹھے گھبرانا عبث ہے ایسا کوئی جلسہ رہس کے طور پر طبع زاد نظم کیا جائے کہ دو چار گھڑی دل لگی کی صورت ہووے اور خلق میں شہرت ہووے۔ آخرالامر موافق ان کی فرمائش کے بندہ اس کے کہنے پر آمادہ ہوا، دم بدم شوق زیادہ ہوا۔"

امانت کی اس تحریر کے بعد کسی شک کی گنجائش نہیں رہتی کہ اندر سبھا مرزا عابد علی عبادت کی فرمائش پر لکھی گئی تھی، واجد علی شاہ کے ایما پر نہیں۔

نورالہی و محمد عمر صاحبان اندر سبھا کا قیصر باغ میں کھیلا جانا بتلاتے ہیں لیکن امانت شرح اندر سبھا میں لکھتے ہیں کہ "دو شخص اس جلسہ کی تیاری پر آمادہ ہوئے"۔ ظاہر ہے کہ یہ دو شخص قیصر باغ کے نہیں ہو سکتے تھے۔ ناصر لکھنوی جو امانت کے ہم عصر تھے، لکھتے ہیں:-

"میاں امانت نے ایک رہس کی طرح مثنوی اندر سبھا تصنیف کی تھی، اس میں بجائے امانت تخلص استاد قرار دیا تھا اور اس نے مثنوی غزلیں اور ہولی و ٹھمری اور چند زبان بھاکا میں کہی تھی چنانچہ جگد سنگھ پنڈت کشمیری اور بہادری کہار اور میر حافظ نے چند طفلان حسین اور امرد ان مہ جبین خوبصورت جمع کر کے اور ان لڑکوں کو مثنوی یاد کرا کے اور تعلیم راگ اور ناچ دلوا کے الگ رہس کھڑا کیا تھا۔ اور وہ پندرہ روپیہ روزینہ پر مجرے کو بھی جاتے تھے چنانچہ خلق نے یہ جلسہ دیکھ کر بہت پسند کیا اور ہزار لوگ بازار میں جمع ہونے لگے۔ ایک روز مؤلف تذکرہ ہذا بھی اس جلسۂ رہس اندر سبھا میں گیا، دیکھا میں نے کہ ہزارہا لوگ ان امردان حسین پر مفتون و شیفتہ ہیں بقول شعر عجب حال ہے ہجوم ان پریوں کا اس قدر تھا کہ مجھ کو دل کے پس جانے کا ڈر تھا

اور میاں امانت مسند پر بیٹھے تھے اور ایک لونڈا حسین سپاہ آگے گا رہا ہے میں یہ دیکھ بس چندے توقف کے بعد اپنے مکان چلا آیا۔"

کیا اس کے بعد بھی کوئی شک رہ جاتا ہے کہ اندر سبھا قیصر باغ میں کھیلی گئی تھی؟۔ اندر سبھا خالص عوامی چیز تھی، عوام نے ہی اسے تیار کیا تھا اور عوام ہی میں کھیلی جاتی تھی۔

نورالہی و محمد عمر صاحبان اندر سبھا کو اوپیرا قرار دیتے ہیں اور اس کے خیال کو کسی فرانسیسی کی طرف منسوب کرتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں:

"ہندوستان میں ڈرامے کا آغاز اوپیرا سے ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ اس کا طرح انداز کوئی فرنگی ہے بلکہ یوں کہیے کہ کوئی فرانسیسی ہے۔"

رام بابو سکسینہ اندر سبھا کو کلی طور پر اوپیرا تو نہیں مگر اوپیرا کی ایک قسم مانتے ہیں فرماتے ہیں:

"امانت نے ۱۲۷۰ھ (مطابق ۱۸۵۳ء) میں اپنی کتاب اندر سبھا تیار کی جو کامیڈی ہے اور چوں کہ اس میں گانا ناچ بھی شامل ہے لہٰذا موسیقی دار کامیڈی ہے جو اوپیرا کی ایک قسم ہے۔"

نورالہی و محمد عمر نے اسے مکمل طور پر اوپیرا اور رام بابو سکسینہ نے اوپیرا کی ایک قسم قرار دیا ہے۔ جب ہم اندر سبھا کا اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس میں یورپین اوپیرا کے اوصاف نظر نہیں آتے۔ یورپین اوپیرا میں قصہ سے مربوط موسیقی کا تسلسل ہوتا ہے جو موقع اور واقعات کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے اور یہ چیز اندر سبھا میں نہیں ہے۔ لیکن میوزیکل کامیڈی ہندوستان کے لیے کوئی نئی چیز نہیں۔ ہندوستان میں اس کی روایت زمانۂ قدیم سے موجود ہے۔ لوک ناٹک میوزیکل کامیڈی ہی کے انداز میں لکھے اور کھیلے جاتے رہے ہیں۔ امانت نے اندر سبھا کی تصنیف کے وقت انھیں لوک ناٹکوں کو پیش نظر رکھا۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ:

"الحمدللہ کہ بھگت کا کوئی نام نہیں لیتا زمانہ اندر سبھا پر جان دیتا ہے۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ امانت کے پیش نظر بھگت کے کھیل تھے اور وہ

ان کے مقابلے میں اندرسبھا کو پیش کرنا چاہتے تھے۔ راقم الحروف نے اپنی کتاب "اندرسبھا اور اندرسبھائیں" میں ہندستان کے لوک ناٹکوں سے بحث کی ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ: "اندرسبھا رقص و موسیقی کی محفل مثنوی کے اسلوب، سوانگ اور بھگت کی تدبیرگری سے عالم وجود میں آئی ہے۔" اندرسبھا کی فنی اہمیت کو سب سے زیادہ ہندی کے ناقد ڈاکٹر گریش رستوگی نے محسوس کیا۔ ان کے ہندی زبان میں لکھے گئے ایک مضمون کا طویل اقتباس اردو رسم الخط میں پیش کیا جا رہا ہے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اندرسبھا کس طرح ہندستانی روایت اور تمثیل گری سے جڑی ہوئی ہے۔ فرماتے ہیں:

"کیا کارن ہے کہ امانت کی اندرسبھا جو سمپورن ہندی ناٹیہ ساہتیہ پر بھاؤشالی پڑنا سوتر رہی ہے اور سویم اپنے میں ایک سشکت رنگ منچی انوبھو ہے جس کو پرایہ ودیشی رچنا مانا جاتا رہا ہے اور جس کے پرتی سویم ہندی ناٹک کاروں کا ورودھ آتمک سوتر رہا ہے، اپنے سمے کی پرچلت لوک ناٹیہ شیلی کے کلا تتوں کو اپنے میں ملائے ہوئے ہے۔ ۱۴ ویں شتابدی کی اس اتینت لوک پریہ رچنا میں درباری واتاورن ودیشی اوپیرا سے کہیں ادھک دھیان آکرشت کرنے والی بات یہ ہے کہ وہ راس لیلا پدھتی پر لکھا گیا پہلا ناٹک ہے۔ اس بات کو کافی پہلے نٹ رنگ (انک ۴) میں ڈاکٹر سریش اوستھی نے اپنے ایک لیکھ میں استھاپت کیا۔ اندرسبھا میں پارسی رنگ منچ جیسا کہ رس، غزل، ٹھمری، شعر و شاعری میں بھی ہے اور راس لیلا جیسا سنگیت تتو، نرت تتو، شاستری سنگیت وے بھو بھی ہے۔ امانت بھی اسے جلسہ رہس کہتے ہیں۔ کتھا گائن، کا دیا پٹھ اور نائکہ کا بھاؤ گائن اور نرت دوارا نائکہ کتھا انش کا جڑتے جانا، پاتروں کا پرویش پرستھان، پاتروں دوارا سویم پر تیچے دے کر نائکہ پریوجن کا سنکیت، کئی کئی چھندوں میں سمواد بولے جانا، گیتوں میں پریم دیا پاردن، رتھوؤں، انسوؤں کا ورنن آدی اسے راس لیلا

شیلی سے جوڑتے ہیں۔ [illegible] گائن، پھر پوردے ناٹک کے کردن گان لیلا ناٹکوں کی طرح ہیں۔ پرایہ سمواداوں کا ناٹکی کتھا سے کوئی سمبندھ نہ ہونا بھی واحد لیلا کی خوبی ہے۔ ایک ہی درشیہ میں کئی نائکہ وچار چلتے ہیں، یا الگ الگ گھٹنا استھل پر پہنچنے کے سنکیت اسے راس لیلا سے نکٹ کرتے ہیں۔ ان اپچارک سادہ منچ، درشیہ پریورتن کا سروپ، پردے کا پریوگ، پردے کے پیچھے پاتر کا چھپے رہنا اور گاتے ہوئے پرویش کرنا وستوتہ راس لیلا ہی کے گن ہیں۔ اس درشٹی سے سمیکشا کرنے پر بھارتیندو یا بھارتیندو یگین ناٹک کاروں کے وہ کتھن نرآدھار ہو جاتے ہیں جن میں اندرسبھا کو بھی ہندی ناٹک کی بھرشٹ وشے تھا اس تیتھی کے پرتی گہری وسے تھا اور آکروش دیکت کرتے سمے گمبھیٹ کیا گیا ہے جس کے پیچھے مکھیہ ہندی ناٹک کا جیون سے سماپت ہو جانا اور پارسی رنگ منچ کا پرچار ادھک ہے۔"[۹]

ڈاکٹر گریش رستوگی کی اس وضاحت کے بعد یہ خیال بے معنی ہو جاتا ہے کہ اندرسبھا کا کوئی تعلق یوروپین اوپیرا سے ہے۔ اندرسبھا خالص امانت کے ذہن کی پیداوار ہے جس نے اردو ڈرامے کی انفرادیت قائم کرنے کی کوشش کی تھی مگر اردو تھیٹر پارسیوں کے ہاتھ میں پہونچ کر کاروبار بن گیا اور مغرب کی بھونڈی نقالی نے اس انفرادیت کو قائم نہ ہونے دیا۔

امانت کا کارنامہ یہی نہیں کہ انھوں نے اردو تھیٹر کی بنیاد رکھی بلکہ ان کا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے ہند ایرانی اور ہندو مسلمان روایات کو ایک دوسرے میں اس طرح ملا جلا دیا کہ ایک مشترک تہذیب اور مشترکہ قوم کا نقشہ نظروں کے سامنے آ گیا۔ راجا اندر جو ہندو دیومالا کا مشہور دیوتا ہے اور ناچ گانے کا شوقین ہے اس کے دربار میں ہندستانی اپسرائیں نہیں ایرانی پریاں ناچتی گاتی ہیں۔ رہتی کوہ قاف میں ہیں مگر آتی ہندستانی اڑن کھٹولے پر بیٹھ کر ہیں۔ بولتی اردو زبان ہیں مگر گاتی ناچتی ہندی دھنوں اور گیتوں پر ہیں۔ غزلوں کے ساتھ ساتھ ٹھمری، ہولی اور بسنت بھی گاتی ہیں۔ گلفام اپنے لباس سے اودھ کا شہزادہ معلوم ہوتا ہے اور

اپنے عمل سے ایک زوال آمادہ سماج کا فرد۔ اور جب راجا اندر اسے بند کرتا ہے تو ہندستان کا قیدخانہ نہیں ہوتا بلکہ ایرانیوں کا قیدخانہ کنواں ہوتا ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں:

"سبزپری اس کے (گلفام کے) فراق میں بیتاب ہوتی ہے تو ہندوستان کی جوگن بنتی ہے جس کے چہرے اور بدن پر ہندستان کی بھبھوت ملتی ہے، سر پر ہندوستانی انڈوا ہے، زلفیں ہندوستانی جوگنوں کی جٹائیں ہیں، کندھے پر ہندستان کا پرانا باجا بین ہے۔ اس کے نغمے میں فارسی شاعری، ہندوستانی موسیقی، لکھنؤ کی ٹھمریاں، ہندوؤں کی ہولیاں اور اردو اور بھاشا نہ باتیں ہیں اور یہ سب چیزیں مل کے ایسی پرلطف ہوگئی ہیں کہ اس سے زیادہ بہتر مجموعہ مختلف مذاقوں کے یکجا ہوجانے کا بمشکل نظر آسکے گا۔" ۱؎

اندرسبھا جس طرح غلط فہمیوں کا شکار رہی ہے اسی طرح تنقید کا نشانہ بھی بنتی رہی ہے۔ آدیا رنگاچاری کو شکایت ہے کہ اس میں کوئی پیغام نہیں دیا گیا ہے۔ پروفیسر سید احتشام حسین لکھتے ہیں:

"اندرسبھا کی کہانی میں نہ کوئی جدت تھی نہ کوئی ندرت۔ ہندو دیومالا کے مشہور کردار راجا اندر کے گرد ایک معمولی سی کہانی کے تانے بانے سے منظوم ڈراما تیار کیا گیا تھا، جس پر میر حسن کی مثنوی سحرالبیان کا غیرمعمولی اثر نظر آتا ہے لیکن امانت نے اس خلا کو اس طرح پُر کردیا کہ گویا اس وقت ڈراما کی دیوی جاگ اٹھی۔" ۲؎

احتشام صاحب اندرسبھا کی اس اہمیت کو تو مانتے ہیں کہ اس کی تخلیق سے ڈرامے کی دیوی جاگ اٹھی لیکن وہ اس کے پلاٹ کو راجا اندر کے گرد گھومتا ہوا ایک معمولی پلاٹ قرار دیتے ہیں۔ اوّل تو یہ متنازعہ مسئلہ ہے کہ پلاٹ راجا اندر کے گرد گھومتا ہے یا سبزپری کے گرد۔ اس سے قطع نظر پلاٹ پر اس طرح تنقید یا اندرسبھا میں کسی پیغام کی تلاش بیسویں صدی کے ڈراموں کے لیے تو مناسب ہے لیکن انیسویں صدی کے ڈراموں کے لیے نہیں۔ انیسویں صدی میں کھیلی جانے والی راس لیلاؤں اور رام لیلاؤں میں بھی کوئی پیغام نہیں ہوتا تھا اور ان میں سری کرشن اور رام چندرجی کے گرد گھومنے والا پلاٹ ہوتا تھا۔ اندرسبھا کے فن کا مقابلہ اپنے ہم عصر ڈراموں سے ہی کیا جاسکتا ہے۔ بیسویں صدی کے ترقی یافتہ ڈراموں سے نہیں۔

جب ہم اندرسبھا اور شرح اندرسبھا کا فنی نقطۂ نظر سے مطالعہ کرتے ہیں تو ان میں ہمیں اسٹیج اور تھیٹر کا کوئی واضح تصور نظر نہیں آتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امانت نے رقص و موسیقی کی محفل میں قصے کا اس طرح اضافہ کردیا ہے کہ یہ رقص و موسیقی کی محفل ایک دوسرے انداز سے سجائی جاسکے کہ لوگوں کو تفریح کا کچھ اور سامان میسر آسکے۔ رہس اور سوانگ کے مقابلے میں زیادہ خوش سلیقگی ہو۔ سنسکرت ڈرامے کے زوال کے بعد جب راس لیلا، رام لیلا، بھگت اور سوانگ عوام میں مقبول ہوئے تو ان کی پیش کش انتہائی سادہ انداز میں کی جاتی تھی۔ امانت نے پیش کش کے اسی سادہ انداز کو اپنایا۔ لیکن اسکرپٹ میں تھوڑی تبدیلی کی یعنی آمد کا گایا جانا اور حسب حال شعرخوانی۔ یہ دونوں چیزیں نہ تو سنسکرت ڈرامے میں ملتی ہیں اور نہ لوک ناٹکوں میں۔ یہ خالص اردو ڈرامے اندرسبھاؤں میں ملتی ہیں۔ سنسکرت ڈرامے میں ناندی کا رواج تھا جس میں ڈراما شروع ہونے سے پہلے کسی دیوتا کی حمد گائی جاتی تھی اور آشیرواد دیا جاتا تھا اور آخر میں بھرت کا دیہ ہوتا تھا اس میں پرارتھنا اور آشیرواد ہوتا تھا، آغاز میں سوتردھار مصنف اس کی تصنیف اور کرداروں کے بارے میں معلومات فراہم کرتا تھا۔ ان کی جگہ پر امانت نے آمد اور حسب حال شعرخوانی کو داخل کیا اور بھرت کا دیہ کی جگہ پر مبارکباد۔ اس طرح امانت نے اپنا الگ راستہ بناکر ایسی روایت کی بنیاد ڈالی جو عرصہ تک اردو ڈرامے پر اثرانداز ہوتی رہی اور بہ قول وقار عظیم:

"یہی چیزیں ہیں جن کی بنا پر ہم اندرسبھا کے فنی مرتبے کا تعین کرتے وقت اس بدیہی نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ اندرسبھا ہمارے ڈرامائی فن کی بنیاد اور اس کا ایک اہم سنگ میل اندرسبھا اور اس سے بھی زیادہ شرح اندرسبھا نے اسٹیج کی جن روایات اور ہدایات کو اردو کے ڈرامائی فن کا پیش خیمہ بنایا ہے وہ اس اہم کتاب کی تصنیف کے

ایک صدی بعد بھی اُردو ڈرامے کے ناگزیر اجزا ہیں۔ اندر سبھا اور شرح اندر سبھا کے بنائے ہوئے نقوش اُردو ڈرامے کے فن کی پوری روایت پر چھائے ہوئے ہیں اور ہمارے مشہور ڈرامے میں کہیں نہ کہیں اس روایت کی جھلک ضرور نظر آتی ہے۔"[12]

جب ہم اندر سبھا کا مطالعہ کرتے ہیں تو ابتدا سے ہی یہ تاثر پیدا ہوجاتا ہے کہ امانت نے "دو چار گھڑی دل لگی کی صورت" پیدا کرنے کا ذریعہ رقص و موسیقی کو بنایا ہے۔ رقص اور موسیقی کے علاوہ جو کچھ ہے وہ سب ضمنی ہے جس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب سبز پری کالے دیو سے گلفام کو اُٹھالانے کو کہتی ہے اور کالا دیو اسے اٹھالاتا ہے تو یہ تمام واقعہ مشکل سے سات شعروں میں ختم ہوجاتا ہے کیوں کہ امانت گلفام کا گانا سننے اور سنانے کے لئے بے چین ہیں۔ چونکہ قصے کی بنیاد رقص و موسیقی پر ہے اس لئے امانت نے ہر مذاق کے لوگوں کا خیال رکھا ہے۔ شروع سے آخر تک غزلوں کے ساتھ ساتھ ٹھمریاں، بسنت، ہولیاں اور چھند برابر گائے جاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ موسم اور وقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ چنانچہ شرح اندر سبھا میں پکھراج کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"چھند کے بعد ٹھمری گاتی ہے، ٹھمری کے بعد ہولی کی فصل میں ہولی نہیں تو غزلیں گاتی ہے۔"

چونکہ اندر سبھا رات بھر کھیلی جاتی تھی اس لیے شب کے کون سے حصے میں کون سی دُھن گائی جائے اس کا بھی امانت نے خاص خیال رکھا ہے چنانچہ ابتدائے شب میں دھن بہار، کھاج اور دیس، درمیانی شب میں پرج اور دیس اور آخر شب میں بھیرویں کے استعمال کی ہدایت کی ہے۔ غزلوں کے لئے مترنم بحروں کا استعمال کیا گیا ہے۔ قافیہ اور ردیف میں صوتی آہنگ موجود ہے۔ امانت نے دوسرے گانوں کے مقابلے میں غزلوں کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ غزلیں اس دور کے لکھنوی ذوقِ شعر کے مطابق ہیں۔ ان غزلوں میں جس محبت کا تذکرہ ہے اس میں بازاری اور سوقیانہ پن ہے۔ عاشق اور معشوق کے درمیان کسی قسم کی پردہ داری نہیں بوسہ کی طلب میں کوئی اخلاقی قدر مانع نہیں۔ جذبۂ محبت میں خلوص کی سادگی نہیں بلکہ جھوٹے جذبات کا اظہار ہے جو ایک زوال آمادہ سماج کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ برخلاف غزلوں کے جو گیت اندر سبھا میں گائے گئے ہیں ان میں ہندی شاعری کی روایت کے مطابق اظہارِ محبت عورت کی طرف سے کیا گیا ہے ان میں جذبہ کا خلوص اور سچائی موجود ہے۔ اس طرح امانت نے موسیقی میں ایسا تنوع پیدا کردیا ہے جس سے ہر مذاق کے لوگوں کی تسکین ہوسکے۔ غرض یہ کہ امانت نے ایک ایسی روایت قائم کردی جو تقریباً نصف صدی تک اُردو ڈرامہ کی بنیاد بنی رہی اور ہماری نسلیں آج تک اندر سبھا کی اس روایت کو نبھا رہی ہیں۔

باوجود اپنی چند خامیوں کے اندر سبھا امانت کا ایک ایسا شاہکار ہے جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا اور نہ اُردو ڈرامہ امانت کے احسان سے سبکدوش ہوسکتا ہے۔

□□

حواشی:

۱ے The Indian Theatre:
Adya Rangacharya:- P 96

۲ے ناٹک ساگر (اتر پردیش اُردو اکادمی لکھنؤ) نور الٰہی و محمد عمر ص۳۶۲

۳ے گزشتہ لکھنؤ (نسیم بک ڈپو لکھنؤ) عبدالحلیم شرر: ص۱۶۹

۴ے بحوالہ اُردو ڈراما اور اسٹیج: سید مسعود حسن رضوی ادیب ص۱۱۲

۵ے " " " " ص۱۸۰

۶ے تذکرہ خوش معرکۂ زیبا۔ ناصر لکھنوی: مرتبہ شمیم انہونوی ص۱۹۲

۷ے ناٹک ساگر: نور الٰہی و محمد عمر ص۳۶۱

۸ے تاریخ ادب اردو (حصہ نثر) رام بابو سکسینہ۔ مترجم مرزا محمد عسکری ص۱۴۶

۹ے راس لیلا کا ہندی ناٹیہ رچنا پر پربھاؤ (بزبان ہندی) ڈاکٹر گریش رستوگی:
چھایا نٹ لکھنؤ: شمارہ ۱۵ اکتوبر تا دسمبر ۸۰ء ص۱۵-۱۶

۱۰ے شعر الہند (حصہ دوم) مولانا عبدالسلام ندوی ص۲۰۲

۱۱ے عکس اور آئینے: پروفیسر احتشام حسین ص۴۲

۱۲ے اندر سبھا کا فنی پہلو: وقار عظیم۔ ماہ نو کراچی۔ جولائی ۱۹۵۵ء ص۲۳

ڈاکٹر سید مسعود حسن رضوی رُدولوی
گورنمنٹ جوبلی کالج، لکھنؤ

تعلقداران اودھ اور ان کی ادبی خدمات

اودھ میں تعلقداروں کا وجود بہت قدیم ہے۔ تقریباً آٹھ سو سال قبل ملک کے مختلف مقامات سے راجپوت اودھ آئے اور یہاں کی تھارو، بھراور آرک قوموں کو شکست دی۔ یہاں وہ حاکمانہ انداز سے آباد ہوگئے۔ آراضیوں کو چھوٹے چھوٹے تعلقوں کی شکل دے کر آپس میں تقسیم کرلیا۔ اپنے اپنے علاقوں کے سردار بن گئے انھیں سرداروں کو بابو، بھیا، ٹھاکر، راجہ یا تعلقدار کہا جانے لگا۔ شیخوں کے دور اقتدار میں بھی تعلقداروں کی حیثیت بدستور رہی۔

جب سلطنت مغلیہ نے ۱۷۲۰ء میں میر محمد امین معروف بہ سعادت خاں برہان الملک کو اودھ میں اپنا وزیر مقرر کیا تعلقداروں کی اچھی خاصی تعداد یہاں موجود تھی۔

نوابین اور سلاطین اودھ کو ان تعلقداروں پر بہت ناز تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بورڈ آف ڈائرکٹرس نے ۲۱، نومبر ۱۸۵۵ء کو سلطنت اودھ ختم کرکے اس پر قبضہ ریزیڈنٹ جنرل اوٹرم کو کر لینے کا حکم دیا۔ جنرل اوٹرم نے ۷، فروری ۱۸۵۶ء کو زبردستی قبضہ کرلیا اور اودھ کے چیف کمشنر بن گیے تو شاہ اودھ واجد علی شاہ نے تعلقداروں کو فرمان بھیجا۔

"ما بدولت نے آج کی تاریخ سے تم سب کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالے کیا۔ تمہیں چاہئے کہ کمپنی مذکور کے احکام کی تعمیل کرو اور اپنے تئیں ان کی رعایا سمجھو۔"

واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد بھی تعلقداروں کا رعب و دبدبہ کچھ خاص کم نہ ہوا تعلقداروں کے اثرات اور عوام میں ان کی مقبولیت دیکھ کر انگریز ان سے بہت مرعوب تھے جسکے ثبوت میں مندرجہ ذیل بیانات کافی ہیں۔ رابرٹ مانٹگمری کمشنر اودھ حکام کو نصیحت کرتے ہیں:۔

"اگر مضبوط اور مستحکم حکومت قائم کرنا ہے تو........ یہاں کے روسا، و عمائدین سے تواضع اور اخلاق کے ساتھ پیش آنا چاہئے۔" (از انجمن ہند ص۱۸)

تعلقداران اودھ کا دور اقتدار نوابین اودھ کے عہد (۱۷۲۰ء) سے شروع ہوتا ہے اور سلطنت برطانیہ کے غروب آفتاب (۱۹۴۷ء) تک رہتا ہے۔ اودھ کی تہذیب و تمدن اور فنون لطیفہ کے عروج کا زمانہ بھی یہی تھا۔ اودھ کی وہ تہذیب جس کی بدولت اودھ کو دنیا بھر کی ترقی پذیر اور ترقی یافتہ سبھی قوموں نے اپنی آنکھوں میں جگہ دی اس کی مشاطگی میں تعلقداروں نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے اور اودھ کی تہذیب مرتے دم تک ان کی مرہون منت رہے گی۔

اودھ کے تعلقدار فنون لطیفہ (موسیقی، رقص، سنگ تراشی، مصوری، شعر وادب) کے بڑے دلدادہ تھے۔ اس وقت شعر وادب سے متعلق ان کی دلچسپیاں اور خدمات موضوع سخن ہیں۔ سلاطین اودھ اور حکومت فرنگ دونوں ہیں ان کی چڑھی بارگاہ تھی۔ لہذا انھوں نے ادیبوں، شاعروں اور صاحبان ذوق کو انعام و اکرام، وظائف اور عہدوں کے ذریعہ اعزاز بخشا ہمت افزائی کی اور انھیں باعزت اور بافراغت زندگی گذارنے کا موقع عطا کیا۔ مثال کے طور پر ریاست محمود آباد سے جو شعراء اور ادباء وابستہ رہے ان میں عزیز لکھنوی، محشر لکھنوی، ثاقب لکھنوی، ظریف لکھنوی، مرزا محمد عسکری، مانی جائسی، ریاض خیرآبادی، جالب دہلوی، سجاد حیدر یلدرم، سجاد حسین مدیر اودھ پنچ، ممتاز حسین عثمانی، مہدی حسن احسن سرفہرست ہیں۔ التفات رسول ہاشمی تعلقدار سندیلہ کے دربار سے آرزو لکھنوی متعلق رہے۔ انھیں تعلقداروں کے مالی تعاون اور توجہ سے ادبی شہپارے بھی زیور طبع سے آراستہ ہوتے رہتے تھے۔ مثلاً ریاست محمود آباد کے دارالتصنیف و

تالیف سے ظریف اور ثاقب کے ضخیم دواوین شائع ہوئے۔ اردو شعر و ادب کی خدمتیں انگریزی حکومت میں زیادہ ہوئیں کیونکہ انگریزوں نے اردو کو سرکاری زبان بنایا۔ اس سے پہلے سرکاری زبان فارسی تھی۔

تعلقداران اودھ کے اشاروں پر ادبی انجمنیں قائم ہوتی تھیں، بڑے بڑے مشاعرے اور ادبی نشستیں ہوتی تھیں۔ شعراء کے کلام کے گلدستے چھپتے رہتے تھے۔ یہ لوگ خود بھی شاعر اور ادیب ہوتے تھے۔

یہاں چند تعلقداروں کے ادب سے وابستگی کا ذکر اختصار سے کیا جا رہا ہے

۱) اثیم جرولی: نام سید ظفر مہدی (۱۹۴۱-۱۸۴۴) والد: سید حسن ذکی۔ تعلقہ: علی نگر (جرول بہرائچ) تلمیذ: مرزا دبیر۔ تلامذہ: فائق، محزوں، نادر، نصیر، بادی، شیو نرائن بھوشن، اثر، بہاری لال جنون یہ سب آپ کے دربار میں حاضر رہتے تھے اور اپنے کلام پر اصلاح لیا کرتے تھے۔ آپ جید عالم دین بھی تھے۔ بہرائچ کے آنریری اسسٹنٹ کمشنر تھے۔

آپ نے قصیدے، مرثیے، سلام، رباعی، قطعے وغیرہ بہت کافی تعداد میں کہے ہیں آپ کے نثری کارنامے بھی بہت وقیع ہیں۔

مطبوعہ نثری کارنامے: تہذیب المحفائل (۳ جلدیں)، ۲۔ روضۃ العارفین (۲ جلدیں)، ۳۔ حدیقۃ السادات، ۴۔ موتیوں کا ہار، ۵۔ معیار المحبت۔

غیر مطبوعہ کارنامے: اشک مسلسل (۵۰۰ بند کا ایک مرثیہ) ۲۔ دس مرثیے۔ ۳۔ متعدد سلام قطعے قصیدے اور رباعیاں وغیرہ۔ آپ کے بیٹے سید حیدر رہبر مہدی شمیم اور سید باقر مہدی بلیغ تھے۔ دونوں عالم دین اور شاعر تھے۔ آپ کے اخلاف میں سید فضل مہدی نسیم، اکبر مہدی سلیم، اور سید اکبر مہدی نہیم، اطہر مہدی قسیم، مسلم مہدی جسیم اور سید جعفر مہدی کلیم ہیں۔ اسی سلسلے میں سید امیر حیدر امیر اور سید نظیر حیدر اقبال بھی ہیں۔ ادبی خدمات میں آپ کی چوتھی پشت چل رہی ہے۔

نمونہ کلام: اشک مسلسل کا ایک بند پیش ہے۔ ؎

گل کیوں چمن میں چاک گریباں ہے آجکل
سنبل برنگ زلف پریشاں ہے آج کل
کیوں سرو مثل بید کے لرزاں ہے آجکل
کیوں اشک ریز نرگس حیراں ہے آجکل
تبدیل کیوں لباس گل جعفری ہوا
کیوں پیرہن گلاب کا نیلوفری ہوا

(۲) امیر جہدی: نام ٹھاکر سید امیر حیدر خاں (۱۹۳۹-۱۸۷۰) والد: ٹھاکر سید محب حیدر محبت۔ تعلقہ: بہوا (ضلع رائے بریلی)۔ بلند پایہ شاعر تھے۔ تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ آپ کے والد بھی اچھے شاعر تھے اور شاہ حسن جائسی کے تلمیذ تھے۔ آپ کے اخلاف میں آج تک شعر گوئی کا سلسلہ قائم ہے صغیر کاظم اور اعجاز کے دم سے چراغ شاعری روشن ہے۔ آپ کے دیگر اہل خاندان عباس، عشرت، مقدر، اظہر، پرویز، نیاز، نسیم، ظہیر، راہی (قومی آواز کے کالم نگار) وغیرہ اچھے شاعر ہیں۔ امیر کے کلام کا ذخیرہ بہت ہے مگر سب غیر مطبوعہ۔ نمونہ کلام: ؎

ترحم اب تو لازم ہے میرے حال شکستہ پر
شب فرقت کی سختی کو بہت کھا کھا کے غم کاٹا

(۳) بسمل لکھنوی: نام چودھری مصطفیٰ حسین (۱۹۵۷-۱۸۹۲) والد: چودھری کاظم حسین۔ تعلقہ: غازی پور (لکھنؤ) تلمیذ: تہّار لکھنوی اور صفی لکھنوی۔ آپ کا ایک دیوان "اوراق پریشاں" چھپ چکا ہے۔

نمونہ کلام: ؎

یارب کسی سے چھین کے مجھ کو خوشی نہ دے
جو دوسروں پہ بار ہو وہ زندگی نہ دے

(۴) سحر: نام راجہ نواب علی خاں (۱۸۵۸-۱۸۱۰) والد: میاں امیر علی خاں بہادر تعلقدار بھرہ (بارہ بنکی) تلمیذ: ناسخ لکھنوی کے بعد شاہ اودھ واجد علی شاہ، شاہ اودھ نے مقیم الدولہ اور قیام جنگ کے خطابات عطا کیے۔ آپ نے انگریزی فوج سے گیارہ مقامات پر مورچہ لیا اور عالم نگر کے معرکے میں زخمی ہوگئے۔ انگریزوں نے پہلے ان کو اپنا طرفدار بنانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر جب کامیاب نہیں ہوئے تو ان کی جان کے دشمن ہوگئے محمود آباد میں مقیم منزل کو توپ سے اڑا دیا۔ اتفاق سے مقیم الدولہ اس وقت اس میں مقیم نہیں تھے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے اس خیال سے کہ کہیں انگریزوں کے ہاتھ پکڑے جائیں اور ذلیل ہونا پڑے اپنے ہاتھوں عزت کی موت قبول کرلی۔

آپ نے نظمیں، ہفت بند، غزلیں، مثنویاں، تاریخیں، واسوخت، سلام رباعیاں، قصیدے اور قطعے کہے ہیں۔ مذہبی شاعری کے لیے آپ نے وہبت تخلص اختیار کیا تھا۔ آپ کا مجموعہ کلام "بیاض سحر" کے نام سے چھپ چکا ہے

نمونہ کلام: ؎ کیوں نہ ہو جاں بخش، روح افزا فضائے لکھنؤ
رشک انفاس مسیحا ہے ہوائے لکھنؤ

آپ کے انتقال کے وقت آپ کے ولی عہد بہادر راجہ محمد امیر حسن خاں المتخلص بہ تحریر ہیبت (۱۹۰۳-۱۸۷۹) صرف نو سال کے تھے۔ علاقہ انگریزی سرکار ضبط کر لیتی مگر مرزا عباس بیگ (مرزا غالب کے بھانجے) کی کوشش سے بچ گیا۔ آپ نے بھی غزلیں رباعیاں، قطعے، نوحے، سلام اور مرثیے لکھے ہیں۔ آپ کا مجموعہ بھی چھپ چکا ہے۔ نمونۂ کلام ؎

عیاں ہوئی نہ مری ہستی عدم کی شان
میں قلب سنگ میں پنہاں رہا شرر کی طرح

آپ کے بعد آپ کے ولی عہد مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں المتخلص بہ ساحر و محب۔ (۱۸۷۸-۱۹۳۱) جانشین ریاست ہوئے۔ مہاراجہ کے بڑے بیٹے اور ریاست کے ولی عہد راجہ محمد امیر احمد خاں المتخلص بہ تجر و مجوب (۱۹۷۳-۱۹۱۴) تھے۔ اس عہد میں عصری سیاست پورے شباب پر تھی۔ دانشوران سیاست آپ کے حلقہ گوشوں میں تھے۔ جناح، گاندھی، موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، سروجنی نائڈو، شوکت علی، حسرت موہانی اور چودھری خلیق الزماں وغیرہ کی نشستیں آپ کے دولت کدے پر ہوا کرتی تھیں اور جنگ آزادی لڑنے کے طریقے طے ہوتے تھے۔ مہاراجہ صاحب اور ولی عہد بہادر نے مرثیوں کے ساتھ ساتھ دیگر اصناف پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ مہاراجہ صاحب کے مرثیوں کا ایک مجموعہ مراثی محب کے نام سے چھپ گیا ہے۔ مگر ولی عہد بہادر کا سارا کلام غیر مطبوعہ ہے۔ مہاراجہ صاحب کے دوسرے بیٹے مہاراجکمار امیر حیدر خاں صاحب المتخلص بہ مسحور و حب (۱۹۱۸-۱۹۹۱) بھی اچھے شاعر تھے۔ بہت سے اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔ مگر کلام ابتک غیر مطبوعہ ہے۔

(۵) علی محمد زیدی؛ ولادت ۵ دسمبر ۱۹۱۳ء والد: چودھری سید محمد حسین۔ آپ چودھری سید ارشاد حسین (۱۸۸۹-۱۹۵۴) کے جانشین ہیں۔ تعلقہ نرولی ہے دینی خدمات اور ریاستی امور سے کچھ وقت نکال کر تصنیف و تالیف میں صرف کرتے ہیں۔ آپ نے ایک محتاط مورخ کا مزاج پایا ہے۔

مطبوعہ تصانیف: ۱۔ مصباح الزائرین۔ ۲۔ العزاء۔ ۳۔ اپنی یادیں ردولی کی باتیں۔ ۴۔ بارہ بنکی۔ ۵۔ ابن حسن اور ردولی۔ ۶۔ تقویم حسن۔

غیر مطبوعہ کتابیں: ۱۔ آئینہ حقیقت ۲۔ چودھری ارشاد حسین۔ ۳۔ تاریخ اودھ۔

(۶) گویا: نام فقیر محمد خاں (۱۷۸۵-۱۸۵۲) والد: محمد بلند خاں۔ تعلقہ: سبلامئو کسمنڈوی خرد۔ تلمیذ: ناسخ یا خواجہ وزیر۔ شاعر، نثر نگار اور فوج کے سالار تھے۔ کسی کو سیف و قلم دونوں پر قدرت کم ملتی ہے۔ جعفر ملیح آبادی کی تصنیف "گویا۔ صاحب سیف و قلم" میں آپ کے تفصیلی حالات درج ہیں۔ آپ کا تذکرہ کئی تذکروں میں ملتا ہے۔ جس کی نشاندہی جوش نے اپنی "یادوں کی بارات" میں ص۲۴۲ پر کردی ہے۔

آپ نے "انوار سہیلی" کا ترجمہ "بستان حکمت" کے نام سے کیا ہے جس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ آپ کا دیوان بھی "دیوان گویا" کے نام سے چھپ چکا ہے جس میں غزل، قصیدہ، نعت، نظم، نوحہ اور سلام وغیرہ کے نمونے ملتے ہیں۔ نمونہ کلام ؎

وہ ایسا نہیں چپ رہے بات سن کر
کوئی اور ہوگا وہ گویا نہ ہوگا

غضب ہے جس کا پدر ہووے ساقی کوثر
کنارے نہر وہ ایک بوند آب کو ترسے

آپ کے دو بیٹے محمد احمد خاں اور محمد نسیم خاں تھے۔ یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ محمد نسیم خاں تعلقدار سبلامئو کے سلسلے میں ایک بھی شاعر یا ادیب نہیں ہوا اور محمد احمد خاں احمد (۱۸۲۹-۱۹۰۳) تعلقدار کسمنڈوی خرد کے سلسلے میں سب کے سب شاعر و ادیب ہوئے۔ آپ کے گیارہ بیویاں تھیں مگر ایک وقت میں چار سے زیادہ نہیں۔ ۱۷ (سترہ) بیٹے اور ۲۰ (بیس) بیٹیاں تھیں جن کے نام "گویا اور خاندان گویا کی ادبی خدمات" (از ڈاکٹر ناہید عارف) میں ص۲۸۳ پر درج ہیں۔ جوش نے اپنی "یادوں کی برات" میں یہ تعداد ۱۱۲ (ایک سو بارہ) لکھی ہے یہ جوش کی بھول ہے۔

آپ نے شعر گوئی، علم دوستی، انگریز دشمنی، صف بندی اور شجاعت اپنے والد سے ورثہ میں پائی تھی۔ آپ بچپن ہی سے شاعر تھے اور والد سے اصلاح لیتے تھے۔ ؎

ہے جو گویا سے سخنور سے تلمذ احمد
کیوں نہ ہو ملک معانی میں اجارا میرا

آپ کا دیوان "مخزن آلام" ۱۸۹۰ء میں نامی پریس لکھنؤ سے چھپ چکا ہے

اس میں غزلیں، قصیدے، مرثیے، سلام اور سہرے وغیرہ ہیں۔ نمونۂ کلام :-

شہر میں آئے تو جنگل کی ہوا سر میں بھری
لائی صحرا میں جو وحشت تو وطن یاد آیا

آپ کے ایک بیٹے امیر احمد خاں امیرؔ (۱۸۷۶-۱۸۵۸) بھی صاحب دیوان شاعر ہوئے۔ باپ کے سامنے تقریباً ۲۸ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ آپ کا دیوان "گلشن غزال" ۱۹۰۰ء میں چھپ چکا ہے۔ اس میں نعت، سہرے، قصیدے اور غزل کے نمونے موجود ہیں۔ نمونہ کلام :-

آیا خیال زندگی بے ثبات کا
دیکھا جو ہم نے آنکھ اٹھا کر حباب کو

محمد احمد خاں احمدؔ کے دوسرے بیٹے بشیر احمد خاں بشیرؔ (۱۹۴۱-۱۸۷۴) تھے۔ انکا بھی ایک چھوٹا سا دیوان "کلام بشیر" کے نام سے چھپ چکا ہے

انھیں کے بیٹے جوشؔ ملیح آبادی ہیں۔ جوشؔ کے علاوہ محمد احمد خاں احمدؔ کے سلسلے میں وصلؔ، شورؔ، نثارؔ، رئیسؔ، شاذؔ، اثرؔ، مشورؔ، اظہارؔ، جلالؔ، شمیمؔ، جعفرؔ، ناصرؔ، ناہید، مائلؔ، عصمتؔ، عاطفؔ، عبدالرزاق خاں اور احمد سعید وغیرہ آتے ہیں۔ آجتک اس خاندان میں ادبی خدمات کا سلسلہ پورے آب و تاب کے ساتھ جاری ہے

(۷) محمد علی (۱۹۵۹ــ ۱۸۸۰) والد: چودھری احسان رسول تعلقہ: امیر پور (ردولی ضلع بارہ بنکی) انگریزی میں مہارت کی وجہ سے انگریزی حکام میں بڑی قدر و منزلت تھی۔ انتہائی شگفتہ قلم تھے۔ آپکی مندرجہ ذیل کتابیں چھپ چکی ہیں :-

۱۔ کشکول محمد علی شاہ فقیر ۲۔ میرا مذہب ۳۔ گناہ کا خوف ۔ ۴۔ صلاح کار ۔ ۵۔ یادگار کرامت حسین ۶۔ تعزیہ داری ۔ ۷۔ اتالیق بی بی ۔ ۸۔ نقاد کے نقطے ۔ ۹۔ پردے کی بات ۔ ۱۰۔ گویا دبستاں کھل گیا ۔

(۸) مذاقؔ :- نام خان بہادر نواب احمد حسین خاں (؟ ــ ۱۸۶۵) والد: خاں بہادر شیخ دوست محمد تعلقدار بریاواں (ضلع پرتاپ گڑھ) آپ کی ادبی خدمات تعداد میں بہت زیادہ اور معیار میں بہت بلند ہیں۔ پہلے آپ کے دو شعری مجموعے "کلیات مذاق" اور "جذبات مذاق" چھپے۔ ایک مجموعہ ہندی مثلوں کا "ضرب المثل" چھپا۔ ایک ناول "عقد الجواہر" شائع ہوا۔ پھر کتابوں پر کتابیں چھپنے لگیں اور ہر کتاب اپنی جگہ ایک سند کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ کی آخری اور معرکۃ الآرا تصنیف "تاریخ احمدی" ہے۔ آپ کے تصانیف کی تعداد بیالیس تک پہونچتی ہے جن کے نام "تاریخ احمدی" میں درج ہیں۔

(۹) مہرؔ :- نام درگا پرشاد (۱۹۳۰-۱۸۴۹) والد: راجہ دھنپت رائے تعلقہ: سروں بڑاگاؤں ان کے مورث اعلیٰ رائے مکھن لال ۱۷۷۰ء میں اودھ آئے اور دربار اودھ سے وابستہ ہوگئے۔ ان کا خاندان ہمیشہ اسی دربار سے متعلق رہا اور اعلیٰ عہدوں پر فائز رہا۔ مہرؔ کو فارسی پر حاکمانہ قدرت حاصل تھی آپ خط نستعلیق، خط نسخ اور خط شکست میں بھی لاجواب تھے۔

تصانیف :- ۱۔ ہسٹری آف انڈیا۔ ۲۔ تاریخ اجودھیا۔ ۳۔ تاریخ سندیلہ ۴۔ بوستان اودھ ۵۔ پندول پسند ۶۔ مہابھارت کا منظوم نامکمل ترجمہ ۔ ۷۔ ہسٹری آف دی فرسٹ ورلڈ وار ۸۔ حدیقۂ عشرت ۹۔ مثنوی ثمر الفت ۔ ۱۰۔ مثنوی مہر تاباں ۔

آپ کے چھوٹے بھائی کامتا پرشاد نجمؔ بھی اچھے شاعر تھے۔ آپ کے دو بیٹے سورج بہادر اور بخت بہادر بھی شاعر تھے ۔

(۱۰) نوابؔ :- نام راجہ نواب علی خاں (۱۹۴۹ ـ ۱۸۸۷) والد راجہ فضل حسین تعلقہ اکبر پور (سیتاپور) موسیقی میں تلمذ پنڈت بشنو نرائن بھات کھنڈے سے حاصل کیا۔ آپ کی معرکۃ الآرا تصنیف "معارف النغمات" ہے۔ دوسرا حصہ بھی چھپ چکا ہے ۔

یہ کتاب علم موسیقی میں انسائیکلو پیڈیا کا درجہ رکھتی ہے۔ ایسی کتاب اردو میں دوسری نہیں چھپی۔ آپ ہی نے لکھنؤ میں ایک میوزک کالج کی بنیاد ڈالی جس کے آپ ہی پہلے صدر ہوئے ،

بہ حیثیت مجموعی تعلقداران اودھ نے دامے درمے قدمے سخنے ہر طرح سے شعر و ادب کی خدمت کی ۔

دس ریاستوں کے تعلقداروں کی ادبی خدمات کا ذکر اور ان کے اہل خاندان سخنوروں کے تخلص دئے گئے ہیں۔ جن کی مجموعی تعداد ساٹھ (۶۰) تک پہنچتی ہے۔ بقیہ ریاستوں کے تعلقدار اور ان کے متعلقین جن کی ادبی خدمات میری گرفت میں آچکی ہیں ان کے نام مع تخلص و تعلقہ حسب ذیل ہیں :-

۱۔ نواب سید جعفر علی خاں جعفرؔ تعلقدار اہما مئو لکھنؤ ۲۔ نواب سید حسین علی خاں عرف رئیس آغا رئیسؔ تعلقدار اہما مئو (لکھنؤ) ۳۔ رئیس کے بیٹے سید صادق علی خاں عرف جمشید آغا صادقؔ ۴۔ نواب مرزا محمد حسین علی خاں سردارؔ تعلقدار دھرورہ (لکھنؤ) ۵۔ نواب مرزا رضا حسین خاں مشہدی تعلقدار بھیٹا (لکھنؤ) ۶۔ ان کے بیٹے نواب مرزا محمد تقی علی عرف لاڈلے نواب تقیؔ ۔۷۔ انکے

بیٹے مرزا محمد سجاد حسین خاں عرف انور نواب انور ۸۔ ان کے بیٹے نقی حسین خاں عرف سرور نواب سرور ۹۔ سید معصوف حسین مشتاق تعلقدار مصطفیٰ آباد (رائے بریلی) ۱۰۔ ان کے بیٹے سید نجم الدین نقوی نقوی ۱۱۔ دوسرے بیٹے سید رضی الدین نجم ۱۲ کیپٹن سید ضامن علی تعلقدار مصطفےٰ آباد (رائے بریلی) ۱۳۔ خان بہادر چودھری علی اختر اختر تعلقدار ملوا سیتاپور) ۱۴۔ احمد سیتاپوری احمد تعلقدار میوہ (سیتاپور) ۱۵۔ خان بہادر سید مسعود حسن مسعود تعلقدار جلال پور را اگر بدرگ (الکھیم پور) ۱۶۔ ان کے بیٹے مختار حسن مختار ۱۷۔ مختار کے بیٹے اختر علی نقوی اختر ۱۸۔ سید فضل رسول واسطی تعلقدار جلال پور (سندیلہ ہردوئی)۔ ۱۹۔ منشی سید فضل حسین شاعر تعلقدار جلال پور (ہردوئی)۔ ۲۰۔ ان کے بیٹے منشی سید التفات رسول ہاشمی ۲۱۔ سید ذکی حیدر ظفر تعلقدار اناؤ ۲۲۔ خان بہادر سید احمد عباس سعید تعلقدار اناؤ ۲۳۔ سید یعقوب الحسن حسن و حسرت تعلقدار اناؤ ۲۴۔ راجہ سید احمد مہدی تعلقدار پیر پور۔ ۲۵۔ راجہ سید بادشاہ حسین تعلقدار لور پور ۲۶۔ راجہ دگ وجے سنگھ تعلقدار بلرام پور تلسی پور (گونڈہ) ۲۷۔ سید غلام حیدر عزتم تعلقدار علی نگر (جردل ضلع بہرائچ) ۲۸۔ سید ریاض علی ریاض تعلقدار علی نگر (جرول بہرائچ) ۲۹۔ حاجی سید مجاور حسین فائق تعلقدار برولی ہرجنیدا (بہرائچ) ۳۰۔ سید شاکر حسین شاکر تعلقدار بروّلی ہرجندا۔ ۳۱۔ ان کے بیٹے سید ناصر کاظم ناصر ۳۲۔ سید مظفر حسین طاہر تعلقدار علی نگر (بہرائچ) ۳۳۔ ٹھاکر محمد حسن یار خاں افسری تعلقدار عثمان پور (بارہ بنکی) ۳۴۔ ان کے تین بیٹے محمود مختار خاں محمود اور ۳۵۔ محمد مختار خاں محمد ۳۶۔ ٹھاکر احمد مختار خاں مختار ۳۷۔ حمید الدین خاں حمید تعلقدار عثمان پور (بارہ بنکی) ۳۸۔ سید محمد احمد زیدی حشم تعلقدار عثمان پور ۳۹۔ سید افتخار مہدی زیدی احمر تعلقدار عثمان پور ۴۰۔ سید محمد حاکم حاکم تعلقدار سرائے اسمٰعیل (بارہ بنکی) ۴۱۔ چودھری سید ارشاد حسین ارشاد نرولی (ضلع بارہ بنکی) ۴۲۔ چودھری سرفراز احمد گیسو تعلقدار ہرئی (بارہ بنکی) ۴۳۔ ان کے بیٹے ڈاکٹر آفتاب احمد صبحی ۴۴۔ جاوید محبوب جاوید تعلقدار ہرئی ۴۵۔ چودھری محمد علی علی تعلقدار ہرئی ۴۶۔ سید معصوم علی بیدل تعلقدار پیرائے (بارہ بنکی) ۴۷۔ سید محمد صادق بشر جانی تعلقدار پیرائے ۴۸۔ سید محمد تقی شبر تقی تعلقدار پیرائے (بارہ بنکی) ۴۹۔ مولانا سید محمد عابد بشر تعلقدار پیرائے۔

فہرست بہت لمبی ہو رہی ہے۔ بس اب زید پور ضلع بارہ بنکی کے تعلقداروں کے تخلص دیکر قلم روک رہا ہوں۔ زید پور میں دو تعلقے تھے۔ ایک بڑے بھائی کے پاس ایک چھوٹے بھائی کے پاس۔ اس حساب سے وہاں چھوٹی سرکار اور بڑی سرکار بن گئی۔ ان تعلقداروں نے مرثیے، نوحے، غزلیں قصیدے تاریخیں، رباعیاں اور قطعے وغیرہ خوب کہے ہیں۔ ان دونوں سرکاروں کے تعلقداروں (حصے داروں) کی تعداد بہت ہے۔ لہذا ان کے صرف تخلص دئے جا رہے ہیں۔

۵۰۔ دل ۵۱۔ وصی ۵۲ فیضر ۵۳۔ قمر رضا ۵۴۔ خوشتر ۵۵۔ طالب ۵۶ جستن ۵۷ دلشاد ۵۸۔ سجاد ۵۹ جوشش۔ ۶۰۔ محسن ۶۱۔ اکبر ۶۲۔ صادق ۶۳۔ آقا ۶۴۔ اکرم ۶۵۔ قمر ۶۶۔ وفا ۶۷۔ زار ۶۸۔ وقار۔

□□

فن طباعت کا آغاز و ارتقاء ص۲۵ کا بقیہ

ص۲۵ کا بقیہ

میں بہت تھی اور ان کے قدردان بادشاہوں کے علاوہ علماء و امراء بھی تھے جن کے گرانقدر انعامات و اعزازات لکھنے والوں کے حوصلے بلند کرتے تھے۔ سلطان المطابع قائم ہوا تو اس وقت کتابت کرنے والوں میں مولوی ہادی علی آشک، منشی امیر اللہ تسلیم اور میر بندہ علی مرتعش جیسے ماہر خوشنویس کتابت کرتے تھے جو اس زمانے میں یک معزز پیشہ سمجھا جاتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب مطبع نول کشور قائم ہوا تو ہادی علی آشک پیرانہ سالی کے باوجود اس میں کام کرنے لگے۔ کلیات نظم غالب کی کتابت انھوں نے ہی کی تھی۔ ان کے شاگردوں میں منشی شمس الدین اعجاز رقم نے اس فن میں بہت شہرت حاصل کی۔ اعجاز رقم مطبع نول کشور میں کام کرتے تھے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بہت ہے۔ اس وقت ہندستان کے مختلف مقامات پر جو اچھے خوشنویس موجود ہیں کسی نہ کسی واسطے سے ان کا تعلق اعجاز رقم کے سلسلے سے ضرور ہوگا۔

اصلاح سنگ، یعنی پتھروں پر چھپاں حروف کو درست کرنا اور معکوس نویسی کے فن کو لکھنؤ میں ترقی حاصل ہوئی۔ یہ کہنا بجا ہوگا کہ یہ دونوں اسی سرزمین کی پیداوار ہیں۔

□□

رشین آغا
ایڈیٹر ہفت روزہ محبت - ۹۵ مقبرہ گولہ گنج
لکھنؤ ۱۸

کمال الدین حیدر: قلمی مخطوطہ اور مطبوعہ تاریخ اودھ

اودھ کے زیرِ موضوع تاریخی مخطوطہ کے بارے میں یا مطبوعہ تاریخ اودھ اور اس کے مؤلف یا مصنف سید کمال الدین حیدر کے سلسلے میں کچھ لکھنے سے پہلے تاریخ کی اس حقیقت اور المیہ کا بیان بھی بیحد ضروری ہے کہ دنیا کی ہر تاریخ میں تحریف ہوئی ہے۔ صدیوں کے طویل سفر کی گرد میں اَٹے ہوئے واقعات، ہر صاحبِ قلم کا جدا اندازِ فکر اور سب سے بڑھ کر جو طاقت اثر انداز ہوتی ہے وہ حکومتِ وقت کی منشا، و مرضی اور خوشنودی ہے۔ ایسا ہر دور اور ہر زمانے میں ہوتا آیا ہے کہ حکومتوں نے اپنے مفاد اور مطالب کے حصول کے لیے قلمکاروں کو بھی استعمال کیا اور عوام میں سے بھی بعض حضرات نے ذاتی اغراض و مقاصد کے تحت حکام کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنے قلم کو حکومتِ وقت کی مرضی کا تابع بنائے رکھا۔ اس کے برخلاف حق گوئی کے ساتھ اپنے قلم کا آزادانہ استعمال کرنے والے ہمیشہ حکومتوں کے شدید عتاب کا نشانہ بنتے رہے اور ان کے زبان و قلم پر حکومت نے کسی نہ کسی طرح اپنی گرفت کو قائم رکھا۔

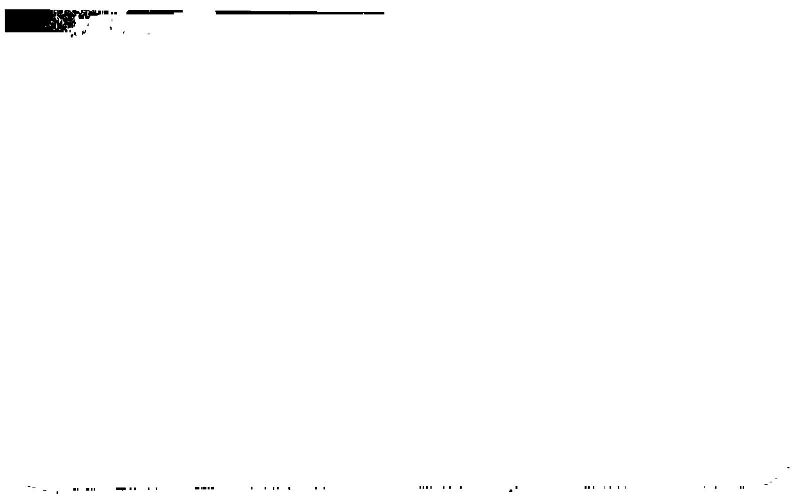
ہندستان کی ماضی قریب کی تاریخ کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اسے انگریزی حکومت کے اندازِ فکر اور اغراض و مقاصد کو پیش نظر رکھ کر ضبط تحریر میں لایا گیا۔ اگر حقائق اور واقعات کو ان کے حقیقی پس منظر میں دیکھا جائے اور ان کا تجزیہ کیا جائے تو سمجھا جا سکتا ہے کہ حقیقی اور غیر جانب دار تاریخ کا لکھا جانا ایک ایسے عہد میں کیونکر ممکن تھا جس میں ایک ہی ملک کی ایک ہی رعایا پر دوہری فرمانروائی کارفرما تھی یعنی ایک طرف تو غیر ملکی غاصب سرکار انگلشیہ یعنی کمپنی بہادر اور دوسری طرف اودھ کے دیسی اور موروثی حکمراں، جن کی طرف کمال الدین حیدر نے اسی کتاب میں بعض مقامات پر لفظ "سرکارین" سے اشارہ کیا ہے۔

جہاں لوگ صاحب ریزیڈنٹ کو "بڑے صاحب" اور گورنر جنرل کو "نواب محتشم الیہ" لکھنے کے عادی اور پابند ہوں وہاں ایسی تاریخ کی تدوین جس میں حکومت کی مرضی کے خلاف حقائق کا برملا اظہار ہو کس مؤرخ کے بس کی بات تھی؟ لیکن جہاں تک کمال الدین حیدر کی تالیف کردہ تاریخ اودھ' اور اودھ پر دستیاب دوسرے مورخین کی کتابوں کا تعلق ہے' کمال الدین حیدر ہی وہ واحد اور تنہا مورخ ہے جس نے ممکنہ طور پر کہیں کہیں بہت ہی چھوٹے سے جملے میں یا انتہائی ہوشیاری سے صرف ایک لفظ کے پردے میں حقیقتوں کا اظہار نہایت عالمانہ اور خوبصورت پیرایہ میں کیا ہے۔ بقول کمال الدین حیدر:

"ارباب سیر و تواریخ کو فقط ایسے اشارات کافی ہیں"

مثلاً نواب سعادت علی خاں اور ریزیڈنٹ جان بیلی کے تعلقات کی کشمکش کا اظہار اور انگریز ریزیڈنٹ کی چیرہ دستیوں پر تبصرہ آرائی کے لیے کیسا معنی خیز اندازِ بیان اختیار کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> "خلاصہ جناب عالی نے جو کچھ وقت ریاست میں عرق ریزی و جد و جہد کی، سب پر ظاہر ہے خصوصاً اس اپنے بے اختیار ہونے میں جتنا کہ صاحب اختیار سے نہ ہو سکا اس عہد دولت میں سوال و جواب مقدمات سرکارین تحریر پرچہ پیام پر موقوف رہا ...... کسی صاحب ریزیڈنٹ اور جناب عالی سے جیسا کہ چاہیے موافقت نہ ہوئی' اور کرنل جان بیلی صاحب سے جو دو برس کی مدت میں گویا ظاہر ہے



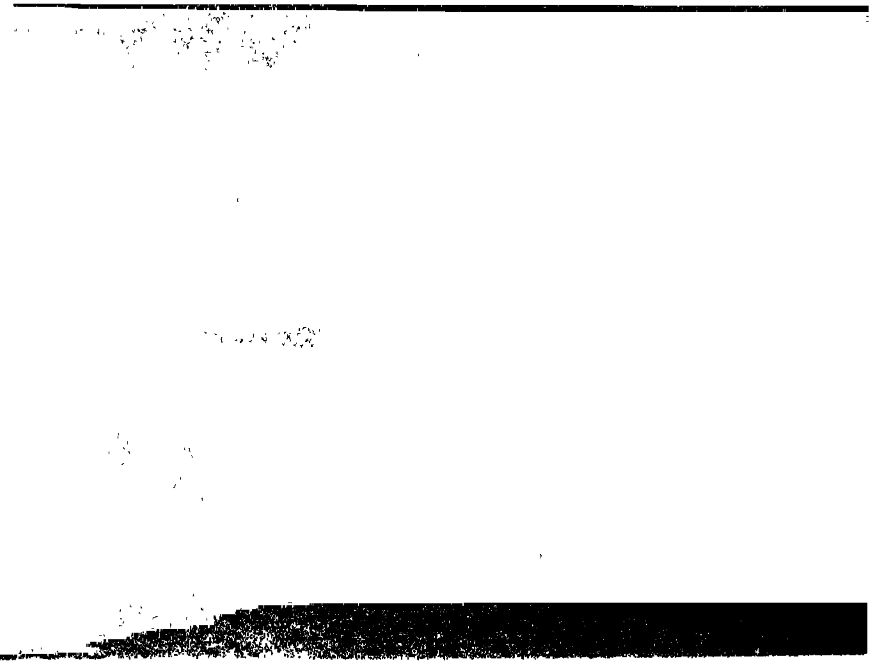
پکچر گیلری حسین آباد لکھنؤ



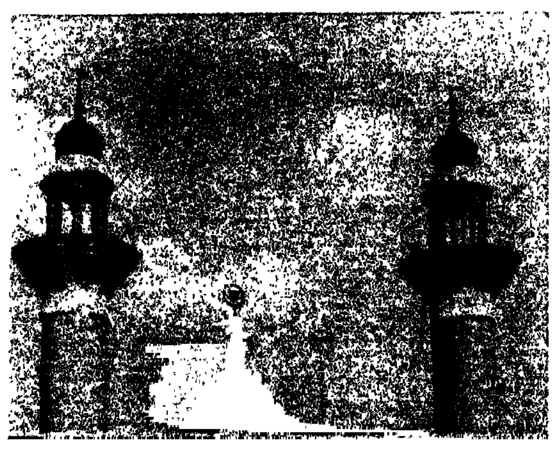
دلکشا باغ لکھنؤ



بیباپور کوٹھی لکھنؤ



جملہ تصاویر
جاوید ہاشمی

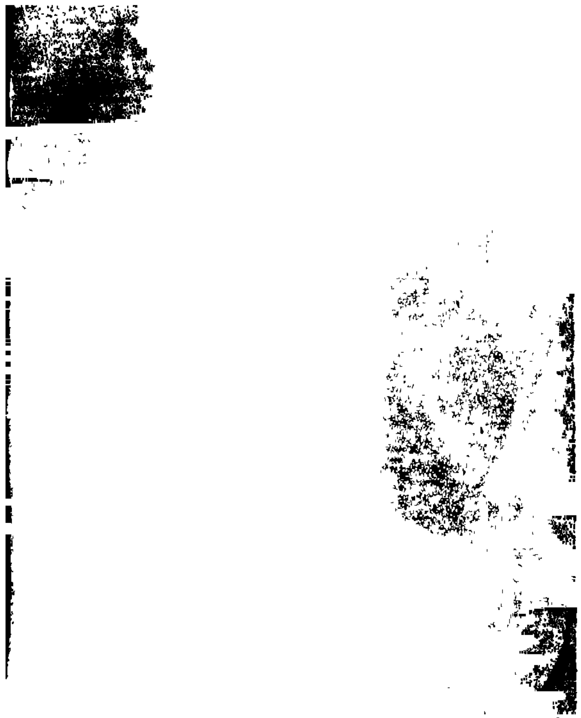


روضۂ
کاظمین
منصور نگر
لکھنؤ

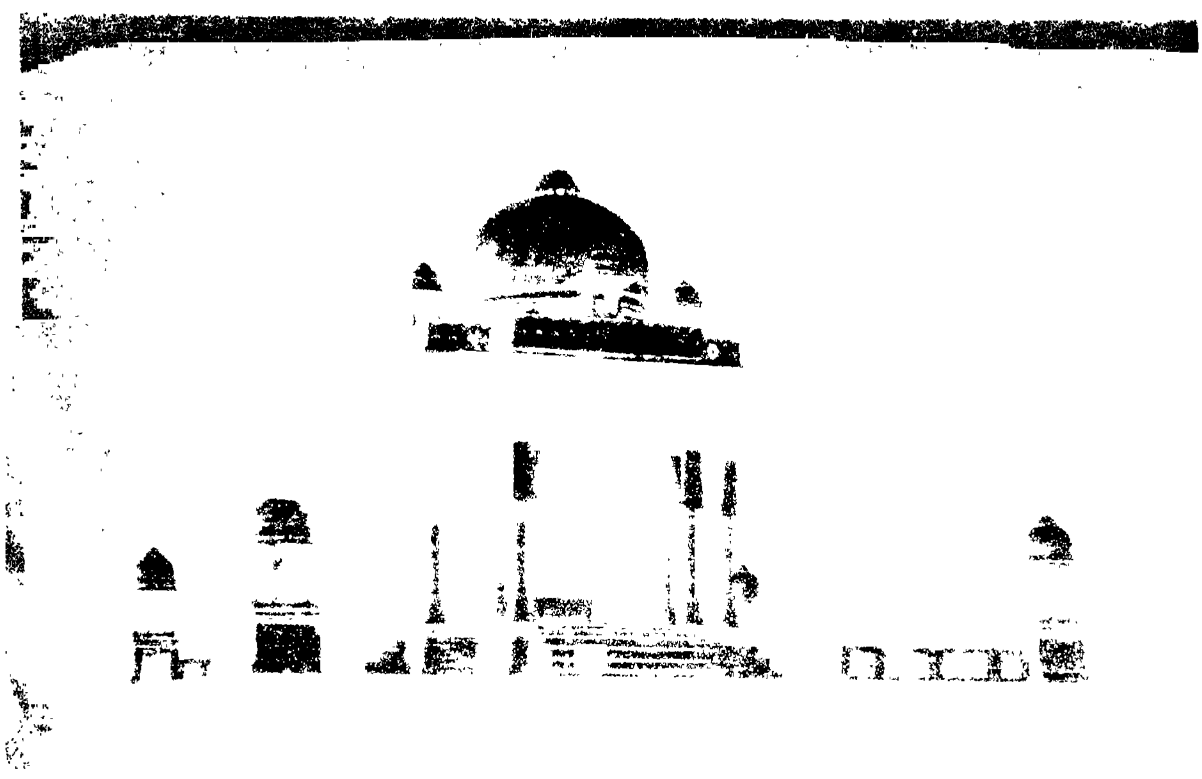


بیگم حضرت محل کی یاد میں
تعمیر کی گئی ایک عمارت
واقع حضرت محل پارک، لکھنؤ

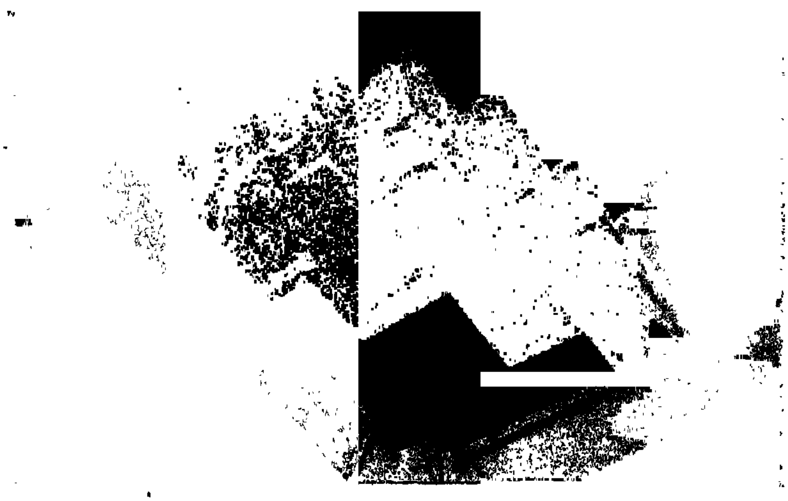
لکھنؤ کی ایک شام

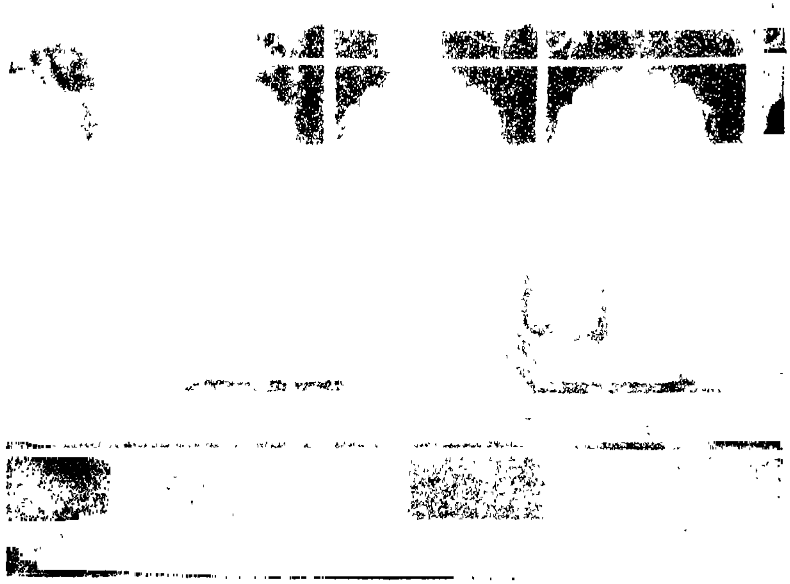


کامدانی کا کام کرتے ہوئے
اودھ کا ایک باشندہ

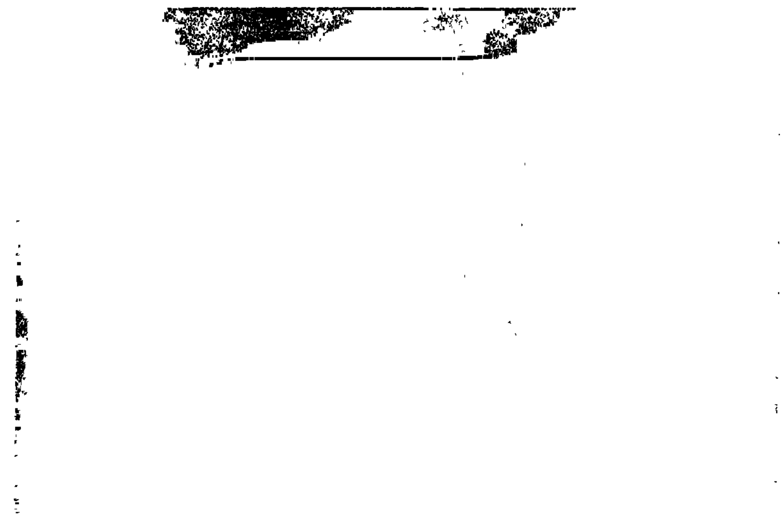


تقریباً
ایک ہزار سال پرانا
مَن کامیشور مندر
ڈالی گنج، لکھنؤ





مزار
مولانا عین القضاۃ
مدرسہ فرقانیہ
لکھنؤ



کرائسٹ چرچ
(جی پی او کے سامنے)
حضرت گنج لکھنؤ

کہ ہر امر جزو و کلی میں بہت سے امور خلاف قانون
عمل میں آئے اس کی تفصیل کہاں تک کی جائے.....
..... اوس زمانے میں ذریسی علامت سے بہت سے
اصحاب الیمین نے اصحاب الشمال ہو کر اپنے مرکز حق سے
تجاوز کر کے راہ منحنی اختیار کی تھی اور بنام نامی خیر خواہان
کمپنی ہونا اپنا مزید تفاخر سمجھتے تھے ....
خلاصہ توضیح ان حکایات کے واسطے ایک دفتر
چاہیے۔ اس کے اشارات کافی ہیں جب ایک مدت ایسے
حال پر گزری، مدت ریزیڈنسی کرنل جان بیلی بہادر کو طول
ہوا۔ ہر صاحب فہم متحیر اور حیران تھا کہ آخر اس کا انجام کار
کیا ہوگا۔"

اسی عنوان کے ذیل میں کمال الدین حیدر نے نواب سعادت علی خاں بہادر کی ہلاکت کا ذمہ دار انگریز ریزیڈنٹ جان بیلی کو قرار دیتے ہوئے سازش اور سازش کے آلۂ کار کی نشاندہی ایک لفظ کے پردے میں اس طرح کی ہے:

" رمضان علی خاں اشرف الدولہ بہادر مہتمم دیوان خانہ
اور معتمد خاص جنابعالی جلد دوڑے اور کرنل بیلی کو یہ "مژدۂ
مرگ" سنایا اور اپنا استحقاق خدمت ثابت کیا، اور
درشن سنگھ جس کا خطاب غالب جنگ ہوا تھا یا محمد غلامی
نے دوڑ کر نواب غازی الدین حیدر خاں کو اس سانحہ کی
خبر پہنچائی۔" لہ

مذکورہ بالا عبارت کی روشنی میں دیکھا جائے تو اہل نظر سے پوشیدہ نہیں کہ لفظ "مژدہ" خوش خبری کو کہتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جن لوگوں کے لئے نواب سعادت علی خاں کی موت خوشی اور اطمینان کا باعث بن سکتی تھی انھیں کے لئے ایک انتہائی الم انگیز اور غیر متوقع " سانحۂ مرگ " جس نے موقع پر موجود تمام حاضرین کو سکتے میں ڈال دیا تھا " مژدۂ مرگ " بن سکتا تھا۔

اسی طرح تاریخ اودھ جلد اول موسومہ " سوانحات سلاطین اودھ " کے سبب تالیف میں مورخ کا یہ جملہ کہ " جب سر ہنری الیٹ لکھنؤ تشریف لائے " یا یہ جملہ کہ " چنانچہ عنوان تحریر کتاب موافق دستور انگریزی کیا " اور تاریخ اودھ جلد دوم موسومہ " قیصر التواریخ " کے صفحہ ۱۱۶ پر " برگشتگی تقدیر ایں عاصی پُر معاصی اور موقوفی عملہ رصد خانۂ سلطانی " کے عنوان سے لکھی گئی عبارت کا یہ جملہ کہ " بسر اوقات مع عیال اطفال ۱۸ برس تک توکل پر رہی " وغیرہ وغیرہ محققین کے لئے بجائے خود ایک موضوع فکر اور دعوتِ تحقیق ہے۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں کہ تاریخ اودھ کے ایسے معروف مورخ کے حالات و کوائف کے ذیل میں اب تک بہت ہی کم معلومات دستیاب ہیں۔ کچھ معلومات منشی نول کشور پریس کے سپرنٹنڈنٹ مولوی اسمٰعیل نے مطبوعہ تاریخ اودھ (۱۸۷۹ء) کے خاتمۃ الطبع میں مہیا کی ہیں۔

کمال الدین حیدر کے سلسلے میں نول کشور پریس لکھنؤ کے مہتمم مولوی محمد اسمٰعیل تاریخ اودھ جلد دوم کے خاتمۃ الطبع میں تحریر کرتے ہیں:

" اس کتاب کے مصنف سید کمال الدین حیدر حسنی الحسینی
علوی نہاد لکھنوی نژاد، متوکل بمشیت رب قدیر عرف سید محمد میر
زائر مشکی کربلائے میر خدا بخش ہیں نہایت عالی خاندان والا
دودمان مولد و مسکن آبادی کرام حضرت مصنف کا تون طیس
کونہ آباد متعلقات مشہد مقدس ہے۔ آپ کے اجداد کرام میں
میر عماد صاحب نہایت مشہور شخص گزرے جن کے علم و فضل
کا شہرہ شرق سے غرب تک مشہور ہے خامہ مقطوع اللسان
اون کی تحریر اوصاف میں معذور ہے کہ وہ سر او نکے اوصاف
سے واقف ہیں کہ سید جلیل فاضل نبیل مقرب خاص سلاطین و
امرا نامدار تھے اور فن خوش نویسی خاص نستعلیق میں شہرہ آفاق
اور اپنے زمانے میں عدیل و نظیر نہ رکھتے تھے چنانچہ یہ
نقل مشہور ہے کہ حضرت شاہ عباس بادشاہ اصفہان نے
میر موصوف سے فرمایا کہ محمود غزنوی نے صلہ تصنیف شاہنامہ
فردوسی طوسی میں ایک اشرفی شعر انعام فرمایا تھا میں تم کو
بصلۂ کتابت ایک بیت کی ایک اشرفی دوں گا۔ میر ممدوح نے
قبول کیا اور تحریر کتابت شروع کی۔ چنانچہ عرصہ قلیل میں
دو ہزار بیت تحریر کیے۔ جب بادشاہ نے طلب فرمایا اوسیقدر

تحریر گزرانی۔ بادشاہ بہت پرغضب ہوئے اور فرمایا ان کا زر انعام جو تا ہے پھیرلو۔ میر ممدوح نے ہر فرد کو مقراض کر ڈالا۔ جب یہ خبر نقادان قدردان کو پہونچی مقتضیات سمجھ کر ہر بیت کو پانچ اشرفی سے دش تک دے کر با آخر خریدلیا میر صاحب نے جس قدر خزانۂ عامرہ شاہی سے لیا تھا داخل کیا۔ بادشاہ یہ خبر سُن کر زیادہ غضب ناک ہوئے اور انگوٹھے قلم کرنے کا حکم دیا چنانچہ اسی صدمے سے روز سوم میر صاحب نے انتقال کیا۔ بعد ازاں پھر بادشاہ کو بہت تاسف ہوا مگر کیا فائدہ قضائے الٰہی جاری ہو چکی تھی۔

...... حضرت مصنف عہد نواب غازی الدین حیدر میں بزمانۂ ترقی وعروج مرزا حاجی ومحمد آ زین علی خاں ملازم سرکار ہوئے ...... عہد دولت غازی الدین حیدر ہی میں تحصیل علم انگریزی کی شروع کی۔ اوس زمانے میں ہندوستانی انگریزی دان شہر میں دو چار ہی شخص تھے۔ عہد سلطنت حضرت نصیر الدین حیدر میں زمانہ عروج نواب قدسیہ محل صاحبہ ودر دورہ نواب روشن الدولہ بہادر میں واسطے تعلیم انگریزی وآتالیقی میرن صاحب صاحبزادۂ قدسیہ محل صاحبہ کے مقرر ہوئے اوسی عہد میں بزمانۂ نیابت نواب معظم الدولہ حکیم مہدی علیخاں جب بنائے اسکول انگریزی در رصد خانہ سلطانی قائم ہوئی مصنف صاحب ممدوح نے علم ریاضی وفلاسفی وعلم طبیعات کی تحصیل شروع کی اور کتاب نیچر فلاسفی یعنی طبیعات کا جس میں مختصر پانچ رسالے نجوم اور ہوا پانی وغیرہ کے تھے اُردو میں ترجمہ کیا۔ بعدہٗ رسالہ لارڈ بروہم صاحب کا ترجمہ اُردو میں لکھا (اس کے علاوہ) اکثر رسالہ علمی انگریزی کے ترجمہ اُردو میں کرکے کلکتہ، آگرہ، شاہجہاں آباد بھیجدیتے تھے اوس کے صلے میں انعام سرکار سے ملتا تھا، اوسی عہد میں جب ولکاکس صاحب مہتمم رصد خانہ سلطانی ہوئے مصنف بھی رصد خانہ میں بمواجب سو روپیہ ماہواری ممتاز رہے۔ الغرض اوسی زمانہ میں ۱۹ رسالے علمی انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کیے۔ مثل رسالہ آلات جر ثقیل۔ رسالۂ آلات آب وغیرہ رسالہ علم ہیئت۔ رسالہ علم ہوا۔ رسالہ علم مناظرہ۔ قصہ راسلس ڈاکٹر جانسن صاحب رسالہ مقاصد علوم صدر الصدور لندن لارڈ بروہم صاحب رسالہ حرارت۔ رسالہ ہیئت ڈاکٹر برنکلی صاحب۔ رسالہ معرفت طبیعی بیل صاحب۔ رسالہ آلات رصدیہ پیمسن صاحب' رسالہ علم مقناطیسی۔ رسالہ علم کیمسٹری۔ رسالہ قوانین دستور العمل سلطنت لندن۔ رسالہ میل مرکزی ارل صاحب مہتمم رصد خانہ لندن۔ تواریخ مملکت اودھ فارسی انگریزی ترجمہ کرنیل چیمبرلین صاحب۔ رسالہ کالو انترم رسالہ جغرافیہ ان رسالوں میں سے اکثر مطابع کلکتہ وشاہجہاں آباد واکبر آباد و مطبع سلطانی لکھنؤ میں طبع ہوئے چنانچہ عہد حضرت نصیر الدین حیدر بہادر سے تازمانہ حضرت سلطان زمان امجد علی شاہ رصد خانہ سلطانی میں منصوب رہے، عہد نیابت امین الدولہ بہادر میں ہمراز تھے۔ خلوت میں صلاح و مشورہ رہا کرتا تھا اوسی زمانے میں حضرت مصنف کربلا میں جاکر دس روز تک قیام کرتے تھے مجلس عزائے امام علیہ السلام ولطف مجاورت وعبادت خدا میں مصروف رہا کرتے تھے تیاری سبیل کی ابتدا آپ ہی کی ذات سے ہوئی اور مجلس امامباڑہ آغا باقر بھی آپ نے برپا کی۔

عہد سلطنت حضرت سلطان عالم واجد علی شاہ میں جب ولکاکس صاحب مہتمم رصد خانہ سلطانی نے انتقال کیا اور انتظام وہاں کا بسبب رحلت صاحب موصوف کے ڈانواڈول ہوا، بمشورۂ میجر برڈ صاحب اسسٹنٹ اول صاحب ریزیڈنٹ بہادر بزمانہ نیابت علی نقی صاحب تخفیف عملہ رصد کی تجویز ہوئی چنانچہ کچھ عملہ برطرف ہوا لیکن حضرت مصنف مع کچھ عملے کے بحال رہے اور مشاہدات رصد خانہ بدستور جاری رہا ....

اوسی زمانے میں حسب الایمائے ایلیٹ صاحب بہادر گورنمنٹ ہند کے تواریخ مملکت اودھ فارسی اور اردو میں تالیف

کی اور تقویم سالی نوروز بھی بطرز جدید موافق دستور وطرز انگریزی لکھی اور سرکاری مطبع میں چھپ کر جا بجا شہر میں تقسیم ہوئی۔ الغرض اس تواریخ کی خوب شہرت ہوئی شدہ شدہ حضرت سلطان عالم کے حضور میں اس کا تذکرہ ہوا۔ حضور نے طلب فرماکر ملاحظہ فرمائی۔ عہد حضرت مکان تک کا حال ملاحظہ فرماکر بہت خوش ہوئے۔ جب اپنی سلطنت کے حالات ملاحظہ فرمائے چونکہ مصنف نے باداے فرض وقائع نگاری جملہ حالات بلا رو رعایت تحریر کیے تھے، بادشاہ کو ناگوار گزرا۔ خلاصہ یہ کہ نواب صاحب سے برطرفی عہدہ صدر خسانہ کا حکم فرمایا۔ حضرت مصنف بھی خانہ نشین ہوکر مہمان در سید الشہداء علیہ السلام ہوئے یعنی کربلا میں رہنا اختیار کیا۔ اس عرصہ میں حوادث روزگار و انقلاب زمانہ سے کارخانہ سلطنت اودھ بھی درہم برہم ہوگیا۔ بعد ازاں فساد بلوہ لکھنؤ ہوا۔ حضرت مصنف وہیں کربلا ہی میں مقیم رہے بعد تسلط تقرر پنشن کے لیے سرکار انگریزی میں تحریک ہوئی اکثر صاحبان انگریز پنشن کے باب میں ساعی ہوئے چنانچہ کرنل چیمبرلین صاحب سابق سٹی مجسٹریٹ لکھنؤ نے بھی صاحب چیف کمشنر بہادر اودھ سے عرض کیا اور بہت اشتیاق سے اس تواریخ اودھ کا ترجمہ انگریزی میں خود فرمایا۔ آخرش بہ تقریب ڈپٹی مرزا عباس بیگ صاحب مرحوم رسالہ جات علمی مترجم حضرت مصنف اور یہی تاریخ مملکت اودھ جرنیل بیرو صاحب کے حضور میں پیش ہوئی۔ صاحب ممدوح نے سن کر بہت تعریف کی اور بکمال اشتیاق مصنف صاحب سے ملاقات فرمائی اور تقرر پنشن کے لیے رپورٹ بحضور گورنر جنرل بہادر بھیجی چنانچہ کل امر حسب باوقا تھا چند عرصے کے بعد پیشگاہ نواب ممدوح الشان سے پچاس روپیہ ماہواری کی پنشن مقرر ہوگئی۔ ....

مصنف ممدوح نے نہایت تحقیق و تنقیح سے اس تواریخ کو مکمل تالیف کرکے دو جلدوں پر منقسم کیا۔ جلد اوّل میں حالات تاریخی وزرا و سلاطین اودھ کے بسلسلہ ازدواج و اولاد خاندان عالی شان از عہد نواب سعادت خاں برہان الملک تا زمان امجد علی شاہ مسطور ہیں اور دوسری جلد میں احوال تخت نشینی حضرت سلطان عالم واجد علی شاہ و سوانحات انقلاب سلطنت و ذکر ایام غدر و حکومت مصنوعی مرزا برجیس قدر و دیگر کوائف متعلقہ بلوہ فساد ہندوستان مرقوم ہیں و نقشہ ملک اودھ و شہر لکھنؤ و تصاویر وزرا و شاہان اودھ و اہل کاران و معتمدان سلطنت نہایت ترتیب کے ساتھ اپنے اپنے مواقع پر نصب کی گئی ہیں۔ الغرض یہ کارنامہ وقایع اودھ بحضور عالیجناب ہز اکسی لنسی مہاراجہ سر دگبجے سنگھ بہادر کے۔ سی۔ ایس۔ آئی والی بلرامپور و تلسی پور اودھ پیش ہوا مہاراجہ صاحب بہادر ممدوح نے بکمال قدردانی نہایت پسند فرمایا اور حکم محکم صادر ہوا کہ یہ شاہد زیبا حلیۂ طبع سے آراستہ ہوکر جلوہ گر ہو کہ اوسکے مطالعہ سے صاحبانِ تواریخ دوست حظ وافر اٹھائیں فائدہ متکاثر پائیں.....

..... جناب منشی نول کشور صاحب مالک مطبع اودھ اخبار میں زیور طبع سے آراستہ ہوکر جلوہ ظہور پایا.... فہرست انگریزی و فارسی سے استخراج حالات میں نہایت تسہیل ہوئی مختصر تفصیل ہوئی ماہ دسمبر ۱۸۷۹ عیسوی میں شاہد رعنا نے شہرت اشاعت پائی سخن سنجان افسانہ دلفریب کو ایک مرقع صورت حال بے طول مقال ہاتھ آئے گا جو مشاہدہ کرے گا لطف بے اندازہ پائے گا امید کہ مقبول انام ہو منظور ہر خاص و عام ہو۔ فقط " ۲ے

مندرجہ بالا حوالے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ کمال الدین حیدر نہ صرف یہ کہ صاحبان کمال پر مشتمل ایک اعلیٰ خاندان کی فرد تھے بلکہ خود بھی مختلف علوم کی وسیع علمی استعداد رکھنے والی اہم شخصیت کے مالک تھے لیکن تاریخ اودھ کی تصنیف کے بعد بحیثیت مورخ ان کا نام شہرتِ عام بن کر رہ گیا۔

مذکورہ کتاب اودھ کی سلطنت کے تفصیلی حالات پر ایک مستند دستاویز

کی حیثیت سے مورخین کا موضوع رہی ہے جس کا سرسری مطالعہ بھی پڑھنے والے پر سب سے پہلے یہ تاثر قائم کر دیتا ہے کہ مورخ انگریزی حکومت کا خیر خواہ اور انگریزوں کا پرستار رہا ہے۔ انگریزوں کے اشارے پر اصل واقعات کو توڑ مروڑ کر حقائق کو چھپانے کی کتنی زبردست کوشش کی گئی ہے۔ اس گنجلک تواریخ اودھ کو منظرِ عام پر لانے والے سر مہاراجہ دگ وجے سنگھ آنجہانی بلرامپور بہ تحقیق انگریزی حکومت کے بہت ہی بڑے وفادار اور انگریزوں کے خیر خواہ شمار ہوتے تھے۔ مذکورہ تاریخ اودھ پر انھیں مہاراجہ سر دگ وجے سنگھ نے ایک دھمکی آمیز تقریظ بھی تحریر فرمائی ہے۔ تقریظ کے اختتام پر مہاراجہ صاحب فرماتے ہیں:

"ازانجا کہ ہر کاتب بعلم خود جہاں تک دریافت کر سکتا ہے اسی کو مقرون حق صداقت سمجھتا ہے اور معرض تحریر میں لاتا ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ ہر کسی مقام پر وہ خود شریک رہا ہو یا اسی کے مشورہ پر کاربندی ہوئی ہو۔ اس نظر سے اگر کسی صاحب نے نزدیک و دور دوسرے طور پر سنا ہو، تو جب تک اس کی تصدیق کی وجہ ثبوت کافی اس سے زیادہ نہ ہو زبانِ اعتراض کو تاہ رکھیں گے دراز نہ فرمائیں گے۔"

تاریخ گواہ ہے کہ حکومت جب کسی کو "زبان درازی" کا مجرم قرار دیتی ہے تو اس کی زبان گدی سے کھینچ لی جاتی ہے۔ اس طرح زبان و قلم پر پہرے لگا کر تواریخ اودھ کے اجرا کی ضرورت کیوں پیش آئی۔؟

مہاراجہ دگ وجے سنگھ کی اس تصدیق کی روشنی میں کہ مصنف مذکور نے اسی تصنیف حکام حال صدر لکھنؤ کی خدمت میں پیش کی تھی[۵] سوال پیدا ہوتا ہے کہ ۱۸۴۷ء سے ۱۸۷۹ء تک کی درمیانی طویل مدت میں کمال الدین حیدر کی جانفشانی سے لکھی گئی تاریخ اودھ کب مکمل ہوئی اور کب حکام صدر لکھنؤ کی خدمت میں پیش کی گئی؟ حکام نے کیا جواب دیا اور کن مراحل سے گزر کر بتیس برس بعد طباعت کی منزل تک پہونچی؟ اس سلسلے میں کوئی واضح عبارت مذکورہ تاریخ اودھ کی دونوں جلدوں میں نہیں ملتی۔

ایسے موقع پر یہ انکشاف بے محل نہ ہوگا کہ سید کمال الدین حیدر نے اپنی تصنیف کردہ تاریخ اودھ کا مسودہ جو دو جلدوں پر مشتمل تھا حکام صدر لکھنؤ کی خدمت میں ۱۸۶۰ء میں اجازت طبع کی درخواست کے ساتھ پیش کیا تھا جسے ۱۸۶۱ء میں ایک مشروط حکم کے ساتھ سید کمال الدین حیدر کو حکام صدر نے واپس کر دیا۔ سرکاری حکم میں کہا گیا کہ:

"کمال الدین حیدر کے تئیں تواریخ واپس کر دی جائے اور آگاہ کر دیا جائے کہ اکثر مقاموں پر تاریخ ساتھ خیر خواہی کے نہیں ہوئی ہے۔ لیکن وہ چھاپ سکتے ہیں۔ مناسب ہے کہ اول چھپی جلد واسطے ملاحظہ کے مع تحریر قلمی اس محکمہ میں پیش کرے اور تا حکم ثانی اور نہ چھاپے۔ فقط"

(دستخط انگریزی)

وہ قلمی نسخہ جو سید کمال الدین حیدر نے اجازتِ طبع کے لئے مشروط حکم کے ساتھ حکام صدر سے واپس لیا تھا۔ راقم الحروف کے پاس موجود و محفوظ ہے۔ مذکورہ قلمی دستاویز کی عبارت اور مواد کا موازنہ راقم الحروف نے مطبوعہ "سوانحات سلاطینِ اودھ" اور "قیصر التواریخ" سے کیا تو انگریزی سرکار کے اس حکم کی عبارت (آگاہ کر دیا جائے کہ اکثر مقاموں پر تاریخ ساتھ خیر خواہی کے نہیں ہوئی ہے) کا حال منکشف ہوا یعنی مطبوعہ تواریخ میں سے ایسا تمام مواد جو صریحاً انگریزی حکومت کے خلاف تھا، خارج کر دیا گیا ہے اور بیشتر مقامات کی عبارت کو توڑ مروڑ کر واقعات کی شکل و صورت بالکل بدل ڈالی گئی ہے۔ اکثر عبارت کا رُخ اپنی تعریف کی طرف موڑ لیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مطبوعہ تواریخ اودھ کا مطالعہ کرنے والے کے ذہن میں قدرتی طور پر یہ تاثر قائم ہو جاتا ہے کہ کمال الدین حیدر مرحوم نے تواریخ اودھ کی تصنیف کے ذریعہ انگریزی حکومت کی خوشامد اور خیر خواہی کا فرض انجام دیا ہے۔ حالانکہ کمال الدین حیدر مرحوم کی مذکورہ اصل دستاویز کی روشنی میں ایسی تمام بدگمانیوں کا ازالہ بھی ہوتا ہے اور انگریزی حکومت کی چالبازیوں کا پردہ بھی چاک ہو جاتا ہے۔ سید کمال الدین حیدر مرحوم مصنف تاریخ اودھ کے ان تاثرات کی ایک جھلک جو موصوف کی قلمی دستاویز میں موجود ہے اور جنھیں مطبوعہ "قیصر التواریخ" سے حذف کر لیا گیا ہے، ملاحظہ کیجیے۔ سلطان عالم واجد علی شاہ سے بہ جبر اودھ کی سلطنت چھین لیے جانے کی کارروائی کے بارے میں کمال الدین حیدر یوں رقمطراز ہیں:

"اب طرفہ ماجرا ہے بمجرد دیکھنے مضمون اشتہارات

اور معطل ہوتے بادشاہ کے تمام کارندوں کو چاہیے کہ سب رعایا، غربا اور ملازم اگر در حقیقت بر طبق مضمون اشتہار نالاں اور گرفتار مصائب کے ہوتے تو راضی اور شاداں ہو کر شکر گزار اور مداح انگریزی سرکار کے ہوتے لیکن برعکس اس کے سب رعایا، غربا اور ملازم بلکہ قیدی جو قید سے چھٹ گئے ہیں نالاں اور فریاد کناں ہیں کہ ہمیں وہ قید اور گرفتاری پسند اور قبول تھی۔ عہد بادشاہ رحمت مجسم میں سب شروں سے محفوظ ہو کر اپنے حال میں خوش تھے اب اس عمل میں رہائی کو اسیر قید جانتے ہیں کہ کہیں روٹی نہ ملے گی، پس جب حال قیدیوں کا جو چھٹ گئے ہوں یہ ہو تو کیف حال خلائق کہ گھر گھر کوچہ بکوچہ حسرات ماتم دیکھا برپا ہے۔"[۴]

اسی واقعہ انتزاع سلطنت اودھ کے بارے میں موصوف نے تحریر کیا ہے:

"مؤلف کتاب کہتا ہے کہ مدت حکومت سلطنت

صاحبان عالیشان کو آج ایک سو پانچ برس کا عرصہ گزرا،

پہلے صوبۂ بنگال، اوڑیسہ اور بہار ۸۰ کروڑ روپے کا ملک

سرکار کے قبضے میں آیا بعد اس کے تمام ہندوستان رفتہ

رفتہ داخل ممالک محروسہ سرکار ہوتا چلا آیا۔ لیکن یہ کسی نے نہ

سنا اور دیکھا ہوگا کہ حال قلب تمام ہندوستان بلکہ تمام

عالم کا ادنیٰ سے اعلیٰ اس طرح سے متغیر اور دہل گیا ہو

یہ امر تو فقط خدا کی طرف سے ہے اور اسے کیا کہیے اور

کیوں کر دلوں کو تسکین دیجیے امر اختیاری نہیں ہے"۔[۵]

اب ملاحظہ فرمایئے سبب تالیف کے اس جملے کی حقیقت جو مذکورہ قلمی مخطوط اور مطبوعہ تاریخ اودھ (۱۸۷۹ء) دونوں ہی میں پایا جاتا ہے:

"چنانچہ عنوان تحریر کتاب موافق دستور انگریزی کیا۔" حقیقتاً مذکورہ قلمی مخطوط میرے پیش نظر نہ ہوتا تو شاید اس جملے کا رمز آسانی سے سمجھ میں نہیں آسکتا تھا۔

دراصل اودھ پر قبضے کے بعد عوام پر انگریزی زبان مسلط کرنے کے ابتدائی اقدامات میں انگریزی سرکار کا طریقہ کار یہ تھا کہ سرکار کی سرپرستی یا سرکاری امداد سے کسی بھی زبان میں چھپنے والی کتاب کے ٹائٹل صفحہ پر کتاب کا نام باعنوان "مدمن زبان" میں لکھے جانے کی پابندی تھی۔ ثبوت کے لئے انگریزی کے باقاعدہ رواج پانے سے قبل کے انگریزی عہد کی شائع شدہ کتابوں میں اس شرط کی پابندی کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے چنانچہ کمال الدین حیدر نے بھی جب اپنی کتاب تاریخ اودھ کی دونوں جلدیں اودھ پر انگریزوں کی باقاعدہ عملداری کے تین برس بعد درخواست طبع کتاب کے ساتھ ۲۶ر جون ۱۸۶۰ء کو حکام صدر لکھنؤ کی خدمت میں پیش کی تھیں تو اس شرط کی پابندی کو ملحوظ رکھا تھا۔ جلد اول کے ٹائٹل پر کمال الدین حیدر نے انگریزی میں درج ذیل عبارت تحریر کی ہے:

BRIFF HISTORY OF OUDE INTO URDU INTWO VOLS.

1st FROM THE COMMENCEMENT TILL THE REIGN OF

UMJAD ALLY SHAH KINE OF OUDE

BY SYED KAMALOODEN HYDER MOONSHI AND

TRANSLATOR TO THE LATE COLL. RE WILCOX

SUPDT OF THE LATE OBSERVATORY LUCKNOW 1859

جس کا اُردو ترجمہ مختصر تاریخ اودھ ہوتا ہے نہ کہ "سوانحات سلاطین اودھ" یہ نام مہاراجہ ورگیجے سنگھ آف بلرامپور کا عطا کردہ معلوم ہوتا ہے۔ مذکورہ تاریخ اودھ کی دوسری جلد جسے مہاراجہ صاحب نے "قیصر التواریخ" کے نام سے موسوم کیا ہے اس کا نام کمال الدین حیدر نے "تقویم حالِ سلطنتِ صوبۂ اودھ" رکھا تھا۔ قلمی مخطوطہ کی دوسری جلد کا سرورق بھی مذکورہ پابندی کا مظہر ہے جس پر انگریزی میں یہ عبارت درج ہے:

TAKWEEM HALE SULTANATE SOBIA OUDE INTO URDU

- 2nd VOLS PARTICULAR AFFAIRS REIGN OF

SOOLTAN ALLUM WAJID ALLY SHAH KING OF OUDE

BY SYED KAMALOODEN HYDER MOONSHI AND

TRANSLATOR TO THE LATE COLL WILCOX SUPT OF

THE LATE OBSERVATORY LUCKNOW 1859

دراصل دوسری جلد واجد علی شاہ کے عہد سلطنت کے احوال پر مشتمل ہے اور واجد علی شاہ کی سلطنت کے آغاز کا سنہ ۱۸۴۷ عیسوی ہے۔ "تقویم حال سلطنت صوبۂ اودھ" سے واجد علی شاہ کے سنہ جلوس کی تاریخ برآمد ہوتی ہے۔ کمال الدین حیدر کی تاریخ اودھ کی جلد اول کا آغاز چند اشعار پر مشتمل ایک قطعہ تاریخ سے ہوا ہے۔ یہ قطعہ تاریخ قلمی مخطوطہ اور مطبوعہ دونوں

ہی کتابوں میں موجود ہے۔ "تقویم حالی سلطنت صوبۂ اودھ" مذکورہ جلد اوّل کے قطعہ تاریخ کا آخری مصرعہ ہے۔ کمال الدین حیدر نے اسی مصرعہ کو جلد دوم کا عنوان قرار دیا ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی لکھا گیا ہے کہ سر ہنری الیٹ واجد علی شاہ کے عہد سلطنت ہی میں آیا تھا اور اسی نے تاریخ اودھ لکھے جانے کی فرمائش کی تھی۔ قلمی مخطوطے کے مطابق تاریخ اودھ کی مذکورہ دونوں جلدیں ۱۸۵۹ء میں مکمل ہو گئیں۔ سبب تالیف میں درج عبارت کی روشنی میں یہ دونوں جلدیں اُردو اور فارسی میں تیار کر کے جون ۱۸۶۰ء میں درخواست طبع کتاب کے ساتھ انگریزی سرکار کے سامنے پیش کی گئیں جنھیں اکتوبر ۱۸۶۱ء میں چیف کمشنر کے ایک مشروط حکم کے ساتھ کمال الدین حیدر کو واپس کیا گیا تھا کہ تاریخ اودھ میں جو باتیں یا واقعات انگریزی سرکار کی نظر میں خیر خواہی کے خلاف درج کر دیئے گئے ہیں انھیں وہ اپنی کتاب سے خارج کر دیں گے۔ لیکن سید کمال الدین حیدر مرحوم مختلف علوم پر حاوی ہندستانی وضع قطع رکھنے والی ایک باکردار شخصیت کے حامل تھے۔ انھوں نے ایک غیر جانبدار مورخ کی حیثیت سے اودھ کی تاریخ جمع کرنے میں گیارہ بارہ برس تک جو عرق ریزی کی تھی اس میں تحریف کر کے کسی کی خوشنودی حاصل کرنے پر وہ راضی نہیں ہوئے ورنہ تاریخ اودھ ۱۸۶۱ء کے آس پاس ہی شائع ہو گئی ہوتی۔

اٹھارہ برس کے طویل وقفے کے بارے میں مطبوعہ تاریخ اودھ کی دوسری جلد موسومہ قیصر التواریخ کے صفحہ ۶۱ پر "سرگشتگی تقدیر این عاصی پُر معاصی" کے عنوان سے لکھی گئی عبارت میں ہی اس کا ثبوت موجود ہے جس میں کمال الدین حیدر نے اس کا اظہار کیا ہے کہ وہ اپنی صاف گوئی اور غیر جانب داری کی خطا پر "سرکارین" یعنی بادشاہ اور بادشاہ گر دونوں ہی کی ناراضگی اور عتاب کا شکار ہو گئے۔ مذکورہ بالا عنوان کی پوری عبارت آپ بھی ملاحظہ کیجئے۔ کمال الدین حیدر یوں رقمطراز ہیں:

"جب اس عاصی پر معاصی نے حسب الحکم ہنری الیٹ صاحب بہادر سکرٹر اعظم گورنمنٹ اور بتصحیح و مقابلہ کرنل ولکاکس صاحب بہادر یہ تواریخ اودھ موافق دستور انگریزی لکھی جس میں خوشامد اور تعریف زائد جانبداری کسی کی نہیں ملحوظ رکھی اکثر صاحبان عالی شان منصف و قدر شناس ہوئے۔ چنانچہ جنرل سلیمن صاحب بہادر ریزیڈنٹ اور کلنٹ صاحب مہتمم کالج جنرل مارٹن ڈاکٹر اسپرنگر صاحب نے بہ نظر اصلاح دیکھا اتفاقاً قطب الدولہ مقرب خاص بادشاہ نے اس کا ذکر بادشاہ سے اس خیال سے کیا کہ ازراہ قدر شناسی کچھ بھلا ہو جائے مگر خوبی قسمت سے اپنے یہ بالعکس صورت ہوئی ع

اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی

صادق آیا۔ یا لقمۂ نان جو بذریعہ صاحب متوفی و بہ سفارش جنرل کانفیلڈ صاحب ریزیڈنٹ بہادر سے منت مومنین دربار مقرر ہوا تھا ازراہ قدر شناسی سلطان عادل موقوف ہوا۔ وجہ یہ ہے کہ قطب الدولہ نے جب تواریخ مجھ سے منگوا بھیجی بادشاہ نے جب حضرت جنّت مکان کا احوال دیکھا بہت خوش ہوئے اور تعریف کی، جب اپنے احوال پر آئے بعض مقام جو حقیقت میں سچ تھے دیکھے اور خفا ہو کر برطرف کیا۔ ہر چند میں نے واسطے سے کہا کہ اگر میں خود پڑھ کر اُن مقامات کو سناتا اور خفا ہوتے جواب شافی دیتا مگر مجھے وہ نہ لے گئے، یہاں کچھ طمع نہ تھی کہ امیدوار ہوتا، صبر کیا۔ بسر اوقات مع عیال اطفال ۱۸ برس تک توکل پر رہی۔ مگر شکر ہے کہ کسی امیر شہر کے دروازے پر نہ گیا۔ حضور عالم البتہ سال بھر کے بعد کچھ اعانت کرتے تھے۔ موافق اپنے عقیدے کے یہ در دولت کربلا قاسم رزق کا تھا باعث دبے منّت رفع احتیاج ہوئی جب عملداری گورنمنٹ ہوئی متواتر عرض حال کیا۔ کسی نے نہ سُنا، صبر کیا۔ جب علاء رصد خانہ برطرف ہوا بنگالی وغیرہ جو بسفارش اکبر آباد و الہ آباد سے آئے تھے جنرل سلیمن صاحب سے درخواست پنشن کی کی۔ بادشاہ نے فرمایا پنشن دستور سرکار نہیں اور اس مصنف تواریخ سے ہمیں رنج ہوا ہے۔ بعد اس کے

بخاطر جنرل صاحب تہائی حصہ پنشن کو ملنے کے لیے اجازت ہوئی سوائے اس معتوب کے بہرحال صبر کرنا چاہیے جب جنرل بیرو صاحب کو چودہ رسالے علمی مع تواریخ اودھ ڈپٹی مرزا عباس بیگ نے دکھائے کہ یہ شخص محروم پنشن سے رہے رپورٹ صدر کو کیا، نصف تنخواہ معینہ یعنی پچاس روپئے ماہواری مقرر ہوئی مگر الحمدللہ کہ وہ کتاب جو ملاحظہ بادشاہ میں آئی تھی ۱۸ یا ۱۹ جز تھے، اب ۷۰ یا ۸۰ جز کے تقریباً کتب مبسوط طیار ہے۔ ایک جلد فارسی اُردو اور انگریزی جنرل چیمبرلین صاحب نے خود اور پاٹر صاحب سے ترجمہ کرایا ہے کئی سے روپیہ اوسکی طبع میں صرف ہوا۔ اور غالب ہے کہ نفع بھی ہو مگر سرکار خود طبع نہیں کر سکتی ہے مجھے اختیار ہے یا جو شخص ازراہ قدردانی طبع کرائے۔ جب اس کے قدرشناس دیکھیں گے البتہ مجھے بہ نیکی یاد کریں گے آئندہ اختیار بخدا۔ وہ کسی کی محنت برباد نہیں کرتا ضرور اس کا اجر دیتا ہے فقط۔"

اب مذکورہ بالا عبارت کے اس جملے پر غور کریں کہ" بسر اوقات مع عیال و اطفال ۱۸ برس تک توکل پر رہی"۔ کیا ۱۸۷۹ء میں چھپی ہوئی تاریخ اودھ میں یہ جملہ اس کی غمازی نہیں کر رہا ہے کہ تاریخ اودھ ۱۸ برس پہلے مکمل کرکے حکام کے سامنے پیش کی گئی تھی قلمی مخطوطہ میں درج ۱۸۶۱ء سے اس کی تصدیق بھی ہو جاتی ہے۔

اسی عنوان کے ذیل میں فارسی جلد کا بھی تذکرہ ہے۔ حالاں کہ قلمی دستاویز میں صرف اُردو اور فارسی جلدوں ہی کی موجودگی کا بیان ہے جبکہ مطبوعہ تاریخ اودھ میں ایک تیسری انگریزی جلد کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ بہرحال قلمی مخطوطہ اور مطبوعہ تاریخ میں ذکر کیے گئے فارسی نسخے کے بارے میں سی۔ اے۔ اسٹوری نامی ایک مشہور (CATELOGUER) کیٹلاگر نے اپنی مشہور کتاب پرشین لٹریچر (Persian Literature) مطبوعہ لندن ۱۹۳۹ء) میں لکھا ہے کہ تاریخ اودھ کی فارسی جلد کے بارے میں مجھے معلوم کہ وہ چھپی یا نہیں۔!

لیکن راقم الحروف نے ۱۹۸۴ء میں ڈاکٹر کے۔ پی۔ سریواستوا ڈائرکٹر محکمۂ آثار قدیمہ اتر پردیش لکھنؤ کی ناقابل فراموش مہربانی اور الہ آباد اسسٹنٹ آرکائیوز کے ٹیکنیکل اسسٹنٹ محترم جلال الدین صاحب کی خصوصی توجہ اور ذاتی دلچسپی سے مذکورہ تاریخ اودھ کی فارسی جلد کے الہ آباد آرکائیوز میں محفوظ ۹۴ صفحات نہ صرف یہ کہ بچشم خود دیکھے بلکہ چند اہم صفحات کی فوٹو کاپیاں بھی حاصل کرلیں۔ اہم بات یہ ہے کہ فارسی نسخے کی عبارت راقم الحروف کے پاس محفوظ قلمی مخطوطے سے عین مطابقت رکھتی ہے اس کے برخلاف قلمی مخطوطہ (اُردو) اور مطبوعہ تاریخ اودھ (اُردو) کی زبان اور طرز بیان بالکل مختلف ہیں بلکہ قلمی مخطوطے میں درج واقعات بھی مطبوعہ تاریخ اودھ کے بعض اندراجات کی نفی کرتے ہیں۔

جہاں تک کمال الدین حیدر کے سنہ ولادت و وفات کا تعلق ہے راقم الحروف کے پاس ایک ورق آوارہ پر درج دو قطعات تاریخ کے مطابق ان کی ولادت ۱۷۹۷ء اور وفات ۱۸۸۱ء میں ہوئی۔ مذکورہ قطعات تاریخ کسی شاعر نے جو نجم تخلص فرماتے تھے نظم کیے ہیں بہ ہزار کوشش بسیار ابھی تک یہ تحقیق نہیں ہو سکا کہ نجم کون تھے! اس انکشاف نے کہ سید کمال الدین حیدر کا انتقال ۱۸۸۱ء میں ہوا، مطبوعہ تاریخ اودھ (دسمبر ۱۸۷۹ء) کو اور بھی مشکوک بنا دیا ہے۔ قطعہ تاریخ کے مطابق کمال الدین حیدر نے اٹھتر برس کی عمر میں انتقال کیا۔ اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ کمال الدین حیدر نے ۱۸۶۱ء میں حکام کی طرف سے تاریخ اودھ کا اپنا مسودہ واپس لے کر حکام کے حسب مرضی تاریخ میں تحریف پر راضی نہیں ہوئے انگریزی سرکار نے اٹھارہ برس بعد جب کمال الدین قریب المرگ رہے ہوں گے مصنف ہی کے نام سے اپنے ایک ہوا خواہ دگبیجے سنگھ آف بلرامپور کے ذریعہ ۱۸۷۹ء میں تحریف شدہ "سوانحات سلاطین اودھ" اور "قیصر التواریخ" شائع کرادی تاکہ یہ سمجھا جائے کہ کمال الدین حیدر کی نظر میں اگر مطبوعہ تاریخ میں قابل اعتراض مواد ہوتا تو وہ خود احتجاج کرتے۔ دوسری صورت میں یہ بھی ممکن ہے کہ مطبوعہ مذکورہ تاریخ اودھ کمال الدین حیدر کے انتقال کے بعد چھاپی گئی ہو اور کتاب پر سنہ اجراء کمال الدین حیدر کی حیات کا ڈالا گیا ہو تاکہ کوئی اعتراض نہ کر سکے اور ستم بالائے ستم یہ کہ مطبوعہ تاریخ اودھ میں ایک دھمکی آمیز تقریظ لکھ کر اعتراض کرنے والوں کے زبان و قلم پر پہرے بٹھا دیئے گئے۔!

تاریخ اودھ پر اب تک لکھنے والوں نے عام طور پر سید کمال الدین حیدر کو انگریزی سرکار کا پرستار گردانا ہے اور بعضوں نے تو مرحوم کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا ہے حالانکہ اگر نگاہ انصاف سے دیکھا جائے اور مطبوعہ تاریخ اودھ ہی کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اسی میں انگریزوں کی مکاری ثابت کرنے کا بہت کچھ مواد موجود ہے اور قلمی مخطوطہ کے مندرجات و مصدقات کی روشنی میں تو یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ سید کمال الدین حیدر انگریزی حکومت کے خیر خواہ تھے۔

لیکن حالات کی اس ستم ظریفی کو کیا کہیے کہ ایک جابر اور ظالم حکومت نے اپنی طاقت کے زور پر ہندستان کے وطن پرستوں کو غدار اور بعض غداروں کو "ہیرو" بنا کر سیدھے سادے ہندستانیوں کو گمراہ کرنے کا عمل برسوں جاری رکھا۔[۶]

عہد حاضر کا تقاضہ ہے کہ ذاتی مفادات اور جھوٹی انا کی تسکین کے لئے تاریخ کے چہرے پر گمراہ کن پردے ڈالنے والوں کے برخلاف صاحبان انصاف تاریخ اور مورخین کے چہروں پر پڑی ہوئی نقابوں کو ہٹا کر عوام کو حقیقی صورت حال سے روشناس کرانے کا فریضہ انجام دیں۔ خصوصاً اودھ کے ایک ایسے مورخ کے بارے میں تحقیق کا حق ادا کریں، جو ۱۷۹۴ء میں (سید کمال الدین حیدر) پیدا ہوا تھا اور جو نواب سعادت علی خاں، اودھ کے پہلے بادشاہ غازی الدین حیدر، دوسرے بادشاہ نصیر الدین حیدر، تیسرے بادشاہ محمد علی شاہ، چوتھے بادشاہ امجد علی شاہ پانچویں بادشاہ واجد علی شاہ و برجیس قدر کی سلطنتوں کے احوال اور غدر (جنگ آزادی) کے حالات نیز اودھ پر انگریزی سرکار کے غاصبانہ قبضہ کا ایک چشم دید گواہ بھی تھا۔

□□

حواشی:

۱۔ "سوانحات سلاطین اودھ" مطبوعہ جلد اول ص ۲۰۱

۲۔ قیصر التواریخ

۳۔ بیگم حضرت محل اور تحریک آزادی۔ مطبوعہ ماہنامہ شیرازہ جلد ۲۱ شمارہ ۸، اگست ۱۹۸۲ء سرینگر کشمیر (مضمون راقم الحروف)

۴۔ قلمی مخطوطہ سید کمال الدین حیدر جلد دوم موسومہ "تقویم حال سلطنت صوبہ اودھ"

۵۔ قلمی مخطوطہ جلد اول (سید کمال الدین حیدر)

۶۔ قلمی مخطوطہ جلد دوم (" " ")

۷۔ "حضرت مکان" طباعت کی غلطی ہے دراصل "جنت مکان" ہونا چاہیے کہ یہ امجد علی شاہ کا لقب تھا۔ یہاں پر غالباً انھیں کی طرف اشارہ ہے غازی الدین حیدر کے انتقال کے بعد "خلد مکان" کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ (ن۔ا)

اصحابِ اہلِ بیتؑ

[illegible] ۷۷/۲۵۸ ... ۲۲۶۰۰۲

شاعر: —

سلام تم پہ اے اصحابِ اہلِ بیتؑ سلام
تمھاری عالی مقامی میں کچھ نہیں ہے کلام

آواز: جہاد تیری امانت ہوں سُرخرو ہوں میں
سنو، سنو کہ خطابت کی آبرو ہوں میں
چلا ہوں لیکے صداقت کی عظمتِ روشن
بڑھا رہا ہوں شجاعت کی عظمتِ روشن

شاعر: سلام تم پہ اے اصحابِ اہلِ بیتؑ سلام
تمھاری عالی مقامی میں کچھ نہیں ہے کلام

آواز: فتح مُبین کی عظمت کا ایک منظر ہوں
اگر فرات ہے دریا تو میں سمندر ہوں
جو کٹ گئے ہیں یہ بازو تو ہم کو کیا غم ہے
ہمارے نام پہ دُنیا کی آنکھ پُرنم ہے

شاعر: سلام تم پہ اے اصحاب اہلِ بیت سلام
تمھاری عالی مقامی میں کچھ نہیں ہے کلام

امین حسن نورانی
کٹرہ باغ لکھنؤ

لکھنؤ میں فنِ طباعت کا آغاز و ارتقا

ایک مختصر جائزہ

سرزمینِ لکھنؤ کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ کئی صدیوں سے علم ودانش کا مرکز رہا ہے۔ ہر دور میں ہنرمندوں اور فن کاروں کی بدولت اس کو نمایاں حیثیت رہی ہے۔ جہاں تک فنِ طباعت کا تعلق ہے اس کا آغاز یہاں کچھ تاخیر سے ہوا لیکن مختصر مدت میں اس فن کو اتنا دلکش و دیدہ زیب بنا دیا کہ اسے دوسرے ہم عصر مطابع پر فوقیت حاصل ہوگئی اور نصف صدی کے اندر لکھنؤ کے مطابع کو ملک گیر شہرت حاصل ہوئی۔ مرزا غالب نے لکھنؤ کی طباعت اور مطابع کے متعلق لکھا ہے:

"دیوانِ اُردو چھپ چکا، ہائے! لکھنؤ کے چھاپے خانے نے جس کا دیوان چھاپا اس کو آسمان پر چڑھا دیا۔ حسنِ خط سے الفاظ کو چمکا دیا۔ دلّی اور اس کے پانی پر اور اس کے چھاپے پر لعنت۔ صاحبِ دیوان کو اس طرح یاد کرتا، جیسے کوئی کتے کو آواز دے۔" [1]

ہندستان میں فن طباعت کا آغاز ۱۵۵۰ء میں پرتگالیوں کی بدولت ہوا، جنھوں نے جنوبی ہندستان میں پہلا مطبع قائم کیا۔ اس کے بعد سری رامپور کے عیسائی مبلغوں نے عیسائیت کی تبلیغ کے لئے جنوب میں کئی مقامات پر مطابع جاری کیے اور اس علاقے کی زبانوں میں کتابیں طبع کیں اور اس فن کو ترقی دی۔ ۱۷۷۲ء میں مدراس کے اندر بھی چھاپہ خانہ قائم ہو چکا تھا۔ کلکتہ میں ۱۷۷۹ء میں مطبع قائم ہوا۔ ۱۸۰۱ء میں "ہندستانی پریس" کے نام سے کلکتہ میں ایک مطبع قائم ہوا، جس میں فارسی اور اُردو کی کتابیں چھپنے لگیں۔

لکھنؤ میں پہلا مطبع نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ نے ۱۸۲۰ء میں اپنی تخت نشینی کے بعد قائم کیا تھا۔ یہ مطبع ایک انگریز مسٹر ارسل کے ذریعہ جاری کرایا گیا تھا، جس کا سامان وہ اپنے ساتھ لایا تھا اور کچھ لکھنؤ میں تیار کیا تھا۔ یہ ٹائپ پریس تھا، اس کا نام سلطان المطابع رکھا گیا۔ اس مطبع نے عربی اور فارسی کی بڑی ضخیم کتابیں طبع کیں جن میں فارسی لغت، ہفت قلزم کی سات جلدیں اور تاج اللغات عربی کی آٹھ سے زیادہ جلدیں شامل ہیں۔ حسنِ طباعت اور صحت کے اعتبار سے ان کو بہت پسند کیا گیا۔ اس مطبع میں کتابوں کے علاوہ شاہی فرمان اور دوسرے دفتری کاغذات بھی چھپتے تھے۔ سلطان المطابع کے بعد لکھنؤ میں لیتھو طریق طباعت کا سلسلہ شروع ہوا اور متعدد مطابع کا قیام عمل میں آیا، جن میں کتابوں کے علاوہ اخبارات بھی طبع ہوتے تھے۔ یہاں صرف ان چند مطابع کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جو اپنے طباعتی کارناموں کے باعث بہت مشہور و ممتاز ہیں۔

مطبع حاجی حرمین شریفین

سلطان المطابع کے بعد اس مطبع کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے مالک حاجی محمد حسین تھے جو لکھنؤ کے ایک معزز شہری تھے اس کا نام مطبع محمدی رکھا تھا لیکن یہ مطبع حرمین شریفین کے نام سے مشہور ہوا۔ حسن طباعت کے اعتبار سے اس کا معیار بہت بلند تھا۔ اس مطبع نے مذہبی کتابوں کی طباعت پر زیادہ توجہ دی۔ ۱۸۴۹ء میں بادشاہ اودھ کے حکم سے تمام چھاپے خانے بند کر دیے گئے اور اعلان کیا گیا کہ "اگر کوئی شاہی اجازت کے بغیر ظاہری یا باطنی طور پر کچھ چھاپے گا تو مجرم لکھا جائے گا۔" [2]

اس اعلان کے بعد تمام مطابع بند ہو گئے، یہ مطبع بھی بند ہو گیا اس پابندی پر شاقہ ہو کر حاجی حرمین اپنے مطبع کو کانپور لے گئے لیکن وہاں

[illegible] ہوگا۔ کچھ عرصے بعد [illegible]
[illegible] کی حیثیت سے شیخ جنت علی مقرر کیے گئے۔ انھوں نے تمام مطابع کے مالکان کو طلب کیا اور حکم دیا کہ سب کے سب اپنا اپنا مطبع سلطان المطابع کے احاطے میں لے آئیں۔ بصورت دیگر چھکڑا دیں کہ تمام عمر اس شہر میں پھر کبھی کچھ نہ چھاپ سکیں گے۔ چونکہ حاجی حرمین کا مطبع کان پور میں منتقل نہیں تھا اس لیے وہ دوبارہ لکھنؤ لے آئے اور سرکاری حکم کے مطابق سلطان المطابع کے ماتحت کام کرنے لگے۔ ہر مطبوعہ کتاب پر سرکاری مطبع کی مہر لگانا ضروری تھا۔ حاجی حرمین کا یہ مطبع اپنی خوش نما طباعت اور صحت و کتابت کی خوبیوں کے باعث بہت مقبول ہوا۔ اخبار طلسم لکھنؤ اسی مطبع میں طبع ہوتا تھا جو لکھنؤ کا پہلا اردو اخبار تھا۔

مطبع مصطفائی

یہ مطبع حاجی حرمین کے مطبع محمدی کے بعد قائم ہوا۔ اس کے قیام کا باعث ایک اہم واقعہ تھا۔ لکھنؤ کے مشہور دولت مند تاجر مصطفےٰ خان کچھ چھپوانے کے لئے حاجی صاحب کے پاس گئے۔ دوران گفتگو کسی بات کا جواب حاجی صاحب نے ترش روئی سے دیا۔ مصطفےٰ خاں کو ان کی بات ناگوار گزری اور وہ اٹھ کر چلے گئے۔ انھوں نے اپنا مطبع قائم کرنے کا انتظام کیا۔ اس کے متعلق مولانا عبدالحلیم شررؔ نے لکھا ہے:

> "انھیں دنوں مصطفےٰ خاں شیشہ آلات کے ایک
> دولت مند تاجر کچھ چھپوانے کے لئے حاجی حرمین کے
> پاس لے گئے اور حاجی صاحب کی زبان سے کوئی ایسا
> سخت کلمہ نکل گیا کہ مصطفےٰ خاں نے گھر آکر خود اپنا مطبع
> مصطفائی جاری کیا۔"[۳]

مطبع مصطفائی حسنِ طباعت کے اعتبار سے اپنا جواب آپ رکھتا تھا۔ مولانا شررؔ نے اس کو سب سے اچھا مطبع قرار دیا ہے۔ اس مطبع نے عربی فارسی کتابوں کے علاوہ اُردو کی بہت سی مستند و معیاری کتابیں طبع کیں۔ جب شاہی حکم سے تمام مطابع بند کر دیئے گئے تو یہ بھی بند ہو گیا جس کی وجہ سے مالک مطبع بہت پریشان ہوئے اور وہ بھی اپنا مطبع کانپور لے گئے۔ ان کو بھی وہی مشکلات پیش آئیں جو حاجی حرمین کو در پیش ہوئی تھیں۔ حکومت کے دوسرے اعلان کے بعد یہ مطبع لکھنؤ لایا گیا اور [illegible] کی مہر ہوتی تھی۔

مطبع علوی

یہ مطبع علی بخش خاں نے مطبع مصطفائی کے بعد قائم کیا تھا۔ اپنی طباعت کے باعث یہ بھی لکھنؤ کے چند معیاری مطابع میں شمار کیا جاتا ہے۔ شاہی دور کے مذکورہ مطابع نے فارسی اور عربی دینیات اور دوسری علمی کتابیں اتنی خوبصورت اور دیدہ زیب چھاپیں جن کا مقابلہ ہندوستان کے دوسرے مطابع نہ کر سکے۔ یہ کتابیں حسنِ طباعت اور صحت کے لحاظ سے موجودہ دور کی تمام کتابوں کو آئینہ دکھاتی ہیں جو آفسیٹ اور بلاک کے ذریعہ طبع ہوتی ہیں۔ شاہی دور میں ۱۸۵۷ء سے پہلے جاری ہونے والے مطابع کی تعداد بہت ہے جن کی تفصیل مشہور کتاب "اختر شہنشاہی" سے معلوم ہوتی ہے۔ ان میں حسبِ ذیل مطابع نے اپنی بعض خوبیوں کے باعث بہت شہرت حاصل کی۔

مطبع مرتضوی

یہ مطبع ایک ماہر ہنرمند شیخ نثار علی نے قائم کیا تھا۔ یہ بھی سلطان المطابع سے منسلک تھا اور اسی کی ماتحتی میں کام کرتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں بند ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ۱۸۵۸ء میں جب مطبع نول کشور قائم ہوا تو منشی نول کشور نے نثار علی کو داروغہ طباعت مقرر کیا اور اودھ اخبار شمارہ جنوری ۱۸۶۲ء میں اپنے ایک مضمون میں نثار علی کی فنی مہارت کی بہت تعریف کی ہے۔ ان کے علاوہ جن مطابع نے کتابوں کی طباعت و اشاعت میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں ان میں مطبع جلالی (۱۸۴۰ء) مطبع میر حسن رضوی (۱۸۴۲ء) مطبع مولوی (۱۸۴۵ء) مطبع اسعدی (۱۸۴۷ء) مطبع مہدیہ (۱۸۴۹ء) مطبع ولی محمد، مطبع قمر ہند، مطبع جعفری، مطبع حسینی کے نام مشہور ہیں۔ ۱۸۵۷ء سے قبل قائم ہونے والے متعدد اور بھی مطابع تھے۔

مطبع منشی نول کشور

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی کے بعد علم و ہنر کا یہ شاداب گلستان نذر خزاں ہو گیا۔ اس کا امن و امان غارت ہوا تو ہر شعبۂ زندگی پر اس کا اثر پڑا۔ شاہی عہد کے اکثر مطابع بند ہو گئے۔ کچھ فسادات میں تباہ و برباد ہو گئے۔ ان کو چلانے والے ہنرمند اور فن کار بے روزگار ہو کر نانِ شبینہ کے

[illegible] ملازمت کا دروازہ کھل گئے۔
ان حالات میں منشی نول کشور نے ۱۸۵۸ء میں انگریزی حکومت کا تعاون حاصل کر کے اپنا مطبع قائم کیا اور اودھ اخبار جاری کیا۔ نول کشور نے نہایت محنت اور لگن سے کام کیا جس کی بدولت اس مطبع نے مختصر مدت میں شہرت [illegible] کی طباعت کے فن میں بھی بڑا اور اکثر ان ماہر فن کی خدمات حاصل کر لیں جو شاہی دور کے مطابع میں کام کرتے تھے کئی مطابع کے مالک جو بے روزگار ہو گئے تھے اس مطبع سے وابستہ ہو گئے۔ ابتدا میں سارا کام دستی پریسوں سے ہوتا تھا جو منشی نول کشور نے خود تیار کرائے تھے۔ یہاں تک کہ ان پریسوں کی تعداد تین سو تک ہو گئی۔ ۱۸۸۳ء میں ایک امریکن سیاح نے مطبع کا معائنہ کرنے کے بعد ایک مضمون لکھا جس کے کچھ اقتباسات پیش خدمت ہیں۔

..... اس مطبع (نول کشور) کا رقبہ اتنا بڑا ہے کہ یورپ میں اس کی قیمت پانچ لاکھ ڈالر سے کم نہ ہوگی۔ کشور ایسا ہوشیار اور چالاک ہے کہ ولایت سے ٹائپ نہیں منگواتا ہے بلکہ خود حروف ڈھالنے کا کرتب سیکھ لیا ہے ..... ایک کمرے کے پریسوں کو میں نے شمار کیا اس میں اکسٹھ تھے جو ہاتھوں سے چلائے جاتے تھے ...

..... نول کشور پریس کا گودام عجائبات عالم سے ہے اس میں غیر مجلد کتابیں زمین سے چھت تک قطاروں میں لگی ہیں۔ اس مطبع میں کام کرنے والے جو لوگ ہیں ان کی تعداد بارہ سو سے کم نہ ہوگی۔" ؎

مطبع نول کشور میں اردو، فارسی، عربی اور بعض ہندی کتابوں کی طباعت دستی پریس پر پتھروں کے ذریعہ ہوتی تھی۔ منشی نول کشور کی زندگی تک مطبوعات کی تعداد ساڑھے تین ہزار سے زیادہ ہو چکی تھی۔ ان میں ضخیم اور کئی کئی جلدوں پر مشتمل کتابوں کی تعداد بہت ہے۔

جب نول کشور نے اپنے مطبع کے لئے ولایت سے طباعت کی مشینیں منگوائیں تو اکثر دستی پریسوں کو ان کے چلانے والوں کے حوالے کر دیا کہ وہ ان کو لے جائیں، مکانوں پر یا کسی اور مناسب جگہ پر لگائیں اور طباعت کے لیے ان کو مطبع سے کام دیا جائے گا۔ اس طرح لکھنؤ کے اندر مطابع کی تعداد بڑھ گئی۔ جو پریس والے دستی پریس اپنے گھر پر لگاتا وہ ایک نام بھی رکھ لیتا تھا، ان میں بعض نے ترقی کر کے طباعت میں خاص مقام حاصل کر لیا۔ لکھنؤ کی چھپی ہوئی کتابوں پر اکثر مطابع کے نام نظر آتے ہیں۔

مطبع نامی

نول کشور پریس کے بعد کئی مطابع نے شہرت حاصل کی۔ ان میں مطبع نامی کو بہت اہمیت حاصل ہوئی۔ اس کے بانی خواجہ قطب الدین تھے جنھوں نے عرصہ تک مطبع نول کشور میں کام کیا تھا، اس کے بعد اپنا مطبع قائم کیا اور ہر علم و فن کی سیکڑوں کتابیں طبع کیں۔ اس کا شمار لکھنؤ کے معیاری مطابع میں ہوتا تھا اور آج تک طباعت کے میدان میں گامزن ہے۔

اصح المطابع

یہ مطبع بھی لکھنؤ کے مشہور مطابع میں شمار کیا جاتا ہے اس کو مولانا عبد العلی عاصی نے قائم کیا تھا۔ محلہ محمود نگر میں واقع تھا۔ اس مطبع نے عربی زبان کی مستند مذہبی کتابیں شائع کیں۔ اردو میں بھی اس کی مطبوعات کی تعداد بہت ہے۔ یہ مطبع اپنے بانی کے بعد زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکا۔

مطبع نظامی

لکھنؤ کا یہ مطبع بہت مشہور ہے۔ اس کے مالک مشہور خوشنویس منشی محمد جواد تھے جنھیں خط نسخ لکھنے میں کمال حاصل تھا۔ اس مطبع نے بھی حسنِ طباعت، صحت و صفائی کا اچھا معیار قائم کیا۔ خط نسخ میں لکھی ہوئی عربی کتابوں کی طباعت جیسی دل کش اور دیدہ زیب اس مطبع میں ہوئی وہ لکھنؤ کے کسی دوسرے مطابع میں کم نظر آئی۔ منشی محمد جواد کے بعد ان کے جانشینوں نے جو اچھے خوشنویس تھے کسی نہ کسی طرح اس مطبع کو جاری رکھا۔ یہ اب بھی اردو طباعت کا اچھا معیار قائم کیے ہوئے ہے۔

دیگر مطابع

لکھنؤ میں لیتھو طریق طباعت کے مطابع کی تعداد ہر دور میں بہت رہی ہے لیکن اس زمانے میں بلاک اور آفسیٹ کی طباعت کا رواج بڑھ گیا، اور لیتھو طباعت کی طرف توجہ کم ہو گئی۔ تاہم لکھنؤ میں اب بھی متعدد مطابع موجود ہیں لیکن ان میں کوئی بھی گزشتہ مطابع کی خصوصیات کا حامل نظر نہیں آتا۔

لکھنؤ کے مطابع کی کامیابی اور مقبولیت میں فنِ خوش نویسی کا بڑا حصہ رہا ہے۔ ماہرِ فن خطاطوں اور خوش نویسوں کی تعداد عہدِ شاہی میں

(جاری)

مظفر علی
کوٹ وارہ ہاؤس، قیصر باغ
لکھنؤ

واجد علی شاہ کا لکھنؤ

گلشن عجب بہار کہ ہر قصر رشکِ خلد
اور گومتی غضب کی ہے دریائے لکھنؤ
حور و پری کو رشک تھا اک ایک شخص پر
بے مثل تھے سبھی مہ سیمائے لکھنؤ

——— واجد علی شاہ

شہر کو خیرباد کہتے ہی گومتی نے اپنے بہاؤ کا رُخ بدل دیا ہے ...... ایک شوریدہ دریا..... مٹی کے ٹیلے کو اندر ہی اندر کاٹتا ہوا ٹیڑھا میڑھا گھومتا گھماتا ضلع سے گزرتا ہے۔ تھکا ہارا اور رقت زدہ ...... یادوں سے پرے، گمنام سا — یہ دریا اپنی موجودگی کا احساس صرف المناک سیلاب سے کراتا ہے ...... لامارٹینیر اس کا شاہد ہے جہاں سیلاب کے لیول پتھر کے زینوں پر لگی پتھر کی پٹیوں پر نقش ہیں۔

اب اس کے تلاطم کو پشتوں اور بیریجوں سے روک دیا گیا ہے اور یہ پھر بھی روانی سے لیکن آلودگی سے بھرپور بہہ رہا ہے۔

اس کی خوبصورتی اور عظمت کے دن بیت گئے ہیں ..... دن اس کے محبوب کے، جب بسنت کے موسم میں زرد لباسوں میں ملبوس خواتین، بجروں میں سوار اس کے پانی سے اٹکھیلیاں کرتی تھیں .... بھگوان کرشن اور رادھا کے دریا کے کنارے یکجا ہو جانے کے دن۔

خوابوں کا شہر لکھنؤ — تبدیلی کی ہواؤں سے غافل تھا..... دریا تجارتی بنتا جا رہا تھا اور اس حقیقت کے پس منظر سے ایک نئی دنیا اُبھر کر سامنے آ رہی تھی ...... پھر بھی دل سے یہ شہر شاعرانہ اور مثلِ خواب بنا رہا..... یاد کرتا رہا وہ جسے وہ بھلانا نہیں چاہتا تھا .... بھلاتا رہا وہ جسے وہ یاد رکھنا نہیں چاہتا تھا....

.... وہ حساس اور جراحت پذیر بنا رہا۔ یہ واجد علی شاہ کا شہر تھا — ایک شاعر، جس کے لئے اس کا شہر اور اس کے لوگ فیضان حاصل کرنے کا ذریعہ تھے۔ اس کا آرٹ اور اس کی تہذیب۔ اپنی نو سالہ خوبصورت سی حکومت کے دوران اس نے شہر کو ایک ایسی زندگی دی تھی جو اس کی پہچان بن گئی تھی۔ حالاں کہ آج جو کچھ بچا ہے وہ اس کے بنیادی کردار کا ذرہ برابر ہی بچا ہے۔

واجد علی شاہ کو سمجھنے کے لیے تاریخ کی ان طاقتور گتھیوں کو سلجھانا پڑے گا جس کی وجہ سے وسطی ہندستان میں مغلوں کا، پنجاب میں سکھوں کا، دکن میں مرہٹوں کا، بنگال میں نواب نظاموں کا زوال ہوا۔ واجد علی شاہ کو سمجھنا تصویر کے دوسرے رُخ کو سمجھنا ہے ..... ہندستانی تاریخ کے منطقی مناظرے جس سے شروع ہوئی آزادی کی پہلی جنگ .... جدوجہد اور اس کے نتائج۔

۱۸۵۷ء کی غدر ہندستانی نقطۂ نظر سے دیکھنے پر آزادی کی پہلی جنگ بن جاتی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کے ہندستانی حکمرانوں نے اسے تاریخ سے باہر ڈھکیل دیا، اور جب آزادی کے لئے نئے سرے سے جدوجہد شروع ہوئی تو ہمارے رہنما اس کی مناسبت واضح نہ کر سکے۔ جب ہم صنعتی تمدن کے نوآبادیاتی معاشرے اور پھر مغربی تہذیب کے اثرات سے آزاد ہندستان کر اُبھرے تب کئی ایسے لوگ جو پس منظر میں تھے وہ ایک سالم اور زوال پذیر معاشرے کے لیے حوصلہ ہونے لگے۔ کلچر کو جوڑنے والا کردار کافی اہم ہو گیا۔ ان لوگوں میں واجد علی شاہ کسی طرح سے سب سے زیادہ کریم النفس اور دلکش نظر آتے ہیں۔ ان کی شخصیت اپنے عہد کے کئی رنگوں میں پیش کرتی ہے۔ ان کے ماحول کا حصار، اپنی رعایا میں ان کی دلچسپی،

افسانے پسندی، عیاداری اور بانکپن، بھگوان کرشن کا دلکش انداز —
انھوں نے کثرت سے اسی طرح کے شاہ پارے چھوڑے ہیں جو ان کی انھیں
خوبیوں کی مثال ہیں۔

واجد علی شاہ ۱۳ر فروری ۱۸۴۷ء کو جب وہ ۲۴ سال کے تھے تخت نشین ہوئے۔ خصوصی طور پر بادشاہ ہونے کی شان و شوکت میں دل کشی تھی اور اس سے متعلق دھوم دھام سے وہ نہایت لطف اندوز ہوتے تھے ان کی دریا دلی سے کوئی محروم نہ تھا اور ہر خاص و عام پر ان کا دست شفقت تھا۔ امجد علی شاہ کی مذہب پرست حکومت کے بعد ان کے جانشین کے آتے ہی اودھ میں تبدیلی کی لہریں چل پڑیں۔ نوجوان بادشاہ اپنے فرائض کو انجام دینے میں پورے جوش و خروش سے لگ گئے اور نظم و نسق کے ہر پہلو پر پورا دھیان دینے کے ساتھ ساتھ اپنے ہم وطنوں کے ساتھ انھوں نے ایک گہرا رشتہ قائم کیا۔

پوری طرح سے حسن و جمال پرست۔ انھوں نے جو بھی کیا اس میں گہری دلچسپی لی۔ انھوں نے اپنی پریڈ کے لیے کئی پلیٹ فارم بنائے جن میں ہر ایک پر ایک خاص اسٹائل کی چھتری ہوتی تھی۔ بادشاہ اپنے آپ کو فوج کا ایک اعلیٰ افسر سمجھتا تھا اور اپنی حکومت کے آغاز کا ایک بڑا حصہ اس نے فوجی معاملات پر صرف کیا۔ اپنے فطری شاعرانہ مزاج کی بدولت انھوں نے اپنی پیدل اور رسالدار فوجی ٹکڑیوں کے بانکا، ترچھا، اختری، سلطان غازی، منصوری، غضنفری، حُسینی، حیدری، شاہدی اور دکھنی جیسے اثر انداز نام رکھے۔ ان کی فوجی ٹکڑیوں کے ایک حصے میں تیلگو سپاہی تھے، جنھیں وہ گھنگھور، خاص دل، جاں نثار، فتح مبارک، گلاب، سلیمانی، ظفر وغیرہ ناموں سے پکارتے تھے۔ ہدایات بھی فارسی زبان میں تھیں۔ خواتین کی بھی فوجی ٹکڑیوں کی تشکیل کی گئی، اور انھیں فوجی قواعد اور پریڈ کرنے کی ٹریننگ دی گئی۔ خاص کر حبشی گوریلا ٹکڑا کو خواتین کی بٹالین قابل ذکر تھی۔ آفتاب طلوع ہوتے ہی پریڈ شروع ہو جاتی تھی اور شہر کے لوگ بڑے شوق سے اس انوکھے فوجی مظاہرے سے لطف اندوز ہونے کے لیے جمع ہو جاتے تھے۔

ان کی پریڈوں کی شان و شوکت تصورات میں افسانوی حیثیت کی حامل ہے۔

ندی کے پار اذان کی آواز گونج رہی ہے۔ بادشاہ مسجد آصفی میں عبادت کرتے نظر آتے ہیں...... باہر سو گھوڑ سوار منتظر ہیں۔ بادشاہ کا سیاہ گھوڑا چاندی کے زیورات اور اودھ کے فوجی دربار کے دوشیزہ آب کے نشان کی نمائش کرتے ہوئے کشیدہ کاری والے گھوڑوں کے ساز سے لیس ہے۔

دریا پر کئی چھوٹی چھوٹی ناویں (کشتیاں) مچھلیاں پکڑنے کے لئے جال پھینکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ بادشاہ خوش نما وردی میں ملبوس اپنے سپاہیوں کے ساتھ دریا کے کنارے کی طرف شان سے قدم بڑھاتے ہیں۔

بادشاہ سے پہلے پہونچنے والے گھوڑ سوار ترکی سپاہیوں نے چاندی کا ایک بڑا صندوق میدان میں رکھا ہے۔ ہدایتوں کی آوازیں نیز گھوڑوں کی ٹاپ سنتے ہی مصیبت زدہ لوگ اپنی اپنی فریاد صندوق میں ڈالنے کے لیے بڑھتے ہیں ...... وہ پسینے سے شرابور محل واپس آتے ہیں اور ساتھ میں شکایتی بکس جس کی کنجی صرف انھیں کے پاس ہے۔ اس کے بعد بادشاہ ہر فریاد کو خود پڑھتا ہے۔ اس طرح سوشل جسٹس کے ایک رومانی انداز کے ساتھ اس کے دن کی شروعات ہوتی ہے۔

اپنی رعایا کے ساتھ اس کے گہرے رشتے سے اودھ کے حکمرانوں اور برطانوی حکومت کے مقامی حکمرانوں کے بیچ جو مبہم سا دستور العمل تھا اس کی خلاف ورزی ہوئی۔ انگریزوں کو اس وقت کئی استحقاق اور مراعات حاصل تھیں جب نواب سعادت علی خاں نے ۱۸۰۱ء میں صلح نامہ پر دستخط کیے۔ نتیجتاً اسے کمپنی کی فوجوں کے قیام کے لئے روہیل کھنڈ، دوآب اور گورکھ پور چھوڑنا پڑا۔ نوآبادکاروں نے وقت کے ساتھ ساتھ اپنی طاقت میں اور بھی اضافہ کرلیا اور حقیقتاً حکومت وہی چلانے لگے۔

جیسے جیسے واجد علی شاہ کی شہرت بڑھی ویسے ویسے رعایا میں ان کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ اسی وجہ سے حکومت برطانیہ کے لئے ان کا وجود خطرہ بن گیا۔ پھر انگریزوں نے ان کی شہرت کو داغدار کرنے کے لئے کہانیاں گڑھنا شروع کر دیں جو ان کی تاریخ کی تمہید ہو گئیں۔ غیر معمولی طور پر قابل اور لائق بادشاہ نے شاعری، موسیقی اور رقص

کے ذریعہ اپنی شخصیت کا اظہار کیا۔ اس کا تخلص اختر تھا اور وہ اکثر عام مضمون میں نثر اور نظم کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کرتا تھا۔ تقریباً ایک سو سے زیادہ شائع شدہ کتابیں اس سے منسوب ہیں۔ اس کی حیرت انگیز مہارت "مثنوی بحر مختلف" میں دیکھنے کو ملتی ہے جو الگ الگ بحروں میں لکھی گئی ہے ـــــ اپنے "عشق نامہ" میں اس نے اپنے عشقیہ نازو انداز کے ۱۳۲ واقعات، جو کہ اس کی آٹھ سال کی کمسنی کی عمر سے ہی سرزد ہو گئے تھے، کا تذکرہ کیا ہے۔

واجد علی شاہ جنسیاتی ترغیب پر لکھے گئے اپنے مضامین میں بہت زیادہ کھلے ہوئے اور صاف گو تھے۔ اور اس طرح انھوں نے اپنی نجی زندگی میں بھی اپنے لوگوں کو شامل کر لیا تھا۔ انھوں نے ان کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا اور اپنی کرشماتی شخصیت سے انھیں سحر زدہ کر دیا تھا۔

بادشاہ، کرشن اور ان کی گوپیوں کے درمیان ہونے والی گفتگو کا منظر پیش کرنے والی راس لیلا سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ اس تھیم نے اسے اتنا زیادہ متاثر کیا کہ اس نے اس پر کئی رقص تیار کئے اور ان کے ضابطے ترتیب دیئے۔ عطر منزل گھنگھروؤں کی کھنک سے گونجتی رہتی تھی۔ مور کے پروں میں ملبوس بادشاہ خود کرشن کنھیا کا کردار ادا کرتا تھا۔ اس کے اس جوش و خروش سے جلد ہی بیگمات اور گرد و پیش کے لوگ بھی متاثر ہونے لگے اور وہ بھی اس کا ساتھ دینے لگے۔ رقاص قلندر بخش اور حیدر علی انھیں کرشن کی گوپیوں کی طرح رقص کرنے کی ٹریننگ پری خانہ میں دیتے تھے۔ اسے رہس کہتے تھے۔ وہ ساتھ ہی ساتھ پلاٹ کی بھی تشکیل کرتا جاتا تھا اور اپنے رقاصوں سے سولو کراتا تھا اور اس رقص میں پھیر بدل کر انھیں اور بھی دلچسپ بناتا تھا۔ کسی بھی رقص کی ترتیب میں وہ گہری دلچسپی لیتا تھا، جو کہ سینریوں، کرداروں کا ایکسپوزیشن اور پلاٹ پر اس کے نوٹس میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان رہس کے ذریعہ کتھک رقص اپنے حقیقی روحانی مقام پر پہونچا، اس وقت کے کسی اور حکمراں نے ایسا نہیں کیا۔ اسی کی حکومت میں کتھک کو فروغ ملا۔ کتھک کے مشہور و معروف ماہر درگا پرشاد نے واجد علی شاہ کے لئے لکھا ہے:

"ہر کام کو خوش اسلوبی اور دلکش انداز میں انجام دینے والے واجد علی شاہ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے موسیقی اور رقص میں ٹھمری کی شروعات کی۔"

اس کی ٹھمریاں اختر پیا کے تخلص سے لکھی گئی ہیں "خیمۂ راگ" اور "صوت المبارک" اس کے میوزیکل شاہکاروں میں شمار ہوتے ہیں۔

اس کے یہ مظاہرے اتنے زیادہ اثر انداز ہوئے کہ وہ جلد ہی عام لوگوں میں مقبول ہو گئے اور میاں امانت کو "اندر سبھا" لکھنے کی تحریک ہوئی۔ اس کے مکالمے نظم میں تھے ...... شروع پردہ ہٹتے ہی اندر (واجد علی شاہ راجہ اندر کے کردار میں) اپنے جاہ و جلال میں نظر آتے ہیں۔ 'آمد' کی اداکاری پر بجنے والے طبلے کی تھاپ پر خاموش بیٹھے۔ پھر کوہ قاف کی پریاں یکایک نمودار ہوتی ہیں اور سامعین کو غزل کی دُھن پر اپنے سولو رقص سے چکا چوند کر دیتی ہیں۔ شاندار گت کے ساتھ وہ اندر کے ساتھ گدی نشین ہو جاتی ہیں ..... حالاں کہ یہ سب ہندوستانی روایت میں ڈھلے ہوئے تھے لیکن ان میں فارسی تصورات کے بھی دیدار ہوتے تھے۔ اندر سبھا کی مقبولیت سے عشقیہ کہانیوں کی دلچسپ نظموں میں پھر سے جان پڑ گئی۔

رقص میں بادشاہ کی مہارت اس کی کتابوں "بنی" اور "ناجو" میں ظاہر ہوتی ہے جس میں اس نے کتھک کی تکنیک کا بیان تصویروں کے ساتھ کیا ہے۔ اس کے نئے نئے تجربوں سے کتھک رقاصوں کو 'سنچاری بھاؤنا' اور 'بھاؤ بھاؤنا' میں مظاہرہ کرنے کا ایک بڑا کینوس ملا اس سے کتھک رقص کی خوبصورتی اور زیادہ نکھر آئی اور یہ آرٹ کا درجہ حاصل کر سکا۔

کرشن لیلا اور اندر سبھا کے درباری مظاہروں کو جن میں واجد علی شاہ مرکزی کردار ادا کرتے تھے، ان کے وقت میں اور زیادہ رنگارنگ بنایا گیا۔ فائن آرٹس میں ان کی گہری دلچسپی کی وجہ سے ہولی، دیوالی بسنت اور دسہرہ جیسے تہواروں کو خوشنمائی کی بلندیوں تک پہنچایا گیا وہ سبھی مذاہب کے لوگوں میں یکساں مقبول تھے۔

محرم بھی اسی ڈرامائی انداز میں کئی دنوں تک منایا جاتا تھا اور اس میں نظم اور ووکل ایکسپریشن کو کئی جمالیاتی رنگوں سے رنگا گیا۔

ہر ایک کو جو گرد آلود کر دیا تھا، سے جڑی انسانی تصورات کی بلندیوں تک پہنچا دیا گیا۔

میجر جنرل سلیمن ۱۸۴۹ء سے ۱۸۵۴ء تک لکھنؤ میں برطانوی ریزیڈنٹ تھا۔ چوں کہ اس کا نظریہ بہت زیادہ متصوفانہ تھا اس لیے اودھ دربار کے بارے میں اس کے خیالات نہایت نفرت انگیز تھے۔ سادہ دل اور منشرح مس پر دی گئی اس کی ایک رپورٹ میں سلیمن نے واجد علی شاہ کو بیہودہ قسم کی تفریحات کا عادی بتایا اور لکھا کہ وہ پوری طرح خواجہ سراؤں اور ناچنے گانے والوں کے ہاتھوں میں تھا۔ پھر بھی وہ ۱۸۰۱ء کے معاہدے کو ختم کرنے کی مناسب وجہ نہ پا سکا۔ جیسا کہ اس نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے:

۱۱؍ اکتوبر ۱۸۴۹ء: "اس نے کبھی بھی ظلم نہیں کیا ہے اور نہ ہی کوئی بدتمیزی کی۔"

۱۲؍ جون ۱۸۵۴ء: "وہ نہ ظالم ہے اور نہ ہی بے رحم۔"

یکم جون ۱۸۵۵ء: "اس جیسا دریادل انسان، جیسا کہ مجھے یقین ہے پہلے کبھی بھی تخت نشین نہیں ہوا۔"

جیمس انڈریو رمسے، ارل آف ڈلہوزی ۳۵ سال کی عمر سے گورنر جنرل بنا۔ ڈلہوزی اور واجد علی شاہ دونوں ہی ایک ساتھ ۱۸۴۸ء میں اقتدار میں آئے۔ وہ دونوں ہی اپنے اپنے والدین کی دوسری اولاد تھے۔ دونوں ہی خوش نصیب تھے کہ انھیں حکومت کرنے کو ملی۔

جب طاقتور شخصیتوں کے مالک یہ دونوں لوگ ایک دوسرے کے سامنے آئے تو شروع ہوا چوہے اور بلّی کا کھیل ..... ڈلہوزی، اودھ کے 'ناکارہ' کی طاقت کو کچلنے کے لئے بضد تھا۔ اور واجد علی شاہ محبوب حکمراں ہونے کے روحانی تصورات میں غرق تھے۔ ان کی دریادلی لوگوں میں مقبول تھی۔ اور عوام کے ساتھ ان کا جو سلوک اور اٹھنا بیٹھنا تھا اس کی وجہ سے وہ انھیں میں سے ایک بن گئے تھے۔

واجد علی شاہ اپنے عالیشان محل کے پھولوں سے آراستہ پھاٹکوں کو اگست کے مہینے میں عام لوگوں کے لیے کھول دیتے تھے جب وہاں ایک بڑا میلہ لگایا جاتا تھا۔ اپنے شاندار شاہی لباس میں ملبوس، اور اسی رنگ کے لباسوں سے آراستہ اپنی چار سو بیویوں کے ساتھ بادشاہ گھنے پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھتے۔ وہ سب بچّوں اور بوڑھوں کے ساتھ میلے سے لطف اندوز ہوتے تھے۔

ڈلہوزی نے واجد علی شاہ کے خلاف انگلینڈ میں میڈیا بلٹز چلا کر اسے ہرانے کے لئے اپنے پلان میں تیزی لائی۔ اس طرح اس کی مصنوعی اخلاقیات کے جذبات کو کُریدکر معاہدے کی خلاف ورزی کرنے کے لیے عام رائے بنائی گئی۔

ایک انگریز: "بدعنوانی سے حکومت کیے جانے والے ملک پر قبضہ کرنے میں ایک دن کی بھی تاخیر کرنے سے سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں اچھے ہندوستانیوں کی مصیبت میں ایک دن کا اضافہ اور ہو جائے گا۔"

اس سے ڈائرکٹروں کی عدالت کی حوصلہ افزائی ہوئی اور انھوں نے نومبر ۱۸۵۵ء میں شہنشاہ کی اجازت کے ساتھ یا اس کے بغیر ہی اودھ پر قبضہ کرنے کیلئے ڈلہوزی کو پورا اختیار دے دیا۔ واجد علی شاہ صرف نام کے بادشاہ رہ جانے پر بہت رنجیدہ ہوئے اور بہت ہی ناامیدی اور مایوسی کے عالم میں انھوں نے اپنا تخت چھوڑا۔ اس بات سے انھیں اتنا صدمہ پہونچا کہ انھوں نے انگریزوں کے ذریعہ دی گئی پنشن کو لینے سے انکار کر دیا۔

۱۳؍ فروری ۱۸۵۶ء کو سرکاری طور پر برطانیہ نے اودھ پر قبضہ کر لیا۔ اور واجد علی شاہ کو کلکتہ میں جلا وطن کر دیا گیا ؎

دوستو! شاد رہو تم کو خدا کو سونپا
ہم نے اپنے دلِ نازک کو جفا کو سونپا
قیصری باغ جو ہے اس کو صبا کو سونپا

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

یہ قدآور شخصیت اپنے پیارے شہر سے دُور چلی گئی لیکن اس کی یادیں اور جذبات لوگوں کے ذہن پر چھائے رہے اور اس کی کمی لوگوں کو بہت کھلتی رہی .... وہ مٹیا برج میں قید کی زندگی گزار رہا تھا اور اس کی داستانیں یہاں پروان چڑھ رہی تھیں ...... اسے نہیں بلکہ اس کی داستانوں کو لوگوں کے دلوں سے جلاوطن کیا جانا چاہئے تھا!
.... یہی کام آسگے کرنا تھا۔

۱۸۵۷ء کی جدوجہد اسی کا بالواسطہ انجام تھی۔ یہ سانحہ بادشاہ کی عالی شان سخاوت ہی تھی جس سے لوگ یکجا ہوئے اور ۱۸۵۷ء کی جنگ کی شدت جتنی زیادہ اودھ میں تھی اتنی ملک کے کسی اور حصے میں نہ تھی۔ اُدھر مٹیا برج میں واجد علی شاہ اپنی مصیبت کے دن گزار رہے تھے اور ادھر لکھنؤ میں ان کا قیصر باغ انگریزوں سے ہو رہی جنگ میں گیارہ مہینے تک اپنی رانی بیگم حضرت محل کے پرچم تلے ایک مضبوط قلعہ ثابت ہو رہا تھا۔ واجد علی شاہ کے دل میں اٹھ رہے جذبات اور اس کا المیہ اتنا ہی دردناک تھا جتنا کہ لکھنؤ پر انگریزوں کا قبضہ۔

جب اس کی محبوب زمین پر جنگ جاری تھی تب واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے درمیان بہت ہی جذباتی خط و کتابت ہوئی۔ ایک لاعلاج بیماری کی تکلیفوں کے مترادف انھوں نے خود کو خدا کی مرضی پر چھوڑ دیا۔ ان کے المیہ جذبات کا اظہار ان کے چھپے ہوئے خطوط کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ بادشاہ کی جلاوطنی کے نو سال بہت ہی تکلیف دہ گزرے ان نو سال کے عرصہ کو دو طرح سے قلم بند کیا گیا۔ ایک کا تذکرہ 'اینلس آف برٹش ریکارڈس اینڈ سیلمن جرنل' میں ملتا ہے اور دوسرے کا ذکر واجد علی شاہ کے سودینئر میں ملتا ہے۔

مشاہدہ کرنے پر نو سال کا یہ عرصہ زیادہ اہم اور یادگاری لگتا ہے بہ نسبت اس کے بعد کے نوّے سال تک چلنے والی برطانوی حکومت کے جس میں نوکر شاہی کو فروغ دیا گیا، نئے لوگوں کو خطاب دیئے گئے اور ان لوگوں کو بھلا دیا گیا جو جلاوطن بادشاہ کے وفادار تھے اور جنھوں نے بغاوت میں حصّہ لیا۔ مہاراج جے گوپال ثاقب، منیرُ الدولہ، مہاراج دمیرج بال کرشن بہادر لال اور کئی دوسرے راجاؤں کا کہیں تذکرہ نہیں ملتا جو اپنے بادشاہ کے تئیں وفادار تھے۔

شہر پر ایک مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ ایک نئی تہذیب کی شروعات ہو رہی تھی۔ شہری منصوبے اور تعمیرات نئے طریقوں اور نئی پالیسیوں کے مطابق تھیں۔ واجد علی شاہ کے خوابوں کا حسین شہر اب کالونیوں کے شہر کا روپ اختیار کر رہا تھا۔ ان کا قیصر باغ کا محل انگریزوں کے عتاب کا پہلا نشانہ بنا۔ اسے گرا دینے کا حکم دیا گیا ——

"یہیں سے دشمنوں نے جنگ شروع کی اور یہیں سے انھوں نے ہمارے خلاف فرمان جاری کیے"

قیصر باغ محل کو دیکھتے ہی ان کا خون کھولنے لگتا تھا۔ جب ان کا قبضہ ہوا تو انھوں نے آرٹ اور خوابوں کی اس دنیا میں سڑکیں وغیرہ بنوانا شروع کر دیں ؎

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
وہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

—— (غالب)

مرزا غالب نے بغاوت اور اس کے بعد کے حادثات کو قلم بند کیا ہے اور اس وقت ملک کے جو درد بھرے حالات تھے ان کا ذکر کیا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ اودھ کی تباہی پر اگر آپ کے آنسو نہیں نکلتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا دل پتھر کا ہے۔"

اسی طرح کے تکلیف دہ اور درد بھرے حالات سے مٹیا برج بھی دوچار تھا، وہاں واجد علی شاہ کی موجودگی سے المیہ شاعری کا ایک نیا ماحول پیدا ہوا وہاں آرٹسٹوں کا ایک پورا گروپ تھا جو اپنے ماضی کی شان و شوکت کے سہارے زندگی گزار رہا تھا اور انھیں یہ امید تھی کہ وہ ایک دن لکھنؤ واپس جائیں گے۔ ایک بوڑھے ہو تے بادشاہ کی یادوں کی دُنیا! وہاں پر وہ سب کچھ تھا جو کہ 'بلبل' اور 'قفس' کے شاعرانہ خیالات کو پورا کرتا تھا۔ لکھنؤ سے آنے والا ہر مہمان خوشی کا باعث ہوتا تھا۔

جاڑوں کی ایک صبح، مٹیا برج میں ایک بگھی آتی ہے۔ گھوڑے کی ٹاپوں سے پیدا ہونے والی آواز سے لوگوں کا تجسس بڑھ جاتا ہے۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا لکھنؤ سے پیام لاتا ہے۔ یہ مٹیا برج میں قید لوگوں کے لئے اُمید افزا پیام لاتا ہے۔

جوشیلی آواز میں گایا جانے والا دادرا برآمدوں میں گونج رہا ہے اور اسی وقت لوگوں کا ایک گروپ بڑے ہال کے اندر آتا ہے۔ یہ منظر اودھ کی سابقہ شان و شوکت کی یاد دلاتا ہے۔

ان لوگوں کے بڑھتے ہی بادشاہ اندر آتے ہیں۔ اپنے پرانے دربار سے آئے دوستوں کو دیکھ کر ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہتا۔ ماحول بہت ہی جذباتی ہو جاتا ہے ...... آنکھوں میں آنسو لیے لوگ انھیں بتاتے ہیں کہ لکھنؤ اب ویسا نہیں رہا۔ لوگوں کی آنکھیں ان سبھی خوبصورت

لموں کو تلاش کر رہی ہیں جنھیں بادشاہ نے موسیقی اور رقص وغیرہ سے بنایا تھا۔ لوگوں کی زندگی ویران ہوجاتی ہے۔ ان کی آنکھیں بادشاہ سلامت کو خود رقص کرتے ہوئے دیکھنا چاہتی تھیں۔ وہ سبھی وہ سب کچھ پانا چاہتے تھے جسے انھوں نے ماضی میں گنوا دیا تھا۔ بادشاہ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اب وہ بوڑھا اور بھدّا ہو چلا ہے.... وقت نے ساتھ نہیں دیا لیکن وہ لوگ اتنے بضد تھے کہ بادشاہ کو ان کی خواہش کا احترام کرنا پڑا۔

تمام انتظامات کیے گئے...... فرش پر سُرخ رنگ کی چادر بچھائی گئی اور پھر اس کے اوپر سفید چاندنی۔ موسیقار اور گلوکار اکٹھے ہوئے اور جیسے ہی بادشاہ رقص کرنے کے لئے کھڑا ہوا ٹھمری کی سُریلی آواز گونجنے لگی۔ گھنگھروؤں کی آواز ایسی تھی جیسے کوئی بہت ہی ماہر موسیقار کوئی ساز بجا رہا ہو۔ اور آرٹسٹک تاریخ کا ایک کھلا پنّا سامنے آگیا۔ تیز دُھن میں بجنے والے طبلے کی لَے پر بادشاہ ایک خوبرُو رقاص بن گیا۔ لوگ سحر زدہ ہو گئے۔ یہ دیکھ کر کہ بادشاہ کی عمر اور موٹاپا بھی ان کے دلکش آرٹ کو چھپا نہ سکا۔

دھیرے دھیرے رقص اپنے عروج پر پہونچ رہا تھا۔ کچھ لموں بعد بادشاہ ناچتے ناچتے گر پڑا۔ اس کی سانس پھُول رہی تھی — اس نے چاندنی کو آہستہ سے ہٹانے کو کہا۔ اس کے پیروں سے سُرخ چادر پر بانسری بجاتے ہوئے بھگوان کرشن کی تصویر بن گئی تھی۔!! بانسری کی آواز ہال میں گونج رہی تھی..... اور سبھی لوگ مبہوت ہو کر واہ واہ کر رہے تھے۔

□□

ترجمہ۔ نرگس خورشید
ڈی ۲۰۰۰ - اندرانگر، لکھنؤ

□ خط و کتابت کرتے وقت براہِ کرم خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

□ جواب طلب امور کے لئے ٹکٹ لگا لفافہ ارسال کریں۔

—— (ادارہ)

شہرِ نگاراں

پیکر جعفری اُترولوی
ڈی ۱۳۸۰ - ایل ڈی اے کالونی، عیش باغ
لکھنؤ - ۲۲۶۰۰۴

یہ لکھنؤ کہ جسے شہرِ آرزو کہیے
یہ لکھنؤ کہ جسے شہرِ آبرو کہیے

یہ رنگ و نور میں ڈوبا ہوا شباب کا شہر
متاعِ بربط و نے، نغمہ و رباب کا شہر

یہی تو شہر ہے بانکوں کا اور جیالوں کا
یہی تو شہر ہے کافر ادا غزالوں کا

اسی کو سچّے خوابوں کا شہر کہتے ہیں
اسی کو لوگ نوابوں کا شہر کہتے ہیں

یہ لکھنؤ کہ دبیر و انیس کا ہے وطن
یہیں تو اہلِ سخن کو ملی ہے دادِ سخن

صفی، یگانہ و ثاقب کا اور شرر کا وطن
عزیز و آرزو، چکبست اور اثر کا وطن

یہی ہے سالک و اسلم کا اور سراج کا شہر
یہی ہے شعلہ و شبنم کے امتزاج کا شہر

یہیں جنابِ خرد کو ملی فضیلتِ فن
یہیں ہے حضرتِ پیکاں کی آرزو کا چمن

یہیں نسیم نہایت ادب سے چلتی ہے
یہیں حیات نئے پیکروں میں ڈھلتی ہے

زمانے بھر میں ہے مشہور لکھنوی تہذیب
یہاں پہ شیر و شکر رہتے ہیں امیر و غریب

یہاں کی شام کو شامِ اودھ کا نام ملا
سحر ہوئی تو ہر اک آدمی کو کام ملا

یہ رومی گیٹ جسے "بابِ لکھنؤ" کہیے
امام باڑہ نہیں خوابِ لکھنؤ کہیے

یہی دیار تو یوپی کی راجدھانی ہے
یہاں کی بولی کی ہر سمت حکمرانی ہے

یہ لکھنؤ تو مرے خواب کی امانت ہے
یہ لکھنؤ جو حقیقت میں ایک جنت ہے

سید احمد حسن رضوی
مرشد آباد ہاؤس۔ منصور نگر لکھنؤ

لکھنؤ کی تاریخی عمارتیں

نوابینِ اودھ نے اپنے دورِ حکومت میں جہاں کلچر، تہذیب اور فنونِ لطیفہ کے مختلف شعبوں میں نئی قدروں کو وسعت دی، وہیں فنِ عمارت میں بھی ایک نیا طرز اختیار کیا اور ایسی عمارتیں تعمیر کرائیں جو فن کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ ہیں۔ یہ عمارتیں نہ تو مغلیہ عمارتوں کی نقل ہیں اور نہ ہی قدیم ہندستانی عمارتوں جیسی ہیں۔ یہاں کی عمارتیں ہندستانی ایرانی اور ترکی طرز کی عمارتوں کے فن کو شامل کر کے بنوائی گئی ہیں۔ یہ عمارتیں مضبوطی میں مغل عمارتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں لیکن خوبصورتی اور نزاکت و نفاست میں اپنی ایک منفرد حیثیت کی مالک ہیں۔ مثال کے طور پر آصفی اماباڑے کو لیجیے جو بھاری بھرکم ایک عظیم عمارت ہوتے ہوئے بھول بھلیوں، دالانوں، محرابوں اور نقش و نگار کی وجہ سے دنیا میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتی۔

شروع کے نوابین نے اپنی جنگی مصروفیات کی وجہ سے محض قلعے، گڑھیاں، کنوئیں وغیرہ ہی حسبِ ضرورت بنوائے ہیں جو فنی اعتبار سے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ لیکن نواب آصف الدولہ کے زمانے میں دیگر قسم کی عمارتیں مثلاً محلات، ڈیوڑھیاں، اماباڑے، سرائے اور چوک بازار وغیرہ بننا شروع ہوئے۔ آصف الدولہ کے بعد نواب سعادت علی خاں تختِ حکومت پر بیٹھے۔ انھیں کئی سال کلکتہ میں رہنے کا اتفاق ہوا تھا اس زمانے میں کلکتہ میں انگلینڈ کے طرز کی عمارتیں بننے لگی تھیں۔ یہ عمارتیں چھوٹی اور دیکھنے میں ہلکی پھلکی لگتی تھیں۔ چونکہ نوابینِ اودھ میں جدت پسندی کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود تھا اس لیے نواب سعادت علی خاں اور ان کے متاخرین نے انگریزی طرز کی عمارتیں بنوانے کی طرف خاص طور سے توجہ دی۔

اودھ کا نوابی دور فیض آباد سے شروع ہوتا ہے جہاں نواب سعادت خاں برہان الملک، نواب صفدر جنگ اور نواب شجاع الدولہ نے ایک نئے ثقافتی مرکز کی بنا ڈالی۔ ابتدائی دور کے دونوں حکمرانوں کو تو سیاسی اور فوجی استحکام ہی پر توجہ دینی پڑی البتہ نواب شجاع الدولہ نے اپنے گیارہ سالہ قیام فیض آباد میں قلعوں وغیرہ کے علاوہ چوک بازار قائم کیے جس کے چار دروازے یکدرہ کے نام سے اب بھی موجود ہیں۔ یہ بہت مضبوط اور وسیع عمارتیں ہیں۔ تین تین در ہیں جن کے اندر سے سواریاں گزرتی رہتی ہیں۔

نواب شجاع الدولہ کے بعد جب نواب آصف الدولہ نے عنانِ حکومت سنبھالی تو سکونت لکھنؤ میں اختیار کی اور یہاں عمارتیں بنوانے لگے۔ بعد کے نوابین اور بادشاہوں نے بھی اپنے مزاج کے مطابق عمارتیں تیار کرائیں۔

یہاں پر چند عمارتوں کا تذکرہ قدرے تفصیل سے کیا جاتا ہے:

آصفی اماباڑہ اس کو بڑا اماباڑہ بھی کہتے ہیں اور اس نام سے یہ زیادہ مشہور ہے۔ یہ اودھ یا لکھنؤ کی سب سے اہم اور مخصوص عمارت ہے جس کو ۱۷۸۴ء میں قحط کے زمانے میں نواب آصف الدولہ نے بنوانے کی ابتدا کی اور جو ۱۷۹۰ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس وسیع و عریض عمارت کے معمار کفایت اللہ تھے۔ اماباڑے کی عمارت پانچ حصوں پر مشتمل ہے جن میں تین دالان، ایک ہشت پہل ہال اور ایک مربع ہال ہے۔ اماباڑے کے سامنے ملحق ایک وسیع و عریض چبوترہ ہے۔ دالانوں میں سے درمیانی دالان ۱۶۳ فٹ لمبا، ۵۳ فٹ چوڑا اور ۴۹½ فٹ اونچا ہے۔ دیواروں کی چوڑائی ۱۶ فٹ ہے۔ مشرق میں ہشت پہل ہال ہے جس کا قطر ۲۱۹ فٹ اور اونچائی ۵۳ فٹ ہے۔ مغرب کی جانب جو ہال ہے اس کی لمبائی چوڑائی ۵۴ فٹ اور اونچائی وہی ۵۳ فٹ ہے۔ دیواروں کی چوڑائی دونوں ہال کی ۱۶ فٹ ہے۔ اماباڑہ کے سامنے ایک مربع سبزہ زار ہے جس کے مغربی

حصہ میں بلند چبوترے پر مسجد ہے اور مشرق کی جانب باولی ہے جو بذات خود کئی منزلہ عمارت ہے۔ اس کے علاوہ دو جلوخانے، نوبت خانہ اور ایک باغ بھی موجود ہے۔

امامباڑہ کے باہر رومی دروازہ نام کی ایک پانچ منزلہ عمارت ہے جو اپنی بلندی، مضبوطی اور عظمت کے لحاظ سے بے مثل ہے۔ اس عمارت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ پوری عمارت ایک محراب پر قائم ہے۔

امام باڑہ اور اس سے ملحق عمارتوں میں لوہا یا لکڑی کا استعمال کہیں نہیں کیا گیا ہے۔

نواب آصف الدولہ جب فیض آباد سے لکھنؤ آئے تو یہاں حسین آباد میں موجودہ گھنٹہ گھر کے شمال میں کئی عمارتیں تعمیر کروائیں جو دولت خانہ کے نام سے مشہور ہوئیں۔ جس حصہ میں وہ خود سکونت پذیر تھے اس کا نام آصفی کوٹھی تھا۔

دلکشا گارڈن اس محل کی عمارت نواب سعادت علی خاں نے بنوائی تھی جو شکستہ حالت میں اب بھی موجود ہے۔ یہ ایک وسیع میدان میں واقع تھی جس میں سیکڑوں جانور مثل ہرن وغیرہ کے پائے جاتے تھے اور جو ان کی شکارگاہ بھی تھی۔ اس عمارت اور باغ کو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شدید نقصان پہونچا۔

بیبیاپور کوٹھی دلکشا گارڈن کے مشرقی جانب اس عمارت کے منہدم شدہ حصے اب بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس عمارت کو نواب آصف الدولہ کے لئے جنرل مارٹن نے تعمیر کیا تھا۔ یہ انگریز ریزیڈنٹ کی قیام گاہ بھی تھی۔ نواب وزیر علی کی معزولی کے احکام اسی کوٹھی سے جاری ہوئے تھے۔

دلکشا سے قریب ہی بادشاہ نصیر الدین حیدر کا تعمیر کیا ہوا ولایتی باغ بھی اپنی خوبصورتی کے لیے مشہور تھا۔ لیکن اب اس کے صرف نشانات باقی ہیں۔

لامارٹینیر یہ ایک بڑی، شاندار اور مستحکم عمارت ہے جسے دور آصف الدولہ میں جنرل کلاڈ مارٹن نے ایک لاکھ ساٹھ ہزار پونڈ کی لاگت سے تعمیر کرایا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ آصف الدولہ اس عمارت کو خرید لیں لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس عمارت میں مارٹن نے توپ بنانے کا ایک کارخانہ بھی قائم کیا تھا جس میں بنی ہوئی ایک توپ ٹیپو سلطان کے خلاف ۱۷۹۲ء میں انگریزوں نے استعمال کی تھی۔

مارٹن کی وصیت کے مطابق اس کی موت کے بعد ایک اسکول قائم کیا گیا جو آج بھی موجود ہے۔ یہی عمارت اس کا مدفن بھی ہے۔ اسی جگہ میجر ہڈسن بھی مدفون ہے جو دہلی کے شہزادوں کا قاتل تھا۔

خورشید منزل اس عمارت کی تعمیر کی ابتدا نواب سعادت علی خاں نے کی تھی جس کی تکمیل ان کے بیٹے بادشاہ غازی الدین حیدر نے کی۔ یہ عمارت نواب کی بیگم خورشید زادی کے نام سے منسوب ہے۔ اس عمارت میں اب لامارٹینیر گرلز اسکول قائم ہے

موتی محل یہ ایک بڑے وسیع و عریض باغ میں تعمیر شدہ تین عمارتوں پر مشتمل ہے۔ خاص موتی محل کو نواب سعادت علی خاں نے بنوایا تھا۔ اس کے ملحق دریا کے کنارے دو عمارتیں مبارک منزل اور شاہ منزل کو نواب غازی الدین حیدر نے تعمیر کرایا تھا۔ اسی سے قریب وہ میدان ہے جہاں جنگلی جانور لڑائے جاتے تھے اور جس کا نظارہ شاہ منزل سے کیا جاتا تھا۔

کوٹھی حیات بخش یہ کوٹھی نواب سعادت علی خاں کے دور میں تعمیر ہوئی ابتدا میں یہاں کلاڈ مارٹن نے بارود بنانے کا کارخانہ قائم کیا تھا۔ دہلی کے بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے بیٹوں کے قاتل میجر ہڈسن کا انتقال اسی کوٹھی میں ہوا تھا۔

یہ آج کل گورنر اترپردیش کی رہائش گاہ ہے۔

کوٹھی فرحت بخش یہ محل کلاڈ مارٹن نے بنوایا تھا اور وہ خود اسی میں رہتا تھا۔ بعد میں اس کو نواب سعادت علی خاں نے پچاس ہزار روپئے میں خرید لیا۔ اس وقت سے نواب واجد علی شاہ سے قبل کے سبھی نوابین اسی

محل میں یا اس سے متصل عمارتوں میں قیام کرتے تھے۔ بعد میں اسی جگہ پر امجد علی شاہ نے اپنے محلات تعمیر کرائے۔

موسیٰ باغ

شہر کے شمال مغرب میں نواب سعادت علی خاں نے ایک بہت بڑا باغ تعمیر کرایا تھا۔ اس عمارت کی تعمیر میں بھی مارٹن کا ہاتھ تھا عمارت کے مقابل دریا کے کنارے کا میدان شکارگاہ اور جنگلی جانوروں کو لڑانے کے کام آتا تھا۔ اب صرف کھنڈرات باقی رہ گئے ہیں۔

ریزیڈنسی

یہ بہت سی عمارتوں کا مجموعہ ہے جس میں انگریز ریزیڈنٹ رہتا بھی تھا اور اس کے دفاتر وغیرہ بھی قائم تھے۔ اصل عمارت نواب سعادت علی خاں نے تعمیر کرائی تھی جس میں اضافہ ہوتا رہا۔ ان میں سے ایک عمارت بیگم کوٹھی کے نام سے مشہور تھی جس میں بادشاہ نصیر الدین حیدر کی انگریز بیگم رہا کرتی تھیں اور جنھوں نے مسجد اور امام باڑہ کا اضافہ کروایا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ان عمارات کو شدید نقصان پہونچا۔ کھنڈرات محفوظ ہیں۔

لوہے کا پل

نواب سعادت علی خاں نے ایک لوہے کا پل دریائے گومتی پر قائم کرنے کی غرض سے سامان انگلینڈ سے منگوایا تھا جس میں تین محرابیں تھیں۔ درمیانی محراب ۹۰ فٹ چوڑی اور دوسری محرابیں ۸۰ فٹ چوڑی تھیں۔ اونچائی سات فٹ تھی۔ تقریباً چالیس سال یونہی پڑا رہا۔ عہد امجد علی شاہ میں ریزیڈنسی کے مقابل دریا پر قائم کیا گیا۔ لوہے کے پل کے ڈھانچے کی لاگت کے علاوہ اس کو قائم کرنے میں ایک لاکھ اسی ہزار روپئے صرف ہوئے تھے۔ ۱۹۶۰ء کے سیلاب میں منہدم ہوگیا۔

امامباڑہ حسین آباد

یہ چھوٹا امامباڑہ کے نام سے بھی مشہور ہے جو اپنی سجاوٹ اور صفائی کے لحاظ سے امتیازی حیثیت رکھتا ہے اسے نواب محمد علی شاہ نے تعمیر کرایا تھا۔ امامباڑہ کے سامنے کھلے میدان میں بہت لمبا حوض ہے مغربی حصہ میں آگرہ کے تاج محل کی نقل کا مقبرہ بنا ہے جس میں بادشاہ کی بیٹی دفن ہیں۔ مشرقی جانب اسی شباہت کی دوسری عمارت ہے۔ اسی احاطہ میں ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد بھی ہے۔ عمارت کے باہری حصے میں نوبت خانہ، کنواں اور سہ درہ پھاٹک وغیرہ بنے ہیں۔ محرم کے دوران روشنی کا خاص انتظام کیا جاتا ہے جس کو دیکھنے کے لیے ہزاروں لوگ آتے ہیں۔ محمد علی شاہ نے جامع مسجد، ست کھنڈہ، تالاب اور دیگر عمارتیں بھی تعمیر کرائیں۔

لال بارہ دری

یہ عمارت موجودہ ہائی کورٹ کی عمارت اور چھتر منزل کے درمیان واقع ہے۔ اسے نواب سعادت علی خاں نے تعمیر کرایا تھا۔ اس کو قصر السلطان نام دیا گیا۔ یہاں پر نوابین کی تاجپوشی اور شاہی دربار ہوا کرتے تھے۔ بادشاہ نصیر الدین حیدر کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے مرزا رفیع الدین عرف مُنّا جان کی تاجپوشی انگریزوں کی مرضی کے خلاف اسی بارہ دری میں ہوئی تھی۔ منّا جان کی دادی اور بادشاہ غازی الدین حیدر کی بیوہ بادشاہ بیگم کی فوجوں کے درمیان اس مسئلہ پر جنگ ہوگئی۔ بارہ دری کے اندر بہت سے لوگ مارے گئے۔ بادشاہ بیگم کے سپاہی فرار ہونے پر مجبور ہوگئے۔ بادشاہ بیگم اور منّا جان قید کر لیے گئے اور شہزادہ نصیر الدولہ محمد علی شاہ تخت نشین ہوئے۔

بعد میں انگریزوں نے یہاں لائبریری قائم کی۔ کچھ عرصہ بعد یہیں پر میوزیم (مردہ عجائب گھر) قائم ہوا، جو اب زندہ عجائب گھر کے احاطے میں ہے آج کل یہاں تصویروں کی نمائش ہوا کرتی ہے۔

چھتر منزل کی عمارتیں

نوابین کے عہد میں ان عمارتوں کا سلسلہ موجودہ صدر ڈاک خانہ کی عمارت سے لے کر بیلی گارد ریزیڈنسی تک پھیلا ہوا تھا۔ ان میں بڑی چھتر منزل اور چھوٹی منزل اور چھوٹی چھتر منزل اہم ہیں۔ بڑی چھتر منزل میں انگریزوں نے ایک کلب قائم کیا تھا۔ آزادی کے بعد سے اب اس عمارت میں سنٹرل ڈرگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم ہے۔ چھوٹی چھتر منزل میں مختلف دفاتر تھے یہ عمارت منہدم ہو چکی ہے۔ اس جگہ پر کمشنر لکھنؤ کا دفتر تعمیر ہوا ہے۔ اس عمارت کی پشت پر جو شاہی عمارت ہے اس کا نام درشن بلاس ہے۔ اس کے جنوب مغرب میں گلستان ارم کی عمارت ہے۔ کوٹھی فرحت بخش جس کا ذکر پیشتر کیا جا چکا ہے۔ انھیں عمارتوں کے مجموعہ میں شامل تھی۔

[illegible]

قیصر باغ سے ملحق دو مقبرے بنے ہوئے ہیں یہ نواب سعادت علی خاں اور ان کی بیگم خورشید زادی کی آرام گاہیں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان مقبروں کی تعمیر سے قبل اس جگہ جو عمارت تھی وہ نواب سعادت علی خاں کی رہائش گاہ تھی۔ ان کے انتقال کے بعد جب ان کے بیٹے نواب غازی الدین حیدر بادشاہ ہوئے تو انھوں نے کہا کہ چوں کہ اب مسند حکومت پر باپ کی جگہ لی ہے اس لیے اس کے عوض وہ اپنی رہائش گاہ اپنے باپ کو سونپ دیں گے چنانچہ اپنے محل کو منہدم کرواکے انھوں نے یہ مقبرے تعمیر کروائے جو کہ اب بھی لوگوں کی نگاہوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے رہتے ہیں۔

بیگم کوٹھی

یہ عمارت موجودہ دار الشفاء کی عمارت کے شمال میں بادشاہ امجد علی شاہ نے اپنی بیگم ملکہ احد کی رہائش کے لیے تعمیر کرائی تھی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی یہاں بھی لڑی گئی تھی۔ انگریزوں کے دور میں یہاں صدر ڈاک خانہ قائم تھا۔ بعد میں جب موجودہ عمارت میں صدر ڈاک خانہ منتقل ہوگیا تو یہاں دیگر سرکاری دفاتر کام کرنے لگے۔ ہیم وتی نندن بہوگنا جب وزیر اعلیٰ ہوئے تو اس عمارت کو منہدم کراکے نئی عمارت تعمیر کرائی گئی جس میں دفاتر کے علاوہ بہت بڑا بازار 'جن پتھ' کے نام سے مشہور ہے۔

شاہ نجف

دریائے گومتی کے کنارے موتی محل کے پاس اس مقبرہ کی تعمیر نواب غازی الدین نے کرائی۔ یہ عمارت عراق میں واقع حضرت علیؑ کے روضہ کی ہو بہو نقل ہے۔ اسی لیے اس کو نجف اشرف بھی کہتے ہیں۔ اس کا گنبد اور سجاوٹ قابلِ دید ہے۔ یہاں کئی موقعوں پر مذہبی محافل و مجالس ہوتی رہتی ہیں۔

تارا والی کوٹھی

اس کوٹھی کی نواب نصیر الدین حیدر نے تعمیر کرائی اور اس میں رصدگاہ قائم کی۔ اس زمانہ کے ماہر فلکیات کرنل ولکاکس اس کے نگراں تھے۔ دور امجد علی شاہ میں جب ان کا انتقال ہوگیا تو یہ محکمہ بھی بند ہوگیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں فیض آباد کے مولوی احمد اللہ شاہ نے اس کو اپنا مستقر بنا لیا تھا آج کل اس عمارت میں اسٹیٹ بنک آف انڈیا کا صدر دفتر ہے۔

بادشاہ باغ

یہ ایک بہت وسیع باغ تھا جس کو بادشاہ نصیر الدین حیدر نے تعمیر کرایا تھا بیچ باغ میں پتھر کی خوبصورت عمارت تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد یہ عمارت مہاراجہ کپور تھلہ کے قبضے میں چلی گئی تھی۔ ۱۹۰۵ء میں کل آراضی نوے ایکڑ رقبہ کی کیننگ کالج کو کالج، ہوسٹل اور کوارٹر وغیرہ کی تعمیر کے لئے دے دی گئی۔ ۱۹۰۸ء میں ہوسٹل تعمیر ہوا اور ۳۱ر اگست ۱۹۰۹ء کو کالج کا سنگ بنیاد چھوٹے گورنر کے ہاتھوں رکھا گیا۔ ۱۷ر فروری ۱۹۱۱ء کو کالج مکمل ہوگیا۔ اب یہ کالج لکھنؤ یونیورسٹی کی شکل میں ایک بہت بڑی تعلیم گاہ ہے۔

قیصر باغ کے محلات

نواب واجد علی شاہ نے قیصر باغ کے نواح میں بہت سی عمارتیں تعمیر کرائی تھیں۔ کچھ عمارتیں مثلاً چاندوالی کوٹھی، چینی باغ یا چینی محل، جلو خانہ اور حضرت محل وغیرہ چہار دیواری کے باہر تھیں۔ چہار دیواری کے اندر درمیان میں سفید بارہ دری ہے۔ چاروں طرف کی عمارتوں میں بیگمات رہتی تھیں، اس میں چار صدر دروازے تھے جن میں صرف دو باقی رہ گئے ہیں۔ یہ لکھی دروازہ یا لکھی گیٹ کہلاتے تھے۔ شمالی حصہ میں جو عمارت ہے اس میں پتھروں کا عجائب گھر ہے۔ اس سے قبل اس عمارت میں موجودہ لکھنؤ یونیورسٹی کیننگ کالج کے نام سے قائم تھی۔

سکندر باغ

اس وسیع و خوبصورت باغ کو نواب واجد علی شاہ نے تعمیر کرایا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں یہاں زبردست جنگ ہوئی تھی جس میں باغ کا بڑا حصہ تباہ ہوگیا۔ صدر گیٹ اور کہیں کہیں چہار دیواری باقی ہے۔ آزادی کے بعد ایک نیا باغ نیشنل بوٹانیکل گارڈن کے نام سے قائم کیا گیا ہے۔

عالم باغ

یہ باغ نواب واجد علی شاہ نے ایک بہت بڑے رقبے میں تعمیر کرایا تھا۔ درمیان میں ایک محل بھی بنوایا تھا۔ کانپور روڈ پر صدر پھاٹک کی عمارت ابھی قائم ہے۔ اندر تھوڑی دور پر محل کی عمارت شکستہ ہو چکی ہے۔ اس محل میں نواب واجد علی شاہ کی بیگم نواب خاص محل

عالم آرا بیگم وہاں کی حکمراں تھیں جو ولی عہد بہادر نواب حامد علی خاں کی اہلیہ تھیں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں یہاں انگریزوں اور ہندوستانیوں میں جم کر لڑائی ہوئی جس کے نتیجے میں عمارت کو شدید نقصان پہنچا۔ ولی عہد بہادر نواب حامد علی خاں کے پوتے پرنس سلطان حسن مرزا صاحب حسین آباد اور شاہ نجف کے متولی تھے۔ ان کی بیٹی شہزادی سلطان قمر آرا بیگم صاحبہ باحیات ہیں اور گولہ گنج میں قیام پذیر ہیں۔

دیگر باغات شہر لکھنؤ باغات کا شہر کہلاتا ہے۔ یہاں کے نوابین کو باغات کی تعمیر کا بڑا شوق تھا۔ عالم باغ اور سکندر باغ کے علاوہ ڈالی باغ، چار باغ، عیش باغ، موسم باغ، بادشاہ باغ، باغ شیر جنگ، موتی باغ، جہانگیر باغ، منور باغ، وزیر باغ وغیرہ بے شمار باغ تھے جو اب باقی نہیں رہے لیکن ان کے نام کے محلے اب بھی آباد و مشہور ہیں۔

فیض آباد کی عمارتیں

مقبرہ بہو بیگم نواب شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے نواب آصف الدولہ نے تو اپنا قیام لکھنؤ میں رکھا لیکن ان کی والدہ امۃ الزہرا صاحبہ جو بہو بیگم کے نام سے مشہور ہیں، وہیں فیض آباد ہی میں رہیں۔ ان کے انتقال پر ایک بلند و پرشکوہ مقبرہ تعمیر ہوا۔ یہ عمارت اس قدر خوبصورت اور دلکش ہے کہ "اودھ کا تاج محل" کے نام سے مشہور ہے۔

مقبرہ شجاع الدولہ فیض آباد کی مشہور عمارتوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کو گلاب باڑی بھی کہتے ہیں کیوں کہ اس کی افتادہ آراضی پر گلاب کا باغ سجایا گیا ہے۔ یہاں کے گلاب کے پھول دور دور تک مشہور ہیں۔

OO

شانِ حق

شاہِ کربلا تو نے شانِ حق بڑھا دی ہے
تو نے ہم کو ایماں کی روشنی دکھا دی ہے

شمعِ حق نہ گل ہوگی آندھیاں ہزار آئیں
شاہِ بیکس و تنہا تو نے وہ ضیا دی ہے

اب کبھی نہ بگڑے گی بات دینِ احمدؐ کی
حق کی آبرو شہؑ نے اس طرح بڑھا دی ہے

دیں کے واسطے اپنا گھر لٹا کے سرورؑ نے
جادۂ صداقت کی راہ جگمگا دی ہے

بھر کے دامنِ امید تیرے در سے وہ آیا
جس نے بھی ارے مولا آپ کو صدا دی ہے

لے کے جائیں گے ہم بھی شہؑ کے آستانے سے
اب جبیں وصیہ نے اس طرح جھکا دی ہے

——— فاطمہ وصیہ جائسی

۲۰۔ ساتویں گلی، نشاط گنج لکھنؤ

"مجھے یاد ہے ۱۹۳۶ء کی ایک شام مجاز رشید جہاں کے گھر پر اپنی کوئی نظم (ترنم میں) سنا رہا تھا۔ محمود الظفر، شوکت عمر اور خواجہ منظور حسین بھی وہاں تھے، دو بچیاں بھی وہاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک بچی نے کچھ کہا تو دوسری نے اسے یہ کہہ کر خاموش کر دیا، چپ رہو باجا بج رہا ہے۔" ——— سردار جعفری

اودھ نمبر

نیادور کا اودھ نمبر ملا، بالاستیعاب دیکھا، بتا نہیں سکتا کس قدر خوشی ہوئی۔ آدمی ٹھان لے اور جی پر رکھ لے تو کیا نہیں ہوسکتا۔ آپ نے پرانے دنوں کی یاد تازہ کردی اور سب سے لکھوایا ۔ یہ آسان نہیں ۔ اودھ نمبر کی حیثیت دستاویزی ہے ۔ یہ بہت اچھا اور اہم کام ہوگیا۔ یقین ہے کہ آئندہ بھی آپ محنت میں کمی نہ آنے دیں گے۔

——— (پروفیسر) گوپی چند نارنگ دہلی

" اودھ نمبر" موصول ہوا۔ رشک آیا کہ اس نمبر کے مضمون نگاروں میں میں کیوں شامل نہیں۔ آپ نے تو کئی بار یاددہانی کرائی، مگر میں ہی بوجوہ مضمون نہ لکھ سکا۔

اس خوبصورت اور بھرپور نمبر پر آپ کو دلی مبارکباد۔ شاد باشید۔

——— کالی داس گپتا رضا بمبئی

نیادور کا اودھ نمبر ملا۔ سیر ہو کر پڑھا پھر بھی سیری نہیں ہوئی۔ آپ نے اودھ کی تہذیب کے تمام نمایاں گوشوں کا احاطہ کرنے والے مضامین شائع کیے ہیں۔ آج ہی یہ نمبر جلد سازی کے لئے دے دیا ہے کیونکہ یہ نمبر محفوظ کیے جانے اور وقتاً فوقتاً ضروری حوالوں کے لیے استعمال کرنے کے قابل ہے۔ آپ نے جب سے نیادور کی ادارت سنبھالی ہے تب سے نیادور واقعی نیادور بن گیا ہے۔ کاظم علی خاں، (اودھ میں اردو شاعروں کی آخری آرام گاہیں) لیئق اختر فیض آبادی: (فیض آباد کی تہذیبی روایات) محمد اسحٰق صدیقی، (لکھنؤ کے امام باڑے)، ڈاکٹر نیر مسعود: (لکھنؤ کی یادگار مجلسیں) اور عرفان عباسی، (چند شاعرات اودھ ایک ذکرے) کے مضامین اس خاص نمبر کی جان ہیں، دل ہیں، نفس ہیں، روح ہیں۔ حسن واسطی عثمانی میرے دیرینہ رفیق ہیں، لگ بھگ پچاس سال سے میرے ان سے تعلقات ہیں اور وہ ایک اچھے صحافی بھی ہیں مگر "لکھنؤ کے چند اخبار" کے عنوان سے انھوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے اُسے Comprehensive نہیں کہا جاسکتا۔ اگر صرف ایک صفحہ اور لکھ دیتے تو سلامت علی مہدی کے روزنامہ "ملت"۔ وزارت شکوہ کاشمیری کے "ہمت"۔ فضل لکھنوی کے "نظارہ"۔ ہاشم رضا عابدی کے "شیعہ گزٹ" کے ساتھ ہی ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی مرحوم کے "قائد" وغیرہ کا بھی احاطہ ہوجاتا۔ پھر بھی "اودھ نمبر" ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ میری جانب سے دلی مبارکباد۔ مجھے یقین ہے کہ کچھ نئے عنوانات شامل کرکے آپ اودھ نمبر حصہ دوم بھی نکالیں گے تاکہ اودھ کے مشہور قصبات، وہاں کی عالی شان تعمیرات اور عظیم ہستیوں کا بھی ذکر ہوجائے۔

——— پروانہ رُدولوی ۔ دہلی

" اودھ نمبر ملا ۔ کیا شاندار نمبر نکالا ہے ۔ میں نے نہایت دلچسپی سے پڑھا ۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی یاد برسوں تک لوگوں کے دلوں میں رہے گی۔

——— دلیپ سنگھ ۔ دہلی

نیادور کا "اودھ نمبر" ملا۔ بہت جی خوش ہوا۔ ۱۶۴ صفحات کی اس تہذیبی دستاویز کے تیس مقالوں میں آپ نے تہذیب اودھ کے بہت سے اہم پہلوؤں کا احاطہ کرلیا ہے۔ اگر اس میں مصوری پر کوئی مضمون شامل نہیں ہوسکا یا شرر کی "گزشتہ لکھنؤ" جیسی تصنیف کے اقتباس نہیں آسکے تو ظاہر ہے کہ شمارے کی طوالت آڑے آگئی۔ لیکن جو کچھ شامل ہوا ہے اس کی حیثیت بھی قاموسی ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی۔ کاکوری کے حقائق۔ فرنگی محل کی علمی اور سیاسی خدمات۔ لکھنؤ کی رثائی تہذیب اور نگارشات، اس کے قدیم مندر، اہم اخبارات، معاشرہ، تہوار، فرماں روا، ممتاز علما، یادگار مجلسیں، شاعرات، ملیح آباد، اور فیض آباد کی روایتیں اور ان سب کے ساتھ اودھ کے نئے جنم کی عکاسی سے اس نمبر کو ایک نادر خزینے کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے، اس کے لیے میری مبارکباد قبول فرمائیں۔

——— گوبچن چندن دہلی

نیادور کا اودھ نمبر ملا۔ ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا کیونکہ اس موضوع پر اکا دکا مضمون پڑھا تھا لیکن ایسا ضخیم مواد اسی میں ملا۔ مبارکباد قبول کریں۔ لکھنؤ کی گائیکی لکھنؤ کا کتھک (نوشاد علی)، فرنگی محل کی علمی ادبی

اس میں مضامین [illegible] اودھ کا آخری تاجدار (کوکب قدر) اور کئی دوسری حقائق کی روشنی میں (ابھی نو تجسیم طلب کی) مضامین بہت پسند آئے۔ صرت کاظم علی خاں صاحب کا "تبرستان" ایک Discordant note تھا۔ آپ کے اداریہ اور انجم قدر سے انٹرویو دلکش تھے۔ اگر کچھ کاٹ چھانٹ کے کتابی شکل میں شائع کر دیں تو اودھ کی تہذیب کی بہت خدمت ہوگی کیوں کہ یہ تہذیب اودھ تک ہی محدود نہیں رہ گئی، کافی بڑے علاقے میں پھیل گئی ہے۔

——— پرکاش چندر۔ لکھنؤ

نیا دور پابندی سے موصول ہو رہا ہے شکر گزار ہوں۔ ادھر فروری اور مارچ کا مشترکہ شمارہ "اودھ نمبر" ملا۔ ایسا ضخیم، معلوماتی اور شان دار نمبر پیش کرنے پر میری طرف سے دلی مبارکباد۔

اودھ کے بارے میں جانتا تھا اور بہت کچھ لیکن اس خصوصی اشاعت کے مطالعہ کے بعد معلوم ہوا کہ اودھ کے بارے میں اور بہت کچھ جاننا باقی تھا۔ اس نمبر نے تو ڈھیر ساری معلومات فراہم کر دیں۔ اودھ کے تعلق سے فنون لطیفہ پر تو آپ نے خاص طور پر توجہ دی ہے لیکن علمی، ادبی، سیاسی، صحافتی، تہذیبی، تاریخی، مذہبی اور کئی پہلوؤں کا بھی احاطہ کر لیا ہے۔ لکھنے والے تو قابل مبارکباد ہیں ہی لیکن بحیثیت مدیر آپ بھی لائق مبارکباد ہیں کہ اتنے زیادہ موضوعات پر اہل قلم حضرات سے مقالات حاصل کر سکے۔

یہ نمبر بلاشبہ ایک تاریخی دستاویز ہے اور پھر جس دیدہ زیب انداز میں آپ نے پیش کیا ہے وہ لائق تحسین ہے۔

——— سلیمان اطہر جاوید تروپتی

نیا دور کا اودھ نمبر باصرہ نواز ہوا، عنایات کے لئے ممنون و متشکر ہوں۔ "اودھ نمبر" اپنے مواد و مشمولات اور تزئین و آرائش کے لحاظ سے ایک نہایت وقیع اور یادگار ادبی و ثقافتی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے نیز اودھ کے جملہ فنون لطیفہ کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اگر مصوری پر بھی کوئی مبسوط مقالہ شامل ہوتا تو نمبر کی افادیت و تکمیلیت کا احساس کچھ سوا ہوتا۔ بہر کیف اس نمبر میں اودھ کے ماضی کی شان دار روایات کی جھلکیاں بھی ہیں اور حال کی جلوہ سامانیاں بھی۔ قومی یکجہتی اور مشترکہ تہذیب کے نمونے ماضی و حال کے آئینوں میں جو سرزمین اودھ میں ملتے ہیں، ماضی میں سوائے

[illegible] ظاہر ہے کہ جس موضوع کا آپ نے انتخاب کیا ہے اس کی مکمل تصویر کی پیش کش ڈیڑھ سو صفحات میں ممکن بھی نہیں ہو سکتا ہے [illegible] لیکن آپ کا معیار، بصیرت [illegible] مقالات اور [illegible] توازن و تزئین سے سمیٹا ہے یقیناً قابل داد ہے۔

اردو کی مختلف اکادمیاں اپنے ذرائع و وسائل کے پیش نظر وقتاً فوقتاً ادیبوں اور فن کاروں کی شخصیات اور ان کے کارناموں پر نمبر شائع کرتی رہی ہیں لیکن اس ضمن میں "نیا دور" کی کاوشیں بہ لحاظ مشمولات و مواد اور کیا بہ لحاظ قیمت، سب پر فوقیت رکھتی ہیں۔

——— مشتاق احمد نوری

بہار اردو اکادمی۔ پٹنہ

نیا دور کا "اودھ نمبر" کل کی ڈاک سے موصول ہوا۔ دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ سرورق سے صفحہ آخر تک پڑھنے کے بعد یہ کہنا پڑے گا کہ اودھ نمبر یقیناً ایک دستاویزی حیثیت رکھتا ہے جس شائق اور جانکاری سے اودھ کی سماجی، سیاسی، ثقافتی حالات کا احاطہ کیا گیا ہے اس کو دیکھنے کے بعد آپ کے رشحات قلم کا قائل ہونا ہی پڑے گا خصوصاً ادبی لحاظ سے استاد محترم جناب پروفیسر مجاور حسین صاحب کا مضمون "طلسم ہوش ربا میں نسوانی معاشرہ" اردو ادب کے طلبا کے لئے بہت ہی کارآمد ثابت ہوگا۔ لکھنؤ کی شاعرات کے سلسلے میں عرفان عباسی کا مضمون اور ڈاکٹر کاظم علی خاں صاحب کا مضمون "اردو شاعروں کی آخری آرام گاہیں" کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کے علاوہ قومی یکجہتی کو مد نظر رکھتے ہوئے جہاں لکھنؤ کے امام باڑوں کا تذکرہ ہے وہیں لکھنؤ کے مشہور مندروں کے بارے میں بھی اچھا خاصا مضمون شامل اشاعت ہے۔ کل ملا کر یہ نمبر اپنے آپ میں ایک جامع مرقع ہے جس کے لیے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ لہٰذا مبارکباد قبول فرمائیں۔

——— (ڈاکٹر) خورشید ظفر

مجیبیہ

شمارہ نمبر ۲

جولائی ۱۹۹۴ء

عنوانات

اپنیبات	ایڈیٹر	۲
اُردو (نظم)	پروفیسر جگن ناتھ آزاد	۳
بیدی کا تخلیقی ورثہ	ڈاکٹر قمر رئیس	۴
غـزل	کاوش الہ آبادی	۹
غزلیں	فضا ابن فیضی	۱۰
	ناوک حمزہ پوری	۱۰
وجودیت میرے لئے	پروفیسر جعفر رضا	۱۱
نذرِ وارث علی شاہ (نظم)	رضا رُدولوی	۲۱
سنگِ میل (نظم)	بلراج کومل	۲۲
دل اک قبرستان (نظم)	رفعت سروش	۲۲
سوانحی کوائف	امان اللہ خاں شروانی	۲۴
تمہارے حق میں دُعاگو ہوں (نظم)	موسیٰ مجروح	۲۵
وقت (نظم)	شعیب شمس	۲۵
اے مری مادرِ ہند.... (نظم)	احترام اسلام	۲۵
اودھ کے قدیم کتب خانے اور مطابع	علی مہدی ایڈوکیٹ	۲۶
ایکتا (نظم)	قاسم شرر	۳۲
پلیٹ فارم (افسانہ)	نسیم بن آسی	۳۳
ادب برائے ادب	ڈاکٹر خورشید انور	۳۶
غـزلیں	مضطر تاجپوری ۔ عزیز الہ آبادی ظفر مہدی	۳۸
	عتیق الہ آبادی ۔ ہما پروین ۔ ثریا خان	۳۸
لکھنوی نثر کی امتیازی خصوصیات	ڈاکٹر نہال احمد صدیقی	۳۹
نقد و تبصرہ	ڈاکٹر نیر مسعود ۔ ناکی انصاری ۔ وقار ناصری	۴۲
	محمد شفیع دلشاد ۔ ڈاکٹر آئی اے حیدری	تا
	افشاں کاظمی	۴۵
اقلیتوں کے مسائل اور ریاستی حکومت کے اقدامات	احتشام حسین	۴۶
اودھ نمبر تاثرات کے آئینے میں	قارئین	۴۸

اپنی بات

برسات کا موسم شاعروں اور افسانہ نگاروں کے لیے ہمیشہ دل کش رہا ہے۔ کالے بادل، رم جھم پانی کا برسنا، پینگیں، باغوں میں جھولے، بھرے ہوئے تالاب، ہر طرف ہریالی —— لیکن دورِ حاضر میں خصوصاً اس سال برسات کی اہمیت مادی بنیادوں پر بھی ہے۔ اوّل تو اس سال صوبۂ اترپردیش میں درجۂ حرارت پچھلے سارے ریکارڈ توڑ گیا اور پورا صوبہ بھٹی کی طرح دہکتا رہا لیکن پھر قدرت کی رحمت جوش میں آئی اور اس سال برسات بہت برمحل اور بروقت شروع ہو گئی۔ اس سے ایک طرف تو جلتے ہوئے ماحول میں تازگی اور شادابی آئی۔ دوسری طرف بہتر آب پاشی اور سینچائی کی وجہ سے زراعت پر بھی خوش گوار اثر پڑے گا۔ بڑھتی ہوئی آبادی نے پینے کے پانی کا بھی مسئلہ پیدا کر دیا ہے۔ اس بارش سے بڑی حد تک سوکھتے ہوئے دریا، کنوئیں اور تالاب پھر سے آبِ حیات مہیا کرنے لگیں گے۔ ایک مسئلہ بجلی کا بھی ہے جس پر بالواسطہ یہ بارش اثر انداز ہوگی۔

ہم دعا کرتے ہیں کہ آنے والے دن بہتری اور خوش حالی کے ہوں اور ہمارے شاعر اور افسانہ نگار جہاں فطرت کے حسن کا تذکرہ کریں وہیں ان کا موضوع سماج اور معاشرے کی خوش حالی اور بہتری بھی ہو۔ آمین

جولائی کے مہینے میں داخلے شروع ہو جاتے ہیں۔ گزشتہ سال سے اس سال جولائی کی فضا بہت مختلف ہے اس لئے کہ اس سال اردو پڑھنے والوں کے لئے ساری سہولتیں مہیا کر دی گئی ہیں۔ اب ان سہولتوں سے فائدہ اٹھانا اور پیار اور محبت کی اس زبان کو فروغ دینا عوام کا فریضہ ہے۔ یہ توقع کی جاتی ہے کہ محبانِ اردو اس موقع پر امنگ اور ولولے کے ساتھ اس خوش گوار ماحول سے فائدہ اٹھائیں گے۔

اودھ نمبر کی توصیف کے سلسلے میں اتنے اہم افراد کے دستاویزی خطوط ملے ہیں کہ اگر انھیں ترتیب دیا جائے تو ایک نمبر شائع ہو سکتا ہے اہلِ علم نے اپنے اپنے ذوق اور زاویۂ نظر کے اعتبار سے مضامین پسند کیے اور اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی کیا۔ تقریباً تمام ہی مضامین (نظم و نثر) بہت پسند کیے گئے۔ ادارہ ان تمام مقتدر اور اہلِ علم حضرات کا ممنون اور متشکر ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہی حوصلہ افزائی ہمارا سرمایہ ہے اور اسی قدر دانی نے ہمیں عزم دیا ہے کہ ہم آئندہ بھی ایسے دستاویزی نمبر نکال سکیں۔

—— ایڈیٹر

یاالٰہی! اس زمیں کو شاد رکھ، آباد رکھ — جس زمیں کی کوکھ سے اُردو زباں پیدا ہوئی
مجھ کو کیا اس سے کہ میری بیدزبانِ دلنشیں — کون سے سن میں ہوئی پیدا کہاں پیدا ہوئی

میں تو اے آزاد! بس اس بات سے دلشاد ہوں
ہم فقیروں کے لیے تسکینِ جاں پیدا ہوئی

ابتدا جس کی محبت، انتہا جس کی خلوص — حبِ آدم سے میری اک داستاں پیدا ہوئی
دہلی و لاہور سے دُنیائے امریکا تلک — اک زبانِ فتحیاب و کامراں پیدا ہوئی
مشرق و مغرب میں جس نے ربطِ نو پیدا کیا — جس کو کہیے نازشِ بزمِ جہاں پیدا ہوئی
آسماں پہ اخترانِ علم و فن کے درمیاں — شاعری کی، نغمگی کی کہکشاں پیدا ہوئی
میرے تہذیب و تمدن کی حفاظت کیلئے — نرم دل، فولاد بازو پاسباں پیدا ہوئی
جن دنوں پانی کے قطروں کو ترستی تھی نظر — ایک موجِ بے اماں و بیکراں پیدا ہوئی
جن دنوں حسنِ بیاں الفاظ کا محتاج تھا — اُن دنوں دانندۂ لفظ و بیاں پیدا ہوئی
دل کو عرفی نے زباں لکھا، زباں کو دل کہا[1] — جو دلوں کی ترجماں تھی، وہ زباں پیدا ہوئی
اک پری پہنے ہوئے سورج کی کرنوں کا لباس — بن کے حسنِ رونقِ ہندوستاں پیدا ہوئی
دیکھ تو بھی اے گرفتارِ مقامِ نفس و طبع — پایۂ ہفتم پہ راحت گاہِ جاں پیدا ہوئی
فیضِ عرفاں رُوح میں، ملبوسِ سادہ جسم پر — اک زبانِ نکتہ بین و نکتہ داں پیدا ہوئی
تاکہ اپنے سامنے والوں کا دل کرلے شکار — زُلف مثلِ طرۂ عنبر فشاں پیدا ہوئی

وہ بیاں کہیے جسے زیبِ بیاں پیدا ہوا
وہ زباں کہیے جسے حسنِ زباں پیدا ہوئی

مرحوم جگن ناتھ آزاد

[illegible]

[1] زبانش بین دل یابی، دلش بین زباں بینی —— عرفی

ڈاکٹر قمر رئیس
پروفیسر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی
دہلی

بیدی کا تخلیقی ورثہ

کسی بڑے فنکار کی تخلیقی میراث تین طرح کی ہوتی ہے۔ مادی، اخلاقی اور ادبی۔ اس کا مادی ترکہ تو اس کے قانونی ورثہ کے حصہ میں آتا ہے اور اکثر ایک خاص مدت گزرنے کے بعد خورد برد ہو جاتا ہے۔ اس کے اخلاقی ورثہ یعنی اس کے احسان، نیکیاں اور کمزوریاں اس سے رابطہ رکھنے والے لوگوں کے ذہن میں اس کے کردار کا ایک خاص نقش بناتی ہیں۔ لیکن یہ نقش بھی ایک دن وقت کے دریائے فراموشی میں غرق ہو جاتا ہے۔ اگر زندہ رہتی ہے تو اس کی تخلیقی میراث جو اس کے باطنی اور روحانی وجود کے ہر پہلو پر محیط ہوتی ہے۔ اور جس سے فیض اٹھانے کا اختیار ساری انسانیت کو ہوتا ہے یہ میراث قومی اور بین الاقوامی انسانی ثقافت کا ایک حصہ بن کر اس کے تمول، تنوع اور تابناکی میں اضافہ کرتی ہے۔ یوں تو تخلیقی اور فکری کاوشوں کی صورت میں یہ میراث ایک ناقابل تقسیم وحدت ہوتی ہے۔ اور ہر شخص بقدر ظرف و ذوق اس سے کسب نشاط کرتا ہے۔ لیکن اسکی شعوری تلاش اور تعبیر کی خاطر اسے تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یعنی فنکار کی فکر، اس کے موضوعات و مسائل اور اس کی جمالیاتی تکمیل۔

یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ہر بڑی ادبی تخلیق یا بڑے ادب کے پیچھے بڑی فکر یا بڑے خیالات کارفرما ہوتے ہیں (اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ بڑے خیالات ہمیشہ بڑی ادبی تخلیق کو جنم دیں) اسطرح بقول گیورگی لوکاچ اس حقیقت کی تردید بھی مشکل ہے کہ افسانوی ادب کے میدان میں شاہکار تخلیقات اپنے عہد کے بڑے مسائل کو سمیٹے ہوتی ہیں۔ اگرچہ یہاں بھی ضمناً یہ اشارہ ضروری ہے کہ کسی عہد کے بڑے یا بنیادی مسائل کا اظہار لازماً ادبی تخلیقات کی کامیابی کی ضمانت نہیں ہوتا۔ بیدی کا ادبی ورثہ اس لیے اہم ہے کہ وہ ان کے سنجیدہ اور دردمندانہ غور و فکر کا آئینہ دار ہے۔ ان کی ہر تخلیق شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کے عہد کے انسانی مسائل اور معاشرتی صورت حال کا عکس ہوتی ہے۔ لیکن ادبی ورثہ کی تیسری جہت یعنی فنی اور جمالیاتی تکمیل مذکورہ دو پہلوؤں سے کسی طرح کم اہمیت کی حامل نہیں ہے۔ دراصل یہی وہ گوشہ ہے جس میں انھیں اپنی منفرد تخلیقی صلاحیت اور تخلیقی ذہانت کو آزمانے کا موقع ملا اور جس نے ابتدا ہی سے اپنے معاصرین میں انھیں اپنی شناخت قائم کرنے کا اختیار بخشا۔

بیدی کے بعض معاصرین جو عوامی زندگی کی ترجمانی کا دعویٰ کرتے تھے دراصل عوام کے دکھ درد سے اتنا قریب نہیں تھے جتنا کہ بیدی۔ بیدی نے نہ تو اس سلسلے میں کوئی دعویٰ کیا ہے اور نہ ہی اپنی کہانیوں کو اپنی عوام دوستی کا جھنڈا بنا کر پیش کیا ہے۔ لیکن یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ پریم چند کے بعد جس ادیب نے ہندوستان کے کروڑوں انسانوں کے دکھوں اور محرومیوں کو فن کی موثر زبان عطا کی جس نے متوسط طبقہ کی بورژوا اخلاقیات کو بے نقاب کیا وہ بیدی ہیں۔ ناداروں مظلوموں اور سماج کے دبے کچلے انسانوں سے گہری اور راست وابستگی کا جو احساس پریم چند کے یہاں ملتا ہے وہی بیدی کے آرٹ کا امتیازی وصف ہے۔ وہ ایسا دردمند اور حساس دل رکھتے تھے کہ اگر چاہتے بھی تو انسانوں سے یگانگت کے اس رشتہ کو توڑ نہ پاتے۔ ان کے پہلے مجموعہ کی کہانیوں "من کی من میں"، "گرم کوٹ"، "کوارنٹین"، "تلادان" اور "دوانی" سے لے کر آخری دور کی کہانیوں، "جنازہ کہاں ہے"، "رحمان کے جوتے" اور "بولو"، تک پر شکستہ اور ستم دیدہ لیکن باہمت انسان انکے آرٹ ہی کا نہیں ان کے خوابوں کا بھی ہیرو نظر آتا ہے وہ اس کی بے بسی اس کی ناآسودگیوں اور دکھوں کو ایک لمحہ کے لیے بھی فراموش نہیں کر پاتے اور نہ بھول پاتے ہیں کہ اس طبقاتی سماج میں اس کے استحصال کے راستے بے شمار ہیں۔ بیدی انسان کے معاشی استحصال سے زیادہ اس بات سے

[illegible] (HUMAN DIGNITY) سے
محروم کرنے والوں کی سطح پر جدید [illegible] ہے۔ بہ قوم [illegible] ذات
اندر [illegible] میں ہے اعلیٰ انسانی جذبات اور انسانی [illegible] سے دور
کر کے ایسی وحشیانہ لذت تک تنہائی میں زندگی گذارنے پر مجبور کرتا
ہے۔ جس سے حیوان بھی دوچار نہیں ہوتے۔ "لاوان" "کا" "بابو" "وٹامن
بی" "کا ہستا دیں" "گرہن" کی "ہولی" "آلو" "کا کھنی سنگھ" "اور" ایک
باپ بیٹی" کی "[illegible]" ایسے ہی اور کئی ورجنوں کردار ہیں۔ جو بیدی کے
قلب و نظر کی انتہائی تپش سے ایک جاندار پیکر اختیار کرتے اور کبھی انسانیت
کا استعارہ بنتے ہیں۔

جدید افسانہ کی تکنیکی ہیئت میں تجربے بھی ہوئے اور ایسی آزادیاں
بھی برتی گئیں جو بعض بوجھل روایات کے احساس تک سرکرتی ہیں اور اس
میں مضائقہ بھی نہیں۔ نئے انسانی تجربے اپنی پیچیدگی کے اعتبار سے اظہار
کے نئے اسالیب کا تقاضہ کرتے ہیں لیکن جن جدید افسانہ نگاروں نے
تمثیلی یا تجریدی مخلوق کو جیتے جاگتے انسانی کرداروں کا نعم البدل بنا کر
پیش کیا وہ افسانہ کو ایسے ویرانہ میں لے گئے ہیں جہاں افسانہ کے قارئین
گم ہیں۔ ایسے قارئین جو افسانہ کے انسانی کرداروں کے ساتھ اندھیرے اجالے
میں ہی اپنی تلاش کا عمل مکمل کرتے ہیں۔ بیدی کی تخلیقی آگہی کا یہ ورثہ اتنا
وقیع ہے کہ آج کا کوئی بھی افسانہ نگار اسے نظر انداز کر کے اردو افسانہ کی
روایت کو آگے بڑھانے کا حوصلہ نہیں کر سکتا۔

بیدی کے تخلیقی ورثہ پر گفتگو کرتے ہوئے فطری طور پر دنیا کے بعض
عظیم افسانہ نگاروں کا خیال آتا ہے خصوصاً وہ جن سے پریم چند اور بیدی
جیسے تخلیق کاروں نے بھی اکتساب کیا ہے۔ مثلاً لیو ٹالسٹائی اور انتون
چیخوف۔ یہاں یہ بھی عرض کردوں کہ ذہنی اور تخلیقی رویے کے اعتبار سے
بیدی اور پریم چند میں تقریباً وہی فرق ہے جو ٹالسٹائی اور چیخوف میں تھا۔
پریم چند قومی اور جذباتی زندگی کے افق پر نمودار ہونے والے بڑے
مسائل پر نظر رکھتے تھے۔ ان سے وہ جس [illegible] تھے ان کی تخلیقی فکر ان
اجتماعی مسائل کو گرفت کرنے میں سرگرداں رہتی تھی۔ ان کے ناول اور
کہانیاں [illegible] کو مات [illegible] پیش کرتی ہیں۔ ٹالسٹائی کے ناول
اور افسانوں [illegible] لیکن وہ اپنے عصر کے مسائل کو
انسان کے بحر گیر روحانی اور اخلاقی مسائل سے جوڑ کر پیش کرتے تھے۔ ان
کی تخلیقی بصیرت غیر معمولی تعمق رکھتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی انہیں پیچیدہ
تشکیل ہونے غیر معمولی زندگی کے پر اسرار محرکات اس کے حل اور ان کی شکلوں
اس کے قوانین اور روح کی جبلیات پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ اس کی
مثال میں ان بعض طویل کہانیوں "ایوان ایلیچ کی موت" "حاجی مراد" اور
"گھوڑے کی آپ بیتی" کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ اس موازنہ سے یہ نہ سمجھا جائے
کہ ٹالسٹائی اور پریم چند کی تخلیقی توانائی کا فرق میرے پیش نظر نہیں۔
مقصود صرف چند مماثلوں کی طرف اشارہ تھا۔ اس کے مقابلے میں انتون
چیخوف زندگی کی معمولی اور چھوٹی چھوٹی سچائیوں اور عام انسانوں کی روز مرہ
کی تگ و دو کے فنی تراشے قاری کے سامنے اس طرح رکھتے ہیں کہ وہ
زندگی کی ایک انوکھی دریافت بن جاتے ہیں۔ چیخوف نے A.SUVORIN
کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ "دنیا میں کوئی شے زندہ رہنے کی تگ و دو
سے زیادہ بے کیف، روکھی اور غیر شاعرانہ نہیں ہے جو زندگی کی مسرتوں
سے محروم کر دیتی اور (انسانوں کو) بے تعلق بنا دیتی ہے"۔

چیخوف کے کردار اسی جدوجہد کی سفاک چکی میں پستے نظر آتے ہیں۔
وہ "ایک کلرک کی موت" "کا ایوان وتیرج ہو یا کہانی "وانکا" کا بچہ جو اپنے
بے کراں دکھوں کی روداد اپنے دادا کو لکھتا ہے اور پھر اس امید پر کہ اس کی
درد بھری کہانی اس کے دادا تک پہنچ جائے گی وہ گہری نیند سو جاتا ہے۔ یا
پھر "ایک چھوٹے سے مذاق" کی نادیکا ہے جو بظاہر ایک پرسکون ازدواجی
زندگی گذارتی ہے۔ لیکن اندر ہی اندر تنہائی کا عذاب بھی جھیلتی ہے۔ گورکی
نے اپنے ایک مضمون میں چیخوف کے مختصر افسانوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے
لکھا تھا۔

'NO ONE EVER UNDERSTOOD THE TRAGIC —— NATURE OF LIFE'S TRIFLES SO CLEARLY) AND INTUITIVELYAS CHEKHOV DIDS NEVER BEFORE HAS A WRITER BEEN ABLE TO HOLD UP TO HUMAN BEINGS SUCH ARUTHLESSLY TRUTHFUL PICTURE OF ALL THAT WAS SHAME FUL AND PITIABLE IN THE DINGYCHO AS OF MIDDLE CLASS LIFE'

PAGE 17, COLLECTED SHORT STORIES VI.

[illegible] انسان کی [illegible] زندگی [illegible]
[illegible] ہے [illegible] کے [illegible] ساتھ [illegible]

کی فنی اسلوب کا ایک منفرد پہلو یہ ہے کہ اکثر کہانیوں میں شگفتگی اور ظرافت کی ایک موج رواں رہتی ہے جو ان کے بیانیہ کا ایک حصہ ہے۔ یہ شگفتگی بیان ان کے کرداروں کی المناکی پہ اپنے آنچل کا سایہ ڈال دیتی ہے تاکہ اذیت اور تلخی گوارا ہو جائے

ٹالسٹائی کے آدرشی اور اخلاقی نقطہ نظر کے بجائے زندگی کے بارے میں چیخوف کا ویژن تعقل پسندانہ اور سائنٹفک تھا وہ ٹالسٹائی کے جاگیردارانہ ذہن کے مقابلے میں متوسط طبقے کے ایک ڈاکٹر کا حقیقت پسندانہ طرز فکر رکھتے تھے جس نے ان کے فن کی منفرد پہچان بنائی۔

چیخوف کی طرح بیدی کی کہانیوں میں بھی بے رحم حقیقت نگاری اور شگفتگی بیان کا انوکھا امتزاج ملتا ہے۔ وہ دردناک سچائیوں پر سے پردہ اٹھاتے ہوئے ایسے نیم ظریفانہ کردار اور ایسی تبسم آفریں SITUATION پیدا کرتے ہیں اور انھیں کہانی کی اندرونی ساخت میں اس طرح پیوست کر دیتے ہیں کہ اس سیاق سے الگ ان کی کوئی معنویت نہیں رہتی۔ مثال کے طور پر "لمبی لڑکی" "حجام الٰہ آباد کے" "بکی" اور "زرمان کے جوتے" جیسی کہانیوں کا حوالہ دیا جاسکتا ہے۔

اس سے جڑا ہوا بیدی کا انسان دوستی کا نظریہ ہے انکا ہیومنزم (Humanism) صرف تعقل پسندانہ سیکولر نقطہ نگاہ کا نام نہیں ہے (جو مذہب اور مشینی تہذیب دونوں کے جادو اور جبر سے بیزار ہے) بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ انھوں نے انسان کے روحانی معمولات کا مطالعہ بڑی گہرائی سے کیا ہے مارکسزم نے انھیں انسان کو رجعت پسندانہ توہمات اور ژولیدہ واہموں کی گہرے نکال کر مادی تاریخ کی شفاف روشنی میں سمجھنے کی راہ دکھائی۔ اس حقیقت کا اعتراف بیدی نے بڑے فخر سے کیا ہے۔ لیکن وہ اس مرحلہ پر ٹھہر نہیں گئے۔ اپنی ذہنی کاوش سے انھوں نے انسان کے ان گنت معلوم اور نامعلوم رشتوں اور جذبوں کی شناخت کے نئے پیمانے بھی وضع کئے اور اس طرح انھوں نے انسانی وجود کی پراسرار

[illegible]
[illegible]
طبقاتی اور قومی معاشرت کے تسلسل اور ان کے مطالبات سے گہرا رشتہ استوار رکھا۔ ان کے آرٹ کا یہ بڑا امتیازی پہلو ہے۔ بیدی کی انسان دوستی کا نصب العین استحصال سے پاک ایک ایسے معاشرہ کا قیام ہے جو بنیادی طور پر ایک صحت مند انسانی اور توانا انسانی قدروں کو جنم دے سکے۔ اس سلسلہ میں ان کی کہانیاں "لاجونتی" "ترمیم سے پہلے" "اپنے دکھ مجھے دیدو" اور "تعطل" خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ "تعطل" کا تجزیہ کرتے ہوئے پاکستانی نقاد فتح محمد ملک نے صحیح لکھا ہے:

> "تعطل فقط ترقی پسند سیاسی شعور، گہرے معاشرتی احساس اور پختہ ادبی ہنرمندی ہی کا نمونہ نہیں بلکہ انسانی آزادی اور خود اختیاری کے مسلک کے ساتھ غیر متزلزل اور جاں فروشانہ کی وابستگی کی نادر مثال ہے"

بیدی کی یہ انسان دوستی اشتراکی انسانی دوستی کی قدروں کو جذب کرنے کے باوجود اپنی ایک امتیازی شان رکھتی ہے۔ اس لئے کہ ایک متوازن اور خوش آہنگ آسودہ زندگی کی جدوجہد کو صرف طبقاتی پیکر کے تناظر میں نہیں دیکھتی بلکہ انسان باطنی، روحانی آویزشوں کے نت نئے عوامل کے آئینہ میں بھی اس کا مطالعہ کرتی ہے۔ زندگی کو بدلنے کے ساتھ ساتھ اسے سمجھنے اور پرکھتے رہنے پر بھی زور دیتی ہے۔ آج کے تخلیق کار کے لئے انسان دوستی کا یہ مسلک بھی بڑی اہمیت اور معنویت کا حامل ہے۔

عہد جدید کے بعض ناقدین یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ افسانہ میں ہم عصر سماجی حقیقتوں کی ترجمانی یا تاریخی حقائق کی کارفرمائی جتنی زیادہ ہوگی وہ افسانہ فنی اعتبار سے اتنا ہی پست اور غیر تخلیقی ہوگا۔ ایسے ناقدین افسانہ کی کامیابی کے لئے اس کے "ازلی اور آفاقی" پہلو پر بہت زور دیتے ہیں۔ لیکن چیخوف یا بیدی کے افسانے فن کے اس فرسودہ اور گمراہ کن نظریے کو باطل قرار دیتے ہیں۔ بیدی کے افسانوں کی جڑیں ان کے عہد کی معاشرتی اور تاریخی حقائق میں دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کا فن تنقیدی حقیقت نگاری کی سب سے روشن مثال ہے۔ چیخوف کی طرح ان کے کردار اپنے عہد کی بنیادی حقیقتوں سے غذا حاصل کر کے نشوونما پاتے ہیں۔ حقیقت

[illegible] کے مقابلے میں اپنی [illegible] زیادہ بہتر بیان کرتے ہیں۔ اصل چیز حقیقت کے گرد و نواح کو آفاقی جہتوں سے آشنا کرنا ہے۔ وہ بیدی کے [illegible] تاثر ہے۔ وہ انسان کے روحانی کرب و عذاب (ANGUISH) کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے فن میں فطرت کی عکاسی یا علامتی اشارے یا جزئیات نگاری سب اسی مرکزی فکر کے تابع ہیں۔ سب انسانی صورت حال کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان کے یہاں ہر شے کی میزان فقط انسان کی ذات ہے۔ لیکن بیدی کے یہاں اس کائنات میں انسانی وجود کی معنویت کا کوئی بندھا ٹکا یا کتابی تصور ڈھونڈنا عبث ہوگا۔ وہ آج کی میکانکی زندگی اور اس کے کنزیومرازم (CON-SUMERISM) میں اسی انسان کے متلاشی ہیں جو اپنی طباعی، خود اختیاری اور انحراف سے اپنے آپ کو پانے اور اپنی حسیات منوانے کی جد و جہد کرتا ہے۔ جو ایک معاندانہ ماحول میں پسپائی کے باوجود مقاومت کا ثبوت دیتا ہے۔ متھن میں کیرتی کا کردار اس حقیقت کی اچھی مثال ہے۔ خود بیدی نے اپنی ایک آپ بیتی میں اس خود اعتمادی کا اظہار کیا ہے:-

"... مجھے کسی دھرم گرنتھ کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ایسے متروک کتابوں سے اچھی میں خود لکھ سکتا ہوں، مجھے کسی گرو، استاد، ویکتا کی تلاش نہیں کیونکہ ہر آدمی آپ ہی اپنا گرو ہو سکتا ہے اور آپ ہی اپنا چیلا۔ باقی سب دکانیں ہیں۔ میں نے بڑے بڑے پیڑوں اور تتلیوں کے پھولوں سے باتیں کی ہیں اور ان سے جواب لیا ہے"۔ ——

بیدی نے ایک موقع پر کہا ہے کہ اپنی زمین میں بس ادیب کی جڑیں زیادہ گہری ہونگی اور جو اپنے عوام کے دکھ درد سے زیادہ قریب ہوگا اس کا فن اتنا ہی جاندار ہوگا۔ یہی سبب ہے کہ وہ اپنے کرداروں کے دکھ سکھ کو ان کی تمام تہذیبی جڑوں اور سماجی عوامل کی سچائیوں کے تناظر میں پیش کرنے پر اصرار کرتے ہیں۔ اس طرح کی قدرت بھی اس المیہ تخیل کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔ "گرہن" کی آخری سطریں دیکھئے۔

"... سمندر کی ایک بڑی اچھال آئی۔ سب پھول، بتاشے [illegible] کا ڈھیر بہا کر لے گئی

اس کے ساتھ ہی انسان کے مہیب ترین گناہ بھی بہہ گئی ... دور بہت دور ایک نامعلوم، ناقابل عبور، ناقابل پیمائش سمندر کی طرف ... جہاں تاریکی ہی تاریکی تھی۔ پھر شنکھ بجنے لگے۔ اس وقت سرائے میں سے کوئی عورت نکل کر بھاگی ..... سرپٹ بگٹٹ ..... وہ گرتی تھی بھاگتی تھی، پیٹ پکڑ کر بیٹھ جاتی، ہانپتی اور دوڑنے لگتی ... اس وقت آسمان پر چاند پورا گہنا چکا تھا۔ راہو اور کیتو نے جی بھر کر قرض وصول کیا تھا ..... دھندلے سے سائے اس عورت کی مدد کے لئے سراسیمہ ادھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور دور ساحل سے ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔

دان کا وقت ہے۔

چھوڑ دو، چھوڑ دو۔

پکڑ لو، پکڑ لو، پکڑ لو" ——

یہاں سمندر کی خشمناک لہر، چاند گہن اور فطرت کی گہری ماتمی تاریکی ایسی فضا تخلیق کر دیتی ہے جو "ہولی" کے پر عذاب زندگی کے دائرے کو مکمل کر سکے۔ بیدی کے فن کی بڑائی کا ایک سبب ماحول کشی اور جزئیات نگاری کا یہی ماہرانہ تخلیقی استعمال ہے۔ جو ان کے بہت سے معاصرین کو میسر نہ ہو سکا۔

بیدی کے فن کی بوطیقا میں اس حقیقت نگاری کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ محض فوٹوگرافی نہیں انسان دوستی کے ایک بڑے وژن کے سہارے تہ در تہ زندگی کی باز آفرینی ہے۔ بیدی کے تجربے اور تخیل کا آفاق بہت وسیع ہے۔ اسی آفاقی انسانی تناظر میں وہ ہر شے، ہر جذبے کی معنویت کو مستقل طور پر تولتے ہیں۔ ان کا احساس و ادراک اتنا تیکھا اور مجلا ہے کہ وہ روزمرہ زندگی کی عام اشیاء اور معمولی واردات میں بھی تحیر اور معنویت کے غیر معمولی پہلو تلاش کر لیتے ہیں۔ بحیثیت فن کار وہ اس کے محتاج نہیں ہوتے کہ افسانہ میں سنسنی خیز ڈرامائی یا چونکا دینے والے عناصر ڈال کر اسے حیرت خیز یا چٹپٹا بنائیں۔ بیدی، چیخوف اور پریم چند کی طرح بڑی آہستگی سے زندگی کے ان کہے ورق کھولتے جاتے ہیں۔ ہر جذبہ کی

[illegible]

[illegible] اس کے ارتقا کے [illegible] ہیں وہ اتفاقاً کرتے ہیں [illegible] انسانی جذبات [illegible] کے گرد وہ جیتے جاگتے افراد [illegible] کی زنجیروں کا ایک [illegible] دیتے ہیں [illegible] تو ہے وہ انسانی پیکر زیادہ جاندار اور جاں گداز نظر آتے ہیں۔ اس قدر کہ افسانہ میں پلاٹ کی منطق کا احساس دھندلا اور [illegible] ہو جاتا ہے۔

بیدی نے ایک انٹرویو میں کہا ہے۔

ـــــ میں فن کی حیثیت سے اسے گھٹیا مانتا ہوں کہ (افسانہ میں قاری کو) آپ چٹکی دیں ... میں اسے مانتا ہوں کہ آپ کے افسانہ کے انجام کا پتہ بھی چل گیا اور قاری نے بہت پہلے سے محسوس کرنا شروع کر دیا اور وہیں آ کے ختم ہوا افسانہ تو میں اس کو بہتر افسانہ مانتا ہوں بجائے ایسے کہ جو آپ کو ورطۂ حیرت میں ڈال دے ـــــ

بیدی کے شعور فن کو سمجھنے میں یہ بہت اہم نکتہ ہے۔ وہ افسانہ میں غیر معمولی یا حیرت زا واقعات اور عمل سے تجسس اور دلچسپی پیدا نہیں کرتے اور نہ ہی آخر میں اچانک (TWIST) دے کر کہانی کو کسی غیر متوقع موڑ پر ختم کرتے ہیں۔ اس لئے کہ تحیر زائی کے اس عمل سے قاری محظوظ تو ہوتا ہے اور ایک سستی سی جمالیاتی تسکین بھی حاصل کرتا ہے لیکن اس کے دل و دماغ اس دیرپا اور ہمہ گیر تاثر سے محروم رہتے ہیں جو افسانہ میں مختلف النوع انسانی حالتوں، رشتوں اور قدروں کی لہروں کے ٹکراؤ سے پیدا ہوتا ہے۔ بیدی کے افسانوں میں آہستگی لیکن تواتر کے ساتھ اٹھنے والی یہ ہلکی اور کہیں کہیں تند لہریں نہ صرف ایک منظم پلاٹ کا بدل بن جاتی ہیں بلکہ ایک ایسے پیٹرن (PATTERN) کو بھی جنم دیتی ہیں جو جمالیاتی تکمیل کے اعتبار سے ان کے افسانوں کو ان کے معاصرین کی تخلیقات سے ممتاز کرتا ہے اور انہیں متحرک زندگی کا مرقع بنا دیتا ہے۔

بیدی نے اپنی کہانیوں کو جھوٹ اور سچ یا حقیقت اور تخیل کا مرکب کہا ہے اور مثال دے کر بتایا ہے کہ دنیا کے آسمانی صحیفوں اور [illegible]

[illegible]

[illegible] انتشار [illegible] (HARMONY) [illegible] اور نظم کا احساس کیا گیا ہے کیونکہ کسی بڑے سے بڑے زندگی کے حسن اور معنویت کو آشکار کر سکتے ہیں۔ تخلیق فن کا یہ تصور بیدی کی کہانیوں میں نمایاں ہے اور یہاں قدروں میں ہے جو تخلیق کو دوامی عناصر سے ہمکنار کرتا ہے۔

بیدی نے ریڈیو کے لئے ناٹک بھی لکھے ہیں اور فلمی ڈرامے بھی اور افسانوی ادب کی طرح اس میدان میں بھی انھوں نے زندگی، آدرش اور ادب کے اپنے آدرشوں سے وفاداری برتی ہے۔ انھوں نے یہاں بھی کچھ کہنا چاہا ہے، کچھ دینا چاہا ہے۔ "سات کھیل" کے ڈرامے انھوں نے جنگ عظیم کے دوران لکھے تھے۔ جب فاشزم امن، آزادی، آشتی اور انسانی محبت کے قلعوں کو مسمار کر رہا تھا، زر پرستی کی سفاک سیاست اپنا کھیل کھیل رہی تھی، پانچ کروڑ بے گناہ انسان اس جنگ اور اس کی سیاست کی بھینٹ چڑھے۔ بیدی کے ان نشری ڈراموں میں بھی سیاسی طاقتوں کی بے رحمی کے مقابلہ میں انسانی قدروں کی شفا بخشی کو ابھارا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ان کا مشہور ڈرامہ "چانکیہ" ہے۔ اس میں چانکیہ اور چندر گپت کے کرداروں کو سیاسی مصلحتوں کی بربریت اور انورادھا اور ہیرونک کے کرداروں کو محبت اور انسانیت کی علامت بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک دلچسپ حقیقت کی طرف اشارہ بے محل نہ ہوگا۔ پاکستانی ادیب مظفر علی سید کی نگرانی میں "جریدہ" کا بیدی نمبر شائع ہوا ہے۔ اس میں بیدی کی ڈرامہ نگاری پر اپنے ایک مضمون میں اسی ڈرامہ "چانکیہ" کے حوالے سے ہندوستان کے قومی رہنماؤں اور اس کی خارجہ پالیسی کو مذمت کا نشانہ بنایا ہے۔ لکھتے ہیں:

"ان سب کہانیوں کے ادھورے کھیل حکومت اور انداز حکومت کی مکاری اور بے دردی کا نقشہ کھینچنے میں خود کامیاب ہو جاتا ہے اور "کالے [illegible]" [illegible] کی طرح [illegible] کا شکار ہو جاتا ہے ... آج کل [illegible]

ٹیپ کو مشرقی مبادیات سے کم نہیں سمجھتے۔ ہو سکتا ہے آج
کا کوئی کالا مکار چانکیہ کو بیدی کی طرح کالے روپ میں پیش
کرنے کی ہمت ہی نہ کرے اس لئے کہ یا پنچ تو ملا یوایپ تو سوار
چیل بھک کو دیوتا سنگھاسن پر بٹھایا جا چکا ہے.....
یہ چانکیہ نیتی پھر نئے ہمسایہ ملکوں کے لیے ایک بہت
بڑا خطرہ ہے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ مظفر علی سید پاکستان کے ان ادیبوں میں ہیں جو ادیبوں کو سیاست سے دور رہنے کی تلقین فرماتے ہیں اور خود اعلیٰ ادبی تخلیقات کو مسخ کر کے ان سے گھناؤنے سیاسی پروپگنڈے کا کام لینے میں تامل نہیں کرتے۔

بہرحال یہ فنی بات تھی۔ بیدی نے فلمی زندگی میں بھی تجارتی مقاصد کو سامنے نہیں رکھا۔ انہوں نے بے شمار فلموں کے مکالمے لکھنے کے علاوہ اپنے افسانہ "نقل مکانی" کی بنیاد پر دستک نام کی جو فلم بنائی وہ بقول خواجہ احمد عباس فنی اعتبار سے ایک چونکا دینے والی تجرباتی فلم ثابت ہوئی۔ اس اگر نچلے متوسط طبقہ کی المناک صورت حال کو بیدی نے نہایت موثر انداز سے پیش کیا ہے تو اپنی آخری فلم "آنکھیں دیکھی" میں ہندوستانی سماج میں ہریجنوں کی پر آشوب زندگی کو موضوع بنایا ہے۔

بیدی کا فن بولتا ہوا اور بلند آہنگ نہیں، خاموشی اور سرگوشی کا فن ہے جو بڑی آہستگی سے قاری کو زندگی کے المناک تماشوں میں شامل کرتا ہے اور یہ کام وہ پریم چند کی طرح لیکن ان سے زیادہ ہنرمندی کے ساتھ الفاظ سے لیتے ہیں۔ روزمرہ کے مانوس اور مجہول الفاظ ان کی کہانیوں میں حیرتوں اور مسرتوں کی ایک وسیع دنیا کے در کھول دیتے ہیں۔ اس میں داخل ہو کر قاری کے لئے پھر لوٹنے کا کوئی دروازہ نہیں ہوتا۔ بیدی کی حقیقت نگاری میں نازک انسانی رشتوں اور جذبوں کی تلاش کو خاص اہمیت حاصل ہے اور ان کی فکر آفرینی ایک خاص ماحول کی تخلیق پر منحصر ہوتی ہے۔ اور یہ دونوں کام بیدی الفاظ کے انتخاب اور ان کے تخلیقی استعمال سے لیتے ہیں۔ بیدی کی کہانیوں میں زبان و بیان کی جن خلیوں اور پنجابی اثرات کی نشاندہی کی گئی ہے وہ بیدی کے فن کی عظمت کے عین مطابق ہے۔ بیدی کی زبان نے پنجابی کے لسانی اور تہذیبی اثرات کو تخلیقی ناگزیریت کے طور پر قبول کیا ہے۔ یہ صورتحال پنجاب سے تعلق رکھنے والی ان کی ہر کہانی اور خاص کر "ایک چادر میلی سی" میں دیکھی جا سکتی ہے۔ بیدی کے ادبی ورثہ میں زبان کے اس تخلیقی استعمال کو بھی نمایاں اہمیت حاصل ہے۔

آخر میں پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ بیدی کے فن کا سرچشمہ انسانی دردمندی کے مقدس جذبات اور اعلیٰ انسانی اقدار سے وابستگی ہے۔ جسے بدلتے ہوئے انسانی رشتوں کے تناظر میں پیش کرتے ہوئے انہوں نے فن کی جمالیات کے تقاضوں کو ایک پل کیلئے نظر انداز نہیں کیا۔ □□

غزل

سُورج کے پھول جلتے ہوئے خار پر جُھکے
بے دست جیسے جنگ میں تلوار پر جُھکے

ٹھنڈی کرن کا گرم لہو دیکھنے کے بعد
سُورج کے ہونٹ پھول کے رُخسار پر جُھکے

کالے بدن پہ دُھوپ کی چادر لپیٹ کر
ظلمت کے دیو سایۂ دیوار پر جُھکے

سُورج کا جسم جُھول گیا یوں تھکن کے بعد
مصلُوب ہو کے جیسے کوئی دار پر جُھکے

جُھلسے ببُول صحرا میں ڈھونڈیں حیات یوں
جیسے طبیب چہرۂ بیمار پر جُھکے

سُورج کا قتل ہو گیا کاوشؔ زمین پر
پڑھتے ہیں لوگ صبح سے اخبار پر جُھکے

کاوشؔ الہ آبادی

۲۳۰- دائرہ شاہ اجمل۔ الہ آباد ۲۱۱۰۰۳

غزلیں

جو ذہن میں سے تھا عبارت، وہ مکاں غائب ہوا
اب کسے یہ ہوش؟ سر سے آسماں غائب ہوا

جسم مکمل ہو کر، اندر سے بہت خالی لگے
شخصیت کا وہ اُدھورا پن، کہاں غائب ہوا

یک کفِ خاکستر دل ہے، ہمارا جسم کیا!
کیا ہوا تھی، بجھ گیا شعلہ، دھواں غائب ہوا

یہ سمندر کا سفر، مجھ کو کہاں لے جائیگا؟
رہ گئی کشتی اکیلی، بادباں غائب ہوا

مدتوں پر، شہر میں اس کے، بلا اذنِ قیام
چلئے، اپنی لا مکانی کا نشاں غائب ہوا

اب اسی قوس و قزح کے رنگ میں جلتے رہو
وقت، پلکوں پر سجا کر تتلیاں، غائب ہوا

ہے ابھی موقع، مجھے محفوظ کر لے، ورنہ میں
آنکھ جھپکی، صورتِ خوابِ رواں غائب ہوا

رائگانی کا نشہ اُترے تو پھر سوچوں فضا
کس جگہ سرمایۂ عمرِ رواں غائب ہوا

—— فضا ابن فیضی

جمال پورہ، مئو ناتھ بھنجن
275101

خدا رکھے، خدا خانے بہت ہیں
اس آبادی میں ویرانے بہت ہیں

نہیں ہے سر بکف دیوانہ کوئی
مآل اندیش فرزانے بہت ہیں

یہاں بھی امن کا امکان کم ہے
یہاں کعبے، صنم خانے بہت ہیں

ہوئے تھے مجھ سے وہ رسماً مخاطب
جہاں میں اس کے افسانے بہت ہیں

تو کیا یہ قول سچا ہے کہ ہشیار
بکارِ خویش دیوانے بہت ہیں

نظر آتا نہیں کیوں اپنا چہرہ
یہاں تو آئینہ خانے بہت ہیں

نہ سلجھے گی کبھی زلفِ پریشاں
اگرچہ آئینے، شانے بہت ہیں

نہ اُترو خواب کے دریا میں ناوک
یہاں گرداب انجانے بہت ہیں

—— ناوک حمزہ پوری

ڈاکخانہ شیر گھاٹی، ضلع گیا (بہار) 824211

پروفیسر جعفر رضا
شعبۂ اردو - الٰہ آباد یونیورسٹی، الٰہ آباد

وجودیت میرے لیے

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہرچند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے

یہ اشعار مرزا غالبؔ کے ہیں۔ ان میں وجودی شئے موجود ہے بس مروجہ لفظ 'ہستی' کو 'وجود' قرار دینے کے بعد ان کے وحدت الوجودی خیالات کو وجودیت کے معنی دیئے جاسکتے ہیں۔ ابتدا سے انسان اور کائنات کا رشتہ فلسفے کا موضوع رہا ہے۔ افلاطون کے نظریۂ اعیان سے ہیگل کی جدلیات تک وجودِ حقیقی کو انسان کی باطنی یا داخلی دُنیا کا مظہر قرار دیا جاتا رہا ہے۔ اگر اس باطنی یا داخلی دُنیا کو 'روح' کہہ دیں تو پھر دور از کار کے شائقین بھی اعتراض نہیں کریں گے۔ مرزا غالبؔ کا یہ شعر ؎

سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

اس میں ہیڈگر کے اس تصور کی تائید ہے کہ انسان زندگی بھر کسی نہ کسی طرح صورتِ حال میں گرفتار رہتا ہے۔ وہ ایک صورتِ حال پر قابو حاصل کرتا ہے تو دوسری صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح دستووسکی کا خیال کہ 'لایعنیت' ہی دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے،

مرزا غالبؔ کے ان اشعار میں تلاش کی جاسکتی ہے ؎

ربطِ یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار
سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل نا آشنا

جب کہ نقشِ مدعا ہو وے نہ جز موجِ سراب
وادیٔ حسرت میں ہے آشفتہ جولانی عبث

نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کفِ خاک
آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

اس طرح کے اشعار میرؔ، دردؔ، مصحفیؔ اور آتشؔ وغیرہ کے کلام سے بآسانی منتخب کیے جاسکتے ہیں۔ ان اشعار کی روشنی میں کوئی خوش عقیدہ ناقد ہمارے بزرگ شعرا کو وجودی قرار دے تو عجب نہیں۔ محتاط ہونے کی صورت میں اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ وجودیت کی اساسی فکریں وجود کے کیف و کم کی آئینہ دار رہی ہیں، جن کا سراغ ہر دور کے فن پاروں میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔ البتہ اُردو میں وجودیت کے اولین نقوش کلامِ اقبال میں ملنے کے امکانات ہیں کیوں کہ علامہ اقبال نطشے سے بالواسطہ متاثر تھے۔ ممکن ہے، اس راستے سے وجودی مفکرین خاص طور پر کرک گارڈ تک رسائی حاصل کی ہو۔ لیکن یہ خوش عقیدگی بھی سردست مفروضے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی جب تک کہ اس کے واضح ثبوت مہیا نہ ہو جائیں۔ البتہ اس کے امکانات ضرور ہیں، کیوں کہ بیشتر جدید وجودی مفکرین ہیڈگر، یاسپرس، مارسل، کروتر وغیرہ علامہ اقبال کی وفات سے قبل اپنا نظامِ فکر مرتب کر چکے تھے۔ مزید برآں علامہ

اقبال کا نظام فکر اسلامی اساس رکھتا [illegible] وجودیت سے مختلف ہے لیکن اقبال کے نظام فکر میں [illegible] تشکیل جدید میں ان [illegible] کی بابت فکر سے متاثر ہونا خالی از امکان نہیں۔ تقدیر اور عمل کے متعلق فکرِ اقبال وجودی فکر کے اساسی ارکان سے بڑی قربت رکھتا ہے لیکن 'مردِ مومن' کے کردار و عمل کا جوہر سارتر کے وجودی کردار و عمل سے مختلف رہتا ہے۔ البتہ کرک گارڈ نے فیصلے کی آزادی میں کرب ابراہیمی کی مثال دی ہے جو کلام اقبال میں بھی جگہ پاتی ہے۔ یہ مماثلت اگر محض اتفاقی نہیں تو علامہ اقبال کے فکر کے اس پہلو پر مزید غور کرنے کی ضرورت ہے ۔

از خود اندیش و ازیں بادیہ ترساں مگذر
کہ تو ہستی و وجودِ دو جہاں چیزے نیست

وجودیت کو یورپ کی فکری تاریخ میں دوسری جنگ عظیم کے دوران خاص طور پر جرمنی میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ جنگی شکست و ریخت نے مروجہ فکری نظام اور نظریاتی اقدار کے قلعے مسمار کر دیئے تھے۔ سماجی زندگی اقتصادی بحران میں مبتلا تھی۔ صرف تدریسی حلقوں میں مقدس زندگی کا تصور باقی تھا جس کو ہیگل یا کانٹ کے تصورات سے رہنمائی ملتی تھی لیکن ایسی نسل جو آگ اور خون کے سمندر میں شناوری کر چکی تھی، اس نے عملی زندگی کے غاروں اور خندقوں کو صرف دیکھا نہ تھا بلکہ اپنے وجود کی تمام طاقتیں یکجا کر کے انھیں عبور بھی کیا تھا، اس نسل کے لئے زندگی کا جوہر (ESSENCE) شاعرانہ مفروضے سے زیادہ اہمیت نہ رکھتا تھا۔ اس مجبور، مقہور نسل کو اپنے افعال و اعمال کے جواز کے لئے کسی فلسفۂ حیات کے گھنے، چھتنار اور سایہ دار درخت کی ضرورت تھی۔ اس کے غم جاناں اور غم دوراں کا مداوا وجودیت میں مل سکتا تھا، جو ملا۔ جدیدیت مابعد الطبیعاتی رویہ کے باوصف فلسفۂ حیات کی حیثیت سے مقبول ہوئی اور اس میں مروجہ فلسفہ کے خلاف ردِ عمل بھی ہوا۔ وجودیت کا کلیدی محور 'ہے' (IS) کے بجائے 'میں ہوں' (I am) میں مضمر ہے، جو یونانیوں کے حکیمانہ قول "اپنی معرفت آپ حاصل کرو" (Know thyself) کی بازیافت ہے۔

روایت ہے کہ یہ قول یونان قدیم کے اس مقدس ڈلفی مندر کے دروازے پر کندہ تھا جس میں دشوار ترین پیچیدہ اور لاینحل مسائل کے حل کی کاوش میں رجوع کیا جاتا تھا [illegible] سارتر اور ساتھیوں [illegible] سقراط اور اس کے قبل کے فلسفیوں کی منطقی معروضیت کی مخالفت کا رویہ بھی وجودی فکر کی نشاندہی کرتا ہے۔ ابتدا میں اس کو رواقی، افلاطونی اور دورِ وسطیٰ کے بعض عیسائی فلسفیوں نے زندہ و باقی رکھا۔ جو دورِ جدید میں داخل ہونے کے بعد تاریخ فلسفہ میں خصوصی اہمیت حاصل کر گیا۔ وجودی رجحانات کے نقوش فلسفہ کے دورِ جدید میں دو عظیم فلسفیوں پاسکال اور ڈیکارٹ کی بدولت واضح ہوئے۔ پاسکال نے انسان کے مطالعہ کے لئے تجربی علوم کو ناموزوں قرار دیا اور روح کے فانی یا لافانی ہونے کی بحث کی۔ پاسکال کو ڈیکارٹ سے شدید اختلاف تھا۔ ڈیکارٹ کی تعلیمات کا اس کے حکیمانہ قول: "میں سوچتا ہوں اس لیے میں موجود ہوں" (Cogotio ergo Soum) میں ہے، اس کو الٹ کر پاسکل کہتا ہے: "میں موجود ہوں اس لیے سوچتا ہوں" (I think therefore I am) وجودی فکر کو پایۂ اعتبار عطا کرانے میں کانٹ، فختے، شلنگ، نطشے اور شوپنہار کے نام لیے جاتے ہیں، بلکہ مشہور شاعر و نقاد کولرج کی نگارشات میں بعض ایسے وجودی نظریات کے نقوش تلاش کیے گئے ہیں جو بعد میں جدید وجودی فکر کے بانی سورن کرک گارڈ کے لئے پیش گوئی ثابت ہوئے۔

کرک گارڈ اپنی حیاتِ مختصر کے باوجود انقلاب آفریں تصانیف کی بنا پر ممتاز ہے وہ اپنے وطن عزیز میں ناقدریوں کا شکار رہا۔ انھوں نے اس کے انقلاب آفریں تصورات کو مجنوں کی بڑ سے زیادہ اہمیت نہ دی۔ لیکن جب اس کی نگارشات ترجمہ ہو کر یورپ میں پھیلیں تو مذہبی فلسفیوں کے ایوانوں میں تہلکہ مچ گیا کیونکہ اس نے ہیگل کی معروضی عینیت پر شدید حملے کیے تھے۔ عصر حاضر میں وجودیت کی مقبولیت کا سبب کرک گارڈ سے زیادہ ژاں پال سارتر اور اس کے دبستانِ فکر کے فلسفی ہیں جنھوں نے وجودیت کو جدید فلسفۂ حیات کا ذریعہ عطا کیا اور ادب و فن کے تجزیہ و تفہیم میں جدید زاویۂ نظر عطا کیا۔ سارتر کا مشہور ناول "نوژیا" (XNOBA) وجودی ادب میں شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے بہت سی کہانیاں اور ڈرامے لکھے، جن کو وجودی ادب میں اہمیت حاصل ہے۔

[illegible]

[illegible] وجودی فکر کے [illegible]

[illegible] ہیں۔ وجودی مفکروں میں سب سے

بلند قامت نام فرانس کے سارتر کا ہے۔ اس کے علاوہ جرمنی کے مارٹن

ہیڈیگر کی اہمیت بھی ہے۔ ان دونوں مکاتب فکر کے علاوہ وجودی فلسفیوں

کا حقیقت پسندانہ گروہ بھی ہے جو دینی اور لادینی فکر کے درمیان میانہ روی

کو سلامت روی قرار دیتا ہے۔ مختلف ماہرین کے درمیان راہ پیدا کرتا ہے

اس مکتب فکر کا علمبردار جرمنی کا مشہور فلسفی کارل یاسپرس ہے۔ وجودی

فلسفیوں کے تمام مکاتب فکر اس بنیادی تصور پر ہم خیال ہیں کہ وجود کا

نقطۂ آغاز موضوعیت (SUBJECTIVITY) ہے جو ماہیت پر مقدم کرتی ہے

(ESSENCE EXISTENCE PROCEEDS) یعنی وجود کو ماہیت

کے قبل ہونا چاہیئے۔ وجودی فکر میں وجود کی اصطلاح کائنات کے

تمام موجودات کا احاطہ نہیں کرتی بلکہ اس سے محض تکوین (Being) مُراد

لی جاتی ہے۔ اس طرح وجودیت فرد کا فلسفہ 'ہونے تک' محدود ہے

وجودی فکر فرد کے لئے اُمید اور تگ و دو کی حمایت کرتی ہے۔ دیگر نظری

نظریات سے ممیز کرنے کی غرض سے بسا اوقات وجودیت کو انتشار کا فلسفہ

(PHILOSOPHY OF CRISIS) بھی کہا گیا۔ "وجود ماہیت پر مقدم ہے"

کی طرح تمام وجودی فلسفیوں کا مشترکہ پیغام ہے کہ:

"فرد کو لگام اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہیئے ورنہ اسے تباہی

کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے"

کرک گارڈ کے الفاظ میں: BOTH END' IS THE ROAD TO –

HELL, BUT 'EITHER OR' IS KEY TO HEAVEN –

وجودیت کے پیغام کو مختصر ترین الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ فرد کو وجود

کے جال میں گرفتار کر کے بے معنی کائنات میں رہنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔

اصول ضوابط کے مطابق واقعات کی تنظیم نہیں ہو سکتی۔ فرد وجود کی

دشواریوں سے عہدہ بر آ ہونے میں کسی نہ کسی طرح معنی کی تلاش

کرتا ہے۔

[illegible] وجودیت کا [illegible] کرک گارڈ راسخ العقیدہ عیسائی

تھا، لیکن اس کا تصور خدا بعض مسیحیوں کے لئے [illegible]

اس پر ہیگل کا فلسفہ عینیت حاوی رہا، جس میں زندگی کی [illegible]

حاصل کرنے کا وسیلہ تلاش کرتا رہا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد [illegible]

ہیگل کو ترک کر کے اپنی راہ الگ بنالی۔ عینیت پسندی سے ناآسودگی

کا سبب انیسویں صدی میں عینیت پر نیچرلزم کے حملے تھے۔ عینیت اور

نیچرلزم دونوں متضاد فلسفے ہیں ان میں قدر مشترک بھی ہے۔ یہی قدر مشترک

یعنی فرد کی اہمیت کی نفی کرک گارڈ کے لیے انقلاب آفریں تصورات کا

باعث بنی۔ عینیت پسندی اور نیچرلزم دونوں میں فرد پر کسی طرح مجرد خیال،

مطلق اقدار اور وجود مطلق کو تقدم دیا گیا ہے۔ عینیت پسند وجود [illegible]

کو وجود مطلق قرار دیتا ہے جو ابدی فیاض ہے۔ اس میں جذب ہو کر

فرد معراج کمال حاصل کرتا ہے۔ اس تصور کا سراغ وید مقدس میں بھی

لگایا جا سکتا ہے جس میں 'سرکشن' کے لیے وجود مطلق میں جذب ہونا

بیان کیا گیا ہے۔ صوفیاء کے وحدت الوجودی تصورات عینیت پسندی

سے مماثل ہیں جو مرزا غالب کے الفاظ میں 'ہر کو بجز جلوۂ یکتائی

معشوق' اہمیت دینے پر تیار نہیں ہوتے اور فرد کے وجود کو 'حسن کے

خود بیں ہونا' قرار دیتے ہیں۔ نیچرلزم میں فرد کو مجبور محض قرار دیا گیا ہے

جس میں فرد نہ تو اپنی مرضی کا مختار ہے اور نہ کسی عمل کا ذمہ دار۔ فرد

آزادی سے محروم، نمائشی اور تحرک سے عاری۔ فرد کے متعلق نیچرلزم

کے تحقیری رجحان کی بنا پر عینیت پسندی کو مقبولیت حاصل ہوئی، لیکن

کرک گارڈ کے سوالات کے جواب نہ تو عینیت پسندوں کے پاس تھے،

نہ نیچرل پسندوں کے پاس۔ کرک گارڈ فرد کو فعال و متحرک وجود قرار دیتا تھا

اس کی آزادی کا قائل تھا، جو انتخاب اور فیصلے کی قوت کا مالک ہے۔

وہ اپنے انتخاب اور فیصلے کا ذمہ دار بھی ہے۔

کرک گارڈ نے خدا کی موجودگی کی بحث کو حماقت سے تعبیر کیا ہے

کیوں کہ خدا (GOD) اور عقیدہ (DOGMA) کو عقل کی میزان پر نہیں

تولا جا سکتا۔ فرد کو جسم و روح کا اتصال قرار دیتا ہے اور [illegible]

روح کو سرچشمہ۔ یعنی خدا ہر لمحہ فرد کے ساتھ ہے اور اس کے جسم

کے اندر ہے۔ دوسرے الفاظ میں فرد میں [illegible]

ابدی کا مقدس سنگم ہے۔ عینیت پسندی میں ذات خدا کو [illegible]

[illegible]

[illegible] کو ماننے کو تیار نہیں [illegible] آزادی کو [illegible] کا تاثر دیتا ہے۔ اس کے نزدیک خدا اور فرد کا رشتہ لطیف بھی ہے اور استوار بھی۔ وہ فرد کے قلب میں عشق روحانی جاگزیں کرتا ہے۔ کرک گارڈ کی واسخ العقیدگی ایک طرف اسے جسمانی موضوعیت کی قائل کرتی ہے، جس میں وہ تصور رگ [illegible] ہے تو دوسری طرف خدا کا یسوع مسیح کے پیکر میں جسم لینا خدا کو فرد کے جسم کے اندر موجود ہونے کی دلیل گردانتا ہے اور [illegible] کرتا ہے کہ فرد کے وجود کے بغیر خدا کے وجود کا تصور نہیں کیا جا سکتا، جبکہ فرد کو محض عرفان ذات تک محدود نہیں بلکہ اپنے اعمال و افکار کے لیے آزاد قرار دیتا ہے۔

عینیت پسندی میں فرد کو شے سے زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہے یہ صحیح ہے کہ اس میں اسے احساس، جوہر اور خیال کو اولیت دینے کی بنا پر وقتی اور معنوی اطمینان حاصل ہو جاتا ہے لیکن وہ حقیقت کو وجود کے لئے ثانوی درجہ عطا کرتا ہے، جو وجود کی تحقیر کے مترادف ہے۔ حالاں کہ حقیقت پسندی میں فرد کو زندگی سے وابستہ کیا گیا ہے لیکن اس میں احساس سے دور اور وجود کے قریب دیکھا گیا ہے جو مختلف النوع تضادات سے دوچار رہتا ہے۔ اسی بنا پر جدلیاتی فلسفے میں تضادات کو اساسی اہمیت دی گئی ہے جن کی تفہیم، مطالعہ اور حل تلاش کرنے میں حقیقت نگاری کے جلوے بے نقاب ہوتے ہیں۔ ملک یا سماج کی سطح پر ان تضادات کو دو خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: تضاد اولی (PRINCIPAL OR PRIMARY CONTRADICTIONS) اور تضاد ثانوی (Secondary contradictions)

ماؤزے تنگ نے تضادات سے متعلق اپنے مضمون (ON CONTRADICTIONS) پر خاصا زور بھی صرف کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ صحیح معنوں میں جدلیات اشیاء کے تضادات کے مطالعہ کا نام ہے۔ لیکن تضادات کا مطالعہ جدلیات کی اصل ماہیت کا کلیہ ہے جیسے وہ جدلیات کے گودا (KERNEL) کا نام دیتا تھا۔ کرک گارڈ بھی تضادات کا قائل ہے جو فرد میں خارجی یا نفسیاتی قوتوں کے دباؤ اور بعض دیگر ضرورتوں کی صورت میں رونما ہوتے ہیں۔ وہ حقیقت پسندوں

[illegible]

یا [illegible] ہوتا ہے [illegible] جہاں [illegible] انسان [illegible] کی سطح پر پہنچ جاتا ہے۔ کرک گارڈ [illegible] سماج کی ضرورت اور اہمیت کا منکر نہیں، وہ انہیں فرد کی تکمیل کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ فرد کو اپنے تکمیل وجود کے لئے دوسرے افراد اور پس منظر کی ضرورت ہوتی ہے، جس کے وسیلے ملک یا سماج ہیں۔ فرد کے وجود میں سماج، ملک اور کائنات کا وجود شامل ہوتا ہے، جو پس منظر کی حیثیت سے فرد کے وجود میں شریک کار بنتے ہیں۔ لادینی وجودی فلسفی [illegible] بھی ملک یا سماج کو تکمیل وجود کا وسیلہ قرار دے کر آزادی کائنات میں [illegible] کا نظریہ پیش کرتا ہے۔ دینی اور لادینی وجودیت کے درمیان [illegible] کا علمبردار دوسرا جرمن وجودی فلسفی یاسپرس کہتا ہے کہ میرا وجود دوسروں سے رابطہ پر منحصر ہے۔

کرک گارڈ نے وجودی (EXISTENTIAL) ہونے کی اصطلاح جرمن اصطلاح EXISTENS PAILONOPTIC سے وضع کی تھی جسے عرف عام میں فلسفۂ زیست کہا جا سکتا ہے۔ اس کے نزدیک کائنات میں ہر مرئی یا غیر مرئی شے وجود رکھتی ہے۔ لیکن وجود انسان یا فرد ہے۔ ہر فرد بذات خود تنہا اکائی ہے، دوسرے سے مختلف ایک دوسرے کے لئے چیستان۔ ہر فرد اپنے افکار و اعمال میں آزاد ہے۔ یہی آزادی وجودیت کا بنیادی محور ہے۔ لیکن وجودی آزادی اس تصور آزادی سے مختلف ہے جسے رومانیت پسندی میں منشور بنایا گیا تھا۔ چونکہ فرد آزاد ہونے کے باوجود قید زمان و مکان سے آزاد نہیں، اس لیے فرد اپنے آزادیٔ انتخاب میں ذہنی اضطراب کا شکار ہوتا ہے کیوں کہ وہ نہیں جانتا کہ اس کے انتخاب کا انجام کیا ہوگا۔ کرک گارڈ نے اضطرابی کیفیت کے تجزیے میں خوف اور اضطراب کا بہترین موازنہ کیا ہے۔ خوف کا سبب خارجی (Objective) ہوتا ہے، اس لیے آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن اضطراب خارجی شے یا عمل کا نتیجہ نہیں، فرد کی باطنی گہرائیوں میں پیدا ہوتا ہے، اس لیے فرد بیان کرنے سے قاصر رہتا ہے کہ وہ کیوں مضطرب ہے؟ یہ معدومیت کی بنا پر ہے جو وجودی فکر کا اہم ترین مسئلہ ہے۔

[illegible] صورت حال [illegible] ہے۔ [illegible] فیصلے کے [illegible] اس صورت حال کو تبدیل [illegible]

انسان و کائنات کی تصدیق کے لئے عشق کہتا ہے۔ اقبال نے عشق کو جذبہ و عمل کی کائنات بنا دیا اور برگساں کے نزدیک یہی وجدان یا تخلیقی فعالیت بن گئی لیکن کرک گارڈ اس کیفیت کو لایعنی (absurd) گردانتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ فرد اپنے تمام تر احساس ذمہ داری سے کوئی فیصلہ کرتا ہے۔ جو کہ چند منطقی اصولوں کے معیار پر کبھی درست کبھی نادرست ہوتا ہے۔ اس لئے فیصلے کے وقت ذہنی سوگواری میں اضطراب پیدا ہوتا ہے۔ احساس کرب ذہنی اذیت میں مبتلا کرتا ہے۔ اس کا مداوا کورے اخلاق یا استدلالی مفروضات میں نہیں مل سکتا۔ نہ تو ریاضی کا مفروضہ کلیہ ۲ + ۲ = ۴ کام آتا ہے، نہ دیگر سائنسی حقائق۔ البتہ مذہبی فرمودات مشعل راہ ہو سکتے ہیں جن پر اعتماد کر کے فرد عالم اضطراب میں دعوت مباہلہ قبول کر کے اپنے نفسوں خواتین اور عیال کے ساتھ شامل ہو جائے۔ اسی بنا پر کرک گارڈ تمام تر وجودی تصورات کے باوجود مذہب سے دامن بچانے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ اس کا تمام تر تجسس ایک راسخ العقیدہ مسیحی کا تجسس ہے البتہ روایتی مذاہب سے ان کے خارجی (OBJECTIVE) ہونے کی بنا پر منحرف ہے کرک گارڈ فرد کے فیصلے کے لئے داخلی (SUBJECTIVE) ہونا ضروری قرار دیتا ہے۔ وہ اپنی مشہور کتاب CONCLUDINGUNSCIENTIFIC POSTSCRIPT میں ہیگل کے اس خیال کو جسارت آمیز اور مضحکہ خیز قرار دیتا ہے کہ جو حقیقی ہے وہی عقلی ہے اور جو عقلی ہے وہی حقیقی (The real is therationaland the reational is real) کرک گارڈ کی شدید تنقید ہیگل کے اس مفروضے پر ہے کہ ایک غیر مکمل منصوبہ کا ایک مخصوص جزو جان سکتا ہے کہ تکمیل کے بعد اس کی کیا شکل ہوگی۔ وہ سوال کرتا ہے کہ اگر واقعتاً کائنات ایک مکمل منظم اکائی ہے۔ تو کائنات کے رموز سے خدا ہی واقف ہو سکتا ہے۔ فرد کا علم و ایقان محدود ہوتا ہے۔

وجودیت کے تاریخی فلسفہ میں ایک اور اہم نام کارل یاسپرس کا ہے۔ وہ کرک گارڈ کی طرح اس کا قائل ہے کہ ہیگل کے استدلالی الہیات کے نظام میں عصری مسائل کے حل تسلی بخش طور پر نہیں مل سکتے۔ یاسپرس کے نزدیک عصر حاضر کے تناظر میں فرد کی انفرادی آزادی کو مذہبی تصورات سے زیادہ تشنیع اور منفی نظام سے خطرہ ہے وہ اس کا تفصیلی ذکر اپنی کتاب MAN IN THE MODERN AGE میں کرتا ہے وہ مشینی نظام زندگی پر شدید تنقید کرتا ہے لیکن کرک گارڈ کی طرح طبیعاتی علوم کی افادیت کا منکر نہیں ہے۔ وہ قبول کرتا ہے کہ اگر چہ طبیعاتی علوم یا سائنس موجودات کے تمام رموز بے نقاب کرنے سے قاصر ہیں، پھر بھی بحیثیت مجموعی ان کی بدولت فرد کے علم و ایقان میں اضافہ ہوا ہے۔ یاسپرس کرک گارڈ کی طرح اثبات وجود الٰہی پر زور نہیں دیتا لیکن نفی کو غیر ضروری سمجھتا ہے بلکہ بعض تحریروں میں بالواسطہ ذکر کرتا ہے کہ فرد علمی ناقطعیت اور سعی و عمل کی تجدیدات میں زندگی کے ایک ایسے منبع یا سرچشمہ کی غمازی ملتی ہے، جو فرد کے علم و ایقان سے بالاتر ہے لیکن وہ وحی یا الہام سے انکار کرتا ہے اور اسے کاروبار زندگی میں رہنمائی وسیلہ نہیں مانتا۔ اس کے نزدیک یہ کہنا کہ فرد اپنے افکار و اعمال کے اعتبار سے فیصلہ کرنے میں آزاد ہے ناممکن صورت حال ہے۔ کیونکہ زندگی میں وجود کو خارجی حقائق کے اعتبار سے سمجھا جا سکتا ہے۔ یاسپرس کے بعض حالات وجودی کلیوں سے میل نہیں کھاتے اس لئے وہ اس طرح کا وجودی منکر نہیں، جیسا کہ کرک گارڈ ہے۔

جبرئیل مارسل وجودیوں کا میر کارواں نہیں ہے لیکن اس نے سماجی جماعت (SOCIAL COMMUNIAN) کو اپنے وجودی فکر کا نقطۂ آغاز قرار دے کر وجودی فکر کو نئی جہتوں سے روشناس کیا اور اس طرح وجودی فلسفیوں میں منفرد حیثیت کا مالک بن گیا۔ وہ مذہب کی بنیادوں پر وجودیت کی اساس قائم کرتا ہے۔ مارسل کے تصورات دیگر وجودیوں کے مقابلے میں زیادہ متاثر نہ کر سکے۔ اس کے مقابلے میں مارٹن ہیڈگر زیادہ مقبول ہے جس نے کئی مختلف وجودی تصورات عطا کئے۔ ہیڈگر کے وجودی فکر کو سہ نکاتی مباحث۔ (۱) زمانہ کی مروجہ تقسیم (۲) خارجیت و داخلیت کی تقسیم اور (۳) صورت حال کی تبدیلی۔ میں نیا زاویہ پیش کرنے کی بنا پر حاصل ہوئی۔ ہیڈگر زمانہ کو ماضی، حال، اور مستقبل میں مروجہ اعتبار سے تقسیم کرنے کے خلاف ہی نہیں اسے غلط اور گمراہ کن کہتا ہے۔ اس کے نزدیک زمانہ وجود انسانی کا لازمی جزو ہے، جس میں تسلسل ہے۔ دراصل جسے ماضی کہا جاتا ہے، ماضی نہیں ہوتا بلکہ اس دائرے (vicious circle) کا جزو ہوتا ہے۔ جس میں زمانہ گردش کرتا ہے۔ ہر ماضی کا حال بھی ہوتا ہے اور مستقبل بھی اس لئے وجود کو زمان و مکانی

[illegible]

[illegible] ... [illegible]

[illegible] فیصلہ کا حق بھی [illegible] سے خارج ہو جاتا ہے

اس میں ایک دوسری قسم کے مطالبات ہیں [illegible] کی تقسیم کو غلط قرار دیتا ہے۔ ہیڈگر کہتا ہے کہ فرد اپنی [illegible] ہو گئی ہیں مختلف صورت حال سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔ وہ ایک صورت حال پر قابو پاتا ہے تو دوسری صورت حال میں گرفتار ہوتا ہے۔ یہ صورت حال بھی لا متناہی دائرے کی حیثیت رکھتی ہے۔ صورت حال کی آخری منزل موت ہے۔ اس لئے کرب، مایوسی یا اضطراب وجود انسانی کا لازمی جزو ہے۔ اس سے نجات حاصل کرنے کیلئے فرد کو معتبر ..... (AUTHENTIC) زندگی گزارنا چاہئے، جو علائم دنیا سے بچنے کیلئے حاصل ہو سکتی ہے۔

عصری وجودیوں کے مطابق فرد لمحہ بہ لمحہ اپنے وجود کی تعمیر و تشکیل میں سرگرم رہتا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ اس میں اس کے وجود کی تعریف کی جا سکے۔ ہر وجود دوسرے وجود سے مختلف ہوتا ہے۔ ان میں باہمی تضادات ہو سکتے ہیں اس لئے وجودیت کی ایسی تعریف نہیں کی جا سکتی جو سب پر محیط ہو سکے۔ مستقبل کا علم کسی کو نہیں لہٰذا اس کے بارے میں پیشن گوئی غلط ہو گی۔ پہلے سے طے شدہ نظریے کے مطابق وجود کی تعریف کرنا گمراہ کن بھی ہوگا اور ناممکن بھی۔ فرد کے بارے میں صرف اتنا یقینی ہے کہ وہ خود اپنا انکشاف کرتا رہتا ہے یعنی فرد ہی اپنی اقدار کا انتخاب و تعین کرتا ہے۔ اپنے اعمال و افکار کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ عصری وجودیت میں موضوعیت کو اساسی اہمیت حاصل ہے لیکن وجودی موضوعیت کو نفسیاتی موضوعیت کے ساتھ خلط ملط نہیں کرنا چاہئے جب کہ دونوں باہمی طور پر مختلف تصورات کے حامل ہیں۔ اول الذکر فرد کی نفسیاتی الجھنوں اور باطن کے اندھیروں سے متعلق ہے۔ آخر الذکر میں فرد زندگی کا مالک ہے۔ اسے کسی غیبی یا فطری محاسب کی ضرورت نہیں۔ اس طرح وجودیت دعویٰ کرتی ہے کہ اس نے فرد کو نہ صرف وقار اور بلندی عطا کی ہے بلکہ دوسروں سے ممیز بھی کیا ہے۔ اس میں فرد کے افعال اہم ہیں، نظریات یا تصورات نہیں فرد اپنی اہلیت و صلاحیت کے اعتبار سے خود کو منکشف کرتا ہے۔ وجودی فکر میں " یوں ہوتا تو یہ ہو جاتا " کی اہمیت نہیں کیونکہ محض امکانات اور ایمان سے مفروضے تیار کرنا مہمل ہے۔ وجودیوں نے خارج کو محض اپنی فکر

[illegible]

[illegible]

وجودیت کا [illegible] فرد [illegible] نظریہ [illegible] (On Movement) [illegible] فرد [illegible] نکالنے کی کوشش کرتا ہے فرد کا وجود دوسروں کی نظروں کے حصار میں گرفتار رہتا ہے۔ اپنے افکار و اعمال کے انتخاب میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ دوسروں کی نگاہ کے مہذب شیشے سے گزرنے کے بعد وجود کی [illegible] تہ در تہ پردوں میں چھپ جاتا ہے۔ جب تک ایک فرد کی نگاہیں دوسرے فرد کو حصار میں گرفتار کرتی رہیں گی، فرد کی زندگی کے اغراض مسخ ہوتے رہیں گے۔ زندگی میں حسرت دوسروں کے سبب معتبر (AUTHEN TIC) نہیں بن پاتی۔ سارتر نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ فرد کو آزادی (Freedom) درکار ہے۔ یہ آزادی فرد کا اپنا وجود ہے بلکہ آزادی اور فرد ہم معنی الفاظ نہیں۔ خواہ اخلاقی اقدار ہوں یا سماجی قیود، فرد کے افکار و اعمال تصدیق یا نفی کرنے سے قاصر ہیں۔ اس لئے سارتر زور دیتا ہے کہ فرد خود آزادانہ انتخاب کرتا ہے

"If a voice speaks to me, it is still I myself who must decide. Whether the voice is or is not that of an angel."

فرد زندگی کی صورت حال (Situation) کے اعتبار سے فیصلہ کرتا ہے اس لئے آزادی انتخاب خوشگوار فریضہ نہیں مجبوری ہے۔ سارتر اپنے مخصوص انداز میں کہتا ہے کہ انسان آزاد رہنے کی سزا کا مستوجب ہے (Man is condemned tobe free) کیونکہ وہ خود کو پیدا نہیں کر سکتا۔ اسے دنیا میں جھونک کر اسے اپنے اعمال کا ذمہ دار بنا دیا گیا ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کس نے جھونک دیا۔ کہیں اسی نے تو نہیں سارتر جس کا قائل نہیں یا قائل ہونے سے انکار کرتا ہے۔

سارتر کوئی گفتگو شروع کرنے سے قبل خدا کی نفی تسلیم کرنے پر زور دیتا ہے۔ یہ قبول کر لینے کے بعد کہ کوئی خدا نہیں، کسی وجود مطلق، ذاتی فطرت یا تجرد و مطلق اقدار کی برتری کا تصور لایعنی ہو جاتا ہے۔ نفی خدا کا تصور حقیقت بلندی کے مضبوط قلعے کے انہدام کے مترادف ہو گیا کیونکہ اس

[illegible] کی صفات [illegible] وجودی نفی خدا [illegible] اثبات ہے یا اس کی تکذیب بھی کرتا ہے۔ [illegible] خدا کے منکر لیکن تصور بہشت کے قائل تھے جو وجود خدا کے بغیر ممکن نہیں۔ ان کے نزدیک نفی خدا سے اتفاقی انسان کے اصول حاصل نہیں ہوتے۔ اس سے خدا غیر ضروری ہے۔ سارتر وجود خدا کو غیر ضروری ہی نہیں مہلک سمجھتا ہے۔ اس طرح نفی خدا کے بعد فرد خود کو ایک ایسی دنیا میں پاتا ہے۔ جہاں ذات سب سے بڑی حقیقت ہے۔ اسی کی جہاں بانی ہے۔ خارجی عوامل کا سہارا یا بہانہ بھی نہیں۔ اسے اپنے گرد و پیش تنہائی، کرب اور مایوسی کی فضا ملتی ہے۔ اسے خارج کے زندگی کے خطرات سے مفر بھی نہیں پھر اسے دوراہوں میں ایک کا تعین ناگزیر بن جاتا ہے۔ ایک یہ کہ اپنے وجود کو ختم کر دے دوسرے خارج کے خطرات سے دست و گریباں ہوتا رہے گا اسے مستقبل کا علم نہیں۔ اپنے انتخاب، اعمال و افکار کا ذمہ دار ہے۔ کسی بالاتر طاقت سے انکار و زندگی کے جوہر سے گریزاں۔ اس کے سامنے صرف اس کی اپنی ذات ہے اور بس جس قدر رچا ہے، اس کی اولیت کے راگ الاپے۔ لادینی وجودیت کی یہی وہ راہ پر خطر ہے جس سے گزر کر فرد وقار و سربلندی سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس منزل پر سارتر کہتا ہے کہ نفی خدا کے بعد بھی ایک فرد Being ہے جس میں وجود ماہیت پر مقدم ہوگا۔ وہ وجود فرد انسان کے علاوہ دوسرا نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے ہیڈگر انسانی حقیقت (HUMAN REALITY) کی اصطلاح استعمال کرتا ہے لیکن اس خیال کی وضاحت ضروری ہے کہ وجود ماہیت مقدم ہے۔

موضوعیت کو وجودیت میں نقطۂ آغاز کی حیثیت حاصل ہے۔ اسکے مفہوم کی وضاحت ایک قلم تراش کی مثال سے ذہن نشین کی جاسکتی ہے۔ قلم تراش کے ساتھ ہی اس کی شکل بنانے والے کاریگر کے مخصوص تصور، جس میں اس نے قلم تراش بنانے کا تاثر حاصل کیا، وغیرہ کا تصور بھی پیدا ہوگا۔ اس کے علاوہ قلم تراش کو تکمیل تک پہونچانے کا طریقۂ کار بھی قلم تراش کا مشاہدہ کرنے والے کے تصور کا جزو بنے گا۔ بہ الفاظ دیگر تخلیق کے پہلو بہ پہلو تخلیقی عمل کی اہمیت ناگزیر ہو جاتی ہے۔ اس طرح تخلیق کی افادیت کا مسئلہ بھی پیدا ہوتا ہے کسی ایسے کاریگر کے متعلق تصور نہیں کیا جا سکتا جس نے قلم تراش تو بنایا ہو لیکن یہ نہ جانتا ہو کہ اس کو کس کام میں لایا جاتا ہے کیونکہ وہ شے کی افادیت جانے بغیر اس کو بنانے کے لئے نہ تو تاثر حاصل کرے گا، نہ اسے تکمیل تک لے جائے گا۔ اسی کو وجودی اصطلاح میں وجود کا ماہیت پر مقدم ہونا قرار دیتے ہیں۔ اس کے برعکس صورت حال یہ ہوگی کہ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ قلم تراش کی ماہیت (مع خواص اور پیداواری طریقے کے) وجود پر مقدم ہے۔ اس صورت میں قلم تراش کے وجود کے قبل اس کا تصور اس کے بنانے والے کے ذہن میں موجود ہے۔ اس لئے دینی وجودی یہ دلیل قائم کی کہ انسان کی تخلیق کے قبل اس کا تصور خدا کو ہے۔ اس حقیقت کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اٹھارہویں صدی کے بعض منفیت پسند فلسفی خدا کے منکر تھے لیکن اس خیال کے حامی تھے کہ ماہیت وجود پر مقدم ہے۔ ڈیکارٹ جس نے جدید فلسفے کی بنیاد تشکیک (SKEPTICISM) اس کے نزدیک ارادہ (WILL) فہم (UNDERSTANDING) پر لازم ہے۔ فلسفہ میں ارادہ کے اصطلاحی معنی سوچے سمجھے فیصلے کے ہوتے ہیں۔ یعنی جب خدا تخلیق کرتا ہے تو اسے معلوم ہے کہ وہ کیا تخلیق کرتا ہے۔ یہی نقطۂ نظر دوسری شکل میں والٹیر ہی نہیں کانٹ کے یہاں بھی ملتا ہے۔ مثلاً انسان صفات انسانی کا حامل ہوتا ہے۔ یہ تصور تمام نوع انسانی کے درمیان جز و مشترک ہے۔ خواہ کسی قماش کا انسان ہو۔ اسی طرح انسان کی ماہیت اس کے تاریخی وجود پر مقدم ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں فرد ہی اپنے نتائج و عواقب کا ذمہ دار ہوگا۔ یہ ذمہ داری اس کی اپنی ذات تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ تمام نوع انسانی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ مد نظر رہے کہ موضوعیت دو معنی اصطلاح ہے ایک یہ کہ فرد اپنے لئے راہ عمل طے کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ اس سے ماورا جانے کی قدرت نہیں رکھتا۔ موضوعیت کے یہی دوسرے معنی وجودیت میں زیادہ اہم ہیں۔ جسے انسانی موضوعیت کہا گیا ہے۔ کیونکہ فرد اپنے لئے جس شے کا انتخاب کرتا ہے، اسی شے کو دوسروں کے لئے بھی مناسب سمجھتا ہے۔ کسی شے کا انتخاب اس کی قدر و قیمت کا تعین بھی ہے۔ نتیجہ میں فرد کبھی شر (EVIL) کا انتخاب نہیں کرے گا۔ وجودیت کی تعلیم ہے کہ فرد وجود کے بعد ہی امیج (IMAGE) کی تشکیل کرنے لگتا ہے، جو فرد ہی نہیں، معاشرہ بلکہ جہد پر صادق آتی ہے۔ اسی کے ساتھ فرد کی ذمہ داری کا احساس بڑھتا ہے کیونکہ جب وہ اپنی منتخب کردہ شے دوسروں پر مسلط کرتا ہے تو اس کے نتیجہ کا ذمہ دار بھی ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی فرد کسی سیاسی جماعت کا رکن بن جائے

اس کی تمنا ہوگی کہ کوئی اس کی مجبوری کو سمجھے [illegible] کی کامیابیوں اور ناکامیوں میں دوسروں کو شریک بنائے گا۔ وجودیت میں بعض دیگر اصطلاحی الفاظ میں کرب (ANGUISH)، تنہائی (ALIENATION)، خوف (FEAR) اور بے کسی (FORLORNNESS) اور مایوسی کا استعمال بار بار ہوتا ہے۔ انھیں وجودیت میں کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ یہ محض اصطلاح نہیں ہیں بلکہ وجودی فلسفے کے جہان تازہ علامت ہیں، جن کی تفہیم میں وجودیت کے فکری عمق تک رسائی ہوتی ہے۔

کرب (ANGUISH) میں فرد اپنے افکار و اعمال کی بنا پر مبتلا ہوتا ہے۔ جو اس پر تمام نوع انسان کی ذمہ داری قبول کرنے کے بعد عائد ہوتی ہے۔ احساس ذمہ داری ہی کرب کا محرک ہوتا ہے۔ سارتر انسان کو کرب مجسم کہتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ وہ لوگ جو کسی طرح کے کرب کا اظہار نہیں کرتے بلکہ نہایت آسودہ زندگی گذارتے ہیں۔ اپنے کرب کو چھپاتے پھرتے ہیں۔ اظہار آسودگی سے کرب کی نفی نہیں ہوتی بلکہ آسودگی ایک پردہ ہے اور بس! اسی طرح بعض لوگ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ جن کاموں میں مصروف ہیں۔ ان کو دوسرا کوئی نہیں کرسکتا۔ یہ تصورات فراریت کے مظہر ہیں۔ کرکگارڈ کرب کو کرب ابراہیمی کہتا ہے۔ وہ احساس ذمہ داری کا کرب ہی تھا جس میں حضرت ابراہیم مبتلا ہوئے۔ اگر جبرئیل کے تصور آسمانی فرشتے کی حیثیت سے قبول کرلیا جائے تو کرب کی شدت ختم ہوجائے لیکن پھر یہ سوال کہ اگر میں ابراہیم ہوں تو جبرئیل آسمانی فرشتہ تھا یا نہیں! غیبی آوازیں ہیں یا ملاء اعلیٰ سے الہام ہوتا ہے؟ کرب کی شدت میں توہم (HALLUCINATION) سے اضافہ ہوتا ہے۔ فرد خود سے سوال کرتا ہے اس کے پاس کیا ثبوت ہے کہ وہ واقعتاً کوئی فرشتہ تھا جو ابراہیم کو ہدایت کرتا تھا کہ اپنے بیٹے کو قربان کردیں۔ فرد خود کے لئے افکار و اعمال کا انتخاب کرتا ہے۔ یہ کس طرح یقینی ہے کہ اس کا انتخاب صالح ہے، وہ بدی کا باعث ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ فرد کو اندیشہ لاحق رہتا ہے کہ تمام نوع انسانی اس کے افکار و اعمال کی نگرانی کررہی ہے۔ کرب کی دوسری مثال یہ ہوسکتی ہے کہ ایک ذمہ دار فوجی افسر دشمن کے حملے سے ملک و قوم کو بچائے رکھنے کی غرض سے سپاہیوں کی موت کا باعث بنتا ہے وہ اپنی اصابت رائے پر

قائم ہے لیکن [illegible] سپاہی موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ اس احساس [illegible] کرب میں مبتلا ہوتا ہے۔ مختصراً یہ احساس ذمہ داری ہی خود کو کرب میں مبتلا رکھتا ہے۔ اس سے یہ غلط فہمی نہیں ہونا چاہئے کہ احساس ذمہ داری کے کرب میں فرد بے عملی کا شکار ہوجاتا ہے۔ مہاتما گاندھی کی مثال لیجیے۔ انھیں عدم تعاون اور ستیہ گرہ کی راہوں میں اس کرب سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ وہ احساس ذمہ داری کے ساتھ فیصلہ کرنے کے بعد اس سے بھی واقف تھے کہ ان کے عمل کی قیمت کیا ادا کرنا ہوگی!

وجودیت میں (DISGUST) کو سارتر نے اور مایوسی..... (DESPAIR) کو اس کے ہم نوا ہیڈیگر نے عام کیا۔ ان کے وجودی مفاہیم لغوی مفہوم سے مختلف ہیں ان کو فرد کے ارادے (WILL) اور امکانات (POSSIBILITIES) سے منسلک کیا گیا ہے۔ فرد کا ارادہ امکانات کے تابع ہوتا ہے۔ مثلاً کسی کا دوست فرائض حج و زیارت ادا کرنا چاہتا ہے اس سے فرد یہ برآمد کرتا ہے کہ ہوائی جہاز کے ذریعہ شخص مذکور وقت مقررہ پر مکہ مکرمہ آجائے گا۔ اسے راہ میں کسی حادثہ، رکاوٹ یا پروگرام کی تبدیلی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ غور طلب ہے کہ دوست کا وقت مقررہ پر مکہ مکرمہ آنے کا تصور، فرد کو وسیع امکانات کی دنیا میں تنہا چھوڑ دیتا ہے۔ اس لیے وجودی فکر رہنمائی کرتا ہے کہ اسے اس سے بس اتنا ہی سروکار رکھنا چاہئے کہ وہ اپنے عمل ارادہ اور امکانات میں مطابقت پیدا کرتا رہے۔ اس سے زیادہ ممکن نہیں کیونکہ عالم امکانات فرد کے تابع نہیں ہے۔ کوئی بڑی سے بڑی طاقت، ارادے اور ممکنات میں مطابقت پیدا نہیں کرسکتی۔ وجودیت اس کو مایوسی کہتی ہے اس مایوسی پر قابو پانے کے لئے ڈیکارٹ نے مشورہ دیا ہے کہ کائنات کی تسخیر کے بجائے اپنی ذات کی تسخیر کرنا چاہئے لیکن مارکسی وجودی مشورہ دے گا کہ اپنے عمل کی حد تک دوسروں پر اعتماد کرلینے سے مایوسی پر قابو پاسکتے ہیں۔ مثلاً اسلامی جمہوریہ ایران کی رہنمائی میں تیسری دنیا کے اسلامی ممالک کے باضمیر لوگ سامراجی قوتوں کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ ان کی ہمت بہ وجہ خوش آئند انقلاب لائے گی کیونکہ وہ اپنی جماعت کے اتحاد کے ساتھ سرگرم ہیں اور طے شدہ مقصد کی ہم آہنگی سے [illegible] ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوگا کہ کس حد تک اسلامی ممالک میں ایرانیوں کے

وجود ...انے حسن ...ی... ہے کہ مستقبل میں بھی ...نیوں کا وہی ...ہو گا جو آج ہے اور کسی طرح ممکن ہے کہ وہ اپنے تصور میں کیا بھی ہوں گے ۔ یہ نا ممکن نہیں ہے کہ مستقبل میں ان کی حکمت عملی تبدیل ہو جائے امریکہ کی شدید مخالفت میں تبدیلی آجائے بلکہ وہ امریکہ نوازی کا رویہ اختیار کر لیں. اس صورت میں اسلام کے بجائے ملوکیت انسانی حقیقت (Human Reality) بن جائے گی. اس طرح دوسروں پر اعتماد کرنے کی صورت میں فرد اپنی مایوسی پر قابو نہیں پا سکتا. اس کا ارادہ امکانات کے تابع رہے گا ۔

تنہائی کو وجودیت میں ان معنوں میں نہیں لیتے ہیں جو جینیت پسند رومانی اپنے آدرش (IDEAL) سے دوری کی بنا پر محسوس کرتے ہیں جو بے چینی کا سبب بنتی ہے وجودی تنہائی فرد کو وجود کی اہمیت واضح کر کے یک گو نہ مسرت کا سبب بخشتی ہے. سارتر کہتا ہے کہ احساس تنہائی انسان کی تکمیل کیلئے ضروری ہے. کیونکہ اسی کی بدولت فرد کو عمل کی توفیق ملتی ہے. سارتر کے نزدیک جماعت فرد سے بے اعتنائی برتتی ہے جب فرد بھی بے نیاز ہو کر اوپر اٹھ جاتا ہے تو اس کی تنہائی ناگزیر ہو جاتی ہے اس طرح وجودی تنہائی میں احساس تعمیر کو بنیادی اساس کی حیثیت حاصل ہے. اسے موضوعیت کیلئے بھی ضروری سمجھا جاتا ہے. چونکہ جماعت سے نجات وجود کے لئے ضروری ہے اس لئے تنہائی وجود کا لازمی جزو بنتی ہے. دوسرے مکاتیب فکر میں عمل کو معروض (OBJECT) سمجھا گیا ہے اور اس کا انداز (PATTERN) پہلے سے مقرر ہے. اس لئے تنہائی وجود کا جزو نہیں بنتی ۔

خوف کو وجودیت میں مثبت تعمیری قوت کا مرتبہ حاصل ہے. تقریباً وہی مرتبہ صوفیائے کرام کے نزدیک شک کا ہے. کرک گارڈ کے نزدیک خوف فرد کی تکمیل کے لئے ضروری ہے. جو موت کے تصور سے وابستہ ہے. موت کو تمام وجودیوں نے عناصر ترکیبی میں داخل کیا ہے اور اسے موضوعیت کا جزو قرار دیا ہے. فرد کے نزدیک موت نظریہ یا مجرد خیال سے زیادہ انفرادی موت بنتی ہے. وہ اپنی موت یاد کر کے خوف زدہ ہوتا ہے. موت ہی فرد کو بے چارہ اور مجبور بناتی ہے. وجودیت نے موت کے خوف سے نجات کو راہ کامرانی کی منزل قرار دیا ہے. موت کو وجود کا جز لاینفک قرار دینے کے باعث احساس سے اطمینان و شادمانی پیدا ہوتی ہے. اس میں تمنا جاگتی ہے کہ اس ناگزیر حقیقت کا شکار ہونے کے قبل خواہشات دنیا سے لطف اندوز ہو لیں. جو کچھ کرنا ہے چند روزہ زندگی میں کر لیں. وجودیوں کے نزدیک دائمی اور ابدی زندگی کا تصور جس میں حیات بعد از مرگ کا تصور ہو، انسان میں کاہلی اور بے عملی پیدا کرتی ہے اس کے برعکس وجودیت موت کے خوف کی بنا پر فرد کو فعال اور متحرک بناتی ہے ۔

وجودی فکر میں اہم ترین اصطلاح بے کسی نفی خدا کے تصور سے وابستہ ہے نفی خدا کے نتیجے میں خدا سے وابستہ اشیاء کی خود بخود نفی ہو جاتی ہے. مثلاً قیامت، جنت، لوح محفوظ، وحی وغیرہ بے کسی کا دوسرا تعلق احساس ذمہ داری سے ہے. جس میں اپنے عواقب و نتائج کی بنا پر فرد اپنے اور تمام نوع بشر کے لیے ذمہ دار ہے. مدنظر رہے کہ نفی خدا کے بعد خیر کے ازلی اقدار کی نفی بھی ہو جاتی ہے. فرد کی انفرادی و اجتماعی ذمہ داری باقی نہیں رہتی۔ شمع ہدایت گل کر دینے کے بعد اکتساب نور ممکن ہی نہیں. لوح نہیں تو پھر کہاں لکھا ہے. کہ فرد سچائی سے وابستہ رہے، جھوٹ نہ بولے، دوسروں کی حق تلفی نہ کرے. خود جینے کے علاوہ، دوسروں کو جینے کا حق دے. اسی بنا پر دستوسکی نے کہا تھا کہ اگر خدا کا وجود باقی نہ رہے تو فرد کے لئے ہر بات ممکن ہو جائے۔ دراصل یہی فرد کی بے کسی کی منزل ہے، جس کو وجودی فکر اساسی اہمیت دیتی ہے. بے کسی کا سبب یہ ہے کہ نفی خدا کے بعد فرد کے پاس کوئی ایسی ذات باقی نہیں. جس میں اپنے اعمال کا جواز تلاش کر سکے. اسے خود کو تمام عواقب و نتائج کا ذمہ دار قرار دینا پڑتا ہے. جب کہ دینی فرد تمام نیک و بد کو خدا کے سپرد کر کے سکون حاصل کر لیتا ہے، بالخصوص "شر" سرزد ہونے کی صورت میں انسان مقدر پہ قدرت نہیں رکھتا، مقدر معبود حقیقی کا مقدور ہے. سزا و جزا، اس کا فیصلہ ہے. انسان جبر و اختیار کا تابع ہے اس طرح آسانی سے اپنی ذمہ داری کسی اور ہستی کے سپرد کر دیتا ہے. وجودیت میں فرد پر تمام عواقب و نتائج کی ذمہ داری ہے. کسی طرح کی جبریت کا کوئی مقام نہیں۔ اسی طرح مستقبل کے تصور میں مذہبی فکر اور وجودی فکر بعد المشرقین ہے مذہبی فکر مستقبل کو مقدر سے وابستہ کرتا ہے، جو علم خدا میں ہے. جس کی جگہ لوح محفوظ ہے. لوح محفوظ کا ناظر خدا ہے. وجودی فکر وجود خدا کی منکر ہے تو اس کے ناظر ہونے یا لوح محفوظ پر مقدر درج ہونے کے لئے کیا گنجائش ہو سکتی ہے؟ وجودی تمسخر سے کہے گا کہ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپکے اللہ پاک

نے آپ کا مستقبل آپ کے عقیدے کے مطابق متعین کر رکھا ہے تو انسان کو
مستقبل کہنا ہی غلط ہو جاتا ہے کیونکہ مستقبل کسی کے علم و اطلاع میں نہیں
ہو سکتا جب کہ آپ کے تصور کے مطابق مستقبل خدا کے علم و اطلاع میں ہے
اگر پہلے سے سب طے ہے تو مستقبل کیا؟ وجودیت میں مستقبل ایسی حالت کا
نام ہے جس کا علم کسی کو نہیں ۔ اس لئے فرد بے کس اور تنہا ہے۔ وجودیت
کا پیغام ہے کہ فرد خود اپنا مستقبل ہے

(MAN IS THE FUTURE OF MAN)

بے کسی کو وجودی تعلیمات کا سب سے روشن، تابناک اور حسرت کی و
نمویاتی کلیہ قرار دیا گیا ہے، جو فرد کے اخلاقی شعور کا محرک ہے۔ اخلاقی شعور کے
مسائل و مباحث قدیم سے حکما و مفکرین سے دست و گریباں رہے ہیں۔
ارسطو نے اخلاقی نظام میں عقل کو اولیت دی تھی اور جذبات کو عقل کا تابع
قرار دیا تھا جو تشکیکی فلسفہ ہیوم کے لیے ناقابل قبول ہے۔ اس کے نزدیک
انسان جذبات سے متاثر ہو یا مجبور یا مغلوب ہو کر کسی خاص عمل کا مرتکب
ہوتا ہے ۔ اس لئے وہ نتیجہ کا ذمہ دار نہیں ۔ وجودیت نے ارسطو اور ہیوم
دونوں سے انکار کیا، وجودی فکر کے اعتبار سے چونکہ فرد اپنے جذبات کا ذمہ دار
ہے اس لیے اس کے نتیجے کا بھی ذمہ دار ہے۔ سارتر اس احساس کو ایک موزوں
ترین مثال سے ذہن نشین کراتا ہے ۔ اس کا ایک ذہین فرانسیسی طالب علم
اس مسئلے سے دوچار تھا اور اس سے مشورہ کرنے آتا تھا۔ اس کے والدین
کے درمیان غلط فہمی اور نفرت کی دیوار کھڑی تھی ۔ طالب علم کا ایک بھائی
نازیوں کے ظلم و ستم کا شکار ہو چکا تھا۔ اس کا باپ فرانس کی جدوجہد کے
دوران نازی طاقتوں کا ہم نوا تھا۔ ماں نازیوں سے شدید نفرت رکھتی تھی۔
جس کی بنا پر باپ سے بیزار ہو گئی تھی ۔ طالب علم کے قلب و جگر میں بھائی
کے انتقام کی آگ دہک رہی تھی ۔ مقبوضہ فرانس کے حدود کے باہر انگلستان
میں آزاد فوج کی تشکیل ہو رہی تھی، جس میں شامل ہو کر طالب علم اپنے
جذبے کی تسکین کر سکتا تھا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنی ماں کو جسے وہ دل
و جان سے چاہتا تھا۔ کسی قیمت پر تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اس کے ذہنی
افق کے سامنے دو راہیں تھیں، جن میں ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ دونوں
ایک دوسرے کے متضاد سمت میں جاتی تھیں ۔ ایک وہ انگلستان جا کر آزاد فوج
میں شامل ہو جائے۔ دوسرے اپنی ماں کے ساتھ فرانس میں بیٹھا رہے ۔

[illegible]
[illegible]
اسے شامل کرنے پر ضمانت نہ ہوں۔ اگر فوج میں شامل ہو جاتا ہے تو کب
یقینی ہے کہ نتیجہ حاصل ہوگی۔ اگر نتیجہ مل سکتا ہے تو کب یقینی ہے کہ وہاں ہلاک
نہیں ہوگا۔ اگر وہ جنگ میں کام آتا ہے تو ماں پر کیا گزرے گی۔ روایت
ہے کہ کسی کے ایک بیٹے کی وفات ہو گئی، شاعر نے تاریخ "داغ جگر"
نکالی، دوسرے برس دوسرا بیٹا چل بسا، اس نے شاعر سے مادہ تاریخ کی
فرمائش کی۔ شاعر نے کہا، داغ جگر، گویا اس کی ماں "داغ جگر" کے بعد
"داغ جگر" کی تاب کیوں کر لا سکے۔ دوسری صورت میں وہ اپنے ضمیر کی
آواز کو کیا کرے، انتقام کی آگ وجود کو خاکستر کر سکتی ہے۔ ایک فرانسیسی
نوجوان کی حیثیت سے اسے ملک کو آزاد کرانے کے لئے آزاد فوج میں شامل
ہونا چاہئے۔ ماں کی محبت کا جواب ہے کہ نازیوں کو ان کی بدکرداری کا
جواب دیا جائے لیکن یہی بات باپ کے تنفر کا باعث ہوگی۔ وہ اچھی طرح
واقف ہے کہ اس کا عمل غیر یقینی ہوگا۔ مدنظر رہے کہ یہ فرانسیسی طالب علم
دوہری اخلاقیات سے دوچار ہے۔ ایک میں انفرادی تسکین اور شخصی عقیدت
ہے، دوسری میں اجتماعی مفاد و وسیع تر اخلاقیات تھی۔ وہ اپنی راہ کیونکر
منتخب کرے؟ عیسائیت مدد نہیں کر سکتی۔ کیونکہ اس میں ہمسایے سے
محبت اور مروت کی تلقین ہے۔ ایسی راہ اختیار کرو جو زیادہ سخت اور دشوار
ہے، وہ کون سی راہ ہے جو زیادہ سخت اور دشوار ہے؟ کس سے محبت اور
تکریم سے پیش آئیں۔ ان جانبازوں سے جو آزاد فوج میں شامل ہیں یا
اپنی ماں سے جس کی بے پناہ عنایتیں ملی ہیں اس کا فیصلہ کیسے ہو سکوئی قیاس
قبل از وقوع (APRIORI) بروئے کار نہیں آتی۔ کانٹ کی اخلاقیات کا
مشورہ ہوگا کہ ذریعہ (MEANS) نہیں، انتہا (END) کا خیال کر کے
فیصلہ کرنا چاہئے۔ اس میں بھی پیچیدگی ہے کیونکہ طالب علم ماں کے ساتھ رہنے
کا فیصلہ کرتا ہے اور اسے انتہا سمجھتا ہے تو اپنے عزیز ہم وطنوں کو ذریعہ قرار
دینے کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس کے برعکس کرتا ہے تو ماں کو ذریعہ بناتا ہے
ہمارا نوجوان طالب علم اس بے کسی کے قلعہ سے باہر نکلنے کے لئے اس اہم الجھن کا
دور کرے؟

سارتر نے مذکورہ بالا روشنی میں، بے کسی کے امکانات کا مفصل

جائزہ لیا ہے۔ وہ طالب علم متعدد بار سارتر سے ملا۔ اس نے مشورہ دیا کہ اسے اپنے محسوسات (FEELINGS) کو معیار بنانا چاہئے۔ طالب علم نے محسوسات کے مطابق فیصلہ کیا کہ اسے ماں کے ساتھ رہنا چاہئے۔ دوسرے الفاظ میں، اس پر ماں کی محبت غالب آگئی۔ پھر پہلا سوال یہ ہوگا کہ اس جذبے کی قدر (VALUE) متعین کرنے کا معیار کیا ہوگا، دوسرا سوال طالب علم کی مادری قدر (Mother Value) کی اساس کیا ہے۔ جواب ہوگا۔ اس کا اپنی ماں کے ساتھ رہنے کا عمل۔ اس دور کا ہیر اپنی رانجھا کے لیے دعوا کرتا ہے کہ وہ آسمان سے تارے توڑ کر لا سکتا ہے۔ اس دعوے کی قدر کا تعین اسی وقت ممکن ہوگا جب وہ ایسا کرکے دکھائے۔ یہ مثال واضح کرتی ہے۔ کہ فرد اپنے لامتناہی دائرے (vicious circle) میں اسیر رہتا ہے۔

وجودیت پر بالعموم اور لادینی وجودیت پر بالخصوص مندرجہ ذیل اعتراضات وارد کئے جاتے ہیں:-

۱- وجودیت میں انسان خود غرضی اور بے بسی کا شکار ہوتا ہے، اپنے احساس تنہائی کی بنا پر مایوسی، مجبوری، حزن اور ناداری اختیار کرلیتا ہے

۲- وجودیت میں زندگی کے تاریک پہلوؤں پر زور دیا جاتا ہے۔ نتیجہ میں انسان حق کی قدروں کو نظر انداز کرنے لگتا ہے۔

۳- وجودیت میں گناہ اور جرم نہیں ہوتا، نتیجے میں انسان کسی نوعیت کی رذالت اختیار کرنے پر آمادہ ہوجاتا ہے۔

۴- وجودیت میں انسان ترقی سے رک جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

سارتر نے وجودیت پر اعتراضات کے مدلل جواب دئے ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ نفی خدا کے بعد فرد بے بسی، بے چارگی اور تنہائی کے احساسات پیدا ہوتے ہیں خوف موت کے علاوہ فرد کو یہ احساس بھی پریشان کرتا ہے۔ کہ اس کے بعد اس کے نامکمل کاموں کی تکمیل کس طرح ہوسکے گی۔ عین ممکن ہے کہ مستقبل میں امکانات تبدیل ہوجائیں یا آئندہ فرد اپنے افکار و عمل کے معیار کی تکذیب کردے۔ اس لئے فرد اپنی زندگی میں ہی بے یقینی، تذبذب اور حزن و ملال کا شکار ہوجاتا ہے۔

سارتر شدید اصرار کرتا ہے کہ وجودیت لاقانونیت کا قانون نہیں۔ وہ نراج بھی نہیں، اس کا قانون و حکومت خود فرد ہے حالانکہ فرد کو نیک و بد میں کسی ایک یا دونوں کو منتخب کرنے کا حق ہے لیکن وہ خود اپنے لیے نیکی اختیار کرتا ہے تو دوسروں کے لئے بھی نیکی اختیار کرے گا۔ لیکن آزادی سے اقدار کے انتخاب کا حق حاصل ہونے کی بنا پر فرد مصلحت کوشی سے محفوظ رہے گا۔ وہ غلطی کرسکتا ہے لیکن گناہ کا مرتکب نہیں ہوسکتا۔ سارتر تفاخر سے کہتا ہے کہ اس سے زیادہ بلند و ارفع بات کیا ہوگی کہ وجودیت کی بدولت انسان اپنی تقدیر کا معمار اور مالک ہے۔ وہ اپنے افکار و اعمال کی بنا پر اعیان کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں آگیا ہے۔ وجودیت اسے آزادی دیکر صاحبِ اختیار بناتی ہے۔

اسی طرح یہ اعتراضات بھی کہ وجودیت میں انسانی ترقی رک جاتی ہے۔ سارتر کے نزدیک درست نہیں اس نے وضاحت کی ہے کہ جن معنوں میں ترقی مراد لی جاتی ہے۔ وجودیت میں اس طرح کی ترقی یا تنزلی کی گنجائش نہیں۔ وجود بذاتہ مکمل ہوتا ہے اور تکمیل پذیر بھی۔ وجودی تکمیل کا آخری مرحلہ موت ہے۔ اس طرح حالات بدلتے ہیں وجود نہیں۔ وجود یا تو ہے یا نہیں ہے۔ سرگرم عمل رہنے میں وجود کی تکمیل ہے اس طرح ترقی یا تنزلی کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ یہ مسئلہ وجود سے علاقہ نہیں رکھتا۔ بلکہ امکانات سے متعلق ہے۔

□□

نذرِ وارثِ علی شاہ

سلام اے جانشینِ خاندانِ مصطفےٰ وارث
غریبوں، بیکسوں، بے آسروں کا آسرا وارث

تلاطم خیز موجیں ہوں کہ طوفانِ حوادث ہو
مجھے کیا غم مری کشتی کے ہیں جب ناخدا وارث

لگا کر مفتیانِ شہر فتویٰ دیکھ لیں مجھ پر
میں بالاعلان کہتا ہوں کہ ہیں میرے خدا وارث

میرے وارث تمہارا نام ہی دینِ مکمل ہے
خدا وارث، نبی وارث، علیِ مرتضےٰ وارث

یہاں سب تشنگانِ معرفت سیراب ہوتے ہیں
رہے تا حشر قائم آپ کا یہ میکدہ وارث

—— رضا ردولوی

۲/۴۲ وشنوپوری کالونی، کرسی روڈ، علی گنج لکھنؤ

سنگِ میل

بصارتیں توفیضِ اہتمام سے
بچی رہیں
بصیرتیں چلی گئیں
گلی میں ایک پیڑ تھا
وہ کٹ گیا
وہ طائرانِ بے قفس
جو برگ و بار کے یہاں تھے منتظر
وہ رفتہ رفتہ، دُور کی
پریشاں بستیوں کی سمت
ایسے اُڑ گئے
کہ لوٹ کر نہ آسکے

میں ریگِ خشتِ مرگ آشنا نہیں
میں سنگِ میل ہوں اُجڑتی رہگزر کے موڑ پر
میں آنے والے راہ رو کی حسرتِ مدام میں
یہیں رہوں گا حشر تک
یہیں جیوں گا حشر تک

□□

بلراج کومل
۱۳۹-ای، کالکاجی
نئی دہلی

دل اک قبرستان

دل اک قبرستان ہے، جس میں
کتنے لمحے، کتنی صدیاں
کتنی اُمنگیں، کتنے ارادے
کتنی قسمیں، کتنے وعدے
کتنی خوشیاں، کتنے آنسو
کتنی آہیں، کتنی یادیں
کتنی لاشیں دفن ہوئی ہیں
میں اک گورکن،
ان قبروں کو اُدھیڑ رہا ہوں
آخر شب کے سناٹے میں
ڈھونڈ رہا ہوں اپنا ماضی،
ایسا لمحہ، جو زندہ ہی دفن ہوا ہے،
دل کے قبرستان کی دھڑکن بن کر،
جو اب تک زندہ ہے

□□

رفعت سروش
۲-بی، پاکٹ سی۔ سدھارتھ ایکسٹینشن
نئی دہلی ۱۱۰۰۱۴

امان اللہ خاں شیروانی
۳ اچشل، گمرگ کالونی۔ ڈگی روڈ
علی گڑھ

سوانحی کوائف

میری پیدائش ۱۵ راگست ۱۹۲۶ء کو گورکھپور میں ہوئی تھی جہاں میرے والد بزرگوار چودھری محمد عبداللہ خاں صاحب مرحوم لکڑی کا روبار کرتے تھے اور ریلوے کو سلیپر سپلائی کرتے تھے۔ لیکن میں چھ ماہ کا ہی تھا تب ہی اپنی والدہ کے ساتھ اپنے وطن سہاور ضلع ایٹہ چلا آیا تھا اور بدقسمتی سے آج تک گورکھپور جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اس طرح اب تک اپنی جنم بھومی کے درشن سے محروم ہوں۔ 'خلافت تحریک' کی مدد کرنے کے جرم میں میرے والد کو نہ صرف کچھ ماہ جیل میں رہنا پڑا بلکہ ان کا ٹھیکہ بھی ختم کر دیا گیا اور ان کا کاروبار بھی تباہ ہو گیا اور پھر مرحوم بھی گورکھپور سے ہجرت کر کے سہاور اپنے وطن واپس آ گئے۔

سہاور ضلع ایٹہ (یو۔پی) کا ایک پرانا اور معروف قصبہ ہے جو کاس گنج اور گنج ڈنڈوارہ کے درمیان واقع ہے۔ یہاں پر پرانے زمینداروں کے پٹھان خاندان آباد ہیں۔ ان ہی پٹھانوں کے ایک چھوٹے سے زمیندار خاندان سے میرا تعلق ہے۔ سہاور کے پٹھانوں کی رشتہ داریاں علی گڑھ کے مشہور شیروانی خاندان سے بہت قدیم زمانہ سے ہوتی چلی آ رہی ہیں اور اسی لیے یہاں کے پٹھان بھی شیروانی برادری میں شامل رہے ہیں۔ حالاں کہ نسلاً شیروانی نہیں ہیں۔ میری ابتدائی تعلیم بھی اسی قصبہ کے اسلامیہ افاغنہ پرائمری اسکول میں ہوئی تھی۔ گھر پر مولوی محمد موسیٰ مرحوم نے اردو اور ابتدائی فارسی اور آنجہانی پنڈت دیوی پرشاد نے انگریزی اور حساب کی تعلیم دی۔ دونوں بڑے ہی شفیق اور قابل استاد تھے۔ ۱۹۳۶ء میں میرا داخلہ گورنمنٹ ہائی اسکول کی چھٹی کلاس میں ہو گیا۔ اسکول میں ایک مسلم بورڈنگ ہاؤس بھی تھا جہاں قصبہ سہاور کے میرے کئی عزیز سکونت پذیر تھے۔ میرا قیام بھی ہائی اسکول تک اسی بورڈنگ ہاؤس میں رہا۔

۱۹۴۱ء میں ہائی اسکول کر کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخل ہوا اور نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی مرحوم کے زیرِ سایہ ان کی مشہور و معروف کوٹھی حبیب منزل میں رہ کر ایم اے تک تعلیم حاصل کی۔ حبیب منزل میں اپنے دورانِ طالب علمی میں کئی اہم سیاسی شخصیتوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان میں قائدِ اعظم محمد علی جناح، نواب زادہ لیاقت علی خاں اور سردار عبدالرب نشتر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ حضرات آئے دن علی گڑھ آتے رہتے تھے اور ان کا قیام حبیب منزل میں ہی ہوتا تھا۔ کبھی کبھی ان کی میزبانی کے لیے حبیب منزل میں رہنے والے نوجوانوں کی ڈیوٹی بھی لگا دی جاتی تھی۔ غالباً اسی تھوڑی سی قربت نے میرے دل و دماغ پر قیامِ پاکستان کے لئے نرم گوشہ پیدا کر دیا تھا لیکن ملک کی آزادی کے بعد میری یہ ہمدردی نہ صرف بالکل ختم ہو گئی بلکہ میں پاکستان کے قیام کو ملک و قوم کے لیے نہایت مضر اور ناقابلِ تلافی نقصان تصور کرنے لگا اور آج تک اسی پر قائم ہوں۔ آزادی کے بعد میرا جھکاؤ سیاسی، سماجی اور ادبی طور پر 'بائیں' طرف ہو گیا تھا۔

اپنے دورانِ طالب علمی میں میری جان پہچان کئی مشہور شعرا سے بھی ہو گئی تھی ان میں احسان دانش، شکیل بدایونی، راز مرادآبادی اور نوشش صدیقی سے تو بڑے قریبی تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں مجھے شعر گوئی کا بھی شوق پیدا ہوا اور غازی تخلص اختیار کر کے بہت سی غزلیں اور کئی نظمیں بھی کہہ ڈالیں۔ احسان دانش سے باقاعدہ خط و کتابت کے ذریعہ اصلاح بھی لی۔ شاعری کا یہ شوق صرف زمانۂ طالب علمی تک ہی رہا اور تعلیم مکمل کرنے کے بعد یہ شوق کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گیا۔

۱۹۴۸ء میں ایم۔ اے (معاشیات) کرنے کے بعد اسلامیہ کالج سہارن پور میں لکچرر مقرر ہوا اور تقریباً دس سال (۱۹۵۸ء) تک سہارن پور میں مقیم رہا۔ سہارن پور میں ظ۔ انصاری، راجیندر کمار گرگ (آجکل سپریم کورٹ کے مشہور وکیل) اور مشہور کمیونسٹ لیڈر راؤ مختار علی خاں کی صحبت میں "ترقی پسند" فکر و فن سے ملاقات ہوئی اور ان ہی کے توسل سے جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، بنے بھائی، علی سردار جعفری، کرشن چندر، مجروح سلطان پوری، نیاز حیدر، سلطان نیازی اور بہت سے ترقی پسند شعرا اور ادیبوں سے متعارف ہونے کا موقع ملا۔ ظ۔ انصاری، راجیندر کمار گرگ اور سہارن پور کے کئی نوجوان ترقی پسند شعرا اور ادیبوں کے ساتھ مل کر غیر رسمی اجتماع کا سلسلہ شروع کیا۔ بعد میں اس اجتماع کو باقاعدہ ایک انجمن کی شکل دی گئی اور اس کا نام 'لٹریری کلب سہارن پور' رکھا گیا مجھے اس کا پہلا صدر چنا گیا اور تقریباً سات سال تک میں نے اس کی صدارت کے فرائض انجام دیئے۔ کلب کی طرف سے ملک کی مشہور ترقی پسند اور اس تحریک سے ہمدردی رکھنے والی شخصیتوں کو مدعو کیا جاتا تھا۔ محترمہ ارونا آصف علی، جے پرکاش نرائن، پنڈت سندر لال، مشہور اداکار پرتھوی راج کپور، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، کرشن چندر، کیفی اعظمی، وامق جونپوری، ہنس راج رہبر اور بہت سے ادبا اور شعرا 'لٹریری کلب' کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ اس طرح ان حضرات سے نہ صرف ملاقات کا شرف حاصل ہوا بلکہ ان میں سے کئی سے اچھے تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ مجھے ان دنوں نثر لکھنے کا شوق پیدا ہوا اور میں نے ملک کی کئی اہم شخصیتوں مثلاً پنڈت نہرو، جے پرکاش نارائن، فیض احمد فیض اور مجاز لکھنوی پر خاکے لکھ کر کلب کے اجتماع میں سنائے تھے لیکن بدقسمتی سے کسی اخبار یا رسالہ کی زینت نہیں بن سکے۔

میرا پہلا مضمون "معاشیات کا باوا آدم" کے عنوان سے مشہور اکنومسٹ ایڈم اسمتھ پر سہارن پور کے ایک ہفتہ وار اخبار 'بیباک' میں شائع ہوا تھا اور اس کے بعد علی گڑھ کے مشہور ہفت روزہ 'جمہور' میں کئی مضامین شائع ہوئے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے ایک مضمون "ملک میں زمیندارانہ نظام کے نقائص" پر بڑا واویلا مچا تھا اور خاندان کے بڑے اور چھوٹے زمینداروں نے بڑا برا مانا تھا اور میرے کمیونسٹ بن جانے کا چرچا بھی ہونے لگا تھا۔

۱۹۵۰ء میں میں نے دوسرا ایم۔ اے (سیاسیات) میں کیا اور ۱۹۵۸ء میں کالج سے ایک سال کی چھٹی لے کر علی گڑھ سے بی۔ ایڈ کی ڈگری لی۔ ۱۹۵۹ء میں میرا تقرر بحیثیت پرنسپل ملک کے مشہور قومی ادارہ "اسلامیہ کالج" اٹاوہ میں ہو گیا اور وہیں سے ۱۹۸۸ء میں ۲۹ سال کی خدمات کے بعد ریٹائر ہوا ہوں۔ ۱۹۶۰ء میں حکومت ہند کی طرف سے کامن ویلتھ اسکالرشپ پر انگلستان گیا اور وہاں ایک سال رہ کر برمنگھم یونیورسٹی سے تعلیمی انتظام میں ڈپلوما حاصل کیا۔ اپنی اس ۲۹ سالہ پرنسپل شپ کے دور کے شروع میں لکھنے پڑھنے کا بہت کم موقع ملا۔ کالج کے مسائل اور انتظامی و تعلیمی امور کی انجام دہی میں بڑا مصروف رہنا پڑتا تھا — لیکن ۱۹۸۰ء کے بعد پھر لکھنے پڑھنے کا کام بڑی تیزی سے شروع کیا۔ اور مختلف رسالوں اور اخبارات میں خاکے اور مضامین شائع ہوتے رہے ان رسالوں اور اخبارات میں قومی آواز لکھنؤ و دہلی۔ نیا دور لکھنؤ۔ آجکل دہلی۔ پتریکا سماچار دہلی۔ بانو دہلی۔ پیام تعلیم دہلی اور قومی راج بمبئی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۸۵ء میں میرے مضامین اور خاکوں کا پہلا مجموعہ کتابی شکل میں "سب کہاں کچھ..." کے نام سے شائع ہوا۔ میری دوسری تصنیف "ایک معیاری درس گاہ کا پرنسپل" ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی اور اس پر اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ نے انعام بھی دیا۔ اب تیسری کتاب "مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے سو سال" زیر طبع ہے۔ ان کے علاوہ ادبی مضامین کا ایک اور مجموعہ زیر ترتیب ہے۔

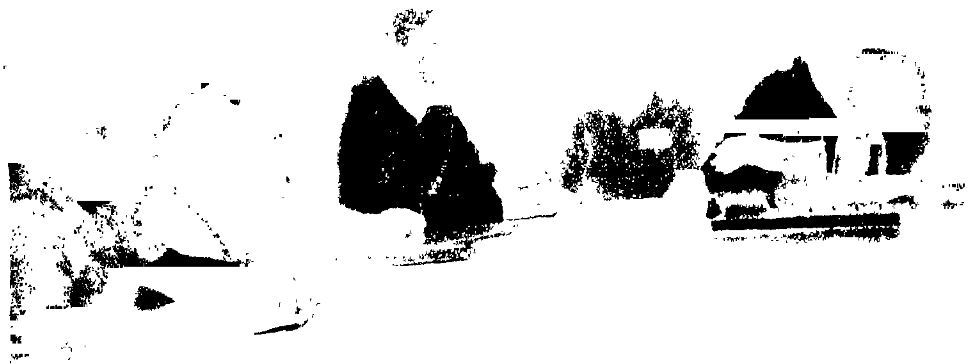
۱۹۸۲ء میں مجھے بھارت سیوا ٹرسٹ دہلی، ۱۹۸۳ء میں محکمہ تعلیم حکومت یوپی اور ۱۹۸۵ء میں 'کیندریہ سیوا سماج سمیتی' مین پوری یوپی کی طرف سے تعلیمی سرگرمیوں پر ایوارڈ دیئے گئے۔ اور ۱۹۸۶ء میں قومی ایوارڈ برائے ٹیچرز کے لئے چنا گیا۔ ۱۹۸۶ء میں مجھے ساٹھ سال کی عمر میں ریٹائر ہو جانا تھا لیکن قومی ایوارڈ کی بنا پر ۲ سال کی توسیع دی گئی اور ۱۹۸۸ء میں ۶۲ سال کی عمر میں ریٹائرڈ ہو گیا۔

لکھنا پڑھنا میرا مشغلہ ہے۔ اس کے علاوہ تعلیمی اور سماجی کاموں میں بھی تھوڑا بہت حصہ لیتا ہوں۔ اس وقت آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

(باقی صـ۳۵ پر)

وزیر اعلا
شری ملائم سنگھ یا
چھپوالیہ انیکسی میں
اترپردیش
اُردو اکادمی کے
وفد سے
گفتگو کرتے ہوئے

فوٹو: جاوید ہاشمی





وزیر اعلا
ری ملائم سنگھ یادو
بمبئی مرکنٹائل بینک
کے
ریمن اور منیجنگ ڈائرکٹر
ڈاکٹر شمیم کاظم
کے ساتھ
بمبئی میں
گفتگو کرتے ہوئے



وزیر اعلیٰ مسٹر ملائم سنگھ یادو ۱۱ جولائی ۱۹۹۴ء کو سچیوالیہ انیکسی ہال میں محکمہ تعلیم کے فروغ سے متعلق جلسے میں تقریر کرتے ہوئے۔ مد مقابل وزیر تعلیم مسٹر شاکر علی اور وزیر ریاست برائے تعلیم مسٹر شاردا نند انچل بھی موجود تھے۔



... وزیر اے اور باہمی
... مسئلہ اوقات
... مند تھے جہاں
... جولائی کو لکھنؤ میں
... بورڈ کی جائیداد
... سلسلے میں
... تدین شہرت
... حال
... نے





وزیر اعلیٰ شری ملائم سنگھ یادو ۱۴ جولائی کو رویندرالیہ لکھنؤ میں آنجہانی چندر بھانو گپتا کے ۹۳ ویں یوم پیدائش پر ان کی تصویر کی گل پوشی کر کے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے

وزیر اعلیٰ شری ملائم سنگھ یادو [illegible] جولائی کو [illegible] میں ڈاکٹر رفیق زکریا کی رہائش گاہ پر تعلیمی جلسے کے [illegible] کو خطاب کرتے ہوئے



وزیر اعلیٰ
شری ملائم سنگھ یادو
[illegible]
[illegible]
ہفتہ وار
'سنگم وانی'
کی رسم اجرا
کرتے ہوئے
(فوٹو: جاوید ہاشمی)



وزیر اعلیٰ شری ملائم سنگھ یادو
نینی تال میں اخباری نمائندوں
سے گفتگو کرتے ہوئے۔



تمہارے حق میں دُعاگو ہوں....

قلم کی رُوح ہے زخمی، لہولہو ہے بدن
مثالِ لالہ و گل، داغ داغ شہرِ سخن
ہے ریزہ ریزہ گریبانِ لیلیٰ تخئیل
ہے تار تار عروسِ غزل کا پیراہن
قبائے شعر ہے آلودہ خونِ دوراں سے
جہاں کے اشکوں سے تر ہے بساطِ فکر و فن
روش روش پہ بریدہ سروں کے گلدستے
لہو کے پھولوں سے گل رنگ گوشۂ چمن
غمِ جدائی سے بے نور اَن گنت آنکھیں
بنے ہیں گنجِ شہیداں ہزاروں گھر آنگن
فگار ایک اک سینہ، شق ایک اک جگر
چلی ہے ایسی چمن میں ہوائے رنج و محن
برایں حکایتِ غمگیں، برایں حدیثِ الم
تمہارے حق میں دُعاگو ہوں اے زمینِ وطن
چنبیلی، جوہی بھی اپنی گلاب بھی اپنے
دلوں میں پھر سے ہو بیدار یہ شعورِ کہن
چڑھے کہ رات کی رانی کی پالکی گزرے
تو ہاتھ باندھے کھڑے راہ میں ہوں سرو و سمن
لٹائیں سنبل و شمشاد کی جہاں بھی تنیں
ہوں بیلا، موگرہ بھی آس پاس خیمہ زن
کھلے ہوں پھول سرِ شاخِ گلستاں ہر دم
بہارِ برگ و گل و خار پہ ہو سایہ فگن

—— موہنی مجروح
شعبۂ اُردو۔ رتن سین ڈگری کالج
بانسی۔ سدھارتھ نگر
۲۷۲۱۵۹

وقت

تین ہم وزن مصرعوں پر مشتمل
مکمل نظمیں

(۱)

وقت کی بات یوں نہیں کرتے
اس کو پہلے سلام کرتے ہیں
ہو کے خوش پھر کلام کرتے ہیں

(۲)

وقت اک بند ڈائری جس میں
ایک اک پَل کی داستاں چھپی
حادثے خود ہی کھول دیں گے کبھی

(۳)

میز پہ وقت کی کتاب پڑی
سب سے کہتی ہے کھول کر پڑھ لو
حادثوں کا شمار خود کرلو

(۴)

وقت صحرا میں ایک سُوکھا درخت
تھے کبھی جس پہ پھول برگ و بار
ہائے کانٹوں نے کردی پھر یلغار

(۵)

وقت اک جھیل کی طرح ساکت
اپنی گہرائیوں میں ڈُوبا ہے
حادثوں کا شکار ہوتا ہے

OO

—— شعیب شمس
نیشنل سیمپل سروے
ڈیری فارم۔ پورٹ بلیر
انڈمان

اے مری مادرِ ہند فخرِ جہاں

اے مری مادرِ ہند فخرِ جہاں
تو کہ ہے حاملِ رفعتِ آسماں
تیری عظمت کا قصہ ہو کیسے بیاں
سچ ہی کہتا ہے جگ تجھ کو جنت نشاں
میرے ہندوستاں، میرے ہندوستاں

سارے دھرموں کا مسکن ہے سینہ ترا
سب کو اونچائی دیتا ہے زینہ ترا
پار کرتا ہے سب کو سفینہ ترا
تیری ممتا ہے کس درجہ راحت فشاں
میرے ہندوستاں، میرے ہندوستاں

سچ ! کہ مذہب کو ہے اولیت تری
گیان وگیان سے بھی ہے نسبت تری
ہے خلا پر بھی اب تو حکومت تری
اور ضوبار ہے علم کی کہکشاں
میرے ہندوستاں، میرے ہندوستاں

پاٹھ ملتا ہے باپو کے ایثار سے
بوس کہتے ہیں گمنام سنسار سے
یہی خواہش ہے اشفاق کی دار سے
ہم اُٹھائے رہیں ایکتا کا نشاں
میرے ہندوستاں، میرے ہندوستاں

□□

—— احترام اسلام
۵۴۷ - اتر سوئیا
الہ آباد
۲۱۱۰۰۳

علی مقدی اشوکت
ملک محمد بخت

اودھ کے قدیم کتب خانے اور مطابع

لکھنؤ اور اودھ کے اسلامی عہد کی تاریخ خواہ کچھ بھی تسلیم کی جائے لیکن اودھ کے قصبات کی تاریخ یقیناً بہت قدیم ہے۔ ان قصبات میں سلاطین تغلق اور خلجی کے بنوائے ہوئے مزارات، درگاہیں، مسجدیں اور خانقاہیں جو حوادثِ زمانہ سے بچ گئیں ابھی تک موجود ہیں۔ حقیقتاً ان قصبات کی تاریخ تو اور بھی قدیم ہے۔ اودھ کے اسی پورے خطہ میں سید سالار مسعود غازیؒ کی وفات سنہ ۴۲۳ھ اور ان کے ساتھیوں کو جو اسی علاقہ میں ہمیشہ کے لیے بس گئے یہاں کے اوّلین مسلمانوں میں شمار کیا جائے گا۔

سنہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد جب سنہ ۱۸۶۰-۶۲ء میں اس پورے علاقہ کا بندوبست ہوا اور مردم شماری و پیمائش کر کے نقشے وخسرے مرتب کیے گئے تو اس وقت پورے ملکِ اودھ میں دس ہزار سے زائد آبادی والے صرف اٹھارہ قصبات اور شہر بشمول لکھنؤ و فیض آباد پائے گئے۔ لکھنؤ اور فیض آباد کے علاوہ یہ قصبات ٹانڈہ، بہرائچ، لہرپور، خیرآباد، شاہ آباد، بلگرام، سندیلہ، سانڈی، ملاواں، جائس، ردولی، زید پور، بلرام پور، گونڈہ، پوروا ہیں۔

(گزیٹر آف اودھ ۱۸۷۷ء مطبوعہ لندن، بار دگر مطبوعہ دہلی)

ان تمام قصبات میں بڑے بڑے علمار، صوفیہ، دانشور اور شعراء سیکڑوں سال پیشتر سے موجود تھے جن میں اکثر مشہور صاحبانِ تالیفات و تصنیفات بھی تھے۔ اس زمانہ میں بھی ہر مکتب اور مدرسے اور صوفیار کی خانقاہوں، علمار اور مشائخ کے آستانوں نیز امرار اور روسا کے دولتکدوں پر مکتب اور کتب خانے موجود تھے۔ یہی کتابیں تغیرات اور حادثات زمانہ کے ہاتھوں ادھر ادھر منتقل ہوتی رہیں اور آج ان کتب خانوں کی نشاندہی تقریباً ناممکن ہے۔ اب بھی اگر تلاش و جستجو کی جائے تو ان قدیم ٹھکانوں پر قدیم مخطوطات، ملفوظات، بیاضوں اور کشکولوں کی نشاندہی ممکن ہے اور نئی معلومات کا امکان ہے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب نے بالکل صحیح فرمایا تھا کہ اگر علمار، فضلا، و دیگر مشاہیر کی فہرست پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اہلِ قصبات کا ملک پر بہت بڑا احسان ہے۔ کاش مولانا آزاد (بلگرامی) کی طرح دوسرے اہل قصبات بھی اس بات کا خیال رکھتے اور اپنے اپنے قصبہ کے علما فضلا اور صوفیا اور دیگر مشاہیر کے حالات قلمبند کر ڈالتے تو ہندوستان کی تاریخ کو اس سے بڑی مدد ملتی۔ بکثرت ایسے قصبات ہیں کہ اگر وہاں کے حالات یا تاریخ لکھی جائے تو ایسی مفید معلومات اس سے حاصل ہو سکتی ہیں جن کا بڑی بڑی مبسوط تاریخوں میں پتہ نہیں۔

مضمون کی طوالت کے خوف سے اودھ کے مشہور قصبات میں جہاں جہاں علما اور کتب خانوں کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے محض مختصراً بلکہ اشارتاً ذکر کیا جاتا ہے۔

بہرائچ

درگاہ شریف حضرت مسعود غازیؒ میں زمانۂ قدیم سے کتب خانہ رہا ہے اور اب بھی موجود ہے۔ کتب خانۂ شاہ نعیم اللہ، کتب خانہ قزلباش، ریاستِ نان پارہ کا کتب خانہ حضرت شاہ تجار (مجتبیٰ) لہرپور کا کتب خانہ مشہور اور بڑے کتب خانوں میں شمار ہوتے ہیں۔

کاکوری

کتب خانہ تکیہ شریف جہاں آج بھی ہزاروں کتب موجود ہیں، کتب خانہ مولوی نورالحسن نیز مؤلف نوراللغات، کتب خانہ مشیر احمد علوی، منشی فیض بخش (عہد آصفی) منشی خلیل الدین خاں،

اس وقت بھی بچی کھچی کتابیں موجود ہیں گو لوگوں نے علی گڑھ، ندوۃ العلماء لکھنؤ وغیرہ میں بخیال حفاظت بہت سی کتب دے دی ہیں۔

سندیلہ

میں بھی عہد قدیم میں مُلّا حمد اللہ، مولانا حیدر علی، مولانا اعظم علی، مولانا شوکت علی اور مولانا شاکر علی صاحبان کے بڑے کتب خانے موجود تھے اس کے علاوہ زمانۂ شاہی میں چودھری حشمت علی، راجہ جے سکھ لال راجہ دھنپت رائے، راجہ درگا پرشاد مہر، مولوی یوسف علی وغیرہ اور عہد برطانیہ میں تعلقداران صاحبان کے کتب خانے مشہور تھے۔
بیشتر حضرات نے بخیال حفاظت ندوۃ العلماء لکھنؤ، علی گڑھ، امیر الدولہ پبلک لائبریری لکھنؤ وغیرہ کو کتب دے دی ہیں اور کچھ لوگوں کے پاس اب بھی موجود ہیں۔

کچھوچھا شریف

یہاں بھی مشہور کتب خانہ تھا اور اس وقت بھی موجود ہے اور کتب کا اچھا ذخیرہ ہے۔

دیوہ شریف

بارہ بنکی میں حضرت وارث علی شاہ کی درگاہ میں اس وقت بھی مخطوطات اور مطبوعات کا ایک بڑا کتب خانہ موجود ہے۔

بلگرام

سرزمین بلگرام سے بڑے بڑے نامور علماء صاحب تصنیفات گزرے ہیں۔ یہاں کے رئیسوں کے پاس گھر گھر کتب خانے تھے۔ خاتمۂ زمینداری کے بعد اور ملک کی تقسیم ہونے پر لوگوں کے پاکستان چلے جانے سے سب نظام درہم برہم ہو گیا۔ یہاں بھی لوگوں نے بخیال حفاظت علی گڑھ وغیرہ میں کتابیں دے دیں۔
اودھ کی تقریباً ہر ریاست میں بڑے بڑے کتب خانے تھے اور اب بھی ہر ریاست اور سابق تعلقدار اور راجاؤں کے یہاں کافی تعداد میں کتب موجود ہیں۔ اودھ کی جملہ ریاستوں میں ریاست محمود آباد کا کتب خانہ قابل ذکر رہا ہے۔

محمود آباد

کے کتب خانے کے مخطوطات کی فہرست ایرانی کلچرل ہاؤس کی جانب سے کئی سال قبل شائع بھی کی جا چکی ہے۔ اس کتب خانہ میں کئی ہزار مخطوطات عربی، فارسی اور اردو کے موجود ہیں اور کئی ہزار مطبوعہ کتابوں کا ذخیرہ بھی ہے۔ آج کل کتابوں کی نئی فہرستیں مرتب ہو رہی ہیں۔

خیرآباد لاہر پور

لاہر پور کا کتب خانہ رکینہ (وقف) میں خیرآباد کے بیشتر اولیاء اور مشائخ علماء اور مشاہیر کی تالیفات موجود ہیں۔ خود خیرآباد میں بھی درگاہوں اور خانقاہوں نیز مشاہیر کے خانوادوں میں کتب موجود ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھئے تذکرۂ مشاہیر خیرآباد مطبوعہ۔
الغرض تمام قصبات میں بڑے بڑے کتب خانے تھے اور اب بھی اگر تلاش و جستجو کی جائے تو بہت کچھ معلومات میں اضافہ ممکن ہے۔

لکھنؤ

لکھنؤ کی نئی تاریخ کا آغاز نواب آصف الدولہ کے عہد سے شروع ہوتا ہے۔ عہد آصفی کے کتب خانہ کا تاریخ میں یوں تذکرہ ملتا ہے:

> "میر عبد اللطیف ایک عالم تھے جو عہد آصفی (۱۷۷۵ء۔ ۱۷۹۵ء) میں لکھنؤ آئے تھے۔ وہ یہاں کے شاہی کتب خانہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس کتب خانہ میں تقریباً تین لاکھ کتابیں اور دیکھ بھال کے لئے ہر سو کتابوں پر ایک ملازم ہے۔ کتابیں مختلف زبانوں اور موضوعات پر ہیں ہندستان، روس اور انگلینڈ وغیرہ کی مصوری کے نادر نمونے یہاں موجود ہیں۔ سات سو مخطوطات ایسے ہیں جو تیموری بادشاہوں کے کتب خانوں میں تھے۔"
>
> (لکھنؤ مہا اتسو پتریکا ۱۹۸۵ء)

اودھ کے نواب سعادت علی خاں جن کا لقب بعد وفات "جنت آرامگاہ" ہوا۔ عہد (۱۷۹۸ء۔ ۱۸۱۴ء) میں کتب خانہ شاہی کے محل وقوع اور کتابوں کی چوری کی اطلاع مؤلف "تاریخ اودھ" کمال الدین حیدر کے بیان سے اس طرح ہوتی ہے،

> "کتب دراصل کتب خانہ شاہی کی قلعہ مچھی بھون میں رہتی تھیں زمانۂ جنت آرام گاہ میں تحویلداروں نے

صندوق کے تختۂ پائیں کو اکھاڑ کر چرائی تھیں قفل اور مہر بدستور قائم ہیں..." (قیصر التواریخ ص...)

سر ہنری ایلیٹ چیف سکریٹری گورنر جنرل نومبر ۱۸۴۸ء شروع عہد واجد علی شاہ میں لکھنؤ آئے تھے بادشاہ سے بھی ملاقات کی اور کتب خانۂ شاہی سے کتب بھی انتخاب کیں۔

"ایلیٹ صاحب کو کتب تواریخ کمیاب و نایاب زمانہ کا بڑا شوق تھا جس شہر گئے جو پائے کتاب ہوئے..... کتب تواریخ ہر طرح کی خواہ بدیہہ لوگوں نے خوشامد سے نذر کیں یا بالقیمت لیں"...

جنوری ۱۸۴۸ء میں ڈاکٹر اسپرنگر ایم، ڈی اسسٹنٹ سرجن بنگال سروس کا تقرر بحکم گورنمنٹ آف انڈیا لکھنؤ میں شاہان اودھ کے کتب خانوں کے مخطوطات کی فہرست بنانے کے لیے ہوا۔ انھوں نے تقریباً اٹھارہ مہینے فہرست بنانے میں صرف کیے اور تقریباً دس ہزار جلدیں دیکھیں اسپرنگر کی بنائی ہوئی فہرست "اے کیٹلاگ آف دی عربک پرشین اینڈ ہندستانی مینو سکرپٹس آف دی لائبریریز آف دی کنگس آف اودھ" کے نام سے ۱۸۵۴ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی تھی۔

واجد علی شاہ کے عہد میں کتب خانے میں تقریباً دو لاکھ کتابیں موجود تھیں اور عملہ ہزاروں روپیہ تنخواہ پاتا تھا۔

اودھ کے ہر بادشاہ نے اپنے عہد میں کتب خانے کی ایک مہر بنوائی تھی جس پر بادشاہ کے نام کا ایک شعر کندہ کیا جاتا تھا۔ آخری چار بادشاہوں کی مہروں پر اشعار ذیل کندہ تھے۔

نصیر الدین حیدر کی مہر:

خوش است مہر کتب خانۂ سلیمان جاہ
بہر کتب مزین چو نقش بسم اللہ

محمد علی شاہ کی مہر:

زہے مہر سلطان والا جناب
کہ زیبا بود بر جبین کتاب

امجد علی شاہ کی مہر:

ناسخ ہر مہر شد چوں شد مزین بر کتاب
خاتم امجد علی شاہ زمن عالی جناب

واجد علی شاہ کی مہر:

خاتم واجد علی سلطان عالم بر کتاب
ثابت و پر نور باد تا فروغ آفتاب

ایامِ غدر میں کتب خانوں کی جو تباہی اور بربادی ہوئی تاریخ میں اس کی بھی داستانیں موجود ہیں۔

"انتزاع سلطنت کے بعد جب نئے چیف کمشنر کپتان ہیز نے قیصر باغ کو دیکھا اور مترجم کتب خانہ سلطانی ہوئے کتابوں کا انبار اور اس کی بے ترتیبی دیکھ کر بہت تاسف کیا اور مفتاح الدولہ سے سبب پوچھا۔ عرض کی کہ یہ حال میجر کارنیگی صاحب کی بدولت ہوا۔ ایک دن سارا کتب خانہ، جو فرح بخش لائبریری کی الماریوں میں بترتیب تھا باہر نکلوا کر پھنکوا دیا۔"

(قیصر التواریخ جلد ۲ ص ۱۸۱)

ایامِ غدر میں کتب خانہ سلطانی کی بربادی خود بادشاہ کی زبانی یوں ہے:

"عمدہ تالیفات و تصنیفات کو باغیوں کی فوج کے سیلاب نے خس و خاشاک کی طرح اس طرح ڈبو دیا کہ اب ان کے ایک حرف کا نشان بھی باقی نہیں ہے۔

کتب انگریزی ہزارہا روپیہ کی کوچہ و بازار میں مثل خس و خاشاک پڑی رہتی تھیں کسی کی مجال نہ تھی کہ اسے اٹھا سکے باہتمام انگریزی مارا جاتا خصوصاً کتب خانہ جنرل مارٹن اور ہزارہا سلطانی جلدیں جلا دیا یا تالاب میں ڈبو دیا۔

سلطان العلماء کاکوری سے گھبرا کر قصبہ موہان چلے گئے... کئی مہینے تک املاک قدیم ضبط سرکار رہی بعد خرابی بصرہ ایک دن محکمۂ کارنیگی صاحب میں گئے مکان قدیم ملا لیکن بیت المال اور کتب خانہ ہزارہا جلد کا نہ ملا۔"

(قیصر التواریخ ص ۲۲۲ و ص ۲۵۰)

ایام غدر میں کتب خانہ ممتاز العلماء ایک اتفاقیہ صورت پیش آجانے کے باعث تباہی سے محفوظ رہا، اس کا حال "تاریخ لکھنؤ" میں مولوی آغا مہدی مرحوم نے یوں بیان کیا ہے:

"ڈیوڑھی میں بڑی بطخیں پلی ہوئی تھیں اور مکھی کا چھتا ایک بلندی پر تھا۔ گورے سنگینیں لیے ہوئے آئے شہد کی مکھیاں چھتا پھوٹ جانے سے اڑیں، بطخیں چیخیں وہ بطخوں کو پکڑ کر لے گئے اور مکھیوں نے اندر جانے نہ دیا اس طرح علمی خزانہ تلف ہونے سے بال بال بچا۔

("تاریخ لکھنؤ" ص۸۱ مطبوعہ کراچی)

کتب خانہ علمائے فرنگی محل

لکھنؤ میں کتب خانہ سلطانی کے علاوہ علماء اور رؤسا کے شخصی کتب خانے بھی تھے جن میں علمائے فرنگی محل کے کتب خانے سب سے قدیم ہیں۔ فرنگی محل عہد عالمگیر میں حضرت ملا نظام الدین سہالوی نے آباد کیا اور عہد شاہی تک علوم دینیہ کا عظیم مرکز رہا۔ یہاں ہر زمانے میں علماء کے بڑے بڑے کتب خانے موجود رہے اور اس وقت بھی موجود ہیں گو اکثر حضرات نے کتابیں ندوۃ العلماء لکھنؤ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کتب خانوں کو دے دی ہیں۔

کتب خانہ غفرانمآب

یہ کتب خانہ عہد آصفی میں مولانا غفرانمآب نے قائم کیا تھا۔ اس کتب خانے کی موجودگی کا اظہار مخطوطہ "ضیاء الابصار" جو واقعات کربلا پر اردو کی قدیم کتاب ہے نیز تاریخ لکھنؤ مؤلفہ آغا مہدی کے ص۱۲۲ کی عبارت سے بخوبی ظاہر ہے۔

امام باڑہ غفرانمآب لکھنؤ میں کتب خانہ "عمدۃ العلماء" اسی کی یادگار ہے جسے مولانا کلب حسین اعلی اللہ مقامہ نے جمع کیا تھا۔

کتب خانہ ممتاز العلماء

عقب مسجد تحسین علی خاں امام باڑہ جنت مآب میں موجود ہے۔ بیشتر مخطوطات کا ذخیرہ ہے۔ یہاں بھی فہرستیں مرتب ہو رہی ہیں۔

کتب خانہ مفتی محمد قلی خاں موسوم بہ

کتب خانہ ناصریہ: محلہ کھجوہ نزد کاب گنج باغ ناظم صاحب میں تا حال موجود ہے تقریباً چالیس ہزار مخطوطات و مطبوعات کا بڑا ذخیرہ ہے۔ کتابوں کی از سر نو فہرستیں مرتب ہو رہی ہیں۔ امید ہے کہ مستقبل قریب میں شائع ہوں گی۔

کتب خانہ علامہ سید علی شاہ کشمیری

علامہ سید علی شاہ کشمیری عہد نواب سعادت علی خاں اور نصیر الدین حیدر کی معروف شخصیت تھے، ان کا یہ کتب خانہ ان کی وفات کے بعد آقائے ابوالحسن اور پھر حضرت باقر العلوم مولانا سید باقر صاحب طاب ثراہ کے پاس رہا۔ اس وقت نبیرۂ باقر العلوم مولانا سید تقی صاحب کے شریعت کدہ کٹرہ ابو تراب خاں میں موجود ہے۔ مخطوطات و مطبوعات کا بڑا ذخیرہ ہے۔ یہاں بھی فہرست سازی کی مہم جاری ہے۔

کتب خانہ دبیر الدولہ

مرزا حیدر ابن آغا تقی ترقی کے بعد حضرات اعلیٰ جاہ اور والا جاہ صاحبان کے نام سے مشہور تھا بعد میں اس خانوادے کے وارث لکھنؤ کی مشہور فرد آغا اَبو صاحب نے مدرسہ سلطانیہ کو وقف کر دیا جو مدرسہ سلطان المدارس میں اب بھی موجود ہے۔ تقریباً بیس ہزار کتب کا ذخیرہ ہے جس میں کئی سو مخطوطات بھی شامل ہیں۔ اس کی فہرست مرتب کی جا رہی ہے۔

کتب خانۂ مرزا سلیمان شکوہ

عہد آصفی میں شہزادہ مرزا سلیمان شکوہ کا بھی بہت بڑا کتب خانہ تھا۔ اس کتب خانہ کی اکثر کتابیں رضا لائبریری رامپور میں موجود ہیں جن پر سلیمان شکوہ کی مہر دیکھی جا سکتی ہے۔

برطانوی عہد حکومت میں لکھنؤ میں قائم ہونے والے قابل ذکر کتب خانوں میں سب سے اہم لکھنؤ یونیورسٹی کا کتب خانہ ہے جہاں تقریباً پانچ لاکھ کتابیں موجود ہیں۔

۱۸۹۵ء میں کتب خانہ ندوۃ العلماء قائم ہوا۔ ۱۹۰۵ء سے یہ کتب خانہ علامہ شبلی نعمانی کے اسم نامی سے معنون ہے۔ کل کتب کی تعداد تقریباً ڈیڑھ لاکھ ہے۔ اردو کتابیں تقریباً پچاس ہزار ہیں۔ کل مخطوطات عربی، فارسی اور اردو تقریباً تین ہزار ہیں جن کی باقاعدہ فہرست شبلی کتب خانہ محمود آباد و ایرانی کلچرل ہاؤس نئی دہلی شائع کر چکا ہے۔

امیر الدولہ پبلک لائبریری قیصر باغ لکھنؤ: کل تعداد کتب تقریباً دو لاکھ ہے۔

اردو، عربی اور فارسی کی کتابیں تقریباً پچاس ہزار ہیں۔ مخطوطات تقریباً پانچ سو ہیں جن میں بیشتر سنسکرت کے ہیں۔

بابو گنگا پرشاد ورما میموریل لائبریری امین آباد میں کل کتب کی تعداد تقریباً پچاس ہزار ہے جس میں چھ ہزار اردو کتب بھی شامل ہیں۔

لکھنؤ کے عہد حاضر کے کتب خانوں کی ایک ڈائرکٹری مرتبہ ایم۔اے صدیقی و جناب ہریش چندر صاحب مخاب لکھنؤ لائبریری ایسوسی ایشن مطبوعہ ۱۹۸۴ء موجود ہے جس میں تقریباً سبھی سرکاری، محکمہ جاتی نیز اسکولوں اور کالجوں کے کتب خانوں کی تفصیلی معلومات موجود ہیں۔

قدیم مطبوعات اور مطابع

فن طباعت کا آغاز اور اس کی ایجاد ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی کے درمیان چین میں تسلیم کی جاتی ہے جہاں سب سے پہلے ۷۵۰ء میں بدھ مذہب کی ترویج اور تبلیغ کے لیے مہاتما بدھ کی تصاویر بلاک کے ذریعہ شائع کی گئیں۔ برٹش میوزیم میں قدیم چینی طباعت کے نمونے محفوظ ہیں۔ پہلے چینی مٹی کے ٹائپ اور بعد میں لکڑی کے یعنی چوبی ٹائپوں کے ذریعہ چھپائی کی جاتی تھی۔

(ہندستانی اخبار نویسی مؤلفہ محمد عتیق صدیقی ص۳)

یورپ میں چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی کے درمیان فنِ طباعت کا پتہ چلتا ہے اور یورپ کے کتب خانوں میں پندرھویں صدی کی مطبوعات موجود ہیں۔

سولھویں صدی عیسوی میں پرتگالی عیسائی مشنوں کے ذریعہ سب سے پہلے ہندستان کے مغربی ساحلی علاقوں میں یہ فن پہونچا اور تامل زبانوں میں عیسائی مذہب کے کتابچے شائع کیے گئے اور بعد میں پھر دوسری زبانوں میں بھی ٹائپ بننے لگے اور چھپائی ہونے لگی۔

اودھ کے علاقے میں سب سے پہلے نواب غازی الدین حیدر کے عہد (۱۸۱۴ء۔۱۸۲۷ء) میں ٹائپ کے ذریعہ فارسی کی کئی کتابیں چھاپی گئیں اور مطبع سلطانی خود بادشاہ کے حکم سے معرض وجود میں آیا۔ ۱۸۱۹ء مطابق ۱۲۳۶ھ میں خود بادشاہ کی تالیف فارسی لغت "ہفت قلزم" کی سات جلدیں، "محامد حیدری" مؤلفہ قاضی محمد صادق خاں اختر، "مناقب حیدری" وغیرہ اسی مطبع سے طبع ہوئیں۔

...یکٹ بک میں اس وقت بھی اس کی مطبوعات میں لکھنؤ میں ندوۃ العلماء، سلطان المدارس اور مدرسۃ الواعظین کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔

مولانا عبدالحلیم شرر نے "گزشتہ لکھنؤ" میں "تاج اللغات" اور "زاد المعاد" کا بھی ہفت قلزم کے علاوہ اس مطبع سے طبع ہونا لکھا ہے۔ مؤلف "ہنرمندان اودھ" سید اسرار حسین خاں نے ان کتب کے علاوہ "شرح منازل" کا بھی اسی مطبع سے طبع ہونا ظاہر کیا ہے۔

گزشتہ لکھنؤ ص۱۴۲۔ ہنرمندان اودھ ص۱۹۰-۱۹۹

عہد غازی الدین حیدر میں مطبع سلطانی کے وجود میں آنے کے بعد ہر بادشاہ کے عہد میں اس مطبع کو مطبع سلطانی ہی کہا گیا۔ یہاں تک کہ انتزاع سلطنت کے بعد واجد علی شاہ نے کلکتہ میں بھی جو مطبع قائم کیا وہ مطبع سلطانی ہی کہا جاتا تھا۔ عہد واجد علی شاہ میں مطبع سلطانی کے مہتمم مقبول الدولہ مہدی علی خاں قبول تھے۔

خط نسخ اور نستعلیق میں کتابوں کی طباعت اودھ کے دوسرے بادشاہ نصیر الدین حیدر کے عہد (۱۸۲۷ء۔۱۸۳۷ء) میں معلوم ہوتی ہے۔ مؤلف "ہندستانی پریس" جناب نادر علی خاں نے مطبع سلطانی شاہ نصیر الدین حیدر کے عہد کی طبع ایک کتاب "شرح الفیہ" مطبوعہ ذیقعدہ ۱۲۴۷ھ کی موجودگی کی نشان دہی کی ہے جس میں نسخ اور نستعلیق دونوں قسم کی طباعت کے نمونے موجود ہیں۔ موصوف نے ۱۲۴۷ھ کو سنہ عیسوی سے تطبیق فرماکر ۱۵ر اپریل ۱۸۳۲ء برآمد کیا ہے اور اس سے یہ تجزیہ کیا ہے کہ مطبع سلطانی ۱۸۳۰ء کے اواخر یا ۱۸۳۱ء کے اوائل میں جاری ہوا تھا۔

مطبع سلطانی کے سلسلے میں مؤلف تاریخ اودھ کمال الدین حیدر مطبوعہ نول کشور ۱۸۹۶ء کی جلد اول کے ص۳۰۹ و ص۳۱۰ کی یہ عبارت اہم ہے جو موصوف نے زیر سرخی "نواب منتظم الدولہ کا وزیر ہونا" اس طرح تحریر کی ہے:

"نواب ۱۷ر جمادی الثانی ۱۲۴۹ھ مطابق ۴ر نومبر ۱۸۳۳ء داخل لکھنؤ ہوئے شرف ملازمت خلعت وزارت پایا" ص۳۰۹

"پہلے نواب اُن کاموں پر متوجہ ہوئے جو باعث نیک نامی اور موجب خوشنودی حکام مدر تھے ... دوسرے چھاپخانہ

سلطانی لیتھوگرافک پریس چھر کا آدھا جیب کو یا پانسو روپیہ
دہ ماہ کرکے تیسرے لوہے کے پل کی تیاری ... چوتھے
نہر جدید کا اہتمام ؛

چوں کہ عہد نصیر الدین حیدر میں نواب مہدی علی خاں منتظم الدولہ کے عہدۂ وزارت عظمیٰ پر منصوبی کے سلسلے میں ملک الشعراء مولوی مہدی علی خاں ذکی نے ایک قصیدہ بھی نظم فرمایا تھا اور اسی قصیدہ میں ایک عجیب و غریب قطعۂ تاریخ بھی نظم کیا ہے جس کے ستائیس اشعار کے ہر مصرعہ کے منقوطہ و غیر منقوطہ حروف نیز اور دیگر صنعتوں سے کل پانچ ہزار نو سو چھ طرح تاریخ ۱۲۴۶ھ برآمد ہوتی ہے۔ (کلیات ذکی مطبوعہ نول کشور)

الغرض مندرجہ بالا عبارت سے ۱۲۴۶ھ مطابق نومبر ۱۸۳۰ء میں مطبع سلطانی لیتھوگرافک کا عہد نصیر الدین حیدر میں بخوبی ثابت ہے اور کسی گمان یا قیاس کا امکان نہیں رہ جاتا۔

لکھنؤ میں مطبع سلطانی کے قیام کے کافی دنوں بعد اور بھی چھاپہ خانوں کی موجودگی ظاہر ہوتی ہے۔ مؤلف "ہندوستانی پریس" مطبوعہ اترپردیش اُردو اکاڈمی لکھنؤ (۱۹۹۰ء) نے مطبع مصطفائی لکھنؤ کی ایک مطبوعہ کتاب "مالابدمنہ" مطبوعہ رجب ۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۳۹ء کی نشان دہی فرمائی ہے۔ حالاں کہ ۱۲۵۵ھ میں ہی لکھنؤ کے مطبع محمدی سے شان دار و یادگار قرآن مجید کے سو نسخوں کی طباعت و اشاعت کا تذکرہ مولوی آغا مہدی صاحب نے بھی اپنی مشہور کتاب "تاریخ لکھنؤ" کے ص۱۳۳ پر کیا ہے۔

بہر حال ۱۸۳۹ء تا ۱۸۵۷ء لکھنؤ میں مطبع سلطانی کے علاوہ اور بھی متعدد چھاپہ خانوں کی موجودگی کا تذکرہ مولانا عبدالحلیم شرر نے "گزشتہ لکھنؤ" میں، رام بابو سکسینہ نے "تاریخ ادب اردو" میں، محمد عتیق صدیقی نے "ہندوستانی اخبار نویسی" میں اور مولف "ہندوستانی پریس" نادر علی خاں صاحب نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایک لاکھ مطبوعہ عربی، فارسی اور اُردو کی ایک ایک کتاب کو نہایت احتیاط سے پرکھنے کے بعد مختلف مطابع کی مطبوعات کے سن طباعت کے اعتبار سے کئی فہرستیں مرتب فرمائی ہیں اور ان سے پیشتر کے محققین نے جو فہرستیں اس سلسلے میں مرتب کی ہیں، ان سب کو اگر یکجا کیا جائے تو اس طرح ترتیب قرار پائے گی :-

۱۸۳۹ء مطبع مصطفائی : زیر اکبری دروازہ محلہ محمود نگر لکھنؤ
مالک مصطفیٰ خاں خلف روشن خاں
۱۸۴۰ء مطبع جلالی : محلہ یحییٰ گنج متصل مسجد مولانا حسن علی محدث
مالک میر جلال الدین
۱۸۴۱ء مطبع علوی : محلہ کٹرہ محمد علی خاں، مالک علی بخش خاں
۱۸۴۲ء مطبع محمدی : متصل رانی کٹرہ در تکیہ شاہ فصیح
مالک، محمد بخش خاں
۱۸۴۳ء مطبع فضل المطابع : مالک: شیخ الٰہی بخش
۱۸۴۳ء مطبع حسنی : متصل اکبری دروازہ۔ محمود نگر لکھنؤ
مالک: میر حسن رضوی
۱۸۴۴ء مطبع میر حسن، محلہ محمود نگر متصل اکبری دروازہ
۱۸۴۴ء مطبع محمدیہ : محلہ جھوائی ٹولہ اندرون امامباڑہ بادشاہ محل
۱۸۴۴ء مطبع حسینی : متصل مسجد ڈیوڑھی آغا میر
مالک: فیاض حسین
۱۸۴۴ء مطبع حیدری : در رکاب گنج جدید۔ مالک سید محمد زماں صفوی
۱۸۴۵ء مطبع مولائیؑ : محلہ بازار ٹکیٹ رائے۔ مالک منشی نظام الدین
۱۸۴۵ء مطبع خدائی : واقع کٹرہ محمد علی خاں
۱۸۴۵ء مطبع گلشن محمدی
۱۸۴۵ء مطبع مسیحائی : مالک مسیح الزماں ولد مولوی نور محمد
باغ قاضی
۱۸۴۶ء مطبع خیالی : مالک منشی خیالی رام
۱۸۴۶ء مطبع سنگین : مہتمم منشی حفیظ اللہ
" مطبع محمدیہ : محلہ جھوائی ٹولہ۔ مالک عبداللہ بن حاجی ولی محمد
" مطبع علوی : چوک قدیم در سرائے بانس والی متصل
مسجد تحسین علی خاں
" مطبع مرتضوی : متصل چاہ شرح۔ مالک، شیخ نصیر الدین
۱۸۴۷ء مطبع محمدی و احمدی : امامباڑہ آغا باقر مرحوم مالک علاء الدولہ
۱۸۴۸ء مطبع جعفریہ : مالک و مہتمم حکیم مرزا محمد جعفر خاں
۱۸۴۹ء مطبع مہدیہ : مالک سید محمد مہدی بن حاجی ولی محمد

۱۸۵۰ء مطبع سلطان المطابع : مہتمم سید عباس

افضل المطابع : مالک عبدالرزاق

۱۸۵۱ء مطبع فیض : مالک کپتان مقبول الدولہ بہادر

۱۸۵۲ء مطبع مصطفائی : محلہ دوگانواں زیر سبزی منڈی متصل کوتوالی

۱۸۵۶ء مطبع گنج پرشاد پنڈت : مالک پنڈت گنج ناتھ

۱۸۵۷ء مطبع حسین بخش علوی ، مالک و مہتمم حسین بخش علوی

راقم الحروف نے مضمون ہٰذا کی تیاری کے سلسلے میں لکھنؤ کے قدیم کتب خانوں میں مطابع مشمولہ فہرست بالا کے علاوہ درج ذیل مطابع کی مطبوعات بھی دیکھیں :

۱۸۴۶ء مطبع دائمی لکھنؤ ۔ کتاب "شرح المواقف" مولفہ علامہ سید شریف عربی ۔ تعداد صفحات ۷۰

۱۸۴۶ء مطبع جعفری : واقع خاص بازار باہتمام محمد جعفر ۔ کتاب "رسالہ حدود" فارسی

۱۸۵۳ء مطبع ذوالفقار حیدری : کتاب "جامع عباسی" مؤلفہ بہاء الدین محمد علی ۔ فارسی

اگر کوشش کی جائے تو ممکن ہے کہ کچھ اور مطابع بھی معلوم ہوسکیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد جبکہ اس دوران ہزارہا کتب بلکہ وہ رجسٹر تک تلف ہو چکے ہیں جن میں کتب کی تفاصیل درج کی جاتی ہیں ۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں کسی مکمل فہرست کی تکمیل خارج از امکان ہے ۔

۱۸۵۷ء کے بعد قائم ہونے والے مطابع میں اہم اور سب سے قابل ذکر نول کشور پریس اور منشی نول کشور کے لیئے نیا دور کا "نول کشور نمبر" ۱۹۸۰ء دیکھا جاسکتا ہے ۔ نول کشور کے مطبوعات کی ایک فہرست سنا ہے کہ خدا بخش لائبریری پٹنہ شائع کرنے والی ہے ۔

اودھ کے اور قصبات یا شہروں میں ، ۱۸۵۷ء سے قبل کسی چھاپہ خانہ کا کوئی سراغ نہ لگ سکا ، ہاں ۱۸۵۷ء کے بعد جگہ جگہ مطابع قائم ہوئے جن کی مطبوعات کثیر تعداد میں ہیں ۔

□□

ایکتا

نفاق و بغض کا سیلاب کیسے آیا ہے
کوئی بتادے ذرا کون ساتھ لایا ہے

پڑوسیوں کے مزاجوں میں برہمی کیسی ؟
ہر ایک شخص کے دل میں یہ دشمنی کیسی ؟

خزاں سی آگئی اب دوستی کے گلشن میں
بجائے پھول کے کانٹے بھرے ہیں دامن میں

دلوں کو توڑنے والے کہاں سے آئے ہیں
خیال موڑنے والے کہاں سے آئے ہیں

ہیں بے قصور یہاں شیخ و برہمن دونوں
سجائے رہتے ہیں پاکیزہ ایک فن دونوں

وبا کو فرقہ پرستی کی جو بھی لایا ہے
اسی نے دیش کے سکھ چین کو بٹایا ہے

مٹا کے فرقہ پرستی دکھا دو دنیا کو
ہم ایک ہیں یہ کہانی سنا دو دنیا کو

یہ مشورہ ہے شررؔ کا ہر ایک انساں سے
ہر ایک صاحبِ ذی ہوش اور ناداں سے

قاسم شررؔ

۲۴۶/۱۹۹ نجریان ۔ ٹھاکر گنج
لکھنؤ

افسانہ

نسیم بن آسی

پلیٹ فارم

ابھی ابھی ایک گاڑی گزر گئی ہے۔ اور اس کی چیخ نکل گئی ہے۔ جب بھی کوئی گاڑی گزرتی ہے۔ لائن کی چیخ نکل جاتی ہے۔ جسے کوئی نہیں سنتا ہے۔ کسی کی چیخ سننے کی فرصت بھی کسے ہے۔ اکثر لوگ زور کی چیخ سنتے ہیں۔ لیکن جو چیخ خاموش اور دبی دبی ہے۔ اسے کون سنتا ہے؟ گاڑی چلی گئی ہے اور لائن کی چیخ فضا میں گونج رہی ہے۔ .... لیکن ٹھہریے کہیں یہ میری اپنی ہی چیخ تو نہیں......

میں بک اسٹال کی طرف چل پڑتا ہوں۔ ایسا میں اس وقت کرتا ہوں، جب کسی پلیٹ فارم پر گاڑی کا انتظار کرتے کرتے طبیعت بور ہو جاتی ہے۔ کسی پلیٹ فارم پر بک اسٹال نہ ہو تو بے حد پریشانی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ دل بہلانے کا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا ہے۔ ہاں کوئی خوبصورت عورت میری ہی طرح جھک مار رہی ہو۔ تو بات دوسری ہے۔ اس سے پلیٹ فارم کی ساری اداسی اور ویرانی دور ہو جاتی ہے۔ کہنے کو تو وہ کسی کی بیوی ہوتی ہے۔ لیکن سچ پوچھئے تو وہ کسی شاعر یا ادیب کی ملکیت ہے!

میں بک اسٹال پر کتابوں کو الٹتا پلٹتا ہوں۔ اور بک سیلر کو دھوکا دیتے ہوئے اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہوں۔ مجھے یہاں بھی اپنی چیخ سنائی دیتی ہے۔ جسے میرے سوا کوئی نہیں سن رہا ہے۔ میں ایک کتاب لے کر اس کی ورق گردانی کرتا ہوں۔ ساتھ ہی ڈرتا بھی ہوں، کہیں کتاب والا ٹوک نہ دے۔ میں اس بے عزتی کا سامنا کرنے سے پہلے ہی وہاں سے کھسک جانا چاہتا ہوں۔ اکثر شریف لوگ یہی کرتے ہیں۔ میں کب کہتا ہوں وہ کچھ لے کر کھسک جاتے ہیں۔

کوئی بنچ پر بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگے یا جاگے، گاڑیاں اپنے وقت ہی پر آتی ہیں۔ کوئی گاڑی غلط وقت پر آتی ہے تو جاتی بھی ہے غلط وقت پر۔ جب شروع غلط ہوتا ہے تو آخر بھی غلط۔ میں بنچ پر بیٹھا ہوں پلیٹ فارم پر ننگی ہی ہوتی ہے۔ کرسیاں تو دفتروں میں ہوتی ہیں۔ جس کے لیے ساری دنیا میں جھگڑے اور فساد ہو رہے ہیں۔ کرسی ہی کے لیے کرسیاں چل رہی ہیں!

سامنے ایک چھوکرا مونگ پھلی بیچ رہا ہے۔ مونگ پھلی ــــ جسے غریبوں کا میوہ بھی کہتے ہیں۔ اور جسے کبھی کبھی امیر لوگ بھی اپنی زبان کا ذائقہ بدلنے کے لیے کھاتے ہیں۔ اس میں وہ غذائیت نہیں ہوتی ہے جو دوسرے سوکھے میووں میں ہوتی ہے۔ مونگ پھلی میں بس اتنی غذائیت ہوتی ہے کہ اس سے آدمی کی بھوک مٹ جائے اور وہ زندہ رہ سکے۔

میں اس چھوکرے سے پچاس گرام مونگ پھلی لیتا ہوں، ساتھ ہی اپنے آس پاس دیکھتا بھی ہوں، کوئی مجھے دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ مونگ پھلی کھاتے ہوئے جانے کیوں مجھے اپنے پھکڑپن کا احساس ہونے لگتا ہے۔ سیب اور انگور ہو تو اپنی ذات کچھ پھیلی ہوئی معلوم ہوتی ہے....!

گاڑی آج کافی لیٹ ہے۔ ایک انجن اکیلا ہی چھک چھاؤں کرتا ہوا گزر گیا ہے۔ جو مجھے جھک مارو، جھک مارو، سنائی دیتا ہے۔ لیکن انجن کی اس آواز میں صرف میں ہی شامل نہیں ہوں۔ میرے ساتھ بہت سارے مسافر بھی ہیں۔ ان میں مرد بھی ہیں، عورتیں بھی! بوڑھے بھی ہیں بچے بھی! مجھے ایمرجنسی کے وہ دن یاد آرہے ہیں۔ جب گاڑیاں اپنے صحیح وقت پر آتی تھیں کوئی گاڑی لیٹ نہیں ہوتی تھی۔ اور صاحب لوگوں کی دم اندر ہو گئی تھی۔ جانے کیوں ہم سختی کے قائل ہیں۔ چاہے یہ قانون کی ہو، یا ڈنڈے کی۔ ڈنڈے کی بات سے بُرا مت مانئے گا، پرانے زمانے سے لے کر آج تک انسان اسی کا عادی ہے۔

اب میں اس عورت کو دیکھ رہا ہوں، جو گھومتی ہوئی ادھر آنکلی ہے۔ اس کا رنگ سانولا ہے۔ لیکن وہ جوان اور خوبصورت ہے اس کے بلاوز کے بٹن ٹوٹے ہوئے ہیں، جس سے اس کا اصل دکھائی دے رہا ہے۔ عورت کے اصل کا یہی سب تو، وہ دور سے دکھائی دینے لگتا ہے اس کی گود میں ایک

ہو جاتی بھی ہے جس کے جسم پر کوئی کپڑا نہیں ہے۔ وہ تنگی نگاہوں سے لوگوں کو دیکھ رہی ہے۔ اور لوگ اسے دیکھتے ہی اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیتے ہیں۔ کوئی عورت جوان اور خوبصورت ہو تو سب اس کی طرف دیکھتے ہیں۔ لیکن جب وہ لوگوں کی طرف ہاتھ پھیلاتی ہے۔ تو کوئی اس کی طرف نہیں دیکھتا ہے......

گاڑی آنے کی گھنٹی بج چکی ہے۔ پلیٹ فارم پر مسافروں کی بھیڑ جمع ہو گئی ہے۔ سب کو کہیں نہ کہیں جانا ہے۔ ایسے ہی دنیا کا پلیٹ فارم ہے۔ ریلوے کا پلیٹ فارم چھوٹا ہے۔ دنیا کا بڑا۔ یہاں بھی مسافر اپنی گاڑی کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ گھنٹی بجے گی، گاڑی آئے گی۔ اور وہ اپنی منزل کی طرف چل دیں گے.....

منچلے نوجوان یا بوڑھے منچلے اس کے بچے کے بجائے اس عورت کو دیکھ رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ ان کی پلکیں کبھی نہیں جھپکیں گی۔

"کیوں ری کس کا بچہ ہے؟"

"کسی کا ہوگا"

"اس کا باپ کہاں ہے؟"

"بنا باپ کا ہے"

"بنا باپ کا بھی بیٹا ہوتا ہے؟"

"ہی.... ہی ...... ہی ...."

وہ عورت بھوکی ہے، لیکن اب وہ ننگی بھی ہو گئی ہے۔ لوگوں کی باتیں اور مذاق سن کر وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگتی ہے۔

گاڑی سوں سوں کرتی ہوئی پلیٹ فارم پر رک جاتی ہے۔ مسافروں کی بھیڑ ٹرین کے دروازے پر آکر اڑ گئی ہے۔ پھر گھس پیٹھ۔ ایک جوان اور طاقتور آدمی دروازہ پر آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور باہر کے آدمیوں کو اندر آنے سے روک رہا ہے۔ دیکھتے نہیں بچہ ہے۔ کیوں پوری بھیڑ اندر گھس جانا چاہتی ہے۔ ایک عورت ڈبے کے اندر سے چلا رہی ہے۔ لیڈیز کو بھی نہیں دیکھتے۔ پھر بھی باہر سے ایک مسافر کہہ رہا ہے۔ آگے بڑھو۔ آگے۔ ایک سیٹ میرے لیے بھی۔ دو جوان عورتیں دھکے کھا کر کسی طرح باہر نکل آئی ہیں ان کی سانسیں پھول رہی ہیں۔ اور ماتھے سے پسینے کی بوندیں ٹپک رہی ہیں۔ لیکن وہ خوش ہیں۔ شاید اس دبنے ملنے سے ان کے جسم کا درد

گیا ہے۔ عورتیں تنگ سے ... ہو رہی ہیں۔ ایک بڑھا بھی بڑی مشکل سے باہر نکلا ہے۔ وہ ہانپ رہا ہے۔ اب جا اپنی ... کے اندر۔ اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا ہے۔ جھاگ کے ساتھ گالی بھی۔ لیکن وہ نہیں جانتا ہے۔ وہ گالی کس اور کو دے رہا ہے، اپنے آپ کو کوس رہا ہے۔

ڈبوں میں اتنی بھیڑ ہے کہ پیشاب خانہ تک لوگ لدے ہوئے ہیں۔ مردوں کی تو کوئی بات نہیں، وہ لوگوں کو ہٹا کر اپنی حاجت رفع کر لیں گے۔ لیکن عورتیں ۔۔۔ کوئی بات نہیں! انہیں تو دیکھتے ہی لوگ اپنے آپ ہٹ جائیں گے۔

جو مسافر گاڑی سے باہر اترے ہیں، وہ ابھی پلیٹ فارم ہی پر ہیں۔ اور جو پلیٹ فارم پر تھے وہ ڈبوں کے اندر ہیں۔ جن کے پاس سامان ہیں، ان سے قلی زیادہ پیسے مانگ رہے ہیں۔ اور مسافر انہیں واجب پیسے دے رہے ہیں۔ جو کسی بھی طرح واجب نہیں ہے۔ انسان کے ذہن سے واجب نکل گیا ہے۔ اور اس کی جگہ "پیسہ" آگیا ہے۔ جو کسی طرح نکلتا ہی نہیں۔ قلی کے بعد ٹیکسی ٹیمپو، اور رکشا والے ہیں، جو مول بھاؤ میں قلیوں سے بھی آگے ہیں۔ وہ جیب کی صفائی دن کے اجالے میں کرتے ہیں۔ پھر بھی جیب ہمیشہ میلی ہی رہتی ہے!

میں پھر اس عورت کو دیکھنے لگا ہوں، جو کھڑی اپنا بدن کھجلا رہی ہے شاید وہ بہت دنوں سے نہائی نہیں ہے۔ میل اس کے بدن پر اس طرح جم گئی ہے۔ جیسے کسی آئینہ پر گرد و غبار۔ اس کا ہاتھ بدن کے اس حصے پر ہے، جسے عورتیں مردوں کے سامنے کھجلانے سے شرماتی ہیں۔ لیکن وہ بے پروائی سے اسے کھجلا رہی ہے۔ کھجلی تو بدن میں کہیں بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن بیکاری میں یہ زیادہ ہوتی ہے۔ وہ اتنی دیر تک مسافروں کے باہر نکلنے اور انہیں اپنی اپنی جگہ بیٹھ جانے کا انتظار کرتی رہی ہے۔ وہ ایک ڈبے کے سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہے۔

"بابا! بھگوان کے لیے!"

"چلو جی پرے۔ جب دیکھو سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہیں، یہ سالی"
"ننگے کا کتنا شوق ہے۔ دو چار اور چاہئیں کیا۔" ۔ بڑا صاپان والا کہتا ہے۔

عورت آنکھیں پھاڑ کر پان والے کی طرف دیکھتی ہے۔ جس کی اپنی بیٹی بھی شاید

"ایک پان ہماری طرف سے اسے بھی دے دو" کوئی آدمی عورت کے جوان جسم کو دیکھ کر کہتا ہے۔

"بابوجی! پان نہیں، جان حاضر ہے، یہ کہئے تو۔!" بوڑھا پان والا کہتا ہے۔

پھر دونوں ایک ساتھ ہنستے ہیں۔ جو ہنسی بھی نہیں ہے۔ عورت جلدی سے آگے بڑھ جاتی ہے۔ لیکن ان کی ہنسی اب بھی اس کا تعاقب کر رہی ہے وہ پیچھے مڑ کر دیکھتی ہے۔ پان والا ہنس رہا ہے وہ آدمی رو رہا ہے۔!

ایک کھڑکی کے پاس کوئی بڑھیا بیٹھی ہے اور گرم گرم چائے پی رہی ہے۔ اس کے ساتھ دو بچے بھی ہیں جو کیلا کھا رہے ہیں۔

"ماتا جی!" وہ عورت اپنا ہاتھ اس کے سامنے پھیلا کر کہتی ہے۔

"یہ لو۔" بڑھیا پرس میں سے دس پیسے نکال کر اسے دیتی ہے۔

عورت کی گود میں جو بچہ ہے، وہ کیلا کھاتے ہوئے بچوں کو ایک ٹک دیکھ رہا ہے۔ بڑھیا ایک کیلا اسے بھی دیتی ہے۔ رحم اور پیار صرف عورتوں کا حصہ ہے یہ رحم اور کہیں ملے یا نہ ملے، عورتوں کے ہاں ضرور ملے گا۔ وہ اپنے اسی جذبہ کی وجہ سے زندگی بھر دیتی رہتی ہیں۔!

وہ پھر آگے بڑھ جاتی ہے۔ کتنے چہرے ریل کی کھڑکی سے باہر جھانک رہے ہیں۔ وہ ایک کھڑکی کے پاس پہنچتی ہے۔ ایک آدمی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا ہے اس کی نگاہیں چائے والے کی طرف ہیں۔ کبھی کبھی ٹھیلے والے کو بھی دیکھتا ہے۔ جو گرم گرم پکوڑے بیچ رہا ہے۔ شاید آدمی کو بھوک لگی ہے۔ وہ عورت اس کے سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اس کا بچہ ایک ٹک اسی آدمی کو دیکھ رہا ہے جس سے اس آدمی کو شرم معلوم ہوتی ہے۔ وہ اپنا سر اندر کر لیتا ہے پھر بھی عورت اسی طرح کھڑی ہے۔ آخر اسے کہنا پڑتا ہے۔

"کیا دیکھ رہی ہو! آگے بڑھو نا!"

لیکن وہ ہٹتی نہیں ہے۔ جیسے وہ کچھ اور سننا چاہتی ہے۔ لیکن آدمی نیک ہے۔ وہ کوئی نامناسب بات نہیں کہتا ہے وہ صرف اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیتا ہے

اب اس عورت کے قدم تیز تیز اٹھ رہے ہیں۔ کچھ ہی دیر میں گاڑی چل دے گی۔ وہ ہر ڈبے سے ہوتی ہوئی ایک دم آگے نکل جاتی ہے۔ آگے انجن ہے جس کے سامنے آکر بہت سے لوگ ایسے حالات میں خودکشی کر لیتے ہیں لیکن عورت بزدل نہیں ہے۔ عورتیں بزدل ہوتی بھی نہیں۔ عورتیں بزدل ہوتیں تو دنیا کی آبادی یکایک اتنی کیسے بڑھ جاتی؟

ایک چائے والا چلا رہا ہے۔ میں اس سے چائے لیتا ہوں۔ جو گرم تو ہے لیکن چائے نہیں ہے۔ میں جب بھی کسی ریلوے اسٹیشن پر چائے پیتا ہوں، یہی محسوس ہوتا ہے، گرم پانی پی رہا ہوں۔ گھر پر اس سے اچھی چائے بننے پر بھی میں اپنی بیوی کو ڈانٹ دیتا ہوں۔ جس سے وہ خفا ہو جاتی ہے اور کہتی ہے۔ کتنی بھی اچھی چائے بناؤں انہیں تو جچتی ہی نہیں۔ باہر کی جو منہ لگ گئی ہے۔ اور وہ اپنی قسمت کو کوسنے لگ جاتی ہے۔ جانے میں کس کے پلے پڑ گئی!

میں گھڑی دیکھتا ہوں۔ گاڑی چلنے میں لیٹ ہو رہی ہے۔ ڈبے میں بیٹھے لوگ باہر آ گئے ہیں۔ اور یہاں وہاں کھانے پینے کی چیزیں تلاش کر رہے ہیں۔ چاٹ والا جلدی جلدی چاٹ بنا رہا ہے۔ ایک عورت اپنی ساری شرم و حیا کھو کر جلدی جلدی چاٹ کھا رہی ہے۔ جیسے وہ ازل سے بھوکی ہے۔ عورتیں گھر میں بھی بھوکی رہتی ہیں۔ باہر بھی! پھر ان کی بھوک کبھی نہیں مٹتی۔!

جو لوگ پکوڑے کھا رہے ہیں، ان سے وہ عورت دور کھڑی ہے۔ شاید اب وہ تھک گئی ہے۔ یا اپنے آپ سے مایوس ہو گئی ہے جب ہی ایک اپ ٹو ڈیٹ آدمی اس کے پاس سے گزرتا ہے۔

"بابوجی!" وہ کہتی ہے

"جوان ہو کر بھیک مانگتی ہے۔ ہمارا ہندوستان سالا چوپٹ ہو گیا ہے۔ تمہارا آدمی کیا کرتا ہے؟

"آدمی ہوتا تو کاہے کو بابوجی!"

"اچھا۔ اچھا۔ میں سمجھ گیا۔ لیکن بھیک مانگنے سے کام نہیں چلے گا۔ کوئی کام کرو۔"

وہ اسے صرف مشورہ دے کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ پڑھا لکھا آدمی ہے نا!

عورت بیٹھ جاتی ہے۔ اس کا بچہ رونے لگتا ہے۔ شاید اسے بھوک لگی ہے۔ لوگوں کو کھاتے ہوئے دیکھ کر ایسے بھی بھوک بڑھ جاتی ہے۔ وہ میلے کپڑے کی ایک پوٹلی نکالتی ہے۔ اور اس میں سے ایک سوکھی ہوئی روٹی نکالتی

ڈاکٹر خورشید انور
[illegible]
[illegible]

ادب برائے ادب

"ادب برائے ادب" کا نظریہ جیسا کہ اس اصطلاح سے ہی ظاہر ہے ادب کو کسی بھی سماجی ذمے داری یا سماجی حقائق کی عکاسی سے دور کر دینے کا نام ہے۔ "ادب برائے ادب" کے نزدیک ادب خالص جمالیاتی تصور ہے اور اس کی پیداوار بھی جمالیاتی بنیادوں پر ہونی چاہیے۔ امریکی شاعر اور افسانہ نگار ایڈگر ایلن پو نے اپنے ادبی مضمون "پوئٹک پرنسپل" میں لکھا ہے:

"..... ہمیں فوراً احساس ہو جائے گا کہ ساری دنیا میں شاعری سے زیادہ پروقار کام نہ تو ہے اور نہ ہو سکتا ہے نظم صرف نظم ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ نظم تصنیف محض ہے نظم کی تصنیف کرنے کے لیے ہی ہونی چاہیے۔"

(انگریزی سے ترجمہ)

یعنی نظم کا کوئی مقصد نہیں ہونا چاہیے۔ شاعری یا کوئی ادبی فن پارہ صرف اس لیے تخلیق کیا جانا چاہیے کہ شاعری یا کسی دوسرے ادبی فن پارے کی تخلیق ایک عظیم فن ہے، پروقار کام ہے۔ ادب میں مقصد، ادب اور سماج کا رشتہ یا ادب میں سماجی ذمہ داری "ادب برائے ادب" کے نزدیک غیر ادبی باتیں ہیں۔ ادب سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ حسن و جمال، اظہار کی خوبصورتی، فنی کاریگری، اسلوب، طرز ادا وغیرہ ہی ادب کی روح ہیں اور یہی ادب کی تشکیل کرتے ہیں۔

"ادب برائے ادب" کے نقوش اٹھارھویں صدی کے نصف آخر میں ملنے شروع ہو جاتے ہیں اور انیسویں صدی کے نصف اول میں یہ نظریہ زور پکڑنے لگتا ہے۔ نظریے کی ابتدا کے متعلق جے۔ اے۔ کڈن لکھتے ہیں:

"اس نظریے کے مطابق فن عظمت نصیحت آمیز اور اخلاقی مقصدیت میں نہیں بلکہ ان فنی قدروں میں ہے۔ سب سے پہلے یہ نظریہ ۱۷۶۶ء میں لسنگ LESSING نے لاؤکون LAOKOON میں دیا اور ۱۸۳۵ء میں گاتیئے GAUTIER کے MADEMOISELLE DE MAUPIN کے مقدمے شائع ہونے کے بعد اس نظریے نے کہرام برپا کر دیا۔ پوری انیسویں صدی میں یہ نظریہ بہت سارے مصنفین کے لیے رہبری کا کام کرتا رہا۔"

(انگریزی سے ترجمہ)

اس خیال سے کافی ملتا جلتا خیال شارب ردولوی نے پیش کیا ہے:

"اس نظریے کی ابتدا سب سے پہلے لسنگ تحریروں سے ۱۷۶۶ء میں ہوئی۔ اس کے بعد فرانس میں ۱۸۳۵ء میں گاتیئے کے MELLE DE MAUPIN کے مقدمے سے اسے اس قدر مقبولیت ملی کہ سارے فرانس پر چھا گیا۔ انیسویں صدی میں مقبولیت دینے میں والٹر پیٹر اور آسکر وائلڈ کو بڑی اہمیت حاصل رہی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس تحریک کا بانی ہی والٹر پیٹر تھا۔"

ایڈگر ایلن پو، جس کا زمانہ ۱۸۰۹ء سے ۱۸۴۹ء تک کا ہے، شاعری کا مقصد حسن پر غور کرنا مانتا ہے۔ اس کے نزدیک محض حسن ہی شاعری کا دائرہ ہے اور مسرت شاعری کا مقصد ہے۔ شاعری میں یہ مسرت صرف حسن کے بیان سے ہی میسر ہوتی ہے۔ خوبصورتی سبب ہے اور مسرت نتیجہ یعنی ثمرہ۔

(انگریزی سے ترجمہ)

اس طرح حسن کو ہی ادب کی روح مان لینے کی روش چل پڑی، جو ادب کو سماج سے الگ کرنے کی ایک کوشش تھی۔ کیٹس کا ایسا شاعری سے نفرت تھی۔

جن میں کوئی مقصدیت پنہاں ہو۔ چنانچہ ادب میں حسن پرستی اور ہیئت نگاری کو اولیت دی جانے لگی۔

ادب برائے ادب کے حامیوں کے نزدیک حسن کا تصور بھی عام تصورات سے مختلف ہے۔ مثال کے طور پر گاٹئے جو ادب برائے ادب کا بانی مانا جاسکتا ہے۔ MADE MOISELLE DE MAUPIN کے مقدمہ میں لکھتا ہے:

"دنیا میں اس چیز سے زیادہ خوبصورت اور کچھ بھی نہیں جو چیز بے مصرف ہو۔ جو چیز بھی بامصرف ہے بدصورت ہے۔ چونکہ یہ انسان کی فطرت کی طرح مفلوج اور حقیر بھی ہوتی ہے۔ کسی گھر میں سب سے زیادہ بامصرف مقام اجابت گاہ ہوتا ہے ..... جسمانی خوبصورتی ہی اچھائی کا پیمانہ ہے۔ جو بدصورت ہے وہ چیز خراب ہے۔"

(فرینچ سے ترجمہ)

ادب برائے ادب کا نظریہ "اظہار" (EXPRESSION) پر خاصا زور دیتا ہے۔ اظہار کی کامیابی کو ادب کی عظمت کا پیمانہ مانا گیا۔ ادیب کی کامیابی اسی میں سمجھی گئی ہے کہ وہ خیالات کو کتنی خوبصورتی سے پیش کرسکتا ہے۔

کروچے جو کہ بیسویں صدی میں "ادب برائے ادب" کا علم بردار ہے، ادب کو ذات کا اظہار مانتا ہے۔ کروچے کے نزدیک حقیقت دو قسم کی ہوتی ہے ایک وہ جو ہمارے شعور سے آزاد علاحدہ طور پر موجود ہوتی ہے اور دوسری وہ جو ہمارے شعور میں ہوتی ہے، وہ کہتا ہے کہ جو بھی وجود میں ہے وہ ہمارے ذہن سے باہر نہیں ہوسکتا۔ حالاں کہ ہمارا ذہن اپنی سہولت کے اعتبار سے کسی شئے کو خارجی تصور کرلیتا ہے۔ کروچے کے فلسفے میں فن صرف وجدان INTUTION یا تاثرات IMPRESSIONS کا اظہار ہے۔ ہمارا ذہن مسلسل طور پر وجدان کی تخلیق کرتا رہتا ہے اور یہ وجدان فن کی شکل اس وقت اختیار کرلیتا ہے جب اس میں روح پھونک دی جاتی ہے۔

کروچے کے ان خیالات کی روشنی میں اگر ادب کو سمجھا جائے تو ادب صرف تین تصورات کا مرکز بن کر رہ جائے گا، وجدان، تاثرات اور اظہار یعنی پورا ادب صرف ایک فرد یا ذات کے وجدان، تاثرات اور ان کے "کامیاب اظہار" پر مبنی ہوگا۔ چنانچہ ادب کا مقصد ہوگا کہ وہ تاثرات کے کامیاب اظہار کے ذریعے لوگوں کو جمالیاتی انبساط سے ہم آہنگ کرے۔

ظاہر ہے ادب محض حسن و جمال کا کامیاب اظہار یا وجدان و تاثرات کا اظہار نہیں ہوسکتا۔ ادب محض ذات کا مظہر نہیں ہوسکتا۔ ادب پورے سماج کا آئینہ دار ہے، اس کا نقاد ہے، اس کی تخلیق اسی سماج میں ہوتی ہے اور اسی سماج میں رہنے والے انسان ادب تخلیق کرتے ہیں۔ چنانچہ ادب سماج سے، سماجی مسائل سے علاحدہ نہیں ہوسکتا۔ یہی نہیں، ادب کا مقصد صرف یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ سماج کو اسی شکل میں پیش کردے جیسا کہ وہ ہے۔ یہ سماج کو مستقبل کی روشنی بھی دکھاتا ہے۔ لیکن ادب برائے ادب میں صورت حال اس خیال کے بالکل برعکس ہے۔ اس کے نزدیک ادب کا نہ کوئی سماجی فریضہ ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی مقصد۔ اس کا کام ہوتا ہے کہ وہ حسن و جمال کی عکاسی کر کے ادب میں جمالیاتی عنصر پیدا کرے جس سے قاری لطف اٹھا سکے۔ یہ حالت سماج سے فرار کی حالت ہے۔

سیاسی بدنظمی اور سماجی بدحالی کی صورت میں تو ادیب کی نہ صرف سماجی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں بلکہ اس کے اندر ان حالات سے لڑنے کا حوصلہ بھی اور زیادہ ہونا چاہیے نہ یہ کہ وہ فرار اختیار کرنے لگے۔ اسے سماجی بدحالی اور سیاسی بدنظمی سے منہ موڑنے کے بجائے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنی چاہیئے۔ یہ نہیں کہ وہ سماج سے اپنا اور اپنی تخلیقات کا رشتہ ہی منقطع کرلے اور حسن و جمال میں غرق ہو کر مسرور ہوتا رہے۔ پلیخانوف کے مطابق:

"فن برائے فن کا نظریہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ فن کار اور عوام جن کو اس میں بہت دلچسپی ہوتی ہے، اپنے سماجی ماحول سے ہم آہنگ نہیں ہوتے۔"

مختصراً یہ کہ ادب برائے ادب کا نظریہ ادب اور سماج کے درمیان کوئی رشتہ نہیں مانتا۔ اس نظریے کے نزدیک ادب میں مقصدیت اور افادیت وغیرہ کے لئے کوئی جگہ نہیں ہونی چاہیئے اور نہ ہی اس قسم کا ادب تخلیق کیا جانا چاہیے جس کے پیچھے کوئی مقصد ہو۔ یہ نظریہ اتنا ہے کہ ادب کو "خالص ادب" ہونا چاہیئے اور حسن و جمال کا اظہار کمال و خوبی کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ ادب کا یہی کام ہے اور اس کی یہی حد ہے۔

□□

غزلیں

آئے نظر کچھ لوگ بھلے
سر پہ لیے گھر بار چلے
جھونپڑیوں کے درد بھی سمجھیں
ایوانوں میں جو ہیں پلے
شام اودھ اور صبح بنارس
منظر کتنے ہیں یہ بھلے
جمہوریت کی پھوٹی کونپل
یگ بیتی کے دیپ جلے
سن لے دعا مضطر کی یارب
اپنا بھارت پھولے پھلے

—— مضطر تاجپوری
تاج پور ڈیہمہ۔ غازی پور

چراغِ آرزو بجھتا نہیں ہے
ہوا کیسی ہو ڈرتا نہیں ہے
فضائے دل کا یہ عالم ہے تجھ بن
گلِ امید بھی کھلتا نہیں ہے
اسے دل کے نہاں خانوں میں ڈھونڈو
سکوں بازار میں ملتا نہیں ہے
ضمیر اپنا بنایا جس نے رہبر
وہ ہاتھوں کو کبھی ملتا نہیں ہے
ہوائے شہرِ دل کچھ یوں چلی ہے
دیا بھی دور تک جلتا نہیں ہے

—— ظفر مہدی
سلیم پور ہاؤس۔ قیصر باغ لکھنؤ

غم کے دریا میں اتر جاؤں گی
تجھ سے بچھڑوں گی تو مر جاؤں گی
آ بھی جا لے مرے آئینہ مزاج
وعدہ کرتی ہوں سنور جاؤں گی
اب سے پہلے کبھی سوچا بھی نہ تھا
اپنے سایہ سے بھی ڈر جاؤں گی
میں ترے خانۂ دل تک اے دوست
کر کے صدیوں کا سفر جاؤں گی
کوئی پہچان نہ پائے گا ہما
شہر سے اس کے گزر جاؤں گی

—— ہما پروین
۲۶۹۸۔ سی بلاک۔ راجہ جی پورم
لکھنؤ

چنگھٹ پر گیتوں کے ٹکڑے چنچل شوخ ہٹیلے ہیں
جیسے ہوں رنگیلن کے دوہے، انکے روپ سجیلے ہیں
تری نظر کی نگرانی ہے کیاری کیاری پھولوں پر
انگنائی میں پیڑوں کے پھل میٹھے اور رسیلے ہیں
ہیرے موتی سے کھیلے ہر کلیانوں میں روپ ترا
کھیتوں میں گیہوں کے دانے سب سونے سے پیلے ہیں
مہنگائی کے بادل برسے، کتنی بھیگی جیون کی
گھر کے دروازے ہیں بھیگے، ٹاٹ کے پردے گیلے ہیں
کون ملائے تجھ سے آنکھیں، کون گنوائے جان عزیز
جیسے پیالے ہوں امرت کے تیرے نین کٹیلے ہیں

—— عزیز الہ آبادی
۱۲۷۔ لوکر گنج پورا، الہ آباد

کون آئے گا مرے ناز اٹھانے والا
روٹھ جاؤں گا اگر میں تو منانے والا
جاگنا اب تو مقدر میں لکھا ہے میرے
تھپکیاں دے کے نہیں کوئی سلانے والا
خود وہ افسانے کا کردار بنا بیٹھا ہے
دیو پریوں کی کہانی کو سنانے والا
بھیڑ رشتوں کی ہے موجود مگر وہ ہی نہیں
غلطیاں میری زمانے سے چھپانے والا
اے عتیق اب نہ ملے گا تجھے ایسا کوئی
تیری تکلیف میں آنسو کو بہانے والا

—— عتیق الہ آبادی
۲۲/۲۹ احمد گنج۔ الہ آباد

خدا جانے انساں کو کیا ہو گیا ہے
جسے دیکھو وہ بے وفا ہو گیا ہے
لبوں پر ہیں نالے تو آنکھوں میں آنسو
زمانے کا شیوہ جفا ہو گیا ہے
بہت اترے اترے ہیں پھولوں کے چہرے
گلستاں سے مالی خفا ہو گیا ہے
یہ تاریک بے خواب اور لمبی راتیں
نہ جانے سویرا کہاں کھو گیا ہے
ثریا کچھ اس طرح یاد ان کی آئی
کہ زخم جگر پھر ہرا ہو گیا ہے

—— ثریا خان
ایم۔ ایس ۹۳۰، سیکٹر ڈی
علی گنج ایکسٹینشن لکھنؤ

ڈاکٹر نہال احمد صدیقی
۹۹۴، حسن منزل - الہ آباد

لکھنوی نثر کی امتیازی خصوصیات

انیسویں صدی میں لکھنوی نثر کی امتیازی خصوصیات کیا تھیں؟ لکھنؤ میں وہ کون سے اسباب و محرکات تھے اور ان کا ادبی پس منظر کیا تھا جنھوں نے ان خصوصیات کو ۱۸۵۷ء کے بعد بھی برقرار رکھا اور جس کا پرتو آج کے دور تک ملتا آرہا ہے۔

لیکن جو بات شاعری کے لیے درست سمجھی گئی تھی وہی بات نثر کے لیے بھی درست سمجھی جانی چاہیے۔ وہ سارے الفاظ، محاورات جن پر ناسخ نے خطِ تنسیخ کھینچ دیا اس طرح ترک کیے گئے کہ آج بھی نہ وہ بولے جاتے ہیں نہ ہی عام آدمی وہ معنی سمجھ سکتا ہے جن معنی میں وہ مستعمل تھے۔ اس پر حیرت ہوتی ہے کہ ایک شخص بہت سارے الفاظ متروک قرار دیدے اور پورا معاشرہ اسے مقبول کرے چنانچہ وہ نثر جو عام بول چال میں دیہی یا قصباتی اثرات کے کسی حد تک تابع تھی وہ شہری تمدن کے زیر اثر پروان چڑھنے لگی۔ شہری تمدن پر فارسیت کا غلبہ تھا۔ فارسی کی تیغ اصیل کو اپنا جوہر زبان سمجھا جاتا تھا اور دوسری طرف ارسطو کا یہ نظریہ کہ جو شے اپنا خارجی وجود رکھتی ہے بس وہی وجود حقیقی ہے۔ اس لیے جو خارج میں ہے وہی حقیقی ہے لکھنؤ والوں کو تو بڑا دلچسپ معنی خیز اور معرکہ خیز نظر آیا۔

یہ رخ شاعری میں بھی نظر آیا نثر میں بھی۔ اس پر زور دیا جانے لگا کہ نثر بھی شعر کی طرح تخلیقی ادب رہے۔ اس لیے اس کی سجاوٹ اور تزئین بھی ناگزیر ہے۔ چونکہ معاشرے میں چاروں طرف فراغت تھی اس لیے بقول نورالحسن ہاشمی "...... دہلی کا تمدن زندگی کا المیہ رخ پیش کرتا ہے تو لکھنؤ کا طربیہ۔ یہاں (لکھنؤ) کے سبھی جذبات، حرکات سکنات سب میں تکلف رچ گیا تھا......"[۱]

لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی ہو یا لکھنؤ ہر جگہ ایک ہی ماحول اور ایک ہی فضا تھی۔ ایسا نہیں ہے کہ لکھنؤ کی نثر میں درد اور کسک کا پہلو نہ ہو جیسے دہلی کا لازم سمجھا جاتا ہے بلکہ دہلی کی نثر سرسید تحریک کے زیر اثر حالی اور نذیر احمد کے ہاتھوں رجائی پہلو کی آئینہ دار نظر آتی ہے۔ اس کے برعکس لکھنؤ میں داستانیں اور ناول اور اگر غور کیا جائے تو سب ماضی کے مرثیہ خواں ہیں۔ شرر کی تاریخیت اور سرشار کی لکھنویت داستان گویوں کی خیالی دنیا ان سب میں ایک پہلو قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ ماضی کی رنگین یادوں سے متعلق ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ شدید کھجلی کے عالم میں کوئی کھجلا رہا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس وقت بڑا مزہ آتا ہے لیکن بعد میں یہی لذت سوزش اور ٹیس میں بدل جاتی ہے۔ بالکل یہی کیفیت ان داستانوں یا شرر کے ناولوں کی ہے۔ یہ ماضی کی یاد کی کھجلی ہے یہ جذبہ عمل پر نہیں ابھارتیں درد و کسک چھوڑ جاتی ہیں۔ اس طرح ۱۸۰۷ء کے بعد لکھنؤ میں اردو نثر کا پہلا وصف جو متوجہ کرتا ہے وہ دراصل ایسا تخلیقی اظہار ہے جس میں طرب اور کسک کا امتزاج نظر آتا ہے۔

دبستان لکھنؤ کے سلسلے میں شعر ہو یا نثر، تصنع، آرائش تزئین اور سجاوٹ کا ذکر کیا جاتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ پہلو تھا اور ۱۸۵۷ء کے بعد بھی رہا لیکن ایسا نہیں ہے تو یہ پہلو دہلی یا دوسری جگہ نہ رہا ہو۔ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ لکھنؤ کا امتیازی وصف کیا ہے۔ منطقی اعتبار سے قضیہ یوں بنے گا کہ اگر رنگینی عبارت آرائی اور معنی آفرینی لکھنؤ کا امتیازی وصف ہے تو یہ دعویٰ غلط ہے کہ یہ دوسری جگہ تھا اگر دوسری جگہ تھا تو یہ لکھنؤ کا امتیازی وصف نہیں ہے۔ لیکن ادب منطق نہیں ہے اور اسی لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ دونوں باتیں اپنی جگہ درست ہیں نثر میں آرائش کا پہلو لکھنؤ کی ہی دین تھی البتہ نثر میں قافیہ پیمائی اور ادق عبارت لکھنے کا رجحان پہلے سے موجود تھا لکھنؤ والوں نے اسے مرصّع اور پرکار بنا دیا۔ اور اس روایت کی اس حد تک توسیع کی کہ وہ لکھنؤ کا امتیازی وصف ہو گیا۔ لکھنؤ کا ایک اور امتیازی پہلو یہ تھا کہ اہل لکھنؤ نے عصری حسیت کے تصور کو انیسویں صدی میں ہی محسوس کر لیا تھا چنانچہ ان کی تحریروں میں ان کا دور بولتا ہے۔ ان کی معاشرت اور ان کی تہذیب نمایاں

ہے۔ لکھنؤ کا مضمون صاف دلی اس کی شگفتگی [illegible]

سے چند مثالوں سے صرف نظر کرتے ہوئے یہ عرض کرنا ہے کہ اہل لکھنؤ کے پیش نظر نثر اور نظم میں صناعی کے اعتبار سے زیادہ فرق نہ تھا۔ صناعی ان کے یہاں ایسی چیز کی حیثیت رکھتی تھی جس کا اظہار زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتا تھا۔

ڈاکٹر صفدر حسین نے اپنی تصنیف "لکھنؤ کی تہذیبی میراث" میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔ کہیں کہیں ان سے اختلاف بھی کیا جاسکتا ہے لیکن اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ لکھنؤ کا ایک مخصوص تخلیقی مزاج تھا۔ اس تخلیقی مزاج میں شائستگی اور نفاست، اپج اور ذہانت تھی۔

یہ زمانہ ۱۸۵۷ء کا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد بھی تہذیب کا یہ رنگ و آہنگ تقریباً ۶۰-۷۰ برس تک تو یقیناً قائم رہا۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں لکھنؤ کی کیا کیفیت تھی، صفدر حسین لکھتے ہیں :-

"اب آیئے اس بات پر بھی غور کر لیں کہ لکھنؤ کی شاہی حیثیت ختم ہوجانے کے بعد بھی اس تہذیب کا کیا حشر ہوا جو دربار سے چوک تک یکساں پسندیدہ اور مقبول تھی۔ جس کی تخلیق میں امیر و غریب، عالم اور جاہل، ہندو اور مسلمان، شاعر اور صوفی سپاہی اور تاجر، مرد اور عورت ہر شخص کا بقدر ہمت و حیثیت حصہ تھا۔ ہر چند کہ بادشاہ معزول ہو کر شہر بدر ہو گئے تھے دربار ٹوٹ گیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں لکھنؤ کی اینٹ سے اینٹ بج گئی تھی انگریزوں کا تسلط اور اقتدار بڑھ گیا تھا۔ معاشی حالات دگرگوں ہو گئے تھے۔ لیکن وہ تہذیب زندہ و تابندہ تھی جس میں غلط العام کو فصیح سمجھا جاتا تھا۔ مراد یہ کہ تہذیب کے اختلاطی اور امتزاجی عناصر کا باہمی جذبہ ایسا قوی تھا کہ اس میں جسم سے روح جدا نہیں ہو رہی تھی۔ چنانچہ لکھنؤ کی تباہی کے تقریباً نصف صدی بعد بھی ان تہذیبی عناصر کی مقبولیت کا یہ حال تھا کہ لکھنؤ سے تیرہ میل کے فاصلے پر ملیح آباد میں سکونت پذیر ایک آفریدی گھرانے کی اندرونی فضا اس انداز پر قائم تھی۔"

لکھنؤ کا ایک دوسرا امتیازی وصف یہ بھی تھا کہ یہاں پہلی بار زبان کے اصلاحی رخ پر توجہ دی گئی۔ اور نثر کے [illegible] لیکن تھے وہ سب اہل لکھنؤ کے یہاں نظر آتے ہیں چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہر علم سے متعلق کتابیں ملتی ہیں۔ عام طور پر یہ خیال ہے کہ لکھنؤ میں طوطا مینا، چہار درویش اور مرغ بازی کے علاوہ تباہی کیا۔ لیکن ایسے لوگ خاندان اجتہاد اور علمائے فرنگی محل کو فراموش کر دیتے ہیں۔ نثر عاری کی مثال وہ کتابیں ہیں جو مذہبی مسائل پر لکھی گئی ہیں۔ بقیہ اسلوب کا ہر رخ داستانوں اور ناولوں میں مل جاتا ہے۔ اگر لکھنؤ کی زبان صرف مرصع کاری کا نمونہ ہوتی تو لکھنؤ میں اتنا متنوع علمی ذخیرہ اکٹھا نہیں ہو سکتا تھا۔ بعض مذہبی کتب ایسی ہیں جو ابھی تک لکھی جا رہی ہیں اور جن کی ایک ایک جلد ہزار ہا صفحی کتابوں کا نچوڑ ہے۔ مثلاً اہل تشیع کے ایک عالم دین مولانا حامد حسین (جو مولانا ناصر حسین مرحوم کے والد تھے) ان کی تصنیف "عبقات الانوار" آج تک بھی جاری ہے۔ جس کا سلسلہ انیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں شروع ہوا تھا۔

ہر موضوع پر تصانیف اس کا ثبوت ہیں کہ لکھنوی دبستان نے اتنی وسعت اور گیرائی پیدا کر لی تھی کہ اس کے اسلوب میں ہر طرح کے مضامین کی گنجائش نکل سکتی تھی۔

ایک اور پہلو اہمیت رکھتا ہے اور وہ یہ کہ نثر میں شعریت اور نثر کے ذریعے شاعری کے حسن کو ابھارنے کا سلیقہ لکھنؤ ہی کی دین ہے چنانچہ ایک طرف تو تذکروں میں کاشف الحقائق جیسی تنقیدوں میں شاعری کا چرچا ہا دوسری طرف داستانوں اور ناولوں میں بالخصوص "فسانۂ آزاد" اور "امراؤ جان ادا" کی تحریر ایک رچے ہوئے شعری مزاج کی نشاندہی کرتی ہیں جس میں اس دور کے تمام شعری اصناف کا کسی نہ کسی پہلو سے تذکرہ مل جاتا ہے۔ اور تجزیہ بھی۔ البتہ نثر و نظم میں ایک واضح فرق کی نشاندہی ہو جاتی ہے۔ نظم پر مرثیت کا اثر نمایاں ہے یا پھر خارجی لوازم کا۔ لیکن نثر میں حیرت انگیز طور پر رجائیت غالب ہے اور یہ رجائیت اپنے ساتھ کئی رخ اور گوشے لاتی ہے۔ جن میں محاسبے بھی ہیں اور مہم سر کرنا بھی ہے اور ان آخری دو پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں لکھنؤ میں جو فن سپہ گری سے دلچسپی تھی اور جو سپاہیانہ ذوق تھا وہ بھی مل جاتا ہے۔

نثر ہو یا نظم اظہار کے مختلف سانچے اور طریقے ہوتے ہیں جنہیں تکنیک کہنا چاہئے۔ کبھی کوئی بات تمثیل کے پیرائے میں بیان کی جاتی ہے کبھی

[illegible] کے اور سے اظہار [illegible]

[illegible] مل جاتے ہیں اور کم از کم فرشتوں جہاں تک ظرافت اور مزاح کا تعلق ہے اسے صرف لکھنؤ کی دین سمجھنا چاہیے۔ یہ درست ہے کہ دلی کے پاس میر تقی میر اور بیگم جیسا کردار ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا کہ لکھنؤ میں ظرافت اور مزاح کا وہ پہلو سامنے آیا جس کا تعلق مزاح یا SITUATION سے ہوتا ہے اور لکھنؤ کی کلاہ افتخار میں یہ موتی بھی ٹانکا جا سکتا ہے کہ داستانوں میں عمرو عیار کی عیاریاں اور ناولوں میں خوجی جیسے کردار مل جاتے ہیں پھر امراؤ جان ادا کے تفصیلی جائزے سے وہ تمام گوشے مل جاتے ہیں جہاں ظرافت کی ہر قسم ہے۔ ادبی، سنجیدہ و علمی فلسفیانہ ظرافت وغیرہ اسی طرح تمثیل کا پہلو داستانوں میں جھلکتا ہے اول تو ناموں کے انتخاب میں تو ہر نام اپنی صفت کے ساتھ ابھرتا ہے۔ جیسے بہار یا باغباں ــــ یا چرند پرند وغیرہ۔ لیکن مستقل تصنیف کی حیثیت سے بھی رجب علی بیگ سرور کی "گلزار سرور" کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو ملا وجہی کی سدالق العشاق کا ترجمہ ہے۔ انشائے لطیف کے نمونے شرر کی تحریروں میں ملتے ہیں۔ اور پھر ان سب کے ساتھ ڈرامائیت تقریباً علمی اور مذہبی کتابوں کے علاوہ ہر صنف میں نظر آتی ہے۔

لکھنؤ کا نثری دبستان بیسویں صدی کے آغاز سے دھیرے دھیرے اپنی خصوصیات کھوتا گیا۔ ابتدائی دو دہوں میں داستانیں بھی لکھی گئیں اور دولہا صاحب اور پیارے صاحب رشید جیسے مرثیہ نگاروں کا بھی دور رہا۔ لیکن زرعی جاگیر داری سماج کی جگہ دھیرے دھیرے مہاجن نظام اور صنعتی سرمایہ دارانہ نظام لے رہا تھا اس لیے بافراغت زندگی کے تہذیبی نقش و نگار آہستہ آہستہ مدہم ہوتے گئے۔ جو علوم کچھ برسوں پہلے باعث افتخار سمجھے جاتے تھے انہیں فرسودہ سمجھا جانے لگا۔ ایک نئی زبان کا دور دورہ ہوا تھا جو سات سمندر پار سے آئی تھی بلکہ جس کے بولنے والے حکمران طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور پھر حاکم کی تو جوتی بھی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے اب علم و فضل کے اظہار کا وسیلہ انگریزی زبان قرار پائی۔ معاشرتی آداب بدلے ہندوستانیوں کا نیا معیار سامنے آیا میلوں کا مزاج بدلا۔ باغوں کے پھول بدلے اور لوگوں نے لباس تبدیل کیا نتیجہ میں ادبی اقدار پر بھی اثر پڑا۔ اور وہ دبستان جس کا عروج شباب انیسویں صدی کی دوسری دہائی سے شروع ہوا تھا۔ سو سال کے عرصے میں بوڑھا ہو کر تاریخ کے صفحات میں گم ہو گیا۔

انداب وہ ہماری تاریخ کا ایک اہم ترین جز ہے۔ اس دبستان نے ہمیں خوش ذوقی سکھائی، جینے کا ڈھنگ سکھایا۔ اس کی داستانوں نے ہمارے تخیل کو مہمیز کیا اس کی وجہ سے افسانے اور ناول جیسی اصناف کو استحکام ملا۔

□□

حواشی : ــــــ

۱؎ دلی کا دبستان شاعری صفحہ [illegible]

۲؎ لکھنؤ کی تہذیبی میراث صفحہ [illegible]

پلیٹ فارم

۔۔۔۔۔۔۔۔۔ صفحہ ۳ کا بقیہ

ہے وہ آدھی روٹی بچے کو دیتی ہے۔ آدھی خود کھانے لگتی ہے ــ

گارڈ ہری جھنڈی دکھا رہا ہے۔ پانی کے نلکے کے پاس بھیڑ لگ گئی ہے لوگ جلدی جلدی پانی پی کر اپنے ڈبوں کی طرف بھاگ رہے ہیں ــــ وہ عورت کھڑی ہو گئی ہے ــ شاید اب وہ یہاں سے جانا چاہتی ہے میں جلدی سے اس کے پاس جاتا ہوں۔ اور دس روپے کا نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہتا ہوں ــــ "یہ لو!"

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک انجانا خوف کانپ رہا ہے۔ لیکن وہ پیچھے ہٹنے لگتی ہے۔

"رکھ لو نا!"

"نہیں۔ مجھے یہ نہیں چاہیئے۔"

"کیوں؟"

"یہ بچہ دس روپے ہی کے بدلے ملا ہے جسے میں پال نہیں سکتی۔"

میں اسے اطمینان دلاتے ہوئے کہتا ہوں۔

"میں ایک مسافر ہوں!"

پھر بھی شام کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں اسے یقین نہیں آ رہا ہے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی ہے ــ

گاڑی کے چلنے کی سیٹی ہو چکی ہے۔ اور میں اسے جلدی سے نوٹ تھما کر اپنے ڈبے کی طرف بڑھ جاتا ہوں۔ اور سوچ رہا ہوں۔ کب اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاؤں ــــ!!

نقد و تبصرہ

تبصرے کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب : "ڈاکٹر مشیر الحق : شخصیت اور فکری بصیرت"

مرتب : ڈاکٹر شاہ عبدالسلام قیمت : تین سو روپے

ملنے کا پتہ : مشیر الحق میموریل ایجوکیشنل کمیٹی

نئی دہلی

ڈاکٹر مشیر الحق مرحوم کی زندگی ایک جہد مسلسل کی داستان تھی۔ دو سال کی عمر میں وہ سایۂ پدری سے محروم ہوگئے تھے۔ لیکن حصول علم کی لگن نے انھیں دنیاوی پریشانیوں کا زیادہ اثر قبول نہیں کرنے دیا اور وہ ثابت قدمی کے ساتھ آگے بڑھتے اور راہ میں پیش آنے والے سخت مرحلوں کو یکے بعد دیگرے طے کرتے گئے۔ زندگی کے اس سفر میں انھوں نے مشہانی کی دوکانداری سے لے کر کشمیر یونیورسٹی کی وائس چانسلری تک کی۔ ان کی تحریروں کا تنوع حیرت انگیز ہے جس کا صحیح اندازہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک ان تحریروں یا کم از کم ان کی فہرست پر ایک نظر نہ ڈالی جائے۔ شاعری، افسانوں، ڈراموں سے لے کر بہت سنجیدہ عالمانہ اور مفکرانہ تحریروں تک کا ایک ذخیرہ ان کی طباعی اور فکری بصیرت کا شاہد ہے۔ عصر جدید میں اسلام سے متعلق مسائل ان کو غور و فکر کی زیادہ دعوت دیتے تھے اور انھوں نے ان نازک اور متنازعہ فیہ موضوعات پر بہت کچھ لکھا۔ اس سلسلے میں ان کے خیالات سے اختلاف بھی کیا گیا لیکن ان کے خلوص اور دینی دردمندی کو بالعموم تسلیم کیا جاتا تھا۔ ان کی موت جس المناک انداز میں ہوئی اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ ہماری علمی دنیا کا بڑا حادثہ تھا جس کا اثر اب تک محسوس کیا جاتا ہے۔

اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ ڈاکٹر مشیر الحق مرحوم کی حیات، شخصیت اور علمی و ادبی اکتسابات سے دنیا کو واقف کرایا جائے۔ اس ضرورت کو سب سے زیادہ ڈاکٹر شاہ عبدالسلام نے محسوس کیا۔ شاہ عبدالسلام مشیر الحق مرحوم کے بھانجے اور داماد ہیں اور خود بھی بہت سنجیدہ مزاج کے محقق اور نقاد ہیں۔ انھوں نے بڑی محنت اور تگ و دو سے ڈاکٹر مشیر الحق کے بارے میں مضامین وغیرہ کا یہ مجموعہ مرتب کیا ہے جس کو ہر لحاظ سے ان مرحوم کے شایان شان کہا جا سکتا ہے۔

مجموعے کے اہم ترین مندرجات میں خود ڈاکٹر مشیر الحق کی زبانی ان کی داستان حیات ہے جو انھوں نے پاکستان میں ریکارڈ کرائی تھی۔ تیس صفحوں پر مشتمل یہ گفتگو نہ صرف مشیر الحق مرحوم کے بارے میں معلومات کا مستند ماخذ ہے بلکہ ان کی سلجھی ہوئی شخصیت کا بھی ایک روشن نقش پیش کرتی ہے۔ اس کے علاوہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ضیاء الحسن فاروقی، عبداللہ عباس ندوی، آل احمد سرور، نثار احمد فاروقی، مجیب اللہ ندوی، ضیاء الدین اصلاحی، ریاض الرحمٰن شروانی، ابوالکلام قاسمی، شمیم حنفی، اجتبا ندوی، شعیب اعظمی، کبیر احمد جائسی، شمس الحق عثمانی صاحبان اور دوسرے اہل قلم کے مضامین کتاب کی ہمہ گیری میں معاون ہیں۔

حصۂ نظم میں ولی الحق انصاری، نثار احمد فاروقی، عبدالرؤف خاں کے کہے ہوئے قطعات تاریخ وفات اور شیث محمد اسمٰعیل اعظمی اور ذیشان عباسی کے پیش کیے ہوئے خراج عقیدت ہیں۔ مجموعے میں متعدد تصویریں بھی ہیں جن کے ساتھ اگر وضاحتی تحریریں بھی ہوتیں تو بہتر تھا۔

اس مجموعے کے لئے مضامین کی فراہمی اور ترتیب میں ڈاکٹر شاہ عبدالسلام کی محنت اور سلیقہ داد کے قابل ہے۔ انھیں جو مضامین موصول ہوئے تھے وہ ایک مجموعے کی گنجائش سے زیادہ تھے اور وہ بقیہ مضامین کا ایک اور مجموعہ تیار کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یقین ہے یہ دوسرا مجموعہ مشیر الحق مرحوم کی علمی شخصیت کے ہر گوشے کو منور کرے گا۔

ــــــــــ ابوفہیم عبدالمعبود

نام کتاب: اتر پردیش میں اُردو افسانہ
(افسانہ نگاروں کی نظر میں)
مرتب: ڈاکٹر عبداللہ چودھری (گورکھپور)
قیمت: چالیس روپئے
ملنے کا پتہ: نصرت پبلشرز۔ امین آباد۔ لکھنؤ

زیرِ نظر کتاب "اتر پردیش میں اُردو افسانہ" اردو کے ان پرانے اور نئے افسانہ نگاروں کے تعارف اور تبصرے پر مشتمل ہے جن کا تعلق اتر پردیش سے ہے ان میں رام لعل اور قاضی عبدالستار سے لے کر تسکین زیدی تک ۴۲ افسانہ نگار شامل ہیں اور ہر ایک افسانہ نگار کی خصوصیت اور اس کے مشہور افسانوں پر مرتب نے مختصراً اظہار خیال کر کے قاری کے سامنے اس کی ایک عمومی تصویر پیش کر دی ہے۔ یہ کتاب اس لحاظ سے مفید ہے کہ جن افسانہ نگاروں کے افسانے ہم رسائل و جرائد میں اکثر پڑھتے رہتے ہیں ان کی افسانہ نگاری کا مجموعی کارنامہ بہ یک نظر سامنے آجاتا ہے۔

رام لعل، قاضی عبدالستار، اقبال مجید، نیر مسعود اور عابد سہیل کی افسانہ نگاری کے بارے میں بھی مرتب نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے جس سے بہر حال قاری کا متفق ہونا ضروری نہیں معلوم ہوتا۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں افسانہ نگاروں کے ناموں کی ترتیب بھی صحیح نہیں ہے۔ یا تو یہ ترتیب افسانہ نگار کے مرتبہ و مقام کو مدِ نظر رکھ کر ہونی چاہیے تھی یا حروفِ تہجی کے اعتبار سے، مگر ان دونوں میں سے کسی کو بھی ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ ان ۴۲ افسانہ نگاروں کے بعد جو افسانہ نگار بچ گئے ہیں ان کا مختصر تذکرہ "دیگر افسانہ نگار" کے تحت کیا گیا ہے جو پانچ صفحوں کو محیط ہے اور تقریباً پچاس چھوٹے بڑے افسانہ نگاروں کے ناموں پر مشتمل ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ اتر پردیش کے افسانہ نگاروں میں حیات اللہ انصاری اور قرۃ العین حیدر کے نام شامل ہی نہیں ہیں جبکہ رتن سنگھ کا نام شامل ہے جو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے اور اب مستقلاً جبلپور (مدھیہ پردیش) میں رہتے ہیں۔ بہر حال عبداللہ چودھری کی یہ ایک اچھی کوشش ہے جس سے قاری کو یو۔ پی کے اُردو افسانہ نگاروں کے بارے میں خاصی معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔

کتاب آفسیٹ پر صاف ستھری چھپی ہے، طباعت کی غلطیاں بھی کم ہیں اور قیمت بھی مناسب ہے۔

——— نامی انصاری

نام کتاب: "دلوں کی خیر"
مصنف: اکرام اللہ   قیمت: سّو روپے
ملنے کا پتہ: اودھ بُک سنٹر، ۱۳۰/۹۶۔ گنیش گنج لکھنؤ

جناب اکرام اللہ کی تصنیف "دلوں کی خیر" نہایت معلوماتی اور کارآمد ہے۔ اُردو میں اس طرح کے موضوعات پر بہت کم تحریریں نظر آتی ہیں۔ مصنف نے یورپ اور ایشیا کے ممالک کے موجودہ جنگی اخراجات اور ہتھیاروں کی ذخیرہ اندوزی کے ساتھ ساتھ تیسری دنیا کے ممالک کی اسلحہ اندوزی اور دفاعی اخراجات کے متعلق جو شواہد اور اعداد و شمار تحریر کیے ہیں ان کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ ممالک کن حالات سے دوچار ہیں۔ جیسا کہ ہم سب کو بخوبی معلوم ہے کہ ہمارا ملک اور اس کے اردگرد کے دیگر ممالک میں عام آدمی غریبی کی سطح سے بھی نیچے سانس لے رہا ہے۔ بڑی طاقتوں کی سیاسی چالبازیاں ہمیں کس طرح ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کیے ہوئے ہیں۔ ان ہتھیاروں کی فروخت کے پیچھے وہ کیا کیا سودے بازیاں کرتے ہیں اور کس درجہ ان غریب ممالک کا استحصال کرتے ہیں یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔

ان فوجی مصارف کی وجہ سے ساری دُنیا عالمی افلاس کا شکار ہوتی چلی جا رہی ہے اور ہتھیار خریدنے والے ممالک یہ سمجھتے ہیں کہ وہ طاقت ور ہو رہے ہیں جب کہ درحقیقت وہ ایک نشیلی دوا کے عادی بنائے جا رہے ہیں۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ ایک طرف اس خطرناک رجحان کے خلاف بیان دیئے جاتے ہیں، تخفیفِ اسلحہ کی بات کی جاتی ہے اور دوسری طرف ہر روز نئے نئے ہتھیاروں کے تجربے ہو رہے ہیں۔

جناب اکرام اللہ صاحب نے ساری صورتِ حال کا جائزہ لے کر اس کے منفی اور مثبت دونوں پہلوؤں کو قارئین کے سامنے رکھ دیا ہے۔

[illegible] ... کتابت ... [illegible]
[illegible]

امید ہے کہ اس کتاب کو قارئین پسند کریں گے۔

———— وقار ناصری

نام کتاب : "مسیحا کی موت" (افسانوی مجموعہ)
افسانہ نگار : قاضی انیس الحق
(ڈائرکٹر، دوردرشن کیندر، بنگلور)
ملنے کا پتہ : ترسیل پبلی کیشنز، اردو لائبریری سنٹر
سٹی مارکیٹ، بنگلور ۲

"مسیحا کی موت" کے مصنف قاضی انیس الحق نئی کہانی کے کارواں کے قد آور مسافر ہیں۔ آپ نے ترقی پسند فن کاروں کے اثرات قبول کیے ہیں اور سیدھے سادے انداز میں زندگی اور اس کے مسائل کا دل چسپ اور انوکھا بیان کیا ہے۔

انیس کا فن علامت، استعارہ اور تمثیل سے پہل نہیں بلکہ ماورائی کائنات اور اقداری بحران کی کہانی سے عبارت ہے۔ کم سے کم الفاظ [illegible] چھوٹے چھوٹے جملوں کے استعمال سے افسانے کے محدود کینوس میں لامحدود باتیں کہنے کا فن آپ کو خوب آتا ہے۔ بیانیہ اور مکالمے کے بہترین امتزاج سے پیدا ہونے والا افسانے کا سڈول پن آپ کا طرۂ امتیاز ہے۔ محسوسات، تجربے، ذوقِ تجسس اور عصری افق پر تیز نگاہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ مصنف غریبوں کے ساتھی، غموں اور صعوبتوں بلکہ عیش و کرب سے گزرتے ہوئے لوگوں کے ساتھی ہیں۔

انیس کا فن موضوعی اعتبار سے ترقی پسند اور جدید مگر اسلوب کے اعتبار سے روایتی ہے۔ گو آپ کا اندازِ بیان روایتی اور بیانیہ ہے۔ لیکن واقعات کے تنوع اور ان میں ایک خاص ربط و تنظیم نے بیانیہ انداز کو کسی قدر زائل کر دیا ہے۔ واقعات کے نہاں خانوں میں پنہاں احساسات و کیفیات کی شدت، افسانوں کو پڑھنے کے لیے آمادہ کرتی ہے۔

مجموعی طور پر "مسیحا کی موت" کے افسانوں کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ سنجیدہ اور پُرخلوص مطالعے کی کوشش کا تقاضہ کرتے ہیں۔

اور ... [illegible] ... کتاب [illegible]
———— [illegible]

نام کتاب : "فارسی ادب کی شخصیات"
مصنف : ڈاکٹر محمد تقی علی عابدی
قیمت : پچاس روپے
ملنے کا پتہ : حیدری منزل، فریدی کالونی۔ نرملی گنج لکھنؤ

"فارسی ادب کی شخصیات" ڈاکٹر محمد تقی علی عابدی کے چھ مضامین کا مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر عابدی لکھنؤ کے ایسے نوجوان ادیب، محقق و ناقد ہیں جنھوں نے فارسی ادب کے متعدد موضوعات پر مقالات و مضامین تحریر کیے ہیں۔ جدید فارسی شاعری پر ان کی کتاب "پروین اعتصامی، حالات و شاعری" کے عنوان سے منظر عام پر آ چکی ہے۔

پہلا مضمون رسالہ نخل بندیہ کے مصنف "حکیم امان اللہ خاں امانی حسینی" کے بارے میں ہے اس میں مقالہ نگار نے نہایت عرق ریزی اور جاں فشانی سے قدیم ماخذ کے حوالے سے ان کی حیات و خدمات کا ایک تفصیلی تاریخی خاکہ مرتب کیا ہے۔ دوسرا مضمون "حزیں اور ان کے تذکرے" کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔ اس میں حزیں کے بیشتر آثار کو حروف تہجی کے اعتبار سے مع ماخذ کے درج کیا گیا ہے۔

تیسرا مضمون بگرام ضلع ہردوئی کی مشہور و معروف ترین شخصیت "مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کی تاریخ گوئی" سے متعلق ہے۔ میر آزاد کی تاریخ گوئی کے سلسلے میں جن افراد سے متعلق تاریخوں کو معرض بحث میں لایا گیا ہے ان کے بارے میں بھی اطلاعات فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

چوتھا مضمون "احمد شاملو بامداد" کے تعارف پر مشتمل ہے جس میں احمد شاملو کی حیات و شاعری پر اختصار سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ پانچواں مضمون دُنیا کی استکباری طاقتوں سے نبرد آزما رہنے والی عظیم شخصیت آیۃ اللہ خمینی کی عرفانی شاعری پر ہے جس میں ان کی شخصیت کے مقدس پوشیدہ پہلو (شاعری) کو منظر عام پر لانے اور ان کے [illegible]

کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے

ڈاکٹر عصمت پر ولی الحق انصاری صاحب سابق صدر شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ کی تاریخ گوئی پر مبنی ہے جس میں تقریباً پانچ درجن افراد سے متعلق قطعات تاریخ کو معرض بحث میں لاکر منطقی و استدلالی طرز پر ولی الحق انصاری کی تاریخ گوئی کا تنقیدی تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مختصر یہ کہ فارسی ادب کی شخصیات مصنفہ کے دقیق مطالعہ و ہمہ جہتی کا اعلانیہ ہے۔ امید ہے کہ ادبی حلقوں میں اس کی زبردست پذیرائی ہوگی۔

ڈاکٹر ای ۔اے ۔حیدری

نام کتاب: "جونک" (افسانوی مجموعہ)
مصنف: پروانہ ردولوی قیمت: ۳۵/ روپئے
ملنے کا پتہ: ۱۶۵ حوض رانی ۔ نئی دہلی

جناب میثم تمار پروانہ ردولوی کہنہ مشق اور پختہ کار صحافی ہیں۔ ۴۴ برس سے ان کا قلم متنوع مضامین لکھتا رہا ہے۔ بہت ساری جگہوں پر لوگوں کو یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ شعلہ صفت حرفوں اور انگارہ سے جیسے الفاظ کے پس منظر میں پروانہ صاحب ہیں۔ یہ ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں سات افسانے ہیں تین مضامین ہیں۔ عظیم اختر اور جعفر عباس نے ان کی کہانی کے فن پر تجزیاتی انداز میں بڑی خوبصورتی سے روشنی ڈالی ہے۔

پروانہ صاحب کی کہانیاں نہ روایت سے انحراف کرتی ہیں نہ بغاوت پریم چند سے لے کر بیدی تک قصہ گوئی کی جو شکل بنی ہے پروانہ صاحب اسی کے پاسبان ہیں۔ ہر قصہ میں دل چسپ آغاز، تحیر و تجسس، موڑ اور چونکا دینے والا انجام ہے۔

یوں تو "بندلفافہ" کا رومانی پس منظر "نام کا فرق" میں سیاست مذہب اور سماج پر محبت کی فتح۔ "جونک" میں عورت کا استحصال وغیرہ نظر آتا ہے۔ نفسیاتی اعتبار سے "پتھر اور" بڑی لذیذ کہانی ہے۔ لیکن "آسیب" اور "واپسی" بڑی خوبصورت اور تراشیدہ کہانیاں ہیں جو ذہن پر پائیدار نقش چھوڑ جاتی ہیں۔ ان کی سب سے طویل کہانی "خون کا رشتہ" ہے۔ جعفر عباس نے اس کی توصیف میں لکھا ہے کہ اس میں ایڈونچر، خوف اور لطف ہے۔ کچھ دن پہلے ٹی۔وی پر "جنون" نام کی ایک تصویر دکھائی گئی تھی جس میں ایک آدمی شیر بن جاتا ہے اور پھاڑ کھاتا ہے۔ پروانہ صاحب کے یہاں وہ شیر انسانی شکل میں ہے۔ جس طرح انسانی خون پی کر "ڈراکولا" میں لوگ خبیث بن جاتے ہیں اسی طرح ڈیزی کی وجہ سے جولیا اور اس کا شوہر دونوں خبیث ہو جاتے ہیں۔ یہ سب اپنی جگہ پر لیکن اس کا عنوان قاری کے لیے سوالیہ نشان بن جاتا ہے۔ اس کہانی کی آخری تین سطریں کہانی کے تاثر کو بالکل ختم کر دیتی ہیں۔

——— افشاں کاظمی

سوانحی کوائف ——— صفحہ ۲۴ کا بقیہ

کا آنریری جوائنٹ سکریٹری ہوں۔ ایجوکیشن بورڈ الٰہ آباد دیوپی کی اکزیکٹیو کمیٹی کا ممبر ہوں، مائنارٹیز انسٹی ٹیوشن ایسوسی ایشن یوپی کا زونل سکریٹری ہوں اور نواب عظمت علی خاں وقف بورڈ مظفر نگر کا ٹرسٹی بھی ہوں۔ اس طرح بہت سے سماجی اور تعلیمی کاموں میں مصروف رہنے کی کوشش کرتا ہوں۔

۱۹۴۷ء میں میری شادی بلقیس بیگم بنت نذیر احمد صدیقی صاحب مرحوم سے ہوئی تھی۔ بفضل خدا تین بیٹیاں ہیں جن کی شادی ۱۹۷۲ء، ۱۹۷۵ء اور ۱۹۷۹ء میں ہو گئی تھی، اور ماشاء اللہ تینوں اپنے اپنے خاندانوں کے ساتھ خوش و خرم ہیں۔

مشہور و معروف صحافی و افسانہ نگار جناب حیات اللہ انصاری کی شریک حیات بیگم سلطانہ حیات کا گزشتہ ۸ جون ۹۴ء کو انتقال ہو گیا۔ مرحومہ ایک سماجی کارکن تھیں اور پس ماندہ طبقات خصوصاً خواتین کی فلاح کے لئے ہمیشہ سرگرم عمل رہیں۔ مرحومہ انجمن ترقی اردو سے وابستہ تھیں اور اردو کیلئے اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک کام کرتی رہیں۔

ادارہ ان کے انتقال پر اپنے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے تعزیت پیش کرتا ہے۔

——— ایڈیٹر

اقلیتوں کے مسائل اور ریاستی حکومت کے اقدامات

جمہوریت کی بقا اور استحکام کے لئے اقلیتوں کا مطمئن اور آسودہ رہنا ضروری ہے۔ ہمارے ملک کا آئین اور دستور بھی ضامن ہے کہ اقلیتیں اپنی شناخت اور اپنی پہچان کے ساتھ ملک کے قومی دھارے میں شامل رہتے ہوئے زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کریں۔ اگر کسی جمہوریت میں اقلیتیں پچھڑی ہوئی یا پسماندہ ہیں تو اس جمہوریت کی مثال اُس موٹر کار کی سی ہوگی جس کے ایک پہیے میں پنکچر ہو۔۔۔! ظاہر ہے کہ گاڑی چل ہی نہیں سکتی۔ اس لیے ترقی کی گاڑی چلانے کے لیے ضروری ہے کہ سماج میں پچھڑاپن نہ ہو۔

اس عظیم اصول کے تحت کہ ملک کی ترقی کے لئے سماجی انصاف ضروری ہے۔ ریاستی حکومت نے بہت سے اقدامات کیے ہیں۔ منجملہ ان اقدامات کے چند پہلو ایسے ہیں جن کا اقلیتوں سے براہ راست تعلق ہے ان کا تذکرہ کیا جارہا ہے:۔۔۔۔

- سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ ریاستی اقلیتوں کے جو مسائل ہیں وہ سامنے آسکیں اور ان مسائل کے حل کیلئے جو تجاویز ہوں وہ بھی بروئے کار آسکیں۔ اس مقصد کے لئے ریاستی اقلیتی کمیشن قائم کیا گیا ہے۔ یہ کمیشن ریاست کی مذہبی اقلیتوں کے مسائل اور ان کے حل کے سلسلے میں اپنے دائرۂ کار کے اندر اقدامات کریگا چنانچہ اقلیتی کمیشن کے ذریعہ خود کفیل بننے اور اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے لئے مختلف پروجیکٹ کے لئے قرضے بھی دیئے جاتے ہیں۔ ملازمتوں میں بھرتی کے لئے بھی اقلیتی کمیشن بحیثیت نگراں اپنے فرائض انجام دیتا ہے۔ مختلف ٹیکنیکل کورس خصوصاً کمپیوٹر کے کورس بھی چلائے جاتے ہیں اور مقابلے کے امتحانوں کے لیے تربیتی مراکز بھی چلائے جاتے ہیں۔ کمیشن پوری کوشش کرتا ہے کہ اقلیتوں کی معاشی و اقتصادی پسماندگی بھی دور ہوسکے اور جن شعبوں میں وہ پچھڑے ہوئے ہیں ان میں وہ برابر آسکیں۔
- ریاست کی ہر اقلیت اپنے اپنے طور پر اپنی مذہبی شناخت برقرار رکھتے ہوئے اپنے تعلیمی ادارے چلاتی ہے۔ مسلمانوں، عیسائیوں اور سکھوں کے ان تعلیمی اداروں میں عمومی تعلیم دی جاتی ہے اور ساتھ ہی جس اقلیت کا وہ ادارہ ہے، اس اقلیت کے افراد تعلیمی میدان میں بھی آگے آسکیں اور ان اداروں میں وہ اپنی امنگوں آرزوؤں اور تمناؤں کی تکمیل کرسکیں۔ ایسے ہی اداروں کے لیے "اقلیتی کردار" کی اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ یہ اقلیتی کردار اب تک ایک خاص حد تک تھا، موجودہ ریاستی سرکار نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ جو اقلیتی ادارے ڈگری کالج چلاتے ہیں ان کے اقلیتی کردار کو تسلیم کرنے کے لیے ضابطے مرتب کیے جارہے ہیں۔ پرائمری اور جونیئر ہائی اسکول کی سطح پر بھی اقلیتوں کو اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور چلانے کا اختیار حاصل ہوجائے گا۔ اس کے لیے بھی ضابطے بنا دیے گئے ہیں۔
- موجودہ سرکار کا ایک اہم ترین فیصلہ یہ بھی ہے کہ بچّوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دی جائے۔ اس سلسلے میں اُردو کی لسانی حیثیت پسماندگی و محرومی کا شکار تھی۔ موجودہ حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ جن بچوں کی مادری زبان اُردو ہے۔ ان کی اُردو تعلیم کا معقول بندوبست کیا جائے اور ایسے اقدامات کیے جائیں کہ بچے اپنی مادری زبان اردو میں تعلیم حاصل کرسکیں۔ سرکار نے یہ بھی

ضروری ہے کہ ان علاقوں میں اقلیتوں کی آبادی ہے اردو پڑھانے
والے ان کے لئے ٹیوشن کی اسکول کھولنے کا بندوبست کیا جائے
صرف یہی نہیں بلکہ بچوں کی فیس بھی معاف کی جائے اور جو بچے
جو تیار ہوں اور اچھی تعلیمی صلاحیت رکھتے ہوں انہیں وظیفہ
بھی دیا جائے۔

ان اقدامات سے نہ صرف اقلیت کی تعلیمی پس ماندگی دُور ہوگی بلکہ ان کا اعتماد بھی بحال ہو جائے گا اور اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کی بنا پر اقلیت اپنی شناخت بھی برقرار رکھ سکے گی۔ فیس کی معافی اور تعلیمی وظائف کی وجہ سے ان کا پچھڑا پن بھی دور ہوگا

○ سرکاری ملازمتوں کے لئے تحریری امتحان ہوتا ہے۔ عموماً اس تحریری امتحان میں اُردو میں جوابات لکھنے کی سہولت نہ تھی۔ موجودہ صوبائی حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ جہاں بھی یہ امتحانات ہوں اُردو میں جواب لکھنے کی سہولت دی جائے۔ اس سلسلے میں احکامات جاری کر دیئے گئے ہیں۔

موجودہ ریاستی حکومت کا یہ فیصلہ بھی قابلِ ستائش ہے کہ بلاک کی سطح سے لیکر ضلع کے صدر مقام تک ساری ریاست میں اُردو مترجمین رکھے جائیں۔ اس فیصلے سے ریاست کے اُردو داں عوام کے ایک بے حد دیرینہ خواب کی تعبیر ملتی ہے۔ دفاتر میں اُردو داں عملہ کے نہ ہونے کی وجہ سے اُردو میں درخواست دینے کا مطلب ہی فوت ہو جاتا تھا۔ اب مترجمین کے تقرر کی وجہ سے ساری الجھنیں ختم ہو جائیں گی اور اُردو میں دی گئی درخواستوں پر کارروائی ہو سکے گی۔

○ ریاستی سرکار کی تجویز پر مرکزی حکومت نے سوت پر پندرہ روپیہ فی کلو کی شرح سے امدادی رقم سبسڈی دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس فیصلے سے ریاست کے بنکروں کو راحت ملے گی۔ یہ واضح رہے کہ بنکروں کی اکثریت کا تعلق اقلیتی فرقہ سے ہے اس لئے اس امداد سے اقلیتی فرقے کو کافی راحت ملے گی اور مجموعی اعتبار سے اس کی معاشی صورت حال بہتر ہوگی۔

آج کے سماج میں سب سے اہم مسئلہ روزی اور روٹی کا ہے۔ یہی مسئلہ تمام مسائل پر بالواسطہ اور کبھی کبھی براہِ راست اثر انداز ہوتا ہے یہ سچ ہے کہ اگر سماج کے کسی ایک حصہ میں معاشی پس ماندگی ہے تو وہ پورے سماج کو متاثر کرے گی۔ معاشی پس ماندگی ہی سے بے روزگاری جنم لیتی ہے۔ موجودہ سرکار عمومی سطح پر بے روزگاری دور کرنے کے اقدامات کر رہی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ متذکرہ بالا اقدامات سے اقلیتوں میں بے روزگاری دور کرنے اور اس طرح ان کی معاشی حالت میں سدھار لانے میں بڑی مدد ملے گی۔ مثلاً تعلیم بالغان کے سلسلے میں جو مراکز کھولے جائیں گے ان میں اُردو کے لیے بھی سنٹر ہوں گے اور ہر سنٹر میں ایک اردو انسٹرکٹر ہوگا۔ اس طرح اُردو انسٹرکٹر کی تقرری ہوگی جو ایک معقول تعداد میں ہوگی۔ پرائمری اسکولوں میں اساتذہ کی تقرری، جونیر ہائی اسکولوں میں اساتذہ کی تقرری ــــ ان سب اقدامات سے اُردو داں طبقے کے ہزاروں افراد کی بے روزگاری دور ہو سکے گی۔ ان سب کا لازمی اثر اور نتیجہ اسکولوں اور کالجوں میں اُردو تعلیم پر بھی پڑے گا اور اس تصور کی بھی نفی ہو سکے گی کہ: "اُردو پڑھنے سے کیا فائدہ"؟ بلکہ اُردو کی وجہ سے روزگار ملنے کی بنا پر اسکولوں، کالجوں اور یونیورسیٹیوں میں اُردو پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوگا اور اس اضافے کی وجہ سے درس گاہوں میں پڑھانے والوں کی تعداد بھی بڑھے گی اور مزید روزگار کے مواقع پیدا ہوں گے۔

اُردو ٹیلی پرنٹر سروس، اُردو کمپیوٹر، مختلف ترجمے کورس اور ان کے مراکز اور تعلیمی اداروں کو اقلیتی کردار عطا کرنے کے ضوابط، پرائمری اسکولوں میں اساتذہ کا تقرر، ہر اسکول میں اُردو تعلیم حاصل کرنے کی سہولت، مترجمین کا تقرر ــــ یہ ایسے اقدامات ہیں جن سے اقلیتوں کے بہت سارے مسائل حل ہو سکیں گے اور ان کی معاشی و تعلیمی پسماندگی بھی دور ہو سکے گی جس سے وہ اپنی تہذیبی شناخت برقرار رکھتے ہوئے اور اپنے انفرادی وجود کے ساتھ ملک کے قومی دھارے میں اپنا مثبت کردار ادا کر سکیں گے۔

اس لیے ان سارے اقدامات کے لیے موجودہ سرکار بجا طور پر مبارکباد اور اقلیتوں کے شکریہ کی مستحق ہے۔

ــــــــــ احتشام حسین

□□

ھ نمبر

تاثرات کے آئینے میں

نیا دور کا "اودھ نمبر" (فروری، مارچ ۱۹۹۳ء) میں نے شروع سے آخر تک پڑھ لیا۔ آپ نے بڑی کد و کاوش سے تہذیب اودھ کے ہر گوشے پر مضامین اکٹھا کیے ہیں۔ آپ کو داد اور مبارکباد دینے کو جی چاہتا ہے۔ مضامین کی مناسب گروہ بندی کر کے انھیں کتابی صورت میں چھپوا دیں تو "مشرق کے گزشتہ لکھنؤ" کا تکملہ ہو جائے گا۔

سارے مضامین (میری تحریر کے سوا) بہت اچھے ہیں۔ پھر بھی دو مضامین نے بطور خاص میری معلومات میں اضافہ کیا: حیات اللہ انصاری صاحب کا "اودھ کا نیا جنم" اور نیر مسعود کا "لکھنؤ کی یادگار مجلسیں" کم سنی کے باوجود نیر مسعود میں باقیات الصالحات، بزرگوں کے اوصاف پیدا ہو گئے ہیں۔ اردو دنیا میں وہ تنہا آدمی ہیں جو تخلیق، تنقید اور تحقیق تینوں میں مقام رکھتے ہیں۔ مجھے ذیل کے مضامین سے بھی روشنی ملی:
(۱) نوشاد علی، لکھنؤ کی موسیقی، لکھنؤ کا کتھک۔ (۲) ولی الحق انصاری، فرنگی محل کی علمی، ادبی اور سیاسی خدمات۔ (۳) کاظم علی خاں، اودھ میں اردو شاعروں کی آخری آرامگاہیں۔ (۴) مرزا کوکب قدر، اودھ کا آخری تاجدار (۵) محمد اسحاق صدیقی، لکھنؤ کے اکھاڑے (۶) حبیب نثار، شاہان اودھ اور موسیقی۔

اور کئی مضامین پسند آئے مگر اطناب کے ڈر سے تفصیل قلمبند کرتا ہوں۔

―――― (پروفیسر) گیان چند، لکھنؤ

عزیز گرامی سید امجد حسین صاحب

"نیا دور" کا اودھ نمبر ایک ایسی مستند دستاویز ہے جو، جس لائبریری، جس کتب خانے اور جس کتاب کی الماری کی زینت نہ ہوئی یہ اس کی بدنصیبی ہوگی۔

―――― مجروح سلطانپوری۔ بمبئی

[illegible]

وابستگی بھی برقرار رکھتی رہے گی۔

خصوصی نمبر شائع کرنے میں نیا دور کی ادارت نے جو محنت کی ہے وہ اس کا منہ بولتا ثبوت ہے جو ہر اعتبار سے مستحسن ہے، شکریہ کی مستحق ہے۔

―――― (ڈاکٹر) تارا چرن رستوگی۔ گورکھپور

خوبصورت ٹائٹل، پرکشش کتابت، مصور اوراق کے ساتھ نیا دور کا فروری، مارچ ۱۹۹۳ء کا اودھ نمبر معلومات سے بھرپور مضامین اور فکر انگیز کلام سے سج سنور کر ملا۔ دل خوش ہوا مبارکباد قبول فرمائیں۔

بلاشبہ ماہنامہ نیا دور نے اپنے ہر زمانے میں اچھے اور مفید نمبر شائع کر کے اردو والوں کی ذہنی و قلبی تسکین کا سامان مہیا کیا ہے اور اس طرح ادب کے خزانے میں نمایاں اضافہ کیا ہے لیکن ادھر آپ نے خاص طور سے قومی یکجہتی نمبر اور اودھ نمبر شائع کر کے ادب کی خدمت تو کی ہی ہے لیکن قومی اتحاد اور اتفاق قائم رکھنے اور اسے مضبوط سے مضبوط تر بنانے میں نمایاں اور اہم فرض ادا کیا ہے۔

―――― عبدالقوی دسنوی، بھوپال

نیا دور کا "اودھ نمبر" دستاویزی حیثیت کا حامل ہے۔ اودھ اپنی تاریخ، تہذیب اور ثقافت کے اعتبار سے خصوصی شناخت رکھتا ہے۔ یہاں کے اکثر فرماں روا احساس جمال سے مالا مال تھے۔ ادب، شاعری، موسیقی، رقص، مصوری، اسٹیج، اوپیرا، فنون لطیفہ کے کتنے اعلیٰ مظاہر اودھ میں پروان چڑھے۔ "اودھ نمبر" میں تقریباً تمام موضوعات پر بڑے وقیع مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ عہد حاضر کے بیشتر اچھے لکھنے والے اور اپنے فن کے ماہر اس شمارے میں یکجا ہو گئے ہیں کس کس کی تعریف کی جائے میں نے بعض مضامین کئی بار پڑھے ہیں اور ان سے نیا لطف حاصل کیا۔ اس کامیاب نمبر کی اشاعت پر بہت بہت مبارک باد۔

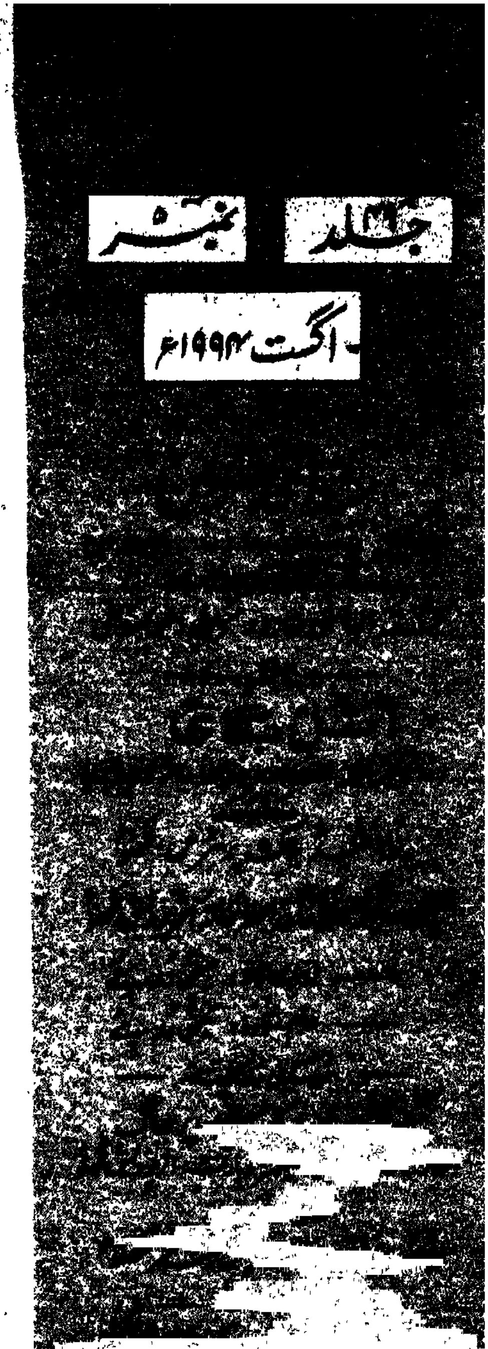
―――― مظہر امام۔ دہلی

نیا دور کا "اودھ نمبر" ملا۔ شکریہ! ۱۶۴ صفحات میں پورے اودھ کی تاریخ کا احاطہ کیا ہے، دریا کو کوزہ میں بھر دیا ہے۔ مبارکباد! لیکن باغبانی کی طرف بالکل دھیان نہیں دیا گیا۔

―――― قیوم صادق۔ کلب گرگہ

عنوانات

اپنی بات	ایڈیٹر	۲
جمالِ سیّدِ کونینؐ سے ہے زندگی روشن (نعت)	رباب رشیدی	۳
میرا تعارف (خودنوشت)	دلیپ سنگھ	۴
غزلیں	کرشن بہاری نور	۸
	شجاع خاور۔ محسن زیدی	۸
مثنوی فریادِ داغ کی تکمیل و طباعت	کالی داس گپتا رضا	۹
اردو کی صبحِ امید	صلاح الدین عثمان	۱۴
میرا پیارا وطن (نظم)	ڈاکٹر بیتاب علی پوری	۱۸
غزل	فوق کریمی	۱۸
نادر کاکوروی	رام لعل نابھوی	۱۹
غزلیں	جمشید مسرور۔ پیام فتحپوری	۲۴
	بسنت کمار بسنت	۲۴
ملائم سنگھ یادو: ایک جائزہ	حسن واصف عثمانی	۲۵
چراغِ راہ (نعت)	خورشید افسر بسوانی	۲۶
مادرِ گیتی (نظم)	اے۔ ندیم بھوپالی	۲۷
آؤ جشنِ آزادی پر یہ عہد کریں (نظم)	مومن خاں شوق	۲۷
مرے سپنوں کا بھارت (نظم)	مہدی رضا ماہلی	۲۷
عوام کی نمائندہ حکومت	احمد ابراہیم علوی	۲۸
بس اتنی سی؟ (مختصر افسانہ)	اقبال مجید	۳۱
'آثار الصنادید' کا ایک محذوف باب	شاہینہ تبسم	۳۳
غزلیں	گروبخش سنگھ بیدار۔ صبا لکھنوی۔ خواب اکبرآبادی	۳۶
	حبیب۔ خوشبیر سنگھ شاد۔ سید معراج احمد	۳۶
ملائم سنگھ یادو کی قیادت میں اتر پردیش	ملک محمد علی خاں	۳۷
ہم سفر رُوٹھ گیا (افسانہ)	ناہید جعفری	۳۹
امدادِ باہمی تحریک	فصاحت حسین رضوی	۴۲
قطعات	عبدالمنان صدیقی	۴۳
غزل	ناشر نقوی	۴۳
نقد و تبصرہ	اکبر حیدری۔ راجیندر بہادر موج۔ شمیم عثمانی۔	۴۴
	خلیل اللہ خاں۔ سلیم عمر۔ اختر مہدی۔ ظفر حسین	۴۶
غزل	اختر عمر اختر	۴۷
اودھ نمبر: تاثرات کے آئینے میں	قارئین	۴۸



نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومتِ اتر پردیش ان سے بہرحال متفق ہو

اپنی بات

پندرہ اگست — ہندستان کی تاریخ آزادی — نہ صرف ہمارے ہی ملک کے لئے بلکہ ایشیا کے واسطے بھی روزِ عید ہے۔ اس لئے کہ ہندستان کی آزادی سے تمام مظلوم، مجبور اور غلامی کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ممالک کو حوصلہ عزم اور آزادی کی جدوجہد تیز کرنے کی قوت ملی، اور یہ ہماری آزادی کے تاریخی دن پندرہ اگست — کی کرامت ہے کہ اس کے بعد دھیرے دھیرے پورے مشرقِ بعید میں ایک کے بعد دوسرا ملک آزاد ہوتا گیا — اور صرف یہی نہیں کہ پندرہ اگست کے تاریخی دن نے سیاسی آزادی ہی کا تصوّر دیا ہو بلکہ رنگ و نسل کے امتیازات سے بھی آزادی کا تصوّر ہندستان ہی کی دین ہے۔ زمبابوے سے لے کر نیلسن منڈیلا کے جنوبی افریقہ تک کی کہانی نسل پرستی کی شکست کے ساتھ ہندستان کے اعلیٰ آدرشوں کے روشن چراغ کی بھی کہانی ہے جس سے تاریخ کی پیشانی دمک رہی ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ پندرہ اگست ۱۹۴۷ء تک پہونچنے کے لئے ہندستان کو اگست ۱۹۴۲ء سے بھی گزرنا پڑا تھا، جب مہاتما گاندھی کی "ہندستان چھوڑو" کی للکار اور "کرو یا مرو" کی گونج سے سامراجی طاقت لرزہ براندام اور مجاہدینِ آزادی سرفروشی کے جذبے کے ساتھ آزادی کی شاہراہ پر اپنے سروں کے چراغ روشن کر رہے تھے۔!

آج یومِ آزادی کے مقدس موقع پر اُن تمام شہیدوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جنھوں نے ۱۷۵۷ء میں پلاسی کے میدان سے آزادی کا نعرہ بلند کیا تھا اور قربانی، ایثار اور سرفروشی کے عزم کے ساتھ ایک سو نوّے برس کی مسافت طے کر کے پندرہ اگست ۱۹۴۷ء تک تاریخ کو لے آئے تھے۔

مادرِ وطن کے ان سپوتوں کو پورے ملک کا احترام و خلوص اور ان کو نمناک آنکھوں کا سلام!

اس سال اگست کے مہینے کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے کہ اسی مہینے میں **عیدمیلادالنبیؐ** کی متبرک اور مقدس تاریخ پڑ رہی ہے۔ اس بابرکت موقع پر برادرانِ اسلام کو خصوصی مبارکباد — حق تو یہ ہے کہ حضورؐ رحمۃللعالمین تھے آپ کی حیاتِ طیبہ اور آپؐ کا پیغام پوری دُنیا کے لئے باعثِ نجات ہے، اس لیے یہ مبارکباد دُنیائے انسانیت کو بھی۔

آئیے اس مُبارک موقع پر دُعا کریں کہ جس ملک سے میرِ عربؐ کو ٹھنڈی ہوا آتی تھی وہ ملک — ہندستان — پیار، محبت، نیز ہم آہنگی اور سلامتی کے ساتھ امن و ترقی کی شاہراہ پر آگے بڑھتا رہے، اور اس کے اقبال کا سُورج چڑھتا رہے۔

—— **ایڈیٹر**

جمالِ سیّدِ کونینؐ سے ہے زندگی روشن!

سحر کا رنگ پھیکا تھا مرے سرکارؐ سے پہلے
ہر اک آئینہ دھندلا تھا مرے سرکارؐ سے پہلے
غمِ دل بے مداوا تھا مرے سرکارؐ سے پہلے
کہاں کوئی سہارا تھا مرے سرکارؐ سے پہلے
قیامت کا اندھیرا تھا مرے سرکارؐ سے پہلے

نہ تھا یہ ذوقِ بینائی مرے سرکارؐ سے پہلے
نہ تھا یہ فقرِ دارائی مرے سرکارؐ سے پہلے
نہ تھی ایسی مسیحائی مرے سرکارؐ سے پہلے
نہ تھی یہ شانِ یکجائی مرے سرکارؐ سے پہلے
نہ تھا یہ رنگِ دانائی مرے سرکارؐ سے پہلے

حضورؐ آئے یتیموں نے سہاروں کی فضا پائی
حضورؐ آئے اندھیروں نے اُمیدوں کی ضیا پائی
حضورؐ آئے ضعیفوں نے نویدِ جانفزا پائی
حضورؐ آئے غریبوں نے کرم کی انتہا پائی
حضورؐ آئے تو مایوسوں نے جینے کی ادا پائی

عُروجِ خود پرستی تھا مرے سرکارؐ سے پہلے
سخن مائل بہ پستی تھا مرے سرکارؐ سے پہلے
زمانہ غرقِ مستی تھا مرے سرکارؐ سے پہلے
عجب اندازِ ہستی تھا مرے سرکارؐ سے پہلے
کہ دورِ چیرہ دستی تھا مرے سرکارؐ سے پہلے

مرے سرکارؐ آئے رحمۃ للعالمیں بن کر
مرے سرکارؐ آئے شرحِ قرآنِ مبیں بن کر
مرے سرکارؐ آئے سرورِ دنیا و دیں بن کر
مرے سرکارؐ آئے روشنیوں کے امیں بن کر
مرے سرکارؐ آئے ہر زمانے کا یقیں بن کر

حضورؐ آئے تجسّس کو اشارا مل گیا آخر
تصورِ وحدتِ حق کا دوبارا مل گیا آخر
جو سب سے پہلے چمکا تھا ستارا مل گیا آخر
وہ نورِ اوّلیں کا استعارا مل گیا آخر
بنی آدم کو طوفاں میں کنارا مل گیا آخر

مکمل رہبری کب تھی مرے سرکارؐ سے پہلے
شریعت آخری کب تھی مرے سرکارؐ سے پہلے
اخوت باہمی کب تھی مرے سرکارؐ سے پہلے
مسرت دائمی کب تھی مرے سرکارؐ سے پہلے
حقیقی زندگی کب تھی مرے سرکارؐ سے پہلے

درودِ رحمۃ للعالمیں انساں کی مخدومی
درودِ رحمۃ للعالمیں باطل کی محرومی
درودِ رحمۃ للعالمیں تسکینِ مظلومی
درودِ رحمۃ للعالمیں فطرت کی منظومی
درودِ رحمۃ للعالمیں ظلمت کی معدومی

سلام اُن پر کہ جن کے ذکر کو بخشی گئی رفعت
سلام اُن پر کہ جن کا نامِ نامی عرش کی زینت
سلام اُن پر ملک کرتے ہیں جنکی رات دن مدحت
سلام اُن پر خدا کے بعد ہیں جو سب سے باعظمت
سلام اُن پر نمازوں میں بھی جن کے نام کی برکت

نہ دردِ آدمیت تھا مرے سرکارؐ سے پہلے
نہ معیارِ شرافت تھا مرے سرکارؐ سے پہلے
نہ کردارِ جماعت تھا مرے سرکارؐ سے پہلے
نہ عرفانِ محبت تھا مرے سرکارؐ سے پہلے
نہ احساسِ ندامت تھا مرے سرکارؐ سے پہلے

حضورؐ آئے نئی صبحوں کا روشن کارواں لے کر
حضورؐ آئے جمالِ رُوح کی رعنائیاں لے کر
حضورؐ آئے عزائم کی متاعِ جاوداں لے کر
حضورؐ آئے عمل کے راستے میں کہکشاں لے کر
حضورؐ آئے زمیں پر سطوتِ ہفت آسماں لے کر

—— رباب رشیدی
۱۲۱ - تازی خانہ
لکھنؤ-۱۸

دلیپ سنگھ
۴۴ مہاولا، پانچمبر نگر، نئی دہلی
۱۱۰۰۲۶

میرا تعارف

خود پر لکھنے بیٹھا تو مجھے شدّت سے احساس ہوا کہ میں اپنا رشتہ کسی بڑے جرنیل یا کسی بڑے ادیب سے تو کیا، کسی بڑے حکیم سے بھی نہیں جوڑ سکتا۔ سچی بات یہ ہے کہ میرے خاندان میں مجھ سے پہلے کوئی "بڑا" آدمی پیدا ہی نہیں ہوا۔ میں بہت کوشش کے باوجود اپنا شجرہ نسب اپنے دادا سے اوپر تلاش نہیں کر پایا۔ ان سے پہلے آنے والوں کا ریکارڈ تاریخ کی کتابوں میں تو کیا، خاندان کے زندہ لوگوں میں کسی کی یاد داشت میں بھی موجود نہیں ہے۔ اس کے باوجود میری پیدائش اور نشو و نما میں کچھ ایسے لوگوں کا دخل ہے کہ صرف اچھی قسمت والے لوگ ہی ایسے خاندانوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

میرے والد گوجرانوالہ ضلع کے ایک گاؤں رام کے چٹھہ کے اچھے خاصے زمیندار تھے۔ تعلیم پرائمری تک تھی۔ لیکن سمجھ بوجھ کئی ایم اے پاس لوگوں سے بہتر تھی۔ ان کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے حیرانی ہوتی ہے کہ اس طرح کا آدمی اس زمانے میں کیسے پیدا ہو گیا۔ سکھ مذہب سے تعلق تھا ان کا۔ مذہب کی رسومات کی بظاہر پابندی بھی کرتے تھے لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر مذہب کے نام پر انھیں کسی کا قتل کرنا پڑتا (قتل تو بہت بڑی بات ہے، کسی دوسرے مذہب کے پیغمبر کو اگر گالی دینا ضروری ہو جاتا) تو وہ بخوشی اپنے مذہب سے منحرف ہو جاتے۔ دماغ بہت اختراعی تھا ان کا۔ اس کی ایک مختصر سی مثال یہ ہے کہ ہمارے گھر کی ایک دیوار ایک مسجد سے جڑی ہوئی تھی۔ میں نے کہا،

"آپ نے شاید اس لئے ایسا کیا ہوگا کہ خدا کے سائے میں رہ سکیں۔"

کہنے لگے، "میں نے تو اس لیے ایسا کیا تھا کہ چور کم از کم اس طرف سے نہیں آ سکیں گے۔"

حسِ مزاح ان کی بہت تیز تھی اور اسی کے بل بوتے پر وہ مشکل سے مشکل حالات کا مقابلہ کر لیتے تھے۔

بڑا گھر تھا ہمارا، ایک ہی گھر میں میرے والد کے سات بیٹے اور دو بیٹیاں اور میرے تایا جی اور ان کی تین بیٹیاں رہتے تھے۔ میں جب پیدا ہوا تو میری تائی اس دنیا سے رخصت ہو چکی تھی۔ میری ماں میرے والد کی دوسری بیوی تھی۔ پہلی شادی سے ایک بیٹا تھا میری ماں جب اس گھر میں بیاہ کر آئی تو شاید چودہ برس کی ہوگی۔ جب وہ اس گھر میں آئی تو پہلے سے چار بچے موجود تھے۔ چودہ برس کی اس لڑکی کو اس بڑے گھر کو چلانے کی ذمہ داری سونپ دی گئی کہ گھر عورتوں سے ہی چلتے تھے۔ ہر سال اس گھر کے بچوں میں اضافہ ہوتا گیا اور اس نیک بی بی نے یہ گھر اس طرح چلایا کہ یہ بات مجھے پندرہ سال کی عمر میں جا کر پتہ چلی کہ ہمارا بڑا بھائی ہمارا سگا بھائی نہیں ہے اور یہ کہ جسے میں اپنی سگی بہن سمجھتا ہوں وہ میرے تائے کی بیٹی ہے۔ میری یہ بہن خصوصی طور پر میری بہن بنا دی گئی کہ اس کا رنگ روپ مجھ سے ملتا ہے۔ ہمیشہ یہی سنتا رہا کہ دلیپ کی بہن کرتار کور ہے۔ میری خوش قسمتی سے وہ حیات ہیں۔ میں ان سے اب بھی وہی محبت کرتا ہوں جو سگی بہن سے کی جاتی ہے اور یہ جذبہ ان کی طرف سے بھی ہے۔ میرا سوتیلا بھائی اس وقت قریب پچھتر برس کا ہوگا۔ اب بھی کبھی جب وہ اپنے بیٹوں سے روٹھ جاتا ہے کسی بات پر، تو ان سے یہ کہہ کر ہمارے گھر آ جاتا ہے کہ میں اپنی ماں کے پاس جا رہا ہوں۔ (ماں ہماری ۶ر فروری ۱۹۹۴ء کو

(اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئی ہے) اسی ماں کی تعلیم کا اثر ہے کہ ہم سارے بھائی ایک دوسرے کے بہترین دوست ہیں اور حالانکہ الگ الگ گھروں اور شہروں میں رہ رہے ہیں لیکن یوں لگتا ہے جیسے آج بھی ہمارا مشترکہ خاندان ہو۔ اتفاق اور باہمی محبت ہمیں اپنی ماں کی دین ہے۔

تیسرا شخص جس کا میری نشوونما میں ہاتھ ہے' میرے نانا تھے۔ میرے نانا ۱۹۰۵ء کے گریجویٹ تھے اور ۱۹۰۵ء میں لاء کرنے کے بعد وکالت کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ عجب طرح کے وکیل تھے وہ۔ کبھی جھوٹا مقدمہ نہ لیا کبھی عدالت میں جھوٹ نہ بولا۔ قریب ۸۵ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ اپنی موت سے دو دن پہلے تک کام کرتے رہے۔ اس وقت وہ اوتھ کمشنر تھے۔ اس عمر میں جو انھیں کام کرتے دیکھتا ہوگا ضرور سوچتا ہوگا کہ بہت لالچی آدمی ہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ پیسوں سے انھیں ذرا بھی لگاؤ نہیں تھا۔ دن بھر جو کچھ کماتے شام کو اسے ہم لوگوں میں بانٹ دیتے اور اگلی صبح خالی جیب لے کر کچہری پہونچ جاتے۔ ملک کی تقسیم کے بعد وہ ہمارے ساتھ رہے۔ ہماری تعلیم کے ذمہ دار وہی ہیں تعلیم کے معاملے میں کبھی انھوں نے یہ نہیں کہا کہ ڈاکٹری پڑھو یا انجینیرنگ پڑھو کہ اس سے بہتر ملازمت پا سکوگے۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ ؎

کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی

یہ بھی کہتے تھے کہ اپنے لیے ایک نصب العین طے کر کے اُدھر چل پڑو اور پھر اِدھر اُدھر مت دیکھو، کہ انسان اس طرح اپنے نصب العین تک نہیں پہونچ سکتا۔

مجھے خیال نہیں کہ پوری زندگی انھوں نے کسی کا دل دکھایا ہو ان کے کردار کی ایک معمولی سی مثال، ہم لوگ اُن دنوں اپنے گھر کے سامنے کھلے آسمان کے نیچے سوتے تھے۔ اس جگہ کو آپ ہمارے گھر کا صحن کہہ سکتے ہیں لیکن تب اُسکے گرد دیواریں نہیں تھیں، دن چھٹی کا ہو یا کام کاج کا، وہ زبردستی ہمیں چھ بجے سویرے اٹھا دیتے تھے۔ ہم نے جب اس "زیادتی" کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ اُس وقت اخبار والا آتا ہے۔ ایک محنتی اور جفاکش آدمی کو اچھا نہیں لگے گا کہ وہ تو اس وقت محنت کرے اور دوسرے لوگ نیند کے مزے لوٹیں، اس کے جذبات کا خیال رکھتے ہوئے تمھیں وہاں سونا نہیں چاہیئے جہاں وہ تمھیں دیکھ سکتا ہے۔

ایسے والد' ایسی ماں اور ایسے نانا کی میں اولاد ہوں۔ میں یہ ہرگز نہیں کہہ رہا ہوں کہ ان کے تمام اوصاف مجھ میں موجود ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو شاید میں ولی ہوتا۔ لیکن اگر آج مجھ میں بطورِ انسان کچھ خوبیاں ہیں تو وہ انھیں کی دین ہیں۔ والد سے سیکولرازم کی بہترین قدریں اور حسِ مزاح، نانا سے علم اور انسانیت سے محبت' اور ماں سے دوسروں کے جذبات کی قدر کرنا اور مل جل کر چلنے کا جو درس میں نے لیا ہے اس سے میری شخصیت کے اچھے پہلو کی تشکیل ہوئی ہے اور میری شخصیت میں جو بُرائیاں ہیں وہ میں نے خود اپنے ماحول سے اپنائی ہیں' اس میں میرے خاندان کے کسی آدمی کا کوئی دخل نہیں ہے۔

اب موقع آگیا ہے کہ میں اپنی زندگی کے کچھ ضروری کوائف لکھ دوں۔ میں گاؤں رام چیٹھہ ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہوا۔ صحیح تاریخِ پیدائش کا خاندان میں کسی کو علم نہیں لیکن اسکول کے سرٹیفکیٹ کے مطابق یہ تاریخ ۲ر جنوری ۱۹۳۲ء ہے۔ سال کا تو خیر اب کسی کو علم نہیں لیکن تاریخ کے بارے میں اندازہ یہ ہے کہ میں اگست کے وسط میں پیدا ہوا تھا چنانچہ اپنی قسمت کا ستارہ LEO سمجھتا ہوں اور اس کی محبتوں اور زیادتیوں کو برداشت کرتا ہوا زندگی گزار رہا ہوں۔

تعلیم کے بارے میں یہ ہے کہ پہلے پانچ سال گاؤں کے لوئر مڈل اسکول میں پڑھا پھر شہر حافظ آباد کے ہائی اسکول میں داخل ہوا اور ہوسٹل میں رہنے لگا، وہاں نویں جماعت میں پڑھتا تھا کہ ملک تقسیم ہوگیا اور ہم لوگ دلی آگئے۔ یہاں پہونچکر ملازمت بھی کی اور تعلیم بھی حاصل کرتا رہا پنجاب یونیورسٹی سے بی اے اور دلی یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کیا۔ لیکن میں اسے تعلیم نہیں سمجھتا۔ یونیورسٹی میں پڑھنے کا مطلب تو یہ ہے کہ اس کے کھیل کے میدانوں میں کھیلا جائے' اس کے کیفے میں چائے کی پیالیوں پر گپ شپ کی جائے' اس میں منعقد ہونے والی بحثوں میں حصہ لیا جائے۔ ہم تو امتحان پاس کرنے کے لئے کالج جایا کرتے تھے یہ تعلیم تو نہ ہوئی۔ تعلیم تو میں نے حاصل کی کچھ عزیز دوستوں کی رفاقت میں دلّی میں آوارگی کرتے ہوئے۔

ملازمتیں تو کئی کیں جن میں دفتر میں کلرکی اور کالج میں استادی بھی شامل ہے لیکن باقاعدہ ملازمت میں نے وزارتِ خارجہ میں کی۔

اپریل ۱۹۵۵ء میں میں نے یہ ملازمت شروع کی۔ ملازمت کے دوران کئی ملکوں کا سفر کیا۔ ملازمت کے جب چار سال رہ گئے تو وزارت خارجہ نے اپنا ایک ماہواری رسالہ انڈیا پرسپیکٹوز شروع کیا تو مجھے اس کا مدیر اعلیٰ بنا دیا گیا۔ یہ فرض نبھاتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ میں اسی کام کے لیے بنایا گیا ہوں، چنانچہ اپنی تمام صلاحیتیں اس پر صرف کر دیں۔ شروع میں یہ رسالہ تین زبانوں میں شائع ہوتا تھا، میں نے اسے بڑھا کر دس زبانوں میں شائع کرنا شروع کر دیا تا کہ پوری دنیا میں پڑھا جا سکے۔ اس کا اردو ایڈیشن "ہندوستانی تناظر" کے نام سے شائع ہوتا تھا۔ مجھے ملازمت سے ۱۹۹۰ء میں ریٹائر ہو جانا چاہیے تھا لیکن میری عمدہ کارکردگی کے اعتراف میں میری ملازمت میں یکے بعد دیگرے تین سال کی توسیع کر دی گئی۔ اب میرا تعلق اس رسالے سے تو نہیں ہے لیکن میں اب بھی اسی وزارت کے محکمۂ نشر و اشاعت میں مشیر ہوں۔ سچ پوچھیے تو مجھے اپنی ملازمت کا صرف وہ حصہ یاد ہے جس کا تعلق انڈیا پرسپیکٹوز سے ہے باقی تو صاحب رہے

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا

آیئے۔ اب سب سے اہم بات کی طرف رجوع کریں۔ یعنی یہ جانیں کہ میں ادیب کیسے بنا۔

ادب کے جراثیم تو میرے اندر بچپن سے تھے۔ شروع شروع میں شعر کہتا تھا، وہ بھی کچھ اس طرح کے کہ بڑے بھائی نے بی اے پاس کیا تو میں نے نظم لکھ ماری۔ ہماری بھینس کو چور لے گئے تو میں نے قطعہ لکھ دیا اور ہماری گھوڑی نے ہمیں گرا دیا تو اس کے خلاف رُباعی ہو گئی۔ گھر کے لوگ میری شعری کاوشوں کو سُن سُن کر خوش ہوتے تھے اور فرمائش کیا کرتے تھے کہ اِس پر لکھو یا اُس پر لکھو۔

اسکول کے ایک اُستاد لالہ ملکھ راج ہمیں اُردو پڑھایا کرتے تھے ان کو جب میری اس "بیماری" کا احساس ہوا تو انھوں نے میری تربیت کی طرف توجہ دی اور مجھے باقاعدگی سے اچھی کتابیں پڑھانا شروع کر دیں۔ آٹھویں جماعت تک پہونچتے پہونچتے میں نے اُردو ادب کی تقریباً ساری کتابیں جو اسکول کی لائبریری میں موجود تھیں، پڑھ لی تھیں۔ اُنہیں کی ایما پر میں نے چند نظمیں اس وقت کے بچّوں کے رسائل گلدستہ اور پھول میں بھیجیں اور وہ چھپ گئیں، اس کے بعد باقاعدہ ادیب بننے کے سوا میرے پاس چارہ ہی کیا تھا۔

جب میرے نانا کو میرے اس شوق کا پتہ چلا تو انھوں نے مجھے انگریزی ادب سے روشناس کرایا۔ شروع میں کلاسیکی ادب کے وہ ایڈیشن جو بچوں کے لیے لکھے گئے ہیں، پڑھائے۔ بعد میں باقاعدہ کلاسیکی ادب۔ چارلس ڈکنز، ٹامس ہارڈی اور تھیکرے میرے پسندیدہ مصنف تھے۔ اب میری دلچسپی نثری ادب کی طرف مڑ گئی۔

جب میں بی اے میں تھا تو کالج میگزین کا ایڈیٹر بنا دیا گیا۔ کالج میں میری ملاقات اُردو کے معروف شاعر بلراج کومل سے ہوئی اور ہمارے درمیان جو دوستی ہوئی وہ اب بہت گہری ہو گئی ہے۔ ان کی معرفت فکر تونسوی اور مخمور جالندھری صاحب سے میری دوستی ہو گئی اور میں باقاعدگی سے ہر شام ان کی صحبت میں گزارنے لگا یہ سلسلہ کئی سال تک چلتا رہا۔

مخمور جالندھری صاحب نے ہی یہ بھید جانا کہ میرا رجحان طنز و مزاح کی طرف ہے۔ ان کے ایما پر میں نے ریڈیو کے لیے کچھ خاکے لکھے جو نشر ہو گئے اور مجھے ان کا معاوضہ مل گیا۔ اسکے بعد میں نے ریڈیو کیلئے ڈراموں، کہانیوں خاکوں اور گیتوں کا ڈھیر لگا دیا اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے بلکہ ٹی وی کے آجانے کے بعد اس سے بھی جُڑ گیا ہے۔ اب تک میں ریڈیو سے قریب ایک ہزار پروگرام اور ٹیلی ویژن سے قریب پانچ سو پروگرام نشر کر چکا ہوں۔ ٹیلی ویژن سے نشر ہونے والے میرے کچھ پسندیدہ سیریلز مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) تصویر کا دوسرا رُخ۔ (۲) دل دریا۔ (۳) دوسرا کیول
(۴) یہ دُنیا غضب کی (۵) میرے تمہارے (۶) اپنی اپنی ہنسی...

اب تک میں نے رسائل کے لیے بہت ہی کم لکھا تھا۔ ۱۹۸۴ء میں جب میں آسٹریلیا کی راجدھانی ری آنا سے اپنی ملازمت پوری کر کے لوٹا تو فکر تونسوی نے سمجھایا کہ اگر رسائل میں نہیں لکھو گے تو 'تمہاری داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں' چنانچہ ۱۹۸۵ء میں میں نے ایک مضمون "معذرت نامہ" ماہنامہ 'شاعر' کو بغرض اشاعت بھیجا۔ مضمون شائع ہوا تو مجھے دو معتبر ادیبوں نے خط لکھ کر مبارک باد دی۔ یہ ادیب تھے ظ. انصاری اور اوپیندر ناتھ اشک۔ اس کے علاوہ بہت سے قارئین نے

بھی تعریفی خطوط لکھے۔ مجھے یقین ہوگیا کہ اُردو ادب کو میری ضرورت بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ میں نے یہ ضرورت پوری کرنے پر اپنی پوری توجہ صرف کردی۔

اب کوئی اتنی شدت سے لکھے گا تو کتابیں تو اس کی چھپیں گی ہی۔ چنانچہ میری مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں:

۱.	سارے جہاں کا درد	طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ
۲.	گوشے میں قفس کے	طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا دوسرا مجموعہ
۳.	دل دریا	ناول
۴.	موم کی گڑیا	ڈرامہ
۵.	تصویر کا دوسرا رُخ	ٹی وی سیریل

ان کے علاوہ انگریزی میں مضامین کا ایک مجموعہ Spiced Laughter اور پنجابی میں ڈراموں کا ایک مجموعہ "نہاتی دھوتی رہ گئی" شائع ہو چکے ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری و ساری ہے۔

مندرجہ ذیل ادبی انعامات سے نوازا جا چکا ہوں:

۱۹۹۱ء سارے جہاں کا درد پر دلّی اُردو اکادمی ایوارڈ
۱۹۹۲ء تخلیقی ادب ایوارڈ دلّی اُردو اکادمی
۱۹۹۳ء مولانا محمد علی جوہر ایوارڈ برائے تخلیقی ادب
۱۹۹۴ء یوپی اُردو اکادمی ایوارڈ 'گوشے میں قفس کے' پر
۱۹۹۴ء پنجاب سرکار کا کنھیا لال کپور ایوارڈ 'گوشے میں قفس کے' پر

آجکل میں دلی اُردو اکادمی اور ہریانہ اُردو اکادمی کی ایوارڈ کمیٹیوں کا ممبر ہوں۔ گویا انعام پانے والوں کی صف سے آگے بڑھ کر انعام بانٹنے والوں کی صف میں آگیا ہوں۔ حالاں کہ پہلی صف کہیں زیادہ دلچسپ تھی۔

اُردو میں مزاح لکھنے کے علاوہ میں انگریزی اخباروں میں مزاحیہ کالم لکھتا ہوں جنہیں 'مڈل' کہتے ہیں کہ وہ ایڈیٹوریل والے صفحے کے درمیان میں شائع ہوتا ہے۔ یوں تو اُردو زبان سے مجھے بے پناہ محبت ہے لیکن لکھنے کے سلسلے میں میرا عقیدہ ہے کہ اگر کسی کے پاس لکھنے کیلئے کچھ ہے تو زبان اس کے لئے سدِ راہ نہیں بنتی۔

یوں تو کوئی بڑا ناقد میرے فن کی تعریف کرے تو ہمیشہ مجھے خوشی ہوتی ہے لیکن قارئین کے خطوط سے مجھے بے پناہ محبت ہے۔ چنانچہ ہر مضمون کے شائع ہونے کے بعد مجھے قارئین کے خطوں کا انتظار رہتا ہے۔

طبیعت کچھ اس طرح کی پائی ہے کہ کچھ دیر کے بعد ہر کام سے اُکتانے لگتا ہوں اور جی چاہتا ہے کہ کوئی نئی حرکت کی جائے۔ کسی زمانے میں بہت سے ڈرامے لکھ کر اسٹیج کروائے۔ ہر شو کے بعد جب مصنف یعنی مجھے اسٹیج پر بلوا کر تالیوں سے میرا استقبال کیا جاتا تو مجھے یوں احساس ہوتا جیسے میں یونان فتح کر کے لوٹا ہوں۔ پھر ایک دن خیال آیا کہ بہتیرا یونان فتح کرلیا، اب وقت پر گھر جانا چاہیئے۔ چنانچہ ۱۹۸۰ء کے بعد میرا کوئی ڈرامہ اسٹیج نہیں ہوا۔ یہی حال ٹی وی سیریل کا ہوا۔ لکھے تو پے در پے کئی اور پھر تین چار سال خاموش ہو رہا۔ طبیعت عجیب پارہ صفت پائی ہے۔ غالب کی طرح کبھی خیال نہیں ہوا کہ فرصت کے رات دن ڈھونڈیں کہ بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے۔ تصورِ جاناں کرنے کا تو مجھے بھی بہت شوق ہے لیکن میں بیٹھ کر کرنے کے بجائے چلتے پھرتے اور دوڑتے بھاگتے کرنا چاہتا ہوں۔

لکھنے کے بارے میں ایک اور بات۔ بہت سے دوسرے ادیبوں کی طرح لکھتے وقت مجھے تنہائی کی تلاش نہیں ہوتی۔ سوچتا ضرور تنہائی میں ہوں مگر لکھ کہیں بھی سکتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر میں نے دفتر میں بیٹھ کر لکھا ہے۔ یہ درست ہے کہ وہاں لوگ اور فائلیں آتی جاتی رہتی ہیں لیکن یہ بھی درست ہے کہ اس سے بہتر کمرہ اور میز مجھے گھر پر دستیاب نہیں ہے۔

میرے ادیب (بلکہ انسان) بننے میں میرے دوستوں کی محبت کا اہم رول رہا ہے۔ دوستوں کے معاملے میں میں بہت ہی خوش قسمت ہوں کہ مجھے زندگی میں بہت ہی اچھے دوست ملے جن کے ساتھ میں نے بھی دوستی کا پورا پورا حق ادا کیا۔ جی ہاں ایک دو ایسے بھی ملے جن کی بے وفائی نے تقریباً میری جان ہی لے لی تھی لیکن اب احساس ہوتا ہے کہ میں ان کی بھولی بھالی صورت اور چکنی چپڑی باتوں میں آکر انھیں دوست سمجھ بیٹھا تھا ورنہ سرے سے ان میں کچھ ایسی بات ہی نہ تھی۔

بہت سی باتوں میں اب تک میرا سبھاؤ بچوں جیسا ہے کہ چھوٹی چھوٹی چیزوں اور باتوں سے خوش ہو جاتا ہوں۔ کوئی تعریفی خط، کوئی محبت بھرا جملہ، کسی کا پیار بھرا سلوک، کوئی اچھا سا شعر، کوئی خوبصورت نظارہ

(باقی صفحہ ۳۰ پر)

غزلیں

دکھائی دے نہ کبھی یہ تو ممکنات میں ہے
وہ سب وجود میں ہے جو تصورات میں ہے

کہ جیسے جسم کی رگ رگ میں دوڑتا ہے لہو
اسی طرح وہ رواں عرصۂ حیات میں ہے

کہ جیسے جھوٹ کئی جھوٹ کے سہارے لیے
اسی طرح وہ پریشاں تکلفات میں ہے

کہ جیسے بوسۂ وفا خود سپردگی میں ملے
اسی طرح کی چمک اسکے التفات میں ہے

گناہ بھی کوئی جیسے کرے ڈرے بھی بہت
اسی طرح کی جھجک اسکی بات بات میں ہے

ہو قلبِ سنگ میں بت جیسے ناتراشیدہ
اسی طرح تری صورت تخیلات میں ہے

نظر کے زاویے بدلے ہیں اور کچھ بھی نہیں
وہی ہے کعبہ میں جو نور سومنات میں ہے

—— رکن شن بہاری نوری
۶۷ - غوث نگر
لکھنؤ

سامان میرا عرشِ بریں پر پڑا رہا
میں بد دماغ اور کہیں پر پڑا رہا

مایوسیوں نے گھیر لیا سارا آسماں
رات آرزو کا چاند زمیں پر پڑا رہا

کیا بات تھی کہ ملتے رہے دوسروں کو تاج
پھر بھی ہما کا سایہ ہمیں پر پڑا رہا

اس کو خدائیوں کی سزا مل گئی مگر
سجدوں کا داغ میری جبیں پر پڑا رہا

خانہ بدوشیوں کا ستایا ہوا تھا وہ
دو گز زمیں ملی تو وہیں پر پڑا رہا

شجاع خاور
ا۔ پارک لین، تال کٹورہ پارک
نئی دہلی

جاتا ہے اسی سمت کہ چارا نہیں کوئی
جس سمت کو رستا بھی نکلتا نہیں کوئی

بس دل کا ہے سودا کوئی بازی نہیں ہر کی
تھوڑا سا ہے نقصان زیادہ نہیں کوئی

منجدھار میں کشتی کا بدلنا نہیں منظور
ایسی مجھے ساحل کی تمنا نہیں کوئی

ہر شخص یہاں گنبدِ بے در کی طرح ہے
آواز پہ آواز دو سنتا نہیں کوئی

ہم سینہ سپر آ گئے میدانِ وفا میں
اب کیوں صفِ اعدا سے نکلتا نہیں کوئی

مانا کہ برا ہے جو کم آمیز ہوں اتنا
یہ تیرا تغافل بھی تو اچھا نہیں کوئی

وہ شعبدہ گر ہی نہ رہا کھیل ہوا ختم
ہونے کو بس اب اور تماشا نہیں کوئی

اک نقدِ ہنر ہے کہ نہیں جس کی کوئی قدر
پاس اس کے سوا اور اثاثا نہیں کوئی

پامالیِ گلشن کی یہ تصویر ہے محسن
شادابیِ گلشن کا یہ نقشا نہیں کوئی

—— محسن زیدی
۵۴/۱۸ - اندرا نگر
لکھنؤ ۱۶

کالی داس گپتا رضا
۳۳ ملک، جبل درشن، چوتھی منزل
نیپین سی روڈ، بمبئی ۴۰۰۰۳۶

مثنوی "فریادِ داغ" کی تکمیل و طباعت

تمکین: — داغ مصنفہ تمکین کاظمی
زیدی: — مطالعۂ داغ مصنفہ ڈاکٹر سید محمد علی زیدی

جلوۂ داغ جو خود داغ کی لکھوائی ہوئی ہے، میں درج ہے:

"..... فریادِ داغ ..... مثنوی دو دن کی معمولی فکر کا نتیجہ ہے" (ص ۱۱۴)

یہاں داغ کی زود گوئی سے بحث نہیں۔ مثنوی کے کُل ۸۲۸ شعر ہیں۔ داغ دن بھر میں چار پانچ سو اشعار کہہ لینے پر قادر تھے۔ چھوٹی بحر، روانی اور ہر شعر میں ربط ہونے کی وجہ سے ایسا قطعی ممکن ہے۔ معلوم جو کرنا ہے وہ یہ ہے کہ وہ دو دن کون سے سال کے تھے جب یہ مثنوی لکھی گئی۔

داغ اوائل اپریل ۱۸۸۲ء میں رام پور سے عازم کلکتہ ہوئے تھے اور دہلی، لکھنؤ وغیرہ ہوتے ہوئے اپریل کے آخر میں پٹنہ پہنچے تھے وہاں ایک لمبی مدت گزار کر قیاساً جون کے تیسرے ہفتے میں بذریعہ ریل کلکتہ وارد ہوئے تھے۔ ان کے آتے ہی شہر میں دھوم ہوگئی ؎

شہر میں دھوم تھی کہ داغ آیا

اوائل جولائی میں داغ واپس عازم رام پور ہوئے۔ واپسی کا ذکر مثنوی میں یوں کیا ہے ؎

ریل نے دو ہی دن میں پہونچایا
رمضان ایک دن کے بعد آیا

اس اشارے کی بنیاد پر کلنڈر دیکھنے کے بعد تمکین اس نتیجے پر پہنچے کہ "داغ ۸ جولائی کو کلکتہ سے چلے ۹، ۱۰ دن ریل میں رہے، ۱۱ جولائی کو تین مہینے بعد بخیر و خوبی رام پور واپس ہوئے۔"

تمکین (ص ۹۳) لکھتے ہیں:

"فریادِ داغ رمضان یا شوال ۱۲۹۹ھ میں لکھی گئی ہے یعنی جولائی / اگست ۱۸۸۲ء میں، مگر اس کا نام داغ نے دو تین مہینے بعد ماہِ محرم ۱۳۰۰ھ میں رکھا ہے جو تاریخی نام ہے اور اسی سال اس کی طباعت بھی ہوئی ہے۔ مطبع مطلع العلوم و اخبار نیرِ اعظم مراد آباد نے اس کا پہلا ایڈیشن شائع کیا۔ اس کے بعد مختلف مطابع نے متعدد ایڈیشن چھاپے ہیں......."

زیدی (ص ۲۲۲) تمکین کے بیان کو دُہرانے کے بعد رقمطراز ہیں:-

"فریادِ داغ پہلی مرتبہ محمد امجد علی مالک اخبار نیرِ اعظم مراد آباد نے اپنے مطبع مطلع العلوم سے ۱۳۰۰ھ میں شائع کی۔ اس پر مندرجۂ ذیل شعر سالِ طباعت کا درج ہے ؎

گفت تسلیم سالِ طبعِ او ____ آفتِ دین فتنہ آرائے
۱۳۰۰ھ

صاحبِ مطبع نے پندرہ سو جلدیں چھاپی تھیں اور وہ بہت جلد فروخت ہوگئیں ——"

پھر لکھتے ہیں (ص ۲۲۳): ——

دوسری مرتبہ یہ مثنوی ۱۳۰۲ھ میں شائع ہوئی۔ محمد فیروز شاہ خاں فیروز نے مندرجۂ ذیل قطعے

سالِ طباعت برآمد کیا ہے ؎

وہ ہیں مضمونِ عالی مثنوی میں
کہ حاصل جس سے معنی کو بلندی
چھپی یہ مثنوی فیروز جس دم
لکھی تاریخ نظمِ دُرِّ منّدی
۱۳۰۲ھ

تیسری مرتبہ یہ مثنوی امجد علی نے مُرادآباد سے ۱۳۱۳ھ میں پھر شائع کی۔ فیروز کے حسبِ ذیل کے قطعے سے سالِ طباعت نکلتا ہے ؎

تیسری بار پھر ہوئی مطبوع — مثنوی وہ جو رُوح پرور ہے
میں نے تاریخ یہ کہی فیروز — مثنوی یہ ہے یاگلِ تر ہے
۱۳۱۳ھ

اس کے بعد یہ مثنوی متعدد بار شائع ہوئی ہے۔ مثنوی کے آخر میں محمد ممتاز علی خاں ممتاز شاگردِ داغ کی تقریظ ہے۔"

مندرجہ بالا سے یہ نتائج اخذ ہوتے ہیں:

(۱) مثنوی فریادِ داغ رمضان یا شوال ۱۲۹۹ھ یعنی جولائی یا اگست ۱۸۸۲ء میں کہی گئی تھی، مگر اس کا نام ماہ محشر م ۱۳۰۰ھ میں رکھا جو تاریخی ہے۔ اسی سال یعنی ۱۳۰۰ھ میں پہلی مرتبہ (زیدی) مطبع مطلع العلوم و اخبار نیرِ اعظم مرادآباد میں چھپی (تمکین)۔
اس پر مندرجہ ذیل شعر سالِ طباعت کا درج ہے ؎

گفت تسلیم سالِ طبع او
آفتِ دین فتنہ آرائی (زیدی)
۱۳۰۰ھ

(۲) اس کے بعد مختلف مطابع نے متعدد ایڈیشن چھاپے (تمکین)
(۳) صاحبِ مطبع نے پندرہ سو جلدیں چھاپی تھیں اور وہ بہت جلد فروخت ہو گئیں۔ (زیدی)
(۴) دوسری مرتبہ یہ مثنوی ۱۳۰۲ھ میں شائع ہوئی۔ محمد فیروز شاہ خاں فیروز نے تاریخ کہی ؎
چھپی یہ مثنوی فیروز جس دم — لکھی تاریخ نظمِ دُرِّ منّدی (زیدی)
۱۳۰۲ھ

(۵) تیسری مرتبہ ۱۳۱۳ھ میں شائع ہوئی۔ فیروز نے تاریخ کہی ؎
تیسری بار پھر ہوئی مطبوع — مثنوی وہ جو رُوح پرور ہے
میں نے تاریخ یہ کہی فیروز — مثنوی یہ ہے یاگلِ تر ہے
۱۳۱۳ھ (زیدی)

(۶) اس کے بعد یہ مثنوی متعدد بار شائع ہوئی ہے۔ مثنوی کے آخر میں محمد ممتاز علی خاں ممتاز کی تقریظ ہے۔ (زیدی)

میرے کتب خانے میں مثنوی فریادِ داغ کا ایک قدیم نسخہ ہے۔ اس کے خاتمۃ الطبع میں تحریر ہے:

"اگرچہ متقدمین دہلی (غالب، ذوق، مومن) کا اب اس عالمِ فانی میں وجود باقی نہ رہا مگر اب جو اہلِ کمال وہاں کے موجود ہیں ان میں سے جناب میرزا خاں صاحب داغ دہلوی کی ذات مغتنمات میں گنی جاتی ہے.....
.... مرزا صاحب نے یہ قیامت کی مثنوی تحریر فرمائی ہے ...... فی الحال پانچویں بار مطبع مطلع العلوم و اخبار نیرِ اعظم مرادآباد ..... میں چھپ کر نذرِ شائقین ہوئی ہے۔"

اس پانچویں ایڈیشن سے اوپر اخذ کیے ان چند نتائج کی بخوبی تغلیط ہو جاتی ہے، ملاحظہ کیجئے:

(۱) مثنوی رمضان یا شوال ۱۲۹۹ھ میں فکر نہیں کی گئی تھی۔ رمضان میں تو یوں بھی ایسی مثنوی کے فکر کرنے کا کوئی تُک نہیں ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ۱۳۰۰ھ (۱۳ نومبر ۱۸۸۲ء تا یکم نومبر ۱۸۸۳ء) ہی میں کہی گئی، اس کے لئے تین شہادتیں پیشِ نظر ہیں۔
اوّل: فریادِ داغ کا تاریخی نام جو ۱۳۰۰ھ کے برابر ہے۔
دوم: منشی محمد شبیر حسین خاں نسیم بریلوی تلمیذِ داغ کا قطعۂ تاریخ ؎

مثنوی وہ مرے استاد کی ہے
جس کا ثانی ہی نہیں ہے ممکن
ختم کا سال لکھا میں نے نسیم
تحفۂ شاعرِ قدسی باطن
۱۳۰۰ھ

شمیم انہونوی (حاشیہ ۲۳۲) لکھتے ہیں :

" زیادہ داغ کا قلمی نسخہ رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے۔ یہ ۳۴ اوراق پر مشتمل ہے۔ کتابت کا سنہ ۱۳۰۰ھ ہے لیکن کاتب کا نام تحریر نہیں ہے۔ اس پر ایک مہر بھی لگی ہوئی ہے جو غالباً داغ کی ہے۔ اس مخطوطے میں مثنوی کے آخر میں دو شعر جو تمام مطبوعہ ایڈیشنوں میں پائے جاتے ہیں، نہیں ہیں۔ دونوں شعر مندرجہ ذیل ہیں :

یا الٰہی نجات غم سے ملے
وہ سراپا حجاب ہم سے ملے
ورنہ اس کا خیال بھی نہ رہے
اب ہے جیسا یہ حال بھی نہ رہے ۔"

اس سے صرف یہی ثابت نہیں ہوجاتا کہ مثنوی ۱۳۰۰ھ میں کہی گئی تھی بلکہ یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ مثنوی کی پہلی روایت میں آخری دو شعر کم تھے، غالباً ان کا اضافہ مثنوی کی طباعت کے وقت کیا گیا۔

اب یہ کہنا کہ یہ اسی سال یعنی ۱۳۰۰ھ میں چھپ گئی، قطعی غلط ہے۔ " آفت دین فتنہ آرائی " سے ۱۳۰۰ھ نہیں ۱۳۰۲ھ برآمد ہوتا ہے (بحث آگے آئے گی)

(۲) یہ غلط ہے کہ پہلے ایڈیشن کے بعد مختلف مطبعوں نے اس مثنوی کے متعدد ایڈیشن چھاپے کیوں کہ پانچویں ایڈیشن کے آخر میں اعلان ہے کہ "چوں کہ حق تصنیف مثنوی ہذا جناب مصنف (داغ) نے راقم نیر اعظم کو ہبہ فرمایا ہے ...... اس لیے کوئی صاحب بغیر اجازت تحریری راقم چھاپنے کا قصد نہ فرمائیں ۔" یہی وجہ ہے کہ پانچوں کے پانچوں ایڈیشن مطبع مطلع العلوم واخبار نیر اعظم مراد آباد ہی سے چھپے، کسی اور مطبع سے نہیں ۔

(۳) یہ کہ پہلے ایڈیشن میں پندرہ سو جلدیں چھاپی تھیں، اس خط سے معلوم ہوتا ہے جو داغ نے (شاید ۱۳۰۲ھ میں) اپنی معشوقہ حجاب کو لکھا تھا دیکھیے "زبان داغ" ص ۹۰/۱۸۹ لکھتے ہیں :

" مثنوی تمہاری تھی، تمہارے حال کی تھی، تمہارے صفات کی تھی .... صاحب مطبع نے پندرہ سو چھاپی تھیں مہینہ بھر میں فروخت ہوگئیں، مکرر چھپیں گی ...."

(۴) دوسری مرتبہ یعنی ۱۳۰۲ھ کی طباعت کے لیے محمد فیروز شاہ خاں فیروز کے قطعے کو دلیل بنایا گیا ہے، مگر پانچویں ایڈیشن میں اس قطعے کا عنوان کچھ اور کہتا ہے :

" قطعۂ تاریخ طبع مثنوی فریاد داغ بار اوّل ریختۂ کلک ...... منشی فیروز شاہ خاں صاحب فیروز رام پوری شاگرد رشید حضرت داغ دہلوی ......"

گویا تاریخ "نظم درد مندی" (۱۳۰۲ھ) مثنوی کی پہلی اشاعت کیلئے کہی گئی تھی۔ پانچویں ایڈیشن میں تین تاریخی قطعات ۱۳۰۲ھ کے ہیں اور پھر تیسری اور چوتھی اشاعت کے لیے قطعات تاریخ ہیں
اب اگر داغ کے خط بنام حجاب پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ پندرہ سو جلدیں مہینہ بھر میں نکل گئی تھیں اور مثنوی کو "مکرر" چھاپا جانے والا تھا اور بہت جلد چھاپ بھی دیا گیا ہوگا۔ اس طرح قیاس کرنا چاہیے کہ مثنوی ۱۳۰۲ھ میں دوبار چھپی۔ پہلی بار ۱۳۰۲ھ میں اور دوسری بار بھی اسی سال میں۔

۱۳۰۲ھ کا تیسرا قطعۂ تاریخ امیر اللہ تسلیم کا ہے جو یوں ہے :

"تاریخ طبع از جناب منشی امیر اللہ تسلیم سلمہ ملازم سرکار رام پور

چو شد مطبوع ایں افسانۂ عشق
زفکر ماہر عالی مقامے
نوشتم مصرعۂ تاریخ تسلیم
کلام شاعر شیریں زبانے "

۱۳۰۲ھ

(۵) تیسری مرتبہ ۱۳۱۲ھ میں نہیں بلکہ ۱۳۱۳ھ میں چھپی۔ فیروز کے مصرعے " مثنوی یہ ہے یا گل تر ہے " سے ۱۳۱۲ھ (۲۱ر جولائی ۱۸۹۴ء تا ۲۴ر جون ۱۸۹۵ء) مستخرج ہوتا ہے۔ تیسری طباعت کیلئے ایک قطعۂ تاریخ اشفاق علی خاں مضطر مراد آبادی مہتمم نیر اعظم کا بھی ہے

چھپ گئی پھر مثنوی وہ حضرت استاد کی
دیکھنے کا جس کے مضطر اک جہاں مشتاق تھا

[illegible]
غیب سے آواز آئی [illegible]

۱۳۱۲ھ

(۴) تیسری اشاعت کے بعد مثنوی "متعدد" بار شائع ہوئی کہ نہیں، یہ تو بحالِ تشکیک سے نہیں کہا جا سکتا مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ داغ کی زندگی میں ایک ہی مطبع مطلع العلوم و اخبار نیر اعظم مرادآباد سے پانچ بار چھپی۔ پانچویں بار اس طرح کہ مثنوی کی کتابت ہو چکی تھی کہ داغ کا انتقال ہو گیا۔ خاتمے کی تمام عبارت میں داغ کو زندہ دکھایا گیا ہے۔ مگر پریس میں جاتے جاتے "داغ دہلوی" پر الگ سے چھوٹا سا "مرحوم" بھی کتابت کرنا پڑا جو قطعی کاتب مسودہ کے قلم سے ہٹ کر ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ داغ کے انتقال کی خبر آتے ہی ایسا کیا گیا ہوگا۔

میرے کتب خانے کے پانچویں ایڈیشن کے آخر میں متن کے بعد ذیل کے تاریخی قطعے اور تقریظیں درج ہیں۔ ان کی تفصیل دلچسپی سے خالی نہیں:

(الف) "قطعہ تاریخ طبع از نتیجۂ فکر رسا و سلیم منشی انوار حسین صاحب تسلیم سہسوانی"

کل اشعار بزبان فارسی ۱۹۔ آخری مصرع جس سے تاریخ نکلتی ہے یہ ہے: "آفتِ دین فتنہ آرائی"

پانچویں ایڈیشن میں سہوِ کاتب سے 'آرائی' کی جگہ 'رعنائی' چھپ گیا ہے۔ 'رعنائی' سے تاریخ قطعی غلط ہو جاتی ہے۔

(ب) "تاریخ مثنوی نتیجۂ طبع جناب منشی شبیر حسین صاحب نسیم بھرتپوری تلمیذ حضرت مصنف ممدوح"

کل ۲ شعر بزبانِ اُردو۔ دوسرا شعر ہے

ختم کا سال لکھا میں نے نسیم تحفۂ شاعرِ قدسی باطن

۱۳۰۰ھ

(ج) "تاریخ طبع از جناب منشی امیر اللہ صاحب تسلیم ملازم سرکار رامپور"

کل ۲ شعر بزبان فارسی۔ پہلا مصرعہ:

"چو شد مطبوع ایں افسانۂ عشق"

چوتھا مصرعہ: "کلام شاعر شیریں زبانے" = (۱۳۰۲ھ)

(۳) [illegible] صاحب گرامی [illegible] ریاست حیدرآباد دکن"

کل ۲۵ شعر بزبان فارسی۔ پہلا شعر ہے

بیا اے بلبلِ کلکِ خوش آہنگ
بمدحِ داغ سرکن نغمہ چنگ

آخری شعر ہے

نیابد از زبانِ نکتہ پرور
گرامی مدحتِ داغِ سخن ور

ان ۲۵ اشعار کا تعلق مثنوی سے قطعی نہیں۔ یہ تمام شعر داغ بحیثیت شاعر کی تعریف میں ہیں۔ اس لئے ان میں کوئی تاریخی مادہ نہیں گرامی میر محبوب علی خاں نظام دکن کے عہد میں حیدرآباد آئے تھے یہ اشعار اسی زمانے ۸۵/۱۸۸۴ء کے فکر کردہ ہو سکتے ہیں مگر اس وقت تک داغ حیدرآباد نہیں پہونچے تھے۔

(۵) "قطعہ تاریخ طبع مثنوی فریادِ داغ بار اوّل، ریختۂ کلکِ جواہر سلک، شاعر عدیم المثال، مورخ باکمال جناب منشی محمد فیروز شاہ خاں صاحب فیروز سابق میر اخبار رپورٹر فارن اخبارات ریاست رامپور شاگردِ رشید حضرت داغ دہلوی مدظلہ العالی"

کل ۲ شعر بزبان اُردو۔ آخری ترکیب نظم دردمندی (۱۳۰۲ھ) سے تاریخ نکلتی ہے۔

(۶) "ایضاً بار سوم"

کل ۲۲ شعر بزبان اُردو۔ پہلا شعر ہے

اوستادِ جہاں فصیح الملک
وصف تیرا ہر اک زباں پر ہے

آخری شعر ہے

میں نے تاریخ یہ کہی فیروز
مثنوی یہ ہے یا گُہر تر ہے

۱۳۱۲ھ

(۷) "قطعہ تاریخ طبع از جناب منشی اشفاق علی صاحب مظفر مرادآبادی منصرم نیر اعظم"

کل ۲ شعر بزبان اردو۔ پہلا مصرعہ ہے

چھپ گئی پھر مثنوی وہ حضرتِ استاد کی

آخری مصرع :

غیب سے آواز آئی "ارمغان بے بہا" = (۱۳۱۲ھ)

(ح) "تقریظ نتیجۂ ذہن آسمان پیمائے منشی محمد ممتاز علی خاں صاحب ممتاز شاگرد رشید حضرت مصنف سلمہا اللہ تعالیٰ"

یہ نثر کا ڈیڑھ صفحہ ہے، کوئی خاص بات نہیں، نمونہ کلام نثر یہ ہے:

"اللہ رے طلاقت، واہ ری فصاحت ۔ مصرعہ
سے ہے کہ ابروئے دلدار، شعر ہے کہ معشوق کا سنگھار
طبیعت میں بلا کی روانی ۔ ذہن میں ستم کی جولانی ..."

(ط) "تقریظ مثنوی چکیدۂ کلک جناب حافظ احمد علی خاں شوق رئیس رامپور تلمیذ حضرت داغ"

یہ آدھے صفحے کی نثری تقریظ ہے۔ شاید یہ پہلا موقع ہے کہ کسی نے داغ کی زندگی میں اعلانیہ داغ کی ولدیت کا اظہار کیا ہو۔ چنانچہ تقریظ میں لکھا ہے:

"...... مثنوی حضرت عالی جناب فیض مآب
بلبلِ ہندوستان استاذی جناب نواب مرزا خاں صاحب
داغ دہلوی مدظلہ العالی خلف عالی جناب نواب
محمد شمس الدین خاں صاحب بہادر دہلوی موسوم بہ
فریادِ داغ طبع ہو چکی ......"

(ی) "تاریخ طبع چہارم نتیجۂ فکر شاعر نامور میرزا احمد شاہ (تخلص جوہر) تلمیذ حضرت تسلیم سہسوانی مرحوم و مغفور"

کل ۲ شعر ہے

طبع شد فریادِ داغ اے شایقانِ نکتہ سنج
با ہزاراں زیب و زینت با ہزاراں دلبری
خامۂ جوہر رقم زد از پئے تاریخ طبع
بارِ چہارم طبع شد ایں ہوش افزا مثنوی

۱۸۹۹ء

(مطابق ۱۸ شعبان ۱۳۱۶ھ تا ۲۸ شعبان ۱۳۱۷ھ)

(ک) "خاتمۃ الطبع": جیسے پہلے بتایا جا چکا ہے، اس پانچویں ایڈیشن کا خاتمۃ الطبع کتابت کیا جا چکا تھا کہ داغ کا انتقال ہو گیا، لہٰذا مالکِ مطبع نے "داغ دہلوی" کے اوپر باریک قلم سے مرحوم لکھ دیا یا لکھوا دیا۔ حالاں کہ تمام خاتمے کی باقی نثر سے ظاہر ہے کہ داغ بقید حیات ہیں۔ چنانچہ یہ جملہ اس کا شاہد ہے:

"اب جو اہلِ کمال وہاں کے موجود ہیں ان میں سے
جنابِ میرزا خاں صاحب داغ دہلوی مرحوم کی ذات
مغتنمات سے سمجھی جاتی ہے"....

اسی خاتمے میں درج ہے کہ:

"فی الحال پانچویں بار مطبع مطلع العلوم و اخبار
نیرِ اعظم مراد آباد میں چھپ کر نذرِ شائقین ہوئی ہے"۔

(ل) پانچویں ایڈیشن کی آخری تین سطروں میں درج ہے:

"چونکہ حقِ تصنیف مثنوی ہٰذا جنابِ مصنف نے راقم
نیرِ اعظم کو ہبہ فرمایا لہٰذا ...... کوئی صاحب بغیر اجازت
تحریری راقم چھاپنے کا قصد نہ فرماویں ورنہ نقصان
اٹھاویں گے۔

العبد ایس۔ این علی مالک و اڈیٹر اخبار نیرِ اعظم مراد آباد"

مندرجہ بالا سے ظاہر ہے کہ مثنوی دو دن میں کہی گئی۔ سال ہجری ۱۳۰۰ تھا۔

* پہلی روایت میں مروجہ مثنوی کے آخری دو شعر نہیں تھے۔ بعد میں بوقت طباعت اضافہ کیے گئے۔
* طباعت ۱۳۰۲ھ میں ہوئی اور پہلے ہی سال میں دو ایڈیشن نکلے
* پہلے ایڈیشن میں پندرہ سو جلدیں چھاپی گئی تھیں جو مہینہ بھر میں فروخت ہو گئیں۔
* داغ کی زندگی میں اس مثنوی کے پانچ ایڈیشن نکلے۔ (پانچویں ایڈیشن کا کتابت شدہ مواد پریس جانے والا تھا کہ داغ کا انتقال ہو گیا)۔
* یہ سب ایڈیشن مطبع مطلع العلوم و اخبار نیرِ اعظم مراد آباد سے شائع ہوئے کیوں کہ حقِ تصنیف داغ نے صرف اسی مطبع کو ہبہ کیا تھا۔

□□

(حواشی صفحہ ۳۰ پر ملاحظہ ہوں)

صلاح الدین عثمان

اُردو کی صبحِ اُمید

اُتر پردیش میں اُردو کے دن پھر پھرتے نظر آتے ہیں۔

بہت زمانہ نہیں گزرا کہ ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی مرحوم کو کونسل ہاؤس (یوپی گورنمنٹ سکریٹریٹ) میں ایک لمبی لڑائی اس لئے لڑنی پڑی تھی کہ وہ اپنے کمرے کے دروازے پر اُردو رسم خط میں اپنے نام کی تختی لگا سکیں۔ ڈاکٹر فریدی مرحوم یوپی لیجسلیٹو کونسل میں پرجا سوشلسٹ پارٹی کے لیڈر تھے اور پارٹی لیڈر کے لئے کونسل ہاؤس میں ایک کمرہ دیا جاتا ہے۔ کمرہ سجا سجایا تھا۔ دروازے کے پاس دیوناگری رسم خط میں ان کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے خود اُردو رسم خط میں اپنے نام کی ایک تختی بنوا کر دروازے کے قریب دوسری طرف آویزاں کرا دی۔ دوسرے دن وہ تختی غائب تھی۔ تحقیق کی تو پتہ چلا کہ کونسل ہاؤس کے کیئر ٹیکر (منتظم عمارت) نے وہ تختی ہٹا دی کیونکہ

"کونسل ہاؤس میں صرف دیوناگری رسم خط میں تختی لگائی جا سکتی ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے یہ سوال ایوان میں اُٹھایا تو حکومت کی طرف سے نہ صرف کیئر ٹیکر کی کارروائی کی تائید کی گئی بلکہ اس کی اس جرأت کی تعریف بھی کی گئی کہ اس نے حکومت کے احکامات کی پوری پابندی کی۔ ڈاکٹر صاحب یوں دبنے والے لوگوں میں نہ تھے۔ انھوں نے سخت احتجاج کیا اور ایک نئی تختی لگوا دی۔ وہ بھی غائب ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے پھر احتجاج کیا۔ تختی یوں ہی لگتی اور غائب ہوتی رہی۔ آخرکار ڈاکٹر صاحب خاموش ہو گئے اور ان کے کمرے کے دروازے پر اُردو رسم خط کی تختی نہ لگ سکی۔

آج کونسل ہاؤس میں تقریباً تمام وزرا اور اعلا افسران کے کمروں پر جو تختیاں لگی ہوئی ہیں ان پر ان کے نام اُردو اور دیوناگری دونوں رسم خط میں لکھے ہوئے ہیں۔

یہ بہت بڑی کامیابی تو نہیں لیکن اس کا اشارہ ضرور ہے کہ اُردو کے دن پھر رہے ہیں۔ بہت سے محبِ اُردو جن کے دل مسلسل ناکامیوں نے توڑ دیئے ہیں، اس اشارے کو سمجھ نہیں پا رہے ہیں کہ یہ تختیاں ہندستان میں آنے والی تبدیلیوں کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ یہ اس بات کی طرف بھی اشارہ کر رہی ہیں کہ اُردو کا مسئلہ صرف ثقافتی، تعلیمی یا علمی مسئلہ نہ تھا۔ اتر پردیش کی پچھلی حکومتوں کی اُردو مخالف کارروائیاں سیاسی اقدامات تھیں۔ سیاست بدلی تو اُردو کی طرف ریاستی حکومت کا رُخ بدل گیا۔ پچھلی حکومتوں نے عوامی حمایت حاصل کرنے کے لئے قدیم ثقافت کے احیاء کی پالیسی اختیار کی تھی۔ ملائم سنگھ یادو کی حکومت نے مشترکہ تہذیب کے تحفظ کی پالیسی اختیار کی ہے۔

موجودہ حکومت کے قیام سے پہلے کبھی کسی حکومت نے اپنی "لسانی پالیسی" کا اعلان نہیں کیا تھا لیکن وزیر اعلا ملائم سنگھ یادو نے اعلان کر دکھایا۔ جب اُردو کو ایوانِ اقتدار اور تعلیمی مراکز سے خارج کیا گیا تو کسی لسانی پالیسی کا اعلان نہیں کیا گیا تھا۔ یوپی اسمبلی نے ایک قانون پاس کر کے ہندی کو سرکاری زبان بنایا اور پنڈت گووند بلبھ پنت کی سرکار نے ایک فرمان کے ذریعہ اتر پردیش کے ہر شہری کو "ہندی بھاشی" قرار دیا۔

۴۸-۱۹۴۷ء کے تعلیمی سال میں ہائی اسکول کے امتحان دینے والے طلبا میں ۸۴ فیصد کی "زبانِ اوّل" یعنی مادری زبان اُردو تھی۔ امتحانات کے بعد گرمیوں کی تعطیل کے لئے اسکول بند ہوئے اور دو ماہ بعد جب کھلے تو تمام طلبا کی مادری زبان ہندی ہو چکی تھی۔

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی

سرکار نے اعلان کیا کہ ان اسکولوں کے علاوہ جن کا ذریعۂ تعلیم انگریزی ہے، تمام اسکولوں میں ذریعۂ تعلیم ہندی ہوگی اور ہر طالب علم کو مادری زبان کی جگہ ہندی پڑھنا ہوگی کیوں کہ اس پردیش کے لوگوں کی زبان ہندی ہے ساتھ ہی ساتھ یہ کہا گیا کہ اگر کچھ لوگ اپنے بچوں کو ہندی کے علاوہ کوئی اور زبان پڑھانا چاہتے ہیں تو وہ اسکول کے تدریس کے اوقات کے بعد اسکول کی عمارت میں اپنی زبان پڑھانے کا انتظام کر سکتے ہیں۔ اس وقت لفظ 'اُردو' سے گریز کیا جاتا تھا: 'کچھ لوگ' سے مُراد اہلِ اُردو تھے۔ اس کے بعد بہت سے واقعات ہوئے جن میں ہر ایک کی ایک لمبی داستان ہے۔ بہت سے وعدے وعید کیے گئے جو کبھی شرمندۂ ایفا نہ ہوئے۔ وعدہ کیا گیا کہ اُردو کو "دوسری سرکاری زبان" بنائیں گے۔ پھر ایک آرڈیننس جاری کیا گیا مگر اس کو اسمبلی میں پیش کر کے منظور نہیں کرایا گیا اور وہ اپنی موت مر گیا۔ آرڈیننس جاری ہوتے رہے اور پانی کے بلبلوں کی طرح اپنی گھڑی دو گھڑی کی زندگی گزار کر ختم ہوتے رہے۔ آخرکار ایک پٹیشن پر ہائی کورٹ نے اس سلسلے کو ختم کیا۔

اس کے بعد اُردو کو "دوسری سرکاری بھاشا" بنانے کا ایک بل (مسودہ قانون) پاس کیا گیا۔ بل میں ایک دفعہ تھی:

"اُردو بھاشا بھاشیوں کے ہت میں دوسری راجیہ بھاشا کے روپ میں اُردو کا پریوگ ایسے پریوجنوں کے لئے کیا جائے گا جو راجیہ سرکار کے دوارا سمئے سمئے پر ادھی سُوچِت کیے جائیں۔"

یعنی اردو کا استعمال ان امور تک محدود ہوگا جن کا اعلان یوپی کی حکومت وقتاً فوقتاً کرتی رہے گی۔ اس قانون کے تحت اُردو کو کیا فوائد حاصل ہوں گے، اس کا ذکر اس بل کے اغراض و مقاصد میں کر دیا گیا ہے۔ مثلاً اُردو کا گزٹ شائع کرنا جو ہندی کے گزٹ کا ترجمہ ہوتا ہے اور ہندی گزٹ کے شائع ہونے کے کئی ماہ بعد چھاپا جاتا ہے۔ سرکاری دفاتر میں اُردو میں درخواست وصول کرنے کی اجازت۔ اہم قوانین اور اہم اعلانات کا اُردو میں ترجمہ اور اشاعت اور اردو میں کاغذات کی رجسٹری وغیرہ (اُردو کا یہ حق وشوناتھ پرتاپ سنگھ کی حکومت نے ۱۹۸۱ء میں ختم کر دیا تھا)۔ یہ نام نہاد حقوق کئی مرتبہ پہلے بھی دیئے جا چکے تھے اور ختم بھی ہو چکے تھے مگر اس بات کو کبھی تسلیم نہیں کیا گیا تھا کہ اس ریاست کے شہریوں کی ایک بہت بڑی تعداد ایسی ہے جس کی مادری زبان اُردو ہے۔

پہلی بار سماج وادی پارٹی نے اپنے مینی فیسٹو میں اور وزیر اعلا شری ملائم سنگھ یادو نے اپنے بیانات میں "لسانی پالیسی" کا اعلان کیا اور اس بات کو تسلیم کیا کہ دس کروڑ کی آبادی کی اس ریاست میں ایک بہت بڑی تعداد میں ایسے شہری ہیں جن کی مادری زبان اُردو ہے۔ انھوں نے کہا کہ ان کی سرکار کی پالیسی یہ ہے کہ:

"سب سرکاری کام دیسی زبان میں ہو۔ ہندی سرکاری زبان ہے مگر اُردو بھی یہاں کے بہت بڑی تعداد کے شہریوں کی زبان ہے اس کو اپنا وہ حق ملنا چاہیئے جو ہندستان کے دستورِ اساسی میں دیا گیا ہے۔ ہم نے اردو کی تعلیم کا مناسب انتظام اور اُردو کو روٹی روزی سے جوڑنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

وزیر اعلا شری ملائم سنگھ یادو نے دو سطحوں پر اُردو کے حقوق کے تحفظ کا اعلان کیا:

(۱) تعلیمی سطح پر۔ یعنی اُردو بھاشی بچوں کی مادری زبان کی تعلیم کا انتظام
(۲) اُردو زبان داں طبقہ کو روزی فراہم کرنے کے اقدامات کرنا۔

اُردو کو 'روزی روٹی سے جوڑنے' کا کام نسبتاً آسان ہے۔ انھوں نے اُردو کو سرکاری دفاتر میں جگہ دینے کی بات کی ہے اور یہ اعلان کیا ہے کہ وہ حکومت کی ہر سطح پر یعنی بلاک آفس سے لے کر ریاستی حکومت کے دفاتر میں ہر جگہ اُردو مترجم کا تقرر کریں گے تاکہ اُردو میں جو درخواستیں آئیں ان کا فوری ترجمہ ہندی میں کیا جائے اور جو بھی سرکاری فیصلے ہوں ان کا اُردو ترجمہ کر کے درخواست دہندہ کو بھیجا جائے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر جگہ ایک نیا آدمی مقرر کیا جائے۔ اگر کسی دفتر میں کوئی ایسا کارکن مل جائے جو ہندی کے علاوہ اچھی اُردو بھی جانتا ہو تو اس کو مزید تنخواہ دے کر اس سے بھی ترجمہ کا کام لیا جا سکتا ہے۔ اس تجویز سے سرکاری ملازموں کو اُردو سیکھنے کی نئی خواہش پیدا ہونا لازمی ہے اور یہ اُردو داں طبقہ کو آسانی فراہم کرنے کے علاوہ اُردو کی مقبولیت میں بھی اضافہ کرے گا۔

اس کے علاوہ انھوں نے ایک اہم اعلان یہ کیا ہے کہ جلد ہی ریاستی پبلک سروس کمیشن کے مقابلے کے امتحانوں میں اردو کو بھی ذریعہ امتحان بنایا جائے گا۔ یہ سرکاری سطح پر اردو کو اہمیت کا حامل بنا دے گا۔

انھوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ نئی حفاظتی فورس (ٹاسک فورس) میں ان لوگوں کو بھرتی میں ترجیح دی جائے گی جو ہندی کے علاوہ ایک اور قومی زبان جانتے ہوں۔ اس سے اردو جاننے والوں کو ٹاسک فورس میں بھرتی ہونے میں آسانی ہو جائے گی۔

ملازمت فراہم کرنے سے زیادہ اہم مسئلہ اردو کی تعلیم کا تھا جس کے نہ ہونے سے ایک بہت بڑی تعداد میں بچے اپنی مادری زبان سے محروم ہو گئے تھے۔ اردو کی تعلیم میں پچھلی حکومتوں نے طرح طرح کی دقتیں پیدا کر کے تعلیم کے مسئلے کو بالکل الجھا دیا تھا۔ اردو زبان پر کالجوں اور اسکولوں کے دروازے تقریباً بند کر دیئے تھے۔ ریاستی حکومتوں کے اردو مخالف رویے سے نہ صرف اردو بھاشیوں کو شکایت تھی بلکہ خود مرکزی حکومت کو یہ شکایت پیدا ہو گئی تھی کہ یہاں اردو اقلیت کے حقوق کو پامال کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں ۱۹۵۸ء میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ایک تجویز بھی ریاستی حکومت کی تنقید کرتے ہوئے پاس کی تھی اس کے بعد مرکزی حکومت نے دستور ہند میں ترمیم کے لئے اقدام کیے اور دستور ہند میں دفعات ۳۵۰ (الف) اور ۳۵۰ (ب) شامل کی گئیں۔ دفعہ ۳۵۰ (الف) میں یہ حکم دیا گیا کہ:

"ہر ریاستی حکومت اور ریاست کے مقامی حکام کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ لسانی اقلیت کے بچوں کیلئے ابتدائی درجات میں مادری زبان کی تعلیم کا انتظام کرے۔ صدر مملکت کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ جب ضرورت محسوس کریں تو ریاستی حکومت کو اس سلسلے میں احکام صادر کریں۔"

دفعہ ۳۵۰ (ب) نے صدر جمہوریہ ہند کو یہ اختیار دیا کہ وہ ایک خصوصی افسر کو یہ جائزہ لینے کے لئے مقرر کریں کہ ریاستی حکومتیں اور ان کے ماتحت حکام لسانی اقلیتوں کے حقوق کا پوری طرح تحفظ کر رہے ہیں یا نہیں؟

مرکزی حکومت نے لاکھ جتن کیے مگر ریاستی حکومت کے محکمہ تعلیم کے افسران بھی اپنی پالیسی پر قائم رہنے کا ہنر جانتے تھے۔ مرکزی حکومت کی کوششیں اتر پردیش میں اردو کی قسمت نہ بدل سکیں۔ اسکولوں میں اردو تعلیم ختم ہو گئی اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اگر یہاں چند دینی مکاتب اور مدارس اپنے طلبا کو اردو نہ پڑھاتے تو اتر پردیش میں اردو داں کا فقدان ہو جاتا۔

وزیر اعلیٰ ملائم سنگھ یادو نے اردو کا مسئلہ ایک قومی زبان کا مسئلہ سمجھا ہے اور اس کو حل کرنے کا عزم کیا اور کہا کہ:

"اردو کروڑوں ہندوستانیوں کی زبان ہے۔ اسی سرزمین میں پیدا ہوئی ہے اور یہیں بڑھی ہے۔ یہ ہمارا تہذیبی ورثہ ہے اس کی حفاظت اور ترقی کے لئے کام کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔"

چنانچہ انھوں نے پہلا اعلان تو یہ کیا کہ اردو کو سہ لسانی فارمولے میں شامل کیا جائے گا اور ہر طالب علم کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ اسکول میں تیسری زبان کی حیثیت سے اگر چاہے تو اردو پڑھے اور چاہے تو سنسکرت پڑھے۔

پھر حکومت یو پی کی طرف سے اعلان ہوا کہ اتر پردیش میں ہر پرائمری اسکول میں ایک اردو معلم کا انتظام کیا جائے گا کیوں کہ اس ریاست میں کوئی ایسا مقام نہیں ہے جہاں کم از کم پانچ بچے اردو لسانی اقلیت کے نہ موجود ہوں۔ اس کے لئے تقریباً ۱۵ ہزار معلموں کی ضرورت ہوگی مگر ان سب کے تقرر کے لئے کچھ وقت درکار ہوگا۔

انھوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ جہاں کہیں لسانی اقلیت کے افراد ایسے سکنڈری اسکول قائم کریں گے جن میں ذریعہ تعلیم اردو ہوگی تو حکومت ان کو منظوری دے گی اور ضروری مالی امداد کرے گی۔

وزیر اعلیٰ کا
جرأت مندانہ اقدام

شری ملائم سنگھ نے ایک جرأت مندانہ اقدام یہ کیا کہ یہ اعلان کر دیا کہ پرائمری سے لے کر سکنڈری اسکولوں تک جو بھی ادارے لسانی اقلیتوں نے قائم کیے ہوں ان کو اقلیتی ادارہ کی حیثیت سے منظوری دی جائے گی۔ اس سے پیشتر ریاستی حکومت کے بیسک ایجوکیشن بورڈ نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ پرائمری اور جونیئر اسکول کی سطح پر کسی بھی تعلیمی ادارے کو اقلیتی ادارے کی حیثیت سے منظور نہیں کیا جائے گا کیونکہ ان اداروں کو اقلیتی ادارے کی حیثیت سے

تسلیم کرنے سے قومی یک جہتی کو سخت صدمہ پہونچے گا۔" اگرچہ یو۔پی بیسک ایجوکیشن بورڈ کا یہ فیصلہ دستورِ ہند کی دفعات ۲۹، اور ۳۰ کے سراسر منافی تھا، مگر حکومت یو۔پی اپنے بورڈ کے اس فیصلے کو دستورِ ہند کی دفعات پر فوقیت دیتی رہی۔

وزیرِ اعلا ملائم سنگھ نے اعلان کیا کہ کسی ادارے کی اقلیتی حیثیت تسلیم کرنے کے مسئلہ پر ان کی حکومت دستورِ ہند کی ہر دفعہ کی پیروی کرے گی جو اقلیتوں کے حق میں ہو۔ اقلیتی حیثیت کی منظوری دینے کے لیے انھوں نے ایک کمیٹی مقرر کردی ہے جس کو ہدایت کردی گئی ہے کہ وہ اقلیتی حیثیت کے مسئلہ پر جتنی بھی درخواستیں ہیں ان پر جلد فیصلہ کرے۔

اُردو حقوق کے عمل درآمد پر محکمہ تعلیمات کے افسران نے جو مشکلات پیدا کی تھیں وہ تو تھیں ہی، خود اُردو والوں نے اس کے راستے میں کچھ کم کانٹے نہیں بوئے تھے۔ ۱۹۶۱ء میں جب مرکزی حکومت نے لسانی اقلیتوں کے حقوق کے تحفّظ کے لیے ضروری اقدامات کیے اور اس سلسلے میں تفصیلی احکامات جاری کیے تو حکومتِ یو۔پی نے حسبِ عادت ان احکامات پر عمل سے گریز چاہا، لیکن مرکزی حکومت نے اس مسئلہ پر ریاستی حکومت کو بار بار ہدایتیں بھیجنا شروع کیں اور حکومت یو۔پی کی دستورِ ہند کی خلاف ورزی پر گرفت کی تو اس پریشانی سے بچنے کے لئے یو۔پی گورنمنٹ نے ایک کمیٹی اچاریہ جے۔ بی۔ کرپلانی کی صدارت میں اُردو کے متعلق تمام احکامات کی تحقیق کے لئے ضروری سفارشات کے لئے مقرر کی۔ کمیٹی کے چیرمین تو اچاریہ کرپلانی تھے اور اس کے سکریٹری ایک آئی۔ اے۔ ایس افسر پنڈت جی۔ پی۔ پانڈے تھے۔ اس وقت یہ مشہور تھا کہ پانڈے جی اصولی طور پر اُردو کو پسند نہیں کرتے۔ مگر ان کے علاوہ زیادہ تر لوگ ایسے تھے جو محافظِ اردو، مجاہدِ اُردو اور خدا جانے کیا کیا سمجھے جاتے تھے، ان میں ایک عساکرِ اُردو کے سپہ سالار بھی تھے۔

اس کمیٹی نے جو سفارشات کیں ان سے اُردو کا مسئلہ اور گنجلک ہو گیا۔ حکومتِ ہند نے لسانی اقلیتوں کے حقوق کے تحفّظ کے لیے جتنے اقدامات تجویز کیے تھے اس کمیٹی نے سب رد کر دیئے، یعنی اُردو کو سہ لسانی فارمولے میں جگہ دینا ممکن نہیں۔ اسکولوں میں ایسا کوئی رجسٹر نہیں رکھا جا سکتا جس میں اسکول کھلنے سے قبل والدین اپنے بچے کی مادری زبان کا اندراج کرا سکیں۔ سکنڈری ایجوکیشن میں ذریعہ تعلیم اُردو بنانے کی ضرورت نہیں کیوں کہ اُردو بولنے والی اقلیت کے بچے ہندی بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں اور خود ہی اُردو میں تعلیم حاصل کرنا نہیں چاہتے۔ پرائمری درجات میں اُردو پڑھنے کا کوئی خاص مطالبہ نہیں ہے۔ کچھ لوگوں نے شکایت کی ہے کہ پرائمری اسکولوں میں اُردو پڑھانے کا انتظام نہیں ہے مگر محکمہ تعلیم کے دو افسروں نے کہا کہ یہ شکایت غلط ہے۔ ان کو اس سلسلے میں بہت کم شکایتیں ملی ہیں اور جو ملیں بھی وہ زیادہ تر غلط ثابت ہوئیں۔ اور اگر کہیں اتفاق سے انتظام میں کہیں خامی رہ گئی تو اس کو فوراً درست کردیا گیا ہے۔

مولانا شاہد فاخری (ایم ایل سی) کانگریس کے پرانے کارکن تھے اور بچپن سے کانگریس کی ہر تحریک پر جیل گئے تھے۔ انھوں نے شکایت کی کہ سہ لسانی فارمولے میں سنسکرت کو شامل کرکے غلطی کی گئی کیونکہ سنسکرت رائج الوقت "ماڈرن زبان" نہیں ہے جیسا کہ فارمولے میں دیا گیا ہے۔ کمیٹی نے ان کے اس مطالبہ کو رد کرتے ہوئے کہا کہ دستورِ ہند میں جتنی زبانوں کا ذکر ہے اس میں سے کوئی بھی زبان اس فارمولے میں شامل کی جا سکتی ہے۔ سنسکرت کو بھی اتنا ہی حق ہے جتنا اور زبانوں کو۔ یو۔پی کے اسکولوں میں صرف ایک ہی زبان کا انتظام ہو سکتا ہے، دستورِ ہند میں دی ہوئی سب ۱۴ زبانوں کا انتظام نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اگر زیادہ تر اسکول سنسکرت پسند کرتے ہیں تو پھر وہاں کسی دوسری زبان میں تعلیم کا بندوبست ضروری نہیں۔

کمیٹی کی تمام سفارشات اتفاقِ رائے سے منظور ہوئی تھیں۔ اس اتفاقِ رائے پر عساکرِ اُردو کے سپہ سالار کے دستخط سب سے اوپر تھے۔ جب کمیٹی کے دوسرے ممبران سے پوچھا گیا کہ آپ نے اس رپورٹ پر کیسے دستخط کر دیئے تو انھوں نے کہا کہ "سپہ سالار کے دستخط دیکھ کر ہم نے اس کی پیروی کی۔"

یہ حیرت کا مقام نہیں کہ یو۔پی میں لسانی زبانوں میں خصوصاً اُردو کا مسئلہ اتنا پیچیدہ بن گیا۔ اس کو حل کرنے کے لئے ایک بہت جرأت مند اور کھلے ذہن کے رہنما کی ضرورت تھی اور وہ ملائم سنگھ یادو ثابت ہوئے۔

□□

میرا پیارا وطن

میرا پیارا وطن میرا پیارا وطن!
پیار کا ہے جہاں اک انوکھا چلن

رقص کرتی ہے سورج کی ہر اک کرن
کہہ رہی ہے ہر زباں آؤ کرلیں ملن

رات ہو مالوے کی یا شامِ اودھ
دونوں یکساں یہاں جھومتے تن بدن

دیکھتے ہیں سبھی حسن کشمیر کا
میرے پنجاب کا ہے الگ بانکپن

لکھنؤی عشق بھی جیسے کمخواب ہے
ہر ادا سے جھلکتا ہے اک حسنِ ظن

عظمتِ تاج اے دوستو خوب ہے
اور اجنتا ایلورا کا بھی حسنِ فن

دلّی دل ہے میرے ہند کا دوستو
ہے یہ رنگین پھولوں کا ہی اک چمن

مسجدوں کی اذاں دیکھئے ہند میں
مندروں میں بھی نت ہو رہا ہے بھجن

خانقاہیں، مقابر، کلیسے بہت
کتنے مشہور ہیں آشرم اور بھون

سادھو سنت اور صوفی قلندر ہوئے
پیار کے گیت گونجے نگر گاؤں بن

پیار کی بات ہو ہر قدم ہر گھڑی
آؤ تشکیل دیں اک نئی انجمن

ہم تو ہیں آب نازاں لیے ہیں سدا
عرش سے آرہا آبِ گنگ و جمن

□□

ڈاکٹر [illegible] ورسی
[illegible]
[illegible] ۱۱۰۰۰۶

غزل

بس اک نگاہ سے مست شراب کرکے مجھے
کسی نے چھوڑ دیا ہے خراب کرکے مجھے

مرے سوال پہ آنکھیں اٹھی تھیں لب نہ ہلے
دیا جواب مگر لاجواب کرکے مجھے

وہ اس ادا سے چلے آج اجنبی بن کر
نظر چرا کے نظر سے خطاب کرکے مجھے

طرح طرح سے دکھایا گیا ہے دنیا کو
کبھی حجاب کبھی بے حجاب کرکے مجھے

حیات درد ہے اور درد ہے حیات مری
ازل نے درد دیا انتخاب کرکے مجھے

کہاں یہ چھوڑ دیا لاکے زندگی تو نے
اسیرِ زلف قتیلِ شباب کرکے مجھے

شکستِ شوق نے جس نے مجھے بچایا تھا
وہ شخص پھر نہ ملا کامیاب کرکے مجھے

رہا نہ فوق زمانے سے اب کوئی پردہ
نتیجہ دیکھ لیا بے نقاب کرکے مجھے

فوق کریمی
کریمی بلڈنگ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

رام لعل نابھوی
محلہ دیوان، نابھا (پنجاب)

نادر کاکوروی

اتفاق سے ہمیں "ماہِ نو" کراچی کا ستمبر ۱۹۵۹ء کا شمارہ ہاتھ لگا اس میں ایک مضمون بعنوان "نادر کاکوروی" تھا جسے ممتاز حسن صاحب نے لکھا تھا۔ نادر کاکوروی صاحب کا نام ہم نے سن رکھا تھا لیکن کوئی مضمون نظر سے نہیں گزرا تھا۔ ممتاز حسین صاحب نے نادر کو تلاش کرنے میں جو سعی کی، اس کا ذکر ضروری ہے۔ لکھتے ہیں:

"رہا نادر کا کلام تو اس وقت "جذباتِ نادر" جو اُن کی شاعری کا واحد مجموعہ ہے۔ صحیح معنوں میں نادر بلکہ نایاب ہے۔ مجموعہ کا دوسرا حصہ آج سے کچھ سال پہلے ہندستان میں مل سکتا تھا، اب وہاں بھی قریب قریب ناپید ہے۔ پہلا حصہ میں نے کہیں بازار میں نہیں دیکھا نہ پاکستان میں نہ ہندستان میں۔ البتہ ایک غیر معروف لائبریری سے حاصل کیا تھا۔ اس لائبریری کے نسخے کے علاوہ کہیں نشان نہیں ملا .... یہ تو نادر کی شاعری کا حال ہے۔ نثر کا کوئی مستقل کارنامہ ان سے منسوب نہیں ہے۔ البتہ ان کے ایک ابتدائی ناول "دلہن ڈاکو" کا ذکر ملتا ہے اور اس کا بھی محض نام ہی نام ہے، نشان کہیں نہیں۔"

ممتاز حسین صاحب ایک صحیح محقق کی طرح ایک تذکرہ ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"عباسیان کاکوروی کے نام سے ان کے خاندان کا ایک مبسوط تبصرہ چھپا ہے جو اسی خاندان کے ایک رکن کی تصنیف ہے۔ اس تذکرے میں خاندان کے اکثر افراد کے حالات کے بیان میں خاصی تفصیل سے کام لیا گیا ہے مگر نادر کا ذکر بہت ہی سرسری سا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وضعدار اور قدامت پسند خاندان کے تذکرے میں نادر جیسے آزاد طبع انسان کے لیے زیادہ گنجائش نہیں نکل سکی ہے میں نے احباب کے وسیلے سے ان کے حالات معلوم کرنا چاہے مگر کامیابی نہیں ہوئی۔"

ممتاز حسین صاحب نے ایک نظم "لالہ رُخ" کا بھی ذکر کیا ہے جو جذباتِ نادر" حصہ دوم میں شامل ہے۔

میرے سامنے "جذباتِ نادر کاکوروی" حصہ دوم اور "مثنوی لائٹ آف حرم" (لالہ رُخ) پڑی ہیں۔ "جذباتِ نادر" میں ایک نظم "پیکر بے زبان" درج ہے۔ یہ نظم رسالہ "ادیب" الہ آباد مئی ۱۹۱۰ء میں نادر کی تصویر کے ساتھ چھپی تھی۔ یہ رسالہ بھی میرے سامنے پڑا ہے۔ اس میں تصویر کا حوالہ ہے لیکن تصویر نہیں ہے۔

نادر کے کلام کا مختصر تجزیہ رام بابو سکسینہ نے اپنی تصنیف "تاریخ ادبِ اُردو" میں، ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ نے اپنے مضمون "جدید اُردو شاعری" میں، ڈاکٹر گراہم بیلی نے "اُردو ادب کی تاریخ" میں اور "شعرالہند" کے مصنف نے کیا ہے۔

رام بابو سکسینہ رقمطراز ہیں:

"نادر کاکوروی متوفی ۱۹۱۲ء نادر علی خاں نادر طرز جدید کے بہت عمدہ لکھنے والوں میں سے تھے۔ اس رنگ میں ان کی اکثر نظمیں بہت مشہور ہیں۔ درد و اثر، اعلیٰ تخیل، حبِ وطن ان کے کلام کی خصوصیات میں سے ہیں۔ یہ

انگریزی شعراء بائرن اور ٹامس کے دلدادہ تھے اور چاہتے تھے کہ انھیں کا رنگ نہایت سلیس اور عمدہ طریقے سے اردو میں بھی داخل ہو جائے۔ ان کی نظمیں "شمع و پروانہ"۔ "شعاعِ امید"۔ "بیکسیٔ زبان"۔ "فلسفۂ شعری" بہت مشہور ہیں۔ ان کو اپنے وطن یعنی ہندستان سے عشق تھا، چنانچہ ان کے وطنی جذبات کی نظمیں "مقدس سرزمین" اور "مادرِ ہند" دیکھنے کے قابل ہیں۔ ٹامس مور کی کتاب "لالۂ رُخ" کے طرز پر انھوں نے بھی ایک مثنوی لکھی ہے اور اس کا نام بھی 'لالۂ رُخ' رکھا ہے۔ ان کا انتقال عین جوانی یعنی چھتالیس برس کی عمر میں ۱۹۱۲ء میں ہوا۔ اس بے ہنگام سانحے سے ادبی دنیا نے جو اُمیدیں قائم کی تھیں، ان سب پر پانی پھر گیا۔"

شیخ نادر علی عباسی، ۱۸۶۷ء میں کاکوری کے مشہور عباسی خاندان میں پیدا ہوئے، ۱۹۱۲ء میں انتقال فرما گئے۔ کل پینتالیس سال جیے۔ دو لڑکیاں اور ایک لڑکا ان کی اولادیں تھیں۔

آیئے پہلے "جذباتِ نادر کاکوروی" کے حصۂ دوم کی جزئیات دیکھیں۔ یہ کتاب نول کشور پریس سے ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی۔ تاریخ جو نکالی گئی ہے اس میں سال ۱۹۰۷ء درج ہے۔ ان کی ایک نظم "شاعر کا دل" ۱۹۰۲ء میں خدنگِ نظر میں شائع ہوئی۔ شروع ہی میں مولوی محمد عزیز مرزا، قاضی تلمذ حسین، مولوی عبدالحلیم شرر اور مولوی مرزا محمد ہادی صاحبان کی تقاریظ ہیں۔ فہرست مضامین ہے۔ رباعی سے آغاز کیا ہے جو فارسی میں ہے، پھر نظمیں ہیں، مزاحیہ نظمیں ہیں، وطنی نظمیں ہیں، مرثیے ہیں، قطعات ہیں، رباعیات ہیں، غزلیات عاشقانہ ہیں۔ مشاعروں کے مصرع طرح پر کلام ہے۔ فارسی میں تاریخ سر راجہ امیر حسن خاں صاحب محمود آباد کی ہے اردو میں تاریخ نادر نے لکھی ہے۔ آخر میں رُباعی اختتام فارسی میں ہے۔

دوسری کتاب سر ٹامس مور کی "لائٹ آف حرم" (لالہ رخ) کا منظوم اُردو ترجمہ ہے۔ یہ بھی نول کشور پریس سے ۱۹۱۰ء میں چھپی۔

دوسرے معنوں میں نادر نے نظمیں، غزلیں، رُباعی، قطعہ، مرثیہ، تراجم، تاریخ، مثنوی سب میں لکھی، فارسی میں بھی۔

اس سے پہلے کہ ان کے کلام کا تجزیہ کیا جائے، مناسب ہوگا اگر تقاریظ کا ذکر ہو جائے:

مولوی محمد عزیز مرزا لکھتے ہیں:—

"مسٹر نادر علی کاکوروی جن کی نظموں کا ایک نیا مجموعہ بنام "جذباتِ نادر" مطبع منشی نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوا ہے وہ اس نئی طرز سے ایک درخشاں گوہر ہیں۔ قدیم روش جس میں مقررہ جملے، بلند الفاظ اور مخصوص خیالات و توہمات تھے۔ اس روش سے کنارہ کر کے انھوں نے فطری طریق اور نئے خیالات کو اختیار کیا۔ ان کی طبیعت فطرتاً فلسفیانہ واقع ہوئی ہے۔

... یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مغرب کے خیالات کو مشرق کی شاعرانہ زبان میں کیونکر ادا کریں۔ انھوں نے اگرچہ پامال روش کو چھوڑ دیا ہے اور بہت زیادہ انگریزی طریق کا استعمال کیا ہے مگر وہ اپنے اس نئے طرز کو اس خوبی سے نباہتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کوئی نیا کام اپنے اوپر نہیں لیا ہے۔ ان کی شاعری صرف انگریزی کی نقالی نہیں ہے ... سر ٹامس مور کی کتاب لائٹ آف دی حرم (لالہ رُخ) کے ترجمے سے انھوں نے اُردو زبان میں ایک قابل قدر اضافہ کیا ہے ... ان کا طرز بیان اس قدر نیچرل اور ان کے الفاظ ایسے خوشنما واقع ہوئے ہیں کہ ترجمے کے بجائے نظم اصل معلوم ہوتی ہے۔"

قاضی تلمذ حسین صاحب کا کہنا ہے:

"... جو لوگ کہ صحیح روز مرہ اور بامحاورہ اُردو میں نئے تخیل کا پیدا کرنا محال سمجھتے ہیں۔ ان کی خدمت میں یہ کلام تمثیلاً پیش کیے جانے کے قابل ہے۔ دوسرا حصہ اس مجموعے کا سر ٹامس مور کی انگریزی مثنوی لائٹ آف دی حرم کا اُردو نظم میں ترجمہ ہے۔ کسی زبان کی تخیل کو دوسری زبان میں بجنسہٖ منتقل کرنا یعنی اس طرح کہ اس کی

تمام شاعرانہ خوبیاں اور تخیل کی باریکیاں قائم رہیں حقیقت میں نہایت ہی مشکل کام ہے۔ لیکن قابل مترجم نے اس کام میں حیرت ناک کامیابی حاصل کی ہے۔ یہ مثنوی اُردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔۔۔۔"

مولوی عبدالحلیم شررؔ فرماتے ہیں: ــــــــ

"۔۔۔ حضرت نادر نے کوشش کی ہے کہ انگریزی شاعری کے لطیف مذاق کو اُردو میں پیدا کریں چنانچہ اس مجموعہ میں اکثر تو انگریزی کی مشہور نظموں کے ترجمے ہیں اور بہت سی نظمیں جو شاعر کے اصلی خیالات وجذبات کو ظاہر کر رہی ہیں وہ بھی اس قدر انگریزی شاعری کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں کہ ان پر بھی ترجمہ ہی کا دھوکا ہوتا ہے۔ حضرت نادرؔ نے شعرائے اُردو کی ایک نئے میدان میں رہبری کی ہے اور ایک بہت وسیع حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔۔۔۔"

مرزا محمد ہادی صاحب کا کہنا ہے: ــــــــ

"۔۔۔۔ بتحقیق انہی صاحبان کا حق ہے جو زبان کو اکتساباً حاصل کرتے ہیں۔ تشبیہ اور استعارے نادر ہیں ہر ایک مضمون اچھی طرح سج سجا کے ناظر کے سامنے پیش کیا ہے"۔۔

سب سے پہلی نظم "شاعر کا دل" ہے۔ ذیل کی نظم انگلستان کے مشہور ملک الشعرا ٹینی سن کی مشہور نظم Poet's mind کا ترجمہ ہے۔ اس نظم کو شروع کرنے سے پہلے مصنف کا ایک وضاحتی نوٹ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انگریزی نظموں کو بمقابلہ اردو اوزان کے نظم کہنا ہی نہیں چاہیئے۔ ان کے دو مصرعے بمشکل ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے اور ایک پیمانہ سے نپے ہوئے ملیں گے۔ ایک اکثر انگل بھر کا تو دوسرا اکثر چار انگل کا ــ کہیں ایک بند میں چار مصرعے ہو گئے کہیں پانچ۔ ایسی بے قاعدہ نظموں کو اردو کے ایک ایسے نپے تلے اوزان میں تولنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔۔۔۔ جس قدر اضافہ مجبوراً کرنا پڑے اس کو صاف دکھا دینا چاہیئے۔۔۔

اس مختصر نوٹ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ نادر کو انگریزی شاعری سے بے حد انس تھا اور ان کی پوری شاعری پر جو ترجموں کے علاوہ بھی ہے' انگریزی شاعری کا اثر ہے۔ ان کے زمانے میں حالیؔ اور آزادؔ کی نیچرل شاعری پروان چڑھ چکی تھی۔ یہ تحریک انگریزی شاعری سے متاثر تھی اور کرنل ہالرائڈ' ناظم تعلیمات پنجاب کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ نادرؔ بھی ردیف اور قوافی کی جکڑ بندیوں سے پرے رہنا چاہتے تھے چنانچہ انھوں نے لکھا ہے کہ "شعرا کی نکتہ سنج جماعت (جن کا یہ حال ہے کہ صرف قافیہ نہ ہونے سے نظم کو موزوں ہی نہیں مانتے) اس کو قبولیت کی نظر سے دیکھے، کوئی آسان کام نہیں۔"

ایک شعر' شاعر کا دل' سے ملاحظہ ہو ؎

صاف اور روشن رواں ہیں صورت نہر بلور
صاف مثلِ بادِ (بستاں) اور روشن مثلِ نور

اس میں 'بستاں' کا اضافہ ضرورتِ شعری سے مجبور ہو کر کیا گیا ہے۔

دوسرا ترجمہ "آنسو" ہے۔ یہ نظم 'خدنگ نظر' اپریل ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی اور لائق ایڈیٹر نے لکھا:

"انگلستان کے مشہور شاعر لارڈ بائرن نے آنسوؤں پر ایک دلکش نظم لکھی ہے جس میں آنسوؤں کے مختلف اثرات وجذبات کو ایک ایک بند میں جداگانہ طور پر نظم کیا ہے۔ انگریزی شاعری میں زیادہ تر اشارات اور محذوفات سے کام لیا جاتا ہے اور تھوڑے سے الفاظ میں بہت سا مطلب ادا کر دینا لٹریچر کے اصول میں داخل ہے لیکن ہماری زبان میں نہ ایسے جامع الفاظ موجود ہیں نہ محذوفات سے کام لینے کی اجازت ہے۔ اس حالت میں ترجمے کی دقتیں محتاج تصریح نہیں۔ لیکن ذیل کے ترجمے میں ہمارے نامور دوست منشی نادر علی خاں صاحب نادرؔ کاکوروی نے ان دقتوں کو آسانی سے حل کر دیا ہے اور مصنف کے خیالات کو ہر بند میں اسی اختصار کے ساتھ اپنی زبان میں لیا ہے جو انگریزی لٹریچر کی شان ہے"۔

دو شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

لے مرے احباب رخصت تم سے ہوتا ہوں مگر
ایک حسرت لے چلا ہوں میں دلِ رنجور میں

گر کبھی پھر ہو جہاں میں اتفاق ایسا تو کاش
جس طرح روتے جُدا ہوتے ہیں روتے ہی ملیں

تیسرا ترجمہ "مرحومہ کی یاد میں" جادو بیان ٹامس مور کی آئرش ملاڈیز سے ایک مختصر اور پُرنم نظم کا ترجمہ ہے۔ دُو شعر دیکھئے،

رات کے پچھلے پہر روتی ہیں جب چشمِ نجوم
الفتِ دیرینہ کی وادی میں اُڑ جاتا ہوں میں

اور اس وادی میں مرحومہ جو یاد آتی ہو تم
محو ہو جاتا ہوں کچھ ایسا مزا پاتا ہوں میں

چوتھا ترجمہ ایک واقعہ پر مبنی ہے ... اسے انگلستان کے ایک شاعر Rose Hartwick Thorpe نے انگریزی میں نظم کیا۔ یہ واقعہ ایثار اور قربانی کی ایک کہانی" بعنوان گھنٹہ نہیں بجے گا" اس کا آخری شعر ملاحظہ ہو ؎

جا نیک بخت شوہر زندہ ترا رہے گا
اور آج گھنٹہ گھر کا گھنٹہ نہیں بجے گا

اگلا ترجمہ "گذرے زمانے کی یاد" بھی ٹامس مور کی نظم ہے۔

تراجم کے سلسلے میں "لائٹ آف حرم" (لالہ رخ) کا ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ سر ٹامس مور کی نظم کا ترجمہ اُردو نظم میں ہے۔ ۱۹ مضامین ہیں۔ نادر نے جہاں ضروری سمجھا، وضاحتی نوٹ بھی دیے ہیں۔ "کشمیر کی شام" کا ایک شعر ہے ؎

محفل میں بن سنور کے آئے
اور وہ گھونگھرو بجا کے گائے

نادر لکھتے ہیں : ــــــ

"گھونگھرو بجا کے گائے۔ ٹامس مور نے اس موقع پر لفظ کا کمر میں گھونگھرو باندھ کر ناچنا نظم کیا ہے لیکن چونکہ کمر میں گھونگھرو باندھ کر ناچنے کا رواج بظاہر ہندستان میں پایا نہیں جاتا اور غالباً کشمیر میں بھی نہ ہو لہٰذا کمر کی لفظ ترجمے میں نہیں رکھی گئی۔"

کچھ نظمیں فارسی میں ترجمہ کی گئی ہیں۔

"نورِ محل کا جشن" سے دو شعر دیکھیے ؎

یہ ہیں سب عشق کے تماشے   دُنیا میں حسن بھی ہے کیا شے
اک حسن ایسا کہ جس کا جلوہ
ہر وقت ہو اک طرح پہ رہتا

تراجم کی دُنیا سے نکل کر آئیے ان کے ذاتی کلام کو بھی دیکھیں۔ یہ بات پہلے کہی جا چکی ہے کہ وہ مختلف اصناف میں شاعری کرتے تھے۔

"تصویرِ بے زباں" ان کی ایک نظم ہے۔ یہ نظم رسالہ ادیب مئی ۱۹۱۰ء میں ہمراہ تصویرِ نادر شائع ہوئی۔ ایڈیٹر نے جو ریویو اس پر لکھا وہ قابلِ ملاحظہ اور توجہ ہے : ــــــ

"مندرجہ بالا نظم کے ساتھ حضرت نادر کی تصویر جو اس کے مقابل میں جلوہ افروز ہے ایک بالکل انوکھی تلمیح پیش کرتی ہے۔ کچھ عرصہ ہوا کہ ہم نے ایک خاص مرقع کیلئے اپنے دیرینہ دوست جناب نادر سے ان کی تصویر مانگی تھی۔ تصویر کے ساتھ نازک خیال شاعر نے ایک نظم بھی ارسال کی جو بالکل نئی اور انوکھی طرزِ خیال پر مبنی تھی اور جسے ہم ایک عمدہ تلمیح کہہ سکتے ہیں۔ مرقع مذکور کی تیاری میں اس لیے ناکامی ہوئی کہ ادیب کے خاص خاص قلمی معاونین میں سے بعض حضرات نے اپنے فوٹو بھیجنے میں خاص معذرت کی۔ ناچار جس قدر تصویریں آگئی ہیں انھیں خاص خاص موقعوں پر علاحدہ علاحدہ شائع کیا جائے گا۔ اس نظم میں جناب نادر کے مخاطب ہم ہیں نہ کوئی خیالی معشوق جیسا کہ عام مذاق کے مطابق شبہ ہو سکتا ہے۔"

اب اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے ؎

ان کا اصرار ہوا بھیج دو تصویر اپنی
میں سمجھتا تھا کہ رُسوائی ہے تشہیر اپنی

کہ یہ تصویر ہے تصویر میں آواز کہاں
وہ جس انداز کے خواہاں ہیں وہ انداز کہاں

لیجئے! بھیج کے رُسوائی میرے ہاتھ آئی
کیوں نہ کہتا تھا میں آخر کو وہی بات آئی

اب وہ کہتے ہیں کہ تصویر بھی کچھ بات کرے

بگڑ بیٹھے بدلے کچھ اظہار خیالات کرے
"تازہ تصنیف کوئی اپنی غزل پڑھ کے سنائے
کچھ پھڑکتے ہوئے اشعار ہی یہ اپنے سنائے
اس لیے اس کو بلایا ہے کہ صورت دیکھیں
اس کی تقریر نہیں اس کی طلاقت دیکھیں
اس میں طاقت ہی نہیں جب سخن آرائی کی
تو یہ تصویر بھی اک شکل ہے رسوائی کی

بے زباں چیز سے ہے نغمہ طرازی کی امید
قبر حاتم سے ہے مہمان نوازی کی امید
کون کہدے کوئی اس منزلِ عالی میں نہیں
صاحبِ خانہ اب اس خانۂ خالی میں نہیں
شاہ جی آگے بڑھو اور کوئی در دیکھو
جاؤ بستی کی طرف کوئی بھرا گھر دیکھو

اس نظم میں کس قدر تازگی، شگفتگی ہے۔ کتنا نیا پن ہے اور کتنا انوکھا طرز خیال ہے۔ یہ نادر ہی کا حصہ ہے۔

نادر نے اوپر لفظ "اُٹھ" پر جو نشان دیا ہے اس کے متعلق نیچے حاشیے میں لکھتے ہیں:

" ہرچند قوافی میں اس قسم کا تصرف ناجائز اور غلطی ہے لیکن مذہبِ شعراء میں مضامین اور روانی کا خوف کر کے اصولِ قافیہ کی پابندی کرنا گناہ بلکہ گناہ کبیرہ ہے شاعری میں نیا تخیل پیدا کرنے اور نئی روح پھونکنے کے لئے ضرورت ہے کہ اصولی پابندی محدود کر کے اس کا میدان زیادہ وسیع کیا جائے لہٰذا آزاد خیال شعراء جان بوجھ کر اس قسم کی غلطیوں سے درگزر کرتے رہے ہیں۔"

مولوی محمد عزیز مرزا اور ممتاز حسن صاحب کا یہ خیال کہ نادر کے کلام میں قنوطیت کا رنگ جھلکتا ہے، صحیح ہے لیکن ان کے مکمل کلام کو پڑھنے سے ان کے ظرافت طبع، طبیعت کی شوخی اور قدرے چھیڑ چھاڑ کا بھی بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

ایسے باکمال شاعر کا ذکر آج نہیں ہوتا۔ ان کی تصنیفات کو جمع کرنے اور چھپوانے کا خیال کسی کو نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ۱۹۱۰ء کے بعد بھی انھوں نے کچھ کہا ہو، اس کی تلاش بھی ضروری ہے۔ لیکن یہ کام یونیورسٹیوں کے اردو شعبوں، انجمنوں، اکادمیوں اور اداروں کا ہے۔ کیا ضروری ہے کہ جن کا ذکر بار بار ہو چکا ہے ان ہی کا ذکر ہوتا رہے۔ شاید اکبر نے اسی لیے کہا تھا ؎

خدا کے واسطے اکبر کوئی ذکر اور ہی چھیڑو
سُنی باتوں کا کیا سُننا کہی باتوں کا کیا کہنا

اور پھر کاکوری کا تو نام لینے سے ہی سر عقیدت سے جھک جاتا ہے۔

اتفاق دیکھئے کہ نادر کاکوروی کی وہی تصویر جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے خدا بخش اورینٹل لائبریری کی کتاب "نوبت رائے نظر کا ادیب" میں مل گئی۔ اسی لائبریری کی ایک اور کتاب "العصر لکھنؤ" میں کلام نادر کے عنوان سے ایک نظم بھی مل گئی، جس کا ایک بند ملاحظہ ہو ؎

خوشی سے خوشی کا نہ ہونا ہی اچھا
یہاں جان رو رو کے کھونا ہی اچھا
رُلانا ہی اچھا ہے، رونا ہی اچھا

"نادر مرحوم" کے عنوان سے "ادیب" نومبر ۱۹۱۲ء میں چھپا:

" ناظرینِ ادیب، یہ حسرت انگیز خبر پڑھ کر ضرور غمگین ہوں گے کہ ۲۰ اکتوبر کی صبح کے ۹ بجے منشی نادر علی خاں صاحب نادر کاکوروی نے اس جہانِ فانی سے رحلت فرمائی۔ مرحوم عرصۂ چھ ماہ سے علیل تھے، گلے میں خناق یک کرزہر بادی اثر پیدا ہو گیا تھا جس کا تین جگہ آپریشن بھی کیا گیا، مگر مشیتِ ایزدی سے کوئی چارہ نہیں۔

نادر مرحوم اخباری دنیا میں ایک مشہور شخص تھے ادیب مئی ۱۹۱۰ء کے شمارہ میں ان کی تصویر بھی شائع ہو چکی ہے۔ مرحوم کے چھوٹے بھائی نے نزع کی شب مصرع ذیل پڑھا ؎

قفس میں مرغِ بسمل کے تڑپنے کا مزا کیا ہو

(باقی صفحہ … پر)

غزلیں

اپنا سرمایہ یہی ہے تجھے دکھلائیں ہم
تیری راہوں میں گُلِ خواب بچھائیں ہم

رات بھی کیوں نہ یونہی پھر کے گزاری جائے
کیا پرندوں کی طرح شام کو گھر جائیں ہم

دن کا ہر لمحہ بنے زخمِ شکستِ پندار
شب کو بیداریٔ پیہم کی سزا پائیں ہم

چھُپ گیا چاند بھی اک اونچے مکاں کے پیچھے
غمِ تنہائی کہاں اب تجھے لے جائیں ہم

پھر یہ اس پر ہی ہمیں کوئی صدا دے کہ نہ دے
آخری بار سہی اس کو پکار آئیں ہم

کیوں میسّر نہیں کھُلتی ہوئی چیزیں مسرور
دل کو سمجھائیں کہ بازار کو سمجھائیں ہم

——— جمشید مسرور
لنڈی برگا سین اے ۴۶
این ۱۰۶۸ - اوسلو
ناروے

ہم جنوں میں بھی کبھی چاک گریباں نہ ہوئے
اہلِ دُنیا کی نگاہوں میں پشیماں نہ ہوئے

ہم کو یہ ناز ہے ہر حال میں انساں ہی رہے
کبھی ہندو نہ ہوئے اور مسلماں نہ ہوئے

زندگی کے بھی ستم ہم نے اٹھائے لیکن
کبھی دَولت کیلئے تاجرِ ایماں نہ ہوئے

ہم سدا اِن کے رہے فخرِ وطن، جانِ وطن
اور کسی دَور میں بھی ننگِ گلستاں نہ ہوئے

کسی مذہب کے ہوں انسان سبھی پیارے ہیں
ہم کسی رنگ میں بھی دشمنِ انساں نہ ہوئے

کشمکش کل بھی تھی اور آج بھی ہے آہ پیام
ہم وفاؤں، وہ جفاؤں پہ پشیماں نہ ہوئے

——— پیام فتحپوری
۲/۲۰ نگر مہاپالیکا کالونی
فہیم آباد - کان پور

محل ہیں سپنوں کے باتیں مباحثے ہیں بہت
فروغ تو ہے بہت کم، مظاہرے ہیں بہت

حروف و لفظ ہیں مضموں کے سب گہر صورت
نوشت چھوٹی ہر کاغذ کی حاشیے ہیں بہت

ابھی تو زُلفِ زمانہ میں اَن گنت خم ہیں
ابھی سنورنے میں دُنیا کے مرحلے ہیں بہت

چلیں تو کیسے چلیں جائیں ہم تو جائیں کدھر؟
مقام ایک ہے جانے کے راستے ہیں بہت

ہماری سوچ کا انداز ہے جُدا سب سے
ہماری فکر کے محور کے زاویے ہیں بہت

بسنت کم ہے یہ کیا بن کے مہرِ چرخِ ادب
بنا لیے ہیں سیاہی چمک رہے ہیں بہت

——— بسنت کمار نگم بسنت لکھنوی
۲۵۱/۴۹، ڈیرھی بازار
رکاب گنج
لکھنؤ

گورنر اترپردیش شری موتی لال وورا آرٹ گیلری لکھنؤ میں مدھوبنیا کی تصاویر دیکھتے ہوئے ساتھ میں فلم اسٹار شبانہ اعظمی بھی نظر آرہی ہیں۔





وزیر اعلا اترپردیش، شری ملائم سنگھ یادو پولیس لائن اٹاوہ میں ہوم گارڈ رضاکاروں کو شری کاٹ کی وردی تقسیم کرتے ہوئے

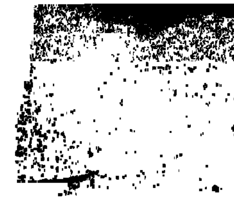


گورنر موتی لال وورا اور وزیر اعلیٰ شری ملائم سنگھ یادو یوم آزادی کے موقع پر کوی سمیلن میں کویوں کی حوصلہ افزائی

وزیر اعلیٰ شری ملائم سنگھ یادو ۱۳ اگست کو جسونت نگر اٹاوہ میں بیواؤں کو پنشن تقسیم کرتے ہوئے ۔



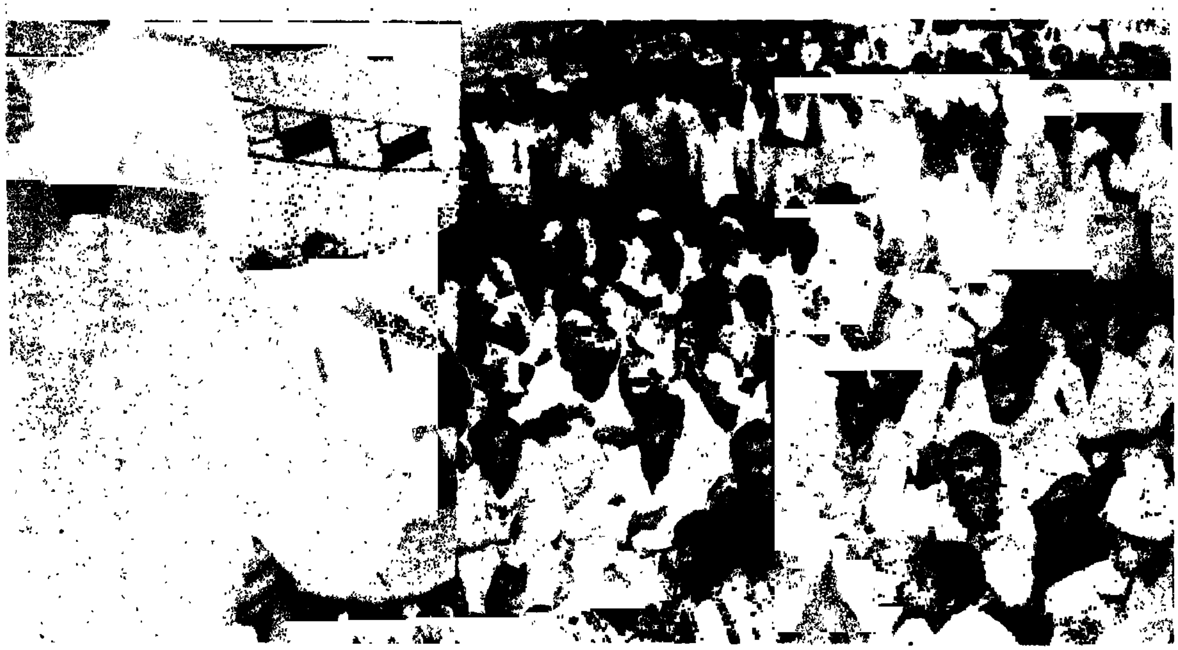






△ وزیر اعلیٰ اترپردیش شری ملائم سنگھ یادو مجاہدین آزادی کو اعزاز بخشتے ہوئے

وزیر تعمیرات عامہ شری بینی پرشاد ورما ۱۱ اگست کو
نہر آباد سیتاپور میں جلسے سے خطاب کرتے ہوئے ▽



وزیر اعلیٰ اتر پردیش
شری ملائم سنگھ یادو
بیس نکاتی پروگرام
میں گڑھوال ڈویژن
کے ریاست میں
اوّل آنے کا انعام
سکریٹری برائے اعلیٰ تعلیم
شری ایم راجندرن
کو دیتے ہوئے



وزیر امداد باہمی شری اعظم خاں سہکاریتا بھون میں شمع روشن کرکے
جلسے کا افتتاح کرتے ہوئے۔



حسن واصف عثمانی

ملائم سنگھ یادو : ایک جائزہ

یو۔پی میں سیاسی، معاشی اور سماجی انتظام کاری ایک ایسا عمل ہے جو ماضی سے حال میں آیا ہے اور مستقبل میں منتقل ہوگا اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ عمل کبھی ختم نہیں ہوگا۔ پارلیمانی جمہوریت میں اقتدار کی مسلسل تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ یو۔پی میں کئی سیاسی پارٹیوں کو باری باری اقتدار ملا ہے۔ طویل ترین مدت کانگریس نے حاصل کی جس کو آزادی سے پہلے بھی یو۔پی میں محدود اقتدار سنبھالنے کا موقع ملا تھا۔

چند ملی جلی وزارتوں کے ناکام تجربے کے بعد بھارتیہ جنتا پارٹی نے انتظام کاری کی ڈور سنبھالی تھی اور ملائم سنگھ یادو اور ان کی سماج وادی پارٹی کو پہلے بھی ایک موقع ملا تھا۔ مگر اب صورت حال دیگر ہے۔ وہ پوری طاقت اور اعتماد کے ساتھ انتظام کاری کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے ہیں۔ اس مرحلہ پر ان کی شخصیت اور ان کے عملی رویے کی بابت کچھ کہا جا سکتا ہے اور کہا جا رہا ہے۔ کسوٹیاں الگ الگ ہیں اس لیے کہی جانے والی باتوں میں فرق ہے۔ ایک کسوٹی ایسی بھی ہے جو غیر جانب دار تجزیہ کے کام میں آسکے اور یہ کسوٹی اس سوال کی ہے کہ یو۔پی کی مجموعی انتظام کاری میں ملائم سنگھ یادو کی منزل مقصود کیا ہے اور وہ کس حد تک منزل کی جانب گامزن ہیں۔ یہ فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ ان کا تعلق اس نسل سے ہے جس نے ۱۹۴۷ء میں آزادی کے بعد ہوش سنبھالا ہے اور ماضی کے مبہم آئیڈیل ازم کی بجائے زندگی کے ان مسائل سے دست و گریباں ہے جس کو انگریزوں کی غلامی سے چھٹکارا پانے کی جدوجہد کے مقابلے میں بہت زیادہ پیچیدہ، ٹھوس اور حقیقی مسائل کا سامنا ہے۔ سوال صرف آزادی کا نہیں، ایک بہتر زندگی کی تعمیر کا ہے۔ اس پر پرانی نسل کے بزرگ رہنماؤں نے بھی توجہ کی تھی ان میں ایک ڈاکٹر رام منوہر لوہیا تھے۔ ملائم سنگھ یادو لوہیا وادی ہیں جو آزادی کے بعد ملک میں بہتر زندگی کی تعمیر کے سوالات سے وجود میں آیا تھا۔ ڈاکٹر لوہیا اور لوہیا واد کو سمجھے بغیر ملائم سنگھ یادو اور ان کی انتظام کاری کو نہیں سمجھا جا سکتا

ڈاکٹر لوہیا نے سیاسی، سماجی اور معاشی لامرکزیت کی وکالت کی تھی اسی لئے وہ مذہب یا ذات پات کے نام پر سیاست کے خلاف تھے اور یہی راستہ ملائم سنگھ یادو کا ہے۔ کسی فرقہ یا ذات سے وابستگی ان کو پسند نہیں۔ وہ یو۔پی اور اس کے بارہ کروڑ سے زیادہ عوام کو مجموعی حیثیت سے بہتر زندگی کی سمت لے جانا چاہتے ہیں۔

ملائم سنگھ یادو نے یو۔پی میں معاشی ترقی اور خوش حالی کے لئے ہندوستان کے سرمایہ داروں کو یو۔پی میں سرمایہ کاری کی دعوت دی ہے یہ کوئی سیاسی فیصلہ نہیں ہے بلکہ معاشی اور سماجی انتظام کاری کی مثال ہے۔ روزگار میں اضافہ، بے روزگاری میں کمی اور اوسط خوش حالی میں اضافہ سماج میں بے چینی اور انتشار کے ماحول میں کمی کرے گا جس کی بنیاد پر ذات پات اور مذہب کی سیاست چلائی جاتی ہے۔ ایک بہتر سماج کی تعمیر میں عام آدمی کی حصہ داری سماجی مسائل میں کمی کرتی ہے۔ پھر یہ ایک ایسی منزل ہے جس کی جانب سفر سے کوئی سیاسی اختلاف ممکن نہیں ہے۔ ملائم سنگھ یادو عوام کے ذہن کو بدلنے کی اسی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر لوہیا کے بنیادی فلسفہ کا مقصد یہی ہے کہ عام آدمی اپنی بہتر زندگی کی خاطر اپنے ذہن اور مزاج کو خود بدلے۔ بلاشبہ ملائم سنگھ یادو کی قیادت کا بنیادی فلسفہ بھی یہی ہے۔

انھوں نے اپنے آپ کو فرقہ واریت اور ذات پات کی سیاست سے دور رکھنے کی کامیاب جدوجہد کی ہے۔

وہ ایک ایسے طاقت ور علاقائی لیڈر کی حیثیت سے ابھرے ہیں جو یوپی میں اپنی انتظام کاری کو ایک مثال بنا کر کل ہند سیاست پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ وہ بہت سے چھوٹے اور ہنگامی نوعیت کے مسائل سے دامن بچا کر بڑے اور بنیادی مسائل سے نپٹنے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ آزادی کے بعد کی جس نسل نے سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل کا سامنا کیا ہے وہ تنگ اور محدود دائروں میں قید نہیں رہ سکتی۔ ملائم سنگھ یادو کا ذہنی افق اور ان کے آئیڈیل بھی محدود نہیں ہیں۔ ان سے عملی تفصیلات یا طرز عمل کے سلسلے میں اختلاف کیا جا سکتا ہے اور جمہوریت میں ہوتا بھی یہی ہے مگر ان کے مقاصد اور ان کے حصول کی جدوجہد سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔

وہ ایک بے چین ذہن اور مضطرب دل کے مالک ہیں۔ اپنی ذاتی زندگی کے تجربوں سے انھوں نے سماج کے کمتر اور کمزور طبقوں کی محرومیوں اور دشواریوں کا تلخ تجربہ کیا ہے لیکن ان تجربوں نے ان میں تلخی کو زہرناک نہیں ہونے دیا ہے۔ ایک لوہیاوادی کی حیثیت سے ان کا ردِ عمل یہ ہے کہ دشواریوں اور محرومیوں کی جگہ امنگ، امید اور بہتر زندگی کی تعمیر کا راستہ ہی ماضی سے چھٹکارہ دلا سکتا ہے اور مستقبل کی تعمیر کر سکتا ہے۔

توازن ٹکراؤ سے بہتر ہے اور تعاون مقابلے سے زیادہ سودمند ہے

یوپی میں سرمایہ کاری کے دروازے کھول کر انھوں نے ٹھیک ہی کیا ہے ان کا یہ فیصلہ ملک کے اس عام رخ سے بھی پوری طرح ہم آہنگ ہے جس میں معاشیات کی سرکاری انتظام کاری کو ناقص تسلیم کر لیا گیا ہے اور غیر ملکی سرمایہ کاری اور ٹکنالوجی کا خیر مقدم کیا جا رہا ہے۔ بہتر زندگی کی تعمیر کے لئے ملائم سنگھ یادو کی جدوجہد کی اہمیت یہ بھی ہے کہ ہندستانی معاشیات کے موجودہ بہاؤ اور عالمی معاشیات کے نئے نظام سے الگ نہیں ہیں مگر اس کے سلسلے میں احتیاط اور ٹھہراؤ سے کام لے رہے ہیں —— ملائم سنگھ یادو سماجی معاشی اور سیاسی توازن اور اعتدال کی مسلسل تلاش کی مثال ہیں اور یہی ان کی حقیقی اہمیت اور قدر و قیمت ہے۔

□□

چراغِ راہ

ہوئیں ظلمتوں کو ندامتیں کہ ارادے شب کے بدل گئے
مرے لب پہ ذکرِ حضورؐ تھا تو چراغ راہ میں جل گئے

میں مسرتوں کا خزانہ ہوں، میں وہ خوش نصیب زمانہ ہوں
مجھے ایسے لمحے عطا ہوئے جو غمِ حبیب میں ڈھل گئے

ہمیں ٹھوکریں تو بہت لگیں مگر ان کی شفقتیں بھی رہیں
جہاں ہم نے نامِ نبیؐ لیا وہیں گرتے گرتے سنبھل گئے

مجھے چاروں سمت سے گھیرتی کئی آفتیں، کئی حادثے
بڑے طمطراق سے آرہے تھے، سنا ذکر انؐ کا تو ٹل گئے

وہ لطیف جھونکے ہواؤں کے دمِ صبح طیبہ سے یوں چلے
کبھی دل میں پھول کھلا گئے، کبھی عطر چہرے پہ مل گئے

چلا حاجیوں کا جو قافلہ مرے اشک افسرؔ بے نوا
کبھی آستیں پہ ٹھہر گئے کبھی راستے میں مچل گئے

خورشید افسر بسوانی
کٹرہ بازار
بسواں ضلع سیتاپور
۲۶۱۲۰۱

مادرِ گیتی

میں نہیں اُن میں
جو آزادی کو بربادی کہا کرتے ہیں
اور دن رات ہے جن کا موضوع
دوسرے فرقے کی غیبت کرنا
اور فسادات کو تازہ رکھنا
لوٹ اور قتل و فسادات کی تاریخ پڑھو
یہ تو انسان کی فطرت میں ہے شامل کب سے
جب فرشتوں نے کہا تھا رب سے
ایسے انسان کی تخلیق کا مطلب کیا ہے
جو فسادات کرے گا برپا
اپنے بھائی کے لہو سے ہی کرے گا جو
زمیں کو ناپاک'
اور بیچارے فرشتوں کی صلاح
رب نے تسلیم نہ کی
رسم آغاز ہوئی جرم کی پھر جنت میں
ابنِ آدم نے کیا ایک سگے بھائی کا قتل
ہوتا آیا ہے یہی اور یہ ہوتا ہی رہے گا
اس کے باوصف یہ دھرتی یہ مرا دیش
مجھے بہرحال غنیمت کیوں کہ
اس کی مٹی سے مجھے پیار ہے
مادرِ گیتی ہے سب کی اک ماں

اے۔ ندیم بھوپالی
۴۷۔ بمن۔ پل پختہ
ہرکھیڑی۔ بھوپال

آؤ جشنِ آزادی پر یہ عہد کریں

آؤ جشنِ آزادی پر یہ عہد کریں
ایکتا کے گلاب مہکائیں
ہر گلی جشن ہو، چراغاں ہو
پیار کے گیت، امن کی باتیں
آگہی کے نئے وسیلے بنیں
اور ہم لوگ اس طرح سے جئیں
شہر، دیہات، گاؤں بستی میں
زندگی کا شعور رقصاں ہو
آدمی آدمی کو پہچانے
آدمیت کی قدر ہو ہر سُو
جہد و محنت پہ اعتماد بڑھے
کوئی بھوکا رہے نہ ننگا رہے
کوئی جھگڑا رہے نہ دنگا رہے
ہر نفس شادکام فرحاں ہو
شوقؔ راہِ حیات آساں ہو

مومن خاں شوقؔ
اشرف ولا
۲۳-۳-۱۱ علے پلی
حیدرآباد-۱

میرے سپنوں کا بھارت

انسان فرشتے ہیں مرا ملک ہے جنت
خوشحال ہے پُرامن ہے، آزاد ہے بھارت
سب لوگ بہت رکھتے ہیں آپس میں محبت
فہرست میں لفظوں کی بھی ملتی نہیں نفرت
اسلام کے اوصاف کے گُن گاتے ہیں ہندو
کرتے ہیں مسلمان بہت رام کی عزت
اب مندر و مسجد کا نہیں کوئی بھی جھگڑا
بلکہ چین سے سب کرتے ہیں خالق کی عبادت
سب لوگ پڑھے لکھے ہیں بچے ہوں کہ بوڑھے
ہے زیورِ تعلیم سے آراستہ عورت
اب حسن کے بازاروں میں عصمت نہیں بکتی
ہر عزت و تکریم کی حقدار ہے عورت
اب گاؤں میں اور شہر میں کچھ فرق نہیں ہے
دیہاتوں میں شہروں کے برابر ہے سہولت
اب مالک و مزدور کا ساجھا ہے ملوں میں
ضائع نہیں جاتی کسی دہقان کی محنت
ہر شخص کو ہے اپنی حکومت پہ بھروسہ
ہر شہری کی کرتی ہے خبرگیری حکومت
تصویر بنائی ہے رضاؔ خونِ جگر سے
اے کاش کہ مل جائے مرے سپنوں کا بھارت

مہدی رضا ماہلی
ڈیوڑھی اوس
ماہل ضلع اعظم گڑھ

احمد ابراہیم علوی

عوام کی نمائندہ حکومت

اترپردیش کی موجودہ حکومت اقلیتوں کی فلاح وبہبود کے لئے بہت کچھ کرنے کا عزم رکھتی ہے اس حکومت کو اقلیتوں کی زبوں حالی کا احساس ہے اور وہ سمجھتی ہے کہ جب تک سماج کے سبھی طبقات کی فلاح وبہبود کو پیش نظر رکھ کر ترقیاتی منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی سود مند مخلصانہ کوششیں نہ ہوں گی سماج میں خوشحالی اور ترقی ممکن نہ ہو سکے گی۔

اقلیتی کمیشن کو قانونی حیثیت

موجودہ حکومت نے اپنی تشکیل کی قلیل مدت میں کئی مفید اسکیمیں شروع کی ہیں۔ اس حکومت نے سب سے اہم کام یہ کیا ہے کہ اقلیتی کمیشن کو بااختیار بنانے کے لئے اسے قانونی حیثیت دے دی ہے۔ اب اقلیتی کمیشن اپنی ہدایات پر عمل درآمد نہ ہو سکنے کی صورت میں کسی کے بھی خلاف قانونی کارروائی کر سکتا ہے۔ اب وہ صرف مشورے ہی نہیں دے گا بلکہ قانونی کارروائی بھی کرے گا۔ وہ کسی بھی افسر کو حکومت کی مرضی اور منشا کے خلاف اقلیتوں کے مفادات کے تحفظ میں تساہلی پر طلب کرکے قانونی کارروائی کر سکتا ہے اور عدالت سزا بھی دے سکتی ہے۔ اس طرح اب اقلیتوں کی فلاح وبہبود کے لئے شروع کی گئی اسکیمیں جو بعض ناعاقبت اندیش اور مصلحت پسند افراد کی تنگ ذہنیت کے سبب اقلیتوں کے لیے کارآمد نہیں رہ جاتی تھیں انھیں کارآمد کرنے کے لئے اقلیتی کمیشن ذمہ دار افسران کو صحیح رویہ اختیار کرنے پر مجبور کر سکتا ہے

اقلیتی کمیشن کو اب پورا اختیار ہے کہ وہ اقلیتوں کی طرف سے ملنے والی شکایتوں کے ازالے کے لئے موثر طور سے کارروائی کرے۔

اقلیتوں میں تحفظ کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے موجودہ حکومت نے تحفظ امن فورس کی تشکیل کی ہے جس میں اقلیتوں کی نمائندگی کا خصوصاً خیال رکھا جائے گا۔

عازمین حج کے لئے بیمہ اسکیم

اس سال پہلی بار حج کے لیے جانے والے زائرین کے لئے بیمہ اسکیم شروع کی گئی جس سے دوران حج انتقال کی صورت میں زائرین کے پس ماندگان کی مدد کی جا سکے گی۔ اس سلسلے میں مرنے والے کے قریب ترین رشتہ دار کو بیمہ کی شکل میں پچاس ہزار روپے کی رقم دی جا سکے گی۔ اس سال حج کے موقع پر زائرین کی صحت کا خیال رکھنے کیلئے حکومت اترپردیش نے اپنی ایک طبی ٹیم بھیجی اس کے علاوہ دہلی میں زائرین کے قیام میں سہولت کے لئے حج بھون کی تعمیر کے لیے بھی وزیر اعلیٰ نے زمین کا بندوبست کرا دیا ہے۔

بنکروں کی خوشحالی کے لئے کوششیں

اترپردیش میں زراعت کے بعد جس پیشے میں بڑی تعداد میں لوگ لگے ہوئے ہیں وہ پیشہ ہے کپڑا بننے کا۔ اور ایسے لوگوں کا زیادہ تر تعلق اقلیتوں اور وہ بھی اقلیتوں کے کمزور طبقات سے ہے اسی لیے ریاستی حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ بنکروں کی خوشحالی اور ترقی کے لئے ہر ممکن کوشش کی جائے۔ موجودہ حکومت صحیح معنوں میں عوام کی نمائندہ حکومت ہے۔ یہ حکومت عوام کی فلاح وبہبود کو ہمیشہ پیش نظر رکھتی ہے اس لئے اس نے اپنے منصوبے کا [illegible] فیصد سرمایہ گاؤں کی خوشحالی کے لیے مختص کر دیا ہے۔

ریاستی حکومت جہاں کاشت کاروں اور کسانوں کو ہر ممکن سہولت

ہم پہنچا رہی ہے وہیں کپڑا بننے والے اور ہتھ کرگھے پر کام کرنے والوں کے گوناگوں مسائل کو حل کرنے کے لیے بھی ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔

بنکروں میں افلاس اور ناخواندگی بہت زیادہ ہے۔ ناخواندگی کو دور کرنے کے لیے افلاس کو ختم کرنا ضروری ہے اور افلاس کے خاتمے کے لیے خواندگی بڑھانا ضروری ہے۔ اس لئے حکومت بڑے منصوبہ بند طریقے سے ناخواندگی اور افلاس دونوں کی بیخ کنی کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔ ابتدائی تعلیم لازمی اور مفت کر دی گئی ہے اس کے علاوہ بڑی عمر کے ان لوگوں کے لئے جن کو پڑھنے لکھنے کا موقع نہیں مل سکا، تعلیم بالغان اسکیم کے تحت مفید طریقے نکالے گئے ہیں۔ جس کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنے کے بہترین مواقع حاصل ہو سکتے ہیں اور تعلیم بالغان مراکز پر علم کے شوقین بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

بنکر مفلس پیدا ہوتے ہیں اور افلاس کے ماحول میں پلنے بڑھنے کی وجہ سے پس ماندہ رہتے ہیں۔ وہ بری عادتوں میں پڑ جاتے ہیں غیر ضروری رسومات کی پابندی اپنے اوپر لازم کر لیتے ہیں اس لیے انھیں قرض لینا پڑتا ہے۔ قرض کا بوجھ بڑھتا ہی رہتا ہے۔ اس کو ہلکا کرنے کی فکر میں وہ ہمیشہ پریشان رہتے ہیں۔

موجودہ حکومت بنکروں کو قرض کے بوجھ سے آزاد کرانے کی بھی کوشش کر رہی ہے چنانچہ جن بنکروں نے اپنے کاروبار کو بڑھانے کے لئے یا روزگار برقرار رکھنے کے لئے حکومت سے یا امداد باہمی انجمنوں سے قرض لے رکھا تھا اور ادا نہیں کر پا رہے تھے، حکومت نے ان کو قرض کی ادائیگی سے معاف کر دیا ہے۔ اب جگہ جگہ بنکروں کے قرض معاف کیے جا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کو مستقبل میں بھی کسی پریشانی سے دوچار نہ ہونا پڑے، اس کے لئے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ باقاعدہ قرض معافی کی اسناد بنکروں کو پیش کر رہے ہیں۔ یہ ایک ایسا کام ہے جس سے بنکروں کو ذہنی راحت مل رہی ہے۔ اس طرح وہ بے فکر ہو کر اپنا کاروبار کر کے اس کو ترقی دے سکتے ہیں جس سے وہ خود خوش حال ہوں گے اور ان کی خوش حالی سے معاشرے میں خوش حالی آئے گی۔

بنکروں کا سب سے بڑا مسئلہ کچے مال کی فراہمی ہے۔ سوت، دھاگا اور اسٹیپل کی دستیابی کے لئے اکثر بنکروں کو زحمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کے لئے حکومت نے جگہ جگہ امداد باہمی سوسائٹیوں کے ذریعہ سبھی بنکروں کو آسانی سے مطلوبہ چیزیں فراہم کرنے کا معقول بندوبست کیا ہے۔

اکثر بنکر اتنے غریب ہیں کہ وہ کرگھوں کی مرمت نہیں کرا سکتے۔ جس کی وجہ سے انھیں بڑی پریشانیوں کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ حکومت بنکروں کو اپنے پرانے کرگھے بدل کر نئے کرگھے حاصل کرنے یا ان کی مرمت کرانے اور جدید ترین کرگھے فراہم کرانے کا معقول بندوبست کر رہی ہے۔ اس طرح اب بنکر زیادہ کپڑا تیار کر سکیں گے اور پہلے سے بہتر بنا سکیں گے۔ انھیں طرح طرح کے اور نئے نئے ڈیزائن نیز فیشن کے مطابق چیزیں بنانے کے لئے بھی باقاعدہ تربیت حاصل کرنے کے مواقع فراہم کیے جائیں گے۔ اس طرح وہ بہتر مال تیار کر کے بازار میں مقابلہ کر سکیں گے اور زیادہ نفع حاصل کر سکیں گے۔

تیار مال کی فروخت میں آسانیاں

اب تک بنکروں کا ایک پریشان کن مسئلہ یہ بھی تھا کہ ان کا تیار مال آسانی سے فروخت نہیں ہوتا تھا یا انھیں ان کی محنت کا معقول معاوضہ نہیں ملتا تھا۔ اس کے لیے بھی حکومت نے بندوبست کر دیا ہے۔ اب بنکر امداد باہمی سوسائٹیوں کے ذریعہ اپنا مال نہ صرف بڑے بڑے شہروں میں فروخت کے لئے بھیج سکتے ہیں بلکہ ان کا تیار مال غیر ممالک بھی بھیجا جا رہا ہے جہاں سے ان کو اچھے آرڈر ملتے ہیں۔

اترپردیش کی موجودہ حکومت نے گزشتہ سات ماہ کی قلیل مدت میں بنکروں کی فلاح و بہبود کے لیے بہت کچھ کیا ہے اور ابھی وہ ان کے لئے بہت کچھ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ بنکر اپنے پیروں پر کھڑے ہوں۔ وہ ہر طرح کے قرض کے بوجھ سے آزاد ہوں انھیں اپنے تیار مال کی کھپت کے لیے نہ بازار کی تلاش ہو اور نہ مال تیار کرنے کے لئے کسی چیز کی کمی۔

سوت کے داموں میں خاصا اضافہ ہو جانے کے باعث بہت سے ہتھ کرگھے بند ہونا شروع ہو گئے تھے اور بنکروں میں بھکمری تک کی نوبت آ گئی تھی حکومت نے اس سلسلے میں فوری قدم اٹھایا اور بنکروں کو

مناسب داموں پر سوت دلانے کا بندوبست مختلف مراکز اور امداد باہمی سوسائیٹیوں کے ذریعہ کیا ہے۔

بنکروں کے لئے مکانات کی سہولتیں

وزیر اعلا جناب ملائم سنگھ یادو کی کوششوں سے مرکزی حکومت نے سوت خریدنے والے بنکروں کو اب ہر ایک کیلوگرام سوت کی خریداری پر پندرہ روپے سبسڈی دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اب مرکزی حکومت نے اتر پردیش کے بنکروں کے لیے اٹھائیس لاکھ کیلوگرام سوت کا کوٹہ رکھا ہے۔

سماجی اور معاشی طور سے بہت ہی کمزور بنکروں کے لئے ایسے اضلاع میں جہاں ان کی اکثریت ہے حکومت نے ایسے پانچ ہزار مکانات بنانے کا فیصلہ کیا ہے جس میں وہ رہ بھی سکیں اور اپنا کاروبار بھی کر سکیں۔

اس طرح بنکروں کی رہائش اور ان کے کاروبار دونوں کے مسائل کو حل کرنے کے لئے ریاستی حکومت نے معقول بندوبست کی طرف جو قدم اٹھایا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ یقیناً اس سے بنکروں اور خصوصاً غریب اقلیتوں کو فائدہ ہوگا اور ان کا معیار حیات بلند ہو سکے گا۔

□□

نادر کاکوروی ...... صہ ۲۳ کا بقیہ

تو انھوں نے فی البدیہہ دوسرا مصرع پڑھا ع

نکل جان حزیں اس جسم خاکی میں دھرا کیا ہے

اس کو مرحوم کی شاعری کا آخری نمونہ کہنا چاہیے۔ مرحوم کی تصانیف ان کے بھائی مولوی شاکر علی صاحب جمع کر رہے ہیں۔ نادر مرحوم نے دو خورد سال بچے چھوڑے ہیں، جو ماں کے سایۂ عاطفت سے پہلے ہی محروم تھے اللہ تعالیٰ اپنے رحم و کرم سے ان بدنصیبوں کی نگہبانی فرمائے۔"

□□

خود نوشت .... صفحہ ۰ کا بقیہ

میری جان لے لیتے ہیں۔ ڈاک کھولتے ہوئے اور فون اٹھاتے ہوئے ہمیشہ توقع رہتی ہے کہ کوئی اچھی خبر پڑھنے اور سننے کو مل جائے۔ خبر ایسی نہیں کہ تمہاری لاٹری نکل آئی ہے (حالاں کہ اگر نکل آئے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا) بلکہ ایسی کہ "صاحب ٹائمز آف انڈیا میں آپ کا مڈل پڑھا تھا مزا آگیا۔ ہمارے لئے بھی تو لکھا کیجئے۔"

اپنے بارے میں کافی کچھ کہہ دیا ہے۔ لیکن یہ کہنا باقی ہے کہ شادی شدہ ہوں، دو بیٹیاں ہیں ہماری جن سے والہانہ محبت کرتا ہوں۔

۱۹۸۰ء میں دل کا ایک دورہ بھی برداشت کر چکا ہوں جس کی بدولت دلی، مدراس اور امریکہ کے اسپتال دیکھے۔ مدراس میں جس ڈاکٹر نے میری این جی او گرافی کی، بعد میں کہنے لگا کہ صاحب آپ تو آپریشن کے دوران بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ میں نے جواب دیا کہ گھبرانا تو تھا ہی کہ میرے قارئین جب مجھ سے محبت کرنے لگے ہیں تو میں ایک انجانے سفر پر نکل جاؤں مجھے ابھی بہت کچھ لکھنا ہے، اس لیے جانے کے نام سے ہی مجھے گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔

□□

مثنوی "فریاد داغ" کی تکمیل صہ ۱۳ کا بقیہ

حواشی:

۱ "داغ دہلوی" کے بعد الگ سے ذرا اوپر کاتب نے باریک قلم سے "مرحوم" تحریر کر دیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ مثنوی کی کتابت پانچویں ایڈیشن کیلئے ہو چکی تھی کہ داغ کے انتقال کی خبر آئی۔ اس سے یہ بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مثنوی پانچویں بار ۱۹۰۵ء میں چھپی تھی۔

۲ نسیم بھرت پوری ۱۸۶۱ء تا ۱۹۰۹ء

۳ متوفی ۱۷ر اگست ۱۹۰۰ء

۴ ولادت ۲۰-۱۸۱۹ء وفات ۲۷ر مئی ۱۹۱۱ء

۵ ولادت ۱۸۵۰ء وفات ۲۰ر مئی ۱۹۲۰ء

۶ باوجود کوشش کے مجھے مثنوی کے پہلے دو ایڈیشن دستیاب نہیں ہو سکے۔ ہو سکتا ہے ان کے خاتمے کی عبارتوں کی روشنی میں مجھے اپنے نتیجے پر نظر ثانی کرنی پڑے۔

منی افسانہ

اقبال مجید
۴۷ - شملہ روڈ، بھوپال
۴۶۲۰۰۲

بس ، اِتنی سی ؟

وہ ایک بے مقصد سی شام تھی جب پروفیسر راگھون سے اس دل چسپ موضوع پر ہماری بات چیت ہوئی۔ مسئلہ یہ تھا کہ پرانے زمانے میں عورت کے بارے میں اس قدر گھٹیا تصور کیوں رکھا جاتا تھا۔ یعنی عورت کو مکار، فریبی، لالچی، دغاباز اور بے وفا وغیرہ کیوں کہا جاتا تھا۔

تب راگھون نے ایک دل چسپ انکشاف کیا تھا۔ وہ یہ کہ مکاری ہو یا دغابازی، بے وفائی ہو یا دھوکے بازی — یہ تمام ان لوگوں کے یا گروہوں کے اوزار ہوتے ہیں جنھیں اپنی غرض پوری کرنے کے لئے لگاتار سماجی یا قانونی یا اخلاقی طور پر دبایا جاتا رہا ہو۔

تب ہی اس قدیم قصے کا ذکر بھی چھڑ گیا تھا جو آج لوک کتھا کی سی حیثیت رکھ سکتا ہے یا ممکن ہے کہ رکھتا ہو — یا پھر لوک کتھا بن جانے کے سارے مسالے موجود ہوں —

ایک بہت شریف میاں بیوی آپس میں بے حد پیار محبت سے رہتے چلے آرہے تھے اور دونوں کے درمیان ہر طرح سے ذہنی اور جذباتی مطابقت قائم تھی اور دن امن و چین سے گزر رہے تھے کہ ایک دن ایک مسافر اونٹ پر غیر معمولی بوجھ لادے اُدھر سے گزرا۔ میاں نے مسافر سے جب اونٹ پر لدے اس بھاری بوجھ کے بارے میں معلومات کی تو اس نے بڑا عجیب انکشاف کیا۔ بولا :

" جناب والا یہ بوجھ جو آپ اونٹ پر لدا دیکھ رہے ہیں، در اصل یہ میری بیوی کی مکاریاں ہیں۔"

میاں کو یہ سُن کر بڑی حیرت ہوئی۔ وہ اونٹ کے قریب گیا اور لدے ہوئے اونچے سے بوجھ کو غور سے دیکھ کر بولا :

اتنی بہت سی اور اتنی وزنی مکاریاں — کیا یہ سب آپ کی بیوی کی مکاریاں ہیں۔ ؟"

مسافر بولا : " اس میں کیا شک ہے۔ اور پھر اس میں حیرت کی بات بھی نہیں۔ اتنی مکاریاں تو عورت میں ہونا ہی چاہیئے۔"

"آپ کی بیوی کہاں ہے ؟" میاں نے سوال کیا۔

" وہ پچھلے ناقے پر سوار ہے۔ اس ناقے پر مکاریاں رکھنے کی جگہ نہ تھی اس لئے دوسرا ناقہ کرنا پڑا۔" مسافر یہ کہہ کر اپنی راہ چل پڑا اور میاں بیچارہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان مکاریوں کے بوجھ کو دیکھتا ہی رہ گیا، جن سے اونٹ بیچارہ دبا جا رہا تھا۔

میاں بیچارہ فکر میں غلطاں گھر آیا اور بغیر کچھ کھائے پیئے اٹوائی کھٹوائی لے کر پڑ رہا۔ بیوی ہوشیار تھی تاڑ گئی کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ میاں غریب اُداسیوں کے سمندر میں اس لیے غرق تھا کہ اپنی بیوی کے ۲۵ سال کے پُرانے ساتھ کے دوران اس نے اپنی بیوی کو آدھا کلو مکاری بھی کبھی استعمال کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ جبکہ مسافر کے کہنے کے مطابق عورت کے پاس ایک اونٹ لادنے بھر کی مکاریاں تو عام طور سے ہونا ہی چاہیئے۔

جب بیوی نے میاں سے اس کی اداسی کا سبب دریافت کیا تو میاں سے نہیں رہا گیا۔ بولا :

" ارے تو کیسی عورت ہے ؟ اور خدا جانے عورت ہے بھی کہ نہیں یا عورت کے بھیس میں کوئی بدرُوح ہے !"

"کیا مطلب ؟" بیوی سٹپٹا گئی۔

"مطلب یہ کہ تیری مکاریاں کہاں ہیں ۔ ؟"

اب تو عورت کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ لاکھ اس نے اپنے میاں کو سمجھایا کہ مکاریوں سے اس کا دُور دُور تک کوئی تعلق نہیں ہے اور بھلا

یہ مکاری کیوں کرنے لگی۔ وہ تو بہت آرام سے ہے خوش ہے مطمئن ہے مگر شوہر نے اس کی ایک نہ سنی ۔ وہ تلوار سونت کر آخر کو کھڑا ہو گیا اور بولا

"دیکھ! تجھے ایک دن کی مہلت دیتا ہوں، تو نے اپنی مکاریاں جہاں بھی چھپا کر رکھی ہوں میرے سامنے ڈھیر کر دے نہیں تو میں تیری ناک کان اور چوٹی کاٹ کر تیرے ہاتھ میں رکھ دوں گا۔"

اب تو بیوی کی راتوں کی نیند حرام ہو گئی۔ اس کا میاں اسے ڈرانے اور دھمکانے کے لئے طرح طرح کی ایذائیں روز ہی دینے لگا۔ غریب بیوی کی روزانہ درگت بنتے دیکھ کر ایک پرانی پڑوسن کو اس پر رحم آ ہی گیا۔ اس نے آخر کو ایک آزمایا ہوا نسخہ اسے بتلایا، جو مصیبت میں گرفتار اس بد قسمت بیوی کے بہت کام آیا۔

صبح ہونے سے پہلے بیوی اٹھی اور اپنے کھیت کے بیچوں بیچ ایک مٹی کی ہانڈی میں ایک مچھلی رکھ کر ہانڈی کو گاڑ آئی۔ اس صبح اس کا میاں اسی کھیت کو گوڑنے والا تھا۔ میاں کھا پی کر کھیت پر چلا گیا اور کھیت کو گوڑنے لگا۔ جب ہل سے اس جگہ کی زمین کھودی جہاں ہانڈی تھی تو مٹی کے ساتھ وہ ہانڈی بھی زمین کے اوپر آ گئی۔ اب جو میاں نے دیکھا تو مچھلی پر اس کی نظر پڑی اور وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ دوڑا دوڑا گھر آیا اور بیوی سے بولا:

"اری نیک بخت میرے کھیت میں مچھلی پیدا ہوئی ہے۔ اسے پکا میں کھاؤں گا۔"

بیوی نے مچھلی کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ مچھلی سے اب کچھ بو بھی آنے لگی تھی۔ وہ مچھلی پھینک تنک کر بولی:

"ارے واہ مردوے! ہوش کی دوا کر، مچھلی تالاب میں پیدا ہوتی ہے کہ کھیت میں۔؟"

مگر میاں نے اس کی ایک نہ سنی اور اپنی ضد پر اڑا رہا کہ وہ مچھلی کھیت میں پیدا ہوئی ہے۔ بات اڑوس پڑوس تک پہونچی۔ جب شور و غل بہت بڑھا اور مچھلی پکوانے کی ضد میں میاں نے اپنی بیوی کی دھول جھاڑنا شروع کر دی تو بیوی نے سب سے فریاد کی کہ اس کا میاں دیوانہ اور سودائی ہو گیا ہے کیفیت جاننے کے بعد تو سب کو یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو میاں پر کوئی دریائی جن سوار ہو گیا ہے۔ پھر تو میاں بیچارے کو رسیوں سے باندھ کر ایک ڈال دیا گیا اور وہ مارے طیش کے چیختا چلاتا ہی رہ گیا۔

ویسے یہ کہانی تو ابھی کچھ اور دلچسپ کروٹیں لے گی لیکن اس سے پہلے میں پروفیسر راگھون کی اس بات پر کھل کر داد دینا چاہتا ہوں کہ قدیم عورت کے مکر و فریب کے تمام قصے دراصل اس مرد کی ایجاد ہیں، جو درحقیقت عورت پر کیے گئے اپنے مظالم اور ناانصافیوں سے دل ہی دل میں ڈرا سہما سا رہا کرتا تھا۔ انسان اپنی ہی غرض کا بندہ ہے۔ اپنی طاقت اور اپنے اختیارات کی عظیم کشتی جب قلوپطرہ نے بھنور میں پھنسی ہوئی دیکھی تو مرد کے استعمال کے عوض زہر کھا لینا پسند کیا۔

خیر۔ تو اس کہانی کا انجام کچھ اس طرح سے ہے کہ جب آدھی رات گزر گئی تو نیک بیوی رسیوں میں جکڑے اور درد سے کراہتے اپنے میاں کے پاس آئی اور بولی:

"کاش میری عمر عشق بازی کی ہوتی اور کوئی میرا آشنا ہوتا تو اس وقت میں اس کو لاتی اور تیرے سامنے ہی رنگ رلیاں مناتی اور صبح جب تو ایک ایک سے شکایت کرتا تو سب تجھے پاگل سمجھ کر تیری ہی ہنسی اڑاتے اور احتیاط کے طور پر تیرے بدن پر دو چار رسیاں اور باندھ دیتے۔"

میاں نے یہ سنا تو دانت پیس کر رہ گیا۔ بولا: "اری بدذات تو حرفوں کی بنی ہے۔ تو جیتی میں ہارا ۔۔ اب تو مجھے کھول دے۔"

میاں نے گڑگڑا کر بیوی سے درخواست تو کھول لینے کی کر لی لیکن دل ہی دل میں یہ بھی تہیہ کر لیا کہ جیسے ہی وہ آزاد ہو گا، بیوی کی ہڈی پسلی توڑ کر رکھ دے گا۔

بیوی کا دل میاں کے گڑگڑانے اور منتیں کرنے سے پسیج گیا۔ اسے کھول لینے سے پہلے اس کا منہ ہاتھ دھلایا۔ مچھلی میں بہترین مسالے زعفران اور کیوڑہ وغیرہ ڈال کر پکایا اور اپنے ہاتھ سے نوالے بنا بنا کر میاں کو کھلایا تب بعد میں اس کی رسیاں کھولیں۔ آزاد ہوتے ہی میاں بیوی کے سینے پر چڑھ بیٹھا اور بولا:

"اب بتا مال زادی! تیرا بھرتہ بناؤں کہ چٹنی ۔۔ آخر کو کھلائی نہ تو نے مجھے وہی مچھلی۔ پر جب میں ضد کر رہا تھا کہ مجھے مچھلی پکا دے تو تو بولی تھی کہ مچھلی کھیت میں پیدا نہیں ہوتی۔" میاں یہ کہتا جاتا اور

(باقی صفحہ ۳۹ پر)

شاہینہ تبسم
سی ۲۴ / جی ۱۰ دکاس پوری۔ نئی دہلی
۱۱۰۰۱۸

"آثار الصنادید" کا ایک محذوف باب

سر سید احمد خاں ایک صاحب طرز ادیب اور ایک عظیم مصلح کی حیثیت سے بلند و بالا مقام کے حامل ہیں۔ بحیثیت مورخ بھی وہ اسی بلند مرتبے پر نظر آتے ہیں۔ تاریخ کے موضوع پر ان کے رسالوں اور کتابوں کی اہمیت سے کسی کو آج بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ جام جم (۱۸۴۰ء) سلسلۃ الملوک (۱۸۵۲ء)، آئینِ اکبری (۵۶-۱۸۵۵ء)، تاریخِ بجنور، تاریخ سرکشی ضلع بجنور (۱۸۵۸ء)، اسباب بغاوت ہند (۱۸۵۹ء)، تاریخ فیروز شاہی (۱۸۶۲ء) اور تزک جہانگیری (۱۸۶۴ء) کے نام اس سلسلے میں بطور دستاویزی ثبوت پیش کیے جا سکتے ہیں۔

"آثار الصنادید" اگرچہ تاریخ کی کتاب نہیں، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ تاریخ سے پرے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ سید احمد خاں نے یہ کتاب ۲۸ سال کی عمر میں لکھی تھی اور ۱۲۶۳ھ میں پہلی بار اپنے مطبع سید الاخبار سے شائع کی تھی۔ تب سے اب تک تقریباً ڈیڑھ سو سال کے عرصے میں اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور اب بھی اس کا سلسلہ جاری ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دہلی اور نواح دہلی کے آثار قدیمہ سے متعلق اتنی مستند اور مفید کوئی اور کتاب نہیں، اسی لئے آج بھی اس کتاب کو بنیادی ماخذ کا درجہ حاصل ہے نہ صرف اردو بلکہ غیر ملکی زبانوں میں بھی اس کے تراجم شائع ہو چکے ہیں۔

مسٹر رابرٹس جو سر سید کے ہم عصر تھے اور شہر دہلی میں کلکٹر کے عہدے پر فائز تھے، انھوں نے سر سید کے ساتھ مل کر آثار الصنادید کے انگریزی ترجمے کا کام شروع کیا تھا اور اس کے ایک بڑے حصے کا ترجمہ کیا تھا۔ علاوہ ازیں فرانس کے بلند پایہ مستشرق گارساں دتاسی نے فرانسیسی زبان میں اس کا ترجمہ کیا تھا اور شائع بھی کرایا تھا جس کے باعث یورپ میں اس کتاب کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور اسی کی بنیاد پر رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے ۱۸۶۴ء میں سید احمد خاں کو اعزازی ممبرشپ تفویض کی تھی۔

آثار الصنادید کے بارے میں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں دہلی اور مضافاتِ دہلی کی عمارتوں کا مستند اور تفصیلی حال بیان کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی تصنیف کے دوران سید احمد خاں نے بڑے دشوار گزار مراحل کا سامنا کیا اور بعض اوقات اپنی جان جوکھم میں ڈال کر بھی حقائق کو ضبط تحریر میں لانے کی مخلصانہ سعی کی۔ یہ کتاب ڈیڑھ سال کی محنت و جانفشانی کے بعد اپنی تکمیل کو پہنچی۔ خواجہ الطاف حسین حالی نے حیات جاوید میں اس کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ سید احمد خاں کی اسی بے پناہ لگن اور جستجو کا نتیجہ ہے کہ آثار الصنادید اپنے موضوع پر ایسی مستند کتاب بن گئی جس سے استفادہ کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔

آثار الصنادید کا اولین ایڈیشن ۱۸۴۶ء میں منظر عام پر آیا تھا جس پر مصنف کا نام "سید احمد خاں منصف" تحریر کیا تھا۔ یہ ایڈیشن ایک ڈیڑھ سال کے قلیل عرصے میں ختم ہو گیا اور کتاب کی پر زور مانگ کو دیکھتے ہوئے فوراً ہی اس کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کا مطالبہ کیا جانے لگا لیکن سید احمد خاں نے اس کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت میں عجلت سے کام نہیں لیا بلکہ یہ منصوبہ بنایا کہ دوسرے ایڈیشن کی اشاعت سے پہلے اس کتاب کے تمام مشمولات پر نظر ثانی کی جائے اور پہلے ایڈیشن میں جو کمیاں رہ گئی ہیں انھیں بھی دور کیا جائے۔ لیکن یہ کام آسان نہ تھا۔ سید احمد خاں

نے اسی موضوع پر دوبارہ غور و فکر کے بعد نظرِ ثانی کا کام شروع کر دیا۔ یہ کام کئی سال جاری رہا اور اس میں ان کے چند انگریز دوستوں بالخصوص ایڈورڈ ٹامس کے مشورے بھی شامل رہے۔ اس طرح دوسرے ایڈیشن میں نفسِ مضمون ہی میں نہیں بلکہ سید احمد خاں نے اسی موضوع پر دوبارہ غور و فکر کے بعد نظرِ ثانی کا کام شروع کر دیا۔ یہ کام کئی سال جاری رہا اور اس میں ان کے چند انگریز دوستوں بالخصوص ایڈورڈ ٹامس کے مشورے بھی شامل رہے۔ اس طرح دوسرے ایڈیشن میں نفسِ مضمون میں نہیں بلکہ سید احمد خاں کے طرزِ اسلوب میں بھی نمایاں تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ اگر ہم پہلے ایڈیشن کا موازنہ بعد کے ایڈیشنوں سے کریں تو ان میں ہمیں نمایاں فرق نظر آئے گا۔ انشا پردازی کا قدیم و فرسودہ طریقہ جو پہلے ایڈیشن میں مستحسن سمجھ کے اختیار کیا گیا تھا، بعد کے ایڈیشن میں اسے معیوب سمجھ کر ترک کرنے کی سعی کی گئی ہے اور وہ سادگی اور حقیقت نگاری جو سر سید کا طرۂ امتیاز سمجھی جاتی ہے جا بجا نظر آتی ہے۔

سید احمد خاں نے طبعِ ثانی کے لیے نقشے دوبارہ تیار کرائے ان سارے کاموں میں چھ سات سال لگ گئے اور ۱۸۵۶ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن منظرِ عام پر آیا۔ اس ایڈیشن میں ایک تبدیلی یہ کی گئی تھی کہ سید احمد خاں نے ایک پورا باب جو دلّی اور دلّی والوں کے بیان میں تھا، حذف کر دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایڈورڈ ٹامس کے مشورے سے یہ بات عمل میں آئی ہوگی۔

بقول ڈاکٹر سید عبداللہ اس میں مصلحت غالباً یہ تھی کہ کتاب صرف آثار و عمارات کے بیان کے لیے مخصوص ہو جائے اور مشاہیر کا تذکرہ چوں کہ اس میں بے جوڑ معلوم ہوتا ہے اسلئے اسے کتاب سے خارج کر دیا جائے۔

گمانِ غالب یہ ہے کہ علاوہ اس بات کے کہ آثارالصنادید کے بابِ چہارم کو حذف کر دینے کے پیچھے اور بھی کئی وجوہات کارفرما تھیں۔ پہلی یہ کہ کتاب دہلی کے آثارِ قدیمہ سے متعلق تھی اور اس میں شخصیات کا ذکر بے محل معلوم ہوتا تھا، دوسرے اس کا اسلوب اور مبالغہ آمیز عبارت آرائی اس قسم کی بلند پایہ علمی کتاب کے لئے مناسب نہیں تھی۔ ان باتوں کے علاوہ ایک اور اہم بات یہ بھی تھی کہ اس باب کی تصنیف میں سر سید سے کہیں زیادہ ان کے نہایت قریبی دوست مولانا امام بخش صہبائی کا حصہ تھا۔ اس بات کے ثبوت ہمیں حالی اور شبلی کی تحریروں سے بھی ملتے ہیں۔

سید احمد خاں کے حالاتِ زندگی سے متعلق سب سے زیادہ معتبر اور مستند کتاب "حیاتِ جاوید" ہے۔ خواجہ الطاف حسین حالی نے اس معرکۃ الآرا کتاب میں جہاں سید احمد خاں کی زندگی کے بہت سے اہم واقعات پر روشنی ڈالی ہے وہیں "آثارالصنادید" کے بارے میں سر سید کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ خود اس بات کا اقرار کرتے تھے کہ "حیاتِ جاوید" (حصہ دوم) میں حالی نے نہایت واضح الفاظ میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ صفحہ ۸۹-۲۸۸ سے منقول ان کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"آثارالصنادید کا سب سے پہلا ایڈیشن جس کی عبارت میں بہت کچھ ساختگی اور تکلّف پایا جاتا ہے وہ جیسا کہ سر سید خود اقرار کرتے تھے، مولانا صہبائی کا لکھا ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ گو اس وقت طبعِ سلیم کے اقتضا سے خود سر سید کی تحریر سیدھی سادی تھی مگر سوسائٹی کے اثر سے یقیناً سادی عبارت لکھنے کو وہ خود حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے جس کی وجہ سے انھوں نے اس بات کو گوارہ کیا کہ جن عمارتوں کی تحقیقات نہایت جانکاہ کوشش سے انجام کو پہنچائی ہو ان کا حال اپنی سیدھی سادی عبارت میں جو اس وقت خود ان کی نظر میں کم وزن معلوم ہوتی تھی، تحریر کریں، مگر اس ایڈیشن کے شائع ہونے کے بعد وہ بہت جلد اس غلطی سے متنبہ ہو گئے اور اس کو دوبارہ اپنے سیدھے سادے نیچرل اسٹائل میں لکھ کر شائع کیا جس کا فرنچ ترجمہ پیرس میں چھپا۔"[۱]

علامہ شبلی نعمانی نے بھی اپنے مضمون "سر سید مرحوم اور اردو لٹریچر" میں آثارالصنادید کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس میں اکثر جگہ بیدل اور ظہوری کا رنگ نظر آتا ہے۔ علامہ شبلی کے نزدیک:

"اس کی وجہ یہ تھی کہ سر سید کی رات دن کی صحبت مولانا امام بخش صہبائی سے رہتی تھی اور مولانائے موصوف بیدل کے ایسے دلدادہ تھے کہ ان کا کلمہ پڑھتے تھے اور جو کچھ لکھتے تھے اسی طرز میں لکھتے تھے۔ سر سید نے مجھ سے خود بیان کیا کہ آثارالصنادید کے بعض مقامات بالکل مولانا امام بخش صہبائی کے لکھے ہوئے ہیں جو انھوں نے میری طرف سے

اور میرے نام سے لکھ دیئے تھے :

حالی اور شبلی دونوں ہی نے یہ بات خود سر سید کے حوالے سے لکھی ہے۔ حیات جاوید سر سید کی زندگی ہی میں حیطۂ تحریر میں آگئی تھی جبکہ شبلی کا مذکورہ مضمون سر سید کی وفات کے بعد لکھا گیا تھا لیکن دونوں بزرگوں کے بیانات میں کسی بھی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے تاہم یہ بات پوری کتاب کے لئے نہیں کہی جاسکتی بلکہ اس کا سب سے زیادہ اطلاق آثار الصنادید کے آخری باب پر ہوتا ہے جو اس کتاب کے جملہ ابواب میں سب سے زیادہ ضخیم باب ہے اور جس میں "شاہجہاں آباد کے لوگوں کا بیان" کے تحت مشاہیر دہلی کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں۔

رسول شاہوں کے بیان میں رسول شاہ صاحب، مولوی شاہ حنیف شاہ غلام حسین اور شاہ توکل حسین کے مختصر حالات لکھے گئے ہیں۔

علمائے کرام کے ذکر کے تحت دہلی کے چند نامور حکیموں کے حالات و کمالات درج کیے گئے ہیں اس کے بعد "ذکر علمائے دین" کے تحت شاہ عبدالعزیز سے لے کر ملا سرفراز تک ۴۹ علماء کی حیات و صفات کا ذکر کیا گیا ہے۔

"مجذوبوں کے بیان میں" دہلی کے ۹ مجذوبوں کا ذکر ہے۔ ان میں خانم صاحب اور بائی جی ناموں سے مشہور دو مجذوب خواتین کا بھی ذکر ہے۔

"ذکر بلبل نوایان شاہجہاں آباد" کے تحت مرزا اسداللہ خاں غالبؔ، مولوی امام بخش صہبائیؔ، مومن خاں مومنؔ، شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ، نواب محمد ضیاء الدین نیرؔ و رخشاں اور نواب زین العابدین خاں عارفؔ وغیرہ دہلی کی ۱۹ سرکردہ ادبی شخصیتوں کا تذکرہ معہ نمونۂ نظم و نثر پیش کیا گیا ہے۔

ذکر قرا و حفاظ کے تحت پانچ قاریوں اور حافظوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح آثار الصنادید میں دہلی کے خوش نویسان اور مصوروں اور موسیقاروں کا ذکر بھی موجود ہے۔

مغربی ناقدین کے مطابق زبان کے تین اقسام ہوتے ہیں جو عام طور سے مروج نظر آتے ہیں:

(۱) عام گفتگو کی زبان جو بے حد سیدھی سادی ہوتی ہے اور جس کی پہلی اور آخری شرط ایک کہے اور دوسرا سمجھے کے علاوہ کچھ اور نہیں ہوتی۔

(۲) علمی زبان، جسے زیادہ حقیقت پسندانہ رنگ دینے کے لئے سائنسی زبان بھی کہا جاسکتا ہے۔ مختلف علوم کی کتابیں اور مضامین عموماً اسی زبان میں لکھے جاتے ہیں۔ عام گفتگو کی زبان کی بہ نسبت اس میں الفاظ و مفاہیم کی صحت اور معیار کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

(۳) ادبی زبان، جسے بسا اوقات خاص اعلیٰ زبان بھی کہا جاتا ہے اور جس میں علم بیان کے جملہ لوازمات تشبیہ، استعارہ، اشارہ کنایہ، مجاز مرسل کے علاوہ فصاحت و بلاغت کا بطور خاص خیال رکھا جاتا ہے لطف، رنگینی اور عبارت آرائی کی جاتی ہے، انشاء پردازی کے جوہر دکھلائے جاتے ہیں اور ترسیل مقصد کے ساتھ ساتھ لطف و انبساط اور حظ اٹھانے کا سامان بھی بہم پہنچایا جاتا ہے۔

جن لوگوں نے سر سید کی تحریروں کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے ان کے لئے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں کہ سر سید کی نثر اول الذکر دونوں اقسام سے عبارت ہے، جو کہ تعمیری نثر ہے۔ اسی طرح مولانا صہبائی کے بارے میں بھی وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ ان کی نثر موخر الذکر تیسری قسم سے تعلق رکھتی ہے جسے تخلیقی نثر کہتے ہیں۔

اگر ہم آثار الصنادید کے چوتھے باب کا بغور مطالعہ کریں تو ہمیں اس میں دو مختلف اسلوب نثر رواں نظر آئیں گے۔ ایک تعمیری اور دوسرا تخلیقی۔ اول الذکر میں سادگی، سلاست اور راست بیانی ہے تو موخر الذکر اسلوب میں اس کے برخلاف ژولیدگی، لفاظی، عبارت آرائی اور شاعرانہ مبالغہ آمیزی ہے۔

اسلوب مصنف کی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے کیوں کہ مصنف کے منفرد اسلوب میں ایسی داخلی صفات و خصوصیات در آتی ہیں جن کے ذریعہ اس کی انفرادی شخصیت کی پہچان ممکن ہے عابد علی عابدؔ کے مطابق چوں کہ مصنف کی انفرادیت کی تشکیل میں اس کا علم، کردار، تجربہ، مشاہدہ، افتادِ طبع، فلسفۂ حیات اور طرز فکر و احساس جیسے عوامل مل جل کر حصہ لیتے ہیں اس لیے اسلوب کو مصنف کی شخصیت کا پرتو اور اس کی ذات کا کلیہ سمجھا جاتا ہے۔

آثار الصنادید کے چوتھے باب میں رواں نظر آنے والے دونوں اسلوبوں کا جائزہ لینے کے بعد ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں جو سادہ آسان اور واضح اسلوب ہے وہ بلاشبہ نئی اردو نثر کے

(باقی صفحہ ۳۸ پر)

بجھنے نہ دے کبھی یہ چراغ وفا کی لو
یہاں خلا ہے بساطِ جہاں پر رکھنا
چہار سمت سے تیر اپنی یہ ہوتا ہے
بچا کے کس سے کہیں تم نہ ہری خبر رکھنا
کبھی میں آئے گا تب ایک رنج کا جوہر
ہتھیلیوں پہ کبھی تم جو اپنا سر رکھنا
اک آگ سی لگی پروائیوں کے موسم میں
مرے لیے بھی ذرا شعلۂ شرر رکھنا
متاعِ درد سنبھلتی بہت اب کسی سے
مرے نصیب میں تھا اس کو عمر بھر رکھنا

—— گرو بخش سنگھ مہاد
گاندھی نگر۔ شکلا گنج
محلہ گھاٹ، اناؤ

بہتی گنگوں کی آپس میں دوستی ان بن ہے
کہ چار حصوں میں تقسیم ایک آنگن ہے
ہمارے سر پہ کوئی آسمان ہو کہ نہ ہو
ہمارے پاؤں کے نیچے زمیں یقیناً ہے
اک انقلاب کی خواہش میں جی رہے ہیں سبھی
تلاش میں کسی رہبر کی آج جن جن ہے
زمانے والے جسے آسمان کہتے ہیں
ہمیں پتہ ہے بخوبی وہ تیرا دامن ہے
ہر ایک شخص نے پائی سگندھ اور ٹھنڈک
جنابِ خوابؔ کا ہر شعر جیسے چندن ہے

خوابؔ اکبرآبادی
اے ۲۔ کملا نگر
آگرہ ۲۸۲۰۰۴

میں جب سے شہر بتاں کے دیار میں ہوں
کبھی زمیں پہ چلوں اور کبھی غبار میں ہوں
میں ریزہ ریزہ بکھرتا ہوا عجیب کو
کبھی گمان بھی نہیں تھا کہ انتشار میں ہوں
نمو کا موسم ہوں کو نپل کے دل میں رہتا ہوں
شجر کا خواب ہوں پھولوں میں برگ و بار میں ہوں
جہاں سے میں نے پکارا تھا خود کو شادؔ کبھی
وہیں پہ آج تلک اپنے انتظار میں ہوں

—— خوشبیر سنگھ شادؔ
۲۲۰۔ رام نگر، عالم باغ
لکھنؤ ۲۲۶۰۰۵

غزلیں

نگاہِ حسن شعلہ بار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
نظر ہم رنگِ نوک خار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
مسیحائی تمہاری شہرۂ آفاق ہے لیکن
علاجِ دردِ دل دشوار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
تری غفلت شعاری آج بھی اے بے خبر زنداں
حریفِ جذبۂ بیدار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
لنڈھائی جا رہی ہے جب کہ گلرنگ مئے ساقی
تو پھر تشنہ ہر اک میخوار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
کھنکتے ساغروں کی صوت ہے ہنگام میں مضمر
سلاسل کی صدا جھنکار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

—— صداؔ لکھنوی
تکیہ پیر جلیل
گولہ گنج لکھنؤ

امینِ خال و خد جہاں ہیں انگلیاں اس کی
ہر آئینے میں ہیں تخلیق کاریاں اس کی
یہ کائنات عبارت اسی کے نام سے ہے
فضا میں بکھری ہوئی ہیں نشانیاں اس کی
کھنڈر سمجھ کے مجھے سرسری نظر سے نہ دیکھ
اسی کھنڈر میں ہیں مضمر حویلیاں اس کی
مجھے بھی کاش کسی حاشیے میں وہ رکھ دے
قلم نوشت کرے جب رباعیاں اس کی
نواحِ دشت میں اڑتے چمکتے پھول جیسے
سیاہ رات میں سرسبز کھیتیاں اس کی

—— حبیب
۳۰۸۔ سی، نجات گنج
کان پور

نہ ہوگی زندگی تاراج میری
وہ رکھیں گے اگر کچھ لاج میری
اگر وہ آ گئے ملنے کو مجھ سے
تو ہوگی پیار کی معراج میری
نہیں ہے ہاتھ ان کا میرے سر پر
محبت ہے ابھی تاراج میری
مجھے محفل میں رسوائی کا ڈر تھا
مگر رکھ لی انھوں نے لاج میری
کبھی رونا کبھی خاموش رہنا
کئی یوں زندگی معراج میری

—— سید معراج احمد
درگاہ شریف کمیر شاہ
حکیم پور کھیری

ملک محمد علی خاں

ملائم سنگھ یادو کی قیادت میں اتر پردیش

اتر پردیش میں ملائم سنگھ یادو سرکار کے ۲۴۳ دن پورے ہونے کو ہیں اور آٹھ ماہ کے قلیل عرصے میں ریاستی سرکار نے جو انقلابی اقدامات کیے ہیں وہ نہ صرف لائق تحسین بلکہ ملک کی دیگر ریاستوں کے لیے بھی مینارۂ نور ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں اتر پردیش سرکار کے عوامی فلاح و بہبود کے لئے کیے جانے والے رفاہی کاموں کی تشہیر نہیں ہو پا رہی ہے لیکن اس کے باوجود جناب ملائم سنگھ یادو کے دوروں اور بعض صحافتی اعلانیوں سے ریاستی سرکار کی کارکردگی عوام پر آشکارا ہو رہی ہے۔

ریاستی سرکار نے کسانوں، بیوپاریوں، تاجروں، طلبا و طالبات خواتین اور اقلیتی طبقات کے لئے اپنے انتخابی منشور میں جن باتوں کا اعلان کیا تھا اس پر بھرپور عمل درآمد کو یقینی بنایا ہے۔

چاق و چوبند نظم و نسق اور امن و ضبط کے ذمہ داروں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ان کا بھرپور تعاون ملائم سنگھ یادو سرکار کو حاصل ہے۔ مہاتما گاندھی، بابا صاحب امبیڈکر اور ڈاکٹر رام منوہر لوہیا کے افکار و نظریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ملائم سنگھ یادو سرکار نے دیہی سطح سے اپنے کام کا آغاز کیا ہے اور ۷۰ فیصد بجٹ دیہات کی ترقی کے لئے مخصوص کیا ہے۔

آب پاشی، کسانوں کو بیج اور کھاد کی فراہمی، صنعتوں کے قیام پینے کے پانی کی دستیابی اور تعلیم کی سہولت کو فوقیت دی گئی ہے۔

اتر پردیش سرکار نے سماج وادی نظام کو مستحکم بنانے کے لئے مساوات، خوش حالی، ہر ایک کے لیے انصاف اور دیہی سطح پر پنچایتوں کو زیادہ اختیارات کے ذریعہ نئے نئے تجربات کرتے ہوئے قانون ساز اسمبلی میں کئی بلوں کو منظور کیا گیا ہے۔

جناب ملائم سنگھ یادو کے سامنے کئی مشکلات بھی ہیں اور سیاسی طور پر انھیں ہراساں بھی کیا جا رہا ہے جبکہ فرقہ پرست طاقتیں بارود کے ڈھیر میں چنگاری ڈالنا چاہتی ہیں لیکن اس کے باوجود سماج واد کا کارواں آگے بڑھتا جا رہا ہے۔

ہم مسلمانوں کے تئیں وزیر اعلا کے اقدامات پر انھیں ہدیۂ تہنیت پیش کرتے ہوئے یہ بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ان کے اقدامات سے دیگر ریاستوں میں مسلمانوں کو ایک نیا حوصلہ ملا ہے اور مسلمانوں نے سماجی انصاف کے حصول کے لئے ملائم سنگھ سرکار کے اقدامات کا حوالہ دینا شروع کر دیا ہے۔

چالیس سال سے اردو زبان کے ساتھ مرکزی حکومت اور ریاستی سرکاروں نے جو ظالمانہ برتاؤ کیا تھا اس کا ازالہ اتر پردیش میں کیا جا رہا ہے جبکہ اردو کو روزی روٹی سے جوڑا گیا ہے۔ اردو ٹیچروں کا تقرر، عربی مدارس کے مدرسین کی تنخواہوں کی ادائیگی، اقلیتی کمیشن کو حاکمانہ اختیارات، اردو اکیڈمی کی تشکیل جدید، وقف بورڈ کو بدعنوان افراد سے نجات، اردو صحافتی ایوارڈ، فخرالدین علی احمد میموریل سوسائٹی کی کارکردگی میں تبدیلیاں، حاجیوں کے انشورنس اسکیم، حج ہاؤس کی تعمیر اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے تیز تر اقدامات کے علاوہ "شانتی سرکشا بل" کو امن و امان کی برقراری کے لئے تشکیل کرنے کا اعلان جناب ملائم سنگھ یادو کے تاریخ ساز اقدامات ہیں۔

ہم یہ بات پورے وثوق کے ساتھ
کہہ سکتے ہیں کہ آزادی کے بعد پہلی مرتبہ
اتر پردیش میں ایک ایسی سرکار قائم ہوئی ہے

جو اتر پردیش کو ملک کی ایک ترقی پذیر ریاست بنانے کا عزم کیے ہوئے ہے۔ اتر پردیش جو مختلف صنعتوں کے لئے دنیا بھر میں مشہور ہے اور ان صنعتوں کو ماضی میں جو نقصان پہونچا ہے، توقع ہے کہ یہ صنعتیں اپنی تیز رفتار ترقی کی بدولت گزشتہ نقصانات کا ازالہ کرسکیں گی۔

جناب ملائم سنگھ یادو نے ہندستان، پاکستان اور بنگلا دیش کے کنفیڈریشن کا ایک نیا سیاسی باب کھولا ہے جس پر سیاسی اور صحافتی مبصرین مصلحتاً خاموش ہیں، لیکن سیاسی حلقوں میں یہ چونکا دینے والا موضوع مقبول ہوتا جا رہا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جناب ملائم سنگھ یادو کو سیاسی طور پر ملک بھر میں اور دونوں ممالک کے امن پسند عوام کا کہاں تک تعاون حاصل ہوتا ہے۔

کسی بھی ریاست میں سرکار کے لئے ۴۴ دن کا وقفہ قابلِ ذکر نہیں ہوتا، لیکن وزیر اعلا جناب ملائم سنگھ یادو نے اس مختصر مدت میں جو چونکا دینے والے اقدامات کیے ہیں ان سے عوام حیرت زدہ ہیں۔

اگر سیاسی دخل اندازیوں اور فرقہ پرست طاقتوں کی مخالف ملائم سنگھ یادو تحریکات کمزور رہتی ہیں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اتر پردیش میں ملائم سنگھ یادو سرکار جرمنی اور جاپان کے نقشِ قدم پر چل کر سارے ملک کے لئے ایک مثال قائم کرے گی۔

جناب ملائم سنگھ یادو نے حیدر آباد میں دُو مرتبہ اپنے دوروں کے موقع پر جو تقاریر کی تھیں، ان کی روشنی میں نیز وزیر اعلا سے اپنی مختصر سی گفتگو کے بعد راقم الحروف نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ جناب ملائم سنگھ یادو ایک چٹان ہیں، آہنی عزائم کے مالک ہیں اور وہ جو کہتے ہیں، کر دکھاتے ہیں۔ انھوں نے ایک اچھی بات کہی تھی کہ:

"ہم کو ہندی یا اُردو میں خط لکھیں۔ اگر آپ کسی دوسری زبان میں لکھتے ہیں تو اس کا ترجمہ ضرور بھیجیں۔ ہم آپ کی تجاویز کا خیر مقدم کریں گے۔"

□□

بس۔ اِتنی سی؟ ——— صفحہ [illegible] کا بقیہ

بیوی کو رضائی کی طرح اوڑھتے جاتا۔

محلے والوں نے جو یہ ماجرا دیکھا تو سمجھے کہ میاں پر پھر زبردست دیوانگی کا دورہ پڑا ہے۔ جھٹ میاں کو قابو میں کیا اور اس بار زیادہ مضبوط رسیوں سے باندھ دیا۔ کہتے ہیں کہ بڑی توبہ تلّا کرنے کے بعد بیوی نے میاں کو آزاد کیا۔

ایک دن وہی میاں اپنے دروازے پر کھڑے تھے کہ گدھے پر بوجھ لادے ایک مسافر سامنے سے گزرا۔ میاں نے گدھے پر لدے بوجھ کے بارے میں دریافت کیا تو مسافر بولا:

"یہ میری بیوی کی مکّاریاں ہیں۔"

میاں نے بوجھ کو اچٹتی نظروں سے دیکھا اور بولا:

"بس اتنی سی ہی۔۔؟ تم بھی بڑے بھولے ہو یار۔" مسافر بیچارہ چلا گیا۔

یہ بتا کر پروفیسر راگھون نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولے:

"خدا جانے اس گدھے والے کی بیوی پر کیا گزری ہوگی، کیونکہ اختیار کے چھن جانے کا ڈر مرد کا بڑا قاتل ہوتا ہے۔ یہ سیکڑوں سال تک شوہروں کے کانوں میں مشوروں کی آواز کو بھی پہونچنے سے باز رکھتا ہے۔"

آثار الصنادید ——— ص [illegible] کا بقیہ

بابواآدم سید احمد خاں کا اسلوب ہے اور انشا پردازی و مبالغہ آرائی سے مملو جو شاعرانہ اسلوب ہے وہ مولانا امام بخش صہبائیؔ کی شخصیت کا پرتو ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ سرسید کے حوالے سے حالیؔ اور شبلیؔ کے بیانات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اور دونوں اسلوبوں کے تجزیے کے بعد "آثار الصنادید" کے چوتھے باب کو صہبائیؔ اور سرسید کی مشترکہ تصنیف قرار دیا جانا چاہیے کہ ادبی دیانت کا تقاضہ بھی یہی ہے۔

□□

حاشیہ:

سلے خواجہ الطاف حسین حالیؔ: حیاتِ جاوید (حصۂ دوم) علی گڑھ ص [illegible]

افسانہ

ڈاکٹر ناہید جعفری
۱۸/۳۴۵ محمود نگر ۔ لکھنؤ

ہم سفر روٹھ گیا

وطن واپس لوٹنے کے تصور نے مجھے تمھارے بہت قریب کر دیا تھا ـــ دل تم سے ملنے کو بیتاب ہو اُٹھا ـــ ایسا نہیں کہ ان ۲۵ برسوں میں تم مجھے یاد نہیں آئیں، یا یوں سمجھ لو کہ میں تم کو بھولا ہی کب تھا جو یاد کرتا ـــ تم تو ہر لمحہ میرے ساتھ رہیں۔ میری سانسوں میں، میرے دل میں، میری روح میں، میری خوشیوں میں اور میرے غم میں۔

لیکن آج جب لوٹنے کا ارادہ کر لیا تو بے قراریاں اور بڑھ گئیں دل مچل مچل کر تم سے ملنے کی ضد کر رہا ہے۔ آنکھیں تمھاری دید کی منتظر ہیں ہونٹ تم سے بات کرنے کے لیے بےچین ہو رہے ہیں۔ یہ بیتابی کس لیے ہے۔ میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔

مجھے ایک ایک پل بوجھ معلوم ہو رہا ہے۔ برسوں بعد اچانک تم سے ملنے کی خواہش جاگی .... اور وہ بھی کچھ اس طرح .... میرا دل قابو سے باہر کیوں ہو رہا ہے۔ فلائٹ میں ابھی آٹھ گھنٹے باقی ہیں .... اور یہ بے قراری .... میں کیا کروں؟

دل کو بہلانے کی غرض سے میں نے وہ بیگ نکالا جس میں تمھاری یادیں محفوظ ہیں۔ تمھارے دیئے ہوئے تمام تحائف جو تم اپنے جیب خرچ سے بچا کر لائی تھیں اور وہ سارے خطوط جو تم نے مجھے برسوں پہلے لکھے تھے، آج بھی تمھاری خوشبو ان میں بسی ہوئی ہے میں ان کو جان سے زیادہ سنبھال کر رکھتا ہوں .... یہ تو میری عمر بھر کی کمائی ہے اور میری زندگی کا سرمایہ .....

جب کبھی میں پریشان ہوتا تو ان خطوط کو بار بار پڑھتا اور ہر مرتبہ یہ مجھے نیا حوصلہ دیتے۔ کیوں کہ ان میں لیلیٰ مجنوں کی داستان درج نہیں ہے بلکہ میری کامیابیوں کے لیے دُعائیں، حوصلہ افزائی، نیک مشورے اور بہت ساری نصیحتیں موجود ہیں جو مجھے جینے کا حوصلہ دیتیں۔ تمھارا لکھا ہوا ہر لفظ مجھے کامیابیوں کی دہلیز تک پہنچانے میں مددگار ثابت ہوتا۔

میں نے ایک بار تمھیں لکھا تھا:

"میں تم سے دُور ہوں۔ تمھیں تنہائی کا احساس نہیں ہوتا۔؟"

تم نے جواب دیا تھا:

"میں خود کو کبھی تنہا نہیں پاتی۔ جانتے ہو کیوں؟ میرا پیار جو ہمیشہ میرے ساتھ رہتا ہے ـــ تم تو ہر وقت میرے دل و دماغ پر چھائے رہتے ہو۔"

اور سچ بھی یہی تھا۔ ۲۵ برس تم سے دور رہا ... لیکن ہمیشہ تمھارے پاس ہی کا رہا۔ تمھارے پیار میں اتنی طاقت تھی کہ میں خود کو ہمیشہ تمھارے قریب ہی پاتا۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ مجھے یہاں آنے کا حوصلہ بھی تم نے ہی دیا تھا۔ ورنہ ... میں تو ....

وہ دن مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں نے تم کو انکل کا خط دکھاتے ہوئے کہا تھا کہ "انکل مجھے لندن بلا رہے ہیں"۔ یہ سُن کر تم ایک لمحے کے لئے بالکل پیلی پڑ گئیں ـــ لیکن اس سے پہلے کہ میں تمھارے چہرے پر ابھرے تاثرات پڑھتا۔ تم مسکرا دیں:

"واقعی .... یہ تو بہت خوشی کی بات ہے .. کب جا رہے ہو؟"

تمھاری خوشی دیکھ کر مجھے سخت حیرانی ہوئی تھی ... میں تو سوچ رہا تھا کہ تم یہ خبر سنتے ہی رو پڑو گی .... مجھ سے لپٹ جاؤ گی اور کہو گی "اتنی دُور مت جاؤ"۔ لیکن .... لیکن سچ تو یہ تھا کہ تم مجھے آسمان کی بلندیوں پر پرواز کرتے دیکھنا چاہتی تھیں .... تو بھلا میری راہ میں رکاوٹ کیسے ڈالتیں۔؟

میں نے پوچھا تھا: "تمھیں افسوس نہیں ہوگا۔؟"

"افسوس کیسا ـــ تم ہمیشہ کے لئے تو جا نہیں رہے ہو۔"

"آ رکھے گئے ہیں ۔۔۔ میں نے اپنی زلفوں میں گرفتار ہو کر رکھا ہے تمہیں" ۔۔ تم نے اپنی گھنی زلفیں پھیلاتے ہوئے کہا تھا ۔ "مجھے یقین ہے میری محبت تمہیں کھینچ لائے گی۔"

"پھر بھی اگر نہ آسکا تو ۔۔۔ ؟"

"تو ۔۔۔ تو ۔۔۔" تمہاری زبان لڑکھڑانے لگی تھی۔ آنکھوں میں موتی جھلملانے لگے تھے۔ "تو کوئی بات نہیں ۔۔۔ تمہارا مستقبل تو سنور جائے گا۔" تم نے اپنا سر میرے کاندھے پر ٹکا دیا تھا۔ تمہاری آنکھوں سے دو موتی ٹپک کر میرے کوٹ میں جذب ہو گئے تھے۔

تمہارے تمام خطوط میں ایک ایک کر کے پڑھنے لگا، اس میں تمہارا آخری خط بھی تھا جس میں تم نے لکھا تھا کہ تمہاری شادی ہو رہی ہے اور التجا کی تھی کہ میں خط برابر لکھتا رہوں، اور تم بھی لکھو گی۔

لیکن میں نے تمہاری اس خواہش کو ٹھکرا دیا تھا ۔۔۔ میں نے لکھا تھا ۔۔۔ "میں اپنا فلیٹ بدل رہا ہوں۔ نیا ایڈریس روانہ کروں تو خط لکھنا" ۔۔۔ اور پھر میں نے اپنا گھر بدل دیا لیکن تم کو نہ تو ایڈریس دیا اور نہ ہی کوئی خط لکھا ۔۔۔۔ اس لیے نہیں کہ میں تم سے نفرت کرنے لگا تھا۔ میں تو تم کو دل و جان سے چاہتا تھا۔

وہ پاگل لڑکی ۔۔۔ میرا پیار کہیں اسے برباد نہ کر دے ۔۔۔۔ میں اس کو کچھ دے نہیں سکا اس کا مجھے بہت افسوس ہے۔ لیکن اب جب کہ اس کی زندگی میں بہار آ رہی ہے تو ۔۔۔۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرا پیار اس کی خوشیوں میں رکاوٹ بن جائے۔ میں اس کو بہت خوش دیکھنا چاہتا تھا اس لئے مجبوراً ایسا قدم اٹھانا پڑا ۔۔۔۔ ایسا کرتے وقت میرا دل رو رہا تھا۔ میری آس ٹوٹ رہی تھی، میرا پیار روٹھ رہا تھا ۔۔۔ لیکن یہ کون سمجھے گا ۔۔۔۔

میں نے گھڑی پر نظر ڈالی، اب صرف دو گھنٹے رہ گئے تھے، اس لئے سامان اٹھایا اور ایئرپورٹ کے لئے روانہ ہو گیا۔

ہندستان میں قدم رکھتے ہی میری آنکھیں بھر آئیں۔ وہی ایئرپورٹ جہاں ۲۵ برس پہلے وہ مجھے چھوڑنے آئی تھی ۔۔۔ لیکن ۔۔۔۔ آج ۔۔۔۔ میرا کوئی اپنا نہیں جو مجھے لینے آتا۔

باہر نکل کر ٹیکسی لی اور شہر کے بڑے ہوٹل کی جانب چل دیا ۔۔۔ راستے بھر میری نگاہیں اس کو تلاش کرتی رہیں۔ شاید وہ کہیں نظر آ جائے اس کے ساتھ گزرا ایک ایک پل مجھے یاد آ رہا ہے وہ جگہیں جہاں ہم ملتے تھے ۔۔۔ آنکھوں کے سامنے رقص کر رہی ہیں۔

رات کافی ہو چکی ہے لیکن نیند کیوں نہیں آ رہی ہے ۔۔۔ شاید ۔۔۔ نئی جگہ کی وجہ سے ۔۔۔ لیکن نئی جگہ کہاں ۔۔۔ بچپن سے جوانی تک کا سفر اسی شہر میں، اسی ملک میں طے کیا تھا۔ تو پھر ۔۔۔ اتنا بے کلی کیوں ۔۔۔ ؟ ہو سکتا ہے اس سے ملنے کی خواہش دل کو بے چین کر رہی ہو۔ یا میں اس سے ملنے کی ہمت نہیں کر پا رہا ہوں ۔۔۔ ایک انجانا سا خوف دل کو چھو رہا ہے۔ کہیں میری اس بے رخی کا اس نے غلط مطلب نہ نکال لیا ہو۔ کہیں وہ مجھ سے نفرت نہ کرنے لگی ہو ۔۔۔ اُف ایسا مت کرنا میں تمہاری نفرت برداشت نہیں کر سکتا ۔۔۔ اگر تم مجھ سے نہ ملیں تو ۔۔۔ میں کیا کروں گا ۔۔۔۔ میرا بھرم کہیں ٹوٹ نہ جائے ۔۔۔ پھر میں یہاں رک کر کیا کروں گا ۔۔۔ مجھے صرف تم یہاں لائی ہو ۔۔۔ صرف تمہاری یادیں اور تمہارا پیار ۔۔۔

اگر تم مجھ سے خفا ہو گئیں تو ۔۔۔ ؟ تمہیں یاد ہے، ایک روز تم نے کہا تھا:

"میری چھوٹی چھوٹی خواہشات میں ایک خواہش یہ بھی ہے کہ ایک بار میں تم سے روٹھ جاؤں۔ پھر تم مجھے مناؤ ۔۔۔ میں نہ مانوں ۔۔۔ میں تم کو خوب ستاؤں ۔۔۔ اور پھر ۔۔۔ پھر تمہارے گلے لگ جاؤں ۔۔۔ خوب ہنسوں، خوب ہنسوں ۔۔۔"

"آج تمہاری وہ خواہش پوری ہو جائے گی ۔۔ آج میں تم کو خوب مناؤں گا۔ خوب مناؤں گا ۔۔۔ اور پھر تم مجھ کو معاف کر دو گی ۔۔۔ کر دو گی نا ۔۔۔" ؟

تم سوچتی ہو گی کہ میں تمہیں بھول گیا ۔۔۔ تمہارے ساتھ فریب کیا ۔۔۔ تم کو چھوڑ کر چلا گیا اور واپس نہیں آیا۔

لیکن ایسا نہیں ۔۔۔ میری روح، میری زندگی، میرا پیار، میرا احساس سب کچھ تم ہی تو ہو ۔۔۔ میں تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں ۔۔۔ ؟

یقین مانو۔ ان گزرے ہوئے برسوں میں۔ میں نے ہمیشہ تمہیں

اپنے ساتھ پایا۔ میری ہر کامیابی پر تمھارا مسکراتا ہوا چہرہ مجھے مبارکباد دیتا، اور مزید کامیابیوں کی دُعائیں ـــــ اور اگر کوئی اُلجھن مجھے گھیرتی تو تم مجھے حوصلہ دیتیں، میری ہمت بڑھاتیں ـ اور جب کسی مصیبت میں گرفتار دیکھتیں تو اپنا آغوش پھیلائے میری جانب چلی آتیں اور پیار سے مجھے سمیٹ لیتیں ـ تم تو اُس برگد کے پیڑ کی مانند ہو جو خود تو سارا دن دھوپ میں جلتا ہے لیکن تھکے ہارے مسافروں کو اپنے سائے میں سمیٹ لیتا ہے۔

میں نے تمھیں جو زخم دیئے ہیں یقیناً وہ قابلِ معافی نہیں ہیں۔ لیکن مجھے اپنے پیار پر یقین ہے۔ وہ مجھے ضرور معاف کر دے گی۔

صبح ہوتے ہی تمھارے گھر کی جانب چل دیا۔ گھر تلاش کرنے میں تھوڑی دقّت ضرور پیش آئی کیوں کہ گزرے برسوں میں کافی کچھ بدل چکا ہے تمھاری گلی کے نکڑ پر چھٹن میاں کی چائے کی وہ دوکان آج ایک اچھے ریسٹورنٹ میں بدل گئی ہے۔ مکانات بھی کافی بدل چکے ہیں۔ نئی نئی عمارتیں نظر آرہی ہیں۔ شاید وہ تمھارا گھر ہے ـ لیکن ـ ایسا تو نہیں کہ تم بھی اس گھر کو چھوڑ چکی ہو ـ لیکن یہ تو تمھارا موروثی مکان ہے ـ جس کی تم تنہا وارث ہو۔

دروازے پر آہستہ سے دستک دے کر کچھ فاصلے پر کھڑا ہو گیا ـ دل زور سے دھڑک رہا تھا۔ چند منٹ بعد دروازہ کھلا ـ سامنے تم کھڑی تھیں ــــ لیکن ..... تم مجھے دیکھ کر خوش کیوں نہیں ہوئیں ..... کیا پہچانا نہیں ...؟ شاید خفا ہو ـــــ تم بالکل ویسی ہی لگ رہی ہو جیسا میں تمھیں چھوڑ کر گیا تھا۔

لیکن ـــــ مجھے اپنے سفید بالوں کا خیال آیا ـــــ تو کیا تم بالکل نہیں بدلیں ـــ !! میں نے جلدی سے جیب سے عینک نکال کر آنکھوں پر چڑھائی۔

نہیں ..... اگر تم ہوتیں تو ..... تو شاید ..... لیکن وہی نقوش، وہی رنگت، وہی قد، وہی سیاہ زلفیں، وہی عمر ـــ لیکن کیسے.....؟ کہیں یہ تمھاری بیٹی تو نہیں .....!؟

ہاں ـ بالکل یہ تمھاری بیٹی ہی ہو سکتی ہے ـــــ بالکل تمھاری ہی کاپی ـــــ!!

"آپ کو کس سے ملنا ہے۔؟"

اس کے اس سوال نے مجھے چونکا دیا ... وہی آواز ....

"بیٹی! تمھاری امّی ہیں۔؟"

"امّی .... امّی تو ...." اس نے ایک سرد آہ بھری۔

یہ اس کی آنکھوں میں آنسو کیوں ـــ؟ میرا دل ڈوبنے لگا ـ خدا خیر کرے ــــ سانسیں رُکتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

"امّی کے انتقال کو تو چھ ماہ بیت گئے۔"

"تو کیا..." میرا جسم لرز گیا ـ سر چکرانے لگا۔ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا:

"تمھارے پاپا کہاں ہیں۔؟"

"شاید آپ بہت دن بعد یہاں آئے ہیں؟"

"ہاں ـ پچیس برس بعد۔"

"ہوں" اس نے طنزیہ نظروں سے آسمان کی جانب دیکھا۔ ـــــ "میرے ابّو ـ وہ تو مجھے دو ماہ کا چھوڑ کر دُنیا سے رُخصت ہو گئے تھے ـــ!!"

"تو کیا وہ بھی ....؟"

"جی .... اُس وقت میرے بھیّا کی عمر صرف چار سال تھی۔"

"نہیں ....!" ایک گھُٹی گھُٹی سی چیخ میرے حلق سے نکل گئی۔

لیکن اس نے مجھے یہ سب نہیں لکھا۔؟

پھر سوچا ـ وہ لکھتی کہاں ـــــ

میں نے اس کو اپنا پتہ بھی نہیں دیا تھا ـــــ یہ میں نے کیا کیا ـ؟

وہ پگلی تو ہر مصیبت میں دور رہ کر بھی میرا ساتھ دیتی رہی ـــــ اور جب اس پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹا۔ تو وہ بالکل تنہا ـــــ وہ سب کچھ اکیلے سہتی رہی۔ اس نے اتنا لمبا سفر کیسے طے کیا ہوگا.....؟ اس پر اس پر کیا بیتی ہوگی ـــ کتنی بے بس رہی ہوگی وہ ... یہ میں نے کیا کیا۔؟

میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، اس بچے کی طرح جس کا سب سے پیارا کھلونا کسی نے چھین کر توڑ دیا ہو۔

□□

فصاحت حسین رضوی

کسانوں، مزدوروں اور کمزور افراد کا طاقت ور ذریعہ

امداد باہمی تحریک

ملک کو طاقت ور اور مستحکم بنانے نیز اسے ترقی کی شاہراہ پر گامزن کرنے کے لئے معیشت پر موثر کنٹرول ضروری ہے۔ معیشت کا استحکام اسی وقت ہو سکتا ہے جب گاؤں میں خود کفیل معاشی نظام موجود ہو اور گاؤں کے رہنے والے بھی خود کفیل ہوں۔ ملک کی تین چوتھائی آبادی گاؤں میں رہتی ہے جو بنیادی طور سے زراعت پر منحصر ہے۔ اس لیے زرعی پیداوار کی ترقی کے ذریعہ ہی صحیح معنی میں قوم کی ترقی اور اس کا عروج ہو سکتا ہے جس کے لئے امداد باہمی ہی ایک طاقت ور ذریعہ ہے۔ ہندستان میں امداد باہمی تحریک کا آغاز بنیادی طور پر کسانوں کو قرض مہیا کرانے اور سماج کے کمزور طبقوں کی اقتصادی صورت حال بہتر بنانے کے لیے ہوا۔

اتر پردیش کی منصوبہ بند اقتصادی ترقی میں محکمہ امداد باہمی نے اہم کردار ادا کیا ہے اور ملک کو ترقی کی راہ پر لے جانے کے لیے یہ مسلسل کوشاں ہے۔ امداد باہمی کمیٹیوں کے توسط سے یہ محکمہ مختلف فلاحی اسکیمیں موثر طور پر نافذ کر کے ریاست کے درج فہرست ذاتوں، قبیلوں، چھوٹے اور مارجنل کسانوں، بے زمین کسانوں، دیہی دست کاروں، بے زمین مزدوروں اور کمزور طبقوں کے وسائل سے محروم افراد کو مسلسل ترقی کی راہ پر لے جا رہا ہے۔ امداد باہمی کی تحریک کے توسط سے عوام الناس کی حصہ داری کو یقینی بنا کر سوشلسٹ سماج کے قیام کے لئے کوشاں ریاستی سرکار کے وعدوں کو حقیقت میں بدلنے میں محکمہ امداد باہمی سرگرم عمل ہے۔

اتر پردیش میں شری ملائم سنگھ یادو کی قیادت میں غریبوں، دبے کچلے، پس ماندہ طبقوں اور اقلیتوں کی موجودہ حکومت نے امداد باہمی تحریک کو اور زیادہ موثر اور فعال بنانے کے مقصد سے کچھ اہم فیصلے کئے ہیں۔

موجودہ حکومت کی ۴ دسمبر ۱۹۹۳ء کو تشکیل ہوئی اور اسی ماہ سے دیہی سطح پر پرائمری زرعی قرض کمیٹیوں سے لے کر ریاستی سطح تک کی بڑی امداد باہمی انجمنوں میں انتخاب کا کام ایک مہم کی شکل میں شروع کیا گیا۔ سوشلسٹ سماج کا قیام امداد باہمی تحریک میں حصہ داری کو یقینی بنانے اور دبے کچلے اور پسماندہ طبقوں کے لیے چلائی گئی اس مہم کے تحت پرائمری، زرعی انجمنوں، امداد باہمی تنظیموں، خرید و فروخت کمیٹیوں اور مرکزی امداد باہمی صارفین اسٹوروں کے انتخابات کرائے جا چکے ہیں۔

امداد باہمی انجمنوں کا انتظام عوامی نمائندوں کے ہاتھوں میں سونپنے کے مقصد سے موجودہ حکومت کی جانب سے چلائے جا رہے اس پروگرام سے ریاست میں پہلی مرتبہ اس تحریک کو جمہوری شکل دی گئی۔ موجودہ حکومت نے اپنے وعدے کے مطابق باقی تمام سطح کی امداد باہمی انجمنوں کے انتخابات کا کام مکمل کر لیا۔

ریاست کے وزیر امداد باہمی کی صدارت میں تشکیل شدہ کمیٹی کی منظوری کی بنیاد پر اتر پردیش امداد باہمی قانون ۱۹۶۵ء میں ترمیم کی گئی ہے جس کے باعث امداد باہمی انجمنوں کی مدت کار اب تین سال سے بڑھا کر پانچ سال کر دی گئی ہے۔ امداد باہمی تحریک میں اقوام و قبائل درج فہرست، پس ماندہ طبقے اور خواتین کے

پرڈویژن کو یقینی بنانے کے مقصد سے موثر کارروائی کی جارہی ہے۔

ایک اہم فیصلے کے تحت دفعہ ۱۱۳ کو ختم کردیا گیا ہے جس میں امداد باہمی قانون کی کسی بھی تجویز کو کسی کمیٹی سے متعلق زیرِ بحث لانے اور ترمیم کرنے کے ساتھ نافذ کرنے کا اختیار حکومت کو تھا۔ اسی طرح رجسٹرار امداد باہمی کمیٹیوں کے ذریعہ تمام رجسٹرڈ کمیٹیوں کی مدّت کار ختم ہونے سے قبل ضروری انتخابات کو یقینی بنائے جانے کا بندوبست کیا گیا ہے۔

وزیر اعلیٰ شری ملائم سنگھ یادو نے اترپردیش زرعی اور دیہی ترقیاتی بینک کی ورکنگ کمیٹی اور امداد باہمی انجمنوں کے نمائندوں کو میٹنگوں میں شرکت کرنے کے لئے ملنے والے سفری بھتّے کی رقم ۵۰ روپئے سے بڑھا کر ۱۰۰ روپئے کردی ہے۔ اسی طرح امداد باہمی تحریک کو نئی جہت اور نئی رفتار دینے میں اہم تعاون دینے والے نمائندوں کو اعزاز دینے کے لئے بھی ایک اسکیم بنائی گئی ہے۔

گاؤں گاؤں میں امداد باہمی کے تئیں لوگوں کو تلقین کرنے اور ان میں امداد باہمی کے جذبے کو بیدار کرنے کے کام کو ایک نئی شکل دی گئی ہے جس سے امداد باہمی کو ایک مستحکم عوامی تحریک بنایا جاسکے گا اور دُور افتادہ دیہی علاقوں تک امداد باہمی کی مشعل جلائی جاسکے گی۔ اس سے جہاں ایک طرف لوگوں کو خاص طور سے دیہی عوام کو امداد باہمی سے فائدہ اُٹھانے کا موقع ملے گا وہیں دوسری طرف قومی یک جہتی کو بھی تقویت حاصل ہوگی اور ریاست میں امن و آشتی کا ماحول قائم ہوسکے گا۔

□□

غزل

سبھی چہرہ بدل کر بولتے ہیں
نگاہیں چپ ہیں منظر بولتے ہیں

سوادِ دشت میں اپنی نوا کیا
دریچوں سے کبوتر بولتے ہیں

سوالوں نے خموشی سادھ لی ہے
جوابوں میں تو خنجر بولتے ہیں

بُتوں سے جا کے چوراہوں پہ ملنا
اکیلے میں یہ پتھر بولتے ہیں

پرندے چہل قدمی کر رہے ہیں
اڑانوں میں تو شہپر بولتے ہیں

ناصر نقوی

قطعات

پندرہ تاریخ آئی، آگیا ماہِ اگست!
پی کے صہبائے مسرت ہر بشر ہے آج مست
آج کتنی شاداں ہے مادرِ ہندوستاں
تھے غلامی میں، تو سب کے حوصلے رہتے تھے پست

گاندھی و آزاد و قدوائی، جواہر لال جی
ہے انھیں کی کوششوں سے ہم کو آزادی ملی
ان کے احسانات بھولیں گے نہیں اہلِ وطن
مل کے آزادی کھلی ہر شخص کے دل کی کلی

—— ماسٹر عبدالمنان صدیقی
محلہ بنگلہ۔ پُرانا سیتاپور

نقد و تبصرہ

تبصرے کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب "طبقاتِ سخن"
مرتب، ڈاکٹر نسیم اقتدار علی   قیمت: ۱۵۰/- روپے
ملنے کا پتہ: دانش محل۔ امین آباد لکھنؤ

یہ بات تکلیف دہ ہے کہ یونیورسیٹوں میں کلاسیکل لٹریچر پر بہت کم توجہ دی جا رہی ہے۔ برسوں سے کسی ادبی پارے کو دیکھنے کے لئے آنکھیں ترستی ہیں۔ قابلِ مُبارکباد ہیں ڈاکٹر نسیم اقتدار علی، جو ایک چھپے ہوئے ادبی خزانے کو منظرِ عام پر لائی ہیں۔ ایک صنفِ نازک کے لئے تذکرہ نویسی کے فن پر تحقیقی مقالہ تیار کرنا اور اُسے پایۂ تکمیل تک پہونچانا کارِ نمایاں ہے۔ اب وہ اساتذہ کہاں جو مخطوطہ شناسی اور مخطوطہ کی موشگافیوں میں مہارت رکھتے تھے اس لئے موجودہ زمانے میں طالب علموں کے لئے خطِ شکست کا پڑھنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے

عرصۂ دراز سے طبقاتِ سخن کی اشاعت کی کمی بڑی شدّت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ بہت سے لوگ اس تذکرے کے نام سے ناواقف ہیں۔ آج سے کوئی ۱۴۰ سال پہلے ڈاکٹر اسپرنگر نے اودھ کیٹلاگ مطبوعہ ۱۸۵۴ء میں مؤلفِ تذکرہ اور اس کی تصنیفات پر روشنی ڈالی تھی۔ یہ فہرست صرف ڈھائی سو جلدوں میں چھپی تھی اور وہ بھی اب عنقا ہو رہی ہے۔

"طبقاتِ سخن" تذکرے کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۲۲ھ (۱۸۰۷-۸ء) کے اعداد برآمد ہوتے ہیں۔ طبقاتِ سخن غالباً پہلا تذکرہ ہے جس میں لکھا ہے کہ "چھنولال تخلص طرب نے مذہبِ اسلام قبول کیا اور مرثیہ میں دلگیر تخلص کرتے ہیں۔" (نسخۂ برلن)

ہماری تحقیق کے مطابق دلگیر ۱۲۳۰ھ (۱۸۱۵ء) میں مشرف بہ اسلام ہوئے تھے اور غلام حسین اسلامی نام رکھا تھا۔

ڈاکٹر صاحبہ نے مؤلفِ تذکرہ کے حالات بہ کم و کاست جمع کئے ہیں۔ جہاں تک معلوم ہو سکا مصنف کے حالات و تصنیفات کا ذکر تو ہے تفصیلات کے ساتھ محبراتی لال کے تذکرہ بے جگر (قلمی، غیر مطبوعہ ورق ۸۱۲ الف) میں موجود ہیں۔

اس تذکرہ میں مبتلا کے دیوان فارسی کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحبہ ان دونوں تذکروں کا بغور مطالعہ فرماتیں تو مبتلا کے بارے میں مزید معلومات فراہم ہوتیں۔

طبقاتِ سخن غیر محتاط تذکرہ ہے۔ اگرچہ اس میں بعض نئی باتوں کا انکشاف کیا گیا ہے تاہم اس میں بہت سی غلطیاں موجود ہیں۔ نواب آصف الدولہ کو آصف جاہ لکھا ہے۔ میر حسن کا نام میر غلام علی اور مصحفی کو "برادرِ نام او میر غلام علی ہمدانی است" لکھا ہے۔

طبقاتِ سخن سے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ بہو بیگم ... "زوجۂ نواب بلند اقبال وزیرِ ہند شجاع الدولہ بہادر" شعر بھی کہتی تھیں۔ ص۲۵ میں ان کی یہ رباعی ملتی ہے ؎

کس کس کوچے میں عشق لایا ہم کو
کیا کیا ستم و جور دکھایا ہم کو
منظور اگر یہی دل آزاری تھی
سوتے تھے عدم سے کیوں جگایا ہم کو

تذکرے کی ایک اہم خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں بہت سے شعراء کا نمونۂ کلام بہت زیادہ تعداد میں دیا گیا ہے۔ یہ پہلا تذکرہ ہے جس میں میر تقی میر کی دو اہم مثنویوں کا انتخاب درج کیا گیا ہے۔ "دریائے عشق" کم و بیش پوری نقل کی گئی ہے۔ "اعجازِ عشق" کے بھی بہت سے شعر ملتے ہیں۔ اسی طرح مثنوی سحر البیان اور سودا کے قصیدے کے سیکڑوں اشعار درج کیے ہیں، ان میں بعض اشعار پہلی مرتبہ سامنے آئے ہیں۔

ڈاکٹر صاحبہ نے مقالے کا مقدمہ بڑی محنت، عرق ریزی اور ایمانداری سے مرتب کیا ہے۔ مقدمہ ۵ ابواب پر مشتمل ہے۔ مرتبہ نے ایک اچھے وکیل کی طرح مستحکم دلیلوں سے ان تمام غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے جو بعض ناقدین اور محققین سے طبقاتِ سخن نہ دیکھنے کی وجہ سے رونما ہوئی تھیں

انھوں نے نسخۂ شاہجہاں پور کو بنیاد بنایا ہے اور برلن اور نارنگ کے نسخوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ ان تمام اوصاف کے باوجود یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ محترمہ نے تذکرہ کی تدوین و ترتیب سے کنارہ کشی کیوں اختیار کی ہے۔

بہر حال یہ مقدمہ شاندار اور قابل تعریف ہے۔ اس تذکرہ (طبقاتِ سخن) پر محترمہ کو پروفیسر محمود الٰہی صاحب کی نگرانی میں گورکھپور یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی ہے۔

———— اکبر حیدری کشمیری

نام کتاب: "ندی کنارے پیاس"
شاعر: شریف قریشی شریف قیمت: ۴۰/- روپئے
ملنے کا پتہ: مکتبۂ دین و ادب۔ امین الدولہ پارک
لکھنؤ

جدید شعری ادب میں جناب شریف قریشی کی ایک نمایاں شخصیت ہے۔ "ندی کنارے پیاس" ان کا چوتھا مجموعہ ہے۔ ان کے یہاں ایسی جدت نہیں جو لایعنیت اور بے معانیت کی حدود کو چھولے اور وہ کلاسیکیت بھی نہیں جو بوسیدہ تشبیہوں اور استعاروں کے سہارے استقامت پذیر ہو یہ مجموعہ ان کی عملی زندگی کا پرتو معلوم ہوتا ہے۔ وہ پیاس کو زندگی کی علامت سمجھتے ہیں اور ناکامیوں سے انھیں نئی جدوجہد کا حوصلہ ملتا ہے اسی لیے غمِ دوراں ان کے راستے میں دیوار نہ بن سکا۔ انھوں نے زندگی کی صداقتوں کے اعتراف میں ساتھ ساتھ فکر کی بلندی اور تجربوں کی دھوپ سے اپنے کلام کو آراستہ کیا ہے ؎

جلتا ہوا چراغ کسی زاویے پہ ہو
کرنیں سفر کریں گی خطِ مستقیم پر

انھوں نے گیت اور نظموں پر بھی کامیاب طبع آزمائی کی ہے 'دیکھا گھر گھر آسے'، 'رجنی گندھا' اور 'بھولی بسری یادیں' ان کی بہت دلآویز نظمیں ہیں۔ ایک اور نظم "یہ انسانوں کی بستی ہے" میں حالاتِ حاضرہ پر کتنا بیباک مگر اصلاحی انداز کا تبصرہ ہے:

"یہ خطہ کیسا خطہ ہے —
جہاں پر زندگی مہنگی ہے لیکن موت سستی ہے
مری دانست میں شاید
یہ انسانوں کی بستی ہے"

مجموعی طور پر یہ شعری مجموعہ ادب میں گرانقدر اضافہ ہے اور قابلِ مطالعہ ہے۔

———— راجندر بہادر موج

نام کتاب: "ہندستان میں فلسفۂ خودی کا ارتقاء"
مصنف: نشور واحدی قیمت: ساٹھ روپئے
ملنے کا پتہ: نیاز واحدی ۹۶/۳۷۔ ناظر باغ
کانپور

حضرت نشور واحدی مرحوم اردو ادب کی شعری کائنات میں ایک توانا اور عظیم شخصیت کی حیثیت سے اپنے زمانۂ حیات ہی میں تسلیم کیے جا چکے ہیں لیکن بطور نثار اور بالخصوص مفکر و فلسفی بہت کم لوگ موصوف سے واقف ہو سکے ہیں۔ اس کا خاص سبب یہ ہے کہ نشور صاحب کی شعری تخلیقات زیادہ تعداد میں شائع ہوئیں۔ ان کے تقریباً دس شعری مجموعے ۱۹۳۹ء سے ۱۹۷۸ء تک زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ ۱۹۶۶ء میں "دانشِ آخرالزماں" کے نام سے ایک کتابچہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

نشور صاحب کی زیرِ بحث تخلیقی نثری کاوش ان کی پہلی تصنیف "تاریخِ فلسفۂ خودی" کی ہی دوسری اور آخری کڑی ہے۔ جن لوگوں نے موصوف مرحوم کی شاعری پڑھی، سنی یا کسی نہ کسی طور پر اس سے واقف ہوئے انھیں ضرور یہ احساس ہوگا کہ نشور صاحب کے شعری افکار میں فلسفہ کا غالب رجحان ہے۔ اردو شاعری میں جہاں کہیں بھی فلسفۂ خودی کا ذکر آتا ہے علامہ اقبال کی جانب لاشعوری طور پر ذہن منتقل ہو جاتا ہے۔ نشور صاحب کی مذکورہ تخلیق اس کمال کی حامل ہے کہ انھوں نے اقبال کے اسی نظریے کی توضیح نہ صرف سریع الفہم کی ہے بلکہ ہندستان کے مختلف مذاہب کے مفکرین و صوفیا کے نظریات کی تاریخ مرتب کر دی ہے۔

زیرِ نظر تصنیف میں مشاہیر قلم کاروں: ڈاکٹر نثار احمد فاروقی ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری مدیر نگار کراچی (پاکستان)

کے گراں قدر مقالات، محترمہ بیگم نظر فاطمہ کا اور صاحبزادے نیاز احمد کا کے مضامین بھی شامل ہیں۔ کتابت و طباعت نفیس ہے بہتر گرد پوش انتہائی جاذب، نفیس اور گٹ اپ شاندار ہے۔ امید ہے کہ نظر فاطمی مرحوم کی مذکورہ تصنیف ارباب علم و قلم میں اسی دلچسپی کے ساتھ پذیرائی حاصل کرے گی۔

—— شمیم عثمانی

نام کتاب: "رشتوں کا کرب"
مصنف: محمد قیوم میو   قیمت: ۴۰/ روپے
ملنے کا پتہ: محمد قیوم میو (ایوب منزل) کریم نگر، تاج گنج۔
آگرہ ۲۸۲۰۰۱

رشتوں کا کرب محمد قیوم میو کے ۷۵ منی افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اپنی مختصر تاریخ میں اُردو افسانے نے اسلوبی، موضوعاتی اور ترسیلی اعتبار سے کئی رنگ بدلے ہیں۔ منی افسانہ انھیں رنگوں میں سے ایک رنگ ہے اور یہی منی افسانے کی ایجاد کا باعث ہے۔ منی افسانہ کوئی چٹکلا، واحد واقعہ، حادثہ یا سانحہ کی مختصر بیانی ہے۔ منی افسانوں کو رمزیت، تہ داری، علامتی انداز اور جذباتیت میں ڈھالا جاتا ہے جس کی محرک تیز رفتار، مصروف اور اذیت زدہ زندگی ہے۔

محمد قیوم میو نے اُردو کے افسانوی ادب میں ان نوجوانوں کی نمائندگی کی ہے جو اپنے احساسات و جذبات کو افسانہ کے پیرایہ میں چابکدستی سے پیش کر سکتے ہیں۔ ان کے منی افسانوں میں ہمدردی کا جذبہ، عصری آگہی، موجودہ سماجی مشاہدات کی جھلکیاں اور لاشعوری طنز نمایاں ہے انھوں نے اپنے ماحول کے واقعات کو لفظی جامہ پہنایا ہے اور اخلاق کے گرتے معیار کا تجزیہ کیا ہے۔

'رشتوں کا کرب' ہمارے سماج میں ہونے والے روزمرہ کی زندگی کے واقعات اور نقشے اصل رنگوں کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ 'انوکھا جہیز' موجودہ سماج کی اس گھناؤنی تصویر کو ایک انوکھے انداز میں پیش کرتا ہے جس میں معصوم اور بے گناہ دوشیزاؤں کو جہیز کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔

محمد قیوم میو کے منی افسانے بہت سادہ زبان میں عصری مسائل پیش کرتے ہیں۔ زبان و بیان میں سادگی ہے لفظی بازیگری اور مبالغات سے گریز کیا گیا ہے۔

—— خلیل اللہ خاں

نام کتاب: "ارضِ دل"
شاعر: عرفان اعظمی   قیمت: ستر روپے
ملنے کا پتہ: مکتبۃ النعیمیہ۔ صدر بازار۔ مئوناتھ بھنجن

"ارضِ دل" اس شاعر کے دل کی کراہ کا نام ہے جسے فکر معاش ارضِ وطن سے ہزاروں میل دور لے گئی ہے۔ یہ ایک ایسے حوصلہ مند شاعر کا مجموعۂ کلام ہے جسے بچپن سے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا پڑا۔ حالات کی بے رحمی پھر پدر بزرگوار کی گمشدگی جس نے کھلونوں سے کھیلنے والے دنیا کے مسائل سے دور ایک آزاد فضا میں سانس لینے کے بجائے شاعر کو حساس دل کا مالک بنا دیا اور اسی زود حسی کا نتیجہ شاعری کی شکل میں سامنے آیا۔ عرفان اعظمی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لیکن غزل کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی حالات سے متاثر ہو کر نظمیں بھی کہی ہیں۔ ان کی نظموں اور غزلوں میں احساس و جذبات کی اتنی یکسانیت ہے کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے آیا یہ غزل بہتر کہتے ہیں یا نظم۔

عرفان اعظمی عرصہ سے مدینہ منورہ میں مقیم ہیں ان کا بیشتر کلام ایسا ہے جو اسی سرزمین پر تخلیق ہوا ہے لیکن انداز کلام سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر اپنے وطن عزیز اور یہاں کے حالات سے بے خبر نہیں ہے ہر چند کہ کتاب میں کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں بھی ہیں مگر مجموعی طور پر کتابت طباعت اور کاغذ بہتر ہے۔

—— سلیم عمر

نام کتاب: "ترے خیال کی وحدت" (شعری مجموعہ)
شاعر: حبیب اجملی   قیمت: ۴۰/ روپے
ملنے کا پتہ: سیماب پبلیکیشنز۔ کرو تدیا۔ سول لائنس۔
سلطان پور

مجروح کے ساتھ سلطان پور محتاج تعارف نہیں۔ حبیب اجملی اسی سرزمین کے ابھرتے ہوئے نئی نسل کے نوجوان شاعر ہیں۔

"ترے خیال کی وحدت" ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ حبیب اجملی کا شعری سفر ابھی کچھ زیادہ طویل نہیں ہے لیکن ان کے یہاں پراسرار قسم کی توجہ کرنے والی سی ایک کیفیت ضرور ملتی ہے۔ مجموعہ کی ابتدا میں چند نعتیں عقیدت کے طور پر تبرکاً شامل کی گئی ہیں لیکن شاعر کی اپنی تصویر اس کی غزلوں میں زیادہ نمایاں ہے اور وہ تمام پہلو و عناصر ملتے ہیں جس کا نام حسیت و شعریت ہے۔

ترے خیال کی وحدت نے روک رکھا ہے
میں اپنے آپ سے بھی آج تک نہ مل پایا

شاعر کے یہاں جدید لب و لہجہ اور نئی علامتوں کے ساتھ عصری آگہی کا احساس بھی ملتا ہے اور غزل کے رموز و نکات اور کلاسیکی انداز سخن کا احترام بھی ہے

ہے شور ڈوب کے سورج نے خودکشی کر لی!
لگی ہے بھیڑ سمندر کے آس پاس بہت

حبیب نے نظموں پر بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کی غزلیں زیادہ مترنم اور اثر انگیز ہیں۔

"ترے خیال کی وحدت" ایک کھلی ہوئی کتاب ہے جو ادبی مطالعہ کو دعوتِ سخن دیتی ہے۔ ابھی حبیب کی شاعری کی عمر بہت زیادہ نہیں لیکن ان کے یہاں کچھ پانے کے لئے جو ایک کھونے کا جذبہ ملتا ہے وہ ان کو اور آگے لے جائے گا جہاں ان کی شاعری کے رنگ و روپ اور نکھر کر سامنے آئیں گے۔

——— سید اختر مہدی

نام کتاب: "اربابِ اُردو" (حصہ دوم)
مرتبہ: اسماء رفعت حسین
قیمت: پچھتّر روپے
ملنے کا پتہ ــــ باغ منّو، نیا گاؤں لکھنؤ

"اربابِ اُردو" تحریر و تصویر کے آئینے میں نظر سے گزری۔ کتاب میں اسماء رفعت نے واقعی بڑی جانفشانی دکھائی ہے اور انتہائی مشکل کام کو آسان بنا کر قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس میں تقریباً ۱۶۵ شعراء اور صحافیوں کے نام، تصویریں اور ان کے قلمی نسخے یکجا کر دیے گئے ہیں۔ اس کے مطالعے سے خوشی بھی ہوگی اور رنج بھی کیوں کہ اسماء رفعت نے ان شخصیتوں کو فراموش کر دیا ہے جو آج ہمارے درمیان نہیں لیکن ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گی ان میں جناب زوار حسین زوّار کراروی اور جناب تحمل حسین تحمّل الہ آبادی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں جن کی ادبی خدمات روز روشن کی طرح واضح ہیں۔ امید ہے کہ کتاب کے حصۂ سوم میں ایسی زندۂ جاوید شخصیتوں کو فراموش نہیں کیا جائے گا۔

"اربابِ اُردو" میں شعراء حضرات کا صرف ایک ایک شعر بھی اگر بطور تبرک شامل کر دیا جاتا تو کتاب آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگتی۔ بہر حال اسماء رفعت حسین کی یہ کاوش قابل قدر اور لائق مبارک باد ہے جنھوں نے اس کتاب کے ذریعہ ہمیں ماضی کا آئینہ دکھایا ہے کیوں کہ کچھ تصویریں قلمی ہیں اور کچھ فوٹوگراف، جو آنے والی نسلوں کے لئے تعارف کا ذریعہ بنیں گی اور مشعل راہ بھی۔

——— ظفر حسین

غزل

اختر علی اختر

بارے رُسوا یونہی ہوئے جاؤ
زندگی جو بھی دے لیے جاؤ

زندگی کے ہزار معنیٰ ہیں
زندگی دیکھ لو جئے جاؤ

ہوں اندھیرے میں ایک مدت سے
اِس طرف روشنی کئے جاؤ

لو اُداسی بھی ہو گئی رُخصت
زندگی سوچ لو جئے جاؤ

لکھنؤ میں ہو، تحفتاً اختر
زیب تن اب چکن کئے جاؤ

اودھ نمبر: تأثرات کے آئینے میں

فروری، مارچ ۱۹۹۴ء کا نیا دور "اودھ نمبر" ملا۔ آپ نے یہ ایک تاریخ ساز کام کیا ہے۔ زیر نظر جریدہ میں زیادہ تر مضامین بلند ادبی اور تاریخی معیار کے ہیں۔ تواریخی مقالوں میں صداقت ضروری عنصر ہے اور اس کا محض غنیمت ہونا کافی نہیں تصور کیا جا سکتا۔ مگر جب 'پدماوت' پر شہاب سرمدی کا مختصر مضمون پڑھا تو قائل ہونا پڑا کہ تاریخ اردو ادب میں عظمت کا بلند بانگ عنصر اس کو کہتے ہیں۔ (شہاب صاحب زندہ رہیے) اودھی تو ایک بولی ہی تھی جس کو سنت تلسی داس نے رام چرتر مانس میں اور ملک محمد جائسی نے پدماوت میں بڑی سے بڑی ترقی یافتہ زبانوں سے بڑھا دیا۔

صوبۂ اودھ پر تاریخی مضامین میں مرزا کوکب قدر کا مضمون "اودھ کا آخری تاجدار" سب سے اچھا مضمون ہے۔ یوں تو زیر نظر جریدہ میں سب ہی مضامین تاریخ اودھ پر روشنی ڈالتے ہیں اور جن کو ثقافتی، ادبی، فنی، روایتی، علمی، مذہبی اور نفسیاتی یا کسی بھی زاویے سے دیکھا جائے تو لکھنؤ ایک نمائندہ اور مرکزی حیثیت کا حامل تھا ہے۔ مگر ایسا بھی نہیں کہ مختلف زاویوں سے لکھنؤ کی تصویر پیش کر دینے سے ادارۂ تحریر عہدہ برآ ہو جائے۔

جو ادیب ایام عزا، مجالس غم، تعزیہ داری، سوز خوانی اور ماتمی دستوں کو اہل ہنود کے تہواروں اور جلسوں کی نقل ثابت کرنے کی سعی کرے اس کو نہ مورخ کہا جا سکتا ہے نہ محقق۔ یہی کچھ صورت صفحات ۱۱۹ تا ۱۲۴ پر مضمون " فرماں روایانِ اودھ کے عہد میں تہواروں کی مشترکہ تہذیبی نوعیت" کی ہے جس میں حقائق کو بالکل الٹ کے پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر اختر بستوی نے اپنے اس مضمون میں تاریخی اسناد کے بھی حوالے نہیں دیئے ہیں اور wishful Thinking سے کام لیا ہے محرم میں بچوں کا فقیر بنایا جانا کوفہ میں حضرت مسلم بن عقیل کے یتیم فرزندوں کی در بدر خیرات طلبی کی یاد میں کیا جاتا ہے۔ اودھ (لکھنؤ) میں وہ دور سفینہ نوابین اودھ حکمرانی کا تھا اور سب کی حکمرانی بھی ... کے ... تھی اور اسی وجہ اکثریت کا اقلیت کے کلچر سے متاثر ہونا ایک فطری اور قرین قیاس عمل تصور کیا جاتا ہے۔

۹ر جون ۱۹۹۴ء کے ٹائمز آف انڈیا لکھنؤ نوٹ بک میں سید ... نے نیا دور کے منتخب اشعار غزل کو (صفحات ۱۱۸-۱۱۹) غیر ضروری کہا گیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ یہ وہ ضرب المثل اشعار ہیں جو اٹھتے بیٹھتے صاحب ذوق حضرات پڑھتے رہتے ہیں مگر زیادہ تر کو نہیں معلوم کہ یہ اشعار کن شعرا کے ہیں۔ کتنوں کو معلوم ہے کہ شعر

دل کے آئینے میں ہے تصویر یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

لالہ موجی رام موجی کا ہے۔ "رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی" اور "کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے" کن شعرا کی تخلیقات ہیں؟

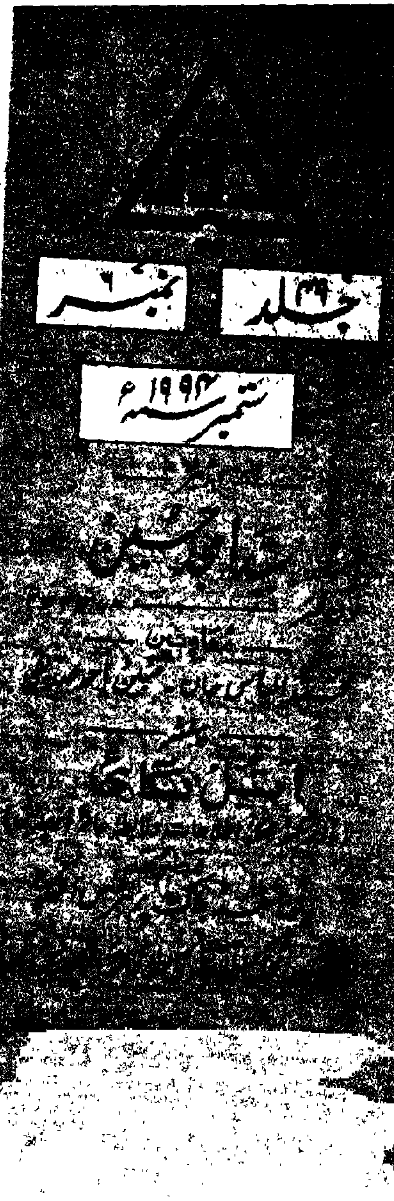
نوشاد علی کا مضمون "لکھنؤ کی گائیکی، لکھنؤ کا کتھک"۔ عشرت علی صدیقی کا تاریخی مضمون "۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اودھ کا محاذ"۔ نیر مسعود کا مضمون "لکھنؤ کی یادگار مجلسیں" اور انیق انصاری کا مضمون "اودھ کی تہذیب کا عروج و زوال" قارئین کے لئے خاصے کی تحریریں ہیں۔

——— وامق جونپوری

نیا دور کے سالنامے کی صورت میں اس خصوصی اشاعت (اودھ نمبر) پر مبارکباد قبول کیجئے۔ بہت اچھا لگا۔ اسے دیکھ کر جی خوش ہوا۔ یہ خاص شمارہ طباعت و اشاعت، تزئین و ترتیب کے لحاظ سے بھی ایک لائق تحسین و قابل ستائش کارنامہ ہے۔ مضامین بھی اچھے اور اونچے درجے کے ہیں اور ان اصحاب قلم کے لکھے ہوئے ہیں جو ایک زمانے سے لکھنؤ کی تاریخ و تہذیب کے سنجیدہ مطالعہ میں مصروف رہے ہیں۔

اگر اس میں سلطنت اودھ کا نقشہ بھی دے دیا جاتا تو شاید زیادہ بہتر ہوتا۔ یہ خواہش بھی تحسین و آفرین ہی کا حصہ ہے۔

——— تنویر احمد علوی
دہلی



عنوانات

اپنی بات	ایڈیٹر	۲
غزل	مخمور سعیدی	۳
احوالِ واقعی (خود نوشت)	ابراہیم یوسف	۴
یہ لمحہ (نظم)	زاہدہ زیدی	۸
رخصت (نظم)	اقبال ماہر	۸
اردو نثر پر ہندو مذہب کا اثر	محمد انصار اللہ	۹
غزلیں	جاوید وشسٹ	۲۴
	اوپندر ناتھ اشک	۲۴
اودھ پنچ کی خدمات	نامی انصاری	۲۵
غزل	تسنیم فاروقی	۲۸
غزلیں	مصطفےٰ زیدی وفا	۲۹
	جعفر عسکری ۔ شبنم گورکھپوری	۲۹
خواب کی پرچھائیاں (افسانہ)	تسکین زیدی	۳۰
غزلیں	ایم. کوٹھیاوی راہی	۳۳
	پی. پی. سریواستو رند ۔ شکیب رضوی	۳۴
ریاست کی مربوط ترقی کے عزائم	احمد نسیم صدیقی	۳۴
دوستو (نظم)	چمن اٹاوی	۳۶
ڈوبتے ابھرتے دائروں کا عکس (نظم)	ساجد حمید	۳۷
جاتی رُت کا درد (نظم)	یوگیندر بہل تشنہ	۳۷
اتر پردیش : اقلیتوں کے مفاد کے نئے باب کا آغاز	ماہنامہ فاطمہ	۳۸
غزلیں	سعید عارفی	۴۱
	ناظم جعفری ۔ مہدی عزمی بجادوی	۴۱
غزلیں	سلیم اختر سیتاپوری ۔ حسن فتحپوری ۔ شیریں اسلم	۴۲
	وصی جعفری ۔ بہار عالم رونق ۔ محمود الحق محمود	۴۲
نقد و تبصرہ	گیان چند ۔ رفیق احمد خاں ۔ شبنم نقوی ۔ انور ندیم	۴۳
	وصیہ جائسی ۔ اقبال اسرار اعجازی ۔ عتیق الہ آبادی	۴۵
غزل	نواب احسن	۴۷
اودھ نمبر تاثرات کے آئینے میں	قارئین	۴۸

اپنی بات

دُنیا کی رقاصہ کے گھنگھروؤں کی جھنکار ہر لمحہ تیز سے تیز تر ہوتی جاتی ہے اور جھنکار کے ساتھ واقعات و حالات میں بھی اتنی تیزی سے تبدیلی آرہی ہے کہ ذہن کبھی کبھی مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے۔ عالمی نقشے پر جبینیں اُبھر رہی ہیں، دشمنیوں کی دیوار ٹوٹ رہی ہے۔ وہ جو کبھی یہ بھی نہیں سوچتے تھے کہ ساتھ بیٹھ کر بات چیت کریں، انھوں نے بھی آخرکار یہ سمجھ لیا کہ تصادم سے نہیں تعاون سے مسائل حل ہوتے ہیں۔ فصل سے نہیں وصل سے کاروانِ زندگی چلتا ہے۔ ارتقاء کا قانون دلوں کو توڑنے کا نہیں بلکہ انھیں جوڑنے کا نام ہے۔ انتشار سے کچھ نہیں ہوتا بلکہ اتحاد اور شیرازہ بندی سے ترقی ہوتی ہے۔

یہ وہ معمولی نکتے ہیں جن پر غور کیا جانا چاہئے۔ خصوصاً ہمارے ملک کے دانش وروں کو۔ اس لئے کہ یہی دانش ور عوام کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور انھیں جس راستے پر چاہیں، لگا بھی سکتے ہیں۔

یہ بھی ایک سوچنے کی بات ہے کہ تاریخ یا ماضی پر اس لئے نظر نہیں ڈالنی چاہیے کہ گڑے مُردے اکھاڑے جائیں بلکہ اس لئے کہ گزرے ہوئے واقعات سے سبق سیکھا جائے اور جو غلطیاں کبھی ہوئی ہوں وہ نہ دہرائی جائیں۔

دورِ حاضر کا سب سے بڑا مطالبہ یہی ہے کہ ہمارے دانش ور غور کریں کہ وہ ملک اور قوم کو کس راستے پر لیے جا رہے ہیں؟ کہیں جوشش ہوش پر تو اثر انداز نہیں ہو رہا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ آگ کے کھیل میں ہم خود اپنا دامن جلا بیٹھے ہیں؟

آنے والا مہینہ اکتوبر کا مہینہ ہے۔ اس شخص کا مہینہ ہے جس نے ساری دنیا کو اسی ہندستان کی سرزمین سے یہ پیغام دیا تھا کہ تشدد مسائل کا حل نہیں ہے۔ ہماری روزانہ کی زندگی ہو، آپسی تعلقات ہوں یا پھر وسیع تر اُفق میں ملکی معاملات ہوں۔ کہیں بھی تشدد کا راستہ ترک کر کے پیار اور محبت کی شمع روشن کر کے ہر مسئلہ کا حل بات چیت کے ذریعہ تلاش کیا جائے۔ شاید یہی راستہ ترقی کا راستہ ہے اور یہی آج کی تاریخ کا سبق ہے۔

محترم گوپی چند نارنگ محقق، نقاد اور اُردو ادب میں دانش وروں کی روشن علامت بن گئے ہیں۔ ان کی شخصیت ہر طرح کے اعزاز سے کہیں بلند تر ہے لیکن پھر بھی ملک کا باوقار راجیو گاندھی ایوارڈ ملنے پر ان کی خدمت میں مبارکباد پیش کی جاتی ہے اور یہ دُعا ہے کہ ان کا ادبی ذوق و شوق اسی طرح نئے جہات افق اور نئے جہانوں کی تلاش کرتا رہے۔ (آمین)

ایڈیٹر

غزل

ہر نفس زہرِ خود آگہی، اور میں
مجھ کو ڈستی ہوئی زندگی، اور میں

ہر طرف شام اُترتی ہوئی، اور میں
اک سمٹتی ہوئی روشنی، اور میں

اک نظارہ، نظر سے گزرتا ہوا
ایک دو پل کی نظّارگی، اور میں

چند پرچھائیاں، رقص کرتی ہوئی
اک تماشا گری دو گھڑی، اور میں

کب بجھا دے مجھے یہ ہوائے ستم!
بجھ نہ جائیں مری روشنی اور میں

آسماں، چل کے خود میرے پاس آئے گا
منتظر میری درماندگی اور میں

رونقِ شہر بھی، جلوۂ وحشت بھی
میری بدنام آوارگی، اور میں

ہر قدم پر کوئی ہم قدم ہو مرا
ساتھ میرے یہ دیوانگی، اور میں

ہجر کی رات، اور چاند نکلا ہوا
تن جلاتی ہوئی چاندنی اور میں

پیاس بڑھتی ہوئی، ہونٹ جلتے ہوئے
پاس سے اک گزرتی ندی، اور میں

لمحے لمحے سے شرمندگی ہے مجھے
وقت کی کیسی بے مصرفی! اور میں

گھٹ کے مرنے کو ہیں اپنی ہی قید میں
میری اک خواہشِ آخری، اور میں

جی رہا ہوں تو محمودؔ حیران ہوں
اک عجب بے دلی، بے حسی، اور میں

محمود سعیدی
دہلی اردو اکادمی، گھٹا مسجد
دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

خود نوشت

ابراہیم یوسف
۱۶ - نیم روڈ - ...گیٹ
بھوپال ۴۶۲۰۰۱

احوالِ واقعی

۱۷ راگست ۱۹۲۱ء کو یہ حادثہ پیش آیا کہ ہم روتے ہوئے اس دُنیا میں وارد ہوئے۔ نام محمد ابراہیم خاں رکھا گیا۔ مگر جانے کیوں سرکار کو ہماری تاریخ پیدائش پسند نہ آئی اور اپنے ریکارڈ میں ۱۵ ر مئی ۱۹۲۵ء درج کرلی۔ ظاہر ہے کہ ہماری پیدائش پر خوشیاں منائی گئی ہونگی خاص طور پر اس لیے بھی کہ ہم سے پہلے ہمارے دو بھائی شیر خوارگی میں اللہ کو پیارے ہوگئے تھے، ہمیں اپنے بچپن کی اور کوئی بات تو یاد نہیں مگر وہ دن اچھی طرح یاد ہے جس روز ہماری رسم بسم اللہ ادا کی گئی۔ گھر میں کافی چہل پہل تھی۔ عزیز و اقارب جمع تھے اور ہم نیا لباس پہنے دولھا بنے بیٹھے تھے اور خود کو کافی اہم شخصیت سمجھ رہے تھے۔ رسم بخیر و خوبی انجام پاگئی۔ مٹھائی تقسیم کی گئی اور دعوت بھی کی گئی۔ دوسرے دن ایک مولوی صاحب ہمیں اُردو اور قرآن پڑھانے آنے لگے۔ ہم کند ذہن تو نہیں تھے مگر جانے کیوں حروف تہجی میں ہمیں ط۔ ظ یاد نہیں ہوتے تھے۔ ڈانٹیں پڑتی تھیں اور کبھی کبھی مولوی صاحب کا چپت بھی سر پر پڑ جاتا تھا مگر ط۔ ظ نے قسم کھا رکھی تھی کہ وہ ہمیں یاد نہ ہوں گے۔

ایک روز والد صاحب ہمیں سبق یاد کرا رہے تھے کہ ط۔ ظ آنے پر ہم رو پڑے اور روتے ہوئے کہا کہ "وہ دونوں پھر آگئے"۔ اس پر والد صاحب مسکرا دیئے اور کہا: "اچھا ان دونوں کو چھوڑ دو"۔ شاید مولوی صاحب کو بھی ہدایت کردی گئی تھی کہ بچہ ان حروف سے خوف زدہ ہے فی الحال ان کے یاد کرانے پر زور نہ دیا جائے۔ اس طرح ط، ظ سے نجات مل گئی۔ اب یاد نہیں، یہ دونوں حروف ہمیں کب یاد ہوئے۔

ہمارے جد امجد محمد ذوالفقار خاں تیراہ (افغانستان) سے تلاشِ معاش میں وارد ہندوستان ہوئے اور جب اُن کو معلوم ہوا کہ اُن کے ہم وطن دوست محمد خان نے ریاست بھوپال قائم کرلی ہے تو وہ بھوپال آگئے اور یہاں انھیں فوجی خدمت سپرد کردی گئی۔ بس اسی دن سے بھوپال کی سرسبز پہاڑیوں، بڑے تالاب کی مچلتی ہوئی لہروں، چھوٹے تالاب کے پرسکون پانی میں رات کو پریاں بن کر ناچتے ہوئے تاروں نے ہمارے خاندان کا دامن ایسا پکڑا کہ ڈھائی سو سال سے زیادہ ہوگئے، آج تک نہ چھوڑا۔

گھر کا ماحول مذہبی تھا، روزہ نماز کا ہر شخص پابند تھا۔ فجر کی نماز کے بعد تلاوتِ قرآن ہر شخص کے لیے لازمی تھا مگر اس میں کٹّرپن نہیں تھی۔ نماز روزہ کے ساتھ شطرنج اور پتنگ بازی تفریحی مشاغل تھے ننہال میں مرغ بازی کا شوق تھا، بچپن میں ہمیں بھی پتنگ بازی کا شوق تھا مگر

جو وقت بادہ کشی کا ہے وہی عین وقتِ نماز ہے

اس پتنگ بازی کے شوق میں مغرب کی نماز گول ہو جاتی تو بعض وقت ساتھ کبھی کبھی پٹائی کی نوبت بھی آجاتی۔ تنگ آکر پتنگ بازی کو چھوڑنا پڑا۔ بھوپالیوں کا مقبول عام کھیل ہاکی تھا۔ ہاکی کھیلنا شروع کیا مگر اچھے کھلاڑی تو کیا بڑے کھلاڑی بھی نہ بن سکے۔ اس سے توبہ کرلی اور کرکٹ کھیلنے لگے اور اس میں ضرور ترقی کرلی اور اسکول کے نہیں بھوپال کے اچھے کھلاڑیوں میں ہمارا شمار ہونے لگا۔ اور جب کالج گئے تو نہ صرف کالج کی ٹیم کے ممبر رہے بلکہ ایک سال کپتان بھی مقرر کیے گئے۔

ہمارے بچپن کے بھوپال کا ماحول رواداری، شرافت اور انسانیت کا ایسا نمونہ تھا جس کی مثال شاید ہی ہندستان کا کوئی دوسرا شہر پیش

کر گئے۔ بھوپال کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ تین پیڑھیوں تک یہاں مسلسل بیگمات کی حکومت رہی۔ ان کی مادرانہ شفقت سب کے لیے برابر تھی، جس میں مذہب اور ذات پات کی کوئی تفریق نہیں تھی۔ رحم دل تھیں اور اپنی رعایا سے محبت کرتی تھیں۔ جیسا راجا ویسی پرجا۔ یہی خوبیاں ان کی رعایا میں بھی پیدا ہو گئی تھیں۔ یہ بیگمات خود اپنے مذہب اور شریعت کی پابند تھیں جس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے دادا کا نام ان کے والدین نے نبی داد خاں رکھا تھا۔ جب شاہجہاں بیگم نے ان کا تقرر تحصیلداری پر کیا تو سرکاری کاغذات میں نام بدل کر حق داد خاں کر دیا۔ دلیل یہ تھی کہ نبی کسی کو کچھ نہیں دیتا جو کچھ دیتا ہے اللہ دیتا ہے، نبی داد خاں اسلامی عقائد کے خلاف ہے۔ شریعت کی اس قدر پابند ہونے کے باوجود ان میں تعصب نام کو نہ تھا۔ اور یہی خوبی اہلِ بھوپال کی تھی۔

یہاں اپنے بچپن کے ایک واقعہ کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے بچپن کے لوگ کس قدر روادار، شریف النفس اور اعلاظرف کے مالک تھے۔ ہوا یہ کہ ایک ہندو ماسٹر صاحب نے کسی بات پر دوسری یا تیسری جماعت کے مسلمان بچّہ کو طمانچہ مار دیا۔ طمانچہ کچھ ایسا بے ضرب لگا کہ بچّہ گرا اور اس نے دم توڑ دیا۔ اسکول میں سنسنی پھیل گئی اور پولیس کیس بننے کی نوبت آ گئی۔ لیکن بچّے کے باپ نے لکھ کر دے دیا کہ "ماسٹر صاحب کو بچّے سے کوئی دشمنی اور عداوت نہیں تھی۔ بچّے کی کسی غلطی کی اصلاح کے لئے تنبیہ کی ہو گی اور یہ اتفاقیہ حادثہ پیش آ گیا ماسٹر صاحب کو اس سلسلے میں پریشان نہ کیا جائے۔" اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ کیا آج اس شرافت، رواداری اور اعلاظرفی کی کوئی مثال پیش کی جا سکتی ہے؟

تو یہ تھا وہ ماحول جس میں ہمارا بچپن گزرا۔ آج ستّر سال کے بعد جب ہم پلٹ کر دیکھتے ہیں تو ہمیں بھوپال کوئی الف لیلوی شہر نظر آتا ہے جس کے باشندے خلوص، محبت، انسانیت، شرافت اور مروّت کا پیکر تھے مگر اب یہ سب خواب و خیال ہو گیا ہے۔ اُس وقت بھوپال کی آبادی ایک لاکھ کے قریب تھی اب پندرہ لاکھ کے آس پاس ہے۔ وہ شریف النفس لوگ اقلیت میں آ کر یا تو گوشہ نشین ہو چکے ہیں یا اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔

پڑھنے کا شوق ہمیں بچپن سے تھا۔ الف لیلا، قصہ چہار درویش، قصہ حاتم طائی اور طلسم ہوش ربا پڑھنے میں بڑا لطف آتا تھا۔ فرصت کے اوقات میں انھیں پڑھنے پر کوئی پابندی بھی نہیں تھی۔ نویں دسویں کلاس تک آتے آتے لکھنے کا شوق بھی ہو گیا۔ مشہور شاعر اور غالب کے شارح مولانا مجددی اس وقت ہمارے پڑوس میں رہتے تھے۔ ہم اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے۔ ایک افسانہ لکھ کر ان کی خدمت میں پیش کیا۔ انھوں نے حوصلہ بڑھایا اور مشورہ دیا کہ اُردو میں افسانے تو بہت لکھے جا رہے ہیں، ہمیں ڈرامے کی طرف توجہ دینا چاہیئے۔ ان کے مشورہ پر ایک کل وقتی ڈراما "گورکن" لکھا جو نیرنگ خیال، لاہور میں شائع ہوا۔ اس سے حوصلہ بڑھ گیا اور پھر تو ڈراما ہمارا ایسا ساتھی بنا کہ پچاس سال سے زیادہ ہو گئے، نہ وہ ہمارا ساتھ چھوڑتا ہے نہ ہم اس کا۔

ہم کوئی ایسے غیر معمولی طالب علم تو تھے نہیں کہ فرسٹ کلاس فرسٹ آیا کرتے لیکن ایسے گئے گزرے بھی نہیں تھے کہ فیل ہونے کا کوئی کارنامہ انجام دیتے پھرتے۔ بس سکنڈ ڈویژن میں ہر امتحان پاس کر لیتے تھے۔ میٹرک بھی سکنڈ ڈویژن میں پاس کر لیا۔ بھوپال میں چونکہ آگے کی پڑھائی کا انتظام نہیں تھا اس لیے ہمیں اندور کے کرسچین کالج میں داخل کرا دیا گیا جہاں سے ہم نے بی۔اے سکنڈ ڈویژن میں پاس کر لیا۔ کرسچین کالج میں اکثر ڈرامے اسٹیج ہوتے رہتے تھے اس سے ہماری ڈرامہ نگاری کا شوق اور بڑھا۔ ہمارا کوئی ڈرامہ تو اسٹیج نہیں ہوا مگر ہم نے دو ایک ڈراموں میں کام ضرور کیا۔

بی۔اے پاس کرنے کے بعد معاش کا مسئلہ پیدا ہوا۔ ہمارے والد محمد یوسف خاں پولیس میں ملازم تھے وہ ہمیں بھی پولیس آفیسر بنانا چاہتے تھے مگر وردی پہن کر اکڑنا ہمیں بالکل پسند نہیں تھا۔ دوسری جنگِ عظیم آخری مراحل میں تھی، پڑھے لکھے لوگوں کی کمی تھی اسی لیے نوکریاں آسانی سے مل جاتی تھیں۔ ہمیں بھی ملٹری آڈٹ میں آسانی سے نوکری مل گئی مگر پسند نہیں آئی اور دو تین مہینے کے بعد چھوڑ دی اور محکمۂ جنگلات میں نوکر ہو گئے۔ یہ نوکری بھی چھوڑ دی۔ اس نوکری کے

چھوڑنے کا واقعہ کافی دل چسپ ہے۔ آپ بھی سن لیجیے :

محکمہ جنگلات کے افسرِ اعلا اپنی بدزبانی کے لیے بھوپال بھر میں مشہور تھے۔ ایک دن ہم نے جو ڈرافٹ بنا کر پیش کیا اس میں انھوں نے ایک لفظ پر اعتراض کیا کہ یہاں اس کا استعمال غلط ہے۔ ہم نے اپنی دلیلیں دیں کہ صحیح ہے اور شیکسپیئر کا حوالہ بھی دے دیا۔ افسر صاحب نے جو ہمارے خاندان سے بخوبی واقف تھے، زچ ہو کر فرمایا کہ :

"دو پٹھان ایک جگہ نہیں رہ سکتے۔"

ہم پٹھان ابن پٹھان ابن پٹھان اور جوانی کا جوش۔ اسی وقت سب فائلیں ان کی میز پر چھوڑ کر یہ کہہ کر چلے آئے کہ :

"بس آپ ہی پٹھان رہیے ہم جا رہے ہیں۔"

پھر ادھر کا رُخ نہیں کیا۔ بھوپال میں ایک درس گاہ جامعہ احمدیہ کے نام سے تھی جس میں درس نظامی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ سید سلیمان ندوی اس درس گاہ کے امیر الجامعہ تھے۔ سید صاحب نے اس جامعہ میں انگریزی تعلیم کا انتظام بھی کیا اور ہمارا تقرر بحیثیت انگریزی مدرس کے کر دیا۔ طالب علم زیادہ تر صوبۂ سرحد افغانستان اور سری لنکا کے تھے۔ چند میں بعض کی عمریں ہماری عمر سے زیادہ تھیں۔ وہ انگریزی کیا پڑھتے۔ ہم انھیں اے، بی، سی، ڈی یاد کرانے کی کوشش کرتے اور وہ اونگھتے رہتے۔ کسی نے اے سے لے کر زیڈ تک پورے سال میں یاد کر کے نہیں دیا۔

ریاست بھوپال کے انڈین یونین میں ضم ہو جانے کے بعد جامعہ احمدیہ بند کر دیا گیا۔ سید سلیمان ندوی پہلے ہی جا چکے تھے باقی مدرسین کو سبک دوش کر دیا گیا اور ہمارا تبادلہ جہانگیریہ اسکول میں کر دیا گیا۔ اسی دوران ۳ر جنوری ۱۹۵۱ء کو ہماری شادی حمیدہ خاتون سے کر دی گئی۔ حمیدہ خاتون کچھ اس قدر سلیم الطبع (ایکسٹرا) واقع ہوئی ہیں کہ آج تک نبھائے چلی جا رہی ہیں۔ اگر ہم تفریحاً بھی ان سے لڑنا چاہتے ہیں تو وہ کنی کاٹ جاتی ہیں اور جھگڑا کرنے کی حسرت ہمارے دل میں رہ جاتی ہے۔ اب چوں کہ درس و تدریس ہمارا مقدر بن چکا تھا اس لیے پرائیویٹ طور پر پولٹیکل سائنس اور اردو میں ایم۔ اے کیا اور علی گڑھ یونیورسٹی سے بی ایڈ بھی کر لیا۔ ۳۶ سال اور کچھ مہینے نوکری کرنے کے بعد ۳۱ رمئی ۱۹۸۸ء کو وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ ان ۳۶ برسوں میں ۲۲ سال مختلف ہائر سکنڈری اسکولوں میں پرنسپل رہے۔

ہمارے بچپن کا ادبی ماحول زیادہ تر شعر و شاعری کا تھا۔ مشاعرے اور شعری نشستیں عام طور پر ہوتی رہتی تھیں اور ہندستان کے مشہور و معروف شاعر بھوپال آتے رہتے تھے۔ جگر مرادآبادی نے تو بھوپال کو وطنِ ثانی بنا لیا تھا۔ علامہ اقبال کا بھوپال سے جو تعلق تھا وہ ظاہر ہے۔ خود بھوپال میں ایسے شعرا موجود تھے جن کو استادی کا درجہ حاصل تھا۔ ریاست میں محکمہ تاریخ کے نام سے ایک محکمہ قائم تھا جس میں تصنیف و تالیف کے کام ہوتے رہتے تھے۔ نیاز فتحپوری اور محمد امین زبیری اس سے منسلک رہ چکے تھے۔ عوامی طور پر عام رجحان شعر و شاعری کی طرف تھا نثر پر بہت کم دھیان دیا جاتا تھا۔

۱۹۴۶ء میں چند نوجوانوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی جس کے ہم بھی بنیادی ممبر تھے۔ انجمن کے باقاعدگی سے ہر ہفتے جلسے ہوتے رہتے تھے۔ نثر و نظم کی تخلیقات پیش کی جاتی تھیں اور ان پر بحث و مباحثہ ہوتا تھا۔ ہم بھی اکثر اپنے ڈرامے پیش کرتے تھے اور تنقید کا نشانہ بنتے تھے۔ اس وقت ہم لوگوں نے ان تبصروں کا مقصد تخلیق کی خامیوں کی نشان دہی کرنا اور خوبیوں کو نظر انداز کرنا سمجھ رکھا تھا۔ ترقی پسند تحریک کو اس وقت جس قدر سمجھا تھا اس کی جھلک ہمارے ڈراموں کے پہلے مجموعہ "سوکھے درخت" میں نظر آتی ہے۔ یہ مجموعہ ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا تھا اس کے بعد ایک ناول "آبلے اور منزلیں" شائع ہوا۔ اس ناول میں ریاست بھوپال کے انڈین یونین میں انضمام کے بعد ایک فرقہ معاشی بحران اور سماجی تبدیلیوں سے جس ذہنی کرب میں مبتلا ہوا اسے پیش کیا گیا ہے اس ناول کے بعد ہم نے اپنی پوری توجہ ڈرامے کی طرف مبذول کر دی اب تک تقریباً ڈیڑھ سو ریڈیائی اور کل وقتی ڈرامے لکھ چکے ہیں۔ ان کے علاوہ ۴۰، ۵۰ مضامین ڈرامے کی تاریخ و تنقید سے متعلق علاحدہ سے ہیں۔ اب تک درج ذیل شائع ہو چکی ہیں :

۱۔ سوکھے درخت — ڈراموں کا مجموعہ — ۱۹۵۲ء
۲۔ آبلے اور منزلیں — ناول — ۱۹۵۳ء
۳۔ دھوئیں کے آنچل — ڈراموں کا مجموعہ — ۱۹۷۶ء

۴۔ طنزیہ ڈرامے ڈراموں کا مجموعہ ۱۹۷۴ء

۵۔ پانچ چھوڈرامے 〃 ۱۹۷۸ء

۶۔ اُداس موڑ 〃 ۱۹۸۳ء

۷۔ الجھاوے 〃 ۱۹۹۰ء

۸۔ صولت عالمگیری : ۱۹۷۶ء

(اُردو کا پہلا دستیاب نثری ڈرامہ مرتب کرکے اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔)

۹۔ گم شدہ خط : رومانیہ کے ڈرامہ نگار کرپجل کے ڈرامہ کا ترجمہ ۱۹۷۸ء

۱۰۔ اندرسبھا اور اندرسبھائیں : ۱۹۸۰ء

(اندرسبھاؤں کے محرکات، پس منظر اور تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور چار اندرسبھاؤں کے متن شامل کیے گئے ہیں)

۱۱۔ اُردو کے اہم ڈرامہ نگار (متقدمین) ۱۹۸۱ء

۱۲۔ اُردو کے اہم ڈرامہ نگار (متوسطین) ۱۹۸۴ء

۱۳۔ اُردو کے اہم ڈرامہ نگار (آغا حشر) ۱۹۸۳ء

۱۴۔ ہندی ڈرامے کا ارتقار ۱۹۸۵ء

۱۵۔ اُردو ڈرامے کی تنقید کا جائزہ (زیر طبع)

ان میں اکثر کتابوں پر اکادمیوں کے انعامات مل چکے ہیں۔ ۱۹۸۶ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے "ہم سب" اور ۱۹۹۳ء میں لکھنؤ کے "امتیاز میر" اعزازات سے نوازا جا چکا ہوں۔

بمبئی یونیورسٹی سے زبیدہ کُتّانی۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے ساآر خاں اور اندور یونیورسٹی سے عتیق النساء ابراہیم یوسف کی اُردو ڈرامے میں خدمات پر مقالے لکھ کر پی ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں حاصل کرچکے ہیں۔

میری ڈرامہ نگاری تب شروع ہوئی تھی جب دوسری جنگ عظیم اپنے آخری مراحل میں تھی۔ جنگ کے ختم ہونے کے بعد اس کے اثرات پھر ملک کی آزادی اور تقسیم، اس سے پیدا ہونے والے مسائل، سوسائٹی کی معینہ اقدار کی شکست وریخت ایسے حالات تھے جس سے حساس ادیب بے حد متاثر تھے اور شعوری طور پر ان مسائل کو اپنی تخلیقات میں پیش کر رہے تھے۔ میرے ابتدائی ڈراموں کے موضوعات بھی یہی مسائل رہے ہیں۔ جنگ اور آزادی کے بعد سوسائٹی عبوری دور میں داخل ہوچکی تھی اس لیے ادیب بالخصوص ترقی پسند ادیب تنقیدحیات کے مقابلے میں تنقید معاشرت اور سماج میں پیدا ہونے والے ہر ٹیڑھے پن کو طنز کا نشانہ بنا رہے تھے، میں اس سے متاثر تھا۔ مسلم معاشرہ خاص طور پر مسلم متوسط طبقہ میرے ڈراموں کا موضوع رہا۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ عبوری دور گذر گیا اب انسان جو بذاتِ خود ایک مسئلہ ہے میرے ڈراموں کا موضوع بنا۔ انسان دوہری زندگی جیتا ہے، ایک داخلی اور ایک خارجی۔ اس داخلی اور خارجی زندگی میں جو کشمکش ہوتی ہے اسی کشمکش کو اپنے ڈراموں میں پیش کیا ہے۔ میں اس میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں، خود کچھ نہیں کہہ سکتا۔

کہا جاتا ہے کہ اُردو میں ڈرامہ ہے ہی نہیں اور جو کچھ ہے بھی وہ معیاری نہیں۔ دوسرے اندرسبھاؤں کو بعض حضرات ڈرامہ مانتے ہی نہیں اور جو حضرات انھیں ڈرامہ مانتے ہیں وہ انھیں یا تو مغربی معیار پر پرکھتے ہیں یا پھر سنسکرت ڈرامے کے معیار پر۔ اور پھر ان پر غیر معیاری ہونے کا فتویٰ صادر کر دیتے ہیں۔ مجھے ہمیشہ ان دونوں خیالات سے اختلاف رہا ہے۔ اندرسبھائیں ڈرامہ ہیں اگر انھیں ناٹک کہا جائے تو مسئلہ کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ ان اندرسبھائی ناٹکوں کا کوئی تعلق نہ تو مغربی ڈرامے سے ہے اور نہ سنسکرت ڈرامے سے کوئی واسطہ۔ ان کی بنیاد ہندستان کے لوک ناٹکوں راس لیلا رام لیلا اور بھگت پر ہے اور ان اندرسبھاؤں کی معیار بندی انھیں لوک ناٹکوں کی بنیاد پر کی جانا چاہیئے یہ میرا غیر متزلزل عقیدہ ہے۔ جس طرح یہ لوک ناٹک ہندستانی ڈرامے کی ایک مضبوط روایت ہیں۔ انھیں غیر معیاری اور گھٹیا کہنا سراسر بے انصافی ہے۔ اسی طرح پارسی تھیٹر کو جسے پارسیوں کا اردو تھیٹر کہنا چاہیئے گھٹیا تماشا کہنا اس کے ساتھ ظلم ہے اس نے اردو ڈرامے اور اُردو تھیٹر کی بڑی خدمت کی ہے یہ اُردو ڈرامے اور اُردو تھیٹر کی بڑی جاندار روایت ہے۔ اس کی اسی اہمیت کے پیش نظر اسے اردو ہندی کا تھیٹر کہہ کر ہتھیانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

یہ خیال بھی کہ اُردو ڈرامہ غیر معیاری ہے، ایک مفروضہ ہے۔ جس طرح دوسری اصناف ادب میں معیاری اور غیر معیاری ادب موجود ہے اسی طرح

(باقی ص۴۸ پر)

چھوڑنے کا واقعہ کافی دلچسپ ہے۔ آپ بھی سن لیجئے:

محکمہ جنگلات کے افسر اعلا اپنی بدمزاجی کے لیے بھوپال بھر میں مشہور تھے۔ ایک دن ہم نے جو ڈرافٹ بنا کر پیش کیا اس میں انھوں نے ایک لفظ پر اعتراض کیا کہ یہاں اس کا استعمال غلط ہے۔ ہم نے اپنی دلیلیں دیں کہ صحیح ہے اور شیکسپیئر کا حوالہ بھی دے دیا۔ افسر صاحب نے جو ہمارے خاندان سے بخوبی واقف تھے، زچ ہو کر فرمایا کہ:

"دو پٹھان ایک جگہ نہیں رہ سکتے۔"

ہم پٹھان ابن پٹھان ابن پٹھان اور جوانی کا جوش۔ اسی وقت سب فائلیں ان کی میز پر چھوڑ کر یہ کہہ کر چلے آئے کہ:

"بس آپ ہی پٹھان رہیے ہم جا رہے ہیں۔"

پھر ادھر کا رُخ نہیں کیا۔ بھوپال میں ایک درس گاہ جامعہ احمدیہ کے نام سے تھی جس میں درس نظامی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ سید سلیمان ندوی اس درس گاہ کے امیر الجامعہ تھے۔ سید صاحب نے اس جامعہ میں انگریزی تعلیم کا انتظام بھی کیا اور ہمارا تقرر بحیثیت انگریزی مدرس کے کر دیا۔ طالب علم زیادہ تر صوبۂ سرحد افغانستان اور شری لنکا کے تھے۔ چند میں بعض کی عمریں ہماری عمر سے زیادہ تھیں۔ وہ انگریزی کیا پڑھتے۔ ہم انھیں اے، بی، سی، ڈی یاد کرانے کی کوشش کرتے اور وہ اونگھتے رہتے۔ کسی نے اے سے لے کر زیڈ تک پورے سال میں یاد کر کے نہیں دیا۔

ریاست بھوپال کے انڈین یونین میں ضم ہو جانے کے بعد جامعہ احمدیہ بند کر دیا گیا۔ سید سلیمان ندوی پہلے ہی جا چکے تھے باقی مدرسین کو سبک دوش کر دیا گیا اور ہمارا تبادلہ جہانگیریہ اسکول میں کر دیا گیا۔ اسی دوران ۳ر جنوری ۱۹۵۱ء کو ہماری شادی حمیدہ خاتون سے کر دی گئی۔ حمیدہ خاتون کچھ اس قدر سلیم الطبع (ایکسٹرا) واقع ہوئی ہیں کہ آج تک نبھائے چلی جا رہی ہیں۔ اگر ہم تفریحاً بھی ان سے لڑنا چاہتے ہیں تو وہ کنی کاٹ جاتی ہیں اور جھگڑا کرنے کی حسرت ہمارے دل میں رہ جاتی ہے۔ اب چوں کہ درس و تدریس ہمارا مقدر بن چکا تھا اس لیے پرائیویٹ طور پر پولیٹکل سائنس اور اردو میں ایم۔ اے کیا اور علی گڑھ یونیورسٹی سے بی ایڈ بھی کر لیا۔ ۳۶ سال اور کچھ مہینے

نوکری کرنے کے بعد اپریل ۱۹۸۳ء کو [illegible] ہوئے۔ ان ۳۶ برسوں میں ۲۶ سال مختلف ہائر سکنڈری اسکولوں میں پرنسپل رہے۔

ہمارے بچپن کا ادبی ماحول زیادہ تر شعر و شاعری کا تھا۔ مشاعرے اور شعری نشستیں عام طور پر ہوتی رہتی تھیں اور ہندستان کے مشہور و معروف شاعر بھوپال آتے رہتے تھے۔ جگر مرادآبادی نے تو بھوپال کو وطن ثانی بنا لیا تھا۔ علامہ اقبال کا بھوپال سے جو تعلق تھا وہ ظاہر ہے۔ خود بھوپال میں ایسے شعرا موجود تھے جن کو استادی کا درجہ حاصل تھا۔ ریاست میں محکمہ تاریخ کے نام سے ایک محکمہ قائم تھا جس میں تصنیف و تالیف کے کام ہوتے رہتے تھے۔ نیاز فتحپوری اور محمد امین زبیری اس سے منسلک رہ چکے تھے۔ عوامی طور پر عام رجحان شعر و شاعری کی طرف تھا نثر پر بہت کم دھیان دیا جاتا تھا۔

۱۹۴۶ء میں چند نوجوانوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی جس کے ہم بھی بنیادی ممبر تھے۔ انجمن کے باقاعدگی سے ہر ہفتے جلسے ہوتے رہتے تھے۔ نثر و نظم کی تخلیقات پیش کی جاتی تھیں اور ان پر بحث و مباحثہ ہوتا تھا۔ ہم بھی اکثر اپنے ڈرامے پیش کرتے تھے اور تنقید کا نشانہ بنتے تھے۔ اس وقت ہم لوگوں نے ان تبصروں کا مقصد تخلیق کی خامیوں کی نشان دہی کرنا اور خوبیوں کو نظر انداز کرنا سمجھ رکھا تھا۔ ترقی پسند تحریک کو اس وقت جس قدر سمجھا تھا اس کی جھلک ہمارے ڈراموں کے پہلے مجموعہ "سوکھے درخت" میں نظر آتی ہے۔ یہ مجموعہ ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا تھا اس کے بعد ایک ناول "آبلے اور منزلیں" شائع ہوا۔ اس ناول میں ریاست بھوپال کے انڈین یونین میں انضمام کے بعد ایک فرقہ معاشی بحران اور سماجی تبدیلیوں سے جس ذہنی کرب میں مبتلا ہوا اسے پیش کیا گیا ہے اس ناول کے بعد ہم نے اپنی پوری توجہ ڈرامے کی طرف مبذول کر دی اب تک تقریباً ڈیڑھ سو ریڈیائی اور کئی وقتی ڈرامے لکھ چکے ہیں۔ ان کے علاوہ ۴۰، ۵۰ مضامین ڈرامے کی تاریخ و تنقید سے متعلق علاحدہ سے ہیں۔ اب تک درج ذیل شائع ہو چکی ہیں:

۱۔ سوکھے درخت — ڈراموں کا مجموعہ — ۱۹۵۲ء
۲۔ آبلے اور منزلیں — ناول — ۱۹۵۳ء
۳۔ دھوئیں کے آنچل — ڈراموں کا مجموعہ — ۱۹۷۶ء

۴۔ طنزیہ ڈرامے   ڈراموں کا مجموعہ   ۱۹۷۴ء
۵۔ پانچ چھوٹے ڈرامے   〃   ۱۹۷۸ء
۶۔ اُداس موڑ   〃   ۱۹۸۳ء
۷۔ الجھاوے   〃   ۱۹۹۰ء
۸۔ صولت عالمگیری :   ۱۹۷۶ء
(اُردو کا پہلا دستیاب نثری ڈرامہ مرتب کر کے اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔)
۹۔ گم شدہ خط : رومانیہ کے ڈرامہ نگار کریجل کے ڈرامہ کا ترجمہ ۱۹۷۸ء
۱۰۔ اندر سبھا اور اندر سبھائیں :   ۱۹۸۰ء
(اندر سبھاؤں کے محرکات، پس منظر اور تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور چار اندر سبھاؤں کے متن شامل کیے گئے ہیں)
۱۱۔ اُردو کے اہم ڈرامہ نگار (متقدمین)   ۱۹۸۱ء
۱۲۔ اُردو کے اہم ڈرامہ نگار (متوسطین)   ۱۹۸۴ء
۱۳۔ اُردو کے اہم ڈرامہ نگار (آغا حشر)   ۱۹۸۳ء
۱۴۔ ہندی ڈرامے کا ارتقاء   ۱۹۸۵ء
۱۵۔ اُردو ڈرامے کی تنقید کا جائزہ   (زیر طبع)

ان میں اکثر کتابوں پر اکادمیوں کے انعامات مل چکے ہیں۔
۱۹۸۶ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے "ہم سب" اور ۱۹۹۳ء میں لکھنؤ کے "امتیاز میر" اعزازات سے نوازا جا چکا ہوں۔

بمبئی یونیورسٹی سے زبیدہ جگانی۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے ستار خاں اور اندور یونیورسٹی سے عتیق النساء ابراہیم یوسف کی اُردو ڈرامے میں خدمات پر مقالے لکھ کر پی ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں حاصل کر چکے ہیں۔

میری ڈرامہ نگاری تب شروع ہوئی تھی جب دوسری جنگ عظیم اپنے آخری مراحل میں تھی۔ جنگ کے ختم ہونے کے بعد اس کے اثرات پھر ملک کی آزادی اور تقسیم، اس سے پیدا ہونے والے مسائل، سوسائٹی کی معینہ اقدار کی شکست و ریخت ایسے حالات تھے جس سے حساس ادیب بے حد متاثر تھے اور شعوری طور پر ان مسائل کو اپنی تخلیقات میں پیش کر رہے تھے۔ میرے ابتدائی ڈراموں کے موضوعات بھی یہی مسائل رہے ہیں۔ جنگ اور آزادی کے بعد سوسائٹی عبوری دور میں داخل ہو چکی تھی اس لیے ادیب بالخصوص ترقی پسند ادیب تنقیدحیات کے تقاضے میں تنقید معاشرت اور سماج میں پیدا ہونے والے ہر ٹیڑھے پن کو طنز کا نشانہ بنا رہے تھے، میں اس سے متاثر تھا۔ مسلم معاشرہ خاص طور پر مسلم متوسط طبقہ میرے ڈراموں کا موضوع رہا۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ عبوری دور گزر گیا اب انسان جو بذاتِ خود ایک مسئلہ ہے میرے ڈراموں کا موضوع بنا۔ انسان دوہری زندگی جیتا ہے، ایک داخلی اور ایک خارجی۔ اس داخلی اور خارجی زندگی میں جو کشمکش ہوتی ہے اسی کشمکش کو اپنے ڈراموں میں پیش کیا ہے۔ میں اس میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں، خود کچھ نہیں کہہ سکتا۔

کہا جاتا ہے کہ اُردو میں ڈرامہ ہے ہی نہیں اور جو کچھ ہے بھی وہ معیاری نہیں۔ دوسرے اندر سبھاؤں کو بعض حضرات ڈرامہ مانتے ہی نہیں اور جو حضرات انھیں ڈرامہ مانتے ہیں وہ انھیں یا تو مغربی معیار پر پرکھتے ہیں یا پھر سنسکرت ڈرامے کے معیار پر۔ اور پھر ان پر غیر معیاری ہونے کا فتویٰ صادر کر دیتے ہیں۔ مجھے ہمیشہ ان دونوں خیالات سے اختلاف رہا ہے۔ اندر سبھائیں ڈرامہ ہیں اگر انھیں ناٹک کہا جائے تو مسئلہ کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ ان اندر سبھائی ناٹکوں کا کوئی تعلق نہ تو مغربی ڈرامے سے ہے اور نہ سنسکرت ڈرامے سے کوئی واسطہ۔ ان کی بنیاد ہندستان کے لوک ناٹکوں راس لیلا رام لیلا اور بھگت پر ہے اور ان اندر سبھاؤں کی معیار بندی انھیں لوک ناٹکوں کی بنیاد پر کی جانا چاہیئے یہ میرا غیر متزلزل عقیدہ ہے۔ جس طرح یہ لوک ناٹک ہندستانی ڈرامے کی ایک مضبوط روایت ہیں۔ انھیں غیر معیاری اور گھٹیا کہنا سراسر بے انصافی ہے۔ اسی طرح پارسی تھیٹر کو جسے پارسیوں کا اردو تھیٹر کہنا چاہیئے گھٹیا تماشا کہنا اس کے ساتھ ظلم ہے اس نے اردو ڈرامے اور اُردو تھیٹر کی بڑی خدمت کی ہے یہ اُردو ڈرامے اور اُردو تھیٹر کی بڑی جاندار روایت ہے۔ اس کی اسی اہمیت کے پیش نظر اسے اردو ہندی کا تھیٹر کہہ کر ہتھیانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔
یہ خیال بھی کہ اُردو ڈرامہ غیر معیاری ہے، ایک مفروضہ ہے۔ جس طرح دوسری اصناف ادب میں معیاری اور غیر معیاری ادب موجود ہے اسی طرح

(باقی صفحہ ۲۸ پر)

یہ لمحہ

یہ لمحہ نہیں
وقت کا منجمد ایک نقطہ
یہ لمحہ تو ہے ایک گہرا سمندر
کہ جس میں
کئی سمت سے آکے ملتے ہیں
پرشور دھارے ......
یہ لمحہ
کہ جس کے لہو میں رواں ہیں
کئی بیتی صدیوں کے زیریں تلاطم
یہ لمحہ کہ جس کی رگوں میں
کئی آنے والے زمانوں کے راز دروں
مرتعش ہیں
یہ لمحہ
جو موجود کی لذتوں کا خزینہ ہے
جو حال کے درد کا راز داں ہے

یہ لمحہ تو ہے
طائر کوہ پیما کی پرواز کا
ایک عکسِ گریزاں .....
زمیں کے لبوں پر
فلک کا وہ بوسہ
کہ جو لذتِ لمس سے ماورا ہے

یہ لمحہ کہ جو ایک رنگین تتلی ہے .....
مائل بہ پرواز ہے
یہ تتلی اگر میری مٹھی میں آنکھ اپنی کھولے
تو میرے تخیل کی پرواز بھی
برق رفتار لمحوں کی یلغار سے
ماورا ہو .....

پروفیسر زاہدہ زیدی
الشفا، ۴/۱۲۰ [illegible]
[illegible] علی گڑھ

[illegible]

شبنم آلودہ یہ مرجھائے ہوئے رخ کے گلاب
میری محبوب مرے واسطے مغموم نہ ہو
میری قسمت میں کبھی تھی تری آنکھوں کی شراب
دیکھ یہ راز کسی اور کو معلوم نہ ہو

تیری آنکھوں میں یہ امڈے ہوئے آنسو کیسے
تو کہاں اور یہ بارِ غم و آلام کہاں
روئے تاباں پہ یہ بکھرے ہوئے گیسو کیسے
مطلعِ صبح پہ یہ تیرگیِ شام کہاں

یہ توہم کی سلاسل یہ خرد کی زنجیر
توڑ کر تو درِ زنداں سے نکل سکتی تھی
یہ کفِ دست کی ریکھائیں جبیں کی تحریر
تو مٹا کر انھیں تقدیر بدل سکتی تھی

سوگ بیکار ہے یہ اشکِ ندامت بے سود
آج حالات پہ آہوں کا اثر کیا ہوگا
زندگی ہوگی جو پابند رسومات و قیود
ہم تو جی لیں گے محبت کا مگر کیا ہوگا

ربطِ باہم کا تصور تو حسیں ہے لیکن
کون ہے گردشِ دوراں سے جو مجبور نہیں
مجھ کو تقدیسِ محبت پہ یقیں ہے لیکن
تیرا چرچا ہو ستاروں میں یہ منظور نہیں

جب امیدوں کا پر اسرار فسوں ٹوٹ گیا
کیوں مرے واسطے مغموم ہے ناشاد ہے تو
خوش ہو اب سلسلۂ عشق و جنوں ٹوٹ گیا
شاد ہو کشمکشِ شوق سے آزاد ہے تو

ہو کے حالات سے مجبور چلا جاؤں گا
تیری نظروں سے بہت دور چلا جاؤں گا

اقبال ماہر
۱۸۔ خاص بازار
الٰہ آباد

پروفیسر محمد انصار اللہ
۴/۱۱۶۲ - سرسید روڈ - سرسید نگر
علی گڑھ

اُردو نثر پر ہندو مذہب کا اثر

بیرونِ ملک میں یہ خیال مدّت سے رائج رہا ہے کہ سنسکرت یہاں کی علمی ہی نہیں، عوامی زبان بھی ہے چنانچہ محمود غزنوی نے یہاں کے لئے جو سکّے ڈھلوائے تھے ان پر اسی زبان میں کلمۂ طیبہ کا ترجمہ لکھوایا تھا. اندرونِ ملک تک رسائی حاصل کر لینے کے بعد یہ بات کھل کر سامنے آئی کہ اس علاقے میں جسے ہند یا ہندستان کہا جاتا تھا، ایک ایسی زبان بولی جاتی تھی جس میں 'ش' کی آواز نہیں تھی. شمس الدین التمش نے اپنے دلّی والے سکّوں پر دیوناگری خط میں جو کچھ لکھوایا، اس میں 'ش' نہیں ہے

ابتدائی زمانے کی زبان اُردو کی جتنی تصانیف دستیاب ہیں، فارسی خط میں ہونے کے باوجود، ان میں عربی، فارسی کی آوازوں کا استعمال عموماً نہیں ہوا ہے، ان زبانوں کے لفظوں کو مقامی لب ولہجے کے مطابق ڈھال لیا گیا ہے، مثلاً

پھیروج ساہ دلّی سُرتانا جونا ساہ اوجیرو بکھانا
فیروز شاہ سلطان شاہ وزیر (چھندائین)

یہی عمل مقامی الفاظ کے ساتھ بھی کیا گیا ہے مثال کے طور پر لفظ ماڑگ (بہ سکون را) کو بہ فتح را یعنی ماڑگ کہا گیا ہے.

بول چال کی یہ زبان عوام میں رائج تھی اور عوام لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے. مسلمانوں نے اس زبان کو اپنے خط (یعنی پہلے عربی پھر فارسی) میں لکھنا شروع کیا اور بالآخر یہ زبان اسی خط سے پہچانی جانے لگی. گھر والے کبیر نے اپنے "الف نامہ" میں صرف عربی کے حرفوں سے اشعار شروع کیے ہیں. اس بنا پر یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید اس زمانے تک پورب دیس میں اس زبان کے لئے عربی خط کا ہی استعمال ہوتا رہا تھا.

زبان ہندوی محض بول چال میں رائج تھی. اس زبان میں بعض ایسی مقامی آوازیں بھی تھیں جن کے اظہار کے لئے دیوناگری خط میں تحریری شکل موجود نہ تھی مثلاً 'ڑ' وغیرہ. فارسی خط میں ان آوازوں کو ظاہر کرنے کے لئے مناسب شکلیں جلد اختراع کر لی گئیں اور ریختہ آمیختہ کا کلام اس خط میں بخوبی لکھا اور پڑھا جانے لگا. ایک شعر یہ ہے

صدق رہبر، صبر توشہ، دشت منزل، دل رفیق
ست نگری، دھرم راجا، جوگ مارگ برملا

مشہور ہے کہ ہندوؤں میں سب سے پہلے کایستھوں نے سکندر لودی کے عہد میں فارسی پڑھنا لکھنا سیکھ لیا تھا لیکن شواہد اس بات کے بھی موجود ہیں کہ دوسری قوموں کے افراد نے بھی اس باب میں پیش قدمی کی تھی. ان لوگوں نے اپنی ضرورت سے بعض وقت مقامی لفظوں کے لئے فارسی میں نئے الفاظ اختراع کیے. ان اختراعوں نے اٹھارھویں صدی کے اواخر تک اُردو کو ایک دلچسپ ضرب المثل دے دی تھی یعنی :

"پھاوڑے کا نام گل صفا"

اس صورت حال سے فارسی ہی نہیں اُردو بھی متاثر ہوئی.

زبانِ اُردو کے بارے میں ایک دل چسپ حقیقت یہ بھی ہے کہ بزرگانِ قدیم کی زبان سے جو فقرے بیساختہ نکل گئے تھے، بیشتر نے ضرب المثل کا درجہ حاصل کر لیا ہے مثلاً :

جو منڈا سا باندھی سو پاین پسری
نیچی بیری سب کوئی جھوری

یہ قدیمی ضرب الامثال عام حقیقتوں سے متعلق تھیں. رفتہ رفتہ مختلف جماعتوں کے عقیدوں اور عملوں سے متعلق بھی کہاوتیں جاری ہوئیں. عالمگیر اورنگ زیب

کے آخر زمانے تک ہندو مذہب اور معاشرت سے متعلق بہت سی مثلیں رواج پاچکی تھیں، مثلاً: ـــــــ

— دلّی کی دیوالی، منہ چکنا پیٹ خالی
— بانبھن ماریں، پروا کھینچے
— گاؤں کا جوگی، آن گاؤں کا سدّھ
— مَری بچھیا پانڈے کے ناؤں
— جوئی پانڈے کی پوتھی، سوئی مکھ بچن
— جوگی کال کے بیت
— بھولیں بانبھن گائے کھائی ـــــــ (عوارفِ ہندی)

وقت کے ساتھ اس سرمایے میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ اٹھارھویں صدی کے اواخر تک جو ضرب الامثال زبانوں پر جاری ہو چکی تھیں، ان میں سے بعض یہ ہیں: ـــــــ

— آدھے گاؤں دوالی، آدھے گاؤں پھاگ
— باممن سے دان مانگتے ہیں
— پانڈے جیویں ہی بتیائیں
— پانی پی کر ذات پوچھتے ہیں
— تُرت دان مہاپُن ـــــــ (خزینۃ الامثال)

بیسویں صدی کے ربعِ اوّل تک اُردو میں کہاوتوں کا سرمایہ بہت ہو گیا تھا۔ ہندوؤں سے متعلق جو کہاوتیں عام ہو رہی تھیں۔ ان میں سے محض چند یہ ہیں: ـــــــ

— باممن بچن پرمان، گنگا کی مٹی چندن سمان
— بنیے کا بہکایا، جوگی کا پھٹکارا
— بنیے کا بیٹا، کچھ دیکھ کر گرتا ہے
— پانڈے جی پچھتائیں گے، سوکھے چنے چبائیں گے
— مُورتی ہار نگل گئی ـــــــ (مخزن الامثال)

ضرب الامثال سے مختلف فرقوں اور جماعتوں کے عمل اور اندازِ فکر و نظر کا پتا چلتا ہے اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو کی تقریر اور تحریر پر بھی ہندو معاشرت کے اثرات بہت پہلے سے مرتب ہو رہے تھے، جیسے جیسے زبان میں پختگی اور وسعت آتی گئی، یہ اثرات بھی نمایاں اور پختہ تر

ہوتے گئے۔

ـــــــ

کہا جا چکا ہے کہ سنسکرت میں جو ہندستان کے علمائے مذہب کی تحریری زبان تھی، کلمۂ اسلام اور اسلامی تعلیمات کو محفوظ کرنے کی کوششیں کی گئی تھیں، لیکن بول چال کی زبانوں میں اسلامیات کا بیان براہِ راست نہیں کیا گیا، ان میں عوام کی استعداد کے مطابق مقامی اصطلاحوں کے واسطے سے بات کہی گئی، مثال کے طور پر ملک محمد جائسی کہتے ہیں ؎

پُنّ سو عثمان پنڈت بڈ گنی
لکھا پُران، جو آیت سُنی

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ قرآن کے لیے پُران، عالم کے لیے پنڈت اور بہادر کے واسطے سنگھ کی اصطلاحیں استعمال کی گئی تھیں ـــ خدائے مطلق و واحد کے لیے لفظ "رام" نے رواج پایا۔ تلسی داس نے بھی رام چرتر مانس میں کہا ہے ؎

انوپا	انادی	الکھ	ابیگت	روپا	پرمارتھ	برہم	رام
لاثانی	جو ہمیشہ سے ہو	مطلق	جس کی انتہا نہ ہو	صورت	فہم سے بالاتر		رب الارباب

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ لفظوں کی معنویت کی تبدیلی میں نشیب اور فراز دونوں ہوتے ہیں، ایک لفظ جس کے معنی آج بہت مستحسن ہیں، کل حقیر و ذلیل بھی ہو سکتا ہے۔ کبھی کبھی یہ تبدیلی بہت کم مدت میں بھی ظاہر ہو جاتی ہے چنانچہ یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ لفظوں کے اثر سے بہت جلد مسلمانوں میں ہندو عقائد نے رواج پانا شروع کر دیا تھا۔ قطب الدین فیروز بیدری نے جو قادریہ سلسلہ میں صاحبِ اجازت بھی تھا، اپنے مرشد کی مدح میں کہا ہے ؏

محی دین دوجے جنم آئیا

ظاہر ہے کہ "جنم" کا تصور غیر اسلامی ہے۔

کہا جا چکا ہے کہ اُردو نثر کے ابتدائی نقوش ان جملوں اور فقروں کی صورت میں ملتے ہیں جن میں سے بیشتر ضرب الامثال کی حیثیت اختیار کر کے خاص و عام کی زبانوں پر جاری ہیں۔ اُردو نثر کی وہ پہلی باضابطہ تحریر جسے تصنیف کا درجہ حاصل ہے، شاہ برہان الدین جانم کا رسالہ "کلمۃ الحقائق" ہے۔ اس رسالے میں پانچ عناصر کا ذکر ملتا ہے:

"باد از اس صفا تے ہُوا کیا و ہُوا تے باد کیا،

"...و باؤ تے آگ کیا، و آگ نے پانی کیا، و پانی تے خاک کیا۔"

(بہ حوالہ، ... خلا ... ہوا)

یہ مشہور و معلوم حقیقت ہے کہ عناصر چار مانے جاتے تھے یعنی آتش و آب و خاک و باد۔ گورکھ ناتھ نے اپنے ہٹھ یوگ کے فلسفہ میں پانچویں عنصر خلا کو بھی شامل کیا۔ ان کی یہ جدّت عام طور سے پسندیدگی کی نظر سے دیکھی گئی اور مسلمان عالموں نے بھی اسے قبول کرلیا۔ جانم نے اپنے رسالوں میں پانچ عناصر کا بیان کیا اور ان کے صاحبزادے شاہ امین الدین علی اعلا نے اپنے نظامِ سلوک میں ان پانچ عناصر اور ان کے پچیس گنوں کو بنیادی اہمیت دی۔ پھر تو یہ سلسلہ چل نکلا اور بات یہاں تک پہونچی کہ خدا اور خدائی کے تمام معاملات کی توضیح و تاویل پانچ پانچ مدارج کے مطابق کی گئی۔ اس طرح ہندو فلسفہ اور مذہب نے مسلمانوں کے مذہبی مسائل میں بھی دخل حاصل کرلیا۔ مذہب اور عقیدے کا براہِ راست تعلق انسان کے فکر و عمل سے ہوتا ہے چنانچہ زبان اُردو کا بھی کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس پر ہندو فلسفہ اور عقیدہ کا براہِ راست یا بالواسطہ کم یا زیادہ اثر مرتب نہ ہوا ہو۔

مسلمان عرب، ترک، ایرانی، افغانی وغیرہ اگرچہ مختلف تہذیبی اور لسانی جماعتوں سے تعلق رکھتے تھے۔ عقیدے کے علاوہ ان میں یہ بات بھی مشترک تھی کہ وہ ایک زندہ قوم تھے اور علم و دانش کے تمام دروازے ان پر کھلے ہوئے تھے۔ کتاب "امرت کنڈ" کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ:

"بروزگارِ سلطان علی مردان در مسجد شہر لکھنوتی میانِ دانش مند ہندو بنام کامروپ و قاضی مسلمان بنام رکن الدین سمرقندی دربارۂ خدا و رسول و حقیقتِ روح مناظرہ و مباحثہ رُخ داد۔ قاضی جوابہائے قانع کنندہ داد و آں ہندو مسلمان شدہ گہ بہ قاضی کتاب امرت کنڈ نشان داد کہ دارائے ہماں نوع جوابات بود کہ قاضی بہ او دادہ بود۔ قاضی آں کتاب را بہ عربی و بہ نام حوض الحیات برگرداند و در سی باب تقسیم کرد۔" (فہرست نسخہ ہای خطی موزہ ملّی ص ۹۰۶)

اس کتاب کو عربی سے شیخ محمد غوث گوالیاری (متوفی ۹۷۰ھ/۶۳-۱۵۶۲ء) نے فارسی میں منتقل کیا۔

مسلمانوں کے شوقِ علمی نے سنسکرت کے بڑے سرمایے کو عربی، فارسی اور پھر اُردو میں منتقل کرکے نہ صرف اسے ملک کی اکثریت کے لئے سہل الحصول بنادیا بلکہ اسے زمانے کی دستبرد سے محفوظ بھی کردیا۔ شاہزادہ داراشکوہ نے سرِّ اکبر کے نام سے اپنشدوں کو فارسی میں منتقل کیا تھا، ان کے بارے میں لکھا ہے:

"سرِّ اکبر: سرّ الاسرار، ترجمۂ اوپانیشاد، از داراشکوہ محمد متخلص بہ قادری (۱۰۲۴ھ/۱۶۱۵ء تا ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۹ء) فرزند شاہجہاں، ترجمۂ پنجاہ اوپانیشاد است کہ از کتابہائے مقدس ہندواں است، از متن سانسکریت، در مدتِ شش ماہ تا ۲۶ رمضان ۱۰۶۷ھ/۱۶۵۷ء یعنی دو سال پیش از گذشتن او، در دہلی با کمک پنڈتان و سنیاسیان بید و دیگر اوپانیشاد دانان بہ فارسی درآورد۔"

(فہرست مشترک جلد ۴ ص ۲۱۹)

مہرشی شیوبرت لال ورمن کا کہنا ہے کہ:

"اسی فارسی اپنشد سے جس کا نام داراشکوہ نے سرِّ اکبر رکھا تھا، دنیا میں اپنشد کے علم کا رواج ہوا۔ لاطینی، فرانسیسی اور جرمنی وغیرہ زبانوں میں سرِّ اکبر کے ترجمے ہوئے اور اب انگریزی عہد میں اس کے مطالعے کا رواج غایت کے درجے پر پہنچ گیا ہے۔ یہ احسان ہے جو داراشکوہ نے اس علم پر کیا ہے۔"

(چھاندوگیہ اپنشد ص ۱۰)

ابوالحسن نامی کسی شخص نے "کہ در مجلس سید مظفر علی شاہ تربیت یافتہ" سرِّ اکبر کا ترجمہ اُردو میں مناہج السالکین کے نام سے کردیا تھا۔ بعد میں یہ کتاب مطبع نول کشور لکھنؤ سے چھپ کر شائع ہوئی۔

اس مقام پر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مغل سلاطین اور امرا آخر زمانے تک سنسکرت کی سرپرستی کرتے رہے تھے جس کے نتیجے میں مسلمانوں

میں اس زبان کی تصانیف سے دلچسپی قائم رہی۔ ہندوؤں کا معاملہ مختلف تھا چنانچہ ہرشی شوبھت لال ورمن نے لکھا ہے:

"سکندر نے اچھی طرح ذہن نشین کر لیا کہ جب تک ہندو مسلمانوں میں میل جول نہ ہوگا قیامت تک مسلمانوں کی سلطنت اس ملک میں قائم ہونے والی نہیں ہے۔ اس نے پنجاب کے کھتریوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اب کائستھوں کو اپنے دام میں پھانس لیا ہے۔ ان کو فارسی پڑھنے کا شوق دلایا۔ اس بادشاہ سے پہلے کوئی ہندو فارسی نہیں پڑھتا تھا۔ سب کو قسم تھی کہ کوئی یون بھاشا نہ سیکھے۔ جب تھوڑے سے کائستھ اس کے دام میں آگئے، ہندوؤں کی تمام قوم نے ان کو اپنے درمیان سے خارج کر دیا۔ ان کی عورتوں نے مردوں کے ہاتھ کا کھانا پینا ترک کیا۔ برہمنوں نے بہت کوشش کی کہ یہ سلطان کے دام میں نہ پھنسیں مگر ان کی ایک قوم جسے بھٹناگر کہتے ہیں، دھوکا کھا گئی۔ وہ فارسی پڑھ کر شاہی منصب دار بنا لیے گئے۔ انکی بود و باش کے لئے دہلی کے قریب ایک شہر سکندر آباد بسایا گیا۔" شاہی ڈاکومر ۳۲-۳۲

وہ فارسی پڑھنے ہی کے نہیں، سنسکرت کی اشاعت کے بھی خلاف تھے فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں کئی لوگوں نے سنسکرت کی تصانیف کے ترجمے اُردو میں کیے تھے۔ ان میں للو لال جی اکیلے ہندو عالم معلوم ہوتے ہیں جنھوں نے مذکورہ کام میں دوسروں کا ہاتھ بٹایا تھا۔ فورٹ ولیم کالج میں سنسکرت کی کتابوں کے جو ترجمے ہوئے ان میں سے بعض یہ ہیں:

سکنتلا

"گلکرسٹ صاحب نے فرمایا کہ سکنتلا ناٹک کا ترجمہ اپنی زبان کے موافق کرو، اور للو لال جی کو حکم کیا کہ بلاناغہ لکھایا کرے۔ یہ قصہ فرخ سیر بادشاہ کی سلطنت میں سنسکرت سے برج بھاکا میں ترجمہ ہوا تھا۔ اب شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں ۱۸۰۱ء/۱۲۱۵ھ کے جان گلکرسٹ صاحب کے حسب الحکم کاظم علی جوان نے اسے زبان ریختہ میں بیان کیا اور جو انگریزی میں ہے وہ سنسکرت سے ترجمہ ہوا ہے۔ اگر اس میں اور اُس میں کچھ فرق ہو تو ممکن ہے۔"

اس کام میں للو جی لال کا کام یہ تھا کہ وہ نواز کے نسخے کو پڑھ دیتے تھے۔ نظر ثانی کے وقت بھی گلکرسٹ نے "اس کب کو فرمایا کہ تم بھی اسے کتاب سے مقابلہ کر و کہ اگر کہیں کمی بیشی ہوئی ہو تو نہ رہے"۔ کاظم علی جوان کی نثر کا نمونہ یہ ہے:

"میں وہ پری ہوں کہ اگر میرا سایہ برہما، بسن، مہادیو پر پڑے دیوانے ہو جاویں۔ وسوامتر کو ایک پل میں اپنے پر دیوانہ کر لوں۔ تمام عمر کو تپسیا کی جگہ کلنک کا ٹیکہ ماتھے پر دھر دوں۔ جوگی یا جتی تین طبق میں کون ایسا ہے جو مجھ سے آپ کو بچاوے۔ ؟ اس کو تو میں دم میں اور کا کچھ اور کر دوں، قسم ہے مہاراج کی، اگر اسے کام کے بس کر انگلیوں پر نہ نچاؤں تو اپنا نام مینکا نہ رکھا کروں۔"

کاظم علی جوان نے للو جی لال کی مدد سے سنگھاسن بتیسی کا بھی اُردو میں ترجمہ کیا تھا۔

اخلاق ہندی:

"اس کتاب کو ہند میں ہتوپدیس یعنی نصیحت مفید کہتے ہیں۔ یہ کتاب سرکار دولت مدار میں ملک الملوک شاہ نصیر الدین کی، جس کی تخت گاہ صوبہ بہار تھی، پہنچی۔ اپنے ملازموں سے ایک کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ اس کو ترجمہ سلیس فارسی میں کرو۔ حکم بجا لایا اور نام اس کا مفرح القلوب رکھا۔ بالفعل اس عاصی میر بہادر علی حسینی نے سن اٹھارہ سو دو (۱۸۰۲) عیسوی میں مطابق سن بارہ سو سترہ ہجری میں فرمانے سے جان گلکرسٹ صاحب کے، فارسی میں ترجمہ سلیس رواجی ریختہ میں، جیسے خاص و عام بولتے ہیں، کیا اور نام اس کا اخلاق ہندی رکھا۔"

اس کتاب کی عبارت اس طور پر ہے:

"آخر آدمی سب سوچ بچار کرکے بولا، اے شیر! وہ چیز جو بشر دیا چاہتا ہے سو کہاں ہے؟ دکھا۔ تب اس نے وہ پایل اپنے تھد پسار کے دکھلادی۔ بٹوہی بولا، تو باگھ میں مانس بھکش، میرا مانس تیرا آدھار، مجھے تیرا بھروسا نہیں۔ میں تیرے پاس کیوں کر آؤں؟ شیر بولا، تو نہیں جانتا ہے کہ میں نے مانس کھانا چھوڑ دیا ہے۔ تم ہرگز خوف اپنے دل میں مت لاؤ، نسنگ چلے آؤ۔ جیسی میں اپنی جان جانتا ہوں ویسی ہی دوسرے کی۔"

بیتال پچیسی

"محمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں راجا جے سنگھ سوائی نے جو مالک جے نگر کا تھا، سورت نام کبیشور سے کہا کہ بیتال پچیسی کو جو زبان سنسکرت میں ہے، تم برج بھاشا میں کہو۔ تب اس نے بموجب حکم راجا کے برج کی بولی میں کہی۔ اب شاہ عالم بادشاہ کے عہد کے بیچ، مظہر علی شاعر نے، جس کا تخلص ولا ہے، زبان سہل میں جو خاص و عام بولتے ہیں اور جسے عالم و جاہل، گنی، گوڑھ سب سمجھیں اور برج کی بولی اکثر اس میں رہے سری للو لال جی کوی کی مدد سے بیان کیا۔ پھر موافق ارشاد ورس ہندی کپتان جیمس موئٹ کے، تارنی چرن مترا نے چھاپے کے واسطے سنسکرت اور بھاشا کے الفاظ کو جو ریختے کے محاورے میں کم آتے ہیں نکال کر مروج الفاظ کو داخل کیا، مگر بعض اصطلاح ہندوؤں کی، جس کے نکال لینے سے خلل جاتا، بحال رکھی۔"

یہ کتاب پہلی بار ۱۸۰۵ء میں شائع ہوئی۔ بعد میں اسے دیوناگری خط میں بھی چھاپا گیا۔ تحریر کا انداز اس طرح ہے،

"ایک تو اندھیری رات کی ڈراتی تھی، دوسرے مینہ کی ایسی جھڑی لگی ہوئی گویا آج برس کر پھر کبھی نہ برسے گا اور بھوت پلید ایسا شور و غل کرتے تھے کہ سور بیر بھی ہو تو دیکھ کے گھبرا جائے لیکن راجا اپنی راہ چلا جاتا تھا

سانپ جو آن آن پاؤں میں لپٹتے تو ان کو منتر پڑھ چھڑا دیتا غرض جوں توں کٹھن باٹ کاٹ کر راجا اُس مسان میں پہنچا تو دیکھا کہ بھوت پریت پکڑ پکڑ آدمیوں کو در سے مارتے ہیں۔"

فورٹ ولیم کالج کی جن دوسری تصانیف میں ہندو عقیدہ اور روایتوں کا رنگ نمایاں ہے۔ ان میں مذہب عشق یعنی قصۂ گل بکاولی خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ مترجم کا بیان یہ ہے:

"عزت اللہ بنگالی نے یہ کتاب فارسی میں تصنیف کی تھی۔ مستمند نہال چند لاہوری کو کہ اس نحیف کا مولد شاہجہان آباد ہے، اشرف البلاد کلکتہ میں آب و خورش کھینچ کر لایا، کپتان ڈیوٹ کی دست گیری سے گلکرسٹ بہادر کے دامن دولت تک دسترس پایا۔ ایک روز ارشاد کیا تاج الملوک اور بکاولی کا قصہ فارسی میں ہے، ہندی ریختہ کے محاورے میں ترجمہ کر۔ حسب الارشاد اپنے حوصلے کے موافق اردو میں کیا اور نام اس کا مذہب عشق رکھا۔"

قصہ کی عبارت پر عموماً فارسی کا اثر غالب ہے لیکن بکاولی کے راجا اندر کے اکھاڑے میں پہنچنے کے بعد ہندو عقائد اور روایات کا اثر نمایاں ہو گیا ہے۔ نمونہ یہ ہے:

"ایک برہمن پجاری ملا، اس سے پوچھا کہ دیوتا تم کون ہو اور کس ٹھاکر دوارے کے پجاری ہو۔ تب اس برہمن نے کہا کہ راجا چتر سین جو اس ملک کا والی ہے اس کے ٹھاکر دوارے کا میں پجاری ہوں۔ پھر تاج الملوک نے پوچھا کہ اس شہر میں کتنے ٹھاکر دوارے ہیں جو مشہور تھے وہ سب برہمن نے بتا دیئے۔ پھر یہ کہا کہ تھوڑے دنوں سے دکھن کی طرف دریا کے کنارے ایک نیا مندر پیدا ہوا ہے۔"

فورٹ ولیم کالج کی ان داستانوں میں ہندو مذہب اور روایتوں کی پیش کش کے نتیجے میں سنسکرت کے الفاظ اور ہندو فلسفہ اور عقیدے کی اصطلاحات کا قابل توجہ حد تک استعمال ہوا ہے جس کے نتیجے میں اردو کو نئے نئے مطالب ہی نہیں ملے بلکہ اس کے سرمایۂ لفظی میں اضافہ ہوا، البتہ یہ

لکھنے والے ایک خاص ماحول کے پسند تھے اور ان کے پیش نظر زبان و بیان کا ایک مخصوص معیار اور معیار بھی تھا۔ اس لیے ان کی عبارت اور نثر کے انداز میں کوئی بڑا فرق پیدا نہیں ہوا۔

سنسکرت ہندوؤں کے لئے دیوتاؤں کی مقدس زبان تھی۔ اس زبان کی ہر تحریر ان کے لئے عملاً دیو بانی تھی۔ عام اور اذان کر کے وہ اس کے تقدس کو مجروح کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ مسلم سلاطین اور امراء کے شوق علمی کا فائدہ بس یہ ہوا تھا کہ اس زبان کی تحریریں پوری طرح ناپید اور بے نشان نہیں ہو سکی تھیں۔ ان کی سرپرستی میں جو کچھ کام ہو چکا تھا فورٹ ولیم کالج کے کارپردازوں نے اسی پر اپنے کاموں کی بنیاد رکھی تھی۔ حسن اتفاق تھا کہ اس زمانہ میں چھاپے خانے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا چنانچہ وہاں سنسکرت کے جو ترجمے ہوئے تھے۔ چھپنے کے بعد ان کی اشاعت عام ہوئی۔ جذباتی لگاؤ ہونے کی وجہ سے ان سے ہندوؤں میں بیداری آئی۔ ان میں فخر و مباہات کے جذبات پیدا ہوئے اور نتیجے کے طور پر وہ تصنیف و تالیف کی طرف مائل ہوئے۔ ۱۸۵۰ء سے پہلے تک اردو نثر میں ہندوؤں کی قابل ذکر یہ کتابیں سامنے آگئی تھیں :

نام کتاب	مصنف	سال تصنیف
۱۔ ریاض دل ربا	منشی گمانی لعل	۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء
۲۔ قصۂ گل و صنوبر	پریم چند کھتری	۵۲-۱۲۵۱ھ/۱۸۳۶ء
۳۔ باغ ارم	خیراتی لال آشم	۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء
۴۔ نغمۂ عندلیب	گوبند سنگھ عندلیب	۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء
۵۔ حکایت سخن سنج	انبا پرساد رسا	۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء
۶۔ قصۂ کام روپ و کام لتا	کندن لال لاہوری	۱۲۶۵ھ/۱۸۴۹ء
۷۔ تذکرۃ الکاملین	پروفیسر رام چندر	۱۲۶۵ھ/۱۸۴۹ء
۸۔ قصۂ سورج پور	منشی چرنجی لال و سید روشن علی	۱۲۷۲ھ/۱۸۵۵ء
۹۔ بیتی کرت ؟	لال بینی لال اگروال	۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء

گوبند سنگھ عندلیب نے اپنی کتاب کے سبب تالیف میں لکھا ہے کہ :

"بہت پست عرض ہے کہ وقت ملاحظے کے چند امور ملحوظ خاطر اشرف رکھیں۔ اول یہ کہ سلاست کی رعایت بہت مدعی اور صنائع۔ ہر دم خیال رہا کہ ہر شخص سمجھ جائے تقریر کا مزا پانے والا بعض استاد یہ قصہ بھی صنائع شاعری سے کچھ کا کچھ ہو جاتا، ترجمے میں ایسا بڑھتا کر سادے قصوں کی رونق گھٹایا۔ دوم یہ کہ ابتدا سے انتہا تک جو شعر لکھا، تصنیف کیا لکھ دیا اور صاحبوں کے اشعار سے اپنی نثر کو زینت نہیں دی۔ اپنی ہی گدڑی اوروں کی قبائے کم خوابی سے بہتر سمجھی۔ سوم یہ کہ گھٹانا بڑھانا جس مقام پر مناسب جانا کیا۔ لیکن بیان میں اختصار ہی ملحوظ رہا۔ طول بیجا نہیں دیا۔ چہارم یہ کہ بندہ محض بے استعداد تھا۔ اس قدر بھی لکھا محض فیض استاد تھا۔ پس اگر کوئی مقام پسند آجاوے دعا، ورنہ چشم پوشی از خطا منظور نظر رہے کہ مقصود اصلی مصنف کا تصنیف سے یہی ہوتا ہے۔ اسی امید سے ہر شخص اپنے اوقات عزیز ان اشغال میں کھوتا ہے۔"

اس بیان سے یہ بات بخوبی ظاہر ہے کہ تحریر بے ساختہ نہیں ہے بلکہ مصنف نے صناعی سے کام لے کر عبارت آرائی کا زور دکھایا ہے۔ اس عبارت آرائی کی مختلف کتابوں میں واضح طور پر دو جہتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ہندو مصنفین عربی، فارسی سے واقفیت بلکہ اپنی قدرت اور گرفت دکھانے کے لئے بالقصد ان زبانوں کے ثقیل الفاظ، مرکب ترکیبیں، تشبیہیں وغیرہ لاتے تھے۔ بیشتر اس معاملے میں اس حد تک مبالغہ ہوتا تھا کہ یہ گمان بھی نہیں ہوتا تھا کہ کسی ہندو کردار کا بیان کیا جا رہا ہے۔ مثلاً ریاض دل ربا میں ہے :

"لباس دل پسند نسواں کا او پر قامت راست اپنے کے راست کیا اور زیورات مرصع و نادرات سے گوش و گردن و دست و پا کو آرائش دی۔ کوئی نظارگیوں سے اس ماہ مصری کو پری از عیب بری جان کر کہتا تھا کہ اسی گھڑی پرستان سے واسطے تسخیر دل مردم کے تختۂ زمین پر اتری ہے اور کوئی اس یگانۂ آفاق قاتل عشاق کو حور بہشتی تصور

کر کر سخن سرا تھا کہ اسی دم گلستانِ جنت سے بہ آہنگ
قتلِ بے دلوں کے واردِ اس جہاں کے ہوئی غرضکہ
ساتھ اس آب و تاب کے آپ کو ہندوزن قرار دے کر
طرف مکانِ شحنۂ اندوہناک کے چلا۔"

دوسرا انداز وہ ہے کہ زبان کو عربی فارسی کی آمیزش سے آزاد کر کے اسے بول چال کے قریب لایا جائے۔ چنانچہ انشاء اللہ خاں انشا نے داستان رانی کیتکی میں اس بات کا بھی التزام کیا کہ:

"ہندوی چھٹ اور کسی بولی کی پُٹ نہ ملے۔"

لیکن معمولاً مسلمان مصنفین کی تحریریں روزمرّہ سے قریب تر معلوم ہوتی ہیں۔ آغا حسن امانت نے شرح اندرسبھا میں لکھا ہے:

"چونکہ یہ جلسہ کہ سب کو مرغوب تھا مگر اپنے نزدیک
معیوب تھا، اس لحاظ سے اپنا تخلص بدل کر اس میں
استاد تخلص کیا۔ لیکن لوگوں نے غزلوں کے سبب سے بندے
کا کلام دریافت کر لیا۔ غرض کہ چودھویں تاریخ شوال
کی ۱۲۶۸ھ میں اندرسبھا اس جلسہ کا نام رکھا، بجائے
چار باب چار پریاں قرار دے کر شروع کیا۔ شہرت گھر گھر
ہوئی۔ اہلِ محلہ کو خبر ہوئی۔ آخر کو اس سے رنج کا پھل
پایا۔ خیر جو ہوا سو بہتر ہوا۔ اپنا تو یہ قول ہے:
تقدیر سے گلہ ہے کسی سے گلہ نہیں"

کہتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء میں مغلوں کی سلطنت ختم ہوئی اور ہندوستان میں انگریزی حکومت قائم ہوئی۔ یہ صحیح ہے لیکن بات اتنی ہی نہیں تھی۔ اس سیاسی تبدیلی نے مسلمانوں کو ہر اعتبار سے تباہ کر دیا تھا۔ اب وہ زیادہ سے زیادہ جو سوچ سکتے تھے یہ تھا کہ:

"ہم کو اب دُنیا میں محکوم بن کر رہنا ہے۔" (حیاتِ جاوید)

انھیں یہ معلوم تھا کہ:

"کارتوس کی مخالفت جو بغاوت کی بنیاد تھی ہندوؤں سے
شروع ہوئی اور مسلمانوں پر تھُپ گئی۔"

(حیاتِ جاوید ص۷۵۳)

گورنر مدراس کے یہ الفاظ بھی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی تھے کہ:

"عقاب چڑیوں کی چائیں چائیں کی کچھ پروا نہیں کرتا،
لیکن باز یا جُرّہ اس کے آگے چوں بھی کرتا ہے تو فوراً
اس کی گردن توڑ ڈالتا ہے۔"

——— حیاتِ جاوید ص۲۵

۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کو وطن کے لیے جنگِ آزادی تسلیم کیا گیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اس کے بعد اکثریت کے حوصلے بہت بلند ہو گئے۔ مشرق اور مغرب میں مختلف ہندو تنظیمیں اور انجمنیں وجود میں آئیں اور ہندو خیالات وعقائد کی ترویج واشاعت کے لیے بہ کثرت رسالے اور اخبارات جاری ہوئے۔ ۱۸۷۵ء تک شہر لاہور سے گیان پتریکا، ہادی حقیقت اور ہندو باندھو کے نام سے کم سے کم تین رسالے ضرور نکل رہے تھے۔ انیسویں صدی کے خاتمے تک اُردو میں مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کے رسالوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ہندوؤں کا رسالہ گیان پتریکا یکم جون ۱۹۶۵ء کو جاری ہوا، اور اُردو ہندی دونوں میں چھپتا تھا عیسائیوں کا تبلیغی رسالہ حقائقِ عرفان جنوری ۱۸۶۸ء میں جاری ہوا، وہ لاہور میں چھپ کر امرتسر سے شائع ہوتا تھا اور مسلمانوں کا ماہنامہ "ناصر الایمان" لاہور سے ۱۸۷۵ء میں نکلنا شروع ہوا تھا۔

ہندوؤں نے سنسکرت کی کتابوں کے ترجمے کے ساتھ ساتھ ہندو مذہب، فلسفہ اور اخلاق سے متعلق تصنیف وتالیف کے سلسلے کو بھی جاری رکھا۔ البتہ فرق یہ ہوا کہ بیشتر کتابوں کے نام سنسکرت ہی رکھے گئے مثلاً گیان بھاسکر، پوتھی گیان پرکاش، پوتھی موکش گیان وغیرہ اس قسم کی کتابیں عموماً ہندوؤں کی تعلیم اور تربیت کے لئے ہوتی تھیں ہندو مذہب کی عام اشاعت اور تبلیغی مقاصد کے لیے جو کتابیں لکھی گئیں ان کے نام البتہ عربی اور فارسی قاعدوں کے مطابق ہوتے تھے مثلاً تالیفِ ہرگوبند، گلدستۂ تہذیب، ذخیرۂ سعادت، مجموعۂ صفاتِ انسانی، کلماتُ الدین، بنیادُ الایمان، مراۃُ الدین وغیرہ۔ ان ناموں سے عموماً یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ یہ ایک خاص عقیدے اور مسلک کی کتابیں ہیں۔

ناموں کی طرح ان کتابوں کی زبان اور عبارت کا بھی معاملہ تھا

یعنی بعض کتابیں ایسی لکھی گئی [illegible] میں ہوتا یہ تھا کہ مسلمانوں کی قومی
ان میں مستعمل اصطلاحوں کو عام ہندو کے لئے بھی سمجھ لینا آسان نہیں تھا
دلچسپ بات یہ ہے کہ ایسے مضمونوں کا سلسلہ بھی جب روانی پر آتا تھا تو
بے ساختہ عربی و فارسی الفاظ نکل پڑتے تھے مثلاً :

"اے منتری یعنی محبت کے دیوتا، واے برن یعنی پانی کے دیوتا، واے ارجمادوز کا کے دیوتا، واے اندر دیوتاؤں کے بادشاہ، واے برہسپت عارفوں کے استاد واے برہما پیدا کرنے والے خلق کے، واے بشن پالنے والے عالم کے تم کو نمسکار ہے اور جو کچھ میں بیان کرتا ہوں اس کا پھل سبھے اور میرے گرو اور سننے والے اور پڑھنے اور دیکھنے والوں کو بخشو یعنی برہم گیان ہو اور گیان سے مکت ہو اور نفاق اور دوئی دل سے دور ہو کیوں کہ جو برہم کو جانتا ہے وہ برہم ہو جاتا ہے۔ کوئی استھان اور کوئی شے اور کوئی ذرا اور کوئی دل برہم سے خالی نہیں ہے کہ سب میں برہم بیاپک ہے۔"

(الکھ پرکاش بحوالہ عزیز ص۴۴)

اب دوسرا انداز یعنی عربی فارسی آمیز زبان کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے :

"دارالسلطنت اُجین میں ایک راجا تھا۔ بھرتری ہری نام، دادگستر، رعیت پرور، نہایت رحیم اور بدرجۂ غایت کریم، جب کسی سائل کی صدا اس کے کان میں در آئی اُمید بولی کی بر آئی۔ ایک روز ایک فقیر آیا اور سلطنت کی درخواست کی۔ اس کو بخش دی اور توکل پر بھروسا کر کے ایک سمت کی راہ لی۔ دن بھر چلا اور شام کو گوشۂ صحرا میں بیٹھ رہا۔ قدرت آفریدگار سے متعدد آدمی صحرا میں نمودار ہوئے۔ انھوں نے اوّلاً صحن کو صاف کر کے طرح طرح کے بچھونوں سے آراستہ کیا اور خیمے ڈیرے استادہ کر کر مسند شاہانہ بچھادی اور جملہ سامانِ طرب مہیا کر دیا۔"
(تالیف ہرگوبند بحوالہ ایضاً ص۴۳)

اس طرح رفتہ رفتہ اُردو تحریر کے دو بہت نمایاں اور مختلف انداز وجود میں آئے اور وقت کے ساتھ ساتھ ان دونوں کا چلن بڑھا۔

مذہب کی تلقین و اشاعت سے بات مذہب کی محافظت اور مدافعت تک پہونچی جس کا نتیجہ مناظراتی تصانیف کی صورت میں ظاہر ہوا ان کتابوں میں دوسرے مسلکوں، عقیدوں کی تردید ہوتی تھی۔ اور اس کے طنز و تعریض سے گذر کر بدگوئی تک نوبت پہنچی تھی۔

دوسروں کو جاہل کہنا اور ان کو جہالت میں مبتلا بتانا عام بات ہو گئی تھی۔ اور اس قسم کی باتیں لکھنے اور شائع کرنے کا سلسلہ غدر کے بعد ہی شروع ہو گیا تھا۔ کتاب الکھ پرکاش میں جو ۱۸۶۱ء میں آگرے سے چھپی تھی، کہا گیا ہے :

"جو لوگ جہالت سے اپنی عمر ضائع کرتے ہیں اور مکاروں اور گمراہوں کے کہنے پر عمل کرتے ہیں اور اونٹوں کی طرح نکیل ناک میں ڈالے ساربانوں کے پیچھے چلتے ہیں اور بوجھ اپنی پیٹھ پر رکھتے ہیں اور نفع ساربانوں کو کھلاتے ہیں اور آپ جاہل رہ کر دوسرے کے قول پر کام کرتے ہیں اور جس طرح بندر والا بندر کو نچاتا ہے، وے ناچتے ہیں، وے دنیا اور عقبیٰ دونوں کو برباد کرتے ہیں۔"

(بحوالہ ایضاً ص۴۵)

اس قسم کی جو کتابیں شائع ہو رہی تھیں، ان میں مصنف کی پوری توجہ نفس مطلب پر مرکوز رہتی تھی۔ بات کو معقول اور علمی انداز سے کہنا یا مناسب اور قابل قبول دلائل اور شواہد پیش کرنے کا خیال کم ہوتا تھا۔ عبارت میں جوش بلکہ بعض اوقات غیظ و غضب زیادہ جھلکتا تھا جس سے عوام خصوصاً عقیدت مند زیادہ متاثر ہوتے تھے۔ چنانچہ یہ طرز زیادہ مقبول ہوا۔

یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ان مذہبی کتابوں نے اُردو کو غیر معمولی فروغ بخشا۔ انیسویں صدی کے اواخر میں صورت حال یہ تھی کہ پڑھے لکھے ہندو گھرانوں کی عورتوں کو بھی اس زبان سے دلچسپی کی حد تک تعلق پیدا ہو چکا تھا۔ مہرشی شیوبرت لال ورمن نے لکھا ہے :

"جب میں ہندوستان کے تمام حصّوں کی سیاحت کرنے کے بعد آریہ انسٹی ٹیوشن بریلی کا ہیڈ ماسٹر ہوا

بیری ہوی بہت قدر دان تھی۔ ایک دن اس نے کہا تم روزانہ مجھ کو ایک ایک اوتاروں کے حالات بتایا کرو۔ اس وقت سے میں مرحومہ کو خوش کرنے کے لیے قدیم کتابوں سے اسی طرح کے تذکرے اکٹھے کرنے لگا۔ وہ ان کو غور سنتی کبھی متاثر ہو کر رونے بھی لگتی۔ آخر اس نے درخواست کی کہ ان سب کو سلیس اردو میں لکھ کر چھپا دوں۔ میں نے اس طرح کے ۲۵ رسالے ترتیب دیئے جو بھارت کی شجاع و عالم استریوں کے کارناموں کے نام سے مشہور ہیں۔"

(داتا دیال ص۱۸)

یہ صورت حال بیسویں صدی کے نصف اول تک رہی ہے چنانچہ داتا دیال نے جب ٹھاکر ہندو سنگھ صاحب کی دوسری شادی کرائی تو اس نئی دلہن کے لئے اردو میں ایک کتاب ہتوپدیش کے نام سے لکھی اس کے دیباچے میں انھوں نے لکھا ہے کہ:

"آشا ہے دلہن اسے پریم سے پڑھے گی اور جب یہ چھپ جائے گی تو پڑھنے والے بھی اس سے مستفید ہوں گے۔"

(ایضاً ص۵)

بیسویں صدی کے آغاز تک اردو میں ہندو مذہب و معاشرت سے متعلق کتابوں اور رسالوں کا اچھا ذخیرہ فراہم ہو گیا تھا۔ ایسے علمی اور ادبی رسالے بھی جاری ہوئے جن میں صرف ہندوؤں کے مضامین چھپتے تھے بات آگے بڑھی تو ہندوؤں کے مختلف فرقوں نے بھی اپنے الگ رسالے نکالنے شروع کیے چنانچہ انیسویں صدی کے ختم تک جن رسالوں کا پتہ چلتا ہے ان میں سے بعض یہ ہیں:

کائستھ متر۔ کھتری سماچار۔ جین پرکاش جالستان
آریہ گزٹ۔ آریہ مسافر۔ آریہ متر۔ آریہ ویر۔
سری گورمت پرکاشک۔ خالصہ، خالصہ بہادر، خالصہ
پنجاب، خالصہ گزٹ اور لائل خالصہ گزٹ۔

بیسویں صدی کے آغاز میں مثنوی گلزار نسیم سے متعلق چکبست اور شرر کا معرکہ ہوا۔ بحث کے آغاز اور انجام سے قطع نظر یہیں سے ہندو مسلم بنیادوں پر تنقیدی بحثوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اردو زبان و ادب کے بارے میں اس قسم کی رائیں شائع کی جانے لگیں:

"جیسی ترقی کہ بنگالی، مرہٹی و گجراتی وغیرہ زبانوں کی ہوئی اس کا عشر عشیر بھی اس زبان (اردو) میں نہیں ہوئی۔ سودا، غالب، ظفر وغیرہ کے کلام کیسے ہی فصیح ہوں مگر وہ زبان کے علم و ادب کی کسی اصلی حالت کو نہیں دکھلاتے، نہ کوئی شخص ان کو پڑھ کر اپنے خیالات میں ترقی پا سکتا ہے۔"

(ہندوستان ص۱۹۹)

گذشتہ زمانے کے تذکروں پر یہ الزام لگایا گیا کہ انھوں نے ہندو صاحبانِ قلم کو نظر انداز کیا ہے۔ منشی چندو لال شفق نے لکھا ہے:

"آب حیات میں بیچارے ہندو شاعروں کو کہیں کہیں فٹ نوٹوں یا حاشیوں پر جگہ دی گئی ہے۔ لالہ سری رام صاحب کے تذکرے میں یہ کمی بھی پوری کی گئی ہے۔"

(خم خانہ ج ۴ تقاریظ ص۳۶)

مسلمانوں نے الزامات سے برأت حاصل کرنے کے لیے طرح طرح کی کوششیں کیں مثلاً مولوی اسماعیل میرٹھی نے کہا ہے

رب کا شکر ادا کر بھائی   جس نے ہماری گائے بنائی

اور اقبال جیسے شاعر نے اخبار ہندو لاہور کے رام نمبر میں "امام ہند" کے عنوان سے ایک نظم شائع کی۔ غلام قادر فرخ امرتسری نے 'انسان' کے نام سے ایک رسالہ نکالا۔ سال کے آخر میں انھوں نے لکھا:

"ہندوؤں نے اس خیال پر دلچسپی نہ لی کہ یہ ایک مسلمان کا رسالہ ہے، حالاں کہ انسان میں مذہبی اور قومی جھگڑوں سے قطعی پرہیز کیا گیا ہے۔"

(انسان ج ۱ نمبر ۱۱، ۱۲ ص۳)

زبان و بیان کی درستی اور معیار کے بلند کرنے کی بات ان حالات میں کون کرتا؟

مہرشی شیوبرت لال ورمن نے لکھا ہے:

"اردو میں ہندوؤں کا کوئی لٹریچر پہلے نہیں تھا اور اگر تھا بھی تو وہ کسمپرسی اور بے وقعتی کے

[illegible] ...ہندو مذہب کی اشاعت کی مخصوص ملّی تحریک، ان کی ترقی و بقا، ہندو لٹریچر کی حفاظت اور اس کا پرچار ہے۔ اس وقت ملک میں کوئی ایسا رسالہ نہیں جو علی الاعلان محض ہندو اہلِ قلم کے مضامین پیش کر کے قومی خدمت انجام دیتا ہو اور قوم کے لئے محض ہندو لٹریچر فراہم کرتا ہو — یہ ہندو قوم کا مشترکہ رسالہ ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ اس قومی رگیہ میں بیش از بیش معاون و مددگار ہوں کہ اس مشن کو کامیاب بنائیں۔ اخترؔ کے مشن کی حفاظت آپ کی قومی حفاظت، اس کی ترقی آپ کی قومی ترقی اور اس کی حیات آپ کی قومی حیات ہے۔"

اس اشتہار میں بس یہ ایک بات صحیح نہیں ہے کہ ملک میں ہندو اہلِ قلم کا کوئی رسالہ نہیں ہے "ڈیڑھ درجن رسالے تو منشی اخترؔ صاحب کے سسر مہر شنکا ورمن ہی کے نکل چکے تھے۔ ان کے علاوہ ذیل کے رسالوں کے نام سے بھی ان کی نوعیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:۔

آریہ مسافر لاہور۔ گئو ماتا لاہور۔ اِندر لاہور۔ بھارت ماتا لاہور تلک لاہور۔ راجپوت گزٹ لاہور۔ ہندو لاہور۔

بہر نوع اخترؔ صاحب کی یہ اپیل رائیگاں نہیں رہی۔ ان کے مختلف رسالوں میں پریم چند سے فراقؔ گورکھپوری تک متعدد مشہور پرانے ہندو صاحبانِ قلم کی تحریریں شائع ہوتی رہیں۔

منشی گوردی شنکر لال اخترؔ غالباً پہلے شخص تھے جنھوں نے بنگالی ناولوں کو اردو میں منتقل کرنے کی کوشش کی۔ مہر شنکا ورمن نے اس کام میں ان کا ساتھ دیا۔ چنانچہ خود لکھتے ہیں:

"شکر ہے کہ اب اردو زبان میں اخترؔ صاحب کو بنگالی ناولوں کے ترجمے کا خیال پیدا ہوا ہے۔ میں بھی اپنی فرصت اور قابلیت کے موافق ان کا جوں توں ہاتھ بٹانے لگا ہوں۔" (داتا دیال ص ۱۲۲)

ان حضرات کے ناولوں کا مقصد بھی عموماً ہندو عقیدہ، فلسفہ اور معاشرت کی اشاعت اور اصلاح ہی ہوتا تھا۔ پریم چند اخترؔ صاحب کے دوست تھے

[illegible] انھوں نے بھی جو ناول لکھے ان میں [illegible] ہے۔ ان حضرات کی تحریریں اس کثرت سے شائع ہوئیں کہ یہی معیار قرار پائیں۔ یہ بات عام طور سے تسلیم کر لی گئی کہ ادب برائے ادب سے کوئی تعلق نہیں۔ ادب کا کوئی اصلاحی، اخلاقی مقصد ضرور ہونا چاہیے۔ چنانچہ ناولوں، افسانوں میں بھی زبان و بیان کی صحت و نفاست کی اہمیت کچھ سے کم ہو گئی اور جو لوگ اپنی زبان پر ناز کرتے تھے وہ اگلے وقتوں کی چیز ہو کر رہ گئے نثر نویسی کا انداز ہی نہیں، تنقید کے معیار اور اصول بھی بدل گئے۔

□□

حواشی:

۱۔ قرأت کی غلطیوں نے جو گل کھلائے ہیں ان سے یہاں بحث نہیں ہے۔ مثلاً "خلیفہ" [illegible] کو بعض مورخین نے "شلیفہ" پڑھ لیا ہے۔

۲۔ دیوناگری کے حروفِ تہجی زبانِ حال سے صاف کہہ رہے ہیں کہ اصل حروف محض چند تھے۔ بیشتر حروف بعد کے زمانے میں ضرورت کے مطابق وضع کیے جاتے رہے چنانچہ "ڑ" لکھنے کی صورت یہ نکالی گئی کہ [illegible] (ڈ) کے نیچے ایک نقطہ لگا دیا جائے، اس طرح: [illegible] بائیں ہمہ بعض آوازوں کے لئے ہنوز کوئی صورت نہیں معلوم ہوتی مثلاً ژ۔

۳۔ اس سلسلے کی سنسکرت زبان میں تصانیف میں "آلوپنشد" (اللہ اپنشد) خاص طور سے قابلِ ذکر ہے جس میں خدا اور اس کے رسول صلعم کا ذکر کیا گیا ہے۔

۴۔ بعض مسلمانوں کے لیے کہا گیا ہے کہ انھوں نے سنسکرت سیکھنے کے لئے برہمن کا بھیس بنایا۔ اس قسم کی حکایتیں گھڑی گئی ہیں۔ مسلمان سنسکرت سیکھنے کے لئے برہمنوں کے محتاج نہیں رہ گئے تھے۔ اس بات کا امکان ضرور ہے کہ برہمنوں کی رسموں اور عملوں کو بچشم خود دیکھنے کی غرض سے کسی نے برہمنوں کا بھیس اختیار کر لیا ہو۔

۵۔ دیوناگری کے [illegible] کا قدیمی تلفظ "کھ" ہے۔ جدید ہندی والوں نے تلفظ کو شدھ کر لینے کے شوق میں اس کا تلفظ "ش" مقرر کر لیا ہے۔ قدیم سِکّوں پر خلیفہ اور قدیم تحریروں میں "کھ" کی جگہ اسی حرف کا استعمال کیا گیا ہے۔ بیاگینا سنگھ نے بھی معیار الاشعار میں اس قسم کے تمام لفظوں میں "کھ" ہی لکھا ہے مثلاً: اوکھد (اوشد)، [illegible]۔

۶ە یہ ترجمہ نواز کبیشر نے کیا تھا جس کے بارے میں پروفیسر مسعود حسن رضوی کا کہنا ہے کہ یہ کوئی معمولی شاعر ہے (لکھنؤیات ادیب۔ ص ۱۴۴ تا ۳۱۶)
سکنتلا کا ترجمہ غلام احمد نے فراموش یادت کے نام سے کیا تھا جو ۱۸۴۹ء میں کلکتہ سے چھپا تھا۔ پھر ۱۸۵۰ء میں اس کا خلاصہ ایشیاٹک جرنل میں شائع ہوا۔ پھر ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اصل سنسکرت نسخے سے اس کا ڈرامے کے انداز میں اُردو میں ترجمہ کیا جو سندھ اکیڈمی کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔

۷ە مفرح القلوب: اصل متن به سنسکریت بنام ہتوپدیس، ترجمہ فارسی از تاج الدین مفتی الملکی یا تاج المعالی یا تاج الدین بن معین الدین ملکی بنام ملک الشرق والغرب نصیر الدین قطلغ بہار ندیم اشدہ نگاشتہ است۔ مجموعۂ چہار داستان است (نسخہ ہای خطی موزۂ ملی ص ۹۱۹)

۸ە اس قصے کو سب سے پہلے دکنی زبان میں کسی نے ۱۰۳۵ھ میں نظم کیا تھا۔ اس کے بعد ۱۰۵۳ھ میں تحفۃ المجالس نامی مثنوی لکھی گئی۔ پھر ۱۲۱۱ھ میں ریحان الدین ریحاں نے اسی قصے کو باغ بہار کے نام سے نظم کیا۔ پنڈت دیا شنکر نسیم نے اسی قصے پر مثنوی گلزار نسیم ۱۲۵۴ھ/ ۱۸۳۸ء میں لکھی۔ محمد داؤد علی ناداں ایک دکنی شاعر ہوئے انھوں نے بھی ۱۲۶۹ھ میں اسی قصے کو نظم کیا تھا۔

۹ە ہندو محققین کا انداز بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔ پروفیسر گیان چند نے گلستانِ بے خزاں کے بارے میں لکھا ہے: "مشہور ہے کہ یہ تذکرہ مولانا صہبائی کی تصنیف ہے" (اُردو مثنوی ص ۱۴۳) وہ یقیناً جانتے ہیں کہ اس کا صہبائی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

مآخذ

۱۔ اخلاق ہندی۔ میر بہادر علی حسینی (مرتب) ڈاکٹر وحید قریشی
مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۳ء
۲۔ اُردو داستان: ڈاکٹر سہیل بخاری مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد ۱۹۸۷ء
۳۔ اسلام کے علاوہ مذاہب کی تاریخ میں اُردو کا حصہ، ڈاکٹر محمد عزیز
انجمن ترقی اُردو علی گڑھ ۱۹۵۵ء
۴۔ بیتال پچیسی: مظہر علی خاں ولا (مرتب) ڈاکٹر گوہر نوشاہی
مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۵ء
۵۔ پاکستان کے اُردو اخبارات اور رسائل۔ کتابیات۔ جلد اول
مرتب: محمود الحسن، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۸۵ء
۶۔ ایضاً جلد دوم (مرتب) ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری
مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد ۱۹۸۵ء
۷۔ حیاتِ جاوید۔ مولانا الطاف حسین حالی۔ ترقی اُردو بورڈ نئی دہلی ۱۹۷۹ء
۸۔ داتا دیال مہرشی شیوبرت لال ورمن: ڈاکٹر محمد انصار اللہ۔ ساہتیہ اکادمی
دہلی۔ ۱۹۹۱ء
۹۔ راج یوگ (مترجم) شیوبرت لال ورمن۔ رفاہ عام پریس لاہور
۱۰۔ ریاض دلربا۔ مہرشی شیوبرت لال ورمن۔ رادھا سوامی دھام، مرزاپور
۱۱۔ سکنتلا۔ کاظم علی جواں مرتب: ڈاکٹر محمد اسلم قریشی
مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۳ء
۱۲۔ سلطان الاذکار۔ مہرشی ورمن۔ رادھا سوامی دھام آنکدہ
۱۳۔ شاہی ڈاکو۔ مہرشی ورمن۔ لالہ رام دتہ مل اینڈ سنز لاہور بار پنجم
۱۴۔ شری پنچ دشی (مترجم) ایضاً انڈین اسٹیم پریس لاہور
۱۵۔ شریمد بھگوت گیتا (مترجم) ایضاً رادھا سوامی دھام، مرزاپور ۱۹۷۷ء
۱۶۔ فہرست نسخہ ہای خطی فارسی۔ موزۂ ملی پاکستان، کراچی۔
مرتب سید عارف نوشاہی، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان،
اسلام آباد ۱۹۸۳ء
۱۷۔ کتابیات۔ پاکستان کے اخبارات و رسائل۔ ۱۹۴۷ء تک (مرتب) ڈاکٹر
ابو سلمان شاہجہاں پوری۔ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد ۱۹۸۷ء
۱۸۔ مذہبِ عشق عرف گل بکاولی۔ نہال چند لاہوری۔ اگروال بک ڈپو دہلی
۱۹۔ مہاراماین۔ مہرشی شیوبرت لال ورمن۔ مشمولہ دیال، حیدرآباد
۱۹۵۰-۵۱ء
۲۰۔ نمونۂ منثورات۔ احسن مارہروی۔ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۸۷ء
۲۱۔ ویدانت وچن (مترجم) بابا نگینا سنگھ۔ شرن دام تیرتھ پبلیکیشن لیگ لکھنؤ
طبع چہارم ۱۹۳۱ء
۲۲۔ وگیان رامائن۔ مہرشی شیوبرت لال ورمن دیال جنکدہ ۱۹۴۰ء
۲۳۔ ہندوستان۔ گزشتہ و حال رائے بہادر لالہ بیج ناتھ عثمانی پریس آگرہ
۱۹۰۴ء

منزل ضرور آئے گی مگر تجربہ کر سکتی ہے"

(ادھرے [illegible] [illegible])

اس حقیقت کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بیسویں صدی کے ہندو معاشرے میں اردو کی بجائے ہندی کو فروغ دینے کا خیال دن بدن راسخ ہوتا چلا جا رہا تھا، کیفیت یہ تھی کہ

"آریہ سماج میں استریوں کی تعلیم ہندی میں ہوتی جاتی ہے۔ پنچایتوں کا کام بہت سکوت اور خاموشی سے ہو رہا ہے۔ رادھا سوامی پنتھ میں بھی زیادہ کتابیں ہندی ہی میں نکلی رہی ہیں۔ ناگری پرچارنی سبھا بھی اپنا کام سکوت کے ساتھ کر رہی ہے۔ ہم بھی تو اردو ہی میں سب کچھ لکھا کرتے ہیں مگر ساتھ ساتھ ہندی کی بھلائی کا دھیان ضرور ہے۔ جن کو اردو تصنیف و تالیف کا شوق ہے وہ اسی کے ذریعہ ہندی کے لئے آئندہ راستہ بنا سکتے ہیں۔ ہندی کے لفظ کثرت سے لائیں۔ یہ اردو کے مصنفین ہمارہ دیگر ہندی کے سچے مددگار ثابت ہوں گے۔" (ایضاً ص۱۸ و ۱۹)

اپنے عمل کی وضاحت مہرشی شیوبرت لال ورمن نے ان الفاظ کی ہے:

"میں اردو کے ذریعہ ہندی زبان کی اشاعت کرنا چاہتا ہوں۔ میری زبان کھچڑی ہے جس میں ہندی سنسکرت کے لفظ بہ کثرت آتے ہیں۔ یہ میں جان بوجھ کر کرتا ہوں تاکہ ہندی کے لفظ پڑھنے والوں کی زبان پر چڑھ جائیں۔"

(داتا دیال ص۳۳)

ان واضح، غیر مبہم اور دوٹوک بیانوں کی روشنی میں ہندو مذہب، فلسفہ اور معاشرت سے متعلق ہندو صاحبان قلم کے ذریعہ سے وجود میں آنے والے اردو کے سرمایے کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے میں کوئی دقت نہیں معلوم ہوتی۔ اس نوعیت کی اردو نثر کا نمونہ یہ ہے:

"جو کہنے میں نہ آوے وہی آتما ہے۔ کہنا سننا اندریوں سے سمبندھ رکھتا ہے۔ اندریاں پرکرتی و ستو کو گرہن کرتی ہیں۔ اپنا آتما اپرکرش ہے۔ اپرکرش پرکرش نہیں ہوتا۔ آتما شوبنہ بھی نہیں ہے کیوں کہ وہ گیان کا وشے نہیں

[illegible] (ہندو [illegible])

آپ یوگ کے ترجمہ میں یوگ ناتھ یوگ شاستر یہ وہ ہے جس آپ کو جا جنم نہیں ہے۔ آپ یوگ ودیا کے انگ کی کتھا ہو۔ آپ دیوتاؤں کے لئے کلپ برکش ہو۔"

(دگیان بھاشن ص۱۲۹)

"تم شکاری ہو بن اور پربت میں بڑے بڑے کشٹ اور کلیش بھوگنے پڑیں گے۔ سنگھ اور ریچھ اور چیتوں کا ڈر، پھر منشیوں کا مانس کھانے والے نشاچر، کبھی اَن ملا تو پانی نہیں اور پانی نہیں ملا تو اَن نہیں۔ پہاڑوں پہاڑوں پھرنا ہوگا۔ بڑی اور بھیانک شلاؤں پر چڑھنا ہوگا۔ کیسے مان لوں کہ تمہارا کومل شریر ان دکھوں کو سہ سکے گا۔"

(مہابھارت ص۲۲۴)

"ریچک پرانایام کا وشے باہر ہے کیوں کہ اس میں پرانوں کو باہر نکالا جاتا ہے۔ پورک کا وشے بھیتر ہے۔ اس میں پرانوں کو اندر کی طرف کھینچتے ہیں۔ ان دونوں پرکار کے پرانایام کے ساتھ جو کمبھک پرانایام کرتے ہیں اس کو سہت کمبھک کہتے ہیں۔" (راج یوگ ص۱۴۲)

جن مختلف کتابوں سے یہ اقتباس ہیں، مصنف ہی نہیں، قارئین بھی اس باب میں متفق ہیں کہ وہ سب اردو نثر کی کتابیں ہیں لیکن ان کو اگر پڑھ کر سنایا جائے تو شاید کوئی شخص بھی ایسا نہ ہوگا جو بغیر تامل کے یہ نہ کہے کہ یہ عبارتیں ہندی زبان میں ہیں۔ اوپر مصنف کے بیانات نقل کیے جا چکے ہیں، جن سے ظاہر ہے کہ اس نے یہ طرز ایک متعین مقصد سے اور عمداً اختیار کیا تھا، ورنہ وہ ہر قسم کی عبارت لکھنے پر بخوبی قادر تھا۔ چنانچہ اسی کی ایک کتاب سے عربی فارسی آمیز عبارت کا نمونہ نقل کیا جاتا ہے:

"انسان اشرف المخلوقات ہے، حقیقی خلقت یا پیدا شدہ مخلوق ہے۔ انسان سب میں اکبر، احسن، اجمل، افضل، اشرف ہے۔ یہ مسجود ملائک بنایا گیا ہے۔ فرشتے انسان کی تقدیس اور بندگی کی گرد تک کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ فرشتے

لطیف ہوتے ہوئے بھی محسوس ہیں اور آدم کثیف ہوتے ہوئے بھی جا بجا ہے۔"

(سُلطان الاذکار ص۴۹)

اب آسان اور روزمرہ کی فصیح و سلیس اُردو کا ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے:

"آریہ سماج خاص طور پر مذہبی جماعت ہے جن
کو مذہب اور دھرم سے تعلق ہے ان کو خود اپنی ذات کی
بھلائی کے لیے پالیٹکس سے تعلق نہ رکھنا چاہیے۔ اگر
ان کے دل میں اور قسم کے جذبات ہیں تو پائے مرا لنگ
نیست، ملک خدا تنگ نیست، وہ خوب کھُل کھیلیں
ان کو منع کون کرتا ہے مگر وہ ناحق سماج کو کیوں بدنام
کرتے ہیں۔ آدھا تیتر آدھا بٹیر اچھا نہیں لگتا۔ در سے
کر گیر محکم گیر۔"

(مارتنڈ۔ اپریل ۱۹۱۰ء ص۲۹)

یہ شگفتہ اور دل نشیں طرز مہرشی شیوبرت لال ورمن کے یہاں عام نہیں ہے۔ عام وہی ہے جس کا ذکر پہلے کیا گیا۔ وہ اسی طرز کو عام کرنا بھی چاہتے تھے چنانچہ اپنی کوشش میں وہ کامیاب رہے۔ ہمارے ریڈیو اور ٹی۔ وی کی زبان بھی وہی ہے۔ ہندو صاحبانِ قلم نے بڑی مستعدی سے بہت تھوڑی مدت میں اسی زبان میں اُردو میں کتابوں کا انبار لگا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ روزمرہ میں بھی وہی زبان رائج ہوئی۔ مہرشی ورمن کے نواسے اور میرے کرم فرما ڈاکٹر راجا رام سنگھ اُردو میں خط و کتابت کرتے ہیں اور ان کی تحریر کی زبان بھی وہی ہے۔ چنانچہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"... یہ تو داتا کی اپار دیا اور انوکمپا ہے جو آپ
کی اتھاہ محبت اور پریم ہم سب کو حاصل ہے......
یو جیہ پتا جی کا داتا دیال سے چولی دامن کا میل تھا۔"

اسی زبان کی روشنی میں کہا جاتا ہے کہ اُردو اور ہندی میں محض لپی (رسم خط) کا فرق ہے۔ بیان اور لفظیات کے فرق پر نظر کر کے ازراہِ احتیاط یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ اردو ہندی کی شیلی ہے۔ یہ دونوں باتیں اس زبان کے لیے صحیح ہیں جو ایک صدی کی مدت میں بہت اہتمام اور احتیاط سے ہندو مذہب، فلسفہ اور اخلاق کی ترویج و اشاعت کے لئے وضع کی گئی تھی۔

مذہب انسان کی فکر کو بھی ایک خاص سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔ قرآن پاک پر ایمان رکھنے والا ایک حرف تو بڑی بات ہے زیر و زبر کے فرق کو بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اُردو کے مسلمان مصنفین (اور وہ تمام صاحبانِ قلم بھی جو مسلم طرزِ فکر و خیال کے زیر اثر تھے) خود اپنی تحریروں پر بار بار نظر ثانی کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ مرزا رجب علی بیگ سرورؔ نے فسانۂ عجائب کو اٹھارہ بار درست کیا۔ مشہور ہے کہ مولانا شبلی اپنے مسودات میں جو لفظ بدلنا چاہتے تھے اس پر چیپی لگا دیتے تھے۔ وہ اپنی تحریروں کی تصحیح اتنی مرتبہ کرتے تھے کہ ان پر چھوٹی چھوٹی چوٹیاں ابھر آتی تھیں۔ ہندوؤں کا معاملہ مختلف تھا۔ مہرشی شیوبرت لال ورمن نے لکھا ہے کہ:

"مہابھارت ہمیشہ سے ہر دلعزیز کتاب رہی ہے
جس میں قابلیت تھی وہ باری باری اضافہ کرتا گیا۔
ہر کہ آمد براں مزید کرد۔"

(بھگوت گیتا ص۱۰۲)

"کہتے ہیں کہ اصلی مہابھارت میں صرف آٹھ ہزار اشلوک تھے۔ اس وقت ایک لاکھ سات ہزار تین سو کوئی ۱۰۷۳۹۰ ہیں۔

(ایضاً ص۱۰۱)

ایسی صورت میں خود اپنی تحریروں میں لفظوں کے املا، تلفظ، جملوں کی ساخت اور عبارت کی چستی پر غور و فکر کرنے کی بھلا کیا اہمیت ہو سکتی تھی۔ کہتے ہیں کہ مہرشی شیوبرت لال ورمن نے اپنی تحریروں پر کبھی نظر ثانی نہیں کی اور اُردو میں ڈیڑھ درجن اخبار اور رسالے نکالے تھے۔ ان کے بعد ان کے داماد منشی گوری شنکر لال اخترؔ نے نصف درجن سے زائد رسالے جاری کرنے کا امتیاز حاصل کیا۔ اخترؔ صاحب نے بھی اُردو میں بڑی کثیر تعداد میں کتابیں لکھ کر شائع کیں۔ اخترؔ صاحب کا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے تمام باصلاحیت ہندوؤں کو اُردو میں تصنیف و تالیف کے کام میں معروف ہو جانے کی دعوت دی۔ اپنے ماہنامے "مان سروور" کے دسمبر ۱۹۳۰ء کے اداریے میں انھوں

مار کانا میں پڑھ رہا تھا۔ وہیں میں نے ہندی (؟)
کی طرف راغب کیا۔ سب سے پہلے ہندوؤں کے مذاق کے مطابق
کتابیں لکھنی شروع کیں، پھر پُران، مہابھارت،
رامائن، تواریخ، فلسفہ، درشن، اپنشد، ویدانت، یوگ
اور سانکھ وغیرہ کی طرف رجوع کیا۔ آخر میں سنت مت
کے دفتر کھنگالے۔ ان کتابوں کی تعداد تین چار سو کے
اندر ہے۔ ملک میں اب ہر جگہ ان کا رواج ہے۔ کئی
زبانوں میں ان کے تراجم بھی ہو گئے ہیں۔ ہز آنر
لیفٹیننٹ گورنر صاحب پنجاب نے بہ دفعات متعدد مالی
امداد سے ہماری دست گیری فرمائی ہے۔ یہ ہماری خدمات
ہیں جو آپ کے سامنے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا فائدہ
یہ ہوا کہ ملک میں ہندوؤں کو تصنیف و تالیف کا شوق ہوا ہے
اور اب اس مذاق کے ادیبوں کی تعداد ہر پہلو سے قابلِ
اطمینان ہے۔" (وآنا ویال ص۳۲)

مہرشی ودمن کے اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس قسم کے تصنیفی کاموں کی سرپرستی حکومت بھی کر رہی تھی۔ ان کتابوں کی طباعت و اشاعت کے لئے لکھنؤ میں شری رام تیرتھ پبلی کیشن لیگ قائم کی گئی جس کے مقاصد میں یہ بات تھی کہ:

"سوامی جی کی تصانیف، لیکچر اور دیگر تصانیف کو جو
ان کی تلقین کے موافق ہوں، شائع اور کم از کم قیمت پر
فروخت کیا جائے۔"

لیگ نے بابا نگینہ سنگھ کی کتابوں وید انو وچن، معیار المکاشفہ، رسالہ عجائب العلم اور جگجیت پرگیا کو نئے سرے سے بڑے اہتمام اور سلیقے کے ساتھ شائع کیا تھا لیکن ان کتابوں میں تلفظ اور املا یکساں نہیں ہے
پہلی کتاب پر مصنف کا نام بابا نگینہ سنگھ بیدی لکھا ہے، باقی تینوں کتابوں پر بابا نگینا سنگھ بیدی تحریر ہے۔
پہلی کتاب پر ہر جگہ اپنشد، پرش، رشی، شت رہا ہے جبکہ باقی کتابوں میں ش کی جگہ کھ آیا ہے
وید انو وچن میں برہم چریہ لکھا ہے اور عجائب العلم میں اچارج

ہے۔ خود وید انو وچن کی کہیں انوواچن لکھا ہے غرض
چاروں کتابیں نارائن سوامی کی تحریر و دیباچے کے ساتھ شائع ہوئی ہیں اس لئے مذکورہ اختلافات کی اہمیت زیادہ ہے۔ اس سے یہ بات بخوبی ظاہر ہے کہ زبان اور رسم الخط کا بھی اب کوئی معیار باقی نہیں رہ گیا تھا۔ لکھنے والا جس لفظ کو جس طرح چاہے لکھ سکتا تھا۔ کسی کو فرق یا اختلاف کا خیال بھی نہیں ہوتا تھا۔ گویا زبان کا احساس بھی باقی نہیں رہ گیا تھا۔ وید انو وچن کی نثر میں جو مقامات محل نظر ہیں، ان میں سے بعض یہ ہیں،

حروفِ معنوی کا حذف، جو جدید ہندی میں عام ہے۔ مثال،
آنکھ کے وسیلے ہم دیکھتے ہیں، کان کے وسیلے ہم سنتے ہیں، زبان کے وسیلے ہم مزا اڑاتے ہیں۔ (ص۳۱)

تذکیر و تانیث کا فرق۔ مثال، نباتات بھی ہماری طرح غذا کرتی اور ہوا کھاتی ہیں (ص۴۹) ان کا جنگ ہوا (ص۸۲)، اس کا آتما بھی اس کا نور ہے (ص۱۰۱)، اس قسم کی غور سے معلوم ہوتا ہے (ص۱۴۲)

بعض لفظوں کا خلاف محاورہ استعمال، مثلاً:

"جب یہ آدان کی مہربانی سے غرق نیند میں جاتا ہے" (ص۶۲)
"جب ہم خوش کھانے، خوش لباس، خوش سواریاں مانگیں سب
سنکلپ سے حاضر ہو جاتی ہیں" ص۶۳

نئے الفاظ اختراع کیے ہیں جیسے: دن رات کی طوقیت سے چھوٹ جاتا ہے۔ (ص۹۳)۔ وہ اس ماتری لوک سے کامیاب ہوئے فرخند اور معزز ہوتے ہیں۔ (ص۱۰۱)

اب ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے تاکہ عبارت کا انداز بھی سامنے آ جائے۔

"اے لوگو، یہ جو دنیا ہے ایک بڑی سلطنت آسمانی ہے
اس میں جو انسان کا بدن ہے ایک خاص راجدھانی برہم کی ہے
جس کا نام برہم پوری ہے اور اس کے سینے کے اندر جو دل
صنوبری گوشت کا ٹکڑا ہے۔ ایک خاص محل سرائے یا بنگلہ
برہم کا ہے اور اس کے اندر جو اپنے آتم برہم کو تلاش
کرتا ہے جانتا ہے وہ فضل سے بلایا جاتا ہے۔ یہی عدل
ہے" (ص۱۹)

سطور بالا سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ عربی فارسی کے الفاظ کے

استعمال ہوتے تھے باوجود ویدانت وید اور اس کی نوعیت کی کتابوں کی زبان مروجہ اور معیاری اُردو سے مختلف تھی۔

اس حقیقت سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا کہ ایک صدی کی مدت میں ہندوؤں نے اُردو کو ایک مختلف سمت پر ڈال کر اس پر پوری طرح قدرت حاصل کرلی۔ بیسویں صدی کے ربع اول تک اس زبان میں ہندو مذہب، فلسفہ اور معاشرت سے متعلق اتنا سرمایہ فراہم ہوچکا تھا کہ دوسری زبان اس سے آنکھ ملانے کی جرأت بھی نہیں کرسکتی تھی۔ مہرشی شیوبرت لال ورمن نے اپنے زورِ قلم سے اس زبان کو عملاً ہندوؤں کی مذہبی زبان کا درجہ عطا کردیا تھا۔ بابا ساون سنگھ جی آچاریہ بیاس اکثر کہا کرتے تھے:

"مہرشی بیاس جی نے تو صرف چار ویدوں کو ہی ترتیب دیا ہے۔ ہمارے مہرشی جی نے ہزاروں کتابیں، جو ہر لحاظ سے پاکیزہ اور بلند پایہ ہیں رفاہ عام و خاص کے لئے تصنیف کی ہیں تاکہ حق کے متلاشی اور سنت مت کے پیروکار ان کے مطالعے سے مستفید و مستفیض ہوسکیں۔"

(داتا دیال ص ۹۳)

عقیدت مندوں نے مہرشی ورمن کی تصانیف کی تعداد تین ہزار سے زیادہ بتائی ہے اور تاحال ان کی ہزار سے زائد تحریروں کے عنوانات دستیاب ہوگئے ہیں۔ خود راقم کے پاس ان کی چار سو سے زائد کتابیں موجود ہیں۔ نظم و نثر کی شاید ہی کوئی صنف ہو جس میں مہرشی ورمن نے اپنی کوئی یادگار نہ چھوڑی ہو۔

کہا جاچکا کہ انھوں نے اپنی بیوی کی خاطر سے اُردو میں ہندو عورتوں کے قصے لکھنے سے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ اسی سلسلے میں انھوں نے طالب علموں کے لیے بعض سوانحی کتابیں بھی لکھیں۔ مثلاً "ابتدائی درجوں کے طلباء کے لئے"۔ ۱۹۰۲ء میں انھوں نے "گوتم بدھ کا مختصر جیون چرتر" کے عنوان سے چھتیس صفحے کا ایک رسالہ شائع کیا۔ اس سے پہلے "کلیان دھرم" کے نام سے اسی موضوع سے متعلق وہ ایک ضخیم کتاب شائع کرچکے تھے۔ اسی ابتدائی زمانے میں طبیعت کی تیزی نے ان سے بعض نئے اور خالص علمی موضوعات سے متعلق رسالے لکھوالیے تھے، مثلاً "قدیم آریوں میں علم تحریر کا رواج"۔ راقم کے علم کی حد تک ہندوستان کی تمام زبانوں میں علم تحریر سے متعلق لکھا جانے والا پہلا رسالہ یہی ہے۔ اسی زمانے میں انھوں نے "سنسکرت زبان کی عظمت" کے عنوان سے ایک اور رسالہ شائع کیا تھا۔ افسوس ہے کہ وہ راقم کو دستیاب نہیں ہوسکا۔

مہرشی شیوبرت لال ورمن نے سنسکرت کی بکثرت کتابوں کو اُردو میں منتقل کیا۔ انھوں نے ایک درجن سے زائد رامائنیں لکھیں۔ انھیں میں ایک "شری وگیان رامائن" ہے جس کے بارے میں گوری شنکر لال اختر کا کہنا ہے کہ "ایسی کتاب سنسکرت زبان میں بھی نہ نکلے گی۔" (داتا دیال ص ۴۸)

اپنشدوں کے تراجم کو اُردو میں شائع کرنے کے لئے انھوں نے امرتسر سے ایک ماہوار رسالہ اپنشد میگزین کے نام سے جاری کیا تھا۔ بعد میں اس رسالے کا دفتر الہ آباد چلا گیا تھا۔ رامائنوں اور اپنشدوں کے علاوہ مہرشی ورمن نے یجروید، مہابھارت، سری مد بھگوت گیتا، شری جگ دشٹ، پتنجلی کے یوگ درشن اور مہرشی بیاس کے یوگ ساگر کے ترجمے بھی اُردو میں کیے تھے۔ یہ سب محض رسمی ترجمے نہیں تھے۔ مہرشی ورمن نے اصل متون کو واقعی سمجھا تھا، غور و فکر کیا تھا اور ترجموں کے ساتھ ان میں تشریح و توضیح کا کام بھی کیا تھا۔ اس سلسلے میں جہاں ضرورت محسوس ہوئی قدیم شارحین سے پوری جرأت کے ساتھ اختلاف بھی کیا ہے۔ مثال کے طور پر منڈک اپنشد کے دیباچے میں خود لکھتے ہیں:

"اسے حجامت کرنے کے راز کا کاشف سمجھا گیا ہے سوامی شنکر آچاریہ جیسے جید اور زبردست عالم نے بھی یہی غلطی کی ہے۔ اپنشدوں کی تاریخ میں پہلا شخص ہوں جو اس قدیم رائے کی مخالفت کرتا ہوں۔" (ایضاً ص ۲۲)

اپنے کام اور مقصد سے جو لگن ان کے یہاں تھی، اس کی مثال ملنی آسان نہیں۔ انھیں اپنی قوم سے غیر معمولی محبت تھی اور اس کی معمولی سی کوتاہی سے بھی ان کا دل تڑپ جاتا تھا۔ باوجود اس کے کہ وہ اُردو میں لکھتے تھے، وہ ہندی کو ہی ہندوؤں کی زبان مانتے تھے اور ہندو ہونے کی حیثیت سے اسی زبان کا فروغ چاہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا:

"سوائے ہندی زبان کے دنیا کی اور کوئی زبان ہماری

ناگوار ہی میں پڑا ہوا تھا وہ جو پتا ہے اس کو (؟)
کی طرف توجہ کی۔ سب سے پہلے ویدوں کے مذاق کے مطابق
کتب میں لکھنا شروع کیں۔ پھر پُران، مہابھارت،
رامائن، تواریخ، فلسفہ، جوتش، اپنشد، ویدانت، یوگ
اور سانکھ وغیرہ کی طرف رجوع کیا۔ آخر میں سنت مت
کے دفتر کنگالے۔ ان کتابوں کی تعداد تین چار سو کے
اندر ہے۔ ملک میں اب ہر جگہ ان کا رواج ہے۔ کئی
زبانوں میں ان کے تراجم بھی ہو گئے ہیں۔ ہز آنر
لیفٹیننٹ گورنر صاحب پنجاب نے بہ دفعات متعدد مالی
امداد سے ہماری دست گیری فرمائی ہے۔ یہ ہماری خدمات
ہیں جو آپ کے سامنے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا فائدہ
یہ ہوا کہ ملک میں ہندوؤں کو تصنیف و تالیف کا شوق ہوا ہے
اور اب اس مذاق کے آدمیوں کی تعداد ہر پہلو سے قابلِ
اطمینان ہے۔" (داتا دیال ص۳۳)

مہرشی ورمن کے اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس قسم کے تصنیفی کاموں کی سرپرستی حکومت بھی کر رہی تھی۔ ان کتابوں کی طباعت و اشاعت کے لئے لکھنؤ میں شری رام تیرتھ پبلیکیشن لیگ قائم کی گئی جس کے مقاصد میں یہ بات تھی کہ،

"سوامی جی کی تصانیف، لیکچر اور دیگر تصانیف کو جو
ان کی تلقین کے موافق ہوں، شائع اور کم از کم قیمت پر
فروخت کیا جائے۔"

لیگ نے بابا نگینہ سنگھ کی کتابوں وید آنو وچن، معیار المکاشفہ، رسالہ عجائب العلم اور جگجیت پرگیا کو نئے سرے سے بڑے اہتمام اور سلیقے کے ساتھ شائع کیا تھا لیکن ان کتابوں میں تلفظ اور املا یکساں نہیں ہے پہلی کتاب پر مصنف کا نام بابا نگینہ سنگھ بیدی لکھا ہے، باقی تینوں کتابوں پر بابا نگینا سنگھ بیدی تحریر ہے۔

پہلی کتاب پر ہر جگہ اپنشد، پُرش، رشی، شُت لکھا ہے جبکہ باقی کتابوں میں ش کی جگہ کھ آیا ہے۔

وید آنو وچن میں برہم چریہ لکھا ہے اور عجائب العلم میں اچارج ہے۔ خود وید انوچن میں کہیں پران اور کہیں پُران لکھا ہے وغیرہ

چاروں کتابیں نارائن سوامی کی تصحیح و دیباچے کے ساتھ شائع ہوئی ہیں اس لئے مذکورہ اختلافات کی اہمیت زیادہ ہے۔ اس سے یہ بات بخوبی ظاہر ہے کہ زبان اور بیان کا بھی اب کوئی معیار باقی نہیں رہ گیا تھا۔ لکھنے والا جس لفظ کو جس طرح چاہے لکھ سکتا تھا۔ کسی کو فرق یا اختلاف کا خیال بھی نہیں ہوتا تھا۔ گویا زبان کا احساس بھی باقی نہیں رہ گیا تھا۔ وید انوچن کی نثر میں جو مقامات محلِ نظر ہیں، ان میں سے بعض یہ ہیں:

حروفِ معنوی کا حذف، جو جدید ہندی میں عام ہے۔ مثال،
آنکھ کے وسیلے ہم دیکھتے ہیں، کان کے وسیلے ہم سنتے ہیں، زبان کے
وسیلے ہم مزا اڑاتے ہیں۔ (ص۱۳)

تذکیر و تانیث کا فرق۔ مثال: نباتات بھی ہماری طرح غذا کرتی اور
ہوا کھاتی ہیں (ص۳۹) ان کا جنگ ہوا (ص۸۲) اس کا آتما
بھی اس کا نور ہے (ص۱۰۱) اس قسم کی غور سے معلوم ہوتا ہے (ص۱۳۰)

بعض لفظوں کا خلافِ محاورہ استعمال، مثلاً:
"جب یہ اُداں کی مہربانی سے غرق نیند میں جاتا ہے" (ص۶۲)
"جب ہم خوش کھانے، خوش لباس، خوش سواریاں مانگیں سب
سنکلپ سے حاضر ہو جاتی ہیں۔" ص۶۳

نئے الفاظ اختراع کیے ہیں جیسے: دن رات کی طوقیت سے چھوٹ جاتا ہے۔ (ص۹۳)، وہ اس ماتری لوک سے کامیاب ہوئے فخرمند اور معزز ہوتے ہیں۔ (ص۱۰۱)

اب ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے تاکہ عبارت کا انداز بھی سامنے آجائے:

سُنے لوگو! یہ جو دنیا ہے ایک بڑی سلطنت آسمانی ہے
اس میں جو انسان کا بدن ہے ایک خاص راجدھانی برہم کی ہے
جس کا نام برہم پوریکا ہے اور اس کے سینے کے اندر جو دل
صنوبری گوشت کا ٹکڑا ہے۔ ایک خاص محل سرائے یا بنگلہ
برہم کا ہے اور اس کے اندر جو اپنے آتم برہم کو تلاش
کرتا ہے جانتا ہے وہ فضل سے بلایا جاتا ہے۔ یہی عدل
ہے۔" (ص۱۹)

سطورِ بالا سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ عربی فارسی کے الفاظ کے

استعمال کے باوجود ویدآنو وچن اور اس کی نوعیت کی کتابوں کی زبان مروجہ اور معیاری اُردو سے مختلف تھی۔

اس حقیقت سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا کہ ایک صدی کی مُدت میں ہندوؤں نے اُردو کو ایک مخلف نہج پر ڈال کر اس پر پوری طرح قدرت حاصل کرلی۔ بیسویں صدی کے ربع اول تک اس زبان میں ہندو مذہب، فلسفہ اور معاشرت سے متعلق اتنا سرمایہ فراہم ہو چکا تھا کہ دوسری زبان اس سے آنکھ ملانے کی جرأت بھی نہیں کرسکتی تھی۔ مہرشی شیوبرت لال ورمن نے اپنے زور قلم سے اس زبان کو عملاً ہندوؤں کی مذہبی زبان کا درجہ عطا کردیا تھا۔ بابا ساون سنگھ جی آچاریہ بیاس اکثر کہا کرتے تھے:

"مہرشی بیاس جی نے تو صرف چار ویدوں کو ہی ترتیب دیا ہے۔ ہمارے مہرشی جی نے ہزاروں کتابیں، جو ہر لحاظ سے پاکیزہ اور بلند پایہ ہیں رفاہ عام و خاص کے لئے تصنیف کی ہیں تاکہ حق کے متلاشی اور سنت مت کے پیروکار ان کے مطالعے سے مستفید و مستفیض ہو سکیں۔"

(داتا دیال ص۹۳)

عقیدت مندوں نے مہرشی ورمن کی تصانیف کا تعداد تین ہزار سے زیادہ بتائی ہے اور تاحال ان کی ہزار سے زائد تحریروں کے عنوانات دستیاب ہو گئے ہیں۔ خود راقم کے پاس ان کی چار سو سے زائد کتابیں موجود ہیں نظم و نثر کی شاید ہی کوئی صنف ہو جس میں مہرشی ورمن نے اپنی کوئی یادگار نہ چھوڑی ہو۔

کہا جا چکا کہ انھوں نے اپنی بیوی کی خاطر سے اُردو میں ہندو عورتوں کے قصّے لکھنے سے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ اسی سلسلے میں انھوں نے طالب علموں کے لیے بعض سوانحی کتابیں بھی لکھیں۔ مثلاً "ابتدائی درجوں کے طلباء کے لئے"۔ ۱۹۰۳ء میں انھوں نے "گوتم بدھ کا مختصر جیون چرتر" کے عنوان سے چھتیس صفحے کا ایک رسالہ شائع کیا۔ اس سے پہلے "کلیان دھرم" کے نام سے اسی موضوع سے متعلق وہ ایک ضخیم کتاب شائع کر چکے تھے۔ اسی ابتدائی زمانے میں طبیعت کی تیزی نے ان سے بعض نئے اور خالص علمی موضوعات سے متعلق رسالے لکھوا لیے تھے، مثلاً "قدیم آریوں میں علم تحریر کا رواج"۔

راقم کے علم کی حد تک ہندوستان کی تمام زبانوں میں علم تحریر سے متعلق لکھا جانے والا پہلا رسالہ یہی ہے۔ اسی زمانے میں انھوں نے "سنسکرت زبان کی عظمت" کے عنوان سے ایک اور رسالہ شائع کیا تھا۔ افسوس ہے کہ وہ راقم کو دستیاب نہیں ہو سکا۔

مہرشی شیوبرت لال ورمن نے سنسکرت کی بکثرت کتابوں کو اُردو میں منتقل کیا۔ انھوں نے ایک درجن سے زائد رامائنیں لکھیں۔ انھیں میں ایک "شری وگیان رامائن" ہے جس کے بارے میں گوری شنکر لال اختر کا کہنا ہے کہ "ایسی کتاب سنسکرت زبان میں بھی نہ نکلے گی"۔ (داتا دیال ص۴۵)

اپنشدوں کے تراجم کو اُردو میں شائع کرنے کے لئے انھوں نے امرتسر سے ایک ماہوار رسالہ اپنشد میگزین کے نام سے جاری کیا تھا۔ بعد میں اس رسالے کا دفتر الہ آباد چلا گیا تھا۔ رامائنوں اور اپنشدوں کے علاوہ مہرشی ورمن نے یجروید، مہابھارت، سری مد بھگوت گیتا، شری پنچ دشی، پتنجلی کے یوگ درشن اور مہرشی بیاس کے یوگ ساگر کے ترجمے بھی اُردو میں کیے تھے۔ یہ سب محض رسمی ترجمے نہیں تھے۔ مہرشی ورمن نے اصل متون کو واقعی سمجھا تھا، غور و فکر کیا تھا اور ترجموں کے ساتھ ان میں تشریح و توضیح کا کام بھی کیا تھا۔ اس سلسلے میں جہاں ضرورت محسوس ہوئی قدیم شارحین سے پوری جرأت کے ساتھ اختلاف بھی کیا ہے۔ مثال کے طور پر منڈک اپنشد کے دیباچے میں خود لکھتے ہیں:

"اسے حجامت کرنے کے راز کا کاشف سمجھا گیا ہے سوامی شنکر آچاریہ جیسے جید اور زبردست عالم نے بھی یہی غلطی کی ہے۔ اپنشدوں کی تاریخ میں پہلا شخص ہوں جو اس قدیم رائے کی مخالفت کرتا ہوں"۔ (ایضاً ص۲۲)

اپنے کام اور مقصد سے جو لگن ان کے یہاں تھی، اس کی مثال ملنی آسان نہیں۔ انھیں اپنی قوم سے غیر معمولی محبت تھی اور اس کی معمولی سی کوتاہی سے بھی ان کا دل تڑپ جاتا تھا۔ باوجود اس کے کہ وہ اُردو میں لکھتے تھے، وہ ہندی کو ہی ہندوؤں کی زبان مانتے تھے اور ہندو ہونے کی حیثیت سے اسی زبان کا فروغ چاہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا:

"سوائے ہندی زبان کے دُنیا کی اور کوئی زبان ہماری

غزلیں

لب شیریں و دہن کی بات لکھوں
حسن کی بات کو نبات لکھوں

کر رہا ہوں جو ترے نامے کو
ذاتِ اقدس کے پھر صفات لکھوں

لوحِ دل پر کسی کے نام کے ساتھ
پیار کی رُت کے پھول پات لکھوں

رُو بَرو تم تو دن ہے عید کا دن
رات کو اب شبِ برات لکھوں

ہے جواب تک بیاضِ دل کوری
حاصلِ ترکِ خواہشات لکھوں

نقلی چہروں کی رنگا رنگی میں
کیا ہر ایک بُت کو سومنات لکھوں

میں کہوں دن کو رات ! ناممکن !
آپ کے جبر کو نجات لکھوں؟

حق فروشی مرا شعار نہیں
دن کو دن، رات کو میں رات لکھوں

وسعتیں دل کی درد سے معمور
درد کو دل کی کائنات لکھوں

مرکے جاوید ہو گئے عاشق
عشق میں موت کو حیات لکھوں

[illegible]
[illegible] ۲۱۱۰۰۱

کب سے خاموش ہیں الست ترانے میرے
عمر نے چھین لیے خواب سہانے میرے

میری شہرت ہے کہ رسوائی جو سچے جھوٹے
سارے عالم میں ہیں اب عام فسانے میرے

پاس بیٹھا ہوں تو خاطر میں نہیں لاتے ہو!
جب چلا جاؤں گا ڈھونڈو گے ٹھکانے میرے

میں نے غم بانٹ دیا شعر میں افسانے میں
جز میرے اور کوئی زخم نہ جانے میرے

کوئی البم ہی اٹھا لاؤ کہ اس کو دیکھوں
دھند میں کھو گئے جو خواب پرانے میرے

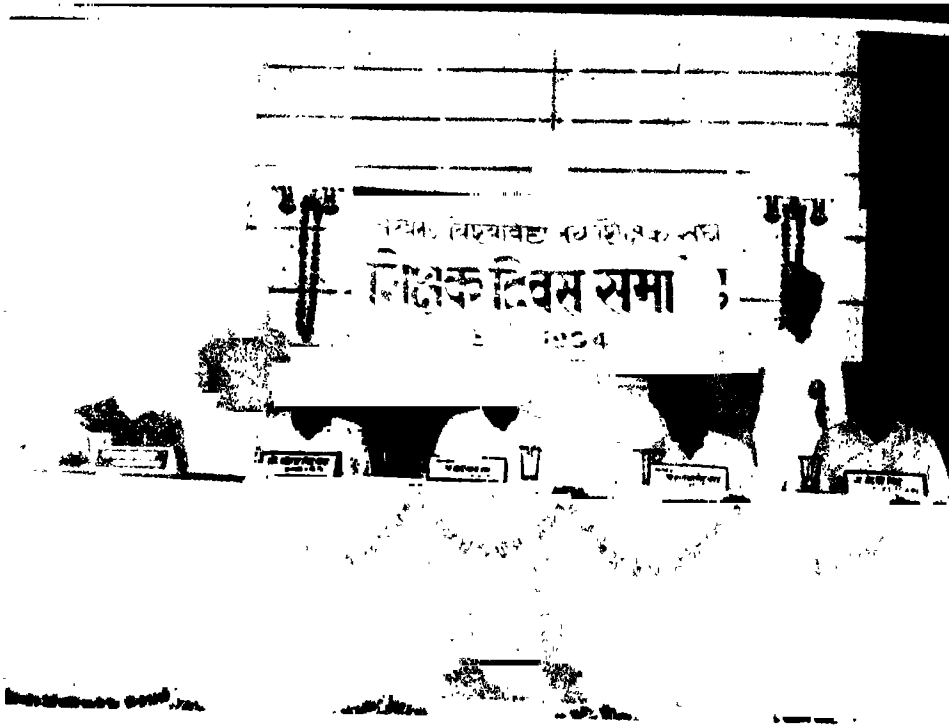
سادہ لوحی ہے، سمجھداری کہ دل کی وسعت
تو نے سچ مان لیے جان بہانے میرے

وہ جتاتے ہیں بہت مجھ سے عقیدت لیکن
کوئی آیا کبھی دکھ درد بٹانے میرے!

اشک بن کر نہیں ٹپکے گا کبھی خون دل کا
تو نے دیکھے نہیں کس بل او زمانے میرے

□□

——— اوپیندر ناتھ اشک
۵۔ خسرو باغ روڈ
الٰہ آباد



اتر پردیش کے گو
شری موتی لال وو
اور
وزیر اعلا اتر پردیش
شری ملائم سنگھ یاد
یوم اساتذہ
کے موقع پر
لکھنو یونیورسٹی کے
اساتذہ کی ایک
تقریب میں۔
(فوٹو: جاوید ہاشمی



رنر اتر پردیش
شری موتی لال وورا
مدرسہ سلطان المدارس
لکھنؤ میں
علماء سے
گفتگو کرتے ہوئے



یر اعلا اُترپردیش شری مُلائِم سنگھ یادو جلسۂ عام کو

میرے عزائم :

- ریاست میں ۶۱۳۱
اُردو اساتذہ کی تقرری
۳۱ر اکتوبر ۱۹۹۴ء تک

- ۱۰۶۰۵
اُردو مترجمین کی تقرری
تین ماہ کے اندر

- عازمین حج
کی سہولتوں کے پیش نظر
حج ہاؤس کی تعمیر کے لئے
پانچ ایکڑ زمین مفت

- ریاست میں
امن و امان، خوش حالی و
خیر سگالی قائم کرنے
کے لئے
شانتی سرکشا بل
کی تشکیل

—— ملائم سنگھ یادو



۔۔۔ رتے ہوئے۔ (فوٹو جاوید ہاشمی)



وزیر برائے سماجی بہبود
شری راج بہادر
لکھیم پور ضلع میں
پنشن
تقسیم کرتے ہوئے



وزیر جنگلات
بھگوتی سنگھ
گزشتہ
اگست ۱۹۹۴ء کو
ٹ جگور شاہراہ
کی
تعمیر نو کا
افتتاح
کرتے ہوئے

اودھ پنچ" کی خدمات

غالب کی وفات (فروری ۱۸۶۹ء) کے نو سال بعد ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ میں "اودھ پنچ" کا اجراء عمل میں آیا جس کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین تھے۔ آٹھ صفحے کا یہ اخبار "لندن پنچ" کے طرز پر جاری ہوا تھا۔ جس کا خاص مقصد طنز و ظرافت کی راہ سے ملک کے سماجی اور سیاسی رجحانات کو ایک نیا رخ دینا تھا۔ اس اخبار کی اردو دنیا میں پرجوش پذیرائی ہوئی۔ اور بقول ڈاکٹر مصباح الحسین قیصر:-

"عوام و خواص نے اس کا خیر مقدم کیا۔ ہم عصر اخباروں نے حقارت کی نظر سے دیکھا اور نفرت سے منہ پھیر لیا۔ گورنمنٹ نے شک و شبہ سے بھرپور نگاہیں ڈالیں اور مسخرا سمجھ کر چھوڑ دیا۔ لیکن ان تمام باتوں سے بے پروا، اپنی دھن میں مست، دیوانہ وار آگے بڑھتا رہا چنانچہ ہر گھر میں اس کا ذکر اور ہر محفل میں اس کے چرچے ہونے لگے"۱

اودھ پنچ کی سیاسی پالیسی انگریزی حکومت کی مخالفت، کانگریس پارٹی کی ہم نوائی، سرسید تحریک کی تردید اور قومی اتحاد کی حمایت پر مبنی تھی۔ اس نے ملک میں انگریزوں کے خلاف بے باکانہ سیاسی طنز کی بنا ڈالی اور ظرافت کے چھینٹوں سے اسے موافقین اور مخالفین دونوں کے لئے خوشگوار بنا دیا۔ غالب، نذیر احمد اور سرسید کی چند ظرافت آمیز تحریروں سے قطع نظر، اودھ پنچ کے ذریعہ اردو میں پہلی بار طنزیہ مزاحیہ صنف ادب کا آغاز ہوا اور درجنوں مضمون نگار اور شاعر طنز و مزاح کے اسٹیج پر نمودار ہوئے۔ اودھ پنچ کے خصوصی نامہ نگار تو چھ یا سات تھے یعنی اس کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین، نواب سید محمد آزاد، منشی احمد علی شوق، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، اکبر الہ آبادی، پنڈت تربھون ناتھ ہجر اور منشی جوالا پرشاد برق مگر کچھ اور نامہ نگاروں نے بھی وقتاً فوقتاً فرضی ناموں سے اودھ پنچ کے لئے خصوصی مضامین لکھے مثلاً مولانا دکنی، مسٹر لافر، زاغ بدایونی، سلطان ظریف، حق مرغ کاکوروی، مدہوش بمبئی، حضرت لکھنوی، ح۔ خ فیض آبادی، ع۔ دخاروقی، ڈاکٹر قدیم اور ظریف ہند وغیرہ۲

اودھ پنچ کے معاونین میں سب سے پہلا نام پنڈت رتن ناتھ سرشار کا ہونا چاہئے مگر کچھ عرصہ تک اودھ پنچ سے وابستہ رہنے کے بعد وہ اس سے الگ ہو کر منشی نول کشور کے اخبار "اودھ اخبار" کے نہ صرف ایڈیٹر ہو گئے بلکہ اودھ پنچ کے مخالف بھی ہو گئے۔ سرشار بے پناہ صلاحیتوں کے مالک تھے اور مزاح نگاری میں تو اس دور میں ان کا کوئی جواب ہی نہ تھا۔ ان کی تصنیف فسانۂ آزاد کلاسیکی ادب کا درجہ رکھتی ہے۔

اودھ پنچ کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین کی نمایاں خصوصیت ان کی بے خوفی اور بے باکی ہے۔ انگریزی اقتدار کے عروج کے زمانے میں بھی وہ کانگریس پارٹی کے رکن اور انگریزی حکومت کے زبردست نکتہ چیں تھے وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ملک کے سیاسی مسائل پر بے باکانہ رائے زنی کی اور بڑے کلّے ٹھلّے والے انگریز حاکموں اور عہدے داروں کو نشانۂ تضحیک بنایا۔ کھلے خطوط اور "سربستہ مضامین" کے علاوہ وہ چٹکلوں اور لطیفوں سے اپنے مضامین میں طرحداری پیدا کر دیتے تھے۔ ان کی طبیعت میں جدت پسندی بھی بہت تھی۔ جس کی وجہ سے اودھ پنچ عوام و خواص میں یکساں طور سے مقبول تھا۔ وہ ایک صاحب طرز ادیب تھے۔ ان کی تصنیفات میں حاجی بغلول، طرحدار لونڈی، اور احمق الدین کو کافی شہرت ملی۔ انکی طنزیہ سیاسی تحریروں میں سے، اس وقت کے برطانوی وزیر اعظم مسٹر گلیڈاسٹون کے نام ان کے ایک خط کا اقتباس:-

"مولوی گلیڈاسٹون صاحب! دعائے خیر نصیب شما باد!

تسکین زیدی
بزم نظر، راہ ... کانپور

خوابوں کی پرچھائیاں

دھوپ پورے کمرے کو اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی۔ اور وہ ایک پتھر کے مجسمے کی طرح آنکھیں بند کئے ہوئے خوابوں کے دھندلکے میں کھویا ہوا تھا۔ بیس برس کا طویل سفر اس کی آنکھوں میں ہزار رنگ بکھیر رہا تھا۔ وہ خواب جو کچھ دیر پہلے وہ سوتے ہوئے دیکھ رہا تھا، اس کی بکھری کڑیاں یکجا کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کسی فلم کو دیکھتے ہوئے درمیان سے بجلی چلی گئی ہو اور وہ جیتی جاگتی متحرک زندگی میں آگیا ہو اور دوبارہ بجلی آنے کا منتظر ہو۔ لمحہ لمحہ اس کے ذہن کے کینوس پر ماضی کی تصویریں ابھرنے لگیں ـــــ

پارک میں وہ والی بال کھیل رہا ہے اور سامنے چھت پر کھڑی ایک لڑکی اسے خاموش نظروں سے دیکھ رہی ہے، وہ بھی سب کی نگاہیں بچا کر اسے دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے کہ کہیں اس کی چوری نہ پکڑ لی جائے .... وہ میچ جیت گیا ہے۔ سارے دوست اسے مبارک باد دے رہے ہیں اور وہ بھی اس کی کامیابی پر مسرور و شاد ہو رہی ہے۔ اس کے شاداب مسکراتے ہوئے چہرے پر فتح مندی کی خوشی کے دھنک رنگ بکھرے ہوئے ہیں ـــــ اور پھر منظر بدل جاتا ہے پھر دوسری تصویریں متحرک ہو جاتی ہیں ـــــ وہی گھر ـــ وہی فضا وہی مانوس چہرے، وہی شفیق اور محبت کرنے والے ماں باپ کا جانا پہچانا لمس اور رفاقت کا کیف آگیں احساس اسے گدگدا رہا تھا۔ سیکڑوں سورج اس کی آنکھوں نے طلوع اور غروب ہوتے ہوئے دیکھے تھے اب وہ بچپن کے شوخی و شرارت بھرے ماحول سے نکل آیا ہے اور ایک سنجیدہ و متین انسان بن گیا ہے۔

وقت ایک نہ رکنے والے پرندے کی مانند ہے جو کسی کا انتظار نہیں کرتا ـــ باپ کی خمیدہ کمر لاٹھی کی محتاج ہو گئی۔ ماں کی زندگی نے کروٹ بدلی اور ان کا دھیان خدا کی طرف لگ گیا .... "اللہ اکبر، اللہ اکبر" کی گونج کے سائے میں ماں کی تسبیح کی سرسراہٹ آج بھی سماعت سے ٹکراتی رہتی ہے۔ وہی کمرہ، وہی کچن۔ وہی ڈرائنگ روم جہاں زندگی ہنستی کھیلتی دوستوں کے ہمراہ گزرتی ہوئی اس موڑ پر آ گئی تھی کہ اب ہر طرف سونے سونے پن کا احساس پھیل گیا تھا ـــ چہار سمت سکوتِ بے کراں سناٹا اور دل دہلا دینے والی خاموشی۔ کوئی آواز، کوئی بازگشت کوئی آہٹ، کوئی صدا، جاگتا ہوا کوئی لمحہ نہیں رہا تھا ـــ سب خواب ـــ خواب ہو کر، دھندھن کر، راکھ ہو کر اسے اذیت بخشتے رہتے ـــ کبھی یہی سناٹے آواز بن جاتے۔ صدا بن جاتے ـــ ابھی وہ اپنے ماضی کی راکھ کرید ہی رہا تھا کہ ایک نحیف اور کمزور آواز اس کے کانوں سے سرگوشیاں کرنے لگی،

"کیا ڈھونڈ رہے ہو میرے لال ؟"

"ماں ! میں اپنا ماضی تلاش کر رہا ہوں ۔"

"بیٹا ! ماضی گزر گیا ـــ راکھ بن کر بکھر گیا ـــ اب اسے کیوں ڈھونڈ رہے ہو ؟ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی ـــ ؟ میں بیمار پڑی تب تو نہیں آیا ـــ تیرے باپ خون تھوکتے ہوئے مر گئے، تو نے مڑ کر نہیں دیکھا ـــ میں بیوگی کے دن بے چارگی سے گزارتی رہی تو نے خبر نہ لی اور میں بھی خاک کا پیوند بن گئی۔ لیکن تو اپنی رنگینیوں میں ڈوبا رہا ـــ زندگی کی ہنگامہ خیزیوں میں کھویا رہا۔ وقت کے زرّیں اور تابناک لمحوں کو اپنا خدا مانتا رہا۔ اور آج جب سے

کسی تیز رفتار پرندہ کی مانند تیری گرفت سے دور نکل گئے ہیں تو ڈھونڈنے آیا ہے۔ اب یہاں کیا ملے گا؟ بڑاکر لوٹتے ہوئے لمحے تجھے بھلا دیں گے؟ اور وہ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

یہی ادھورے اور اذیت ناک خواب وہ کئی دنوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ خوابوں کی کڑیاں کسی طرح مل جائیں۔ لیکن خوابوں کی تصویریں مختلف شکلوں کے ساتھ اُبھرتیں اور ذہن میں آگ بھر جاتیں۔

پرائمری اسکول کی بوسیدہ عمارت، بچپن کے دوستوں کے ساتھ ہنستا کھیلتا مسکراتا ہوا چہرہ ــــ وہ کبھی والی بال کی فیلڈ میں تالیوں کی گونج میں اور کبھی شہانہ کے قریب اس کی باتوں کی شیرینی میں خود کو ڈوبتے ہوئے محسوس کرتا ــــ وہ سالگرہ کا منظر بھی اس کی نگاہوں میں پھر جاتا جب اس کے ماں باپ اس کی سالگرہ مناتے تھے۔ زندگی ایک پرسکون جھیل کی طرح بہتی ہوئی لگتی۔ حسین خواب دیکھنا اور خواب میں بڑبڑاتے رہنا اس کی زندگی کا معمول بن گیا تھا۔

بیوی پوچھتی: "یہ سب کیا ہے؟ آپ سوتے سوتے جاگ جاتے ہیں۔ اب میں آپ کے کمرے میں نہیں سوؤں گی۔ مجھے آپ سے ڈر لگنے لگتا ہے۔"

وہ خاموش رہتا۔ اس کے پاس بیوی کی بات کا کوئی جواب نہ تھا اِدھر کچھ دنوں سے اس کے خوابوں کا محور زیادہ تر شہانہ ہوتی ــــ وہ اکثر سوچتا کہ ان بیس برسوں کے طویل عرصے میں شہانہ پر کیا گزری ہوگی ــــ؟ مدت ہوئی اس نے سنا تھا کہ باپ نے اس کی شادی کسی معمر آدمی سے کردی تھی۔ انھیں دنوں اس کا ایک خط ملا تھا، جس میں اس نے اپنی دکھ بھری داستان تحریر کی تھی لیکن اس نے اس کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا تھا ــــ پھر اس کی کچھ خبر نہ ملی۔ اور اب وہی ماضی کے لمحے اسے ناگ بن کر ڈستے ہیں اور عجیب عجیب خواہشیں بیدار ہوتی ہیں کہ کاش ایک بار شہانہ سے ملاقات ہو جائے۔ چند لمحے اس کے ساتھ دکھ سکھ کے گزر جائیں۔

بیوی اکثر پوچھتی:

"یہ آپ سوتے میں شہانہ۔ شہانہ کیا بڑبڑاتے ہیں؟"

"کچھ نہیں۔ یہ وہی شہانہ ہے جس کے ڈھیر سارے خطوط تم نے بکس سے نکال کر جلا دیئے تھے۔"

"اچھا تو یہ وہی شہانہ ہے جسے آپ اس بڑھاپے میں بھی اپنے خوابوں کا مرکز بنائے ہوئے ہیں؟"

"تم کیا جانو کہ ماضی کے شرارے کیا ہوتے ہیں؟"

"ماضی۔ ماضی۔ ماضی ــــ میں تو سنتے سنتے عاجز آگئی۔ حال سے غفلت۔ ماضی سے رغبت!! آخر ہیں نا آپ ٹیچر اور رائٹر ــــ ہر وقت خوابوں میں گم رہنے والے۔ جھوٹی سچی کہانیاں لکھنے والے ــــ ماضی۔ خواب۔ خیال ــــ یہ سب بے سروپا باتیں ہیں۔ شہانہ ــــ شہانہ ہر وقت آپ کے خیالوں پر شہانہ سوار رہتی ہے۔ زندگی اجیرن کردی ہے اس نے ــــ اگر اسے اتنا ہی چاہتے تھے تو مجھ سے شادی کیوں کی؟ جایئے اس کے پاس ــــ میں اپنے میکے چلی جاؤں گی۔" یہ کہہ کر بیوی سسک پڑی۔

"یہ کیا پاگل پن ہے؟ عورت خواہ عمر کی کسی بھی منزل پر پہنچ جائے دوسری عورت کا ذکر برداشت نہیں کرسکتی۔ اس کے اندر رقابت کا مادّہ ہمیشہ برقرار رہتا ہے۔ بھلا میں اس عمر میں عشق کروں گا۔؟"

بیوی بڑبڑاتے ہوئے کچن میں چلی گئی اور وہ صوفے پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ بھلا وہ کیسے کہے کہ اس کے خیال و خواب کی دنیا ہی تو اس کا سرمایہ ہے جس سے اس کو سکون ملتا ہے ــــ یہ دولت، تعلیم، ڈگریاں، کار، بنگلہ شہرت اور عہدہ اس کی زندگی میں کیا کچھ نہیں تھا۔ لیکن پھر یہ اتھل پتھل کیوں ہو رہی ہے؟ جب سے اس کی زندگی میں ریسرچ اسکالر لڑکی صبیحہ آئی ہے جس کا موضوع "خواب" ہے، تب سے اس کے خوابوں کو اور جلا مل گئی ہے۔

خواب و خیال کی دنیا سے جب اس نے باہر نکل کر دیکھا تو سورج کی شعاعیں اسے وقت کی اہمیت کا احساس دلا رہی تھیں اور وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

شام اپنی پوری رنگینیوں، رعنائیوں، کیفیتوں، شادابیوں اور جلوہ سامانیوں کے ساتھ اس کے آنگن میں اتر آئی تھی۔ روشنی کی پھوار سب کے چہروں پر مسرت کی کرن بن کر پڑ رہی تھی ــــ آج اس کی سالگرہ پارٹی میں صبیحہ بھی آئی تھی۔ حسین و خوشنما لباس، خوبصورت

اس نے طنز و مزاح کے نئے نئے حربے اور نئے نئے گوشے دریافت کرکے داخل نظم و نثر کئے اور اس طرح اردو نثر میں طنز و مزاح کا ہو خلا تھا اسے پر کیا۔

□□

حواشی

۱۔ مضامین اودھ پنچ مطبوعہ ۱۹۷۴ء (ص ۱۰۱-۱۱۰)

۲۔ مضامین اودھ پنچ (ص ۱۹۰)

۳۔ طنزیات و مضحکات از رشید احمد صدیقی مطبوعہ ہندوستان اکیڈمی الہ آباد (ص ۸۲)

۴۔ طنز و ظرافت (مضمون) از ڈاکٹر خورشید الاسلام (ص ۱۷)

۵۔ اردو ادب میں طنز و مزاح۔ از ڈاکٹر وزیر آغا مطبوعہ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ (ص ۲۷۰)

۶۔ مضامین اودھ پنچ از ڈاکٹر مصباح الحسین قیصر مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ (ص ۲)

احوالِ واقعی .... ص۷ کا بقیہ

ڈرامے میں بھی معیاری اور غیر معیاری ڈرامے ہیں۔ آج سے اسّی نوّے سال پہلے اگر کسی نے اُردو ڈرامے کو مغرب کے ترقی یافتہ ڈرامے کے مقابلے میں غیر معیاری کہہ دیا تھا تو ہم آج تک اسی لکیر کو پیٹے چلے جا رہے ہیں۔ سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ہم نے اُردو ڈرامے کا سنجیدگی سے مطالعہ نہیں کیا۔ بہر حال نہ تو میں اردو کو کمتر سمجھتا ہوں اور نہ اس کے مستقبل سے مایوس ہوں۔

□□

اُردو کے ممتاز ادیب، محقق اور ماہر لسانیات ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا گزشتہ دنوں کراچی میں انتقال ہوگیا۔ ان کا وطن بدایوں (یوپی) تھا۔ انھوں نے بہت سی کتابیں لکھیں۔ ان کی ایک تصنیف "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" بہت مشہور ہوئی۔ ان کے انتقالِ پُرملال پر ادارہ نیا دور اپنے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔
(ا۔ ح)

اسی کی چھاؤں سے لوگوں کو پیار ہوتا ہے
وہی درخت جو کچھ سایہ دار ہوتا ہے

گلے سے لگ کے بھی وہ بات پھر نہیں رہتی
تعلقات میں جب انتشار ہوتا ہے

جو شخص جان سے زیادہ عزیز تھا ہم کو
وہ دشمنوں میں ہمارے شمار ہوتا ہے

ہم ایسی وادئ آہو زدہ میں قید سے ہیں
جہاں پہونچ کے شکاری شکار ہوتا ہے

ذرا سنبھال کے رکھو اساس سوچوں کی
کہ چہرہ ذہن کا آئینہ دار ہوتا ہے

بلندیوں کی بھی پستی میں پیاس بجھتی ہے
جہاں فراز وہیں آبشار ہوتا ہے

نکلیے گھر سے تو پھر واپسی نہیں ہوتی
یہ معرکہ بھی سرِ رہ گزار ہوتا ہے

کسی سے ملیے کہیں جائیے مگر تسنیم
وطن کے نام سے دل بے قرار ہوتا ہے

تسنیم فاروقی
تلسی داس مارگ
لکھنؤ ۲۲۶۰۰۴

غزلیں

لفظ و معنی و فکر کا دفتر لیے پھرتا ہوں میں
حسرتوں کا دل میں اک لشکر لیے پھرتا ہوں میں

شہر و صحرا دشت و دریا ہر جگہ پرچا بھی
زندگی کے بوجھ کو کیوں کر لیے پھرتا ہوں میں

دل میں رہ رہ کر چمک اٹھتا ہے ہیرا سا وہ حسن
آئینوں کے شہر میں پتھر لیے پھرتا ہوں میں

حادثاتِ نو بہ نو ہمسفر ہیں ہر سفر
خشکی لب اور چشم تر لیے پھرتا ہوں میں

ہیں سکوں بخش اس کے جلوے چار سو بکھرے ہوئے
کیوں عصائے آہ و چشم تر لیے پھرتا ہوں میں

تیغ سے اس کی انا کی جب مفر ممکن نہیں
اپنے کاندھے پر یہ دیکھو سر لیے پھرتا ہوں میں

نیک و بد اعمال میں ہے وہ برابر کا شریک
کیوں وفا الزام اپنے سر لیے پھرتا ہوں میں

مصطفٰی زیدی وفا
۱۲/۲ دولت باغ کالونی
لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

شہرت نہیں دولت نہیں توقیر عطا کر
اے ربِ جہاں بس یہی جاگیر عطا کر

دیکھے ہیں شب و روز کئی خواب سہانے
آخر تو کسی خواب کی تعبیر عطا کر

میں کشتۂ شمشیرِ جفا ہوں مرے اللہ
بس آخری منت ہے کہ شمشیر عطا کر

بندہ ہوں ترا نرغۂ اعدا میں گھرا ہوں
آسی ہوں تو کیا قوتِ تسخیر عطا کر

گر تیری رضا ہو تو رہوں سرخرو میں بھی
کب میں نے کہا منصبِ شبیرؑ عطا کر

میں بے سر و ساماں ہوں تو یہ تیرا کرم ہے
گھر نہ دے مگر حسرتِ تعمیر عطا کر

ہے تیری نوازش جو سخن ور بنا جعفر
اب تو ہی مجھے سوزِ فنِ میر عطا کر

جعفر عسکری
ممتاز محل کمپاؤنڈ گولہ گنج
لکھنؤ

رنج و الم کا ناز اٹھائے ایک زمانہ بیت گیا
دل کے چمن میں پھول کھلائے ایک زمانہ بیت گیا

غم کی بارش سے لت پت ہیں جو کپڑے ہم پہنے ہیں
ان کپڑوں کو دھوپ دکھائے ایک زمانہ بیت گیا

کیا پاؤ گے دل کے ورق پر آڑی ترچھی کوئی لکیر
اس کا ایک اک نقش مٹائے ایک زمانہ بیت گیا

اب یہ تمنا ہے کہ اتاریں اس کو دل کے پردے پر
کاغذ پر تصویر بنائے ایک زمانہ بیت گیا

چاند ستاروں کی دنیا میں تو ہے فروزاں اور یہاں
امیدوں کی بزم سجائے ایک زمانہ بیت گیا

پاس نہ آئے روشن لمحے پھر بھی زیست میں اے شبنم
اشکوں کی قندیل جلائے ایک زمانہ بیت گیا

شبنم گورکھپوری
۱۵۴- رسول پور
گورکھپور
۲۷۳۰۰۱

تم بالکل دستر خوان کے اچھے اچھے کھانوں اور ہوشیار
خدمت گار ہو۔ پکا پکایا کھانا، تیار باندی تم خوان سے
چن سکتے ہو مگر باندی پکانے اور چیز تیار کرنے کے نام
سے خاک دھول۔ بکائن کے پھول۔ تم نہیں جانتے کہ
طرح طرح کے کھانوں کے واسطے کون کون سا مسالہ
کیوں کر پیسا اور ترکیب دیا جاتا ہے۔ کبابوں میں کس چیز
سے گلاوٹ آتی ہے۔ پلاؤ کو دم کیسے دیتے ہیں۔ فارن
پالیسی کا مزعفر اور متنجن کیا پا کر خوشگوار چاشنی پیدا کرتا ہے۔"

(ماخوذ از کھلے خط اور سربستہ مضامین)

منشی سجاد حسین کا یہ اسلوب اگرچہ نیا بھی ہے اور اودھ کے تہذیبی رنگ میں ڈوبا ہوا بھی ہے مگر اس میں کوئی دیر پا چاشنی نہیں ہے۔ آج یہ اسلوب بذات خود مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ ایک طرف گلیڈ اسٹون کو مولوی بنا کر مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور دوسری طرف ان کو باورچی بنا دیا ہے۔ دونوں میں کوئی ربط نہیں ہے اور یہ مزاح کی کوئی من بھاوتی تصویر نہیں پیش کرتا ان کے سیاسی مزاحیوں کا یہ عمومی رنگ ہے جس سے انکی جودت طبع تو ظاہر ہوتی ہے مگر ان کے تخیل کی اڑان محدود ہے اور وہ کوئی باقی رہنے والا کارنامہ نہ پیش کر سکے۔ البتہ انھوں نے اودھ پنچ کے گرد لکھنے والوں کا ایک با اثر حلقہ پیدا کر لیا تھا۔ اس سلسلہ سیارہ میں سب سے اہم نام نواب سید محمد آزاد کا ہے۔ ان کی ظرافت کے بارے میں رشید احمد صدیقی کا خیال ہے کہ "مغرب اور مغربیت کے خلاف نواب آزاد نے جس معقول اور دلنشین پیرایہ میں طنز کی ہے اس کا جواب بہ حیثیت مجموعی اردو ادب میں ملنا دشوار ہے۔ آزاد کی طنز و ظرافت میں جو چیز نہایت نمایاں اور بامزہ ہے وہ ان کی خلقی شگفتگی ہے۔ کینہ پروری اور زہرناکی عنصر کہیں نمایاں نہیں ہے اس اعتبار سے ان کو اردو ادب کا ہوریس اور چاسر کہنا ناموزوں نہ ہوگا۔"

نواب سید محمد آزاد کے علاوہ اودھ پنچ کے دیگر نامہ نگاروں کے طرز تحریر میں آورد اور تکلف زیادہ ہے۔ وہ زیادہ تر زبان کی بندش، الفاظ کے الٹ پھیر، محاوروں کی شوخی اور چرب زبانی سے مزاح پیدا کرتے ہیں مگر ان میں متانت اور ٹھہراؤ کی کمی سے ادبی چاشنی نہیں پیدا ہو پاتی۔ منشی احمد علی شوق، تربھون ناتھ ہجر، مرزا ستم ظریف اور جوالا پرشاد برق کے اسالیب میں کوئی نمایاں انفرادیت نظر نہیں آتی۔ ان کے موضوعات میں بھی کوئی ندرت یا تازگی نہیں ملتی۔ ان مزاح نگاروں کی حیثیت ادبی کم اور تاریخی زیادہ ہے۔

شاید کم لوگوں کو معلوم ہو کہ اکبر الہ آبادی نے اودھ پنچ میں نثری مضامین بھی لکھے ہیں ڈاکٹر مصباح الحسین قیصر نے اپنی کتاب "اودھ پنچ کے معاونین" میں اکبر کے ۴۳ مضامین کی فہرست دی ہے اور لکھا ہے کہ "یہ مضامین موضوع یا مواد کی نوعیت کے اعتبار سے اکبر کی شاعری کی تفسیر ہیں۔ اکبر کی نظمیں ان کے جن خیالات، عقائد اور مقاصد کی عکاسی کرتی ہیں۔ یہ مضامین نثر بھی انھیں کی وضاحت کرتے ہیں۔" اودھ پنچ کی ۱۰ اپریل ۱۸۹۹ء کی اشاعت میں "تم بھی برطرف" کے عنوان سے اکبر کا جو مضمون شائع ہوا ہے اس کا ایک ٹکڑا یہ ہے۔

"لوگ سچ کہتے تھے کہ حضرت خضر کی عمر بڑی ہے۔
مدت دراز سے سید صاحب اپنی تحقیق کی تلوار سے بہت
سی مذہبی چیزوں کو ملک عدم کی طرف کھٹا کھٹ بھیج رہے
تھے لیکن حضرت خضر ابھی تک بچے ہوئے تھے۔ نہیں معلوم
سید صاحب کی فروگذاشت تھی یا حضرت خضر کی روپوشی بہرحال
وہ بھاگے ہوئے ضرور تھے۔ تہذیب الاخلاق کی پہلی جلد میں
ایک مضمون دیکھا کہ خضر کوئی چیز نہیں۔ لیجئے اتنے دنوں تک
تو حضرت خضر زندہ رہنے پائے اور صرف اب عالم موجودات
سے سدھارنے پر مجبور ہوئے۔ اس پر ہم کو بھانڈوں کی
وہ نقل یاد آئی جس کو وہ تحفیف اعمالی پر اعتراض کرنے
کیلئے محفلوں میں کیا کرتے تھے۔"

اکبر الہ آبادی نے اودھ پنچ کے لیے کچھ سیاسی اور کچھ ادبی مضامین بھی لکھے ہیں مگر اصلیت یہ ہے کہ ان مضامین میں اکبر کی جودت طبع نہیں کھلی۔ ان میں وہ مزاح اور نشتریت ہرگز نہیں ہے جو ان کی نظموں میں۔ سیاسی مضامین میں انکا انداز بڑا محتاط اور سنبھلا ہوا ہے۔ نیز ان میں طنز و مزاح دونوں کی چاشنی بہت پھیکی ہے۔ قدرت نے ان کو نثر نگاری کے لئے پیدا ہی نہیں کیا تھا وہ محض منشی سجاد حسین کی مروت میں اودھ پنچ کے لئے کچھ نہ کچھ لکھ دیا کرتے تھے اکبر کے اصل جوہر تو ان کی شاعری میں کھلتے ہیں۔

اودھ پنچ کے دور میں ممتاز ترین شاعر طنز و ظرافت، اکبر الہ آبادی تھے

اودھ پنچ کے ممتاز ترین نثر نگار پنڈت رتن ناتھ سرشار تھے۔ جن کی ادبی قدر و قیمت آج بھی مسلم ہے۔ ان دونوں کی نظم و نثر کی تازگی اور شگفتہ کاری آج بھی دامن دل کو کھینچ لیتی ہے۔ رتن ناتھ سرشار اگرچہ اودھ پنچ سے بہت کم متعلق رہے تاہم وہ تھے اسی دور کے پروردہ اس لئے ان کا شمار بھی اودھ پنچ کے دور میں ہی کرنا چاہئے۔ سرشار کا سب سے زیادہ اور توانا کارنامہ فسانۂ آزاد ہے جو تقریباً ڈھائی ہزار صفحات کو محیط ہے۔ بقول ڈاکٹر خورشید الاسلام :-

"یہ ایک ایسے دیوانہ کا کارنامہ ہے جس سے دنیا نے انکار کر دیا۔ جس نے خود بھی اپنے آپ کو نہ سنبھالا اور جو اپنے افسانے کے ہیرو کو بھی نہ سنبھال سکا لیکن اس کے باوجود ہمیشہ زندہ رہے گا" (۲)

رتن ناتھ سرشار اپنی ذکاوت اور ذہانت کے لحاظ سے اپنے تمام ہمعصروں پر فوقیت رکھتے تھے۔ فسانۂ آزاد انھوں نے قلم برداشتہ لکھا مگر ان کا جادو خوجی کی شکل میں آج بھی زندہ ہے۔ بیشتر نقادوں کا خیال ہے کہ خوجی کا کردار لکھنؤ کی ملتی بگڑتی کھوکھلی تہذیب کا نمائندہ کردار ہے مگر یہ بات زیادہ قرین قیاس نہیں کہ سرشار کے ذہن میں یہی خیال رہا ہو۔ ممکن ہے کہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے لکھنؤ میں کسی ایسے مضحک کردار کو دیکھا ہو اور اس کو فسانۂ آزاد میں خوجی کی شکل دے دی ہو۔ خوجی کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے :-

"دراصل خوجی کا کردار، نواب کے مصاحب یا مسخرے کا کردار ہے اور اس کا کام ہی نواب کے لئے تفریح طبع کا سامان بہم پہنچانا ہے۔ کسی زمانے میں بدقسمتی سے انشا کو بھی نواب سعادت علی خاں کی کچھ اس قسم کی خدمات انجام دینا پڑی تھی لیکن ذکر خوجی کا تھا۔ بعض اوقات خوجی کی چالاکی اسکے تصنع اور بناوٹ روں میں غرور کو چھپانے کی کوشش کے باوجود جب ایک جھلک دکھاتی ہے تو ناظر کو فوراً اس کے مسخرے پن کا احساس ہو جاتا ہے" (۳)

یہاں خوجی کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا نے انشا کو بھی لپیٹ لیا ہے۔ خوجی احساس کمتری کا شکار ہو کر مضحک بن جاتا ہے مگر انشا صاحب کمال شخص تھے جو مضحک نہیں صاحب سند تھے اور صاحب اکثر اوقات اچھے اچھوں کو دھوکہ جانے کتنے کنوئیں جھنکوا دیتی ہے۔ دراصل خوجی کی خود فریبی ہی اس کو مضحکہ خیز بنا دیتی ہے۔ اس کی قرولی بھی ایک علامتی ہتھیار ہے جس کا کبھی کوئی استعمال نہیں ہوتا مگر ذکر ہمیشہ ہر جگہ ہوتا ہے۔

سید سجاد حسین کے مضحک کردار حاجی بغلول کے مقابلے میں خوجی زیادہ دلچسپ، متنوع اور جاندار کردار ہے۔ حاجی بغلول کا دیہاتی اور ماحولی کمزوریوں سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش مستحسن نہیں کہی جا سکتی تاہم جب حاجی بغلول اپنی فطری ناہمواریوں کے باعث نشانۂ تمسخر بنتا ہے تو اس کا مضحک کردار زیادہ قابل توجہ بن جاتا ہے۔ خوجی اور بغلول دونوں بعض اوقات عملی مذاق کی وجہ سے مضحکہ خیز بنتے ہیں مگر اس سے مزاح نگار کا اعتبار بڑھتا نہیں گھٹ جاتا ہے۔

اودھ پنچ کی حیثیت تاریخی تھی، ادبی نہ تھی۔ اس نے شائستہ ظرافت کا کوئی اعلیٰ معیار قائم نہیں کیا۔ یہ شائستہ ظرافت تھی بھی نہیں بلکہ مہذب لوگوں کی اجتماعی اچھل کود تھی جس نے ماحول کو ایک حد تک جگایا تو ضرور مگر کوئی دیرپا اثر قائم نہ کر سکی۔ طنز و مزاح اگر مہذب قوموں کی فہم و دانش کا پیمانہ ہوتا ہے تو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اودھ پنچ اس پیمانے پر پورا نہیں اترتا۔ یہ صحیح ہے کہ انیسویں صدی کے آخر ربع میں اس سے زیادہ ممکن بھی نہ تھا جو اودھ پنچ نے پیش کیا مگر یہ بھی صحیح ہے کہ اودھ پنچ کو ایسے اعلیٰ پایہ کے نثر نگار میسر ہی نہیں آئے جن سے اس کو وقار اور اعتبار حاصل ہوتا البتہ اکبر الہ آبادی کی طنزیہ مزاحیہ شاعری استثنا کی حیثیت رکھتی ہے اور اودھ پنچ کا یہی ایک کارنامہ اس کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے کہ اس نے اکبر الہ آبادی جیسے بہترین طنزیہ و مزاحیہ شاعر کو اردو دنیا سے روشناس کیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کیفیت اور کمیت کے لحاظ سے اب تک اردو شاعری اکبر کا جواب نہیں پیدا کر سکی۔ اگر اکبر ہی کے معیار کے دو ایک شاعر اور بھی اودھ پنچ کو میسر آجاتے تو اردو کی طنزیہ مزاحیہ شاعری میں اودھ پنچ کی خدمات کا مقام اور بھی بلند ہو جاتا۔ پھر بھی اودھ پنچ نے اپنے محدود دائرے کے اندر جو کام کیا ہے اس سے اردو ادب میں طنز و مزاح کی تاریخ صرف نظر نہیں کر سکتی۔ اودھ پنچ کا یہی احسان کیا کم ہے کہ اس نے ایک نئی روش کی داغ بیل ڈالی اور پہلی بار اردو ادب کو طنز و مزاح کا ذہنی شعور بخشا۔

ہوا۔ یہ جشن [illegible] تقریب منعقد ہوئی اور رنگ [illegible]
ہوئی [illegible] بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ [illegible] دیکھتے ہوئے چلا۔
[illegible] سالگرہ مبارک ہو۔
وہ صبیحہ کو دیکھ کر چونک پڑا۔ رنگ و روپ کی لہروں میں ڈوب گیا۔ اس کی آنکھوں میں اپنی بھرپور رعنائیوں کے ساتھ شگفتہ اور اس کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا:

"ہیپی برتھ ڈے شہانہ"۔ (تمھیں بھی شاد)

صبیحہ حیران کن نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ پھر اس نے سُنا کہ وہ بیوی سے پوچھ رہی تھی۔

"آنٹی! یہ شہانہ کون ہے؟ اکثر میں نے سر سے یہ نام سُنا ہے"

"صبیحہ! یہ ان کے بچپن کی کوئی دوست تھی۔ پتہ نہیں انھیں کیا ہو گیا ہے۔ ہر وقت خواب میں ڈوبے رہتے ہیں۔ میں تو اس نام سے عاجز آ گئی ہوں۔" بیوی نے اُداسی سے کہا۔

صبیحہ خاموش ہو کر سوچنے لگی "کل سر سے کل شہانہ کے بارے میں معلوم کروں گی۔ ضرور ان کا شہانہ سے افیئر چلا ہوگا۔ لیکن اس عمر میں جبکہ بچے جوان ہیں ـــ شہانہ کی یاد۔ بڑی عجیب بات ہے ـــ!! پروفیسر صاحب کا نظریہ ہے کہ گناہ اور ثواب کیا؟ یہ سوچ کے طریقے ہیں جو چیز آپ کو بُری لگتی ہے وہ دوسری کو بھلی لگتی ہے ـــ عجیب شخصیت ہے؟! خوابوں میں کھوئے رہنا، سوچتے رہنا ـــ دنیا و مافیہا سے بے خبر ـــ!! میری ریسرچ بھی ادھوری پڑی ہے ـ کچھ ہی ابواب لکھے گئے ہیں۔"

اُدھر بیوی کے ذہن میں یہ وہم سر اُبھار رہا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ صبیحہ ان کی زندگی میں شہانہ بن کر داخل ہو گئی ہو اور وہ ریسرچ کی آڑ میں رنگ رلیاں منا رہے ہوں۔ اسے یاد آیا کہ ایک دن جب وہ صبیحہ کو پڑھا رہے تھے اور وہ اچانک وہاں پہونچ گئی تو وہ گھبرا گئے تھے۔ وہ صبیحہ کے بہت قریب جڑ کے ـــ پھر وہ خیالوں کے ہجوم میں گھری ہوئی، سالگرہ کے ہنگاموں میں کھو گئی۔

سالگرہ کی تقریب ختم ہوئے کئی دن ہو چکے تھے، لیکن اس کے ذہن پر ایک بوجھ سا محسوس ہو رہا تھا اور وہ ایک عجیب اضطراری کیفیت سے گزر رہا تھا۔ احساسِ شکست سے [illegible] سا ہو رہا تھا [illegible] کہ اب اس کے خوابوں کا مرکز صبیحہ بنتی جا رہی ہے اور اس کی آنکھوں میں جہاں کبھی شہانہ کا عکس ابھر آیا کرتا تھا اب صبیحہ کا [illegible] ابھر آتا تھا۔ وہ اُدھر کئی دنوں سے بہت مضطرب، بے چین اور کھویا کھویا سا نظر آ رہا تھا۔ بیوی بھی اس کی اس کیفیت سے فکر مند تھی کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ اِدھر صبیحہ بھی نہیں آ رہی ہے۔ کہیں وہ باہر تو نہیں چلی گئی یا بیمار تو نہیں ہو گئی جس کی وجہ سے یہ بجھے بجھے اور خاموش نظر آتے ہیں۔؟

اور پھر ایک دن بیوی نے پوچھ ہی لیا:

"یہ آپ خاموش خاموش کیوں ہیں؟ کیا بات ہے۔؟ اُدھر کالج بھی باقاعدگی سے نہیں جا رہے ہیں اور صبیحہ بھی پڑھنے نہیں آ رہی ہے یہ چہرے پر بے چینی اور اضطراب کی لکیریں کیسی ہیں؟"

"اوہ ـــ کچھ نہیں۔! جانے کیوں کچھ طبیعت سست سست رہتی ہے۔ کچھ کام کرنے کو جی نہیں چاہتا۔"

"اجی ہاں ـــ اگر آپ کی طبیعت سست ہے تو ڈاکٹر کو دکھایئے۔ آج کل صبیحہ بھی نہیں آ رہی ہے۔؟"

"میں نے اسے دوسرے گائیڈ کو ٹرانسفر کر دیا ہے۔"

"کیوں۔؟"

"اس کی وجہ سے میرا ذہنی انتشار بڑھ گیا تھا۔ ہر وقت خواب، خیال، شرارے.... چنگاریاں.... بنتی بگڑتی تصویریں... شعلے ہی شعلے رقص کرتے نظر آنے لگے تھے۔ اس لیے میں نے صبیحہ کو...."

وہ بڑبڑاتے بڑبڑاتے اس پر تشنجی کیفیت طاری ہو گئی اور وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں صوفے پر ڈھلک گیا۔

ایک لمحہ کے لیے بیوی کے چہرے پر جو مسرت کی لہر آئی تھی وہ بے چینی میں بدل گئی اور وہ سوچنے لگی کہ اب خواب ہی ان کی زندگی ہے۔ اس کے بغیر وہ جینے کا تصور نہیں کر سکتے۔ تو کیا ـــ تو کیا ـــ انھوں نے صبیحہ کو ٹرانسفر کر کے کوئی بھول کی ہے؟ غلط فیصلہ کیا ہے ـــ؟!

□□

غزلیں

وہی ہے رات وہی ہے جہانِ آوارہ
یہ آج کیا ہے کہ چپ ہیں سگانِ آوارہ

ہوس رسیدہ نہیں ہیں تو اور کیا ہیں کہو
دیارِ سنگ کے آسودگانِ آوارہ

وہ کوئی دوست ہو دشمن ہو ہر کسی کیلئے
کھلا ہی رہتا ہے شب بھر مکانِ آوارہ

مجھے نہ روک مرے خواب میرے پیار کو بانٹ
کہ غم میں ڈوبی ہوئی ہے اذانِ آوارہ

یہ بھیگی بھیگی سی ظلمت یہ نم جبینِ ورق
مٹا مٹا سا یہ نام و نشانِ آوارہ

خدا کرے کہ مرے پاس اب نہ آئے کوئی
بہت ہے ایک وہی مہربانِ آوارہ

ایم کوٹھیاوی راہی

ایڈیٹر "اشتراک"
قاضی پور خورد
گورکھ پور

داؤ پہ اپنا روز مقدر رکھتا ہے
بنجارا ہے کاندھے پر گھر رکھتا ہے

کوئی تو ہے جو سرد اندھیروں کے بدلے
روز کھنڈر میں چاند جلا کر رکھتا ہے

کتنے ہی طوفان نگل کر آیا ہے
دل میں جو اک چپ کا سمندر رکھتا ہے

چاند گزر کر بیٹھے ٹوٹے تاروں کی
میری چھت پر کرب کا منظر رکھتا ہے

یادوں کے ملبے کے نیچے درد کے پھول
اک دیوانہ روز چھپا کر رکھتا ہے

میں ہی خود کو کھو دیتا ہوں اکثر رند
اس پر بھی وہ دھیان برابر رکھتا ہے

پی پی سریواستو رند سانوی

آر۔ ۱۹، سیکٹر ۶
نوئیڈا-۲۰۱۳۰۱

سماعتوں پہ گراں بے زبانیاں اس کی
اسیرِ دیر و حرم لامکانیاں اس کی

ہر ایک چہرے پہ بے چہرگی کے سائے ہیں
گرفت میں نہیں آتیں نشانیاں اس کی

یہ کس نے سخن سے کاٹا ہے نور کا رشتہ
کہ بے نوا ہوئیں جادو بیانیاں اس کی

اسی کا کاسۂ سر بھی اسی کا پتھر بھی
لہو اسی کا لہو میں روانیاں اس کی

وہ سیلِ کارِ جہاں تھا کہ اس کو بھول گیا
پھر آ کے مجھ کو سناؤ کہانیاں اس کی

وہ ہم پہ کرتا رہا اپنی نعمتوں کا نزول!
ہمیں سے ہو نہ سکیں قدردانیاں اس کی

شکیب رضوی

کرائسٹ چرچ انٹر کالج
کان پور

احمد نسیم صدیقی

ریاست کی مربوط ترقی کے عزائم

اس کرۂ ارض پر جب سے زندگی کی ابتداء ہوئی ہے انسانی فطرت کا یہ تقاضہ ہے کہ وہ بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود اور بہتری کے لئے مسلسل کوشاں رہے۔ یہ بہتری خواہ علم کے میدان میں ہو، انسانی ضروریات کی تکمیل کے سلسلے میں ہو یا سماج کے کمزور اور ناتواں افراد کو ان کا حق دلانے کے سلسلے میں ہو، زمانے کی مسافت کے ساتھ ہی زندگی کے تمام شعبہ جات میں مسلسل ترقی اور کوشش کا عمل جاری و ساری ہے۔

ہماری ریاست اتر پردیش نے بھی سماج کی فلاح و بہبود کے سلسلے میں متنوع اقدامات کیے ہیں۔ ہمارے وزیر اعلا کی یہ کوشش ہے کہ سماج کو ہر لحاظ سے ایک نئی اور انقلابی شکل دی جائے۔ ان کی خاص توجہ کا مرکز سماج کے وہ افراد ہیں جو بعض وجوہ کی بنا پر اب تک پس ماندہ ہیں اور کمزور ہیں، ناتواں ہیں، اپنے حقوق سے محروم ہیں اور زیادتیوں یا ناانصافیوں کا شکار ہیں۔ ایسے تمام افراد کے جائز حقوق دلانے اور انھیں سماج میں اپنا مقام پہچاننے کے لائق بنانے کی غرض سے موجودہ حکومت جو اقدامات کر رہی ہے اور جو پروگرام زیر عمل ہیں، آیئے ان پر ایک نظر ڈالتے چلیں۔

موجودہ حکومت نے اپنی ترجیحات متعین کی ہیں اور انھیں پورا کرنے کے لیے اس سمت ٹھوس اقدامات بھی شروع کر دیئے ہیں۔ تاکہ قول اور فعل میں کسی قسم کا تضاد نہ رہ جائے۔ منڈل کمیشن کی سفارش کو نافذ کرتے ہوئے پس ماندہ طبقوں کے لیے ۲۷ فی صد ریزرویشن کا فیصلہ کیا گیا تاکہ انھیں اپنی سماجی و معاشی ترقی کے لئے سازگار ماحول اور مواقع دستیاب ہوں۔ ان احکامات پر پوری طرح عمل درآمد کو یقینی بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور اس ضمن میں کوتاہی کرنے والوں کے خلاف قانونی کارروائی کا بھی بندوبست کیا گیا ہے۔ حکومت کے ایک حالیہ فیصلے کے مطابق سی۔ پی۔ ایم۔ ٹی انجینیرنگ کالجوں اور دیگر کثیر مقصدی اداروں میں بھی ریزرویشن کو نافذ کر دیا گیا ہے تاکہ سماج کے کمزور طبقے ان سہولتوں سے بھی محروم نہ رہ جائیں۔

کمہار طبقے کے افراد جو اپنے آبائی پیشے کے ذریعہ اپنی روزی روٹی کما رہے ہیں انھیں زمین کے پٹے دیئے جا رہے ہیں تاکہ مٹی کی حصولیابی میں دقت نہ ہو۔ اسی طرح مچھلی کا کاروبار کرنے والوں کو بھی تالاب کے پٹے دیئے جا رہے ہیں تاکہ ان کا استحصال نہ کیا جا سکے اور انھیں اپنی محنت کا بھرپور فائدہ حاصل ہو۔ اس کے علاوہ یہ ہدایات بھی جاری کی گئی ہیں کہ چک بندی کے دوران کمہاری کے کام میں آنے والی مٹی اور زمین کو جوت میں شامل نہ کیا جائے۔

سرکاری محکموں میں صراحی اور گھڑوں کی خریداری براہ راست انھیں تیار کرنے والے کمہاروں سے ہی کی جائے۔ اس طرح دلالوں کے ہاتھوں ہونے والے استحصال سے مچھلی پالک اور کمہار دونوں ہی محفوظ رہ کر اپنے پیشوں کو فروغ دے کر معاشی طور سے خوش حال بن سکیں گے۔

ریاست کے ہر حصے کو مساوی مواقع اور سہولتیں حاصل ہوں اس چیز کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ دیہی علاقوں اور پہاڑی علاقوں کو بعض مراعات محض اس بنیاد پر دی جا رہی ہیں کہ ان میں سے بعض علاقے اب تک نظرانداز رہے ہیں یا جغرافیائی حالات کے باعث پسماندہ رہ گئے۔ ان کی بنیادی ضروریات پانی، بجلی، سڑکوں اور علاج و معالجہ کی سہولتیں دینے کے لیے بڑی رقومات مختص کی گئی ہیں۔ یہی نہیں وزیر اعلا نے ترقیاتی پروگراموں کو زیادہ فعال بنانے کے لئے مرکز سے گرانٹ کی رقم میں اضافہ کرنے کی بھی درخواست کی ہے۔

ترقی اور معاشی بہتری کے لیے وسائل کی بھی ضرورت ہوتی ہے اس ضمن میں وزیر اعلا نے دسویں مالیاتی کمیشن کے صدر سے بھی تبادلۂ خیال میں واضح کر دیا ہے کہ اب تک ریاست کو اس کے حق کے مساوی رقومات نہیں مل پائی ہیں لہٰذا انھوں نے درخواست کی ہے کہ ریاست کو اس کے حصے کی تمام رقم یک مشت امداد گرانٹ کی شکل میں دی جائے۔ اس کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے وزیر اعلا نے بتایا کہ پسماندہ علاقوں میں نئے پنچایتی نظام قائم کرنے اور مقامی اداروں کی مالی حالت کو بہتر بنانے کے لئے یہ رقم اشد ضروری ہے۔ اس رقم کو کس طرح استعمال کیا جائے گا، اس کی تفصیل پر روشنی ڈالنے کے لئے چند باتوں کی جانب توجہ دینے کی سخت ضرورت ہے۔

چھوٹی آب پاشی پروگرام دیہی ترقی میں کافی اہم کردار ادا کرتا ہے، جو چھوٹے اور درمیانی کسان بورنگ کا خرچ برداشت نہیں کر سکتے اور کھیتی کے کام میں پس ماندہ رہ جاتے ہیں، ان کے لیے یہ بندوبست کیا گیا ہے کہ ۹۵-۱۹۹۴ء کے دوران دو لاکھ بورنگ کے مقررہ نشانے کو بڑھا کر تین لاکھ کر دیا جائے۔ اس مد پر حکومت ۳۰ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے خرچ کرے گی اور ۵۰ لاکھ ہیکٹیر رقبہ کے لئے آب پاشی کی سہولت فراہم ہوگی۔ اسی طرح مربوط دیہی ترقیاتی اسکیم کے تحت جو پروگرام زیر عمل ہیں انھیں زیادہ کارگر بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ہر گاؤں میں پینے کے پانی کا بندوبست دو برس میں کر دینے کے لئے حکومت پر عزم ہے۔ اس سلسلے میں بھی ایک وسیع پروگرام وضع کیا جا رہا ہے۔ دیہی علاقوں میں پاخانوں کا ناکافی بندوبست ہونے کے باعث عوام بالخصوص خواتین کو زیادہ پریشانی ہوتی ہے۔ حکومت نے سال رواں میں پاخانوں کی تعمیر کے لئے ۲۲ کروڑ کی رقم مختص کی ہے۔

آئندہ پانچ برسوں کے دوران دس ہزار امبیڈکر گاؤں قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے جہاں تمام دیہی سہولتیں دستیاب ہوں گی۔ ان دیہاتوں میں اقوام و قبائل درج فہرست کے خاندانوں کو مفت بورنگ پمپنگ سیٹ، رابطہ سڑکیں، کمزور / اندرا رہائشی سہولت، پینے کے پانی، بائیو گیس، بلا دھواں چولھا، اجابت گاہیں وغیرہ کی سہولتیں اسی اسکیم کے تحت دی جائیں گی۔ ان دیہاتوں میں پنچایت گھروں کی تعمیر سڑکوں کو پختہ کرنے، بجلی کاری کرنے، بچوں کو ٹیکے لگانے اور صفائی منظور کرنے کا کام متعلقہ محکمے کریں گے۔ امبیڈکر گاؤں میں کھڑنجہ بچھانے اور نالیوں کی تعمیر کرنے کی غرض سے ۱۳۹ لاکھ روپے اور گاؤں سبھاؤں کے پنچایت گھروں کی تعمیر کے لئے ۱۷۷ لاکھ روپے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر رام منوہر لوہیا کا کہنا تھا کہ ہمارے یہاں کی تمام عورتیں پسماندہ ہیں اور ان کی ترقی کے لئے خصوصی کوششیں کی جانا چاہیے۔

بابا صاحب ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کا خیال تھا کہ کسی ملک یا ریاست کی ترقی کا پیمانہ یہ ہے کہ وہاں کی عورتوں کی حالت کیسی ہے۔ ان اقوال کے پیش نظر ریاستی حکومت عورتوں کی پس ماندگی دور کرنے اور انھیں خود کفیل بنانے کے لئے کوشاں ہے۔ دیہی خواتین و اطفال ترقیاتی پروگرام کے تحت ریاست کے ۴۴ اضلاع کے ۲۶۱ ترقیاتی بلاکوں میں عورتوں کو روزگار دینے والی تربیت دی جا رہی ہے تاکہ تربیت حاصل کر کے وہ اپنا روزگار کر سکیں اور خود کفیل بن سکیں۔ دیہی علاقوں میں خواتین ڈیری انجمنوں کی تشکیل کی اسکیم تیار کی گئی ہے اور یہ بندوبست بھی کیا جا رہا ہے کہ انھیں بھیڑ بکریاں خریدنے کے لئے آسان شرطوں پر قرض دیا جائے۔

تعلیم کی کمی عورتوں کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے لہٰذا ان میں خواندگی پھیلانے کے لیے کئی وسیع پروگرام زیر عمل ہیں۔ ایسا بندوبست کیا جا رہا ہے کہ جن ترقیاتی بلاکوں میں لڑکیوں کے لئے ایک بھی سکنڈری اسکول نہیں ہے وہاں ترجیحی بنیاد پر نسواں سکنڈری اسکول قائم کیے جائیں۔ تکنیکی میدان میں عورتوں کو آگے بڑھنے کا موقع دینے اور انھیں خود کفیل بنانے کی غرض سے بعض اداروں میں کمپیوٹر اور فارمیسی کے نصابات شروع کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ آنگن باڑی مرکزوں کو زیادہ فعال اور سود مند بنانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔

ریاستی حکومت کی ایما پر اقلیتوں کی معاشی، سماجی ترقی اور انھیں باعزت زندگی گزارنے کا موقع دینے کے لئے متعدد اقدامات کیے گئے ہیں، اقلیتی کمیشن کی تشکیل کر دی گئی ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات کی روک تھام کے لئے اقلیتی حفاظتی فورس کی تشکیل کی جا رہی ہے۔ جن بچوں کی مادری زبان اردو ہے انھیں پرائمری اور سکنڈری درجوں میں

اُردو پڑھانے کی سہولت دینے کا فیصلہ بھی حکومت نے کیا ہے۔ تعلیمی میدان میں پسماندہ مسلم خانوادوں کے بچوں کو قریب ہی پڑھائی کی سہولت دینے کی غرض سے اسکول کھولنے، فیس معاف کرنے اور وظائف دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ایسی سرکاری تقرریوں میں جہاں تحریری امتحان ضروری ہے اب یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ تحریری امتحان ہندی کے علاوہ اُردو میں بھی کرایا جائے گا۔

اُردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے کر یہ بندوبست کر دیا گیا ہے کہ لوگ اُردو میں بھی اپنی درخواست سرکاری دفاتر میں دے سکیں۔

عام لوگوں کی تعلیم کے سلسلے میں بھی موجودہ حکومت متعدد عزائم رکھتی ہے جنھیں پورا کرنے کے لیے تیزی سے کارروائی کی جارہی ہے طلباء و طالبات اور ٹیچروں سے مجرموں جیسا برتاؤ کرنے والے نقل آرڈی ننس کو ختم کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا، موجودہ حکومت نے اپنے اقتدار کے پہلے ہی دن اسے پورا کر دیا اور طلباء پر چلنے والے ۲۴۰۰۰ مقدموں کو واپس لے لیا۔

حکومت نے اپنے طرز عمل سے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ نقل آرڈی ننس کے خاتمے سے اس کا اصل مقصد نقل میں چھوٹ دینا نہیں ہے۔ امتحانات میں نقل کے مسئلہ کا حل تلاش کرنے کے لئے تشکیل شدہ کمیٹی کی رپورٹ حکومت کو بروقت مل گئی تھی اور اس پر عمل کرتے ہوئے ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے امتحانات پُرامن طریقے سے نقل کیے بغیر کرائے گئے۔

موجودہ حکومت نے پرائمری تعلیم کو کس قدر اہمیت دی ہے اس کا اندازہ اس بات سے ظاہر ہے کہ گزشتہ سال کے مقابلے میں اس سال ۲۴ فیصد زیادہ رقم اس مد میں رکھی گئی ہے۔ سماج کے مخیر اور رضا کار افراد کے تعاون سے بھی ۱۰۰ پرائمری اور ۲۰۰ اپر پرائمری اسکول کھولنے کی ابتدا کی گئی ہے۔ اس کوشش سے حکومت کا مقصد یہ ہے کہ سماجی تبدیلی لانے میں سماج کے مخیر افراد تعاون کر سکیں۔

سکنڈری اور ڈگری سطح پر تعلیم کے ذریعہ روزگار فراہم کرانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ سبھی کے لیے تعلیم اسکیم ریاست کے دس اضلاع میں جاری ہے۔ اس پراجکٹ کا مقصد یہ ہے کہ ۱۴ برس تک کی عمر کے سبھی بچّے اور لڑکیوں کو ابتدائی ضروری تعلیم مہیا کی جائے۔

مذکورہ بالا تمام ترقیاتی پروگرام، اسکیمیں اور پراجیکٹ اس امر کا جیتا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ موجودہ ریاستی حکومت ریاست کے پسماندہ دیہی، اقلیتی فرقے اور معاشی اعتبار سے کمزور تمام افراد کی فلاح و بہبود کے لئے کس قدر فکر مند ہے اور اپنے خلوص نیت کا اظہار کرنے کے لئے ان تمام پروگراموں پر ایمانداری اور سختی سے عمل درآمد کرانے کے لئے کوششیں کر رہی ہے۔ ریاست کی مربوط ترقی ہی موجودہ حکومت کا نصب العین ہے۔ وہ سماج کے ہر شخص کے ہونٹوں پر مسکان دیکھنا چاہتی ہے۔ وہ اس سے غرض نہیں رکھتی کہ وہ شخص کس ذات، فرقے یا طبقے سے تعلق رکھتا ہے اور شاید یہی کسی مخلص حکومت کی ذمہ داری اور فرض بھی ہوتا ہے۔

□□

دوستو!

محتشم جامۂ اہلِ فن دوستو
کاغذی پیرہن زیبِ تن دوستو

بغض و نفرت کی شعلہ فشاں دھوپ میں
جل گئے چاندنی سے بدن دوستو

ہر قلم سرخ سیاہی اُگلنے لگا
یہ خلوص و وفا کا چلن دوستو

گرم خبروں سے اخبار تک جل گئے
اتنی سوزش درونِ وطن دوستو

بغض و نفرت کے شعلے بجھا دیجئے
ورنہ جل جائے گا کل وطن دوستو

آستینوں میں جو پل رہے ہیں چمن
کاٹ دو ایسے سانپوں کے پھن دوستو

——— مرزا انور بیگ چمن اٹاوی
۲۸- چمن بھون، پوہتا
اٹاوہ ۲۰۶۰۰۱

ڈوبتے ابھرتے دائروں کا عکس

مجھے سوچنے دو
مگر۔۔۔!!
حادثوں نے
مجھے سوچنے سے منع کر دیا ہے
کروں گا بھی کیا سوچ کر
سوچتا ہوں

مجھے سوچنے کی۔
سزا دی ہے کس نے
یہی کھوجنے میں
لہو بادباں کھول کر چل پڑا ہوں
فقیر ضیا ہوں
اسیر انا ہوں
مرے رازداں، ہمسفر۔۔۔ گم
سوالات میں ہیں

میں چلتا رہا ہوں
میں چاروں دشاؤں میں چلتا رہوں گا

نظر کو مری گو گہن لگ گیا ہے
گو تعمیر بدن منہدم ہو گیا ہے
میں چلتا رہوں گا
بکھرنا، سمٹنا
سمٹ کر بکھرنا
مرا حوصلہ ہے

ازل سے ابد تک یہی سلسلہ روز و شب
چل رہا ہے
مرا راستہ ہی مری منزلیں ہیں
مرا مدعا ہے
مری وسعتوں میں اسی واسطے
پھر اضافہ ہوا ہے
مجھے بے طرف کرنے والے خلاؤں میں گم
بے نشاں ہو گئے ہیں

عجب سانحہ ہے!
عجب سانحہ ہے!

□□

ساجد حمید
سوائی پالیہ۔ شموگہ ۵۷۷۲۰۱
(کرناٹک)

جاتی رُت کا درد

گھر کا مالک، گھر میں بیٹھا
اُس الماری کی جانب
اشکوں میں ڈوب کے دیکھ رہا تھا
جس میں کبھی محفوظ تھا، وہ ادبی سرمایہ
جس کی خاطر وہ جیتا تھا، وہ مرتا تھا!

لیکن وقت نے کروٹ بدلی
گھر کی حکومت
ان لوگوں کے ہاتھ میں آئی
جن کو ٹی۔ وی کی دُنیا نے
صحنِ ادب سے کاٹ دیا تھا!!

اب اس الماری کے اندر تھا وہ سامان
جس پر نئی حکومت کا سرمایہ صرف ہوا تھا
اور کتابیں؟
کسی کباڑی کے قدموں میں
پڑی ہوئی تھیں
اپنے دیرینہ مالک کو بھول چکی تھیں!!

یوگیندر بہل تشنہ
۲۰۶۔ بی۔ ڈی جی چیمبرس
۱۰/۵۴۔ ویشن بندھو گپتا روڈ
قرول باغ۔ نئی دہلی ۵

ماهناز فاطمه

اتر پردیش: اقلیتوں کے مفاد کے نئے باب کا آغاز

شری ملائم سنگھ یادو کی زیر قیادت تشکیل شدہ اترپردیش سرکار نے غریبوں، بے سہارا افراد، خواتین اور اقلیتوں پر ہونے والے ظلم و ستم، استحصال، جبر اور ناانصافی کو ختم کر کے ریاست میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ موجودہ سرکار سبھی کو ترقی کے مساوی مواقع مہیا کرانے اور لوگوں کو انصاف دلانے کے لئے کمربستہ ہے۔

موجودہ ریاستی سرکار نے سماج کے دبے کچلے اور کمزور طبقہ کے لئے جو بھی فلاحی اقدامات کیے ہیں وہ سب اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ حکومت ان طبقات کی فلاح و بہبود کے لئے مکمل طور پر وقف ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ موجودہ حکومت کے برسر اقتدار آتے ہی اقلیت، بالخصوص مسلمان جو فرقہ پرست اور فاشسٹ طاقتوں کے رویّے سے خوفزدہ اور خود کو غیر محفوظ محسوس کر رہے تھے، ان کے اندر سے خوف و دہشت ختم ہوئی۔ اب وہ خود کو محفوظ پا رہے ہیں اور ان میں ایک نیا جوش و حوصلہ دکھائی دے رہا ہے۔

کسی بھی ملک و ریاست کی ترقی، نادار و کمزور طبقوں کو تحفظ دینے اور ان کے لئے سماجی معاشی انصاف کو یقینی بنانے کے لئے امن و قانون برقرار رکھنا اولین شرط کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ اترپردیش میں امن و قانون کی عملداری اور خیرسگالی و رواداری کا ماحول قائم رکھنے نیز سماج دشمن عناصر اور جرائم پیشہ لوگوں پر کنٹرول رکھنے کو اولین ترجیح دی گئی ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات کا منصفانہ اور کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرنے اور ناگزیر حالات سے نمٹنے اور اقلیتوں نیز دیگر کمزور طبقوں میں احساس تحفظ کو مستحکم کرنے کے مقصد سے ریاست میں شانتی سرکشا بل کی تشکیل کے لئے کارروائی شروع کی گئی ہے جس میں تمام طبقوں کے لوگوں کو نمائندگی دی جائے گی۔

پردیش میں اقلیتوں کے مفاد کی حفاظت، ان کی ترقی و بہبودی کے لئے چلائے جا رہے پروگراموں کا جائزہ اور ان کی پریشانیوں اور شکایتوں کے ازالے کے لئے ریاست میں تشکیل اقلیتی کمیشن کو قانونی درجہ دینے کے لیے نوٹی فکیشن جاری کیا گیا ہے تاکہ حکومت تبدیل ہونے پر اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہ کی جا سکے۔ بلاشبہ اس سے ان کی معاشی و اقتصادی پس ماندگی دور ہوگی۔

پہلی بار ریاست کے عازمین حج کے لئے حادثاتی موت بیمہ اسکیم نافذ کی گئی ہے۔ یہ بیمہ اسکیم نہ صرف حج کے دوران جاری رہے گی بلکہ پورے سال عازم حج کی موت ہو جانے پر اس اسکیم کے تحت فائدہ ملے گا اور کسی بھی عازم حج کی موت واقع ہونے پر اس کے وارث کو ۵۰ ہزار روپیہ ادا کیا جائے گا۔ چنانچہ ریاست میں اس اسکیم کے نفاذ کے بعد ہی منیٰ حادثے میں ایک حاجی کی موت ہو جانے پر ان کی بیوہ کو وزیر اعلیٰ جناب ملائم سنگھ یادو نے بیمہ اسکیم کے تحت پچاس ہزار روپے کا چیک پیش کیا۔

گزشتہ برس سنٹرل حج کمیٹی بمبئی نے ریاست کے عازمین حج سے پانچ ہزار پانچ سو سعودی ریال کا بیرونی زرمبادلہ حاصل کرنا لازمی قرار دیا تھا جس کی وجہ سے عازمین حج پر بہت زیادہ بار پڑ رہا تھا، اسے دیکھتے ہوئے اس سال ریاست کی گزارش پر سنٹرل حج کمیٹی نے اسے

کم کر سکے۔ ۴۹۰۰ سعودی ریال کر دیا جس کے نتیجہ میں ۱۹۹۴ء میں عازمین حج کے سفر میں ہوائی جہاز سے تقریباً ۶۵۰۰ روپئے اور بحری جہاز سے تقریباً آٹھ ہزار روپئے کی کمی آئی جس سے ریاست سے جانے والے عازمین حج کو کافی راحت ملی۔

اتر پردیش سے جانے والے عازمین حج کو اور زیادہ سہولت فراہم کرنے کے لئے ریاست کے وزیر اعلا جناب ملائم سنگھ یادو نے دہلی میں ان کے سفر کے دوران ٹھہرنے وغیرہ کے انتظام کو معقول بنانے کے لئے دہلی میں حج ہاؤس کی تعمیر کے لئے زمین مہیا کرادی ہے جہاں جلد ہی عازمین حج کے لئے بلڈنگ کی تعمیر کا کام شروع کر دیا جائے گا۔ ان اقدامات سے اقلیت بالخصوص مسلمانوں کے مذہبی فرائض کی ادائیگی کو تقویت ملی ہے۔

اُردو کو دوسری ریاستی زبان کا درجہ دیتے ہوئے اسے روزی روٹی سے جوڑنے کے سلسلے میں یہ بندوبست کیا گیا ہے کہ لوگ اُردو میں بھی اپنی درخواستیں سرکاری دفتروں میں دے سکیں۔ اس کے لئے سبھی سرکاری دفاتر میں اُردو مترجم کی تقرری ایک دو ماہ کے اندر کر دی جائے گی۔

جن بچوں کی مادری زبان اُردو ہے انھیں ابتدائی و ثانوی سطح پر اُردو پڑھانے کی سہولت سرکار نے دستیاب کرانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کے لئے کثیر تعداد میں اُردو اساتذہ کی تقرری بھی کی جائے گی۔ موجودہ سرکار نے اقلیتی تعلیمی اداروں کو آئین کے آرٹیکل ۳۰ کے تحت واجب الادا سہولتیں اور اختیارات دیئے جانے کے احکامات جاری کر دیئے ہیں۔ تعلیمی اعتبار سے پسماندہ مسلمان کنبوں کے بچوں کو ان کے گھروں کے قریب ہی تعلیم دینے کے پیش نظر اسکول کھولنے، فیس معاف کرنے اور وظائف دستیاب کرانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ایسی تمام سرکاری تقرریوں کے لئے جہاں تحریری امتحان بھی ہوتے ہیں۔ اب یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ تحریری امتحان ہندی کے علاوہ اُردو میں بھی کرایا جائے گا۔ ریاست کے لیے منظور شدہ غیر رسمی مراکز کے دس فیصد مراکز اُردو کے ہوں گے۔

ریاستی اقلیتی مالیاتی و ترقیاتی کارپوریشن کے توسط سے اقلیتوں کی تعلیمی اور اقتصادی ترقی ان کی پیشہ ورانہ تعلیم و تربیت اور خود روزگار کے مواقع فراہم کرانے کی غرض سے کئی اسکیمیں چلائی جا رہی ہیں۔

اسی کے ساتھ ساتھ وقف ولاس کارپوریشن کے توسط سے آئی اے ایس، پی سی ایس، انجینیرنگ، میڈیکل کے مقابلے کے امتحانات و داخلہ امتحانات کی تیاری کے لئے باصلاحیت مسلم طالب علموں کے لئے کوچنگ کا انتظام کیا جا رہا ہے تاکہ ان کا تعلیمی نیز سماجی پسماندگی دُور ہو سکے۔

وقف بورڈ کو مستحکم بنانے کے لئے اب یہ قانون بنا دیا گیا ہے کہ وقف بورڈ کا کنٹرولر جوائنٹ سکریٹری سطح کا افسر ہوگا، تاکہ من مانے ڈھنگ سے وقف کی جائیداد کو فروخت کرنے اور ناجائز قبضے کو روکا جا سکے۔ موجودہ ریاستی حکومت نے وعدہ کیا ہے کہ جلد ہی وقف کی جائیداد کو رنٹ کنٹرول سے مستثنٰی کر دیا جائے گا۔

وزیر اعلیٰ کی سفارش پر دھاگے کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کے پیش نظر بنکروں کو راحت پہنچانے کے لئے حکومت ہند کے توسط سے دھاگے کی خریداری میں پندرہ روپیہ فی کلوگرام کی سبسڈی دی گئی ہے۔

اقلیتوں کے لئے موجودہ ریاستی حکومت کی جانب سے لیے گئے ان فیصلوں اور اقدامات سے ان کی تعلیمی سماجی اور معاشی پس ماندگی دور ہو سکے گی۔

موجودہ حکومت نے جہاں اقلیتوں کے مفاد کے لئے متعدد فیصلے کیے ہیں وہیں سماج کے غریبوں، بے سہاروں، خواتین، درج فہرست اقوام و قبائل اور پس ماندہ طبقوں کی ترقی اور بہبودی کے لئے اعلیٰ پیمانے پر کارگر قدم اٹھائے ہیں۔

سرکاری ملازمت اور تعلیمی اداروں کے داخلہ میں درج فہرست اقوام و قبائل اور پسماندہ طبقوں کو بہتر مواقع فراہم کرنے کی غرض سے سرکار نے ان کے لئے معقول ریزرویشن کا انتظام کیا ہے۔ منڈل کمیشن کی سفارشوں کی اساس پر سرکاری ملازمت میں پس ماندہ طبقوں کیلئے ۲۷ فیصد اور درج فہرست اقوام و قبائل کے لئے ۲۲ فی صد جگہیں مختص کی گئی ہیں۔ درج فہرست اقوام کے ریزرویشن کا کوٹہ ۱۸ فیصد سے بڑھا کر ۲۱ فیصد کر دیا گیا ہے۔ اس طرح کے ریزرویشن کا بندوبست سکنڈری اسکول، سی۔ پی۔ ایم۔ ٹی، انجینیرنگ کالج، پالی ٹیکنک اور یونیورسٹیوں میں داخلے کے لیے بھی کیے گئے ہیں۔ اسی طرح پنچایتی راج اداروں اور نگر نگاموں میں خواتین کی حصّہ داری مقرر کرنے کے لئے

درج فہرست اقوام وقبائل اور پسماندہ طبقوں کے ساتھ خواتین کے لئے بھی ۳۳٪ ریزرویشن کیا گیا ہے۔

موجودہ حکومت نے ان طبقات کے افراد میں تحفظ کے جذبے کو قوی بنانے کو اہمیت دی ہے اور درج فہرست اقوام وقبائل اور خواتین کے خلاف ہونے والے جرائم پر کڑی نگرانی رکھی جا رہی ہے۔ ایسے واقعات کی روک تھام کے لئے اعلا سطحی جائزے کا انتظام کیا گیا ہے تاکہ ان پر روک کے لئے دباؤ بنا رہے۔

دوسری بار وزیر اعلا بننے کے فوراً بعد شری ملائم سنگھ یادو نے سب سے پہلے جو فیصلے کیے ہیں ان میں خواتین اور بچوں کے لئے ان کی ہمدردی اور نیک دلی جھلکتی ہے۔ ایسا ہی ایک فیصلہ تھا بلدیاتی محکمہ کی صفائی خواتین ملازمین کی ڈیوٹی کے اوقات کو صبح ۳۰۔۶ بجے کی جگہ ۳۰۔۸ بجے کرنا تاکہ وہ اپنے بچوں کو وقت سے تیار کر کے اسکول روانہ کر سکیں۔ اپنی گزشتہ حکومت کے دوران ہی بڑے پیمانے پر دیہی اجابت گاہوں کی تعمیر کا فیصلہ کر کے انھوں نے خواتین کی پاسداری کی۔

بے سہارا بیوہ اسکیم کے لئے گزشتہ سال کے مقابلے میں زیادہ رقم رکھی گئی ہے اور ۲۵۰۰۰ نئے معاملات کو منظور کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ اس سال ریاست میں سبھی مستحق معذور افراد کی پنشن منظور کر دی جائے گی۔

اقوام وقبائل درج فہرست کی ترقی و بہبود کے لئے اپنے وعدے کو ایفا کرتے ہوئے موجودہ ریاستی حکومت نے آئندہ پانچ برسوں میں پردیش میں درج فہرست اقوام کی اکثریت والے دس ہزار مواضعات کو امبیڈکر گاؤں کی شکل میں فروغ دے کر دیہی ترقیاتی اسکیموں کے تمام فائدے انھیں پہونچانے کا عزم کیا ہے۔ ریاست میں درج فہرست اقوام وقبائل کے حقوق کے تحفظ کے لیے ایک کمیشن بنانے کا بھی فیصلہ کیا گیا ہے۔ صفائی ملازمین کو کثافت ڈھونے کے رواج سے نجات دلانے کے لئے خشک اجابت گاہوں کی تعمیر پر پابندی لگا دی ہے اور ان کو فلش میں تبدیل کرنے کی غرض سے ایک کروڑ روپے فراہم کرائے گئے ہیں۔ درج فہرست اقوام مالیاتی اور ترقیاتی کارپوریشن کے توسط سے درج فہرست اقوام وقبائل کی بہبودی کے لئے چلائے جا رہے متعدد پیداگراسکیموں کے علاوہ ایک نئی اسکیم کی توضیح کی جا رہی ہے۔ درج فہرست اقوام وقبائل کے لوگوں کو ان کی بیٹیوں کی شادی کے لیے دی جانے والی امدادی رقم کو ایک ہزار سے بڑھا کر پانچ ہزار روپے کر دیا گیا ہے اس کے علاوہ تالابوں اور مٹی کے لیے زمین کے پٹے کمہاروں اور ماہی گیروں نیز برجاپتی طبقے کے لوگوں کو ہی دیئے جا رہے ہیں۔

ایک اور فیصلے کے تحت سرکاری دفاتر میں گملوں، صراحیوں اور گھڑوں کی خرید کمہار خاندانوں سے ہی کرنا لازمی کر دیا گیا ہے۔

قلیل مدت میں ریاست کی موجودہ حکومت نے غریبوں، دبے کچلے، پسماندہ طبقوں، خواتین اور اقلیتوں کے مفاد میں جو بھی کام کیے ہیں وہ اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ وزیر اعلا شری ملائم سنگھ یادو ایک دردمند دل کے مالک ہیں اور مذکورہ طبقوں کے افراد کی ترقی اور فلاح و بہبود کے سلسلے میں کس درجہ فکرمند اور پرعزم ہیں۔ بلاشبہ وہ ان طبقوں کے مسیحا کی شکل میں ابھرے ہیں۔

دودھان سبھا کے گزشتہ سیشن میں غریبوں کے لئے، کسانوں کے لئے، دبے کچلے طبقوں اور اقلیتوں کے لئے ایک دو نہیں بلکہ ۱۷ آرڈی نینس کا پاس کیا جانا اس بات کی زندہ مثال ہے۔

□□

اعلان

نیا دور کے اودھ نمبر کی جس طرح پذیرائی ہوئی ہے، اس کے لئے ہم اپنے قارئین کے ممنون ہیں۔

اودھ سے متعلق ابھی بہت سے پہلو تشنۂ تفصیل ہیں۔ لہٰذا اکتوبر، نومبر ۱۹۹۴ء کا مشترکہ شمارہ "اودھ نمبر حصہ دوم" کے عنوان سے شائع کیا جائے گا۔

——— ایڈیٹر

غزلیں

حصارِ جور میں گھر کر جو بچ گیا ہوں میں
لہو لہان مناظر کو دیکھتا ہوں میں

ضیاء سے جن کی ہے روشن تمام قصرِ حیات
انھیں چمکتے چراغوں کا سلسلہ ہوں میں

یہ مسلوں کی کڑی دھوپ کیا بگاڑے گی
سلگتی ریت پہ چلنا بھی جانتا ہوں میں

مٹا نہ پائے گی بیکس وجود کو دُنیا
کسی فقیر کی مانگی ہوئی دُعا ہوں میں

میں جانتا ہوں خود اپنے وجود کی قیمت
کسی فقیر خود آگاہ کی اَنا ہوں میں

زمانے پر بھی نظر ہے مری سعید مگر
کبھی خود اپنا تماشا بھی دیکھتا ہوں میں

—— ڈاکٹر سعید عارفی
قانون گو پورہ
بہرائچ
۲۷۱۸۰۱

بُتوں کی طرح سے پتھر پہ بیٹھ جاتے ہیں
جو لو لگائے ترے دَر پہ بیٹھ جاتے ہیں

نہ جانے کون سا جذبہ جگائے رکھتا ہے
ہم اُٹھ کے رات کو بستر پہ بیٹھ جاتے ہیں

تمام عمر نہ دھو پائے گا کوئی قاتل
لہو کے داغ جو خنجر پہ بیٹھ جاتے ہیں

درِ قفس جو کبھی بڑھ کے کھول دیتا ہوں
کئی پرند مرے سر پہ بیٹھ جاتے ہیں

بہت سے لوگ خود اپنی شکست سے پہلے
بھروسہ کر کے مقدر پہ بیٹھ جاتے ہیں

جنھیں بھی جرم کا احساس ہو گیا ناظم
جھکا کے سر کسی پتھر پہ بیٹھ جاتے ہیں

—— ڈاکٹر ناظم جعفری
حکیم جعفر روڈ
دال منڈی
وارانسی

پلکوں پہ لرزنے لگے اشکوں کے نگینے
احساس کی دہلیز پہ دستک دی کسی نے

زخموں کی بنا ڈالنے والا بھی وہی تھا
مرہم مرے زخموں پہ لگایا بھی اسی نے

کمھلائے ہیں کچھ پھول بہاروں میں چمن کے
ساحل کے قریب آکے بھی ڈوبے ہیں سفینے

دیکھو تو ذرا ندرتِ اعجازِ تبسم!
لاکھوں کو رُلایا ہے مری ایک ہنسی نے

ممکن تھا کہ لمحوں میں بدل جاتا مقدر
ہاتھوں کو مرے کھینچ لیا میری خودی نے

یہ آہ و بکا چھوڑ نکل کُنجِ قفس سے
صیاد نہ بدلا ہے نہ بدلے گا قرینے

تاریخ کے اوراق میں ڈھونڈو مجھے عزمی
تاریخ بدل دی ہے مری تشنہ لبی نے

□□

مہدی عزمی بھادوی
بھادر۔ شاہ گنج
ضلع جونپور

کبھی زمین کبھی آسمان سے نکلا
غموں کا سلسلہ دونوں جہان سے نکلا
تمہارا نام اچانک زبان سے نکلا
یہ ایک تیر بھی آخر کمان سے نکلا
تمام شہر کو گویا ملی گئی سب جیسے
جب ایک لفظ محبت زبان سے نکلا
میں اپنے قتل کی سازش میں پھنس گیا خود ہی
مرا گواہ جب اپنے بیان سے نکلا
اگر یہ سنگ پگھلتے نہیں سلیم اختر
تو کس طرح کوئی دریا چٹان سے نکلا

سلیم اختر سیتاپوری

شیخ سرائے سیتاپور

جب یادوں کا جنگل مہکا
پلکیں بھیگیں کاجل مہکا
جس نے جس نے پھول چرائے
اس کا اس کا آنچل مہکا
پریم نگر سے جب میں گزری
میرے جسم کا صندل مہکا
جب آئی بارات کسی کی
پنگھٹ پنگھٹ پیپل مہکا
شیریں تجھ کو کیا بتلائیں
کیسے زلف کا بادل مہکا

شیریں اسلم

۵/۱۳ کا ٹجو روڈ۔ الہ آباد

دل کو ان شوخ اداؤں سے لبھانے والے
تیرے دھوکے میں کبھی ہم نہیں آنے والے
خون کا رنگ تو ہر جسم میں یکساں ہے مگر
بات یہ بھول گئے خون بہانے والے
خون کی بو نہ کہیں راز کو ظاہر کر دے
اپنے ہاتھوں میں لہو میرا رچانے والے
تم تو گلزاروں کو صحرا میں بدلتے ہو مگر
ہم ہیں صحراؤں کو گلزار بنانے والے
نارِ نمرود سے کیا کیا کھلے گل اے رونق
بات یہ بھول گئے آگ لگانے والے

سید سجاد عالم رونق صفی پوری

قصبہ سلون ضلع رائے بریلی

غزلیں

حسن کی بستی کے سب چہرے یوں تو بہت بھڑکیلے ہیں
جسم تو جیسے پھول ہیں لیکن دل ان کے پتھریلے ہیں
آج بھی شاید ڈوب گیا ہو کوئی لپٹ کر موجوں سے
جس کے غم میں ساحل کے رخسار ابھی تک گیلے ہیں
جسم تو کیا ہے روح کا چہرہ بھی لگتا ہے مجھ کو سیاہ
گردشِ دوراں یہ تیرے ناخن کتنے زہریلے ہیں
آپ کے ہاتھوں زخم لگا تو درد کا بھی احساس نہیں
یادوں کے مرہم کا اثر ہے زخم بہت برفیلے ہیں
وقت کے ہاتھوں اتنی ضربیں کھائی ہیں میں نے یارو
روحِ حسن پر دیکھو آکر دھبے نیلے نیلے ہیں

حسن فتحپوری

ایچ ۱۸۔ برکت اللہ یونیورسٹی کیمپس بھوپال

ہوگا کبھی نہ ختم سفر آفتاب کا
سونا پڑا ہے اسلئے گھر آفتاب کا
اس تک کسی بشر کی رسائی نہ ہو سکے
اونچا بہت ہے اسلئے سر آفتاب کا
تم کو یقیں نہیں ہو تو تاریخ دیکھ لو
اک دن چڑھا تھا نیزے پہ سر آفتاب کا
وہ لوگ خوف کھائیں جو شبنم مزاج ہیں
میں نے تو پالیا ہے اثر آفتاب کا
تعبیر اس کی کیا ہے وصی ہم سے پوچھیے
دیدار خواب میں ہو اگر آفتاب کا

وصی جعفری

ماہنامہ "الجواد" بنارس

دوستوں کی محفلوں سے اب تو گھبراتا ہوں میں
زندگی کے اس سفر سے دل کو بہلاتا ہوں میں
اس نگاہِ ناز نے میری طرف دیکھا نہیں
پتھروں کو آئینے سے اب تو ٹکراتا ہوں میں
میرا دل شفاف ہے تم آئینے میں دیکھ لو!
آب ساکت پر ہمیشہ ہی نظر آتا ہوں میں
یہ تو بربادی ہے قسمت میں لکھا کچھ اور ہے
اس طرح حالات سے اب دل کو سمجھاتا ہوں میں
جو بھی ہیں اپنے پرائے سب کا مقصد ایک ہے
ایک ہر ہندوستاں محمود بتلاتا ہوں میں

محمود الحق محمود

اے ۶۸/۵۔ برما ریلوے کالونی لکھنؤ

نقد و تبصرہ

تبصرے کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: "مقالات ونشریات"
مصنف: کاظم علی خاں
قیمت: ایک سو پچاس روپے
ملنے کا پتہ: نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ۔ امین آباد لکھنؤ

اردو کے مشہور محقق کاظم علی خاں کا تازہ ترین مجموعۂ مضامین "مقالات ونشریات" جون ۱۹۹۴ء کے وسط میں شائع ہوا ہے۔ اس میں سولہ مقالات اور پانچ ریڈیو نشریات ہیں۔ یہ سب جنوری ۱۹۸۷ء سے مارچ ۱۹۹۱ء کے بیچ یعنی سوا چار سال کے عرصے میں وجود میں آئے۔

پہلا مقالہ "تحریکِ آزادی اور لکھنوی ادب" ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ لکھنؤ کے قدیم وجدید شاعروں اور نثر نگاروں کا تحریکِ آزادی میں کیا حصّہ رہا۔ مضمون معرکے کا ہے۔ کاظم علی خاں کے اسی مجموعے میں ایک نشریہ 'مثنوی حزنِ اختر' شامل ہے۔ اس میں کہیں بھی 'حزنِ اختری' نہیں لکھا۔ جبکہ وہ متن صہ۲۲ پر 'حزنِ اختر' لکھ کر صہ۳۶ پر حاشیے میں بحث کرتے ہیں کہ مثنوی کا صحیح نام 'حزنِ اختر' نہیں "حزنِ اختری" ہے۔

دوسرا مقالہ "اردو میں رواداری کی اہمیت" ہے۔ اس میں اردو شاعری سے قومی یک جہتی کے نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں قدیم شعرا کے اشعار بطورِ خاص بیش بہا ہیں۔ مضمون بہت ولولہ انگیز ہے۔ اسے پڑھ کر ہر قاری کسی نہ کسی حد تک افتراق کو چھوڑ کر اتحاد کی طرف مائل ہوگا۔

تیسرے مقالے کا طویل عنوان "اردو کے آئینۂ شعر وسخن میں ہندی کے خدوخال کی جلوہ گری" ہے۔ اس میں انھوں نے ایسے بہت سے اشعار درج کیے ہیں جن میں عربی فارسی کا ایک لفظ نہیں۔

چوتھا مضمون "اتر پردیش میں اردو لوک گیتوں کی روایت" ہے۔ لوک گیت سے کیا مراد ہے؟ میری رائے میں لوک گیت ان عوامی گیتوں کو کہتے ہیں جن کے مصنف کا علم نہیں۔ کاظم علی خاں نے 'امانت لکھنوی کے لوک گیت'، 'واجد علی شاہ اختر کے لوک گیت'، 'آغا حشر کے لوک گیت' جیسے عنوانات قائم کیے ہیں۔ میری رائے میں ان میں سے لفظ 'لوک' حذف ہونا چاہیے۔

پانچواں مضمون "واقعۂ کربلا اور اردو مرثیہ میں روایت نگاری کی روایت" ہے۔ اس میں مراثی میں ضعیف اور درست روایتوں کے فرق کو موضوع بنایا گیا ہے۔

چھٹا مضمون "مرزا دبیر کے غیر مطبوعہ مراثی: بعض غلط فہمیوں کا ازالہ" ہے۔ دبیر کے محققین میں ڈاکٹر اکبر حیدری، ڈاکٹر محمد زماں آزردہ اور ڈاکٹر کاظم علی خاں سرِ فہرست ہیں۔ کاظم علی خاں نے مضمون کے آخر میں دبیر کے چند غیر مطبوعہ مراثی کی نشان دہی کی ہے۔

ساتواں مقالہ "مولانا ابوالکلام آزاد اور اردو زبان" ہے۔ حبیب احمد صدیقی نے 'نیا دور' لکھنؤ کے اکتوبر ۱۹۶۶ء اور ستمبر ۱۹۶۸ء کے شماروں میں مولانا آزاد کی اردو پر اعتراضات کر کے اردو دنیا میں کھلبلی مچادی۔ کاظم علی خاں اس پر بپھرتے ہیں لیکن حبیب احمد کے کسی اعتراض کو لے کر اس کا جواب دینے کے بجائے مولانا کا یہ دفاع کرتے ہیں کہ اردو ان کی مادری زبان نہیں تھی، اکتسابی زبان تھی۔

اگلا مضمون "سر سید اور ابوالکلام آزاد: فکری اتحاد واتفاق کے چند پہلو" ہے۔ سر سید اور مولانا آزاد کے راستوں کو الگ الگ سمجھا جاتا ہے لیکن کاظم علی خاں نے ڈھونڈ بھال کر آزاد پر سر سید کے اثرات تلاش کر لیے۔

نواں مضمون "غزلیاتِ جگر مرادآبادی کا تجزیاتی جائزہ" ہے۔ یہ مضمون تنقیدی سے زیادہ تحقیقی ہے۔

اس کے بعد "ریختی: تاریخ اور تنقید کی روشنی میں" ہے۔ اس مضمون میں لکھتے ہیں کہ "ہاشمی سے پہلے بھی دکن میں متعدد ریختی گو شعرا ہوئے ہیں"۔ ان میں شہباز حسینی اور ملک خوشنود کو بھی شامل کرتے ہیں۔

گیارھواں مضمون "ہندستانی نشاۃ ثانیہ کے خدوخال" ہے۔

جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے [illegible] سے متعلق ایک مضمون [illegible]
ہے۔ ضروری ہے کہ اردو ادب کو محض فکشن اور شاعری تک محدود نہ رکھا
جائے بلکہ معاشرے کے [illegible] اور علمی مسائل کی طرف بھی توجہ دی
جائے۔ سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کب قائم ہوئی اس کے بارے میں
غالب [illegible] ص ۳۲۶-۳۲۷ پر معلومات کا جو ہیرا پھیلا ہے وہ
قابل ملاحظہ ہے۔

بارھواں مضمون "غالب شناسی اور مولانا حسرت موہانی" ہے۔ اس کی
ابتدا ہی میں لکھتے ہیں: "حسرت موہانی (ولادت ۱۸۸۱ء۔ وفات مئی ۱۹۵۱ء)"
کاظم علی خاں کا مرغوب شیوہ ہے کہ جس ادیب کا ذکر کرتے ہیں ان کے
سنین ولادت و وفات اَز بدا کر ضرور لکھ دیتے ہیں۔

تیرھواں مضمون "غالب اور محمد حسین آزاد" ہے۔ یہ مضمون اچھا اور تحقیقی
ہے۔ اس میں اوّل دہلی اردو اخبار میں سائی اجراء سے ۱۸۵۵ء تک
غالب کی ۱۷ اردو فارسی غزلوں، قصیدوں اور دوسری نظموں کی اشاعت کی
تاریخیں دی ہیں۔

اگلے دو مضامین غالب کے خطوط سے متعلق ہیں۔ یہ کاظم علی خاں کے
مطالعے کا میدان اختصاص ہے۔ پہلا مضمون "مکاتیب غالب مرتبہ
مولانا عرشی، ایک جائزہ" ہے۔ اس میں انھوں نے مکاتیب کے مختلف
ایڈیشنوں میں اضافوں کی نشان دہی کرتے ہوئے بتایا کہ چوتھے ایڈیشن
۱۹۴۹ء کے بعد مزید اضافے نہیں ہوئے۔

پندرھواں مضمون "خطوط غالب کی اہمیت و افادیت" ہے۔ اس مضمون
میں بہت سے تاریخی اور تحقیقی نکات کی نشان دہی کی ہے۔ مثلاً حواشی
ص ۳۱۹ میں عقد غالب کی تاریخ کے بارے میں مختلف راویوں کی مندرجہ
مختلف تاریخوں کا ذکر کرتے ہیں۔

سولھواں مضمون "خطوط قاضی عبدالودود بنام کاظم علی خاں" ہے۔
اس میں قاضی صاحب کے ۱۷ خطوط اور ان پر مختصر حواشی ہیں۔

کتاب کے آخر میں طویل کتابیات بھی ہے اور مفصل اشاریہ بھی۔
آخر میں ان کی ۲۲ مطبوعہ اور تین زیر طبع کتابوں کی فہرست ہے کتابوں
میں زیادہ تر مرتبات ہیں۔

کاظم علی خاں کی دو شخصیتیں ہیں۔ ملاقاتوں میں وہ ایک خاص کی گفتار
[illegible]
میں وہ ایک بالغ نظر ادیب [illegible] کے طور پر [illegible]
[illegible] ہے۔ میں
ایک بار پھر اپنے اس احساس کا اعادہ کرنا چاہتا ہوں کہ کاظم علی خاں
[illegible] کی [illegible]

مقالات دلچسپ [illegible] ہے [illegible] روشنائی بہت
سے مقالات پر پھیکی ہے۔ ۳۳۲ صفحوں کی اس کتاب کی قیمت ۱۵۰/-
روپئے ہے۔

—— گیان چند

نام کتاب: "افکار محروم"
مرتبہ: مالک رام — قیمت: ستر روپئے
ملنے کا پتہ: انجمن ترقی اردو ہند۔ راؤز ایونیو۔ اردو گھر
نئی دہلی

"افکار محروم" مختلف لوگوں سے مختلف موضوعات پر لکھائے گئے
مقالات کا مجموعہ ہے جس میں تلوک چند محروم کی شاعری کے مختلف اقسام
مثلاً غزلوں، نظموں، رباعی، فارسی گوئی، قومی شاعری اور بچوں کے محروم
پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن، عرش ملسیانی، علی جواد زیدی
ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر خلیق انجم نے گراں قدر مضامین لکھے ہیں۔

ادیب اپنے زمانے کا نباض ہوتا ہے اور ہر ادیب اپنے زمانے کا
عکاس ہوتا ہے۔ تلوک چند محروم نے جس زمانے میں آنکھیں کھولیں اس
وقت ہماری قومی زندگی پر مغربی حکومت اور تہذیب کے گہرے اثرات پڑ رہے
تھے جس کا اثر محروم پر بھی پڑا۔ ان کی قومی شاعری اسی ماحول کی دین ہے۔
تلوک چند محروم مذہب اور روحانیت کے قائل تھے۔ دنیا
کے ساتھ انھیں آخرت کی بھی فکر تھی۔ ان اثرات کے تحت انھوں نے
مختلف مذہبی رہنماؤں کے بارے میں بہت اچھی نظمیں کہی ہیں۔ مذہب
کچھ بھی ہو مگر ہر انسان ایک دوسرے انسان کی ہمدردی کا مستحق ہے۔
ان کی نظموں میں عالمگیر انسان دوستی کا جذبہ صاف جھلکتا ہے۔ وہ سکون تو
تلاش کرتے ہیں مگر جب خود غرض دنیا سے مایوس ہوتی ہے تو گوشۂ تنہائی

تلاش کیے گئے ہیں۔

مرحوم کا اُن دانشوروں کے افکار میں اہم مقام ہے۔ ان کی نظمیں گوناگوں محاسن کی حامل ہیں۔ مرحوم صاحب کون کی نفسیات سے واقف تھے۔ وہ وطن کی محبت سے سرشار دیارِ غیر میں وطن کو یاد کر کے کہتے ہیں ؎

اے صبحِ وطن تری صباحت ہے اور
مقصان ہر اک کرن میں طلعت ہے اور
نظارے سے تیرے آج یہ معلوم ہوا
صبحِ وطن اور صبحِ غربت ہے اور

کتاب کے آخر میں کوک چند محروم کے فرزند پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا مضمون "محروم میرے والد صاحب" بہت ہی جذباتی اور معلوماتی ہے۔

رفیق احمد خاں ———

نامِ کتاب: "تیسرا سفر" (شعری مجموعہ)
شاعر: نذیر فتحپوری قیمت: ۴۰/- روپئے
ملنے کا پتہ: اسباق پبلی کیشنز ۱۴۳/۳، ایرواڑہ
پونہ - ۶

نذیر فتح پوری گذشتہ چند برسوں میں ادبی افق پر ابھرنے والی آواز کا نام ہے۔ "تیسرا سفر" ان کا نیا مجموعۂ کلام ہے۔ اس سے پہلے بھی ان کے شعری مجموعے آچکے ہیں۔ مختلف جرائد میں بھی ان کی نگارشات شائع ہوتی رہی ہیں۔

نذیر نے اپنی غزلوں میں انسانیت اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ انھوں نے زندگی اور اس کے تقاضوں کو چھان پھٹک کر دیکھنے کی سعی کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں پیار کی خوشبو، جذبات کی جولانی، فکر کی روانی اور مشاہدات کی وہ چمک ہے جو ذہن کو چھوتی ہوئی دل میں اتر جاتی ہے ؎

میں تری کہانی کا مرکزی ستارہ ہوں
میرے نام بھی کوئی انتساب لکھ دینا

شاعرانہ تجربے کے اظہار کے ہزاروں پہلو ہو سکتے ہیں۔ لیکن زندگی و انسانی تقاضوں اور فطرت کی رنگا رنگی کی طرح انھیں کسی ایک اصول یا نظریے کے فریم میں جوڑا نہیں جاسکتا۔ نذیر فتحپوری کا شعری مجموعہ استعاروں اور حسی پیکروں سے اٹا ہے ان میں خوشبو، چہرا، صحرا، دریا، شہر، دشت، شجر، سایہ، پیاس، دھوپ، رات اور سورج مرکزی حیثیت رکھتے ہیں جن کی مدد سے اپنے تجربے کی وہ تخلیقی دیوار کھڑی کرتے ہیں کہ جس کا سایہ اجتماعی حیثیت بن کر دور تک پھیل جاتا ہے ؎

ہم اہلِ درد کبھی رائیگاں نہیں ہوتے
سلگتے رہتے ہیں لیکن دھواں نہیں ہوتے

نذیر فتحپوری کی شاعری کا مجموعی تجزیہ و تاثر ان کے اندازِ بیان و فکری آہنگ کی گواہی دیتا ہے۔ انھوں نے عصری حسیت، غزل کے ہمہ رنگ اسلوب کو جدید لب و لہجہ اور نئی علامتوں کے ساتھ دریافت کیا ہے۔

"تیسرا سفر" مطالعہ کے لئے خوبصورت دعوتِ فکر دیتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان کے تیسرے سفر سے کہیں زیادہ روشن چوتھا سفر ہوگا۔ وہ یہ سفر کر کے تو دیکھیں۔

شبنم نقوی ———

نامِ کتاب: "افسانے کے معمار"
مصنف: ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی ۔ قیمت: ۴۰/- روپے
ملنے کا پتہ: (۱) مکتبۂ جامعہ دہلی کی تینوں شاخیں
(۲) نصرت پبلشرز ۔ حیدری مارکیٹ، امین آباد
لکھنؤ

ادھر بہت دنوں سے اُردو کی زیادہ تر کتابیں ۱۸×۲۲ کے سائز پر شائع ہو رہی ہیں لیکن زیرِ تبصرہ کتاب اس عام روئیے کے برعکس ۲۰×۳۰/۱۶ کے چھوٹے سائز کے بارہ فارم پر، خوبصورت کتابت، بے داغ طباعت اور چالیس روپئے کی معقول قیمت کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔

کتاب اپنی قدر و قیمت کو منوانے میں پوری طرح کامیاب رہی، مگر ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی نے ہمارے ان فن کاروں کو اُردو افسانے کے میر تقی میر اور منشی پریم چند کی صف میں کھڑا کرنے کی کوشش کی ہے جہاں رام لعل اور شیطر پردیپ کی بغل میں کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی کے تابناک چہرے بھی جگمگا رہے ہیں۔

پریم چند کو ۲۶، کتابیات کو ۴، کرشن چندر کو ۱۹، کتابیات کو ۲،
راجندر سنگھ بیدی کو ۹، کتابیات کو ۱، رام لعل کے فکروفن کو ۸، ان کے
اشاریے کو ۲۳، بانو قدسیہ کو ۸، ان کے خطوط تصاویر اور شجرے کو ۴،
بشیشر پردیپ کو ۲۴، ان کے اشاریے کو ۱۳، ان کے خطوط تصاویر شجرے
اور کتابیات کو ۹، ڈاکٹر ظہیر کے ایک مضمون کو ۲۲، کتابیات کو ۲، کتاب کی
رسمی ضرورتوں کو ۶، اور نہ جانے کیوں علی عباس حسینی کو چار صفحات دیئے گئے
ہیں۔

پریم چند، کرشن چندر اور بیدی کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لکھا جا رہا ہے اور کل بھی لکھا جائے گا۔ رام لعل اپنی شخصیت کے معاملے میں گراں فروش ہیں، وہ اپنی قیمت جانتے ہیں۔ کئی لوگوں کو اپنے فن اور شخصیت کے بارے میں سوچنے اور لکھنے کی طرف مائل کر چکے ہیں۔ بشیشر پردیپ اپنے روپوں میں بیراگی ہیں، چاہتے ہیں دوسرے خود اپنے بل بوتے پر انھیں سمجھنے کی کوشش کریں

——— انور ندیم

نام کتاب: "حیاتِ جاوداں"
مصنف: رضوان بنارسی
ملنے کا پتہ: آبجواد بک ڈپو، پرہلاد گھاٹ، وارانسی

"حیاتِ جاوداں" جناب رضوان بنارسی کا سلام و نوحوں کا مجموعہ ہے جس میں کچھ قطعات بھی شامل ہیں۔

یہ امر مسلّمہ ہے کہ انسان کی زندگی میں غم کا عنصر زیادہ ہے اس لیے آدمی بہ نسبت خوشی کے غم کا اثر جلد قبول کر لیتا ہے اور جب اسے واقعۂ کربلا کے پس منظر میں دیکھا جائے تو اس کی افادیت بہت بڑھ جاتی ہے۔

اردو ادب کی تو ابتدا ہی غم شہید کربلا سے ہوئی۔ آج اتنی صدیاں گزرنے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ نوحہ تو ہے ہی غموں کے بیان کے لیے لیکن غزل بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ رضوان صاحب نے جو نوحے لکھے ہیں وہ اچھے ہیں لیکن ابھی مشق کی ضرورت ہے۔

ویسے عقیدہ تو یہی ہے کہ ان کے یہی چند اشعار جو نوحہ و سلام کی

شکل میں ہیں ان کی بخشش کا ذریعہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ شعر ملاحظہ ہو:

امام تو نہیں شانِ امام ہے زینب
حسینیت کا مکمل پیام ہے زینب

——— فاطمہ وصیہ جائسی

نام کتاب: "اردو صحافت کا استغاثہ"
مصنف: پروانہ ردولوی قیمت: ساٹھ روپئے
ملنے کا پتہ: جاپلنگ ہاؤس، ۱۴۵، حوض رانی، مالویہ نگر
نئی دہلی

اس کتاب کا نام "اردو صحافت کا استغاثہ" ہے اور استغاثہ کا لفظ پرجوش انداز بیان، خطیبانہ لہجہ، دلائل کے ساتھ اپنی بات منوانے کے جذبے کا مطالبہ کرتا ہے۔ اور یہ ساری خوبیاں اس کتاب میں ہیں۔ اس میں ایک بے حد دلچسپ تکنیک اختیار کی گئی ہے یعنی ۱۹ عنوانات ہیں۔ ہر عنوان کے تحت جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اپنی جگہ پر مکمل ہے۔ لیکن اگر یہ عنوانات ہٹا دیئے جائیں یا برقرار بھی رکھے جائیں تو بھی انھیں ایک کتاب اور مسلسل مضمون کی حیثیت حاصل ہوگی۔ ابتدا میں جناب شمس کنول اور جناب شمیم اختر نے "دیباچہ" اور "اردو زبان کا مقدر" کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے اس سے اختلاف کرنا مشکل ہے۔ لیکن اس سے اہم بات یہ ہے کہ دونوں حضرات نے اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے وہی لہجہ اختیار کیا ہے جو پروانہ ردولوی کا ہے۔ پروانہ ردولوی نے جو لہجہ اختیار کیا ہے اس کا اندازہ اس اقتباس سے لگا لیجیے:

"مجھے کسی کے دکتور بننے پر کوئی اعتراض نہیں ہے
اعتراض اس بات پر ہے کہ جس کو دیکھئے وہ اردو صحافت کا
امام غزالی بنا پھر رہا ہے!"

اس طرح کے فقروں میں صرف طنز و تعریض نہیں ہے بلکہ عالمانہ شان بھی ہے یہ فقرہ اسی کو لکھنے کا حق حاصل ہے جس نے امام غزالی کو پڑھا ہو اور پروانہ صاحب نے پڑھا ہے۔ مثلاً:

یہی نہ ہوگا کہ در در کی خاک چھانیں گے
بس اور اے دلِ خانہ خراب کیا ہوگا

یہ شعر قریب قریب سب کو یاد ہے لیکن یہ کسے معلوم کہ یہ شعر دہلی کے مجذوب شاعر نواب حسن کا ہے۔ انھوں نے منشی سدا سکھ لال (اُردو کے پہلے صحافی) کو جس طرح خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اور اُردو کے پبلشر ہری ہردت کے بارے میں جس طرح لکھا ہے وہ بےحد اہم اور قیمتی ہے۔

انھوں نے گروپکی چندن کے حوالے سے جام جہاں نما ۲۶-۱۸۲۵ء کے کچھ اقتباسات بھی دیئے ہیں جلا شبہ خاصے کی چیز ہے۔ اس وجہ سے کہ جام جہاں نما کا تذکرہ تو ادب کے طالب علموں نے پڑھا ہے مگر اس کی تحریر پڑھنے سے کم ہی لوگ مشرف ہوئے ہیں۔

مولوی محمد باقر شہید (اُردو کے پہلے مجاہد اور شہید صحافی جن کے قلم نے گولا اگلتی ہوئی توپوں کو دعوت مبارزت دی) کے بارے میں لکھتے ہوئے پرواز صاحب نے اپنے خونِ دل سے چراغ روشن کیا ہے اور پھر قلم اٹھایا ہے۔

ان کی اکثر باتوں سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ لطحتا اور جھلا ہٹ میں انھوں نے اُردو کے تمام پروفیسروں کو قلم کے بجائے نوکِ خار سے ہدف بنایا ہے۔

یہ استغاثہ بہت خوب ہے۔ کتابت و طباعت معیاری ہے۔

——— ڈاکٹر اقبال احمد اعجازی

نام کتاب: **ہرے زخم کی پہچان**
مصنف: شائستہ فاخری قیمت: چالیس روپے
ملنے کا پتہ: انجمن تہذیبِ نو
——— الہ آباد

"ہرے زخم کی پہچان" شائستہ فاخری کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے مگر اُردو میں یہ ان کا پہلا مجموعہ ہے جس میں تیرہ افسانے کربلا گراؤنڈ سے خالی گھونسلے تک شامل ہیں۔

ان کے افسانوں کو حسیات کے افسانے بھی کہہ سکتے ہیں کیوں کہ ان میں فطری مناظر کی دل کشی اور نرالی عکس بندی ہے۔ ان کے افسانوں میں ذات اور شعور کا ذکر برابر سے ہے۔ دونوں تصورات ان کے یہاں ہم معنی ہیں اور وہ ہر حالت میں اپنے شعور کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں گہرائی اور ضبط و توازن کا بھی احساس ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے زندگی کے مانوس تجربات کے اظہار کے لئے شائستہ کسی نئے پیرایۂ اظہار کی متلاشی ہیں اور ان میں انھیں کہیں کہیں غیر معمولی کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ان کے ذہن میں کوئی لاوا ابلتا رہتا ہے جس کی عکاسی ان کا افسانہ بن جاتا ہے۔

انھوں نے ایک ایک لمحے کو شدت سے محسوس کر کے گزارا ہے اور بعض لمحے تو ایسے ہیں جو اپنے آنے والے لمحوں میں شامل ہو گئے ہیں اور یہی ان کے افسانوں کا بنیادی تجربہ بن کر سامنے آتا ہے اور اسی تجربے نے ان کے تخلیقی عمل کو ایک ایسے سانچے میں ڈھال دیا ہے جو صرف کسی سچے اور کھرے افسانہ نگار کا ہی ہوتا ہے اسی لئے وہ مجھے ہمیشہ اپنی عمر سے بہت بڑی نظر آتی ہے۔

——— عتیق الہ آبادی

غزل

مرے سلگتے لبوں پر یہ پیاس رہنے دو
ابھی حیات کو صحرا شناس رہنے دو

میں زندگی کے ہر اک فلسفے سے واقف ہوں
مجھے فریبوں کے ہی آس پاس رہنے دو

کرو نہ قید خوشی کے گھروندے میں مجھ کو
غمِ زمانہ میں کچھ تو اُداس رہنے دو

چراغِ راہ بنیں گے یہ نسلِ نو کے لئے
مری کہانی کے کچھ اقتباس رہنے دو

ابھی صدا نہ دو احسن کو تم صلیبوں سے
حیات کی ہے جو تھوڑی سی آس رہنے دو

——— نواب احسن
۱۵۴/۲۲۶ - بخشی بازار، الہ آباد

تاثرات کے آئینے میں

"نیا دور" کے دونوں اودھ نمبر دیکھے۔ آپ نے نہ صرف یہ کہ اس میں بہت اچھے مضامین اکٹھا کر دیئے ہیں بلکہ اسے ایک بے حد کارآمد اور خوبصورت نمبر بنا دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ فراق نمبر کے بعد بہت دنوں میں ایسا خوبصورت اور کارآمد نمبر "نیا دور" کا نکلا ہے۔ ضمیمے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی شاید آپ کے پاس اودھ کے سلسلے میں اور مسالہ ہے، اسے بھی شائع کر دیجئے تو اودھ اور واجد علی شاہ یا دیگر شاہان اودھ پر اچھا خاصہ مسالہ اکٹھا ہو جائے گا۔ ایک زمانے میں مجھے بھی اودھ کے متعلق بڑی دلچسپی تھی، مجھے ایک قلمی کتاب "اودھ بلیو بک" مل گئی تھی۔ یہ وہ کتاب ہے جو بادشاہ واجد علی شاہ نے اپنے اوپر لگائے گئے الزامات کے جواب میں ملکہ عالیہ انگلستان کو بھیجی تھی جس میں تمام الزامات کی تردید ہے۔ اگر آپ اس کتاب کو قسط وار شائع کر دیں تو واجد علی شاہ پر کام کرنے والے بہت سے طلباء کا فائدہ ہوگا۔ واجد علی شاہ کے خلاف انگریزوں نے جو الزامات لگائے تھے سب کا جواب اس میں موجود ہے۔

ضمیمے والے نمبر میں مظفر علی صاحب کے مضمون "واجد علی شاہ کا لکھنؤ" میں دو جگہوں پر لکھا ہے کہ واجد علی شاہ راجہ اندر بنتے تھے، بلکہ ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ امانت کی اندر سبھا میں واجد علی شاہ نے کام کیا تھا۔ عبارت یوں ہے:

"سرخ پردہ ہٹتے ہی اندر (واجد علی شاہ راجہ اندر کے کردار میں) اپنے جاہ و جلال میں نظر آتے ہیں۔"

یہ درست نہیں ہے۔ واجد علی شاہ کبھی راجہ اندر نہیں بنے، اور پھر امانت کی اندر سبھا میں بادشاہ کا پارٹ ادا کرنا بالکل بے بنیاد اور لغویات ہے۔ یہ تفصیل مظفر علی صاحب کو کہاں سے ملی؟ میرے علم میں اضافہ ہوگا اگر مظفر علی صاحب اپنے ماخذ کی نشان دہی کر دیں۔

——— پروفیسر سید محمد عقیل الہ آباد

[illegible] کا اودھ نمبر [illegible] رسالہ پڑھ کر دیکھا، اودھ کے [illegible] عشقیہ کی شخصیت اور [illegible] اندر سبھا کو دیکھ کر جی خوش ہوگیا۔ صوری اور معنوی اعتبار سے بہت جاذب نظر اور معلومات افزا نمبر ہے۔ اب اس میں دو رائیں نہیں کہ آپ نے نیا دور کو نئی زندگی دی ہے اور واقعی اس کا ایک "نیا دور" شروع ہو گیا ہے۔

اودھ کی ثقافت اور تہذیب پر یہ نمبر ایک دستاویزی حیثیت رکھتا ہے اور بلا شبہ حوالے کا کام دے گا۔ بہت بہت مبارکباد۔

——— منظر اعظمی دہلی

نیا دور کا اودھ نمبر بڑا خوبصورت چھپا ہے اور لکھنوی تہذیب کے تعلق سے متنوع اور اہم مضامین کا حامل ہے جنھیں آپ نے بڑی لگن اور ذہانت سے ترتیب دیا ہے۔ اسے پاکر میں اس لئے بھی خوش ہوں کہ بعض معلومات کی مجھے ایک مدت سے تلاش تھی وہ سب مجھے اس اشاعت میں فراہم ہو گئی ہیں۔

میں نے آپ کا یہ تہذیبی دستاویز اول تا آخر نہایت دلچسپی سے پڑھا ہے اور اس کام کی انجام دہی پر آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

——— جوگیندر پال نئی دہلی

نیا دور کا اودھ نمبر ملا، شکریہ! بھئی آپ نے کمال کر دیا۔ تہذیب و تاریخ اودھ پر اتنا شاندار اور اتنا جامع، بسیط اور معلوماتی نمبر شائع کرنا کسی بھی طور پر آسان کام نہیں تھا۔ آپ اور آپ کے اشاعت کی عرق ریزی اور جذبۂ جستجو اس عظیم شمارے کے ہر ورق سے عیاں ہے۔ ہر ایک تحریر معیاری ہے۔ آپ نے ایک اہم تاریخی اور ادبی خدمت انجام دی ہے۔ میری دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔

——— م۔م۔ راجندر دہلی

نیا دور کا اودھ نمبر اتنا خوبصورت ہے کہ میں ایک عرصہ تک اس کے سوا کسی اور رسالے کے سحر میں مبتلا ہونا نہیں چاہتا۔ آپ کی محنت ہر صفحہ پر روشن نظر آتی ہے۔ اتنے سلیقے سے بہت کم لوگ نمبر نکالتے ہیں۔ یہ نمبر نیا دور کو صف اول کے رسالوں میں کھڑا کر دے گا۔ میری جانب سے مبارکباد۔

——— ساجد حمید شموگا

اودھ نمبر حصہ دوم

عنوانات

○ حرفِ چند ——— اتل نگائی ——— ۳
○ اپنی بات ——— ایڈیٹر ——— ۴
○ پیغام ——— گورنر اتر پردیش ——— ۶
○ پیغام ——— وزیر اعلیٰ ——— ۷
○ پیغام ——— مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ——— ۸
○ غزل ——— مجروح سلطان پوری ——— ۹
○ بشمبھر ناتھ پانڈے سے ایک ملاقات (ادارہ) ——— ۱۰
○ تجدیدِ الفت کا ترانہ : آنند نرائن مُلّا سے ایک ملاقات ——— ۱۲
——— سید امجد حسین
○ شہر آرزو ——— ۱۶
——— قرۃ العین حیدر
○ سلطنت اودھ کا توقیت نامہ ——— ۱۹
○ لکھنؤ : کچھ یادیں، کچھ باتیں ——— ۲۰
——— پروفیسر آل احمد سرور
○ یادوں کی رہ گزر ——— ۲۹
——— علی جواد زیدی
○ غزل ——— خمار بارہ بنکوی ——— ۳۸
○ لکھنؤ : قصبے سے شہر ہونے تک ——— ۳۹
——— نورالحسن ہاشمی
○ داستان امیر حمزہ : بعض ابتدائی باتیں ——— ۴۱
——— شمس الرحمٰن فاروقی

اودھ میں فنِ سپہ گری ———— ۴۸

اودھ میں عزاداری ———— ۵۶

اودھ: جغرافیائی اور تہذیبی پس منظر ———— ۶۷

اودھ میں ادبی صنّاعی ———— ۸۹

شامِ اودھ (نظم) ———— ۱۰۳

اودھ پنچ اور اس کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری ———— ۱۰۴

اودھ کے نامور تاریخ نگار ———— ۱۰۸

لکھنؤ کا گم شدہ دسترخوان: چند پہلو ———— ۱۲۱

فیض آباد: ماضی و حال کے آئینے میں ———— ۱۲۵

سیّد اشرف جہانگیر سمنانی ———— ۱۳۲

لکھنؤ (نظم) ———— ۱۳۶

اودھ اور اطراف کی چند انوکھی اردو مطبوعات ———— ۱۳۷

سلطنت اودھ کے غیر مسلم منصب دار ———— ۱۴۶

مُرقّع اودھ: ایک نادر تصویر نامہ ———— ۱۵۰
تنویر احمد علوی

لکھنؤ کے تفریحی مشاغل ———— ۱۵۴
وقار ناصری

ندوۃ العلماء کا تاریخی پس منظر ———— ۱۶۲
نذر الحفیظ ندوی

غزل ———— ۱۶۷
عرفان صدیقی

لکھنؤ کے پھیری والے ———— ۱۶۸
[illegible] مسعود

خوش نویسانِ اودھ: احوال و آثار ———— ۱۷۴
علی احمد دانش

اودھ کے ستار نواز: لکھنؤ گھرانہ ———— ۱۷۷
نجمہ آرا خاں

نیشاپوری نوابوں کے عہد میں اودھ کا انتظامیہ ———— ۱۸۰
پروین طلحہ

نوابینِ اودھ کے زیورات اور لباس ———— ۱۸۲
اشفاق احمد خاں

شامِ اودھ (نظم) ———— ۱۸۸
مصطفیٰ زیدی وفا

بیگماتِ اودھ کا درخشاں کردار ———— ۱۸۹
کرشن لال

حضرت محل پارک کی تاریخی وجہ تسمیہ ———— ۱۹۱
پرنس انجم قدر

انیسویں صدی کا لکھنؤ ———— ۱۹۵
سید امجد حسین

حرفے چند

انسان کی تخلیقی قوتوں کا سب سے بڑا کارنامہ زبان کی ایجاد ہے ـــــ زبان نہ ہوتی تو انسانی سماج گونگوں بہروں کی دُنیا میں بدل جاتا۔ یہی زبان ـــ یہی لفظوں کی دُنیا جانوروں اور انسانوں میں فرق پیدا کرتی ہے اور یہ بھی زبان ہی کا چمتکار ہے کہ آج تجارت، صنعت و حرفت، ایجادات اور فنونِ لطیفہ اپنا وجود رکھتے ہیں۔ زبان ہی سے تہذیب کی پہچان ہوتی ہے اور تہذیب کے خد و خال اُبھرتے ہیں۔

زبان ہی ایک دوسرے کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ سچ یہ ہے کہ زبان کا اصل مقصد دلوں کو جوڑنا اور نفرت کی دیواروں کو توڑنا ہے۔ زندگی میں پیار کی مٹھاس بھرنا اور ہر طرح کی کڑواہٹ کو نکال پھینکنا ہی زبان کا اصلی مقصد ہے چاہے وہ کوئی بھی زبان ہو۔

اُردو زبان بھی پیار، محبّت والی یک جہتی اور تہذیب کی زبان ہے۔ اس پر بحث کرنا کہ یہ دکن میں پیدا ہوئی کہ پنجاب میں کہ ہریانہ میں یا پھر یہ کھڑی بولی کا ایک رُوپ ہے ـــــ ماہرینِ لسانیات کا کام ہے۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ یہ زبان اسی دیس کی ہے اور خاص طور سے ہمارے اترپردیش کی ہے۔ یہ گنگا جمنا گومتی، سرجو کی لہروں سے دُھلی ہے اور اس میں جو خوشبو ہے وہ گلاب کی بھی ہے اور ساتھ ہی ساتھ بیلا چنبیلی، جُوہی، کیتکی اور تلسی کی بھی ہے۔ یہ ہمارے آبا و اجداد کی عطا کی ہوئی اور شان دار اور قیمتی وراثت ہے جس پر آج ہم فخر کرتے ہیں اور خوشی کی بات ہے کہ اُردو کو اترپردیش اور اودھ سے خاص تعلق رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اُردو کے حُسن میں جو سلوناپن ہے وہ شامِ اودھ کی دین ہے اور اودھی کا جو اثر اس پر نظر آتا ہے اس نے اس زبان کے رُوپ کو اور نکھار دیا ہے۔

ہمیں اس کا احساس رہتا ہے کہ ادب صرف کچھ اچھے اشعار یا کہانیوں کا ہی نام نہیں ہے بلکہ ادب ہی کے ذریعے ہم کسی عہد یا کسی دور کے تہذیبی خد و خال کو پہچان لیتے ہیں اور ادب ہی کے ذریعے سے ہمیں تاریخ کی ان کڑیوں کا بھی پتہ چل جاتا ہے جن پر کبھی کبھی وقت کا پردہ پڑ جاتا ہے۔

کچھ دنوں پہلے ہم نے اودھ نمبر پیش کیا تھا۔ اس کے بعد بھی کچھ مضامین رہ گئے تھے جو بعد کے شماروں میں شائع ہوتے رہے۔ جب میں نے اودھ نمبر کے اس سلسلے کا مطالعہ کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ ع

ـــــ اب بھی کہنے کو بات باقی ہے ـــــ

بہت سارے گوشے ایسے رہ گئے تھے جن پر لکھا جا سکتا تھا۔ مجھے بیحد خوشی ہے اور اپنے نوجوان ایڈیٹر نیا دور سیّد امجد حسین پر فخر ہے کہ انھوں نے اس نمبر میں ادب کے جگمگاتے ہوئے ستاروں کو اکٹھا ہی نہیں کیا بلکہ فرمائش کر کے ان ماہرین سے ایسے موضوعات پر مضامین لکھوائے جن پر نہیں لکھا گیا تھا۔

یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اودھ کے سلسلے میں اب کام مکمل ہو گیا ہے لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ یہ ایک ادبی، سماجی اور تہذیبی دستاویز ہے جو آنے والے برسوں میں لوگوں کو روشنی دے گی اور ہم اپنی شان دار تہذیبی وراثت سے واقف ہو سکیں گے اور ہماری یہ واقفیت ہمارے اندر حبُّ الوطنی، قومی یک جہتی اور اپنی روایات اور اپنی تہذیبی وراثت کو سمجھنے کی اور اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلنے کی قدرت و صلاحیت عطا کرے گی۔

ـــــ آتُل بگائی

(ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش)

اپنی بات

وقت کے اُفق میں تہذیبیں غروب ہو جاتی ہیں اور تاریخ اُن کے تذکرے کو گمنامی کی چادر اُڑھا دیتی ہے۔ بس صرف یہ یاد رہ جاتا ہے کہ کلدانی یا سیمورین یا یونان کی تہذیبیں بڑی حسین و خوبصورت تھیں۔ آج بھی ان کے آثار نظر آجاتے ہیں۔ لیکن یہ وہ تہذیبی اصنام ہیں جو دیکھنے میں تو اچھے لگتے ہیں مگر جن میں نہ حرکت ہے نہ عمل نہ انسانی تہذیبی تاریخ کو کوئی سمت دینے کا حوصلہ یا ولولہ یا شعور! اس کا سبب یہی ہے کہ ان تہذیبوں کی بنیاد بہت کمزور تھی، ان کے پاس اعلا انسانی اقدار کا کوئی تصور نہیں تھا، شاید اسی لیے اقبال نے کہا تھا ؎

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

اس کا مفہوم یہی ہے کہ بہت ساری عظیم الشان تہذیبوں کے قصر منہدم ہو گئے لیکن ہندستانی تہذیب اپنی روایات کے تسلسل کے ساتھ آج بھی دنیا کے لئے مشعل راہ ہے۔ اس لیے کہ ہندستانی تہذیب کی بنیاد کچھ آفاقی اقدار پر تھی ایسی اقدار جن میں رواداری، وسیع النظری، عدم تشدد، مظاہر فطرت کا احترام اور خاکساری جیسی قدریں تھیں۔

ہندستانی تہذیب کے جو مظاہر نظر آتے ہیں، چاہے وہ فنونِ لطیفہ کے کسی شعبے سے تعلق رکھتے ہوں، آج بھی ان سے انہیں اقدار پر روشنی پڑتی ہے اس لئے بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ہندستانی تہذیب صرف ایک خطۂ ارض تک محدود نہیں تھی بلکہ وہ ساری دنیا کے لیے ایک پیغام تھی۔

اسی ہندستانی تہذیب کے آب و گِل سے اٹھارھویں صدی کے اواخر میں اودھ تہذیب کی کونپلیں پھوٹی تھیں۔ یہ تہذیب کہنے کو تو ایک علاقہ تک مخصوص کی گئی تھی لیکن سچی بات یہ ہے کہ یہ ایک رُجحان کا نام تھا — ایک رجحان — جہاں انکساری اور خاکساری باہمی احترام کے تصور سے گلے ملتے نظر آتے ہیں "پہلے آپ" کا مشہور تکیۂ کلام اسی رُخ کو اُجاگر کرتا ہے۔ اودھ کی تہذیب کا ایک رُخ یہ بھی تھا کہ اس نے زندگی کے جنگجویانہ پہلو کو بھی حُسن عطا کیا تھا۔ ان کا ذوقِ جمالیات اتنا ستھرا تھا کہ وہ تلوار کے میان سے نکلنے کو بھی "کنارِ شوق سے خوبرو کے جُدا ہونے" کو تعبیر کرتے تھے۔ اعتراضوں کی بھیڑ، نکتہ چینیوں کے انبوہ اور طنز و تعریض کے ازدحام کی پروا نہ کرتے ہوئے اودھ کی اس تہذیب نے خوش ذوقی، نفاست، آرائش، شائستگی اور حُسن شناسی کے ساتھ امن پسندی کا بھی تصور دیا تھا جو ہندستانی تہذیب کے مزاج کے عین مطابق تھا۔

اِسی لئے اودھ سے متعلق تہذیبی دستاویز پیش کرتے ہوئے فخر کا احساس ہوتا ہے کہ ڈیڑھ سو برس کے محدود وقفے میں ایک چھوٹے سے خطۂ ارض پر علم و فضل و دانش و تفکّر کے ساتھ موسیقی، رقص، خطّاطی، سپہ گری اور دیگر علوم و فنون کی جو شمعیں روشن ہوئی تھیں آج اس سے ہم اکتسابِ نور کر رہے ہیں۔

تہذیبی قدریں بدلتی رہتی ہیں لیکن اس کی بنیاد محفوظ رہتی ہے۔ اودھ کی تہذیب کے مظاہر بدل گئے ہیں لیکن اس کی بنیاد میں جو اعلا انسانی اقدار تھیں وہ آج بھی محفوظ ہیں اور آنے والے کل میں بھی محفوظ رہیں گی۔

یہ اُسی تہذیب کی کرامت ہے کہ اُردو صحافت کی تاریخ میں یہ یادگار واقعہ بھی پیش آیا کہ ایک سال کے اندر ایک موضوع پر دو خاص نمبر اور دو عام شمارے پیش کیے گئے۔ اس بار بھی جو ہماری روایات رہی ہیں ان کی پاسداری کرتے ہوئے جن ممتاز ماہرینِ علم و ادب کی جو تخصیص تھی اس پر انھیں زحمتِ نگارش دی گئی ہے۔ اس نمبر کے علمی، ادبی وزن و وقار کے بارے میں صرف اتنا عرض کیا جا سکتا ہے کہ بیشتر ممتاز اور بین الاقوامی شہرت رکھنے والے علماء، ادیبوں اور شعراء کا تعاون ہمیں حاصل ہوا۔ ادارہ ان کا بے حد ممنون ہے۔

اس خاص نمبر کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامّہ کے ڈائرکٹر محترم اَتُل بگائی نے اس میں خصوصی دل چسپی لی، جس طرح ایک سرکردہ جنرل اپنے سپاہیوں کا حوصلہ بڑھاتا ہے اور مورچے سر کرتا ہے اسی طرح انھوں نے بھی حوصلہ و عزم دیا، رہنمائی فرمائی اور خود اس شمارے کا افتتاحیہ تحریر فرمایا۔ ان کی سرپرستی اور رہنمائی کا اعلان و اعتراف اودھ کی تہذیب کے عین مطابق ہے۔

رفقائے کار اور معاونین میں جناب اسرار سیّد اور جناب مبین احمد صدیقی نے اپنا بھرپور تعاون دیا۔ ان لوگوں نے جس لگن، انہماک، خلوص، تن دہی، انتھک محنت اور اعلا علمی، ادبی ذوق کا مظاہرہ کیا اس کے ثبوت میں اس نمبر کا ہر لفظ گواہی دے گا۔

☐ ۲ر اکتوبر بابائے قوم مہاتما گاندھی کا یوم پیدائش ہے۔ سچ یہ ہے کہ یہ تاریخ ایک ایسے نظریے کے آغاز کا دن ہے جس نے دُنیائے انسانیت کو عدم تشدّد اور اہنسا کا راستہ دکھایا۔ مہاتما گاندھی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ اپنے نظریات پر عمل پیرا رہے اور انھیں نظریات کی حفاظت کے لئے انھوں نے شہادت کا راستہ اختیار کیا آج ان کے ایک سو پچیسویں یوم پیدائش پر ادارہ انھیں خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔

☐ نومبر کا مہینہ تاریخ کی عظیم شخصیتوں کی پیدائش کا مہینہ ہے۔ ہندستان کے پہلے وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو کا یوم پیدائش ۱۴ر نومبر ہے۔ مورّخ، ادیب اور پنچ شیل کے معمار تیسری دُنیا کے ذریعہ ناوابستگی کا تصوّر دینے والے نہرو نے امنِ عالم کے لئے دُنیا کو مثبت زاویۂ نظر عطا کیا اور عالمی تاریخ میں اپنی جگہ بنائی۔

یہی نومبر کا مہینہ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی پیدائش کا بھی مہینہ ہے۔ مولانا آزاد جہدِ آزادی کے میرِ کارواں تھے ادارہ نیا دور ہندستان کے ان عظیم فرزندوں کو صمیم قلب سے خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔

سید امجد حسین
ایڈیٹر



پیغام

راج بھون
لکھنؤ

اودھ کا علاقہ صرف اُترپردیش ہی کے لئے نہیں بلکہ پورے ہندستان کے لئے تاریخی و تہذیبی اعتبار سے بے حد اہمیت کا حامل رہا ہے۔ جہدِ آزادی میں اودھ کی قربانیاں ناقابلِ فراموش رہی ہیں، دوسری طرف آرٹ، کلچر، تہذیب اور ادب کو اس علاقے نے جس طرح سے سنوارا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ہماری قومی تہذیب کے لئے اس سے بڑی مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ پدماوت کے لکھنے والے ملک محمد جائسی اسی علاقے کے ایک ممتاز فرد تھے اور یہیں کے اسٹیج پر پہلی بار رہس لیلائیں اور رادھا کنھیّا کا قصّہ منظوم شکل میں امانت اور واجد علی شاہ کے ذریعہ سے اسٹیج کیا گیا۔

یہاں کا فنِ تعمیر، رقص، موسیقی، یہاں کی صنعتیں ان سب میں پورے دیش کیلئے ایک سندیش ہے، ایک چھپا ہوا پیغام ہے جو پچھلے دو سَو برس سے آج بھی اور آنے والی صدیوں تک بھی لوگوں کو جگاتا رہے گا اور انھیں اُن کے 'ایک ہونے کا' احساس بھی دلاتا رہے گا۔

مجھے بے حد خوشی ہے کہ ادارہ 'نیا دور' اودھ کے سلسلے میں اپنے اس نمبر کے ذریعہ اپنے اس سفر کو منزل تک لے جا رہا ہے جو اس سال کی ابتدا میں شروع ہوا تھا۔

میری نیک خواہشات اور مستقبل میں ایسے ہی اعلا پائے کے خصوصی نمبر نکالنے کی دعائیں ادارے کے ساتھ ہیں۔

یکم نومبر ۱۹۹۴ء

(موتی لال وورا)
گورنر اترپردیش



سچیوالیہ انیکسی
لکھنؤ

وزیر اعلا
اتر پردیش

۲۶ راکتوبر ۱۹۹۴ء

پیغام

اُردو کی مٹھاس میں گنگا جمنا کے ساتھ گومتی کا پانی بھی شامل ہے۔ اس زبان نے ہمیں بہت کچھ دیا ہے۔ اُس زمانے میں بھی جب چاروں طرف خوش حالی، فراغت، بھائی چارہ اور امن و امان کا دَور دَورہ تھا اس وقت اس زبان نے اپنے ادب کو مالا مال کر کے ہمیں ایک نئی سوچ اور ایک نئے راستے کی طرف توجہ دلائی تھی اور پھر ۱۸۵۷ء میں اور اس کے بعد جب سارا دیش سنگھرش کر رہا تھا، جوجھ رہا تھا، اس وقت بھی اُردو "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ لگا کر ہمارے کام آئی تھی۔

آج بھی پیار و محبّت کی یہ میٹھی زبان دلوں کو جوڑ رہی ہے۔ انھیں ایک کر رہی ہے اس کے ادب کا ہر حصّہ شاعری ہو، نثر ہو اپنا فرض انجام دے رہا ہے لیکن سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ اُردو صحافت بھی پُوری طرح سرگرم ہے۔

ہمارے اخبار اور رسالے اپنا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ خاص طور سے ہمارا محکمہ اطلاعات جو نیا دَور شائع کرتا ہے، اس 'نیا دور' کی اپنی ایک تاریخ ہے یہ ادبی، تہذیبی اور ثقافتی رسالہ ہے اس نے اب تک کئی عنوانات پر نمبر نکالے ہیں۔ پچھلے برسوں میں اس کے دَو نمبر بہت مقبول ہوئے یہ قومی یک جہتی نمبر اور اودھ نمبر اب پھر مزید پھیلاؤ کے ساتھ، جو جو عنوانات چھوٹ گئے تھے انھیں شامل کر کے نیا دور اودھ نمبر نکال رہا ہے۔ میں اس نمبر کا خیر مقدم کرتا ہوں اور مجھے پورا یقین ہے کہ اُردو پریمیوں میں یہ نمبر بہت مقبول ہوگا اور جو ہمارا مقصد ہے یعنی دلوں کو جوڑنا، قومی ایکتا کو بڑھانا، اپنی تہذیبی وراثت سے سبق سیکھنا ـــ ان تینوں مقاصد کی تکمیل میں یہ نمبر اپنا تاریخی فریضہ انجام دے گا۔

نمبر کی کامیابی کے لئے نیک تمناؤں کے ساتھ۔

(ملائم سنگھ یادو)



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

أبو الحسن علی الحسنی الندوی
ندوۃ العلماء ۔ لکھنؤ ۔ الہند

پیغام

اودھ ہندستان کی علمی، تہذیبی، ادبی و تصنیفی تاریخ میں ایک خاص مقام رکھتا ہے بادشاہِ ہند شاہجہاں اس کو ہندستان کا شیراز کہتا تھا۔ یہاں فضلاء، ادباء، شعراء اس تعداد میں اور اس درجے کے پیدا ہوئے کہ انھوں نے ہندستان کے فکر و ذہن، اظہار بیان کے طریقے اور طرز و اسلوب پر اثر ڈالا، پھر اس کے مرکزی شہر دارالسلطنت لکھنؤ نے قدیم دینی، علمی، اخلاقی تعلیم کا وہ نصاب اور تصنیف شدہ کتابیں دیں، جن کو پورے ہندستان نے سینے سے لگایا اور تقریباً برصغیر ہند کے تمام مدارس نے اس کو اپنا نصاب درس بنالیا۔ اب بھی اس خطۂ ملک میں بہت سے ایسے مرکزی ادارے، تعلیم گاہیں اور کتب خانے اور تصنیفی مراکز پائے جاتے ہیں، جن کا حق تھا اور رہے گا کہ اودھ کو تاریخ اور حالاتِ حاضرہ کی روشنی میں تعلیم یافتہ دُنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔

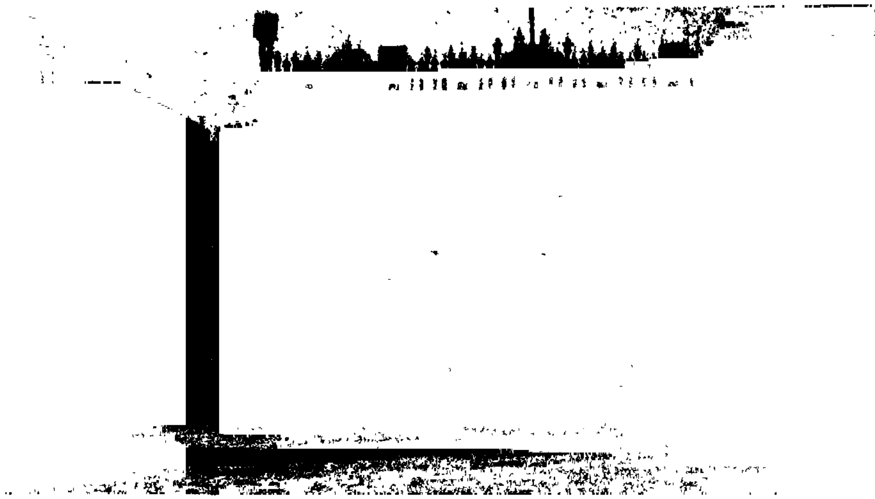
اس بنا پر ہر طرح مناسب تھا کہ رسالہ "نیادور" جس کا نام ہی حقیقت پسندی کو ظاہر کرتا ہے اور ایک ذمہ داری کا اعلان بھی ہے، اودھ پر خاص نمبر نکالے، جس میں ان سب خصوصیات کو، جن کا تذکرہ کیا گیا، نمایاں طور پر پیش کیا جائے۔ ہمیں معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ اس نے اپنی ذمہ داری کو محسوس کیا اور اودھ پر خاص نمبر نکالا، امید ہے کہ وہ نہ صرف دل چسپی کا باعث ہوگا بلکہ قارئین و ناظرین کی معلومات میں مفید اضافہ کرے گا۔

میں مُدیرِ رسالہ سید امجد حسین صاحب کو اس ادائے فرض اور احساسِ ذمہ داری پر اور اس کے خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کرنے پر مبارکباد دیتا ہوں۔

راقم
ابوالحسن علی ندوی

(مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)
ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

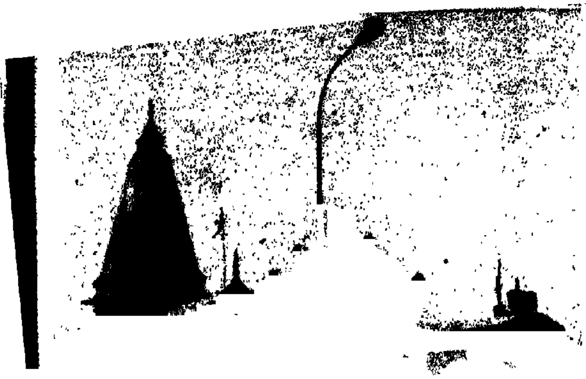
۱۲ ربیع الاوّل ۱۴۱۵ھ
۱۲ اگست ۱۹۹۴ء



حُسینیۂ ارشادیہ رُدولی
موسوم بہ
امامباڑہ چودھری صاحب
رُدَولی



لمِ آزادی کی یادگار
مُوسیٰ بَاغ
لکھنؤ



△ ہنومان سیتو مندر۔ لکھنؤ



شری لکشمن جی کا مجسمہ
جو لکشمن پارک لکھنؤ
میں نصب ہے۔

بابا ہزارا کا مندر اور مزار جو تقریباً تین سو برس قدیم ہے۔





غزل

مجھ سے کہا جبریلِ جنوں نے یہ بھی وحیِ الٰہی ہے
مذہب تو بس مذہبِ دل ہے باقی سب گمراہی ہے

وہ جو ہوئے فردوس بدر تقصیر تھی وہ آدم کی مگر
میرا عذابِ دربدری میری ناکردہ گناہی ہے

حرفِ طلب سینے میں کچل دو شرطِ وفا ٹھہری ہے یہی
کاٹ کے رکھ دو اپنی زباں یہ حکمِ ظلِّ الٰہی ہے

سنگ تو کوئی بڑھ کے اٹھاؤ شاخِ ثمر کچھ دور نہیں
جس کو بلندی سمجھے ہو ان ہاتھوں کی کوتاہی ہے

پھر کوئی منظر پھر وہی گردش! کیا کیجے اے کوئے نگار
میرے لئے زنجیرِ گلو میری آوارہ نگاہی ہے

بہرِ خدا خاموش رہو بس دیکھتے جاؤ اہلِ نظر
کیا لغزیدہ قدم ہیں اس کے کیا دزدیدہ نگاہی ہے

دور سے اس کو چاکِ ملامت جان کے ناصح خوش ہیں بہت
لیکن میرے گریباں پر تو اس کاجل کی سیاہی ہے

دید کے قابل ہے تو سہی مجروحؔ تری مستانہ روی
گردِ ہوا ہے رختِ سفر رستے کا شجر ہمراہی ہے

مجروح سلطانپوری
۶۰۲۔ سی گل 'سی' شرلے راجن روڈ
باندرہ (ویسٹ) بمبئی



ممتاز دانش ور، ادیب اور مجاہدِ آزادی

بشمبھر ناتھ پانڈے سے ایک ملاقات

نیا دور کی طرف سے ممتاز دانش ور، ادیب، مفکر، مورخ، صحافی اور مجاہدِ آزادی جناب بشمبھر ناتھ پانڈے سے تاریخی موضوعات اور اودھ کی تہذیبی زندگی سے متعلق چند سوالات کیے گئے۔ ذیل میں ان کے جوابات شائع کیے جا رہے ہیں۔ امید ہے کہ قارئین ان سے استفادہ کریں گے۔

ایڈیٹر

سوال پانڈے صاحب! آپ ایک بزرگ مجاہد آزادی ہیں۔ آپ کی تاریخ اور خصوصی طور پر تاریخ اودھ پر بہت اچھی نظر ہے۔ ذرا بتلانے کی زحمت گوارا فرمائیں کہ نوابین اودھ میں آپ سب سے بہتر کس کو سمجھتے ہیں اور کیوں؟

جواب جہاں تک خدمت کے ساتھ ساتھ حکومت چلانے کا سوال ہے میں نواب آصف الدولہ کو پہلی جگہ دیتا ہوں۔ باقی لوگوں کے عہد حکومت میں تو انگریز اس قدر غالب ہو گئے تھے کہ ہر وقت جنگ کا خدشہ لاحق رہتا تھا۔ واجد علی شاہ کے دور میں انگریز اپنی آزاد حکومت قائم کرنا چاہتے تھے جس کے سبب ہر وقت نرج کشی کا خطرہ ہوتا تھا۔ رشوت ستانی کو کام میں لاکر انگریز ریزیڈنسی حاوی ہو گئی تھی جبکہ ان کے سامنے واجد علی شاہ جیسا جوان مرد سُورما تھا۔ جو اپنے ہی رفقا، مصاحبوں اور وزیروں کی کوتاہیوں کا شکار ہوئے۔ انھوں نے نواب کا ساتھ نہ دیا ورنہ وہ اودھ سے انگریزوں کے عمل دخل کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتے۔ آخر میں ان کے درباریوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور مجبور کیا کہ انگریز ریزیڈنٹ کے فیصلے کے مطابق کلکتہ چلے جائیں۔ بادشاہ جس وقت لکھنؤ سے جا رہے تھے، عوام زار و قطار رو رہے تھے۔ نواب آصف الدولہ بہت ہونہار تھے اسی لئے تو بہت مشہور ہے "جس کو نہ دے مولا اس کو دے آصف الدولہ"

سوال شامِ اودھ کیوں مشہور ہوئی؟ اس کی کیا خصوصیات تھیں؟

جواب شامِ اودھ کی مقبولیت کے بارے میں میرا خیال ہے کہ دہلی کے تباہ ہو جانے کے بعد لکھنؤ فن کاروں، شاعروں، ادیبوں کا ایک ثقافتی مرکز بن گیا تھا۔ جگہ جگہ کے شاعر لکھنؤ میں جمع ہونے لگے تھے۔ مرزا غالب بھی کلکتہ جاتے ہوئے لکھنؤ میں رُکے۔ ذوق کو بھی لوگوں نے مشورہ دیا کہ وہ لکھنؤ جائیں ذوق کا جواب تھا ؎

کون جائے ذوق اب دہلی کی گلیاں چھوڑ کر

دن ڈھلتے ہی شاہی دربار کے اردگرد شاعروں کا دربار لگ جاتا تھا۔ ڈھلتی ہوئی شام رنگینیوں سے بھر جاتی تھی۔ گرمیوں میں چاروں طرف خس کی ٹٹیاں لگا دی جاتی تھیں اور بیلے کے ساتھ ساتھ عطر کی خوشبو فضاؤں میں چاروں طرف پھیل جاتی تھی۔ بیلے کے پھولوں کی بہار کی اپنی الگ شان ہوتی ہے، اس لئے لوگ "شامِ اودھ" کو اس طرح یاد کرتے ہیں اور کہتے ہیں، کوئی شہر جہاں میں ایسا نہیں ہے جس کی شام اس قدر رنگینیوں سے بھری ہو۔

سوال کیا آپ واجد علی شاہ کی فوجی صلاحیت کے سلسلے میں روشنی ڈالنا چاہیں گے؟

جواب جس بہادری کے ساتھ اودھ کے عوام نے اپنی جانیں قربان کیں، جنگِ آزادی میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس وقت لندن کے ایک انگریزی اخبار کے مُدیر نے اپنے اخبار میں لکھا کہ ہندستان کے دوسرے علاقوں کی جنگیں سامنتی تھیں لیکن اودھ کی جنگ انقلابی جنگ تھی۔ اس زمانے کے گیتوں میں اودھ کے سُورماؤں کی بے حد تعریفیں ملتی ہیں۔

سوال کہا جاتا ہے کہ ناول "امراؤ جان ادا" لکھنوی تہذیب کا دلکش مرقع ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ اس کا قصہ حقیقت ہے یا محض افسانہ؟

جواب میں تو اسے افسانہ ہی کہوں گا۔ یہ تو فلمی لوگوں نے اور ریکھا کی لاجواب اداکاری نے لوگوں کے دلوں پر جادو سا کر دیا، لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ لکھنؤ کے رئیسوں میں بے شک ایک گراوٹ آگئی تھی۔ اس لحاظ سے اسے زوال آمادہ تمدن کا ترجمان کہنا غلط نہ ہوگا۔

سوال اب "مرحوم لکھنؤ" کیوں یاد کیا جاتا ہے؟

جواب ۱۸۵۷ء کے بعد جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ براہ راست برطانیہ کی حکومت قائم ہوئی تب.... گورنر کا دربار محض خوشامد کرنے والوں کا دربار بن گیا تھا۔ لکھنؤ کا ڈھانچہ رہ گیا تھا اس کی رُوح غائب ہوگئی۔ بقول شاعر ؎

اب پہلے سے ولولے ہیں اور نہ ارمانوں کی بھیڑ

انیس و دبیر کی مرثیہ خوانی اب کہاں؟ اپنے پیچھے ایک نزاکت کی فضا زبان و بیان میں فصاحت و بلاغت تو ہے لیکن زندہ دلی غائب ہوگئی ہے اور اسی لئے شاعرانہ انداز سے لوگوں نے لکھنؤ کو مرحوم کہہ دیا۔

سوال اس بات میں کتنی سچائی ہے کہ نوابینِ اودھ نے کئی مندروں کی تعمیر کرائی؟

جواب تفسیر میں ملتا ہے کہ اورنگ زیب نے بہت سے مندروں کو جاگیریں دیں تو اس کا اثر تمام مسلم حکمرانوں پر پڑا۔ ٹیپو سُلطان ۱۵۶ مندروں میں ہر سال نذرانہ بھیجتا تھا اس کے علاوہ بھی کچھ مسلمان بادشاہوں کا بھی ایسا ہی دستور تھا لیکن اس سلسلے میں میری معلومات کچھ کم ہیں کہ اودھ کے نوابوں نے کیا کیا۔ لیکن چوں کہ یہ سلسلہ قائم ہوگیا تھا اس لئے انھوں نے اس روایت کو برقرار رکھا ہوگا۔

سوال موجودہ اترپردیش سرکار اُردو والوں کی ہمت افزائی بھی کر رہی ہے اور اُردو زبان کی ترقی کے لئے کوشاں ہے۔ کیا اس سے اُردو کو فائدہ پہونچ سکتا ہے۔

جواب یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ کچھ ہندی والوں کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے اُردو کے متعلق گاندھی جی کی صلاح کو نظر انداز کیا گیا گاندھی جی چاہتے تھے کہ ناگری اور فارسی رسم خط میں جو زبان لکھی جائے وہی ہندستانی و ملکی زبان ہو چوں کہ اُردو زبان کا گہوارہ اترپردیش ہے اسی لئے درحقیقت اردو اترپردیش کی بیٹی ہے۔ عوام نے اسے اپنی بول چال کی زبان بنا کر بہت آسان کر دیا تھا لیکن انگریز نوکر شاہی کے اشارے سے دونوں ہندی اور اُردو زبانوں میں سنسکرت اور فارسی کے الفاظ زبردستی بھر دیئے گئے۔

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ پنت جی، سمپورنانند جی اور چرن سنگھ جی کے بعد پنڈت کملاپتی ترپاٹھی جی نے اُردو کے لئے ایک عملی قدم اٹھایا۔ انھوں نے ۶ ہزار اردو اساتذہ مقرر کیے اور صلاح و مشورہ کر کے قانون بنا دیا کہ جس مدرسہ میں چالیس لڑکے ہوں اور وہ اُردو کو میڈیم بنانا چاہتے ہوں وہاں ایک اُردو ٹیچر کا تقرر کر دیا جائے گا۔ اُردو کتابیں شائع کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ ہندی اکادمی کے ساتھ ساتھ اردو اکادمی بنائی گئی اُردو لیکھکوں کو پُرسکار دیا گیا۔ یہ سلسلہ کملاپتی جی نے شروع کیا تھا۔ وہ اب بھی کم و بیش چل رہا ہے۔ (باقی)

سید امجد حسین
سوچنا بھون، لکھنؤ

تجدیدِ الفت کا ترانہ

آنند نرائن مُلّا سے ایک مُلاقات



اُردو شاعری واعظ، ناصح اور مُلّا کی دشمن رہی ہے۔ اُردو کو مُلّائیت سے ایک طرح کی چڑ ہے مگر ہر کلیے کا ایک استثنا ہوتا ہے۔ آنند نرائن مُلّا اُردو کے مجاہد بھی ہیں، رہنما بھی ہیں، عاشق بھی ہیں اور اُردو کی جمہوریت کے سربراہ بھی ہیں اور اُردو داں عوام کے محبوب بھی۔ مجھے ناز ہے کہ اُردو کے اس جواں عزم مجاہد سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔

الف ج

(س) آپ کی پیدائش لکھنؤ میں ہوئی اور آپ کی زندگی کا ایک طویل عرصہ لکھنؤ میں گزرا۔ اس کے بارے میں کچھ ارشاد ہو۔

(ج) میں ۲۴ر اکتوبر ۱۹۰۱ء میں اپنے آبائی وطن رانی کٹرہ میں پیدا ہوا۔ میرا خاندان وکیلوں کا خاندان تھا۔ میرے والد بہت مشہور و معروف وکیل تھے۔ ان کی بڑھتی ہوئی پریکٹس کی وجہ سے انھیں اپنا آبائی مکان کچھ مناسب نہیں معلوم ہوا۔ جب میں تین چار سال کا تھا، وہ نواب غلام حسین خاں کی کوٹھی میں جو کہ شاہ مینا کے مزار کے سامنے ہے جہاں آج غالباً عورتوں کا اسپتال ہے، اس کوٹھی میں کرایہ دار ہو کر آباد ہو گئے۔ اس کوٹھی میں بھی میں کوئی تین چار سال رہا۔ اس کے بعد اپنے پیشے کی ضرورت سے میرے والد نے گولہ گنج میں ایک مکان کرایہ پر لے لیا اور اس مکان میں انھوں نے زندگی گزار دی۔ میں بھی اس مکان ہی میں رہا۔ اور جب ۱۹۵۴ء میں الٰہ آباد ہائی کورٹ کا جج ہوا تو میں نے وہ مکان چھوڑا اور نمبر ۲ چائنا بازار پر مقیم ہوا۔ گویا قریب بچاس سال اس گولہ گنج والے مکان میں رہا۔ وہ سڑک جس پر وہ مکان تھا اُس وقت سرکلر روڈ کے نام سے مشہور تھی اور اسی کا نام بعد میں جگت نرائن روڈ رکھا گیا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے والد ایک بڑے وکیل تھے۔

میرے والد لکھنؤ بار کے چیرمین بھی رہے۔ ان کی ایمان داری کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے ایک انچ زمین بھی نہ خریدی ورنہ لوگ محل تعمیر کرتے ہیں۔ میرے پاس یہاں بھی اپنا کوئی مکان نہیں ہے۔ میں سرکاری مکان میں رہ رہا ہوں۔ ایمان داری ہمارا خاندانی کردار رہا ہے۔

(س) آپ نے اپنی شاعری کا آغاز کس زمانے میں کیا۔؟

(ج) میں نے اپنی شاعری کی ابتدا انگریزی زبان میں کی۔

اُردو میں شاعری ۱۹۲۵ء میں شروع کی اور میری پہلی نظم کان پور کے "زمانہ" میں جس کے مُدیر دیا نرائن نگم تھے، انھوں نے اپنے نوٹ کے ساتھ شائع کی کہ یہ ایک نیا شاعر ابھر رہا ہے۔ اُردو کے ایک شاعر متوّد تھے انھوں نے شروع میں مجھ پر ایک نظم کہی جس کا مفہوم کچھ اس طرح تھا :

"یہ ایک نیا آفتاب افقِ ادب پر نمایاں ہے"۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ جو میری قدر اس وقت ہوئی، شاید وہ قدر اب باقی نہیں ہے۔[1]

(س) آپ کے زمانے میں ادبی سرگرمیاں کیا تھیں ؟

(ج) ؎ اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

بے اختیار یہ مصرعہ یاد آتا ہے اور ایک دوسرا شعر یاد آتا ہے

آسماں کی کیا ہے طاقت جو چھڑائے لکھنؤ
لکھنؤ ہم پر فدا ہے ہم فدائے لکھنؤ

مجھے لکھنؤ کی ادبی انجمنوں نے اپنی محفلوں میں اعلا سے اعلا مقام دیا۔ لکھنؤ میں شعراء کے دو گروپ ہو گئے تھے۔ ایک پُرانے شاعر نے "انجمن معین الادب" کے نام سے چند شعراء کو یکجا کیا تھا، اور کچھ نئے شاعر "انجمن معراجُ الادب" بنا کر سامنے آئے تھے مجھ کو دونوں انجمنوں نے اونچی سے اونچی جگہ دی اور میں نے کوشش بھی کی کہ یہ دونوں انجمنیں مل جائیں اور میں اس مقصد میں کامیاب بھی ہوا۔ میرے اس دور کے شاعر جو معین الادب میں تھے صفی لکھنوی تھے میں ان کے گھر بھی جایا کرتا تھا۔ انجمن معراج الادب کے جو شاعر روحِ رواں تھے وہ تھے حکیم آشفتہ سراج لکھنوی اور منظر لکھنوی وغیرہ۔ یہ انجمن معراج الادب کے روحِ رواں تھے۔ اس میں ایک دلچسپ واقعہ یہ بھی ہے کہ وہ دورِ استادی اور شاگردی کا تھا۔ جو باہر کے شعرا تھے ان کو شکایت تھی کہ لکھنؤ والے ان پر اعتراض کرتے تھے۔ لکھنؤ والوں کو اپنی زبان پر اس قدر ناز تھا کہ انھوں نے اقبال پر بھی اعتراض کیا۔ یہی نہیں بلکہ ایک شاعر نے تو اصلاح بھی فرمادی۔ سراج لکھنوی کے اشعار پر بھی اعتراض ہوا۔ افقر موہانی ایک ہفت روزہ نکالتے تھے جس کا نام مجھے یاد نہیں، اس میں انھوں نے ایک مضمون لکھا جس میں ایک غزل کی اصلاح کی اور اس کو یوں شائع کیا کہ گزشتہ دور میں ایک شاعر سراج جھنجھانوی گزرے ہیں اور یہ غزل سراج نے ان سے چرائی ہے۔ اس کے بارے میں سراج نے مقدمہ دائر کر دیا افقر موہانی کے خلاف۔ اور میں اس میں وکیل تھا۔ یہ مقدمہ سٹی مجسٹریٹ کے یہاں چلا۔ اور مہینوں چلا۔ صفائی میں گواہ پیش کیے۔ ایک کتاب جس میں دس پندرہ غزلیں تھیں اس کو عدالت میں یہ کہہ کے پیش کیا کہ اس میں کچھ حصہ سراج جھنجھانوی کا ہے۔ میں نے ثبوت کی طرف سے اگلی پیشی پر ایک خردہ چھوٹی سی بات آٹھ صفحے کی چیز شائع کی اور کہا کہ اس میں سراج کی غزلیں ہیں۔ اب بے بس ہو گئے اور آخر میں انھوں نے معافی مانگی جس پر مقدمہ ختم ہو گیا۔ اس زمانے میں جگر اور اصغر میرے بہت قریب تھے۔

(س) آپ کے خیال میں ہندستان میں اُردو ادب کا کیا کردار رہا ہے ؟

(ج) ہندستان تو ایک ایسا ملک ہے جہاں شاید سب سے زیادہ زبانیں بولی جاتی ہیں دیگر ممالک تو آسانی سے اپنی ایک زبان رکھ سکتے ہیں لیکن ہندستان کی تاریخ بتاتی ہے کہ ہندستان میں ایسا ممکن نہیں ہے۔ اُردو مغلیہ دورِ حکومت میں پیدا ہوئی اور انگریزوں کی حکومت تک یہ دہلی اور لکھنؤ میں پروان چڑھ چکی تھی۔ اُردو گویا اتر پردیش میں ہی پیدا ہوئی ہے اور اس زبان کی اس قدر پذیرائی ہوئی کہ یہ سب سے اہم زبان ہو گئی۔ یوں تو انگریزوں کی حکومت کے عہد میں الگ الگ علاقوں میں علاقائی زبانوں کو عروج حاصل ہوا نتیجے میں ہندی کی بھی ترقی ہوئی۔ جب جنگِ آزادی کی ابتدا کے ساتھ ہندی زبان رفتہ رفتہ بامِ عروج پر پہونچنے لگی یہاں ملک کی آزادی تک اُردو ہندی، جو دراصل ایک ہی زبان کی دو شکلیں ہیں، ایک دوسرے کی حریف سمجھی جانے لگیں، پاکستان

---

[1] ادب کے ساتھ اختلاف ہے۔ اُردو کی تاریخ میں آپ کی جگہ محفوظ ہے (راح)

کے ضمن میں اُردو زبان کا سوال بھی اٹھا ۔ آزادی کے بعد ہندی کو اور زیادہ ترقی ملی اور رفتہ رفتہ کچھ ہندی والوں نے یہ مناسب سمجھا کہ اُردو زبان کو مٹا دیا جائے لیکن اُردو عوام کو اس قدر پسند تھی کہ وہ مٹائی نہ جا سکی اس امر میں سب سے بڑا ہاتھ فلمی دنیا کا تھا جس نے اُردو زبان کو زندہ رکھا ۔ آج یہ احساس ہونے لگا ہے کہ اس مشترکہ تہذیب کے دور میں ہر زبان کو اس کا قانونی حق دیا جائے اور کسی ایک زبان کو اس پر مسلط نہ کیا جائے شاید اس کا احساس اب حکومت کو بھی ہو گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ زبان کے معاملے میں اب اتنی تنگ نظری نہیں ہے جو اس سے قبل تھی ۔

(س) اُردو زبان کا ہمارے سیاسی رہنماؤں سے کیا تعلق رہا ہے ؟

(ج) جنگ آزادی میں ہندی کے مقابلے میں اُردو کی پذیرائی زیادہ ہوئی ۔ گاندھی اور نہرو دونوں کی زبان اُردو سے زیادہ قریب تھی ۔ موتی لال نہرو مکمل طور پر اُردو ہی میں اظہار خیال کرتے تھے

۹۳۵ء میں لکھنؤ میں ایک جلسہ ہوا جس میں مجھ سے ایک مشاعرہ منعقد کرنے کی درخواست کی گئی ۔ میں نے اس کے لئے امین سلونوی کو بحیثیت سکریٹری مقرر کیا ۔ مسز نائیڈو اس کی صدر ہوئیں مشاعرہ ہوا اور اس میں ملک کے نامور شعراء جگر، ساغر وغیرہ نے شرکت کی ۔ سب نے وطن پرستی کی نظمیں سنائیں ۔ میں نے بھی نہرو پر ایک نظم سنائی جو نہرو کو پسند آئی ۔ دوسرے دن وہ نظم میں نے دوبارہ پڑھی ۔

بعد میں ہندی والوں نے بھی ایک کوی سمیلن کیا لیکن خود منتظمین نے آ کر مجھے بتایا کہ کوی سمیلن میں وہ مجمع اکٹھا نہ ہو سکا جو مشاعرہ میں ہوا تھا ۔

مشاعرے کے تمام ٹکٹ جب ختم ہو گئے تو منتظمین کو کاؤنٹر فائل پھاڑ پھاڑ کر بیچنا پڑا ۔

(س) اودھ کے شعراء اور ادیبوں میں آپ سب سے زیادہ کس شاعر اور ادیب سے متاثر ہوئے ۔ ؟

(ج) میں نے اپنی شاعری انگریزی زبان میں شروع کی اور سات آٹھ سال تک انگریزی زبان ہی میں شعر کہتا رہا ۔ مگر میرے دوستوں نے مجبور کیا کہ میں مادری زبان میں شعر کہوں ۔ میں نے اپنے دوستوں کی یہ رائے قبول کر لی اور پہلے پہل ۱۹۲۵ء میں اُردو میں شعر کہنا شروع کیا ۔ ۱۹۲۵ء میں وکالت کا امتحان بھی پاس کر چکا تھا ۔ لہٰذا میرے لیے کسی دوسرے کی مدد لینا ناممکن تھا ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شاگردی اور استادی اُردو ادب میں رائج تھی اور ہر شاعر کے استاد ہوا کرتے تھے اور جو خود بعد میں استاد بن جاتے تھے ۔

میری زندگی کا یہ بھی عجیب واقعہ ہے کہ میں نے غزل سے پہلے نظم کہی ۔ ظاہر ہے کہ اس وقت کسی شاعر سے متاثر ہونا قریب قریب ناممکن تھا ۔ البتہ میں اُردو شاعری میں غالب و اقبال سے بے شک متاثر ہوا ۔

میں اوروں کے اشعار بھی پسند کرتا تھا مگر ان سے متاثر نہیں ہوا ۔ یہاں تک کہ چکبست جو میرے برہمن خاندان کے تھے ان سے بھی متاثر نہیں ہوا ۔ میں نے غالب اور اقبال کی نظموں کا ترجمہ بھی کیا جو شائع بھی ہوئیں ۔ اقبال کی ایک نظم کا میں نے ترجمہ کیا جسے ساہتیہ اکاڈمی نے شائع کیا ۔ غالب کے جن اشعار کا میں نے ترجمہ کیا وہ اس وقت میرے ذہن میں نہیں ہے البتہ ع

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل

اس کا ترجمہ اب بھی میرے ذہن میں ہے ۔

(س) آپ کا قیام ایک عرصے سے دہلی میں ہے کیا آپ کا دل لکھنؤ جانے کو چاہتا ہے ۔ ؟

(ج) لکھنؤ میں اگر کوئی مکان ہوتا تو ضرور جانا چاہتا ۔ سب دوست ختم ہو گئے ہیں ۔ کچھ عزیز ہیں وہ کبھی دہلی آ جاتے ہیں ۔ اب میں قریب پانچ سال سے لکھنؤ نہیں گیا ۔ میرے لیے لکھنؤ میں کافی ہاؤس میں ایک میز الگ (مخصوص) رہتی تھی ۔ ان میں مجاز سلام مچھلی شہری ، احتشام حسین ، سرور صاحب یہ سب میرے ساتھ بیٹھتے تھے ۔ میں اس زمانے میں ایک بورڈ کا

جیز میں تھا آزادی سے پہلے جس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو تھے اور علی ظہیر اس کے ممبر تھے۔ اسی کمیٹی کے سلسلے میں پاکستان بھی گیا تھا میری ایک نظم بہت مقبول ہوئی تھی۔ مجھے شوکت تھانوی نے "سفیر اودھ" کا خطاب بھی دیا تھا۔ نظم کا عنوان تھا "سوغات" اس کے کچھ شعر سنو ۔

(ج) ار

(لا تعداد) — یہ تجدید الفت کا ترانہ لے کے آیا ہوں
میں گیا آیا ہوں اک گزرا زمانہ لے کے آیا ہوں
بنام خط اقبال خاک ... غالب سے
... ... لے ... آیا ہوں
قفس تو بو ... نشیمن پر
میں ... دونوں ... پھر آشیانہ لے کے آیا ہوں
... اوراق دل کو ... یوں برباد ہونے دو
کہ میں ان میں تمہارا بھی فسانہ لے کے آیا ہوں
نہ ٹھکراؤ گے مجھے اپنا بنالو گے
محبت کی شکست فاتحانہ لے کے آیا ہوں
فقط تھوڑا سا زمزم اسکے بدلے میں مجھے دیدو
میں گنگا کے دہانے کا دہانہ لے کے آیا ہوں

(س) موجودہ حکومت اتر پردیش اُردو کی ترقی کے لئے کوشاں ہے آپ کی کیا رائے ہے۔

(ج) ہم اس کے اس کام کی قدر کرتے ہیں اور حکومت سے درخواست کرتے ہیں کہ ہندی کی طرح اُردو کو بھی روزگار سے جوڑا جائے اور جو اقدامات ملائم سنگھ کی حکومت نے کیے ہیں اور اُردو کو روزی روٹی سے جوڑنے کی جو کوششیں کی جارہی ہیں وہ مستحسن ہیں۔ □□

بشمبھر ناتھ پانڈے ..... صفحہ ۱۱ کا بقیہ

بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہندی کے کچھ بینک اُردو کو ایک زبان ماننے پر تیار ہی نہیں اور لگاتار اس کے خلاف اُلٹا سیدھا پرچار کر رہے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ اُردو شاعروں اور ادیبوں نے نوجوانوں کے دلوں میں آزادی کے لئے جوش پیدا کیا۔ رام پرشاد بسمل اور اشفاق اللہ خاں وطن پرستی کے شعر پڑھتے ہوئے پھانسی پر چڑھے۔

درجنوں اُردو اخباروں کو آزادی کے پرچار کرنے کے لئے معتوب کیا گیا، ان کے مالکوں اور مدیروں کو جیل کی سزائیں جھیلنی پڑیں۔ الہ آباد کے اُردو ہفت روزہ 'سوُرج' نے آزادی کی لڑائی میں ایک ایسی مثال قائم کی جس کی دنیا نے تعریف کی۔ ۱۹۱۸ء میں یہ نو مہینے تک شائع ہوا۔ اس کے تیرہ ایڈیٹروں کو قید ہوئی پہلے کو پانچ سال، دوسرے کو سات سال اور اس کے بعد عمر قید، کالے پانی کی سزائیں ہوئیں۔ یکے بعد دیگرے تیرہ ایڈیٹر اسی اخبار کے لئے قربان ہو گئے۔ آخر میں حکومت کو پریس ایکٹ بناکر اس اخبار کو بند کرنا پڑا۔ اس اخبار کے پہلے صفحے پر ایک اشتہار ہوتا تھا کہ:

> "ایڈیٹر چاہیئے۔ تنخواہ میں دو سوکھی روٹیاں ایک گلاس پانی اور عمر بھر کے لئے کالے پانی کی سزا"

پولیس نے جب اخبار کے دفتر کی تلاشی لی تو میز کی دراز سے گیارہ درخواستیں ملیں جو ایڈیٹر بننا چاہتے تھے!! ہندستان ہی میں نہیں پوری دنیا میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

یہ بات بڑی افسوس ناک ہے کہ اُردو کی ان قربانیوں کو ہندی کے کٹھ ملّے قبول کرنے کو بھی تیار نہیں۔ □□

> "اے میرے فرض شناس، جفاکوش، عدالت پناہ اور فقیر منش بادشاہ! اے میرے شرافت سنج ہنرور، نکتہ رس، علم نواز اور ادب پرست شاعر! افرنگی نے آپ کو تباہ بھی کیا اور بدنام بھی۔ آپ جتنے اچھے تھے، اتنے ہی بُرے بنائے گئے۔"
>
> ——— جوش ملیح آبادی (یادوں کی برات صد ۸۱ تا ۸۳)

قرۃ العین حیدر
جے ۱۴۰ - سیکٹر ۲۵ - نوئیڈا
غازی آباد

شہرِ آرزو

اُردو کی کچھ شخصیتیں ایسی ہیں جنھوں نے اپنے عہد میں ہی اساطیری حیثیت حاصل کرلی ہے۔ محترمہ قرۃ العین حیدر صاحبہ بھی ہمارے عہد کی ایسی ہی شخصیت ہیں۔

لکھنؤ اُن کا شہرِ آرزو تھا اور ہے۔ ان کی برہمی اور اُن کا غصّہ اُسی بے پایاں اُلفت کا مظہر تھا جو انھیں اُردو سے ہے۔ پہلے وہ کچھ برہم ہوئیں۔ ازراہِ شفقت انھوں نے جو کچھ فرمایا وہ نذرِ قارئین ہے۔ کوئی سوال پوچھنے کا سوال ہی نہیں رہ گیا تھا۔ لکھنؤ کے بارے میں ان سے جو کچھ پوچھنا چاہتا تھا انھوں نے ایک ہی جواب میں سب کا احاطہ کرلیا ہے۔

—— الف ح

میں نے لکھنؤ کے بارے میں پچھلے چند برسوں میں دو ناول لکھے ہیں جن میں ایک ناول "گردشِ رنگِ چمن" ہے جس کا نام اگر انگریزی میں رکھا جائے تو وہ The Death of a City ہوگا۔ میں نے دوسرے ناول "چاندنی بیگم" میں لکھنؤ کے تیزی سے بدلتے ہوئے منظر کو پیش کیا ہے۔

ہمارے یہاں اس وقت خاص طور پر رویّہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ اپنے قومی تہذیبی سرمائے کو برباد کیا جائے۔ دوسرے ملکوں میں یہ سرمایہ سجا کے، سنوار کے بڑی احتیاط سے رکھا جاتا ہے۔ ہم نے اسے ایک سیاسی اکھاڑہ بنادیا۔ لہٰذا کتب خانے، آرٹ کے ذخیرے، تاریخی عمارتیں، ادبی اور تہذیبی روایات — ان سب کو دھڑلے سے برباد کیا جارہا ہے۔ جب تاج محل کی حالت ناگفتہ بہ ہوچکی ہے تو لکھنؤ کے امام باڑے کا کیا ذکر کیا جائے۔ میں نے اپنے کسی مضمون میں چند سال قبل لکھا تھا کہ پیرس (Paris) کا پرانا شہر قانوناً اس طرح محفوظ ہے کہ اس کی ایک اینٹ کو بھی نہیں ہٹایا گیا ہے۔ لکھنؤ میں تاریخی عمارتیں باضابطہ طور پر منہدم کی گئی ہیں بشمول کے طور پر روشن الدولہ کی کچہری۔ جو عمارتیں باقی ہیں ان میں نیلے اور پیلے رنگ پوت دیئے گئے ہیں جس طرح پرانی عمارات کو نئی عمارتوں کے ساتھ طرزِ تعمیر کی مناسبت سے (Blend) کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس لکھنؤ میں انتہائی بھدّی عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں اور افسوس یہ ہے کہ کسی نے اس صورتِ حال پر توجہ نہ کی۔ شاید کسی نے بھی نہیں۔ اس شہر کو جو اہلِ ذوق کے لیے جنّت نگاہ تھا، کس بے دردی سے تاراج کیا گیا۔ ایک وقت تھا کہ منشی نول کشور خود بیل گاڑی پر جگہ جگہ دوسرے شہروں میں جاتے تھے اور اپنی کتابیں فروخت کرتے تھے اور اس طرح انھوں نے اُردو کی عظیم الشان خدمت انجام دی۔ ایک وقت یہ ہے کہ ان کے وارثوں نے اُردو والوں سے کہا کہ ان کے گودام میں جو کتابیں ہیں "لے لو" اور انھیں محفوظ کرلو۔ لیکن کسی نے پروا نہیں کی۔

آج سے قریب دس سال پہلے کی بات ہے کہ میں نے اُردو اکادمی کے اربابِ اقتدار سے بار بار درخواست کی کہ وہ اس نایاب ذخیرے کو اپنے یہاں منتقل کرلیں۔ مجھے جو جواب ملا، میں سنّاٹے میں آگئی۔

مجھ سے کہا گیا کہ میں پرانے لکھنؤ کی کچھ یادیں تازہ کروں —

میں موجودہ لکھنؤ کے بارے میں اتنی غم و غصّہ میں بھری بیٹھی ہوں کہ میں پُرانے لکھنؤ کے بارے میں کیا لکھوں ؟ کیا میں یہ بتاؤں کہ میرے بچپن کے لکھنؤ میں پُرانے شہر کی گلیاں کتنی صاف ستھری تھیں۔ فرقہ وارانہ تاثرات ناپید تھے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں نظامِ تعلیم بہت اچھا تھا، پڑھائی ہوتی تھی۔ غنڈہ گردی، امتحان میں نقل کرنا اور نگرانوں کو چاقو دکھا کر بھگا دینا اس قسم کے خواب و خیال کسی کے دماغ میں نہ آ سکتے تھے۔

ابھی کچھ سال پہلے کی بات ہے کہ ایک صاحب نے بتایا کہ وہ شیعہ کالج میں مسلسل کے امتحان کے سنٹر میں نگرانی کر رہے تھے۔ لڑکوں نے ان کو چاقو دکھا کر بھگا دیا وہ اس وقت وہیں سے پریشان حال چلے آ رہے تھے۔ اس صورت حال کا ذمّہ دار پورا عمرانی اور اقتصادی انقلاب ہے جس میں بے پناہ بڑھتی ہوئی آبادی اور بے لگام اور بے کار راج نیتی (سیاست) کی وجہ سے ابھی سُدھر نے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔

مسئلہ یہ ہے کہ جس نسل نے وہ گزشتہ تہذیب یا ماحول نہیں دیکھا ان کی سمجھ میں نہیں آسکتا کہ اگلے وقتوں کے لوگ اب کتنے دُکھی اور شاکی ہیں۔ آخر اس زمانے کی ایسی کیا بات تھی ؟

مجھے بہت افسوس ہوا اور میں نے جب حال ہی میں ایک خاتون نقاد کا مضمون پڑھا جس میں انھوں نے (Generation gaps) کے باوجود میرے لیے ایسا لہجہ اختیار کیا کہ جو میں ذاتی طور پر اپنے کسی بزرگ ادیب کے لئے سوچ بھی نہیں سکتی۔ انھوں نے بڑے استہزا کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ میں تہذیب وغیرہ کے بارے میں لکھتے لکھتے نہیں تھکتی۔ ان کے الفاظ کچھ اسی قسم کے تھے۔ تو بی بی اس طرح تو میں برابر لکھتی رہوں گی اور نہ تھکوں گی۔

ہر مصنف کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنی ترجیحات کے مطابق لکھے اور قاری کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اسے مسترد کر دے، مجھے یاد ہے کہ جمیل مہدی مرحوم (ایڈیٹر عزائم) نے لکھا تھا کہ اب ہم لوگ جس زبان میں بات کر رہے ہیں اس کو سمجھنے والا اب کوئی نہیں ہے میں نے امیر الدولہ لائبریری میں نایاب کتابیں باہر پڑی دیکھیں۔

مجھے ایسا لگتا ہے کہ لکھنؤ پر کچھ زیادہ ہی آفت آئی ہے۔ ان حالات میں یہ کون بیٹھ کر سوچے اور تجویز کرے کہ فلاں فلاں مکان اور کوچے ان کی ادبی اہمیت کی وجہ سے محفوظ کر دیے جائیں۔ مثال کے طور پر میں نے یہ اندازہ لگایا کہ چوک میں پُرانی سبزی منڈی کا وہ حصّہ جہاں سے کوچۂ میر انیس شروع ہوتا ہے شاید یہی مثنوی "زہرِ عشق" کی جائے وقوع تھی یا بھیم کا اکھاڑہ سنہٹی وغیرہ کا علاقہ وہی ہے جس کا تذکرہ حسن شاہ کے قصّۂ رنگیں میں کیا گیا ہے۔ اس کا ترجمہ نشتر کے نام سے سجاد حسین کسمنڈوی نے کیا ہے۔

گولہ گنج اور بارود خانے میں نواب آصف الدولہ کے زمانے میں انگریزوں نے اپنی پہلی چھاؤنی چھائی تھی اور بحیثیت (Camp Followers) خانم جان کا کنبہ وہیں اترا۔ انگریزوں کا قدیم فوجی قبرستان بھی اسی علاقے میں ہے جو اب گنجان آبادی کا علاقہ ہے اور کلن کی لاٹ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ آس پاس لوگوں نے اپنے مکان بنا لیے ہیں کمپنی باغ بھی اسی طرف ہے یعنی میڈیکل کالج کے آس پاس تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کا جہاں جہاں تسلّط ہوتا تھا، عوام کے لئے ایک باغ لگاتی تھی جو کمپنی باغ کہلاتا تھا۔ ۱۹۳۶ء میں گومتی کے کنارے جو صنعتی نمائش (Industrial Exibition) ہوتی تھی اور غالباً کمپنی باغ تک پھیلی تھی اس میں ایک پرستان تھیٹر (Paristan Theatre) تھا اس میں سہگل (Sehgal) اور اختری بائی فیض آبادی نے پارٹ (Part) ادا کیا تھا۔ اس نمائش کے انچارج لکھنؤ کی مشہور شاعرہ محترمہ داراب بانو وفا کے دادا تھے۔

دوسری نمائش جو ۱۹۳۸ء میں لگی تھی وہ بھی گومتی کے کنارے تھی اس زمانے میں لکھنؤ میں پان کی گلوریوں میں کیلیں لگائی جاتی تھیں۔ ہمارے گھر میں پان دان تھا مگر میں نے کبھی پان نہیں کھایا۔ میں اپنی والدہ بھائی اور چند رشتہ داروں کے ساتھ نمائش میں گھوم رہی تھی تو پان کی دکان پر مجھے کسی نے دو بیڑے پان دیئے جن میں لونگ کی جگہ چھوٹی کیلیں لگائی گئی تھیں میں وہ دونوں کھا گئی۔ وہ کیلیں جا کر میری آنتوں میں چبھیں، جان کے لالے پڑ گئے۔ فوراً میڈیکل کالج پہونچایا گیا۔

میں لکھنؤ میں جس اسکول میں پڑھتی تھی یعنی ماسٹر صاحب

قرۃ العین حیدر
جے ۱۴۰ - سیکٹر ۲۵ - نوئیڈا
غازی آباد

شہرِ آرزو

اردو کی کچھ شخصیتیں ایسی ہیں جنھوں نے اپنے عہد میں ہی اساطیری حیثیت حاصل کرلی ہے۔ محترمہ قرۃالعین حیدر صاحبہ بھی ہمارے عہد کی ایسی ہی شخصیت ہیں۔

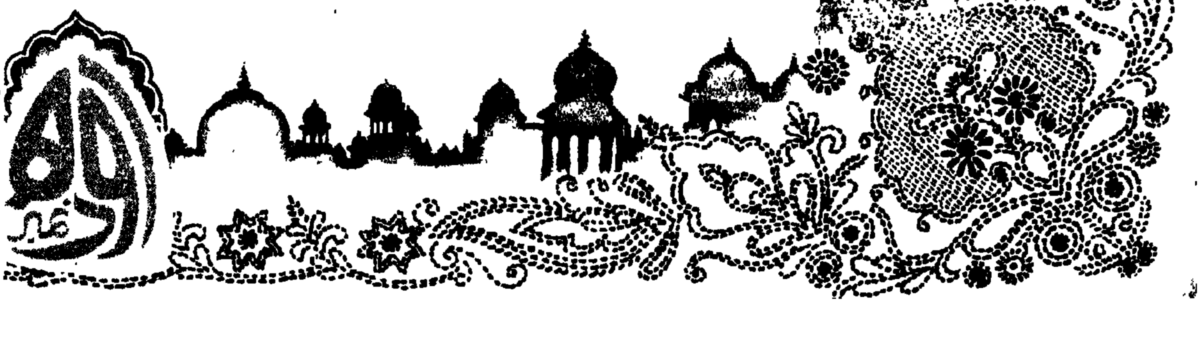
لکھنؤ آن کا شہرِ آرزو تھا اور ہے۔ ان کی برہمی اور اُن کا غصّہ اُسی بے پایاں اُلفت کا مظہر تھا جو انھیں اُردو سے ہے۔ پہلے وہ مجھ پر خفا ہوئیں۔ ازراہِ شفقت انھوں نے جو کچھ فرمایا وہ نذرِ قارئین ہے۔ کوئی سوال پوچھنے کا سوال ہی نہیں رہ گیا تھا۔ لکھنؤ کے بارے میں ان سے جو کچھ پوچھنا چاہتا تھا انھوں نے ایک ہی جواب میں سب کا احاطہ کرلیا ہے۔

——— الف ح

میں نے لکھنؤ کے بارے میں پچھلے چند برسوں میں دو ناول لکھے ہیں جن میں ایک ناول "گردشِ رنگِ چمن" ہے جس کا نام اگر انگریزی میں رکھا جائے تو وہ The Death of a City ہوگا۔ میں نے دوسرے ناول "چاندنی بیگم" میں لکھنؤ کے تیزی سے بدلتے ہوئے منظر کو پیش کیا ہے۔

ہمارے یہاں اس وقت خاص طور پر رویّہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ اپنے قومی تہذیبی سرمائے کو برباد کیا جائے۔ دوسرے ملکوں میں یہ سرمایہ سجا کے، سنوار کے بڑی احتیاط سے رکھا جاتا ہے۔ ہم نے اسے ایک سیاسی اکھاڑہ بنا دیا۔ لہٰذا کتب خانے، آرٹ کے ذخیرے، تاریخی عمارتیں، ادبی اور تہذیبی روایات — ان سب کو دھڑلے سے برباد کیا جا رہا ہے۔ جب تاج محل کی حالت ناگفتہ بہ ہوچکی ہے تو لکھنؤ کے امام باڑے کا کیا ذکر کیا جائے۔ میں نے اپنے کسی مضمون میں چند سال قبل لکھا تھا کہ پیرس (Paris) کا پرانا شہر قانوناً اس طرح محفوظ ہے کہ اس کی ایک اینٹ کو بھی نہیں ہٹایا ہے۔ لکھنؤ میں تاریخی عمارتیں باضابطہ طور پر منہدم کی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر روشن الدولہ کی کچہری۔ جو عمارتیں باقی ہیں ان میں نیلے اور پیلے رنگ پوت دیئے گئے ہیں جس طرح پرانی عمارات کو نئی عمارتوں کے ساتھ طرزِ تعمیر کی مناسبت سے (Blend) کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس لکھنؤ میں انتہائی بھدّی عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں اور افسوس یہ ہے کہ کسی نے اس صورتِ حال پر توجہ نہ کی۔ شاید کسی نے بھی نہیں۔ اس شہر کو جو اہلِ ذوق کے لیے جنّت نگاہ تھا، کس بے دردی سے تاراج کیا گیا۔ ایک وقت تھا کہ منشی نول کشور خود بیل گاڑی پر جگہ جگہ دوسرے شہروں میں جاتے تھے اور اپنی کتابیں فروخت کرتے تھے اور اس طرح انھوں نے اُردو کی عظیم الشان خدمت انجام دی۔ ایک وقت یہ ہے کہ ان کے وارثوں نے اُردو والوں سے کہا کہ ان کے گودام میں جو کتابیں ہیں "لے لو" اور انھیں محفوظ کرلو۔ لیکن کسی نے پروا نہیں کی۔

آج سے قریب دس سال پہلے کی بات ہے کہ میں نے اُردو اکادمی کے اربابِ اقتدار سے بارہا درخواست کی کہ وہ اس نایاب ذخیرے کو اپنے یہاں منتقل کرلیں۔ مجھے جو جواب ملا، میں سناٹے میں آگئی۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں پرانے لکھنؤ کی کچھ یادیں تازہ کروں۔



میں موجودہ لکھنؤ کے بارے میں اتنی غم و غصہ میں بھری بیٹھی ہوں کہ میں پرانے لکھنؤ کے بارے میں کیا لکھوں؟ کیا میں یہ بتاؤں کہ میرے بچپن کے لکھنؤ میں پرانے شہر کی گلیاں کتنی صاف ستھری تھیں۔ فرقہ وارانہ تاثرات ناپید تھے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں نظام تعلیم بہت اچھا تھا، پڑھائی ہوتی تھی۔ غنڈہ گردی، امتحان میں نقل کرنا اور نگرانوں کو چاقو دکھا کر بھگا دینا اس قسم کے خواب و خیال کسی کے دماغ میں نہ آسکتے تھے۔

ابھی کچھ سال پہلے کی بات ہے کہ ایک صاحب نے بتایا کہ وہ شیعہ کالج میں مدرسہ کے امتحان کے سنٹر میں نگرانی کر رہے تھے۔ لڑکوں نے ان کو چاقو دکھا کر بھگا دیا وہ اس وقت وہیں سے پریشان حال چلے آرہے تھے۔ اس صورت حال کا ذمہ دار پورا عمرانی اور اقتصادی انقلاب ہے جس میں بے پناہ بڑھتی ہوئی آبادی اور بے لگام اور بے کار راج نیتی (سیاست) کی وجہ سے ابھی سدھرنے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔

مسئلہ یہ ہے کہ جس نسل نے وہ گزشتہ تہذیب یا ماحول نہیں دیکھا ان کی سمجھ میں نہیں آسکتا کہ اگلے وقتوں کے لوگ اب کتنے دکھی اور شاکی ہیں۔ آخر اس زمانے کی ایسی کیا بات تھی؟

مجھے بہت افسوس ہوا اور میں نے جب حال ہی میں ایک خاتون نقاد کا مضمون پڑھا جس میں انھوں نے (Generation gaps) کے باوجود میرے لیے ایسا لہجہ اختیار کیا کہ جو میں ذاتی طور پر اپنے کسی بزرگ ادیب کے لئے سوچ بھی نہیں سکتی۔ انھوں نے بڑے استہزا کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ میں تہذیب وغیرہ کے بارے میں لکھتے لکھتے نہیں تھکتی۔ ان کے الفاظ کچھ اسی قسم کے تھے۔ تو بی بی اس طرح تو میں برابر لکھتی رہوں گی اور نہ تھکوں گی۔

ہر مصنف کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنی ترجیحات کے مطابق لکھے اور قاری کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اسے مسترد کردے۔ مجھے یاد ہے کہ جمیل مہدی مرحوم (ایڈیٹر عزائم) نے لکھا تھا کہ اب ہم لوگ جس زبان میں بات کررہے ہیں اس کو سمجھنے والا اب کوئی نہیں ہے میں نے امیر الدولہ لائبریری میں نایاب کتابیں باہر پڑی دیکھیں۔

مجھے ایسا لگتا ہے کہ لکھنؤ پر کچھ زیادہ ہی آفت آئی ہے۔ ان حالات میں یہ کون بیٹھ کر سوچے اور تجویز کرے کہ فلاں فلاں مکان اور کوچے ان کی ادبی اہمیت کی وجہ سے محفوظ کر دیے جائیں۔ مثال کے طور پر میں نے یہ اندازہ لگایا کہ چوک میں پرانی سبزی منڈی کا وہ حصہ جہاں سے کوچہ میر انیس شروع ہوتا ہے شاید یہی مثنوی "زہر عشق" کی جائے وقوع تھی یا بھیم کا اکھاڑہ سٹھٹی وغیرہ کا علاقہ وہی ہے جس کا تذکرہ حسن شاہ کے قصۂ رنگیں میں کیا گیا ہے۔ اس کا ترجمہ نشتر کے نام سے سجاد حسین کسمنڈوی نے کیا ہے۔

گولہ گنج اور بارود خانے میں نواب آصف الدولہ کے زمانے میں انگریزوں نے اپنی پہلی چھاؤنی چھائی تھی اور بحیثیت (Camp Followers) خانم جان کا کنبہ وہیں اترا۔ انگریزوں کا قدیم فوجی قبرستان بھی اسی علاقے میں ہے جو اب گنجان آبادی کا علاقہ ہے اور کلن کی لاٹ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ آس پاس لوگوں نے اپنے مکان بنا لیے ہیں کمپنی باغ بھی اسی طرف ہے یعنی میڈیکل کالج کے آس پاس تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کا جہاں جہاں تسلط ہوتا تھا، عوام کے لئے ایک باغ لگاتی تھی جو کمپنی باغ کہلاتا تھا۔ ۱۹۳۰ء میں گومتی کے کنارے جو صنعتی نمائش (Industrial Exibition) ہوتی تھی اور غالباً کمپنی باغ تک پھیلی تھی اس میں ایک پرستان تھیٹر (Paristan Theatre) تھا اس میں سہگل (Sehgal) اور اختری بائی فیض آبادی نے پارٹ (Part) ادا کیا تھا۔ اس نمائش کے انچارج لکھنؤ کی مشہور شاعرہ محترمہ داراب بانو وفا کے دادا تھے۔

دوسری نمائش جو ۱۹۳۸ء میں لگی تھی وہ بھی گومتی کے کنارے تھی اس زمانے میں لکھنؤ میں پان کی گلوریوں میں کیلیں لگائی جاتی تھیں۔ ہمارے گھر میں پان دان تھا مگر میں نے کبھی پان نہیں کھایا۔ میں اپنی والدہ بھائی اور چند رشتہ داروں کے ساتھ نمائش میں گھوم رہی تھی تو پان کی دکان پر مجھے کسی نے دو بیڑے پان دیئے جن میں لونگ کی جگہ چھوٹی کیلیں لگائی گئی تھیں میں وہ دونوں کھا گئی۔ وہ کیلیں جا کر میری آنتوں میں چبھیں، جان کے لالے پڑ گئے۔ فوراً میڈیکل کالج پہنچایا گیا۔

میں لکھنؤ میں جس اسکول میں پڑھتی تھی یعنی ماسٹر صاحب

ٹھٹر والا اسکول ؛ میں اپنے ناولوں اور کہانیوں میں اس کا ذکر کرتے نہیں تھکتی۔

پٹرول راشننگ (Rationing) شروع ہوگئی تھی میں گھوڑا گاڑی پر ماسٹر صاحب کے اسکول جایا کرتی تھی۔ ماسٹر صاحب یعنی پیروی سنگھ سر پرواستوا بفضلِ خدا حیات ہیں اور لکھنو میں ان کا وہ اسکول اب مہاتما گاندھی گرلس کالج کہلاتا ہے۔

میرا ایک مضمون موسیقی بھی تھا تو میں گھوڑا گاڑی پر طنبورہ سامنے رکھے اسکول جاتی تھی اور شام کو جھٹ پٹے وقت گھوڑا گاڑی موتی محل برج پر پہونچتی تھی۔ میں نے یہ سارا منظر "آگ کا دریا" میں پیش کیا طلعت گھوڑا گاڑی پر طنبورہ لیے اسکول آتی اور جاتی ہے۔ یہ ناول عرصہ ہوا ہندی میں بھی چھپ چکا ہے اور بڑا توارد یہ ہوا ہے کہ ہندی کے ایک مشہور ادیب کا ناول جو ابھی حال ہی میں چھپا ہے اس کی ہیروئن بھی طنبورہ لیے گھوڑا گاڑی پر میوزک (Music) سیکھنے جاتی ہے اور پھر موتی محل برج پر گاڑی واپس پہونچتی ہے اور وہاں سے دریا کنارے کوٹھی میں جاتی ہے جس طرح "آگ کا دریا" میں طلعت سنگھاڑے والی کوٹھی جاتی تھی۔

اس زمانے میں لکھنو شہر کے اندر پالکیاں اور جو پہلے چلتے تھے میری والدہ اپنے چند رشتہ داروں کے یہاں مجالسِ محرم میں کٹرہ ابو تراب خاں (لکھنؤ) وغیرہ جاتی تھیں۔ کار باہر چھوڑ کر ایک جو پہلے پر بیٹھتی تھیں، اور میں بھی بڑے شوق سے جو پہلے کی سواری کرتے ہوئے قدیم حویلیوں میں جاتی تھی جہاں میراثنیں نوحہ و ماتم کرتی تھیں۔

اب جبکہ مجھے اکثر لندن میں مجالسِ محرم میں شرکت کا اتفاق ہوا تو میں نے انقلابِ زمانہ پر عش عش کیا۔ اب لکھنؤ اور کراچی وغیرہ کے ذاکر اور مرثیہ خوان لندن اور شکاگو میں مجلسیں پڑھ رہے ہیں۔

یہ عالمی سیاست اور عالمی اقتصادیات کے نئے منظر نامے کا ایک پہلو ہے جس نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا ہے۔ برمنگھم میں محرم کے جلوس نکلتے ہیں اور شکاگو میں گھوڑے جوڑے کی شادیاں ہوتی ہیں۔ لکھنؤ کی میراثنیں لندن میں بڑی مقبول آرٹسٹ بن چکی ہیں اور مرسیڈیز گاڑی پر گھومتی ہیں لیکن غالباً کسی NRI کو یہ خیال نہ آیا ہوگا کہ تاریخی عمارتوں اور آثار کی تھوڑی بہت مرمت ہی کرا دیں۔

□□

کُتُب خَانَہ

"اُن کے (آصف الدولہ کے) کتب خانے میں تین لاکھ منتخب کتابیں میں نے دیکھی تھیں جو نہایت پاکیزہ خط میں لکھی ہوئی تھیں۔ ہر سو کتابوں پر ایک گماشتہ مقرر تھا۔ مختلف فنون و اصناف پر عربی، فارسی اور انگریزی میں کتابیں تھیں۔ نظم و نثر کی کتابیں۔ تاریخیں اور دواوین بے شمار تھے۔ ان کے علاوہ خوش نما قطعات جو اولین و آخرین خوشنویسوں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے اور ایران، ہند، روم اور فرنگ کے مصوّروں کی بنائی ہوئی تصویریں اتنی تعداد میں تھیں کہ ان کے دیکھنے سے تمام عمر فراغت نہ مل سکے۔۔۔۔

میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تخریب سلطنت کے بعد سلاطین تیموریہ کا کتب خانہ جس کے ہاتھ بھی لگا ہوگا اس کے خزائن اور دفائن اور سامان طلا و جواہر اس کتب خانہ کا عشرِ عشیر بھی نہ ہوگا۔"

— عبدُاللطیف شوستری

"تحفۃ العالم"

سلطنتِ اودھ کا توقیت نامہ

برہان الملک سعادت خان



۱۱ھ تا ۱۱۵۱ھ له
۱۷ء تا ۱۷۳۸ء

صفدر جنگ



۱۱۵۱ھ تا ۱۱۶۶ھ
۱۷۳۸ء تا ۱۷۵۳ء

شجاع الدولہ



۱۱۶۶ھ تا ۱۱۸۸ھ
۱۷۵۳ء تا ۱۷۷۵ء

آصف الدولہ



۱۱۸۸ھ تا ۱۲۱۲ھ
۱۷۷۵ء تا ۱۷۹۷ء

وزیر علی خان



۱۷۹۷ء تا ۱۷۹۸ء
(مدتِ حکومت چار مہینے)

سعادت علی خان



۱۲۱۲ھ تا ۱۲۲۹ھ
۱۷۹۸ء تا ۱۸۱۴ء

غازی الدین حیدر



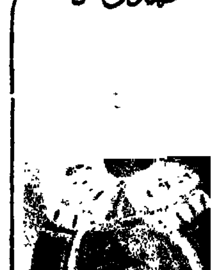
۱۲۲۹ھ تا ۱۲۴۳ھ
۱۸۱۴ء تا ۱۸۲۷ء

نصیر الدین حیدر



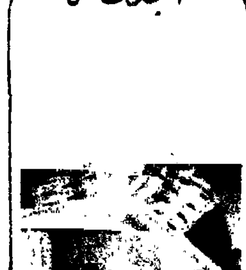
۱۲۴۳ھ تا ۱۲۵۳ھ
۱۸۲۷ء تا ۱۸۳۷ء

محمد علی شاہ



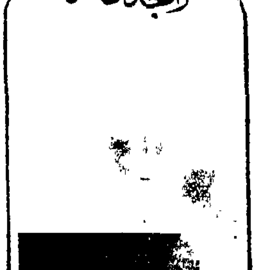
۱۲۵ھ تا ۱۲۵۸ھ
۱۸۲ء تا ۱۸۴۲ء

امجد علی شاہ



۱۲۵۸ھ تا ۱۲۶۳ھ
۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۷ء

واجد علی شاہ



۱۲۶۳ھ تا ۱۲۷۲ھ
۱۸۴۷ء تا ۱۸۵۶ء

برجیس قدر



۱۲۷۳ھ تا ۱۲۷۴ھ
۱۸۵۷ء تا ۱۸۵۸ء

له برہان الملک کی وفات اور صفدر جنگ کی مسند نشینی کے سنہ یقین کے ساتھ نہیں معلوم۔



پروفیسر آل احمد سرور
سرسید نگر، علی گڑھ

لکھنؤ: کچھ یادیں کچھ باتیں

جنوں ہر دشت وصحرا میں لیے پھرتا تو ہے ہم کو
مگر اک وادیٔ گل کو برابر یاد رکھتے ہیں

اگست ۱۹۴۶ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں اُردو کے ریڈر کی حیثیت سے میں نے کام شروع کیا۔ اس وقت مشہور ادیب اور محقق سید مسعود حسن رضوی، صدر شعبہ تھے۔ شعبہ اُردو اور فارسی دونوں کا تھا۔ فارسی میں مسعود حسن رضوی کے علاوہ عبدالقوی فانی اور یوسف حسین موسوی لکچرر تھے اور اُردو میں میرے علاوہ سید احتشام حسین، نورالحسن ہاشمی اور سید محمد تقی لکچرر تھے۔ تقی صاحب کا چند سال کے بعد انتقال ہوگیا اور ان کی جگہ عبدالاحد خاں خلیل مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں میرا قیام بیررووڈ (لال باغ) پر تھا۔ یہ حضرت گنج اور یونیورسٹی کے درمیان تھا۔ میں دس منٹ میں سائیکل سے وہاں پہونچ جاتا تھا۔ یونیورسٹی سے پہلے گومتی پر ایک پل تھا جو منکی برج کہلاتا تھا۔ اب اس کا نام 'ہنومان سیتو' ہے۔ میں جب لکھنؤ پہونچا ہوں تو یونیورسٹی کے وائس چانسلر بشیشور دیال تھے۔ بشیشور دیال ایک تعلقدار تھے۔ سال بھر کے بعد اچاریہ نریندر دیو، وائس چانسلر ہوکر آئے۔ میرے لکھنؤ یونیورسٹی میں تقرر کے چند ماہ بعد ہی ایران سے ایک ثقافتی وفد علی اصغر حکمت کی قیادت میں آیا۔ اس سے چار پانچ سال پہلے جب میں علی گڑھ میں تھا، علی اصغر حکمت ایک اور وفد کے قائد کی حیثیت سے ہندستان آچکے تھے اور ان کے وفد کے ایک رکن پورداؤد کے اقبال کے متعلق ایک جملے کی وجہ سے لاہور میں خاصا ہنگامہ ہوا تھا۔ انھوں نے اس نشست میں ٹیگور کی بڑی تعریف کی تھی اور انھیں آفاقی شاعر بتایا تھا۔ جب ان سے یہ پوچھا گیا کہ اقبال کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے تو انھوں نے یہ کہہ کر بات ختم کردی تھی کہ "اقبال تو ایک مقامی شاعر ہیں۔" بعد میں علی اصغر حکمت کو ایک بیان دینا پڑا تھا جس میں انھوں نے اقبال کی عظمت کا اعتراف کیا تھا۔

غرض جب ۱۹۴۷ء کے شروع میں، غالباً مارچ میں علی اصغر حکمت، ڈاکٹر صادقی اور ایک صحافی، ان تین حضرات کا وفد علی گڑھ پہنچا تو وائس چانسلر نے مجھے لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں اس وفد کا سکریٹری مقرر کیا تاکہ میں لکھنؤ میں ان کی ساری مصروفیات کو منظم کرسکوں۔ علی اصغر حکمت کا یونیورسٹی میں ایک لکچر ہوا تھا جس میں مسعود حسن رضوی صاحب نے فارسی میں ان کا تعارف کرایا تھا۔ شام کو ایک استقبالیہ میں جو لکھنؤ کے شہریوں کی طرف سے اس وفد کو دیا گیا تھا۔ شری پرشوتم داس ٹنڈن نے، جو ایک سینیر کانگریسی ہونے کے علاوہ ہندی کے بہت پرجوش حامیوں میں تھے، مجھ سے کہا کہ:

"میں علی اصغر حکمت سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں، تاکہ ایران میں عربی الفاظ کو خارج کرکے خالص فارسی الفاظ استعمال کرنے کی جو روش عام ہوگئی ہے اس کے متعلق ان سے بات کروں۔"

وفد کا قیام کارلٹن ہوٹل میں تھا اور میں نے دوسرے دن سہ پہر میں ان کے لیے ملاقات کا وقت طے کردیا۔ لیکن دوسرے دن صبح ہی حکمت صاحب کو ٹنڈن جی کے متعلق اور زبان کے سلسلے میں ان کے نظریے کے متعلق ضروری معلومات فراہم کردیں۔ بعد میں علی اصغر حکمت نے اس

ملاقات کی رُوداد بتاتے ہوئے کہا کہ یہ حضرت تو زبان کے معاملے میں بہت کٹر معلوم ہوتے ہیں۔ ایران میں بلا شبہ اس وقت ایک تحریک چل رہی ہے کہ عربی کے ان الفاظ کی جگہ جو فارسی میں استعمال ہوتے آئے ہیں، خالص فارسی کے الفاظ استعمال کیے جائیں۔ مثلاً شعور، لاشعور، تحت شعور کی جگہ آگہی، ناآگہی، تحت آگہی۔ مگر اس روش کی بعض حلقوں میں مخالفت بھی ہو رہی ہے۔ حکمت نے کہا کہ میں تو دوسری زبانوں کے ان الفاظ کو جو ایک عرصۂ دراز سے ہماری زبان میں رائج ہیں، یک قلم خارج کرنے کے حق میں نہیں ہوں اور یہی مشورہ میں نے آپ کے ٹنڈن جی کو دیا ہے۔

شروع ۱۹۴۷ء میں میں نے شعبہ میں اقبال سوسائٹی قائم کی۔ جس کے لئے پنڈت جواہر لال نہرو، مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر عابد حسین نے خیر سگالی کے پیغامات بھیجے تھے۔ مولوی عبدالحق صاحب کے پیغام کی اہمیت یہ ہے کہ اس سے اقبال کے ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ کے سفر کا ثبوت مل جاتا ہے۔ ڈاکٹر اکبر حیدری نے اقبال کے لکھنؤ کے سفر پر جو شبہ ظاہر کیا ہے وہ بے بنیاد ٹھہرتا ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب کے سپرد انجمن کی خدمت جس طرح کی گئی اس کا حال بھی ملتا ہے۔ پیغام یہ ہے:

انجمن ترقی اُردو ہند

۱۔ دریا گنج۔ دہلی ۲۲ جنوری ۱۹۴۷ء

۱۹۱۲ء ماہ دسمبر کی آخری تاریخوں میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں ہوا میجر حسن بلگرامی مرحوم اس کے صدر تھے۔ ڈاکٹر اقبال بھی اس جلسے میں شریک تھے۔ اہلِ جلسہ نے بہت مجبور کیا تو انھوں نے بھی ایک مختصر تقریر کی۔ حضرت صفی کی نظم کی بہت تعریف ہوئی تھی۔ کانفرنس کے آخری روز شب کے وقت انجمن ترقی اُردو کا جلسہ تھا۔ یہ انجمن کئی سال سے بے غوری کی حالت میں پڑی سسک رہی تھی۔ مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب صدر مجلس تھے اور وہی انجمن کے سکریٹری بھی تھے۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے اپنی تقریر میں انجمن کے سکریٹری کی خدمت کے لئے مجھے تجویز کیا۔ اس بلا کو سب اپنے سر سے ٹالنا چاہتے تھے۔ اب میرے سر منڈھ دی گئی۔ اور بھی دو ایک صاحبوں نے تقریریں کیں: سید سجاد حیدر مرحوم نے اپنی تقریر میں بہت افسوس ظاہر کیا کہ ڈاکٹر اقبال جیسا شخص لکھنؤ آیا اور اہلِ لکھنؤ نے کچھ التفات نہ کیا۔ اس پر چند اہلِ لکھنؤ جو اس مجمع میں موجود تھے بہت بگڑے اور اس صحبت میں جو ٹھنڈی پڑ گئی تھی تھوڑی دیر کے لئے گرمی پیدا ہو گئی۔

اب جو آپ نے مجھے بزمِ اقبال کے قائم کرنے کی اطلاع دی تو معاً یہ واقعہ یاد آ گیا۔ آپ نے بڑا اچھا کام کیا ہے۔ ایک تو ادب کی خدمت کی ہے دوسرے لکھنؤ پر سے الزام رفع ہو جاتا ہے اس اعتبار سے آپ دوہرے شکریے کے مستحق ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی نگرانی اور ہدایت میں یہ بزم صحیح ادبی ذوق پیدا کرنے میں کامیاب ہوگی۔"

——— عبدالحق

۱۹۴۷ء میں آزادی کے بعد جو فسادات شروع ہوئے اُن کا اثر لکھنؤ میں زیادہ نہیں تھا۔ کچھ لوگ جو پنجاب سے لٹ پٹ کر آئے تھے انھوں نے لکھنؤ میں ہنگامہ کرنے کی کوشش کی مگر لکھنؤ والوں نے ان کی ان کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ ہاں ان لوگوں کو شہر میں سر چھپانے کی جگہ مل گئی اور ان میں سے بہت سے لوگوں نے رفتہ رفتہ اپنا کوئی نہ کوئی کاروبار شروع کر دیا۔ اکتوبر کے آخر میں پنجاب سے آئے ہوئے شرنارتھیوں کی امداد کے سلسلے میں لکھنؤ کے اُردو دوستوں نے ایک مشاعرہ کا اہتمام کیا۔ مشاعرہ کمیٹی میں میں بھی شریک تھا۔ قرۃ العین حیدر اس وقت انگریزی میں ایم اے کر چکی تھیں اور انھوں نے اس وقت مشاعرہ کے ٹکٹ بھی بیچے تھے لیکن مشاعرہ کے انعقاد سے پہلے ہی وہ اپنی والدہ کے اصرار پر پاکستان چلی گئیں۔ مشاعرہ کے چند روز بعد سردار جعفری مجھ سے ملنے بیرو روڈ آئے اور مجھے بتایا کہ دسمبر میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی طرف سے ایک آل انڈیا کانفرنس کرنے کا ارادہ ہے جس کے لئے ایک

استقبالیہ کمیٹی کی تشکیل فوراً کرلی ہے۔ سردار نے اصرار کیا کہ میں اس استقبالیہ کمیٹی کا سکریٹری یا یوں کہیے کہ کانفرنس کا کنوینر ہو جاؤں۔ میں نے یہ عذر پیش کیا کہ مجھے لکھنؤ آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا اور ابھی میں لکھنؤ میں ساری اہم شخصیتوں سے رابطہ قائم نہیں کر پایا ہوں، اس لیے کسی اور کو یہ منصب سونپا جائے۔ اس سلسلے میں میں نے احتشام صاحب کا نام لیا۔ لیکن سردار نے بتایا کہ احتشام صاحب تو کسی طرح اس ذمہ داری کے لیے تیار نہیں ہیں اور آپ کے سوا کوئی اور ایسا نہیں جو کانفرنس کے سلسلے میں سارے انتظامات بخیر و خوبی انجام دے سکے۔ بہر حال میں نے ان کی بات مان لی اور انتظامات شروع کر دیئے۔ چندہ کی فراہمی کے سلسلے میں تو خود سردار اور سلطانہ دونوں گشت کر رہے تھے اور کانفرنس کے کچھ عرصے بعد ہی دونوں کی شادی کی خبر آ گئی۔ کانفرنس بہت اچھی ہوئی۔ سجاد ظہیر پاکستان سے اس میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ قاضی عبدالغفار فراق گورکھپوری، نیاز فتحپوری نے مختلف اجلاسوں کی صدارت کی۔

یہاں یہ لطیفہ بیان کرنا شاید نامناسب نہ ہو کہ جب فراق کانفرنس سے دو دن پہلے مجھ سے ملنے آئے تو میں نے ان سے کہا کہ اگر آپ کا خطبہ تحریری ہو تو اچھا ہے۔ وہ اس پر کچھ برہم بھی ہوئے تو میں نے ان سے کہا کہ اچھی سے اچھی تقریر بالآخر کچھ عرصے کے بعد لوگوں کے دلوں سے محو ہو جاتی ہے جب کہ تحریر کے ذریعہ سے ان خیالات کی تب و تاب باقی رہتی ہے۔ فراق نے میری اس بات کی صداقت کو تسلیم کیا مگر کہنے لگے:

"بھائی مجھے تو مجمع کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے میں لطف آتا ہے۔"

اور یہ واقعہ ہے کہ فراق کی زبان کے مسئلہ پر یہ تقریر واقعی بڑی شان دار تھی۔ انھوں نے کوئی ایک گھنٹہ تقریر کی ہوگی۔ لیکن لوگ مسحور ہو کر ان کی باتیں سن رہے تھے۔ عرصے کے بعد جب ۱۹۷۳ء میں رام لعل نے غیر مسلم اُردو مصنفین کی ایک کانفرنس لکھنؤ میں کی تو اس میں بھی فراق کی ایسی ہی شان دار تقریر ہوئی۔ اس وقت ٹیپ ریکارڈر کا استعمال بہت کم ہوتا تھا اس لیے افسوس ہے یہ تقریریں ٹیپ نہ کی جا سکیں۔ کانفرنس گنگا پرشاد میموریل ہال امین آباد میں ہوئی تھی۔ عابد سہیل نے نیا دور کے اودھ نمبر (ضمیمہ۔ جون ۱۹۹۴ء) میں یہ صحیح نہیں لکھا کہ اس کانفرنس کا مشاعرہ امبیسڈر ہوٹل میں ہوا تھا۔ مشاعرہ بھی گنگا پرشاد میموریل ہال میں ہوا تھا اور اس کے صدر آثر لکھنوی تھے۔ اسی مشاعرے میں جگر صاحب نے وہ معرکۃ الآرا غزل پڑھی تھی جس کا مطلع ہے ؎

فکر جمیل خواب پریشاں ہے آجکل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آجکل

اسی مشاعرہ میں سردار جعفری نے "نئی دنیا کو سلام" کا ایک حصہ سُنایا تھا مگر لکھنؤ کے قدامت پرست ماحول میں ان کی یہ آزاد نظم چلی نہیں اور ان پر جب ہوٹنگ شروع ہوئی تو انھوں نے یہ سلسلہ جلد ہی ختم کر دیا۔ ویسے یہ مشاعرہ بہت شان دار تھا اور اس میں اثر لکھنوی اور جگر کے علاوہ اختر انصاری، وامق اور بہت سے ترقی پسند شعراء شریک تھے۔ مگر اس مشاعرہ میں جگر کے سامنے کسی کا چراغ نہ جلا اور اس کا اعتراف سجاد ظہیر نے بھی مشاعرہ کے بعد کیا تھا۔

یاد آتا ہے کہ اُردو کانفرنس کے چند روز بعد ہی دسمبر کے آخر ہفتے میں مسلمانانِ ہند کا ایک بڑا اجتماع بھی لکھنؤ میں ہوا تھا جس کے انتظامات میں حافظ ابراہیم اور قاضی عبدالغفار پیش پیش تھے۔ مولانا آزاد نے اسی کانفرنس میں مسلمانوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ فرقہ پرست سیاست کو چھوڑ کر کسی قومی جماعت کے ساتھ ہو جائیں۔ ان کا مشورہ کانگریس میں شمولیت کے لیے تھا۔

بشیشور دیال سیٹھ کا ٹرم جب ختم ہو گیا تو اچاریہ نریندر دیو کا لکھنؤ یونیورسٹی میں وائس چانسلر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ اچاریہ نریندر دیو سے پہلے میں ۱۹۳۸ء میں فیض آباد میں مل چکا تھا وہاں ایک لکچر کے سلسلے میں گیا ہوا تھا تو وہاں ایک دوست کے ساتھ اچاریہ نریندر دیو کے گھر گیا۔ وہ فیض آباد کے رہنے والے تھے اور وہاں کے مشہور محلے گلاب باڑی میں ان کا مکان تھا۔ اس زمانے میں وہ کانگریس کے ممتاز رہنماؤں میں سے تھے۔

۱۹۴۲ء میں ہندستان چھوڑو تحریک کے سلسلے میں جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد کے ساتھ احمد نگر کے قلعہ میں نظر بند رہے۔ بعد میں انھوں نے کانگریس چھوڑ دی تھی اور سوشلسٹ پارٹی قائم کی تھی۔ اچاریہ نریندر دیو اُردو سے خاصے آشنا تھے اور انھوں نے ایک گفتگو میں مجھے بتایا تھا کہ بچپن میں وہ اپنی نانی کے ساتھ فیض آباد کی زنانی مجلسوں میں جایا کرتے تھے جہاں عام طور پر انیس و دبیر کے مرثیے پڑھے جاتے تھے۔ ان مرثیوں کی وجہ سے وہ اُردو سے اچھی طرح واقف ہو گئے تھے۔ اچاریہ جی پالی کے ممتاز عالم تھے اور ہندی میں بھی وہ ایک صاحب طرز ادیب کی حیثیت رکھتے تھے، دلچسپ بات یہ تھی کہ باوجود اس کے وہ ہندستانی کے حامی تھے۔ جب ہندی بولتے تھے تو اچھی خاصی ادبی ہندی ہوتی تھی اور جب اُردو بولتے تھے تو وہ اُردوئے معلیٰ معلوم ہوتی تھی۔ میں نے ایک دفعہ ان سے دریافت کیا کہ یہ تضاد کیوں ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ بھئی میں نظریاتی طور پر ہندستانی کا حامی ہوں لیکن میرا ادبی ذوق کھچڑی زبان کو پسند نہیں کرتا۔

میں نے اپنی زندگی میں تین ایسے وائس چانسلر دیکھے جنھوں نے اپنے دور میں ان یونیورسٹیوں کو نئی بلندیوں پر پہونچایا جہاں وہ وائس چانسلر رہے۔ اچاریہ نریندر دیو، ڈاکٹر ذاکر حسین اور سی. ڈی. دیش مکھ۔ (ڈاکٹر نریندر دیو لکھنؤ یونیورسٹی، ڈاکٹر ذاکر حسین علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور ڈاکٹر سی. ڈی. دیش مکھ دہلی یونیورسٹی کے کارناموں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا) لکھنؤ یونیورسٹی اس زمانے میں ہندستان کی بہترین یونیورسٹیوں میں گنی جاتی تھی۔ وہاں بیربل ساہنی، بہل اور آر. جی. مشرا جیسے سائنس داں، سدھانت اور سریشت جیسے انگریزی کے استاد اور ڈی. پی. مکرجی، وحید مرزا، مسعود حسین رضوی، بی. این. موجمدار جیسے اساتذہ تھے، جن کی شہرت سارے ملک میں تھی۔ ڈی. پی. مکرجی کے متعلق BEVERLY NICOLS نے کہا تھا کہ انھیں ہندستان میں ایک ہی انٹلکچول ڈی. پی. مکرجی ملے۔

جب تک میرا قیام ۷ بیرو روڈ لکھنؤ میں رہا، ہر اتوار کو یہاں انجمن ترقی پسند مصنفین کا جلسہ ہوا کرتا تھا۔ یہ جلسے اتنی پابندی سے ہوتے تھے کہ "نیشنل ہیرالڈ" کے ایڈیٹر کہتے تھے کہ ہم اس جلسے کی اطلاع ضروری نہیں سمجھتے خود ہی اس کی باقاعدگی کی وجہ سے اس کا اعلان کر دیتے ہیں۔ ان جلسوں میں لکھنؤ کے بیشتر پرانے اور نئے ادیب شریک ہوتے تھے۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے استادوں میں جن لوگوں سے میرا ربط وضبط زیادہ رہا ان میں ڈاکٹر عبد العلیم، سید احتشام حسین، نور الحسن ہاشمی، عبد الاحد خاں خلیل اور احسن فاروقی قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ شعبۂ انگریزی کے شیام کشن نرائن اور دیوکی پانڈے اور شعبۂ اقتصادیات کے ویر بہادر سنگھ اور اودھ کشور سرن اور نصیر احمد خاں اور شعبۂ انگریزی کے ہری کشن اوستھی قابلِ ذکر ہیں۔ شاگردوں میں آل حسن (بی بی سی والے) حنیف فوق، منظر سلیم قاضی عبد الستار، چودھری محمد نعیم، نادر علی خاں، مسعود عالم، امیر احمد صدیقی، احمد جمال پاشا اور عالیہ عسکری (عالیہ امام) یاد آتے ہیں۔

میں جب ۱۹۵۲ء میں بیرو روڈ سے منتقل ہو کر نعمت اللہ بلڈنگ امین آباد میں آ گیا تو ترقی پسند مصنفین کے جلسے یہاں بھی پابندی سے ہونے لگے۔

لکھنؤ کے قیام میں جن ادیبوں سے ملنے کا موقع ملا، ان میں اثر لکھنوی، آنند نرائن ملا، کشن پرشاد کول، چودھری محمد علی ردولوی اور حبیب احمد صدیقی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اثر لکھنوی سے سب سے پہلی ملاقات چکراتہ کے ڈاک بنگلے میں ہوئی تھی۔ اثر صاحب اس زمانے میں دہرہ دون کے کلکٹر تھے اور دورے پر چکراتہ آئے ہوئے تھے۔ میں علی گڑھ یونیورسٹی کے چند ساتھیوں کے ساتھ مسوری سے شملہ کا پیدل سفر کر رہا تھا۔ جب ہم لوگ چکراتہ پہونچے تو معلوم ہوا کہ ڈاک بنگلے میں کوئی کمرہ خالی نہیں ہے کیوں کہ وہاں کلکٹر صاحب کا قیام ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کلکٹر جعفر علی خاں اثر لکھنوی ہیں۔ ان کا نام سنا تھا اور ان کے مضامین بھی رسالوں میں دیکھے تھے۔ ہمارے ایک ساتھی کے پاؤں میں چکراتہ کے قریب پہونچتے پہونچتے جونکیں لپٹ گئی تھیں اور ان کا جوتا خون سے رنگین ہو گیا تھا۔ اس لئے ہمیں جلد سے جلد کہیں سر چھپانے کی جگہ کی ضرورت تھی۔ میں نے بالآخر ہمت کر کے اثر صاحب سے کہلایا کہ "ہم لوگ اس حالت میں یہاں

پہنچے ہیں۔ چونکہ ان میں کسی سے واقف نہیں ہیں اور آپ کے قیام کی وجہ سے ڈاک بنگلے میں جگہ ملنے کا کوئی سوال نہیں کیا۔ کیا آپ ازراہ مہربانی ایک رات ٹھہرنے کا انتظام کروادیں گے، صبح ہمیں اگلے پڑاؤ کے لئے چلنا ہے۔"

اثر صاحب نے نہ صرف ہمارے لئے کمرہ خالی کروادیا بلکہ شام کے کھانے کی دعوت بھی دی تھی اور کھانے کے بعد انھوں نے خاصی دیر تک اپنا کلام بھی سُنایا۔ ان سے اس طرح تعارف تو ہو ہی گیا تھا جب میں لکھنؤ پہونچا تو کشمیری محلے میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بڑی محبت سے پیش آئے اور پھر برابر ان سے ملنا ہوتا رہا۔ اس زمانے میں حبیب احمد صدیقی بھی حکومت یوپی میں کسی شعبے کے سکریٹری تھے۔ بجنور کے رہنے والے حبیب احمد صدیقی بہت اچھے شاعر بھی تھے اور ادب کا بڑا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ علی گڑھ سے انھوں نے انگریزی میں ایم۔اے کیا تھا۔ جب وہ اناؤ کے کلکٹر ہو کر چلے گئے تو انھوں نے اثر صاحب کو اور مجھے ایک اتوار کو اناؤ بلایا۔ ہم دونوں کوئی دس بجے کے قریب اناؤ پہونچے۔ کئی گھنٹے میر و غالب کی شاعری پر ہم تینوں کے درمیان گفتگو ہوئی۔ دوپہر کے کھانے کے بعد تھوڑی دیر آرام کیا اور سہ پہر میں ہم لوگ لکھنؤ واپس آگئے۔ اب تک میر کے ایک شعر کی تشریح یاد ہے شعر یہ ہے ؎

اُگتے تھے دست بلبل و دامان گل بہم
صحنِ چمن نمونۂ یوم الحساب تھا

اثر صاحب نے بتایا تھا کہ دست بلبل سے مراد وہ ہری پتیاں ہیں جو پھول کے نیچے ہوتی ہیں اور دامان گل سے مُراد پھول کی پنکھڑیاں۔ یہ ہری پتیاں پانچ ہوتی ہیں اور گویا ایک پنجے کی شکل سی ہوتی ہے اس لیے میر نے ان پتیوں کو دستِ بلبل کہا ہے۔ گویا جس طرح مظلوم کا ہاتھ میدانِ حشر میں ظالم کے گریبان پر ہوگا، اسی طرح ان ہری پتیوں کی سی شکل میں بلبل کا ہاتھ پھول کے دامن پر ہے۔ اثر صاحب نے اس موقع پر اپنا کلام بھی سنایا تھا۔ ولی کی مشہور زمین میں ان کا ایک شعر اب تک یاد ہے ؎

مجھے کیا نیند آئے گی کہ ہمدم میں نے دیکھی ہیں
وہ آنکھیں بند ہوتے وقت خواب آہستہ آہستہ

اثر صاحب مجھ پر بڑی عنایت کرتے تھے۔ ان سے مختلف ادبی مسائل پر گھنٹوں گفتگو ہوتی تھی۔ میری دعوت پر لکھنؤ یونیورسٹی کے مشاعرے میں کئی دفعہ شرکت کی۔ اپنے گھر پر کئی دفعہ میری دعوت کی۔ میرے بعض اشعار کی انھوں نے بڑی تعریف کی اور بعض میں انھوں نے اصلاحیں بھی تجویز کیں۔ میں ان کا باقاعدہ شاگرد تو نہیں رہا لیکن ان سے استفادہ خاصا کیا ہے۔ میر کی عظمت کو انھوں نے ادبی دُنیا میں اور واضح کیا، اور "مزامیر" کے ذریعے میر کا ایک بہت اچھا انتخاب پیش کیا۔ جب میں نے لکھنؤ یونیورسٹی میں اقبال سوسائٹی قائم کی تو اس کے افتتاحی جلسے میں انھوں نے اقبال کے اسلوب پر ایک مضمون بھی پڑھا تھا۔ اثر صاحب نے فیض، سردار جعفری اور بعض دیگر شعراء کے کلام پر قابلِ قدر عملی تنقید بھی کی ہے۔ مجاز کے متعلق ان کا یہ جملہ ایک زمانے میں خاصا مشہور ہوا تھا کہ :

" اردو شاعری نے ایک 'کیٹس' پیدا کیا تھا جسے بعد میں بھیڑیے اُٹھا لے گئے۔"

میرے لکھنؤ کے قیام کے دوران میں فراق پر ان کے اعتراضات اور فراق کے جوابات رسائل میں دلچسپی کا مرکز تھے۔ اثر صاحب کو فراق کے کلام کی ناہمواری پر بجا اعتراض تھا اور اسی کے ساتھ ساتھ ان کی رباعیوں میں بعض عریاں اشعار پر بھی۔ فراق صاحب نے سنجیدہ جواب کے بجائے زیادہ تر اثر صاحب کے کلام کے پھیکے پن پر زور دیا تھا اور ان کی شخصیت کا بھی مذاق اڑایا تھا۔ فراق کے کلام میں یہ ناہمواری اور رُباعیوں میں کہیں کہیں عریانی مسلم ہے۔ "بہاراں" کے نام سے اثر صاحب کے کلام کا مجموعہ بہت سے جواہر پارے رکھتا ہے۔ "فرہنگِ اثر" کے نام سے نُورُ اللغات کی جو غلطیاں انھوں نے دکھائی ہیں ان کی اہمیت بھی مسلم ہے۔ لکھنوی تہذیب اس کی نفاست، وضعداری اور دل کشی اثر صاحب پر ختم ہوگئی۔

پنڈت آنند نرائن مُلّا لکھنؤ کی ایک اور اہم شخصیت ہیں جن سے میری خاص قربت رہی ہے۔ وہ میرے یہاں انجمن ترقی پسند

مصنفین کے کئی جلسوں میں شریک ہوئے اور پھر ربط ضبط اتنا بڑھا کہ قریب قریب روزانہ ان سے ملاقات ہوتی رہی۔ وہ لکھنؤ کافی ہاؤس کے بڑے دلدادہ تھے، جب میرا قیام بیرو روڈ پر تھا تو وہ کسی ٹریبونل کے جج ہو گئے تھے جس کا کام ہندستان و پاکستان کے سابق فوجیوں کے واجبات کا معاملہ طے کرنا تھا۔ انھیں خاصی فرصت تھی۔ بازو دخانے سے پہلے دفتر جاتے اور پھر مجھے لیکر کافی ہاؤس کا ایک پھیرا کرتے۔ ملا صاحب بعد میں لکھنؤ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مقرر ہوئے۔ لکھنؤ سے پارلیمنٹ کے ممبر منتخب کیے گئے دو مرتبہ راجیہ سبھا کے ممبر ہوئے۔ انجمن ترقی اُردو ہند کے دس سال تک صدر رہے۔ ان کا پہلا مجموعۂ کلام "جوئے شیر" کے عنوان سے ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا۔ میرا اس پر خاصا مفصل مقدمہ ہے اور میں نے اس میں اس بات پر زور دیا ہے کہ چکبست کے بعد جدید لکھنؤ کی شاعری کی بلندی اور عظمت آنند نرائن مُلا کے یہاں ملتی ہے چکبست کی نظم "خاکِ ہند" تو مشہور ہے لیکن مُلا کی نظم "زمینِ وطن اے زمینِ وطن" اپنی غنائیت کی وجہ سے قومی نظموں میں ایک امتیاز رکھتی ہے۔ مُلا صاحب کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ "جوئے شیر" کے علاوہ "کچھ ذرّے کچھ تارے"۔ "سیاہی کی ایک بوند"۔ "میری حدیثِ عمرِ گریزاں" اور "مضامینِ نہرو" کے نام سے پنڈت جواہر لال نہرو کے چند منتخب انگریزی مضامین کا اُردو ترجمہ نیز انجمن ترقی اردو ہند کی کل ہند اُردو کانفرنس منعقدہ جے پور میں ان کا خطبۂ صدارت ہمارا قیمتی سرمایہ ہیں۔ اسی خطبے میں انھوں نے کہا تھا کہ ــــــ

"میں اپنا مذہب چھوڑ سکتا ہوں مگر اپنی زبان نہیں چھوڑ سکتا"۔

ان کے یہ اشعار بھلائے نہیں جا سکتے ؎

لب مادر سے ملّا لوریاں جس نے سُنائی تھیں
وہ دن آیا ہے اب اس کو بھی غیروں کی زباں سمجھو

"جوئے شیر" کا ایک نسخہ میری نذر کرتے ہوئے انھوں نے یہ رُباعی بھی لکھی تھی ؎

یہ حادثہ سالِ چہل و نہ میں ہوا   ہندی کی چھُری تھی اوراُردو کا گلا

اُردو کے ادیبوں میں جو مقتول ہوئے
ملّا نامی سُنا ہے شاعر بھی تھا

یہ بات شاید بہت سے لوگوں کو معلوم نہیں کہ مُلا صاحب نے اقبال کے ان قطعات کا بھی انگریزی میں ترجمہ کیا ہے جو "لالۂ طور" کے نام سے پیامِ مشرق میں ملتے ہیں۔ ساہتیہ اکاڈمی کے رسالے "انڈین لٹریچر" میں یہ تراجم چند سال ہوئے شائع ہوئے۔

لکھنؤ میں کئی بار چودھری محمد علی سے ملاقات ہوئی۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "گناہ کا خوف" عرصہ ہوا شائع ہو چکا تھا۔ ان کی دوسری کتاب "کشکول محمد علی شاہ فقیر" میرے زمانے میں شائع ہوئی۔ اس میں بھی "نیلم کا نگ" جیسا افسانہ موجود ہے۔ چودھری محمد علی بڑے باغ و بہار انسان تھے۔ عمر تو اس وقت ساٹھ سے متجاوز تھی مگر اپنی زندہ دلی اور شوخیٔ طبع کی وجہ سے مرجع خلائق تھے۔ کبھی کافی ہاؤس آجاتے تو تھوڑی دیر کے بعد لوگ اپنی کرسیاں لے کر ان کی دل چسپ باتیں سننے کے لیے پہونچ جاتے اور پھر یہ عالم ہوتا وہ کہیں اور سنا کرے کوئی، انھوں نے اپنی لڑکی ہما کے نام جو خط لکھے ہیں وہ مکتوب نگاری میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ چودھری صاحب کے یہاں طنز کے مقابلے میں ظرافت زیادہ ہوتی تھی۔ وہ زندگی کے نشیب و فراز پر پُرلطف انداز میں تبصرہ کرتے۔ کسی کی دکھتی رگ چھیڑتے تو اس طرح کہ وہ ہنس پڑتا ان کے یہاں طنز کے تیر نہیں ہوتے تھے بلکہ ہلکی سی، بجوِ ملیح کی نوک اسی زمانے میں مراد چودھری کی خود نوشت انگریزی میں شائع ہوئی تھی، اس کے بڑے مداح تھے، اس لیے کہ اس کتاب میں کسی کو بخشا نہیں گیا تھا۔ اقبال کا یہ مصرع ان پر واقعی صادق آتا تھا۔ ع

جس کی پیری میں ہے مانندِ سحر رنگِ شباب

مولانا عبدالماجد دریابادی سے ملاقات تو رشید صاحب کے یہاں علی گڑھ میں ہو چکی تھی، ان کے علم و فضل کا قائل تھا لیکن ان کے نقطۂ نظر سے کبھی متفق نہیں ہو سکا۔ مولانا عبدالماجد کی ساری زندگی پڑھنے لکھنے میں گزری۔ انھوں نے فلسفے کی بعض اہم کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ "ہم اور آپ" کے نام سے انسانی نفسیات پر بڑی اچھی کتاب لکھی ہے۔ "اکبر کا آخری دورِ شاعری"۔ "اُردو کا ادیب

بنام شاعر"۔ "محمد علی، ایک ذاتی ڈائری" ان کی یہ تصانیف قابلِ ذکر ہیں۔ ان کا اصل کارنامہ "تفسیر ماجدی" ہے۔ ان کی پابندیٔ اوقات اور منظم زندگی قابلِ رشک تھی۔ ان کا اپنا ایک اسلوب بھی ہے جس میں رعایتِ لفظی کی چاشنی کچھ زیادہ ہی ہے۔ ایک عرصے تک انھوں نے پہلے "سچ" اور پھر "صدق" نکالا۔

'سچ' اور 'صدق' دونوں کے شذرات میں اکثر مغربی تہذیب کے داغ دھبّوں کا ذکر ضرور ہوتا اور ان میں عام طور پر جنسی آزادی اور بے راہ روی کے تذکرے ہوتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مولانا کے کتب خانے میں جنسیات پر بھی خاصا لٹریچر تھا۔ میں جب امریکہ کے سفر سے واپس آیا تو "ہماری زبان" میں کئی ماہ تک امریکہ کے قیام کے تاثرات لکھے۔ ایک قسط میں فلپ راتھ کی کتاب PORTNOYS COMPLAINT کا بھی تذکرہ تھا۔ مولانا عبدالماجد نے ایک خط میں اس مصنف کی اور کتابوں کے بارے میں بھی دریافت کیا تھا۔ میرا جی نے اپنی نظم 'لب جوئے بارے' میں جس قبیح عادت کا ذکر کیا ہے، فلپ راتھ نے اس پر ایک پورا ناول لکھ دیا ہے۔ مولانا کی کتاب "محمد علی؛ ایک ذاتی ڈائری" پر میں نے لکھنؤ ریڈیو سے تبصرہ کیا تھا اور میں نے گفتگو اس طرح شروع کی تھی:

"یہ ایک پارکھ کا نہیں، ایک پرستار کا کارنامہ ہے"۔

اسٹیشن ڈائرکٹر اس جملے پر بہت گھبرایا اور مجھ سے کہا کہ "مولانا ہماری مشاورتی کمیٹی کے ممبر ہیں، ان کے خلاف یہ جملہ یا تو نکال دیں یا نرم کر دیں"۔ میں نے جواب دیا کہ حضرت ریڈیو پر فرقہ وارانہ منافرت پھیلانا، جنس کا برملا اظہار کرنا اور حکومت پر اعتراضات ممنوع ہیں۔ ادبی تنقید کب سے آپ نے ممنوع قرار دے دی۔ میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں مولانا محمد علی کو مولانا عبدالماجد جیسے پرستار ملے ویسے تو اب پارکھ بھی کسی کو نہیں ملتے۔ مجھے اپنے جملے میں ترمیم منظور نہیں۔" چنانچہ یہ اسی طرح نشر ہوا۔

جوشؔ سے بھی لکھنؤ میں متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔ پہلی ملاقات جو علی گڑھ میں ہوئی بہت دل چسپ تھی۔ دسمبر ۱۹۳۸ء میں انجمن اردو کی انجمن، حدیقۃ الشعر کی طرف سے مشاعرہ تھا۔ اس انجمن کا میں صدر تھا اور انجمن اُردوئے معلّٰی کے رشید صاحب، جاں نثار اختر اس وقت ایم اے فائنل میں تھے اور وہ ہماری انجمن کے سکریٹری تھے۔ احسان دانش پہلی دفعہ علی گڑھ آئے تھے اور بہت مقبول رہے۔ انھوں نے شاید ایک نظم "مزدور کی عید" سنائی تھی۔ جوشؔ اس وقت مشاعرہ کے ہال میں داخل ہوئے جب مشاعرہ شباب پر تھا۔ مجازؔ بھی ان کے ساتھ تھے۔ جاں نثار نے میرے کہنے پر مجاز سے فرمائش کی کہ تم "نذرِ علی گڑھ" پڑھو۔ یہی نظم بعد میں علی گڑھ یونیورسٹی کا ترانہ قرار پائی۔ سب سے آخر میں جوشؔ کا نمبر آیا، انھوں نے ایک قطعہ شروع کیا جس کا پہلا اور آخری شعر یہ ہے ؎

مقامِ شیخ سے واقف ہوں میں بھی
کہ یہ پاپڑ بہت بیلے ہوئے ہیں

خدا کو اور پہچانیں نہ حضرت
خدا کے ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں

اس پر ہال میں ایک شور برپا ہو گیا۔ ظفر احمد صدیقی (مرحوم) نے جو فلسفے میں لکچرر تھے، اعتراض کیا کہ جوش صاحب نے بزرگانِ دین کی توہین کی ہے۔ میں نے صدر کی حیثیت سے ایک چھوٹی سی تقریر کی اور کہا کہ اُردو شاعری میں زاہد اور شیخ پر طنز کی ایک خاصی پُرانی روایت ہے۔ اسی سیاق و سباق میں اس نظم کو بھی دیکھنا چاہیئے۔ اس کے بعد مجمع خاموش ہو گیا اور میں نے جوشؔ صاحب سے دوسری نظم پڑھنے کی فرمائش کی۔ جوشؔ صاحب نے کہا: نظم کا عنوان ہے "فتنۂ خانقاہ" اور ابھی یہ دو مصرعے پڑھ پائے تھے ؎

اک دن جو بہرِ فاتحہ اک بنتِ مہر و ماہ
پہنچی نظر جھکائے ہوئے سوئے خانقاہ

زہاد نے اُٹھائی جھجکتے ہوئے نگاہ
ہونٹوں میں دب کے ٹوٹ گئی ضربِ لا الٰہ

کہ رشید صاحب جو سامنے پہلی صف میں بیٹھے ہوئے تھے، کھڑے ہو گئے اور اس ڈر سے کہ کہیں پھر کوئی ہنگامہ نہ ہو جائے، جوشؔ صاحب سے التجا کی کہ آپ کے خزانے میں تو ہر طرح کے ہیرے جواہرات ہیں ایک موضوع پر نظم ہو چکی اب کسی اور موضوع مثلاً فطرت نگاری یا

انقلاب پر کچھ ارشاد ہو۔ رشید صاحب کی یہ بات سُن کر جوش صاحب خفا ہو گئے اور کہنے لگے :

" میں یہاں تراویح پڑھنے نہیں آیا ہوں"۔

اور یہ کہہ کر اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔ میں نے اس کے بعد روش اور احسان دانش دونوں سے باری باری دوسرے دور کے طور پر کچھ سنانے کو کہا۔ احسان دانش نے تو معذرت کر لی۔ روش نے چند شعر میرے کہنے سے سُنا دیئے اس کے بعد مشاعرہ ختم ہو گیا۔

جوش صاحب سے پھر ۱۹۳۹ء میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں ملاقات ہوئی تھی۔ ڈاکٹر رشید جہاں میرے گھر کے قریب ہی رہتی تھیں، اور ان سے اکثر ملاقات ہوتی تھی ایک دن جب وہ آئیں تو کہنے لگیں کہ جوش صاحب آئے تھے میں گھر پر موجود نہیں تھی، چلئے ان سے مل آئیں۔ چنانچہ میں رشید جہاں کے ساتھ مرزا جعفر حسین کے مکان پر بارود خانے میں جہاں جوش ٹھہرے ہوئے تھے، گیا۔ جوش صاحب بیٹھے شغل کر رہے تھے۔ مانی جائسی، مرزا جعفر حسین، بسمل شاہجہاں پوری اور چند اور حضرات موجود تھے، ہنسی اور قہقہے کی آواز آ رہی تھی۔ رشید جہاں کے داخل ہوتے ہی فضا سنجیدہ ہو گئی۔ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد رشید جہاں نے ان سے تازہ کلام سنانے کی فرمائش کی اور انھوں نے ایک نظم سنائی۔ نظم سننے کے بعد رشید جہاں نے کہا کہ مجھے اپنے کلینک جانا ہے۔ مریض انتظار کر رہے ہوں گے جوش صاحب دروازے تک ان کو پہونچانے آئے۔ مجھ سے جوش نے کہا " ان کو تو کلینک جانا ہے آپ کی تو ایسی کوئی مصروفیت نہیں ہے کچھ دیر اور بیٹھئے۔" چنانچہ میں بیٹھ گیا۔

واپس آکر جوش نے اطمینان کی سانس لی اور کہنے لگے " بھئی اب مردانہ ہوا " سب لوگ ہنس پڑے۔ اس کے بعد جوش صاحب نے مانی جائسی کی شان میں فی البدیہہ شعر پڑھنا شروع کر دیئے۔ یہ اشعار فانی کی مشہور غزل ؎

مال سوزِ غم ہائے نہانی دیکھتے جاؤ

کی زمین میں تھے جس کا سامنے کا قافیہ 'مانی' تھا۔

جوش صاحب کئی مرتبہ غریب خانے پر بھی تشریف لائے۔ ایک دفعہ وہ آئے تو انجمن ترقی پسند مصنفین کا جلسہ میرے ہی گھر پر ہونے والا تھا۔ میں نے جوش صاحب سے کہا کہ کیا ہی اچھا ہوتا اگر آپ جلسے میں شریک ہو جاتے۔ انھوں نے معذرت کی کہ بھائی میں اب سرکاری ملازم ہوں اور آپ کو تو معلوم ہے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین حکومت کی نظر میں معتوب ہے اس لیے میری شرکت نہ ہو سکے گی۔ کئی ملاقاتوں میں میں نے یہ محسوس کیا کہ جوش صاحب معاصرین کے اعتراف میں زیادہ فیاضی سے کام نہیں لیتے تھے۔

اتفاق سے فیض کے یہ دو شعر حیدرآباد سندھ کے جیل سے سجاد ظہیر کے ایک خط کے ذریعے سے لکھنؤ پہونچے تھے میں نے جوش صاحب کو یہ شعر سنائے اور ان کی رائے طلب کی۔ جوش صاحب نے کوئی گرم جوشی نہیں دکھائی اور اتنا کہا 'بہت خوب'۔ ؎

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا، کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

ایک دفعہ خبر ملی کہ جوش صاحب آئے ہوئے ہیں اور کارلٹن ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ میں پہونچا تو اتفاق سے اکیلے بیٹھے شغل کر رہے تھے مجھے دیکھتے ہی بوتل اُٹھائی اور ایک خالی گلاس میں میرے لئے شراب ڈالنی چاہی۔ میں نے معذرت کی کہ میں تو پیتا ہی نہیں ہوں۔ بوتل رکھ دی اور سگریٹوں کا ڈبہ اٹھایا۔ میں نے پھر معذرت کی کہ میں سگریٹ بھی نہیں پیتا، پاس ہی پانوں کی ڈبیا رکھی ہوئی تھی اب کے انھوں نے ڈبیا اٹھائی اور مجھے پیش کی۔ میں نے آداب کر کے ڈبیا میں سے ایک پان لے لیا تو مسکرا کر بولے :

"شکر ہے کہ آپ نے میرے یہاں کی کوئی چیز تو قبول کی"۔

وہ 'آجکل' کے ایڈیٹر تھے اور ایسے ایڈیٹر کہ ان کی فرمائش پر میں نے ایک مضمون رسالہ کے لیے لکھا۔ وہ مضمون رسالہ میں چھپ بھی گیا۔ اب لطیفہ یہ ہوا کہ اِسی نشست میں مجھ سے شکایت کی کہ آپ کا مضمون اب تک نہیں آیا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت مضمون تو چھپ بھی گیا۔ اس پر ہنس کر بولے "ارے آغر شی نے مجھے بتایا ہی

۱۹۵۳ء کے شروع میں لکھنؤ ریڈیو سے ایک مشاعرہ ہوا۔ ڈائریکٹر نے مجھ سے کہا کہ میں جوش صاحب کو اور جگر صاحب کو مشاعرہ میں شرکت کے لئے آمادہ کرلوں۔ جوش کو لکھا تو انھوں نے پہلے تو ریڈیو والوں کی خست کی شکایت کی پھر آنے پر آمادگی ظاہر کی مگر یہ شرط بھی لگائی کہ میں بسمل سعیدی کو بھی دعوت نامہ بھیجوں گا۔ میں نے بسمل سعیدی کے لیے ڈائرکٹر سے بات کی انھوں نے معذرت کی کہ اب کے حسنِ اتفاق سے جتنے لوگوں کو مدعو کیا گیا تھا سبھوں نے آمادگی ظاہر کردی ہے۔ اس لئے اضافے کی گنجائش نہیں ہے۔ یہی بات میں نے جوش صاحب کو لکھ دی۔ جوش صاحب نے قدرے برہمی سے مجھے لکھا کہ "مجھے یقین ہے کہ آپ نے سعیِ بلیغ نہیں کی ہوگی ورنہ ڈائرکٹر آپ کی بات کو ٹال نہیں سکتے تھے۔ خیر میں نے وعدہ کرلیا ہے تو بدرجۂ مجبوری آ ہی جاؤں گا۔"

جوش صاحب آئے، جگر بھی موجود تھے۔ جوش صاحب نے جو نظم پڑھی وہ پہلے سے ڈائرکٹر کو دکھائی نہیں گئی تھی۔ عام طور پر ریڈیو کے مشاعرے میں جو کلام سنایا جاتا ہے اس کی نقل پہلے سے بھیج دی جاتی ہے۔ ڈائرکٹر نے مشاعرہ سے پہلے جوش صاحب سے نظم کی نقل مانگی تو انھوں نے کہا کہ آپ مشاعرہ ہی میں سن لیجیے گا اصرار کرنے کی اس کی ہمت نہ ہوئی۔ نظم کے دو شعر مجھے اب تک یاد ہیں ؎

ٹھیکرے بیچنے والوں کے پرانے گاہک
بند کرتے ہیں جواہر کی دکاں اے ساقی
جس کے ہر لفظ سے سو پھول مہک اٹھتے ہیں
کاٹ دی جائے گی شاید وہ زباں اے ساقی

مشاعرے کے بعد جوش تو چلے گئے۔ مگر ڈائرکٹر صاحب بہت گھبرائے ہوئے تھے اور مجھ سے کہنے لگے اب میری خیر نہیں۔ یقیناً مجھ سے جواب طلب کیا جائے گا۔ دیکھئے صرف تبادلے پر بات ختم ہوتی ہے یا نوکری جاتی ہے۔

میں نے کہا حضرت کچھ نہیں ہوگا۔ آپ گھبرائیے نہیں۔ جوش صاحب محکمۂ اطلاعات کے ملازم ہیں۔ اگر آپ سے کچھ پوچھا جائے تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ 'آجکل' کے ایڈیٹر نے یہ نظم پڑھی تھی۔



لکھنؤ یونیورسٹی کا ایک منظر

بہرحال کچھ نہیں ہوا اور جوش صاحب نے جس دھڑلے سے ریڈیو پر یہ نظم پڑھی، اس سے ہم سب کی بڑی ڈھارس بندھی۔ اسی مشاعرہ کا ایک واقعہ اور یاد آتا ہے۔ مشاعرہ ختم ہونے کے بعد جگر صاحب ایک کونے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ جوش صاحب نے مجھ سے کہا:

"دیکھو! شیر گھاس کھا رہا ہے۔"

اس کے بعد جگر صاحب سے کہنے لگے: "ارے بھائی! اردو پر یہ برا وقت پڑا اور ہم تم دم بخود بیٹھے ہوئے ہیں۔" جوش صاحب نے جو لفظ استعمال کیا تھا اس کو میں یہاں دہرانے کی ہمت نہیں رکھتا۔ صرف مفہوم بیان کیے دیتا ہوں۔

جوش صاحب کے مزاج کا ایک رخ لکھنؤ یونیورسٹی کے مشاعرہ میں سامنے آیا۔ یونیورسٹی کی جوبلی تھی۔ اچاریہ نریندر دیو وائس چانسلر نے اس موقع پر ایک مشاعرہ بھی ضروری سمجھا اور خاص طور پر جوش اور جگر کو سننے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ جوش صاحب عام طور پر مغرب کے بعد ہاتھ نہیں آتے تھے اس لئے کہ یہ ان کے شغل کا وقت ہوتا تھا مشاعرہ نو بجے سے تھا۔ میں نے ان کے دوست حکیم صاحب عالم سے درخواست کی کہ وہ کسی طرح جوش صاحب کو لے آئیں۔ حکیم صاحب میرا بہت خیال رکھتے تھے اس لئے وہ جوش صاحب کو خود پہنچا گئے۔

(باقی ص ۳۴ پر)



علی جواد زیدی

اے ۵/۳ گرین فیلڈ کامپلکس مہاکالی کورس روڈ
اندھیری۔ بمبئی ۹۳

یادوں کی رہگزر

قدیم لکھنؤ میں واقع گورنمنٹ جوبلی کالج میں دو سال گزارنے کے بعد میں نے لکھنؤ کے جدید علاقے میں واقع لکھنؤ یونیورسٹی میں بی اے کے پہلے سال میں داخلہ لیا۔ یہ واقعہ ۱۹۳۶ء کی ابتدا کا ہے۔ ۱۹۳۵ء کی آئینی اصلاحات کے تحت محدود اختیارات کی جمہوری حکومت قائم ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ کانگریس نے برطانوی حکومت سے یہ وضاحت چاہی تھی کہ گورنر حکومت کے عام معاملات میں دخل اندازی نہیں کرے گا طویل گفتگو کے بعد معاملات طے ہوئے اور کانگریس نے محدود خود مختاری قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا اور یہی وہ منزل تھی جب میں یونیورسٹی کے حدود میں داخل ہوا۔

داخل تو ہم پہلے بھی ہوتے تھے لیکن اُس وقت طلبہ کی عام ہڑتالوں میں یونیورسٹی کے طلبہ کی حمایت حاصل کرنے کے لئے اب فضا بدل چکی تھی پھر بھی ہم آزادی کی منزل سے دور تھے اس لیے حکومت سے ٹکراؤ کی صورت کبھی کبھی پیدا ہو جاتی تھی اور جد و جہد کا وہ تسلسل قائم رہتا جو ہم کالج کے زمانے سے پہلے ہی اپنا چکے تھے۔ ابھی ایک سال پہلے ہی تو ہم نے اسی لکھنؤ کے گنگا پرشاد ورما ہال میں پہلی آل انڈیا اسٹوڈنٹس کانفرنس کا انعقاد کیا تھا، جس کا افتتاح جوانوں کے ہر دلعزیز رہنما پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا تھا اور صدارت محمد علی جناح نے۔ یہ آخری موقع تھا جب یہ دونوں ہستیاں ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع ہوئیں اور دونوں نے متحدہ قومیت کا پیغام دیا۔ ۱۹۳۶ء کی اس کانفرنس نے یہ فیصلہ کیا کہ طلبا کی ایک کل ہند جماعت بنائی جائے اور اگلے سال لاہور اجلاس میں اس کا نام آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن طے پایا اور اس طرح طلبہ کی منظم تحریک کا آغاز ہوا۔ اسی سال انجمن ترقی پسند مصنفین کی داغ بیل بھی پڑی۔ پہلا اجلاس لکھنؤ ہی کے "رفاہ عام کلب" میں ہوا۔ صدارت منشی پریم چند نے کی اور سجاد ظہیر اور مولانا حسرت موہانی ممتاز شرکا میں تھے۔ میں ان دونوں ہی تاریخی اجتماعات میں شریک تھا اور دونوں سے عملی دلچسپی کا آغاز اُسی وقت سے ہوا جب میں ابھی جوبلی کالج کا طالب علم تھا۔ اسی نئی بیداری اور گہما گہمی کا کوئی خاموش تماشائی کیسے بنا رہ سکتا تھا۔

پہلی طلبہ کانفرنس کے انعقاد میں خاص کردار ادا کرنے والوں میں پریم نرائن بھارگو اور آئی این ام بدر الدین تھے۔ کانفرنس کے بعد بھارگو نے اپنے مکان میں ایک کمرہ الگ کر دیا تھا جو کئی برس تک طلبہ کی سیاست کا اہم مرکز بنا رہا۔ یہ امین آباد میں واقع تھا۔

یونیورسٹی کا علاقہ اودھ کے شاہی زمانہ میں "بادشاہ باغ" کہلاتا تھا۔ سن ستاون کے ہنگاموں میں اس پر بھی تباہی آئی اور آس پاس کے علاقوں کی بربادی کا اثر اس پر بھی پڑا کیونکہ یہ سکندر باغ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ جہاں لکھنؤ کے آزادی پسندوں نے برطانوی فوجوں سے زبردست مورچہ لیا تھا۔ بادشاہی نام کی یادگار کے طور پر ایک سُرخ رنگ کی بارہ دری اب بھی موجود تھی جس میں یونیورسٹی ریسٹوراں اور اساتذہ کا کلب تھا۔ کھیل کود کے وارڈن کا چھوٹا سا دفتر بھی اسی کے ایک گوشے میں تھا۔ بارہ دری کی شکل و صورت مسخ ہو چکی تھی۔ ایک خشک آبشار اور پشت پر ایک سوکھی نہر ایک اجڑے ہوئے دور کی یاد دلاتی رہتی تھی۔ آج یہ نشانات بھی باقی نہیں ہیں۔

یونیورسٹی کے قیام سے پہلے اس اس عمارت میں کیننگ کالج تھا جو الہ آباد یونیورسٹی سے وابستہ تھا۔ جب لکھنؤ کو اتر پردیش کا دارالحکومت بنایا گیا تو کالج کو بھی یونیورسٹی میں تبدیل کر دیا گیا۔ اجڑی ہوئی اختر نگری میں سچا اقتدار حکومت نہ سہی، لیکن اُس کی کچھ بو باس تو ملی۔ تعلقداران اودھ خوش ہوئے، وہ بھی مسرور ہوئے جو اودھ سے جذباتی وابستگی

رکھتے تھے۔ یہ سب الہ آباد کے خسارے پر ہوا اور انھیں فطری طور سے گراں گزرا۔ اس زمانے میں لکھنؤ اور الہ آباد کی اہمیت پر ثقافتی حلقوں میں کچھ نوک جھونک بھی چلی۔ اس سلسلے میں مشہور رباعی گو شاعر منشی سکھ دیو پرشاد بسمل الہ آبادی نے بہتوں کی دل لگتی بات کہی کہ لوگ لکھنؤ کو لاکھ بڑھائیں مگر ع

وہ گومتی کو تو گنگا بنا نہیں سکتے!

لیکن بنانا بھی کون چاہتا تھا۔ صفی جیسے لکھنوی نے کیا خوبصورت نظم الہ آباد پر لکھی ہے، جس میں انھوں نے گنگا ہی کیا 'تربینی' پر ناز کیا ہے ؎

اے الہ آباد اے جولاں گہہ گنگ و جمن
تیرا دامن تین تربینی کی ہے اک انجمن!

لکھنؤ دارالحکومت بن گیا لیکن قانون و انصاف کا مرکز الہ آباد ہی رہا۔ لکھنؤ کے حصے میں صرف چیف کورٹ آیا، ہائی کورٹ الہ آباد ہی میں برقرار رہا۔ الہ آباد محکمۂ تعلیم، پبلک سروس کمیشن، اکاؤنٹنٹ جنرل وغیرہ کا بھی صدر دفتر بنا رہا۔ الہ آباد میں سر تیج بہادر سپرو (محسن اردو) سر شاہ محمد سلیمان (جو ادب و قانون کا سنگم تھے)، پنڈت موتی لال نہرو، سر وزیر حسن (جو بعد میں لکھنؤ میں چیف جج ہوئے) جیسی عظیم ہستیاں تھیں۔ اور پھر وہ سیاست کا اہم مرکز بھی یہیں الہ آباد میں تھا جو آنند بھون اور سوراج بھون کے نام سے سارے ہندوستان کی توجہات کا محور بنا رہا۔

لکھنؤ کو صوبے کا صدر مرکز بنانے میں گورنر ہارکورٹ بٹلر نے خاص کد و کاوش کی تھی۔ انھیں اودھ سے ثقافتی سطح پر لگاؤ پیدا ہو گیا تھا اور وہ اپنی نجی زندگی میں کبھی کبھی انگرکھا اور دو پلی ٹوپی زیب تن کر لیتے اور سگار کی طرح پیچوان سے بھی لطف لیتے۔ (یہ روایت صرف سنی سنائی ہے، پتا نہیں کہ اس میں صداقت کہاں تک تھی) اتنا یقینی ہے کہ سن ستاون کی تلخیوں کی یادیں کم کرنے کی بٹلر نے کوشش ضرور کی اور لکھنؤ کے تعلقہ داروں نے اس کا بدلہ کئی طرح سے دیا۔ بٹلر روڈ، بٹلر پارک (جہاں ان کا اسپ سوار مجسمہ بھی نصب تھا)، بٹلر پیلس (جو دراصل محمود آباد پیلس تھا، لیکن مرحوم راجہ محمود آباد کی ہجرت کے بعد بحق سرکار ضبط ہو کر سرکاری افسروں کی رہائش گاہ کے طور پر خوبصورت کمپلکس بن گیا ہے) بٹلر کی یادگاریں تھیں۔ یونیورسٹی میں ان کے نام پر بٹلر ہوسٹل تھا۔

آزادی کے بعد جب برطانوی یادگاریں ہٹائی گئیں تو یہ نام مٹا دیے گئے اور مجسمہ عجائب گھر کے ایک گوشے میں پہنچا دیا گیا۔ بٹلر ہوسٹل کے بارے میں معلوم نہیں کہ وہ نام بدستور باقی ہے یا وہ بھی بدل دیا گیا۔

یونیورسٹی پہنچ کر جوبلی کالج کے ساتھی کیلاش ورما سے ملاقات ہوئی۔ وہ مجھ سے ایک سال سینیر تھے اور ایک سال پہلے ہی یونیورسٹی پہنچ چکے تھے۔ مشہور سوشلسٹ لیڈر اچاریہ نریندر دیو کے بھتیجے تھے۔ میری ہی طرح طلبہ کی تحریک کے سرگرم رکن تھے، ان سے میری خاصی دوستی تھی افسوس کہ ع

خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود

(خوب چمکے مگر جلد بجھ جانے والا شعلہ ثابت ہوئے) کسی شدید بیماری میں ابدی جدائی کا داغ دے گئے۔ ان کے علاوہ کچھ اور دوست بھی ساتھ آئے۔ ان میں ایک تعلقہ دار خاندان کے سیٹھ برادران بھی تھے۔ یہ توأم تھے اور جیسے جڑواں بھائی ہوتے ہیں۔ ان میں مکمل مشابہت تھی۔ کپڑے بھی یکساں اور ایک ہی رنگ کے پہنتے تھے۔ فرق یہ تھا کہ دونوں الگ الگ سکشن میں تھے مگر ایک میرے ساتھ تھے۔ اکثر شناخت کا سوال اٹھ کھڑا ہوتا۔ ایک بار میرے کلاس نوٹ دوسرے دن واپس کرنے کا وعدہ کر کے لے گئے ——— دو دن تک نظر نہیں آئے۔ تیسرے دن ملے تو میں نے انھیں یاد دلایا۔ کہنے لگے "میں نے تو آپ سے نوٹ نہیں لیے"۔ میں حیران، میں نے پھر یاد دلانے کی کوشش کی تو بولے "غالباً آپ نے میرے بھائی کو دیے ہوں گے"۔ تھوڑی دیر بعد یہ بھائی صاحب ملے اور وہ نوٹ مجھے واپس کر دیے!! ایسے کئی دلچسپ واقعات آئے دن ہوا کرتے تھے! جوبلی کالج میں دو ساتھیوں کو پیچھے چھوڑ آیا تھا، عبادت بریلوی اور میرے ماموں زاد بھائی سید خورشید احمد (سابق مدیر نیا دور) یہ دونوں مجھ سے ایک سال جونیر تھے۔ سال بھر بعد یونیورسٹی آئے، برابر ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں، کیونکہ ہم تینوں قریب قریب رہتے تھے"۔

طلبہ کے علاوہ اساتذہ میں پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب اور مولوی سید محمد حسین سے پہلے سے ملاقات تھی۔ مسعود صاحب اس وقت صدر شعبہ مگر ریڈر ہی تھے۔ کیونکہ شعبۂ فارسی و اردو میں پروفیسر کی جگہ ہی نہیں تھی۔ یہ

اردو کی ڈھائی کا حال تھا۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے آغاز میں عربی میں — ! اور سنسکرت کے شعبوں میں پروفیسر موجود تھے عربی میں ڈاکٹر وحید مرزا اور سنسکرت میں ڈاکٹر ایئر۔ سبب یہ تھا کہ ان دونوں زبانوں کو کلاسیکی زبانوں کا مرتبہ حاصل تھا، اردو کو نہیں! فارسی کے شعبے میں مسعود صاحب کے علاوہ یوسف حسین موسوی صاحب اور مولوی عبدالقوی فانی تھے۔ وہ فارسی میں شعر بلکہ قصائد بھی لکھتے تھے۔ موسوی صاحب عرفی کے پرستاروں میں تھے۔ تنہا مسعود صاحب کو فارسی جدید پر عبور تھا اور وہی تحقیق کے مردِ میدان بھی تھے۔ اردو میں پہلے احتشام حسین صاحب اور بعد میں آل احمد سرور کی شمولیت سے شہر کے اردو داں حلقوں میں نئی چہل پہل دیکھی گئی۔ عربی میں ڈاکٹر وحید مرزا، ڈاکٹر عبدالعلیم اور انگریزی میں احمد علی صاحب کا اپنا مقام تھا لیکن وہ بھی اردو حلقے ہی میں شامل سمجھے جاتے تھے اور اس میں کیا شک ہے کہ یہاں بھی اُن کا اپنا مقام تھا۔

ہماری یونیورسٹی کی ایک بڑی خصوصیت اس کا بین صوبائی کردار تھا۔ وائس چانسلر ڈاکٹر پرانجپے ریاضی کے ماہر تھے، ان کے علاوہ جنوبی ہند کے ڈاکٹر رام سیاسیات کے شعبے کے صدر تھے ——— اسی شعبے میں ڈاکٹر مینن بھی تھے، جن کی اہلیہ مسز لکشمی مینن بعد میں حکومت ہند کی وزارت خارجہ میں وزیر ہوئیں۔ سنسکرت کے صدر شعبہ آگے چل کر وائس چانسلر بھی ہو گئے تھے۔ ریڈر راہیرادم کا تعلق بھی جنوبی ہند سے تھا۔ اہل بنگال میں مشہور ماہر اقتصادیات ڈاکٹر رادھا کمل مکرجی اور مشہور ترقی پسند استاد ڈی، پی مکرجی کے علاوہ بی بی مکرجی تھے۔ صدر شعبۂ فلسفہ ڈاکٹر این، این سین گپتا تھے۔ انگریزی کے صدر ڈاکٹر سدھانت صاحب تھے جو آکسفورڈ یونیورسٹی سے ایم، اے (انگریزی) تھے۔ شعبۂ کامرس کے صدر داس گپتا صاحب بھی بنگالی تھے۔ تاریخ ہند قدیم کے پروفیسر ڈاکٹر کمد مکرجی تھے جو اس موضوع پر استناد کا درجہ رکھتے تھے — ڈاکٹر مزمدار انتھراپالوجی میں امتیازی شان کے مالک تھے۔ پنجابیوں میں پالیو باٹنی میں عالمی شہرت کے مالک ڈاکٹر بیربل ساہنی تھے، جن کی یاد میں اب ایک پالیو باٹنی انسٹی ٹیوٹ بنادیا گیا ہے، اس کے علاوہ فزکس میں ڈاکٹر ولی محمد تھے۔ دلّی والوں میں احمد علی صاحب (مشہور ترقی پسند ادیب) انگریزی میں ریڈر ہوئے تھے۔ یوپی والے عربی، فارسی، اردو، ہندی شعبوں میں بھرے پڑے تھے۔ دوسرے اہم شعبوں میں اہم عہدے پر سر وزیر حسن کے صاحبزادے ڈاکٹر حسین ظہیر کیمسٹری میں اور پروفیسر سلطان (سیاسیات) کا نام بھی یاد آتا ہے لیکن ان میں سے کوئی صدر شعبہ نہیں تھا۔ عربی میں صدر شعبہ بے ریش و بروت ڈاکٹر وحید مرزا تھے۔ ان کے علاوہ ریڈر ڈاکٹر عبدالعلیم اپنی ترقی پسندی کی وجہ سے نمایاں تھے۔ سلطان صاحب اور علیم صاحب بعد میں علی گڑھ یونیورسٹی چلے گئے۔ اور علیم صاحب تو وہاں وائس چانسلر بھی ہو گئے۔ غرض لکھنؤ یونیورسٹی کل ہند ادارہ تھی۔ یہی صورت الہ آباد، علی گڑھ اور بنارس ہندو یونیورسٹی کی بھی تھی، لیکن رفتہ رفتہ علاقائی تصورات غالب آتے گئے۔ اب مشکل ہی سے صلاحیتوں اور مہارت فن کا ایسا بین صوبائی اجتماع کہیں نظر آئے گا۔ معلوم نہیں اور حضرات کیا سوچیں گے لیکن میں علم کی حد بندی اور علاقہ بندی کو پسند نہیں کرتا۔ پھر سوچتا ہوں حافظ شیرازی کی طرح کہ میاں زیدی تم ٹھہرے گدائے گوشہ نشین خواہ مخواہ شور کیوں کرتے ہو؟ نقار خانے میں کون سنے گا؟

پروفیسر سلطان سیاسیات کے علاوہ کھیلوں کے بھی رسیا بلکہ خود ٹینس کے اچھے کھلاڑی ہونے کی وجہ سے یونیورسٹی میں کھیلوں اور ان۔ سی۔ سی کے انچارج تھے۔ سلطان صاحب تعلقہ دار تھے اور بڑے خوش سلیقہ اور خوش اخلاق اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ یونیورسٹی پہنچ کر ٹینس کے بین الاقوامی شہرت کے کھلاڑی غوث محمد سے ملاقات ہوئی۔ نام سے واقفیت تو پہلے سے تھی، لیکن ملنے کے بعد میں اس مشہور کھلاڑی کی اخلاقی بلندیوں سے واقف ہوا۔ اس پرخلوص، ملنسار، خوش مزاج ملیح آبادی پٹھان بلکہ تعلقہ دار سے مل کر یہ محسوس ہوا کہ پھل دار شاخیں کیوں جھکی رہتی ہیں۔ ع

نہد شاخ پُرمیوہ سر بر زمیں! اُسے نہ اپنے پٹھان ہونے کا گھمنڈ تھا نہ تعلقہ داری اور شہرت کا غرور! وہ تو اس طرح دوستوں میں گھل مل جاتا کہ بعض وقت ملنے والا سوچنے لگتا کہ یہ واقعتہً غوث محمد ہی ہیں یا کوئی اور۔ ایک دن اپنے ساتھ ملیح آباد لے گئے اور ان کے دولت کدے پر ان کی میزبانی سے ہم لطف اندوز ہوئے۔ کبھی کبھی احمد حسین قدوائی ٹینس کے دوسرے مشہور کھلاڑی بھی اُدھر آنکلتے۔ یہ ہر قدم اس انداز سے اٹھاتے

گویا یہ کھلاڑی نہیں بلکہ حکمراں نہیں تو حکم راں جماعت کے افسر اعلیٰ ضرور ہیں۔ دیر میں کھلے اور جب کھلے تو غوث ہی کی طرح گھل مل بھی گئے۔ پھر بھی غوث "چیزے دیگر" تھا! یونیورسٹی سے کچھ اور کھلاڑی بھی ابھرے۔ ان میں آخری انور حسین تھے، لیکن وہ صحافت کی طرف نکل پڑے۔ پائنیر میں کھیل کود کی رپورٹنگ کرتے تھے۔ آخر میں شاید پاکستان چلے گئے۔ کے ڈی سنگھ بابو کی کے مشہور کھلاڑی اسی یونیورسٹی کی دین تھے۔ اب ان کے نام پر ایک اسٹیڈیم بنا دیا گیا ہے۔ میری ان سب یاد اللہ تھی اگرچہ کھیل کود سے مجھے کبھی کوئی خاص شغف نہیں رہا۔

اساتذہ ہی کی طرح یونیورسٹی میں طلبہ کا مجمع بھی گل بنہ تھا۔ پنجاب، کشمیر، کرالا، تامل ناڈو وغیرہ علاقوں سے طالب علموں کی بڑی تعداد ہر سال ہماری یونیورسٹی میں آجاتی تھی۔ ان سے ہمارے ہوسٹلوں میں بڑی رونق رہتی۔ اساتذہ اور طلبہ کے اس رنگا رنگ مجمع نے ہماری یونیورسٹی کو ایک چھوٹا موٹا ہندوستان بنا دیا تھا جس میں صوبوں اور زبانوں کی تفریق مٹ گئی تھی۔ آج معاملہ برعکس ہے۔ باہر کے طالب علم تو درکنار اساتذہ بھی مل جائیں تو ہم اسے خوش قسمتی سمجھیں گے۔ بیرونی طلبہ کی بڑی تعداد اس لیے بھی آتی تھی کہ یہاں ایم اے اور ایل ایل بی دونوں امتحانات ایک ساتھ یعنی دو سال کے اندر پاس کرنے کی اجازت تھی۔ دوسری یونیورسٹیوں میں یہ رعایت حاصل نہیں تھی۔

لکھنؤ یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم (Co-Education) عام تھی۔ یہ بڑی بات تھی، کیونکہ واجد علی شاہ کے لکھنؤ کی مسخ شدہ تصویر پیش کیے جانے کے باوجود لکھنؤ ایک صاف ستھرا، سنجیدہ اور خوش اخلاق معاشرہ تھا۔ یہاں انٹرمیڈیٹ تک لڑکوں اور لڑکیوں کے علیحدہ علیحدہ کالج تھے۔ لڑکیوں کے مخصوص کالج مہیلا ودیالیہ امین آباد میں، کرامت حسین گرلز کالج گومتی پار اور آئی، ٹی کالج یونیورسٹی کے آس پاس اہم کالج تھے۔ لڑکوں کے بہت سے کالج تھے۔ آئی ٹی، کالج اور بقیہ دو کالجوں میں بی اے کی سہولت بھی تھی لیکن اگر لڑکیاں چاہتیں تو یونیورسٹی میں اسی سطح پر داخل ہو سکتی تھیں۔ ایم، اے کی تعلیم صرف یونیورسٹی میں ہوتی تھی، اس طرح یونیورسٹی میں طالبات کی بھی معقول تعداد تھی۔ ان میں مسلمان، کرسچین، ہندو سبھی فرقوں کی لڑکیاں تھیں۔ باہر سے آنے والی لڑکیوں کا قیام لیڈی کیلاش ہوسٹل میں ہوتا تھا

کچھ لڑکیاں میری ہم جماعت بھی تھیں۔ بعض طلبہ کی سیاسیات میں حصہ بھی لیتی تھیں۔ ان میں بھی کئی صوبوں اور تمام مذاہب کی نمائندگی تھی۔ اکثریت یو، پی بلکہ اودھ کی رہنے والیوں کی تھی۔ مسلم طالبات میں زیادہ تر تعلقہ داروں اور اعلیٰ عہدہ داروں یا بڑے زمیندار گھرانوں کی لڑکیاں تھیں۔ سبھی کا تعلق کھاتے پیتے خاندانوں سے تھا۔ دو ایک کا تعلق متوسط طبقے کے خاندانوں سے تھا۔ یہ تانگے سے یونیورسٹی آتی تھیں۔ صرف ایک طالبہ ایسی تھیں جو یونیورسٹی تک یکّہ سے آیا کرتی تھیں۔ ان کے ضعیف باپ بھی ساتھ ہی یونیورسٹی تک پہنچانے آتے اور پھر ساتھ ہی واپس لے جاتے۔ ان خاتون کو سبھی عزت کی نگاہ سے دیکھتے اور ان سے دلی ہمدردی رکھتے تھے۔ یہ سنجیدہ اور کم آمیز تھیں۔ کسی کو بے ضرورت بات کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ برقعہ پوش لڑکیاں بہت کم نظر آتی تھیں۔ پانچ چھ برس کے قیام میں میں نے مشکل سے چار یا پانچ پردہ پوش طالبات کو یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرتے دیکھا ہوگا۔ یونیورسٹی میں لڑکیوں کی کمی کا ایک سبب شہر میں طالبات کے اُن خصوصی کالجوں کی موجودگی تھی جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

ان میں آئی۔ ٹی کالج سب سے اچھا کالج سمجھا جاتا تھا۔ یہاں کی لڑکیاں خاصی تیز، طرّار، ذہین مشہور تھیں، لیکن تیزی اور ذہانت کسی خاص کالج کی اجارہ داری نہیں تھی، اچھی اور تیز لڑکیاں دوسرے کالجوں میں بھی تھیں اور ان کی ذہانت امتحانات کے نتائج میں ظاہر ہوتی تھی۔ آئی ٹی کالج کی لڑکیاں یونیورسٹی سے قربت کی وجہ سے ادھر بھی آنکلتی تھیں۔ بالخصوص کیلاش ہوسٹل میں تو ان کا آنا جانا برابر ہوتا رہتا تھا۔ دوسرے کالج کی لڑکیوں سے بھی ان کی دوستی تھی۔ اور وہ سیاسی یا عام ثقافتی دلچسپیوں میں شریک ہو جایا کرتی تھیں۔ کیلاش ہوسٹل میں تو کبھی کبھی مختصر اور محدود مشاعرے بھی ہو جایا کرتے تھے۔ ہوسٹل میں لڑکے بھی کبھی کبھی چلے جاتے۔ یونین کے الکشن کے دنوں میں تو ایسا ہونا تعجب خیز نہیں تھا۔ مختصر یہ کہ طلبا اور طالبات کے درمیان وہ نفسیاتی دیواریں دھیرے دھیرے ٹوٹ کر گرنے لگی تھیں جو چھوٹے شہروں میں آج بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ یونیورسٹی میں آئے دن سیاسی ہنگامے یا ثقافتی پروگرام مثلاً مشاعرے، کوی سمیلن، سیاسی مفکرین اور سیاست دانوں کی تقریریں ہوتی رہتی تھیں اور ان میں لڑکیوں کی اچھی خاصی تعداد شرکت کرتی تھی۔ سیاسی جلوسوں میں بھی چند لڑکیاں

شامل ہوتیں اور آگے آگے رہتیں۔

لڑکیوں کی باتوں نے کچھ طول پکڑ لیا۔ لطیفہ حکایت دراز تر ہوگئی لیکن ابھی بہت کچھ کہنا باقی ہے جس کے بغیر اس دور کی یونیورسٹی کی زندگی کی ایک جیتی جاگتی تصویر میں رنگ نہیں بھرا جا سکتا۔ تھوڑی دیر رک کے ذرا ڈے اسکالروں کی باتیں کر لی جائیں جو ہوسٹلوں کے باہر رہتے تھے اور شہر کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے تھے۔ میں خود بھی "ڈے" اسکالر یعنی ہوسٹل کے باہر مقیم طالب علم تھا۔ پرانے شہر میں سٹی اسٹیشن کے قریب کمرہ، پھر فلیٹ، پھر مکان کرائے پر لیتا رہا۔ میرے دو ماموں زاد بھائی سید ابو جعفر اور سید خورشید احمد (مدیر نیا دور) اور دو چھوٹے بھائی سید علی بنیاد اور سید علی اعتماد ساتھ رہتے تھے۔ یہ احساس برابر دل میں نشتر چبھوتا رہتا ہے کہ اب ان ساتھ رہنے والے چاروں بھائیوں نے ہمیشہ کے لیے ساتھ چھوڑ دیا صرف ان کی وہ یادیں رہ گئی ہیں جو اکثر و بیشتر پلکوں کو بھگوتی رہتی ہیں۔ میرے حقیقی بھائی تو دونوں ہی مجھ سے عمر میں چھوٹے تھے اور چونکہ ہم سب بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے ہم نے ساتھ ساتھ بہت تکلیفیں جھیلی تھیں اور ہمیشہ ایک دوسرے کے شریک و سہیم رہے تھے۔ آج اس ضعیفی میں وہ میرے قوت بازو ہوتے اور دکھ سکھ بانٹتے۔ لیکن وہ بھی بیچارے مجبور تھے۔ رضاً بقضائہٖ وتسلیماً لامرہٖ!

ہاں تو ہم لوگ اکثر رہائش گاہ بدلتے رہتے۔ آج کل کا سا حال نہیں تھا۔ پہلے چودھری کی گڑھیا، پھر آغا میر کی ڈیوڑھی، پھر گولہ گنج پھر سٹی اسٹیشن کے سامنے حامد پارک میں قیام رہا۔ اُس دور میں کرائے کے مکان آسانی سے مل جایا کرتے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف دو چار تختیاں "مکان برائے کرایہ خالی ہے" کا اشتہار کرتی رہتی تھیں۔ مکان بدلنے سے پہلے ہم لوگ دو چار مکان دیکھ کر کرایہ وغیرہ طے کرتے۔ پرانے لکھنؤ میں دس پندرہ روپے تک خاصا مکان مل جاتا تھا۔ کچھ دنوں بعد خورشید بھائی اور ابوجعفر بھائی سبوٹ ہوسٹل میں منتقل ہو گئے اور ہم تینوں بھائی کرائے کے نئے مکان میں منتقل ہو گئے۔ ایک باورچی ملازم رکھ لیا۔ کچھ دنوں بعد ہمارے عزیز اور موجودہ دور کے مشہور ترقی پسند نقاد ممتاز حسین بھی ہماری طرف آنکلے اور پھر ہم نے انھیں مہمان بنا لیا اور انھیں کہیں اور نہیں جانے دیا۔ انھوں نے تعلقہ دار کالج میں ملازمت کر لی تھی اور مکان کی تلاش میں تھے۔

ہمارے ہر مکان سے یونیورسٹی کا فاصلہ تین میل سے زیادہ ہی ہوگا۔ کم نہیں۔ اس وقت شہر میں بسیں نہیں چلتی تھیں۔ بسیں تھیں لیکن صرف مضافات تک جاتی تھیں، مثلاً سیتاپور، محمود آباد، کرسی وغیرہ۔ ٹیکسیاں معدوم تھیں، کاریں چند تھیں لیکن تعلقہ داروں یا لکھ پتیوں کے یہاں تانگے اور یکے (تلفظ 'اِکے') کی سواریاں عام تھیں۔ بہت سے طالب علم سائیکلوں پر آتے جاتے تھے۔ اس جاگیردارانہ ماحول میں یکے کی سواری کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ لیکن عام طالب علم تانگہ، یکہ یا سائیکل کی سواریوں ہی پر قناعت کرنے کے لیے مجبور تھا اور اسی میں مسرور تھا۔ میرے پاس بھی ایک پرانی سی سائیکل تھی جو برسوں بعد مرمت کرا کے اور پرزے بدلوا کے قابل استعمال بنائی گئی تھی۔ میری شاعرانہ بے توجہیوں کے باعث اس کا حال بُرا ہی رہتا۔ کبھی گھنٹی نہیں تو کبھی بریک ندارد، کبھی مڈگارڈ غائب تو کبھی چین کور۔ شام کے بعد اگلے پہیے کے بالائی حصہ میں ایک لیمپ لگا کے چلنا پڑتا تھا جس میں مٹی کا تیل جلتا تھا۔ اگر یہ نہ ہو تو چالان ہو جاتا تھا۔ بعض نفاست پسند بیٹری سے چلنے والا لیمپ لگا لیتے تھے۔ لیکن ان کی حیثیت استثنائی تھی۔ جب میری موسموں کی ماری سائیکل کی حالت سقیم ہوتی، اور ایسا اکثر ہوتا تو میں تانگے سے یونیورسٹی جانے لگتا۔ تانگے والوں سے خاصے مراسم ہو گئے تھے۔ کیونکہ اس زمانے میں کرائے کم ہونے کے باوجود، صرف کھاتے پیتے لوگ ہی علی العموم تانگے پر چلتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ جیب میں پیسے کم ہوتے یا بالکل نہ ہوتے تو ایک خاص تانگے والے کو نوازتا تھا۔ نام اب بھول رہا ہوں اُن سے مراسم اتنے بڑھ گئے تھے کہ کرائے کا حساب ماہانہ ہونے لگا تھا۔ یہ صاحب گھوڑ دوڑ کے شائقین میں تھے، سٹی اسٹیشن، وزیر گنج، گولہ گنج، ڈیوڑھی آغا میر کے آس پاس نوابوں کی خاصی آبادی تھی اور یہ حضرات اسٹیشن کے سامنے حامد پارک والی دکانوں میں ایک ایرانی چائے خانے میں بیٹھ کر گھوڑوں کی باتیں کرتے اور بازیاں لگاتے تھے، انھیں میں ہمارے تانگے والے بھی تھے۔ ہمارے معزز تانگے والے بھی گھوڑ دوڑ (ریس) کے بڑے شوقین اور بٹیر بازی کے رسیا تھے۔ غالباً نوابوں کے کسی لٹے ہوئے خاندان کے متوسلین میں تھے۔ میرے بار بار احتجاج کرنے کے باوجود مجھے ہمیشہ "نواب صاحب" کہہ کر مخاطب کرتے اور فرشی سلام سے نوازتے تھے۔ راستے بھر نوابوں اور گھوڑوں

دنوں کی باتیں کرتے۔ دل پھینک بھی واقع ہوئے تھے۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ کرایہ نقد لینے پر اصرار نہ تھا۔ ان تمام خوبیوں کی وجہ سے سائیکل میں ذرا بھی نقص ہوتا تو میں تانگے پر یونیورسٹی چلا جاتا۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ تانگے کا ماہانہ بل خاصا بھاری بھر کم ہو جاتا۔ گھر سے جو بندھی ہوئی رقم آتی تھی اُس میں بجٹ کو متوازن رکھنا مشکل ہوتا تب بجٹ بڑھانے کے لیے لکھنا پڑتا اور "قہر درویش بر جانِ درویش" والے انداز میں منظوری بھی مل جاتی!

اُدھار کا سلسلہ یونیورسٹی رسٹوراں میں بھی چلتا تھا۔ رسٹوراں کے کشمیری مالک بقایا صاحب تھے اور جیسا نام: ویسا کام! ان کے تعلقات سیاسی کارکن قسم کے طلبہ سے کچھ زیادہ ہی تھے۔ طلبہ کی سیاست میں حصہ لینے والوں کا خاص مرکز یہی رسٹوراں تھا اور ان کی بدولت بقایا صاحب کی آمدنی خاصی بڑھ گئی تھی۔ یہ سب ماہانہ حساب رکھتے تھے۔ یہ بھی ایک ریاست کی شان تھی کہ پیسے ہوں یا نہ ہوں، دوستوں کی خاطر تواضع ہوتی۔ کشمیر اور پنجاب وغیرہ سے جو طلبہ آتے وہ عام طور سے اچھے گھرانوں کے افراد ہوتے ان کو اچھی خاصی جیبی رقم (پاکٹ منی) ملتی تھی اور وہ خوب خرچ بھی کرتے۔ بعض تو حضرت گنج کے ہوٹلوں میں شراب نوشی بھی کر لیا کرتے تھے کہ یہ تہذیب جدید کی بھی نشانی سمجھی جاتی تھی اور ریاست کی بھی۔ جملۂ معترضہ کے طور پر یہ بھی کہہ دینے کو جی چاہتا ہے کہ مطعون واجد علی شاہی ریاستوں میں کئی راجہ نواب ایسے بھی تھے جو کسی عیاشی کے قریب نہیں جاتے تھے۔ ان میں محمود آباد، پیر پور، سلیم پور کی ریاستیں نمایاں تھیں!

ہم جیسے متوسط طبقے کے طالب علموں کا حال یہ تھا کہ جیب میں پیسے ہوں یا نہ ہوں، بقایا صاحب کے طریق کار کی بدولت، دوست احباب اور سیاسی رفقائے کار کی مدارات ہوتی رہتی تھی۔ ایک کی جگہ چار خرچ ہوتے تھے۔ میں اس زمانے میں سگریٹ بھی بہت پیتا تھا۔ رسٹوراں کے سامنے ہی سگریٹ والے کی دوکان تھی اور بغل میں پھلوں کی دوکان تھی، ہر جگہ حساب چلتا تھا، کیونکہ قرض جاگیردارو ں کی ایک شناخت بھی تھا! گھر والے میری فضول خرچیوں سے عاجز تھے۔ لیکن خدا بخشے والدہ مرحومہ کو کہ ان کا دامن شفقت و کرم میری ساری کوتاہیوں کی پردہ پوشی کر لیا کرتا تھا۔ میں کتابوں کے نام پر پیسے منگواتا مگر کتاب نہ خریدتا اور ماہانہ بجٹ کے اُتار چڑھاؤ سے نپٹتا رہتا، فیس اور جرمانے کے نام پر مزید رقم کی فرمائش کرتا، دوا علاج کے بہانے سے بھی پیسے منگوا لیتا۔ مشاعروں سے اور جب ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن کھُل گیا تو وہاں کے پروگراموں سے بھی کچھ پیسے ملنے لگے۔ لیکن اخراجات کی ایک نئی شکل کافی ہاؤس کی شکل میں اُبھر آئی تھی۔ غرض اخراجات بڑھتے جاتے اور جو کچھ بھی ملتا وہ انھیں دائروں میں خرچ ہو جاتا تھا۔

لکھنؤ کافی ہاؤس خاصے کی چیز تھا۔ یہاں بڑے بڑے اخبار نویس جیسے راما راؤ، چیلاپتی راؤ، ایس۔ این گھوش، بڑے بڑے سیاستداں جیسے اچاریہ نریندر دیو، رام منوہر لوہیا، کیشو دیو مالویہ، ترلوکی سنگھ، پی سی جوشی، سجاد ظہیر آیا کرتے۔ دانشوروں میں احمد علی، آل احمد سرور، ڈی۔ پی مکرجی اور احتشام حسین، خبر نگاروں میں امین سلونوی، انصار ہروانی، جوالا سنگھ بھٹّا چاریہ وغیرہ اور طالب علموں کی سیاست میں حصہ لینے والوں میں سید سبط حسن، ڈی۔ پی۔ دھر (درگا پرساد دھر) کاشی ناتھ بامزئی، بلرام سنگھ، صدیق احمد صدیقی، وانچو جگدیش دکشت، سید محمد جعفر، راجہ بخش، شفیق نقوی، نریش تیواری، انور جمال قدوائی، خواجہ جمیل الدین اور بہت سے نام ہیں سب جمع ہو جاتے تھے۔ یہ وہی زمانہ ہے جب علی سردار جعفری، مجاز (اسرار الحق ردولوی) اور قاضی جلیل عباسی اپنی ترقی پسندی کی بدولت علی گڑھ سے نکالے گئے اور ہماری یونیورسٹی میں پناہ گزیں ہوئے۔ یہ لوگ بھی آجاتے۔ سلام مچھلی شہری بھی شامل ہو جاتے۔ اتنے شاعر جمع ہوں اور شعر خوانی کا دور نہ چلے یہ ناممکن تھا، غرض وہاں اکثر و بیشتر چھوٹا موٹا مشاعرہ ہو جاتا۔ ہندی کے مشہور شاعر گرجا کمار ماتھر خاص دوستوں میں تھے وہ بھی آجاتے تو ملے جُلے مشاعرے اور کوی سمیلن کا سماں بندھ جاتا۔ بیچ بیچ میں سیاسی حالات پر تبصرے اور نظریاتی بحثیں بھی چھڑ جاتیں۔ انجمن در انجمن کی فضا ہوتی، لیکن شور و غل نہیں۔ دھیمے لہجوں میں گفتگو ہوتی اور اسی انداز سے شعر بھی سُنائے جاتے۔ یہ لکھنوی تہذیب کا کرشمہ تھا۔ اس تہذیب میں شور و غل کو ناپسند کرتے تھے۔ اس کی جگہ سڑک تھی یا سیاسی اجتماعات!

میرے اور میری طرح کے دوسرے دوستوں کے اخراجات کی

زیادتی کا سبب ثقافت و سیاست سے اس طرح کی دلچسپیاں بھی تھیں۔ اسٹوڈنٹس فیڈریشن، کانگریس، سوشلسٹ پارٹی (جس میں کمیونسٹ بھی شامل تھے کیونکہ ۱۹۳۹ء تک سی، پی، آئی شجر ممنوعہ تھی)، انجمن ترقی پسند مصنفین، کالجوں اور یونیورسٹی کی یونینیں۔ سبھی کے نمائندے جمع ہوتے، چائے، کافی، بلکہ دوسے اور سینڈوچ تک میں ہمپقرادر ہم قلم سبھی شریک ہوجاتے۔ میہمانی اور میزبانی کا سلسلہ روز کا تھا اور ہم سب کے یہاں حسابِ دوستاں در دل والا معاملہ تھا۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے دوست اور عزیز تھے اور بہت سے کام! مختصر یہ کہ اخراجات کی کثرت سے ہم اکثر پریشان رہتے ہیں اس کا تطعی حل اُس زمانے میں کیا آج تک ڈھونڈ نہیں پایا ہوں، لیکن شکر ہے کہ قدرت نے ہر حال میں مست رہنے والی طبیعت عطا کی ہے۔ اور چاہیئے بھی کیا!

لباس کے معاملے میں یونیورسٹی میں کافی آزادی تھی۔ زیادہ تر لڑکے سوٹ پہنتے تھے لیکن شیروانی اور بڑی موری کے پائجامے کا رواج بھی خاصا تھا۔ کچھ لوگ جواہر بنڈی، کرتے اور پاجامے بھی استعمال کرتے تھے۔ میں کھدر ہی کے کپڑے بنواتا تھا کیونکہ یہ سیاسی کارکنوں اور آزادی پسندوں کی نشانی تھی اور میں بھی اپنے کو اسی گروہ میں شامل سمجھنے لگا تھا۔ شیروانی "شرفا" کا پہناوا تھی۔ ہندو، مسلم، شہری دیہاتی ذات پات کی تفریق نہیں تھی، ایسے پرستاروں میں وکیل، بیرسٹر، تعلقہ دار، جاگیردار، مولوی، پنڈت سب تھے۔ انگرکھو کا رواج کم ہو چلا تھا اور یونیورسٹی میں تو اس کا سوال ہی نہیں تھا۔ یہی حال دھوتی کا تھا۔

یونیورسٹی کے طلبہ کے بہت سے نام آگئے۔ لیکن طالبات کی بات بیچ ہی میں رہ گئی تھی۔ یونیورسٹی کی طالبات نے بیداری نسواں میں بڑا حصہ لیا ہے اور اس کا سرسری ذکر بھی نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ طالبات میں منہاج خواہران، مسز سروپ رانی بخش، تزئین حبیب اللہ، اور رتنا سدھانت وغیرہ کا رجحان سیاست کی طرف شروع ہی سے تھا۔ منہاج خواہران میں سلطانہ نے (جو اب علی سردار جعفری کی شریک حیات ہیں) طلبہ کی تحریک میں سرگرم حصہ لیا اور یہی حال تزئین حبیب اللہ کا بھی تھا۔ فرق یہ تھا کہ سلطانہ منہاج شروع سے قوم پرور اور ترقی پسند خیالات کی تھیں لیکن تزئین بعد میں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے وابستہ ہو کر

عام دھارے سے کٹ گئیں۔ طالبات کو طلبا کی تحریک سے قریب تر لانے کے لیے میری ہی تحریک پر کل ہند طالبات کانفرنس لکھنؤ میں بلائی گئی۔ سلطانہ کو اس میں صدر مجلس استقبالیہ بنایا گیا۔ بعد میں سلطانہ سی، پی، آئی سے وابستہ ہو گئیں۔ انھوں نے دلّی اسٹوڈنٹس کانفرنس میں دوسری طالبات کے ساتھ شرکت کی اور لکھنؤ یونیورسٹی کا نام بلند کیا۔ آمنہ اور خدیجہ اپنی بڑی بہن سے مختلف تھیں۔ ان کی دلچسپیاں ثقافتی زیادہ اور سیاسی کم تھیں۔ ان تینوں بہنوں کا ایک ساتھ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا اور حسنِ ظاہری کے ساتھ حسنِ باطنی سے آراستہ ہونا ان کے والد منہاج الدین صاحب مرحوم کی مآل اندیشی، وسیع النظری اور حسنِ تربیت کا نتیجہ تھا۔

تزئین حبیب اللہ فلسفہ کی طالبہ ہونے کی وجہ سے میری ہم جماعت تھیں۔ شیخ حبیب اللہ کی دختر تھیں۔ شیخ صاحب تعلقہ دار تھے، ڈپٹی کلکٹری بھی کی تھی اور ریاست محمود آباد کی مدار المہامی بھی۔ بعد میں لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی ہوئے۔ بیگم حبیب اللہ بھی اوسط درجے کی تعلیم یافتہ تھیں۔ سیاست میں حصہ لیتی تھیں، لیکن ان کا تعلق مسلم لیگ سے تھا۔ فلسفہ کی جماعت میں تھوڑے سے طالب علم ہوتے تھے۔ جن میں طالبات تو اور بھی کم ہوتی تھیں۔ اس مختصر سی کلاس میں اپنی ذہانت اور ہیجانی طبیعت کے باعث تزئین نمایاں تھیں۔ ہم جماعت ہونے کی وجہ سے انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ کلاس کے اندر اور کلاس کے باہر بھی ان سے باتیں ہوتیں۔ بحیثیں ہوتیں ان کی ذکاوت سے متاثر نہ ہونا ناممکن تھا۔ ترقی پسندانہ خیالات بھی رکھتی تھیں لیکن میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ اُن کی طبیعت میں ٹھہراؤ نہیں ہے۔ بہت جلد اپنی ماں کے سیاسی دباؤ میں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں شامل ہوگئیں اور ناگپور کے اجلاس کی صدارت بھی کر آئیں۔ اس طرح یہ سلطانہ سے مختلف مزاج کی مالک تھیں اور بہت جلد ترقی پندی سے ہٹ کر لیگی سیاست میں الجھ گئیں۔ پھر وہ بیگم تزئین فریدی ہوگئیں۔ (ہماری یونیورسٹی میں لیگ کا زور نہیں تھا، بس علی رضا مرحوم اس کی نمائندگی کرتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد علی رضا مرحوم کے خیالات میں تبدیلی آگئی۔) تزئین کے شوہر نے چند دن لکھنؤ یونیورسٹی میں فارسی بھی پڑھائی تھی لیکن

جلد ہی انھیں ایک اور اچھی ملازمت مل گئی اور اُس علاقے میں تعینات ہوگئے جو بعد میں پاکستان بننے والا تھا۔ تزئین بھی وہیں پہنچ گئیں۔ وہاں بھی نچلی نہ بیٹھیں اور اَپوا (آل پاکستان ویمنز آرگنائزیشن) کی صدر بن گئیں۔ بعد میں سُنا کہ سندھ حکومت میں وزارت بھی مل گئی۔ ان کے بھائی جنرل حبیب اللہ ہندوستان ہی میں رہے۔ ان کی بیگم حامدہ حبیب اللہ کانگریس کی سرگرم رُکن ہیں۔ وزیر بھی رہ چکی ہیں۔ انھیں کے دورِ وزارت میں اتر پردیش اردو اکیڈمی قائم ہوئی۔ ان کے صاحبزادے وجاہت حبیب اللہ آئی۔ اے۔ ایس افسر ہیں اور تزئین حبیب اللہ کی صاحبزادی ان کو منسوب ہیں۔ صورت شکل میں تزئین سے بہت مشابہ ہیں۔ پہلی بار ٹرین کے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں ملاقات ہوئی تو میں چونک پڑا کہ تزئین کہاں سے آگئیں۔ تعارف پر معلوم ہوا کہ انھیں کی صاحبزادی ہیں۔

ان فریدی صاحب کے بڑے بھائی ڈاکٹر فریدی شہر کے ممتاز ماہرِ امراضِ سینہ تھے۔ سوشلسٹ خیالات رکھتے تھے لیکن اچھے نماز گزار مسلمان تھے۔ آخر دم تک سوشلسٹ بھی رہے اور صوم و صلوٰۃ کے پابند بھی۔ پاکستان بن جانے کے بعد مسلمان سیاسی اعتبار سے پراگندہ خیال ہوگئے تھے۔ ان کو صحیح رہنمائی فراہم کرنے کے خیال سے جو مجلسِ مشاورت بنی، اس میں بھی عملی حصہ لیا۔ ان کو عزیزوں، یار دوستوں نے بہت پاکستان کھینچنا چاہا لیکن یہ ہندوستان کے باہر جانے پر کسی طرح تیار نہیں ہوئے۔
ع وفاداری بہ شرطِ استواری اصل ایماں ہے! بیحد کامیاب ڈاکٹر تھے اور دستِ شفا کے لیے مشہور تھے۔ بہت سے مریضوں کا مفت علاج کر دیا کرتے تھے۔ میرے مستقل معالج تھے۔ یونیورسٹی کی سیاست سے بھی انھیں گہری دلچسپی تھی۔ وہاں چندر بھان گپتا کی مسلسل مخالفت کرتے رہے۔ یہ مخالفت میڈیکل کالج کے معاملات سے شروع ہوئی اور پھر سیاست میں اس نے بڑے بڑے رنگ دکھائے۔ گپتا جی دو بار وزیرِ اعلیٰ رہ چکے تھے لیکن ایک بار فریدی صاحب نے الکشن میں ان کی مخالفت پر کمر باندھی تو پھر ان کے سیاسی حریف ترلوکی سنگھ کو حمایت پر آمادہ کیا اور اپنی ہر دلعزیزی کی بنا پر گپتا جی کو ہرا کے ہی دم لیا۔ اتفاق کی بات کہ ایک مرتبہ فریدی اور گپتا ایک ہی کمپارٹمنٹ میں دلّی جا رہے تھے۔ راستے میں گپتا پر دل کا شدید دورہ پڑا۔ فریدی بھی دل کے مریض تھے اس لیے دوائیں اور انجکشن وغیرہ ساتھ رکھتے تھے۔ فوراً علاج کیا اور اس قابل ہوئے کہ دلّی تک بخیر پہنچ جائیں۔ اسٹیشن ٹیلیفون کرا کے کار کا انتظام کر لیا اور باقاعدہ اسپتال پہنچا کے ہی دم لیا۔ کیسی دشمنیاں ایک آن میں دوستیوں میں بدل جاتی ہیں اور ع

عدو شود سببِ خیر گر خدا خواہد

طالبات ہی میں ٹینس کے مشہور کھلاڑی باب کی صاحبزادی ہیزل باب بھی تھیں، بیحد خوش طبع اور خوش اخلاق۔ انھوں نے ایک دن علی سردار جعفری کو نئے سال کی مبارک باد دی تو ان کی وہ نظم وجود میں آئی:

یہ کس نے فون پہ دی سالِ نو کی تہنیت مجھ کو
تصوّر رقص کرتا ہے، تخیّل گنگناتا ہے

سیاست سے دلچسپی لینے والوں میں نشاط حسن اور رتنا سدھانت کا بھی نام لیا جا سکتا ہے لیکن ان کی دلچسپی سطحی تھی ہاں طلبہ کانفرنسوں کے انعقاد میں ان سے اکثر مدد ملتی تھی۔ مسز وجے لکشمی پنڈت کی صاحبزادیاں یونیورسٹی میں تو نہیں پڑھتی تھیں لیکن لکھنؤ میں موجود ہونے کی وجہ سے نین تارا اور چندر لیکھا طلبہ کی سیاست میں بھی کبھی کبھی حصہ لیا کرتی تھیں۔ انھیں کی طرح آنند نرائن ملّا کی صاحبزادی چترا مُلّا کو بھی دلچسپی تھی۔ انھیں ہندوستانی کلاسیکی رقص سے دلچسپی تھی۔ ایک بار ہماری استدعا پر انھوں نے کانفرنس کے موقع پر اپنے رقص کا ایک مظاہرہ بھی کیا تھا۔

یہ فہرست کافی طویل ہو سکتی ہے لیکن فہرست مرتب کرنا مقصود نہیں۔ اتنے ہی تذکرے سے یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ بیداری نسواں کے سلسلے میں یونیورسٹی کے خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ اور ہماری طالبات نے بھی تحریکِ آزادی اور اس کے متعلق خدمات میں عملی دلچسپی لی ہے۔ اُس زمانے میں ترقی کے ہر شعبے میں ہماری یونیورسٹی پیش پیش تھی اور صوبے ہی میں نہیں بلکہ دُور دُور تک اس کی قیادت و سیادت تسلیم کی جاتی تھی۔

طلبہ کی تحریک کے سلسلے میں صرف جلسے جلوس الکشن اور ہنگامے

نہیں تھے بلکہ طلبہ برابر سختیاں جھیلتے تھے۔ انور جمال قدوائی، شفیق
ی اور بلرام سنگھ کو دو سال کے لیے یونیورسٹی سے خارج کر دیا گیا تھا۔
ی طرح میرے چھوٹے بھائی سید علی اعتماد مرحوم کو جوبلی کالج سے
رطانوی جھنڈا اُتار کر قومی پرچم لہرانے کے جرم میں دو سال کے اخراج
ی سزا ملی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ آزادی کی تحریک میں حصہ لینے
والوں نے بعد میں انعام بھی پایا۔ یہ بہت ہی غلط تصور ہے۔ یونیورسٹی
کے طلبہ میں کسی کو کیا ملا؟ علی جواد زیدی، علی سردار جعفری، سید محمد
جعفر، قاضی جلیل عباسی، رامیشور پرشاد مصر، بلرام سنگھ تو جیل بھی
گئے لیکن انھوں نے حکومت سے اس کا کوئی بدلہ نہ چاہا خود کنواں کھود
تو پانی پیا۔ اسی یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ سیاست دانوں میں سجاد ظہیر،
پی، سی، جوشی بھی تھے۔ اگر جگدیش چندر دکشت صدر لیجس لیٹو کونسل
ہو بھی گئے تو کیا ہوا۔؟ ہاں یہ مقام فخر ہے کہ یونیورسٹی نے ایسے نوجوانوں
کی ترتیب کی جو ملک کے لیے باعثِ افتخار ہوئے۔ انھیں میں موجود
صدر شنکر دیال شرما بھی ہیں، جو میرے ہی زمانے میں زیرِ تعلیم تھے۔
آزادی اور ترقی پسندی کی جب بھی کوئی تاریخ لکھی جائے گی تو یونیورسٹی
کے کارناموں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ باقی تفصیلات حسبِ موقع
دوسرے ابواب میں سامنے آئیں گی۔ یہاں اتنے ہی پر اکتفا کرنا مناسب ہوگا۔

□□

حواشی:

[1] گنگا پرشاد ورما، جن کی یادگار یہ ہال تھا، کانگریس کے بنیادی ممبروں میں تھے اور اردو کے صحافی بھی تھے۔

[2] واجد علی شاہ کا تخلص اختر تھا اس مناسبت سے اسے اختر نگر بھی کہا گیا ہے۔ [3] اسے کرامت حسین نے قائم کیا تھا۔ مسلمان لڑکیوں کے لیے اعلیٰ تعلیم کی ضرورت کا احساس انھوں نے دلایا۔ یہاں پردے کا بھی اہتمام تھا۔ خصوصیت سے پردہ دار اور متوسط طبقے کی لڑکیاں یہیں تعلیم پاتی تھیں۔ اب اس کی ایک شاخ پرانے لکھنؤ میں نخاس کے قریب بھی کھل گئی ہے۔ شیعہ کالج میں بھی بچیوں کے لئے صبح کو علیحٰدہ تعلیم کا انتظام ہو گیا ہے۔

[4] میں اس اردو لفظ کو کسی قیمت پر بھی کسی اور لفظ سے بدلنے یا ترک کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ [5] "شرفا" سے خاص طبقہ نہیں بلکہ عام تہذیب یافتہ اور تعلیم یافتہ افراد مراد ہیں جو روایت دوست بھی تھے۔

لکھنؤ: کچھ یادیں کچھ باتیں ـــــــ صفحہ ۲۸ کا بقیہ

مشاعرہ شروع ہو چکا تھا۔ اتفاق سے جب جوش صاحب پہنچے تو شکیل بدایونی غزل سنا رہے تھے اور داد سے ہال کے در و دیوار گونج رہے تھے۔ اس پر وہ بہت بدحظ ہوئے اور کہنے لگے سرور صاحب! آپ نے مجھے کہاں لا کر پھنسا دیا۔ شکیل صاحب کے بعد ساغر نے اپنا کلام سنایا واثق بھی تھے مگر شکیل کے بعد کوئی جما نہیں۔ جب آخر میں میں نے جوش صاحب کو زحمتِ کلام دی تو فرمانے لگے۔ بیاض میں بھول آیا ہوں اور زبانی اس لیے کچھ نہیں سُنا سکتا کہ مجھے کچھ یاد ہی نہیں۔ میں نے ان کی کچھ مشہور رباعیاں یاد دلائیں۔ ایک رباعی یہ بھی تھی ؎

غنچے تیری بے بسی پہ دل ہلتا ہے بس ایک تبسم کے لیے کھلتا ہے
غنچے نے کہا کہ اس چمن میں بابا یہ ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے

اسی طرح دو ایک رُباعیاں اور میں نے پڑھیں اور جوش نے دُہرا دیں۔ بہر حال مجمع میں بے لطفی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ آچاریہ جی نے مجھ سے اشارہ کیا کہ اب تم زیادہ اصرار نہ کرو۔ تھوڑی دیر بعد جوش صاحب تشریف لے گئے۔ اب سوچتا ہوں تو شاید جو داد شکیل بدایونی کو مل رہی تھی وہ ان کو ناگوار ہوئی تھی اور ان کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔

جب میں لکھنؤ سے علی گڑھ آ گیا تو ایک دفعہ دہلی جانا ہوا جہاں جوش کے اعزاز میں ایک نشست تھی۔ دہلی کے بعض ممتاز شعرا اور منتخب جاہوی بھی موجود تھے جہاں تک یاد پڑتا ہے شنکر پرشاد اور رولی شنکر کے علاوہ بسمل سعیدی، عرش ملسیانی، جگن ناتھ آزاد، ممتاز مرزا سبھی تھے کھانے کے بعد شعر و شاعری شروع ہوئی۔ ہم سب کے بعد جوش صاحب کی باری آئی۔ غالباً رات کے گیارہ بجے تھے۔ جب جوش صاحب نے سنانا شروع کیا تھا کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پڑھتے رہے۔ متعدد رُباعیاں اور کئی نظمیں سنائیں۔ آواز میں شروع سے آخر تک وہی طنطنہ جو ان کی پہچان تھا۔ نہ کھانسے نہ کھنکھارے، نہ بیچ میں پانی پیا۔ ایک توانا لے میں آخر تک اپنا کلام سناتے رہے اور لوگ داد دیتے رہے

(باقی آئندہ)

غزل



وہ جو مست آنکھوں کو مل کر رہ گئے
کیسے کیسے دور چل کر رہ گئے

آہ جن اشکوں کو پی جانا پڑا
اُف جو دریا رُخ بدل کر رہ گئے

لغزشیں بے کیف، سجدے بے مزہ
دل جو بدلا سب بدل کر رہ گئے

ہم تو بہکے عشق میں ناصح مگر
ہائے رے وہ جو سنبھل کر رہ گئے

وقت کے ہاتھوں ہزاروں کارواں
منزلیں اپنی بدل کر رہ گئے

شمع جل اُٹھی تو پروانے جلے
پیشتر ہی کیوں نہ جل کر رہ گئے

مسکرانے کے ارادے اے خمار!
بارہا اشکوں میں ڈھل کر رہ گئے

خمار بارہ بنکوی
پیر بٹاون۔ بارہ بنکی

پروفیسر نور الحسن ہاشمی
قطب پور، ڈالی گنج، لکھنؤ

لکھنؤ: قصبے سے شہر ہونے تک

لکھنؤ گزیٹیر (مطبوعہ ۱۹۲۲ء) کے صفحہ ۲۴۱ پر مذکور رہے کہ لکھنؤ میں مسلمانوں کی آمد سے کچھ پہلے ٹیلے والی مسجد کے اردگرد برہمنوں اور کایستھوں کی مختصر نوآبادی تھی۔ کچھ عرصہ بعد قصبہ بجنور (ضلع لکھنؤ) کے شیخوں کا ایک قبیلہ وہاں آکر بس گیا تھا ان کے بعد رام نگر کے پٹھانوں کا ایک گروہ آکر یہاں اقامت پذیر ہوگیا تھا۔ یہ لوگ ٹیلے والی مسجد سے لے کر موجودہ گول دروازہ تک کے علاقے کو اپنی زمینداری میں شامل بتاتے تھے۔ اس کے جنوب مشرق میں شیخوں کی عملداری تھی جو موجودہ ریزیڈنسی تک پھیلی تھی۔ ان شیخوں کے کارناموں میں سے ایک اہم کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے اس مقام پر جو بعد میں مچھی بھون کہلایا ایک قلعہ بنوایا تھا جو اپنی مضبوطی کے باعث بہت مشہور ہوگیا تھا کہا جاتا ہے کہ اس قلعہ کا معمار خاص ایک ہندو لکھن نامی تھا اس لئے یہ قلعہ لکھن کے نام سے مشہور ہوگیا تھا۔ شیخوں کا اثر اور اقتدار تو بڑھتا رہا ان کی آبادی بھی بڑھتی رہی لیکن اس چھوٹے سے قصبہ نے قلعہ لکھن سے لکھنؤ کی صورت کب اور کیونکر اختیار کرلی تواریخ کے صفحات سے اس پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ قیاسات سے البتہ کام لیا گیا ہے اور بہت سے قیاسات اس نام کے بارے میں اخبارات میں شائع ہوچکے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا بھی ایک قیاس ان میں شامل کرلیا جائے شاید یہ ظن غالب مانا جاسکے میرا خیال یہ ہے کہ لفظ لکھن میں لفظ مئو جوڑ دیا گیا ہوگا اور اسی کا نام لکھن مئو پڑ گیا تھا۔ لفظ مئو کے ساتھ اکثر قصبوں کے نام رکھے جاتے تھے جن میں سے کئی اب بھی موجود ہیں مثلاً بالا مئو، گوپا مئو، مئو ناتھ بھنجن یا خالی لفظ مئو، لکھن مئو میں چونکہ ن اور م کی دو متوازی آوازیں ساتھ میں تھیں کثرت استعمال سے م کی آواز گر گئی یا حذف ہوگئی۔ صرف لکھنؤ رہ گیا۔ اس قیاس کو مانا جائے یا نہ مانا جائے میرا جو ظن غالب تھا تحریر کر دیا۔

مینا نگری

بڑی دقت یہ ہے کہ لکھنؤ کا نام پرانی تاریخی کتابوں میں لودھی دور حکومت میں تو کہیں کہیں مل جاتا ہے اس سے پہلے نہیں ملتا۔ بہر حال اس کا نام لکھنؤ تو چل پڑا تھا لیکن کچھ عرصے کے لئے مینا نگری بھی رہا ہے۔ وہ اس طرح کہ یہاں کے مشہور بزرگ شیخ محمد عرف شاہ مینا پندرھویں صدی عیسوی میں سکونت پذیر تھے۔ یہ حاجی شیخ قیام الدین کے مرید اور خلیفہ تھے۔ حاجی صاحب مذکور ۱۳۹۶ء میں لکھنؤ میں وارد ہوئے تھے۔ شاہ مینا کا لقب انھوں نے اپنے مرید خاص شیخ محمد کو عطا کیا تھا۔ شاہ مینا صاحب مذکور نے اپنے محلہ کا نام مینا نگر یا مینا نگری رکھا تھا جس کا اطلاق کچھ عرصے تک پورے قصبہ لکھنؤ پر بھی ہوتا رہا[له]۔ ان کا مزار متصل میڈیکل کالج لکھنؤ آج تک مرجع خاص وعام ہے۔

اکبر بادشاہ

لکھنؤ کو ترقی دینے کے سلسلے میں اکبر بادشاہ کا نام بھی لیا جاسکتا ہے کہا جاتا ہے کہ اس کو (۱۵۵۶ء تا ۱۶۰۵ء) لکھنؤ سے خاصی دلچسپی تھی۔ یہاں اس نے اس ٹکسال کو برقرار رکھا جو تانبے کے سکّے ڈھالنے کے لئے اس سے پیشتر شیر شاہ نے قائم کی تھی۔ اکبر نے چوک کے جنوبی علاقے میں چند محلے بھی آباد کیے تھے۔ یہاں برہمنوں کا وقار بڑھانے کے لئے اس فرقے کو لاکھ روپیہ عطیہ بھی دیا تھا جس کے بعد یہ فرقہ باجپئی برہمن کہا جانے لگا تھا۔ ان کے نام سے ایک محلہ بھی آباد ہوا تھا جو اب معدوم ہوچکا ہے۔ اکبر کو یہ مقام شاید اس لئے بھی یاد رہا ہوگا کہ جب ۱۵۴۰ء میں ہمایوں بادشاہ جون پور میں شیر شاہ سے شکست کھا کر فرار ہوا تھا تو لکھنؤ سے بھی گزرا تھا۔

یہاں صرف چار گھنٹے قیام کیا تھا۔ ان چار گھنٹوں میں یہاں کے شیخوں نے اس کے لئے دس ہزار روپے نقد اور پچاس گھوڑے فراہم کردئے تھے۔

جہانگیر جو اپنی شہزادگی کے زمانے میں مرزا سلیم کہلاتا تھا ایک دفعہ یہاں آیا تھا۔ اور اس نے یہاں مرزا منڈی کے نام سے ایک منڈی قائم کی تھی جس کا کچھ حصہ مچھی بھون کے مغرب میں تھا۔

اکبر کے عہد کے آخری زمانے میں یہاں اودھ میں جوہر خاں نامی ایک صوبہ دار کو مقرر کیا گیا تھا اس کے نائب قاسم محمود بلگرامی نے یہاں چوک کے بائیں جانب محمود نگر اور شاہ گنج کے محلے آباد کیے تھے اور چوک کے جنوبی حصہ میں اکبری دروازہ بنوایا تھا۔ جو آج بھی قائم ہے۔

نوابی دور

۱۷۲۰ء میں محمد شاہ بادشاہ سعادت خاں نیشاپوری کو برہان الملک کا خطاب دے کر پہلے آگرہ کا صوبیدار مقرر کیا، بعد ازاں ۱۷۳۲ء میں اودھ کا۔ (بحوالہ گزیٹر لکھنؤ) اجودھیا اس کی راجدھانی تھی لیکن لکھنؤ میں بھی اکثر آکر رہتا تھا یہاں اس نے شیخوں سے دو محل (پنج محلہ اور مبارک محل) کرایہ پر لئے تھے وہیں قیام کرتا تھا یہاں اس نے کئی کٹرے بھی آباد کئے مثلاً چوک کے ارد گرد کٹرہ سید حسین خاں، کٹرہ ابو تراب خاں، باغ مہانرائن اور سعادت گنج میں کٹرہ خدایار خاں اور بزن بیگ خاں اور دولت گنج میں کٹرہ محمد علی خاں اور سرائے معالی خاں وغیرہ۔ سعادت خاں نے دہلی میں ۱۷۳۹ء میں وفات پائی۔

سعادت خاں کے بعد اس کا بھتیجا اور داماد ابو المنصور خاں مخاطب بہ صفدر جنگ اس کا جانشین ہوا یہ زیادہ تر دہلی میں ہی رہا۔ اپنی وفات (۱۷۵۴ء) سے کچھ پیشتر یہ اودھ میں مستقل طور سے رہنے کے لئے آگیا تھا۔ اجودھیا کے قریب فیض آباد شہر کی بنیاد ڈالی اور اسی کو اپنا مستقر بنایا۔ لکھنؤ میں اس نے شیخوں کے قلعہ کی جگہ پر دوسرا قلعہ بنوایا جو مچھی بھون کہلایا۔ یہ علاقہ وہی ہے جہاں اب امام باڑہ آصف الدولہ اور میڈیکل کالج کے چند ہوسٹل کالج کے شمالی حصہ میں واقع ہیں۔ ۱۷۵۴ء میں وفات پائی۔ اس کی میت دہلی لے جائی گئی اور وہیں تدفین ہوئی۔

صفدر جنگ کے بیٹے شجاع الدولہ نے اپنی سکونت فیض آباد ہی میں رکھی اور اسی شہر کی آرائش و زیبائش میں تاعمر مصروف رہا۔ لکھنؤ سے زیادہ سروکار نہ رکھا۔ نہ یہاں کی عمارتوں میں کوئی اضافہ کیا۔

۱۷۷۵ء میں شجاع الدولہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا آصف الدولہ صوبہ داری اودھ پر فائز ہوا۔ اس نے اسی سال فیض آباد کے بجائے لکھنؤ کو اپنا مستقر قرار دیا اور حقیقت یہ ہے کہ اسی نے ایک بڑے قصبہ کو ایک بڑے شہر کی صورت دے دی۔ اس کو اودھ کی راجدھانی بنایا اور بے شمار عمارتوں محلّوں اور باغوں سے بے حد آراستہ کر دیا۔ ان کی تفصیل کتب تواریخ میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

بہر حال یہ اسی کا اور اس کے اخلاف کا بنایا اور آراستہ کیا ہوا لکھنؤ ہے جو آج نہ صرف سرکار یو۔ پی کا دار الحکومت ہے بلکہ ہندوستان کے تمام ممتاز شہروں میں اپنی خوبصورت عمارتوں اپنی مخصوص تہذیب، اپنی قومی یک جہتی اور اپنی فصاحتِ زبان کے لئے ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔

حواشی

ع۱ ملفوظات شاہ مینا کا ایک قلمی (فارسی) نسخہ مولفہ محی الدین بن حسین رضوی ہروی مکتوبہ ۱۱۵۵ھ (از شیخ امان اللہ) لکھنؤ یونیورسٹی میں موجود ہے۔ یہ اواخر انیسویں صدی عیسوی میں مطبع مرقع عالم ہردوئی سے شائع ہو چکا ہے۔ ہاشمی

"اہلِ لکھنؤ کی زبان اس قدر شائستہ اور شستہ و رُفتہ ہوگئی ہے کہ یہاں کے جُہلا دوسرے شہروں کے اکثر شعراء و فصحا سے زیادہ اچھی اُردو بولتے ہیں اور جو شائستگی اور تمیزداری ان سے ظاہر ہوجاتی ہے کسی اور مقام کے قابل اور ذی علم لوگوں سے بھی ظاہر نہیں ہوسکتی۔"

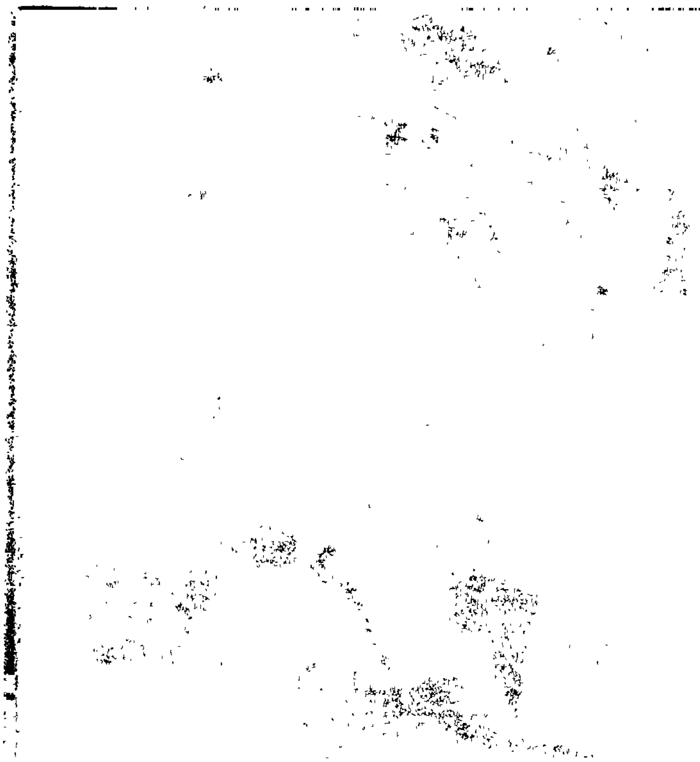
—— گزشتہ لکھنؤ ص ۳۲۷
از عبد الحلیم شرر

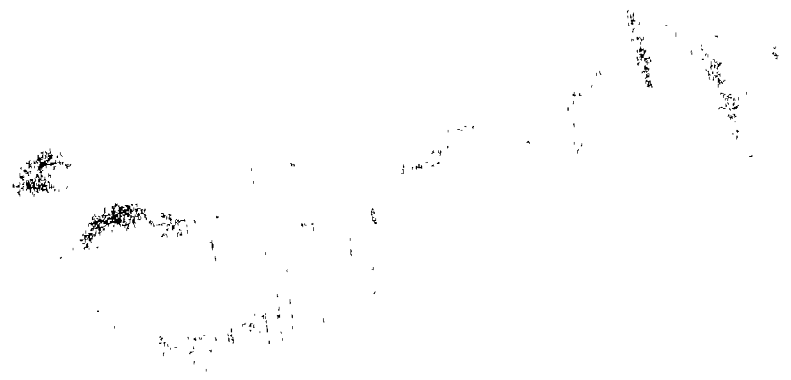


بادشاہ اودھ
غازی الدین حیدر
کے
عہدِ حکومت
کے
سکے



تاجدارِ اودھ نصیرالدین حیدر فوج کا معائنہ کرتے ہوئے







قلعہ
عالم باغ
لکھنؤ

شمس الرحمٰن فاروقی
۲۹-سی، ہیسٹنگز روڈ، الہ آباد



داستان امیر حمزہ: بعض ابتدائی باتیں

لکھنؤ نے اردو ادب کو بہت کچھ دیا۔ اگرچہ اس شہر کی اداؤں میں ایک ادا یہ بھی ہے کہ یہ اپنے عاشقوں کو مار رکھتا ہے۔ یا گاڑ کر بھول جاتا ہے، لیکن اس کے چاہنے والے اپنی مدت حیات اسکے ناز اٹھانے ہی میں گذار دیتے ہیں۔ آتش و ناسخ، میر و مصحفی، کتنے ہی ایسے ہیں جن کی لوح مزار کیا، مزار تک اب باقی نہیں لیکن ان کے بارے میں اتنا تو معلوم ہے کہ یہ خاک لکھنؤ میں آسودہ ہیں (اگر "آسودہ" کا لفظ ایسوں کے لئے مناسب ہو۔) داستان امیر حمزہ (طویل) اور داستان امیر حمزہ (مختصر) کی تخلیق کرنے والوں کے بارے میں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ لکھنؤ میں دفن ہیں یا کہاں دفن ہیں؟ کسی قوم اور کسی تہذیب نے کم ہی اپنے محسنوں کے ساتھ وہ سلوک کیا ہوگا جو اہل لکھنؤ، اہل اردو اور اہل ہند نے داستان امیر حمزہ جیسی عظیم المرتبت کارگاہ نیرنگ کے صانعوں کے ساتھ کیا۔ اگر لکھنؤ کے ادبی کارناموں کی قیمت لگائی جائے تو انیس کے مرثیوں اور ناسخ کی غزلوں کے سوا غالباً کوئی بھی متن ایسا نہ ہوگا جسے داستان امیر حمزہ (طویل) کے مقابل رکھا جا سکے۔

داستان، اور خاص کر داستان امیر حمزہ کے زوال کا سبب صرف ناول کی مقبولیت نہیں۔ اور صرف ناول ہی کیوں، تھیٹر خاص کر پارسی تھیٹر، اور داستان کے آخری زمانے میں خاموش فلموں کا بھی غلغلہ کچھ کم نہ تھا۔ تاہم یہ چیزیں اتنی طاقت ور نہ تھیں کہ سیکڑوں برس کی توانا اور دور رس روایت کو چند برسوں میں اکھاڑ پھینکتیں۔ اصل وجہ تو یہ تھی کہ ہم اپنے ورثے پر شرمندہ اور اپنے تہذیبی مظاہر سے متنفر تھے۔ نصوح نے کلیم کا کتب خانہ بے وجہ ہی نذر آتش نہ کیا تھا۔ اور گلستان سعدی میں "فحش" عناصر کچھ یوں ہی محجوب نہ تھے اپنی بیوی سے اس نے کہا کہ مجھے "گلستان" کے صفحے کے صفحے کاٹنے پڑے، کیوں کہ وہ تمہیں پڑھانے کے لائق نہ تھے۔ یہ ہیں وہ لوگ جو ہمارے بزرگان سلف ہیں اور جن کا نام ہم "رحمۃ اللہ علیہ" اور "شیخ" کہہ کر لیتے ہیں۔ اپنی تہذیبی روایت سے برگشتگی اور اس کی نا قدری اور اس سے تنفر کا دور دورہ ہمارے یہاں اب بھی ہے۔ ایسا کیوں ہے، اس پر گفتگو کبھی اور ہوگی لیکن جب کبھی میں کسی "بزرگ" سے کہتا ہوں کہ میں داستان امیر حمزہ پر کام کر رہا ہوں، تو وہ مسکرا کر کہتے ہیں "ہاں ہم نے بھی بچپن میں طلسم ہوشربا/داستان امیر حمزہ پڑھی تھی"۔ یعنی یہ بس پرانے زمانے کے بچوں کا دل بہلانے کی حد تک تو ٹھیک ہے، آج کوئی عمر رسیدہ شخص اسے پڑھے، یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔

"داستان" کے بارے میں فی الحال اتنا کہنا کافی ہے کہ داستان ایسا بیانیہ ہے جو زبانی سنانے کے لئے تصنیف کیا جائے۔ چاہے فی البدیہہ، چاہے سوچ کر، خواہ دن رات محنت کر کے لکھ کر، یا دل میں گڑھ کر اور پھر زبانی یاد کر کے، چاہے لکھ کر چھپوانے کی غرض سے طریقہ "تصنیف" جو بھی ہو، لیکن مقصود یہی ہوتا ہے کہ اسے زبانی سنایا جائے۔ باختن نے لکھا ہے کہ دنیا میں ناول نگار سے زیادہ تنہا کوئی فن کار نہیں۔ کیوں کہ اسکی تحریر پڑھنے والا اجنبی، خالق تحریر سے دور، اور اکثر خالق تحریر سے کوئی مطلب نہ رکھنے والا ہوتا ہے۔ ناول تنہائی میں یا چپ چاپ پڑھا جاتا ہے یعنی وہ ایسا بیانیہ ہے جس

Target audience مفقود ہوتی ہے اگرچہ جیرالڈ پرنس Gerald Prince اور بعض دوسرے وضعیاتی مفکرین نے فکشن کے Narratee کا تصور پیش کیا ہے، یعنی ایسے شخص (یا سننے والے / پڑھنے والے) کا جسے فکشن نگار اپنے مفروضہ قاری کی طرح ذہن میں رکھتا ہے۔ لیکن پاعفن کی بات میں پھر بھی بہت سچائی ہے۔ ناول نگار اور اس کے قاری / سامع کے درمیان براہ راست کوئی رشتہ نہیں قائم ہو سکتا۔ ناول نگار کی مثال اندھیرے میں بیٹھکر گانے والے کی ہے۔ اسے کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ اس کا گانا کون سن رہا ہے۔ سن بھی رہا ہے کہ نہیں، اور اگر سن رہا ہے تو وہ اسے ناپسند کر رہا ہے یا پسند کر رہا ہے، یا بہت زیادہ متاثر ہو رہا ہے یا بالکل پہلو تہی کر رہا ہے۔ اس کے برخلاف زبانی بیانیہ اور Target audience کے درمیان فوری عمل اور ردعمل ہوتا ہے۔ اور اگر بیانیہ سنایا نہ بھی جا رہا ہو، لیکن تصنیف اس غرض سے کیا جا رہا ہو کہ اسے زبانی سنایا جائے گا۔ تو بھی اس کی شعریات وہی ہوگی، اس کی بدیعیات Rhetoric وہی ہوگی۔ رسومیات اور انداز وہی ہوں گے جو زبانی بیانیہ کے ہوتے ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر کسی نے کوئی زبانی بیانیہ کبھی نہ سنایا ہو، تو وہ ایسا بیانیہ تصنیف بھی نہیں کر سکتا جسے زبانی بیانیہ oral Narrative کہا جا سکے۔ داستان امیر حمزہ " زبانی بیانیہ کی اعلیٰ ترین مثالوں میں بھی ممتاز تو ہے ہی اسے تحریری یا ریکارڈ کی ہوئی شکل میں موجود دنیا کا طویل ترین زبانی بیانیہ کہا جا سکتا ہے۔

جب ہم اردو میں " داستان امیر حمزہ " کا فقرہ استعمال کرتے ہیں تو اس کے معنی کم از کم مندرجہ ذیل ہوتے ہیں۔

(۱) وہ زبانی (یا زبانی۔ تحریری) بیانیہ جو اردو، فارسی، ترکی، پشتو، سندھی، انڈونیشیائی بھاشا، جارجیائی، بنگالی، ہندی، اور بہت سی دیگر زبانوں میں ہے اور جس میں امیر حمزہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

(۲) وہ داستان جسے خلیل علی اشک نے فورٹ ولیم کالج میں فارسی سے ترجمہ کیا (۱۸۰۱)۔ یہ ایک جلد میں ہے اور اب بھی دستیاب ہے۔ اس کی فارسی اصل کا پتہ نہیں لگ سکا ہے۔

(۳) وہ داستان جسے امان علی خاں غالب لکھنوی نے کلکتہ میں فارسی سے ترجمہ کیا (۱۸۵۵)۔ یہ اب تقریباً ناپید ہے، لیکن نولکشور نے اسے ۱۸۷۱ میں عبداللہ بلگرامی کے نام سے تھوڑے بہت تغیر کے بعد چھاپا۔ یہ بھی ایک جلد میں ہے اور اب بھی دستیاب ہے۔ بلگرامی کے بعد تصدق حسین، اور پھر عبدالباری آسی نے اس میں رد و بدل کیا، لیکن عمومی اعتبار سے یہ اب بھی وہی متن ہے جو غالب لکھنوی نے ۱۸۵۵ میں شایع کیا تھا۔ اس کی بھی فارسی اصل کا پتہ نہیں لگ سکا ہے لیکن اغلب یہ ہے کہ اشک اور غالب لکھنوی کے پیش نظر دو الگ الگ نسخے تھے۔ اشک کے سامنے " رموز حمزہ " کا کوئی متن تھا اور غالب لکھنوی کا متن کوئی بالکل مختلف نسخہ تھا۔ اس کا " زبدۃ الرموز " سے بھی کوئی خاص تعلق نظر نہیں آتا۔

(۴) وہ داستان جو چھیالیس جلدوں میں بزبان اردو نولکشور پریس لکھنؤ سے چھپی۔ ۱۸۸۳ سے ۱۹۰۹ کے درمیان پینتالیس جلدیں چھپیں۔ آخری جلد ۱۹۱۷ میں چھپی ۔۔۔۔ سہولت کے لئے میں اشک کی داستان کے لئے " داستان (مختصر) مصنفہ اشک "، غالب لکھنوی کی داستان کے لئے " داستان (مختصر) مصنفہ غالب لکھنوی / عبداللہ بلگرامی اور چھیالیس جلدوں والی داستان کے لئے " داستان (طویل) " کے فقرے استعمال کروں گا۔ اگر لفظ داستان تنہا آئے تو اس سے داستان بطور صنف، یا کوئی خاص داستان جو کسی کتاب / جلد میں مذکور ہو، یا عمومی طور پر داستان امیر حمزہ مراد ہوگی۔ ایسی صورت میں سیاق کلام سے مفہوم متعین ہوگا۔

" داستان امیر حمزہ " جس شکل میں ہم تک پہنچی ہے (اگر اس کی بے گھری اور نا قدری اور کسی بھی جگہ پر اس کی مکمل جلدوں کا نہ ہونا " ہم تک پہنچنا " قرار دیا جائے) اس کے اعتبار سے یہ داستان آٹھ دفتروں اور چھیالیس جلدوں پر مشتمل قرار دی جا سکتی ہے۔ " قرار دی جا سکتی ہے " میں نے اس لئے کہا کہ دفتروں اور جلدوں

کی تعداد میں تھوڑی بحث کی گنجائش ہے۔

سب سے پہلی بات یہ کہ جلدیں چھیالیس ہیں یا زیادہ؟ سراج منیر مرحوم نے مجھ سے بہ وثوق کہا تھا کہ باون جلدیں ہیں۔ میں نے تفصیل چاہی تو انھوں نے کہا کہ کراچی میں ایک صاحب کے پاس تھیں۔ لیکن وہ ان صاحب کا پتہ نشان دینے سے قاصر رہے، اور نہ مجھے ہی میری تلاش کا کوئی پھل ملا۔ نہ ان صاحب کی خبر لگی اور نہ کسی فہرست یا تحریر میں، ہی مجھے باون جلدوں کا ذکر ملا۔

علی بہادر خاں نے اکتالیس جلدیں بیان کی ہیں۔ لیکن انھوں نے "آفتاب شجاعت" کو خدا معلوم کیوں ایک ہی جلد قرار دیا ہے۔ لہٰذا ان کے یہاں بھی دراصل چھیالیس جلدیں ہوئیں۔ راز یزدانی نے اپنے ایک مضمون (مطبوعہ "آج کل" دہلی بابت جولائی ۱۹۹۶ء) میں لکھا ہے کہ انچاس جلدیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں :

"ہرمز نامہ، آفتاب شجاعت اور گلستان باختر وغیرہ سب
کو گنا جائے تو انچاس جلدیں اور تقریباً پینتالیس ہزار
صفحات ہوتے ہیں"

یزدانی نے جلدوں کی فہرست یا تفصیل نہیں دی ہے۔ لہٰذا ان کے دعوے کو بے دلیل ہی قرار دینا پڑے گا۔ صفحات کا اندازہ البتہ ان کا تقریباً درست ہے کیونکہ صفحات کی تعداد بیالیس ہزار بیٹھتی ہے۔ گیان چند نے پہلی بار تمام جلدوں کی فہرست تیار کی اور ان کا مختصر بیان لکھا ان کے یہاں بھی جلدیں چھیالیس ہی ہیں۔ اپنی حالیہ تحریر میں بھی انھوں نے وہی چھیالیس جلدیں بتائی ہیں۔ (مضمون مطبوعہ "نیا دور"، لکھنؤ، اودھ نمبر) سینتالیس کا معاملہ یہ ہے کہ ایم۔ حبیب خاں نے اپنی کتاب "اردو کی قدیم داستانیں" میں احمد حسین قمر کی طلسم نارنج " پر مفصل گفتگو کی ہے اور کہا ہے کہ یہ "داستان امیر حمزہ کے پہلے دفتر "نوشیرواں نامہ" کی دراصل ایک کڑی ہے۔" حبیب خاں نے مزید کہا ہے کہ "طلسم نارنج" چونکہ داستان امیر حمزہ ہی کا ایک حصہ ہے، اس لئے جلدوں کی تعداد چھیالیس کے بجائے سینتالیس ہو جاتی ہے۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے، "طلسم نارنج" کا ذکر سب سے پہلے حبیب خاں نے کیا۔ اس کا مفصل تعارف تو یقیناً حبیب خاں ہی نے لکھا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اسے داستان امیر حمزہ کی سینتالیسویں جلد قرار دینا تو الگ رہا، کسی نے "طلسم نارنج" کا ذکر حبیب خاں کے بعد بھی نہیں کیا۔ نہ ہی کسی نے حبیب خاں کے اس دعوے کا محاکمہ کیا ہے کہ "طلسم نارنج" کو امیر حمزہ کے سلسلے کی ایک قرارداد دیا جانا چاہئے اور اس طرح جلدوں کی تعداد چھیالیس کے بجائے سینتالیس ٹھہرائی چاہئے۔ "طلسم نارنج" کے بارے میں خاموشی کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ بہت کم یاب ہے۔ حبیب خاں نے انجمن ترقی اردو (ہند) کی لائبریری کے نسخے سے استفادہ کیا ہے۔ ممکن ہے یہ نسخہ اوروں کی دسترس میں نہ ہو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ "طلسم نارنج" میں واقعات، کردار اور عمومی فضا بالکل ویسے ہی ہیں جیسے کہ داستان امیر حمزہ (طویل) کی کسی اور جلد میں۔ پھر یہ بھی ہے کہ داستان (طویل) اور داستان (مختصر) دونوں میں "طلسم نارنج" کے حوالے بھی ہیں۔ "طلسم نارنج" کے شروع ہی میں داستان گو ہمیں بتاتا ہے کہ عمرو بن حمزہ یونانی کی پیدائش کا بیان جیسا کہ "دفتر" میں ہے، درست نہیں۔ بلکہ وہ بیان درست ہے جو زیر نظر داستان میں مذکور ہے۔ یہاں "دفتر" سے مراد "نوشیرواں نامہ"، جلد اول (صفحہ ۴۴۹) یا داستان (مختصر) مصنفہ خلیل علی اشک، جلد دوم (صفحہ ۲۲) ہے جہاں عمرو بن حمزہ کی پیدائش کے بارے میں ایک دلچسپ اور انوکھا واقعہ مذکور ہے۔ "نارنج" کے مصنف احمد حسین قمر کو یہ فکر ہمیشہ رہتی ہے دوسرے داستان گویوں پر اپنی برتری کسی طرح ثابت کریں۔ صفحہ ۷ تا ۸ پر وہ دوسرے داستان گویوں کو ناقص بتاتے اور عمرو بن حمزہ کی پیدائش کا ایک اور بیان درج کرتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ عمرو بن حمزہ کی پیدائش کا دوسرا بیان بھی "نوشیرواں" اول میں اسی جگہ (صفحہ ۴۴۹) موجود ہے۔ قمر نے اپنی فوقیت جتانے کے جوش میں "نوشیرواں نامہ" کا مکمل حوالہ نہیں دیا۔ بہرحال، وہ بات الگ ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ "طلسم نارنج" کا مرکزی کردار عمرو بن حمزہ ہے اور اس کی پیدائش کے واقعات داستان (مختصر) اور داستان (طویل)، دونوں میں موجود

ہیں۔ عمرو بن حمزہ کے ہاتھوں "طلسم نارنج" کی فتح کا بیان بھی "نوشیرواں" (اول) میں موجود ہے۔ "طلسم ہوشربا" (چہارم) کے صفحہ ۱۲۰ پر بھی طلسم نارنج" کا حوالہ ہے۔ اور ایک بندریا کا ذکر ہے جس کا نام دم خبیثہ تھا اور جو بڑی ساحرہ تھی۔ دم خبیثہ کی تفصیلی روداد "طلسم نارنج" میں ہے۔ "ہوشربا" (پنجم اول) میں بھی نارنج جادو کا ذکر ہے۔ داستان (مختصر) مصنفہ غالب لکھنوی / عبداللہ بلگرامی میں بھی طلسم نارنج کا سرسری حوالہ ہے۔ غرض کہ اس بات میں کوئی شک ہی نہیں کہ داستان طلسم نارنج اپنی تفصیلات میں اور عام نقشے کے اعتبار سے بھی اور طرز بیان کے اعتبار سے تو بالکل سو فی صدی، داستان (طویل) کا حصہ قرار دی جاسکتی ہے۔ لیکن یہ بھی بالکل یقینی ہے کہ کسی نے اسے داستان (طویل) کا حصہ قرار نہیں دیا۔ گیان چند کی کتاب کے تازہ ایڈیشن کی کتابیات میں "طلسم نارنج" اور حبیب خاں کی کتاب "اردو کی قدیم داستانیں" دونوں درج ہیں۔ لیکن نفس کتاب میں "طلسم نارنج" پر ایک جملہ بھی نہیں۔ داستان امیر حمزہ کا جتنا تفصیلی اور محتاط محاکمہ گیان چند نے کیا ہے۔ اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ دریں صورت انھوں نے اگر "طلسم نارنج" کو نظرانداز کیا تو اس کی وجوہ ہونگی افسوس کہ انھوں نے اس بحث کو چھیڑا ہی نہیں۔

میرا خیال ہے کہ "نارنج" کو داستان (طویل) کا حصہ قرار دینا غلط ہوگا۔ یعنی داستان (طویل) کی کل جلدیں چھیالیس ہی ہیں سینتالیس نہیں۔ "نارنج" کو داستان (طویل) سے الگ رکھنے کی وجہیں حسب ذیل ہیں:۔

(۱)۔ قمر نے اپنے معمول لاف وگزاف اور اپنے معاصروں کو نیچا دکھانے کی کوششوں کے باوجود یہ دعویٰ کہیں نہیں کیا کہ "نارنج" بھی داستان (طویل) کی جلدوں میں سے ایک ہے۔ یہ داستان انھوں نے بالکل آخری زمانے میں لکھی تھی۔ اس وقت تک ان کا رنگ خوب جم چکا تھا۔ ان کے صاحب زادے اشتیاق حسین سہیل نے "نارنج" کے آخر میں جو تقریظ لکھی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قمر نے "ہومان نامہ" انھیں دنوں ختم کی تھی اور اس وقت وہ "جمشیدی" پر کام کر رہے تھے۔ "اور جوش طبع عالی اسی طور پر ہے اور فرماتے ہیں کہ اگر کوئی قدرداں بقدردانی لکھوائے تو دس بیس جلدیں مثل بوستان خیال کے لکھوں کہ کچھ رنگ طبیعت ظاہر ہو۔ ان دو تین جلدوں میں کیا جودت طبع کم ہو۔ اس طلسم کو ملاحظہ فرما کر ناظرین بہت خوش ہوں گے کہ نوشیرواں نامہ میں نہیں تحریر ہوا۔" صاف ظاہر ہے کہ داستان گو، اور ان کے بیٹے دونوں ہی کی نظر میں "نارنج" داستان (طویل) کا حصہ نہ تھی۔ اگر ہوتی تو وہ بہ بانگ دہل اعلان کرتے۔ وہ ایسے چوکنے والے لوگ نہ تھے۔ جیسا کہ ہم ابھی دیکھ چکے ہیں۔ قمر نے عمرو بن حمزہ یونانی کی پیدائش کا بیان تصدق حسین (نوشیرواں اول) کے یہاں سے بے کھٹکے اپنا مال بنا کر لے لیا اور تمام داستان گویوں (بہ شمول تصدق حسین) کو مطعون بھی کیا کہ وہ "خلاف امر" روایتیں بیان کرتے ہیں، اصل روایت تو میں بیان کر رہا ہوں۔ خود قمر نے "نارنج" کے آخر میں یہی کہا ہے کہ "طلسم حقیر نے تمام کیا۔ اب آگے داستان صاحب قران کا ذکر ہے... اگر ناظرین وسامعین اس طلسم کو ہاتھوں ہاتھ خریدیں گے تو آئندہ اس کو بھی تحریر کروں گا۔" یعنی انھوں نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں نے داستان (طویل) کی ایک جلد لکھی ہے۔ داستان (طویل) کی جلدیں تو وہ نولکشور کیلئے لکھ ہی رہے تھے یہاں انکو غالباً یہ امید تھی کہ اگر "ناظرین وسامعین" اصرار کریں گے۔ تو انھیں نوشیرواں جیسی داستان الگ سے لکھنے کا موقع مل جائے گا معلوم نہیں "نارنج" کے ساتھ "ناظرین وسامعین" نے کیا سلوک کیا؟ یہ داستان شاید مقبول نہ ہوئی۔ کیوں کہ یہ کم وبیش گم نام رہی ہے۔ بہرحال قمر کی بھی عمر نے وفا نہ کی، اور "نارنج" کی اشاعت کے تھوڑے ہی عرصے بعد وہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔

(۲)۔ خود پبلشر کی کسی فہرست یا اشتہار میں "طلسم نارنج" کا ذکر داستان (طویل) کے حصے کے طور پر نہیں ہے۔ شروع داستان کی جلدیں جو میرے پاس ہیں، ان میں "نارنج" کا اشتہار کیا، اور داستان (طویل) کے حصے کے طور پر اس کا ذکر کیا، فہرست تک میں اس کا نام نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پبلشر اس داستان اور داستان (طویل) کے درمیان واضح امتیاز رکھنا چاہتا ہے۔ اشتہار اور فہرست سے نام غائب رہنا بھی "نارنج" کی گمنامی کا ایک سبب یقیناً رہا ہوگا۔

(۳)۔ داستان (طویل) کی جلدیں اوسطاً نو سو صفحے یا کچھ زیادہ کی ہیں۔ (بوستان خیال" کی جلدیں اوسطاً" بڑی تقطیع کے سات سو صفحات یا کچھ ہیں۔ یہ اوسط دہلوی اور لکھنوی دونوں "بوستان" کا ہے۔) اس سے معلوم ہوا کہ طوالت اور ضخامت بھی داستان کی شرط ہے۔ "نارنج" کی ضخامت ۲۰۸ صفحات ہے، یعنی یہ اتنی چھوٹی ہے کہ اس جیسی چار داستانیں بآسانی داستان (طویل) کی کسی جلد میں سما سکتی ہیں۔

مندرجہ بالا محاکمے سے یہ بات کم و بیش ثابت ہو جاتی ہے کہ "نارنج" کو داستان (طویل) کی سینتالیسویں جلد قرار دینے کی کوئی معقول وجہ نہیں، اور جلدوں کی صحیح تعداد چھیالیس ہی ہے۔

جیسا کہ اوپر بیان ہوا، داستان (طویل) کی چھیالیس جلدیں آٹھ دفتروں میں منقسم ہیں۔ یہ دفتر کس نے بنائے اور دفتروں کی تعداد کس نے متعین کی۔ ان سوالوں کے جواب فی الوقت ممکن نہیں۔ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ دفتروں کی یہ تقسیم اتنی قدیم نہیں جتنی نولکشوری بیانات، یا داستان گویوں کے مفروضات سے مترشح ہوتا ہے۔ "رموز حمزہ" میں دفتروں کا پتہ نہیں۔

راز یزدانی نے لکھا ہے (نگار لکھنؤ بابت ستمبر ۱۹۵۹ء) کہ انھوں نے "رموز حمزہ" مطبوعہ تہران ۱۲۷۵-۱۲۷۸ھ دیکھی ہے۔ (برٹش لائبریری میں جو نسخہ ہے اس کی تاریخ طباعت ۱۲۷۴-۱۲۷۶ھ ہے۔ ممکن ہے راز یزدانی نے دوسرا ایڈیشن دیکھا ہو)۔ اس مضمون میں انھوں نے دفتروں کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ کتابوں کا ذکر کیا ہے جن میں "رموز حمزہ" منقسم ہے۔ وہ لکھتے ہیں: اس "رموز حمزہ" کو سات جلدوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر جلد کو "کتاب" کہا گیا ہے۔ لیکن "آج کل" دہلی بابت جولائی ۱۹۶۰ء والے مضمون میں وہ کہتے ہیں کہ اس میں "صرف تین دفتروں کا نام ملتا ہے۔ نوشیرواں نامہ۔ ایرج نامہ اور صندلی نامہ" اصل کتاب دیکھے بغیر میں نہیں یقین کر سکتا کہ اس میں دفتر ہوں (جب کہ راز صاحب خود بھی "کتابوں" کا ہی ذکر کر رہے ہیں)۔ "رموز حمزہ" مطبوعہ بمبئی ۱۹۰۹ء میرے سامنے ہے۔ نہ اس میں اور نہ "قصۂ حمزہ" مرتبہ جعفر شعار (تہران ۱۳۴۸ / ۱۹۶۹ء) میں دفتر ہیں۔ موخر الذکر بھی میرے سامنے ہے۔ "زبدۃ الرموز" میں بھی دفتر نہیں ہیں۔ لیکن اس کا امکان ہے کہ اٹھارویں صدی آتے آتے داستان اتنی پھیل گئی ہو کہ اس کے کئی حصے یا دفتر ہو گئے ہوں جیسا کہ فرنیس پرچیٹ نے لکھا ہے کہ غالب نے ۱۸۶۱-۱۸۶۲ کے زمانے میں میرن صاحب کو جب یہ لکھا کہ "مولانا غالب علیہ الرحمۃ ان دنوں میں بہت خوش ہیں۔ پچاس ساٹھ جزو کی کتاب امیر حمزہ کی داستان کی... آگئی ہے..." تو ممکن ہے کہ وہ "کتاب رموز حمزہ" مطبوعہ تہران ۱۸۵۷-۱۸۵۹ کا ذکر کر رہے ہوں، کیوں کہ اردو یا فارسی میں اس وقت کسی اور داستان امیر حمزہ کا پتہ نہیں چلتا جو اس حجم کی ہو۔ راز یزدانی نے اپنی دیکھی ہوئی "رموز حمزہ" کا جو حجم بتایا ہے وہ غالب کے بیان کردہ حجم سے مطابقت رکھتا ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ داستان (مختصر) مصنفہ خلیل علی اشک (۱۸۰۱) اور داستان (مختصر) مصنفہ غالب لکھنوی (۱۸۵۵) دونوں میں داستان کی چودہ جلدوں کا ذکر ہے۔ اگرچہ یہ دونوں کتابیں خود بالترتیب ۴۳۳ اور ۴۹۲ صفحات پر مشتمل ہیں لیکن دونوں میں تاثر اس بات کا پایا جاتا ہے کہ اصل داستان بہت طویل ہے۔

داستان کے آٹھ دفتروں کے سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان کی ترتیب وہی ہے جو خود قصے کی ترتیب ہے۔ یعنی

داستان کا آغاز "نوشیرواں" اول میں ہوتا ہے، بعد کے دفاتر جس ترتیب سے رکھے گئے ہیں، اسی ترتیب سے واقعات پیش آتے ہیں اور "لعل نامہ" دوم میں امیر حمزہ اور عمرو کی موت پر داستان تمام ہوجاتی ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ داستان کی بہت سی جلدیں، یا بہت سے اجزا کو پبلشر (نولکشور) نے دفتروں کا حصہ نہیں قرار دیا ہے۔ چنانچہ "ہفت پیکر"، "نور افشاں"، "سکندری" وغیرہ کسی دفتر کا حصہ نہیں قرار دیا گیا۔ "آفتاب شجاعت" کو ہمیشہ "دفتر آفتاب شجاعت" کہا گیا۔ (یعنی عملاً آٹھ کے بعد نواں دفتر جاری کیا گیا۔) "گلستاں باختر" کو "آفتاب" کے سلسلے کی داستان (لہذا "دفتر" آفتاب شجاعت" کا حصہ) بیان کیا گیا۔ تیسری اہم بات یہ ہے کہ دفتروں کی داستانیں، اور ان کی جلدوں کی تعداد، دونوں باتیں دفتروں کی تحریر کے پہلے کم و بیش متعین ہوچکی تھیں اس تیسری بات سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا داستان گو/پبلشر کو پورا اندازہ تھا کہ تحریری شکل میں کون داستان کتنے صفحے لے گی اور کون سے دفتر میں کتنی جلدیں ہوں گی؟ ظاہر ہے کہ بات بالکل قرین قیاس نہیں۔ لہذا قوی امکان اس بات کا ہے کہ پبلشر اور داستان گو مل کر طے کر لیتے ہوں گے کہ کس دفتر میں کتنی اور کون سی جلدیں ہوں، اور اگر کوئی نئی داستان (یا پرانی داستان کی توسیع) ہو تو اسے کس دفتر میں رکھا جائے۔ لہذا یہ بات بھی پوری طرح ممکن، بلکہ اغلب معلوم ہوتی ہے، کہ پوری داستان (یا کم سے کم وہ حصے/جلدیں جو آٹھ دفتروں تک محدود تھیں) زبانی شکل میں کم و بیش مستقل صورت اختیار کر چکی تھی معرض تحریر میں آنے کے بعد صحیح پتہ لگتا تھا کہ کوئی داستان کتنی جلدوں میں سمائی ہے۔ لیکن دفتروں کے بارے میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ اور یہ ممکن ہے کہ فارسی میں بھی (ہندوستان کی حد تک) یہ اپنی اصل سے بہت زیادہ پھیل چکی ہو۔ "بہار عجم" اور "چراغ ہدایت" میں بعض داستان الفاظ کا اندراج اس خیال کو مستحکم کرتا ہے۔

اس موضوع پر گفتگو آئندہ ہوگی۔ فی الحال آٹھ دفتروں پر کچھ مزید ذکر کرتے ہیں "نوشیرواں" اول (جون ۱۸۹۳) کے سرورق پر نمایاں الفاظ میں حسب ذیل اعلان ہمیں ملتا ہے: ... "اس کے آٹھ دفتر ہیں اور بعض دفتر کی کئی جلدیں حسب تفصیل ذیل" اس کے بعد چوکھٹے میں جلدوں اور دفتروں کے نام یوں درج ہیں :-

تعداد دفتر	نام داستان	تعداد جلد	تعداد دفتر	نام داستان	تعداد جلد
اول	نوشیرواں نامہ	۲جلد	پنجم	طلسم ہوشربا	۷جلد
دوم	کوچک باختر	۱جلد	ششم	صندلی نامہ	۱جلد
سوم	بالا باختر	۱جلد	ہفتم	تورج نامہ	۲جلد
چہارم	ایرج نامہ	۲جلد	ہشتم	لال (کذا) نامہ	۱جلد

"ہوشربا" (پنجم اول) کے ایک نسخے کی داشت میرے پاس ہے۔ یادداشت کے مطابق اس کے صفحہ ۷۶۰ پر ایک اشتہار ہے جو ۱۸۹۱ء کی اشاعت (یعنی اول اشاعت) میں مندرج اعلان کی من وعن نقل ہے۔ جون ۱۸۹۳ کی منقولہ بالا فہرست بھی بالکل وہی ہے جو ۱۸۹۱ کے اشتہار میں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ۱۸۹۱۔۱۸۹۳ میں یہ بات طے نہ تھی کہ "لعل" کی دو جلدیں ہوں گی۔ نہ ہی "ہومان" اور "ہرمز" کی اشاعت کی کوئی تجویز نظر آتی ہے، اور نہ بقیۂ طلسم ہوشربا کی دو جلدوں کی۔ ہاں "ہرمز" کی اشاعت اول (۱۹۰۰) میں "لال (کذا) نامہ" کی دو جلدیں بتائی گئی ہیں۔ اشتہار میں "ہرمز نامہ متعلقہ نوشیرواں نامہ" اور "ہومان نامہ متعلقہ نوشیرواں نامہ" کا اعلان ہے۔ "آفتاب" کا اشتہار "جمشیدی" دوم اور سوم (۱۹۰۲) "سلیمانی" دوم (۱۹۰۵) میں بھی نہیں، اور جب ہے تو الگ "دفتر" کی حیثیت سے ہے۔

اس بحث کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پبلشر (اور شاید داستان گو بھی) دفتروں کی تعداد میں اضافہ نہ کرنا چاہتے تھے۔ اور نئی داستانوں کی تصنیف یا تحریر اور پھر اشاعت کے مشتاق بھی تھے۔ "ہومان" اور "ہرمز" کو تو انھوں نے دفتر میں شامل کر لیا کہ ان کا تعلق براہ راست "نوشیرواں" سے تھا، اور شاید یہ داستانیں پہلے سے موجود بھی تھیں اور "بقیۂ ہوشربا" کو دفتر میں ڈالنا کچھ مشکل نہ تھا۔ لیکن بقیہ داستانوں کے بارے میں ان کا رویہ گومگو کا رہا۔

یہاں ہمارے لئے مشکل آپڑتی ہے کہ ہم داستان (طویل) کو ایک داستان کہیں، یا دو کہیں، اگر ایک کہیں تو دفتر کے باہر والی داستانوں کو کہاں رکھیں؟ اور اگر دو کہیں تو اس کے لئے جواز کیا ہو، جب کہ داستان گویوں اور پبلشر، کسی نے بھی کبھی نہیں کہا کہ دو داستانیں معرض وجود میں آرہی ہیں۔ گیان چند نے اس معاملے کو یوں حل کیا ہے کہ گیارہ گیارہ دفتروں اور انتیس انتیس جلدوں کے دو سلسلے قائم کئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جلدیں چونکہ صرف چھیالیس ہیں اس لئے دونوں سلسلوں میں کئی جلدیں مشترک ہیں۔ گیان چند کہتے ہیں کہ اس ترکیب کو اختیار کرنے کے باعث "کڑی سے کڑی ملتی چلی گئی ہے اور جنہیں ایک مربوط داستان قرار دیا جاسکتا ہے۔" گیان چند کی یہ ترکیب ہے تو دلچسپ، لیکن اس میں کئی قباحتیں ہیں۔

پہلی بات تو یہ کہ جلدوں کی تکرار کے باعث Symmetry غائب ہوگئی ہے اور مطالعہ مشکل ہوگیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ دفتروں کی تعداد آٹھ سے گیارہ ہوگئی ہے۔ تیسری بات یہ کہ ایک کی جگہ دو سلسلے ہوگئے ہیں۔ پھر بھی جلدوں کی تعداد چھیالیس نہ رہ سکی، اٹھاون ہوگئی، میرا خیال ہے کہ آٹھ دفتروں کی ترتیب کو قائم رکھتے ہوئے ایک ہی سلسلہ وضع کیا جاسکتا ہے۔ اور ربط بھی پہلے سے زیادہ پیدا ہوسکتا ہے۔ ملحوظ رہے کہ مکمل ربط اور کامل طور پر ہر واقعے کی منطقی اور زمانی ترکیب داستان کے لئے نہ ضروری ہے نہ ممکن، ضروری صرف یہ ہے کہ ربط بیش از بیش ہو اور اہم واقعات و اشخاص کے بارے میں معلوم ہوسکے کہ وہ کس وقت کہاں ہوں گے گیان چند کی ترتیب کے نتیجے میں داستان کا ربط زائل ہوجاتا ہے کیوں کہ انھوں نے سلسلۂ اول میں "لعل"، پھر "آفتاب" اور پھر "گلستان" کو رکھا ہے۔ حالانکہ "لعل" میں حمزۂ اول، حمزۂ ثانی اور عمرو، سب کی موت ہوجاتی ہے۔ یہ داستان بہرحال "داستان امیر حمزہ" ہے، داستان حمزہ ثالث و رابع نہیں، اور نہ ہی امیر حمزہ و حمزۂ ثانی و ثالث و رابع ہے۔ اس داستان کا اختتام بہرحال امیر حمزہ اول کی موت پر ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ داستان گو ان کی موت کا بیان نہ کرے، اور ان کی زندگی کے واقعات کو طویل سے طویل تر کرتا جائے۔ لیکن اگر وہ امیر حمزۂ اول کی موت کا بیان کرتا ہے تو داستان وہیں ختم بھی کرتا ہے۔ داستان (مختصر) کی دونوں روایتیں (اشک اور غالب لکھنوی / عبداللہ بلگرامی) امیر حمزۂ اول کی موت پر ہی ختم ہوتی ہیں۔

بنیادی بات جو ذہن میں رکھنے کی ہے وہ حمزۂ ثانی کا ظہور ہے (صندلی نامہ) اس کا مطلب یہ ہے کہ صاحب قران (امیر حمزہ) مر سکتے ہیں، لیکن صاحب قرانی باقی رہتی ہے۔ یعنی صاحب قرآن تو اور بھی ہوں گے (اگر خدا چاہے) لیکن صاحب قرآن وقت کو موت بھی ہے۔ اور عزل بھی۔ یعنی وہ اپنی زندگی ہی میں صاحب قرانی کسی اور کو منتقل کرسکتا ہے۔ لہٰذا صندلی نامہ کو داستان (طویل) کا خط انقسام کہنا چاہئے۔ صندلی کے بعد کی جلدیں حمزۂ اول، حمزۂ ثانی، صاحب قران ثالث (بدیع الملک) اور صاحب قران رابع (عادل کیواں شکوہ) کے کارناموں کے اعتبار سے مرتب ہوں گی۔

داستان (مختصر، اشک) اردو میں داستان امیر حمزہ کی قدیم ترین تحریری شکل ہے۔ اس کی جلد دوم صفحہ ۱۹۱ اور "رموز حمزہ"، صفحہ ۹۷ پر لکھا ہے کہ قضا و قدر نے امیر حمزہ کی عمر ایک سو بچانوے برس دو پہر لکھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ امیر حمزہ کی مدت حیات میں بہت کارناموں اور واقعات کی گنجائش ہے۔ اور ایسا نہیں ہے کہ داستان (طویل) کے داستان گویوں کو وقت کا احساس نہ تھا۔ ایک جگہ ایک پہلوان کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کی عمر ایک سو بیس برس ہے اور یہ نوشیرواں نامے کے وقت سے جنگوں میں شریک رہا ہے۔ طلسم ہوشربا میں کتنی مدت گذرتی ہے۔ طلسم ہفت پیکر میں کتنا عرصہ لگتا ہے، ان سب باتوں کا ذکر داستان (طویل) میں ہے۔ تفصیل اپنے وقت پر بیان ہوگی۔

□□

شاعری وہ جادو یا اعجاز ہے جس کا کرشمہ یہ ہے کہ انسان کے خیالات و احساسات اس کے جذبات دل کے سانچے میں ڈھل کر زبان سے نکلتے ہیں اور ایک عالم تصویر پیدا کر دیتے ہیں۔

برج نرائن چکبست

نیر مسعود
"ادبستان" دین دیال روڈ
لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

اودھ میں فنِ سپہ گری

انگریز سیاح ولیم نائٹن نے نصیر الدین حیدر کے عہد کا لکھنؤ دیکھا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

"ڈریسڈن، ماسکو، قاہرہ، جس سے چاہیے لکھنؤ کو مشابہ قرار دیجئے، مگر میرے نزدیک لکھنؤ کی ایسی عجائب روزگار چیزیں ان مقامات میں سے کہیں نظر نہ آئیں گی۔

اوّلاً لکھنؤ کے ایسے ہتھیار بند آدمی ان شہروں میں کہیں نہ دکھائی دیں گے۔ ماسکو کے باشندے صرف چھری باندھتے ہیں اور قاہرہ کے لوگوں کے ہاتھ میں کچھ ہتھیار کبھی کبھی دکھائی دیتے ہیں، برخلاف اس کے لکھنؤ کے باشندے بالعموم اوپچی بنے نظر آئیں گے، ان کے پاس ڈھال، تلوار اور بندوق یا پستول ضرور ہوگی۔ حتیٰ کہ وہ لوگ جو کاروبار روزمرّہ کرتے ہیں وہ بھی تلوار تو ضرور باندھتے ہیں، اور کوچہ گرد حضرات جب سیر گشت کو نکلتے ہیں تو چاہے کیسی ہی ذلیل پوشاک کیوں نہ پہنے ہوں مگر طپنچے کی جوڑی اور ڈھال ضرور لگائے ہوں گے۔ بھینسے کی کھال سے منڈھی ہوئی ڈھال جس پر پیتل کے پھول لگے ہوتے ہیں اکثر بائیں جانب کاندھے پر پڑی ہوتی ہے۔ بڑی بڑی مونچھوں والے مہیب صورت راجپوت اور پٹھان اور سیاہ داڑھی والے مسلمان ڈھال تلوار سے لیس تنتے بَرتے نظر آتے ہیں اور اہل لکھنؤ کے پندار خودی و خود پسندی اور جوشِ نبرد آزمائی کو بخوبی ظاہر کرتے ہیں۔

یہ امر کہ کیوں اہلِ لکھنؤ بالعموم سپاہیانہ وضع رکھتے ہیں، تعجب خیز نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ کمپنی کے فوجی صیغے میں اودھ کے ہی پرورش یافتہ بہ کثرت ہوتے ہیں اور احاطہ بنگالہ کی فوج تمام تر یہیں کے باشندوں سے مملو ہے۔

باشندگانِ لکھنؤ میں اسلحہ کا مذاق بچپنے ہی سے پیدا کر دیا جاتا ہے۔ تیر اور برچھے یہاں کے لڑکوں کے معمولی کھلونے ہیں اور جس طرح پر کہ انگریز دائیاں بالعموم بچّوں کے ہاتھوں میں جھنجھنے دیتی ہیں، اسی طرح یہاں چھوٹے چھوٹے طپنچے اور کاٹھ کی تلواریں کھیلنے کو پکڑا دی جاتی ہیں"۔[1]

اودھ کی جس پُرتکلّف، نرم و نازک تہذیبی فضا کا نقش ہمارے ذہنوں میں راسخ ہے، نائٹن کی پیش کی ہوئی فضا اس سے بہت مختلف نظر آتی ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ فنِ سپہ گری سے دلچسپی اور واقفیت اودھ کی تہذیب کا ایک اہم عنصر تھی اور یہاں کے بیشتر شہری اس فن میں دخل ضرور رکھتے تھے خواہ وہ اہلِ قلم ہوں یا اہلِ علم ہوں یا اہلِ حرفہ۔ اسی لیے یہاں کے ادب، خصوصاً داستان اور مرثیے میں، رزمیہ عناصر کو بڑی اہمیت اور مقبولیت حاصل تھی۔ اس پورانے دور کے کئی ادبی مشاہیر فنِ سپہ گری سے خاص ربط رکھتے تھے۔ مرزا رجب علی بیگ سرور اپنے بارے میں بتاتے ہیں:

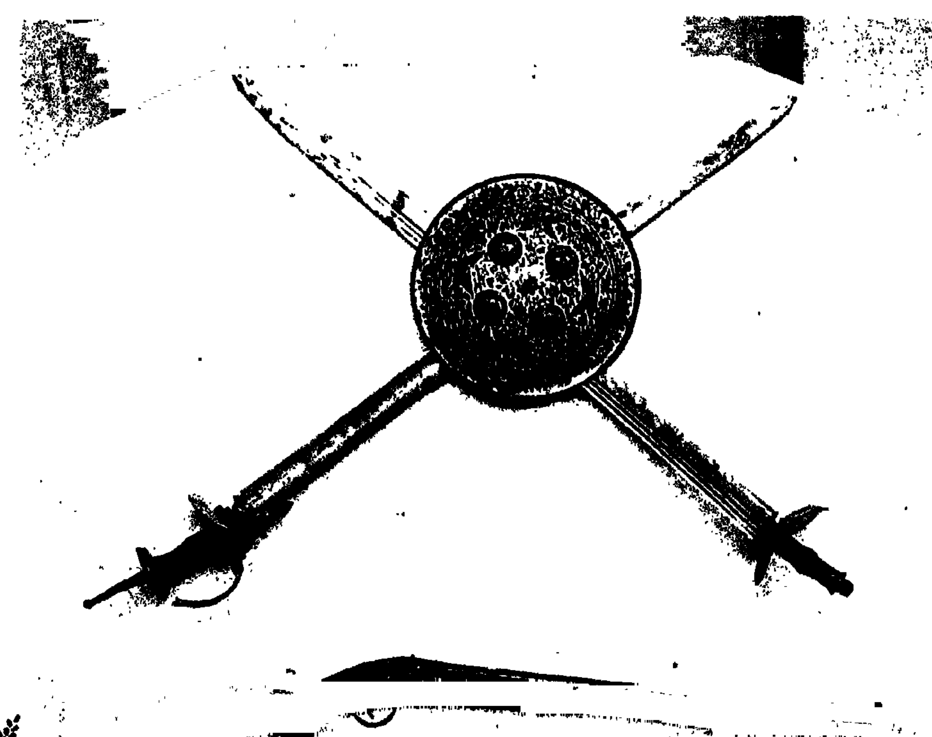
"ہم بھی کبھی ڈھال تلوار باندھتے تھے اور وہ کام کرتے تھے جس میں صد ہا مرتے تھے، ہاتھ منہ کٹتے تھے"۔[2]

غالباً اسی شوق کا شاخسانہ تھا کہ سرور قتل کے الزام میں ماخوذ ہوگئے

تھے اور ان کو لکھنؤ سے جلاوطن ہونا پڑا تھا۔[۳]

خواجہ آتش کی سپاہی مزاجی اور بانکی طبیعت مشہور تھی۔ ایک بار وہ ایک مشاعرے میں بھری ہوئی قرابین لے کر گئے تھے اس لیے کہ انھیں اطلاع ملی تھی کہ اس مشاعرے کے بانی نواب صاحب اس موقع پر ان کے ادبی حریف ناسخ کو خلعت دیں گے اور اس طرح آتش کی سبکی ہوگی۔ آتش کے تیور دیکھ کر نواب صاحب کو اسی وقت ان کے لیے بھی خلعت کا انتظام کرنا پڑا۔[۴] ایک اور موقع پر انھوں نے تلوار کھینچ کر فقیر محمد خاں گویا کے سے زبردست سپہ گر کو مقابلے کے لئے للکار دیا تھا۔[۵]

خود گویا اودھ کے نامور ترین سپہ گروں میں تھے۔ نصیر الدین حیدر کی بادشاہی اور منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں کی وزارت کے زمانے میں فوجی افسروں کو ہتھیار باندھ کر دربار میں آنے کی ممانعت ہوئی تو گویا نے کہا:



"میں اہلِ جنگ کے زُمرے میں ملازم ہوں، اگر ہتھیار کھول دوں گا تو کیا طبلہ اور سارنگی لے کر دربار میں حاضر ہوا کروں گا؟" اور دربار میں جانے سے انکار کر دیا۔ آخر ان کو اس حکم سے مستثنیٰ کیا گیا[۵۶]

میر انیس فنِ سپہ گری میں عملی مہارت رکھتے تھے۔ شہسواری اور سیف زنی کے علاوہ وہ بنوٹ کے بھی ماہر تھے۔ اس فن میں ان کے استاد میر امیر علی کا کہنا تھا کہ "اگر میر انیس کے ہاتھ میں ایک گز لٹھے کے رومال میں محمد شاہی یا بھوپال کے چار پیسے والا پیسا بندھا ہوتا تو وہ دس لکڑی پھینکنے والوں سے بھی چوٹ نہ کھا سکتے تھے اور ان کی چوٹ کو بنوٹ جاننے والوں کے سوا کوئی روک نہ سکتا تھا۔"[۵۷]

سید مسیح حسن نقوی نے مراثیِ انیس کے رزمیہ حصّوں کا مطالعہ کرکے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ انیس تمام رائج الوقت ہتھیاروں اور ان کے استعمال سے واقف تھے[۵۸] اس زمانے کے پسندیدہ ترین ہتھیار تلوار کی تعریف انیس اور دوسرے مرثیہ نگاروں کے یہاں اس طرح ملتی ہے جیسے غزل میں معشوق کی تعریف کی جاتی ہے۔ ایک مجلس میں انیس نے خواجہ آتش کو خاص طور پر متوجہ کرکے جب تلوار کی تعریف میں یہ بیت پڑھی ؎

اشراف کا بناؤ، رئیسوں کی شان ہے
شاہوں کی آبرو ہے سپاہی کی جان ہے

تو آتش وجد میں آکر نصف قد سے کھڑے ہو گئے۔[۵۹]

علمائے دین بھی سپہ گری کے ذوق سے بے بہرہ نہیں تھے اور ان میں سے کئی اس فن میں استادی کا درجہ رکھتے تھے۔ لیکن ظاہر ہے وہ اس کی برسرِ عام نمائش نہیں کرتے تھے۔

بعض خواتین نے بھی سپہ گری میں مہارت بہم پہونچائی تھی۔ لکھنؤ کی ایک بیگم کا قصہ مشہور ہے کہ رات کو ان کے گھر میں چور اتر آئے تھے انھوں نے مزاحمت کی تو چوروں نے ان پر تلوار سے حملہ کر دیا۔ بیگم نے لوٹے پر وار کو روک کر ایسی ضربیں لگائیں کہ ایک ایک چور بے ہوش ہو گیا۔

لیکن سپہ گری میں افسانوی شہرت حاصل کرنے والا طبقہ بانکوں کا تھا جن کی وضعداریوں اور دبدبے کے بہت واقعات مشہور ہیں۔ بانکوں کا اس سماج میں بہت لحاظ کیا جاتا تھا اور بڑے بڑے صاحبانِ اقتدار بھی ان کو طرح دے جاتے تھے۔ بانکوں کی یہ ساکھ ان کی سپہ گری پر قائم تھی۔

اودھ میں جس طرح ہر فن میں باریکیاں پیدا کی گئیں اسی طرح فنِ سپہ گری میں بھی طرح طرح کے کمالات دکھائے گئے۔ میرے لڑکپن تک ایسے بزرگ موجود تھے جو ان کمالات کے چشم دید گواہ تھے۔ کمان سے ایک تیر چلانا اور دوسرے تیر سے اُسے ہوا ہی میں اُڑا دینا، چارپائی کے نیچے جنگلی کبوتر کو چھوڑ کر چارپائی کے ہر طرف اس تیزی سے لاٹھی چلانا کہ کبوتر کسی بھی طرف سے باہر نہ نکل سکے۔ لکڑی کے تختے پر پان کا پتّا رکھ کر اس پر تلوار کا ایسا سدھا ہوا ہاتھ لگانا کہ پتّا کٹ جائے لیکن تلوار تختے سے چھونے نہ پائے، تلوار سے دوسرے کی آنکھ میں بحفاظت سُرمہ لگا دینا، لیموں پر خط دے کر اُسے اوپر اُچھالنا اور ٹھیک خط کے مقام پر سے دو ٹکڑے کر دینا، کسیرو کو ہوا میں اُچھالنا اور اسے زمین پر گرنے سے پہلے پہلے چھیل دینا وغیرہ اودھ کی بادشاہی ختم ہونے کے بعد تک کے عام تماشے تھے۔

سپہ گری کے آخری کامل اُستاد مُبارک حسین (وفات جنوری ۱۹۹۰ء) نے اپنی کتاب "فنِ سپہ گری" میں اس فن کے مختلف شعبوں کا ذکر کیا ہے، مثلاً تیر اندازی، نیزہ بازی، تبر کی لڑائی، شمشیر زنی، بانک (خنجر کی لڑائی)، لاٹھی، بانا، بنیٹھی، تیغہ، رومال کی لڑائی، ٹھگوں کی گُتھریاں، کُشتی، پٹا، گُرز کی جنگ، گکری یا پھالی، شیر پنجہ۔ استاد نے ان شعبوں کے داؤں پیچ بھی لکھے ہیں۔[۶۰]

اسلحہ سازی میں بھی اودھ کو امتیاز حاصل تھا۔ قدیم زمانے میں یہاں کے بنے ہوئے تیر ہندستان بھر میں مشہور تھے[۶۱] ۱۸۸۵ء میں اودھ کی صنعت و حرفت کی نمائش کے لیۓ اشیا کی طلب میں ایک اپیل شائع کی گئی تھی، اس میں بتایا گیا ہے:

"اودھ مدتوں سے ڈھالوں اور بھالوں اور برچھوں اور توڑے دار بندوقوں کے واسطے مشہور ہے.... اب بھی بہت سے عمدہ نمونے اودھ اور ممالکِ مغربی و شمالی میں ہیں۔"[۶۲]

مطلوبہ اسلحہ کے ذیل میں لکھا ہے:

"کل اسلحہ اور زرہ جو کہ نہایت مشہور زرہ سازوں کے بنائے ہوئے ہوں یا جو کہ بڑے نامی جنگ جو اور نبرد آزما بہادروں اور تواریخی معزز اشخاص کے ہوں، زیادہ مطلوب ہیں۔ نیز ایسی زرہ بختر (بکتر) اور چار آئینے وغیرہ جن پر طلسماتی اور سحری تحریر کندہ ہو.... ایک کامل مجموعہ کل ایسے آلات کا جو کہ مختلف اودھ کے مشہور اسلحہ سازوں کے بنائے ہوئے ہوں، نہایت پسندیدہ اور دلچسپ ہوں گے۔" ۱۳ے

اس اپیل میں مطلوبہ ہتھیاروں اور سپہ گری کے دوسرے لوازم کی فہرست بھی دی گئی ہے اور اس سے پہلے یہ صراحت کردی گئی ہے:

"ہم اس موقع پر بطور اختصار صرف چند اسلحہ کے نام لکھنے پر قناعت کرتے ہیں۔ ایک پوری فہرست لکھنے میں بہت وسعت چاہیے۔" ۱۴ے

یہ فہرست (چند اضافوں کے ساتھ) درج ذیل ہے:

"کمان۔ تیر۔ تبر۔ ترکش۔ ترسول۔ گرز۔ چکر۔ پیش قبض۔ بچھوا۔ چھری۔ سروہی۔ جمدھر۔ خنجر۔ قرولی۔ چاقو۔ نیمچہ۔ بھجالی کھکری (نیپالی بھجالی)۔ کلہاڑی۔ بانکا۔ پھرسا۔ تیغہ۔ دوہتھی تیغہ۔ کھانڈا بلم۔ برچھا۔ بھالا۔ نیزہ۔ برچھی۔ شمشیر۔ کٹار۔ کٹاری گپتی۔ کورا۔ پیشہ۔ سوسن پتا۔ تلوار۔ بندوق توڑے دار بندوق جوہردار۔ بندوق پتھردار۔ طپنچہ۔ شیرپنجہ۔ قرابین۔ سنگین۔ کربستہ۔ رنجک دانی۔ بارود کے سینگڑے۔ زنبورک۔ بگھنک (شیرپنجہ)۔ کمند۔ بانا۔ پٹا۔ بنیٹھی۔ لاٹھی۔ پھری۔ گدکا (گتکا)۔ غلیل۔ چکک پتھری۔ ڈھال۔ ناگ پھنی ڈھال۔ ماڑو۔ ٹوپ۔ خود۔ دستانہ۔ زرہ۔ بکتر۔ چار آئینہ۔ جوشن۔ پیٹی۔ جھلم۔ چلتہ۔ تحت الحنک۔ لیزم۔ مگدر۔ کھڑگ۔ رام داؤں۔ تیغ جلاد۔ "چھوٹے چھوٹے اوزار جو قوم مرہٹہ کی عورتیں اور لڑکے استعمال کرتے تھے" رہال۔ توپ۔ شترنال۔ (ہاتھی گھوڑے اونٹ کو بھی سامان سپہ گری میں شمار کیا جاتا تھا)۔

ان اسلحہ وغیرہ کی مختلف قسمیں، وضعیں اور الگ الگ حصے ہوتے تھے، اور ان سب کے الگ الگ نام تھے، ان کی تفصیل کاغذات میں درج کی جاتی تھی اور دفتری اصطلاح میں "چہرہ" کہلاتی تھی۔ کچھ اشیاء کے چہرے دیکھیے:

تلوار کا چہرہ

(۱) "تیغہ انگریزی، طرح المانی، ہر دو جانب نقاشی آب طلا، قبضہ مع دو قرص طلا مرصع یاقوت، زمرد و الماس، بر نیمچی نقرہ ملمع طلا، تہنال و دو حلقہ میناکاری، سلک آہنی کوفت طلا، دستکی قور نقرہ۔" ۱۵ے

(۲) "تیغہ ولایتی، طرح جنوبی، دونوں طرف اوپر بیچ کے خط ہندسی اور ناد علیؑ اور آیۃ الکرسی تمام سونے سے طغریٰ میں لکھی ہے، اور قبضہ ولایتی، سادہ یا پولادی یا ملمع کار یا کوفت میناکاری کا۔ یا تہنال فولادی ملمع سونے کا۔" ۱۶ے

کمان کا چہرہ

"کمان لاہوری، سبزرنگ، دوٹانک، بند سرخ، شنگرفی لاہوری، چلہ ریشم سرخ و سفید، بالا پیچ طلال و دور گوشہ خم دار، قبضہ گرد خوش آیند یکساں۔" ۱۷ے

(ایک ٹانک: ساڑھے تین سیر۔ دوٹانک کی کمان کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس کے چلے میں سات سیر کا وزن لٹکا دیا جائے تو کمان کے دونوں سرے آپس میں مل جائیں گے ۱۸ے)

بندوق کا چہرہ

"نال آہنی یا برنجی، مدور یا ہشت پہل، رومی یا لاہوری یا داغستانی یا رام پوری یا ولایتی یا انگریزی، توڑے دار، گل ہاتھی دانت یا شاخ آہنی یا نقرہ یا برنجی، یا مسی، سات بند یا دس یا گیارہ بند، برنجی یا نقرئی یا کسواری، دو کڑی برنجی یا آہنی ملمع کی یا کوفت کی یا فولادی یا نقرہ، تسمہ چرمی مع غلاف بانات یا مخمل یا اطلس کے، یا بندوق چقماقی، ولایتی یا رومی یا انگریزی کا یا عمّی، گندے میں ایک ڈبیا گندھی ہوئی۔" ۱۹ے

بکتر کا چہرہ

"بکتر زرہ آہنی، گریبان مخمل سرخ مع تسمۂ چرمی، دامن از عقب چاک، وزن دس سیر۔"[20]

خنجر کا چہرہ

"تیغۂ فولادی، دستہ سنگ یشم، مرصع کاری طلا، دانۂ یاقوت چوں دانہ ہائے زمرد کوچک سفید، دانہ ہائے یاقوت پیوستہ خانہ و دو خانہ خالی و یک پیوستہ طلا۔"[21]

گھوڑے کا چہرہ

"اسپ سرنگ دور کابہ و چار سال، سیاہ چشم، شاہ گام، داغ سنگ ریزہ بر کلا جانب راست و داغ سفید مقدار برگ پان بر پیشانی و مقدار دو انگشت متصل سم پائے راست پیشین و داغ سین بر کفل جانب چپ۔"[22]

سید اسرار حسین خاں نے اپنی کتاب "قدیم ہنر و ہنرمندان اودھ" میں اودھ کے مندرجۂ ذیل مشہور سپہ گروں کا ذکر کیا ہے:

۱۔ مرزا محمد امیر خیرآبادی (بانک) ۲۔ مرزا ذوالفقار بیگ (لکڑی، بنوٹ) ۳۔ بھوانی سنگھ چھتری (لکڑی) ۴۔ محمد خاں (بانا، پٹا) ۵۔ بادل خاں (بانا، پٹا) ۶۔ سردار سنگھ چندیر (بانا، پٹا) ۷۔ شیخ محمد مہدی (بانک) ۸۔ میر لنگرباز (رستم خانی) ۹۔ میر نجم الدین (لکڑی) ۱۰۔ میر علی (پھکیت) ۱۱۔ اصالت خاں بکیت، ۱۲۔ خلیفہ ملھے پٹیت ۱۳۔ گوری پٹے باز ۱۴۔ میر فضل علی (بانک) ۱۵۔ منصور علی خاں (بانک) ۱۶۔ یحییٰ خاں (بانک، رستم خانی) ۱۷۔ نواب فتح یاب خاں (رستم خانی) ۱۸۔ شیخ نجم الدین (بانک) ۱۹۔ ولی محمد خاں (بانک) ۲۰۔ میر بہادر علی (بانک) ۲۱۔ میر جعفر علی (بانک) ۲۲۔ محمد مہدی (بنوٹ) ۲۳۔ محمد علی خاں (علی مد) ۲۴۔ مرزا احمد بیگ کٹیا کٹیا (تلوار) ۲۵۔ میر ولایت علی ڈنڈا تورڈ (پٹا) ۲۶۔ وزیر علی فرزند آصف الدولہ ۲۷۔ میر عشرت علی پھکیت) ۲۸۔ شیخ ببر فنا (پھکیت) ۲۹۔ مرزا حبیب (بانک وغیرہ) ۳۰۔ بھوانی بخش دریا بادی (کشتی) ۳۱۔ سید مشرف علی عرف جھنڈا میاں (کشتی) ۳۲۔ مہاراجا ڈگبجے سنگھ (نیزہ بازی وغیرہ) ۳۳۔ میر کلو (نیزہ بازی) ۳۴۔ میر اکبر علی (نیزہ بازی) ۳۵۔ نواب قائم خاں بنگش (نیزہ بازی) ۳۶۔ طالب شیر خاں (تلوار) ۳۷۔ فیض بخش (تیر اندازی) ۳۸۔ نواب آصف الدولہ (تیر اندازی وغیرہ) ۳۹۔ نواب علی محمد خاں روہیلہ (تیر اندازی) ۴۰۔ ہادی یار خاں (تیر اندازی) ۴۱۔ میرن صاحب بیچ بھیجے (بندوق) ۴۲۔ ٹھاکر فضل علی خاں (بندوق) ۴۳۔ نواب جہاں پناہ محل (بندوق، شہ سواری) ۴۴۔ شہزادی سمان آرا بیگم (شہ سواری، بندوق) ۴۵۔ پرنس مرزا محمد سکندر قدر تیموری (بندوق) ۴۶۔ حکیم محمود رشید فتح پوری (بندوق) ۴۷۔ راجا محمد کاظم حسین خاں (طمنچہ) ۴۸۔ نواب سعادت علی خاں (شہ سواری) ۴۹۔ نواب حیدر خاں بنگش (شہ سواری) ۵۰۔ فتح خاں (شہ سواری) ۵۱۔ دلاور خاں (شہ سواری) ۵۲۔ نواب علی نقی خاں وزیر اودھ (نیزہ بازی، شہ سواری) ۵۳۔ رجب خاں (شہ سواری) ۵۴۔ شیخ ببر علی (شہ سواری) ۵۵۔ ممن خاں (شہ سواری) ۵۶۔ سید صادق حسین (شہ سواری) ۵۷۔ پورن لکھنوی (شہ سواری) ۵۸۔ پہاڑ خاں لکھنوی (شہ سواری) ۵۹۔ سلطان العلما مولانا سید محمد مجتہد (شہ سواری وغیرہ)[23]

اودھ میں سپہ گری کے اخلاقی ضابطے بھی تھے۔ اچھا سپہ گر بالعموم

خوش اخلاق، منکسر مزاج، غصّہ کو ضبط کرنے والا اور مظلوموں کا حمایتی ہوتا تھا۔ ادّعائیت اور اپنے کمال کو جتانا اوچھا پن سمجھا جاتا تھا۔ خصوصاً بنوٹ کے ماہر اپنی وضع قطع یا کسی بھی ادا سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ اس فن میں دخل رکھتے ہیں۔ یہ دیکھنے میں ثقہ اور سیدھے سادھے لوگ ہوتے تھے، ہتھیار کے نام پر رومال میں بندھا ہوا پیسا یا تسبیح میں ایک بڑا دانہ لوہے کا رکھتے تھے اور اپنے فن کا استعمال صرف اسی وقت کرتے تھے جب زندگی اور موت کا سوال پیدا ہو جائے — ایسے موقعوں پر خاموشی کے ساتھ پیسے یا تسبیح کے دانے کی ایک ہلکی سی ضرب سے حریف کو مفلوج بلکہ ہلاک تک کر دیتے تھے اور گردن جھکائے ہوئے آگے بڑھ جاتے تھے۔

اودھ کے سپہ گروں کی بہادری اور اعلیٰ ظرفی کے بہت سے واقعات مشہور ہیں۔ کچھ لکھے بھی گئے ہیں۔ مثلاً کتاب "وضع داران لکھنؤ" میں مفتی گنج کے میر مصطفےٰ حسین خاں کا واقعہ لکھا ہے کہ انتزاع سلطنت اودھ سے کچھ پہلے ایک دن چوک میں ان سے کچھ لوگوں سے تکرار ہو گئی۔ بات اتنی بڑھی کہ تلواریں نکل آئیں۔ میر مصطفےٰ حسین تن تنہا اس پوری جماعت کے مقابلے پر ڈٹ گئے لیکن مخالف جماعت کے ایک صاحب نے کہا "بھئی ایک سے ایک ہی کو لڑنا چاہیے" اور خود میر صاحب کے مقابلے پر آ گئے۔ لڑائی میں میر صاحب زخمی ہو کر گر گئے۔ اس عرصے میں وزیر اودھ نواب علی نقی خاں کے بہنوئی محمود حسین خاں کو اس فوجداری کی خبر ہو گئی۔ وہ میر مصطفےٰ حسین خاں کے عزیز ہوتے تھے، فوراً ہاتھی پر سوار ہو کر سپاہیوں کی ایک پلٹن لیے ہوئے موقع واردات پر آ پہونچے لیکن میر صاحب نے انھیں کوئی کارروائی کرنے سے روک دیا اور کہا کہ مجھ سے صرف ایک آدمی نے مقابلہ کیا ہے۔ اچھا ہو جاؤں گا تو خود اس سے بدلا لوں گا۔ اگر اس وقت تم لوگوں نے مداخلت کی تو مجھے ایسا صدمہ پہونچے گا کہ زندہ نہ بچوں گا۔

"آخر یہ لوگ حریفوں سے بغیر کچھ باز پرس کیے، میر مصطفےٰ حسین خاں کو گھر اٹھا لائے۔ ابھی وہ اچھے بھی نہ ہونے پائے تھے کہ مخالف صاحب مزاج پرسی کے لیے تشریف لائے ..... بعد صحت کے پردہ ہوا۔ میر صاحب کے پاس بیٹھ گئے اور مزاج پرسی کی۔ میر صاحب نے جواب دیا کہ اب اچھا ہوں اور ان شاء اللہ ایک ہفتے میں صحت کلی ہو جائے گی، پھر میرے آپ کے مقابلہ ہوگا۔ حریف صاحب نے کہا کہ بھائی اب تو میں تمھاری بہادری اور منصف مزاجی کا قائل ہو چکا۔ تم پر میرا ہاتھ نہیں اٹھ سکتا۔ یہ کہہ کر رخصت ہوئے۔ بعد غسل صحت خود میر صاحب اُن کے مکان پر گئے اور بہت کچھ تانا، لیکن انھوں نے سوائے سر جھکا دینے کے کوئی جواب نہ دیا۔ ہمیشہ یہی کہا کیے کہ یہ سر حاضر ہے، میں تو آپ کو بھائی کہہ چکا۔ آخر میر صاحب نے بھی بھائی کہہ کر گلے سے لگا لیا اور جب تک زندہ رہے بھائی ہی سمجھتے رہے۔" ۲۳

گزشتہ سطور میں استاد سید مبارک حسین اور ان کی کتاب "فن سپہ گری" کا ذکر آیا ہے۔ لکھنؤ میں سپہ گری کے واقف کاروں کا کہنا تھا کہ عہد شاہی میں بھی، جب سپہ گری کا دور عروج تھا، مبارک حسین صاحب کا سا کامل استاد شاید ہی کوئی ہوا ہو۔ اُستاد سپہ گری کے قریب قریب سب شعبوں میں منتہی کا درجہ رکھتے تھے۔ وہ چھوٹے قد اور ہلکے ڈیل ڈول کے آدمی تھے اس لیے بھاری گُرز اور بڑا کھانڈا تو شاید نہ چلا سکتے ہوں، باقی تمام ہتھیاروں کے استعمال پر انھیں پوری قدرت حاصل تھی۔ میرے چچا ڈاکٹر سید آفاق حسین رضوی صاحب نے گھر پر ایک ورزش خانہ اور اکھاڑا بنا رکھا تھا جہاں شریف نوجوانوں کو کسرت کرانے کے علاوہ سپہ گری اور کشتی سکھائی جاتی تھی۔ عمدہ قسم کے ہتھیار بھی بہت تھے (جو ۱۹۴۷ء کے بعد اسلحہ پر پابندیوں کی وجہ سے زمین میں دفن کر دیے گئے اور زنگ انھیں کھا گیا) یہاں استاد مبارک حسین بھی تعلیم دینے آتے تھے اور میں نے اس زمانے میں ان کے ایسے ایسے کمالات دیکھے ہیں کہ آج ان پر یقین کرنا مشکل ہے۔ استاد کا تفصیلی تذکرہ ان شاء اللہ کسی علاحدہ مضمون میں کیا جائے گا۔ یہاں صرف دو تین واقعات درج کیے جاتے ہیں:

ایک بار کسی دوسرے شہر کے ایک صاحب سجادہ بزرگ اپنے مریدوں کے ساتھ لکھنؤ تشریف لائے۔ ان کو سپہ گری کا ایسا ذوق تھا کہ

شخص کو مُرید نہیں کرتے تھے جو اس فن میں کسی شعبے سے عملی واقفیت نہ رکھتا ہو۔ انھوں نے لکھنؤ کے کسی سپہ گر کا کمال دیکھنے کی خواہش کی۔ ان کو اُستاد مُبارک حسین کا نام بتایا گیا، اور ہمارے ہی گھر پر استاد کا مظاہرہ قرار پایا۔ شاہ صاحب اپنے آٹھ دس مُریدوں کے ساتھ تشریف لائے۔ اُستاد نے ان سے پوچھا: آپ کو زیادہ دلچسپی کس ہتھیار سے ہے؟ شاہ صاحب نے نیزے کا نام لیا اور بتایا کہ ان کے سب مُرید نیزہ بازی سے واقف ہیں۔ اُستاد نے سب مُریدوں کو ایک ایک لاٹھی تقسیم کرا دی اور کہا کہ لاٹھیوں کو نیزوں کی طرح استعمال کیجئے۔ میں خود چوٹ نہیں کروں گا، لیکن آپ لوگ اس کا خیال رکھیے گا کہ آپ کے ہاتھ سے آپ کا کوئی ساتھی چوٹ نہ کھائے۔ اس کے بعد اُستاد خالی ہاتھ دیوار سے پیٹھ لگا کر کھڑے ہو گئے۔ مُریدوں نے حملہ کیا۔ اُستاد بجلی کی طرح چمکے۔ کئی لاٹھیاں دیوار پر پڑ کر رہ گئیں، ایک حریف کی لاٹھی اُستاد کے ہاتھ میں نظر آئی اور خود اس حریف کی گردن میں ہاتھ ڈال کر انھوں نے نیچے کی طرف اس طرح جھکایا کہ وہ بے دست و پا ہو کر رہ گیا اور استاد اس کے پیچھے تقریباً چھپ گئے۔ حریفوں نے دوبارہ حملہ کیا تو بچھ کے سامنے یہ انسانی ڈھال آ گئی اور کچھ کے وار اُستاد نے اپنی چھینی ہوئی لاٹھی سے کاٹ دیئے۔ اس کے بعد استاد نے اس حریف کو چھوڑ کر لاٹھی اسے واپس کر دی اور کہا کہ ابھی تک میری پشت پر دیوار کی حفاظت تھی، اب میں کھلے میں نہتا آتا ہوں' اور دیوار کے پاس سے ہٹ کر بیچ احاطے میں کھڑے ہو گئے۔ اب حریفوں نے ان کو ہر طرف سے گھیر کر ایک ساتھ حملہ کیا۔ استاد پھر بجلی کی طرح چمکے اور آناً فاناً ان کے ہاتھوں میں دو حریفوں کی گردنیں آ گئیں۔ ایک پہلے کی طرح ان کے سامنے اور دوسرا ان کی پیٹھ پر ڈھال بن گیا۔ اُستاد نے آواز لگائی:

"خیال رہے یہ دونوں آپ کے آدمی ہیں۔"

اس کے بعد استاد پر جتنے وار ہوئے ان کے نشانے پر یہی دونوں آدمی آتے اور حریفوں کا ہاتھ رُک جاتا۔ شاہ صاحب کو یہ مظاہرہ اتنا پسند آیا کہ انھوں نے اپنے گلے سے منکوں کی ایک مالا اُتار کر اُستاد کو پہنا دی، اعتراف کیا کہ ایسا باکمال انھوں نے ہندوستان بھر میں کہیں نہیں دیکھا اور [illegible] کہ استاد ان کی خانقاہ میں رہ کر ان کے مُریدوں کو کچھ سکھائیں۔

علی ظہیر عرف پیارے جانی لکھنؤ کے نامی زور آور تھے۔ وہ ہمارے یہاں ورزش کرنے آتے تھے اور ان کے بارے میں مشہور تھا کہ ایک بھینسے کے برابر قوت رکھتے ہیں۔ ایک بار اُستاد نے ان کے ہاتھ میں خنجر دے کر اس کی دھار چٹکی سے پکڑ لی اور کہا کہ خنجر کو میرے ہاتھ سے چھڑا لو۔ پیارے جانی نے خنجر کو طرح طرح سے جھٹکے دیئے، اُستاد کے ہاتھ کو مروڑنے کی کوشش کی، یہاں تک کہ جس طرح دھوبی کپڑے کو پھٹکتے ہیں اسی طرح استاد کو پھٹکنے لگے لیکن خنجر کو ان کی چٹکی سے چھڑا نہیں سکے۔

استاد مبارک حسین نے لمبی عُمر پا کر انتقال کیا۔ بڑھاپے میں ان کی صحت خراب اور بینائی بہت کمزور ہو گئی تھی۔ اسی زمانے میں ایک دن جھٹ پٹے کے وقت ہم لوگوں نے دیکھا کہ استاد سڑک کے کنارے کھڑے کچھ بڑبڑا رہے ہیں اور ان کے پیروں کے پاس ایک بائیسکل پڑی ہے۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ کسی سائیکل سوار نے ان سے ٹکرا کر انھیں اندھا کہہ دیا تھا۔ اُستاد نے جواب دیا کہ "میں تو واقعی اندھا ہو رہا ہوں۔ تم کو اللہ نے بڑی بڑی آنکھیں دی ہیں، تم نے کیوں نہیں دیکھا کہ بڈھا آدمی راستے میں ہے۔" سوار کو اور غصّہ آیا۔ آخر اس نے استاد پر بائیسکل چڑھا دی۔ ہم لوگوں نے حیرت سے پوچھا:

"اُستاد، آپ پر بائیسکل چڑھا دی؟ پھر کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا۔" استاد نے جواب دیا۔ "بائیسکل یہ پڑی ہے اور خود بدولت اُدھر کپڑے جھاڑ رہے ہیں۔"

اور ہم لوگوں نے دیکھا کہ واقعی سڑک کے دوسرے کنارے پر ایک ہٹا کٹا جوان کھڑا کپڑے جھاڑ رہا ہے۔ پھر وہ لنگڑاتا ہوا ہم لوگوں کی طرف آیا، خاموشی سے بائیسکل اٹھائی اور استاد سے کترا کر نکل گیا۔ استاد نے معلوم نہیں کیا داؤں کیا تھا کہ غریب نے سڑک کے اس پار جا کر پٹخنی کھائی تھی۔

عہدِ شاہی کے اودھ کی سپہ گرانہ فضا اور فنِ سپہ گری سے عام واقفیت کا ذکر شروع میں آ چکا ہے۔ اس وقت یہاں بہت بڑی تعداد میں ایسے افراد موجود تھے جو انفرادی طور پر اس فن میں درجۂ کمال کو

پہنچے ہوئے تھے لیکن یہ انفرادی کمال اجتماعی قوت کا بدل نہیں بن سکتا تھا۔ ایک بانکا شہر کی فوجداریوں میں دس حریفوں کو ضرور مار گرا سکتا تھا لیکن میدان جنگ میں دو سو بانکے ایک منظم دستے کی طرح یک جان ہوکر دو سو تربیت یافتہ فوجیوں کی پلٹن کو فنا نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے کہ انھیں اجتماعی فوجی تربیت حاصل نہیں تھی۔ شجاع الدولہ کے بعد انگریزوں نے ایک لشکری قوت کی حیثیت سے اودھ کو پنپنے نہیں دیا۔ یہاں کے حکمرانوں کو صرف " بقدر ضرورت " تھوڑی سی فوج اور سامان جنگ رکھنے کی اجازت تھی۔ اس صورت میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں پورے ہندستان کی طرح اودھ بھی انگریزوں سے شکست کھا گیا۔ البتہ اس پر تعجب کیا جا سکتا ہے کہ اس جنگ میں انگریزوں کی سب سے سخت مزاحمت اودھ نے کی بلکہ کچھ عرصے کے لئے ان سے اپنی سلطنت واپس چھین کر یہاں برجیس قدر کی حکومت قائم کرادی۔

اس سلسلے میں اودھ کے آخری حکمراں واجد علی شاہ کا پس پردہ کردار بڑا پراسرار معلوم ہوتا ہے۔ سلطنت اودھ کا خاتمہ انھیں کے زمانے میں ہوا اس لئے ان کا نام عیش کوشی اور ناکارگی کی علامت بنا دیا گیا۔ لیکن واجد علی شاہ نے تخت نشین ہوتے ہی کوششیں شروع کردی تھیں کہ اودھ کی فوجی قوت انگریزوں سے بڑھ جائے۔ برائے نام فوج رکھنے کے بجائے وہ بڑی تعداد میں سپاہیوں کو بھرتی کرنے لگے۔ وہ خود روزانہ کئی گھنٹے تک ان سپاہیوں کو فوجی مشقیں کراتے تھے۔ آخر گورنر جنرل کو رپورٹ کی گئی کہ بقدرِ ضرورت تھوڑے سے آدمیوں اور سامان کی جگہ اب واجد علی شاہ کی فوج میں چار سو توپیں، پانچ ہزار توپچی، چار ہزار سوار اور چوالیس ہزار پیادے ہیں۔ گورنر جنرل نے مداخلت کر کے اس فوج کی تعداد میں بہت تخفیف کرادی ۲۴

واجد علی شاہ نے اپنے بعض فوجی دستوں کے عجیب غیر سپاہیانہ نام رکھے تھے مثلاً " ترچھا رسالہ "، " گلابی پلٹن "۔ کچھ کے نام پھولوں پر رکھے مثلاً داؤدی، جعفری، عباسی۔ ان کے سپاہیوں کی وردیاں بھی عام فوجی لباس کے برخلاف رنگ برنگے مخمل اور بانات وغیرہ کی تھیں۔ فوجی علم بھی خوب رنگین اور زردنگار تھے ۲۵ غرض ان دستوں پر فوج سے زیادہ کسی برات کا دھوکا ہوتا تھا۔ شاید اسی لئے انگریزوں نے ان میں سے کچھ دستوں کو بے ضرر سمجھ کر شاہی ملازمت میں باقی رہنے دیا تھا لیکن اس رنگین پردے کے پیچھے تربیت پانے والے سپاہیوں نے ۱۸۵۷ء میں غیر معمولی حربی لیاقت دکھائی اور اپنی شجاعت اور مہارت سے انگریزوں کو عاجز اور حیران کردیا۔ واجد علی شاہ نے حبشی سپاہیوں کا بھی ایک دستہ تیار کیا تھا۔ کرنل سلیمن نے گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی کو اودھ میں فوجی مداخلت کا مشورہ دیتے ہوئے اس دستے کا یوں ذکر کیا ہے،

" سب سے مقدم یہ ہے کہ (واجد علی شاہ کی) حبشیوں کی فوج کو، جو تین سو آدمی ہیں، غیر مسلح کرنا پڑے گا ....
ان حبشی قاتلوں کی لکھنؤ میں موجودگی سے نہ ریزیڈنٹ اور نہ ریجنسی (کا کوئی رکن) محفوظ ہوگا۔" ۲۶

ولی عہدی کے زمانے میں واجد علی شاہ نے اپنے پہرے کے لئے تیس عورتوں کو ملازم رکھ کر انھیں فوجی تربیت دی تھی۔ ۱۶ نومبر ۱۸۵۷ء کو سکندر باغ کے خونیں معرکے میں " لیفٹننٹ کرنل گورڈن الگزنڈر نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مقتولین میں کچھ قوی ہیکل حبشنیں تھیں جو جنگلی بلیوں کی طرح لڑی تھیں اور جب تک وہ ہلاک نہ ہوگئیں یہ شبہ بھی نہیں ہوا کہ وہ عورتیں تھیں۔ سارجنٹ فوربس مچل ایک عورت کا ذکر کرتا ہے ـــ جو سکندر باغ کے صحن میں پیپل کے ایک بڑے درخت پر بیٹھی ہوئی کئی انگریز فوجیوں کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنا چکی تھی، اور آخرکار خود بھی گولی سے ہلاک ہوئی۔" ۲۷

□□

حواشی:

۱ شبابِ لکھنؤ (ترجمہ پرائیوٹ لائف آف این ایسٹرن کنگ: ولیم نائٹن) مترجمہ محمد احمد علی۔ الناظر پریس لکھنؤ ۱۹۱۲ء ص ۱۰۳

۲ انشائے سرور: مرزا رجب علی بیگ سرور۔ مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۹۱۶ء رقعہ ۴۹

۳ رجب علی بیگ سرور: نیر مسعود۔ شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی ۱۹۶۷ء ص ۵۵

۴ آبِ حیات: محمد حسین آزاد۔ آزاد بکڈپو لاہور ص ۳۶۴-۶۵

۵ گویا۔ صاحبِ سیف و قلم: جعفر ملیح آبادی۔ ناشر مصنف لکھنؤ ۱۹۶۸ء ص ۱۰۶

۶ تاریخ اودھ (حصہ چہارم) نجم الغنی۔ مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۹۱۹ء ص ۴۰-۶۱

۷ حیات انیس: امجد علی اشہری۔ مطبع آگرہ اخبار آگرہ ۱۱...

پروفیسر جعفر رضا
صدر شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی

اودھ میں عزاداری

ہندوستان میں عزاداری کا اہم ترین مرکز اودھ رہا ہے۔ اودھ میں عزاداری کو دہلی یا دکن کے مقابلہ میں مختلف و متنوع جہات حاصل ہوئے۔ انھیں حکمرانوں کے علاوہ عوامی سطح پر بھی مقبولیت حاصل ہوئی۔ سماج کے مختلف طبقوں کے لوگ اپنے طور پر عزاداری کرتے، جن میں کسی خاص عقیدہ کی پابندی ضروری نہیں تھی۔ اہل اسلام ہی نہیں غیر مسلموں میں بھی انتہائی خلوص و عقیدت سے عزاداری کا رواج تھا۔ اودھ میں عزاداری کو قومی شناخت حاصل تھی۔ محرم کا چاند دیکھتے ہی عزاداری کا آغاز ہو جاتا اور دسویں محرم کو تکمیل کو پہنچتا۔ نوابین اودھ نے ایام عزا کو سرکاری تعطیل قرار دے دیا تھا۔ اس دوران کسی طرح کی تقریبات مسرت منعقد کرنے کی ممانعت تھی۔ اس اجمال کی تفصیل جاننے کے لیے ذیل میں بعض حقایق پر توجہ کی جا سکتی ہے۔

شمالی ہند میں تبرکات عزا کے طور پر علم حسینی برآمد کرنے کا سلسلہ حضرت شاہ اشرف جہانگیر سمنانی سے شروع ہوتا ہے۔ انھوں نے پہلی بار محرم کے موقع پر علم حسینی برآمد کیا اور اس کے زیر سایہ قیام کیا۔ ان کا دستور تھا کہ سبزدار کے طریقے پر علم اور زنبیل تیار کرتے۔ زنبیل کے ساتھ سادات اور متقی و پرہیزگار لوگوں کو اطراف و جوانب میں بھیجتے۔ بسا اوقات یہ فرض اپنے خلیفۂ ارشد حضرت شاہ سید علی قلندر کے سپرد کرتے۔ حضرت شاہ سمنانی ۱۳۸۰ء میں ہندوستان تشریف لائے۔ اس طرح علم برآمد کرنے کا سلسلہ اس کے گرد و پیش شروع ہوا ہوگا۔ ان کے ملفوظات میں درج ہے کہ موصوف درمیان عشرہ محرم اچھا لباس زیب تن نہیں کرتے تھے، کسی تقریب مسرت میں شریک ہوتے تھے۔ آٹھویں اور دسویں محرم کے درمیان کی تاریخوں میں آرام ترک کر دیتے تھے۔ تیس برس تک، خواہ سفر میں ہوں یا حضر میں کبھی غم حسینؑ سے غافل نہیں ہوئے۔

اودھ میں عزاداری کی ابتدا فیض آباد کی مشہور بابری مسجد کے چبوترے سے ہوئی۔ عشرۂ محرم کے دوران مسجد کے چبوترے پر ایک تعزیہ بنا کر رکھا جس کے بعد فیض آباد میں عزاداری شروع ہو گئی لیکن یہ صرف نقش اولیں تھا۔ عزاداری کا باقاعدہ رواج اس وقت ہوا کہ جب فیض آباد میں پہلا امام باڑہ نواب صفدر جنگ کی اہلیہ صدر جہاں بیگم نے شہر کے مشہور موتی باغ کے عقب میں ۱۷۴۶ء میں تعمیر کرایا اور اسی سے ملحق ایک مسجد بھی تعمیر کرائی۔ یہ عمارتیں ہنوز موجود نہیں۔ فیض آباد میں دوسرا امام باڑہ شجاع الدولہ کی اہلیہ بہو بیگم کا تعمیر کردہ ہے جس کی شہ نشین اور دیواریں عظمت پارینہ کی داستان کہتی ہیں۔ شجاع الدولہ نے بیاد تشنگان کربلا سبیل تعمیر کرائی جرأت نے تاریخ کہی:

پانی جو اس کا قاسم کوثر کو ہے نثار
جو پیوے اس کو ہر دو جہاں میں صلہ ہے
جرأت نے کی جو فکر میں تاریخ چاہ کی
آئی ندا کہ "ذکرِ حسینی سبیل ہے"

۱۱۷۵ھ (مطابق ۱۷۶۱ء)

نواب شجاع الدولہ کو عزاداری سے خصوصی شغف تھا۔ اگر کسی جنگی مہم کے دوران عشرہ محرم پڑ جاتا تو ایام عزا میں جنگ کو ملتوی رکھتے۔ فوجی خیموں میں مجلس عزا ہوتی۔ سپاہی تعزیے بنانے کے لیے بانس اپنے ساتھ لے جاتے۔ ایک بار ۱۷۶۱ء میں پانی پت کی مہم درپیش ہونے کی بنا پر شجاع الدولہ کا قیام نواح

دہلی میں تھا کہ محرم شروع ہوگیا۔ موصوف سیاہ پوش ہوگئے۔ دیگر ماتم داروں کے ہمراہ علم بردوش سروپا برہنہ ماتم کرتے ہوئے احمد شاہ کی قیام گاہ کے سامنے سے گزرے۔ اس واقعہ کا بیان سید غلام علی خاں کی زبانی سنیے

"سیہ پوش شدن نواب والاقدر است در محرم الحرام و گذشتن باجماعہ سیہ پوشان از پیش در خانہ بادشاہی بایں ہیہات کہ ہریک از انہا سر و پا برہنہ علم بر دوش گرفتہ سر و سینہ می زد۔ نواب ہم بہمیں صورت شریکِ حال شان بود۔"[۵۸]

نواب شجاع الدولہ کے مقربین میں نواب سرفراز الدولہ حسن رضا خاں کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ حسن رضا خاں کو عزاداری سے جذباتی وابستگی تھی۔ اولاً اپنے مکان پر مجالس عزا منعقد کرتے رہے بعدۂ ایک عالی شان امام باڑہ تعمیر کرایا جو زیارت گاہ خاص و عام بن گیا۔ قیام فیض آباد کے دوران عزاداری میں منہمک رہتے۔ ان کا معمول تھا کہ روزانہ بعد نماز پنجگانہ امام باڑے میں ضریح کے سامنے زیارت پڑھتے۔ مرزا سوداؔ نے امام باڑہ میں علم استادہ کرنے کی تاریخ کہی:

چل قلم کہہ حسن رضا خاں سے — درِ دولت سَرا جو تیرا ہے
ہے عجب طرح کی زیارت گاہ — جس سے تحصیلِ دین و دُنیا ہے
یاں علم نذرِ حضرتِ عباسؑ — صدقِ دل سے ترا جو برپا ہے
اے خوشا حال وہ کہ اس سے نذر — مخلصی آخرت کی سمجھا ہے

سال تاریخ اس علم کی ہے یہ
سر ترے سایہ اس علم کا ہے[۵۹]

اس دور کے فیض آباد میں جواہر علی خاں خواجہ سرا کی بدولت عزاداری میں خصوصی رونق پیدا ہوئی۔ جواہر علی خاں طبیعتاً مذہبی تھے۔ انھیں کی کوششوں سے فیض آباد میں باجماعت نماز جمعہ کا رواج ہوا حالانکہ نواب شجاع الدولہ کا حکم تھا کہ نماز باجماعت پڑھی جائے لیکن یاران طریقت عذر پیدا کرلیتے۔ جواہر علی خاں نے نماز پڑھنے پر آمادہ کرنے کے لیے ایک دستہ ترتیب دیا جو لوگوں کو نماز پنجگانہ کے وقت مسجد میں لے آتے تھے۔ موصوف بہو بیگم کے خزانے کے وزیر تھے جو انھیں نواب ناظر کہتی تھیں اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتی تھیں۔ جواہر علی خاں نے ایک امام باڑہ تعمیر کیا تھا جس میں بڑے جوش و خروش سے عزاداری کرتے۔ ان کے انتقال کے بعد داراب علی خاں نے امام باڑہ کی توسیع کی اور عمارت کو پختہ کردیا۔ یہ امام باڑہ آج بھی موجود ہے اور اس میں عزاداری ہوتی ہے۔

نواب آصف الدولہ نے اودھ کا دارالسلطنت فیض آباد سے لکھنؤ منتقل کیا تو عزاداری کی رونق سمٹ کر لکھنؤ آگئی، حالانکہ بہو بیگم کی موجودگی کی بنا پر فیض آباد میں قدیم روایات کے مطابق عزاداری ہوتی رہی، جسے کسی طرح کے زوال کا شکار نہیں ہونا پڑا لیکن لکھنؤ کی بات ہی کچھ اور تھی۔ آصف الدولہ نے اپنے دست مبارک سے سرزمین لکھنؤ میں نہال عزاداری نصب کر کے خلوص و محبت سے اس طرح سیراب کیا کہ وہ تناور درخت بن گیا۔ موصوف نے لکھنؤ کے باہر دوسرے اضلاع میں عزاداری کے لیے کئی املاک وقف کیے۔ طوالت کے خیال سے ان کا ذکر نہیں کیا جارہا ہے حالانکہ بعد میں آصف الدولہ کی سی بات نہیں رہی مگر عزاداری سے اودھ کے ہر حکمراں کو زیادہ سے زیادہ دلچسپی تھی اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے، نتیجے میں عزاداری کو لکھنؤ میں ایسا عروج حاصل ہوا کہ شاید و باید۔ اس اجمال کی تفصیل کے لیے لکھنؤ کے امام باڑوں کی سیر کی جاسکتی ہے، جو اپنی کہانی خود کہہ دیں گے کہ اتنے شاندار امام باڑوں میں کتنی عظیم الشان عزاداری ہوتی رہی ہوگی ان میں شاہی امام باڑے ہیں۔ امرا و روسا کے امام باڑے ہیں، بیگمات کے امام باڑے ہیں، عوام کے امام باڑے ہیں، مسلمانوں میں دونوں فرقوں کے امام باڑے ہیں، غیر مسلموں کے امام باڑے ہیں۔ ان کی تعداد کا صحیح اندازہ لگانا ممکن نہیں کیوں کہ لکھنؤ میں گھر گھر امام باڑے رہے ہیں جن میں علم و تعزیے استادہ کیے جاتے۔ بعد محرم انھیں ایک جگہ دفن کر دیتے، جنھیں کربلا کہا جاتا ہے۔

امام باڑہ آصفی کو نواب آصف الدولہ کے عزاداری سے غیر معمولی شغف کا مظہر قرار دیا جاسکتا ہے، جو لکھنؤ میں ان کا تعمیر کردہ عظیم الشان امام باڑہ ہے، جو اودھ کے تہذیبی و ثقافتی ورثہ کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے۔ اس امام باڑہ کی تعمیر کے لیے نواب موصوف نے خصوصی اہتمام کیا تھا۔ ماہرین سے نقشے طلب کیے۔ کفایت اللہ کا تیار کردہ نقشہ پسند خاطر ہوا۔ اس کے اعتبار سے تعمیر کا کام شروع ہوا[۶۰] اتفاق سے اودھ ۱۷۸۴-۱۷۸۶ء میں زبردست قحط کا شکار ہوگیا[۶۱]۔ تعمیر امام باڑہ کا سلسلہ دن کے علاوہ رات میں بھی جاری رہتا۔ عام لوگ دن میں مزدوری کرتے اور رات کی تاریکی میں غریب و فاقہ کش شرفائے شہر۔ یہ امام باڑہ دس سال

مدت میں ۵۰ لاکھ روپیے کی لاگت سے ۱۲۰۵ھ (۹۰-۱۷۹۱ء) میں مکمل ہوا۔[illegible] دالان کا طول ۱۸۰ فٹ عرض ۹۰ فٹ اور چھت ۲۰ ا فٹ چوڑی بالکل لداؤ کی بنی ہوئی بے ستون استادہ ہے۔ ہم عصر مورخ مرتضیٰ حسین بلگرامی لکھتے ہیں:

"ہیچ ملک را از املاک ہفت اقلیم بانی آں در رفعت ومتانت وسعت پیدا نیست"[illegible]

ایک یورپی سیاح ڈبلو ہیبر نے اس امام باڑہ کو دیکھا تو مبہوت رہ گیا لکھتا ہے کہ:

"میں نے اس سے بہتر کسی دوسری عمارت کا نقشہ نہیں دیکھا جو اتنے نفاست، تنوع، تناسب اور خوش ذوقی کے اصولوں پر تیار کیا گیا ہو۔"[illegible]

میرزا ابوطالب لندنی امام باڑہ آصفی کے ساز وسامان کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"اب تک ہر سال چار پانچ لاکھ روپے امام باڑہ کی آرایش پر صرف ہوتا ہے۔ سیکڑوں چھوٹے بڑے، سونے اور چاندی کے تعزیے بنائے گئے اور اس قدر کانچ کے جھاڑ فانوس اور سونے چاندی کی سادہ و رنگین قندیلیں خریدیں کہ جن کا حساب شمار سے باہر ہے۔ چنانچہ اس کشادگی کے باوجود دالان چھت سے زمین تک بھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس طرح اس کی صفائی کرنے والوں کو اپنے کام میں دشواری ہوتی ہے اور تعزیہ داروں کی آمد ورفت کے لیے مشکل سے جگہ نکل پاتی ہے۔ اس کے باوجود وزیر کا دل نہیں بھرا۔ جس وقت ڈاکٹر بلین ولایت (لندن) جارہے تھے تو نواب نے کانچ کے دو تعزیوں کی فرمائش کی جو جھاڑ فانوس اور دیگر لوازمات کے ساتھ ایک سرخ اور ایک سبز رنگ کا ہو۔ ایک لاکھ روپے اس کی قیمت مقرر ہوئی۔ ۱۲۱۱ھ (۹۷-۱۷۹۶ء) میں ایک تعزیہ موصول ہوا اور دوسرا اگلے سال آنا طے ہوا۔"[illegible]

بدقسمتی سے اگلے سال نواب موصوف کا انتقال ہوگیا اس لیے کہنا دشوار ہے کہ دوسرا تعزیہ لندن سے آیا بھی یا نہیں۔ امام باڑہ آصفی کے زیب وزینت کے متعلق اسی طرح کے بیانات مورخین میں سید عبداللطیف خاں شوستری،[illegible] مرزا محمد کاظم[illegible] وغیرہ نے کیا ہے لیکن سب کچھ لٹ چکا ہے ان تبرکات میں محض کانچ کا ایک تعزیہ اور چند جھاڑ فانوس باقی رہ گئے ہیں، جو امام عزا میں استعمال کر دیئے جاتے ہیں۔

درگاہ حضرت عباس کی پہلی تعمیر دور آصفی میں ہوئی۔ روایت ہے کہ باشندۂ منصور نگر (لکھنؤ) صوفی درویش مرزا فقیر بیگ کو حج کے موقع پر خواب میں بشارت ہوئی کہ لکھنؤ جاکر درگاہ حضرت عباس کی تعمیر کریں۔ انھوں نے لکھنؤ واپس آکر نواب آصف الدولہ کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعہ بیان کیا۔ کئی مورخوں[illegible] کا بیان ہے کہ آصف الدولہ نے درگاہ کے لیے اینٹوں کا گنبد تعمیر کرایا، ایک ہزار روپے انتظامات کے لیے عطا کیے اور وہاں ایک علم نذر کیا۔ حاجت مندوں نے حاضری شروع کردی۔ درگاہ کی دوسری تعمیر اور توسیع نواب سعادت علی خاں کے ہاتھوں ہوئی۔ انھوں نے فرش وفروش، جھاڑ فانوس و دیگر آلات شیشہ، چاندی کا منبر، چاندی کا صندوق اور سونے چاندی کے علم استادہ کیے ۱۲۱۷ھ (۱۸۰۲ء) میں طلائی گنبد تعمیر کرایا۔ بارہ اماموں کے نام سے بارہ دروازے تعمیر کرائے۔ مرزا محمد حسن قتیل نے تاریخ کہی: ع

"ایں جدید بنائے سعادت است"

۱۲۱۷ھ

غازی الدین حیدر نے درگاہ میں نقارخانہ بلند تعمیر کرایا، نوبت اور گھڑیال لگائے۔ دیگر سامان آرائش کے علاوہ اندرون درگاہ چاندی کا دروازہ بنوایا اور چاندی کا منبر نذر کیا۔ عہد نصیر الدین حیدر میں ملکہ زمانیہ نے درگاہ کا باورچی خانہ بنوایا۔ انتزاع سلطنت اودھ کے بعد ہجرت کے وقت واجد علی شاہ نے اپنی تلوار اور تاج درگاہ پر نذر کردی۔ غدر کی لوٹ میں سب کچھ جاتا رہا اور درگاہ بھی نزول میں آگئی۔ شرف الدولہ غلام رضا نے نزول سے واگذاری کرائی اور کچھ سامان نذر کیا۔

عزاداری سے متعلق متذکرہ بالا تفصیلات کی توثیق دربار آصفی کے منتخب خبرنامہ "انتخاب اخبار نواب وزیر بہادر وانتخاب دربار معلی و اطراف" سے ہوتی ہے، جس کی دو جلدیں رائل ایشیاٹک سوسائٹی گریٹ برٹین اینڈ آئرلینڈ، لندن میں محفوظ ہیں۔[illegible] ان میں ۲۸، ذی الحجہ ۱۲۰۸ھ (۲۷، جولائی ۱۷۹۴ء) سے ربیع الثانی ۱۲۱۰ھ (نومبر ۱۷۹۶ء) تک کے دربار آصفی کے حالات اور آصف الدولہ کے کوائف درج ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آصفی امام باڑہ کو عزاداری میں مرکزیت حاصل تھی، لیکن نواب موصوف، بیگمات، امرا ورؤسا

کے امام باڑوں کے علاوہ سماج کے مختلف طبقوں کے افراد کے امام باڑوں میں بھی شرکت کرتے تھے۔ تعزیوں اور مجالس عزا کا سلسلہ محرم کا چاند دیکھتے ہی شروع ہو جاتا تھا۔ ذیل میں دونوں سال کے محرم کے کوائف کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے:

۲۸ ذی الحجہ ۱۲۰۸ھ (۲۷ جولائی ۱۷۹۴ء): اطلاع دی گئی کہ لکھنؤ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ریذیڈینٹ مسٹر چیری امام باڑہ میں حاضری کے لیے آئے ہیں۔ نواب وزیر نے راجہ جھاؤ لعل کو حکم دیا کہ فوراً جائیں اور مسٹر چیری کو امام باڑہ اور دیگر عمارتیں دکھائیں

۲۹ ذی الحجہ ۱۲۰۸ھ (۲۸ جولائی ۱۷۹۴ء): منجموں نے مطلع کیا کہ آج کی تاریخ میں ہندوؤں کے دوج پڑ رہی ہے۔ چاند دکھائی پڑے گا۔ شام کو چاند دیکھنے کی بہت کوشش کی گئی۔ اطراف و جوانب میں خبر دی گئی کہ اگر کسی نے چاند دیکھا ہو، تو مطلع کرے۔ لوگوں نے واپس آکر بتایا کہ کہیں بھی چاند نہیں دیکھا گیا نواب نے کہا کہ شدید ابر باد کی بنا پر چاند نہیں دیکھا جا سکا۔ انشاء اللہ کل دکھائی دے گا۔ بہر صورت کل ۳۰ ذی الحجہ ہے، جو ماہ کی آخری تاریخ ہے۔ علم، ضریح اور تعزیہ برآمد کرنا درست نہیں۔ ماتم، مرثیہ خوانی اور روضہ خوانی ملتوی رکھی جائے۔ البتہ کل صبح ماتمی تقریبات ہوں گی۔

۳۰ ذی الحجہ ۱۲۰۸ھ (۲۹ جولائی ۱۷۹۴ء): نواب وزیر امام باڑہ تشریف لائے، فاتحہ پڑھا اور جھاڑ فانوس اور آئینے ملاحظہ کیے۔ بعدۂ محل کو واپس لوٹ گئے۔ مسٹر چیری کے امام باڑہ آنے کے دوسرے اعلان کے بعد تحسین علی خاں کو حکم دیا کہ سیتل سنگھ کا فوجی دستہ ریذیڈینٹ کی خدمت میں سلامی پیش کرے۔ نواب وزیر بہ ہمراہ تحسین علی خاں امام باڑہ تک گئے تاکہ تعزیوں سے متعلق انتظامات کا بہ نفس نفیس معائنہ کر سکیں۔ نواب سرفراز الدولہ بہادر، مہاراجہ ٹکیٹ رائے، راجہ بلاس رائے، راجہ نرمل داس بھی شامل ہو گئے۔ نواب وزیر نے امام باڑہ میں مسٹر چیری سے گفتگو کی۔ نواب نے تحسین علی خاں کو مطلع کیا کہ گورنر جنرل سر جان شور کلکتہ سے لکھنؤ کے لیے روانہ ہو چکے ہیں۔ بعد عاشورہ نواب وزیر بہ نفس نفیس ان کے استقبال کے لیے شہر کے باہر تک جائیں گے۔ راجہ بھوانی مشرا نے تعزیہ پر نذر کے لیے اصلی زردوزی کے تبرکات پیش کیے۔ نواب نے انھیں پگڑی، دوشالہ، کان کے بالے، کمربند اور چہار پارچہ خلعت سے نوازا۔ نواب نے تحسین علی خاں کو حکم دیا کہ فوج دار خاں کو تعزیہ کی تیاری کے لیے پانچ ہزار روپے مرحمت کیے جائیں۔ غروب آفتاب کے قبل نواب وزیر نے غسل کیا، سیاہ ماتمی عمامہ زیب تن کیا تاکہ امام حسن و امام حسین کی یاد منا سکیں انھوں نے چائے نوش کیا پھر مرثیہ خوان اور روضہ خوان طلب کیے گئے۔ خاص امرا، کو باریابی عطا ہوئی۔ تحسین علی خاں کو مرثیہ خوانوں کے لیے بارہ دوشالے اور ایک بڑی رقم روضہ خوانوں کے لیے مرحمت ہوئی۔ بعدۂ نواب وزیر اپنے محل سرا سے جانب امام باڑہ پا پیادہ گئے۔ برج طلائی کے نزدیک گھوڑے پر سوار ہوئے اور امام باڑہ کے دروازے پر اترے۔ طلائی علم اور پنجے تیار تھے۔ نواب امام باڑہ میں داخل ہوئے تو فوجی باجوں نے ماتمی دھن بجائی، نواب نے تعزیوں پر فاتحہ پڑھا اور اس کے گرد چکر لگایا۔ روضہ خوانی اور مرثیہ خوانی کے لیے حکم ہوا۔ مجلس کے بعد تحسین علی خاں کو حکم ہوا کہ مرثیہ خوانوں کو دو دوشالے اور روضہ خوانوں کو پانچ سو روپئے فی کس دیئے جائیں۔ آدھی رات کے بعد نواب وزیر محل سرا کو لوٹ گئے امراء و روسا بھی اپنے گھروں کو گئے۔ نواب وزیر نے محل سرا میں روضہ خوانوں کو طلب کیا۔ انھوں نے خوش گلوئی سے دردناک واقعات بیان کیے۔ موصوف نے دلی طور پر پسند کیا اور انھیں مزید پانچ پانچ سو روپے عطا کیے۔

یکم محرم ۱۲۰۹ھ (۳۰ جولائی ۱۷۹۴ء): نواب وزیر علی الصباح بیدار ہوئے، غسل کیا، لباس تبدیل کیا اور چائے نوش کی۔ سہ درہ محل میں پیپل کے پیڑ کے نیچے بیٹھ گئے (ضروری امور سے متعلق احکامات دیئے)۔ گھوڑے پر سوار ہوئے۔ امام باڑہ عتیق اللہ پر حاضر ہوئے، فاتحہ پڑھا، احترام سے پانچ سو روپئے تعزیہ پر نذر کیے۔ دیگر غربا و فقراء کے تعزیوں کی زیارت کی۔ اہل تعزیہ کی ضرورت کے پیش نظر کچھ روپے ہر ایک تعزیہ پر نذر کیے۔ اس کے بعد اپنے محل سرا کو لوٹ گئے۔ نواب وزیر کو اطلاع دی گئی کہ امام حسن و امام حسین کو خراج عقیدت کے طور پر ڈھول تاشوں کا شور مسٹر چیری کو پسند نہیں آیا۔ ریزیڈینسی چھوڑ کر اطراف میں بی بی پور چلے گئے ہیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں ہندوؤں کی طرح مسلمان بھی تیوہاروں کے منانے میں لغویات کے شکار ہیں۔ اب محرم کے بعد

بالا جا پور سے ہو وا پس لوٹیں گے۔

۲ محرم ۱۲۰۹ھ (۳۱ جولائی ۱۷۹۴ء): سہ پہر کے بعد نواب وزیر بیدار ہوئے۔ محل کے تالاب میں غسل کیا۔ لباس تبدیل کرکے کرم صاحب کی بارہ دری گئے۔ وہاں سے فوجی چھاؤنی گئے، جہاں ہر ایک تعزیہ کے سامنے نذر گذاری۔ اس کے بعد اشرف علی خاں اور ان کے بھائیوں کے امام باڑہ گئے۔ مرثیہ خوانی اور روضہ خوانی میں شریک ہوئے۔ ایک ہزار روپے نذر کیے۔ سواری پنج محلہ گئے اور خورد محل میں داخل ہوئے، جہاں خواتین کے تعزیوں پر بڑی رقم نذر کی۔ وہاں سے اپنے امام باڑہ میں واپس آئے۔ مرثیہ خوانی اور روضہ خوانی میں شرکت کی۔ نواب نے انھیں دوشالہ اور زر نقد پیش کیا۔ معظم چیلا کو سیاہ دوشالہ، راجہ مشرا کے ندیم کو ہرا دوشالہ عطا کیا۔ راجہ کا تربیت یافتہ ملازم بھی دوشالے سے سرفراز ہوا۔

۳ محرم ۱۲۰۹ھ (یکم اگست ۱۷۹۴ء): نواب وزیر سواری میں شہہ تی گئے۔ غرباء کے تعزیوں پر زر نقد نذر کیا۔ محل سرا کو لوٹ آئے۔

۴ محرم ۱۲۰۹ھ (۲ اگست ۱۷۹۴ء): نواب وزیر سواری میں نواب حسن رضا خاں کی حویلی تک گئے۔ تعزیوں پر پانچ اشرفیاں نذر کیں۔ بعدہٗ امام باڑہ حسن رضا خاں میں حاضر ہوئے۔ پانچ سو روپئے تعزیہ پر نذر کیے۔ حسن رضا خاں نے ایک حاجی کا تعارف کرایا، جو عقبات عالیات کی زیارت سے واپس آیا تھا۔ اس نے کربلا کے تبرکات پیش کیے۔ نواب وزیر نے اسے پانچ ہزار روپے مرحمت کیے۔ سواری میں میاں تحسین علی خاں کی حویلی آئے۔ امام باڑہ میں درود پڑھا، عقیدت سے پانچ سو روپئے تعزیہ پر نذر کیے۔ روضہ خواں کو دوشالہ عطا کیا۔ امراء و روسار کے ہمراہ ماتم میں شرکت فرمائی۔ شام کو محل سرا کو واپس ہوئے۔ وہاں مرثیہ سنا اور خوب روئے۔ راجہ جھاؤ لعل کے امام باڑہ میں حاضر ہوئے، فاتحہ پڑھا، تعزیہ پر پانچ سو روپئے نذر کیے۔ پھر الماس علی خاں کے مکان پر آئے۔ الماس علی خاں نے پندرہ اشرفیاں اور دو ہزار روپے پیش کیے۔ وہاں سے محل سرا کو لوٹ آئے۔ مرثیہ خواں طلب کیے گئے، جنھوں نے امام حسین کے مصائب پر کلام پیش کیا۔ آدھی رات کے بعد بستر پر آرام کے لیے گئے۔

۵ محرم ۱۲۰۹ھ (۳ اگست ۱۷۹۴ء): دریائے گومتی عبور کرکے نواب وزیر فوج دار خاں کی حویلی تک گئے۔ تعزیوں پر ایک ہزار روپئے نذر کیے۔ وہاں سے مستان شاہ کے تعزیے کی زیارت کے لیے گئے۔ ایک صد روپیے نذر کیے۔ مدے خاں نے نواب وزیر کی خدمت میں ایک ہزار روپے پیش کیے۔ وہاں سے محل سرا لوٹ آئے جہاں مرثیہ خوانی اور روضہ خوانی سن کر مثاب ہوئے۔ ماتم میں شرکت کی۔ بعدہٗ خورد محل کی حرم سرا گئے اور بیگمات کی تنخواہ کی ادائیگی کے احکامات صادر کیے۔ وزیر علی خاں کے تعزیہ درود و سلام کے بعد اپنے امام باڑہ میں واپس آگئے۔ مرثیہ خوانی، روضہ خوانی اور ماتم میں شریک ہوئے۔ بعدہٗ محل سرا کو واپس ہوگئے۔ نواب وزیر نے حکم دیا کہ تعزیوں کے گرد و پیش حفاظتی دستے مامور کر دیئے جائیں اور نقص امن کے ملزموں کو ان کے روبرو پیش کیا جائے۔

۶ محرم ۱۲۰۹ھ (۴ اگست ۱۷۹۴ء): نواب وزیر درگاہ حضرت عباس پر حاضر ہوئے۔ پانچ سو روپئے نذر کیے۔ اطلاع دی گئی کہ کل مرزا بہلو قتل اور تین افراد زخمی ہوئے۔ نواب وزیر نے قاتلوں کو قید خانہ بھجوا دیا۔ بعدہٗ تعزیہ نعیم علی خاں کی زیارت کو گئے اور زر نقد نذر کیا۔ دیگر تعزیوں پر نذر گذارنے کے بعد اپنے امام باڑہ آئے، روضہ خوانی سنی، ماتم کیا اور محل سرا کو لوٹ گئے۔ راجہ نرمل رائے اور بلاس رائے نے مطلع کیا کہ کل درگاہ حضرت عباس پر فساد کرنے کی بنا پر دو ہندوؤں کو قید خانہ میں ڈال دیا گیا ہے۔ انھوں نے ان کی رہائی کی سفارش کی، جو قبول کی گئی۔ نواب وزیر اسیہ مئو گئے، جہاں تعزیہ پر نذر کی۔ مہاراجہ ٹکیٹ رائے کے تعزیہ کی زیارت کے لیے بھی تشریف لے گئے۔ چار سو روپیے نذر کیے۔ مہاراجہ اور ان کے عیال نے نواب وزیر کی خدمت میں نقد تحائف پیش کیے۔ مرثیہ خوانی اور روضہ خوانی میں شرکت کی۔ بعد میں محل سرا کو لوٹ آئے۔ اسی درمیان مسٹر چیری اور دیگر انگریز وارد ہوئے۔ انھوں نے نواب وزیر کے ساتھ روضہ خوانی میں شرکت اور ماتم کیا۔ حملہ آوروں کو پابہ زنجیر پیش کیا گیا، جو ہندو سنگھ کی تحویل میں دیئے گئے۔ نواب وزیر پھر محل سرا سے وزیر باغ گئے اور تعزیوں پر نذر گذاری۔ تھوڑی دیر آرام کے بعد حویلی مرزا جمعہ گئے۔ تعزیہ پر تین سو روپے نذر کیے اور محل سرا

کو لوٹ آئے۔ رات میں کھانا نہیں کھایا ماتم کرتے رہے۔

(۸ محرم سے ۹ محرم کا خبر نامہ مہیا نہیں ہے)

۱۰ محرم ۱۲۰۹ھ (۸ اگست ۱۷۹۴ء): جلوس تعزیہ نے پتھر کے پل سے گومتی پار کیا۔ نواب وزیر بہ نفس نفیس دریا پار گئے اور حویلی فوج دار خاں کے قریب قیام کیا۔ نو تعمیر کربلا میں تعزیے دفن کرنے کے احکامات دیئے گئے۔ حویلی مرزا سلیمان شکوہ کے محافظ دستے کے سپاہی آئے اور انھوں نے اطلاع دی کہ گذشتہ رات مرزا سلیمان شکوہ بے حد پریشان رہے اور اپنی اہلیہ ثانی کے مکان میں بند رہے۔ محافظ رات بھر گولہ باری کرتے رہے۔ کسی طرح فتنہ رفع دفع ہوا۔ نواب وزیر نے ماتمی لباس اور دو سو یا تین سو روپے سادات کو نذر کیے۔ ایک اہم سید میر محمد علی نمو نمائی کو ماتمی لباس اور ایک ہزار روپے دیے گئے۔

اسی طرح دوسرے سال کے محرم کے حسب ذیل کوائف ملتے ہیں:

۲۹ ذی الحجہ ۱۲۰۹ھ (۱۷ جولائی ۱۷۹۵ء): ابر باد کی بنا پر محرم کا چاند نظر نہیں آیا۔

یکم محرم ۱۲۱۰ھ (۱۸ جولائی ۱۷۹۵ء): شام کو امام باڑہ میں سونا اور چاندی کے تعزیے استادہ کیے گئے۔ نواب وزیر نے ماتم کیا۔

۲ محرم ۱۲۱۰ھ (۱۹ جولائی ۱۷۹۵ء): نواب وزیر نے حکم دیا کہ مداح علی خاں سے ۲۵ ہزار روپے حاصل کر کے تحسین علی خاں کے سپرد کر دیئے جائیں، جو فی کس پانچ روپے کے حساب سے غریب تعزیہ داروں میں تقسیم کر دیں۔ بعد میں فوج دار خاں کے تعزیہ کی زیارت کو گئے۔ ایک سو روپے نذر کیے۔ دکن اور کابل کی خبریں پڑھنے کے بعد اپنے امام باڑہ میں گئے اور تعزیوں کی زیارت کی۔

۳ محرم ۱۲۱۰ھ (۲۰ جولائی ۱۷۹۵ء): نواب وزیر نے راجہ جھاؤ لعل کو حکم دیا کہ نجف اشرف میں روضہ حضرت علی پر نذر کرنے کے لیے دو سو طلائی کمربند اور ایک لاکھ روپے کی مالیت کے دیگر سامان تیار کیے جائیں۔ نواب وزیر راجہ جھاؤ لعل کے تعزیہ کی زیارت کو گئے۔ سو روپے نذر کیے۔ راجہ موصوف نے پانچ سو روپے نذرانہ پیش کیے۔

۴ محرم ۱۲۱۰ھ (۲۱ جولائی ۱۷۹۵ء): کل نواب وزیر الماس علی خاں کے امام باڑہ کی زیارت کو گئے، سو روپے نذر کیے۔ غربا کے تعزیوں کی زیارت کی اور پانچ روپے فی تعزیہ نذر کیا۔

۵ محرم ۱۲۱۰ھ (۲۲ جولائی ۱۷۹۵ء): کل نواب وزیر نے دین محمد چودھری کے تعزیہ کی زیارت کی اور سو روپے نذر کیے مزید سو روپے وارث علی کے تعزیہ پر نذر کیے۔ مسٹر چیری اور دیگر انگریز افسران ملاقات کے لیے نواب وزیر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے امام باڑہ میں تعزیوں کی زیارت بھی کی۔

۶ محرم ۱۲۱۰ھ (۲۳ جولائی ۱۷۹۵ء): نواب وزیر نے راجہ بھوانی مشرا کے تعزیہ پر پانچ سو روپئے نذر کیے۔ راجہ نے تحفۃً میں دو ہزار روپے پیش کیے۔

۷ محرم ۱۲۱۰ھ (۲۴ جولائی ۱۷۹۵ء): درگاہ حضرت عباس پر حاضر ہوئے اور پانچ سو روپئے نذر کیے۔ وہاں سے مہاراجہ ٹکیٹ رائے کی حویلی گئے اور تعزیہ پر پانچ سو روپئے نذر کیے۔ مہاراج نے پانچ اشرفیاں اور پانچ ہزار روپئے نذر کیے۔ اس کے بعد نواب وزیر گوگھاٹ گئے اور میر مسیتا کے تعزیہ پر پانچ سو روپئے نذر کیے۔

۸ محرم ۱۲۱۰ھ (۲۵ جولائی ۱۷۹۵ء): شام کو نواب وزیر اپنے امام باڑہ تشریف لے گئے۔ میاں عالم علی خاں کی حویلی سے حضرت قاسم ابن حسن کی یاد میں جلوس مہندی برآمد ہوا۔ نواب موصوف نے روضہ خوانی سماعت فرمائی اور ماتم کیا۔ محل سرا کو لوٹ آئے۔ چندے آرام کے بعد سواری میں امام باڑہ آغا باقر گئے، تعزیہ پر نذرگذاری اور محل سرا کو لوٹ آئے۔

۹ محرم ۱۲۱۰ھ (۲۶ جولائی ۱۷۹۵ء): نواب وزیر قدم رسول کی زیارت کو گئے اور تعزیہ پر سو روپئے نذر کیے۔

۱۰ محرم ۱۲۱۰ھ (۲۷ جولائی ۱۷۹۵ء): شب عاشور نواب وزیر کو متلی ہوئی، معالج حاضر ہوئے، دوائیں دی گئیں۔ صبح عاشور نواب وزیر بیدار ہوئے۔ امرا سلامی کے لیے حاضر ہوئے۔ نواب وزیر اپنے امام باڑہ تشریف لے گئے۔ اپنے وزیروں کے ہمراہ ماتم کیا۔ اس کے بعد دریائے گومتی کے پار جلوس تعزیہ میں شریک ہوئے۔ بعد دفن تعزیہ محل سرا کو لوٹ آئے۔ بارہ گھنٹے مکمل آرام کیا، پھر بیدار ہوئے۔ ماتمی لباس زیب تن کیا۔ محمد علی نمو نمائی کو ایک لاکھ روپے

دیئے۔ حسین علی خاں کو حکم دیا کہ شہزادوں، سادات اور ان کی خواتین میں ماتمی لباس تقسیم کیا جائے۔ امام حسن و امام حسین کے نام پر پانچ ہزار روپے غریبوں اور ناداروں میں خیرات کیے گئے۔ رات کے کھانے کے بعد نواب وزیر آرام کے لیے بستر پر گئے۔

۱۲ر محرم ۱۲۱۰ھ (۲۸ر جولائی ۱۷۹۵ء) : نواب وزیر حسب معمول بیدار ہوئے۔ امرا تعظیم بجالائے۔ مسٹر چیری بھی ملاقات کے لیے حاضر ہوئے۔ چونکہ ابر باد تھا، مسٹر چیری کو شال اوڑھنے کو دی گئی۔ انھوں نے نواب وزیر سے گفتگو کی۔

۱۳ر محرم ۱۲۱۰ھ (۲۹ر جولائی ۱۷۹۵ء) : کل تحسین علی خاں کو حکم دیا گیا کہ ائمہ کرام کی یاد میں بڑے پیمانہ پر کھانا پکوا کر غربا و مساکین میں تقسیم کرائیں۔ محرم کے اخراجات کی تفصیل مع تعزیہ اور روشنی پیش کیے گئے۔ نواب وزیر نے ملاحظہ کیا۔

مذکورہ بالا کوائف کی روشنی میں آصفی دور کی عزاداری کا اجمالی خاکہ تیار کیا جا سکتا ہے جن سے کئی اہم و معنی خیز معلومات حاصل ہوتے ہیں اولاً یہ کہ شہر لکھنؤ میں متعدد امام باڑے تھے جن میں نفاست سے قیمتی تعزیے و علم استادہ کیے جاتے تھے۔ ان کے علاوہ گھر گھر میں تعزیہ داری ہوتی تھی۔ ہر شخص اپنی توفیق کے اعتبار سے تعزیہ استادہ کرتا تھا۔ نواب آصف کی سیر چشمی کسی کو مایوس نہیں ہونے دیتی تھی۔ وہ بہ نفس نفیس چھوٹے بڑے امیر و غریب ہندو و مسلمان سب کے تعزیوں کی زیارت کے لیے جاتے اور زرِ نقد نذر کرتے۔ دوئم یہ کہ ایسٹ انڈیا کمپنی صاحب اقتدار ہونے کے باوجود عزاداری میں مخل نہیں ہوتی تھی بلکہ اس کے عملہ بھی عزاداری میں حصہ لیتے تھے۔ سوئم یہ کہ نواب وزیر کی زرپاشی کا بہاؤ شیعوں کے مقابلہ میں سنیوں کی طرف اور سنیوں کے مقابلہ میں ہندوؤں کی طرف زیادہ ہوتا تھا۔ روضہ خوانوں کو پانچ سو روپئے فی کس ملتے تھے۔ لیکن مرثیہ خواں (جس میں مرثیہ نگار بھی شامل ہیں) کی قدر افزائی محض عطیہ دوشالہ تک محدود تھی۔ کسی کو زرنقد نہیں دیا جاتا تھا۔ ممکن ہے کہ مرثیہ گویوں کے احترام کے پیش نظر کیا جاتا ہو، بہرحال نواب آصف الدولہ کی زرپاشی سے سارا شہر فیض یاب ہو رہا تھا، علاوہ مرثیہ گویوں کے۔ اس سے یہ حقیقت بے نقاب ہوتی ہے کہ نوابین اودھ کی زرپاشی سے مرثیہ سننے

اودھ میں عروج حاصل کیا۔ چہارم یہ کہ عزاداری محض عشرہ محرم تک محدود تھی۔ گیارہویں محرم سے معمولات شروع کر دیئے جاتے تھے۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ دورِ آصفی میں عزاداری کو عوامی مقبولیت حاصل ہو گئی تھی۔ مختلف العقائد کے برگ و بار میں یہ تناور درخت فطری نشو و نما پا رہا تھا۔ اس کی جڑیں عصری سماجی زندگی میں پیوست تھیں۔ آصف الدولہ نے اظہار محبت و مودت اہل بیت اطہار میں باہمی ہم آہنگی کو رشتۂ جاں بنا دیا تھا۔ اس کے مخالف کو عتاب آصفی کا شکار بننا پڑتا تھا۔ آصفی سرپرستی ابر نیساں کی طرح عام تھی۔ انھیں معلوم ہوا کہ اس وقت کے بادشاہ عراق کی لاپروائی کی بنا پر زائرین کو کربلائے معلّٰی میں پانی کی قلت سے شدید تکلیفیں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ نواب موصوف نے حاجی محمد طہرانی کی معرفت ۷ لاکھ روپے صرف کر کے فرات کی ایک نہر تعمیر کرائی جو "نہر آصفی" کے نام سے مشہور ہوئی۔[۱۱] اب یہ نہر معدوم ہو چکی ہے لیکن اس سے آصف الدولہ کے عقاید محبت و مودت اہل بیت اطہار کی مزید توثیق ہوتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ آصف الدولہ فدائے محمد و آل محمد کی حیثیت سے زندہ رہے اور انھیں کی محبت و مودت میں موت سے ہم کنار ہوئے۔

آصف الدولہ کے بعد ان کے بیٹے نواب وزیر علی بخش کو بےدخل کر کے انگریزوں کی امداد سے نواب شجاع الدولہ کی دوسری بیوی کے بیٹے سعادت علی خان کو نواب وزیر کا عہدہ حاصل ہوا۔ نواب سعادت علی خان میں آصف الدولہ کی طرح کی داد و دہش کی اعلا صفات نہیں تھیں لیکن انھوں نے دربار کے آصفی ماحول کو برقرار رکھا۔ لکھنؤ کو فنون لطیفہ اور شعر و شاعری میں مرکزیت عطا کرنے کی کوشش کی۔ مختلف علوم و فنون کے ماہرین سے دربار کو آراستہ کیا گیا۔ عزاداری میں فروغ ہوا۔ درگاہ حضرت عباس میں ہر جمعرات کو خوب گہما گہمی ہوتی۔ سال بھر مجلسیں، نذر و نیاز اور فاتحہ و درود کا سلسلہ رہتا۔ محرم میں شہر بھر سے ہزاروں کی تعداد میں علم برآمد کیے جاتے، جو درگاہ حضرت عباس میں نذر کیے جاتے۔ دورِ نواب سعادت علی خاں میں عزاداری کے جوش و خروش کے متعلق سید انشار بیان کرتے ہیں:

ہوتی ہے اس میں تعزیہ داری امام کی   اس کی مدد کو ہیں حسنین اور ان کے جد[۱۲]

دورِ نواب سعادت علی خاں (۱۸۱۴-۱۷۹۸ء) کو عزاداری میں اس بنا پر بھی امتیاز حاصل ہے کہ اسی زمانہ سے لکھنؤ میں چہلم کی ابتدا ہوئی۔ اس کے قبل عشرۂ محرم کے بعد عزاداری کا سلسلہ منقطع ہو جاتا تھا جو آئندہ سال ہلال محرم دیکھنے کے بعد شروع ہوتا۔ اس دور کے ایک ممتاز مرثیہ خواں میر احسان علی نے عشرۂ عزا کی توسیع کر کے چہلم کی ابتدا کی۔ اس کے بعد غازی الدین حیدر (۲۷-۱۸۱۴ء) کی حکومت نوابی سے بادشاہی میں تبدیل ہوئی تو عزاداری میں بھی فروغ ہوا۔ نجف اشرف میں روضہ حضرت علی کی شبیہ کے طور پر ایک نیا امام باڑہ شاہ نجف تعمیر کیا گیا، جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ اس کے قریب ہی قدم رسول بھی ہے۔ غازی الدین حیدر کے دور میں شاہ نجف کو شاہی عزاداری کی مرکزیت حاصل ہو گئی۔ انھوں نے شاہ نجف میں عزاداری کے لیے کافی دولت وقف کی تحریری معاہدہ کے مطابق ایک خطیر رقم ایسٹ انڈیا کمپنی میں جمع کر دی تاکہ سال بہ سال عزاداری ہوتی رہے۔ غازی الدین حیدر کے بعد ان کے بیٹے نصیر الدین حیدر سریر آرائے سلطنت ہوئے۔ جو ایک کنیز کے بطن سے تھے لیکن غازی الدین حیدر کی اہلیہ بادشاہ بیگم نے اپنے بیٹے کی طرح پالا پوسا تھا۔ نصیر الدین حیدر کے دور میں بادشاہ بیگم کے اثرات بہت بڑھ گئے۔ موصوفہ مذہبی مزاج رکھتی تھیں اور عزاداری میں خصوصی شغف تھا۔ انھوں نے عزاداری سے متعلق مختلف و متنوع مراسم کی ابتدا کی۔ ایام عزا میں مزید توسیع کی گئی۔ ۸ ربیع الاول تک جلوس عزا کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ انھوں نے نصیر الدین حیدر کے جلوس کے پہلے سال ہی ایک فرمان جاری کر کے چہلم تک تقریب مسرت کرنے پر پابندی عاید کر دی۔ انگریز ریزیڈنٹ نے مداخلت کی، جس کے نتیجے میں نصیر الدین حیدر نے ماتم داری کو اختیاری قرار دے دیا لیکن عزاداری کی جڑیں اودھ کی عوامی زندگی میں اس طرح پیوست ہو چکی تھیں کہ ہر عام و خاص بہ رضا و رغبت چہلم تک خوشی کی کوئی تقریب نہیں کرتا تھا، نہ اس میں شرکت کرتا تھا۔

اس دور کی عزاداری کی تفصیلات ولیم نائٹن اور مسز میر حسن علی نے پیش کیے ہیں۔ یہ بیانات تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ولیم نائٹن ساڑھے تین برس تک نصیر الدین شاہ کا مصاحب رہا۔ روزانہ کے واقعات بطور یادداشت لکھتا رہا مسز میر حسن علی انگریز خاتون تھیں، جنھوں نے کسی امیر حسن علی سے شادی کر لی تھی۔ دونوں کے بیانات پایہ اسناد رکھتے ہیں۔ دورِ نصیر الدین حیدر میں لکھنؤ کی عزاداری کے متعلق ولیم نائٹن نے اپنی کتاب میں ایک باب رکھا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> "اس زمانے میں امام باڑوں میں روشنی کی یہ بہتات اور اسی روشنی میں کارچوبی کام کی چیزوں کی اس قدر چمک دمک ہوتی ہے کہ آدمی کی نظر کو چکا چوندھ لگ جاتی ہے علموں کے طلائی و نقرئی پنجوں کی جگمگاہٹ اور ان کے بھاری بھاری پٹکوں کی سجاوٹ۔ زردوزی کام پر گنگا جمنی کرن کی جھالروں کی زیبائش اور ان کی وجہ سے در و دیوار آب و تاب بس سارا امام باڑہ بقعۂ نور ہو جاتا..... ایام محرم میں برابر تعزیوں کے گرد بڑی بڑی سرخ و سبز رنگ کی مومی توغیں روشن رہا کرتی ہیں اور شب و روز دو مرتبہ مجالس عزا امام باڑوں میں منعقد ہوا کرتی ہیں جس میں شام کی مجلس زیادہ دلچسپ ہوتی ہے..... (شاہی) جلوس میں سب کے آگے چھ سات ہاتھی ہوتے تھے جن پر مغرق جھولیں یا کھریں پڑی نقرئی، طلائی ہودے، عماریاں اور گلے میں نقرئی گھنٹے اور ہیکلیں لٹکتی ہوئی ہوتی تھیں ہر ایک ہاتھی پر کچھ لوگ جواہر نگار علم ہاتھوں میں لیے سوار ہوتے تھے اور ان کے ہمراہ سپاہیوں کا ایک گارد ہوتا تھا۔ ہاتھیوں کے پیچھے ایک شخص خاص طور پر سوگوار بنا ہوتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بانس کی ایک بڑی چھڑی سیاہ کپڑے سے منڈھی ہوتی تھی۔ اس چھڑ کے اوپر ایک الٹی کمان میں دو ننگی تلواریں لٹکتی ہوتی تھیں۔ اس کے پیچھے خود بادشاہ سلامت ہوتے تھے ان کے گرد و پیش خاندان شاہی کے لوگ مقرب، مقرب علمائے مذہب ہوتے تھے۔"[۳۳]

مسز میر حسن علی شب عاشور کے متعلق لکھتی ہیں کہ:

> "غریب ہو یا امیر، ہر ایک عزادار اپنے امام باڑے کو حتی الوسع آراستہ کرتا ہے۔ اتنی روشنی کی جاتی ہے کہ آنکھیں نہیں ٹھہرتیں۔ رات بھر لوگ روشنی دیکھنے کے لیے

پھرتے رہتے ہیں۔ عورتیں اپنے گھروں میں گریہ وزاری کرتی ہیں۔ رات بھر مجلس و ماتم کرتی ہیں۔"[24]

ہندؤوں کی عزاداری کے بارے میں لکھتی ہیں کہ:

"ہر شیعہ کے گھر میں تعزیہ رکھا جاتا ہے۔ ہندؤوں میں بھی تعزیہ سے عقیدت عام ہے۔ وہ لوگ تعزیہ کو دیکھ کر مودبانہ جھک جاتے ہیں۔ مجالس میں شریک ہوتے ہیں۔ مسلمان بخوشی اپنے ساتھ بٹھاتے ہیں۔ امام باڑہ میں کوئی بھی شخص داخل ہونے سے قبل اپنے جوتے اتار دیتا ہے۔ یہ اس قدر عام ہے کہ اب یورپین لوگوں کے علاوہ کسی سے جوتے اتارنے کے لیے کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔"[25]

اپنا ایک دلچسپ تجربہ لکھتی ہیں:

"میرا باورچی ایک مجوسی تھا۔ عزاداری میں چالیس روپے خرچ کرتا تھا اور مسلمانوں کی جوش و خروش کا اظہار کرتا تھا۔ روز عاشورہ دفن تعزیہ کے بعد اپنے دھرم کرم میں لوٹ آتا تھا۔"[26]

بادشاہ نصیر الدین حیدر کی عزاداری کے متعلق مولوی نجم الغنی نے تفصیل سے لکھا ہے۔ ذیل میں ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

"ہر امام کی ولادت کی تاریخ میں حسب قاعدہ مجلس عزا برپا ہوتی تھی اور بارگاہ پھولوں سے نہایت خوشنما تیار ہوتی تھی۔ باغات سلطانی میں جتنے خوشبودار پھول ہوتے وہ اور ان کے سوا بازاروں سے پانچ ہزار روپے روز کے پھول عشرہ محرم تک مول آتے تھے۔ اس زمانے میں خوشبودار پھول بڑے آدمیوں کو بھی مشکل سے ملتے تھے۔ اس بارگاہ کا طول سو قدم سے کم نہیں ہوتا تھا اور عرض پندرہ بیس قدم سے زیادہ ہوتا تھا۔ کبھی طلائی کبھی نقرئی مقیش اور ستاروں اور بادلے کی جھالریں پھولوں کی جگہ کام میں لائی جاتی تھیں۔ عطریات سے وہ مکان بسایا جاتا تھا۔ غرضیکہ ہر امام کی ولادت کی تقریب میں پہلے دن سے چھ دن تک برابر اور ہر امام کی وفات کے دنوں میں کئی روز تک اور محرم کی پہلی تاریخ سے چہلم تک بادشاہ نے اپنے اوپر لازم کر لیا تھا کہ بہ نفس نفیس وہاں کی خدمت ہزار دل و جان سے فرماتے تھے۔ وفات و شہادت کے دنوں میں مرثیہ خوانی ہوتی اور شربت اور مٹھائی اور میوہ جات صرف ہوتا تھا۔ ان مصارف میں چار پانچ لاکھ روپوں سے کم خرچ نہ ہوتے بلکہ زیادہ تصور کرنا چاہیے۔ بادشاہ محرم کی پہلی تاریخ کو سو پچاس تعزیے درِ دولت سے مقام معہود تک اپنے سر پر پہنچاتے تھے۔ ہر مرتبہ کی آمد و رفت میں کئی کوس زمین پاپیادہ طے ہوتی تھی اور آنا جانا کنکریوں کی زمین پر برہنہ پا ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ تلووں سے وہ کنکریاں کانٹوں کی طرح کھٹکتی تھیں۔"[27]

دورِ محمد علی شاہ ۱۸۳۷-۴۲ء میں امام باڑہ حسین آباد کی تعمیر کے بعد یکم محرم کو جلوس ضریح کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ ضریح امام باڑہ آصفی میں استادہ کی گئی۔ وہیں سے جلوس برآمد ہوتا۔ اس جلوس نے عزاداری میں مزید شان پیدا کر دی۔ اس کے پہلو بہ پہلو شیخ خدا بخش کے جلوس چہلم کی شہرت تھی۔ عظیم آباد (پٹنہ) کا ایک باشندہ نجات حسین خاں خاص طور پر لکھنؤ کا جلوس چہلم دیکھنے آیا۔ اس نے جلوس چہلم کی متحرک تصویر پیش کی ہے کہ "سہ پہر کو جلوس دارالشفا کی مسجد (اب وجود نہیں!) کے قریب سے گذرا۔ آگے آگے سات روٹیاں سیاہ کپڑوں میں ڈھنکی ہوتی تھیں، ان کے سوار بھی سیاہ پوش تھے۔ اس کے بعد سترہ سیاہ پوش ہاتھی تھے، جن پر بلند پرچم اور علم استادہ تھے۔ سیاہ و سرخ پھریرے کے علم تھے، جن پر اللہ اور پنجتن محمد، علی، فاطمہ، حسن، حسین کے نام سونے اور چاندی کے تاروں سے بنائے گئے تھے۔ اس کے بعد سرکاری لوگ تھے، جن کے ہاتھوں میں سونے اور چاندی کے ماہی مراتب تھے۔ جلوس ایک میل سے زیادہ لمبا تھا۔ پیچھے ماتمی دھن بجاتے ہوئے دستے تھے۔ اس کے پیچھے "آب خوارہ" (پانی شربت وغیرہ) تھا، جو شرکا کو سیر و سیراب کر رہا تھا۔ اس کے بعد دو تین ذوالجناح اور تابوت تھے۔ تابوت پر تیر آویزاں تھے۔ ذوالجناح پر خون کے دھبے تھے۔ ان کے پیچھے سیکڑوں لوگ سروں پر تعزیے اٹھائے تھے۔ سب کے آخر میں شیخ خدا بخش کا تعزیہ تھا۔ تعزیوں کے گرد و پیش ہزاروں ماتم دار تھے، سر برہنہ، پیادہ پا۔

آنکھوں سے آنسو جاری۔ مختلف قوموں کے الگ الگ گروہوں میں شامل تھے ماوراالہندی، مغل وغیرہ الگ ماتم کرتے تھے۔ عجب عالم تھا کہ اگر امام حسین کا قاتل شمر آجائے تو تڑپ اٹھے۔[28]

سید امجد علی شاہ (۴۲-۱۸۴۷ء) انتہائی مذہبی تھے۔ ان کے دور میں عنانِ سلطنت دو علمائے شیعہ سلطان العلما، سید محمد مجتہد اور سید العلما، سید حسین مجتہد کے ہاتھوں میں تھی، فطری طور پر عزاداری میں خصوصی دلچسپی لی گئی۔ امام باڑہ سبطین آباد تعمیر ہوا، جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ امام باڑہ کو قیمتی ساز و سامان سے آراستہ کیا گیا تھا۔ ایام عزا میں روشنی کا خاص اہتمام کیا جاتا۔ بڑی شان و شوکت سے عزاداری ہوتی۔ امجد علی شاہ کے وزیر اعظم نواب امین الدولہ بھی بڑے دیندار و متقی و پرہیزگار تھے۔ انھوں نے بھی اپنا امام باڑہ تعمیر کرایا۔ بادشاہ کے معتمد اور داروغہ عمارات جگن ناتھ اگروال (بعدہٗ غلام رضا خاں) نواب شرف الدولہ نے بھی شاندار امام باڑے تعمیر کرائے جن کا ذکر آ چکا۔ ان میں بھی شاندار عزاداری ہوتی تھی۔ عزاداری سے امجد علی شاہ کے غیر معمولی شغف کا ذکر کرتے ہوئے مولوی نجم الحسن لکھتے ہیں،

"ایک بار مرزا حیدر شکوہ شاہزادہ تیموریہ نے امجد علی شاہ سے عرض کیا کہ ایک رات میرے تعزیہ خانہ میں شعاعِ آفتاب سے بھی تیز نور حضرت امام حسین کی ضریح پر ظاہر ہوا۔ در و دیوار اور چھت بھی زیادہ چمکنے لگی اور حضرت عباس کا علم جو ضریح کے پاس کھڑا تھا، وہ ضریح پر جھک گیا۔ بادشاہ نے یہ سن کر ڈھائی ہزار روپے دے کر شاہزادے سے وہ ضریح و علم خرید کے اپنے تعزیہ خانے میں رکھوا لیے۔..... اسی طرح ایک دن میر ذکی مرثیہ خواں نے بادشاہ سے عرض کیا کہ میرے مکان میں حضرت امام حسین کا پنجہ موجود ہے۔ بادشاہ نے وہ مانگ لیا اور انعام بخشا۔۔۔"[29]

شاہی محل میں بھی بڑے جوش و خروش سے عزاداری ہوتی تھی جس میں سید انشا کی تین نواسیاں مرثیہ پڑھتی تھیں![30]

آخری تاجدار اودھ سلطان عالم واجد علی شاہ اختر کے دورِ حکومت میں بجھتی ہوئی شمع کی لَو اتنی تیز ہو گئی تھی کہ آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ واجد علی شاہ مختلف علوم و فنون کی سرپرستی ہی نہیں کرتے تھے بلکہ خود ماہرانہ دسترس رکھتے تھے۔ وہ خود مرثیہ گو و مرثیہ خواں تھے۔ عزاداری سے بے پناہ شغف تھا۔ اہلبیت اطہار اور خاص کر امام حسین پر دل و جان سے نثار تھے۔ انھوں نے بھی 'قصر العزا' کے نام سے قیصر باغ میں عظیم الشان امام باڑہ تعمیر کرایا، جس کا ذکر آچکا ہے۔ انتزاع سلطنت اودھ تک لکھنؤ میں انتہائی جوش و خروش سے عزاداری کرتے رہے۔ بعدہٗ قید فرنگ نے مٹیا برج میں ڈالا تو وہاں بھی سب کچھ عزاداری پر نثار کرتے رہے۔ شرر لکھنوی لکھتے ہیں،

"مٹیا برج میں بادشاہ کی محرم کی خاص طور پر تیاریاں کی جاتیں سب امام باڑے آراستہ ہوتے۔ گھروں میں اندر باہر قلعی کر دی جاتی۔ بادشاہ کے یہاں ۲۹ ذی الحجہ کو ضریح کے ساتھ ماہی مراتب، شاہی جلوس، جھنڈی بردار اور باجے والے ہوتے۔ کہیں کہیں ۳۰ ذی الحجہ یا پہلی محرم کو تعزیے آتے۔ بادشاہ ۲۹ ذی الحجہ سے ماتمی لباس پہن لیتے جو اکثر سبز ہوتا اور کبھی سیاہ۔ محرم میں مٹیا برج میں جگہ جگہ لنگر جاری ہو جاتا۔ شاہی مجلسیں روزانہ ہوا کرتیں جن میں پلاؤ، شیرمال یا باقر خانیاں تقسیم ہوتی۔ مقامی ذاکرین کے علاوہ دیگر مقامات اور زیادہ تر لکھنؤ سے ذاکر آتے اور بادشاہ کی طرف سے انعام اور خلعت لے کر واپس جاتے..... ساتویں محرم کو مہندی اٹھتی تھی اور اسی روز نواب نشاط محل بادشاہ کو منت کا چھلا اور ناڑہ پہناتی تھیں۔ مغرب کے وقت بادشاہ بھی مہندی کے ساتھ ہوتے بڑے کر و فر باجے اور جلوس سے جاتی.... دسویں محرم کو علی الصبح سب سے پہلے سبطین آباد کی شاہی ضریح ہوتی۔ اس کے بعد محلات کے تعزیے اور دولہاؤں کے تعزیے پوری شان و شوکت اور جلوس سے اٹھائے جاتے اور غلام عباس کی کربلا جاتے۔ سبطین آباد کی ضریح نو یا سوا نو بجے کربلا پہنچ جاتی پھر دن بھر دوسرے تعزیوں کا سلسلہ جاری رہتا۔ بادشاہ ابتدا میں کربلا تک ضریح کے ساتھ پیادہ پا جاتے تھے مگر آخری عمر میں ضعف کی وجہ سے تھوڑی دور جاکے واپس آجاتے۔ مجلسوں کا سلسلہ چہلم تک جاری رہتا۔ سوم، دسویں، بیسویں اور چہلم کی مجلسیں بڑے پیمانے پر ہوتیں۔"

مذکورہ بالا جائزہ اودھ میں عزاداری کا محدود خاکہ پیش کر

جس میں سلطنت اودھ کے دو مراکز فیض آباد اور لکھنؤ کی عزاداری کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ مراکز حکمرانوں کی سرپرستی میں رہے۔ ان کے باہر عوامی سطح پر عزاداری کو مقبولیت حاصل تھی۔ اودھ کا کوئی علاقہ ایسا نہیں رہا ہوگا جس میں عزاداری نہ ہوتی رہی ہو، خواہ وہ نواب سعادت علی خاں کے معاہدۂ الہ آباد (۱۰ نومبر ۱۸۰۱ء) کے قبل کا اودھ ہو یا بعد کا۔ ان میں بعض مقامات کی عزاداری اپنے اطراف و جوانب میں مشہور و معروف رہی ہے۔ شہروں میں خاص طور پر الہ آباد، بنارس، جونپور، بہرائچ، اناؤ، غازی پور وغیرہ اور قصبات میں زید پور اور ردولی (بارہ بنکی) محمود آباد (سیتاپور) مچھلی شہر (جونپور)، اترائوں (الہ آباد) جائس و نصیر آباد (رائے بریلی) وغیرہ کا خاص طور پر ذکر کیا جا سکتا ہے۔ ان کے علاوہ اودھ کے تقریباً ہر شہر اور زیادہ تر دیہاتوں میں عزاداری ہوتی رہی ہے۔ ان میں سلطنت اودھ کی عزاداری کے اثرات نظر آتے ہیں لیکن مقامی ضرورتوں کے اعتبار سے ترمیم و تنسیخ بھی ہوتی رہی ہے۔ ان شہروں اور دیہاتوں میں بھی مرثیہ نگار رہے ہیں لیکن عام طور پر مشہور مرثیہ نگاروں کے مراثی کی خواندگی پر زور رہا ہے۔ جلوس ہائے عزا کے متعلق بھی ضابطے مقرر رہے ہیں۔ کس منزل پر کون مرثیہ پڑھا جائے گا اور کون پڑھے گا اس کی بھی پابندی کی جاتی رہی ہے۔ عوام میں نوحہ کے طرز پر "ڈھنوں" کا رواج ہوا۔ ڈہے اپنے آپ میں ایک صنف شاعری ہے۔ جلوس کے ساتھ عام طور سے دیہاتی عورتیں لحن سے کہتی ہوئی گزرتی تھیں، جس کو اصطلاحاً 'ڈہارنا' کہتے ہیں۔ ان مباحث پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے، جس کا متحمل یہ مضمون نہیں ہو سکتا۔

حواشی:

۱ سید اطہر عباس رضوی اے سوشیو انٹلکچول ہسٹری آف اثنا عشری شیعیز ان انڈیا۔ ج ۱ ص ۳۰۸۔

۲ لطائف اشرفی۔ ج ۲۔ ص ۲۶۸

۳ ایضاً ۴ ایضاً

۵ سید کمال الدین حیدر، قیصر التواریخ ج ۲ ص ۱۱۰

۶ فیض گزیٹو ص ۲۱۵

کلیات جرأت (مخطوطہ) ورق نمبر ۲۱۰ لکھنؤ یونی ورسٹی لائبریری

۷ محمد خاں شاہجہاں پوری، ملفوظات رزاقی ص ۱۰۴

۸ سید غلام علی خاں، عماد السعادت ص ۸۳ ۹ کلیات سودا (مخطوطہ) محمود آباد

۱۰ نجم الغنی، تاریخ اودھ ج ۳ ص ۲۹۷ ۱۱ لکھنؤ گزیٹر ص ۲۰۲

۱۲ نجم الغنی، تاریخ اودھ ج ۳ ص ۲۹۷ ۱۳ مرتضیٰ حسین بلگرامی حدیقۃ الاقالیم ص ۱۵۵

۱۴ ڈبلو ہیبر، نیریٹو آف دی جرنی ۱۵ مرزا ابو طالب لندنی تفضیح الغافلین ص ۱۱۵

۱۶ سید عبد اللطیف خاں شوستری، تحفۃ العوام ص ص ۵۳۳-۵۳۲

۱۷ مرزا محمد کاظم، رسالہ سوانح عمری ص ۴۸-۴۷

۱۸ سید غلام علی خاں، عماد السعادت ص ۱۷۲، تھامس ولیم بیل مفتاح التواریخ (ترجمہ)ص
نجم الغنی، تاریخ اودھ ج ۳ ص ۳۰۰

۱۹ سید اطہر عباس رضوی، ہسٹری آف اثنا عشری شیعیز ان انڈیا ج ۱ ص ۳۰۹

۲۰ ڈاکٹر اکبر حیدری (اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقا ص ۹۲) نے کربلا کی بجائے نجف لکھا ہے جو غیر صحیح ہے۔ ج۔ ہ

۲۱ سید بصیرات حسین تنویر امامت ص ۵۴ (مخطوطہ) محمد علی جون پوری زینت الزائرین ص ۵۵

۲۲ کلیات انشا، مخطوطہ مکتوبہ ۱۲۴۴ھ

۲۳ ولیم ناٹن، دی پرائیوٹ لائف آف این ایسٹرن کنگ (اردو ترجمہ، شباب لکھنؤ محمد احمد علی) ص ص ۱۳۶-۱۴۹ (لکھنؤ ۱۹۱۳ء)

۲۴ مسز میر حسن علی، آبزرویشن آن دی مسلمان آف انڈیا ص (سنہ اشاعت ۱۸۳۲ء)

۲۵ ایضاً ۲۶ ایضاً ص ص ۱۷-۲۸

۲۶ ,, وان ڈرنگ آف پل گرمس ان سرچ آف پکچرس ڈیورنگ فور ایئر ریزیڈنس ان دی ایسٹ ج ۱ ص ۲۹۶ (سنہ اشاعت ۱۸۵۰ء)

۲۷ نجم الغنی: تاریخ اودھ ج ۴ ص ص ۳۹۶-۳۹۷

۲۸ سید حسن: چند تحقیقی مقالے ص ۷-۹ (پٹنہ ۱۹۷۶)

۲۹ نجم الغنی: تاریخ اودھ ج ۵ ص ۲۴ ۳۰ عبد الحلیم شرر، جان عالم ص ص ۱۵۷-۱۵۹

> "قدیم لکھنؤ میں بیسنی روٹی بڑی پسندیدہ غذا تھی۔ آخری تاجدارِ اودھ کو بیسنی روٹی سے عشق تھا"
>
> ——— لکھنؤ کا دسترخوان۔ مرزا جعفر حسین

پروفیسر محمود الحسن
صدر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

جغرافیائی اور تہذیبی پس منظر

ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اودھ کو اپنی تاریخی، سیاسی اور ثقافتی حیثیت سے دورِ قدیم سے ہی ایک امتیاز حاصل رہا ہے بلکہ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ یہاں سے جو تہذیبی و فکری قدریں ابھریں اس نے ملک کے مختلف گوشوں کو متاثر کیا اور خود اس میں بھی بہت سی قدروں کا اشتراک ہوتا گیا۔ امتدادِ زمانہ اور سیاسی و تاریخی انقلابات و نشیب و فراز اس کے جغرافیائی حدود میں تبدیلیاں ضرور پیدا کرتے رہے لیکن اس کے مرکزی علاقہ میں جو مخصوص روایات نشو و نما پاچکی تھیں ان کے نقوش ہر دور میں برقرار رہے اور اس کی اہمیت کسی نہ کسی شکل میں آج بھی قائم ہے۔

مؤرخین میں اس بات پر پوری طرح اتفاق نہیں پایا جاتا کہ "اودھ" کی وجہ تسمیہ کیا ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ یہ لفظ "ایودھیہ" کا اپ بھرنش ہے عام بول چال میں "ایودھیہ" سے "اودھ" بن گیا۔ فارسی رسم الخط کے لحاظ سے بھی اس کا تلفظ "اودھ" ہی رائج ہوگیا اسی لئے سولھویں صدی عیسوی تک (مغلوں کے اثرات سے پہلے) کسی جگہ "اودھ" نہیں بلکہ "ایودھیا" ہی پایا جاتا ہے۔ "ایودھیا" کا یہ نام کیوں پڑا اس سلسلے میں بھی کوئی قطعی رائے نہیں پائی جاتی۔ بعض اس کی مناسبت "अज-युद्ध" یعنی ब्रहमा की अपराजेय नगरी سے دیتے ہیں اور بعضوں کے خیال میں اس لفظ کا تعلق "अ + युध" یعنی अजेय नगरी سے ہے۔ یہاں کے جنگجو اور بہادر باشندوں کے کارناموں کی بنیاد پر ڈاکٹر WILSON نے یہ نظریہ بھی پیش کیا ہے کہ "اس کا تعلق لفظ "युद्ध" سے زیادہ مناسب ہے یعنی (جنگجو چھتریوں کا شہر) "युद्ध वीर क्षत्रियों का नगर"[1]۔ عوام میں ایک روایت یہ بھی مقبول ہے کہ جب شری رام چندر جی بن باس کی مدت ختم کرکے واپس آئے تو اسی अवधि کی بنا پر اس کا نام "ایودھیا" (अयधि) پڑ گیا۔ لیکن یہ بات قرین قیاس نہیں ہے کیونکہ اس بات پر بھی مؤرخین متفق ہیں کہ "ایودھیا" نام رام چندر جی کے بن باس سے پہلے بھی رائج تھا بلکہ والمیک نے رامائن میں تو یہ لکھا ہے کہ "ایودھیا" کی بنیاد "منو" نے ڈالی تھی، باب ۵، اشلوک ٦ میں وہ لکھتے ہیں :-

"अयोध्या नाम नगरी तत्रासील्लोक विश्रता
मनुना मान्वेन्द्रेण या पुरी निर्मिता स्वयम" [2]

بہرحال قبل تاریخ کے ایودھیا کے حدود اربعہ کی معلومات حاصل کرنے کے ذرائع مفقود ہونے کی وجہ سے اس سلسلہ میں کوئی قطعی بات نہیں کہی جاسکتی نہ اس کی تحقیق پیشِ نظر ہے لیکن تقریباً ڈھائی ہزار سال پہلے ہندوستان کا وسطی علاقہ چار ریاستوں (کوشل، کاشی، مگدھ اور ویدیہ (विदेह) پر مشتمل تھا جس میں کوشل راج کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی اور اسی کی راجدھانی "ایودھیا" تھی۔ ڈاکٹر سرجو پرشاد اگروال لکھتے ہیں کہ "مہا پران کے انوسار اس میں سات لاکھ گاؤں بنائے گئے ہیں"[3] اس کا رقبہ پانچ ہزار مربع میل تھا اور ڈاکٹر رائے چودھری کے مطابق "کوشل کا علاقہ تقریباً موجودہ اودھ کے برابر تھا جو پورب میں ویدیہ راج، پچھم میں پنچال، دکھن میں سئی ندی اور شمال میں نیپال کے پہاڑی علاقے تک پھیلا ہوا تھا"[4] اور یہی وہ حدود ہیں جو اس علاقہ کے تقریباً برابر ہیں جسے موجودہ اودھ کی حیثیت سے مانا جاتا ہے۔ کوشل کے دارالسلطنت کی حیثیت سے سیاسی طور پر تو ایودھیا کو مرکزی اہمیت حاصل تھی ہی جہاں مان دھاتا، ہریش چند، سگر، دلیپ، رگھو، اج، اور دشرتھ وغیرہ عظیم راجاؤں کے علاوہ رام چندر جی ایسے ایشور کے اوتار گذرے ہیں یہاں تک

ساتھ ہندو مذہب کا تیرتھ استھان ہونے کی وجہ سے اسے ہمیشہ سے عقیدت وعظمت کی نظر سے دیکھا جاتا رہا ہے' اس دور کا ذکر کرتے ہوئے Samuel Lucas لکھتا ہے کہ :-

"Before we knew of its existence, Oude was a country of ancient traditions and the scene of India's earliest romance. In the first great Sanscrit epic "The Ramayan" it is the residence of a splendid king and an heroic people and its capital Ayodhya, or OUde, is filled with gorgeous accessories."* ۵

چنانچہ انھیں روایات کا اثر تھا کہ بہت سے سیاسی انقلابات وانتشار کا سامنا کرنے کے باوجود ساتویں صدی تک جبکہ یہ چندر گپت وکرماجیت کا پایہ تخت تھا، اس کی اہمیت اور مرکزیت میں کسی طرح کی کمی واقع نہیں ہوئی البتہ جب ساتویں صدی میں ہرش اس علاقہ پر قابض ہوا تو اس نے اپنا پایۂ تخت ایودھیا سے تبدیل کرکے قنوج بنادیا اور اس کے بعد ہی ملک میں ہر طرف ایسی بے اطمینانی، ہیجان اور غیر یقینی حالت تھی کہ کسی حکومت کو زیادہ عرصہ تک استحکام حاصل نہیں رہا' مختلف طاقتوں کا تصادم' حکمرانوں کی لڑائیاں، سلطنتوں کے نشیب وفراز یہ ساری کشمکش ایسی بر پا تھی کہ کوئی جگہ مرکزی حیثیت نہ حاصل کر سکی، کہیں راجپوت طاقت پکڑ رہے تھے کہیں ان کے مخالفین اور یہ سلسلہ تقریباً بارھویں صدی عیسوی تک چلتا رہا جبکہ مسلمانوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اپنی طاقت مضبوط کرکے حکومتیں قائم کرلیں چنانچہ اس درمیان میں تقریباً پانچ سو سال تک اجودھیا کی تاریخ پر بھی تاریکی کے پردے پڑے ہوئے ہیں - اسی چیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے Carnegi نے Oudh Gazetters میں لکھا ہے کہ :-

"The History of Ajodhya, however, as of nearly all Hindu Kingdoms between the 7th & 11th centuries, is a mystry." ۷

البتہ اس علاقے میں کچھ ایسی ہی جاذبیت واہمیت تھی کہ جیسے ہی سیاسی نظام کو مسلمان حکمرانوں کے ذریعہ استحکام حاصل ہوا' اس کی مرکزی حیثیت دوبارہ ابھرنے لگی -

مذہبی اعتقاد کی رُو سے تو مسلمان ایودھیا سے اپنا تعلق ابتدائے آفرینش ہی سے قائم کرتے ہیں چنانچہ یہ روایت آج تک مشہور ہے کہ جناب یعقوبؑ، جناب شیثؑ اور حضرت نوحؑ کی قبریں اسی مقام پر ہیں - ابو الفضل نے آئینِ اکبری میں بھی اس کا ذکر کیا ہے' وہ لکھتا ہے :-

دریں شہر دو قبر بزرگ ساختہ اند' شش و
ہفت گزی - بر خوانند خوابگاہِ شیثؑ و ایوبؑ
پندارند و زرداخت ہا برخوانند" ۸

لیکن ان خیالات سے قطع نظر سیاسی طور پر یہ علاقہ مسلمان حکمرانوں کے قبضہ میں بارھویں صدی عیسوی کے ربع آخر میں اس وقت آیا جب محمد غوری نے (۱۱۹۲ء میں) شمالی ہند کے راجپوت راجاؤں کو شکست دے کر دہلی پر اپنی حکومت قائم کرلی - محمد غوری سلطنت کی باگ ڈور قطب الدین کے ہاتھوں میں سونپ کر خود واپس چلا گیا اور یہی پہلی منزل تھی جب ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مرکزی حکومت کی جانب سے جاگیرداروں کی حیثیت سے حاکم بنا کر بھیجے گئے چنانچہ ایودھیا کے علاقہ میں بختیار خلجی نے صوبہ داری کا عہدہ سنبھالا لیکن جس طرح اس وقت کے بادشاہوں کی حکومتوں میں پے در پے تبدیلیاں ہو رہی تھیں اسی طرح یہ صوبہ دار بھی زیادہ عرصہ تک نہ ٹھہر سکتے تھے چنانچہ یہاں بھی کبھی التتمش کا بیٹا نصیر الدین محمد شاہ (۱۲۲۵ء میں) صوبہ دار رہا کبھی قمر الدین قیرآن، کبھی بلبن کی طرف سے فرحت خاں جاگیردار بنایا گیا کبھی اسے معزول کرکے خواجہ جہاں کو - خواجہ جہاں' یوں تو محمد تغلق کی طرف سے مشرقی علاقوں کا حاکم مقرر کیا گیا تھا لیکن چودھویں صدی کے آخر میں جبکہ ایک طرف تیمور کے حملہ نے دہلی کی حکومت کو کمزور وتباہ کر دیا تھا دوسری طرف مختلف علاقوں کی بغاوت اور انتشار سے ہر طرف بے چینی پھیلی ہوئی تھی، ان حالات سے فائدہ اٹھا کر اس نے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور جونپور کو پایۂ تخت بنا کر بادشاہ بن بیٹھا - وہ جن علاقوں کا حاکم تھا ان میں کڑا، قنوج' ڈلمئو، سندیلہ' بہرائچ، بہار اور جونپور اضلاع شامل تھے" لیکن اس کی حکومت کو بھی' اودھ' ہی کا علاقہ مانا جاتا ہے - یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ مشرقی حصّہ کے ان اضلاع میں جس بادشاہ کی حکومت بھی رہی اس نے اس کے انتظام کی طرف خاص طور پر دھیان دیا

اس کا ایک خاص سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسی علاقہ کے نظم ونسق پر غالباً مختلف حقوں کے نظام کا انحصار تھا جس کو مضبوط کئے بغیر حکومت کا استحکام ممکن نہ تھا غالباً اسی پہلو کے پیش نظر جب تغلق عہد میں قنوج سے بنگال تک ہر جگہ فوجی لوٹ مار اور انتشار و ابتری پھیلی ہوئی تھی تو فیروز شاہ تغلق (۱۳۲۴ء اور ۱۳۲۸ء میں) دوبار اودھ آیا۔

مغل دور میں جہاں سیاسی حیثیت سے سارے ملک کو اتحاد و استحکام حاصل ہوا وہاں اودھ میں بھی اسی منزل سے ایک باقاعدہ نظام کی بنیاد پڑی۔ چنانچہ ۱۵۲۶ء میں بابر کے تخت نشین ہوتے ہی اس علاقہ پر خاص توجہ کی گئی یہاں تک کہ ۱۵۲۸ء میں اپنی فوج کے ساتھ وہ خود اودھ آیا اور رفتہ رفتہ اس کی اہمیت میں اضافہ ہوتا رہا۔ ہمایوں کے سیاسی نشیب و فراز نے تو اسے اتنا موقع ہی نہ دیا کہ حکومت کو استقلال حاصل ہوتا کہ اسی عرصہ میں شیر شاہ سوری نے قبضہ کر کے سارے ملک کو منظم و مضبوط کرنے پر توجہ دی۔ اس وقت تک جو صوبے قائم تھے شیر شاہ نے ان کی از سر نو تنظیم و تقسیم کر کے انھیں مختلف سرکاروں اور پرگنوں کی شکل دی۔ اس طرح اودھ کا علاقہ بھی کئی سرکاروں میں بٹ گیا تھا لیکن جب اکبر نے مغل شہنشاہ کی حیثیت سے زمام سلطنت سنبھالی تو سارے ملک میں نئی فضا پیدا کرنے کے ساتھ ہر شعبۂ حکومت میں ایسی تبدیلیوں پر توجہ کی گئی جس سے نہ صرف انتظام سلطنت بہتر اور مضبوط ہو بلکہ سماجی و انفرادی زندگی میں بھی ترقی و بلندی کے مواقع حاصل ہو سکیں۔ انھیں تبدیلیوں میں ایک اہم تبدیلی یہ بھی تھی کہ مختلف علاقوں سے جاگیرداری کا نظام ختم کر کے اس نے سارے ملک کو ۱۲ صوبوں میں تقسیم کر دیا۔ ان صوبہ کے حاکموں کو سپہ سالار کہا جاتا تھا جو اپنے علاقوں میں سارے اختیارات کے مالک ہوتے تھے البتہ وہ پوری طرح مرکزی حکومت کے مطیع اور اس کے احکام کے پابند ہوتے تھے۔ انھیں صوبوں میں اودھ بھی ایک اہم صوبہ تھا۔ گو اس کی علاقائی شکل اس طرح قائم ہوئی تھی کہ اس کے ایک طرف گورکھپور سرکار تھی۔ (جس میں موجودہ گورکھپور اور بستی کے اضلاع شامل ہیں۔) دوسری طرف موجودہ فیض آباد ضلع کا نصف مشرقی علاقہ۔ اس تقسیم سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس وقت کے اودھ میں ضلع سلطانپور کا جنوبی و مشرقی علاقہ اور رائے بریلی ضلع کا جنوبی حصے شامل نہ تھے بلکہ ان کا تعلق صوبۂ الہ آباد سے تھا۔ اکبر کے دور سے لے کر محمد شاہ تک اودھ کا صوبہ اپنی اسی شکل میں رہا لیکن ڈاکٹر ایشوری پرشاد کے الفاظ میں "دارالحکومت سے دور ہونے اور ذرائع آمد و رفت کی دشواریوں کی وجہ سے ان صوبوں پر بادشاہوں کا اثر پوری طرح نہ رہ پاتا تھا"[9] دوسرے جیسے جیسے مغل حکومت میں زوال و انحطاط بڑھتا رہا۔ جیسے جیسے ملک میں سیاسی انتشار شدت اختیار کرتے رہے، جیسے جیسے ملک کی اندرونی بغاوتوں اور باہری حملوں سے مرکزی حکومت مجبور و محدود ہوتی گئی اسی طرح مختلف حصوں میں نیم خود مختار ریاستیں قائم ہوتی گئیں یہاں تک کہ Macaulay کے الفاظ میں" بعض صوبہ دار اتنی بڑی تعداد کی رعایا پر حکومت کرتے تھے جو جرمنی اور فرانس کے بادشاہوں کے برابر تھی اور محمد شاہ کے عہد تک آتے آتے صوبہ داروں کا تعلق دہلی سے اسی حد تک رہ گیا تھا کہ :

> "They might occasionally send to their titular soverign a complimentary present or solicit from him a title of honour. In truth, however, they were no longer lieutenants, removable at pleasure, but independent hereditary princes." [10]

چنانچہ یہی حالات جن میں سعادت خاں نے ۹ ستمبر ۱۷۲۲ء کو اودھ کی صوبہ داری کا عہدہ سنبھالا فیض آباد دار السلطنت بنا اور ایک نئی اسلامی حکومت کے ساتھ ساتھ نئی تہذیبی زندگی، نئی معاشرت اور شعر و ادب کی نئی روایت کی بنیاد پڑی جس کے خطوط چاہے ابتدا میں واضح نہ رہے ہوں لیکن جلد ہی ان میں روشنی اور تابندگی پھیل گئی۔ اسی چیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اشرفی لال سریواستوا لکھتے ہیں کہ :

> "Its geographical situation, equable climate and fertility of soil gave it an unique place among the provinces of Mughal India. While its multifarious products filled the coffers of the emperors, its hardy and martial population swelled the ranks of the imperial forces. It continued virtually to be a province of the decaying Empire till 1722 when Saadat Khan, the new governor laid the foundation, infact, if not in name, of an independent Muslim Dynasty under whose rule Lucknow, its capital, prospered to rival Delhi in wealth, magnificence and culture." [11]

اودھ کے اِن حکمرانوں نے اپنی انفرادی صلاحیتوں اور انتظامی تجربات سے اس سلطنت کو کس طرح ترقی دی اس کا مختصراً جائزہ لینا بھی ضروری ہے جس کے مطالعہ کے بغیر اس پس منظر کو نہیں سمجھا جا سکتا جس سے اسے مرکزی اور امتیازی حیثیت حاصل ہوتی گئی۔

سعادت خاں

یہ عجب حُسنِ اتفاق ہے کہ جس دَور میں ہندوستان میں مغلیہ سلطنت اپنے عروج پر تھی تقریباً وہی زمانہ ایران میں صفوی بادشاہوں کی عظمت کا بھی تھا، دونوں حکومتوں میں اہل علم و اہل فن کو قدر و منزلت حاصل تھی اور ان میں ایسے دوستانہ تعلقات تھے کہ وقت پڑنے پر ہمایوں کو شاہ طہماسپ سے فوجی امداد بھی حاصل ہوئی اور سلطنت کی تعمیر ترقی اور عظمت کے لیے اکبر، جہاں گیر اور شاہ جہاں نے بڑے بڑے ماہرین اور فنکار بھی وہاں سے بلا کر جمع کر لیے۔ یہ قربت یہاں تک بڑھی کہ صفوی حکومت کے زوال کے بعد ایران کے اصلی خاندان کے افراد ہندوستان میں تلاش روزگار کے سلسلہ میں بھی آنے لگے بلکہ مغل سلطنت کے انحطاط کے دور میں تو یہ نوبت آگئی تھی کہ مقامی حکام کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے ان ایرانی افراد کو ترجیح دی جاتی تھی تاکہ نظام میں ابتری و کشمکش پیدا نہ ہونے پائے۔ انھیں حالات میں شاہ عباس صفوی (دوم) کے وزیر رضا قلی بیگ کے داماد محمد نصیر بھی اپنے بڑے بیٹے محمد باقر کے ساتھ ہندوستان آئے اور پٹنہ میں مرشد قلی خاں جاگیردار سے "مدد معاش" حاصل رہی۔ محمد نصیر کے دوسرے بیٹے محمد امین بھی کچھ دنوں بعد پٹنہ آگئے لیکن ان کے آنے سے پہلے ہی والد کا انتقال ہو چکا تھا اور جب وہاں کوئی ذریعۂ روزگار نہ مل سکا تو ۱۷۰۸ء میں دہلی آگئے اور یہیں سے ان کی زندگی کا وہ دَور شروع ہوتا ہے جس میں مسلسل کامیابیاں حاصل کرتے ہوئے وہ پہلے "سعادت خان" اور بعد میں "برہان الملک" ایسے خطابات سے شہرت پا گئے۔

اٹھارہویں صدی کے ہندوستان میں جہاں مغل شہنشاہ کو آئے دن بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑتا رہتا تھا، جہاں راجاؤں اور فوجیوں کی سرکشی معمولات بن چکے تھے۔ وہاں کامیابی اور ترقی حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ فوجی حکمت عملی، بہادری اور حوصلہ مندی ہی ہو سکتی تھی۔

محمد امین میں ذہانت و ہوشمندی کے ساتھ ساتھ یہ صفات پوری طرح موجود تھیں جس کے نتیجہ میں (کوٹ امانک پور کے فوجدار سر بلند خاں کے) معمولی فوجی سردار سے بڑھتے بڑھتے وہ ایک اہم حکومت کے مالک بن گئے۔ سر بلند خاں کی ملازمت انھوں نے ناراض ہو کر چھوڑی تھی اور دہلی اس لیے واپس گئے تھے کہ کوئی دوسرا ذریعہ معاش تلاش کریں یہاں خوش قسمتی ان کے قدم چومنے کی منتظر تھی اور فرخ سیر کی فوج میں ملازمت حاصل کرتے ہی ۱۷۱۳ء میں "ہفت ہزاری" کا اعزاز حاصل کر لیا۔ محمد شاہ کی نظر انتخاب زیادہ تیز اور قدر شناس تھی اس نے تخت پر بیٹھتے ہی محمد امین کے سپرد کئی اہم ذمہ داریاں سونپ دیں اور کسی منزل پر ان کی طرف سے اسے مایوسی نہ ہوئی۔ کبھی صوبۂ آگرہ کے بیانہ اور ہنڈوان اضلاع کی بغاوت ختم کر کے فوجدار بن گئے، کبھی صوبۂ الٰہ آباد کے گورنر راجہ گردھر بہادر کی سرکشی مٹا کر کمانڈر کا عہدہ حاصل کیا اور ایک منزل وہ بھی آئی کہ بادشاہ کی خوشنودی کے لیے اپنے محسن و ہمدرد "سید برادران" کے گروہ کے اہم رکن حسین علی کے قتل کی سازش میں شریک ہونے سے بھی دریغ نہ کیا اور اس کارنامہ کے انجام دینے پر ان کو "سعادت خاں بہادر" کے خطاب سے سرفراز کیا گیا' اور ڈاکٹر اشرادی لال سریواستوا کے الفاظ میں' اس طرح بیانہ اور ہنڈوانہ کی سرداری حاصل کرنے کے سال ہی بھر بعد سعادت خاں "پنج ہزاری" کے مرتبہ پر پہنچ گئے۔[12] اب وہ محمد شاہ کے معتمد ترین افسروں میں شامل ہو چکے تھے اور "چھ ہزاری" کا منصب دے کر ۱۵ اکتوبر ۱۷۲۰ء کو آگرہ کا صوبہ دار بنا دیا گیا۔ اسی زمانہ میں "۱۲ جنوری ۱۷۲۱ء کو ان کو داروغہ خواصان" Captain of the Imperial Body guards کا اعزاز بھی ملا۔[13]

اس زمانے میں اودھ میں بھی شدید بدنظمی پھیلتی جا رہی تھی اور جب لمبے عرصہ تک دبایا نہ جا سکا تو اس کے لیے بھی سعادت خاں ہی کا انتخاب ہوا اس طرح وہ اس جگہ پہنچ گئے جہاں پوری طرح سے ایک نئی حکومت کی بنیادیں قائم ہو گئیں۔ محمد امین کے ابتدائی حالات سے لے کر اودھ کی صوبہ داری حاصل کرنے تک کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے کنور درگا پرشاد لکھتے ہیں کہ :-

"..... بعد قطع منازل و مراحل بہ دار الخلافت دہلی رسید

رفتہ رفتہ با راجہ رتن چند، دیوان عبداللہ خاں قطب الملک وزیر فرخ سیر طرح تالف و تعارف انگند و از قدردانی و مردم شناسئ او حکومت ہندون بیانہ حاصل نمود، مدتے سمندِ حکومت دراں سرزمین بجولاں درآورد، ہنگامیکہ حضرت محمد شاہ متمکن سریر سلطنت شدند، وامیر الامراء حسین علی خاں برادرِ عبداللہ خاں قطب الملک با یمار اعتماد الدولہ، محمد امین خاں از دستِ حیدر علی خاں کشتہ گردید وعزت خاں ہمشیرزادۂ امیر الامراء با فوجِ کثیر و جمعیت ساداتِ بارہہ بر حضرت بادشاہ یورش نمود، دراں وقت سعادت خاں با پانچ ہزار سوار خنجر گذار خود را بموکبِ سلطانی رسانیدہ ترددات نمایاں بجا آورد، بظہور ایں خدمتِ شائستہ، وایں کار بایستہ از پیشگاہ حضرت بادشاہ بخطاب سعادت خاں بہادر مخاطب گردید، بعد چندے بہ صوبہ داریِ اکبرآباد امتیاز یافت. بمقارن ایں حال کیفیتِ بدنظمیِ صوبہ اودھ معروضِ عاکفانِ پایۂ سریر خلافت گردید، آنحضرت درخور ایں خدمت سعادت خاں بہادر دانشتہ بہ صوبہ داریِ اودھ امتیاز بخشیدند، سعادت خاں بافواجِ جرار و سپاہِ خنجر گذار بہ اودھ آمد "[14]

اور ۹ ستمبر ۱۷۲۲ء کو اودھ کی صوبہ داری کا عہدہ بھی سنبھالا اور ساتھ ہی ساتھ گورکھپور کی فوجداری بھی سونپی گئی۔ اودھ کا علاقہ اکبر ہی کے عہد میں ایک اہم صوبہ بن چکا تھا اور اس وقت سے لے کر سعادت خاں کی صوبہ داری حاصل کرنے تک اس میں خیرآباد، فیض آباد، گورکھپور، بہرائچ اور لکھنؤ یہ پانچ اضلاع شامل تھے۔ اس کے محل وقوع اور حدودِ اربعہ کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر آشیرواد ی لال سریواستوا لکھتے ہیں کہ:۔

" شمال میں ہمالیہ کی پوربی چوٹیاں، مشرق میں بہار، جنوب میں (صوبۂ الہ آباد کے) مانک پور تک اور مغرب میں قنوج تک۔ گورکھپور کے مشرقی حصہ سے قنوج تک تقریباً ۲۷۰ میل لمبائی اور شمالی پہاڑی سے لے کر مانک پور ریاست کے شمالی حدود تک ۲۳۰ میل چوڑائی تھی، ان سب کا رقبہ ایک کروڑ ایک لاکھ اکہتر ہزار اسی بیگہ تھا"[15]

اس سارے علاقے میں مختلف راجاؤں، جاگیرداروں اور زمینداروں نے اورنگ زیب ہی کے وقت سے بدنظمی و انتشار پھیلا رکھا تھا، خاص کر لکھنؤ کے شیخ زادے ایسے شورہ پشت تھے کہ ان کو قابو میں کرنا بہت بڑا مسئلہ تھا۔ سب سے پہلے ان کی طاقت و دبدبہ کو سعادت خاں نے لکھنؤ میں قدم رکھتے ہی اس طرح مٹا دیا کہ "شیخ زادوں" کے پھاٹک پر جو ننگی تلوار اس لیے لٹکتی رہتی تھی کہ ہر آنے والا اس کی تعظیم کرے اس تلوار کو گرا دیا اور شیخ زادوں کو شکست دے کر شیخ عبدالرحیم کے "پنچ محلہ" کو اپنی رہائش کے لیے خالی کرا لیا۔ اور بعد میں تلوئی، پرتاپ گڑھ، گونڈہ، رسول پور، بلرام پور اور راناؤ (بواڑہ) کے راجاؤں اور جاگیرداروں نے جو انتشار و ہیجان پھیلا رکھا تھا اس پر قابو کر کے امن و سکون کی فضا قائم کی اور اجودھیا کے قریب اپنا "بنگلہ" قائم کر کے ایک نئے شہر کی بنیاد ڈالی جو بعد میں فیض آباد کے نام سے نئی حکومت کا دارالسلطنت بنا۔ اب انھوں نے ساری توجہ اس بات پر صرف کرنی شروع کر دی کہ حکومت کی آمدنی میں اضافہ بھی ہو سکے اور رعایا کی فلاح و بہبود کے ذرائع بھی بڑھتے رہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے جو بند و بست کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہی علاقہ جس کی آمدنی پہلے کبھی ستر لاکھ روپیہ سے زیادہ نہ تھی اسی سے "سعادت خاں در سالِ اول یک کرور ہفت لک روپیہ تحصیل فرمود و در سالِ دوم و سوم جمع دو کرور روپیہ تشخیص نمود"[16] اس کامیابی سے محمد شاہ کی نظر میں ان کی قدر و منزلت اور بڑھ گئی اور انھیں "برہان الملک" کا خطاب دے کر ان کارناموں کو سراہا گیا۔ بعض انگریز مؤرخین، جن کی نظر میں اودھ کے سبھی حکمراں، نااہل اور رعایا کی بہبود و انتظام حکومت سے غافل تھے، وہ بھی سعادت خاں کی ان صلاحیتوں کا اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکے چنانچہ H.C. IRWIN نے اپنی کتاب The Garden of India میں لکھا ہے کہ:۔

Saadat Khan's policy in Oudh seems to have been to cherish the peasantry, and to keep in check the encroachments of the larger

land holders and he was probably the first to make the power ofacompratively strong central govt. felt throughout the Province. [۱۷]

ان انتظامات سے محمد شاہ اتنا متاثر اور مطمئن تھا کہ کسی طرح کا دخل دینا مناسب نہ سمجھتا تھا چنانچہ ایک خود مختار حکمراں کی طرح وہ حکومت کی وسعت بڑھانے پر متوجہ ہوئے اور ۱۷۲۸ء میں مرتضیٰ خاں جاگیردار سے بنارس، جونپور، غازی پور اور چنار کی سرکار پٹہ پر حاصل کر لی، ان اضلاع کی اہمیت اس لیے بھی تھی کہ

As these dists. lay on the eastern boundry of Awadh, Saadat Khan found his eastern frontier automatically pushed to the limit of the modern U.P. in that direction. [۱۸]

سعادت خاں معمولی فوجی افسر سے اتنی بڑی حکومت کے مالک بنے تھے اس لیے انھیں ان درباری سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا بھی تجربہ تھا جو ملک کے مختلف حکمرانوں کے خلاف سر اٹھاتی رہتی تھیں، محمد شاہ کے بعض مشیروں اور خاص کر امیرالامرا، خانِ دوراں کی طرف سے بھی غافل نہ تھے، انھیں باتوں کے پیشِ نظر اودھ میں وہ اپنے ساتھ کسی ایسے شخص کو رکھنا چاہتے تھے جس پر پوری طرح اعتماد بھی کر سکیں اور جو اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے پوری طرح ان سے قریب بھی ہو۔ چنانچہ انھوں نے اودھ کی صوبہ داری حاصل کرنے کے دوسرے ہی سال نیشا پور سے اپنے بھانجے محمد مقیم کو بلا کر اپنی بڑی بیٹی سے شادی کر دی، محمد شاہ کی طرف سے ان کے لیے نائب صوبہ داری کا عہدہ حاصل کرکے "ابوالمنصور" کا خطاب دلا دیا۔ اس طرح اپنا جانشین بنا کر بہت سی فوجی و CIVIL ذمہ داریاں بھی سونپ دیں اور خود انھیں یہ موقع بھی مل گیا کہ مرکزی دارالسلطنت میں قیام کرکے ملکی معاملات میں اپنا دخل و اقتدار قائم رکھ سکیں۔ دہلی کی سیاست میں ایرانی و تورانی گروہ بندی جس کے باہمی مناقشات نے بقول ڈاکٹر محمد حسن "مستقل آویزش کی شکل اختیار کر لی تھی" [۱۹] اس کے نشیب و فراز سے بھی انھیں پوری واقفیت رکھنا ضروری تھی کیونکہ یہ خطرہ لاحق تھا کہ ذرا سی غفلت ان کے ایرانی گروہ کے اثر و اقتدار کو برباد کر سکتی ہے لیکن ان تمام احتیاطی تدابیر کے بعد بھی آخر سعادت خاں "تورانی گروہ" کی سازشوں کا شکار ہو ہی گئے، اور ۱۷۳۷ء میں محمد شاہ کی خاطر دکن کے مرہٹہ سردار پیشوا باجی راؤ کو شکست دینے کے باوجود بادشاہ کی نظر میں ان کی یہ جنگ مناسب نہ تھی۔ اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صاحبِ بوستانِ اودھ لکھتے ہیں:۔

"۱۷۳۶ء میں دکن کا پیشوا باجی راؤ، چوتھ کی رقم وصول کرنے دہلی کی طرف چلا، اس نے دہلی پہنچ کر قتل و غارت گری شروع کر دی۔ بادشاہ کے پاس چار لاکھ سے کم فوج نہ تھی، پھر بھی مقابلہ نہ کر سکا اور باجی راؤ کے شرائط ماننا پڑے۔ اس کامیابی سے باجی راؤ کا دماغ چڑھ گیا اور برابر بدامنی پھیلاتا رہا۔ سعادت خاں کی شجاعت اسے برداشت نہ کر سکی اور یکایک اس کی فوج پر حملہ کر دیا۔ اس اچانک حملے سے باجی راؤ گھبرا کر مصالحت پر تیار ہو گیا، اسی عرصہ میں خانِ دوراں جو امیرالامرا تھے وہ سعادت خاں کی فتح سے حسد کرنے اور بادشاہ کو ان کے خلاف بھڑکا دیا، بادشاہ نے (سعادت خاں کو) لکھا کہ اسے ہمارے معاملات میں دخل نہ دینا چاہیے، آخرکار سعادت خاں نے باجی راؤ سے صلح کر لی اور لکھنؤ آ گئے" [۲۰]

ان سیاسی مناقشات نے ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کے حملہ کے وقت ایسی شدت اختیار کر لی کہ دہلی کو قتل و غارت گری کے لرزہ خیز حالات کا سامنا بھی کرنا پڑا اور یہاں تک کہ سعادت خاں ایسے حوصلہ مند اور باعزم حکمراں کو موت کے دامن میں پناہ لینی پڑی۔ نادر شاہ جب دہلی کی طرف بڑھا تو سعادت خاں اس کے مقابلہ کے لیے روانہ ہوئے اور اسے اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ دو کروڑ روپیہ لے کر واپس چلا جائے ابھی یہ شرط پوری نہ ہوئی تھی کہ تورانی گروہ کی طرف اس صلح کی کامیابی کا سہرا آصف جاہ کے سر باندھ دیا گیا اور یہ بات مشہور ہو گئی کہ یہ معاملات اسی کی وجہ سے طے ہوئے ہیں۔ خود محمد شاہ بھی حقائق سے واقف نہ تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے اس کارگزاری پر آصف جاہ کو "امیرالامرا" کے عہدہ پر فائز کر دیا۔ ان حالات سے کبیدہ خاطر ہو کر سعادت خاں نے کنارہ کشی اختیار کر لی اور نادر شاہ کو سب باتوں سے آگاہ کرتے

ہوئے اطلاع دے دی کہ ان معاملات سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ نادر شاہ کا ظلم و جلال اسے برداشت نہ کر سکا اور آصف جاہ کو قید کر کے دہلی میں قتل و خون اور تباہی و بربادی کا بازار ایسا گرم ہوا جس کی مثال تاریخ عالم میں مشکل ہی سے ملے گی۔ ابھی یہ ہنگامہ پوری طرح مٹا بھی نہیں تھا کہ عام مؤرخین کے مطابق سعادت خاں نے زہر کا پیالہ پی کر خودکشی کر لی، بعض مؤرخین نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ ۱۹ مارچ ۱۷۳۹ء کو ان کی موت اچانک واقع ہو گئی۔ بہرحال اپنے سترہ سالہ دور صوبہ داری میں ایک سلطنت کی بنیاد سے لے کر اسے ترقی و خوشحالی کی جس منزل تک پہنچا دیا یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ان کی موت کے وقت اودھ میں ۲۲ ہزار فوج اور پچاس توپیں تھیں اور "خزانہ میں کئی کروڑ روپیہ موجود تھا۔"[۲۱]

صفدر جنگ

ابھی دہلی پر نادر شاہ ہی کی حکمرانی تھی کہ اودھ کی صوبہ داری کا مسئلہ پیش آیا، ایک طرف سعادت خاں کے بھتیجے شیر جنگ کوشاں تھے۔ دوسری طرف ابوالمنصور محمد مقیم جو نہ صرف سعادت خاں کے داماد بلکہ ان کے بیٹے کی طرح تھے اور جو ان کے جانشین اور نائب کی حیثیت سے تقریباً ۱۵ سال تک سیاسی پیچ و خم کے تجربات بھی حاصل کر چکے تھے اور فوجی و ملکی انتظام کی پوری مہارت بھی۔ ظاہر ہے عام حالات میں تو محمد مقیم کے علاوہ کسی دوسرے پر نظر انتخاب کا سوال ہی نہ تھا، لیکن نادر شاہ کو نہ ان حقائق سے کوئی سروکار تھا نہ وہ ابوالمنصور کے وکیل راجہ لچھمی نرائن کی عرضداشت کے ان جملوں سے متاثر ہو سکتا تھا کہ "وہ ایماندار، قابلِ اعتماد اور خدا ترس انسان ہیں، انتظام حکومت کی فطری صلاحیت ہے اور سعادت خاں کے فوجیوں میں کافی مقبولیت حاصل ہے۔" البتہ اس کے نفسیاتی تقاضوں کو جس چیز سے تسکین مل سکتی تھی لچھمی نرائن نے اس کا اظہار بھی اس طرح کر دیا تھا کہ "تقرری کے بعد دو کروڑ روپے نذر کے طور پر بھی پیش کیے جائیں گے اور حقیقتاً اسی پر فیصلہ کا انحصار تھا۔" نادر شاہ نے لچھمی نرائن کے ساتھ دو سو قزلباش فوجی اودھ بھیجے تاکہ وہ رقم لے جائیں۔ اودھ سے ایک کروڑ اسّی لاکھ کا انتظام ہو سکا اور بقیہ ۲۰ لاکھ روپیہ محمد مقیم ابوالمنصور نے سعادت خاں کے دہلی کی رہائش گاہ سے حاصل کی اور اس طرح دو کروڑ پورے کر کے "بہت سے قیمتی تحائف اور ایک ہاتھی نادر شاہ کی خدمت میں پیش کر دیے گئے"۔ چنانچہ اس طرح "ابوالمنصور محمد مقیم" کو اودھ کا صوبہ دار مقرر کر دیا گیا اور محمد شاہ کی طرف سے "صفدر جنگ" کا خطاب ملا۔

انتظام حکومت سنبھالتے ہی صفدر جنگ کو بھی انھیں تمام مسائل کا سامنا کرنا پڑا جس سے سعادت خاں ہمیشہ الجھے رہے۔ دہلی کی درباری سازشیں، مختلف راجاؤں کی سرکشی اور ساتھ ہی ساتھ فوج اور رعایا کی بہبود و خوشحالی، وہ کسی طرف سے غفلت نہیں برت سکتے تھے اور یہ ان کی غیر معمولی صلاحیت اور ہوشمندی کا نتیجہ تھا کہ شدید سے شدید ہیجانی و انتشاری حالات میں بھی ہر شعبہ میں کامیابی حاصل کرتے رہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان کامیابیوں کے پیچھے ان کے اسی "ایرانی گروہ" کی جدوجہد بھی شامل ہے جس کے وہ اہم رکن تھے اور راجہ نول رائے، راجہ جینڈر گیر گوشائیں، راجہ لچھمی نرائن اور راجہ رام نرائن ایسے مخلص، وفادار اور بے لوث افسران کی کارگزاریاں بھی جو اس دور کے بہت کم حکمرانوں کو میسّر تھیں۔ ان مختلف عناصر کے اشتراک سے صفدر جنگ نے بہت سے باغی راجاؤں، روہیلوں اور بنگشوں کی سرکشی مٹا کر اودھ میں پوری طرح امن و سکون بھی پیدا کر دیا اور محمد شاہ کا اعتماد حاصل کر کے "میر آتش" کا مرتبہ بھی حاصل کر لیا اور کشمیر کی صوبہ داری بھی۔ محمد شاہ پر ان کا اتنا گہرا اثر قائم ہو چکا تھا کہ حکومت کا سارا انتظام ایک طرح سے صفدر جنگ ہی کے سہارے چل رہا تھا، خود ان کا تجمّل اور شاہانہ اقتدار کی مثال کے لئے ان کے بیٹے جلال الدین حیدر کی شان و شوکت کا ذکر کافی ہے جس میں "چہل و شش لکھ روپیہ بمصرف در آمدہ بود" اور جس کی "رسم ساچق" کا ذکر کرتے ہوئے اشرف ادی لال لکھتے ہیں:-

"شاہی قلعہ سے کوٹلہ فیروز شاہ تک پھلوں، مٹھائیوں، جوڑوں، زیوروں اور عطر کی شیشیوں سے بھری ہوئی کشتیوں کے علاوہ کچھ اور دکھائی نہ دیتا تھا۔ منقش برتنوں، پیالوں اور پلیٹوں کا شمار ممکن نہ تھا اور اسی کے ساتھ چاندی اور سونے کے لاتعداد برتن ایسے نظر آتے تھے جن میں کوئی بھی سو روپیہ سے کم قیمت کا نہ رہا ہو گا۔"[۲۲]

دولت ونشاط کی یہ فراوانی اسی لئے تھی کہ صفدر جنگ کے حصولِ اقتدار کے پانچ چھ برسوں میں اودھ کی سیاسی حالت بھی مستحکم ہو چکی تھی اور معاشی واقتصادی حیثیت سے پوری طرح خوشحال بھی بن چکا تھا۔ مغلیہ دورِ حکومت کی دہلی کی تہذیبی عظمت وتابناکی، قوت وزندگی اور عیش ونشاط کے عناصر، جو کشمکش وسراسیمگی میں چراغ سحری کی طرح بجھنے سے پہلے بھڑک رہے تھے اسے اودھ میں روشنی پھیلانے کا موقع مل گیا۔

درحقیقت صفدر جنگ پر اودھ کے ساتھ ساتھ ایک طرح سے ملکی و بیرونی بھی خطرات وہیجانات سے تحفظ کی ذمہ داری آپڑی تھی اور یہی سبب تھا کہ احمد شاہ ابدالی کے مقابلہ کے لئے بھی وہی گئے۔

محمد شاہ کے آخری دور اور ۱۷۴۸ء میں احمد شاہ کی تخت نشینی کے بعد ملکی خانہ جنگی اور احمد شاہ ابدالی کے حملے نے بادشاہ، امراء اور عوام کو اتنا مجبور وبے بس بنا دیا تھا کہ انھیں سکون کی سانس لینا بھی ممکن نہ تھا، ان حالات میں ہر ایک کی نظر صفدر جنگ ہی پر تھی، وہی خطرات کا مقابلہ کر کے سہارا دے سکتے ہیں۔ احمد شاہ نے نہ صرف ان کو اپنا وزیر بنا دیا بلکہ "منتظم غسل خانہ" کا عہدہ دے کر اندرونی وملکی ساری ذمہ داریاں سونپ دیں، اودھ کے علاوہ اجمیر کے صوبہ دار بھی بنا دیے گئے، نرنول کے فوجدار بھی ہو گئے، ان کے بیٹے جلال الدین حیدر کو "شجاع الدولہ" کا خطاب دے کر SUPDT. OF IMPERIAL ARMY بنا دیا گیا اور بعد میں "بخشی" اور بہت سے دوسرے عہدے بھی مل گئے۔

یہاں ان خیالات سے بحث مقصود نہیں ہے کہ بادشاہ اپنی مجبوری و کمزوری کے احساس کے تحت صفدر جنگ کو سارے اختیارات دیتا جا رہا تھا یا اسے ان سے بہتر منتظم و باصلاحیت شخصیت مل نہ سکتی تھی لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں مغلیہ سلطنت کے سارے اختیارات صفدر جنگ ہی کو حاصل ہو چکے تھے جو ایک ذمہ دار اور حوصلہ مند حاکم کی طرح اپنے فرائض بھی نبھا رہے تھے اور اودھ کی اس حکومت کی ترقی وعظمت کی طرف بھی متوجہ رہے جسے وہ اپنی ذاتی اور خاندانی ملکیت سمجھتے تھے۔

جس طرح صفدر جنگ کو اودھ کی صوبہ داری ایک طرح سے جانشینی کے طور پر ملی تھی، اسی طرح ایرانی اور تورانی گروہ کے مناقشات بھی سعادت خاں سے ورثہ میں ملے اور آخری ۵، ۶ برسوں میں ان کے نشیب وفراز میں بری طرح الجھے رہے۔ جب تک باہمی اختلافات محض ایک دوسرے گروہ کو نیچا دکھانے تک محدود رہے اس وقت تک تو صفدر جنگ بادشاہ یا تورانی امراء سے براہِ راست ٹکر لینے سے گریز کرتے ہوئے سارے فرائض پوری طرح نبھاتے رہے لیکن جب سازشوں کا حصار ایسا پست بن گیا کہ ادھم بائی رقاصہ اور اس کے بیٹے جاوید خاں خواجہ سرا کے زیر اثر احمد شاہ خود بھی ملک کے مفاد اور وقار کو نظر انداز کر کے صفدر جنگ کو الگ کر دینے کے درپے ہو گیا تو ان کے لیے برداشت سے باہر تھا۔ ادھم بائی کو شاہی حرم میں داخل کر کے بہت نئے خطابات سے سرفراز فرمایا گیا تھا"[22] اور "تمام شاہی اختیارات جاوید خاں کے ہاتھ میں آ گئے تھے جس نے حرم کو عورتوں سے بھر دیا تھا۔ محل سے ایک ایک کوس تک چاروں طرف خوبصورت عورتیں نظر آتی تھیں، خود بادشاہ (احمد شاہ) کے گرد اوباشوں کا ہجوم تھا"[24]

ڈاکٹر محمد حسن کے یہ جملے اور دوسرے مؤرخین وماہرین کی دربار کے غیر سنجیدہ ماحول کی عکاسی، اس بات کا پوری طرح احساس دلا دیتی ہے کہ حالات ایسے بدتر ہو چکے تھے کہ ان میں بہتری پیدا کرنا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ اسی دور کے ایک مؤرخ نے کھل کر کہہ دیا تھا کہ:

> "راقم حروف گوید کہ بایں نازک مزاجی وآسائش شہر جہان آباد ویران وسلطنت ہندوستان خراب وابتر گشت"[25]

صفدر جنگ کی شجاعت وحوصلہ مندی اپنے اوپر قاتلانہ حملوں کو تو نظر انداز کر گئی تھی لیکن ان کی حمیت وخودداری سے یہ برداشت نہ ہو سکا کہ دربار کی عظیم روایات اور اس کے وقار کو بدنام ہوتے دیکھ سکیں، چنانچہ ۱۷۵۳ء میں انھوں نے جاوید خاں کو قتل کرا دیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ صفدر جنگ اور احمد شاہ میں کھل کر مقابلہ شروع ہو گیا۔ یہ مقابلہ محض سیاسی نہ رہ گیا بلکہ فوجی صف آرائی بھی شروع ہو گئی اور بادشاہ کی شہ پا کر عماد الملک نے پوری کوشش کی کہ صفدر جنگ اور ان کے گروہ کو مٹا دیا جائے لیکن احمد شاہ کے فوجیوں کی جو حالت

تھی ان میں یہ ممکن نہ ہوسکا تو وہ مصالحت کی گفتگو پر رضامند ہوگیا۔ صفدر جنگ بھی دہلی کی ہنگامی زندگی سے بیزار ہو چکے تھے چنانچہ وہاں کے عہدوں سے الگ ہوجانا ہی بہتر سمجھا اور اس طرح دسمبر ۱۷۵۳ء میں اودھ واپس آگئے۔ اب ان کے پیشِ نظر محض ایک مقصد رہ گیا تھا کہ اس سلطنت میں امن و سکون، قانون و انصاف کی مستحکم فضا قائم کرکے اس ریاست کو اتنا خوشحال و دلکش بنا دیں کہ دہلی اور دوسری ریاستوں کے لیے قابلِ رشک بن سکے اور اپنی کوششوں میں کافی حد تک کامیاب ہوئے اور جب اکتوبر ۱۷۵۴ء میں ان کا انتقال ہوا تو اس وقت جہاں دوسرے صوبوں میں بدامنی، انتشار و ہیجان اور انحطاط کی کیفیات چھائی ہوئی تھیں وہاں اودھ میں قانونی و انتظامی استحکام نے ڈاکٹر اشرواد ی لال کے الفاظ میں ایسی فضا پیدا کر دی تھی کہ

"Which kept the strong and unruly in check and created a feeling of security of life and property, gave an impetus for the development of liberal art and profitable industries and made Awadh evolve a distinct type of culture.. [۲۷]

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، عہدِ اکبر سے لے کر برہان الملک سعادت خاں کے ابتدائی دور تک اودھ کے علاقائی حدود تقریباً ایک ہی شکل میں قائم تھے، سعادت خاں نے بیجنڈی کی ریاست اور صوبہ الہ آباد کے بنارس، غازی پور، اعظم گڑھ، بلیا کے اضلاع اور ضلع مرزاپور کا مشرقی حصہ شامل کرکے اس کی وسعت کی طرف پہلا قدم اٹھایا تھا اور ۱۷۴۸ء میں صفدر جنگ نے اپنی حکمتِ عملی سے پورا الہ آباد کا صوبہ اپنی حکومت میں شامل کرکے اودھ کو مشرق میں بہار جنوب میں مدھیہ پردیش اور مغرب میں مغل دور کے صوبہ آگرہ تک پھیلا دیا۔ صفدر جنگ کے بعد واقع ہونے والے سیاسی نشیب و فراز کے زیرِ اثر یہ علاقہ محدود و منقسم ضرور ہوتا گیا لیکن اس سے یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہ ہوگی کہ صفدر جنگ نے کتنی عریض و وسیع حکومت کو نہایت مختصر مدت میں استحکام و خوشحالی بخشدی اور یہ ان کی صلاحیتوں کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ انھوں نے فوجیوں میں اپنا اثر اس طرح قائم رکھا تھا کہ "معائنہ کے وقت جس سوار پر خصوصی نظر پڑجاتی تھی اس کی تنخواہ میں دس روپیہ اور جس پیادے پر توجہ ہوجاتی تھی اس کی تنخواہ میں ۲ روپیہ ماہوار اضافہ ہوجاتا [۲۸]" امرا اور عوام میں اس طرح مقبولیت حاصل کی کہ "جب کبھی کوئی نادار انسان ان سے سوال کرتا تو اس کا کلام منقطع ہوتے ہی اسے پچاس اشرفیاں دیدیتے اور بہت سے نادار سیدوں کی وہ جاگیریں بھی واپس کردیں جو مقامی عاملوں نے ضبط کرلی تھیں" [۲۹] اور علماء، شعراء اور فنکاروں کو انعام و اکرام سے ہمت افزائی کرکے علمی و تہذیبی عظمت پر توجہ دی، غرضیکہ ترقی کے کسی پہلو کو نظر انداز نہ کیا جس کا ایک خوشگوار نتیجہ ڈاکٹر محمد تقی احمد کے الفاظ میں "یہ بھی ہوا کہ سلطنتِ مغلیہ کے دورِ زوال میں دہلی کی اعلیٰ درجہ کی تہذیب اور وہاں کے تمدن کو سلطنت کی تباہی سے ایسا سخت صدمہ نہیں اٹھانا پڑا جیسا کہ قدرتاً امید کی جا سکتی تھی اس لیے کہ یہ نئی سلطنت اس بارِ عظیم کو اٹھانے کے لیے تیار ہوگئی۔"

صفدر جنگ کے بعد ان کے بیٹے شجاع الدولہ نے دہلی کی مرکزی سلطنت کی تباہی و زوال کا بخوبی اندازہ کر لیا تھا اس لیے انھوں نے وہاں کی سیاست سے کنارہ کشی کرکے خود اپنی حکومت کی عظمت و شان و شوکت پر توجہ مرکوز کی۔ اب اودھ کی حکومت اتنی مضبوط اور ممتاز ہوچکی تھی کہ دوسری ریاستوں کے حکمراں خود اس سے امداد کے طالب رہتے تھے۔ انھوں نے اقتصادی اور معاشی حیثیت سے ساری ریاست کو اتنا خوشحال بنا دیا تھا کہ روسا اور امرا کے علاوہ عوام میں بھی عیش و عشرت اور نشاط و آسائش کی کیفیات چھائی ہوئی تھیں، سارے ماحول میں زندہ دلی، سکون اور اطمینان کی لہر پھیل رہی تھی، سماجی زندگی میں اربابِ نشاط اور ماہرینِ فن کی قدر کی جانے لگی تھی اور یہی حالات تھے جن میں دہلی اور دوسری جگہوں کے مایوس و پریشان حال امرا اور فنکاروں کو اپنے لیے ایک جائے پناہ نظر آئی جہاں وہ اپنا کھویا ہوا دقار دوبارہ حاصل کر سکتے تھے چنانچہ سب اسی مرکز کی طرف رجوع ہوگئے۔

اب اودھ کو کسی ہندوستانی راجہ یا مہاراجہ سے خطرہ تو نہیں تھا لیکن ملک میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی شکل میں غیر ملکی طاقت کا جو اثر پھیلتا جا رہا تھا اسے زائل کرنا سب سے بڑا مسئلہ تھا اور شجاع الدولہ ایسے ماہر اور ہوشمند سیاست داں نے محسوس کر لیا تھا کہ اس خطرہ

بھی محفوظ نہیں رہ سکتے چنانچہ سب سے پہلے ۱۷۶۴ء میں میر قاسم کی مدد کے طور پر بکسر کے مقام پر انھوں نے انگریزوں کا مقابلہ کیا لیکن یہ طاقت ان کے اندازے سے زیادہ منظم اور مضبوط نکلی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو شکست اٹھانی پڑی۔ پھر بھی وہ مایوس نہ ہوئے اور کوڑہ جہان آباد میں مرہٹوں کی مدد لے کر دوبارہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج کا مقابلہ کیا لیکن حالات نے ساتھ نہ دیا اور پھر شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اب ان کے لیے سوائے صلح کرنے کے کوئی چارہ نہ تھا لہٰذا ۱۶ اگست ۱۷۶۵ء کے الہ آباد کے شرائط نامہ کے سارے پہلو ان کو قبول کرنا پڑے اور یہیں سے اندازہ ہونے لگتا ہے کہ ڈاکٹر ہاف مین (.Dr - Haffman -) کے الفاظ میں:

How from 1765 till the annexation of Oude, The East India Co. heaped Wrong after wrong upon that country and its princes. [۲۵]

بظاہر اس صلح کے شرائط بہت معمولی تھے کہ اودھ کے سارے علاقہ میں سے دو اضلاع کوڑہ اور الہ آباد کے اضلاع کمپنی کو مل جائیں گے جو شاہ عالم کی زیر حکومت رہیں گے، پچاس لاکھ روپیہ کی رقم اودھ کی جانب سے کمپنی کو تاوان جنگ کے طور پر ادا کرنی پڑے گی اور انگریزوں کو اودھ کے سارے علاقے میں تجارت کی آزادی حاصل ہوگی، کمپنی اور نواب کے مساوی مرتبے کا احساس دلاتے ہوئے اس میں ایک نکتہ یہ بھی شامل تھا کہ دوسری طاقتوں سے مقابلہ کے وقت دونوں ایک دوسرے کی امداد کریں گے۔ لیکن دراصل یہ بہت گہری سازش کی ابتدا تھی جس کا جال برابر پھیلتا رہا۔ شجاع الدولہ اپنے کھوئے ہوئے وقار کو دوبارہ بحال کرنا چاہتے تھے اس لیے وہ پوری مستعدی سے فوجی اور اقتصادی انتظام کی طرف متوجہ ہو گئے۔ جلد ہی انھوں نے سارے علاقہ کا دورہ کر کے مسائل کا جائزہ لیا اور تعمیری، ترقیاتی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ فوجی تنظیم پر خاص طور سے زور دیا ـــــ اسلحہ اور توپیں ڈھالنے کے لیے کارخانے قائم کیے گئے، جگہ جگہ چھاؤنیاں بنائی گئیں، ہوشیار اور وفادار افسروں کا تقرر کیا گیا اور خبر رسانی اور ذرائع آمد و رفت کو بہتر بنایا گیا، اس طرح دن رات اسی مقصد میں مصروف ہو گئے کہ آئندہ اُن کو اِن حالات کا سامنا نہ کرنا پڑے جس نے ان کے اقتدار کو ضرب لگائی تھی۔ یہ منظم طاقت انگریزوں کے لیے سب سے بڑا خطرہ ثابت ہو سکتی تھی چنانچہ کمپنی کے لیے ان پر روک لگانا ضروری تھا۔ تین ہی سال میں انھوں نے اپنی فوج کو ایسا منظم کر لیا تھا کہ اس وقت کے ایسٹ انڈیا کمپنی کے کمانڈر انچیف جنرل بارکر نے ان حالات سے آگاہ کرتے ہوئے (۱۷ فروری ۱۷۶۸ء کو) ایک خط میں کمپنی کی Select Committee کو لکھا تھا کہ:

"شجاع الدولہ نے اس عرصہ میں جو فوجی ترقی کی ہے وہ تصور سے بالاتر ہے، اس وقت ان کے پاس سترہ بٹالین تیار ہیں جن میں سے پانچ یورپ کے بنے ہوئے ہتھیاروں اور سامانوں سے مسلح ہیں، ان کے علاوہ تیس ہزار تربیت یافتہ سوار بھی موجود ہیں۔ گھوڑے خریدنے کے لیے تین لاکھ روپے گجرات بھیجے گئے ہیں، انھوں نے احمد شاہ ابدالی کے ایک ماہر افسر عمر خاں کو بھی ملازمت کی دعوت دی ہے۔ اور رشیدی بلوچ کو پانچ ہزار بلوچ بھرتی کرنے کے لیے کہا ہے۔ ایک سکھ سردار کو بھی دو ہزار سپاہی لانے کے لیے لکھا ہے۔"

یہ اطلاعات کمپنی کے لیے اتنی تشویشناک تھیں کہ اس کے لیے نئی پابندیاں عائد کرنے کے علاوہ کوئی بس نہ تھا چنانچہ ۱۷۶۸ء میں گزشتہ (۱۷۶۵ء والے) معاہدہ میں ایک شرط کا اضافہ کر دیا گیا کہ نواب کی فوج کی تعداد ۳۵ ہزار سے زیادہ پر مشتمل نہیں ہو سکتی۔ شجاع الدولہ کو مرہٹوں اور بعض دوسری طاقتوں کی طرف سے خطرے کا احساس تھا اس لیے وہ اس بندش کے باوجود انگریزوں سے مخالفت مول نہیں لے سکتے تھے، چنانچہ ان حالات میں بھی انھوں نے رہیلوں کی مدد سے مرہٹوں کو شکست دی اور سلطنت کی ترقی اور رعایا کی بہبودی و خوشحالی کی طرف متوجہ رہے۔

۱۷۷۳ء میں جب گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز بنارس آیا تو شجاع الدولہ نے اس کے سامنے بہت سے مسائل پر تبادلۂ خیال کیا اور بعد میں ایک نئے معاہدہ کی شکل میں یہ طے پایا کہ اودھ کے دو اضلاع (کوڑہ اور الہ آباد) جو ۱۷۶۵ء میں کمپنی نے لے لیے تھے وہ پچاس لاکھ روپیہ

دے کو واپس مل جائیں گے، فوجی امداد کے موقع پر دورانِ جنگ کمپنی کو فی بریگیڈ دو لاکھ دس ہزار روپیہ ماہانہ ملا کرے گا اور کمپنی کی طرف سے حالات کا جائزہ لینے کے لیے ایک Resident مقرر کر دیا جائے گا۔ اس صلح نامہ کے بعد واپس آتے ہی انھوں نے مرہٹوں کی سرکشی دور کرنے کی غرض سے دوآبہ کی طرف فوج کشی شروع کر دی اور تقریباً پچاس ہزار کی فوج کے ساتھ مرہٹوں کی تمام چھاونیاں ختم کر دیں۔ روہیلوں کی طاقت کو بھی زائل کرنا ان کے لیے ضروری تھا چنانچہ ۲۳ اپریل ۱۷۷۴ء کو بابل نالہ کی جنگ میں حافظ رحمت خاں کی فوج کو شکست دے کر روہیل کھنڈ کے علاقہ پر بھی قبضہ کر لیا لیکن ابھی ان علاقوں کے انتظامات کی طرف سے پوری طرح فراغت بھی نہ مل پائی تھی کہ ۲۶ جنوری ۱۷۷۵ء کو محض ۴۶ سال کی عمر میں انتقال کر گئے، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر یہ کچھ دنوں اور زندہ رہتے تو نہ صرف اودھ کی آنے والی تاریخ دوسری شکل میں ہوتی بلکہ سارے ہندستان کے سیاسی حالات دوسرا رُخ اختیار کر لیتے۔

شجاع الدولہ کے معصر اور بعد کے مؤرخین سبھی نے اس وقت کے عہد کی درباری شان و شوکت اور عوام کی خوشحالی و پرسکون زندگی کی تعریف کی ہے۔ اگر شاہی محل میں اربابِ نشاط کنیزوں اور حسیناؤں کی رنگ رلیاں چھائی رہتی تھیں، اگر شجاع الدولہ کے سفر میں ان کے خیموں کے ساتھ طوائفوں کے ڈیرے بھی پہلے ہی سے موجود ہوتے تھے[۳۰] تو رعایا میں بھی رقص و موسیقی، حسن و شاہد سے دلچسپی عام تھی اور بازی گری، مرغوں اور کبوتروں کی لڑائیاں اور پتنگ بازی وغیرہ کے رواج نے ہر طرف چہل پہل اور رنگی زندگی بھر دی تھی۔ یہ کیفیت محض امراء و روساء کی سوسائٹی تک محدود نہ تھی بلکہ ہر فرد کے مذاق اور اس کی تفریح کا سامان موجود تھا۔ اسی کیفیت کی عکاسی کرتے ہوئے فیض بخش نے خود چشم دید حالات اس طرح بیان کیے ہیں کہ:۔

"جب میں اپنے وطن سے پہلی مرتبہ ممتاز نگر پہنچا جو شہر فیض آباد کے مغربی دروازہ سے چار میل کے فاصلہ پر ہے تو یہاں ایک بازار لگا ہوا تھا اور خرید و فروخت کی گرم بازاری تھی۔ انواع و اقسام کے پکوان، مٹھائیاں، شربت، کباب، پراٹھے، بھنا ہوا گوشت، پانی کے بتاشے، فالودہ اور نان خطائیاں وغیرہ نظر آتی تھیں اور مسافر خریدنے میں سبقت کرنے کی وجہ سے ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے۔ یہ ہنگامہ دیکھ کر میں نے خیال کیا کہ ضرور چوک بازار یہی ہے لیکن مجھے کسی نے بتایا کہ ابھی تو شہر پناہ کے دروازہ میں بھی داخل نہیں ہوا۔ بالآخر جب میں شہر میں پہنچا تو میں نے ہر طرف ناچنے اور گانے والے طائفے دیکھے جنھیں دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ صبح سے شام تک اور غروبِ آفتاب سے طلوعِ سحر تک فوجوں کے ڈھول اور باجوں کی آوازیں برابر چلی آتی تھیں، گھڑیالوں کی صداؤں اور نوبت کی آوازوں سے کان بہرے ہوئے جاتے تھے، گھوڑے گاڑی، اونٹ، خچر، شکاری کتے، بیل، بیل گاڑیاں اور توپیں لے جانے والی گاڑیاں شمار سے باہر تھیں۔ لباسِ فاخرہ پہنے ہوئے شرفائے دہلی کے نوجوان، رشتہ دار، اطبا، ہر ملک کے گانے بجانے اور ناچنے والے مرد و زن سب بڑی تنخواہوں پر ملازم تھے اور ہر چھوٹے بڑے کی جیبیں سونے چاندی سے بھری ہوئی تھیں۔ مفلسی اور فلاکت کا کسی کو وہم بھی نہ تھا۔ نواب وزیر شہر کی آبادی اور رونق پر خاص طور پر متوجہ تھے[۳۱]۔"

یہ حالات ۱۷۶۹ء کی زندگی پر مشتمل ہیں جبکہ انگریزی اثرات بھی گہرے ہوتے جا رہے تھے اور شجاع الدولہ اپنا وقار بحال کرنے کے لیے بھی کوشاں تھے لیکن پھر بھی عوام کی پُرمسرت زندگی اور شہر کی رونق پر اثر نہ پڑنے پایا بلکہ "ناچنے اور گانے والے طائفوں" کے ساتھ ہی "فوجوں کے ڈھول باجے اور توپیں لے جانے والی گاڑیاں" اس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ وہ عیش و عشرت کے ماحول میں بھی سلطنت کی طرف سے غافل نہ رہتے تھے۔ اسی شان و شوکت کا احساس تھا جس کے تحت نئی نئی عمارتیں بنوائی گئیں، خوبصورت باغات کی تشکیل ہوئی، نہروں اور پلوں کی بنیادیں پڑیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ علوم و فنون

ایسے مراکز قائم ہوگئے جس کی مثالیں دوسری جگہ مشکل سے ملیں گی۔ اہلِ حرفہ اور ماہرینِ فن ہندوستان کے مختلف حصوں سے آ کر جمع ہوگئے عالموں کی قدر و منزلت نے علوم کو مقبولیت بخشی اور شاعروں کی اتنی بڑی تعداد امنڈ پڑی کہ یہیں سے نئی روایت اور نئے مرکز کی بنیاد پڑ گئی۔ خود شجاع الدولہ اتنا با ذوق تھا کہ بعض ماہرینِ شعر و فن کو اپنی طرف سے اعزاز و اکرام کے ساتھ اصرار کر کے بلاتا اور یہاں آ کر ان فنکاروں کو شاہی قربت بھی حاصل رہتی اور عوام کی مقبولیت و شہرت بھی۔

آصف الدولہ

شجاع الدولہ کے دورِ حکومت کے آخری دنوں میں ایسٹ انڈیا کمپنی اودھ کے معاملات میں اتنی حادی ہو چکی تھی کہ اس کی مرضی کے بغیر جائز و قانونی وارث بھی نیا حکمراں نہیں بن سکتا تھا چنانچہ شجاع الدولہ کو جب اپنی موت کا یقین ہوگیا تھا تو انھوں نے اپنی زندگی ہی میں یہ مسئلہ طے کر ڈالنا مناسب سمجھا اور بہو بیگم کی مرضی کے مطابق ایک خط کے ذریعہ گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ ان کے بعد آصف الدولہ کو اودھ کا نواب مقرر کیا جائے جو کمپنی سے پوری طرح وفاداری اور تعاون کرتے رہیں گے، اس خط کے کلکتہ پہنچنے سے پہلے شجاع الدولہ کا انتقال ہوگیا لیکن اس کی بنیاد پر حالات کا جائزہ لیکر ۴ مارچ ۱۷۷۵ء کو آصف الدولہ کو "نواب" کا اعزاز حاصل ہوگیا۔ آصف الدولہ کے والدین نے کمپنی سے ان کی خیر خواہی کا وعدہ تو کر لیا تھا لیکن شاید ان کو یہ احساس نہیں تھا کہ اس حکومت کے تاج میں اذیت ناک کانٹے بھرے ہوں گے جن سے کسی لمحہ سکون نہ مل سکے گا۔

آصف الدولہ کو حکومت تو مل گئی لیکن مختلف معاہدوں اور کمپنی اور اودھ میں ("Universal peace , firm friendship & perfect union"-) کے نام پر معاشی، علاقائی اور فوجی پابندیوں کا حصار تنگ سے تنگ ہوتا گیا۔ ۲۱ مئی ۱۷۷۵ء کو یہ کہہ کر نئے معاہدہ کی ضرورت پیش آئی کہ شجاع الدولہ کے ساتھ جو معاہدے ہوئے تھے وہ ان کے ساتھ ختم ہوگئے، چنانچہ اس TREATY سے اس دور کی ابتدا ہوگئی کہ اقتصادی اور معاشی طور پر اودھ کا خزانہ بالکل خالی ہوگیا اور نواب محض محکوم بن کر رہ گیا۔ سب سے پہلا دھکا یہ لگا کہ بنارس اور اس کے قرب و جوار میں غازی پور اور جون پور کے اضلاع (جو علاقہ راجہ چیت سنگھ کے تعلقہ میں تھا) کمپنی نے اودھ سے نکال کر اپنے قبضہ میں کر لیے اور دوسری شرط یہ ماننی پڑی کہ شجاع الدولہ تک اودھ کی طرف سے کمپنی کو فوجی اخراجات کے لیے فی برگیڈ ۲ لاکھ ۱۰ ہزار ماہانہ دینا پڑتا تھا اب اس میں پچاس ہزار کا اضافہ کر کے دو لاکھ ساٹھ ہزار کر دیئے گئے۔ اور تیسری چیز یہ تھی کہ ایک Temp. Brigade بھی قائم کر دیا گیا اور اس کے سارے اخراجات کا بوجھ بھی اودھ ہی کے خزانہ پر پڑا۔ محض اتنا ہی نہیں اودھ کے فوج کے افسران کی حیثیت سے بھی انگریزوں ہی کا تقرر کرنا پڑا، Resident اور اس کے عملہ کے مصارف بھی اسی کے ذمہ تھے اور ان سب باتوں کے باوجود اس پر اصرار تھا کہ انتظام حکومت اور رعایا کی حالت کو بہتر بنایا جائے۔ آصف الدولہ کو سوائے کمپنی کی ہر ہدایت کے ماننے کے کوئی چارہ کار نہ تھا کیونکہ بار بار اس خطرہ کا احساس دلا دیا جاتا تھا کہ اگر ان کے لیے یہ شرائط قابلِ قبول نہیں ہیں تو سعادت علی خاں (ان کے بھائی) کو حکومت سونپ دی جائے گی جس کے لیے وہ تیار نہ تھے لیکن پھر بھی جب حالات نے یہ شکل اختیار کر لی کہ:

> "The pay of the Nawabs Servants and the allowances of members of his family were heavily in arrears. The ladies of the harem were in absolute want of food." [22]

تو بار بار انھوں نے وارن ہیسٹنگز کو اپنی بے بسی کی طرف متوجہ کیا۔ ہیسٹنگز نے خود ان چیزوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

> "The number, influence and enormous amount of the Salaries, pensions & emoluments of the co.s Service, civil & military, in the Vazir's serviceshave become an intolerable burden upon the revenue and authority of His Excellency and exposes to the envy and resentment of the whole country." [23]

معاشی ہیجان و انتشار کا یہ سلسلہ محض دربار اودھ یا آصف الدولہ تک محدود نہیں رہا بلکہ جب اودھ کا خزانہ خالی ہوگیا تو ہیسٹنگز کی حرص و ہوس کی نظر بہو بیگم کی جاگیر اور ان کے خزانے کی طرف گئی اور آصف الدولہ کے وزیر مختار الدولہ (مرتضیٰ علی خاں) کی سازش سے بیگم اور ان کے ملازمین

...طرح طرح کے مظالم ڈھاکر ساری دولت لوٹ لی گئی۔ آصف الدولہ کے دارالسلطنت کی تبدیلی کے بعد بھی یہ فیض آباد ہی میں مقیم رہیں اور ان کی جاگیر اتنی سیر حاصل اور خزانہ اتنا معمور تھا کہ اس سے ہزاروں شریف اور آبرودار آدمی حرمت اور امارت کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔"[44] تاریخ فرح بخش کا مصنف فیض بخش لکھتا ہے کہ "یوں تو صاحبزادے (آصف الدولہ) آئے دن ماں سے مطالبہ کرکے کئی کئی لاکھ روپے اڑا لے جاتے تھے۔ لیکن پانچویں بار جو لوٹ ہوئی اس میں مختارالدولہ اور صاحب ریذیڈنٹ بہادر جان برسٹو بھی شریک تھے۔ اس بار چوبیس لاکھ روپے نقد اور چھتیس لاکھ روپے کا سامان وصول کیا گیا جس میں زر و جواہر کے علاوہ ستر ہاتھی، آٹھ سو بیل گاڑیاں، ستر ہزار کا ایک پیچوان، سترہ ہزار کی طلائی زین، جواہرات جڑے ہوئے چالیس سرپوش اور اطلس، زربفت، کمخواب اور کاشانی مخملوں کے بیشمار تھان بھی شامل تھے۔ اس کے بعد چھٹی اور آخری لوٹ ۱۷۸۲ء میں اس وقت ہوئی جب حیدر بیگ خاں نائب سلطنت اور مڈلٹن ریذیڈنٹ بہادر تھے۔ یہ لوٹ گورنر جنرل کے اشارے پر ہوئی اس میں بہو بیگم کے دو خواجہ سراؤں یعنی جواہر علی خاں اور بہادر علی خاں کو گرفتار کرکے لکھنؤ کے مقام پر چھاؤنی میں رکھا گیا جہاں ان پر سخت مظالم کیے گئے اور اس طرح پچپن لاکھ روپیہ کا ساز و سامان حاصل کر لیا گیا"[45]

یہ ساری لرزہ خیز داستان اس چیز کی بہت بڑی مثال ہے کہ آصف الدولہ کے معمولی افسر سے لے کر نائب سلطنت تک سبھی کسی نہ کسی شکل میں اپنے مفادات کے پیشِ نظر کمپنی اور اس کے حاکموں کے خیر خواہ بن چکے تھے، اول تو مختلف عہدوں پر انھیں افراد کا تقرر ہوتا تھا جو انگریزوں سے اعتماد حاصل کر سکے، نواب کے خلاف سازش میں شریک ہوتے رہیں دوسرے ہر اس افسر کو اس کے عہدوں سے ہٹا دینا عام دستور بن گیا تھا جس کے بارے میں ذرا سا بھی شک ہو کر نواب سے قریب اور ان کا وفادار ہے، کبھی نائب سلطنت مختارالدولہ کو کمانڈر انچیف بسنت خاں کے ذریعہ قتل کرا دیا گیا، کبھی جھاؤ لال ایسے ماہر، ہوشمند اور بے لوث دیوان کو معزول کرکے گرفتار کر لیا گیا اور اسی سلسلہ کی آخری کڑی وہ تھی جب حیدر بیگ خاں کے انتقال کے بعد آصف الدولہ کی خواہش کے خلاف نواب تفضل حسین خاں کو نائب سلطنت بنا دیا گیا۔ آصف الدولہ اس عہدہ پر الماس علی خاں کا تقرر چاہتے تھے جن کی صلاحیتوں کا اعتراف (Sleeman) ایسے انگریز افسر نے بھی کیا ہے جس نے اودھ کے حکمراں پر طرح طرح کے الزامات عائد کیے ہیں، وہ لکھتا ہے :-

> "Miyan Almas was the greatest and best man of any note that Oudh has produced. He held for about 40 years, districts yielding to the Oudh Govt. an annual revenue of about 80 lakhs of rupees. During all this time he kept the people secure in life & property and as happy as people in such a state of society can be; and the whole country under his charge was, during his life time a garden." [46]

لیکن ایسے باصلاحیت شخص کے مقابلہ میں نواب تفضل حسین خاں کو ترجیح دی گئی جو ایک دانشور اور عالم تو ضرور تھے لیکن انتظامی معاملات میں امتیاز حاصل نہ تھا، آصف الدولہ اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ وہ سعادت علی خاں کے استاد بھی اور گورنر جنرل اور کمپنی کے خیر خواہ بھی۔ چنانچہ اب ان کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ حکومت کے کسی شعبہ پر ان کا اختیار و عمل قائم نہیں رہ سکتا اور آخر میں یہ حالت ہو گئی تھی کہ حالات کی بے بسی و مجبوری سے بیمار رہنے لگے، دوا علاج پر بھی توجہ نہ دی اور مایوسی کی یہ شدت ہو چکی تھی کہ یہ کہا کرتے تھے کہ "جو دل غم و آلام سے ٹوٹ چکا ہے اس کا کوئی علاج نہیں ہے" اور انھیں حالات میں ۲۱ ستمبر ۱۷۹۷ء کو انتقال کر گئے۔

تفضل حسین خاں کی طرف سے آصف الدولہ کے شکوک غلط نہیں تھے چنانچہ ان کے انتقال کے بعد وزیر علی خاں کی تخت نشینی پر انھوں نے جو رول ادا کیا اسے کسی شکل میں سراہا نہیں جا سکتا۔ یہاں مؤرخوں کے ان متضاد نظریات سے بحث نہیں ہے کہ ان کی جانشینی کا اعلان غلط تھا یا صحیح لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس وقت کی رعایا کی نظر میں ان کی معزولی ایک منظم منصوبہ کے تحت عمل میں آئی تھی جس میں بہت سی اعلیٰ شخصیتوں کا ہاتھ بھی تھا۔ اسی سلسلہ میں یہ شعر زبان زد عوام تھا کہ ؎

ساتھ حرفوں نے کیا خانہ خراب   تین ت اور دو الف کو ح ...

(یعنی نواب تفضّل حسین خاں، نواب تحسین علی خاں، مہاراجہ ٹکیت رائے، اشرف علی خاں، نواب حسن رضا خاں اور بہو بیگم) ان سب نے ایک محضر پر دستخط کرکے گورنر جنرل کو ان کی معزولی کی ترغیب دی تھی، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "عوام میں بڑا تلاطم مچ گیا، تمام لوگ تفضل حسین خاں، سرفراز الدولہ، ٹکیت رائے اور الماس علی خاں کو غلیظ گالیاں دے رہے تھے"[37] اور اس سلسلہ میں سب سے زیادہ بدنامی تفضل حسین خاں ہی کو اٹھانی پڑی جو بہرحال انگریزی اثرات کے بہت بڑے نمائندے بھی تھے اور جنھیں (اپنے پرانے شاگرد) سعادت علی خاں سے زیادہ ہمدردی کی امید تھی"[38] حقیقت یہ ہے کہ اگر آصف الدولہ تفضل حسین خاں کی تقرری رکوا سکتے تو بعد میں وزیر علی خاں کے خلاف سازشوں کا یہ طوفان ہرگز نہ اٹھتا اور نوجوانی کے جوش وولولہ کے ساتھ ان کے دل میں انگریزوں کے خلاف جو غم و غصہ کی لہر پیدا ہوئی اس کے پیشِ نظر اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہو سکتی کہ اودھ کی تاریخ کسی اور شکل میں ہوتی۔

آصف الدولہ کی زندگی اور ان کے بعد رونما ہونے والے ان واقعات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ انھیں درباری اور بیرونی سازشوں کے اس جال میں حکومت کا انتظام کتنا دشوار مرحلہ تھا لیکن حقائق شاہد ہیں کہ رعایا کی فلاح و بہبود اور سلطنت کی ترقی و شوکت وعظمت کے لیے ان کے دورِ حکومت میں جو کام ہوئے وہ بعد میں بہت کم انجام پا سکے۔ فیض آباد سے دارالسلطنت تبدیل کرکے لکھنؤ میں بارونق محلوں، شاندار عمارتوں اور خوبصورت باغوں کی تعمیر کرکے زندگی بخش دینا کوئی معمولی کارنامہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ان عمارتوں کی تعمیر کے پیچھے بھی محض اظہارِ شان و شوکت کا جذبہ پوشیدہ نہ تھا بلکہ اس سے ہزاروں مفلس وغریب عوام کو روزگار بھی میسر ہو جاتا تھا، کاریگروں اور صناعوں کی ہمت افزائی بھی ہوتی تھی اور ہزاروں افراد کی رہائش و قیام گاہ کا انتظام بھی ہو جاتا تھا چنانچہ امام باڑہ، اس کا رومی گیٹ، بیبیا پور کوٹھی، چنہٹ کوٹھی، ریزیڈنسی اور لکھنؤ کی بہت سی اہم عمارات اسی دور کی صناعی اور عظمت کا احساس دلاتی ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے شعبوں کے فنکاروں کی قدر و منزلت بھی کی گئی، مصوری، موسیقی، نجوم، طب، غرضیکہ ہر فن کے ماہرین لکھنؤ میں جمع ہو گئے اور خاص کر شعری و ادبی زندگی کا جو دور یہاں سے پھیلا اس کی گونج آج تک اپنی روایات کے ساتھ کسی نہ کسی شکل میں قائم ہے۔ مختلف علوم کی ترقی پر ایسی توجہ دی جاتی تھی کہ علما کی سرپرستی کے ساتھ ساتھ کتبخانہ میں نادر کتابوں کی فراہمی بھی ضروری جز تھا اور اسی سلسلہ میں سیّد عبداللطیف شوستری لکھتے ہیں کہ :-

> "ان کے کتب خانے میں تین لاکھ منتخب کتابیں میں نے دیکھی تھیں جو نہایت پاکیزہ خط میں لکھی ہوئی تھیں۔ ہر سو کتاب پر ایک گماشتہ مقرر تھا، مختلف فنونُ اصناف پر عربی، فارسی اور انگریزی میں کتابیں تھیں۔ نظم و نثر کی کتابیں، تاریخیں اور دواوین بے شمار تھے۔ ان کے علاوہ خوشنما قطعات جو اولین و آخرین خوشنویسوں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے اور ایران، ہند، روم اور فرنگ کے مصوّروں کی بنائی ہوئی تصویریں اتنی تعداد میں تھیں کہ ان کے دیکھنے سے تمام عمر فراغت نہ مل سکے"[39]

آصف الدولہ کے حسن انتظام اور ترقی سلطنت کے جذبہ کا ایک پہلو یہ بھی قابل قدر ہے کہ اودھ کے گذشتہ حکمرانوں کی طرح انھوں نے بھی کسی معاملہ میں مذہبی امتیاز نہیں برتا بلکہ مساویانہ سلوک کرتے رہے۔ اگر ان کے یہاں اعلیٰ عہدوں پر مسلمان تھے تو ہندوؤں کو بھی پورا اعزاز ملتا تھا بلکہ بعض عہدوں پر تو ان کو مسلمان افسروں سے زیادہ ہندو افسران پر اعتماد تھا۔ اسی طرح اگر وہ محرّم اور عید کے سلسلہ میں لاکھوں روپیہ صرف کرتے تھے تو ہولی میں بھی حکومت کی طرف سے ۵ لاکھ خرچ کیے جاتے تھے اور وہ خود جشن میں شریک ہو کر عوام کی خوشیوں میں اضافہ کرتے رہتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ چاہے خزانہ خالی رہا ہو لیکن انھوں نے عوام میں مایوسی اور بددلی نہ پھیلنے دی اور اپنے کو عوام میں اتنا مقبول بنا لیا کہ یہ محاورہ مشہور ہو گیا کہ ع

جس کو نہ دیں مولا، اس کو دیں آصف الدولہ

ان کی سخاوت، فیاضی اور دریادلی کی داستانیں آج بھی یاد کی جاتی ہیں اور کسی طرح عوام کے یہ بات قرینِ قیاس نہیں آسکتی کہ ایسا پرشکوہ

اور عظیم دربار اقتصادی کساد بازاری کا شکار رہا ہو۔ اسی منزل سے دربار میں ایرانی علما و دانشوروں کا اثر و اقتدار بھی بڑھنے لگا اور مقامی تہذیب میں ایرانی کلچر کے اثرات، اس کی لطافت و شائستگی کے امتزاج سے تہذیبی زندگی کا نیا مزاج ابھر کر باقاعدہ سامنے آگیا۔

سعادت علی خاں

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے وزیر علی خاں جو آصف الدولہ کے بعد "نواب" کی مسند حاصل کر چکے تھے انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کے لیے بہت بڑی رکاوٹ بن سکتے تھے اور یہی احساس تھا جس کے تحت ان کو ہٹانے کے لیے طرح طرح کے دلائل تلاش کیے گئے اور سعادت علی خاں سے کمپنی کی اطاعت اور اس کے احکام کی پابندی کا وعدہ لے کر ۲۱ جنوری ۱۷۹۸ء کو ان کی جانشینی کا اعلان کر دیا گیا۔ سعادت علی خاں کے لیے یہ حکومت نعمتِ غیر مترقبہ کے طور پر مل رہی تھی اس لئے انھوں نے حکومت سنبھالنے سے پہلے ہی انگریزوں کی طرف سے پیش کی گئی TREATY کو بخوشی منظور کر لیا جس کی رُو سے کمپنی کو ملنے والی ۵۶ لاکھ کی رقم میں ۲۰ لاکھ کا اضافہ کر کے ۷۶ لاکھ سالانہ دینے پر راضی ہو گئے، ان کی جانشینی کے لیے کمپنی کے حکام کو جو کارنامے انجام دینے پڑے تھے اس کے اخراجات کے سلسلہ میں ۱۲ لاکھ کی رقم ادا کی اور الہ آباد اور فتح گڑھ کے قلعوں کو کمپنی کے حوالے کر کے ان کی مرمت کے لیے بالترتیب ۸ اور ۳ لاکھ دینا منظور کر لیے۔ دراصل سعادت علی خاں کو جو اعزاز مل رہا تھا اس کے پیشِ نظر وہ اس پوزیشن میں تھے ہی نہیں کہ کسی قسم کی رد و قدح کر سکتے۔ محض اسی پر اکتفا نہیں کی گئی بلکہ گورنر جنرل لارڈ ولزلی نے اس بات پر زور دینا شروع کیا کہ اودھ کی فوج (جو آصف الدولہ تک تقریباً ۸۰ ہزار تھی) کم کر دی جائے اور اس کی جگہ کمپنی کی فوجی طاقت میں اضافہ ہوتا رہے۔ اس طرح حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے تین ہی سال میں ان کے اختیارات کم سے کم تر ہوتے گئے۔ کمپنی کی بندشیں زیادہ سے زیادہ عائد ہوتی گئیں، حکومت کی آمدنی کے ذرائع محدود ہو کر رہ گئے۔ اور نوبت آگئی کہ عاجز آکر سعادت علی خاں نے حکومت سے کنارہ کشی کر لینے کا ارادہ بھی کر لیا، اور گورنر جنرل سے کمپنی کے تقاضوں کو پورا کرنے کی معذوری بھی ظاہر کی لیکن ان مسائل پر توجہ دینے کے بجائے گورنر جنرل نے ۲۸ اپریل ۱۸۰۱ء کو لکھنؤ کے Resident کو یہ لکھ بھیجا کہ اودھ کی سلطنت کا آدھا علاقہ سعادت علی خاں سے لے کر کمپنی اپنے زیر انتظام کر لے اور "اگر وزیر اس کے لیے بخوشی راضی نہ ہوں تو ان علاقوں پر جبری قبضہ حاصل کر لیا جائے" سعادت علی خاں کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ اگر یہی حالات رہے تو بہت وقت نہیں لگے گا کہ اودھ کا بقیہ علاقہ بھی کمپنی کے اختیار میں چلا جائے گا" لیکن ان کے پاس کوئی چارۂ کار نہ تھا چنانچہ ۱۰ نومبر ۱۸۰۱ء کے ایک معاہدہ کے ذریعہ وہ اودھ کے آدھے علاقے سے دستبردار ہو گئے۔ اس معاہدے کی رُو سے جو اضلاع کمپنی کو ملے ان میں روہیل کھنڈ، فرخ آباد، مین پوری، اٹاوہ، کانپور، فتح گڑھ، الہ آباد، اعظم گڑھ، بستی اور گورکھپور شامل تھے اور جس سے اودھ کے خزانہ کو ۳ کروڑ سالانہ کی آمدنی تھی۔ اسی واقعہ کو ایک شاعر نے قطعۂ تاریخ کی شکل میں یوں نظم کیا کہ

خود بخود ایں دور دورنگی گرفت
ملک ز نواب فرنگی گرفت = (۱۲۱۶ھ)

چنانچہ اس تقسیم سے نواب اور رعایا کے دلوں پر جو اثرات ہوئے ہوں ان کا اندازہ لگانا مشکل ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ اس نصف علاقہ پر قناعت کر کے سعادت علی خاں نے اپنے حسنِ انتظام اور غیر معمولی صلاحیتوں سے اودھ میں ایسی خوشحالی اور شان و شوکت بھر دی کہ عوام اس کی کمی محسوس نہ کر سکے۔

اس تقسیم نے اگر سیاسی طور سے اودھ کو تبدیل کر دیا تھا تو سعادت علی خاں کی ذاتی زندگی میں بھی انقلاب پیدا کر دیا اور وہی شخص جو سیر و شکار، شاہد و شراب اور عیش و عشرت کا دلدادہ تھا ایسا ذمہ دار حکمراں بن گیا کہ اس معاہدہ کے بعد اپنے آخری لمحات تک بڑی سے بڑی دشواریوں کا سامنا کرنے کے باوجود کسی طرح کی غفلت نہ برتی۔ یہاں تک کہ معاشی لحاظ سے بھی سلطنت کو تنگی و مفلسی کا احساس نہ ہونے دیا، اور مال گزاری کا ایسا بندوبست کیا کہ حکومت کی آمدنی بھی بڑھتی رہے اور رعایا کو پریشانی کا سامنا بھی نہ کرنا پڑے۔ ایک انگریز مؤرخ بھی ان کے حُسنِ انتظام کا اعتراف کرتے

ہوئے لکھتا ہے کہ :-

"The result of his administration was that the people became contented and prosperous,...... At his death S. Ali left behind him the name of the friend of the ryot, and a full treasury." [43]

اور انھیں تمام خصوصیات کی بنیاد پر H.C. IRWIN نے ان کو اس سلطنت کے تمام حکمرانوں میں "سب سے زیادہ عظیم" سب سے زیادہ ہوشمند اور مضبوط ترین منتظم" قرار دیتے ہوئے اس چیز پر اظہار افسوس کیا ہے :

"He (Lord Wellesley, Governor General) had before him perhaps the ablest and most enlightened native ruler then living, and failed to recognise him." [44]

ان کی صلاحیتوں کا یہ بہت بڑا ثبوت ہے کہ شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کے دور سے فنکاروں، صناعوں اور شعراء کی قدر و منزلت کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا انھوں نے اسے نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اس میں اضافہ کر کے درباری فضا کو زیادہ بارونق اور پرشکوہ بنا دیا اور عوام میں بھی شعری و فنی ذوق تیزی سے پھیل گیا۔ انشا کا یہ جملہ سعادت علی خاں اور ان کی رعایا دونوں کے رجحان کا پتہ دیتے ہیں وہ لکھتے ہیں :-

"پیر و مرشد کے عہد میں نئے اور نفیس فیشن کی تعمیر دل، الفاظ کی تحقیق، فصاحت کی جانچ، بلاغت کا لحاظ، لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی، تقریر کی شستگی اور نئی چیزوں کی ایجاد کے چرچے بہت زیادہ ہیں اور قابل اور فصیح بلیغ شخصوں کے علاوہ کسی کی صحبت حضور والا کو پسند نہیں ہر بات اور لطیفہ کے مغز کو پہنچتے ہیں" [45]

اس دور کی زبان دانی، شعراء کے گروہ اور ان کے معرکے اور عوام کے فنی ذوق کی بلندیوں کے تذکرے آب حیات اور دوسری ادبی تاریخوں سے آسانی سے دیکھے جا سکتے ہیں، یہاں محض ان کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے، اسی طرح دوسرے فنون کے ماہرین بھی عوام میں مقبولیت حاصل کئے ہوئے تھے اور فن تعمیر کو بھی ایسی بلندی ملی تھی کہ دلارام، دلکشا، حیات بخش، موسیٰ باغ، نور بخش خاص بازار کی کوٹھیاں اور حضرت عباس کی درگاہ آج بھی اس کا موجودہ ثبوت ہیں۔ بازاروں کی چہل پہل، جشن اور تقاریب کی رونق اور مذہبی رسوم ہر چیز سے شاہی عظمت کا احساس ہوتا تھا اور یہ ایسے حکمراں کے دور کی کیفیت ہے جو سیاسی اور انتظامی طور پر نہ معلوم کتنی پابندیوں میں جکڑا ہوا تھا، انھوں نے عوام کو خوشحالی بھی بخشی، سلطنت کو مضبوط و شاداب بھی بنایا، شاہی عظمت کو برقرار بھی رکھا اور اس طرح ایک کامیاب اور ہر دلعزیز حکمراں کی زندگی گزار کر ۱۱ جولائی ۱۸۱۴ء کو انتقال کر گئے۔

غازی الدین حیدر

سعادت علی خاں کے بعد غازی الدین حیدر نے مسند حکومت سنبھالی اور ان کو اس شرط کے ساتھ حکمراں بنایا گیا کہ وہ سابق معاہدے کی پابندی کرتے رہیں گے اور ایک ایسے خود مختار (Independent — prince) حکمراں ہوں گے جن کے لیے حکومت برطانیہ کی اطاعت لازمی ہوگی۔ (must be Subservient to the British Govt.) کمپنی کی جانب سے نواب کی اس تجویز کو بھی قبول کر لیا گیا تھا کہ ان کے علاقہ میں آئندہ کسی قسم کی کمی نہ کی جائے گی البتہ کبھی انتظام سلطنت کو بہتر بنانے کے لیے، کبھی نیپال و برما کی جنگ کے موقع پر اور کبھی دوسرے مواقع تلاش کر کے ادھر سے کروڑوں روپیہ اعانت یا قرض کے طور پر لئے جاتے رہے اور غازی الدین حیدر کو بخوشی دینا پڑتا یہاں تک کہ اسی عرصہ میں بہو بیگم کے انتقال کے بعد ان کی مال و دولت اور ان کا سارا خزانہ جس کے جائز وارث غازی الدین حیدر ہی تھے اس کو بھی کمپنی نے اپنے قبضہ میں کر لیا۔ ان تمام عطیات کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ گورنر جنرل اور کمپنی کے دوسرے اعلیٰ حکام سے ان کے تعلقات بہت خوشگوار رہے اور اسی اظہار تعاون کا اثر یہ ہوا کہ ان کو ۱۸۱۹ء سے "بادشاہ" کا مرتبہ دے دیا گیا۔ اس اعلان سے جہاں عوام کی نظر میں غازی الدین حیدر کا مرتبہ بڑھ گیا وہاں بادشاہ کو اپنی شاہی عظمت کا احساس بھی ہو گیا اور بہت سے ایسے طریقے اختیار کیے گئے کہ دربار میں شہرت بھی بڑھے اور دہلی کی بادشاہت

کا مقابلہ بھی کیا جا سکے۔ زراعتی پیداوار میں کسی طرح کی کمی نہ تھی، صنعت و حرفت کو ترقی حاصل ہو چکی تھی، مختلف فنونِ لطیفہ کی ہمت افزائی کی جا رہی تھی اور سب سے بڑھ کر شعر و ادب نے اسی منزل سے غیر معمولی ترقی کی۔ بادشاہ کو مشرقی فلسفہ اور علمِ لسانیات کے مطالعہ سے خود بھی گہری دلچسپی تھی، شعراء کے کلام پر گہری نظر تھی، بڑے بڑے اساتذہ کو انعام و اکرام سے نوازا جاتا تھا اور یہی دور تھا جب پریس قائم کر کے مختلف موضوعات سے متعلق کتابیں چھاپنے کی ابتدا ہوئی۔ یہاں ان چیزوں کا تفصیلی ذکر کرنا مقصود نہیں ہے کہ نثر و نظم کے ارتقا میں دورِ غازی الدین میں کیا اہم کام انجام دیے گئے۔ البتہ اس طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ ان کا دور انتشار و بےچینی سے بہت حد تک پاک رہا اور شاہی سرپرستی کے تحت عوام میں مختلف فنون اور علمی و ادبی شعبوں سے دلچسپی کا رجحان شدت سے بڑھتا رہا۔ غازی الدین حیدر کا انتقال ۲۰ اکتوبر ۱۸۲۷ء کو ہوا اور اودھ کے تہذیبی عناصر ان کے دورِ حکومت میں زیادہ واضح طور پر ابھر چکے تھے۔

نصیر الدین حیدر

نصیر الدین حیدر کے دور سے ہی یہ خبریں گشت کرنے لگیں تھیں کہ ان کے ہاتھ سے حکومت لے کر کسی دوسرے فرد کو سونپی جائے گی، ان کی عیاشی، بدانتظامی اور انتشار و ہیجان کی کیفیت تیزی سے پھیلائی جا رہی تھی۔ اس وقت کے Resident کرنل (Low) نے پرزور سفارش کی تھی کہ ان کو ہٹا دیا جائے۔ خود اپنے وزیر معتمد الدولہ آغا میر پر بادشاہ کو اعتماد نہ تھا، ان کو شہر بدر کر کے کبھی مہدی علی خاں کو وزیر بنایا گیا کبھی روشن الدولہ کو لیکن کمپنی کے حکام کو کسی طرح اطمینان نہ ہوا، وہ انگریزی تہذیب، ان کے لباس و وضع قطع سے گہری دلچسپی رکھتے تھے، درباری زندگی پر بھی انگریزوں کا گہرا اثر تھا اور یہ اثرات یہاں تک بڑھے کہ وہی لوگ بادشاہ کے ہر امر میں پوری طرح دخیل ہو گئے اور ان کو موقع مل گیا کہ درباری سازشوں میں شریک ہو کر بادشاہ کو بدنام کر سکیں۔ خود بادشاہ کو اپنی بیگمات اور اپنے امراء پر کسی طرح کا اعتماد نہ تھا۔ ہر طرف سے خطرات گھیرے ہوئے تھے لیکن ان حالات میں بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے کام نہ کیے گئے ہوں۔ ان کے دور کی تہذیبی زندگی کا نقشہ رجب علی بیگ سرور کی فسانۂ عبرت میں تفصیل سے مل جاتا ہے اور اگر انگریز مؤرخ نے (Private Life of an Estern King) میں ان کی عیاشیوں اور نفسیاتی کجروی کی مبالغہ آمیز داستانیں بیان کی ہیں تو فسانۂ عبرت سے درباری شان و شوکت اور علمی و تہذیبی بلندی کا پتہ بھی چلتا ہے۔ انھوں نے غریبوں، فقیروں اور معذوروں کی امداد پر ہمیشہ توجہ کی اور ایک بڑی رقم اس کام کے لیے جمع کر دی کہ اس سے ان لوگوں کو روزی ملتی رہے۔ اتنا ہی نہیں انھوں نے حکومت کی طرف سے لکھنؤ کے علمی مراکز میں حصولِ علم کے لئے وظیفہ بھی مقرر کیا، غریب و نادار مریضوں کے لیے شفا خانے کھلوائے اور سب سے بڑھ کر بردہ فروشی کی اس رسم پر بھی پابندی عائد کی جو اس زمانے میں رائج تھی۔ رعایا کے تحفظ کے طور پر ٹھگوں اور ڈاکوؤں کے مظالم کو روکا اور اپنے مختصر دورِ حکومت میں علم و ادب اور شعر و فن کو کافی وسعت بخشی۔ ۷ جولائی ۱۸۳۷ء کو ان کے انتقال کے بعد درباری ریشہ دوانیوں اور ریزیڈنٹ کی سازشوں سے جو قتل و غارت گری ہوئی اس کا تفصیلی ذکر کرنا ضروری نہیں ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ رعایا اور عوام میں ان کی موت سے جو مایوسی اور صدمہ ظاہر ہوا وہ ان کی مقبولیت کا بہت بڑا ثبوت ہے۔

محمد علی شاہ

محمد علی شاہ بڑے ہنگامہ خیز حالات میں تختِ سلطنت پر بیٹھے تھے، نصیر الدین حیدر کے انتقال کے بعد ان کی والدہ "بادشاہ بیگم" نے منا جان (مرحوم بادشاہ کے بیٹے اور وارث) کو تخت و تاج کا مالک قرار دے کر ان کی بادشاہت کا اعلان کر دیا، کمپنی اس کے لیے تیار نہ تھی اور اس کشمکش نے اتنی شدت اختیار کر لی کہ پہلی بار اودھ اور کمپنی کی فوجوں میں مقابلہ ہوا اور بادشاہ بیگم اور منا جان کی گرفتاری کے بعد محمد علی شاہ [illegible]

خاں کے بیٹے، نصیر الدین حیدر کے چچا) کو حکومت سونپنے کا فیصلہ کیا گیا ــــ البتہ ان سے ریزیڈنٹ نے اس اقرار نامہ پر دستخط لے لیے تھے کہ "بادشاہت ملنے کے بعد گورنر جنرل کی طرف سے جو نیا معاہدہ بھی پیش کیا جائے گا اسے بخوشی منظور کرلیں گے۔" ممکن ہے اس سلسلہ میں بعض مورخین کا یہ خیال صحیح ہو کہ "ان کو خود بھی یہ احساس تھا کہ اس شرط کے ذریعہ یہ سلطنت ان کے خاندان والوں کے ہاتھ سے نکل جائے گی۔"[۴۶] لیکن موجودہ حالات میں وہ اس سلطنت سے دستبردار ہونا نہیں چاہتے تھے۔ ظاہر ہے انتظامی اور فوجی و معاشی امور کے نظام میں بادشاہ کے اختیارات برائے نام ہی رہ گئے تھے، پھر بھی امرار، رؤسار اور عوام کی معاشرتی اور تہذیبی روایات میں کسی طرح کا انحطاط پیدا نہ ہونے پایا۔ انھوں نے بہت سی بدعنوانیوں کو دور کر کے بہتر طرزِ حکومت پر توجہ دی، زراعتی پیداوار میں اضافہ ہوا، پولیس، قانون اور مال کے محکموں کے نظام میں سدھار ہوا، اور تجارت و صنعت و حرفت میں بھی غیر معمولی ترقی ہوئی۔ ان کے دورِ حکومت میں رعایا کی بہبود کے لیے بڑے بڑے کام کیے گئے۔ نہریں جاری کی گئیں، کنوئیں اور تالاب کھدوائے گئے، مسافروں کے لیے سرائیں بنوائی گئیں اور امام باڑہ حسین آباد، حسین آباد کا تالاب، جامع مسجد اور بہت سی دوسری عمارتیں بادشاہ کے ذوقِ تعمیر کا احساس دلاتی ہیں۔ شعر و ادب کی روایات اپنی امتیازی خصوصیات کے تحت بڑھتی رہیں اور ہر شعبۂ فن ترقی کرتا رہا۔ انھیں خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صاحبِ بوستانِ اودھ لکھتے ہیں کہ:۔

"ہر امرے کہ ازیں بادشاہ بہ ظہور رسید صد ہزار تحسین است۔ در عہدِ دولتش ہمہ مردم فارغ البال و آسودہ حال بودند۔ ہیچ کس آزارے بر دل نداشت۔ ابواب معدلت بر روئے خلائق باز و دست تظلم و تعدی کوتاہ بود۔ باوجود ضعفِ پیری از کار ہائے سلطنت خود را معذور نمی داشتند و بر امور کلی و جزوی می رسیدند۔"[۴۷]

محمد علی شاہ نے محض پانچ سال حکومت کر کے، مئی ۱۸۴۲ء کو انتقال کیا لیکن اس مختصر دور میں بھی انتظامِ سلطنت کو جو استحکام بخشا اس سے ہر طبقہ اور ہر علاقہ کے لوگوں کو امن و سکون اور خوشحالی حاصل رہی یہاں تک کہ انگریزوں کو بھی کسی قسم کی بدنظمی کی شکایت کا موقع نہ مل سکا۔

امجد علی شاہ

امجد علی شاہ اپنی ہمدردی و شرافت کے لیے بھی مشہور رہے اور سخاوت و فیاضی کے لیے بھی۔ رعایا کی عام خوشحالی میں اضافہ کے ساتھ ساتھ انھوں نے گومتی پر لوہے کا پل تعمیر کرا کے اور لکھنؤ سے کانپور تک پختہ سڑک بنوا کر ذرائع آمد و رفت کی بڑی دشواری دور کرا دی۔ صنعت و حرفت، تجارت اور زراعت کی ترقی کے ساتھ ان کے دور میں علومِ مشرقیہ کے ارتقار پر خاص توجہ کی گئی۔ فلسفہ، منطق اور مذہبی و دینی علوم کا معیار بلند کرنے کے لیے مدرسۂ سلطانی کا قیام عمل میں آیا اور نامور علمار و ماہرین کو اعزاز و اکرام کے علاوہ وظائف دے کر طلبار کی ہمت افزائی کی گئی، امجد علی شاہ خود مہذب شائستہ قسم کے انسان تھے اور انھوں نے اودھ کی وضعداری اور تہذیبی امتیاز کو آگے بڑھانے میں بڑا حصہ لیا۔ ان کے دور تک اردو نثر و نظم کا بڑا سرمایہ سامنے آچکا تھا اور شعرار و ادبار سکون و اطمینان سے فنی اقدار کے ارتقار پر متوجہ تھے۔

واجد علی شاہ

امجد علی شاہ کے دور تک آتے آتے ایسٹ انڈیا کمپنی فوجی اور سیاسی حیثیت سے اودھ کے معاملات میں اتنا حاوی ہو چکی تھی کہ اب وہ محض یہ موقع تلاش کر رہی تھی کہ اس حکومت کو کس طرح قبضہ میں کر لیا جائے۔ ابھی تک نیپال اور افغانستان سے تصادم کی وجہ سے وہ ادھر متوجہ نہ ہو سکی تھی لیکن واجد علی شاہ کی تخت نشینی کے فوراً ہی بعد ان کے خلاف بدنظمی، ہیجان، انتشار اور ان کی نااہلی اور عیاشی کے ایسے ایسے الزامات تراش لیے گئے جس کا علاج ان کی معزولی کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ ان کی تخت نشینی کے کچھ ہی عرصہ بعد لارڈ ہارڈنگ نے نومبر ۱۸۴۷ء میں متنبہ کر دیا تھا کہ اگر سلطنت کے حالات میں سدھار نہ ہوا تو کمپنی اختیارات کو اپنے ہاتھ میں لے لے

گی۔ دراصل یہ اس سلسلہ کی پہلی کڑی تھی لیکن ۱۸۴۹ء میں جب کرنل سلیمن کو رزیڈنٹ بناکر لکھنؤ بھیجا گیا تو اس کو دراصل اسی مقصد کی تکمیل کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ بظاہر اس نے تین مہینہ تک (یکم دسمبر ۱۸۴۹ء سے ۲۸ فروری ۱۸۵۰ء تک) پوری ریاست کا دورہ کرنے کے بعد رعایا کی تباہ حالی، حکام کی سرکشی، لاقانونیت اور قتل و لوٹ مار کی کیفیات رپورٹ کی شکل میں مرتب کی تھیں لیکن (Samuel Lucas) کے الفاظ میں :۔

> "....The character of his report was determined for him before he entered oude. He professed to examine but he was under orders to sentence; he pretended to try, but he was instructed simply to condemn." [۳۹]

چنانچہ انھیں 'ہدایات' کا اثر تھا کہ بادشاہ کے اختیارات پر زیادہ سے زیادہ پابندیاں عائد ہوتی رہیں، فوجی، اقتصادی، درباری یہاں تک کہ محل کے اندرونی معاملات میں بھی اس کے احکام کے خلاف دخل اندازی کر کے بے بس و مجبور کر دیا اور حالات نے ایسی سنگین شکل اختیار کر لی کہ معمولی افسران اور عاملوں سے لے کر وزرا کی تقرری تک رزیڈنٹ کی مرضی کے بغیر ممکن نہ تھا۔ مجتہد العصر جن ملزمان کو بے قصور ٹھہراتے تھے ان کو سزا دی جاتی اور جو واقعی میں فتنہ و فساد اور سرکشی کے مرتکب ہوتے ان کو رزیڈنٹ کی پشت پناہی حاصل ہوتی۔ اودھ کی ہر تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہے، یہاں اس کے تفصیلی ذکر کی ضرورت نہیں البتہ صاحب سیر المتعشہ نے جس واقعہ کو پیش کیا ہے اس سے اس کیفیت کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :۔

> "دربار لکھنؤ کا شاہی تخت، جسے غازی الدین حیدر نے کئی کروڑ روپیہ میں تیار کرایا تھا، واجد علی شاہ نے اسے کوٹھی "فرح بخش" سے قیصر باغ میں منتقل کرنا چاہا لیکن رزیڈنٹ کی اجازت حاصل نہ ہو سکنے کی وجہ سے اتنا معمولی سا کام بھی بادشاہ سے ممکن نہ ہو سکا" [۴۰]

ان چیزوں کا مقصد صرف یہ تھا کہ رعایا اور عوام کی نظر میں بادشاہ کی وقعت کم ہوتی رہے۔ وہ رزیڈنٹ اور گورنر جنرل کے احکام کے آگے سر تسلیم خم کرتا رہے، اور انتشار و کساد بازاری پیدا کر کے ہر قسم کی تباہی و بربادی کا ذمہ دار بادشاہ کو قرار دیا جا سکے۔ فیض احمد فیض کے یہ اشعار اس دور کی کیفیت پر بھی پوری طرح صادق آتے ہیں:

سچ ہے ستم جناب کے سب دوستانہ تھے
حق ہے ہمیں کو آپ کے شکوے بجا نہ تھے
ہاں جو جفا بھی آپ نے کی قاعدے سے کی
ہاں ہم ہی کاربندِ اصولِ وفا نہ تھے

دراصل انگریزی حکام اس نظریہ پر پوری طرح عامل تھے کہ اگر دروغ بیانی کی اشاعت پوری شدت سے کی جائے تو کچھ عرصہ بعد لوگوں کو اس کی سچائی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ واجد علی شاہ کی صلاحیتوں اور ان کے حُسنِ انتظام سے متنفر کرنے کے لیے یہی طریقہ اپنایا گیا اور کمپنی کے (Directors) کی طرف سے جو منصوبہ بنایا گیا تھا اس پر کرنل سلیمن پوری طرح عامل رہا اور اس کے بعد جب نومبر ۱۸۵۴ء میں (Gen. Outram) نے ریزیڈنٹ کا عہدہ سنبھالا تو اس نے بھی اسی مقصد کی تکمیل ضروری سمجھی۔ چنانچہ واجد علی شاہ اور ان کے دربار میں ۹ سال سے مایوسی اور کشاکش کے جو بادل منڈلا رہے تھے وہ ۴ فروری ۱۸۵۶ء کو شدید طوفان کی شکل میں امنڈ پڑے جس دن کہ انھیں رزیڈنٹ نے گورنر جنرل کی طرف سے یہ حکم سنایا کہ ان کو معزول کر کے اودھ کا انتظام کمپنی نے اپنے اختیار میں کر لیا ہے۔

انصاف پسند محققین و مورخین نے واجد علی شاہ کی شخصیت اور ان کے انتظامِ سلطنت اور اس دور کے معاشرتی و سماجی حالات کے سلسلہ میں جو خیالات پیش کیے ہیں اس سے بہت سے حقائق پوری طرح سامنے آجاتے ہیں۔ تختِ حکومت پر بیٹھتے ہی انھوں نے رعایا کی خوشحالی، درباری شان و شوکت اور مملکت کی ترقی کے لیے ہر شعبہ کی اصلاح پر توجہ کی۔ خاص کر فوج کی تنظیم و تربیت اور اس کے استحکام پر زیادہ زور دیا" بادشاہ نے پیادوں کی چند پلٹنیں اور سواروں کے رسالے بھرتی کر کے ان کو وردی اور ہتھیاروں سے آراستہ کیا تھا...... اکثر بادشاہ بہ نفسِ نفیس میدانِ پریڈ میں جا کر ان کے قواعد اور نیزہ بازی اور شمشیر زنی، اور تفنگ اندازی کی مشق

ملاحظہ فرماتے اور تین تین چار چار ساعت تک گھوڑے پر سوار ہو کر دھوپ میں کھڑے رہتے تھے اور کبھی کبھی خوش ہو کر انعامات اور خطابات سے سرفراز کرتے تھے[۵۱] رعایا سے ایسی ہمدردی و شفقت تھی کہ کسی پر ظلم و جبر برداشت نہیں کر سکتے تھے اور عدل و انصاف سے ذرا بھی انحراف نہیں پایا جاتا۔ اسی کے پیش نظر ان کی سواری کے ساتھ ایک ایسا صندوقچہ رکھا رہتا تھا کہ اگر کسی کو داد و فریاد کرنی ہے تو وہ اس صندوقچہ میں اپنی عرضی ڈال سکتا ہے' بادشاہ ان درخواستوں کو بذاتِ خود پڑھ کر ان پر احکام صادر کرتے تھے۔" ہر گاؤں میں مسافروں کے لیے سرائے قائم کی گئی تھیں اور ان کے تحفظ کے لیے شاہی خرچ سے چوکیدار مقرر تھے' زراعتی پیداوار میں اضافہ کے لیے جگہ جگہ کنوئیں کھدوائے گئے تھے' بہترین تعمیر ہوئی تھیں اور تجارت کی ترقی پر خاص طور سے دھیان دیا گیا تھا، انھیں خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کا ایک ہمعصر مورخ و دانشور مسیح الدین لکھتا ہے کہ :۔

"Wajid Ali Shah is much beloved and respected by his subjects, for the highest to the lowest, from the rajah to the ryot, and this the more so, as he has ever discharged the duties of his high office with justice tempered by mercy." [۵۲]

اس کے ساتھ ان میں علم و فن کے لیے جو فطری رجحان تھا اس نے اودھ کی ادبی زندگی کو سنوارنے، سدھارنے اور اسے ترقی دینے میں خاص طور سے مدد کی۔ حکومت کی ذمہ داریاں نبھانے کے ساتھ ساتھ انھوں نے شعر و ادب اور دوسرے فنونِ لطیفہ کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے جو وسعت بخشی اس کی مثال کہیں اور بڑی مشکل سے ملے گی۔ اس دور میں موسیقی، رہس اور ڈراما کا فن بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بادشاہ نے خود تقریباً پچاس کتابوں کی تصنیف کی، شعراء کی قدر و منزلت کا یہ عالم تھا کہ شیخ تصدق حسین کے الفاظ میں "ان کے عہد میں اتنے شاعر لکھنؤ میں تھے جتنے سارے ہندوستان میں تھے..... شعر کہنا لکھنؤ میں ایک وضعداری بن گیا تھا، جہلا کے کلام میں بھی شاعرانہ خیال آفرینیوں، تشبیہوں اور استعاروں کی جھلک نظر آنے لگی۔" شاہی دربار میں جو مشاعرے منعقد ہوتے تھے اس کے لیے خاص اہتمام کیے جاتے تھے، اس کی کیفیت خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی نے اس طرح بیان کی ہے کہ :

"لال بارہ دری میں سہ پہر کو چمن بندی گل دفوارہ کی ہوتی تھی، کمرے میں تمام سامانِ عیش تیار ہوتا تھا، دریچیاں سبز، سُرخ کاشانی مخمل کی مندیں گز گز بھر کی جھالر نقرئی طلائی ٹنکی ہوئی، چاروں طرف گلدستے قرینے سے رکھے ہوئے، جھاڑ، جھاب، کنول، فانوس، شام سے روشن ہو گئے..... مشاعرے میں ہمیشہ اہل دربار شریک ہوتے تھے اور کبھی کبھی خاص اعزائے بادشاہ مدعو ہوتے تھے..... خواجہ سرا گنگا جمنی کشتیاں جن میں بھاری بھاری پلکے گوٹے کے ہار، الائچیاں، چکنی ڈلیاں، عطر کے کنٹر رکھے ہوئے، مخملی کشتی پوش پڑے ہوئے سب کے سامنے ایک ایک کشتی لگا گئے، اس کے بعد مشاعرہ شروع ہوا..."[۵۳]

غرضیکہ شعر و ادب تہذیبی زندگی میں اس طرح چھا گیا تھا کہ لوگ ادب بولتے تھے، شاعری میں باتیں کرتے تھے اور ساری فضا میں شعر و ادب کا ذوق گونجتا رہتا تھا۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا کہ ہر فرد مطمئن و خوشحال بھی تھا اور اس کا فنی و ادبی مذاق بھی نازک سے نازک اور باریک سے باریک پہلوؤں کی تلاش میں لگا رہتا تھا، صنعت عامہ، علم و ہنر اور فنونِ لطیفہ کے ہر شعبہ میں صفائی و نفاست پر توجہ دی جاتی تھی اور دستکاروں کو ایسی مقبولیت حاصل تھی کہ ان کی بنائی ہوئی اشیاء ملک کے ہر گوشہ میں نعمت سمجھی جاتی تھیں۔ عیش و نشاط کے تقاضوں نے تکمیلِ ذوق کے لیے مختلف فنون میں نئے نئے گوشے بھی پیدا کرائے اور انھیں کی ضروریات کے تحت اعلیٰ اور نفیس سامان بھی تیار ہونے لگے اس طرح صنعت و حرفت کو بھی ترقی ہوئی اور تجارت و دولت میں بھی، انھیں چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے واجد علی شاہ کا ہمعصر مؤرخ خواجہ محمد بشیر لکھتا ہے کہ :

"باعتبار تعیم بذل واحسان وتخصیص فراوانی زخارز زر و گوہر نمایاں وتکلفات استعمال لباسہائے پاکیزہ وموزوں وتصرفات در ترکیبات اطعمۂ لذیزہ لطافت مشحون از ملک سبزہ وسامیخواست و بہ اعتبار جلوہ آرایہائے حسن خورشید طلعتانٔ نازک ادا و خوب رویان دلربا از مصر وکنعان خراج میگرفت و باعتبار جمعیت ارباب فضل وبراعت ومجمع دانشمندان مستوعب مقدمات جلائل صناعت بر یونان تفوق می جیست" [۴۲]

واجد علی شاہ کی معزولی اور غدر ۱۸۵۷ء کے بعد جب اودھ پوری طرح انگریزی عملداری میں آگیا اس کے بعد جہاں سیاسی زندگی میں انقلابات رونما ہونے لگے وہیں صناعی وفنکاری کی ان اعلیٰ قدروں پر بھی تباہی آگئی، اس کی دولت بھی مٹ گئی اور شان و شوکت بھی۔

ایک انگریز مورخ H. C. IRWIN جس نے واجد علی شاہ کی عیاشی ونااہلی اور انتظام حکومت کے انتشار و ہیجان کا مبالغہ آمیز نقشہ پیش کرتے ہوئے ان کی معزولی کو حق بہ جانب قرار دیا ہے وہ بھی ضبطیٔ حکومت کے تقریباً بیس سال کے بعد بھی (۱۸۷۸ء میں) اس کا اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکا کہ :۔

"With the traders & artisans of Lucknow annexation could hardly be otherwise than unpopular, and the decay of these classes during the last 20 years, has been pitiful in the extreme. [۵۵]

اس طرح واجد علی شاہ کے دور حکومت نے بے پناہ دشواریوں اور سنگین پابندیوں کے باوجود اودھ کی اس تہذیبی اور ثقافتی میراث کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اسے ترقی بھی دی، جس کی بنیاد ان کے آبار واجداد نے تقریباً ایک سو پینتیس سال پہلے قائم کی تھی۔

یہ تہذیب جو ہند آریائی عناصر کی پروردہ تھی، اس میں ایرانی لطافت وشائستگی کے امتزاج سے ایک ایسی امتیازی حیثیت پیدا ہوگئی جو کسی دوسری جگہ نہ ہو سکی اور اس کے یہ نقوش آج بھی دھندلے طور پر برقرار ہیں البتہ اسپنگلر کا یہ خیال اس پر پوری طرح صادق آتا ہے کہ "انسانی تہذیب ایک زندہ نظام ہے جو ہر جاندار کی طرح نشو ونما پا کر جوان ہوتی ہے اور پھر بوڑھی ہو کر مر جاتی ہے" چنانچہ اس کے عناصر بھی اب انحطاط وضعف کی اس منزل تک پہنچ چکے ہیں جس کی توانائی مفقود ہو چکی ہے اور آخری سانس آرہی ہیں۔

۱۸۵۷ء میں غدر کے بعد جس طرح سارے ملک پر براہ راست برطانیہ کی حکومت قائم ہوگئی اسی طرح اودھ کی جغرافیائی اور علاقائی حیثیت بھی ختم کر کے اسے ممالک متحدہ آگرہ و اودھ (موجودہ اتر پردیش) کا نام دیا گیا۔ یہیں سے ہمارے ہندوستان کے ساتھ (پہلے کے) اودھ کی تہذیب ومعاشرت اور یہاں کے عوام کے شعور وافکار نے نیا سفر شروع کیا اور مشرقی تصورات میں مغربی عناصر کی شمولیت ہونے لگی، سماجی اور اجتماعی زندگی کا کوئی شعبہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا، یہیں سے نئے معاشی تعلقات، نئے ادبی رجحانات، طریقۂ تعلیم اور نئی اصلاحی تحریکات کے نئے طوفان اٹھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اور جلد ہی نئے تقاضوں کے تحت غیر معمولی تبدیلیاں واقع ہونے لگیں۔ علمی سطح پر سائنس اور مغربی فلسفہ کے مطالعہ نے وسعت پیدا کی اور نئے ادبی رجحانات سے متاثر ہو کر نئی روایتوں کی بنیاد پڑی۔ ◻◻

حواشی :- [۱] بحوالہ (— Oudh Gazatters Vol. I, PP2

carnegi —) "شمولہ" اودھ کے پرکھوکوی "بی، کے مصرا۔ لکھنؤ یونیورسٹی

۱۹۶۰۔ [۲] (— अवध के स्थान नामों का भाषावैज्ञानिक अध्ययन — PP2

(Political -.[۳] (-Lko. University Hindi Publication, 1973

DACOITE IN — [۴] Hist. of ANCIENT India — PP64)

(— EXCELSIS Pustak Kendra, Lko. 1971

[۵] (Oudh Gazatters PP. 458, Vol. I) [۶] آئین اکبری

جلد دوم۔ صفحہ ۱۴۵۔ [۷] (— A short Hist. of Muslim

(— rule in India (Dr. Ishwari Prashad) PP5

[۸] A short Hist. of Muslim Rule in India — PP 455

۹ Quoted In Dacoittee in Excelsis (Samuel Lucas) PP 3

۱۰ Firt Two Nawabs of Awadh - PP30 — S.L. –)

The First two Nawabs ۱۱ (– Agrwal & Co. Agra 1954

The First two Nawabs of –) ۱۲ (of Awadh – PP 30

Awadh PP 35 –) ۱۳ بوستان اودھ PP 37 مطبع احمدی

First two Nawabs of Awadh – PP 31–32 ۱۴ (18–92

۱۵ بوستان اودھ (کنور درگا پرشاد) صفحہ ۳۰۔ مطبع احمدی ۱۸۹۲ء

The garden of India PP 68 Pustak Kendra, –) ۱۶

The First two Nawabs of –) ۱۷ (– Lucknow 1973

۱۸ دہلی میں اردو شاعری کا فکری اور تہذیبی پس منظر صفحہ ۳۰۔ ادارۂ تصنیف علی گڑھ ۱۹۶۲ء (– Awadh – PP 42 ۔ ۱۹ بوستان اودھ از کنور درگا پرشاد مطبع احمدی ۱۸۹۲ء . . . .

First Two Nawabs of Awadh (A.L. Srivastava) ۲۰

۲۱ عماد السعادت ۔ سید غلام علی صفحہ ۳۶ ۔ ۲۲ - First Two "

Nawabs of Awadh" ۔ ۲۳ دہلی میں اردو شاعری کا فکری اور تہذیبی پس منظر صفحہ ۷۰ ۔ (ڈاکٹر محمد حسن) ادارۂ تصنیف علی گڑھ ۱۹۶۴ء ۲۴ دہلی میں اردو شاعری کا فکری اور تہذیبی پس منظر صفحہ ۳ ۔ (ڈاکٹر محمد حسن) ادارۂ تصنیف علی گڑھ ۱۹۶۴ء ۔ ۲۵ حدیقۃ الاقالیم (مشمولہ دہلی میں اردو شاعری کا فکری اور تہذیبی پس منظر صفحہ ۴۸ (ڈاکٹر محمد حسن) ادارۂ تصنیف علی گڑھ ۱۹۶۴ء ۔

First Two Nawabs of Awadh pp 247 ۲۶

۲۷ ۲۸ عماد السعادت ۲۹ آخری تاجدار اودھ صفحہ ۸ ۔ دانش محل لکھنؤ ۱۹۳۵ء ۔ ۳۰ ڈاکٹر ہارمن جرمنی کا ایک (Scholar) تھا جس نے ۲۴ ستمبر ۱۸۵۶ء کو واجد علی شاہ کو ایک خط میں ان کے پیٹیشن (Petition) سے متاثر ہو کر ان خیالات کا اظہار کیا تھا یہ خط مسیح الدین کی کتاب ("Oude : Its Princes & Its Govt.) میں شامل ہے۔ ۳۱ تاریخ فرح بخش

Dacoitee In –) ۳۳ The Garden of India PP 78 ۳۲

۳۴ تاریخ اودھ جلد دوم صفحہ ۷۰ ۔ (– Excelsis – PP

۳۵ تاریخ فرح بخش ۔ ۳۶ بوستان اودھ، کنور درگا پرشاد صفحہ ۶۴ ۔ مطبع احمدی ۱۸۹۲ء ۔ ۳۷ The Garden of —)

India –) صفحہ ۸۷ ۳۸ H. C. IRWIN ۳۹ تحفۃ العالم (سید عبد اللطیف شوستری ۔ صفحہ ۳۱ ۵) مشمولہ لکھنؤ کی تہذیبی میراث ۔

۴۰ (The Garden of India PP 90) ۴۱ Dacoitte in –)

۴۲ (– excelsis PP 34) ۴۳ (Dacoitte in excelsis PP 35

Col. NAC Andrens Quoted In The Garden of —) ۴۴

garden - ۴۵ Garden of India P 89 ۴۶ (– India P.95

of India P 91) ۴۷ دریائے لطافت (ترجمہ) صفحہ ۲۴ ۔

How to make & how to break a treaty; Quted —) ۴۸

۴۹ بوستان اودھ ۔ کنور درگا (– Dacoitte in Oudh PP 61 پرشاد صفحہ ۔ ۵۰ Dacoittee in Excelsis PP 80

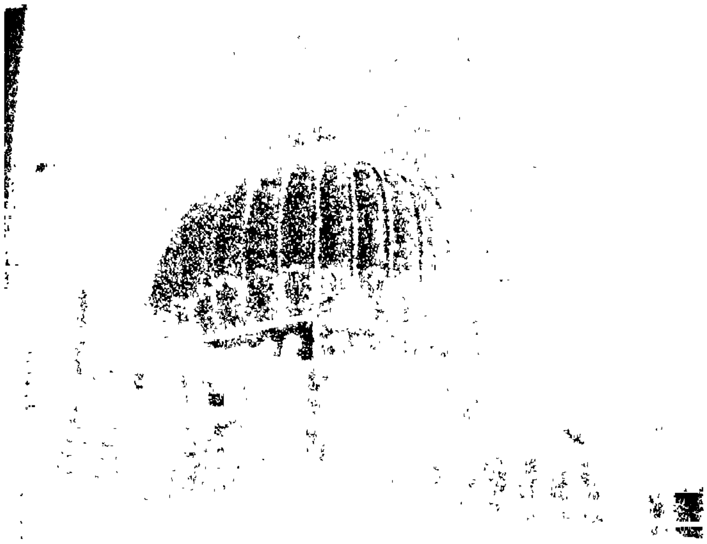
۵۱ بیر المتشم (مشمولہ لکھنؤ کی تہذیبی میراث صفحہ ۱۱۰) ۵۲ تاریخ اودھ جلد ۵ (نجم الغنی صفحہ ۱۲۵) ۵۳ British Aggression.)

(– In Oudh PP 72) ۵۴ قدیم ہنرمندان اودھ صفحہ ۲۲ ۔ . . . .

۵۵ تذکرۂ آب بقا ۔ ۵۶ صحیفۂ والا قدر صفحہ ۳۰، مطبع نول کشور ۱۲۸۲ھ ۔ ۵۷ The Garden of India – Vol.)

(– I P 136

> ”شاعر کے کانوں کی فضا میں سلاست زبان کا نغمہ قدرتی طور پر سمایا ہوا ہوتا ہے لہٰذا وہ اپنے الفاظ کو اس خوبی سے ترتیب دیتا ہے کہ ان میں عالم تصویر کے علاوہ ایک تاثیر موسیقی بھی پیدا ہو جاتی ہے ۔ شاعر کا کلام ایک آئینہ ہوتا ہے جس میں اس کے ان خیالات اور احساسات کا عکس نظر آتا ہے جو اس کے جذبات دلی کے رنگ میں ڈوبے ہوتے ہیں“
>
> —— پنڈت برج نرائن چکبست

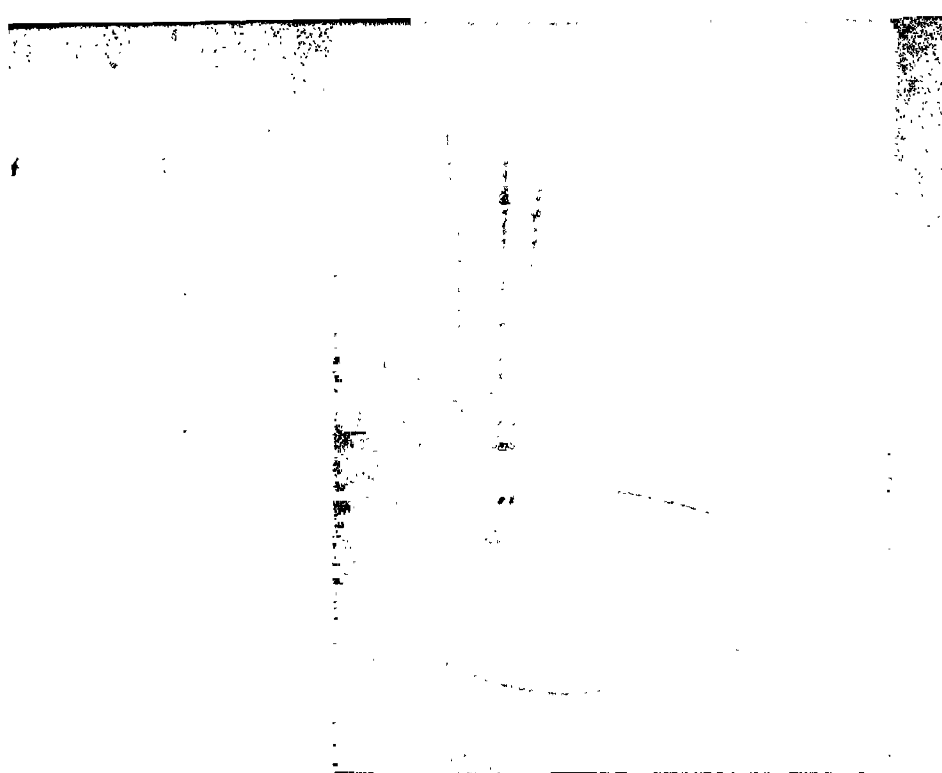


مزار
شاہ عبدالرحمٰن صاحبؒ
لکھنؤ

تصاویر: عباس حسنین

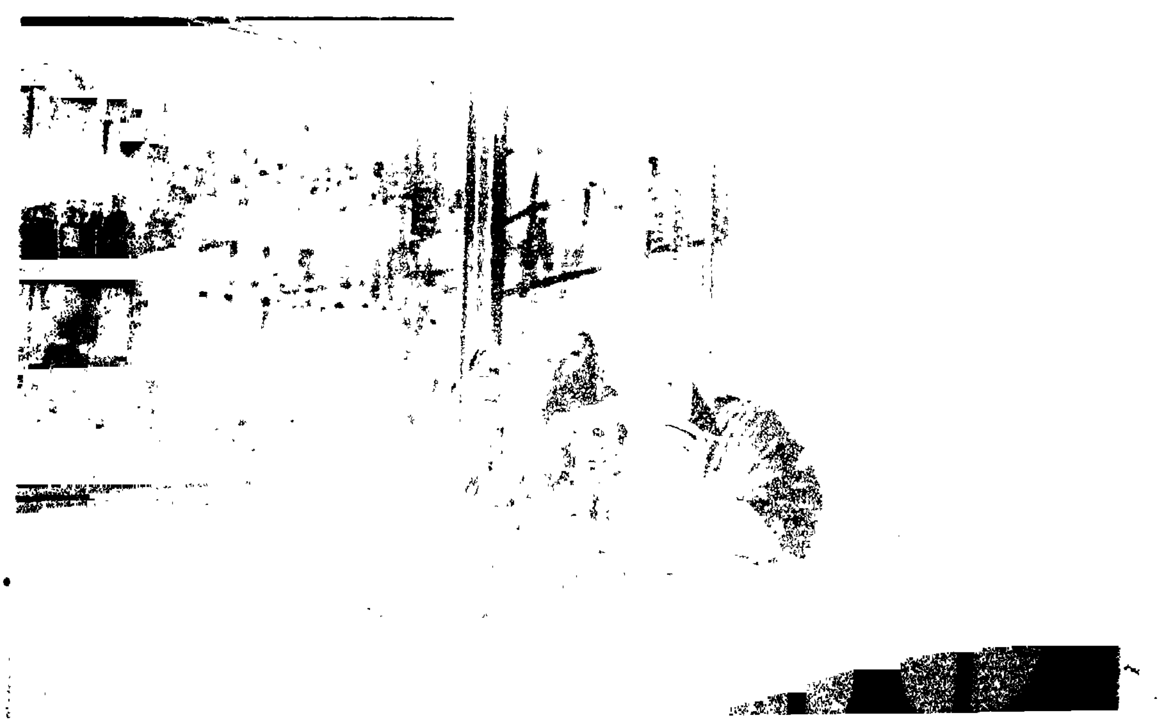


مزار
شاہ پیر محمد صاحبؒ
لکھنؤ



اودھ کا
ایک نادر
حقہ

اودھ کے
عطر فروش





پروفیسر مجاور حسین رضوی
۵۳۴/۱۰، اتر سوئیا
(حسن منزل)
الہ آباد

اودھ میں ادبی صنّاعی

صنّاعی تخلیقی ہنر ہے۔ تخلیق کے تین مدارج ہیں:

(۱) تخلیقِ محض (۲) ایجاد یا انوکھاپن یعنی بدیع (۳) بیان اور اس کا حسن یہی حسن، ایجاد و انوکھے پن سے مل کر توازن اور تناسب فن پیدا کرتا ہے جسے صنّاعی کہا جاتا ہے۔

اگر کائنات کی حقیقت پر غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوگا، کہ خداوندِ عالم خالق بھی ہے، بدیع السماوات والارض بھی ہے اور صانعِ مطلق بھی ہے۔ اس کی صناعی کا ایک کرشمہ وہ ہے جسے حسن کا نام دیا جاتا ہے۔

ادبی تخلیق میں بھی جو حسن ہوتا ہے وہ صناعی کا رہینِ منت ہوتا ہے۔ صناعی میں بیان کی وہ نزاکتیں بھی ہوتی ہیں جنھیں تشبیہ، مجاز استعارہ اور کنایہ کہتے ہیں اور الفاظ کا وہ آہنگ بھی ہوتا ہے جو نجم الغنی کے مطابق "کلام میں ایسی خوبی پیدا کرتا ہے کہ کانوں کو بھلا معلوم ہو اور دل میں اتر کر جائے۔"[1] یہاں اتنا اضافہ ضروری ہے کہ الفاظ کے وجود اور پیکر کا احساس قوتِ حاسّہ ہر طرح کرتی ہے ہم بولتے ہیں تو ساخت کو محسوس کرتے ہیں، کبھی کبھی تو اس کا ذائقہ چکھنا پڑتا ہے۔ سنتے ہیں تو ناگواری اور خوش گواری کی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ دیکھتے ہیں تو کر خمیدہ دال (د) یا چلیں بر جبیں تشدید (ّ) یا خوبصورت بالوں کی چوٹی والی میم (م) یا زلفوں والا لام (ل) ان سب کی شکلیں بھی ایک دوسرے سے مل کر مخصوص صوری پیکر تیار کرتے ہیں۔

ادب انسانی احساسات کا وہ دُھندلکا ہے جہاں الفاظ سے معنی روشنی میں آجاتے ہیں۔ یہ عمل فن کا مطالبہ کرتا ہے اور یہ فنکاری حسن پیدا کرتی ہے اور انھیں محاسن سے صناعی وجود میں آتی ہے۔

ادبی تخلیق میں سب سے اہم الفاظ ہوتے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سب کچھ الفاظ ہوتے ہیں حالاں کہ ابنِ قتیبہ نے چار صورتیں بتائی ہیں، لفظ و معنی اچھے ہوں، لفظ اچھے ہوں، معنی اچھے نہ ہوں۔ معنی اچھے ہوں لفظ اچھے نہ ہوں، لفظ و معنی دونوں اچھے نہ ہوں۔ لیکن اس بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابنِ قتیبہ کے نزدیک لفظ الگ کوئی چیز ہے اور معنی الگ کوئی شے ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ دراصل لفظ کا استعمال ہی معنی کی تخلیق کرتا ہے اور یہی لفظ اپنی ترتیب سے جہانِ معنی آباد کرتے ہیں۔

جس کے پاس جتنے زیادہ الفاظ ہوتے ہیں اتنا ہی اس کی معلومات زیادہ ہوتی ہیں اور کسی حد تک علم بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو لفظ ہی سب کچھ ہیں۔

دکُن، لفظ ہی تھا جس سے یہ دُنیا وجود میں آئی۔ اس سے زیادہ لفظ کی اور کیا اہمیت بیان کی جاسکتی ہے۔ انھیں لفظوں کے استعمال سے محاسن اور استعام پیدا ہوتے ہیں اور انھیں محاسن کو صناعی کا ایک رُخ سمجھا جاتا ہے ورنہ صناعی میں تو سب کچھ شامل ہے۔ علم بیان بھی، علم بدیع بھی، عروض بھی اور جتنے اسالیب یا طرز ادا ممکن ہیں وہ سب بھی۔ اس لیے یہاں جب صناعی یا صنعت کا لفظ استعمال کیا جارہا ہے تو اس کا مفہوم ہے وہ محاسن جو لفظ کے استعمال سے کلام کے ظاہر و باطن میں پیدا ہوتے ہیں۔

ادب کا وہ رُخ جہاں محاسن کی تلاش ہونا چاہیے [illegible]

کڑھے ہوئے علم اور "کلاسیکی ادب سے شناسائی اور تربیت یافتہ ذوق"[۲۴] کا مطالبہ کرتا تھا، ان دونوں کے لیے جگر سوزی کی بھی ضرورت تھی اور ایک خاص طرح کی لطافتِ ذہنی کی بھی۔ اگرچہ ہمارے اکثر بزرگ صناعی سے خوش نہیں تھے۔ امداد امام اثر نے اسے "ڈھکوسلا" کہا ہے۔ شبلی جیسے متوازن ذہن رکھنے والے نے بھی ایک جگہ لکھا ہے کہ:

"انیس جس شاعری کو زندہ رکھنا چاہتے تھے اس کے چہرے پر صنائع اور بدائع کے داغ ہیں"

ایک جگہ اور لکھا ہے کہ "صنائع بدائع شاعری اور انشا پردازی کا دیباچۂ زوال ہے" مسعود حسن رضوی ادیب نے انیسیات میں نہایت عالمانہ انداز میں انیس کے کلام میں محاسن شاعری کی تلاش کی لیکن یہ بھی لکھ گئے کہ:

"صنعتوں کا استعمال بذاتِ خود شاعری نہیں ہے....
کچھ صنعتیں ایسی بھی ہیں کہ ان کا استعمال بذاتِ خود ایک مشکل صنعت ہے..... ان صنعتوں کے استعمال کا ملکہ اور چیز ہے اور شاعری اور چیز ہے۔ جو صناع ان صنعتوں میں کمال رکھتا ہے وہ شاعر نہیں بلکہ ایک طرح کا بازی گر اور شعبدہ باز ہے"

اس سلسلے میں حالی کا بھی ایک اقتباس ملاحظہ ہو، کھانے کی مثال سے بات سمجھاتے ہیں:

"مفید ہو، لذیذ ہو، جزو بدن بننے کے لائق ہو۔ بو باس، رنگ روپ بھی اچھا رکھتا ہو۔ اگر باوجود ان سب باتوں کے چینی کے باسنوں میں کھایا جائے تو اور بہتر ہے"

ہمارے بزرگوں کے لئے ساری مشکل یہی تھی کہ وہ صناعی کو چینی کا باسن یا نفسِ شاعری سے الگ کوئی چیز سمجھتے تھے۔ لوگوں کے خیال میں صنّاعی کی مثال زیور کی سی تھی، جسے کہیں سے لاکر عروسِ شعر کو پہنا دیا جاتا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ صنعتیں کہیں باہر سے نہیں لائی جاتی تھیں، الفاظ کی نشست، ان کے دروبست سے پیدا ہوتی تھیں۔ یہ دراصل کھانے کا رنگ، بو باس اور کسی حد تک ذائقہ تھا۔ چینی کا باسن تو وہ ہیئت تھی جس ہیئت میں تخلیق پیش کی جاتی تھی۔

دراصل صنعت خود الفاظ کے اندر ہی موجود ہوتی ہے۔ لفظ کا استعمال بہت سارے امکانات کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ عام آدمی جب کوئی لفظ استعمال کرتا ہے تو بات ذہن ختم ہو جاتی ہے، سارے امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ لیکن تخلیق کار جب کوئی لفظ استعمال کرتا ہے تو وہ بہت سارے امکانات[۲۵] کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

قواعد اور صناعی میں یہی فرق ہے۔ قواعد یہ تو بتا دے گی کہ یہ لفظ اسم ہے، صفت ہے، فعل ہے۔ باہمی الفاظ یا حروف میں کیا رشتہ ہے۔ مضاف مضاف الیہ، جار مجرور، صفت موصوف وغیرہ۔ لیکن صناعی یہ بتاتی ہے کہ لفظ میں کتنی گہرائی ہے۔ اس میں کہاں تک وسعت ہے وہ دوسرے لفظ کے ساتھ کس حد تک نبھا سکتا ہے "پوشش چھینٹ[۲۶] کی گل کاری تو اچھی لگی مگر پوشش کھدر بہت گاڑھا معلوم ہوا۔"

بالکل انسانوں کی طرح لفظ بھی ایک دوسرے سے مل کر رہتے ہیں، اور جب ان کی دوسرے لفظ سے نہیں نبھتی تو "زیر قدم[۲۷] والدہ فردوس بریں ہے" جیسے مصرعے وجود میں آتے ہیں۔ الفاظ میں ایک دوسرے کے ساتھ تصادم اور تعاون ہوتا رہتا ہے اور ان کی ترتیب میں جب کسی طرح کا حسن آجاتا ہے تو کبھی معنی جگمگا اٹھتے ہیں اور کبھی انھیں کا باہمی میل ملاپ مکمل تخلیق کو چمکا دیتا ہے۔

ان محاسن کی طرف ۲۷۴ھ میں عبد اللہ بن معتز عباسی نے توجہ دی۔ اس نے سترہ[۲۸] محاسن شمار کیے۔ ابو نصر علی بن احمد طوسی نے بھی اس موضوع کی طرف متوجہ کیا۔ مولوی شمس الدین کی "حدائق البلاغت" اس سلسلے میں اہم کتاب سمجھی جاتی ہے لیکن اُردو میں کہا جاتا ہے کہ خوب محمد چشتی نے "بھاؤ بھید" علم بدیع پر کتاب لکھی۔ منشی رنچھوڑ داس جون پوری نے ۱۲۳۵ھ میں "حقائق الانشاء" کے نام سے ایک رسالہ لکھا جس میں نثر میں صناعی پر روشنی ڈالی گئی ہے[۲۹] لیکن سچ یہ ہے کہ بحر الفصاحت میں نجم الغنی نے ستاروں کی طرح چمکتے ہوئے موتی بکھیرے ہیں۔ انھوں نے کل ایک سو گیارہ یعنی ستاون صنائع لفظی اور چون صنائع معنوی پر روشنی ڈالی ہے۔

عزیزی ڈاکٹر رحمت علی خاں نے اپنے غیر مطبوعہ تحقیقی

مقالے میں تین صنعتوں کا اضافہ کیا۔ عزیزی ڈاکٹر محبوب عالم انصاری نے مزید تین صنعتیں دریافت کیں۔ اس طرح ان کی تعداد ایک سو سترہ ہو گئی ہے۔

لیکن اس سے بڑا المیہ اور کیا ہوگا کہ چھپن کے بعد سے نقد ادب میں محاسن کی تلاش بے سود سمجھی گئی۔ شعر میں سماج اور عوام ہل بیل، رل، چمنی وغیرہ وغیرہ تلاش کیے جانے لگے۔ ادبی معیاروں پر ادب کی تفہیم زیاں کاری اور شعور فراموشی کی علامت سمجھی گئی۔ اسلوبیاتی تنقید یا ساختیاتی تنقید نے تعبیر تشریح تجزیہ اور تفہیم میں محاسن کی تلاش فعل عبث بنا دی کبھی کبھی بعض مدرسین امتحان کے پرچوں میں گزارئیتیم یا مزاد تیرہ پر سوال کرتے ہوئے یہ ایک فقرہ بڑھا دیتے ہیں کہ محاسن شعری پر روشنی ڈالیے۔ حالاں کہ اُردو کے مزاج سے یہ محاسن ہم آہنگ تھے۔

اُردو کی وراثت ہندستانی تھی۔ عربی اور فارسی سے اگر نخلستان کی شادابی ملی تھی تو سنسکرت سے ہمالیائی سربلندی بھی عطا ہوئی تھی محترم علی جواد زیدی نے بڑے خوبصورت انداز میں اس طرف اشارہ کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ تجنیسات میں کوئی سنسکرت شعراء سے بازی نہیں لے جا سکتا تھا۔ ڈاکٹر رحمت علی خاں نے اپنے وقیع مقالے میں عربی، فارسی، سنسکرت وغیرہ کے ساتھ تلگو میں بھی صناعی پر روشنی ڈالی ہے اور یہ بتایا ہے کہ تلگو میں ایکاکشری ایک صنعت ہے جس میں ایک ہی حرف کا استعمال کرتے ہوئے پوری نظم کی تشکیل کی جاتی ہے اس طرح یہ صنعت گری ہندستانی ہے اور ہندستان میں تو ہر ورق سے صنعت ترصیع آشکار ہے اور بالخصوص اُردو میں اگر دکنی پر نظر ڈالی جائے تو فخر دین نظامی کی 'کدم راو پدم راو' سے لے کر غواصی تک وہ سارے محاسن تلاش کیے جا سکتے ہیں جن کے لیے اودھ کی شاعری کو زیادہ "بدنام" کیا گیا۔ نثر میں 'سب رس' کے تمثیلی اسلوب میں جب محاسن کی تلاش کی جائے گی تو تجنیس کی بیشتر اقسام کے ساتھ اس کی مقفیٰ عبارت میں قافیہ معمولہ تک مل جائے گا اور اشتقاق، تاکید المدح، کلام جامع جیسی صنعتیں بھی تلاش کرنے پر مل جائیں گی۔ مراعاۃ النظیر اور حسن تعلیل تو عام بات ہے۔

یہی وراثت دہلی سے گزرتی ہوئی اودھ میں آئی اور بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ مجسم و شجر جو دکن سے دہلی تک آئے تھے اودھ میں آکر سجدہ ریز نظر آئے اور یہاں کے آفتاب و مہتاب نے اس صناعی کو تابندہ و درخشندہ بنا دیا۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اودھ کی فضا، نفیس طبعیتیں، مزاج کی لطافت، ان محاسن کو برتنے کیلئے بے حد موزوں بھی تھی اسی لیے یہ صناعی انیسویں صدی ہی میں نہیں بلکہ بیسویں صدی اور دور حاضر میں بھی موجود ہے اور یہ وہ ادبی اور تہذیبی میراث ہے جس کے بار امانت کو سنبھال کر رکھا گیا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلا نام انشاؔ کا لیا جانا چاہیے جنہوں نے صنعت مقلوب کے نادر نمونے پیش کیے اور ایک شعر میں نہیں کئی اشعار میں۔ صرف ایک شعر درج کیا جاتا ہے ؎

فقط اس لفافے پر ہے کہ خط آشنا کو پہنچے
تو لکھا ہے اس نے انشاؔ یہ ترا ہی نام الٹا

یہاں ایسی صنعتوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جو نسبتاً کم معروف ہیں مثلاً میر تقی میرؔ کی محبوب صنعت ایہام یا سوداؔ اور غالبؔ کی نظر کردہ حسن تعلیل اور مراعات النظیر (جو لکھنؤ کے انیسویں صدی کے تقریباً ہر شاعر کے یہاں پائی جائے گی) سے صرف نظر کیا گیا ہے اور یہ کوشش کی گئی ہے کہ اودھ کے شعرا نے جس بے تکلفی اور جس حسن کے ساتھ ایک ایک شعر میں کئی محاسن جمع کیے اور جو صنعتیں نسبتاً کم معروف ہیں انھیں پیش کیا جائے۔

ناسخؔ کی اصلاح زبان کی کوششوں نے لفظ کے نکھار اور مرکبات کو حسین سے حسین تر بنانے کی طرف متوجہ کیا۔ فراغت اور خوش حالی کا دور بھی زندگی کے ان گوشوں کی طرف متوجہ کرتا ہے جہاں حسن کاری ہوتی ہے۔ حسن کاری ہی کا ایک نام صناعی تھا۔ اسی لیے اودھ میں صناعی کی روایت نسبتاً ہر جگہ سے زیادہ ارتقا پذیر رہی۔ ناسخؔ کہتے ہیں ؎

وہ آفتاب نہ ہو کس طرح سے بے سایہ
ہوا نہ سر سے کبھی سایۂ سحاب جدا

اس میں جہاں مراعات النظیر ہے وہیں مذہب کلامی بھی ہے یعنی ایک بات کہی جو دعوے کے طور پر ہے اور پھر اس کے لئے دلیل لائے۔ آفتاب اس لیے بے سایہ ہے کہ سحاب ہمیشہ سایہ فگن رہتا ہے تو آفتاب پر کیسے سایہ ڈالے۔

انیسؔ و دبیرؔ سے پہلے دوسرے مرثیہ نگاروں خصوصاً ضمیرؔ کے یہاں صناعی کا حسن ہے ؎

کس نور کی مجلس میں مری جلوہ گری ہے

میں تمثالیہ، لف ونشر وغیرہ بھی دیگر صنعتوں کے ساتھ ملتی ہیں لیکن صنعتوں کے خدا بوتحن اور خدائے سخن اور خالق بنائے سخن انیسؔ و دبیرؔ ہیں۔

دبیرؔ نے شاعری میں صناعی کو اس منزل تک پہنچا دیا جس کے آگے سوچتے ہوئے تخیل کے پر جلتے ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا۔ دبیرؔ کے کلام سے معروف صنعتوں کی مثالیں نہیں پیش کی جا رہی ہیں۔ جیسے ایہام، رعایت لفظی، صنعت مراعاۃ النظیر حسنِ تعلیل وغیرہ بلکہ صرف ان صنعتوں کی نشاندہی کی جا رہی ہے جن کی طرف نسبتاً ذہن نہیں جاتا حالانکہ روزانہ کی بات چیت میں ان میں سے اکثر صنعتیں شرفا اور اہلِ علم کے کلام میں خود بخود آجاتی ہیں۔ مثلاً صنعتِ عکس[۱۱] اس کی تعریف یہ ہے کہ کلام میں دو لفظ لائیں پھر ان کو الٹ پلٹ دیں۔ اس صنعت کی عظمت اس وجہ سے بھی ہے کہ براہ راست قرآنِ حکیم سے استفادہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۔

اب مرزا صاحب نے اپنے اسلوب میں اس سے جو فیض اُٹھایا ہے وہ دیکھیے[۱۳] ؎

انصاف کہاں سے ہو کہ دل صاف نہیں ہے
دل صاف کہاں سے ہو کہ انصاف نہیں ہے

میر انیسؔ[۱۴] کا بھی انداز دیکھ لیجیے ؎

استادہ آب میں یہ روانی خدا کی شان
پانی میں آگ، آگ میں پانی خدا کی شان

اس سلسلے میں اسی سے ملتی جلتی صنعت صنعت مقلوب ہے، یعنی مصرع کو اگر اُلٹ دیں تو وہی مصرع بنے۔ مرزا صاحب کے یہاں کئی بند ایسے مل جائیں گے جن میں یہ صنعت موجود ہے۔ ایک بند کی بیت ملاحظہ ہو:

آقائے امم عرشِ معلیٰ کا شرف ہے
یہ فرشِ باآداب ایک آقا کا شرف ہے[۱۵]

دوسرا مصرع اگر اُلٹ دیا جائے تو بھی یہی مصرع بنے گا یعنی اب اگر اس کے حروف کی ترتیب بائیں جانب سے شروع کی جائے تو یہی مصرع برقرار رہے گا۔

میر انیسؔ نے مقلوب سے ملتی جلتی صنعت کا نمونہ تجنیس قلب میں پیش کیا ہے ؎

زر زر رواں اُدھر سے درم جست و خیز تھا
الٹا پھرا ادھر سے تو رف رف سے تیز تھا

انیسؔ نے اشارہ بھی کر دیا ہے کہ زر زر کو اگر اُلٹ دیجیے تو رف رف بن جائے گا اور رف رف کو اُلٹا تو بھی زر زر۔

مرزا صاحب کے یہاں صنعت جمع، تفریق، اور تقسیم کی بڑی اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ صنعت جمع کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے کہ ایک یا چند چیزیں ایک حکم میں جمع کر دی جائیں۔ یہ صنعت بھی قرآن شریف سے استفادہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :

المال والبنون زينة الحيوة الدنيا

یعنی مال واولاد زندگانیِ دُنیا کی زینت ہیں۔ مال واولاد کو ایک حکم زینت میں جمع کر دیا ہے۔ اب مرزا صاحب کا استفادہ ملاحظہ ہو[۱۲] ؎

نقاش، نقش، کاتب و خط، بانی و بنا
بود و نبود، ذات و صفت، ہستی و فنا
آدم، ملک، زمین، فلک، گردشِ کیمیا
دنیا و دیں، حدوث و قدم، بندہ و خدا
سب شاہدِ کمالِ شہ مشرقین ہیں
جب تک خدا کا ملک ہے مالک حسینؑ ہیں

اس بند میں صرف صنعتِ جمع ہی نہیں ہے صنعت تضاد بھی ہے۔ تجنیس بھی ہے، اشتقاق بھی ہے اور مراعاۃ النظیر بھی ہے۔

ثابت لکھتے ہیں کہ اس کمال کو دیکھیے کہ ہر مصرع میں چھ چیزیں لائے ہیں۔ نہ کم نہ زیادہ۔

اسی سے ملتی جلتی ہوئی صنعت تنسیق الصفات ہے یعنی کئی صفات ایک ساتھ مذکور ہوں۔ انیسؔ کہتے ہیں ؎

احسان بھی، حیا بھی، مروّت بھی، قہر بھی
خود موت بھی، حیات بھی، امرت بھی، زہر بھی

بنیاد نکتہ سنج بھی، دانائے دہر بھی
تسنیم بھی، بہشت بھی، کوثر کی نہر بھی
سر شرم سے جھکائے ہے نرگس ریاض میں
جنت سواد میں ید بیضا بیاض میں

صنعت تفریق[۱۵] میں دو امر بظاہر ایک طرح کے ہوں لیکن ان کے درمیان جو فرق ہے وہ واضح کر دیا جائے۔ دبیر کہتے ہیں ؎

آئینے کے آئین پہ میں نے جو کیا غور — منھ پر تو ہے کچھ اور پس پشت ہے کچھ اور
گو چرخ کی گردش سے نہ ہو صاف کبھی دور — پر حاضر و غائب دل روشن کا ہے اک طور
جن آئینوں میں دونوں طرف ایک چمک ہے
وہ ایک برادل ہے اور اک مہر فلک ہے

صنعت تقسیم[۱۶] بھی ایک صنعت ہے اس میں اور لف و نشر میں باریک سا فرق ہے کہ لف و نشر میں اول چند چیزیں بیان کرتے ہیں پھر ان کے منسوبات لاتے ہیں تقسیم میں چند چیزیں یا ایک ہی چیز کے چند اجزا بیان کیے جاتے ہیں پھر ہر چیز یا ہر چیز کے منسوب کو واضح کرتے ہیں کہتے ہیں ؎

تابوت اٹھانے کی جزا، قبر کی راحت — دلدل کو بنانے کی جزا، ناقۂ جنت
سقائی کے انعام میں کوثر کی حکومت — دولت ہے یہ سب تعزیہ داری کی بدولت
عابد کے لئے طوق پہنتے ہیں تو کیا ہے
وہ طوق نہیں، دائرۂ حفظ خدا ہے

اس میں صنعت تقسیم ہی نہیں مذہب کلامی بھی ہے یعنی جزا کو دلیل بنایا ہے مراعاۃ النظیر و رعایت لفظی کے ساتھ دولت بدولت میں تجنیس زاید بھی ہے۔ مسعود صاحب نے میر انیس کے یہاں تینوں صنعتوں کی مثال ایک شعر میں دی ہے یعنی جمع، تقسیم اور تفریق کے بارے میں ؎

نکلا ادھر سے وہ جو اجل کا شکار تھا
پیدل ہوا سوار یہ ڈونھا وہ چار تھا

ان صنعتوں کے علاوہ میر صاحب کے یہاں دوسرے مصرع میں سیاقۃ الاعداد بھی ہے۔

ایک اور صنعت مرزا صاحب کے یہاں ملتی ہے جس کو استتباع[۱۹] کہتے ہیں یعنی اس طرز پر مدح کرنا کہ ایک مدح سے دوسری مدح حاصل ہو۔ ایک بند ملاحظہ ہو ؎

خالق نے عطا کی شہ مرداں کو یہ قدرت — لیں ان کی زباں سے جو ہو محتاجوں کو حاجت
گردوں نے بلندی لی زمیں نے زر و دولت — یوسفؑ نے لیا حسن سلیمانؑ نے حشمت
پر ان کی قناعت ہے فزوں حد بیاں سے
جز نام خدا آپ لیا کچھ نہ زباں سے

یہاں آخری مصرع میں ابتدائی مصرعوں کی مدح سے مدح نکالی ہے کہ کائنات نے ہر شے آپ سے لی اور آپ نے سوائے ذکر خدا کچھ نہ لیا۔

مرزا صاحب کے یہاں صنعت رجوع[۱۷] کا بھی بڑا خوبصورت استعمال ملتا ہے یہ صنعت جب کئی بندوں میں مسلسل آتی ہے تو نئی صنعت بن جاتی ہے جسے مثالیہ کہتے ہیں۔ یہاں صرف صنعت رجوع کی مثال پیش کی جاتی ہے۔ مثالیہ کی گنجائش نہیں ہے ؎

تاروں کا ہے دعویٰ کہ یہ زہج بزرجی ہے
پر بدر ہے منکر، یہ کہاں مجھ میں ضیا ہے
ذروں کا اشارہ ہے، یہ شمس ضحیٰ ہے
خورشید لرزتا ہے کہ یہ نور خدا ہے
پروانہ و بلبل میں جدا بحث کا غل ہے
وہ کہتا ہے یہ شمع ہے یہ کہتی ہے گل ہے

مرزا صاحب کے یہاں بہت ساری صنعتوں سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف چند کی نشاندہی کی جا رہی ہے جن کی طرف توقی بلگرامی نے بھی توجہ کیا ہے۔ صنعت تجرید[۱۸] کی مثال ملاحظہ ہو، گھوڑے کا تذکرہ ہے۔ یہ صنعت مبالغہ مقبول میں بھی آتی ہے اس لئے کہ گھوڑے کے افعال کو جن صفات سے استعارہ کیا ہے وہ سب ممکن ہیں ؎

لڑنے میں یہ ہے عقل، اکھڑنے میں جہالت
بڑھنے میں یہ ہے حرص، تو گھٹنے میں قناعت
جانے میں حواس، آنے میں عاشق کی طبیعت
مخفی ہے تو اسرار، عیاں ہے تو کرامت
ہر سو جو نسیم اس کے طرارے کی بہی ہے
سبزے کی طرح رن کی زمیں کھیت رہی ہے

جہالت میں ہی آدمی بگڑتا ہے۔ حواس جاتے ہیں۔ عاشق کی طبیعت

محبوب پر آتی ہے وغیرہ۔

ذوقؔ نے بہت سی صنعتوں کی نشان دہی کی ہے، ان میں قافیہ معمولہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اگر لفظ کے ایک جزو کو قافیہ اور دوسرے جزو کو ردیف میں شامل کریں یعنی ایک ہی کلمہ میں ردیف و قافیہ پیدا کریں تو اس کو قافیہ معمولہ کہتے ہیں۔ مثال دی ہے ؎

کیا ہاتھ ہے کیا سینہ ہے کیا چہرہ ہے کیا سر
اے صلّ علیٰ نور کا مجمع ہے سراسر

موصوف نے صنعتِ ترصیع کو صنعت موازنہ کہا ہے۔ اسی طرح مراعاۃ النظیر کی ایک قسم ایہام تناسب قرار دی ہے۔ لکھتے ہیں کہ اس کی پرلطف قسم وہ ہے جس کو ایہام التناسب کہتے ہیں۔ مثلاً دو معنی جمع کریں جن کو آپس میں کچھ مناسبت نہ ہو مگر ان معنوں کو جن دو لفظ سے تعبیر کریں ان میں ایک لفظ کے دو معنی ہوں اور معنی دوئم جو غیر مقصود ہوں ان کو پہلے لفظ سے مناسبت ہو۔ مثلاً ؎

بارش تھی آبِ تیغ کی برسات سے فزوں
بدلی تھی فوجِ شام کی رنگت گھٹا تھا خوں

یہاں بدلی کو بارش سے اور گھٹا کو برسات سے مناسبت ہے لیکن معنی دوئم مقصود نہیں ہے، بدلی کے معنی بدلنا ہے۔

مرزا صاحب کے یہاں کچھ ایسی صنعتیں بھی ہیں جن کا کوئی نام نہیں مل سکا۔ بحر الفصاحت میں تو اس کا امکان ہی نہیں تھا۔ حیاتِ دبیر اور المیزان میں بھی ان صنعتوں کی کوئی نشاندہی نہیں ہو سکی۔ مثلاً ایک مرثیہ ہے جس میں ہند قید خانۂ شام میں آتی ہے اور اسے کنیزیں بتاتی ہیں کہ قید خانہ میں ایک یوسف ہے۔ مرزا صاحب نے یوسفؑ کا تلازمہ آخر تک برقرار رکھا ہے اور اس طرح سے کہ حضرت یوسفؑ اور حضرت سید سجاد کے موازنے میں مصائب کے رخ سے حضرت سید سجاد کی برتری ظاہر کی ہے۔ کچھ مصرعے درج کیے جاتے ہیں

یوسف جسے میں کہتی تھی وہ ہے یہی داری
یوسف مجھے کس واسطے تو کہتی ہے ہر بار
آداب بجا لاتی ہوں اے یوسفِ زنداں
اس عہد کے یوسف ہو تمہیں خلقِ خدا میں
فرمایا یہ درجہ تو ہے یوسفؑ سے فزاواں
گھر سے گئے یوسف تو ہوئے مصر کے سلطاں
یوسف نے زمانے میں یہ محشر نہیں دیکھا
یوسف کا فقط باپ کی فرقت میں کڑھا دل

ہو سکتا ہے اسے صنعتِ لزوم یا صنعتِ التزام کہا جائے لیکن وہ زیادہ سے زیادہ ایک بند یا دو بند کے لیے ہے۔ یہاں تشابہ الاطراف ہے اور تلمیح کو نبھایا ہے، حسن یہ پیدا کیا ہے کہ حضرت یوسف اور حضرت سید سجاد دونوں کی علامتوں کو ایک طرح سے روایت بنا دیا گیا ہے۔ اس بے مثال صناعی کی نزاکت نام کا بوجھ نہیں برداشت کر سکتی۔

اسی طرح ایک بند ملاحظہ ہو ؎

ہوتا ہے جو حاضر یہ بہادر سرِ دربار	دربار میں دُربارِ علی ہوتے ہیں ہر بار
غیر از حسنینؑ ان پہ تصدق مرا گھر بار	عارض ہے قمر بار لبِ لعل گہر بار

یہ والیٔ اقلیمِ ولایت کا ولی ہے
تصویر تو آئے حسینؑ ابنِ علی ہے

یہاں لفظ 'بار' چھ مرتبہ آیا ہے اور ہر جگہ کہیں دوسرے لفظ کے ساتھ کبھی تنہا نئے معنی دیتا ہے ایک ہی لفظ کے کثیر الجہت استعمال کو اگر صنعت نہ کہا جائے تو پھر کیا کہا جائے اور پھر اس صنعت کا کیا نام رکھا جائے۔

یہ کہنا پڑتا ہے کہ میر انیسؔ نے اس میدان میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں، کہتے ہیں ؎

دولت حاکمِ دوں پر ہے ترا دار و مدار	دارِ دنیا سے تعلق نہیں رکھتے دیں دار
کیا مجھے دار پہ کھینچے گا وہ ظالم غدار	بخت خفتہ ہیں ترے اور مرے طالع بیدار

کسی سردار نے یہ اوج نہ پایا ہوگا
دارِ طوبیٰ کا مرے فرق پہ سایہ ہوگا

نو بار انیسؔ نے لفظ 'دار' کا استعمال کیا ہے اور ہر بار یہ لفظ ایک نئے معنی دیتا ہے۔ مسعود صاحب نے بھی "انیسیات" میں اس کا تذکرہ نہیں کیا کہ اس صنعت کا کیا نام ہوگا۔ حالاں کہ انھوں نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ انیسؔ کے کلام میں ان صنعتوں کی طرف متوجہ کیا ہے جس کو کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ لکھتے ہیں انیسؔ نے ایسی صنعتیں ایجاد کر دی ہیں جن کا نام ابھی تک مقرر نہیں ہو سکا۔ مسعود صاحب نے ایسے مصرعوں کی

فہرست دی ہے۔

(۱) الجھاتے تھے کمند کینے کمان میں
(۲) بیکار کمیں میں ہیں کینوں کی کمانیں
(۳) گویا گلے میں حور کے ہیرے کا ہار تھا
(۴) وہشت تھی کہ وحشت کو ہرن بھول گئے تھے
(۵) تازی کو تیز کر کے یہ غازی نے دی صدا

پہلے مصرع میں تجنیس لاحق اور دوسرے میں تضمین المزدوج کہا گیا ہے لیکن مسعود صاحب نے تفصیل سے یہ بتایا کہ دونوں میں یہ صنعت نہیں ہے

اسی طرح صنعت التزام بالزوم کے تحت انھوں نے دو بند لکھے ہیں ۔

اعدا کے حق میں ہو گیا آب حسام سم　　کرتے تھے آہوؤں کی طرح خوش خرام رم
نیزے تھے خوف سے صفت چوب خام خم　　ایسا لڑا جہاں میں کوئی تشنہ کام کم
دشمن بھی معترف تھے وہ پیکار کر گئے
مقتل سے اڑ کے تا سر کہسار سر گئے

رکھتا نہیں کوئی یہ غریب الدیار یار　　شمشیر شعلہ بار پڑے سر پہ بار بار
تیروں کی تن پہ دور سے ہوشیار مار　　نیزے اٹھا اٹھا کے کریں سب سوار وار
آگے سے تیغ و خنجر و تیر و سناں چلے
پیچھے سے فرق پاک پہ گرز گراں چلے

اس میں صنعت لزوم کا حسن بھی ہے شبہ اشتقاق سام سم ۔ رام رم ۔ خام خم ، کام کم کے ساتھ صنعت ذو قافیتین بھی ۔ دوسرے بند میں ان دونوں صنعتوں کے ساتھ صنعت تکریر بھی ہے اور بے شمار صنعتیں دونوں بندوں میں ہیں ۔

ایک ہی بند اگر کئی صنعت رکھتا ہو تو اس صنعت کا کیا نام ہوگا جس کے ذیل میں ساری صنعتیں آتی ہیں ؛

ع : عین اس کا ہے وہ چشمہ کہ فیض اس کا ہوا عام
یہ علم کا آغاز ہے اور شرح کا انجام
ب + ا : بے سے برکت اور الف اول اسلام
س : سے ہے سین سعادت کہ اسی نام کا اتمام
عباس　　یہ اسم مقدس تو سعید ازلی ہے
اعلیٰ نہ ہو کیونکہ کہ شریک اس کے علی ہے

تیلگو ادب میں ایکاکشری اس سے کچھ ملتی جلتی صنعت ہے لیکن اردو میں اس صنعت کا کوئی نام ابھی تک راقم کو نہیں مل سکا ۔ انیس کی خوش گوار تقلید کرتے ہوئے نسیم امروہوی نے اپنا معرکۃ الآرا مرثیہ سورہ مریم اسی تکنیک میں لکھا ہے ۔ انیس کا کمال فن یہی ہے کہ وہ ایک ہی بند میں بیک وقت کئی صنعتیں استعمال کرتے ہیں اور یہ اتفاق نہیں بلکہ شعوری طور پر یہ محاسن ان کے یہاں جلوہ گر ہیں ۔ ان کا نظریہ ہے ؎

سامعین جلد سمجھ لیں جسے صنعت ہو وہی

سامعین اسے جلد سمجھ لیتے تھے کہ نہیں کہ کون سی صنعت ہے لیکن سامعین کو یہ اندازہ یقیناً ہو جاتا رہا ہوگا کہ شعر میں یا بند میں کوئی حسن ضرور ہے جو قلب و ذہن کو متاثر کرتا ہے ۔ انیس ان صنعتوں کے ساتھ تجنیس میں اپنا کوئی مقابل نہیں رکھتے تھے ۔ شاید یہ مبالغہ نہ ہو کہ وہ کہیں کہیں مرزا دبیر سے بھی آگے نظر آتے ہیں ۔ کچھ مثالیں ہیں جو پیش کی جا رہی ہیں :

تجنیس تام : خیبر میں کیا گزر گئی روح الامین پہ
کاٹے ہیں کس کی تیغ دو پیکر نے تین پہ

تجنیس تام اسے کہتے ہیں جس میں دو لفظ ہر لحاظ سے ایک ہوں لیکن معنی میں مختلف ہوں ۔ پر ہر لحاظ سے ایک ہے مگر معنی کے اعتبار سے مختلف ہے ۔

تجنیس لاحق میں پہلا حرف تبدیل ہوتا ہے اور اگر پہلا حرف زائد ہو تو اسے تجنیس زائد کہتے ہیں مثلاً ع

صاحب ہو تو ایسا ہو مصاحب ہو تو ایسا

صنعت تضمین المزدوج کی تعریف یہ ہے کہ رعایت قوافی کے بعد اثنائے کلام میں دو ایسے لفظ جمع کیے جائیں جو وزن اور روی میں موافق ہوں مثلاً ؎

ابر کرم ، خدیو عجم ، خسرو عرب　　عالی ہمم ، امام امم ، شاہ تشنہ لب

اس میں ترصیع بھی ہے ۔

انیس کے یہاں ایسی صنعتیں بھی ملتی ہیں جو بظاہر بہت مشکل ہیں ، لیکن انیس انھیں اتنی بے تکلفی سے نظم کرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے جیسے **صنعت مبادلۃ الراسین** یعنی دو لفظوں میں حرف اول باہم تبدیل ہو جیسے یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

اللہ اللہ عجب فوج عجب غازی تھے
عجب اسوار تھے بے مثل عجب تازی تھے

انیسؔ کے یہاں صنعتِ اطرادؔ کی لاجواب مثالیں ہیں یعنی جس شخص کی مدح کرنی ہو اس کے آباؤ اجداد کا نام آجائے۔ انیسؔ کا ایک بند ملاحظہ ہو جس میں صنعت اطراد کی نشان دہی کی جارہی ہے ؎

عباسؑ نامور بھی عجب سج کا ہے جواں
نازاں ہے جس کے دوش منوّر پہ خود نشاں
حمزہ کا رعب، صولتِ جعفرؑ، علیؑ کی شاں
شبّیر کا دل، حسینؑ کا بازو، حسنؑ کی جاں
کیونکر نہ عشق ہو شہِ گردوں جناب کو
حاصل ہیں سیکڑوں شرف اس آفتاب کو

صنعتِ ادماج: یہ وہ صنعت ہے جس میں پورا مصرع دو معنی دیتا ہے۔ انیسؔ کے ان چار مصرعوں کے چوتھے مصرع میں صنعت ادماج ہے۔ حضرت حبیب ابن مظاہر جو بہت ضعیف تھے، ان کیلئے لکھتے ہیں ؎

بڑھتا تھا خون جوشِ شجاعت سے دم بدم | گردن میں وہ کجی تھی نہ مطلق کمر میں خم
ہر نوجواں سے تھا یہ اشارہ بصد حشم | یعنی یہاں سے جائیںگے سیدھے جناں میں ہم

یہاں دو معنی ہیں ایک یہ کہ جنت میں بغیر کسی رکاوٹ کے جائیں گے، دوسرے معنی یہ ہیں کہ جب جنت میں جائیں گے تو کمر خمیدہ نہ ہوگی بلکہ سیدھی ہوگی۔

صنعتِ تصلیف: جس طرح انیسؔ و دبیرؔ اور دیگر مرثیہ نگاروں کے یہاں ہے شاید ہی کسی کے یہاں ہو اس کا مطلب ہے شاعرانہ تعلّی — انیسؔ کہتے ہیں ؎

ہے لعل و گہر سے یہ دہن کانِ جواہر | ہنگامِ سخن کھلتی ہے دکّان جواہر
ہیں بند مرصّع تو ورق خوانِ جواہر | دیکھے اسے ہاں ہے کوئی خواہانِ جواہر

مینائے رقومات ہنر چاہیے اس کو
سودا ہے جواہر کا، نظر چاہیے اس کو

انیسؔ کے فنی سمندر کی یہ کچھ لہریں ہیں جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ... میں بعض دل چسپ پہلو بھی ہیں۔ مثلاً ؎

پیش آجاتا تھا گر کوئی زبردست دلیر
دونوں تشدید شجاعت سے اسے کرتے تھے زیر

قواعد کا تلازمہ ہے زیر، زبر، پیش، تشدید۔ یہاں چاروں موجود ہیں۔

انیسؔ کہیں کہیں صنعت کو اس طرح استعمال کرتے ہیں اور اس کی طرف ایسا اشارہ کرتے ہیں کہ بالغ ذہنی انبساط حاصل ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

بھائی خوش فکر ہے خوش لہجہ و پاکیزہ خیال | جن کا سینہ گہرِ علم سے ہے مالامال
یہ فصاحت یہ بلاغت یہ سلاست یہ کمال | معجزہ گر نہ اسے کہیے تو ہے سحرِ حلال

اپنے موقع پہ جسے دیکھیے لاثانی ہے
لطف حضرت کا ہے یہ رحمتِ یزدانی ہے

اس کا دل چسپ پہلو یہ ہے کہ سحرِ حلال ایک صنعت ہے اور اس بند میں یہ صنعت موجود ہے اس کی تعریف یہ ہے کہ ایک لفظ یا زیادہ لفظ جو بظاہر کلمات سابقہ کا تتمہ ہو اور کلمات آئندہ کے مقدمات میں شمار ہو سکے چنانچہ اس بند میں لفظ کمال تتمہ ہے اور آئندہ کا مقدمہ ہے۔

انیسؔ و دبیرؔ کے یہاں جتنی صنعتیں انسانی ذہن سوچ سکتا ہے وہ سب ہیں۔ انھوں نے جو روایت سازی کی وہ ان کے بعد کے شعرا اور دورِ حاضر کے شعرا کے یہاں ملتی ہے اس لیے بہت صنعتوں کا تذکرہ جو دوسروں کے یہاں کیا گیا ہے وہ سب انیسؔ کے یہاں ہیں لیکن دو صنعتوں کا ذکر انیسؔ کے یہاں ضروری ہے ان میں سے ایک صنعت مکالمہ ہے۔ علم بدیع کے ماہرین نے صنعت سوال و جواب تو لکھی لیکن عام طور سے یہ صنعت صرف ایک شعر میں پائی جاتی ہے۔ انیسؔ کے مشہور مرثیہ "بخدا فارس میدانِ تہوّر تھا حُر" میں عمر بن سعد اور حضرت حُر کا مکالمہ ہے۔ یہ صنعت کسی ایک بند یا شعر تک محدود نہیں ہے بلکہ ردالعجز علی الصدر کی طرح کئی بندوں پر محیط ہے۔ یہ صنعت مرثیہ نگاروں کے یہاں عموماً ہے لیکن جو حسن انیسؔ نے پیدا کیا ہے وہ صرف حضرت امام کا لطف اور رحمتِ یزدانی ہونے کی وجہ سے لاثانی ہے، یہ صنعت بند نمبر اکتیس ۳۱ سے شروع ہوتی ہے اور پچپن ۵۵ تک اس کا سلسلہ چلتا ہے۔ ان بندوں میں صنعت ابداع تو ہے ہی یعنی لفظ سے خوب معنی نکالے، ان میں صنعت تدارک یعنی کسی کی اس طرح برائی کرے کہ تعریف معلوم ہو، صنعتِ احتجاج بدلیل (یہ مذہب کلامی کی ایک قسم ہے) اور تاکید المدح وغیرہ بھی ہے)

انیس کے دادا میر حسن نے ایک مصرع کہا تھا:

دوں دوں خوشی کی خبر کیوں نہ دوں

اس میں نقارے کی آواز یعنی "دوں دوں" نظم کر دیا تھا۔ غالباً اسی ایک مصرع کی طرف ذہن گیا اور اس صنعت کا کوئی نام نہیں رکھا گیا۔ زبان انگریزی میں کہا جاتا ہے onomotopoeia میں یہ ہوتا ہے کہ گونجتی ہوئی چیخ کے لئے Shrill کہہ دیں گے یا پہیے کی کھڑکھڑاہٹ کو Rattling کہہ دیں گے وغیرہ۔ اردو میں میر انیس نے اس صنعت میں کمال دکھایا ہے اور بہت بڑی بات یہ ہے کہ علم بدیع کے اس رُخ کو علم بیان میں لے آئے اور اس صنعت سے انھوں نے صوتی آہنگ ہی کو پیش نہیں کیا بلکہ فضا آفرینی کی ہے۔ موضوع سے مناسبت رکھنے والے حروف منتخب کر کے پورا منظر نامہ تیار کیا ہے ایک شعر اور ایک بند ملاحظہ ہو ؎

گرما کے سب رگوں میں لہو دوڑنے لگا　　ژَژ فرس کے نتھنوں سے آنے لگی صدا

اور یہ بند

لشکر کے سب جواں تھے لڑائی میں جی لڑائے
وہ بد نظر تھا آنکھوں میں آنکھیں ادھر گڑائے
ڈھالیں لڑیں سیاہ کی یا ابر گڑگڑائے
غصے میں آکے گھوڑے نے بھی دانت کڑکڑائے
ماری جو ٹاپ ڈر کے ہٹے ہر لعین کے پاؤں
ماہی پہ ڈگمگا گئے گاؤ زمیں کے پاؤں

تلمیح تجنیس، مراعات النظیر کے ساتھ جس پہلو کی طرف متوجہ کرنا ہے وہ فضا آفرینی کے لئے کراہت، ڈر، تناؤ پیدا کرنے والے ایسے الفاظ کا انتخاب ہے جن میں کریہہ الصوت حروف بہت آئے ہیں جیسے ڈ، ٹ، ڑ وغیرہ اور گھوڑے کا دانت کڑکڑانا یا تیز روی میں فرفرانا "میر حسن سے کہیں آگے میر انیس کو لے جاتا ہے"[۲۳]

انیس کے یہاں ایک صنعت اور ہے صنعت ملمع یا تلمیع[۲۴] اس کی تعریف یہ ہے کہ کلام میں دوسری زبان کا ایک رکن لے آنا۔ اس کی مثال عام طور سے انیس کے یہاں سے پیش کی جاتی ہے ؎

حُر پکارا یَا بُنَیَّ اَنتَ وَاُمِّیْ یا شاہ　　قابلِ عفو نہ تھے بندۂ آثم کے گناہ

کہتے ہیں کہ انگریزی کے ایک بہت بڑے شاعر کی سب سے مشہور نظم میں یہ صناعی درجۂ کمال پر پہونچی ہوئی ہے۔ حالاں کہ بوتل میں بند زندگی اور موسموں کا تذکرہ برباد شدہ دنیا کا بیان لیکن "بے مصرف زمین" والی یہ نظم اس لیے بہت اہم سمجھی جاتی ہے کہ اسے سمجھنے کے لئے صنعت تلمیع کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ اس لیے کہ اس میں اطالوی، جرمن، فرانسیسی سے آگہی ضروری ہے۔ نظم شانتی شانتی پر ختم ہوتی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جیمس جوائس کی نثری تخلیق میں کہ نام جس کا یولیسس ہے یہ صنعت پائی جاتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

انیس و دبیر کی روایات کی پاسداری تمام مرثیہ نگاروں نے کی اور ان محاسن کو برقرار رکھا جن کو انیس و دبیر نے منزل کمال تک پہنچا دیا تھا عشق، تعشق، پیارے صاحب رشید وغیرہ کے یہاں صناعی ملتی ہے۔ پروفیسر جعفر رضا نے تفصیل سے بتایا کہ دبستان عشق، علم بیان کا شیدائی تھا۔ تشبیہ کی لطافت، استعارے کی نزاکت، فضا کی تخلیق ــــ لیکن اس دبستان میں بھی علم بدیع کی مروجہ صنعتوں کے علاوہ صناعی ملتی ہے۔

عروج اے مرے پروردگار دے مجھ کو　　(عشق)
سچ ہے دنیا میں شبِ ہجر بلا ہوتی ہے
ــــ کھینچ اے قلم مرقعِ صحرائے کربلا

ــــ تعشق کے مرثیے اس سلسلے میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ کبھی کبھی تلاش کرنا پڑتا ہے۔ بہر حال نفیس کے یہاں تجنیس خطی[۲۵] کی ایک مثال ؎

علی کا دبدبہ و رعب جرأت و شہرت　　حسن کا حسن حسین حسیں کی سب شوکت

اس میں دو لفظ بغیر رعایت نکات و حرکات مشابہ واقع ہوئے ہیں جیسے حسن، حسین، حُسن۔

ناسخ و آتش کے شاگردوں نے صناعی کی روایت کو برقرار رکھا۔ ان کے یہاں حسن تعلیل، مراعاۃ النظیر، ایہام تناسب اور رعایت لفظی کی کثرت ہے لیکن دیا شنکر نسیم نے انیس و دبیر کے معاصر کی حیثیت سے ان بزرگوں کے ساتھ صناعی کے کمال میں اپنے کو اس منزل تک پہنچایا کہ ان کا نام انیس و دبیر کے ساتھ لیا جانے لگا۔ کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

صنعت مشاکلہ[۲۸]: میں جاکے جلی تو غم نہیں ہائے
ڈر ہے نہ تجھ پہ آنچ آجائے

اس صنعت میں دو لفظوں کو اس طرح لاتے ہیں کہ اصل سے بھی انھیں نسبت ہو اور اپنی جگہ الگ معنی بھی رکھتے ہوں۔

صنعت توجیہ یا محتمل الضدّین[۲۹]

جس کف میں وہ گل ہو داغ ہو جائے   جس گھر میں ہو وہ گل چراغ ہو جائے

یہ دراصل قرأت کی صنعت ہے، جس طرح پڑھیے نئے معنی حاصل ہوں گے۔

تجنیس محرّف: مشکیں زلفوں سے مشکیں کسواؤ
کالے ناگوں سے مجھ کو ڈسواؤ

مشکیں اور مشکیں میں تجنیس محرف ہے۔

صنعت سوال و جواب: ؎

پوچھا کہ سبب کہا کہ قسمت   پوچھا کہ طلب کہا قناعت

یہاں بے اختیار یہ عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ منیرؔ شکوہ آبادی کا مشہور قصیدہ " اشک زلیخا ہوئے بحر صفت جوش زن" کنایہ کی بہترین مثال ہے لیکن نسیمؔ نے جو خط بکاؤلی کی طرف سے تاج الملوک کو لکھا ہے وہ بے حد بلیغ کنایہ کی دولت لیے ہوئے۔ منیرؔ شکوہ آبادی کے یہاں بھی صناعی اپنے شباب پر نظر آتی ہے۔ ایک صنعت ہے کلام جامع[۳۰] اس کی مختصر تعریف یہ ہے کہ اس میں شکایت زمانہ ہوئی ہے۔ اس صنعت کے سلسلے میں انیسؔ کا بند " ناقدری عالم کی شکایت نہیں مُلا" بہت معروف ہے۔ اس کے علاوہ صنعت تکریر کی مشہور مثال زہر عشق سے دی جاتی ہے ؎

عشق سے کون ہے بشر خالی   کر دیے جس نے گھر کے گھر خالی

لیکن عزیزی رحمت علی خاں کے مطابق تکریر مستانف یا مجدد میں جن الفاظ کی تکرار ہوتی ہے ان کے درمیان وقفہ ہوتا ہے۔ منیرؔ کے یہاں سے انھوں نے مثال دی ہے ؎

سر بگریبان فکر، فکر کی دل میں جگہ
خامہ میان دوات، شمع میان لگن

اودھ کے شعراء میں مرزا شوقؔ کا نام بہت مشہور ہے۔ ذرا غور کیجیے: زہر عشق کا پہلا مصرع

لکھ قلم پہلے حمد رب وَدود

اس میں صنعت براعت الاستہلال بھی ہے اور صنعت حذف قطع الالف بھی ہے، یعنی مصرع میں الف نہیں ہے۔ ایک شعر اسی صنعت میں ملاحظہ ہو ؎

پیش یوں فرقت حبیب نہ ہو
کسی دشمن کو بھی نصیب نہ ہو

اودھ کے شعراء کی ایک طویل فہرست ہے جن میں محسنؔ کاکوروی، صفیؔ، ثاقبؔ، عزیزؔ وغیرہ کے نام بہت اہم ہیں۔ صرف اشعار درج کیے جا رہے ہیں اور صنعت کا نام درج کر دیا ہے، اہل نظر کے لیے سمجھنے کو کافی ہے ؎

کالے کوسوں نظر آتی ہیں گھٹائیں کالی
ہند کیا ساری خدائی میں بتوں کا ہے عمل ——— محسنؔ کاکوروی

صنعت تکریر مستانف: ایک سر فکر بیشت دہ کرے یا فکر شعر
کام ہے فکر سخن ہر فکر سے آزاد کا (صفیؔ)

اشتقاق: آتش عشق نے عشاق کو اُف پھونک دیا
تھا ادھر حسن ادھر مہر مبیں کی حدت (عزیزؔ)

صنعت ایراد المثل: باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے (ثاقبؔ)

(دوسرا مصرع ضرب المثل ہے اور یہی نظم کرنا مذکورہ صنعت ہے)

عہد حاضر کا تذکرہ کرتے ہی ایسا معلوم ہونے لگتا ہے جیسے شاعری کا رشتہ الفاظ سے توڑ دیا گیا اور یہ سمجھ لیا گیا کہ شعراء نے ان محاسن شعری کی طرف سے آنکھیں موڑ لی ہیں لیکن قصور شعراء کا نہ تھا قاری کا تھا۔ ان محاسن کی فہم کے لیے جس علم کی ضرورت تھی وہ تیز رفتار زندگی میں ممکن نہ رہ گیا تھا۔ حالاں کہ اقبالؔ جیسے شاعر کے یہاں شاید ہی کوئی ایسی نظم ہو جو صناعی کا شاہکار نہ ہو۔ "مسجد قرطبہ" اور "ذوق و شوق" میں تلمیح، تلمیح، اشتقاق، ابداع، طباق جمع وغیرہ ہر قدم پر ملیں گے۔ بہرحال ضمناً اقبالؔ کا تذکرہ آگیا ہے[۳۱]

اودھ میں جوشؔ ملیح آبادی سے دور حاضر کا آغاز ہوتا ہے صنعت جمع میں تو جہاں سے جی چاہے ان کی کوئی نظم اٹھا لیجیے۔ یہی حال

سبق الصفات کا ہے، پھر بھی ایک بند نقل کیا جاتا ہے جس میں دونوں صنعتیں موجود ہیں ؎

ب مکاں، امام زماں، آیۂ مبیں — کنزِ علوم، کاشفِ سرِ کعبۂ یقیں
قاضیِ دہر، قبلۂ دوراں، قوامِ دیں — منشائے عصر، معنیِ کن، میرِ عالمیں
تابندگیِ طرۂ طرفِ کلاہِ علم
مولائے جاں، رسولِ تمدن، الٰہِ علم

اس میں بہت ساری صنعتیں یکجا ہوگئی ہیں۔ مثلاً پہلے دو مصرعوں میں لف و نشر بھی ہے اور تیسرے و چوتھے مصرعوں میں مراعاۃ النظیر تو ہے ہی، مبالغہ مقبول بھی ہے۔ پہلے مصرعہ کے دو رکن صنعت ترصیع میں ہیں۔ جوشؔ کے یہاں صنعتوں کی تلاش کی ضرورت نہیں۔ "جنگل کی شہزادی" ہو یا "حسین اور انقلاب" ہر جگہ صناعی بولتا ہوا پیکر اختیار کر لیتی ہے صنعت توسیم کی مثال ملاحظہ ہو۔ اس صنعت میں قافیہ کی ایسے حروف پر بنیاد رکھتے ہیں کہ دوسرے مصرعہ میں ممدوح کا نام آجائے۔ مثلاً جوشؔ کہتے ہیں ؎

جس کی رگوں میں آتشِ بدر و حنین ہے — جس سورما کا اسمِ گرامی حسینؑ ہے

حسرتؔ موہانی کلاسیکی مزاج کے غزل گو تھے اس لئے کہ ان کے مشہور شعر ؎

جنوں کا نام خرد پڑ گیا خرد کا جنوں
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

میں صنعت عکس ہے اور یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ اس دور کے جتنے ممتاز شعراء ہیں، جن میں حسرتؔ اور ان کے بزرگ معاصرین اور کم عمر شعراء ہیں، ان سب کے یہاں صنعتوں کا التزام ہے چاہے وہ اصغرؔ گونڈوی ہوں یا ریاضؔ خیرآبادی یا مضطرؔ خیرآبادی یا آرزوؔ لکھنوی لیکن جوشؔ کو از تعجب ہوتا ہے جب مجازؔ اور علی سردار جعفری کے یہاں صنعتیں ملتی ہیں۔ مجازؔ کہتے ہیں ؎

سب کا تو مداوا کر ڈالا اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے

اس میں رد الابتدا علی الصدر[۴۸] و صنعت تکریر کی نشاندہی عزیزی رحمت علی خاں نے کی ہے۔ مجازؔ کا ایک شعر اور ملاحظہ ہو ؎

اے دل کی لگی چل یونہی سہی چلتا تو ہوں ان کی محفل میں
اس وقت مجھے چونکا دینا جب رنگ پہ محفل آجائے

اب چل اور چلتا میں تجنیس[۴۴] ذیل لطف دے رہی ہے۔ اس کی تعریف یہی لکھی ہوئی ہے کہ ایک لفظ کے آخر میں دو حرف کی زیادتی ہو۔ اس کے علاوہ اور بھی صنعتیں ہیں۔ علی سردار جعفری[۴۵] کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

خواب اب حسنِ تصور کے افق سے ہیں پرے
دل کے اک جذبۂ معصوم نے دیکھے تھے جو خواب

یہ صنعت محاذ بھی کہلاتی ہے اور اکثر نے اسے صنعت معاد بھی کہا ہے مگر صحیح نام رد العجز علی الابتدا ہے۔ ان کا ایک بند اور ملاحظہ ہو ؎

صبح سے لے کے تابہ شام، مست خرام، تیز گام
کرتی نہیں کہیں قیام، کرتی نہیں کہیں مقام
جذبۂ شوق ہے تمام منزلِ شوق ناتمام
دامنِ شش جہات میں سیلِ رواں ہے زندگی

اس میں صنعت ذوقافیتین، قیام اور مقام میں تجنیس، تیسرے مصرعہ میں تضاد وغیرہ ہے۔

حضرت خمارؔ بارہ بنکوی کی تمام مقبول عام غزلیں صناعی کا حسن رکھتی ہیں۔

اسی طرح ڈاکٹر وحید اختر[۴۶] محسن زیدی[۴۷] کے یہاں بھی صنعتوں کا برمحل اور متناسب التزام ہے۔ وحید اختر کے ایک مرثیہ کے چہرے میں قلم کا قصیدہ ہے۔ اس میں تصلیف سے لے کر تجنیس کے بیشتر اقسام، کلام جامع، صنعت جمع اور مراعاۃ النظیر وغیرہ ہیں۔ ان کے مرثیے "مریم سے بھی سوا ہے فضیلت بتول کی" سے ایک بند پیش کیا جاتا ہے جس میں تجنیس تجاہل عارف سے لے کر صنعت منقطع و رود۔ ذرود میں ہے ؎

بولی جو ہو سو ہو یہ ہے کس حسن کی نمو — نیزے پہ سر نہیں یہ ہے صبح کا ورود
ایسا جوان دیکھے کب چشم ہست و بود — دیکھوں ادھر تو بڑھتی ہے ہر ہر نظر درود
دل کہہ رہا ہے پھول یہ باغِ علیؑ کا ہے
میرے دہن میں خاک یہ چہرہ نبیؐ کا ہے

مجروحؔ سلطان پوری ہمارے عہد کے آتش ہیں۔ ان کے...

آنکل کے میداں میں دو رخی کے خانے سے

پڑھئے تو اپنے لہجے کے اعتبار سے یہ آتش کی غزل ؎

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا

کی یاد دلاتی ہے۔ مجروح بھی اسی بانکپن کے ساتھ اپنی کلاہ کج رکھتے ہیں جو آتش کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہاں ان کی شاعری پر تبصرہ کرنا مقصود نہیں ہے۔ صرف یہ عرض کرنا ہے کہ آتش نے جب کہا تھا ع

شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

تو انھوں نے اپنی شعری روایت کا سلسلہ مستقبل تک پھیلا دیا تھا۔ یہی شعری روایت اور مرصع سازی غزل گو شعرا، بالخصوص اودھ کی ادبی اور شعری روایت کے ورثہ دار اور نمائندہ شاعر مجروح سلطان پوری کے یہاں ملتی ہے۔ ان کے دو بہت مشہور شعر ملاحظہ ہوں ؎

رفتہ رفتہ منقلب ہوتی گئی صبحِ چمن

دھیرے دھیرے نغمۂ دل بھی فغاں بنتا گیا

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر

لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

پہلے شعر میں رفتہ رفتہ اور دھیرے دھیرے نے تکریر پیدا کی۔ نغمہ اور فغاں میں تضاد ہے۔ دوسرے شعر میں جمع ہے، مراعاۃ النظیر ہے اور اب ایرادالمثل ہے کہ پورا شعر ضرب المثل بن گیا ہے۔ جب کوئی ضرب المثل نظم کی جاتی ہے تو اسے ایراد المثل کہتے ہیں۔ مجروح کے اس شعر میں صناعی کی یہ کرامت ہے کہ اب یہ شعر ضرب المثل بن گیا ہے۔ ان کے یہاں تلاش کرنے پر بھی کوئی ایسا شعر نہ مل سکا جو آتش کی مرصع سازی کے معیار پر پورا نہ اترتا ہو۔[۴۸] مثال کے طور پر ان کے دو معروف شعر ؎

دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن جوشِ بہار

رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

شبِ ظلم نرغۂ راہزن سے پکارتا ہے کوئی مجھے

میں فرازِ دار سے دیکھ لوں کہیں کاروانِ سحر نہ ہو

پہلے شعر میں مراعاۃ النظیر، صنعت طباق ہے۔ دوسرے شعر میں ان خوبیوں کے علاوہ صنعت تجاہلِ عارفانہ بھی ہے۔ لفظ "کہیں" نگینے کی طرح جڑا ہوا ہے اور یہ صنعت شعر کے پیکر میں بول رہی ہے۔

یہ وہ وراثت ہے جو انشا، اور مصحفی کے زمانے سے ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتی آئی ہے اور یہ وراثت زندہ و تابندہ ہے۔ یہ سچ ہے کہ اب انیس و دبیر نہیں ہیں اور علم بدیع سے زیادہ علم بیان کی طرف توجہ دی جا رہی ہے۔ استعارہ کا ستارہ چمک رہا ہے۔ تشبیہ، کنایہ و مجاز، اور پھر دوسری صنعتیں ٹمٹاتی نظر آتی ہیں۔ لیکن آج بھی اعلیٰ علمی سطح رکھنے والے ادبی اذہان، کلاسیکی ادب سے شناسائی، تربیت یافتہ ذوق، ادبی معیار رکھنے والے اور محاسنِ شعری تلاش کرنے والوں کو یہ صنعتیں ذہنی حظ و انبساط مہیا کرتی ہیں۔[۵۵] مشاعروں میں بھی عوام یہ تو نہیں جانتے کہ جس شعر پر وہ داد و تحسین کے پھول نچھاور کر رہے ہیں ان میں کون سے محاسنِ شعری ہیں لیکن غور کیجیے تو یہ احساس ہوگا کہ عوامی ذہن بھی انھیں اشعار سے زیادہ متاثر ہوتا ہے جن میں رعایتِ لفظی، مراعاۃ النظیر اور حسنِ تعلیل کا سحرِ حلال ہوتا ہے۔

اودھ نے نظم کے ساتھ نثر میں بھی ادبی صناعی کے اعلیٰ ترین نمونے پیش کیے ہیں۔ اس سلسلے میں جاہ و قمر کی طلسمِ ہوش رُبا، آغا حجو ہندی کی چھوٹے آغا کی تصحیح کی ہوئی بوستانِ خیال وغیرہ میں سجع، ترصیع، مراعاۃ النظیر اور تجنیس کی مختلف اقسام ملتی ہیں، اور یہ ساری صنعتیں آغا حسن امانت کے ضلع اور جگت اور فقرے بازی سے بالکل مختلف ہیں۔ ان میں سروشِ سخن بھی ادبی صناعی کا اچھوتا نمونہ ہے لیکن بلاشبہ سرور کی فسانۂ عجائب میں یہ تمام صنعتیں معراجِ کمال پر نظر آتی ہیں۔ سرور نے گلزارِ نسیم اور سحرالبیان کی طرح ہر قصے کے چہرے میں براعت الاستہلال سے کام لیا ہے یعنی ابتدا میں کسی لفظ سے بعد میں رونما ہونے والے واقعات کی طرف اشارہ ہے۔ رعایتِ لفظی، مراعاۃ النظیر، ایہام التناسب اور صنعتِ تصحیف کے ایسے الفاظ لائیں کہ حرکات کو بدل دیں تو مدح ہجو بن جائے یا صنعت تزلزل کہ اس میں بھی ذرا سی تبدیلی سے مدح، ہجو میں بدل جاتی ہے یا صنعت الہزل الذی کہ بظاہر تمسخرانہ و ہزلیانہ ہو مگر مراد اس سے ہزل نہ ہو ــ یہ ساری صنعتیں سرور کے یہاں ملتی ہیں۔ ایک بہت مختصر سا ٹکڑا دیکھیے:

"اور نوا ور شہدا پیر بخارا کا نواسا، سید الشہدا، کا شیدا!" [۵۱]

شُہدا، شُہدا، شیدا میں صنعت تجنیس نے بیان کا جو حُسن پیدا کیا ہے اس کے حسن کو سمجھنے کے لئے تربیت یافتہ ذہن کی ضرورت ہے۔ سرور کے یہاں ایک صنعت ہے جس کو کوئی نام نہیں دیا جا سکا، صرف ایک فقرے پر غور کیجئے، [۵۲]

"اصل تو یہ ہے کہ عسل مصفیٰ جنت کی نہر کا حلق سے اترا"

اس میں اصل اور عسل میں تجنیس نہیں ہے۔ یہاں وہ صوتی آہنگ ہے جو انگریزی ادب میں پایا جاتا ہے۔

صرف داستانوں ہی میں نہیں، اودھ کی بیشتر نمائندہ تخلیقات میں بھی صناعی ملے گی، چاہے وہ فسانہ آزاد ہو یا سرشار کے ناول۔ ظاہر ہے طویل اقتباسات کی گنجائش نہیں۔ "امراؤ جان آدا" سے کچھ فقرے ملاحظہ ہوں:

رسوا: "امراؤ جان! سنا کیا شعر کہا ہے۔"

امراؤ جان: "سبحان اللہ۔ میں پہلے ہی سمجھ گئی جو چاہیں کہیں، مالک ہیں۔"

اس میں ہجو ملیح اور تاکید الذم بما یشبہ المدح ہے۔ اس لیے کہ مالک، داروغہ جہنم کو بھی کہتے ہیں۔ "امراؤ جان آدا" میں صناعی کا باقاعدہ التزام ہے۔ چھوٹے چھوٹے فقرے صنعتوں سے بھرپور ہیں۔ زیادہ مثالوں کی گنجائش نہیں صرف ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو:

"اوّل تو پہلے ہی طبیعت بہت رسا تھی دوسرے لائق احباب کی وساطت سے اونچے اونچے گھروں پر رسائی ہوگئی۔ رسائی کیسی بے تکلفی بڑھ گئی۔!"

یہاں تجنیس، اشتقاق اور "رسائی کیسی" سے صنعت رجوع سامنے آتی ہے۔

اودھ میں ادبی صناعی [۵۴] کی اس داستان معجز بیان کو سمجھنے کے لئے تربیت یافتہ ذوق، کڑھی ہوئی شخصیت، شگفتہ ذہن اور علمی مزاج ضروری ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اہل علم اور شرفا کی صحبتوں میں ان سے موانست اور مجالست رہی ہو۔ اور اگر یہ نہیں، تو پھر بقول انیس ؂

ان صنعتوں کو پائے کہاں عقل سادہ کار!

□□

حواشی تعلیقات

۱؎ نجم الغنی: بحر الفصاحت ص۱۹۲ ۔ ۲؎ رشید حسن خاں: مقدمہ فسانۂ عجائب ص۹۶

۳؎ لفظوں کی چٹانوں سے ابلتے ہیں معانی
اک بات کے سوراخ سے نکلتے ہیں معانی (وحید اختر)

۴؎ پوستش چینٹ قلمکار بہر دشت وجبل۔ سودا

۵؎ قدیر شاگرد مرزا دبیر

۶؎ بحوالہ "اردو شاعری میں صنائع و بدائع: عزیزی ڈاکٹر رحمت علی خاں یوسف زئی۔ ریڈر سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد ص۳

۷؎ ایضاً ص۹۶

۸؎ نجی خط۔ عزیزی ڈاکٹر محبوب عالم انصاری ریڈر ٹی این ڈگری کالج ٹانڈہ

۹؎ فکر و ریاض: علی جواد زیدی ص۱۱۸

۱۰؎ یہاں ایک بحث یہ پیدا ہو سکتی ہے کہ اودھ میں ادبی صناعی کا نقطہ آغاز کسے اور کیوں قرار دیا جائے؟ انشا سے ہی اس کا آغاز کیوں؟ وہ سارے دلائل ایک بسیط مضمون کا مطالبہ کرتے ہیں۔ عابد پشاوری کا مضمون "انشا کا وطن" (نیا دور فروری، مارچ ۱۹۹۴ء) اس سلسلے میں فیصلے تک پہنچنے میں ممد و معاون ہوا۔

۱۱؎ اشعار اور صنعتوں کے انتخاب میں ذاتی وجدان ہی کو دخل رہا ہے، بے شمار اشعار اور بھی ہو سکتے ہیں جتنی صنعتوں کی نشاندہی کی گئی ہے اتنی ہی صنعتیں باقی رہ گئی ہیں۔

۱۲؎ مہذب اللغات ص۳۳ ۱۳؎ حیات دبیر: افضل حسین ثابت ص۱۱۴

۱۴؎ یہاں اس کی وضاحت ضروری ہے کہ جتنی صنعتیں مرزا صاحب کے یہاں ہیں وہ سب انیس کے یہاں بھی ہیں، راقم الحروف نے اسی لیے اس کا لحاظ رکھا ہے کہ دونوں کے یہاں الگ الگ صنعتوں کی نشاندہی کی جائے البتہ کہیں کہیں شعر کے حسن نے مجبور کر دیا ہے۔

۱۵؎ حیات دبیر: افضل حسین ثابت ص۱۹۳ ، ۱۶؎ ایضاً ص۱۲۴

۱۷؎ ایضاً ص۱۱ ۱۸؎ انیسیات ص۱۲۶

۱۹ے حیاتِ دبیر ص۱۸۱ ، ۲۰ے ایضاً ص۱۹۷ ۲۱ے مہذب اللغات ص۳۳۹

۲۲ے المیزان : چودھری سید نظیر الحسن فوق بلگرامی ص۵۸

۲۳ے انیسیات ص۱۳۳

۲۴ے کلام میں ایسے لفظ لانا کہ بادی النظر میں یہ محسوس ہو کہ ایک لفظ سے مشتق ہے مگر ایسا نہ ہو۔ شبہِ اشتقاق سے کلام میں صوتی آہنگ کا حسن پیدا ہوتا ہے۔

۲۵ے مہذب اللغات ص۳۲۵ ۲۶ے ایضاً ص۳۲۶ ، ۲۷ے ایضاً ص۳۳۱

۲۸ے ایضاً ص۳۳۳، ۲۹ے ایضاً ص۳۳۸، ۳۰ے ایضاً ص۳۴۶

۳۱ے، ۳۲ے، ۳۳ے مہذب اللغات ص۳۴۶

۳۴ے اور یہی کمالِ فن ہے کہ بدیع کو بیان میں لے آئے۔ صوتی آہنگ سے فضا آفرینی اور شعری منظر نامے کا حسن چمک اٹھا ہے۔

۳۵ے انیسیات ص۱۲۹ ، ۳۶ے مہذب اللغات ص۳۲۵ .

۳۷ے مہذب اللغات ص۳۴۲ ، ۳۸ے ایضاً ص۳۳۹ ، ۳۹ے ایضاً ص۳۴۷

۴۰ے ایضاً ص۳۳۸ ، ۴۱ے غیر مطبوعہ مقالہ "اردو شاعری میں صنائع بدائع" از ڈاکٹر رحمت علی خاں .

۴۲ے عنوان کی پابندی کے خیال سے صرف اودھ کے شعرا تک تذکرہ محدود رکھا گیا ہے ورنہ اقبال ، فیض ، مخدوم ، ناصر کاظمی ، احمد فراز ، قتیل شفائی ، اختر شیرانی ، وامق جونپوری ، علی جواد زیدی ، کیفی اعظمی ان سب کے یہاں وافر صنعتیں ہیں .

۴۳ے اردو شاعری میں صنائع بدائع ۔ رحمت یوسف ص۴۸

۴۴ے مہذب اللغات ص۳۲۶

۴۵ے علی سردار جعفری بلرامپور گونڈہ کے رہنے والے ہیں .

۴۶ے وحید اختر کا اصل وطن نصیر آباد (رائے بریلی) ہے .

۴۷ے محسن زیدی کا اصل وطن بہرائچ ہے .

۴۸ے مجروح کی غزلوں کے بارے میں یہ کہا گیا ہے ، فلمی گانوں کے بارے میں نہیں .

۴۹ے مسعود صاحب نے 'انیسیات' میں اسے تجاہلِ عارفانہ لکھا ہے . لیکن مہذب صاحب نے تجاہلِ عارف لکھا اور یہی مرجح ہے

۵۰ے مزاحیہ شعرا ر مثلاً ظریف لکھنوی ، ناچیں لکھنوی ، شوق بہرائچی ، ساغر خیامی کے کلام میں متداول صنعتوں کے علاوہ تزلزل الہزل الذی اور تصحیف بکثرت ملتی ہیں ۔ یہاں صناعی کلام میں بے انتہا شگفتگی و گدگدی پیدا کرتی ہے . طوالت کے خیال سے مثالوں سے گریز کیا گیا .

۵۱ے مہذب اللغات ص۳۳۹

۵۲ے رشید حسن خاں : مقدمہ فسانۂ عجائب ص۳۷

۵۳ے فسانۂ عجائب ص۳

۵۴ے یہ صناعی ماضی کا مزار نہیں دورِ حاضر کی بھی زندہ حقیقت ہے . پارلیمنٹ ہو یا اسمبلی یا عوامی رہنماؤں کی تقریریں ، اگر صناعی ہے تو پھر یادگار حیثیت حاصل ہوتی ہے . تقریر کا ایک فقرہ ملاحظہ ہو :

"نیتا کی نیتی ہی نہیں ، نیت بھی اچھی ہو "

ایک بیان پڑھئے : "کل تک وہ ہمارا ہاتھ تھے آج سفید ہاتھی ہیں "

"نوجوان تمہارا ہتھیار نہیں ، ہاتھ ہیں " اور صرف سیاست داں نہیں ، ہر شعبۂ حیات کا انسان اگر لفظ کے استعمال کا ہنر جانتا ہے تو وہ صناعی برتتا ہے .

"سر پر تو بالِ وبالِ جان ، بسانِ سنبلِ پریشان پریشان ہیں اور اس گل کا گریبان مانندِ گل تا بداماں چاک ہے اور تیری نرگسِ چشم کے خیال میں وہ روز و شب آنکھوں سے آبجو جاری رکھتا ہے اور تیری مژگانِ رشکِ سنان کے تصور میں شام و سحر خارِ ہجراں اس کے دل میں کھٹکتا ہے ، اور تیرے لعلِ لبِ خنداں کے دھیان میں غنچے کی طرح آٹھ پہر گردن جھکائے چپ بیٹھا رہتا ہے اور کبھی تیرے دستِ حنائی ، رشکِ پنجۂ مرجان کی یاد میں برنگ ارونگ قطرۂ خون دیدۂ خوں بار ہر دم ٹپکاتا ہے . . . . اور تیرے فراقِ پر اشتیاق میں روز و شب بحالِ پر تعب مانندِ بلبل دور از چمن نعرہ زن ہے اور رنگِ رخسار جو اس گل عذار کا مثلِ گل ۔ سرخ تھا سو کاہشِ غم سے مثلِ صد برگ زرد ہو گیا ."

مہجور

[شیخ محمد بخش مہجور کی داستان "نورتن" (۱۸۱۳ء) کا ایک اقتباس ۔]



شامِ اَودھ

لکھنؤ اے لکھنؤ صُورت گرِ شامِ اَودھ
مالکِ مُلکِ سُخن ساقی گرِ جامِ اَودھ

لکھنؤ کے پھُول ہوں پھل ہوں کہ صوت و رقص میں
لاکھوں میں لگتے ہیں یکتا نازک اندامِ اَودھ

صبحِ صادق کی اذانیں، شام کے ناقوسِ دیر
قومی یک جہتی پہ قائم ہیں درو بامِ اَودھ

یاد کرتا رہتا ہے حضرت محل کا سبزہ زار
جنگِ آزادی کے خوں آشام ایّامِ اَودھ

شامِ حضرت گنج ہو یا صبحِ قیصر باغ ہو
کیسے کیسے پیچ ڈالا کرتا ہے دامِ اَودھ

صبحِ فیض آباد کا اک نام ہے شہرِ گلاب
لکھنؤ میں گومتی پہ ختم ہے شامِ اَودھ

اک دہکتا آگ کا گولا بگیتا ر گھاٹ
سرجو سے تا گومتی بن جائے ہے شامِ اَودھ

"بیلی گارد" لکھنؤ کے دل کا اک ناسُور ہے
ہو گئی تھی جس کے آگے کُند صمصامِ اَودھ

کہنے کو ہر چند ہے وہ "حافظِ شیرازِ ہند"
ہے مگر وامق پُرانا بادہ آشامِ اَودھ

وامِق جونپوری
'لال کوٹھی'
پوسٹ کھجگاؤں
جون پور — ۲۲۲۱۳۰

عبد القوی دسنوی
۲۰، پرنس کالونی، نعمت پورا،
عید گاہ ہلس، بھوپال ۱۰

اودھ پنچ اور اس کی طنزیہ مزاحیہ شاعری

۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کے ٹھیک بیس سال بعد جنوری ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ کی سرزمین سے ایک طنز و مزاح سے بھرپور اخبار "اودھ پنچ" جاری ہوا۔ اس اخبار کو اردو طنز و مزاح کے تیسرے دور میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے مدیر منشی سجاد حسین اپنی شگفتہ مزاجی اور طنزیہ و مزاحیہ تحریر کے لیے مشہور رہے

"اودھ پنچ" سے قبل سب سے پہلے ۱۸۵۵ء میں رام پور سے اس رنگ کا اخبار "مذاق" کے نام سے حکیم احمد رضا لکھنوی نے جاری کیا تھا۔ پھر ۱۸۵۹ء میں "مدراس پنچ" کے نام سے اردو کا دوسرا مزاحیہ اخبار نکلا تھا جس کے مالک شاہ محمد صادق حسینی شریف تھے۔ یہ اردو کا پہلا پنچ اخبار تھا۔ ۱۸۷۶ء میں بمبئی سے "فرحت الاخبار" "روہیلکھنڈ پنچ" مرادآباد اور پٹنہ سے "اپنچ" جاری ہوگئے۔

اودھ پنچ نکالنے کی غرض و غایت مالی فائدہ کے بجائے طنز و مزاح کے ذریعہ قوم میں پیدا شدہ معاشرتی برائیوں کی اصلاح، ذہنی بیداری پیدا کرنا اور انگریزوں کی لائی ہوئی ذہنی غلامی سے نجات دلانے کی کوشش تھی۔ بلاشبہ اس اخبار نے نہایت ہی جرأت مندی اور حوصلہ مندی کے ساتھ انگریزی ذہن و فکر اور تہذیب کا مذاق اڑایا۔ اور ان کی سیاست کو نشانہ بنایا۔ مغربی تہذیب جسے بغیر سوچے سمجھے اہل ہند اختیار کیے جا رہے تھے اور اپنے ماضی و مستقبل سے بے خبر ہوتے جا رہے تھے جس کے نتیجہ میں بھیانک تباہی کے آثار دکھائی دینے لگے تھے۔ ایسے وقت میں اپنچ نے ہنستے ہنساتے اور طنز کے وار سے مضطرب کرتے ہوئے میں جھنجھوڑنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں وہ بہت حد تک کامیاب ہوا۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے پنچ کی اسی خصوصیت کی طرف اپنی اس تحریر میں اشارہ کیا ہے۔

> "پنچ نے ایک طرف ان حیثیات سے بغاوت کی جو شرق کے لیے باعث ننگ اور اس کی تباہی کا موجب تھیں دوسری طرف اس نے اس کورانہ تقلید کے خلاف علم جہاد بلند کیا جس کی بنا پر لوگ دیوانہ وار مغرب کی پذیرائی اور پرستش کر رہے تھے" ۱

اودھ پنچ نے اصلاحی مقصد کے لیے طنز و ظرافت کا استعمال صرف نثر و نظم کے ذریعہ نہیں کیا بلکہ کارٹون کی مدد سے بھی اپنے اصلاحی کاموں کو آگے بڑھانے کی کوشش کی تھی جس میں انھیں بہت حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی تھی۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس کی باگ ڈور منشی سجاد حسین کے ہاتھ میں تھی جو ایک زندہ دل اور بے باک صحافی اور نڈر اور محب وطن ہندوستانی تھے۔ جن کی ظرافت میں عام طور سے دل آزاری نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ صحتمند انداز سے برائیوں کو دور کرنے کی کوششیں ہوتی تھیں جس کے نتیجہ میں اس کی طنزیہ مزاحیہ مشمولات اور کارٹونوں کو اس زمانے میں بڑی مقبولیت رہی ۱۸۷۷ء سے ۱۹۱۲ء تک تقریباً ۳۵ سال تک اس اخبار نے کبھی اپنی ظرافت سے قہقہہ لگانے اور مسکرانے پر مجبور کیا اور کبھی اپنے طنز کے تیر سے لہولہان اور مضطرب کرتے ہوئے اردو ادب کے طنز و ظرافت کے سرمایہ کو مالا مال بھی کیا اور اہل اردو کو اپنی کوتاہیوں کی طرف متوجہ کرنے میں کامیابی بھی حاصل کی۔ بلاشبہ اردو کے طنزیہ مزاحیہ ادب میں اودھ پنچ کی ہمیشہ اہمیت رہے گی اور اس کی زبان و ادب

اور ملک کی خدمات کا ہمیشہ اعتراف کیا جاتا رہے گا۔

پنڈت برج نرائن چکبست نے اودھ پنچ کی مقبولیت اور اہمیت سے متعلق اس طرح کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

"اودھ پنچ ظرافت کا سرچشمہ تھا اور عام طور سے لوگ اس کے فقروں اور لطیفوں پر لوٹ پوٹ رہتے تھے جو پھبتی اس میں نکل جاتی تھی وہ مہینوں زبان پر رہتی تھی،،" [2]

اور انھوں نے یہ بھی اعتراف کیا ہے:

"آج نثر اردو جس سلیس اور پاکیزہ روش پر جاری ہے اس کی ایجاد میں اودھ پنچ کا بہت بڑا حصہ ہے۔" [3]

اس اخبار کی خوبیوں کے پروفیسر رشید احمد صدیقی بھی معترف تھے انھوں نے اس کی ان خصوصیات کی طرف توجہ دلائی تھی:

"...... اس میں شک نہیں کہ پنچ، ظرافت کا علمبردار تھا اور ظرافت کے اس بے پناہ آلہ نے زندگی کے کسی شعبہ کو اپنے وار سے محفوظ نہ رکھا۔ اردو ادب میں اودھ پنچ اپنے قسم کا اولین پرچہ تھا اور اکثر حیثیت سے وہ ظرافت و طنزیات کے رائج الوقت معیار کا بہترین ترجمان تھا۔" [4]

اودھ پنچ میں لکھنے والے اس زمانہ کے اردو کے تقریباً تمام معروف طنز و مزاح نگار تھے۔ خود منشی سجاد حسین اس میدان میں نمایاں اور ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ انگریزی حکومت کے خلاف آواز اٹھاتے رہے اور ان کی تہذیب کی مخالفت کرتے رہے اور مشرقی اقدار کی ہمنوائی ان کا شیوہ رہا۔ اس اخبار کا موٹو تھا (LIFE IS PLEASURE) یعنی زندگی مسرت ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ مزاحیہ صحافت کو اردو میں اسی اخبار کی وجہ سے مقبولیت حاصل ہوئی سیاسی اور سماجی مسائل پر اس نے ہمیشہ نہایت تیکھے انداز سے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور بڑے بڑوں کے آواز بلند کرتا رہا۔

یہ اودھ پنچ کی مقبولیت ہی تھی جس کی وجہ سے اردو میں اور بھی بہت سے اخبارات اس طرز کے نکلے جن میں پنجاب پنچ (لاہور) کلکتہ پنچ (کلکتہ) انڈین پنچ (لکھنؤ) دہلی پنچ (لاہور) بنگال پنچ (کلکتہ) باوا آدم پنچ (بنارس) راجپوتانہ پنچ (اجمیر) میرٹھ پنچ (میرٹھ) سرپنچ (سید پور) کشمیر پنچ (بدایوں) ہریانہ پنچ (جھجھر) کرناٹک پنچ (رائے پیٹھ) دکن پنچ (مدراس) کشرا پنچ (الہ آباد) فتح گڑھ پنچ (فتح گڑھ) برار پنچ (کولہاپور) گجرات پنچ (گجرات) فیروز پور پنچ (فیروز پور) سرپنچ (میرٹھ) دکن پنچ (جالندھر) آگرہ پنچ (آگرہ) [5] وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

لیکن ایک خیال یہ بھی ہے کہ اودھ پنچ نے جہاں مزاحیہ صحافت کو فروغ دیا وہاں پھکڑپن اور ابتذال سے نہ صرف دامن نہیں بچا سکا بلکہ اس کی وجہ سے اسے فروغ ہوا۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے تحریر کیا ہے:

"جس زمانہ میں اودھ اخبار روزنامہ کی حیثیت سے نکل رہا تھا ہندوستانی صحافت میں پنچ اخبارات کا بڑا چرچا تھا۔ یہ اخبار مزاحیہ اخبار تھے لیکن جب پھکڑپن پر آجاتے تو حدود سے متجاوز ہوجاتے اور خوب گندگی اچھالتے ان میں سب سے نمایاں اودھ پنچ تھا۔،،" [6]

آگے ایک جگہ اپنی اس بات کو انھوں نے اس طرح بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے:

"اودھ پنچ سے اردو صحافت کو نقصان بھی پہنچا ہے اس نے مزاح میں ابتذال اور پھکڑپن کو فروغ دیا۔ بڑے بڑے ادیبوں نے یہی رنگ اختیار کر لیا اور پھر اس کی تقلید میں جو پنچ اخبار ہندوستان کے طول و عرض میں نکلے انھوں نے پھکڑپن ابتذال اور فحش نگاری میں انتہا کردی۔ یہ رنگ صحافت میں تیس پینتیس ۳۵ سال تک مسلط رہا،،" [7]

رام بابو سکسینہ بھی اودھ پنچ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اس کی بعض خامیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں لیکن نرم لہجہ کے ساتھ:

"اودھ پنچ یوں تو ایک ظریفانہ موقر اخبار تھا مگر کبھی کبھی اس کی ظرافت کا رنگ بدل جاتا تھا اور وہ طعن و تشنیع اور ذاتی حملوں پر اتر آتا تھا۔ بعض مضامین کے پڑھنے سے مثلاً وہ جو فسانۂ آزاد، حالی، داغ، گلزار نسیم وغیرہ کے متعلق لکھے گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اودھ پنچ کے صفحات مہذب اور سنجیدہ ظرافت سے گزر کر

پھکڑ کا ایک میدان بن گئے ہیں مگر اقسام ذیل کے مضامین
نہایت قابلیت اور شستگی کے ساتھ اس کے صفحات میں
درج ہوتے رہے ہیں... شے

ان اقتباسات کے مطالعہ سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ اودھ پنچ نے کبھی کبھی حالات اور ماحول سے متاثر ہو کر اردو کے طنز و مزاح کے معیار اور مزاج کو نقصان پہنچایا ہے لیکن اس کا اعتراف تقریباً تمام اہل نظر نے کیا ہے کہ اس کے وجود سے طنز و مزاح کے خزانے میں نمایاں اضافہ بھی ہوا ہے خاص طور سے اردو طنزیہ اور اور مزاحیہ شاعری نے اودھ پنچ کے زیر سایہ نئی کروٹ لی تھی اور بڑی مقبولیت اور شہرت حاصل کی تھی اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اودھ پنچ نے طنزیہ اور مزاحیہ شاعروں کا اپنے گرد جمگھٹا تیار کر لیا تھا۔ ان شعراء نے ان پینتیس سال میں اپنے خوب خوب جوہر دکھلائے ان میں منشی سجاد حسین کے علاوہ احمد علی شوق، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، تربھون ناتھ ہجر، عبدالغفور شہباز، بابو جوالا پرشاد برق، الانسان ضاحک اور اکبر الہ آبادی اہم ہیں۔

منشی سجاد حسین کے یہاں طنز و مزاح میں اصلاحی مقاصد کی اہمیت زیادہ رہی ہے لیکن ان مقاصد کے حصول میں بھی سچائی کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ عبدالغفور شہباز نے قوم اور مذہب کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا لیکن نرم لہجہ کے ساتھ سطحیت کو قریب پھٹکنے نہیں دیا۔ مرزا مچھو بیگ ستم ظریف نے کئی سال تک اودھ پنچ میں بول چال کی زبان میں مضامین لکھے۔ تربھون ناتھ ہجر تحریف نگاری میں نمایاں ہوئے الانسان ضاحک اودھ پنچ کے نامہ نگار رہتے۔ اخبار کے ماحول نے انھیں بھی اسی رنگ کا شاعر بنا دیا تھا۔ احمد علی شوق نے معاشرہ کی خرابی اور بری عادتوں کے خلاف آواز بلند کی اور طنز کے وار کیے اور اکبر الہ آبادی نے جو مغرب سے اس قدر متنفر تھے کہ اس کی ہر اچھی بری چیز کی مخالفت میں تسکین محسوس کرتے تھے۔ اپنی طنزیہ مزاحیہ شاعری کا معیار ہمیشہ بلند رکھا۔ یہاں چند شعراء کے کلام کے نمونے درج کیے جاتے ہیں تاکہ اس دور کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کے معیار کا اندازہ ہو سکے۔

تن ہو گیا ہے سوکھ کے کانٹا ببول کا ۔۔۔ اپنے تو حق میں عشق امربیل ہو گیا
قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں رسن
دو ایک ہاتھ چاہ میں جب ڈول رہ گیا

——— سجاد حسین

تھذیب قیس

لیلیٰ کے کہنے سننے سے آخر کو قیس نے ۔۔۔ لکھوایا نام نجد کے انگلش اسکول میں
اے بی کے بعد پڑھنے گیا ایسی ریڈریں
تعلیم خوش معاشی ہے جن کے اصول میں

——— شہباز

وہی مجو بھٹیاری جو پہلے تھی سو اب بھی ہو ۔۔۔ وہی لنہگا وہی ساری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے
وہی کھانا نہ پینا دس بجے جانا کچہری کا ۔۔۔ نصیبوں کی وہی خواری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

——— ستم ظریف

وہ کہہ رہے ہیں ہند میں تکلیف کچھ نہیں
ہم کہہ رہے ہیں ہند میں آرام جھوٹ ہے

——— الانسان ضاحک

لیکن اس اودھ پنچی جمگھٹے میں سب سے بڑا اور نمایاں نام اکبر حسین اکبر الہ آبادی کا ہے جنھوں نے نہ صرف اودھ پنچ کی مقبولیت اور اہمیت میں اضافہ کیا بلکہ اردو طنزیہ مزاحیہ شاعری کا وقار بہت بلند کیا۔ ان کا اپنا ایک رنگ مزاج اور اندازِ فکر تھا جو قابلِ تقلید نہ تھا۔ بعض شعراء نے ان کے رنگ کو اختیار کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بہت زیادہ کامیاب نہیں ہوئے انھیں میں علامہ اقبال بھی تھے۔

اکبر الہ آبادی مشرقی مزاج رکھتے تھے لیکن تنگ نظری پسند نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے اودھ پنچ کے ذریعہ سرسید تحریک کی مخالفت محض مغربیت سے نفرت کی وجہ سے اس انداز سے کی کہ وہ سرسید کے مخالفوں میں شمار کئے جانے لگے۔

اکبر الہ آبادی کے طنزیہ مزاحیہ کلام میں ایک خاص قسم کی سنجیدہ شوخی اور طنز کی تیزی پائی جاتی ہے لیکن انھوں نے کہیں شدت اختیار نہیں کی بلکہ ہمیشہ درمیانہ روی ہی کو پسند کرتے رہے اور ساری

زندگی نہایت احتیاط سے کام لے کر اس میدان میں آگے اور بہت آگے بڑھتے رہے اور تندی و تلخی سے پرہیز کرتے رہے جس کی وجہ سے ہر معیار اور مزاج اور نقطۂ نظر کے لوگوں میں پسند کی نظر سے دیکھے جاتے رہے۔

دراصل اکبر کا مقصد مذاق اڑانا کبھی نہیں رہا۔ وہ اصلاح چاہتے تھے اور قوم کو مغربیت کے اثرات سے محفوظ دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی کو انھوں نے اپنی زندگی کا حاصل سمجھا تھا لیکن اس کے باوجود انھوں نے دوسرے مسائل کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دی ہے اور قوم کو متوجہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اکبر کے یہ چند اشعار ملاحظہ کریں۔

نے خانۂ ریفارم کی چکنی زمین پر　　واعظ کا خاندان بھی آکر پھسل گیا
کیسی نماز، بال میں ناچو جنابِ شیخ　　تم کو خبر نہیں کہ زمانہ بدل گیا

نئی تعلیم کو کیا واسطہ ہے آدمیت سے
جنابِ ڈاروِن کو حضرتِ آدم سے کیا مطلب

کہاں کی پوجا، نماز کیسی کہاں کی گنگا کہاں کا زم زم
ڈٹا ہے ہوٹل کے در پہ ہر اک ابھی دو ایک جام صاحب

اکبر الٰہ آبادی اردو طنز و مزاح کے میدان میں تنہا شاعر ہیں۔ جن کا کلام ہر دور میں مقبول رہا ہے۔ آج بھی ان کے یہ اشعار صحافیوں کی تحریروں میں، رہنماؤں کی تقریروں میں، تقاریب اور سنجیدہ محفلوں میں گونجتے اور محظوظ کرتے محسوس ہوتے ہیں جن کی وجہ سے اردو کے پژمردہ خیموں میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں　　اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا　　کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کے پڑ گیا

یہ اور اس طرح کے بے شمار اشعار ہیں جو مختلف اوقات میں فضا میں گونجتے رہے ہیں اور اودھ پنچ کی یاد تازہ کرتے رہے ہیں یہ اودھ پنچ ہی ہے جس نے اودھ کو طنز و مزاح کی دنیا میں نمایاں مقام دلا کر اپنی پہچان بنائی ہے۔

□□

حواشی:

۱ے طنزیات و مضحکات : رشید احمد صدیقی ص۹۰
۲ے مضامین چکبست ص۲۲۸　۳ے مضامین چکبست ص۲۲۹
۴ے طنزیات و مضحکات : رشید احمد صدیقی ص۸۵
۵ے دیکھئے صحافت پاک و ہند میں ص۲۴۵ از ڈاکٹر عبدالاسلام خورشید
۶ے صحافت پاکستان و ہند میں : ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ص۱۹۹
۷ے 〃 〃 〃 〃 ص۲۴۷
۸ے تاریخ ادب اُردو : رام بابو سکسینہ ص۱۰۲-۱۰۳

اودھ میں فنِ سپہ گری —— ص۵۵ کا بقیہ

۸ے مضمون: میر انیس اور فنِ سپہ گری : سید محمد حسن نقوی۔ سہ ماہی تحریر۔ دہلی اکتوبر تا دسمبر ۱۹۷۳ء
۹ے واقعاتِ انیس : سید مہدی حسن احسن لکھنوی، اصح المطابع لکھنؤ ص۹۰-۹۱
۱۰ے فنِ سپہ گری : سید مبارک حسین۔ ناشر مصنف۔ لکھنؤ ۱۹۷۴ء
۱۱ے تذکرۂ ہفت اقلیم (مخطوطہ لکھنؤ یونیورسٹی) امین احمد رازی
۱۲ے قطرہ محیط بحر ہند : منجانب کمیٹی نمائش صنعت و حرفت بمقام قیصر باغ لکھنؤ ۱۸۸۵ء۔ ترجمہ منشی درگا دیال۔ مطبع مصطفائی لکھنؤ ۱۸۸۵ء ص۳۰
۱۳ے قطرہ محیط بحر ہند ص۳۰　۱۴ے ایضاً ص۲۸
۱۵ے سیاق نامہ : منشی آنند رام مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۸۷۹ء
۱۶ے مکتب نامہ مسمّی بہ علم الحساب : باہتمام محمد عبدالرحمٰن ابن حاجی محمد روشن خاں، بار دوم۔ مطبع نظامی کان پور، رمضان المبارک ۱۲۷۹ھ
۱۷ے انشائے دل کشا : سید نثار علی بخاری بریلوی۔ فخر المطابع، ۱۲۷۰ھ
۱۸ے و ۱۹ے ایضاً، ۲۰ے ۲۱ے سیاق نامہ، ۲۲ے انشائے دل کشا
۲۳ے وضع دارانِ لکھنؤ : سید محمد ہادی لکھنوی۔ تصویر عالم پریس لکھنؤ ۱۹۰۸ء ص۴۴-۴۵
۲۴ے سلطانِ عالم واجد علی شاہ : سید مسعود حسن رضوی ادیب، نسیم اکادمی، لکھنؤ ۱۹۷۷ء ص۳۸
۲۵ے وزیر نامہ : وزیر السلطان امیر علی خاں، مطبع نظامی کان پور ۱۲۹۳ھ ص۳۲-۱۱۰
۲۶ے اودھ پر انگریزوں کا غاصبانہ قبضہ : مرزا علی اظہر برلاس۔ اودھ اکادمی (؟) کراچی ص۲۸
۲۷ے ایسٹ انڈین نفنی سیون : سریندر ناتھ سین (بحوالہ سلطانِ عالم واجد علی شاہ ص۴۳-۴۴)
۲۸ے قدیم ہنر و ہنرمندان لکھنؤ : سید اسرار حسین خاں۔ سرفراز قومی پریس لکھنؤ ۱۹۳۶ء ص۱۱۰- ص۱۱۳ و ص۱۷۳ تا ص۱۸۳



سبطِ محمد نقوی

چیف ایڈیٹر "ہماری توحید" (ہندی)
امامباڑہ غفران مآب، لکھنؤ ۳

اودھ کے چند نامور تاریخ نگار

(۶) اُن کی تاریخیں

اصل موضوع میں داخلے سے پہلے تاریخ کا موضوع و مقصد کیا ہے! اس کی نسبت مختصر سی گفتگو ہو جائے تو غالبا اودھ کی تاریخ نگاری کی مزاجی کیفیت سمجھنے میں زیادہ آسانی ہو۔ جب اس فن کی تدوین ہوئی تو اس کا مقصد محض واقعات کی جمع آوری تھا۔ یونان میں معقولات کا دور دورہ ہوا تو واقعات کی تصدیق اور اس کے پس پشت کارفرما عوامل کی تحقیق کا عنصر شامل ہوا پولی بی ایس کے نزدیک تاریخ کا مقصد یہ تھا کہ وہ افراد کی اصلاح نفس کا موجب بنے بسسرد اس سے بھی آگے گیا۔ اس کے نزدیک چونکہ تاریخ "معلم زندگی" ہے لہٰذا اس میں دروغ مصلحت آمیز بھی جائز ہے۔ [1]

بسسرد کا مصلحانہ یا مصالحانہ نقطۂ نظر سمجھ میں آتا ہے لیکن صداقت تو مخدوش ہو ہی گئی۔ اسی پر بس ہو جاتا تو بسا غنیمت تھا لیکن مغربی تہذیب و سیاست نے تاریخ نویسی کو سیاست کا محض ایک حصہ بنا ڈالا۔ پروفیسر سیلی اور پروفیسر گولڈن اسمتھ جیسے یورپین فاضلوں نے تاریخ کو سیاست کا محض ایک حصہ تسلیم کیا ہے۔ [2]

اور ان خیالات کا پورا پورا اثر پڑا۔ اودھ کی جتنی تاریخ نگاری ہوتی ہے شاید ہی کسی اور خطۂ ارض کی ہوئی ہو۔ اس کثرت کا سبب ظاہر ہے کہ پہلے تھوڑا بہت "خوشنودی مزاج" کی مد میں لکھا گیا جیسے ہر چرن کی چہار گلزار شجاعی۔ اسے آپ مدلل مداحی یا نثری قصیدے کے ذیل میں بھی درج فرما سکتے ہیں۔ مگر ان کی تعداد شاید انگلیوں پر شمار کرنے بھر کی ہو یا اس سے بھی کم ہو۔ پھر ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے اقدامات کو جائز اور اپنے منصوبوں کو اصلاحی و فلاحی ثابت کرنے کے لیے انبار لگوانا شروع کیا۔ غصب اودھ کے بعد تو یہ رو اتنی تیز ہوئی کہ جس کا شمار ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اسی تیر بارانی میں اکّا دکّا دفاعی کارروائی ہوئی۔ وزیر السلطان سید امیر علی خاں کے وزیر نامہ اور برڈ کی انگریزی کتاب کو جس کا ترجمہ راجیندر پانڈے نے ہندی میں اودھ کی لوٹ کے نام سے کیا ہے اسی قبیل سے شمار کرنا چاہیے۔

ایک سبب یہ بھی ہوا کہ ۱۸۵۷ء کا انقلابی اقدام سب سے زیادہ اودھ ہی میں موثر رہا۔ اسے "غدر" کا نام دے کے اپنے موقف کو برحق ثابت کرنے کے لیے اس کی روداد انگریزوں نے خود لکھنا اور لکھوانا شروع کی۔ ملک آزاد ہوا تو اودھ کی تاریخ نگاری تین دھاروں میں بہنے لگی۔ ایک تو وہ لوگ جو بے لاگ واقعی تاریخ لکھنا چاہتے تھے جس میں بیشتر یونیورسٹیوں کے ریسرچ اسکالر تھے مگر اردو، فارسی پر دست رس نہ ہونے کی وجہ سے یا بعض اور موانع سے ماخذ کے صحیح فہم و درک سے قاصر رہے۔ دوسرا دھارا ان لوگوں کا ہے جو اودھ کے فرماں رواؤں سے ناراض ہیں اور اس کچے مال سے پورا پورا فائدہ لے رہے ہیں جو انگریز چھوڑ گئے ہیں۔ تیسرے دھارے میں وہ لوگ ہیں جو اپنے بس بھر حقائق پیش کر رہے ہیں۔ اس دھارے میں ان حضرات کو شامل سمجھنا چاہیے جن کا موضوع فکر و دائرہ کار ہی تاریخ ہو۔ یہ سب ملا جلا کے فارسی اردو، انگریزی اور ہندی میں بہت بڑا انبار لگ گیا۔

قلم کاروں کے حالات کی تحقیق تو فرد واحد کے لیے تقریباً محال ہے۔ اہل دانش و بینش کی ایک جماعت اس کے لیے آمادہ ہو تو بات بن سکتی ہے۔ فارسی، اردو سے ناآشنائی نے بھی نتائج کو ناقص اور معیار کو پست کیا ہے۔

اس سلسلے میں ایک فنی سوال بھی کھڑا ہوگا کہ سیرت و سوانح نگار بھی تاریخ نگاروں کے دائرے میں شامل ہیں یا نہیں؟ مرحوم رئیس احمد جعفری ندوی، جامی اور پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم کا دیس

واجد علی شاہ کی حیات سے متعلق ہیں مگر واجد علی شاہ کی فرماں روایانہ حیثیت کا بخوبی احاطہ کرتی ہیں پروفیسر مرزا اظہر علی کی پیش کش کا نام ہے "کنگ واجد علی شاہ آف اودھ" یہ بھی جامع اور تحقیقی کتاب ہے۔ اس راقم کی کوشش "امجد علی شاہ" میں بھی فرماں روائی کا پہلو اُجاگر ہے۔ ایک صنف ایسی کتابوں کی ہے جن میں اَودھ کی ذیلی یا جزوی حیثیت ہے یعنی وہ کتابیں جو ہندستان پر ہیں یا ایسی کتابیں جن کا مرکزی مقام یا ہیرو اَودھ کے باہر کا ہے پھر بھی کسی نہ کسی حد تک اودھ کا مذکور ہوا ہے۔ مثال کے طور پر نانا صاحب پیشوا پر پنڈت آنند سروپ مشر کی فاضلانہ کتاب لیکن اس میں ایک باب حضرت محل پر بھی ہے اور اودھ کے کچھ دوسرے انقلابی سورماؤں کا ذکر ہے۔ ایک صنف ان کتابوں کی ہے جو علم سینہ کا قیمہ ہیں جیسے پنڈت امرت لال ناگر کی "غدر کا پھول" یہ تاریخ نہیں لی جنڈ میں مدرج ہوگی لیکن معلومات تو ہمیں عطا ہی کرتی ہے ان سب سوالوں کا کوئی قابل قبول جواب مل سکے تو کام کے حدود معین کرنے میں یقیناً مدد مل سکے گی۔ فی الحال تو یہی ہو رہا ہے کہ اودھ کے کسی پہلو پر لکھنے والے کو مورخ مان لیا جا رہا ہے۔

جہاں تک راقم عاجز کی اطلاع ہے۔ اس موضوع پر چودھری نبی احمد سندیلوی کی کتاب "تذکرۂ مورخین" غالباً ابتدائی کوشش کے طور پر موجود ہے ہر چند کہ نوادر کے حکم میں ہے۔ اس سلسلے کو ہمارے انور حسین اکبرپوری نے آگے بڑھایا ہے لیکن ان کی کوشش ابھی رسم اجرا کی منتظر ہے۔ نیا دور اس موضوع کو وسعت دے رہا ہے۔ اور سب سے مفصل کام یہی ہو سکتا ہے اگر اس سلسلے کو چلایا جائے۔ مصنفوں، نثر نگاروں وغیرہ کے جو تذکرے ہیں ان میں بھی چیزیں موجود ہیں پھر بھی امید ہے کہ اس کام کی طرف ہمارے ارباب قلم و نظر کی توجہ اور بڑھے گی۔ کام آگے بڑھا تو اور راہیں نکلیں گی مثلاً اب تک اردو صحافیوں کے بارے میں ہمارے پاس کچھ نہیں ہے ہر چند کہ اردو صحافت کی تاریخ پر اچھا خاصا مطبوعہ مواد مہیّا ہو گیا ہے۔ ان تاریخ نگاروں یا صحافیوں کے حالات کی جستجو زیادہ دقت طلب نہیں ہے جن کے کام دوسرے اصناف میں بھی ہیں۔ دقت انھیں حضرات کے بارے میں ہے جو محض صحافت کے ہو کر رہ گئے۔ یا تاریخ نگار کے علاوہ شخصیت کا کوئی اور پہلو نہیں رکھتے۔

میں نے اس تمہیدی معروضے میں دراز نفسی سے کام لیا ہے۔ مقصود بس یہ ہے کہ صورت مسئلہ واضح ہو جائے۔ اب ہمیں موضوع کی طرف رُخ کرنا چاہیئے۔

● ابوطالب کی کتاب اودھ کی قدیم تاریخوں میں شمار ہوتی ہے لیکن مصنف کے ارادے نام سے ہی ظاہر ہیں۔ تفضیح الغافلین یعنی غافلوں، بے سدھ لوگوں کو فضیحت کرنے والی کتاب۔ یہ غافل آصف الدولہ اور ان کے امیروں اور درباریوں کے سوا کون ہو سکتا ہے۔ بڑے حسن عقیدت کو راہ دی جائے تو کہہ سکتے ہیں کہ ابوطالب بھی تاریخ کو معلم سمجھتا ہے اور افراد کی اصلاح چاہتا ہے مگر اصلاح، تعلیم پند و نصیحت سے ہوتی ہے۔ یا توبیخ و تفضیح سے! واقعہ یہ ہے کہ ابوطالب کمپنی بہادر کے حلقوں میں مقبول مال تھا۔ وہ بنگال سے لکھنؤ گورنر جنرل لارڈ کارنوالس کے سفارشی خط کے ساتھ آیا تھا۔ اودھ سے نکالا گیا تو چیری کے ساتھ۔ ابوطالب کا گہرا دوست کپتان رچرڈسن اسے اپنے ساتھ یورپ کی سیاحت پر لے گیا ابوطالب سے لکھنؤ کے ریزیڈنٹ مڈلٹن نے راجہ تلوئی بلبھدر سنگھ کے خلاف کمپنی کی مدد کی درخواست کی۔ یہ درخواست ابوطالب نے قبول کی اور مدد دی راجہ گرفتار ہوئے اور زخموں کی تاب نہ لا کر انتقال کر گئے۔ ایسے مقبول کمپنی سے معروضی تاریخ نگاری کی توقع کیسے کی جائے؟ ۱۲۱۲ھ میں رچرڈسن کی فرمائش پر کلکتے میں کتاب لکھی۔ سیاحت یورپ کی دعوت کو اسی کتاب کا معاوضہ سمجھنا چاہیئے[۳]

ابوطالب کی سرگزشت حیات کی طرف متوجہ ہونے سے پہلے ممتاز مورخ و استاد مرحوم ڈاکٹر حبیب کے انتباہ کو دیکھ لینا چاہیئے۔

ملاحظہ فرمائیں[۴] اودھ کی تاریخی تالیفات میں ابوطالب اصفہانی کی تفضیح الغافلین (یا تاریخ آصفی) ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ ابوطالب کے والد حاجی محمد بیگ خاں جو پیدائش کے لحاظ سے ترک لیکن تہذیبی اعتبار سے ایرانی تھے۔ قسمت آزمائی کے لیے ہندوستان آئے اور نواب صفدر جنگ کی ملازمت میں داخل ہو گئے لیکن نواب شجاع الدولہ ان سے بدگمان ہو گئے اور انھیں گرفتار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ تاہم حاجی محمد خان کو کسی طرح عین وقت پر نواب کے ارادے سے آگاہی ہو گئی اور وہ اپنے اہل و عیال اور تمام جائداد و املاک چھوڑ چھاڑ کر مرشدآباد کی طرف راہ فرار اختیار کر گئے جہاں وہ ۱۷۶۸ء میں فوت ہو گئے۔ شجاع الدولہ نے حاجی محمد خان کا

وہ لاکھ روپیہ نقد اور ان کی تمام جائداد ضبط کرلی۔ لیکن ان کے فرزند ابوطالب کا بہت خیال رکھا۔ اپنی کتاب مسیر طالبی۔ میں ابوطالب کا کہنا ہے کہ میں لکھنؤ میں ۱۷۵۲ء میں پیدا ہوا تھا اور اگرچہ وہ (شجاع الدولہ) میرے والد کے رویّے سے بہت ناخوش تھے پھر بھی انھوں نے اپنے اور ہمارے خاندانی تعلقات کے مدّنظر میری والدہ کو خرچ کے لیے روپے دئے اور میری اعلیٰ تعلیم کے بارے میں انھیں پر زور تاکید کی۔ ابوطالب نے مروجہ نصاب کے مطابق جتنی بھی تعلیم ہوسکتی تھی حاصل کی۔ باوجود پریشان حالی کے ان کی تصنیف و تالیف کی ہوئی تقریباً بارہ کتابیں (سب کی سب فارسی میں) ملی ہیں جو ان کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں۔ نظم و نثر میں اور موسیقی اور علم ہیئت ایسے مضامین پر بھی ان کی معرکۃ الآرا تصانیف ہیں "مسیر طالبی" جس میں ان کے یورپ اور افریقہ اور مشرق قریب کے سفر کے حالات ہیں "خلاصۃ الافکار" جو فارسی شعراء کی سوانح عمری ہے اور "تفضیح الغافلین" جو اودھ کے آصف الدولہ کے دور کی تاریخ ہے۔

ڈاکٹر ثروت علی (نیشنل آرکائیوز آف انڈیا) جنھوں نے ابوطالب کی زندگی اور تحریروں کا ہر پہلو سے مطالعہ کرنے کے لیے انتہائی سعی و مشقت کے ساتھ چھ سال صرف کیے ہیں۔ تفضیح الغافلین کا اردو ترجمہ کرکے اسے شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس بنا پر کہ اودھ اور لکھنؤ کی تہذیب و معاشرت کے بیان میں آصف الدولہ (کے دور) کی تاریخ بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کا فارسی متن جو رامپور لائبریری کے قلمی نسخہ پر مبنی ہے ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے شائع کر دیا ہے۔ قارئین ملاحظہ فرمائیں گے کہ ڈاکٹر ثروت علی کا کیا ہوا ترجمہ بہت صحیح، صاف ستھرا اور واضح ہے۔ یہ فارسی متن کی قابل توجہ ترتیب اور ابوطالب اور اس کے معاصرین کی تحریروں کے وسیع مطالعہ کی بنیاد پر تیار کئے گئے حواشی پر مبنی ہے۔

ابوطالب کی اصل کتاب کی حقیقت کے بارے میں ہمیں یہ یاد رکھنا ہوگا کہ حکومت برطانیہ نے اپنے اثر و رسوخ کا سایہ اودھ پر ڈالنا شروع کر دیا تھا اور ابوطالب نے ایک برطانوی افسر کرنل رچرڈسن کی تجویز سے یہ کتاب لکھنی شروع کی تھی چنانچہ اکثر و بیشتر انھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایجنٹ کی طرح لکھا۔ سوچا اور برتاؤ کیا ہے۔ "تفضیح الغافلین" (جس کا انگریزی ترجمہ ۱۸۸۵ء میں ہوئے نے کیا۔ اس مقدمے کا ایک جز معلوم ہوتی ہے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسران نے اودھ کے الحاق کے جواز کے لیے بنانا شروع کیا تھا۔ ڈاکٹر ثروت علی نے نہایت توجہ کے ساتھ کتاب کے ناقدانہ موازنہ کی کوشش کی ہے۔ میں اتنا ہی کہنے پر اکتفا کروں گا کہ وہ سارا مواد جو ہماری دسترس میں ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وارن ہیسٹنگز اور کارنوالس کے بنگال کی بہ نسبت آصف الدولہ کے اودھ میں اوسط درجہ کے تعلیم یافتہ یا غیر تعلیم یافتہ ہندوستانی اشخاص کی حالت بدرجہا بہتر تھی۔ [۴]

ڈاکٹر جیب کے اس ارشاد میں ابوطالب کی سرگرمیاں کافی حد تک آگئی ہیں بس یہ ذکر باقی ہے کہ چودہ سال کی عمر میں ابوطالب اپنے باپ کی طلب پر بنگال چلا گیا تھا۔ مرشد آباد میں اس کی شادی ہوئی اور وہیں عامل مقرر ہوگیا۔ شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد مختار الدولہ کے بلانے پر زین العابدین کے ساتھ لکھنؤ آیا ۱۷۹۱ء میں زین العابدین دوآبے کے انتظام کے لیے بھیجا گیا۔ ابوطالب پھپھوند (اب ضلع اٹاوہ میں) تعینات ہوا۔ اس دوران اس نے ایک انگریز افسر میجر ہو کی جان بچائی۔ لیکن مختار الدولہ کے قتل کے بعد حیدر بیگ خاں نائب ہوا۔ اس نے ابوطالب کو معطل کر دیا۔ ناچار ابوطالب کو بھی اس کے ساتھ لکھنؤ واپس آنا پڑا۔ انگلستان کی سیاحت سے واپس آیا تو بھی برسر کار نہ ہوسکا۔ کافی قرض دار بھی ہوچکا تھا بالآخر ۱۸۰۶ء میں اسے موندہ (باندہ) میں تحصیلدار مقرر کیا گیا لیکن اسی سال فرمانِ اجل آپہنچا اور وہ چوّن سال کی عمر میں چل بسا۔

ڈاکٹر ثروت علی نے حالات کا ذکر کرتے ہوئے ابوطالب کے مصنفات کی فہرست دی ہے جس میں بارہ تصنیفوں کے نام ہیں۔ ان میں سے صرف تین مسیر طالبی فی بلاد افرنجی، اسی تاریخ آصفی (یعنی تفضیح الغافلین) اور مثنوی سرور افزا کو مطبوعہ بتایا ہے۔ [۵]

● آپ نے ابھی نیا دور کے ضمیمہ اودھ نمبر (جون ۱۹۹۴ء) میں سید کمال الدین حیدر میر محمد زآبر کی تاریخ اودھ کی ایک جلد قیصر التواریخ کی نسبت سید رئیس آغا کا مفصل مضمون دیکھا ہوگا۔ یہ اودھ کی کثیر الحوالہ تاریخ ہوجانے سے کافی اہمیت پاگئی ہے۔ اس کی عصری اہمیت یہ ہے کہ رئیس آغا صاحب کے ہاتھ مصنّف کا وہ مخطوطہ بھی لگ گیا جسے حکّام کے سامنے اجازۂ اشاعت کے لیے پیش کیا گیا تھا۔ اس میں اور مطبوعہ

درت میں نمایاں فرق ہے۔ انگریزوں کی تاریخ کے ساتھ دھاندلی کا یہ ایک جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ جیتا جاگتا ثبوت ہی نہیں منہ بولتا ثبوت بھی۔ کاش اس کا صحیح استعمال ہو سکتا۔ اگر یہ مسودہ پہلے منظرِ عام پر ہوتا تو مرحوم رئیس احمد جعفری کو اتنی تیکھی تنقید نہ کرنا پڑتی۔ فرماتے ہیں۔ غدر کے سلسلے میں اودھ کی بہت سی تاریخیں انگریزوں، ہندوؤں اور مسلمانوں نے لکھی ہیں۔ ان میں قیصر التواریخ خاص طور پر اہم ہے۔ یہ تاریخ سید کمال الدین حیدر حسنی الحسینی المشہدی عرف میر زائر نے لکھی ہے۔ لکھنے والے میر زائر صاحب ہیں۔ لکھوانے والے مشہور مورخ سر ہنری ایلیٹ ہیں جو گورنر جنرل ہند کے سکریٹری تھے۔ طبع اور اشاعت کا انتظام سر ڈگوبے سنگھ راجا بلرام پور نے کیا تھا جو سرکار کمپنی بہادر اور سرکار انگریز بہادر کی وفاداری اور اپنے ملک کی غداری میں مشہور ہیں۔ چھاپنے والا نول کشور پریس ہے۔"[۹] بے احتیاطی کے اور نمونے جو تحقیق کاروں کی طرف سے ظہور میں آئے ہیں۔ وہ قابلِ حیرت ہیں۔ ڈاکٹر جی ڈی بھٹناگر نے یہ بات جانتے ہوئے بھی کہ میر زائر کی کتاب پر انگریزوں کی ایک تثلیث نے نظر کر کے اسے سہ آتشہ بنایا جس کے ارکان میں کلائنٹ اور ڈاکٹر اسپرنگر کے علاوہ سلیمن بھی ہیں۔ غصبِ اودھ کے سلسلے کی سب سے سرگرم و چالباز شخصیت۔ پھر بھی ڈاکٹر بھٹناگر فرماتے ہیں۔ "کمال الدین حیدر نے بیانِ واقعات میں ناجانب دار رہنے کی کوشش کی ہے۔"[۱۰] ہمارے اس دانشور نے اس بات پر بھی دھیان نہیں دیا کہ یہ انہونی ہوتی کیسی؟ کام سر ہنری ایلیٹ کی فرمائش پر ہوا تھا۔ جب وہ ۱۸۴۷ء میں لکھنؤ آیا تھا اور میر زائر سے مفصل تاریخ لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ کیا یہ ممکن تھا کہ مال گاہک کی فرمائش کے مطابق نہ ہوتا۔ فرمائش کرنے والا بھی اناڑی نہیں تھا۔ خود پیشے میں تھا اور بہت شاطر کھلاڑی۔ کتاب غصبِ اودھ سے پہلے ۱۸۵۵-۵۶ء تک تصنیف ہو گئی ہوتی تو نہ اجازت کا سوال اٹھتا نہ اتنی تحریف ہوتی۔ میر صاحب نے اتنی دیر لگائی کہ غصبِ اودھ کا المیہ پیش آ گیا اور صورتحال یہ ہو گئی کہ۔

زباں پہ مہر لگا دی، قلم کو روک دیا

رئیس آغا بتاتے ہیں کہ "سید کمال الدین حیدر نے تاریخِ اودھ کا مسودہ جو دو جلدوں پر مشتمل تھا۔ حکام صدر لکھنؤ کی خدمت میں ۱۸۶۰ء اجازتِ طبع کی درخواست کے ساتھ پیش کیا تھا جسے ۱۸۶۱ء میں ایک مشروط حکم کے ساتھ... حکام صدر نے واپس کر دیا۔ سرکاری حکم میں کہا گیا (تھا) کہ

"کمال الدین حیدر کے تئیں تاریخ واپس دی جائے اور آگاہ کر دیا جائے کہ اکثر مقامات پر تاریخ مافق خیر خواہی کے نہیں ہوئی ہے۔ لیکن وہ چھاپ سکتے ہیں۔ مناسب ہے کہ اول چھپی جلد سے تحریر قلمی واسطے ملاحظہ کے اس محکمہ میں پیش کرے اور تا حکم ثانی اور نہ چھاپے۔"[۸]

ہر چند کہ آغا صاحب نے اپنے مضمون میں حذف و اضافہ کے بعض مقامات کی نشاندہی کی ہے۔ پھر بھی یہ ایک ضروری اور مفید و دلچسپ کام ہے کہ رئیس آغا صاحب کے مقبوضہ مخطوطے کو مطبوعہ نسخے سے بالاستیعاب مقابلہ کر کے اختلافِ متن کی نشاندہی کر دی جائے۔ اس سے قبل کہ میر زائر کے حالات کی طرف متوجہ ہوں۔ سر ہنری ایلیٹ کی ایک جھانکی سید سلیمان ندوی کے قلم سے دیکھ لیں:

"ایلیٹ کی کتاب کو اپنا گائڈ بنانے والا محقق، مسلمان سلاطین کے عہد کو صرف خون آلود اور خون آشام پاتا ہے جس کے ذہنی اثرات مدتوں کی تحقیق و کوشش کے بعد بھی مشکل سے مٹ سکیں گے۔ ایلیٹ شروع انگریزی عہد کا آدمی ہے۔ اور یہ ایک گونہ سرکاری حیثیت بھی رکھتا ہے اور اس نے اپنے کام کے مقصد کو چھپا کر نہیں رکھا ہے۔ اس نے صاف طور سے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ اس کے پیشِ نظر تمام تر یہ ہے کہ اپنے اگلے پیش رو حاکموں کے غیر منصفانہ عہد کی تاریکی کو دکھا کر اپنی قوم کے عہدِ حکومت کی روشنی دکھلائے تاکہ ہندوستان کے رہنے والے اس کو سایۂ رحمت سمجھ کر اطاعت مندانہ اخلاص کا خراج ہمیشہ پیش کیا کریں۔"[۹]

ہم میر زائر کے حالات رئیس آغا صاحب کی فراہم کردہ اطلاعات کی بنیاد پر یہاں پیش کرتے ہیں۔" خود کمال الدین حیدر نے اپنی عرفیت میر محمد زائر لکھی ہے اور اپنا آبائی وطن طول طبس بتایا ہے۔ وہ ایران کے ایک معزز گھرانے کی فرد تھے۔ ان کے اسلاف میں سجاد خو...

آپنے فن میں طاق اور ایران کے صفوی بادشاہوں کے عہد میں شہرۂ آفاق حیثیت کے حامل تھے۔"

انھیں میر عماد کے صاحبزادے میر ابراہیم خاں ہندوستان آئے۔ یہ نواب سربلند خاں کی صوبہ داری کشمیر کا زمانہ تھا۔ میر محسن خاں ان کے بیٹے ساتھ تھے۔ محسن خاں کے بیٹے میر مشرف خاں اپنے باپ سے روٹھ کر کوڑہ جہان آباد (اب ضلع فتح پور) گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی میر زائر کے دادا میر محمد اسمٰعیل عہد آصفی میں اکثر چکلہ دار و عامل کے منصب پر رہے۔ میر صاحب کے والد بھی سرکاری ملازمت اور مہاراجہ ٹکیت رائے کے درباریوں میں رہے۔ عہد نواب سعادت علی خاں میں تجارت کرنے لگے۔ خود میر زائر عہد غازی الدین حیدر میں ملازم ہوئے۔ اسی عہد میں انگریزی پڑھنا شروع کی۔ پھر رصدگاہ سلطانی سے متعلق ہوئے اور پھر الگ ہوئے۔ درمیان میں ترجمہ و تالیف کے اہم کام کیے ابھی دو ایک ماہ قبل آپ ان سوانح کو ملاحظہ فرما چکے ہیں یہاں بقدر ضرورت عرض کر دیا گیا۔ پوری سرگذشت کے اعادہ کی ضرورت نہیں البتہ میر زائر کے زمانۂ وفات کے بارے میں اس عاجز کو رئیس آغا کے بیان سے اتفاق نہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ مادہ ہائے تاریخ کے مصرعوں کی آغا صاحب نے کیا قرأت کی۔ میں انھیں اس طرح پڑھتا ہوں۔

"کہ پائین شہ والا بردن باب وے دفن است"

۱۳۱۰ ہجری

"بردن باب سوئے پائے شاہ مدفون است"

۱۲۹۹ فصلی

میں اس پر اعتماد اس لیے کر رہا ہوں کہ نجم نے ہجری والے قطعے میں صاف صاف بتایا ہے کہ۔

"زہ پانزدہ شب چہارشنبہ از صفر ناگہ
بہ عمر ہفت و ہشتادم کمر بہر سفر بربست"

یہ سب چیزیں ۱۳۱۰ھ میں واقع ہوئی ہیں۔ اسی سنہ ہجری میں ۱۵ر صفر بدھ کے دن ۷ر ستمبر ۱۸۹۲ء ہی تھی۔ یہی میر زائر کی صحیح تاریخ وفات ہے۔ بیشک سنہ فصلی میں ایک عدد کی کمی ہے اور وہ غالباً اس لیے کہ ۱۲۹۹ف ایک دن پہلے ختم ہوا تھا۔ ۱۳۰۰ف کا پہلا دن یعنی کنوار کی پہلی۔ اسی ۱۵ر صفر، چہارشنبہ، ۷ر ستمبر کو تھی۔ اس امکان کو یکسر مسترد نہیں کیا جا سکتا کہ زائر کا انتقال نصف شب سے قبل حدود ۱۲۹۹ف میں ہی ہو گیا ہو۔ سنہ قمری میں غروب آفتاب کے ساتھ دوسری تاریخ شروع ہو جاتی ہے۔ فصلی میں ایسا نہیں ہے۔ اس طرح میر زائر کا سنہ ولادت ۱۲۲۳ ہجری قرار پاتا ہے جو ۱۷ر فروری ۱۸۰۹ء اور ۶ر فروری ۱۸۱۰ء کے حصار میں ہے۔ معلوم ہے کہ میر زائر کربلائے میر خدا بخش میں تکیہ زن تھے۔ اب یہ کربلا اپنے بانی کی بجائے محل وقوع کی نسبت سے زیادہ مشہور ہے اور تال کٹورے کی کربلا کہی جاتی ہے۔ یہیں ضریح کی پائنتی حجرے سے باہر میر زائر دفن ہیں۔ افسوس ہے کہ میر زائر کے پسماندگان کا نام نظر قاصر سے نہیں گذرا۔

ان قطعات کے شاعر نجم تھے۔ سید محمد رضا نجم لکھتے ہیں۔ ان کی مصنفہ تاریخ کی ایک جلد کا مخطوطہ مدرسہ سلطان المدارس میں محفوظ ہے وہاں کے فاضل کتاب دار مولانا رضا ساجد رضوی زید پوری نجم صاحب کے حالات کی تلاش میں ہیں۔ مجھے ایسا خیال ہوتا ہے کہ ان کی بعض کتابیں شائع بھی ہو چکی ہیں۔ اب مجھے مرزا رجب علی بیگ سرور کی طرف متوجہ ہونے کی اجازت دیں۔

● رجب علی بیگ کی جو کتاب تاریخ کہی جاتی ہے وہ فسانۂ عبرت ہے۔ یہ بھی ان قلم کاروں میں ہیں جو بڑی حد تک حالات کے چشم دید گواہ ہیں اس میں اودھ کے آخری چار بادشاہ مذکور ہیں۔ معلوم نہیں کہ پہلے بادشاہ غازی الدین حیدر کا ذکر کیوں نہیں۔ حالانکہ سب سے زیادہ انقلابی واقعہ انھیں کے ہاتوں پیش آیا یعنی مسند وزارت بساط شاہی سے بدلی۔ انگریزوں کے دباؤ سے غازی الدین حیدر نے مرکزی شہنشاہیت سے ناتہ توڑ کر کمپنی بہادر کی اعانت و سرپرستی میں آ گئے۔ مگر سرور کا فسانہ نویس قلم نصیر الدین حیدر سے داستان شروع کرتا ہے۔ لیکن داستان ادھوری۔ نہ پیدائش کا ذکر، نہ تعلیم کا، نہ تربیت کا۔ سیدھے تخت نشینی سے داستان شروع کر دیتے ہیں: "پچیس برس کا سن عین شباب، جوانی کی آب تاب، مزے کے دن تھے جو تاج و تخت بہار و بخت زیست کی کیفیت، حکومت کا لطف خوب اٹھایا" سلہ

آپ توجہ فرمائیں، گنے چنے دس سال کی فرماں روائی سے دس کے کل پینتیس سال کی عمر۔ کیا زیست کی کیفیت دیکھی ہوگی اور کتنی دیر حکومت کا لطف اٹھایا ہوگا!

عزاداری میں بادشاہ کی دلچسپی کا ماتم کرتے ہیں۔ محرم میں یہ حال تھا کہ راہ چلتوں کو مسکرانا محال تھا۔ روز و شب غم اہل بیت میں رونا، اربعین تک زمین پر سونا، لباس آبی یا سیاہ، ہر دم لب پر نالہ و آہ ہزار ہا روپیہ اور جہاں کی نعمت "مرثیہ خوان" اور "سید محتاج آب نان" پاتے تھے۔ مرزا جی ان سطور میں کیا کہہ گئے ہیں وہ اہل دانش و بینش پر روشن ہے۔ افسوس ہے کہ راقم عاجز کی نظر امجد علی شاہ کی تصنیف کے وقت اس پہلو پر نہیں گئی ورنہ ذرا تفصیل سے گفتگو ہوتی۔

واقعہ یہ ہے کہ نصیر الدین شاہ حیدر کا دور اودھ کی تعمیر و ترقی کا دور تھا۔ سب سے اہم کام جو اس رفاہ عہد میں ہوا وہ گنگا سے ایک نہر نکال کے گومتی میں ملانا تھا۔ زراعت کی جو آبیاری ہوتی وہ بجائے خود بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ لیکن اس سے بڑھ کر ایک مہتم بالشان یہ بات ہوتی کہ لکھنؤ کے ساتھ اودھ کے باشندوں کے ایک اور حصے کو اپنی دھرتی پر گنگا جل مل جاتا اور عظمت و تقدس برادران ہنود کی نظر میں گنگا کے لیے مخصوص تھا اس میں گومتی بھی شامل ہو جاتی۔ غالبًا بادشاہ نے اسے اپنے والد کے نام سے منسوب کیا تھا کیونکہ یہ نہر اگرچہ لکھنؤ میں عوامی پیمانے پر حیدری نہر کے نام سے یاد کی جاتی ہے لیکن پڑھے لکھے بزرگوں کی زبان و قلم سے نہر غازی الدین حیدر سنا بھی، پڑھا بھی۔ لیکن اتنے اہم رفاہی کام پر سرور کی فقرہ بازی ملاحظہ ہو چاہے لطف لیں چاہے عبرت پکڑیں۔ فرماتے ہیں۔ بیٹھے بیٹھے طبیعت لہرائی، گنگا سے نہر منگائی، منظور ہوا کہ چشمۂ خوشگوار جاری ہو جو بحر ہستی میں یادگار ہو، سرسبز ہر ایک کشت کار ہو، مزدور، غریب غربا نہال ہو گئے، کارندے صاحب مال ہو گئے۔[11] اتنی تعمیری فکر کا نمونہ مرزا جی کی نظر میں بس "طبیعت کی لہر" ہے۔ اتنا ہی نہیں یہ داستان رنگ پر لانے سے پہلے ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ انگریزوں کی سیاہ کاری نظر ہی نہیں آتی۔ انگریزوں کی چیرہ دستی کا بحر اعظم۔ یہ نہر مکمل ہونے ہی نہیں دی گئی؟ رکاوٹ بھی ابتدائے کار میں نہیں کھڑی کی گئی۔ جب پچاس میل کھدائی ہو چکی۔ لاکھوں روپے ڈوب چکے تب بڑے صاحب (ریزیڈنٹ صاحب) پر یہ راز افشا ہوا "چونکہ گنگا کمپنی کے علاقے سے ہو کے گذرتی ہے لہذا سارا سرحدی علاقہ کمپنی کا ہے۔" برڈ تبصرہ کرتے ہیں "اگر ریزیڈنٹ کی بات سچ بھی تھی تو اس کا فریضہ تھا کہ کام شروع ہونے سے پہلے ہی بادشاہ کو آگاہ کر دیتا۔ ریزیڈنٹ نے ایسا نہیں کیا۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ریزیڈنٹ کا مقصد ہی یہ تھا کہ وہ بادشاہ کے اقتصادی ذرائع کو بے دست و پا کر دے۔"[12] کیا آدھے سچ کا بیان، وہ بھی تعبیر کو تفریحی انداز میں بیان کر کے تاریخ نگاری کہا جا سکتا ہے؟

آپ کا جواب جو بھی ہو لیکن فسانۂ عبرت کے مسیحا یا اس کے دوسرے جنم کے خالق پروفیسر مسعود حسن ادیب مرحوم کا جواب ملاحظہ فرمائیں "مبالغہ بھی اس (یعنی سرور کے) زمانے میں بہت مقبول تھا۔ سرور بھی جب کسی کی تعریف یا مذمت میں قلم کا زور دکھاتے ہیں تو مبالغے کے پل باندھ دیتے ہیں۔ ایسے حد سے گذرے مبالغے کا ایک اچھا پہلو یہ ہے کہ پڑھنے والے کو اس پر حقیقت کا دھوکا نہیں ہو سکتا اور اگر وہ بالکل نثری طبیعت کا آدمی نہیں ہے تو مبالغہ کی نئی نئی صورتوں سے لطف بھی اٹھا سکتا ہے۔"[13]

مگر اس پیر دانا کا یہ اندازہ درست ثابت نہیں ہوا۔ ایک بڑے معتبر و باوقار اخبار کے مبصر نے اسے نئی اطلاعات کی کان سمجھا اور ارشاد فرمایا کہ "یہ تحریر ان تاریخی صداقتوں کی حامل ہے جن کی تلاش تاریخ اودھ کے مطبوعہ ذخیرہ میں بیکار ہے۔ گویا کہ فسانۂ عبرت کا کتاب نگر اڈیشن کسی غیر مطبوعہ مخطوطہ سے لیا گیا ہے۔ یہ ہے اودھ کی تاریخ نگاری اور یہ ہے اردو کی تبصرہ نگاری اور یہ ہے ہماری غیرت ملی و وطنی ظاہر ہے کہ مرتب کی نظر میں جو ایسا بیان ہو جس پر حقیقت کا دھوکا بھی نہ ہو سکے اسے تاریخی ماخذ کی طرح استعمال کرنا بڑی ستم ظریفی ہے اور یہ ستم ظریفی غاصب انگریزوں کی ستم گاری سے تاریخ ہند کے ساتھ بھی ہوئی ہو اور تاریخ اودھ کے ساتھ تو بے تحاشا۔

سرور کا دکھڑا کہاں تک رویا جائے۔ مختصرًا یہ ملاحظہ فرمائیں کہ تیسرے بادشاہ محمد علی شاہ کے ساتھ یہ برتاؤ اس لیے نہیں ہوا کہ تب قلمدان وزارت نواب محمد ابراہیم شرف الدولہ کے پاس تھا اور سرور صاحب

شرف الدولہ کے متوسلوں اور کاسہ لیسوں میں تھے۔ لیکن جب شرف الدولہ کسی طرح امجد علی شاہ سے سمجھوتے پر آمادہ نہیں ہوئے اور ریزیڈنٹ نے مکرر اشارہ کیا تو شرف الدولہ برطرف ہو گئے اور پھر سرور نے امجد علی شاہ کے نظم و نسق کی کوئی گت نہیں چھوڑی۔ امین الدولہ کے دور تک تو صورتحال یہی رہی لیکن علی نقی خاں کے تقرر کے ساتھ سلطان عالم واجد علی شاہ کے دربار سے سرور کی نیاز مندی کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ جس لیے زہرافشانی کی لے مدھم پڑ گئی۔

سرور کے سوانح کی طرف متوجہ ہونے سے پہلے ایک بات اور عرض کر دی جائے کہ آخر "تفضیح الغافلین" اور "فسانۂ عبرت" کے نہج کے نام رکھنے سے کیا اشارہ ملتا ہے۔ آپ میں ایسے حضرات بھی ہوں گے جن کی نظر اس پہلو پر ہوگی اور جن کی نظر نہیں ہے انھیں اب توجہ فرمانا چاہئے۔ کیا کوئی شخص جو بے لاگ تاریخ لکھنا چاہے گا ایسے نام سوچ سکتا ہے۔

سرور کی سکونت میں بڑی بحث ہے۔ زمانۂ ولادت بھی یقینی طور پر معلوم نہیں۔ ڈاکٹر نیر مسعود نے بھی قرائن کی بنیاد پر ان کا سال ولادت ۱۲۰۰ھ (۱۷۸۶ء) متعین کیا ہے۔ حکیم مظہر حسن کوڑوی کے اس بیان سے کہ ۱۲۸۵ھ انتقال کے وقت سرور کی عمر صرف پچاسی برس تھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ وطنی نسبت کو یہ راقم ناکارہ بے ثمرہ سمجھتا ہے۔ جب ڈاکٹر حنیف نقوی تسلیم کرتے ہیں تو تذکرہ نگاروں کی تحریر سے استدلال غیر ضروری ہے۔ عشق و مبتلا اور بے جگر انھیں خوش باشان شہر کانپور کہتے ہیں۔ باشندہ یا ساکن یا متوطن نہیں کہتے۔ یہ بات درست بھی ہے کہ وہ کانپور میں رہتے تھے۔ کون نہیں جانتا کہ ڈاکٹر حنیف نقوی سہسوان کے متوطن ہیں لیکن اگر موصوف کو خوش باش شہر بنارس کہا جائے تو اس میں غلط کیا ہوگا۔ یہ بات بھی عرض کرنے کی ہے کہ جب ساری روداد حیات کی نسبت سرور کا بیان تسلیم کرتے ہیں تو وطنی نسبت کے بارے میں کیوں نہیں؟ خوب چند ذکا نے خوش باش و ساکن کو مرادف سمجھ لیا ہوگا۔

سرور اپنے بیان کے مطابق ربیع الثانی ۱۲۴۰ھ (نومبر و دسمبر ۱۸۲۴ء) تلاش معاش میں لکھنؤ سے کانپور جا پہنچے۔ یہیں اپنے معالج حکیم اسد کے کہنے سے فسانۂ عجائب لکھ کے بقائے دوام کی سیڑھی پر پہلا قدم رکھا۔ ۱۲۴۳ھ (۱۸۲۷ء) میں سرور لکھنؤ واپس آ گئے اور ۱۸۵۶ء تک وہیں رہے۔ ۱۸۴۳ء میں میر حسن رضوی کے مطبع حسینی محمود نگر سے اس کا پہلا اڈیشن شائع ہوا۔ سلطان عالم ۱۸۴۷ء میں تخت نشین اور سرور زمرۂ ملازمین میں داخل ہوئے۔ ۷ر فروری ۱۸۵۶ء کو جب غصب اودھ کا اعلانیہ "کمپنی بہادر" نے جاری کیا تو سرور کاشی نریش مہاراجہ ایشوری پرشاد نرائن سنگھ کے مہمان تھے۔ وہاں سے افتاں خیزاں لکھنؤ پہنچے مگر حالات کی گھٹا ٹوپ اندھیاری میں جب "لکھنؤ میں دم گھبرانے لگا"، شہر کاٹے کھانے لگا تو حسن اتفاق سے کاشی نریش نے انھیں پھر یاد کیا چنانچہ ۱۶ر ذیقعدہ ۱۲۷۵ھ ۱۸ر جون ۱۸۵۹ء کو وہ لکھنؤ سے کانپور گئے اور اپنے متبنّی سید احمد علی کے پاس قیام کر کے ۶ر ذی الحجہ/ ۸ر جولائی کو بنارس پہنچ گئے اور یہیں ۱۲۸۵ھ میں سفر آخرت پیش آیا اور یہیں مٹی ملی۔[۱۴]

فسانۂ عبرت کے طبع تازہ کے مرتب، اردو کے عظیم محقق و مبصر پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کا دیباچہ کتاب میں فرماتا ہے۔ فسانۂ عبرت اودھ کی شاہی کے خاتمہ کے بعد کتابی صورت میں آئی لیکن غور سے دیکھنے پر صاف پتہ چلتا ہے کہ اس کے مختلف حصے مختلف زمانوں میں لکھے جا چکے تھے مثلاً شرف الدولہ کی مدح ص ۴۶،۴۳ ان کی برطرفی کے بعد ان کے بر سر حکومت پہنچنے کی دعا ص ۵۲،۵۳ ۔۔شاہی اسپ کی ایجاد ص ۱۱۵،۱۱۱[۱۵]

سرور نے شگوفۂ محبت، گلزار سرور اور شبستان سرور کی طرح فسانۂ عبرت کا حق تصنیف و اشاعت بھی مولوی محمد یعقوب انصاری لکھنوی کو بعوض نقد محبت و امداد و اعانت و ہبہ بحل کیا، ہبہ نامہ یکم رجب ۱۲۷۸ھ کو لکھا گیا۔ ہبہ نامہ کی تحریر کے تیئس ۲۳ برس بعد جمادی الثانیہ ۱۳۰۱ھ (اپریل ۱۸۸۴ء) میں یہ کتاب مولوی محمد یعقوب کے مطبع نجم العلوم کارنامہ لکھنؤ میں چھپی... پہلے کے چھپے نسخے میں سرخیاں بہت کم تھیں عبارت پاروں میں منقسم نہ تھی۔ اوقات کے نشانات معدوم تھے۔ یہ پتہ نہ چلتا تھا کہ کون سا بیان کہاں سے شروع اور کہاں پر ختم ہوتا ہے اور اکثر مقاموں پر کلام کا ربط اور عبارت کا مطلب سمجھنے میں دقت ہوتی تھی۔ یہ سب نقائص درست کر دئے گئے ہیں۔ بہت سے لفظ

مشکوک تھے جن میں سے بعض کی تصحیح کردی گئی ہے اور بعض جوں کا توں بجنسہ نقل کر دیے گئے ہیں۔ بعض واقعات کی تاریخیں غلط تھیں اور بعض جگہ ہجری اور عیسوی تاریخوں میں مطابقت نہ تھی جہاں تک ممکن ہوا ان کی تصحیح و تطبیق کردی گئی ہے۔ کہیں کہیں ایک بیان کے دو ٹکڑے کے بیچ میں کوئی دوسرا بیان داخل تھا اب وہ ٹکڑے یکجا کر دیے گئے ہیں اور ایسا کرنے سے ایک آدھ فقرہ جو بے ضرورت ہوگیا تھا حذف کر دیا گیا ہے مثلاً آمدم برسر مطلب، ناتمام مقدمہ سنو، وغیرہ۔ کتاب کے ابتدائی چار صفحوں میں کچھ اعتقادی باتیں اشاروں میں کہی گئی تھیں۔ جن کو تلمیحوں کی کثرت نے چیستاں بنا دیا تھا اور کچھ دنیا کی دورنگی کا تخئیلی بیان تھا۔ یہ چیزیں کتاب کے موضوع سے کوئی تعلق بھی نہ رکھتی تھیں اس لئے حذف کر دی گئیں۔ آخری چند صفحوں میں مولوی امیر علی کے جہاد کا بیان تاریخی انداز کے بجائے جذباتی انداز میں لکھا گیا تھا وہ بھی حذف کر دیا گیا۔

مصنف نے شاہی رسم کی ایجاد کے بیان میں ایک مستقل تحریر حمد و نعت اور مدح بادشاہ و وزیر کے ساتھ پیشتر لکھی تھی، جس کو بجنسہ کتاب میں شامل کر دیا۔ اب اس کا تمہیدی حصہ الگ کر کے کتاب کے آخر میں ضمیمہ کے طور پر لگا دیا گیا ہے۔ اسی طرح جشن نوروز کی تہنیت میں طولانی نثر اور تین عرضداشتیں جو کتاب میں جگہ جگہ شامل تھیں ان کو بھی ضمیموں میں جگہ دی گئی ہے۔

اب یہ کتاب نئی ترتیب اور موجودہ تہذیب کتابت کے ساتھ پیش کی جاتی ہے۔ امید ہے کہ اس کا مطالعہ دلچسپ بھی ہوگا اور معلومات میں اضافہ بھی کرے گا۔[۱۹]

● منشی رام سہائے تمنا لکھنوی کی یاد تازہ اور اہمیت قائم تو ان کی کتابوں احسن التواریخ، افضل التواریخ اور اشرف التواریخ سے ہو۔ یہ کتابیں خصوصاً افضل التواریخ اب تک تاریخ اودھ کے معروف اور مستند ماخذ کے طور پر استعمال ہو رہی ہیں۔ لیکن تمنا ایک بسیار نویس اہل قلم اور درجنوں کتابوں کے مصنف شاعر اور صحافی تھے۔ ان کے تمام کارنامے اگر آج بسہولت دستیاب ہوتے تو بلاشبہ آج کے تحقیق کاروں اور طلباء کو ان کا نقطۂ نظر سمجھنے میں سہولت ہوتی اور وہ تمنا کے بیانات کو اسی احتیاط سے دیکھتے جس احتیاط و تامل سے دیکھے جانے کے مستحق ہیں۔

تمنا ۱۸۵۴ء میں پیدا ہوئے تھے[۱۵] اور سولہ برس کی عمر میں انسپکٹر سررشتہ تعلیم اودھ کے دفتر میں کلرک ہوگئے یہیں ان کی آبائی صلاحیتوں پر جلا ہوئی جن میں علمی اور شعری روایات بھی شامل ہیں اور یہیں ان کو وہ انگریز بھکتی ملی جس نے اودھ کی تاریخ کو انگریز پسند بنایا۔ یہ سمجھنے کے لیے کہ سکسینہ کایستھوں کے اس خانوادے میں منشی تمنا جس کی ایک نمایاں فرد ثابت ہوئے۔ ریاست اور علم دونوں جمع تھے۔ ہم اس مضمون کو طوالت سے بچانے کے لیے شجرے کو قطع کرتے ہیں۔ لیکن ان کی اہلیہ کشن پیاری کا ذکر ضروری ہے۔ جن سے تمنا کی شادی دس سال کی عمر میں ہوئی تھی اور خود کشن پیاری آٹھ سال کی تھیں۔ اور شاعرہ بھی تھیں ان کے ذوق شعر نے تمنا کے فکر و سخن کو ارتقا کا ہموار راستہ بتایا کیا۔ سفر حیات میں تو کشن پیاری وفادار اور ہم مذاق رفیقہ تھیں ہی سفر آخرت میں بھی بہت پیچھے نہیں رہیں اور اپنے باکمال شوہر کی وفات کے پچیسویں دن ہی وہ بھی چل بسیں۔

اپنی مثنوی یادگار ریاست الور۔ مطبوعہ ۱۸۷۰ء میں خود تمنا اپنا تعارف یوں کراتے ہیں۔ منشی رام سہائے تمنا خلف منشی پورن چند ابن ایشوری پرشاد رئیس آبائی ساکن محلہ نوبستہ۔ منشی تمنا اپنے دادا کے تخلص کا ذکر کرتے ہیں نہ شاعری کا۔ اگرچہ شعاعی کے رقعات مرتب ہو چکے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تمنا کی نظر میں علمی روایات سے زیادہ "ریاست آبائی" کی اہمیت ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ تمنا کی طویل عمر تمام تر علمی سرگرمیوں میں گذری ۳۲ سال کی عمر میں ۱۸۸۶ء تک وہ ۴۲ نثری و شعری تخلیقات کر چکے تھے جنوری ۱۸۸۹ء میں تمنا نے اپنی نظم "مفید الترکیب" استفادہ طلبائے مدارس ورنیکولر کے واسطے بزبان سلیس و محاورات نفیس عمدہ روزمرہ اور صاف بول چال میں بشمول مطالب ضروری زینت ترتیب و تنظیم دی۔ اس کتاب کے آخر میں "تمت" کے بعد فہرست تصنیفات تمنا میں ۴۲ کتابیں مندرج ہیں۔

مدرسہ سلطان المدارس لکھنؤ کے کتب خانہ کے ذخیرۂ آغا ابو صاحب مرحوم میں ان کتابوں سے ۱۰ کتابیں ایک ساتھ مجلد ہیں

میں سے بس چند پر تحیر خیز گفتگو کے لیے نگاہ ڈالیں گے۔

① نظمِ دلپذیر

یہ تاریخی نام ہے جس سے سمبت ۱۹۳۶ برآمد ہوتا ہے۔ یہ بھی ۱۶ صفحات کا رسالہ ہے جس میں ۴۲ بند کا ایک مسدس ہے۔ سرورق کی لوح سے پتہ چلتا ہے کہ "مشتہر حالات جناب مستطاب ہز ہائی نس دی آنریبل مہاراجہ سر دگ وجے سنگھ بہادر کے ایس، سی ایس آئی دام اقبالہ ہے۔ یہ مہاراجہ بلرام پور ہیں۔ برطانیہ کے مشہور وفادار جنھوں نے ستائش گروں کا وسیع حلقہ اپنے گرد جمع کر لیا تھا۔ پریس قائم کر کے سید آغا حسن نامی عرف میرن رضوی لکھنوی مشہور خطاط کے خدمات حاصل کر لیے تھے بلکہ اپنی فضائل نگاری کے لیے انھیں اہلِ قلم بھی بنا دیا تھا۔ میرن رضوی نے حسن التواریخ کے نام سے مہاراج کے حالات میں ایک کتاب لکھی جو مہاراج کے مطبع جنگ بہادر سے شائع ہوئی مہاراجہ نے اپنے مناقب نگاری کی لے اتنی اونچی کر دی تھی کہ مرزا غالب نے دبدبۂ سکندری کا اپنے نام آنا بند کرا دیا تھا۔ مالک مطبع حسنی کو لکھتے ہیں:

> "شفیق اور مکرمی محمد حسن خاں صاحب کو غالب آزردہ دل کا سلام پہنچے۔ آج بھی آپ کا ایک خط آیا۔ کئی اخبارات آپ کے پھیرے۔ کئی خطوط آپ کے پھیرے اور آپ اخبارات بھیجے جاتے ہیں۔ الٰہی آپ کا خط، خط تھا یا کوئی جھوٹ کی پوٹ بیش تر مجذوبوں کی بڑ اور جو کچھ سمجھ میں آیا وہ غلط اور دروغ اور جھوٹ، یہ محض غلط ہے اور مطبع حضور کا ہو اور تم مہتمم حضور کی طرف سے۔ اللہ اللہ دگ وجے سنگھ کی تعریف میں کہیں سارا ایک صفحہ، کہیں سارا ایک ورق اور اپنے والئ ملک اور اپنے بادشاہ یعنی امیر المسلمین نواب کلب علی خاں بہادر کے نام کے آگے یا نام سے پہلے کوئی دو تین لفظ تعظیم کو لکھتے ہو اور بس۔ اور اس قباحت کو نہیں سمجھتے کہ اگر یہ اخبار حضور کی طرف سے ہو تو گویا دگ بجے سنگھ کی تعریف بھی حضور سے ہوگی۔

> ہندوستانی عمل داری میں وہ ایک زمیندار مال گذار تھا اب گورنمنٹ ہند نے اس کو جاگیردار مستقل کر دیا۔[19]

اس اقتباس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مہاراجہ نے اپنی حکمت عملی اور داد و دہش سے کس قدر مدح سرا اکٹھا کر لیے تھے۔ مرزا غالب کے ایسے شخص تک سے، جو مدح سرائی میں خود بھی بہت محتاط نہ تھے برداشت نہ ہو سکا۔ اسی خط میں آگے چل کر غالب نے دو جملے لکھے ہیں جس سے یہ سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے کہ منشی تمنا کے عہد میں وہ طبقہ جو ہر حال میں خوش اور ہر حکومت میں مطمئن رہنے کا ہنر جانتا تھا کس قدر فعال تھا .... اس لیے اس معاملہ کو تمنا کی تنہا کمزوری نہیں سمجھنا چاہئے۔ ایسے وقت تداخل میں موقع شناس اس پر چل ہی پڑتے ہیں غالب آگے اور تلخ نوا ہو جاتے ہیں:

> نواب محمد علی خاں رئیس ٹونک کا ہر اخبار میں ایک مرثیہ لکھتے ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تم طرح طرح سے اطراف و جوانب کے رئیسوں سے بھیک مانگتے ہو۔ بھائی! ایک در گیر و محکم گیر.....[20]

ہو سکتا ہے کہ بھیک مانگنے کی بات کچھ سخت ہو لیکن یہ تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ منشی تمنا یا منشی محمد حسن یہ سب سلسلے کی تمنا اور ستائش سے بے پروا ہو کے کر رہے تھے۔ منشی محمد حسن کی نسبت تو نہیں کہا جا سکتا لیکن تمنا کے بارے میں معلوم ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ان کے وسائل تباہی کا شکار ہو گئے تھے اور پورے کنبہ کا بوجھ صرف تمنا کی کمائی پر آ پڑا تھا۔[21]

ایسی صورت میں تماشائے اہلِ نعم دیکھنا ان کی مجبوری بھی ہو سکتی ہے اور مجبوری اور معروضی تاریخ نگاری جمع ہو ہی نہیں سکتیں۔

② رسالہ ضروریاتِ ہند

یہ رسالہ دسمبر ۱۸۸۴ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ پہلا رسالہ ہے جس میں کلارک محکمہ جناب صاحب انسپکٹر بہادر" کے وصف سے منشی تمنا کا تعارف کرایا گیا ہے۔ سو صفحوں کی یہ کتاب نثر میں ہے مگر سجاوٹ کے لیے کہیں کہیں نظم کے ٹکڑے بھی جوڑے گئے ہیں۔

اس میں ہندستان کی ۱۵ ضرورتیں بیان کی گئی ہیں۔ کتاب بہت واضح طور پر واعظان فرنگ کے نصائح کا پرتو معلوم ہوتی ہے۔

تمنا بعد میں ترقی کر کے ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے تک پہونچے اور ضلع اناؤ میں تعینات رہے۔ وہیں سے ۱۹۱۰ء میں پنشن لی۔[۲۲]

اس کے بعد تمنا نے اپنا ماہنامہ "بہار" جاری کیا تھا اور کتابوں کے مشہور تاجر لانگ مین گرین اینڈ سنز کے یہاں ملازمت کر کے دلی میں قیام کر لیا۔ چونکہ تمنا کو ملازمت کی وجہ سے دورے پر جانا پڑتا تھا۔ اس لیے پرچے کی دیکھ بھال ان کے چھوٹے صاحبزادے ڈاکٹر گوری سہائے اور برادر زادے منور لکھنوی کے ذمے تھی۔

منور لکھنوی، انق صاحب کے صاحبزادے تھے اور ان کے دم تک اس خانوادۂ شعر و ادب کی روایت پانچ پشتوں تک چلی۔

فرماتے ہیں ؎

شاعری سے نہ منور کو ہو کیوں کر رغبت
پانچ پشتوں سے یہی شوق چلا آتا ہے

جناب نادم سیتاپوری بتاتے ہیں کہ تمنا نے ایک ماہانہ رسالہ گلدستۂ سخن کے نام سے ۲۴ جولائی ۱۸۷۹ء سے نکالا تھا اور ۱۰ ستمبر ۱۸۸۲ء سے مہر ظرافت کے نام سے ایک مزاحیہ ہفتہ وار بھی تمنا کی ادارت میں نکلا تھا۔[۲۳]

تمنا کے شعری کارناموں میں قابل ذکر چند رباعیات عمر خیام کا ترجمہ ہے بلکہ کہہ سکتے ہیں کہ منظوم شرح ہے۔ صورت اس کی یہ ہے کہ پہلے چار مصرعوں میں لفظی ترجمہ کرنے کی سعی کی ہے اور بعد میں مفہوم کی تشریح قطعہ میں بطور نمونہ ایک رباعی ملاحظہ فرمائیں۔

خیام

جملہ رفتگان ایں راہِ دراز — باز آئندہ کو کہ با گوید راز
زنہار ازیں سراچہ از روئے نیاز — چیزے نہ گذاری کہ نمی آئی باز

ترجمہ

اس منزل دور کو جو پہونچے جا کر — کچھ راز کہا نہ واپس آ کر دم بھر
ہرگز ہرگز سرائے فانی میں بھی
کچھ چیز نہ چھوڑو، واپس آنا نہیں گھر

تشریح قطعہ

مرا جب آدمی پھر اس سے ملنے کی ہوس کیا ہے
نہ تم ہمدرد ہو جس کے تو پھر وہ دور دورس کیا ہے
تمنا بعد مردن واپسی جب غیر ممکن ہے!
ضرورت کیا ہے چھوڑے کوئی شے یاں پیش و پس کیا ہے

یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ تمنا کے کارناموں کی مکمل تلاش و تحقیق کی ضرورت ہے۔ اسی ذیل میں ان کی ادبی و افادی اہمیت کا تعین بھی ہو سکتا ہے لیکن ان کے رنگ و آہنگ کو دیکھتے ہوئے ان کی تاریخی تصنیفوں پر اعتماد کرنا، خصوصاً اودھ کی تاریخ کو معروضی سمجھنا خلاف احتیاط ہوگا۔ اس کثیر التصانیف نثار شاعر، صحافی نے ۱۹۳۲ء میں حیات فانی سے منہ موڑا۔ افسوس کہ وفات کی تاریخ معلوم نہ ہو سکی۔ ان کے صاحبزادے نے وفات کے آٹھ سال کے اندر ۱۹۴۰ء میں حالات ترتیب دے کر شائع کئے۔ لیکن تاریخ وہ بھی ذکر نہ کر سکے۔

● اس قسط میں ہمیں راجہ درگا پرشاد مہر سندیلوی کا ذکر کر کے سلسلۂ کلام ملتوی کرنا ہے۔

ڈاکٹر شکیل احمد صدیقی (اب مرحوم جوانا مرگ) نے اپنے مجمل مگر معلوماتی مضمون "اودھ کا ایک قصبہ سندیلہ" میں ان صاحبان کمال کی فہرست دی ہے۔ جو خاک سندیلہ سے اٹھے۔ صدیقی صاحب نے مختلف طبقات قائم کر کے ان کے ذیل میں نام مندرج کیے ہیں۔ راجہ درگا پرشاد کا نام چار طبقوں میں مذکور ہوا ہے جس میں سندیلہ کی تاریخ نگاری میں خاص طور سے جگہ ملی ہے۔

...راجہ صاحب کے مورخ ہونے میں کوئی کلام نہیں ہے۔ انھوں نے تاریخ کی کتابیں لکھی ہیں لیکن مورخ سے بڑھ کر ان کی حیثیت شاعر کی ہے۔ ان کی شاعری اس قصبہ کے لیے باعث فخر ہے۔ انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں اس ملک کے فارسی گو شعرا میں ان کا شمار صف اول میں کرنا چاہئے۔ ان دو صدیوں میں فارسی کے ایسے بلند پایہ شاعر کم ہی ہوئے ہیں۔ ان کی فارسی دانی کو ایرانیوں تک نے سراہا ہے۔ چنانچہ ذکار الملک وزیر صیغۂ علمی سلطنت ایران نے ان کی کتاب "گلستان ہند" پر ریویو کے سلسلے میں لکھا ہے کہ

بلندی مقام آں بخت یار رادر داستن فارسی معلوم می نماید. لیکن مورخ اور شاعر دونوں کے راستے الگ الگ ہیں۔ مورخ شاعری میں حقائق کی جستجو کرتا ہے برخلاف اس کے شاعر حقائق کو مبالغہ کی چاشنی کے بغیر کم ہی بیان کرتا ہے۔ اس لیے ایک عمدہ شاعر اعلا درجے کا مورخ نہیں ہو سکتا۔

راجہ صاحب انگریزوں کے بڑے مداح تھے۔ ہمیں یہاں اس سے بحث نہیں کہ راجہ صاحب نے انگریزوں کی شان میں جو قصیدے لکھے ہیں وہ قابلِ ستائش ہیں یا موجبِ حرف گیری۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اگر تاریخ اُن سے محفوظ رہتی تو اچھا رہتا ....."

درگا پرشاد کی ولادت سندیلہ میں ہوئی جہاں ان کے ایک بزرگ رائے کنور سین کے سندیلہ و ملیح آباد کی چکلہ داری پر عہد نواب شجاع الدولہ (۱۷۵۴ - ۱۷۷۵) میں سرفراز ہونے کے بعد اس خاندان کی سکونت ہوگئی تھی۔ درگا پرشاد کی ولادت ۱۸۴۶ء میں ہوئی تھی۔

درگا پرشاد کی تعلیم پانچ سال کی عمر میں مکتب سے شروع ہوئی ابھی مروجہ نصاب کی تحصیل میں مشغول تھے کہ راجا گووردھن لال اور ان کے صاحبزادے کنور جمعیت رائے کا انتقال ہوگیا اور خاندانی کوائف تعطل و تفرقہ کا شکار ہوگئے۔ اس سے مہر کی تعلیم میں بھی خلل پڑا۔ جب معاملات رو براہ ہوئے اور یہ خاندان جو علاقہ اور عہدہ سبھی سے محروم ہو کر آوارہ وطن ہوگیا تھا۔ پھر سندیلہ واپس آیا۔ اس کے بعد ہی غصبِ اودھ کا واقعہ پیش آگیا۔ نئے آقاؤں نے قدیم علاقہ کے چند دیہات اور باقی کے معاوضہ میں زرِ نقد کی دہانید کی۔ یہ مراحل طے ہو ہی رہے تھے کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی لہر آگئی۔ اور اس میں مہر کے والد راجہ دھنپت رائے نے انگریزوں کی وفاداری کے بڑے جوہر دکھائے۔ فرنگی جوہر شناسوں نے پوری قیمت لگائی۔ اپنا پورا علاقہ تو ملنا ہی تھا۔ ضلع کھیم پور کھیری کے کسی انقلابی رئیس کا ضبط شدہ علاقہ سرسوا بھی بطورِ انعام ملا۔ اپنے اس کارنامے سے راجہ دھنپت رائے جعفر ثانی بن گئے۔ ان کے قطعہ تاریخ وفات میں شمس الشعرا سید مقصود علی بہانوی نے ان کے سیرت کے اس پہلو کو خاص طور سے اجاگر کیا۔ نہیں کہہ سکتے کہ یہ طنز و تعریض کی راہ سے یا تاکید الذم بما یشبہ المدح کی صورت میں تھا۔ شمس الشعرا اس خانوادے کے متوسل تھے اور پھر معاملت ایسے نکتہ رس، معنی یاب، سخن سنج سے تھی۔ دو شعر ملاحظہ فرمائیے۔

خوشا ممدوح دریا دل کرم گستر سخا بانی
وحید العصر دھنپت رائے راجہ جعفر ثانی
رقم زد کلکم اے مقصود سالِ انتقال او
جہاں دیہم بدرد از انتقالِ حاتم ثانی
سمبت ۱۹۲۴

انقلابی تحریک کے سرد پڑ جانے یا سامراجی اصطلاح میں غدر فرو ہونے کے بعد مہر کی تعلیم کا سلسلہ پھر سے شروع ہوا چودھری محمد امیر اس کام کے لیے متعین ہوئے جو خاندان کی پریشانیوں کے دور میں بہت مددگار ثابت ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ راجہ دھنپت رائے نے جو بقول مہر خود بڑے صاحبِ فضل و کمال تھے۔ اپنے ولی عہد کی تعلیم و تربیت میں دلچسپی لی۔

اس طرح مہر کی فارسی تعلیم کا سلسلہ رہا۔ ان کے پاس علم کے شعرا و فضلا کی بھی آمد و رفت رہتی تھی۔ جس سے ان کے ذوق کو اور بھی جلا ہوئی۔ جب مہر نے محسوس کیا کہ " دریں روز از تغیر اوضاع روزگار زبان فارسی از پایہ اعتبار افتادہ و زبان اردو آب و رنگے تازہ یافتہ" تو اردو میں بھی تحصیلِ کمال کی کوشش کی۔ مولانا ظہور حسن لکھنوی سے تلمذ اختیار کیا۔ اس طرح اردو شعر گوئی کا مذاق پیدا ہوا۔ مہر کو بحکم سرکار انگریزی کی بھی تعلیم دی جا رہی تھی۔ یہ اشتغال تین سال تک رہا تھا کہ ۱۸۶۷ء میں اُن کے والد کا انتقال ہوگیا اور مہر مشاغل ریاست کے ہجوم میں ایسا کھوئے کہ انگریزی تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ لیکن فارسی کا ذوق اُن کا جزوِ عنصری بن گیا تھا اور اس سے ان کی شیفتگی تمام عمر رہی اور اس زبان کے ذریعہ انھوں نے علم و ادب کی بڑی مایہ ناز خدمتیں کیں اور ہندوستانیوں کی فارسی دانی کا پایہ ایران تک مسلم ہوا۔ ان کی جن کتابوں کا حال راقم السطور کو معلوم ہو سکا ہے ان میں سے بیشتر فارسی میں ہیں۔ وہ کتابیں یہ ہیں۔

گلستانِ ہند، بوستانِ اودھ، حدیقۂ عشرت، مخزنِ اخلاق،

منوی مہرتاباں، مثنوی مہر الفت، تاریخ اجودھیا، پند دل پسند اور تواریخ
سندیلہ، ڈاکٹر مسعود حسن رضوی ردولوی، ہسٹری آف انڈیا کا ذکر کرتے
ہیں۔ معلوم نہیں کہ یہ گلستان ہند کا انگریزی نام ہے یا اس کا ترجمہ۔
ڈاکٹر مسعود اس فہرست میں گلستان ہند کا نام نہیں لیتے۔ اس سے
معاملہ دریافت طلب بن گیا ہے۔ ڈاکٹر مسعود ایک انگریزی نام "ہسٹری
آف فرسٹ ورلڈ وار" کا لیتے ہیں۔ اس کی بھی تصریح نہیں ہے کہ یہ
کتاب کس زبان میں ہے۔

ڈاکٹر صدیقی مرحوم کا بیان ہے کہ تواریخ سندیلہ ۱۹۱۵ء میں
کارونیشن پریس سے نکلی۔ پند دل پسند، جو نظر ناصر سے گذر چکی ہے
۱۹۰۳ء ۱۳۲۶ھ میں شائع ہوئی تھی۔ یہ سوال تحقیق طلب ہو کہ ان بارہ
برسوں میں کیا مہر کا سریع السیر قلم آرام کرتا رہا یا کچھ اور چیزیں ان کے
قلم سے نکلیں۔ ہو سکتا ہے کہ تواریخ سندیلہ میں دوسرے مصنفات
کی فہرست دی گئی ہو۔

پند دل پسند میں مہر نے بتایا ہے کہ وہ مہابھارت کے ترجمہ
میں مشغول ہیں اور دعا کی ہے کہ "خدا ایش بسر انجام رساند"۔ کچھ خبر نہیں
کہ یہ دعا قبول ہو کر کارنامہ مکمل ہو سکا یا نہیں! ڈاکٹر مسعود ردولوی بتاتے
ہیں کہ یہ منظوم ترجمہ نامکمل رہا اور سر انجام کو نہیں پہونچا۔

ہو سکتا ہے کہ ان کا پایۂ شاعری، پایۂ تاریخ نگاری سے بلندتر
ہو۔ جیسا کہ ڈاکٹر صدیقی کی رائے ہو۔ لیکن تاریخ نگار کی حیثیت سے
بھی ان کی جو جگہ ہے اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ ایودھیا کی
اہمیت محتاج بیان نہیں مگر اس کی تاریخ نگاری میں اولیت کا سہرا مہر ہی
کے سر رہا کیونکہ شری امرت لال ناگر کا کہنا ہے:-

" ایودھیا کی تاریخ لکھنے کی لگن راجہ دشرتھ کے وزیر
سمنت کی اولاد اودھ واسی لالہ سیتا رام جی کے علاوہ اور
بھلا کس کو ہو سکتی تھی!"

اس کا مطلب یہ نکلا کہ ہندی میں اودھ واسی لالہ سیتا رام جی سے پہلے
کسی نے اس موضوع پر اتنا تفصیلی کام نہیں کیا تھا۔ معلوم ہے کہ اودھ
واسی جی کی اس موضوع پر پہلی تقریبًا ۱۹۲۰ء کے پاس کی ہے۔ مہر کی کتاب
۱۹۰۳ء میں شائع ہو چکی تھی۔ راقم السطور کو اودھ واسی کی کتاب "ایودھیا
کا اتہاس" دیکھنے کا شرف بھی ملا ہے اور اس میں کچھ بھی ایسا نہ ملا جو
مہر کی کتاب سے الگ یا نیا محسوس ہوتا۔ اسی طرح سندیلے کی تاریخ
جن حضرات نے لکھی سب کی مساعی قابل تحسین ہیں لیکن منظر عام پر سب سے
پہلے مہر ہی کی کاوش آئی اور اس اعتبار سے یہاں بھی "الفضل للمتقدم"
مہر ہی کا حصہ ہے۔

آپ نے ابھی ملاحظہ فرمایا کہ تازہ مسلط سفید فام آقاؤں کی خدمت
مہر کے والد نے اس طرح کی کہ "جعفر از بنگال" سے تشبیہ پائی۔ مہر
کا مسلک بھی یہی رہا۔ بلکہ اور دوسرے حکام کی مدح سرائی پر ہی اکتفا نہیں کی
پریس قائم کیا تو اسے صاحب بہادر کے نام سے منسوب کیا۔ کوئی پریس
اور کوئی سرائے۔ مسٹر ٹی جی کو تیو ڈپٹی کمشنر ہردوئی کے ہی نام سے منسوب
کئے۔ اسی پر بس نہیں۔ راجہ صاحب اپنے سعادت کیش فرزندوں کو بھی
یہی سبق پڑھاتے ہیں:-

" پند دل پسند" میں ایک عنوان ذکر "حقوق بادشاہ و حاکم وقت"
کا بھی قائم کیا ہے۔ اس میں فرماتے ہیں۔

بر رعیت حق سلطاں بس بود — خدمت او لازم ہر کس بود
حافظ جان بنی آدم است — قبلۂ دوران شاہ عالم است
پس ترا باید کہ حق شہ بداں — فرق خود را خوش بنہ بر آستاں
اینچہ خود کردم بتو آموختم — شمع دانش در رہت افروختم

حکومت حامی طبقہ کی عام کمزوریوں سے مہر کافی حد تک محفوظ بھی تھے
جس دور میں بر اہتمام جانبدارانہ تاریخ نگاری ہو رہی تھی اور کرائے کے
مصنف تلاش کئے جا رہے تھے۔ اس وقت بھی مہر نے اپنے قلم سے
شہنشاہان ہند یا فرماں روایان اودھ کے دامن کو داغدار بنانے کی کم
سے کم کوشش کی ہے۔ اس وقت کے حالات دیکھتے ہوئے یہ
بسا غنیمت ہے۔ اتنا ہی نہیں شاہان و شہزادگان ہند سے اپنے
رشتۂ دیرینہ و عقیدت کے اظہار میں کوئی تکلف نہیں کیا۔

اس مجموعۂ کمالات نے ۱۹۲۰ء میں جان جان آفریں کو سپرد کی۔[۲۹]
اب آئندہ قسط میں منشی نول کشور، حکیم نجم الغنی خاں، مولوی
رئیس احمد جعفری ندوی اور پروفیسر مرزا علی اظہر برلاس کے بارے
میں گفتگو کا قصد ہے۔ بشرطیکہ ادارہ نیا دور ضرورت محسوس کرے۔

ویسے ہمارے تازہ دم قلمکاروں کو یہ مورچہ سنبھال لینا چاہئے اور ہمارے جرائد کو ان مضامین کا خیر مقدم کرنا چاہئے۔

حاشیے

۱ محمد عرفان خاں، مضمون، تاریخ نگاری اور اس کی مشکلات۔ ماہنامہ جامعہ نئی دہلی۔ بابت نومبر ۱۹۷۶ء۔

۲ سبط محمد نقوی۔ امجد علی شاہ ص ۲۵۵، بحوالہ سندر لال۔ بھارت میں انگریزی راج ج ۱ ص ۱۱

۳ ڈاکٹر ثروت علی، تاریخ آصفی۔ اردو ترجمہ تفضیح الغافلین دہلی۔ ۱۹۳۸ء ص ۱۲

۴ وہی ج

۵ وہی ص ۱۴

۶ امجد علی شاہ ص ۲۵۷۔ بحوالہ رئیس احمد جعفری ندوی۔ واجد علی شاہ اور ان کا عہد ص ۵۹۵

۷ وہی بحوالہ ڈاکٹر جی ڈی بھٹناگر۔ اودھ انڈر واجد علی شاہ ص ۴۳ حاشیہ ص ۱۱

۸ سید رئیس آغا مدیر نجم، مسودہ مضمون۔ کمال الدین حیدر، مخطوطہ تاریخ اودھ، مضمون نگار کا دستی مسودہ۔

۹ امجد علی شاہ ص ۲۵۸ بحوالہ مقالات سلیمان، دار المصنفین اعظم گڑھ ص ۳۹۰۔

۱۰ مرزا رجب علی بیگ سرور، فسانۂ عبرت۔ کتاب نگر لکھنؤ ص ۹

۱۱ وہی ص ۱۹

۱۲ امجد علی شاہ ص ۹۹ بحوالہ اودھ کی لوٹ ص ۱۳۱

۱۳ فسانۂ عبرت ص ۸

۱۴ یہ ساری اطلاعیں ڈاکٹر حنیف نقوی کے مضمون، مقدمہ کلام سرور مشمولہ دوماہی اکادمی، لکھنؤ بابت مارچ۔ اپریل ۱۹۸۸ء سے بصد تشکر مستعار ہیں۔ افسوس ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا وہ مضمون جس میں سرور کے سفر عاقبت سے بحث ہے وہ فی الوقت دستیاب نہ ہو سکا۔

فسانۂ عبرت۔ ص ۸

۱۶ وہی ص ۸

۱۷ اعلام و انکار ۱۹۸۲ء بحوالہ گنپت سہائے سری واستو، اردو شاعری کے ارتقا میں ہندو شعرا کا حصہ ص ۴۷۹

۱۸ وہی ص ۵۴ بحوالہ مالک رام معاصرین ج ۱ ص ۲۰۸

۱۹ وہی ص ۵۷ بحوالہ محمد اکرام، غالب نامہ ص ۲۲۷

۲۰ وہی ص ۵۸ بحوالہ غالب نامہ ص ۲۲۸

۲۱ وہی ص ۵۸ بحوالہ گوری سہائے فرزند تمنا، انتخاب کلام تمنا مع مختصر تبصرہ ص ۵

۲۲ وہی ص ۹۵ بحوالہ گنپت سہائے۔

۲۳ وہی ص ۹۱ بحوالہ ہفت روزہ پیام اسلام لکھنؤ مورخہ یکم فروری ۱۹۶۰ء مضمون، انیسویں صدی میں لکھنؤ کی اردو صحافت

۲۴ وہی ص ۳۹ بحوالہ ڈاکٹر شکیل احمد صدیقی، ضمیمہ روزنامہ قومی آواز لکھنؤ۔ مورخہ ۲۳ ر دسمبر ۱۹۷۳ء

۲۵ ڈاکٹر مسعود حسن رضوی ردولوی۔ مضمون، تعلقداران اودھ اور ان کے ادبی خدمات مشمولہ ضمیمہ اودھ نمبر نیا دور لکھنؤ۔ بابت جون ۱۹۹۴ء ص ۲۲

۲۶ اعلام و انکار ص ۵۸ بحوالہ گوری سہائے ص ۵

> "اس پیرایۂ بیان سے لطف اندوز ہونے کے لئے کلاسیکی ادب سے شناسائی اور تربیت یافتہ ذوق کی بھی ضرورت ہے اور اس معاشرے کے آداب و اطوار سے واقفیت بھی ضروری ہے ..... نگارش کے اس انداز اور ترصیع کے اس فن اور حسن کو سمجھنے کے لئے ذہن کا تربیت یافتہ ہونا اور کلاسیکی اسالیب سے واقفیت ضروری ہے ورنہ یہ سب بے جان لفظوں کا کھیل نظر آئے گا۔"
>
> ——— رشید حسن خاں
>
> مقدمہ فسانۂ عجائب ص ۶۷-۶۶

حسن واصف عثمانی
گن کی لاٹ، حیدر مرزا روڈ، لکھنؤ

لکھنؤ کا گم شدہ دسترخوان: چند پہلو

بازیافت نہ سہی بازخوانی فرض

کھانا، کھلانا اور پکانا روزمرہ کی زندگی کا ایک حصہ ہے جس کا مقصد صرف شکم سیری نہیں ہے نہ پیٹ بھرنے اور رکھ لینے کا ڈھنگ ہے بلکہ یہ ایک ثقافتی عمل ہے اور کام و دہن کی تربیت سے وابستہ اور حواس خمسہ کی تہذیب کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ہر ایک ثقافت زندگی کے ہر پہلو اور زندگی کی ہر سطح پر جمالیات کا اپنا منفرد شعور پیدا کرتی ہے۔ کھانا خوش رنگ، خوشبودار اور خوش مزہ ہوتا ہے تو وہ شکم سیری ہی نہیں کرتا بلکہ لذّت اور ذائقہ کے اس معیار پر کھرا اترتا ہے جو کسی نہ کسی مخصوص ثقافت نے صدیوں کی روایتوں کے سلسلے کے بعد بنائے ہوتے ہیں۔ اس کی افادیت شکم سیری کو اہمیت نہیں دیتی بلکہ کھانے کھلانے کے سارے عمل کو انہیں خصوصیات اور نفاست و لطافت سے ہم آہنگ کرتی ہے۔ اس صدی میں مغربی دنیا کے ایک عظیم دانش ور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے اسی لیے یہ بصیرت انگیز بات کہی ہے کہ جب کسی تہذیب پر زوال آتا ہے تو سب سے پہلے اس کا دسترخوان اُلٹتا ہے۔

لکھنؤ کی تہذیب کے زوال میں کوئی شک نہیں۔ یہ المیہ بھی ایک کڑوی سچائی کی طرح سب کو تسلیم ہے۔ پھر کیا تعجب کہ لکھنؤ کا دسترخوان بھی اُلٹ گیا ہے۔ یہ دسترخوان صرف شاہی دربار، امیروں کے محلوں اور رئیسوں کے درباروں اور ڈیوڑھیوں تک محدود نہیں تھا شاہی دسترخوان بھی تھے اور رئیسوں کے دسترخوان بھی تھے مگر گلی کوچوں، بازاروں اور عام گھروں میں بھی لکھنؤ کا دسترخوان اپنی انفرادیت کے ساتھ موجود تھا۔ یہ ایک مشترکہ سماجی عمل تھا۔ بازار میں شیرمال، کباب، قورمہ، پلاؤ اور فیرنی کا راج تھا۔ طباخی کے فن کاروں کا ایک طبقہ تھا جس نے نمکین اور میٹھے کھانوں کی تیاری اور فراہمی میں اپنی فن کاری کے کمال دکھائے تھے وہ دربار، بازار اور گھروں کی ضرورتوں کو یکساں مہارت سے پورا کرتے تھے۔ ان فن کاروں کا احترام سماجی اور تہذیبی زندگی میں شامل تھا۔ لکھنؤ میں ان کی شہرت اور ان کے نام اہمیت سے لینے اور یاد رکھنے کی روایت کا پتہ رجب علی بیگ سرور اور عبدالحلیم شرر کی تحریروں سے بھی ملتا ہے۔ اور اس کی جانب بے ساختہ اشارے پنڈت رتن ناتھ سرشار نے بھی کئے۔ شعری اور نثری کتابوں میں اس کا براہ راست کم لیکن بالواسطہ حوالہ اور تذکرہ بہت ملتا ہے۔ شاید لکھنؤ کے دسترخوان کی پوری بازیافت بہت دشوار ہے لیکن اس کی تاریخ، اس کی نفاست اور لطافت کے معیاروں کی تاریخ کی بازیافت بے شمار منتشر تحریروں کے جائزے سے ضرور ممکن ہے اس سے زیادہ حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ بیسویں صدی کی آخری دہائی میں بھی لکھنؤ والوں کے اجتماعی حافظہ میں اپنے دسترخوان کی انفرادیت اور امتیاز کا شعور باقی ہے بہت

حسن واصف عثمانی صاحب مرحوم اس خاکسار سے بیحد شفقت فرماتے تھے۔ یہ فرمائشی مضمون نیا دور میں اُن کی آخری تحریر ہے اور میرے لئے ایک قیمتی اثاثہ۔ ——— امجد حسین

سے نام زندہ ہیں اور باورچیوں اور طباخوں کی گزشتہ فن کاری کے وارث بھی موجود ہیں جو بہت بھول جانے کے باوجود بہت کچھ نہیں بھول سکے ہیں۔ زمانے کی تبدیلی، تہذیب کے زوال اور ناقدری نے ان کو اپنے بزرگوں کی فن کاری سے دور کر دیا ہے۔ لیکن نفاست و لطافت کا شعور و احساس لکھنؤ کے ماہر باورچیوں اور طباخوں کی سب سے خصوصیت اور انفرادیت ہے۔ پکانے کے ڈھنگ مسالوں کے انتخاب اور ان کے استعمال میں ایک خاص تناسب کا لحاظ آج بھی لکھنؤ کے دسترخوانوں کو انفرادیت عطا کرتا ہے۔ نفاست و لطافت کے معیاروں کی بازیافت کی ضرورت بالکل نہیں کیوں کہ یہ تو اب بھی سلامت ہیں۔

خود ہماری نسل نے اس بزرگ نسل کی بیگموں، خواتین اور گھر والیوں کو دنیا سے رخصت ہوتے دیکھا ہے جو اپنے ہاتھ سے ہانڈی پکانے کو فرض سمجھتی تھیں۔ کھانوں کو مزے دار اور لذیذ بنانے کے گر جانتی تھیں۔ ان کا ذوق نفاست و لطافت کو روزمرہ کے کھانوں میں بھی برقرار رکھتا تھا۔ ہماری نانیوں، دادیوں اور ماؤں تک اپنی ثقافت کی روایت سلامت رہی۔ کسی کے پکائے ہوئے کھانے میں لذت، ذائقہ اور لطافت نہ ہو تو یہ بڑی بوڑھیاں کس حقارت سے کہتی تھیں کہ کیا پھوہڑ مردماری تھی کہ ہاتھ میں ذائقہ ہی نہیں۔

لکھنوی دسترخوان کے ایک سرسری جائزے سے نفاست و لطافت کی دو بنیادی خصوصیات، بنیادی اصول اور بنیادی رجحان نظر آتی ہیں۔ عرب و عجم سے لے کر ہندوستان تک تنور کی گرم بازاری صدیوں سے چلی آ رہی ہے۔ تنوری روٹی، نان خمیر اور نان فطیر کا رواج صدیوں سے چلا آتا ہے۔ لکھنؤ کے دسترخوان نے اس میدان میں ایک طرف باریک، ہلکی اور آسانی سے ہضم ہونے والی چپاتی کا اضافہ کیا تو دوسری طرف میدے، گھی اور دودھ کی آمیزش سے شیرمال ایجاد کی جس کی لذت بے مثال تھی۔ تافتان بھی لکھنوی ایجاد ہے مگر اس میں شیرمال کی طرح خستگی نہیں ہوتی۔ شیرمال قورمے اور کباب کی لذت کو دوبالا کرتی ہے۔ لکھنؤ نے تافتان سے زیادہ فن کاری پوری اور پراٹھے کی تیاری میں دکھائی۔ پوری کا آٹا گوندھتے وقت اس میں گھی دے کر اس کو خستہ بنا دیا۔ پراٹھے

گرم رہنے تک نرم رہتے تھے پھر ان میں سختی آجاتی تھی۔ لکھنؤ کے باکمالوں نے ورقی پراٹھے ایجاد کیے اور ان کے آٹے میں زیادہ سے زیادہ گھی کھپانے میں کامیابی حاصل کرلی۔

کلچہ ایران اور افغانستان سے آیا تھا اور ہندستان میں ہر جگہ پھیل گیا تھا لیکن ہر جگہ اس میں مقامی اثر غالب ہوا۔ لکھنؤ والوں نے بھی کلچہ میں تصرف کیا اور اس کی تکونی شکل متعین کی اور اس کے اندر پرت پیدا کیے اور اس طرح اس کو نہاری سے وابستہ کیا۔ آج بھی لکھنؤ کا کلچہ سارے ہندستان میں اپنی انفرادیت رکھتا ہے اس کی لذت اور نفاست دونوں بے مثال ہیں۔ نہاری بھی اپنے مخصوص مسالوں اور ان کے امتزاج سے جداگانہ لذت رکھتی ہے جو اور کہیں نہاری میں نہیں ملتی۔ بلاشبہ الہ آباد کی مشہور نہاری بے حد لذیذ ہوتی ہے لیکن اس کی لذت کا دار و مدار اس پر ہے کہ یہ پائے اور اس کی ہڈیوں کے روغن سے تیار ہوتی ہے۔ لکھنؤ والے پائے کی نہاری بہت کم پسند کرتے ہیں لکھنؤ کی نہاری اپنے خاص مسالوں اور گوشت کی بوٹیوں سے تیار ہوتی ہے۔ دہلی کی طرح اس میں بے تحاشا سرخ مرچ نہیں ہوتی جو اپنی تیزی سے اصل ذائقے ہی کو غارت کردے۔

لکھنؤ کے ماہر باورچیوں کا یہ قول بھی نقل کیا جاتا رہا ہے کہ:

"اصل کھانا تو بس قورمہ چپاتی ہے باقی سب امیروں کے نخرے ہیں۔" واقعہ یہ ہے کہ لکھنؤ کے دسترخوان نے قورمہ اور چپاتی کی نفاست اور لطافت کو آسمان تک پہونچا دیا تھا۔ چپاتی کا باریک، نرم اور سرخ چتی دار ہونا لازمی شرط تھا۔ ماہر باورچی پاؤ بھر آٹے کی سولہ چپاتیاں توے سے اتار لیتے تھے جو ٹھنڈی ہونے پر بھی نرم رہتی تھیں ان کا جوڑ قورمہ تھا جو عمدہ قسم کے گوشت سے تیار کیا جاتا تھا۔ قورمہ میں تیاری کے بعد بھی شوربہ بالکل نہیں ہوتا تھا۔ اس کے مخصوص مسالے، گوشت کا جوہر اور گھی کے تار کی وجہ سے قورمہ بے حد لذیذ ہوتا تھا۔ قورمہ کا تار اور مسالہ لعاب دار، خوش رنگ اور خوشبودار رکھا جاتا تھا۔ لعاب پیدا کرنے میں دھیمی آنچ میں پکنے کو بھی دخل تھا اور بالائی۔ بادام اور گھی کے تار کو بھی۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ایک کردار نے لکھنوی ذوق کی نمائندگی کرتے ہوئے بڑے مزے سے کہا ہے کہ:

"یہاں تو جب تک قورمہ میں شیرہ بادام نہ ہو وہ حلق سے نہیں اترتا۔"

لکھنوی دسترخوان پر شوربہ دار سالن بھی نظر آتے ہیں۔ ان کا ذائقہ الگ شان رکھتا تھا۔ قورمے میں ہلدی نہیں پڑتی تھی۔ سالنوں کے مسالے میں ہلدی شامل تھی۔ درباروں سے زیادہ عام گھروں میں سالن کا چلن تھا۔ پھر بھی ترکاری دار سالن معیوب پسند نہیں کیے جاتے تھے۔ تلی اروی اور تلے آلو کے سالن خاصے کی چیز سمجھے جاتے تھے ان کے پکانے میں اہتمام اور مہارت سے کام لیا جاتا تھا۔

قیمہ، کوفتہ اور کباب خاص و عام کے دسترخوان کی زینت ہوتے تھے۔ قیمہ سادہ، دو پیازہ، سیم کے بیج، ٹماٹر اور آلو کے ساتھ پکتا تھا اور چنے کی دال کے ساتھ بھی۔ مگر اہمیت دو پیازہ قیمہ کو حاصل تھی۔ پراٹھے، شیرمال اور چپاتی تینوں ہی دو پیازہ قیمہ کے جوڑ تھے۔ کوفتے کا خستہ اور نرم ہونا ضروری تھا اور یہ لعاب دار شوربے میں گھی کے تار کے ساتھ دسترخوان پر پیش ہوتا تھا۔ اس کے مسالوں میں گرم مسالہ شامل تھا۔

لکھنؤ میں شامی کباب، سیخ کے کباب، گلاوٹ کے کباب گھروں کی طرح بازار میں بھی عام طور پر تیار ہوتے تھے۔ لکھنوی کبابوں میں بہت باریک پسے ہوئے قیمے اور کباب کے خاص مسالوں کے استعمال کی وجہ سے لذت اور ذائقہ کا ایک نیا اور بلند معیار قائم ہوا اور لکھنؤ کے کبابچیوں کے نام، ان کی شہرت اور ان کے کمال کا اعتراف سارے ہندستان میں کیا جانے لگا۔ تاریخ کے صفحوں پر ان باکمالوں کے نام درج ہوئے جن کے حالات معلوم نہیں مگر ان کی فن کاری اور مہارت کی داستان زندہ ہے۔

بہتر سے بہتر کی تلاش نے جو ذوق پیدا کیا تھا وہ پلاؤ کو بریانی پر اور فیرنی کو کھیر پر ترجیح دینے کا سبب بنا۔ بریانی میں چاولوں پر گوشت کی تہ پر تہ لگا کر اس کو دم دیا جاتا ہے۔ اس میں رنگ اور خوشبو کے لیے زعفران کے استعمال کے باوجود لکھنوی نفاست

یہ بریانی چاول اور گوشت کا ملغوبہ نظر آتی تھی۔ اس لیے لکھنؤ میں پلاؤ اور اس کی بے شمار اقسام لکھنؤ کے ذوق کی علامت بن کر سامنے آئیں۔ پلاؤ بھی عرب و عجم سے آیا تھا مگر لکھنؤ نے پلاؤ کی لطافت کو پروان چڑھایا اور پلاؤ کو بریانی سے بالکل الگ کرنے کے لئے ساری توجہ یخنی دار پلاؤ پر کی، جس میں چاول میں گوشت کا جوہر اور ذائقہ حل ہو جاتا ہے۔ پلاؤ کی اسی خاص لذت کو بڑھانے کے لئے دو گوشتہ اور سہ گوشتہ پلاؤ کا رواج ہوا۔ کم از کم مقدار کے چاول میں گوشت کی زیادہ سے زیادہ مقدار کے جوہر، ذائقہ اور مزے کو شامل کرنے کا طریقہ اس کے سوا کوئی نہ تھا کہ عملی طور پر پلاؤ یخنی میں تیار ہو۔ پلاؤ کی حقیقی لذت لکھنؤ والے ہی جانتے تھے اور اسی لیے وہ بے یخنی کے تیار ہونے والے پلاؤ کو جو بریانی کے قریب ہوتا ہے، بڑی حقارت سے دھوبیا پلاؤ کہتے تھے۔

لطافت کی تلاش میں لکھنؤ والوں نے ملائی کو بالائی کا نام دیکر بالائی کو دسترخوان کی زینت بنایا اور کھیر میں دودھ، چاول اور شکر کی آمیزش اور پکانے کے طریقے کو مزید ترقی دے کر فیرنی رائج کی۔ فیرنی میں دودھ کی زیادہ مقدار میں پسے ہوئے چاول کم مقدار میں ڈال کر یوں پکائے جاتے ہیں کہ وہ باہم ایک ہو جائیں اور ٹھنڈا ہونے پر جم سکیں۔ فیرنی مٹی کے پیالوں میں سوندھے پن اور لطافت کی وجہ سے لکھنوی ذوق کی پوری طرح تسکین کرتی تھی۔ اور گلی کوچوں اور بازاروں میں بالائی کی طرح عام طور پر ملتی تھی۔ یہ رواج اب بھی ہے اور بالائی اور فیرنی کی قدر دانی میں لکھنؤ والے سب سے آگے ہیں۔

نفاست اور لطافت کے ترقی یافتہ شعور نے لکھنؤ میں مٹھائیوں مربّوں اور حلووں کی تیاری پر پورا اثر ڈالا۔ یہاں برفی، قلاقند، گلاب جامن، امرتی، جلیبی، نکتی اور لڈو جیسی عام مٹھائیوں کی لذّت، رنگت اور ذائقہ کا معیار کاریگر حلوائیوں نے ایسا بلند کیا کہ سارے اودھ بلکہ شمالی ہند سے دکن تک ان کے نام کا طوطی بولنے لگا۔ ان ماہروں کی بڑی تعداد لکھنؤ سے نکل کر ملک میں پھیلی اور لکھنؤ کا نام روشن کیا۔ ان مٹھائیوں کی طرح مربّہ سازی بھی لکھنؤ میں اہمیت رکھتی تھی۔ لکھنؤ کے دورِ شباب میں باورچیوں، طباخوں، مربہ سازوں کے گھرانے، محلے اور علاقے شہرت رکھتے تھے۔ وہ اپنے خاندانی فن کی ترقی پر پوری توجہ دیتے تھے اور جدّتوں سے کام لے کر عوام و خواص سب کو متاثر کرتے تھے۔

مربہ سازی کے میدان میں سیب، بہی، آنولا جیسے مربّوں کو دل و دماغ کی فرحت اور ہاضمہ کی طاقت بڑھانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ حکیموں کے نسخوں میں سیب کے مربّے کو ہمراہ ورقِ نقرہ یا ہمراہ ورق طلا استعمال کرنے کی ہدایت عام طور پر کی جاتی تھی۔ طرح طرح کے لذیذ حلوے بھی طبّی فائدوں کے پیشِ نظر تیار ہوتے تھے ان کو طاقت و توانائی عطا کرنے والی غذا کا درجہ حاصل تھا اس لیے ان میں بادام، پستہ اور دیگر خشک میوے۔ زعفران اور کبھی کبھی مشک بھی شامل کی جاتی تھی، یا بعض یونانی دواؤں کو حلوے کے اجزا میں شامل کیا جاتا تھا۔

غذائیت کے صحت اور جسم کی طاقت اور توانائی کے تعلق کا پورا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ اس لیے ہر موسم میں پیدا ہونے والی سبزی ترکاری بھی بڑے اہتمام سے استعمال کی جاتی تھی۔ اس میں سستی اور آسانی سے دستیاب ہونے والی ترکاریوں سے پرہیز بالکل نہیں تھا بلکہ بطورِ خاص ان کو استعمال میں لایا جاتا تھا۔ سبزیوں اور ترکاریوں کے پکانے میں لکھنؤ کے ماہر باورچیوں نے اپنے فن کی پوری مہارت سے کام لیا۔ ہر ایک ترکاری کو کئی کئی ڈھنگ سے پکانے کے طریقے کر کے سبزی خوری میں نئی لذّت پیدا کر دی۔

حامد علی خاں بیرسٹر نے اس صدی کی پہلی دہائی میں اپنے ایک ماہر باورچی کا تذکرہ کیا ہے جو صرف بھنڈی کی ترکاری کو اتنی الگ الگ طریقوں سے پکاتا تھا اور ہر ہانڈی کا ذائقہ الگ ہوتا تھا۔

لکھنوی دسترخوان کی سرسری جھلک اس کے متنوع، رنگارنگی اور فن کارانہ وسعتوں کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ یہ بلا مبالغہ سیکڑوں اقسام کے نمکین اور میٹھے کھانوں سے آراستہ تھا۔ مشرقی تمدّن اور تہذیب کی صدیوں سے چلی آنے والی روایتوں نے اس کو ہمہ گیر بنا دیا تھا۔ داستان امیر حمزہ، طلسم ہوش رُبا اور دوسری داستانوں (باقی)

جسٹس مرتضیٰ حسین
'المرتضیٰ' بارود خانہ گولہ گنج لکھنؤ

فیض آباد: ماضی اور حال کے آئینے میں

فیض آباد مشرقی اترپردیش کے قلب میں واقع ہے جو لکھنؤ سے ایک سو چھبیس ۱۲۶ کلومیٹر پورب دریائے گھاگرہ کے اس حصّہ کے دکھنی کنارے پر بسا ہوا ہے جو سرجو ندی کہلاتا ہے اجودھیا فیض آباد شہر سے چھ کلومیٹر پورب ہے۔ آبادی کے اضافے اور بہت سی نئی عمارتیں بن جانے کے سبب یہ فاصلہ اور بھی کم ہو گیا ہے۔ اس وقت فیض آباد اور اجودھیا ایک ہی میونسپلٹی کے حلقے میں ہیں۔

فیض آباد اور اجودھیا درحقیقت ایک ہی داستان کے مختلف حصّے ہیں۔ اسی لیے اجودھیا کے ذکر کے بغیر فیض آباد کا تذکرہ ادھورا رہے گا۔ تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ کسی زمانے میں اودھ کا سارا علاقہ اجودھیا کہلاتا تھا اور اس کا رقبہ بارہ جوجن یعنی ۴۸ کوس تک پھیلا ہوا تھا۔ موجودہ اجودھیا صرف ۶ میل کے رقبے میں ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ فیض آباد کا ضلع ہی نہیں بلکہ آس پاس کے دیگر اضلاع کے علاقے عہد قدیم میں اجودھیا میں شامل تھے۔

ہندوؤں کے لیے اجودھیا ایک متبرک زیارت گاہ ہے۔ یہ کوشل خاندان کی راجدھانی تھی۔ بھگوان رام اسی خاندان کے تھے راجہ منو سے ستاون پشت بعد رام چندر جی کا اوتار ہوا اور راجہ سمترا پر جاکر یہ سلسلہ ختم ہوا۔ رام چندر کے زمانے میں اجودھیا کی شان و شوکت کے تذکرے رامائن اور مہابھارت کی مقدس کتابوں میں ملتے ہیں۔

سنت تلسی داس نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "رام چرتر مانس" کے "اودھ کانڈ" میں رام اور سیتا کی نگری اجودھیا کے بارے میں فرمایا ہے ؎

کہی نہ جائے کچھو نگر وبھوتی   جنو اتینو ورنچی کرتونی

"نگری کی خوبی کا حال کچھ نہیں کہا جاتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے برہما جی کی کاریگری اتنی ہی ہے اس سے پرے سنسار کچھ بھی نہیں ہے۔"

کوشل خاندان کی ایک سو اٹھاون پشتوں نے اجودھیا پر حکمرانی کی تھی۔ جین دھرم والوں کے لیے بھی اجودھیا ایک بڑا تیرتھ استھان ہے۔

اجودھیا مسلمانوں کی بھی زیارت گاہ ہے کیونکہ وہاں ۳ پیغمبروں یعنی حضرت نوح، حضرت شیث اور حضرت ایوب علیہم السلام کے مزار ہیں۔ سورج بنسی راجہ سمترا کے زوال کے بعد اجودھیا اُجاڑ ہوگیا اور اس کی سیاسی اہمیت ختم ہوگئی۔ گیارہویں صدی عیسوی تک اس کا کوئی تذکرہ کتابوں میں نہیں ملتا ہے۔ گیارہویں صدی عیسوی میں سپہ سالار مسعود وہاں پہونچے۔ اس کے بعد یہ علاقہ دہلی کی مرکزی حکومت کا حصہ ہوگیا۔ اور سپہ سالار مسعود افسانوی کردار بن گئے۔ اجودھیا سے بہرائچ جانے والی شاہراہ کے ایک حصہ کو اس علاقہ کے لوگ بالے میاں کے بے سری فوج کے قیام کی جگہ بتاتے ہیں۔

کوئی دو سال بعد جب دہلی سلطنت کا اودھ پر قبضہ ہوا تو اجودھیا اودھ کی راجدھانی بن گیا۔ پندرہویں صدی میں جون پور کے شرقی بادشاہوں نے اس علاقہ کو فتح کرلیا مگر ان کے زوال کے

بعد یہ پھر دہلی کی مرکزی سلطنت کا حصّہ ہوگیا۔ شہنشاہ اکبر کے زمانے میں ان کی پوری مملکت بارہ صوبوں میں منقسم تھی جن میں اودھ کے صوبے کو خاصی اہمیت حاصل تھی۔ اس وقت یہ صوبہ مشرق میں بنارس تک اور مغرب میں بریلی تک پھیلا ہوا تھا۔ اس صوبے کا گورنر اجودھیا میں رہتا تھا۔ عہدِ اکبری میں ہی یہ صوبہ شیخ زادوں کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ جب سلطنتِ مغلیہ پر زوال آنا شروع ہوا تو شیخ زادوں نے جگہ جگہ آزاد حکومتیں قائم کرلیں۔ اس زمانے میں شیخوں اور پٹھانوں کے درمیان لڑائیوں کے واقعات بھی تاریخ کے صفحات پر نظر آتے ہیں۔

فیض آباد کی کہانی نے ۱۷۲۲ء میں اس وقت ایک فیصلہ کن موڑ لیا جب سلطنتِ مغلیہ کی مرکزی حکومت نے شیخ زادوں کی سرکوبی کے لیے ایک تجربہ کار فوجی افسر سیّد محمد امین نیشاپوری کو اودھ کا صوبیدار بنا کر بھیجا۔ انھوں نے اجودھیا کی آبادی سے ذرا ہٹ کر لچھمن گھاٹ کے مقام پر سرجو ندی کے کنارے، کیوڑے کے جنگل میں انتظامِ حکومت کی خاطر خیمے نصب کرائے جنھیں "قلعہ مبارک" کا نام دیا گیا برسات کا موسم آیا تو کچھ اور ہٹ کر ایک وسیع چھپّر ڈلوایا۔ اس کے گرد ایک بڑے رقبے میں کچی دیواروں کا بہت بڑا حصار بنوایا جس کے اندر خام دیواروں کی چھپّر پوش عمارتوں میں فوجی رسالے اور عملہ کے لوگ اور دیگر متعلقین رہنے لگے۔ یہ حصار ایک چھوٹا سا شہر تھا جس میں فوجی اور شہری ضرورتوں کی ہر چیز مہیا تھی چھپّروں اور کچی عمارتوں کی وجہ سے اس شہر کا نام "بنگلہ" پڑ گیا۔

برہان الملک کے انتقال کے بعد ان کے بھانجے اور داماد صفدر جنگ اودھ کے دوسرے نواب ہوئے۔ ان کے زمانے میں برہان الملک کی بنوائی ہوئی کچی عمارتوں کے دن پھرے۔ پھاٹک بنے بازاریں سجیں، حویلیاں کھڑی ہوئیں۔ پر فضا نزہت گاہیں قائم ہوئیں اور بنگلہ کا نام تبدیل ہو کر فیض آباد ہوگیا۔

شجاع الدولہ اودھ کے تیسرے نواب ہوئے۔ ان کا دل فیض آباد سے اچاٹ ہوا اور لکھنؤ پر ریجھا مگر یہ عشق ان کو [illegible] نہ آیا۔ انگریزوں سے ان کی لڑائی ٹھنی ۱۷۶۴ء میں بکسر کی لڑائی میں انھوں نے شکست کھائی اور بے سروسامانی کے عالم میں بھاگ کر فیض آباد آئے۔ قلعہ میں جو کچھ سازوسامان موجود پایا اسے کر راتوں رات چل کھڑے ہوئے اور لکھنؤ پہونچے اور وہاں بھی ایک ہی رات قیام کرکے جو کچھ ہاتھ آیا ساتھ لیا اور بریلی کی راہ لی تاکہ روہیل کھنڈ کے افغانوں کے ساتھ جاکر پناہ لیں۔ لڑائی کے نو مہینے کے بعد شجاع الدولہ کی انگریزوں سے صلح ہوئی اور کچھ شرائط و قیود کے بعد ان کو دوبارہ اودھ میں حکمرانی کا موقع ملا۔ صلح سے کچھ پہلے شجاع الدولہ اتفاق سے فرخ آباد پہونچ گئے۔ وہاں ان کی ملاقات ایک تجربہ کار سپہ سالار احمد خاں بنگش سے ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے شجاع الدولہ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ آپ کی جو عنانِ حکومت سنبھالو تو لکھنؤ میں نہ رہنا بلکہ فیض آباد کو دارالحکومت بنانا یہ مشورہ شجاع الدولہ کو پسند آیا اور انھوں نے سترہ سو پینسٹھ ۱۷۶۵ء میں فیض آباد کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ یہاں انھوں نے پھر سے فوجی بھرتی شروع کی۔ نئے رسالے مرتب کئے اور نئی عمارتوں کی بنیاد ڈالی۔ پرانے حصار کو ایک نئے شہر پناہ کی حیثیت سے ازسرِ نو تعمیر کرایا۔ اس حصار کے ہر طرف دو دو میل کا میدان چھوڑ کر چاروں طرف گہری خندق کھدوا کر قلعہ بندی کرائی اور ملازمین سرکار اور افسرانِ فوج کو حکم دیا کہ اپنی حیثیت اور ضرورت کے مطابق قطعاتِ زمین لے کر شہر پناہ اور خندق کے درمیانی میدان میں مکانات تعمیر کرائیں۔

شجاع الدولہ بڑے بیدار مغز حکمراں اور اعلا صلاحیتوں کے انسان تھے۔ ان کی بنوائی ہوئی عالی شان عمارتوں میں سے کچھ گر گئی ہیں مگر اس دور کی جو عمارتیں اب بھی موجود ہیں ان میں بہو بیگم صاحبہ کے مقبرہ کو چھوڑ کر سب شجاع الدولہ کے زمانے کی ہیں۔ کچھ ان کی خود بنوائی ہیں اور کچھ ان کے متوسلین کی۔

انھوں نے بہت سے باغ بھی لگوائے تھے جن میں سے انگوری باغ، موتی باغ، لال باغ، آصف باغ اور بلند باغ کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے۔ ان باغات میں لال باغ کے حسن و دلکشی کی اتنی شہرت تھی کہ شہنشاہِ دہلی شاہ عالم جب الٰہ آباد سے پلٹے تو اس باغ کی سیر کے

سوق میں فیض آباد گئے اور وہاں کچھ روز قیام کیا۔ چوک سے پچھم جانے
الی سڑک پر نواب شجاع الدولہ ہی کے زمانے میں دو رویہ املی کے
پیڑ لگے تھے۔ یہ جگہ اب بھی املی کی قطار کے نام سے موسوم ہے۔
نواب شجاع الدولہ کو شہر کی درستی کا اس قدر شوق تھا کہ وہ صبح و
شام سڑکوں اور مکانوں کا معائنہ کرتے تھے۔ مزدور پھاوڑے اور
کدالیں لیکر ان کی سواری کے ساتھ ہوتے تھے جہاں کہیں کسی مکان کو ٹیڑھا
یا اپنی حد سے بڑھا ہوا پاتے یا کسی دوکاندار کو دیکھتے کہ اس نے
سڑک کی زمین بالشت بھر بھی دبالی ہے تو فوڑا کھدوا کر برابر اور
سیدھا کرا دیتے۔ انھوں نے شعر و ادب، موسیقی رقص اور
دیگر فنون لطیفہ کی بھی ہمت افزائی کی۔ صاحبان علم و ہنر کی انھوں نے
ایسی قدر شناسی کی کہ اجڑی ہوئی دہلی اور دیگر مقامات کی ساری خلقت فیض آباد
کی طرف ٹوٹ پڑی اور وہاں کی علمی ادبی، ثقافتی اور سماجی عظمتیں اس
وقت کے شاہجہان آباد کو آنکھیں دکھانے لگیں۔
منشی فیض بخش مصنف تاریخ فرح بخش نے عہد شجاع الدولہ
کے فیض آباد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب میں پہلے پہل گھر
چھوڑ کر فیض آباد گیا ہوں۔ ستاز نگر ہی تک پہونچا تھا جو شہر کے مغربی
پھاٹک سے چار میل کے فاصلے پر تھا میں نے دیکھا کہ ایک درخت
کے نیچے مٹھائیاں، گرم گرم کھانا کباب۔ سالن، روٹیاں اور پراٹھے
وغیرہ پک رہے ہیں۔ سبیلیں رکھی ہوئی ہیں۔ نان خطائیاں، مختلف
قسم کے شربت اور فالودہ بھی بک رہا ہے اور صدہا آدمی خریداری
کے لیے ان دوکانوں پر گرے پڑتے ہیں۔ مجھے خیال گذرا کہ میں
شہر کے اندر داخل ہوگیا اور خاص چوک میں ہوں مگر متحیر تھا کہ
ابھی تک شہر کا پھاٹک تو آیا ہی نہیں میں اندر کیسے پہونچ گیا؟ لوگوں
سے پوچھا تو ایک راہ گیر نے کہا جناب شہر کا پھاٹک ابھی چار میل
ہے۔ آپ کس خیال میں ہیں۔ اس جواب پر حیرت کرتا ہوا
میں شہر میں داخل ہوا تو عجیب چہل پہل نظر آئی۔ رنگینیاں تھیں اور
دلچسپیاں۔ جدھر دیکھتا ہوں ناچ ہو رہا ہے۔ مداری تماشا کر رہے
ہیں۔ وہ لوگ طرح طرح کے سیر اور تماشوں میں مصروف ہیں۔ میں
یہ رونق اور ہنگامہ دیکھ کے مبہوت رہ گیا۔ صبح سے شام تک

کوئی وقت نہ ہوتا جب نوجوانوں اور پلٹنوں کے نقاروں کی آواز نہ سنی
جاتی ہو۔ پہروں اور گھڑیوں کے بتانے کے لیے بار بار نوبت بجتی اور
گھڑیال پر مونگریاں پڑتی جن کے شور و غل سے کان اڑے پڑتے سڑکوں
پر دیکھئے تو ہر دم گھوڑوں، ہاتھیوں اونٹوں، خچروں، شکاری کتوں گائے
بھینسوں، بیلوں، چھکڑوں اور توپوں کے گذرنے کا سلسلہ جاری رہتا
جن کا شمار اور حساب اندازے سے باہر تھا اور راستہ چلنا
دشوار تھا۔
ایک عجیب رونق اور تمکنت کا شہر نظر آیا جن میں وضعداران
دہلی میں سے خوش پوشاک اور وضعدار شریف شہزادے، حاذق
اطبائے یونانی، اعلا درجے کے مردانے اور زنانے طائفے ہر شہر اور
ہر مقام کے مشہور اور باکمال گویے سرکار میں ملازم تھے اور بڑی بڑی تنخواہیں
پاتے اور عیش و فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے۔ ادنی اور اعلا سب کی
جیبیں روپیوں اور اشرفیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ بلکہ ایسا نظر آتا جیسے
یہاں کبھی کسی نے افلاس و احتیاج کو خواب میں بھی نہیں دیکھا ہو۔ نواب
وزیر شجاع الدولہ بہادر، شہر کی سرسبزی و رونق اور رعایا کی خوشحالی
میں ہمہ تن مصروف ہیں اور معلوم ہوتا تھا کہ فیض آباد چند ہی روز میں دہلی
کی ہمسری کا دعوا کرے گا۔
چونکہ کسی مملکت اور کسی شہر کا رئیس اس نفاست اور شان و شکوہ
سے نہیں رہتا تھا جس طرح نواب شجاع الدولہ رہتے تھے اور اس کے
ساتھ ہی یہ بھی نظر آتا تھا کہ کہیں لوگ اس بے جگری سے ہر کام اور ہر
موقع و محل پر دولت صرف کرنے کو تیار نہیں ہو جاتے تھے اس لیے
ہر قسم اور ہر جگہ کے اعلا دست کاروں، صناعوں اور طالب علموں نے
وطنوں کو خیرباد کہہ کے فیض آباد ہی کو اپنا مسکن بنا لیا۔ اور یہاں ہر
زمانے میں ڈھاکے، بنگالے، گجرات، مالوہ، حیدر آباد، شاہجہان آباد
لاہور، پشاور، کابل، کشمیر اور ملتان وغیرہ کے طالب علموں کا ایک
بھاری گروہ موجود رہتا جو علمار کی درسگاہوں میں تعلیم پاتے اور اس
سرچشمۂ علم سے جو فیض آباد میں جاری تھا سیراب ہوکر اپنے گھروں
کو واپس جاتے۔ کاش نواب وزیر اور دس بارہ سال جی جاتے
تو گھاگھرا کے کنارے ایک نیا شاہجہان آباد آباد ہو جاتا اور د

ایک نئی زندہ دہلی کی صورت بخشی تھی۔

نو سال کی حکمرانی کے بعد ۱۷۷۵ء میں شجاع الدولہ کا انتقال ہوا انھیں کی بنوائی ہوئی ایک عمارت ان کی آخری آرام گاہ بنی جو گلاب باڑی کے نام سے آج بھی فیض آباد کی کھوئی ہوئی عظمتوں کی جیتی جاگتی علامت ہے ان کے چمن کے گلاب دور دراز تک مشہور رہیں۔

آصف الدولہ اودھ کے چوتھے فرماں روا ہوئے۔ انھوں نے لکھنؤ کو اپنا دار الحکومت بنا لیا۔ اس لیے ان کے تخت نشین ہوتے ہی فیض آباد خالی ہونے لگا۔ حاکم کے ساتھ ہر وہ محکوم چلا گیا جو جا سکتا تھا۔ فیض آباد اجڑتا رہا اور لکھنؤ بستا رہا۔ حتیٰ کہ محلوں، بازاروں اور باغوں کے نام بھی فیض آباد سے لکھنؤ چلے گئے۔ فیض آباد میں رکنے والی ایک گراں قدر ہستی آصف الدولہ کی والدہ محترمہ امۃ الزہرا بیگم صاحبہ کی تھی جن کا خطاب بہو بیگم تھا۔ ۱۸۱۶ء میں ان کی وفات ہوئی اور وہ اس مقبرہ میں دفن ہوئیں جو بہو بیگم کا مقبرہ کہلاتا ہے اور بلاشبہ فیض آباد کی سب سے پُر شکوہ عمارت ہے۔ ادھر عرصہ سے اس کی باہری جو کاری نہیں ہوئی ہے جس کے سبب یہ عالیشان عمارت سیاہ پوش ہو کر ذمہ داروں کی تغافل کیشی کا ماتم کر رہی ہے۔

گلاب باڑی کے علاوہ عہد شجاع الدولہ کی عمارتیں جو اب بھی قائم ہیں ان میں چوک کا وہ مرکزی حصّہ ہے جو ترپولیا کہلاتا ہے اس کی مختلف سمتوں میں اونچے اونچے عالی شان درپے ہوئے ہیں۔ چوک کے بیچوں بیچ لوہے کا ڈھلا ہوا گھنٹہ گھر ہے جس کی سوئیاں کبھی وقت کا صحیح طور پر ساتھ نہ دے سکیں۔ کہا جاتا ہے کہ بلرام پور کے مہاراجہ نے برطانی عہد میں اسے لگوایا تھا۔ گھنٹہ گھر کے مغرب میں ایک عالیشان مسجد نواب شجاع الدولہ کے ایک عہدے دار حسن رضا خاں کی بنوائی ہوئی ہے جو چوک کی مسجد کہلاتی ہے۔ مسجد کے شمال میں ایک پختہ سرائے ہے جس میں اب ترکاری منڈی ہے۔ اسی زمانے میں ایک کوٹھی چھاؤنی کے علاقہ میں گپتار گھاٹ کے پاس ہے جو محکمہ زراعت کے قبضہ میں ہے۔ دوسری کوٹھی دریا کے کنارے دل کشا کوٹھی کے نام سے ہے جس میں محکمہ افیون کا دفتر ہے۔ امام باڑہ جواہر علی خاں بنی خانم کا مقبرہ موتی مسجد اور وثیقہ اسکول کی مسجد بھی شجاع الدولہ کے زمانے کی یادگاریں ہیں۔

اب سے تقریباً ساٹھ سال پہلے جب میں نے ہوش سنبھالا تھا تو چوک کی مسجد کے چاروں طرف اور گھنٹہ گھر کی ہر سمت میں نیچی نیچی دکانیں تھیں جن کے آگے ٹین کے سائبان تھے۔ گھنٹہ گھر کے مشرق میں ایک قطار چھپر کی دکانوں کی تھی جن میں گرمی میں شربت اور جاڑوں میں چائے ملتی تھی۔ انھیں دکانوں میں اور ان کے آس پاس خونچوں والے مٹی کے سکوروں میں کھیر اور ایک خاص قسم کی چائے کے ساتھ استعمال ہونے والے بسکٹ بیچتے تھے جو "پاپے" کہلاتے تھے۔ کھیر کے پیالے فیض آباد کے چوک میں اب بھی مل جاتے ہیں۔ مگر "پاپے" نہیں ملتے۔ جس کا سبب یہی ہے کہ اب نئے نئے قسم کے بسکٹ بنانے کی فیکٹریاں کھل گئیں ہیں۔ مذکورہ بالا چھپر کی دکانوں سے اُتر لوہے کا ایک گول کٹہرہ تھا جس میں ہفتے کے مقررّہ ایام میں عیسائی مبلغین کھڑے ہو کر اپنے مذہب کی تبلیغ کیا کرتے تھے۔

مسجد کی اتری دکانوں میں ایک دوکان بھیکو حلوائی کی تھی جس کی رابڑی بہت مشہور تھی۔ چوک کی مسجد کے سامنے سڑک کی پٹری پر پھولوں کے ہار اور گجرے بکا کرتے تھے۔ بنی خانم کا مقبرہ میں نے ہمیشہ ویران دیکھا۔ خورد محل کے نشانات بھی مٹ چکے۔ وہاں میں نے ایک چھوٹی سی درگاہ دیکھی تھی جس میں ایک کرخ کا پیڑ تھا۔ اس مناسبت سے وہ کرخ کی درگاہ کہلاتی تھی۔ اب وہاں ایک بہت بڑی درگاہ بن گئی ہے موتی محل میں قدیم پھاٹکوں اور دیواروں کے آثار اب بھی اپنی زبانِ بے زبانی سے ؎

از نقش و نگارِ در و دیوارِ شکستہ
آثار پدید است صنادیدِ عجم را

سُنا رہے ہیں۔

جواہر علی خاں کا امام باڑہ فرقۂ شیعہ کے امور مذہبی کی ادائیگی کا مرکز ہے اسی کے احاطہ میں ان لوگوں کی جامع مسجد ہے۔ موجودہ پیش امام مولوی ابن حسن صاحب قبلہ کی کوششوں سے اس مسجد کی از سر نو تعمیر اور تزئین ہو گئی ہے۔ حضرات اہل سنت کی جامع مسجد "ٹاٹ شاہ کی مسجد" کے نام سے مشہور ہے۔ موتی مسجد کے پائیں وسیع احاطہ میں حکیم نواب شجاع الدولہ مرحوم کے خاندان کے لوگ وثیقہ اسکول کی

مسجد کے احاطے میں عرصۂ دراز سے ایک عربی اسکول بیگم صاحبہ کے وثیقہ کی آمدنی سے قائم ہے۔ سرکٹ ہاؤس، ٹاؤن ہال، کچہریوں کی عمارتیں اور مردہ عجائب گھر جس کی عمارت میں اب محکمۂ پلاننگ کا دفتر ہے انگریزی عہد کی یادگاریں ہیں۔ اس طرف آواس وکاس اور محکمہ تعمیراتِ عامہ کے زیرِ اہتمام بہت سی رہائشی کالونیاں بن گئی ہیں۔

اجودھیا کے تقدس کی ضمانت وہ پرانے مندر ہیں جو رام کوٹ لچھمن مندر، ہنومان گڑھی، منی پربت، سورگ دروازہ اور گپتار گھاٹ کے نام سے مشہور ہیں۔

گپتار گھاٹ کی مذہبی اہمیت کے بارے میں کہاوت ہے کہ یہیں پر سرجو ندی میں ڈوب کر بھگوان رام نے اپنی جیون لیلا ختم کی تھی۔

ان تمام متبرک مقامات کی رونق رام نومی، جنم اشٹمی، دسہرہ اور دیگر تہواروں کے موقعوں پر سجاوٹ اور عقیدتمندوں کی آمد نیز مذہبی رسوم کی ادائگی کے ذریعہ دوبالا ہو جاتی ہے۔

مسلمانوں کے جذباتی لگاؤ کا مرکز اجودھیا کا ایک قبرستان ہے جس میں کئی لمبی لمبی قبریں ہیں۔ ان میں سے ایک قبر حضرت شیث پیغمبر کی بتائی جاتی ہے۔ اس کی لمبائی نو گز ہے وہاں ہر سال میلے کی شکل میں عُرس ہوتا ہے۔

فیض آباد اور اجودھیا کے درمیان سڑک سے کچھ دکھن ہٹ کر ایک مقام ہے جہاں ایک بہت پرانی اور وسیع مسجد کے کچھ کھنڈر اور پرانی قبریں ہیں۔ یہ جگہ وہیں کی ایک صاحب قبر "بڑی بوا" کے نام سے موسوم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بڑی عبادت گزار اور اللہ والی بی بی تھیں۔ قدرت نے ان کو حسن ظاہری بھی عطا فرمایا تھا۔ اس زمانے کے شہر کوتوال نے ان سے شادی کرنا چاہی مگر وہ راضی نہ ہوئیں۔ کوتوال نے کچھ عالموں اور بزرگوں کو بیچ میں ڈالا مگر ناکامیاب رہا۔ تب اس نے ان معظمہ سے زبردستی شادی کرنے کی ٹھانی اور انھیں اپنے ارادے سے مطلع کیا۔ انھوں نے کوتوال سے دریافت کرایا کہ اس کو ان میں کون سی ایسی کشش نظر آئی جس سے وہ اتنا بضد اور ظلم و جور پر آمادہ ہے۔ اس نے جواب کہلایا کہ اس کو ان کی آنکھیں بہت پسند آئیں۔ یہ سن کر انھوں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی دونوں آنکھیں نکال کر ایک پتّے پر رکھیں اور خادمہ کے ہاتھ کوتوال کو اس پیغام کے ساتھ بھجوا دیں کہ تجھے جو چیز پسند ہے وہ حاضر ہے مگر یاد رکھنا کہ فیض آباد میں اب کوئی عالم رہے گا نہ ظالم"۔ کیا عجب کہ ان کے دل سے نکلی ہوئی اس آواز ہی کا اثر ہو کہ فیض آباد کی پوری تاریخ مذہبی رواداری اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی سے بھری ہوئی اور ظلم و ستم کی کہانیوں سے خالی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ انھیں کے دل کی پکار کا یہ سبب ہو کہ فیض آباد میں پیدا ہونے والا ہر صاحبِ علم و کمال مہرِ عالم تاب کی مانند ابھرا تو مشرق سے مگر چمکتا ہوا مغرب کی طرف بڑھا اور اسی سمت غروب ہو گیا۔

شعر و ادب، موسیقی کھیل کود اور سیاست کے میدان میں بھی فیض آباد کا بلند مقام رہا ہے۔ ناخدائے سخن میر ببر علی انیسؔ ان کے صاحبزادے میر نفیسؔ، خواجہ حیدر علی آتشؔ، نواب سید محمد خاں رندؔ میر علی اوسط رشکؔ، پنڈت برج نرائن چکبستؔ اور امیر اللہ تسلیمؔ وغیرہ مملکت شعر و ادب کے وہ تاجدار ہیں جن کو جنم دینے پر سرزمین فیض آباد ہمیشہ ناز کرے گی۔ انقلاباتِ زمانہ کے ہاتھوں میر انیس مرحوم کے مکان میں فیض آباد کی میونسپلٹی نے کانجی ہاؤس بنا لیا تھا۔ سید اطہر علی عرف مولوی اچھّن صاحب مرحوم سید اظہر حسین صاحب مرحوم ریٹائرڈ آئی اے ایس افسر اور اُن کے رفقائے کار کی مساعی جمیلہ کی بدولت وہاں پر ایک ادبی مرکز قائم ہو گیا ہے جس کے ایک حصہ میں فیض آباد کے شمس و قمر انیسؔ و چکبستؔ کے نام سے ایک لائبریری بھی ہے۔

مرزا جعفر حسین جو ادب، صحافت نیز تصنیف و تالیف کے میدانوں میں ایک منفرد مقام رکھتے تھے فیض آباد ہی کے تھے۔

ملکۂ غزل اختری بائی بھی جو بعد میں بیگم اختر کے نام سے مشہور ہوئیں فیض آباد کی تھیں۔ فٹ بال کے کھلاڑیوں میں فیض آباد چھاونی کے محلہ لال کرتی کے دو بھائی ولی محمد اور نور محمد اپنے وقت کے بہترین کھلاڑی تھے۔ ہاکی کے کھلاڑیوں میں براؤن ہیرا اور متین الدین کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ پنالٹی کارنر مل جانے پر گول کرنے میں متین صاحب کو بڑی مہارت تھی۔ فیض آباد میں ان کھیلوں کا اب بھی چلن ہے۔ ہندوستان کی آزادی کی جنگ میں بھی فیض آباد کا بڑا اہم

گل رہا ہے۔ فیض آباد کے مولوی احمد اللہ شاہ نے ۱۸۵۷ء کی اس لڑائی میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا تھا مگر دراصل وہ جنگ آزادی کی پہلی لہر تھی۔ وہ ایک درویش تھے اور مولوی کے نام سے مشہور تھے۔ انھوں نے اپنی تقریروں کے ذریعہ انگریزی سرکار کو ہلا دیا تھا۔ ان کی قیادت میں باغیوں نے انگریزی فوج سے جگہ جگہ ٹکر لے کر ان کے دانت کھٹے کر دیے تھے بالآخر اپنے ہی ایک ساتھی کی غداری سے ان کا کٹا ہوا سر انگریزوں کو ملا اور انھوں نے اسے شاہجہاں پور کی کوتوالی کے دروازے پر لٹکایا۔ ان کی موت کی خبر جب انگلستان پہنچی تو انگریزوں نے چین کی سانس لی کیونکہ ان کی نگاہ میں شمالی ہندستان میں انگریزوں کے سب سے بڑے دشمن کا خاتمہ ہو گیا تھا۔

علم و سیاست کے میدانوں میں یکساں پیش رفت کرنے والی فیض آباد کی دو نمایاں ہستیاں مولانا حسین احمد مدنی اور اچاریہ نریندر دیو ہیں۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں جب انگریزوں کے خلاف پورے ملک میں نفرت کے جذبات پھیلے ہوئے تھے مولانا حسین احمد مدنی نے اپنے پیر و مرشد مولانا محمود الحسن کے ساتھ ریشمی رومال کی تحریک میں حصہ لیا تھا جو انگریزی حکومت کے خلاف چلائی گئی تھی۔ انھوں نے ترکی اور دیگر عرب ممالک میں جا کر ہندوستان کی آزادی کے لیے فضا ہموار کی تھی۔ وہ جمعیتہ علمائے ہند اور دیوبند کے مدرسہ کے بانیوں میں بھی تھے۔ اچاریہ نریندر دیو سوشلسٹ طرز فکر کے حامی تھے۔ جنگ آزادی میں جیل گئے تھے اور لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے تھے۔ ابھی حال میں فیض آباد میں ان کی یاد میں ایک بہت اچھا ہال "نریندر ہالیہ" کے نام سے بن گیا ہے۔ ایک اور کل ہند سطح کی قابل ذکر سیاسی شخصیت ڈاکٹر رام منوہر لوہیا کی تھی جو فیض آباد کی تحصیل اکبر پور کے موضع شہزاد پور میں پیدا ہوئے تھے۔

میرے تعلیمی دور میں فیض آباد شہر میں دو ہائی اسکول اور ایک انٹرمیڈیٹ کالج تھے تحصیلوں میں بھی ہائی اسکول تھے۔ اب جگہ جگہ ہائی اسکول انٹرمیڈیٹ کالج اور متعدد ڈگری کالج ہیں شہر میں دو یونیورسٹیاں ہیں جن میں سے ایک زراعتی ہے اور وہ آچاریہ نریندر دیو کے نام سے منسوب ہے اس کے علاوہ پالی ٹکنک کالج اور آئی ٹی آئی بھی قائم ہیں۔

فیض آباد کی قدیم صنعتوں میں پہلے قصبہ ٹانڈہ اور اس کے نواح میں جامدانی اور ڈوریا کی بنائی کا کام اعلیٰ پیمانے پر ہوتا تھا اب وہاں پرانی چال کے کپڑوں میں تہبند اور انگوچھے وغیرہ بنتے ہیں اور نئی قسم کے ٹیریکاٹ اور دیگر اچھے کپڑے بُنے جاتے ہیں۔

فیض آباد شہر میں لکڑی کے صندوقچے، قلمدان، عطر دان اور سنگار دان بہت اچھے بنتے تھے جن پر پیتل کے نفیس کام کی پھول پتیاں بنی ہوتی تھیں اب اس کام کا صرف ایک کارخانہ رہ گیا ہے۔ کھانڈ بنانے کا کام پہلے شہر کے محلے کاندو ٹولہ میں بہت ہوتا تھا اب وہاں رام دانے اور مرمرے کی لیّا، شکر کے گٹّے اور بتاشے بکثرت بنتے ہیں۔ ناریل کے حقّے جنھیں گڑگڑا کہتے ہیں وزیر گنج کے محلے میں بنتے تھے اور چوک میں گھنٹہ گھر کے دکھن میں ان حقوں کی کئی دکانیں تھیں۔ اب یہ کام نسبتاً کم ہو گیا ہے اور چوک میں ناریل کے حقّے کی صرف ایک دوکان ہے۔ تمباکو کی کاشت اجودھیا اور اس کے آس پاس بہت کافی رقبہ میں ہوتی ہو۔

قصبہ مبارک پور کی لکڑی کی کھڑاویں پہلے بہت مشہور تھیں فیض آباد میں اب بھی کہیں کہیں لکڑی کی کھڑاویں بنانے کی دکانیں ہیں۔ سینگ کی کنگھیاں پہلے کی طرح اب بھی فیض آباد میں بنتی ہیں اور باہر جاتی ہیں۔ اس طرف فیض آباد میں بیٹری بنانے اور جوتہ و چپل سازی کے کام کو بہت فروغ ہو گیا ہے۔ جوتہ سازی کے لیے فیض آباد مشرقی یوپی کا آگرہ کہا جا سکتا ہے۔ حکومت کا محکمہ انڈسٹریز فیض آباد میں جدید صنعتوں کو بڑھاوا دے رہا ہے۔ مسودہ میں ایک شکر مل اور اکبر پور میں سوت کی کتائی کی مل کھل گئی ہے۔ ترکاریوں کے بیج کا کام اب فیض آباد میں اعلا پیمانے پر ہوتا ہے۔ سیکڑوں کمپنیاں اس کام کو کر رہی ہیں۔ اور فیض آباد میں تیار کئے ہوئے بیج نہ صرف ہندوستان کے مختلف حصّوں میں بلکہ بیرونی ممالک کو بھی بھیجے جاتے ہیں۔

پھلوں میں امرود، شریفہ اور بیر فیض آباد میں اچھے اور بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ دریا کے کنارے ریتی کے علاقے میں ترکاریاں بہت پیدا ہوتی ہیں جن میں بڑے سائز کے بنڈے خصوصیت کے ساتھ

مشہور ہیں۔ وہاں کے تربوز کافی بڑے اور خوش ذائقہ ہوتے ہیں۔

فیض آباد کے تذکرے کے ساتھ وہاں کی ضلع جیل بھی قابلِ ذکر ہے۔ اس کا احاطہ بہت بڑے رقبے میں ہے میرے بچپن میں اس کے چاروں طرف کی سڑکیں زیادہ تر سنسان رہتی تھیں اور رات کو ان سڑکوں پر کھمبوں میں مٹی کے تیل کی لالٹینیں جلا کرتی تھیں اب وہ سڑکیں کافی مشغول رہتی ہیں۔ اسی جیل میں عظیم انقلابی اشفاق اللہ خاں کو ۱۹ دسمبر ۱۹۲۷ء کو پھانسی دی گئی تھی اور انھوں نے تختۂ دار چڑھتے وقت اپنی اس آخری خواہش کا اظہار کیا تھا۔ ؎

کچھ آرزو نہیں ہے، ہے آرزو تو یہ ہے — رکھ دے کوئی ذرا سی خاکِ وطن کفن میں

گورنمنٹ کالج کے ایک استاد مولوی عبد اللہ مرحوم تھے جن کا تعلق افغانستان سے تھا انھوں نے اشفاق اللہ خاں مرحوم کی تجہیز و تکفین کے انتظامات کئے تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ جب انھوں نے اشفاق اللہ خاں کی لاش پر ان کے کاندھے سے لٹکا ہوا کلام پاک دیکھا تو ان کی زبان سے بے ساختہ نکلا ؎

سوئے جاناں می روم — پیغامِ جاناں در بغل

فیض آباد ہی کی جیل میں مولانا حسرت موہانی، لال بہادر شاستری، فیروز گاندھی، اجیت پرشاد جین، جگن پرشاد راوت، گوپال نرائن سکسینہ، بابا راگھو داس، ٹھاکر دسودھا سنگھ، ڈاکٹر جتیلے، جے رام ورما، ہرگووند سنگھ اور بند باسنی پرشاد سنگھ وغیرہ نے قید و بند کی اذیتیں برداشت کی تھیں۔

فیض آباد کی آبادی ہمیشہ سے مخلوط رہی ہے۔ وہاں ہندوؤں مسلمانوں اور کشمیری برہمنوں کے متعدد گھرانے زمانۂ قدیم سے مل جل کر رہتے ہیں۔ تقسیمِ وطن کے بعد بہت سے قدیم مسلم گھرانے ہجرت کر گئے اور پاکستانی مہاجرین کثیر تعداد میں آ کر آباد ہو گئے۔ ان کے آنے سے نئے مکانوں اور شاندار دوکانوں کا اضافہ ہوا اور ہر قسم کی تجارت کو فروغ ملا۔ ان کے زیر اثر پرانی دکانوں نے بھی نئے چہرے نکال لئے۔ آج کا فیض آباد ہمارے صوبے کی ایک کمشنری ہے وہاں پرانی آبادیاں بھی قائم ہیں اور نئی آبادیاں بھی چھلک رہی ہیں۔

□□

لکھنؤ کا گم شدہ دسترخوان۔ صفحہ ۱۲۴ کا بقیہ

میں کھانوں کے سیکڑوں نام ملتے ہیں' ہر کھانے کی بے شمار اقسام کی جانب اشارہ ملتا ہے۔

یہ کہنا تو دشوار ہے کہ لکھنوی دسترخوان، اس کے کھانوں' اور ان کی تیاری کے ماہرانہ طریقوں، مسالوں اور ان کے امتزاج کے ضابطوں کی پوری بازیافت آسان یا ممکن ہے لیکن کچھ نہ کچھ تو ممکن ہے اور اسی لئے اس تہذیبی سرمایے کی بابت تحریری ذخیرے کی بازخوانی لکھنؤ والوں پر فرض ہے۔ □□

اُردو نثر کے میرِ چشمے

زندگی جن کے تصوّر سے جلا پاتی تھی
ہائے کیا لوگ تھے جو دامِ اجل میں آگئے

حسن واصف عثمانی حق گو صحافی، منفرد ادیب، صاحبِ طرز انشا پرداز، سنجیدہ تخلیق کار اور اسلامیات کے ممتاز اہلِ قلم تھے "ندائے ملت"، "قومی آواز"، "عزائم" اور صحافت سے وابستگی کے ساتھ نیا دور کے قلمی معاونین میں بھی تھے۔ ان کی پُر خلوص شخصیت محبت آمیز رویّہ اور بے لوث' بے غرض وابستگی نے انھیں ایسی ہر دلعزیزی عطا کی تھی۔ ۱۱ر نومبر کو انھوں نے اس عالم خاکی سے کنارہ کیا۔ ادارہ ان کے انتقال کو اردو ادب کے لئے نقصانِ عظیم تصور کرتا ہے اور مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہے۔ □□

امیر حسن نورانی ایک محقق، مدرّس، قومی یک جہتی کے علمبردار اور اعلا پائے کے ماہرین علم و ادب میں سے تھے۔ ۸ر نومبر ۱۹۹۴ء کو انھوں نے انتقال کیا۔ ان کا سلسلۂ خدمات اسلامیہ کالج لکھنؤ یونیورسٹی اور دہلی یونیورسٹی تک پھیلا ہوا ہے "اُردو کے چار ستارے" "نور مولانا آزاد: حیات اور خدمات" ان کی وقیع تصانیف ہیں۔

ادارہ ان کے انتقال کو علم و ادب اور اودھ کی تہذیب اور وضعداری کی روایات کیلئے ناقابلِ تلافی نقصان سمجھتا ہے۔

ایڈیٹر

سید علی اشرفی
سجادہ نشین ۔ کچھوچھہ شریف
فیض آباد

آٹھویں صدی ہجری کے صاحب کرامت بزرگ

سید اشرف جہانگیر سمنانی علیہ الرحمۃ

ضلع فیض آباد میں اشرف پور کچھوچھا اور رسول پور درگاہ گرام سجھاؤں کو ملاکر "ٹاؤن ایریا اشرف پور کچھوچھا" جسے کچھوچھا شریف کے نام سے کافی شہرت حاصل ہے۔

وہاں پر حضرت مخدوم سلطان سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ کا آستانہ مرجع خلائق ہے۔ اور بلا امتیاز مذہب، قوم، ذات برادری زبان علاقہ، امیر، غریب ہندوستان کے مختلف علاقوں سے نیز بیرون ملک سے زائرین وعقیدت مند حاضری دیتے رہتے ہیں، دفع آسیب کے لیے آستانہ پر خصوصی طور پر ہزاروں افراد شفایاب ہونے کے لئے حاضری دیتے ہیں۔

حضرت مخدوم سلطان سید اشرف جہانگیر سمنانی قدس سرہٗ کے پہلو میں آپ کے بھانجے اور معنوی فرزند حضرت سید عبدالرزاق نورالعین جو حضرت سیدنا شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی غوث اعظم کی نسلِ پاک سے ہیں کا مزار اقدس ہے۔

حضرت نورالعین کے دو فرزند حضرت سید شاہ حسن خلفِ اکبر سجادہ نشین اور حضرت سید شاہ حسین خلفِ ثانی سجادہ نشین کے مزارات حضرت کے گنبد کے سامنے صحن پہ واقع ہیں۔ ان دونوں بزرگوں کی اولادیں نبیران کے سجادہ نشینان ہر سال ۲۵ محرم سے ۲۹ محرم تک مختلف مراسم عرس ومراسم سجادگی ادا کرتے چلے آرہے ہیں۔

حضرت مخدوم سلطان سید اشرف جہانگیر کے وصال کی تاریخ ۲۸ محرم ۸۰۸ھ ہے۔ حضرت کے وصال کے وقت تقریباً ۱۲۰ لاکھ تھے

ساتویں صدی ہجری کے آخر ربع میں سادات حسینی کی ایک مضبوط سلطنت خراسان میں قائم تھی جس کی عظمت اور جلالت کا سکہ دیگر سلاطین کے دلوں پر تھا۔ اس کی دو وجوہات تھیں، اول تو اس حکومت نے عادل، مدبر سلاطین کے ہاتھوں استحکام پایا۔ دوسرے حکمرانوں کی سیادت، ان کی دینی برتری اور مذہبی تشخص کا سبب تھی۔

تیسری صدی ہجری میں سید تاج الدین بہلول نوربخشی نے اس سلطنت کی بنیاد رکھی تھی، جو بڑے صاحب فضل وکمال ہوشمند انسان تھے۔ آپ کے بعد آپ کے فرزند اور اولادیں والئی سلطنت ہوئیں اور اسی تسلسل میں حضرت قدوۃ الکبریٰ مخدوم سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے والد حضرت سید ابراہیم شاہ تخت نشین ہوئے۔ حضرت سید ابراہیم کی سلطنت کا پایۂ تخت سمنان تھا۔

سمنان کوہ البرز کے جنوب میں تہران (قدیم رے) اور دامغان کے بیچ میں واقع ہے جو ایران کا ایک نہایت قدیم شہر ہے۔

اسی سرزمین پر آٹھویں صدی ہجری کی ابتدا میں سادات حسینی کے ایک فرزند سید اشرف پیدا ہوئے۔ جو بعد میں قدوۃ الکبریٰ محبوب یزدانی غوث العالم جہانگیر اوحدالدین کے القاب ومنصب سے نوازے گئے۔

حضرت مخدوم سلطان سید اشرف جہانگیر سمنانی کا سلسلۂ نسب حضرت سیدنا امام حسینؓ سے ہے۔

حضرت مخدوم سید اشرف جہانگیر کے والد ماجد والئی سلطنت کے ساتھ ساتھ ایک بلند مرتبہ عالم فاضل اور وقت کے ولی کامل تھے اور امور سلطنت کے انہماک کے باوجود درس وتدریس کا سلسلہ بھی

جاری رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کے دورِ حکومت میں ہزاروں طلبہ مختلف علوم وفنون کے ماہر و کامل ہو کر نکلے۔ جنھوں نے براہِ راست سلطان سید ابراہیم سے علم کے اسباق ختم کرائے تھے۔

حضرت مخدوم سلطان سید اشرف سمنانی کے استاد مولانا عماد الدین تبریزی استاد تھے۔ ایک سال کی مدت میں حضرت قدوۃ الکبریٰ نے ہفت قرأت کے ساتھ قرآن عظیم ختم فرمایا۔ سلطان حضرت سید ابراہیم خود بھی اپنے لختِ جگر کی علمی استعداد سے متعلق اساتذہ کو ہدایت دیا کرتے تھے۔ اور خود بھی نگرانی فرماتے تھے۔ چنانچہ جب آپ چودہ سال کے ہوئے تو آپ تمام علوم متداولہ پر عبور حاصل کر چکے تھے۔ معقولات منقولات دونوں پر یکساں حاوی تھے۔

حضرت مخدوم سید اشرف جہانگیر سمنانی جب پندرہ سال کے ہوئے تو والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اور رسم کے مطابق تاج شاہی آپ کے سر پر رکھا گیا آپ کی قابلیت، فراست، عدل و انصاف کی دھوم مچ گئی۔ خوشحالی اور فارغ البالی گھر گھر پھیل گئی۔

بارہ سال کا آپ کا عرصۂ حکمرانی صرف دنیاوی امور میں ہی نہیں گزرا۔ بلکہ آپ کا بڑا وقت سلوک کی تعلیم میں اور علمی مشاغل میں صرف ہوا۔ حضرت عبد الرزاق کاشانی سے خصوص الحکم پڑھی اور مسئلہ وحدۃ الوجود کی حقیقت سے پوری طرح واقفیت حاصل کی۔ اور ہر وقت اللہ کی یاد میں مستغرق رہنے لگے۔ اور معرفتِ الٰہی کا مقصد بن چکا تھا۔

آپ نے ترکِ سلطنت کیا اور تاج شاہی اپنے چھوٹے بھائی کے سر پر رکھا۔ اور ان کو نصیحت فرمائی کہ عدل و انصاف و شریعتِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی پابندی رکھنا اور فرمایا کہ " دائرہ رجال الغیب کی حفاظت کرنا۔ اور پر زور تاکید فرمائی کی سورہ مدیح الشر کی مداومت کرنا اور دنیا کا کوئی کام شریعت کی پابندی میں مانع نہ ہو۔ چھوٹے بھائی کو سلطنت تفویض کرنے کے بعد رختِ سفر باندھا۔ سفر کرتے ہوئے آپ بخارا پہنچے۔ وہاں سے سمرقند آئے جہاں سمرقند کے شیخ الاسلام سے ملاقات فرمائی۔ ہیبتوں جنگلوں، پہاڑوں اور ناقابل گزار راستوں سے منزل بہ منزل سفر طے کرتے ہوئے اس



آستانہ حضرت مخدوم سلطان سید اشرف جہانگیر سمنانی رح کچھوچھہ شریف

وقت کے) صوبہ سندھ (آج کے صوبہ پنجاب) کے شہر اوچھ پہنچے۔

اوچھ شہر اس وقت حضرت مخدوم جلال الدین جہانیاں جہانگشت رح کے قیام کی وجہ سے مرجع خلائق تھا۔ دوران قیام اوچھ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت نے آپ کو خرقۂ خلافت عطا فرمایا اور فرمایا کہ نیقرنے جو کچھ آج تک اکابرینِ مشائخ سے نعمتیں حاصل کی تھیں وہ سب کی سب تم کو دیدیں۔

اوچھ شریف سے دہلی حضرت نظام الدین اولیاؒ کے روضہ کی حاضری دیتے ہوئے دیگر بزرگان سلسلہ چشتیہ کے مزارات پر حاضر ہوتے ہوئے دو سال تک پیدل سفر کرتے ہوئے بنگال میں داخل ہوئے۔

پنڈوہ شریف (بنگال) میں آپ کے پیر و مرشد حضرت سلطان المرشدین علاؤ الحق والدین گنج نبات آپ کے منتظر تھے۔

پنڈوہ شریف میں حضرت مخدوم سید اشرف جہانگیر کی آمد پر سلطان المرشدین شیخ علاؤ الحق والدین گنج نبات کا مع اصحابِ شہر کے باہر تشریف لاکر استقبال کرنا ایک غیر معمولی اور کافی اہم بات تھی۔ جوق در جوق لوگ جمع ہو گئے۔ حضرت سید اشرف سمنانی نے شیخ کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ حضرت شیخ نے اٹھا کر سینہ سے لگالیا۔ چار سال تک حضرت شیخ کی خدمت میں رہے۔ مجاہدات و مکاشفات اشغال ذکر و فکر ہر طرح سے پیر و مرشد کی نگاہ میں کامیاب قرار پائے اور خطاب جہانگیر سے سرفراز ہوئے۔

ایک روز حضرت شیخ جب اسرار وحدت بیان فرما رہے تھے اور حضرت انہماک سے پیر و مرشد کی تقریر سن رہے تھے تو تقریر ختم ہونے پر حضرت پیر و مرشد حضرت مخدوم سید اشرف کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا۔ فرزند اشرف میں نے اپنی استعداد و مقدور بھر کوشش کے ذریعہ تمھیں تعلیم دی اور تربیت کی۔ ہدایت و اسرار غیبی سے آگاہ کیا۔ اب مناسب ہے کہ تمھارے لیے کوئی مقام تجویز کیا جائے جہاں جا کر مخلوق خدا جو گمراہی کے دلدل میں پھنسی ہے اور فریب خوردہ صفات میں گرفتار ہے وہ تم سے فیض پائے۔ شیخ نے آپ کے لیے جونپور کا علاقہ منتخب فرمایا اور عید کا دن روانگی کے لیے متعین ہوا۔

آپ منزل بہ منزل کوچ فرماتے رہے۔ قصبۂ محمد آباد گہنہ (ضلع اعظم گڈھ) میں مناقب اصحاب رسولؐ پر ایک بہت ہی جامع تقریر فرمائی۔ مولانا سید خاں اور ان کے معاون قاضی حمید الدین پوری عقیدت سے حاضر خدمت رہے۔ اور کثیر تعداد میں لوگ مشرف بیعت ہوئے۔ ظفر آباد (ضلع جونپور) کی آمد پر وہاں کے ایک مشہور نوجوان عالم دین شیخ کبیر نے انتہائی عقیدت کے ساتھ شرف بیعت حاصل کیا۔ دیگر بیشتر افراد بھی حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔ جونپور ہوتے ہوئے حضرت بیرونِ ہند کے سفر کے لیے روانہ ہو گئے۔

بیرون ہند کے سفر سے واپسی پر حضرت پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایک عرصہ تک قیام فرمایا۔ حضرت شیخ نے قدوۃ الکبریٰ حضرت مخدوم سلطان سید اشرف جہانگیر سمنانی کو مرکز رشد و ہدایت و مقام آرام گاہ آخرت سے آگاہ فرمایا۔

بیرونِ ہند کے سفر میں حضرت بصرہ، کربلائے معلیٰ، کاظمین شریفین، نجف اشرف ہوتے ہوئے بغداد تشریف لائے اور اپنے بھانجے جو حضرت غوث اعظمؓ کی اولاد سے ہیں حضرت سید عبدالرزاق نورالعین کو اپنی فرزندی میں قبول فرمایا اور انھیں اپنا روحانی جانشین مقرر فرمایا۔

بغداد سے دمشق بعد عید الفطر مدینہ منورہ اور حج کے قریب ایشیا تشریف لے گئے۔

حضرت اشرف یمن تشریف لے گئے جہاں شیخ نظام الدین یمنی آپ کے گرویدہ ہو گئے۔ بیرونِ ہند سے واپسی پر جب ہندستان کے سفر میں بہار پہنچے تو وہاں حضرت مخدوم الملک شیخ شرف الدین یحییٰ ہندیؒ کا وصال ہو چکا تھا۔ مخدوم الملک کی وصیت کے مطابق آپ کا جنازہ رکھا تھا۔ تارک السلطنت سیدزادہ آکر نماز پڑھائیں گے۔ حضرت میر شریف پہونچے اور مخدوم الملک کی نماز جنازہ ادا فرمائی۔

پیر و مرشد کی ہدایت کے مطابق حضرت مخدوم سید اشرف سمنانی جونپور تشریف لائے، حاکم جونپور نے قیام کی درخواست کی، آپ نے فرمایا کہ تمھاری حدودِ سلطنت سے باہر نہ رہوں گا۔ آپ کا کچھوچھہ شریف اُس دور میں شاہانِ شرقی جونپور کے حدود سلطنت میں تھا۔ جونپور سے جب آپ بعد میں ہٹ تشریف لائے۔ قرب و جوار کے لوگ آپ کی زیارت کے لیے امنڈ پڑے، اس گاؤں کے بڑے رئیس ملک محمود تھے۔ انھوں نے شاندار استقبال کیا۔ زیارت سے مشرف ہوئے۔ بیعت سے سرفراز فرماتے گئے۔

موضع مذکور سمت مغرب میں قریب ہی ایک گول تالاب کا آپ نے معائنہ کیا جس کے بیچ و بیچ ایک ٹیلہ تھا۔ حضرت نے فرمایا یہی وہ جگہ ہے جو میرے پیر و مرشد نے بہ نظر کشف دکھائی تھی۔ ملک محمود جو سلسلہ اشرفیہ سے وابستہ ہو چکے تھے فرمایا کہ اس ٹیلہ پر ایک جوگی جادوگر رہتا ہے۔

چنانچہ جادوگر نے اپنے جادو کے تمام کمالات او شعبدے دکھائے اور جب اسے یقین ہو گیا کہ باطل حق پر فتحیاب نہیں ہو سکتا تو وہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، اور حضرت کے پیروں پر گر پڑا۔ اور اسلام قبول کیا، اس کے ساتھ ہی اس کے پانچ سو چیلے بھی مسلمان ہو گئے۔ اس کے اسلام لانے کے بعد قرب و جوار کے پانچ ہزار مشرکین دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔

حضرت کے وصال کے وقت تقریباً ۸۳ لاکھ مرید تھے جن میں ۵۳ لاکھ غیر مسلم حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔

وصال سے قبل حضرت نے قبر تیار فرمائی اور ایک شبانہ روز

اس قبر میں رہے — دوسرے روز صبح ایک مضمون تحریر کرکے لائے جو رسالہ "قبریہ و بشارۃ المریدین" کے نام سے مشہور ہے۔ جو عقائد، اعتقادات، بشارت و ہدایت پر مشتمل ہے۔ تفصیلِ متن لطائف اشرفی میں موجود ہے۔

حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اخبار الاخیار میں ذکر کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دنیا میں صرف تین محبوب گزرے ہیں۔ پہلے محبوب سبحانی شیخ عبدالقادر جیلانی، دوسرے حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی، تیسرے غوث العالم محبوب یزدانی مخدوم سید اشرف سمنانی۔

حضرت قدوۃ الکبریٰ غوث العالم محبوب یزدانی سلطان سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ کو اپنے وقت کے بیشتر علوم و فنون میں دسترس تھی۔ قرآن مجید، علم حدیث و فقہ پر پورا عبور تھا۔ علم تصوف میں کمال ادراک تھا۔ قوت حافظہ ایسی تھی کہ ایک سال کے عرصہ میں آپ نے سبع قرأت کے ساتھ قرآن پاک حفظ فرمایا۔ آپ کی تصانیف میں ایک کتاب فتاویٰ اشرفیہ بھی تھی جو جامع ازہر کی قدیم لائبریری میں ہے۔

ایک طرف اگر آپ کی عملی زندگی ترک دنیا کا نمونہ پیش کرتی ہے تو دوسری طرف آپ کا تفقہ یہ بتاتا ہے کہ راہ طریقت کے رہبر علم دین میں کسی سے کم نہیں۔ حضرت کے ملفوظات، تصانیف، خطوط آپ کی علمی قابلیت پر شاہد ہیں۔

لطائفِ اشرفی خود آپ کے وسعتِ علم اور علمی بصیرت کا پتہ دیتی ہے۔ یہ کتاب تصوف اسلام کی تمام بنیادی کتابوں کا نچوڑ ہے۔

آپ کے سیکڑوں اشعار لطائفِ اشرفی، مکتوباتِ اشرفی اور دوسری تصانیف میں موجود ہیں۔

دیوان اشرف کے اشعار جو عالم بےخودی میں کہے گئے ہیں شعری لطافت، جذبہ اور سوز و گداز میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں۔

حضرت مخدوم سید اشرف سمنانی نظم و نثر پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ نثر میں ان کی انشاء پردازی کے نہایت عمدہ نمونے ملتے ہیں اگرچہ ان کی فطری روش سادہ نگاری ہے پھر بھی زمانے کے علماء اور امراء میں رائج طرز نگارش نے ان کو پرتکلف اور دشوار راہ پر ڈال دیا تھا۔

حضرت مخدوم سید اشرف جہانگیر سمنانی کی تصانیف :-

(۱) نحو اشرفیہ (جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ کتاب عربی میں تھی۔ حضرت نورالعین اس کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں "افضلِ روزگار راد ستور شد") (۲) شرح ہدایہ (یہ فقہ پر تھی) (۳) شرح عوارف، (۴) شرح خصوص الحکم، (۵) فوائد العقائد۔ (یہ کتاب پہلے فارسی میں لکھی گئی، اس کے بعد اسی کتاب کا عربی ترجمہ کیا۔) فتاویٰ اشرفیہ (جامع ازہر کی قدیم لائبریری میں ہے) (۷) زیچ سامانی (۸) تفسیر نوربخشیہ (۹) کنزالاسرار (۱۰) دیوان اشرف (۱۱) رسالۂ غوثیہ (۱۲) رسالہ در منازل خلفائے راشدین (۱۳) مرأۃ الحقائق (اصلاحات تصوف کی تشریح پر مشتمل) (۱۴) بحرذاکرین (۱۵) حجتہ الذاکرین (۱۶) حاشیہ بر حواشی مبارک (مولانا برہان الدین مرغیانی) (۱۷) کنزالدقائق (۱۸) شیخ علاءالدولہ سمنانی کی لکھی ہوئی کتاب تاریخ کی فہرست اسماء رجال بھی آپ نے ترتیب دی تھی۔ (۱۹) بشارت الاخوان (۲۰) مکتوباتِ اشرفی مرتبہ حضرت نظام یمنی (۲۱) مکتوبات اشرفی مرتبہ حضرت در یتیم (۲۲) لطائف اشرفی (ملفوظاتِ حضرت مخدوم سمنانی مرتبہ حضرت نظام یمنی (۲۳) مکتوباتِ اشرفی (جمع شدہ حضرت نورالعین) (۲۴) ضمیمہ مکتوباتِ اشرفی (۲۵) اشرف الانساب (یہ کتاب فنزین میں لکھی گئی) (۲۶) فوائد الاشرف (گجرات میں لکھی گئی) (۲۷) اشرف الفوائد (گجرات میں لکھی گئی) (۲۸) بشارت الذاکرین (۲۹) تنبیہ الاخوان (سیف خاں کے لیے لکھی گئی) (۳۰) ارشاد الاخوان (یہ کتاب بھی سیف خاں کے لیے لکھی گئی) (۳۱) ترجمہ قرآن پاک بہ زبان فارسی بہ عہد سلطانی (یہ قرآن پاک قدیم ترک زمانے کی لائبریری مدینہ منورہ سے

ا ھ ـ نؤ

مانا بہت حسیں ہے، مانا بہت جواں ہے
یادوں کی سرزمیں ہے، خوابوں کا آسماں ہے
بستی ہے صاحبوں کی، شہرِ سخن وراں ہے
سب کچھ ہی پھر بھی جیسے ہر شے دھواں دھواں ہے
میں جس کو ڈھونڈتا ہوں وہ لکھنؤ کہاں ہے

ہیں میر و میرزا بھی، دفن اپنے لکھنؤ میں
غالب ہیں اک اضافہ ناسخ کی آبرو میں
رطب اللساں یگانہ، آتش کی گفتگو میں
تھی ان کی جو زباں اب سب کی وہی زباں ہے
میں جس کو ڈھونڈتا ہوں وہ لکھنؤ کہاں ہے

ذہنِ دبیر دیکھا، طبعِ انیس دیکھی
جو شے ملی جہاں بھی ہم کو نفیس دیکھی
ہر شمع انجمن کی اپنی جلیس دیکھی
کیا نامِ شوق ہے جو ابتک ادب کی جاں ہے
میں جس کو ڈھونڈتا ہوں وہ لکھنؤ کہاں ہے

محسن کی اُف وہ نعتیں حضرت امیر کی سی
دنیا، کسی فقیرِ روشن ضمیر کی سی
سب خصلتیں کماں سے اک چھوٹے تیر کی سی
شاید کہ نام اسی کا معراجِ عاشقاں ہے
میں جس کو ڈھونڈتا ہوں وہ لکھنؤ کہاں ہے

کیا بات ہے صفی کی غزلوں کے بانکپن کی
کلیاں چٹک رہی ہوں جیسے کسی چمن کی
توصیف کس زباں سے ہو آرزو کے فن کی
جو مصرعِ غزل ہے، بس اک کھنچی کماں ہے
میں جس کو ڈھونڈتا ہوں وہ لکھنؤ کہاں ہے

مرزا عزیز ہوں وہ یا میرزا یگانہ
ہر اک کا ہر سخن تھا، کس درجہ عارفانہ
مجھ سے سنو کہ میں نے دیکھا ہے وہ زمانہ
سر پر انھیں کا سایہ اب تک رواں دواں ہے
میں جس کو ڈھونڈتا ہوں وہ لکھنؤ کہاں ہے

جوش و نسیم و چکبست، اپنی ہی سرزمیں کے
اصغر، فراق، حسرت، شیدا اسی حسیں کے
اردو جہاں جہاں ہے، سب خوشہ چیں یہیں کے
جو ذرہ جس جگہ ہے، روشن گہر جہاں ہے
میں جس کو ڈھونڈتا ہوں وہ لکھنؤ کہاں ہے

سالک، مجاز، افسر، سب نقشِ جاوداں ہیں
سب اپنے کارواں کے خود میرِ کارواں ہیں
ہے باغ لکھنؤ اک، یہ اس کے باغباں ہیں
ہے کم ضرور پانی چشمہ مگر رواں ہے
میں جس کو ڈھونڈتا ہوں وہ لکھنؤ کہاں ہے

کیا فن تھا کارچوبی، کیا شے تھی جامدانی
ململ کی اور چکن کی، اللہ ری قدردانی
مٹی کے تھے کھلونے، یا شاہ کارِ مانی
پکوان ہیں نہ ویسے، نہ ویسی اب زباں ہے
میں جس کو ڈھونڈتا ہوں وہ لکھنؤ کہاں ہے

کیا رعبِ آصفی تھا، فن میں عمارتوں کے
دروازے جن پہ وا تھے، ساری بشارتوں کے
اختر پیا سے سنیئے، قصے مہارتوں کے
رنگین دم قدم سے جن کے یہ داستاں ہے
میں جس کو ڈھونڈتا ہوں وہ لکھنؤ کہاں ہے

— عُمیر انصاری امین آباد لکھنؤ

امامباڑہ مغل صاحبہ
وزیر باغ روڈ، لکھنؤ





لکھنؤ کی دستکاری
اور دستکار

کنگ جارج میڈیکل کالج لکھنؤ

اماباڑہ آصفی (بڑا اماباڑہ) اور مسجد کا ایک منظر رومی گیٹ کے اوپر سے





اسلم محمود
اے ۸۸۵۔ اندرا نگر۔ لکھنؤ

اودھ اور اطراف کی
چند انوکھی اردو مطبوعات

اسلم محمود صاحب ادبی تحقیق میں ایک خاص اہمیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے جتنی کتابوں کا ذکر کیا ہے وہ سب ان کے پاس موجود ہیں، تاہم ان میں سے کچھ کتابیں خاص اہمیت کی حامل نہیں ہیں لیکن زندگی بڑی متنوع ہوتی ہے۔ اسی طرح ادب میں بھی بے شمار گوشے ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض گوشوں سے متعلق کتابیں ان کے ذخیرۂ کتب میں موجود ہیں۔ خصوصاً نثر میں صناعی پر یہ کتابیں بہت اہم ہیں اور ان کو اسلم محمود صاحب کے پاس دیکھا بھی جاسکتا ہے۔

ایڈیٹر

اردو کی پرانی مطبوعات کی ابھی تک کوئی اہم وضاحتی فہرست نہیں چھپی ہے۔ اشاعت گھروں کی فہرستیں بیشتر بے ترتیب چھاپی گئی ہیں کتاب یا مصنف کے نام سے اکثر موضوع کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تاریخ ادب میں جن کتابوں کو جگہ پانا چاہیے ان کا ذکر بالکل غائب رہتا ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ شعری ادب، تذکرۂ ادبا اور علمی نثر کے علاوہ اور کسی موضوع پر کتابوں کو ادب کی تاریخ میں شامل نہیں کیا جاتا۔

بہت سی علمی و ادبی کتابیں ایسی ہیں جو اردو ادب کی کڑی ہیں لیکن سرسری طور سے ان کے بارے میں لکھ کر بات آگے بڑھائی جاتی ہے۔ وجہ یہ ہوتی ہے کہ مصنف نے کتاب کو دیکھا ہی نہیں اور صرف ناواقف قاری کو مرعوب کرنے یا ببلیوگرافی کو بھاری بنانے کے لیے اس کا نام لیا جاتا ہے اس طرح مصنف اندھیرے میں تیر چلاتا ہے اور متن کے بارے میں اپنی بے بنیاد رائے دے دیتا ہے جو بعد میں دوسرے مصنفین اپنی کتاب میں نقل کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک کتاب "نوابی دربار" تھی جس کو نثر کی کتاب سمجھ کر کئی لوگوں نے حوالہ دیا۔ جب یہ کتاب چند سال پیشتر دوبارہ چھپی تو معلوم ہوا کہ نثری قصہ نہیں ڈراما ہے۔

نول کشور پریس لکھنؤ، حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی اور صدیق بک ڈپو لکھنؤ نے کتابوں کی طویل فہرستیں چھاپی تھیں جن میں کتابوں کو موضوع وار تقسیم کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ حالی پبلشنگ ہاؤس کی فہرست میں ادیبوں کی تصویریں بھی شامل تھیں۔ یہ اردو میں غالباً اپنی قسم کی پہلی کوشش تھی اور اس کے بعد شاید اردو میں کوئی ایسی فہرست نہیں چھپی، جس میں تصویریں اتنی تعداد میں دی ہوں۔ اب یہ فہرستیں بھی بالکل نایاب ہیں۔

انگریزی اور دوسرے مغربی اشاعت خانوں کا عام رواج ہے کہ آنے والی کتابوں کی وضاحتی فہرست سال میں دوبار یعنی بہار (مارچ، اپریل) اور خزاں (ستمبر، اکتوبر) میں شائع کرتے ہیں۔ زیادہ تر کتابوں کا سرورق یا مصنفوں کی تصویریں موضوع وار درج رہتی ہیں۔ کوشش یہ بھی رہتی ہے کہ متن کی خصوصیت اور مختصر سا کسی تبصرے سے اقتباس نمائندہ چھپنے والی کتابوں پر شامل ہو۔ یہ فہرستیں عمدہ کاغذ پر دیدہ زیب طریقے سے اور بہت سلیقے سے شائع ہوتی ہیں۔

اردو میں اچھی فہرستوں کی کوتاہی نجی طور پر کتابوں کو چھاپنے کی روش اور قاری کی عدم دل چسپی سے بہت سی اہم کتابیں

گمنامی میں پڑی ہیں اور اچھا حصّہ تو اُن کا ناپید ہو گیا ہے۔ کیا نایاب کتابوں کے کتب فروش بھی عنقا ہوتے جا رہے ہیں جس بے احتیاطی سے اُردو والوں کے گھروں میں کتابیں رہتی ہیں اس کو دیکھتے ہوئے یہ حیرت کی بات ہے کہ اب بھی کبھی کبھی بازار میں انیسویں صدی کی چھپی ہوئی کچھ کتابیں نظر آجاتی ہیں کیوں کہ انفرادی طور پر اُردو کتابیں جمع کرنے والے بہت کم ہیں اس لیے زیادہ خرید لائبریریوں میں ہی ہوتی ہے۔ لائبریریوں کے لیے خریدنے والے عام طور سے یا تو واقفیت زیادہ نہیں رکھتے اور یا پھر دلچسپی نہیں لیتے۔ شعری مجموعوں، ناول، افسانے اور عام ادبی و علمی کتابوں کے علاوہ ایسے اہم موضوعات جیسے صنعت و حرفت، لطائف، خطاطی و موسیقی وغیرہ پر کتابیں مشکل ہی سے خریدی جاتی ہیں۔ خدا بھلا کرے ان ناواقف کاروں کا، کہ ہم جیسوں کو بھی اس دریا میں ہاتھ ڈالنے کا موقع مل جاتا ہے اور چند ڈگر سے ہٹی کتابیں ہم کو بھی مل جاتی ہیں۔

ان ہی میں سے پندرہ بھولی بسری کتابوں کا مختصر جائزہ آگے لیا جائے گا۔ یہ کتابیں کسی نہ کسی اعتبار سے اہم ہیں لیکن بہر حال گمنامی میں پڑی ہیں۔ زیادہ تر ان میں نایاب ہیں اور ان کا کسی بھی قیمت پر ملنا اگر ناممکن نہیں تو آسان بھی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس انتخاب میں بعض ایسی کتابیں بھی ہیں جن کو اپنی خصوصیت کی بنا پر اہمیت دینے کی ضرورت ہے۔

(۱) آتش خانہ یا خمار کیفیات

مصنف: خاؔم۔ مطبع کا نام اور مقام اشاعت درج نہیں

۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء صفحات ۹۶، ۷ رنگین تصاویر

"آتش خانہ" ایک سو پچاس اشعار کی نظم ہے جو عورتوں کے پستان کی تعریف میں ۱۹۳۸ء میں کہی گئی تھی۔

اسی انداز کی ایک غزل شیخ امداد علی بحر لکھنوی کے دیوان میں بھی ملتی ہے مگر خاؔم کی یہ نظم اسی طور پر ڈیڑھ سو اشعار پورے کرتی ہے۔

اس نظم کی تقریظ جگر مراد آبادی نے لکھی ہے جو فرماتے ہیں کہ وہ مُصنّف کے تعارف سے زیادہ نظم کو ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ نظم کتابی شکل میں جیبی سائز پر چھپی تھی۔ آتی چھوٹی کہ قمیص کی جیب میں آسانی سے آجائے۔ کتاب میں سات رنگین تصویریں عورتوں کی ہیں، لیکن معمولی آرٹ کا نمونہ ہیں۔ کتاب غالباً بازار میں نہیں آئی اور مصنف نے صرف اپنے حلقۂ احباب میں تقسیم کی تھی۔

سوال یہ ہے کہ اس عجیب نظم کا خالق کون تھا۔؟ فرضی نام "خاؔم" کتاب پر پڑا ہے۔ اس نام کے حروف تہجی 'خ'، 'الف' اور 'م'، ہیں یعنی الٹا پڑھنے سے 'م'، 'الف' اور 'خ' ہوتے ہیں، اسی سے نظم کے شاعر کا نام نکلتا ہے یعنی محمد اصطفےٰ خاں جو عطریات کے مشہور کارخانے اصغر علی محمد علی کے مالک تھے۔ شاعری میں محمد اصطفےٰ خاں اصطفےٰ لکھنوی سید عبدالحکیم سیؔف شاہجہاں پوری کے شاگرد تھے۔ اصطفےٰ لکھنوی کا ایک مجموعہ کلام "آئینہ" کے نام سے بھی چھپا ہے۔

"آتش خانہ" ایک ایسی کتاب ہے جس کے بارے میں شاید اب بہت کم لوگ جانتے ہوں گے۔ یہ کتاب بالکل نایاب ہے یہاں تک کہ اصطفےٰ خاں کے پوتے جو حیات ہیں ان کے پاس بھی نہیں ہے اور نہ ہی انھیں اس کا علم تھا۔ جہاں تک میرے محدود مطالعے کا تعلق ہے میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ کسی اور زبان میں اس نوعیت کی کتاب نہیں چھپی ہے۔

(۲) انتخاب نقص

مصنف: ابو محمد عبدالغفور خاں نسّاخ مطبع نظامی کان پور

ماہ محرم ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۹ء۔ صفحات ۳۲

یہ رسالہ اعتراضات کلام مرزا سلامت علی دبیؔر و میر ببر علی انیؔس پر مبنی ہے۔ جب ان مشہور شاعروں کا کلام طبع ہوا تو اس میں مصنف نے

"عجب طرح کا بے ربط پایا، چیانی معنی اور اسلوب ترکیب اور مراعات الفاظ ایک طرف، بعض اشعار کے وزن و قافیہ و ردیف میں بھی فتور نظر آیا۔ معلوم ہوا کہ ماہرین فن جو اُن کے کلام میں سلامتی سقم سے خاموش تھے 'بے جا نہ تھا اور گاہ گاہ' راقم کو جو شبہات سُننے میں واقع ہوئے تھے، اصل سے خالی نہ تھے۔"

مرزا دبیؔر کے کلام کو نسّاخ نے پہلے نشانہ بنایا ہے۔ مثال کے طور پر یہ مصرعے لیجئے:

وہ تیغیں ذوالفقار کے فقروں میں آگئیں

جوہر کی تنگ چشمی سے آنکھیں چرا گئیں
یکسر شکستِ فاش سرِ دست کھا گئیں
تھیں آپ کم حیا کہ عرق میں نہا گئیں

ناسخ نے یہاں اعتراض یوں کیا ہے :-

"کم حیا ہو کر عرق میں نہانا کیا معنی ؟ کیوں کہ عرق لازمۂ خجالت ہے اور خجالت اس کو ہوتی ہے جس کو حیا ہو۔ لہٰذا اگر باحیا لکھتے تو معنی درست ہوتے لیکن یہ بھی استادی کے خلاف تھا۔"

دبیر کے اِن مصرعوں میں بھی دلچسپ نقص نکالا ہے :

آنکھوں کی تری روغنِ بادام سے بہتر
عارض کا پسینہ ہے گلابِ گلِ احمر

ناسخ لکھتے ہیں :

گلابِ گل کسی کو نہ کہتے سُنا نہ لکھتے دیکھا۔ اس کی سند چاہیئے۔ البتہ بعضے عوام بے سواد شبِ برات و شبِ قدر کی رات اور آبِ زمزم کا پانی بولتے ہیں — گلابِ گل بھی اسی قسم میں داخل ہے۔"

اغلاطِ مرثیہ میر انیس ۲۳ کے آخر سے شروع ہوتے ہیں۔ انیس کے اِن مصرعوں پر بھی ناسخ کو اعتراض ہے :

یہ سُن کے ضعیفہ کا لگا کانپنے اندام
بولی یہ بھلا آنے کا ہے کون سا ہنگام

ناسخ سمجھاتے ہیں کہ :

" خوف اور ہراس کی جگہ اندام کانپنے لگے بصیغۂ جمع بولا جاتا ہے اور جہاں اندام کا بافراد مذکور ہوتا ہے اس سے اور ہی اندام مُراد ہوتا ہے "۔

جب " انتخابِ نقص " چھپی تو لکھنؤ میں ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ کسی کو یہ گوارا نہ تھا کہ ناسخ جیسا بنگال کا رہنے والا لکھنؤ کے شعراء پر انگلیاں اُٹھائے نتیجہ یہ ہوا کہ جوابی کتابیں چھپیں اور ایک ادبی معرکے کی صورت اختیار کر لی۔ لکھنوی جوابوں پر کتابیں سامنے آئیں :

● تطہیر الاوساخ، لنسخ النّاسخ - مرزا محمد رضا تجز (شاگرد شیخ ناسخ)

مطبع شعلۂ طور کان پور - ۲ رمضان ۱۲۹۶ھ صفحات ۱۵۱

● گستاخی معاف - سید مرتضیٰ گستاخ امروہوی

مطبع شعلۂ طور کان پور ۲۵ رمضان ۱۲۹۶ھ صفحات ۸۰

● تفضیح - آغا علی

اودھ پریس لکھنؤ - ۱۲۹۹ھ صفحات ۲۳۸

● مسکتِ شائستہ - مظفر علی ہنر (یہ کتاب چھپی مگر ضائع ہو گئی صرف اس کی تقریظ باقی رہی جو الگ سے چھپی)۔

● تقریظ مُسکتِ شائستہ - سید محمد تقی فیض لکھنوی

مطبع قادریہ عمر محمد ناخدا، کلکتہ ۱۳۰۱ھ - صفحات ۲۸

● سنانِ دل خراش - سید محمد اسماعیل حسین منیر شکوہ آبادی - یہ کتاب قلمی ہے لیکن معجز نے اپنی کتاب میں اس سے کام لیا ہے۔

ناسخ کے ایک شاگرد عصمت اللہ الشخ نے بھی اپنے استاد کی طرفداری میں ایک کتاب " طومار اغلاط " آگرہ سے ۱۲۹۰ھ میں شائع کی۔

" انتخابِ نقص " اُردو کے ادبی معرکوں کی ایک اہم کڑی ہے لیکن یہ تقریباً یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ کم از کم اس صدی میں شاید ہی کسی اُردو ادیب نے اس کتاب کی زیارت کی ہو۔ بہت سے ادیبوں نے صرف حوالہ دیا ہے اور وہ بھی اس معرکے کی دوسری کتابوں سے جن میں " انتخابِ نقص " کی عبارتیں نقل کی گئی ہیں اس لئے کہ یہ کتاب قطعی نایاب ہے گو کہ تاریخِ اردو ادب میں اس کتاب کو جگہ دی گئی ہے۔

(۳) بادشاہ نامہ

مصنف : نواب صدر محل صدر - مطبع سلطانی، کلکتہ

ذیقعدہ ۱۲۸۸ھ / ۱۸۷۲ء صفحات ۲۰۲

یہ نواب صدر محل صدر جو بادشاہ اودھ واجد علی شاہ کی منکوحہ بیگم تھیں، کا دیوان ہے۔ اس میں کل ۱۷۷ غزلیں ہیں۔ اس دیوان کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر غزل کے ہر شعر میں واجد علی شاہ اختر کی تعریف ہے اور کسی نہ کسی طور سے ان کا نام یا خطاب آتا ہے۔ اپنے رنگ کا عجیب دیوان ہے۔

چند اشعار حاضر ہیں ؎

بڑھا رتبہ شہِ واجد علی کا　　بجے ڈنکا شہِ واجد علی کا

حسین سبزہ رو غنچہ دہن محفل میں حاضر ہیں
پھلا پھولا ہوا سارا چمن ہے جانِ عالم کا

زندگی بھر یہ حلاوت یہ مزا باقی رہا　　جان ہاتھ آئی کہ پایا اُلفتِ اختر میں خط

دیکھو یہ سامنے کا نشانہ نہ چوکتا
دل پر ہمارے تیر لگاؤ شہِ اودھ

" آتش خانہ " کی طرح یہ کتاب بھی اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے جس میں ہر شعر میں معشوق اپنے محبوب کا نام لیتا ہے۔ دوسری زبانوں میں شاید اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔

(۴) تحریرِ عاشق

مصنفہ : نواب بیگم عرف چھوٹی بیگم حجاب۔ مطبع حسینی اثنا عشری لکھنؤ۔ جمادی الثانی ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳ء صفحات ۸۰۔

یہ حیرت کی بات ہے کہ اگر ہم انیسویں صدی میں چھپے اُردو دواوین شاعرات کا جائزہ لیں تو ایک درجن سے زیادہ ہرگز موجود نہیں۔ بدقسمتی سے شاعرات کا کلام سنجیدگی سے نہیں دیکھا جاتا تھا اور یہ غلط فہمی آج تک رائج ہے کہ خواتین اپنا کلام دوسروں سے کہلواتی ہیں۔ کچھ شاعرات پر یہ الزام شاید صحیح ہو مگر یہ تو بہت سے شاعروں پر بھی عائد ہو سکتا ہے۔ شاعرات کے خلاف اس تعصب ہی کی وجہ سے اُردو ادب میں کوئی بہت بڑی شاعرہ نہ ہوئی تھی۔

حجاب کا دیوان " تحریرِ عاشق " شاعراتِ اُردو کے اولین مطبوعہ دواوین میں سے ہے۔ ہر غزل کی ابتدا میں بحر اور وزن درج ہیں۔ حجاب کے والد کا نام داروغہ اعظم علی خاں دیا ہے اور شاعرہ کا لکھنؤ سے تعلق تھا۔

نمونے کے چند اشعار یہ ہیں ؎

جب ہم نے تجھی سے تری الفت کو چھپایا
پھر اور کے آگے ہمیں اظہار سے مطلب

ڈیوڑھی پہ حجاب اس کے ہیں درباں کی طرح ہم
دربار سے ہے کام نہ سرکار سے مطلب

آگے سے بھی ہے زیادہ بے قراری اِن دنوں
شکل پہچانی نہیں جاتی ہماری اِن دنوں

عزت تو کیسی، دیتے ہیں ذلت مجھے حضور
یہ آپ آپ، آپ کی تو تو سے کم نہیں

اشکِ غم حدتِ دوزخ کو بھلا دیتا ہے
گرچہ پانی ہے مگر آگ لگا دیتا ہے

(۵) تعلیم النستعلیق

مصنف : شیخ عابد علی الہ آبادی۔ مطبع آصفی کان پور ۱۸۶۲ء
صفحات ۸

نستعلیق طرزِ خطاطی پر یہ مختصر ترین رسالہ اُردو میں پہلی مطبوعہ کوشش ہے۔ مصنف نے لکھا ہے کہ حروف نستعلیق میں بکثرت چھپی وصلیوں سے اگر کوئی اہلِ شوق طرزِ تحریر حروف کی تعلیم حاصل کرنا چاہے تو خوش خط تو لکھ لے گا مگر استادوں کے قواعد و ضوابط سے بے بہرہ رہے گا۔ شیخ عابد علی خلف شیخ ذاکر علی انصاری الہ آبادی نے یہ رسالہ بابو مادھو پرشاد، تحصیل دار کھاگا، ضلع فتحپور کی فرمائش پر لکھا تھا۔

اس رسالے میں فنِ نستعلیق نویسی کے اصول و ضوابط بتائے گئے ہیں۔ اس میں تاریخ خط نستعلیق، اس کے موجد اور ان کے شاگردوں کا بھی تذکرہ ہے۔ اس خط کی دو قسموں یعنی بیضاوی اور آفتابی کی تفصیل اور قواعد بیان کیے گئے ہیں۔ قلم کی ساخت سے لے کر حروف " الف " سے " ے " تک کے خوش خط لکھنے کے طریقے کو بھی سلیقے سے پیش کیا گیا ہے۔ آخر میں مختصر انداز میں خطوطِ طلسمات و عملیات کو بھی داخل کیا گیا ہے۔

۱۸۶۲ء سے قبل کی کوئی اور چھپی کتاب اس فن پر اردو میں نہیں ملتی۔ اس کتابچے کا کہیں ذکر نہیں ملتا اور نہ ہی اسلامی خطاطی کی تاریخ میں کوئی حوالہ۔ کتب خانوں میں بھی یہ بالکل غائب ہے۔

(۶) خزینۃ الامثال

مصنف : سید حسین شاہ حقیقت مطبع مصطفائی کان پور
محرم ۱۲۷۰ھ صفحات ۲۲۴

یہ عربی فارسی و اُردو ضرب الامثال کا مجموعہ ہے جس کو سید حسین شاہ

حقیقت کے انتقال کے بعد ان کے فرزند سید محسن علی (صاحب تذکرہ سراپا سخن) نے چھپوایا۔ حقیقت کی وفات ۱۲۴۹ھ مطابق ۱۸۳۳-۳۴ عیسوی میں ہوئی۔ اور یہ کتاب محرم ۱۲۷۰ھ مطابق اکتوبر ۱۸۵۳ء میں شائع ہوئی۔ یہ اُردو ضرب الامثال پر ایک ہندستانی کی مرتب کی ہوئی تیسری مطبوعہ کتاب تھی۔ اس صنف کی پہلی مطبوعہ کتاب "شمس البیان فی مصطلاحات الہندوستان" تھی جس کو مرزا محمد اسماعیل عرف مرزا جان تپش دہلوی نے مرتب کیا اور مطبع آفتاب عالم تاب مرشد آباد سے ۱۲۶۵ھ مطابق ۱۸۴۹-۱۸۴۸ء میں پہلی بار چھپی۔ تپش دہلوی کی وفات شعبان ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء کے کچھ عرصے بعد ہوئی۔ اس سلسلے کی دوسری مطبوعہ کتاب حقیقت ہی کی "صنم کدۂ چین" تھی جس کا ذکر آگے آئے گا۔

اسی کتاب میں فارسی کی مشہور مثل یوں درج ہے:

کبوتر با کبوتر قاز با قاز　　کند ہم جنس با ہم جنس پرواز

کیوں کہ قاز غول میں اڑتے ہیں اور باز غول میں نہیں اڑتے اس لیے مثل کی یہ شکل زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

اُردو مثلوں کے چند نمونے درج کیے جاتے ہیں:

- دشمنوں میں یوں رہیئے جیسے بتیس دانتوں میں زبان
- رات تھوڑی سانگ بہت۔ خلق کا حلق کس نے بند کیا ہے۔
- سسکتے گئے بلکتے آئے۔ بالے پن کی عاشقی گلے پڑے زنجیر۔

تقریباً ڈیڑھ سو سال پُرانا یہ ضرب الامثال کا ذخیرہ نہایت اہم ہے دوسری بار یہ مطبع نول کشور لکھنؤ سے ۱۸۷۲ء میں چھپا۔ پھر یہ بالکل نایاب ہوگیا۔ خوش قسمتی سے تیسری بار ۱۹۸۶ء میں مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد (پاکستان) سے شائع ہوا۔ بعد کے مرتب مثلوں کے مجموعوں پر حقیقت کے انتخاب کو فوقیت حاصل ہے۔

(۷) درخت خرد

مصنف: قمر علی۔ مطبع فیضی بریلی

سنہ اشاعت درج نہیں　صفحات ۴۸

یہ کتاب صنعت مقلوب میں اُردو میں پہلی اور ابھی تک آخری کتاب ہے۔ صنعت مقلوب کو انگریزی میں PALINDROME کہتے ہیں یعنی وہ لفظ یا جملہ جو اُلٹا پڑھنے سے بھی وہی رہتا ہے جو سیدھا پڑھنے میں جیسا کہ اس کتاب کے نام "درخت خرد" سے ظاہر ہے۔ مصنف قمر علی مرحوم بریلی میں ایڈوکیٹ تھے۔

اس کتاب میں ایک فرضی بزرگ کا قصہ ہے جن کا نام قلق ہے یہ صاحب بات چیت میں صرف صنعت مقلوب[1] میں جملے استعمال کرتے ہیں۔ کچھ دل چسپ نمونے یہ ہیں:

- نام رب کا اکبر مان ـــ تیری خیریت
- ہائے وہ تو فوت ہوئے آہ۔ اے اہل حرم مرحلہ آیا
- یہ بلاغت غالب ہے ـــ یہ یک بات کتاب کی ہے
- لے بابا ابابیل ـــ رکن بن کر
- اے اہل فاقہ قافلہ آیا ـــ شاباش
- یہ نان ہے یہ کیک ہے ـــ یہ شکل دل کش ہے
- یہ ولایتی اُلو ہے ـــ لا مورا رومال

کتاب پر چھپا ہے کہ ایک ہزار کاپیاں اس کتاب کی چھپیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لگ بھگ پچاس برس قبل شائع ہوئی تھی لیکن اب کہیں بھی دستیاب نہیں۔

(۸) دستور الملاقات

مصنف: جواہر سنگھ جوہر لکھنوی۔ مطبع خاص علوی محمد علی بخش خاں (مقام اشاعت درج نہیں) سنہ اشاعت درج نہیں۔ صفحات ۳۴۴

"دستور الملاقات" تقریباً سو فرضی ملاقاتوں پر مشتمل ہے ہر گفتگو دو شخصوں کے درمیان ہے۔ سماج کے مختلف افراد ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہیں جیسے ہندو مسلمان سے، شیعہ سنی سے، استاد شاگرد سے، عالم جاہل سے، سخی جورس سے، ملحد خدا پرست سے، باپ بیٹے سے، مرشد پیر سے، حکیم مریض سے، مومن مجتہد العصر سے، کاشتکار تحصیل دار سے اور ایک نواب وثیقہ دار مہاجن سے قرض لینے کے لئے۔ غرض یہ کتاب ایسی ہی ملاقاتوں سے بھری پڑی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جو مکالمے اور طریقۂ گفتگو اختیار کیا گیا ہے وہ

---

[1] شاعری میں یہ صنعت مرزا دبیر اور میر انیس کے یہاں خصوصاً ملتی ہے۔

ان ہی افراد کے حسبِ مراتب ہے۔ ان ملاقاتوں سے اس زمانے کے آداب وتہذیبِ ملاقات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ شاعر وادیب کے مکالموں میں اردو زبان کے قواعد کے دریا بہاکر زبان پر دسترس کا ثبوت دیا گیا ہے اور زبان کے رموز ونکات کی تعلیم دی گئی ہے۔ "دستور الملاقات" معلوماتِ ادب وغیرہ کا ایک انمول خزانہ ہے جو ملاقاتوں کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے اور ثابت کرتا ہے کہ جواہر سنگھ جوہر یقیناً ایک غیر معمولی آدمی تھے۔

جواہر سنگھ جوہر لکھنوی ناطق مکرانی کے شاگرد تھے۔ یہ کتاب حسبِ ارشاد مہاراجہ ڈگ بجے سنگھ والی بلرام پور وتلسی پور وچردہ تحریر کی گئی تھی۔ اس میں ایڈورڈ ہفتم کا اس وقت کا ذکر ہے جب وہ پرنس آف ویلز تھے اور عہد وکٹوریہ میں ہندستان آئے تھے۔ ایک مجلس کا بھی ذکر ہے جس میں آغا حسن امانت لکھنوی نے مرثیہ پڑھا تھا۔ گو کہ کتاب پر سنہ طباعت درج نہیں ہے لیکن اس کی اشاعت ۱۸۷۵ء کے آس پاس کی لگتی ہے۔

ملاقات کے آداب پر خاص طور سے نسوانی تعلیم کے سلسلے میں اُردو میں کئی کتابیں ہیں لیکن گفتگو کے نمونوں پر اپنے انداز کی پہلی فیخم کتاب "دستور الملاقات" ہے جو پڑھنے میں دلچسپ اور مفید ہے۔

(۹) دیوانِ چرکین

مصنف: شیخ باقر علی چرکینؔ
مطبع کا نام اور مقامِ اشاعت درج نہیں۔
۱۲۷۳ھ صفحات ۳۲

یہ چرکین کے دیوان کا پہلا ایڈیشن ہے۔ دیوان حوض وحاشیے میں چھپا ہے۔ سرورق اور ترقیمہ میں مطبع کا نام درج نہیں کیا گیا ہے البتہ کاتب کا نام چیت رام ہے جس کا قطعۂ تاریخ طباعتِ دیوان کتاب کے آخری صفحے پر شامل ہے۔ ایک قطعۂ تاریخ میر یار علی جان صاحب ریختی گو کا بھی ہے جس کے ذیل کے مصرعِ تاریخ سے سال ۱۲۷۳ھ نکلتا ہے:

"سُنا بی جان باجی کل چھپا چرکین کا نسخہ"

یہ دیوان ۱۲۷۳ھ مطابق ۵۷-۱۸۵۶ء کا چھپا ہوا ہے اور قیاس ہے کہ لکھنؤ میں "غدر" سے کچھ قبل چھپا ہوگا۔ اس میں یہ بھی ذکر ہے کہ:

"عرصہ پچیس برس کا ہوا کہ مصنف لکھنؤ سے زیارتِ کربلائے معلّیٰ کے لئے روانہ ہوئے تھے اور دورانِ سفر جہاز اختلاف آب و ہوا سے بیمار ہوئے، کسی جزیرے پر جہاز روکا گیا اور وہاں کے 'ایک انگوری باغ' میں چرکین کی موت ہوئی۔ صاحبِ باغ نے رحم کھاکر دفن فرمایا۔"

چرکین غالباً دنیا کا واحد شاعر ہے جس نے بول وبراز کے متعلق شاعری کو اپنی فکر کا موضوع بنایا اور اس میدان میں جولانیِ طبع دکھائی۔ اس رنگ میں اٹھارھویں صدی کے انگریزی ادیب جون ایتھن سوئفٹ (JONATHAN SWIFT) نے بھی تھوڑی بہت شاعری کی تھی۔ لیکن چرکین کے صاحبِ کمال ہونے میں شک نہیں۔ کلام کے نمونے آزادی کے ساتھ نہیں دیئے جاسکتے۔

اس "دیوان چرکین" کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بیشتر کلام ایسا ہے جو بعد کے عام بازاری ایڈیشنوں میں نہیں ہے یا حذف کر دیا گیا ہے ہاں کچھ قلمی نسخوں میں اس دیوان سے زیادہ بھی کلام ملتا ہے۔ یہ المیہ ہے کہ چرکین ایسے عجیب وغریب شاعر کو مکمل طور سے نظر انداز کر دیا گیا ہے اور اُردو میں شاید سنجیدگی سے کوئی مضمون بھی اس پر نہیں چھپا۔

(۱۰) رسالہ آئینِ بدر سازی

مصنف: محمد علی بدر ساز مطبع مشرق الانوار لکھنؤ
سنہ اشاعت درج نہیں۔ صفحات ۸ اور ۳۱ تصاویر

بدری ظروف دکن میں بیدر اور اس کے اطراف میں بنائے جاتے ہیں۔ اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ (م ۱۷۹۸ء) کے عہد میں بھی اس کام کی ترقی ہوئی مگر کاریگر باہر سے آئے تھے۔ بدری ظروف سیہ فام ہوتے ہیں اور ان پر چاندی کا کام پیوست ہوتا ہے۔ بنیادی دھات جستہ، سیسہ وتانبہ وغیرہ ملاکر بنتی ہے اور برتنوں کو مٹی کے سانچوں میں ڈھالا جاتا ہے، ڈھلے برتن پر تین قسم کے آہنی قلموں سے کھود کر چاندی کی پتی یا تار کو بٹھاتے ہیں تاکہ پھول یا ڈیزائن وغیرہ بن جائیں۔ کئی چیزوں سے برتن کو رگڑا جاتا ہے جس سے جستہ کالا ہوتا ہے اور چاندی صاف

ہوتی ہے۔ نوسادر، پُرانی دیوار کی لونی مٹی اور قلمی شورے کو پانی میں اُبال کر پُچارے سے برتن پر خوب پھیرتے ہیں اور بعد میں صاف پانی سے دھو ڈالتے ہیں۔

یہ رسالہ بڑے سائز پر چھپا ہے اور طباعت انیسویں صدی کی معلوم ہوتی ہے۔ بدری ظروف بنانے پر شروع میں دو صفحات ہیں پھر اکانوے ظروف وزر بلند جیسے: صُراحی، تھالی، کاغذ تراش، آب خورا، حقہ، پیچوان، گڑگڑی، اگالدان، خاصدان، گملا، مُہنال، رکابی اور پیالی وغیرہ کی فہرست۔ اس میں ناپ، کیفیت اور قیمت درج ہیں۔ کتاب میں بڑے پیمانے پر پورے صفحے اور بعض دوہرے صفحات (جو موڑ دیئے گئے ہیں) پر ۲۹ خوبصورت برتنوں کی تصویریں بھی شامل ہیں۔ یہ بھی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف محمد علی بدرساز کو ۱۸۸۱ء اور ۱۸۸۴ء کے درمیان لکھنؤ، کلکتہ اور جے پور کی صنعتی نمائشوں میں تمغے بھی ملے تھے جو ان کے کامل استاد ہونے کا ثبوت ہے۔

اُردو میں یہ کتاب صنعتی آرٹ پر گنی چُنی کتابوں میں سے ہے اور خصوصاً بدرسازی کے بارے میں شاید واحد کتاب ہے۔ اب یہ کتاب گمشدہ اور ناپید ہے۔

(۱۱) رسالہ بٹیر بازی

مصنف: مرزا محمد وزیر بیگ رعایت لکھنوی

مطبع اعجاز محمدی لکھنؤ۔ ۱۸۸۸ء صفحات ۱۲

اس رسالے میں مصنف نے خود لکھا ہے کہ فن بٹیر بازی عقلمندوں کے نزدیک بہت خراب ہے اور سوائے دل لگی اور واہ واہ کے کوئی نتیجہ اس سے نہیں نکلتا ہے۔ بہر حال اودھ کے مشاغل میں بٹیر بازی کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے اور یہ کتابچہ اس مشغلے سے متعلق معلومات کا ذریعہ ہے۔

اس رسالے کے مطابق بٹیر قدآور، بڑی چونچ، چوڑا سینہ اور باریک پَروالا اچھا مانا گیا ہے۔ بٹیروں کو پہچاننے کے طریقے دیئے ہیں۔ بٹیر کی بیماریوں کے علاج کے نسخے بھی فراہم کیے ہیں۔ بیماریوں میں بلغم، لاغری، کھانسی اور ہچکی وغیرہ بھی شامل ہیں۔ بہت کم لوگ اب فن بٹیر بازی سے واقف ہیں اور یہ نایاب رسالہ ایک خاص تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔

(۱۲) سُداما (مثنوی)

مصنف: لچھمن پرشاد صدر لکھنوی مطبع بہار اودھ لکھنؤ

۱۹۲۹ء صفحات ۱۶

یہ مختصر مثنوی غیر منقوط لکھی گئی ہے۔ خوبی یہ ہے کہ حرف "ی" یا "ے" بھی کہیں استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ ۱۹۹۱ء میں "مرصع حلم" کے نام سے سید وقار الحسنین حلم بنگلوری کا غیر منقوط دیوان چھپا ہے مگر شاعر صاحب 'ی' اور 'ے' کے استعمال سے بچ نہ سکے۔

مثنوی کرشن جی کے بچپن کے مفلس دوست سُداما پر ہے جو اپنی بیوی کے کہنے پر اپنے ہم مکتب کرشن جی کے پاس اپنی حالت پیش کرنے کے تحفے میں کچھ چاول لے کر جاتے ہیں۔ کرشن جی کہتے ہیں کہ اپنی زوجہ کی دی ہوئی سوغات جو تمہارے پاس موجود ہے ہم کو دو۔ ایک بار چاول کھا کر کرشن جی نے ایک عالم کی دولت بخش دی اور دوبارہ کھانے پر دوسرے عالم کی دولت عطا کی۔ تیسری بار چاول کھانے جا رہے تھے کہ کرشن جی کی بیوی رکمنی جی نے ان کی کلائی تھام لی۔ سداما کرشن جی سے کچھ نہیں مانگتے اور اپنے گھر واپس لوٹتے ہیں جہاں ان کا جھونپڑا غائب ہے اور اس کی جگہ ایک بلند محل ان کے لیے تیار کھڑا ہے۔

صدر لکھنوی وہی ہیں جن کی اُردو میں منظوم گیتا مشہور ہے۔ مثنوی "سُداما" کی زبان ثقیل اور غیر مانوس ہے۔ یہ کوشش ایک ادبی ریاضت ہے کیوں کہ اُردو حروف تہجی کے تقریباً بیس منقوط حروف کو ترک کرنا پڑا ہے۔ اگرچہ بعض مرثیے اور غزلیں اس صنف میں کہی گئی ہیں لیکن کسی ایک صنف سخن میں یہ غالباً واحد مسلسل اور مستقل کتاب ہے۔

(۱۳) صنمکدۂ چین

مصنف: سید حسین شاہ حقیقت۔ مطبع مصطفائی، کانپور

رجب ۱۲۶۹ھ / ۱۸۵۳ء صفحات ۴۳

حقیقت کی یہ کتاب ان کی دوسری تصنیف "خزینۃ الامثال"

سے الگ بوگ چھ ماہ پہلے چھپی تھی۔ اس میں اُردو بھاشا، فارسی اور عربی ضرب الامثال کے علاوہ کبت، دوہے، پہیلیاں اور اشعار بھی ہیں اشعار خود حقیقت، مرزا جعفر علی حسرت، شیخ قلندر بخش جرأت، سید حسن شاہ ضبط (مصنف کے بڑے بھائی) اور مرزا قتیل وغیرہ کے ہیں۔

پکھ کہاوتیں بہت دل چسپ ہیں: ——

—— چار دن کی چاندنی پھر اندھیرا پاکھ

—— جس کے ہاتھ ڈوئی اس کا سب کوئی

—— وہ دن گئے کہ خلیل خاں فاختہ مارتے

دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا مواد بھی بہت پہلے تیار ہو گیا تھا۔ تپش دہلوی کی اس صنف کی کتاب کے بعد یہ اُردو میں ایک ہندستانی کی لکھی ہوئی دوسری مطبوعہ کتاب ہے۔ اس کے دوبارہ چھپنے کی، جہاں تک مجھے علم ہے، نوبت نہیں آئی۔ اُردو امثال اور پہیلیوں کی ڈیڑھ سو سال پرانی صورت اس کتاب میں محفوظ ہے۔ کتاب کو اچھے طریقے سے ایڈٹ کر کے چھاپنے کی ضرورت ہے۔

(۱۴) کشف اللّماس فی صبغ اللّباس

مصنف: خواجہ محمد اشرف علی لکھنوی مطبع نامی لکھنؤ

باردوم ۱۸۸۸ء صفحات ۱۶

یہ کتابچہ رنگریزی کے فن پر ہے جس میں رنگوں کی قسمیں، ان کے بنانے کی ترکیبیں اور ان کے شرعی استعمال کو بیان کیا گیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ زیادہ تر رنگ قدرتی یعنی غیر کیمیاوی اجزا سے بنائے گئے ہیں۔ اس کتاب میں کپڑا رنگنے کے تقریباً چالیس رنگوں کو تیار کرنے کے طریقے لکھے ہیں۔ رنگوں کو بنانے میں جو چیزیں ملائی جاتی ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں:

—— گلِ انار کا رنگ: شہاب (جو زعفران سے نکالا جاتا ہے) اور ہلدی کو ملا کر پانی میں جوش دیتے ہیں۔

—— نارنجی رنگ: ہارسنگھار کے پھولوں کو پانی میں اُبالتے ہیں

—— [illegible] رنگ: ہلدی کو آم کی چھال وغیرہ کے ساتھ ملاتے ہیں۔

—— سیاہ رنگ: تخم پنوار سوکھا بھون کر نیل میں ملا کر تیار کرتے ہیں۔

—— طوسی (بھورا) رنگ: ببول کی چھال اور انار کا پھل ملا کر بناتے ہیں۔

—— کاہی (گھاس والا سبز) رنگ: نیل، ہلدی اور انار کا پوست مختلف طریقوں سے استعمال کرتے ہیں

بعض رنگوں کے نام بھی عام واقفیت کے نہیں ہیں جیسے شربتی (ہلکا پیلا)، کرنجوہ (ہلکا بھورا)، کاکریزی (تیز بیگنی) اور کوکئی (سلیٹی) ان کے علاوہ صابری، جیلانی، عاقل خانی اور عباسی رنگوں کا بھی ذکر ہے۔

رنگ سازی اور رنگ ریزی اودھ کے خاص فن تھے اور اس غیر معروف اور نایاب کتاب سے اس صنعت کے رموز کھلتے ہیں۔

(۱۵) معیار الاملا

مصنف: دیبی پرشاد سحر بدایونی۔ پہلی بار: مطبع نظامی کان پور

۱۲۸۴ھ / ۶۸-۱۸۶۷ء صفحات ۱۶

(۱۶) رسالہ معیار الاملا (بعد تصحیح و نظر ثانی)

مصنف: دیبی پرشاد سحر بدایونی دوسری بار: مطبع نول کشور لکھنؤ

۱۸۷۶ء صفحات: ۵۴

کتاب کی ابتدا میں لکھا ہے: "چوں کہ علم رسم الخط و املا کا سیکھنا ہر طالب علم کو اکثر علوم کی تحصیل پر مقدم ہے مگر اس زمانے میں اکثر شخص اس کے قواعد و ضوابط سے محض ناواقف ہیں لہٰذا راقم آثم نے نے اس کے قوانین ضروری کو کتب معتبرہ مثل رسالہ مولوی انور علی صاحب و دیگر کتب لغات مثل غیاث اللغات و برہان قاطع وغیرہ سے جس قدر طلبا فارسی و اُردو کو مفید ہو انتخاب اور ترجمہ کر کر معیار الاملا نام کیا۔"

املا کے اصول سمجھانے کے بعد الفاظ کی طویل فہرست دی ہے چند نمونے دیکھیے:

لفظ غلط العام	صحیح
آتو	آتون
بغیچہ	باغیچہ
تابعدار	تابع

حاطہ	احاطہ	
کچہ	کلچہ (چھوٹی روٹی)	
قطعہ	بفتح	بکسر اوّل و سکون ثانی
مشاط	ضم اوّل	فتح اوّل و ثانی مشدد

لفظ	اعراب غلط	اعراب صحیح
آتش	فتح ثانی	کسر ثانی
برادر	بکسر اوّل	بفتح اوّل
رکاب	بفتح "	بکسر "
سوال	فتح اوّل	ضم اوّل
عربی	بسکون ثانی	بفتح ثانی
عصمت	فتح اوّل	کسر اوّل
عبادت	"	"
عنقا	ضم اوّل	فتح اوّل

سحر بدایونی شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ خطاط بھی تھے۔ انھوں نے اسلامی خطاطی پر "ارژنگ چین" (مطبع نظامی کانپور ۱۲۹۲ھ) اور "نظم پروین" (تیج کمار پریس لکھنؤ۔ ستائیسویں بار ۱۹۶۴ء) کتابیں لکھیں۔ "لطائف ہندی" ان ہی کی کتاب ہے۔

اُردو املا پہ سحر بدایونی کی کتاب اُردو میں اس سلسلے کی اولین تنظیم میں سے ہے جس کے دو ایڈیشن اوپر نوٹ کیے گئے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آج املا و تلفظ کی جو غلطیاں عام ہیں ان میں سے متعدد پرانے زمانے میں بھی عام تھیں۔ اس اہم کتاب کو لوگ بھول چکے ہیں اور شاید ہی کہیں اس کا ذکر ملتا ہو۔ □□

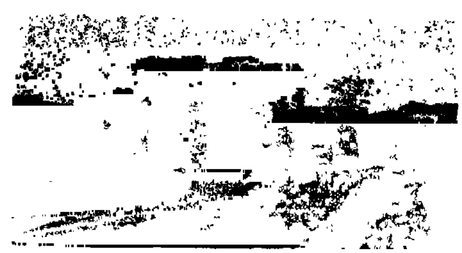
یہ نایاب تصاویر اسلم محمود صاحب نے اپنے گرانقدر مضمون کے ساتھ ارسال کی ہیں جنھیں ہم ان کے شکریہ کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔
ایڈیٹر



محل کا ایک منظر



لکھی گیٹ قیصر باغ لکھنؤ



ریزیڈنسی کا گیٹ



لکھنؤ کا ایک مقبرہ

یوگیش پروینؔ
۸۹۔ غوث نگر۔ لکھنؤ

سلطنتِ اودھ کے غیر مسلم منصب دار

قدیم بھارت اور عہد وسطیٰ کے ہندستان میں کائستھ اعلا عہدوں پر فائز رہے اور درباروں میں اپنی فراست، ذہانت، شعری ملکہ، تحریر و تفکر میں دستگاہ اور اپنی خوش اخلاقی کی وجہ سے ہمیشہ معقولات، ادب فلسفہ، آرٹ، سائنس اور سیاست سبھی شعبوں میں معزز و محترم رہے اور اپنے گہرے نقوش چھوڑے۔

سنسکرت کے مشہور مچھ کٹیٹ کم 'मच्छकतिटकम' کتاب کی تخلیق سے لیکر اودھ کے درباروں تک کائستھوں کا بول بالا رہا۔ وہ بڑی بڑی ریاستوں اور جاگیروں کے مالک بھی رہے ہیں۔ نوابین اودھ کے جد امجد نواب سعادت خاں برہان الملک کے وقت سے لیکر ریاست کے نظم و نسق کے لئے ہندو نائب مقرر کئے جانے لگے۔ اس روایت میں اکثر یہ پایا گیا کہ نوابوں کے بنکرس، بنئے، خزانچی، کھتری اور نائب کائستھ رہے ہیں۔ اپنی خوش اخلاق کے باعث عہد وسطیٰ میں اقتدار میں رہنے کے باوجود کائستھوں کا اسلام قبول کرنا نہ کے برابر رہا ہے۔

اودھ کے نوابوں اور بادشاہوں کے ساتھ کچھ کائستھوں نے بھرپور تعاون کیا ہے۔ اودھ کے پہلے نواب برہان الملک کے دور میں راجہ ہرنرائن کے بیٹے راجہ لکشمی نرائن ان کے سب سے زیادہ معتمد نائب تھے۔ نواب کے انتقال کے بعد راجہ لکشمی نرائن نے نادر شاہ کو سمجھایا اور اسی کی بنا پر نواب کے داماد کو ابو المنصور خاں کا خطاب ملا اور اودھ کے صوبہ دار ہوئے بعد میں صفدر جنگ کے نام سے شہرت پائی۔

نواب سعادت خاں برہان الملک کے دیوان آتما رام تھے۔ ان ہی کے بڑے بیٹے رام نرائن نے فیض آباد میں دلی دروازہ بنوایا۔ ان کے چھوٹے بیٹے مہانرائن نے لکھنؤ کو سنوارا جہاں ان کی رہائش گاہ باغ مہانرائن کے نام سے معروف ہے۔ برہان الملک کے وقت میں حرم کے دارو غہ رائے کیشو رام ہی تھے۔ نواب صفدر جنگ کے ہی نائب راجہ نول رائے کائستھ تھے جو کوڑا خورد تحصیل ملیح آباد لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ نواب صفدر جنگ چونکہ عام طور سے دہلی ہی میں رہا کرتے تھے اس لئے اودھ کا انصرام و انتظام راجہ نول رائے ہی سے متعلق رہا۔

ان کے خاندان کی تاریخ اس طرح ہے کہ شری مہتاب رائے کوڑا خورد تحصیل ملیح آباد کے باشندے تھے اور ان کا خاندان قانون گویان کے نام سے مشہور تھا۔ ان کے لڑکے نول رائے تھے۔ آج بھی کوڑا میں لوگ اس خاندان کو عزت کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ —— نول رائے کی دربار میں رسائی الماس میاں کی مہربانی سے ہوئی تھی۔ شری نول رائے کے بیٹے گلاب رائے اپنے ننہال بانگرمئو ضلع اناؤ چلے گئے اور وہاں شروع سے ہی چکلے دار اور پھر ناظم ہوئے۔

نواب آصف الدولہ کے زمانے میں راجہ ٹکیت رائے کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ امیٹھی سے لگان وصول کریں۔ امیٹھی فیض آباد کے راجہ مان سنگھ کے علاقے میں تھی۔ جب راجہ ٹکیت رائے پہنچے تو راجہ مان سنگھ نے آکر ان کے راکھی باندھ دی۔ کیونکہ وہ برہمن تھے راکھی کے نیگ میں انھوں نے لگان کی معافی مانگ لی۔ اس کے بعد راجہ گلاب رائے کو امیٹھی بھیجا گیا۔ انھوں نے امیٹھی کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور لگان وصول کر لیا اس کے ساتھ ہی ایک فرمان بھی لکھا لیا کہ اب لگان نہیں لیں گے۔ اس بات سے راجہ ددوا کے ناتا راجہ مان سنگھ کے دشمن ہو گئے۔ اور پھر انگریزی حکومت میں راجہ مان سنگھ انگریزوں کے حامی ہوئے تو انھوں نے گلاب رائے کے گھرانے سے بدلہ لے کر زبردست نقصان پہنچایا۔ راجہ نول رائے نے لکھنؤ اور وہاں کے

پنچا نول گنج آباد کیا۔ ان کے بنوائے ہوئے شوالے بیلج آباد اور نول گنج میں موجود ہیں۔ راجہ صاحب نے لکھنؤ میں گومتی پر پہلا پتھر کا پل بنوانا شروع کیا تھا لیکن پل ان کی زندگی میں مکمل نہ ہو سکا کیونکہ وہ اپنی بہادری کے باعث فرخ آباد کے نواب احمد خاں بنگش کے مقابلہ کے لئے بھیجے گئے تھے جہاں وہ شہید ہو گئے۔ نواب صفدر جنگ کے دور حکومت میں راجہ بھگوان داس کو میر منشی بنا کر دلی سے بھیجا گیا تھا۔ انھیں کاکوری پرگنے کے کئی گاؤں اور مہونا جاگیر ملا تھا۔ پھر ان کے چھوٹے بھائی راجہ کشن سنگھ منشی بنے نواب سعادت علی خاں کے دور میں جن کے بیٹے دولت رائے نے آخر تک یہ عہدہ سنبھالا۔ نواب شجاع الدولہ کی فوج میں راجہ شتاب رائے کو اعزازی عہدہ حاصل تھا اسی طرح انگریزوں کے ساتھ لڑائی میں راجہ بینی بہادر نائب صوبہ دار نے نواب کا ساتھ دیا تھا۔

نواب شجاع الدولہ کے ہی دور میں راجہ پورن چند کو ایک رپورٹر کی حیثیت سے رکھا گیا۔ ان کے بیٹے رائے بال کرشن اور داماد جسونت رائے بعد میں نواب آصف الدولہ کے دیوانِ وزارت میں تھے۔ نواب آصف الدولہ کے ہی دور میں مشرقی علاقہ کے منتظم رائے جینی لال کو بنایا گیا تھا۔ یہ رائے پورن چند اور رائے رگھوناتھ پرشاد کے بیٹے تھے۔

راجہ ٹکیت رائے نواب آصف الدولہ کے وزیر مال تھے۔ وہ پٹنہ کے پران ناتھ شریواستو قانون گو خاندان کے تھے جن کا خاندان پہلے ہی گنگا کے کنارے ڈلمؤ میں آباد ہو چکا تھا۔ ابتدا میں وہ بیس واڑہ کے ناظم رہے تھے۔ نواب آصف الدولہ نے انھیں اپنے دربار میں اعزاز دینے کی غرض سے بائیس پارچے کا خلعت دیا تھا۔ راجہ صاحب نواب کے دیوان ہونے کے ساتھ ساتھ اودھ دربار کے وزیر مال بھی تھے اودھ مسند کا وزارت کرنے والوں میں راجہ ٹکیت رائے کا نام سر فہرست لیا جاتا ہے۔

راجہ ٹکیت رائے کے بنوائے مندر، شوالے، ٹھاکر دوارے، مسجد، تالاب، دھرم شالہ گھاٹ اور ان کے نام سے آباد محلے، قصبے بڑی تعداد میں ملتے ہیں۔ انھیں اس زمانے میں ہندو دھرم کا سرپرست محافظ کہا جاتا تھا۔ راجہ صاحب نے پریاگ میں دھرم شالہ اور ٹھکور میں شوالہ بنوایا تھا جو قابلِ دید ہیں۔

راجہ صاحب کی مذہبی وسیع النظری کا ایک جیتا جاگتا نمونہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے بیتوا ندی کے پاس جہاں مندر بنوائے وہاں ایک مسجد بھی تعمیر کروائی۔ اسی طرح لکھنؤ کے حیدر گنج محلہ میں راجہ ٹکیت رائے کی تعمیر کردہ مسجد قابلِ دید ہے۔ مسجد میں اوپر سنگ مرمر کی پٹی پر اُن کی اس تعمیر کی کہانی لکھی ہے۔ اس کے پاس ہی ان کا بنوایا ہوا امام باڑہ بھی تھا۔

آصف الدولہ کے دور میں کچھ مخالفین کی کارستانی کے نتیجہ میں نواب سے ان کی اَن بَن ہو گئی تھی اور کچھ دنوں کے لئے اپنے عہدہ سے ہٹ گئے تھے حالانکہ بعد میں پھر اسی عہدہ پر فائز ہوئے لیکن وہ بات نہ آسکی۔ نواب آصف الدولہ کو مرتے مرتے اس بات کا غم رہا۔

راجہ جھاؤ لال نواب آصف الدولہ کے دوسرے نائب تھے۔ جھاؤ لال نواب شجاع الدولہ کے وقت سے دوابہ میں کام کرتے تھے اودھ کی پرانی راجدھانی میں ہی انھیں خواص و عوام دونوں ہی شفقت احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ نواب بیگم اور بہو بیگم انھیں پیار سے للوجی کہکر پکارتی تھیں جو کہ ان کے گھر کا نام تھا۔ سکسینہ خاندان کے چراغ مہاراجہ جھاؤ لال نے فیض آباد کے خزانہ کی پوری حفاظت کی تھی جبکہ وارن ہیسٹنگ نے اُسے لوٹنے کی کوشش کی تھی۔ (مہاراجہ جھاؤ لال نے اجودھیا کے بیے مذہبی اداروں کا بھی تحفظ کیا۔ وہ اپنی دریا دلی اور مذہبی وقار کی وجہ سے اجودھیا کے لوگوں میں مہاراجہ ہی رائج کہے جاتے تھے)

لکھنؤ بلا کر نواب آصف الدولہ نے پہلے انھیں توپخانے کا داروغہ بنوایا اور میر بخشی کی حیثیت سے ان کے ہاتھوں میں اپنی جاگیروں کا انتظام حوالے کر دیا۔ راجہ صاحب کو دربار سے شاندار خلعت ملا تھا۔ ان کے سفر کے واسطے ہاتھی اور آٹھ کہاروں کی جھالر والی پالکی ملی تھی۔ لکھنؤ میں راجہ کی حویلی مہاراجہ جھاؤ لال کا بنوایا پُل اور ان کے نام کا بازار کسی نہ کسی شکل میں ملتا ہے۔ راجہ صاحب نے بھی قومی یک جہتی کا خیال کرتے ہوئے مندروں کے ساتھ ساتھ امام باڑے و مسجدیں بنوائیں جو ٹھاکر گنج میں موجود ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ نواب کی محنت کا سبب جھاؤ لال کی ان سے علاحدگی تھی۔ یہ علاحدگی شک اور غلط فہمی کی وجہ سے ہوئی تھی۔

رائے کھیم نرائن رند نواب آصف الدولہ کے پاس

ماہانہ پر ملازم ہوئے تھے۔ انھوں نے ۱۰ ہزار اشعار کہے ہیں۔ ہیر را نجھا نل دمینتی (فارسی) اور چہار درویش ان کی مشہور کتابیں ہیں۔

نواب آصف الدولہ کے دور حکومت میں ان کے دوسرے داروغہ نورا آور سنگھ بھی کائستھ تھے اور بینی نرائن ان کے کاتب ہوئے جنھوں نے نواب کے لئے تمام اشعار جمع کئے۔ الماس علی خاں کے دیوان لالہ روشن لال مشہور ہیں جنھوں نے دریاآباد میں کٹرا روشن لال آباد کیا۔ لکھنؤ میں روشن لال کی بارہ دری بھی ہے۔

نواب آصف الدولہ کی دیوانی کچہری میں شری شیولال جی ملازم تھے جن کے انتقال کے بعد ان کے ہی بیٹے بھگوان داس جی کو وہ جگہ دی گئی پھر بریلی کا اہلکار بنا دیا گیا جہاں ان کا قتل ہوگیا۔ ان کے بعد ان کے بیٹے رائے بالک رائے کو نواب آصف الدولہ نے راجہ جھاؤلال کی سربراہی میں ملازمت دے دی۔ نواب سعادت علی خاں کے دربار میں دیوانی کے عہدہ پر تھے۔

راجہ دیاکرشن بال کرشن رائے اور تلسی رام منشی بھولا ناتھ دارالانشاء کے صدر تھے۔ جو بہت خوبصورت لکھتے تھے۔ اس لئے کہ نواب بہترین سواد خط کے دلدادہ تھے۔

نواب سعادت علی خاں کے دور حکومت میں راجہ امرت لال دربار میں ملازم تھے جو بعد میں بادشاہ غازی الدین حیدر کے وقت میں داروغہ دیوان خانہ کے عہدہ پر پہنچ گئے اور انھیں راجہ کا خطاب نصیر الدین حیدر کے وقت میں ملا۔

اس کے بعد بادشاہ کچھ جلنے والوں کے بہکاوے میں آکر ان سے ناراض ہو گئے اور پھر امرت لال نے خود کٹار بھونک کر اپنی جان دیدی تھی۔

ان کے بیٹے رائے مکھن لال انگریزی حکومت کے ذریعہ ڈپٹی کلیکٹر بنائے گئے۔

گرد بخش ادیب کہار تھا لیکن نواب سعادت علی خاں کا منہ لگا تھا۔ اور شعر پڑھ کر سناتا تھا۔

اودھ کے مشہور بادشاہ غازی الدین حیدر کے وزیر اعلیٰ راجہ دیاکرشن ہوئے اور پھر نصیر الدین حیدر کے مشہور دوست اور ریاست کے انتظام کار لالہ رام پرشاد میوہ رام ہوئے جنھیں افتخار الدولہ کے اعزاز سے نوازا گیا تھا۔ راجہ الفت رائے الفت کے بیٹے راجہ ترلوک چندر عرف لال جی بخشی بادشاہ کے دیوان تھے جن کے ذریعہ بخشی کا تالاب بنوایا گیا۔

بادشاہ نصیر الدین حیدر کے وقت میں مہاراج نول کرشن کے لئے راجہ رام نائب دیوانی کے عہدہ پر تھے۔ لائق و فائق بھی تھے۔ تعزیہ داری میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کے بعد راجہ بال کرشن کو یہ عہدہ دیا گیا۔

محمد علی شاہ کے دور حکومت میں بھی راجہ جیالال ان کے نائب ہوئے جو شاعر تھے گلشن تخلص تھا۔ محمد علی شاہ کی بیگم ملکہ جہاں کی جاگیر کے منتظم لکھپت رائے جی تھے۔

اس وقت امجد علی شاہ حکمراں تھے۔ محمد علی شاہ حسین آباد کی عمارتیں ادھوری چھوڑ کر انتقال کر گئے تھے اور ان کی بیوہ بیگم ملکہ جہاں ان کے ادھورے کام پورے کر رہی تھیں۔ ملکہ جہاں صاحبہ کی دیکھ بھال حاجی بشیر نام کا حبشی نسل کا خواجہ سرا کیا کرتا تھا۔ بیگم کے خزانے کی چابیاں بھی اسی کے پاس رہا کرتی تھیں حاجی بشیر نے لکھپت رائے جی کی فراست اور حسن انتظام کی تعریف جب ملکہ جہاں سے کی تو انھوں نے لکھپت رائے جی کو اپنا نائب دیوان بنا لیا۔ اس وقت ملکہ جہاں تحسین گنج میں جامع مسجد کی تعمیر کروا رہی تھیں جو اودھ اسکول کے فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ لالہ لکھپت رائے جی بعد میں بیگم صاحبہ کے دیوان بن گئے۔

۱۸۴۷ء میں حکومت اودھ میں جس وقت واجد علی شاہ کا جلوس ہوا دیوان لکھپت رائے جی گنیش گنج میں اپنا مکان بنوا رہے تھے۔ ان کی ڈیوڑھی کا کچھ حصہ آج بھی باقی ہے جس میں اس وقت کے فن تعمیر کے روشن نقوش مل جاتے ہیں۔

ملکہ جہاں ۱۸۶۰ء میں زیارت کے لئے گئیں اور وہیں سپرد خاک ہوئیں لکھپت رائے جی اسی زمانے میں اپنے بزرگوں کا "شرادھ" کرنے گیا تشریف لے گئے۔

لکھنؤ میں تیجی کھیڑا مہاراجہ بال کرشن کے بیٹے مہاراج تیج کرشن نے بسایا تھا۔ راجہ تیج کرشن کی حویلی بھدیواں کے قریب تھی اور تب وہاں بج نگر کی بستی بھی تھی۔

۱۸۵۷ء میں جان عالم کی طرف سے راجہ بال کرشن انگریزوں سے لڑائی میں شہید ہوئے اس لئے انگریزوں نے اس حویلی کو برباد کر دیا تھا مہاراجہ بال کرشن عیش باغ رام لیلا کے سرپرست تھے ان کے نام سے موہان

روڈ پر مہاراج گنج قصبہ آباد ہے۔ مہاراجہ بال کرشن کی یادگار بال کرشن کا چبوترہ سرائے معالی خاں کے قریب تھا جو اب ایک محلہ ہے۔ منشی جوالا پرشاد، راجہ بیوارام، منشی صاحب رائے خاموش اور خیالی رام خیالؔ واجد علی شاہ کے درباری دانشوروں میں تھے۔

کرشن چند سکسینہ کا خاندان دلی سے آکر نوبستہ لکھنؤ میں آباد ہوا تھا وہ اردو فارسی میں دونوں زبانوں کے شاعر تھے اور مرزا آغا حجو شرف کے شاگرد تھے۔ ان کے آبا و اجداد سب اودھ دربار سے متعلق تھے۔ اسی طرح رائے دولت رام دولتؔ کے والد کا نام گردیال تھا۔ یہ راجہ پڈ چند کے پوتے تھے۔ دولت اودھ دربار کے خاص شاعر تھے اور فارسی کے ممتاز عالم بھگوان داس ہندی کے شاگرد تھے۔

بیگم حضرت محل کے دور حکومت میں مہاراج بال کرشن نے ہی نول گنج کے ساتھ مہاراج گنج کو آباد کیا۔ ان کی بنوائی ہوئی عالیشان عمارتیں ہیں۔ انھوں نے ہی ایک شوالہ کو تعمیر کرایا تھا جس کی خوبصورتی قابل دید ہے۔ ۱۸۵۷ء کی آزادی کی لڑائی میں مہاراجہ شہید ہو گئے۔ ان کی قربانی بے مثال اور یادگار ہے۔ مہاراجہ بال کرشن کا ایک مکان خاص بازار میں تھا اور دوسرا ابھوانی گنج میں تھا۔ ان کے بیٹے راجہ تیج کرشن اور راجہ بہاری لال کو بھی دربار کی جانب سے ۲۲ پارچے کا خلعت ملا تھا۔

واجد علی شاہ کے زمانے میں تو قومی ایکتا کا ستارہ اور بھی بلند ہوا۔ راجہ بال کرشن ان کے وزیر تھے اور راجہ بہاری لال ان کے اچھے دوست۔ ٹھاکر پرشاد جی واجد علی شاہ کے استاد تھے اور انھیں کتھک سکھاتے تھے جب ان کے وزیر علی نقی نے ایک ہندو بیوہ کی زمین ٹھاکر گنج میں ضبط کرلی تو انھوں نے اس کی زمین واپس دلاکر اس غریب کو ایک مندر بنانے کے لئے روپے دئے۔ واجد علی شاہ قیصر باغ میں جوگیانہ میلہ، اندر سبھا اور رام لیلا بھی رچاتے تھے۔ جن کی بنیاد معتقدات و رسوم پر تھی۔ ان کی لکھی ہوئی ہولیاں، بابُل اور ٹھمریاں ہندی کے رنگ میں ہیں۔ وہ اگر محرم بڑی دھوم سے مناتے تھے تو بڑے منگل پر بھی دل کھول کر روپے خرچ کرتے تھے جس میں ان کی طرف سے ایک "برہم بھوج" بھی ہوتا تھا۔ اسی زمانے میں لکھنؤ میں بہت سے مندروں کی بنیادیں پڑیں اور درستگی و تزئین ہوئی۔

بیگم حضرت محل کی سلطنت میں راجہ جے لال سنگھ نے اس کی آن اور وطن کی شان کے لئے اپنی جان قربان کر دی تھی۔ سنگر پور کے راجہ بینی مادھو اور کالا کانکر کے راجہ ہنومنت سنگھ اور تلسی پور کے راجہ جنگ آزادی میں اپنی جان پر کھیل گئے۔ بیگم کے ساتھ راجہ دیوی بخش سنگھ، راجہ امر سنگھ وغیرہ سرحد نیپال تک گئے تھے۔ نوابوں میں اگر ہندو لوگ تعزیہ داری اور پیر فقیروں کے مرید تھے تو مسلمان چیچک نکلنے پر شیتلا مندر سے نیر اور پھول مانگتے تھے۔ لکھنؤ میں بنی ہوئی رانی پٹرائن کی مسجد اور دھنیا مہری کی مسجد سے اپنے آپ میں قومی میل جول کی داستانیں سنا رہی ہیں۔ یہاں اگر ہندو راجہ امام بخش ہیں تو ٹھاکر نواب علی بھی ہوئے ہیں۔ یہاں کی شاہی عماروں پر مچھلی، کمل، ناگ پھن اور جل پریوں کے نقوش ملتے ہیں۔ وہ اس تہذیب کے مقدس نشان ہیں جس کی برابر کی آزاد فضا میں سب برابر کے حقدار تھے۔

اور تو اور اس زمانے میں لکھنؤ کے محلے آباد کئے گئے تو اس بات کا پورا پورا دھیان رکھا گیا کہ ہندو اور مسلمان ساتھ ساتھ ایک ہی ماحول میں رہ سکیں غرض یہ کہ حسین آباد کے ساتھ رام گنج بسایا گیا۔ منصور نگر کے پہلو میں کشمیری محلہ آباد ہوا۔ اسی طرح راجہ بازار کے ساتھ کٹرہ ابوتراب خاں گنیش گنج کے ساتھ تصائی باڑہ، پھول باغ کے ساتھ حسین گنج اور ٹھاکر گنج کے ساتھ نواب گنج اور ٹکیت گنج کے ساتھ مہدی گنج کی بستیاں آباد ہوئیں۔

دراصل نوابی کا وہ زمانہ آپسی میل جول کا، مذہبی رواداری اور باہمی محبّت کا زمانہ تھا۔ اور تاریخ گواہ ہے کہ یہاں کبھی ہندو مسلم جھگڑے نہیں ہوئے۔

★

ترجمہ: کوثر سلطانہ

جہانگیر سمنانیؒ ۔۔۔۔ صفحہ ۱۲۵ کا بقیہ

حاصل ہوا۔ (۳۲) رسالہ تحقیقاتِ عشق (۳۳) رسالہ تصوّف و اخلاق (کراچی یونیورسٹی شعبۂ اردو کے سربراہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی تحقیق کے مطابق حضرت مخدوم سید اشرف کا اردو نثر میں رسالہ تصوف و اخلاق اردو نثر نگاری کی پہلی تصنیف قرار دی گئی ہے۔ اس سے قبل حضرت محمد گیسو دراز کو اردو نثر کا پہلا مصنّف مانا جاتا ہے۔ لیکن ان کی خود کتاب کے دیباچہ میں درج ہے کہ اس سے قبل شمالی ہند کے بزرگ حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی نے ایک رسالہ اردو میں تحریر کیا تھا۔ پروفیسر احتشام حسین کی تحقیق سے بھی یہی اشارہ ملتا ہے۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی
خالق منزل، ۳۷۴۲ - چوڑی والان
دہلی

مُرقّع اودھ

اودھ کے حکمرانوں کی تاریخ کا ایک نادر تصویر نامہ

والیانِ اودھ کی تاریخ نواب سعادت خاں برُہان الملک کے شخصی اوج و عروج سے شروع ہوتی ہے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایران کے ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور مہم جوئی و مقدر آزمائی کی غرض سے ہندستان آئے۔ انھیں اقتدار عہد محمد شاہی میں نصیب ہوا اور نادر شاہ کے حملہ ۱۷۳۸ء کے زمانے میں انھوں نے بطور خاص شائستہ خدمات انجام دیں۔

جب ایرانی حملے اور اسکے پیدا کردہ خونی ہنگامے کی شدت فرو ہوئی تو انھیں لکھنؤ کی صوبیداری پر فائز کیا گیا۔ اودھ کے حکمرانوں کا یہ مرکز ریاست اس وقت شیخ زادوں کے تسلط میں تھا جنھوں نے اپنی تاب و تواں کے زعم میں اس علاقے اور اس شہر میں ایک "مُفسدہ" برپا کر رکھا تھا۔

نواب سعادت خاں نے اپنے حیلہ و تدبّر سے مخالفین کو شکست دی اور اس تمام علاقے کو اپنے قبضہ و تصرّف میں کچھ اس طرح لائے کہ آئندہ ایک صدی تک، یہ ان کے خاندان کے لیئے "قلمرو سعادت" اور برہان الملک کے ورثے کی صورت اختیار کر گیا۔

بنگال اور دکن بھی اسی زمانے میں اپنے قیام و استحکام کے تاریخی مدارج طے کرتے نظر آتے ہیں لیکن بنگال میں علی وردی کے خاندان کی حکومت ایک ربع صدی کے اندر ختم ہوگئی اودھ نے تقریبًا ایک صدی پوری کی اور شمالی ہند کی تہذیب و تاریخ پر اپنے گہرے نقش ثبت کیے اور نظام دکن آصف جاہ اوّل کی قائم کردہ حکومت تقریبًا دو صدیاں پوری کا گزار کر اپنے تاریخی انجام کو پہونچی۔

اودھ کے حکمرانوں نے پہلے اپنا مسکن دولت و مرکز ریاست شہر فیض آباد کو بنایا۔ یہ ان کی حکمرانی کا پرآشوب و پرتحرک دور تھا۔

سعادت خاں برہان الملک کے بعد پہلے دو حکمرانوں کی تاریخ اسی گلاب باڑی کے شہر سے وابستہ ہے۔

آصف الدولہ نے لکھنؤ کو اس طرح آباد اور شہری خوبیوں سے آراستہ کیا کہ پھر اودھ کی حکمرانی و جہاں بانی اسی شہر تہذیب کا حصّہ بن کر رہ گئی۔

اَودھ کے فرماں رواؤں کا زمانہ ایک صدی سے زیادہ نہیں اور اس حاکمانہ تصرف میں بھی آگے چل کر انگریز شریک غالب کی حیثیت سے شامل ہو گئے بایں ہمہ اودھ کی تہذیبی فتوحات میں "تارِ حریرِ دو رنگ جیسی ادا نمائیاں اور جلوہ فرمائیاں ملتی ہیں جو اپنی جگہ پر بہت عجیب ہیں جنھوں نے غزالانِ لکھنؤ کے اس مرغزار کو" مشرقی تمدن کا آخری نمونہ "بنا دیا۔

زبان و ادب، تہذیب و شائستگی، شعر و سخن، فن رقص و سرود، مہارتِ تحریر و تقریر اور کمالاتِ نقش گری و تعمیر میں اس شاہی شہر اور مشرق کے تہذیبی مرکز نے جو "رسائیاں" حاصل کیں وہ اپنی نظیر آپ ہیں۔

آصف الدولہ "لکھ لُٹ" کہلاتے تھے اور یہ مثل مشہور تھی "جسے نہ دے مولا اسے دے آصف الدولہ"۔ ان کا بنایا ہوا امامباڑہ آسمان کی طرح دور تک پھیلی ہوئی اس کی "بے ستون سقف" اس کے ایک گوشے میں بنی ہوئی حسین و جمیل مسجد، رومی دروازہ، اس کی طرف گام زمانے کے وقت قدم بہ قدم بڑھتی ہوئی اس کی وسعت، محمد علی شاہ کے مقبرے کا قاش در قاش "ہوادار" گنبد، آخری دور میں فن خطاطی کے بہترین نمونے فن داستان گوئی جو "طلسم ہوش رُبا" تک پہونچ گئی، مرثیہ و غزل کی طرفہ کاریاں، عطر و پان کی پیش کش کے رسوم و آداب کی نزاکتیں، شامِ اودھ کی جلوہ باریوں کو مشرقی تہذیب و تاریخ کے اوراقِ حضور میں

بدل دیتی ہیں ؎

دیکھو تو دلفریبیٔ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

اودھ کے حکمرانوں کو، انگریزوں کے ایما پر، عارضی بادشاہت تو بہر حال حاصل ہو گئی مگر عظیم مغلوں جیسا جاہ و جلال، لاؤ لشکر اور زر و دولت کی فراوانی ان کا مقسوم نہ بنی ان کا دربار داخلی و خارجی ریشہ دوانیوں کا ٹوٹتا جڑتا سلسلہ بنا رہا۔ ان کی تشیع پسندی اور عقائد پرستی کا تذکرہ بھی ہماری ادبی تاریخ و صحافت میں آتا ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان کا صد سالہ دورِ حکمرانی ہماری علاقائی تہذیب کی بہترین فتوحات Achievement. میں ہے۔

یہ تصویری مرقع جس کے ساتھ اس کے والیانِ دولت کے مختصر سوانح نامے بھی شامل ہیں، اودھ کی پرشکوہ تاریخ کے "اوراقِ گل" کی سی حیثیت رکھتا ہے شاید اسی لئے اس کے مرتب منشی بلاقی داس نے اس کا نام گلدستۂ اودھ" رکھا ہے۔

یہ گلدستہ لکھنؤ کی شہری تہذیب کی وہ خوبصورت اور منہ بولتی تصویر ہے جس کو شامِ اودھ کا ایک دیدہ زیب و نظر فریب مرقع سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جس کا تماشا اوراقِ مصور کی سیر سے کم نہیں۔

غالب نے لکھنؤ کے حسنِ خط کی تعریف کی ہے اس کی خوبصورت چھپی ہوئی کتابوں کے سرورق۔ ان کی گل کاری و نقاشی، موم سازی و طغرے نویسی کے حسنِ پیش کش کا اندازہ ایک نظر میں کیا جا سکتا ہے اور اکثر اس نظر داری کا تاثر بہت خوش آیند ہوتا ہے۔

لکھنؤ کی مسندِ شاہی کو زینت بخشنے والوں کی قلمی تصاویر کا دلپذیر عکس ان کے سوانحی کوائف کے ساتھ ایک پرکشش مرقع کی صورت میں بگمانِ غالب موجودہ صدی کے آغاز میں دہلی سے شائع ہوا تھا۔ یہ صرف چالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ سعادت خاں برہان الملک سے لے کر آخری فرماں روائے لکھنؤ، واجد علی شاہ تک سب ہی سریر سلطنت کو آراستہ کرنے والوں کی تصویریں اس میں دی گئی ہیں۔

لیتھو پر چھپی ہوئی، اتنی حسین و جمیل اور پرکشش تصویریں بہت کم کتابوں میں ملیں گی۔ ان کے ساتھ ہی شاہی شخصیتوں کے تعارف نامے بھی بہت خوش خط نستعلیق میں رقم کیے گئے ہیں۔

تصویروں کا انداز یا شبیہ نگاری کا اسلوب کچھ ایسا ہے جسے "ایرانی موقلم" کا حسین عکس کہا جا سکتا ہے۔ یہ تصویریں یا شبیہیں اپنے خطوط جلال و جمال میں اس عہد اور زمانہ بہ زمانہ اس کی بولتی ہوئی تصویر کا ایک ثبات آفریں عکس پیش کرتی ہیں۔

موجودہ صورت میں اس کی تقطیع ۴½×۱۰½ انچ ہے۔ نگارش متن کی جدول سہ خطی ہے۔ بعدہٗ ایک انچ کے قریب جگہ چھوڑ کر پھر یک خطی جدول زیبِ قرطاس و اوراق کی گئی ہے۔ اس کے بعد بھی کچھ سادہ حاشیہ چھوڑا گیا ہے۔

بیاض کی پیشانی بھی سادہ ہے اور بغیر کسی لوح سازی کے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جلی قلم سے لکھا گیا ہے۔ تحریرِ متن کے لئے بھی نسبتاً جلی قلم استعمال کیا گیا ہے۔ کاغذ کا رنگ ہلکا بادامی ہے جو اب اپنی تاب و تواں سے محروم ہوتا جا رہا ہے۔

دیباچہ کے طور پر اس تصویری مرقع اور اس کے تاریخی ماخذ کے ضمن میں لکھا گیا ہے:

"شائقینِ تاریخ دوست پر مخفی نہ رہے کہ اس نالائق ردِ خلائق عقیدت اساس، بندۂ بلاقی داس، پسر منشی جگن لال صاحب کائست سری باستو کے پاس ایک نادر و نایاب مرقع تصویرات قلمی شاہانِ اودھ' ابتدائے عہد سعادت خاں (برہان الملک) لغایت واجد علی شاہ خاص کتب خانۂ شاہی کا موجود تھا ....."

مصنفِ کتاب کا بیان ہے کہ وہ اس نسخہ پر نظر ڈالتا تھا اودھ کے حکمرانوں کے شاہانہ تزک و احترام کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا اور جو شخص اسے دیکھتا تھا وہ حیرت میں پڑ جاتا تھا۔

منشی بلاقی داس نے اس تعارفی نگارش نامہ کے ساتھ ان مغل امراء بعد کے شاہانِ اودھ کے جو مختصر تاریخی کوائف سپردِ قلم کیے ہیں، ان میں ایک گونہ تاریخی توازن اور اس تہذیبی تناظر کو باقی رکھا ہے جو ایسی شاہی شخصیات پر گفتگو کے ضمن میں ضروری ہوتا ہے۔

دہلی کا مغل خاندان جس کی حکمرانی و جہاں بانی کا تصور شدہ

قلعۂ مبارک کی سنگین چار دیواری تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ اودھ کے ان مسند نشینوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے کہ انھوں نے انگریزوں کے ایما پر شہر شاہجہاں آباد کے صاحبانِ تاج و سریر کے مقابلہ میں ان کے آبا و اجداد کی طرف سے تفویض کردہ صوبیداری اور عہدۂ وزارت کو خود مختاری اور بادشاہت میں بدل دیا تھا۔

شہر لکھنؤ کے اہلِ زبان اور اربابِ ادب نے اپنی زبان حسنِ بیان روزمرہ اور شہری محاورہ کو ایک نئی دبستانی حیثیت بخش دی تھی جس کے ردِ عمل کو ہم دہلی کے اساتذۂ سخن اور اس شہر کے انجمن نشینوں کے لب و لہجہ اور طرزِ کلام میں کبھی ابھرتا ہوا دیکھتے ہیں۔ منشی بُلاقی داس کی نگاہ میں یہ پہلو اور اس کے لسانی تقاضے رہے ہوں گے لیکن ان کی زبانِ قلم؛ ان تہذیبی تحفظات" (Cultural Reservation) سے محفوظ رہی اور یہ اپنے طور پر ایک لائقِ توجہ اور منشی صاحب کے تئیں قابلِ تحسین بات ہے۔

دہلی اور لکھنؤ کے مابین دبستانی کش مکش بھی تھی اور وہ تعلقِ خاطر بھی جس کو حریفانہ کہا جا سکتا ہے مگر مرتب کا رویہ غیر جانبدارانہ رہا۔ اس نے اس کا خیال رکھا ہے کہ تاریخی تعارف ناموں میں شخصی تفاخر اور نجی تعصب کا اظہار نہ ہونا چاہیے۔ یہاں اس کے بعض تعارف ناموں سے مختصر اقتباس پیش کیے جاتے ہیں جس سے اس کے سوانحی اسلوب نگارش اور شخصی طرزِ گزارش کا کچھ حال معلوم ہو سکے

نواب ابُوالمنصُور صفدر جنگ

"کہتے ہیں کہ یہ نواب بڑا دلیر اور صاحب تدبیر تھا جبکہ احمد شاہ ابدالی نے مغل بادشاہ کے ہندوستان میں شورش برپا کی اس نے خوب دادِ شجاعت دی۔

اس نے اودھ میں راجہ نول رائے کو اپنا نائب مقرر کیا اور خود شاہ جہاں آباد میں بحضور بادشاہ موجود رہا بعد چند روز کے پٹھانوں نے "مفسدہ" برپا کیا۔ نول رائے اسی ہنگامے میں مارا گیا۔ نواب نے باعانت سورج مل جاٹ وغیرہ کے پٹھانوں کا مقابلہ کیا۔"

اس زمانے میں ہندوؤں، مسلمانوں اور دوسری ہندستانی قوموں کے مابین عسکری اور سیاسی مہمات میں نامذہبی رشتوں کا کچھ حال معلوم ہوتا ہے۔ غازی الدین حیدر کی طرف سے بادشاہت کے اعلان پر مرتب نے کسی خاص ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا بلکہ اس کے تذکرے سے بھی صرفِ نظر کیا ہاں ایک دوسرے موقع پر ضرور Passing Reference کے طور پر اس کی طرف اشارہ کر دیا۔

نواب آصف الدولہ کے دور میں لکھنؤ کی آبادی و رونق کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اس نواب کے عہد میں بسببِ قلّت آمد و کثرت خرچ کے منجملہ چھ آنے جو محاصل صوبہ فی روپیہ خزانۂ سرکار انگریزی میں داخل ہوتے تھے دو آنے معاف ہوئے اور سوداگرانِ انگریزی سے محصول لینے کی اجازت بھی ملی، اور یہ انتظام بھی اسی زمانے میں ہوا کہ کوئی بدون وساطت ریزیڈنٹ کے نواب سے ملاقات نہ کرنے پائے۔

۲۳ برس کئی مہینے حکمرانی کر کے ۲۸ ربیع الاول ۱۲۱۲ھ کو اکیاون سال کی عمر میں عالمِ فانی سے ملکِ جاودانی کو چلا گیا۔"

نواب مرزا وزیر علی خاں بہادر

اس نواب کے بارے میں منشی صاحب کے بیانات کا خلاصہ بایں طور پیش کیا جاتا ہے:-

" مزاج میں نخوت بدرجۂ کمال تھی، اراکینِ دولت اس کی حکومت سے نہایت بیزار اور کمال ناخوش (تھے) صاحبان صدر نے نواب سعادت علی خاں کو متوقع اس حکومت کا کیا تھا۔ آخر عمائدِ ریاست نے ایک محضر بدیں مضمون بہ ثبت مواہر بہو بیگم و دیگر اراکین و افسرانِ فوج وغیرہ تیار کیا کہ یہ نواب، آصف الدولہ کا فرزندِ صُلبی نہیں ہے۔

مسٹر جان شور نے اس نواب کو نظر بند کر کے روانہ بنارس کیا اور تین لاکھ روپیے اس کے مصارف کے لیے اس ریاست سے مقرر کر دیے۔ وہاں مطلق العنان رہا کیا

اور علی بہادر خاں رئیس بندیل کھنڈ، گوشائیں ہمت بہادر اور سندھیا سے خط و کتابت جاری کی اس سبب سے وہاں سے بھی اس کا اخراج عمل میں آیا بعد میں اس رئیس زادے نے ایک بڑے انگریز افسر مسٹر چیری کو قتل کر ڈالا جس کی پاداش میں وہ قید کر دیا گیا اور اسی قیدِ فرنگ کی حالت میں اس نے جان دی ۔"

وزیر علی خاں کے کردار کو اس سے متعلق بعض واقعات کے پس منظر میں شاید نئے سرے سے سمجھنے کی ضرورت ہے ۔

منّاجان اور ان کی والدہ کا غیر مطمئن بلکہ باغیانہ کردار بھی اتنا کم مایہ نہیں جتنا انگریزہ بالادستی کے تناظر میں اسے دیکھا اور سمجھا گیا ہے ۔

فریدوں بخت عرف منّاجان کے تعارف میں لکھا ہے :

" بعد وفات نصیر الدین حیدر کے کرنیل جان لو صاحب ریزیڈنٹ نے مسند نشینی کے واسطے نصیر الدولہ کو تجویز کر کے ایک کاغذ اس مضمون کا اس کے پاس بھیجا کہ جو کچھ نواب، گورنر جنرل بہادر عہدنامۂ جدید تجویز فرمائیں گے ہم اس عہدنامہ پہ بلا تامل دستخط کر دیں گے ۔"

ادھر تو یہ ہو رہا تھا ادھر صاحب مرقع کے بیان کے مطابق صورتِ حال یوں بن گئی :

" ہنوز یہ گفتگو کرسی نشین مطلب نہیں ہوئی تھی کہ بادشاہ بیگم باوجود ممانعت کے مع منّاجان اپنے فرزند کے با فوجِ کثیر آئی ۔ کرنیل جان لو صاحب کہ سامان جلوس مسند نشینی نصیر الدولہ میں مصروف تھے، بہت گھبرائے ۔ بادشاہ بیگم بزور فیل دروازہ توڑ کر مع فوج مکان سلطانی میں در آئی اور کرنیل جان لو صاحب کو قید کر لیا اور دیگر اُمرایان کو بھی مع نصیر الدولہ کے نظر بند کر لیا اور منّاجان اپنے فرزند کو تخت پر بٹھایا ۔ توپیں سلامی کی سر ہونے لگیں ۔"

اس سے اودھ کے سیاسی منظر نامے کا ایک دوسرا رُخ بھی سامنے آتا ہے ۔

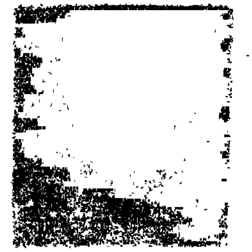
ان تصویروں میں جن کی اصل قلمی تھی، اعلانِ بادشاہت کے بعد سب نوابوں کے سر پر مغربی انداز پر بنے ہوئے تاج رکھے ہیں، جنھوں نے مغلوں کے سرپیچ اور مالائے مروارید کی جگہ لے لی ہے ۔ شاہی لبادہ بھی بہت کچھ برٹش تاجداروں کے لبادے سے مشابہ ہو گیا ہے اب اس نئے لبادہ نے شاہی عبا و قبا کی جگہ لے لی ہے ۔

لانبی مونچھیں آصف الدولہ کے علاوہ ایک دو اور تصویروں میں بھی ملتی ہیں اور یہ ایک گونہ ایرانی اثرات کی نشان دہی کرنے والا Factor ہے واجد علی شاہ کے سر پر تاج نہیں ۔ یوں بھی ان کے دس سالہ دورِ حکومت کے بعد اودھ کی تاج داری کا زمانہ ختم ہو گیا ۔

□□



سکندر باغ لکھنؤ



وقار ناصری
شیش محل، حسین آباد لکھنؤ-۳

لکھنؤ کے تفریحی مشاغل

حکومت اودھ کے عروج وزوال کی تاریخ جیسی بھی رہی ہو لیکن اس حکومت نے جس تہذیب کو پروان چڑھایا اس کی مثال ہندوستان میں اور کہیں نہیں ملتی۔ یہ تہذیب یہاں اس طرح پھولی پھلی کہ دور دور تک اس کے حسن ودل کشی نے دلوں کو مسخر کیا۔ زندگی گزارنے کا یہ فن ہر پہلو سے اتنا روشن تھا کہ لوگ آج تک اسے فراموش نہیں کرسکے۔ لکھنؤ اس تہذیب کا وہ مرکز تھا جس نے اپنی نفاست اور وضع داری سے زبان، رہن سہن، لباس، بول چال حتیٰ کہ تفریحی مشاغل کو بھی ایک ایسے معیاری رنگ میں ڈھال دیا جس کے نقوش یادگار بن گئے۔

یہ تفریحی مشاغل عوام سے خواص تک کی زندگی میں اس طرح رچ بس گئے تھے کہ ان کے بغیر لکھنؤ کی شناخت ممکن نہیں۔ ہر چند کہ ان مشاغل میں کافی دولت صرف ہوتی رہی ہے لیکن اس کے پس پشت ایک مثبت مقصد بھی رہا ہے۔ اگر یہ مشاغل نہ ہوتے تو وہ لوگ ہاتھوں پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے جن کو اس وسیلے سے روزگار فراہم ہوتے رہے۔ اس کے علاوہ یہ تفریحی مشاغل ذہن ودل اور جسمانی سکون کا سبب بھی تھے اس لیے لوگوں کو جو فرحت ان مشاغل سے میسر تھی وہ کسی اور طریقے سے نہیں حاصل ہوسکتی تھی۔ ان تفریحات کو معیار کمال بنانا بھی ایک مقصد تھا جو اسی صورت میں ممکن تھا کہ لوگ اس میں طرح طرح کی اختراع اور ایجاد کرکے اس منزل پر پہنچادیں جو لکھنؤ اور اہلِ لکھنؤ کو دوسروں کے بمقابل ممتاز کرسکے۔

لکھنؤ اور اہل لکھنؤ کے لیے یہ تفریحی مشاغل برائے تفریح نہ تھے بلکہ یہ اس تہذیب کا ایک حصہ تھے جس کی رنگا رنگی میں بھی ایک سلیقہ اور یہی وہ سلیقہ تھا جس نے ان تفریحات کو وہ معیار دیا جو سوائے لکھنؤ کے اور کہیں نہیں مل سکتا

داستان گوئی

لکھنؤ میں داستان گوئی کا عام رواج تھا۔ عورتیں اور مرد بالخصوص امراء اور بیگمات کو داستانیں سننے کا بہت شوق تھا۔ مسز میر علی حسن کا بیان ہے کہ "اونچے مردوں کی اور عورتوں کی یہ عادت ہے کہ جب وہ بستر استراحت پر دراز ہوجاتے ہیں تو انھیں نیند کے لیے قصے سنائے جاتے ہیں۔"

عموماً یہ داستانیں بہادرانہ قصوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ عشقیہ داستانوں کا بھی رواج تھا۔ فسانۂ عجائب کی تحریر کی وجہ بیان کرتے ہوئے رجب علی بیگ سرور نے لکھا ہے : "حسب اتفاق ایک روز مع چند دوستِ صادق ومحبان صفا کیش وموافق بیٹھا تھا مگر نیرنگیٔ زمانۂ ناہنجار وکجرویٔ فلک سفلہ پرور دوں نواز جفا شعار سے سب بادل حزیں وزار اور بہجوم اندوہ ویاس سے اور کثرت حرمان وافکار سے کہ ہر دم بہ پاس تھے دل گرفتہ سینہ ریش اور اداس تھے انھوں نے کہا ...... اس وقت کوئی قصہ یا کہانی بہ شیریں زبانی ایسا بیان کر کہ رفع کدورت و جمعیت پریشانی ہو۔"

لکھنؤ میں داستان گوئی کے بارے میں رتن ناتھ سرشار رقم طراز ہیں : "لکھنؤ سے بڑھ کر داستان گوئی کا چرچا اور کہیں کم ہوگا۔ بیس پچیس یاران صادق اور داستان موافق شب کے وقت کہ پردہ دارِ عاشقاں ہے ایک مقام پر جمع ہوئے۔ کوئی گنا چھیل رہا ہے، کوئی پونڈے پہ ہاتھ تیز کر رہا ہے جابجا پیالیوں میں افیون گھل

رہی ہے حقیقت تو یہ ہے کہ افیون کا گھولنا اور گنّے چھیلنا بھی لکھنؤ والوں ہی کا حصہ ہے۔ کہیں چائے تیار ہو رہی ہے اور داستان گو صاحب بہ لحن داؤدی فرما رہے ہیں "اور خوں خوار ظلماتی ۔۔۔۔۔" ایک ایک فقرے پر سبحان اللہ اور واہ واہ کی تعریف ہوتی جاتی ہے اور داستان گو صاحب کا دماغ عرش بریں سے گزر کر لامکاں کی خبر لاتا ہے۔"

سید احسان حسن بن میر حسن نے داستان گوئی میں بڑا نام پیدا کیا۔ لکھنؤ کے دو باکمال داستان گو میر احمد علی اور میر قاسم علی تھے۔ حکیم سید اصغر علی خاں بھی مشہور داستان گو رہے ہیں جو بعد میں دربار رامپور سے متوسل ہو گئے۔ ان کے بیٹے سید ضامن علی جلال لکھنوی بھی کمال کے داستان گو تھے۔ منشی انبا پرشاد رسا شاگرد میر احمد علی، حیدر مرزا تصور شاگرد حکیم سید اصغر علی نے داستانوں سے بڑی شہرت حاصل کی۔

مولانا سید آغا مہدی نے "تاریخ اودھ" میں لکھا ہے، مرزا علی نقی خاں داستان گو بنجاری ٹولہ میں رہتے تھے اور شہر کے آخری داستان گو تھے۔ ان کے بعد زبانی قصہ کہنے والا کوئی نہ رہا۔"

اگر یہ داستان گو نہ ہوتے تو اردو ادب کو فسانۂ عجائب اور طلسم ہوشربا جیسی داستانیں نصیب نہ ہوتیں۔ داستان امیر حمزہ اور طلسم ہفت پیکر کا وجود نہ ہوتا اور نہ ہی گل وصنوبر کی کہانی پڑھنے یا سننے کو ملتی۔

ہاں کس طرح وہ قصہ صنوبر بہ گل چہ کرد
اے قصہ خواں ادھوری نہ یہ داستان چھوڑ (انشا)

شطرنج

لکھنؤ میں شطرنج کھیلنے کا بھی عام رواج تھا۔ اس فن کے ایک سے ایک باکمال لکھنؤ میں موجود تھے۔ تاریخ اودھ میں مولانا سید آغا مہدی نے لکھا ہے، "پرنس دارا قدر تیموری شہزادہ سکندر کے چھوٹے بھائی تھے شطرنج میں اس قدر مہارت تھی کہ یورپین انگریز ان کے کمال کے معترف ہوئے اور شکست کھائی۔ یہ عہد واجدی کے پیدا شدہ صاحب فن تھے۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار نے فسانۂ آزاد میں شطرنج کے کھیل کا مفصل ذکر کیا ہے۔ مصحفی نے پوری ایک غزل شطرنج کی ردیف میں لکھی ہے۔

چوپڑ

لکھنؤ کے تفریحی مشاغل میں چوپڑ کو بھی کافی اہمیت تھی۔ عوام اس سے اچھی طرح آشنا تھے۔ انشاء اور دیگر شعراء کے کلام میں چوپڑ کھیلنے کے بارے میں کثرت سے اشعار موجود ہیں۔

یوں لگی کوسنے چوپڑ میں جو ہاری وہ پری
ستی ہو جائے دمّن مرتا راجہ نل جائے (انشا)

اسی طرح تاش کھیلنے اور پچیسی کھیلنے کا عام رواج تھا۔

پتنگ بازی

لکھنؤ کے عوام وخواص کے ہر طبقے میں پتنگ بازی کا شوق پایا جاتا تھا اور پتنگ بازی کو ایک فن بنا دیا تھا۔ ڈور، مانجھا اور پتنگ بنانے میں لکھنؤ والوں نے جو کمال دکھائے اس کی مثال شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ یہیں کے لوگوں نے پتنگ میں تبدیلیاں کر کے کنکوا بنایا جس کی وجہ سے یہاں کے لوگ پتنگ بازی کو کنکوا بازی کہنے لگے۔ شرر کے بقول: "کنکوے کی موجودہ صورت ابو تراب خاں کی ایجاد ہے۔ سب سے پہلے کنکوا انھوں نے بڑھایا۔"

آصف الدولہ گول دروازے کی چھت پر تکل اڑاتے تھے۔

عموماً کنکوے کھلی ہوئی چھتوں یا وسیع میدانوں میں اڑائے جاتے تھے۔ کنکوے باز ڈور کی چرخیاں اور کنکوے لے کر آجاتے۔ مسلسل نو پیچ کاٹنے والے کو نوشیرواں کہتے تھے۔ اکثر لوگ شرط بد کر کنکوے بازی کرتے تھے۔ حکماء کے نزدیک کنکوا اڑانے سے نگاہ تیز ہوجاتی ہے اور اسے ایک مقام پر قیام کرنا آجاتا ہے۔ کنکوا بازی ایک طرح کی کسرت ہے جس میں جسم کے سارے اعضا حرکت میں رہتے ہیں۔ ہاتھ اور چکّی کہ جس سے ڈور کو پکڑا جاتا ہے اس کی حرکت سے دوران خون میں تیزی اور رگ و پٹھے میں توانائی آتی ہے۔

مسٹر میر حسن علی نے لکھا ہے، "پتنگ لڑانے کا یہ طریقہ تھا کہ لوگ مانجھا والی ڈور سے اپنے پڑوسی کے پتنگ سے اپنا پتنگ لڑاتے تھے۔ جب ہوا میں پتنگ ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں تو دونوں پتنگ باز اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ اس کی ڈور اوپر آجائے۔ اوپر والی ڈور نیچے والی ڈور کو کاٹ دیتی ہے۔ پتنگ کٹنے کے موقع پر ان میں سے فاتح اور تماشہ بینوں کو بڑی خوشی ہوتی ہے۔ بچے شور و غل کرتے ہوئے کٹی پتنگ کو لوٹنے کے لیے دوڑتے ہیں لیکن کسی ایک شخص کے ہاتھ وہ پتنگ نہیں آتا بلکہ اس کے پرزے پرزے ہو جاتے ہیں۔ اپنی پتنگ کی ڈور کو اوپر کرنے کے لیے بڑی جد و جہد کی جاتی ہے تاکہ وہ طرف ثانی کی پتنگ کاٹنے میں کامیابی حاصل کر سکے۔"

ممکن ہے پتنگ اس وقت اسی طرح لڑتی ہو جیسا مسز میر حسن علی نے لکھا ہے مگر اب کنکوے باز اوپر نیچے ہر رخ سے پیچ لڑاتے ہیں اور کنکوے کاٹ دیتے ہیں۔ یہ تو صرف ان کی مہارت اور ہوشیاری پر منحصر ہے کہ وہ کس رخ سے اچھا پیچ لڑا سکتے ہیں۔ کنکوے بازی کے لیے لکھنؤ میں بہت سی اصطلاحیں رائج ہیں جن کو صرف وہی سمجھ سکتے ہیں جن کو اس شغل سے شغف ہے۔

آج بھی لکھنؤ میں کنکوے بازی کے لیے باقاعدہ ایک جگہ مقرر ہے جسے "کائٹ پارک" کہا جاتا ہے۔ یہاں کنکوے بازی کے ٹورنامنٹ ہوتے رہتے ہیں۔ دوسرے شہروں سے بھی لوگ کنکوا لڑانے یہاں آتے ہیں۔ کچھ برس قبل تک عیش باغ کے میدان میں کنکوا لڑایا جاتا تھا۔ وہاں انگریزوں کا بنوایا ہوا ایک قلعہ تھا جو بعد میں منہدم کرا دیا گیا۔ ظریف نے عیش باغ کے قلعہ کے میدان کی کنکوے بازی کے لیے یہ شعر لکھا ہے۔

ڈور کے گولے چرخیاں لے کر　　ہیں قلعہ میدان میں دن بھر

لکھنؤ کے مشہور پتنگ باز بخشو اور سالاری تھے۔ اس عہد کی پتنگ بازی کا اندازہ انشا کے اس شعر سے بخوبی ہو سکتا ہے:

ہوتا ہے پہلے خون سے مانجھے کا رنگ سرخ
واں سارے ڈور پہ نہیں اڑتا پتنگ سرخ

موجودہ لکھنؤ میں مشہور کنکوا لڑانے والے مرحوم سکندر نواب، مرحوم نواب، منور نواب، منے نواب، صادق حسین عرف اغن، ریاست، ذکی مرحوم حنیف محمد، لالہ رام داس اور سدھو ناتھ ملہوترا عرف سدھو ہیں۔ ان لوگوں کے بہت سے شاگرد کنکوے بازی میں نام پیدا کر رہے ہیں۔

لکھنؤ میں پتنگ بہت خوشنما اور مختلف سائز کے بنائے جاتے ہیں۔ بچوں اور کمسن لڑکوں کے لیے چھوٹی پتنگوں کا رواج ہے۔ لکھنؤ کے ڈور سوتنے والے اور پتنگ بنانے والے کاریگر ہندوستان کے دوسرے شہروں میں بھی اس فن کی بدولت قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ احمد آباد، دہلی، جے پور وغیرہ میں لکھنؤ کے بہت سے کاریگر موجود ہیں۔

مرغ بازی

لکھنؤ میں مرغ بازی بھی مرغوب ترین کھیل رہا ہے۔ عبدالحلیم شرر "گذشتہ لکھنؤ" میں لکھتے ہیں، "مرغوں کی لڑائی کا شوق یہاں نواب شجاع الدولہ کے عہد سے آخر تک برابر رہا۔ نواب آصف الدولہ کو بے انتہا شوق تھا۔ نواب سعادت علی خاں باوجود بیدار مغز کے مرغ بازی کے دلدادہ تھے۔ ان کے شوق نے سوسائٹی پر ایسا اثر ڈالا کہ لکھنؤ کے امرا، دربار در کنار اس زمانے میں جو اہل یورپ یہاں موجود تھے انھیں بھی یہی شوق ہو گیا تھا۔ چنانچہ جنرل مارٹن.... اول درجے کے مرغ باز تھے اور نواب سعادت علی خاں سے بازی بد کر مرغ لڑاتے تھے۔"

میر تقی میر نواب آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ آئے۔ میر کی پہلی ملاقات بھی نواب آصف الدولہ سے اس وقت ہوئی جب وہ ایک مقام پر مرغ بازی میں مصروف تھے۔ میر نے ایک مثنوی مرغ بازوں کے لیے لکھی ہے۔

دلی سے ہم جو لکھنؤ آئے　　گرم پرخاش مرغ یہاں پائے

... ...　　... ... ...

میراں کا نہ ہووے گو قائل　　مرغ معنی پہ وہ بھی ہے مائل

مصحفی نے "مثنوی مرغ نامہ مرزا تقی فیض آبادی" میں مرزا تقی کے مرغوں اور مرغ بازی کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ مرزا تقی کو اس فن کی اچھی مہارت تھی۔

انشاء اللہ خاں انشا کو مرغ بازی کا شوق تھا۔ انشا نے ایک مثنوی "مرغ نامہ" کے نام سے لکھی ہے جس میں انھوں نے اپنے اس شوق کا ذکر کیا ہے۔

اب مجھے بھی یہ شوق ہے اس کا ۔۔۔ کہ سمجھتا ہوں مرغ کو عنقا

۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔

ہیں غرض خوب خوب عالی مرغ ۔۔۔ ہے بجا کہیے اگر انھیں سیمرغ

بٹیر بازی

گذشتہ لکھنؤ میں شرر نے بٹیر بازی کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ شرر لکھتے ہیں، "بٹیر بازی کا شوق لکھنؤ میں پنجاب سے آیا۔ وہاں کے بعض کنچن لوگ جن کی عورتیں عصمت فروشی کیا کرتی تھیں۔ نواب سعادت علی خاں کے عہد میں لکھنؤ وارد ہوئے اور گھاگھس بٹیر اپنے ساتھ لائے تھے۔ ان کو وہ لڑاتے تھے۔ چونکہ بٹیر لڑانے کے لیے کسی میدان وغیرہ کی ضرورت نہیں ہوتی تھی بلکہ کمرے کے اندر ہی صاف ستھرے فرش پر بیٹھ کر اس کی لڑائی کا تماشہ دیکھا جا سکتا تھا۔ اس لیے لکھنؤ کے معاشرے نے اس کو بہت پسند کیا"

لکھنؤ والوں نے بٹیر بازی میں بھی خاصہ اہتمام کیا۔ بٹیر بنانے اور لڑانے میں طرح طرح کی جدتیں کیں۔ بٹیر کا دانہ اور غذا کے نسخے بھی ایسے تیار کیے جو اس سے پہلے کہیں استعمال نہ ہوئے۔ بٹیر کی چونچ اور ناخن پر خاص توجہ کی اور ان کے لیے ایسی کابکیں بنائیں جن کی خوبصورتی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ یادش بخیر اب سے کچھ برس پہلے تک نخاس کے چائے خانوں میں لوگ بٹیریں لیے بیٹھے رہتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بابا ہزارہ باغ اور شیش محل میں بٹیر باز جمع ہوتے تھے اور بٹیریں لڑاتے تھے۔

مصحفی نے بٹیر بازوں کے لیے لکھا ہے:

یہاں نہ روبہ کی اور نہ شیر کی بحث
رات دن ہے یہی بٹیر کی بحث

کبوتر بازی

لکھنؤ میں کبوتر بازی کے شوق کا آغاز نوابین کے قیام کے ابتدائی زمانے سے ہی ہو گیا تھا۔ اچھی اچھی نسل کے کبوتر خریدے اور پالے جاتے تھے۔ بعض کبوتر کی نسلیں اڑانے کے لیے اور بعض لڑانے کے لیے ہوتی تھیں۔ عہدِ شجاع الدولہ میں یار علی نے جو بریلی کا باشندہ تھا، کبوتر بازی کو بڑا عروج دیا۔ نواب شجاع الدولہ کے کبوتر خانے میں دو ہزار کبوتر تھے۔ نواب آصف الدولہ کے کبوتروں کی تعداد تین لاکھ کے قریب تھی۔

نواب واجد علی شاہ نے باقاعدہ ایک کوٹھی کبوتر خانے کے طور پر موتی محل کے نزدیک بنوائی تھی جس میں ایک سے ایک نادر کبوتر موجود تھا۔ چھوٹے خاں رئیس الدولہ کبوتر خانے کے داروغہ اور شیخ محمد ان کی پیش دستی میں کام کرتے تھے۔

عہد غازی الدین حیدر میں میر عباس کبوتر بازی میں استاد تھے۔ میر امان علی قلی علی بھی کامل فن کبوتر باز تھے۔ عہدِ واجدی میں مرزا قین مشہور کبوتر باز تھے۔ یہ زیادہ تر کبوتریاں پالا کرتے تھے۔ یہ لکھنؤ کے محلہ مفتی گنج کے رہنے والے تھے۔

محلہ نواز گنج کے مرزا علی عباس کبوتر بازی میں کامل فن تھے۔ عموماً لڑانے کے لیے گولا نسل کے کبوتر کام میں لائے جاتے ہیں لیکن اسی لکھنؤ میں ایک کبوتر باز نواب پایہ تھے جو گرہ باز کبوتروں کو گولوں کی طرح لڑاتے تھے۔

لکھنؤ میں صرف کبوتر لڑائے ہی نہیں جاتے تھے بلکہ بعض امراض میں علاج کا ذریعہ بھی تھے۔ اطبا ان کے ذریعہ فالج کا علاج بھی کرتے تھے۔ کبوتر کے پر کی ہوا کئی بیماریوں میں کارآمد ثابت ہوتی تھی۔ جراح اس کی بیٹ سے زخموں کے بھرنے میں مدد لیتے تھے۔ میدان جنگ میں پیغام رسانی کے لیے بھی کبوتر کام میں لائے جاتے تھے۔

اردو شاعری میں بھی کبوتر نے مضامین کے ڈھیر لگا دیے ہیں۔

احباب کی صحبت سے دل اپنا نہ اٹھے گا
ٹکڑی کا کبوتر ہے یہ تنہا نہ اٹھے گا

—— امان علی سحر

شریک رنج غیر اس طرح سے ہونا مناسب ہے،
مری آنکھوں میں سرخی رہ گئی خون کبوتر کی

—— بندہ کاظم جاوید لکھنوی

کبوتر کی قسمیں بہت ہیں، جو مختلف قد و قامت اور مختلف رنگ کے ہوتے ہیں۔ کبوتروں کی پیوندکاری کر کے بھی کبوتر بنانے کا ہنر لکھنؤ میں رائج تھا۔

گرہ باز، گولا، لقا، شیرازی، لوٹن، نسورے وغیرہ کبوتر کی مشہور قسمیں ہیں۔ گو کہ کبوتر بازی کو زوال ہو چکا ہے۔ لیکن اب بھی لکھنؤ میں کبوتر پالنے اور لڑانے کا رواج اس عہد کی یاد دلاتا ہے جب کبوتر بازی کے فن کو لکھنؤ

عروج حاصل تھا۔

دیگر پرندوں کی لڑائیاں

مرغ بازی اور بٹیر بازی کے علاوہ لکھنؤ میں تیتر بازی، لووں کا لڑانا، گلدم لڑانا، لال لڑانا اور طوطے بازی کا شغل بھی تفریح کا اہم ذریعہ تھا۔ طوطوں کو بولنا بھی سکھایا جاتا تھا۔ گھروں میں "مینا" چڑیا پالنے کا رواج تھا لوگ اسے بولنا بھی سکھاتے تھے۔ کچھ لوگ کوئل اور بلبل بھی لڑاتے تھے شکرے اور باز پالنے کا رواج تھا انھیں شکار کے لیے سدھایا جاتا تھا۔

عہدِ محمد علی شاہ میں میر محمد علی طوطوں کو کبوتر کی طرح اڑاتے تھے۔ دس بارہ طوطوں کی ٹکڑی ان کی سیٹی کی آواز پر کبوتر کی طرح اڑتی اور چھت پر اترتی تھی۔

موجودہ زمانے میں بھی تیتر بازی کا رواج اودھ کے اکثر اضلاع میں پایا جاتا ہے۔

شکار

لکھنؤ میں شکار بھی تفریحی مشاغل میں تھا لیکن یہ شوق امرا و روسا اور نوابین کا شوق تھا کیونکہ اس شوق میں دولت بہت صرف ہوتی تھی لہٰذا عوام کو اس شوق سے وہ نسبت نہ تھی جو دوسرے مشاغل سے تھی۔

نواب شجاع الدولہ کو شکار کا بہت شوق تھا اور اس کے لیے باقاعدہ جنگل میں ہرن، بارہ سنگھے، چیتے اور چیتل وغیرہ چھوڑے گئے تھے جن کا نواب شکار کرتا تھا۔

نواب آصف الدولہ کو شکار سے بہت شغف تھا۔ سال میں دوبارہ وہ ضرور شکار کھیلنے کے لیے جاتے۔ دو مرتبہ میر تقی میر بھی نواب کے ہمراہ گئے اور مفصل شکار نامے لکھے۔ نواب سعادت علی خاں شکار کا ذوق رکھتے تھے۔ انشا نے نواب کے لیے شکار نامے لکھے ہیں۔ لکھنؤ کے مشہور رئیس آغا ابو صاحب مانے ہوئے شکاری تھے۔ یہ ہمیشہ گورنر یا وائسرائے کے ساتھ شکار کھیلنے جاتے تھے۔ ان کا نشانہ لاجواب تھا۔

درندوں اور چوپایوں کی لڑائی

تفریحی مشاغل میں یہ شوق عام طور پر خواص میں پایا جاتا تھا عبدالحلیم شرر گذشتہ لکھنؤ میں لکھتے ہیں، "جب لوگوں کو ملک گیری و صف آرائی سے فرصت ملی اور میدان جنگ میں لڑنے کا حوصلہ نہ رہا تو جنگ جوئی کے جذبات نے جانوروں کو لڑا لڑا کر جانبازی و خوں ریزی کا تماشہ دیکھنے کا مشغلہ پیدا کیا۔ یہ شوق یوں تو تھوڑا بہت بہت جگہ ہے مگر اس میں جس قدر انہماک اہل لکھنؤ کو ہوا اور ان بے نتیجہ اور سنگ دلی کی دل چسپیوں کو ان لوگوں نے جس درجۂ کمال کو پہنچا دیا اور مقامات کے لوگوں کے خواب و خیال میں بھی نہ گزرا تھا۔"

لکھنؤ میں اس تماشے کے لیے شیر، چیتے، تیندوے، ہاتھی، اونٹ، گینڈے، بارہ سنگھے، مینڈھے اور سانڈ لڑائے جاتے تھے۔ نواب شجاع الدولہ کو جنگ فیلان دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ نواب آصف الدولہ کے فیل خانے میں دو ہزار ہاتھی تھے۔ وہ دو تین دن کے بعد ہمیشہ ہاتھیوں کی لڑائی دیکھتے تھے۔

دریا اس پار جہاں آج کل ندوۃ العلماء اور آرٹ کالج کی عمارتیں ہیں وہاں جانوروں کے لیے باقاعدہ رمنہ کی تعمیر ہوئی تھی۔ نصیر الدین حیدر کے وقت اس مقام پر ہاتھی، گینڈے اور بارہ سنگھے لڑائے جاتے تھے۔

اسی رمنہ میں واجد علی شاہ فوج کی قواعد اور فنون جنگ کی مشاقی دیکھتے تھے اور باکمال سپاہیوں کو انعام و اکرام سے سرفراز فرماتے تھے۔

محمد حسین آزاد نے آب حیات میں آصف الدولہ کا ایک واقعہ لکھا ہے۔ نواب آصف الدولہ نے بھیلوں کے بن میں شیر مارا سودا کو خبر ہوئی تو برجستہ یہ شعر کہا ؎

یارو یہ ابنِ ملجم پیدا ہوا دوبارہ
شیرِ خدا کو جس نے بھیلوں کے بن میں مارا

فنونِ حرب

سپہ گری کے فنون کے علاوہ لکھنؤ میں کشتی، لکڑی، پٹہ، بانک، بنوٹ، برچھا، بانا، تیر اندازی، کٹار بازی اور جل بانک کا عام رواج تھا جن کے باکمال استاد اپنے شاگردوں کو یہ فنون سکھاتے تھے۔

کشتی گیری

کشتی اور پہلوانی کے لیے لکھنؤ میں بہت سے اکھاڑے تھے۔ یہاں

کشتی میں داؤ پیچ پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ لکھنؤ کے مشہور پہلوانوں اور شہزوروں میں احمد حسین شہ زور، میر لٹو، میر تقی خاں، استاد سکندر، نواب پٹھان دریابادی، شیدی فولاد، شیدی فضل علی، شیدی عنبر، شیدی غلام علی، نواب صادق علی خاں عرف شہنشہ دولہ اور غالب علی نمایاں تھے۔ چھوٹے سید اور بڑے سید بھی نامی پہلوانوں میں تھے۔ ان کا اکھاڑا بہت مشہور تھا اور ان کے سینکڑوں شاگرد تھے۔ بڑے سید کے انتقال کے کچھ برس بعد چھوٹے سید بھی ۱۹۳۳ء میں فوت ہوئے۔ اخبارات نے نوٹ لکھے۔

کہیں اکھاڑے میں کرتے ہیں پیچ کشتی گیر
کہ ٹھوک ٹھوک کے خم لڑتے ہیں جواں سے جواں

مصحفی کہتے ہیں ؎

فن کشتی میں قیامت ہے وہ بت کا درکا
دھوم دیتا ہے مچا آوے ہے جب دھوبی پاٹ

بانک

یہ فن بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ اس فن کی ابتدا اس مقصد سے ہوئی کہ چھڑیوں کی مدد سے حریف کا مقابلہ کیا جائے اور وہ پسپا ہو جائے اودھ میں اس فن کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ زیادہ تر شرفا اس فن کے قدرداں تھے اور وہی اس فن کو شوق سے سیکھتے تھے۔

نواب شجاع الدولہ کے عہد میں منصور علی خاں اس فن کے ماہرین میں سے تھے۔ نواب آصف الدولہ کے عہد میں شیخ نجم الدین کا شمار اس فن کے ماہرین میں ہوتا تھا۔ آغا مرزا بانک کے فن کے باکمال استاد تھے۔ عبدالحلیم شرر نے بانک جاننے والوں میں پرنس مرزا ہمایوں قدر کا بھی ذکر کیا ہے۔

بنوٹ

اس فن کے جاننے والے اپنے ہاتھ سے یا ایک رومال سے جس میں پیسہ بندھا ہوتا تھا اپنے حریف کو چاہے وہ کوئی حربہ لیے ہو ایسے کارگر طریقے سے زک پہنچاتے تھے کہ اس کا کام تمام ہو جاتا تھا۔ لکھنؤ میں اس فن کے بہت سے باکمال استاد تھے۔ محمد ابراہیم خاں رامپوری اور طالب شیر خاں اس فن کے ماہرین میں سے تھے۔ نواب معشوق محل کے داروغہ محمد مہدی اس فن کے باکمال استاد تھے۔ اس فن کے ماہرین کا ادنیٰ کرشمہ کمال یہ ہے کہ جنگلی کبوتر چوکی کے نیچے چھوڑ دیا جاتا تھا اور وہ باہر نہیں آ پاتا تھا۔

آخری دور کے ایک استاد حسین بخش تھے جن کو اس فن میں بہت مہارت تھی۔ لکھنؤ میں استاد ابو صاحب اس فن کے آخری جاننے والے تھے۔

کٹار

اپنی جان کی حفاظت کے لیے عام طور پر لکھنؤ کے لوگ کٹار اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ کٹار چلانا بھی باقاعدہ ایک فن ہے۔ لکھنؤ میں اس فن کے بہت سے ماہرین تھے۔

اس زمانے میں یہ سپاہی نہیں بیگاری ہے
نہ تو تلوار ہی ہے نہ کٹاری تیار (آتش)

جل بانک

یہ شناوری کا فن تھا۔ اس فن کا مقصد گہرے پانی میں دشمن پر قابو حاصل کرنا تھا۔ نصیر الدین حیدر کے عہد میں میرک جان اس فن کے استاد تھے۔ لکھنؤ کے محلہ شریف منزل کے خلیفہ رضا حسین جل بانک کے ماہرین میں سے تھے۔ کیونکہ جل بانک کا تعلق پیراکی سے ہے لہٰذا اس فن کے ماہرین باکمال پیراک بھی ہوتے تھے۔ نصیر الدین حیدر کے استاد میر مچھلی باکمال پیراک تھے۔ عہد واجدی میں بدلو نائی پیراکی میں ماہر تھا۔ شیخ عابد علی پیراکی کے باکمال استاد تھے۔ خلیفہ رضا حسین کے والد میر صفدر علی پیراکی کے ماہر تھے جو شیر دیج ملاحی اور جل بانک میں لاجواب تھے سینکڑوں شاگردوں کو انھوں نے پیراکی کے فن سے آگاہ کیا تھا۔ حکیم سید محمد نواب جل بانک اور لکڑی میں کافی مہارت رکھتے تھے۔

شہسواری

لکھنؤ میں شہسواری بھی تفریحی مشاغل میں شامل تھی۔ عموماً روسا اور امرا اس فن میں دلچسپی رکھتے تھے۔ عمدہ عمدہ نسل کے گھوڑے فراہم کیے جاتے تھے۔ سپاہیانہ زندگی کے علاوہ سفر اور شکار کے لیے بھی شہسواری ضروری ہے لہٰذا لکھنؤ میں اس فن کو بڑا عروج حاصل ہوا۔

نواب سعادت علی خاں شہسواری کی بڑی مہارت رکھتے تھے۔ ان کے اصطبل میں ایک سے ایک عمدہ نسل کے گھوڑے موجود تھے۔ عہد واجدی

میں ممن خاں اور شیخ ببر علی شہسواری کے باکمال لوگ تھے۔ آغا ابو صاحب بھی اپنے زمانے کے مشہور شہسوار تھے۔

تلوار چلانا

کیونکہ اس دور میں تلوار کو جنگ میں اہمیت حاصل تھی اس لیے فوجیوں اور شہزادوں کو اس فن کی تعلیم دی جاتی تھی۔ علاوہ ازیں جو لوگ مگدر چلانے کے مشاق ہوتے تھے وہ تلوار چلانے میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ لکھنؤ کے بانکے تو آج تک تلوار چلانے کے لیے مشہور ہیں جو ذرا ذرا سی بات پر تلوار کھینچ لیتے تھے۔ مرزا احمد بیگ کٹیا کٹیا زبردست بانکے تھے، ایک تلوریے اور ان سے تلوار چلی۔ اپنے سینے پر احمد بیگ نے تلوار کے اس قدر وار روکے کہ زخموں کے نشان کی ہیکل بن گئی۔ اسی دن سے مرزا صاحب کٹیا کٹیا کے نام سے مشہور ہو گئے۔

بھانڈ، نقال، لطیفہ گو

لکھنؤ کے تفریحی مشاغل میں یہ لوگ بھی شامل تھے۔ عموماً شادی بیاہ اور دیگر تقریبوں میں دل بہلانے کے لیے یہ لوگ بلائے جاتے تھے۔ لکھنؤ کے بھانڈوں میں قائم علی مشہور بھانڈ گذرا ہے جس کی حکایتیں آج بھی تاریخ میں محفوظ ہیں۔ نخاس کے پاس کی گلی میں آج بھی بھانڈ طبقہ کے لوگ موجود ہیں۔ نقالوں کی نقل اور لطیفہ گویوں کے لطیفوں سے ہر طبقہ محظوظ ہوتا تھا لیکن دھیرے دھیرے یہ لوگ کم ہوتے گئے یا دوسرے پیشوں میں چلے گئے اب ان کا نام و نشان بھی نہیں ملتا۔

رقص و سرود

دربار اودھ کی سرپرستی کی وجہ سے اس فن کو فروغ حاصل ہوا۔ نواب شجاع الدولہ بذات خود فن موسیقی میں دسترس رکھتا تھا۔ نواب آصف الدولہ نواب وزیر علی خاں اور دوسرے نوابین اودھ کو رقص و سرود سے بڑی دلچسپی تھی فیض آباد اور لکھنؤ میں بالخصوص ہندوستانی موسیقی کو بڑی ترقی ہوئی۔

نواب آصف الدولہ کے عہد میں محمد رضا خاں نے اصول النغمات الآصفیہ عرف معرکۃ الآرا کتاب لکھی۔ انشا نے سندیلہ کے ایک مولوی صاحب کے بارے میں لکھا ہے جو فارسی راگوں کے علاوہ ہندوستانی راگوں سے بھی بخوبی واقف تھے۔ لکھنؤ کے سازندوں اور گویوں کا ذکر کرتے ہوئے رجب علی بیگ سرورؔ نے فسانۂ عجائب میں لکھا ہے: "کلاونت قوال بے مثال، چھجو خاں، غلام رسول سب کو موسیقی میں کمال۔ حصول شوری کی منہ زوری کی دھوم ہے ٹپے کا موجد ہے۔ سب کو معلوم ہے بخشو اور سالاری نے طبلہ ایسا بجایا کہ پکھاوج کو بھی شرمایا۔"

اس عہد کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آنند بخش، شجاعت خاں، محمد خاں، دیبی داس، جیون خاں، مصاحب خاں، ہستو خاں اور میر ضاحک مشہور و معروف موسیقی داں تھے۔ واجد علی شاہ نے اس فن کی بہت قدر دانی کی۔ رقص و سرود کی تعلیم کے لیے پری خانہ کی بنا ڈالی۔ کتھک کو فروغ دیا۔ طبلہ بجانے اور سنے کاری میں واجد علی شاہ کا جواب نہ تھا دھرپد، پٹہ اور خیال ایسا گاتے تھے کہ اچھے اچھے گانے والوں کے ہوش اڑ جاتے تھے۔ بنی، ناجو اور دلھن میں واجد علی شاہ نے بہت کچھ موسیقی کے بارے میں تحریر کیا ہے۔ کتھک کے بھاؤ، طبلہ کی گتیں اور تال کے بارے میں یہ کتابیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

آصف الدولہ کے ماموں سالار جنگ، خواجہ حسن مودودی، علامہ تفضل حسین خاں موسیقی کے نامور ماہرین میں سے تھے۔ غازی الدین حیدر کے زمانے میں حیدر خاں، خیال گانے میں بے مثال تھا۔ غازی الدین حیدر ہی کے زمانۂ حکومت میں سوز خوانی کا بھی رواج ہوا۔ میر علی نے اس میں بڑی شہرت پائی۔ عہدِ واجد میں پیار خاں، جعفر خاں، حیدر خاں، محمد علی خاں، نظام الدین احمد خاں، محمد احمد خاں، حیدر علی خاں، جھمو خاں موسیقی کے ماہرین میں شمار ہوتے تھے۔ ٹھمری گانے والا قدر نواب وزیر مرزا بے مثال تھے۔ ڈولے خاں دھرپد اور ہوری گانے میں استاد تھا۔ کتھک میں کالکا اور بندا دین جیسے فنکار تھے۔

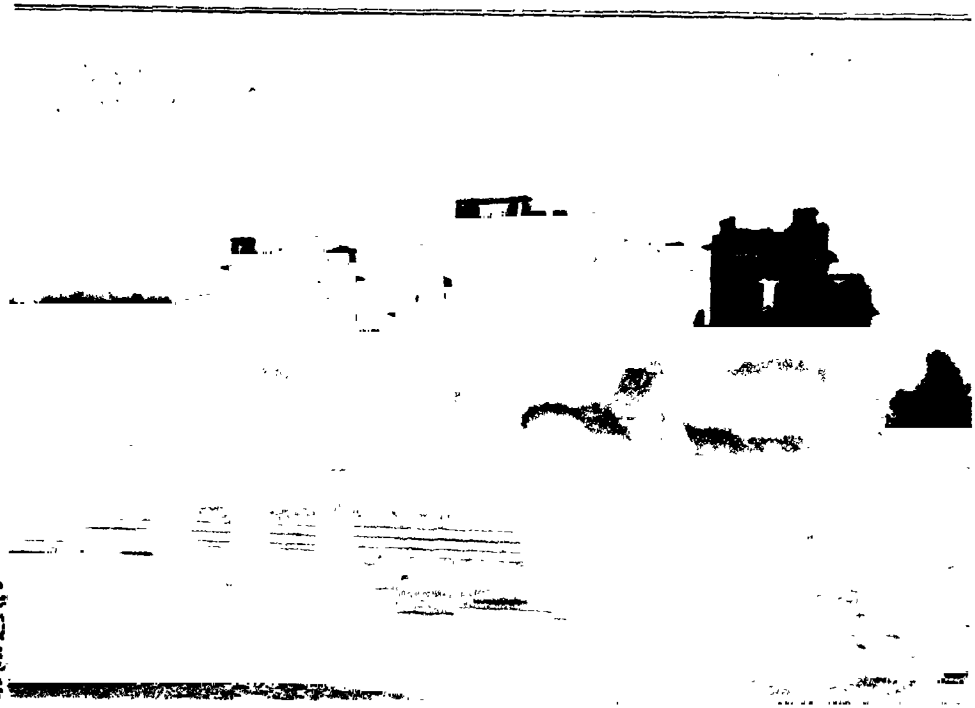
مرد ماہرین کے علاوہ عورتوں کو بھی ناچ گانے میں کمال تھا۔ سعادت یار خاں رنگینؔ نے عزیز طوائف اور مہتاب کے رقص و سرود کا بڑے پر لطف انداز میں ذکر کیا ہے۔ میر حسنؔ نے ایک مثنوی میں ماہ رتن، ننھی، پنا، مصری اور بہت سی طوائفوں کا ذکر کیا ہے۔ مرزا قتیلؔ نے لکھنؤ کی طوائفوں میں جگیا امیر بخش کے علاوہ اور کئی نام لکھے ہیں۔ چونے والی حیدر اپنی آواز کی وجہ سے بہت مشہور تھی۔ نصیر الدین حیدر کے عہد میں بی بنّو کو ناچ گانے میں کمال

حاصل تھا۔ لکھنؤ کی کچھ اور مشہور ناچنے گانے والیاں حیدر جان، حسین باندی، پیازو، امیر بخش تھیں جن کے نام تاریخ میں محفوظ ہیں۔ جدن، ہر مزی، ننہوا، گوہر، چھو دھرائن اور اس کی لڑکیاں رشک منیر، بدر منیر بعد کی وہ گانے والیاں ہیں جن کی دھوم سارے ہندوستان میں تھی۔

کچھ برس قبل تک لکھنؤ میں استاد یوسف علی خاں، خلیفہ احمد حسین، چنو خاں، بڑے آغا خاں (میوزک کالج کے پرنسپل بھی رہ چکے ہیں) استاد عابد حسین، استاد مروت حسین خاں، سخاوت حسین خاں، لچھو مہاراج اور راجہ نواب علی جیسے فنکار موجود تھے۔ راجہ نواب علی کا ایک بڑا کارنامہ ان کی تصنیف "معروف النغمات" ہے جو فن موسیقی پر ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

یہ تفریحی مشاغل صرف لکھنؤ کا طرۂ امتیاز نہ تھے بلکہ اودھ کے دیگر قصبات میں بھی ان کا چلن عام تھا۔ اگر ان قصبات کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو اس کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے کہ وہاں کے لوگ بھی لکھنؤ کی تہذیب سے متاثر تھے اور جو کچھ لکھنؤ میں ہوتا تھا وہ اس کو بڑے فخر کے ساتھ قبول کر لیتے تھے۔ چنانچہ اودھ کے راجگان اور تعلقدار کا طرز حیات لکھنؤ کے نوابین کی تقلید کرتے کرتے بالکل لکھنوی ہو گیا تھا۔

بعض مورخین نے ان تفریحی مشاغل میں دولت کے بیجا اسراف کا شکوہ کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی بات کسی حد تک درست ہو لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اس وقت اودھ کی رعایا خوشحال تھی اور لوگوں کے پاس اتنی دولت تھی کہ وہ صرف کر سکیں۔ اس کے علاوہ یہ مشاغل روزگار کی ایک بڑی صورت بھی تھے کیونکہ اس وقت نہ آج کی طرح بڑی بڑی صنعتیں تھیں اور نہ ہی دوسرے وسائل۔ لہٰذا اس صورت میں تو یہ ہی ہو سکتا



ککوری قلعہ



نذر الحفیظ ندوی، ازہری
استاد عربی ادب۔ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

ندوۃ العلماء کا تاریخی پس منظر

ندوۃ العلماء کی بنیاد جس زمانے میں رکھی گئی وہ انیسویں صدی کے نصف آخر کا زمانہ تھا۔ یہ وہ عہد ہے جس میں تازہ دم مغرب اور ضعیف و ناتواں مشرق کی باہمی کشمکش اپنے نقطۂ عروج تک پہنچ چکی تھی۔ اس عقلی و فکری کشمکش کے نتیجے میں قدرتی طور پر بہت سی شخصیتیں پیدا ہوئیں جو مسلمانوں کے مختلف مکاتب خیال کی نمائندہ تھیں، متعدد تعلیمی اور اصلاحی تحریکیں اٹھیں اور انھوں نے اپنے اپنے دائرہ میں اسلام اور مسلمانوں کی قابلِ قدر اور ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں۔

قدیم عربی مدارس

اس عہد پر نظر ڈالیے تو ایک طرف قدیم عربی مدارس اپنے تمام خصوصیات اور امتیازات کے ساتھ نظر آئیں گے۔ کتاب و سنت استقامت اور اسلاف کے طریقۂ فکر اور طریقۂ تعلیم پر اصرار ان کا شعار تھا اور نو وارد مغربی تہذیب اور ہندوستانی سماج کے تصادم سے پیدا ہونے والے مسائل اور سوالات کی طرف ان کی توجہ بہت کم تھی۔ ان کے ذمہ دار اور ارباب حل و عقد جن کا اخلاص شبہ سے بالاتر ہے۔ شاید یہ سوچتے تھے کہ آگے بڑھ کر دشمن پر حملہ کرنے کے بجائے قلعہ بند ہو کر اپنی حفاظت زیادہ مفید ہے اور صرف اس طریقہ سے ایمان کی حفاظت ممکن ہے۔

اس طرز فکر کا اظہار نصاب تعلیم میں اس طرح ہوا کہ درس نظامی (جس کے نظام میں اس سے پہلے برابر تبدیلیاں ہوتی رہیں۔

اس زمانہ میں (قیام ندوۃ العلماء کے وقت) نصاب تعلیم بعض قدیم مرکزی مدارس میں رائج تھا اس پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ طلبہ کے قیمتی اوقات کا بڑا حصہ معقولات پر بلا ضرورت صرف ہو رہا تھا، اور دینیات اور علم نافع کی طرف توجہ کتنی کم تھی۔ مثلاً شرح ملا جامی جو چار سو صفحہ کی کتاب ہے۔ اس کی مدت سات ماہ تھی، لیکن صحیح بخاری کیلئے ۱۱۴۰ صفحے کی کتاب ہے ۳/۴ ۶ مہینے کی رکھی گئی۔ [1]

مولانا رشید احمد گنگوہی رح، فلسفہ کی کتابوں کا پڑھانا دین اور وقت دونوں کا ضیاع سمجھتے تھے۔[2] لیکن ہندوستان کی عام تدریسی فضا کے اثر سے نیز دار العلوم کے دوسرے اساتذہ کی خواہش اور دباؤ سے مولانا نانوتوی کی وفات کے بعد تدریجی طور پر فلسفہ و منطق کی ساری کتابیں داخل کر لی گئیں، اور اس کے ساتھ مدت تعلیم میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔

تاہم اس حقیقت سے کوئی ہوشمند اور منصف انسان انکار نہیں کر سکتا کہ دیوبند کے فضلاء نے ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل کر دین خالص کی جس طرح حفاظت کی ہے اس سے ہندوستان میں اسلامی زندگی کے قیام و بقاء و استحکام میں بیش قیمت مدد ملی ہے اور آج جو صحیح اسلامی عقائد دینی علوم اہل دین کی وقعت، اور صحیح روحانیت اس ملک میں نظر آتی ہے اس میں بلاشبہ اس کا نمایاں اور بنیادی حصہ ہے، اگرچہ زمانہ کی تغیر پذیری نے نئے نئے خطرات اور مسائل میں روز افزوں ترقی الحاد و بے دینی کی اشاعت نیز مغربیت و اشتراکیت کی ہر دلعزیزی و مقبولیت کی بنا پر مادیت کی طوفانی لہر عام مسلمانوں کے سروں سے گزر کر اب ان قلعوں کی دیواروں سے بھی ٹکرانے لگی ہے جنکو ابتک محفوظ اور اس نئے طوفان کی دسترس سے دور سمجھا جاتا رہا ہے۔

سرسید کی رائے یہ تھی کہ تہذیب و تمدن، معاشرت و اخلاق اور خیالات و افکار میں مغرب کی تقلید کرو، اور اس کے سانچے میں اپنے کو ڈھال دو لیکن کیا ان دو راستوں کے علاوہ کوئی تیسرا راستہ نہیں تھا؟

سید امیر علی اور مولوی چراغ علی

سید امیر علی (م ۱۹۲۸ء) اور مولوی چراغ علی (م ۱۸۹۵ء) نے سرسید سے کچھ آگے بڑھ کر اسلام کی مدافعت کی اور مغربی مفکرین و مصنفین کے اعتراضات کے جوابات دینے کی کوشش کی اور اس میں ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے، بالخصوص سید

امیر علی کی کتاب (SPRIT OF ISLAM) نے مغرب کے علمی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کیا، اور ہندوستان کے اعلیٰ تعلیم یافتہ حلقہ پر خاصًا اثر ڈالا، لیکن افسوس ہے کہ ان دونوں کا طرز فکر اور اسلوب بیان معذرت خواہانہ APOLOGETIC اور مدافعانہ تھا وہ کہتے تھے کہ اسلام مغربی علوم کا کسی صورت میں مخالف نہیں ہے۔ ان کتابوں کے سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ آگے بڑھکر جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے کسی حد تک اسلام کی فضیلت اور برتری کا اچھا اثر دیا ہے، لیکن مغربی فلسفہ مغربی علم اجتماع اور مغربی علم تمدن نے لوگوں کے لئے ذہن ودماغ پر جو نقش قائم کر رکھا تھا، اس کو زائل کرنے کی کوشش نہیں کی، نتیجہ یہ ہوا کہ نیا تاثر اور نیا نقش دیر پا ثابت نہ ہو سکا، اور مغربی طرز فکر کی بنیادیں مضبوط اور مستحکم رہیں۔

روحانی مراکز اور خانقاہیں ۔ ان مکاتب خیال کے پہلو بہ پہلو ایک قوت اور بھی تھی جس کے اثر سے اسلامی ہند کا کوئی حصہ آزاد نہیں تھا، یہ روحانی خانقاہیں اور سلسلے تھے، جن کے احسان بارگراں سے ملت اسلامیہ کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی، یہ مراکز ایمان ویقین، اخلاقی اور روحانی تربیت اور اصلاح باطن کا وہ سرچشمہ تھے جہاں بس اہل ایمان اور اہل طلب سیراب ہوتے تھے، اور اپنی روحانی تشنگی بجھاتے تھے جو چند نام اس سلسلے میں لئے جا سکتے ہیں ان میں خواجہ محمد سلمان تونسوی (م ۱۸۴۱ء) اور مولانا فضل الرحمٰن گنج مرآدابادی (م ۱۸۹۵ء) حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (م ۱۳۱۷ھ) مولانا رشید احمد گنگوہی (م ۱۳۲۳ھ) کے نام سر فہرست ہیں۔ ان بزرگوں کے حلقے ہندستان کے مضطرب تغیر پذیر ماحول میں رشد وہدایت کے وہ جزیرے تھے جہاں آکر انسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے دل کا مرہم اور قلب کا سکون پایا۔

تحریک ندوۃ العلماء

تحریک ندوۃ العلماء، دار العلوم دیوبند اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے بعد وجود میں آئی گویا ندوۃ العلماء کی تاسیس اس وقت ہوئی جب قدیم وجدید مکتب خیال کی دونوں تحریکوں کی سرگرمیوں کے برسوں بیت چکے تھے، دیوبند کے قیام کو ۲۶ سال ہو چکے تھے، اور علی گڑھ کا ایم اے او کالج اپنی عمر کا اٹھارواں سال پورا کر رہا تھا، علی گڑھ اور دیوبند کی تعلیمی واصلاحی تحریکوں کے عین عہد شباب میں ندوۃ العلماء کا قیام جن اغراض ومقاصد کے تحت عمل میں آیا وہ حسب ذیل تھے، اس تحریک کے پیش نظر ابتدا میں دو مقاصد تھے ۔

۱۔ علوم اسلامیہ کے نصاب درس میں دور رس اور بنیادی اصلاحات اور نئے نصاب کی تیاری ۔

(۲) رفع نزاع باہمی ۔ یعنی اتحاد ملی اور اخوت اسلامی کے جذبات کو فروغ دینا۔ تحریک ندوۃ العلماء بانی ندوۃ العلماء مولانا سید محمد علی مونگیری اور ان کے عالی ہمت رفقا، کی قیادت میں جوں جوں آگے بڑھتی رہی اس نے اپنے دائرہ کار اور بنیادی مقاصد میں اضافہ کیا۔ اب گویا مندرجۂ ذیل چار مقاصد تحریک ندوۃ العلماء کے بنیادی مقاصد قرار پائے۔

۱۔ علوم اسلامیہ کے نصاب درس میں بنیادی اصلاحات اور نئے نصاب کی تیاری۔

۲۔ ایسے علما، پیدا کرنا جو کتاب وسنت کے وسیع وعمیق علم کے ساتھ جدید خیالات سے بخوبی واقف اور زمانہ کے نبض شناس ہوں

۳۔ اتحاد ملی اور اخوت اسلامی کے جذبات کو فروغ دینا۔

۴۔ اسلامی تعلیمات کی اشاعت بالخصوص برادران وطن کو اس کی خوبیوں سے روشناس کرانا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنے والد ماجد سید عبدالحی حسنی جو تحریک ندوۃ العلماء کے سرگرم مخلص، داعی وناظم بھی تھے کی سیرت حیات عبدالحیٔ میں تحریک کی فکری اساس اور اس کی خصوصیات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

۱۔ اس تحریک کی اساس (علی گڑھ کی تعلیم جدید اور مغربی تہذیب کی دعوت اور ملک کی دوسری تحریکوں کے خلاف) خالص دینی تھی۔ یعنی اس میں مسلمانوں کے تنزلی کا اصل سبب دین سے انحراف اور صحیح دینی تعلیم سے محرومی کو قرار دیا گیا تھا اور اس کو ملت کے درد کا مداوا اور اصلاح وترقی کا واحد راستہ تسلیم کیا گیا تھا۔

(۲) اس تحریک میں طبقہ علما، میں امور شریعت اسلامی کا حامل وامین، کتاب وسنت کا شارح وترجمان اور اسلام کا اصل نبض شناس ہے۔ مرکزی مقام دیا گیا ہے اور اسی کو اہمیت

کی تعمیر و تخریب یا ترقی و تنزلی، اصلاح و فساد کا اصل ذمہ دار قرار دیکر اپنی دعوت اور جد وجہد کا محور بنایا گیا ہے۔ کہ اس میں اصلاح حال کی کوئی کوشش اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک علما اسکے داعی و علمبردار نہ بنیں اور ان میں امت کی رہنمائی کی قیادت کی صلاحیت پیدا نہ ہو اس کیلئے ایک طرف دینی علوم پر حاوی اور کتاب و سنت کا رمز شناس ہونے کی ضرورت ہے۔ دوسری طرف حالات زمانہ اور جدید ضرورتوں سے واقفیت کی۔

۳۔ اس تحریک کا مزاج (سیاسی و ہنگامی کے بجائے) علمی و فکری تھا۔

۴۔ ندوۃ العلماء کی تحریک کا آغاز ہی اصلاح و ترقی کے کام سے ہوا تھا۔

۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۹۲ء میں مدرسہ فیض عام کانپور کے سالانہ جلسہ کے موقع پر ہندوستان کے چوٹی کے مشاہیر علما، جمع تھے جن میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

استاذ الاساتذہ مولانا لطف اللہ علی گڑھی، مولانا حافظ شاہ محمد حسین الہ آبادی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا خلیل احمد مدرس دوئم دیوبند مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا نذر محمد پنجابی، وصدر مدرس مدرسہ اسلامیہ فتحپور) مولانا احمد حسن کانپوری، مولانا سید محمد علی مونگیری، شیخ الہند مولانا محمود حسن (مدرس اول دارالعلوم دیوبند) مولانا شاہ محمد سلیمان پھلواروی، مولانا حکیم سید محمد ظہور الاسلام فتحپوری، مولانا عبدالغنی خاں، مولانا حکیم فخر الحسن گنگوہی، مولانا سید شاہ تجمل حسین دسنوی ۔ اس منتخب جلسہ میں باہمی مشورے سے ندوۃ العلماء کے نام سے ایک مجلس کے قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور یہ بھی کہ آئندہ سال ندوۃ العلماء کے نام سے ایک جلسہ کیا جائے مولانا سید محمد علی مونگیری کو اس مجلس کا پہلا ناظم اور سکریٹری مقرر کیا گیا۔

مولانا سید محمد علی مونگیری نے ندوۃ العلماء کے اغراض و مقاصد سے تعارف کرانے کے لئے ملک کے کونے کونے میں اپنے آدمی بھیجے جنہوں نے علماء اور جدید حلقہ سے رابطہ قائم کرکے انہیں ندوۃ العلماء کے پہلے سالانہ اجلاس میں شرکت کی دعوت دی۔ ندوۃ العلماء کا پہلا سالانہ اجلاس ۱۵، ۱۶، ۱۷ شوال ۱۳۱۱ھ مطابق ۲۲، ۲۳، ۲۴ اپریل ۱۸۹۴ء میں مدرسہ فیض عام کانپور میں منعقد ہوا، پھر تو ملک کے مختلف مقامات پر اجلاس ہونے لگے مسلمانوں کے ہر طبقہ نے ندوۃ العلماء کے اغراض و مقاصد کی حوصلہ افزائی کی، اور اس کو وقت کا اہم تقاضہ قرار دیا۔

دارالعلوم کے قیام کا پہلا خاکہ

۱۲ محرم ۱۳۱۱ھ کو شہر بریلی کے جلسے میں مولانا سید محمد علی مونگیری نے سب سے پہلے دارالعلوم کے قیام کا خاکہ پیش کیا جسے استصواب رائے کیلئے ملک کے ممتاز علماء اور دانشوروں کے پاس بھیجا گیا۔ دوسرے سال کے جلسہ میں عام بحث و مباحثہ کے بعد یہ مسودہ منظور کر لیا گیا۔

علما، حضرات نے نہ صرف اس مسودہ کی بھرپور تائید و حمایت کی بلکہ ندوۃ العلماء کے تحت ایک دارالعلوم کے قیام کو ہندوستان میں نیز پورے عالم اسلام کے لئے ایک انقلاب انگیز قدم قرار دیا۔

دارالعلوم کے لئے مطلوب درسگاہ کی عمارت کے علاوہ دارالاقاموں، کتب خانہ، شفاخانہ، اساتذہ کے لئے رہائشی عمارتیں، لکچر ھال، طلبہ کی یونین اور مسجد کیلئے عمارتوں کی تفصیل دی ہے۔ دفعہ۴ کے تحت اس دارالعلوم کے طلبہ کے لئے نظام تربیت کی تفصیل بارہ دفعات میں ہے پھر شرائط، اقدار و اصول و ضوابط ہیں اس کے بعد نظام تعلیم و تدریس اور نصاب کا ذکر ہے اور یہ تجویز رکھی گئی ہے کہ وقتاً فوقتاً عالم اسلام کے تعلیمی مراکز سے نصاب کی تفصیلات منگوائی جائیں گی، اور اگر کوئی کتاب مطلوبہ معیار کے مطابق دستیاب نہ ہوئی تو اس کو ترتیب دیا جائے گا

دارالعلوم کے طلبہ کی انجمنوں کا خاصا تفصیل سے تذکرہ ہے جس میں دارالمطالعہ، دارالکتب تحریری و تقریری ملکہ پیدا کرنے کے لئے مختلف ثقافتی و فکری شعبوں کی تفصیل ہے۔

اس مسودہ دارالعلوم میں سالانہ و ششماہی امتحانات کا بھی تذکرہ ہے۔ اس مجوزہ دارالعلوم کے قیام کے لئے متفقہ طور پر لکھنؤ کا انتخاب ہوا۔ جو ہر طرح اس علمی، ادبی تہذیبی مرکز کے شایان شان تھا۔

کانپور سے علماء کا ایک وفد مولانا سید محمد علی مونگیری کی قیادت میں ۱۶ر شوال ۱۳۱۰ھ مطابق بروز پنجشنبہ ۱۰ر مارچ ۱۸۹۰ء لکھنؤ روانہ ہوا، اس وفد میں مولانا مسیح الزماں خاں صاحب مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مولانا حاجی محمد یونس خاں صاحب، مولانا خلیل الرحمٰن سہارنپوری، مولانا ظہور الاسلام فتحپوری، مولانا حفیظ اللہ وغیرہ تھے منشی احترام علی کاکوروی اور منشی احتشام علی کاکوروی نے کشادہ دلی سے دریائے گومتی کے کنارے اپنی ایک وسیع قطعۂ آراضی ندوۃ العلماء کے حوالہ کی۔ یہ جگہ اس وقت بروده حسن باڑی کے نام سے مشہور تھی، ابتداء میں گولہ گنج کی ایک عمارت کو خرید کر عارضی طور پر دارالعلوم قائم کردیا گیا، پھر رفتہ رفتہ دارالعلوم کی عمارتیں تعمیر ہونے لگیں، اب اس وقت مرکزی عمارت درسگاہ کے لئے، ایک عمارت تین منزل کتب خانہ کے لئے، ایک حسین وجمیل مسجد، ایک مہمان خانہ، ایک شفاخانہ، ایک دارالقضا، ایک وسیع عمارت، معہد تحفیظ القرآن کے نام سے، ایک معہد ثانویہ مع دارالاقامہ، سلیمانیہ ہوسٹل، اطہر ہوسٹل، رحمانیہ ہوسٹل اور شبلی ہوسٹل نیز اساتذہ اور اسٹاف کے لئے رہائشی عمارتیں دارالعلوم کے کیمپس کے مختلف حصوں میں موجود ہیں۔ شعبۂ تعمیر و ترقی، اور مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کی بھی عمارتیں اس کیمپس میں موجود ہیں۔ ۲ر ستمبر ۱۸۹۸ء کو کانپور سے ندوہ کا دفتر منتقل ہوکر لکھنؤ گولہ گنج آگیا۔ ۲۶ر ستمبر کو دارالعلوم کا عملی افتتاح اس خاتون منزل میں ہوگیا جو دارالعلوم کے لئے خریدی گئی تھی۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء نے جس عزم وارادے سے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا وہ اس نے جاری رکھا ملک کے طول وعرض میں ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسے بڑے اہتمام سے منعقد کئے جاتے تھے کانپور، لکھنؤ، ناگ پور، امرتسر، بریلی، بلگام، کلکتہ، مدراس، میرٹھ، شاہجہاں پور، پٹنہ بنارس، پونہ، انبالہ جیسے مقامات پر ندوۃ العلماء کے تقریباً بائیس سالانہ جلسے منعقد کئے گئے، دوسری طرف تعلیم وتربیت اور دعوت و تبلیغ، تصنیف وتالیف کے میدان میں بھی ندوۃ العلماء نے اپنا سفر جاری رکھا، اور اس نے اپنے نصب العین سے کسی دور میں بھی انحراف نہیں کیا اللہ تعالیٰ نے اس ادارے کو ایسی مخلص اور باکمال شخصیتیں عطا فرمائیں جنہوں نے اس کے پیغام کو مشرق ومغرب کے گوشے گوشے میں پہنچادیا مولانا سید محمد علی مونگیری جیسے روشن ضمیر، عالم ربانی، مولانا سید عبدالحئی حسنی جیسے بلند پایہ محقق ومصنف دیدہ ور، مبصر ندوہ کے مقاصد اور پیغام کی نشرواشاعت کے لئے سراپا اخلاص، جدوجہد وقربانی، ایثار کی تابندہ مثال تھے۔

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، علامہ شبلی جیسے ممتاز عالم وادیب اور سید سلیمان ندوی جیسے بلند پایہ علمی رہنما، غلام محمد شملوی، مولوی عبدالغفور جیسے مخلص اور خاموش وانتھک کارکن ندوۃ العلماء کو نصیب ہوئے۔ مولانا سید عبدالحئی حسنی کے علاوہ نواب علی حسن خاں، مولانا خلیل الرحمٰن صاحب، ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب جیسے حضرات نے نظامت کے فرائض انجام دئے۔ اور بڑے نازک اور سنگین حالات میں اس سفینہ کو طوفان سے بچاکر لانے میں کامیاب ہوئے، اللہ تعالیٰ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی عمر میں برکت عطا فرمائے کہ ندوۃ العلماء کے لئے ان کی نظامت کا دور سب سے درخشاں، تابناک اور وقیع دور ہے۔

ندوۃ العلماء کے کارناموں پر ایک اجمالی نظر

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے قیام کا پہلا شاندار نتیجہ یہ نکلا کہ جو تنافر مسلمانوں کے مختلف گروہوں اور جماعتوں میں جو چپقلش اور چشمک تھی اس میں بہت کمی ہوگئی، قدیم وجدید گروہوں کے درمیان جو خلیج تھی وہ دور ہوگئی، علامہ عبدالحئی حسنی مولانا سید سلیمان ندوی، اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی، مولانا عبدالباری ندوی وغیرہ کی جدید وقدیم دونوں حلقوں میں خوب پذیرائی ہوئی اور ان حضرات پر ہر طبقہ نے اعتماد کیا بلکہ اب تو ندویوں کو اعتدال و توازن اور جدید وقدیم کا جامع تصور کیا جاتا ہے۔ اور دونوں حلقوں کا اعتماد ان کو حاصل ہے۔ ندوی فرزندوں نے میر کارواں حضرت سید سلیمان ندوی کی رہنمائی میں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی، اور اس ادارے کے ذریعہ مسلمانوں کی فکری، علمی، رہنمائی۔ اور ان کی ذہنی و دینی تربیت کا کام کیا۔

سیرت نبویؐ، سیرت عائشہؓ، امام مالک، عربوں کی جہازرانی

عمر خیام، نقوش سلیمانی، عرب و ہند کے تعلقات، خطبات مدراس، رحمت عالم، ارض القرآن، المامون، الغزالی، شعر العجم، شعر الہند، حکمائے اسلام، سیرۃ النعمان، الفاروق، علم کلام، سیرۃ الصحابہ والصحابیات کے موضوع پر گیارہ جلدوں میں ان حضرات کے سیرت کے کارنامے تابعین و تبع تابعین و اہل کتاب اور صحابہ کی سیرت کے علاوہ خلفاء راشدین، خلفاء بنو امیہ، خلفاء بنی عباس کی تاریخ چار جلدوں میں، دولت عثمانیہ کی تاریخ دو جلدوں میں، اور حکومت صقلیہ کی تاریخ دو حصوں میں مرتب کرکے دار المصنفین نے اسلامی کتب خانے میں گراں قدر اضافے کئے۔

آخری نصف صدی کا یہ دور بلاشبہ اسلامی دعوت و عزیمت اور فکر کے میدان میں ندوہ کا تجدیدی دور ہے جیسا کہ اس کے فرزندوں کی تصنیفی اور دعوتی اور تربیتی سرگرمیوں سے اندازہ ہوتا ہے۔

تاریخ دعوت و عزیمت کے طلائی سلسلہ نے اسلامی کتب خانے میں ایک نئے موضوع کا نہ صرف اضافہ بلکہ مسلمانوں کا اعتماد اسلامی تاریخ پر از سر نو بحال کیا اور یہ ثابت کیا کہ اسلام ایک ایسا سدابہار درخت ہے جو ہر زمانہ میں برگ و بار لاتا رہا ہے اور لاتا رہے گا۔

مسلم ممالک میں اسلامیات و مغربیت کی کش مکش، اور ارکان اربعہ، نبی رحمت، المرتضیٰ تذکرہ و سوانح کی کتابوں نے جدید تعلیم یافتہ طبقے کے اندر اسلام پر اعتماد بحال کرنے اور ہر زمانہ میں قائدانہ کردار ادا کرنے کی بھرپور صلاحیت پر یقین پیدا کرنے کا اہم کارنامہ انجام دیا۔

یہاں پر ۱۹۵۰ء کے بعد سے اب تک کی ندوی تصنیفات کا تعارف اور جائزہ مقصود نہیں صرف اس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کی مطبوعات پر ایک نظر ڈالنے سے ہمارے اس دعوے کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

تصنیف و تالیف کے میدان میں نئے اسلوب اور عصری زبان میں لکھنے کے علاوہ ندوۃ العلماء نے اردو و عربی، صحافت کے میدان میں بھی انقلابی انداز میں قدم ایسے وقت ۱۹۵۵ء میں رکھا، اور طاقت ور اسلامی صحافت کی بنیاد رکھی، جبکہ عالم عربی میں زبردست خلا تھا۔ ماہنامہ "البعث الاسلامی" مولانا سید محمد الحسنی نے ۱۹۵۵ء میں جاری کیا جس نے اپنے طاقتور اداریوں اور بے لاگ تبصروں کی بدولت عالم عربی کے سب سے بڑے فتنے عرب قومیت کو رسوا کر دیا۔ عربوں کے دماغ سے اس فتنے کے مسموم اثرات کو زائل کرنے اور اسلام پر ان کا از سر نو اعتماد بحال کرنے میں "البعث الاسلامی" کے ساتھ پندرہ روزہ الرائد نے بنیادی کردار ادا کیا۔ پہلے دور میں الندوہ، الضیاء، اور اس دور میں تعمیر حیات نے یہ کام اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔

نومبر ۱۹۷۵ء میں ندوۃ العلماء نے جو شاندار تعلیمی جشن منعقد کیا وہ ہندوستان ہی نہیں پورے عالم اسلام کا ممتاز و منفرد اور تاریخی جشن کہلانے کا مستحق ہے۔ اس جشن میں عالم عربی و اسلامی کے تقریباً تمام ہی ملکوں سے وفود شریک ہوئے تھے یہ جشن ایک طرح سے عالم اسلام کی طرف سے ندوہ کی فکری قیادت پر اتحاد کا اظہار تھا۔

□□ ——————

حواشی:

ؔ۱ روئیداد ندوۃ العلماء سال اول

ؔ۲ سوانح قاسمی ص ۳۹۲

لکھنؤ کے تفریحی مشاغل ...... صفحہ ۱۶۱ کا بقیہ

ہے کہ ضرورت مند افراد کو کسی نہ کسی طرح فیض پہنچایا جا سکے اور ان کو کسی حد تک ایسا روزگار کا ایک بہانہ تھے اور ہزاروں لوگ اسی بہانے اپنا پیٹ پالتے تھے۔

وقت کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ لکھنؤ کے یہ تفریحی مشاغل بھی قریب قریب ناپید ہو چکے ہیں۔ لے دے کے پتنگ بازی اور کبوتر بازی اور کچھ دوسری تفریحات بچی کچھی سانسیں لے رہی ہیں اور یہ بھی کب نظروں سے اوجھل ہو جائیں اس کا کوئی ٹھیک نہیں ہے کیونکہ مشینی دور اب کمپیوٹر اور الیکٹرانک کے عہد میں قدم رکھ چکا ہے۔ اب کس کو فرصت ہے جو مڑ کر یہ دیکھے کہ لکھنؤ اور اس کی تہذیب و تفریحی مشاغل کہاں گم ہو چکے ہیں۔

□□ ——————

ماخذ: آب حیات۔ محمد حسین آزاد۔ اٹھارویں صدی میں ہندوستانی معاشرت۔ ڈاکٹر محمد عمر۔ تاریخ لکھنؤ۔ مولانا سید آغا مہدی۔ گذشتہ لکھنؤ۔ عبدالحلیم شرر۔



غزل

عشق میاں، اس آگ میں میرا ظاہر ہی چمکا دینا
میرے بدن کی مٹی کو ذرا کندن رنگ بنا دینا

آؤ تمھاری نذر کریں ہم ایک چراغ حکایت کا
جب تک جاگو روشن رکھنا نیند آئے تو بجھا دینا

سینے کے ویرانے میں یہ خوشبو ایک کرامت ہے
ورنہ اتنا سہل نہیں تھا راکھ میں پھول کھلا دینا

بیس اکیس برس پیچھے ہیں کب تک ملتے رہنا ہے
دیکھو اب کی بار ملو تو دل کی بات بتا دینا

مولا! پھر مری بستی سے بن برسے بادل لوٹ گئے
خیر، شکایت کوئی نہیں ہے اگلے برس برسا دینا

دل کی زمیں تک روشنیاں تھیں، چہرے تھے، ہریالی تھی
اب تو جہاں بھی ساحل پانا، کشتی کو ٹھہرا دینا

خواجہ خضر سنو! ہم کب سے اس بستی میں بھٹکتے ہیں
تم کو اگر تکلیف نہ ہو تو جنگل تک پہونچا دینا

—— عرفان صدیقی
حیدر مرزا روڈ۔ لکھنؤ

اظہر مسعود
'ادبستان' - دین دیال روڈ
لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

لکھنؤ کے پھیری والے

اَودھ کے آخری تاجدار سلطان عالم واجد علی شاہ اختر کی معزولی کے تقریباً چار برس بعد ۱۸۶۰ء میں غالب نے اپنے ایک خط میں میر مہدی مجروح کو لکھا تھا:

".. لکھنؤ کی آبادی میں فرق نہیں آیا۔ ریاست تو جاتی رہی باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں۔" [1]

مذکورہ بالا خط میں جس لکھنؤ کی تعریف کی گئی ہے اب اس کے آثار بھی تقریباً مٹ چکے ہیں۔

بیسویں صدی کی تیسری دہائی تک لکھنؤ ہندوستان کے تہذیبی اور ثقافتی نقشے پر نمایاں نظر آتا تھا۔ اس کے بعد انحطاط کی رفتار بہت تیز ہو گئی یہاں تک کہ پانچویں دہائی کے اختتام پذیر ہوتے ہی تہذیب یافتہ بزرگوں کے حافظے میں محض اس کی دھندلی سی یاد باقی رہ گئی اور اب وہ بزرگ بھی نظر نہیں آتے۔

لکھنوی تہذیب کے عناصر ترکیبی میں شاعری اور موسیقی کا بہت اہم مقام تھا حتیٰ کہ یہاں کے آداب معاشرت اور نشست و برخاست کے طور طریقوں میں بھی ایک طرح کی موزونیت اور لے داری کا احساس ہوتا تھا۔ یہ صفات محض مخصوصین سے وابستہ نہیں تھیں جاہل عوام تک اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ محمد باقر شمس لکھتے ہیں:

"آج بھی لکھنؤ کے جہلا جس شاعرانہ انداز میں بات کرتے ہیں دوسری جگہ علما نہیں کر سکتے جب سماعت میں جامن بیچنے والا اپنی مترنم آواز میں کہتا ہے۔ کالی گھٹا کے کالے پھلیندے۔ تو ہزاروں شعر نثار کر دینے کو جی چاہتا ہے۔ اگر گرمیوں میں برف کی قلفی بیچنے والے کا یہ کہنا، 'یہ کس کی محبت میں گھل رہی ہے' اپنے اندر جذب اثر کا ایک عالم رکھتا ہے (تو) گنڈیریوں والے کی آواز، برفی کی ڈلیاں کون لے گا؟ بلاغت کی جان ہے اور گولر بیچنے والے کی صدا، گولر کیا ہیں شہد کی کپّیاں ہیں بیر بیچنے والے کی آواز، پیوندی بیر ٹکے سیر، پان بیچنے والے کا یہ مصرعہ، 'کرتی ہے سرخ رو وہ گلوری ہے پان کی'، دماغ کی ادبی شاعرانہ شاخ کا پتہ دیتی ہے۔" [2]

مندرجہ بالا اقتباس میں لکھنؤ کے کئی پھیری والوں کا ذکر آ گیا ہے اور یہ پھیری والے ہی ہمارے اس مضمون کا موضوع ہیں۔

لکھنؤ کے پھیری والوں کی صدائیں کسی موزوں مصرعے، فقرے نظم یا تک بندی کی شکل میں اور مترنم ہوا کرتی تھیں۔ حمد، نعت، منقبت وغیرہ سنا کر پیسے مانگتے پھرنے والے بالعموم بہت خوش گلو ہوتے تھے شرر کا بیان ہے۔

"بازاری لوگ اور عموماً لڑکے جو سڑکوں اور گزرگاہوں میں گاتے پھرتے ہیں وہ بھی مختلف چیزوں کو ایسے سچّے سُروں میں ادا کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے راگنی اور لَے گلے میں اتری ہوئی ہے..... لے داری یہاں کے بچے بچے کے رگ و پے میں سرایت کر گئی ہے۔" [3]

پھیری والے گھروں پر عموماً صبح کے وقت یا سہ پہر کو مغرب سے قبل سے آتے تھے۔ دوپہر یا رات میں آنے سے گریز کیا جاتا تھا۔ اس طرح اوقات کی پابندی میں غالباً یہ مصلحت پوشیدہ تھی کہ صاحب خانہ کے آرام میں خلل نہ پڑے۔

کچھ پھیری والوں کے اوقات بھی مخصوص تھے۔ مثلاً دودھ، دہی، بالائی وغیرہ بیچنے والے ہمیشہ صبح کے وقت اور قلفی، چاٹ، مٹھائی، بسکٹ وغیرہ بیچنے والے سہ پہر کو آتے تھے۔ پھیری والوں کے ذیل میں حسب ضرورت ان کے اوقات بھی بنا دیے گئے تھے۔

نفس موضوع پر آنے سے پہلے اس بات کی وضاحت بھی کردی جائے کہ ایسا نہیں ہے کہ اب پھیری والے نہیں رہے البتہ اگلے سے رکھ رکھاؤ، شائستگی، سلیقے اور نفاست کا فقدان ہے۔ انتضائے حال نے سودا رکھنے کے ظروف بھی بدل دیے ہیں اور صدائیں بھی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اب شاذ و نادر ہی کوئی پھیری والا گھر کے دروازے پر آواز لگاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اگلے وقتوں میں شرفا گھر کے باہر وہ بھی سر راہ کچھ کھانا تو درکنار گھر کے اندر بھی کھانے کے لیے مخصوص جگہ کے سوا کہیں اور کچھ نہیں کھاتے تھے۔ خواتین گھر میں ہی رہتیں۔ ایسی کوئی ضرورت درپیش ہوتی تو سات پردوں کے اندر گھر سے نکلتیں اور لوٹ کر سیدھی گھر آتیں۔ یہی سبب ہے کہ کنجڑنیں، گدنیں، منہارنیں، کمہارنیں، رنگریزنیں، دھوبنیں وغیرہ گھر گھر جاتی تھیں اب نہ وہ تہذیب ہے نہ وہ تکلفات، نہ وہ نشست و برخاست کے انداز، نہ وہ خورد و نوش کے آداب، نہ وہ باکمال، نہ وہ قدردان کہ جن سے کمال فن کی داد حاصل کرنے بلادِ غیر سے بھی لوگ آتے تھے۔ اب تو زندگی مجسم بازار ہو کر رہ گئی ہے جہاں ہر طرح کا مال بکتا اور خریدا جاتا ہے۔

لکھنؤ میں بعض کھانے کی چیزوں کو ان کے نام کے بجائے محض ان کی صفت بیان کرکے بیچا جاتا تھا۔ مثلاً "کڑوے وکرارے" کی آواز سنئے تو سمجھ لیجئے کہ سلونے سیو والا ہے۔ "مزے لو بادام کے" سے مراد مونگ پھلی ہے۔ ایک خاص لحن میں آواز سنائی دے، "آٹھ آنے سیر لیو جلیبہ" کے معنی ہیں شکر قند بیچی جارہی ہے۔ "کیا پیڑے ہیں" کا مطلب ہے امرود۔ "لیلیٰ کی انگلیاں ہیں مجنوں کی پسلیاں ہیں" یعنی پتلی پتلی لچھے دار ککڑیاں ہیں۔

سید حسن نام کا ایک پھیری والا تیل کے لڈو یوں بیچتا تھا: "کل پھس پھسے تھے آج کرارے ہیں میاں!"

لیلیٰ کی انگلیوں اور مجنوں کی پسلیوں پر ایک لطیفہ بھی سن لیجئے۔ ایک دفعہ الہ آباد کے محلہ سبزی منڈی میں ڈاکٹر مسیح الزماں مرحوم کے یہاں میرا قیام تھا۔ سہ پہر کے وقت نہایت بھونڈی آواز سنائی دی "لیلیٰ کی انگلیاں ہیں مجنوں کی پسلیاں ہیں"، لکھنؤ کی اس صدا کا دیہاتی کرن پہلی بار سنا تھا جاکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک پھیری والا موٹے موٹے ککڑے بیچ رہا ہے۔ میں نے سوچا کہ واقعی اگر لیلیٰ مجنوں اس تن و توش کے مالک تھے تو اردو کے ہزاروں اشعار کی صحت مشکوک قرار پائے گی۔

کچھ اشیائے خورد و نوش کسی دوسری چیز سے تشبیہ دے کر بیچی جاتی تھیں۔ آج بھی یہ آواز برابر سنائی دیتی ہے۔ "مزہ سیب کا ہے امرود میں" یا بقول سرور "مزہ انگور کا ہے رنگتروں میں"[۴]

مقامات سے بھی نسبت دے کر پھیری والے آواز لگاتے تھے جیسے الٰہ آباد کے امرود ہیں، خربوزے شہد پور کے ہیں، کانپوری کچلے ہیں، انگور چمن والے ہیں، سہارنپوری پونڈے ہیں، جونپوری تربوز ہیں۔ سیب کہیں کا بھی ہو، کشمیر کی نسبت سے بیچا جاتا تھا۔ پیٹھے کی مٹھائی اور موتی چور کے لڈو آج بھی سندیلے اور آگرے کی نسبت سے فروخت ہوتے ہیں۔ چارباغ ریلوے اسٹیشن پر سندیلے کے لڈو، لکھنؤ کی ریوڑی اور بنارس کے چوبی کھلونے کے لیے پھیری والے ٹرین کے ساتھ آواز لگاتے پھرا کرتے تھے۔

کھانے کا کچا اور پکا دونوں طرح کا سامان لے کر پھیری والے نکلتے تھے۔ مچھلی والے دروازے دروازے آواز لگاتے گھومتے، "تازہ ریہو ہے، پڑھن مچھلی"۔ والد مرحوم مسعود حسن رضوی ادیب سے ایک مچھلی والے نے بتایا کہ اس نے پورے ملک کی مچھلی کھائی ہے مگر جو مزہ گومتی کی مچھلی میں ہے اور کہیں نہیں۔ صبح سویرے ہی مچھلی والے بہنگی لیکر پھیری پر نکلتے تھے۔ آج مچھلی بازار میں رہو، ٹور، موہ، پڑھن، ماشیر، گرئی، بام غرض جو سی مچھلی چاہیے مل جائے گی۔ کیونکہ نقل و حمل کے ذرائع اتنے ہوگئے ہیں کہ ملک کے کونے کونے سے قیصر باغ کی منڈی میں مچھلی آجاتی ہے جب یہ ذرائع مفقود یا بے انتہا محدود تھے تو مچھیرے گومتی میں رات بھر جال ڈالتے اور جو مچھلیاں ہاتھ لگتیں انھیں لے کر منہ اندھیرے نکل کھڑے ہوتے۔

گوشت والے بھانکڑ کی بالکل مچھلی ڈلیا میں گوشت بیچنے

تھے۔ یہ لوگ عموماً بڑے جانور کی کلیجی، پھیپھڑا، دل، گردہ بھیجا وغیرہ بیچتے تھے۔

ترکاری والے ڈیوڑھی پر آتے اور ترکاری والیاں عموماً گھروں کے اندر جا کر سامان بیچتی تھیں اب ترکاری والیوں نے آنا بند کر دیا ہے۔ مگر ترکاری والے اب بھی چوپہیا ٹھیلے آراستہ کر کے سڑکوں اور گلیوں میں آواز لگاتے پھرتے ہیں۔

خشک مسالے اور میوے والے بھی گھر گھر جایا کرتے تھے۔ گنّے پائے والا، ٹکیں گرم، کباب کلیجی کے، پلاؤ گرم ابھی کل کی صدائیں معلوم ہوتی ہیں۔ چاٹ والے بھی اپنا خوانچہ سر پر اٹھائے سہ پہر کے وقت آ جایا کرتے تھے۔ چاٹ آج بھی ملتی ہے مگر خوانچوں والوں کا رواج اور گھر گھر جانے کا دستور ختم ہو رہا ہے۔ اگلے وقتوں میں چاٹ میں ایک چیز لونگ چڑا بھی ہوتی تھی یہ املی کے پتے میں بھیگی ہوئی چھوٹی چھوٹی پتلی پتلی ٹکیاں ہوتی تھیں غالباً بیسن سے بنائی جاتی تھیں۔ اب اس کا نام جاننے والے بھی مشکل سے ملیں گے۔

سردیوں میں گرما گرم چائے سماور میں اور کاغذی سموسے بانس کی ٹوکری میں لے کر پھیری والے نکلا کرتے تھے۔ کشمیری چائے کی تین صفتیں خاص بیان کی جاتی ہیں۔ لب سوز، لب دوز اور لب ریز۔

دودھ دہی اور دیسی گھی والے بھی گھروں پر جاتے تھے۔ دیسی گھی عام طور پر گدنیں گھروں کے اندر لے کر آتی تھیں اگر گھی کے خالص پن میں شک ظاہر کیا جاتا تو فوراً قسمیں کھانا شروع کر دیتیں۔ آنکھن کسم (آنکھوں کی قسم)، بچّن کسم (بچوں کی قسم)، بالکل نکھالس (بالکل خالص) ہے۔

دودھ، دہی، بالائی اور نمش والے ہی گرمیوں میں برف کی قلفیاں بھی لے کر آتے تھے۔ شورہ ملی، برف میں جمی، مخروطی وضع کی خوب گھیے ہوئے دودھ کی جمائی گئی قلفیاں بڑی ذائقہ دار اور فرحت بخش ہوتی تھیں کچھ لوگ کیوڑے اور فالسے کی قلفیاں بھی جماتے تھے۔ مٹی کے ظروف میں بھی قلفیاں جمائی جاتی تھیں یہ اسپیشل کوالٹی کی ہوتی تھیں۔ ان میں مال بھی زیادہ ہوتا تھا۔ اور انھیں عرف عام میں قلفہ کہا جاتا تھا۔ قلفی والے ہمیشہ عصر اور مغرب کے بیچ میں آتے تھے۔ لکھنؤ کی قلفی کے بارے میں سرور کا بیان بھی

"دو دو پیسے کو برف جمی، دو کھائے، بدن تھرائے، زیادہ ہو کا کرے لقوے فالج میں مرے۔"[۵]

گنّے کی گنڈیریاں بھی پھیری والے کبھی بہنگی میں اور کبھی جھانکڑ کی بچھلی ڈلیا میں لے کر نکلتے تھے۔ نفاست سے چھلی ہوئی، برابر سے کٹی ہوئی اور سلیقے سے چنی ہوئی گنڈیریوں کو چاندی کے ورق اور گلاب کے پھولوں سے سجایا اور بسایا جاتا تھا۔

سالم گنا بھی بکتا تھا مگر اب پہلے جیسا خوش رنگ، موٹا، نرم اور رسیلا گنا بازار میں نہیں آتا جس کے بارے میں سرور لکھتے ہیں۔

"بنی کا پونڈا، نرم گندہ، قند و شہد کا سینچا۔ اگر پوپلا بھی مسوڑھوں سے چبائے شربت کا گھونٹ حلق سے اتر جائے"[۶]

سالم گنے کی بات چلی ہے تو ذرا شرر کا بیان بھی دیکھتے چلئے۔

"ایک کنجڑا چوک میں پونڈے بیچ رہا تھا۔ صدا یہ تھی کہ "ارے بھئی یہ کنکوے کون لوٹے گا؟ کیا اس سے بھی زیادہ بامذاق کوئی استعارہ ہو سکتا ہے ..... نہ پونڈے کا نام لیا نہ گنّے کا جس سے کنکوے لوٹے جاتے ہیں صرف اتنا کہہ کے کہ کنکوے کون لوٹے گا۔ یہ بتا دیا کہ پونڈے لگوں کے برابر ہیں۔"[۷]

مرزا جعفر حسین مرحوم لکھتے ہیں:

"اس ترانے میں اتنی کشش تھی کہ مولانائے محترم (شرر) اپنے کمرے سے..... بے تابانہ ننگے پاؤں باہر آ گئے اور کچھ قدم سڑک پر اسی گنے والے کے ہمراہ نکل گئے"[۸]

سید صاحب بسکٹ والے بڑے سے ٹین کے بکس میں بسکٹ لاتے تھے۔ ان کے بکس کے اندر ایک کشتی بھی لگی تھی جس میں پیسٹری، نان خطائی، کریم رول وغیرہ سلیقے سے چنے ہوتے اور کشتی کے نیچے بکس کے گہرے حصے میں گولا بتاسے رکھتے۔ تھے تو مسلمان مگر وضع قطع ہندوؤں جیسی تھی۔ دھوتی کرتے میں ملبوس رہتے۔ پھنسی پھنسی آواز میں خستہ بسکٹ کی صدا لگاتے گھروں پر جایا کرتے تھے۔ پڑھے لکھے تو غالباً بالکل نہیں تھے مگر گفتگو اچھی مگر جوش میں بھر کر کیا کرتے تھے خود زندگی بھر پھیری لگائی لیکن اولاد کو اعلیٰ تعلیم دلائی۔ بکڑی سیکھے ہوئے تھے

فن سپہ گری کا کوئی قدر دان مل جاتا تو بسکٹوں کا بکس رکھ کر لاٹھی کے ہاتھ دکھانے لگتے۔ دو ایک پینترے مجھے بھی بتائے تھے۔

پاپڑ ہندو حضرات کے کھانے کا ایک خاص جزو ہے لیکن مسلمانوں میں اس کی طرف کوئی خاص رغبت نہیں پائی جاتی ہے شاید اسی وجہ سے پاپڑ بیچنے والوں میں مسلمان خال خال ہی نظر آتے تھے۔ ان میں ایک طاہر صاحب بھی ہوا کرتے تھے۔ نہایت سیدھے شریف اور نرم گفتار انسان تھے۔ علی گڑھ کاٹ کا پائجامہ اور کرتا پہنتے۔ کبھی برہنہ سر دکھائی نہیں دیتے۔ سر پر ٹوپی ہمیشہ ہوتی۔ مونگ اور ماش کے چھوٹے بڑے تلے ہوئے پاپڑ اور پاپڑ کے چٹ پٹے چورے کی پڑیاں بیچتے تھے۔ پڑیاں کندھے سے لٹکے ہوئے تھیلے میں ہوتیں اور پاپڑ ہتھے دار بانس کی ٹوکری میں۔ اردو میں خوشخط ”طاہر پاپڑ والا“ لکھا ہوا ایک موٹا کاغذ ٹوکری پر چسپاں رہتا۔ یہ گویا اس چلتی پھرتی دکان کا سائن بورڈ تھا۔ بڑی شائستگی کے ساتھ آواز بھی یہی لگاتے ”طاہر پاپڑ والا“۔

شیشے کے صندوق نما شوکیش میں بنگالی مٹھائی بیچنے والے بھی دروازے دروازے جاتے تھے رس گلے اور چم چم ملائی ان کی خاص مٹھائیاں ہوتی تھیں۔ یہ لوگ مٹھائی کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے ایک خاص طرح کی چمٹی سے پکڑ کر نکالتے تھے اور ڈھاک کے تازہ پتے کے دونے میں دیتے تھے۔

بنگالی مٹھائی کی طرح شیشے کے شوکیس میں ہی فینسی قسم کے بسکٹ بیچنے کا رواج بھی تھا مگر ان کا شوکیس مستطیل کے بجائے ہشت پہل ہوتا تھا۔ یہ لوگ اپنا شوکیش زمین پر کبھی نہیں رکھتے تھے۔ سودا دینا ہوتا تو پہلے بغل میں دبے ہوئے ڈھائی تین فٹ اونچے بید کے اسٹینڈ کو زمین پر رکھتے پھر اس پر اپنا شوکیش ٹکاتے۔

چنا جور گرم والے مزے دار چٹپٹے چنوں کے علاوہ اپنے آواز لگانے کے مخصوص انداز کی بدولت بھی خاصے مقبول تھے۔ ایک آدمی بڑی تیز اور باریک آواز میں ایک ایک لفظ کو کھینچ کر صدا لگاتا۔ آئی چنے کی بہار، میرا چنا ذائقہ دار۔ ایک دوسرا پھیری والا مخصوص لحن میں اس طرح تک بندی کرتا:

میرا چنا بنا ہے اعلا　　　اس میں پڑا ہے گرم مسالہ
جس کو کھائیں نند کے لالہ　　　جس کو کھائے بوڑھا بالا
جس کو کھائے افسر اعلا　　　چنا جور گرم

یہ چنے والا احمد ڈاکو کی منظوم کتھا بھی سنایا کرتا تھا۔

ایک پھیری والا بالو کے بھنے بھٹے بھی لایا کرتا تھا۔ ان بھٹوں کا ذائقہ کوئلوں پر بھنے بھٹوں سے بالکل الگ ہوتا تھا۔ وہ بھٹوں کو گرم رکھنے کے لیے انھیں روئی کے گدے میں لپیٹے رہتا تھا۔

ایک شخص حلوا پراٹھا بیچتا تھا۔ پیتل کے تسلے میں ترتراتا ہوا رَوے کا حلوا اور رنگ بھگ تین فٹ قطر کا پرت دار پراٹھا۔ پورا پراٹھا کھانا کسی معتدل انسان کے بس کی بات نہیں تھی تُل کر بکتا تھا اور چار آنے میں سیری ہو جایا کرتی تھی۔

ایک پھیری والے تمام دنوں میں کھویا پٹی، سلونے سیو، تل کے لڈو، گزک، پھپے والی پیڑی وغیرہ کا خوانچہ لگاتے اور عشرۂ محرم کے دوران مجلس کا تبرک مثلاً نمکین، نکتیاں، نمک پارے، الائچی دانے شکر پارے، اندرسے کی گولیاں وغیرہ بیچتے۔ بارہ محرم کو امام کے تیجے کے دن پھولوں کے پیالے جن میں سوگ بڑھانے کی اشیا، ہوتی تھیں اور چھوٹے بڑے الائچی دانے اور میٹھی کھیلیں لیکر آتے تھے۔ بڑی نرم اور دل آویز گفتگو کرتے تھے۔ انھوں نے بعد میں پھیری لگانا بند کر کے آری زردوزی کا کارخانہ کھول لیا تھا۔

کڑکڑاتے جاڑوں میں تاروں کی چھاؤں تلے دودھ کو متھ کر نمش بنائی جاتی ہو۔ ایک زمانے میں پھین کی شکل میں اس مٹھائی پر پستے، بادام کی ہوائیاں بھی نظر آتی تھیں۔ نمش والے صبح تڑکے پھیری پر نکلتے تھے۔ بڑے سے پیتل کے تھال میں نمش کا کونڈا کسی کپڑے یا سینی سے ڈھکا ہوا رکھا ہوتا اور تھال کے تین طرف پرانے روپے کے سکے سے لیکر ہتھیلی کے برابر تک کی کوری سکوریاں اور پیالے رکھے ہوتے نمش کو ایک زمانے میں نان تنک سے کھایا جاتا تھا۹؎ صبح کے وقت اکثر نمش والوں کی پرکشش آواز ملائی مکھن ہے! سے آنکھ کھلتی تھی۔

بالائی والے بھی صبحدم آتے تھے مگر نمش والوں کے بعد ان کا پھیرا ہوتا۔ اس بالائی کی غربال نما اور پری پرت اتنی خشک ہوتی تھی کہ ہاتھ لگایئے تو بجز چکنائی کے ذرا سی بھی نمی ہاتھ میں نہیں چھوٹتی تھی جیسا بالائی

میں سے دودھ چھوٹتا ہوا اسے اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ لکھنؤ کی بالائی کے لئے رجب علی بیگ سرور لکھتے ہیں:

"بے قند و شکر خدا کر کر چھری سے کاٹی اور کھائی ہے"

اور شرر لکھتے ہیں کہ:

"بالائی کی تہوں کو نفاست اور خوش نمائی سے جمانا ایسا کام ہے جو لکھنؤ کے سوا شاذ و نادر ہی کسی شہر کے لوگوں کو آتا ہوگا۔" [۱۱]

ایک بالائی والے نے ناپ تول کا جھنجھٹ ہٹانے کے لیے مٹی کے کورے پیالوں میں چھٹانک چھٹانک بھر بالائی رکھ کر بیچنا شروع کی۔ اس کی بالائی اوپر سے بہت خشک، اندر سے خوب چکنی اور خوش ذائقہ ہوتی تھی۔ بالائی کے پیالے ایں کی پاٹ دار آواز کے ساتھ ہی گھروں کے دروازے کھل جاتے اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا خوانچہ خالی ہو جاتا۔

افغانستان کے لوگ خشک میوے، ہینگ، سلاجیت اور شیر کی چربی لے کر سردیوں کے موسم میں آتے تھے اور سال بھر کی روزی روٹی کا حساب کر کے واپس اپنے ملک چلے جاتے تھے۔ کچھ لوگ سود پر روپیہ بھی چلاتے تھے۔

کچھ پھیری والے جگہ جگہ رک کر پہلے اپنے چاروں طرف مجمع اکٹھا کرتے اس کے بعد اپنے مال کی تشہیر کرتے۔ ایسے ہی ایک دانت کا منجن بیچنے والے تھے جو اپنی چرب زبانی کے علاوہ اپنی ہیئت کذائی سے بھی لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا کرتے تھے۔ کبھی دانتوں کے سرجن کا بھیس بدلے ہیں۔ کبھی یونان کے قدیم فوجی لباس میں سکندر اعظم کا بہروپ بنائے ہوئے ہیں۔ بڑے وجیہہ اور تندرست تھے۔ اس لیے ہر روپ ان کے اوپر کھپتا تھا۔ ان کے دانت بالکل برابر کے، سڈول اور موتیوں جیسے چمکدار تھے۔ بارہ تیرہ برس کا ایک لڑکا بھی ان کے اسسٹنٹ کے طور پر ساتھ رہتا تھا۔

ایک اور منجن والے تھے یہ اپنے دانتوں کی مضبوطی دکھانے کے لیے تانبے کے سکے کو دانت سے پکڑ کر دوہرا کر دیا کرتے تھے۔ بغیر تکلیف اور اوزار کے دانت اکھاڑتے بھی انھیں دیکھا وہ انگوچھے کے کونے پر کچھ پڑھ کر دم کرتے پھر وہی کونا دانت سے مس کر کے الگ ہٹ جاتے دانت اپنی جڑیں خود بخود چھوڑ دیتا اور درد میں مبتلا شخص اپنی ہی چٹکی سے دانت کو گویا مسوڑھے پر سے اٹھا لیتا۔ اس میں حقیقت کہاں تک ہے واللہ اعلم۔ لیکن کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ایسا ہو سکتا ہے۔

ایک صاحب تھے جو لال مرہم بیچا کرتے تھے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ پہلے تو پولیس انسپکٹر تھے۔ وضع قطع اور چہرے مہرے سے لگتے بھی تھے۔ تیز سے تیز درد ہو مرہم کی ایک انگلی لگانے سے اڑنچھو ہو جایا کرتا تھا۔ خیال تھا کہ چارہ گری کرانے والے انھیں کے گرگے ہوتے تھے جو ان کا مرہم لگتے ہی ہشاش بشاش لگنے لگتے تھے مگر اب کو دیکھتے ہیں منٹوں میں درد کا رفع ہو جانا بڑی معمولی بات معلوم ہوتی ہے۔

بانو شاہ کا سُرمہ بیچنے والے بھی اسی طرح بھیڑ لگا کر کاروبار کیا کرتے تھے نخاس کی طرف اتوار کی بازار میں ضرور آتے تھے یہ دو ننگ دھڑنگ آدمی تھے جو، کوئی بھی موسم ہو لباس کے نام پر صرف ایک سیاہ رنگ کی لنگوٹی باندھے رہتے تھے۔ یہ لوگ بانس کے ڈنڈوں کے سہارے ایک پوسٹر ٹانگ دیتے جس پر سرمے کے خواص لکھے ہوتے اور بانو شاہ کی روغنی رنگ سے ایک تصویر بنی ہوتی، خود بانو شاہ بھی لمبی کاکلوں اور ریش دراز کے ساتھ ایک لنگوٹی کسے مگدر کاندھے پر رکھے نظر آتے تھے۔ یہ دونوں لنگوٹ بند سرے والے پاٹ دار آواز میں مخصوص دھن سے ایک نظم پڑھتے جاتے اور راہ گیروں کو ہاتھ کے اشارے سے پاس بلا کر ایک ہی سلائی سے سب کے سرمہ لگاتے اور ہاتھ میں دبے ہوئے کثیف رومال سے آنسو خشک کرتے جاتے۔ ان کی نظم کی یہ تین لائنیں یاد رہ گئی ہیں۔

لگا لو پیاری آنکھوں میں یہ بانو شاہ کا سُرمہ
نہ لگتا ہے نہ جلتا ہے کرے آنکھوں کو یہ ٹھنڈا
عجب تاثیر لاتا ہے یہ بانو شاہ کا سُرمہ

ایک چوبے جی ہوا کرتے تھے۔ یہ قوت مردی کی دوا بیچتے تھے یہ اپنے ساتھ پٹاریوں اور تھیلیوں میں بند دو چند قسم کے سانپ بھی رکھتے تھے اور ہر سانپ سے وابستہ کوئی نہ کوئی قصہ بھی بیان کرتے تھے۔ چٹکلے بھی سناتے جو ان کی دوا کی مناسبت سے ہی ہوتے اور

جنھیں مہذب محفل میں نقل نہیں کیا جا سکتا۔ مجمع بڑی دلچسپی اور انہماک سے ان کی باتیں سنتا۔ بیچ بیچ میں لوگوں کو خبردار بھی کرتے رہتے۔ بھائیو جیب پاکٹ سے ہوشیار۔ دنیا میں بڑا بڑا کلاکار پڑا ہوا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ بٹوے کو ہلکا کر دے۔ ان کے پاس بچھو بھی تھے۔ پانچ پانچ چھ چھ انچ لمبے اور بالکل سیاہ۔ کہتے تھے کالے ناگ کا ڈسا جیسے اس کا کاٹا پانی نہ پیئے۔ کبھی کبھی چھیڑ خانی کے لیے سانپ کو زمین پر چھوڑ دیتے وہ مجمع کی طرف جانے لگتا تو ایک کھلبلی مچ جاتی۔ اس سے پہلے کہ لوگ بھاگ کھڑے ہوں یہ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ہی پتلی سی چھڑی سے اسے اس طرح اٹھا لیتے جیسے سانپ نہ ہو کپڑے کا ازار بند ہو۔

بزاز اور بچکہ، گوٹا کناری والے لوگ بھی گھروں پر آتے اور آواز لگاتے۔ ان میں سے بعضوں کی تو خاصی بڑی دکانیں چوک میں تھیں بزاز کپڑوں کے تھان کو مارکین کی چادر میں باندھ کر کندھے سے اس طرح لٹکاتے کہ سارا وزن کولہوں اور کمر پر آ جاتا۔ یہ لوگ جھکے جھکے لوہے یا لکڑی کا گز زمین پر ٹیک ٹیک کر چلا کرتے تھے۔ کچھ بزاز کپڑے کا گٹھر اٹھانے کے لیے مزدور بھی کر لیا کرتے تھے۔

ایک زمانے میں سرحد پار سے چینی تاجر اپنے یہاں کی مصنوعات لے کر یہاں آتے اور پھیری پر نکلتے۔ صاحبانِ استعداد سے انھیں اپنے مال کی اچھی قیمت ملتی۔ چین کا ریشمی کپڑا خصوصاً ساٹن اور کڑھائی کا کام بہت نفیس ہوتا تھا۔ یہ لوگ ہاتھ کی بنی تصویریں بھی لاتے تھے جو موقلم کی باریکی اور رنگوں کے امتزاج و تناسب کے اعلا شعور کی گواہی دیتی تھیں۔ یہ لوگ ہندوستانی اور انگریزی کو مخلوط کر کے عجیب و غریب زبان بولتے تھے۔ مثال کے طور پر اگر یہ کہنا ہے کہ "یہ کپڑا دھوئے دھوئے و بیٹر ہوتا ہے" تو کہتے "یہ کپرا واشے واشے تھک اوتا اسے"

دھات اور شیشے، چینی کے برتن بھی پھیری والے گھروں پر لاتے تھے۔ کچھ عورتیں صرف کامدار پرانے کپڑے کے بدلے میں برتن دیتی تھیں۔ آج کی طرح پہلے جھوٹا پھکا پٹھا تو ہوتا نہیں تھا۔ کامدانی زردوزی، سلمٰی ستارہ، کرن، مقیش، جوا، مرمرا، زربفت، جامہ وار جو چیز بھی تھی اس میں سونا یا چاندی ضرور ہوتی تھی۔

پھیری والوں میں ایک قسم لال سوداگروں کی ہوا کرتی تھی یہ لوگ ایسی چیزیں بیچا کرتے تھے جن میں کوئی باہمی ربط نظر نہ آتا ہو۔ ایک لال سوداگر کو میں نے بھی دیکھا ہے وہ شاید آخری لال سوداگر تھے۔ مرحوم نہایت کڑوے بڑے میاں تھے۔ آج سے کوئی تیس برس پہلے کمر خم کھا کر تقریباً دوہری ہو چکی تھی۔ وضع قطع ثقات جیسی۔ سن سفید پٹے روئی کا گالا جیسی داڑھی، نورانی چہرہ، صاف رنگت مگر تیور ہمیشہ میلے سڑک کے آوارہ گرد لڑکے انھیں چھیڑا کرتے۔ یہ بھی سمجھتے تھے کہ کیوں چھیڑ رہے ہیں۔ لہٰذا جواباً ان کی ماں بہنوں تک کو نواز کر رکھ دیتے۔

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

وہ تو کب کے اپنا اسباب لٹا کر راہِ عدم کے سفری ہوئے مگر ان کی آواز آج تک کانوں میں گونجتی ہوئی معلوم ہوتی ہے "ہوادار پنکھے، مرید آباد کی مہندی، نوحے ماتم کی بیاضیں!"

حواشی:

۱؎ غالب کے خطوط (جلد دوم) مرتبہ خلیق انجم طبع ۱۹۸۵ ص ۵۲۳/۵۲۴

۲؎ لکھنؤ کی زبان۔ طبع ۱۹۶۹ ص ۴۶

۳؎ گزشتہ لکھنؤ۔ مرتبہ شمیم انہونوی طبع ۱۹۶۵ ص ۱۹۸

۴؎ فسانۂ عجائب۔ مرتبہ رشید حسن خاں۔ متن ص ۷

۵؎ ایضاً ۶؎ فسانۂ عجائب متن ص ۹

۷؎ گزشتہ لکھنؤ طبع قدیم ناقص الاول ص ۹۹

۸؎ بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب اپنے تہذیبی پس منظر میں طبع ۱۹۷۸ ص ۱۰

۹؎ قدیم ہنر و ہنرمندانِ اودھ۔ از سید اسرار حسین خاں ۱۹۳۹ ص ۱۴۸

۱۰؎ فسانۂ عجائب مرتبہ رشید حسن خاں متن ص ۸

۱۱؎ گزشتہ لکھنؤ مرتبہ شمیم انہونوی طبع ۱۹۶۵ ص ۲۵۱



دانش لکھنوی
۳۲۷/۱۲۴ انیس ہاؤس، چوک
لکھنؤ

خوشنویسانِ اودھ : احوال و آثار

جو ہاتھ مقام کے لکھے تو کتبہ ہو خورشید   شبیہ برق کھینچے گر چلے شتاب قلم

مغلیہ دورِ حکومت سے عروجِ سلطنتِ اودھ تک مختلف بادشاہوں کے زمانے میں ماہرینِ فن جمع ہوتے رہے۔ ان میں فن خوش نویسی کے ممتاز افراد بھی تھے جو یہاں باعزت زندگی گزار رہے تھے۔ انھیں آصف الدولہ کے سے سخی معتمد الدولہ آغا میر سے فیاض، جانِ عالم مرزا واجد علی شاہ اختر جیسے جوہر شناس اور حوصلہ مند بادشاہ نصیب ہوئے جنھوں نے بیک وقت مختلف فنون کے ماہروں کو یکجا کر دیا تھا۔

واجد علی شاہ کے دور میں خوشنویسوں کو جواہر رقم خاں' یاقوت رقم خاں' گوہر رقم خاں، میر بندہ علی، مرتعش رقم، حامد علی مرصّع رقم جیسے خطابات سے نوازا گیا۔ اس عہد میں بیضاوی لکھنے والے الگ' آفتابی لکھنے والے الگ تھے۔ مطبع سلطانی کی چھپی اور قلمی کتابوں میں ان کے قلم کی معجز نمائیاں آج بھی موجود ہیں۔ بادشاہ کے علاوہ امرا و روٴسا نے بھی اس فن کے جاننے والوں کی قدر دانیاں کیں۔ نواب آغا علی خاں المعروف بہ آغائی صاحب (ناظم سلطان پور) کی فیاضیاں اور سرپرستیاں فنکاروں کے شاملِ حال رہیں۔

ان تمام صاحبِ کمال افراد کے مورثِ اعلیٰ عہد شجاع الدولہ میں محمد خلیل تھے جن کے بارے میں اب تک تحقیق نہ ہو سکی کہ وہ اس فن میں کس کے شاگرد تھے۔ خلیل بیک وقت اٹھارہ خطوں پر عبور رکھتے تھے اور خدا نے انھیں وہ قدرت عطا کی تھی کہ جب وہ میر علی' میر عماد، حدّاد اور یاقوت رقم خاں کا خط دیکھتے تو اس کی نقل اس طرح فرماتے کہ بانظر ماہرینِ فن بھی اصل اور نقل میں تمیز کرنے سے قاصر رہ جاتے تھے۔

محمد خلیل کے بعد اگر کسی کا ذکر ملتا ہے تو وہ آقا عبد الرشید تھے جو شاہجہاں کے عہد میں ہندوستان آئے اور اپنے لازوال فن کی بدولت مشہور و مقبول ہوئے۔ صاحبِ "صحیفۂ خوشنویساں" مولوی احترام الدین شاغل عثمانی نے آقا عبد الرشید کو میر عماد الحسن "عماد الحسنی" (اوّل) کا بھانجہ اور شاگردِ سعید تحریر کیا ہے۔

آقا عبد الرشید کے شاگرد قاضی نعمت اللہ لاہوری شہزادوں کی اصلاح پر معین تھے اور حافظ نور اللہ درباری ضروریات کو پورا کرتے تھے۔ اس زمانے میں تصویروں میں سنہری بیلیں بنانے کا رواج تھا۔ چنانچہ عہدِ آصفی کی بعض تصاویر میں متذکرہ ماہرینِ فن کی قلم کاریاں موجود ہیں۔ حافظ نور اللہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر مسجدِ آصفی کے کنوئیں کی جگت اور مسجد کی رو کار پر بہ صورت قطعات اب بھی موجود ہے۔ تحسین علی خاں کی مسجد واقع چوک لکھنؤ کا قطعۂ تاریخ بھی نور اللہ نے لکھا ہے۔ اودھ میں عبد الرشید دیلمی کے کئی شاگرد تھے مگر خصوصیت سے میر عماد الحسن "عماد الحسنی" (دوم) نے بڑا نام پیدا کیا۔ میر عماد عہد محمد شاہ میں ہندستان آئے اور لاتعداد شاگرد بنائے جو ہندوستان کے مختلف صوبوں میں پھیل گئے۔ ان کے نامور شاگردوں میں حافظ نور اللہ، قاضی نعمت اللہ اور عباد اللہ بیگ اودھ کے حصّے میں آئے۔

حافظ نور اللہ کے شاگردوں میں میاں وجیہ الدین' محمد عباس بال چند' سید احمد طباطبائی، حافظ ابراہیم، سرب سکھ لال دیوانہ، عبد الستار سندیلوی' محمد میرزا الس' حسین میرزا عشق نے بڑا نام پیدا کیا۔ میر عشق کے ہاتھ کا لکھا ہوا طویل قطعۂ تاریخ آصف الدولہ کی قبر کے سرہانے آویزاں ہے۔ اسی طرح حافظ ابراہیم نے ۱۲۲۵ھ میں معتمد الدولہ آغا میر کی فرمائش پر محتشم کاشی کا مرثیہ کتابت کیا جسے مختار الملک نواب سید محمد کو پیش کیا گیا۔ یہ مرثیہ شیخ ممتاز حسین جونپوری (مصنف "تعلیم خطاطی") کے پاس تھا۔ معلوم نہیں ان کے انتقال کے بعد کہاں گیا۔

نعمت اللہ کے شاگردوں میں محمد اشرف' مولوی فضل احمد تھے جنھوں نے لکھنؤ میں کافی شہرت حاصل کی۔ اسی عہد میں منشی بکالکا پرشاد تحقیق' کالکا پرشاد موجد نے بھی بڑا نام پیدا کیا۔ ان دونوں حضرات نے عہد آصفی سے محمد علی شاہ

تک کا زمانہ دیکھا۔ کالکا پرشاد تحقیق کو نواب سعادت علی خاں نے اپنا میر منشی بنالیا تھا۔ عہد بادشاہ غازی الدین حیدر تک وہ اسی عہدے پر فائز رہے۔ مصنف "فسانۂ عجائب" رجب علی بیگ سرور اور صاحب "قیصر التواریخ" سید محمد میر معروف بہ کمال الدین حیدر بھی لاجواب خوشنویس تھے۔ ان کا لکھا ہوا جلی کتبہ بہ صورت صغریٰ درگاہ حضرت عباس لکھنؤ میں موجود ہے۔

اسی عہد کے ایک باصلاحیت استاد نواب سید محمد علی عرف نواب دولھا (متوفی ۱۲۹۴ھ) بھی تھے۔ جن کی شادی اعتماد الدولہ میر فضل علی خاں وزیر نصیر الدین حیدر کی دختر جعفری بیگم سے ہوئی۔ وہ ۱۲۵۴ھ میں مع اہل و عیال لکھنؤ سے شمس آباد ہجرت کر گئے۔ وہ شاعر بھی تھے۔ ابتدا میں مجرم اور بعد کو انور تخلص اختیار کیا۔ فن خوشنویسی میں وہ شیخ بہادر علی بن شیخ خلیل "مروارید رقم" خاں فیض آبادی کے شاگرد تھے۔ انھوں نے نسخ یاقوت رقم خانی شیخ بہادر علی سے سیکھا تھا۔ اس سلسلے میں وہ اپنی کتاب "مرغوب دل" قلمی صفحہ ۱۰۵ میں تحریر فرماتے ہیں:

"...شیخ بہادر علی خوشنویس مرحوم بن شیخ خلیل مروارید
[illegible] خاں فیض آبادی یہ بزرگوار گورے، بڑی آنکھ، گرد ڈاڑھی چھوٹے
[illegible] شیہہ و خلیق و بے پروا و پرہیزگار و عادی افیون
اور خوشنویس [illegible] بالخصوص نسخ یاقوت رقم خانی کے تھے۔ چنانچہ
راقم نے بھی ان سے اسی خط کو چھ مہینے لکھنؤ میں جب کہ بادشاہ مغفور
غازی الدین حیدر کا عہد تھا حاصل کیا تھا۔"

نواب سید محمد علی اپنی مشق کے متعلق "مرغوب دل" کے صفحہ ۵۴۶ میں تحریر فرماتے ہیں:

"اور میں نے بفضل سوائے داہنے ہاتھ کے کبھی کبھی گھائی
اور بائیں ہاتھ اور داہنے پاؤں سے بھی کلمات مناسب لکھے ہیں۔
اور خط غبار کو بعونہ تعالیٰ ایسا لکھا کہ ایک رُخ پر چنے کی دال کے ساری
سورت قل ھو اللہ کی مع بسم اللہ و اکثر اعراب علاوہ انا اعطینٰک
الکوثر کے آگئی۔ مگر پہلے طریق کو بفضلہ داہنے ہاتھ کے ہوتے ہوئے
فالِ بد اور دوسرے کو ترک ادب سمجھ کر چھوڑ دیا۔"

سید محمد علی قرآن مجید کی کتابت روزانہ فرماتے تھے۔ ایک صفحہ یا ایک سطر یا ایک لفظ ہی سہی۔ سید محمد علی کا لکھا ہوا قرآن مجید ان کے اخلاف میں سید محمد صادق صفوی کے پاس موجود ہے۔

میر انیس کے تلامذہ میں آغا وزیر حسین خاں عطا فیض آبادی خط نسخ بہت اچھا لکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی حیات (ولادت ۱۸۷۰ء۔ وفات ۱۹۱۲ء مدفن نجف اشرف عراق) میں کئی قرآن لکھے۔

خویش میر انیس میر ضامن علی بھی عربی خط بہترین لکھتے تھے۔ ان کا لکھا ہوا قرآن مجید (۱۲۷۲ھ نبوی) خاندان انیس میں موجود ہے۔ اس قرآن کی جدولیں سبز و سرخ روشنائی سے کھینچی گئی ہیں۔ اس میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہر جگہ سرخ روشنائی سے تحریر کیا گیا ہے۔

سید محمد مہدی تاثیر نقوی (خویش آرزو لکھنوی) نے چاول پر پوری سورت قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ خطِ نسخ میں لکھی تھی جو تعلقدار بہوا راجہ غلام حیدر صاحب مرحوم کے خاندان میں اب بھی محفوظ ہے۔ اسے دیکھنے کے لیے دور دور سے لوگ آتے تھے۔

عہد واجد علی شاہ کے معتبر خوشنویسوں میں مولوی باقر علی "جادو رقم" مصنف پنج نگارین (مطبوعہ ۱۳۱۲ھ) فقیر محمد حامد علی مصنف "قطعات الجواہر" در خط نسخ (مطبوعہ نول کشور ۱۸۸۴ء) مولوی گلشن علی جونپوری، اصغر حسین جونپوری، اکبر حسین جونپوری، عبدالحکیم، حافظ ابوالحسن، میر کرم علی، سید مہدی علی، حافظ مسعود، عنایت اللہ، آلِ حسن، میر امام علی، میر جلال الدین، حکیم محمد حسین، وزیر علی، میر زین العابدین، عطا حسین، میر مہدی، شاہ وارث علی، محمد مراد، محمد صالح، محمد حسن، سید ابوالحسن فرقتی امروہوی، نور محمد، معظم علی، شرف الدین، اشرف علی، میر سید علی، مرزا جعفر، محمد اکبر، محمد موسیٰ، لال خاں، مرزا محمد علی، مرزا احمد طباطبائی، غلام علی، مرزا حاتم بیگ، محمد نور خاں، حیات علی، غلام مجتبیٰ، امام الدین، ابوالبرکات خاں، رونق علی، منشی احمد حسن خاں عروج، منشی امیر اللہ تسلیم، الٰہی بخش، میر احمد حسن، منشی عبدالحی عرشی، احمد علی خوش رقم، علامہ تفضل حسین خاں، تجمل حسین خاں، حامد حسین حافظ محمد باقر، محمد احمد، مرزا محمد ہادی اکبرآبادی، وزیر علی انجم، محمد مبین علی، معین علی، مولوی ہادی علی "ہفت قلم" نثار احمد بریلوی تھے۔

غیر مسلم خوشنویسوں میں کنور چندی سہائے نہال، پیارے لال، شیام بخش، رام دیال، کنور پریم کشور، منشی ہیرا لال مونس، چیت رام، راجہ آنند رام، لچھمی سنگھ، پنڈت لچھمی نرائن، راجہ تند رام پنڈت، رائے سدھ رائے، سرب سکھ رائے، شنکر ناتھ، نرائن داس، امید سنگھ، رام چندر نظر جواہر رقم، شیو پرساد، بالک رام، چندر بھان برہمن، لالہ درگا پرشاد مضطر، راجہ درگا پرشاد مہر تھے۔ ان شخصیتوں کے علاوہ منشی دیبی پرشاد سحر ڈپٹی انسپکٹر مدارس ضلع بدایوں نے بڑی عرق ریزی سے حسب فرمائش مسٹر ڈی بی کین صاحب بہادر ایک کتاب "نظم پروین" ۱۸۶۵ء

میں اصول خوشنویسی پر مبنی تحریر کی۔

خط نستعلیق کے علاوہ خط نسخ کے بھی بعض ماہرین پیدا ہوئے جن میں محمد خلیل کا تذکرہ مندرجہ بالا سطور میں ہم کر چکے ہیں۔ وہ عبدالباقی حدّاد "یاقوت رقم" کے پائے کے استادِ فن تھے۔ اس کے بعد منشی ہادی علی لکھنوی خوش نویس تھے جنھیں طغرا نویسی میں مہارت حاصل تھی۔ ہادی علی کے شاگردوں میں حامد علی اور شمس الدین ہوئے۔ اگر یہ کہا جائے کہ بیسویں صدی میں فن خوشنویسی کی بقا اور حیاتِ دوام کے یہی امانت دار ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ حامد علی کے ہاتھ کی تحریروں میں خط نسخ کی جلی چیزیں راقم کی نظر سے گذریں مگر خفی خط فراہم نہ ہو سکا۔

۱۱ر مارچ ۱۸۵۶ء کو واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد جنگ آزادی ۱۸۵۷ء رونما ہوئی۔ مختلف فنون کے ماہران دانشبینہ کو محتاج ہو گئے اور مجبوراً دیار و امصار کے سفر اختیار کیے۔ اللہ نے منشی نول کشور کی صورت میں ایک باحوصلہ انسان پیدا کیا جس نے ادبار، شعرار، حکمار اور ماہر مصوّروں اور خوشنویسوں کی امکانی ہمت افزائی اور سرپرستی کی۔ شعرار کے دواوین، حکمار کی علم طب کی کتابیں، داستان گویوں کی داستانیں اور ماہر خوشنویسوں کے فن پارے اسی مطبع سے شائع ہوئے۔ منشی نول کشور کی وفات کے بعد ان کے جانشینوں خصوصاً رائے بہادر منشی پراگ نرائن جی نے بڑی لگن سے کام کیا اور محمد شمس الدین "اعجاز رقم" سے یکے بعد دیگرے کئی کتابیں جو فن خوشنویسی سے تعلق رکھتی ہیں قلم بند کروائیں جن میں کاپی بک کے پانچ حصے تنویر شمس (مطبوعہ نول کشور ۱۹۰۰ء) مرقع نگارین، گلدستہ ریاحین، پنجہ نگارین، نظم پروین، آئینۂ خوشنویسی، اعجاز رقم (مطبوعہ نول کشور ۱۹۱۶ء) گلستاں، بوستاں، دیوان حافظ، کریما وغیرہ دیکھنے کے لائق ہیں۔

منشی شمس الدین شمس لکھنوی کی تحریر کردہ جلی چیزوں میں کتابوں کے علاوہ مدرسہ عالیہ فرقانیہ کے صدر دروازے کی عبارت اور مسجد حیدر بخش چوک کے بالائی حصے کی مغربی دیوار پر موجود مسجد سے متعلق وصیت نامۂ حیدر بخش (۱۲۰۳ھ) کا پتھر جس کی لمبائی ۵ فٹ اور چوڑائی ۴½ فٹ ہے۔

منشی شمس الدین نے اپنی حیات میں لاتعداد شاگرد بنائے۔ جس میں جتنی صلاحیت تھی کسب فیض حاصل کیا۔ ان کے نامور شاگردوں میں منشی محمد افضل، محبوب علی، عاشق علی، لیاقت علی، شیخ زائر حسین، شیخ محمد باقر جونپوری شیخ علی یاور، (ذوالقدر اول) منشی الطاف، منشی عبدالحکیم، منشی آغا شباب، منشی سید علی حسین، سید محمد محسن، مرزا علی حسین، منشی نور الحسن، منشی شاہ میرزا، منشی بندہ حسن، منشی محمد نواب، منشی احمد حسین، منشی رضا حسین، منشی ساجد حسین، اشرف علی، منشی حسن مرزا، منشی حامد حسین، منشی محمد صادق غیور، منشی حمید الحسن عیش، جمیل الحسن، منشی ابوالقاسم زیدی، ابوطالب زیدی، منشی انوار احمد، سید احمد (خویش شمس الدین صاحب) منشی یاور حسین، منشی مساجد حسین، سید غلام حسین عرف نادر آغا، ابراہیم لکھنوی، منشی عبدالرحیم، منشی مرزا محمد جواد صاحبان ہیں۔

□□

حواشی:-

لہ بہ عہد شاہ عباس صفوی ۱۶۱۵ء/۱۰۲۴ھ آپ کو ایران ہی میں قتل کر دیا گیا۔ شاہجہاں کو جب یہ خبر معلوم ہوئی تو بے حد افسوس کیا اور کہا کاش اس کو میرے پاس بھیج دیا جاتا۔ (ملاحظہ ہو، تذکرہ خوش نویسان ص ۱۶۵)

ٹہ "مرغوب دل" تالیف نواب سید محمد علی خاں کے قلمی نسخہ کے آخری صفحہ پر خاتمہ کی تاریخ یہ ہے: بفضلہ شب شنبہ ۲۳ر صفر ۱۲۸۳ھ مطابق ۶ر جولائی ۱۸۶۶ء از تصحیح ایں کتاب الفراغ حاصل گردید، الحمد للہ علی ذلک الاتمام۔ اس خطی نسخہ کی فراہمی کے لیے راقم سید ظہیر حسین الخبیر رئیس بہوہ کا ممنون ہے۔



تجمّل خاں
پرنسپل بھات کھنڈے ہندستانی سنگیت
مہاودیالیہ، لکھنؤ

اودھ کے سِتار نواز : لکھنؤ گھرانہ

جناب تجمل خاں صاحب سِتار کے ماہر ہیں اور فی الوقت لکھنؤ کے بھات کھنڈے ہندوستانی سنگیت مہاودیالیہ کے پرنسپل ہیں۔ ان کی ولادت ۲۴ اگست ۱۹۴۵ء کو لکھنؤ میں ہوئی۔ موسیقی کی تعلیم اپنے والد اُستاد رحمت حسین خاں اور بڑے بھائی اُستاد بشارت حسین خاں سے حاصل کی۔ اس کے علاوہ اُستاد کرامت اللہ خاں کے شاگرد خاص الٰہ آباد کے پروفیسر بنواری لال جی اور بمبئی کے اروند پاریکھ صاحب سے بھی ستار بجانا سیکھا۔ ۱۹۵۶ء میں استاد کی حیثیت سے سنگیت کی دُنیا میں قدم رکھا اور ۱۹۶۳ء سے ۱۹۷۰ء تک پریاگ سنگیت سمیتی، الٰہ آباد، بعد ازاں بی۔ آر۔ پی کالج، جونپور میں تین برس تک قیام رہا ہے۔

والد کی وفات کے بعد آکاش وانی لکھنؤ میں اور پھر شملہ میں۔ اسٹاف آرٹسٹ کے طور پر کام کیا۔

سپّت تنتریکا (सप्त तंत्रिका) دو جلدیں، اور سنگیت کے قدیم و جدید تاریخ (संगीत युगे युगे) پر ایک کتاب تصنیف کی ہے۔ اس کے علاوہ اپنے دادا کی تصنیف 'مُعَلّمِ نغمات' کا ہندی میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ گھرانے دار کلاکار ہوتے ہوئے بھی سنگیت کے اہم ترین شعبے یعنی شاستر کے ہر پہلو سے پوری طرح واقف ہیں۔ (ا۔ ح)

جب ۱۷۷۵ء میں فیض آباد سے اودھ کی راجدھانی لکھنؤ منتقل ہوئی تو ملک کے بہت سے صاحبِ کمال فنکار سرپرستی کے لئے لکھنؤ آگئے، جن میں پیار خاں، باسط خاں (رباب نواز)، نعمت اللہ خاں (سرود نواز)، جونپور کے باشندے محمد غلام رضا خاں (ستار نواز)، لکھنؤ والے محمد حسین خاں (بین کار)، لکھنؤ کے استاد دولھے خاں (سادرہ گایک) وغیرہ کو نواب آصف الدولہ اور بعد میں نواب واجد علی شاہ کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی حاصل ہوئی۔[1]

اِس کی بدولت لکھنؤ سنگیت کا مرکز بن گیا۔ مذکورہ بالا فنکاروں کی مشترکہ کوششوں سے لکھنؤ میں موسیقی کی خوب مقبولیت ہوئی اور سنگیت کے کئی نئے گھرانے وجود میں آئے۔ جیسے پیار خاں کے شاگرد برکت علی سانولیا خاں کا گھرانہ جو فرخ آباد گھرانہ تسلیم کیا گیا۔ استاد نعمت اللہ خاں کا گھرانہ، استاد محمد حسین خاں کا گھرانہ، جو لکھنؤ گھرانے کے تحت شمار کیا گیا۔ اِن کے علاوہ استاد عبدالغنی خاں اور یوسف علی خاں سے لکھنؤ میں ستار نوازی کی علیحدہ روایت قائم ہوئی۔

اِن کے علاوہ اُس عہد کے دیگر ستار نوازوں میں غلام محمد خاں، سجّاد محمد خاں، غلام محمد خاں کے شاگرد نبی بخش ڈیرے دار، بریلی کے قطب الدولہ، نواب حشمت جنگ، نواب علی نقی خاں، پنّا لعل باجپئی، ویدار حسن داس، بابو الیشوری پرساد، چھنے خاں، شری بنواری لال شرلیواستو اور استاد رحمت حسین خاں وغیرہ کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان فنکاروں نے ستار کے باج کو ترقی دینے اور مقبول بنانے میں گرانقدر خدمات انجام دیں۔

محمد غلام رضا خاں

استاد محمد غلام رضا خاں جونپور کے باشندے تھے اور نواب آصف الدولہ کے عہد میں فیض آباد سے لکھنؤ آکر بس گئے تھے۔ انھوں نے اُسی زمانے میں ایک کتاب ـــــ نغماتِ آصفی ـــــ تصنیف کی تھی۔ انھوں نے ستار بجانے

کی ابتدائی تعلیم بجے پور کے استاد سید خاں جی سے حاصل کی تھی۔[۱۰]

نوابوں کے درباروں اور رئیسوں کی محفلوں میں منعقد ہونے والی موسیقی کی بزم طرب میں استاد محمد غلام رضا خاں کو متواتر شرکت کرنے کے مواقع ملے۔ انھوں نے مشاہدہ کیا کہ ان محفلوں میں عموماً دھرو پد یا خیال کی ٹھمری گائیکی کو زیادہ اہمیت اور اعزاز حاصل ہے۔ دُور رَس صلاحیت کے مالک استاد محمد غلام رضا خاں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اب لکھنؤ کے نواب اور رؤسا سنجیدہ، دھیمی اور دھرو پد کے ضابطوں کی پابند مسید خانی طرز سے مطمئن نہیں ہیں۔ اسی عوامی مقبولیت کی تبدیلی نے تیز رفتار دیگر گت شیلی (शैली) کے تصور کو جنم دیا۔ سامعین کی پسند اور ذہنیت کو دھیان میں رکھتے ہوئے استاد محمد غلام رضا خاں نے ٹھمری اور ترانے جیسی چنچل شیلیوں (चपल शैलियों) کی بنیاد پر دھیمی تین تال (ستار خانی ٹھیکہ) میں بجانے کے لائق ایک نئی گت شیلی (गत शैली) ایجاد کی جو انھیں کے نام سے یعنی رضا خانی باج کے نام سے آج بھی رائج ہے۔[۱۱]

کچھ ستار نوازوں کا خیال ہے کہ رضا خانی باج یا پوروی باج کی ایجاد، ترقی، شہرت و مقبولیت کا اعزاز صرف محمد غلام رضا خاں ہی کو حاصل نہیں ہے، ان کے ہی زمانے میں غلام محمد خاں سجاد محمد خاں، پیار خاں[۱۲]، باسط خاں بالو اشوری پرساد، نواب حشمت جنگ، قطب الدولہ، لکھنؤ کے استاد محمد حسین خاں، نعمت اللہ خاں وغیرہ متعدد ایسے فنکار بھی تھے جو اس باج کو پوری طرح فروغ دینے میں مشغول تھے اور ان سبھی کلاکاروں نے ستار خانی ٹھیکے کے تحت کئی گتوں (गत) کی تخلیق کی تھی جو آج بھی اُن لوگوں کے نام سے رائج ہیں۔ کیونکہ سب سے پہلے اس طرح کے باج کا تصور محمد رضا خاں نے کیا تھا اس لیے اس طرز (शैली) کا نام رضا خانی طرز پڑا۔ چونکہ پورب کے کئی صاحبان کمال کا بھی اس طرز کے فروغ میں ہاتھ تھا اس وجہ سے اسے پوروی باج بھی کہا گیا۔

ڈاکٹر بمل کانت رائے چودھری نے خیال ظاہر کیا ہے کہ مسید خاں نے مسید خانی باج کو اپنے گھرانے کے لئے محفوظ رکھا اور اپنے شاگرد رضا خاں کے لئے ایک نئی گت شیلی کی تخلیق کی جو بعد میں رضا خانی باج کے نام سے مشہور ہوئی۔[۱۳]

استاد محمد حسین خاں

استاد محمد حسین خاں کی ولادت لکھنؤ میں ۱۸۷۰ عیسوی میں ہوئی تھی۔ ان کے والد کا نام استاد دولھے خاں تھا، جو دھرو پد، سادرہ، ہوری اور خیال گائیک تھے۔ استاد محمد حسین خاں کے بزرگوں میں مہدی حسن خاں، فدا حسین خاں، غلام عباس خاں اور غلام وارث علی خاں وغیرہ کے نام معلوم ہوسکے ہیں۔

استاد محمد حسین خاں کو اپنے ماموں استاد مہدی حسن خاں (جو حسن خاں امبیٹھے (अमवेट) والے کے شاگرد تھے) سے بین کاری تعلیم ملی تھی اور گائیکی کی تعلیم اپنے والد استاد دولھے سے لی تھی۔ کچھ مدت تک الور بجہ ریاست میں رہے مگر دل نہیں لگا اور کچھ ہی دنوں بعد واپس لکھنؤ آگئے اور پھر یہیں رہے۔ استاد محمد حسین خاں خوددار اور آزاد مزاج تھے لکھنؤ کے تھوڑے سے ہی رئیس ایسے تھے جن کی محفلوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔

ٹھاکر نواب علی خاں نے بارہا ان کو اپنی محفلوں میں مدعو کیا اور ان کی بین نوازی سے لطف اندوز ہوئے۔ استاد محمد حسین خاں گاتے بھی بہت اچھا تھے۔ ٹھاکر نواب علی خاں نے اپنی کتاب معارف النغمات کی دوسری جلد میں ان کی بنائی ہوئی متعدد بندشوں کو جمع کیا ہے۔ اس کتاب میں زیادہ تر تخلیقات استاد محمد علی خاں (ننکو میاں ابن باسط خاں) کی ہیں۔ لیکن گائیک محمد حسین خاں (لکھنؤ) کے نام سے جو بندشیں ہیں وہ محمد حسین خاں بین کار کی بنائی ہوئی ہیں۔

استاد محمد حسین خاں لاولد تھے۔ اپنے بھائی خلیفہ احمد حسین کے بیٹے رحمت حسین خاں کو گود لے کر بیٹے کی طرح تعلیم دی تھی۔ انھیں بین بجانے اور گانے کے علاوہ ستار نوازی پر بھی مکمل قدرت حاصل تھی۔ بین کار ہونے کے ناطے انھوں نے کبھی کسی محفل میں ستار بجانے کا فن پیش نہیں کیا بلکہ بہت سے لوگوں کو ستار بجانے کی تعلیم دی تھی، جن میں استاد رحمت حسین خاں، ڈی۔ این۔ سانیال، بشیر خاں، ٹوٹو دتہ (ستار سکھانے کی استاد) شستی بھوشن انٹر کالج، لکھنؤ) کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ لکھنؤ ہی میں ۱۹۶۲ عیسوی میں رحلت کی۔

رضا حسین خاں

دولھے خاں صاحب کے دوسرے بیٹے استاد رضا حسین خاں پہلے لکھنؤ میں اور پھر رام پور ریاست میں رہے۔ رام پور کے ذرائع نے بتایا کہ استاد رضا حسین خاں رام پور بینڈ میں استاد کے عہدے پر تھے۔[۱۴] وہ اپنے زمانے کے اچھے خیال گائیک تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ بڑے

عباس حسین خاں عرف ابّن خاں ہی نے سنگیت کو پیشہ بنایا۔ یہ بھی خیال گائک تھے۔ ان کی بھی ایک بندش راجہ نواب علی خاں نے معارف النغمات جلد دوم کے صفحہ ۶۴ پر درج کی ہے۔ ابّن خاں صاحب کے بیٹوں نے سنگیت کو بطور پیشہ نہیں اپنایا۔ اِن کے خاص شاگردوں میں لکھنؤ کے سکندر حسین اور نوابو خاں (دونوں شہنائی نواز) کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

استاد دولھے خاں کے تیسرے بیٹے باقر خاں بھی اعلیٰ پایہ کے گائک تھے۔ نوجوانی ہی میں فوت ہو گئے۔

استاد دولھے خاں کے سب سے چھوٹے بیٹے خلیفہ احمد حسین خاں تھے۔ انھوں نے گانے کی تعلیم بڑے بھائی رضا حسین خاں اور والد سے حاصل کی۔ خلیفہ احمد حسین خاں اپنے زمانے کے اولین مسلمان استادوں میں سے تھے جن کو صوتی تحریر (स्वर लिपि) کا مکمل علم تھا۔ انھوں نے مروجہ راگوں میں دو سو استھائیاں (स्थाइयां) حفظ کی تھیں۔ انھیں خوبیوں کی بنا پر اُس زمانے کے صاحبانِ کمال نے اُنھیں لکھنؤ گھرانے (استاد دولھے خاں کا گھرانہ) کا 'خلیفہ' قرار دیا تھا۔ انھوں نے متعدد لوگوں کو سنگیت کی تعلیم بھی دی تھی جن میں علی خورشید اللہ رکھی 'بڑی اور چھوٹی' مشتری بائی، قمر جہاں اور محمدی کی سلمیٰ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اِن طوائفوں کو موسیقی کی تعلیم دینے ہی کی وجہ سے پیشہ ورانہ رقابت رکھنے والوں نے خلیفہ احمد حسین خاں کو یہ کہہ کر مشہور کر دیا کہ وہ صرف بائیوں ہی کے استاد ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ٹھاکر نواب علی خاں، رائے اُما ناتھ بلی اور روشنو نارائن بھات کھنڈے کی خواہش پر ایک عرصے تک لکھنؤ کے بھات کھنڈے ہندوستانی سنگیت مہاودیالیہ میں استاد کے عہدے پر فائز رہے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں لکھنؤ کے اسّی فیصد پیشہ ور کلاکاروں کو گانے کی تعلیم دی تھی، جن میں بسم اللہ خاں (شہنائی)، اقبال خاں، امجد خاں، الودھیا پرشاد، مشرف خاں، ننھے خاں، جونپور کے محتشم حسین (مصنف انڈین میوزک، اردو) اور جہانگیر آباد کے راجہ اعزاز رسول صاحب کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

راجہ جہانگیر آباد کی فرمائش پر ایک کتاب "معلّم نغمات" تصنیف بھی کی تھی۔ انتہائی باصلاحیت ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد غصّے ور بھی تھے، جس کی وجہ سے اس زمانے کے زیادہ تر بااثر لوگوں اور فنکاروں سے ان کی اَن بن رہتی تھی اور یہی سبب ہے کہ خلیفہ احمد حسین خاں کو تاریخِ موسیقی کے صفحات میں جگہ نہیں ملی۔ اِن کے اکلوتے بیٹے استاد رحمت حسین خاں تھے۔

استاد رحمت حسین خاں اچھے موسیقی نواز، اچھے معلّم اور اچھے موجد بھی تھے۔ ٹھمری انگ کی بنیاد پر ستار کے لئے موزوں مدھیہ لے کی کئی گتوں کی بندش کی تھی۔ یہی نہیں ٹھمری انگ کی اُن گتوں کو بجانا بھی جانتے تھے جن میں زیادہ بول نہیں ہوتے۔ اُن کے بجانے میں خاص طور پر منند سُوروں (मन्द स्वरों) کے آلاپ کی کثرت ہوتی تھی اور گت کاری میں مدھیہ لے کی گتیں ہی زیادہ بجاتے تھے۔ ان کی گتوں کی خصوصیت گت کی تہائی بن کر آنا تھی۔ خاں صاحب نے بھی بہت سے لوگوں کو تعلیم دی تھی، جن میں ومل مشرا، پاؤلا سرکار، گوری شنکر، سپنا بھٹا چاریہ، بھولا ناتھ (دربھنگہ)، سورج نارائن لال، وملا فالونگوا اور بال کرشن نائر کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۷۲ء کو لکھنؤ میں بعمر ۷۵ برس وفات پائی۔

بشارت حسین خاں (ستار)

اِن کی ولادت ۱۹۴۱ء میں لکھنؤ میں ہوئی۔ ستار بجانے کی تعلیم اپنے والد اور دادا (خلیفہ محمد حسین خاں) سے حاصل کی۔ محض بارہ برس کی عمر میں ستار نوازی کا مظاہرہ کرنے لگے تھے۔ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۷۲ء تک آکاش وانی کیندر، لکھنؤ کے کلاکار رہے۔ بعد میں دس برس تک بمبئی فلمی دنیا سے وابستہ رہے۔ اُس کے بعد نیروبی (کینیا، مشرقی افریقہ) میں ستار سکھانے کا اپنا ادارہ چلا رہے ہیں۔ پورے یورپ میں ستار نوازی کے پروگرام پیش کر چکے ہیں۔ ستار نواز ہونے کے ساتھ ساتھ استاد بھی ہیں۔ اہم شاگردوں میں لکھنؤ کے گوپال چکرورتی، بھوَن موہنی نگم، سوہا رسنی وغیرہ شامل ہیں۔ کلاسیکل موسیقی کے علاوہ ستار میں سگم سنگیت کے موجد ہیں اور دھن بجانے میں ماہر ہیں۔ ترانہ انگ کی رضا خانی گت نواز ہیں۔

مترجم: نازک جہاں

حواشی، انا الموسیقی

۱۔ موعود انا الموسیقی۔ کرم امام صفحہ ۴۵۔۴۴ ۲۔ بھارتیہ سنگیت کوش صفحہ ۱۳۶/ سنگیت بودھ صفحہ ۱۴۳ ۳۔ خسرو، تان سین اور دیگر کلاکار صفحہ ۲۰۳ ۴۔ پیارے خاں کی تخلیق 'راگ کافی' کی پوربی باج کی گت اس کا ثبوت ہے۔ ۵۔ لکھنؤ کی سنگیت پرمپرا صفحہ ۴ ۶۔ بھارتیہ سنگیت کوش صفحہ ۱۳۶ ۷۔ معارف النغمات، جلد دوم طبع اول ۱۹۲۴ صفحہ ۲۵، ۲۸، ۸۱، ۲۰۳، ۲۱۶، ۲۲۶، ۲۲۹ وغیرہ ۸۔ خسرو، تان سین اور دیگر کلاکار صفحہ

پروین طلحہ
سی ۔ ۳۰، بٹلر پیلس کالونی، لکھنؤ

نیشاپوری نوابوں کے عہد میں اودھ کا انتظامیہ

اکبر کے عہد میں سلطنت مغلیہ بارہ صوبوں میں منقسم تھی۔ اودھ ان میں سے ایک تھا اودھ حکومت کے بانی سعادت خاں مغل حکومت کے امرا میں سے تھے اور ۱۷۲۲ میں اودھ کے صوبے دار مقرر کئے گئے تھے انھوں نے ہی اودھ انتظامیہ کی داغ بیل ڈالی تھی جس کا سلسلہ واجد علی شاہ کے دور تک چلا۔ حالانکہ اس انتظامیہ نے مغل قوانین وضوابط کو برقرار رکھا۔ لیکن انیسویں صدی میں اس کے ڈھانچے اور اس کے ضابطوں اور قوانین میں تبدیلیاں آئیں۔ سعادت خاں اور ان کے فوراً بعد کے دو نواب زیر صوبۂ اودھ میں مغل شہنشاہ کے نائب کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ مگر ۱۷۶۵ء میں انگریزوں سے صلح کے بعد اودھ کے نواب وزیروں کے قدم خود مختاری کی طرف بڑھنے لگے۔ ابتدائی تین نواب وزیر ایک مضبوط انتظامیہ کی تشکیل میں کامیاب ہوئے جو صوبہ دار کی فوری توجہ کے بغیر بھی فرائض کی بجا آوری کی صلاحیت رکھتا تھا۔

سعادت خاں نے ایک ایسا مضبوط انتظامیہ تشکیل دیا جو مکمل طور سے ان کا وفادار تھا اس وجہ سے ان کی عدم موجودگی میں بھی اس صوبہ پر ان کی گرفت رہتی تھی۔ اس مقصد کے پیش نظر انھوں نے اپنے اعزا اقربا اور رفقا کو انتظامیہ کی کلیدی اور اہم جگہوں پر مقرر کیا یہ اسلئے بھی کیا گیا تھا کہ اودھ کو ایک آزاد مرکز کی حیثیت حاصل رہے جہاں سے پوری سلطنت پر اثر انداز ہونے کی کوششوں کا آغاز کیا جا سکے۔

شہنشاہ اکبر نے اپنے انتظامیہ کو اس طرح تشکیل دیا تھا کہ مختلف صوبے دار مرکز سے آزادی نہ حاصل کر پائیں اس نے صوبوں کی دیوانی کے افسروں کا تقرر اپنے پاس رکھا اور اسطرح سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔ صوبے دار صرف نظامت کا سربراہ ہوتا تھا مغلوں نے اس بات پر خصوصی توجہ دی کہ صوبوں کی دیوانی اور نظامت ایک ہی فرد کے پاس نہ رہنے پائے۔ لیکن اورنگ زیب کے بعد کمزور شہنشاہ تخت پر بیٹھے ان کے پاس نہ سیاسی فراست تھی اور نہ انتظامیہ کے اہم نکات کو سمجھنے کی مہم۔ یہی وجہ تھی کہ اٹھارویں صدی میں مغل سلطنت کے مختلف صوبوں کے علاقائی حکمرانوں نے مرکزی حکومت سے اپنے کو آزاد کر کے اپنی خاندانی حکومت قائم کر لی تھی۔ صوبائی ناظم نے خود کو مغل طرز میں ڈھال لیا تھا۔ مسلم الثبوت مغل روایات کے مطابق مختلف شعبہ جات و دفاتر میں اقتدار کے خطوط اور طریقۂ کار کے بنیادی عناصر وہی رہے اسی لئے انیسویں صدی میں اس انتظامیہ نے انھیں دوسری شکل دینے کی برطانوی کوششوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اودھ کے افسروں کا تقرر مغلیہ امرا میں سے کیا جاتا تھا۔ اودھ کے انتظامیہ کے مختلف محکمے وہی تھے جو مغلوں نے بنائے تھے۔ سرکاری زمرے اور نظامت کے درمیان ایک طرح کا تناؤ رہا کرتا تھا۔ نظامت کا سربراہ صوبے دار یا گورنر ہوتا تھا۔ لیکن محکمۂ مالیات کا سربراہ دیوان کہلاتا تھا اودھ کے صوبے دار اس سے واقف تھے کہ اس طرح کے تناؤ اور اختلافات نے بنگال کے صوبے دار کو ایسٹ انڈیا کمپنی کا وظیفہ خوار بنا دیا تھا۔ شہنشاہ ہندستان نے ایسٹ انڈیا کمپنی بنگال بہار اور اڑیسہ کی دیوانی عطا کی تھی۔ اس لئے اودھ میں صوبہ دار نے اختیارات کا استعمال خود کیا اور سعادت خاں کے عہدے سے دیوان اور دوسرے افسروں کا تقرر وہی کیا کرتے تھے تاکہ دیوان صوبہ دار کا ماتحت رہے۔ حالانکہ یہ مغل انتظامیہ کے بنیادی اقدار کے منافی تھا لیکن ۱۷۲۲ سے کوئی شہنشاہ ہی نہیں رہ گیا تھا جو اودھ کے صوبے داروں کے اس اقدام کے مضمرات پر غور کر سکتا چونکہ مرکز سے کوئی اعتراض

نہیں ہوا اس لئے یہ طرز عمل جاری رہا اور صوبے دار مغل بادشاہ کے تسلط سے آزادی حاصل کرتے گئے۔ آخر کار ۱۸۱۹ سے ان لوگوں نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

چونکہ صوبے دار بلا شرکت غیرے صوبائی انتظامیہ کے سربراہ بن گئے تھے اس لئے وہ لوگ اپنا ایک نائب مقرر کر دیا کرتے تھے جو انکی عدم موجودگی میں شعبۂ نظامت کا نگراں ہوتا تھا۔ نائب ایسا شخص ہوتا تھا جس پر زبردست اعتماد کیا جا سکے اور صوبے دار اس پر مکمل بھروسہ کر سکے ابتداء میں نائب کے عہدے کے لئے صرف رشتے دار مقرر کئے جاتے تھے۔ جیسے اودھ میں سعادت خاں کے نائب صفدر جنگ تھے۔ صفدر جنگ سعادت خاں کے بھانجے اور داماد تھے اور بعد میں اودھ کے نواب ہوئے تھے۔ نائب کے محکمے میں زیادہ تر افسران وہ ہوتے تھے جو حکمرانوں کے خاندان کے معتبر نوکر، غلام یا خواجہ سرا ہوں یا جن کی سعادت خاں کے خاندان سے قدیم وابستگی ہوتی تھی۔ حکومت کے اختتام تک نواب نے اس کا لحاظ رکھا کہ ان عہدوں پر شیعہ فرقے کا کوئی مسلمان مقرر کیا جائے۔ البتہ دیوانی کے محکمے کے لئے نوابوں نے کائستھ اور کھتریوں کے خاندان سے منشیوں کا تقرر کیا۔ دیوان کے منصب پر کچھ مستثنیات کو چھوڑ کر اسی طبقات افراد مقرر کئے جاتے تھے انھیں دو برادری کے افراد دیوانی کے مختلف محکموں پر ہر سطح پر مقرر کئے گئے نوابوں کے انتظامیہ میں ایک اور اہم بات یہ رہی کہ جو بھی دیوانی کے کسی بھی عہدے پر مقرر ہوا وہ جب تک زندہ رہا اپنے عہدہ سے ہٹایا نہیں گیا اور اس کے انتقال کے بعد اس کے ورثا میں سے کوئی اسی عہدے پر مقرر کیا گیا۔ آتما رام لاہور کے پنجابی کھتری تھے اور سعادت خاں کی آگرہ کی صوبے داری کے زمانے سے ان کے ساتھ رہے۔ جب سعادت خاں اودھ کے صوبے دار ہوئے تو آتما رام دیوان مقرر ہوئے کئی نسلوں تک آتما رام کے ہی خاندان میں رہی نوابی انتظامیہ میں اس طرح کی سیکڑوں مثالیں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ درحقیقت کائستھ اور کھتری دیوان اس کا التزام رکھتے تھے کہ ان کے محکموں میں انھیں کے خاندان اور برادری کے افراد مقرر ہو سکیں اس دیوانی کے محکموں میں بہت سارے نقائص کے باوصف استحکام اور مضبوطی پیدا ہوئی۔ یہاں نوابوں کی انتظامیہ مغل انتظامیہ سے بالکل الگ تھی۔ اس لئے کہ مغلوں کے یہاں حکام مسلسل تبدیل ہوا کرتے تھے۔ مغل شہنشاہ پوری سلطنت کا دورہ کیا کرتے تھے۔ انتظامیہ کے مختلف محکموں پر نظر رکھتے تھے کہ ان محکموں میں کسی مخصوص خاندان یا فرد کا کوئی آدمی زیادہ بااختیار ہو کر اپنی جڑیں مضبوط نہ کرنے پائے مغل انتظامیہ کی یہی طاقت اس وقت تک رہی جب تک لائق شہنشاہ تخت نشیں ہوتے رہے

جس طرح سعادت خاں نے اپنے منصب کو خاندانی عہدہ بنانے میں کامیابی حاصل کی ان کے ماتحت حکام نے بھی اپنے محکموں کو اسی طرز میں ڈھال لیا۔ کسی خاندان کی اس طرح کی اجارہ داری انتظامیہ کو کمزور بنانے کا ایک سبب بنی۔ ان خاندانوں کی وجہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی اودھ انتظامیہ میں دخیل ہو سکی اور صوبے پر اپنے اثرات کو مستحکم بنا سکی۔ انتظامیہ کی کمزوری کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس ڈھانچے میں زمینداروں کا کوئی مقام نہیں رکھا گیا یہ زمیندار جنہیں انتظامیہ اور دربار سے ایک فاصلے پر رکھا گیا تھا دن بہ دن سرکش اور مختار ہوتے گئے ایک وہ بھی زمانہ آیا کہ جب اصل مالیہ کم ہوتا تھا مگر مالیہ کے بقایہ کی وصولیابی پر اصل سے زیادہ لاگت آتی تھی۔ اس طرح کے حالات میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے لئے یہ دشوار نہیں رہ گیا کہ وہ طرح طرح کے بہانے تلاش کر کے اودھ کی بادشاہت کو ختم کر دے اور انتظامیہ کا الحاق کر لے۔

(ترجمہ: باقر عباس)

لکھنؤ کے کوتوال

مرزا علی رضا بیگ نے دو سپاہی کوتوالی سے ساتھ کیے۔ وہ انگوٹھی اور کپڑے اس کے گھر سے منگوائے۔ انگوٹھی مہر کی تھی۔ مرزا علی رضا بیگ نے بڑے نواب کو اس سانحے کی خبر کی۔ کپڑے اور دونوں انگوٹھیاں گھر بھجوادیں۔ امام بخش کو سزا ہو گئی۔ واہ مرزا کیا کہنا۔ کوتوال ہو تو ایسا ہو۔

—— امراؤ جان ادا: مرزا رسوا

آشفاق احمد خاں
اسسٹنٹ میوزیم، لکھنؤ

نوابینِ اودھ کے زیورات اور لباس

اپنے ارتقا سے لے کر مختلف مراحل سے گذرتے ہوئے آج کے زیورات کی تاریخ ایک دلکش داستان ہے۔ یہ ایک طرف انسان کے شوق، ذوق، مہارت اور دست صناعی کی کہانی تو دوسری طرف کسی قوم کی علمی، ادبی اور جمالیاتی ذوق کے ساتھ ساتھ سیاسی، اقتصادی عروج اور زوال کی بھی عکاسی کرتی ہے۔

زیورات انسان کے تخیل کا وہ پہلا عملی جامہ ہے جسے اس نے تہذیب کے اولین دور میں اپنی محبوبہ کے تئیں محبت، خلوص اور اعتماد ظاہر کرنے کا پہلا پہلا ایک خوبصورت ذریعہ بنایا ہوگا۔ شروع میں ان گہنوں یا زیوروں کے لئے اس نے بھلے ہی آج کی طرح سونے، چاندی، ہیرے اور موتیوں کا استعمال نہ کیا ہو مگر جسم کی آرائش و زیبائش کے لئے اس کے اپنے آس پاس دستیاب قدرتی چیزیں تو تھیں ہی جیسے پھول، چڑیوں کے رنگین پر، رنگ برنگے پتھر، سوکھے اور ہرے رنگین پھل، گھاس، ہڈیاں اور دانت اور جانوروں کے ناخن وغیرہ۔ شروع میں عورت مرد دونوں ہی اپنے کو قدرت کی ان خوبصورت چیزوں سے آراستہ کرتے تھے۔ اس طرح سے ایک اندازہ ہوسکتا ہے کہ زیور کی ایجاد انسان نے تواریخ کے دھندلکے میں کب اور کیسے کی ہوگی۔ یہ زیورات اس کی زندگی میں تہذیب کی پہلی منزل سے ہی زمین کے ہر خطے اور ہر نسل و قوم میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انسان نے زیور پہلے پہنا، کپڑا بعد میں۔ آثار قدیمہ کے ماہرین کو زمانۂ قدیم کے قبرستانوں میں پائی گئی لاشوں کے ڈھانچہ کے گلے میں پڑا کسی نہ کسی قسم کا ہار ملتا ہے اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ زیورات کی اہمیت، اس کا تصور دنیا کے ہر خطے میں تھا، چاہے وہ ہندوستان ہو، مصر، روم، بابل اور چین کی تہذیبیں ہوں یا افریقہ اور یورپ کے براعظم ہوں۔ ہر جگہ آثار قدیمہ کے ماہرین کو کھدائی میں زیورات دستیاب ہوئے ہیں۔ زمانۂ قدیم کے غاروں میں رہنے والے انسانوں کے ذریعہ غاروں کی دیواروں پر پائی گئی تصویروں میں Rockcare Painting میں بھی اسی دور کے انسانوں کے گلے میں اکثر زیورات کے قسم کے ہار جیسی چیزیں دیکھی جاسکتی ہیں۔

ہندوستان میں زیورات کی اہمیت انسان کی پیدائش سے لے کر مرنے تک یکساں ہے۔ ایک طرف اس کا استعمال مذہبی رسموں، ٹوٹنے ٹوٹکوں کے لئے ہوتا ہے تو دوسری طرف ان کا مقصد جسم کی آرائش بھی ہے ضعیف الاعتقادی کی وجہ سے تعویذ کی صورت میں قیمتی اور نیم قیمتی پتھر گلے اور ہاتھ میں پہنے جاتے ہیں یہی ضعیف الاعتقادی اور روحانیت بھی مختلف اقسام کے زیورات کی ذمہ دار ہے۔ اکثر دیوی دیوتاؤں کو خوش کرنے، بیماروں کے مضر اثرات سے بچنے، بیماری اور دیگر مصیبتوں سے حفاظت کی خاطر یہی قیمتی و نیم قیمتی پتھروں کو تعویذ کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ ان تعویذوں نے ہی آگے چل کر زیورات کی شکل اختیار کرلی۔ قدیم بابل کی پہاڑیوں پر بنے مندروں کے پجاری بری روحوں اور دیوتاؤں سے بچنے کی خاطر ہار کی شکل میں اکثر قیمتی پتھروں سے جڑے حفاظتی تعویذ گلے میں پہنا کرتے تھے۔ آج بھی قیمتی اور نیم قیمتی پتھروں کی اہمیت میں کمی نہیں آسکی ہے۔

ہندوستان میں عورتیں سہاگ کی نشانی کے طور پر گلے میں منگل سوتر پہنتی ہیں، اسی طرح ماتھے کا ٹیکہ نتھ اور چوڑیاں بھی سہاگ کی نشانیاں سمجھی جاتی ہیں۔

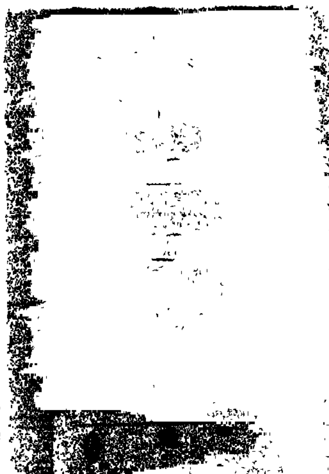
ہندوستان میں تاریخی دور کے زیورات کے ثبوت سانچی، امراوتی و بھارہوت کی موتیوں اور اجنتا کے غار میں دیواروں پر بنی تصویروں سے ملنے شروع ہو جاتے ہیں۔ اس کے پہلے ہڑپہ، موہن، جودڑو اور ٹکشلہ میں آثار قدیمہ کی کھدائی سے زیورات کے نمونے ملے ہیں۔

مغل دور ہندوستان کی تاریخ میں نمایاں دور مانا جاتا ہے۔ خاص طور سے شہنشاہ اکبر سے شہنشاہ شاہجہاں تک کا زمانہ ہندوستان

کا سنہرا دور سمجھا جاتا ہے۔ اس دور میں مغل دربار میں نہ صرف ہندوستان بلکہ سارے ایشیا، خاص کر ایرانی اور مغربی ایشیا کے عظیم المرتبت فنکار اکٹھا ہوگئے تھے۔ سبھی فنون کی قدر دانی کی گئی۔ ادب، فلسفہ، موسیقی، فن تعمیر، مصوری فنون لطیفہ غرض کہ کوئی بھی فن ایسا نہ تھا جس کے پائے کے ماہرین دربار مغلیہ سے فیضیاب نہ ہوئے ہوں۔ اس عیش وطرب اور خوشحالی کے زمانے میں زیورات کہاں اچھوتے رہ سکتے تھے۔ مغل بادشاہوں، امیروں، رؤسار و دیگر بڑے منصب دوراں یہاں تک کہ درمیانی طبقہ کے اہل کاروں کو اپنی شان وشوکت، شاہی دبدبہ اور نام ونمود کا بے انتہا احساس تھا۔ اپنے اپنے مرتبہ، حشمت اور دولت کی نمائش کے لئے زیورات بھی ایک بڑا ذریعہ ہیں۔ اس فن کو بھی سبھی فنون کی طرح ہر اعتبار سے سراہا گیا۔ آئینہ اکبری کے مطابق اکبر اعظم کے پاس ہر فن کے الگ الگ کارخانے تھے۔ فنکاروں کی حسین تخلیق کا بادشاہ بذات خود معائنہ کرتا اور فنکاروں کو انعام واکرام سے نوازتا۔ شاہی بیگمات و دیگر امرار کی عورتیں اکثر سونے کے ہی زیور پہنتی تھیں۔

چاندی کے پہننا عموماً ہتک آمیز سمجھا جاتا تھا۔ طلائی زیورات کو مزید پرکشش اور خوبصورت بنانے کے لئے زیورات پر ہیرے جڑے جاتے اور مینا کاری سے سجایا جاتا، اس دور میں بھی زیورات کے استعمال کا عام رجحان لگ بھگ پہلے جیسا ہی رہا۔ مگر شاہی بیگمات اور دیگر رؤسار اور امرار میں دولت کی فراوانی کی وجہ سے اس کی طرز بناوٹ، نمونے اور وزن وغیرہ میں تبدیلی آئی، اس دور کے زیورات پہلے کے مقابلے ہلکے مگر بہت خوبصورت، نازک اور سبک بننے لگے۔ اب زیورات بنانے کا تصور دولت کو زیور کی شکل میں بدل کر محفوظ رکھنا نہیں، بلکہ جسم کی زیبائش کا ذریعہ مانا جانے لگا۔ ان کو ہیرے جواہرات اور موتیوں سے بھی سجایا جانے لگا۔ اس طرح جڑاؤ زیورات زیادہ بننے لگے اور ان میں ایرانی ومغربی ایشیار کے فیشن کے طرز جھلکنے لگے۔

زیوروں پر اوپری سجاوٹ پر زیادہ دھیان دیا جاتا۔ اکثر سونے کے زیور پر اوپر کوئی قیمتی پتھر اور نیچے کی طرف میناکاری کا کام ہونے لگا۔ ہندوستان میں آگرہ اور دلّی کے علاوہ جے پور، بنارس اور لکھنؤ وغیرہ میں بھی یہ فن زندہ

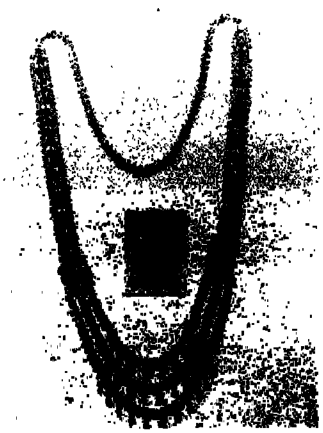




رہا مگر بعد کے دنوں میں جے پور اس فن کا خاص مرکز بن گیا۔ اودھ میں نواب آصف الدولہ کے دور میں قیصر آغا نام کے فنکار نے گلابی میناکاری کی شروعات کی تھی۔

مغل بادشاہوں کے زوال کے شروعات کے ساتھ نوابین اودھ کے عروج کی داستان شروع ہوتی ہے۔ نوابین اودھ کا خاص دور ۱۷۲۲ء سے ۱۸۵۶ء تک کا زمانہ مانا جاتا ہے۔ یہ عہد ہندوستان کی تاریخ میں بے مثال ہے۔ اس دور میں ایک عجیب انداز کی گنگا جمنی تہذیب نے جنم لیا۔ اودھ کی تاریخ جہاں ایک طرف نوابوں کی مذہبی رواداری، اخلاق، رعایا پروری نفاست و نزاکت کی کہانی ہے تو وہیں دوسری طرف انگریزوں کی ریشہ دوانیوں، مخبری اور سیاسی عیاریوں، نوابوں کی مجبوری اور لاچاری کی ایک پرسوز داستان بھی ہے۔

نوابین اودھ کے جد اعلیٰ محمد امین نیشاپوری دلی دربار کی طرف سے نواب برہان الملک کے خطاب سے سرفراز ہو کر ۱۷۲۲ء میں اودھ کے صوبہ دار مقرر ہوئے اور انھوں نے اجودھیا شہر کے پاس اپنی حکومت کا مرکز بنایا، جو بعد میں فیض آباد کے نام سے مشہور ہوا۔ انہی کے وارثوں نے اودھ پر انگریزی حکومت کے تسلط سے پہلے یعنی ۱۸۵۶ء تک حکومت کی اور نوابین اودھ و شاہان اودھ کے نام سے تاریخ میں مشہور ہوئے۔ ان نوابوں کے ساتھ ان کی اور ان کے درباریوں کی مستورات بھی دلی سے اودھ آئیں جن کے لباس اور دیگر آرائش کا سامان جیسے زیورات وغیرہ عام طور سے مغلوں کے ہی جیسے تھے۔ ان کے زیورات میں بھی فقط زینت اور آرائش کا خیال باقی رہ گیا تھا۔ نزاکت اور نفاست میں ہر قسم کے زیورات بتدریج سبک، ہلکے، نازک اور خوشنما ہوتے گئے۔ آخر وقت میں دولت مند گھرانوں کی بیویوں کی یہ وضع ہو گئی کہ شاید ہی بغیر گوٹے پٹے کے کپڑے پہنتیں اور دو ایک نہایت ہلکے اور نازک زیوروں پر ہی اکتفا کرتیں جو بہت ہی نفیس، سبک اور قیمتی ہوتے۔ گلے، ناک، کان میں اگر زیور پہننا ہوتا تو وہ بھی بہت سبک ہلکے قسم کے ہوتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اتنا ہلکا زیور بننا شروع ہوا جس کی مثال







ہندوستان کے کسی اور مقام پر نہیں ملتی۔ ہندوستان میں نتھ پہننے کا کافی رواج تھا مسلم عورتوں نے بھی اسے اپنایا مگر لکھنؤ کی مستورات نے نتھ کی جگہ پر ہلکی، باریک اور خوشنما کیل کو زیادہ ترجیح دی، جو انتہائی نفیس اور خوبصورت زیور ثابت ہوا۔ نازک پسندی نے ان کیلوں کو بھی اتنا مختصر اور سبک کر دیا کہ اس قسم کی کیلوں کے کاریگر لکھنؤ کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتے تھے۔

محرم کے مہینہ میں مسلمانوں میں اور خصوصاً شیعہ حضرات کی مستورات میں سارے زیورات تن سے جدا کر دیئے جاتے کیوں کہ محرم غمی کا مہینہ مانا جاتا ہے، یہاں تک کہ ہاتھوں کی کلائیاں بھی چوڑیوں سے بے نیاز ہو جاتیں۔ چوڑیوں کی جگہ کلائیوں میں ریشم کی سیاہ پہونچیاں اور کانوں میں سیاہ اور زرد رنگ کے ریشم کے کرن پھول استعمال کئے جاتے۔

ملبوسات

ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے سے قبل سلے ہوئے لباس کا رواج نہ تھا، عورتیں اور مرد دونوں بے سلی چادر، ساریاں اور دھوتیوں سے اپنی ستر پوشی کرتے تھے۔ عربوں کے بھی لباس اور وضع یہاں کے لوگوں سے کچھ خاص مختلف نہ تھے، لباس میں تبدیلی کے ساتھ تہذیب کا براہ راست نتیجہ ہے جس کا اثر بغداد کے عباسی خلفاء پر پڑا، اور وہیں سے مسلمانوں کے ساتھ ہوتا ہوا ہندوستان میں داخل ہوا، دہلی کے دربار مغلیہ کا اور ساتھ ہی اودھ میں آنے والے نوابوں کا آخری لباس یہ تھا کہ سر پر پگڑی، بدن میں نیمہ، جامہ ٹانگوں میں ٹخنوں سے اونچا تنگ مہری کا پاجامہ، کمر میں جامہ کے اوپر پٹکا اور پیروں میں جوتا۔ جامہ جو کہنی تک آدھی آستین کا شلوکہ ہوتا تھا عموماً باریک ململ اور جامدانی کا ہوا کرتا تھا، اسے خوشنما بنانے کی خاطر سفید ململ پہ چکن کا باریک اور خوبصورت کام بنایا جاتا تھا۔ ڈھاکہ کی ململ اور جامدانی اور اودھ میں ٹانڈہ کی جامدانی بادشاہوں و دیگر عالی مرتبت امیروں کے لئے مخصوص تھی۔ بعد میں ایرانی قبا سے ماخوذ کر کے بالابر ایجاد ہوا۔ اس میں گریبان بالکل کھلا ہوتا تھا۔ آگے چل کر اسی بالابر کو ترقی دے کر انگرکھا ایجاد ہوا۔ انگرکھا در اصل بالابر اور جامہ دونوں کو ملا کر بنایا گیا تھا اس طرح ایک نئی قطع پیدا کر دی گئی۔ اس میں بائیں جانب سینہ تھوڑا کھلا رہتا تھا چولی اور دامن نیچے رہتے تھے، لکھنؤ آنے پر اس انگرکھے میں زیادہ چستی اور قطع داری پیدا کی گئی۔ چولی گول، اونچی اور کھنچی ہوئی چست ہو گئی۔ بغلوں کی چنٹیں بالکل غائب ہو گئیں۔ انگرکھے کی مقبولیت نے نیمہ کا رواج ختم کر دیا۔ اس میں بائیں جانب سینہ کا کھلا رہنا اس دور میں معیوب نہ سمجھا جاتا۔ لکھنؤ میں انگرکھے کے نیچے نیمہ کے بجائے شلوکہ کا استعمال رائج ہوا۔ بعض حضرات رنگین شلوکہ بھی پہنتے اس لئے کہ اس کے بیل بوٹے اور رنگ تن زیب کے سفید انگرکھے کے نیچے اپنی رنگین جھلک دکھا کر ایک خاص نفاست پیدا کرتے تھے۔ بالابر میں دوسری ترمیم لکھنؤ میں یوں ہوئی کہ چپکن کے نام سے ایک چست قبا ایجاد ہوئی۔ یہ چپکن کسی بھاری کپڑے کی ہوتی جو جاڑے کے موسم کے لئے زیادہ موزوں تھی۔ یہی چپکن اہلکار، باریان دربار سلطنت کا معزز لباس بن گئی۔ اس کے بعد آخر عہد میں انگرکھا اور چپکن دونوں کو ترتیب دے کر اچکن ایجاد کی گئی، یہ اچکن لوگوں کو بہت بھائی اور اس کا رواج شہر سے نکل کر دیہاتوں اور ہندوستان کے دیگر حصوں تک پہونچ گیا۔ یہی اچکن حیدرآباد پہونچ کر تھوڑی ترمیم کے بعد شیروانی بن گئی۔ وہاں اس کی آستینیں انگریزی کوٹ کی طرح کر دی گئیں۔ انگرکھے کے نیچے شلوکہ پہنا جاتا تھا، اس کے عوض آگے چل کر پہلے ڈھیلا کرتا ایجاد ہوا، اور بعد میں مغربی اثر کے تحت قمیص نے اس کی جگہ لے لی۔

ابتدا میں مسلم حکمران کے عمامے بڑے بڑے ہوا کرتے تھے اور اسی کی مناسبت سے امراء اور درباریوں کی پگڑیاں بھی بڑی ہوا کرتی تھیں سلطنت مغلیہ کے عہد میں یہ پگڑیاں چھوٹی اور ہلکی ہوتی گئیں۔ اکثر جدت طراز امراء نے اپنی خاص بندشیں اور خاص وضع کی چھوٹی پگڑیاں ایجاد کیں۔ آگے چل کر ان پگڑیوں کو مزید مختصر اور ہلکا کرنے کی خواہش نے ٹوپیوں کی ایجاد کی۔ چند روز میں ان ٹوپیوں میں بھی ترمیم و تنسیخ کا عمل شروع ہوا اور دیکھتے دیکھتے ٹوپیوں کی باڑھ سی آگئی۔ پگڑیاں چھوڑ کر ٹوپیوں کو اس طرح اپنایا گیا کہ سب کے سر پر ٹوپیاں ہی نظر آنے لگیں۔ چوگوشیہ، پنجگوشیہ اور دوپلی ٹوپیاں زیادہ مقبول ہوئیں، چوگوشیہ ٹوپی مہذب اور اعلیٰ درجہ کے لوگوں کے لئے مخصوص تھیں۔ دوسری ٹوپی دوپلی تھی جسے شہزادوں سے لے کر ادنیٰ طبقہ کے لوگ بھی کچھ ترمیم کے ساتھ استعمال کرتے تھے۔ نواب نصیر الدین

کے وقت میں ایک گول ٹوپی کا بھی رواج تھا جو مندیل کہلاتی تھی۔ اس ٹوپی کو دربار میں بھی جگہ دی گئی۔ سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد تک چوگوشیہ، مندیلوں اور دوپلی ٹوپیوں کا خوب دور رہا، بعد میں ترکی ٹوپی نے بھی زور پکڑا، اس کے ساتھ ساتھ انگریزی ہیٹ صاحب قسم کے ہندوستانی لوگ استعمال کرنے لگے۔ ساتھ ہی انگریزوں کے اثر میں آکر مندیل کی فیلٹ کیپ بھی ایجاد ہوئی۔ جسے انگریزوں نے "بالوزکیپ" کا نام دے رکھا تھا۔ ٹوپیاں چاہے جتنی قسم کی رہی ہوں دوپلی ٹوپیوں کی مقبولیت کو کوئی نہ پہونچ سکی۔ سبھی لوگوں نے اس ہلکی پھلکی ٹوپی کو اپنے سروں پر بٹھایا۔

ٹوپی کی مقبولیت سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ لکھنؤ کی نازک پسندی نے پگڑیوں کو فنا کردیا۔ خود یہاں کے حکمرانوں کے سروں پر پرانی دستار نواب سعادت علی خاں کے زمانے تک رہی، پہلے نواب برہان الملک، نواب شجاع الدولہ اور نواب آصف الدولہ کے سروں پر وہی دہلی کے عہدیداران سلطنت کی سی سفید دستار ہوا کرتی تھی۔ جس پر درباری موقعوں پر جواہرات کی قلغیاں، مرصع چرغے اور سرپیچ لگا دیئے جاتے تھے۔ اکثر قلمی تصویروں میں نواب سعادت علی خاں کے سر پر ایک نئی قسم کی پگڑی نظر آتی ہے جسے اہل لکھنؤ شملہ کہتے ہیں۔ یہی شملہ نواب نے دربار کے دیگر سبھی امراء اور وزیروں کو پہنایا۔ غازی الدین حیدر کو انگریزوں نے نواب سے بادشاہ بناکر ان کے سر کو ایک عدد تاج کا حقدار بنا دیا۔ یہ تاج یورپ کے بادشاہوں کے تاج جیسا تھا۔ اس عہد کے شہزادے خاص موقعوں پر بھاری کام کی نوک دار ٹوپیاں پہنتے تھے۔ مگر سلطنت کے عہدیداران کو حکم تھا کہ شملہ پہن کر دربار میں حاضر ہوں۔ شملہ ٹوپی کا چلن واجد علی شاہ کے زمانے تک رہا۔ دربار کے مختلف درجہ کے اہلکاروں کے لئے الگ الگ رنگ اور قسم کی پگڑیوں کے پہننے کا حکم تھا۔ سنی علماء دین عام طور سے سر پر عمامے پہنا کرتے تھے۔ شیعہ علماء بیشتر دوپلی ٹوپی ہی پہنتے رہے مگر عام لوگوں کے خلاف ان کی سیون بجائے آگے سے پیچھے آڑی یعنی ایک کان سے دوسرے کان تک رہتی ہے۔ بدن پہ لمبا کرتا مگر اس کے گریبان

کا چاک سینے کے بیچ کے بجائے بائیں شانے کے پاس ہوتا ہے۔ جو علماء ایران و کربلا ہو آتے ہیں، ان کے کرتے کے اوپر طیلسان ہوا کرتی ہے۔ جو دوپٹہ یا رومال ہوا کرتی ہے۔ جسے واعظ خطبہ کے وقت پہنتے ہیں پاؤں میں چھوٹے پائچوں کا پاجامہ ہوتا ہے اور پیروں میں ایک خاص جوتا (قفشہ) ہوا کرتا ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں میں دھوتی کی جگہ پائجاموں کا رواج تھا۔ اس کے پہلے صرف دھوتی ہی پہنی جاتی تھی، پائجامہ مسلمان اپنے ساتھ لائے۔ آگے چل کر پائجاموں کی قطع میں اتنا تغیر ہوا کہ پائجامہ کی مہری پنڈلی سے لپٹی رہتی۔ بعد میں مہری کسی قدر نیچی اور لمبی ہوگئی۔ مگر ٹخنوں سے آگے نہ بڑھی۔ لکھنؤ میں ڈھیلے عرض کا پاجامہ شروع ہوا آگے چل کر اسی کاٹ کا تنگ اور چست پائجامہ پہننے کا رواج چل نکلا جسے گھٹنا (چوڑی دار) کہتے ہیں۔ یہ گھٹنا سبھی طبقوں میں یکساں مقبول ہوا۔

ہندوستان میں عورتوں کا قدیم لباس صرف بے سلی چادر تھی جو کمر سے باندھ کر آدھی اوپری حصہ پر لپیٹ لی جاتی تھی اس کے علاوہ سینہ کے اوپر باندھنے کا ایک اور لباس تھا جسے انگیا اور چولی کہتے تھے سلے ہوئے کرتے پائجامے مسلمان اپنے ساتھ لائے۔ مسلمان عورتیں ڈھیلے پائجامے ساتھ لائیں جو بعد میں گھٹنے بن گئے مگر ان کا گھیر اوپر سے ڈھیلا ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس میں اوپر کا گھیر کم ہوتا گیا اور پائنچہ کی مہریاں بہت تنگ ہوگئیں۔ لکھنؤ میں مسلمان بیگمات تنگ مہری کا پائجامہ، سینے پر تنگ آستین کی کھنچی ہوئی انگیا اور دھڑ چھپانے کے لئے ایک کرتی اور دوپٹے کا استعمال کرتی تھیں۔ بادشاہ نصیر الدین حیدر کے زمانے سے گھٹنے کی جگہ بڑے بڑے گھیر دار پائنچوں کے کلی دار پائجاموں نے لے لی تھی جو کمر سے بالکل تنگ ہوتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے آس پاس باریک کپڑوں اور آدھی آستین کے تنگ شلوکوں کا بھی رواج نکلا۔ اسی کے ساتھ نیچے کرتے کا بھی چلن شروع ہوا۔ جاڑے کے لباس خصوصاً امراء میں موٹے اور اونی کپڑوں کے ہوا کرتے تھے جنھیں زردوزی کے کاموں سے سجا کر ان کی خوبصورتی کو دوبالا کیا جاتا۔

خاص خدمت گار مردوں اور عورتوں کی پوشاکیں ان کے مالکان کے جیسی ہی ہوا کرتی تھیں، اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ خدمت گار اپنے مالکوں کی اتری ہوئی پوشاکیں ہی پہنا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ امیروں اور رئیسوں کے دیگر خدمت گاران جیسے محل داروں، مغلانیوں، کہارنوں وغیرہ کی وضع قطع مختلف ہوا کرتی تھیں اور انھیں آسانی سے پہچانا جا سکتا تھا۔

اودھ میں خصوصاً لکھنؤ اور اس میں بھی خاص کر شیعہ حضرات کے یہاں محرم کی ایک الگ اہمیت ہے اور چونکہ یہ غم کا مہینہ مانا جاتا ہے اس لئے اس ماہ میں زندگی انتہائی سادگی سے گذاری جاتی ہے۔ اظہار غم کرنے کے لئے بھڑکیلے، فیشن دار کپڑوں کو تج کر سادے کپڑے جو اکثر کالے نیلے یا سبز رنگ کے ہوتے ان کا استعمال کیا جاتا کیوں کہ یہ رنگ غم اور سوز کا رنگ تصور کئے جاتے ہیں۔ سبز رنگ کے کپڑے اس لئے استعمال کئے جاتے تھے کہ بنی عباس کے عہد میں بنی فاطمہ کا رنگ سبز تھا۔

نوابین اودھ کا زمانہ دنیا کی پریشانیوں سے دور، چین، سکون امن، عیش و طرب کا زمانہ تھا۔ یہاں کے نوابین، روساء، امراء و دیگر ذی حیثیت حضرات کو اپنی کفالت کے لئے کچھ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ وقت گذارنے کا ذریعہ گھر سے باہر ادبی محفلیں، یا گھر کے اندر بیگمات اور باندیوں کی صحبتیں ہوتیں۔ نتیجہ کے طور پر اکثر مردوں پر عورتوں کی وضع غالب آنے لگی اور لوگوں کی یہ حالت ہوگئی کہ میاں اور بیوی کی رضائیوں، دوشالوں پائجاموں وغیرہ میں بھی کوئی فرق باقی نہ رہا سوائے اس کے کہ گوٹہ، پٹہ اور زیور عورتوں کے ساتھ مخصوص تھا۔ مرد شوخ رنگوں کے نازک ریشمی کپڑے بغیر گوٹے پٹے کے پہننے لگے۔ لیکن آگے چل کر انگریزی اثر سے یہ کیفیت کم ہونے لگی۔

آج کل کے برخلاف گذشتہ نوابی عہد میں بھی گھر اور باہر ایک ہی جیسے کپڑے پہننے کا چلن نہ تھا۔ گھر سے باہر نکلتے وقت انگرکھا، چکن، پائجامہ وغیرہ پہنا جاتا تھا مگر گھر کے اندر ایک ہلکی سی لنگی، تہہ بند بھی استعمال کی جاتی تھی۔ نتیجے کے طور پر ایک دھلا ہوا لباس مہینہ بھر چل جاتا جیسے آج ہی دھل کر آیا ہو۔ دھوبی کے یہاں سے دھلے ہوئے انگرکھے کا دامن، گوٹ اور آستین چنٹ دے کر سجائی جاتیں جن کا اثر کافی عرصہ تک باقی رہتا۔ عورتوں کے گھریلو اور باہری لباس میں کوئی فرق نہ تھا۔ گھر میں پہننے کا جوڑا صرف تھوڑا ہلکا اور باہر مہمانداری میں جانے کا جوڑا بھاری قیمتی اور کامدار ہوا کرتا تھا۔ مہمانداری میں مرد عورتیں اور بچے سبھی اپنے حسب اوقات نفیس



شامِ اودھ

مجھ کو معلوم نہیں کیا تھے عوامل، یعنی
کس لیے دہر میں مشہور ہوئی شامِ اودھ
گومتی! تو ہی بتا، تو نے تو دیکھا ہوگا
قافلہ اہلِ سعادت کا جب اترا ہوگا
تیرے ساحل پہ رکا، پھر نہ کہیں اور گیا
اک نئے عہد کی تاریخ کی تمہید بنا

میں اسی فکر میں اک دن سرِ ساحل بیٹھا
چاہتا تھا کہ ملے میرے سوالوں کا جواب
دفعتاً ایسا لگا، کھُل گئی ماضی کی کتاب
عکس ساکن ہوئے، بہتا ہوا پانی ٹھہرا
کوئی آواز نہ تھی، ہوگئی خاموش فضا
ایسے ماحول میں آئی لبِ دریا سے صدا

میرے شاعر! یہ تری فکر و تشویش بجا
واقفِ حال نہیں کوئی، فقط میرے سوا
یوں تو ساحل مرا، صدیوں سے ہے آباد رہا
جو بھی آیا وہ یہیں رہ گیا، واپس نہ گیا
اور گیا بھی تو مری یاد لیے دل میں گیا
ربط قائم رکھا، کچھ نام و نشاں چھوڑ گیا

میری دھرتی پہ ابھی باقی ہے کچھ ن ٹیلہ
وہ مسافر یا مہاجر ہو کہ صاحب یا گدا
راس آجاتی ہے ہر اک کو مری آب و ہوا
جڑ پکڑ لیتا ہے، ہو چاہے جہاں کا پودا

ہاں مگر شامِ اودھ کے ہیں عوامل کچھ اور
عامی کچھ کہتے ہیں، فرماتے ہیں عاقل کچھ اور
میرے شاعر! میں بتاتی ہوں کہ یہ راز ہے کیا
مجھ سے بڑھ کر تو کسی نے بھی نہ دیکھا نہ سُنا
یہ مری شامِ اودھ لمحۂ فطرت بھی ہے
اس کی تخلیق میں برسوں کی ریاضت بھی ہے
اس کی تعمیر کی بُنیاد، سعادت بھی ہے
اس کی تہذیب کا عنوان، شرافت بھی ہے
اس کی تاریخ، دھنک رنگ عبارت بھی ہے
اس کے باشندوں کی مشترکہ وراثت بھی ہے
علم و فن اور ہُنرمندی میں رفعت بھی ہے
اس کے لہجے میں سخن ساز ملاحت بھی ہے
لذّتِ گوش جسے کہیے، حلاوت بھی ہے
بات کہنے کے سلیقے کی روایت بھی ہے
خواہش امن و اماں، چشمِ مروّت بھی ہے
یعنی مِل جُل کے بسر کرنے کی عادت بھی ہے

اور کچھ ایسا جسے حاملِ نُدرت سمجھو
یہ مری شامِ اودھ ایک علامت سمجھو

مُصطفیٰ زیدی وفا
۱۲/۶ ڈالی باغ کالونی
لکھنؤ - ۱

گرو شرن لال

سورج پرنٹرس کھدرا، سیتاپور روڈ لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۲۰



بیگماتِ اودھ کا درخشاں کردار

شاہان اودھ اپنی شان و شوکت اور تعیش کے لئے مشہور تھے۔ فنونِ لطیفہ سے والہانہ عشق کے سبب انھوں نے مختلف وضع کی پوشاکیں۔ زیورات و آرائش کے ساز و سامان بھی ایجاد کیے۔ اسکے علاوہ ان کے دورِ حکومت میں فنِ تعمیر، دست کاری صنعت اور زبان و ادب کو کافی فروغ ملا۔ بیگمات اودھ ان کاموں میں برابر کی شریک رہیں۔ ان میں حُبّ الوطنی۔ رعایہ پروری کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ اُن کی ان ہی خصوصیات کی وجہ سے نسائی زندگی میں بھی تبدیلی ہوئی اور ایک نئے فکر کا آغاز ہوا۔ ان خصوصیات کی حامل بیگمات نے نوابوں کے اذہان و افکار کو بھی تبدیل کر دیا تھا۔ اپنے اس مثالی کردار کی وجہ سے بیگمات اودھ نے ہندوستانی تاریخ میں اپنا وجود ہمیشہ کے لئے محفوظ کرلیا۔ اس سلسلے میں کچھ بیگمات کا ذکر حسب ذیل ہے۔

نواب بیگم:۔ نواب منصور خاں نے برہان الملک کی دختر سے شادی کی تھی جنھیں نواب بیگم کے نام سے جانا جاتا تھا۔ سسرال میں انھیں صفدر جہاں بیگم کا خطاب ملا۔ جو بعد میں نواب بیگم کے نام سے مشہور ہوئیں۔ یہ بہت ہوشیار خاتون تھیں ۱۷۵۴ء میں جب وہ اپنے زخمی شوہر کے ساتھ احمد شاہ کی دعوت پر فیض آباد سے دلّی جا رہی تھیں۔ راستے میں ان کے شوہر کا انتقال ہوگیا لیکن انھوں نے ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے اس راز کو راز ہی رہنے دیا۔ ۱۷۶۴ء میں بکسر کی جنگ میں شجاع الدولہ کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اسکے بعد نواب سے پچاس لاکھ روپئے بطورِ جرمانہ وصول کیا گیا۔ جون ۱۷۹۶ء کو دورانِ نماز ان کا انتقال ہوگیا۔

بہو بیگم:۔ شجاع الدولہ کی بیگم امت الزہرہ دلّی کے وزیر خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کا نکاح ۱۷۴۵ء میں دلّی میں دارا شکوہ کے محل میں ہوا۔ اس یتیم بچّی کے نکاح میں شہنشاہ نے لاکھوں روپئے خرچ کئے۔ بعد میں انھیں بہو بیگم کا خطاب دیا گیا۔ دلّی سے وہ کافی مال و دولت ساتھ لائی تھیں۔ بکسر کی لڑائی میں انگریز فوج پر ہونے والے اخراجات کو بہو بیگم نے بھی پورا کیا تھا۔ وہ آصف الدولہ کے ساتھ لکھنؤ میں گومتی کے کنارے بنے بُرج میں کچھ ماہ تک قیام پذیر رہیں۔ ان کی لکھنؤ آمد پر تمام شاہراہوں پر اشرفیاں لٹائی گئیں۔ ایک بار آصف الدولہ کے سپاہیوں کی تنخواہ کی ادائیگی انھوں نے اپنی بیٹی کے جہیز کے لئے رکھے روپیوں سے کی تھی ۱۸۱۶ء میں بہو بیگم کا انتقال ہوگیا اور فیض آباد کے جواہر باغ میں اُن کے ہی قائم کردہ ٹرسٹ سے ان کا خوبصورت مقبرہ بنوایا گیا۔

بیگم شمس النساء:۔ نواب آصف الدولہ کا پہلا نکاح دلّی کے دیوانَ خاندان کے امام الدّین خاں عرف امتیاز الدّولہ کی دختر شمس النسائ سے ہوا تھا۔ ۱۷۶۹ء میں فیض آباد میں ہوئی اس شادی میں ۲۴ لاکھ روپئے خرچ ہوئے تھے۔ دلّی کے شاہ عالم اور شعلہ پوری بیگم نے اس شادی میں شرکت کی تھی۔ شمس النساء لکھنؤ کے شیش محل میں سات سال تک رہیں۔ بعد میں الہ آباد میں ان کا انتقال ہوگیا اور انھیں لکھنؤ میں دفن کیا گیا۔

بیگم قدسیہ محل:۔ غریب پرور قدسیہ بیگم کی رہائش گاہ چھتر منزل تھی۔ بادشاہ نصیر الدین کی اس منظورِ نظر کے پاس سے کوئی مایوس نہیں لوٹا تھا۔ معمولی خاندان سے متعلق ہونے کی وجہ سے وہ غریبوں کے دُکھ درد سے بخوبی واقف تھیں بچپن میں ایک نجومی نے ان کا ہاتھ دیکھ کر یہ بتایا تھا کہ ایک دن وہ ملکہ بن جائیں گی لیکن شرط یہ ہوگی کہ وہ غریبوں کو نہ بھولیں۔

بیگم ہوتے ہی قدسیہ محل نے میر انور علی کو بلا کر دس ہزار روپے کی تھیلی عطا کی۔ وہ روزانہ پانچ سو روپئے غریبوں میں تقسیم کرنے کے بعد ہی ناشتہ کرتی تھیں۔ وہ نہایت خوددار خاتون تھیں۔ انھوں نے بادشاہ کی کسی بات سے ناراض ہو کر سنکھیا چاٹ کر خودکشی کر لی تھی۔ ۲۱ اگست ۱۸۳۳ء کو لکھنؤ کے ارادت نگر محلّے کی کربلا میں انھیں دفنا دیا گیا۔

بیگم حضرت محل:- لکھنؤ کے اکبری دروازے کے پاس چودھرائن کا امام باڑہ ہے جس کی شکل اب کافی بدل گئی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہیں سے حضرت محل کو لیجا کر شاہ عالم کے پری خانہ میں پیش کیا گیا تھا۔ شاہ عالم نے انھیں مہک پری کا خطاب دیا۔ برجیس قدر کی ولادت کے بعد انھیں بیگم کا خطاب دیا گیا۔ ۱۳ فروری ۱۸۴۷ء کو واجد علی شاہ کے برسرِ اقتدار ہوتے ہی انھیں حضرت محل کا خطاب ملا۔ محمدی اور جلال آباد کی جاگیریں انھیں دے کر ان کی شان میں اضافہ کیا گیا۔

حضرت محل نے ۹ جولائی ۱۸۵۷ء کو اپنے نابالغ فرزند رمضان علی برجیس قدر کو چاندی والی بارہ دری میں تخت نشین کرایا۔ شام کو تیز بارش میں ۲۱ توپوں کی سلامی کے ساتھ بیگم راج ماتا بنیں۔ اپنے بیش قیمت زیورات ملک کی خدمت میں پیش کر دئے جب لکھنؤ میدان جنگ بن گیا اور چنہٹ، سکندر باغ، قدم رسول، بیگم کوٹھی، ریزی ڈنسی، دلکشا قلعہ، جلال آباد اور عالم باغ میں زبردست جنگ ہوئی جس کے نتیجے میں ۷۵ ہزار لوگ قتل ہو گئے۔ بیگم حضرت محل نے جنگ کی باگ ڈور سنبھال کر انگریزوں سے بہت دلیرانہ مقابلہ کیا۔ گومتی کے دائیں کنارے پر موسیٰ باغ میں ان کی انگریزوں سے آخری جنگ ہوئی۔

ملکہ کشور:- یہ امجد علی شاہ کی خاص محل تھیں۔ ملکہ کشور ان کا خطاب تھا۔ وہ نہایت شرمیلے مزاج کی تھیں۔ واجد علی شاہ انھیں کے بیٹے تھے۔ ان کے محل میں تاتاری عورتیں پستول باندھ کر ٹہلا کرتی تھیں۔ وہ مختلف موسموں میں مختلف مقامات پر رہتی تھیں۔ موسم سرما میں چھتر منزل میں، موسم گرما میں چوکھی میں اور موسم باراں میں حویلی باغ میں رہتی تھیں۔ جس کپڑے کو ایک بار استعمال کر لیتی تھیں دوبارہ ہاتھ تک نہیں لگاتی تھیں۔

اب دھیرے دھیرے اودھ کے شاہی خاندان کی رسائی کلکتے کے چیچ گارڈن تک ہو چکی تھی۔ کشور اپنے فرزند کو اپنے حقوق دلانے کی غرض سے وکٹوریا کے پاس جانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ نواب واجد علی شاہ اس وقت بیمار تھے ملکہ کشور اور حضرت محل (ساس بہو) کے درمیان تعلقات خوش گوار نہ تھے۔ ملکہ کے ساتھ انگلینڈ جانے کے لئے ۱۴۰ افراد تیار کئے گئے۔ اس تاریخی اور غیر معمولی سفر کی تیاری میں دس لاکھ روپئے خرچ ہوئے کروڑوں روپئے کے تحفے وکٹوریا کو دینے کی غرض سے اکٹھا کئے گئے۔ ۱۶ جون ۱۸۵۶ء کو کشتوجہاں کا یہ قافلہ رات کے بارہ بجے کوریا کے جہاز سے روانہ ہوا۔

۲۰ اگست کو یہ قافلہ لندن پہونچا۔ چار لاکھ روپئے کے ساتھ ملکہ کشور نے وکٹوریا کے پاس اپنی اپیل بھجوائی۔ ملکہ کشور اور وکٹوریا کے درمیان دس ماہ تک ملاقات نہ ہو سکی۔ روپیہ پانی کی طرح بہایا گیا۔ آخر میں ۴ جولائی ۱۸۵۷ء کو وکٹوریا نے ایک زنانہ دربار منعقد کیا جس میں ملکہ کشور کو مدعو کیا گیا۔ آٹھ ہندوستانی زبان جاننے والی عورتوں کی مدد سے ان دونوں کے درمیان بات چیت ہو سکی۔ تحائف کا انبار لگا دیا گیا۔ لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ وکٹوریا بار بار مسافرت کی تفصیل اور بچّوں کی خیریت ہی پوچھتی رہیں۔ کچھ دن بعد ہندوستان میں بغاوت کی خبر انگلینڈ پہنچ گئی۔ کانپور میں انگریزوں کے اجتماعی قتل کی خبر نے انگلینڈ کو مشتعل کر دیا ۱۸۵۷ء کی بغاوت نے وکٹوریا کے رُخ کو ہی بدل دیا۔ ملکہ کشور اس شکست سے ٹوٹ سی گئیں اپنی علالت کے سبب انھوں نے وطن واپس آنے کا قصد کیا۔ ۲۴ جنوری ۱۸۵۸ء کو دوپہر کے وقت پیرس میں ان کا انتقال ہو گیا اور وہیں ان کی لاش کو فوجی اعزاز کے ساتھ دفن کر دیا گیا۔ ان کے مزار کے قریب فرانس کی حکومت نے ایک مسجد تعمیر کرا دی۔

اس طرح اودھ کی بیگمات کی تاریخ کا بھی خاتمہ ہو گیا اور ان کے کارنامے قصّہ کہانیوں میں تبدیل ہو کر کتابوں میں محفوظ ہو گئے۔

ترجمہ: ضیا بانو

پرنس انجم قدر
(نبیرۂ واجد علی شاہ و بیگم حضرت محل)
گارڈن ریچ۔ کلکتہ ۲۴



بیگم حضرت محل پارک کی تاریخی وجہِ تسمیہ

بیگم حضرت محل پارک لکھنؤ کا نام ۱۹۶۲ء میں میرے بھائی پرنس نیر قدر رحال مقیم لندن کی کوششوں سے رکھا گیا تھا۔ نیر صاحب کی تحریک پر حافظ محمد ابراہیمؔ اس وقت کی حکومت یوپی کے وزیر آبپاشی (Irrigation) نے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کو ۱۸۵۷ء کی تاریخ کے ان پہلوؤں سے روشناس کرایا جو لکھنؤ اور بالخصوص قیصر باغ سے متعلق تھے۔ اس کے بعد پنڈت نہرو نے قیصر باغ وکٹوریہ پارک کا نام بدل کر "بیگم حضرت محل پارک" رکھا۔ جاہ وجلال میں غرق ملکۂ وکٹوریہ۔ شاہی مجسمہ کو میوزیم میں منتقل کر دیا گیا۔ اور اس جگہ ملکۂ حضرت محل کا مجسمہ نصب کرنے کے لئے وزیر اعلیٰ چندر بھان گپتا نے ریاستی سرکار کی جانب سے پچاس ہزار روپیہ منظور کیا۔ لیکن میرے اور پرنس نیر کے اعتراض پر کر اسلامی رو سے مجسمہ اور وہ بھی خاتون کا نامناسب ہوگا وہ تجویز بدل دی گئی۔ حضرت محل کی مہر اور کتبہ چھتری کے نیچے سنگ مرمر کے ستون پر تانبے کی چکتیوں پر کندہ کر کے نصب کر دیا گیا اور پورے پارک کا نام "بیگم حضرت محل پارک" رکھ کر حکومت ہند کے محکمۂ آثار قدیمہ کے حوالے کر دیا گیا۔ اس محکمہ نے عوام کی اطلاع کیلئے نیلی تختی پر اپنا نوٹس لگا دیا ہے۔

ملکۂ وکٹوریہ کے نام سے ایک اور وکٹوریہ پارک گول دروازہ چوک کے سامنے لکھنؤ ہی میں ہے اور اس وقت بھی موجود ہے۔ چنانچہ یہ مسئلہ بھی زیر بحث تھا کہ جب چوک والا وکٹوریہ پارک محفوظ رکھا گیا تو یہ قیصر باغ والے نام کی تبدیلی کیوں ضروری سمجھی گئی۔ حقیقتاً قیصر باغ کا پارک، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے خونچکاں داستان سے بھری ہوئی ہے یہاں کے ذرہ ذرہ میں ہندوستانی سپاہیوں اور جانبازوں کی داستانیں پیوست ہیں۔ اسی میدان جنگ میں ہندوستانی ملکہ حضرت محل نے بدیسی ملکہ وکٹوریہ کی فرنگی فوج کو شکست دیکر لکھنؤ اور اودھ کی حکومت دوبارہ حاصل کی تھی۔

اسی میدان جنگ میں برٹش کمانڈر ان چیف جنرل نیل گھوڑے کی پشت پر سوار شیر دروازے سے داغے گئے توپ کے گولے سے اڑا دیا گیا تھا۔ نیل وہیں ڈھیر ہو گیا مگر اس کا زخمی گھوڑا بھاگ کر ایک فاصلہ پر گرا۔ وہیں دفن کیا گیا جہاں اب پریس کلب ہے۔ جنرل نیل کے قتل کے مقام پر انگریزوں کا لگا ہوا ایک کتبہ موجود ہے۔

اسی میدان جنگ میں بیگم کی ہندوستانی فوجوں سے فرنگی فوجیں شکست کھا کر مرتی مارتی بھاگ کر رزیڈنسی میں روپوش ہو گئی تھیں۔

اسی میدان جنگ میں حضرت باغ کے اندر واقع چاندی والی بارہ دری میں حضرت محل کے بیٹے برجیس قدر کی تاجپوشی ہوئی تھی۔ اور ان کا جلوس تاجپوشی بھی اسی میدان سے شادیانے بجاتا ہوا گزرا تھا۔

اسی میدان جنگ کے کنارے چار عالی شان کوٹھیوں کا جھرمٹ جو چوکھی کہلاتا تھا بیگم حضرت محل کی رہائش گاہ تھی۔ اور ۱۸۵۷ء میں وہ یہاں دربار بھی کرتی تھیں۔

تاجپوشی کے بعد چھ بڑے انگریز افسر قیدیوں کا مقدمہ بیگم حضرت محل کی فوجی کونسل نے اسی میدان جنگ کے اندر چوکھی میں سماعت کیا۔ یہیں سزائے موت کا حکم سنایا گیا جس کی فوراً تعمیل ہوئی۔ بیگم حضرت محل کے حکم سے وہ چھ لاشیں ایک مشترکہ قبر میں عیسائی طریقہ سے دفنائی گئیں اور اس پر ایک صلیب بھی نصب ہے۔ وہ قبر موجودہ تلسی سینما کے سامنے آج بھی موجود ہے۔ انگریزی دو

میں سنگ مرمر کا کتبہ لگا دیا گیا تھا جس پر یہ نام کندہ ہیں۔

"بیاد سر ماؤنٹ اسٹورٹ جیکسن بارٹ، کیپٹن پیٹرک
آر، لفٹنٹ برنیس، سارجنٹ میجر مورٹن، جی پی کاریو،
اور ایم جیکسن۔ ۱۸۵۷ کے مہلوکین"

دس ماہ بعد کایا پلٹ ہوئی تو انگریزی فوجوں نے بھی اسی میدان جنگ میں بیگم حضرت محل کو شکست دی۔ پانچ ہزار وفادار ہندو اور مسلم مجاہدین جنگ آزادی اسی میدان کارزار میں اپنی جانیں وطن پر نثار کرکے تاریخ بنا گئے۔ ایک بھی فرار نہ ہوا۔

یہ وہی میدان ہے جہاں خود بیگم حضرت محل ملک کو انگریزوں کے ناپاک ہاتھوں سے آزاد کرانے اور جام شہادت نوش کرنے کے جذبہ سے پردے سے باہر نکل آئی تھیں۔ مگر عین وقت پر مولانا احمد اللہ شاہ دو ہزار جانبازوں کو لے کر انگریزوں کا گھیراؤ توڑ کر گھس آئے اور بیگم اور برجیس قدر کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے بچالے گئے اسی موقع پر حضرت محل نے کہا تھا کہ میں جانتی ہوں کہ جنگ ہار گئی ہوں۔ مگر میں یہیں میدان جنگ میں جان دے دوں گی لیکن جو لکھی چھوڑوں گی نہیں۔

اسی میدان جنگ میں فتح کے بعد فرنگیوں نے بھی اپنے دو قیدیوں کو پھانسی دی۔ اور مسلمان کی لاش کو جلا کر ہندو راجہ جیالال کو نہ صرف دفن کر دیا بلکہ نشان قبر بھی مٹا کر اپنے مظالم کا اظہار کیا۔ فرنگیوں نے اپنی عیاری اور مکر و فریب کی حکمت عملی سے ۱۸۵۷ کی جنگ میں فتح کے بعد اودھ کے پایۂ تخت لکھنؤ کے اس تاریخی میدان جنگ کا نام اپنی انگریز ملکہ کے نام پر "قیصر باغ وکٹوریہ پارک" رکھا اور اس پر عالی شان مجسمہ نصب کیا تھا۔ لیکن ملک کے پہلے وزیر اعظم کو اسکی تاریخی اہمیت کی طرف جیسے ہی متوجہ کیا گیا۔ انھوں نے اسے ہٹوا کر میوزیم میں بھجوا دیا۔ اور اس تاریخی میدان جنگ کا نام بدل کر "بیگم حضرت محل پارک" رکھا۔

اسی کے بعد ہم لوگوں کی تحریک پر حکومت اتر پردیش نے "بیگم حضرت محل پارک" کا وہ ٹکڑا جہاں حضرت محل کے وزیر جنگ راجہ جیالال قتل کر کے مدفون کر دئے گئے تھے، "راجہ جیالال پارک" رکھ کر اور ایک تختی پر لکھ کر اس بہادر اور وطن پرست راجہ کے نام کو بھی شہرت دوام دیدی۔

چونکہ یہ میدان جنگ آزادی وطن کے لئے قربانی پیش کرنے کی ایک علامت سمجھا جاتا ہے چنانچہ جنگ آزادی کے ایک دوسرے





سورما نیتاجی سبھاش چندر بوس کا فوجی لباس میں ملبوس مجسمہ بھی اسی سابق میدان جنگ میں دوسری جگہ لگا دیا گیا ہے۔

ممکن ہے چند افراد بعض مصلحتوں کی بنا پر یا حقائق سے عدم واقفیت کے سبب اس پارک کو حضرت محل سے منسوب کرنا مناسب نہ سمجھتے ہوں یا اس سے اتفاق نہ ہو، بلکہ اس کا نام کچھ اور رکھنا چاہتے ہوں لیکن یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ ساری زمین ۱۹۶۲ء سے مرکزی حکومت کے محکمۂ آثار قدیمہ کی ملکیت ہے۔ آراضی کا مالک ہی نام بدل سکتا ہے۔

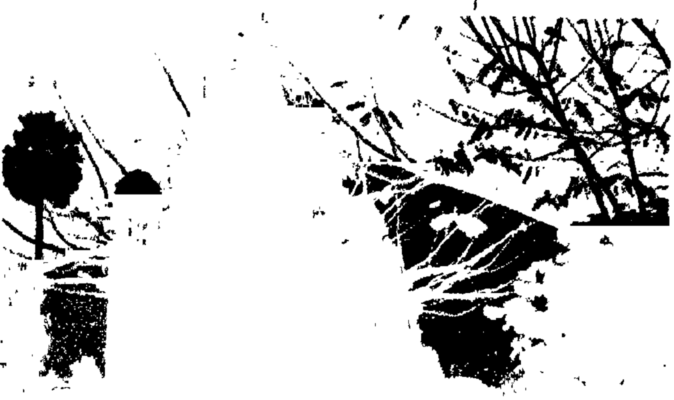
۲۔ وہ پارک قیصر باغ کے شاہی محلات کی آراضی ہونے کے سبب خاندان شاہی اودھ کی ملکیت تھا اور انگریزی سرکار بطور غاصب اس پر قابض رہی۔ اس کے بعد بھی تا ۱۹۶۲ء وہی صورت حال تھی۔ اودھ کے آخری حکمراں کے حق سے وہ زمین حضرت محل کی ملکیت تھی۔

۳۔ وہ بیگم حضرت محل کا میدان جنگ تھا۔ جس پر موصوفہ نے انگریزوں سے لڑائیاں لڑیں جیتیں اور ہاریں۔

۴۔ اس میدان جنگ میں برٹش کمانڈر ان چیف جنرل نیل کے قتل کی جگہ کی نشان دہی ہے۔ فرنگی فوجی قیدیوں کی قبر ہے۔ اور بیگم حضرت محل کے وزیر جنگ راجہ جیالال کی بھی قبر ہے۔ اور اس طرح فرنگیوں کی کم ظرفی کا مستقل مظاہرہ بھی ہے۔ یہاں آزاد ہند فوج کے کمانڈر ان چیف نیتاجی سبھاش چندر بوس کا جنگی مجسمہ بھی لگا ہوا ہے۔

۵۔ اسی میدان جنگ میں چاروں طرف، ۱۸۵۷ کی جنگی کارروائیوں کی نشانیاں اور تاریخی شواہد موجود ہیں۔ تاجپوشی، جنگی کاؤنسل کے دربار، نامور انگریز اور ہندستانی جنگی قیدیوں پر چارہ جوئی، سزائے موت اور تعمیل، ان تمام تاریخی حقائق کی داستانیں پوشیدہ ہیں جس کے مطالعے سے ہماری نئی نسل اپنی عظمت اور ملک اور قوم کے لئے قربانی پیش کرنے کے کارناموں سے بخوبی واقف ہو سکتی ہے۔ ان تمام باتوں سے واقف ہونے کے بعد نہ تو کسی کو اس پارک کی تاریخی اہمیت سے انکار ہو سکتا ہے نہ کسی کو یہ پسند ہوگا کہ "حضرت محل پارک" کا نام تبدیل کیا جائے۔

لازم تو یہ تھا کہ مختلف اوقات تاریخ میں پائے ہوئے ایسے نادر خطابات، افتخار النساء، ملکۂ اودھ، جناب عالیہ، راج ماتا کی حامل بیگم حضرت محل کے مانے ہوئے کارناموں اور ان کے ایثار کے مدنظر ان کے نام کی بے شمار یادگاریں مختلف طریقوں کی سارے ملک میں



مقبرہ سعادت علی خاں لکھنؤ

قائم ہوتیں۔ مگر دنیا میں صرف یہی ایک "بیگم حضرت محل پارک" واحد یادگار ہے جس سے موصوف کا نام نامی زندۂ جاوید ہے، اور روز دنیا کے اخباروں میں چھپتا ہے۔ اس کو بھی مٹا دینا یعنی حضرت محل کی یاد یکلخت محو کر دینا قوم و ملت کی احسان فراموشی ہو گی یہاں چند اقتباسات مشاہیر عالم مفکرین کے بیگم حضرت محل کی اہمیت اور ان کے اعتراف میں درج کئے جاتے ہیں۔ تاکہ آزادی وطن اور ملک و قوم کے وقار کو بچانے کے لئے ان کی خدمات کو آسانی سے سمجھا جا سکے۔

ویر ساورکر

• باہمت اور قابل قدر بیگم صاحبہ کا باوجود اس قدر افراتفری کے، سارے نظام حکومت کو برقرار رکھنا ان کی لیاقت اور بے جگری کا بین ثبوت ہے۔"

کارل مارکس

"حضرت محل، اودھ کی بیگم نے ہندستان قومی جدوجہد آزادی میں ۱۸۵۷-۵۹ء تک مجاہدین کی قیادت کی۔" (شائع شدہ ماسکو" دی فرسٹ انڈین وار آف انڈپینڈنس ۱۸۵۷-۵۹ء ص ۲۰۳)

سر ڈبلو، ایچ رسل

"بیگم نے سارے اودھ کو لڑنے پر آمادہ کر لیا ہے۔ اور سرداروں نے وفاداری کا حلف لیا ہے۔" (مائی انڈین میوٹنی ڈایری")

سر جادو ناتھ سرکار

"بیگمات اودھ نے تاریخ پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں ..... سلطنت کے زوال پر نمودار ہوئیں حضرت محل، بغاوت کی ہیروئین، نرم تر واجد علی شاہ کی شیر دل ملکہ۔"

("تاریخ بادشاہ بیگم" مقدمہ ۱۵ر جون ۱۹۳۸ء)

وزارت اطلاعات حکومت ہند

"اودھ کے معزول پادشاہ کی بڑی بیوی حضرت محل غیر معمولی صلاحیت کی خاتون تھیں اور آزادی کی جدوجہد میں انھوں نے نمایاں حصہ لیا۔ اپنے کم سن لڑکے برجیس قدر کو اس کے باپ کا جانشیں کی حیثیت سے انھوں نے اس کی سرپرستی میں حکومت کے نظم و نسق کو سنبھالا لکھنؤ کی مدافعانہ جنگ میں وہ خود شریک ہوئیں اور اپنی فوجوں میں اکثر حرکت کرتی دیکھی گئیں۔ انگریزوں نے اودھ کو جب دوبارہ فتح کیا تو انھوں نے نیپال میں پناہ لی اور اپنے لڑکے کے حقوق سے دستبردار ہونے سے صاف انکار کر دیا۔"

(ترجمہ، پکٹوریل پریزنٹیشن مطبوعہ حکومت ہند)

انگریز سرپرست فخر محل

"میں نہیں سمجھتی تھی کہ حضرت محل ایسی آفت کی پرکالہ ہے خود ہاتھی پر بیٹھ کر تلنگوں کے آگے آگے فرنگیوں کا مقابلہ کرتی ہے آنکھ کا پانی ڈھل گیا ہے۔ اس کو ہراس مطلق نہیں ہے۔"

بیگمات اودھ کے خطوط

شیدا بیگم بنام واجد علی شاہ

"حضرت محل نے ایسی بہادری دکھائی کہ دشمن کے منہ پھر پھر گئے۔ بڑی جیدار عورت نکلیں۔ سلطان عالم کا نام کر گئیں کہ جس کی عورت ایسی ہو جو مردانہ وار مقابلہ کرے تو اس کا مرد کیسا بہادر اور شجاع ہوگا۔"

(بیگمات اودھ کے خطوط)

اور یہی حقائق ہیں جن کے پیش نظر "حضرت محل" کو یاد رکھنا قومی و تہذیبی ضرورت ہے۔

□□

نوابین اودھ کے زیورات اور لباس ... صفحہ ۱۸۷ کا بقیہ

اور قیمتی لباسوں میں جایا کرتے جس سے محفلیں بھڑکیلی اور بارونق نظر آتیں۔

لباس کے ساتھ ساتھ مغل فیشن کے جوتوں میں لکھنؤ کے لوگوں نے تراش خراش کر نئی جوتیاں پیدا کیں۔ اکثر جوتے سبک، ہلکے اور انتہائی نفیس بنے ہوتے اور انھیں سجانے کے لئے کارچوبی اور بروکیڈ وغیرہ استعمال کئے جاتے۔ بعد میں ان جوتوں اور جوتیوں کی جگہ سلیپروں، چپلوں اور انگریزی طرز کے شوز نے لے لیں۔

□□

حاشیہ:

[1] زیورات اور دوسری قیمتی دھات کی اشیاء کی اوپری سطح کو مختلف قدرتی رنگوں سے سجانے کے فن کو میناکاری کہتے ہیں۔ اس کی ہلکی پھلکی مثال تو ٹکشلا کی کھدائی سے حاصل قدیم عہد کے زیورات میں بھی ملتی ہے۔ مگر اس فن کو نکھرنے کا پورا موقع مغل دور میں ہی حاصل ہوا۔

سید امجد حسین
سوچنا بھون، لکھنؤ

اُنیسویں ۱۹ صدی کا لکھنؤ ۶

لکھنؤ کا ذکر آتے ہی تہذیب معاشرت کے نہ معلوم کتنے امتیازی پہلو نظروں کے سامنے آجاتے ہیں چنانچہ نوابین اودھ نے اگر ایک طرف یہ کوشش کی کہ اس کو ایسی مرکزیت حاصل ہو جائے کہ شیراز و اصفہان کا حسن و نفاست ذہنوں سے محو ہو جائے تو دوسری طرف عوام کو فنون لطیفہ اور خاص کر شعر و ادب سے ایسی دلچسپی پیدا ہو گئی کہ انیسویں صدی کے نصف اول تک پہونچتے پہونچتے لوگوں کے ادبی و فنی ذوق کا یہ عالم تھا کہ ادب بولتے تھے اور شاعری میں باتیں کرتے تھے۔ اتنا ہی نہیں معاشرتی زندگی کے ہر پہلو میں ایک مخصوص کیفیت اُبھر کر سامنے آ رہی تھی۔

سماجی اور عوامی زندگی میں کتنی رنگینی و رعنائی بسی تھی عوام نے اپنے ذوق کی تسکین کے لئے کیا کیا ذرائع مہیا کر لئے تھے اور فنکاروں نے مختلف فنون کو کتنی وسعت اور بلندی تک پہنچا دیا تھا۔ ان کیفیات کے مطالعہ کے لئے اسی دور کے بہت سے مصنفین کی تصانیف سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ یوں تو لکھنوی معاشرت سے متعلق جو کتابیں لکھی گئیں ان کی تعداد بہت ہے لیکن خاص طور سے فسانۂ عجائب، فسانۂ آزاد، اُمراؤ جان ادا اور گذشتہ لکھنؤ کو زیادہ مقبولیت اور اہمیت حاصل ہے۔ لیکن راقم الحروف کا مقصد یہ ہے کہ انیسویں صدی میں ہی لکھی گئی تصانیف کے ذریعہ اس عہد کی معاشرت کے امتیازی پہلوؤں کو پیش کیا جائے اس لئے اس مطالعہ میں گذشتہ لکھنؤ کو شامل نہیں کیا جا رہا ہے۔

یوں تو ان میں سے ہر تصنیف روحِ عصر کی مکمل ترجمانی کرتی ہے جن میں کہیں نہ کہیں براہ راست تعین زمانی کے ساتھ لکھنؤ کی جیتی جاگتی، چلتی پھرتی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن فسانۂ عجائب اپنی عبارت آرائی اور صناعانہ نثر کی وجہ سے مخصوص انفرادیت کا احساس دلاتی ہے چنانچہ اس کے دیباچہ سے اس بیان کی تلخیص پیش کی جا رہی ہے جو ۱۸۵۷ء سے پہلے کے لکھنؤ کا بولتا ہوا تذکرہ ہے۔

شنا رضواں بھی جس کا خوشہ چیں ہے
وہ بے شک لکھنؤ کی سرزمیں ہے

سُبحان اللہ و بحمدہٖ! عجب شہر گلزار ہے۔ ہر گلی دلچسپ، ہر کوچہ بے باغ و بہار ہے۔ ہر شخص اپنے طور کا وضع قطع دار ہے۔ دو رو یہ بازار کس انداز کا ہے! ہر دکان میں سرمایۂ ناز و نیاز کا ہے۔ گو، ہر محلہ میں جہان کا ساز و سامان مہیا ہے۔ پر، اکبری دروازے سے جلو خانہ اور پکّے پل تک کہ صراطِ مستقیم ہے۔ کیا جلسہ ہے! نان بائی خوش سلیقہ۔ شیرمال، کباب، نان نہاری بلکہ جہاں کی نعمت اس آب داری کی، جس کی بو باس سے دل طاقت پائے، دماغ معطر ہو جائے۔ فرشتہ گزرے تو سونگھے مست ہو جائے، غنودگی میں اونگھے۔ کیسا ہی سیر ہو، ذرا نہ دیر ہو، دیکھنے سے بھوک لگ آئے۔ وہ سرخ سرخ پیاز سے نہاری کا بگھار، سریلی چھنکار، شیرمال شنگرف کے رنگ کی خستہ، بھُربھُری، ایک بار کھائے نانِ نعمت کا مزہ پائے۔ تمام عمر ہونٹ چاٹتا رہ جائے۔

سرچوک ہمیشہ شانے سے شانہ چھلا، نسیم و صبا کو سیدھا رستہ نہ ملا شیخ کولی کی مٹھائی جس نے کھائی جہان کی شیرینی سے دل کھٹا ہوا۔ بنارس کا کھلا بھولا، متھرا کے پیڑے کا کھٹّھا ہوا، برفی کی نفاست، بو باس کھوئے نے ہوش کھوئے۔ وہ اس کا ذرہ دار پن، نقرئی ورق کا جوبن۔ کسی اور شہر کا رکاب دار اگر دیکھ پائے یا ذائقہ لب پر آئے زندگی تلخ ہو جب تک جیتا رہے۔ ہاتھ کاٹ کاٹ کر کھائے۔ اِمرتی سلسل کا ہر پیچ ذائقے کو پیچ و تاب دیتا۔ یاقوتی مفرح کا جواب دیتا۔ جب منہ میں رکھا۔ اصل تو یہ ہے عسلِ مصفّیٰ جنّت کی نہر کا حلق سے اترا۔ پراچیوں کی گلی کی کھوپرپاک

ذائقے میں چوں بہتر از انگور نہایت آب و تاب، ہم خرما ہم ثواب۔

اگر برسات کا موسم ہے تو شہر کا یہ عالم ہے۔ ادھر مینہ برسا، پانی بہہ بجا سے بہ گیا۔ گلی کوچہ صاف رہ گیا ہے۔ ساون بھادوں میں زرد وزی جوتا پہن کر پھرے سلیقہ شرط ہے، کیچڑ تو کیا مٹی نہ بھرے۔ باغ بہار کے صنعت پروردگار کے رضوان جن کا شائق دیکھنے کے لائق۔ روز عیش باغ میں تماشے کا میلہ، ہر وقت چین کا جلسہ موتی جھیل کا پانی چشمۂ زندگانی کی آب و تاب دکھاتا، پیاسوں کا دل لہراتا، سڑک کے درختوں کی فضا، جدھر جا، کھجوا موجیں مارتا، ہارسنگار کے جنگل میں لوگوں کا جمگھٹا رنگا رنگ کی پوشاک۔ آبنس کی جھانک تاک، تختۂ لالہ نافرمان۔ آم کے درختوں میں ٹپکا لگا۔ خاص جھولا ہیں پڑا، جھولنے والوں پر ول ٹپکا پڑتا، محبت کے پینگ بڑھتے۔ دیکھنے والے درود پڑھتے۔ باغ میں کوئل، پپیہے، مور کا شور جھولے پر گھٹا رہی اور بھی گھنگھور، ساون بھادوں کے جھالے، وہ رنگین جھولنے والے۔ رومی دروازہ اس رفعت و شان کا ہے۔ گذرگاہ ایک جوان کا ہے اگر اس پر چڑھ جائے بام فلک پست معلوم ہو۔ فرشتوں کا مشورہ کان میں آئے، سپہر اولیں اُس کی زمیں ہے شش جہت میں دوسرا نہیں ہے۔ مسجد انتخاب ہے، امام باڑہ لاجواب۔

شہر نفیس، مجمع رئیس ہر فن کا کامل یہاں حاصل ہے۔ خوش نویس حافظ ابراہیم صاحب سا۔ اس قطع کا قطعہ لکھا: جو میر علی یا آغا جیتے ہوتے اپنے لکھے کو روتے، اشکِ حسرت سے وصلیاں دھوتے۔ مرزائی صاحب کی مشق کا کوئی پرچہ اگر نظر پڑ جاتا، نیر یز بر یز بر یز کہتا، یاقوت رقم ہیر اکھاتا۔

مرثیہ خواں جناب میر علی صاحب نے وہ طرز نو مرثیہ خوانی کا ایجاد کیا کہ چرخ کہن نے مسلّم الثبوت استاد کیا۔ علم موسیقی میں یہ کمال بہم پہونچایا۔ اس طرح کا دھرپت، خیال، ٹپا گایا اور بنایا کہ کبھی کسی نایک کے وہم و خیال میں نہ آیا۔ ایک رنگین احاطہ کھینچا ہے جو اس میں آیا، پھولا پھلا، وہ ان کا پیرو ہوا اور جس نے ڈھنگ جدا کیا۔ وہ ٹکسال باہر بد رنگ ہوا۔ اگر تان سین جیتا ہوتا۔ ان کے نام پر کان پکڑتا، بھیک مانگ کھاتا مگر نہ گاتا۔

ہزاروں شاگرد جگت استاد ہوا، مولوی سب میں پری زاد ہوا۔ امیروں میں حسین علی خاں، بلبل ہزار داستاں، خوش الحان، مرثیہ گو بے نظیر میاں دلگیر صاف باطن، نیک ضمیر، خلیق، فصیح، مرد مسکین، مکروہاتِ زمانہ سے کبھی افسردہ دل، ضمیر کے عہد اللہ کے کرم سے ناظم خوب، دبیر مرغوب۔ سکندر طالع، بصورت گدا بادِ احسان اہلِ دول کا نہ اٹھایا۔ عرصۂ قلیل میں مرثیے سلام کا دیوان کثیر فرمایا۔ شہر میں جتنے رئیس تھے ان کے انیس، جلیس تھے۔

چالیس سال جہان کی دیکھو بھال کی۔ ایسا شہر، یہ لوگ نظر سے نہ گزرے چنانچہ میاں محمد اشرف نواب معتمد الدولہ بہادر کے زمانے میں باورچی خانے کے داروغہ تھے، آدمیت، مروت، ہمت ہزاروں مرد آدمی ان کی ذات سے فیض پاتا تھا۔ جہان کی نعمت کھاتا تھا، کاریگر ایسے: معتمد الدولہ بہادر کے دسترخوان پر سوا امرا ہوتے تھے، چھ مہینے تک جو چیز ایک دن روبرو آئی دوسرے دن تکرار نہ ہونے پائی۔

اور تو اور، شہدا پیر بخارا کا، ٹماسا، سید الشہدا کا شیدا، برس روز میں جو پیدا کیا عشرۂ محرم میں محتاجوں کو نذر حسینؑ کھلا دیا۔

مشائخ، فقیروں کے مزار خوب، خواب راحت میں آسودہ سالک و مجذوب، شاہ مینا، شاہ پیر محمد، شاہ خیر اللہ ایک سے ایک سبحان اللہ بظاہر مردہ، حقیقت میں جیتے ہیں۔

یہ شہر ایسا تھا جیتے جی یہاں سے نہ نکلے مر گئے، پر یہیں رہے اور یوں تو، ؎ کس نگوید کہ دروغِ من ترش است

بس کہ خامۂ مولف اختصار رقم ہے مگر جتنا اس کی صفت میں لکھئے بہت کم ہے لہٰذا اس غزل پر مطلب کو اختتام دیا۔ یہ داستان وہ نہیں جو لکھی جائے۔ ناچار تمام کیا۔ غزل

گر ملے جنت بھی رہنے کو بجائے لکھنؤ
چونک میں اٹھتا ہوں اس پر کہہ کے ہائے لکھنؤ

رشک کھاکھا، گو فلک مجھ سے چھڑائے لکھنؤ
تب میں جانوں دل سے جب میرے بھلائے لکھنؤ

دشتِ غربت میں کیا برباد وحشت نے تو کیا
دل سے اڑتی ہے کوئی اپنے ہوائے لکھنؤ

یہ رہے آباد یارب تابہ دورِ مشتری
میں کہیں ہوں مانگتا ہوں پر دعائے لکھنؤ

بلبلِ شیراز کو ہے رشک ناسخ کا سرور
اصفہاں اس نے کیے ہیں کوچہ ہائے لکھنؤ

الٰہی! بہ حرمت سید ابرار احمد مختار و بہ تصدق ائمۂ اطہار لکھنؤ کو آباد رکھ۔ جب تک گنگا جمنا میں پانی بہے، یہ خطۂ دل چسپ، شاید سرشار سے بہتر اس عہد اور ماحول کی تنقید کوئی دوسرا نہیں کر سکتا تھا جس میں زندگی کے حقائق بھی پیش کر دئے گئے ہیں۔ اور غیر حقیقی تصویریں بھی۔ سرشار نے محسوس کر لیا تھا کہ لکھنؤ کی تہذیبی زندگی میں وہ استحکام باقی نہیں رہ گیا تھا جو پہلے تھا بلکہ اب سوائے زوال اور انحطاط کے کچھ نہیں تھا۔ چنانچہ وہ مٹتی ہوئی

تہذیب پر آنسو ضرور بہاتے ہیں لیکن یہ احساس بھی دلاتے ہیں کہ اس حقیقت کو ماننا پڑے گا کہ ایک نیا معاشرہ اُبھر رہا ہے۔ اسی لئے انھوں نے اس دور کی خوبیاں اور خامیاں پوری بیباکی سے پیش کردی ہیں۔ کسی نے لکھا ہے کہ سرشار ایک جادوگر ہیں جن کی جھولی میں ہر طرح کے سامان موجود ہیں چنانچہ اس عہد کی لکھنوی معاشرت کے ہر پہلو فسانۂ آزاد میں دیکھے جاسکتے ہیں البتہ خوجی کے کردار کے ذریعہ زیرِ نظر تصنیف کی مقبولیت و اہمیت میں غیر معمولی اضافہ پیدا ہوگیا ہے۔ دوسری طرف یہ چیز بھی قابلِ توجہ ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد بھی لکھنؤ میں جو چہل پہل تھی اور جو تہذیبی نقوش کی چمک دمک تھی اس کی بہترین تصویر فسانۂ آزاد میں ملتی ہے۔ یہ لکھنؤ کے انیسویں صدی کی چھٹی، ساتویں اور آٹھویں دہائی کا زمانہ ہے۔ فسانۂ آزاد کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ اس نے ہندوستانی ادب بلکہ ہندوستانی عوام کے مزاج اور اس کی روایات کو ایک کڑی میں پیوست کردیا جس کے اثرات آج تک دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس کا مصنف اردو کے دو اہم مراکز لکھنؤ اور حیدرآباد کا نقطۂ اتصال تھا۔ راقم الحروف نے صرف وہ اقتباسات منتخب کئے ہیں جس سے لکھنؤ کی تین اہم تقریبات پر روشنی پڑتی ہے۔ ان میں دو تقریبات یعنی عید اور محرم مذہبی رنگ بھی رکھتی ہیں لیکن ان کا بیان قومی یک جہتی کا بے مثال نمونہ ہے۔ اس کے علاوہ اس عہد کے مزاج، نفسیات طرزِ فکر اور اہلِ لکھنؤ کے فلسفۂ ابتہاجیت پر بھی روشنی پڑتی ہے

ان تمام اقتباسات میں صرف تقریبات ہی نہیں ہیں بلکہ ان سے اس عہد کا لباس، وضع قطع، مختلف پیشے کے افراد کا پہناوا، مزاج، نفاستیں، عیش پرستیاں، رنگینی، مختلف علوم و فنون کے نکات و رموز اور صنّاعی سے بھرپور سرشار کے سحرکارانہ اسلوب پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

لکھنؤ کا محرم الحرام

سینوں میں جگر پہ تیر غم چلتے ہیں　　　رخساروں پہ اشک شمع ساں ڈھلتے ہیں
کیوں تعزیہ خانوں میں نہ رونق ہو زیادہ　　　دل بھی تو چراغوں کی طرح جلتے ہیں

میاں آزاد سیلانی آدمی سیر سپاٹے پر ادھار کھائے ہوئے، شتر گشتی کی دھن جو سمائی تو ریل کے انجن کی طرح چل کھڑے ہوئے اور سوچے کہ چل کر محرم لکھنؤ کا دیکھ لیں۔ دیکھتے کیا ہیں کہ گھر گھر شیون و شین، گھر گھر بکا و بین گریہ و زاری، اشکباری، ہجم غفیر، مجمع کثیر اور کیوں نہ ہو مجالس عزا کی دھوم دھام ہے۔ لکھنؤ کا محرم الحرام ہے۔ لکھنؤ کی سوز خوانی، لکھنؤ کی خوش بیانی، لکھنؤ کی عزاداری، لکھنؤ کی سوگواری از شام تا روم مشہور مرز و بوم ہے۔ تعزیہ خانوں میں دھوم، امام باڑوں میں ہجوم ہے اور ان سب میں حسین آباد مبارک کالبدر فی النجوم ہے۔ ان کے ساتھ ان کے دوست بھی ہو لئے تھے۔ ان کی بے قراری کا حال کچھ نہ پوچھئے۔ وہ لکھنؤ سے واقف نہ تھے۔ لوٹے جاتے ہیں کہ شہید کربلا کا واسطہ، آلِ مصطفےٰ کا صدقہ۔ ہمیں لکھنؤ کا محرم دکھا دو مگر کوئی جگہ چھوٹنے نہ پائے۔ ایک شخص نے ایک آہ سرد کھینچ کر کہا میاں اب وہ لکھنؤ کہاں، وہ لوگ کہاں، وہ دل کہاں۔ لکھنؤ کا محرم رنگیلے پیا جانِ عالم کے دور میں دیکھتا تو ارنی گوئے اوجِ طور بھی غش کھا کر گر جاتا بانکوں کی شمشیر دو پیکر جب دیکھو میان سے دو انگل باہر کسی نے ذرا تیکھی چتون کی اور انھوں نے کھٹ سے سر وہی کا تلا ہوا ہاتھ چھوڑا۔ بھنڈارا کھل گیا۔ ایک ایک گھنٹوں میں بیس بیس خانہ جنگیوں کی خبر آتی تھی۔ دوکان دار جوتیاں چھوڑ کر سٹک جاتے تھے۔ وہ دھکم دھکا وہ بھیڑ بھڑکا ہوتا تھا کہ واہ جی واہ! انتظام کرنا خالہ جی کا گھر نہ تھا۔

اب کوئی چوں بھی نہیں کرتا۔ ادنیٰ ادنیٰ آدمی ہزاروں لٹاتا تھا۔ اب کوئی بھی نذرِ حسین نہیں نکالتا۔ اب انیس ہیں نہ دبیر، مونس ہیں نہ مشیر، ضمیر ہیں نہ دلگیر۔

ایک ہی رُباعی پڑھی اور سامعین ہمہ تن محوِ حیرت میں غرق ہوگئے کہ اللہ اللہ یہ فصاحت یہ بلاغت۔

مداح امیر ابن امیر آتا ہے　　　دربارِ امین شاہوں کے فقیر آتا ہے
مشتاقِ سخن خلق چلی آتی ہے　　　لو مرثیہ پڑھنے کو دبیر آتا ہے

اور انیس مغفور خدا بخشے باللہ العظیم کلام کیا جواہرات کے ٹکڑے قند و نبات کے ریزے نور کے مرسیئے ہیں۔ فصحائے خطۂ پاک ایران تک کہتے ہیں کہ کجا انیس کجا فردوسی کجا کمر بند مرصع کجا شال طوسی، بزم میں وہ ڈھنگ رزم میں وہ رنگ کہ ؎

مضمون انیس کا نہ چہرہ اُترا　　　اترا بھی تو کچھ بگڑ کے کا نقشہ اُترا
نقاش نے سو طرح کی محنت کھینچی　　　تصویر نہ کھینچ سکی تو چہرا اُترا

لیکن ہاتھی لٹے گا بھی تو کہاں تک۔ اب بھی اس شہر کی ایسی عزاداری ہفت اقلیم میں نہیں ہوتی۔

لو قدم چلے جاتے تھے راہ میں وہ بھیڑ، وہ ریل پیل کہ عیاذاً باللہ

شانے سے شانہ چھلتا تھا۔ ہوا جب بدخوالی بھر کہیں گذر پائے تو فیض النفس ہو جائے۔ بانکے ترچھے ثقات مقدس، کس و ناکس، غریب امیر، برنا و پیر اُمڈے چلے آتے ہیں۔ جدھر دیکھو نرالی سج دھج، مومن پاک مثل کعبہ سیاہ پوش۔ کوئی ماتم حسین میں برہنہ سر چلا جاتا ہے۔ کوئی حلہ پوشان بہشت کی طرح ہرا ہرا جوڑا پھڑکاتا ہے۔

لیجئے آغا باقر کے امام باڑے میں کھٹ سے داخل۔ اُہو ہو ہو خدا کی قدرت مجسم نظر آتی ہے۔ واہ میاں باقر کیوں نہ ہو۔ نام کر گئے۔ چکا چوند کا عالم ہے لیکن گلی تنگ تماشائیوں کی عقل دنگ، جائے تنگ است مردماں بسیار۔ گھس بیٹھ کر خلقت۔ وہاں سے جو طرارہ بھرا تو حسین آباد مبارک میں پہنچے۔ سبحان اللہ سبحان اللہ۔ یہ امام باڑہ ہے یا روضۂ رضواں۔ الٰہی یہ مکان ہے یا باغ جناں۔ ہر در و دیوار سے محمد علی شاہ فردوس آرام گاہ کا نام روشن ہے۔ امام باڑہ سجا سجایا دلہن کا ایسا جوبن ہے۔ برجوں پر ضیائے حور تو منار نور علی نور۔ حیرت تھی کہ یہ کوہ نور ہے یا شعلہ طور ہے۔ سرخ قندیل پر یاقوت احمر پیر اکھاسے۔ چراغاں کی قطار پر مہتاب پروانہ ہو جائے پھر نہر مصفا جو نظر آئی تو آنکھوں نے عجب طراوت پائی۔

ماتم داران جناب سید الشہدا علیہ التحیۃ والثنا اور زائرین مصائب خاص آل عبا کی اشک باری اور گریہ و زاری سے یقین کامل ہو گیا کہ ماتم داری لکھنؤ پر ختم ہے۔ عاشورہ کی رات تو نچوڑ کا دن تھا۔

چہل پہل عید

نواب گردوں مدار مع یاران موافق و احباب صادق عیدگاہ تشریف لے گئے۔ دیکھا کر ساکنین بناؤ چناؤ کر کے ٹھسے کے ساتھ بیٹھیں۔ تختوں پر سفید سفید چاندنیاں بچھی ہیں۔ سامنے پاندان رکھا ہے۔ برنجی حقے لگے ہوئے ہیں۔ دائیں بائیں ایک ایک لگن آگ کے نیچے روشن۔ چلمیں بھرنے کے لیے دو آدمی حاضر ہیں۔ یاران سرپل کا جھرمٹ ہے۔ پالوں اور جھولداریوں میں گھس گھس کے دم لگاتے ہیں۔ آسمان تک لو پہنچاتے ہیں۔ کسی کی جھولداری میں دائرہ بج رہا ہے۔ کہیں ساقن کے سامنے نٹنی ڈھولکی پر گاتی ہے اور چمک دمک کے تماشائیوں کو لبھاتی ہے۔ ساقی چکارہ بجاتے ہیں۔ بیفکرے پھبتیاں سناتے ہیں۔ حلوائیوں کی دکانوں پر دھوم ہے۔ افیمیوں پھیریوں کا ہجوم ہے۔ کھلونے والے، بھولے بھالے کھلونے رکھے دکان جمائے۔ دونوں ہاتھوں سے لوٹتے ہیں۔ ننھے ننھے بچے مچل رہے ہیں کہ ہم تو مٹی کا بوا لیں گے۔ دو پیسے دیں گے۔ عیدگاہ کے پھاٹک پر پہونچے تو ہوادار گاڑی اور فٹن اور گھوڑوں کا تانتا لگا ہوا۔ حوض پر بیٹھے منہ ہاتھ دھویا دست پاک سے ہاتھ پوچھا۔ اتنے میں آواز آئی (الصلوٰۃ الصلوٰۃ)

نمازی جھک پڑے۔ صفیں بندھیں پیش نماز آگے کھڑے ہوئے نواب صاحب بھی ایک صف میں داخل ہو گئے۔ نماز پڑھ کر احباب سے بغل گیر ہوئے۔

حضور نواب صاحب روانہ ہوئے چٹکیوں میں گھر پہنچے۔ باہر کمرہ میں بیٹھے۔ رفقا نے نذر دکھائی۔ اس کے بعد اندر تشریف لے گئے محل دار نے پردہ اٹھایا۔ خدمتگاروں اور چوبداروں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہا۔

دو قابوں میں نان خطائی، ایک قاب میں جوزی۔ کسی میں نہایت خستہ پٹیرے میں آٹھ سیر گھی کھپایا ہوا۔ اچاری میں میٹھے کی سرخ سرخ مچھلیاں معلوم ہوتا تھا کہ سچ مچ کی مچھلیاں ہی تیر رہی ہیں۔ قوام آبدار اور برف کا سا سفید۔ اچاری پر سرخ اطلسی اور کلابتوں کی ڈوری بندھی ہوئی۔ اِدھر اُدھر مقیش کے پھندے لٹکے ہوئے بڑی بیگم صاحب کے سامنے ڈالی لگائی گئی۔ اس کے بعد رحیم بخش باورچی آیا۔ ایک قاب میں شامی کباب ایک میں پراٹھے بلدار مغلئی خستہ، کسی میں پسندے کباب، کسی میں کوفتے کباب سرخ عمدہ باقرخانی ایک قاب میں ہوائی روٹی، ایک میں نان بشیر۔ کوری کاغذی ہنڈیا میں شکر قند کی گلتھی۔ برابر کی بالائی دی ہوئی، کیوڑا پڑا ہوا۔ یہ ڈالی بھی بیگم کے سامنے پیش ہوئی۔

امراؤجان ادا ۱۸۹۹ء میں منظرِ عام پر آئی۔ رسوا کا لکھنؤ ان کا معاصر لکھنؤ ہے۔ امراؤجان کے حالات کم و بیش ۱۸۲۷ء سے شروع ہوئے لیکن ان کا سلسلہ غدر کے بعد تک ہے —— امراؤجان سے صرف وہ حصے منتخب کئے گئے ہیں جن سے ایک خوشحال دیہات، دیہات سے شہر اور پھر انتزاع سلطنت کے واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔ دراصل ناقدین نے امراؤجان کو طوائف کی حیثیت سے پیش کرنے پر زیادہ توجہ دی ہے اور یہی موضوع زیادہ تر زیر بحث رہا۔ راقم الحروف کے اس کردار میں متحرک کیمرہ نظر آتا ہے جو معاصر لکھنؤ کے تقریباً ہر گوشے کو روشنی میں لاتا ہے۔

شہر سے دیہات تک

شہر سے نکل کے جنگل کا ساماں قابل دید تھا۔ جدھر نگاہ جاتی ہے سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ بادل چاروں طرف گھرے ہوئے ہیں۔ مینہ برس رہا ہے۔ درختوں کے پتوں سے پانی ٹپک رہا ہے۔ نالے ندیاں بھری ہوئی ہیں مور ناچ رہے ہیں۔ کوئل کوک رہی ہے۔ بات کہتے میں تالاب تک پہونچ گئے۔ بارہ دری میں فرش کیا گیا۔ چولہے بن گئے، کڑھائیاں چڑھ گئیں۔ پوریاں تلی جانے لگیں۔ نواب چھٹن صاحب برساتی پہن کے شکار کو نکل گئے۔ گوہر مرزا آموں کی کھانچیاں چکالائے۔ اتنی دیر میں نوکروں نے سڑک کے کنارے باغ میں چھولداریاں گاڑ دیں۔ گاؤں سے چارپائیاں آگئیں۔ یہاں اور ہی لطف تھا آم ٹپک رہے ہیں۔ ایک ایک آم پر چار چار آدمی ٹوٹے پڑتے ہیں۔ پانی میں چھپکے لگا رہے ہیں۔ کوئی اُدھر دوڑا جاتا ہے کوئی اِدھر۔ آپس میں چھینگا مشتی ہو رہی ہے۔ اب اس میں اگر کوئی گر پڑا تو کیچڑ میں لت پت۔ تھوڑی دیر پانی میں جا کے کھڑے ہوگئے پھر ویسے ہی صاف۔ جن کے مزاج میں کسی قدر احتیاط تھی جیسے باجی بیگا جان وہ چھولداری میں بیٹھی رہیں۔ دو گھڑی دن رہے ہماری قسمت سے آسمان کھل گیا۔ دھوپ نکل آئی۔ ہم لوگ احتیاطاً ایک ایک جوڑا گھر سے لے آئے تھے۔ سب نے کپڑے بدلے جنگل کی سیر کو نکلے۔

میں بھی اکیلی ایک طرف کو روانہ ہوئی۔ سامنے گنجان درخت تھے سورج انھیں گنجان درختوں کی آڑ میں ڈوب رہا تھا۔ سبزے پر سنہری کرنوں کے پڑنے سے عجیب کیفیت تھی۔ جا بجا جنگلی پھول کھلے تھے۔ چڑیاں سبزے کی تلاش میں اِدھر اُدھر اڑ رہی تھیں۔ سامنے جھیل کے پانی پر آفتاب کی شعاع سے وہ عالم نظر آتا تھا جیسے پگھلا ہوا سونا جھلک رہا ہے۔ درختوں کے پتوں کی آڑ میں سورج کی کرنیں اور ہی عالم دکھا رہی تھیں۔ آسمان پر سرخ شفق پھولی ہوئی تھی۔ اس وقت کا سماں ایسا نہ تھا کہ ایک خفقانی مزاج کی عورت جیسی کہ میں ہوں۔ جلدی سے چھولداری میں چلی آئی۔ یہ تماشہ دیکھتی ہوئی خدا جانے کتنی دور نکل گئی۔ آگے جا کر ایک کچی سڑک ملی اس پر کچھ گنوار راستہ چل رہے تھے کسی کے کندھے پر ہل تھا۔ کوئی بیلوں کو ہانکتا ہوا چلا آتا تھا۔ ایک چھوٹی سی لڑکی گائے بھینس لئے ہوئے چلی جاتی تھی۔ ایک لڑکا بہت سی بھیڑیں اور بکریوں کے پیچھے تھا۔ یہ سب آنکھوں کے سامنے آئے اور پھر نظروں سے غائب ہو گئے۔ میں پھر اکیلی رہ گئی نہیں معلوم کس دھن میں تھی مگر اب میں سڑک پر چلنے لگی۔ اپنے نزدیک میں اب گویا تالاب کی طرف چل رہی ہوں اب اندھیرا ہوتا جاتا ہے۔ سورج ڈوبنے ہی کو ہے۔ اب میرا قدم جلد جلد اٹھ رہا ہے آگے چل کر ایک فقیر کا تکیہ ملا یہاں کچھ لوگ بیٹھے حقہ پی رہے تھے یہاں میں نے تالاب کا راستہ پوچھا۔ معلوم ہوا کہ میں لکھنؤ کی سڑک پر جا رہی ہوں تالاب داہنے کو چھوٹ گیا ہے۔

ادبی نشست

اس میں شک نہیں کہ منشی صاحب نے آج کے جلسے کے لئے بڑے سلیقے سے انتظام کیا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ مہتابی پر دو گھڑی دن رہے چھڑکاؤ ہوا تھا تاکہ شام تک زمین سرد رہے اسی پر دری بچھا کے اُجلی چاندنی کا فرش کر دیا گیا تھا۔ کوری کوری صراحیاں پانی بھر کے، کیوڑا ڈال کے منڈیر پر چنوا دی گئی تھیں۔ ان پر بالو کے آبخورے ڈھکے ہوئے تھے۔ برف کا انتظام علیحدہ کیا گیا تھا۔ کاغذی ہنڈیوں میں سفید پانوں کی سات سات گلوریاں سرخ صافی میں لپیٹ کر کیوڑے میں بسا کر رکھ دی گئی تھیں ڈھکنیوں پر تھوڑا تھوڑا کھانے کا خوشبودار تمباکو رکھ دیا تھا۔ ڈیڑھ خمے حقے کے نیچوں میں پانی چھڑک کر ہار لپیٹ دیے تھے۔ چاندنی رات تھی اس سے روشنی کا انتظام زیادہ نہیں کرنا پڑا۔ صرف ایک سفید کنول دورے کے لئے روشن کر دیا گیا تھا۔ آٹھ بجتے بجتے سب احباب میر صاحب، آغا صاحب خان صاحب، شیخ صاحب، پنڈت صاحب وغیرہ وغیرہ تشریف لائے پہلے شیر فالودہ کے ایک ایک پیالے کا دور چلا پھر شعر و سخن کا چرچا ہونے لگا۔

لکھنؤ کا ایک دیہات

میری پھوپی کے لڑکے کے ساتھ ٹھہری ہوئی منگنی نو برس کے سن میں ہوگئی تھی۔ اب ادھر سے شادی کا تقاضہ تھا۔ میری پھوپی نواب گنج میں بیاہی ہوئی تھیں۔ پھوپا ہمارے زمیندار تھے۔ پھوپی کا گھر ہمارے گھر سے زیادہ بھرا پرا تھا منگنی ہونے سے پہلے میں کئی مرتبہ اپنی ماں کے ساتھ وہاں جا چکی تھی۔ وہاں کے کارخانے ہی اور تھے۔ مکان تو کچا تھا مگر بہت وسیع۔ دروازے پر چھپر پڑے تھے۔ گائے بیل بھینس بندھتی تھیں۔ گھی دودھ کی افراط تھی۔ اناج کی کثرت۔ بھٹوں کی فصل میں ٹوکروں بھٹے چلے آتے ہیں۔ کناروں کی پھاندیاں پڑی ہوئی ہیں ادھ

کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ کوئی کہاں تک کھائے۔

گالیاں

آپ کے لکھنؤ میں تو رنڈیاں گالیاں نہیں گاتیں۔ ڈومنیاں البتہ گاتی ہیں وہ بھی عورتیں ہیں۔ دیہات میں رنڈیوں کو گانا پڑتی ہیں۔ مردوں میں واقعی مرزا صاحب شہر ہو یا دیہات یہ رسم تو کچھ اچھی نہیں ہے۔

آپکے کہنے سے اچھی نہیں ہے۔ ہم نے ان آنکھوں سے دیکھا ہے اور ان کانوں سے سُنا ہے۔ اچھے اچھے شریف مرد آدمی اور عورتوں میں گھس کے شوقیہ گالیاں سُنتے ہیں۔ ماں بہنیں تولی جارہی ہیں اور یہ خوش ہیں باچھیں کھلی جاتی ہیں۔ آج خدا نے یہ دن دکھایا۔ کاش خدا یہ دن نہ دکھاتا۔ اس کے علاوہ برات کی رات اور صبح جو بیہودگیاں باعصمت بہو بیٹیوں میں ہوتی ہیں ان کا ذکر بھی کیا۔ خیر ان باتوں کو رہنے دیجئے۔ اپنی بیتی کہئے۔ ہم کوئی مصلح قوم نہیں جو ان باتوں پر نکتہ چینی کریں۔

غدر کا ھنگامہ

دیکھئے پہنچے کہاں تک شورشِ دل کا اثر

صرصرِ وحشت کا یہ شعلہ ہے بھڑکایا ہوا

نواب ملکہ کشور کی سرکار میں سوز خوانی کا سلسلہ انتزاع سلطنت کے زمانے تک رہا۔ اسی اثنا میں شہزادے مرزا اسکندر حشمت عرف جرنیل صاحب کے مجرائیوں میں میرا بھی نام ہو گیا تھا۔ جناب عالیہ اور جرنیل صاحب کلکتہ چلے گئے وہ تعلق منقطع ہو گیا۔

جس زمانے میں مرزا برجیس قدر کو مسندِ ریاست پر بٹھایا۔ میں بہ لحاظ قدامت اور اس وجہ سے بھی کہ میرا نام شاہی محلات میں اکثر کی زبان پر تھا مبارکباد دینے کے لئے طلب ہوئی۔ شہر میں ایک اندھیر تھا۔ آج اس کا گھر لٹا۔ کل وہ گرفتار ہوا پرسوں اس کے گولی لگی۔ چاروں طرف قیامت کا سامان نظر آتا تھا۔ سید قطب الدین نامی ایک صاحب افسران فوج میں سے تھے۔ ان کا تعین در دولت پر تھا میرے حال پر بہت عنایت کرتے تھے۔ اس لئے اکثر وہیں رہنا پڑتا تھا مجرے کے لئے بھی وقت بے وقت طلب ہو جاتی تھی۔

اس چند روزہ حکومت کے زمانے میں برجیس قدر کے گیارہویں سال کی سالگرہ کا جلسہ بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ اس جلسہ میں کشمیریوں نے یہ ٹھمری گائی تھی۔

غیرتِ مہتاب ہے برجیس قدر   گوہرِ نایاب ہے برجیس قدر

رسوا:- بھلا کچھ یاد ہے کہ کس دن بیگم صاحب قیصر باغ سے نکلی تھیں؟

امراؤ:- دن تو یاد نہیں۔ ہزاری روزے کے دوسرے یا تیسرے دن۔

رسوا:- ہاں تمہیں یاد رہا۔ رجب کی انتیسویں تاریخ تھی بھلا فصل کون سی تھی؟

امراؤ:- اُخیر جاڑے تھے نوروز کے چار پانچ دن باقی رہے ہوں گے۔

رسوا:- بالکل درست۔ مارچ کی سولھویں تاریخ تھی۔ اچھا تم بیگم صاحب کے ساتھ قیصر باغ سے نکلیں۔

امراؤ:- جی ہاں بونڈی تک ہمراہ گئی۔ راستے میں نمک حرام اور بزدل افسران فوج کے نخرے اور بیگم صاحب کی خوشامد عمر بھر نہ بھولے گی۔ ایک صاحب کہتے ہیں "تو صاحب ان کے راج میں ہم پیدل چلیں"۔ دوسرے صاحب فرماتے ہیں "بھلا کھانے کا انتظام تو درست ہوتا"۔ تیسرے صاحب افیم کو پیٹ رہے تھے چوتھے اپنی جان کو رو رہے تھے کہ حقہ وقت پر نہیں ملتا۔ جب بہرائچ سے انگریزی فوج نے بونڈی پر حملہ کیا ہے اس میں سید قطب الدین مارے گئے بیگم صاحب نیپال کی طرف روانہ ہوئیں۔ میں اپنی جان بچا کے فیض آباد چلی آئی۔

□□

طلسمِ شامِ اودھ
کا چراغ روشن ھے

یہ لکھنؤ کی چکن یہ زری کی شام و سحر

ہر ایک تار میں سو بار اُلجھے تارِ نظر

یہ چاندنی ہے یا کہکشاں کی راہ گزر

یا ایک تختۂ گل رات بھر کی اوس میں تر

سیاہ رات کبھی آئے تو صبحِ گلشن ہے

طلسمِ شامِ اودھ کا چراغ روشن ہے

ڈاکٹر راہی معصوم رضا

جلد

نمبر

[illegible]

عنوانات

ابتدائیہ	ایڈیٹر	۲
یہ کون ہے جو ہے اکثر مری تلاش میں گم (نظم)	جگن ناتھ آزاد	۳
احساس کے کچھ لمحے اور ہم اور آپ ۔ ۔ ۔ ؟	محمد اعظم خاں	۴
	اوپیندر ناتھ اشک	۷
غزلیں	شاہد میر ۔ شائق اجے پوری	۷
یقین اور عزم کا نیا عہد	صلاح الدین عثمان	۸
کسانی غزل	بیکل اتساہی	۱۱
دوہے	رتن سنگھ	۱۱
اردو صحافت جد و جہد آزادی کے میدان میں	طیش صدیقی	۱۲
غزل	اسلم الہ آبادی	۱۹
نور پیکر (نظم)	اندر سروپ دت نادان	۲۰
دعا (نظم)	اظہار شادانی	۲۰
رام سنگھ یادو حکومت کا ایک سال	احمد ابراہیم علوی	۲۱
کڑی جد و جہد ۔ کامیاب کوششیں	رباب رشیدی	۲۳
ریاستی حکومت کا ایک برس	احمد نسیم صدیقی	۲۵
غزلیں	حفیظ میرٹھی	۲۸
	سید امور سحر ۔ نجم مظفر نگری	۲۸
فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا سال	پرشوتم سنگھ سیٹھی	۲۹
کامیاب ایک سال	سید عاصف رضا	۳۱
عوامی حکومت کے فلاحی اقدامات	سید رضوان حیدر	۳۳
غزلیں	حسن عزیز ۔ قمر گونڈوی ۔ عفت زرین	۳۶
	علی باقر زیدی ۔ معراج احمد ۔ آفاق فاخری	۳۷
اتر پردیش میں اردو بابی ۔ ایک جائزہ	خورشید ظفر	۳۸
قول فیصل	نازک جہاں	۴۱
نقد و تبصرہ	عابد سہیل ۔ عطیہ نشاط ۔ اختر بستوی ۔ عصمت ملیح آبادی ۔ سلیم عنبر ۔ محمود کاکوری ۔ محمود سلیم ۔ اخلاق احمد چشتی	۴۳

[illegible]

اپنی بات

یہ ۱۹۹۳ء کے آخری دن ہیں۔
سال بھر میں ہر ایک نے کیا کھویا ہے کیا پایا ہے اس کا حساب اسی زمانے میں کیا جاتا ہے۔
نیا دور نے اس مختصر سی مدت میں:

— اپنی باقاعدگی میں استحکام پیدا کیا۔
— اپنی روایت کی پاسداری کی
— خوب سے خوب تر کی جستجو میں اور تیزی پیدا کی۔
— اس قلیل مدت میں دو خاص نمبر پیش کیے — یقیناً یہ اردو صحافت میں خوش گوار انوکھا پن ہے کہ اودھ سے متعلق دو خاص نمبر اور تین عام شماروں میں اودھ کے بارے میں وقیع مضامین کا تسلسل برقرار رکھا گیا اور اقبال کے الفاظ میں

باقی ہے ابھی رنگ مرے خونِ جگر میں

نیا دور کے ان کارناموں کے لیے حقیقی معنوں میں ان ممتاز ادبی شخصیتوں کا حصہ ہے جن کے رشحاتِ قلم نے نیا دور کے صفحات کو زینت بخشی ہے۔

سالِ رواں میں دنیا بہت سارے مرحلوں سے گزری ہے۔ سیاسی نشیب و فراز کی بہت سی کہانیاں لکھی اور مٹائی گئیں، ان میں جہاں انسانی حقوق کی پامالی کا غلغلہ بلند ہوا وہیں صلح اور مذاکرات کی بنیاد پر رشتے خوش گوار ہوئے اور بہت سے عالمی سیاست کے اس منظرنامے میں بہت ساری ادبی فتوحات کا بھی ذکر ہوا اور اہم شخصیتوں کی پذیرائی کی گئی۔ ہمارے ملک خصوصاً ہمارے صوبے میں "سمان" کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ ممتاز شخصیتوں کی پذیرائی کے ساتھ ساتھ اہم ادبی شخصیتوں کو بھی انعام و اعزاز سے نوازا گیا اور ہمارے صوبے کے اردو اہل قلم کا شکوہ کہ ہر سے کسی حد تک کم ہوا۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ان عظیم ادبی شخصیتوں کی خدمات کے اعتراف کا حق ادا ہو گیا۔ ابھی تو بہت کچھ باقی ہے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ عوامی حکومت نے خوش گوار پہل کی ہے اور ایک خوش آیند مستقبل کے چراغ جلائے ہیں۔ ہماری یہ توقع بے جا نہیں ہے کہ مزید چراغ جلیں گے اور یہ خوش گوار سلسلہ جاری رہے گا۔

یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ سال بھر کے اندر بہت ساری توقعات کو پورا کرنے کی سعی مذکور کی گئی۔ ان میں اہم ترین کارنامہ اردو اساتذہ کی تقرری اور اردو مترجم کا تقرر بھی قریب قریب ہو گیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جناب ملائم سنگھ یادو کی حکومت عوام کے لیے قابلِ تحسین فلاحی اقدامات کر رہی ہے جن کا تذکرہ آگے کے صفحات میں کیا گیا ہے۔

یہ یقین ہے کہ آنے والا سال خوشیوں اور مسرتوں کا سال ہوگا۔ ہم اپنے تمام قارئین کو نئے سال کی مبارکباد پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ ان کی آرزوؤں کے کنول کھلیں۔ ان کے خوابوں کی تعبیر ملے اور ہمارا وطن ترقی اور خوش حالی کی شاہراہ پر رواں دواں رہے۔ آمین۔ ثم آمین

ایڈیٹر



کون ہے جو ہے اکثر مری تلاش میں گم؟

یہ کون ہے جو ہے اکثر مری تلاش میں گم
کبھی کبھی تو مجھے گھر میں ڈھونڈ لیتا ہے
کبھی سفر میں مرے ساتھ ساتھ رہتا ہے
یہ کون ہے جو ہے اکثر مری تلاش میں گم؟

خرد کے کانٹے میں جب خیر و شر کو تولتا ہے
میں یہ سمجھتا ہوں میرا رفیق ہے تو یہی
مگر جب آکے یہ میرے لہو میں بولتا ہے
رگیں کھنگالتا ہے
بدن ٹٹولتا ہے
تو پھر سمجھ میں کہیں جا کے بات آتی ہے
یہی تو ہے جو حلاوت میں زہر گھولتا ہے
یہ کون ہے جو ہے اکثر مری تلاش میں گم؟

پروفیسر جگن ناتھ آزاد
شعبۂ اردو، جموں یونیورسٹی، جموں - ۱۸۰۰۰۱
کشمیر

[illegible]
[illegible] اتر پردیش

احساس کے کچھ لمحے اور ہم اور آپ......؟

عہد قدیم میں جب سماج غیر مہذب تھا، لوگ برہنہ رہتے تھے۔ ان کی غذا میں تند اور تندمول تھی۔ موسموں کی شدت سے اپنے جسم کو بچانے کے لئے یہ لوگ درختوں کی چھالوں اور پتوں کا سہارا لیتے تھے۔ اس وقت یہی انداز رائج تھے۔ یہ غیر مہذب افراد جب ایک دوسرے سے لڑتے تو ان کا غصہ شاکی میں بدل جاتا تب یہ لوگ یا تو جنگ کرتے یا پھر پتھر کا سہارا لے کر ایک دوسرے سے نبرد آزما ہو جاتے۔

جیسے جیسے سماج مہذب ہوتا گیا، یہ غیر مہذب افراد اپنے جسم کی ستر پوشی کرنے لگے۔ پہلے انھوں نے اپنے جسم کے وہی اعضاء چھپائے جن کا چھپایا جانا سب سے زیادہ ان کی سمجھ میں آیا، ان کی تہذیب کے عروج کے ساتھ ساتھ ان کی بے رحمی اور سنگ دلی کے اظہار کا ذریعہ پتھر نہیں رہ گئے، بلکہ ان کی جگہ فولاد اور لکڑی کے بنے اسلحہ نے لے لی۔ تہذیب یافتہ ہوتے ہی انسان نے اپنے جسم کے ان اعضا کی بھی ستر پوشی کرنی شروع کر دی جنھیں وہ غیر مہذب سماج میں نہیں چھپاتے تھے۔ جب انسان مہذب ہونے لگا اور اس کے بڑھتے ہوئے وقار نے سماج تہذیب کی راہ پر گامزن ہو گیا، وقت گزرتا گیا تہذیب کا ارتقا ہونے لگا تو ہیروشیما پر دنیا کے سب سے مہذب ملک امریکا نے بم باری کر دی۔ ایک ہی دھماکے میں بے شمار افراد ہلاک ہوئے۔ عالمی تاریخ میں اس ملک کا نام ظالم ملک ہو گیا۔ سیکڑوں میل دور اس بم کے دھماکے سے متاثر ہونے والے علاقے میں آج بھی نابینا، کوڑھی اور اپاہج بچے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی تہذیب نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔ لیکن ایک چیز مشترک رہی جس پر دنیا ایک سرے سے دوسرے سرے تک متفق ہے وہ یہ کہ کمزور کا کوئی مددگار نہیں ہوتا اور طاقتور سے سبھی صلح چاہتے ہیں۔

انسان جب اور مہذب ہوا تو تعلیم یافتہ بھی ہوا۔ تعلیم نے اس کے قدم زمین سے اٹھا کر چاند اور ستاروں تک پہونچا دیئے۔ انسان جب موجوں پر اترا تو سمندر کی بے پناہ گہرائیوں میں اتر گیا۔ پہاڑوں کی بلندی پر چڑھا تو ایورسٹ کو بھی سر کر لیا۔ یہاں تک کہ جسمانی طور پر معذور افراد بھی اس چوٹی تک پہونچ گئے۔ جب زمین کے بارے میں جانکاری شروع کی تو سونا، چاندی، پلاٹینم، جواہرات اور ہیرے موتی چن لیے۔ اس روشنی کا استعمال کبھی ظلمت کو بھگانے کے لئے کیا، کبھی بے گناہ بستیوں کو نذر آتش کرنے کے لئے کیا۔ تہذیب کی علامت وہ ملک جن کا لوہا سبھی مانتے ہیں، ان کے بارے میں جب کبھی قصے پڑھنے کو ملیں اور ان کے کارناموں کی فلمیں دیکھنے کو ملیں تو معلوم ہوگا کہ انسانیت نے چیخ چیخ کر کہا ہے کہ تہذیب کا لباس پہنے ہوئے یہ لوگ برہنہ ہیں۔ یہ دنیا میں مہذب سمجھے جانے والے لوگ پہلے لٹیرے تھے، آج بھی لوٹ رہے ہیں اور مستقبل میں بھی لوٹتے ہی رہیں گے۔ یہ وہ تھے جنھوں نے ہندستان پر سیکڑوں برس حکومت کی جنھوں نے ہماری غلامی کے دنوں میں ہمارے وقار اور عزت کو پامال کیا۔ ان کی حکمرانی کی مدت میں موت آسان تھی اور زندگی گراں۔ وجہ یہ تھی کہ [illegible] سجدہ نہیں کر سکتیں۔ یہ لٹیرے ہندستان سے سونے کی چڑیا اپنے ہمراہ لے گئے اور دے گئے ہلاکت، افلاس، غریبی، بے بسی اور لاچارگی۔

سلے گئے ہمارے دن کا اُجالا اور شام کا سنہرا پن! لے گئے ہماری محبت، لے گئے ہماری مترنم لے، لے گئے ہمارا کوہ نور، لے گئے ہمارا تخت طاؤس اور بدلے میں چھوڑ گئے نفرت کے وہ بیج جسے سات سمندر پار بیٹھ کر اپنی نفرت کی بوندوں سے سینچتے رہے۔

بھائی بھائی ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے۔ ستم ظریفی یہ ہوئی کہ اس نے ایک بار بھی اپنی قدیم تہذیب کی طرف، جو اس کی اصل میراث تھی اور جو اس کا بیش قیمت سرمایہ تھی، پلٹ کر نہیں دیکھا اس سے وہ دور ہٹتا چلا گیا ؎

اشارہ اور ہی کچھ کر رہا تھا ڈوبنے والا
مگر یاران ساحل تو سلام آخری سمجھے

ملک تو آزاد ہوا، اس کی خوشی کے نغمے بھی گائے گئے۔ متعدد قسم کے نعرے بلند ہوئے کبھی غریب کو ہٹانے کا، کبھی نوجوانوں کو بڑھانے کا، کبھی لوٹنے والا جائے گا اور کمانے والا کھائے گا، کبھی جو سرکار نکمی ہے وہ سرکار بدلنی ہے ـــــ لیکن جو ہوا وہ ہم نے بھی دیکھا اور آپ نے بھی! ؎ اس رنگ بدلتی دنیا میں تیرا کیا ہے میرا کیا ہے

جب ہمارے سامنے 'تحریک' اور 'بھوک' کے دو لفظ آتے ہیں تو کبھی بھوک تحریک سے تو کبھی تحریک بھوک سے جا ملتے ہیں۔ شاید ہمارے بزرگوں نے جب تحریک کے بگل بجائے ہوں گے تو زندگی کی صداقتوں کو اپنے سے بہت ہی نزدیک پایا ہوگا۔

'امداد باہمی' یوں تو صرف ایک لفظ ہے، لیکن یہ لفظ خود میں آسمان ہے، خود میں سمندر ہے، خود میں ستاروں کا جھرمٹ ہے اور اگر اس کے لفظوں کی گہرائی میں جائیں تو امداد باہمی کڑی سے کڑی جوڑ کر زنجیر بنانے کا نام ہے۔ ہم نہ تو بغیر کسی کی مدد کے زندہ رہ سکتے ہیں اور نہ ہی بغیر کسی کی مدد کے مر سکتے ہیں۔ ماں کی کوکھ سے لے کر موت کی آغوش تک فضا سے بہار کا اور بہار سے فضا کا رشتہ نہ منسلک ہوتا تو فطرت یا کائنات کی تخلیق ممکن نہ ہوتی۔ ایک دوسرے کی مدد کی مضبوط ڈور ہم جتنی مضبوطی سے پکڑیں گے، اتنا ہی سماج کے اس طبقے کے لیے، جو پیاسا ہے، بھوکا ہے، ننگا ہے، بے سہارا ہے، کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ راحت کی شبنم اپنے تپتے ہوئے جسم پر ضرور پائے گا۔

حکومتیں آئیں گی اور چلی بھی جائیں گی۔ فرد آئیں گے، چلے جائیں گے ..... زمانہ اور حکومت بدل جائے گی ..... کبھی تانا شاہی ہوگی، تخت و تاج ہوگا ..... غلامی ہوگی! آج آزادی! کل ہم تنہا تھے آج کارواں ہے کل ہم کسی پر منحصر تھے آج اپنے پیروں پر کھڑے ہونا چاہتے ہیں۔ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر پرورش پانے والا بچہ اپنی جوانی پر پہونچتا ہے اور اسی طرح فطرت کا نظام تکمیل پاتا ہے۔ ہمیں اس پر آشوب دور میں جہاں

نہ دوستی نہ تکلم نہ دلبری نہ خلوص
کسی کا کوئی نہیں آج سب اکیلے ہیں

ایسے وقت میں چیلنج کا مقابلہ کرنا ہے جب تبدیلی ہے، انتشار ہے اور ہماری ذمہ داریاں ہیں جو مانگ کرتی ہیں کہ بکھرنے والوں کو بکھرنے نہ دیا جائے۔ بدلاؤ کی نشان وہی ایسی ہو جس میں سب کو ساتھ لیکر چلنے، اداس چہروں پر مسکان لانے، آنسوؤں سے بھری آنکھوں سے ٹوٹ کر بکھرنے والے آنسوؤں کو خاک میں ملنے سے پہلے رسوا ہونے سے بچا لینے، زخمی دلوں پر محبت کا مرہم رکھنے، جن ہاتھوں کے پاس کام نہیں ہے انھیں کام دینے، جن کھیتوں میں پانی نہیں ہے ان میں پانی دینے، جن کے پاس بیج نہیں ہے انھیں بیج دینے، کھاد اور دوا دینے، غریب کسان، غریب دست کار، محنت کش مزدور کو قرض دینے میں معاون ہو تاکہ وہ بھی زندہ رہ سکے، زندگی گزار سکے، زمین پر کھیتی لہلہانے والا بھوکا نہ رہے۔ کپاس پیدا کرنے والا بے لباس نہ رہے گنے کی کھیتی کرنے والا کسان مٹھاس کو نہ ترسے۔ ہم ایک دوسرے کے مددگار ہوں اور ہماری تحریک امداد باہمی تحریک ہو۔

ایک دوسرے کی مدد کا جذبہ، ساتھ مل کر کام کرنے کے بنیادی اصول کو لے کر ہم نے نہ صرف صوبے کے ایک سمت سے دوسری سمت تک امداد باہمی انجمنوں کا جال بچھا کر رکھ دیا ہے بلکہ کھیت سے کھیت، پگڈنڈی سے پگڈنڈی اور گاؤں سے گاؤں جوڑ دینے کا نام ہے امداد باہمی تحریک۔

پی۔ سی۔ ایف نے کھاد اور بیج دیئے، دوا فراہم کی۔ امداد باہمی بینکوں نے قرض دیا، گرنے والے کا ہاتھ تھام کر سہارا دیا، فصل سے فصل تک کا سہارا دیا۔ بھومی وکاس بینک نے چاہا کر ترقی ہو زمین کی۔ زمین

کھیتی کی مزدوری ہے، پیاس بجھ رہی ہے۔ ہمارے کسانوں کو کاشت کے حساب دام ملیں۔ اُن کی فصلوں کو گودام ملے۔ اس کے لئے بنایا گیا پرادیشک کارپوریشن جو آج گھاٹے سے نکل کر فائدے کی طرف گامزن ہو چلا ہے۔ ہمارا امپیکس، کامن بینک اور ہمارے کوآپریٹیو بینک بھی مشکلوں کے گھیرے میں ہیں لیکن وہ بھی ترقی کے راستے پر ہر خطر کو پار کر آگے بڑھتا جا رہا ہیں۔ ہم سینہ ٹھونک کر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ...... ملک کے وہ بڑے بڑے بینک، جو سرمایہ داروں کے ناموں سے چلتے ہیں اور جن کے دروازے فولادی کارخانے بنانے کے لئے سرمایہ داروں کی تجوریوں کو مالامال کرنے کے لیے ہر وقت کھلے ہیں۔ ان کے یہاں قرض واپسی آدھی سے کم ہے۔ ہمارے غریب کسان، دست کار، محنت کش مزدور جو کچھ بھی قرض لیے ہوتے ہیں اسے پورے سود کے ساتھ مقررہ وقت پر ۸۵ سے ۹۰ فی صد تک ریکارڈ کے نام پر واپس کرتے ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ آج بھی ایمان داری کا پیمانہ وہی ہے جو اس وقت تھا جب ملک سونے کی چڑیا تھا۔ غریب کل بھی ایمان دار تھا اور آج بھی دیانت دار ہے اس بار میں نے سہکاری زندگی کے راستوں کو بدلنا چاہا ہے اور خواہش ہے کہ کچھ ایسا کام کریں جس سے سماج میں پھیلی ہوئی بُرائیوں اور نفرت کو کم کر سکیں۔ ہم نے پردیش کے دست کاروں کو ان کے محلوں اور گلیوں سے تلاش کر کے ملک کے بڑے بڑے میلوں اور بازاروں میں پہنچا کر ان کی زندگی کو بچولیوں کے ناپاک ہاتھوں سے آزاد کرایا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کمانے والا ہی کھائے نہ کہ لوٹنے والا۔ ہمارے دست کاروں نے لکھنؤ، رامپور، نینی تال، دہلی کے میلوں میں اپنی دستکاری کے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہاں تک کہ ان کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے کہ دہلی کے بین اقوامی میلے میں بھی دُنیا کی دوڑ میں شامل ہو چکے ہیں۔ یہی ہمارا اصل مقصد اور خواب ہے۔ کہ چپے چپے پر دست کاروں سے بھرا یہ صوبہ ہندستان کی عظمت کی علامت بنا رہے۔ یہاں ہاتھوں سے تراشے پتھر کے صنم ملتے ہیں یہاں محبت کی نشانی تاج محل ہر غریب کو بہت کم قیمت پر ملتا ہے یہاں ملتا ہے سہارن پور کا بنا ہوا لکڑی کا نایاب تحفہ۔ مراد آباد کے برتن اور سجاوٹ کا سامان، جس کا لوہا پوری دُنیا مانتی ہے۔ رامپور کا ٹوپی، زردوزی کا سامان اور چکن وغیرہ۔ یہاں کی شیروانیاں اور کسی زمانے میں ہاتھوں سے نقش کیے ہوئے چاقو جیسے مثال ہیں۔ بریلی کا بنا ہوا گھڑے پر چکن کا کام، فرخ آباد کی چھپائی، آگرہ کی رضائیاں، سہارن پور کی قالین، دریاں، لکھنؤ کی چکن کا بنا ہوا ایسا کام جسے دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ ان دست کاروں کی تعریف کا فریضہ ادا کیا جائے جنھوں نے اپنے فن سے چکن کے کام کو ملک و بیرون ملک تک پہنچا کر اپنے وطن کی شان کو بڑھایا ہے۔ بھدوہی کے بنے ہوئے قالین ایرانی قالینوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ بنارس کی ساری، گوشہ گمنامی میں ڈوبے ہوئے مبارکپور کی ہینڈلوم کی بنی ساریاں، گورکھپور کی مٹی کی بنی اشیاء وغیرہ ہماری عظمت کی علامت ہیں۔

اقتدار میں آنے کے فوراً بعد سرکار نے امداد باہمی سے سرکاری دخل کو کم کیا۔ نامزد ہونے والے نمائندوں کی تعداد ۵۰ فیصد کم کر دی تقریباً سولہ برسوں سے ملتوی انتخابات کے چیلنج کو قبول کر کے انتخابات کرائے، امداد باہمی قانونوں میں بنیادی تبدیلی کی، انجمنوں وغیرہ کی مدت تین سال سے بڑھا کر پانچ سال کی۔ غریبوں کی حصہ داری یقینی بنائی انجمنوں وغیرہ پر ایڈمنسٹریٹر بٹھانے کے رواج کو غیر قانونی قرار دیا۔ کسانوں کے قرض کی کتابوں پر درج ہونے والی رقم کو سچا مانا۔ اگر محکمہ کے ملازمین نے رجسٹر میں ادائیگی کے وقت رقم کم درج کی ہے اور کتاب پر صحیح ہے تو کسان کی کتاب کو سچا مانا جاتا ہے نہ کہ ملازم کو۔ یہ بھی ہدایت کی گئی ہے کہ اب کوئی کسان کی کتاب پر چڑیا نہیں بنائیگا بلکہ اپنا پورا نام لکھے گا تاکہ کسانوں کے ساتھ کہیں دھوکا ہونے کا شبہ تک باقی نہ رہ جائے۔

بمبئی میں چل رہا ہمارا کولڈ اسٹوریج نقصان سے فائدے کی طرف بڑھ چلا ہے۔ رانی کھیت میں آیورویدک دوائیں بنانے کی فیکٹری گھاٹے سے ابھر کر فائدے کے راستے پر چل نکلی ہے۔ ہم فکر مند ہیں کہ اپنے بند کولڈ اسٹوریجوں کا کوئی راستہ جلد نکالیں۔ یہ جاری فکر ہی نہیں بلکہ ہم نے اس کی شروعات بھی کر دی ہے۔ اب ہماری کسی بھی یونٹ کی عمارت تعمیر ہوگی تو اس کے ساتھ ایک شاپنگ کامپلیکس بھی بنے گا۔ ہم کاروبار کے اودھ میں کمانے کے پُرانے رواج

(باقی صفحہ ۷)

غزلیں

تم جو آئے ہو تو اُمید بھی انگڑائی ہے
غم زدہ ابر کے ہونٹوں پہ چمک آئی ہے

ہم نہ مجنوں ہیں نہ فرہاد ہیں لیکن یارو!
عشق سے اپنی بھی تھوڑی سی شناسائی ہے

اب تو آئیں گے عدو شوق سے پرسش کو مری
دوستوں نے جو نہ آنے کی قسم کھائی ہے

تیری آغوش میں تسنیم بھی کوثر بھی ہے
تیری آنکھوں میں قیامت کی مسیحائی ہے

آؤ اک روز سنو درد کا میرے قصہ
لب مہر بند گا گوشئہ تنہائی ہے

منزلِ عشق کٹھن ہے یہ نہیں ناممکن
گر ترے دل میں لگن ضبط و شکیبائی ہے

اک قدم جانبِ منزل میں بڑھا ہوں ہر دم
جب بھی مشکل میں مصیبت مرے در آئی ہے

اوپیندر ناتھ اشک
۵۔ خسرو باغ روڈ
الہ آباد

ہواؤں کی یورشوں سے لرزاں ڈلوں میں ناگفتہ ڈر سمیٹے
نظر پڑی تو حدِ نظر تک پرند بیٹھے تھے پر سمیٹے

کوئی دعاؤں کی فصل کاٹے کوئی خدا کے ثمر سمیٹے
کسی نے مٹی پہ گل بکھیرے کسی نے نیزوں سے سر سمیٹے

چہار جانب ہو بیکرانی تو کیا کوئی آبِ زر سمیٹے
زمیں کی برکتیں کہاں تک نحیف و تنہا شجر سمیٹے

ہزار شکلیں ہزار چہرے کہاں رکے کس جگہ پہ ٹھہرے
بھلا نظاروں کی بیکرانی کہاں تلک اک نظر سمیٹے

مری کتابیں مرے تعارف کی رسم ابتک نبھا رہی ہیں
میں اپنی خوش رنگ خواہشوں کے ورق رہا عمر بھر سمیٹے

کہاں سے آئے تھے وہ مسافر کہاں گئے کس نگر کو پہنچے
ہزارہا نقشِ پا بنے ہیں کبھی کیسے رہ گزر سمیٹے

لڑی وہ پُر آب موتیوں کی جھڑی لہو رنگ آنسوؤں کی
کسی نے عظمت کا تاج پہنا کسی نے تھالی میں سمیٹے

روش روش پھول کھل چکے ہیں دراز وحشت کے سلسلے ہیں
تو کس لیے غیرتِ شاہد میں گھر میں بیٹھا ہوں گھر سمیٹے

شاہد میر
سرونج، ضلع ودیشا (ایم پی) ۴۶۴۲۲۸

جفا پرور نہیں ہیں ہم سے اُمید وفا رکھیے
ہر اک کو جانیے اپنا ہر اک سے آسرا رکھیے

جہاں بھی جائیے بے خوف اپنا مدعا رکھیے
سرِ مقتل بھی حق گوئی کا دل میں حوصلہ رکھیے

یہ راہِ زندگی آساں ہے تو دشوار تر بھی ہے
بلا سوچے قدم اپنا نہ ہرگز جا بجا رکھیے

یہ دنیا ہے یہاں معیار ہے پستی بلندی کا
میاں ہرگز نہ اپنا کم کسی سے مرتبہ رکھیے

نہ کوئی مصلحت درپیش آئے حق بیانی میں
ہر محفل خواہ جس کی بات اپنی برملا رکھیے

یہاں شب خوں میں تہذیبوں پہ ڈالے ہیں ہنر ہم نے
یہ سرمایہ گراں مایہ ہیں سینے سے لگا رکھیے

جہادِ زندگی ہے دوسروں کے غم میں کام آنا
یہ ہے کارِ خداونداں نہ اُمیدِ صلہ رکھیے

سلوک اہلِ دنیا سے ہیں کیوں خاطر شکن شارق
یہ انسانوں کی بستی ہے دل درد آشنا رکھیے

شارق اجے پوری
بیت الحسن۔ ایم پی سنہا روڈ
قدم کنواں۔ پٹنہ۔ ۸۰۰۰۰۴

یقین اور عزم کا نیا عہد

وزیر اعلیٰ ملائم سنگھ یادو نے اس کیفیت کی طرف بار بار اشارہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہندستان میں جات واد طبقاتی کشمکش کی دوسری اور بدتر شکل ہے۔ ہندوستان میں طبقات کی تقسیم کو مستقل شکل دیدی گئی ہے او صدیوں سے ایک ہی شکل میں چلی آرہی ہے۔ اس کے نتیجہ میں کچھ لوگ ہمیشہ کے لئے جاہل غریب اور پست ہوگئے اور کچھ ہمیشہ کے لئے اوپر اٹھ گئے۔ اس غیر منصفانہ مستقل تقسیم نے ملک کی اکثریت ترقی کی خواہش اور اوپر اٹھنے کی امنگ کو ختم کردیا۔ اس لئے سب سے اہم کام یہ تھا کہ اس "مستقل تقسیم" کو ختم کیا جائے۔ اور یہاں کے دبے اور کچلے ہوئے عوام کے ذہنوں سے یہ خیال ختم کردیا جائے کہ وہ ہمیشہ کے لئے پست رہنے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں ان کے دلوں میں ترقی کرنے کی خواہش اور باعزت زندگی گذارنے کی تمنا بیدار کی جائے۔ مگر وہ اتنے کمزور ہوچکے تھے اور ان کی قوت ارادی اتنی کمزور ہوچکی تھی کہ وہ خود ترقی کے دروازوں کو اپنے ہاتھوں سے نہیں کھول سکتے تھے۔ اس لئے یہ حکومت کی ذمہ داری بن گئی تھی کہ وہ ان دروازوں کو کھولے اور شہریوں کو ترقی کی شاہراہوں پر چلنے کا موقع دے۔ وزیر اعلیٰ نے کئی مرتبہ یہ کہا ہے کہ ان کا پہلا کام یہی تھا اور یہی ان کی اولین ذمہ داری تھی۔ یہ کام اس حکومت نے ایک قلیل عرصہ میں کر دکھایا اور صدیوں پرانی زنجیروں کو چند دنوں میں توڑ دیا۔ دبے اور پچھڑے ہوئے طبقوں کے نوجوانوں کے دلوں میں نئی خواہشات نئی امنگیں پیدا کیں ان کو جذبہ خود اعتمادی دیا جو اب تک ان میں مفقود تھا اور اس جذبہ کو اتنا مضبوط کردیا کہ اب اس کو ختم نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی ترقی کے جذبے کو اسی وقت تسکین ممکن تھی جب ان پر تعلیمی اداروں کے دروازے کھول دئے جائیں اور ان دروازوں میں داخل ہونے کا راستہ ان کو دکھا دیا جائے۔ اس کا صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ راستہ تھا "رزرویشن" کا راستہ۔ اس حکومت نے اس راستے کے ذریعہ پچھڑے اور پس ماندہ طبقے کے لئے ترقی کی شاہراہ کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ ان میں نئی بیداری اور نیا عزم پیدا کردیا ہے۔ اب تعلیمی اداروں اور سرکاری منصبوں کے دروازے ان پر بند نہیں کئے جاسکتے۔ سماج کے دبے ہوئے طبقوں میں جو جذبہ ہندستان کی بائیں بازو کی جماعتیں پچھلے ۴۵ سال سے پیدا کرنے کی کوشش کررہی تھیں اور اس میں کامیاب نہ ہوسکیں تھیں وہ آج پیدا ہوگیا ہے۔ اس طرح ریزرویشن ایک معمولی سیاسی کارروائی نہیں یہ ایک انقلابی قدم بن گیا ہے جس کے نتائج بہت دوررس اثرات والے ہیں۔ اس سلسلہ میں اعداد و شمار کی یہاں بیان کی ضرورت نہیں یہ سب کو معلوم ہے کہ دلتوں کے لئے رزرویشن ۱۸ فی صد سے بڑھا کر ۲۱ فی صد کردیا گیا ہے اور دوسرے پچھڑے طبقوں کے لئے جن میں پچھڑے مسلمان بھی ہیں ۲۷ فی صد کردیا گیا ہے۔

موجودہ حکومت کو اس بات کا بھی احساس ہے کہ ہر انقلابی قدم صدیوں سے قائم فرسودہ نظام کے توازن کو بدل دیتا ہے اور اس اتھل پتھل میں سماج دشمن عناصر کو سر اٹھانے کا موقع مل جاتا ہے۔

سماج وادی، بہوجن سماج پارٹیوں نے اس بات کو علی الاعلان تسلیم کیا کہ فسادات میں مظالم کا شکار عموماً اقلیت کے لوگ ہی ہوتے ہیں۔ اسی لئے اس نے اس بات کو بھی مانا کہ موجودہ "فورس" فسادات کو روکنے کی صحیح ہتھیار نہیں بن سکتی ہے اور اس کے لئے ایک نئے

قسم اور بہتر تربیت یافتہ فورس کی صورت ہوگی چنانچہ اس کام کیلئے سرکشا بل کی بنیاد ڈالی. پی اے سی کی جدید تربیت کا انتظام کیا. پولیس اور پی اے سی کیلئے نئے ہتھیار اور تیز رفتار گاڑیوں کا انتظام کیا گیا۔

فسادات کی روک تھام کے لئے سیاسی اقدامات کی بھی ضرورت تھی کیونکہ فسادات کا اکثر سبب سیاسی ہی رہا ہے۔ اس سیاسی چیلنج کا مقابلہ وزیر اعلا اور ریاستی کابینہ میں ان کے ساتھیوں نے خود کیا اور صاف صاف اعلان کیا کہ وہ فرقہ پرست طاقتوں کے خلاف جنگ کریں گے اور اقلیتوں کو فرقہ پرستی کا شکار نہیں ہونے دیں گے۔ انہوں نے یہ اعلان کیا کہ ان کی حکومت کا ایک اہم مقصد فرقہ پرستی کو ختم کرنا اور قومی اتحاد کو مضبوط کرنا ہے اور اسکے لئے فرقہ پرست فسطائی جماعتوں کا مقابلہ کرنا ہے۔ ہم اس جنگ کو لڑتے رہیں گے اور کامیاب ہوں گے۔

اس کے علاوہ حکومت نے مغربی اضلاع خصوصًا غازی آباد اور میرٹھ وغیرہ کے علاقوں میں جہاں جرائم کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی تھی جرائم روکنے کے لئے ۲۲ کروڑ روپیہ کا پلان بنایا تاکہ وہاں ڈکیتی اور اغوا کی وارداتوں کو روکا جاسکے۔ اس کام کے لئے پولس کے خصوصی دستے تعینات کئے گئے۔ مدھیہ پردیش پولیس کے ساتھ تعاون کر کے سرحدی اضلاع میں ڈکیتوں کو روکنے کا منصوبہ تیار کیا گیا اور بروئے کار لایا گیا۔ پولیس کی ڈکیتوں سے مڈبھیڑیں بھی ہوئیں جن میں ۱۸۸ ڈاکو مارے گئے جن میں ڈاکوؤں کے گروہ کا ایک سردار مہیندر سنگھ فوجی بھی تھا۔

گذشتہ ایک سال میں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ڈکیتی قتل اور لوٹ مار اور اغوا کے واقعات میں کافی کمی آئی ہے۔

ملائم سنگھ سرکار نے صرف پولیس کی ہی طاقت سے فرقہ پرستی کا مقابلہ نہیں کیا اس حکومت نے یہ بھی محسوس کیا کہ اقلیتوں اور دوسرے پچھڑے طبقات کے کچھ مسائل ایسے ہیں جن کی طرف پوری توجہ نہیں دی جاسکی ہے اس لئے اتر پردیش اقلیتی کمیشن کو قانونی حیثیت دے کر ضروری اختیارات دئے گئے ہیں۔ ابھی تک اقلیتی کمیشن کی حیثیت صرف سرکار کی مقرر کی ہوئی ایک ایسی کمیٹی کی تھی جس کو کسی قسم کا کوئی اختیار نہیں حاصل تھا۔ وہ سرکاری محکموں سے کسی قسم کی اطلاع بھی نہیں حاصل کر سکتا تھا۔ اقلیتی کمیشن کے صدر اور سکریٹری کے خطوط کا سرکاری محکمے اور آفیسر عمومًا جواب دینا بھی ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ اب اس کو ایک ایکٹ بنا کر قانونی طور پر اختیارات دیئے گئے ہیں اور کمیشن اقلیتوں کے متعلق ضروری معلومات حاصل کر کے اقلیتوں کے مسائل کے حل کی تجاویز پیش کر سکتا ہے۔

اتر پردیش حکومت نے پچھڑی جاتیوں اور شیڈولڈ کاسٹ (دلتوں) کے لئے بھی ایک کمیشن بنانے کا بھی فیصلہ کیا ہے جو انکی شکایات کو رفع کرنے میں ان کی مدد کرے گا۔

حکومت نے اتر پردیش میں اردو بھاشی اقلیت کے مسائل کو حل کرنے کے لئے خصوصی قدم اٹھائے ہیں۔ اور پہلی بار یہ کوشش کی گئی ہے کہ دستور ہند میں بھاشائی اقلیت کو دی ہوئی ضمانت کہ ان کے بچوں کی ابتدائی تعلیم بچوں کی مادری زبان میں دی جائے پہلی مرتبہ اس بات کی سنجیدگی سے کوشش کی گئی ہے کہ ثانوی درجات میں اردو کو تیسری زبان کی حیثیت سے پڑھنے کی آسانی ہو۔ پہلی مرتبہ دستور ہند کی اس گارنٹی پر عمل کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اقلیتوں کے اسکولوں کو اقلیتی تعلیمی ادارے کے طور پر تسلیم کیا جائے اور ان میں کوئی مشکلات نہ پیدا کی جائیں۔

صرف یہی نہیں اقتصادی ترقی کے اقدامات کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ دلت طبقے کے لئے خصوصی اقدامات کئے گئے۔ دس ہزار گاؤں جن میں دلتوں کی زیادہ آبادی ہے خصوصی ترقی کے منصوبوں کے لئے چنے گئے اور ان کی ترقی کے لئے ضروری اقدامات کئے گئے۔ کرگھے پر کام کرنے والوں بنکروں کو جب دھاگے کی قیمت بڑھ جانے کی وجہ سے دھاگا ملنے میں دقت ہوئی تو یوپی گورنمنٹ نے بنکروں کے لئے دھاگے کی قیمت میں ۱۵ روپیہ فی کلو اپنی طرف سے سبسڈی دینے کا اعلان کر دیا۔ گورنمنٹ نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ آدی واسی اور دلتوں کو ان کی لڑکی کی شادی کے موقع پر پانچ ہزار روپیہ کی مالی امداد کی جائے۔

ابھی تک بڑے کسانوں کو ضعیف العمری میں کسی قسم کی مالی امداد نہیں ملتی تھی۔ ملائم سنگھ گورنمنٹ نے ایک اسکیم تیار کی ہیں کے رو سے ہر چھوٹے کسان کو ۶۰ سال کی عمر کے بعد بڑھاپا پنشن دی جانے لگی۔ اس وقت بھی بڑھاپے کی پنشن کچھ لوگوں کو دی جاتی ہے مگر وہ لوگ زیادہ تر شہروں ہی کے ہیں۔ گورنمنٹ کی نئی اسکیم کے مطابق ہر چھوٹے کسان کو ۶۰ سال کے بعد بڑھاپے کی پنشن ملنا شروع ہو جائے گی۔ غریب بیوہ عورتوں کے لئے بھی حکومت نے ایک پنشن کی اسکیم تیار کی ہے اور کوشش کی جا رہی ہے کہ اس مالی سال کے ختم ہونے تک کم از کم ۲۵ ہزار بیواؤں کو پنشن یافتہ بنا دیا جائے۔

گورنمنٹ نے پنشن یافتہ فوجی سپاہیوں کی پنشن میں ۱۰۰ روپیہ ماہوار اضافہ کا اعلان کیا ہے۔

دیہاتوں میں بے روزگاری دور کرنے کے لئے ۱۲ ضلعوں میں بھومی سینا بنانے کا منصوبہ بھی تیار کیا گیا ہے۔ یہ "سینا" بنجر زمین کو اپجاؤ بنانے کا کام کرے گی۔ منصوبے کے مطابق یہ سینا ۴۵۰۰۰ (پینتالیس) ہزار ٹن غلہ مزید پیدا کرے گی۔

یہ سب تو غریبوں اور پسماندہ لوگوں کے لئے امداد کی یوجنائیں اور تجاویز تھیں۔ اتر پردیش کی صنعتی ترقی کے لئے بھی ملائم سنگھ سرکار نے کافی کوشش کی ہے۔ اس مالی سال میں ترقیاتی منصوبہ کے لئے ۴،۷۶۲ (چار ہزار سات سو باسٹھ کروڑ) روپیہ کی رقم مقرر کی گئی ہے جو پچھلے سال کے ترقیاتی منصوبے سے ۵۱۲ (پانچ سو بارہ) کروڑ روپیہ زیادہ ہے۔

وزیر اعلیٰ ملائم سنگھ یادو نے بذات خود ریاست میں صنعتی ترقی کی کوششیں کی ہیں۔ اس سلسلے میں وہ بمبئی اور دوسرے صنعتی مرکزوں کے صنعت کاروں سے ملے اور ان سے تجویز کی کہ وہ اپنی صنعتیں اتر پردیش میں لگائیں۔ ان کا اندازہ یہ ہے کہ اگر صنعت کاروں کو آسانیاں فراہم ہوں تو وہ چند ہی دنوں میں دس ہزار کروڑ روپیہ سے بھی زیادہ صنعتی کارخانے اتر پردیش میں نصب کر سکتے ہیں۔ انہوں نے صنعت کاروں کو یقین دلایا ہے کہ اتر پردیش کی حکومت ان کو ہر طرح کی آسانیاں فراہم کرے گی۔

اس سلسلے میں [illegible] سرکار نے پہلا کام تو یہ کیا کہ اتر پردیش سے انسپکٹر راج کا مکمل خاتمہ کر دیا۔ ملائم سنگھ حکومت نے صنعت کاروں کو انسپکٹروں سے نجات دلائی ہے۔ اور یہ فیصلہ کیا ہے کہ خود صنعت کار سرٹیفکیٹ پر کام کر سکتے ہیں کافی ہو اور یہ حکم دے کر صنعتی کارخانے نصب کرنے کا کام آسان کر دیا ہے اس کا اثر پردیش کی صنعت پر ضرور ہوگا اور اتر پردیش کی صنعتی ترقی تیز ہوگی۔ ——— صلاح الدین عثمان

احساس کے کچھ لمحے .... صفحہ ۶ کا بقیہ

کو ترک کر کے نئے رواجوں کو قبول کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے نئے طریقے جس میں کبھی نقصان نہ ہو، کبھی دھوکا نہ ہو۔ ہم دست کاروں کو ان کے پیروں پر کھڑا کر دینا چاہتے ہیں تاکہ وہ سرکار سے ملازمت مانگنے کے بجائے خود ملازمت دینے کی حیثیت میں آ جائیں۔ یہ ہمارا ارادہ بھی ہے اور ہماری تمنا بھی، ہماری کوشش بھی، ہمارا عہد بھی۔ بغیر بادل کی بارش بغیر آفتاب کے دھوپ نہیں ہوا کرتی۔ ہمیں آپ کے تعاون، آپ کی دعاؤں کی ہر سطح پر ضرورت ہے۔ ہم شانہ سے شانہ ملا کر اور قدم سے قدم ملا کر آپ کو ساتھ لے کر غریبی سے لڑنا چاہتے ہیں اور لڑنا چاہتے ہیں فرقہ واریت سے، نا برابری سے، علاحدگی پسندی سے، اونچ نیچ کی تفریق سے، لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم کھلے دل سے اور ایمانداری کے ساتھ اپنے سماج اور دھرتی کو بچانے کا عہد کریں۔

گزشتہ مہینے صوبہ کے تاریخی شہر لکھنؤ کے بیگم حضرت محل پارک میں منعقدہ 'سہکاریتا سمیلن' جو اب تک دنیا کی سب سے بڑی امداد باہمی کانفرنس رہی، اس بات کی علامت ہے کہ امداد باہمی کا جذبہ ترقی کی راہ کو ایک نئی جہت دینے کے ساتھ ساتھ مستقبل کو روشن کرے گا۔

مجھے فخر ہے کہ ملک کی آزادی کے لئے انگریزوں کے مقابلے میں تلوار سے ٹکرانے والی بیگم حضرت محل کی بہادری کی سچائیاں کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ ایسے پارک میں منعقدہ تاریخی سہکاریتا سمیلن نے امداد باہمی کے جذبہ کا جو دوامی نقش چھوڑا ہے وہ بلاشبہ امداد باہمی کی تحریک کو تقویت دے گا۔

(ترجمہ: ماہناز فاطمہ)

غزل

دھوپ آنگن میں اُتر آئے تو میں چھپّر کاٹوں
رات دن عمر کے میں اوڑھ کے امبر کاٹوں

کوئی موسم سے شکایت نہ زمانے سے گلہ
پک گیا کھیت میں گیہوں تو میں آدھر کاٹوں

باجرہ قحط زدہ، مونگ ہے بارش کا شکار
اب مہاجن کے تقاضے کیلئے گھر کاٹوں

رات میں جاڑے کی، دہکے ہوئے انگاروں پر
نیند کے پاؤں میں کاٹوں تو کبھی سر کاٹوں

میلے ٹھیلے سے تھکن لے کے پلٹ آیا ہوں
بال بچوں کی تمناؤں کے پتھر کاٹوں

تلخ تر ہے مری ہر سوچ کریلے کی طرح
پھر بھی اوروں کیلئے لفظوں کے گاجر کاٹوں

من کی چاہت ہے کوئی پودا کروں پیڑ مگر
تن کی ضد ہے کہ وہی پیڑ تناور کاٹوں

اب بھی دوری ہے بہت حال سے مستقبل کی
فاصلہ یہ بھی ہر اک سانس کے اندر کاٹوں

مور کے پاؤں نظر آتی ہے پگڈنڈی مری
شہر کی سڑکوں پہ اس دکھ کو بچا کر کاٹوں

سر پہ اوڑھوں تو کبھی پاؤں کو ڈھانپوں بیکل
اپنی اوقات پہ پشتینی ہے چادر کاٹوں

بیکل اتساہی

۳۱۸۔ وی پی ہاؤس
نئی دہلی

دوہے

چاند سے مکھ پر چاند کی بندیا ناک کے اوپر چمکے
رتی کا من موہ کا مارا بچہ بن کے پھسکے

سیاہی کالے رنگ کی رب کا گورا نام
گورے کاغذ پر اب رتی کیسے لکھے رام

پیڑ کے ساتھ کھڑی اک لڑکی اپنی پیٹھ ٹکائے
بچے پکے پھل توڑ کے لوٹا نیچے پھینکے جائے

کبھی کبھی اک سندر مکھڑا آنکھ آ کے مسکاتا
رتی بھر کا رتی اس پل لعل، رتن بن جاتا

تو بھی رتی سندر بن جا کر کوئی ایسا چارا
سورج سے اک کرن مانگ کر من میں کر اجیارا

لال پھول گل مہر کے اور مہوے کی خوشبو
لیٹ دہکتی آگ پر اور چین سے سو جا تو

رتی کا من بہت ہی میلا کیسے اجلا ہووے
گورے ہاتھوں سے کوئی گوری مل مل کے یہ دھووے

دو ہاتھوں میں تھامے گھونگھٹ ادھر ادھر سرکائے
ڈرتی ہے کہ روپ کی لو سے خود ہی نہ جل جائے

سارا دن ہو گیا ضائع کیا نہیں کچھ کام
معاف نہیں کر سکتے اس کو رام اور گھن شام

رتن سنگھ
۲۲۔ آدرش نگر۔ نربدا روڈ۔ جبل پور

طیب صدیقی
۳۴۶/۹۹، گنگی نتال، کانپور

اُردو صحافت جدوجہد آزادی کے میدان میں

اس میں شک نہیں کہ اُردو زبان کے اولین اور اہم علمی و ادبی مراکز دہلی، لکھنؤ اور حیدر آباد تھے بعد میں لاہور نے بھی تیزی سے پیش قدمی کر کے اس صف میں جگہ حاصل کر لی بلکہ بعض حیثیتوں سے اس نے زیادہ شاندار اور نمایاں خدمات انجام دیں (قیام پاکستان کے بعد لاہور سے کہیں بڑا مرکز علم و ادب کراچی بن گیا خاص طور پر صحافت کے معاملہ میں کیوں کہ نئی مملکت کا دارالحکومت قرار پانے کی وجہ سے اخبارات و رسائل اور خاص طور پر روزناموں کے لیے اسے زیادہ موزوں اور مناسب مقام سمجھا گیا) البتہ یہ بات عجیب اور حیرت انگیز ہے کہ صحافت کے خارزار میں پہلا قدم رکھنے کا سہرا کلکتہ کے منشی سدا سکھ (جام جہاں نما) یا منی رام ٹھاکر (شمس الاخبار) کے سر رہا۔ یہ اقدام اب سے تقریباً پونے دو سو سال قبل ۱۸۲۳ء میں کیا گیا۔ اردو طباعت کے میدان میں بھی کلکتہ ہی بازی لے گیا اور پہلا اُردو پریس ۱۸۱۰ء میں اکرام علی نام کے ایک صاحب نے "ہندوستانی پریس" کے نام سے قائم کیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ بعد میں دہلی، لاہور، لکھنؤ، حیدر آباد، الٰہ آباد اور عظیم آباد (پٹنہ) وغیرہ نے اس راستے میں اتنا کام کیا کہ کلکتہ اگر گردِ راہ نہیں ہوا تو پیچھے ضرور ہو گیا۔

اُردو ہندستان کی مقبولِ عام اور محبوبِ عوام زبان ہی نہیں ہے بلکہ اس نے تنہا آگے بڑھ کر جدوجہد آزادی کے میدان میں محبِ وطن جانبازوں کی قیادت کا اعزاز اور ہر ممکن حد تک ان کی حوصلہ افزائی کرنے کا شرف بھی حاصل کیا۔ اس راہ میں ملک کی کوئی اور زبان اُردو کے مقابل نہیں تھی۔ اسی زبان نے اپنے خادموں، خدمت گزاروں، ادیبوں اور شاعروں، صحافیوں، عالموں اور دانش وروں کے رگ و ریشہ میں خون کی جگہ آگ دوڑائی اور اسی نے "انقلاب زندہ باد" کا پُرجوش نعرہ دیا جس نے سات سمندر پار سے "سونے کی چڑیا" کو قید کرنے کے لئے آئے ہوئے گوری چمڑی اور کالے دل والے انگریزوں کے قصر و ایوان میں زلزلہ پیدا کر دیا۔ اسی نے ؂

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

کے ذریعہ ہمارے جاں نثاروں کی ترجمانی کا حق ادا کیا اور اسی زبان نے ؂

پتھر کی مورتی میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے

کی حقیقت بیان کی۔ جنگِ آزادی کی شروعات ۱۸۵۷ء سے ہو کر ۱۹۴۷ء تک پورے ۹۰ سال اس زبان کے خادم نے اپنے قلم کو تیغ جوہر دار اور دودھاری تلوار بنائے رکھا اور اپنی زبان و دہن کو آتش باری اور شعلہ فشانی کے لئے وقف رکھا۔ خاص طور پر صحافیوں نے اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو بدرجہ اتم پورا کیا۔ انھوں نے نہ صرف اپنے آپ کو پوری طرح جہاد بالقلم کے حوالے کر دیا بلکہ مجاہدین حریت کی دلیرانہ سرگرمیوں کو جرأت مندانہ انداز میں پیش کیا۔ قائدین وقت کے گرما گرم اور خرمنِ اعدا پر برقِ بے اماں بن کر گرنے والے خیالات اور بیانات کو عوام تک پہونچانے میں پوری پوری گرم جوشی دکھائی اور شعراء کے آتشیں نغمات نے فضاؤں کو معمور کر دیا۔ اس کی پاداش میں وہ تباہی و بربادی سے لے کر دار و رسن تک کے مرحلوں سے گزرے لیکن یہ بھی تاریخ صحافت کا قابلِ فخر واقعہ ہے کہ ابتلاء و آزمائش کی دشوار گزار وادیوں میں بھی نہ ان کے پائے ثبات میں لغزش آئی اور نہ ان کی جبین جرأت و تہوّر پر کوئی شکن ابھری، کارواں چلتا رہا، قطع مسافت ہوتی رہی۔

[illegible] کر دیا۔

دنیا کی دوسری زندہ اور بیدار اقوام کی طرح ہندوستانی قوم نے بھی اخبارات کی اہمیت و افادیت کا اعتراف و اقرار کیا اور انہیں کو ہتھیار بنا کر حق و باطل کے ہر معرکہ اور دار و رسن کے ہر قضیے میں اپنے حصے کا فریضہ ادا کیا.

یہی وجہ ہے کہ عقیل و فہیم اور باشعور مدبرین حکومت اور صاحبان ثروت و سلطنت نے اپنے اقتدار و اختیار کو برقرار رکھنے کے لئے اخبارات کو بھی ایک ذریعہ کے طور پر استعمال کیا چنانچہ فرانس کے مشہور شہنشاہ نپولین بوناپارٹ کے سوانح نگاروں کا بیان ہے کہ :

"وہ جب کوئی اہم اقدام کرنا چاہتا تھا تو اس سے قبل اخبارات کو اپنا ہم نوا بنا لیا کرتا تھا"

پرنس بسمارک اور گلیڈ اسٹون اپنی سیاست، فراست، تدبر اور دانش مندی کی وجہ سے سارے یورپ کے اور سلطنت پر حاوی ہو گئے تھے، وہ بھی اپنی کامیابی و کامرانی کے لئے اخبارات ہی کے تعاون و اشتراک پر تکیہ کرتے تھے.

انگریز حکمراں بھی اخبارات کی قوت و طاقت سے پوری طرح واقف تھے اور ابتدا ہی سے وہ ترغیب و تحریص کے ہتھکنڈوں سے صحافیوں کو زیر کرنے، اخبارات کو خریدنے یا عزت افزائی اور قدر دانی کے پرفریب عنوانات سے انعام و اکرام کے ذریعہ مالکان و مدیران جرائد کو رام کرنے کی کسی کوشش سے دریغ نہ کرتے تھے، [illegible] خود غرض اور غدار قسم کے عناصر ان کے دام فریب میں آ گئے بھی مگر اردو اہل قلم اور صحافیوں کی ایک بڑی تعداد نے اپنی حب الوطنی، قوم دوستی اور حریت پسندی کا بھرپور مظاہرہ کر کے حاکمان وقت کی ایسی تمام چالوں کو ذرہ برابر بھی اہمیت نہیں دی. وہ برابر حق و صداقت کا ڈنکا بجاتے رہے. جنگ آزادی کے سورماؤں کی رہنمائی کرتے رہے اور جب قید و بند کے ظالمانہ اور آمرانہ شکنجوں کے حوالے کیے گئے تو ترنم گاہ زنداں کو بتا دیا کہ ؎

زباں کو بند کرو یا مجھے اسیر کرو
مرے خیال کو بیڑی پہنا نہیں سکتے

یہ کیفیت تنہا دہلی کے اخبارات کی نہیں تھی بلکہ سارے غیر منقسم ہندوستان کی تھی۔ سارا ملک آگ کا ایک بہت بڑا گولہ بن گیا تھا. سینکڑوں چھوٹے بڑے اور معروف و غیر معروف مقامات سے ہزاروں کی تعداد میں اخبارات میدان میں آ کر آزادی کے سپاہیوں کی ہمتیں بڑھا رہے تھے ان میں سے اکثر کا ذکر تو تاریخ کے صفحات میں بھی نہیں آ سکا.

مشہور ڈرامہ نگار سید امتیاز علی تاج نے ۱۹۱۹ء میں ایک سالنامہ "کہکشاں" لاہور سے نکالا تھا، اس میں ممتاز صحافی اور ادیب قاضی عبدالغفار کا ایک مقالہ بعنوان "اردو صحافت ۱۹۱۸ء تک" شائع ہوا تھا، اس میں اخبارات و رسائل کے بارے میں نادر و نایاب معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ یہ انکشاف بھی کیا گیا تھا کہ:

"میرے (قاضی عبدالغفار) پاس اس وقت [illegible] سو اردو رسائل و اخبارات کے نام اور مختصر حالات موجود ہیں لیکن ۱۸۹۰ء سے پہلے کے پرانے پرچے بہت کم دستیاب ہوتے ہیں .... بعض خاص خاص مقامات کے اخبارات و رسائل کی تعداد بہ لحاظ میری فہرست کے ذیل میں درج کی جاتی ہے:

لاہور (۲۰۲)، لکھنؤ (۱۴۸)، دہلی (۱۳۳)، کلکتہ (۶۵)، حیدرآباد دکن (۴۰)، مرادآباد (۳۵)، مدراس (۲۳)، بنارس (۲۹)، امرتسر (۲۸)، بدایوں (۱۶)، بمبئی (۱۴)، شاہجہاں پور (۱۱)۔"

اگرچہ ضروری نہیں کہ یہ فہرست مکمل ہی ہو، ممکن ہے کہ مذکورہ بالا مقامات ہی سے یا پھر دوسری جگہوں سے نکلنے والے اخبارات و جرائد تک فاضل مضمون نگار کی رسائی نہ ہو سکی ہو. تاہم اس فہرست میں بھی ملک کے ایک بڑے اور باوقار صوبے کی حیثیت سے اتر پردیش نے (جو اُس وقت "ممالک متحدہ آگرہ و اودھ" یا کسی اور نام سے یاد کیا جاتا ہوگا) اس معاملے میں بھی اپنی وقعت و وقار کو برقرار رکھا ہے. اس فہرست میں لکھنؤ [illegible] کا نمبر دوسرا ہے. گویا لاہور کے بعد سب سے زیادہ (دہلی سے بھی زیادہ) اخبارات یہاں سے شائع ہو رہے تھے. اس خطے کے تمام اخبارات کی میزان بھی باقی ملک کے اخبارات کی مجموعی تعداد سے زیادہ ہی ہے. (یہ بات تمام محبان اردو کے لئے قابل فخر ہے).

بعض مقالہ نگاروں اور مقالات کی نا مناسبت کے باعث وہیں سے اکثر دم توڑ گئے مگر تاریخ میں اپنا نام چھوڑ گئے

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

غالباً اسی زمانے میں میرٹھ سے ایک ہفتہ وار اخبار "عالم" نکلتا تھا، اس کے متعلق مشہور مستشرق گارساں دتاسی نے لکھا ہے کہ،

"وہ مقبول ترین اخبار تھا اور اس کی اشاعت ۵۲۰ تھی جو اس زمانے میں غیر معمولی طور پر بڑی اشاعت سمجھی جاتی تھی"

جائزہ لیا جاتا تو دوسرے اخبارات کی اشاعت بھی ممکن ہے اس درجہ نہ سہی تو بھی قابل ذکر حیثیت کی حامل رہی ہوگی کیوں کہ اس دور میں اخبارات کو سرکاری یا غیر سرکاری اشتہارات تو ملتے نہیں تھے وہ خریداروں ہی کے بل بوتے پر چلائے جاتے تھے۔ بہرحال ان میں سے اکثر کی اشاعت ہزاروں میں نہیں تو سیکڑوں میں ضرور رہی ہوگی اور یہ امر کچھ کم اہم نہیں ہے

یہی زمانہ تھا جب لکھنؤ کی سرزمین سے ہفت روزہ "اودھ اخبار" نمودار ہوا۔ منشی نول کشور جو لاہور کے ممتاز اخبار "کوہ نور" کے ادارہ میں شامل تھے، ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ آئے، پریس قائم کیا اور ۲۶ نومبر کو اودھ اخبار نکالا۔ افق لکھنؤ اس سے قبل کئی ستاروں کی تابانیوں سے معمور تھا مگر تازہ اخبار ماہِ درخشاں بن کر طلوع ہوا۔ گارساں دتاسی نے اس کے بارے میں بڑے اچھے خیالات کا اظہار کیا ہے اور بتایا ہے کہ

"اس کی ضخامت چار صفحے سے بڑھتے بڑھتے ۴۸ صفحات تک پہونچ گئی تھی"

مرنجاں مرنج اور صلح کل مسلک رکھتا تھا، اس لئے ہر حلقے میں پسند کیا جاتا تھا، اس کی پالیسی نہ عوام کے لئے وجہ شکایت تھی نہ حکام پر بار خاطر اسی مقبولیت کے پیش نظر ۱۸۷۷ء میں اسے روزنامے کی شکل دے دی گئی۔ نہ صرف اردو زبان کے پہلے روزنامے کی حیثیت سے بلکہ اپنی دوسری داخلی اور خارجی خوبیوں کے باعث وہ آسمان ادب و صحافت پر آفتاب درخشاں بن کر چمکا۔ [illegible] صحافت کے تمام [illegible] سے کما حقہٗ آشنا تھے، اس لئے [illegible] نے صرف [illegible] کے [illegible] اردو کے پہلے روزنامہ کی بلندیوں سے ہمکنار کیا بلکہ اردو اخبار [illegible]

کو معیاری اور باوقار بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اور اعلیٰ صحافت سے اس کی جڑیں اتنی مضبوط کردیں کہ ان کی موت (۱۹ فروری ۱۸۹۵ء) کے بعد بھی نصف صدی سے زیادہ عرصے تک وہ کامیابی کے ساتھ جاری رہا۔

لکھنؤ کے "قدیم اردو اخبار" کے زیر عنوان اپنے ایک مضمون میں جناب اکبر حیدری کشمیری نے ایک مفید اور دلچسپ کتاب "اختر شہنشاہی" کا تعارف کرایا ہے۔ دسمبر ۱۹۹۲ء کے ماہنامہ "نیا دور" میں شائع شدہ اس مضمون کے مطابق کتاب کے مؤلف حاجی سید محمد اشرف لقب اختر الملک (مالک و مدیر اخبار اختر ہند، اشرف گزٹ اور اختر پریس لکھنؤ) نے بڑا اہم کام کیا ہے کہ اس میں ابتدا سے لے کر کتاب کی ترتیب کے وقت (۱۸۸۷ء) تک ہندستان کے طول و عرض سے شائع ہونے والے اخبارات رسائل، گلدستوں اور پرچوں کا تذکرہ شامل کردیا گیا ہے جون ۱۸۸۸ء (۱۳۰۵ھ) میں اختر پریس سے چھپ کر منظر عام پر آنے والی اس کتاب میں شامل کل تذکروں کی تعداد ۱۵۱۸ ہے۔

کتاب میں اخبارات اور مطابع کے مطابق حروف تہجی کے لحاظ سے دیئے گئے ہیں حالانکہ ترتیب کے وقت ذرا زحمت کرلی جاتی اور نام اخبارات کی تاریخ اجرا کے مطابق دیئے جاتے تو اردو صحافت کے تدریجی ارتقاء اور اس زمانے کے قارئین کے ذوق و شوق کا بھی اندازہ کرنے میں آسانی ہوتی۔ اس وقت کے بعض اخبارات و رسائل کا ذکر بھی شامل ہونے سے رہ گیا ہے۔ دوسرے مقامات کے بارے میں تو پوری کتاب دیکھنے کے بعد ہی کہا جاسکتا ہے۔ خود لکھنؤ سے ۱۸۵۹ء میں شائع ہونے والے "مخزن الاخبار" کا نام غائب ہے۔ ۱۸۸۰ء میں لکھنؤ ہی سے عیسائی مشن نے عورتوں کے لئے ایک ہفت روزہ "رفیق نسواں" جاری کیا تھا وہ بھی اس تذکرہ میں شامل نہیں، ممکن ہے ایسے ہی کچھ اور اخبارات کا ذکر سہواً رہ گیا ہو۔ مضمون میں کتاب کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ

"لکھنؤ میں ۱۸۸۷ء تک اودھ اخبار کے علاوہ [illegible] اور روزنامہ اخبار جاری [illegible]

[illegible]"

مطبع گلزار احمد میں چھپتا تھا اور اخلاق پر مشتمل ہوتا تھا
مطبع ... نے کا نام "روداد" تھا۔ یہ پہلے ہفت روزہ
تھا اور بعد میں ... تھا۔ جنوری ۱۸۸۲ء میں اجرا ہوا تھا
اور ... ۱۸۸۵ء کو ... ہوا۔ وہ بڑے اوراق
میں چھپتا تھا۔ اس کے مالک حاجی منشی محمد تیغ بہادر
مہتمم مولوی شیخ محمد صاحب نائب تھے اور مدیر منشی محمد
علی خاں عرشی تھے۔ (نیا دور دسمبر ۱۹۹۳ء)

مضمون سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جناب ریاض خیرآبادی ریاض الاخبار، گلدستۂ ریاض اور فتنہ و عطر فتنہ کے علاوہ دامنِ گلچیں کے بھی مالک تھے یہ گلدستہ لکھنؤ سے منشی امیر مینائیؔ کے زیرِ سرپرستی فروری ۱۸۸۵ء میں جاری ہوا تھا۔ اس زمانے میں شعر و شاعری کا شوق زوروں پر تھا۔ لکھنؤ، الہ آباد، آگرہ، بدایوں، میرٹھ اور بلند شہر وغیرہ میں اکثر طرحی مشاعرے ہوا کرتے تھے، ان کی رپورٹیں گلدستوں کی شکل میں شائع کی جاتی تھیں۔ یہ گلدستے وقت کے شاعرانہ رجحان اور ادب کے آئینہ دار ہوتے تھے اور کسی نہ کسی ہج سے جدوجہدِ آزادی کا ذکر بھی کرتے رہتے تھے۔

اختر الدولہ نے اپنی کتاب کے تقریظ نگار مولوی عبدالحلیم شررؔ کے جریدہ 'دلگداز' کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے جو ۱۸۸۷ء کے شروع میں نکلا تھا۔ پیامِ یار کے بارے میں بتایا ہے کہ اس کے سرورق پر یہ شعر درج ہوتا تھا ؎

نالۂ بلبلِ شیدا تو سنا ہنس ہنس کر
اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی

"انجمنِ ہند" نامی ہفت روزہ واجد صاحب محمود آباد نکالتے تھے۔ اس کا آغاز اس شعر سے ہوتا تھا ؎

تیرے کرم سے انجمن اخبار با خبر
ہر بزم وانجمن میں ہو مطبوع دل پذیر

اس زمانے میں منشی سجاد حسین لکھنؤ سے اودھ پنچ نکالتے تھے۔ یہ ظریفانہ ہفت روزہ ... ۱۸۷۷ء سے جاری ہوا۔ ... سے ... اس وقت کے اخبارات میں اخبار عام ... ہے

"پہلی جنگِ آزادی کی صد سالہ سال گرہ" کے موقع پر ۱۹۵۷ء میں "نوائے آزادی" کے نام سے ایک قابلِ قدر کتاب منظرِ عام پر آئی جو اردو کی ان تحریروں، تقریروں، نظموں، افسانوں، ڈراموں اور اقتباسات کے اداریے پر مشتمل ہے جنھوں نے پہلی جنگِ آزادی کی تحریک اور تیاری سے لے کر عہدبہ عہد جہادِ حریت کے چراغ کی لو کو تیز رکھا۔ حریت و حرارت ذہن و ضمیر کے جذبات کو ہوا دی اور سورماؤں کے حوصلے بڑھائے۔ اس کے شروع میں باغی سپاہیوں کے نام جاری ہونے والے احکام، شاہی فرمان اور علمائے کرام کی جانب سے جاری فتویٰ جہاد وغیرہ بھی شامل ہے اور بعض کے عکس سے بھی کتاب کو مزین کیا گیا ہے۔ اس کتاب سے پوری طرح عیاں ہوتا ہے کہ جنگِ آزادی میں اردو اہلِ قلم نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا بلکہ ملک کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں اپنا پلہ بھاری رکھا۔ کتاب کی اشاعت کے لیے بجا طور پر انجمن اسلام بھی مستحقِ ستائش اور لائقِ مبارک باد ہے۔

'نوائے آزادی' کے مقدمہ "جنگِ آزادی میں اردو کا حصہ" میں جناب عبدالرزاق قریشی کی اس رائے سے اختلاف کی گنجائش نہیں کہ:

"....آزادی کی اس جدوجہد کے لیے زمین ہموار کرنے اور عوام میں بیداری پیدا کرنے میں علماء، ادبا اور شعراء کا نمایاں حصہ ہے۔ ان میں امام بخش صہبائیؔ، مولانا فضلِ حق خیرآبادی، مفتی صدرالدین آزردہؔ، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ، تیغ شکوہ آبادی وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ لیے جا سکتے ہیں۔"

عوام میں حریت اور وطن دوستی کا جذبہ بیدار کرنے میں اخبارات کے نمایاں کردار کا اعتراف کرتے ہوئے قریشی صاحب نے "اودھ پنچ" کے بارے میں کہا ہے کہ:

"اودھ پنچ ۱۸۷۷ء میں جاری ہوا۔ اس وقت ملک میں سیاسی شورش نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ابتدائی پرچوں میں انگریزی حکومت سے زیادہ مغربی تہذیب و تمدن پر طنز ہے۔ جب ملک میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی تو اودھ پنچ نے بھی اس طرف

زور کب سے [illegible] صحافت [illegible] سے [illegible] کے
[illegible] آ گئے [illegible] ریاستوں میں
[illegible] مضمون پہلی بار [illegible] سخت تنقید
[illegible] اس کے [illegible] ہوتے تھے۔ اس
دور میں جبکہ اخباروں کو آج کی سی آزادی حاصل
نہ تھی، اودھ پنچ کا انگریزی حکومت پر دلیری کے
ساتھ تنقید کرنا قابل ستائش ہے۔"

انیسویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے اردو اخبارات و رسائل نے ملک کے کونے کونے میں دھوم مچادی۔ اسی دور (۱۸۹۹ء) میں منشی محبوب عالم نے گوجرانوالہ سے اخبار "ہمت" نکالا اور مرزا حیرت دہلوی نے دہلی سے "کرزن گزٹ"، مولوی عبدالحق (بعد کے بابائے اُردو) کے برادر بزرگ منشی ضیاء الحق نے "پیشوا" جاری کیا۔ (بہت دنوں بعد جناب عزیز حسن بقائی نے دہلی سے اسی نام کا مذہبی ماہنامہ جاری کیا)۔

بیسویں صدی کا آفتاب حقیقی معنوں میں عالم تاب و حرارت تاب بن کر طلوع ہوا۔ یہی وہ صدی ہے جس کی ہوائے حریت کی تیغ سے غلامی کی ان بیڑیوں کے کٹ کر گر جانے کی پیش گوئی کرتے ہوئے جو ہم نے خود اپنے پیروں میں ڈال لی ہیں، وقت کے ایک مدبر (مولانا ابوالکلام آزاد) نے مسلمانان ہند کو ان الفاظ میں چونکایا تھا کہ:

"غفلت و سرشاری کی بہت سی راتیں بسر ہو چکی ہیں، اب خدا کے لیے بستر مدہوشی سے سر اٹھا کر دیکھیے کہ آفتاب کہاں تک نکل آیا ہے؟ آپ کے ہم سفر کہاں پہونچ گئے ہیں اور آپ کہاں پڑے ہیں یہ نہ سمجھیے کہ آپ اور کوئی نہیں بلکہ مسلم ہیں اور اسلام کی آواز آپ سے آج بہت سے مطالبات رکھتی ہے۔"

(ندائے آزادی)

منشی محبوب عالم نے جو گزشتہ صدی کے آخری دنوں میں اخبار نویسی کے میدان میں داخل ہوئے تھے، تیز رفتاری سے آگے بڑھ کر روزنامہ "پیسہ اخبار" ہفت روزہ پیسہ اخبار، ہفت روزہ (انتخاب لاجواب، ہفت روزہ شریف بی بی (خواتین کے لیے) اور ہفت روزہ بچوں کا اخبار (بچوں کے لیے) جاری کر کے اردو کی [illegible] صحافت کی [illegible] شروعات کی۔ گوجرانوالہ ہی کا [illegible] مولوی [illegible] خواتین کا اخبار جاری کر رہے تھے۔ مولوی سید ممتاز علی کے تہذیب نسواں (عورتوں کے لیے) اور پھول (بچوں کے لیے) بھی بڑا مقبول ہو رہے تھے۔ مولانا ظفر علی خان ابھی تک حیدرآباد دکن میں ملازمت کر رہے تھے۔ اس وقت کون جانتا تھا کہ ایک دن یہ شخص شعلہ نوا خطیب، انقلابی نو گو شاعر اور بہترین صحافی کی حیثیت سے اُردو دُنیا میں نام پیدا کرے گا۔ ان کے والد مولوی سراج الدین احمد نے البتہ اپنے گاؤں کرم آباد سے ہفت روزہ "زمیندار" جاری کر رکھا تھا جو صرف اپنے علاقے کے زمینداروں کی ماندگی اور ان کے حقوق کی ترجمانی کرتا تھا۔ ۱۹۱۱ء میں حیدرآباد چھوڑ کر مولانا ظفر علی خاں "زمیندار" کو لاہور لے آئے اور پھر انھوں نے اپنے علم و قلم اور عزم و ہمت کے جوہر دکھائے۔

اُردو کے نامور صحافی میر جالب دہلوی جنھوں نے بعد میں لکھنؤ کے ہمدم کی ادارت کے ذریعہ بہت نام کمایا، اس وقت پیسہ اخبار میں کام کرتے تھے، دہلی سے مولانا محمد علی نے ہمدرد جاری کیا تو اُن کی رفاقت کے لیے پہنچ گئے۔ "الہ دینا" تھا روزنامہ "وکیل" اور ہفت روزہ ہمالہ سے لاہور کی بزم سجائے ہوئے تھے اور راشد الخیری دہلوی کا ہفتہ وار "ہندوستان" سرگرم تھا کہ سر عبدالقادر مخزن لے کر آ گئے اور رونق محفل بن گئے۔ اس رسالہ کو سب سے بڑا اعزاز یہ حاصل تھا کہ ڈاکٹر محمد اقبال کی پہلی نظم "ہمالہ" اسی کی زینت بنی بعد میں بھی اقبال کا بیشتر کلام مخزن ہی کے ذریعہ لوگوں تک پہونچتا تھا۔ اس کے مضمون نگاروں اور شاعروں میں اس وقت تک ممتاز اور مشہور اہل قلم شامل تھے۔ اسی زمانے میں "زمانہ" کانپور منظر عام پر آیا جس کے ایڈیٹر اور مالک منشی دیا نرائن نگم تھے جن کے بارے میں جوش نے کہا تھا ؎

مری نگاہ خلوص بین نے دیا نرائن نگم کو دیکھا

نگم صاحب ایک وضعدار شخص تھے جو قومی یک جہتی کے شیدائی تھے اور انھوں نے زمانے کو ملک کی مشترکہ تہذیبی ورثہ کا آئینہ دار بنایا۔ بعد میں انھوں نے ایک ہفتہ وار اخبار بھی "آزاد" کے نام سے جاری کیا۔ یہ دونوں (زمانہ اور آزاد) نگم جی کے انتقال کے بعد عرصہ تک جاری

[illegible] اودھ پنچ کے [illegible] مولانا حسرت موہانی [illegible] کی
[illegible] اور [illegible] جناب محمد یعقوب [illegible]
[illegible] الہلال [illegible] کے آخری شمارے ۱۹۲۰ء میں نکلے۔

خیالات کی شعلہ فشانی اور زبان کی جادو بیانی کے ساتھ تحریر اور تقریر کے میدان میں مولانا ابوالکلام پہلے ہی جھنڈے گاڑ چکے تھے۔ کلکتہ کے افق سے الہلال نے شرر باری کی تو سارے ملک کی فضا روشن اور درخشاں ہوگئی۔ طرابلس اور بلقان کی جنگوں نے مسلمانانِ ہند کے قلوب کو غیرت ملی اور حمیت وطنی کے جذبات سے معمور کر دیا تھا۔

جنگ کے بعد حالات نے کروٹ لی جو اردو صحافت کے لئے خوش آئند ثابت ہوئی اور وہ اپنے روایتی جوش و خروش اور نئے عزم و حوصلے کے ساتھ آزادی کی تڑپ لے کر میدانِ عمل میں آگئی۔ عروس البلاد بمبئی نے انگڑائی لی تو خلافت، اجمل، ہلال اور انقلاب وغیرہ ہر صبح عوامی بیداری کے نقیب بن کر منظرِ عام پر آنے لگے۔ کلکتہ سے سید حبیب نے سیاست نکالا، پیغام، عصرِ جدید اور ہند بھی کلکتہ ہی سے نکلے۔ لکھنؤ سے جناب رئیس احمد عباسی نے حقیقت اور جناب عبدالرؤف عباسی نے حق جاری کیا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے سچ کے نام سے ایک جاندار ہفت روزہ جاری کیا جو مولانا کی منفرد انشاء پردازی کی وجہ سے مقبولِ خاص و عام ہوا اور بعد میں صدق اور صدقِ جدید کی شکل اختیار کرتا ہوا عرصہ دراز تک انشائے ماجدی کے شوقینوں کی تسلی کا سامان فراہم کرتا رہا۔ دہلی سے وحدت، الامان، جنگ اور الجمعیۃ وغیرہ روزناموں اور ہفتہ واروں کے ساتھ ساقی اور شہود وغیرہ کئی اچھے علمی و ادبی ماہنامے بھی نکلنے لگے۔ اسی زمانہ میں لالہ دیش بندھو گپتا نے تیج کے نام سے اردو روزنامہ نکالا جس کا ہفت روزہ ایڈیشن "تیج ویکلی" قابلِ دید اور لائقِ مطالعہ ہوتا تھا۔ لاہور کے بعض پرانے روزناموں کے ساتھ کئی نئے روزنامے جاری ہوئے جن میں انقلاب، احسان، شہباز اور زمیندار (روزنامے) وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ساتھ ہی بہت سے ہندوؤں اور سکھوں نے بھی ہند، آدم، [illegible] پرتاپ، پربھات، [illegible] اور ریاست وغیرہ کے نام سے روزنامے [illegible] روزنامے بھی نکالے۔ ان میں

[illegible] حکومت دشمنی کے لئے معروف تھے [illegible]
[illegible] ضمانت ضبط [illegible] سے گزرنا پڑتا تھا [illegible]
[illegible] نہیں ہوتے تھے۔

اس زمانے میں [illegible] روزنامہ اخبار [illegible] کے وقت شائع نہیں ہوتا تھا (معلوم نہیں کیوں؟) اور انگریزی اخبار "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کے حساب ایک ایک آنے میں بکتے تھے۔ سب سے پہلے پرتاپ نے یہ روایت توڑی اور وہ شام کے بجائے صبح شائع ہونے لگا۔ اس کے بعد بھی عرصہ تک دوسرے اخبارات شام ہی کو شائع ہوتے رہے لیکن آخر سب کو پرتاپ کی تقلید کرنی پڑی۔ گنگا جمنا اور سرسوتی کے سنگم (تربینی) کی سرزمین الہ آباد سے جناب پیارے لال شاکر میرٹھی نے ادیب اور الناظر کے نام سے اعلیٰ درجے کے دو ادبی ماہنامے اسی دور میں جاری کیے جو باتصویر شائع ہوتے تھے۔ لکھنؤ سے سرسوتی بھی یک رنگی اور سہ رنگی تصویروں کے ساتھ شائع ہوتا تھا۔ زمانہ بھی باتصویر ہوتا تھا بجنور سے مشہور سہ روزہ مدینہ بھی اسی زمانے میں جاری ہوا۔

خاتمۂ جنگِ عظیم (۱۹۱۸ء) کے بعد قائدینِ وطن کو یقین تھا کہ حالات میں انقلاب آفریں تبدیلی آئے گی اور انگریز حکمران ہندوستان کو آزاد کرنے کی راہ میں پیش قدمی کریں گے۔ ایک سال قبل خود وزیرِ ہند مسٹر مانٹیگو نے رفتہ رفتہ ہندوستان کو حکومتِ خود اختیاری سونپنے کا اعلان کر کے امید بندھائی تھی کہ اب آزادی کی منزل دور نہیں ہے۔ لیکن بدعہد و ناشناس اور احسان فراموش حکمرانوں نے ہماری وفاداری کا صلہ "رولٹ بل" جیسے سیاہ قانون کی شکل میں دیا جو غلامی کی زنجیروں کو مزید مضبوط تر بنانے کی ایک سنگین کوشش تھی۔

اس قانون نے اہلِ ملک کے تن بدن میں آگ لگا دی، اخبارات نے شعلہ فشانی کی اور عوام اپنی بے پناہ بے چینی کا اظہار کرنے کیلئے سڑکوں پر نکل آئے۔ احتجاجی ہڑتالوں، جلسوں اور جلوسوں وغیرہ کا سلسلہ جاری ہو گیا، فضائیں گرما گرم نعروں سے گونج اٹھیں۔ حاکمانِ وقت کے تنخواہ دار غلاموں اور بے ضمیر خوشامدیوں کو وفاداری اور جاسوسی کرنے کا موقع ملا، فوج اور پولیس کے جوانوں نے ہتھیار سنبھالے اور نتیجے کے طور پر ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو جلیانوالا باغ (امرتسر) کا وہ المیہ رونما ہوا جس نے پورے



[illegible]

بہت سے ... اخبارات میں اشاعت پذیر ہوئے۔ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خاں وغیرہ کے مضامین نثر و نظم نے بھی انگریزوں کی درندگی کو بے نقاب کیا۔ اقبال بھی خاموش نہ رہ سکے اور چیخ پڑے۔

ہر زائر چمن سے یہ کہتی ہے خاک باغ
غافل نہ رہ جہان میں گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خون شہیداں سے اس کا تخم
تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس نہال سے

تحریک خلافت اور ترک موالات کا عہد ہماری جدوجہد آزادی کی تاریخ کے ایک زریں باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ گاندھی جی، علی برادران اور دوسرے علمائے کرام [illegible] کی سرگرمیوں [illegible] نے ملک کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کر دیا۔ [illegible] نے حسب معمول مجاہدانہ قیادت کا کردار ادا کیا۔ اس زمانے میں معلوم و معروف قائدین کے دوش بدوش کچھ نئے [illegible] رہنما [illegible] میدان میں آ گئے جن میں مولانا [illegible] طور پر قابل ذکر ہیں۔

علی برادران کی والدہ [illegible] میدان میں [illegible] (۱۹۲۱) کی صدارت [illegible]

[illegible]

[illegible]

ملائم سنگھ سرکار کی

اہم کامیابیاں

- پس ماندہ سب سے پچھلے اور کمزور طبقوں کی سماجی ترقی کے لئے دور رس اور زیادہ فیصلے۔
- ریاست کی تاریخ میں پہلی مرتبہ منصوبے کی رقم کا ۱۰ فیصد حصہ دیہی ترقی کے لئے۔
- کسان پنشن اسکیم نافذ۔ بیس لاکھ خاندانوں کے مستفید ہونے کی امید۔
- اقلیتوں کے تحفظ اور عزت کی ضمانت۔
- سانحۂ بابری مسجد کی تشکیل کی کارروائی شروع۔
- موجودہ حکومت کے تقریباً تمام وعدے پورے۔

[illegible]

[illegible] صاحب سے عزیز تر تھے۔

خلافت کمیٹی سے شائع ہونے والا ہفت روزہ تھا جسے بیک وقت اخبار کہا جا سکتا تھا جو مولانا آزاد، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خان، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی جیسی شخصیتوں کے فیصلے اور اتفاق سے ۱۹۲۲ء تک جاری رہا تھا۔

[illegible] کیا ہے کہ:

"[illegible] تحریک خلافت اور اشاعت کے [illegible] مسلم اور انگریزی وغیرہ کے اہم معروف اخبارات کی تشہیر کرتا تھا۔"

(انقلاب بمبئی ۱۹ اگست ۱۹۲۲ء)

اخبار خلافت سے مولانا آزاد کی تحریر شامل تھی۔ اس کا ادارہ اس خط سے ملتا ہے جو خلافت کمیٹی نے ۲۳ جولائی ۱۹۲۲ء کو حاجی احمد علی کو لکھا تھا۔

اخبار خلافت روزانہ جو مرکزی خلافت کمیٹی کی جانب سے نکلتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت بھی مالی تنگی اور بڑی مشکل میں ہے اور اس وقت تک جو ایڈیٹر رہے ہیں ان پر مقدمہ چلائے جا رہے ہیں۔ [illegible] آپ اس کی ایڈیٹری کا چارج لے لیں۔ [illegible] مجھے امید ہے آپ قبول فرمائیں گے۔

(نقش آزاد)

□□

سڑکیں

لے کے ہاتھوں میں ہاتھ سڑکوں پر
بات کرو گھر کی بات سڑکوں پر
جسم پہ روشنی پہنے ہوئے
رقص کرتی ہے رات سڑکوں پر
کاسۂ غم اٹھائے ہاتھوں میں
گھومتی ہے حیات سڑکوں پر
چاند سورج کو دوڑتے دیکھا
کار کے ساتھ ساتھ سڑکوں پر
دن گزرتا ہے دفتروں کے قریب
اور کٹتی ہے رات سڑکوں پر
مڑ کر چوکر گزر گیا اکثر
پھول سا نرم ہاتھ سڑکوں پر

احتشام الہ آبادی — ۱۳/۷ کا بج روڈ، الہ آباد

نورِ پیکر

پھر آگئی وہ گھڑی کہ جس کو
ہم سمجھ رہے تھے
اور اس کی نبض کے زخم جو ٹوٹے
تباہ کرنے پہ تل گئے وہ حسین منظر
کہ جن کی تشکیل کی تھی صدیوں کی محنتوں نے محبتوں نے

وہ بوڑھا برگد
کہ جس کے سائے میں زندگی دلکشی بنی تھی
عجب اندھیروں میں گھر گیا تھا
وہ ٹھنڈا چشمہ
جو اپنے جادو سے پیاس کا روگ کاٹتا تھا
منافرت کی فضا کے ہاتھوں
شکار تفریق بن گیا تھا
وہ گیت سارے
جو دل کی دنیا کے ترجماں تھے
جو بوڑھے ہو کر بھی نوجواں تھے
زباں سے جیسے اتر گئے تھے......

عجب نہ ہوتا
جو اس مکدّر فضا کا جادو
ہمارے آئینِ زندگی کو
شکست کا ذائقہ چکھا کر
ہمیں اندھیروں کے بازوؤں میں دھکیل دیتا
مگر ہماری مدد کو آیا
وہ نورِ پیکر
جو دشتِ ماضی کے زخم زاروں سے نیزہ نیزہ ابھر رہا تھا

اندر سروپ دت نادان
بی ۳/۲۹۹ پچھم وہار، نئی دہلی ۱۱۰۰۱

دعا

دراصل لطف جب ہے غمِ یار دے
وہ اُمنگ دے جو چہرۂ ہستی نکھار دے

ایمانِ زندگی ہے مجھے ایسا پیار دے
وہ درد دے کہ جس کو نہ کوئی قرار دے

انسانیت کو فخر ہو، تہذیب کو بھی ناز
یارب مری حیات کو وہ شاہکار دے

میں محوِ رقص، جامِ صفت حشر تک رہوں
اے چشمِ مست! تو مجھے ایسا خمار دے

رحمت بھی تیری دیکھ کے پھر مسکرا اُٹھے
توفیق اس گناہ کی پروردگار دے

ذرّہ کو آفتاب بنا دے ترا کرم
چاہے تو ایک قطرہ میں دریا اُتار دے

عشقِ جنوں نواز کے قصّہ بانی چاہیے
اظہار وہ بنا دے تو دنیا سنوار دے

——— اظہار شادانی
پرچہ یا پینسارگ
(معمار ۔ ۲۵)

ملائم سنگھ حکومت کا ایک سال

گزشتہ سال دسمبر میں جب ملائم سنگھ یادو کو اتر پردیش میں دوبارہ حکومت سازی کا موقع ملا تھا اور انھوں نے بہوجن سماج پارٹی کے تعاون سے حکومت کی تشکیل کی تھی تب بہت سے سیاسی پنڈتوں نے پیش گوئی کی تھی کہ یہ حکومت زیادہ دن نہ چل سکے گی۔ اب جبکہ حکومت کو ایک سال مکمل ہو رہا ہے، سب سے زیادہ پریشان وہی سیاسی لوگ ہیں جن کو اس حکومت کے استحکام کی ذرا بھی امید نہ تھی، اس لیے اب بجائے ستائش کے وہ طرح طرح کی باتیں کر رہے ہیں لیکن دھیرے دھیرے وہ سب بے سود ثابت ہو رہی ہیں۔

ملائم سنگھ کو یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ ملک کی سیاست میں دلتوں اور اقلیتوں کا بڑا دخل ہے۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ دیہی عوام کی خواہشات اور امنگیں بھی ان سے وابستہ ہیں اسی لیے انھوں نے حکومت سازی کے بعد ہی اعلان کیا تھا کہ اب ان کو سینہ تان کر چلنے کا موقع فراہم کیا جائے گا جن کو سر جھکا کر چلنا پڑتا تھا اس لیے ملائم سنگھ کی حکومت نے بہت سے اہم فیصلے کیے۔

ملائم سنگھ حکومت کا سب سے اہم فیصلہ یہ تھا کہ منڈل کمیشن کی سفارشات کے عین مطابق سرکاری ملازمت میں پسماندہ طبقات کے لئے ۲۷ فیصد، اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کے لیے بالترتیب ۲۱ فیصد اور ۲ فیصد ریزرویشن کا انتظام قانون کے تحت ہوگا۔ اسی طرح طبی تعلیم اور تکنیکی تربیتی اداروں میں یعنی سی پی ایم ٹی، انجینیرنگ کالج اور پالی ٹکنک میں پس ماندہ طبقوں کے لئے ۲۷ فیصد اور اقوام مندرجہ فہرست کے لئے ۲۱ فیصد ریزرویشن کا انتظام کیا گیا ہے۔

ملائم سنگھ حکومت کا دوسرا سب سے اہم فیصلہ اقلیتی کمیشن کو قانونی درجہ دینا تھا جبکہ اس سے قبل کی حکومت نے اقلیتی کمیشن کو ختم کر دیا تھا۔ اب اقلیتی کمیشن کوئی سفارش نہیں کرے گا بلکہ حکم دے گا اور خطاکار کو سزا بھی سنائے گا۔ اس طرح اقلیتوں میں اعتماد بحال ہوا ہے اور اب وہ ناجائز طور پر پریشان کیے جانے پر اقلیتی کمیشن کی مدد حاصل کر سکتے ہیں۔

اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لئے ملائم سنگھ یادو کی حکومت نے گزشتہ ایک سال میں بہت کچھ کیا ہے جو یقیناً قابل ستائش ہے۔

ابتدائی سطح پر جن بچوں کی مادری زبان اُردو ہے ان کی اردو کی تعلیم کا معقول بندوبست کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں فیصلہ کیا گیا ہے کہ کسی پرائمری اسکول میں پانچ سے زیادہ بچوں کی مادری زبان اُردو ہوگی تو وہاں ایک اردو مدرس اور اگر ۵۰ ایسے بچوں کی مزید تعداد ہوگی جن کی مادری زبان اردو ہوگی تو وہاں ایک اور اُردو مدرس کی تقرری ہوگی۔

ایک اندازے کے مطابق اتر پردیش کے پرائمری اسکولوں میں تقریباً ۳ ہزار اور جونیر ہائی اسکولوں میں تقریباً ایک ہزار اردو اساتذہ کی تقرری ہوگی۔ اس سلسلے میں بہت کچھ ہو چکا ہے اور بعض جگہوں پر اساتذہ کی تقرری کے لئے ان کو تقرری کے پروانے بھیجے جا رہے ہیں۔

ثانوی سطح پر بھی مرکزی حکومت کی لسانی پالیسی کے مطابق سہ لسانی فارمولا میں اردو زبان کو مناسب درجہ دیا گیا ہے اور یہ کوشش کی گئی ہے کہ جہاں اُردو پڑھنے کے خواہش مند طلبا ہوں ان کی اُردو تعلیم کا معقول بندوبست ہو۔

ابتدائی اور ثانوی سطح پر اُردو کی نصابی کتب کی طباعت اور فراہمی کے لئے ریاستی حکومت معقول بندوبست کے لیے کوشاں ہے۔ فی الوقت ریاست میں دس فیصد مراکز میں اردو زبان میں غیر رسمی تعلیم

کے بندوبست کی کوشش کی جارہی ہے کہ ۹۵-۱۹۹۴ء میں اترپردیش میں دو ہزار ایسے مراکز ہوں جن میں اُردو کی غیر رسمی تعلیم کا معقول بندوبست ہو۔

ناخواندگی کو دور کرنے کے لیے ناخواندہ افراد کو اُردو کے ذریعہ بھی اپنی ناخواندگی دور کرنے کے مواقع فراہم کیے جارہے ہیں۔

اترپردیش کے ہر محکمے کے ہر دفتر میں ایک اُردو مترجم کو تعینات کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس سلسلے میں ابتدائی کارروائی ہوچکی ہے۔ اُردو اساتذہ کی تربیت کے لئے بھی بندوبست کرنے کیلئے ریاستی حکومت نے کوششیں شروع کردی ہیں۔

مسلمانوں میں ناخواندگی کی شرح زیادہ ہونے کے سبب ان کی پسماندگی دور کرنے کا کام حکومت کا ہوتا ہے اس لئے ریاستی حکومت نے مسلمانوں کی ناخواندگی دور کرنے کے لئے مسلم اکثریت والے علاقوں میں تعلیم کا بندوبست کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ایسے علاقے جن میں زیادہ مسلمان رہتے ہیں وہاں ضرورت کے مطابق ابتدائی درجے پرائمری اسکول اور انٹر کالج کھولے جانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ بہت سے ایسے مسلم اداروں کو اقلیتی ادارے تسلیم کیا گیا جن کو برسوں سے بطور اقلیتی تعلیمی ادارے کے، تسلیم نہیں کیا جارہا تھا۔ اس طرح مسلمانوں کو اپنے طور سے اپنے تعلیمی ادارے چلا کر مسلمانوں کو تعلیم یافتہ بنانے کے بہتر مواقع فراہم ہوں گے۔

یاد رہے کہ ہندوستانی آئین کی رو سے اقلیتی فرقوں کو دفعہ ۳۰ کے تحت اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور چلانے کا اختیار حاصل ہے لیکن اب تک اس پر مشکل ہی سے عمل درآمد ہوتا تھا لیکن ملائم سنگھ یادو کی موجودہ حکومت نے قانونی طور سے چلائے جانے والے مسلم تعلیمی اداروں کو دفعہ ۳۰ کے تحت مکمل آزادی دینے کا فیصلہ کیا ہے اس کا یقیناً اچھا اثر ہوگا۔ مسلمانوں میں نہ صرف اعتماد بحال ہوگا بلکہ وہ تعلیمی اداروں کو زیادہ لگن اور خلوص سے چلا کر قوم کو علم کی دولت سے مالا مال کرسکیں گے۔

ملائم سنگھ یادو کی حکومت نے اقلیتوں اور دلتوں کی حالت سُدھارنے کے ساتھ ساتھ کسانوں کی حالت سدھارنے کی بھی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ ملائم سنگھ یادو کا کہنا ہے کہ اترپردیش میں ۹۰ فی صد لوگ وہ ہیں جو کمزور ہیں ان میں اقلیتیں بھی ہیں اور دلت بھی کسان مزدور بھی اور مظلوم و محکوم بے سہارا اور بے روزگار بھی اس لیے ریاست کی بہتری اور خوشحالی کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ ۹۰ فی صد عوام کے معیار حیات کو بلند کرنے کی ہر ممکن کوشش ہو۔

ملائم سنگھ یادو کی حکومت نے ریاست کی آمدنی کا بیشتر حصہ دیہی عوام کی فلاح و بہبود کے لئے مختص کیا ہے اور ریاست کے اسی فی صد سے زیادہ دیہی علاقوں میں ۱۶ گھنٹے اور کہیں کہیں اس سے بھی زیادہ بجلی کی فراہمی کو یقینی بنایا ہے۔

آب پاشی کے بہتر بندوبست کے لیے تمام نہروں اور ذیلی نہروں میں آخری سرے تک آب رسانی کی کوشش کی جارہی ہے۔ گنا کسانوں کو اس سال سب سے زیادہ اجرت دلائی گئی ہے۔ گنے کی قیمت کی ادائیگی بھی تقریباً مکمل کردی گئی ہے۔

اترپردیش کے کسانوں کو ان کی پیداوار کی مناسب قیمت دلانے کے لئے گیہوں، دھان اور موٹے اناج کو ریاست سے باہر بھیجنے کی پابندی ختم کردی گئی ہے۔ منڈی کمیٹیوں میں کسانوں اور تاجروں کی نمائندگی کے لئے منڈی کمیٹیوں کو انتظامیہ کی گرفت سے آزاد کرایا جارہا ہے۔

اب کھلیان حادثہ بیمہ اسکیم شروع کی گئی ہے۔ چند شرائط کے ساتھ نجی ٹیوب ویلوں کی بجلی کے بقایاجات پر دی گئی رعایت کے تحت واجب الادا رقم معاف کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے اس سے کسانوں کو مجموعی طور پر ستر کروڑ روپئے کی راحت ملے گی۔

اترپردیش میں ۲۵ نئی شکر ملیں قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ہندوستان میں پہلی بار اترپردیش میں کسانوں کے لیے پنشن کا بندوبست کیا گیا ہے۔ ساٹھ سال کی عمر سے زیادہ اور ڈھائی ایکڑ سے کم زمین رکھنے والے بے سہارا کسانوں کو ۱۲۵ روپئے ماہوار کی شرح سے پنشن دینے کا کام شروع ہوگیا ہے اور اس سال دو لاکھ بے سہارا کسانوں کو کسان پنشن اسکیم سے مستفید کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

ضعیفوں کے تئیں سماج کی ذمہ داری کو ملائم سنگھ یادو سرکار نے محسوس کیا ہے اور ۹۵-۱۹۹۴ء میں ضعیفوں کی پنشن اسکیم کے تحت
(باقی صفحہ ۔۔۔ پر)

کڑی جدوجہد - کامیاب کوششیں

نو منتخب حکومت کو ایک برس کڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ مگر کاروانِ ترقی بڑی تیز رفتاری سے آگے بڑھتا رہا۔ امیدیں روشن رہیں۔ حوصلے بیدار رہے۔ اسے خدا کا فضل اور قیادت کا کمال کہئے کہ نامساعد حالات کس طرح درست ہو گئے۔ وہ دیہات جہاں مدتوں سے اندھیروں نے ڈیرا جما رکھا تھا وہاں اجالوں نے پڑاؤ ڈال دیا۔ جہاں افسردگی کی فضا منعقد ہو گئی تھی وہاں مسرت کی شاداب کونپلیں پھوٹنے لگیں۔ زندگی کی کڑی دھوپ سے بچنے کے لیے سایہ دار درخت جگہ جگہ نظر آنے لگے۔ سرکار نے اپنی پالیسی اس طرح وضع کی کہ سبھی کے چہرے شگفتہ دکھائی دینے لگے اور الیکشن مینوفسٹو میں کئے گئے تمام اعلانات تکمیل کے مرحلے میں داخل ہو گئے۔ آزادی کے بعد یہ پہلی ریاستی حکومت تھی جسے واقعی غریبوں کی حکومت کہا جائے۔ وقت نے اس کی باگ ڈور اس کے ہاتھوں میں سونپ دی۔ اس طرح ایک تاریخ ساز عمل کا آغاز ہو گیا۔ ڈاکٹر رام منوہر لوہیا اور بابا صاحب امبیڈکر کی فکر رنگ لا کر رہی۔ ان کے نظریات کو فروغ ملا۔ پورے ملک میں سماج وادی ابھرتے نے بھی احساس پیدا کیا کہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ جمہوریت کی جڑیں سماجی ناہمواری، عدم مساوات ان میں کسی کو مضبوط اور کسی کو دور کرنے کے لیے سوشلسٹ فلسفہ کی ضرورت ہے۔ اب ہم اسی سمت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اتر پردیش کی خوش نصیبی ہے کہ اسے ملائم سنگھ یادو جیسا قائد ملا جس کی بصیرت کے مخالفین بھی قائل ہو گئے ہیں۔

ملائم سنگھ کی قد آوری کسی الفاظ کی محتاج نہیں رہی ہے۔ اپنے عمل اور سچی تدبیر سے انہوں نے بگڑے ہوئے ماحول کو جس طرح سازگار کیا ہے وہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ ریاست کے مسائل پر ان کی بڑی گہری نظر ہے۔ وہ [illegible] اقلیتوں [illegible] کرتے ہیں اور سبھی طبقوں کے مسئلوں کو ہمدردی کے ساتھ حل کرنے کا عزم کئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ [illegible] سے کہا کہ ہم دلتوں، غریبوں اور دیگر پسماندہ افراد پر ظاہر کر دینا چاہتے ہیں کہ ہماری حکومت دیگر طبقے کے کمزور اور غریب افراد کی ترقی کے لیے کام کرے گی۔ تمام طبقات کے ساتھ انصاف ہوگا کسی بھی طبقے سے متعلق افراد کے ساتھ ظلم یا استحصال نہیں ہوگا۔ ہمیں یاد آ رہے ہیں ڈاکٹر امبیڈکر کے وہ الفاظ کہ ایک مثالی سماج کو تیز قدم ہونا چاہئے۔ اگر سماج کے کسی شعبہ میں تبدیلی ہوتی ہے تو اس کا اثر دیگر شعبوں پر بھی پڑ سکے۔ اس کے لیے وسائل مہیا ہونے چاہئیں۔ مثالی سماج آزادی اور مساوات اور جذبۂ اخوت سے تشکیل پاتا ہے۔ یہاں صرف اس امر کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ موجودہ حکومت کن نظریات کی پابند ہے اور کس طرح ایک خوشحال اور پُرامن معاشرہ تشکیل دینا چاہتی ہے۔ ملائم سنگھ سرکار نے آتے آتے جو پہلا اعلان کیا وہ یہ کہ ترقیاتی بجٹ کا ستر فیصد حصہ دیہی علاقوں کی ترقی کے لیے صرف کیا جائے گا۔ دیہی علاقے کے لوگوں کو روزگار فراہم کرنے کی تجویز کے پیش نظر سو کروڑ روپے آئندہ مالیاتی سال میں مختص کیا گیا ہے۔ اس طرح جواہر روزگار اسکیم کے تحت ۹۵-۱۹۹۴ء میں ۶۰۵ کروڑ کی تجویز ہے۔ ریاست کے نہایت پسماندہ ۱۲ اضلاع میں جواہر روزگار کی سہولتوں کو اور مستحکم کیا جائے گا اور دیہی بستیوں کی اہمیت و افادیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اجتماعی اثاثے کو قائم کیا جائے گا۔ دیہاتوں میں آبپاشی نظام جتنا موثر ہوگا کسان اتنے ہی آسودہ حال ہوں گے۔ جو کسان بورنگ کا خرچ نہیں اٹھا سکتے ان کے مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے ایسا بندوبست کیا گیا ہے کہ ۹۵-۱۹۹۴ء میں جو ڈیڑھ لاکھ بورنگ کا نشانہ مقرر تھا، اسے بڑھا کر تین لاکھ کر دیا جائے گا۔ اسی طرح ۹۴-۱۹۹۳ء کے مقابلے میں [illegible] فیصد خرچ ان امور کے لئے مختص کیا گیا ہے۔ اس کام میں حکومت ۵ء۱۰۳ کروڑ روپے خرچ کرے گی۔ اس سے ۱۵ لاکھ ہیکٹر آبپاشی ہو سکے گی۔ آنے والے برسوں [illegible] کے قیام کا فیصلہ کیا گیا ہے جو [illegible] کی تمام سہولتوں

سے منسلک ہوں گے۔ ایسے کاشتکاروں کو جو تالاب [illegible] اور ان کو مفت
بارنگ، پمپ سیٹ، رہٹ، [illegible]، [illegible] آلات، بائیو گیس، بغیر دھوئیں
کا چولہا اور دیگر [illegible] سے [illegible] ترقیاتی اسکیم کے تحت
مستفید کیا جائے گا۔ اس طرح کی [illegible] کو بھی فروغ دینے کے لیے
۲۲ کروڑ روپیہ خرچ کیے گئے ہیں اس سے [illegible] کا ماحول پیدا ہوگا۔
کمہاروں اور [illegible] کو زمین کا پٹہ دیے جانے کی ایک مفید اسکیم شروع کی گئی
ہے ۳ جنوری ۱۹۹۴ کو ایک [illegible] کے ذریعہ یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ
گاؤں کی جو زمین تالابوں، پوکھروں اور تالوں کے پیٹے [illegible] ۱۰
[illegible] کے [illegible] جائیں۔ اس کے لیے حکومت نے اتر پردیش میں
زمین انتظامیہ [illegible] میں ضروری ترمیم کر دی ہیں۔ یہ بھی بندوبست
کیا گیا ہے کہ کسی گاؤں میں کمہاروں کی تعداد بہت کم ہو یا ایک ہی ہو تو اس
کے لیے زمین ضرور ریزرو کی جائے۔ یہی نہیں بلکہ انہیں اپنی معاشی ترقی کے
لیے زیادہ سے زیادہ مواقع دستیاب کرائے جائیں۔ اس کے لیے حکم جاری
کیا گیا ہے کہ سرکاری محکموں [illegible] اور [illegible] لازمی
طور سے کمہاروں کے ذریعہ ہی کرائی جائے۔ یہ سرکار ایک [illegible] پنچایتی نظام
کے لئے انقلابی قدم اٹھانے جا رہی ہے ـــ اب تک یہی ہوتا رہا
ہے کہ ضلع پریشدوں، گرام پنچایتوں پر افسروں ہی کا تسلط تھا، مگر اب
ایک جامع اسکیم کے تحت پنچایتی الیکشن ہوں گے جن میں درج فہرست [illegible] پسماندہ
اور دیگر طبقوں کی خواتین کو اور اقلیتی فرقے کے افراد کو [illegible]
راج اداروں میں [illegible] فیصد نمائندگی دی جائے گی۔ [illegible] کے صدر
اب ضلع مجسٹریٹ کے بجائے ضلع پریشد کے چیئرمین ہوں گے۔ [illegible]
جلد ہمارے دیہاتوں میں زندگی، مسرت، [illegible] اور تعلیم کا ایک ایسا
ماحول ہوگا جو پوری ریاست میں [illegible] ہو سکے گا۔ اس سرکار کا عزم [illegible]
ہے کہ اپنی حکومت کی میعاد پوری ہونے تک وہ ہمارے بیشتر خوابوں کو
پورا کر دے۔

وزیر اعلیٰ نے کہا کہ وہ اقتدار میں آتے ہی نقل مخالف قانون کو ۲ منٹ
کے اندر ختم کر دیں گے۔ انھوں نے اپنا وعدہ [illegible]
کا کہنا تھا کہ اس سے نقل کرنے والوں کی بہت [illegible] ہوگی اور تعلیم کا معیار
گر جائے گا جس سے [illegible] نقصان ہوگا مگر وزیر اعلیٰ نے [illegible] نقل

کی [illegible]
تشکیل کی گئی تھی اس نے [illegible]
جس کی سفارش کے مطابق [illegible]
ختم کیا [illegible] اور [illegible] نے
[illegible] اہم فیصلہ کیا گیا۔ کولڈ
ڈرنک، جوتے چپلیں [illegible] تھے انہیں بھی ٹیکس سے [illegible] کا اعلان ہوا۔ اس طرح
[illegible] چیزوں کو [illegible] ٹیکس کا انتظام کیا گیا
جو چیزیں [illegible] سستی [illegible] بنا دیا گیا تاکہ [illegible]
عام چیزوں کو منفعت بخش بنایا جائے۔ یہ ہے موجودہ سرکار کا کارنامہ۔
بحیثیت مجموعی جب ان تمام اقدامات کے نتائج سامنے آئیں گے تو عوام کتنی فرحت
اور راحت محسوس کریں گے۔ اسے ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔

اب آخر میں اردو مترجمین اور اردو معاون [illegible] تقرری کے فیصلے پر
بھی ایک نظر ڈالتے چلیں۔ اردو زبان کا فروغ اسی وقت یقینی بنایا جا سکتا ہے
جب اردو والوں کو روزی روٹی کے مواقع [illegible] دستیاب ہوں اور اردو پڑھانے
کا مناسب انتظام کیا جائے۔ سرکار نے تمام دشواریوں [illegible] جس
جرأت و ہمت کے ساتھ [illegible] تقرری کے احکامات جاری کیے ہیں
وہ میری نظر میں بڑی اہمیت [illegible] ہے۔ [illegible] کے امتحانات کو نہ صرف
مان لیا گیا بلکہ [illegible] کے مقابلے [illegible] دی گئی۔ امیدواروں کو
میرٹ لسٹ پر منتخب کیا گیا اور [illegible] کا تقرر بھی مکمل ہو گیا
ہے۔ اس سلسلے میں بڑی بدگمانیاں پھیلائی گئیں [illegible] دیکھنا ہے کہ
[illegible] مترجمین رکھے جائیں گے [illegible] کا تقرر ہوگا مگر ان
ایسا کہنے والوں کے چہرے [illegible] اردو مترجمین کا امتحان
ہو گیا ہے [illegible] حضرات اردو کے سہارے
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
لگا دیئے ہیں۔

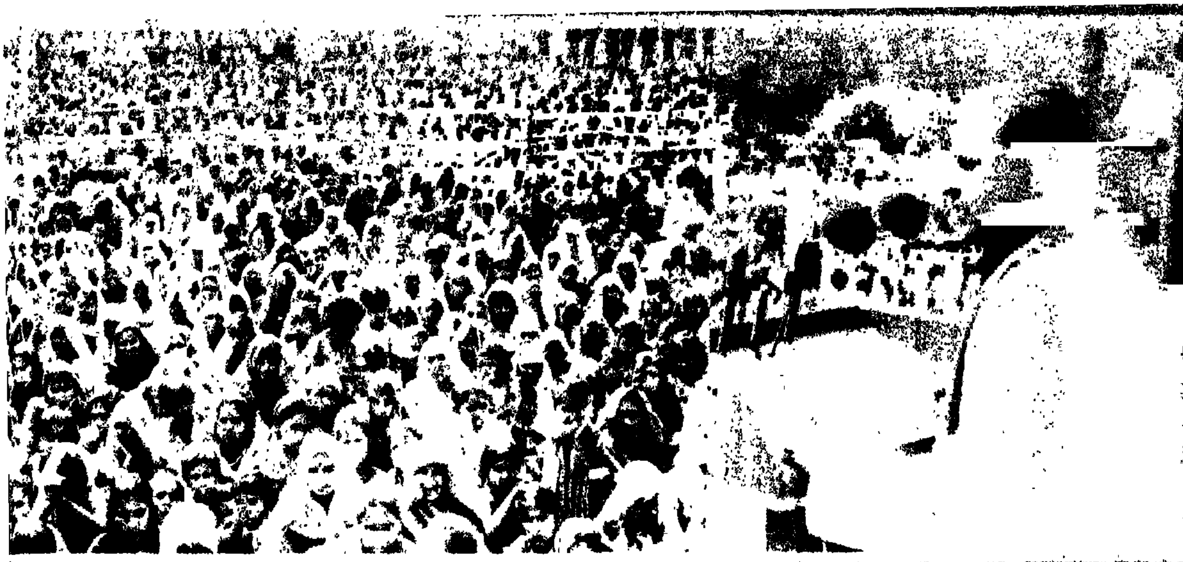
رباب رشیدی

وزیر اعلا اتر پردیش
شری ملائم سنگھ یادو
کے زیر صدارت
بارہ بنکی میں
کسان گورنمنٹ گرلز کالج
کا افتتاح کرتے ہوئے
وزیر تعمیرات عامہ
شری بینی پرشاد ورما





وزیر اعلا اتر پردیش
شری ملائم سنگھ یادو
امداد باہمی
مہا سمیلن
کا
شمع روشن کرکے
افتتاح کرتے ہوئے



وزیر اعلیٰ
شری رام نریش یادو
جلسۂ عام سے خطاب
کرتے ہوئے



وزیر اعلیٰ
شری رام نریش یادو
لکھنؤ میں
منعقدہ [illegible]
[illegible]





وزیر صنعت سہائے
"ادیوگ بندھو"
کے ایک جلسہ میں
تجزیہ کرتے ہوئے



وزیر ریاست برائے
خواتین و اطفال ترقیات
اور سماجی بہبود
شری راج بہادر
یوم اطفال کے موقع پر
بارہ دری لکھنؤ میں
منعقد نمائش کا
شمع روشن کر کے
افتتاح
کرتے ہوئے

ریاستی حکومت کا ایک برس

کسی ملک یا ریاست کی ترقی کے سفر میں ایک برس کی مدت کوئی معنی نہیں رکھتی اور اسی طرح اس ملک یا ریاست میں برسرِ اقتدار سیاسی پارٹی کی کامیابی یا ناکامی کے بارے میں کوئی فیصلہ صادر کرنا ایک کوشش لاحاصل یا قبل از وقت اقدام کے مترادف ہوگا تاہم اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ ایک برس کی قلیل مدت اس حکومت کے آئندہ عزائم اور سمت سفر کا تعین کرنے میں بہرکیف ایک پیمانہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ پوت کے پاؤں پالنے میں دیکھے جاتے ہیں اس کہاوت کے آئینہ میں اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ کسی حکومت کے اقتدار کے پہلے سال کی مدت کے دوران اس کے ذریعہ کیے گئے اقدامات اور مجوزہ شروعات کی بنیاد پر کم از کم اتنا تو کہا ہی جاسکتا ہے کہ آیا یہ حکومت اپنے دورانِ اقتدار عوام کے لیے فلاحی ثابت ہوگی یا اس کے برعکس عوام کے دکھ درد دور کرنے میں ناکام رہے گی۔

موجودہ ریاستی حکومت جس کے مکھیا خود کو ایک سماج وادی رہنما اور سماجی برابری کے لیے کام کرنے والوں کے مکھیا کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں انہوں نے اقتدار کی ذمہ داری سنبھالتے ہی اپنے بعض عزائم اور پروگراموں کی جانب واضح اشارہ کیا تھا اور ان کے ذریعہ اعلان شدہ یہ تمام پروگرام ریاست کے عوام بالخصوص دبے کچلے پسماندہ سماجی اعتبار سے پچھڑے افراد نیز اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے پروگرام دکھائی دیتے ہیں۔

وزیر اعلیٰ نے اقتدار میں آنے سے قبل عوام سے وعدہ کیا تھا کہ وہ منڈل کمیشن کی سفارشات کو نافذالعمل کریں گے اور اس ضمن میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اترپردیش کی حکومت ملک کی پہلی ریاستی حکومت ہے جس نے پسماندہ طبقوں کے لیے ملازمتوں میں ۲۷ فیصد ریزرویشن کا اصول سب سے پہلے نافذ کیا۔ جس کے نتیجہ میں ان پسماندہ طبقوں کو اپنی سماجی و معاشی ترقی کرنے کے خصوصی مواقع حاصل ہوں گے۔ مندرجہ فہرست اقوام کے ریزرویشن کا کوٹہ بھی ۱۸ فیصد سے بڑھا کر ۲۱ فیصد کر دیا گیا ہے نیز قبائل درج فہرست کے لیے بھی دو فیصد ریزرویشن کا بندوبست کیا گیا ہے۔ سرکاری ملازمتوں میں خصوصی مواقع فراہم کرنے کے لیے جو قوانین وضع کیے گئے ہیں ان پر پوری طرح عمل درآمد کو یقینی بنانے کا بھی بندوبست کیا گیا ہے اور ان قوانین کی خلاف ورزی کرنے کو قابل سزا جرم قرار دیا گیا ہے۔

اپنے ایک دوسرے فیصلے کے ذریعہ حکومت نے سی۔پی۔ایم۔ٹی، انجینئرنگ کیئر مقصدی اداروں اور نویں درجہ سے اوپر کے درجات والے تعلیمی اداروں میں بھی ریزرویشن نافذ کر دیا گیا ہے۔ جس کے نتیجہ میں پچھڑے اور دلت طبقوں کے ہونہار نوجوانوں کو ترقی کرنے کے خصوصی مواقع دستیاب ہوں گے۔ اپنے اس ایک سالہ دورِ اقتدار میں ریاستی حکومت نے متعدد ایسے اقدامات کیے ہیں جن سے کمزور طبقوں اور سماج کے پسماندہ نیز نظرانداز افراد کو راحت مل سکے۔ ودھان سبھا نے گذشتہ سیشن میں غریبوں اور پسماندہ طبقوں کی فلاح و بہبود کے سلسلے میں ایک درجن سے زائد تجویزیں پاس کر انہیں قانون کی شکل دی گئی۔

نظرانداز طبقوں میں صفائی ملازمین بھی شامل ہیں اور ریاستی حکومت نے شہروں نیز قصبوں میں صفائی ملازمین عورتوں کی ڈیوٹی کا وقت صبح ۷ بجے سے بدل کر ساڑھے آٹھ بجے کر دیا ہے۔ اب تک یہ عورتیں اپنے سوتے ہوئے بچوں کو چھوڑ کر کام پر آتی تھیں۔ بچوں کے کھانے اور انہیں اسکول بھیجنے کا بندوبست نہیں کر پاتی تھیں جس کے نتیجہ میں صفائی ملازمین کی نئی نسل نظرانداز ہو رہی تھی۔ اب نئے احکامات کے

قسمت خلاف وہ معاشی طور پر کہیں بہتر صورت حاصل ہو گئی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو مناسب تعلیم دلوا سکیں۔ بادی النظر میں یہ ایک معمولی سا فیصلہ لگتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ فیصلہ سماجی طور پر ان کے حق میں ایک بڑی سماجی و معاشی تبدیلی لانے میں معاون ثابت ہوگا۔ یہ فیصلہ بلاشبہ خود ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ موجودہ حکومت غریبوں کی ہمدرد ہے اور اس نے غریبوں کی فلاح و بہبود کو اولیت دی ہے۔

اسی طرح اقوام و قبائل درج فہرست کے افراد کی بیٹیوں کی شادی کے لیے امداد کی رقم کو ۱۰۰۰ روپے سے بڑھا کر ۵۰۰۰ روپے کر دیا گیا ہے۔ اقوام درج فہرست کے لیے طلبا و طالبات کی رہائش کے لیے ہاسٹلوں کی تعمیر کی جا رہی ہے جن میں سے ہر ہاسٹل میں ۵۰ طلبا کی گنجائش ہوگی۔

خط افلاس سے نیچے زندگی بسر کرنے والے خاندانوں کو مربوط ترقیاتی پروگراموں کے ذریعہ ۹۲-۱۹۹۱ کے دوران ۴۴ کروڑ روپے کی مالی امداد تقسیم کی گئی تھی۔ موجودہ حکومت کی کوششوں کے باعث ۹۳-۱۹۹۲ میں اس رقم سے ۴۵ فیصد زیادہ یعنی ۶۴ کروڑ روپے کی رقم تقسیم کی گئی۔ بینکوں کے توسط سے بھی جو قرضے دلائے گئے ان میں متعدد مسائل کے باوجود ۶۰ فیصد کا اضافہ ہوا اور ۲۲۴ کروڑ روپے کا قرض بینکوں کے توسط سے فراہم کیا گیا۔ دیہی خواتین و اطفال ترقیاتی پروگرام کے تحت غریب عورتوں کو گروپوں میں منظم کرکے کاروباری کاموں کے ذریعہ خود کفیل بنانے کی اسکیم پر عملدرآمد میں تیزی آئی ہے۔ ۹۳-۱۹۹۲ء میں ۳۹ لاکھ روپے کی لاگت سے تیار اشیاء ۱۲.۰۶ کروڑ روپے میں فروخت کی گئیں اور اس پر ہونے والے منافع کی رقم غریب عورتوں میں تقسیم کی گئی۔

ریاستی حکومت کی خصوصی کوششوں سے گذشتہ دس مہینوں کے دوران ۹۵ کروڑ ۵۰ لاکھ روپئے خرچ کرکے خط افلاس سے نیچے زندگی بسر کرنے والے ۱۹۹۴۸۵ خاندانوں کو فائدہ پہنچایا گیا۔ ان خاندانوں میں سے ۶۰۹۰۲ خاندان اقوام و قبائل درج فہرست سے تعلق رکھتے ہیں اور ۲۳۲۰۰ خواتین کو بھی اس کا فائدہ پہنچا۔

بے زمین زرعی مزدوروں کو امداد باہمی سوسائٹی کی شکل میں منظم کرکے اور ... کی کثرت والے ۱۲ اضلاع میں ۱۲۰۰۰ ایکڑ اراضی زمین کو ان کا شت بنا کر

اسکیم پر عملدرآمد کیا گیا۔ اس اسکیم کے مکمل ہو جانے پر ۱۸ ہزار ہیکٹر مزید اراضی پیدا ہوگی اور ۲۵ لاکھ انسانی دنوں کے بقدر روزگار کے مواقع پیدا کیے جائیں گے جس کا فائدہ غریب لوگوں کو ملے گا۔

موجودہ حکومت نے اقتدار میں آنے کے وقت دبے کچلے کمزور پسماندہ عوام، اقوام و قبائل درج فہرست کے لوگوں اور اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے کام کرنے اور ایسے پروگراموں پر عملدرآمد کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس ایک سال مدت میں ریاستی حکومت کے اقدامات اور پروگراموں کا جائزہ لینے پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حکومت نے اپنے عزائم کو عملی شکل دینے کے سلسلے میں ٹھوس اور پر خلوص کوششیں کی ہیں۔ مزید برآں اس کی یہ کوششیں آج بھی جاری ہیں کیونکہ سماجی تبدیلی اور معاشی بہتری کے سلسلے میں اس کے یہ اقدامات ایک سعی مسلسل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔

ریاست میں مسلم عوام میں تعلیم کی نہایت کمی ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ مسلم اکثریت والے گاؤں یا محلوں میں تعلیم کا مناسب بندوبست نہیں ہے اور اسکول بھی نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ اقتصادی نظریہ سے بھی یہ فرقہ دوسرے فرقوں کے مقابلے میں کمزور ہونے کے باعث اس فرقے کے بچے اسکول کی تعلیم مکمل نہیں کر پاتے ہیں۔ اس لیے یہ فیصلہ کیا گیا کہ ایسے علاقے جہاں زیادہ تر مسلم آبادی ہو، پہچان کر وہاں ضرورت کے مطابق ریاستی حکومت کے توسط سے ابتدائی جونیئر ہائی اسکول اور کالج کھولے جائیں تاکہ تعلیم کی سہولت ان کو قریب ہی حاصل ہو سکے۔ اس کے علاوہ ایک مقررہ حد کے اندر ہونے پر مسلم طلبا کو بھی اقوام و قبائل درج فہرست طلبا کی طرح وظیفے دینے کی اسکیم بھی تیار کی جا رہی ہے۔

ہر سرکاری تقرری جس میں تحریری امتحان ضروری ہے اس کے لیے تحریری امتحان ہندی کے علاوہ اردو میں بھی کرانے کے احکام جاری کیے گئے۔ اقلیتی فرقہ کے افراد کو آئین کی دفعہ ۳۰ کے تحت اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور چلانے کا اختیار ہے۔ اس سے قبل اس قسم کے تعلیمی اداروں کو اقلیتی ادارے قرار دینے کا کوئی بندوبست نہیں تھا اور اس سبب سے ان کے پیش کردہ درخواستوں پر کوئی فیصلہ نہیں ہو پاتا تھا۔ اب ان اداروں کو اقلیتی ادارے قرار دینے کا بندوبست کر دیا گیا ہے۔

اس سے قبل حکومت نے اقلیتی کمیشن کو ختم کر دیا تھا۔ نہ صرف اس کو دوبارہ قائم کیا گیا ہے بلکہ اقلیتی کمیشن کو اب قانونی درجہ بھی دے دیا گیا ہے۔

ریاست میں فرقہ وارانہ کشیدگی اور فسادات سے نمٹنے کے لئے خصوصی دستہ نامی جدید پولس فورس کی تشکیل کی جارہی ہے۔ اس ضمن میں قانون بھی پاس کر دیا گیا ہے۔

اردو کے سلسلے میں چند اہم فیصلے کئے گئے۔

ابتدائی سطح پر جن بچوں کی مادری زبان اردو ہے ان کی اردو کی تعلیم کا معقول بندوبست کیا جارہا ہے۔ اس سلسلے میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اگر کسی پرائمری اسکول میں پانچ سے زیادہ بچوں کی مادری زبان اردو ہے تو وہاں ایک اردو مدرس اور اس کے بعد ۵۰ ایسے بچوں پر مزید ایک اردو مدرس کی تقرری کی جائے گی۔

ثانوی سطح پر بھی مرکزی حکومت کی لسانی پالیسی کے مطابق ہندی کو اولین ترجیح دے کر سہ لسانی فارمولا نافذ کرتے ہوئے اس میں اردو زبان کو مناسب درجہ دیا جائے گا اور اس بات کا خیال رکھا جائے گا کہ جہاں ایک یا اس سے زائد طلباء اردو پڑھنا چاہتے ہوں وہاں اردو کی تعلیم کا معقول بندوبست کیا جائے ساتھ ہی سنسکرت کے پڑھنے کا سلسلہ حسب سابق چلتا رہے گا۔ ابتدائی اور ثانوی سطح پر اردو کی نصابی کتابوں کی چھپائی اور فراہمی کا بھی معقول بندوبست کیا جارہا ہے تاکہ ان کی کمی کے باعث کسی قسم کی پریشانی نہ ہو۔

ریاست میں جاری مکمل حرف شناسی مہم کے تحت بھی اردو زبان میں بھی حرف شناس بنانے کا بندوبست کیا جارہا ہے۔

ہر دفتر میں ایک اردو مترجم کی تعیناتی کی جارہی ہے تاکہ اگر کوئی شخص اردو میں درخواست دیتا ہے تو اس پر معقول کارروائی کی جاسکے۔ □□

احمد نسیم صدیقی ———

حکومت کا ایک سال ---- صفحہ ۲۲ کا بقیہ

اترپردیش میں ایک لاکھ ضعیفوں کو پنشن دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ بیوہ پنشن اسکیم کے تحت ۱۵ ہزار نئے معاملات میں پنشن منظور کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ معذور پنشن اسکیم کے تحت تمام معذور افراد کو پنشن منظور کرنے کا فیصلہ بھی ملائم سنگھ یادو کی حکومت نے کیا ہے۔

مچھلی پکڑنے والوں اور اس کا کاروبار کرنے والے ماہی گیروں یا مچھیروں کی فلاح و بہبود سے بھی موجودہ سرکار غافل نہیں رہی ہے۔ اس لئے فیصلہ کیا گیا ہے کہ ماہی پروری کے لیے تالاب کے پٹے لازمی طور سے ماہی گیروں کو دیئے جائیں گے۔

کمہار یعنی مٹی کے برتن بنانے والوں کو بھی سہولت دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اب کمہاروں کو مٹی فراہم کرنے کے لئے زمین کے پٹے دیئے جائیں گے۔

بلدیاتی اداروں میں خواتین صفائی ملازمین کی حاضری کا وقت بدل کر صبح ۸½ بجے کر دیا گیا ہے تاکہ وہ اطمینان سے اپنے گھر کا کام پہلے کر سکیں۔

بیڑی مزدوروں کی کم سے کم اجرت ۲۰ روپئے فی ہزار سے بڑھا کر ۲۵ روپئے فی ہزار کر دی گئی ہے۔

اترپردیش میں ملائم سنگھ یادو کی حکومت نے صرف ایک سال کی مختصر مدت میں بڑے اہم اور دوررس نتائج کے فیصلے کرکے عوام کی فلاح و بہبود کے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ بس ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک تو لوگ ان فوائد سے واقف ہوں، دوسرے یہ کہ جو سہولیات فراہم کی گئی ہیں ان سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں اس طرح نہ صرف اپنی زندگی کو سنواریں بلکہ ریاست کا سر اونچا کریں۔

فوائد سے اپنا معیار حیات اسی وقت بلند کیا جاسکتا ہے جب منفی تنقید سے پرہیز کرکے جو سہولیات حاصل ہیں ان سے ہر ممکن فائدہ اٹھا لینے کا عزم ہو۔ تنقید حکومت کے لیے بھی ضروری ہے اور سماج کے لیے بھی لیکن صرف تنقید اور عمل کچھ بھی نہیں، کبھی سودمند نہیں ہوتا ہے۔ جہاں خامیاں ہیں وہاں تنقید ضروری ہوتی ہے لیکن تنقید برائے تنقید کوئی صحت مند علامت نہیں۔ اس سے سماج بنتا نہیں ٹوٹتا ہے۔ ہمیں سماج کو بنانا ہے، جوڑنا ہے۔ اوپر اٹھانا ہے ——— توڑنا نہیں۔ □□

——— احمد ابراہیم علوی

غزلیں

زمانے کی رَو سے بچا کر تو جانیں
سلامت سے رکھ کے دکھاؤ تو جانیں

یہ گوشہ نشینی تو اک بزدلی ہے
نظر زندگی سے ملاؤ تو جانیں

ہمارے لئے جو فلک بن نہ جائے
زمیں کوئی ایسی بتاؤ تو جانیں

علامت ہے یہ حضرتِ محتسب کا
یہاں بھی اگر لڑکھڑاؤ تو جانیں

غریبوں کا خوں جن کے منہ لگ گیا ہے
اگر ان سے توبہ کراؤ تو جانیں

جو پوچھا کہ کیا ہے وفا؟ ہنس کے بولے
بتاؤ تو جانیں، سکھاؤ تو جانیں

حفیظ آج انسانیت مر رہی ہے
کسی طرح اس کو بچاؤ تو جانیں

حفیظ میرٹھی
۱۴۰، پوروا شیخ لال
میرٹھ ۲۵۰۰۰۲

چھوڑ کر لشکرِ اعدا کی جو صف آیا تھا
میں بھی دشمن تھا تو وہ کیسی طرف آیا تھا

اس نے منہ موڑ لیا مہر و وفا سے کیسے
جاں نثاری کا اگر لے کے حلف آیا تھا

دل کو چھو کر کوئی خوشبو کا شرارہ گزرا
کس کا پیغام تھا یہ کس کی طرف آیا تھا

اب یہ قسمت نہ ملا گوہرِ مقصود اُسے
غوطہ زن لے کے تو مٹھی میں صدف آیا تھا

تو نے اس مایۂ صد فخر کی بھی قدر نہ کی
تیرے حصے میں ازل میں جو شرف آیا تھا

سرخرو کتنا تھا جو تا بہ شب پی کے جری
آج خورشیدِ سحر جام بکف آیا تھا

سید احمد سحر
محلہ خلیل شرقی
شاہ جہاں پور
۲۴۲۰۰۱

ادب سے جھکنے والوں کا کبھی قد کم نہیں ہوتا
مگر ہر آستاں پہ سر تو ان کا خم نہیں ہوتا

بنا لیتے ہیں راہیں بھی لگن ہے جن کو منزل کی
بھٹک جاتے ہیں جن کا عزم مستحکم نہیں ہوتا

مسائل زندگی کے فیصلہ کن موڑ پر جب ہوں
علاجِ زخمِ دل الفاظ کا مرہم نہیں ہوتا

وہ قربت ہو کہ دوری ہی فرق اس سے کچھ نہیں پڑتا
تعلق دو دلوں کا فاصلوں سے کم نہیں ہوتا

عمارت کو سنبھالے رہتی ہیں بنیاد کی اینٹیں
مگر کیا کیجئے ان کا کسی کو غم نہیں ہوتا

مزاجِ حسن بدلا ہے نہ بدلے گا کبھی یارو
وہ شعلہ رو کسی موسم میں بھی شبنم نہیں ہوتا

حیات اے نجم اپنی زلزلوں کے درمیاں گزری
در و دیوار گرنے کا بھی اب کچھ غم نہیں ہوتا

نجم مظفرنگری
۱۹۳، گردھی گوردھان
مظفرنگر

فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا سال

وزیر اعلیٰ جناب ملائم سنگھ یادو کے عہد حکومت کے ایک سال میں سب سے بڑا کارنامہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا رہا۔

ہولی، دسہرہ، دیوالی، عید، بقرعید اور دوسرے مذہبی تہواروں کو مختلف فرقوں کے افراد نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ منایا۔ کسی بھی تہوار پر کوئی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا۔ ایک مذہب یا فرقہ کے ماننے والوں نے دوسرے فرقہ یا مذہب کے تہواروں میں نہ صرف شرکت ہی کی بلکہ مختلف تقریبوں کا اہتمام بھی کیا اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا ثبوت پیش کیا۔

کھیل، موسیقی، مشاعرے، کوی سمیلن اور ایسے ہی پروگراموں کے لئے نہ صرف مالی امداد بڑھا دی گئی بلکہ ان کے انعقاد میں ہر قسم کا تعاون بھی دیا گیا جس سے قومی یک جہتی اور فرقہ وارانہ بھائی چارگی کا ماحول بھی پیدا ہوا۔ ان شعبوں میں نمایاں رول ادا کرنے والوں کو حکومت نے انعامات سے نوازا۔

کرکٹ کے ہر فن مولا کپل دیو کو پانچ لاکھ روپئے کے انعام کے علاوہ ایک بڑی تقریب میں دوسرے اعزازات بھی دیئے گئے۔ کپل دیو نے کھیل کے ذریعہ محبت و آشتی کا پیغام عوام تک پہونچانے کی نوجوانوں کو تلقین کی۔ انھوں نے ٹسٹ کرکٹ میں ۴۳۴ وکٹ لے کر دنیا میں ریکارڈ قائم کیا۔

موسیقی کے میدان میں فن کاروں کو ایک ایک لاکھ روپئے اور دوسرے اعزازات سے نوازا گیا۔ ان میں استاد بسم اللہ خاں، برجو مہاراج، ستارہ دیوی، گرجا دیوی اور گلاب بائی نمایاں ہیں۔ استاد بسم اللہ خاں، برجو مہاراج اور ستارہ دیوی نے ہندوستان کا نام دوسرے ملکوں میں روشن کیا اور اپنے فن سے ہندوستان کے کلاسیکی کلچر کو اجاگر کیا۔

فلمی دنیا کی نامور شخصیت مظفر علی اور مشہور شاعر کیفی اعظمی کو بھی ایک ایک لاکھ روپئے کے انعامات عطا کیے گئے۔ مظفر علی اور کیفی اعظمی نے قومی یک جہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے فروغ میں اہم رول ادا کیا ہے۔

فرقہ وارانہ فسادات کے سدباب کے لئے "شانتی سینا" بنائی گئی ہے اس میں اقلیتوں کو نمایاں حصہ دیا گیا ہے اس کی تشکیل جدید ترین پولیس فورس کی صورت میں ہوئی ہے۔ اس فورس کے ذمہ دہشت گردوں کی سرکوبی بھی ہے۔

ان تمام مقدمات کو واپس لے لیا گیا ہے جن کا تعلق ۱۹۹۲ء کے فرقہ وارانہ فسادات سے تھا۔ اس سے بھی فرقہ وارانہ یکجہتی میں کافی مدد ملی ہے۔

اتر پردیش حکومت کے اس فیصلے سے فرقہ وارانہ ہنگاموں کو روکنے میں پیش رفت ہوگی۔ اب فرقہ وارانہ فساد کی صورت میں ضلع مجسٹریٹ اور سپرنٹنڈنٹ پولیس ذمہ دار ہوں گے۔ یہ بڑے بڑے افسران اب زیادہ مستعدی سے کام کر رہے ہیں اور فرقہ وارانہ معاملات کو ابھرنے سے روک رہے ہیں نیز سماج دشمن عناصر پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے ہیں اور ضرورت پڑنے پر کارروائی سے بھی گریز نہیں کر رہے ہیں۔

مختلف مذہبی و سیاسی جماعتوں کی مانگ کے پیش نظر حکومت اتر پردیش نے ٹاڈا کے تحت گرفتار لوگوں کے مقدمات پر نظر ثانی کرتے ہوئے ۴۴ (چوالیس) افراد کو رہا کر دیا ہے اور ان پر سے مقدمے واپس لے لیے ہیں تاکہ خیر سگالی کا ماحول پیدا ہو سکے۔ تقریباً تین سو اور معاملات کو ازسر نو دیکھا جا رہا ہے اور توقع ہے کہ کافی تعداد میں ان مقدمات کو واپس لے لیا جائے گا۔

[illegible]

[illegible]

— پرشوتم سنگھ [illegible]

کامیاب لوک سٹال — [illegible]

[illegible]

[illegible] جا سکے گا۔

[illegible]

— [illegible] رضا

[illegible]

[illegible] کے لیے اس [illegible] کو اقدامات [illegible]

ملائم سنگھ یادو حکومت کا

کامیاب ایک سال

ملائم سنگھ یادو نے [illegible] ہے [illegible] حکومت جب [illegible] تو اس کے سامنے کئی چیلنج تھے۔ سب سے بڑا چیلنج فرقہ پرست اور فسطائی طاقتوں سے مقابلہ کرنے کا تھا۔ ان طاقتوں نے ریاست کی فضا کو زہر آلود کر دیا تھا [illegible] ہو گیا تھا۔ اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں میں [illegible] اور پسماندہ طبقوں کا کوئی پرسان حال نہیں تھا۔

شری یادو نے [illegible] سماج وادی پارٹی کی [illegible] جنتا دل اور سیکولر نیز [illegible] کی باہری حمایت سے جو حکومت بنائی اس نے ایک سال کی قلیل مدت میں عوامی فلاح و بہبود کے اتنے ڈھیر سارے کام [illegible] ایک ریکارڈ ہے۔

سوشلسٹ نظریات پر یقین رکھنے والے وزیر اعلیٰ شری یادو اور ان کی حکومت نے اپنے [illegible] کو پورا کرنے اور عوامی بہبود کی اسکیموں کی [illegible] تیزی [illegible] یقیناً قابل تعریف ہے۔

سیاسی بصیرت

شری یادو کی سیاسی بصیرت عوام بالخصوص غریب اور پسماندہ [illegible] سے لڑنے کی [illegible] نظریات کی وجہ سے [illegible] ملک کی سب سے بڑی ریاست کی قیادت [illegible] شری یادو کی رہنمائی [illegible] شری یادو [illegible] سوشلسٹ مفکر ڈاکٹر [illegible] کے خیالات اور نظریات سے متاثر [illegible]

[illegible] ہے۔ شری یادو [illegible] جو کچھ کہا جاتا ہے اسے کر کے دکھایا جاتا ہے [illegible] وجہ سے پیدا ہوا۔ شری یادو ایسے سیاسی رہنما ہیں جن کے قول و فعل میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

[illegible]

شری یادو [illegible] عوام کی بے پناہ حمایت حاصل کر رہے ہیں۔ گذشتہ ایک سال میں شری یادو نے جس طرح فرقہ پرست اور فسطائی طاقتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے ریاست میں جس طرح فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا ماحول پیدا کیا ہے اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں میں جس طرح تحفظ کا احساس پیدا کیا ہے اور غریبوں نیز پسماندہ [illegible] فلاح و بہبود کے اقدامات کر کے سماج کے آخری شخص کے [illegible] لانے کی جو کوشش کی ہے اس کی بنیاد پر شری یادو کو [illegible] کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔

ہر دلعزیز رہنما

شری یادو نے اپنی سیاسی سوجھ بوجھ سے تمام فرقوں اور طبقوں کے لوگوں کے دلوں میں اپنے لئے جگہ بنا لی ہے۔ سوشلسٹ نظریات کے [illegible] نے بھی ان کے سیاسی تدبر کو سراہا ہے۔ ریاست کی اقتصادی ترقی کے [illegible] کو پورا کرنے کی شری یادو نے جی جان سے کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سماج کے تمام طبقوں میں ان کی مقبولیت بڑھی ہے اور عوامی وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے انہوں نے اپنی ساکھ قائم کر لی ہے۔

[illegible]

[illegible] کو منظوری دے دی گئی ہے۔ [illegible] پسماندہ طبقوں کو خوشحال بنانا اور اصلاحات [illegible] ان کی حکومت کا [illegible] مقصد ہے۔

شری یادو نے وزیر اعلیٰ بننے سے قبل عوام سے جو وعدے کئے تھے ان میں سے بیشتر کو ان کی حکومت نے ایک سال کی مختصر مدت میں پورا کر دکھایا ہے۔ پسماندہ طبقوں کے منڈل کمیشن کی سفارشات کے مطابق ۲۷ فیصد ریزرویشن اس کی سب سے بڑی اور روشن مثال ہے۔ اس سہولت سے غریب اور پسماندہ طبقوں کو سماجی اور اقتصادی ترقی کا خصوصی موقع ملے گا۔

درج فہرست اقوام کا ریزرویشن کوٹا بھی ۱۸ فیصدی سے بڑھا کر ۲۱ فیصد کر دیا گیا ہے اور درج فہرست قبائل کے لئے دو فیصد ریزرویشن مقرر کیا گیا ہے۔ شری یادو کے دل میں غریب و پسماندہ طبقوں کو راحت پہنچانے کا جذبہ ہے یہی وجہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی ان کی نظر رہتی ہے۔ وہ غریبوں کے دکھ درد میں شریک ہونے اور ان کو راحت و آرام پہنچانے کے لئے بیتاب رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر شری یادو کی حکومت نے ایک کام یہ کیا کہ شہروں اور قصبوں میں خاتون صفائی ملازمین کی ڈیوٹی صبح ۵ بجے کے بجائے صبح ۶ بجے سے کر دی۔ اگرچہ یہ ایک چھوٹا سا فیصلہ ہے لیکن اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ شری یادو کو غریب لوگوں کی دشواریوں اور مسائل کا کتنا احساس ہے۔ صبح ۵ بجے سے ڈیوٹی ہونے پر خاتون صفائی ملازمین اپنے بچوں کو سوتا ہوا چھوڑ کر گھر سے باہر نکلتی تھیں جس کی وجہ سے وہ اپنے بچوں کے کھانے پینے اور انہیں اسکول بھیجنے کا مناسب بندوبست نہیں کر پاتی تھیں۔ اس فیصلے سے خاتون صفائی ملازمین کے کنبوں میں سماجی اور اقتصادی تبدیلی پیدا ہو گی۔

ریاستی حکومت نے سر پر گندگی ڈھونے کے رواج کو ختم کر کے اس پیشے میں لگے ہوئے صفائی ملازمین کو باعزت پیشوں میں لگانے کے لئے [illegible] ہزار صفائی ملازمین کی آبادکاری کا نشانہ مقرر کیا ہے۔ اس کے علاوہ بڑھاپا پنشن اسکیم کے تحت [illegible] سالانہ

[illegible]

[illegible] کو منظوری دے دی گئی ہے۔ [illegible] روپے ماہانہ سے بڑھا کر [illegible] روپے اور [illegible] پر ۲۲ روپے سے بڑھا کر ۳۲ روپے کر دی گئی ہے۔

پسماندہ برادری ذات کے لوگوں کو [illegible] کی بنیاد پر [illegible] دینے کا حکم دیا گیا ہے۔

پنچایت راج اور [illegible] میں درج فہرست [illegible] پسماندہ طبقات کے لوگوں کے لئے ریزرویشن کا بندوبست کیا گیا ہے۔

آئندہ پانچ سال میں [illegible] کی ترقی کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔

درج فہرست اقوام و قبائل کے تحفظ اور ان کے لئے ریزرویشن کو یقینی بنانے اور ان پر ہونے والے مظالم کی شکایت کی جانچ کے لئے کمیشن کی تشکیل کا فیصلہ بھی ریاستی حکومت نے کیا ہے۔ یہ اور اس قسم کے دیگر بہت سے اقدامات اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ شری یادو غریبوں کے مسیحا ہیں اور ان کی حکومت غریبوں کی حکومت ہے۔

اقلیتوں کے ہمدرد

شری یادو ایک سال قبل جب دوبارہ وزیر اعلیٰ بنے اس وقت فرقہ پرست اور فسطائی طاقتوں کا بول بالا تھا۔ فرقہ وارانہ اتحاد پارہ پارہ ہو چکا تھا اور اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کا اعتماد حکومت پر سے ختم ہو گیا تھا۔ امن و قانون نام کی کوئی چیز ریاست میں نہیں رہ گئی تھی۔ شری یادو نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ اپنے سوشلسٹ اور سیکولر نظریات کی بنیاد پر فرقہ پرست اور فسطائی طاقتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور انہیں پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ اقلیتوں میں تحفظ اور اعتماد کا احساس پیدا کرنے کے لئے شری یادو کی حکومت نے ریاست میں امن و قانون کی صورت حال بہتر بنانے کے لئے سخت اقدامات کئے۔ اقلیتوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے اقلیتی کمیشن کی تشکیل کی گئی جسے قانونی حیثیت دی گئی ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات کو روکنے کے لئے [illegible]

[illegible] دستے کی تشکیل کی گئی۔

ریاستی حکومت نے اقلیتی تعلیمی اداروں کو آئین کے سیکشن ۳۰ کے تحت حاصل حقوق اور تحفظ دیے جانے کے احکام دئے ہیں۔ تعلیمی اعتبار سے پسماندہ مسلمانوں کے بچوں کو قریب میں ہی تعلیمی سہولت دستیاب کرانے کے لئے اسکول کھولنے ان کی فیس معاف کرنے اور وظائف دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

موجودہ حکومت کی پہل پر مرکزی حکومت نے بنکروں کو سوت پر پندرہ روپے فی کیلو کی گرانٹ منظور کی ہے۔

ریاست کے غیر سرکاری اقلیتی طبقے کے ڈگری کالجوں کو اقلیتی ادارہ تسلیم کرنے کے لئے معیار مقرر کر دیا گیا ہے۔

اردو نوازی

وزیر اعلیٰ شری یادو نے مختلف موقعوں پر اپنی تقریروں میں یہ بات واضح کر دی ہے کہ اردو ہندوستان کی زبان ہے اور دیگر ہندوستانی زبانوں کی طرح اردو کو بھی پھلنے پھولنے اور ترقی کرنے کا پورا حق حاصل ہے شری یادو اس بات پر بھی زور دیتے رہے ہیں کہ اردو کی ترقی اسی وقت ممکن ہے جب اسے روزی روٹی سے جوڑا جائے۔ چنانچہ شری یادو کی حکومت نے اردو کو روزی روٹی سے جوڑنے کے کئی اقدامات کئے ہیں اور اردو داں حلقہ میں یہ احساس پیدا ہوا ہے کہ شری یادو کی حکومت نے اردو کی ترقی کے لئے جو کام کئے ہیں کسی دوسری حکومت نے اتنے کام نہیں کئے۔

ابتدائی سطح پر جن بچوں کی مادری زبان اردو ہے ان کی اردو کی تعلیم کا معقول بندوبست کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں ریاستی حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اگر کسی پرائمری اسکول میں پانچ سے زیادہ بچوں کی مادری زبان اردو ہے تو وہاں ایک اردو ٹیچر اور اس کے بعد پچاس ایسے بچوں پر ایک اور اردو ٹیچر کا تقرر کیا جائے۔ سرکاری طور پر یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس طرح ریاست کے پرائمری اسکولوں میں تقریباً ۱۳ ہزار اور جونیئر ہائی اسکولوں میں تقریباً ایک ہزار اردو اساتذہ کا تقرر کرنا ہوگا۔

ثانوی سطح پر بھی مرکزی حکومت کی لسانی پالیسی کے مطابق ہندی کو اولیت ترجیح دے کر سہ لسانی فارمولا نافذ کرتے ہوئے اس میں اردو کو مناسب درجہ دیا گیا ہے۔ ابتدائی اور ثانوی سطح پر اردو کی نصابی کتابوں کی چھپائی اور فراہمی کا بھی معقول بندوبست کیا گیا ہے۔ ریاست میں غیر رسمی تعلیمی پروگرام کے تحت کھولے جانے والے مراکز میں سے دس فیصد مراکز میں اردو میں غیر رسمی تعلیم دی جائے گی۔ ۹۵-۱۹۹۴ء میں ریاست میں ۳۰ ہزار غیر رسمی تعلیمی مراکز میں سے تین ہزار مراکز اردو کے ہوں گے۔

ریاست کے ہر سرکاری محکمے کے ہر دفتر میں ایک اردو مترجم کا تقرر کیا جا رہا ہے تاکہ اگر کوئی شخص اردو میں درخواست دیتا ہے تو اس پر معقول کارروائی کی جا سکے۔ ہر سرکاری تقرر جس میں تحریری امتحان ضروری ہے اس کے لئے تحریری امتحان ہندی کے علاوہ اردو میں بھی کرانے کے احکام جاری کر دئے گئے ہیں۔ ریاستی حکومت کے ان اقدامات سے اردو کو روزی روٹی سے جوڑنے میں مدد مل رہی ہے اور اس زبان کو بھی دیگر زبانوں کے شانہ بشانہ ترقی کرنے کا موقع مل رہا ہے

کسان دوست

کسان دوست حکومت کی حیثیت سے شری یادو کی حکومت نے ریاست کے ۸۰ فیصد سے زائد دیہی علاقوں میں ۱۴ گھنٹے بجلی کی فراہمی کو یقینی بنانے کے اقدامات کئے ہیں، گنا کسانوں کو گذشتہ سال گنے کی بہت اچھی قیمت حاصل ہوئی ہے اور گنے کی قیمت کی ادائیگی بھی تقریباً سو فیصد کر دی گئی ہے۔ کسانوں کو ان کی پیداوار کی مناسب قیمت دلانے کے پیش نظر حکومت نے گیہوں، دھان اور موٹے اناج کو ریاست سے باہر لے جانے پر عائد پابندی ختم کر دی ہے۔ منڈی کمیٹیوں میں کسانوں اور بیوپاریوں کی نمائندگی کو یقینی بنانے کے لئے ان کمیٹیوں کو انتظامیہ کے کنٹرول سے نکالنے کے اقدامات کئے گئے ہیں۔

ریاستی حکومت نے حال ہی میں کسان پنشن اسکیم کا اعلان کیا ہے۔ اور اس پر عمل درآمد شروع کر دیا گیا ہے۔ کھلیان حادثہ بیمہ اسکیم بھی شروع کی گئی ہے چند شرائط کے تحت نجی ٹیوب ویلوں کے بجلی کے بقایاجات پر دی جانے والی رعایت کے تحت واجب الادا رقم معاف کرنے کا فیصلہ بھی کیا گیا ہے۔ اس سے کسانوں کو مجموعی طور پر ۷۰ کروڑ روپے کی راحت ملے گی۔

گنا خریداری مراکز پر کسانوں سے گنے کی ڈھلائی کے لئے کی جانے والی تین روپے کی کٹوتی کو کم کر کے اب دو روپے فی کوئنٹل کر دیا گیا ہے۔ دس کروڑ روپے سے زائد خسارے والے کارپوریشنوں اور آٹھ شوگر ملوں

(باقی صفحہ ۳۰ پر)

اتر پردیش میں اقلیتوں کے لئے

عوامی حکومت کے فلاحی اقدامات

جمہوری نظام میں جہاں عوام کا یہ فرض ہے کہ وہ حکومت کے اقدامات پر کڑی نظر رکھیں، وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ اگر حکومت نے کچھ اچھے کام کیے ہوں تو انہیں سراہا جائے اور ان کا اس لیے بھی تذکرہ کیا جائے کہ اس طرح کی تعریف و توصیف سے اچھے کام کرنے کے لیے حوصلے بلند ہوتے ہیں۔

اتر پردیش میں موجودہ ملائم سنگھ سرکار نے جتنے وعدے کیے تھے انہیں پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے اور اس سلسلے میں اہم بات یہ ہے کہ وزیر اعلیٰ شری ملائم سنگھ یادو شخصی دلچسپی لیکر یہ دیکھ رہے ہیں کہ جو بھی اعلان کیا جائے وہ صرف کاغذی پیرہن میں نہ رہے بلکہ عملی جامہ بھی پہنے۔ چنانچہ اقلیتوں کے سلسلے میں بہت سارے ایسے گوشے ہیں جنہیں روشنی میں لانا ضروری ہے۔ اس کا مقصد صرف حکومت کی قصیدہ خوانی نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد یہ بھی ہے کہ حکومت کو یہ معلوم ہو جائے کہ کتنا کام ہو چکا ہے اور کتنا باقی ہے اور عوام بھی یہ جان لیں کہ ان کے کتنے مطالبات کی تکمیل ہو چکی ہے اور کتنے مطالبات باقی ہیں۔

ملائم سنگھ حکومت نے سب سے بڑا کارنامہ یہ انجام دیا کہ اقلیتی کمیشن دوبارہ قائم کیا گیا اور اسے قانونی درجہ بھی دیا گیا ہے۔ اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے سلسلے میں سارے کام اقلیتی کمیشن سے متعلق کر دیے گئے ہیں۔ اس کمیشن کے سارے فیصلے صرف سفارشات کی حیثیت نہیں رکھیں گے بلکہ وہ قانونی حیثیت کے حامل ہوں گے۔

ایک دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ اس کمیشن کے ذریعہ خود کفیل بننے اور اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے لیے مختلف پروجیکٹ کے لیے قرضے بھی دیے جائیں گے۔ نئی ملازمتوں کے لیے بھی یہ کمیشن اپنے فرائض انجام دے گا۔ مختلف کورسوں اور مقابلے کے امتحانات کے لیے تربیت بھی دی جائے گی۔ اقلیتوں کی معاشی اور اقتصادی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے بھی کمیشن پوری کوشش کرے گا۔

اقلیتی کمیشن کے قیام کے ساتھ حکومت نے مسلم اقلیت کے لیے ایک بہت ہی اہم اقدام کیا ہے اور وہ ہے حج ہاؤس کی تعمیر۔ حج مسلمان اقلیت کا مذہبی فریضہ ہے اور اس اعتبار سے یہ اقدام صرف مسلمانوں سے متعلق ہے۔ اس سلسلے میں ساری تفصیلات اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں۔ وزیر اعلیٰ کے ساتھ جناب محمد اعظم خاں صاحب خصوصیت سے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ حج ہاؤس کی تعمیر کے ساتھ وہ ساری دشواریاں اور پریشانیاں دور ہو جائیں گی جن سے حجاج کرام کو گزرنا پڑتا تھا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اتر پردیش میں اردو اہم ترین لسانی اقلیت کی زبان ہے بلکہ جہاں تک بول چال لین دین کاروبار اور سماجی تہذیبی اور تفریحی زندگی کا تعلق ہے اردو اقلیت کی نہیں بلکہ اکثریت کی زبان ہے۔ اس سلسلے میں سرکار نے اہم ترین فیصلے کیے ہیں۔ جن میں سے کچھ درج کیے جا رہے ہیں۔

(الف) ابتدائی سطح پر جن بچوں کی مادری زبان اردو ہے ان کی تعلیم کا معقول بندوبست کیا جا رہا ہے۔ یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اگر کسی پرائمری اسکول میں پانچ سے زیادہ بچوں کی مادری زبان اردو ہے تو وہاں ایک اردو مدرس اور اس کے بعد ۵۰ ایسے بچوں پر ایک اور مدرس کا تقرر کیا جائے گا۔ سرکاری طور پر اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس طرح ریاست کے پرائمری اسکولوں میں تقریباً ۱۳ ہزار اور جونیئر ہائی اسکولوں میں تقریباً ایک ہزار اردو اساتذہ کی تقرریاں کرنی ہوں گی۔

(ب) ثانوی سطح پر بھی مرکزی حکومت کی لسانی پالیسی کے مطابق ہندی کو

الیکن ترجیح دینے کی بہ نسبت [illegible] اس میں اردو زبان کو مناسب درجہ دیا جائے گا۔ اور اس بات کا خیال رکھا جائے گا کہ جہاں تک ممکن ہو سکے تمام طلباء کے لیے جو اردو پڑھنا چاہتے ہوں ثانوی سطح پر اردو کی تعلیم و تربیت کا معقول بندوبست کیا جائے۔ یہاں دوسری جانب سنسکرت کے پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ پہلے کی طرح ہی چلتا رہے گا۔

(ج) ابتدائی اور ثانوی سطح پر اردو کی نصابی کتابوں کی چھپائی اور فراہمی کا بھی معقول بندوبست کیا جا رہا ہے تاکہ ان کی کمی کے باعث کسی قسم کی پریشانی نہ ہو۔

(د) ریاست میں غیر رسمی تعلیمی پروگرام کے تحت کھولے گئے مراکز میں سے ۱۰ فیصد مراکز میں اردو زبان میں غیر رسمی تعلیم دی جائے گی۔ سال ۹۵-۱۹۹۴ء میں ریاست میں ۲۰ ہزار غیر رسمی تعلیمی مراکز میں ۲ ہزار مراکز اردو کے ہوں گے۔

(ذ) ریاست میں چل رہی مکمل حرف شناسی مہم کے تحت بھی مندرجہ بالا کے مطابق اردو زبان میں بھی حرف شناس بنانے کا مکمل بندوبست کیا جائے گا۔

(ر) اردو اساتذہ کی تربیت کے لیے معقول بندوبست کیا جائے گا تاکہ برسرکار اساتذہ یا تعلیمی خدمات میں لیے جانے والے اردو اساتذہ کو مناسب تربیت جلد دی جا سکے۔

(ز) ہر محکمہ کے ہر دفتر میں ایک اردو مترجم کی تعیناتی کی جا رہی ہے تاکہ اگر کوئی شخص اردو میں درخواست دیتا ہے تو اس پر معقول کارروائی کی جا سکے۔

(س) ہر سرکاری تقرری جس میں تحریری امتحان ضروری ہے۔ اس کے لیے تحریری امتحان ہندی کے علاوہ اردو میں بھی کرانے کے احکام جاری کر دیے ہیں۔

یہ وہ اہم نکات ہیں جو سرکاری طور پر سرکاری کتابچے میں پیش کیے گئے ہیں۔ یہ نکات بہت عمدہ اور اقلیتوں کی ترقی کی راہ میں نشان راہ ہیں لیکن اہم بات یہ ہے کہ ان پر عمل درآمد بھی ہو رہا ہے۔ چنانچہ اردو اساتذہ کی تقرری کے سلسلے میں [illegible] بقول شاعر

[illegible] کے ٹکڑوں
اور سیماں کا [illegible] کہ مرنا بات رہے

[illegible] کے [illegible] وزیر اعلیٰ نے یہ تہیہ کر رکھا ہے کہ چاہے کتنی ہی دشواریاں کیوں نہ ہوں۔ انھوں نے جو وعدے کر رکھے ہیں وہ پورے کیے جائیں۔ چنانچہ اردو اساتذہ کی تقرری کے لیے پھر سے سارے مراحل مکمل کیے جا رہے ہیں اور یہ یقین ہے کہ ان شاء اللہ آپ جب یہ سطریں پڑھ رہے ہوں گے اس وقت تک یہ تقرریاں عمل میں آ چکی ہوں گی۔

اس سلسلے میں یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ وسیع تر تناظر میں تعلیم کو عام کرنا اور تعلیم کا مناسب بندوبست کرنا پورے صوبے کے مفاد میں ہے۔

عام طور سے یہ کہا جا رہا ہے کہ مسلم عوام میں تعلیم کی نہایت کمی ہے راقم الحروف کا یہ خیال ہے کہ کسی خاص فرقے میں نہیں بلکہ عمومی طور پر تعلیم کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے اور آبادی کی شرح کے اعتبار سے اسکول بھی نہیں ہے۔ یہ بھی ایک پہلو ہے کہ مادری زبان میں تعلیم حاصل نہ کر سکنے کی بنا پر مسلم عوام مقابلے کے امتحانات میں کمزور ثابت ہوئے ہیں۔

حکومت نے اس کا بندوبست کیا ہے کہ جہاں مسلم آبادی غالب اکثریت میں ہے ایسے علاقوں اور محلوں کی شناخت کی جائے اور ان علاقوں یا محلوں میں ابتدائی/ جونیر ہائی اسکول/ انٹر کالج قائم کیے جائیں۔ ایک ایسی اسکیم بھی تیار کی جا رہی ہے جس کی بنیاد پر مالی اعتبار سے کمزور مسلم طلباء کو وظیفہ دیا جا سکے۔ بالکل اسی طرح جس طرح قبائل درج فہرست طلباء کو وظیفہ دیا جاتا ہے۔

تعلیم کے سلسلے میں حکومت نے اس کا بھی لحاظ رکھا ہے کہ اقلیتی ادارہ قرار دیا جانے کے وہ سارے طریقے رو بہ عمل لائے جائیں اور وہ خامیاں دور کی جائیں جن خامیوں کی وجہ سے پیش کردہ درخواستوں پر کوئی فیصلہ نہیں ہو پاتا تھا۔ اب ایسے تمام اداروں کو اقلیتی ادارہ قرار دیے جانے کی ساری سہولتیں مہیا ہیں۔

دراصل اہمیت اس بات کی ہے کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے اس پر عمل بھی ہو رہا ہے یا نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حکام کے رویے میں وزیر اعلیٰ کی ہدایات کے مطابق جو خوشگوار تبدیلی آئی ہے وہ بہت اہم ہے۔ چنانچہ راقم الحروف نے الٰہ آباد میں ایک پبلک اسکول کے لیے سرکار سے زمین کی مانگ کی تھی اور اس سلسلے میں وزیر اعلیٰ نے جس [illegible] کا ثبوت دیا ہے۔ اور اس طرح کی سیکڑوں مثالیں [illegible] کے سلسلے میں

میں ہوا کرتی ہیں۔

شاعری میں کچھ اطلاع ہندوستانی تشکیل نہایت ہی نیک، مبارک اور مستحسن اقدام ہے۔ واضح ہو کہ اقلیتوں کو اس کی شکایت رہا ہے کہ انھیں ملازمتوں کے دفتروں میں مناسب حصہ نہیں ملتا تھا لیکن شاعری کی ملازمتوں میں انھیں مناسب حصہ کم نہ ملے گا۔ یہ ایسی بات ہے کہ اس کا دل سے خیر مقدم کیا جانا چاہیے۔

اس طرح کے اقدامات کے ساتھ دانشور طبقہ کی پذیرائی اور ان کے تعلیمی کاموں کا اعتراف کسی بھی طبقہ کی شناخت اور پہچان کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ دانشورانہ سطح پر جو اقدامات کیے گئے ہیں ان میں سے ایک اہم بھارتیہ بھاشا سنستھان کا قیام ہے اور اس سنستھان سے تمام زبانوں کو منسلک کر دیا گیا ہے اور اب صوبے میں تمل، تیلگو، کنڑ، ملیالم، اڑیہ، بنگالی، گجراتی اور مراٹھی زبانوں کے درجات چلائے جائیں گے اور زبانوں کے سیکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔ اس طرح لسانی ہم آہنگی سے قومی یکجہتی کو بھی فروغ حاصل ہوگا۔ اردو اکادمی کو بھی اسی بھاشا سنستھان سے منسلک کر دیا گیا ہے چنانچہ اب پہلے انعام کی رقم ایک کروڑ روپیہ سے بڑھا دی گئی اور مجموعی خدمات کے اعتراف میں انعام کی رقم اب ۵۰ ہزار ہوا کرے گی۔

حکومت نے یش بھارتی سمان کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے اس میں جہاں محترم ہریونش رائے بچن کو خود وزیر اعلیٰ نے جا کر ان کی خدمت میں معزز انعام پیش کیا وہاں لکھنؤ میں ایک باوقار تقریب میں محترم کیفی اعظمی کی خدمت میں یش بھارتی سمان پیش کیا گیا۔ اس اعزاز سے جن لوگوں کو اور نوازا گیا ان میں اہم نام مشہور فلمی ہدایت کار اور اداکار جاوید اختر اور متحرک شکل دینے والے جناب مظفر علی کا بھی ہے۔ قیصر باغ کی بارہ دری میں وزیر اعلیٰ نے انھیں خود اس انعام سے سرفراز کیا۔ یش بھارتی سمان سے فخر لسانیات اور رشک ہندوستان جناب استاد بسم اللہ خاں صاحب کو بھی نوازا گیا۔ یہ بات ساری دنیا کے لیے قابل فخر ہے کہ بنارس کا یہ عظیم فرزند اور قوی یکجہتی کا علمبردار بین الاقوامی شہرت کا حامل ہے۔ وزیر اعلیٰ نے ان کی خدمت میں یہ انعام خود پیش کیا۔ البتہ انعام کی رقم کا ذکر نہیں ہوا کرتا۔ وہ شال اور ستائش نامہ اور رقم حاصل کر کے علاقائی اعتراف ہوتے ہیں۔ البتہ اس کا اعلان ہے کہ حکومت کے سربراہ نے جن دانشوروں کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی نگاہوں میں یہ وقار حاصل کیا ہے ان کا تعلق اقلیتوں کے ان طبقوں سے ہے جن کے شکار...

...کی طرف ان کی نظروں سے ہے۔

یہ ساری وسعت نظر اقلیتوں کے متعلق ہے لیکن اس سے الگ ہٹ کے بہت سارے اقدامات ایسے ہیں جن میں سے ہر ایک کا فائدہ اکثریت اور اقلیت کو یکساں حاصل ہوگا۔ ابھی حال ہی میں ریاستی ملازموں کے مہنگائی بھتہ میں اضافہ کیا گیا ہے۔ کسانوں پر جو بوجھ تھا اور جو بقایا بہت زیادہ ہو چکا تھا ان کو معاف کر دیا گیا ہے۔ اس کا فائدہ ایک بہت بڑی تعداد اور اس کی اقلیتوں کو بھی ہوگا اور اس کا فائدہ اقلیتوں کو بھی پہنچے گا۔

اس طرح آگرہ اور لکھنؤ میں ۳۰ کروڑ روپیہ کے سرمایہ کاری کا بھی سبب، ساتھ اقلیتی طبقہ کو فائدہ پہنچے گا اور کئی ایسے کام ہیں جو بہت ہی اہم ہیں اور ان سے سب کو فائدہ پہنچے گا اور ان سب میں اقلیت بھی شامل ہے۔ مثلاً ہوم گارڈ، دستکاروں کا ڈیلی الاؤنس ۱۵ روپیہ سے بڑھا کر ۲۵ روپیہ کر دیا گیا ہے۔ مجاہدین آزادی کو ملنے والی پنشن کی رقم بڑھا کر ۱۵۰۰ روپیہ ماہانہ کر دی گئی ہے۔

بجلی گھروں اور دیگر ریاستی سرکاری اداروں کے جانداروں پر پابندی لگانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ہر ترقیاتی بلاک میں ایک اسٹر کالج اور گرام سبھا لیول پر اسکول قائم کیا جا رہا ہے۔

یہ وہ اہم نکات ہیں جن سے ہر طرح سے اقلیتوں کا مقبول ہے اور جن سے واقفیت اور سا لگی ہماری مجموعی ترقی کے لیے مفید اور کارآمد ہے۔ وہ تمام لوگ جو ہمیشہ شکوہ شکایت کرتے رہے ہیں اور صرف اعتراض کرتے ہیں ان کی خدمت میں گذارش ہے کہ

عیب ہے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

□□

—— ڈاکٹر سید رضوان حیدر

کہاں اُٹھاؤ گے ہیں سامنے نشانے بہت
ابھی تو خالی پڑے ہیں لہو کے خانے بہت
ابھی کچھ اور کا احساس پھر بھی زندہ ہے
تو یوں تو جسم کے اسرار ہم نے جانے بہت
لگا ہوا ہوں اِدھر وقت کو سمیٹنے میں
پھسل رہے ہیں اُدھر ہاتھ سے زمانے بہت
سفر قیام سے بہتر نہیں رہا اب کے
کہ جا بجا تھے مری راہ میں ٹھکانے بہت
بڑی عجیب تھی پچھلی خموش رات حسنؔ
مجھے رُلایا کسی دُور کی صدا نے بہت

حسن عزیز

۱۲۵/۳۵ پیکاپور، کان پور
۲۰۸۰۰۱

خود کو ہم بھول گئے تیری جفا سے پہلے
کوئی انداز نہ راس آیا وفا سے پہلے
ٹوٹ جانے کا تھا احساس مگر اتنا نہ تھا
میں بکھر جاؤں گی خوشبو میں ہوا سے پہلے
جن سے ہم گزرے ہیں اے دوست تری یاد کے ساتھ
کیا مقامات تھے وہ کوہِ ندا سے پہلے
ہم ہی مٹ جائیں گے قسمت کی لکیروں کی طرح
رنگ اُڑ جائیں گے سب رنگِ حنا سے پہلے
ڈھونڈ لے مجھ کو تو اپنوں کی دعا میں زرّیںؔ
ورنہ کھو جاؤں گی میں تیری صدا سے پہلے

ڈاکٹر عفت زرّیں

۳۴۴۵- گلی حکیم جی - چوڑی والان
جامع مسجد، دہلی ۱۱۰۰۰۶

خزاں کی دلکشی بھی کم نہیں ہے
بہار آئے نہ آئے غم نہیں ہے
ہے کارِ شیشہ و آہن محبت!
یہ تمثیلِ گل و شبنم نہیں ہے
خرد کی روشنی اس کو مبارک
جنوں کی رہبری کچھ کم نہیں ہے
وہ مقتل ہو کہ بزمِ ناز اس کی
ہمارا سر کہیں بھی خم نہیں ہے
اِدھر میں ہوں سراپا شوق معراجؔ
اُدھر بھی آگ دل کی کم نہیں ہے

ڈاکٹر معراج احمد

شعبۂ سماجیات
لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

غزلیں

برہمن ہونا نہ زاہد کا مسلماں ہونا
سب سے پہلی ہے ضرورت مرا انساں ہونا
خوش نہ اس بات پہ اے گردشِ دوراں ہونا
تھا مقدر میں یہاں خاک بداماں ہونا
منحرف دورِ ترقی کا نہیں ہوں لیکن
اچھا لگتا ہے مجھے چاک گریباں ہونا
ہے تقاضائے مشیت کہ سفر جاری رہے
مشکلوں کا نہیں از خود کبھی آساں ہونا
ایک اک لفظ قمرؔ سینچا ہے خونِ دل سے
کتنا آساں سمجھے ہے اک صاحبِ دیواں ہونا

قمر گونڈوی

گردشِ شام و سحر پیشِ نظر ہے کہ نہیں
پیر کے نیچے کوئی کاسۂ سر ہے کہ نہیں
راہ میں شام نہ ہو جائے کہیں دیکھ تو لوں
میرے ہمراہ مرا رختِ سفر ہے کہ نہیں
سیرِ گلگشت کو نکلے ہو تو یہ بھی دیکھو!
خشک پتّوں پہ بہاروں کا اثر ہے کہ نہیں
وہ جو ہر اک کو محبت سے دعا دیتا تھا
آج کے دور میں زندہ وہ بشر ہے کہ نہیں
جس کے احساس سے جیتے رہے باقرؔ صاحب
اب بھی سینے میں وہ خوابوں کا نگر ہے کہ نہیں

ڈاکٹر علی باقر زیدی

۱۰۹- سیکٹر این، علی گنج، لکھنؤ

بام و دیوار نہ در جانتے ہیں
ہم تو صحرا ہی کو گھر جانتے ہیں
تم جسے کاہکشاں کہتے ہو
ہم اُسے راہ گزر جانتے ہیں
سرفروشانِ جنوں ہیں ہم لوگ
جشنِ مقتل کی خبر جانتے ہیں
جو کبھی عیب ہوا کرتا تھا
لوگ اب اس کو ہنر جانتے ہیں
جو ٹپکتے ہیں کبھی آخرِ شب
ہم ان اشکوں کو گہر جانتے ہیں

ڈاکٹر آفاق فاخری

پوسٹ جلال پور ضلع فیض آباد ۲۲۴۱۴۹

اتر پردیش میں

امداد باہمی - ایک جائزہ

دنیا کے امور امداد باہمی اشتراک و تعاون سے ہی انجام پاتے رہیں۔ ارتقا تہذیب کے ساتھ ساتھ اشتراک و تعاون کی بنیادوں میں بھی تبدیلی آئی ہے۔ لیکن اصل جذبہ اپنی بنیادی صورت میں ہی ہے۔ سائنس کی تیز رفتار ترقی نے اس جذبہ کو آدمی سے معاشرہ، معاشرہ سے ملک اور ملک سے عالمی سطح تک وسعت دیدی آج زراعت، صنعت تجارت، تعمیرات اور پیداوار کے دوسرے شعبوں میں بھی تعاون کا جذبہ جھلکتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں مختلف ممالک کے درمیان تعلق قائم ہے۔

دیہی ترقی کے شعبے میں امداد باہمی کی کوشش ایک عظیم انقلابی طاقت کی حیثیت رکھتی ہے، جو پُر امن، رضاکارانہ تصور پر مبنی ہے۔ منصفانہ قدروں کو جمہوریت کی بنیاد پر قائم کرنے کا بے مثال تجربہ بھی ہے۔ اس لئے امداد باہمی کی کوششیں یقینی طور پر دیہی معیشت میں انقلابی کردار نبھانے کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ اور ریاست کی سطح پر امداد باہمی کو زرعی اور دوسری پیداوار میں اہم رول دیا گیا ہے۔ اس سے اس کی کارکردگیوں میں تبدیلی آئی ہے۔ لیکن چند در چند وجوہات کی بنیاد پر غریب طبقہ اس سے پورا فائدہ نہیں اٹھا رہا ہے۔ موجودہ سرکار ان طبقات کو فائدہ پہونچانے کے لئے ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔ حکومت سمجھتی ہے کہ امداد باہمی کوششوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کیلئے گاؤں کے نوجوانوں اور باصلاحیت افراد کو آگے لانے کی ضرورت ہے۔ جس سے سماج کے غریب افراد کو امداد باہمی انجمنوں کی جانب متوجہ کر کے ان کی معاشی ترقی، خاص طور سے زراعت، آبپاشی، چھوٹی صنعتوں خرید و فروخت، تقسیم، بجلی کاری، رہائشی مکانات اور غریب طبقہ کے افراد خاص طور سے کسانوں کے لئے ضروری سہولیات کی تکمیل میں امداد باہمی انجمنوں کا مکمل استعمال کیا جا سکے۔ موجودہ حکومت نے امداد باہمی تحریک کو اتر پردیش میں اور زیادہ مؤثر اور فعال بنانے اور اسے زیادہ مستحکم کر کے متعدد اہم فیصلے کئے ہیں جنکی افادیت ثابت ہوتی جا رہی ہے۔

امداد باہمی میں عوام کی حصہ داری شامل کر کے عوامی سماج کے قیام کے مقصد سے گاؤں کی سطح پر پرائمری زرعی انجمنوں سے لیکر ریاستی سطح کی اعلیٰ امداد باہمی انجمنوں میں انتخابات کی کارروائی دسمبر ۱۹۹۲ء میں ہی شروع کر دی گئی تھی اور اس کے بعد پرائمری زرعی قرض کمیٹیوں، امداد باہمی انجمنوں، خرید و فروخت کمیٹیوں، مرکزی باہمی صارفین ذخیروں اور ریاستی سطح کی اعلیٰ امداد باہمی کمیٹیوں کے انتخابات کامیابی کے ساتھ کرائے گئے۔ واضح ہو کہ ان کمیٹیوں کے انتخابات گذشتہ کئی برسوں سے نہیں کرائے گئے تھے ریاست کی موجودہ حکومت نے یہ انتخابات کرا کر جمہوری نظام کو اور مضبوط و مستحکم بنایا ہے۔

امداد باہمی انجمنوں کا انتظام عوامی نمائندوں کے ہاتھوں میں سونپنے کے مقصد سے موجودہ سرکار کے پروگراموں کے توسط سے ریاست میں پہلی مرتبہ اس تحریک کے مفید اور جمہوری پہلو کو مستحکم کیا گیا ہے۔

موجودہ حکومت نے عنان حکومت سنبھالتے ہی امداد باہمی کو خصوصی امتیازات دینے کی غرض سے ایک کمیٹی تشکیل کی جس کی رپورٹ کے مطابق اتر پردیش امداد باہمی قانون ۱۹۶۵ء میں ترمیم کی گئی اور امداد باہمی انجمنوں کی مدت اب تین سال سے بڑھا کر

پانچ سال کردی گئی ہے۔ قانون کی دفعہ ۱۱۳ کے حق میں آسان کرنے اور ترمیم کرکے ساتھ نافذ کرنے کا حق حکومت کو حاصل تھا۔ اسطرح رجسٹرار امداد باہمی انجمنوں کے ذریعہ کمیٹیوں کی انتظامی انجمنوں کی مدت ختم ہونے سے قبل لازمی طور پر انتخابات کرائے جانے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ اگر اصول و ضوابط کے تحت کارروائی مکمل نہ کی جائے تو انتظامیہ کمیٹی کے خود بخود تحلیل ہو جانے کا اب بندوبست کیا گیا ہے۔ امداد باہمی تحریک میں اقوام و قبائل درج فہرست، پسماندہ ذاتوں اور خواتین کے ریزرویشن کو یقینی بنانے کے مقصد سے موثر کارروائی کی جا رہی ہے۔

سوشلسٹ سماج کے ڈھانچہ کے لئے اپنائے گئے منصوبہ بند معاشی بندوبست میں مختلف ترقیاتی اسکیموں کی عمل آوری خاص طور پر زرعی پیداوار کے اضافہ میں اہم کردار رہا ہے۔ ریاست کی ۸۵۹۹ پرائمری امداد باہمی زرعی قرض سمیتیوں کے توسط سے ریاست کے امداد باہمی ممبروں کو ان کی پیداوار کے لئے کم شرح سود پر قرض کیمیاوی کھاد اور زرعی آلات وغیرہ مہیا کرانے اور انکی پیداوار کی مناسب قیمت دلانے کے لئے حکومت پر عزم ہے۔ اس کے علاوہ کمزور طبقہ کے لوگوں کو روزمرہ کے استعمال کی اشیا کو سستے داموں پر دستیاب کرانا اور اسٹور کرنے کی سہولیت مہیا کرانا ہے۔ موجودہ حکومت امداد باہمی زرعی قرض انجمنوں کے ۱۱۰۱۹۷ لاکھ ممبران، حکومت کے ذریعہ چلائی جا رہی مختلف فلاحی اسکیموں سے مستفید ہو رہے ہیں۔ ان مقاصد کی تکمیل میں محکمۂ امداد باہمی مسلسل کوشاں ہے اور زیادہ کاموں میں اضافہ کی جانب گامزن ہے۔

اترپردیش امداد باہمی دیہی ترقیاتی بینک کے ذریعہ خصوصی طور پر منی آبپاشی کے لئے طویل مدتی قرض دیا جاتا ہے۔ منی آبپاشی کے علاوہ زرعی آلات جیسے ٹریکٹر، پاور تھریشر اور افزائش مویشیاں ڈیری، ماہی گیری وغیرہ پروجیکٹوں کے لئے بھی طویل مدتی قرض دیا جاتا ہے۔ رواں مالیاتی سال میں ۱۹۵ کروڑ روپیہ کے نشانہ کے مقابلہ میں ۳۱ اگست ۹۴ تک ۵۵ کروڑ روپیہ سے زیادہ کا طویل مدتی قرض تقسیم کیا گیا جو گزشتہ سال کی اسی مدت سے ۱۱۶۹۹ کروڑ روپیہ زیادہ ہے۔ امداد باہمی دیہی ترقیاتی بینک کے نجی وسائل ۱۱۰۸۰ کروڑ روپیہ ہے۔ ۳۰ جون ۱۹۹۴ تک بینک کی وصولی ۱۲۸۰۲ فی صد رہی۔ اس سال وصولی کا نشانہ ۸۰ فیصد رکھا گیا ہے۔ بینک اپنے ابتدائی دور سے اب تک فائدہ پر چل رہا ہے۔

صوبائی حکومت کی پالیسی کے تحت امداد باہمی کا اعلا ادارہ اترپردیش کوآپریٹو بینک کاشتکاروں کو فصلی قرض آسان قسطوں پر فراہم کر رہا ہے۔ اس بینک کا مجموعی سرمایہ دسمبر ۱۹۹۳ء تک مجموعی طور پر ۱۱۲۰ کروڑ روپیہ تھا جو ۳۰ ستمبر ۱۹۹۴ کو بڑھ کر ۱۴۵۰ کروڑ روپیہ ہو گیا۔ اس بنک کے ذریعہ ضلع امداد باہمی بینکوں اور ابتدائی زرعی قرض سمیتیوں کے توسط سے گاؤں کے ۲۰۵ لاکھ کاشتکار ممبروں کو اس سال ۴۹۹ کروڑ روپیہ ربیع فصل کیلئے اور ۳۴۰ کروڑ روپیہ خریف فصل کے لئے زرعی پیداوار قرض آسان قسطوں پر فصلی قرض کی شکل میں تقسیم کیا گیا۔

دیہی علاقے کے ۳۱ ہزار ممبروں کو جن میں کسان ممبر غیر کسان ممبر اور دستکار شامل ہیں کل ۲۶ کروڑ روپیہ کے وسط مدتی قرض مہیا کرائے گئے۔ گزشتہ جون کو ختم ہوئے امداد باہمی سال میں زرعی قرض کی وصولی ۶۲ فی صد رہی اس مدت میں عالمی بینک نے نابارڈ سے فصلی قرض کی تقسیم کے لئے ۵۸۹۱۰ روپیہ کا سرمایہ حاصل کیا جو گزشتہ سال کے مقابلہ میں ۱۰۱۸۹ کروڑ روپئے زیادہ تھا۔ امداد باہمی سال رواں میں جولائی سے ستمبر تک کی مدت میں اترپردیش امداد باہمی بینک کے توسط سے نابارڈ سے ۶۱۱۴۷ کروڑ روپیہ کا سرمایہ حاصل کیا گیا جو گزشتہ سال کی اسی مدت میں حاصل کئے گئے سرمایہ سے ۹۶۲۹ کروڑ روپیہ زیادہ ہے۔

اسی طرح امداد باہمی کے ایک دوسرے اعلا ادارہ پی سی ایف نے موجودہ حکومت کے اقتدار میں آنے کے بعد یعنی دسمبر ۱۹۹۳ء سے ستمبر ۱۹۹۴ء کے دس مہینوں میں ۱۲۵۳۱۴ کروڑ روپیہ کا کاروبار کیا جبکہ اسی مدت میں گزشتہ سال ۱۱۹۹۷۵ کروڑ روپیہ کا ہی کاروبار کیا گیا تھا۔ اسی طرح گزشتہ سال کی اس دس ماہ کی مدت

جو کئے گئے کاروبار سے ۲۵ء۲۳ کروڑ روپیہ کا زیادہ کاروبار کیا گیا۔ ان دس مہینوں میں جہاں پی سی ایف نے دوسرے کاروبار کئے وہیں اس کی جانب سے ریاست میں امداد باہمی کمیٹیوں کے توسط سے ۱۱۵ء۲۳ کروڑ روپئے کی کھاد تقسیم کی گئی جو گذشتہ سال کی اس مدت میں تقسیم کی گئی کھاد کے مقابلہ میں ۲۶ء۱۵ء۴ کروڑ روپیہ زیادہ ہے۔

امداد باہمی کا ایک دوسرا ادارہ اتر پردیش صارفین امداد باہمی کی جانب سے اگست ۹۳ تک ۱۵۳۴۰ء لاکھ روپیہ کا کاروبار کیا گیا جو گذشتہ سال اسی مدت میں کئے گئے کاروبار سے ۲۹ء۱۹ لاکھ روپیہ زیادہ ہے۔ اس سال رام پور میں زری، زردوزی اور پیچ ورکس کا پراجکٹ شروع کیا گیا ہے۔ اس پراجکٹ میں رامپور میں پانچ خواتین کمیٹیوں کی تشکیل کی گئی ہے۔ ادارہ کی جانب سے ممبروں کو کچا مال۔ مالی امداد کی سہولت مہیا کرائی جارہی ہے۔ امداد باہمی دستکاروں کے ذریعہ تیار مال کی فروخت کیلئے ملک کے کئی شہروں میں نمائش اور میلوں کا انعقاد کیا گیا تاکہ انھیں بچولیوں سے نجات مل سکے اور اپنی چیز کا مناسب پیسہ انھیں خود حاصل ہو۔ دستکاروں کو بچولیوں سے بچانے کے سلسلے میں سرکار نے کئی قدم اٹھائے ہیں۔ اس پالیسی کے تحت صارفین امداد باہمی اداروں کے توسط سے اب تک ۱۲۱ امداد باہمی کمیٹیوں کی تشکیل کی جاچکی ہے جن میں ۲۵۰۰ دستکار ممبر ہیں۔

امداد باہمی کا ایک ادارہ ہے اتر پردیش کوآپریٹیو یونین جو امداد باہمی کو فروغ دینے کی غرض سے نشر واشاعت اور امداد باہمی تعلیم وتربیت دیتا ہے۔ اس ادارہ کے ذریعہ سال ۹۲-۱۹۹۱ء سے اب تک قریب ۱۱ لاکھ ممبروں امداد باہمی سے متعلق افراد کو تربیت دی گئی ہے۔

وزیر اعلا جناب ملائم سنگھ یادو جو خود امداد باہمی تحریک سے وابستہ رہے ہیں انھوں نے ریاست میں اس تحریک کو ایک نئی جہت دینے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ امداد باہمی انجمنوں کے نٹ ورکس سے مواضعات کو جوڑ کر ہی ان کی بنیادی ضرورتیں پوری کی جاسکتی ہیں۔ اس تحریک کو مستحکم بنانے کی غرض سے ہی گذشتہ ۲۰ نومبر کو لکھنؤ واقع بیگم حضرت محل پارک میں سہکارتا مہا سمیلن کا انعقاد کیا گیا جس میں صوبہ کے علاوہ ملک کے دوسرے صوبوں سے امداد باہمی تحریک سے وابستہ افراد نے شرکت کی۔ اس موقع پر ان افراد کی خدمات کے صلہ میں انعامات بھی تقسیم کئے گئے۔

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اتر پردیش میں امداد باہمی ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔

——— خورشید ظفر

قول وعمل ——— صفحہ ۲۴ کا بقیہ

کی شروعات کی گئی ہے۔

۴. اُردو اکادمی کے انعامات کی رقم میں اضافہ کردیا گیا ہے۔

۵. اچھی کتابوں کے مصنف کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے ۱۰۰۰ روپے ماہانہ اور ۵۰۰ روپئے کے وظیفے شروع کیے گئے ہیں۔

۶. مختلف علاقوں کے ان فن کاروں، ادیبوں، صحافیوں کو اعزاز بخشنے کا فیصلہ کیا گیا ہے جو ریاست کا وقار بڑھا رہے ہیں۔ اب تک پانچ تقریبات منعقد کرکے "یش بھارتی سمان" دیئے جاچکے ہیں۔

آخر کلام میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ تمام اقدامات اور فیصلے عوام کے بھرپور تعاون ہی سے روبہ عمل ہوسکتے ہیں۔ ان کا فائدہ بھی عوام ہی کو ملے گا۔ ایک فلاحی ریاست کا خواب اب سراب نہیں، حقیقت کی تعبیر لیے ہوئے سامنے آرہا ہے کہ

وابستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

——— نازش جہاںؔ

جوابِ طلب امور کے لیے ٹکٹ لگا لفافہ ارسال کریں اور خط وکتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر فرمائیں۔

——— ادارہ

قول و عمل

قول و عمل میں تضاد سبھی کے لئے ایک ناپسندیدہ امر ہے یہاں تک کہ جو خود اس کے مرتکب ہوتے ہیں، وہ بھی دوسروں سے اس کی توقع نہیں کرتے۔ عام انسانوں کی زندگی میں اس سے انتشار اور بے لطفی پیدا ہوتی ہے۔ وہ شخص معتبر نہیں ہوتا جو وقتی فائدے یا حالات کے دباؤ کے تحت ایسے وعدے کر لیتا ہے، جن پر بعد میں عمل ممکن نہ ہو سکے یا سرے سے ان کے پورا کرنے کا ارادہ ہی نہ رکھتا ہو۔

سربراہانِ ملک و ملت کے معاملے میں یہ رویہ بے حد مضر اور دور رس نتائج کا حامل ہوتا ہے۔ جمہوری نظام حکومت میں تمام باشندوں کو یکساں حقوق کی ضمانت ملک کے آئین میں دی گئی ہے۔ ہمارا ملک اس معاملے میں کئی لحاظ سے منفرد ہے۔ یہاں زبان، مذہب، علاقہ، تہذیب و تمدن اور نسل و فرقوں کی اتنی رنگا رنگی ہے کہ ان سب کو مساوی حقوق کی گارنٹی دینا مشکل کام ہے۔ آئین بنانے والوں نے تحریری ضرورت تو پوری کر دی مگر آئین و ملکی قوانین پر خاطر خواہ عمل درآمد آسان نہیں یہی سبب ہے کہ اقلیت، پسماندگی، تعلیمی اور معاشی کمزوری محکومی کی علامت تصور کی جانے لگی۔ اس طرح ان طبقوں میں بتدریج کم ہمتی، اپنے حقوق کے حصول کے لئے بے توجہی اور حالات کو جوں کا توں قبول کرنے کی عادت پڑ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ برسر اقتدار سیاسی جماعتوں نے ان طبقوں کی عددی طاقت کو دلکش، خوش آیند اور خوش حال مستقبل کے رنگین خواب دکھا کر اپنے مفاد اور حصول مقاصد کے لئے بے جھجک استعمال کرنا اپنا حق اور روّیہ بنا لیا۔ الکشنی وعدے، حکومت کے حاصل کر لینے کے بعد یکسر فراموش کر دیئے گئے۔ یا بہت کیا تو کچھ تھوڑا سا دے دلا کر اپنے فرض سے سبک دوش ہو گئے۔

لیکن یہ طریق کار اور دلفریبی بہت دنوں تک جاری اور کامیاب نہیں ہو سکی۔ ضرورت اور حالات کے دباؤ نے ان فرقوں کو متحد ہونے اور جائز آئینی حقوق کے حصول کے لیے جدوجہد پر آمادہ کرنے کی راہ دکھائی۔ مخلص اور دردمند قیادت کی کمی نہ تھی، نہ ہے۔

اتر پردیش کی موجودہ حکومت کے قائدین نے ان طبقوں کی حالت کس مپرسی اور زبوں حالی کو نہ صرف سمجھا بلکہ ان کے دیرینہ مطالبات کو پورا کرنے کا الکشنی مینو فیسٹو میں وعدہ بھی کیا۔ عوام کو امید کی کرن نظر آئی اور انھوں نے اپنی رائے سے انھیں یہ موقع فراہم کیا کہ جو کہہ رہے ہیں اسے کر دکھانے کے لیے ایوان حکومت تک پہونچا دیا۔

نئی سرکار نے بھی اپنے وعدے کا پاس کرتے ہوئے بہت جلد ایسے اقدامات کرنے کا اعلان کیا، جو بظاہر ناممکن نظر آتے تھے۔ اب قول کی منزل سے آگے بڑھ کر عمل کی راہ پر بڑھنے کا مرحلہ تھا۔ خوشی اور اطمینان کی بات ہے کہ قول و عمل کی یکسانیت کا مظاہرہ جلد ہی نظر آنے لگا۔

زیر نظر مضمون میں ان اقدامات کا اجمالی تذکرہ مقصود ہے جو اب تک کیے جا چکے ہیں اور جن کے نتائج عوام کی فلاح و بہبود کے پیش نظر ہیں۔ بہت سے وعدے عمل کی منزل کے مختلف مراحل میں ہیں۔ سرکاری احکام اور اقدام پر خاطر خواہ عمل درآمد کے لئے انتظامیہ میں بھی مختلف سطحوں پر ضروری تبدیلیاں کی جا رہی ہیں۔ جواب دہی اور ذمہ داری متعین کی جا رہی ہے اور عملاً یہ ثابت کر دیا گیا کہ مخلص اور ہمدرد قیادت، عوام کے تعاون سے انتظامیہ کو مثبت اور واضح ہدایت دے کر فعال بنانے کے لیے کوشاں ہے۔

ریاست میں اقلیتوں کے مسائل کا حل سلطنت کی بھول بھلیاں میں

[illegible] گئے ہیں۔ یہاں تک میں سرگرم رہ کر مرحلے وار طریقے سے کیا جا رہا ہے۔ ان کا اتحاد اور اتفاق ضروری ہے۔

اردو زبان کو اس کا جائز حق اور مقام دلانے کے لئے سرکار کا جو اب تک جو کچھ کیا جا چکا ہے اس کی تفصیل اس طرح ہے۔

الف : ابتدائی سطح پر جن بچوں کی مادری زبان اردو ہے ان کی اردو کی تعلیم کا معقول بندوبست کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اگر کسی پرائمری اسکول میں پانچ سے زیادہ بچوں کی مادری زبان اردو ہے تو وہاں ایک اردو مدرس اور اس کے بعد ۵۰ ایسے بچوں پر ایک اور اردو مدرس کی تقرری کی جائے گی۔

سرکاری طور پر یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس طرح ریاست کے پرائمری اسکولوں میں تقریباً ۱۲ ہزار اور جونیئر ہائی اسکولوں میں تقریباً ایک ہزار اردو اساتذہ کی تقرری کرنی ہوگی۔

ب : ثانوی سطح پر بھی مرکزی حکومت کی لسانی پالیسی کے مطابق ہندی کو اولین ترجیح دے کر سہ لسانی فارمولا لاگو کرتے ہوئے اس میں اردو زبان کو مناسب درجہ دیا جائے گا اور اس بات کا خیال رکھا جائے گا کہ جہاں ایک یا دیگر ایسے تمام طلبا کے لیے جو اردو پڑھنا چاہتے ہوں، ثانوی سطح پر اردو کی تعلیم و تربیت کا معقول بندوبست کیا جائے، وہیں دوسری جانب سنسکرت کے پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ اسی طرح چلتا رہے گا۔

ج : ابتدائی اور ثانوی سطح پر اردو کی نصابی کتابوں کی چھپائی اور فراہمی کا بھی معقول بندوبست کیا جا رہا ہے تاکہ ان کی کمی کے باعث کسی قسم کی پریشانی نہ ہو۔

د : ریاست میں غیر رسمی تعلیمی پروگرام کے تحت کھولے گئے مراکز میں سے دس فیصد مراکز میں اردو زبان میں غیر رسمی تعلیم دی جائے گی۔ سال ۹۵-۱۹۹۴ء میں ریاست میں ۳۰ ہزار غیر رسمی تعلیمی مراکز میں سے تین ہزار مرکز اردو کے ہوں گے۔

ہ : ریاست میں چل رہی مکمل حرف شناسی مہم کے تحت بھی مندرجہ بالا کے مطابق اردو زبان میں بھی حرف شناس بنانے کا مناسب بندوبست کیا جائے گا۔

و : اردو اساتذہ کی تربیت کے لئے معقول بندوبست کیا جائے گا تاکہ ہر سرکاری اساتذہ یا تعلیمی شعبات میں لیے جانے والے اردو اساتذہ کو مناسب تربیت جلد دی جا سکے۔

ز : ہر محکمے کے ہر دفتر میں ایک اردو مترجم کی تعیناتی کی جا رہی ہے تاکہ اگر کوئی شخص اردو میں درخواست دیتا ہے تو اس پر معقول کارروائی کی جا سکے۔

ح : ہر سرکاری تقرری جس میں تحریری امتحان ضروری ہے اس کے لئے تحریری امتحان میں ہندی کے علاوہ اردو میں بھی کرانے کے احکام جاری کر دیئے گئے ہیں۔

ط : اقلیتی فرقہ کے افراد کو آئین کی دفعہ ۳۰ کے تحت اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور چلانے کا اختیار ہے۔ قبل میں اس قسم کے تعلیمی اداروں کو اقلیتی ادارے قرار دینے کا کوئی بندوبست نہیں تھا اور اس سبب سے ان کی پیش کردہ درخواستوں پر کوئی فیصلہ نہیں ہو پاتا تھا۔ اب ان اداروں کو اقلیتی ادارے قرار دینے کا بندوبست کر دیا گیا ہے۔

ی : اس سے قبل حکومت نے اقلیتی کمیشن کو ختم کر دیا تھا۔ نہ صرف اس کو دوبارہ قائم کیا گیا ہے بلکہ اقلیتی کمیشن کو اب قانونی درجہ بھی دے دیا گیا ہے۔

ک : ریاست میں فرقہ وارانہ کشیدگی اور فسادات کے پیش نظر امن تحفظ دستہ نامی جدید پولیس فورس کی تشکیل کی جا رہی ہے۔ اس ضمن میں قانون بھی پاس کر دیا گیا ہے۔

ریاستی سرکار کے سماجی تبدیلیوں سے متعلق اہم فیصلوں کا مختصر جائزہ فعال قیادت کے قول و عمل میں یکجائیت اور نیک نیتی کی تصویر بڑی واضح کر دیتا ہے۔ خاص خاص شعبوں کے کچھ نکات ملاحظہ ہوں: ——

پسماندہ اور کمزور طبقوں کی فلاح

۱. منڈل کمیشن کی سفارشات کی بنیاد پر سرکاری نوکریوں میں پسماندہ طبقے کے لئے ۲۷ فیصد، اقوام و قبائل درج فہرست

کے لئے بالترتیب ۱۶ فیصد اور ۲ فیصد ریزرویشن کا انتظام قانون کے تحت کیا گیا ہے۔ اسی طرح سی پی ایم ٹی، انجینئرنگ کالج اور پالی ٹکنک میں پسماندہ طبقوں کے لئے ۱۵ فیصد اور اقوام درج فہرست کے لیے ۲۱ فیصد ریزرویشن کیا گیا ہے۔

۲. ضعیفوں کی پنشن اسکیم کے تحت ۹۵-۱۹۹۴ء میں ریاست میں ایک لاکھ معاملات میں پنشن منظور کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

۳. بیوہ پنشن اسکیم کے تحت ۹۵-۱۹۹۴ء میں ۲۵ ہزار نئے معاملات میں پنشن منظور کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

۴. معذور پنشن اسکیم کے تحت سال ۹۵-۱۹۹۴ء میں تمام دائمی معذور افراد کو پنشن منظور کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

۵. ماہی پروری کے لئے تالاب کے پٹے لازمی طور سے ماہی گیروں کو ہی دینے کے احکام دیے گئے ہیں۔

۶. کمہار/پرجاپتی طبقے کے افراد کو مٹی دستیاب کرانے کے لئے ترجیحات کی بنیاد پر زمین کے پٹے دینے کے سرکاری احکام دیے گئے ہیں۔

۷. نگر پالیکا اور نگر مہاپالیکاؤں میں خواتین صفائی ملازمین کی حاضری کا وقت بدل کر صبح ساڑھے آٹھ بجے کر دیا گیا ہے۔

۸. مغربی اتر پردیش کے کھیتوں پر کام کرنے والے مزدوروں کی اُجرت ۲۵ روپے یومیہ سے بڑھا کر ۳۵ روپے یومیہ اور باقی جگہوں پر ۲۳ روپے یومیہ سے بڑھا کر ۳۲ روپے یومیہ کر دی گئی ہے۔

۹. بیڑی مزدوروں کی کم سے کم اجرت ۲۰ روپے فی ہزار سے بڑھا کر ۲۵ روپے فی ہزار کر دی گئی ہے۔

۱۰. آئندہ پانچ سال میں دس ہزار منتخب امبیڈکر گاؤں کی ترقی کا پروگرام تیار کیا گیا ہے۔

۱۱. اقوام و قبائل درج فہرست کی حفاظت اور انھیں ریزرویشن کی سہولت کو یقینی بنانے اور ان پر ہونے والے مظالم اور ان کی شکایتوں کی جانچ کے لیے اقوام و قبائل درج فہرست کمیشن کی تشکیل کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

اقلیتوں کی فلاح و بہبود

۱. فرقہ وارانہ فسادات کو روکنے کے لئے نشانی ٹاسک فورس کی تشکیل کی جا رہی ہے۔

۲. جن بچوں کی مادری زبان اُردو ہے انہیں ابتدائی اور ثانوی سطح پر اُردو پڑھانے کی سہولت مہیا کرانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس کے لئے اتر تعداد میں اساتذہ کی تقرری کی جا رہی ہے۔

۳. اقلیتی تعلیمی اداروں کو آئین کے سکشن ۳۰ کے تحت دستیاب سہولتیں و حقوق دیئے جانے کے احکام دیئے گئے ہیں۔

۴. تعلیمی نقطۂ نظر سے پسماندہ مسلم طبقے کے بچوں کو نزدیک میں ہی تعلیمی سہولت دستیاب کرانے کے لیے اسکول کھولنے اور ان کی فیس معافی اور وظائف دیئے جانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

۵. تمام سرکاری تقرری، جس میں تحریری امتحان کی تجویز ہے کے لئے تحریری امتحان ہندی کے علاوہ اُردو میڈیم میں بھی کرائے جانے کا حکم نافذ کر دیا گیا ہے اور اس کے لئے ترمیم شدہ دستور جاری کر دیا گیا ہے۔

۶. ریاست کے غیر سرکاری اقلیتی طبقے کے ڈگری کالجوں کو اقلیتی ادارہ تسلیم کرنے کے لئے پیمانہ مقرر کر دیا گیا ہے۔

۷. ابتدائی ثانوی اسکولوں میں ۶۱۳۱، اُردو معاون اساتذہ کی تقرری کی کارروائی شروع کر دی گئی ہے۔

زبان، آرٹ، تہذیب اور ادب

۱. حکومت کی لسانی پالیسی پر عمل درآمد کرنے اور ہندی، سنسکرت اُردو اور دیگر ہندستانی زبانوں کی ترقی کے لئے پہلی مرتبہ لسانیات ڈائرکٹریٹ کی تشکیل کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

۲. آٹھ اضلاع کے ۱۶۱ اسکولوں میں تمل، تیلگو، کنڑ، ملیالم، اڑیہ، بنگلہ، گجراتی اور مراٹھی زبانوں کے درجات چلائے گئے ہیں جہاں مفت نصابی کتابوں کے علاوہ کامیاب امیدواروں کے لئے انعامات کا بھی بندوبست ہے۔

۳. ڈاکٹر رام منوہر لوہیا کے نام سے ایک نہایت خصوصی انعام (دو لاکھ روپئے) اور ایک اور خصوصی انعام (ڈیڑھ لاکھ روپئے)

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

نقد و تبصرہ

تبصرے کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب : "پانی"
مصنف : غضنفر قیمت : ۳۰/- روپے
ملنے کا پتہ : تخلیق اکیڈمی ، جامعہ نگر ۔ نئی دہلی

"پانی"۔ "دو گز زمین" اور "مکان" آگے پیچھے شائع ہوئے اور موضوعِ گفتگو بن گئے اور یہ سلسلہ کسی نہ کسی طرح اب تک جاری ہے ۔ یہ تینوں اپنے مصنفین کے پہلے ناول ہیں اور پہلی ہی تخلیق کا پڑھنے والوں اور ناقدوں کو متوجہ کر لینا کوئی معمولی کامیابی نہیں۔

غضنفر نے 'پانی' کو زندگی اور پیاس بجھانے کی کوشش کو باعزت طور پر زندگی کرنے کی خواہش کی علامت بنا کر پیانی کا تانا بانا بنا ہے اور متعدد دوسری علامتوں کے سہارے جو نہ سپاٹ ہیں نہ چیستاں یکسر محرومی اور بے انتہا کامرانی کو آسان لیکن معصوم خواہشوں اور بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کے درمیان کی وسیع خلیج کو ناقابلِ عبور بنا کر پیش کیا ہے ۔

ناول کا خلاصہ ناول نہیں ہوتا، تاہم تبصرے میں اس سے مفر نہیں ۔ اس ناول میں "بے نظیر" کو ایک معصوم سی خواہش کی تکمیل کی جستجو میں سب کچھ ملتا ہے ۔

بہ مشکل سو صفحات کے ناول میں لاکھوں برس کی اس انسانی پیاس کو متشکل اور مجسم کر دینا بذاتِ خود ایک بڑی کامیابی ہے ۔

"پانی" کی حیثیت ایک تجربہ کی ہے اور زبان و بیان سے تجربہ کرنا ہر ہما شما کا کام نہیں ۔ غضنفر کی بعد کی تخلیقات شاہد ہیں کہ یہ طریقِ کار ان کی حد تک "ایک ابتدائی پڑاؤ" کی حیثیت رکھتا ہے ۔

[illegible] ہرگز نہیں ۔ صوری اعتبار سے بھی پانی پرکشش ہے اور قاری کی آنکھوں کو ٹھنڈک بخشتا ہے اور دل و دماغ کو سرور ۔ مصنف کے تخلیقی سفر اور فکری اساس سے شناسائی کے لئے بھی ہر سنجیدہ قاری کو اس ناول کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے ۔

——— عابدہ سہیل

نام کتاب : "اور بستی نہیں یہ دلّی ہے"
مصنف : رفعت سروش قیمت : ۲۰۰/- روپے
ملنے کا پتہ : نورنگ کتاب گھر ، ۲-بی پاکٹ سدھارتھ ایکسٹنشن نئی دہلی

رفعت سروش کا ادبی سفر کسی نہ کسی شکل میں گزشتہ نصف صدی سے جاری ہے ۔ بحیثیت شاعر ان کی نظمیں مقبول اور معروف حیثیت رکھتی ہیں ۔ جس طرح آغا محمد اشرف نے لندن سے "آداب عرض" لکھی تھی اسی طرز پر رفعت سروش کی یہ تصنیف ہے ۔ اس کا محور و مرکز خود ان کی ذات ہے ۔ لیکن یہ ان کی خود نوشت سوانح عمری بھی نہیں کہی جا سکتی ، اور نہ ہی اسے روزنامچہ کہہ سکتے ہیں ۔ یہ تو ان کے ذاتی تاثرات ہیں اور ۴۶ عنوانات کے تحت ان کے یہ ذاتی تاثرات معروف اور غیر معروف اچھے اور برے ادیبوں ، شاعروں یا ان سے متعلق افراد کے بارے میں ہیں ۔

رفعت سروش نے ۴۶ عنوانات میں منقسم ۴۲۴ صفحات میں قاری کو بہت کچھ دیا ہے ۔ اس کا ایک حصہ شخصیات سے متعلق ہے ۔ پریم ناتھ در ، ساغر نظامی ، جوش ملیح آبادی ، سلام مچھلی شہری ، عرش ملسیانی جیسے مرحومین پھر جگن ناتھ آزاد ، شمس الرحمان فاروقی ، بلراج کومل ، سریندر پرکاش ، م ۔ م راجندر اور قمر رئیس وغیرہ کے بارے میں بھی رفعت سروش کے تیکھے ، شگفتہ [illegible] کے ساتھ ان لوگوں کی تصویریں ملتی ہیں ۔ [illegible] طالب علموں کے لئے تحقیقی معلومات فراہم [illegible]

اکثر عنوانات کے تحت [illegible]

تاریخی [illegible]

[illegible] کی وجہ سے مزاح کا بانکپن ہاتھ سے

جاتا رہا [illegible] "نظم کا صد [illegible] جواز ڈھونڈ [illegible] " ایسے ہی

مضامین ہیں جنہیں پڑھتے ہوئے حقیقی معنوں میں مزاح کے بجائے

[illegible] سنائی دیتی ہے۔

یہ تمام عنوانات الگ الگ مضامین کی شکل میں ہیں لیکن یہ سب

ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور دھیرے دھیرے ۲۲ برس

کے ادبی سفر کی منزل تک پہنچاتے ہیں۔

کتاب کے سرورق پر ایک عبارت درج ہے لیکن وہ رفعت سروش کی ہے

ملاحظہ ہو:

"یہ اس شہر کا مخصوص کردار ہے کہ آدمی اپنے کام اور علم و فضل

سے نہیں اپنی کرسی اور اپنے عہدے سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر آپ

محض پڑھے لکھے ہیں اور آپ کو کسی بارسوخ کی پشت پناہی حاصل

نہیں ہے تو آپ کچھ نہیں ہیں۔ تلاش معاش میں سرگرداں ہیں

تو آپ کے احباب آپ سے ملتے ہوئے کتراتے ہیں لیکن کل اگر

آپ کسی یونیورسٹی کے پروفیسر ہو جائیں، آپ کسی بورڈ کے

ڈائرکٹر یا کسی ادارے کے سکریٹری یا چیرمین بنا دیئے جائیں

تو آپ کے مداح شہر کے کونے کونے سے ابل پڑیں گے۔ لیکن

جیسے ہی آپ کی کرسی ہلی تو آپ طلسمی شہر کے شہزادے کی

طرح اپنے آپ کو بے یار و مددگار پائیں گے اور عزت و

شہرت تو کیسی ۔۔۔ کوئی پرسانِ حال نہ ہوگا!"

اب دلی طلسمی شہر ہے یا نہیں، اس سے تو اتفاق یا اختلاف

کیا جا سکتا ہے لیکن ان سطور کے لکھنے والے کے قلم کی سحرکاری کا انکار

ممکن نہیں۔ دلی جانے والے اعلیٰ حکام سے لے کر معمولی مزدور تک کو

یہ سطریں پڑھنے کے بعد اپنی پگڑی سنبھالے رہنا پڑے گی۔

[illegible] ہے کہ بے جا توصیف

کا الزام [illegible] کے بجائے اصلی صحیفہ نہ

[illegible] کی الاٹمنٹ درج

[illegible] ہے۔ مرحلہ ہائے

[illegible] اس تمام

[illegible] کے کسی ایک کا مضمون نہیں ہے۔

______ ڈاکٹر عطیہ نشاط خان

نام کتاب: "چاندنی کا درد" (شعری مجموعہ)

شاعر: منصور اعجاز   قیمت: ۵۰/- روپے

ملنے کا پتہ: راشدہ اسٹوڈیو۔ ایوت محل (مہاراشٹر)

منصور اعجاز علاقہ برار کے ایوت محل ضلع سے تعلق رکھتے ہیں جو اردو شعر و ادب کے لئے مردم خیز خطہ نہیں رہا ہے۔ ان کی شعری تخلیقات تقریباً دس برسوں سے مختلف رسائل میں شائع ہوتی رہی ہیں اور اب "چاندنی کا درد" کی صورت میں ان کا پہلا مجموعۂ کلام منظر عام پر آیا ہے۔

"چاندنی کا درد" ایک ایسا شعری مجموعہ ہے جو نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے۔ اس کی نظمیں غم دوراں کی حامل ہیں۔ بیشتر نظموں کے موضوعات گرد و پیش کے ماحول اور حالاتِ حاضرہ سے متعلق ہیں۔ لیکن کچھ نظمیں ایسی بھی ہیں جن کے موضوعات آفاقی اور ابدی ہیں۔ مثلاً "سورگ نرک"، "حسرت" اور "میں کے پیچھے" جیسی نظموں کے موضوعات کو زمان و مکاں کی حدود میں قید نہیں کیا جا سکتا۔

اس مجموعے کی غزلیں اس کی نظموں کے مقابلے میں بہتر ہیں۔ غزلوں میں نسبتاً فن کاری بھی زیادہ ہے اور جاذبیت بھی۔ یوں تو منصور اعجاز نے غزلوں میں بھی کہیں کہیں "غمِ دوراں" کی جانب رخ کیا ہے لیکن ان کی غزلوں کے اشعار میں غالب اکثریت ایسے شعروں کی ہے جن کا موضوع عشق ہے۔ غزل کے جن شعروں میں انھوں نے زمانے کے غموں اور مسائل کو موضوعِ سخن بنایا ہے وہ بالعموم رپورٹنگ یا اسٹیٹمنٹ ہو کر رہ گئے ہیں۔ مثلاً

چھین لیتے ہیں قرض خواہ تمام

اس گرانی میں ساری مزدوری

مگر جو اشعار عشق کے موضوع پر مبنی ہیں وہ پرکشش ہیں اور انہیں عمدہ شاعری کے نمونے کہا جا سکتا ہے۔ عشق کے موضوع پر اچھے اشعار کہنا مشکل کام ہے مگر منصور اعجاز نے اس کار مشکل میں [illegible]

[illegible] مثال کے طور پر شعر
تو غزل سے بھی غزل میں
آخری شعر کا قافیہ ہوں
——— ڈاکٹر لشتر بستوی

نام کتاب: "لَو" (شعری مجموعہ)
شاعر: تسنیم فاروقی   قیمت: ۱۰/ روپے
ملنے کے پتے: (۱) لو کدہ۔ ۲۰۴، بی۔ تلسی داس مارگ
نیو اسپتال، لکھنؤ ۳۔ (۲) مکتبۂ دین و ادب
امین آباد، لکھنؤ

سب ہاتھ میں خوبصورت عورت اور ہاتھ میں خوبصورت کتاب ہو تو سبھی کی نظریں اٹھ جاتی ہیں۔ فیشن سے آلودہ معاشرے میں جہاں سبھی سجاوٹی چیزیں ہی پسند کی جا رہی ہیں، کتاب بھی خوبصورتی اور سجاوٹ دیکھ کر ہی ہاتھ میں لی جاتی ہے۔ تسنیم فاروقی کی کتاب "لَو" بھی شاید اپنے گیٹ اپ، کتابت، طباعت اور سجاوٹ کے اعتبار سے اردو کی نمائندہ کتابوں میں ہے۔

شعری مجموعوں کی کثرت نے قارئین کو اتنا بیزار کر دیا ہے کہ وہ شعری مجموعے پڑھنا ہی نہیں چاہتے کیونکہ موجودہ غزل اپنے شعری اور فنی تقاضوں کو سلیقے سے نہیں برت رہی ہے لیکن مجھے خوشی ہے کہ تسنیم فاروقی کی شخصیت بھی غزل ہے۔ ان کی گفتگو بھی غزل ہے، ان کے آداب محفل بھی غزل ہیں، ان کی شیروانی بھی غزل ہے۔ ان کے افکار بھی غزل ہیں اور ان کی غزل بھی غزل ہے۔

تسنیم فاروقی نے لکھنوی غزل کی پر فضا شاہراہ پر اتنا لمبا سفر طے کر لیا ہے کہ ان کی آرزو بھی پوری ہو گئی ہے اور ان کا مخصوص رنگ ابھر کر سامنے آ گیا ہے۔ اب اس رنگ میں کسی دوسرے رنگ کی آمیزش اشعار کو بد رنگ کر دے گی لیکن یہی رنگ دوسرے شعرا کے اشعار کو خوش رنگ کر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

تقریباً [illegible] غزلوں پر مشتمل بالکل نئے انداز سے ترتیب دی ہوئی کتاب "لَو" اپنے اشعار کے ساتھ ذہنی آسودگی اور مسرت بخش رہی ہے

[illegible]
[illegible] بہت [illegible] ہے
[illegible] کی [illegible] ہے
سو روپے کی لَو ذہنوں کو منور کر رہی ہے
——— ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی

نام کتاب: "تابشیں" (شعری مجموعہ)
شاعر: انجم صدیقی   قیمت: ۳۰/ روپے
ملنے کا پتہ: انجم صدیقی، شیخیاپورہ، بہرائچ

ہند نیپال کا سرحدی ضلع بہرائچ کئی اعتبار سے امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ خصوصاً روحانی اعتبار سے اسے خاص اہمیت حاصل ہے۔ ہندوستان کی قدیم ترین ہستی گوتم بدھ سے لے کر مسلم صوفی بزرگ حضرت سید سالار مسعود غازیؒ تک ایک طویل روحانی سلسلہ ہے۔ یہاں سیاست اور ادب کے میدان میں بھی ہمیشہ سرگرمیاں رہی ہیں۔ اسی سرزمین سے آبائی تعلق رکھتے ہیں جناب انجم صدیقی۔ ان کا مجموعۂ کلام "تابشیں" غزلوں پر مشتمل ہے۔ آخر میں پانچ گیت اور دو نظمیں ضرور شامل ہیں لیکن مجموعۂ کلام دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انجم صدیقی کی محبوب صنف سخن غزل ہی ہے۔ ان کی غزلوں میں روایت کی پاسداری بھی ہے اور عصری حسیت بھی۔ انجم کی شاعری ان کے عہد کی بھی نمائندگی کرتی ہے۔

اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ تابشیں سنبھلے ہوئے لب و لہجے کی شاعری میں ایک اضافہ ہے جسے پڑھ کر ہر قاری محظوظ ہوگا۔
——— سلیم عنبر

نام کتاب: "صحیفۂ تواریخ" (شعری مجموعہ)
شاعر: شاہ کوکب الفاروقی   قیمت: ۴۰/ روپے
ملنے کا پتہ: دانش محل، امین آباد، لکھنؤ

شاہ کوکب الفاروقی [illegible] شاعر ہیں [illegible] کتاب صحیفۂ تواریخ ان کے قطعات پر مشتمل [illegible]

[illegible]

[illegible] کتاب میں کتب [illegible] ہوئی شکل میں [illegible] شکل جو رہا دیوان کی وجہ نظم بھی کی ہے۔ اس میں مختلف [illegible] شعرا جیسے "تجربہ" [illegible] فضل کی بات [illegible] تاریخ نکالنے کے مختلف انداز پر مدلل اظہار خیال کیا ہے۔

صحیفۂ تواریخ دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصہ میں تقریباً دو سو قطعات تاریخ وفات ہیں جو چند بزرگان دین، سربراہان مملکت، سیاسی رہنماؤں اور شعرا، شاعروں کی وفات پر ان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے تاریخیں نکالی گئی ہیں۔ دوسرے حصے میں جو قطعات ہیں وہ زیادہ تر مسجدوں اور عمارتوں کی تعمیر سے متعلق ہیں۔ چند قطعات ولادت اور جشن شادی کے سلسلے میں کہے گئے ہیں۔

صحیفۂ تواریخ کئی اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے۔ یہ مرحومین کا مرثیہ بھی ہے اور تذکرہ بھی۔ اس میں ان کی وفات پر اظہار تاسف بھی کیا گیا ہے اور ادبی خدمات کا اعتراف بھی۔ یہ کتاب ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

——— [illegible]

> نام کتاب: "بازیافت" تحقیقی و تنقیدی مجلہ
> مدیر نگران: پروفیسر مرزا محمد زمان آزردہ
> پتہ: شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی، حضرت بل، سری نگر

[illegible] درسگاہوں سے جو مجلے شائع کیے جاتے ہیں ان میں درسیاتی تحقیق کی طرف زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ خصوصی طور پر اس کا خیال رکھا جاتا ہے کہ وہ مفید ہوں۔ عموماً اس درسگاہ کے طلبا اور اساتذہ کے [illegible] قلم [illegible] ہیں لیکن بازیافت اس اعتبار سے منفرد ہے۔ اس کے [illegible] ہے۔ [illegible] بھی اور [illegible] شامل ہیں مجلے کا [illegible] مضامین ہیں اور پھر گوشۂ محی الدین حاجنی ہے جس میں کشمیری کے ایک اہم شاعر کو خراج عقیدت پیش کیا ہے جس کی [illegible] سے حاجنی مرحوم کا تعارف ہے جو اپنی کشمیریت کی بنا پر مقبول و معروف تھے۔

مضامین میں پہلے مضمون میں مرکز دو عالم پر صلاح الدین پرویز صاحب کی نعت پر پروفیسر حامدی کشمیری کا تجزیاتی مطالعہ۔ یہ نعت آزاد نظم کی ہیئت میں ہے اور نعت اور تخلیق کا دلپذیر نمونہ ہے۔ حامدی کشمیری صاحب نے اپنے زبردست طرز اظہار کا بہت خوبصورت مظاہرہ کیا ہے۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی: نظامی عروضی سمرقندی کے چہار مقالہ پر مضمون فارسی کا ذوق رکھنے والوں کے لئے سرمۂ چشم بصیرت ہے۔

مسعود حسن رضوی ادیب کا نظام تنقید (مرزا زماں آزردہ)

خسرو کی غزلیہ شاعری کی محرکات ـ ابوالکلام قاسمی

کہاں کیا ہے؟ ـ ڈاکٹر ظہور الدین

گوڈان کا تنقیدی مطالعہ: ایس، اے، رحمان

کشمیر: سرمایہ الفاظ کے سرچشمے ـ ڈاکٹر نذیر احمد ملک

سریندر پرکاش کے افسانے ـ ڈاکٹر مجید مضمر

باوقار اور بلند پایہ مضامین ہیں۔ اس تحقیقی و تنقیدی مجلّہ کے لیے بعض ایسے مضامین بھی منتخب کیے گئے ہیں جنھیں اور پھیلا کر کتاب کی شکل دی جا سکتی ہے۔

پہلا مضمون تو صرف اشارات تک محدود ہے۔ دوسرے مضمون میں بھی بظاہر تو ۱۹ صفحات ہیں لیکن جتنا اہم موضوع ہے اس کی مناسبت سے تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔

اقبال کے تصور کائنات کے سلسلے میں ان کا سب سے اہم مصدر قرآن کریم ہے اور پھر اسلامی فلاسفہ میں ابن مسکویہ بھی ہے۔ اقبال نے معتزلہ سے بھی اپنی فکر کا چراغ روشن کیا ہے۔ ان کے یہاں شوپنہار بھی کائنات کے بارے میں اپنے تصورات کو بکھیرتا نظر آتا ہے لیکن ان میں سب سے اہم کانٹ ہے جس کے اثرات نے اقبال سے یہ شعر کہلوایا:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

یہ علمی اور ادبی مجلہ بے حد مفید اور معیاری ہے اور ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

——— [illegible]

نام کتاب: تدریسی مسائل

مرتب: سید ساجد علی ٹونکی۔ قیمت: ۱۲ روپے

ملنے کا پتہ: مدرسۃ الشاہ، محلہ ... ، ٹونک

راجستھان

سید ساجد علی ٹونکی کی مرتب کردہ کتاب "تدریسی مسائل" مختلف اہل علم حضرات کے ۲۲ مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں شامل مضامین میں دینی مدارس و مکاتب اور ان کی افادیت، عصری تعلیم، تعلیمی نصاب، قرآنی تعلیم، اسلام میں تعلیم و تربیت کی اہمیت، تعلیم نسواں کی شرعی حیثیت وغیرہ موضوعات پر کئی اہل قلم حضرات نے روشنی ڈالی ہے۔

ان مضامین میں قوم کی ابتدائی تعلیم و تربیت سے لے کر ہر شعبۂ زندگی کی تعلیم، اس کا طریقہ اور اس کی ضروریات پر نہایت سلیقے سے وقت اور حالات کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اظہار خیال کیا گیا ہے۔

ساجد صاحب کی یہ کوشش ہے کہ ابتدائی ضروری دینی تعلیم عام ہو جائے اس کے بعد دوسرے علوم کی جانب توجہ و شوق مبذول کرایا جائے دینی تعلیم کے طلب گاروں کو دینی مدارس کی طرف راغب کیا جائے۔ اپنی اسی کوشش کے ثبوت میں ساجد علی ٹونکی صاحب نے "تدریسی مسائل" پیش کیا ہے جو انہیں اپنے مقصد تک پہونچانے میں ممد و معاون ثابت ہوگی۔

اخلاق احمد

نام کتاب: اردو ادب کی تاریخ

مع حواشی و تعلیقات

مصنف: ٹی، گراہم بیلی۔ قیمت: ۲۰ روپے

ملنے کا پتہ: سید محمد عصیم، ۲۳/۱۹ ترکمان گیٹ

دہلی

ڈاکٹر ٹی گراہم بیلی نے انگریزی میں ایک سو صفحات پر مشتمل اردو زبان و ادب کی تاریخ مرتب کی تھی جو "A History of Urdu Literature" کے عنوان سے ۱۹۳۲ء میں منظر عام پر

[illegible] میں ... اور ... ایک ... سے ... کی ... اہمیت کا ثبوت ... کتاب میں اردو ادب کی تقریباً چھ سو سالہ تاریخ بیان کی گئی ہے۔ یہ کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ شروع کے ابواب میں ... کو مواد اور اخذ کی دستیابی جیسے مباحث کا ذکر ملتا ہے۔ اردو کے "آغاز" اور لفظ "اردو" کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔

دوسرے باب میں "دکنی دور" اور دکن میں اردو ادب کا پہلا دور" ... ابواب ہیں۔ ان کے تحت قطب شاہی اور عادل شاہی شعراء کا ذکر ہے۔ دور مغلیہ کے عہد میں ادب کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

تیسرے باب میں "دہلی میں اردو شاعری کی پہلی صدی" کا احاطہ کیا گیا ہے۔ چوتھے باب میں لکھنؤ کے ۲۴ شعراء کی زندگی اور فن پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ دہلی کے دوسرے دور کا مفصل بیان پانچویں باب میں ملتا ہے۔ اس باب میں ذوق، غالب، مومن، شیفتہ اور شیفتہ کے ذکر کے علاوہ رام پور کے دربار کے شعراء بھی شامل کیے گئے ہیں۔ چھٹے باب میں اردو نثر موضوع بحث ہے۔ ساتواں باب میں حالی، آزاد اور عظمت اللہ خاں، دہلوی، نذیر جیسی اہم شخصیتوں کا ذکر ملتا ہے۔ اور آخری باب اردو ادب پر انگریزی کے اثرات پر لکھا ہے۔

ٹی گراہم بیلی نے کہیں کہیں بڑی مشقت، سنجیدگی اور عرق ریزی سے تحقیقی کام کیا ہے لیکن کہیں کہیں محض روایات کا سہارا لیا ہے۔ اس طرح محمد عصیم کے اس ترجمے سے اس کتاب کی اہمیت میں اضافہ ہوا ہے اور اس میں شامل حواشی اور تعلیقات سے کتاب کی افادیت بھی بڑھ گئی ہے۔

شمیم ... ـــــــــ

عنوانات

جلد نمبر

جنوری ۱۹۸۸ء

اپنی بات	ایڈیٹر	۲
پروین شاکر (نظم)	علی سردار جعفری	۳
اُردو صحافت اور لکھنؤ	پروانہ ردولوی	۴
	عبدالمنان صدیقی	۹
قطعات	سید عابد نظر	۹
ولی نکتہ داں کا شہر (نظم)	ولی الحق انصاری	۱۰
لکھنؤ کے امام باڑے (۲)	اسحٰق صدیقی	۱۱
لکھنؤ کی دستکاری	مسعود حسن رضوی ردولوی	۱۸
سالِ نو (نظم)	وجاہت علی سندیلوی	۲۶
اٹھارھویں صدی میں اودھ میں اُردو داستان نگاری	شبیر رضوی	۲۷
لکھنؤ کے گنج، بازار، گلی کوچے	علی مہدی ایڈوکیٹ	۳۲
اُردو کی کہانی (نظم)	پیام اعظمی	۳۶
گیت	انجم صدیقی	۳۶
لکھنؤ کی بانیاں	روشن تقی	۳۷
کشمیری محلہ	بی. این. بشر غا	۴۳
جشنِ جمہوریہ (نظم)	مظہر رائے بریلوی	۴۵
اودھ کبھو (نظم)	شوق مرزاپوری	۴۵
پروین شاکر کی شاعری	احتشام حسین ٹانڈوی	۴۶

اپنی بات

سب سے پہلے قارئین کو نئے سال کی مبارکباد دی جاتی ہے۔ حالاں کہ یہ شمارہ جب تک آپ تک پہونچے گا تو نیا سال بھی تھوڑا سا تجربہ کار اور پرانا ہو چکا ہوگا۔ اس مبارکباد کے ساتھ یہ دعا بھی ہے کہ ہمارے قارئین کے لئے بھی، ہمارے صوبے کے لئے بھی، ہمارے ملک کے لیے بھی اور ساری دنیائے انسانیت کے لئے بھی یہ سال خوشیوں اور مسرتوں کا پیغامبر بن کر آسکے، اور دنیا ہر طرح کی آفاتِ ارضی و سماوی سے محفوظ رہے۔ (آمین)

جنوری کا مہینہ ہم لوگوں کے لئے جہاں نئے سال کا نقطۂ آغاز ہوتا ہے وہیں چھبیس جنوری کا مقدس دن ہمیں یہ یاد دلاتا ہے کہ ہندستان دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ہے۔ اس عظیم جمہوریت کو ہر قیمت پر دنیا کے لئے مشعلِ راہ بننا ہے اور ہر ہندستانی کو اس کے اعلیٰ اقدار کی روایتوں کی حفاظت بھی کرنا ہے۔

یومِ جمہوریہ مناتے ہوئے ہم سب کا یہ فریضہ ہے کہ عدم تشدد کا راستہ اپنائیں اور جس طرح سے چور دروازے سے کچھ بدعنوان لوگ سماجی زندگی میں گھس آتے ہیں انھیں شکست دے کر ہندستان کی عظیم جمہوریت کو روشن اور تابناک بنائیں۔

جنوری کے مہینے میں اس سال گنگا جمنا کے سنگم الٰہ آباد میں اس صدی کا آخری کمبھ ہوا۔ سرکار نے وسیع پیمانے پر انتظامات کیے تھے۔ عقیدت مندوں نے ان انتظامات سے استفادہ کیا۔ لیکن جس طرح ۱۹۹۴ء میں گرمی نے ریکارڈ قائم کیا تھا اسی طرح ۱۹۹۵ء کا آغاز کڑاکے کی سردی سے ہوا اور ہمارے جیسے اردو ادب کے طالب علم سودا کا شعر پڑھتے رہے ؎

سردی اب کے برس تھی اتنی شدید — صبح نکلے تھا کانپتا خورشید

لیکن عقیدت مند بہرحال سردی کا مقابلہ کرتے ہوئے ہمیشہ کی طرح اس سال بھی کلپ واس اور اشنان کرتے رہے۔

تیسؔ جنوری کا تاریخی دن ہم سب کے لیے عہد کرنے کا دن ہوتا ہے اور یہ یاد رکھنے کا دن ہوتا ہے کہ مہاتما گاندھی نے اپنی بے مثال قربانی سے ہم سب کو عدم تشدد و صداقت، وسیع النظری اور عمیر زرت ومانہ بنیادوں پر سماج کی تشکیل کا سبق دیا تھا، لہٰذا ہر ہندستانی کو یہ سوچنا چاہیے کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ یہ سبق بھلا دیا جا رہا ہو، اس لئے کہ آج کے دور کا سب سے بڑا مطالبہ یہ ہے کہ روزانہ زندگی سے لے کر اہم ترین مسائل میں تشدد کا راستہ ترک کیا جائے۔

۲۶ر دسمبر ۱۹۹۴ء کو ایک حادثے میں پروین شاکر کا انتقال ہو گیا — اور — نئے لب و لہجہ کی یہ منفرد شاعرہ عالمی ادب کے شیلی، کیٹس اور اردو ادب کے مجاز اور اختر شیرانی کی صف میں شامل ہو گئیں۔

وہ درخشندہ ستارے کی طرح شعری فضا پر چھا گئیں اور ان کے اشعار پوری ایک نسل کے دل کی دھڑکن بن گئے۔ انھوں نے دنیا کے دیگر عظیم شعرا کی طرح یہ ثابت کر دیا کہ ادب کی دنیا جغرافیائی حدوں سے بہت بلند ہوتی ہے۔ اردو کی اس عظیم شاعرہ کو ادارہ نیا دور کا آنسو بھرا سلام۔!

ایڈیٹر

پروین شاکر

جشنِ جواں مرگی، تصویرِ حسن، عشقِ دراز
تیاگ، سنگم، ...
مثالی فنکار

اس نظم میں کچھ تلمیحات اور اشارے تشریح طلب ہیں،

ودیاپتی میتھلی زبان کا مشہور اور عظیم شاعر ہے اس نے اپنی شاعری میں کرشن اور رادھا کے عشق کا جشن منایا ہے۔ اس کی نظموں کا انگریزی ترجمہ یونسکو (UNESCO) سے شائع ہو چکا ہے۔ بہار کی لڑکیاں عام طور سے اس کی شاعری سے واقف ہیں۔ کرشن اور رادھا کے عشق سے فطرت کے سارے مظاہر ہم آہنگ ہیں۔ اس کی شاعری کا ذرا سا اندازہ اس طرح کے اشعار سے ہو سکتا ہے ؎

آئے ہیں جب تو گھر میں من لگتا ہے
ہر چیز میں ایک اپنا پن لگتا ہے
وہ دیکھ رہے ہیں مسکرا کے مجھ کو
اب میرا بدن میرا بدن لگتا ہے

پروین شاکر کی شاعری میں 'گلنار لب' کی ترکیب مجاز کی یاد دلاتی ہے۔ اس نے پہلی بار اپنی نظم 'بتانِ حرم' میں یہ ترکیب استعمال کی تھی۔ مراد "دوشیزہ لب" — سر دار جعفری کے احساس جسم میں جو فرق ہے وہ فراق، فیض اور پروین شاکر کی شاعری میں نمایاں ہے — 'اڑتیس صلیبیں'، پروین شاکر کی عمر کے اڑتیس سال ہیں اس کے پہلے مجموعہ 'خوشبو' میں ایک نظم ہے جس کا عنوان 'بائیس صلیب' ہے۔ اس میں اس نے اپنی عمر کے بائیس برسوں کو بائیس صلیبوں کے استعارے میں بیان کیا تھا یہ کتاب غالباً ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا دستخط کیا ہوا نسخہ میرے کتب خانے میں ہے۔ اس حساب سے اس کی عمر انتقال کے وقت اڑتیس سال ایک ماہ [illegible] 'صد برگ' اور 'خود کلامی' اس کے شعری مجموعوں کے نام ہیں۔

([illegible])

وہ ودیاپتی کی شاعری کی
معصوم و حسین و شوخ رادھا
وہ اپنے خیال کا کنہیا
اُن شہروں میں ڈھونڈنے گئی تھی
دستور تھا جن کا سنگ باری

وہ فیض و فراق سے زیادہ
تقدیسِ بدن کی نغمہ خواں تھی
تہذیبِ بدن کی راز داں تھی
گلنار لبوں کی تہنیت میں
گلنار لبوں سے گل فشاں تھی
لب آشنا لبِ غزل کے مصرعے
جسم آشنا جسم نظم پیکر
لفظوں کی ہتھیلیاں حنائی
تشبیہوں کی انگلیاں گلابی
سر سبز خیال کا گلستاں
مبہم سے کچھ آنسوؤں کے چشمے
آہوں کی وہ ہلکی سی ہوائیں
'صد برگ' ہوا میں منتشر تھے
تتلی تھی کہ رقص کر رہی تھی
اور درد کے بادلوں سے چھن کر
نغموں کی پھوار پڑ رہی تھی
پُر شور منافقت کے بازار
افواہیں فروخت کر رہے تھے

وہ اپنی شکستہ شخصیت کو
اشعار کی چادروں کے اندر
اس طرح سمیٹنے لگی تھی
احساس میں آ رہی تھی وسعت
نظروں کا افق بدل رہا تھا
اور دردِ جہانِ آدمیت
ٹوٹے ہوئے دل میں ڈھل رہا تھا

اس عالمِ کیف و کم میں اک دن
اک حادثے کا شکار ہو کر
جب خون کا کفن پہن لیا تو
'اڑتیس صلیبیں' نوحہ خواں تھیں
خاموش تھا کربِ 'خود کلامی'
اب کچھ نہیں رہ گیا ہے باقی
باقی ہے سخن کی دلنوازی

(۲)

جنت میں ہے جشنِ نو کا ساماں
محفل میں مجاز و بائرن ہیں
موجود ہیں کیٹس اور شیلی
یہ مرگِ جواں کے سارے عاشق
خوش ہیں کہ زمینِ پاک سے اک
نو مرگ بہار آ گئی ہے
لپٹی ہوئی خاک کی ہے خوشبو
اور سایہ فگن سحابِ رحمت

□□

علی سردار جعفری
۱۰۔ سیتا محل، روسن جی پیٹٹ روڈ،
بمبئی ۴۰۰۰۲۶

پروفیسر ...

پوسٹ بکس ۹۴۲۱، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۱

اُردو صحافت اور لکھنؤ

ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے پردے میں جبر و استبداد کے ذریعہ برٹش اقتدار کی جڑوں کو مضبوط بنانے اور مختلف رجواڑوں میں منقسم اس ملک پر اقتدارِ اعلیٰ حاصل کرنے کی سازشوں کا پردہ سب سے پہلے ایک انگریز صحافی ولیم بولٹس نے چاک کیا تھا۔ اُس کے اِس اقدام پر اسے ہندوستان سے نکال دیا گیا تھا اور جب وہ کلکتہ سے براستہ مدراس انگلستان واپس ہو رہا تھا تو اس نے پانچ سو صفحات کی ایک کتاب شائع کر کے ایسٹ انڈیا کمپنی کی استبدادی حکمت عملی کو طشت از بام کر کے رکھ دیا تھا۔

اس کے ہندوستان سے جانے کے بعد ایک اور انگریز جیمز آگسٹس ہکی نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف اس کام کو آگے بڑھایا اور ۲۹ جنوری ۱۷۸۰ء کو "ہکیز بنگال گزٹ" عرف کلکتہ ایڈورٹائزر کے نام سے کلکتہ سے ایک انگریزی اخبار جاری کیا۔ اُس کی تحریروں سے ایسٹ انڈیا کمپنی آتش زیرپا ہو گئی اور ہکیز کے قلم کو توڑ کر رکھ دینے اور کمپنی کو بدنامی سے بچانے کے لیے اُس وقت کے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز کے ذریعہ سرکاری ڈاک خانہ سے اس کی ترسیل کو ممنوع قرار دے دیا گیا۔ دو سال تک ہکیز ایسٹ انڈیا کمپنی سے برسرپیکار رہا اور صحافت کی آبرو کے تحفظ کے لیے مختلف طریقوں سے کمپنی کے ظلم و ستم اور استحصالی سازشوں کے پردے چاک کرتا رہا۔ بالآخر مارچ ۱۷۸۲ء میں اس کے دارالاشاعت کو بحق سرکار کمپنی بہادر ضبط کر لیا گیا اور ہمیشہ کے لیے اس کے اخبار کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ اس کے بعد انڈیا گزٹ، کلکتہ گزٹ، ایشیاٹک میسلنی اینڈ بنگال رجسٹر، بنگال جرنل، انڈین ورلڈ، اورینٹل میگزین، بنگال ہرکارہ، ایشیاٹک مرر، مارننگ پوسٹ، ٹیلی گراف اور اورینٹل اسٹار جیسے اخبارات خود انگریزوں کی ملکیت میں کلکتہ سے جاری ہوئے۔ ان اخبارات کی تحریروں سے بھی انگریزی اقتدار کے سرپرستوں کی نیندیں حرام ہوتی رہیں۔

اُدھر مدراس سے بھی انگریزی اخبارات کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ مدراس کوریئر وہاں کا پہلا اخبار تھا جو ۱۷۸۵ء میں جاری ہوا۔ ۱۷۹۳ء میں مدراس ہرکارہ، ۱۷۹۵ء میں مدراس گزٹ اور ۱۷۹۴ء میں انڈیا ہیرالڈ منصۂ شہود پر نمودار ہوئے۔

بمبئی کا پہلا اخبار "بمبئی گزٹ" تھا جو ڈبلو ایس کوپر نے ۱۵ جون ۱۷۸۹ء کو جاری کیا تھا۔ دوسرا اخبار بمبئی گزٹ تھا اور تیسرا اخبار بمبئی کوریئر۔ اس اخبار کو کثیر الزبان اخبار ہونے کا شرف بھی حاصل تھا کیونکہ اس میں انگریزی کے علاوہ کنڑ، گجراتی، مراٹھی اور اردو زبان میں بھی اشتہارات شائع ہوتے تھے۔ اس کے بعد ۱۷۹۱ء میں بمبئی آبزرور کے نام سے بھی ایک اخبار جاری ہوا۔ ان تمام اخبارات نے کمپنی کی چیرہ دستیوں کی مذمت میں کبھی بھی پس و پیش نہیں کیا۔ بمبئی کوریئر کو اس اعتبار سے اردو کی مطبوعہ صحافت کا نقش اول قرار دیا جا سکتا ہے کہ اس میں اردو زبان میں بھی اشتہارات شائع ہوتے تھے۔

جب میسور فتح ہو گیا تو وائسرائے لارڈ ویلزلی کی ہیبت بڑھ گئی اور انھوں نے مطبوعہ صحافت کو پابند کرنے کے احکامات جاری کیے۔ اخبارات پر روز بروز پابندیاں سخت ہونے لگیں مگر ۱۸۱۸ء میں کلکتہ سے جیمس سلک بکنگھم کی ادارت میں جاری ہونے والے اخبار کلکتہ جرنل اور فارسی اخبار "مراۃ الاخبار" کے ایڈیٹر راجہ رام موہن رائے آزادیٔ قلم پر برٹش سرکار کے حملوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے۔ اردو کے پہلے اخبار جام جہاں نما جو ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ء کو جاری ہوا، کے ایڈیٹر سدا سکھ لال نے بھی اخبارات اور چھاپہ خانوں پر لگائی گئی پابندیوں کے خلاف احتجاجی مضامین لکھے۔

جام جہاں نما ہندوستان میں اردو کا پہلا باقاعدہ اخبار تھا جس کے شائع ہوتے ہی اردو صحافت کی راہ سے اردو کے نثری اور شعری ادب کے

ہوتا ہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلے بنگال کے ... اس اخبار کے ایڈیٹر منشی سدا سکھ لال مرزا پوری ومالک شیخ عبد اللہ (ریاست اودھ) کے مشیر ... تھے جس کا آزادی کے بعد اتر پردیش (یوپی) کا علاقہ ... اعتبار سے یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ہندوستان میں اردو صحافت کے آغاز کا سہرا یوپی کے سر بندھتا ہے۔ اس اخبار نے اودھ کے حالات پر خاص توجہ دی اور اودھ کے حکمراں رؤسا اور حکام ہی کے تعلق سے نہیں بلکہ اودھ کی تہذیبی زندگی کے تعلق سے بھی بہت سی خبریں شائع کیں۔ ان خبروں سے جہاں بادشاہ و سلطان اودھ کے سیکولر افکار کی نشان دہی ہوتی ہے وہیں یہ انکشاف بھی ہوتا ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کے لیے اودھ کے امرا ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔ وہ نہ صرف ہولی دسہرہ اور دیوالی کے "تیوہار" کے وسیلہ سے فرقہ وارانہ اتحاد کو فروغ دیتے تھے بلکہ وہ اپنی رعایا کی دل کھول کر مدد کیا کرتے تھے اور قحط و گرانی اجناس کے دنوں میں محتاجوں فقیروں اور غریبوں کی دست گیری میں کوئی کسر نہ چھوڑتے تھے۔ اس اخبار سے اودھ بالخصوص لکھنؤ کی تہذیبی زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے اور وہاں کے ارباب نشاط کی عیش کوشی بھی سامنے آتی ہے۔ اس سلسلہ میں ان خبروں سے ۱۸۲۵ء کے لکھنؤ کی تہذیبی "قدروں" پر کافی روشنی پڑتی ہے جو ذیل میں درج کی جا رہی ہیں۔

(۱) "ایک دن سیتا بیگ کوتوال کو حکم دیا کہ جتنی لونڈیاں شہر میں بکیں انھیں حضور کی ڈیوڑھی پر حاضر کیا کرو۔"

(جام جہاں نما ۱۲ اکتوبر ۱۸۲۵ء)

(۲) "ایک عرضی پہنچی کہ احسان علی بردہ فروش چار کنیزیں لایا ہے اور اس سے آٹھ کنیزیں مرزا سیتا بیگ کوتوال کو بھیجی تھیں وہ بھی در دولت پر حاضر ہیں۔ حکم ہوا کہ احسان علی کے پاس روانہ کردو جو کنیزیں سلطان کے پاس آئی تھیں ان میں تین بہت چھوٹی عمر کی تھیں انکو مسترد کر دیا گیا۔" (جام جہاں نما ۲۳ مارچ ۱۸۲۵ء)

(۳) "مرزا محمد تقی آغا نصیر کے بھائی جو ناراض ہو کر کانپور کی طرف روانہ ہوئے ان کے ساتھ الف چالیس رنڈیوں کے ساتھ گیروے کپڑے پہنے اور علم ہاتھ میں اٹھا کر حضرت عباسؑ کی درگاہ کو گئے۔" (جام جہاں نما ۱۳ مارچ ۱۸۲۵ء)

جام جہاں نما کی زبان اودھ کی عام بول چال کی زبان تھی اس کی ادبی ... ایک ... شاعر ذوقی کا انشاکی اردو غزل شائع ہوئی تھی جس کا مطلع یہ تھا ؎

کل ہم تمھارے کوچہ میں آئے چلے گئے
ہے ہے ہزار اشک بہاتے چلے گئے

شاہان اودھ کی انصاف پروری اور غربا نوازی پر بمبئی کے آئینہ سکندر (مدیر فضل حق) کی تحریروں سے بھی روشنی پڑتی ہے۔ ۱۶ اپریل ۱۸۲۲ء کو فارسی میں جاری ہونے والے اس ہفت نامہ میں ۱۸۳۴ء میں اردو ضمیمہ کا بھی اضافہ کیا گیا تھا۔ اس اخبار کی خوبی اردو اشعار کے برجستہ استعمال سے تعلق رکھتی ہے۔ خبر دار السلطنت لکھنؤ کا آغاز اس شعر سے ہوا ہے ؎

ملک بخت شاہ عالی جاہ
رہے قائم ہمیشہ شاہ پناہ

سلطان نصیر الدین حیدر بن غازی الدین حیدر ۱۸ اکتوبر ۱۸۲۷ء کو تخت نشین ہوئے تھے اور ۷ جولائی ۱۸۳۷ء کو ان کا انتقال ہوا تھا۔ ان کی انسان دوستی کی ایک مثال آئینہ سکندری کی اس خبر سے ملتی ہے:

"حضور کا حکم اشرف روشن الدولہ بہادر کے نام سے یوں ہوا ہے کہ حضرت امیر المومنین علی مرتضیٰؑ کی شہادت کے روز تابوت جو حضرت عباسؑ کے روضے میں لے جاتے ہیں اثنائے راہ میں بسبب مذہب کے دونوں فرقوں سے جنگ و جدل ہمیشہ ہوا کرتا ہے ایسا بندوبست کیجو کہ کوئی بات بے موقع نہ ہونے پاوے اور کسی زبان سے بری بات نہ نکلے چنانچہ بموجب ارشاد خوب ہی کار پردازان کا اہتمام عمل میں آیا اور ساری رعیت کو امن و امان کا منھ دکھلایا۔"

اودھ یعنی (اتر پردیش کا وہ علاقہ جو گھٹتے گھٹتے واجد علی شاہ کے زمانہ میں بہت محدود ہو گیا تھا) نے روز اول ہی سے اردو صحافت کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اس سلسلہ میں منشی سدا سکھ لال مرزا پوری (جام جہاں نما کلکتہ)، فضل حق (اخبار سکندری بمبئی)، منشی امان اللہ لکھنوی (کشف الاخبار کاشف الاسرار بمبئی)، منشی غلام حسین لکھنوی اردو صحافت کے آغاز ہی سے ہندوستانی عوام کے بہی خواہ اور والیان اودھ کے ساتھ انگریزوں کی ناانصافیوں کے ناقد تھے۔ وہ کمپنی بہادر کے ظلم و جبر کے خلاف برابر آواز اٹھاتے رہتے تھے۔

جب سرکاری زبان فارسی کی جگہ پر اردو بن گئی تو دہلی، آگرہ اور لکھنؤ اردو صحافت کے مضبوط مرکز بن گئے تھے مگر ملک کے دوسرے حصوں میں بھی اردو اخبارات شائع ہوتے تھے جن میں لکھنؤ کی خبریں بڑے اہتمام سے شائع ہوتی تھیں۔

[illegible]

[illegible]

[illegible] اس [illegible]

"[illegible] سے دہلی [illegible] کا

کام جاری [illegible] کے ایام میں شہر کے [illegible]

[illegible]

جماعت کے [illegible]۔ غرض اس ضبط سے

[illegible] سے گزرنے کے [illegible]

[illegible]"

یہ اخبار اگرچہ [illegible] اور دہلی اردو کی خدمت کا کوئی گوشہ [illegible] کے حکمرانوں کو [illegible] ہم آہنگی کی کوشش کا اعتراف کرنا پڑا۔

دہلی کے پہلے اردو اخبار "دہلی اردو اخبار" کا اجرا ۱۸۳۶ء میں ہوا۔ مولوی محمد باقر کا یہ اخبار دہلی ہی کا نہیں بلکہ شمالی ہندوستان کا پہلا اردو اخبار تھا۔ ان کے فرزند شمس العلماء محمد حسین آزاد تحریر فرماتے ہیں کہ:

"۱۸۳۶ء میں جب پریس کو آزادی ملی تو انھوں نے مولوی باقر نے دہلی سے پہلا اردو اخبار جاری کیا اس کے ساتھ ایک مطبع بھی قائم کیا جس میں مولانا کی تصنیفات اور درسی کتابیں شائع ہوا کرتی تھیں۔ اس پریس کا نام پہلے جعفری اور پھر اردو اخبار پریس رکھا۔"

جس مکان سے یہ اخبار جاری کیا گیا تھا وہ درگاہ پنجہ شریف (کشمیری گیٹ دہلی) سے متصل ہے اور آج بھی موجود ہے جو پہلے ایک قسم خانہ امام باڑہ کی شکل میں تھا مگر اب اس کے بیشتر حصے کو تجارتی اغراض کے لیے استعمال کیا جانے لگا ہے اور محرم کو شیعہ جامع مسجد سے علم تابوت اور ذوالجناح کا جلوس اس کے اندرونی حصہ میں آتا ہے۔ اس اخبار نے ملک کے مختلف حصوں میں اپنے نامہ نگار مقرر کیے تھے [illegible] میں اس اخبار کے کئی نامہ نگار تھے مگر افسوس کہ ان کے نام نہ معلوم ہو سکے۔ دہلی اردو اخبار کی ۱۰ مارچ ۱۸۵۳ء کی اشاعت میں اس کے ایک مکتوب نگار کی یہ خبر [illegible] کے حالات پر روشنی ڈالتی ہے

"[illegible]"

[illegible]

[illegible]

[illegible] سلطنت [illegible]

[illegible]

[illegible] جس سبب سے [illegible]

بعد نمایاں ہوتی ہے۔"

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جس [illegible] کا نام دیا گیا [illegible] اردو اخبار نے اہم کردار ادا کیا۔ مولوی باقر نے اپنے قلم کو تیشہ بنالیا۔ اور ان کی جرأت رندانہ ان کی شہادت کا عنوان بنی۔

دہلی میں لکھنؤ کے ایک اور اخبار نویس کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے یہ تھے لکھنؤ کے مصطفیٰ خاں۔ جب ۱۸۴۹ء میں شاہی حکم سے لکھنؤ کے مطابع بند کر دیے گئے تو مطبع مصطفائی کے مالک مصطفیٰ خاں نے اپنا مطبع لکھنؤ سے کانپور منتقل کیا اور پھر اسی نام سے ایک مطبع دہلی میں بھی کھولا۔ انھوں نے دہلی والے مطبع پر زیادہ توجہ دی اور خطبات دتاسی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصطفیٰ خاں نے ۱۸۵۲ء میں صادق الاخبار کے نام سے ایک اخبار بھی جاری کیا جو مصطفائی پریس دہلی سے شائع ہوتا تھا۔ مطبع مصطفائی سے وابستہ ایک کاتب جمیل الدین خاں ہجر نے بھی مصطفیٰ خاں سے علاحدہ ہو کر جمیل المطابع کے نام سے اپنا ایک مطبع محلہ چرخی والان دہلی میں قائم کیا تھا اور صادق الاخبار کے نام ہی سے ایک اخبار کی اشاعت شروع کی تھی جو دیکھتے دیکھتے دہلی کا سب سے با اثر اور کثیر الاشاعت اخبار بن گیا تھا کیونکہ ان کے اخبار میں انگریزوں کے خلاف تفصیلی خبریں شائع ہوا کرتی تھیں۔ ۲۰ جولائی ۱۸۵۷ء کی اشاعت میں اپنے آبائی وطن سے ان کی گہری وابستگی کا اظہار اس خبر سے ہوتا ہے:

"الٰہ آباد سے ایک دوست کے پاس سے ایک کاغذ آیا [illegible] لکھنؤ کے [illegible] انگریز [illegible]

[illegible]"

پنڈت رام چندر دہلوی نے یکم ستمبر ۱۸۴۷ء کو دہلی سے [illegible] جاری کیا [illegible]

[illegible]

[illegible] حضرت [illegible] مدرسہ [illegible] کر دیا
[illegible] کا دوسرا شمارہ مجھے دکھایا تھا۔ جو [illegible] اودھ
کے [illegible] شاہ [illegible] نواب شجاع الدولہ اور آصف الدولہ
کی [illegible] ملک اودھ کے تحت سعادت علی خاں [illegible]
[illegible] غازی الدین حیدر، محمد علی شاہ اور شاہ
واجد علی خاں کے حالات کا مطالعہ کر کے بہت خوشی ہوئی تھی۔ مولانا امداد صابری
نے تاریخ صحافت اردو میں تاریخ اودھ کے ذیل میں جو کچھ بھی لکھا ہے اس سے
اندازہ ہوتا ہے کہ اودھ کی زمین زرخیز تھی۔ دریاؤں اور نہروں سے آبپاشی کا
انتظام تھا اس لیے بہت کم قحط پڑتا تھا اور ۸۰ برس تک اودھ امن و امان کا
گہوارہ بنا رہا۔ اس وقت ملک اودھ کی آمدنی لگ بھگ ڈیڑھ کروڑ روپے تھی
اور اس آمدنی کی تحصیل کا انتظام اس طور سے ہوتا تھا کہ وزیر ہر ضلعے کو اس شخص
کے سپرد کر دیتا تھا جو سب سے زیادہ روپیہ دینے کا اقرار کرتا مگر ان ٹھیکے داروں
کا طریقہ کار ظالمانہ اور جابرانہ تھا جس کی وجہ سے ہزاروں دیہات برباد ہو گئے اور
لوٹ مار کا بازار گرم ہو گیا اور یہ سب انگریزوں کی سوچی سمجھی حکمت عملی کے نتیجے میں
ہوا کیونکہ وہ بادشاہ کو رعایا کی نظر میں گرانا چاہتے تھے تاکہ ان کے مکمل اقتدار کی
منزل آسان ہو جائے۔

شمالی ہند کا سب سے پرانا اخبار زبدۃ الاخبار ہے جو ۱۸۳۳ء میں آگرہ سے جاری ہوا۔ یہ فارسی زبان کا اخبار تھا اور اس کے مالک و مدیر منشی واجد علی خاں تھے۔ تجارتی اعتبار سے یہ ایک کامیاب اخبار تھا اس کی تعداد اشاعت ۵۰ تھی۔ اس کی اشاعت و طباعت پر صرف چالیس روپے خرچ ہوتے تھے اور اخبار کی بکری سے ماہانہ ۱۳۰ روپے کی آمدنی تھی۔ اشتہارات سے ہونے والی آمدنی اس کے علاوہ تھی۔ منشی واجد علی خاں کو صرف اخبار نویسی ہی میں ملکہ حاصل نہ تھا بلکہ وہ اردو اور فارسی میں بلند پایہ کی شاعری بھی کرتے تھے۔ انھوں نے گلدستہ انجمن کے نام سے اردو زبان کی ایک تاریخ بھی مرتب کی تھی۔ ان کے ایک ہم عصر اسعد الاخبار آگرہ کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے گلدستہ انجمن میں ایک باب مراسلات و مکاتبات پر بھی تحریر کیا تھا اور انھوں نے ایک کتاب مطلع العلوم و مجمع الفنون بھی تصنیف کی تھی جو [illegible] اس کتاب میں [illegible] علوم و فنون سے بحث کی گئی تھی [illegible] زبدۃ الاخبار کا ایک [illegible]

تھا جو اردو کی [illegible] سال کیا کرتا تھا۔ اسعد الاخبار آگرہ [illegible] اخبار [illegible] کو ترجمہ کر کے شائع کیا جاتا تھا ان خبروں کا انداز انگریزی [illegible] ان خبروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ اور ان کے [illegible] کرنے کی ایک منظم سازش پر عمل ہو رہا تھا۔ مثلاً ایک خبر میں یہ اطلاع دی گئی ہے کہ "حضرت بادشاہ سلامت معاملات سلطنت سے دست بردار ہو کر رات دن [illegible] عیش کرتے ہیں۔" ایک اور خبر میں بتایا گیا ہے کہ "حضرت سلطان وزیر الممالک کے گھر محفل جشن میں گئے، وہاں جو حرکات بدر ذاتی حضرت سلطانی سے ہوئیں ان کے لکھنے کی ادب و حجاب رخصت نہیں دیتے۔ [illegible] مطرب لوگ کرتے ہیں اس سے ہزار درجے بہتر بندگان عالی نے کیا۔" ایک اور خبر میں سرفراز کنچنی کے گھر مستی کی تقریب میں حضرت سلطان کی وزیر الممالک سمیت شرکت کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ انھوں نے "شہر کی تمام کنچنیوں میں اس کی (سرفراز کنچنی کی) قدر و منزلت بڑھا دی فی الحقیقت حضرت سلطانی کا مرتبہ تو کچھ کم نہ ہوا مگر اس کنچنی کا مرتبہ بلند ہو گیا بقول شیخ سعدی علیہ الرحمۃ "ز قدر و شوکت سلطان نہ گشت چیزے کم" الخ جب حضرت سلطانی وہاں سے مراجعت کر آئے تو باغ دلکشا میں اس کنچنی کو بلوا کر عیش و سرور کی خوب داد دی۔"

آگرہ کا پہلا اردو اخبار صدر الاخبار تھا جو آگرہ کالج کے ایک انگریز پروفیسر سی فنک نے ۱۸۴۶ء میں جاری کیا تھا۔ غالباً اردو کا یہ پہلا اخبار تھا جو کمپنی کے حصے فروخت کر کے جاری رکھا گیا تھا۔ پروفیسر سی فنک نے آگرہ کالج سے منسلک دو سو افراد کو ۵۔۵ روپے کے حصے فروخت کیے تھے۔ صدر الاخبار کے اجرا کے دوسرے سال یعنی ۱۸۴۷ء میں اردو کا ایک اور اخبار اسعد الاخبار کے نام سے جاری ہوا تھا یہ ہفتہ وار اخبار تھا اور اس کے مالک منشی قمر الدین تھے۔ اسعد الاخبار میں ہر ہفتہ ادارہ تحریر کی جانب سے یہ اعلان شائع کیا جاتا تھا:

"جناب رسالت مآب صلی اللہ و آلہ و اصحابہ وسلم کے زمانہ مبارک کا حال واقعہ اصحاب فیل سے شروع کر کے تھوڑا تھوڑا ہر اخبار میں چھاپا جاتا ہے۔ جب بفضلہ یہ حال تمام ہو چکے گا تو اہل بیت طاہرین اور خلفائے راشدین اور صحابہ کبار رضوان اللہ علیہم الصلوٰۃ والسلام کے حالات بے کم و کاست بہ ترتیب درج کیے جائیں گے تاکہ خلق کو ان حالات فیض سمات پر اطلاع ہو۔"

اس اعلان سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں رہ جاتا کہ اس [illegible]

[illegible]

کے بعد لکھنؤ میں [illegible] کے ساتھ ایک

کاتب کو پریس کہا گیا۔ اس پریس میں سب سے پہلے ہفت اقلیم شائع کی گئی پھر عربی میں مناقب حیدریہ چھپی (۱۸۲۸ء) تاج حیدری فارسی میں (۱۸۳۲ء) چھپی۔ ۱۸۳۲ء میں آگرہ والوں کی ایک انگریزی کمپنی نے لکھنؤ کا لیتھو پریس لگایا جو بعد میں لکھنؤ منتقل کر دیا گیا۔ اخبار شہنشاہی جو ۱۸۳۸ء میں شائع ہوئی تھی ۱۸۴۷ء سے ۱۸۵۷ء تک لکھنؤ کے جو اخبارات نسبتاً باقاعدہ چھاپہ خانوں کے نام گنوائے گئے ہیں ان کی تعداد ۱۲ ہے ان میں سلطان المطابع کے علاوہ مصطفائی (۱۸۴۲ء) افضل المطابع (۱۸۴۵ء) [illegible] (۱۸۴۵ء) مرتضوی (۱۸۴۵ء) مولائی (۱۸۴۷ء) حسینی (۱۸۴۴ء) شمسی (۱۸۴۵ء) محمدی (۱۸۴۵ء) احمدی (۱۸۴۶ء) لکھنوی (۱۸۴۸ء) اور افضل المطابع (۱۸۵۱ء) کے نام شامل ہیں۔

لکھنؤ کا پہلا باقاعدہ اخبار لکھنؤ اخبار تھا جو ۱۸۴۷ء میں جاری ہوا۔ اس کا ایڈیٹر لال جی تھے۔ لکھنؤ کا طلسم لکھنؤ ۱۸۵۶ء میں نکلا۔ جلد ہی اس کا شمار اہم اخباروں میں ہونے لگا۔ اس کی زبان مقفیٰ و مسجع تھی۔ یہ اخبار لکھنوی تہذیب و معاشرت کا عکاس تھا۔ اس کی ایک خبر ملاحظہ کیجیے:

"لکھنؤ میں سنیچر آیا ہے۔ چوروں نے ہنگامہ مچایا ہے۔ جو ساتھ ہے بھاگ جاتا ہے۔ آنکھ جھپکی پگڑی غائب ہے۔

میر صاحب زمانہ نازک ہے   دونوں ہاتھوں سے تھامیے دستار"

طلسم لکھنؤ کے ایڈیٹر فرنگی محل کے مولوی محمد یعقوب انصاری تھے۔ اس اخبار کی اشاعت کے ۵ ماہ بعد ۱۸ نومبر ۱۸۵۶ء کو سحر سامری ہفت روزہ کی شکل میں نمودار ہوا۔ اس کے ایڈیٹر کمیر نرائن عاشق اور پنڈت نند کشور تھے۔ اس کا اسلوب بیان بھی طلسم لکھنؤ جیسا تھا۔ ایک خبر ملاحظہ ہو: "ان دنوں غلہ کی گرانی ہے۔ گرانی خاطر کی ارزانی ہے..... گویا مفلسی میں آٹا گیلا ہے۔ خون دل بجائے شراب ہے۔ طرہ جگر کباب ہے....." اسی زمانہ کا ایک اخبار مخزن الاخبار تھا اور دوسرا تاج الاخبار تھا۔ لکھنؤ کے جس اخبار کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی وہ اودھ اخبار تھا جسے ۱۸۵۸ء میں منشی نول کشور نے جاری کیا تھا۔ ۱۸۷۷ء میں یہ ہفت روزہ سے سہ روزہ ہوا اور سر سید احمد خاں کی تحریک پر ۱۸۷۸ء میں اودھ اخبار روزنامہ بن گیا۔ اس کی پالیسی مرنجاں مرنج تھی۔ بڑے بڑے شاعر، ادیب اور انشاپرداز اس اخبار سے وابستہ تھے جن میں مولوی غلام محمد تنہا

[illegible] پنڈت رتن ناتھ سرشار [illegible]

[illegible]

سے اودھ پنچ تک [illegible] اخبار کے ایڈیٹر [illegible] منشی نول کشور نے ان کو [illegible] پنڈت [illegible] لیکن یہ سلسلہ دیر پا ثابت نہ ہوا اور چشمک بڑھتی گئی۔ ان کی جگہ پنڈت رتن ناتھ سرشار ایڈیٹر بنائے گئے۔ ان کے عہد ادارت میں فسانۂ آزاد قسط وار اس اخبار میں شائع ہوا جس کو ۱۸۸۰ء میں کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔ منشی سجاد حسین نے اپنے اودھ پنچ میں اودھ اخبار کے خلاف قلم کی جولانیاں دکھائیں۔ سرشار کی معیاد ملازمت ختم ہونے کے بعد فروری ۱۸۹۰ء میں خود منشی نول کشور نے اودھ اخبار کی ادارت سنبھال لی۔ اودھ پنچ ایک مزاحیہ اخبار تھا جس کا اجرا ۱۸۷۷ء میں ہوا تھا۔ اس اخبار میں پنڈت رتن ناتھ سرشار، اکبر الہ آبادی، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، منشی جوالا پرشاد برق، منشی احمد علی شوق اور منشی احمد علی کسمنڈوی کی تخلیقات کے علاوہ مرزا مچھو بیگ ستم ظریف اور نواب سید محمد آزاد (بنگال) کی خدمات بھی اودھ پنچ کو حاصل تھیں۔ اودھ پنچ مزاحیہ انداز میں حکمرانوں سے خوب چھیڑ چھاڑ کرتا تھا اس کی تحریر کا ایک نمونہ درج ذیل ہے:

"مبارک وہ کانے جو ستائے جاتے ہیں کیونکہ آسمان کی راحت اُن ہی کے واسطے ہے۔ مبارک وہ جو سول سروس کے لیے رنجیدہ ہیں کیونکہ سرکار سے زبانی تسلی دی جائے گی۔ مبارک وہ جو قوم کے ہمدرد کہلاتے ہیں کیونکہ [illegible] کی بدولت [illegible] مذہب سے مشرف ہوں گے۔ مبارک وہ جو تنگ دل ہیں کیونکہ بعض خوشامدی اخبار [illegible] کہیں گے۔ مبارک وہ جو راست باز ہیں کیونکہ [illegible] کے لیے دھکیلے جاتے ہیں کیونکہ ان کی سچائی کے درخت کی جڑ مضبوط ہو جائے گی۔"

کچھ لوگ اودھ پنچ کو اردو کا پہلا مزاحیہ اخبار سمجھتے اور لکھتے آئے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مزاحیہ صحافت کا آغاز اودھ پنچ سے پہلے ہوا اور منشی سجاد حسین پہلے مزاحیہ صحافی بھی نہ تھے بلکہ پہلا مزاحیہ اخبار مذاق تھا جس کے مالک حکیم احمد رضا لکھنوی اور ایڈیٹر عبدالجلیل نعمانی تھے۔ اودھ پنچ اخبار نے اردو کے مزاحیہ ادب میں ایک نئے [illegible] اضافہ کیا۔ [illegible] ۱۸۷۷ء [illegible] لکھنؤ سے شائع ہوتے تھے۔ ان کے [illegible]

آدم پنچ (۱۸۸۱ء) بنارس، بنارس پنچ (۱۸۸۱ء) بنارس، ظریف (۱۸۸۲ء) بنارس، میرٹھ پنچ (۱۸۸۱ء) میرٹھ، ظریف الہند (۱۸۸۶ء) میرٹھ، فتنہ (۱۸۸۲ء) گورکھپور، کشمیر پنچ (۱۸۸۴ء) بدایوں، کٹرا پنچ (۱۸۸۵ء) الٰہ آباد، پرکار آتش المعروف قنوج پنچ (۱۸۸۵ء) قنوج۔

اگر ایک طرف اردو صحافت میں طنز و مزاح کا زور تھا تو دوسری طرف علوم جدیدہ پر بھی توجہ دی جانے لگی تھی۔ سر سید احمد نے جنوری ۱۸۶۴ء میں غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کرنے کے بعد مارچ ۱۸۶۶ء میں علی گڑھ سے اخبار سائنٹفک سوسائٹی جاری کیا یہ اخبار پہلے ہفت روزہ تھا۔ بعد میں سہ روزہ ہوگیا اور سر سید احمد کے انتقال کے بعد بھی شائع ہوتا رہا۔ اس اخبار کی پالیسی رعایا اور حکمراں طبقے میں مفاہمت کی خوشگوار فضا پیدا کرنا اور سر سید کے سماجی، اخلاقی، مذہبی اور سیاسی نظریات کی تبلیغ کرنا تھا۔ سر سید نے ۱۸۷۰ء میں تہذیب الاخلاق بھی علی گڑھ ہی سے جاری کیا یہ دس روزہ اخبار تھا جس کا مقصد اہل ہند بالخصوص مسلمانوں کو اعلیٰ درجہ کی تہذیب و اخلاق سے روشناس کرانا تھا۔ سر سید احمد کے تہذیب الاخلاق کے مقابلہ میں سر سید کی پالیسی کے خلاف آواز بلند کرنے کے لیے بھی کئی اخبار نکلے مثلاً کانپور سے نور الآفاق اور نور الانوار۔ مراد آباد سے لوح محفوظ اور آگرہ سے تیرہویں صدی۔ ان اخبارات میں سے اگر کسی اخبار میں سر سید پر چوٹ نہ ہوتی تھی تو وہ متعجب ہوتے تھے چنانچہ تہذیب الاخلاق میں انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ :

"ہمارا حال تو اس بڑھیا کا سا ہوگیا ہے جس کو بازار کے لونڈے چھیڑا کرتے تھے اور جب وہ چھیڑنے والے نہ ہوتے تو کہتی، کیا آج بازار کے سارے لونڈے مرگئے"

جب ہندوستان میں انجمنوں کے اخبارات نکلنا شروع ہوئے تو لکھنؤ بھی پیچھے نہ رہا۔ ان اخبارات کی تعداد بہت زیادہ ہے ان میں لکھنؤ کے اخبار انجمن ہند (۱۸۶۲ء) گرنڈہ کے ماہنامہ انجمن رفاہ عام شاہجہاں پور کے اخبار انجمن شاہجہاں پور، لکھنؤ کے رسالہ انجمن اسلام اور کانپور کے رسالہ انجمن تہذیب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

(باقی آئندہ)

قطعات

مُبارک ہو وطن والو کہ چھبیسؔ جنوری آئی
مئے عشرت کے یہ جام و سبُو ہمراہ ہے لائی
ہوئے مخمورُ خاص و عام ہیں صہبائے عشرت سے
ملا سب کو سکونِ قلب ہر دل نے خوشی پائی

آئی چھبیسؔ جنوری شاداں ہیں سب پیر و جواں
راگ خوشیوں کے ہوئے ہر ایک کے وردِ زباں
ہوگیا کافور غم، ہر اک دل رنجور سے
غلغلہ ہے عشرتوں کا از زمیں تا آسماں

ماسٹر عبدالمنان صدیقی
محلہ بنگلہ سیتاپور

— ۲ —

افق پہ آیا نئے سال کا ہلال نظرؔ
کہ اب غریب بھی آئیگا مالا مال نظرؔ
دعا ہے اپنی کہ تسخیر کائنات کریں
محبتوں میں یہ گزرے ہمارا سال نظرؔ

سالِ نو پر مان لو بھائی نظرؔ کی ایک بات
اپنے ہاتھوں میں اٹھاؤ پرچمِ عزم و ثبات
دُور ہو جائے گی ہم سے خود بخود ناکامیاں
ورد کرلو اسمِ اعظم اس میں ہر راہ نجات

——— سیّد عابد نظرؔ
۲۰۔ پاٹا نالہ۔ لکھنؤ

زندہ دلاں کا شہر

پروفیسر محمود الحق انصاری

یہ لکھنؤ یہ دہر کے نام آوراں کا شہر — ایسا کہاں ہے کوئی بھی سارے جہاں کا شہر
بستی یہ نازنینوں کی، یہ دلبراں کا شہر — یہ عاشقوں کا دیس، یہ دل دادگاں کا شہر
مرکز یہ اہلِ دل کا، بزرگوں کی خانقاہ — مجذوبوں کا دیار، زخود رفتگاں کا شہر
یہ خطۂ فنون، یہ گہوارۂ ادب — یہ مرکزِ علوم، یہ دانش وراں کا شہر
یہ سرزمین معجزۂ سوزن و قلم — فن کاروں کی زمین، یہ ہنر پیشگاں کا شہر
آواز و ساز و نغمہ کی جادوگری کا گڑھ — رقاصوں کا اطاق، یہ خنیاگراں کا شہر
رنگینیٔ محبت و اخلاص کا دیار — شیرینیٔ خلوصِ دلِ دوستاں کا شہر
بنتے ہیں روز لوگ، بگڑتے ہیں روز لوگ — مرکز یہ تاجروں کا، یہ سود و زیاں کا شہر
تہذیب کا یہ گھر، یہ شرافت کی جایگاہ — ہے کل جہاں کی جاں یہ ہندوستاں کا شہر
بستی شناوروں کی، بنکوں کا یہ دیار — بانکوں کی سرزمین یہ، زور آوراں کا شہر
ہستی تھی اُن کی ہندو و مسلم کا امتزاج — صادق یہاں تھے، ہے یہ انھیں پہلواں کا شہر
ہے جس کے لفظ لفظ میں کوثر کی چاشنی — تسنیم سے دُھلی اُسی اُردو زباں کا شہر
ہے کون گل ادب کا یہاں جو کِھلا نہیں — یہ مرثیہ، قصیدہ، غزل، داستاں کا شہر
شعلہ بیاں بھی تھے یہاں، شیریں زبان بھی — نثاروں کی زمیں یہ، گویندگاں کا شہر
پشتوں رہے جو مادحِ شبیرؑ ان کا گھر — صدیوں سے علم جس میں ہے، اُس خانداں کا شہر
سودا کی خواب گاہ، یہ آرام گاہِ میر — ناسخ سے نغز گوئے شہِ شاعراں کا شہر
اس شہر میں کبھی تھے صبا و وزیر و رند — یہ رہ چکا ہے آتش آتش بجاں کا شہر
تھے یاں کبھی اسیر و امیر و جلال و سحر — پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے اہلِ زباں کا شہر
گلزار یہ نسیم کا، اختر کی سرزمیں — بستی یہ زہرِ عشق کی، سحر البیاں کا شہر
تھے آرزو و یاس و صفی و شرر یہاں — تھا یہ عزیز و بیخود مشک فشاں کا شہر
یہ تھا سرور و آسی و سرشار کا وطن — چکبست کا دیار، اثر خوش بیاں کا شہر
یہ منظر و مراج کے خوابوں کی سرزمیں — یہ حلقۂ ظریف کے زندہ دلاں کا شہر
مرحوم فضل و سالکِ مغفور کا وطن — شہرِ عمر یہ، افسر جنت مکاں کا شہر
امرت کی جنم بھومی یہ، دھرتی یہ روپ کی — اُردو کے ساتھ ساتھ ہے ہندی زباں کا شہر
اک دور وہ بھی تھا کہ یہ تھا فخرِ روزگار — گویا کہ تھا زمین پہ اک آسماں کا شہر

ماضی میں کچھ بھی تو ہو، مگر آج لکھنؤ!
کہ اس پہ فخر ہے قلی نکتہ داں کا شہر

محمد اسحٰق صدیقی
۱۲۹/بی رویندر گارڈن۔ علی گنج سیکٹر ای،
لکھنؤ ۲۲۶۰۲۰

لکھنؤ کے امام باڑے[1]

— ۲ —

امام باڑہ میر باقر سوداگر

یہ امام باڑہ چوک سے متصل جوہری محلہ میں واقع ہے گول دروازہ سے چوک جاتے ہوئے بائیں جانب ایک قدیم پھاٹک ملتا ہے جو گھڑ والی محلّہ کے پھاٹک کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں سے امام باڑے کو سیدھا راستہ گیا ہے۔

امام باڑے کا بلند پھاٹک اور اس کی جوڑیاں مضبوط اور موٹی لکڑی کی بنی ہیں ان کا رنگ سیاہ ہے۔ اوپر کا حصّہ محراب کی صورت میں ہے۔ پھاٹک کے دائیں جانب عمارت کے حصّے میں ایک دکان ہے۔ پھاٹک کے بائیں جانب گلی میں جانے پر امام باڑے کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ لمبی دیوار کے نیچے کے حصّے کا پلستر غائب ہو چکا ہے جس سے لکھوری اینٹیں اور چونے کی جڑائی نظر آتی ہے۔ اوپر کے حصّے کا پرانا پلستر موجود ہے۔ باہر سے دیکھنے پر اندازہ ہو جاتا ہے کہ عمارت دو منزلہ ہے۔

اس عمارت کو میر باقر سوداگر نے اپنے رہائشی مکان کے قریب بنوایا تھا۔ میر باقر بہ عہد غازی الدین حیدر (۱۸۱۴ - ۱۸۲۷ء) اور ان کے بعد کے بادشاہوں کے زمانۂ حکومت میں جواہرات اور شیشہ آلات کے نامی سوداگر تھے۔ انھوں نے مختلف شہروں میں بہ آسانی کوٹھیاں بھی قائم کی تھیں جن میں ہنڈی پرنسے کا کاروبار بھی ہوتا تھا۔ بعد انتقال (۱۸۹۳ء) حسب منشا خود پھاٹک کے سامنے ایسے مقام پر دفن کئے گئے کہ امام باڑے میں زائرین اور شرکائے مجلس کی آمد و رفت کے وقت ان کی قبر پر سے گذرتے ہیں۔ [2]

پھاٹک میں داخل ہونے پر دالان نما ڈیوڑھی ملتی ہے جس سے گذر کر ایک دوسرا دالان ملتا ہے جس میں صدر دروازے کے دونوں جانب پانچ پانچ در ہیں۔

پختہ صحن میں قدم رکھتے ہی فرش سے ملی ایک پکّی قبر نظر آتی ہے جس کے کتبے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاندان کی نامور شخصیت حکیم نظیر حسن خاں (متوفی ۱۳۴۸ ہجری مطابق ۱۹۲۹ء) کا مدفن ہے۔

پختہ صحن کے بعد ایک وسیع چبوترہ ہے۔ اس چبوترے کے بعد دو منزلہ امام باڑہ ہے۔ امام باڑے میں ضریح سے مزیّن شہ نشین کے سامنے تین دالان ہیں جن میں سے ہر ایک میں پانچ پانچ در ہیں۔ دالانوں کے دونوں جانب صحنچیاں ہیں شہ نشین سے متصل دالان کی صحنچیوں میں ایک ایک دروازہ ہے۔ دوسرے دالان (شہ نشین کی طرف سے شمار کرنے پر) کے دونوں طرف ایک منزلہ صحنچیاں ہیں جن میں تین تین در ہیں ان میں تعزیے رکھے ہیں۔ تیسرے دالان کے دونوں جانب دو منزلہ صحنچیاں ہیں جن میں اندر اور باہر تین تین در ہیں۔ باہر والے دالان اور صحنچیوں کے دروازے لکڑی کے ہیں۔

امام باڑے میں وقتاً فوقتاً مرمت ہوتی رہتی ہے۔ پہلے دالان (شہ نشین کی طرف سے شمار کرنے پر) کی چھت قدیم ہے۔ دھنیوں اور چھاجوں کا رنگ سیاہ ہے۔ بعد کے دونوں دالانوں کی چھتیں نو تعمیر ہیں (سلیب پڑی ہے) امام باڑے کا پختہ فرش بھی بنا ہے۔ باہر کی دیوار کے جو حصّے گر گئے تھے گی اینٹوں سے بنائے گئے ہیں۔

امام باڑے کے اگلے دو دالان نہایت خوش نما جھاڑ فانوس سے آراستہ ہیں۔ چار بھاری بھرکم جھاڑ فرش پر رکھے ہیں جنھیں بیٹھکس کہتے ہیں۔ بعض دیوار سے جڑے ہیں۔ ان کی قیمت کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

[1] اس سلسلے کا پہلا مضمون "نیا دور" فروری - مارچ ۱۹۹۴ء - اودھ نمبر" میں صفحات ۱۲۵ تا ۱۳۵ شائع ہوا تھا۔ (ا-ح)

امام باڑے کے دونوں جانب اور سامنے غلام گردش ہے۔ دونوں طرف غلام گردش میں تیرہ تیرہ در ہیں۔ (چبوترے کے اطراف میں چاروں سمت کے اطراف میں نو) غلام گردش دو منزلہ ہے اور اوپر کے حصے میں جو کمرے ہیں وہ باہر سے آنے والے نادار طلباء کے قیام کے لیے وقف ہیں ان سے کرایہ نہیں لیا جاتا۔

چبوترے کے دائیں طرف جو پہلا در ہے اس کا دروازہ امام باڑے میں آنے جانے کے لئے دن بھر کھلا رہتا ہے۔ اس کے سامنے جو گلی ہے وہ لاہری محلے سے نرہی نکل جاتی ہے۔

چبوترے سے اتر کر بائیں جانب (شمال کی طرف) جو در ہے اسے پار کرنے کے بعد امام باڑے کے باہر ایک بڑی مسجد نظر آتی ہے جسے میر باقر سوداگر نے بنوایا تھا۔ اس کے سامنے ایک حوض ہے۔ امام باڑے کی پشت پر ایک چھوٹی مسجد ہے جسے کسی اور شخص نے بنوایا تھا۔ دونوں مسجدوں میں تین تین در ہیں۔ مسجدیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ دوسرے امام باڑوں کے برخلاف (جن کا رخ جنوب کی طرف ہے) اس امام باڑے کا رخ مشرق کی جانب ہے۔

امام باڑہ خاندانی وقف ہے اور اس کے صحن میں اہل خاندان ہی دفن ہو سکتے ہیں۔

امام باڑہ ناظم صاحب

یہ امام باڑہ میڈیکل کالج سے نخاس جاتے ہوئے وکٹوریہ اسٹریٹ کے بائیں جانب شیعہ کالج (آرٹس) سے پہلے واقع ہے۔ اسے مرزا آغا علی خاں عرف آغائی صاحب نے بنوایا تھا۔ وہ زمانۂ واجد علی شاہ میں سلطانپور کے ناظم تھے۔ سنہ ۱۹[illegible]ء میں انتقال ہوا۔

امام باڑہ عمارتوں کے ایک طویل سلسلے کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔ اس کے گول پھاٹک کے دونوں جانب دکانیں ہیں۔ پھاٹک میں داخل ہونے پر صحن ملتا ہے جس کے سامنے اور اطراف میں اوپر نیچے کمرے بنے ہیں۔ دائیں جانب کے آخری در میں امام باڑے میں جانے کا راستہ ہے

دوسرے امام باڑوں کے برخلاف (جن کا رخ جانب جنوب ہے) اس کا رخ مغرب کی طرف ہے۔ شہ نشین کے سامنے دو دالان ہیں جن میں سے ہر ایک میں پانچ پانچ در ہیں۔ دالانوں کے اطراف میں دو منزلہ صحنچیاں ہیں جن میں سے ہر ایک میں تین تین در ہیں۔ ہر جانب کل ۱۱ در ہیں (۳ + ۵ + ۳) بیرونی دالان اور صحنچیوں کے دروازے لکڑی کے ہیں۔ امام باڑہ اندر کی جانب نصف سبز رنگ (اوپر کا حصہ) اور نصف (نیچے کا حصہ) سفید چونے سے پتا ہوا ہے۔ دالانوں کے فرش کے نیچے اہل خاندان کی قبریں ہیں۔

امام باڑے کے پانچ در اور ہر جانب کی صحنچی کے ایک ایک در کو ملا کر سامنے کے رخ سات در ہیں۔ امام باڑے کے سامنے اینٹوں کا پختہ صحن ہے جس کے تینوں طرف دو منزلہ غلام گردش ہے۔ ہر جانب اوپر نیچے سات سات در ہیں۔ امام باڑے کے دائیں جانب صحنچی سے متصل اندر آنے کا دروازہ ہے بائیں جانب کی صحنچی کے نزدیک باہر جانے کے لیے دوسرا دروازہ ہے جس کے باہر ایک گلی ہے۔ غلام گردش کے کمروں میں اوپر اہل خاندان اور نیچے ان کے متعلقین آباد ہیں۔

امام باڑہ وقف علی الاولاد ہے۔ مجالس و محافل کے لیے اجازت لینا ضروری ہے۔ امام باڑے کے موجودہ متولی مرزا تقی رضا صاحب (ایڈوکیٹ) امام باڑے کی بقا اور تحفظ کے لیے دن رات کوشاں ہیں۔ پہلے دالان کا فرش کچا تھا اب پختہ بنوا دیا گیا ہے۔ شہ نشین کی زینت لکڑی کی ایک نہایت خوشنما ضریح ہے اس کے لیے مناسب ناپ کا چبوترہ بنوا دیا جس کے چاروں طرف چینی مٹی کے خوشنما پھول کے (TILES) لگے ہیں ـــ امام باڑے کے گول کھمبوں کے نیچے کے حصے مضبوطی کے خیال سے چوکور بنائے گئے ہیں چھتوں کی دھنیاں اور جانبیں کمزور ہو گئی ہیں اس لیے ان کی جگہ سلیب ڈلوانے کا ارادہ ہے۔

اس امام باڑے کی خصوصیت چپ تعزیہ کی مجالس ہیں جو ۱۸ صفر سے ۸ ربیع الاول تک روزانہ صبح ہوتی ہیں۔ یہ تعزیہ یکم محرم سے ۷ ربیع الاول کی شب تک ڈاکٹر آغا محمد باقر (آل بانی چپ تعزیہ) کے نئے مکان نمبر ۴۸ واقع بنجاری ٹولہ (لکھنؤ ۲) میں رکھا جاتا ہے۔ ۷ ربیع الاول کا دن گذرنے کے بعد رات میں کسی وقت خاموشی کے ساتھ تعزیہ ناظم صاحب کے امام باڑے میں لایا جاتا ہے۔ ۸ ربیع الاول کی صبح الوداعی مجلس اور ماتم کے بعد لوگ چپ تعزیے کی زیارت کرتے ہیں۔ تعزیہ بنانے والے کاریگر کمیاب ہیں۔ اسی لیے یہ تعزیہ دو تین سال تک محفوظ رکھا جاتا ہے جب کاغذ بوسیدہ اور ڈھانچہ کمزور ہو جاتا ہے تو اسے دفن کر دیتے ہیں

امام باڑہ افضل محل

یہ امام باڑہ میڈیکل کالج سے نخاس جاتے ہوئے وکٹوریہ اسٹریٹ کے

دونوں جانب واقع ہے۔ اس کے سامنے سڑک کے بائیں جانب شیعہ کالج (آڈیٹوریم) ہے امام باڑے کے باہر کی طرف لال رنگ کی ایک شاندار دومنزلہ عمارت ہے جس کے لوہے کے دروازے (CHANNEL GATE) کے دونوں جانب دکانیں اور اوپر مکانات ہیں۔

پھاٹک میں داخل ہونے پر پختہ فرش والی ڈیوڑھی ملتی ہے جس کے آخر میں لوہے کا ایک دوسرا پھاٹک ہے۔ اس کے سامنے باغیچہ ہے جس کے بائیں جانب (جنوب رخ) امام باڑے کی خوشنما عمارت ہے امام باڑے کے سامنے باغیچہ کی جس کے دائیں جانب ایک دومنزلہ پرانی مسجد ہے۔ اس سے ملی ہوئی ایک نئی عمارت ہے۔ امام باڑے کے بائیں جانب بھی نو تعمیر کمرے ہیں۔

امام باڑے میں شہ نشین کے سامنے دو دالان ہیں۔ شہ نشین اور دالان میں پانچ پانچ در ہیں۔ دونوں دالانوں کے اطراف میں صحنچیاں ہیں شہ نشین سے متصل ہر صحنچی میں ایک ایک در اور اوپر جانے کے لیے پتلا سا زینہ ہے اگلے دالان کی صحنچیوں میں اوپر نیچے تین تین در ہیں۔ ان صحنچیوں کی اوپری منزل مستورات کے لیے وقف ہے۔ اگلے دالان کے دروں میں شیشہ لگے ہوئے لکڑی کے دروازے ہیں۔ ان کے اوپر لوہے کا سائبان ہے۔

امام باڑے کے اندر کے حصے کا رنگ ہلکا فیروزی ہے۔ بعض حصے سفید ہیں در و دیوار پر سنہری کام ہے یہ رنگ روغنی (OIL PAINTS) ہیں۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ ہر در کی محراب پر دونوں جانب خوشنما مچھلیاں بنی ہیں۔ شہ نشین کے مرکزی در کی محراب کے اوپر بجائے مچھلیوں کے دو لمبی دم والے مور بنے ہیں شہ نشین کے دروں کے گرد دیواروں پر چینی مٹی کے خوشنما ڈیزائنوں والے چوکے (TILES) لگے ہیں۔ امام باڑے کی عمارت قدیم لیکن رنگ روپ نیا ہے۔

یہ امام باڑہ جس قطعۂ اراضی پر بنا ہے وہ کبھی افضل محل کی ملکیت تھی (افضل محل غالباً واجد علی شاہ کی بیگم تھیں) یہ جائداد رانی شہنشاہ بیگم زوجہ فضل علی خاں، تعلقہ دار اکبرپور (ضلع سیتاپور) نے ۱۹۰۱ء میں خریدی تھی۔ ان کے بیٹے راجہ ٹھاکر نواب علی خاں علم موسیقی کی مشہور کتاب "معارف النغمات" کے مولف اور بھات کھنڈے میوزک کالج کے بانیوں میں سے تھے ٹھاکر نواب علی خاں اور ان کے بیٹے کنور یوسف علی خاں دونوں ہی رانی صاحبہ کو ان کی زندگی میں داغ مفارقت دے گئے۔ ٹھاکر نواب علی خاں کا مقبرہ امام باڑہ غفران مآب کے نزدیک ہے۔ رانی صاحبہ کا انتقال ۱۹۳۵ء میں ہوا۔

امام باڑے کے موجودہ متولی منتصر عباس صاحب عرف منصور سلطان ہیں ان کے والد سلطان علی خاں کو رانی صاحبہ نے گود لے لیا تھا اور ان کے نام پر اپنی بنوائی ہوئی عمارت کا نام سلطان منزل رکھا تھا چنانچہ پھاٹک کے دائیں جانب سنگ مرمر کی تختی پر اردو میں اور بائیں جانب سنگ مرمر کی تختی پر انگریزی میں عمارت کا نام اور سنہ تعمیر درج ہے۔

سلطان منزل

۲۷ر ستمبر ۱۹۰۷ء مطابق ۱۸ر شعبان ۱۳۲۵ھ

SULTAN MANZIL

1907

امام باڑہ وقف علی الاولاد ہے۔ خاندان کے ایک ممتاز فرد اور خاص مکین ڈاکٹر سید سلیمان حسین (ریڈر شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی) منصور سلطان صاحب کے سگے بہنوئی ہیں۔

امام باڑہ اکرام اللہ خاں

یہ امام باڑہ نخاس پولیس چوکی کے نزدیک واقع ہے (اس کی پشت پر شاہ گنج ہے) قدیم عمارت عرصہ دراز تک کھنڈر کی صورت میں باقی رہی اب اس کی جگہ حسینیہ اکرام اللہ خاں اور ماکرام باکر ہیں۔ تعمیر جدید کا آغاز ۱۹ نومبر ۱۹۸۴ء کو ہوا تھا۔

نواب اکرام اللہ خاں علامہ تفضل حسین خاں کے چچازاد بھائی تھے۔ جب نواب آصف الدولہ نے ۱۷۹۶ء میں خان علامہ کو نائب ریاست مقرر کیا تو اکرام اللہ خاں ان کی پیش دستی میں کام کرتے رہے[۴] ان کا بنوایا ہوا امام باڑہ تقریباً ۵۸۰۰ مربع فٹ زمین پر پھیلا ہوا ہے اب اس کی جگہ ایک مختصر سا امام باڑہ ہے جس کی تعمیر کا انداز یہ ہے کہ لوہے کے دروازے (CHANNEL GATE) جس کے دونوں جانب دکانیں اور اوپر مکانات ہیں ڈیوڑھی کے بعد پختہ صحن اور اس کے دونوں جانب دو منزلہ عمارتیں ہیں۔ جن میں کرائے دار آباد ہیں صحن کے بعد امام باڑے کی خاص عمارت ہے پانچ در والے دالان کے پیچھے پانچ در والے برآمدے میں مختصر سا شہ نشین ہے دالان کے اندر دائیں جانب (مغرب رخ) مختصر سی مسجد ہے بائیں جانب اس کا جواب ہے اس کے سامنے منبر رکھا ہے۔ امام باڑے کی پشت پر دائیں جانب ایک خوشنما مینار ہے۔ امام باڑہ شیعہ سنٹرل وقف بورڈ کی نگرانی میں ہے۔

امام باڑہ تجمل حسین خاں

یہ امام باڑہ ...... کی پشت پر لکھنؤ کے ...... میں واقع ہے۔ ...... اسپتال کے سامنے والی گلی میں سیدھا جا کر بائیں طرف مڑنا ہوتا ہے جہاں ڈاکٹر ...... کے مطب کے پاس ...... گلی میں چار کھوری اینٹوں کی ایک لمبی دیوار کے بعد نئی وضع کا لکڑی کا سبز پھاٹک نظر آتا ہے۔ رنگا اینٹوں کی چنائی سے پتہ چلتا ہے کہ یہ پھاٹک ...... بنایا گیا ہے۔ یہی امام باڑہ تجمل حسین خاں ہے۔ اس کے داہنی اور بائیں جانب گلیاں ہیں۔ بائیں طرف کی گلی میں امام باڑے کے زیر سایہ کرایہ دار آباد ہیں۔

امام باڑے کے پھاٹک میں داخل ہونے سے پہلے ڈیوڑھی ملتی ہے جس پر چھت کی جگہ ٹین پڑی ہے۔ پھر کچا صحن پار کر کے امام باڑے کی عمارت نظر آتی ہے جس میں دو کمرے ہیں۔ آگے والا کمرہ مجلس کے لیے وقف ہے اور پیچھے والا شہ نشین ہے جس کی زینت ضریح کے علاوہ زمانۂ قدیم کا ایک شاندار منبر ہے اس کے بارے میں بیگمات اودھ کے مصنف اور تاریخ لکھنؤ کے مشہور محقق شیخ تصدق حسین نے یہ خیال ظاہر کیا تھا (امام باڑے کا) منبر ایک نادر اور محبوبہ روزگار چیز ہے جس (کے پہلو میں) جالی دار چوبی تختیاں جڑی ہیں جن میں تاج محل آگرہ کی پتھر کی جالیوں کی ہو بہو نہایت نفیس اور نازک نقل بنائی گئی ہے۔ ...... رو پہلے پینٹ کی وجہ سے یہ بتانا مشکل ہے کہ پہلے اس کا کیا رنگ تھا اور یہ کس لکڑی کا بنا ہے۔

شہ نشین کے سامنے دالان میں امام باڑے کے بانی کی فرش سے ملی قبر ہے جس پر سنگ مرمر کی ایک مختصر سی تختی لگی ہے جس پر سیاہ حروف میں مندرجہ ذیل کتبہ ہے۔

۷۸۶

یا غفار

مرقد منور مخدوم نواب تجمل حسین خاں فردوس مسکن
نواب مغفور بتاریخ بست و سوم ماہ ربیع الاول ۱۲۳۵ھ ہجری وفات یافت
محمد ادرتضیٰ حسین خاں رئیس خاندان در سنہ ۱۲۸۸ ہجری نصب کردہ

تجمل حسین خاں خلف تفضل حسین خاں کا انتقال ۲۳ ربیع الاول سنہ ۱۲۳۵ھ مطابق ۱۰ جنوری سنہ ۱۸۲۰ء کو ہوا تھا۔ سنگ مزار ان کے پوتے نے ۱۲۸۸ھ مطابق ۱۸۷۱ء میں نصب کرایا۔

امام باڑے سے متصل کچا صحن ہے۔ اس کے آگے کچا صحن ہے جس کے داہنی جانب دو کشادہ دالان ہیں۔ جن میں سے ہر ایک ...... ہے کہ ...... کی ...... امام باڑے ...... لگی ہیں ...... امام باڑہ ...... بوسیدہ حالت سے اس کی گذشتہ شان و شوکت کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

امام باڑہ وقف علی الاولاد ہے۔ موجودہ متولی قائم حسین خاں ہیں۔

امام باڑہ امیر محل صاحبہ

یہ امام باڑہ مولوی گنج سے متصل ...... میں واقع ہے اسے نواب امیر محل صاحبہ نے ...... سے آراضی خرید کر بنوایا تھا۔

جان عالم واجد علی شاہ نے بزمانۂ ولی عہدی امیر محل متعہ کیا تھا۔ تخت نشین ہونے پر دو ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کر کے ...... خورشید لقا ...... خطاب دیا تھا۔ مارچ ۱۸۵۶ء میں وہ شاہ معزول کے ساتھ کلکتہ نہیں گئیں بلکہ علیحدگی اختیار کرنا بہتر سمجھا۔ انھوں نے بارہ بنکی کے قاضی اصغر خاں سے دوسری شادی کی ان سے چار اولادیں ہوئیں ...... واجد علی خاں کے بعد ان کے بیٹے بہادر علی خاں امام باڑے کے متولی ہوئے۔ موجودہ متولیہ امیر جہاں بیگم بہادر علی خاں (مرحوم) کی بیٹی ہیں۔ ان کے شوہر کا اسم گرامی ظاہر علی خاں ہے امام باڑہ خاندانی وقف ہے۔

امام باڑے کا پھاٹک لب سڑک ہے۔ ڈیوڑھی کے بعد کچا صحن ہے اور پھر دوسری ڈیوڑھی کے بعد کچا صحن جس کے سامنے امام باڑہ ہے۔ امام باڑے میں شہ نشین کے سامنے دو دالان ہیں تینوں میں با پھانک در ہیں دروازے لکڑی کے ہیں۔ امام باڑے کی عمارت قدیم ہے لیکن چھتیں بدل گئی ہیں جنھیں واجد علی خاں مرحوم نے بنوایا تھا۔ امام باڑے کی زینت کربلائے معلیٰ کی ضریح ہے۔ شیشے کے خوشنما جھاڑ، ہانڈیاں، کنول، دیوار گیریاں اور بڑے بڑے قمقمے زمانۂ قدیم کی یادگار ہیں۔

امام باڑے کے اطراف میں مکانات اور سامنے دکانیں ہیں پشت پر ...... مذکورہ بالا کا رہائشی مکان ہے (نمبر ...... بٹان) امام باڑہ عام طور پر بند رہتا ہے۔ سلسلۂ مجالس لگتا ہے۔

امام باڑہ اچھی حالت میں ہے۔ متولی کا تقرر ضرور تھا۔ انتظامی کمیٹی کا تقرر شیعہ وقف بورڈ ایک معینہ مدت کے لیے کرتا ہے۔ موجودہ منتظم متولی سید احمد عباس رضوی (رجسٹرار شیعہ انٹر کالج گولہ گنج لکھنؤ) ہیں۔

امام باڑہ داراب علی خاں

یہ امام باڑہ مولوی گنج میں حیدر مرزا روڈ (چکنی منڈی کی پشت) پر واقع ہو اسے میاں داراب علی خاں (زمانۂ حیات ۱۸۲۱ء تا ۱۸۹۱ء) نے بنوایا تھا موصوف حسینی خانم صاحبہ مخاطب بہ نواب ملکۂ عہد نواب ناظر تھے۔ ملکۂ عہد امجد علی شاہ (زمانۂ حکومت ۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۷ء) کی زوجہ تھیں۔ شہ

امام باڑہ سڑک کے دائیں جانب ہے اندر جانے کے لیے سبز رنگ کا لوہے کا پھاٹک ہے۔ پھاٹک کے بعد ڈیوڑھی اور پھر صحن ہے۔ سبز، سرخ، سفید اور زرد پیلے روغنی رنگ (OIL PAINT) سے رنگے ہوئے در و دیوار جدید آرائش کا ثبوت ہیں۔ البتہ صحن کی مشرقی دیوار پر بنی ہوئی مچھلی زمانۂ قدیم کی یادگار ہے۔ مغربی رو کار پر بنی مچھلی تعمیر نو کی نذر ہو گئی۔ امام باڑے کے ارد گرد دکانیں اور مکانات ہیں۔

امام باڑہ صحن کے دائیں جانب (جنوب رخ) ہے اس کے سامنے صحن کے دوسرے سرے پر حوض ہے۔ امام باڑے کی عمارت میں برآمدے کے بعد دو دالان ہیں اور پھر شہ نشین۔ ہر ایک میں پانچ پانچ در ہیں۔ دالانوں کے دونوں جانب دو منزلہ صحنچیاں ہیں۔ شہ نشین سے متصل دالان کی صحنچیوں میں اوپر نیچے ایک ایک دروازہ ہے۔ اس کے سامنے منبر والے دالان (دکو) کی صحنچیوں میں اوپر نیچے تینوں تین در ہیں جن کے دروازے لکڑی کے ہیں۔

شہ نشین کی زینت پیتل کی خوشنما ضریح (شبیہہ روضۂ امام حسین) ہے جس پر سونے کی پالش ہے۔ متعدد علم ہیں جن کے پنجے سونے چاندی کے ہیں پٹکوں پر سونے کا بھاری کام ہے۔ چھتوں سے بیش قیمت جھاڑ فانوس لٹکے ہیں۔ یہ سب سامان زمانۂ شاہی کا ہے۔ میاں داراب علی خاں نے امام باڑے کی بقا اور دیگر امور خیر کے لیے وافر جائداد وقف کی تھی۔ امام باڑہ اچھی حالت میں ہے۔

امام باڑہ داروغہ میر واجد علی

یہ امام باڑہ محلہ گولہ گنج میں بارود خانہ کے بائیں جانب ایک گلی میں واقع ہے۔ میر واجد علی آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ کی زوجہ نواب سلطان جہاں محل کی ڈیوڑھی کے داروغہ تھے۔ بادشاہ کی معزولی کے بعد سلطان جہاں ان کے ساتھ کلکتے نہیں گئیں۔ لکھنؤ ہی میں رہیں۔ پہلے قیصر باغ میں اور پھر گولہ گنج میں۔ داروغہ میر واجد علی نے آخری وقت تک ان کا ساتھ دیا ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران دو انگریز عورتوں کی جان بچانے کے صلے میں دونوں کی جان بچی۔ سلطان محل کی جاگیر اور جائداد برقرار رہی گزارہ بھی مقرر ہوا میر واجد علی کو سرکار سے لاکھ روپیہ بطور انعام ملا۔

اس امام باڑے کی خصوصیت ۷ محرم کا مہندی کا جلوس ہے جس کی بانیہ سلطان جہاں تھیں۔ مہندی کے جلوس اور دیگر امور خیر کے لیے انھوں نے وافر جائداد اور زر و جواہرات وقف کیے تھے۔ وقف نامے کے مطابق سلطان جہاں کے انتقال کے بعد میر واجد علی بڑے اہتمام کے ساتھ مہندی کا جلوس اٹھاتے رہے۔ یہ سلسلہ ان کی اولاد نے جاری رکھا جلوس ہائے عزا پر پابندی عائد ہونے کی وجہ سے اب امام باڑے میں ۷ محرم کو زنانی مجلس ہوتی ہے اور بعد مجلس مہندی کا جلوس امام باڑے میں گشت کرتا ہے۔

داروغہ میر واجد علی کا انتقال ۱۴ دسمبر ۱۸۷۶ء کو ہوا تھا ان کے بیٹے میر نظیر حسین نے اپنے نام پر امین آباد سے متصل مشہور محلہ نظیر آباد آباد کیا تھا۔ شہ سلطان جہاں کی قبر امام باڑے کی شہ نشین کے مرکز میں ہے۔ ان کے بائیں جانب میر واجد علی اور دائیں جانب میر نظیر حسین دفن ہیں۔ امام باڑے کے صحن میں (جہاں پہلے چمن تھا) اور اطراف کے بعض کمروں میں اہل خاندان کی قبریں ہیں۔

شہ نشین کے سامنے دو دالان ہیں۔ ان کے دونوں جانب صحنچیاں ہیں کل ملا کر سامنے کے رخ نو در ہیں (۲ + ۵ + ۲) سامنے کچا صحن ہے جس کے دونوں طرف چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں (سابقہ غلام گردش) جن میں کرایہ دار آباد ہیں پھر ڈیوڑھی ہے جن کے دونوں جانب دو کمرے ہیں امام باڑے کی عمارت ایک منزلہ ہے لکھوری اینٹوں اور گارے کی بنی ہے لکڑی کے معمولی پھاٹک پر ایک تختی لگی ہے جس پر دیوناگری حروف میں لکھا ہے "وقف سلطان جہاں صاحبہ، متولی وقف سید حبیب علی خاں عرف راجہ میاں خاقان منزل تھانہ وزیر گنج لکھنؤ"

امام باڑہ ڈپٹی محمد عظیم خاں

یہ امام باڑہ محلہ وزیر گنج میں بھگن پرساد روڈ پر واقع ہو (نمبر ۷۶) اگر آپ سٹی اسٹیشن سے وزیر گنج جائیں تو سڑک کے دائیں جانب پہلی گلی میں کچھ دور جا کر بائیں جانب امام باڑے کا بلند و بالا لکڑی کا پھاٹک نظر آتا ہے جس کے اوپر دیوار میں سنگ مرمر کی تختی نصب ہے جس پر مندرجہ ذیل کتبہ ہے:

محمد　　　　　　　　　　　　　　　　علی

اللّٰہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بیت الحزن

امام باڑہ عزائے حسین و نجد

وقف کردہ:- نواب حسین علی خاں عرف چھوٹے نواب

مومنین کو محافل و مجالس سید الشہداء و فاتحہ کرنے کی

بلا اُجرت عام اجازت ہے

فاطمہ　　　　　حسن　　　　　حسین

نواب حسین علی خاں ڈپٹی محمد عظیم خاں کے بیٹے تھے۔

نواب حسین علی خاں اور ان کی بہن سلطان زمانی بیگم نے امام باڑہ سنہ ۱۹۰۰ء کے آس پاس وقف کیا تھا۔

ڈپٹی محمد عظیم خاں کا تعلق افغانستان کے شاہ شجاع درانی کے خاندان سے تھا۔ ان کے اَجداد افغانستان سے ہجرت کر کے دہلی میں آبسے تھے۔ بہادر شاہ ظفر کے دربار تک رسائی اور رشتے داری تھی۔ سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے قبل یہ خاندان رفتہ رفتہ لکھنؤ منتقل ہو گیا۔ محمد عظیم خاں اس خاندان کے ایک نمایاں فرد تھے۔ وہ اپنی ذاتی قابلیت سے ترقی کر کے ڈپٹی کمشنر ہوئے اور خان بہادر کا خطاب پایا۔ ۲۲ اگست سنہ ۱۹۳۶ء میں انتقال ہوا۔ قبر کربلائے تالکٹورہ میں روضہ کے سامنے ہے۔

امام باڑہ جس عمارت کا حصّہ ہے اس کا پرانا نام محلسرائے ڈپٹی محمد عظیم خاں یا ڈپٹی صاحب کی کوٹھی ہے۔ یہ عمارت انھوں نے بنوائی نہ تھی بلکہ خریدی تھی۔

امام باڑے کے پھاٹک میں داخل ہونے پر پہلے ڈیوڑھی ملتی ہے جس میں بائیں جانب چھوٹا زینہ ہے۔ یہ آمد و رفت کی آسانی کے لیے بعد کی تعمیر ہے۔ پہلے پھاٹک سے اوپر تک لکھوری اینٹوں کی ڈھال تھی جس پر سے ذوالجناح آسانی سے گزر کر امام باڑے کے صحن تک جا سکتا تھا۔ زینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ عمارت کی کرسی تقریباً ایک منزل بلند ہو۔

سیڑھیاں چڑھنے کے بعد دائیں جانب ایک دروازہ ہے جو اندر داخل ہونے پر ایک وسیع صحن نظر آتا ہے اس میں دائیں جانب (مغرب میں) ایک پانچ دروں والی مسجد ہے اور بائیں جانب (مشرق میں) اس کا جواب دالان کی صورت میں تھا (وہ اب موجود نہیں ہے)

صحن کے سامنے جانب جنوب امام باڑے کی عمارت ایک اونچے چبوترے پر تعمیر ہے۔ چبوترے کے سامنے وسط میں حوض ہے جسے پاٹ دیا گیا ہے۔ امام باڑے کے دو حصّے ہیں پہلا دالان جہاں محافل و مجالس ہوتی ہیں اور پھر شہ نشین۔ دونوں میں خوشنما محرابوں والے پانچ در ہیں شہ نشین اور دالان کے دونوں طرف دو منزلہ صحنچیاں ہیں جن میں سے ہر ایک میں آمنے سامنے تین تین در ہیں۔ امام باڑے کی عمارت قدیم ہے لیکن چھتیں بدل گئی ہیں (لوہے کے گرڈر لگا کر بنائی گئی ہیں)

شہ نشین کی زینت شیشے (آئینہ کے ٹکڑوں) کی ایک خوشنما ضریح ہے جو روضۂ امام حسین کی شبیہ ہے۔ شیشے کے دو علم بھی ضریح مبارک کے ارد گرد موجود ہیں۔ ضریح کے نیچے تحریر ہے:

بنا کردہ: نواب حسین علی خاں ابن خان بہادر نواب محمد عظیم خاں۔

محرم میں امام باڑے کی آرائش دیکھنے کے قابل ہوتی ہے لیکن عمارت غیر محفوظ ہے اس لیے جزوی طور پر سجایا جاتا ہے۔

چھوٹی مہارانی کا امام باڑہ

یہ خوبصورت امام باڑہ محلہ وزیر گنج میں سٹی اسٹیشن کے نزدیک واقع ہے۔ اسے مہاراجہ سر محمد علی خاں، والیٔ ریاست محمود آباد نے اپنی دوسری بیوی مہارانی ذاکیہ بیگم صاحبہ کے لیے سنہ ۱۹۲۰ء میں تعمیر کرایا تھا۔ وہ چھوٹی مہارانی کے نام سے مشہور تھیں۔ مہاراجہ کے انتقال کے بعد ان کے بڑے بیٹے مہاراجکمار محمد محمود حسن خاں نے اپنا حصّہ جائداد جس میں امام باڑہ شامل ہو اپنے بیٹے راجکمار محمد امیر نقی خاں کے نام منتقل کر دیا۔ مہاراجکمار محمد امیر علی خاں (خلف اصغر) نے اپنا حصّہ شہر کی مشہور و معروف شخصیت مقبول احمد لاری کے ہاتھ سنہ ۱۹۴۷ء میں فروخت کر دیا۔

چھوٹی مہارانی کا امام باڑہ پہلے "اقبال منزل" کا ایک حصّہ تھا جس کا موجودہ نام "مقبول لاری منزل" ہے۔ تاریخی اہمیت کے پیش نظر فراغ دل اور دوراندیش خریدار نے سنہ تعمیر کے کتبے کو بجنسہ محفوظ رکھا ہے جو

عمارت کے اندرونی گیٹ کے بائیں جانب دیوار میں نصب ہے۔ سنگ مرمر کی سفید تختی پر سیاہ حروف میں مندرجہ ذیل تاریخ تعمیر کندہ ہے۔

ھو العلی

تماشہ کرد چو تعمیر جدید اساس — فلک رفعت حسین چوں ماہ کامل

سنیش گفت اختر یاد دل شاد — زہے این خوش نما اقبال منزل

۱۳۴۲ھ

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال منزل مہاراجہ محمود آباد نے ۱۳۴۲ھ مطابق ۱۹۲۳ء میں تعمیر کرائی تھی۔ اس سے پہلے یہاں ممتاز الدولہ محمد حسین علی خاں کا محل تھا جس کے بارے میں سید آغا مہدی صاحب نے "تاریخ لکھنؤ" (مطبوعہ کراچی ۱۹۷۶ء) میں صفحہ ۲۹۸ پر ڈیوڑھی ممتاز الدولہ کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

"نواب ممتاز الدولہ رو سار شہر میں بڑی آن بان کے رئیس تھے۔ تاریخ اودھ میں ان کا نمایاں ذکر ہے۔ بڑی آباد سرکار تھی۔ نواب کے فرزند مغفور مرزا بہادر کے وقت تک دروازے پر ہاتھی بندھا رہتا تھا۔ دہلی دربار میں شرکت کے بعد ان کا انتقال ہوا۔ اور یہ جائداد ورثا نے مہاراجہ محمود آباد کے ہاتھ فروخت کر دی جس پر اقبال منزل کی تعمیر ہوئی۔"

مقبول احمد لاری صاحب نے ازراہ کرم نواب ممتاز الدولہ کا شجرہ عنایت فرمایا جس کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ نواب ممتاز الدولہ کے چچا زاد بھائی تھے۔

چھوٹی رانی کا امام باڑہ بارہ دری واقع محمود آباد (ضلع سیتاپور) کی نقل ہے تعمیر کے بعد تقریباً ۸۰ سال تک یہاں بڑی شان و شوکت سے عزاداری ہوتی رہی۔ نویں اور دسویں محرم کی روشنی دیکھنے کے لیے لوگ دور دور سے آتے تھے۔ یہ اور ڈپٹی محمد عظیم خاں کا امام باڑہ وزیر گنج میں عوام کی کشش کا خاص مرکز ہے لیکن اب وہ بات کہاں۔ "اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے۔"

امام باڑہ ایک اونچے چبوترے پر بنا ہے جس کے دونوں جانب پانچ دروں والی دو منزلہ عمارتیں ہیں۔ ان کے درمیان کشادہ صحن کے مقابل امام باڑے کی عمارت ہے۔ امام باڑے میں شہ نشین کے سامنے پانچ دروں والے دو دالان ہیں۔ اگلے دالان کے اطراف میں صحنچیاں ہیں۔ اگلا دالان ایک کمرے کی صورت میں ہے جس میں سامنے کے رخ لکڑی کے خوشنما دروازے لگے ہیں۔ اسی کشادہ کمرے میں بچوں کا ایک اسکول قائم ہے جس کا نام گرین ہال اسکول (GREEN HALL SCHOOL) ہے ذریعۂ تعلیم انگریزی ہے اور فی الحال ساتویں درجے تک تعلیم ہوتی ہے۔ پرنسپل راجکمار امیر نقی خاں ہیں۔ ان کا دفتر بائیں جانب کی صحنچی میں ہے۔

حواشی

۱۔ شیخ تصدق حسین امام باڑہ میر باقر سوداگر، ماہنامہ الواعظ، لکھنؤ اگست ستمبر ۱۹۵۴ء صفحات ۵۲۔۴۹ سید آغا مہدی تاریخ لکھنؤ کراچی ۱۹۷۶ء صفحات ۱۵۰۔۱۴۹

۲۔ رانی شہنشاہ بیگم کے والد محمد حسن خاں شیدا انگی خانم (زوجہ نواب سعادت علی خاں) کے بھائی نواب رمضان علی خاں کے بیٹے تھے۔ شیخ تصدق حسین بیگمات اودھ (کتاب نگر لکھنؤ) صفحہ ۹۲

۳۔ معارف النغمات حصہ اول، نور المطابع تھوئی ٹولہ لکھنؤ ۱۹۱۳ء حصہ دوم ممتاز المطابع، وکٹوریہ اسٹریٹ، لکھنؤ۔

۴۔ شیخ تصدق حسین۔ امام باڑہ نواب اکرام اللہ خاں۔ ماہنامہ الواعظ لکھنؤ مارچ ۱۹۵۰ء صفحات ۱۳۔۱۲
روزنامہ قومی آواز (لکھنؤ) مورخہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۸۸ء صفحہ ۴ (خبر)

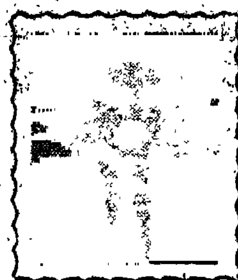
۵۔ شیخ تصدق حسین۔ امام باڑہ تجمل حسین خاں۔ ماہنامہ الواعظ (لکھنؤ) مارچ ۱۹۵۰ء صفحات ۱۴، ۱۳ سید آغا مہدی، تاریخ لکھنؤ صفحہ ۲۴۷

۶۔ شیخ تصدق حسین۔ امام باڑہ نواب امیر محل صاحبہ۔ ماہنامہ الواعظ لکھنؤ مئی ۱۹۴۸ء صفحات ۱۵۔۱۲

۷۔ شیخ تصدق حسین۔ امام باڑہ میاں دلدار علی خاں ماہنامہ الواعظ (لکھنؤ) اپریل ۱۹۴۸ء صفحات ۱۵۔۱۲ سید آغا مہدی، تاریخ لکھنؤ، صفحہ ۳۱۱۔

۸۔ سید تصدق حسین بیگمات اودھ۔ نواب سلطان جہاں محل صفحات ۲۸۲۔۲۴۹ سید آغا مہدی، تاریخ لکھنؤ صفحات ۲۴۹۔۲۴۵ ۹۔ ایضاً صفحہ ۲۹۹

۱۰۔ مرزا جعفر حسین۔ قدیم لکھنؤ کی آخری بہار۔ ترقی اردو بیورو نئی دہلی ۱۹۸۱ء صفحہ ۲۵۸ چھوٹی مہارانی کے نام سے مشہور تھیں۔



ڈاکٹر سید مسعود حسن رضوی سندیلوی
گورنمنٹ جوبلی کالج لکھنؤ

لکھنؤ کی دست کاری

لکھنؤ کے رئیسوں۔ تعلقداروں۔ راجاؤں۔ نوابوں۔ اور بڑے زمینداروں نے جس طرح شاعری۔ موسیقی۔ رقص۔ مصوری۔ پہلوانی۔ اور دیگر تفریحی فنون (بٹیر بازی۔ مرغ بازی۔ کبوتر بازی۔ پتنگ بازی وغیرہ) کی قدردانی اور سرپرستی کی اور انھیں معراج کمال پر پہونچایا اس طرح فنکاروں کی حوصلہ افزائی اور فن کی پرورش کر کے لکھنؤ کی دستکاری کو بھی قبولیت عام اور شہرت دوام بخشی۔

لکھنؤ کے دستکار جو چیزیں تیار کرتے تھے وہ بہت ہی نفیس دیدہ زیب اور بے مثل تھیں۔ مثلاً چکن۔ کامدانی۔ کارچوب۔ مٹی کے برتن اور کھلونے، سونے چاندی کے زیورات۔ تانبے کے برتن، رضائی لحاف کی چھپائی، لکڑی کے چھاپے اور جوتے جوتیاں وغیرہ کے علاوہ گودڑ کی گڑیاں، دستی پنکھے، بیلن پیڑے، جھلیے، ٹاپے، ٹوکریاں، ارہر کے زر کلے، بید کے پٹارے، لکڑی کی کھڑاویں، اچار چٹنی، کنگھیاں، باندھ، سُتلی، مونڈھے، تخل چوگوشیہ ٹوپی، چمڑے کے ڈول، مشکیں، گودڑ کی گیند، پٹاخے، آتش بازی، جھاڑ، چربی کی شمعیں، کاٹھ کی ڈبیاں۔ کلبیاں۔ کٹھرے۔ کونڈے۔ لاکھ کی شہانی چوڑیاں۔ حقے۔ چلم۔ تمباکو خوردنی و کشیدنی۔ عطر۔ پھولوں کے گہنے۔ ٹاٹ کے بورے۔ کھجور کی چٹائیاں۔ چاندی کے ورق۔ جھاڑو کی سینکوں کی خوبصورت اور رنگین ٹوکریں۔ بانس کی تیلیوں کے پنجڑے۔ ہنٹر۔ غلیل۔ کمان۔ ہاتھی دانت کی مصنوعات وغیرہ دستکاریوں کے نمونے تھے۔

لکھنؤ کی جتنی دستکاریاں تھیں ان میں بقول سید اسرار حسین خاں ہر دستکاری میں اہل فن نے ہنرمندی کے دریا بہا دیئے۔

چکن

چکن سازی نے لکھنؤ کو امتیازی شان بخشنے میں اہم کردار ادا کیا رؤسائے لکھنؤ کے ذوق و شوق کی آسودگی کے لئے چکن سازی میں نئے نئے تجربات ہوتے رہے اور نئی نئی وضعیں نکلتی رہیں۔ اب چکن ذوق و شوق کی منزل سے آگے بڑھ کر تجارت کی منڈی میں داخل ہو گئی ہے۔ یہاں کے بنے ہوئے چکن کے ملبوسات کلکتہ۔ مدراس۔ پونا۔ بمبئی اور دہلی کے علاوہ امیریکہ اور آسٹریلیا میں بھی کافی مقدار میں جاتے ہیں۔ یہاں چکن کے بڑے تاجروں میں سیٹھ نرائن داس (چھاچھی کنواں) بھگوت داس (ڈیوڑھی آغامیر)۔ چھنگا مل (چوک)۔ بیر و جین (پھول والی گلی) لال بہاری ٹنڈن (چوک)۔ پنا لال (نادان محل روڈ)۔ بھارتی چکن (نادان محل روڈ) کھنا چکن (چوک) انل کمار رستوگی (سبھاش مارگ) وغیرہ تھوک فروش ہیں۔ ان کے علاوہ خورده فروشی کی تقریباً دو ہزار دکانیں پورے لکھنؤ میں پھیلی ہوئی ہیں بالخصوص چوک، نظیرآباد، امین آباد اور ڈیوڑھی آغامیر خورده فروشی کے گڑھ ہیں۔ مجموعی طور سے بیس لاکھ روپے یومیہ کی کھپت ہے۔

قدیم چکن کے نفیس اور دیدہ زیب نمونے پرتاپ چند لکھن لال (تھوک و خورده فروش ڈیوڑھی آغامیر) کے یہاں آج بھی موجود ہیں۔ ان کے کام کی قیمت بہت ہوتی ہے۔ لون (نفیس تنزیب) کے کرتے تین سو اور پانچ سو روپے کے اور انگرکھا پندرہ سو روپیہ کا اس دوکان سے لوگ خریدتے ہیں انگرکھا پہننے والے اب بھی لکھنؤ میں موجود ہیں۔ اس دوکان سے معلوم ہوا کہ اب بھی بیس پچیس انگرکھے ہر سال بک جاتے ہیں۔

کپڑے۔ پہلے چکن صرف باریک تنزیب پر انگلینڈ کے بنے ہوئے دھاگے سے بنتی تھی۔ اب نہ وہ تنزیب ملتی ہے اور نہ وہ دھاگا۔ اب یہ کام لون (موٹی نفیس تنزیب یا ادھی) کیمبرک، ٹیری روبیا، ٹیری وائل، ڈوریا، سوتی کاٹن (ٹانڈہ، فیض آباد) وائل، شیفون (ٹانڈہ) وغیرہ پر بنتا ہے۔ جیو پرس اور سبزی سوتی کاٹن پر بھی کام ہوتا ہے۔

مرکز۔ چکن سازی کے آج بھی وہی محلہ مرکز ہیں جن میں نادر شہرادہ

آباد میں مثلاً چوک۔ حسین آباد۔ کشمیری محلہ۔ نخاس۔ مفتی گنج۔ احاطہ مرزا علی خاں اور محمود نگر وغیرہ۔ یہ کام پرانے لکھنؤ میں ازآغاز تا ایں دم ہوتا چلا آیا ہے۔

چکن کے چند مشہور کاریگر:۔ واجد علی شاہ کے عہد حکومت میں حاجی میاں اور امیر حسن چکن سازی میں بہت مشہور تھے۔ تپن، شمشاد، دولہا صاحب اور رشمان علی اچھے فنکار تھے۔ مفلوک الحال شرفاء کی پردہ نشین عورتیں عام طور سے چکن سازی کرتی ہیں۔ کچھ شریف خاندانوں کا تو ذریعۂ معاش ہی یہی ہے۔ مردوں کے مقابلے میں عورتیں کام بھی اچھا کرتی ہیں اور اجرت بھی کم لیتی ہیں۔ صالحہ بیگم (ڈالی گنج) قومی انعام یافتہ چکن ساز ہیں۔ اُن کے شوہر بابو خاں بھی استادوں میں ہیں۔ تاجران چکن سے معلوم ہوا کہ فیاض علی خاں (ڈالی گنج)، مرزا مجتن (حسین آباد) جو بغیر چھاپے ہی چکن سازی کرواتے تھے نامی چکن ساز تھے۔

چکن کی قسمیں:۔ چکن کی کئی قسمیں ہوتی ہیں اور ہر قسم کی چکن کے بنانے والے الگ الگ ہوتے ہیں۔ مثلاً:۔

آ۔ مُرّی کے کام میں حسینہ بانو اور قمر جہاں (خوشحال گنج۔ موراواں روڈ) ماہر ہیں۔

ب۔ بیچی (الٹا سیدھا نہیں ہوتا) بنانے میں شاہ جہاں بیگم (کھدرا) مشہور ہیں۔

ج۔ پھندا سازی میں فاروق جہاں (اناؤ روڈ نزد ڈیری) مہارت رکھتی ہیں۔

د۔ جالی اور ہتھکٹی میں نور جہاں (ٹھاکر گنج۔ ٹی بی اسپتال کے سامنے گلی میں) لاجواب ہیں۔

ہ۔ بخیہ کی چکن میں قمر النساء، عصمت جہاں اور افسر جہاں (دھنیا مہری کا پُل) ماہر ہیں۔

چکن کے ملبوسات کی ترپائی بھی مہارت اور محنت کا کام ہے۔ ترپائی سادی اور درج دار میں چمن (درزی لغیہ) بہت مشہور ہیں۔ سادی ترپائی میں اچھی وہ ترپائی مانی جاتی ہے جو ایک مہین ڈوری جیسی لگتی ہے۔ درج کی بہت سی قسمیں ہیں مثلاً سنگھاٹا درج، مچھلی درج، مکمل درج، کوڑی درج، شکرپارہ درج وغیرہ۔

کامدانی

کامدانی چکن اور زردوزی کے بیچ کی دستکاری ہے۔ یہ روپہلے اور سنہرے تاروں سے بنتی ہے۔ اِن تاروں کو بادلہ کہتے ہیں۔ پہلے مردانے کرتوں اور ٹوپیوں پر کامدانی بنتی تھی مگر اب صرف عورتوں کے لئے مخصوص ہے۔ دوپٹوں۔ ساریوں، جمپروں اور شلوار سوٹ پر کامدانی بنتی ہے۔ عموماً یہ کام جارجٹ شیفان اور سلک پر کیا جاتا ہے۔ اب یہ کام ٹیری گروپ (ٹیری کاٹ۔ ٹیری لین۔ ٹیری روبیا۔ ٹیری وائل) پر بھی ہوتا ہے۔

کارخانے:۔ پرانے لکھنؤ میں بالخصوص حسین آباد اور شیش محل میں کئی کارخانے ہیں۔ کامدانی کا کام ۷۵ فیصدی شریف پردہ نشین عورتیں کرتی ہیں۔

ڈیزائنس یا وضعیں:۔ ڈیزائنس پہلے بندکیوں سے بنائی جاتی ہیں۔ اِن بندکیوں کو دانہ فردی کہتے ہیں۔ اِن سے بنی ڈیزائنوں کے نام بھی رکھ لئے جاتے تھے۔ جیسے کیری، بادلی، اور یہ پٹ، ستھانی، کرن، جالی سات میں رنگ، چاند اور ناخونی وغیرہ۔

کامدانی کے چند مشہور کاریگر:۔ مشہور کامدانی سازوں میں عسکری حسن (رنجھن)، نبن صاحب (مفتی گنج)، عباس حسین (ہردوئی روڈ)، گوہر آغا (مفتی گنج)، شہنشاہ حسین (رستم نگر)، باقر حسین مرحوم (سندیلہ ہاؤس) وغیرہ بقول اصغر حسین صاحب زری والا (سبھاش مارگ) سرفہرست ہیں۔ چکن کی طرح اس کو بھی مقبولیت حاصل ہے۔ تقریباً ایک لاکھ روپے یومیہ کی کھپت ہوتی ہے۔

کارچوب

جس کپڑے پر کارچوب بنتا ہے وہ پہلے ایک لکڑی کے چوکھٹے پر کس دیا جاتا ہے تاکہ کام بناتے وقت کپڑے میں ذرا بھی جھول نہ آنے پائے۔ چوب (یعنی لکڑی) سے مراد وہی لکڑی کا چوکھٹا ہے۔

قسمیں:۔ کارچوب کی دو قسمیں ہیں۔ ۱۔ آری، ۲۔ زردوزی

۱۔ آری:۔ اس کام میں آری کے دندانوں کے طرز پر محرابیں، بیلیں اور کٹاؤ بنتے ہیں۔ آری کے کام میں کلابتو، ریشم اور دھاگے استعمال ہوتے ہیں۔ کپڑے پر چھپائی کرنے کے بعد یہ کام ہوتا ہے۔ پہلے چھاپے لکڑی کے

ہوتے تھے مگر اب ڈیزائن کاغذ پر بنا کر کپڑے پر اتار لیتے ہیں چھاپے کے مقابلے میں یہ طریقہ آسان بھی ہے اور سستا بھی۔ آری کا کام ہلکا بھی ہوتا ہے اور بھاری بھی۔ رئیس اور صاحب حیثیت کی فرمائش پر بھاری سے بھاری کام بنتا ہے اب اس میں طرح طرح کے نقش و نگار بننے لگے ہیں۔ بیرونجات میں اس کی مقبولیت بہت بڑھ چکی ہے۔ ۲۔ زردوزی:۔ زردوزی کا کام پہلے مخمل پر بنتا تھا جس کو شہنوں کہتے تھے۔ عروس کے لئے اسی مخمل کے شہانی جوڑے تیار کئے جاتے ہیں اور ان پر زردوزی کا ہلکا یا بھاری کام خریدار کی حیثیت کے مطابق ہوتا ہے۔ شادی بیاہ یا خوشی کے موقعوں پر مستورات بالعموم زردوزی کے بنے ہوئے ملبوسات پہنتی آئی ہیں۔

زردوزی کے لئے چاندی کے مہین تاروں پر سونا چڑھا دیا جاتا تھا وہی سونے کے تار کہلاتے تھے۔ چاندی کے تار بھی استعمال ہوتے تھے۔ یہی کلابتو کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ نقلی ستارہ ریشم اور موتیوں کا استعمال ہوتا ہے۔ گرانی کی وجہ سے سچے موتیوں کی جگہ چھوٹے موتی لگتی لڑی شیشے اور پلاسٹک کے موتی آ گئے ہیں۔ ریشم کی جگہ ایک قسم کی گھاس استعمال ہوتی ہے جسے جاپانی گھاس کہتے ہیں۔ مختلف رنگوں میں رنگ کر بہت دیدہ زیب ہو جاتی ہے۔ اس سے بہت حسین پھول پتیاں بنتی ہیں۔ اب نقلی ستارہ اور کلابتو وغیرہ بھی مصنوعی ہو گئے ہیں۔ البتہ ڈیزائنوں کی بھرمار ہو گئی ہے۔ کشیدہ کاری جو چکن کے ساتھ وابستہ تھی اب کارچوب میں بھی ہونے لگی ہے۔

چند مشہور کاریگر:۔ کارچوب سازی مشکل کام ہے۔ کافی توجہ سلیقہ اور جمالیاتی ذوق چاہتا ہے۔ لکھنؤ نے کارچوب میں بھی لاجواب صنعت کار پیدا کئے ہیں۔ مثلاً اکبر حسین اور امیر حسین (بلوچ پورہ) صفدر حسین (ترمنی گنج)، عاشق حسین (منصور نگر) اعظم حسین (مرزا علی خاں کا احاطہ) اور بنو صاحب (بعد لیاں) مشہور صنعت کار گذرے ہیں۔ اس وقت مرتضیٰ علی عرف منا بھائی (مارگم) اور احمد حسین (صاحب گنج) اچھے فنکار ہیں۔

کارخانے:۔ لکھنؤ کے کئی محلوں میں اس کے کارخانے قائم ہیں۔ درگاہ حضرت عباس، چوک، نور باڑی، چوپٹیاں، مفتی گنج، کاظمین، حسین آباد، شیش محل، معظم نگر، حسین گنج، اشرف آباد اور منصور نگر محلوں میں مجموعی طور پر تقریباً چار ہزار کارخانے ہوں گے۔

کارچوب کے ملبوسات سے پہلے کارچوب کا رواج بہت تھا۔ عالمگیر کی مسند یا شامیانے، خیمے کے چھتے، ہاتھیوں کی جھولیں، گھوڑوں، سائیسوں اور دوسرے عہدیداروں کی وردیاں کارچوب کے کام سے بھری ہوتی تھیں۔ دوپٹے، شلوار، قمیص، تہمد، رومال، ساری، شلوار سوٹ، جیکٹ، ٹوپی، بیگ اور پرس وغیرہ پر یہ کام اب بھی ہوتا ہے۔ پہلے جوتوں پر بھی یہ کام بہت ہوتا تھا مگر اب اس کا رواج بہت کم ہو گیا ہے۔

سونے چاندی کے زیورات

لکھنؤ کے روساء مزاج کی نفاست، جمالیاتی ذوق، دولت و ثروت کی افراط کے ساتھ سخاوت و فیاضی کی بدولت لکھنؤ میں اعلیٰ درجے کے سونے چاندی کے دستکار پیدا ہو گئے۔ ہر رئیس کا اپنا ایک مخصوص سنار رہتا تھا جو اس کے مزاج کو خوب پہچانتا تھا۔

نمونے:۔ سنار زیورات سنتی طرح طرح کے نمونے بنایا کرتے تھے جس پر روساء انہیں زیورات کی قیمت کے علاوہ انعام و اکرام دیا کرتے تھے مثلاً کندن کا کام، مینا کاری، کٹاؤ، مرصع سازی، جڑاؤ کام، ایمبوسنگ اور لاکھ بھرائی وغیرہ۔

سنار:۔ سناروں کے دو طبقے تھے۔ ایک مرصع سازی کرتا تھا اور دوسرا نقاشی وغیرہ۔ مرصع سازوں کو رنگ سے رنگ اور پتھر سے پتھر ملانے کا بڑا سلیقہ تھا۔ بقول مرزا جعفر حسین دار الشفاء کے سامنے ایک مرصع ساز رہتا تھا اس نے ایک پتھر میں جوڑ کر کے بال سے باریک تاروں سے ہیرے کا نگینہ اس طرح جڑ دیا جیسے لال پتھر سے سفید نگ نکل آیا ہو۔ شرر لکھتے ہیں۔

"غدر سے پیشتر لکھنؤ سے اچھے سنار اور کاریگر کہیں نہ مل سکتے تھے۔"

نگینہ لکھنؤ پتھروں کی تراش و خراش بھی لکھنؤ میں ہی ہوتی تھی۔ جواہرات کی کریاں باہر سے آتی تھیں۔ مثلاً نیلم (کشمیر سے) اور یاقوت لنکا سے آتے تھے۔ انہیں ٹکڑوں سے نگینہ ساز مختلف سائز کے نگینے تراش لیتے تھے۔ در شہوار، در غلطاں، یاقوت، زمرد، لعل، عقیق، مونگی اور فیروزہ مثلاً ہیرے سب پہنے جاتے تھے۔

مردوں میں زیورات پہننے کا رواج بہت کم تھا صرف انگوٹھیاں یا کچھ لوگ گلے میں بہت ہلکی سونے کی زنجیر پہنتے ہیں۔ عورتوں کے سر سے لے کر پاؤں تک ہر عضو کے لیے زیورات ایجاد ہو گئے۔

زیورات۔ ہیرے لئے چھپکا۔ شکا۔ جھومر۔ ستلائٹی۔ ماتھے کے لئے بینا۔ جگنو، سادہ گلے کے لئے نیکلس۔ موتی مالا۔ چمپکلی ہار۔ گلوبند۔ چمپا کلی کی مالا۔ چندن ہار۔ طوق۔ ہنسلی۔ مڑمالا۔ کنٹھا۔ تختیاں۔ معلّی۔ نظم ہار۔ چاند۔ زنجیر۔ لاکٹ اور مگنگھو۔ ہار میں بہت سی ڈیزائنیں ایجاد ہو گئی ہیں اور ہوتی جا رہی ہیں۔ ناک کے لئے تھے تھنی۔ کیل اور بلاق۔ بلاق دونوں نتھنوں کے بیچ کے پردے میں چھید کر کے پہنا جاتا تھا۔ اس کا رواج اب عموماً دیہاتوں میں رہ گیا ہے۔ نتھ سہاگ کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ اس میں دو موتی بیچ میں مرّی پڑی رہتی ہے جو بہت قیمتی ہوتی ہے۔ کیلیں بھی کئی طرز کی ہوتی ہیں۔ سادی، نگ دار اور لونگ نما۔ زیورات میں سب سے چھوٹا زیور یہی ہے۔ اس میں بھی لکھنؤ کے دستکار اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ شرر لکھتے ہیں :-

"نسبک ناک کی کیلیں لکھنؤ کے سناروں اور سادہ کاروں کے سوا اور کہیں کے کاریگر نہیں بنا سکتے۔" (گذشتہ لکھنؤ)

کانوں کے لئے تھے۔ ٹاپس۔ بالیاں۔ بجلیاں۔ اتراج۔ انتیاں۔ کرن پھول بندے۔ گوشوارے۔ جھالے۔ کنٹھیاں اور جھمکے وغیرہ۔ کسی زمانے میں کانوں پر ایک چاندی کا خول چڑھا کر اُس میں زیورات آویزاں کئے جاتے تھے۔ اس خول کو کان چین کہتے تھے۔ یہ بہت تکلیف دہ ہوتا تھا۔ لہٰذا جلدی ہی اس کا رواج ختم ہو گیا۔ ہاتھوں کے لئے آرسی۔ انگوٹھیاں۔ چوڑیاں۔ کڑے۔ کنگن۔ جہانگیریاں۔ پٹریاں۔ پہونچیاں۔ دست بند۔ شوق بند۔ سرنین۔ چھپے وتیا اور موتیوں کے گجرے۔ بازوؤں کے لئے جوشن۔ بازو بند۔ نورتن اور بکہ وغیرہ۔ پیروں کے لئے چھلے۔ بچھیا۔ چھاگل۔ کڑے۔ چھڑے۔ لچھے۔ جھانجھ۔ پٹریاں۔ توڑے۔ پازیب۔ پیری جھپک۔ جھانوریاں۔ چاند تارے۔ رام جھول۔ بیری اور گھونگرو وغیرہ پیر کے زیورات چاندی کے ہوتے ہیں۔ سونا احتراماً پیروں میں نہیں پہنا جاتا تھا۔

ماہر صنعت کار :- جڑاؤ کام کرنے والوں میں بابو بنگالی (ماڈل ہاؤس) کا جواب نہیں تھا۔ اب اشرف صاحب (جھنوائی ٹولہ دوزی لغیر) کندن کا جڑاؤ کام کرنے میں ماہر و واحد ہیں۔ نقاشی میں ادمکار سنار (راجہ بازار) کے بزرگ مشہور تھے۔ قیمچ سازی میں صدیق مرحوم استاد تھے۔ محمد اسمٰعیل خاں (دہ کانادہ میں) سب سے سادہ کاری میں بہت شہرت رکھتے تھے۔ اور زیورات کا ڈبہ بنانے والے ماہر فنی ذکی مرحوم تھے۔ حضور میاں (ٹھاکر گنج)

اور ننھے صاحب کندن کے کام میں بہت مشہور ہیں۔ حمید (کپتان کا کنواں) اور محمد عمر (سرائے معالی خاں) چاندی کی انگوٹھی بنانے میں اپنی مثال نہیں رکھتے۔ آرٹی کٹنگ جولری کے ماہر عبدالستار تانبے کے فرمے بناتے تھے۔

تانبے کے برتن

تانبے کے برتنوں کے لیے لکھنؤ میں یحییٰ گنج محلہ مخصوص ہے۔ پیتل کے برتنوں اور لوہے کی بنی ہوئی اشیاء کی تھوک کی دوکانیں اسی محلے میں ہیں۔ لوہے اور پیتل کے مصنوعات کے لئے لکھنؤ مشہور نہیں ہے اگرچہ پیتل کے لوٹے وغیرہ کی ڈھلائی کا کام یہاں بھی ہوتا ہے۔

تانبے کے برتن لکھنؤ کے علاوہ شاید ہی کہیں بنتے ہوں۔ یہاں تانبے کے برتنوں کی بہت پرانی دوکان کنھیا لال پراگ داس کی ہے۔ اُن کے پرپوتے ہری اوم جی سے معلوم ہوا کہ یہ دوکان ۱۸۵۹ء میں قائم ہوئی تھی مگر اس وقت بھی دو چار دوکانیں پہلے سے موجود تھیں۔

تانبے کی چادریں دہلی، ہاپڑ، جگادری (پنجاب)، شاملی، مظفر نگر وغیرہ سے آتی ہیں۔ ان چادروں سے لوٹے۔ پتیلی۔ دیگ۔ پاندان۔ سینی۔ لگن۔ کفگیر اور چمچے وغیرہ بنتے بھی ہیں ڈھالے بھی جاتے ہیں۔ ظروف سازی میں خوب خوب کمالات دکھائے گئے تھے۔ ڈھلائی۔ نقاشی اور مینا کاری سے برتن بہت دیدہ زیب ہو جاتے تھے۔

ڈھلائی :- یہ کام لکھنؤ میں بہت صاف اور نفیس ہوتا تھا اور اب بھی ہوتا ہے۔ لوٹے کی موجودہ ساخت خاص لکھنؤ کی ایجاد ہے۔ بقول شرر

"یہ لکھنؤ کا موجودہ لوٹا ہے جس سے زیادہ خوشنما اور سڈول لوٹے ہندوستان کے کسی شہر میں نہیں بنتے اور ہر جگہ شوقین فرمائشیں کر کے لکھنؤ سے منگوایا کرتے ہیں۔ جو تناسب لوٹوں میں یہاں پیدا ہو گیا ہے۔ چھوٹی لٹیا سے لے کر بڑے سے بڑے لوٹے تک سب میں نظر آتا ہے۔" (گذشتہ لکھنؤ)

نقاشی :- نقاشی میں زیادہ تر پھولوں، پتیوں اور بیلوں کی عکاسی ہوتی ہے۔ نقاشی کے بعد ان پر جلا ہوتی ہے۔ پہلے ان پر رانگے کی بڑی اچھی قلعی ہوتی تھی۔ قلعی کے بعد ان کی نظر نوازی معراج کمال پر پہنچ جاتی تھی۔ مگر اب پہلے جیسی نفیس نقاشی ہوتی ہے نہ قلعی۔

مینا کاری :- ایک قسم کا چمکتا ہوا مسالہ مینا کار بناتے تھے جس کی

[illegible] ہوتی تھی ... اور بہت [illegible]
تھیں ... ظروف کے نقش و نگار ... مینا کاری ... سلے
بھرے جاتے ... سے ... کرتے اور لگائے جاتے تھے۔ برتن پکانے ... اور
چمک دار ہو جاتے تھے۔ مینا کاری کی رنگ برنگ کی ڈیزائن عجب لطف
پیدا کر دیتی تھی۔ امراء کے یہاں سونے چاندی کی چیزوں پر بھی مینا کاری
ہوتی تھی۔ اب مینا کاری کا فن بالکل ختم ہو چکا ہے۔

گنگا جمنی ۔۔ مینا کاری کی طرح یہ بھی ایک طرز تھی۔ جس میں روپہلی اور سنہری ڈیزائن بنائی جاتی تھی۔ دونوں رنگ ساتھ ساتھ چلتے تھے اور ڈیزائن کی خوبصورتی میں چار چاند لگ جاتے تھے۔ یحییٰ گنج کے صنعت کار ایک پان کی ڈبیہ میں ہی اپنی کاریگری کے جوہر دکھا دیتے تھے۔ نہایت خوبصورت سجل خوش وضع دیدہ زیب اور مختلف وضعوں کی ہوتی تھیں۔

چند صنعت کار ۔ نقاشی کرنے میں مالک رام مشہور تھے۔ اس وقت گھنشیام راج کمار اور پرشوتم وغیرہ نقاشی کرتے اور سب یحییٰ گنج ہی میں رہتے ہیں۔ بلوچ پورا، سعادت گنج اور کٹرہ [illegible] وغیرہ میں کاریگر موجود ہیں۔

مٹی کے برتن اور کھلونے

لکھنؤ کے گراں قدر اور بیش بہا مصنوعات میں مٹی کے برتن اور کھلونے بھی شامل ہیں۔ لکھنؤ کے نواب فن کے پرستار تھے۔ ان کی قدر شناسی اور حوصلہ افزائی نے مٹی کو بھی رنگ روپ دیکر فردوسِ نظر بنا دینے والے فنکار پیدا کر دیے۔ شرر لکھتے ہیں:۔

> کمہاروں اور کسگروں دونوں نے اپنے کام میں جو کمال و باریک طبائی اور جدت طرازیاں دکھانا شروع کیں جو ایک مصور تصویروں میں اور ایک شاعر اشعار میں دکھا سکتا ہے .... حسن اتفاق سے لکھنؤ کی مٹی اس فن کے لئے مناسب ثابت ہوئی جس نے کاریگروں کو اظہار کمالات کا موقع دینا شروع کیا اور برتن اور کھلونے دونوں ایسے بننے لگے جیسے کہیں نہیں بن سکتے۔ (گذشتہ لکھنؤ [illegible])

برتن ۔ مٹی کی رکابیاں جن میں کھانے کی چیزیں رکھی جاتی تھیں تین قسم کی ہوتی تھیں۔ (۱) سادی (۲) لاکھی (۳) روغنی۔ سادی رکابیاں پھلوں، میووں اور مٹھائیوں کے رکھنے کے لئے ہوتی تھیں۔ لاکھی رکابیوں کا رنگ سیاہی مائل ہوتا تھا۔ ان پر [illegible] خوبصورت ہوتا تھا۔ روغنی رکابیوں کا رنگ ہرا نیلا زرد اور سفید ہوتا تھا۔ ان میں روغن جذب نہیں ہوتا تھا۔ ان کا استعمال بھی اس لئے ہوتا تھا کہ غذا اور رنگ و روغن اپنی اصلی حالت پر رہے۔ پلاؤ۔ زردہ۔ کباب اور متنجن انہیں رکابیوں میں امراء اور احباب کے پاس بھیجا جاتا تھا۔ سالن اور کھیر کے لئے ہانڈیاں اور پیالے بھی بنتے تھے۔ یہ چیزیں بہت ہلکی صاف ستھری ہلکی نازک اور خوبصورت ہوتی تھیں۔ ایسے ہلکے اور باریک برتن کاغذی کہے جاتے تھے۔

کاغذی صراحیاں اور آبخورے بہت سوندھے ہوتے تھے۔ گرمیوں میں صراحیوں میں رکھا ہوا پانی آبخورے میں پیا جاتا تھا تو روح تازہ ہو جاتی تھی۔ آبخورے چھوٹے اور بڑے ہوتے تھے۔ بڑے آبخوروں کے بنانے میں بالو کی مقدار زیادہ رکھی جاتی تھی اس میں پانی جلدی ٹھنڈا ہوتا تھا۔ سستا ہونے کی وجہ سے امیر غریب سب ہی اس سے لطف اندوز ہوتے تھے۔

دوکاندار کاغذی آبخوروں میں شربت۔ کاغذی پیالوں میں کھیر کاغذی ہانڈیوں میں مٹھائیاں بیچتے تھے۔ کاغذی آبخوروں میں ملائی کی برف کاغذی چمچوں سے کھائی جاتی تھی۔ کھیر اور مزعفر کھانے کے لئے کاغذی چمچ الگ الگ مخصوص وضع و قطع کے ہوتے تھے۔ پان رکھنے کے لئے کاغذی ہانڈیاں ڈھکنے دار بہت ہی خوبصورت بنتی تھیں۔ ڈھکنوں پر [illegible] کا نقش لگا ہوا غلاف چڑھایا جاتا تھا۔ اندر سرخ رنگ کے تر کپڑوں میں پان کی گلوریاں رکھی جاتی تھیں۔

نصف صدی پہلے حقہ پینے کا رواج بہت زیادہ تھا۔ سگریٹ اور بیڑی کا چلن زیادہ نہیں تھا۔ حقہ بھی لکھنؤ کی ایجاد ہے۔ اس کے تین اجزاء ہوتے ہیں۔ سب سے نیچے پیندا ہوتا ہے جو زمین پر رہتا ہے اس پر نیچہ رکھا جاتا ہے اور نیچے پر چلم رکھی جاتی ہے۔ پیندے سونے چاندی تانبے پیتل اور مٹی کے بنتے تھے۔ ان پیندوں کو حقہ بھی کہا جاتا ہے۔ امراء حقوں کی سج دھج پر کثیر رقم خرچ کرتے تھے۔ چلم پر بھی چاندی پیتل یا تانبے کا ہوتا تھا اس سے لگا ہوا نازک زنجیر میں [illegible] لٹکی رہتی تھیں۔ نیچے میں [illegible] چاندی تانبے یا پیتل کا چڑھا رہتا تھا۔ نیچے [illegible] سے بنتے تھے۔ یہ کئی قسم کے

ہوتے تھے۔ [illegible] بہت [illegible] جاتے [illegible]

یا [illegible] واجد علی شاہ کی یادگار ہے۔ جیسے کے زرکل پر پہلے کالا یا لال کا لیپ کر کے زرکل خشک کیا جاتا ہے پھر کلابتون سے اس پر طرح طرح کی خوبصورت [illegible] بنا دی جاتی تھی۔ مینا سے (حقے) بھی بہت خوبصورت لگتے تھے اور مینا کاری کے کام سے دیدہ زیب بنا دیے جاتے تھے مگر ان قیمتی حقوں کے سامنے مٹی کے کاغذی حقے کچھ کم اہمیت نہیں رکھتے تھے۔

گھروں میں امرا بھی ان مٹی کے حقوں کو استعمال کر کے ان کے سوندھے سوندھے دھوئیں سے اپنی روح بالیدہ کیا کرتے تھے۔ شرر نے لکھا ہے کہ انگریزی شاعر ٹینی سن (Tennyson) مٹی کے بنے ہوئے پائپ پیا کرتا تھا۔ اسے مٹی کا سوندھا پن بہت عزیز تھا۔ اسے اگر یہ حقے مل جاتے تو شاید وہ پائپ کو کبھی منہ نہ لگاتا۔ چلمیں بھی کاغذی اور روغنی بنتی تھیں۔

تمباکو کشیدنی بھی (حقہ میں پینے کے لئے) لکھنؤ میں بہتر سے بہتر خوشبودار تیار ہونے لگی۔ بقول اسرار حسین :۔

"ٹھانا لکھنوی نصیری عہد میں اعلیٰ درجہ کا تمباکو کشیدنی بناتا تھا کہ اس میں مشک وغیرہ کی خوشبو آتی تھی۔ جس نے ایک گھونٹ کھینچا دم بھرنے لگا۔" (ہنر و ہنرمندان اودھ صفحہ ۱۹۱)

ان ظروف کے علاوہ مٹی کے گھڑے، جھجھر، کپ، لوٹے، ڈنر سٹ، ٹی سٹ، لیمن سٹ، مشکا اور کلھیاں، گلدان، شمع دان، اگر دان وغیرہ بہت خوشنما بنتے تھے۔

کھلونے :۔ مٹی کے برتنوں سے زیادہ گراں قدر مٹی کے کھلونے ہوتے تھے اور ہوتے ہیں۔ ان کی دلکشی بیان سے باہر ہے۔ گائے بنائی تو چہرے سے معصومیت ٹپکتی ہوئی۔ شیر بنایا تو دیکھنے والا ڈر کر پیچھے ہٹ جائے۔ کبوتر اور طوطے کے جوڑے ایسے کہ لگتا تھا پاس کوئی گیا کہ یہ اڑے۔ کٹا ہوا انار یا تربوز۔ لال مرچ۔ پرور۔ کھیرا دیکھئے کیا مجال ان کی اصلیت پر دیکھنے والا شک کر سکے۔

ابھی گیٹ کے قدیم آمنے سامنے کی دو دو دکانوں میں سے ایک دکان موجود ہے۔ اس کے مالک کافی سن رسیدہ ہو چکے ہیں۔ ان سے معلوم ہوا کہ پہلے [illegible] انگریزوں، راجاؤں اور تعلقہ داروں کی وجہ سے مٹی کا کام [illegible] تھا اب [illegible] والی زندہ رکھے [illegible]

جوتے اور جوتیاں

لکھنؤ کے ایجادات میں گھیتلے جوتے، خورد نوکے، ادھگیا، کفش، لعنبرپائی وغیرہ بھی ہیں۔ گھیتلے جوتے کسی زمانے میں بہت مقبول تھے۔ بقول شرر۔

"یہاں ایک گھیتلا جوتا مروج تھا۔ اس کی نوک ہاتھی کی سونڈ کی طرح ..... اودھ کے اگلے بادشاہوں، وزرا، امرا سب کے پاؤں کی زینت ہوا کرتا۔ غدر ہوتے ہوتے فقط عورتوں کے پاؤں میں رہ گیا جن کے نازک پاؤں کا وہ عام لباس تھا۔"

سید اسرار حسین ہنر و ہنرمندان اودھ صفحہ … پر فسانۂ عبرت کے حوالے سے لکھتے ہیں :۔

"نبر علی لکھنوی نصیری عہد میں گذرے ہیں۔ خورد نو کا گھیتلہ جوتا اس نوک جھوک کا بناتے تھے دنیا میں اس کا جواب نہ تھا۔"

کفش :۔ بقول شرر کفش اپنی اصلی صورت میں آج تک باقی ہیں جو شیعان علی کے اتقیا و علما، خصوصاً مجتہدین کے ساتھ مخصوص ہیں۔ (گ ل صفحہ …) مگر ایک شیعہ متقی مصلح اور مجتہد مولانا آغا مہدی کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ اب کفشوں کا رواج بھی باقی نہیں رہا۔ آپ لکھتے ہیں :۔

"کفش عالم اور بوڑھے عبادت گذار پہنتے تھے۔ نیچے کی طرف سے چوڑی کناروں پر چمڑے کی گوٹ اوپر مخمل یا کمخواب۔ نوک میں خرطومی انداز نہ تھا مگر ایڑی میں ایک خاص طرح کا نعل ہونا ضروری تھا۔ کفش بنانے والا اللہ رکھو پہلا کاریگر تھا پھر رمضان خان، ذاکر حسین اور آخر میں آغا حسن جفت فروش فرمائش آنے پر تیار کرتے تھے۔ پہننے والے نہ رہے تو یہ کام بھی بند ہو گیا۔" (تاریخ لکھنؤ صفحہ …)

زیرپائی :۔ تربوز کے چھلکے کو دانت سے کھٹکنے پر دو رخوں میں سے ایک رخ کا آدھا حصہ اگر کتر لیں تو جو حصہ باقی رہے وہی زیرپائی کی شکل ہے۔ ذاکر حسین اور رمضان خان اس کے آخری کاریگر تھے۔ براؤن چمڑے یا زرد مخمل کی بنتی تھی۔ اب اس کا بھی رواج نہیں رہا۔

خورد نوکا :۔ شرر گذشتہ لکھنؤ کے صفحہ ۲۵۱ پر لکھتے ہیں۔ (مختصر کر کے اپنے لفظوں میں لکھ رہا ہوں)

"خورد نوکے لال فری کے نہایت سبک اور صاف بنائے جاتے

اگلے زمانے میں اب بھی پیالے سے بٹے کر پیالہ چار پانچ سیر
بھر سے زیادہ نہیں۔ پیالہ بن کے لئے ایسی وضع کے جوتے
جوتے سیر بھر ڈیڑھ سیر سے کم نہ ہوتے تھے۔ سرسوں کا تیل پلا
کے اور بھی وزنی ہو جاتے۔ نوابین کے گرمیوں کے لئے کاشانی
مخمل اور برسات کے لئے کیمخت، گھوڑے یا گدھے کی کھال کے
بننا شروع ہوئے۔ بانات کا جوتا نہایت نفیس سادہ سبک اور
خوشنما ہوتا ہے۔ جوتے کی آرائش میں اور ترقی ہوئی اور سلمے
ستارے کے کارچوبی کام کے جوتے بننے شروع ہوئے جن میں مقیش
کے پھندنے لگا کر عجیب چمک دمک اور آب و تاب پیدا کر دی گئی
(گذشتہ لکھنؤ صفحہ [illegible])

ڈاکٹر سید صفدر حسین "لکھنؤ کی تہذیبی میراث" کے صفحہ [illegible] پر رقمطراز ہیں۔
"لکھنؤ کے مرد، عورت و بچے کے جوتے مخمل، کمخواب، بانات، زربفت
اور کیمخت وغیرہ کے عام طور پر بنتے تھے جن میں کلابتو کا مدانی
اور سلمی ستارے وغیرہ کا حسین نازک کام ہوتا تھا"

اودھیا۔ "گذشتہ لکھنؤ" کے صفحہ [illegible] پر شرر لکھتے ہیں۔
"اودھی کارچوبی کام کے ان مختلف قطع کے ٹکڑوں کو کہتے ہیں جو
زنانے یا مردانے جوتوں پر لگائے جاتے ہیں۔ اودھیاں یہاں بہت
ہی نفیس زرق برق اعلیٰ درجے کی ایسی بنتی تھیں جیسی کہیں نہ بن
سکتی تھیں اور ان کی مانگ اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ آبادی
کا ایک معتد بہ حصہ انھیں کی تیاری پر زندگی بسر کر رہا تھا"

محلہ رانی گنج (رکاب گنج سے چار باغ جانے والی سڑک پر ناکہ ہنڈولہ
سے پہلے) میں رہنے والے کاریگروں کے آبا و اجداد یہ جوتے بناتے تھے۔
مگر اب ان کی آبادی کا ایک معتد بہ حصہ عورتوں اور لڑکیوں کے لئے بیلی
جوتے بنا رہا ہے۔ محلہ رانی گنج جا کر معلوم کیا تو پتہ چلا کہ تقریباً دو سو گھر اس
محلے میں جوتا بناتے ہیں مگر سب کے سب بیلی جوتے بنا رہے ہیں۔ گھیتلے، خورد
نوکفش۔ زیرپائی اور اودھیاں کا بننا لکھنؤ میں بالکل بند ہو گیا۔ نوابین
لکھنؤ کے ساتھ فن اور فنکار سب رخصت ہو گئے۔

رضائی اور لحاف کی چھپائی

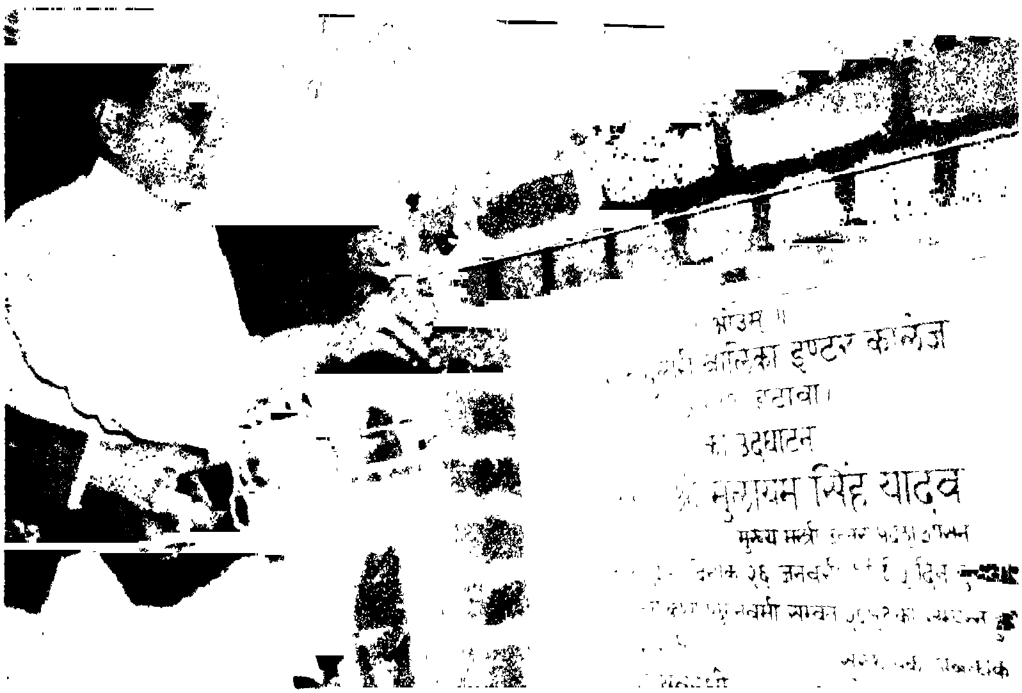
لکھنؤ میں چھپائی کی ایجاد۔ کلن خاں نامی ایک شخص نے
[illegible] کے قریب جاپان گئے وہاں [illegible]
انھوں نے [illegible] میں لکھنؤ اور دیگر [illegible] کا بجائے [illegible] کاغذ کی چھپائی
شروع کی۔ رنگ خود ہی بناتے تھے کسیس، دھوا، پانی، [illegible] یا نمک وغیرہ
سال بھر تک پڑا رہتا تھا اور انتہائی پختہ کالا رنگ بن جاتا تھا۔ پھول پتے
گل انار اور جنگلی بوٹیوں سے لال رنگ بنتی تھی۔ [illegible] وغیرہ ملا کر ہرا
رنگ اور ہلدی سے پیلا رنگ بناتے تھے۔ [illegible] میں جرمنی کے ریپڈ فاسٹ
کلر (Rapid Fast Colour) کا پتہ چلا اور کپڑوں پر چھپائی شروع ہو گئی۔
سب سے پہلے کلن خاں رسول بخش فرم نے یہ کام شروع کیا۔ کلن خاں لکھنؤ کی
چھپائی کے پہلے کاریگر ہیں۔ پھر انھوں نے اور لوگوں کو سکھایا اور فن عام ہونے
لگا۔ چھپائی کے لئے کپڑے مانچسٹر اور دوسرے یورپین ممالک سے آتے تھے۔

[illegible] سے رسول بخش نے غلطے پر چھپائی شروع کی۔ غلطہ ایک کپڑا تھا
جس میں نیچے کی بنائی سوتی اور اوپر کی بنائی ریشمی ہوتی تھی۔ غلطے پر چھپائی
دوسرے کارخانوں میں بھی شروع ہوئی۔ اور بہت مقبول ہوئی۔ رضائی
لحاف، غلاف تکیہ، پردے، شیروانی کے کپڑے، پرنٹ میز پوش، پلنگ پوش
وغیرہ غلطے پر چھپنے لگے۔

ایکسپورٹ۔ [illegible] کے قریب رسول بخش نے جرمنی، جاپان اور
انگلینڈ سے رابطہ قائم کیا اور مال بھیجنے لگے۔

ایک انکشاف۔ [illegible] میں جرمنی سے اشفاق رسول (رشک گنج)
کے پاس ایک اشتہار ڈائرکٹری آئی جس میں لکھا تھا کہ آپ کے اشتہارات
میرے یہاں سے نکلتے تھے۔ اب میرے ریٹ یہ ہیں۔ آپ کہیں تو اشتہار
دے دیا جائے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ لکھنؤ کی چھپائی بین الاقوامی سطح
پر مشہور ہو چکی تھی۔

کارخانے۔ [illegible] تک لکھنؤ میں چھپائی کے چھتیس کارخانے تھے ہر
کارخانے میں لگ بھگ (۱۵) پندرہ کاریگر رہتے تھے صرف اشفاق رسول
(رشک گنج) کے یہاں چھتیس کاریگر تھے۔ یہ کارخانے رشک گنج، [illegible]
سرائے، [illegible] گنج، [illegible] گنج، [illegible] آباد، لال باغ۔
بارود خانہ اور رکاب گنج وغیرہ میں تھے اب صرف چار کارخانے [illegible]
[illegible] چوک۔ راجہ بازار، [illegible] آباد اور رشک گنج میں ہیں
چھپائی کے کپڑے۔ [illegible]





وزیراعلیٰ
شری ملائم سنگھ یادو
۲۶ جنوری ۱۹۹۵ء کو
اوریا ضلع اٹاوہ میں
جنگ ڈالاری گرلس انٹرکالج
کا افتتاح
کرتے ہوئے

ملائم سنگھ یادو سرکار کے دو

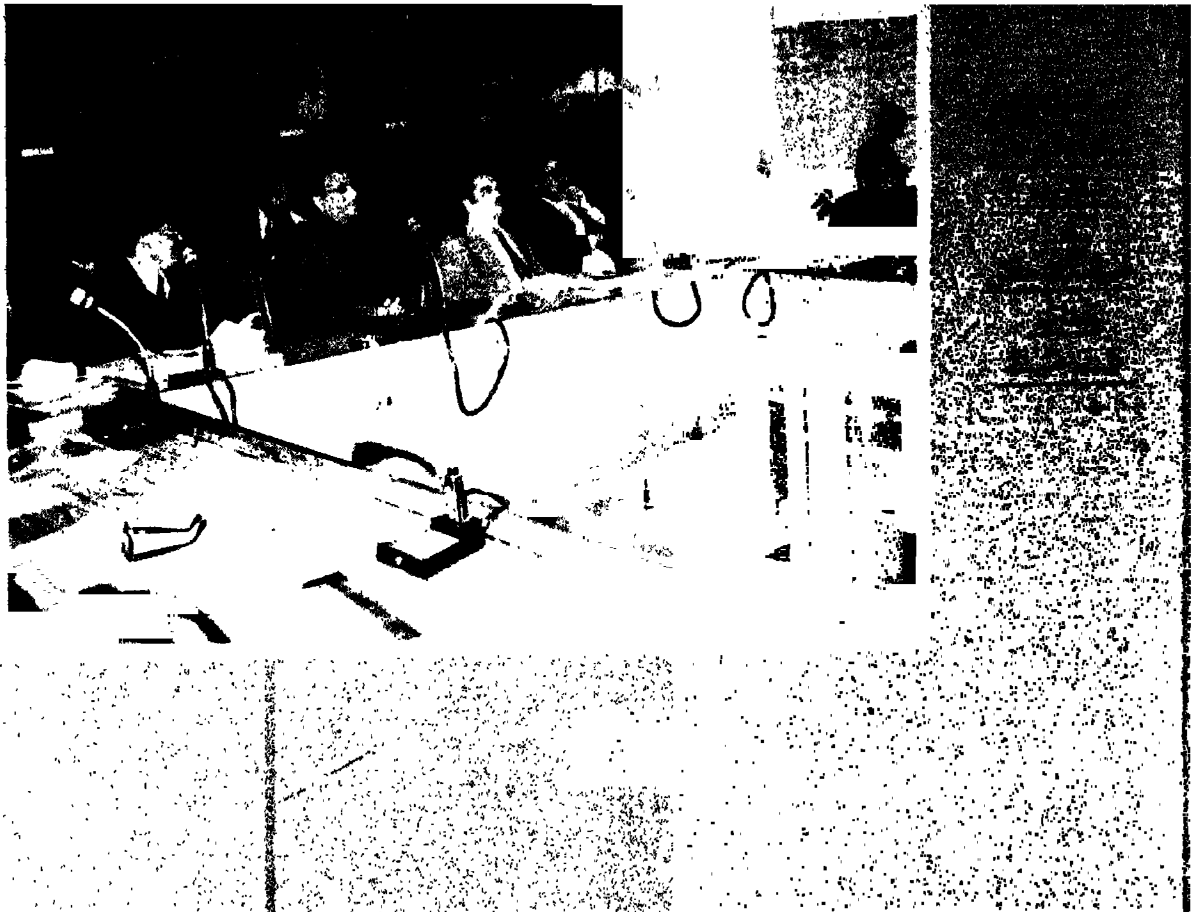


وزیر اعلیٰ اترپردیش شری ملائم سنگھ

وعدے پورے کر دکھائے"



اڈوہ میں جلسۂ عام کو خطاب کرتے ہوئے





وزیر نقل و حمل
ٹی آر کے چوہدری
آل نقل و حمل
کے امکانات
کے موضوع پر
منعقدہ جلسہ میں
شمع روشن
کرتے ہوئے

پھیلی ہوئی تھی۔ ایک ہی خاندان کی دو شاخیں یہ کام کر رہی تھیں۔ ایک شاخ پاکستان چلی گئی اور دوسری نے ٹھلے کا کام بند کر کے ریشمی ساریوں کا کام شروع کر دیا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد سے ٹھلے کی چھپائی بند ہو گئی پھر شاہوس، گھدر، لانگ کلاتھ، بلک، تنزیب اور دوسرے سوتی، ریشمی اور اونی کپڑوں کی چھپائی ہوتی رہی۔ اب اونی اور ریشمی کپڑوں کی چھپائی بھی تقریباً بند ہو چکی ہے۔ نہ کاریگر رہے اور نہ وہ صاحب مذاق جو اس کی قدر کرتے تھے۔ اب صرف سوتی کپڑوں کی چھپائی چل رہی ہے۔

چھپائی کی چیزیں :۔ رضائی۔ لحاف۔ دسترخوان، چھینٹ، پلنگ پوش، میز پوش، ساری، غلاف تکیہ۔ رومال، شال (اونی سوتی) اونی چادرے وغیرہ۔

دستکار :۔ اس میں دو قسم کے کاریگر ہوتے ہیں۔ ایک حاشئے کی چھپائی کرتے ہیں دوسرے ڈٹائی یعنی ڈزائن کی بھرائی کرتے ہیں۔ حاشئے کے کام میں قادر بخش اور عبدالرحیم بھیا (مشک گنج) دین محمد (وزیر گنج) منی لال (ڈکیٹ گنج) وغیرہ بہت مشہور تھے۔ بہت سے کاریگر اب بھی موجود ہیں جو اچھا کام کرتے ہیں۔

چھپائی کی ڈزائن :۔ ڈزائن تین قسم کی ہوتی ہیں (۱) اورینٹل پھول پتی بیلیں اور نیچر سے تعلق رکھنے والی چیزیں (۲) ماڈرن (آدمی۔ جانور نٹراج، کرشن کنھیا، لیلیٰ مجنوں، کسان، مکڑی کا جال۔ چوخانے اور گول جال وغیرہ) (۳) کیری وار (Paaly) یہ ڈزائن نوابی دور کی پسندیدہ ڈزائن ہے۔ (ابھی سے جامے وار (قیمتی کپڑے کی ایک قسم) وجود میں آئی۔ یہ اتنی مقبول ہوئی کہ انگرکھے، شیروانی، عمامے اور شال وغیرہ پر بننے لگی۔ کیریاں بھی کئی وضعوں میں ایجاد ہوئیں جو اپنے موجد کے نام سے موسوم ہوئیں۔ مثلاً شبراتی کاریگر نے ایک نئی طرح کی کیری ایجاد کی اُسے شبراتی کیری کہتے ہیں۔ اسی طرح بلاقی کیری، نواب کیری اور رحیم کیری وغیرہ وجود میں آئیں۔

رنگ :۔ ریپڈ فاسٹ (Rapid Fast)، انڈگوسول (Indigosol) اور انڈین تھرین (Indane Threne) یہ رنگ پہلے جرمنی سے آتے تھے۔ اب یہیں تیار ہونے لگے ہیں۔

لکڑی کے چھاپے ٹھپیا بلاک

لکڑی کے بلاکوں کی اہمیت اس لئے بہت زیادہ ہے کہ اگر ان کی ایجا

لکھنؤ کے فنکاروں نے دلی ہوتی تو چکن، کارچوب اور چھپائی کی صنعتیں بڑی طرح متاثر ہوتیں۔ چکن اور کارچوب میں اب لکڑی کے ٹھپوں کا کام کاغذ سے لیا جاتا ہے مگر چھپائی آج بھی انھیں ٹھپوں سے ہوتی ہے۔ شیشم کی پرانی سوکھی اور سیدھے ریشے والی لکڑی پر بہت محنت دیدہ ریزی اور مہارت سے نقاشی ہوتی ہے۔

چھاپہ یا بلاک ساز :۔ ۱۹۰۰ء سے ۱۹۵۰ء تک لکھنؤ میں چھاپہ سازی کا کام ہوتا رہا۔ یہاں بہت ہی اعلیٰ درجے کے کاریگر رہے۔

آج اس فن کے ماہرین سے بھی لکھنؤ خالی ہو گیا۔ اب بارہ بنکی کے عطاء اللہ لکھنؤ والوں کو چھاپے فراہم کرتے ہیں۔ فرخ آباد میں عبدالرزاق اور ان کے بیٹے عبدالرحمٰن چھاپے سازی کرتے ہیں۔ بنارس۔ جے پور اور احمد آباد میں بھی چھاپے بنتے ہیں۔

لکھنؤ کی کچھ دستکاریاں آج اپنی مٹی ہوئی حالت میں بھی دنیا کے کونے کونے میں اپنی مقبولیت کے ڈنکے بجا رہی ہیں اور داد تحسین حاصل کر رہی ہیں۔ لکھنؤ کی دستکاری آج بھی شہرۂ آفاق ہے۔

□□

سالِ نو

رفاقت علی سندیلوی
نصرت منزل، سندیلہ ۲۴۱۲۰۴ ضلع ہردوئی

جگمگاتا سالِ نو آیا بصد ناز و ادا
چھا گئی ہے سارے عالم پر طرب کی فضا

سالِ نو لے کر ہے آیا پھر نئے شام و سحر
ظلمتوں کے درمیاں ہے روشنی آتی نظر

زندہ رہنے کے لئے دیتا ہے سب کو حوصلہ
گوشِ دل سے ہم سنیں وہ دے رہا ہے کیا صدا

سالِ نو سے آؤ سیکھیں وہ شعورِ زندگی
ذہنِ انساں کو جو بخشے اک نئی تابندگی

پھر نمایاں ہو جہاں میں عظمتِ گنگ و جمن
ہو وطن میں ہر طرف مہر و محبت کا چلن

پھر کہیں باقی نہ ہو تفریق کا داغِ کہن
ہم جبینِ ہند پر دیکھیں نہیں کوئی شکن

منتشر ہیں، متحد ہو کر بنیں ہم کارواں
شاہراہوں پر ترقی کی نظر آئیں رواں

جہل سے، افلاس سے اب آؤ ہم مل کر لڑیں
بھائی درماندہ جو اپنے ہیں انھیں لے کر بڑھیں

اس نفاقِ باہمی کی توڑ دیں زنجیر ہم
گاندھی و نہرو کے خوابوں کی بنیں تعبیر ہم

مسلکِ انسانیت کی بن کے اک تنویر ہم
وید اور قرآن کی تازہ کریں تفسیر ہم

بھول کر بغض و عداوت، ختم کر دیں نفرتیں
زخم بھر جائیں پرانے، دل میں ہوں گر وسعتیں

ہو رواداری، اخوت، حبِّ انساں چار سُو
ایک دل ہو کر بڑھائیں ہم وطن کی آبرو

پست و بالا دور ہو، اور ذہن بھی ہموار ہو
تفرقوں کی، درمیاں باقی نہ اب دیوار ہو

خوف و دہشت کی نظر آئیں نہیں پرچھائیاں
خرمنوں پر بے گناہوں کے نہ چمکیں بجلیاں

بھائیوں کے درمیاں کیوں خون کے دریا بہیں
بھائی چارے کی فضا میں آؤ سب مل کر رہیں

امن، خوش حالی، محبت کی یہاں گنگا بہے
بغض و نفرت کا فسانہ قصۂ ماضی بنے

فکر و دانش کی وطن میں ہو بہارِ بے خزاں
اس کے میخانے سے ہو سرشار پھر سارا جہاں

چار سُو الفت کے غنچے مسکرائیں ناز سے
پھر رواداری کے نغمے ہم سنیں ہر ساز سے

زندہ رہنے کا ہمارا دوسرا انداز ہو
ایک زریں دَور کا ہم سے نیا آغاز ہو

سرخ رو عالم میں ہو اپنا وطن ہندوستاں
زندہ باد و شادماں و کامران و جاوداں

ڈاکٹر شمیمہ رضوی
شعبۂ اردو. لکھنؤ یونیورسٹی
لکھنؤ

اٹھارہویں صدی میں

اودھ میں اردو داستان نگاری

اُردو ادب کے ارتقاء کے لحاظ سے شمالی ہند میں اٹھارہویں صدی کا زمانہ وہ زمانہ ہے جب اُردو کو ادبی حیثیت حاصل ہو چکی تھی، لیکن فارسی کے مقابلے میں وہ ابھی بہت کم سن تھی۔ شعری سرمایہ کے لحاظ سے تو اس نے ایک مقام حاصل کر لیا تھا لیکن اس دور کا نثری ادب خاصا کمزور تھا۔ شمالی ہند میں اٹھارہویں صدی کی نثری داستانوں کی تفصیل اس طرح ہے:

(۱) قصہ مہر افروز و دلبر۔ از عیسوی خاں۔ کتاب کا نام تاریخی ہے، جس سے سال تصنیف ۱۰۶۶ھ (مطابق ۵۶۔۱۶۵۵ء) کا استخراج ہوتا ہے۔ یہ شاہجہاں کے آخری زمانے کی تالیف ہے۔

(۲) عجائب القصص، از شاہ عالم ثانی زمانۂ شاہ عالم ثانی ۱۷۵۹ء۔ ۱۸۰۶ء)۔ دہلی کے اس مظلوم بادشاہ نے نہ صرف اُردو شعراء کی سرپرستی کی بلکہ وہ ایک نثری داستان کے مؤلف بھی ہیں جس کا ذکر سب سے پہلے قدرت اللہ قاسم نے مجموعۂ نغز میں کیا۔ اس قصے میں ہندی الفاظ کا زیادہ غلبہ ہے۔

(۳) نوطرز مرصع۔ از میر محمد حسین عطا خاں تحسین۔

(۴) نوآئین ہندی عرف قصہ ملک محمد و گیتی افروز از مہر چند کھتری مہر (۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء)

(۵) جذب عشق از شاہ حسین حقیقت بریلوی (۱۲۱۲ھ/۹۸۔۱۷۹۷ء)

ان میں سے اول الذکر دو داستانیں "قصہ مہر افروز و دلبر" اور "عجائب القصص" بالترتیب دورِ شاہ جہانی اور شاہ عالم ثانی سے متعلق ہیں، چونکہ ہمارا موضوع صرف اودھ کی نثری داستانوں سے ہے اس لئے اول الذکر دونوں داستانیں ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ بقیہ تین داستانوں پر ہم تفصیلی گفتگو کریں گے۔

(۱) نوطرزِ مرصع

میر محمد حسین عطا خاں تحسین کی نوطرزِ مرصع نہ صرف شمالی ہند میں اردو نثر کی سب سے پہلی کتاب مانی گئی ہے بلکہ اودھ میں داستان نگاری کی حیثیت سے بھی اسے اولیت کا فخر حاصل ہے جن مستند کتابوں میں تحسین کا ذکر ملتا ہے وہ حوالے اس طرح ہیں،

(۱) تحسین کا سب سے پہلے ذکر آبِ حیات میں ملتا ہے اس لیے آزاد نے نوطرز مرصع کا سال تالیف ۱۷۸۹ء لکھا ہے۔

(۲) قدیم تذکروں میں سب سے پہلے خوب چند ذکا کے تذکرے (سالِ ترتیب ۱۷۸۸ء) میں تحسین کا ذکر بحیثیت شاعر ملتا ہے۔ نوطرز مرصع کا ذکر اس میں نہیں ملتا۔

(۳) ڈاکٹر گل کرسٹ نے میر امن کی تصنیف "باغ و بہار" کے مقدمے میں تحسین کے طرز اور اسٹائل پر صرف تبصرہ کیا ہے ان کے حالات کچھ نہیں لکھے۔

(۴) غلام علی خاں نے اپنی فارسی تاریخ اودھ مسمیٰ بہ عماد السعادت (۱۸۰۸ء) میں تحسین کا مختصر ذکر کیا ہے۔

(۵) گارساں دتاسی نے تحسین کا ذکر کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ وہ کلکتہ، پٹنہ اور فیض آباد میں رہ چکے ہیں، شجاع الدولہ اور پھر آصف الدولہ کے دربار میں رسائی ہوئی۔ شجاع الدولہ کے کہنے سے نوطرز مرصع لکھی اور پھر اسے آصف الدولہ نے بھی

یہ وہ خارجی شواہد ہیں جن سے تحسین کے متعلق کسی تفصیلی حالات کا علم نہیں ہوتا، نہ تو سنہ پیدائش کا پتہ چلتا ہے نہ سنہ وفات کا۔ تحسین کی تعلیم و تربیت کا بھی کچھ علم نہیں ہوتا۔ نوطرز مرصع کے شروع میں ایک دیباچہ شامل ہے جس سے اس قدر علم ہوتا ہے کہ ان کے والد مشہور آدمی تھے، خاندان میں علم و ہنر کا چرچا تھا۔ دادا سے لے کر پوتے تک سبھی سرکار مغلیہ میں اچھے عہدوں پر فائز تھے۔ نوطرز مرصع کے علاوہ وہ انشائے تحسین، ضوابط انگریزی اور تواریخ قاسمی کے بھی مصنف تھے۔ یہ کتابیں اب ناپید ہیں۔

تحسین نے نوطرز مرصع کا سبب تالیف یوں بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ تحسین کو جنرل اسمتھ کے ساتھ، جو انگریزی فوج کے کمانڈر تھے، کشتی پر کلکتے کا سفر درپیش ہوا۔ سفر بہت طویل تھا چناں چہ ان کا ایک خادم سفر میں مختلف قسم کی داستانیں سنا کر دل بہلایا کرتا۔ اس کو سن کر تحسین کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اگر اس داستان کو (جو نوطرز مرصع میں موجود ہے) مرصع ہندی زبان میں لکھا جائے تو کہیں بہتر ہوگا۔ چناں چہ انھوں نے دوران سفر کئی قصے لکھ ڈالے لیکن مکمل نہ کر سکے۔ کلکتہ پہونچنے کے بعد ان کا تبادلہ عظیم آباد ہو گیا اور داستان کا کام ملتوی کرنا پڑا۔ بعد کو فیض آباد جا کر شجاع الدولہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے اور انھیں اس داستان کا کچھ حصہ سنایا۔ انھوں نے اسے بہت پسند کیا اور حکم دیا کہ اسے مکمل کرو۔ اس کی تکمیل ہوئی تھی کہ شجاع الدولہ کا انتقال ہو گیا۔ آصف الدولہ کے تخت نشین ہونے کے بعد دیباچے میں چند کلمات توصیف کے اور ایک قصیدہ ان کی تعریف میں لکھ کر اسے آصف الدولہ کے حضور پیش کیا۔

نوطرز مرصع لکھنے کی ابتدا ۱۱۸۶ھ میں ہوئی تھی اور ۱۱۹۰ھ میں اس کی تکمیل ہوئی۔ اس میں چار درویش کا قصہ مذکور ہے۔ پروفیسر محمود شیرانی کی تحقیق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ پہلے فارسی میں لکھا گیا۔ اس سلسلے میں دو ناموں کا پتہ ملتا ہے۔ اول حکیم محمد علی المخاطب بہ معصوم علی خاں دوسرے انجب جن کا ذکر مصحفی نے "عقد ثریا" میں کیا ہے۔ لیکن یہ قصہ اب ناپید ہے۔ بعد کے مؤلفین میں میر احمد خلف شاہ محمد کی فارسی تالیف میں چہار درویش کے قصے کی تصنیف امیر خسرو سے منسوب ہے۔ اسی خلاصے کو میر امن نے "باغ و بہار" میں منتقل کیا ہے۔ پروفیسر شیرانی نے اس کی تردید مندرجہ ذیل نکات سے مدلل طور پر کی ہے:

۱۔ چہار درویش کے جتنے بھی قلمی نسخے ملے ہیں ان میں سے کوئی [illegible] سے پہلے کا نہیں۔

۲۔ حضرت نظام الدین اولیاء کے مقالات و ملفوظات میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔

۳۔ کسی بھی مورخ یا تذکرہ نگار نے اسے امیر خسرو کی تصنیف نہیں بتایا ہے۔

۴۔ اس قصے میں شامل اشعار خسرو کے بعد کے شعرا مثلاً حافظ، خاقانی، نظیری، عرفی کے کہے ہوئے ہیں۔

۵۔ "قہوہ" اور "اشرفی" جن کا ذکر قصوں میں آیا ہے خسرو کے زمانے میں ان کا رواج نہ تھا۔

۶۔ مختلف منصب و عہدے جیسے خزانہ دار، امیر آخور مغلوں کی آمد کے بعد رواج پذیر ہوئے۔

۷۔ گودڑیوں کا ذکر خواجہ سگ پرست کے قصے میں ملتا ہے۔ یہ سترہویں صدی کی دین ہے۔

۸۔ متن کی عبارت سے مولف کا اثنا عشری ہونا ثابت ہوتا ہے۔ امیر خسرو سنی تھے۔

ایک قدیمی نسخے کے مطالعہ کے بعد پروفیسر شیرانی اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ یہ فارسی تالیف حکیم محمد علی المخاطب بہ معصوم علی خاں کی ہے جو محمد شاہ بادشاہ (۱۱۳۱ھ۔ ۱۱۶۱ھ) کے عہد میں گزرا ہے۔ اس کا ذکر پرانی کتابوں کے سرورق پر یوں ملتا ہے:

"باغ و بہار" تالیف کیا ہوا میر امن دلی والے کا، ماخذ اس کا نوطرز مرصع، لیکن باغ و بہار میں قصہ کی جو ترتیب ہے وہ احمد خلف شاہ کے فارسی نسخے سے مطابقت رکھتی ہے۔ اس لیے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ میر امن نے احمد خلف شاہ کے نسخے سے بھی استفادہ کیا ہے:

اٹھارہویں صدی عیسوی میں فارسی انشا کے زیر اثر اردو نثر پر بھی تکلف و تصنع غالب تھا۔ منشی محمد حسین عطا مرصع رقم تو منشی کے عہدے پر فائز تھے نیز یہ داستان بادشاہ کی فرمائش پر لکھی گئی تھی تو کیوں کر ممکن تھا کہ وہ انشا پردازی سے کام نہ لیتے۔ شجاع الدولہ کا ذکر کرتے ہیں تو

کئی سطریں تو صرف ان کے توصیفی کلمات کی نذر ہو جاتی ہیں۔ قصے کے شروع میں ہی عبارت آرائی موجود ہے، ملاحظہ ہو:

"بیچ سرزمین فردوس آئین ولایت روم کے ایک بادشاہ تھا، سلیمان قدر فریدوں فر، جہاں بان، دین پرور رعیت نواز، عدالت گستر، برآرندۂ حاجات، بستہ کاراں، بخشندۂ مرادات امیدواراں، زرندۂ سیر نام کہ اشعۂ شوارق فضل ربانی کا اور شعشۂ بوارق فیض سبحانی کا ہمیشہ اوپر لوح پیشانی اس کے لمعان و نور افشاں رہتا۔"

(نوطرز مرصع صفحہ ۶۵)

یہ اور اسی قسم کی عبارتوں سے ایسا لگتا ہے کہ فارسی کا لفظی ترجمہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر جان گل کرسٹ نے باغ و بہار میں اس طرف یوں اشارہ کیا ہے،

"عطا حسین خان نے ابتداءً اصل فارسی سے اس کا ترجمہ شائع کیا، مگر چوں کہ اس کی زبان بوجہ کثرت تراکیب و محاورہ فارسی و عربی مغلق اور قابل اعتراض مانی گئی تھی اسلئے ...... اس نقص کو رفع کرنے کی غرض سے کالج کے ملازمین میں میر امن دہلوی نے مذکورہ بالا ترجمے سے موجودہ متن تیار کیا۔ دونوں کا ایک ساتھ متن ملاحظہ کیجیے، فرق خود بخود سامنے آجائے گا ..."

نوطرز مرصع:

"جس وقت زلف خاتون شب کی کمر تک پہونچی اور چشم خلائق کی خمار نشۂ غنودگی کے سے سرمست خواب غفلت کے ہوئی یکایک صندوق چوبیں فراز دیوار حصار کے سے مانند خورشید کے برج حمل کے سے جلا بخش دیدۂ تماشا بین کا ہوا۔ فقیر وارادات اس عجائبات کے سے کمال متعجب ہوا کہ آیا یہ خیال طلسمات کا ہے یا مسبب الاسباب حقیقی نے اوپر بیکسی اس بیکس کے نظر ترحم کی زمانے کے خزانۂ غیب سے دولت غیر مترقبہ مرحمت کی۔" (ص ۸۳-۸۴)

باغ و بہار:

"جس وقت آدھی رات اِدھر آدھی رات اُدھر ہوگئی، سنسان ہوگیا، دیکھتا کیا ہوں کہ ایک صندوق قلعے کی دیوار سے نیچے چلا آتا ہے۔ دیکھ کر میں اچنبھے میں آیا کہ یہ کیا طلسم ہے شاید خدا نے میری حیرانی اور سرگردانی پر رحم کھاکر خزانۂ غیب سے عطا کیا۔"

عبارت میں جگہ جگہ تحسین نے مشہور شعرا کے منتخب اشعار بھی پیش کیے ہیں، بہ لحاظ اسلوب یہ تالیف انتہائی مرصّع ہے۔

(۲) نوآئین ہندی عرف قصہ ملک محمد و گیتی افروز

ہرچند کھتری مہر کی تالیف "نوآئین ہندی" اٹھارویں صدی عیسوی کے دوسرا خیر کی اہم تالیف ہے۔ مہر کے حالات مختلف تذکروں میں موجود ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے مستند تذکرہ خیراتی لال بے جگر کا "تذکرۂ بے جگر" ہے۔ اس لیے کہ اس میں مہر نے خود اپنے حالات لکھ کر بھیجے تھے۔[۱]

مہر ۱۱۸۲ھ/۱۷۶۸ء میں کوڑا جہان آباد تحصیل کھجوا ضلع فتح پور میں پیدا ہوئے، مہر آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ آئے اور یہیں شعری و ادبی ماحول میں ان کی شعر گوئی کا آغاز ہوا۔ فارسی میں مہر اور اردو میں فتنہ تخلص کرتے تھے۔ اس داستان کو ہم اکادمیاء اودھ سے متعلق قرار دیتے ہیں۔ مہر کے بڑے بھائی لالہ گوکل چند کھتری متخلص بہ ہندو اور چھوٹے بھائی لالہ کشن چند متخلص بہ عاشق بھی شاعر تھے

"نوآئین ہندی" کے سبب تالیف سے علم ہوتا ہے کہ اسے مہر نے اپنے مربی سر نکیلی کو اردو سکھانے کی غرض سے آذرشاہ و سمن رخ کا قصہ سادہ اور آسان زبان میں پیش کیا۔

مہر کے کہے ہوئے ایک قطعہ کے آخری مصرعے اس کا سال تصنیف برآمد ہوتا ہے ؎

سراپا اگر اس سہو و خطا ہے
تو صاحب دلوں سے امید عطا ہے
کہا مجھ سے ہاتف نے تاریخ اس کی
بیاں کر تو اے مہر قصے کو جلدی[۲]

۱۲۱۸ھ

لیکن پروفیسر گیان چند جین نے ایک مطبوعہ ایڈیشن کی بنیاد پر اس کا سالِ تالیف ۱۲۰۳ھ/۸۹-۱۷۸۸ء قرار دیا ہے اور ثبوت میں یہ مادہ تاریخ پیش کیا ہے: "بیاں کر تو آہستہ قصہ کو جلدی" اس بنیاد پر ہم اسے اٹھارھویں صدی کی ہی داستان قرار دیتے ہیں۔

پروفیسر گیان چند لکھتے ہیں کہ اس داستان کا قدیم ترین فارسی نسخہ گلکنڈہ سے میں قصۂ الجواہر کے نام سے ملتا ہے جو ۱۷۰۰ء کے لگ بھگ لکھا گیا۔ دوسرا فارسی نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں قصہ ملک محمود گیتی افروز کے نام سے ۱۱۵۱ھ/۱۷۳۸ء کا لکھا ہوا موجود ہے۔ ایک فارسی مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں ہے۔ ایک قدیم دکنی نسخہ انجمن ترقی اردو کے کتب خانے میں موجود ہے۔ کیمبرج یونیورسٹی میں بھی ایک نسخہ موجود ہے۔ رجب علی بیگ سرور نے اسی قصے کو "شگوفۂ محبت" کے نام سے ۱۸۶۲ء میں لکھا۔

یہ ایک مختصر داستان ہے لیکن اس میں واقعہ نگاری پر توجہ مرکوز رکھی گئی ہے۔ نثر میں شعریت پیدا کرنے کے لئے جگہ جگہ اشعار سے بھی کام لیا گیا ہے۔ لیکن بعض اشعار پست اور غیر معیاری ہیں اس میں شک نہیں کہ اردو نثر نگاری کی سادہ بیانی کے سلسلے میں فورٹ ولیم کالج نے کلیدی رول ادا کیا لیکن یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ بہر اس کی داغ بیل ڈال چکے تھے۔

نوآئین ہندی میں قصہ در قصہ تکنیک کو اپنایا گیا ہے۔ اس طرح پوری داستان ۲۵ حصوں پر مشتمل ہے۔ داستانیں عموماً اپنی معاشرت کی آئینہ دار ہوتی ہیں، نوآئین ہندی پر بھی ہم عصر تہذیبی جھلک نمایاں ہے یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔ کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ اودھ کے کسی حکمراں کے زمانے کی تصویر نہیں ہے،

"اندر جا کے جو دیکھا تو عجب نادر باغ ہے کہ جس کی رونق اور بہار کو بہشت بھی نہ پہونچ سکے اور تمام صحن میں یک تخت مخمل زربفتی فرش ہے اور چاروں طرف سنہری دیواروں پر موتی اور لعل اور یاقوت اور زمرد وغیرہ جواہر کی ایسی ایسی جڑاؤ تصویریں بنائی گئی ہیں کہ نقش کھینچنے میں نقاش چین کا چیں مان جائیں کہ مانی و بہزاد ا کساتیں اور باغ کے چاروں کونوں میں بلور کے تختوں پر لعل و زمرد کی صراحیاں رنگ برنگ کی شرابوں سے بھری ہوئی قطار بہ قطار رکھی ہیں اور ان کے پاس سونے کی چوکیوں پر یاقوت کے پیالوں اور ہیرے کے آبخوروں کی عجب بہار ہے۔" [۳۶]

نوآئین ہندی کا بھی اگرچہ فارسی سے اردو میں ترجمہ ہوا لیکن اسلوب بیان سے ترجمہ پن کا اظہار کہیں نہیں ہوتا۔

(۳) جذب عشق

جذب عشق شاہ حسین حقیقت کی تالیف ہے۔ حقیقت کی تصانیف میں دیوان ریختہ، صنم کدۂ چین، تحفۃ العجم، خزینۃ الامثال، مثنوی ہشت گلزار، ہفت نسخہ، تذکرہ احبا اور جذب عشق بھی شامل ہیں۔ حقیقت حضرت سید عبداللہ ملقب بہ مظلوم کی اولاد میں سے تھے جن کا سلسلۂ نسب گیارہ واسطوں سے حضرت سید الشہداء امام حسینؑ تک پہونچتا ہے۔ حقیقت کے والد سید عرب شاہ نے آنولہ بریلی میں حکیم میر محمد نواز کی دختر سے شادی کی۔ حقیقت کے اجداد بلخ کے رہنے والے تھے۔ حقیقت کی پیدائش ۷۳-۱۷۷۲ء میں بریلی میں ہوئی۔ بلخ کی مناسبت سے اکثر تذکرہ نگاروں نے انہیں بلخی بھی لکھا ہے۔ حقیقت تین بھائی تھے۔ بڑے بھائی حسن شاہ ضبط (پیدائش ۱۱۸۴ھ) اور چھوٹے بھائی کا نام سید قاسم شاہ تھا۔ پندرہ سولہ برس کی عمر میں ان کے نانا نے انہیں بریلی سے کان پور بلوالیا۔ بعد کو وہ لکھنؤ آگئے۔ حقیقت کا مختصر ذکر عیار الشعراء، تذکرۂ گلشن بے خار، تذکرہ سراپا سخن اور مصحفی کے "تذکرۂ ہندی" میں موجود ہے۔ ان کا انتقال مدراس میں ہوا۔ ڈاکٹر لطیف حسین ادیب نے ان کا سنہ وفات ۱۲۴۹ھ/۳۴-۱۸۳۳ء بتایا ہے۔

"جذب عشق" فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کی نثری تصانیف سے قبل کی تصنیف ہے۔ اس کا سالِ تصنیف ۱۲۱۲ھ مادۂ تاریخ "جذب عشق آہ" سے برآمد ہوتا ہے۔ حقیقت نے خود ہی اس کی وضاحت کی ہے

حقیقت نے کی جو تاریخ کی فکر — کروں خوبی کا اس کی تم سے کیا ذکر
کیا ہاتف نے اس معنی سے آگاہ — حقیقت کو کہ ہے یہ "جذب عشق آہ"

۱۲۱۲ھ

حقیقت نے جس لکھنؤ میں قدم رکھا وہ لکھنؤ آصف الدولہ کا لکھنؤ تھا آصف الدولہ کا انتقال ۱۷۹۷ء میں ہوا اور یہ داستان بھی اسی دوران تکمیل ہوئی۔ چنانچہ یہ داستان بھی دورِ اودھ سے متعلق ہے۔ ڈاکٹر عبدالرؤف نے اسے اردو کی پہلی طبع زاد کہانی سے تعبیر کیا ہے۔ ۴؎ لیکن پروفیسر لطیف حسین لکھتے ہیں کہ:

"حقیقت کے بڑے بھائی سید محمد حسن شاہ ضبط نے فارسی زبان میں ایک کہانی ۱۲۰۴ھ / ۱۷۹۰ء میں لکھی تھی، حقیقت نے محمد حسن شاہ کے ارشاد کے مطابق اس کہانی کو ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) میں اردو میں منتقل کیا۔ ۵؎

ضبط کی کوئی اور تصنیف باقی نہیں، ان کا صرف ایک ناول "نشتر" موجود ہے۔ یہ ناول بھی فارسی میں لکھا گیا ہے لیکن جذبِ عشق اور اس ناول کے پلاٹ مختلف ہیں۔ ہوسکتا ہے ان کی کوئی تصنیف قلمی صورت میں موجود ہو جس کی بنیاد پر حقیقت نے اسے اردو میں منتقل کیا۔

جذبِ عشق کا قصہ میر کی مثنوی دریائے عشق سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے حالاں کہ مصنف لکھتا ہے کہ یہ قصہ ۱۲۰۴ھ میں بندرابن کے قریب پیش آیا اور واقعہ سچا ہے۔ حقیقت نے شعوری طور پر اس داستان میں فوق الفطرت عناصر سے گریز کرتے ہوئے حقیقت نگاری کو اختیار کیا ہے۔

بحیثیت مجموعی ان داستانوں پر فارسی کے مرصع اسلوب کا اثر زیادہ ہے۔ خصوصاً تحسین کی نوطرزِ مرصع، مہر چند کھتری نے اس اسلوب سے سب سے پہلے بغاوت کی اور سلیس و روزمرہ کا نمونہ پیش کیا حقیقت کی داستان میں رنگین و سلیس دونوں اسلوب کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔

اگرچہ یہ داستانیں تعداد کے لحاظ سے بہت قلیل ہیں لیکن ہم عصر زندگی کا آئینہ دار ہیں۔ ان میں عظمتِ رفتہ کے بعض شعبوں کے تابناک مرقعے موجود ہیں جس سے ہم اودھ کی تہذیب و معاشرت کا شعور آسانی سے کر سکتے ہیں۔ قدیم اردو ادب کا زیادہ تر حصہ امراء کی سرپرستی ہی میں پروان چڑھا، داستانیں بھی انھیں کے زیرِ سایہ لکھی گئیں۔

اس میں شک نہیں کہ ان داستانوں سے اودھ اور خاص کر لکھنؤ کی تہذیب کی پوری تاریخ مرتب ہوسکتی ہے۔

□□

حواشی

۱؎ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی اپنی تاریخِ ادبِ اردو جلد دوم میں ان کے حالات قلم بند کیے ہیں۔

۲؎ بحوالہ مقدمہ نوآئینِ ہندی، ڈاکٹر سیلمان حسین۔ اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۸۰ء ص ۱۳

۳؎ نوآئینِ ہندی ص ۹۳

۴؎ جذبِ عشق۔ مرتبہ ڈاکٹر عبدالرؤف، پیش لفظ پروفیسر محمود الحسن ص ۳۷ نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۹۳ء

۵؎ شاہ حسین حقیقت اور ان کا خاندان: مشرف احمد۔ ادارہ ادبیات پاکستان کراچی، ۱۹۷۷ء ص ۹۲

اردو ادب کی تنقیدی تاریخ

"اردو ادب کے ارتقا کے تاریخی پس منظر میں دہلی کے زوال اور اودھ کے عروج کو بڑی اہمیت حاصل ہے لیکن اردو کے کچھ مورخوں اور ناقدوں نے بہار و خزاں کی اس تصویر میں ایسا رنگ بھرا ہے جیسے کسی معجزے سے اردو شاعری کا روپ ایسا بدل دیا گیا جو دلی میں تھا وہ اودھ میں جان بوجھ کر مٹایا گیا اور ایسی تبدیلیاں کی گئیں جو ایک کو دوسرے سے بالکل الگ کرتی ہیں حقیقت یہ ہے کہ اگر زبان کے استعمال، لب و لہجہ کے تغیر، اسلوب کے بعض عناصر اور بعض اصناف کی ترقی کو نظر انداز کر کے دیکھا جائے تو ہندستان کے سماجی نظام میں یہ کوئی بڑا تغیر نہ تھا۔ پھر بھی ادبی اور علمی نقطۂ نظر سے لسانی اور ادبی روایات میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں انھیں تہذیب کے وسیع ہوتے ہوئے دائرے میں رکھ کر دیکھنا مفید ہوگا۔

پروفیسر سید احتشام حسین

علی مہدی ایڈوکیٹ
مشک گنج لکھنؤ

لکھنؤ کے گنج، بازار اور گلی کوچے

مرزا غالب سے "مردم چشم جہان" کا لقب پانے والے لکھنؤ کی تاریخ تو صدیوں پرانی ہے۔ لکھنؤ میں مسلمانوں کی آمد اور آبادی تو بس سید سالار مسعود غازی (بہرائچ ۱۰۳۴ء) اور ان کے ساتھیوں کی اس پورے خطّے میں آمد و قیام سے ظاہر ہے جس کے تذکرے قدیم ماخذوں میں موجود ہیں۔ لکھنؤ میں اندرونِ محلہ راجہ بازار صجبتیہ (صجبتیا باغ) سید سالار کے ساتھی "ملک آدم" کا مزار و مقبرہ اس وقت بھی موجود ہے۔ بقول صاحب گزیٹیر آف اودھ اس مزار پر باغ میں چونکہ صحبت کا میلہ ہر سال ہوتا تھا، اسی لیے یہ جگہ صجبتیا باغ مشہور ہو گئی۔

قدیم ماخذوں کی روشنی میں صاحب گزیٹیر آف اودھ اور پھر بعد میں مولانا شرر نے "گزشتہ لکھنؤ" میں بھی مغل شہنشاہ ہمایوں کی لکھنؤ آمد کے وقت شیوخ لکھنؤ کی موجودگی کا ذکر کیا ہے۔

عہدِ اکبری (۱۵۹۰ء) میں اکبری دروازہ اور چوک میں باچپٹی ٹولہ کساری ٹولہ، بنجاری ٹولہ، سوندھی ٹولہ اور عہدِ جہانگیری اور شاہجہانی میں مرزا منڈی، محمود نگر، منصور نگر، فاضل نگر، شاہ گنج وغیرہ کا آباد ہونا اور عہدِ عالمگیری میں فرنگی محل میں ملا نظام الدینؒ کا قیام کرنا تحریر کیا ہے۔

لیکن مرزا غالب سے "مردم چشم جہاں" کا لقب پانے والا لکھنؤ حقیقت میں نواب آصف الدولہ (۱۷۷۵ء-۱۷۹۸ء) کی فیض آباد سے لکھنؤ آمد اور مستقل قیام کا نتیجہ تھا۔ دربارِ اودھ کی لکھنؤ میں قائمی کے بعد ہر چہار جانب لوگ آباد ہونے لگے۔ نئے نئے محلے، ٹولے، گنج اور بازار بسنے لگے، اور یہ سلسلہ اس خاندان کے آخری تاجدار سلطانِ عالم واجد علی شاہ تک جاری رہا اور آج آزادی کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ لکھنؤ ہر چہار جانب بڑھتا اور بستا ہی جا رہا ہے۔ نئے نئے محلے اور زمانۂ حال کی متعدد منزلہ عمارتیں اور کالونیاں تیار ہو رہی ہیں۔

عہدِ آصفی کے آباد محلوں اور بازاروں میں بازار جھاؤلال، بازار ٹکیٹ رائے، ٹکیٹ گنج، بالک گنج، امانی گنج، فتح گنج، رکاب گنج، نخاس دولت گنج، بیگم گنج، نواب گنج، ترمنی گنج، بھوانی گنج، نواز گنج، مشک گنج اور وزیر گنج جو آصف الدولہ کے جانشین وزیر علی خاں کے نام پر موسوم ہے اور عہدِ نواب سعادت علی خاں میں بنگلی گنج، مقبول گنج، مولوی گنج اور موتی محل و گولہ گنج وغیرہ آباد ہوئے۔ سعادت گنج بھی نواب سعادت علی خاں نے عہدِ آصفی میں آباد کیا تھا جسے اپنے عہدِ نوابی میں اور بھی رونق بخشی۔ غازی الدین حیدر کے زمانہ میں بادشاہ نگر اور ان کے وزیر معتمد الدولہ آغا میر نے قلبِ شہر میں اپنے محلات تعمیر کرائے جو ڈیوڑھی آغا میر کے نام سے مشہور ہوئے۔ نصیر الدین حیدر نے دریا پار ارادت نگر، چاند گنج وغیرہ بسائے۔ امجد علی شاہ نے حضرت گنج اور ان کے وزیر اعظم امین الدولہ نے امین آباد وغیرہ اور عہدِ واجدی میں قیصر باغ، بادشاہ باغ جہاں آج لکھنؤ یونیورسٹی ہے، سکندر باغ، بنارسی باغ وغیرہ میں بارہ دریاں اور کوٹھیاں بنوائیں۔

انھیں گنج اور بازاروں میں آبادیاں قائم ہوئیں اور اہلِ حرفہ اور صنعت کاروں نے بھی اپنے ٹولے آباد کیے، گلیاں اور کوچے وجود میں آئے جو اپنے حلقے یا علاقے کے معروف لوگوں یا رہنے والوں کے پیشوں یا اس مقام پر بننے یا فروخت ہونے والی اشیاء کے ناموں سے معنون ہو کر مشہور ہو گئے۔ اہلِ لکھنؤ اپنی علمی اور تہذیبی ثقافتوں

سکے ساتھ ساتھ اپنی ظرافتوں کے لیے بھی مشہور رہے ہیں جس کی جھلک کچھ محلوں اور ٹولوں کے ناموں سے ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً جھپ جھالی ٹولہ اچھوتی گلی، ستو بیا کی گلی، کالے کی گلی، جناب عالی گلی، گلی شاہ چھڑا، چوڑسے کی گلی، کیتھے والے جناب کی گلی وغیرہ۔

عہدِ شاہی کے لکھنؤ میں بڑی بڑی چوڑی سڑکیں نہ تھیں اور نہ ان کی ضرورت ہی تھی کیوں کہ کسی قسم کی گاڑیوں کا رواج نہ تھا، عموماً لوگ پیدل چلتے تھے۔ ہاں امرا اور رؤسا پالکیوں، نالکیوں، ہواداروں، فینسوں، چوپہلوں اور ڈولیوں میں ایک مقام سے دوسرے مقام پر آتے جاتے لیکن قریب کے مقامات پر یہ حضرات بھی پیدل ہی اپنے مصاحبین کے ہمراہ چلتے پھرتے تھے۔ گلیوں اور تنگ راہوں میں راستہ چلنے میں دھوپ کی تیزی، گرمی کی شدت، گرد و غبار، آندھی اور طوفان نیز بارش سے بھی کسی قدر مفر و آرام رہتا تھا۔ ان بچی کھچی گلیوں اور تنگ راستوں میں اب بھی ایسی چند گلیاں موجود ہیں کہ جن میں ہو کر مشرقی لکھنؤ سے مغربی لکھنؤ تک نہایت آرام سے دھوپ اور گرد و غبار سے بچ کر پہونچا جا سکتا ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ اب عرصے سے ان گلیوں میں پہلے جیسی صفائی نہیں ہے۔

عہدِ شاہی کا لکھنؤ اپنی آبادی، ترقی اور رونق کے سبب دنیا کے چند اہم اور بڑے شہروں میں شمار ہوتا تھا۔ ابتدائے انگریزی دورِ حکومت میں بھی بمبئی، کلکتہ اور مدراس کے بعد لکھنؤ ہندستان کا سب سے بڑا شہر تھا۔

برٹش حکومت کے قیام کے بعد جب مختلف قسم کی گاڑیوں کا رواج عام ہوا اور یکے تانگے، فینس، ٹم ٹم اور بگھیاں اور موٹریں بھی آگئیں تو کشادہ راستوں اور سڑکوں کی بھی ضرورت پیش آئی۔ شہر میں متعدد کشادہ سڑکیں نئی بنیں اور کچھ قدیمی راستوں کو ہی مزید کشادہ کیا گیا۔ مکانات، گلیاں اور کوچے کھودے گئے جن کے اب صحیح نام بھی معلوم کرنا مشکل ہے۔

۱۸۶۹ء کی مردم شماری کے بموجب ملٹری، یوروپین اور جیل کے ملازمین اور مجرمین کے علاوہ لکھنؤ شہر کی آبادی دو لاکھ تہتر ہزار ایک سو چھبیس (۲۷۳۱۲۶) افراد پر مشتمل تھی اور پورا شہر سات تھانوں یا وارڈوں پر منقسم تھا۔ سب سے زیادہ آبادی تھانہ چوک کی ۶۳۲۵۰ نفر تھی۔ لکھنؤ شہر کی آبادی کی تفصیل صاحب گزیٹیر نے یوں لکھی ہے؛

تھانہ چوک	۶۳۲۵۰
تھانہ حسن گنج	۲۹۸۴۹
تھانہ دولت گنج	۵۴۲۲۱
تھانہ سعادت گنج	۳۸۵۰۷
تھانہ گنیش گنج	۴۰۱۷۵
تھانہ وزیر گنج	۳۳۷۴۰
تھانہ دلکشا اور کنٹونمنٹ	۱۵۲۸۴
میزان؛	۲۷۳۱۲۶

ملٹری؛	۳۶۴۸	یوروپین؛	۴۲۲۲
دیگر غیر ملکی؛	۷۶۰	ملازمین جیل اور مجرم	۳۰۲۳

۷۰-۱۸۶۱ء کے درمیان لکھنؤ شہر کے بازاروں میں مختلف اجناس کی خوردہ قیمت بھی صاحبِ گزیٹیر نے لکھی ہے۔ ناظرین کی دلچسپی کے سبب سے بھی پیش کیا جاتا ہے؛

کودو	۳۴ سیر فی روپیہ	چھوٹی جوار	۴۴ سیر فی روپیہ
مکا	۲۹ سیر "	ماش	۲۲ سیر "
سانواں	۳۲ سیر "	موٹھ	۲۴ سیر "
چاول	۲۷ سیر "	چنا	۲۰ سیر "
باجرہ	۲۲ سیر "	مٹر	۲۵ سیر "
ارہر	۲۷ سیر "	گیہوں	½۱۹ سیر "

مچھلی بڑی؛ دو آنہ فی سیر مچھلی چھوٹی: ½۱ آنہ فی سیر
مچھلی معمولی: ایک آنہ فی سیر

۱۹۶۹ء سے اس وقت تک ان تھانوں اور وارڈوں کی تعداد چند سال کے وقفوں کے بعد بڑھتی رہی ہے اور اب صورتِ حال یہ ہے کہ پورا شہر چالیس وارڈوں پر تقسیم ہے جو اس طرح ہیں؛

<u>لکھنؤ کے وارڈ</u>

۱. نرہی ۲. حضرت گنج ۳. مُرلی نگر ۴. گھسیاری منڈی

۵۔ قیصر باغ، ۶۔ مقبول گنج، ۷۔ حسین گنج، ۸۔ لال کنواں،
۹۔ گنیش گنج، ۱۰۔ بشیر گنج، ۱۱۔ امین آباد، ۱۲۔ مولوی گنج،
۱۳۔ وزیر گنج، ۱۴۔ مشک گنج، ۱۵۔ راجہ بازار، ۱۶۔ یحییٰ گنج،
۱۷۔ گنڈری رکاب گنج، ۱۸۔ عیش باغ، ۱۹۔ راجندر نگر، ۲۰۔ چندر بھان گپت نگر
۲۱۔ آدرش نگر، ۲۲۔ جے پرکاش نگر، ۲۳۔ سکار نگر، ۲۴۔ سروجنی نگر،
۲۵۔ کمرکارائے بریلی روڈ، ۲۶۔ راجہ جی پورم، ۲۷۔ سعادت گنج،
۲۸۔ کشمیری محلہ، ۲۹۔ اشرف آباد، ۳۰۔ چوک، ۳۱۔ نواز گنج،
۳۲۔ دولت گنج، ۳۳۔ تروینی نگر، ۳۴۔ ڈالی گنج، ۳۵۔ نرالا نگر،
۳۶۔ بادشاہ نگر، ۳۷۔ گومتی نگر، ۳۸۔ اندرا نگر، ۳۹۔ ماہ نگر، ۴۰۔ علی گنج

عرصے سے ہو رہی ان تبدیلیوں اور ردوبدل کے سبب گو بہت سے قدیم مقامات اور ان کے نام مٹ گئے ہیں، پھر بھی کچھ مقامات اور گلیاں اپنے قدیم ناموں سے ہی مقامی طور پر جانی پہچانی جاتی ہیں۔ حالاں کہ کاغذات سرکار میں ان کے نام کچھ اور ہی درج ہیں۔ مثلاً چاول والی گلی جہاں کبھی چاول بکتے تھے، ابھی کچھ عرصہ پہلے تک ادنیٰ درجہ کی کسبیوں کی آماجگاہ تھی۔ کاغذات سرکاری میں پرانا نخاس کے نام سے درج ہے۔ اسی طرح مشہور ٹاپے والی گلی کاظمین، میدان ایلچی خاں میں شامل ہے۔

زمانۂ شاہی کے بعد تک چوک گول دروازے سے بیلی گارد تک کا علاقہ، جو اب شاہ مینا روڈ اور بجگت نرائن روڈ کے نام سے مشہور ہے، نیہرہ (NEBHERA) کہلاتا تھا اور اسے نیہرہ اس وجہ سے کہتے تھے کہ اس پورے علاقے میں نیم کے درختوں کی بہت کثرت تھی۔ مولانا عبدالحلیم شرر کے "گزشتہ لکھنؤ" کا ۱۹۷۵ء میں یونیسکو کی معرفت لندن سے انگریزی ترجمہ شائع ہوا تو مترجمین نے اس لفظ کو نقطوں کی بے ترتیبی یا کسی اور غلط فہمی میں (BENEHRAH) پڑھا اور اس کی شرح بھی زیر نوٹ (۸۳) یہ فرمادی کہ "بنہرہ ضلع بارہ بنکی کا ایک قصبہ ہے۔" لیجیے نقطوں کی بے ترتیبی یا غلط فہمی میں ایک نئی تاریخ بن گئی۔

اسی طرح کھجوہ باغ ناظم صاحب، جو ادھر کچھ عرصہ سے شاستری نگر کے نام سے موسوم ہے، اگر علامہ صفی لکھنوی کا نظم کردہ قطعہ تاریخ وفات پروفیسر علی اصغر مرحوم جو کیننگ کالج میں استاد تھے، کچھ عرصے بعد پڑھا جائے تو باغ ناظم صاحب اور کھجوے کا پتہ بتانے والا بھی شاید کوئی نہ ملے گا۔

جہاں ہے کھجوے پہ باغ ناظم — وہیں بہشت بریں کا عازم
کفن سے منھ کو چھپا کے لیٹا — غبار پردے گرا کے اٹھا

الغرض ان حالات میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کے معروف گلی کوچوں اور محلوں کی ایک مختصر ردیف وار فہرست مرتب کردی جائے جو باعث دلچسپی بھی ہو اور شاید کبھی کام آسکے:

گلیاں

آ چھوتی گلی۔ پل غلام حسین	گنے والی گلی۔ امین آباد
کنگھی والی گلی۔ نخاس	بتاشے والی گلی۔ امین آباد
چاول والی گلی۔ نخاس	جوتے والی گلی "
پھول والی گلی۔ چوک	جھوٹے والی گلی "
بتو والی گلی۔ ڈالی گنج	ڈور والی گلی۔ چوک
گھوڑے والی گلی۔ نخاس	پارچہ والی گلی۔ چوک
بیل والی گلی۔ مشک گنج	سرکہ والی گلی۔ کاظمین
پیڑے والی گلی۔ ڈیوڑھی آغا میر	سناروں والی گلی۔ مفتی گنج
فینس والی گلی۔ راجہ بازار	مارواڑی گلی۔ گنیش گنج
دیگ والی گلی۔ بنجاری ٹولہ	پپیتے والی گلی۔ رکاب گنج
گلی شاہ چھڑا۔ وکٹوریہ اسٹریٹ	پتھر والی گلی۔ وزیر گنج
باندہ والی گلی۔ چوک	ٹاپے والی گلی۔ کاظمین
چوڑی والی گلی۔ چوک	حمام والی گلی۔ چوک
گلی نشاط گنج بطرف تارے	جناب والی گلی۔ نخاس

کالے کی گلی۔ مفتی گنج

ٹولے:

اہیر کا ٹولہ۔ کشمیری محلہ	شنکری ٹولہ۔ چوک
باورچی ٹولہ۔ ڈیوڑھی آغا میر	سوندھی ٹولہ۔ چوک
کشمیری ٹولہ۔ "	کلین ٹولہ۔ چوک
کافدی ٹولہ۔ سعادت گنج	بھوانی ٹولہ۔ چوک

برہمی ٹولہ ۔ سعادت گنج — سورگی ٹولہ چوک
حاجی ٹولہ " — چوپاڑی ٹولہ ۔ چوک
جوشی ٹولہ ۔ ڈیوڑھی آغا میر — جھبو جھاؤ ٹولہ ۔ ڈالی گنج
جھوائی ٹولہ ۔ چوپٹیاں — بھانڈوں کا ٹولہ ۔ "
نعل بندی ٹولہ ۔ ڈیوڑھی آغا میر — کرمی ٹولہ ۔ مقبول گنج
دریائی ٹولہ ۔ راجہ بازار — بجرین ٹولہ "
دستگی ٹولہ ۔ راجہ بازار — چکوں ٹولہ ۔ چوپٹیاں
چڑی مار ٹولہ ۔ راجہ بازار — گوئن ٹولہ ۔ مولوی گنج
تلاجی ٹولہ ۔ مشک گنج — کھتری ٹولہ ۔ مشک گنج
پوری ٹولہ ۔ راجہ بازار — دیدن ٹولہ ۔ نواز گنج
صواتی ٹولہ ۔ یٰسین گنج — پنجابی ٹولہ ۔ راجہ بازار
نواتی ٹولہ " — تھوئی ٹولہ ۔ راجہ بازار

کٹڑے:

کٹڑہ میر جہانگیر ۔ یحییٰ گنج — کٹڑہ خدایار خاں ۔ سعادت گنج
کٹڑہ ابوتراب خاں ۔ یحییٰ گنج — کٹڑہ وفا بیگ ۔ کشمیری محلہ
کٹڑہ حیدر حسین ۔ چوک — کٹڑہ محمد علی خاں ۔ نواز گنج
کٹڑہ اعظم بیگ ۔ ڈالیہ گنج — کٹڑہ مقبول گنج ۔ کٹڑہ رانی

پُل

پُل غلام حسین ۔ جھاؤلال کا پُل ۔ کچّا پُل ۔ پکّا پُل ۔ گاؤ کا پُل (چوک) ۔ قاسم علی خاں کا پُل (مفتی گنج) ۔ قصائی کا پُل (چوک) ۔ فرنگی محل کا پُل کاٹھ والا پُل ۔ لوہے والا پُل ۔ موتی محل کا پُل ۔ رکاب گنج کا پُل ۔ کمہاروں کا پُل (مشک گنج) ۔ موتی لال کا پُل (چوک)

دروازے اور پھاٹک

رومی دروازہ ۔ گول دروازہ (چوک) ۔ اکبری دروازہ ۔ توپ دروازہ شیر دروازہ (قیصر باغ) ۔ نعل دروازہ ۔

حیدر حسین خاں کا پھاٹک (چوک) ۔ ملکہ گیتی کا پھاٹک (قندھاری بازار) پھاٹک جیالال (نواز گنج)

احاطے

احاطہ خواجہ بہار، حسین گنج ۔ احاطہ تراب خاں، حسین گنج ۔ احاطہ غنی خاں، حسین گنج ۔ احاطہ ماتادین، گنیش گنج ۔ احاطہ نور بیگ، سعادت گنج احاطہ دھنو بیگ، کاظمین ۔ احاطہ سنگی بیگ، اشرف آباد ۔ احاطہ سلیمان قدر، مولوی گنج احاطہ درگا پرشاد، مشک گنج ۔ احاطہ صورت سنگھ ۔ احاطہ مرزا علی خاں احاطہ فقیر محمد خاں پختہ و خام ۔ احاطہ خانساماں ۔ احاطہ ستارہ بیگم ۔ احاطہ رسول خاں ۔ احاطہ حکیم خاں، نواز گنج ۔

محلے

کشمیری محلہ ۔ چوبداری محلہ ۔ جوہری محلہ ۔ دلّالی محلہ ۔ بیلداری محلہ ۔ اٹکی محلہ، رکاب گنج ۔ گھڑیالی، چوک ۔

باغ

چار باغ ۔ عیش باغ ۔ عالم باغ ۔ نظر باغ ۔ قیصر باغ ۔ لال باغ ۔ بادشاہ باغ ۔ سکندر باغ ۔ وزیر باغ ۔ بنارسی باغ ۔ تیلی باغ ۔ ڈالی باغ ۔ خورشید باغ ۔ موسیٰ باغ ۔ جاکر باغ ۔ صفدر باغ ۔ سندر باغ ۔ ہزارہ باغ صحبتیا باغ ۔ بلند باغ (وزیر گنج) ۔ باغ شیر جنگ ۔ باغ آئینہ بی بی ۔ باغ مرزا جمعہ ۔ باغ قاضی ۔ باغ مکّا ۔ باغ جتّو ۔ باغ مولوی انوار ۔ باغ ناظم صاحب ۔ دلکشا باغ ۔

منڈی

چک منڈی ۔ دال منڈی ۔ گھسیاری منڈی ۔ غازی منڈی ۔ بھوسہ منڈی تمباکو منڈی ۔ بھیڑی منڈی ۔ مرزا منڈی، چوک ۔ چرس منڈی، بشرت گنج سبزی منڈی، قیصر باغ ۔ سبزی منڈی چوک ۔

کنویں

لال کنواں ۔ کنکر کنواں ۔ بھولا ناتھ کا کنواں ۔ چھاچھی کنواں، ڈیوڑھی آغا میر ۔ کپتان کنواں، چوک ۔ پتھر کنواں ۔

آباد

امین آباد ۔ نظیر آباد ۔ حیدر آباد ۔ حسین آباد

خانہ

گنبد خانہ، حسین آباد ۔ چاندی خانہ ۔ مرغ خانہ ۔ فیل خانہ ۔ شُتر خانہ، مقبول گنج ۔ چھپی خانہ ۔ زنبور خانہ، گھسیاری منڈی ۔ تازی خانہ، مشک گنج ۔ بارود خانہ، گولہ گنج ۔ فراش خانہ، مشک گنج ۔ برف خانہ، مصاحب گنج ۔ رتھ خانہ، مولوی گنج ۔ لنگر خانہ، حسین آباد، خیرات خانہ، ٹوریہ گنج ۔ یتیم خانہ کاظمین

(ناتمام)

اردو کی کہانی

بنتِ جمہور ہوں تہذیب کی دولت ہوں میں
تلسی و نانک و خسرو کی امانت ہوں میں
آنکھ کھولی ہے دوآبے کے چمن زاروں میں
بولنا سیکھا ہے فوجوں کبھی بازاروں میں
عہدِ طفلی ہی میں یوں عظمتِ فن تک پہونچی
گنگناتی ہوئی دلی سے دکن تک پہونچی
مجھ میں یکجا ہیں کئی رنگ، یک رنگ بھی ہوں
وید کا لحن بھی، قرآن کا آہنگ بھی ہوں
دوسری بہنوں سے گو سن میں بہت کم ہوں میں
پھر بھی ہر قوم کی تہذیب کا سنگم ہوں میں
بڑھ گیا جس میں جب اور بھی چرچا میرا
پڑ گیا نام تب اردوئے معلّیٰ میرا
زندگی بخشی ہے مظلوم کی غمخواری نے
شان کچھ اور بڑھا دی ہے عزاداری نے
میرؔ کے ساتھ کبھی نوحہ گری کی میں نے
بزمِ اقبال میں پیغامبری کی میں نے
غالبؔ و ذوقؔ سے اسلوبِ وفا سیکھا ہے
صحبتِ داغؔ میں انداز و ادا سیکھا ہے
مجھ کو دیکھا تو خود اپنی ہی زباں بھول گئے
قندِ پارس کا مزا فارسی داں بھول گئے
قیدیوں کو لبِ اظہار دیا تھا میں نے
جنگِ آزادی کا اعلان کیا تھا میں نے
عمر آغوشِ محبت میں بسر ہوتی تھی
رات مندر میں، تو مسجد میں سحر ہوتی تھی
نامکمل ہے مگر آہ کہانی میری
لائی ہے موت کا پیغام جوانی میری

□□

ڈاکٹر بیگم اعظمی
مقیم ... [illegible]

گیت

سونے جیسی دھرتی اس کی امرت جیسا پانی ہے
کوہِ ہمالہ اس کے گورو اور عظمت کی نشانی ہے

گرو گرنتھ کا پاٹھ بائبل گیتا اور قرآن
مندر مسجد گرجا گردوارہ سب اسکے مکان
مرلی کی دھن شبد کیرتن اور ملّا کی اذان
ہندو مسلم سکھ عیسائی اک جیسے انسان
آپس میں نفرت پھیلانا انسانو! نادانی ہے
سونے جیسی دھرتی اسکی امرت جیسا پانی ہے

دیوالی کرسمس بیساکھی اور ہولی کے رنگ
عید شبِ بارات منائیں اک دوجے کے سنگ
اک جیسے جذبات سبھی کے اک جیسی ہے امنگ
اک جیسے ہیں جسم سبھی کے اک جیسے ہیں انگ
جب کوئی بھی فرق نہیں تب آپس میں کیوں ٹھانی ہے
سونے جیسی دھرتی اسکی امرت جیسا پانی ہے

رام اور گوتم چشتی نانک سب کا اک سندیش
رشی منی پیر اولیاء کا اس میں اپدیش
طرح طرح کی بھاشا ایسے طرح طرح کے بھیش
ان سب سے مل کر انجمؔ بنتا ہے بھارت دیش
تاج محل کا حسن ہے اور گنگا جمنا کی روانی ہے
سونے جیسی دھرتی اسکی امرت جیسا پانی ہے

——— انجمؔ صدیقی بہرائچی
آزاد انٹر کالج
بہرائچ

روشن تقوی
۵۰۔ بارود خانہ، بدری ناتھ روڈ
گولہ گنج، لکھنؤ

لکھنؤ کی بازیاں

کنکوے بازی

لکھنؤ کی بازیاں بہت مشہور رہیں، ان میں سے کچھ خاص کے نام ہیں: پتنگ بازی، کبوتر بازی، مرغ بازی، بٹیر بازی اور تیتر بازی۔ ان بازیوں میں یہاں صرف پتنگ بازی کے بارے میں تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

اس صدی کی شروعات میں کنکوا بازی کا فن لکھنؤ میں اپنے عروج پر تھا۔ نوابین، شرفاء اور رئیس لوگ اس شوق کے دلدادہ تھے اسی زمانے میں کنکوے بازی کے بڑے بڑے کلب بنے، اس کے اصول قائم کیے گئے اور کوشش یہ کی گئی کہ کرکٹ اور فٹ بال وغیرہ کی طرح اسے بھی مستقل قسم کے کھیلوں میں شامل کرلیا جائے۔ چنانچہ ۱۹۲۴ء مطابق ۱۳۰۹ھ میں "ہوائی شغل" کے نام سے ایک کتاب لکھی گئی اور اس میں بھی یہی مانگ دہرائی گئی۔ لکھنؤ کی پتنگ بازی پر لکھی گئی شاید یہ واحد کتاب ہے اور اسے سید احمد معتمد اعزازی نے مرتب کیا تھا اور اس کی تاریخ باقر حسن شہرت اور آرزو لکھنوی نے سید محمد حیدر کے نام سے تصنیف کی تھی۔

پتنگ کا لفظ پتنگا سے نکلا ہے اور پتنگا چونکہ چھوٹا ہوتا ہے اس لئے چھوٹے کنکوے کو جسے عموماً کنکیا کہتے ہیں، اسے ہی پتنگ کہا جاتا ہے اور بڑے سائز والے کنکوے کہلاتے ہیں۔

خطۂ یونان کے ایک مشہور حکیم عرقیدوس طارطی نے حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے چار سو سال قبل اس کی ایجاد کی تھی لے مگر لکھنؤ میں پتنگ بازی کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں ہے۔ نواب آصف الدولہ کے زمانے میں تکل، پتنگ، کنکوا زیادہ تر جھل جھل واد لڑا کرتا تھا، لیکن باقاعدہ کنکوے بازی کا رواج نہ تھا۔ نہ کثرت سے یہ شغل ہوتا تھا۔ اس زمانے میں ڈور موٹی، پتنگ بہت بھاری اور بھس ہوتی تھی۔ واجد علی شاہ کے زمانے تک تکل، پتنگ، کنکوے، بابچی اڑا کرتے تھے۔ آخر عہد شاہ مرحوم میں بیگموں اور خواجہ سراؤں میں چند ماہ پتنگ بازی کا شغل ہوا۔ یہ لوگ مینا بازار میں رہتے تھے کچھ بدمزگی پیدا ہو جانے سے شغل بند ہوگیا۔ ؎

۱۸۵۶ء میں لکھنؤ کی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی لڑی گئی۔ اس کے تین سال بعد مشہور کنکوے بازی لکھنؤ میں شاہزادوں اور نواب زادوں میں ہوئی۔

ایک فریق شاہزادہ مرزا ولی عہد بہادر خلف شاہزادہ مرزا جیدہ صاحب دہلوی، دوسرے فریق نواب علی محمد خاں صاحب بہادر ساکن احاطہ مرزا علی خاں لکھنؤ تھے۔ یہ کنکوے بازی ڈھائی سال تک جاری رہی۔

لکھنؤ میں آصف الدولہ کے وقت سے ہی تکل، مکڑی، آدم اور اڑدھا شکل کی پتنگ اڑانے کا شوق تھا مگر لڑانے کا طریقہ اس وقت تک رائج نہیں تھا۔ باقاعدہ طور پر پینچ لڑانے اور کلب وغیرہ بنانے کا سلسلہ انگریزوں کی حکومت قائم ہو جانے کے بعد شروع ہوا۔

کوئی بھی شوق جب فن بن جاتا ہے تو اس کے تمام اصول مرتب کرنے میں ہنرمندی درکار ہوتی ہے۔ چنانچہ کنکوا بنانا، سادی تیار کرنا، مانجھا سوتنا اور چرخی گھرانا وغیرہ لکھنؤ کا ہنر بن گیا۔

پرانے زمانے میں جم کا برسی کاغذ کنکووں میں استعمال ہوتا تھا ہر رنگ کے تاؤ ہوتے تھے اور پچاس برس قبل اس کی قیمت دو روپیہ فی رم ہوتی تھی۔ ان رنگین کاغذ پر کوڑیاں گھس کر اس پر چکیاں بنائی جاتی تھیں اس سے کاغذ پر ایک طرح کا نقش ابھر آتا تھا اس طرح کے نقش

کر جب دو سرے رنگ کے کاغذ سے ملا کر پتنگ بنائی جاتی تھی تو وہ بہت خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔

یہ فن اتنا ترقی پذیر ہوا کہ سادہ کاغذ چار خانہ دار، لہریا دار اور دوسری طرز کی لکیروں والے دیدہ زیب بن جاتا تھا۔ یہی فن آگے بڑھا تو پہلے بعض ہنرمند اچھے سے اچھے نقوش اور اناردانہ قریب قریب کھینچ کر تیار کر دیتے تھے۔

آجکل یہ فن ختم ہو گیا ہے اور اب دیسی کاغذ سے ہی رنگ رنگ اور پٹی سے پٹی جوڑ کر ڈیزائن بنایا جاتا ہے۔ کچھ پرانے اور کچھ نئے ڈیزائن کے کنکووں کے نام اس طرح مشہور ہیں:

پرانوں میں: انگاریہ، ابابیلیا، ایک کلا، بنٹھیا، بھیڑیا، بگلا، پہاڑیا، پٹی دار، بڑھی دار، بہروپیا، تپتا، جینویا، جسم دہر، چپٹ، چوبرہ، جھنڈے دار، چاند تارا، جستن، خربوزیہ، دو دگر، دو پازہ، دو پرہ، زیر پرہ، سلیمانیہ، شطرنجیا، مرچی دار، طوقیہ، کروندیا، کٹ مانگیا، کل پتہ، گوٹیا، گیند دار، مانگ دار، لل پتہ، مٹھے دار، مرد نگیا، مکھی (فعل اور طوقیہ) وغیرہ مشہور تھیں۔

نئے ڈیزائنوں میں اب صرف چند ہی نام ہیں مثلاً مانگ دار، لیٹے دار، چپٹ، گیند دار، طوقیہ، پٹی دار، بڑھی دار، چاند تارا اور مٹھے دار وغیرہ۔

اس صدی کی پتنگ کی موجودہ شکل میں اس کے آٹھ حصے ہوتے ہیں: ٹھڈا، مڈھا، کانپ، پٹہ، کندہ، پشتا، کنا اور ڈور۔

پتنگ سازی کے جو مشہور ماہر فن اور باکمال استاد ہوئے ہیں، ان میں کچھ پرانے نام یوسف حسین، اچھے صاحب، اسمٰعیل، منوہر لال، محمد نواب صاحب، آغا صاحب، چھٹن صاحب، جو مولوی صاحب بھی کہلاتے تھے، لیکن ۱۹۱۴ء سے ۱۹۷۶ء تک جس شخص نے پتنگ سازی میں اپنا لوہا منوایا اس کا نام تھا آغا بتن کاشمیری جنہوں نے یہ فن اپنے والد سے حاصل کیا تھا۔

زمانۂ حال میں کنکوا مانجھے اور ڈور کے ذریعے اڑایا اور لڑایا جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں مانجھے کو ڈور کہتے تھے اور ڈور کے بجائے ساوی کا لفظ مستعمل تھا۔ کنکوا لڑانے میں مانجھا بقدر ضرورت باندھا جاتا تھا اور پیچ کی لمبائی کا تعین ساوی سے ہوتا تھا۔ اصل ساوی تقریباً پچاس برس قبل ختم ہو گئی تھی اور اس کی جگہ پر جرمنی اور جاپان کی ریل گیاں استعمال ہونے لگی تھیں، اب وہ بھی دستیاب نہیں ہیں بلکہ ملوں کا بنا ڈور استعمال ہوتا ہے۔

لکھنؤ میں مانجھا اور ساوی بنانے والوں کے محلے الگ الگ تھے اور ہیں۔ گومتی کے اس پار ڈور والے رہا کرتے تھے اور وہ ڈور والا محلہ کہلاتا تھا۔ ساوی بنانے کے لیے سوت کے تار گن کر انھیں بٹ لیا جاتا تھا اور پھر چاول کی پیچ کا اس میں کلف دیا جاتا تھا اور پھر اسے سائے میں ایک ہفتہ تک سکھایا جاتا تھا۔ ساوی کے درجات اس میں بنے ہوئے تاروں سے مانے جاتے تھے۔ عام طور پر تین تار والی ساوی معمولی درجہ کی ہوتی تھی بہت سے رؤسا ۷، ۹، ۱۱، اور ۱۳ اور کبھی کبھی ۱۷ تاروں کی ساوی بھی بنواتے تھے۔ اس طرح کی اڑھا چڑھی ہوئی ساوی بہت اچھی مانی جاتی تھی۔

کسی بھی فن میں جب گراوٹ آجاتی ہے تو سماج میں ان فن کاروں کی حیثیت بہت گھٹ جاتی ہے اور ایسے وقت میں یہ فن کار اپنے آپ کو اور اپنے فن کو زمانے سے چھپانے لگتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی ہوا ہے لکھنؤ کے ڈور اور مانجھا سوتنے والے فن کاروں کے ساتھ۔ کشمیری محلہ کے پیچھے ایک محلہ ہے جسے گڑھیا اعظم بیگ کہتے ہیں۔ یہاں کے مانجھا سوتنے والے لکھنؤ کی ناک کہے جاتے تھے، ان میں بہت سے شرفا بھی تھے جو اسی محلے کے رہنے والے تھے۔ گڑھیا اعظم بیگ کا سوتا ہوا مانجھا لکھنؤ سے احمد آباد تک اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔

وقت کے ساتھ سارے فن کاروں اور فن کے طریقے بھی بدل جایا کرتے ہیں۔ مانجھا بنانے یا سوتنے کا فن لکھنؤ میں بہت کم ہو گیا ہے اور اچھے اچھے فن کے جاننے والے لکھنؤ سے باہر چلے گئے۔ گڑھیا اعظم بیگ کے چودھری بتن نواب صاحب، منن نواب صاحب اور اتو نواب صاحب تین بھائی اس صدی کے اوائل میں مانجھا سوتنے والوں میں سے تھے مگر قدر دانی نہ ہونے کی وجہ سے لکھنؤ چھوڑ کر احمد آباد چلے گئے اور وہاں مانجھا سوتنے کا پورا کارخانہ کھول لیا جس سے ان کو وہاں بہت عزت اور شہرت ملی اور لکھنؤ کی ایک الگ پہچان بھی۔

پہلے گھر کی چھتوں پر سے پتنگ لڑانے کا رواج نہیں تھا۔

اس زمانے میں کنکوے بازی کے مقابلے دریائے گومتی کے کنارے یا چار باغ ریلوے اسٹیشن کے قریب یا تحسین گنج جمعہ مسجد کے پاس یا گول دالان عقب شیش محل میدان میں ہوتے تھے۔ اس زمانے میں تعداد لڑانے والوں اور پیچوں کی مقرر کر لی جاتی تھی اور کس قسم کا کنکوا لڑے گا یہ بھی طے کر لیا جاتا تھا۔ چھوٹے پیچ میں سوا کے تین سے ایک چھ دس تک جس کا ٹھڈا ۲۱ انچ سے زائد نہ ہو اور بڑے پیچ میں پون تا دے سے لے کر پیچ کم تاؤ کے کنکوے جس کا ٹھڈا ۲۹ انچ سے زائد نہ ہو، لڑائے جاتے۔ یہ طریقہ آج بھی رائج ہے۔ چھوٹے پیچ میں لڑانے والوں کا درمیان کا فاصلہ دو سو فٹ مع کریز ہوتا ہے۔ پیچ لڑانے والوں کو طولاً دس گز اور عرضاً پانچ گز جگہ مقرر کر دی جاتی تھی جس کی حد بندی فرش یا کسی نشان خط سے ہوتی تھی۔ ہر پیچ میں تین منصف (امپائر) بھی ہوتے تھے۔ مگر اب یہ سارے سلسلے بدل گئے ہیں پہلے بڑے پیچ میں آٹھ سو گز سے کم کا پیچ نہیں ہوتا تھا جس میں دو سو گز مانجھا باندھا جاتا تھا۔ مگر تجربہ کار اور مشاق حضرات سو گز مانجھا کافی خیال کرتے تھے۔

شاہزادہ مرزا سلطان بخت مرحوم نے کبھی ۱۸ گز سے زائد مانجھا نہیں باندھا اور کسی وقت ان کا کنکوا اساڈی سے نہیں کٹا۔

کنکوا کس طرح لڑایا جاتا ہے اس کے بارے میں صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ بھی جیومیٹری ہے اور اسی کے اصولوں پر آسمان میں انگلی کے اشارے پر لڑائی ہوتی ہے۔ پیچ اوپر سے گدّا مار کر یا نیچے سے کھینچ کر یا داہنے اور بائیں سے بغلی مار کر کس طرح لڑایا جاتا ہے یہ بتانا یہاں بے محل ہے لیکن یہ بتانا بہت ضروری ہے کہ پیچ دو طرح کے ہوتے ہیں اکہرا اور دوہرا۔ عام طور پر لوگ اکہرا پیچ ہی لڑاتے ہیں کیوں کہ دوہرا پیچ لڑانا بہت مشکل اور تجربہ کا کام ہے۔ دوہرا پیچ ڈالنے اور اسے لڑانے کے لئے بہت صحیح زاویہ اور مناسب وقت پر بھرپور خط مارنا بہت ضروری ہے۔ جس وقت فریقین کے کنکوے قریب آ کر اور دوہرا پیچ لڑا کر ایک جیومیٹری کے زاویے پر آ جاتے ہیں اس وقت دماغ آنکھ، ہاتھ پیر، سانس سب پر قابو ہونا چاہیے بس یہی کام کرتا ہے دوہرے پیچ لڑانے والوں میں شاہزادہ مرزا سلطان بخت اور وزیر گنج کے نواب سید محسن (خاقان منزل والے) کا جواب نہیں تھا۔

کنکوے بازی ایک ایسا کھیل ہے جس میں اعلا سطحی مقابلہ ہوتا ہے اور یہ دنیا کے دوسرے کھیلوں کی طرح عروج پر آ سکتا ہے اور آ گیا بھی ہوتا مگر انگریزوں کی سیاست ہمیشہ انگریزی کھیلوں کو بڑھانے اور دیسی مشغلوں کو دبانے کی رہی اور اسی وجہ سے انھوں نے ان سارے مشغلوں کو عیاشی قرار دیا اور اپنے کھیلوں کو فروغ دیا مگر اس کے باوجود لکھنے والوں نے کنکوے بازی کو ایک مقابلہ، ایک پیچ اور ایک اعلا سطحی کھیل بنانے کی پوری کوشش کی۔ ۱۹۲۰ء کے بعد سے باقاعدہ اس کی مہم شروع ہوئی اس وقت یہاں چھ یا سات کلب موجود تھے۔ نواب کلب، نخاس کلب وزیر گنج کلب، مولوی گنج کلب، معزز کلب (امین آباد کلب)، ہیرو کلب چوک کلب اور اشرف آباد کلب وغیرہ۔ سب نے مل کر یہ مہم چلائی کہ کنکوے بازی، کرکٹ یا ہاکی کے کھیل سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اس بات کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کے لیے یہ طے ہوا کہ اس کے سارے اصول وغیرہ وضع کیے جائیں اور یہ کام اراکین وزیر گنج کلب کو سونپا گیا۔

اراکین وزیر گنج کلب نے کھیل کے سارے اصول اور میدان کی لمبائی چوڑائی وغیرہ طے کر کے انگریز سرکار کے حوالے کر دیے اور انھیں اصولوں پر ہی سب کلب کے اراکین گامزن رہے۔ اس کے لئے چار باغ اسٹیشن کے پیچھے اور گومتی کے کنارے دو میدان Stadium بنانے کی بھی تجویز رکھی گئی، مگر فرنگی حکومت نے ایک کان گونگا ایک بہرہ کر لیا، یہاں تک کہ دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی اور اس کے بعد ملک کا بٹوارہ ہو گیا اور یہ فن لکھنؤ سے ختم ہو گیا اور رہ گیا صرف مذاق۔

پرانے زمانے میں جو رؤسا اور نوابین کنکوے بازی کرتے تھے وہ اپنے کنکوے میں چاندی کا مقیش لگا دیتے تھے جس کی قیمت اس زمانے میں بھی پانچ روپیے ہوتی تھی، بعد میں کچھ کنکوے بازوں نے یہ طریقہ بنا لیا تھا کہ چاندی کے چھلّے پتنگ کے پتے میں باندھ دیتے تھے اس سے پتنگ کا وزن اچھا ہو جاتا تھا اور اس سے پتنگ لوٹنے والے غریب لوگوں کی مدد بھی ہوتی تھی۔ اس طرح اس شوق اور شغل سے سیکڑوں لوگوں کی روزی روٹی چل رہی تھی۔ یہ طریقہ ۱۹۵۰ء کے بعد ختم ہو گیا۔ ایک دوسری روایت کے مطابق

چھوٹے خاںصاحب کے گھر محلے والے نے ۱۹۹۰ تک یہ روایت قائم رکھی۔

گزشتہ ۲۰۰-۳۰۰ برسوں سے لکھنؤ کے بازاروں میں ایک طبقہ اور پیدا ہو گیا ہے جو مانجھے کی جگہ تار باندھ کر پتنگ اڑاتا ہے اور ہوا میں ہی کٹی ہوئی پتنگ کو اپنی پتنگ میں لپٹا لیتا ہے اور پھر دھیرے دھیرے اسے اتار کر لے آتا ہے پھر بہت سی پتنگیں جمع ہو جانے کے بعد وہ انھیں آزاد کر اڑاتا ہے

لکھنؤ کی پان والیاں

پان یوں تو سارے ہندوستان میں کھائے جاتے ہیں مگر لکھنؤ اور بنارس کے پانوں کی اپنی ایک الگ اہمیت ہے۔ بنارس اور لکھنؤ کے پان کھانے والوں میں ایک فرق ہے۔

بنارسی پان کھانے والے انگلی یا تنکے سے چونا چاٹتے رہتے ہیں۔ لکھنؤ والوں نے اپنی تہذیب میں اسے اچھا نہیں سمجھا کہ چونا الگ سے چاٹا جائے۔

لکھنؤ کے پان بہت مشہور ہیں۔ شاہی دور میں ہر فن کو عروج ہوا۔ پان لگانا بھی ایک فن قرار پایا۔ چنانچہ اس فن کو بھی ترقی ہوئی۔ لکھنؤ کی ہر محفل میں پان جزو لاینفک بن گیا اور خواتین کی محفل میں پان والیوں کا ہونا بھی بہت ضروری ہوتا ہے اور ہوتا تھا۔ عوام ہی میں نہیں، یہ پان والیاں شاہی درباروں میں بھی بہت مقبول تھیں۔ ان پان والیوں نے شاہی درباروں میں اپنے اپنے انداز کے پان لگانے میں مہارت دکھا کر اپنی ایک الگ جگہ بنالی تھی۔ لکھنؤ کی ہر محفل میں دسترخوان ہو یا نہ ہو، پان کا ہونا ایک رواج بن گیا تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ پان والیوں کا نام بھی جڑا ہوا تھا۔ پان کے لیے شاعروں نے غزلیں لکھیں۔ پان والیوں نے انھیں گایا اور پان کو ادب میں بھی جگہ مل گئی۔ ایک شعر ملاحظہ ہو:

یہ قیامت کا شوخ و پرفن ہے
یہ حسینوں کے لب کا جوبن ہے

چھمن پرشاد ورما مارگ پر ایک پان والی ہے شوتن۔ بہت مزے دار باتیں کرتی ہے۔ جگتیں کسنے میں کبھی چوکتی نہیں ہے۔ اس کی ایک لڑکی جس کی عمر تقریباً ۱۰ برس ہے، باتوں میں جتنی تیز ہے اس سے زیادہ پان لگانے میں۔ ایک بار ایک عاشق مزاج نوجوان نے اس سے کہا، "آج بہت اچھی لگ رہی ہو۔"

اس نے فوراً اپنی دوکان پر لگے شیشے کے اوپر لکھی اس عبارت کی طرف اشارہ کیا جس پر لکھا تھا۔

"یہاں صرف پانوں ہی سے منہ لال نہیں کیا جاتا!"

یہ ہیں آج کی پان والیاں — جو لکھنؤ کی تہذیب پر فاتحہ پڑھ چکی ہیں۔!!

شاہی زمانے میں چوک کی بعض طوائفوں نے اپنی جوانی ڈھلنے کے ساتھ ہی رقص و موسیقی سے اپنا ناطہ توڑ لیا اور کوٹھے سے اتر کر پان لگانے کا شغل اختیار کر لیا — بشیرن پان والی کی کہانی بھی کچھ ایسی ہی تھی۔

بشیرن پان لگانا اچھا جانتی تھی۔ بہت کم وقت میں لوگوں نے اس کا نام پان کے ساتھ جوڑ دیا تھا۔ لکھنؤ کے شریف زادے اپنے شوق کی تکمیل کے لیے رات کی تاریکی میں سب کی نظریں بچا کر کوٹھوں پر آتے تھے مگر وہ بشیرن کی نظروں سے نہیں چھپ سکتے تھے اور بشیرن اس سے فائدہ بھی اٹھاتی تھی۔ پان دیتے وقت ایک جملے میں سب کچھ کہہ دیتی تھی اور ایسا جملہ کہ شریف زادے گھبرا جاتے تھے۔

"میاں! وہ جمن آپ کے گھر کا نوکر تو نشہ لگانے والا ہر کوٹھے پر جا جا کر آپ کو تلاش کر رہا تھا۔ آپ کی والدہ نے آپ کو ڈھونڈوایا تھا۔"

"اچھا۔؟!" شریف زادے کے چہرے پر پریشانی کی لکیریں ابھر آئیں۔ "تو کیا تم نے بتا دیا۔؟"

"نہیں حضور۔ آپ کی پرانی نمک خوار ہوں۔ میں نے تو اسے ان سیڑھیوں کے نزدیک نہیں آنے دیا۔ مجھے معلوم تھا آپ اوپر تشریف رکھتے ہیں۔" — دو چار چکنی چپڑی باتیں کیں اور میاں کی جیب خالی کروالی۔!!

بشیرن کی بہن جس کا نام معلوم نہ ہو سکا، وہ بھی پان لگانے میں مشاق تھی۔ روزانہ ایک نئے پان کا نام نکالنا اور اس کے الگ مسالے تیار کرنا ہی اس کی تجارت تھی۔ اس کے بنائے ہوئے پانوں میں مغلائی، نوابی، نصیری، مہدی، اور بیگمی وغیرہ بہت دنوں تک چلتے رہے۔ پان میں

گلوری بنا کے خوشبو دار مسالے ڈال کر اسے چاندی کے ورق میں لپیٹ کر پیش کیا جاتا تھا اسے نصیری پان کہتے تھے۔ اسی طرح کے پانوں کا رواج نصیر الدین حیدر کے وقت سے چلا۔ پان میں زعفران کھانے کا رواج بھی انکے زمانے سے ہوا۔ زعفران پان کے ساتھ کھانے سے دو فائدے بتائے جاتے ہیں ایک یہ کہ پان کے ٹکڑے اور بھیگی ہوئی ڈلی کی کریں دانتوں میں نہیں پھنستیں دوسرے یہ کہ منہ میں لس بنا رہتا ہے۔ اس پان کا نام اس نے رسمی رکھا تھا۔

محلوں میں اور نوابین کے دولت کدوں پر خاص بہ دار عورتیں ایک ہی نام سے پکاری جاتی تھیں، انھیں "مغلانی" کہتے تھے۔ انھیں مغلانیوں کی ادا کے نام پر ایک پان کا رواج تھا جسے مغلائی پان کہتے تھے۔

پان کھانے کی شروعات دلی میں مغلوں کے زمانے سے ہوئی تھی لیکن صرف چونے کے پان سے۔ نور جہاں نے اس میں کتھے کا اضافہ کیا اور لکھنؤ والوں نے پان کے ساتھ سیکڑوں مسالے جوڑ دیئے۔ کچھ صاحب فہم حضرات اسی لیے چونے کے پان کو مغلائی کہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے دونوں ہی باتیں صحیح ہوں لیکن لکھنؤ کے شاہی محلوں میں چونے کے پان کھائے جانے کا کوئی واقعہ سننے کو نہیں ملتا۔ ایک شاعر کہتا ہے ؎

پان کھا کر بجھائی ہے مستی
سرِ شب ہے مگر شفق باقی

مستی کا رنگ سیاہی مائل ہوتا ہے اور شفق کا رنگ سرخ۔ مستی کے باوجود پان کا سرخ رنگ صاف دکھائی دے رہا ہے۔ پان میں آنے والی یہ سرخی بغیر کتھے کے نہیں آ سکتی اس لیے پہلی بات بھی صحیح معلوم ہوتی ہے۔

ایک تیسری روایت اور بھی ہے کہ نصیر الدین حیدر کے محل میں مغلانی بیگم نام کی بھی ایک عورت تھی۔ ہو سکتا ہے نصیر الدین حیدر نے اسی کے نام پر کسی خاص پان کو مغلائی پان کا نام دیا ہو۔

بہر حال یہ بات طے ہے کہ نصیر الدین حیدر کے محل میں پان کھلانے کی خدمت جو عورتیں انجام دیتی تھیں انھیں بادشاہ کی طرف سے "ڈیوڑھی خوابی" پان کھلا کر ہر ایک کی انگلیوں میں گلوری کا سا لگتا تھا، ہم اور سے سنتے ملتے کہ کہاں کی کری تھی

[illegible]

اس طرح کی پان والیاں اکثر دکھائی دیتی تھیں۔ گو تھا چھٹنے کے بعد بھی محفل کی تمنا ان عورتوں کے دلوں میں رہتی تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ پان کے بہانے رنگین لوگ ان کے پاس آتے رہیں اور کچھ نہیں تو ان کی دکان پر ہی محفل جمی رہے۔ محفل جمائے رکھنے میں سب سے مشہور بھولا اتی صاحب گنج میں فوروزی کے ہتھیار خانے کے پاس اس کی دکان تھی۔ اس کے چاہنے والے چوک چھوڑ کر یہاں آتے تھے۔ دھڑی کا پان کھاتے اور گھنٹوں بیٹھے اس کی میٹھی میٹھی باتیں سنا کرتے۔ ایسی ہی پان والیوں کے یہاں سے پان میں افیم اور کوکین کھانے کا چلن ہوا۔

ان پان والیوں نے ہی پان میں جان ڈالی اور اسے سماج کا ایک رواج بنا دیا۔ پانوں میں کشتے اور تمباکو کے مسالے کھائے جانے لگے۔ اودھ کے آخری بادشاہ واجد علی شاہ کی پہلی بیگم سلطان عالیہ عالم آرا کے پاس کئی عمدہ پان والیاں نوکر تھیں اور ان کا خرچ دو ہزار روپیہ ماہوار تھا۔

دعوتِ عام ہو یا دعوتِ خاص، اگر کھانا کھانے کے بعد پان پیش نہیں کیا گیا تو میزبان جاہل اور بدتمیز مانا جاتا تھا۔ لکھنؤ کی تہذیب میں پان اس کا ایک حصہ تھا۔

جس معاشرے میں پان کھانا اس حد تک ضروری ہو اس معاشرے میں پان والیوں کی کیا حیثیت ہوگی یہ بات سمجھنا مشکل نہیں ہے۔ شاہی محل میں پان والیوں کی حیثیت سے کمپنی بہادر کے چھپے ہوئے وفاداروں نے انگریزوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔ شاہی حکیم سے نظر بچا کر ان کے نام کا استعمال کیا اور پان والیوں کو لالچ دے کر اپنی طرف ملا لیا۔ تمباکو، ڈھپتی جسے بعد میں چائے کا نام دیا گیا، انڈا، سنکھیا، توتیا، بادام اور دھتورے کے ہرے پتے سے ملا کر بادشاہِ وقت کے لئے ایک کشتہ تیار کیا گیا یہ کشتہ بہت خوش ذائقہ دار تھا اور اس میں زعفران ملا کر اسے خوشبودار بنایا گیا تھا۔ اس طرح کے کشتوں کا استعمال عموماً قوتِ باہ کے لئے امجد علی شاہ کے وقت میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ مگر سلطان عالم واجد علی شاہ کے دور میں انہی پان والیوں نے دغا کی اور اس کشتہ کا استعمال کثرت سے بادشاہ کو کرا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرسام کی کیفیت ہو گئی اور ۱۸۴۷ء سے ۱۸۵۱ء تک تقریباً چار برس بادشاہ بہت بیمار رہے۔ اور اس طرح انگریز اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔

[illegible]

[illegible] ختم ہو گیا۔ اس تہذیب کی [illegible] ختم [illegible] اس لیے تہذیب کا وہ دور بھی ختم ہو گیا۔

اب نہ وہ باتیں ہیں نہ وہ ماحول ہے۔ پان والیاں آج بھی لکھنؤ میں [illegible] اور حاضر جواب لیکن وہ بات کہاں۔ اب تو صف [illegible] کے [illegible] ایک غزل کے کچھ اشعار کو بجے [illegible] کی تہذیب کی چند جزئیں ہوکر احساس کے پردے پر چمک جاتی ہیں۔

پان ایک شے لطف کا ہے نام
جس کو کھاتے ہیں اہل ہند تمام
یہ قیامت کا شوخ پرفن ہے
یہ حسینوں کے لب کا جوبن ہے
اس کی قسمیں بہت سی ہیں لیکن
جن کی تعریف ہو نہیں سکتی
کتھا چونا الائچی چھالیہ
بامزہ اس سے خوب ہوتا ہے پان

□□

کشمیری محلہ ...... صفحہ ۴۴ کا بقیہ

کشمیری محلہ اب صرف کشمیری پنڈتوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ہر ذات و فرقے کے افراد یہاں رہ رہے ہیں۔ بدقسمتی سے گزشتہ تیس برس میں اس محلے میں کوئی ترقیاتی کام نہیں ہو سکا ہے۔ وہ ساری بنیادی سہولتیں یہاں کے لوگوں کو میسر نہیں ہیں جو عموماً ہر شہری کو ملنی چاہیے۔ غالباً اب یہ محلہ زوال کا شکار ہے اور یہاں کھنڈرات ویرانی کے آثار نمایاں ہیں۔ شاید یہ سمجھا گیا کہ یہ تاریخی یادگار ہے اور بس۔ حالانکہ ایک حد تک درست ہے اس لیے کہ یہاں ہر قدم پر تاریخ کے نقوش مل جاتے ہیں۔

لکھنؤ کے گنج بازار نگر ... صفحہ [illegible] کا بقیہ

بازار

کھیالی بازار۔ [illegible] بازار۔ [illegible] بازار۔ آئینہ بازار۔ [illegible]
جلال بازار۔ [illegible] بازار۔ [illegible]

نگر

خندق نگر۔ عالم نگر۔ فاضل نگر۔ [illegible] نگر۔ سبحان نگر۔ رستم نگر
ارادت نگر۔ واجد نگر۔ [illegible] نگر۔ سروجنی نگر۔ اندرا نگر۔ شاستری نگر۔ [illegible] نگر
چندر بھان گپت نگر۔ بادشاہ نگر۔ گومتی نگر۔ [illegible] نگر۔ [illegible] نگر۔

گنج

علی گنج۔ بابو گنج۔ چاند گنج۔ منشی گنج۔ ڈالی گنج۔ حسن گنج۔
مفتی گنج۔ مصاحب گنج۔ ٹھاکر گنج۔ بالک گنج۔ رام گنج۔ حسین گنج۔ نواز گنج
تحسین گنج۔ محبوب گنج۔ دولت گنج۔ سعادت گنج۔ ہواتی گنج۔ ترمنی گنج۔
مہدی گنج۔ حیدر گنج۔ نور گنج۔ شاہ گنج۔ یحییٰ گنج۔ رکاب گنج۔ مشک گنج۔
مولوی گنج۔ وزیر گنج۔ گولا گنج۔ فتح گنج۔ گنیش گنج۔ بشیر گنج۔ جگل گنج۔
امان گنج۔ نخاس گنج۔ رانی گنج۔ بیگم گنج۔ پانڈے گنج۔ اودے گنج۔ نشاط گنج
حضرت گنج۔ حسین گنج۔ بالا گنج۔

دہلی کی طرح لکھنؤ میں بھی کوچوں کی موجودگی معلوم نہیں ہوتی۔ وفات انیس اور دبیر (۱۸۷۴-۱۸۷۵ء) کے بعد کوچہ میر انیس و کوچہ مرزا دبیر یا پھر تیاگانوں میں کوچہ میر علی جان کے علاوہ کوئی اور کوچے معلوم نہ ہو سکے۔

□□

[illegible]. ایس. شرما
[illegible] کشمیری محلہ لکھنؤ

کشمیری محلہ

آج کی زندگی میں شہر اور محلے کی کیا اہمیت ہے؟ لیکن ذرا غور تو کیجیے، اودھ اور کشمیر کے تعلق طر کشمیریوں کو گومتی کا کنارا کتنا پسند تھا اور اہلِ لکھنؤ کو کشمیر کتنا پیارا تھا اس کا جیتا جاگتا ثبوت کشمیری محلہ ہے۔ لکھنؤ میں اور کسی صوبے کے نام پر کوئی محلہ نہیں ہے۔

کشمیری پنڈتوں نے جس طرح اردو اور لکھنؤ کو سنوارا اس پر تو کتاب لکھی جا سکتی ہے لیکن خاکسار کچھ نام لکھ رہا ہے مثلاً دیا شنکر نسیم۔ سرشار، وشنو نرائن در۔ آنند نرائن ملا۔ ناول نگار کول۔ اور ان سب سے بڑھ کر اردو کا لافانی مجاہد۔ سر تیج بہادر سپرو ـــــ ناموں کی ایک کہکشاں ہے لیکن اس نام کے بعد کوئی نام نہیں لکھا جا سکتا تاہم یہ اشارہ کر کے میں اپنی بات ختم کرتا ہوں کہ جب تک اردو اور اردو تہذیب زندہ ہے نہ ہم کشمیر سے الگ ہو سکتے ہیں اور نہ کشمیر ہم سے۔

ـــــــــــــ الف ع

کشمیری پنڈت فارسی میں اچھی استعداد رکھتے تھے، ساتھ ہی ساتھ انتظامی صلاحیت اور سوجھ بوجھ بھی ان کی بدرجۂ اتم ہوا کرتی تھی اسی وجہ سے دہلی اور اودھ کے نوابوں کے یہاں انھیں اعلا منصب ملا کرتے تھے۔

جب [illegible] میں اپنی والدہ بہو بیگم صاحبہ سے اختلافات کی بنا پر نواب آصف الدولہ نے فیض آباد کو چھوڑ کر لکھنؤ کو اپنا پایۂ تخت بنایا تو کشمیری پنڈتوں کے بہت سے خاندان لکھنؤ چلے آئے اور ایک محلے میں آباد ہوتے گئے جسے بعد میں کشمیری محلے کے نام سے موسوم کیا گیا۔ [illegible] کے آس پاس یہ محلہ پوری طور سے آباد ہو گیا تھا۔

[illegible] کی مردم شماری کے مطابق کشمیری محلے میں ۲۱۹ کشمیری پنڈت [illegible] کی اکثریت اہم سرکاری عہدوں پر فائز تھی۔ اس محلے کی خصوصیت یہ بھی تھی کہ یہاں کشمیری برادری کے ممتاز افراد رہتے تھے اور یہ بھی کہ اس محلے میں کشمیری پنڈت برادری کے کھانے اور ان کی انفرادیت برقرار رکھنے کا ایک ذریعہ بھی یہ محلہ تھا اس محلے میں اپنے باشندوں کی سماجی، تفریحی اور تہذیبی مراسم ادا کرنے کی ساری سہولتیں موجود تھیں۔ اس لیے اس تاریخی محلے میں کشمیری پنڈت تائین کو محلے کے باہر جانے کی کبھی ضرورت ہی نہیں پیش آئی البتہ مرد اپنی کاروباری یا تہذیبی سرگرمیوں کی بنا پر اس چھوٹی سی دنیا کے باہر جایا کرتے تھے۔

کشمیری محلہ کشمیری پنڈتوں کی ذات برادری کی سرگرمیوں اور اجتماعات کا اہم مرکز تھا جس سے کشمیری پنڈتوں کی سالمیت برقرار رہی۔ کشمیری محلے کے سالانہ اجتماعات میں ایک تقریب "رشی پیر کا جگ" بھی ہوا کرتی تھی۔ کشمیری محلے کے افراد اکثر بھولا ناتھ کے باغ میں اکٹھا ہوا کرتے تھے۔ یہ باغ ایک کشمیری پنڈت کے خاندان کی ملکیت تھا اور اس طرح کی تمام سرگرمیوں کا مرکز۔

[illegible] محلے میں ایک [illegible] شادی [illegible] مقابلہ شادی کی تقریب [illegible] ساتھ جلسے بھی ہوا کرتے تھے۔ اس شادی [illegible] کی [illegible] کے آخری اور بیسویں صدی کے آغاز میں کشمیری پنڈتوں کی [illegible] کانفرنس بھی منعقد ہوتی تھی۔

[illegible] برج نرائن بہادر نے سرتیج بہادر سپرو اور پنڈت [illegible] نرائن [illegible] کی صدارت [illegible] ازائی اور ان کی تحریک پر کشمیری برادری کے بچوں کے لیے کشمیری محلے میں ایک کانگریس اسکول قائم کیا تھا۔ پنڈت بشن نرائن در کے نام سے اردو ادبی دنیا بہ خوبی واقف ہے۔ انھوں نے [illegible] میں بیرسٹری کا امتحان پاس کیا اور لندن سے آئے۔ ان کی انقلابی تقاریر کی بنا پر وہ کانگریس کے ۱۹۱۱ء کے کلکتہ سیشن کے صدر بھی چنے گئے۔ ان کے بہت سے مضامین اردو میں شائع ہوتے تھے۔ ایک مضمون کی بہت شہرت ہوئی جس میں انھوں نے فسانۂ آزاد اور فسانۂ عجائب کے اسلوب کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔

کشمیری پنڈتوں نے اس محلے میں اپنے لیے جو رہائش گاہیں بنوائی تھیں انھیں حویلی کہا جاتا تھا۔ حویلی کے دو حصے ہوا کرتے تھے، ایک زنانخانہ اور ایک مردانہ۔ ان حویلیوں کے طرز تعمیر پر ایرانی فن تعمیر کا بہت اثر تھا ان کے بہت سے حصوں کے نام بھی ایرانی طرز کے ہوا کرتے تھے۔ مثلاً غلام گردش، محراب، ستون وغیرہ۔

فیض آباد سے لکھنؤ آنے والوں میں جن کشمیری پنڈتوں کے آبا و اجداد شامل تھے ان میں پنڈت دیا شنکر نسیم اور پنڈت تربھون ناتھ سپرو ہجر اور پنڈت برج نرائن چکبست کے خاندان تھے۔ کول شرفا کے لوگ دربار اودھ کے خاندانی وثیقہ دار اسی محلے میں رہا کرتے تھے۔ اور یہ کشمیری پنڈتوں کے مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ نوابی دور میں کشمیری محلہ اشراف، سرکاری اہل کاروں اور دانشوروں کا محلہ سمجھا جاتا تھا۔ مختلف ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں میں ان لوگوں نے اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ نسیم اور چکبست جیسے شاعر، رتن ناتھ سرشار جیسے ناول نگار اردو ادب کی تاریخ کے روشن اور درخشندہ ستارے ہیں۔

تحریک آزادی کے ابتدائی دنوں میں کشمیری محلہ کانگریس اسکول سیاسی سرگرمیوں کے مرکز کی حیثیت رکھتا تھا اس لیے کہ پنڈت موتی لال نہرو، سرتیج بہادر سپرو [illegible] جیسی ہستیاں [illegible] بھی یہاں آیا کرتے تھے اور سیاسی مسائل پر تبادلۂ خیال کیا کرتے تھے۔

کشمیری محلے میں شرفا خاندان کی سات نسلیں گزر چکی ہیں۔ پنڈت شیام منوہر لعل شرفا (۱۸۷۴ء تا ۱۹۵۲ء) کے آبا و اجداد آصف الدولہ کے ساتھ فیض آباد سے لکھنؤ آئے تھے۔ شیام منوہر لعل شرفا کلکٹر گنج جیسے معمولی شہرت کے حامل تھے۔ اردو، فارسی اور سنسکرت کے عالم ہونے کے ساتھ بڑے اچھے شاعر بھی تھے۔ شرفا خاندان کو اودھ دربار سے وابستگی کی بنا پر بہو بیگم صاحبہ کا وثیقہ آج تک ملتا ہے۔

پنڈت شیام منوہر کو ۱۹۲۳ء میں ان کی خدمات کے سلسلے میں برٹش سرکار نے رائے بہادر کا خطاب دیا تھا۔ انھوں نے ۱۹۱۶ء میں اس علاقے میں لکھنؤ میونسپل بورڈ کی طرف سے ایک پارک بنوایا تھا جس کا نام شرفا پارک رکھا۔ اپنی سماجی سرگرمیوں اور منفرد طرز عمل کی بنا پر ہی رائے بہادر کشمیری محلے میں عام طور سے جج کے نام سے پکارے جاتے تھے۔

۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان کو آزادی ملی تو بہت سے کشمیری پنڈتوں کو لکھنؤ سے باہر اچھے اچھے عہدے ملے اور اسی لیے کشمیری پنڈتوں کے بہت سارے خاندان ایک بار پھر ہجرت کرکے بدلے ہوئے سیاسی منظرنامے میں ان کے لیے روزگار کے بہترین ذریعے اور امکانات اور مواقع دوسری جگہوں پر تھے۔ اسی لیے وہ جس طرح فیض آباد سے لکھنؤ آئے تھے۔ اسی طرح یہاں سے بھی چلے گئے اور ان کی جگہ پر دوسرے لوگ آکر آباد ہو گئے۔ انھیں لوگوں میں نواب جعفر علی خاں اثر بھی تھے جو کشمیر ریاست کے وزیر بھی رہ چکے تھے۔ انھوں نے بہت بڑی حویلی خریدی تھی ان کے کوئی لڑکا تو نہیں تھا لیکن ان کی نواسیاں آج بھی اپنے آبائی مکانات میں فروکش ہیں۔ اثر صاحب کے علاوہ معروف کاشتوں کے کچھ خاندان آکر آباد ہوئے تھے۔ پنڈت رام نرائن بخشی جو بہت بڑے زمیندار تھے ان کے یہاں اولاد [illegible] انھوں نے ایک فقیر سے [illegible] کانگریس اسکول کے پاس ایک مسجد بنوا [illegible] انھوں نے مسجد بنوا دی [illegible] نہیں ہیں انھوں نے [illegible]

باقی صفحہ ۴۴ پر

جشنِ جمہور

جشنِ جمہور ہے آج اے شاعرو
اپنے آزاد نغموں کو آواز دو
جانِ صحنِ چمن، گل بداماں اٹھو
داستانِ بہاراں مرتب کرو
جشنِ جمہور ہے آج اے شاعرو

اپنا پرچم فضاؤں میں لہرا گیا
اک نیا رنگ اور روپ بکھرا گیا
داستاں جن شہیدوں کی دہرا گیا
ان شہیدوں کی یادیں جگاتے چلو
جشنِ جمہور ہے آج اے شاعرو

ساز کے تار جیسے مچلنے لگے
جیسے گیتوں میں جذبات ڈھلنے لگے
جیسے نغموں کے چشمے ابلنے لگے
آؤ محفل جگاؤ اے نغمہ گرو
جشنِ جمہور ہے آج اے شاعرو

جامِ کہنہ میں سرمستیٔ نو ملی
جیسے ہم کو حیاتِ آفریں رو ملی
جیسے تاریکیوں کو نئی ضو ملی
ایک دولت ہے، دولت یہ ضائع نہ ہو
جشنِ جمہور ہے آج اے شاعرو

ہاں مگر، راہزن کچھ مچلنے لگے
فتنہ کوشی کے اقسام ڈھلنے لگے
چند بیٹوں میں طوفاں سے چلنے لگے
[illegible]
[illegible]

نیل کنٹھ

[illegible]

ہے پرانی بات لیکن کس قدر ہے جاوداں
اس کا افسانہ نہیں محتاجِ اظہارِ بیاں
دیوتا کے ساتھ دانو مصلحت سے جٹ گئے
سب کے سب یکجا ہوئے اور ایک مت سے جٹ گئے
کام تھا جتنا یہ مشکل اتنا آساں ہو گیا
نادرات ابھرے سمندر کا منتھن جس دم ہوا

منتھ کے بحرِ بےکراں سے جب نکالے دو گھڑے
اک میں امرت ایک میں وِش جان کے لالے پڑے
وہ تپش اٹھی کہ پربت آنچ سے گلنے لگے
دیوتا دانو سبھی اس آنچ سے جلنے لگے
وقت کے کارِ نمایاں سے عجب تھی بےحسی
زندگی بربادیٔ حالات سے گھبرائی ہوئی

چرخ پر سنولا گیا تھا آفتابِ زرنگار
تھا اندھیرا ہر طرف چھایا تھا اک کالا غبار
چار سو یہ شور برپا تھا قیامت آ گئی
بزمِ رنگ و بو کے مٹ جانے کی ساعت آ گئی
چھوڑ دی شیو نے سمادھی اور انہیں آیا جلال
بزمِ عالم کو بچانے کا انہیں آیا خیال

بڑھ رہا تھا ہاتھ پھیلائے ہوئے کوئی عتاب
منتظر تھا ایک طوفانِ بلا بن کر عذاب
یہ زمین و آسماں زیر و زبر ہونے کو تھے
بچ نہ پاتا کوئی بھی اس آتشِ زہراب سے
پی لیا شیو نے ہلاہل جان کر آبِ حیات
بچ گئی تاراج ہونے سے یہ بزمِ کائنات

جس میں امرت کا گھڑا ہے وہ زمیں پر آگ ہے
سارا عالم جانتا ہے وہ زمیں پر آگ ہے
ذرہ جس کا آئینہ ہے وہ زمیں پر آگ ہے
آسماں سے جو سوا ہے وہ زمیں پر آگ ہے
[illegible]
[illegible]

احتشام حسین ندوی
محلہ میراں پورہ، پوسٹ ٹانڈہ
ضلع فیض آباد

پروین شاکر کی شاعری

وہ پروین شاکر، جس نے بڑے پُراعتماد لہجے میں کہا تھا۔

کانٹوں میں گھرے پھول کو چوم آئے گی لیکن
تتلی کے پَروں کو کبھی چھلتے نہیں دیکھا

آخر اس پر ایسی کیا گذری۔ کس گل مراد کو چھونے کی کوشش میں خاردار حالات نے اس کے پروں کو چھیل کر لہولہان کردیا ہے۔ بے رحم ساعتوں نے نارسائی کا کون سا پتھر رگِ جاں میں اتار دیا کہ اسے شکست خوردہ لہجے میں کہنا پڑا۔

ہم تو سمجھے تھے کہ اک زخم ہے بھر جائے گا
کیا خبر تھی کہ رگِ جاں میں اتر جائے گا

وہ جو آندھیوں کی ایسی مزاج آشنا تھی کہ اسے یقین کامل تھا کہ اگر اس نے خود اپنے ہاتھوں اپنے گھر کو منہدم نہ کرلیا تو آندھیاں اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گی۔ تو کیا اس نے آندھیوں کا مزاج سمجھنے میں غلطی کی تھی یا آندھیوں نے اس کی فصیل پُراعتمادی کا کوئی ایسا کمزور گوشہ تلاش کرلیا جس سمت سے حملہ آور ہوکر طوفان کی زد میں آئے پھول کی طرح اسے ٹکڑے ٹکڑے کرکے فضا میں بکھیر دیا۔ وہ جسے تیرگی کو آنکھوں کا کاجل بناکر اندھیروں کو اُجالے میں تبدیل کردینے کا فن آتا تھا کس بے سمت راستے پر چل پڑی کہ چند قدم چلنے کے بعد ہی اسے محسوس ہوا کہ:

" یہاں سے چراغوں کی حد ختم ہوگئی ہے اور آج سے اس کا راستہ اور ہے "۔ وہ جس کے پاؤں میں تتلیوں کی بے چینی ایسی تھی کہ بمشکل پل بھر کے لیے چھاؤں میں اور پھر ہواؤں میں ہوتی۔ کس کم حوصلے سے متاثر ہوگئی ہے کہ تھم تھم چل کر ہی چھاؤں کی آرزو سر اٹھانے لگتی ہے۔ وہ پروین شاکر جس کا نام بخت آزماؤں میں تھا، کیوں اتنی عاقبت اندیش ہوگئی ہے ٹوٹی کشتی کو بھی آگ سے بچانے کی فکر میں ہے۔ آخر وہ غم کا کون سا سیلاب ہے جس کی شدت سے گھبرا کر وہ ضبط کی شہر پناہوں کی سلامتی کی دعا مانگ رہی ہے۔ آخر کس نے اس کے باغ حیات پر خزاں مسلط کردی جس کی مسلسل چیرہ دستیوں نے اسے آمدِ فصلِ بہار کے تیقن ہی سے محروم کردیا اور انتہائی حسرت زدہ انداز میں یہ کہنے پر مجبور کردیا۔

کبھی تو ہو مرے کمرے کا ایسا منظر بھی
بہار دیکھ کے کھڑکی سے مسکرائی ہو

کسی بھی رُت میں پھر ہرا ہونے کی امید کھوکر اس نے شجرِ جاں ہی کو جلا دیا اور ایسا کرنے پہ مجبور ہوگئی تھی کیوں کہ اس نے ہر اسم پڑھ کر دیکھ لیا مگر پتھرایا ہوا شہرِ دل جادو کے اثر سے نہ نکلا، اس بلبل ہزار داستان پہ نہ صرف سکوت طاری کردیا بلکہ اس شہرِ کرب اس دشتِ بلا نیز اس جادو کے اثر سے نکلنے کے لیے اسے یہ دعا مانگنی پڑی۔

یارب مرے سکوت کو نغمہ سرائی دے
زخمِ ہنر کو حوصلۂ لب کشائی دے
شہروں کی تشنگی پہ بھی ثابت قدم رہوں
دشتِ بلا میں رونے مجھے کربلائی سے

اور اب جبکہ شہزادی کے جسم سے بیشتر جادو کی سوئیاں نکل چکی ہیں اور ہر سکوت بھی ٹوٹ چکا ہے، ہوش و حواس نے اپنا کام کرنا شروع کردیا ہے تو پتہ چلا کہ صرف گویائی بلکہ شہزادی کا تخت و تاج بھی غائب ہیں۔ شہزادی نے پھر کلام کہا شاں ہکی شروع کردی لیکن بدلے ہوئے حالات میں اس کا لہجہ بھی بدلا ہوا معلوم ہوتا ہے

لیجیے اسی سے پہلے کہی گئی منظوم کہانی کا یہ شعر دیکھیں ؎

کانپ اٹھتی ہوں میں یہ سوچ کے تنہائی میں
میرے چہرے پہ ترا نام نہ کوئی پڑھ لے

اور اب سیلابِ رنگ و بو، سحرِ جذبات اور نشۂ خود سپردگی کے زیرِ اثر وادیٔ شباب کے نشیب و فراز کی ہر ان کہی داستان بے جھجک کہتے کہتے اچانک سحرِ تنہائی کا شکار ہو کر وادیٔ حسن و عشق سے نکل کر دشتِ کرب و بلائے زندگی کی پتھریلی زمین پر آنکھیں کھولنے اور گویائی واپس آنے کے بعد پھر یک بار وہ منظوم کہانی کہنی شروع کر دی ہے مگر اب نہ شہر کے نیم رس شگوفوں سے اکتا کر تازگی سے ملنے تتلی آتی ہے نہ پریاں کہانی کہنے آتی ہیں، نہ چاندنی رات لوری دیتی ہے نہ اس کی آنکھیں بند کر کے کوئی شرارت سے ہنستا ہے نہ جان بوجھ کر بوجھے جانے کا تماشہ ہوتا ہے اور اب نہ اس کے تن میں کوئی ایسا منتر ہی رہا ہے کہ ہوائیں بھی اسے چھو لیں تو راستہ بھول جائیں لیکن چوں کہ زندگی کا تسلسل جاری ہے لہٰذا کہانی کا تسلسل بنائے رکھنا ضروری ہے اور وہ بھی بدلے ہوئے لہجے میں جو اسے خود بھی اجنبی معلوم ہو رہا ہے۔ بایں وجہ کچھ جھجک سی رہی ہے ؎

میں شہرِ گل میں زخم کا چہرا کسے دکھاؤں
شبنم بدست لوگ تو کانٹے چبھو گئے

اپنی تنہائی اور بے ردائی کا احساس اسے مارے ڈال رہا ہے۔ یہاں ایک سوال قائم ہوتا ہے یہ بے ردائی کیسی ہے، کیوں ہوئی۔ وادیٔ رنگ و بو میں مصروفِ گلگشت شہزادی کو دشتِ کرب و بلائے زندگی میں کون لے آیا تو آیئے اسی کی کہی ہوئی کہانی کا بغور جائزہ لیں شاید ان عوامل کا پتہ چل ہی جائے۔ لیجیے وجہ بھی معلوم ہو گئی ؎

کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اس نے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

پہلے یہ تو معلوم ہو گیا کہ وہ رشتۂ رفاقت جس سے سارے رنگ برستے تھے اور ساری خوشبوئیں جس سے عبارت تھیں ایک لفظ۔ طلاق نے توڑ دیا اور "طلاق کے کالے جادو" نے ساری لطافتیں اور رعنائیاں چھین کر زندگی میں اداسی، تنہائی کی سیاہیاں بھر دیں لیکن اس کی وجہ طلاق کیا تھی کچھ وجوہات ضرور رہی ہوں گی کیوں کہ اتنی سنگین بات بے وجہ تو ہو نہیں سکتی۔ اس کی وجوہات جاننے اور اس کا تجزیہ کرنے کے لیے فریقین کے بارے میں پوری جانکاری ضروری ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ پروین شاکر کے بارے میں ان کے افکار و اشعار کی مدد سے تو بہت کچھ جانا جا سکتا ہے لیکن فریقِ ثانی کے بارے میں کوئی دستاویزی ثبوت موجود نہیں ہے لہٰذا حتمی طور پر کچھ کہنا ممکن نہیں ہے پھر بھی اگر پروین شاکر نے اس بارے میں کوئی عقدہ کشائی کی ہے تو اسی پر اعتبار کرتے ہوئے تجزیہ کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے تو آیئے اسی لحاظ سے جائزہ لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں پروین شاکر کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

سچ تمھارے سارے کڑوے تھے مگر اچھے لگے
پھانس بن کر رہ گیا بس ایک افسانہ ہمیں

اس شعر میں کوئی واضح بات تو نہیں کہی گئی ہے لیکن بات چوں کہ اشاروں کی زبان میں کہی گئی ہے لہٰذا ایک افسانہ جو پھانس بن کر رہ گیا ہے فریقِ ثانی کے کردار پر ایک شک کی لکیر ضرور کھینچتا ہے۔ ایک اور شعر جس میں واضح اور حتمی طور پر فریقِ ثانی پر الزام لگایا گیا ہے:۔

تم موجِ موج مثلِ صبا گھومتے رہو!
کٹ جائیں مری سوچ کے پر اس سے تم کو کیا

ایک اور شعر جس میں پروین شاکر نے اپنے فطری (نسوانی) لہجے میں فریقِ ثانی کے کردار کو اجاگر کیا ہے ؎

وہ کہیں بھی گیا لوٹا تو مرے پاس آیا
بس یہی بات ہے اچھی مرے ہرجائی کی

اسی ضمن میں ایک اور شعر ملاحظہ ہو ؎

وہ آج پھر مجھے سوتے میں ڈسنے آئے گا
وہ جانتا ہے کہ چڑھتا ہے مجھ پہ زہر کا رنگ

محولہ بالا شعر میں جو بات کہی گئی ہے وہ انتہائی خود غرض اور عیاش و بدکردار شوہر کی پہچان ہے جو یقیناً انھیں زندگی کے کرب و بلا میں گھیر کر لے آیا ہے پروین شاکر نے جب میدانِ کرب و بلائے زندگی میں لشکرِ شدائد و مصائب اور رنج و غم میں گھری ہوئی اپنی ذات کو یکہ و تنہا پایا تو اس المیاتی احساس کی گرفت سے ذہن و دل کو آزاد کرانے کے لیے بطورِ علاج

پاشکستہ اپنے آپ کو مجبور کر کے کرناٹک ... کربلا میں غرق کر دیا جس کا نتیجہ بھی شکست ہی حاصل ہوا۔ ملاحظہ فرمائیں ہے

اسیر کربلا جب یاد آئیں
کہاں تک ہے چھڑا زنجیر بھائی کا

سطور بالا میں صرف دو وجوہات کی بات کہی گئی ہے لیکن بات چونکہ پروین شاکر کی شاعری کی ہے لہٰذا اس تعلق سے ان کے سلیقۂ اظہار خیال کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ اگر بات صرف اتنی ہی ہوتی کہ اپنا غم بھلانے کے لیے سانحۂ کربلا کا تذکرہ کرنا تھا تو مکمل طور پر وہ جہت اختیار کر لی تھی جسے "رثائی ادب" کہا جاتا ہے لیکن مشکل یہ تھی کہ رثائی ادب کا خاصہ ہے کہ منظر یا پس منظر کسی بھی صورت میں میدان کربلا اور واقعات کربلا سے ہٹ کر کسی اور بات کا متحمل نہیں ہو سکتا جب کہ انھیں اس "اظہاریہ" کا استعمال اپنی زیست یا ذات کو معتبر کرنے کے لئے کرنا تھا اور مفہوم کی اتنی تہہ داری کی گنجائش صنف غزل کے علاوہ اور کسی صنف میں موجود نہیں ہے لہٰذا انھوں نے اسی صنف کا سہارا لیا ہے

آستیں کے سانپوں کی پہنیں گے گلے میں مالا
اہل کوفہ کو نئی شہر پناہی دیں گے

جن عوامل نے گھیر کر پروین شاکر کو اس راستے پر ڈالا تھا وہ سب آمادۂ منافقت ہو گئے لیکن وہ اس راہ پر چلنے کے لئے مجبور تھیں جو کشاں کشاں انھیں مقتل شوق کی طرف لے جا رہا تھا۔ کیوں کہ رواج و سماج نے کوچۂ قاتل کے سوا سارے راستے بند کر دیئے تھے اور پروین شاکر کے پاس آستین کے سانپوں کی مالا گلے میں پہننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا ہے

دشمن کے ساتھ میرے دوست بھی آزاد ہیں
دیکھنا ہے کھینچتا ہے مجھ پہ پہلا تیر کون

زندگی کے کرب و بلا میں تن تنہا کر شاکر کے رفیق زندگی ساتھ چھوڑ جاتا ہے اور جیسا کہ مردوں کی برتری والے سماج میں ہمیشہ ہوتا رہا ہے کہ سارا قصور عورت کے سر تھوپ کر طعن و تشنیع کے تیر و نشتر کا رخ پروین شاکر کی جانب ہو جاتا ہے اور اس میں اپنے اور پرائے اور دوست و دشمن کی کوئی تخصیص نہیں اور ایسا واقعہ پروین کے ساتھ پیش بھی آیا، ان کے بہت سے اپنوں یعنی اعزا و اقربا نے بھی پروین کا ساتھ چھوڑ کر معلمت ... ۔۔۔ کا تاج سر پر رکھ کر زنِ ثانی کی حیثیت اختیار کی۔

ردا چھنی مرے سر سے مگر میں کیا کہتی
کٹا ہوا تو نہ تھا ہاتھ میرے بھائی کا

پروین شاکر کو اپنی بے ردائی کا صدمہ بھی تھا لیکن اپنے طور پر ان کا ضمیر مطمئن تھا کہ اس میں ان کا اپنا کوئی قصور نہ تھا اور جو کچھ بھی ہوا وہ ان کے ساتھ محض زیادتی تھی۔ ایسی کوئی کمزوری ان کی اپنی نہ تھی کہ ان کے بھائی کو شرمندگی سے دو چار ہونا پڑتا۔

خیمے سے دور شام ڈھلے اجنبی جگہ
نکلی ہوں کس کی کھوج میں بے وقت سر کھلے

پروین شاکر کی بے قراری اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ اضطراری طور پر "تلاش سکون گم شدہ" میں یوں سرگرداں ہو جاتی ہیں کہ تن بدن کا ہوش نہیں رہتا اور ایسا ہونا فطرت انسانی کا تقاضہ ہے۔

میری چادر تو چھنی تھی شام کی تنہائی میں
بے ردائی کو مری پھر دے گیا تشہیر کون

پروین شاکر حیرت زدہ ہیں کہ انھوں نے زہر کا یہ کڑوا کسیلا گھونٹ مجبوراً ہی سہی مگر خاموشی سے پی لیا تھا پھر ان کی بے ردائی کی تشہیر کس نے کی، ظاہر ہے کہ ایسا زنِ ثانی نے ہی کیا ہوگا۔

پروین شاکر کے یہاں اس ضمن میں اور بہت سارے اشعار ہیں جن کا احاطہ ایک مختصر مضمون میں کرنا ممکن نہیں۔ زیر نظر مضمون میں صرف چند اشعار شامل ہیں ان کی تشریح بھی تفصیلاً نہیں بلکہ اجمالی طور پر یہ ثابت کرنے کے لئے کی گئی ہے کہ انھوں نے خالص رثائی موضوع کے لیے غزل کا میدان منتخب کیا ہے۔

امام حسین علیہ السلام کی ذات اور ان کی بے مثال شہادت اسلامی تاریخ کا ایسا سرچشمۂ فیض ہے جو اردو شاعری کے حافظے سے کبھی محو نہیں ہوا۔ صدیوں کا "رثائی ادب" اس بات کا شاہد ہے بلکہ عصر حاضر میں یہ "اظہاریہ" رثائی ادب سے بالکل ہٹ کر عام شاعری میں یعنی جدید غزل اور جدید نظم میں نئی شان کے ساتھ نمایاں ہو رہا ہے۔ مذکورہ استعاراتی اور علامتی ترسیل سے اس میں ایک عالمگیر اور آفاقی معنویت پیدا ہوتی جا رہی ہے جس کا اطلاق تمام انسانی برادری کی عمومی صورت حال پر اور استبداد و استحصال کے خلاف برسرِ ... [illegible]

عنوانات

پہلی بات	ایڈیٹر	۲
[illegible] (نظم)	شاہد ماہلی	۳
گفتگو: کچھ یادیں کچھ باتیں (۲)	آل احمد سرور	۴
افسانے	رفعت سروش	۱۱
	معصومہ سبزواری	۱۵
[illegible] دبستانِ لکھنؤ	سلمان عباسی	۱۶
مضامین	[illegible]	۲۰
	عنوان چشتی	۲۰
میر تقی میر اور ان کی ہمعصر ہندی شاعری	انیس انصاری	۲۲
وطن والو! (نظم)	مرزا احمد اشفاق شوق	۲۹
تمہارے بعد (نظم)	[illegible]	۲۹
حیدرآباد میں عہد آصف الدولہ کے چند نایاب غیر مطبوعہ مخطوطات	حبیب نثار	۳۴
غزلیں	ایم کوٹھیاوی راہی	۳۸
	پی پی سریواستو رند۔ [illegible]	۳۸
دورِ جبر (نظم)	سعید عارفی	۳۹
سراسیمگی (نظم)	قیصر آدیب	۳۹
فرصت کے رات دن (نظم)	ماہر ریاض	۳۹
اردو ادب اور تصوف	محمد کاظم ہاشمی	۴۰
[illegible] (نظم)	مومن خاں شوق	۴۲
[illegible] (نظم)	جنید سرور	۴۲
[illegible] (نظم)	اسرار سعید	۴۳
غزلیں	چندر پرکاش جوہر بجنوری۔ [illegible] اقبال ظفر	۴۴
	سجاد سید۔ [illegible] خلیل انصاری	۴۴
تبصرے	[illegible]	۴۸

اپنی بات

[illegible]
...کے دستِ مبارک سے چاند کے اودھ نمبر کا رسمِ اجرا عمل میں آیا۔ اس جلسہ میں [illegible]
مقتدر اہلِ علم و ادب بھی شامل ہوئے۔ [illegible]
سرپرستی کے لئے وہاں موجود تھے۔ مدیر کو [illegible]
گورنر اتر پردیش نے خواہش ظاہر کی کہ میرا چند دستخطوں کے ساتھ انہیں [illegible]
یہ فرمائش بھی ہمارے لیے باعثِ صد افتخار تھی کہ اودھ نمبر (حصۂ اول و دوم) ہندی میں بھی شائع کیا جائے۔
نیا دور کی گزشتہ پچاس سال کی تاریخ میں یہ یادگار رہے گا کہ اس کے نمبر اتنی پسندیدگی کی نظر سے دیکھے گئے ہوں۔
نیا دور کی اس شاندار کامیابی اور بے مثال مقبولیت اور پذیرائی کے لیے جتنا بھی خدا کا شکر ادا کیا جائے کم ہے اور اس شکر کے ساتھ اپنے معاونین کا بھی ممنون ہوں ---- اسی کے ساتھ یہ اعتراف بھی بہت ضروری ہے کہ اگر ہمارے میر کارواں ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات جناب انل نگائی صاحب کی دانشمندانہ رہنمائی اور حوصلہ افزائی ہمارا ساتھ نہ دیتی تو اس منزل کی کامیابی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

فروری کا یہ مہینہ اس لیے تو اہم تھا ہی کہ اس میں نیا دور کے اودھ نمبر (حصۂ دوم) کی رسمِ اجرا عمل میں آئی تھی بلکہ یہ مہینہ اس لیے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ ہماری ہندوستانی تاریخ کی دو اہم شخصیتوں یعنی امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی برسی کی تاریخ بھی اسی فروری میں تھی اور ہندوستان میں سفیرِ انقلاب کے نام سے [illegible] کا صد سالہ یومِ پیدائش بھی اسی مہینہ میں منایا گیا۔ ہندوستان کی سیکولر روایات کے امین و پاسبان ان عظیم سپوتوں کو ادارہ [illegible] خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔ ان عظیم شخصیتوں کی یاد مناتے ہوئے ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی جتنی شدید ضرورت آج ہے اتنی شاید کبھی نہیں رہی۔!!

رمضان کے بعد عید کا مہینہ آتا ہے اور نظیر اکبرآبادی کے لفظوں میں ہر خوشی سے زیادہ عید کی خوشی ہوتی ہے۔ اس عید کے کچھ دن بعد ہولی کا رنگین تہوار بھی جڑا ہوا ہے جو اردو شاعری میں [illegible] ہولی کی وجہ سے اردو کے ہر طالبِ علم کو تمام رنگینیوں اور رعنائیوں کے ساتھ نیا کیف اور نیا سرور عطا کرتا ہے۔
ادارہ اپنے تمام قارئین کو عید اور ہولی کی مبارکباد پیش کرتا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ جس طرح [illegible] ہم مل جل کر ہر تہوار مناتے آئے ہیں، اسی طرح آنے والے [illegible] میں بھی [illegible] کے سیلاب کے ساتھ مناتے رہیں۔ آمین!

[illegible]

G-1 Sri

اپنی بات

[illegible] قرۃ العین کی خوشگوار اور جاندار [illegible]
کے وسیع مبارک سے نیا دور کے دو حصوں پر مشتمل [illegible]
متعدد اہل علم و ادب بھی شامل ہو سکے [illegible]
ہندوستان کے لیے وہاں موجود تھے [illegible]
گورنر اتر پردیش نے خواہش ظاہر کی کہ نیا دور اپنے دستخطوں کے ساتھ انھیں [illegible] پیش کیا جائے
یہ فرمائش بھی ہمارے لیے باعث صد افتخار ہوئی کہ اودھ نمبر (حصہ اول و دوم) ہندی میں بھی شائع کیا جائے۔
نیا دور کی گزشتہ پچاس سال کی تاریخ میں یہ یادگار ہے کہ اس کے نمبر اتنی پسندیدگی کی نظر سے دیکھے گئے ہوں
نیا دور کی اس شاندار کامیابی اور بے مثال مقبولیت اور پذیرائی کے لیے جتنا بھی خدا کا شکر ادا کیا جائے
کم ہے اور اس شکر کے ساتھ اپنے معاونین کا بھی ممنون ہوں ——— ابھی کے ساتھ یہ اعتراف بھی بہت
ضروری ہے کہ اگر ہمارے میر کارواں ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات جناب [illegible] صاحب کی دانش مندانہ رہنمائی اور
حوصلہ افزائی ہمارا ساتھ نہ دیتی تو اس نوعیت کی کامیابی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

فروری کا یہ مہینہ اس لیے تو اہم تھا ہی کہ اس میں نیا دور کے اودھ نمبر (حصہ دوم) کی رسم اجرا عمل میں آئی تھی بلکہ یہ مہینہ اس لیے
بھی اہمیت کا حامل ہے کہ ہماری ہندوستانی تاریخ کی دو اہم شخصیتوں یعنی امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی برسی کی
تاریخ بھی اسی فروری میں تھی اور ہندوستان میں "سبز انقلاب" کے [illegible] کا صد سالہ یوم پیدائش
بھی اسی مہینہ میں منایا گیا۔ ہندوستان کی سیکولر روایات کے امین و پاسبان ان عظیم سپوتوں کو ادارہ [illegible]
خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔ ان عظیم شخصیتوں کی یاد مناتے ہوئے ان کے نقش قدم پر چلنے کی جتنی
شدید ضرورت آج ہے اتنی شاید کبھی نہیں رہی۔!!

رمضان کے بعد عید کا مہینہ آتا ہے اور نظیر اکبرآبادی کے لفظوں میں ہر خوشی سے زیادہ عید کی خوشی ہوتی ہے۔ اس عید
کے کچھ دن بعد ہولی کا رنگین تہوار بھی جڑا ہوا ہے جو اردو شاعری میں [illegible]
اردو کے ہر طالب علم کو تمام رنگینیوں اور رعنائیوں کے ساتھ [illegible]
ادارہ اپنے تمام قارئین کو عید اور ہولی کی مبارکباد پیش کرتا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ [illegible]
ہم مل جل کر ہر تہوار مناتے آئے ہیں، اسی طرح آنے والے [illegible]
کے سیلاب کے ساتھ مناتے رہیں۔ آمین!

ایڈیٹر

عجیب رنگ ہیں

عجیب زمیں پہ شہر ہیں، گھر ہیں
سمٹتے پھیلتے شہر، سہمے ہوئے سمندر میں
خلا میں، چاند کی بنجر زمیں کے سینے پر
جو صبح و شام کی تاریک راہ میں چپ چاپ
تعلقات کی تعمیر کرتے رہتے ہیں۔
ہوا کے دوش پہ،
طوفان، زلزلہ، سیلاب۔
دیا سلائی کی تیلی پہ ٹینک، ایٹم بم
کوئی جلوس، کوئی پوسٹر، کوئی تقریر
امڈتی بھیڑ کا ہر ووٹ کوئی بیلٹ باکس
پھسلتی کرسی کا جادو،
بسوں کی لمبی قطار
کہیں پہ صحن میں گوبر، کہیں پہ گائے کا سر
ہر ایک گوشہ ہے شمشان، قبر ہے بستر
اکیلا پھرتا ہے سنسان شہر میں کرفیو
قریب گھور پہ چیتھڑوں میں جسم کے ٹکڑے
سسکتی رات سے جنمی ہوئی فسردہ صبح
بگڑتے بنتے ہوئے زاویے کھسکتی اینٹ
تمام سلسلے بے ربط، منقطع رشتے
مگر ——!
وہ دوستی کے پیڑوں پہ اُگتے ننھے ہاتھ
ہر ایک جبر سے بے خوف،
سبھی نیاز مند
جو صبح و شام کی بے ربط راہ میں چپ چاپ
تعلقات کی تعمیر کرتے رہتے ہیں
عجیب رنگ ہیں!

[illegible] کی کتنا [illegible] کے رسالے نگار
[illegible] جب [illegible] سے [illegible]
[illegible] سے [illegible] ایک [illegible]
[illegible] بہت [illegible]
[illegible] سے [illegible] تھے ۔ [illegible] سے
[illegible] ملاقات ہوئی ۔ انھوں نے ایک دفعہ ایک [illegible]
[illegible] کتاب تنقیدی اشارے [illegible] نے
[illegible] نیاز صاحب ہمارے [illegible] بہتر ادیب اور انشاپرداز [illegible]
تھے ان کے رسالے نگار نے علم و ادب کی بڑی خدمت کی ۔ انھوں نے نگار
کے بعض ایسے خاص نمبر نکالے جن کی مستقل ادبی اہمیت ہے ۔ [illegible]
پڑھانے میں اپنا ایک مخصوص معیار رکھتے تھے اس لئے [illegible]
[illegible] اور [illegible] کے مقابلے میں [illegible]
[illegible] نگار کے [illegible] ہے ۔ انھوں نے
ہیں لوگوں کے تاج آ گئے اور کتنے تمام شعرا کا تاج پہنانے ۔ یہ بھی ہے کہ
ان کے بہت سے مضامین کی انگریزی کتاب میں [illegible] کا چربہ ہوتے
تھے اور بعض تو ان کے مضامین انھوں نے اپنے نام سے شائع کیے
پھر بھی عربی فارسی اور اردو ادب پر ان کی گہری نظر تھی [illegible] کے اسرار
رموز سے واقف [illegible] ۔ ان کا آخری کلام ان کی ادبی زندگی کا [illegible]
[illegible] ہے ۔

نیاز صاحب اپنے کو [illegible] رہتے تھے ۔ [illegible]
ادیب [illegible] شاعری سے تھے ۔ [illegible]
[illegible] ۔ انھوں نے [illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

RAM NOT YET BORN [illegible]

[illegible]

Now, meet our poet Majaz. [illegible]

[illegible]

[illegible] یہاں کے افسانہ نگار تھے۔ ان کے افسانے اور [illegible] لکھنؤ نیا پاکستان سے بار بار شائع ہوتے رہتے ہیں [illegible] کے نام سے ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ شائع ہوا اور دواخانے کی تاریخ میں ان کا کام محفوظ ہے۔

لکھنؤ کا ذکر نامکمل رہے گا اگر بیگم اختر کا نام نہ لیا جائے۔ بیگم اختر ان دنوں عام طور پر نہیں گاتی تھیں۔ صرف ریڈیو پر کبھی کبھار ان کا کلام سننے کو مل جاتا تھا۔ چند بار ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا اور ان کے شوہر اشتیاق عباسی بیرسٹر سے ملاقات بھی ہوئی۔ بڑے مستعلیق آدمی تھے اور غزل کا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے کبھی کبھار یہ بھی ہوتا تھا کہ ریڈیو پر کسی شاعر کا یوم منایا جا رہا ہے اس میں میری چند منٹ کی بات چیت ہے اور اس کے بعد بیگم اختر پندرہ منٹ ان کا کلام سازوں کے ساتھ پیش کر رہی ہیں۔ ایک دفعہ نظیر اکبرآبادی پر ایک پروگرام تھا۔ میری تقریر کا عنوان تھا نظیر اور عوام۔ تقریر خاصی لمبی ہو گئی تھی۔ عباد۔ انصاری پروڈیوسر نے کہا سرور صاحب تقریر لمبی ہے۔ اس کے بعد بیگم اختر ان کی کچھ نظمیں گائیں گی ان کے لئے بھی وقت چاہئے میں نے کہا کہ آخر کا کچھ حصہ چھوڑ دوں گا۔ آپ اطمینان رکھئے مگر ہوا یہ کہ میں رو میں بہتا چلا گیا اور تقریر جو پندرہ منٹ میں ختم ہونی چاہئے تھی ۲۳ منٹ لے گئی۔ دیکھا تو شیشے کے پیچھے نیاز انصاری اور بیگم اختر بدحواس کھڑے ہیں۔ میں نے باہر نکل کر معذرت کی کہ مجھے خیال نہ رہا مگر بیگم اختر نے مسکرا کر کہا سرور صاحب کوئی بات نہیں میرا کام آسان ہو گیا اب دو کے بجائے ایک ہی نظم پیش کروں گی۔ ۱۹۶۲ کے آخر میں دہلی میں ہم لوگوں نے لال قلعہ میں بزم ظفر کی طرف سے بہادر شاہ ظفر کی یاد میں ایک جشن منایا تھا جس کا افتتاح جواہر لال نہرو نے کیا تھا اور جس میں جوش نے یہ کہا تھا۔ کون کہتا ہے کہ مغل باہر کے تھے جب وہ ہندوستان میں بس گئے تو ہندوستانی ہو گئے۔ اس موقع پر بیگم اختر نے بہادر شاہ ظفر کی ایک غزل جس کمال فن کے ساتھ گائی تھی اس نے تمام سامعین پر جادو سا کر دیا تھا۔ یہ دو شعر انھوں نے خاص طور پر بڑی پرسوز لے میں گائے تھے۔ اب تک ان کی یہ پرسوز لے کانوں میں گونجتی ہے۔

عمرِ عزیز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں
کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لئے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

بیگم اختر کی پرسوز لے یاد آئی تو ذہن راجہ محمود آباد کی مرثیہ خوانی کی طرف گیا۔ [illegible] لکھنؤ کی مرثیہ خوانی پر ایک بہت اچھا مضمون نظر سے گذرا تھا اس میں یہ عجیب بات کہی گئی تھی کہ راجہ محمود آباد کا ذکر نہ تھا راجہ صاحب کے والد مہاراجہ محمود آباد کا ذکر [illegible] کی سیاست لکھنؤ کی تہذیبی زندگی کی نمائندگی اور [illegible] مسلم یونیورسٹی کی جدوجہد کے سلسلے میں یاد رکھا جائے گا۔ ان کے یہ بیٹے مسلم لیگ کے ایک اہم رکن بھی تھے مگر مجھے ان کی مرثیہ خوانی کے طرز سے یہاں غرض ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے یہ فن دولہا صاحب عروج سے سیکھا تھا۔ میں نے سب سے پہلے انھیں علی گڑھ کی ایک مخصوص مجلس میں سنا تھا۔ پھر رام پور میں اور اس کے بعد آل رضا کے یہاں کی مجلس میں لکھنؤ میں جن لوگوں نے ذوالفقار بخاری کو ریڈیو پر اقبال کا کلام اور انیس کے مرثیے پڑھتے سنا وہ کہتے ہیں کہ ذوالفقار بخاری اس فن کے آخری امام تھے۔ مجھے ان سے اختلاف ہے۔ ذوالفقار بخاری یقیناً اس فن کے ماہرین میں شمار کئے جاتے تھے مگر راجہ محمود آباد کی بات ہی کچھ اور تھی۔ راجہ صاحب موسیقی کے اسرار و رموز سے واقف تھے اور ان کی آواز میں قدرتی لحن تھا۔ میں نے محسن جونپوری کو بھی سنا ہے اور لکھنؤ کی مجلسوں میں بعض دیگر حضرات کو بھی مگر راجہ صاحب کی مرثیہ خوانی میں جو تاثیر اور اس کے ساتھ لفظ کے امکانات کی جو ترسیل تھی وہ مجھے ان کے معاصرین میں کسی کے یہاں نظر نہ آئی۔ راجہ صاحب کو صحت الفاظ کا بڑا خیال رہتا تھا۔ ان سے ایک ملاقات میں حالات حاضرہ پر تبصرہ ہو رہا تھا۔ اپنی بات کو موثر بنانے کے لئے میں نے غالب کا یہ شعر پڑھا۔ ؎

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر
دامن کو آج اس کے حریفانہ کھینچئے

راجہ صاحب کہنے لگے سرور صاحب عجز کے بجائے عجز کہتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ حضور والا انشا نے انیسویں صدی کے آغاز میں دریائے لطافت لکھی اس میں ہماری زبان کے لئے آزادی کا یہ صحیفہ موجود ہے کہ کوئی عربی یا فارسی کا لفظ جس طرح اردو میں بولا جاتا ہے اسی طرح صحیح ہے۔ خواہ لغتاً وہ اصل غلط ہی کیوں نہ کہا جائے۔ اس کے بعد میں نے آتش کا یہ شعر پڑھا۔ ؎

دخت رز میری مونس ہمدم ہے
میں جہانگیر ہوں وہ نورجہاں بیگم ہے

میں نے مزید کہا کہ آتش کے اس شعر پر کسی نے ان کے سامنے اعتراض کیا اور کہا کہ حضرت صحیح لفظ بیگم نہیں بیگم ہے۔ آتش نے کہا کہ جب ہم شاہ کا لکھیں گے تو بیگم ہی لکھیں گے اور [illegible]

[illegible] ماجد صاحب ان کے [illegible] ہو گئے۔ جس زمانے میں
[illegible] لکھنؤ یونیورسٹی کے [illegible] ہاسٹل میں رہتے تھے میں نے ان سے اس بات کا ذکر کیا کہ اب مرثیہ خوانی کے فن کے آخری نمائندے ماجد صاحب رہ گئے ہیں۔ اگر کسی طرح یہ ہو سکے کہ وہ آپ کے یہاں ایک مخصوص نشست میں اپنا کوئی تصنیف مرثیہ پڑھیں اور اسے ٹیپ کر لیا جائے تو کتنا اچھا ہو۔ زیدی صاحب نے ماجد صاحب کو مدعو کیا اور وہ تشریف لے آئے۔ مجلس جب شروع ہوئی اور ماجد صاحب آکر ممبر پر بیٹھے تو انھوں نے دیکھا کہ فرش پر مائک رکھا ہے۔ بہت خفا ہو گئے۔ کہنے لگے کہ زیدی صاحب اس کو ہٹوائیے یہ میری اور مشین کی ازلی دشمنی ہے۔ میں اس طرح مرثیہ نہیں پڑھ سکتا۔ مجبوراً مائک ہٹا دیا گیا اور انھوں نے اپنے مخصوص انداز سے تقریباً ایک گھنٹہ اپنا نیا مرثیہ سنایا۔ سامعین ہر بند پر داد دیتے رہے۔ جب مجلس برخاست ہوئی اور سب لوگ چلے گئے تو میں نے ماجد صاحب کا شکریہ ادا کیا اور ساتھ ہی یہ بھی شکایت کی کہ اگر یہ مرثیہ ٹیپ ہو جاتا تو آپ کی آواز بھی آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ ہو جاتی۔ اب تو اس کی گونج صرف فضا میں رہ جائے گی۔ ماجد صاحب کچھ نرم پڑے اور کہنے لگے اچھا اب کی بار تو پھر آپ کی خاطر اپنے مرثیے کو ٹیپ بھی کرا دوں گا مگر میں جانتا تھا کہ انھوں نے یہ ٹالنے کے لئے کہا ہے۔

یونیورسٹی میں جن لوگوں سے قریب رہا ان میں پروفیسر سید مسعود حسن رضوی، ڈاکٹر وحید مرزا، ڈاکٹر عبدالعلیم، سید احتشام حسین اور نورالحسن ہاشمی یاد آتے ہیں

مسعود صاحب سے پہلی ملاقات ۱۹۳۳ میں ہوئی تھی جب میں لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک ڈبیٹ میں شرکت کے لئے گیا تھا۔ موضوع تھا۔ شاعری بیکاروں کا مشغلہ ہے۔ ججوں میں جسٹس وزیر حسن اور مسعود حسن رضوی تھے۔ مجھے دوسرا انعام ملا تھا۔ مباحثے کے بعد ڈاکٹر مسعود حسن صاحب سے ملاقات ہوئی انھوں نے میری تقریر کی تعریف کی تھی۔ میں نے کچھ دن پہلے ان کی کتاب ہماری شاعری پڑھی تھی جو مجھے علی گڑھ کے مباحثے میں انعام میں ملی تھی اس کی بھی بات ہوئی۔ اس وقت مسعود صاحب کے داڑھی تھی۔ یہ یاد پڑتا ہے کہ اس مختصر سی ملاقات میں نوجوانی کے سلسلے میں انھوں نے بیہودہ رومانی کی خاصی مذمت کی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ شروع میں دونوں کے [illegible] تھے لیکن پھر اختلاف ہو گیا تھا۔ ۱۹۳۸-۳۹ء میں جب میرا لکھنؤ کئی بار جانا ہوا تو میں مسعود صاحب سے ملنے کے لئے ایک شاگرد منظور حسین کے ساتھ ادبستان پہنچا۔ اطلاع کرائی تو ہم لوگوں کو ایک کمرے میں بٹھلا دیا گیا۔ منظور کے مزاج میں شوخی بہت تھی جب مسعود صاحب کے برآمد ہونے میں کچھ دیر ہوئی اور مجھے بے چین دیکھا تو منظور نے ہنس کر کہا کہ مسعود صاحب میک اپ کر رہے ہوں گے آتے ہی ہوں گے اور واقعی جب وہ کچھ دیر بعد تشریف لائے تو شیروانی اور ٹوپی میں تھے گویا کسی سے ملنے باہر جا رہے ہوں۔ دیر تک ان سے دنیا جہان کے مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔ مسعود صاحب ہر جملہ ٹھہر ٹھہر کر اس طرح ادا کرتے تھے کہ لفظ کی معنویت پوری طرح آشکار ہو جائے۔ اس گفتگو سے یہ اندازہ ہوا کہ ان کے اعلیٰ پیرو محمد حسین آزاد، انیس اور واجد علی شاہ ہیں۔ اس ملاقات کے بعد کانپور کی اردو کانفرنس میں فائز دہلوی پر ان کا مقالہ سنا۔ ان کے پڑھنے کے انداز میں بھی بڑی دلکشی تھی۔

جب ۱۹۴۹ میں میرا تقرر لکھنؤ یونیورسٹی میں ہو گیا تو ان سے روزانہ ملاقات ہونے لگی۔ وہ صدر شعبہ تھے شروع میں مجھے یہ محسوس ہوا کہ مسعود صاحب کچھ مجھ سے کھنچے کھنچے رہتے تھے۔ وہ صدر شعبہ کے کمرے میں الگ بیٹھتے تھے۔ دوسرے کمرے میں عبدالقوی فانی اور یوسف حسین موسوی فارسی کے استاد اور میں احتشام حسین، نورالحسن ہاشمی اور محمد لقمان سب کی نشست ہوتی تھی۔ احتشام صاحب سے ۱۹۳۹ میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں ملاقات ہو چکی تھی۔ نورالحسن ہاشمی علی گڑھ میں میرے شاگرد رہے تھے۔ سید محمد تقی نئے نئے آئے تھے۔ یہ سید محمد حسین صاحب کے صاحبزادے تھے جن کا کچھ مہینے پہلے انتقال ہوا تھا۔ عبدالقوی فانی صاحب اور یوسف حسین موسوی صاحب دونوں کا محبوب مشغلہ مسعود صاحب کو برا بھلا کہنا تھا۔ تین دن تک تو میں ان کی باتیں سنتا رہا پھر میں نے کہا کہ میری زندگی کا واحد مقصد مسعود صاحب کی مخالفت نہیں ہے۔ ہمارا شعبہ اردو اور فارسی کا ملا جلا شعبہ ہے۔ مسعود صاحب خود اردو کے ممتاز محقق اور ادیب ہیں مجھے توقع یہ ہے کہ اردو کے نصاب و تدریس کے سلسلے میں مجھ سے بھی مشورہ کرتے رہیں گے۔ اگر میں انھیں کوئی غلط بات کرتے ہوئے دیکھوں گا تو ضرور مخالفت کروں گا۔ لیکن ویسے ہر معاملے میں ان سے تعاون کروں گا۔ اس کے بعد ان لوگوں نے میرے سامنے ان کی برائی کرنا چھوڑ دیا۔ چند مہینے بعد میں نے یہ محسوس کیا کہ ہمارے مضمون کا نام صرف اردو نہیں بلکہ اردو مع فارسی ہے۔ بی اے کے اردو کے نصاب میں ایک پرچہ فارسی کا بھی ہے

اور فارسی کے پرچہ میں پاس ہونا لازمی ہے۔ ورنہ طالب علم مضمون میں فیل کیا جائے گا۔ میں نے مسعود صاحب سے کہا کہ جہاں تک بی اے کے اردو کے نصاب میں فارسی کے پرچے کا سوال ہے میں اس کا [illegible] کیونکہ اردو ادب میں بی اے کرنے والوں کو کچھ فارسی ادب بھی آنا چاہئے لیکن مضمون کا نام اردو و فارسی نامناسب ہے صرف اردو ہونا چاہئے۔ دوسرے یہ کہ فارسی کے پرچہ میں اگر فیل ہو تو اس کے معنی یہ نہ ہونا چاہئے کہ پورے اردو کے پرچہ میں فیل ہے۔ مسعود صاحب نے میری تجویز سے اختلاف کیا تو میں نے فیکلٹی کی ایک میٹنگ میں اردو کا الگ شعبہ قائم کرنے کی تجویز پیش کی جو منظور ہو گئی مگر اکیڈمک کاونسل میں جا کر یہ تجویز سیاست کا شکار ہو گئی مسعود صاحب اس سلسلے میں بالکل خاموش رہے نہ مخالفت کی نہ موافقت احتشام صاحب نے بھی سکوت اختیار کیا لیکن میری تجویز کا اتنا نتیجہ ضرور ہوا کہ اردو کا ایک الگ بورڈ آف اسٹڈیز بنا دیا گیا اور مجھ سے کہا گیا کہ اس کے لئے بیرونی ممبروں کے نام تجویز کردوں۔ میں نے رشید احمد صدیقی اور قاضی عبد الغفار کے نام تجویز کئے۔ مسعود صاحب نے ڈاکٹر عبد الستار صدیقی کا نام تجویز کیا جو میں نے منظور کر لیا۔ جب اردو بورڈ کی پہلی میٹنگ ہوئی تو اس میں رشید صاحب اور عبد الستار صدیقی دونوں موجود تھے۔ قاضی عبد الغفار تشریف نہیں لا سکے تھے۔ اس میٹنگ میں خود مسعود صاحب نے یہ تحریک پیش کی کہ مضمون کا نام صرف اردو ہوگا اور فارسی کے پرچے میں پاس ہونے کی شرط نہ ہوگی۔ ایک دفعہ اور ممتحنوں کے ناموں کی سفارش پر کچھ معمولی سا اختلاف ہو گیا۔ وائس چانسلر نریندر دیو نے میری تائید کی تو مسعود صاحب نے میرے مجوزہ نام مان لئے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ رفتہ رفتہ مسعود صاحب سے ربط ضبط بڑھنے لگا احتشام حسین اور نور الحسن ہاشمی کا تو ساتھ رہتا ہی تھا۔ ہم تینوں بلا ناغہ لکچروں کے بعد کچھ دیر کے لئے اسٹاف کلب میں جس کی عمارت پاس ہی تھی ہم لوگ ضرور جایا کرتے تھے۔ مسعود صاحب اکثر الہ آباد کی اپنی ملازمت کا ذکر کیا کرتے تھے جہاں ان کا کام سال بھر کی اردو مطبوعات پر تبصرہ لکھنا ہوتا تھا۔ کیننگ کالج کے مشاعروں اور لکھنؤ کی ادبی شخصیتوں کا بھی ذکر رہتا۔ عام طور پر وہ سوٹ میں ہوتے لیکن کبھی کبھی شیروانی میں بھی۔ شیروانی ان پر زیادہ جچتی تھی۔ گیارہ بجے کے قریب وہ شعبہ میں تشریف لاتے۔ عام طور پر ان کے ساتھ آٹھ دس کتابیں بھی ہوتی تھیں جو چپراسی لا کر ان کی میز پر رکھ

[illegible] سے بات چیت [illegible] کے قریب [illegible] یونیورسٹی کے کسی جلسے یا مشاعرہ میں شریک ہوتے نہیں دیکھا صرف [illegible] کی میٹنگ میں شریک ہوتے تھے لیکن میں اور احتشام صاحب یونیورسٹی کے بیشتر علمی اور ادبی اجتماعات میں موجود رہتے تھے اور ہم دونوں کا اساتذہ کی ایسوسی ایشن اور طلبہ کی یونین سے گہرا ربط ضبط تھا۔

مسعود صاحب لکھنؤ کی بعض صحبتوں اور شخصیتوں کے دلچسپ قصے سناتے تھے اور جب لکھنؤ کے ایک اجتماع میں مولانا عبد الماجد دریابادی نے شوق قدوائی پر اپنا مضمون ”اردو کا ایک بدنام شاعر“ کے عنوان سے پڑھا تو اس میں دلچسپ بات یہ تھی کہ نثر کا حصہ تو مولانا ماجد نے پڑھا تھا اور شوق کے جتنے اشعار تھے وہ مسعود حسن رضوی نے پڑھے تھے غالباً یہ اس وجہ سے ہوا تھا کہ شاید مولانا ماجد کے پڑھنے میں شعریت کا خون ہو جاتا تھا اور مسعود صاحب کے پڑھنے کا انداز نہایت دلنشین تھا۔ وہ لکھنؤ کے ایک اور بزرگ کا قصہ بھی سناتے تھے جن کو غالب کی شاعری [illegible] معلوم ہوتی تھی۔ وہ آرزو لکھنوی اور یاس یگانہ دونوں کے قائل تھے۔ یوسف حسین موسوی صاحب مسعود صاحب پر اسی وجہ سے معترض ہوتے تھے کہ وہ میر، غالب، انیس، سعدی، حافظ، مصحفی، ثاقب سب کے قائل تھے جبکہ موسوی صاحب صرف عرفی کے ماننے والے تھے۔ کہتے تھے کہ سرور صاحب بات کیا ہوئی مسعود صاحب سب کے قائل ہیں۔ مولوی عبد الحق کو مسعود صاحب سے شکایت یہ تھی کہ انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کا الگ شعبہ اپنی زندگی میں الگ نہیں بننے دیا۔ جوش کہتے تھے کہ مسعود صاحب کو جدید ادب سے کوئی ہمدردی نہیں ہے وہ صرف قدیم کے عاشق ہیں۔ اپنے مخصوص انداز میں اکثر یہ کہتے تھے کہ مسعود صاحب کی گھڑی تو مدت ہوئی بند ہو چکی۔

یہ بات تو صحیح تھی کہ جدید میلانات سے نہ مسعود صاحب واقف تھے نہ ان کو کوئی ہمدردی تھی لیکن ان کی نظر میں کلاسیکی ادب کے سارے ابعاد موجود تھے۔ ایک محقق ادیب اور زبان داں کی حیثیت سے ان کی اہمیت مسلم ہے۔ لکھنؤ میں عام طور پر انیس کا اعتقاد دیدنی تھا کہ لوگ صرف انھیں کا کلمہ پڑھتے تھے۔ مسعود صاحب بھی انیس کے بڑے مداح تھے لیکن میر و غالب کی عظمت بھی ان پر روشن تھی۔ ہاں اقبال اور نظیر اکبر آبادی کے معاملے میں

سے خاموش رہتے تھے۔ ایک مرتبہ الٰہ آباد کے ایک مشاعرہ کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے بڑا لطف لے کر ثاقب کا یہ شعر سنایا تھا ؎

آپ کا تھا گناہ گار میں نہ کہ برق و باد کا
جس پہ مزار تھا مرا اب وہ زمین صاف ہے

میں نے قافیے کے استادی کے ساتھ برتنے کی تعریف کی لیکن یہ مضمون مجھے بہت روایتی معلوم ہوا اور دوسرے دن اسی زمین میں ایک غزل کہہ کر میں نے مسعود صاحب کو سنائی مطلع اور ایک شعر میں صاف کا قافیہ اس طرح نظم کیا تھا۔ ؎

مجھ کو گلہ نہیں اگر سارا جہاں خلاف ہے
آپ تو مہربان ہیں آپ کا دل تو صاف ہے
سود و زیاں کا ذکر کیا جب ہو جنوں کا کاروبار
آج ہیں سب کو الجھنیں میرا حساب صاف ہے

مسعود صاحب نے میرے ان اشعار کی بہت تعریف کی۔

مسعود صاحب کے ذریعے مولانا سید علی نقی صاحب سے بھی ملاقات ہوئی اور میں ان کی علمیت سے بہت متاثر ہوا۔ وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں اورینٹل سیکشن میں استاد تھے۔ کبھی کبھار مسعود صاحب سے ملنے ان کے گھر بھی آجاتے مجھے یاد ہے اقبال کے کلام میں بعض قرآنی آیات کی تشریح مولانا نے بڑے دلنشین انداز میں کی تھی خاص طور پر آیۃ اِنَّ الصَّلٰوۃَ کی۔ مجھے معلوم تھا کہ محرم کو مسعود صاحب کے یہاں مولانا سید علی نقی جو عام طور پر نقن صاحب کہلاتے تھے مجلس پڑھتے تھے۔ ایک بار آئندہ مجلس میں مولانا کی تقریر کا عنوان زیر بحث تھا۔ میں نے اقبال کا ایک شعر تجویز کیا جسے نقن صاحب اور مسعود صاحب دونوں نے بہت پسند کیا۔

حقیقت ابدی ہے مقام شبیری بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی و شامی

افسوس ہے کہ یہ سلسلہ اس وقت منقطع ہو گیا جب نقن صاحب کی کتاب شہید انسانیت کی اشاعت کے بعد کچھ لوگوں نے نقن صاحب پر اعتراضات کیے۔ مسعود صاحب کی گفتگو نہ صرف مزے دار ہوتی۔ ان کے یہاں دعوتیں بھی پر لطف ہوتی تھیں۔ ان کے بھائی آفاق صاحب بعض کھانوں کا خاص طور پر اہتمام کرتے تھے۔ مسعود صاحب ۱۹۵۴ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو گئے، زندگی اور ادب دونوں میں انھوں نے چند معیاروں کو ہمیشہ بلند رکھا۔ مجھے صرف اس پر حیرت ہوتی تھی کہ واجد علی شاہ بھی ان کے ممدوحین میں سے تھے۔ واجد علی شاہ کے ساتھ واقعی بعض لوگوں نے بڑی ناانصافی کی ہے اور بہت سی غلط باتیں ان سے منسوب کر دی ہیں۔ وہ بڑی صلاحیت کے مالک تھے اور رقص و موسیقی، اسٹیج اور شاعری میں ان کے کارنامے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن وہ کسی طرح ہیرو نہیں کیے جا سکتے۔ انھوں نے جس طرح اپنی سادہ لوحی میں انگریزوں کے ہر وعدے پر اعتبار کر لیا اور چپ چاپ سلطنت ان کے حوالے کر کے کلکتہ سدھار گئے وہ ہماری تاریخ کا ایک المناک واقعہ ہے۔

جب دستور کے خلاف مجھے ہٹا کر یوسف حسین موسوی صاحب کو وائس چانسلر رادھا کمل مکرجی نے شعبہ کا صدر بنایا اور میں نے اس زیادتی پر استعفا دیا تو مسعود صاحب ہی نہیں بلکہ وائس چانسلر کے حواریوں کو چھوڑ کر پوری یونیورسٹی اس زیادتی پر میری ہمنوا تھی۔ بالآخر ایگزیکیٹو کاؤنسل نے میرا استعفا منظور کرنے کے بجائے وائس چانسلر سے کہا کہ وہ مجھ سے استعفا واپس لینے کو کہے۔ مجھ سے یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ یا تو شعبہ اردو کو الگ کر دیا جائے گا یا مجھے سینئر استاد کی حیثیت سے صدر شعبہ بنایا جائے گا۔ اس میں کچھ دیر ہوئی اور ذاکر صاحب کے اصرار پر پھر میں علی گڑھ چلا آیا۔ میرے علی گڑھ آنے کے بعد جب آرڈی نینس میں تبدیلی ہوئی اور یہ اعلان ہوا کہ سینئر استاد صدر شعبہ ہوگا۔ تو مسعود صاحب نے مجھ سے بہت اصرار کیا کہ میں لکھنؤ آکر چارج لے لوں میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور اپنا یہ شعر پڑھا۔

ملول تو بیٹھے رہے اس در پہ ہم اک عمر سرور
جب چلے آئے تو پھر منہ نہ ادھر ہم نے کیا

اگرچہ لکھنؤ میں جس جگہ پر میرا تقرر ہوا۔ اس پر احتشام حسین بھی امیدوار تھے اور یقیناً ان کو ریڈر نہ ہونے پر مایوسی ہوئی ہوگی لیکن میرے چارج لینے کے بعد انھوں نے ہر معاملے میں تعاون کیا اور بہت جلد ان سے خوب ربط ضبط ہو گیا۔ احتشام حسین الٰہ آباد یونیورسٹی میں تھے ایک شاندار ریکارڈ کے بعد ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ یونیورسٹی آگئے تھے اور جب میں لکھنؤ پہنچا ہوں تو اردو کے ایک ممتاز نقاد اور ادب کے ایک چوٹی کے استاد کی حیثیت سے ان کی شہرت ہو چکی تھی ترقی پسند تحریک کے وہ پرجوش علمبردار تھے۔ بعض ترقی پسند نقادوں کی طرح نہ تو ان کے یہاں کلاسیکی ادب سے بے اعتنائی تھی نہ ماضی سے بیزاری۔ ان کی تحریروں میں ایک علمیت اور گہرائی اور لہجہ میں سنجیدگی ہوتی تھی۔ وہ ہندی بھی اچھی جانتے

تھے اور انھوں نے اردو ادب کی ایک تاریخ ہندی میں بھی لکھی ہے۔ احتشام کی حیثیت نقاد کے بھی شہرت تھی۔ وہ اپنی بات دل کش اور دلنشین انداز میں پیش کرتے تھے۔ عام محفلوں میں ان کے یہاں ایک اداسی کی لہر کا احساس ہوتا تھا لیکن بے تکلف نشستوں میں وہ خاصے دلچسپ ہو جاتے تھے۔ وہ شعر بھی کہتے تھے اور چونکہ ان کی آواز میں ایک قدرتی سحر تھا اس لئے جب وہ اپنا کلام سناتے تھے تو لطف آجاتا تھا۔ ان کا یہ شعر تو اکثر یاد آتا ہے۔

کل تو خیر ان کی یاد آئی تھی — آج کیوں ہے فضا اداس اداس

جس زمانے میں لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر اچاریہ جگل کشور تھے تو ان کی انتہائی سیدھی باتوں پر اسٹاف کلب کی نشستوں میں اکثر تبصرہ ہوتا تھا۔ ہری کرشن اوستھی (جو اس زمانے میں ہندی کے شعبے میں ریڈر تھے اور بعد میں وائس چانسلر بھی ہوگئے) ان کو جگلو کہتے تھے۔ انھوں نے ایک مصرعہ دیا اور اس پر طبع آزمائی کے لئے کہا۔ ع

"اس واسطے جگلو کو بھی اُلّو نہیں کہتے"

میں نے یہ مصرعہ لگایا۔ ع (اوستھی کے خلاف ایک کمیشن بیٹھ چکا تھا)

اس پر بھی نہ بیٹھے کہیں اک اور کمیشن
اس واسطے جگلو کو بھی الو نہیں کہتے

مگر احتشام حسین کا مصرعہ زیادہ مزے کا تھا۔ ع

الو بھی نہ کر دے کہیں توہین کا دعویٰ
اس واسطے جگلو کو بھی الو نہیں کہتے

احتشام حسین پیچش کے مریض تھے جب اعجاز حسین صاحب کے سبکدوش ہونے پر الہ آباد یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر کی جگہ خالی ہوئی تو اس پر احتشام حسین صاحب کا تقرر ہوا۔ سلیکشن کمیٹی میں میں بھی تھا اور میں نے ان کی پرجوش تائید کی تھی۔ وہ ابھی ساٹھ سال کے بھی نہ ہوئے تھے کہ دسمبر ۷۲ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ اردو ادب اپنے اس بلند پایہ نقاد کو کبھی فراموش نہ کر سکے گا۔

نورالحسن ہاشمی لکھنؤ سے انگریزی میں ایم اے کرکے علی گڑھ آئے تھے علی گڑھ میں میں نے ان کو پڑھایا بھی تھا۔ پھر انھوں نے میری ہی نگرانی میں پی ایچ ڈی کیا۔ ان کے مقالے کا عنوان تھا "دلی کا دبستان شاعری"۔ پی ایچ ڈی کرنے کے بعد یہ لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کے لکچرر ہو گئے تھے۔ جب ۱۹۴۶ میں لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کے ریڈر کا اشتہار ہوا تو انھوں نے مجھے فارم بھیجا اور امروہہ کالج میں ملازمت کے دوران ہاشمی صاحب نے پرائیویٹ طور سے فارسی میں بھی ایم اے کر لیا۔ ہاشمی صاحب نے کلیات ولی، کلیات جعفر علی حسرت مرتب کی ہیں اور مسعود حسن رضوی کے ساتھ مل کر بکٹ کہانی بھی شائع کی ہے۔ غالباً ۱۹۵۴ء میں جب مسعود صاحب سبکدوش ہو چکے تھے اور میں عارضی طور پر صدر شعبہ تھا تو رالف رسل کی ایک شاگرد ایک سوئس لڑکی جس کا نام مس ویلس تھا اردو میں مزید مہارت حاصل کرنے کے لئے لکھنؤ آئی تھی۔ وہ خاص طور پر عروض سیکھنا چاہتی تھی۔ اتفاق سے میری اور احتشام صاحب کی عروض سے واقفیت یوں ہی سی تھی۔ لہٰذا اس کی تعلیم کی نگرانی ہاشمی صاحب کے سپرد کی گئی اور انھوں نے اس کام کو بحسن وخوبی انجام دیا۔ ہاشمی صاحب شعر بھی کہتے ہیں اور جب میں لکھنؤ یونیورسٹی سے رخصت ہوا تو انھوں نے ایک نہایت پرسوز نظم لکھی تھی۔ کبھی کبھی ہم لوگ شعبے میں خالی وقت میں ایک چھوٹا سا مشاعرہ کر لیا کرتے تھے جس میں میں، احتشام، ہاشمی اور خلیل چاروں کی غزلیں ہوا کرتی تھیں۔ کلاس سے فارغ ہوکر ہم لوگ عام طور پر اسٹاف کلب جایا کرتے تھے اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ٹیبل ٹینس یا ایک کھیل چینی چکر کھیل کر گھر چلے جاتے تھے۔ ہاشمی صاحب میرے ہم عمر ہیں اور خدا کے فضل سے ابھی تک ان کا تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ شوقیہ ہومیوپیتھی کا علاج بھی کرتے ہیں اور ہم لوگوں نے ان کی مسیحائی کی وجہ سے اکثر نزلے زکام سے جلد نجات حاصل کی ہے۔

ہاشمی صاحب جامعہ کی جوبلی میں شرکت کے لئے میرے اور علیم صاحب کے ساتھ دہلی گئے تھے۔ جاتے ہی بخار میں مبتلا ہو گئے۔ کشمیر کی ایک سلیکشن کمیٹی میں سری نگر گئے۔ وہاں اتفاق سے مئی کے مہینے میں بارش ہوگئی یہ گرمی کی یونیفارم میں تھے نتیجہ یہ ہوا کہ بُرا حال ہوگیا اور جلد سے جلد ہوائی جہاز سے سری نگر کی جنت سے لکھنؤ کے آتش خانے میں پہنچ کر دم لیا۔

جب کے ایم منشی اتر پردیش کے گورنر ہوئے تو پہلے انھوں نے ریاست کے انتظامات میں دخل دینا شروع کیا لیکن پنڈت گوبند بلبھ پنت نے جو اس زمانے میں وزیر اعلیٰ تھے ان کی ایک نہ چلنے دی۔ مجبور ہوکر انھوں نے یونیورسٹیوں میں شرم ناک حالات کی تحریک چلائی اور اس سلسلے میں لکھنؤ یونیورسٹی کے اساتذہ سے بھی خطاب کیا۔ اور لوگ تو خاموش بیٹھے رہے لیکن اودھ کشور شرما نے جو سوشیالوجی کے لکچرر تھے کہا کہ ہم لوگ اپنا سب کام خود ہی کر سکتے ہیں ایک

ہماری حیثیت سے ہمارا کام اچھا چلتا ہے یہ شرم ہولناک بات کہیں اور جا کر کہئے۔ گورنر صاحب اتنے خفا ہوئے کہ صدر شعبہ پروفیسر ڈی پی مکرجی کو بلا کر کہا کہ ایسے بد تمیز آدمی کو آپ کو سخت تنبیہہ کرنی چاہئے۔ ڈی پی مکرجی نے جواب دیا کہ اس نے بالکل درست کہا۔ تنبیہہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بات تو مجھے کہنی چاہئے تھی۔ یونیورسٹیوں کے سلسلے میں ان کے مختلف اقدامات کی وجہ سے اساتذہ اور طلبہ سب بد ظن ہو گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۵۳ء میں کچھ طلبہ نے اسٹرائک کی۔ چندر بھان گپتا نے جو اس وقت وزیر تھے اور یونیورسٹی کے ٹریزرار بھی تھے اساتذہ کو اپنے گھر بان دریبہ بلایا۔ ایک دن پروفیسروں سے، دوسرے دن ریڈروں سے اور تیسرے دن لکچرروں سے خطاب کیا اور ان پر زور دیا کہ طالب علموں کی بھوک ہڑتال ختم کرائیں۔ پہلے دن تو کسی نے کچھ نہیں کہا دوسرے دن گپتا جی کی تقریر کے بعد میں نے بھی جواب میں تقریر کی اور کہا کہ اساتذہ حکومت کے آلۂ کار نہیں ہوتے۔ یہ جو حالات ہیں ان میں راج ہٹ اور بال ہٹ کا تصادم ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ ہم طلبہ کی بھوک ہڑتال ختم کرا دیں اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ اگر ہمیں ان کے مطالبات جائز معلوم ہوں تو ان کو ماننے کا بھی اختیار ہو۔ آپ ہمیں یہ اختیار دے دیجئے تو ہمیں یقین ہے کہ طلبہ کی بھوک ہڑتال چند گھنٹوں میں ختم ہو سکتی ہے۔ ہماری بات ان لوگوں نے نہیں مانی اور معاملہ اتنا آگے بڑھا کہ چند روز کے بعد طلبہ اور پولیس میں منکی برج پر باقاعدہ جھڑپ ہوا اور بعد میں امین آباد میں فائرنگ کے نتیجہ میں تین افراد مارے گئے جن میں ایک جونیئر ڈاکٹر تھا۔ اس زمانے میں شہر میں ایک نعرہ بہت عام تھا۔ لکھنؤ کے تین چور منشی، گپتا، جگل کشور۔

منشی نول کشور کی گرانقدر خدمات سب پر روشن ہیں۔ مولانا آزاد نے ایک دفعہ مجھ سے کہا کہ کیا اچھا ہو اگر نول کشور کے ادارہ کی سو اہم مطبوعات Every men's Library کے نہج پر دوبارہ شائع کی جائیں۔ اگر نول کشور کے وارث وزارت تعلیم کو اس کے لئے ایک اسکیم پیش کریں تو حکومت ہند کی طرف سے انھیں ایک لاکھ روپے کام کا آغاز کرنے کے لئے گرانٹ کے طور پر دئے جائیں گے شرط صرف یہ ہوگی کہ اس کی [illegible] اردو کے چند ممتاز نقاد اور یونیورسٹی کے پروفیسر ہوں گے۔ میں نے لکھنؤ واپس آ کر ماہر رام کمار [illegible] سے بات کی اور ان سے کہا کہ اس اسکیم کے مرتب کرنے میں [illegible] گا مگر ماہر صاحب نے کہا کہ اب اردو کی کتابوں کی نکاسی کی امید بہت کم ہے اور اردو کالجوں اور یونیورسٹیوں کی درسی کتابیں ہی شائع کرنا زیادہ مفید سمجھتے ہیں۔ میں نے مولانا کو اس کی اطلاع دی۔ کئی سال بعد جب میں علی گڑھ سے کسی ادبی اجتماع میں شرکت کرنے کے لئے لکھنؤ گیا تو ماہر صاحب کا بیٹا مجھ سے ملا اور اس نے کہا کہ مجھے کاغذات میں آپ کے اس سلسلے کی خط و کتابت ملی ہے کیا اس اسکیم کو اب عمل میں لایا جا سکتا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ بھائی اب کیا ہو سکتا ہے۔ "وہ پانی تو ملتان بہہ گیا" (دیکھو آب حیات)

ڈاکٹر عبد العلیم جامعہ ملیہ سے علی گڑھ ہوتے ہوئے ۳۸ء میں لکھنؤ پہنچے۔ یونیورسٹی میں اور شہر کی علمی و ادبی محفلوں میں ان کا ایک نمایاں رول ہوتا تھا لکھنؤ میں پہلے وہ لال باغ کے قریب اصغر حسین ایڈوکیٹ کے ایک مکان میں کرایہ پر رہے۔ پھر بندریا باغ کے ڈیلی گیسی سینٹر میں وارڈن رہے۔ وہ مارکسزم کے علمبردار اور شہر کی کمیونسٹ اور ترقی پسند انجمنوں کے روح رواں تھے۔ جب دسمبر ۴۷ء میں ہم لوگ ترقی پسند مصنفین کی آل انڈیا اردو کانفرنس کر رہے تھے تو کچھ کارکنوں نے جوش میں آ کر گنگا پرشاد میموریل ہال میں ایک جگہ یہ بینر لگایا "مارکسزم ہی صحیح ترقی پسندی ہے" علیم صاحب نے دیکھا تو اس بینر کو ہٹوا دیا۔ جب ہم لوگوں نے ان سے پوچھا یہ کیا؟ تو کہنے لگے بات تو صحیح ہے لیکن اس سے غلط فہمی پھیل سکتی ہے اس لئے کہ ترقی پسند تحریک میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو مارکسی نہیں ہیں اور ان لوگوں کو شکایت ہو سکتی ہے۔

علیم صاحب جامعہ میں مولانا سورتی جیسے عالم کے شاگرد تھے۔ اس زمانے میں عربی کے استادوں میں مولانا یسین اور مولانا سورتی کے پایہ کا کوئی دوسرا نہ تھا۔ جامعہ سے اعلیٰ تعلیم کے لئے جرمنی گئے وہاں عقیدۂ اعجاز قرآن کی تاریخ پر پی ایچ ڈی کیا۔ واپس آ کر چند سال جامعہ میں استاد رہے۔ علی گڑھ میں ۳۲ء میں نواب اسماعیل خاں کی وائس چانسلری کے زمانے میں عربی کے لکچرر مقرر ہوئے۔ بڑا مرتب ذہن پایا تھا اور تقریر بہت اچھی کرتے تھے۔ علی گڑھ میں وہ زیادہ تر پرانے اسٹاف کلب کے ایک کمرے میں رہے (اب یہاں پر اکثر آفس ہے)

۱۹۵۰ء میں یسین صاحب کے سبکدوش ہونے پر علی گڑھ آ گئے تھے [illegible] میں وہ علی گڑھ میں عربی کے پروفیسر ہوئے اور ۶۸ء میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر۔ ۷۶ء کے شروع میں ان کا انتقال ہوا۔ اس وقت وہ ترقی اردو بیورو حکومت ہند کے چیرمین تھے۔ علیم صاحب نے لکھا بہت کم ہے۔ ان کا پی

[illegible] کا مقابلہ [illegible] ان کی [illegible] تحریک [illegible] نہیں تقریر کے
موڈ میں آجاتے تھے۔ نہایت پابندی سے کلاس میں آتے [illegible] کا ان پر اثر ضرور ہو جاتے
تھے اور کوئی لفظ [illegible] دوست [illegible] رخصت [illegible] دیتا
تھا وہ کلاس میں [illegible] زبان [illegible] تھے بہت کم تھے۔ ان کے شعبہ کے صدر
پروفیسر وحید مرزا بھی بہت کم سخن تھے بلکہ ان پر تو غالب کا یہ شعر صادق آتا تھا

کہتے ہیں فرشتے کہ دل آویز ہے مومن
حوروں کو شکایت ہے کم آمیز ہے مومن

وحید مرزا صاحب عربی کے بہت اچھے استاد تھے۔ امیر خسرو پر ان کی کتاب جو ہندوستانی اکیڈمی سے چھپی تھی اور اسی طرح امیر خسرو کی مثنوی 'نہ سپہر' کا ان کا مرتب کیا ہوا ایڈیشن بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ وحید مرزا صاحب لکھنؤ یونیورسٹی کے اساتذہ یا طلبہ یا شہر کی تہذیبی اور ادبی زندگی سے زیادہ سروکار نہیں رکھتے تھے لیکن ڈاکٹر عبدالعلیم خواہ اساتذہ کی انجمن ہو یا انجمن ترقی پسند مصنفین یا یونیورسٹی یونین سب کی سرگرمیوں میں پیش پیش رہتے تھے۔ لکھنؤ میں علیم صاحب کے بہت سے معرکے رہے ہیں مگر وحید مرزا سے لکھنؤ کے صرف خواص ہی واقف تھے عوام سے ان کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ علیم صاحب ہمیشہ شیروانی اور کرتے پاجامے میں نظر آئے تو وحید مرزا صاحب کو ہمیشہ سوٹ اور ٹائی میں مقطع دیکھا گیا۔

لکھنؤ یونیورسٹی کی ایک قابل ذکر شخصیت احسن فاروقی کی تھی۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں شعبۂ انگریزی میں ان کا تقرر ۱۹۴۲ء میں میرے جوائن کرنے کے کچھ دن بعد ہی ہوا تھا۔ قریب ہی کی چوکھی میں ان کا مکان تھا۔ باپ دادا تو خیر بدایوں کے تھے مگر ایک عرصہ سے ان کے والد محمود آباد اور بلہرہ کی ریاست سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے ناول 'شام اودھ' میں لکھنؤ کی تہذیب و معاشرت کا اثر دیکھا جا سکتا ہے۔ احسن فاروقی نے اسی زمانے میں لکھنا شروع کیا۔ پہلی کتاب انھوں نے نورالحسن ہاشمی کے ساتھ لکھی تھی جس میں ان کی انگریزی [illegible] زبان کو ہاشمی نے صاف ستھری نثر بنا دیا تھا۔ وہ خاصے زود نویس تھے۔ نگار میں انیس کے مراثی پر ان کے مضامین اختلافی ثابت ہوئے۔ اثر لکھنوی نے ان کا جواب بھی دیا تھا۔ پھر اردو ادب میں [illegible] کے نذیر احمد کے تمثیل مضمون پر مضامین شائع کئے۔ ان کا ناول شام اودھ چند سال بعد لکھا۔ غالباً ۱۹۵۲ء میں وہ پاکستان چلے گئے تھے۔ تصنیف و تالیف کا سلسلہ [illegible]

لیکن [illegible] ایک [illegible] تحریک کے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] بہت [illegible] شروع ہو گئی [illegible] کوئی احترام
[illegible] سکتے تھے اور [illegible] بڑی مشکل سے میں نے گفتگو کا رخ کسی اور موضوع کی طرف موڑا۔ احسن فاروقی بہت اچھے دوست تھے اور [illegible] اور دوستوں کی ہر معاملے میں مدد کے لئے تیار رہتے تھے۔ ایک دفعہ امیر الدولہ اسلامیہ انٹر کالج والوں نے فرحت اللہ بیگ کا اردو کا ایک یادگار مشاعرہ اسٹیج کیا۔ کالج کے ان طلبہ کی تعداد دو درجن کے قریب تھی۔ منتظمین نے ان لڑکوں کی واپسی کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا۔ مشاعرے کے بعد جب کسی طرح ان کی گاڑی ہاتھ نہ آئی۔ وائس چانسلر بھی جا چکے تھے تو بیچارے احسن فاروقی کو پکڑ لایا گیا اور انھوں نے رات کے بارہ بجے پانچ چھ پھیروں میں یونیورسٹی سے ان طلبا کو امین آباد پہنچایا۔ مشہور فلم ساز مظفر علی انھیں احسن فاروقی کے بھانجے ہیں۔ میں جب ۷۷ء میں پاکستان گیا تھا تو کراچی میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ جنوری ۷۸ء میں کوئٹے میں ان کا انتقال ہو گیا۔ 'نیا دور' کراچی کی ادارت میں انھوں نے جمیل جالبی کی بہت مدد کی تھی۔ اس کے علاوہ شاہد احمد دہلوی نے جب کراچی سے 'ساقی' دوبارہ نکالنا شروع کیا تو احسن فاروقی نے ان کے رسالے میں بہت سے مضامین لکھے۔ انھوں نے 'شام اودھ' کے علاوہ ناولوں اور کہانیوں کا بھی ایک خاصہ گرانقدر سرمایہ چھوڑا ہے۔ اردو ناول اور اردو تنقید پر بھی قابل قدر کتابیں لکھی ہیں۔

جب میں سینٹ جانس کالج آگرہ میں سکنڈ ایر سائنس میں پڑھتا تھا تو اسرار الحق مجاز اور معین احسن ملال (بعد میں جذبی) فرسٹ ایر سائنس میں داخل ہوئے۔ دونوں کو سائنس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی چنانچہ انٹرمیڈیٹ میں دونوں فیل ہو گئے۔ مجاز علی گڑھ آگئے اور جذبی اینگلو عربک کالج دلی پہنچ گئے۔ جب میں ۳۲ء میں انگریزی میں ایم اے کرنے لگا تو مجاز بی اے میں پڑھ رہے تھے۔ انھوں نے ۱۹۳۴ء میں علی گڑھ سے بی اے کیا اور اسی سال آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہو گئے۔ یہاں وہ ریڈیو کے رسالے 'آہنگ' کے ایڈیٹر تھے۔ شاید ڈیڑھ سال بعد [illegible] جدا کر دیا۔ اس کے بعد ان کا قیام زیادہ تر دلی میں رہا اور اس زمانے میں وہ [illegible] سے خاصے قریب تھے۔ یہ

جو ریسرچ [illegible] ایک [illegible] کی حیثیت سے انھوں نے
کام کیا۔ شراب نوشی کی کثرت کا نتیجہ [illegible] ان کے اعصاب جواب دے گئے تھے
کچھ دنوں تک وہ [illegible] رہے پھر ٹھیک ہو گئے تھے۔ جب ۱۹۴۰ء میں لکھنؤ
پہنچا تو [illegible] شراب نوشی اور [illegible] کی شہرت عام تھی۔ شاعروں
میں [illegible] بہت مقبول رہتے تھے۔ لیکن ۱۹۴۵ء کے بعد ان کی شراب نوشی
[illegible] ایک [illegible] دونوں [illegible] جہاں آنے
[illegible]۔ اتفاق سے اس وقت روشن
صدیقی [illegible] شہید ہو گئی تھی کہ جالندھر میں ۴۷ء کے
ہنگامے میں شہید کر دیے گئے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ وہاں سے
کسی طرح جان بچا کر [illegible] کامیاب ہو گئے تھے۔ اور اس وقت
[illegible] تھے۔ روشن صاحب نے باتوں باتوں میں مجھ سے کہا کہ اب جبکہ
یہاں قیام مستقل طور پر مرادآباد میں ہے تو سوچتا ہوں کہ شادی کر لوں اور کسی بیوہ
سے کروں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟ میں نے مجاز صاحب کو متوجہ کرتے ہوئے
کہا کہ روشن صاحب شادی کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں اور کسی بیوہ سے عقد
کرنے کی سوچ رہے ہیں۔ مجاز نے چھوٹتے ہی کہا روشن صاحب آپ سوچئے
مت۔ کسی سے بھی شادی کر لیجئے۔ بیوہ تو آپ سے شادی کے بعد ہو ہی جائے
گی۔ ہم لوگوں کے قہقہے میں روشن صاحب بھی شریک تھے۔ لکھنؤ ریڈیو والوں
نے ایک دفعہ عید کے موقع پر ایک شعری نشست رکھی جس میں مجاز اور
میں دونوں مدعو تھے۔ عید سے ایک دن پہلے جب کافی ہاؤس میں مجاز
سے ملاقات ہوئی تو میں نے کہا کہ اس سال عید پر تمہاری قربانی ہے۔ بے ساختہ
کہنے لگے سردار صاحب قربانی نہیں جھٹکا ہے۔ کافی ہاؤس میں اکثر نظر آتے
تھے۔ ایک دفعہ جب [illegible] تو کسی دوسری میز پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے انھیں
اپنی میز پر بلا لیا اور کافی کا آرڈر دیا۔ کہنے لگے آپ تکلیف نہ کیجئے مجھے کافی
سوٹ نہیں کرتی۔ ۱۹۵۰ء کی گرمیوں میں پٹنے میں ایک اردو کانفرنس تھی جس
میں شرکت کے لئے ڈاکٹر عبدالعلیم، مجاز اور میں لکھنؤ سے گئے تھے۔ کانفرنس
کے بعد مشاعرہ بھی تھا۔ اس زمانے میں مجاز کی شراب نوشی بہت بڑھ
گئی تھی۔ میں نے [illegible] سہیل عظیم آبادی سے تاکید کر دی کہ وہ ان کے ساتھ
رہیں اور مشاعرے کے اختتام [illegible] تاکہ کوئی بدمزگی نہ ہونے پائے۔
مشاعرہ کے بعد کوئی ایک بجے کے قریب شعراء اور مندوبین اپنی قیام گاہ

[illegible] جہاں [illegible] مشہور محقق [illegible]
کانفرنس [illegible] شریک تھے۔ تمام [illegible]
اپنے کمروں میں سو گئے۔ تھوڑی دیر بعد ایک طرف سے شور اٹھا۔ [illegible]
ہمارے [illegible] شور [illegible] کہ لوگ [illegible] صاحب کے کمرے [illegible]
دیکھا کہ مجاز نشے میں [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
ذاکر [illegible] بہت [illegible]
ایک معمہ تھی۔ [illegible]
جنگ نامہ [illegible] مجاز [illegible] کے عنوان سے ایک نظم لکھی اور [illegible] شائع [illegible]
کی تلقین کی تو مجاز نے صرف یہ کہا کہ شیخ عبداللہ کی تعریف میں جو
جو نظم لکھی تھی اس کا حوالہ دیتے ہوئے اپنا انتقام اس طرح لیا۔

مندر باد کو نصیحت ہے
شیخ کی شان [illegible]

پھر [illegible] بعد جب ان کی صحت گرنے لگی تو کسی طرح ان کو [illegible]
میں داخل کرا دیا گیا۔ چند ماہ وہاں کے قیام کے بعد خاصے صحت مند ہو گئے [illegible]
تک شراب بھی چھوڑ دی تھی لیکن پھر یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ دسمبر ۱۹۵۵ء میں
ایک دوست کے یہاں ان سے ملاقات ہوئی۔ کہنے لگے سنا ہے [illegible]
[illegible] ذاکر صاحب نے [illegible] کا ترانہ [illegible] لیا ہے۔ [illegible]
ایک کانفرنس ہے اس کے بعد میرا ارادہ علی گڑھ آنے کا ہے۔ افسوس
کہ اس کانفرنس کے مشاعرہ میں شرکت کے بعد ہی وہ لال باغ کے ایک مکان
کی چھت پر بے ہوش پائے گئے جہاں سے انھیں اسپتال منتقل کرایا گیا۔ کچھ
گھنٹے کی بے ہوشی کے بعد انھوں نے جان جان آفریں کے سپرد کر دی
عصمت نے مجاز کے خاکے میں ان کے مزاج اور ان کی شاعری دونوں کی بڑی
اچھی تصویر کشی کی ہے۔ محض غم روزگار کو مجاز کی بربادی کا ذمہ دار قرار دینا
غلط ہوگا۔ وہ دراصل اپنے خلاف [illegible] کا شکار ہو گئے۔
کافی ہاؤس میں اکثر [illegible] اور سلام مچھلی شہری ساتھ ساتھ نظر آتے تھے
سلام مچھلی شہری اس زمانے میں مختلف لوگوں کو [illegible] منظوم خط لکھا
کرتے تھے۔ کبھی سجاد ظہیر کے نام، کبھی جوش کے نام۔ ایک دفعہ کافی ہاؤس میں
ان سے ہندی کے ایک ادیب نے [illegible] پوچھا تم [illegible] نام خط

[illegible] مجھ سے کہنے لگے کہ تمہارے نام خط آیا [illegible] سلام کے گیتوں اور نظموں کا اس وقت کی [illegible] ان کے ایک ساتھی نے ان کی چند نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا ایک دفعہ میں کافی ہاؤس میں بیٹھا ہوا تھا اور میری میز پر [illegible] کے علاوہ ایک خاتون بھی تھیں جن کے حسن کا سارے لکھنؤ میں شہرہ تھا۔ سلام آئے اور اسی میز پر بیٹھ گئے مگر بالکل خاموش تھے نگاہیں خاتون کے چہرے پر تھیں۔ انھوں نے از راہ ہمدردی ان سے پوچھا سلام صاحب خیریت تو ہے آپ اس قدر خاموش کیوں ہیں؟ میں نے یوں ہی مذاق میں کہہ دیا کہ محترمہ پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ان کی صورت ہی ایسی ہے میز پر جتنے لوگ تھے سب ہنس پڑے۔ تھوڑی دیر بعد جب لوگ منتشر ہونے لگے تو سلام نے آکر مجھ سے شکوہ کیا کہ سرور صاحب مجھے آپ سے سخت شکایت ہے۔ آپ نے ایک خاتون کے سامنے میرا مذاق اڑایا۔ میں نے ان سے کہا کہ بھائی ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کا برا نہیں ماننا چاہئے۔ اور میرا آپ کی سبکی کا کوئی ارادہ نہیں تھا شکر ہے کہ انھوں نے میری بات مان لی اور اس کے بعد اسی خلوص سے ملنے لگے۔

لکھنؤ کا گنگا پرشاد میموریل ہال میرے زمانے میں اچھا خاصا ادبی مرکز تھا۔ عام طور پر ہر ادبی کانفرنس یا مشاعرہ وہیں ہوتا تھا۔ اس زمانے میں لکھنؤ میں کئی یادگار مشاعرے ہوئے۔ آل انڈیا ریڈیو نے بھی کئی اچھے مشاعرے کئے مشاعرے یونیورسٹی میں بھی ہوتے تھے مگر یہاں بعض اوقات اردو سے ناواقف ہونے کی وجہ سے طلبہ شور بھی بہت مچاتے تھے۔ لیکن گنگا پرشاد میموریل ہال میں جو مشاعرے ہوتے تھے یا سنی وقف بورڈ کے مشاعرے جو محبوب عالم صاحب کی طرف سے ہوتے تھے ادب اور تہذیب کے گہوارے تھے اور ان میں کبھی کبھار جوش اور جگر اور اثر لکھنوی، آنند نرائن ملا، سراج لکھنوی، قدیر، شہزاد لکھنوی باقاعدہ شریک ہوتے تھے۔

آنند نرائن ملا ہمارے چوٹی کے شعراء میں ہیں مگر ان کے پڑھنے کا انداز منفرد ہے۔ شوکت تھانوی نے بشیشر [illegible] میں اس کا بڑے پر لطف انداز سے ذکر کیا ہے۔ میں نے ایک دفعہ یونیورسٹی کے مشاعرہ میں یہ سوچ کر کہ کہیں لڑکے شور نہ مچائیں ان سے مشاعرہ کا افتتاح کرنے کی درخواست کی اور ان کا کلام سب نے نہایت احترام سے سنا تھا جب میں نے دوبارہ ان کو دوسرے شعراء کے ساتھ

ذہنیت [illegible] اس زمانے میں لکھنؤ کے مشاعرے آج کل کے مشاعروں کی طرح ہنگامے یا خرافات کے اڈے کی نمائش نہیں ہوتے تھے۔ بزرگوں کو احترام سے سنا جاتا تھا اور نوجوانوں کو موقع دیا جاتا تھا کہ وہ اپنے کمالِ فن کا ثبوت دیں۔ مصرع طرح کا رواج بھی باقی تھا۔

میں نے ۱۹۷۷ء میں لاہور میں ایک ادبی استقبالیہ میں جو ادارہ نقوش کی طرف سے دیا گیا تھا کہا تھا کہ برصغیر میں تین شہر ہیں باقی سب گاؤں ہیں۔ ہندوستان میں لکھنؤ اور حیدرآباد اور پاکستان میں لاہور۔ لکھنؤ اگرچہ اب بہت بدل گیا ہے مگر یہ تو اب بھی کہا ہی جا سکتا ہے۔ کہ

"کہ با وجود خزاں بوئے یاسمن باقیست"

□□

وابستہ ہے جس سے مری تحریر پُرانی
دل میں ہے مُزیّن وہی تصویر پُرانی

پھر سنگِ درِ یار پہ سجدے ہوں میسّر
لکھ دے مری پیشانی پہ تقدیر پُرانی

ہر لفظ سے جھلکے ہے محبّت کا تقدس
سینے سے لگا رکھی ہے تحریر پُرانی

ہر روز نئے خواب سجاتا ہوں نظر میں
مِلتی ہے مگر خواب کی تعبیر پُرانی

کھو جاؤں گا اک دن اِسی یادوں کے بھنور میں
ٹوٹی ہی نہیں پاؤں کی زنجیر پُرانی

رفعت سروش
۲-بی، پاکٹ سی،
سدھارتھ ایکسٹینشن
نئی دہلی-۱۱۰۰۱۴

غزل

غزل

تھا جب متاعِ وقت تو بیزار سب ہوئے
میں خرچ ہو گیا تو خریدار سب ہوئے

منظر، نظر، مشاہدہ، احساس، دل، دماغ
اک معرکے میں قتل یہ کردار سب ہوئے

دہلیز پر کھڑی تھی سوالوں کی کوئی بھیڑ
میں چُپ رہا تو برسرِ پیکار سب ہوئے

اک بے یقین عزم کہیں دل میں تھا مقیم
کہسار حوصلے مرے مسمار سب ہوئے

ہم ہی یہاں نہ نکلے قیافہ شناسِ ہجر
لمبی جُدائیوں کے تو آثار سب ہوئے

وہ برقِ بے لباس تھی یا لذّتِ نگاہ
دیکھے نہ دیکھے کوئی گنہگار سب ہوئے

مُنصور سبزواری
پوسٹ نوح، ضلع گوڑگاؤں
ہریانہ ۱۲۲۱۰۷

ڈاکٹر سلمان عباسی
سی ۲، ... پیپر مل کالونی، نشاط گنج، لکھنؤ

"اب ہم کہاں سے لائیں دبستانِ لکھنؤ"

اُردو ادب میں دبستانوں کی ابتدا کب سے ہوئی۔؟ اس سوال کا حتمی جواب دینا تو محال ہے۔ بہرحال اس سلسلے میں تاریخ کا تھوڑا سا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

سب سے پہلے یہ تحقیق ہوئی کہ اُردو کے سب سے پہلے صاحبِ دیوان شاعر قلی قطب شاہ ہیں۔ کچھ عرصے بعد محققین نے یہ دعویٰ کیا کہ سراج اورنگ آبادی کا دیوان قلی قطب شاہ سے پہلے مرتب ہوا تھا اس لیے سراج اورنگ آبادی کو اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہونے کا شرف حاصل ہے۔

شمالی ہند کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر فائز کا دیوان مع حاشیوں اور اصل متن کے ساتھ شائع کر کے پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے یہ ثابت کیا کہ وہی ہندستان کے اس خطے کے اولین شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔

عظیم آباد (پٹنہ) کے بیشتر مستند شعرا بھی اس دوڑ میں کسی سے پیچھے نہیں تھے اور وقتاً فوقتاً اپنے فن اور تخلیق کاوشوں کا مظاہرہ کر کے دنیائے ادب میں اپنی موجودگی کا ثبوت دیتے رہے۔

پھر دبستانوں کی ابتدا کب اور کیسے ہوئی؟ یہ دبستان کن بنیادوں پر قائم ہوئے اور ان کی پرورش اور پرداخت کن خطوط پر ہوئی ــــ؟ یہ سوال آج تک تشنۂ تحقیق ــ اور جواب طلب ہے۔

لکھنؤ اور دہلی کے دبستانوں کے وجود کی کہانی تو غالباً اس دور سے شروع ہوتی ہے جب میر حسن، میر تقی میر، میرزا رفیع سودا، انشاء اللہ خاں انشا، امانت، غلام ہمدانی مصحفی، سعادت یار خاں رنگین اور دوسرے متعدد قابلِ ذکر شعرائے دلی مرحوم کی تباہی اور بربادی سے متاثر ہو کر لکھنؤ کی سرزمین کو اپنے لیے منتخب کیا۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں ــ میر

دلی سلطنت کے زوال کے بعد ساری ادبی گہما گہمی اودھ کی راجدھانی لکھنؤ منتقل ہوئی تو یہاں کے امیروں، رئیسوں اور نوابوں کی ڈیوڑھیاں جگمگا اٹھیں اور ادبی جلسوں و مشاعروں کا رواج عام ہو گیا۔

ان میں ایک ایسا یادگار مشاعرہ بھی تھا جو میر، مصحفی، انشا، قتیل، رند اور شہزادہ سلیمان شکوہ وغیرہ کے یہاں ہر ماہ جگہ بدل کر پابندی سے منعقد ہوتا تھا۔

ناسخ کے شاعرے آپسی چشمکوں کی وجہ سے عوام و خواص میں بے حد مقبول تھے۔ نواب آصف الدولہ کے وزیر اعظم آغا میر اور فقیر محمد خاں گویا کے مشاعروں کے بھی لوگ منتظر رہا کرتے تھے۔

ان مشاعروں کے واقعات، لطیفوں اور معرکوں کے ذکر سے اردو ادب کی تاریخ بھری پڑی ہے۔

دراصل انھیں ادبی سرگرمیوں نے دبستانِ لکھنؤ کے تصور کو اجاگر کیا اور یہاں کی شعری روایات کو ایک الگ رنگ و آہنگ بخشا اور اسی ماحول میں اصلاحِ زبان کے ٹھوس اور بنیادی کام کی طرف توجہ دی جانے لگی۔ انشا اور ناسخ کے نام اس ضمن میں ناقابلِ فراموش اور زریں حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔

اس دور کے بعد اودھ کی انحطاط پذیر حکومت میں سلاطینِ اودھ کی کم سے کم اور محتاط ادب نوازی اور شعرا پروری کے باوجود ناسخ کی طبع آزمائی اور آتش سے مقابلہ آرائی بھی اپنے دور کے ادبی ثقافتی

اور تہذیبی پس منظر کی شاندار عکاسی کرتی ہے ۔

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی نام ہے آتش مرصع ساز کا

لفظوں کو نگینے کی طرح جڑنے کا کام اس شدّت اور تندہی کے ساتھ اس دور میں جاری رہا کہ "شاعری" "مرصع سازی" کے فرائض انجام دینے لگی اور شاید یہی وہ دور تھا جب یہ امتیاز قائم ہوا کہ داخلی اور خارجی شاعری کے دو الگ الگ شعبے ہیں اور — دلی اور لکھنؤ — دو الگ الگ دبستان شاعری ہیں۔

دبستانِ لکھنؤ کی پہلی آواز کے روپ میں میر ببر علی انیس کی آواز ــــ

وہ موجِ حوادث کا تھپیڑا نہ رہا کشتی وہ ہوئی غرق وہ بیڑا نہ رہا
سارے جھگڑے تھے زندگانی تک انیس جب ہم نہ رہے تو کچھ بکھیڑا نہ رہا
ـــــــــــــ میر انیس

انیس اور دبیر کی شائستہ ادبی جنگ ــ انیسیوں اور دبیریوں کی ناشائستہ جنگ تک پہونچ گئی، اور دونوں کے حامیتوں کے ہاتھ ایک دوسرے کے گریبانوں تک پہونچ گئے۔

لیکن وہ دونوں ــــ ایک دوسرے کے مداح اور قدرداں ــــــ پہلے بھی تھے اور آخر عمر تک رہے۔ یہاں تک کہ جب ۱۸۷۴ء میں انیس کی وفات ہو گئی تو ان کے انتقال کے بعد مرزا سلامت علی دبیر نے یہ کہہ کر شاعری ترک کردی کہ؛

"میں اب کس کے لئے شعر کہوں۔ ؟"

مرزا دبیر نے میر انیس کا مصرعِ تاریخ ان الفاظ میں نکالا ــ

آسماں بے ماہِ کامل سدرہ بے روح الامیں
طورِ سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس
ـــــــــــــ مرزا دبیر

اگلے سال ۱۸۷۵ء میں جب دبیر کا انتقال ہوا تو بادشاہ اودھ نواب واجد علی شاہ کے ستوہی اور آتش اسکول کے نمایاں شاعر آغا حجو شرف نے دونوں موقر اور معتبر شعرا کی تاریخ ایک ہی مصرعے سے نکالی؛

ہے ہے غم انیس میں غم ہے دبیر کا

کیا دبستانوں کی بنیادیں معرکہ آرائیوں پر ہیں ــ ؟

ـــــ انشاء اور مصحفی کا معرکہ !
ـــــ ناسخ اور آتش کا معرکہ !
ـــــ انیس اور دبیر کا معرکہ !
ـــــ شرر اور چکبست کا معرکہ !

یہ معرکے دبستانوں کی بنیاد بنے ہوں تو بنے ہوں، لیکن حقیقتوں کی بنیاد نہیں بن سکتے۔ لکھنؤ کی نفاست، نزاکت اور جذباتی ہم آہنگی کے بالکل برخلاف ہیں۔ انھیں وضعداری، رواداری اور شفقت و محبت کے وہ گھنے سائے ملے ہیں جنھوں نے لکھنؤ، دلی اور دوسرے دبستانوں کے تصور کو پروان چڑھایا ہے۔

اب آیئے ــ دبستانِ لکھنؤ کے اس ادب پرور اور رومان خیز تصور پہ جہاں، یہ آوازیں گونج رہی ہیں ـــــــ

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

ثاقب لکھنوی کا منفرد لب و لہجہ جو دبستان لکھنؤ کے وجود پر مہر تصدیق ثبت کر دیتا ہے ملاحظہ ہو ــ

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

آرزو لکھنوی کی سہل، شستہ، سلیس اور ترکیبوں سے عاری شاعری نے باذوق سامعین اور قارئین کے دلوں کو جھنجوڑ کر رکھ دیا ــ

کالی گھٹا میں کوندا لپکا رو کے جو کوئل کوک گئی
جتنی لمبی سانس کھینچی اتنی ہی لمبی ہوک گئی

عزیز لکھنوی جنھوں نے جوش ملیح آبادی اور جعفر علی خاں اثر جیسی یادگاریں چھوڑیں، اپنا جواب آپ ہیں ــ

دل کا چھالا پھوٹا ہوتا، کاش یہ تارا ٹوٹا ہوتا
شیشۂ دل کو یوں نہ اٹھاؤ، دیکھو ہاتھ سے چھوٹا ہوتا

جس طرح دلی کے شاعر لکھنؤ آ کر یہاں کے شاعروں سے گھل مل گئے، کچھ شکووں اور شکایتوں کے باوجود مرزا یاس یگانہ چنگیزی عظیم آبادی بھی "لکھنوی" بن کر یہیں پیوندِ خاک ہوئے۔ جون و یاس کے

ماحول میں زندگی بسر کرنے والے یگانہ، اپنے انفرادی لب و لہجہ کے لئے بھی اردو شاعری میں یگانۂ روزگار ہیں:

ہر صبح ہوئی شام کو اک خواب فراموش
دنیا یہی ہے دنیا تو کیا یاد رہے گی

لکھنؤ اسکول کے آخری شاعروں میں سراج لکھنوی کی آواز ابھی تک کانوں میں گونج رہی ہے ؎

آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے
اک ذرا آپ کو زحمت ہوگی

آتش لکھنوی نے "بندش الفاظ" کو نگینے جڑنے کا ہنر بنا کر جس طرح شاعری کو "مرصع سازی" بنا دیا تھا، اب وہ ہنر ناپید ہو گیا اور لکھنوی شاعری کی روش میں روز افزوں تبدیلیاں رونما ہونے لگیں، لہجے بدلنے لگے۔ الفاظ کا کھیل ختم ہوا، آوازوں میں نزاکت، نفاست اور حلاوت کی جگہ کھردرے پن کے آثار نمایاں ہونے لگے۔

فانی، جوش، حسرت اور مجاز نے ہر چند کہ اردو غزل کی روایات کو آگے بڑھایا لیکن ان کے یہاں وہ خالص لکھنوی انداز نہیں ملتا جو دبستان لکھنؤ کا خاصہ سمجھا جاتا ہے۔

- آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ امڈا آتا ہے
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے

——— فانی

کلی پہ بیلے کی اس طرح سے پڑا ہے شبنم کا ایک موتی
نہیں۔ یہ ہیرے کی کیل پہنے کوئی پری مسکرا رہی ہے

——— جوش

شاعر شہر نگاراں مجاز نے تو یا تا وہ اعلان کر دیا ہے
اب اس کے بعد صبح ہے اور صبح نو مجاز
ہم پر ہے ختم شام غریبان لکھنؤ

حقیقت تو یہ ہے کہ صفی، ثاقب، یگانہ، آرزو اور عزیز جیسے باغ و بہار شعرا کے بعد دبستانِ لکھنؤ کا تصور دھندلا گیا تھا لیکن کچھ ٹمٹماتے ہوئے چراغوں کی لویں ابوالفضل شمس لکھنوی، مولانا عبدالباری آسی، مولانا انقر موہانی، سراج لکھنوی، جعفر علی خاں اثر، نشتر لکھنوی، سید وزیر حسین خبیر، نور حسین نشتر، اور محمد اسمٰعیل اسلم لکھنوی وغیرہ کی شکل میں بزم اردو کی زیب و زینت میں اضافہ کرتی رہیں۔ یہ تمام حضرات کثیر التلامذہ تھے اور اپنی اپنی ذات میں ایک بھری پری انجمن کا مزاج رکھتے تھے۔ ان کے بعد لکھنؤ کی روایتی شاعری کا چراغ گل ہو گیا۔

دراصل اب تو لکھنؤ میں کسی دبستان کا وجود باقی ہے اور نہ کوئی اسکول ہی ہے جسے عہد قدیم کے لکھنؤ کی علامت قرار دیا جا سکے۔ آج لکھنؤ میں ہونے والی شاعری سماج اور زندگی سے پوری طرح متاثر ہے۔ ملک کی آزادی کے بعد ترقی پسند تحریک کے حوالے سے متاثر ہو کر تخلیق کیے جانے والے ادب میں لکھنؤ کا قابلِ ذکر حصہ رہا ہے — آج لکھنؤ کا منظر نامہ ہی کچھ اور ہے۔ موجودہ شاعری شاید اسی سبب لکھنؤ کے تنگ دائروں سے نکل کر اور اپنے ملک کے ادبی حصار کو توڑ کر اب اردو کی تیسری دنیا یعنی مغرب اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کی منظور نظر بن چکی ہے

آج کا شاعر گل و بلبل اور شانہ و گیسو کی از کار رفتہ تشبیہات اور اصطلاحات کو بالائے طاق رکھ کر اب مہر و مریخ اور جنگ و امن جیسے عالمی مسائل کو پیش نظر رکھ کر اور انھیں اپنا موضوع سخن بنانے نیز برتنے کی کوششوں کے ساتھ اکیسویں صدی میں داخل ہو رہا ہے۔ اس ضمن میں چند مثالیں اشعار کی شکل میں درج کرنا ضروری ہیں ؎

- بچھڑ بھی جاتے ہیں مل کر رہ محبت میں
مگر یہ بات ابھی تیرے سوچنے کی نہیں

——— تصور حسین زیدی

خاک میں اس کی اگر خون بھی شامل ہے تو کیا
یہ مرا گھر بھی تو ہے کوچۂ قاتل ہے تو کیا

——— عرفان صدیقی

مثالِ کوہ ندا اک فسانہ بن جاؤں
میں گونج گونج کے مر جاؤں اور سنائی نہ دوں

——— آغا روحی (علی ناصر سعید عبقاتی)

- میری خلوت میں جہاں گرد بھی پائی گئی
انگلیوں سے تری تصویر بنی پائی گئی

——— بانو داراب وفا

میں جس کے ہاتھ میں اک پھول دے کے آیا تھا
اسی کے ہاتھ کا پتھر مری تلاش میں ہے

——— کرشن بہاری نورؔ

دنیا میں اب خلوص ہے بس مصلحت کا نام
بے لوث دوستی کے زمانے گزر گئے

——— ساحرؔ لکھنوی

رگ رگ میں زمانے کی اُتر کیوں نہیں جاتے
جب ٹوٹ گئے ہو تو بکھر کیوں نہیں جاتے

——— سلطان عباسی

اُمید کی مدھم سی لَو بھی ہو تو پیاری ہے
یہ ایک کرن تنہا ظلمات پہ بھاری ہے

——— تسنیم فاروقی

مل بھی جاتے ہیں تو کترا کے نکل جاتے ہیں
اب تو موسم کی طرح دوست بدل جاتے ہیں

——— والیؔ آسی

اے حیات اب اس سے بڑھ کر انقلاب آئے گا کیا
پاؤں کی روندی ہوئی خاک اُڑ کے سر تک آگئی

——— حیات وارثی

اب تو آجائیں مجھے چھوڑ کے جانے والے
میں نے خوابوں کے دریچوں کو کھلا چھوڑ دیا

——— بشیر فاروقی

لکھنؤ کی روایتی شاعری میں تلمیحات نظم کرنے کا رواج عام رہا ہے اس سلسلے میں کربلا کے حوالے سے بڑی نادر و نایاب تلمیحات نظم کی گئی ہیں۔ ذیل میں صرف چند اشعار تلمیحات کے سلسلے میں ہے

ید بیضا کو گدا کا کشکول نہ بناؤ
وقت فرعون ہو تو ضرب عصا سے مانگو

——— ملک زادہ منظور احمد

عشق حسینؑ بجا ہے لیکن کون زیارت کرنے جائے
کرب و بلا کے سارے منظر ہندستان میں بستے ہیں

انیس انصاری

چلے چلو کہ اسی دھوپ کے سمندر میں
کہیں کہیں شجر سایہ دار بھی ہوں گے

——— سعید اختر نظامی

مجھ سے محبتوں کو برتنے چلے ہیں لوگ
کچھ دوسروں کے کان میں بھرنے چلے ہیں لوگ

——— انور ندیم

اسی طرح زندگی کرنے اور اسے برتنے کی بے انتہا مثالیں لکھنوی شاعری میں گھر کر چکی ہیں جو زمانے کے عوامل اور کیف و کم سے ہم آہنگ ہیں لیکن ان کے اقتباسات پیش کرنا سمندر کو کوزہ میں قید کرنے کے مترادف ہے ۔ غرضکہ سرزمینِ لکھنؤ پر منصۂ شہود پر آنے والی موجودہ دور کی شاعری اب کسی شناخت کی محتاج نہیں ہے بلکہ اس نے خود اپنی شناخت قائم کر کے اُردو ادب کی ملکی اور غیر ملکی سرحدیں پار کر لی ہیں۔

دبستانِ لکھنؤ کی سرحدیں ___ اب لکھنؤ اور اودھ کی تنگنائیوں سے نکل کر قومی اور بین اقوامی معیار و اقتدار سے نبرد آزما ہیں ___ اور ___ اکیسویں صدی اُن کا کشادہ دلی سے استقبال کرنے کو خندہ پیشانی کے ساتھ تیار ہے ۔

□□

تصحیح نیا دور بابت جنوری ۱۹۹۵ء میں مضمون "لکھنؤ کے امام باڑے (۲)" میں **امام باڑہ امیر محمد صاحب** کے عنوان کے تحت آخری پیراگراف ، " امام باڑہ اچھی حالت میں ہے ، متولی کا تقرر ، یا ضرورتاً انتظامی کمیٹی کا تقرر شیعہ وقف بورڈ ایک معینہ مدت کے لیے کرتا ہے ۔ موجودہ منتظم متولی سید احمد عباس ردولوی (لیکچرر شعبۂ اردو کرسچین کالج گولہ گنج لکھنؤ) ہیں" دراصل امام باڑہ داراب علی خاں سے متعلق ہے ۔ ناظرین اصلاح فرمالیں ۔ اسی طرح صفحہ ۱ پر حواشی کے تحت آخری جملہ "چھوٹی مہارانی کے نام سے مشہور تھیں" حذف کر دیں ۔

——— مدیر

غزلیں

پیار انا کے ہاتھوں جب فرعون خدا بن جاتے ہیں
ان ہی کے محلوں میں پل کر بچے موسیٰ بن جاتے ہیں

ہم سجدے میں جھک جاتے ہیں چاہے گردن پر خنجر ہو
اپنا سر اونچا رکھنے کو خود ہی نیزا بن جاتے ہیں

ویسے ادراک نہیں ہوتا اپنی شخصیت کا لیکن
جب سامنا ہوتا ہے تیرا، ہم آئینہ بن جاتے ہیں

یہ سیلِ فنا، وہ جوشِ نمو، پیہم آویزش دونوں میں
جنگل میں بستی اگتی ہے، قریے صحرا بن جاتے ہیں

کانٹوں سے کہو ہشیار رہیں، نورانی ہیں وہ سب چہرے
پہلے پھولوں کو ڈستے ہیں پھر بادِ صبا بن جاتے ہیں

کھلتے ہیں پھول ارمانوں کے، پڑتی ہے اوس امیدوں پر
ہم سے جب آنکھیں ملتی ہیں وہ لاپروا بن جاتے ہیں

ہم ہیں کہ مظفر خاک ہوئے، سنتے تھے کہ ان کے پاس آکر
ذرّے سورج ہو جاتے ہیں، قطرے دریا بن جاتے ہیں

مظفر حنفی
اقبال پروفیسر
کلکتہ یونیورسٹی۔ کلکتہ ۷۰۰۰۷۳

خوشبو سا اک رنگ کا پیکر دیکھا ہے
یعنی ہم نے چاند کو چھت پر دیکھا ہے

سنتا ہوں، ہوتی ہے محبت خود سے بھی
تم نے بھی کیا خود میں سنور کر، دیکھا ہے

ڈھونڈھتا ہوں میں جس کو زمیں پر مدت سے
میں نے اس کو خواب میں اکثر دیکھا ہے

روپ ہی روپ اور نشہ ہی نشہ ہے یعنی
ہم نے اس کو دل کے اندر دیکھا ہے

کس سے کہوں یہ بات تو اچھی ہے لیکن
تن کا جادو من کے اندر دیکھا ہے

عنوان چشتی
سی ۱۰۱، جامعہ نگر
نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

انیس انصاری
شاپ ۹، فلیٹ ۲، ڈالی باغ کالونی
لکھنؤ

میر تقی میر اور اُن کی ہم عصر ہندی شاعری[1]

اُردو شاعری کے خدائے سخن میر تقی میر ۱۷۲۲ء-۱۸۱۰ء کا عہد ہندی شاعری میں ریتی کال (یا جنوب وسطی عہد اتر مدھ کال ۱۶۴۳ء - ۱۸۴۳ء) کے نام سے معروف ہے۔ میر تقی میر کی پیدائش آگرہ میں ہوئی تھی۔ ان کی زیادہ تر اور اہم شعری تخلیقات دہلی میں لکھی گئیں اور نواب آصف الدولہ کے عہد میں وہ لکھنؤ آگئے جہاں ان کا انتقال ہوا۔

ہندی شاعری کا ریتی کال (یا جنوب وسطی عہد و مابعد عہد وسطی) میر کی پیدائش سے تقریباً سو سال پہلے شروع ہوتا ہے۔ لیکن اس کے دائرے میں میر کا تقریباً پورا عہد شامل ہو جاتا ہے۔ اس لئے ہم میر کی ہم عصر ہندی شاعری کو ریتی کال کے شعرا کے شعری رجحانات کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

میر کا زمانہ سیاسی، سماجی اور تہذیبی سطح پر انتشار اور انحطاط کا زمانہ تھا۔ سیاسی سطح پر یہ وقت سائنس اور تکنیک میں پچھڑی ہوئی ہندستانی، چینی، افریقی اور موجودہ تیسری دنیا کی دوسری تہذیبوں کی شکست کا عہد تھا ۱۷۰۰ء کے قریب یورپ نے سائنس اور تکنیک کی دوڑ میں آگے بڑھنا شروع کر دیا تھا۔

۱۷۵۰ء سے ۱۸۶۰ء کے درمیان برطانیہ اور یورپ کے دوسرے ملک صنعتی اور تکنیکی انقلاب سے گذرے اور ان کی پیداواری قوت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ دنیا کی کل مصنوعاتی پیداوار میں تیسری دنیا کا حصّہ ۱۷۵۰ء کے ۷۳ فیصد سے گھٹ کر ۱۸۳۰ء میں ۶۰.۵ فیصد اور ۱۸۶۰ء میں ۳۶.۶ فیصد رہ گیا۔ اسی زمرہ میں ہندستان کا حصہ ۱۷۵۰ء کے ۲۴.۵ فیصد سے گھٹ کر ۱۸۳۰ء میں ۱۷.۶ فیصد اور ۱۸۶۰ء میں ۸.۶ فیصد رہ گیا۔ اس کے برعکس یورپی ملکوں کا حصہ ۱۷۵۰ء کے ۲۳ فیصد سے بڑھ کر ۱۸۳۰ء میں ۳۴ فیصد اور ۱۸۶۰ء میں ۵۳ فیصد ہو گیا۔

فی کس صنعت کاری کی سطح میں برطانیہ کا حصّہ ۱۷۵۰ء کے دس فیصد سے بڑھ کر ۱۸۳۰ء میں ۲۵ فیصد اور ۱۸۶۰ء میں ۶۴ فیصد ہو گیا۔ اس معاملے میں ہندستان کا حصّہ ۱۷۵۰ء کے ۷ فیصد سے گھٹ کر ۱۸۳۰ء میں ۶ فیصد اور ۱۸۶۰ء میں ۳ فیصد رہ گیا۔ یورپ میں پیداواریت کے اضافے نے تیسری دنیا کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ لنکا شائر کی کتائی و بُنائی کی مشینوں کی پیداواری صلاحیت نے ہندستان کی اقتصادی کمر توڑ دی۔ اسٹیم انجن اور مشین کے بنائے ہوئے اوزاروں کی ترقی یافتہ تکنیک کی مدد سے فوجی ساز و سامان اور ہتھیاروں کے میدان میں یورپ کو سبقت ملی۔ اس اقتصادی اور فوجی طاقت کے بڑھنے کا انجام تھا کہ ۱۸۰۰ء میں یورپ دنیا کی زمینی سطح کے ۳۵ فیصد پر قابض تھا جو ۱۸۷۸ء میں بڑھ کر ۶۷ فیصد اور ۱۹۱۴ء میں ۸۴ فیصد ہو گیا۔

میر کا عہد سیاسی طوائف الملوکی کا دور تھا۔ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کے انتقال کے بعد ان کا دوسرا بیٹا معظم بہادر (شاہ اوّل) تخت پر بیٹھا اور ۱۷۱۲ء تک حکومت چلتی رہی۔ اس کے بعد مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہوا تو ۱۸۵۷ء تک مرکزی حکومت کو استحکام حاصل نہ ہو سکا۔ مرکز کی کمزوری کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے نوابوں اور جاگیرداروں نے خود مختار ہونے کی کوششیں شروع کر دیں۔ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا۔ پھر ۱۷۴۷ء سے ۱۷۶۹ء کے درمیان احمد شاہ درانی نے نو حملے دہلی پر کیے ۱۷۶۴ء میں بکسر کی لڑائی میں ہندستان کی متحدہ طاقت بشمول شجاع الدولہ کو انگریزوں کے مقابلہ میں شکست ہوئی اور انگریز حاوی ہونا شروع ہو گئے۔

مرہٹے، روہیلے، جاٹ، افغان، سکھ سب خود مختار ہونا

چاہتے تھے اور اس طرح بدامنی اور شورش کی راہ ہموار ہوتی گئی۔ یو پی خاص طور سے برطانی تاجروں اور حکمرانوں نے شمالی ہند کے بیشتر علاقوں پر اپنا اقتدار قائم کرلیا۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے براہ راست انتظام سنبھال لینے کے بعد مغلوں کا ٹمٹماتا چراغ بھی بجھ گیا۔

۱۷۶۴ء میں بکسر کی لڑائی میں شجاع الدولہ کی شکست کے بعد اودھ کے نواب برطانی تاجروں اور حکمرانوں کے وظیفہ خوار ہوگئے۔ دوسرے راجاؤں کی طرح اودھ کے نواب بھی خودمختار رہ گئے اور برطانوی مفادات کے لیے استعمال ہوتے رہے۔ ۱۸۱۸ء میں غازی الدین حیدر نے اودھ کے بادشاہ ہونے کا اعلان کیا۔ نوابوں نے سیاسی سطح پر مغلوں سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن تہذیبی سطح پر مغل دربار کے معیاروں کی نقل کرتے رہے۔ یہی حال بندیل کھنڈ اور راجستھان کے رجواڑوں کا تھا۔

اس عہد میں سماجی سطح پر بھی زوال کا اثر تھا۔ جاگیرداری نظام میں مزدوروں اور کاشتکاروں، چھوٹے دکان داروں کا استحصال عام بات تھی ایسے میں تقدیر پرستی اور اخلاقی زوال کے رجحانات قوی تر ہوتے گئے۔ رشوت ستانی، عورت کو ذاتی ملکیت کی طرح برتنا اور عیش پرستی کے وسیلوں کی تلاش غالب رجحان بن کر ابھرے۔ غریب ہندو اور مسلمان مندروں اور مزاروں پر دعائیں مانگنے میں مصروف تھے۔ لوگ توہم پرستی اور کورانہ تقلید کے شکار ہوتے گئے۔

شاعر اور فن کار درباروں سے وابستہ تھے، اس لئے انھیں اس بات کی آزادی کم تھی کہ وہ اپنی ذاتی پسند کے مطابق تخلیق کرسکیں۔ انھیں شاہوں اور رئیسوں کی پسند و ناپسند کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ فارسی زبان کے غلبہ کی وجہ سے فارسی ادب کے صنائع و بدائع کا اثر سبھی ہندستانی زبانوں پر پڑا۔ مصوری میں سنہرے رنگوں اور جامد تصویروں کا چلن عام ہوا۔ رفتار اور حرکت میں کمی آئی۔ البتہ راجستھانی اور کانگڑا دبستانوں کی مصوری میں عام زندگی سے رشتہ استوار رہا۔ موسیقی اور فن تعمیر بھی درباروں کے زیر اثر عوام سے دور ہوتے گئے۔

اس سیاسی، سماجی، تہذیبی اور اخلاقی زوال کے پس منظر میں میرؔ نے اپنی ذاتی فکر کے چراغ کو روشن رکھا۔ انھوں نے اس انحطاط پذیر معاشرہ اور زوال آمادہ تہذیب کے ماحول میں بھی حسن اور عشق کا پاکیزہ اور ارفع تصور پیش کیا۔ درباروں اور رئیسوں پر انحصار کے باوجود اپنی پسند اور ناپسند کو اہمیت دی۔ میرؔ کے یہاں جاگیرداری کی قدروں سے الگ ہٹ کر وحدتِ انسان کا اہم تصور جگہ جگہ ملتا ہے جس کا ایک سرا قرون وسطیٰ کے تصوف بھکتی تحریک اور سرّیت (Mysticism) سے جاملتا ہے۔ میرؔ کا اعتقاد تھا کہ سب انسان مذہب، ذات پات اور پیشہ کی حد بندیوں کے باوجود ایک رشتہ سے منسلک ہیں۔ عشق اور دل خارجی حد بندیوں سے بالاتر ہے۔ آدمی دل سے بنتا ہے اور عشق خدا ہے۔ صرف انسان سے محبت کرکے خدا تک پہونچا جاسکتا ہے اس لیے دل توڑ کر کعبہ اور مندر بنانا بے سود ہے۔ انسانوں میں کھو جانا اور دنیا کو برتنا نجات کا صحیح راستہ ہے۔ اس میں گناہ بھی شامل ہے جو خدا کی رحمت کو مائل کرتا ہے۔ اس طرح جنسی محبت، انسانوں کی محبت اور خدا کی محبت تینوں مل کر ایک ہو جاتی ہیں۔ میرؔ کی شاعری دل اور دہلی کی خرابی کی دستاویز ہے، جس میں ذاتی غم اور عہد کے غم کا فرق مٹ جاتا ہے۔ چند مثالیں دیکھئے:

غیر از خدا کی ذات میرؔ گھر میں کچھ نہیں یعنی کہ اب مکان میرا لامکاں ہوا

نہ ہو کیوں غیرتِ گلزار وہ کوچہ خدا جانے
لہو اس خاک پر کن کن عزیزوں کا بہا ہوگا

دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا

جم گیا خوں کفِ قاتل پہ ترا میرؔ زبس
اُن نے رو رو دیا کل ہاتھ کو دھوتے دھوتے

منعم نے بنا ظلم کی رکھ گھر تو بنایا پر آپ کوئی رات ہی مہماں رہے گا

گر پرستش خدا کی ثابت کی
کسو صورت [illegible]

کس کو کہتے ہیں نہیں میں جانتا اسلام و کفر
دیر ہو یا کعبہ مطلب مجھ کو تیرے در سے ہے

مت رنجہ کر کسی کو کہ اپنے تو اعتقاد　　دل ڈھائے کر کعبہ بنایا تو کیا ہوا

غلط تھا آپ سے غافل گزرنا　　نہ سمجھے ہم کہ اس قالب میں تو تھا

آدم خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ　　آئینہ تھا تو مگر قابلِ دیدار نہ تھا

گل ہو، مہتاب ہو، آئینہ ہو، خورشید ہو میر
اپنا محبوب وہی ہے جو ادا رکھتا ہے

دور بیٹھا غبارِ میر اس سے　　عشق بن یہ ادب نہیں آتا

مختصراً میر کی شاعری میں سامنتی نظام کے خلاف احتجاج، حسن اور عشق کا پاکیزہ اور ہمہ گیر تصور، فطرت سے ہم آہنگی، حزن اور درد کی لَے، داخلیت، وسیع المشربی، انسان کی عظمت، خودداری اور بلند حوصلہ قلندرانہ شان کے جذبات، بھرپور روپ میں نظر آتے ہیں اسلوب میں سادگی اور پُرکاری، ندرت، نشتریت، ایجاز، موسیقیت محاوروں، تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال اور عوام کی زبان میں بات کہنے کا سلیقہ پایا جاتا ہے۔ خود میر نے کہا ہے

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

میر کے پہلے اور ان کے ہم عصر ہندی شاعر ریتی کال کے شاعر کہلاتے ہیں۔ ان شاعروں کا غالب رجحان سنسکرت کے اچاریوں کے ذریعہ شعری تخلیقات کے لئے مقرر کیے گئے اصولوں کی نقل کرنا تھا۔ اسکی ایک شکل ریتی گرنتھ (علمی تنقید) کی تخلیقات کی تھی، جن میں شاعر النکاروں (صنائع و بدائع) اور لکشنوں (شعری محاسن) کے وسیلے سے صرف شعروں کی تعریف کرتا ہے یا مثال سے کہ شعر کہتا ہے۔ مثالیں زیادہ تر سنسکرت کے کلاسیکی شاعروں سے مستعار ہوتی تھیں۔ اس طبقے میں جسونت سنگھ، یعقوب خاں، بینک شوبھی، دلپتی رائے، ونشی دھر، اگووند اور رس روپ کی کچھ تخلیقات شامل ہیں۔ اس ریتی بدھ (روایت پسند) شاعری کی دوسری شکل لکشنوں (محاسن شعری) اور ان کے مطابق رسیلے مثالوں کی طبع زاد تخلیق میں ظاہر ہوئی۔ چنتامنی، متی رام، بھوشن، داس، کلپتی، شری پتی، پدماکر اور گوال وغیرہ کی تقلیدی یا روایت پسند شاعری اسی خانے میں آتی ہے۔

تیسری شکل میں لکشنوں (محاسن شعری) کو اہمیت نہیں دی گئی سنسکرت کے شعری اصولوں کے دائرے میں رہتے ہوئے بھی اس طبقے کے شاعروں نے لکشنوں (محاسن شعری) کے بجائے شاعرانہ تخلیق پر زیادہ زور دیا ہے۔ بہاری، متی رام، بھوپتی، چندن، ہٹھی جی، آچاریہ دیو، بھکاری داس، سید غلام نبی بلگرامی رسلین اس اسلوب کے نمائندہ شاعر ہیں۔ یہ شاعر بنیادی طور پر سنگار (تغزل) کے شاعر ہیں۔

مختصراً ریتی بدھ یا (روایت پسند) شاعری پر سنگار رس نایک، نایکا بھید اور النکاروں کے استعمال کا اسلوب حاوی تھا۔ ریتی کال میں ریتی بدھ (روایتی) شاعری بنیادی رجحان ہے۔

ظاہر ہے کہ ہندی کی ریتی بدھ شاعری اور میر کی شاعری میں کوئی مماثلت نہیں ہے۔ ریتی بدھ کی شاعری بنیادی طور پر درباری تہذیب کے زیر اثر پروان چڑھی تھی۔ یہ شاعری اُردو میں جرأت اور ناسخ کے لکھنوی دبستان کی شاعری سے زیادہ قریب ہے۔ جیسے لکھنو دبستان کی اُردو شاعری میں تصنع و بناوٹ، سنگار، صنائع و بدائع (النکاروں) پر زور جنسی معاملہ بندی وغیرہ کا اظہار ہوا ہے، وہی بات ریتی بدھ ہندی شاعری میں بھی نظر آتی ہے۔ یہ دونوں دھارے سیاسی سطح پر مغلوں سے سیاسی خود مختاری لیکن تہذیبی معاملوں میں ان کی نقل کرنے یا ان سے آگے بڑھ جانے کی نوابوں اور رجواڑوں کی ذہنیت سے پھوٹے تھے۔

ریتی بدھ (روایت پسند) شاعری کے برخلاف ایک متوازی (Parallel) دھارا اُس دبستان کا تھا جسے ریتی مکت یا غیر تقلیدی یا غیر روایتی شاعری کہا جاتا ہے۔ ریتی مکت (غیر روایتی) شاعری کی اہم خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں؛

(۱) اس دھارا کے شاعروں نے اپنی ذاتی شعری آدرشوں کا اظہار کیا اور

غزلیں

بیمارِ اَنا کے ہاتھوں جب فرعون خدا بن جاتے ہیں
ان ہی کے محلوں میں پل کر بچّے موسیٰ بن جاتے ہیں

ہم سجدے میں جھک جاتے ہیں چاہے گردن پر خنجر ہو
اپنا سر اونچا رکھنے کو خود ہی نیزا بن جاتے ہیں

ویسے ادراک نہیں ہوتا اپنی شخصیت کا لیکن
جب سامنا ہوتا ہے تیرا، ہم آئینہ بن جاتے ہیں

یہ سیلِ فنا، وہ جوشش نمو، پیہم آویزش دونوں میں
جنگل میں بستی اُگتی ہے، قریے صحرا بن جاتے ہیں

کانٹوں سے کہو ہشیار رہیں، نورانی ہیں وہ سب چہرے
پہلے پھولوں کو ڈستے ہیں پھر بادِ صبا بن جاتے ہیں

کھلتے ہیں پھول ارمانوں کے، پڑتی ہے اوس اُمیدوں پر
ہم سے جب آنکھیں ملتی ہیں وہ لاپروا بن جاتے ہیں

ہم ہیں کہ مظفؔر خاک ہوئے، سُنتے تھے کہ اُن کے پاس آکر
ذرّے سُورج ہو جاتے ہیں، قطرے دریا بن جاتے ہیں

مُظفّر حنفی
اقبال پروفیسر
کلکتہ یونیورسٹی۔ کلکتہ ۷۰۰۰۷۳

خوشبُو سا اِک رنگ کا پیکر دیکھا ہے
یعنی ہم نے چاند کو چھت پر دیکھا ہے

سُنتا ہوں، ہوتی ہے محبّت خود سے بھی
تم نے بھی کیا خود میں سَنور کر، دیکھا ہے

ڈھونڈھتا ہوں میں جس کو زمیں پر مدّت سے
میں نے اس کو خواب میں اکثر دیکھا ہے

رُوپ ہی رُوپ اور نشّہ ہی نشّہ ہے یعنی
ہم نے اس کو دل کے اندر دیکھا ہے

کِس سے کہوں یہ بات تو اچھی ہے لیکن
تن کا جادُو من کے اندر دیکھا ہے

عُنوان چشتی
اے ۱۰۰، جامعہ نگر
نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

انیس انصاری
ڈی ۔ ۹، فلیٹ ۲، ڈالی باغ کالونی
لکھنؤ

میر تقی میر اور اُن کی ہم عصر ہندی شاعری

اُردو شاعری کے خدائے سخن میر تقی میر ۱۷۲۲ء - ۱۸۱۰ء کا عہد ہندی شاعری میں ریتی کال (یا جنوب وسطی عہد اتر مدھ کال ۱۶۴۳ء - ۱۸۴۳ء) کے نام سے معروف ہے۔ میر تقی میر کی پیدائش آگرہ میں ہوئی تھی۔ ان کی زیادہ تر اور اہم شعری تخلیقات دہلی میں لکھی گئیں اور نواب آصف الدولہ کے عہد میں وہ لکھنؤ آگئے جہاں ان کا انتقال ہوا۔

ہندی شاعری کا ریتی کال (یا جنوب وسطی عہد و مابعد عہد وسطی) میر کی پیدائش سے تقریباً سو سال پہلے شروع ہوتا ہے لیکن اس کے دائرے میں میر کا تقریباً پورا عہد شامل ہو جاتا ہے۔ اس لیے ہم میر کی ہم عصر ہندی شاعری کو ریتی کال کے شعراء کے شعری رجحانات کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

میر کا زمانہ سیاسی، سماجی اور تہذیبی سطح پر افراتفری اور انحطاط کا زمانہ تھا۔ سیاسی سطح پر یہ وقت سائنس اور تکنیک میں پچھڑی ہوئی ہندوستانی، چینی، افریقی اور موجودہ تیسری دنیا کی دوسری تہذیبوں کی شکست کا عہد تھا۔ ۱۵۰۰ء کے قریب یورپ نے سائنس اور تکنیک کی دوڑ میں آگے بڑھنا شروع کر دیا تھا۔

۱۷۵۰ء سے ۱۸۶۰ء کے درمیان برطانیہ اور یورپ کے دوسرے ملک صنعتی اور تکنیکی انقلاب سے گزرے اور ان کی پیداواری قوت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ دنیا کی کل مصنوعاتی پیداوار میں تیسری دنیا کا حصہ ۱۷۵۰ء کے ۷۳ فیصد سے گھٹ کر ۱۸۳۰ء میں ۶۰.۵ فیصد اور ۱۸۶۰ء میں ۳۶.۶ فیصد رہ گیا۔ اسی زمرہ میں ہندوستان کا حصہ ۱۷۵۰ء کے ۲۴.۵ فیصد سے گھٹ کر ۱۸۳۰ء میں ۱۷.۶ فیصد اور ۱۸۶۰ء میں ۸.۶ فیصد رہ گیا۔ اس کے برعکس یورپی ملکوں کا حصہ ۱۷۵۰ء کے ۲۳ فیصد سے بڑھ کر ۱۸۳۰ء میں ۳۴ فیصد اور ۱۸۶۰ء میں ۵۳ فیصد ہو گیا۔

فی کس صنعت کاری کی سطح میں برطانیہ کا حصہ ۱۷۵۰ء کے دس فیصد سے بڑھ کر ۱۸۳۰ء میں ۲۵ فیصد اور ۱۸۶۰ء میں ۶۴ فیصد ہو گیا۔ اس معاملے میں ہندوستان کا حصہ ۱۷۵۰ء کے ۷ فیصد سے گھٹ کر ۱۸۳۰ء میں ۶ فیصد اور ۱۸۶۰ء میں ۳ فیصد رہ گیا۔ یورپ میں پیداواریت کے اضافے نے تیسری دنیا کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ لنکاشائر کی کتائی بُنائی کی مشینوں کی پیداواری صلاحیت نے ہندوستان کی اقتصادی کمر توڑ دی۔ اسٹیم انجن اور مشینوں کے بنائے ہوئے اوزاروں کی ترقی یافتہ تکنیک کی مدد سے فوجی ساز و سامان اور ہتھیاروں کے میدان میں یورپ کو سبقت ملی۔ اس اقتصادی اور فوجی طاقت کے بڑھنے کا انجام تھا کہ ۱۸۰۰ء میں یورپ دُنیا کی زمینی سطح کے ۳۵ فیصد پر قابض تھا جو ۱۸۷۸ء میں بڑھ کر ۶۷ فیصد اور ۱۹۱۴ء میں ۸۴ فیصد ہو گیا۔

میر کا عہد سیاسی طوائف الملوکی کا دور تھا۔ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کے انتقال کے بعد ان کا دوسرا بیٹا معظم بہادر (شاہ اول) تخت پر بیٹھا اور ۱۷۱۲ء تک حکومت چلتی رہی۔ اس کے بعد مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہوا تو ۱۸۵۷ء تک مرکزی حکومت کو استحکام حاصل نہ ہو سکا۔ مرکز کی کمزوری کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے نوابوں اور جاگیرداروں نے خود مختار ہونے کی کوششیں شروع کر دیں۔ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا۔ پھر ۱۷۴۷ء سے ۱۷۶۹ء کے درمیان احمد شاہ درانی نے نو حملے دہلی پر کیے۔ ۱۷۶۴ء میں بکسر کی لڑائی میں ہندوستان کی متحدہ طاقت بشمول شجاع الدولہ کو انگریزوں کے مقابلہ میں شکست ہوئی اور انگریز حاوی ہونا شروع ہو گئے۔

مرہٹے، روہیلے، جاٹ، افغان، سکھ سب خود مختار ہونا

انھیں اپنے زمانے کے ریتی بدھ شعری آدرشوں سے الگ بھی گھنانند نے خاص طور پر اپنے شعری آدرشوں کا شد و مد کے ساتھ اعلان کیا۔ ان کی شعری دنیا جذبوں میں ڈوبی ہونے کی وجہ سے داخلی زیادہ ہے۔ شعوری طور پر خارجی نہیں ہے جیسی کہ بہاری، متی رام، پدماکر وغیرہ کے یہاں ہیں۔ جذبے سے سرشار ہونے کی وجہ سے یہ طبقہ عقل کو شعریت سے ہم آہنگ صفت نہیں مانتا۔ گھنانند اور عالم کی شاعری میں جذبے کی تہ داری تہ در تہ کھُل کر آتی ہے۔

(۲) شاعروں کے عشق کے تجربے کو اظہار ذات کے اسلوب میں پیش کیا گیا ہے۔ ریتی بدھ کے شاعروں نے عاشق، محبوب یا نایک، نایکا کے وسیلہ سے منصوبہ بند طریقے سے محبت کا اظہار کیا ہے لیکن ریتی مکت یا غیر روایتی شاعر اپنی نجی زندگیوں میں عشق سے مجروح ہوئے تھے۔ یوں تو اظہارِ ذات کی روایت بھکتی کال کے ادب سے شروع ہو گئی تھی لیکن بھکتی شاعری میں شاعر عبادت کے احساس اور عشقِ حقیقی کے جذبات سے دوچار ہوتا تھا۔ ریتی مکت شاعری میں عشق مجازی کے دُکھوں کا راستہ کھُلا۔ ریتی بدھ (روایتی) شاعری میں اشیا اور لوازمات اہم تھا۔ ریتی مکت (غیر روایتی) شاعری میں فرد اور عشق کے اثرات، ہندی میں مجازی عشق کی شاعری میں یہ نیا اسلوب تھا۔ شاید یہ فارسی شاعری کا اثر تھا کیوں کہ فارسی شاعری میں عاشق صیغۂ متکلم میں عشق کا اظہار کرتا ہے۔

(۳) اس اسلوب میں درد اور حزن کی لے تیز ہے، وصل کا بیان کم ہے اور اگر ہے بھی تو سوز و درد سے متاثر ہے۔ ریتی بدھ شاعری میں وصل کو خوشی اور ہجر کو غم کے الگ الگ خانوں میں رکھا گیا ہے۔ ریتی مکت شاعری میں وصل میں بھی رنج اور درد کا احساس چھایا رہتا ہے۔ شاید فارسی شاعری کی روایت کا اثر یہاں بھی ہے۔ فارسی میں عشق اور غم الگ نہیں ہو پاتے۔ دوسرے اس وقت کے سماج میں مرد کے دل میں گھٹن اور غم کا احساس حاوی تھا۔ سامنتی نظام میں مرد کے درد کی داستان گزشتہ ذکر کی تھا۔ ان شاعروں نے درد کو شدت کے ساتھ لیے اور اسے ظاہر کر سکنے کا بار بار ذکر کیا ہے۔ یہ سے یعنی عشق کے غم کے روپ میں ظاہر ہوئی۔ یعنی ذاتی عشق کی داستانِ غم کے درون میں سماجی اضطراب بھی لہریں مار رہا تھا۔

(۴) اس داستان کی سب سے بڑی خاصیت پرانی شعری روایت کو ترک کرنا ہے۔ ریتی کال کا ادب النکاروں کی شعبدہ بازی یا نایکا بھید یا بھاؤ بھید سے سجا ہوا ہے۔ اس طبقے کے شعرا کو نایکا بھید کا عرفان کلاسیکی روایت سے زیادہ ہوتا تھا، زندگی سے کم۔ غیر روایتی شاعروں نے شعوری طور پر کوشش کی کہ النکاروں سے محفوظ رہ سکیں۔ ٹھاکر نے عام طور پر آسان زبان میں شعر کہے ہیں۔ گھنانند کے یہاں النکاروں کا سب سے زیادہ استعمال ہوا ہے لیکن وہ دانستہ طور پر کوشش کر کے استعمال نہیں ہوئے بلکہ جذبے کے اظہار کا حصہ بن کر۔ گھنانند نے محاورے لکشناؤ (استعاروں اور بالواسطہ اظہار) سے اظہار کا نیا راستہ بنایا۔ ٹھاکر کے یہاں بھی محاوروں کا استعمال زیادہ ہے، النکاروں کا کم۔ ان شاعروں کی محبوبائیں جیتی جاگتی انسان ہیں۔ ان کے موضوعات اور اسلوب دونوں روایت سے الگ ہیں۔

(۵) ان شاعروں کے عشق کا تصور ارفع ہے اس میں بوالہوسی نہیں ہے عاشق ہجر کے دُکھ سہہ کر بھی محبوبہ کے لیے تمنائے خیر کرتا ہے عشق کے سوز کو خاموشی سے سہتا ہے۔ گھنانند، عالم، بودھا (۱۷۶۳ء — ۱۸۰۳ء) ٹھاکر اور دیو جی دیو سب کے یہاں عشق کی انفرادیت کا اظہار ہوا ہے۔ ان کا عشق جذباتی ہے، جس میں حسرتوں کا غلبہ ہے۔ ریتی بدھ شاعری میں عشق پاکیزہ نہیں شعوری ہے اور ظاہری شکل و صورت کے گرد گھومتا ہے اسی لیے کبھی کبھی عریانیت آجاتی ہے۔ غیر روایتی شاعری میں احساس اور جذبے کی حکمرانی ہے۔ ان کا عشق دشوار تر ہے یہ روایت سودا اس کے یہاں بھی ہے۔ فارسی شاعری میں بھی یک طرفہ عشق کی روایت ہے، جس کا اثر ریتی مکت شاعری پر پڑا۔ ذاتی زندگی میں عشق میں ناکامی کے تجربے سے بھی

یہ لوگ گزرے تھے۔ ان کا محبوب بے حد سخت دل ہے لیکن ناکامی سے عاشق مایوس نہیں ہوتا، اس کا عشق پختہ ہوتا ہے

(۴) فارسی کے شعری رجحانات کا اثر ریتی مکت شاعری کے موضوعات فکر اور اسلوب پر پڑا۔ "مکتک کاویہ" (پربندھ کاویہ (طویل مسلسل نظم) کے برعکس) کا عروج تشبیہ و استعاروں میں تبدیلی، شرنگار میں نامراد محبوبہ کا بیان فارسی کے اثر کا نتیجہ ہے۔ سویّا میں آخری مصرعہ زیادہ بھرپور اور با اثر رکھنے کا اسلوب بھی فارسی شعرا کی تقلید تھی۔ گھنا نند اور عالم فارسی پر دسترس رکھتے تھے گھنا نند محمد شاہ بادشاہ کے میر منشی بھی تھے۔ فارسی درباری زبان تھی جس کا اثر ہندی پر پڑنا ناگزیر تھا۔ خیال میں شدت نزاکت، انفرادیت، حزن، داخلیت، صوفیانہ رنگ، مایوسی اور یک طرفہ محبت کا اظہار فارسی روایت کی دین ہے۔

میر اور ہندی کے ریتی مکت یا غیر روایتی شاعروں کی فکر اسلوب اور ادائیگی کے انداز میں بڑی مماثلت ہے۔ دونوں کے یہاں جذبے کا زور اور شدت، نزاکت، انفرادیت، حزن، مایوسی، صوفی تصورات بالواسطہ اظہار داخلیت مجازی اور حقیقی عشق کا اتصال قلبی واردات کا بیان اور آزادیٔ خیال کا زور ہے۔ زبان اور اسلوب سادہ اور عوام کے محاورے سے قریب ہے۔ اس پہلو پر زیادہ تفصیل سے کام کرنے کی ضرورت ہے کہ میر اور ریتی مکت کویّوں کے درمیان کتنی مماثلت اور کتنا فرق ہے اور اس کے اسباب کیا ہیں۔

ریتی کال میں ویر کاویہ (شجاعانہ رزمیہ) اور نیتی کاویہ (اخلاقی شاعری) کی چھوٹی چھوٹی دھارا بھی بہہ رہی تھیں، ان میں بالعموم راجاؤں اور سامنتوں کی بہادری اور سخاوت کی داستانیں پربندھ کاویہ (طویل مسلسل نظموں) کی شکل میں لکھی گئی ہیں۔ اسی طرح نیتی کاوی کے تحت رامائن اور مہابھارت کی کہانیوں اور دوسری دھارمک اور اخلاقی کہانیوں پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ جہاں ویر رس کی شاعری رجواڑوں اور مربیوں کے نمک حق کی ادائیگی کے مقصد سے لکھی گئیں وہیں نیتی کاویہ کی شاعری جاگیردارانہ نظام میں فرد کی گھٹن کو کم کرنے کا وسیلہ بنی۔ لیکن یہ دونوں اہریں ادبی لحاظ سے زیادہ اہمیت کی حامل نہیں ہیں۔

میر نے اپنے مربیوں کی شان میں قصیدے لکھے ہیں اور کربلا کے واقعات پر مرثیے بھی۔ لیکن میر کا بنیادی مزاج قلندرانہ تھا۔

خوش رہا جب تلک رہا جیتا
میر معلوم ہے قلندر تھا

اس لیے ان کی اخلاقی یا مذہبی نوعیت کی شاعری یا رئیسوں کی شان میں لکھے گئے قصیدوں میں پھیکا پن ہے۔ دراصل اُردو شاعری کا مزاج زیادہ وسیع المشرب ہے جہاں اخلاقی یا مذہبی شاعری کی گنجائش کم رہی ہے اس لیے میر کو ویر کاویہ یا نیتی کاویہ کی شاعری کے مقابلہ میں پرکھا جانا دونوں کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔

میر اور ریتی کال کے ہندی کویوں کے درمیان ایک نمایاں فرق قابلِ غور ہے ریتی کال کے کویّوں نے عام طور پر کھڑی بولی کے بجائے برج بھاشا کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ میر کی زبان کھڑی بولی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ موجودہ زمانے کی ہندی کا ڈھانچہ کھڑی بولی نے مہیّا کیا ہے اور موجودہ عہد کی اُردو کا بھی۔ یہ الگ سے مطالعہ کا موضوع ہے کہ میر کے ہمعصر ہندی کے ریتی کال کے کویّوں نے کھڑی بولی کا استعمال کیوں نہیں کیا؟ کیا وہ یہ اندازہ نہیں لگا سکے تھے کہ ان کے ہم عصر میر صاحب کا فرمایا ہوا ہی آگے چل کر ہندستان میں مستند ہونے والا ہے۔

□□

ا؎ اس مضمون کی تیاری میں ڈاکٹر کلپنا پرساد کے تعاون کے لیے شکر گزار ہوں انھوں نے ہندی شاعری کے سمجھنے میں بڑی مدد دی۔ (الف انصاری)

کتابیات:

ا؎ Paul Kennedy, The Rise And Fall of the Great Power (1989)
Fontana Press, London, PP-189-193

(۲) علی سردار جعفری: "پیغمبرانِ سخن" (۱۹۸۰ء) ریڈ شاٹ پبلیکیشن بمبئی ص ۱۲۲-۱۳۸
(۳) ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی: "میر تقی میر - حیات اور شاعری" (۱۹۵۴ء) (انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ۔
(۴) ڈاکٹر نگیندر "ہندی ساہتیہ کا اتہاس" (۱۹۹۱ء) میور پیپر بیکس نوئیڈا (یوپی)
(۵) ڈاکٹر شرمے وینکٹ رمن راؤ، ریتی کالین کاویہ کی سانسکرتک پرشٹھ بھومی (۱۹۷۲ء) متھرا جواہر پستکالیہ
(۶) ڈاکٹر راج کشور پانڈے: "ہندی ساہتیہ کا اتر مدھیگ" (۱۹۸۱ء) ہندی ساہتیہ بھنڈار لکھنؤ

وطن والو!

نہ تم انداز دل آزار رکھو
نہ رستے میں کسی کے خار رکھو
بلند اپنا سدا معیار رکھو
جو سب اپنائیں وہ کردار رکھو
وطن والو! وطن سے پیار رکھو

تمام اہلِ وطن ہیں بھائی بھائی
نہیں اچھی یہ آپس کی لڑائی
وہی دل ہیں کہ جن میں ہو صفائی
نہ کینے کی کوئی دیوار رکھو
وطن والو! وطن سے پیار رکھو

محبت سے بڑی دولت نہیں ہے
عداوت میں کوئی عزت نہیں ہے
کسی کو لوٹنا ثروت نہیں ہے
نہ برگِ گل پہ نوکِ خار رکھو
وطن والو! وطن سے پیار رکھو

ہمالہ کی طرح خود کو بناؤ
وفا و مہر کی نہریں بہاؤ
ہمیشہ پھول دامن میں سجاؤ
شمیمِ گل سرِ بازار رکھو
وطن والو! وطن سے پیار رکھو

تمھاری ہے یہ گنگا اور جمنا
اودھ کی شام کاشی کا سویرا
تمھارا ہے زمانے بھر میں چرچا
تم اپنے آپ کو بیدار رکھو
وطن والو! وطن سے پیار رکھو

محافظ ہو تمھیں ہندوستاں کے
فرائض ہیں بہت کچھ پاسباں کے
کھلیں غنچے یہاں امن و اماں کے
سدا جنگ و جدل سے عار رکھو
وطن والو! وطن سے پیار رکھو

نہ گھبراؤ محیطِ بیکراں سے
نہ خائف ہو کسی کوہِ گراں سے
ہوں سب مسحور اک حسنِ بیاں سے
تم ایسی قوتِ گفتار رکھو
وطن والو! وطن سے پیار رکھو

دلوں میں بیج تم الفت کے بو دو
شجر نفرت کے سارے جڑ سے کھو دو
بہ شکلِ امن دو دنیا کو جو دو
نہ کوئی صورتِ پیکار رکھو
وطن والو! وطن سے پیار رکھو

مرزا محمد اشفاق شوق
۱۳۱ - شاہ گنج
لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

[illegible]ار آمد

میں پوچھتا ہوں
جواب دو مجھ کو
کیوں
تمھارے بعد
کوئی
سمجھ سکا
نہ دھڑکنیں دل کی

زندگی
کھو گئی
اندھیرے سایوں میں
نہ رہا چاند
نہ بہار کی راتیں
وہ وصلِ یار
وہ انتظار کی راتیں
میں پوچھتا ہوں
جواب دو مجھ کو
کیوں
تمھارے بعد
میں کبھی
نہ ہو سکا
کسی کا !!

ڈاکٹر وجے موہن [illegible]
۲۰۹ - [illegible] روڈ
کارزال، اونٹاریو، [illegible]
کناڈا

ڈاکٹر حبیب نثار
حیدرآباد یونیورسٹی، حیدرآباد

حیدرآباد میں عہدِ آصف الدولہ کے

چند نایاب غیر مطبوعہ مخطوطات

آصف الدولہ کا عہدِ حکومت ۱۱۸۸ھ تا ۱۲۱۲ھ/۱۷۷۵ء تا ۱۷۹۷ء پر محیط ہے۔ یہ زمانہ تہذیب کی ترقی کے لحاظ سے سلطنت اودھ میں سنہری عہد کہلائے جانے کا مستحق ہے ــــ اسی زمانے میں فنونِ لطیفہ کے تمام دبستانوں نے اودھ میں ترقی کی۔ اُردو شعرا میں میر، سودا، مصحفی، جرأت، صاحب قران، انشا دادِ سخن دے رہے تھے۔ میر حسین عطا خان تحسین نے ۱۷۸۱ء میں نوطرزِ مرصع مکمل کی۔ شاہ صابر علی غلام رضا نے ۱۲۰۸ھ/۱۷۹۳ء میں ہندستانی موسیقی کی مبادیات پر "اصول النغمات الآصفی" جیسی بے بدل کتاب تصنیف کی۔ شاہ کمال نے اُردو کا ضخیم ترین تذکرہ یہیں اور اسی زمانے میں ترتیب دیا۔ میر حسن نے اُردو کی بہترین مثنوی سحرالبیان اسی عہد آصف الدولہ میں مکمل کی۔ ہولی، بہار اور بسنت کے جشن مناتے ہوئے آصف الدولہ نے موسیقی کو دربار کے ایوانوں سے نکال کر تیوہار کا روپ دے کر ڈرامہ کی بنا ڈالی۔ اسی عہد میں زوفینی نے مصوری میں اودھ اسکول کی پہچان بنائی ــــ خود آصف الدولہ نے امام باڑہ آصفی، دولت خانہ آصفی اور مسجد آصفی تعمیر کیں، اور اسی زمانے میں غلام مرتضیٰ فیض آبادی نے ۱۱۹۴ھ میں قرآن مجید کی منظوم تفسیر اُردو میں لکھنے کی سعیِ بلیغ فرمائی ــــ اسی لیے راقم الحروف کا خیال ہے کہ اردو ادب کی ترقی و ترویج کے تناظر میں اس عہد کو لکھنؤ کا عہدِ زرّیں کہنا مناسب ہوگا۔

حیدرآباد کے کتب خانوں میں اس عہد کے بیشتر مخطوطات محفوظ ہیں۔ کلیاتِ سودا کا ۱۱۹۹ھ کا مکتوبہ نسخہ ادارہ ادبیات اُردو میں محفوظ ہے۔ کلیاتِ سودا کا ایک اور قلمی نسخہ شعبہ مخطوطات کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہے۔ دیوانِ میر سوز کے قلمی نسخے کتب خانہ سالار جنگ، کتب خانہ آصفیہ (موجودہ ادارہ تحقیق مخطوطات مشرقی) اور کتب خانہ ادارۂ ادبیاتِ اُردو میں محفوظ ہیں۔ اسی طرح دیوانِ میر حسن، دیوانِ جرأت، دیوانِ مصحفی، کلیاتِ انشا، کے مخطوطات حیدرآباد کے مختلف کتب خانوں میں مخزون ہیں۔ مثنوی سحرالبیان کے تقریباً پچاس قلمی نسخے حیدرآباد کے کتب خانوں کی زینت ہیں، جن میں بعض لکھنؤ میں کتابت شدہ ہیں۔

حیدرآباد میں مخزون عہدِ آصف الدولہ کے سیکڑوں مخطوطات میں سے راقم الحروف صرف چند ایسے مخطوطات کا تفصیلی تعارف پیش کر رہا ہے ــــ جو نایاب ہیں اور جن کی تفصیل بیشتر اہلِ ادب کی آنکھوں سے اب تک اوجھل رہی ہے۔

اودھ کا پہلا صاحبِ کلیات حکمراں :

نواب آصف الدولہ آصف

یحییٰ خاں عرف مرزا امانی، نواب شجاع الدولہ بہادر کے یہاں ۱۱۶۱ھ م ۱۷۴۸ء میں پیدا ہوئے۔ اپنے وقت کے بہترین اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ دہلی سے آئے مہاجر شاعر میر سوز سے مشورۂ سخن کیا۔ ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۵ء میں شجاع الدولہ کے انتقال پر مسند نشین ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد لکھنؤ کو بجائے فیض آباد اپنا دارالحکومت بنایا۔ یہیں پر محل بنوائے، امام باڑہ تعمیر کیا اور لکھنؤ کو اتنی ترقی دی کہ رشکِ شیراز و اصفہان ہوگیا۔ آصف الدولہ کے اوصاف حمیدہ بیان کرتے ہوئے عمدۂ منتخبہ میں سرور لکھتے ہیں :

"....اکتساب فضائل وکمالاتِ فنونِ بے نظیر و در ہر فن یدِطولی داشت، چنانچہ در تیر اندازی وتفنگ بازی بر نوع ماہر بود کہ طائران را از فلک بر زمین مے انداخت، غرضکہ مناقب وتوصیفِ آں والا مرتبت ہر قدر کہ مرقوم شو و بجاست وخامۂ بلند تلاشش بکہ از ارقام جوہر ذاتیش کوتہی می کند۔" [۱]

آصف الدولہ کی مہارتِ تیر اندازی کا بیان عبد الغفور نساخ نے بھی کیا ہے، لکھتے ہیں:

"تیر اندازی میں کمال رکھتے تھے۔ دیوان ان کا نظر سے گزرا۔" [۲]

آصف الدولہ کی شعر گوئی سے متعلق تذکروں میں تراجم ملتے ہیں چناں چہ مردان علی خاں مبتلا لکھنوی "گلشنِ سخن" میں لکھتے ہیں

"گاہے سخنے می فرماید ایں دو بیت از آنجناب است۔" [۳]

مصحفی تذکرۂ ہندی میں رقم طراز ہیں:

"ازبسکہ از ابتدائے عمر در جمیع فنون دانائے یگانۂ روزگار است بمقتضائے موزونیِ طبع گاہ گاہے خیال شعر نیز می زاید چند اشعار از کلام اوست۔" [۴]

مجموعۂ نغز میں قاسم لکھتے ہیں:

"گاہ گاہ طبع فیض بخش میل سخن می کرد و بامزہ می گفت ایں بست ویک بیت از کلام حشمت انتظام اوست عفی اللہ عنہ" [۵]

عمدۂ منتخبہ میں سرور نے بھی اسی طرح کا بیان لکھا ہے۔ دیکھیے،

"خاطرش اکثر مائلِ ریختہ گوئی بود۔ اشعار برجستہ از طبع وقادش سر بر می زد و پرداخت .... ایں چند شعر ازاں گوہر دریائی وزارت بہ نظر ایں مولف رسیدہ۔" [۶]

ان اقتباسات سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ آصف الدولہ آصف کے مکمل کلام سے تذکرہ نگار واقف نہیں صرف کچھ ابیات پر نظر رہی جبکہ آصف الدولہ آصف نے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہے ہیں اُردو میں انھوں نے مکمل کلیات ترتیب دیا ہے۔ فارسی کلام بھی قابلِ قدر ہے۔ اردو میں انھوں نے غزل، مثنوی، رُباعی، مخمس، مسدس

متمن سبھی کہے ہیں۔

کلیات آصف الدولہ آصف

حیدرآباد میں کلیاتِ آصف کے دو قلمی نسخے مخزون ہیں۔ ایک قلمی نسخہ شعبۂ مخطوطات، کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد میں موجود ہے اور دوسرا نسخہ کتب خانہ و ادارۂ تحقیق مخطوطات مشرقی آندھرا پردیش میں محفوظ ہے۔

کلیاتِ آصف نسخہ سالار جنگ حیدرآباد

کلیاتِ آصف نسخہ سالار جنگ نہایت اہتمام سے لکھا گیا ہے کلیات میں کلام کی مناسبت سے تین حصے قرار دیے گئے ہیں اور ہر حصے کی ابتدا میں طلائی لاجوردی نقش و نگار بنائے گئے ہیں۔ تقریباً دو سو صفحات پر جدول بنایا گیا ہے جس پر نیلگوں، سُنہری اور سُرخ حاشیہ ہے، درمیان سے جدول کو تقسیم کیا گیا ہے تاکہ شعر کے دونوں مصرعے اہتمام سے لکھے جائیں۔ جملہ ۳۱۴ ورق اور ایک صفحہ پر یعنی جملہ ۶۲۵ صفحا پر کلام موجود ہے۔ خط نستعلیق ہے۔ کاغذ دیسی۔ مخطوطہ کا سائز "۱۰×۶" ہے اور ہر صفحہ پر ۱۱، ۱۱ سطر لکھی گئی ہیں۔

مخطوطہ کی ابتدا میں ۲۷ صفحات سادہ ہیں۔ صفحہ ۲۸ منقش ہے نیلگوں اور سُنہری قلم سے بیل بوٹے بنائے گئے ہیں۔ ص ۲۸ اور ص ۲۹ کے ہر شعر کو سنہری زنجیرہ سے سجایا گیا ہے۔ ان دو صفحات کے حاشیہ کو بھی سنہری بیل بوٹوں سے مزین کیا گیا ہے۔ اوراق پر نمبر ہیں ترک موجود نہیں چنانچہ ص ۲۹ پر کاتب ہی کے قلم سے ورق کا نمبر لکھا ملتا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس ورق سے قبل بھی ایک ورق موجود تھا جس پر یقیناً کلیات اور شاعر کا نام لکھا ہوگا — تقریباً تمام حروف تہجی پر مشتمل ردیف میں کلام موجود ہے۔ ہر ردیف کی غزلوں کے بعد چند صفحات سادہ رکھے گئے ہیں، جس سے قیاس ہوتا ہے کہ یہ مخطوطہ خود آصف الدولہ بہادر کا نجی مخطوطہ ہوگا۔؟

فہرست مخطوطات کتب خانہ سالار جنگ کے مرتب نصیر الدین ہاشمی اس مخطوطہ کی تفصیل اس طرح بیان کرتے ہیں،

"اس کلیات میں اولاً ردیف وار غزلیات ہیں۔ ہر ردیف کے بعد کسی قدر صفحے خالی رکھے گئے ہیں۔ ان کے

بعد دوسرے ردیف کی غزلیات شروع ہوئی ہیں۔ غزلیات کے بعد مخمس ہیں اور اس کے بعد ایسے چند مخمس ہیں جو فارسی غزلیات پر موزوں کیے گئے ہیں۔ آخر پر (کذا) ایک مثنوی ہے ـــ اس کے بعد ۲ صفحے میں فارسی غزلیات ہیں پھر رباعیات اس کے بعد بسم اللہ کے ساتھ حمد اور نعت ہیں، مثنویاں ہیں۔ آخر میں ایک مخمس ہے۔ مخمس کے بعد ایک مثنوی منقبت حضرت علی میں ہے اس کے باوجود کلیات ناقص الآخر ہے۔" ۵۷

نصیرالدین ہاشمی نے کلیات کو ناقص الآخر قرار دیا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ کلیات ناقص الاوسط بھی ہے کہ درمیان سے بھی بیشتر صفحات گم ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے بیشتر غزلیات اور صفحات گم ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے بیشتر غزلیات اور صفحات نامکمل رہ گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ارباب کتب خانہ کو کاتب کے لکھے ہوئے نمبر اوراق سے علاحدہ نمبرات اوراق پر لکھنے پڑے ہیں۔ اس کلیات میں ہر ردیف کی حسب ذیل غزلیں موجود ہیں جسے یہاں ایک جدول کے ذریعہ پیش کیا جاتا ہے:

حرف	تعداد غزلیات	حرف	تعداد غزلیات	حرف	تعداد غزلیات
ا	۴۴	ر	۱۸	ف	۱
ب	۳	ز	۶	ق	۱
ت	۸	س	۵۹	ک	۲
ث	۲	ش	۴	ل	۳
ج	۴	ص	۱۵	م	۶
چ	۱	ض	۱۳	ن	۲۵
ح	۲	ط	۱۸	و	۱۲
خ	۲	ظ	۱۲	ہ	۹
د	۱۰	ع	۱۳	ی	۷۰
ذ	۱۳	غ	۱۲	میزان: ۳۸۵	

... اور اس طرح کلیات میں کل ۳۸۵ غزلیں ہیں جو ورق ۱ الف سے ورق ۱۸۸ الف تک درج ہیں۔ اس کے بعد ورق ۱۸۸ ب سے ابتدا فارسی غزلیات پر لکھے گئے صفحات ہیں پھر اُردو کے ۲۴ مخمس ہیں جو ورق ۲۵۱ ب تک ہیں۔ اسی حصے میں چند مسدس بھی ہیں۔ ورق ۲۵۲ الف سے ورق ۲۶۱ ب تک ۲۰ فارسی غزلیں ہیں۔ ورق ۲۶۳ الف سے رباعیات درج ہیں تمام ۲۰ اُردو اور ایک فارسی رباعی ہے۔ ورق ۲۶۸ الف سے حصۂ مثنوی شروع ہوتا ہے۔ پہلا صفحہ نیلگوں اور سنہری نقش و نگار سے مزین ہے۔ ابتداً حمد میں مثنوی کہی ہے جس میں ۵۷ شعر ہیں۔ پہلا شعر ہے:

خدا و خدا کہاں طاقت زباں میں
کہ لاؤں وصف تیرا کچھ بیاں میں

۵۷ شعر کے بعد ۱۴ شعر پر مشتمل فارسی غزل ہے، پھر مزید نو شعر کہہ کر نعت شروع کی ہے جو ورق ۲۹۱ الف سے شروع ہوتی ہے۔ پہلا شعر ہے ؎

محمد خازن گنج خدائی
محمد نور ذات کبریائی

نعت کے ہر شعر میں یہ اہتمام کیا ہے کہ ہر شعر کے دونوں مصرعے سرور کائنات کے اسم مبارک یعنی محمدؐ ہی سے شروع ہوتے ہیں اور اس طرح ۹۸ شعر کہے ہیں اور ۱۰۲ شعر کے بعد نعت ہی کے بیان پر اُردو غزل کہی ہے جو ۱۲ شعر پر مشتمل ہے پھر ایک فارسی غزل نعت ہی میں ۱۵ شعر کی کہی ہے اور پھر مثنوی مسلسل ہوئی ہے اور مزید ۱۴۴ شعر کہنے کے بعد واقعہ معراج وصف براق کا بیان کرتے ہوئے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی منقبت کی جانب گریز کیا ہے۔ ص۲۰۳ ب پر ان اشعار کے بعد منقبت شروع کی ہے ؎

سنا ہے میں نے راوی معتبر سے — نبیؐ پاک جب اودھر گئے ہیں
یہاں سوئے تھے اون کے بستر اوپر — وصیِ مصطفےٰ شاہ ولایت

علیؑ مرتضےٰ جانِ محمدؐ
نبی تازہ جیسے بستان محمدؐ

اور اس کے بعد منقبت شروع کی ہے اور ۹۸ شعر تک شعر کے ہر دو مصرعوں کو حضرت علیؑ کے اسم مبارک سے شروع کیا ہے۔ اس کے بعد کے دو شعر بھی حضرت علیؑ کے نام ہی سے شروع کیے ہیں لیکن مصرع ثانی میں اس کا اہتمام نہیں ہے۔ ان اشعار کے بعد حضرت علی کی مدح میں غزل کہی ہے پھر مثنوی شروع کی ہے ... چند شعر کے بعد مثنوی کے اوراق ضائع ہو گئے ہیں اس لیے مثنوی ناقص الآخر ہے۔ موجودہ صورت میں

یہ مثنوی تقریباً آٹھ سو شعروں پر مشتمل ہے۔

نصیر الدین ہاشمی نے کلیات میں تین مثنویوں کی موجودگی کا ذکر کیا ہے انھیں تسامح ہوا ہے۔ دراصل کلیات میں صرف دو مثنویاں ہیں۔ ایک مختصر مثنوی صرف تیئیس شعر پر مشتمل ردیف الف کی غزلوں کے درمیان "ہُوا" پر موجود ہے

لے یار دو میں رکھوں تھا ایک زر نگار ہُوا

مت پوچھ کیا تھا جس کے او پر ہزار ہُوا

اور دوسری مثنوی فارسی کلام کے بعد کلیات کے حصۂ سوم میں درج ہے جو کہ حمد نعت و منقبت میں ہے۔ کلیات آصف نسخہ سالار جنگ کی ابتدا حسب ذیل شعر سے ہوتی ہے ؎

کس قدر رو رو کے شب کرتا تھا مذکور تیرا

وہ ہی بیمار تیرا خستہ و رنجور تیرا

(ورق ۲ الف)

کلیات آصف نُسخۂ آصفیہ

کلیات آصف کے اس نسخہ میں جملہ اوراق ۳۲۸ ہیں یعنی نسخہ سالار جنگ سے ۱۲ ورق زیادہ ہیں۔ مخطوطہ کا سائز ۲۹٫۵ × ۲۰ ہے۔ ہر صفحہ پر ۱۱ سطریں ہیں۔ کاغذ دیسی، خط نستعلیق ہے۔

مخطوطہ کے پہلے صفحہ پر جہاں کلیات کا نام اور شاعر کا نام کاتب کے قلم سے درج ہے اسی صفحہ پر شکستہ تحریر میں ایک نوٹ بہ زبان فارسی موجود ہے جس کے آخر میں تفضل حسین خاں کا نام صاف پڑھا جاتا ہے یہ تفضل حسین خاں غالباً وہی خان علامہ ہیں جنھوں نے نواب سعادت علیخاں کی تخت نشینی ہونے میں مدد کی تھی ۔۔ اس طرح یہ نسخہ نہایت اہم ہے۔ مذکرہ بالا نوٹ سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ نسخہ آصف الدولہ ہی کی حیات میں نقل ہوا ہے۔ کلیات کے صفحات پر کوئی جدول وغیرہ نہیں بنایا گیا ہے۔ سادہ صفحات پر کلام نوٹ کر لیا گیا ہے۔ نقش و نگار مطلق نہیں ہیں۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھ کر پہلے مثنوی درج کی ہے چنانچہ کلیات حسب ذیل شعر سے شروع ہوتی ہے ؎

خدا وندا کہاں طاقت زباں میں

کہ لاؤں وصف تیرا کچھ بیاں میں

یہاں مثنوی مکمل ہے۔ اس مثنوی کے بعد متعدد دوسرے شعراء کا کلام نقل کیا گیا ہے۔ چنانچہ جرأت کی مختصر مثنوی (صرف چھ شعر) "کربلا جانا" بھی ان صفحات پر درج ہے۔ سودا کی بھی چند مثنویات درج ہیں۔ دوسرے شعراء کے کلام کو درج کرنے کے بعد چند صفحات سادہ چھوڑ دیئے گئے ہیں پھر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھ کر غزلیات آصف نقل کی گئی ہیں۔ اس نسخہ میں صرف ۲۰۸ غزلیات موجود ہیں یعنی نسخہ سالار جنگ سے ۹۷ غزلیات کم ہیں۔ لیکن آٹھ غزلیں اس نسخہ میں ایسی ہیں جو سالار جنگ میں موجود نہیں جس کی تفصیل حسب ذیل ہے :

ذ۔ دو غزلیں، ش۔ دو غزلیں، غ۔ دو غزلیں، م۔ ایک غزل، اور ن ایک غزل ـــــ اس طرح آصف الدولہ کے ہر دو کلیات میں موجود غزلیات کی جملہ تعداد ۳۸۵+۸=۳۹۳ ہوتی ہے اور ان غزلوں کے اشعار کی تعداد تقریباً پانچ ہزار ہے۔

نسخہ سالار جنگ میں موجود مثنوی "ہُوا" نسخہ آصفیہ میں موجود نہیں اس کے برخلاف نسخہ آصفیہ میں "مثنوی چیٹنی" موجود ہے۔ جو بڑی چٹ پٹی سی مختصر مثنوی ہے۔ مخمس نسخہ سالار جنگ ہی کے مماثل ہیں۔ البتہ اس نسخہ میں صرف ۲۳ رُباعیاں موجود ہیں یعنی نسخہ سالار جنگ سے ۷ کم نسخہ آصفیہ میں دو رباعیاں درج ہیں۔

دونوں ہی نسخوں میں املا بارھویں صدی ہجری کے آخر کا ہے۔ چنانچہ یائے مجہول اور یائے معروف میں کوئی فرق روا نہیں رکھا گیا ہے۔ ٹ اور ڈ کے لئے حرف پر چار نقطے ڈالے گئے ہیں، ک فارسی و ک ہندی پر ایک ہی مرکز ڈالا گیا ہے۔

غزل کے اشعار نسخہ سالار جنگ سے یہاں نمونتہً درج کیے جاتے ہیں "کلام الملوک ملوک الکلام" ہے ؎

اس ادا سے مجھے سلام کیا ایک ہی آن میں غلام کیا

لے گیا ننگ و نام اب مجھ سے عشق نے آخر اپنا کام کیا

قصۂ جاں گداز اے آصف

تھوڑی سی بات میں تمام کیا

ـــــــ ورق ۱۲۲ الف

دو چار دن میں ظالم ہووے گی خط کی شدت یہ حسن عارضی ہے اس پر نہ ناز کرنا

ـــــــ صفحہ ۵ ب

شبنم نہیں ہے برگ گل اوپر چمن کے بیچ   آصف گرا ہے اشک کسی بے قرار کا

———— ص۹ ب

مقدور کب زباں کو بیانِ صفات کا   جلوہ ہو ہر صفات میں جب عینِ ذات کا

———— ص۸ ب

جلنے نہ دیا آتشِ غم سے جگر اور دل   کیا کیا کہوں احسان میں اس دیدۂ نم کا

———— ص۹ الف

کہاں تک میں پونچھوں ترے اشک آصف   ہوا تر بتر خوں سے دامان میرا

———— ص۹ ب

ہم نے دنیا میں آن کر دیکھا   جلوہ تیرا ہی سر بسر دیکھا[1]

تیرے کوچے میں آن کر پیارے   لوہو اپنا ہی تا کمر دیکھا

———— ص۱۰ ب

نہ کام آوے کسب کچھ نہ ہنر کچھ فائدہ بخشے

نصیبہ شرط ہے ہر چیز میں کسب و ہنر کس کا

———— ص۱۲ الف

ہمیشہ ایک عالم پر یہ آب و گل نہیں رہتا

جہاں میں بن کھلے عقدہ کوئی مشکل نہیں رہتا

———— ص۱۳ ب

دلِ بے تاب تو نسبت تو پوری اس سے پیدا کر

جہاں نسبت ہوئی پوری تو کچھ حائل نہیں رہتا

بھروسا جز خدا آصف نہیں کچھ خوب دنیا کا

کہ دنیا کے بھروسے پر کوئی کامل نہیں رہتا

———— ص۱۴ الف

آصف اس تیری کہانی نے تو مارا ہم کو

اے میاں یہ بھی کوئی کہنے کا افسانہ تھا

ص۱۸ الف

دل ٹھہرتا نہیں ہے سینے میں   آگ میں کس طرح رہے پارا

———— ص۱۹ ب

آصف اب ادبار لگے کرنے ترقی دن رات   شامت بخت ہوئی میری تو کم یا قسمت

———— ص۲۴ الف

سیر گلشن کی کیوں کروں میں ہوس   دل کا یہاں لالہ زار ہے موجود

———— ص۳۳ ب

نہ ہووے چاشنیِ درد بن کلام لذیذ   کہ بے نمک نہیں ہوتا کہیں طعام لذیذ

———— ص۳۸ الف

آصف خدا ہی بندوں کو دیتا ہے رات دن   کس کس مزہ کی نعمتیں اور بے طلب لذیذ

———— ص۴۰ ب

دوستی کے امور میں دل سا   ہم نے دیکھا نہ با اثر تعویذ

———— ص۴۳ ب

مت گمرہی سے چلنا اے گمرہاں زمیں پر

گزرے ہیں تم سے لاکھوں اس بے نشاں زمیں پر

———— ص۴۶ الف

مچا دوں شورِ قیامت ہر ایک جا آصف   غزل سرائی پہ آؤں اگر بہ سوز و گداز

———— ص۵۵ ب

ایک گردش کو ہی ثبات نہیں   تیرے اے چرخ بے مدار افسوس

———— ص۵۸ ب

صفات و ذات سے باہر ہے وہ بہ ذات و صفات

خدا نہ ہووے گا ذات و صفات کا محبوس

یہی ہے واجب و ممکن کا فرق اے آصف

کہ وہ تو واجب و یہ ممکنات کا محبوس

———— ص۶۲ الف

پانی پہ ماک کب تئیں ٹھہرے گی دوستو   بے فائدہ ہے دل کا لگانا یہیں اساس

———— ص۶۷ الف

وسعت کا دل کے کیا کروں آصف بیان میں

ایسا نہ ہے طویل نہ کون و مکاں عریض

———— ص۹۹ ب

---

۱ خواجہ میر درد بزرگ معاصر قرار پاتے ہیں اسلئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آصف نے درد کے اس شعر سے استفادہ کیا۔

جگ میں آ کر ادھر ادھر دیکھا   تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

———— (ایڈیٹر)

کانٹا سا یہ بھی دل سے نکل جاوے یا خدا
سینے میں سانس کھٹکے ہے اب خار کی غلط

——— ص ۱۰۴ ب

بنا کے پہلے مٹاتا ہے پھر بناتا ہے　　جو چاہتا ہے سو کرتا ہے یاد وسب صانع

——— ص ۱۰۸ الف

جوں شمع سوز دل سے جو پوچھا کہے تھی رات
اک آہ کھینچ کر پڑے آنسو ڈھلک دریغ

——— ص ۱۲۵ ب

اب تو اک مدت ہوئی آنے سے وہ بھی رہ گئے
ورنہ دیتے تھے خبر دل کی مجھے ہر بار اشک

——— ص ۱۲۸ الف

جو چاہیں کہ لکھیں کچھ احوال دل کا　　تو ہاتھوں کو اپنے قلم دیکھتے ہیں[۱]

——— ص ۱۳۶ ب

زنہار مرتے مرتے بھی سجدہ ضرور ہے　　اے دل نماز عشق مبادا قضا نہ ہو

——— ص ۱۴۷ ب

آتا ہے تیغ ہاتھ میں وہ جنگ جو لیے　　جاتا ہوں میں بھی سر کے تئیں دو بدو لیے

——— ص ۱۶۱ الف

آصف نہ چھوڑ دست سخاوت کو زنہار　　لایا ہے کچھ نہ ساتھ نہ جائے گا کچھ لیے

——— ص ۱۶۱ الف

عہد حکومت آصف الدولہ میں انگریزوں نے خوب خوب پر پھیلائے اور نواب وزیر کو طرح طرح سے تنگ کیا۔ تاریخ کے صفحات پر یہ داستان شرح و بسیط کے ساتھ لکھی ہوئی ہے۔ آیئے دیکھیں کہ نواب آصف الدولہ آصف اپنے اور انگریزوں کے تعلق خاطر اور انگریزوں کی ہوس ملک گیری کے بارے میں اپنے کلام میں کیا بیان کرتے ہیں۔ آصف کے کلام کی یہ عصری حیثیت نقادان ادب کو دعوت فکر دیتی ہے۔ ذیل میں صرف چند اشعار لکھے جاتے ہیں ؎

گدا تیرے کوچے کا ہے پادشاہ　　نہیں اس کو درکار کچھ تخت و تاج

——— ص ۲۹ الف

قفس سے چھوٹنے پائے تو ہم صفیروں سے
کریں گے جا کے ہم آصف شکایت صیاد

——— ص ۳۶ ب

ذرا جور و جفا کو کم کر اے شوخ　　کہ لازم ہے ترحم بے وطن پر

——— ص ۴۹ ب

اس شوخ کی ہو طبع اگر امتحان پر　　لاکھوں ہی کھیل جائیں اپنی جان پر

——— ص ۵۰ ب

تمہاری خفگی سے ہو جائیں کیوں نہ ہم مایوس
کہ ہم سا عاشقوں میں ہوگا کوئی کم مایوس　　ص ۵۸ الف

تمہارا اجنبی سخن کانوں کو لگا مانوس　　لگے ہے ساری خدائی کی بات مانوس

——— ص ۵۸ ب

بُرا نہیں جو کرو تم بھی انس آصف سے　　کہ آشناؤں سے ہوتے ہیں آشنا مانوس

——— ص ۵۹ الف

طاپ کے تو یہ اطوار ہی نہیں پیارے　　ہر ایک بات کا لڑ کر جواب دو برعکس

——— ص ۶۴ الف

کہو ہو اپنی ہر اک اُلٹی بات کو سیدھا　　ہماری سیدھی کو سمجھو ہو اور سنو برعکس
خدا ہمارا ہمیں تم سے چاہیئے سیدھا　　تمہارے جی میں جہاں تک کہ ہو کرو برعکس

——— ص ۶۴ ب

انسان کی نہ بے خبری کا اور سبب کچھ　　دنیا میں نہیں اس کے سوا تیری قسم حرص
زر کے عوض اب جان کے خواہاں ہیں یہ کافر　　عشاق سے ایمان نہیں کرتے ہیں صنم حرص
آصف نہیں کچھ حرص و ہوا منحصر ہند　　پھیلی ہوئی ہے تا بہ عرب اور عجم حرص

——— ص ۱۰۰ الف

آصف الدولہ آصف نے سودا کی غزل پر مخمس کہا ہے۔ ذیل میں پہلا اور آخری بند درج کیا جاتا ہے ؎

عزیزو ذکر بھی یہ مت کرو ہوا سو ہوا　　مبادا خفتہ ہوے فتنہ خو ہوا سو ہوا
نہ اس کے آگے میرا نام لو ہوا سو ہوا　　جو گزری مجھ پہ اسے مت کہو ہوا سو ہوا

---

[۱] مرزا غالب نے غالباً یہیں سے چراغ روشن کیا ؎
لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں　　ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
——— ایڈیٹر

باکشان محبت پہ جو ہوا سو ہوا

——— ص۲۲۹ الف

جو پوچھا عشق میں آشفتہ حالی ہیں دل کا | تو دیکھ دیکھ کے سن سن کے رو رو سر کو اٹھا
لگا یہ کہنے کہ اب پوچھتا ہے کیا دل کا | دیا دے ڈالا دین اب یہ جان ہے سودا
پھر آگے دیکھئے جو ہو سو ہو ہوا سو ہوا

——— ص۲۳۲ الف

امام باڑہ آصفی پر کہے ہوئے مخمس کا بند ملاحظہ ہو ؎

مسجد کا گرچہ سب سے بڑا احترام ہے | لیکن امام باڑہ بھی عالی مقام ہے
وہ آستان حق یہ مکان امام ہے | بخشے جو ہیں سو دارآسون ان کا یام ہے
سجدہ اگر ادھر ہے تو ادھر سلام ہے

——— ص۲۳۲ . الف

ایک رباعی نسخۂ سالار جنگ سے یہاں درج کی جاتی ہے ؎

جو کوئی کسی کو یاد کل پاوے گا | یہ یاد رہے وہ بھی نہ کل پاوے گا
جو اس دور مکافات میں سن اے غافل | بیدلو کرے گا آج کل پاوے گا

——— ص۲۶۳ ب، ص۲۶۴ الف

لکھنؤ کے بدنام ھزل گو شاعر
صاحبقران کا سنجیدہ کلام

سید امام علی بلگرامی ولد غلام حسین رضوی بلگرامی متخلص بہ صاحبقران کا مکمل کلیات اور دو دیوان حیدر آباد کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ کلیات شعبۂ مخطوطات کتب خانہ سالار جنگ حیدر آباد میں محفوظ ہے —— تاریخ ادب اردو میں صاحبقران لکھنؤ کا یقیناً پہلا اور آخری شاعر ہے جس پر "صاحبانِ تذکرہ" نے بے سوچے سمجھے ظلم ڈھایا ہے اور ان کے کلام کو پڑھے بغیر اسے ہزل گو، فحش گو اور چنیں چناں ..... کے القاب سے نواز دیا۔ چنانچہ "مجموعۂ نغز" میں حکیم قدرت اللہ قاسم صاحبقران کے کلام پر اس طرح اپنی رائے لکھتے ہیں:

"صاحبقران —— دیوانے مملو از انمائے فحش و اقسام ہزل دارد موزون الطبع واقع شدہ در ردیف وقافیہ غلطی نمی کند۔ الا غیر از ہزل و فحش بر زبانش نمی رود"۔ ۹

یعنی ردیف وقافیہ پہ دسترس رکھنے اور طبع موزون کے اعتراف کے باوجود کلام کو "مملو از انمائے فحش و اقسام ہزل" کا تمغہ عطا کیا گویا مکمل کلام تک صاحب تذکرہ کی رسائی نہ ہوئی —— اسی طرح تذکرہ "ریاض الفصحاء" میں مصحفی رقمطراز ہیں:

"صاحبقران تخلص ساکن بلگرام شخصے پاچی زبان طرفہ بود فی الحقیقت دریں فن نظیر خود نہ داشت"۔ ۱۰

اس "مدح سرائی" کے باوجود تذکرہ میں ۲۶ شعر درج کیے ہیں جو مطلق فحش یا ہزل سے علاقہ نہیں رکھتے بلکہ ایک شعر بھی فحش یا ابتذال لیے ہوئے نہیں ہے اور تمام تر سنجیدہ اشعار ہیں۔ ۱۱

اعظم الدولہ سرور "عمدۂ منتخبہ" میں اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"شخصے ہزال و فحاش ہرچند در ردیف و قوافی و معانی بندی و موزونیت قصورے نہ دارد لیکن تمام دیوانش مملو از الفاظ فحش و ہزل است ..... کہ دریں فن یکتا و موحد وقت خود ست"۔ ۱۲

سخن شعراء میں نساخ نے حق رائے دہی اس طرح ادا کیا ہے:

"معاصر جرأت و انشا ہزل اور فحش سے اشعار ان کے مملو ہیں دیوان ان کا نظر سے گزرا"۔ ۱۳

یادگار الشعراء میں اسپرنگر لکھتا ہے:

"لکھنؤ کے ایک مسخرے شاعر نے ایک نہایت فحش دیوان لکھا ہے"۔ ۱۴

اسپرنگر نے صاحبقران کے کلام کو فحش تو قرار ہی دیا ہے ساتھ ہی ان کو مسخرے کا لقب بھی عطا کیا۔ اور لالہ سری رام فرماتے ہیں:

"طبیعت ہزل گوئی کی طرف رجوع ہو گئی تھی لیکن دو چار شعر اچھے بھی کہہ گئے ہیں"۔ ۱۵

چند معتبر تذکرہ نگار "صاحبان" کی آراء آپ نے ملاحظہ فرمائی۔ اب چند ناقدانِ ادب کی سخن فہمی کی داد بھی دیجئے —— عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں:

"صاحبقران تخلص بلگرام کے ایک ہزل گو لکھنؤ آئے ..... معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کے مبتذل مذاق والے رئیس زادوں

میں ان کا نشوو نما ہوا۔ ان کا دیوان ملتا ہے اور گو کہ کلام فحش اور تہذیب سے کوسوں دور ہے مگر پھر بھی اس میں ایک بات ہے۔" [۱۲]

"فحش اور تہذیب سے کوسوں دور" کلام میں "پھر بھی ایک بات" کیا ہے؟ اس کا بیان اور وضاحت شرر نے نہیں کی ہے۔ ڈاکٹر خلیل احمد صدیقی منیر لکھتے ہیں:۔

"وہ ایک ہزل گو شاعر ہیں۔ ان کا سارا دیوان ہزلیات کا مجموعہ ہے جو فحش ہے اور گالیوں سے بھرپور ہے۔" [۱۳]

نصیر الدین ہاشمی مرتب فہرست مخطوطات کتب خانہ سالار جنگ فرماتے ہیں:

"مصنف ہزلیات میں اپنی آپ نظیر تھا:" [۱۴]

ان تمام آرا کو پڑھنے کے بعد اور صاحبقران کے کلیات پر ایک نظر ڈالنے سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ ان "صاحبانِ تذکرہ" اور "ناقدانِ ادب" نے یا تو صاحبقران کے مکمل کلیات کو دیکھا ہی نہیں ہے یا پھر ان کے کلام پر ایک "نگہِ غلط" ڈال کر اپنی آرا کا اظہار کر دیا ہے اور تفصیل سے مطالعہ کی زحمت گوارا نہ کی یا تیسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اپنے سے قبل کے "صاحبانِ تذکرہ و نقد" کے چراغ سے چراغ جلایا ہے۔

حیدرآباد میں دیوان صاحبقران کے دو قلمی نسخے اور ایک مکمل کلیات کا قلمی نسخہ محفوظ ہے۔ ان مخطوطات کی تفصیل سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس "پاجی زٹل لولیان اور فحش و ہزل گو مسخرے شاعر" کے سنجیدہ کلام کے چند منتخبہ اشعار پڑھ لیں ——— قارئین کرام! ان اشعار کو توجہ سے پڑھیے، غور کیجیے کہ عہدِ مرزا و میر کا ایک شاعر لکھنؤ میں دادِ سخن دے رہا ہے اور زبان و بیان، تشبیہ و استعارہ، کو اپنے طور پر باندھ رہا ہے۔ میر و مرزا سے متاثر نہیں ۔ اپنا ایک علاحدہ لہجہ بنائے ہوئے ہے ——!

ان اشعار میں آصف الدولہ بہادر کی توصیف و مدح سرائی بھی ہے نواب وزیر علی بہادر کا قصیدہ بھی ہے۔ نواب سعادت علی خاں کی مدح بھی ہے۔ خدا کے رازق ہونے پر ایمان بھی ہے۔ انگریزی تہذیب کے بڑھتے ہوئے اثرات کا بیان بھی ان اشعار میں اپنا شعور دکھا رہا ہے ہندوستان کی لٹتی ہوئی دولت اور بڑھتی ہوئی غربت کا بیان بھی آپ کو ان اشعار میں ملے گا اور انہی اشعار میں ہندوستانیوں کے ہاتھوں ایک ایک صوبہ کا نکل جانا بیان ہوا ہے۔ یہ چند اشعار کلیاتِ صاحبقران سے پیش ہیں:

یہ حسن خداداد ہے یا نور کا چمکا — عالم سے جمال اس کا نظر آتا ہے چمکا

——— ص۲ الف

قتل کرنے کو ہمارے جو رسالا نکلا — نازکی برچھی ادا کا لیے بھالا نکلا

——— ص۵ الف

دیر و حرم سے جلوہ گہ عشق نہ ہے — صوفی سے پوچھ سبحہ و زنار ہی عبث

——— ص۹ الف

زاہد نے کرتا نیلا رنگا یا بسنت میں — جو زرد پیرہن ہیں کیا انھیں پروا بسنت کی

——— ص۳۲ ب

سر رشتۂ محبت وابستہ زلف سے نہ تھا
دیتے ہیں اب تو دھاگا آنکھوں کے لال ڈورے — ص۵۸ الف

اشعار در مدح آصف الدولہ بہادر

اس زمانے میں وہ محسن ہے گدا اور شاہ کا
دونوں عالم میں ہے جاری فیض آصف جاہ کا — ص۲ الف

ہوتا نہیں ہے خدمتِ فقرا سے کچھ حصول — صاحبقران زیارتِ نواب کیجیے

——— ص۳۳ الف

آصف برنگ آئینہ روشن ضمیر ہے — معنی میں بادشاہ بصورت وزیر ہے

——— ص۴۲ الف

اشعار متعلق نواب وزیر علی بہادر

یوں کہے تھا وزیر علی باشعور — ہم سے جو رو ٹھ رو ٹھ نکلے گا
تن بدن میں نمک حراموں کے — یہ نمک پھوٹ پھوٹ نکلے گا

——— ص۶۴ الف

اشعار در مدح نواب سعادت علی خان

یہ حشم و جاہ تم کو سعادت علی مبارک — نازو ادا مبارک فیض و عطا مبارک
ہے سعادت علی خاں کہ اندریں عالم — بذل و سخاوت و جود و کرم دو چند از حاتم

——— ص۷۱ ب

عصری حسیت کے کچھ اشعار

سلے فرنگی بچہ تیرے ہاتھوں — دانت ہر باگ ال کے ٹوٹے
کیوں پکڑتا نہیں ہے رندوں کو — ہاتھ کیا کوتوال کے ٹوٹے

—— ص۲۴ ب

بساط دہر ہے شطرنج بازی — پیادے سے ہوا جاتا ہے شہ مات

—— ص۹ الف

مسلم معاشرت

اشک اب متصل آتے ہیں میری آنکھوں میں
ہوش لڑکی نے جہاں گھر میں سنبھالا نکلا — ص۹ الف

ہوا میں ٹھہر سکی کوئی شمع بے فانوس
جو بی بی پردے سے نکلے کوکب ملا ناموس — ص۱۵ ب

اشعار موسیقی

نہ دھرپت ہے نہ پٹر ہے کہرواہے نہ ٹھمری ہے
کہیں جو مست ہوئے ہے تو پھر گائے ہے تم تم تم — ص۱ ب

نہ ہر سے ہے بزم طرب میں جو کوئی چونکے تال
میٹھا ہے شہد سے گرخوب میاں سم بیٹھے — ص۴۲ ب

ذیل کے مصرعوں اور اشعار کو دیکھئے کہ معلوم ہوتا ہے غالب نے انہی سے اپنے اشعار کا چراغ جلایا ہے ؎

صاحبقران: ہے عشق کے سبب میری اوقات میں خلل — ص۱۹ ب
غالب: کہتے ہیں جسے عشق خلل ہے دماغ کا
صاحبقران: ہر بوالہوس سے عشق کا اظہار ہے عبث — ص۱۱ الف
غالب: ہر بوالہوس نے عاشقی شعار کی

شاعر کا نام و زمان

اسپرنگر، صاحبقران کا نام "امام علی رضوی" لکھتا ہے[۱۹] عبدالغفور نساخ نے سید امام علی نام بتایا ہے[۲۰] لالہ سری رام نے امام علی نام لکھا ہے[۲۱] شاہ کمال نے "سید امام خاں رضوی بلگرامی" نام لکھا ہے[۲۲]
شاہ کمال، صاحبقران کے دوست تھے اور صاحبقران اکثر شاہ کمال کے گھر آیا کرتے تھے۔ صاحبقران نے خود کو اپنے ایک شعر میں ؎ حسن سید رضوی نام کہا ہے[۲۳] صاحبقران کے والد کا نام سید غلام حسین رضوی تھا۔[۲۴] صاحبقران کا وطن ضلع ہردوئی بلگرام تھا اور انہوں نے لکھنؤ میں سکونت اختیار کی تھی۔ مصحفی "ریاض الفصحا" میں لکھتے ہیں:

"بعمر ہفتاد سالگی از جہاں درگذشت" [۲۵]

مصحفی نے "ریاض الفصحا" ۱۲۲۱ھ میں مکمل کیا اور صاحبقران کا ترجمہ انہوں نے انہی کے صیغہ میں کیا ہے۔ شاہ کمال نے اپنا تذکرہ "مجموعہ انتخاب" ۱۲۱۹ھ میں ختم کیا۔ ۱۲۱۶ھ/۱۲۱۷ھ تک وہ لکھنؤ ہی میں تھے۔ نورالامرا کے ساتھ وہ حیدرآباد چلے آئے تھے اور ڈیڑھ برس میں تذکرہ ترتیب دیا اور ۱۲۱۹ھ میں اسے مکمل کیا۔ جس میں صاحبقران کے لئے ؎

"حق تعالیٰ سلامت دارد"

لکھا ہے۔ اس طرح ہم صاحبقران کی وفات کو ۱۲۱۹ھ/۱۲۲۰ھ کا واقعہ قرار دے سکتے ہیں۔ مصحفی نے صاحبقران کی عمر ستر برس بوقت وفات لکھی ہے۔ اس طرح صاحبقران کی پیدائش ۱۱۴۹ھ یا ۱۱۵۰ھ قرار پاتی ہے۔ تحقیق کے محتاط تقاضے کے وقت ہم ان کی پیدائش کا سنہ ۱۱۴۹ھ تا ۱۱۵۱ھ کے درمیان قرار دے سکتے ہیں۔

کلیاتِ صاحبقران کی اندرونی شہادت گواہی دیتی ہے کہ وہ شجاع الدولہ بہادر کے زمانے میں لکھنؤ آچکے تھے اور انہوں نے آصف الدولہ کے تخت نشین ہونے پر خوشی کا اظہار کیا ہے۔ اس طرح صاحبقران نے گویا لکھنؤ کے چار حکمرانوں کا زمانہ دیکھا یعنی شجاع الدولہ، آصف الدولہ، وزیر علی خاں اور سعادت علی خاں۔ آخر الذکر تین حکمرانوں کی مدح میں انہوں نے شعر کہے ہیں لیکن کلام کی شہادت کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ صاحبقران کو صرف نواب آصف الدولہ کی سرپرستی حاصل ہوئی تھی یا پھر شہزادہ سلیمان شکوہ کی۔ اس طرح ہم صاحبقران کو میر و مرزا اور مصحفی کا ہم عصر شاعر کہہ سکتے ہیں۔ صاحبقران کا انتقال نواب سعادت علی خاں کے عہد میں ہوا۔ اس لیے انہیں جرأت انشا اور رنگین کا ہمعصر شاعر کہنا مناسب نہیں، جیسا کہ تقریباً ہر تذکرے میں لکھا گیا ہے۔

خطی کلیات کی تفصیلات

کلیات صاحبقران میں ۹۹ اوراق اور ایک صفحہ ہے اس طرح

جو صفحات ۱۹۹ ہیں۔ مجلد کا سائز ۱۳" × ۸" ہے۔ ہر صفحہ پر ۱۹ تا ۲۲ سطریں ہیں۔ جگہ جگہ حاشیہ پر بھی شعر لکھے گئے ہیں۔ خط نستعلیق اور کاغذ دیسی ہے۔ صفحہ الف مطلا و منقش ہے۔ نیلگوں و سنہری بیل بوٹے بنائے گئے ہیں۔ تخلص ہر غزل و نظم میں سرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ صفحات پر نمبرات نہیں ہیں، ترک موجود ہے۔ اس کلیات کی کتابت یقیناً صاحبقران کی حیات ہی میں ہوئی ہے کہ کلام میں جا بجا تنسیخ و ترمیم کی گئی ہے۔ کہیں کسی شعر کا ایک مصرعہ بدلا گیا ہے اور حوالہ نشان کے ساتھ حاشیہ پر دوسرا مصرعہ لکھا گیا ہے کہیں فقط کوئی لفظ قلم زد کرتے ہوئے حاشیہ پر دوسرا لفظ لکھ دیا ہے۔ بعض غزلوں میں چند اشعار کے بعد چلیپا بناتے ہوئے حاشیہ پر مزید اشعار لکھے گئے ہیں۔ اس کیفیت کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ مخطوطہ خود شاعر کی زندگی میں نقل ہوا ہے۔

کلیات صاحبقران کا زیر مطالعہ نسخہ شاہانِ اودھ کے شاہی کتب خانے کی زینت رہا ہے اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی غارت گری میں یہ مخطوطہ کسی کے ہاتھ لگا اور حیدرآباد پہونچ گیا۔ کلیات کے پہلے صفحہ پر پانچ مہریں ہیں، سب سے قدیم مہر نثار حسین خاں کی ہے۔ ۱۸ رمضان ۱۲۲۷ھ سے متعلق۔ دوسری مہر کتب خانہ سلیمان جاہ ۱۲۴۳ھ۔ تیسری مہر سلطان والا جناب کی ہے۔ چوتھی مہر نواب امجد علی شاہ ۱۲۶۰ھ اور آخری مہر نواب واجد علی شاہ ۱۲۶۳ھ ثبت ہیں۔ ان کے علاوہ پانچ مختلف شکستہ تحریریں بھی ہیں۔

کلیات کی پہلی غزل حمد میں ہے، شعر ہے ؎

یہ حسن خدا داد ہے یا نور کا چمکا
عالم سے جمال اس کا نظر آتا ہے چمکا — ۱ الف

دوسری غزل بادشاہ وقت کی مدح میں ہے، مطلع ہے ؎

اس زمانے میں وہ محسن ہے گدا اور شاہ کا
دونوں عالم میں ہے جاری فیض آصف جاہ کا — ۲ الف

اس کے بعد غزلیات ہیں۔ ہزلیات اور سنجیدہ کلام ایک ساتھ درج ہے اُردو غزلوں ہی کے ساتھ فارسی غزلیات بلا کسی تخصیص درج ہیں۔ یعنی اُردو و فارسی کلام گڈمڈ ہے۔ ورق ۵۹ الف تک مسلسل غزلیات ہیں۔ درمیان میں ایک مخمس مثنوی ہے جو ورق ۲۵ الف و ب پر درج ہے۔

ورق ۵۹ ب سے مخمس درج ہیں، ورق ۶۸ ب سے مثلث درج ہیں۔ ورق ۷۵ الف تا ۷۸ ب تک رباعیات ہیں۔ ورق ۷۹ الف سے پھر اُردو فارسی کی سنجیدہ غزلیات ہیں۔ ورق ۸۲ ب و ۸۳ الف پر نواب سعادت علی خاں کی مبارکباد درج ہے۔ ورق ۸۳ ب سے پھر ایک مخمس مثنوی شروع ہوتی ہے جو ورق ۸۴ ب پر ختم ہوتی ہے۔ ورق ۸۵ الف پر غزلیات مخمسات درج ہیں۔ ورق ۹۵ ب سے مناقب حضرت علیؓ شروع ہیں جو مسدس اور مخمس کی ہیئت میں لکھی گئی ہیں۔ ہر منقبت کے آخری بند میں اپنے کثیر العیال خاندان کی مفلسی کا بیان کیا ہے اور غیبی مدد کی دعا مانگی ہے سلسلۂ منقبت اس بند پر ختم ہوتا ہے ؎

صاحبقران توسّل جس کو ہے علیؑ سے
تحقیق میں سُناہوں یہ کلمہ ہر ولی سے
پروا نہیں ہے اس کو ہر دن کی تنگی سے
پڑھتے تھے سب یہ مطلع ہر آن خوشدلی سے
کیا مسکوں سے رکھتا ہے دل امیدواری
کردے گا تجھ کو حیدرؑ دم میں ہفت ہزاری

۹۸ ب

ورق ۹۹ الف پر ایک سلام درج ہے۔ ورق ۹۹ ب پر مزید دو منقبت موجود ہیں۔ ورق ۱۰۰ الف پر کلیات ختم ہو جاتا ہے۔ ترقیمہ حسب ذیل ہے:

"برائے خاطر مرزا قربان علی بیگ صاحب تحریر نمودہ شد
کتبہ شیخ احمد علی تمام نمودہ شد"

اس ورق پر بھی صفحۂ اول ہی کی طرح شاہان اودھ کی مہریں ثبت ہیں۔

دیوان صاحبقران کا ایک خطی نسخہ ادارہ ادبیاتِ اُردو حیدرآباد میں مخزون ہے غیر مخطوطہ ۹۲۳ فن نظم۔ اس میں صرف ۱۸ ورق ہیں اور صرف پچاسی شعر انتخاب کیے گئے ہیں۔ دیوان صاحبقران کا ایک اور قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہے۔ لیکن یہ بھی مکمل دیوان نہیں بلکہ صرف انتخاب ہے۔

واللہ اعلم بالصواب۔

تفسیر مرتضوی قلمی

اُردو نثر میں قرآن مجید کا ترجمہ اور تفسیر سب سے پہلے شاہ محمد رفیع الدین

دہلوی نے "تفسیر رفیعی" اور شاہ عبدالقادر نے ترجمہ قرآن بنام "موضح قرآن" سے کیا۔ قرآن مجید کا منظوم ترجمہ سب سے پہلے غالباً شاہ بہاء الدین متوفی ۹۱۲ھ نے کیا۔ یہ منظوم ترجمہ آج مکمل دستیاب نہیں لیکن خزائن رحمت اللہ کے خزینہ ششم میں سورۂ اخلاص کا منظوم ترجمہ موجود ہے [۲۶]

عہد آصف الدولہ میں یعنی ۱۱۹۴ھ میں غلام مرتضیٰ فیض آبادی نے لکھنؤ میں قرآن مجید کی منظوم تفسیر اُردو میں لکھنے کی سعی بلیغ فرمائی۔ نام و تاریخ تصنیف اور اپنا نام ان اشعار میں منظوم کیا ہے ؎

دل لگا کہنے بوقت اختتام — اس کا رکھ تفسیر مرتضوی تو نام
کیونکہ تو ہے گا غلام مرتضیٰ — حکم سے مولیٰ کے ہے اس کو لکھا

سنہ ہجری ان دنوں ترجمان لے
یک ہزار اور ایک سو چورانوے

تفسیر مرتضوی کا یہ نادر مخطوطہ شعبہ مخطوطات ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد میں مخزون ہے۔ مخطوطہ ناقص الطرفین ہے۔ فی الحال مخطوطہ ۱۲۸ ورق پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ پر ۱۵ شعر ہیں۔ سائز ۵½ × ۹" ہے۔ مخطوطے کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ غلام مرتضیٰ نے غالباً تمام قرآن مجید کا ترجمہ/تفسیر کیا تھا لیکن اس مخطوطہ میں مکمل نہیں ہے۔ تفسیر مثنوی کی ہیئت میں کہی گئی ہے۔ ابتدا میں حمد و نعت و مدح صحابہ موجود ہے۔ غلام مرتضیٰ نے اپنے والد شاہ تیمور کی مدح میں بھی شعر کہے ہیں۔ غلام مرتضیٰ شاہ سید محمد کے مرید تھے۔ مثنوی میں ان کی مدح بھی موجود ہے۔ والد اور مرشد کے علاوہ شاعر نے اپنے استاد مولوی محمد برکت کی مدح بھی کی ہے اور پھر مغل شہنشاہ شاہ عالم کی مدح ہے۔ پھر وزیر الممالک نواب آصف الدولہ کی توصیف کی گئی ہے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

آصف الدولہ وزیر مملکت — حامیٔ دین و مشیر سلطنت
آصف وقت سلیمانِ زماں — ہے سکندر بخت و دارائے جہاں
وہ سعادت سے ہے منصور جہاں — ہے شجاعت اس سے با نام و نشاں

ہے تکلف گر کروں مدح وزیر
کر دعائے خیر ہے کار فقیر

مثنوی میں جابجا آیتیں اور حدیثیں عربی میں درج ہیں جسے نسخ روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ املائی خصوصیات تیرھویں صدی ہجری کی نصف اول کی ہیں۔ چونکہ ترقیمہ موجود نہیں اس لئے سنہ کتابت اور کاتب کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔

□□

حواشی:

۱۔ اعظم الدولہ سرور "عمدہ منتخبہ" ص۵ طبع اول۔ شائع کردہ دہلی یونیورسٹی دہلی
۲۔ عبدالغفور نساخ "سخن شعرا" ص۲۳۳ سن اشاعت ۱۲۹۱ھ
۳۔ مردان علی خاں مبتلا "گلشن سخن" ص۱ مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب بار اول ۱۹۶۵ء
۴۔ غلام ہمدانی مصحفی "تذکرہ ہندی" ص۱۳ اکیڈمی ایڈیشن ۱۹۸۵ء
۵۔ حکیم قدرت اللہ قاسم: مجموعۂ نغز ص۳۶ مرتبہ حافظ محمود شیرانی اکتوبر ۱۹۳۳ء
۶۔ اعظم الدولہ سرور "عمدہ منتخبہ" ص۵۔ ۷۔ نصیر الدین ہاشمی "فہرست مخطوطات کتب خانہ سالار جنگ" اردو ص۲۱۶ ۸۔ خان آرزو کا شعر
داغ چھوٹا نہیں کس کا لہو ہے قاتل — ہاتھ بھی دکھ گئے دامن ترا دھوتے دھوتے
۹۔ قاسم: "مجموعۂ نغز" ص۲۶۱۔ ۱۰۔ مصحفی، "تذکرۂ ہندی" ص۱۸۸
۱۱۔ ایضاً ص۱۸۸ و ص۱۸۹ ۱۲۔ سرور: "عمدہ منتخبہ" ص۳۰۲
۱۳۔ عبدالغفور نساخ: "سخن شعرا" ص۲۵۳ ۱۴۔ اسپرنگر: "یادگار الشعراء" مترجمہ طفیل احمد ص۱۰۶ ۱۹۸۵ء ۱۵۔ لالہ سری رام، "خمخانۂ جاوید" جلد پنجم ص۲۸۱ مرتبہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی ۱۹۴۰ء
۱۶۔ عبدالحلیم شرر: "گزشتہ لکھنؤ" ص۱۰۵ مرتبہ شمیم انہونوی۔ ۱۹۷۴ء
۱۷۔ خلیل احمد صدیقی مشیر: "ریختی کا تنقیدی مطالعہ" ص۲۳۲ بار اول ۱۹۷۴ء
۱۸۔ نصیر الدین ہاشمی: "فہرست مخطوطات کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد" طبع اول ص۴۴۵۔ ۱۹۔ اسپرنگر: "یادگار الشعراء" ص۱۰۶
۲۰۔ نساخ، "سخن شعرا" ص۲۵۳۔ ۲۱۔ لالہ سری رام: "خمخانۂ جاوید" ص۲۸۱
۲۲۔ شاہ کمال: "مجموعۂ انتخاب" ص۳۴۳ قلمی مخزونہ کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد فن تذکرہ نمبر ۲ داخلہ نمبر ۱۰۶۱ ۲۳۔ صاحبقران: "کلیات صاحبقران" ص۵۴ قلمی مخزونہ کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد فن کلیات نمبر ۷۷
۲۴۔ لالہ سری رام: "خمخانۂ جاوید" ص۲۴۱
۲۵۔ غلام ہمدانی مصحفی: "ریاض الفصحا" ص۱۸۸ اکیڈمی ایڈیشن
۲۶۔ ملاحظہ ہو "شاہ بہاء الدین باجن، حیات اور فکری کلام" مرتبہ ڈاکٹر شیخ فرید سنہ ۱۹۸۲ء

غزلیں

شہرِ افسردگاں میں اُجالا کہاں، گاؤں کے دل چلو آؤ واپس چلیں
اُجڑے برگد تلے، بھیگے خوابوں تلے چاند کی روشنی کا سواگت کریں

تم مرے دوست ہو، بات جھوٹی ہے یہ، اب میں اس جھوٹ سے بھی بہلتا نہیں
مجھ کو اچھے ہوئے ایک مدت ہوئی، چارہ گر لوگ آپ خود کو اچھا کریں

آسماں اب زمیں لگ رہا ہے مجھے، ہر ستارہ حسیں لگ رہا ہے مجھے
ڈر ہے لوگوں سے میں چھٹ نہ جاؤں کہیں، لوگ رشتا ہی کچھ مرے بھی توڑیں

بات جب آپ کی ہے تو کیا بات ہے، رات جب آپ کی ہے تو کیا رات ہے
چاند کے مقبرے سے نکلئے ذرا، ظلمتوں کی زیارت بھی کرتے چلیں

دیوتا اپنے مندر کے اپنے نہیں، غیر ملکی خداؤں کی کیا بات ہے
جی میں آتا ہے دھرتی کے رتھ توڑ دیں، آسمانی جہازوں کے پر نوچ لیں

——— ایم کوٹھیاوی راہی
ایڈیٹر "اشتراک" دیکلی،
قاضی پور خورد - گورکھپور

☐

گم شدہ لمحات کی زنجیر لے کر آئی ہے
غم کی پُروائی عجب تاثیر لے کر آئی ہے

دھوپ لفظوں کی، سنہرے تیر لیکر آئی ہے
زنگ آلودہ سہی، شمشیر لے کر آئی ہے

مدتوں کے بعد اب ٹوٹی ہوئی دہلیز تک
پھر وہی خوشبو، وہی تحریر لے کر آئی ہے

موسموں کی زد میں کچھ الفاظ گیلے تھے مگر
آ کے بارش اک نئی تدبیر لے کر آئی ہے

خواہشِ فکرِ تمنا، پتھروں کے شہر میں
ایک بے آواز سی زنجیر لے کر آئی ہے

رند میری ذات تو بے ربط منظر تھی مگر
زندگی اپنی الگ تصویر لے کر آئی ہے

——— پی پی سریواستوا رند
آر ۱۶ - سیکٹر ۱۱ - نوئیڈا
۲۰۱۳۰۱

ہزار سخت سہی راہ چلتے رہنا ہے
ہمیں تو چشموں کی مانند اُبلتے رہنا ہے

مرا نصیب بنی اس کی بد دُعا شاید
کہ مجھ کو پانی میں رہ کر بھی جلتے رہنا ہے

پھر اعتماد دواؤں سے کیوں نہ اُٹھ جائے
جو رات بھر ہمیں کروٹ بدلتے رہنا ہے

مہکتے بچوں سے سیکھا ہے زندگی کرنا
غموں کی گود میں ہم کو مچلتے رہنا ہے

ہم اُن کے ہاتھوں میں سونپیں گے کیسے مستقبل
ہوا کے ساتھ ہی جن کو بدلتے رہنا ہے

توقع شیریں بیانی کی ہے عبث اُس سے
کہ زہر ہی جسے ہر دم اُگلتے رہنا ہے

رگِ حیات میں باقی لہو بچے نہ بچے
تمام رات چراغوں کو جلتے رہنا ہے

گنوا کے اس کی رفاقت کا بے بہا لمحہ
تمام عمر ہمیں ہاتھ ملتے رہنا ہے

——— مہدی پرتاپگڑھی
۲۸، اسکول وارڈ
پرتاپگڑھ ۲۳۰۰۰۱
(یوپی)

وجودِ مُعتبر

ہم
موسموں کی عنایتوں پر
زندہ رہنے والے
درخت نہیں ہیں
بلکہ ہماری جڑیں
کسی درخت کی بلندی سے بھی زیادہ گہرائی تک
اس زمین کے نیچے پھیلی ہوئی ہیں

ہم
نہ تو وہ درخت ہیں
جو بادلوں کی گرج سے لرز اٹھتا ہے
یا، ہلکی سی بارش کے سہارے پر
اپنے وجود میں
زندہ رہنے کا حوصلہ باقی رکھتا ہے
اور
جس کی آنکھیں
بارش کی ایک ننھی سی بوند کے انتظار میں
آسمان پر جمی رہتی ہیں

ہم
وہ درخت بھی نہیں، جو
پُرکیف ہواؤں کے فریب میں آکر
سمجھنے لگتا ہے کہ ان ہواؤں پر ہی
اس کی سانسوں کا دار و مدار ہے
یہ موسم، یہ بادل
یہ ہوائیں
سب تبدیلیوں کے محکوم ہیں
کبھی ان کے جسم پر
خوش نما لباس ہوتا ہے
کبھی چیتھڑے
کبھی یہ چیخنے، چنگھاڑنے لگتے ہیں
کبھی اپنے چہرے سیاہی میں ڈھک لیتے ہیں

اور ہم
ایک روشنی، شادابی
اور جستجو کا مسلسل سفر ہیں
جو ازل سے ابھی تک جاری ہے
اور
ابد تک جاری رہے گا۔

—— سعید عارفی
قانون گو پورہ۔ بہرائچ ۲۷۱۸۰۱

سراسیمگی

گماں تک نہیں تھا
کبھی کھردرا سا
یہ لہجہ
سراسیمگی کی
علامت بنے گا
ہمارے دروں میں
کواڑے مقفّل ہیں
لیکن
مسلسل جھری سے
کوئی جھانکتا ہے۔

—— قمر ادیب
۱۴۔ ادریس گنج۔ ہردوئی

فرصت کے رات دن

پتھر بچھاؤں ٹوٹے ہوئے پھل چنا کروں
باغوں میں تتلیوں کا تعاقب کیا کروں

پُروائیوں میں ملتی ہوئی پتیوں کا راگ
شاخوں پہ بیٹھی پریوں کے نغمے سنا کروں

آندھی میں اُڑتے پنکھ حسیں کا غذوں کے ساتھ
پھیلا کے دونوں ہاتھ زمیں پر اڑا کروں

خاموش جھیل میں کوئی کنکر اچھال کے
پانی پہ بنتے دائرے دیکھوں گنا کروں

بارش میں چھت کے جھرنے تلے اپنی زلف میں
گنگا اتارنے کا حسیں تجربہ کروں

بچپن کی وہ حسین سی وادی کہ آج تک
بکھری ہوئی فضاؤں میں سانسیں لیا کروں

وہ دورِ انبساط وہ لمحے وہ سال و سن
"جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن"

—— ڈاکٹر عامر ریاض
لینگویج سیکشن (اردو)
سکریٹریٹ (لکھنؤ)

ڈاکٹر نگار فاطمہ ہاشمی
۹۳/۲۵۸ - نادان محل، لکھنؤ ۴

اردو ادب اور قصبہ سندیلہ

سندیلہ ایک قدیم قصبہ ہے۔ اس قصبہ کا نام سندیلہ کیسے پڑا، اس میں بھی لوگوں کی رائیں مختلف ہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ سلہا اور سلہا دو حقیقی بھائی تھے جو آرکھ کی قوم سے تعلق رکھتے تھے، انھیں دونوں بھائیوں میں سے ایک نے ملیح آباد اور دوسرے نے سندیلہ آباد کیا۔ راجہ درگا پرشاد مہر اپنی تصنیف "تاریخ سندیلہ" میں اس طرح لکھتے ہیں:

"مخدوم حضرت سید علاء الدین صاحب کو اس سرزمین کی معافی کی سند دربار دہلی یا ایک قول پہ ان کے پیر و مرشد حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی سے ملی تھی۔ انھوں نے قریب سندیلہ پہونچ کر وہ نوشتہ دریا میں ڈبو دیا اور کہا کہ سند اللہ کافی ہے اور اس سے سندیلہ بن گیا۔"[1]

اس بات کو "رسالہ ادیب اردو" لکھنؤ ماہ جون ۱۹۲۲ء میں اس طرح لکھا گیا ہے:

"چراغ دہلوی نے عطائے خلافت کے وقت مخدوم صاحب کو ایک سند خرچ خانقاہ کے لئے عنایت کر دی تھی جس میں تین سو ساٹھ بیگہ آراضی درج تھی جو آج تک بدستور آپ کی اولاد میں چلی آتی ہے۔ بارہا سلطنت میں انقلاب ہوئے مگر اس جاگیر میں آج تک تغیر نہ ہوا۔ یہ انھیں بزرگان دین کا تصرف ہے۔ اس امر کی تصدیق کتاب مرآۃ الاسرار کے مصنف نے بھی کی ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ منجانب بادشاہ دہلی جو سند بنابر مصارف خانقاہ شریف آئی تھی وہ آپ کے پاس اس وقت پہونچی جب کہ آپ روانہ ہو رہے تھے۔ چوں کہ آپ نے بحری سفر اختیار کیا تھا اور کشتی میں سوار ہو کر روانگی فرمائی تھی، اس سند کو دریا میں ڈال کر سندی اللہ یعنی میرے لئے اللہ سند ہے فرمایا تھا۔ چوں کہ خدا کی ذات پر آپ نے بھروسہ فرمایا تھا اس کا صلہ یہ ہے کہ شہنشاہ حقیقی نے آپ کو ہمیشہ کے لئے یہ جگہ مرحمت کی۔ القصہ آپ نے وہاں سے روانہ ہو کر جس جگہ قیام فرمایا اس جگہ کا نام سندی اللہ رکھا۔ آخر کثرت استعمال سے سندیلہ ہو گیا۔"[2]

ان تمام باتوں سے یہ بات تو بہر حال ظاہر ہو جاتی ہے کہ سندیلہ میں مسلمانوں کی آبادی مخدوم صاحب ہی کی بدولت ہوئی۔ مخدوم صاحب سندیلہ کے شاہ ولایت ہیں۔ آپ کا مزار شریف محلہ درگاہ میں واقع ہے۔ کافی تعداد میں سندیلہ اور دیگر شہروں کے لوگ آپ کے معتقد ہیں۔ ہر سال آپ کا عرس منایا جاتا ہے۔ مسلمان ہی نہیں بلکہ بڑی تعداد میں ہندو بھی مخدوم صاحب کے عقیدت مند ہیں۔

اس طرح سندیلہ کئی صدی تک مخدوم زادگان اور قاضی احمد اللہ شاہ صاحب سلم ان کے اخلاف کے سبب علم و ادب کا مرکز بنا رہا۔ اس زمانے میں بیشتر حضرات فارسی میں شعر کہتے تھے۔ ان میں حضرت جنید روحانی، احمد علی خاں، ملک زادہ منشی یوسف علی خاں یوسف، عارف علی شاہ عارف خراسانی اور راجہ درگا پرشاد مہر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات کی ذات سے فارسی شعر و شاعری کا چرچا تھا۔

۱۸۵۷ء کے بعد جن صاحب دیوان شعرا پر ہماری نظر پڑتی ہے ان میں منشی فضل رسول واصلی، میر محمد حسین شیفتہ، مولوی ریاض الدین

امجد ریاض، مولوی نیاز علی پریشان، مولوی عزیز الدین اکرم عزت محمد افضل تجلّی مرحومین قابل ذکر ہیں۔ ان شعراء نے چوں کہ رعایت لفظی اور قافیہ پیمائی کو بہت حد تک اپنی شاعری کا جزو بنایا ہے اس وجہ سے ان کے کلام میں وہ کیف اور اثر نہیں پایا جاتا ہے جو بعد کے شعراء کے کلام میں دکھائی پڑتا ہے۔ اس دور کے زیادہ تر شعراء خلق، اسیر اور ناسخ کے شاگرد تھے۔ لیکن پھر بھی ان کا کلام اپنی جگہ پر ایک الگ اہمیت کا حامل ہے۔ بطور نمونہ ان حضرات کے کچھ اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

منشی فضل رسول واسطی شاگرد مظفر علی خاں اسیر لکھنوی:

عشق میں اس شعلہ رو کے دل جلایا جائے گا
ایک دن سرو چراغاں یہ بنایا جائے گا

میر محمد حسن شیفتہ شاگرد اسیر:

فروغ حسن جس نے بخشا ہے جلوہ ماہ کنعاں کو
عطا کی مہر تیرے نام کی حق نے سلیماں کو
جو مجھ کو لے گیا جوش جنوں صحرا سے وحشت میں
بگولے کی طرح پکڑ دیا سارے بیاباں کو

سید فضل حسین شاعر (خلف واسطی) شاگرد فصاحت لکھنوی:

تیر مژگاں یار کا سینے میں جو غیر بیٹھا — ساتھ ہی تیر نگہ آکے جگر پر بیٹھا
یہ بھی اعجاز ہے ادنیٰ کہ ہما بن کے اڑا — قصر جاناں پہ اگر آکے کبوتر بیٹھا

سید فضل رسول واسطی سندیلوی سنہ ۱۸۷۹ء میں انتقال کیا۔ ان کے صاحبزادے منشی سید فضل حسین نے ان کا عرس شروع کیا۔ ان کی وفات (۱۹۰۲ء) کے بعد ان کے خلف منشی سید التفات رسول نے عرس کے ساتھ ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی۔ اس مشاعرہ اور عرس پر ہزاروں روپئے خرچ کرتے تھے۔ اس کے متعلق نفیس سندیلوی اپنے مضمون مطبوعہ "التفات رسول انٹر کالج میگزین، سندیلہ" میں لکھتے ہیں:

"آپ کے صاحبزادے منشی سید فضل حسین مرحوم نے اس پر ایک شاندار مقبرہ تعمیر کرایا جو کئی سال میں تکمیل کو پہنچا۔ مکان کے قریب دو پرشکوہ دالان بنوائے جن کو آپ کے صاحبزادے منشی سید التفات رسول ہاشمی مرحوم نے توڑوا کر ایک ہال تعمیر کرا دیا اور جھاڑ فانوس وغیرہ سے آراستہ کرا دیا۔ حضرت واسطی مرحوم کا سالانہ عرس اور اسی ضمن میں ایک مشاعرہ اس ہال میں منعقد ہوتا تھا۔"

سندیلہ کے اس مشاعرہ میں شمالی ہند کے قریب قریب تمام شعراء اور استادان فن مثلاً مرزا افضل حسین افضل لکھنوی، محمد احسان علی خاں احسان شاہجہاں پوری، سید انور حسین آرزو لکھنوی، مولانا محمد احمد بیخود موہانی، سید حسین احمد بیباک شاہجہاں پوری، سید تصدق حسین جادو رامپوری، حمید میرٹھی، فدا علی خنجر لکھنوی، محمد ضمیر خاں صاحب دل شاہجہاں پوری، نواب سراج الدین احمد سائل دہلوی، مرزا کاظم حسین محشر لکھنوی، حکیم سید علی محسن ابر لکھنوی، مولوی معین الدین احقر بنارسی، فخر الفا ریونشین حجاب شاہجہانپوری وغیرہ اپنے کثیر شاگردوں کے ساتھ شریک مشاعرہ ہو کر داد سخن دیتے تھے۔ ان مشاعروں کے کچھ گلدستے بھی چھپتے تھے ۱۹۱۹ء کے گلدستے کے دیباچے میں التفات رسول ہاشمی صاحب نے تحریر فرمایا ہے:

"یہ گلدستہ اس اعتبار سے نہیں کہ کاغذ کے گھوڑے دوڑائے گئے ہیں بلکہ اس لحاظ سے کہ گلزار سخن و مضامین کے سدا بہار پھول ہیں جو خزاں کے جھونکوں سے کھلا نہیں سکتے۔ ہمیشہ بہار بے خزاں رہیں گے۔ یہ کہنا بھی بے موقع نہیں ہوگا کہ سندیلہ میں میری سرپرستی سے ایک مشاعرہ قائم ہے اور ماہوار مشاعرہ ہوا کرتا ہے۔ گو میرے یہاں مشاعرہ ماہانہ ہوتا ہے مگر یہ سالانہ مشاعرہ اور عرس بہت اعلیٰ پیمانے پر ہوتا ہے۔ یہ کہنا تو خودستائی کرنا ہے کہ اس مشاعرے اور سالانہ عرس کو حد درجہ حوصلے کے ساتھ کرتا ہوں۔" سے۵

اس کے علاوہ التفات رسول ہاشمی صاحب ماہانہ شاعرے بھی کرواتے تھے جن کی غزلیات کبھی کبھی "رسالہ گلچیں" میں شائع ہوتی تھیں۔ یہ رسالہ محلہ نخاس لکھنؤ سے وسیم خیرآبادی شاگرد امیر مینائی نکالتے تھے۔ ہاشمی صاحب اس رسالہ کے مربی بھی تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے نواب سید اعزاز رسول صاحب نے

اس مشاعرہ اور عرس کو چند سال تک قائم رکھا۔ پرانے استاد ختم ہوتے گئے ان کی جگہ نئے شاعر مثلاً اصغر گونڈوی اور جگر مراد آبادی وغیرہ آتے رہے۔

سندیلہ کے اس دور کے شعراء کا کلام کافی پُرلطف اور اثر دار ہے۔ ان شعراء کے کلام میں زیادہ تر آرزو لکھنوی کا انداز دکھائی پڑتا ہے کیوں کہ سندیلہ کے ان سالانہ مشاعروں کی صدارت آرزو صاحب ہی کرتے تھے اور اس دور کے زیادہ تر شاعر انھیں کے شاگرد تھے اور ان شعراء کے کلام میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو دبستان لکھنؤ کی خصوصیات تھیں۔ اس دور کے شعراء کے کچھ اشعار پیش خدمت ہیں، ملاحظہ ہوں ؎

میر منصب علی حسن سندیلوی :

مری باتوں کا سمجھے مدعا کیا
سُنا کیا آپ نے میں نے کہا کیا

چودھری وزیر حسن نشتر سندیلوی :

افسردہ دل کی آہِ رسا کو خبر نہیں
بجھ بھی گیا چراغ ہوا کو خبر نہیں

چودھری امیر حسین بسمل سندیلوی :

اب تیری محبت کا دل سے افسانہ بھلا کر دیکھیں گے
اپنا تو بنا کر دیکھ چکے بیگانہ بنا کر دیکھیں گے

منی لال جوان سندیلوی :

نیرنگِ صبح و شام میں الجھی رہی نگاہ
گر گر کے جلوہ گاہ کے پردے اُٹھا کیے

شاہ محمد احمد کوکب سندیلوی :

یوسف بھی اس جمال کا دیوانہ ہوگیا
جو تھا چراغِ حسن وہ پروانہ ہوگیا

مولوی نذر حسن فتنہ سندیلوی :

خیر جان و سر کی ہو پھر سامنا مشکل کا ہے
پھر ارادہ آج میرا کوچۂ قاتل کا ہے

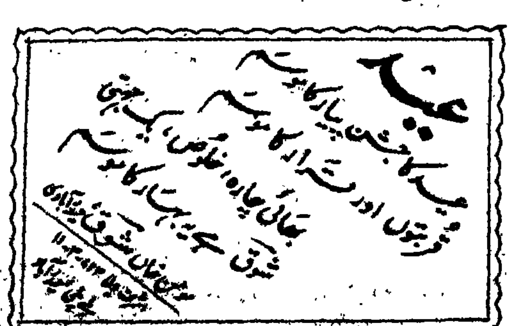
۱۹۵۵ء میں انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم ہوئی۔ نفیس سندیلوی اس کے صدر اور مولانا حکیم عبدالمجید شفق مرحوم اس کے سکریٹری تھے۔ حکیم صاحب کی حیات تک اردو کے سلسلے میں میٹنگیں اور مشاعرے ہوتے رہے اور اب بھی برابر سندیلہ میں مشاعرے ہوتے ہیں۔

سندیلہ میں جہاں ایک طرف شاعری کو فروغ مل رہا تھا وہیں دوسری طرف ہمارے ادیب اور شعراء نثر سے بھی بے نیاز نہیں تھے۔ نثر میں سب سے پہلی تصنیف "سرورِ ریاض" جس کے مصنف مولوی ریاض الدین امجد ریاض سندیلوی ہیں یہ ایک سفرنامہ ہے۔ اس کے بعد دوسری کتاب "تذکرہ شعر و سخن" جو کہ ۱۲۸۹ھ میں شائع ہوئی، مولانا نیاز علی پریشاں کی ہے۔ مولانا موصوف کی ایک اور تصنیف قصیدہ موسوم بہ "گلِ رعنا" ہے۔ ان کتابوں سے پہلے ان کی دو کتابیں اور شائع ہوئیں جن میں ایک مثنوی واسوخت "سرمایۂ عشق" اور دوسری کتاب "افسانۂ عشق" مطبوعہ ۱۸۸۰ء ہیں۔

راجہ درگا پرشاد مہر کی کتاب "تاریخ سندیلہ"، "تاریخ اجودھیا" اور "مہابھارت" بھی قابلِ قدر کتابیں ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر شجاعت علی، ڈاکٹر سلام اور چودھری وجاہت علی نے بھی کافی تعداد میں کتابیں لکھیں جو اردو زبان کے لیے ایک گراں بہا تحفہ ہیں جن کو اردو ادب کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔

□□

حواشی : (۱) تاریخ سندیلہ (۲) رسالہ ادیب اردو (۳) اللغات رسول اثر کا کی نیگزین سندیلہ (۴) گلدستۂ بہار عرس مجموعہ غزلیات سالانہ شاعرہ سندیلہ ۱۹۰۹ء (۵) رسالہ گچیں



دُھندلکا

وہ گرمیوں کے اُداس لمبے دنوں کے منظر
گھروں میں ٹکتے نہ تھے لڑکپن کے پاؤں اکثر
ہمیشہ ہمجولیوں کے ٹولے کے ساتھ باہر
گلی میں بازار میں گھروں کے چبوتروں پر
کبھی پرندوں کے گھونسلوں میں، کبھی چھتوں پہ
نگر نگر کھیل کی بھٹکتی تلاش بن کر
کبھی کبھی اک خیال سا عاشقی کا آنا
وہیں شرارت کی جھونک میں اس کو بھول جانا

بہت سہی زندگی گزرنے کی فکر تم کو
بکھرے ہوئے کنکروں سے میں اپنی جیب بھر لوں
ذرا ٹھہرنا ——
کہ میں لڑکپن کو یاد کرلوں !

□□

—— جمشید مسرور
لنڈے برگ آسین ، ۲۴ ، اے
این ۰ ۱۰۹۸ ، اوسلو
ناروے

مکڑیاں چار سُو
مکھیاں ہر طرف
کاکروچوں کا بہتا سمندر یہاں
بستیاں ۔ شہر
انسان ۔ آدمی
بھیڑ ہی بھیڑ
کیسے جیوں اب ؟

یہ شہر شہر تہذیب کا منظر
غلاظت، تعفن سے بھرتا چلا جا رہا ہے

بھاگ کر
میں سمندر کے اُس پار پہونچا
میں اکیلا اور تنہا وہاں رہ پڑا
لمبی اور آزاد سانسوں کے ساتھ جینے لگا
کیوں کہ وہ ایک جنگل تھا
جس میں کبھی کوئی ذی رُوح پہنچا ہی نہ تھا
—— مگر
میں نے جب میٹھے پھل کھا کے
اپنے شکم کی آگ کو ٹھنڈا کیا
رس گرا۔ پھل کے چھلکے گرے۔ مکھیاں آگئیں
چیونٹیاں آگئیں
پیڑ بڑھنے لگے۔ سورج گھٹنے لگا
اور پھر وہ بھی وقت آن پہونچا وہاں
پیڑ ہی پیڑ، چیونٹیاں چیونٹیاں، مکھیاں مکھیاں
بھوک ۔ تعفن ۔ گھٹن !
—— اب کہاں جاؤں میں !
اُف اب کہاں جاؤں میں ؟

□□

غزلیں

کون جانے کہ تخیل میں ہیں پیکر کتنے
بُت تراشے گا ابھی اور یہ آزر کتنے

ہم نے اک قطرہ کا احسان گوارا نہ کیا
پی گئے لوگ خدا جانے سمندر کتنے

یاد آتے ہی تری آئے خیالوں کے ہجوم
ایک پیکر سے تراشے گئے پیکر کتنے

شہر پھولوں کا جسے ہم نے بسا رکھا تھا
ہم پہ پھینکے گئے اس شہر میں پتھر کتنے

ایک تم ہی نہیں دنیائے اَدب میں جوہرؔ
ہیں اسی بحر میں کیا جانیے گوہر کتنے

چندر پرکاش جوہرؔ[1] بجنوری

۹- ریوا بلڈنگ' لیڈر روڈ- الہ آباد

نہ مال و زر سے میسّر نہ عزّ و جاہ میں ہے
سکونِ قلب تو بس اس کی بارگاہ میں ہے

بلندیاں مجھے دلکش نظر نہیں آتیں
غروبِ مہر کا منظر مری نگاہ میں ہے

وہ ایک خوشۂ گندم جو میری قسمت تھا
اثر اسی کا ابھی تک مرے گناہ میں ہے

ضمیر ٹوکتا رہتا تھا ہر قدم مجھ کو
خموش رہتا ہے جب سے مری پناہ میں ہے

غزل میں حسن جو آئے تو کس طرح سیّدؔ
ہزار یاس کا عالم دلِ تباہ میں ہے

سجّاد سیّد

سی ۲- گل مہر ایونیو
جامعہ نگر۔ اوکھلا
نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

کبھی اِسکے' کبھی پہنچے' کبھی سِتّے کی طرح
زندگی اپنی ہے اک تاش کے پتّے کی طرح

زندگی مجھ کو برتنے کے جتن کرتی ہے
پھیلا رہتا ہوں میں اس شہر میں رستے کی طرح

مری تنقید نگاہی مجھے لے ڈوبے نہ
لٹکا رہتا ہوں میں دار کے تختے کی طرح

میرے افسانے' مرے گیت' مری تحریریں
بکتی رہتی ہیں سبھی پان کے پتّے کی طرح

اپنی آواز کا مالک تو ہوں میں بھی اخترؔ
اپنے شانوں پہ چھلکتے ہوئے بستے کی طرح

اختر عمر اختر

۱۴۸/۳۲۵' محمود نگر
لکھنؤ-۳

کانٹوں کی راہ میرے جنوں کو ملی تو ہے
میرے لہو سے دشت میں کچھ روشنی تو ہے

ہم روشنی نہ دے سکے اپنے وجود کو
احساس کے چراغوں سے لَو پھوٹتی تو ہے

پڑتی ہے ضرب ان پہ تو دیتے ہیں یہ شرر
بے جان پتھروں میں کوئی زندگی تو ہے

جس نے غموں کے سائے میں اک عمر کاٹ دی
اس شخص کے مزاج میں زندہ دلی تو ہے

یہ سچ کہ ایک گنبدِ بے در میں قید ہوں
لیکن صدا ہماری ظفرؔ گونجتی تو ہے

ظفر اقبال ظفر

۱۴۰ - خیلدار- شاہجہانپور
۲۴۲۰۰۱

فغانِ دل سے ہے معمور داستانِ غزل
جبینِ شوق سے پُر نور آستانِ غزل

گلوں کو چومتی پھرتی ہے جب نسیمِ سحر
ہمارے دل میں مچلتا ہے ایک جہانِ غزل

بھلائیں غم کہ چھیڑیں کوئی حسین غزل
بھلائیں غم کو یہاں اپنے عاشقانِ غزل

سجا کے حسنِ تغزّل' مسائلِ دوراں
بہت قریب ہے منزل سے کاروانِ غزل

سناؤ بزمِ سخن میں طفیلؔ تم بھی غزل
نصیب سے ہیں بہم دیکھو شاعرانِ غزل

طفیل انصاری

مفتی محلہ- جونپور
۲۲۲۰۰۱

[1] چندر پرکاش جوہرؔ بجنوری کا ابھی کچھ دن پہلے انتقال ہو گیا۔ ادارہ انھیں اپنا خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔ (الف' ع)

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: "توازن" (سہ ماہی مجلّہ)
فضا ابن فیضی نمبر
صفحات: ۲۹۴ قیمت: ۲۵ روپے
ملنے کا پتہ: "توازن" ۴۵۴۔ نیاپورہ۔ مالے گاؤں
مہاراشٹر

مجلّہ توازن (مالے گاؤں) کا فضا ابن فیضی نمبر ایک ایسے شاعر کو خراجِ عقیدت ہے، جس نے نصف صدی سے مئوناتھ بھنجن جیسے معمولی قصبے میں شاعری کا چراغ روشن کر رکھا ہے۔ فضا صاحب مشاعروں کے شاعر نہیں ہیں، مگر ہندستان میں اُردو کا کوئی رسالہ ایسا نہیں ہے جس میں ان کا کلام نہ شائع ہوا ہو۔ ان کے پانچ شعری مجموعے سفینۂ گل۔ شعلۂ نیم سوز۔ دریچۂ سیم سخن۔ سرِشاخِ طوبیٰ اور پسِ دیوارِ حرف (ہر نام رنفلی) شائع ہو چکے ہیں۔

سہ ماہی توازن کے ایڈیٹر عتیق احمد عتیق نے بڑی کاوش سے ہند و پاک کے مقتدر ادیبوں اور نقادوں سے فضا ابن فیضی کے فکر و فن پر مضامین حاصل کر کے ان کو ایک دستاویز کی صورت میں ترتیب دے دیا ہے۔ فضا صاحب کی شاعری پر ڈاکٹر گیان چند جین، ظہیر احمد صدیقی، محمد سالم قریشی، شمس الرحمان فاروقی، نیر مسعود اور ابوالفیض سحر نے کھُل کر اظہارِ خیال کیا ہے اور اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ ان کی نظمیں اُردو کی مروجہ روایات، جو اقبال و جوش سے ہم تک پہونچی ہیں، ہی کا ایک حصّہ ہیں، اس لیے زبان و بیان کی پُرلطف کرشمہ سازی کے باوصف، ان کی حیثیت محض اطلاقی ہے اور ان سے فضا کا کوئی انفرادی نقش نہیں ابھرتا۔

توازن کا یہ خاص نمبر فضا ابن فیضی کی شاعری کے مداحوں کے لیے ایک قیمتی تحفہ ہے۔ لیکن فضا ابن فیضی کی شخصیت پر ایک بھی مضمون شامل نہیں ہے البتہ رسالہ کے پہلے صفحہ پر ایک سوچتے ہوئے چہرے کی تصویر ضرور ہے جسے فضا ابن فیضی کے سوا کوئی دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا۔

——— ناقی انصاری

نام کتاب: تذکرہ شعرائے غازی پور
مصنف: مضطر تاج پوری قیمت: بارہ روپئے
ملنے کا پتہ: سید علی مشیر رضوی۔ تاج پور
غازی پور ۲۳۳۲۲۸

تذکرے اُردو شعر و ادب کی تاریخ و تنقید کے نقوشِ اولین ہونے کی وجہ سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اپنی اہمیت و افادیت کے لحاظ سے یہ تاریخ و تنقید ادبیات کی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ ہمارے بہت سے شعرا صرف تذکروں ہی کی بدولت زندہ رہ گئے ہیں۔ کئی شعرا کے کلام کے بڑے ذخیرے سے صرف وہی کلام محفوظ رہ گیا ہے جو بطور نمونہ کسی تذکرے میں شامل ہوگیا تھا۔

گزشتہ برس ایک تحقیقی مقالے کے سلسلے میں مولانا قمر الہدیٰ شیرگھاٹوی (متوفی ۱۹۶۵ء) کی تاریخ پیدائش کے لیے شیرگھاٹی، گیا، ہزاری باغ اور بنارس تک کی خاک چھاننے کے بعد مجھے ناکام و نامراد لوٹنا پڑا تھا، اس لیے مجھے احساس ہے کہ غازی پور سے متعلق قریباً ایک سو شعرا کے حالات اور نمونۂ کلام جمع کرنے میں جناب مضطر تاج پوری کو کن کن صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑا ہوگا۔

کتاب کی ابتدا میں 'عرضِ مؤلف' کے عنوان سے غازی پور کا ہلکا سا تعارف کراتے ہوئے جناب مضطر نے اپنی راہ میں آنے والی بعض دشواریوں کا ذکر کیا ہے اس کے بعد چند صفحات میں غازی پور میں بولی جانے والی اُردو کے عنوان سے ایک عالمانہ مضمون سپردِ قلم کیا ہے اور اس کے بعد شعرا کے تذکرے درج ہیں۔

ڈیمائی سائز پر ۲۴۴ صفحات کی مجلّد اور دیدہ زیب سرورق سے مزین مفید کتاب ہے۔

——— ناوک حمزہ پوری

غزلیں

کون جانے کہ تخیل میں ہیں پیکر کتنے
بت تراشے گا ابھی اور یہ آزر کتنے
ہم نے اک قطرہ کا احسان گوارا نہ کیا
پی گئے لوگ خدا جانے سمندر کتنے
یاد آتے ہی تری آئے خیالوں کے ہجوم
ایک پیکر سے تراشے گئے پیکر کتنے
شہر پھولوں کا جسے ہم نے بسا رکھا تھا
ہم پہ پھینکے گئے اس شہر میں پتھر کتنے
ایک تم ہی نہیں دنیائے ادب میں جوہر
ہیں اسی بحر میں کیا جانیے گوہر کتنے

چندر پرکاش جوہر بجنوری [1]
د- دیوا بلڈنگ لیڈر روڈ۔ الہ آباد

نہ مال و زر سے میسر نہ عز و جاہ میں ہے
سکونِ قلب تو بس اس کی بارگاہ میں ہے
بلندیاں مجھے دلکش نظر نہیں آتیں
غروبِ مہر کا منظر مری نگاہ میں ہے
وہ ایک خوشۂ گندم جو میری قسمت تھا
اثر اسی کا ابھی تک مرے گناہ میں ہے
ضمیر ٹوکتا رہتا تھا ہر قدم مجھ کو
خموش رہتا ہے جب سے مری پناہ میں ہے
غزل میں حسن جو آئے تو کس طرح سید
ہزار یاس کا عالم دلِ تباہ میں ہے

سجاد سید
سی ۲- گل مہر ایونیو
جامعہ نگر۔ اوکھلا
نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

کبھی اکے کبھی پنجے کبھی ستے کی طرح
زندگی اپنی ہے اک تاش کے پتے کی طرح
زندگی مجھ کو برتنے کے جتن کرتی ہے
پھیلا رہتا ہوں میں اس شہر میں رستے کی طرح
مری تنقید نگاہی مجھے لے ڈوبے نہ
لٹکا رہتا ہوں میں دار کے تختے کی طرح
میرے افسانے، مرے گیت، مری تحریریں
بکتی رہتی ہیں سبھی پان کے پتے کی طرح
اپنی آواز کا مالک تو ہوں میں بھی اختر
اپنے شانوں پہ چھلکتے ہوئے بستے کی طرح

اختر عمر اختر
۳۲۵/۱۴۸، محمود نگر
لکھنؤ ۳

کانٹوں کی راہ میرے جنوں کو ملی تو ہے
میرے لہو سے دشت میں کچھ روشنی تو ہے
ہم روشنی نہ دے سکے اپنے وجود کو
احساس کے چراغوں سے لو پھوٹتی تو ہے
پڑتی ہے ضرب ان پہ تو دیتے ہیں یہ شرر
بے جان پتھروں میں کوئی زندگی تو ہے
جس نے غموں کے سائے میں اک عمر کاٹ دی
اس شخص کے مزاج میں زندہ دلی تو ہے
یہ سچ کہ ایک گنبدِ بے در میں قید ہوں
لیکن صدا ہماری فضا میں گونجتی تو ہے

ظفر اقبال ظفر
۱۸۰- خیلدار۔ فتح پور
۲۱۲۶۰۱

فغانِ دل سے ہے معمور داستانِ غزل
جبینِ شوق سے پُر نور آستانِ غزل
گلوں کو چومتی پھرتی ہے جب نسیمِ سحر
ہمارے دل میں مچلتا ہے ایک جہانِ غزل
بھلائیں غم کہ چھیڑیں کوئی حسین غزل
بھلائیں غم کو یہاں اپنے عاشقانِ غزل
سجا کے حسنِ تغزل، مسائلِ دوراں
بہت قریب ہے منزل سے کاروانِ غزل
سناؤ بزمِ سخن میں طفیل تم بھی غزل
نصیب ہیں یہ کہ دیکھو شاعرانِ غزل

طفیل انصاری
مفتی محلہ۔ جونپور
۲۲۲۰۰۱

[1] چندر پرکاش جوہر بجنوری کا ابھی کچھ دن پہلے انتقال ہو گیا۔ ادارہ نیا دور اپنا خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔ (الف، ج)

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: "توازن" (سہ ماہی مجلّہ)
فضا ابن فیضی نمبر
صفحات: ۲۹۴ قیمت: ۲۵/ روپے
ملنے کا پتہ: "توازن" ۴۵۴۔ نیا پورہ۔ مالے گاؤں
مہاراشٹر

مجلّہ توازن (مالے گاؤں) کا فضا ابن فیضی نمبر ایک ایسے شاعر کو خراجِ عقیدت ہے، جس نے نصف صدی سے مئوناتھ بھنجن جیسے معمولی قصبے میں شاعری کا چراغ روشن کر رکھا ہے۔ فضا صاحب مشاعروں کے شاعر نہیں ہیں، مگر ہندستان میں اردو کا کوئی رسالہ ایسا نہیں ہے جس میں ان کا کلام نہ شائع ہوا ہو۔ ان کے پانچ شعری مجموعے سفینۂ گل۔ شعلۂ نیم سوز۔ دریچۂ سیم سخن۔ سر شاخِ طوبیٰ اور پسِ دیوارِ حرف (بہ نام سرنغلی) شائع ہو چکے ہیں۔

سہ ماہی توازن کے ایڈیٹر عتیق احمد عتیق نے بڑی کاوش سے ہند و پاک کے متعدد ادیبوں اور نقادوں سے فضا ابن فیضی کے فکر و فن پر مضامین حاصل کر کے ان کو ایک دستاویز کی صورت میں ترتیب دے دیا ہے۔ فضا صاحب کی شاعری پر ڈاکٹر گیان چند جین، ظہیر احمد صدیقی، محمد سالم قریشی، شمس الرحمان فاروقی، نیّر مسعود اور ابو الفیض سحر نے کھل کر اظہار خیال کیا ہے اور اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ ان کی نظمیں اُردو کی مروجہ روایات، جو اقبال و جوش سے ہم تک پہونچی ہیں، ہی کا ایک حصہ ہیں، اس لیے زبان و بیان کی پرلطف کرشمہ سازی کے باوصف، ان کی حیثیت محض الحاقی ہے اور ان سے فضا کا کوئی انفرادی نقش نہیں ابھرتا۔

توازن کا یہ خاص نمبر فضا ابن فیضی کی شاعری کے ماحول کے لیے ایک قیمتی تحفہ ہے۔ لیکن فضا ابن فیضی کی شخصیت پر ایک بھی مضمون شامل نہیں ہے البتہ رسالہ کے پہلے صفحہ پر ایک سوچتے ہوئے چہرے کی تصویر ضرور ہے جسے فضا ابن فیضی کے سوا کوئی دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا۔

——— ناتق انصاری

نام کتاب: تذکرہ شعرائے غازی پور
مصنف: مضطر تاج پوری قیمت: بارہ روپے
ملنے کا پتہ: سید علی مشیر رضوی۔ تاج پور ڈیہمہ
غازی پور ۲۳۳۲۲۸

تذکرے اُردو شعر و ادب کی تاریخ و تنقید کے نقوشِ اولین ہونے کی وجہ سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اپنی اہمیت و افادیت کے لحاظ سے یہ تاریخ و تنقیدِ ادبیات کی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ ہمارے بہت سے شعراء صرف تذکروں ہی کی بدولت زندہ رہ گئے ہیں۔ کئی شعراء کے کلام کے بڑے ذخیرے سے صرف وہی کلام محفوظ رہ گیا ہے جو بطور نمونہ کسی تذکرے میں شامل ہو گیا تھا۔

گزشتہ برس ایک تحقیقی مقالے کے سلسلے میں مولانا قمر الہدیٰ شیرگھاٹوی (متوفی ۱۹۶۵ء) کی تاریخ پیدائش کے لیے شیرگھاٹی، گیا، ہزاری باغ اور بنارس تک کی خاک چھاننے کے بعد مجھے ناکام و نامراد لوٹنا پڑا تھا، اس لیے مجھے احساس ہے کہ غازی پور سے متعلق قریباً ایک سو شعراء کے حالات اور نمونۂ کلام جمع کرنے میں جناب مضطر تاج پوری کو کن کن صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑا ہوگا۔

کتاب کی ابتدا، میں 'عرضِ مؤلف' کے عنوان سے غازی پور کا ہلکا سا تعارف کراتے ہوئے جناب مضطر نے اپنی راہ میں آنے والی بعض دشواریوں کا ذکر کیا ہے اس کے بعد چند صفحات میں غازی پور میں بولی جانے والی اُردو کے عنوان سے ایک عالمانہ مضمون سپردِ قلم کیا ہے اور اس کے بعد شعراء کے تذکرے درج ہیں۔

ڈیمائی سائز پر ۲۴۴ صفحات کی مجلد اور دیدہ زیب سرورق سے مزین مفید کتاب ہے۔

——— ناوک حمزہ پوری

نام کتاب : "بچپن"
شاعرہ : فاطمہ وصیہ جائسی   قیمت : بیس روپئے
ملنے کا پتہ : ۴۷. ساتویں گلی، شاہ گنج، لکھنؤ

وصیہ جائسی کافی عرصے سے خدمت علم و ادب میں منہمک ہیں۔ ان کی سنجیدہ کوششیں انھیں دنیائے ادب میں روشناس کرانے میں ممد و معاون ہو رہی ہیں۔ یہ بڑی اچھی بات ہے کہ انھوں نے ادب اطفال کی اہمیت اور افادیت کو محسوس کرتے ہوئے اب اس طرف بھی توجہ کی ہے اور اب وہ بچوں اور بچیوں کی تعلیم و تربیت کو پیش نظر رکھ کر ان کے لیے مفید، معلوماتی اور سبق آموز نظمیں کہہ رہی ہیں۔ ان کی ان کوششوں کے مجموعے کی شکل میں ایک مختصر سی کتاب "بچپن" منظر عام پر آئی ہے۔

"بچپن" اپنے نام سے ہی بچوں کو ملتفت کرتی ہے اس میں شامل بہت سی عام فہم اور آسان زبان میں بڑے سلیقے سے لکھی گئی نظمیں خصوصیت سے بچوں کے دل جیت لیتی ہیں اور وہ اس کتاب کو مکمل کیے بغیر چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتے۔

اردو میں بچوں کے لیے ادب کی کمی بچوں کو اردو سے دور رکھنے کا خاص سبب بن رہی ہے۔ اگر انگریزی اور دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی طرح اردو میں بھی ادب اطفال کی طرف خصوصی توجہ دی جائے اور انتہائی دیدہ زیب اور دلچسپ کتابیں مناسب قیمت پر بازار میں آنے لگیں تو کوئی وجہ نہیں کہ جو بچے اردو سے بالکل ہی ناواقف و ناآشنا ہیں وہ بھی اس میں دلچسپی لیں۔ ایسے ادیبوں، شاعروں اور پبلشروں کی سخت ضرورت ہے جو کہ صرف بچوں ہی کے لیے اپنے کو وقف کردیں جیسا کہ ماضی قریب میں شفیع الدین نیّر مرحوم نے کیا تھا۔

امید ہے وصیہ جائسی بچوں کے لئے مزید سبق آموز اور سبق آمیز و دلچسپ نظمیں لکھیں گی اور "بچپن" کے بعد وہ بچوں کو اور بھی اچھی کتابیں پیش کریں گی۔

——— احمد ابراہیم علوی

نام کتاب : "کتاب سنگ"
شاعر : کاظم جرولی   قیمت : پچاس روپئے
ملنے کا پتہ : ۱۱۵. نصیر منزل، نخاس لکھنؤ

"کتاب سنگ" کاظم جرولی کا تیسرا شعری مجموعہ ہے اس سے قبل ان کے دو شعری مجموعے "کاروان غم" "کوچے اور قندیلیں" شائع ہو چکے ہیں۔ یہ شعری مجموعہ اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ وہ تھک کر نہیں بیٹھے بلکہ ان کا تخلیقی سفر برابر جاری ہے۔ ان کے زیر نظر شعری مجموعے کے مطالعہ کے بعد عام قاری یہ رائے قائم کر سکتا ہے کہ کاظم جرولی جدید لب و لہجہ کے شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں جذبے کا خلوص، احساس کی شدت، لفظیات کا برمحل استعمال، زبان و بیان پر فنکارانہ قدرت، کاظم جرولی کی بحیثیت شاعر شناخت کے لئے کافی ہیں۔ کاظم جرولی کی خود اعتمادی کی جھلک ان کے اشعار میں جا بجا ملتی ہے۔ ان کے فن پر لفظوں کی جو کہکشاں ہے وہ ہمیشہ جگمگانے والی ہے۔ یہ احساس ہی شاعر کی بقا کا ضامن ہے

جگمگائے گی کاظم سدا   تیرے الفاظ کی کہکشاں

کاظم جرولی کے کلام میں عصر حاضر کی زندگی، عصری رجحانات کا بیان موثر پیرائے میں ملتا ہے۔ اپنے کلام میں تغیر حیات اور تعمیر حیات کی بھرپور عکاسی کے لیے وہ قابل مبارکباد ہیں

اڑا اڑا کے فضا میں غبار نفرت کا
تباہ راہِ محبت کی کہکشاں نہ کرو

وہ نہ تو ترقی پسند تحریک سے متاثر ہیں اور نہ ہی انھوں نے جدیدیت کی ہی کورانہ تقلید کی ہے۔ ان کی شاعری روایت میں درایت کی آئینہ دار ہے ماضی کی شاندار روایتوں کے ساتھ ساتھ عصری حسیت ان کے کلام کو حیات نو بخش رہی ہے۔

طبقاتی استحصال اور دوسرے اچھوتے موضوعات پر انھوں نے قلم اٹھایا ہے ان کا ذہن ایک سوچتا ہوا متحرک ذہن ہے

جن درختوں پر بسیرے کو پرندے ترسیں
ان درختوں کی ہر اک شاخ جلادی جائے

"کتاب سنگ" میں غزلوں کے ساتھ ساتھ نظمیں بھی ہیں ۔ قلم جرولی کا جادو غزلوں میں زیادہ چلتا نظر آتا ہے پھر بھی ان کی بعض نظمیں ان کے درد مند دل کی آئینہ دار ہیں ۔ مجھے یقین ہے کہ زیر نظر شعری مجموعہ "کتاب سنگ" ادبی حلقوں میں پسند کیا جائے گا ۔

——— بشیر فاروقی

نام کتاب: " اُس کے لئے "
مصنفہ: بانو سرتاج قیمت: ۶۰/ روپئے
ملنے کے پتے: (۱) مکتبۂ جامعہ اُردو بازار دہلی (۲) پرنس بلڈنگ ای۔ آر۔ روڈ، بمبئی ۔ (۳) یونیورسٹی مارکیٹ ۔ مسلم یونیورسٹی

بانو سرتاج کا افسانوی مجموعہ "اس کے لئے" تکنیک اور بیان کے لحاظ سے قدیم افسانے کا تاثر دیتا ہے لیکن کہانی مکمل کر لینے کے بعد یہ تاثر یکسر غائب ہو جاتا ہے اور افسانہ خود اس کا احساس دلاتا ہے کہ وہ کتنا جدید ہے اور عصری حسیت سے بھرپور ہے ۔

۱۴۴ صفحات پر پھیلے ۸ افسانے بہت دلچسپ، زندگی سے قریب اور اس کے کھردرے پن کی اتنی خوبصورتی سے عکاسی اور غمازی کرتے ہیں کہ ہر کردار کے بارے میں یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ اس سے زندگی میں کہیں ملاقات ہو چکی ہے ۔ چہرے اتنے جانے پہچانے اور شناسا ہیں کہ کسی کردار سے تصنع یا اجنبیت کی ترشح نہیں ہوتی ہے ۔

بانو سرتاج چوں کہ ایک عورت ہیں اس لیے عورتوں کی نفسیات کی تجزیہ کاری ان سے بہتر کون کر سکتا ہے ؟ انھوں نے جس باریکی سے سماج میں ہر طرح کی عورت کی تحلیل نفسی کی ہے یہ انھیں کا فن ہے ۔

"اس کے لئے" مجموعہ پڑھنے کے بعد تشنگی نہیں بلکہ سیرابی اور سکون کا احساس ہوتا ہے کہ فن کار نے ایمان داری سے کام لے کر سماج کی سچی تصویر پیش کی ہے ۔ چاہے وہ افسر ہوں یا بڑے کسان، سیاسی لیڈر ہوں یا قلم کار سب کہیں نہ کہیں جگہ غریبوں کا استحصال کرتے نظر آتے ہیں ۔ بانو نے بڑے شہروں میں گھریلو ملازموں کے مسائل کی جانب توجہ کیا ہے ۔

۲۲×۱۸ سائز پر خوبصورت سفید کاغذ پر آفسیٹ پر طبع "اس کیلئے" اُردو افسانوی ادب میں نیا اضافہ ہے ۔ موضوع، مواد اور گٹ اپ کو دیکھتے ہوئے یہ اچھی کتاب ہے ۔

——— قطب اللہ

نام کتاب: " ہندستانی تاریخ وثقافت اور فنون لطیفہ "
مصنف: عتیق انور صدیقی ۔ قیمت: ۲۸۰/ روپئے
ملنے کا پتہ: عرشی پبلیکیشن ۱۲۰۔ جی ۔ سیکٹر IV
پشپ وہار (ساکیت) نئی دہلی ۱۱۰۰۱۷

ہندستان کی اپنی قدیم ترین تاریخ کے سیاق و سباق میں کوئی مستند کتاب ملنا از حد دشوار امر رہا ہے ۔ ضرورت تھی کہ اس موضوع پر یعنی ہندستانی تہذیب کے اب تک دریافت آثار قدیمہ پر بھرپور انداز میں عوام کو بتایا جائے، اس سے ہم آشنا ہو سکیں ۔ ہمارے یہاں میوزیم اور عجائب گھر کی تاریخ کیا رہی ہے اور اس میں کس طرح کے نمونے رکھے ہوئے ہیں ۔ ان کے بنانے والے فن کاروں کا تعارف ہمارے قدیم شہروں کی تاریخی پس منظر میں واقفیت، آثار قدیمہ کی اہم عمارتوں سے متعلق تاریخی آگہی اور غیر ملکی سیاحوں کے تاثرات ہمارے لیے جاننا ضروری تھا ۔

" ہندوستانی تاریخ وثقافت اور فنون لطیفہ " میں عتیق انور صدیقی نے نہایت دلکش انداز میں یہ سب کچھ ہمیں مہیا کرا دیا ہے ۔ ان کی یہ کاوش لائق تحسین ومبارک باد ہے ۔ عتیق صاحب بالغ نظر محقق ہیں فن خطاطی پر ان کی ایک کتاب "اسٹوری آف اسلامک کیلی گرافی" انگریزی میں شائع ہو چکی ہے ۔

زیر تبصرہ کتاب میں موصوف نے ہندستان کا تاریخی پس منظر بتاتے ہوئے جہاں قدیم ہندستان کی داستان سنائی ہے وہیں اس میں وادی سندھ کی تہذیب ہڑپا اور موہن جوداڑو جیسے شہروں کی اب تک دریافت ہونے والی نوعیت کی وضاحت بھی کی ہے ۔

آثار قدیمہ کی اہم عمارتوں میں بین الاقوامی اہمیت کی حامل تاریخی عمارتیں اور ہندو مسلم فن تعمیر کے خصوصی پہلو بھی واضح کیے ہیں ۔ ہندستان کے کچھ شہروں اور غیر ملکی سیاحوں سے بھی ہمیں متعارف کرایا

ہے۔ نوادرات اور فنونِ لطیفہ کے عنوان سے جن اشیاء پر اظہار خیال کیا ہے ان میں فنِ مصوری، خطاطی، اسطرلاب اور سکوں کی تاریخ، پچی کاری کیا تھا کھیل گوی، اکبر کے دین الٰہی کی وضاحت و تعارف، ٹیپو سلطان کی تلوار شاہجہاں کے تخت طاؤس۔ کوہ نور ہیرے کی تاریخی نوعیت کافی اہم مضامین شامل ہیں۔ کتاب معنوی حیثیت سے ہی نہیں ظاہری گیٹ اپ وغیرہ کے لحاظ سے بھی نہایت خوبصورت چھپی ہے۔

——— ظفر محمود

نام کتاب: "سُن تو سہی"
مصنف: پروفیسر مرزا محمد زماں آزردہ
قیمت: ساٹھ روپئے
ملنے کا پتہ: مرزا پبلی کیشن۔ رعنا واری۔ سرینگر کشمیر

مرزا محمد زماں آزردہ کشمیری صاحب طرز ادیب ہیں انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے ان کی کتاب "مضامین" ۱۹۸۴ء پر نوازا جا چکا ہے۔ یوں وہ اُردو کی ادبی دنیا میں بحیثیت محقق زیادہ معروف ہیں۔ ان کا گراں قدر تحقیقی مقالہ "مرزا سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے" اس موضوع پر پایۂ استقامت رکھتا ہے۔

ایک محقق اور نقاد کے لئے مزاح نگار ہونا رواجِ عام سے الگ ہٹ کر سمجھا جائے گا۔ کہا جاتا ہے کہ علم کی خشکی مسکراہٹیں چھین لیتی ہے، آزردہ صاحب نے اسے غلط ثابت کر دیا اور ان کے انشائیے پڑھتے ہوئے یہ اندازہ ہوا کہ اگر علم شخصیت کا جز ہو جائے تو یہی مزاج میں شگفتگی پیدا کرتا ہے۔ یہی شگفتگی ان کے یہاں نہ قہقہوں کی دنیا ہے اور نہ کھلکھلا کر ہنسنے کی بلکہ یہ شگفتگی ہے جس سے ذہنی خلا انبساط اور روحانی بالیدگی ملتی ہے۔ اس کے ساتھ طنز کی ایک ذیلی لہر اور یہ طنز بھی بڑا مزہ دیتا ہے۔ مثلاً ہم سب خیالی پلاؤ پکاتے ہیں اور اسے اپنی ہی ذات تک محدود بھی رکھتے ہیں۔ آزردہ صاحب نے خیالی پلاؤ کھلانے کا بھی تصور پیش کیا ہے۔

کتاب میں ۱۷۰ صفحات ہیں۔ کاغذ اور طباعت معیاری ہیں اور سرورق بھی دلکش ہے۔ پوری کتاب پڑھنے کے بعد ایک بات نہیں کہ یہ اور وہ ہے کہ ——— حالات جو ذہن میں اُتر رہے ہوئے ہوں اور ماحول جو گھونٹ رہا ہو، اس میں ہنسی کے فوارے بکھیرنے والا آزردہ کیا اور کیسے ہو سکتا ہے؟

——— اقبال احمد اعجاز

نام کتاب: افکارِ سوداگر (شعری مجموعہ)
مصنف: عبدالقادر سوداگر قیمت: ۴۰/ روپئے
ملنے کا پتہ: حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان۔ حیدر آباد

عبدالقادر سوداگر صرف ایک مقبول شاعر ہی نہیں بلکہ ایک ناول نگار، ڈرامہ نگار اور افسانہ نویس کی حیثیت سے بھی شہرت رکھتے ہیں۔ ان کا ایک جاسوسی ناول "قانون کا دائرہ" اور ڈرامہ "انوکھی الفت" چھپ کر مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ سوداگر ایک ایسے ادیب اور شاعر ہیں جو اُردو کے مراکز لکھنؤ اور دہلی سے دور کرناٹک میں اُردو کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب "افکارِ سوداگر" عبدالقادر کا دوسرا مجموعہ کلام ہے اس سے پہلے "نغماتِ سوداگر" کے نام سے ان کا ایک اور شعری مجموعہ منظرِ عام پر آ چکا ہے۔ افکارِ سوداگر نظموں، غزلوں کے علاوہ حمد، نعت اور منقبت پر مشتمل ہے۔ سوداگر پابند اور روایتی شاعری کے دلدادہ ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کا ایک خاص معیار مقرر کر لیا ہے۔ ان کے کلام میں حسن پرستی اور وارفتگیٔ دل کے جذبات اس قدر نمایاں ہیں کہ پیمانہ چھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اسلوب بیان اور سوچنے کا انداز بالکل فطری ہے مگر دلچسپ ہے۔ زبان سادہ، سلیس اور عام فہم ہے۔

یہی وہ شاعرانہ خوبیاں ہیں، جن سے ان کی ایک الگ شناخت قائم ہوتی ہے۔ سوداگر کے کلام میں اگر کوئی بات کھٹکتی ہے تو وہ ہیں ان کی چند فنی کوتاہیاں۔ کاغذ، طباعت اور سرورق بھی معقول ہیں۔

——— محمد علی

□

نیا دور

مارچ، اپریل، مئی ۱۹۹۵ء

ایڈیٹر

سیّد امجد حسین

فون: دفتر ۲۱۳۴۷۸ * رہائش ۲۷۲۴۸۲

— جوائنٹ ایڈیٹر —

سیّد اسرار حسین

معاونین: محمّد الیاس خاں * مبین احمد صدیقی

— پبلشر —

روہت نندن

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامّہ اترپردیش

— مطبوعہ —

یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس لکھنؤ

شائع کردہ

محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامّہ اترپردیش لکھنؤ

زرِسالانہ: —— تیس ۳۰ روپے

عام شمارہ: —— تین ۳ روپے

ترسیلِ زر کا پتہ

سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ

انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ اترپردیش لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ

ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ بکس نمبر ۱۴۶ لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری:

ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ
اترپردیش۔ لکھنؤ

سرورق: ابوالفضل

کاتب و تزئین کار: حسن اختر

موضوعات

حرفے چند	روہت نندن	۳
اپنی بات	ایڈیٹر	۴
پیغام	وزیرِ اعظم ہند	۶
پیغام	گورنر اترپردیش	۷
پیغام	اشوک پریہ درشی	۸

شعریات

تہنیت نامہ	علی سردار جعفری	۱۱
غبارِ شام و سحر	مظہر امام	۱۲
سناٹے کا ایک امپریشن	اوپیندر ناتھ اشک	۱۳
ذرّہ	جگن ناتھ آزاد	۱۴
یگانہ کی یاد میں	باقر مہدی	۱۵
گیت	بیکل اتساہی	۱۶
دوہے	ندا فاضلی	۱۷
سچائی	زاہدہ زیدی	۱۸
فانی یا لافانی	اسرار سیّد	۱۸
میں ایک شعلہ بجھا ہوا سا	خورشید افسر بسوانی	۱۹
منافقوں کے شہر میں	جعفر عسکری	۱۹
رباعیات	رباب رشیدی	۲۰

غزلیں

پی پی کے جگمگائے زمانے گزر گئے	خمار بارہ بنکوی	۲۱
وہ کل جو نکلا سرِ راہ عام بھولے سے	وامق جون پوری	۲۲
کوئی ملک ہو کوئی زمانہ ہو وہی کھیل ...	عرفان صدیقی	۲۳
منزلیں گو مختلف ہیں رہ گزر ہے ایک سی	فضا ابن فیضی	۲۴
نہ مندر میں صنم ہوتے نہ مسجد میں خدا ہوتا	نوشاد علی	۲۵

سے نوادرات اور فنونِ لطیفہ کے عنوان سے جو اشیاء پر اظہارِ خیال کیا ہے ان میں فنِ مصوری، خطاطی، اسلحہ اور سکوں کی تاریخ، پیچ تفنن کی کہانیاں کھیل کود، اکبر کے دینِ الٰہی کی وضاحت و تعارف، ٹیپو سلطان کی تلوار شاہجہاں کے تختِ طاؤس، کوہِ نور ہیرے کی تاریخی نوعیت کافی اہم مضامین شامل ہیں۔ کتاب معنوی حیثیت سے ہی نہیں ظاہری گیٹ اپ وغیرہ کے لحاظ سے بھی نہایت خوبصورت چھپی ہے۔

ظفر محمود ——————

نام کتاب: "سن تو سہی"
مصنف: پروفیسر مرزا محمد زماں آزردہ
قیمت: ساٹھ روپئے
ملنے کا پتہ: مرزا پبلی کیشن۔ رعنا واری۔ سرینگر کشمیر

مرزا محمد زماں آزردہ کشمیری صاحبِ طرز ادیب ہیں انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے ان کی کتاب "اُلسے" ۱۹۸۴ء پر نوازا جا چکا ہے۔ یوں وہ اُردو کی ادبی دنیا میں بحیثیت محقق زیادہ معروف ہیں۔ ان کا گراں قدر تحقیقی مقالہ "مرزا سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے" اس موضوع پر پایۂ استناد رکھتا ہے۔

ایک محقق اور نقاد کے لئے مزاح نگار ہونا رواجِ عام سے الگ ہٹ کر سمجھا جائے گا۔ کہا جاتا ہے کہ علم کی خشکی مسکراہٹیں چھین لیتی ہے، آزردہ صاحب نے اسے غلط ثابت کر دیا اور ان کے انشائیے پڑھتے ہوئے یہ اندازہ ہوا کہ اگر علم شخصیت کا جز ہو جائے تو یہی مزاج میں شگفتگی پیدا کرتا ہے۔ یہی شگفتگی ان کے یہاں نہ قہقہوں کی دنیا ہے اور نہ کھلکھلا کر ہنسنے کی بلکہ یہی شگفتگی ہے جس سے ذہنی خلا انبساط اور روحانی بالیدگی ملتی ہے۔ اس کے ساتھ طنز کی ایک ذیلی لہر اور یہ طنز بھی بڑا مزہ دیتا ہے۔ مثلاً ہم سب خیالی پلاؤ پکاتے ہیں اور اسے اپنی ہی ذات تک محدود بھی رکھتے ہیں۔ آزردہ صاحب نے خیالی پلاؤ کھلانے کا بھی تصور پیش کیا ہے۔

کتاب میں ۱۲۷ صفحات ہیں۔ کاغذ اور طباعت معیاری ہیں اور سرورق بھی دیدہ زیب ہے۔ پوری کتاب پڑھنے کے بعد ایک بات سمجھ میں آتی ہے کہ —— حالات جو خون میں لتھڑے ہوئے ہوں اور ناسور جو گلا گھونٹ رہا ہو، ان میں ہنسی کے خزانے بکھیرنے والا آزردہ کیوں اور کیسے ہو سکتا ہے!

اقبال احمد اعجازی ——————

نام کتاب: افکارِ سوداگر (شعری مجموعہ)
مصنف: عبدالقادر سوداگر قیمت: ۳۰/ روپئے
ملنے کا پتہ: حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان۔ حیدرآباد

عبدالقادر سوداگر صرف ایک مقبول شاعر ہی نہیں بلکہ ایک ناول نگار، ڈرامہ نگار اور افسانہ نویس کی حیثیت سے بھی شہرت رکھتے ہیں۔ ان کا ایک جاسوسی ناول "قانون کا دائرہ" اور ڈرامہ "انوکھی الفت" چھپ کر مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ سوداگر ایک ایسے ادیب اور شاعر ہیں جو اُردو کے مراکز لکھنؤ اور دہلی سے دور کرناٹک میں اُردو کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں زیرِ تبصرہ کتاب "افکارِ سوداگر" عبدالقادر کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے اس سے پہلے نغماتِ سوداگر کے نام سے ان کا ایک اور شعری مجموعہ منظرِ عام پر آ چکا ہے افکارِ سوداگر نظموں، غزلوں کے علاوہ حمد، نعت اور منقبت پر مشتمل ہے۔ سوداگر پابند اور روایتی شاعری کے دلدادہ ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کا ایک خاص معیار مقرر کر لیا ہے۔ ان کے کلام میں حسن پرستی اور وارفتگیٔ دل کے جذبات اس قدر نمایاں ہیں کہ پیمانہ چھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اسلوبِ بیان اور سوچنے کا انداز بالکل فطری ہے مگر دلچسپ ہے۔ زبان سادہ، سلیس اور عام فہم ہے۔

یہی وہ شاعرانہ خوبیاں ہیں، جن سے ان کی ایک الگ شناخت قائم ہوتی ہے۔ سوداگر کے کلام میں اگر کوئی بات کھٹکتی ہے تو وہ ہیں ان کی چند فنی کوتاہیاں۔ کاغذ، طباعت اور سرورق بھی معمولی ہیں۔

—————— محمد علی

□

نیا دور

مارچ، اپریل، مئی ۱۹۹۵ء

ایڈیٹر
سیّد امجد حسین
فون: دفتر ۲۱۳۴۷۸ * رہائش ۲۷۲۴۸۲

جوائنٹ ایڈیٹر
سیّد اسرار حسین

معاونین: محمّد الیاس خاں * مُبین احمد صدیقی

پبلشر
روہت نندن
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامّہ اتر پردیش

مطبوعہ
یُونائٹیڈ بلاک پرنٹرس لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامّہ اتر پردیش لکھنؤ

زرِ سالانہ: —— تیس روپے
عام شمارہ: —— تین روپے

ترسیلِ زر کا پتہ
سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ
انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ اتر پردیش لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ بکس نمبر ۱۴۶ لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری:
ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ
اتر پردیش، لکھنؤ

سرورق: ابوالفضل
کاتب و تزئین کار: حسن اختر

موضوعات

حرفے چند	روہت نندن	۳
اپنی بات	ایڈیٹر	۴
پیغام	وزیرِ اعظم ہند	۶
پیغام	گورنر اتر پردیش	۷
پیغام	اشوک پریہ درشی	۸

شعریات

تہنیت نامہ	علی سردار جعفری	۱۱
غبارِ شام و سحر	مظہر امام	۱۲
سنّاٹے کا ایک امپریشن	اوپیندر ناتھ اشک	۱۳
ذرّہ	جگن ناتھ آزاد	۱۴
یگانہ کی یاد میں	باقر مہدی	۱۵
گیت	بیکل اتساہی	۱۶
دوہے	ندا فاضلی	۱۷
سچائی	زاہدہ زیدی	۱۸
فانی یا لافانی	اسرار سیّد	۱۸
میں ایک شعلہ بجھا ہوا سا	خورشید افسر بسوانی	۱۹
منافقوں کے شہر میں	جعفر عسکری	۱۹
رُباعیات	رباب رشیدی	۲۰

غزلیں

پی پی کے جگمگائے زمانے گزر گئے	خمار بارہ بنکوی	۲۱
وہ کل جو نکلا سرِ راہ عام بھولے سے	وامق جون پوری	۲۲
کوئی ملک ہو کوئی زمانہ ہو وہی کھیل ...	عرفان صدیقی	۲۳
منزلیں گو مختلف ہیں رہ گزر ہے ایک سی	فضا ابن فیضی	۲۴
نہ مندر میں صنم ہوتے نہ مسجد میں خدا ہوتا	نوشاد علی	۲۵
گم شدہ ہو گئے ہم گل ریز ہو گئے ہم	مظفر حنفی	۲۶
وہ امیرِ شہر بنا نہ تھا.....	تسنیم فاروقی	۲۶

تحقیق و تاریخ

گزشتہ نصف صدی کی اُردو تحقیق — گیان چند — ۲۷
عمارت (نظم) — رفعت سروش — ۳۶
غالب از مہر — کالی داس گپتا رضا — ۴۲
حیدرآباد کے ادبی رسائل — سلیمان اطہر جاوید — ۴۳
غزل — منور رانا — ۴۹

تنقید

ادبی تنقید: نیا چیلنج — گوپی چند نارنگ — ۵۰
نیا اُردو افسانہ — جوگندر پال — ۵۳
نصف صدی (سانٹ) — حضور سہسوانی — ۵۶
قرۃ العین حیدر کے ناول — وقار ناصری — ۵۷
انسان کی آنکھیں (نظم) — اختر بستوی — ۶۳

ادبی سماجیات

اُردو شاعری میں قومی یکجہتی کی روایت (نصف صدی میں) — سید سجاد حسین رضوی — ۶۴

صحافت

نیا دور کا زریں دور — علی جواد زیدی — ۶۹
ہمعصر اُردو صحافت — گروبچن چندن — ۷۶
نیا دور کے ادارت کار — سبط محمد نقوی — ۸۲
نیا دور کے ۵۰ سال — عرفان عباسی — ۸۸
نیا دور: کچھ یادیں — امیر احمد صدیقی — ۹۵
نیا دور: پچاس سال کا سفر — احمد ابراہیم علوی — ۹۹

شخصیات

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر — گلزار دہلوی — ۱۰۳
صباح الدین عمر — صلاح الدین عثمان — ۱۰۷

شہر شہر اور نگر نگر....

میر الہ آباد — سید محمد عقیل — ۱۰۹
بھوپال کے ادبی سفر کی نصف صدی — عبدالقوی دسنوی — ۱۱۶
آسام میں ادبی سرگرمیاں — تارا چرن رستوگی — ۱۲۴
فرخ آباد کا ادبی سفر — راجندر بہادر موج — ۱۲۶
اپین میں اُردو ادب کی نصف صدی — ظفر محمود — ۱۳۰

طنزیات و مضحکات

غالبِ خستہ کے بغیر — یوسف ناظم — ۱۳۴
اُردو ادب اور بھینس — دلیپ سنگھ — ۱۳۸
قطعات — طالب خوندمیری — ۱۴۰

افسانہ

صدیوں کا بھروسہ — م م راجندر — ۱۴۱

یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ

غزل — آنند نرائن ملا — ۱۴۷
غزل — معین احسن جذبی — ۱۴۸
بوڑھا مالی (نظم) — عمر انصاری — ۱۴۹
ہندستان اور کشمیر کے لوک گیت — حیات اللہ انصاری — ۱۵۰
بنیادی اصول — عابد سہیل — ۱۵۳

تبرکات

غزل — شارب لکھنوی — ۱۵۶
ترل سنگیت — جاوید وششٹ — ۱۵۷
مولوی عبدالحق: ہندستان اور پاکستان میں — سری نواس لاہوٹی — ۱۶۰
اُردو میں سفرناموں کی روایت — امیر حسن نورانی — ۱۶۳

یادِ رفتگاں

مہاتما گاندھی کی اُردو تحریر کے دو عکس — ۱۶۹
دو غزلہ — فراق گورکھپوری — ۱۷۰
غزل — جاں نثار اختر — ۱۷۲
غزل — سلام مچھلی شہری — ۱۷۲
دیکھئے کب تک لہو (نظم) — شمیم کرہانی — ۱۷۳
دوپہر (نظم) — راہی معصوم رضا — ۱۷۴
غزل — غلام ربانی تاباں — ۱۷۵
بولی پہلی کوئل (نظم) — شہاب سرمدی — ۱۷۵

پرورش لوح و قلم

فن تمثیل کا آغاز و ارتقا — نیاز فتحپوری — ۱۷۶
اودھ کے تفریحی شغلوں میں ڈرامائی عناصر — سید مسعود حسن رضوی ادیب — ۱۸۰
اُردو میں تحقیق، آزادی کے بعد — سید احتشام حسین — ۱۸۵
رشت چمن: لکھنؤ کی ایک قدیم نثری داستان — نصیر الدین ہاشمی — ۱۹۴
لکھنؤ کے چند الفاظ اور محاورے — جعفر علی خاں اثر — ۱۹۷
ہندستان کی شاہانہ دعوتیں — صباح الدین عبدالرحمن — ۲۰۲
مانجھی (افسانہ) — علی عباس حسینی — ۲۰۸
گومتی سے ہگلی تک — شانتی رنجن بھٹاچاریہ — ۲۱۱
جھلکیاں — فرحت اللہ انصاری — ۲۱۷
اُردو شاعری میں ہولی — مسیح الزماں — ۲۲۰
اُردو میں بچوں کا ادب — حامد اللہ افسر — ۲۲۳
جگر مرادآبادی: عظیم شاعر، عظیم انسان — سید اطہر حسین ہاشمی — ۲۲۶

حرفے چند

ادب اس تہذیبی وراثت کا نام ہے جس میں قوموں اور ملکوں کے عروج و زوال کی داستانیں چھپی ہوتی ہیں اور جس کے ذریعے کسی بھی ملک کے تمدنی مزاج، خصوصیات، رفتار ترقی اور ان تمام انقلابات، تغیرات کو سمجھا جا سکتا ہے جس سے وہ ملک دوچار رہا ہے۔ ادب اپنے وسیع تر مفہوم میں ماضی کے تجربات کی بنا پر مستقبل کی شاہراہ کی تعمیر کرتا ہے اور اس طرح ادب کی دنیا ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔

اُردو ادب بھی ہماری ایسی ہی تہذیبی میراث ہے جس پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لالہ زاروں کی آبیاری میں ہندوستان کے مختلف مذہب رکھنے والے دانشوروں کا خونِ جگر شامل ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ اُردو ادب نے ہماری قومی تاریخ کے ہر نازک موڑ پر اپنا فریضہ انجام دیا ہے اور آزادی کی جدوجہد سے لے کر دَورِ حاضر تک ہر نازک مرحلے کو اُردو ادب سے روشنی ملی ہے آج بھی جب ہم فراق صاحب کا شعر پڑھتے ہیں ؎

کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نُور سا
کچھ فضا کچھ حسرتِ پرواز کی باتیں کرو

تو وہ "نور" جو آزادی کے سنگھرش کے زمانے میں روشنی دکھا رہا تھا وہی نور آج بھی حوصلہ بخش رہا ہے، یا جب ہم پڑھتے ہیں ؎

دیکھو رفتارِ انقلاب فراق   کتنی آہستہ اور کتنی تیز

تو ہماری نظروں کے سامنے وہ سارے انقلابات آ جاتے ہیں جو بڑی خاموشی سے ہماری زندگی میں رونما ہوئے اور جنھوں نے ہندوستان کی سماجی زندگی کا ڈھانچہ بدل دیا اور نئی تہذیبی قدروں سے ہمیں آشنا کیا۔

اُردو ادب نے گزشتہ نصف صدی میں جو کارنامے انجام دیئے ہیں وہ ہماری تاریخ کا حصّہ ہیں۔ وہ چاہے تقسیم کا المیہ رہا ہو یا وہ تین جنگیں رہی ہوں جو ہندوستان پر مسلّط کی گئی تھیں یا اور بہت سے نازک موڑ آئے ہوں، یا غالبؔ کے لفظوں میں ـ "دار و رسن کی آزمائش سے گزرنا پڑا ہو"۔ اُردو ادب نے اپنا تاریخی فریضہ ادا کیا اور ہماری زندگی کی صرف تصویر کشی نہیں کی بلکہ اس تصویر کو خوبصورت اور حسین ترین بنانے کا فرض بھی نبھایا ہے۔

گزشتہ نصف صدی میں اُردو ادب کے جو مختلف رُجحانات رہے ہیں اور ہماری زندگی کی جو دھارائیں رہی ہیں ان سب کو "نیا دور" نے کسی نہ کسی شکل میں ہمیشہ پیش کیا ہے۔ نیا دور کی اپنی سنہری روایات رہی ہیں۔ اس نے گزشتہ نصف صدی میں اپنے خصوصی شماروں کے ذریعہ سے صحافت کا اعلاترین معیار پیش کیا ہے۔ نیا دور کے اس ادبی سفر میں اُردو کے ممتاز ادیب اور دانشور شریک رہے ہیں۔ ہماری یہ خوش قسمتی ہے کہ ان میں سے کچھ آج بھی اپنی روشن تحریروں سے ہماری رہنمائی کر رہے ہیں اور کچھ بزرگوں کی سرپرستی سے ہم محروم بھی ہو گئے لیکن ادیب اور اس کا قلم کبھی نہیں مرتا اس لیے وہ اَمر ہیں اور ہم نے بڑے فخر کے ساتھ ان کی تحریروں سے بھی اس نمبر کو سجایا ہے۔
ان تمام خصوصیات کے لیے ادیبوں اور دانشوروں کا تعاون اور ادارے کی انتھک محنت شامل ہے جس کا اعتراف ضروری ہے۔

ساتھ ہی میں اپنے نوجوان ساتھی سیّد امجد حسین کو مبارکباد دیتا ہوں، جن کی کاوشوں کے نتیجے میں یہ خصوصی شمارہ وجود میں آ سکا۔

———— رُوہِت نندن
(ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش)

اپنی بات

وقت قوموں کی تاریخ کے لئے ترازو ہے اور ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اس ترازو میں ہر شے کی قدر و قیمت کا تعین بھی ہوتا ہے اور یہی ترازو جسے کم قیمت سمجھتی ہے اسے سرد خانے میں پھینک دیتی ہے۔

گذشتہ پچاس برس میں دنیا نے ہر طرح کے نشیب و فراز، عروج و زوال اور تغیرات کی کہانیاں دیکھیں اور سنیں، ہزار واقعات ایسے ہوئے کہ جن کا نقش آج بھی باقی ہے اور بہت سے نام اور بہت سے واقعات ایسے بھی ہوئے جنھیں سب نے بھلا دیا۔ پچاس سال قبل ایٹم بم سے جو کہانی شروع ہوئی تھی وہ آج ایٹمی ہتھیاروں پر پابندیاں اور حد بندیاں عاید کرنے کی منزل پر پہنچ گئی ہے۔ ان تمام واقعات میں اس نصف صدی میں بھی اور اس سے پہلے بھی اور آنے والے دور میں بھی ایک پہلو مشترک رہا ہے ـــــ امن کے لئے انسانی تلاش و جستجو ـــــ اور یہی امن کی خواہش اور تمنا اور تڑپ جب اصول و ضابطے بناتی ہے تو انسانی حقوق کی صدائے بازگشت سے سارا ماحول گونج اٹھتا ہے یہی انسانی حقوق کسی نہ کسی شکل میں ساری زبانوں کے ادب کا محور و مرکز رہے ہیں۔

چاہے وہ کوئی دور ہو، نصف صدی قبل، جب بڑے زور شور سے ترقی پسند تحریک جہد آزادی کے مطالبے کو لے کر آگے بڑھی تھی تو اس وقت بھی اور پھر چھٹی اور ساتویں دہائی میں سارتر کے اثرات کے تحت جدیدیت کا رجحان بھی انسانی حقوق کی آواز بلند کرتا رہا اور اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ کسی سمت سے بھی ہوائیں چلیں، کسی رنگ کا پھول کھلے، کسی طرح کا موسم ہو، وہی تہذیب و تمدن و ادب زندہ اور باقی رہتا ہے جو انسانی حقوق کا علمبردار ہوتا ہے۔ پریم چند کے لفظوں میں:

"وہی ادب کسوٹی پر کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، جو ہمیں جگائے، سلائے نہیں"

پریم چند کی اس تعریف پر اردو ادب ہمیشہ کھرا اترا اور گذشتہ پچاس برس کی سماجی، سیاسی اور فکری تاریخ ہماری ادبی تخلیقات کے ذریعہ مرتب کی جاسکتی ہے۔

نیا دور نے بھی اپنی زندگی کے پچاس سال پورے کیے اور ان پچاس برسوں میں ادب کی ہر جہت کو "نصف صدی" نمبر کے ذریعہ آپ کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔

مغرب میں جبلی اس وقت مناتے ہیں جب کوئی قرض ادا ہوجائے یا کسی کو اس کی جائداد واپس مل جائے۔ یہ یہودیوں کا مخصوص طرزِ فکر تھا۔ ہمارے مغربی دوست ہر چیز کو اپنے تاجرانہ ذہن کی وجہ سے چاندی سونے اور ہیرے میں تولنے کے قائل تھے، اس لئے ہندستان میں بھی پچیس سال میں سلور جبلی اور پچاس سال میں گولڈن جبلی کی روایت چل پڑی۔ راقم الحروف سونے چاندی کی زبان نہیں سمجھ پاتا اور اس سے دور ہی رہنا چاہتا ہے، اس کی نظر میں وقت قوموں کی تاریخ کے لئے

ترازو ہے۔ اس لیے گولڈن جبلی نمبر کے بجائے اسے "نصف صدی" نمبر سے موسوم کیا ہے۔ گزشتہ
نصف صدی میں "اطلاعات" سے نیادور نے اس منزل تک سفر طے کیا ہے۔ اس کی ہیئت بھی
بدلی اور رنگ و رُوپ بھی بدلا ہے۔ وقت کی گرد نے اسے دُھندلایا نہیں بلکہ اُبٹن کا کام کیا جس سے
یہ نکھرتا ہی چلا گیا اور یہ اظہار حقیقت ہے خود ستائی نہیں کہ آج نیادور کو ادبی ماہناموں میں یقیناً
ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ اس کے خصوصی نمبروں نے صحافت میں تاریخ سازی کی ہے۔ ہمیں
فخر ہے اور اس پر ناز ہے کہ ہم تک جو روشن اور تابناک وراثت پہونچی، ان روایات کو
ہم نے آگے بڑھایا۔ گزشتہ دو برسوں میں ہمارے خصوصی نمبروں، قومی یکجہتی نمبر۔ اودھ نمبر
اور پھر اودھ نمبر حصہ دوم نے یادگار اور تاریخی مقبولیت حاصل کی۔

نیادور کا یہ اعزاز کم نہیں ہے کہ اودھ نمبر کی مقبولیت سے متاثر ہوکر اس کا ہندی روپ
بھی شائع ہوا۔ اور اب نصف صدی نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اس نمبر میں کئی پہلو قابل توجہ ہیں ایک طرف تو پانچ مضامین ایسے ہیں جو نیادور کے اس
پچاس برس پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالتے ہیں تو دوسری طرف تحقیق، تنقید، شعری اور نثری
تخلیقات، طنز و مزاح، شخصیات اور اہم شہروں کے دل کی ادبی دھڑکنیں اور قومی یکجہتی
وغیرہ پر نگارشات پیش کی گئی ہیں۔ اسی کے ساتھ ہم نے اپنے بے حد قیمتی اور قابل فخر
ماضی سے ایسے لہر پارے منتخب کیے ہیں جو ہماری ادبی تاریخ کا بھی ایک حصہ ہیں
اور جس سے ہمیں ہر عہد کے مزاج کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

ہمیشہ کی طرح ممتاز اور بین الاقوامی سطح کے معروف اور ممتاز اہل قلم کی نگارشات سے
نیادور کی تزئین کی گئی ہے اور ان اہل قلم کی تخلیقات نے اس نمبر کو بھی
وقار استناد اور اہمیت عطا کی ہے، اتنی اہم اور بلند شخصیتوں کے مضامین ہیں
کہ ان میں تقدیم و تاخیر کا تصور رکھنا ناممکن تھا۔ جو مضمون جس جگہ ہے وہیں پر
یا کوہ نور ہے یا لعلِ شب چراغ۔

اپنے تمام معاونین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے، اپنے بزرگوں کی سرپرستی کا اعتراف کرتے ہوئے اور
اپنے دوستوں کے خلوص پر اظہارِ ممنونیت کرتے ہوئے "نصف صدی نمبر" پیش کرنے کی
سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

ع یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر

امجد سلیم
ایڈیٹر

وزیر اعظم

پیغام

یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اترپردیش کا محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اپنے اردو ماہنامہ نیا دور کا "نصف صدی نمبر" شائع کر رہا ہے۔ نیا دور نے اپنی پچاس سالہ تاریخ میں اردو زبان و ادب کی جو خدمت انجام دی ہے اور اردو ادیبوں اور شاعروں کی جس طرح سے حوصلہ افزائی کی ہے، وہ قابلِ تعریف ہے۔ نیا دور نہ صرف اترپردیش کا ثقافتی آئینہ بن گیا ہے، بلکہ قومی یکجہتی کا ایک با اثر وسیلہ بھی۔

اس مبارک موقع پر نیا دور میں کام کرنے والے سبھی لوگوں اور اس کے قارئین کو میری دلی مبارکباد!

(پی۔ وی۔ نرسمہا راؤ)
وزیر اعظم ہند

نئی دہلی
۱۸ مئی ۱۹۹۵ء

پیغام



موتی لال وورا
گورنر اتر پردیش

راج بھون
لکھنؤ-۲۲۶۱۳۲

مجھے یہ جان کر انتہائی مسرت ہوئی کہ اُردو ماہنامہ "نیا دور" کا نصف صدی نمبر شائع ہو رہا ہے۔

نیا دور کا ہر نمبر ادبی دُنیا میں تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے غالب نمبر، احتشام حسین نمبر، نول کشور نمبر، بہادر شاہ ظفر نمبر، فراق نمبر، قومی یک جہتی نمبر اور اودھ نمبر نے اُردو دنیا میں جو شہرت اور مقبولیت حاصل کی ہے وہ اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔ یہ سبھی نمبر دستاویزی حیثیت کے حامل ہیں۔

نیا دور کی اپنی اسی اعلا ترین روایت کے مطابق اب نصف صدی نمبر شائع ہو رہا ہے مجھے مسرت ہے کہ نیا دور نے صحافتی اور ادبی معیار کو برقرار رکھتے ہوئے بلند اخلاقی قدروں کو بھی طاقت بخشی ہے یعنی آپسی بھائی چارا، میل محبت اور سب سے بڑھ کر قومی یک جہتی کو فروغ دینے میں اس رسالے نے شاندار خدمت انجام دی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ نیا دور اپنے روشن مستقبل اور نئی بلندیوں کی طرف رواں دواں رہے گا۔ میری دعائیں ادارے کے ساتھ ہیں۔ میں نیا دور کے مدیر جناب سید امجد حسین کو مبارکباد دیتا ہوں۔

(موتی لال وورا)

۵ر جولائی ۱۹۹۵ء



راج بھون
لکھنؤ

اشوک پریہ درشی

پیغام

بھاشا یا زبان دلوں کو جوڑنے کے لئے ہے، توڑنے کے لئے نہیں ـــ اُردو زبان ایک پیاری زبان ہے اس نے ہمیشہ دلوں کو جوڑنے کا کام انجام دیا ہے۔

نیا دور اترپردیش کا ایک مقبول ادبی ماہنامہ ہے۔ اُردو زبان کی ہی طرح سے یہ بھی دلوں کو جوڑنے کا کام کرتا ہے۔ اس کے کئی خاص نمبر بہت مقبول ہوئے ہیں۔ خاص طور سے قومی یکجہتی نمبر، اور 'اودھ نمبر' تو بہت ہی پسند کیے گئے ہیں۔ اس کے عام شمارے بھی ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے ہیں۔

"نصف صدی نمبر" کے لئے میں اپنی نیک تمنائیں اور بہترین خواہشات پیش کرتا ہوں۔

مجھے یقین ہے کہ ادب کو سماجی ترقی کے لئے استعمال کرتے ہوئے نیا دور اترپردیش کی شاندار خدمت انجام دیتا رہے گا۔

(اشوک پریہ درشی)
(سکریٹری محکمۂ اطلاعات و رابطہ عامہ اترپردیش)

شعریات

اُردو شعریات

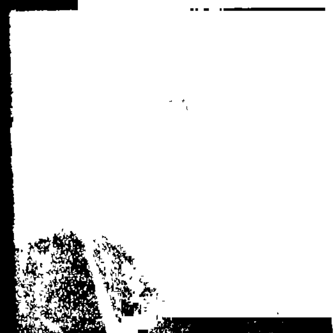
صرف احساسِ جمال کی تسکین نہیں ہے بلکہ
اس میں عصری حقائق کے دل کی دھڑکنیں بھی شامل ہیں
کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ ہیئت و ساخت
کے نئے تجربات نے اُردو شعریات کو کبھی فرسودہ نہیں ہونے دیا
اور اسی لیے آج بھی اس میں
نئی زندگی کی تابانی، دمک اور درخشندگی ہے۔
اُردو شعریات اقدارِ حیات کی نمائندہ اور مفسّر بھی ہے، شارح اور نقاد بھی
اور مستقبل کے لئے روشنی کی کرن بھی کہ
آج کی شعریات نے
ماضی کی ادبی روایات سے اپنا رشتہ استوار رکھا ہے، اور
آنے والے دَور کے لئے روایت سازی کی ہے۔

——— ایڈیٹر

تہنیت نامہ

دو شاعروں کی شادی خانہ آبادی

علامہ سردار جعفری



خوب ہے دو شاعروں کی زندگی کا اضطراب
حسن کی نظروں نے لکھی عشق کے دل کی کتاب

گلشنِ شعر و سخن میں آ گئی تازہ بہار
گلشنِ حرف و نوا میں شعلۂ جاں کے گلاب

اختلافاتِ تخیّل کے کچھ افسانے بھی ہیں
یوں تو سب ہیں اُلفت و مہر و مروّت ہی کے باب

عمر بھر یہ لکھی جائے گی ورق اندر ورق
عمر بھر تخلیق ہوگی اک کتاب اندر کتاب

یہ مکمل ہوگی اس دن جب غزل کے ساتھ ساتھ
کچھ لکھا جائے گا اس میں دال روٹی کا حساب

دال روٹی کیا ہے اس دُنیا میں اک جنسِ حقیر
لیکن ایسی جنس جو ہے بھوک کی آنکھوں کا خواب

کور ہے چشمِ حقارت روٹیوں کے سامنے
تاجِ شاہی سے ہے بڑھ کے ان کے رُخ کی آب و تاب

ان کے در پہ ایک ہو جاتے ہیں سب شاہ و گدا
ان کے دروازے پہ جھک جاتے ہیں سب عالیجناب

ان کے قدموں پر بکھر جاتی ہیں سر کی پگڑیاں
ان کے آگے ناچنے لگتے ہیں سب عزت مآب

آفتابِ آسماں سے گردشِ لیل و نہار
روٹیوں سے گردشِ خونِ بشر ہے شعلہ تاب

روٹیاں ہونٹوں کی خوشبو، روٹیاں آنکھوں کا نور
بازوئے سیمیں پہ زُلفِ عنبریں کا پیچ و تاب

کُند کر دیتی ہیں یہ سفاک تلواروں کی دھار
کاٹ دیتی ہیں یہ آقاؤں کے خیموں کی طناب[1]

یومِ محشر، روزِ میزاں بن کے آجاتی ہیں جب
آدمی کے نفسِ امّارہ کا لیتی ہیں حساب

جانتی ہیں مفلسوں کا اور شکم پروروں کا فرق
ریشے ریشے میں بسی ہے ان کے اک انقلاب[2]

روٹیوں کے نور سے نوشاہ کے ماتھے کا نور
جس سے روشن ہے عروسِ نو کی چشمِ پُر حجاب

یہ دُعا ہے گھر میں اُن کے جگمگائیں رات دن
آسمانِ اشتہا کے آفتاب و ماہتاب

دولتِ علم و ہنر میں ہو اضافہ ساتھ ساتھ
تا ابد روشن رہے شعر و سخن کا آفتاب

□□

---

[1] اقبال کا مصرعہ ذرا سی ترمیم کے ساتھ [2] یہاں یجُروید میں اُن [illegible] کچھ اشلوک ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ جو اناج کو اپنے لیے حاصل کرتا ہے [illegible] وہ موت حاصل کرتا ہے اور جو دوسروں کے لیے حاصل کرتا ہے وہ زندگی حاصل کرتا ہے۔



سحر و شام غبار

مظہر امام

۱۸۶- بی، پاکٹ اے
میور وہار - فیز اے
دہلی - ۹۱

جبینِ سرو پہ لے کر غبارِ شام و سحر
رہِ حیات سے گزرے ہیں قافلے کتنے
کسے بتاؤں، کسے اپنا رازداں کرلوں
کہ آئے راہِ تمنّا میں مرحلے کتنے

حسیں تھا گرچہ یہ غم، پھر بھی اک خلش سی رہی
کہ زندگی غمِ محبوب ہی کا نام نہیں
پناہِ سایۂ گیسو طرب فزا ہو، مگر
یہ سایہ وہ ہے کہ حاصل جسے دوام نہیں

رہی سلاسل و زنداں سے رسم و راہ، مگر
ہوائے وقت کے جھونکے کچھ اور کہتے تھے
بنا لیا تھا اسے دوستوں نے منزلِ شوق
مرے جنوں کے تقاضے کچھ اور کہتے تھے

عروجِ دار و رسن پا کے یہ ہوا معلوم
کمالِ عظمتِ انساں اسی پہ ختم نہیں
مرے شعور نے اکثر مجھے یہ سمجھایا
کہ زندگی ہوسِ خودکشی پہ ختم نہیں

گزر کے اتنے مراحل سے، سوچتا ہوں میں
حیات جنتِ افکار کے سوا کیا ہے
نہ آرزوؤں کی منزل، نہ عزم و شوق کی حد
بھلا بلندیِ انساں کی انتہا کیا ہے!



سمتا ڈے کا ایک امپریشن

اوپیندرناتھ اشک
۵۔ خسرو باغ روڈ
الہ آباد

پھر سے تجدیدِ وفا کا ہوا امکاں یارو
آؤ دوہراؤ پُرانے سبھی پیماں یارو

نئے اوزار گڑھو لوح و قلم تیز کرو
پھر ہوئے ہیں نئے سنگھرش کے ساماں یارو

سر بہ زانو ہو، نہ ہو سر بہ گریباں یارو
اپنی تقدیر پلٹ دیتے ہیں انساں یارو

نامساوات کی کڑیاں بھی ہمیں کاٹیں گے
اپنے ہی پاس ہے اس درد کا درماں یارو

گردشِ وقت کا کیا غم کہ اُلٹ دیتی ہے
روشِ دہر کو بھی ہمّتِ مرداں یارو

جاؤ کچلے ہوئے پسماندہ غریبوں سے کہو
نابرابر ہیں جو ڈھادو سبھی ایواں یارو

پھر اُٹھی ہے نئی آواز نئے درد کے ساتھ
پھر بدل جائیں گے تاریخ کے عنواں یارو

پھر ہیں احساسِ خودی سے سبھی مجبور اُٹھے
پھر مساوات کی آندھی کے ہیں ساماں یارو

یہ ملائم سی صدا اشکؔ ملائم بھی نہیں
اس میں فولاد کی خو ہے کہیں پنہاں یارو

□□

ذرّہ

پروفیسر جگن ناتھ آزاد
شعبۂ اُردو، جموں یونیورسٹی
جموں ۱۸۰۰۰۱

جُزوِ عالم، جُزوِ صحرا، جُزوِ میداں، جُزوِ گرد
علم کے اس دورِ نو میں جُزوِ مستقبل ہے تو
جادۂ تہذیبِ انسانی کے ننھے رہ نورد
آج دُنیا کی سیاست کا دھڑکتا دل ہے تو

○

اب نئے پرتو ہیں تیری زیست کے ہر طور میں
رنگ بھی دامن میں خوابیدہ ہے تیرے نور بھی
تو اگر شدّت سے چمکے علم کے اس دور میں
تیرے آگے مات کھا جائے چراغِ طور بھی

○

تجھ کو دُنیا ایک کُل کا جزو ہی کہتی رہی
آج یہ ثابت کیا ہے عقل نے خود کُل ہے تو
موجِ نادانی میں دنیا آج تک بہتی رہی
اب کھُلا یہ راز تو ہے عصرِ نو کی آبرو

○

خاک کے ذرّے، تہی دامن، فرو مایہ، حقیر
تو وہ کُل ہے جزو ہیں جس کے شرار و برق و باد
آج ہے تیری ضیا سے ذہنِ انساں مستنیر
اے دھڑکتے دل خِرد کے! اے ضمیرِ اجتہاد

○

تیرے ہر پردے میں آسُودہ ضیائے شرق ہے
تیرے پیکر میں نہاں ہے بجلیوں کی آب و تاب
آندھیوں کا شور تیری خامشی میں غرق ہے
کھا رہے ہیں زلزلے تیرے جلو میں پیچ و تاب

○

انحصارِ جنگ بھی تجھ پر، مدارِ امن بھی
جنگ کی اے رُوحِ مضطر، منزلِ مقصودِ امن
تو کمالِ جنگ بھی ہے، شاہکارِ امن بھی
منزلِ جنگ و جدل، اے پیکرِ مسجودِ امن

○

چرخ پر اُڑتے ہوئے قلعے کہ ہیں سربستہ راز
زندگی کے یہ سلیقے، موت کے یہ اہتمام
فوج، توپیں، ٹینک، طیارے، سمندر کے جہاز
ذرّۂ بے مایہ یہ ہیں آج سب تیرے غلام

○

آبِ جو کا رقصِ بیتابانہ بادل کا خروش
چاند کی ٹھنڈی تجلّی، مہرِ تاباں کی تپش
دن کے ہنگامے، اندھیری رات کا سازِ خموش
پھول کی خوشبو، کلی کا ناز، کانٹے کی خلش

○

موجِ باراں کا ترنّم، کوہساروں کا سکوت
سو رہے ہیں سب کے سب تیرے دلِ خاموش میں
نو بہاروں کا تبسّم، لالہ زاروں کا سکوت
کتنی دُنیائیں ہیں خوابیدہ ترے آغوش میں

○

آج امریکا ہے تیری اک تجلّی پر نثار
رُوس کا ذوقِ نظر ہے تیرے جلوے کا شہید
دیدۂ برطانیہ تیرے لیے ہے بے قرار
ہند و پاکستان کی روحانیت تیری مُرید

○

خاک کے ذرّے، تہی دامن، فرو مایہ، حقیر
اے سیاست کے دھڑکتے دل، زمانے کے امام
رہنمائے حال، مستقبل کی دُنیا کے اسیر
دیکھ تیرے سامنے ہے اک بڑا نازک مقام

○

عصرِ نو کی جنگ بازی کے بھرے بازار میں
کاش بن کر شاخِ گُل مہکے تو اے عالی مقام
زیست کے اس دورِ آتش ریز و آتش بار میں
دے سکے تو امن کا اے کاش دُنیا کو پیام

□□

یگانہ کی یاد میں



کتنے خوش آیند تھے لمحے جواں تھی آرزو
حوصلے بھی تھے نئے، ہم تھے خوشی سے سرخرو

فرق اتنا بھی نہ تھا آخر تھے ہم تم سے الگ
کس طرح دونوں رہے تنہا ہی جیسے آب جو

الجھنوں نے ہم کو ملنے کی کبھی فرصت نہ دی
کیسے کرتے دیر تک شمع جلا کر گفتگو؟

اپنے سائے آئینوں میں ڈوب کر ابھرے نہیں
دھند سی چھائی سی کیا دیکھتے ہم چار سو

ملنے جلنے کا زمانہ کب کا رخصت ہو چکا
اب تو ہم خاموش ہیں اک دوسرے کے روبرو

دوستی کیسی؟ برائے نام تھے رشتے تمام
یوں تو مل کر بارہا چھلکائے جام و سبو

خون بہتا تھا بہت اٹھ اٹھ کے گرتا تھا بہت
سامنے وہ شخص تھا جیسے کہ میں جیسے کہ تو

بے رخی کی قید نے ڈالا ہمیں اپنے سے دور
اس اندھیرے میں چلی آئی خودی کی جستجو

حکمرانوں سے کبھی بیعت نہ کی آخر تلک
صنم اٹھا کر تو نے رکھ لی آدمی کی آبرو

کیسے مر مر کر جئے باقر کہو یہ داستاں
کیسے رگ رگ میں چھپا زندہ ہے سرکش کا لہو

باقر مہدی
ای/۱. ریوی درشن
کارٹر روڈ. باندرہ
بمبئی ۴۰۰۰۵۰

گیت

ترا رُوپ تکوں تو سپن لگے
ترا پاؤں چھوؤں تو گگن لگے
تُو اور کسی کا لگتا ہے　　پھر بھی تو میرا سجن لگے

تو اُٹھے تو پربت جھک جائے
تو چلے تو آندھی رُک جائے
تری دُھوپ چھاؤں تقدیر مری　　ترا سُورج میری کرن لگے　　پھر بھی تُو میرا سجن لگے

مری آس بھی رل کر بچھڑ گئی
میں ہمسفروں سے بچھڑ گئی
جب جب رستے میں چاند اُگا　　تب تب چاند نیا چُبھن لگے　　پھر بھی تُو میرا سجن لگے

کچھ رات گئے انگنائی میں
تو لپٹ گیا تنہائی میں
جب صبح ہوئی، انگڑائی لی　　مرا بکھرا بکھرا بدن لگے　　پھر بھی تُو میرا سجن لگے

میں اَنگ اَنگ سے ٹوٹ گئی
مری کوری گگریا پھوٹ گئی
پنگھٹ سے چُوچھی لوٹ آئی　　سکھیاں چھیڑیں تو تھکن لگے　　پھر بھی تُو میرا سجن لگے

بشواس کی کیسی بھوک ہوئی
میں دھوکا کھا گئی چوک ہوئی
دو ٹوک ہوا دل کا درپن　　دھڑکن دھڑکن اک اگن لگے　　پھر بھی تُو میرا سجن لگے

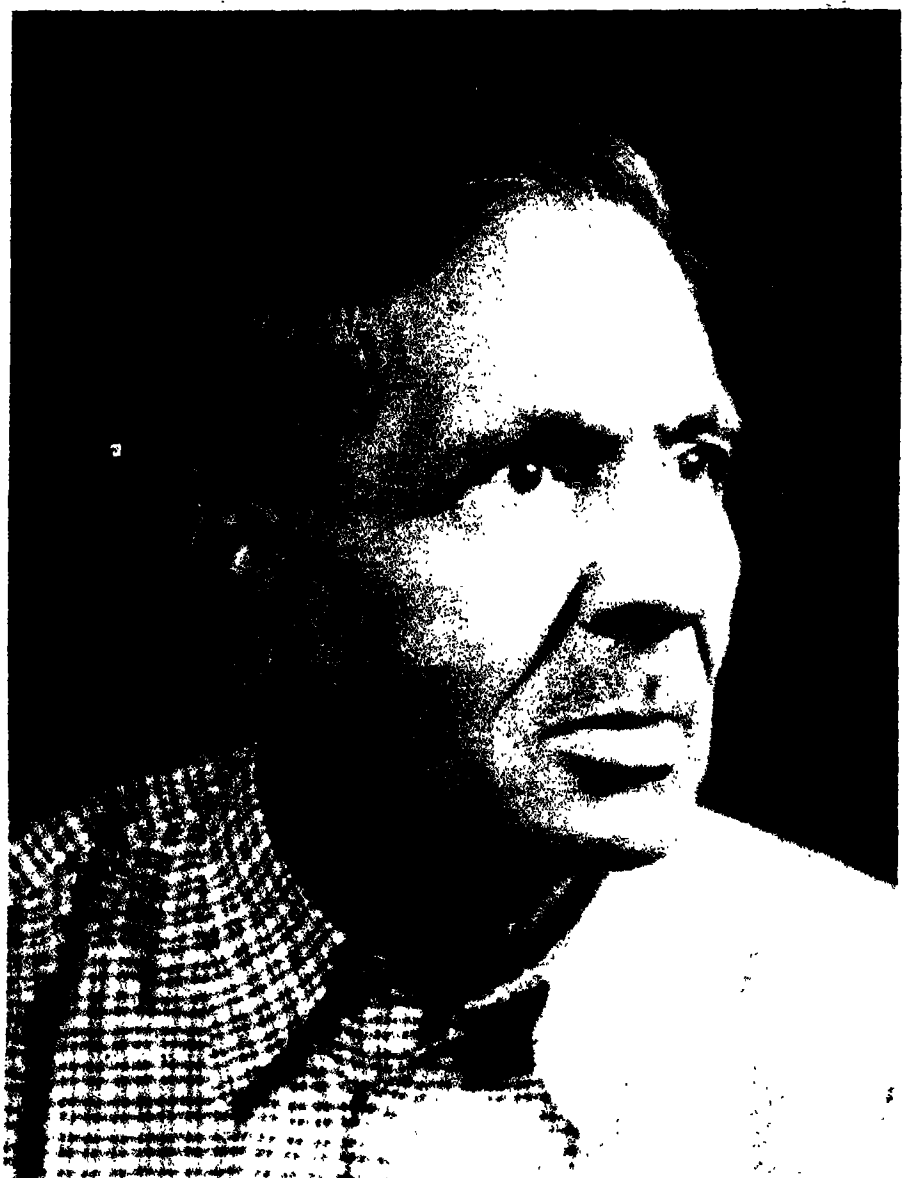
تجھے اپنا کہوں کیا سُوجھ گئی
میں بوجھ سے اپنے جھوجھ گئی
تو پاس آکر بھی دُور رہی　　یہی بچھڑن جیسے ملن لگے　　پھر بھی تُو میرا سجن لگے

جس اور کہے میں مڑ جاؤں
تو جب چاہے میں اُڑ جاؤں
بیکل کوئی زور نہ روک سکے　　کوئی آنچل آنچل پون لگے　　پھر بھی تُو میرا سجن لگے

پدم شری بیکل اُتساہی
سول لائن۔ بلرام پور ۔ ۲۷۱۲۰۱



جوش ملیح آبادی —— ۱۸۹۸ء-۱۹۸۲ء



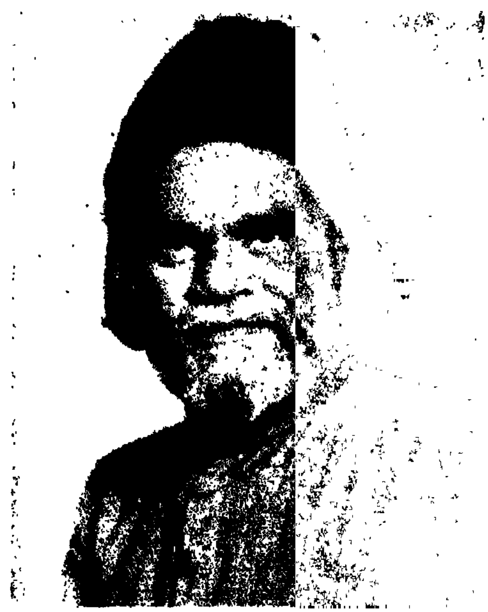
فراق گورکھپوری —— (۱۸۹۶ء-۱۹۸۲ء)


عصمت چغتائی
۱۹۱۵ء - ۱۹۹۱ء
رشید جہاں
۱۹۰۵ء - ۱۹۵۲ء



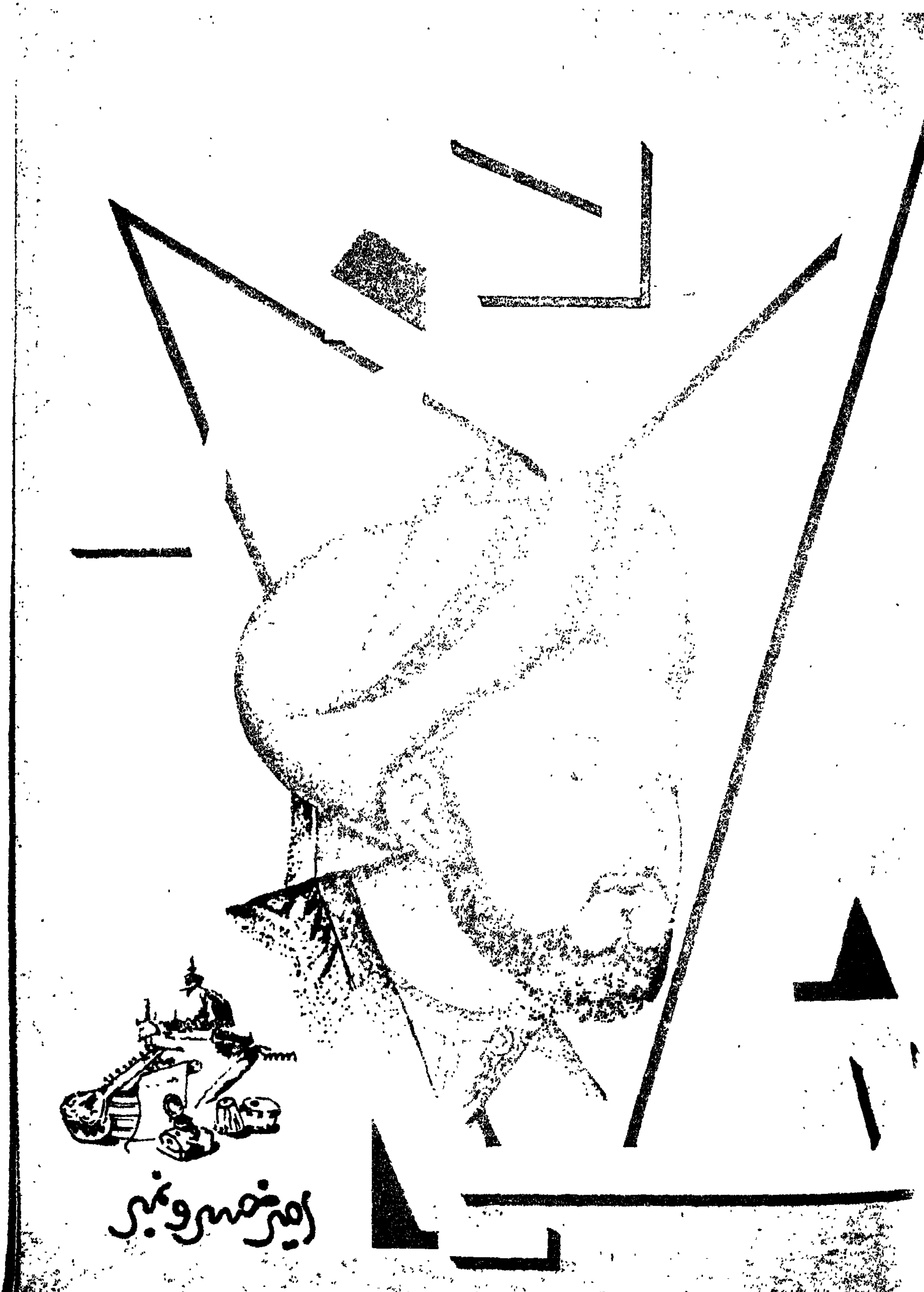
نوح ناروی

۱۸۷۹ء - ۱۹۶۲ء



جگر مرادآبادی

۱۸۹۰ء - ۱۹۶۰ء


امیر خسرو نمبر



نیا دور
ایک شمارہ قومی ہم آہنگی کا



دوہے

رستے کو بھی دوش دے، آنکھیں بھی کر لال
چپّل میں جو کیل ہے، پہلے اُسے نکال

سیدھا سادا ڈاکیہ، جادو کرے مہان
ایک ہی تھیلے میں رکھے، آنسو اور مُسکان

دُکھ تو مجھ کو بھی ہوا، ملا نہ تیرا سات
شاید تجھ میں نہ ہو، تیری جیسی بات

بچہ بولا دیکھ کر، مسجد عالی شان
اللہ تیرے ایک کو، اتنا بڑا مکان

سُنا ہے اپنے گاؤں میں، رہا نہ اب وہ نیم
جس کے آگے ماند تھے، سارے وید حکیم

□□

ندا فاضلی
[illegible]
[illegible]

سچائی

اے مری ہمنوا
میری دمساز
اس دشتِ پُرخار میں
میری غم خوار
تاریک راہوں میں اک شعلۂ جاں فزا
تو ہے میری تگ و دو کی معراج
میری مسلسل سفر کی ہے تو
منزلِ آخریں

تو مری خلوتِ جاں میں
اک شمع کی طرح جلتی رہی
اور میں تیری دشوار راہوں میں
ہر لمحہ مصلوب ہوتی رہی
کاسۂ جاں میں زخموں کی سوغات ڈھوتی رہی
فکر کی دھوپ میں میں نے پگھلائے
سخ بستہ راہوں کے سنگِ گراں
ذہن کی روشنی میں کبھی میں نے پائی اماں
یا کبھی — شدّتِ کرب میں
میں نے ڈھونڈے ہیں خود
منزلوں کے نشاں

پر بتا! اے مری راہنما
میری دم ساز
اے شدّتِ شوق کی پاسباں
آج کیوں ہر طرف
قتل و غارت ہے
ہنگامۂ حشر ہے
ظلم و نفرت کی یلغار ہے
زخم خوردہ زمیں
سخت قدموں سے پامال ہے
خون روتا ہے جلتا ہوا آسماں
بے حسی کی امڈتی ہوئی دھند میں
تو بھی کیوں آج روپوش ہے
— کچھ بتا —

اے مری دوست
اے ہمدم خوش ادا
مجھ کو پھر اپنا جلوہ دکھا
میری بے مہر مسلسل کو دے
رقص کرتی ہوئی اک سنہری زمیں
نیلا نیلا سا اک بیکراں آسماں

□□

زاہدہ زیدی

'آبشار'
نمبر ۶ ۔ ایچ ، آئی جی فلیٹ
سرسید نگر ۔ علی گڑھ

فانی یا لافانی

اسرار رسیدؔ
[illegible]، لکھنؤ

وہ ہمیشہ سے ہے
وہ ہمیشہ رہے گا
مگر
میرا اپنا وجود
نہ صرف اپنا وجود
بلکہ سارا وجودِ کائنات
بے معنی، بے مقصد
پھر میں کیوں پیدا ہوا؟
کیوں پیدا کیا گیا
اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً
یعنی کہ اس کی تصویر
یعنی کہ اس کی نقل
لیکن
تصویر کے نقوش تو مٹ جاتے ہیں
اور بچتا ہے محض ایک کاغذ کا ٹکڑا
سادہ کاغذ وجود تو ہے
لیکن کس کا؟
کوئی شناخت تو ہو ۔ کسی کی پہچان تو ہو
کوئی نشان وہ بھی نہیں
کاغذ کے ٹکڑے پر جس کی تصویر اس کا ہی نام
تو پھر میرے کاغذ پر اسرار ہی کیوں
عفریت، جن، چرند و پرند
خشت و سنگ ۔ شجر و حجر
میں نے تو طے کرلیا ہے
نہ لوں گا ایسا چہرہ جو مٹ جائے
شناخت کھو بیٹھے
میں نہ لوں گا کبھی ایسی زندگی
جو فانی ہے!

□□

میں ایک شعلہ بجھا ہوا سا

میں ایک شعلہ بجھا ہوا سا
مجھے جلانے کی کوششوں میں
زمانہ کیوں ہے
زمانہ کیوں میرے گرد آکر
ہوائیں دیتا ہے دامنوں سے
میں اپنا دم سادھ کر پڑا ہوں
ہوا سے چپ چاپ لڑ رہا ہوں
میں جانتا ہوں
یہ چاند پر فتح پانے والے
کہ اک نئی دنیا بسانے کی کوششوں میں
جٹے ہوئے ہیں
ستاروں پر پھینکتے کمندیں
نئے جہاں کی تلاش میں رات دن گنواتے
مگر خود اپنی زمیں کی ان کو خبر نہیں ہے
کہ اس زمیں پر امیر زادے
شریف و نادار لڑکیوں کو
کھنکتے سکوں کا دے کے لالچ
کبھی وفا کی دہائی دے کر
کبھی چمکتے چہرے دکھا کر
ہوس کا اپنی نشانہ نت بنا رہے ہیں
کہیں یہ فاقہ زدہ غریبوں کی ٹولیوں کو
ملوں کا ایندھن بنا رہے ہیں
تھرکتی کاریں
چمکتے بنگلے
صلہ ہے یہ جن کی محنتوں کا
جو کارخانے چلا رہے ہیں
انھیں تو تیوہار میں بھی ہوتی نہیں ہے
ایسی غذا میسّر
کہ ان کے کتے جو کھا رہے ہیں
یہاں برہنہ ہے آدمیت
نہ فکرِ حرمت، نہ پاسِ عصمت
زباں، قلم اور ضمیر کی قیمتیں یہاں ہیں
یہاں اب اخلاق ہو کہ انصاف
یہاں یہ تہذیب ہو کہ کردار
یہاں ہیں بازار ہر طرح کے
شرافتوں کے سیاستوں کے
یہاں نہ ہمسائگی نہ رشتہ
کہ ہر تعلق میں مصلحت ہے۔
میں ایک شعلہ بجھا ہوا سا
مجھے جلانے کی کوششوں میں
زمانہ کیوں ہے؟

□□

خورشید افسر بسوانی
بسواں ضلع سیتاپور

منافقوں کے شہر میں

خود آپ اپنی سادگیِ طبع پر خجل ہوں میں
کہ کر رہا ہوں صاحبانِ بے ریا کی جستجو
خباثتوں کے دشتِ بے ثبات میں
دیارِ بد صفات میں!
مجھے یہ علم تک نہیں
کہ جو یہاں پہ جتنا بے ریا ہے،
بے زبان ہے
وہ اتنا ہی زیادہ پائمال ہے!
مجھے یہ علم تک نہیں
کہ ہر مقام پر یہاں مرا شریک و ہم سفر
ہجومِ بد خصال ہے!
مجھے عجب گمان ہے
کہ میرے اپنے قلبِ باصفا و باوقار کی طرح
ہر ایک قلب میں رواں
مسرتوں، محبتوں کا بے کنار بحر ہے
مجھے یہ علم تک نہیں
کہ ان قلوبِ بد سرشت میں نہاں
ذلالتوں کا زہر ہے!
مجھے یہ علم تک نہیں
کہ جس دیارِ ننگ و نار میں مرے
گزر رہے ہیں روز و شب
وہ خطۂ فرشتگاں نہیں کوئی
منافقوں کا شہر ہے!
یہاں کی خلق کے دلوں پہ مدتوں سے حکمراں
خدائے ذوالجلال کی دعائے بد کا قہر ہے!

جعفر عسکری
ممتاز محل کیا ؤنڈ، گولہ گنج لکھنؤ



رباعیات

ریاض رشیدی
۹۰۔ تارین
شاہجہاں پور

یہ سترِ نہاں، سترِ نہاں کچھ بھی نہیں
یہ رنگِ عیاں، رنگِ عیاں کچھ بھی نہیں
دریا میں ہیں ڈوبتی، اُبھرتی موجیں
یہ لفظ و بیاں، لفظ و بیاں کچھ بھی نہیں

وجدان نے ماحول سے رعنائی لی
احساس نے جذبات کی گہرائی لی
منظر سے برسنے لگے آئینے پر
اک عکس نے پل بھر کو جو انگڑائی لی

سوچا ہے آگہی کا منشا، کیا ہے
دیکھا ہے روشنی کا ہالا کیا ہے
لفظوں میں زندگی کے منظر چمکیں
تخلیق کا بس اور تقاضا کیا ہے

وہ کون ہے جو ذہنِ رسا دیتا ہے
اور فکر کی وسعتیں بڑھا دیتا ہے
اللہ غنی اس کے علائم کا جمال
الفاظ میں تصویریں چھپا دیتا ہے

اس دشت میں ذات کا حوالا بھی مرا
تشکیک کا بنتا ہوا جالا بھی مرا
جو گونج رہی ہے، جو ہے روشن میں ہوں
آواز بھی میری ہے، اُجالا بھی مرا

ہم رہتے تو حوصلہ بھی باقی رہتا
گردش کا سلسلہ بھی باقی رہتا
اور اس کو یونہی تلاش کرتے رہتے
صدیوں یہ مشغلہ بھی باقی رہتا

پائل ترے پاؤں کی جھنکتی جائے
پھولوں سے لدی شاخ لچکتی جائے
میں سوچتے سوچتے تجھے پا جاؤں
بھولی ہوئی اک شام مہکتی جائے

لمحوں کو عطا ثبات کرنے والا
ان میں شامل حیات کرنے والا
دل ڈھونڈے تو ہر وقت اسی کو ڈھونڈے
آنکھوں آنکھوں میں بات کرنے والا

افکار سے روشنی رچھنی جاتی ہے
اشعار سے تازگی چھنی جاتی ہے
احساسِ جمال! تو کہاں ہے، آجا
مجھ سے مری زندگی چھنی جاتی ہے

کیا کرتے جو رُک کر کہیں سوچا ہوتا
کیا ہوتا جو احتساب اپنا ہوتا
چاندی بھی ہوئے بال مگر لاحاصل
ہم خواب نہ دیکھتے تو اچھا ہوتا



غزل

خمار بارہ بنکوی

پیر بٹاون
بارہ بنکی

پی پی کے جگمگائے زمانے گزر گئے
راتوں کو دن بنائے زمانے گزر گئے

کیا لائقِ ستم بھی نہیں اب میں دوستو!
پتھر بھی گھر میں آئے زمانے گزر گئے

غم ہے نہ اب خوشی ہے نہ اُمید ہے نہ یاس
سب سے نجات پائے زمانے گزر گئے

جانِ بہار پھول نہیں آدمی ہوں میں
آ جا کہ مسکرائے زمانے گزر گئے

او جانے والے آ کہ ترے انتظار میں
رستے کو گھر بنائے زمانے گزر گئے

مرنے کا ڈر ہو اُن کو جو زندہ ہیں اے خمار
مجھ کو تو موت آئے زمانے گزر گئے

□□



غزل

وہ کل جو نکلا سرِ راہِ عام بھولے سے
تو ہم بھی اس سے ہوئے ہمکلام بھولے سے

خیالِ خام، پیامِ سلام بھولے سے
ہوا ہی کرتے ہیں سب ایسے کام بھولے سے

کسی کے بھی جو نہ آیا ہو کام بھولے سے
اسی کے ہو گئے ہم سب غلام بھولے سے

وہ کام جو کس و ناکس [redacted] کی بات نہ ہو
کیا ہی کرتے ہیں ہم [redacted]م بھولے سے

ہزاروں سال سے ہے مہرِ توبہ ہونٹوں پر
پیا ہی کرتے ہیں ہم صبح و شام بھولے سے

طویل اس کے مظالم کا دور ہے ہر چند
ہمیں تو زیب نہیں [redacted]م بھولے سے

جو تیرگی میں سرابوں کے پیچھے دوڑے [redacted]
ضرور پائے گا آبِ دوام بھولے سے

نہ تھا جو ملکِ ثقافت [redacted] شہسواروں میں
اسی کو دے دی ادب کی لگام بھولے سے

جنونِ شوق کا جس میں رمق نہ ہو وامق!
وہ ہم سے کر نہیں سکتا کلام [redacted]

وامقِ جونپوری
"لال کوٹھی" ۔ پوسٹ کجگاؤں
جون پور ۲۲۲۱۳۸



غزل

کوئی ملک ہو، کوئی زمانہ ہو، وہی کھیل، وہی کردار میاں
وہی کام ردائیں چھیننے کا، وہی بردوں کا بیوپار میاں

یہ خاکِ گزر زنجیر مری، یہ بستی دامن گیر مری
یہ رقصِ جنوں تقدیر مری، یہ شہر مرا بازار میاں

وہ اَبر یہاں تک آتا کیا، خالی تھا گھر برساتا کیا
صحرا سے گھٹا کا ناتا کیا، تو رنج نہ کر بیکار میاں

جو دل نے کیا ہے دل پہ سہو، کیا بولتے ہو خاموش رہو
کبھی اِس سے کہو کبھی اُس سے کہو، یہ عشق ہے یا اخبار میاں

یا جال میں پھنس یا بچ کے گزر، کوئی اور نہیں ہے راہِ مفر
یا ماتھا رکھ دے چوکھٹ پر، یا مال پہ ٹھوکر مار میاں

یہ کس سے پریت نبھاتی ہے، بس پیاس بجھانے آتی ہے
رُت بدلے تو اُڑ جاتی ہے، ہنسوں کی ساری ڈار میاں

کل رات عجب احوال ہوا، مجھے صبر و قرار محال ہوا
کچھ ایسا جی کو ملال ہوا، کہ یہ شعر لکھے ناچار میاں

عرفان صدیقی
حیدر مرزا روڈ لکھنؤ

منزلیں گو مختلف ہیں، رہ گزر ہے ایک سی
ہو کوئی بھی سمت، رفتارِ سفر ہے ایک سی

اتنا رنگا رنگ منظر نامہ، حسنِ ذات کا؟
اور سب کے پاس، چشم خودنگر ہے ایک سی

میں سلگتا ہوں، ترے آنگن کا موسم پھول پھول
دھوپ تو، میری تری دیوار پر ہے ایک سی

یہ ہنر میں، زاویے اتنے، کہاں سے آ گئے؟
ایک محفل، اور تہذیبِ ہنر ہے ایک سی

تیرے میرے لفظ، معناً صورتاً کیوں ہیں الگ؟
گفتگو تو سب، بہ الفاظِ دگر ہے ایک سی

کیسے نقطے پر صحافت بھی سمٹ کر آ گئی؟
سارے اخباروں میں، لگتا ہے خبر ہے ایک سی

کتنے رخنے ہیں پسِ دیوار و در، کس کو خبر
یوں بہ ظاہر، صورتِ دیوار و در ہر ایک سی

اتنی شستہ آہنگ، کربِ زندگی کی لے فضا
سب کے ہونٹوں پر، فغانِ مختصر ہے ایک سی

فضا ابن فیضی
جمال پورہ
مئوناتھ بھنجن



غزل

نہ مندر میں صنم ہوتے، نہ مسجد میں خدا ہوتا
ہمیں سے یہ تماشا ہے نہ ہم ہوتے تو کیا ہوتا

نہ ایسی منزلیں ہوتیں، نہ ایسا راستہ ہوتا
سنبھل کر ہم ذرا چلتے تو عالم زیرِ پا ہوتا

گھٹا چھاتی، بہار آتی تمہارا تذکرہ ہوتا
پھر اس کے بعد گل کھلتے کہ زخمِ دل ہرا ہوتا

زمانے کو تو بس مشقِ ستم سے لطف لینا ہے
نشانے پر نہ ہم ہوتے تو کوئی دوسرا ہوتا

بلا کر تم نے محفل میں ہمیں غیروں سے اٹھوایا
ہمیں خود اٹھ گئے ہوتے اشارہ کر دیا ہوتا

تیرے احباب تجھ سے مل کے پھر مایوس لوٹ آئے
تجھے نوشاد کیسی چپ لگی کچھ تو کہا ہوتا

نوشاد
"آشیانہ" کارٹر روڈ
باندرہ - بمبئی ۴۰۰۰۵۰





غزل

گلنار ہوگئے، ہم گل ریز ہوگئے، ہم
جب یاد آئے ہو تم زرخیز ہوگئے، ہم

پتھر سے دودھ کل تک ہم بھی نکالتے تھے
فرہاد بڑھ گئے تو پرویز ہوگئے، ہم

یہ حادثہ ہے لیکن رنگین حادثہ ہے
میں شیر تھا شکر وہ، آمیز ہوگئے، ہم

مت پوچھیے کہ کتنی عزت بڑھی ہماری
کل درمیانِ محفل کچھ تیز ہوگئے، ہم

مٹی سے پوچھ لیجے، ہم خاکسار بھی تھے
دُنیا نے جب ستایا، چنگیز ہوگئے، ہم

سو رُخ بدل بدل کر دیکھا اُسے مظفرؔ
منصور بن گئے ہم تبریز ہوگئے، ہم

ڈاکٹر مظفرؔ حنفی
پروفیسر آف اقبال چیئر کلکتہ یونیورسٹی
کلکتہ ۷۰۰۰۶۲

غزل

وہ امیرِ شہر بنا رہا، بس اسی کی سِکّہ گری رہی
وہ اَنا جو میرا نصیب تھی، وہ اَنا دھری کی دھری رہی

وہ دُعا کے ہاتھ اُٹھے رہے، وہ مِلن کی فصل ہری رہی
ترے غم سے آنکھیں سجی رہیں تری یاد دل میں بھری رہی

ہے جو دُکھ تو دکھ کو چھپایئے کسی اور کو نہ بتایئے
نہ وہ آنسوؤں میں نمی رہی، نہ وہ دامنوں میں تری رہی

مری اُنگلیوں کی تراش نے اسے پتھروں کا محل دیا
وہ تو فن کا شہر بسا گیا، مرے ہاتھ بے ہنری رہی

مری شاعری مرے رت جگے مجھے زندگی تو نہ دے سکے
مگر ایک بات ضرور ہے، مری بات سب سے کھری رہی

کبھی عکس چھوڑ کے چل دیئے کبھی دل کو توڑ کے چل دیئے
وہی میری شیشہ مزاجیاں وہی ان کی شیشہ گری رہی

مرا دل نہیں صنم آشنا، مری حسرتوں کا حرم ہے یہ
یہ وہ ایک مسجدِ خاص ہے جو نمازیوں سے بھری رہی

تسنیم فاروقی
تلسی داس مارگ لکھنؤ

پروفیسر گیان چند
۹/۲۵ - اندرا نگر۔ لکھنؤ



گزشتہ نصف صدی کی اُردو تحقیق

یوں تو ادبی تحقیق کی داغ بیل شعرا کے تذکروں سے پڑ چکی تھی لیکن جدید انداز کی تحقیق کا آغاز بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی ہوا۔ حسرت موہانی نے ۱۹۰۱ء میں علی گڑھ کالج کی انجمن اردوئے معلیٰ میں کئی شعرا کے حالات پر مضامین پڑھے۔ اسی سال مخزن میں طالب علی خاں عیشی پر ان کا مضمون شائع ہوا۔ ۱۹۰۳ء میں انھوں نے رسالہ اردوئے معلیٰ جاری کیا اور اس میں خود نیز دوسرے طلبہ سے شاعروں کے بارے میں مضمون لکھوائے ۱۹۰۶ء میں مولانا شبلی نے لطف کا تذکرہ گلشن ہند مرتب کر کے شائع کیا یہ اردو کی پہلی ادبی تدوین ہے۔ اس پر مولوی عبدالحق نے ایک سیر حاصل مقدمہ لکھا جس میں فورٹ ولیم کے نثاروں کے کارناموں کی تفصیل دی۔ اگر حسرت کے مضامین کو تذکروں کا ہی تسلسل کہا جائے تو مولوی صاحب کا مقدمہ بالیقین پہلا مستقل تحقیقی مقالہ ہے ۱۹۲۱ء کے بعد تحقیق کے کل شعبوں میں زندگی اور تابندگی کے آثار رواں دواں ہو گئے۔

میرا موضوع تحقیق کے گذشتہ پچاس سال یعنی تقریباً ۱۹۴۵ سے حال تک کے کارنامے ہیں۔ اردو تحقیق کا محض دس فیصد یا اس سے بھی کم اس دور سے قبل اور تقریباً ۹۰ فیصد اس عہد زریں میں ملتا ہے۔ اردو تحقیق کی داستان پورے اردو ادب کے ارتقا کی داستان ہے کیونکہ یہ ادیبوں اور ان کی تخلیقات سے لاینفک طریقے سے جڑی ہوئی ہے۔ تحقیق کے ہر شعبے کی تاریخ ایک پوری کتاب چاہتی ہے۔ ایک مضمون کی گاگر میں اس ساگر کو کیسے سموؤں کوشش کروں گا کہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ کی جھلک دکھلا سکوں اپنے نائرہ جزو رس کی فرسائی صرف اہم شعبوں کے اہم کارناموں تک محدود رکھوں گا پھر بھی بعض اہم مطالب قلم انداز ہو جائیں گے۔

واضح کر دوں کہ پاکستان کی تحقیق کے لئے میرا خاص ماخذ ڈاکٹر معین الدین عقیل کی عالمانہ کتاب "پاکستان میں اردو تحقیق" (کراچی ۱۹۸۷ء) ہے اصلاً یہ رسالہ اردو ۱۹۸۵ء شمارہ ۱-۲ کی شکل میں شائع ہوئی تھی۔ اس طرح اس میں ۱۹۸۴ء تک کی تحقیق کا ذکر ہے۔ ڈاکٹر معین الدین کی کتاب یونیورسٹیوں میں اردو تحقیق (لاہور ۱۹۸۹) اس سے کچھ اور آگے لے جاتی ہے ملازمت سے سبکدوشی کے بعد کوئی حوالہ جاتی کتب خانہ میری رسائی میں نہیں رہا۔ اس لئے میں ہندوستان کی تازہ ترین تحقیق سے بھی واقفیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا میں اپنے جائزے کو چند عنوانات کے تحت شروع کروں گا:

نئے متون کی دریافت، تدوین متن، ادبی شخصیات پر کام، ادبی تاریخیں فہرست کتابیات وغیرہ۔

نئے متون کی دریافت

یہ تحقیق کا سب سے اہم اور قابل فخر شعبہ ہے اس کے تحت دو طرح کے متن آتے ہیں۔ ایک وہ جن کے وجود اور نام کا ہی مورخان ادب کو پہلے سے علم تھا اور وہ یکایک منکشف ہوئے مثلاً عبدی خاں کا "قصۂ مہر افروز و دلبر" بینی نرائن جہاں کی تفریح طبع، دوسرے وہ جن کا ذکر تو سننے میں آتا تھا لیکن وہ نایاب تھے مثلاً فضل کی کربل کتھا۔ حیدر بخش حیدری کی متعدد تخلیقات، آزردہ کا تذکرہ میں دونوں کو ملا جلا کر ایک نظر دوڑاتا ہوں۔ انہیں زمانۂ تصنیف کے اعتبار سے درج کروں گا سنہ اشاعت کے اعتبار سے نہیں۔

سخاوت مرزا نے شیخ فرید الدین گنج شکر کے ایک ریختے کو اکتوبر سنہ ۱۹۵۱ء میں شائع کیا اور اسے ریختے کا قدیم ترین نمونہ قرار دیا۔ اس کے بعد انھوں نے شیخ بدرالدین جونپوری (ف اوائل نویں صدی ہجری) کی ایک ریختہ غزل اردو ادب شمارہ ۱، ۱۹۷۰ء میں شائع کی۔ یہ ریختہ انھیں ملک محمد جائسی کے مجموعۂ رسائل میں دستیاب ہوا (معین عقیل ص ۷) مولوی عبدالحق کو اُجے چندر بھٹناگر کی ایک منظوم نصابی لغت مورخہ ۹۶۰ ملی۔ ان کا

اس میں نام نہیں تھا اس لئے انھوں نے اسے "مثل خالق باری" جیسا گڈمڈ نام دیا۔ اسے افسر صدیقی امروہوی نے رسالہ اردو جولائی و اکتوبر ۱۹۸۳ء میں دو قسطوں میں چھاپ دیا۔ دوسری طرف ڈاکٹر نذیر احمد کو سنٹرل لائبریری بھوپال میں اس کا نسخہ بنام ابجے چندنامہ ملا اور انھوں نے اس نام سے غالب نامہ دہلی بابت جنوری ۱۹۸۶ء میں شائع کردیا۔ وہ مثل خالق باری سے واقف نہیں۔

میری شاگرد ڈاکٹر صبیحہ نسرین کراچی سے مولوی عبدالحق کی مشہور دکنی بیاض مکتوبہ ۱۰۹۸ھ کا عکس لے آئیں اس میں شاہ شمس العشاق کی ایک نئی مثنوی وصیت النور ملی جسے انھوں نے حیدرآباد سے ۱۹۸۷ء میں شائع کیا۔ پھولبن کے مرتب شیخ چاند ابن حسین نے محمد جعفر ابن حیدر کی مثنوی "تتمۂ پھولبن" رسالہ اردو اپریل و جولائی ۱۹۴۸ء میں شائع کی۔ نصیر الدین ہاشمی، یورپ میں دکھنی مخطوطات میں اس تصنیف کا ذکر کرچکے تھے۔ سفارش حسین رضوی نے اپنی کتاب اردو مرثیہ میں روشن علی سہارنگ پوری کی مثنوی عاشورنامہ کا تعارف کرایا (دہلی ۱۹۶۵ء) بعد میں مسعود حسین خاں اور سفارش حسین رضوی نے اسے کتابی صورت میں ۱۹۷۲ء میں شائع کیا۔ مرتبین کے خیال میں سہارنگ پور سے مراد سہارنپور ہے۔ لیکن جمیل جالبی (تاریخ ادب) سید ندرت نقوی (نذر مختار) اور میری (نذر مسعود) رائے میں یہ مالوے کا قصبہ سارنگ پور ہے۔

مولوی عبدالحق نے اسمٰعیل امروہوی کی مثنوی تولدنامہ بی بی فاطمہ (۱۱۰۵ھ) کو شمالی ہند کی سب سے بڑی قدیم مثنوی۔ کے عنوان سے رسالہ اردو بابت اپریل ۱۹۵۱ء میں متعارف کیا۔ اس کا عنوان دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کیونکہ اس سے پہلے افضل کی بکٹ کہانی اور عبدی نیز محبوب عالم کی مثنویاں ملتی ہیں نجیب اشرف ندوی نے اسمٰعیل کی ایک اور مثنوی قصۂ معجزۂ انار (۱۱۴۰ھ) کو رسالہ اردو بابت جنوری ۱۹۵۴ء میں شائع کیا بعد میں نائب حسین نقوی نے مکمل تر نسخوں کی مدد سے ان دونوں نظموں کو اردو کی دو قدیم مثنویاں، کے نام سے ترتیب دیا (لاہور ۱۹۷۰ء) انجمن ترقی اردو پاکستان کے کتب خانے میں مرثیوں اور نوحوں کی ایک بیاض مکتوبہ ۱۱۱۷ھ ہے۔ افسر امروہوی نے اسے کراچی سے ۱۹۷۵ء میں شائع کیا۔ دوسری طرف مسعود حسن رضوی کے پاس ایک بیاض مراثی ریختہ مطبوعہ ۱۱۵۱ھ تھی۔ انھوں نے اس کا مفصل تعارف رسالہ تحریر دہلی اپریل تا جون ۱۹۷۱ء میں کرایا۔ برٹش میوزیم میں عبداللہ خاں دکنی مبتلا کا دیوان ہے۔ یہ احمد شاہ ابدالی کے حملے کے دوران میں دہلی میں لکھا گیا۔ مبتلا نے کثرت سے ولی کی غزلوں پر غزلیں لکھی ہیں۔ اس دیوان کو عبادت بریلوی نے اورینٹل کالج میگزین بابت اگست ۱۹۷۰ء میں شائع کیا۔ دوسری طرف مختارالدین احمد بھی اس کا عکس لائے تھے اسے ڈاکٹر نعیم احمد نے رسالہ تحریر دہلی ۱۹۷۱ء شمارہ ایک میں شائع کیا۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ۱۹۸۷ء میں امیر خسرو کا ہندوی کلام مع نسخہ برلن ذخیرہ اشپرنگر شائع کی۔ اس کی کتابت ۱۸۰۰ سے کچھ قبل ہوئی اس میں تقریباً ڈیڑھ سو پہیلیاں ہیں جن میں سے تین پر خسرو کا نام لکھا ہے۔ ڈاکٹر نارنگ اس کتاب کو خسرو سے منسوب کرنے پر مائل ہیں۔ اپنی کتاب کے فاضلانہ مقدمہ میں انھوں نے شرح و بسط سے اس پر بحث کی ہے۔ بعض دوسرے محققین اسے خسرو کا کلام نہیں مانتے مثلاً مختلف موقعوں پر مالک رام اور حنیف احمد نقوی نے مجھ سے ایسا ہی کہا اور میں ان سے متفق ہوں۔ ہمارے پاس مجہول الاسم قدیم مخطوطوں کو جانچنے کے لئے دو پیمانے ہیں (۱) خارجی یعنی اس کی روایت عہد مصنف سے کتنی بعد میں ملتی ہے اور اس کا پایۂ استناد کیسا ہے (۲) داخلی یعنی اس کی لسانی کیفیت کہ اردو زبان کے ارتقا میں اسکی زبان عہد مصنف کے مطابق ہے کہ نہیں۔ خسرو سے منسوب کھڑی بولی کی چیزیں ان دونوں پیمانوں پر پوری نہیں اترتیں۔ بہرحال ماضی کی جن چیزوں کے بارے میں ہماری معلومات ناکافی ہیں ان کے بارے میں مختلف محققین کو مختلف رائے رکھنے کا اختیار ہے۔

اٹھارہویں صدی کا ایک متن قابل ذکر ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کو شاہ عالم ثانی کے عہد کے سیف اللہ کی مثنوی چندر بدن ماہیار ملی جس میں ایک بارہ ماسہ بھی ہے۔ انھوں نے اس کا تفصیلی تعارف اپنی کتاب کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ (لاہور ۱۹۶۵ء) میں کرایا۔ شمالی ہند میں اس موضوع کی وحید کی مثنوی معلوم ہوتی ہے۔ سراج کے شاگرد خواجہ عنایت اللہ فتوت اپنے تذکرہ ریاض حسنی کے سبب مشہور رہیں۔ ان کی ایک مثنوی کراچی میں موجود ہے جسے پروفیسر شفقت رضوی نے اردو نامہ اپریل ۱۹۶۴ء میں شائع کیا۔ آب حیات کی روایت کے مطابق میر ضاحک کا دیوان تلف کردیا گیا تھا لیکن بیتاراج بہار میں قیام الدین کو اس کا ایک نسخہ مل گیا جنھوں نے معاصر پٹنہ بابت جولائی ۱۹۶۲ء میں اس کا مفصل تعارف پیش کیا۔

عبادت بریلوی پانچ سال لندن میں مقیم رہے جہاں انھوں نے متعدد متون برآمد کرکے شائع کیے انھیں میں ایک حیدر بخش حیدری کا دیوان ہے

جسے ایک تحقیقی مقدمہ کے ساتھ لاہور سے ۱۹۹۶ء میں شائع کیا۔ حیدری کی مثنوی ہفت پیکر کو ناپید سمجھا جاتا تھا۔ ڈاکٹر جاوید نہال نے اپنی کتاب بنگال کا اردو ادب میں اس کا مفصل تذکرہ کیا۔ (کلکتہ سنہ ندارد)

مجھے بھوپال میں مرزا ہوس کی ایک ناقص الآخر ۸۲ء اشعار کی مثنوی ملی میں نے اپنے مجموعہ تحریر میں (۱۹۹۴) میں اس کا تعارف پیش کیا۔ ڈاکٹر سلیمان حسین نے اپنی کتاب۔ لکھنؤ کے چند نامور شعراء۔ میں اطلاع دی کہ ندوۃ العلما لکھنؤ کے کتب خانے میں اس کا مکمل نسخہ موجود ہے جس میں تقریباً ایک ہزار شعر ہیں ڈاکٹر اکبر حیدری نے اپنے مجموعے تحقیقات حیدری ۱۹۸۴ء میں اس کا پورا متن شائع کر دیا۔ ہوس نے اس مثنوی کا کوئی نام نہیں رکھا۔

اس دور کی سب سے اہم دریافتیں کلام غالب کی ہیں ۱۹۶۹ء میں دیوان غالب بخط غالب دریافت ہوا اس کی دو اعلیٰ تدوینات ہوئیں۔ اکبر علی خاں نے ستمبر ۶۹ء میں رام پور سے نسخۂ عرشی زادہ شائع کیا اور اکتوبر ۶۹ء میں نثار احمد فاروقی نے بیاض غالب بخط غالب کو نقوش کے خاص نمبر کے طور پر پیش کیا۔ زمانی ترتیب سے کلام غالب کا دوسرا مجموعہ نسخۂ شیرانی ہے جو لاہور سے ۶۹ء میں شائع کیا گیا تیسرا مجموعہ اردو فارسی کلام کا انتخاب گل رعنا ہے جس کی تدوینیں ہوئیں۔ مالک رام کا ۱۹۷۰ء میں، وزیر حسن کا لاہور سے ظاہراً ۱۹۶۹ء میں لیکن دراصل ۱۹۷۰ء کے آخر میں تیسرا نسخہ سید قدرت نقوی نے لاہور سے ۱۹۷۵ء میں شائع کیا۔ واضح ہو کہ لاہور میں گل رعنا بخط غالب دریافت ہوا تھا جس کو سب سے پہلے ڈاکٹر معین الرحمان نے متعارف کرایا۔

میں نے امیر مینائی کی ۶۲ء شعروں کی مثنوی کارنامۂ عشرت رام پور میں دریافت کر کے رسالہ اردو اپریل ۵۶ء میں شائع کرائی۔ دوسری طرف اسرائیل احمد مینائی نے امیر کی عشقیہ داستانی مثنوی (۲۲۵۱) رسالہ اردو بابت جولائی تا اکتوبر ۱۹۹۰ء میں پیش کی۔ ڈاکٹر فضل امام نے امیر اللہ تسلیم کی دو مثنویاں غنچۂ عشق ۱۹۷۲ء میں اور نغمۂ مسلسل گریۂ انتخاب ۱۹۷۰ء میں شائع کیں پہلی شاہجہاں پور سے اور دوسری منگرول سے لی۔ ڈاکٹر اکبر حیدری نے تحقیقات حیدری لکھنؤ ۸۴ء میں نکہت دہلوی کی اندر سبھا شائع کی۔ ان کا دعوا ہے کہ یہ امانت کی اندر سبھا پر مقدم ہے لیکن ایسا ماننے کی کوئی مضبوط دلیل نہیں۔

اور بھی کئی شعری متون پہلی بار میرے سامنے آئے مثلاً میں نے میر کی دو طویل اور ایک مختصر مثنوی دریافت کر کے شائع کیں۔ اُن کا ذکر انتخاب کے

خیال سے قطع کیا جاتا ہے۔

گذشتہ نصف صدی میں تخلیقی ادب کی تدوین بہت بڑی تعداد میں ہوئی جس میں شعری ادب کا بہرہ نثری ادب سے زیادہ ہی معلوم ہوتا ہے اس میں قدیم و جدید منظومات، دیوان و کلیات، مثنوی، مرثیے، قصاید وغیرہ سبھی شامل ہیں۔ بہتر تدوین وہ ہے جس میں کئی نسخوں کا مقابلہ کر کے صحیح متن تیار کیا جاتا ہے اور متن سے قبل ایک تحقیقی مقدمہ اور بعد میں حواشی لکھے جاتے ہیں بیشتر تدوینوں میں جملہ اہم ترین خطی اور مطبوعہ نسخوں کو سامنے نہیں رکھا جاتا۔ کئی صورتوں میں مدون محض ایک نسخہ کو لے کر اس پر مقدمہ لکھ کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتا ہے۔ چونکہ مدونات اتنی بڑی تعداد میں ہیں کہ یہ مضمون ان کے سیلاب میں بہہ جائے گا۔ اس لئے میں چند منتخب تدوینات ہی کے ذکر پر اکتفا کروں گا اور پھر اعادہ کرتا ہوں کہ بیشتر پاکستانی مدونات میری نظر سے نہیں گذریں۔ معین الدین عقیل کی کتاب سے ان کے بارے میں ابتدائی معلومات حاصل کر چکا ہوں۔

شعری متون میں قدامت کے لحاظ سے دکنی منظومات سب سے پہلے آتی ہیں۔ ڈاکٹر محمد علی نے اپنی کتاب، دکنی اور دکنیات (حیدرآباد ۱۹۸۲ء) میں ان سب کی شرح کی ہے۔ میرے پاس کہاں گنجائش ہے کہ ان کے ساتھ انصاف کر سکوں۔ میں چند ہی نام دے پاؤں گا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اردو نظم کی قدیم ترین، مشکل ترین اور اہم ترین مدون نظامی کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ پاکستان میں ۱۹۷۳ء میں اور ہندوستان میں ۱۹۷۹ء میں شائع کی۔ اس کے مخطوطے کو پڑھ لینا ہی اتنا بڑا ہفت خواں سر کر لینا ہے کہ جالبی اردو کے سب سے ماہر مخطوطہ شناس کہلائے جانے کے حق دار ہیں۔ حیدرآباد کی ڈاکٹر زینت ساجدہ نے اشرف کی نوسرہار کی تدوین پر ۱۹۷۰ء میں پی ایچ ڈی کی تھی لیکن اسے شائع نہیں کیا۔ افسر صدیقی امروہوی نے نوسرہار کو مرتب کر کے ۱۹۸۲ء میں کراچی سے شائع کیا۔ حیدرآباد سے ڈاکٹر سیدہ جعفر نے شیخ احمد گجراتی کی یوسف زلیخا ۱۹۸۳ء میں اور احمد جنیدی کی ماہ پیکر ۱۹۸۹ء میں مرتب کر کے شائع کیں۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر غلام عمر خاں نے عثمانیہ یونیورسٹی کے قدیم ترین کے سلسلے میں کئی مثنویاں پیش کیں۔ شیخ چاند ابن حسن نے دکن کی ضخیم ترین مثنوی خاور نامہ از رستمی کو ۱۹۶۸ء میں شائع کیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے مختلف بیاضوں سے غزلیں جمع کر کے دیوان حسن

شوق اور دیوان نصرتی تیار کئے (کراچی ۱۹۷۱ء اور لاہور ۱۹۷۲ء) اسی دور کی شمالی ہند کی قدیم ترین نظم بکٹ کہانی کو ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے ۱۹۶۵ء میں شائع کیا۔ شاہ تراب کی طویل نظم من سمجھاون کو ڈاکٹر سیدہ جعفر نے ۱۹۶۳ء میں اور ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے ۱۹۶۵ء میں شائع کیا۔ ڈاکٹر سلطانہ بخش نے دیوان تراب مرتب کر کے کراچی سے ۱۹۸۲ء میں چھاپا۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے عبدی کی مثنوی نقشِ ہندی کو رسالہ اردو اکتوبر ۱۹۵۹ء میں شائع کیا۔ اس مثنوی کے شاعر کے بارے میں یہ طے نہیں تھا کہ عبدی اور امین میں کون تخلص ہے اور کون نام۔ مصطفیٰ خاں کے مخطوطے میں کاتب نے بغل حاشیے میں عبداللہ امین پنجابی لکھا ہے جس سے بات صاف ہو جاتی ہے۔

سخاوت مرزا نے کئی مخطوں کی مدد سے شاہ قاسم اورنگ آبادی معاصر سراج کا دیوان شائع کیا۔ (کراچی ۱۹۷۵ء) اس کی زبان شمالی ہند کے شاعروں کی طرح صاف ہے۔ گوہر نوشاہی نے پنجاب کے سید غلام قادر شاہ کی مثنوی رمز العشق اور ایک دوسری مثنوی چرخی نامہ کو شائع کیا (لاہور ۱۹۷۲ء) ڈاکٹر محمد باقر کی اردو ئے قدیم دکن اور پنجاب میں (لاہور ۱۹۷۲ء) ان علاقوں کے کم یاب اور غیر مطبوعہ متون کا تعارف پیش کرتی ہے۔ وحید قریشی نے جہاندار شاہ ابن شاہ عالم ثانی کے دیوان کو دیوان جہاندار کے نام سے مرتب کیا (لاہور ۱۹۶۵ء) ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے خلیفہ محمد معظم عباسی تلمیذ قدرت اللہ شوق کی مثنوی جنگ نامہ، آصف الدولہ نواب رامپور (تصنیف ۱۷۹۰ء) کو کئی نسخوں سے مرتب کر کے شائع کیا (کراچی ۱۹۸۰ء) خلیل الرحمان داؤدی نے اردو کی قدیم منظوم داستانیں ۱۹۶۷ میں کئی مقبول عام مثنویوں کو ایک ساتھ پیش کیا۔

کلب علی خاں فائق نے کلیات میر ۱۹۷۹ء کے علاوہ دوسرے چھ شاعروں کی کلیات میں ترتیب دے کر شائع کیں۔ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے کلیات سودا ۱۹۷۶ء اور ڈاکٹر اقتدا حسن نے کلیات قائم چاند پوری (۱۹۶۵ء) شائع کی۔ آخر الذکر تدوین بہت اعلیٰ معیار کی ہے۔ ڈاکٹر اکبر حیدری نے دیوان میر نسخۂ حیدرآباد کو طویل مقدمہ کے ساتھ ۱۹۷۳ء میں شائع کیا۔ بعد میں یہی رسالہ نقوش ۱۹۸۰ء میں دہرایا گیا۔ انھوں نے میر حسن کی سحر البیان کو بھی متعدد نسخوں کی مدد سے ترتیب دے کر لکھنؤ سے شائع کیا۔ ——— رنگین لاجواب مثنوی دل پذیر ہنوز غیر مطبوعہ تھی ڈاکٹر سلیمان حسین نے اسے ۱۹۸۷ء میں لکھنؤ سے شائع کیا۔

انیسویں اور بیسویں صدی کی تقریباً تمام شعری تدوینات سے صرفِ نظر کر کے میں صرف غالب اور اقبال کے چند مجموعوں کا ذکر کرتا ہوں۔ مولانا عرشی نے دیوان غالب نسخۂ عرشی ۱۹۵۸ء میں شائع کیا تا حال یہ اردو کی بہترین شعری تدوین ہے چونکہ اس سے سبھی قارئین واقف ہیں اس لئے اس پر مزید لب کشائی کی ضرورت نہیں۔ دیوان غالب بخط غالب کی عرشی زادہ اور نثار احمد فاروقی کی تدوینوں کا پیچھے ذکر کیا جا چکا ہے۔ حمید احمد خاں نے لاہور میں ۱۹۶۹ء نسخۂ حمیدیہ شائع کیا اس میں مفتی انوار الحق کے ایڈیشن کی غلطیوں اور کمیوں کو دور کر دیا گیا تھا۔ مسلم ضیائی نے غالب کے متفرق کلام کو غالب کا منسوخ دیوان کے نام سے کراچی میں ۱۹۶۹ء میں شائع کیا (معین عقیل ص ۶۱) مجھے واضح نہیں کہ اس میں نسخۂ حمیدیہ والا منسوخ کلام شامل ہے کہ نہیں؟ غالباً نہیں۔ کالی داس گپتا رضا نے، دیوان غالب کامل تاریخی ترتیب سے ،، شائع کیا (بمبئی ۱۹۸۸ء) جیسا کہ نام سے ظاہر ہے انھوں نے تحقیق کر کے متداول دیوان کے تمام کلام کو عہد وار ترتیب دیا ہے اور اس پر ایک معلومات افروز مقدمہ لکھا ہے۔

اقبال کے منسوخ کلام کے کئی مجموعے آئے بہ تفصیل ذیل۔

محمد انور حارث: رختِ سفر ۱۹۵۲ء۔ عبدالواحد معینی: باقیات اقبال لاہور ۱۹۵۲ء تبرکات اقبال دہلی ۱۹۵۹ء۔ غلام رسول مہر، صادق علی دلاوری: سرودِ رفتہ ۱۹۵۹ء۔ عبدالغفار شکیل: نوادر اقبال علی گڑھ ۱۹۶۲ء

منسوخ کلام کا بہترین مجموعہ باقیاتِ اقبال طبع سوم (لاہور ۱۹۷۸ء) ہے جس کی تدوین عبدالواحد معینی اور محمد عبداللہ قریشی نے کی۔ میں نے ابتدائی کلام اقبال بہ ترتیب مہ و سال ۱۹۰۸ء تک مندرجہ بالا کتابوں اور درجن مخطوطوں کی مدد سے مرتب کیا ہے اور ۱۹۹۰ء میں حیدرآباد اور کراچی دو جگہوں سے شائع کیا۔

اب نثری متون کو لیجئے۔ نئے دریافت ہونے والے قابل ذکر متون یہ ہیں۔

اردو نثر کی قدیم ترین کتاب پیر روشان، بایزید انصاری کی خیر البیان مصنفہ ۹۲۸/۱۵۲۱ء ہے۔ اس کا تعارف فارغ بخاری نے ادبیات سرحد جلد سوم میں کرایا۔ (پشاور ۱۹۵۵ء) بعد میں حافظ محمد عبدالقدوس قاسمی نے ترتیب دے کر پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی سے ۱۹۶۷ء میں شائع کر دیا۔ (جالبی: تاریخ جلد اول ص ۶۹۹-۷۰۳) خواجہ حمیدالدین شاہد نے ایک مختصر رسالہ محمود خوش دہان بیجاپوری اپنے تعارف کے ساتھ کراچی سے ۱۹۶۹ء میں شائع کیا۔ سب سے اہم اور قدیم نثری کتاب فضل کی کربل کتھا ہے

جیسے ڈاکٹر مختار الدین احمد نے جرمنی میں دریافت کیا اس کی دس مجلسوں کا ناقص ایڈیشن ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے ۱۹۶۱ء میں دہلی یونیورسٹی سے شائع کیا. لیکن بعض وجوہ سے بازار میں نہیں دیا. مکمل نسخہ مکمل ترتیب سے مالک رام اور مختار الدین احمد نے پٹنہ سے ۱۹۶۵ء میں شائع کیا.

ایک بہت اہم کتاب عبدی خاں کی قصۂ مہر و افروز دلبر ہے جسے ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے ۱۹۶۶ میں شائع کیا. میرے بڑے بھائی ڈاکٹر پرکاش مونس نے اس مصنف کی شناخت کی اور اس کا زمانہ ۵۲ ۱۷ کے آس پاس مقرر کیا. انھوں نے عبدی خاں کی ایک اور کتاب بہاری ست سئی کی اردو شرح کی نشاندہی کی. اس کا نسخہ راج لائبریری ٹیکم گڑھ مدھیہ پردیش میں ہے (اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر ۱۹۷۸ء) ان کے بعد ہی اہم داستان شاہ عالم ثانی کی عجائب القصص ہے. اس کے چار حصوں میں سے دو دستیاب ہیں جنھیں مس راحت افزا بخاری نے کراچی سے ۱۹۶۵ء میں شائع کیا، ڈاکٹر نجم الاسلام نے شاہ حاتم کی نسخۂ مفرح الضحک (تصنیف قبل ۱۷۴۰ء) کو نقوش شمارہ ۱۰۵ میں پیش کیا. بعد میں یہ جمیل جالبی کی تاریخ جلد دوم حصہ اول میں بھی ڈائجسٹ کرلی گئی نجم الاسلام نے ہی نقوش کے اسی شمارہ میں سید رستم علی بجنوری کے قصہ احوال روہیلہ (۱۷۸۱) کی تفصیلات پیش کیں. ڈاکٹر شبیہ الحسن نے مرزا مغل غافل کی زاد آخرت (۱۷۹۸ء) کی تنقیدی تدوین پر ڈی لٹ کی ڈگری لی لیکن مقالہ شائع نہیں کیا انھوں نے غافل کی پیشتر کی نثر وسیلۃ النجاۃ (۱۷۹۲) اور بعد کی نثر ماتم (۱۸۱۵ء) کی بھی نشاندہی کی. مولانا عرشی نے انشا کی غیر منقوطہ داستان ملک گوہر رام پور سے ۱۹۴۸ء میں شائع کی.

فورٹ ولیم کالج کی کئی نثری کتابیں جو ابھی تک معدوم و مفقود تھیں دریافت ہوئیں. یہ کارنامہ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے سرانجام دیا ہے. حیدر بخش حیدری کی گلزار دانش کا تعارف جاوید نہال نے اپنی کتاب بنگال میں اردو ادب (سند ندارد) میں کرایا. ڈاکٹر عبادت نے اس کے حصہ اول کو اورینٹل کالج میگزین شمارہ ۱۹۶۴-۹۵ میں شائع کرایا. اس کے علاوہ انھوں نے ذیل کے نسخے بھی شائع کئے

حیدر بخش حیدری کی مختصر کہانیاں کراچی ۱۹۶۴ء. اشک کا رسالہ کائنات (کراچی ۱۹۵۶ء) اشک کی گلزار چین کراچی ۱۹۶۶ء ولال ہفت گلشن کراچی ۱۹۶۴ء بینی نرائن جہاں کی چار گلشن ۱۹۶۷ء.

انھیں حیدری کا قصۂ لیلی مجنوں بھی دستیاب ہو گیا لیکن اسے شائع نہیں کیا

ڈاکٹر حنیف نقوی کو بینی نرائن جہاں کی حکایات کی کتاب تفریح طبع ملی جس کا تعارف انھوں نے نوائے ادب اکتوبر ۷۷ء میں پیش کیا میں نے غلام غوث تشنہ کی غیر مطبوعہ داستان ہفت سیاح (تصنیف ۱۸۲۲ء) کا مستقل تعارف شاعر بمبئی عصر ادب نمبر ۱۹۷۷ء میں پیش کیا. بعد میں یہ مضمون میرے مجموعے حقائق میں شامل ہوا.

ڈاکٹر محمود الٰہی کو فسانۂ عجائب کا ایک سادہ نقش اول مکتوبہ ۱۸ رجب ۱۲۵۹ھ ملا. انھوں نے اسے فسانۂ عجائب کا بنیادی متن کے نام سے اپریل ۷۲ء میں لکھنؤ سے شائع کر دیا. دوسری طرف ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی کو اسی بنیادی متن کا ایک نسخہ اور ملا جو ۱۳ محرم ۱۲۵۵ء کا مکتوبہ معلوم ہوتا ہے. میں نے ان دونوں نسخوں اور متداول متن کے تقابلی مطالعہ پر ایک مفصل مضمون رسالہ اردو اور آج کل میں ۱۹۸۶ء میں شائع کرایا. جو بعد کو میرے مجموعے کھوج میں ۱۹۹۰ میں شامل ہوا. عبادت بریلوی نے نواب کریم خاں کا سیاحت نامہ لندن برٹش میوزیم سے حاصل کیا اور لاہور سے ۱۹۸۲ء میں شائع کر دیا. کریم خاں بہادر شاہ ظفر کے سفیر کی حیثیت سے ۱۸۴۱ء میں لندن گئے تھے.

نظم کی طرح نثری مدونات کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے. میں چند منتخب تدوینوں کا ذکر کر رہا ہوں. ظاہر ہے کہ بہت سے اہم کاموں سے بھی صرفِ نظر کرنا پڑ رہا ہے.

شیخ وجیہہ الدین گجراتی کا مجموعہ ملفوظات بحر الحقائق مشہور ہے. ڈاکٹر غلام مصطفی کو ان کے فارسی اور اردو ملفوظات کا ایک اور مجموعہ ملا جس سے اردو ملفوظات لے کر انھوں نے اپنے مضمون ملفوظات شیخ وجیہہ الدین گجراتی میں نقل کئے. (معارف جون ۱۹۵۰ء) ڈاکٹر حمیرہ جلیلی نے کئی مخطوطوں کی مدد سے سب رس کو مرتب کر کے حیدر آباد سے ۱۹۸۳ء میں شائع کیا. ڈاکٹر نور السعید اختر نے وجہی کی تاج الحقائق کو ایک پر مغز مقدمے کے ساتھ مرتب کیا. (انجمن سنہ ندارد. اس کی طباعت اچھی نہیں ہے پورا متن بغیر پیراگراف بنائے ایک سلسلے میں لکھ دیا گیا ہے. سخاوت مرزا نے دکنی کی کئی نثریں ترتیب دے کر شائع کیں مثلاً سید شاہ طاہر حموی کرنولی کا نصاب صبیان، خوان یغما دکنی، (اردو اپریل و جولائی ۱۹۵۳ء) ۲. نامعلوم مصنف کی دکنی مزاحیہ مسجع نثر جنگ نامہ بنگی خاں مصنفہ ۱۷۰۳ (اردو نامہ جولائی ۱۹۶۴ء) ۳. سید حسین علی شاہ قادری کی انوار العاشقین وغیرہ.

ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے تحسین کی نو طرز مرصع کو متعدد نسخوں سے

ترتیب دے کر ۱۹۵۸ء میں الہ آباد سے شائع کیا۔ اٹھارہویں صدی کے آخر کی دوسری دو داستانیں جو ایک زمانے میں چھپی تھیں لیکن اب کم یاب تھیں انھیں دو مرتبین نے از سر نو مرتب کر کے شائع کیا۔ ڈاکٹر سلیمان حسین نے ہر چند کھتری کی نو آئین ہندی کو لکھنؤ سے ۱۹۸۸ء میں اور ڈاکٹر عبدالرؤف نے شاہ حسین حقیقت کی جذب عشق کو لکھنؤ ہی سے ۱۹۹۲ء میں۔ سلیمان حسین نے مصنّف کی سوانح عمری اور تاریخ تصنیف کے بارے میں مفید معلومات بہم پہونچائیں فورٹ ولیم کالج کی بہت سی کتابوں کی پاکستان میں تدوین کی گئی۔ اس شعبے میں مجلس ترقی ادب لاہور نے خصوصی کارگذاری کی۔ مرتبین میں خلیل الرحمٰن داؤدی اور عبادت بریلوی قابل ذکر ہیں۔ ان کاموں کی فہرست معین الدین عقیل کی کتاب کے ص ۶۲ پر دیکھی جا سکتی ہے۔ وقار عظیم نے گلکرسٹ کی نقلیات کے پہلے حصّہ کو ۱۹۶۹ء میں مرتب کیا۔ بعد میں عبادت بریلوی نے اس کی دو جلدوں کو لاہور سے ۱۹۷۹ء میں شائع کیا۔

دہلی میں ۱۹۹۲ء میں رشید حسن خاں نے باغ و بہار کو جس انداز سے ترتیب دیا وہ تدوین کے عروج کا بلند ترین نقطہ ہے۔ چند الفاظ یا سطور میں اس کی خوبیاں شرح نہیں کی جا سکتیں۔ ڈاکٹر معین الحق نے اخبار رنگین کو اپنے مقدمے کے ساتھ ترتیب دیا (کراچی ۹۲ء) خلیل الرحمان داؤدی نے ہیجور کی نو رتن کو ۱۹۶۲ء میں شائع کیا۔ ہیجور کی گلشن نو بہار انیسویں صدی میں چھپ کر نایاب ہوگئی تھی۔ میں نے نذر حمید میں اس پر مفصل مضمون لکھا تھا۔ ڈاکٹر سلیمان حسن نے اسے از سر نو ترتیب دے کر ۱۹۵۸ء میں لکھنؤ سے شائع کیا۔ سرور کی فسانۂ عجائب کی کئی اچھی تدوینات ہوئیں۔ اطہر پرویز نے الہ آباد سے ۱۹۶۹ء میں اور سلیمان حسین نے لکھنؤ سے ۱۹۸۱ء میں۔ لیکن اس کا حرف آخر رشید حسن خاں نے لکھا جن کی ترتیب فسانۂ عجائب دہلی ۱۹۹۰) اسی طرح ہوش ربا ہے جیسے اس کے بعد کی باغ و بہار کی۔ ان دو تدوینات کی بدولت رشید حسن خاں اردو نثر کے خدائے تدوین ہو گئے ہیں۔ آغا سہیل نے سرور کی کم یاب سرور سلطانی ۱۹۷۲ء میں شائع کی۔

ڈاکٹر ارجن کنول نے منشی گمانی لال کی ریاض دلربا تصنیف (۱۲۴۸ھ / ۱۸۳۲ء) کو مرتب کر کے دہلی سے ۱۹۸۹ء میں شائع کیا۔ وہ اسے ناول قرار دیتے ہیں لیکن میری رائے میں یہ داستان ہی ہے۔ اردو کا پہلا سفر نامہ یوسف خاں کمبل پوش کے عجائبات فرنگ (طبع ۱۸۴۷ء) کو سمجھا جاتا ہے۔ تحسین فراقی نے اسے ایک نہایت معلوماتی مقدمے، حواشی اور تعلیقات کے ساتھ لاہور ۱۹۸۳ء میں شائع کیا۔ ڈاکٹر افضل اقبال نے محمد مہدی واصف کی حکایات لطیفہ کی حیدرآباد سے ۱۹۹۳ء میں اشاعت کی۔ ان کے مطابق یہ مجموعہ پہلی بار مدراس سے ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا تھا لیکن زبان کے اعتبار سے مجھے یہ بہت فرسودہ معلوم ہوتا ہے۔

غالب کی نثر کی بہت سی تدوینیں ہوئیں ان میں خلیق انجم کی غالب کی نادر تحریریں (۶۱ء) اور خلیل الرحمان داؤدی کی مجموعۂ نثر غالب (۱۹۶۷ء) شامل ہیں۔ داؤدی کا ایڈیشن تحقیق کے جملہ تقاضوں کے مطابق تیار کیا گیا ہے لیکن مجھے یہ واضح نہیں کہ اس میں خطوط شامل ہیں کہ نہیں۔ خطوط کے مجموعوں میں آفاق حسین کی نادراتِ غالب (کراچی ۴۹ء) اہم ہے کہ اس میں غالب کے بیشتر کے دو مجموعوں کے علاوہ خطوط ہیں۔ غلام رسول مہر کا مجموعہ خطوط غالب (لاہور ۵۱ء) بھی اہم ہے۔ غالب کے جملہ مکاتیب کی بہترین تدوین خلیق انجم نے اپنے مجموعے غالب کے خطوط چار جلدیں کی۔ اس کی جلد اول دہلی سے ۸۴ء میں اور جلد سوم ۸۷ء میں شائع ہوئی۔ یہ ایک طرح سے کلیات خطوط غالب ہے۔ قاضی عبدالودود نے برہان قاطع کے قضیے سے متعلق قاطع برہان اور رسائل متعلقہ ۱۹۶۸ء میں شائع کی۔ وعدہ تھا کہ دوسری جلد میں اس کے حواشی ہوں گے لیکن وہ کبھی سامنے نہ آسکی۔

اس دور میں قدیم ڈراموں کی بھی تدوین کی گئی ہے۔ مسعود حسن رضوی نے ۱۹۵۷ء میں لکھنؤ کا شاہی اسٹیج میں واجد علی شاہ کا ڈرامہ رادھا کنہیا کا قصہ پیش کیا اور اگلے سال لکھنؤ کا عوامی اسٹیج میں امانت کی اندر سبھا کی تدوین کی حیدرآباد کے ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال نے کیپٹن گرین آرسے کا ڈرامہ علی بابا چالیس چور جنوری ۱۹۸۲ء میں شائع کیا یہ اصلاً ۱۸۵۶ء میں مدراس سے شائع ہوا تھا۔ امتیاز علی تاج نے متعدد ڈراما نگاروں کے ناٹکوں میں سلیقے سے تدوین کی۔ واجد علی شاہ نے کلکتے سے اپنی بیگم ممتاز جہاں زینت محل کو جو خطوط لکھے تھے۔ اس کا مجموعہ تاریخ ممتاز کے نام سے برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ ڈاکٹر محمد باقر نے اسے اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کر دیا (لاہور ۱۹۵۲ء) شیخ اسمٰعیل پانی پتی نے سر سید کی جملہ تحریروں کو مجلس ترقی ادب لاہور کے لئے تقریباً ۲۲ جلدوں میں ترتیب دیا۔ اس میں مقالات، خطبات، مکاتیب اور سفر نامے شامل ہیں۔ غالباً آثار الصنادید اس میں نہیں ہے۔ ڈاکٹر

ڈاکٹر وحید قریشی نے مقدمۂ شعر و شاعری کو اس خوبصورتی سے مزین کیا کہ اس کے جملہ مآخذ کی نشاندہی کر کے تنقید کو تحقیق بنا دیا (لاہور [redacted] ند حسین آزاد نے انگریزوں کی ایماء پر ۶۶ - ۱۸۶۵ء میں [redacted] سی نوعیت کا دورہ کیا تھا۔ آغا محمد اشرف نے انڈیا آفس [redacted] دستاویزوں کی مدد سے اسے ایک سفرنامے کی شکل دی (کراچی [redacted] ر نے مقالات آزاد کی دو جلدیں ۱۹۷۸ء میں مرتب کیں۔ مظفر [redacted] کلیاتِ مخطوطاتِ اقبال بھی خاصے کی چیز ہے۔ اسکی کئی جلدیں آچکی ہیں۔

چکبست کے مضامین کا ایک مجموعہ مضامین چکبست [redacted] ہر کالی داس گپتا رضا نے دوسرے مضامین جمع کر کے مقالاتِ چکبست [redacted] (بمبئی جنوری ۱۹۸۳ء) عبدالواحد معینی نے لاہور سے مقالاتِ [redacted] شائع کئے منشی احمد دین نے اقبال پر ایک کتاب [redacted] کا بہت سا کلام لے کر اس طرح ترتیب دیا کہ دونوں ایڈ [redacted] (کراچی ۷۹ء) مالک رام نے مولانا ابوالکلام آزاد کی کئی تصانیف کو اس [redacted] مرتب کیا کہ وہ اردو کی بہترین تدوینوں کے ذیل میں آتی ہیں۔ ان [redacted] ۶۷ء تذکرہ ۶۸ء اور خطبات آزاد ۷۴ء شامل ہیں۔ غبار خاطر کے حواشی ۱۲۰ صفحات پر اور تذکرہ کے ۲۰۳ صفحات پر ہیں۔

تذکرے ۔ میں نے نثر کی تدوین میں [redacted] وڑ دیا۔ اور انہیں علیحدہ زمرے میں درج کرنا چاہتا تھا۔ ان کی محض فہرست [redacted] ہوں۔ عام طور سے ان کے سنہ تصنیف کے اعتبار سے پیش کر رہا ہوں۔

محمود الٰہی : نکات الشعراء از میر لکھنؤ ۷۲ء۔ [redacted] : تحفۃ الشعرا از افضل بیگ قاقشال۔ حیدرآباد ۱۹۶۱ء۔ اقتدا حسن : [redacted] ات از قائم لاہور ۶۶ء۔ نثار احمد فاروقی : تین تذکرے [redacted] شعرا، کمال کے مجمع الانتخاب اور مبتلا و عشق کے طبقاتِ سخن [redacted] ۱۹۶۹ء۔ انھوں نے طبقاتِ سخن مکمل لاہور سے ۱۹۶۸ء میں [redacted] : تذکرۂ میر حسن لکھنؤ ۷۹ء۔ کلیم الدین احمد : دو تذکرے (شورش اور [redacted] جلد اول ۵۹ء۔ جلد دوم ۶۳ء۔ محمود الٰہی : رموز الشعراء یعنی شور [redacted] لکھنؤ ۸۴ء قاضی عبدالودود : تذکرہ مسرت افزا از امر [redacted] ۵۵-۵۴ء۔ مسعود حسن رضوی : گلشن سخن۔ از مبتلا لکھنؤ ۶۵ء۔ اکبر حیدری [redacted] ہندی گویان از مصحفی لکھنؤ ۸۰ء۔ خواجہ احمد فاروقی : عمدۂ منتخبہ از اعظم الدولہ [redacted] دہلی ۶۱ء۔

مختار الدین احمد : گلشن ہند از حیدری۔ رسالہ اردو ادب ۶۶ء۔ شمارہ ۳۔ کتابی شکل میں دہلی ۶۸ء۔ عبادت [redacted] شن ہند از حیدری کراچی ۶۸ء۔ نور الحسن نقوی : خیار الشعرا از خوب چند [redacted] غیر مطبوعہ۔

رام بابو سکسینہ : مرثیۂ شعرا دہلی ۵۶ء۔ نسیم اقتدار علی۔ طبقات سخن از مبتلا و عشق لکھنؤ ۹۱ء۔ مختار [redacted] تذکرہ آزردہ، رسالہ تحریر دہلی ۶۰ء کتابی شکل میں کراچی ۷۴ء۔ کلیم [redacted] : دیوان جہاں پٹنہ ۵۹ء۔ قاضی عبدالودود : تذکرہ ابن امین طوفان [redacted] ۵۱ء۔ فائق : گلشن بے خار از شیفتہ ۷۲ء۔ انسر صدیقی امروہوی : [redacted] شعرا۔ از عنایت حسین خاں مہجور کراچی ۷۶ء اسلم فرخی : گلشن ہمیشہ بہار : [redacted] نصر اللہ خاں خویشگی کراچی ۶۷ء۔ مشفق خواجہ خوش معرکۂ زیبا۔ از ناصر لاہور ۷۰ء [redacted] شمیم انہونوی لکھنؤ ۷۱ء، نعیم احمد : بہار بے خزاں از احمد حسن سحر دہلی [redacted] یہی از حفیظ عباسی دہلی ۶۹ء، سلیمان حسین تلخیص، سراپا سخن از محسن لکھنؤ [redacted] سن لاہور ۷۰ء رئیس الدین : منتخب التذکرہ از جنیے جیے ترا [redacted] ۔ مالک رام نسخۂ دلکشا از ارمان رسالہ تحریر اکتوبر ۶۹ء۔

خلیل الرحمان داؤدی : [redacted] سخن از قادر بخش صابر لاہور ۶۶ء۔ مرتضیٰ حسین فاضل : ریاض [redacted] محمد حسین خاں شاہجہانپوری لاہور ۶۸ء انصار اللہ : قطعۂ منتخب از [redacted] ۶۹ - ۶۸ء۔ خلیل الرحمان داؤدی : بہارستان ناز از فصیح الدین رنج۔ مسعود حسن رضوی : تذکرہ نادر لکھنؤ ۵۷ء۔ انسر امروہوی : عروس الاذکار از [redacted] نقش کراچی ۷۵ء۔ فرمان فتحپوری : ارمغان گوکل پرشاد۔ رسالہ اردو کراچی [redacted] ، شمارہ ۱، ۲۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے نقوش [redacted] میں تذکرۂ بے جگر کا مفصل تعارف کرایا۔ وحید قریشی اسے مرتب [redacted] لے تھے معلوم نہیں کیا کہ نہیں کتابیات وحید اسلام آباد ۱۹۸۶ [redacted] س کا ذکر نہیں۔ واضح ہو کہ بیشتر صورتوں میں مرتبین نے تدوین کا [redacted] نہیں کیا۔ محض ایک مختصر مقدمہ لکھنے کو کافی سمجھ لیا۔ کوئی حاشیہ نگاری نہیں [redacted] دہی میں بڑے بڑے عمائد شامل ہیں۔ اقتدا حسن کے تذکرۂ قائم [redacted] مشفق خواجہ کے خوش معرکۂ زیبا جیسی تدوین بہت کم لوگوں نے کی ہے۔ میں یہ بھی واضح کر دوں کہ میں نے اس فہرست میں وہ تذکرے شامل نہیں کئے جو تقسیم ملک کے بعد لکھے گئے کیونکہ وہ تصنیف ہیں تدوین نہیں [redacted] کے پیش نہ تذکرہ کروں

کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ یعنی

تلامذۂ غالب طبع اول نکودر ۵۸ء، اضافہ شدہ طبع دوم دہلی ۸۴ء۔ تذکرۂ معاصرین دہلی جلد اول ۷۲ء، دوم ۷۶ء، سوم ۷۸ء، چہارم ۸۲ء، تذکرۂ ماہ و سال دہلی ۹۱ء۔

ادبی شخصیات۔

ادیبوں پر کتابیں بھی بڑی تعداد میں ہیں۔ اس کی ایک وجہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے مقالے ہیں جن میں اکثر حیات اور کارناموں کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ بیشتر مقالے شائع نہیں ہو پاتے لیکن شائع شدہ مقالوں کی تعداد بھی ہوشربا ہے۔ شخصیات پر اعلیٰ درجے کے کام بھی اتنے زیادہ ہیں کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کا نام لوں اور کسے چھوڑ دوں۔ مجبوراً چند نام پیش کر رہا ہوں جن میں سے بیشتر ایسے ہیں جنھوں نے اس ادیب کی تحقیق کو نیا موڑ دیا ہے محض نام ملاحظہ ہوں۔

وحید مرزا: امیر خسرو ۴۹ء۔ صفدر آہ: امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر بمبئی ۶۶ء۔ ظ انصاری: ابوالفیض سحر، خسرو شناسی ۷۵ء۔ نارنگ: امیر خسرو کا ہندی کلام مع نسخۂ برلن ذخیرہ اسپرنگر دہلی ۸۷ء۔ حفیظ قتیل: معراج العاشقین کا مصنف حیدرآباد ۶۸ء۔ محمد نورالدین سعید: خواجہ بندہ نواز سے منسوب دکنی رسائل، بنگلور غیر مطبوعہ۔ حسینی شاہد: سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ حیدرآباد ۷۳ء۔ ظہیرالدین مدنی: ولی گجراتی بمبئی ۵۰ء۔ وحید قریشی: میر حسن اور ان کا زمانہ لاہور ۵۹ء۔ عابد پشاوری: انشاء اللہ خاں انشا لکھنؤ ۸۵ء، مسعود حسن رضوی: سلطان عالم واجد علی شاہ لکھنؤ ۷۶ء، مالک رام: فسانۂ غالب دلی ۷۷ء۔ حنیف نقوی: غالب احوال و آثار لکھنؤ ۹۰ء، ڈاکٹر معین الرحمان: غالب کا علمی سرمایہ لاہور ۸۹ء۔ مسعود حسن رضوی: آب حیات کا تنقیدی مطالعہ لکھنؤ۔ طبع اول ۵۳ء، دوم ۹۴ء، قاضی عبدالودود: آزاد بحیثیت محقق نوائے ادب ۵۶ء، کتابی شکل میں پٹنہ ۸۴ء۔ ڈاکٹر محمد صادق: محمد حسین آزاد، احوال و آثار لاہور ۷۶ء۔ اسلم فرخی: محمد حسین آزاد کراچی ۶۵ء۔ عابد پشاوری: ذوق اور محمد حسین آزاد، دہلی ۸۷ء۔ عبدالمجید سالک: ذکر اقبال لاہور ۵۵ء۔ نیتر وحیدالدین: روزگار فقیر لاہور جلد اول ۵۱ء، دوم ۶۴ء، خالد نظر صوفی: اقبال درون خانہ لاہور ۷۱ء۔ رفیع الدین ہاشمی: تصانیف اقبال تحقیقی اور توضیحی مطالعہ لاہور ۸۲ء۔ جاوید اقبال: زندہ رود (سوانح اقبال) لاہور۔

افراد پر متعدد دوسرے مقالے اتنے ہی اچھے ہیں جتنے مندرجہ بالا۔ میرے پاس اس کا جواب نہیں ہے کہ میں نے ان پر مندرجہ بالا کتب کو کیوں ترجیح دی۔ مفرد شخصیات پر مقالات کے مجموعے بھی بیش بہا تحقیق کے حامل ہوتے ہیں ان میں دو زمرے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ۱ رسالوں کے خاص نمبر ۲ ارمغانی جلدیں۔ اول الذکر کی بہترین مثال نقوش لاہور، افکار کراچی، اردو کراچی، اردو ادب، شاعر کے شمارے اور کتاب نما دہلی کے گوشے ہیں۔ ارمغانوں کے معاملے میں مالک رام معیار ساز ہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی اسی انداز کی یادگاری جلدیں تیار کرنی چاہیں لیکن مولوی مدن کی سی بات کہاں۔ یادگاری جلدوں میں ایک وہ ہیں جن میں دو تین مضمون متعلقہ شخصیت پر اور بقیہ تمام اس کی دلچسپی کے موضوعات پر ہوتے ہیں۔ دوسری قسم وہ ہے جس میں جملہ مضامین متعلقہ شخصیت کے بارے میں ہوتے ہیں۔ تحقیقی معلومات کے لحاظ سے موخر الذکر زیادہ کارآمد ہے۔

محققوں کے تحقیقی مضامین کے مجموعوں میں بھی مختلف موضوعات پر اتنی ہی بیش بہا معلومات ملتی ہیں جتنی مستقل کتابوں میں۔ رواج عام ہے کہ بیشتر محققین رسالوں میں منتشر اپنے مضامین کی کتابی شکل میں شیرازہ بندی کر دیتے ہیں۔ اس وجہ سے اہم اور غیر اہم، معروف اور غیر معروف ادیبوں کے مجموعوں کی تعداد سیکڑوں میں ہے۔ ان مجموعوں میں کچھ مضامین تحقیقی ہوتے ہیں تو کچھ دوسرے تنقیدی۔ بعض مضامین تحقیقی اعتبار سے بہت بلند ہوتے ہیں۔ دوسرے نسبتاً کم تر۔ محقق کے نقطۂ نظر سے مستند محققین کے مجموعے ہی زیادہ اہم اور معتبر ہیں۔ چند ناقابل ذکر مجموعے:

مقالات حافظ محمود شیرانی غالباً سات جلدیں لاہور ۶۶ کے قریب مولوی عبدالحق: قدیم اردو کراچی ۶۱ء۔ قاضی عبدالودود: عیار ستان پٹنہ ۷۵ء، اشتر و سوزن ۶۴ء۔ مالک رام: تحقیقی مضامین دہلی ۸۴ء۔ خواجہ احمد فاروقی: ذوق و جستجو لکھنؤ ۶۷ء، چراغ رہ گذر دہلی ۷۴ء۔ مختارالدین احمد (مرتبہ) احوال غالب علی گڑھ ۵۲ء۔ گیان چند: حقائق ۷۸ء، کھوج ۹۰ء، پرکھ اور پہچان ۹۰ء۔ وحید قریشی: کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ لاہور ۶۵ء، مقالات تحقیق لاہور ۸۸ء۔ کالی داس گپتا رضا: سہو و سراغ بمبئی ۸۰ء، رشید حسن خاں، ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ علی گڑھ ۷۸ء۔ اکبر حیدری: تحقیق و انتقاد، سری نگر ۶۶ء تحقیقی جائزے جلد اول، سری نگر ۶۸ء مقالات حیدری لکھنؤ، ۱۹۸۴ء

نثار احمد فاروقی: دید و دریافت ۱۹۶۴ء ، دارالادب دہلی ۱۹۷۸ء۔ مشفق خواجہ: تحقیق نامہ لاہور ۱۹۹۱ء۔ نور السعید اختر: نقوش [illegible] ۱۹۹۳ء۔ نجم الاسلام: مطالعات حیدرآباد سندھ ۱۹۹۰ء۔ گوہر نوشاہی: تحقیق زاویے، اسلام آباد ۱۹۹۱ء۔ حنیف نقوی: تلاش و تعارف، لکھنؤ ۱۹۸۰ء۔ [illegible] تلاش و تحقیق لکھنؤ ۱۹۸۹ء، مقالات و نشریات ۱۹۹۴ء۔ محمد علی اثر: [illegible] تحقیق و تنقید حیدرآباد ۱۹۸۸ء، تحقیقی نقوش حیدرآباد ۱۹۹۴ء۔

قابلِ ذکر مجموعے اور بھی ہوں گے لیکن فی الوقت وہ میرے [illegible] نہیں۔

ادبی تاریخیں

اس دور میں تو تاریخ ادب بھی بکثرت [illegible] اردو اور انگریزی میں لکھی جانے والی مجموعی تاریخیں یہ ہیں۔ مخمور اکبرآبادی [illegible] تاریخ ادب اردو [illegible] ء۔ یہ تحقیق کے لحاظ سے قابل ذکر نہیں۔ تنقید پر [illegible] نے ہمت کر کے بڑے بڑوں کی شاعری کو رد کر دیا ہے۔ محمد یحییٰ تنہا [illegible] ضخیم سیر المصنفین [illegible] دو جلد لاہور (۱۹۴۹ء اور ۱۹۵۰ء) تحقیق میں کوئی اضافہ نہیں کرتی لیکن تنقید میں اس کا تہور مخمور سے بھی زیادہ ہے۔ جدید ، افادی [illegible] نقطہ نظر [illegible] کر بیشتر شعراء کی شاعری کو بے سود قرار دیتے ہیں۔ [illegible] تاریخ ادب اردو حصہ اول (کراچی ۱۹۶۱ء) محض ۱۷۰۰ء تک کے ادب [illegible] پر [illegible] ہے۔ اسے پانچ مضمون نگاروں نے لکھا ہے۔ ان میں [illegible] مرزا کی [illegible] باب تحقیقی اعتبار سے بہت اعلا ہیں۔ علی گڑھ [illegible] تاریخ ادب ۱۹۶۲ء میں آئی یہ تحقیقی معلومات کا گنجینہ ہے۔ گو بعض جگہ [illegible] آگئیں۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور کی تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند [illegible] تا ۱۰ اردو ادب کے بارے میں ہیں (لاہور ۱۹۷۱ء - ۷۲) [illegible] کا اشاریہ ہے۔ یہ پورے اردو ادب کی سب سے ضخیم اور مکمل تاریخ [illegible] میں بعض مضامین بہت عمدہ ہیں۔ بعض اوسط درجے کے اور بعض [illegible] سے قدرے کم۔

ڈاکٹر ملک حسن اختر کی تاریخ ادب اردو [illegible] ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی ضخامت ۱۲۰۰ صفحات ایک جلد میں۔ اس [illegible] تحقیق سے کام نہیں لیا گیا۔ ڈاکٹر محمد انصار اللہ کی تاریخ اقلیم ادب کا [illegible] ۱۹۷۹ء میں اور دوسرا ۱۹۸۰ء میں علی گڑھ سے شائع ہوا۔ یہ احمد شاہ کے [illegible] میں بعض اوقات بہت مفید معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں لیکن ان [illegible] پرستی نے توازن کو نقصان پہنچایا ہے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین کی مختصر تاریخ ادب [illegible] میں ڈاکٹر محمد عقیل رضوی نے نہ صرف ترمیمات کیں بلکہ معتد بہ اضافے کر کے حال تک لے آئے ہیں (الٰہ آباد ۱۹۸۴ء) درسی تاریخوں میں یہ بہترین ہے گو سنین کے معاملے میں دوسری تاریخوں کی طرح غیر معتبر ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو کی جلد اول لاہور میں ۱۹۷۵ء میں اور جلد دوم کے دو حصے ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئے ابھی یہ اٹھارہویں صدی کے آخر تک پہونچی ہے۔ یہ بالیقین اردو کی بہترین تاریخ ہے۔ جو تحقیق و تنقید دونوں اعتبار سے اعلیٰ ہے۔ تنہا یہی تاریخ ہے جس کے سنین پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔

انگریزی میں لکھی دو تاریخیں اچھی ہیں۔ ڈاکٹر محمد صادق کی تاریخ ادب اردو کی طبع اول لندن سے ۱۹۶۴ء اور اضافہ شدہ طبع دوم ۱۹۸۴ء میں ہوئی۔ تحقیقی مواد کے لحاظ سے اہم نہیں لیکن ادب اور سماج کی طرف ان کا صالح نقطۂ نظر اور جرأت اظہار قابل داد ہے۔ علی جواد زیدی کی تاریخ ساہتیہ اکادمی دہلی سے ۱۹۹۳ء میں شائع ہوئی۔ یہ تحقیق و تنقید دونوں کے اعتبار سے مفید ہے لیکن سنین کے معاملہ میں کمزور ہے۔

یہ تو ہوئیں عمومی تاریخیں لیکن اتنی ہی اہم ہیں محدود تاریخیں جو کسی علاقے صنف ، دبستان یا گروہ وغیرہ کا احصار کرتی ہیں ان کے نام میرے مضمون کتابیات تحقیق رسالہ اکادمی لکھنؤ جولائی تا اکتوبر ۱۹۹۰ء میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ زیر نظر مضمون میں صفحات کی تحدید کے سبب میں ان کا ذکر قطع کرتا ہوں۔ اس طرح کتب خانوں کی فہرستوں سے زیادہ اہم ہیں۔ وہ فہرستیں جو کسی خاص ذخیرے سے متعلق نہیں مثلاً انجمن ترقی اردو پاکستان کی قاموس الکتب جن کی تین جلدوں کی اشاعت کا مجھے علم ہے۔ مشفق خواجہ کی جائزۂ مخطوطات اردو جلد اول لاہور ۱۹۷۹ء۔ سلیم اختر: کتابیات تحقیق و تنقید جو پاکستان میں ۱۹۴۷ء اور ۱۹۷۲ء کے بیچ شائع ہونے والی کتابوں کے بارے میں ہے۔ محمد علی اثر: دکنی اور دکنیات حیدرآباد ۱۹۸۲ء۔ معین الدین عقیل کا ہے بے نظیر کارنامہ پاکستان میں اردو تحقیق (کراچی ۱۹۸۷ء) بھی بنیادی حیثیت سے کتابوں کی فہرست میں ہے۔

فن تحقیق پر بہت سے مضامین لکھے گئے اور ان کے مجموعے مرتب کئے گئے۔ ان سے اہم ترین اس فن کی مستقل کتابیں ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

خلیق انجم: فنی تنقید دلی ۱۹۶۷ء۔ عبدالرزاق قریشی: مبادیات تحقیق بمبئی ۱۹۶۸ء۔ تنویر علوی: اصول تحقیق و ترتیب متن دلی ۱۹۷۷ء۔ کلب عابد: مبادی التحقیق علی گڑھ ۱۹۷۸ء۔ گیان چند: تحقیق کا فن ، لکھنؤ ، ۱۹۹۰ء

ڈاکٹر تبسم کاشمیری: ادبی تحقیق کے اصول، اسلام آباد ۹۲ء۔

میرا خیال ہے کہ میری ضخیم کتاب تحقیق کا فن اس موضوع پر سب سے زیادہ جامع اور مکمل ہے۔

متعدد اچھے مقالے ابھی تک شائع نہیں ہو سکے جس کی وجہ سے وہ زمین میں مدفون خزینے کی طرح رہ گئے ہیں۔ فی زمانہ تحقیق کے بہت زیادہ کام سامنے آرہے ہیں۔ شاید پاکستان میں ہندوستان سے بھی زیادہ ان میں منتخب اور بہتر کاموں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے جنھیں دیکھ کر میں مطمئن اور رجائی ہو جاتا ہوں۔ مجھے ساقط الیعار کاموں سے کیا لینا دینا۔ اردو تحقیق کے چار ستونوں یا عناصر خمسہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ میری گستاخی معاف کی جائے تو میں کہوں گا کہ ہمارے دور میں بھی ایسے پختہ کار محقق موجود ہیں جن کے ہاتھ پر بیعت کی جا سکتی ہو۔ جنھیں بدرقہ بنا کر ان کے پیچھے چلا جا سکتا ہے۔

میں یہ اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ موجودہ تحقیق کو قاضی عبدالودود نے جس طرح متاثر کیا ہے اور اسے ایک جہت دی ہے ویسا کسی دوسرے نے نہیں کیا ان کے سچے جانشین ہیں رشید حسن خاں۔ انھوں نے بھی تحقیق کو یقیناً متاثر کیا ہے اور ایک راہ دکھائی ہے۔ میں انھیں سرآمدِ محققین سمجھتا ہوں اور نسبتاً کم عمر محققین میں ڈاکٹر حنیف احمد نقوی کی پختہ کاری بڑے بڑوں کے کاموں پر جشمک زن ہے۔ عابد پشاوری نے قاضی عبدالودود اور رشید حسن خاں کی طرح تصحیحی تحقیق کے ذریعہ بہت کچھ اصلاح کی ان کی۔ زرتی۔ اور محمد حسین آزاد نے جس طرح آبِ حیات کی قلعی کھولی ہے اس سے اتفاق کرتے ہی بنتا ہے۔ کالی داس گپتا رضا کی غالبیات میں جو نظر ہے وہ مرحوم ماہرین سے کم نہیں۔

پاکستان میں سخاوت مرزا، افسر صدیقی امروہوی، کلب علی خاں فائق وغیرہ ہم سے جدا ہو گئے، لیکن جمیل جالبی اور مشفق خواجہ جیسے محققین پر ایمان لاتے ہی بنتا ہے۔ یہاں بھی اطناب کے خوف سے دوسرے کئی مستند محققوں کے نام مقتدر رکھنے پر مجبور ہوں۔ ان میں کئی ایسے نام ہیں جن کا میں احترام کرتا ہوں اور جن کا ذکر نہ کرنے پر میرا دل خون ہے۔

یہ مضمون تحقیق کی ایک تشنہ و نامکمل کہانی ہے۔ میرے اندازے کے مطابق اردو تحقیق کی تاریخ بیان کرنے کو دس جلدیں درکار ہیں جو اگر دس محققوں کے سپرد کی جائیں تو تین سال میں لکھی جا سکتی ہیں۔ اتنے بحر ذخار کو ایک رسالے کے مضمون میں کس طرح اسیر کیا جا سکتا ہے۔ مجھے نصف جھلک پر قناعت کرنی پڑی ہے۔ ■■

عمارت

فلک شگاف بلندی'
حسین محرابیں
نقوش ایسے کہ آزر کو رشک آجائے
یہ سنگ و خشت میں ملبوس آہنی پیکر
سلام کرتے ہیں طوفان جس کو صبح و شام
میں اس مکان کی چھت پر کھڑا یہ سوچتا ہوں

ہزار پختہ عمارت ہو ـــــــ
ایک دن اس میں
دراڑ پڑتی ہے، ہلتی ہیں اس کی بنیادیں
زمین چھونے کو جھکتی ہیں اس کی محرابیں
□□

رفعت سروش

اے ۱۸۰، سیکٹر ۲۰
نوئیڈہ
۲۰۱۳۰۱

کالی داس گپتا رضا
۴۲ اے ۔ جل درشن ۔ نیپین سی روڈ
بمبئی ۴۰۰۰۳۶



غالبؔ از مہر

تمہیں معلوم کہ جناب غلام رسول مہرؔ کی مشہورزمانہ تصنیف "غالبؔ" پہلے پہل کب شائع ہوئی۔ تاہم مصنف کی 'تمہید' (مورخہ ۱۰ر مئی ۱۹۳۶ء) اور 'تقریب' از مولانا عبدالمجید سالکؔ مرحوم (مورخہ یکم جون ۱۹۳۶ء) سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سال اشاعت ۱۹۳۶ء ہی ہوگا۔ مہر صاحب کے ایک دوست جناب عبدالرشید راحلؔ نے کتاب کے پہلی مرتبہ چھپنے پر ایک قطعہ تاریخ کہا تھا جسے مہرؔ صاحب نے چوتھے ایڈیشن کے پیش لفظ میں شامل کیا ہے اس سے یہی ثابت ہوتا ہے ؎

جامے بدہ ز بادۂ غالبؔ بہ لطفِ خاص
جانم فدائے لطف تو ساقیٔ مہر چہر

زیں بعد گو بہ حضرت مہر ایں پیامِ من
دل را بہ دل رہیست دریں گنبدِ سپہر

در ذیرِ چرخ راحلِ سرمست را بہ است
جامے ز دستِ ساقی و غالب ز کلکِ مہرؔ[۱]

۱۳۵۵ھ

۱۳۵۵ھ مطابق ہے ۲۵ر مارچ ۱۹۳۶ء تا ۱۴ر مارچ ۱۹۳۷ء کے۔
جناب مہرؔ تحریر فرماتے ہیں :

"غالبؔ کی تصانیف کے غائر مطالعہ کے بعد 'یادگارِ' کا مطالعہ کیا جائے تو کئی مقامات پر دل اثر قبول کرتا ہے کہ اس کتاب کی ترتیب کے وقت غالبؔ کی تمام تحریرات خواجہ مرحوم کے پیشِ نظر نہ تھیں لہٰذا ان (حالیؔ) سے بعض حیرت انگیز سہو سرزد ہوئے جن کی تفصیل آپ کو آئندہ صفحات میں ملے گی۔"

اس بیان کے بعد یہی امید کی جاسکتی ہے کہ مہرؔ صاحب نے غالبؔ کی تمام "تحریرات" کے پیشِ نظر ہی یہ کتاب لکھی ہوگی اور ان سے "سہو سرزد" نہ ہوئے ہوں گے۔ خاص کر اس حالت میں کہ اس کتاب کے چار ایڈیشن نکل چکے ہوں ـــ مگر حقیقت یہ ہے کہ چار ایڈیشن نکل چکنے کے بعد بھی جناب مہرؔ سے حیرت انگیز سہو سرزد ہوئے ہیں تحقیق میں مصنف کی زندگی میں شائع ہونے والا آخری ایڈیشن ہی معتبر ترین ایڈیشن سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح میں نے 'غالبؔ' کے پہلے تین ایڈیشنوں (اگرچہ یہ تمام میرے کتب خانے میں موجود ہیں) سے صرف نظر کر کے چوتھے ایڈیشن ہی کو پیش نظر رکھا ہے۔

یہ ایڈیشن شیخ مبارک علی تاجر کتب، لاہور کی فرمائش پر عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور سے چھپا تھا۔ اس پر بھی سال اشاعت درج نہیں ہے۔ البتہ مصنف نے اپنا ایک صفحے کا پیش لفظ ۱۴ر ستمبر ۱۹۴۶ء کو لکھا تھا اور آخری صفحہ پر دسمبر ۱۹۴۶ء درج ہے۔ کل صفحات ۴۸۰ ہیں۔ سرورق کے فوراً بعد "فہرستِ ابواب" کے نیچے ایک نوٹ ہے اسے پہلے لاحظہ کر لیجیے :

نوٹ : غالبؔ کی جن تصانیف کے حوالے کتاب میں دیئے گئے ہیں ان کے ایڈیشنوں کی تفصیل یہ ہے :

(۱) کلیات نظم فارسی ۔ نول کشور ۱۸۹۳ء
(۲) کلیات نثر فارسی ۔ مطبوعہ نول کشور ۱۸۸۴ء
(۳) اردوئے معلّیٰ مطبوعہ فاروقی ۱۳۳۶ھ
(۴) عود ہندی مطبوعہ نول کشور جولائی ۱۹۰۰ء

کتاب کا جائزہ لیتے ہوئے یہ چاروں ماخذ میرے پیش نظر ہیں ذیل میں صفحہ نمبر غالب از مہر کے چوتھے ایڈیشن کا صفحہ نمبر ہے،

(ص ۴): "........ ۱۸۵۰ء تک غالب عرشہ [مرزا نوشہ] سے متنفر ہو چکے تھے .... جب شباب کی رنگینیوں اور عامیانہ آرائش جوئیوں کا دور گزر گیا اور تصنیف میں متانت و ثقاہت پیدا ہو گئی تو عرف سے عار آنے لگی۔"

یہ درست نہیں کیوں کہ انھوں نے اپنے دیوانِ اُردو کے دیباچے میں عرف آخر تک ترک نہیں کیا تھا۔ حالانکہ ان کی زندگی میں اس کے پانچ ایڈیشن ان کے زیر نگرانی شائع ہوئے۔ اس وقت دیوانِ غالب اُردو کا چوتھا ایڈیشن جو جون ۱۸۶۲ء میں مطبع نظامی کان پور سے چھپا تھا، میرے سامنے ہے۔ اس کے دیباچے کے آخر میں یہ لکھا ملتا ہے:

"اسد اللہ خاں موسوم بہ میرزا نوشہ معروف بہ غالب تخلص است۔"

(ص ۱۳) "غالب کز خاک پاک تورانیم"۔ غالب از ......" ہونا چاہیے۔ شاید سہو کاتب ہے۔

(ص ۲۹) "غالب عربی خاصی جانتے تھے"۔ یہ درست نہیں۔ عربی داں ماہر غالبیات کا کہنا ہے کہ غالب آخر تک عربی میں غلطیاں کرتے رہے۔

(ص ۳۲) "...... مرزا یوسف خاں ...... غالب سے دو برس چھوٹے تھے تیئس برس کی عمر میں دیوانگی کا عارضہ ہوا"۔ ۲۸ سال کی عمر میں کہنا چاہیے۔ پورا نام مرزا یوسف علی بیگ خاں تھا۔ مگر مرزا یوسف کے نام ہی سے جانے گئے

(ص ۳۳) "[مرزا یوسف کی صرف ایک لڑکی تھی] جس کی شادی میرزا علی بخش خاں رنجور (ابن نواب الٰہی بخش خاں معروف) کے صاحبزادے غلام فخر الدین کے ساتھ ہوئی تھی"

غالب اپنے ایک خط بنام شیفتہ میں (جو پنج آہنگ میں شامل ہے) لکھتے ہیں کہ مرزا علی بخش خاں جے پور سے بیمار آئے ہیں اور میرے پاس ہی رہ رہے ہیں۔ خط کی اصل عبارت یہ ہے:

"برادر بجاں برابر مرزا علی بخش خاں بہادر، رنجور از جے پور آمدہ، بہ کاشانۂ نامہ نگار طرحِ اقامت کردہ ..."

یہاں غالب نے 'رنجور' بمعنی 'علیل' استعمال کیا تھا مگر یار لوگوں نے اسے علی بخش خاں کے ساتھ جوڑ دیا۔ حالانکہ علی بخش خاں کا سرے سے شاعر ہونا ہی ثابت نہیں۔

(ص ۳۸) ذیلی سرخی ہے "علی بخش خاں رنجور"۔ یہاں 'رنجور' زائد ہے۔

(ص ۴۲) "اگر یہ کہا جائے کہ موجودہ ریاست الور کی تاسیس احمد بخش خاں ہی کی مساعی کا نتیجہ تھی تو یہ مبالغہ نہ ہوگا[۱] نواب موصوف نے لارڈ لیک کی معیت میں بڑی شان دار خدمات انجام دی تھیں، جن کی بنا پر انھیں علاقہ میوات میں فیروز پور جھرکہ کی ریاست مل گئی۔ لوہارو کا پرگنہ انھوں نے خود خرید لیا[۲] ......

...... احمد بخش خاں کی دو بیگمیں تھیں، ایک میواتی الاصل جس کا نام مدی بیگم عرف بہو بیگم تھا[۳]۔

ا۔ نہ صرف مبالغہ بلکہ غلط۔ ریاست پہلے ہی سے موجود تھی۔ نواب احمد بخش خاں نے صرف اتنا کام کیا کہ راؤ راجہ اور انگریزوں کے باہمی تعلقات کو خوش گوار اور استوار کر دیا۔

۲۔ لوہارو کا پرگنہ خریدا نہیں گیا تھا بلکہ یہ راؤ راجہ الور نے انھیں بطور انعام عطا کیا تھا۔

۳۔ اصل نام صرف مدی تھا جو موتی کی بہن تھی یہ دونوں بہنیں منسا رام کی بیٹیاں تھیں۔ مدی، احمد بخش خاں کی حرم تھی۔ کہا جاتا ہے کہ نواب نے آخر آخر میں شمس الدین خاں کو جائز وارث بنانے کے لئے مدی کو بہو بیگم کا خطاب دے کر بیوی بنا لیا تھا۔

(ص ۵۰) "...... اس بنا پر نواب کے ملازم جس کا نام باسورتہ سمتھ نے وسائل خاں بتایا ہے گرفتار کر لیا گیا"

(حاشیہ) "صحیح یہی ہے کہ اس کا نام کریم خاں تھا...."
صحیح واصل خاں ہے۔ یہ کریم خاں کا بہنوئی تھا۔ سہو کو غلط فہمی ہوئی۔ یہ بھی نواب شمس الدین احمد خاں کے قتل کے جرم میں گرفتار ہوا تھا لیکن بعد میں بے گناہ ثابت ہوا اور رہا کر دیا گیا۔

(ص ۵۱) "کرنل سکنر" صحیح سکنر (SKINNER) سہو کاتب

(ص ۵۳) "شمس الدین احمد خاں کے نرینہ اولاد نہ تھی، صرف لڑکیاں تھیں۔"

— ایک نرینہ اولاد تھی، نواب مرزا خاں، وہ اس وقت اس لئے تسلیم نہ کیے گئے کیونکہ وہ نواب کی داشتہ وزیر بیگم عرف چھوٹی بیگم کے بطن سے تھے۔ یہی نواب مرزا خاں آگے چل کر نامور شاعر جہاں استاد داغ کے نام سے مشہور ہوئے۔

(ص ۵۴) "سائل (سراج الدین احمد خاں دہلوی) نے زیادہ شہرت پائی۔ ۱۹۴۳ء میں فوت ہوئے۔"

— سائل دہلوی کی وفات ۱۹۴۵ء (۱۵ دسمبر) میں ہوئی۔

(ص ۷۵) "(غالب) نواب کی گرفتاری کے پورے ذمہ دار ہوں یا نہ ہوں لیکن ان کا دامن اس کے باب میں کاملاً پاک نہ تھا۔"

— آج تک کوئی ایسا ثبوت فراہم نہیں ہو سکا جس سے غالب پر مخبری کا الزام عائد کیا جا سکے۔ نواب شمس الدین احمد خاں کی گرفتاری میں غالب کا قطعاً کوئی ہاتھ نہ تھا۔

(ص ۸۰) "شیخ نصیر الدین عرف کالے میاں" (کتاب میں مہر مرحوم نے ہر جگہ اسی طرح لکھا ہے)

— "شیخ نصیر الدین عرف میاں کالے صاحب" کہنا چاہیے۔ غالب نے بیشتر "کالے صاحب" ہی لکھا ہے۔

(ص ۸۳) "کرولڑا ل والی حویلی جس کا ذکر جولائی ۱۸۶۰ء کے مکتوب میں ہے غالباً کرایہ پر نہیں لی تھی بلکہ مفت رہنے کو مل گئی تھی۔ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس حویلی میں وہ کب تک رہے۔"

— معلوم ہوتا ہے کہ غالب اس حویلی میں منتقل ہی نہیں ہوئے کیوں کہ جولائی ۱۸۶۰ء میں وہ میر خیراتی کے مکان میں اٹھ گئے تھے۔

(ص ۱۰۵) "حضرت مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں..... شملہ بازار ...... چیت پور روڈ کے اس حصے میں تھا جو بعد کو گینڈا تالاب کے نام سے مشہور ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہیں مرزا غالب ٹھہرے تھے اب یہ حصہ بالکل بدل گیا ہے — مکانوں کا نام و نشان باقی نہیں۔"

— جناب مالک رام نے مختلف تفصیل بیان کی ہے اور وہی معتبر معلوم ہوتی ہے۔ (ملاحظہ کیجیے ذکرِ غالب پانچواں ایڈیشن صـ۶۳ حاشیہ) لکھتے ہیں:

"کارنواس اسکوائر کے تالاب کے سامنے مانک ٹولہ (مانک تلہ) اسٹریٹ کے نکڑ پر ایک گرجا ہے جس کا نام کرائسٹ چرچ .... ہے۔ اس گرجے کی پشت پر ایک بازار ہوا کرتا تھا جو مانک ٹولا اسٹریٹ سے شروع ہو کر شمالی کو بیڈن اسٹریٹ کی طرف چلا جاتا تھا، اسی کا نام شملہ بازار تھا۔ یہ بازار اس صدی کے شروع تک موجود تھا۔ اب اس کے کچھ حصے میں عمارتیں بن گئی ہیں اور باقی میں بیتھون رو ہے ..... میرزا علی سوداگر کا مکان غالباً اسی جگہ تھا جہاں اس وقت بیتھون رو کا مکان ۱۳ ہے۔ اس کے صحن کا کنواں ۱۹۳۵ء میں پاٹا گیا تھا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ گرد تالاب اسی جگہ تھا جہاں اب کارنوالس اسکوائر کا تالاب ہے۔"

(ص ۱۱۳) حاشیہ: "..... اس (گلِ رعنا) کا ایک نسخہ مولانا حسرت موہانی کے پاس ہے۔"

— یہ بتا دینا چاہیے کہ یہ نسخہ غیر مکمل اور ناقص تھا۔ اب گلِ رعنا دوسرے مخطوطوں کی مدد سے مطبوعہ دستیاب ہے۔

(ص ۱۱۶) " نواب اکبر علی خاں اور منشی محمد حسن نے ان سب کے جواب دیے "

— کتاب میں ہر جگہ یہ نام محمد حسن ہی لکھا گیا ہے ۔ صحیح نام محمد محسن ہے ۔

(ص ۱۱۶) حاشیہ : " غالب نامہ کے فاضل مؤلف نے اس سلسلے میں مندرجہ ذیل شعر غالب سے منسوب کیا ہے جس پر اعتراض ہوا تھا ۔

شورِ اشکے بہ فشار بُنِ مژگاں ادم (دادم)
طعنہ بر بے سروسامانیِ طوفاں ردہٗ

مجھے غالب کے کلام میں یہ شعر نہیں مل سکا ۔ اس زمین میں غالب کی ایک غزل موجود ہے لیکن اس میں منقولہ شعر موجود نہیں "

— اس زمین میں دو غزلیں ہیں اور یہ شعر بھی کلیات میں موجود ہے (طبع اول پیش نظر ہے) ایک غزل ص ۲۴۶ پر ہے اور دوسری ص ۲۴۷ پر ۔ منقولہ شعر دوسری غزل کا چوتھا شعر ہے ۔

(ص ۱۲۱) "..... مولانا ...... آزاد فرماتے ہیں : کلکتہ میں

— یہ ہنگامہ جن لوگوں نے بپا کیا تھا (ان میں) ایک صاحب احمد علی گوپاموی کے ...... اور دوسرے صاحب انہی کے ہم نام مولوی احمد علی مدرسہ عالیہ میں مدرس اور ایشیاٹک سوسائٹی کی فارسی عربی مطبوعات کے مصحح تھے "

— دوسرے صاحب یعنی مولوی احمد علی ان میں سے نہیں ہو سکتے ۔ جناب مالک رام نے ان کی ولادت کی تاریخ 'ہفت آسمان' کے دیباچے میں حوالے سے ۱۷ دسمبر ۱۸۳۹ء بیان کی ہے ۔ لہٰذا ۱۸۲۸ء میں ان کا ہنگامے میں موجود ہونا کیونکر ممکن ہو سکتا ہے ۔ ؟

(ص ۱۲۷) مولانا عرشی کے حوالے سے حاشیے میں لکھا ہے :

" غالب پر سکہ کا الزام ابتدا ہی میں رفع ہو گیا تھا "

— الزام رفع نہیں ہوا تھا بلکہ آخر تک قائم رہا تھا ۔ البتہ اس پر مزید کوئی کارروائی نہیں کی گئی تھی ۔ یہ تو ایک زمانے کے بعد مالک رام نے دریافت کیا کہ سکہ حقیقت میں ویران شاگرد ذوق کا کہا ہوا تھا ۔

(ص ۱۳۶) " (غالب کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ خاں) ایک ہزار روپیہ ماہانہ ان کا ذاتی مشاہرہ تھا ۔"

— معلوم نہیں یہ اطلاع کہاں سے ملی ۔ خود غالب نے سترہ سو کہا ہے (مضمون برائے مظہر العجائب) البتہ سالانہ یا ماہانہ کی کہیں تصریح نہیں ۔ اگر ماہانہ تھی تو اس زمانے کے مطابق بہت بڑی تنخواہ تھی ۔ اگر لاکھوں روپے کی جاگیر تھی تو سترہ سو روپے سالانہ تنخواہ کم معلوم ہوتی ہے ۔

(ص ۱۸۹) " جب معلوم ہوا کہ مومن علی خاں صدر الصدور کو اس مقدمہ کے فیصلے میں دخل ہے اور وہ صدیق حسن خاں کے دوست ہیں تو (غالب نے) بھوپال خط لکھ کر صدر الصدور کے نام خط منگوایا اور شیفتہ کو ایک خاص معتمد کے ہاتھ بھجوایا ..... "

— بھوپال 'نواب صدیق حسن خاں کے نام خط خود شیفتہ نے لکھا تھا کہ غالب نے بھیجا کہ نواب صدیق حسن خاں کے مؤلفہ تذکرے 'شمع انجمن' سے (حسرتی کے تحت) ثابت ہوتا ہے ۔

(ص ۲۰۵) " نواب یوسف علی خاں نے مستقل طور پر دو سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر کر دی "

'ایک سو روپے' چاہیے ۔

(ص ۲۰۵) " نواب یوسف علی خاں .... غالب کے وظیفہ کی ہنڈی اپنے خط میں رکھ کر بھیجتے اور کبھی اس کی رسید طلب نہ فرمائی ۔"

— مکاتیب غالب سے ثابت ہوتا ہے کہ اگرچہ کبھی رسید طلب نہیں کی گئی لیکن غالب جس خط میں ہنڈی کے پہنچنے کی اطلاع نواب صاحب کو دیتے تھے وہی رسید تصور کی جاتی تھی اور وہ خط فائل میں محفوظ رکھا جاتا تھا ۔

(ص ۲۳۰) " وفات کے وقت ان پر (غالب پر) آٹھ سو روپے کا قرض برستور رہا جو نواب ضیاء الدین احمد خاں نے ادا کیا "

— چھ سو روپے نواب کلب علی خاں نے بھجوائے تھے، اس لیے



جعفر علی خاں اثر

۱۸۸۵ء - ۱۹۶۷ء



سجّاد ظہیر

۱۹۰۴ء - ۱۹۷۳ء



خواجہ احمد عباس

۱۹۱۴ء - ۱۹۸۷ء



میکش اکبرآبادی

۱۹۰۲ء - ۱۹۹۱ء



نیاز فتح پوری

۱۸۵۸ء - ۱۹۶۶ء



عبدالماجد دریابادی

۱۸۹۲ء - ۱۹۷۷ء



مجازؔ ردولوی

۱۹۱۱ء - ۱۹۵۵ء

سیماب اکبرآبادی

۱۸۸۲ء - ۱۹۵۱ء



ادر ۱۸۸۹ شک

ستمبر سنہ ۱۹۶۷ عیسوی

نگار

۵۰ پیسے

عبدالماجد دریابادی نمبر



نواب ضیاءالدین احمد خاں نے زیادہ سے زیادہ دو سو روپے کی ادائی کا انتظام کیا ہوگا۔

(ص ۲۴۴) " غالب کے 'صریرِ خامہ' کی نوائے سروش 'نواءِ بھی بلکہ اسی [غدر سے پیدا شدہ] بربادی کا نوحہ اور .... تباہی کا مرثیہ تھی [پھر اس غزل کا ایک شعر رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے، کے چار شعر دیئے ہیں]۔"

—— یہ غزل ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے کی تخلیق ہے یعنی لگ بھگ ۱۸۲۷ء کی (دیکھیے دیوانِ غالب کامل، تاریخی ترتیب سے) یہاں اس کا اطلاق درست نہیں۔

(ص ۲۷۱) حاشیہ، "جامع مسجد کے پاس مفتی صدرالدین آزردہ مرحوم کی قائم کی ہوئی درس گاہ تھی جس کا نام دارالبقا تھا۔"

—— یہ مدرسہ دارالبقا عہد شاہ جہانی میں قائم ہوا تھا جو بالکل ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ آزردہ نے اسے قائم نہیں کیا بلکہ اسے از سرِ نو مرتب کر کے زندہ کیا تھا۔

(ص ۲۸۰) حاشیہ: " تاریخِ ولادت لفظ 'چراغ' سے نکلتی ہے (۱۲۰۱ء) اور تاریخِ وفات 'چراغ دو جہاں بود'۔ اس حساب سے مفتی (آزردہ) صاحب مرحوم نے اکاسی برس کی عمر پائی۔"

—— چراغ سے ۱۲۰۴ھ برآمد ہوتا ہے (۱۲۰۱ء سہو کاتب ہے) اور 'چراغ دو جہاں بود' سے ۱۲۸۵ھ۔ صحیح تاریخ وفات ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۶ جولائی ۱۸۶۸ء

(ص ۳۰۳) " دہلی پر انگریزوں کے دوبارہ قابض ہونے کے بعد شہر کی جو حالت ہوئی تھی اس کا نقشہ غالب نے چند اُردو اشعار میں بھی کھینچا تھا ...... میں انھیں یہاں درج کرتا ہوں ؎

بسکہ فعّالِ مایُرید ہے آج ہر سلحشور انگلستان کا

(قطعے کے کل شعر نو ہیں) "

—— یہ قطعہ علائی کے ایک خط میں لکھا گیا تھا مگر اس طرح کہ ایک حرف بھی قطعہ کے بارے میں نہیں۔ شاید متعلقہ عبارت اُردوئے معلّٰی میں شامل کرتے وقت حذف کر دی گئی ہو کیوں کہ قطعہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے پیدا شدہ حالات کے بارے میں ہے۔

قطعہ کے اس شعر ؎

کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک آدمی واں نہ جا سکے یاں کا

میں 'واں' سے مراد لوہارو ہے اور 'یاں' سے مراد دِلّی ہے۔

(ص ۳۶۷) " اُن (غالب) کی روزانہ زندگی کے متعلق تفصیلی حالات معلوم نہیں ہو سکے۔"

—— غالب کے خطوں میں ان کی روزمرہ کی سرگرمیوں کا کافی ذکر ملتا ہے۔ اب وافر تفصیلات فراہم ہو چکی ہیں۔

(ص ۳۸۲) "(۸) 'نادر خطوطِ غالب' غالب کے ۲۷ مکاتیب کا مجموعہ ہے ...... یہ مجموعہ .... سیّد اسمٰعیل منا دَساگیاوی نے شائع کیا ہے۔"

—— یہ خط جعلی ہیں۔ مطبوعہ خطوں کے ٹکڑے جہاں تہاں سے لیکر مرتب کیے گئے ہیں۔ اب اس کتاب کو غالب کے خطوں کا مجموعہ نہیں سمجھا جاتا۔

(ص ۳۸۲): "(۵) قادر نامہ۔ اس کتاب کا ایک نسخہ ۱۸۷۳ء کا چھپا ہوا پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ پبلشر کا دعویٰ ہے کہ یہ کتاب غالب کی تصنیف ہے۔ لیکن مجھے اس میں کلام ہے"۔

—— یہ یقیناً غالب کی تصنیف ہے۔ اس کے دو ایڈیشن غالب کی زندگی میں چھپ چکے تھے۔ پہلا مطبع سلطانی (قلعہ) دہلی سے ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۶ء) میں دوسرا ۱۸۶۴ء میں مجلس پریس دہلی سے قادر نامہ کے متعدد ایڈیشن چھپے (تیرہ ایڈیشن میرے غالب کلکشن میں ہیں)۔

(ص ۳۸۵، ۸۶) " اپریل ۱۸۵۹ء کے ..... مکتوب ..... سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے پیشتر غالب کا اُردو دیوان ایک سے زیادہ مرتبہ چھپ چکا تھا۔ مثلاً پہلی بار ۱۲۵۷ھ (مطابق ۴۳-۱۸۴۲ء) میں چھپا تھا ...... اِس دیوان میں کل

۱۰۶۲ شعر تھے۔ دوسرا ایڈیشن ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۵ء) میں چھپا اس نسخے میں ۱۰۹۳ شعر تھے۔"

۱؎ پہلا ایڈیشن شعبان ۱۲۵۷ھ مطابق اکتوبر ۱۸۴۱ء میں چھپا تھا کل شعر ۱۰۹۶ ہیں مگر تین شعر دوبارہ چھپ گئے ہیں اس لیے متن صرف ۱۰۹۳ اشعار پر مشتمل ہے۔

۲؎ دوسرا ایڈیشن مئی ۱۸۴۷ء میں چھپا۔ کل اشعار ۱۱۵۸ ہیں۔

(ص ۳۸۹) "منشی شیو نرائن صاحب بھی [اردو دیوان کے ایک ایڈیشن] کی طباعت شروع کر چکے تھے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے چھاپا مکمل کیا تھا یا نہیں۔"

یہ دیوان منشی شیو نرائن نے ۱۸۶۳ء میں چھاپ دیا تھا یہ غالب کے اردو دیوان کا پانچواں اور آخری ایڈیشن ہے۔ اس میں تعداد اشعار ۱۷۹۵ ہے۔ (ص ۳۹۱) پر مہر مرحوم نے لکھا ہے کہ مطبع نظامی کان پور کے ایڈیشن کے بعد ان کی "معلومات کے مطابق غالب کی زندگی میں اردو دیوان کا کوئی ایڈیشن نہیں چھپا" عرض ہے کہ مطبع نظامی کان پور والا ایڈیشن چوتھا ہے اور منشی شیو نرائن کے اہتمام میں مطبع مفید خلائق آگرہ سے چھپنے والا ایڈیشن غالب کے اردو دیوان کا پانچواں اور آخری ایڈیشن ہے۔

(ص ۴۰۵، ۴۰۶) "سالک کی کہی ہوئی تاریخ طبع کا آخری شعر ہے ؎

ہے یہی سالِ طبع سالِ وفات
آج ان کا سخن تمام ہوا"

—— مگر 'ان' کو 'اون' لکھے بغیر تاریخ پوری نہیں ہوتی یعنی ۱۲۸۵ھ۔ پہلے مصرع میں بھی "سالِ طبع سالِ وفات" ہے۔

(ص ۴۱۱) "اگرچہ شروع میں کلیات (نظم فارسی) کی قیمت تین روپے اور محصول ڈاک چار آنے قرار پایا تھا لیکن بعد ازاں چار روپے کا اعلان ہو گیا اور کتاب چھپی تو اس کی قیمت پانچ روپے اور محصول ڈاک پانچ آنے ٹھہرا۔ غالب کے ساتھ یہ وعدہ تھا کہ انھیں سوا تین ہی روپے میں کتاب ملے گی لیکن انھیں بھی پانچ روپے دینے پڑے۔"

—— یہ درست نہیں۔ غالب اور علائی نے اسی سوا تین روپے قیمت سے دس دس نسخے خریدے تھے۔

(ص ۴۱۶) "دستنبو" کے بارے میں منشی ہرگوپال تفتہ کے نام سے اقتباس دیا گیا ہے: "(اس میں) پارسی قدیم لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے۔ جو نظم اس میں درج ہے وہ بھی بے آمیزش لفظ عربی ہے۔"

—— اس احتیاط کے باوجود "دستنبو" میں عربی لفظ رہ گئے ہیں سب سے پہلے میرے مرحوم دوست سید جمیل الدین بغدادی نے ان عربی الفاظ کا انکشاف اپنے ایک مضمون میں کیا تھا۔

(ص ۴۲۲) "غالب کو کتاب کے حقوق محفوظ کرنے کا بڑا خیال تھا چنانچہ لکھتے ہیں کہ کتاب کے آخر میں ممانعتِ طبع کا اعلان کر دیا جائے۔ پھر تفتہ اور شیو نرائن کی فرمائش پر خود یہ عبارت تحریر کر بھیجی: 'نامہ نگار غالب خاکسار کا بیان ہے ...... اس کو میں نے مطبع مفید خلائق میں چھپوایا ہے ...... جب تک مجھ سے طلبِ رخصت نہ کریں ...... چھاپنے کی جرأت نہ کریں۔"

—— میرے غالب کلکشن میں 'دستنبو' کے طبع اول کے جو نسخے ہیں ان میں کسی کے ساتھ یہ عبارت چھپی ہوئی میری نظر سے نہیں گزری

(ص ۴۲۹) "محرق قاطع۔ یہ پہلی کتاب ہے جو قاطع کے جواب میں لکھی گئی۔"

—— سب سے پہلی 'قاطع القاطع' لکھی گئی تھی۔ البتہ سب سے پہلے چھپی تھی محرقِ قاطع برہان۔ مؤلف محرق قاطع برہان نے قاطع القاطع کا ذکر کیا ہے۔

(ص ۴۴۹) "آگرہ کے ایک صاحب لالہ کنھیا لال .... غالب کے ہم عمر تھے۔"

—— یہ لالہ کنھیا لال غالب کے شاگرد لالہ شیو نرائن آرام کے دادا کے چھوٹے بھائی تھے۔

(ص ۴۶۱) "نسخۂ حمیدیہ کے علاوہ بھی غالب کے بعض اچھے اشعار ملے ہیں، ...... مثلاً۔"

(باقی صہ ۴۹ پر) ←



سلیمانؔ اطہر جاویدؔ
۱۰-۴۴۳، مارو تی نگر ۔ تروپتی
۵۱۷۵۰۲

حیدرآباد کے ادبی رسائل

۱۸۲۰ء کو حیدرآباد میں اُردو زبان و ادب کے تعلق سے یوں اہمیت حاصل ہے کہ اسی سال امیر پائیگاہ نواب محمد فخرالدین خاں شمس الامرا ثانی نے اپنی ڈیوڑھی واقع شاہ گنج میں "مطبع سنگی شمس الامرا" قائم کیا۔ یہ حیدرآباد کا پہلا لیتھو پریس تھا۔ شمس الامرا نے جنھیں سائنس سے غیر معمولی دل چسپی تھی اپنے پریس سے سائنسی موضوعات پر کئی کتابیں شائع کیں ——— لیکن انھیں صحافت سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ لگ بھگ مزید چار دہائیوں تک یہاں صحافت سے کسی نے دل چسپی نہیں لی۔ حیدرآباد کا پہلا اخبار "آفتابِ دکن" ہے جس کو قاضی محمد قطب نے ۱۸۶۰ء میں جاری کیا تھا لیکن اس سے چندسال قبل جب کہ ناصر الدولہ نے حیدرآباد میں طبّی کالج قائم کیا تھا۔ اس کالج کے ترجمان کی حیثیت سے "رسالہ طبابت" کا ۱۸۵۷ء میں اجرا عمل میں آیا تھا اور یہی دراصل حیدرآباد کا پہلا جریدہ اور یہاں صحافت کا نقطۂ آغاز ہے۔ ظاہر ہے رسالہ طبابت میں طب اور صحت کے موضوعات ہی پر مضامین شائع ہوتے تھے۔

——— حیدرآباد میں ادبی صحافت کا آغاز "مخزن الفواید" سے ہوتا ہے جس کو ۱۸۷۵ء میں عماد الملک نے جاری کیا۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ حیدرآباد میں شمالی ہند سے آئے ہوئے اہلِ قلم کی کہکشاں موجود تھی۔ داغ، شاہ نصیر، امیر مینائی، رتن ناتھ سرشار، محسن الملک، وقار الملک، مولوی چراغ علی، نذیر احمد، شبلی نعمانی، عبدالحلیم شرر، ظفر علی خاں اور لگ بھگ اسی زمانے میں نہ جانے اور کتنے ——— ان کے باعث بھی حیدرآباد میں شعر و ادب کا ماحول گرم رہا اور یہاں کے شعرا و ادبا کے جذباتِ شوق کو مہمیز ملی۔ ادبی جرائد جو ابھی ابھی شائع ہو رہے تھے، ان اکابر ادب کی تخلیقات سے سجنے اور سنورنے لگے۔ ایسے میں میر کاظم علی غازی کے رسالے "ادیب" کی اہمیت ہو جاتی ہے جو انھوں نے ابتداءً ۱۸۸۲ء میں جاری کیا۔ بعد میں ۱۹۰۵ء میں یہ رسالہ خورشید علی کی ادارت میں شائع ہونے لگا۔ ادیب نے ادبی حلقوں میں نمایاں مقام حاصل کرلیا تھا۔ ممتاز رُباعی گو شاعر امجد حیدرآبادی کا اس رسالہ سے گہرا تعلق رہا۔ حسن بن عبداللہ کا تعلق شمالی ہند سے تھا۔ حیدرآباد آئے، دربار سے وابستگی حاصل کی۔ نواب عماد نواز جنگ کے خطاب سے سرفراز ہوئے اور رسالہ "حسن" جاری کیا۔ "حسن" میں ادبی نہیں، معاشرتی موضوعات پر بھی مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ مجیب احمد تمنائی سہارن پور کے رہنے والے تھے اور حیدرآباد آنے سے قبل بھی تھوڑا بہت صحافت سے وابستہ تھے اور جب حیدرآباد میں سکونت اختیار کی تو رسالہ "سحر البیان" جاری کیا۔ اگرچہ اس رسالہ کے صرف چند شمارے شائع ہوئے لیکن اس کا ادبی مذاق عالی تھا۔ عبدالحلیم شرر حیدرآباد آنے سے قبل اپنا اونچا مقام رکھتے تھے، حیدرآباد پہونچے تو ۱۸۸۶ء میں انھوں نے "دل گداز" جیسا تاریخ ساز رسالہ جاری کیا۔ آج بھی جس کے قدیم شمارے سرمۂ اہلِ نظر ہیں۔ افسر الملک کا حیدرآباد کی معاشرتی زندگی میں قابلِ لحاظ مقام تھا، شستہ ادبی ذوق بھی رکھتے تھے۔ پہلے انھوں نے آزادیٔ نسواں کے حامی مولوی محب حسین کے تعاون سے "افسر" جاری کیا اور بعد میں مولوی عبدالحق کی خدمات حاصل کیں۔ "افسر" اپنے دور کا مقبول عام ادبی رسالہ تھا۔ "پیام مجنوں" بھی اسی زمانے میں شائع ہوا جس میں غزلیات وغیرہ ہی نہیں، مضامین حتیٰ کہ ناول بھی قسط وار شائع ہوا کرتے تھے۔

مہاراجہ سرکشن پرشاد حیدرآباد کی وزارت عظمیٰ پر فائز رہے — وسیع النظر، کشادہ قلب، صوفی مزاج ——— شعروادب کا بھی ستھرا اور پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ شعروادب سے تو دلچسپی تھی ہی، نہایت خوش فکر شاعر تھے، شاعروں اور ادیبوں کے سرپرست بھی۔ نہ جانے کتنے شاعر اور ادیب ان کے دربار سے وابستہ رہے، ان سے فیض یاب ہوئے۔ کتنوں کو انھوں نے نوازا۔ نہایت سخی اور فیاض! انھیں اپنے عہد کا حاتم کہیے۔ اپنی سرپرستی میں ۱۸۹۷ء میں "دبدبۂ آصفی" جاری کیا۔ شعروادب سے زیادہ شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی مقصود تھی۔ فصاحت جنگ جلیل اور بعد میں رتن ناتھ سرشار کی خدمات حاصل کیں۔ یوں ادبی صحافت کی تاریخ کو ایک نیا موڑ دیا۔ عزیز جنگ ولاؔ، طبقۂ اشرافیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اچھے شاعر تھے۔ ۱۹۰۰ء میں اپنا جریدہ "عزیز الاخبار" شائع کیا۔ یہ اپنے دور کے مقبول جرائد میں رہا ہے۔ فصاحت جنگ جلیل، مہاراجہ سرکشن پرشاد کے دربار سے وابستہ تھے۔ بعد میں آصف سابع کے استاد بھی ہوئے۔ انھوں نے اپنا ماہنامہ "محبوب الکلام" جاری کیا جس میں شعری تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ اس عہد کے اور جرائد میں "نسیم دکن" ہے جو نادر علی برتر شائع کرتے تھے۔ اس کے لکھنے والوں میں عبدالحلیم شرر کا نام بھی ملتا ہے۔ ظفر علی خاں نے جنوری ۱۹۰۴ء میں اپنے طور پر "افسانہ" کی اشاعت شروع کی۔ جب کہ لگ بھگ دو سال قبل یہ مہاراجہ سرکشن پرشاد کی سرپرستی میں شائع ہوا کرتا تھا۔ سید رضی الدین حسن کیفی نے جنھیں استاد سخن کا درجہ حاصل تھا اور جو اپنے طور پر کسی دبستان سے کم نہ تھے، ۱۹۰۵ء میں ماہنامہ "صحیفہ" جاری کیا۔ مالی موقف بہتر نہ ہونے کے سبب چند ہی ماہ میں اس کی اشاعت مسدود ہوگئی۔ بعد میں مولوی اکبر علی اس کو شائع کرتے رہے۔ چند سال قبل تک "صحیفہ" روزنامہ کی صورت میں شائع ہوا کرتا تھا۔ اس زمانے کے جرائد میں "معیار الاشعار" کو انفرادیت حاصل ہے۔ سراج الدین خاں اس کو شائع کیا کرتے تھے اور اس میں صرف تلامذہ داغ کی غزلیں شائع ہوا کرتی تھیں۔ اسی طرح ایک اہم جریدہ "تاج" ہے جس کا اجراء فروری ۱۹۱۴ء میں عمل میں آیا۔ مولوی ابوالوفا غلام محمد انصاری وفاؔ اس کے مدیر تھے۔ اس کا سب کو اعتراف ہے کہ اس جریدے نے حیدرآباد میں شعری و ادبی ذوق کو عام اور صیقل کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اس دور کے ایک اور شاعر پنڈت رگھوناتھ راؤ درد اس کے شریک مدیر تھے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ حکیم شمس اللہ قادری کی مایہ ناز تصنیف "اردوئے قدیم" تاج میں بالاقساط شائع ہوتی رہی۔ اس دور کے شائع ہونے والے دیگر جرائد میں رسالہ "افادہ" (۱۹۱۲ء) ہوش بلگرامی کا رسالہ "ذخیرہ" (۱۹۱۸ء) اور اسی سال شائع ہونے والا عبدالواسع صفا کا "ثمرۃ الادب" لائق ذکر ہیں۔

۱۹۱۷ء میں جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آتا ہے۔ یہ دور ہر زاویہ سے اردو شعروادب کے لیے ترویج و ترقی کا دور تھا۔ جامعاتی سطح پر اردو ذریعہ تعلیم کا آغاز ہی نہیں ہوا تھا۔ کتابوں کی اشاعت بھی وسیع پیمانے پر ہونے لگی تھی، صحافت نے بھی نیا رُخ لیا تھا۔ شعروادب کے عروج و اقبال کے نئے امکانات روشن ہوئے تھے۔ شاعروں اور ادیبوں کا ایک ایسا حلقہ وجود میں آیا تھا، جس نے اپنی تحریروں سے اردو ادب کی تاریخ کو ایک نئی سمت اور ایک رفتار دے دی تھی۔ ہر صنف ادب نکھرنے لگی تھی۔ غزل، افسانہ، ڈراما، ناول، نظم، تنقید اور ادھر صحافت سیاسی اور ادبی بھی ——— جامعہ عثمانیہ کا فیض کہ مخدوم محی الدین، سکندر علی وجد، میکش حیدرآبادی، عزیز احمد، اشفاق حسین، ڈاکٹر زور، پروفیسر سروری، پروفیسر سید محمد، عالم خوندمیری، عبدالمجید صدیقی، ہارون خاں شیروانی، پروفیسر علی اکبر، اکبرالدین صدیقی، راج بہادر گوڑ، حمیدالدین شاہد جیسے نہ جانے کتنے تابندہ ستارے تھے جن کی چمک سے آسمانِ اردو آج بھی منور ہے۔ ان میں سے کئی ایک نے صحافت کی شمعیں بھی جلائیں۔ اس عہد میں جہاں کئی ایسے جرائد شائع ہوئے جن کے مدیر فرزندان جامعہ تھے ایسے بھی کئی جن کو غیر عثمانین نے شائع کیا لیکن بہرکیف جامعہ عثمانیہ کے اثرات ہر جگہ محسوس ہوتے ہیں۔

ابوالمکارم محمد انوار اللہ نے ۱۹۲۲ء میں رسالہ "ترقی" جاری کیا۔ یہ غیر معمولی اور اونچے درجے کا علمی اور ادبی جریدہ تھا۔ ضامن کنتوری کو رائے بریلی میں صحافت کا تجربہ تھا، حیدرآباد آئے تو نواب عماد الملک کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ انھوں نے ۱۹۲۳ء میں رسالہ "لسان الملک" کا اجرا کیا۔ ضامن کو انگریزی زبان پر عبور تھا اور ان کا

انگریزی شعر و ادب کا مطالعہ بھی تھا۔ انھوں نے اپنے رسالہ میں انگریزی شاعری کے ترجمے شائع کیے اسی لیے انجمن اربابِ اُردو نے اپنا ترجمان "تحفہ" شائع کیا۔ اس رسالہ سے خاصی توقعات وابستہ کی جاسکتی تھیں لیکن کسی نہ کسی وجہ سے جلد ہی اس کی اشاعت مسدود ہو گئی۔

پیرزادہ شاہ یوسف الدین قادری کا ۱۹۲۷ء میں جاری کردہ "ارشاد" اگرچہ زیادہ تر مذہبی مضامین لیے ہوتا تھا لیکن اس میں معیاری ادبی مضامین بھی شائع ہوتے تھے اور شعری حصہ بھی اونچے مذاق کا ہوتا تھا۔ شاہ یوسف الدین کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے پیرزادہ جاوید قادری اس کو شائع کرتے رہے۔ لیکن جاوید قادری کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کے انتقال سے چند سال قبل ہی "ارشاد" کی اشاعت بند ہو چکی تھی۔ بہرکیف اپنے دور میں اس جریدہ کا مقام رہا۔

بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے اُردو کے لئے کیا کچھ نہیں کیا ان کی زندگی کا ہر لمحہ اردو کے لیے وقف تھا۔ ۱۹۲۰ء میں انھوں نے اورنگ آباد سے رسالہ "اردو" جاری کیا تھا جو جامعہ عثمانیہ کے قیام کے چند سال بعد حیدرآباد سے شائع کیا جانے لگا۔ مولوی عبدالحق نے "اُردو" کو کچھ ایسے عالی معیار کا حامل بنا دیا تھا کہ آج بھی اسکی مثال ملنی مشکل ہے۔ تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا "اُردو" بلاشبہ خزینہ تھا۔

مکتبۂ ابراہیمیہ ایک اشاعتی ادارہ تھا۔ ....."مکتبہ" جس کی اشاعت کا آغاز ۱۹۲۹ء سے ہوا اس "مکتبہ" میں صرف کتابوں کے اشتہار ہی نہیں، گرانمایہ ادبی مضامین بھی شائع ہوا کرتے تھے۔ اس کی مثال ان دنوں مکتبہ جامعہ نئی دہلی سے شائع ہونے والے "کتاب نما" سے دی جاسکتی ہے۔ مکتبہ نے اپنے قارئین کے ادبی ذوق کو نکھارا بھی اور بلند بھی کیا۔ ایسا ہونا بھی تھا کہ پروفیسر عبدالقادر سروری اس کے مدیر تھے اور سید محمد شریک مدیر۔ سروری صاحب کے افسانے اور افسانہ نگاری پر کئی مضامین "مکتبہ" ہی میں شائع ہوئے۔ اسی سال مارچ میں نور اللہ محمد نوری نے "مشاعرہ" جاری کیا۔ رسالہ "شہاب" کو عبدالرزاق بسمل نے ۱۹۳۴ء میں جاری کیا۔ اس میں افسانے اور ادبی مضامین شائع ہوتے رہے۔ آج بھی ان کے شمارے ادبی تحقیق کرنے والوں کے کام آتے ہیں۔

مولوی عبدالحق کی طرح پروفیسر محی الدین قادری زورؔ نے حیدرآباد میں اردو زبان اور شعر و ادب کو اعتبار اور امتیاز عطا کیا۔ انھوں نے اپنے چند رفقاء کے ساتھ ادارہ ادبیاتِ اردو قائم کیا، جو آج بھی ہمارے ملک کے معدودے چند ادبی تحقیقی اداروں میں ہے۔ زورؔ صاحب نے ادارہ ادبیات اُردو کے ترجمان کے طور جنوری ۱۹۳۸ء میں "سب رس" کا اجرا کیا۔ "سب رس" کا ابتداء سے صاف ستھرا ادبی ذوق رہا۔ "سب رس" کے صفحات پر دکنی شعر و ادب کو زیادہ جگہ دی جاتی ہے لیکن اس سے قطع نظر بھی معیاری ادبی تخلیقات "سب رس" کی زینت ہوتی ہیں۔ سب رس کے معیار کا اندازہ یوں بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ابتداء سے اس کے مدیر نامی گرامی شاعر یا ادیب رہے۔ زورؔ صاحب نے شروع میں اس کی ادارت کی۔ بعد میں اس کے مدیروں میں حمید الدین شاہدؔ، میکش حیدرآبادی، سلیمان ادیب اور وقار خلیل رہے۔ ان دنوں پروفیسر مغنی تبسم اس کی ادارت کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ مغنی صاحب نے سب رس کو کچھ اور نکھار دیا ہے۔

۱۹۳۸ء میں فصیح الدین احمد نے "پرچم" جاری کیا۔ اگرچہ اس میں سیاسی موضوعات پر تبصرے بھی ہوئے تھے لیکن اس کا ادبی حصہ بھی خاصا وسیع ہوتا تھا۔ اس کے قلم کاروں میں ابراہیم جلیس کا نام بھی ملتا ہے۔ "پرچم" ترقی پسند رجحانات کا حامل تھا۔ ۱۹۴۱ء میں جو جرائد شائع ہونے لگے ان میں "داستان گو" ہے جو اپنے نام کی مناسبت سے فکشن پر زیادہ توجہ دیتا تھا۔

صدیق احمد نے اپریل میں "فصاحت" کی اشاعت عمل میں لائی اور اسی سال جون میں غلام محمد خاں نے "ہندوستانی ادب" جاری کیا۔ ممتاز مزاح نگار فرحت اللہ بیگ نے رسالہ "جیت" اور بعد میں رسالہ "تماشہ" جاری کیا۔ ۱۹۴۲ء میں انجمن ترقی اُردو نے مکتبۂ ابراہیمیہ کے "مکتبہ" کے طرز پر جریدہ "ہماری کتابیں" شائع کرنا شروع کیا جس میں اعلا پایہ کے تحقیقی، تخلیقی مضامین شائع ہوتے تھے۔

غوث محی الدین نے فروری ۱۹۴۵ء میں "سویرا" نکالا۔ سویرا کے

صفحات ترقی پسند ادب کے لیے وقف تھے۔ ۲۳ر جولائی ۱۹۴۶ء کو محمد عثمان اور حسینی شاہد نے "ارباب" کی اشاعت عمل میں لائی۔ یہ بھی ترقی پسند میلانات کا حامل تھا۔ اچھوتے مضامین، وقیع مقالات اور شعری حصے کے لئے "رباب" یاد رکھا جائے گا۔ ۱۹۴۷ء میں بھی کئی جرائد شائع ہوئے۔ جنوری میں عبدالقادر نے سہ ماہی "نیا زمانہ" جاری کیا۔ مسلم ضیائی اس کے شریک مدیر تھے۔ اس کے پہلے ہی شمارہ کے لکھنے والوں میں احمد ندیم قاسمی، قاضی عبدالغفار اور محبوب حسین جگر کے نام ملتے ہیں۔ فروری میں احمد مکی نے "داستان" جاری کیا۔ زینت ساجدہ اس کی مجلسِ ادارت میں تھیں۔ داستان کے معیار کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے پہلے شمارہ میں میراجی، اختر الایمان، احمد ندیم قاسمی، ابراہیم جلیس، سلام مچھلی شہری اور رفعت سروش جیسے فن کار شامل تھے۔

فروری ۱۹۴۷ء ہی میں ایک اور ہفت روزہ "البلاغ" جاری ہوا۔ مختار احمد کرمانی نے "ایوان" نکالا اور تمکین کاظمی نے "مینا" جاری کیا ۱۹۴۷ء میں نہ جانے کتنے اور ادبی جرائد کی اشاعت عمل میں آئی۔ چند ایک کے نام ہیں؛ سنگم (مدیر سری نواس لاہوٹی)، عوام (اختر حسن) عظیم تر حیدرآباد (عزیز احمد) آزادی (مختار کرمانی) بصر (صفدر اقبال) امروز (شعیب اللہ خاں)، وقت (سوامی واسدیو شاستری) اور انقلاب (مرتضیٰ مشہدی) ہر چند کہ یہ جرائد ایک حد تک سیاسی تھے لیکن ان میں ادبی صفحات بھی خاصے ہوتے اور خاص مواقع پر اور خاص خاص شخصیات پر یہ اپنے ادبی ایڈیشن شائع کرتے۔

۱۹۴۸ء میں حیدرآباد کی آزاد ریاست کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے اور اس کا ہندستانی یونین میں انضمام عمل میں آتا ہے۔ اسی سال نظر حیدرآبادی نے جو بعد میں پاکستان منتقل ہوئے "سنگم" جاری کیا۔ اسی زمانے میں اپنی طرز کے ممتاز شاعر خورشید احمد جامی نے "آہنگ" جاری کیا، لیکن اس کی اشاعت جلد ہی مسدود ہو گئی۔ یہی حال "نیا دور" کا رہا جس کو ۱۹۵۱ء میں مخدوم محی الدین نے جاری کیا تھا اور یہ بھی جلد ہی بند ہو گیا۔ اسی زمانے میں بزمِ احباب قائم ہوئی "بزم احباب" نے اپنے ترجمان کے طور پر "معمار" کا اجرا کیا۔ غوث خاموشی اس کے مدیر تھے اس میں بزم احباب کی سرگرمیوں کے علاوہ معاشرتی موضوعات پر بھی مضامین ہوتے۔ اس کا ادبی حصہ بھی خاصا معیاری ہوتا۔ بزم احباب نے آگے چل کر "تعمیر ملت" کی صورت اختیار کی۔ "معمار" بند ہو گیا۔ تعمیر ملت نے اپنا جریدہ "شعور" جاری کیا، شعور کی مجلس ادارت میں مغنی تبسم اور غیاث صدیقی بھی تھے۔ ویسے اس کی مدیرہ اختر جہاں تھیں۔ علمی و ادبی طور پر ایک اونچے درجے کا جریدہ تھا۔ مغنی تبسم نے آگے چل کر "شعر و حکمت" جاری کیا جو سہ ماہی تھا۔ شہریار بھی اس کی مجلس ادارت میں شامل رہے۔ 'شعر و حکمت' اپنے پہلے دور میں سات شماروں کے بعد بند ہو گیا۔ شعر و حکمت کا "ن۔ م۔ راشد نمبر" دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔ شعر و حکمت کے دوسرے دور کا ۱۹۸۰ء سے آغاز ہوا لیکن اس کے دو ہی شمارے شائع ہوئے۔ بہرکیف اس جریدہ کے غیر معمولی وزن و وقار سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

"گجر" بھی ایک ایسا ہی جریدہ تھا جو ادبی جرائد کی تاریخ میں یاد رکھا جائے گا۔ نجم الثاقب شحنہ کی ادارت میں فروری ۱۹۵۵ء سے یہ شائع ہونے لگا۔ حسینی شاہد اور سری نواس لاہوٹی اس کی مجلس ادارت میں تھے۔ اگرچہ "گجر" نے کچھ زیادہ عمر نہیں پائی لیکن اس کی ادبی مرتبت ممتاز رہی۔ اس کے لکھنے والوں میں برصغیر کے صف اول کے فن کار شامل تھے مثلاً قاضی عبدالغفار، سجاد ظہیر، اعجاز حسین، جوش، فراق، اثر لکھنوی، مخدوم محی الدین، وجد، ساغر نظامی، جگر مرادآبادی، قتیل شفائی، جیلانی بانو، سہیل عظیم آبادی، عصمت چغتائی اور راجہ سرور وغیرہ۔ "گجر" کی اشاعت کے ایک ماہ بعد مارچ ۱۹۵۵ء میں سلیمان اریب نے اپنا ماہنامہ "صبا" جاری کیا۔ کمزور مالیہ کے باوجود اریب اس کو کسی طرح نکالتے رہے چنانچہ ان کے انتقال ستمبر ۱۹۷۰ء تک "صبا" شائع ہوتا رہا۔ بعد میں ان کی اہلیہ صفیہ اریب نے اس کو زندہ رکھنے کی سعی کی لیکن اس کے صرف دو شمارے شائع ہو سکے۔

۱۹۴۸ء کے بعد حیدرآباد میں اُردو کا نقشہ ہی بدل جاتا ہے سقوط ریاست حیدرآباد اور ہندستانی یونین میں انضمام کے بعد حیدرآباد کے سیاسی خدوخال ہی نہیں تہذیبی، لسانی اور ادبی منظرنامہ بھی کچھ اور ہو گیا۔ اُردو پر تو نہایت کڑا اور بُرا وقت آن پڑا۔ اُردو ریاست

کی سرکاری زبان نہ رہی۔ مدارس میں ذریعۂ تعلیم بدل گیا۔ جامعہ عثمانیہ جو اُردو ذریعہ تعلیم کی ملک بھر میں واحد یونیورسٹی تھی اس کے کردار کو یکسر منقلب کردیا گیا۔ یہی نہیں اُردو کو سرکاری سرپرستی بھی حاصل نہ رہی!...

۱۹۵۶ء میں لسانی بنیادوں پر ریاست حیدرآباد کی تقسیم عمل میں آئی۔ کنڑی بولنے والے علاقے کرناٹک میں شامل ہوئے، مرہٹی کے علاقے مہاراشٹر کے حوالے کردیے گئے اور تلگو کے علاقے آندھراپردیش کے حصے میں آئے اور حیدرآباد، آندھراپردیش کا دارالحکومت قرار پایا۔ ۱۹۴۸ء کے بعد حیدرآباد میں یہ اردو کے لیے دوسرا آزمائشی مرحلہ تھا۔ اُردو داں طبقہ کے لئے ملازمتوں کے مواقع متاثر ہوئے۔ اُردو تعلیمی اداروں کو نقصان پہونچا۔ اردو کے ثقافتی اداروں کا اعتبار گیا۔ اُردو صحافت بھی کہیں سے کہیں آگئی خاص طور پر اردو کی ادبی صحافت نے سمت کھودی بے منزل ہوگئی۔ اردو عوام کی قوت خرید کم ہوگئی اور دوسری طرف سرکار کی عدم سرپرستی کے سبب حکومت کے اشتہار اُردو صحافت کو کم ملنے لگے بلکہ نہ ملنے کے برابر تھے ۱۹۵۶ء کے بعد بہت کم ایسے جرائد کا اجراء عمل میں آیا جن کی اشاعت مسلسل رہی ہو اور عمر قابل لحاظ۔

۱۹۵۸ء میں اعظم راہی نے "پیکر" کا اجراء کیا۔ پرعزم پُرجوش اور پرحوصلہ نوجوان اعظم راہی کے ساتھ تھے۔ پرانی قدروں کے احترام کے ساتھ 'پیکر' نے نئے رجحانات اور جدید میلانات کو رہنما بنالیا۔ حیدرآباد کے آج جو معروف لکھنے والے ہیں ان کو "صبا" اور "پیکر" ہی نے متعارف کرایا۔ پیکر نے عصری حسیت اور جدید اقدار کو فروغ دینے میں نمایاں حصہ ادا کیا، لیکن وہی ــــ خریداروں کی کمی اور اشتہارات نہ ملنے کے باعث کمزور مالیہ نے "پیکر" کو متاثر کیا اور ۱۹۶۳ء میں اس کی اشاعت مسدود کردی گئی۔

اعظم راہی نے چند سال بعد ۱۹۶۸ء میں پندرہ روزہ "تیشہ" جاری کیا اس کے چیف ایڈیٹر غلام محمد عمر خاں اور اس کے مدیروں میں حسن فرخ، شاہد عظیم اور ساجد اعظم تھے لیکن یہ بھی دو تین سال بعد بند کردیا گیا۔ ہر چند کہ یہ خالص ادبی جریدہ نہیں تھا لیکن اس میں معاشرتی، سیاسی اور فلمی موضوعات کے علاوہ ادبی تخلیقات بھی شائع ہوتی تھیں۔ نئے ادبی رجحانات پر "تیشہ" کی توجہ تھی۔

۱۹۶۲ء میں ہفت روزہ "نیا آدم" کا اجراء عمل میں آیا۔ احسن علی مرزا اور امجد باغی اس کے مدیران تھے۔ بائیں بازو کے حامل اس جریدہ میں اگرچہ سیاسی موضوعات پر بھی اظہار خیال کیا جاتا تھا۔ لیکن ادبی طور پر اس میں غیر معمولی شستہ اور اونچے معیار کی تخلیقات جگہ پاتی تھیں۔ "نیا آدم" کا مخدوم نمبر گراں بہا اور دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی سال اکتوبر میں سید شمس الدین حسن نے "زعیم" شائع کیا جس میں مذہبی مسائل کے علاوہ ادبی تخلیقات بھی جگہ پاتی تھیں

۱۹۶۵ء میں ناصر کرنولی نے "پونم" جاری کیا۔ نظریاتی وابستگی کے بغیر "پونم" نے اپنے انداز میں شعروادب کی خدمت کی اور کئی خصوصی شمارے بھی شائع کئے۔ دسمبر ۱۹۶۵ء میں مصطفےٰ کمال نے "شگوفہ" کا اجراء عمل میں لایا۔ شگوفہ طنزیہ ومزاحیہ ادب کے لئے وقف ہے۔ ابتداء میں یہ ڈیڑھ ماہی تھا، لیکن جلد ہی اس کو ماہانہ کردیا گیا۔ ادبی طور پر شگوفہ کا اپنا معیار ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ یہ ان چند جرائد میں ہے جن کی اشاعت پابندی سے عمل میں آتی ہے۔ شگوفہ نے ڈرامہ نمبر، سلور جبلی نمبر اور مشہور مزاح نگاروں کی وفات پر خصوصی نمبروں کے علاوہ نہایت یادگار سالنامے شائع کیے۔ اقبال اکیڈمی کی جانب سے ۱۹۷۶ء میں "اقبال ریویو" شائع ہوا۔ یہ صرف اقبالیات کے لیے وقف جریدہ ہے۔ منظور احمد اس کے مدیر ہیں۔ اگرچہ یہ ایسی پابندی سے شائع نہیں ہوتا لیکن اس کے شمارے خاصے کی چیز ہوتے ہیں۔

آندھراپردیش اُردو اکیڈمی نے جون ۱۹۸۱ء میں اپنا ترجمان "قومی زبان" شائع کرنا شروع کیا۔ اس کے پہلے شمارے کے مدیر چندر سریواستوا تھے۔ ان دنوں اقبال مظفر احمد ہیں۔ مضامین وغیرہ کے زاویے سے قومی زبان کے شمارے عالی معیار کے ہوتے ہیں۔ جنوری ۱۹۸۵ء میں ماہنامہ "ذوق نظر" کا اجراء ہوا۔ اس کے مدیران بشیر وارثی اور یعقوب عمر تھے۔ اس کے مشمولات کلاسیکی انداز رکھتے تھے۔ بشیر وارثی کے انتقال کے بعد "ذوقِ نظر" کے بس دو تین شمارے شائع ہوئے۔

ان ادبی جرائد کے علاوہ یونیورسٹیوں اور کالجوں اور مدارس سے شائع ہونے والے جرائد بھی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے معیار کو مذکورہ جرائد کے معیار سے نہ دیکھا جائے۔ ایسے جرائد میں زیادہ تر طلباء کی تخلیقات شائع ہوتی ہیں جن سے مستقبل میں ان کے روشن امکانات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایسے جرائد میں طلبائے جامعہ عثمانیہ کے جرائد "طیلسانین" اور "مجلہ جامعہ عثمانیہ" لائق ذکر ہیں۔ طیلسانین کی اشاعت ۱۹۲۶ء سے عمل میں آئی۔ "الموسیٰ" سٹی کالج کے طلباء کا جریدہ تھا۔ چادر گھاٹ کالج سے "چادر گھاٹ کالج میگزین" شائع ہوتا ہے — یونیورسٹی آف حیدرآباد نے اپنا ترجمان "محیط" شائع کیا۔ اسی طرح دیگر کالجوں کے طلباء کے اپنے اپنے جرائد شائع ہوتے ہیں جن کی اپنی جگہ اہمیت اور افادیت ہے، و نیز روزانہ اخبارات "رہنمائے دکن"، "سیاست"، "منصف" اور "ملاپ" اپنے ہفت روزہ ایڈیشن میں ادبی صفحات شامل رکھتے ہیں۔

ان کے علاوہ خواتین اور بچوں کے جرائد بھی ہیں، جن میں خواتین اور بچوں کے مزاج و مذاق اور ان کے مسائل کو ملحوظ رکھا گیا لیکن جو ادبی زاویوں سے بھی لائق توجہ ہیں۔ اگرچہ خواتین کے بیشتر رسائل کی مدیران خواتین ہی تھیں لیکن یہ بات لائق ذکر ہے کہ حیدرآباد سے خواتین کا پہلا رسالہ "معلم" ایک مرد محب حسین نے ۱۸۹۲ء میں جاری کیا۔ اور دو سال بعد ہی ۱۸۹۴ء میں اس کا نام معلم نسواں کر دیا گیا۔ محب حسین تحریک نسواں کے زبردست موید تھے وہ خواتین کو روشن خیال بنانا اور معاشرہ کی ترقی میں انھیں برابر کا حصہ دینا چاہتے تھے۔ "معلم نسواں" کے ذریعہ انھوں نے یہ کام انجام دیا۔ انھوں نے خواتین کے علمی ادبی ذوق کو فروغ دینے کے لیے ہر ماہ صاف ستھرے مضامین شائع کیے اور ادبی طور پر بھی اپنے رسالہ کا معیار برقرار رکھا۔

صغریٰ ہمایوں مرزا نے جو خواتین کی تحریک میں پیش پیش تھیں، ۲۱ اپریل ۱۹۲۰ء کو "النساء" کا اجرا کیا۔ اس کو تحریک نسواں کے ترجمان کی حیثیت حاصل تھی۔ ادبی طور پر بھی اس میں معیاری تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ محب حسین کی دختر نے اکتوبر ۱۹۲۰ء میں "خادم" شائع کیا۔ اس نے بھی خواتین میں معاشرتی بیداری پیدا کرنے کے ساتھ ان کے ادبی ذوق کو بھی ملحوظ رکھا۔ بیگم صادقہ قریشی نے ۱۹۲۸ء میں "سفینۂ نسواں" جاری کیا، اس کے اونچے ادبی معیار کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے پہلے ہی شمارے میں امجد حیدرآبادی، یاس یگانہ چنگیزی، علی اختر نظر اور ماہر القادری جیسے اہل قلم شامل تھے۔

جولائی ۱۹۳۱ء میں سیدہ بیگم ابوبکر خاں خویشگی نے اپنی ادارت میں "ہمجولی" کا اجرا کیا۔ ۱۹۳۲ء میں "شباب ناہید" کی اشاعت عمل میں آئی۔ "مستورات" کی اشاعت ۱۹۳۴ء میں عمل میں آئی جس کی مدیرہ حبیب بلقیس بیگم تھیں۔ نواب فخر یار جنگ بہادر معتمد مالیہ ریاست حیدرآباد اس کے سرپرست تھے۔ یہ جریدہ ظاہری اور معنوی دونوں اعتبار سے عمدہ انداز میں شائع ہوتا تھا۔ مئی ۱۹۴۰ء میں ارشاد محمود خاں نے "گلدستۂ ارم" جاری کیا لیکن ڈیڑھ ماہ بعد ہی اس کی ادارت شکیلہ جی۔ ایم۔ خاں نے سنبھال لی اور جس میں خواتین کی تخلیقات اور دلچسپیوں کو زیادہ توجہ سے پیش کیا گیا۔

عسکری علی نے جنوری ۱۹۴۴ء میں "خیابانِ دکن" جاری کیا اور ۱۹۵۲ء میں محمودہ یاسمین نے "عکس" کی اشاعت کا آغاز کیا صالحہ الطاف نے ۱۹۶۲ء میں "خاتونِ دکن" جاری کیا۔ "خاتونِ دکن" کے کئی خاص نمبر شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ یہ رسالہ ایک مدت تک پابندی سے شائع ہوا کرتا تھا اور اب بھی اس کی اشاعت عمل میں آتی ہے لیکن پابندی سے نہیں۔ "خاتونِ دکن" کے بعد حیدرآباد سے ایسا کوئی جریدہ شائع نہیں ہوا جس کو خواتین کا جریدہ کہا جا سکے۔

بچوں کے جرائد میں، بیسویں صدی کے آغاز میں ۱۹۰۹ء میں مولوی احمد اللہ بیگ نے "ادیب الاطفال" اور عبدالرب کوکب نے "اتالیق" شائع کیے۔ یہ حیدرآباد میں بچوں کے اولین رسائل میں شمار ہوتے ہیں لیکن ۱۹۲۰ء سے شائع ہونے والے "نونہال" کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی، جس کو محمد مرغوب الدین اور خواجہ احمد نے جاری کیا تھا، اس میں بچوں کی عمدہ اور معیاری تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ نصیر افسر نے ۲۶ دسمبر ۱۹۴۶ء کو "کلیان" جاری کیا تھا۔ یہ بھی اپنے دور کا مقبول رسالہ تھا۔ اس کے بعد

حیدرآباد کے بچوں کے جس جریدہ کو برصغیر میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی وہ "تارے" ہے جس کو مسلم ضیائی نے ۱۹۴۸ء میں جاری کیا تھا۔ اس میں بچوں کے نامور لکھنے والوں کی تخلیقات شائع ہوتی تھیں مسلم ضیائی اس کو نہایت اہتمام سے اور باتصویر شائع کرتے تھے۔

"بچوں کی دنیا" ۴ر اکتوبر ۱۹۴۹ء سے معروف ڈراما نگار اظہر افسر نے شائع کرنا شروع کیا۔ اگرچہ یہ ایسا ضخیم نہیں تھا لیکن پابندی سے شائع ہونے کی وجہ سے بچوں میں خاصا مقبول تھا۔ اس کی اشاعت بھی کثیر تھی۔ حیدرآباد کے آج کے کئی نامور لکھنے والوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز "تارے" اور "بچوں کی دُنیا" ہی سے کیا تھا

۱۹۵۲ء میں بچوں کے دو رسالے جاری ہوئے۔ منیر صفوی نے "نوخیز" نکالا اور محمود انصاری نے "گلشن"۔ یہ دونوں اہتمام اور سلیقے سے شائع ہونے والے جریدے تھے۔ موسٰی کاظم نے ۱۹۵۴ء میں "بچپن" جاری کیا، یہ ہفت روزہ تھا، رنگین اور باتصویر۔ وقار خلیل نے ۱۹۵۷ء میں "انعام" نکالا۔ "تارے" اور "بچوں کی دنیا" کی طرح "انعام" نے بھی بچوں کے ادبی جرائد کی تاریخ بنائی۔

ان دنوں حیدرآباد سے ادبی جرائد بہت کم شائع ہوتے ہیں "سب رس"، "شگوفہ"، "قومی زبان" اور "اقبال ریویو" کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ جن میں سب رس اور شگوفہ کی اشاعت پابندی سے عمل میں آتی ہے۔

□□

غالب از مہر

صفحہ ۴۴ کا بقیہ

—— اس صفحے پر جو سات اشعار درج ہیں ان میں سے کوئی بھی غالب کا نہیں۔

(ص ۴۶۲) "خواجہ فخرالدین حسین سخن کے پاس جو مکاتیب تھے وہ ابھی تک نہیں چھپے۔"

—— یہ خط اگر ہیں تو آج تک منظرِ عام پر نہیں آسکے۔

ان چند کوتاہیوں کے باوجود، جن کی میں نے مطالعہ کے دوران نشان دہی کرلی تھی اور جنھیں اب آپ کی خدمت میں پیش کر دیا ہے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ کتاب محنت سے لکھی گئی ہے۔ حیرت ہے کہ مولانا غلام رسول مہر ۱۹۴۶ء کے بعد ۲۵ سال زندہ رہے[۲] اور تصنیف و تالیف کے کام میں سرگرم رہے مگر انھوں نے اپنی کتاب کو اپ ٹو ڈیٹ نہیں کیا۔ حالاں کہ غالبیات میں جو ان ۲۵ برسوں میں اضافے ہوئے ہیں، مہر مرحوم اُن سے بے خبر نہ تھے۔

ضرورت ہے کہ اس اہم کتاب کو تازہ معلومات کے پیشِ نظر تفصیلی حاشیوں اور ضمیموں کے ساتھ پھر شائع کیا جائے۔

□□

حواشی: [۱] غالب۔ اشاعتِ اوّل ص ۱۲ (پیش لفظ)

[۲] یادگارِ غالب۔ از حالی، [۳] ۱۳ر اپریل ۱۸۹۵ء تا ۱۶ر نومبر ۱۹۷۱ء

غزل



خاندانی وراثت کے نیلام پر آپ اپنے کو تیار کرتے ہوئے
اس حویلی کے سارے مکیں رو دیے اس حویلی کو بازار کرتے ہوئے

دوستی دشمنی دونوں شامل ہیں، دوستوں کی نوازش تھی کچھ اس طرح
کاٹ لے شوخ بچّہ کوئی جس طرح ماں کے رخسار پر پیار کرتے ہوئے

دُکھ بزرگوں نے کافی اٹھائے مگر میرا بچپن بہت ہی سہانا رہا
دھوپ میں عمر بھر پیڑ جلتے رہے اپنی شاخیں ثمردار کرتے ہوئے

اپنے زخموں سے احساس ہونے لگا مجھ کو دشمن کے زخموں کی تکلیف کا
یاد آتی ہے فاقہ کشوں کی بہت شام کے وقت افطار کرتے ہوئے

ماں کی ممتا گھنے بادلوں کی طرح سر پہ سایہ کیے ساتھ چلتی رہی
ایک بچّہ کتابیں لیے ہاتھ میں خامشی سے سڑک پار کرتے ہوئے

بھیگی پلکیں مگر مسکراتے ہوئے، جیسے پانی برسنے لگے دھوپ میں
میں نے رانا مگر مڑ کے دیکھا نہیں گھر کی دہلیز کو پار کرتے ہوئے

مسعود رانا

پروفیسر گوپی چند نارنگ
دہلی یونیورسٹی۔ دہلی

ادبی تنقید ۔ نیا چیلنج

بیسویں صدی اپنی آخری سانسوں پر ہے اور اکیسویں صدی کے قدموں کی چاپ صاف سنائی دے رہی ہے۔ اتنی بات معلوم ہے کہ تبدیلیوں کی رفتار بیسویں صدی میں نہایت تیز ہو گئی ہے۔ سائنسی علوم ہوں، ٹیکنالوجی ہو یا علوم انسانیہ، ان میں تبدیلیاں اتنی تیزی سے ہوئی ہیں کہ خود تاریخ کی سانس رکنے لگی ہے۔ بالعموم ان تبدیلیوں کو ترقی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ کہنا آسان نہیں کہ کیا انسان واقعی ترقی کر رہا ہے، اس لیے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی سے نہ صرف امنِ عالم بلکہ کرۂ ارض کی بقا کو جو خطرات لاحق ہیں انھیں انسان صرف سادہ لوحی کی بنا پر ہی نظر انداز کر سکتا ہے دوسرے یہ کہ کمرشیل تقاضوں کی یلغار، منڈی معیشت اور بے لگام صارفیت سے زیستِ انسانی جس طرح داؤں پر لگ گئی ہے اور عقیدے کے زوال سے اقدار پر جس طرح سوالیہ نشان لگ گیا ہے اس سے خود ترقی کی معنویت بھی زیرِ بحث آ گئی ہے۔ شاید نطشے نے غلط نہیں کہا تھا کہ ارتقائے انسانی میں تاریخ کا ہر قدم ترقی کی راہ میں ہو یہ ضروری نہیں ہے۔ یعنی تاریخ آگے تو بڑھ رہی ہے، نئی نئی دریافتیں، نئی آسائشیں، نیا ساز و سامان ـــــ یہ سب تو ہے لیکن یہ سب ترقی کا لازمہ ہو یہ ضروری نہیں۔ یہ تباہی و بربادی کا پیش خیمہ بھی تو ہو سکتا ہے اور نہ بھی ہو تو بھی اس میں کلام نہیں کہ مادی آسائشوں اور کمرشیل ریل پیل کے باوجود انسان کی ویرانیِ باطن بڑھتی جاتی ہے انسان خود سے، دوسرے انسانوں سے، فطرت سے، اپنے ماحول سے روز بروز بیگانہ ہوتا جاتا ہے۔ انسان کے مسائل کم نہیں ہوئے، بڑھے ہی ہیں، اور کچھ مسائل تو ایسے ہیں جن کا کوئی حل نظر نہیں آتا۔ بیسویں صدی ایک ایسے خطرناک موڑ پر تاریخ کو اکیسویں صدی کے حوالے کر رہی ہے جہاں سوال ہی سوال ہیں اور کوئی آسان حل سامنے نہیں ہے۔

یہی کیفیت ادبی اور تخلیقی تصورات کی ہے۔ ہمارا عہد اقدار کے کرائسس کا عہد ہے۔ جب عالم کرائسس کا ہو تو علوم انسانیہ یعنی فلسفے اور ادب کی حیثیت اقدار کے نگہبان کی ہو جاتی ہے۔ یعنی زیست کی معنویت کا تحفظ کیونکر ہو۔ اس وقت ادب اور فلسفے کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے۔ چنانچہ فلسفہ ہو یا ادبی فکر، مرکزی سوال یہ ہے کہ ذہنِ انسانی یا شعورِ ذات یا موضوع کیا ہے۔ کیونکہ سب قدروں سے بڑی قدر "موضوعیت" ہے۔ موضوعِ انسانی کے سوال کے اٹھ کھڑے ہونے سے یہ سوال کہ ادب کیا ہے، زبان کیا ہے، معنی کیا ہے، ثقافت اور آئیڈیالوجی کیا ہیں، یہ سب بھی معرضِ بحث میں آ گئے ہیں۔

مارکس کی فکر جو ہیگل کے ارتقائے انسانی کے نظریے اور جدلیت پر مبنی تھی، اس صدی کے آغاز میں اس کی بنیاد پر انسانیت نے ایک خواب دیکھا، معاشی مساوات، سماجی انصاف اور آزادی کی توقعات کے وعدہ پر ایک ریاست وجود میں آئی جو مغرب کے نوآبادیاتی اور سرمایہ دارانہ استحصال کے کچلے، پسے ہوئے ایشیائی، افریقی اور لاطینی امریکی معاشروں کا مرکزِ نگاہ بن گئی۔ لیکن وہ ریاست جس کو مثالی معاشرہ ہونا چاہیے تھا، بجائے حرکیت کا پیغامبر اور مظہر ہونے کے وہ ادعائیت اور جبر کا ایسا آلۂ کار بن کر سامنے آئی کہ انسانیت ابھی اس میں پوری طرح اپنے مستقبل کا چہرہ بھی نہ دیکھ پائی تھی کہ وہ

آئینہ اپنی ہی لگائی ہوئی ضربوں کی شکستوں سے چور ہو گیا۔ غرض اشتراکیت یا مارکسیت کے نام سے انسان نے روشن خیالی کا جو خواب دیکھا تھا اس کے پاش پاش ہونے سے مایوسی کی جو فضا پیدا ہوئی ہے اس میں کہا جانے لگا ہے کہ: "اگر مارکس بھی صحیح نہیں ہے تو پھر کوئی بھی صحیح نہیں؟"

تاریخ صدیوں سے اپنا سفر انسان کو مرکز میں رکھ کر طے کرتی رہی ہے، مارکس نے مادی جدلیات اور طبقاتی کشمکش پر زور دے کر فرد کی مرکزیت پر سوالیہ نشان لگا دیا اور تاریخ کو ہمیشہ کے لیے بے مرکز کر دیا، بالکل جس طرح کوپرنیکوس نے کائنات کو بے مرکز کیا تھا، فرد کی فردیت کی بنیادوں کو منہدم کرنے میں دوسرا بڑا وار فرائیڈ کے فلسفے کا تھا جس نے لاشعور کی دریافت سے شعورِ انسانی کو بے دخل کر دیا۔ بیسویں صدی کے آتے آتے یا زیادہ سے زیادہ دوسری جنگِ عظیم تک انسان، فرد یا ذات کا تصور وہ نہیں رہا جو پہلے تھا اُردو ادب میں ان تبدیلیوں کو محسوس کیا گیا لیکن برصغیر کی آزادی کا مسئلہ چوں کہ ہمارا بنیادی مسئلہ تھا، اس لیے اس طرف توجہ ہوئی بھی تو انیس سو پچاس پچپن کے بعد یعنی آزادی کے بعد۔ لیکن اتنی توجہ پھر بھی نہیں ہوئی جتنی نئی فکر کا حق تھی۔ بائیں بازو کے ادیبوں نے نہ دائیں بازو کے ادیبوں نے اور نہ اعتدال پسندوں نے جو دراصل دائیں بازو ہی کا حصہ تھے، نئے فکری چیلنج پر غور و خوض کیا۔ اس کا احساس کم ہی رہا کہ فرائیڈ کے معاصر فلسفی ایڈمنڈ ہوسرل اور اس کے غیر مقلد پیروکار مارٹن ہائیڈیگر نے تصورِ حقیقت کی بنیادوں ہی کو چیلنج کر دیا تھا کہ وجود شعور سے ہٹ کر نہیں ہے۔ وجودیت کی بحث تو ہوئی لیکن اس کے علمیاتی مضمرات پر توجہ کم مرکوز کی گئی کہ انسانی وجود کا امتیاز فقط اس کے 'دیے ہوئے' ہونے میں ہے۔ شعور بیک وقت دنیا کا ادراک بھی کرتا ہے اور اس کے ذریعے متشکل بھی ہوتا ہے، یعنی شعور الگ سے کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتا۔ ہوسرل نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ بنیادی مسئلہ پہلے سے چلے آرہے COMMONSENSE یعنی عام اعتقادات سے ہاتھ اٹھانے کا ہے کیونکہ انسان اپنی فریب خوردگیوں کی بنا پر جیتا ہے۔ ہوسرل کا اجتہادی قول ہے:

THE FAMILIAR CONCEPTS ARE THE PROBLEM
NOT THE SOLUTION

یعنی مانوس تصورات نے انسان کو اندھا بنا کر چھوڑ دیا ہے اور وہ ان سے ہٹ کر سوچ نہیں سکتا۔

شعورِ انسانی کا رائج تصور ڈیکارٹ کے فلسفے پر مبنی چلا آرہا ہے جس کا زمانہ سولھویں سترھویں صدی کا ہے:

I THINK = THEREFORE I AM

بیسویں صدی تک آتے آتے اس تصور کی یوں کایا پلٹ ہو گئی:

I THINK WHERE I AM NOT
THEREFORE I AM WHERE I DO NOT THINK

دراصل کارٹیسیائی روایت جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا یا خود ہماری مشرقی روایت کی بنیاد کسی نہ کسی طرح کی عینیت پسندی پر ہے۔ ان میں انسان کی پہچان مبنی تھی شعور پر، یعنی شعور مرکز تھا تصورِ انسانی کا، لیکن بیسویں صدی کے وسط تک یہ واضح ہونے لگا کہ شعور فی نفسہٖ وجود نہیں رکھتا، بلکہ 'میں' فقط تشکیل ہے لسانی نظام کی اور جو چیز خود تشکیل ہے یعنی بے مرکز ہے وہ تصورِ انسانی کا مرکز کیونکر ہو سکتی ہے!

دانشِ حاضر میں یہ تبدیلی آناً فاناً نہیں ہوئی بلکہ جیسے پہلے کہا گیا اس کی پشت پر ایک صدی سے زیادہ کا تجسس و تفحص ہے اور ہوسرل اور ہائیڈیگر کے ساتھ ساتھ اس میں بڑا ہاتھ ساختیاتی فکر کا بھی ہے جس کا امام فرڈیننڈ سوسیئر اور ہمارے عہد میں جس کا سب سے بڑا شارح ژاک دریدا ہے۔ سوسیئر کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنی فکر سے ثابت کر دیا کہ "کوئی جوہر یا خیال زبان سے پہلے یا زبان کے باہر نہیں ہے" دوسرے یہ کہ زبان جیسا کہ صدیوں سے سمجھا جاتا تھا نظامِ تسمیہ نہیں ہے بلکہ محض ساخت یا فارم ہے جو رشتوں کے نظام سے عبارت ہے۔ تیسرے یہ کہ ان رشتوں میں کچھ بھی مثبت نہیں ہے بلکہ یہ افتراقیت یا تضادِ مسلسل سے قائم ہوتے ہیں، چوتھے یہ چوں کہ معنی زبان میں رشتوں کی ساخت سے پیدا ہوتے ہیں، لفظ اور معنی میں کوئی فطری یا لازمی رشتہ نہیں، اور پانچویں یا سب سے بڑی اور انقلاب آفریں بات یہ کہ معنی چوں کہ زبان کی ساختوں سے پیدا ہوتے ہیں، ذہنِ انسانی معنی کا سرچشمہ نہیں بلکہ فقط وسیلہ ہے نظامِ لسان کے کارگر ہونے کا۔

دوسرے لفظوں میں :

LANGUAGE SPEAKS NOT MAN

سوسیئر لفظ یا ہر اُس شے کو جو کسی بھی معنی پر دلالت کرتی ہو، 'نشان' (SIGN) کہتا ہے۔ اس کے فلسفے کو نشانیات (SEMIOTICS) کہا جاتا ہے ساختیاتی فکر یا اس کی توسیعی شکل پس ساختیاتی فکر جس نے تھیوری یا ادب و تنقید کے منظرنامے کو شدید طور پر متاثر کیا ہے، نشانیات کے وسیع تر فلسفے ہی کا حصّہ ہیں۔ چوں کہ زبان کے ذریعے ادراکِ حقیقت کیسے ہوتا ہے یا معنی خیزی کیسے ہوتی ہے یا ذہنِ انسانی یا شعور کا عمل کیا ہے؟ ان مسائل کے بارے میں سوچنے کی نہج بدل گئی ہے، اس لئے ادب کی نوعیت و ماہیت، تخلیق کی اصلیت، معنی کی وحدت متن، قرأت اور قاری کے تفاعل جیسے مباحث بھی از سرِ نو موضوعِ بحث بن گئے ہیں اور ادبی تھیوری پر زور شور سے توجہ ہونے لگی ہے۔

نتیجتاً ادب کے گرد تقدس کا جو ہالہ تھا وہ قریب قریب ختم ہو چکا ہے، صریرِ خامہ بھلے ہی نوائے سروش ہو، اگرچہ محسوس یہی ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ شعر و ادب میں مضامین غیب سے خیال میں نہیں آتے، معنی سے معنی اور شکلوں سے شکلیں بنتی ہیں لسان کی لانگ کی طرح ادب کی لانگ بھی ہر لحظہ موجزن ہے اور حرکیت سے ہمکنار ہے۔ لاکھ محسوس ہو کہ معنی کسی خلا سے آرہے ہیں معنی خلا سے نہیں ساخت سے پیدا ہوتے ہیں اور ادب میں بڑے سے بڑا تخلیقی تجربہ، بڑی سے بڑی ندرت و جدّت یا اجتہاد و انحراف ساخت کی رو سے ہے جو موجود ہے اور ہر لحظہ خود انضباطی کی رُو سے بن اور بگڑ رہی ہے۔ ہر متن میں سیکڑوں ہزاروں متن گھلے ملے ہوتے ہیں۔ متن کی معروضیت نظر کا دھوکہ ہے جب متن آزادانہ وجود ہی نہیں رکھتا اور معانی فی نفسہٖ قائم ہی نہیں ہوتے، تو متن نہ خود کفیل ہوسکتا ہے نہ خود مختار۔ موضوعِ انسانی یا شعورِ انسانی کے بے دخل ہونے کا براہِ راست اثر مصنف کے تصور پر پڑا ہے اور اس کی مرکزیت ختم ہوگئی ہے۔ گویا ادب کے رومانی تصورات جو اب بھی کچھ نہ کچھ زندہ تھے، ان کی بساط تہ ہوگئی ہے۔ متن کی معروضیت اور خود مختاری پر ساختیاتی فکر نے ایسی ضرب لگائی ہے کہ وہ تمام تصورات جو موجودگی کی مابعد الطبیعیات پر مبنی تھے یا معنی کی وحدانیت پر قائم تھے، وہ ہمیشہ کے لئے پارہ پارہ ہو گئے ہیں۔

اس وقت جب ہم اکیسویں صدی کی دہلیز پر کھڑے ہیں ادب کے بارے میں سوچنے کا عام رویّہ یہ ہے (اور اس رویے سے ملتے جلتے بعض رویے ہماری مشرقی شعریات کی بصیرتوں میں بھی مل جاتے ہیں، لیکن یہ اور بات ہے کہ خود ہمارے مانوس روایتی تصورات نے ان پر پردہ ڈال رکھا ہے) وہ یہ کہ معانی متن میں فقط بالقوۃ موجود ہیں اور وہ قاری ہی ہے جو قرأت کے عمل سے معانی کو فی الواقعہ موجود بناتا ہے، گویا معنی فقط مصنف کی یا متن کی جاگیر نہیں، بلکہ مصنف، متن اور قاری کا تفاعل مل کر معنی خیزی کا باعث بنتا ہے، نیز چوں کہ قرأت کا تفاعل ثقافت کی رو سے اور تاریخ کے محور پر ہے اور چوں کہ معنی کا وجود فی نفسہٖ نہیں ہے اس لیے معنی کی وحدانیت ایک نقشِ باطل ہے، معنی کی تعبیریں بدلتی رہتی ہیں اور کوئی تشریح INTERPRETATION آخری نہیں۔ تنقید چوں کہ قرأت کا استعارہ ہے INTERPRETATION تنقید کا اصل منصب یہی ہے کہ وہ ہر اس مقتدرہ کو چیلنج کرے جو معنی پر پہرہ بٹھاتا ہے، نیز کلیت پسندانہ رویّوں یا جبر کا مقابلہ کرے جو فکر کو مقید کرتے ہیں یا معنی کی آزادی میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں۔ یہ پہرہ مانوس تصورات بھی بٹھا سکتے ہیں جن کو ہم بغیر سوچے سمجھے قبول کر لیتے ہیں یا جبر شعار آئیڈیالوجی بھی یا سکہ بند ادبی تصورات بھی جو سب کو ایک ہی لیک پر چلانا چاہتے ہیں اور جو سوچ یا تخلیق کے سرچشموں کو خاک ریز کر دیتے ہیں۔ اکیسویں صدی کے چیلنج کو قبول کرتے ہوئے فکرِ انسانی کا شاید سب سے اہم فریضہ یہی ہے کہ وہ 'دوسری آواز' گویا باطن کی آواز کو یا شعر و ادب کی اس داخلی آواز کو جو بقول اکتیویو پاز ہر طرح کے جبر، ادعائیت یا افادہ سے آزاد ہوتی ہے، ابھرنے دے، تاکہ تکثیرِ معنی کی یا معنی کی مختلف تعبیروں کی راہ کھلی رہے۔ انسانیت کو جن خطرات کا سامنا ہے ان سے عہدہ برآ ہونے کا یا اقدار کے تحفظ کا یا تعبیر نو کا شاید یہ آخری مورچہ ہو۔

□□

جوگندر پال
۲۰۴۔ مستد اکثی انکلیو۔ نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۱۹

نیا اردو افسانہ : زبان و بیان کے مسائل

ہر نئے دور کو پرانی زبان کی [illegible] کرنا اسے نئے سرے سے باندھنا ہوتا ہے کیونکہ اپنی ہر نئی [illegible] کے دوران زندگی ایک الگ تناظر میں ڈھل چکی ہوتی ہے اور اس تنا[illegible] کی پیش کش اکثر الفاظ کی پرانی نشست یا ان کے پرانے مفاہیم سے ادا نہیں ہو پاتی۔ [illegible]س کے علاوہ یہ بھی ہے کہ پرانے الفاظ خوب دھوم دھام سے اپنا بیاہ رچا کے بچے پیدا کرکے اور پھر انھیں اپنے پیروں پر [illegible] بڑے اطمینان سے دم توڑ دیتے ہیں۔ ان کے بعد ان کے [illegible]س زمانے میں گزر کر بسر نہ کر پائیں تو انھیں اپنے بھرپور اظہار کا [illegible] نہیں آتا۔ زبان کو اسی طور اس کے بولنے والوں کی [illegible]ت پھیلتی پھولتی تہذیب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ہمارے معتبروں نے اردو کو جمنا اور گومتی کے پانی سے نہلا [illegible] گہنوں اور کپڑوں سے لاد رکھا تھا کہ بے چاری کے چہرے کے فطری اتار چڑھاؤ کا پتہ ہی نہ چلتا تھا۔ اب یا تو آپ اسے ایرانی [illegible] پر پہنچا کرنے تک واہ واہ سے کوٹھوں کی چھت اڑاتے رہیے یا پھر سے کسی طرح عام زندگی جینے کی راہ پر ڈال لیجیے۔ بھلا ہو ان منچلوں کا جو اسے [illegible]ں سے اٹھا کر گھروں میں لے آئے اور دفتروں، دکانوں اور [illegible] پہنچا دیا کہ ناچ گانا بہت ہو لیا اب [illegible]نت سے جینے کھانے کا جتن کرے۔ اور ساری آرائش جھاڑ کر سیدھے سیدھے زندگی بسر کرنے میں جٹ جائے۔ ایسا نہ ہوتا تو ارد[illegible] چھن چھنا چھن چھن ہی سنائی دیتی۔ پریم [illegible] "کفن"، منٹو کے "ٹوبہ ٹیک سنگھ"، غلام عباس کے "آنندی"، [illegible] احمد کے "گڈریا" کی جہتوں کی صدابندی اسے نصیب نہ ہوتی۔

اردو راس کماری سے پشاور تک بلکہ اس سے بھی آگے تک بس چکی تھی مگر کچھوں کا اصرار تھا — بعضوں کا اب بھی ہے — کہ پٹھان اور پنجابی بھی اسے دلی اور لکھنؤ والوں کی نزاکتوں سے کام میں لا کر برتیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہر مقام کے لوگ اپنا الگ مزاج رکھتے ہیں اور ان کی مقامی تہذیب کا مناسب اظہار فطرتاً مقامی تقاضوں سے وابستہ ہوتا ہے انہی تقاضوں کو پورا کرکے انسانی اداسیوں اور مسرتوں کا کوئی منظری تصور بندھتا ہے اور زبان میں وہ خوبیاں اجاگر ہونے لگتی ہیں جو برتر ادب کی محرک ہوں۔ اظہار کے جامد اور غیر مقامی قواعد سے زبان کو غلط یا صحیح تو ثابت کیا جا سکتا ہے مگر ان باہری وسیلوں کی سٹوف ٹانسی سے مقامی لوگوں کے روابط کی، ان کی محبت اور نفرت کی وہ باطنی کیفیت منکشف ہونے سے رہ جاتی ہے جو ادب کو غیر ادب سے ممیز کرتی ہے۔ وہ تو غنیمت ہوئی کہ اردو کو برصغیر کے ہر خطے اور اس خطے کی چھوٹی چھوٹی بستیوں کی مقامی شکل اختیار کرنے میں کبھی تامل نہیں رہا یہی وجہ ہے کہ پشتو، پنجابی، مراٹھی، سندھی، دکنی، بہاری۔ برصغیر کے ہر کلچر کے عناصر اردو میں آباد ہوتے چلے گئے اور اس طرح ان سارے عناصر کے رچے بسے معیار سے ہماری زبان میں ابلاغ و ترسیل کے امکانات وسیع تر ہو گئے۔ یہی نہیں بلکہ اس کی یہ صلاحیت بھی برابر جڑیں پکڑتی رہی کہ ہر دور کے مخصوص مزاج کا احاطہ بھی کرتے رہے۔ اپنی لسانی پرتوں کے پھیلتے چلے جانے کا نتیجہ ہے کہ کرشن چندر کی بمبئی کی کہانیاں پڑھ کر وہاں کے نچلے طبقوں کے گوشت پوست اور روح کو سونگھ لینے کا احساس ہو جاتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے "پرمیشر سنگھ" اور بلونت سنگھ کے "جگا" میں پنجاب کا کوئی دریا سا چڑھ آتا ہے اور

بیدی کا "چشم بددور" مزے مزے آج کی تیسری دُنیا کے ایک ایسے فرد اسٹینڈرڈ کی تصویر کشی کرجاتا ہے جس کے پیچیدہ شخصی رویوں سے ہم اس کی سہولتوں کی کٹ منٹ کو جھٹ اپنے بصری حصار میں لے آتے ہیں۔

اس بحث سے میرے ذہن میں یہ خیال ابھر رہا ہے کہ جوں جوں آدمی بڑا ہوتا جاتا ہے اس کے روز افزوں تجربے اور شعور کے ساتھ ساتھ اس کی زبان کی جہتیں بھی پھیلتی رہتی ہیں اور یوں دونوں کے حلیوں میں بھی ترمیم واقع ہوتی رہتی ہے اور جہاں نہ ہو وہاں الفاظ اپنی اپنی ہیئتوں میں اپنے طبع زاد مفہوم میں نئے زمانے کا توسیعی معنی جذب کر لیتے ہیں علاوہ ازیں یہ بھی ہے کہ ایک ہی زمانے کے لوگ وہی الفاظ اپنے جداگانہ شعور اور مزاج کی روشنی میں الگ الگ سطح پر استعمال کریں۔ اظہار و بیان کے رموز نگاہ سے باہر نہ ہوں تو یہ نکتہ واضح طور پر سمجھ میں آجاتا ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد کی نثر مصنف کو بڑی جامعیت سے باندھ لینے کے باوجود پریم چند کے لئے بے محل کیوں نہیں۔ اور پریم چند کے لئے کیوں ضروری تھا کہ روایتی بندھی بندھائی زبان کو خوب ڈھیلا کرے۔ یا پھر منٹو، کرشن اور بیدی تینوں معاصرین میں سے پہلے کی برجستگی، دوسرے کی افراط اور تیسرے کی کھینچ انھیں کیونکر مختلف خطوط دیتی ہیں۔

"لکھے ہوئے لفظ" کی داخلی یا دریا گنجائشوں کی بات اگرچہ اپنی جگہ غلط نہیں، تاہم اس امر کا مطالعہ بھی خالی از دلچسپی نہیں کہ ایسی گنجائشوں کی دریافت کیوں کر "بولے ہوئے لفظ" کی سلطیت کی محتاج ہے۔ ادب میں شاید یہ بات افسانے کے حوالے سے زیادہ وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ فن کی متکلم صفات کی رونق سے زیادہ اس کا داخلی منظر بھی بارونق ہوجاتا ہے جیسے مانوس اور محبوب آوازوں کے گنجان بازار میں آپ کے قدم تیز تیز اٹھ رہے ہوں۔ عصمت چغتائی اور واجدہ تبسم کو پڑھتے ہوئے میرے قدم اس بازار کے آخری سرے پر پہنچنے سے پہلے نہیں رکتے، یا پھر میں اس آخری سرے سے بھی آگے نکل جاتا ہوں۔ "لکھے ہوئے لفظ" اگر احساس کمتری کا شکار نہ ہوں تو پکی سیاہی میں اپنی گولائیاں ننگی کرکے بغلیں بجانے کی بجائے گویائی حاصل کرلینے کی تڑپ میں اوجھل ہو ہوجاتے ہیں۔ تاکہ ان سے وہ واقعات بہ صدا پھوٹتے ہوئے محسوس ہوں جنھیں بیان کرنے کے لئے انھیں لکھا گیا۔ واقعات کی راست پیش کشی کا یہ اسلوب کئی سال کی شرکت و ریاضت کے بعد قابو میں آتا ہے۔ رام لعل کا افسانہ "اداسی" پڑھ کر دیکھئے کہ لفظوں کے عارضی پن پر قدرت حاصل کرکے اس نے ایک ہنگامی واقعہ کے تحیر کو کیسے ٹھہرا سا لیا ہے۔

افسانوی ادب کا پہلا پرابلم یہی رہا ہے کہ واقعات کی محدود نوعیت سے ان کی لامحدود معنی کو محسوس کیا جاسکے۔ ایسے نازک کام کی تکمیل میں افسانہ نگار کو آندھی لغویت کا پابند نہیں کیا جاسکتا۔ اچھا لکھنے والوں کو استادانہ التزام سے واقعات کی زیبا کشی نہیں کرنا ہوتی بلکہ زبان میں دم پھونک کر اسے اپنے وارداتی سفر پر چڑھانا ہوتا ہے۔ اس سفر کی کلفتوں میں وہ بیچاری ویسی ہی کوری کیونکر لگے؟ سنہری جلد کی ڈکشنری سے نکل کر سیدھی آپ سے فلرٹ کرنے تو نہیں چلی آئی۔ زبان کے تخلیقی سفر کی سرحدیں پہلے سے حتمی طور پر طے نہیں کی جاسکتیں، کیونکہ وہ آئندہ دَور کے نئے فکری تقاضوں کے عین مطابق آپ ہی آپ کسی دیگر جغرافیائی شیہر میں منتقل ہوجاتی ہے تخلیقی زبان کے دھاگوں کو اپنے سروں پر کھلا رکھنے کا ایک اور اہم سبب یہ بھی ہے کہ افسانہ نگار کے مانند قاری کا بھی افسانے کی تخلیق میں اہم حصّہ ہوتا ہے لہٰذا افسانہ نگار کو کسی معین سرحد سے پرے ان نادیدہ مقامات کی بھی انجانے میں ٹوہ رہتی ہے جو قاری کے ذہنی افق میں ڈوبے ہوئے ہوں۔

صرف اطلاعات عامہ کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونا ہو تو بے شک الفاظ کے محدود معنی اور ترکیب کے طے شدہ قاعدوں کے بغیر بن نہیں پڑتی لیکن الفاظ کی باقاعدہ تاجپوشی سے ہم انھیں تخلیقی ادب کی حکمرانی کا مجاز قرار نہیں دے سکتے۔ کلیوں اور قاعدوں کی بھرمار سے لکھنے والوں کو تخلیقیت کی آبروریزی کی ترغیب ہوتی رہتی ہے۔ اچھی زبان بھی اس وقت بری لگتی ہے جب بلاوجہ اپنی طرف متوجہ کرکے ہمیں ڈسٹرب کیے جانے پر اتر آئے۔ کسی بُت کو دیکھ کر اگر بار بار اس کے پتھر کی بہتر کوالٹی کی طرف دھیان جائے تو ہم کیوں کر باور کرپائیں گے کہ وہ ذی جان ہے؟ اصل افسانوی زبان بھی نامعلوم افسانے میں کہاں اس کی روح کے سراغ میں اوجھل ہوتی ہے۔

کسی جاندار کے پنجر اور گوشت پوست کا بیج اس کی جان میں ہوتا ہے اسی لئے ہم اپنے جسم کا عذاب اپنی روح میں بھی محسوس کرتے ہیں اور روح کا عذاب جسم میں بھی۔ جاندار فکشن کی شناخت کا معیار بھی یہی ہے جو افسانہ

اوپر اوپر سے کوئی شکل اوڑھے ہوئے ہو۔ اس کی وہ شکل آپ کتنی ہی کیوں نہ سنوار لیں اسے آپ ایک دھڑکن نہ دے پائیں گے۔ ہمارے بعض نقاد افسانوں کے تذکروں میں ہیئت کے تجربوں کو کچھ اس طرح ملحوظ رکھتے ہیں جیسے افسانہ نگار کو صرف افسانے کا خارج ہی جوڑ کر کھڑا کر دینا ہو۔ افسانے کا باطن اگر لکھنے والے کی پہونچ سے باہر ہو تو اس کی کسی بھی شکل کو چلنے اور بولنے پر صرف اسی طور قادر کیا جا سکتا ہے کہ اس میں سدا چابی بھری رہے یا پھر آج کل تو بیٹری کے کھلونے بھی عام ملنے لگے ہیں۔ اگر کھلونے ہی بنانا ہوں تو براہ راست یہی کام کیوں نہ انجام دیا جائے افسانے لکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ اپنے کسی افسانوی کردار کی ملاقات پر مجھے تو یہی خواہش رہتی ہے کہ اس میں زندگی کے سارے عناصر دوڑ رہے ہوں کچھ اس طرح کہ جہاں سے بھی کاٹو، لہو بہنے لگے۔ افسانے کی اصل ہیئت کسی پیچ پر کی گھٹنا سے ترتیب پاتی ہے اور پھر وہ ہیئت کتنی بھی انجانی کیوں نہ ہو پڑھنے والے کو اجنبی معلوم نہیں ہوتی لیکن اگر کوئی افسانہ خواہ مخواہ بھیس بدل کر وارد ہو جائے تو اس کی شناخت ممکن ہے نہ لازم۔

افسانہ کہنے کے کان گنت جانے اور انجانے طریقے ہیں اور اس کے اسی غیر رسمی پن کی بدولت اس کی یہ خوبی قائم ہے کہ وہ زندگی کے مخفی گوشوں میں پھیلتا چلا جائے مگر ہر افسانے کے تمام تر وسائل اسی میں مضمر ہوتے ہیں اور صرف انہی وسیلوں کی دریافت پر وہ اپنی اصل صورت دریافت کر پاتا ہے۔ علامت، تجرید اور اسطور بھی بیانیہ کے مانند ہمارے افسانے کے گرانبہا ذرائع ہیں تاہم قیمتی سے قیمتی ذرائع بھی اس شئے کا نعم البدل نہیں ہوتے جس کے حصول کی خاطر انھیں کام میں لایا جاتا ہے۔ علامت، تجرید اور اسطور کا ذکر ہماری نئی تنقید میں اکثر یوں کیا جاتا ہے جیسے کسی افسانہ نگار کو ان وسائل کے توسط سے یہ وسائل ہی پیش کرنا ہوں۔ اپنا افسانہ نہیں۔ سبھی ہتھیار بذات خود بے ضمیر ہوتے ہیں اس لئے ان کی خودکار کھلواڑ سے صرف تخریب کا منظر ہی بن پاتا ہے۔ تاہم کئی ایک ہمعصر لکھنے والوں نے افسانے کے ان ذرائع کو فنکارانہ چابکدستی سے برت کر ہمیں بعض بہت اچھے افسانے دیے ہیں مثلاً انتظار حسین ہمارے دور کے ایک بہت اہم افسانہ نگار ہیں۔ خطابیہ لہجے میں سینئر زکی ہمیر نے "میں ادب میں خطابیہ کے مناسب استعمال کو کوئی عیب نہیں گردانتا" محض اپنے تعصبات کا شکار ہو کے کچھ ایسا بندوبست کیے رکھا کہ ایک طویل مدت تک وہ کسی کو نظر ہی نہ آ پائے۔ انھیں حالات میں چھٹے دہے میں ایک ادبی کانفرنس میں ان سے کہا گیا، آپ کہیں دکھائی نہیں دیتے؟ انھوں نے تلملا کر جواب دیا، آپ سامنے سے ذرا ہٹیں تو دکھائی دوں۔ ادب کی بے تعصب فضا میں انتظار حسین کے تہہ در تہہ داستانی لہجے کا فوری احساس ہو جانا چاہئے تھا۔ اس کے باوجود کرشن چندر نے انہی دنوں اپنی آواز میں لہک سی پیدا کر کے بڑی ماتی شگفتگی سے کہا تھا کیا کیا جائے اپنے پیچھے ہمیں کوئی نظر ہی نہیں آتا۔ مشکل اصل یہ ہوتی ہے کہ ہمارے بعد کے لوگ ہمارے آگے پہنچے ہوتے ہیں، ہم انھیں اپنے پیچھے ڈھونڈتے رہیں تو وہ کیونکر نظر آئیں؟ ہر آنے والے دور کے ادیبوں کو اپنی وسیع تر جنگ سے نمٹنے کے لئے برتر ہتھیاروں کی ضرورت ہوتی ہے (اس کا مطلب یہ نہیں کہ نئے دور میں چائے میں ایک ذرا چینی کم پا کر گاہک وہاں ہائیڈروجن بم پھینکنے کی ٹھان لے۔) انتظار حسین کے داستانی لہجے میں ماضی کے حوالے نئی زندگی کی بالائی فضا میں بوڑھے ستاروں کی توانائی سے جھلملاتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ یہ سب ٹھیک ہیں مگر ادب کے بیان میں تکیہ کلام کی عادت سے عصری زندگی کی پہچان محدود و مشروط ہو کر رہ جاتی ہے۔ پرانے لوگوں کی داستانوں میں ستھو کی کھنک کا انحصار اس پر ہے کہ انھوں نے اپنے وقتوں کی مخصوص جینس کو کھلے بندوں اور بے تحفظ محسوس کر لیا کہ ہماری موجودہ زندگی کا اتنا بڑا ستھو جس کی ٹکنالوجیائی شورش کی تصویر تا حد نظر کھنچی ہوئی ہے۔ ہماری ویسی ہی آزاد شرکتوں کا متقاضی نہیں؟ کافکا کے میٹامورفسیس کا، جائی گینٹنگ کاک روچ۔ کیا آنے والی نسلوں کو کسی ستھو سے کم معلوم ہوگا۔ منٹو کا ٹوبہ ٹیک سنگھ، تو ہمارے وقتوں میں ہی اسطوری پہناوے میں نظر آنے لگا۔ اپنے سمے کی کتھاؤں کو اس صورت آئندہ وقتوں میں ستھو کی طرح سونپنا ہو پاتا ہے۔ جب کتھا کار اپنے زمانے کو اسی کے بے لاگ محاورے میں بیان کر سکیں۔

سارا قصہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ یہ بھی ہے کہ ایک ہی افسانہ نگار کا ہر نیا افسانہ، اگر وہ واقعی نیا ہے، ایک الگ برتاؤ طلب کرتا ہے۔ سبھی افسانوں میں ایک ہی پیٹرن برتنے سے ان کے چہرے اپنے طبع زاد خطوط سے عاری ہوتے ہیں یا اس امر کا خطرہ بھی لاحق ہونے لگتا ہے کہ افسانہ نگار نے ڈھیروں کہانیاں لکھ لینے کے باوجود فی الحقیقت اسی ایک کہانی کو بار بار لکھا ہے۔ اسی تعلق سے موپساں کے ایک قاری نے بجا طور پر

مانے دکھاتی اور یہ رائے ایک حد تک منٹو کے بارے میں بھی بیجا نہیں معلوم نہیں ہوتی کہ موپساں اپنی کہانی کے آخری سطور میں جھٹکا دینے کا عادی ہو چکا ہے کہ وہ مجھے اسی وقت جھٹکا دے پائے گا جب وہ اپنی کسی کہانی میں اس شعوری عمل سے احتراز کرے ۔ زندگی میں ہر واقعہ پہلی بار اور آخری بار پیش آتا ہے اور اس لحاظ سے لاثانی ہوتا ہے ۔ جیتے چلے جانے کی جوش آفرینی اسی سبب سے بنی رہتی ہے۔ اسی مانند کسی نئی کہانی کا جواز بھی یہی ہے کہ وہ پہلی آخری بار ہوئی ہو اور اظہار کے کسی الگ پیرائے پر اصرار کر رہی ہو. کہانی کار جب تک اپنے آپ کو کلیتاً اپنی نئی کہانی کے تابع نہیں کر لیتا اس وقت تک یہ خوف بیجا نہیں کہ اس کی شخصی تکنیکی تجربوں کے جبر سے کہانی کا خون ہو جائے گا۔ ایک ہی نقطۂ نظر کی پریڈ کے مانند، ایک ہی انداز بیان سے بھی کہانیاں یکسانیت یا میکانیکی ٹھک ٹھک کی نظر ہو جاتی ہیں۔ اس صورتحال میں لکھنے والوں کی پیہم تکنیکی مشق زیادہ سے زیادہ اتنا کر دیتی ہے کہ بعد کی کہانی پڑھ کر معلوم ہو پہلی کہانی کی صورت اب بہتر نکل آئی ہے جیسے کوئی جسم صرف اپنی ہی جان کی وجہ سے جاندار ہوتا ہے ویسے کسی انداز بیان میں بھی اسی کی روح کی موجودگی کا احساس نہ ہو تو وہ مردہ ہوتا ہے۔ افسانے میں جان ہو تو جیسے بھی ہو جائے اور اسے پڑھ کر لگے کہ وہ صرف اسی طرح ہو سکتا تھا۔ اسے لکھنے کا اور کوئی طریقہ تھا ہی نہیں ۔

ہماری زبان کے بعض ماہرین کو تخلیق کاروں کا یہ خداداد حق ناگوار گزرتا ہے کہ وہ زبان کو اپنی اظہار کی ضرورتوں کے مطابق استعمال میں لائیں یہ سراسر زیادتی ہے ۔لسانیات کی حیثیت سے بہر حال اپنی جگہ مسلم ہے تاہم بچہ تو ماں کو ہی جننا ہوتا ہے۔ بچے کا جنم ہو جائے تو ریکارڈ آفس کا کام تو یہی ہوتا ہے کہ ریکارڈنگ کرکے سرٹیفکیٹ ایشو کر دے ۔ زبانیں اس طرح نہیں پنپتیں کہ ماہرین لسانیات کسی بند کمرے میں اجلاس یا تحقیق کرکے ان میں اضافے یا حذف کا اعلان کر دیں۔ کسی زبان کی تبدیلی اظہار کی ضرورتوں پر قابل یقین معلوم ہوتی ہے ۔لسانیات کے ماہروں کا کام ہے کہ تبدیلی واقع ہونے پر اس کی مناسبت کے پیش نظر اسے اعتبار کا درجہ دلانے میں معاون ہوں۔ افسانہ نگار کو اگر ہر دور کے مفاہیم کو گرفت میں لاتے چلے جانا ہے اور نئے نئے قارئین کو اپنے تخلیقی سفر میں شریک رکھنا ہے تو اس کی زبان و بیان کی آزادی بہر صورت بنی رہنی چاہئے۔ زبان کو تخلیقی طور پر برتنے کی آزادی میں ذمہ داریوں کے معیار نہایت کڑے ہوتے ہیں۔ ان معیاروں سے گر کر وہ بیچارہ آپ ہی کھرا نہ ہو پائے گا۔

□□

"نصف صدی"

ہے "نیا دور" نام تو میرا
اصلیت میں مگر پرانا ہوں
جو ہے جاری وہی زمانا ہوں
خدمتِ فن ہے کام تو میرا

ادنیٰ خادم زبانِ اردو ہوں
زندہ رکھنا اسے ہے کام مرا
اس کے حق میں ہی ہر پیام مرا
وہ ہے اک پھول تو میں خوشبو ہوں

سچ تو یہ ہے کہ میرے دامن پر
اہلِ فن جو گہر سجاتے ہیں
بحرِ عرفاں سے کھوج لاتے ہیں
اس لیے میں ادب کا ہوں محور

گن کے گزرے ہوئے ہر اک دن کو
پالیا ہے پچاس کے سن کو

حضور سہسوانی
"راز منزل"
پوسٹ سہسوان
بدایوں (یو پی)

وقار ناصری
شیش محل، حسین آباد لکھنؤ



قرۃ العین حیدر کے ناول

اردو ادب میں ناول نے چاہے ویسی ترقی نہ کی ہو جیسی کہ دوسرا اصناف نے لیکن یہ کیا کم ہے کہ اردو میں چند اچھے ناول ضرور موجود ہیں۔ نذیر احمد سے رسوا کے امراؤ جان ادا تک اور امراؤ جان سے گئودان تک آتے آتے ناول کے کردار پلاٹ اور اسلوب میں کافی تبدیلیاں ہوئیں۔ ایک طرف توبۃ النصوح کا تمثیلی پیرایۂ اظہار دوسری طرف گئودان لیکن اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ رسوا کا امراؤ جان وہ سنگ میل ہے جو اردو ناول کی اولیں شناخت ہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد کے اردو ناول کا اگر جائزہ لیا جائے تو بہت سے ایسے ناول ہیں جو اردو ناول میں اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر لاکھ کہیں کہ "چھکے چھڑا دینے والے ناول اردو میں آج تلک نہیں لکھے گئے لیکن خود قرۃ العین کے ناول اس بات کا ثبوت ہیں کہ اردو میں چند اچھے اور بہت اچھے ناول موجود ہیں۔

قرۃ العین سے قبل اردو ناول کی بنیاد اتنی مستحکم نہ تھی۔ لے دے کے چند قابلِ ذکر ناول تھے۔ لیکن یہ ناول اپنی تمام خصوصیت کے باوجود ایسے نہ تھے جن کی گرفت مضبوط ہو۔ قرۃ العین حیدر کا پہلا ناول "میرے بھی صنم خانے" جب شائع ہوا تو اس کے انداز بیان اور اسلوب کی تازگی نے بڑی حد تک اس خلا کو دور کرنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے اردو ناول ایک کمزور صنف کی طرح نقادوں کے لئے ہدف ملامت تھا۔ اردو ناول کا منظر نامہ بدلنے میں قرۃ العین حیدر نے جو کردار ادا کیا ہے اس میں کوئی ان کا حریف نہیں — اردو ناول نے جو کچھ ترقی کی ہے بلاشبہ وہ قرۃ العین حیدر کی مرہون منت ہے۔ اگر ان کی تحریروں کو حذف کر دیا جائے تو اردو ناول کے معیار و اعتبار کی تاریخ نہ ہونے کے برابر رہ جاتی ہے۔

۱۹۴۷ء کی تقسیم کو جس طرح انہوں نے جھیلا اس کا براہ راست اثر ان کی تحریروں میں نمایاں ہے۔ ذہنی جلاوطنی کا یہ سفر آج تک کسی نہ کسی طرح ان کی تحریروں میں بوند بوند چھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کا اعتراف کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں۔

> "تقسیم ہند کے صدمے نے ۱۹۴۷ء کے آخر میں ساڑھے انیس سال کی عمر میں مجھ سے "میرے بھی صنم خانے" لکھوائی جو میرا پہلا ناول تھا اور جسے آج بھی اردو کے چند اچھے ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد میں نے جو کچھ لکھا اس صدمہ کے زیر اثر لکھا۔ ذہنی جلاوطنی نے مجھے بہت پریشان کیا۔"

میرے بھی صنم خانے کا مرکزی کردار رخشندہ تقسیم کے المیہ کی وہ رمزیت ہے جو محرومیوں اور مایوسیوں کے ساتھ ساتھ تہذیب کے مٹنے کا ماتم دار ہے۔ تقسیم نے جس طرح انسانوں کی چشم زدن میں اکھاڑ پھینکا اور جس شکست و ریخت سے وہ دوچار ہوئے وہ ساری صورت حال رخشندہ کے پس منظر میں موجود ہے۔ یہ رخشندہ سے زیادہ قرۃ العین کی کہانی ہے اور کبھی کبھی تو یہ محسوس ہوتا ہے جیسے ان کی پرچھائیوں نے رخشندہ کا روپ بھر لیا ہو۔

قرۃ العین حیدر کا دوسرا ناول "سفینۂ غم دل" اودھ کی تہذیب و معاشرت سے عبارت ہے۔ اس ناول میں قرۃ العین حیدر نے سوانحی مواد خاص کر اپنے والد سجاد حیدر یلدرم کے کردار کو بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ جگہ جگہ اپنی ذات کو موضوع بنا کر گرد و پیش کی فضا اپنے مخصوص انداز میں تخلیق کی ہے۔

اس ناول میں "میرے بھی صنم خانے" جیسی آنچ نہیں لیکن دل کو خون کر دینے کا ہنر ضرور موجود ہے جو کبھی اپنے باپ کا مرثیہ لکھتا ہے اور کبھی علی کے کردار میں چنگاریاں تلاش کرتا ہے۔

"آگ کا دریا" قرۃ العین حیدر کا وہ ناول ہے جو سب سے زیادہ موضوعِ بحث بنا۔ اس ضخیم ناول میں قرۃ العین حیدر نے ہندوستان کے تہذیبی ورثے کو اس انداز سے کھنگالا ہے کہ تاریخ کے مختلف ادوار زندہ اور متحرک ہو کر منظر سے پس منظر تک اس عہد کی مثال بن جاتے ہیں۔

ہندوستانی تاریخ کے یہ چار مختلف ادوار تین ہزار برسوں کی محیط یہ کہانی تہذیب و ثقافت کے اس ارتقائی عمل کا احساس ہے جس نے ایک مشترکہ تہذیب کی داغ بیل ڈالی اور پھر تقسیم کا عمل قبول کر کے خود اپنی قدروں کو وقت کے دریا میں تند موجوں کے حوالے کر دیا۔

"آگ کا دریا" لکھنے کا سبب کیا تھا اس پر روشنی ڈالتے ہوئے قرۃ العین حیدر لکھتی ہیں۔

"ملک کیوں تقسیم ہوا۔ کیا تقسیم تاریخی حیثیت سے ناگزیر تھی اس
سوال نے مجھے فلسفۂ تاریخ کی طرف کھینچا۔ اس کا جواب ڈھونڈنے
کی کوشش میں ایک ناول آگ کا دریا لکھا اور اس کو سمبل بنا کر میں نے
تین ہزار سال کی پھیلی ہوئی اور الجھی ہوئی ہندوستانی تاریخ
میں سے ہندوستانی شخصیت کی عظمت کو گرفت میں لانے کی
کوشش کی۔"

اس کوشش میں انہوں نے وہ پیکر تراشے جو تاریخ میں کہیں نہیں تھے لیکن ہندوستان کی ساری کی ساری تاریخ انہی پر منحصر تھی۔

"گوتم نیلمبر کی تاریخ عظیم ناموں سے پُر تھی۔ ان میں سے بہت
سے نام اب روایت اور اسرار کے دھندلکے میں جا چھپے تھے
جس طرح ہماوت کی اونچی چوٹیوں پر دھند جمع ہو جاتی ہے۔"

"آگ کا دریا" دراصل دھند میں گم ان قریوں اور بستیوں کی تلاش ہے جن کو وقت کا دریا غرقاب کر کے کبھی کا آگے بڑھ چکا تھا۔ یہ شکستہ ساحلوں اور ڈوبی نوکاؤں کے کرداروں کی کہانی ہے جسے قرۃ العین حیدر نے چار مختلف ادوار میں تقسیم کر کے ہندوستانی شخصیت کا ہر پہلو تاریخ کے تناظر میں سمیٹ لیا ہے۔

گوتم نیلمبر، ہری شنکر، ابوالمنصور کمال الدین، سرل ایشلے تہذیب کے دو پڑاؤ ہیں جس میں ہر ایک کے سفر کا اختتام دوسرے سفر نامے کی تمہید بن جاتا ہے۔

"سرجو کی موجیں گوتم نیلمبر کے سر سے گذرتی چلی گئیں۔ ابوالمنصور
کمال الدین نے کنارے پر پہنچ کر اپنا شیام کرن گھوڑا برگد
کے نیچے باندھا اور چاروں اور نظر ڈالی۔"

"سرل کو بڑا عجیب سا لگا۔ اس نے آنکھیں ملیں اور خود کو یقین
دلانا چاہا کہ یہ سب سچ ہے کہ قسمت کے ایک انوکھے داؤ نے
اسے کیمبرج کی گلیوں سے نکال کر یہاں اس نوکے میں لا بٹھلایا
ہے۔ اس عجیب و غریب ملک میں جسے "بنگال" کہتے ہیں۔
جسے انڈیا کہتے ہیں۔"

چار مختلف ادوار کی کہانی چندر گپت کے عہد سے شروع ہو کر تقسیم کے المیہ پر ختم ہوتی ہے۔ اس تاریخ سے عبارت ہے جس میں ایک طرف راجوں، مہاراجوں کی جنگیں، بادشاہ اور سلطانوں کی فوج کشی، ایسٹ انڈیا کمپنی کی سازشیں، سراج الدولہ اور واجد علی شاہ جیسے حکمراں ہیں اور دوسری طرف ویدک فلسفہ، بدھ مت، بھگتی اور اسلام کی رنگا رنگی سے ابھرتی ہوئی وہ تہذیب جو مشترک ہے۔ یہ وقت کے دریا کی اس بے رحم حقیقت کا سفاکانہ سیل ہے جس کی زد میں آ کر ہر شے تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ پاٹلی پتر، شراوستی، دلی، جونپور، بنگال اور اودھ سب کو غرقاب کرتا ہوا یہ وقت کا دریا وہاں پر ٹھہر سا جاتا ہے جہاں ہندوستان گنگا اور راوی کے پانیوں میں تقسیم ہو کر دو نظریوں اور دو قوموں میں بٹ کر جُدا ہو جاتا ہے۔

اور یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ یہ سب سے زیادہ ان انسانوں کی بھینٹ لیتا ہے جن میں گوتم نیلمبر، ابوالمنصور کمال الدین، ہری شنکر اور کمال کی آرزوئیں اور خواب ہوتے ہیں۔ چمپک، چمپا، طلعت، نرملا اور چمپا احمد کسی کے لیے اس کی لہریں مہرباں نہیں یہ سب کو ایک حقیر تنکے کی طرح اپنی موجوں میں اچھالتا پھینکتا کہیں سے کہیں جا نکلتا ہے۔

یہ ہندوستان کے ہزاروں لاکھوں انسانوں کی کہانی ہے جو محبتوں کے امین تھے۔ جن کے ہونٹوں پر خیال، معرفتی، کبیرا اور ودیاپتی براجتے تھے۔ جنہیں اپنے سے زیادہ دوسروں کی زندگی سے پیار تھا لیکن۔

"اور جب دونوں بھائیوں میں خانہ جنگی شروع ہوئی تو ارجن
نے اپنی کمان اٹھا کر کرشن سے کہا اجنار دھن میرا رتھ دونوں

فوجوں کے درمیان کھڑا کر دو تاکہ میں دیکھوں کہ مجھے کون سے فریق کا ساتھ دینا چاہیئے۔"

اور کرشنا نے رتھ وہاں لے جا کر کھڑا کر دیا اور ارجن نے دیکھا دونوں فوجوں میں ایک دوسرے کے پرکھ باپ، دادا، چچا، بھائی بھتیجے، دوست، استاد، رفیق ایک دوسرے کے خلاف صفیں آراستہ کیے کھڑے تھے۔ تب کنتی کے بیٹے نے دکھ میں ڈوب کر کہا، اوکرشنا یہ منظر دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں شل ہیں میرا حلق سوکھ رہا ہے۔ میرا جسم تھرتھر کانپتا ہے۔

کنتی کے بیٹے کا یہ دکھ گوتم، ہری شنکر اور کمال کا دکھ ہے۔

"جب ٹرین نے بارڈر کراس کیا تو وہ اتنے دنوں سے اپنی ساری ہمت صرف کر کے اپنے آنسو ضبط کر رہا تھا کھمبے کے پاس ایک سردار جی کو کھیسیں نکالے بندوق تانے کھڑے دیکھ کر وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔"

"یار گوتم"

"ہاں"

"یار کمال ہمیں دغا دے گیا۔" ہری شنکر نے چند لمحوں کے بعد آہستہ سے کہا۔"

"ہاں"

"تم کو پتہ ہے۔ سالا دلی ہوتا ہوا گیا، اگر مجھے تار دے دیتا تو میں اس سے آ کر وہیں مل لیتا"

"میں تو دلی میں موجود تھا اس کے باوجود وہ مجھ سے نہیں ملا" گوتم نے آہستہ سے جواب دیا۔

وہ دونوں پھر چپ ہو گئے۔

"نہ جانے وہ اس وقت کہاں ہوگا۔" ہری شنکر نے تاسف سے کہا۔

"کراچی میں ہوگا اور کہاں ہوگا۔" گوتم نے نیچی آواز میں جواب دیا وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ سیڑھیاں اتر کر وہ ندی کنارے آئے اور پانی کو دیکھتے رہے۔ شاید وہ دونوں اکٹھے سوچ رہے تھے کہ ابوالمنصور کمال الدین کس طرح ہندوستان میں داخل ہوا اور کس طرح ہندوستان سے نکل گیا۔

"آگ کا دریا" کے بعد قرۃ العین حیدر نے سیتا ہرن لکھا۔ اس ناول میں قرۃ العین نے ایک بار پھر تقسیم کے پس منظر سے سیتا میر چندانی جیسا کردار تخلیق کیا ہے۔ سیتا میر چندانی کے کردار میں جو انفرادیت اور انوکھا پن ہے اس نے اس کردار کو ان کے تمام نسوانی کرداروں سے زیادہ تہہ دار بنا دیا ہے تقسیم کے نتیجہ میں کراچی سے دلی آنے والی سیتا میر چندانی ایک عجیب نفسیاتی کشمکش کا شکار ہے۔ ایک طرف تو وہ ہر اس شخص کی پذیرائی کرتی ہے جو اس کے قریب آتا ہے دوسری طرف وہ اپنے شوہر جمیل کے لیے بھی بے چین ہے۔ جمیل سے امریکہ میں ملاقات شادی کا بہانہ بن جاتی ہے لیکن کچھ ہی دنوں میں جمیل اسے چھوڑ دیتا ہے۔ قمرالاسلام، بہیش کمار اور عرفان وقفہ وقفہ سے اس کی زندگی میں داخل ہوتے ہیں۔ جمیل سے ملنے کے لیے وہ لنکا جاتی ہے لیکن مل نہیں پاتی۔ اپنے بیٹے راہل کے لیے تڑپنے والی سیتا میر چندانی عرفان کے ساتھ پیرس چلی جاتی ہے۔ تھوڑے دنوں بعد جب وہ دلی آ کر واپس پیرس لوٹتی ہے تو عرفان کے بجائے فلیٹ میں ایک اور آدمی ملتا ہے جو اس سے پوچھتا ہے کہ وہ کون ہے اور کس سے ملنے آئی ہے۔ سیتا میر چندانی خود کو مسز عرفان بتاتی ہے تب وہ آدمی بتاتا ہے کہ عرفان اپنی مسز کے ساتھ دو مہینے کی رخصت پر کراچی گئے ہیں اور یہ فلیٹ اسے دے گئے ہیں سیتا میر چندانی ایک بار پھر تنہا ہو جاتی ہے۔ وہ رام جس کے لئے وہ بار بار ہرن ہوتی رہی ہر بن باس میں اسے اکیلا چھوڑ دیتا ہے۔

سندھ اور لنکا کے قدیمی پس منظر کو لے کر قرۃ العین نے سیتا میر چندانی کے کردار کے مختلف پہلوؤں کو بڑی خوبصورتی سے اجاگر کیا ہے۔ جا بجا رامائن کے حوالوں سے داستان اور معنی خیز بن گئی ہے۔ سیتا ہرن کی سیتا میر چندانی۔

"وہ اٹھ کر دوسری سیڑھی پر جا بیٹھی۔ کیسا اندھیرا ہے یہاں اس اندھیرے میں میری ساری آرزوئیں، سارے آدرش، سارے پچھتاوے اگیا بیتال کی طرح جگمگاتے ہیں۔ ابھی میں نے آنکھیں بند کیں تو مجھے ایسا لگا جیسے بھیرو کی سواری کا کتا لکڑ بگھے پر سوار ہو کر قبرستانوں کی طرف جانے والی چڑیلیں، ہزاروں برس کی مری ہوئی روحیں ان سب نے مل کر مجھے چاروں اور سے گھیر لیا ہے اور بہت جلد مر جاؤں گی۔"

"اس رات وہ سکھر بیراج پر کھڑی دیر تک سندھ دریا کی کہانی سناتی رہی اور پھر یک لخت خاموش ہو گئی۔ اس وقت عرفان نے

دیکھا وہ اس عظیم الشان باجبروت بند کی منڈیر پر جھکی بے حد اکیلی، بے حد کمزور اور بے حد اجنبی الگ رہی تھی۔ مہران کی سمندر ایسی موجوں میں گھری میلوں لمبے پل کی روشنیوں کی جھلملاہٹ اور صدیوں تک پھیلے صحرا کی وسعت میں کھوئی ہوئی بے چاری لڑکی"

ایک کمزور عورت کو معاشرے میں اپنی شناخت بنانے کے لیے کن کن منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے اور زندگی کی چھوٹی چھوٹی آسائشوں کی تلاش اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے اسے قرۃ العین نے چائے کے باغ میں بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ حاصل لاحاصل کی یہ کہانی ہر اس محمودہ کا منظر نامہ ہے جو ریٹایا راست کا شانی کا لبادہ اوڑھنے کے باوجود محمودہ رہتی ہے۔ ایک غریب مولوی عبدالصمد کی لڑکی جس کو خود فریبی اور فرار مسلسل کے صلہ میں کیا ملا؟ چند آنسو جو تحریر کی سیاہی پہ ہی نہیں اس کی ساری زندگی پر بھاری ہیں۔ خط پہ ٹپکے ہوئے یہ چند آنسو اس کی تنہائیوں اور محرومیوں کی روداد ہیں جس میں وہ ایک چھوٹے سے درخت کی طرح بڑے درختوں کے درمیان اکیلی اور بہت اکیلی ہے۔

چائے کے باغ میں پاربتی، رام نندن، غفور الرحمان اور بہت سارے لوگ ہیں جن کو وقت اور حالات نے سونار بنگلہ کی سرزمینوں پر لا پھینکا ہے۔ یہ کاشی، اعظم گڑھ، سیتاپور، مرزاپور اور نہ جانے کن کن قریوں سے لائے ہوئے لوگ ان چائے کے باغوں میں مزدور ہیں جنہیں کل انگریز اور ان کے گرگے کھدیر کھدیر کرا دھر لائے تاکہ یہ فاقہ کش مزدور صاحب لوگوں کے لیے محنت کریں اور جو کوئی پوچھے تو اپنا پچکا ہوا پیٹ دکھا کر بھوک اور لاچاری کی وہ حقیقت بیان کر سکیں جو ملکوں کی تقدیر بدلنے کے باوجود ان کا مقدر ہے۔

سونار بنگلہ کی خوبصورت فضاؤں میں ڈولتی یہ کہانی زندگی کے اتنے رنگ سمیٹے ہے کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کون سا رنگ کتنا خوبصورت اور کتنا بدصورت ہے۔

"اور تب مجھ پر انکشاف ہوا۔ تمہارا اور میرا محبوب خوابیدہ، مرنجان مرنج، سیدھا سادا، غریب، شریف، بھولا بھالا پروشل ڈھاکہ اب ایک ماڈرن، صنعتی، سوفیسٹی کیٹیڈ بڑا شہر بن چکا ہے اور اس حیرت انگیز قلب ماہیت کی علامت چمکیل تھنڈر برڈ بھی ہے جو قصبہ ریسٹو مال کے سامنے کھڑی ہے۔"

ناول کا طنزیہ اسلوب نہایت بھرپور ہے اور کہیں کہیں تو اس کی دھار جسم سے روح تک شگاف ڈال دیتی ہے۔

"یہ شخص غفور الرحمن میاں، یہ بھوکا ننگا، فاقہ کش ملاح اور اس کے فاقہ کش ماں باپ اور بہن بھائی صرف اتنا جانتے کہ ملکوں کے بیچ میں دیواریں کھڑی ہیں مگر دکھ کی کوئی سرحد نہیں ہے۔ وہ غالباً نہیں جانتے کہ ان گھنے جنگلوں میں آسام کہاں ختم ہوتا ہے اور سلہٹ کہاں سے شروع ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ صرف یہ جانتے ہیں کہ ان کا بانس کا جھونپڑا اور اناس اور دھان کا کھیت سرما ندی کے کنارے تھا جہاں پرکھوں کے زمانے سے وہ رہتے آئے تھے۔ اور اب وہ ان کا نہیں۔"

اگلے جنم میں مو ہے بٹیانہ کیجیئو عورتوں کی بے کسی کی کہانی۔ معاشرے میں مردوں کی برتری کسی نہ کسی رشک قمر کو پامال کرتی رہتی ہے۔ وقت اور حالات کے ہاتھوں مجبور رشک قمر کا یہ المیہ اصل میں اس سماج کا المیہ ہے جس میں عورت مرد کے لیے محض ایک کھلونا ہے۔ قرۃ العین نے اپنے مخصوص طبقہ اشرفیہ کے بجائے نچلے طبقے سے رشک قمر کا کردار چن کر اس حقیقت کو پیش کیا ہے جہاں کوئی نہ کوئی فرہاد یا نریندر رکمار ور ما رشک قمر جیسی عورتوں کا استحصال کر کے اسے پرچھائیوں میں اکیلا چھوڑ دیتا ہے۔ گانا گا کر بھیک مانگنے والی رشک قمر مشاعروں اور ریڈیو کی دنیا سے متعارف ہو کر آغا ہمدانی کے چکر میں کراچی پہنچتی ہے اور وہیں ایک دوسری دنیا میں اپنی بیٹی گنوا کر جب لکھنؤ واپس آتی ہے تو اس کی چھوٹی بہن جمیلن اس کا انتظار کھینچتے کھینچتے مرکھپ چکی ہوتی ہے۔ رشک قمر کی عمر ڈھل جانے کے بعد ریڈیو اور مشاعروں میں جگہ نہیں ملتی۔ آخر کار وہ چکن کا کام بنانے لگتی ہے کیونکہ یہی ایک وسیلہ ہے جس کے ذریعہ وہ زندگی کی بچی کھچی سانسوں کو سمیٹ سکتی ہے۔

قرۃ العین نے عورت کی بے کسی کو جس تناظر میں پیش کیا ہے وہ نہایت مؤثر ہے۔ رشک قمر کا کردار اور اس کے اردگرد کی فضا جس فنکاری سے تخلیق ہے وہ قرۃ العین کے کمال اور مہارت کی دلیل ہے جزئیات پر ان کی نظر طائرانہ نہیں فنکارانہ ہے۔

"لڑکی دوڑتی ہوئی چبوترے کی سمت آتی ہے۔ جہاں ایک یک چشم مسخرہ پھندنے کی ترکی ٹوپی اور سرخ واسکٹ سلیپنگ سوٹ کا نیلا دھاری دار پائجامہ پہنے ایک مختصر سا ہارمونیم سنبھال

چکا ہے۔ ایک مدقوق عورت دھسّہ شال میں لپٹی ڈھولک اپنے آگے سرکاتی ہے۔ ایک کمسن بچی قریب بیٹھی مجمع کو غور سے دیکھ رہی ہے۔ مدقوق عورت اسے ایک تھپڑ رسید کرتی ہے اری بد ذات ادھر کیا بیٹھی ہے۔ تھوا کی تھوا سامنے آکر بیٹھ۔"

وقت اور حالات نے اچھے اچھے شریف گھرانوں کو کس حال پر پہنچا دیا تھا قرۃ العین نے دو جملوں میں وہ بات کر کے تفصیل سے گریز کے باوجود بہت کچھ کہہ دیا۔

"انسان پیٹ کی خاطر سب کچھ کرتا ہے۔ شرافت وراثت سب دھری رہ جاتی ہے۔ زیادہ تر خانگیاں سفید پوش بدحال خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔"

"اس ناول کا اختتام رشکِ قمر کے آنے والے کل کا آغاز ہے قمرن کھپریل میں آئی بوسیدہ تخت کو جھاڑن سے خوب اچھی طرح صاف کیا۔ اس پر چادر بچھائی اور ساری اپنے سامنے پھیلا کر اس پر چھپے بیل بوٹوں کو غور سے دیکھا۔ سوئی میں سفید دھاگہ پرویا۔ دیوار کے سہارے بیٹھ کر ساری کا آنچل گھٹنوں پر پھیلایا اور بوٹا کاڑھنا شروع کیا۔"

تب وہ دفعتاً اپنا سر گھٹنوں پر رکھ کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

مٹتی ہوئی قدروں کے ملبے پر نئی قدریں جب اپنی نیو دکھڑی کرتی ہیں تو ایک نہ ایک دلربا اس کا اہم ستون بن جاتی ہے۔ تہذیبوں کے عروج و زوال کی یہ کہانی گلنار بائی طوائف سے شروع ہو کر دلربا پر ختم نہیں ہوتی بلکہ یہ تو بیرسٹر رفاقت حسین کی تہذیب کے انحطاط سے خود کو ترتیب دیتی چلتی ہے۔

وہ گلنار بائی جسے رفاقت حسین نے اپنے بنگلہ سے ذلت آمیز برتاؤ کر کے نکالا تھا ان کی پوتی حمیدہ کو دلربا بنا کر پردہ سیمیں پر اسی طرح نچاتی ہے جس طرح پارسی تھیٹر میں وہ خود ناچتی تھی۔ وقت کی اس گردش پر وہ خدا کی شکر گذار ہے۔

"اور اس کارسازِ حقیقی کی قدرت کے قربان جاؤں۔ جس نے ایک بہت طویل مدت کے بعد میرے کلیجے میں ٹھنڈک ڈالی"

ڈیرے دار طوائف گلنار بائی کا یہ عروج رفاقت حسین کے لیے جان لیوا ہوا یہ اور بات لیکن قرۃ العین نے جس طرح اسے پیش کیا ہے اس نے دلربا کو اس عہد کی دستاویز بنا دیا ہے۔

کارِ جہاں دراز قرۃ العین کا سوانحی ناول ہے جس میں انہوں نے اپنی جڑوں کی تلاش میں فرات سے جیحوں تک سفر کر ڈالا ہے۔ وہ کارِ جہاں دراز کے متعلق رقم طراز ہیں۔

"۱۹۶۱ء کی برسات میں محلہ سادات سردری، نہٹور ضلع بجنور (یوپی) کے ویران ڈھنڈار آبائی مکانات بارش کی جھڑی میں دھڑا دھڑ گرتے جا رہے تھے۔ جب کمترین وقائع نویس کے ذہن میں مندرجۂ بالا خیالات آئے جن کا ملفوظات کمالیہ میں کہیں ذکر نہ تھا۔"

دو جلدوں کو محیط اس ضخیم ناول میں ناول جیسی خصوصیت تو نہیں لیکن قرۃ العین کے تاریخی شعور نے اسے بہت کچھ اہم بنا دیا ہے۔ گمشدہ زمانوں کی تلاش میں تذکروں ملفوظات، رقعات اور شجروں کی چھان پھٹک کر کے وہ اپنے اجداد کی داستان کو اس لہو کے شجر سے سرخیاں دیتی ہیں جس کے خون نے نہٹور کی زمینوں کی آبیاری کی۔

کوفہ میں امام زید کی شہادت کے بعد ان کی اولاد جائے امان تلاش کرتی ہوئی بارھویں صدی میں ہندوستان وارد ہوئی اور یہیں ان کی اولادوں میں سید ضاالدین ترمذی کے بیٹے میر حسن نے بجنور کے قصبہ نہٹور کو آباد کیا۔ یلدرم اسی خاندان کے فرد تھے۔

کارِ جہاں دراز میں قرۃ العین نے اپنے بچپن سے لے کر ۱۹۶۱ء تک کے واقعات کا احاطہ کیا ہے اور اپنے والد یلدرم کو کافی اہمیت دی ہے۔ ہوش بجنوری کا علامتی کردار خوب ہے۔ مستری مبارک حسین کی کسمپرسی برصغیر کے زبوں حالی اور ذہنی پستی کی وہ مثال ہے۔ جو صرف ان کا نہیں شاید ہم سب کا المیہ ہے۔

ان دو جلدوں کے باوجود کارِ جہاں دراز کا سلسلہ ختم نہیں ہوا ہے کیونکہ قرۃ العین کا سفر جاری ہے اور کارِ جہاں کا اختتام جانے کب اور کیسے ہو یہ وہی سمجھ سکتی ہیں۔

آخرِ شب کے ہم سفر بنگال کی سیاسی اور انقلابی تحریکات سے عبارت ہے قرۃ العین کا یہ ناول بلاشبہ اپنے موضوع اور اہمیت کے اعتبار سے ان کی سابقہ تحریروں میں آگ کا دریا کے بعد سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ بنگال کی دہشت پسند اور انقلابی تحریک، ۴۲ ۱۹ء کا آندولن، مطالبہ پاکستان

تقسیمِ ہند اور بنگلہ دیش کے تناظر میں یہ ناول اس دور کے انقلاب پسند حضرات کے تصورِ انقلاب کی بے چہرگی کا آئینہ ہے۔ یہ دیپالی' روزی' او مارائے' ریحان الدین احمد اپنے تمام ظاہری حسن اور باطنی کثافتوں کی وجہ سے ان تمام لوگوں کی حقیقت ہیں جو انقلاب کی تلقین کرتے کرتے خود اسٹیبلشمنٹ کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ان کے اشتراکی اور انقلابی نظریات صرف زبانی ہوتے ہیں عملی طور پر یہ لوگ انقلاب سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتے۔ اپنے تضاد کی وجہ سے یہ نام نہاد انقلابی آخر شب کے ہم سفر بن کر انہی تاریکیوں میں کھو جاتے ہیں جو برصغیر کے افق پر پھیل چکی تھی۔

"وہی ریحان جس نے دیپالی سے کہا تھا۔
علی گڑھ' لکھنؤ' اور جامعہ ملیہ اور کلکتہ اور سب جگہوں کے نوجوان ہمارا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو چکے ہیں۔ پرانے دہشت پسند بھی اب ہماری طرف آ چکے تھے۔ شوکتی ہم لوگ خوش قسمت ہیں جو اس زمانے میں پیدا ہوئے اور ملک کے لیے کچھ کر سکنے کے اہل ہیں"
یہ وہی ریحان ہے۔ لیکن
"ماموں جان۔ کیا خوب چیز ہیں۔ مکمل آدرش وادی۔ مجسم انٹرنیشنل گڈول آج پراگ میں ہیں، کل قاہرہ پرسوں نیویارک۔ آج اس پولیٹکل پارٹی میں ہیں کل اس میں جہاں منسٹر بننے کے مواقع زیادہ نظر آئیں۔ ادھر کو لڑھک گئے۔ ماسکو اور واشنگٹن دونوں کے خیر خواہ۔ مکمل غیر جانبداری اسی کو کہتے ہیں۔"
اور دیپالی' ناصرہ کو یوں سمجھاتی ہے۔
"کل کے باغی آج کے اسٹیبلشمنٹ میں شامل ہو چکے ہیں۔ تم آج کی باغی ہو۔ ممکن ہے تم کل کے اسٹیبلشمنٹ میں شامل ہو جاؤ۔"

اس پر ناصرہ کا استہزا اور ہنسی دراصل دیپالی' روزی ادمارائے اور ریحان الدین احمد جیسے لوگوں کے نام نہاد انقلابی نظریات اور کردار کی مکمل تفسیر ہے۔

اس ناول کو علامتی اور اشاراتی اسلوب نے بہت زیادہ معنی خیز بنا دیا ہے اور کہیں کہیں پر اس کے طنز کی دھار اتنی تیز ہے جو دل کی گہرائیوں تک میں اتر جاتی ہے۔

گردشِ رنگ چمن قرۃ العین کا ایک اور اہم ناول ہے۔ انہوں نے یہ ناول لکھ کر بیسویں صدی کے اس طبقہ کی حقیقت بیان کی ہے جس نے انگریزوں کے اقتدار کے ساتھ معاشرے کو بنانے یا بگاڑنے میں اہم کردار ادا کیا۔ تہذیبی عروج و زوال خاص کر لکھنؤ کے لیے لکھتے وقت انہوں نے اپنی تحریر میں ماضی اور حال کے وہ منظر نامے سمیٹ لیے ہیں جن کے رنگوں کے تغیر پر گردش رنگ چمن کا دارومدار ہے۔

"بائیں ابلک عنبر۔ یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ تم بھی تو اس افسانوی ساحل پر رہتی ہو۔ بسنت رت میں چھتر منزل اور فرح بخش کے جھروکوں سے بیگمات گومتی کے میلے کا نظارہ کرتی تھیں۔ بادشاہ اور خواص و عوام زرد پوش ہو رہ ماہی نما بجروں پر سوار میر انشا مہنت کا بھیس بدل کر اسی کنارے پر۔ واللہ وہ دیکھو لکھنؤ کی وضع داری۔ ایک بزرگ لڑکھڑاتے چلے آ رہے ہیں۔ ہاتھ میں ریشمی رومال

"یہی بسنت رت۔ نوروز ۲۱ مارچ ۱۸۵۷ء۔ جب سر کولون کیمپ بل کا فاتح لشکر لکھنؤ میں داخل ہوا۔ اکبری دروازے سے لے کر دلکشا تک یہ بے مثال شہر کھدوا ڈالا۔ اس کے ملبے سے سڑکیں بنوائیں۔ قیصر باغ میں ایک بارہ دری تھی جس میں واجد علی شاہ جشن مہتاب کے لیے رونق افروز ہوتے تھے۔ اسے کھدوا ڈالا کیونکہ اختر پیا کے کلکتے سدھارنے کے بعد عوام وہاں جمع ہو کر زار و قطار روتے تھے۔"

پانی کی طرح بہتی ہوئی نسلوں کی یہ کہاں ماضی سے حال تک پھیلی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر منصور کاشغری' ڈاکٹر عنبریں بیگ اور وہ سب جو اس ناول کا کردار ہیں دراصل تاریخ کا وہ چہرہ ہیں جنہیں قرۃ العین نے یکجا کر کے گردش رنگ چمن کی یاد تازہ کر دی ہے۔ اگر یہ کردار نہ ہوتے تو کس کو پتہ چلتا پانی کی طرح بہتی ہوئی نسلیں کہاں سے کہاں پہنچ گئیں ہیں۔

ناول کا ایک خاص پہلو تصوف ہے جو آخری حصہ میں بارہ بنکی کے ایک صوفی کے سیاق و سباق میں ہے۔ غالباً یہ عارف میاں کا تذکرہ ہے۔ جانے کیوں اسے پڑھتے وقت مجھے جمیلہ ہاشمی کا دشت سوس یاد آ گیا۔ دشتِ سوس کی فضا میں منصور حلاج کے انا الحق کی گونج ہے اور یہ عارف میاں۔

"عاشقِ حسینؑ ہیں محرم میں تعزیہ داری کرتے ہیں۔ ایک روز حضرت علیؑ کے متعلق فرما رہے تھے۔ ارے ہمیں جو کچھ سامان ملتا ہے شاہ ولایت ہی سے تو ملتا ہے۔ "سلطان" میاں کا مخصوص لفظ

ہے۔ ان کی مراد ان کی اپنی ولایت تھی۔"

چاندنی بیگم زندگی کے اتار چڑھاؤ اور رد و قبول کی کشمکش کی کہانی ہے وہ طبقہ جو انگریزوں کے اقتدار کے ساتھ وجود میں آیا آزادی کے بعد بدلتے ہوئے حالات میں وہ خود کو کھپا نہیں سکا۔ اب وقت کے تقاضے دوسرے تھے لہٰذا وہ لوگ جو جاگیردارانہ نظام کے پروردہ تھے نئی ترجیحات اور نئے معاشرے میں قدم نہیں جما سکے۔ اقتدار کی باگ ڈور اب دوسرے ہاتھوں میں تھی۔ سیاسی طور پر بھی وہ لوگ پیچھے اور بہت پیچھے ہو چکے تھے۔

قنبر علی، صفیہ، بوبی، چاندنی بیگم یہ سارے کردار اس معاشرے کی روایت ہیں جو وقت کے ساتھ تبدیل نہیں ہوئی۔ یہ مایوس، ناکام، مجہول اور خودکشی پر آمادہ لوگ ہیں۔ یہ صرف خواب دیکھ سکتے ہیں کیونکہ خوابوں کے علاوہ ان کے پاس رہا ہی کیا ہے۔ تبدیلی حالات نے انہیں اس موڑ پر لاکر اکیلا چھوڑ دیا ہے جس سے آگے چلنے کی سکت ان میں نہیں ہے۔

ریڈ روز میں آگ لگنے کا واقعہ اصل میں ان کے طبقے کے خاک ہو جانے کی علامت ہے۔ یہ اس طبقہ کا المیہ ہے جو وقت کے ساتھ کچھ دور ہی چل کر تھک گیا۔

قرۃ العین نے مولانا مودودی کی تفہیم القرآن سے ایک آیت کا ترجمہ لے کر اول سے آخر تک وہ سب کچھ سمیٹ لیا ہے جو چاندنی بیگم کے ذریعہ وہ کہنا چاہتی ہیں:

"جب چاہیں ہم ان کی شکلیں بدل سکتے ہیں ..."

اور واقعی چاندنی بیگم شکلیں بدلنے کی کہانی ہے جسے قرۃ العین کے مخصوص اسلوب نے گردش رنگ چمن کا چہرہ بنا دیا ہے۔

فصل گل آئی یا اجل آئی اور ہاؤسنگ سوسائٹی کوشش کے باوجود دستیاب نہ ہو سکیں۔ حالانکہ ان کا ذکر بھی ضروری تھا بہرحال قرۃ العین کے اہم ناول اس مختصر جائزے میں شامل ہیں۔ ان پر تفصیلی نظر ڈالنا میرا منصب نہیں۔ یہ تو نقادوں کا کام ہے۔ ایک قاری کی حیثیت سے قرۃ العین کے فن کو ایک طرح کا خراج عقیدت ہے کیونکہ وہ اردو کی تنہا ادیبہ ہیں جن کے لیے قاری کوئی مسئلہ نہیں۔

□□

ماخذ: میرے بھی صنم خانے۔ سفینۂ غم دل۔ آگ کا دریا۔ سیتا ہرن۔ چائے کا باغ۔ اگلے جنم میں موہے بٹیا نہ کیجیو۔ دلربا۔ آخر شب کے ہمسفر۔ کار جہاں دراز ہے۔ گردش رنگ چمن۔ چاندنی بیگم (قرۃ العین حیدر) قرۃ العین حیدر کی ناولٹ نگاری (شہنشاہ مرزا)

انسان کی آنکھیں

شہر کی اک نیم روشن سی گلی میں رات کو
میں نے دیکھی اک جواں عورت کی خوں آلود لاش
ایک خنجر جس کے مُردہ جسم میں پیوست تھا
جس سے تھوڑے فاصلے پر تھا کھڑا اِک بدمعاش
دستۂ خنجر کی جانب اس کی آنکھوں کا تھا رُخ
جن میں آتی تھی نظر سفاکی و دیوانگی
لاش سے چمٹا ہوا تھا ایک طفلِ شیرخوار
جس کی آنکھوں میں تھی اک معصوم سی بے چارگی
دل میں سوچا میں نے ان دونوں کی آنکھیں دیکھ کر
کس کی آنکھوں کو بھلا انسان کی آنکھیں کہوں
ذہن نے جو کچھ کیا تھا فیصلہ، مت پوچھیے
ہے یہی بہتر کہ میں خاموش و لب بستہ رہوں

○○

ڈاکٹر اختر بستوی
شعبۂ اردو۔ گورکھپور یونیورسٹی
گورکھپور ۲۷۳۰۰۹

پروفیسر سید مجاور حسین رضوی
۵۳۴ - اتر سوئیا، حسن منزل، الہ آباد



اردو شاعری میں قومی یکجہتی کی روایت
(نصف صدی میں)

ارنسٹ رینان کے خیال میں ایک قوم ماضی کی قربانیوں کے شعور اور مستقبل میں مزید قربانیاں دینے کی رضامندی کے احساس سے جنم لیتی ہے۔ مشترکہ دکھ اور مشترکہ تجربات ایک قوم کی تعمیر و تشکیل میں مثبت کردار ادا کرتے ہیں۔

ہندستانی تاریخ کا تسلسل بھی ہندستانی قومیت کی تعمیر میں بہت اہم رہا ہے۔ ہندستان میں مختلف نسلوں کے افراد رہتے ہیں۔ مختلف مذاہب اور عقائد یہاں کی رنگا رنگ زندگی کا جز ہیں۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے سے مختلف زبانوں کی بنیاد پر لسانی خطے ہیں لیکن اس کثرت کے باوجود ہندستان میں ہمیشہ ایک بنیادی وحدت رہی ہے۔ ہندستان کے کسی علاقے کا باشندہ ہو، وہ کہیں بھی ہو اپنے کو ہندستانی ہی کہتا ہے۔ پنڈت نہرو لکھتے ہیں:

"میں سمجھتا ہوں کہ تاریخ کے کسی حصے میں بھی
ایک ہندستانی نے ہندستان کے کسی بھی حصے میں اپنے
لیے بیگانگت محسوس کی ہوگی اور کسی بھی دوسرے ملک
میں اپنے کو اجنبی محسوس کیا ہوگا!"

دراصل یہ باطنی احساس اور یہ نفسیاتی اور جذباتی ہم آہنگی کا تصور قومیت کی تشکیل کرتا ہے۔ قومیت ایک روحانی جذبہ یا اصول ہے جو ایک ہی وطن کے باشندوں اور ایک ہی تاریخی ورثہ رکھنے والوں کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔ قومیت کا یہ جذبہ زبان و ادب، رسم و رواج، معاشرتی آداب، عادات و خصائل، پیداواری ذرائع اخلاقی و جمالیاتی نظام اجتماعی احساسات اور ان سب سے بڑھ کر ایک روحانی لہر ہوتی ہے جو تمام افراد کو ایک رشتہ میں پرو کر انھیں اکائی کی شکل عطا کرتی ہے۔

ہندوستان میں جنوب سے لے کر شمال تک مشرق سے لے کر مغرب تک سارے ہندستانی اپنے عادات و خصائل کی خوبیوں اور خامیوں کی بنیاد پر ایک جیسے نظر آتے ہیں۔ ان کی تاریخی وراثت بھی ایک رہی ہے، ان کے زندہ سکھ اور تجربات بھی مشترک رہے ہیں اور تمام تر اختلافات کے باوجود اس کثرت میں وحدت کی تمنا اور تڑپ رہی ہے اور یہی کثرت میں وحدت قومی یکجہتی کے شعور کو تاریخ کے ہر موڑ پر زندہ اور متحرک رکھتی رہی ہے۔

قومیت کا یہی مشترکہ باطنی احساس قومی یکجہتی کا پہلا اور بنیادی ستون ہے۔ حالاں کہ قومی یکجہتی کی اصطلاح اردو شاعری کے لیے زیادہ قدیم نہیں ہے بلکہ تقریباً ساٹھ برس قبل اثر لکھنوی نے ایک نظم لکھی تھی جس کا عنوان "درسِ اتحاد" تھا۔ اس نظم میں انھوں نے لفظ 'یکجہتی' وسیع تر مفہوم میں استعمال کیا ہے اور سمجھایا ہے کہ یکجہتی کیا ہے۔ کہتے ہیں ؎

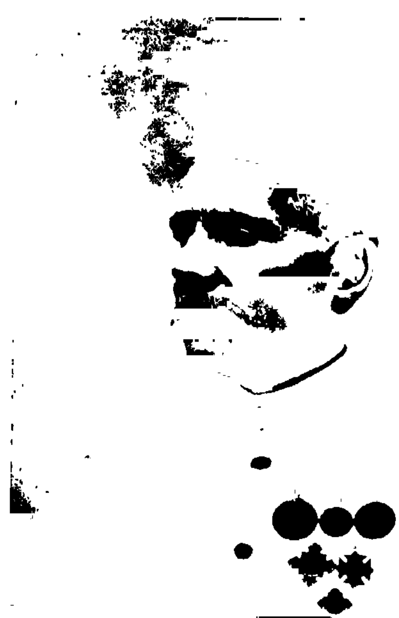
الفت ہوئی رسمِ پارینہ ہے اس کی جگہ دل میں کینہ
اگلوں کے چلن ہم بھول گئے وہ رسمِ کہن ہم بھول گئے
آپس کی رواداری اُٹھی الفت اُٹھی یاری اُٹھی
وہ جوگ رہا نہ وہ پریت رہی بس اک نفرت کی ریت رہی
یکجہتی جب مفقود ہوئی اور فکرِ زیاں و سود ہوئی
وہ جذب کی طاقت سلب ہوئی
توفیقِ ہدایت سلب ہوئی

بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس میں یکجہتی کا تصور نہیں ہے'



آرزو لکھنوی

۱۸۷۳ء - ۱۹۵۱ء



صفی لکھنوی

۱۸۶۲ء - ۱۹۵۰ء



حسرت موہانی

۱۸۷۵ء-۱۹۵۱ء



ثاقب لکھنوی

۱۸۶۹ء - ۱۹۴۶ء



مالک رام

۱۹۰۶ء - ۱۹۹۳ء



کلیم الدین احمد

۱۹۰۸ء - ۱۹۸۳ء



ساحر لدھیانوی

۱۹۲۱ء — ۱۹۸۰ء



جاں نثار اختر

۱۹۱۴ء - ۱۹۷۶ء

لیکن ذرا سا غور کرنے پر یک جہتی کے لئے کلیدی اشارے مل جاتے ہیں مثلاً یک جہتی کے لئے (۱) باہمی اُلفت ضروری ہے اس کو رسمِ پارینہ نہیں بنانا چاہیے البتہ (۲) ہمیں اپنی روایات کو جس کی بنیاد باہمی محبت و احترام پر ہے فراموش نہیں کرنا چاہیے اور یہی اگلوں کا چلن تھا۔ (۳) رواداری ہندستانی تہذیب اور تاریخ کی اساس ہے اور اسی سے یک جہتی حاصل ہوتی ہے۔ رواداری ہی کا جزو باہمی احترام ہے اور اسی باہمی احترام کی کوکھ سے وسیع النظری جنم لیتی ہے۔ یہ رواداری ختم ہو رہی ہے (۴) رواداری، وسیع النظری، باہمی احترام اور اپنی روایات کے تسلسل کو فراموش کرنے کا نتیجہ ہوتا ہے سود و زیاں کی فکر، اجتماعی سُود و زیاں کا مفہوم ہوتا ہے دوسرے وجود کو نہ برداشت کرنا اور رنگا رنگی کو یک رنگی میں بدلنا۔

یہ سارے امور اثر لکھنوی کی 'درسِ اتحاد' میں موجود ہیں۔

یہ چوتھی دہائی کی نظم ہے اور اس وقت قومی یک جہتی کا شعور پیغامِ اتحاد کا دوسرا نام تھا۔ اس وقت غلامی کا مشترکہ دُکھ اور تقریباً ڈیڑھ سو برس کے انتشار کی تاریخ اور سیاسی عدمِ استحکام کا مظاہرہ قومی وحدت کے شعور کو آواز دے رہا تھا، یہ تمنا اور تڑپ تھی کہ آزادی ملے 'انتشار کے بجائے شیرازہ بندی ہو۔

لیکن اس دور کے حالات نے تیوریوں میں لچکتے ہوئے خنجر، خون آلودہ آستینیں، شکستہ دامن اور الجھی ہوئی شخصیتیں ایک دوسرے سے دست و گریباں تھیں۔ کیفی جیسے شعرا ایک طرف ان حالات کا تجزیہ کر رہے تھے جس نے ملک میں منافرت کا زہر پیدا کر دیا تھا اور بدیسی سامراج 'لڑاؤ اور حکومت کرو' کی پالیسی پر کاربند تھا۔

تم نے اپنوں سے لے لیا بدلہ — خون کے ایک ایک قطرے کا
لیکن اس سے ملا سکے نہ نگاہ — کر دیا جس نے زندگی کو تباہ
روئے کشمیر سے چرا لی آب — لوٹ لی شان و شوکتِ پنجاب
زلفِ بنگال الجھ کے بکھرا دی — صبحِ کاشی پہ دھوپ دوڑا دی

ہو گئی مالوے کی نیند حرام
رات دیکر اودھ سے لے لی شام

ان تمام اشعار میں ہندستانی تہذیب کی حسین وراثت کا بھی ذکر ہے اور اس کا بھی تذکرہ ہے کہ کس طرح قومی وحدت کے فقدان کی وجہ سے یہ عظیم تہذیبی سرمایہ منتشر ہو رہا تھا۔

۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۷ء تک کی تاریخ میں کئی دھارے نظر آتے ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ نازی ازم اور فاشزم کو شکست فاش ہوئی تھی۔ نو آبادیاتی نظام کے گھروندے جن کی بنیاد جبر پر تھی ٹوٹ رہے تھے۔ تمام ایشیائی ممالک میں بیداری کی نئی لہر پیدا ہوئی تھی اور بیشتر ممالک نے غلامی کی زنجیروں کو توڑ پھینکا تھا۔

ان سب کا اثر ہندستان نے قبول کیا تھا اور دوسری طرف پس منظر میں پوری تاریخ تھی جہدِ آزادی کی، قربانیوں کی، خون سے لکھی گئی تاریخ جس میں جلیان والا باغ، موپلا کسانوں کی بغاوت، بھگت سنگھ کی شہادت، سائمن کمیشن، نہرو رپورٹ، ڈانڈی مارچ، بنگال کا قحط، ۱۹۴۲ء کی تحریک، ۱۹۴۵ء میں آزاد ہند فوج کے سلسلے میں قومی تحریک اور پھر ان سب کے ساتھ فرقہ واریت کی سڑی ہوئی لاش اور فرقہ وارانہ فسادات جو ۱۸۹۳ء میں بھی ہوئے اور ۱۹۲۷ء میں بھی ہوئے اور پھر ۱۹۴۶ء میں فسادات کے اس خونی سیلاب میں نواکھالی، بہار اور پنجاب تک نہا اٹھے تھے، اور انھیں حالات میں جب ملک مشتعل تھا، متحد نہیں تھا تو ہندستان آزاد ہوا۔

یہ کچھ دنوں پہلے جو آوازیں گونجی تھیں کہ ؎

اٹھو برق کی طرح ہنستے ہوئے
کڑکتے، گرجتے، برستے ہوئے
غلامی کی زنجیر کو توڑ دو!

تو آہنی طوق تو گل گیا لیکن ——

"آخر کار ہندستان نے آزادی حاصل کر لی مگر
بہت بڑی قیمت پر اور بڑے اذیت دہ طریقے سے
اس تقسیم کو منظور کرنا پڑا۔"

تقسیم کا یہ زخم اُردو ادب کے لیے رُوح فرسا تھا۔ اُردو کا وجود متحدہ قومیت، مشترکہ تہذیب، مشترکہ ہیروز، مشترکہ تجربات کی بنیاد پر ہوا تھا اور ان سارے تصورات کو آگ اور خون کی ہولی کھیلنا پڑی تھی۔

اس دور میں اُردو کے شعرا نے اس ہمیت، اس فرقہ وارانہ

عصبیت اور ساتھ ہی ساتھ قومی یک جہتی کی شہ رگ کاٹنے والے رجحانات کی سخت مذمت کی۔

کسی بھی اُردو شاعر کے یہاں ایک مصرع ایسا نہیں مل سکتا جس میں فرقہ وارانہ منافرت ہو۔ بلکہ راہی معصوم رضا، وامق جون پوری، غلام ربانی تاباں، سلام مچھلی شہری، ساحر لدھیانوی اور کمال احمد صدیقی وغیرہ نے اپنی نظموں میں ایک طرف تو فسادات کے خلاف آواز بلند کی، دوسری طرف ہندستانیوں کو متحد کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ گاندھی جی فرقہ واریت کی صلیب پر مصلوب کر دیئے گئے، مگر اسی کے ساتھ وہ قومی یک جہتی کی علامت بن گئے۔ وہ ایسی تاریخی صداقت بن گئے جو ہزار ہا برس کے مشترکہ کلچر کے تسلسل کا تاریخی نتیجہ تھا۔ انھیں مجازؔ نے "تاجِ وطن کا لعل درخشاں" کہا۔ جوشؔ نے "ہند کا شاہِ شہیداں"۔ سلامؔ نے "باغباں" کی علامت استعمال کی اور وامقؔ نے "وطن کا میر کارواں" کہتے ہوئے لکھا ہے

وہ چاند جو غروب ہو گیا تھا بن کے آفتاب
دلوں کو اک نئی شعاعِ زندگی میں گوندھتا
بلند ہوتا جا رہا ہے مشرقی فضاؤں میں
پھر اتحاد کے پھریرے کھل گئے ہواؤں میں
غلط کہ میرِ کارواں .... غلط کہ اپنا پاسباں
نظر سے دور ہو گیا
نظر سے دور ہوتے ہی نظر میں کھنچ کے آ گیا
ہماری رُوح کے شکستہ تاروں کو ملا گیا!

یہ قومی یک جہتی کا بھرپور تصور ہے اور اتنی مکمل علامت ہے کہ جس کا ہر لفظ اپنے اندر ایک جہانِ معنی رکھتا ہے۔ 'شکستہ تار' کا استعارہ اس انتشار کی نشان دہی کرتا ہے جو فرقہ وارانہ منافرت کی بنیاد پر انتشار کا سبب بن گیا تھا۔

اس طرح ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۱ء تک اُردو شاعری مسلسل ان طاقتوں سے نبرد آزما رہی جو ملک میں انتشار پھیلانا چاہتی تھیں اور یک جہتی کی دشمن تھیں۔ اسی پانچویں دہائی میں سیکولرازم کا تصور اُبھرا جو قومی یک جہتی کے سلسلے میں دوسرا اہم ترین ستون تھا۔ سیکولرازم کا کوئی رابطہ لامذہبیت سے نہیں ہے۔ یعنی اس عمومی تصور سے کہ سیکولرازم کا مطلب ہے کہ کسی کا کوئی مذہب ہی نہ ہو اور وہ لامذہب ہو جائے۔ چنانچہ ایم۔ این رائے صاحب نے سیکولرازم کی یہی تعریف کی تھی کہ سیکولرازم نام ہے مذہب سے چھٹکارا پانے کا لیکن گجندر گڈکر نے اسی طرح کے خیالوں کو صاف کرتے ہوئے بھگوت گیتا کی روشنی میں یہ بتایا کہ تمام مذاہب کا یکساں احترام ہونا چاہیے۔ ہندستانی سیکولرازم کا پہلا بنیادی اصول یہی ہے۔

اپنے مخصوص نظریات کو دوسروں پر مسلط کرنا سیکولرازم نہیں ہے فراخ دلی اور رواداری کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ دوسروں کو خوش کرنے کے لئے اپنے معتقدات اور تشخص سے بے نیاز ہو جائے یا قومی دھارے کے نام پر اپنی انفرادیت سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ہندستانی سیکولرازم نے ہمیشہ اسی پر زور دیا کہ چمن میں ہر رنگ کے پھول ہیں اور قومی یک جہتی کا مفہوم رنگا رنگی میں یک رنگی اور ہم آہنگی سمجھا جائے نہ کہ محض یک رنگی اور انضمام۔

رواداری میں باہمی احترام تھا۔ ایک کو ختم کر کے دوسرے کو مسلط کرنا نہیں تھا چنانچہ اردو شاعری نے ماضی کے ہیروز یا عظیم شخصیتوں میں مہادیو جی، سری کرشن جی، راجہ رام چندر جی، گوتم بدھ، گرو نانک، حضور سرورِ کائناتؐ، حضرت علیؓ اور حضرت امام حسینؓ کی شخصیتوں کو اپنے ہیروز میں شمار کیا ہے۔

لیکن اردو شاعری نے ہندستانی عوام کو ہندستانی قومیت کی تشکیل و تعمیر کے لئے ایسے 'ہیرو' دیئے اور ایسے افراد کو اپنی روایات کا جزو بنایا جن کی شخصیت ہر اعتبار سے نہ صرف اختلافات سے بلند تھی بلکہ یگانگت اور ہم آہنگی کی علمبردار بن کر رہنمائی کا فریضہ بھی انجام دے سکتی تھی۔ ان شخصیتوں میں تاریخ کے ایسے روشن اور تابناک پہلو تھے جن کی بنیاد ایثار و قربانی، حق و صداقت، میل و محبت، اخوت و رواداری اور اعلاترین انسانی قدروں پر تھی۔ اردو شاعری نے تاریخ سے لکشمن، بھرت، ارجن، نل اور دمینتی، ہریش چندر، رضیہ سلطانہ، اکبر، چاند بی بی، رحیم، جہانگیر، گرو نانک، سراج الدولہ، موہن لال، میر مدن، ٹیپو سلطان، بہادر شاہ ظفر،

لکشمی بائی، گوکھلے، مولانا محمد علی جوہر، بھگت سنگھ، واجد علی شاہ اختر جیسے افراد کو منتخب کر کے اپنے شعری روایات کا جزو بنا کر مشترکہ ہیروز کا سیکولر تصور پیش کیا اور اس طرح ہندستانی قومیت کی تعمیر میں نمایاں کردار ادا کیا۔ یہ سارے افراد اردو شاعری میں کہیں نہ کہیں اور کبھی بار بار نظر آتے ہیں۔

یہ عظیم شخصیتیں ہمارے ماضی کا شاندار اور باعظمت ورق ہیں لیکن گزشتہ پچاس برس میں یوں تو کئی شخصیتیں ابھریں لیکن ان میں سے کچھ کو ہی ملک گیر مقبولیت حاصل ہو سکی چنانچہ مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو لال بہادر شاستری، جے پرکاش نرائن، مولانا آزاد، ڈاکٹر رام منوہر لوہیا شیخ محمد عبداللہ، اندرا گاندھی، راجیو گاندھی ایسی شخصیتیں ہیں جنہوں نے تاریخ میں اپنی جگہ بنائی لیکن ان میں سے بہت کم اردو شاعری کا محور و مرکز بن سکے۔

چھٹی دہائی سے قومی یک جہتی کا باضابطہ تصور شروع ہوا۔ ۱۹۶۱ء میں قومی یک جہتی کانفرنس میں ان تمام عناصر کی نشاندہی کی گئی جو قومی یک جہتی کی راہ میں رکاوٹ تھیں۔ قومی یک جہتی کا جو سیاسی تصور قومی یکجہتی کونسل کی طرف سے پیش کیا گیا تھا اس میں کہا گیا کہ:

"ہندوستان میں ہمیشہ ایک بنیادی وحدت رہی اور ایک ممتاز انفرادیت، حالاں کہ سیاسی وحدت اور حصول آزادی نے اس سالمیت کی توثیق کر دی ہے پھر بھی انتشار پسند، علیحدگی پسند رجحانات عوامی ایکتا کے شیرازے کو منتشر کرنا چاہتے ہیں۔ ان رجحانات میں فرقہ واریت، ذات پات، علاقائیت اور لسانی تاثر اہم ہیں۔"

قومی یک جہتی کی تعریف کرتے ہوئے کہا گیا:

"قومی یک جہتی ایک نفسیاتی عمل ہے جس سے وحدت، ایکتا اور جذباتی ہم آہنگی کے تصورات عوام کے دلوں میں بیدار ہوں اور مملکت سے وفاداری اور مشترکہ شہریت کا شعور پیدا ہو۔"

قومی یک جہتی کونسل کی اس تعریف میں مشترکہ شہریت کے بجائے ہندستانیت کا لفظ ہونا چاہیے، اس لیے کہ ہندستانیت کا شعور روحانی بھی ہے اور تہذیبی بھی ہے اور یہی ہندستانیت حقیقی معنوں میں قومی یک جہتی ہے اور یہی قومی یک جہتی حب الوطنی بھی ہے اور وطن پرستی بھی۔

چناں چہ ہندستانی تاریخ میں کئی موڑ آئے جب اردو شاعری کا کارواں پوری طاقت کے ساتھ ہندستانیت کے شعور کے ساتھ حب الوطنی کا پرچم بلند کیے انتشار پسند طاقتوں سے نبرد آزما رہا۔ ۱۹۶۲ء، ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی لڑائیوں کے بعد بہت سارے نازک اور حساس موضوعات ملک کی سیاسی تاریخ کا محور و مرکز بنے، ان میں جہاں علاقائیت کا رجحان تھا جو ملک کی سالمیت کے لیے خطرہ بن سکتا تھا، یا لسانی جارحیت کا پہلو تھا جو بے حد خطرناک نتائج کا حامل ہو سکتا تھا یا تشخص اور انفرادیت کے نام پر ذات پات کا نظام تھا جس کی جہتیں ملک کو مختلف سمتوں میں لے جانا چاہتی تھیں۔ یہ سارے گوشے تو تھے ہی، ان میں سب سے خطرناک رجحان انتہا پسندی یا تشدد اور جنگجویانہ حکمت عملی و دہشت گردی کا ہے، جو ہندستان جیسے ملک کے لئے جس کا بنیادی فلسفہ عدم تشدد اور رواداری رہا ہو، وہاں بندوق کی نال اور گولیاں سوہان روح ہیں۔

یہ رجحان اب ایسی منزلوں پر آ گیا ہے جہاں اس کا مقابلہ نہ سیاسی داؤں پیچ سے کیا جا سکتا ہے نہ اعلانات، وعدوں اور سیاسی نعرے بازی سے۔ اس رجحان کا اگر مقابلہ ہو سکتا ہے تو تہذیبی سطح پر اور ادب کے ذریعہ ان رجحانات کی بیخ کنی کی جا سکتی ہے۔

عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ جسے شعر کہتے ہیں وہ تزکیہ نفس اور تطہیر جذبات کا نام ہے۔ اس طرح کی شاعری یا شاعری میں اس طرح کے عناصر کی تلاش اگر تضیع اوقات نہیں تو غیر ادبی عمل ضرور ہے اور یہ کہ صحافیانہ طرز کی شاعری یا پروپیگنڈہ شاعری کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اکثر بہت ثقہ قسم کے دانش وروں نے یہ ارشاد فرمایا کہ اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر اور ازیں قبیل کی تلاش بد ذوقی ہے۔ نعرہ بازی شاعری نہیں ہے۔

"آواز دو ہم ایک ہیں"

"وطن کی آبرو خطرے میں ہے ہشیار ہو جاؤ"

یا اسی طرح کے نغمے مخصوص حالات میں تالیاں تو بجوا سکتے ہیں لیکن ان کی ادبی قدر و قیمت نہیں ہو سکتی۔

یہ درست ہے کہ ادب مملکت کے ہاتھوں اخبار، ٹیلی ویژن یا ریڈیو کی طرح حکومت کی تشہیر یا پروپیگنڈہ کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ یہ بھی درست ہے کہ شاعر سے یہ مطالبہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ہاتھ میں قلم لیے بیٹھا رہے اور کوئی حادثہ ہو، کوئی سانحہ ہو اور وہ شعر کہنا شروع کر دے۔ یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ کسی عبادت گاہ کی شہادت یا بے حرمتی شاعری کا موضوع بن جائے۔ اسی طرح بہت سارے ایسے واقعات ہیں جو ملک گیر اہمیت رکھتے ہیں۔ مثلاً کرکٹ ٹیم کی فتحیابی یا لتا منگیشکر کی گیت و نغمہ کی زندگی کی نصف صدی یا محترمہ کرن بیدی کا ایوارڈ پانا یا محترمہ سنتلیش یادو کی بے نظیر جرأت، ہمت، شجاعت اور دیوی درگا جیسا کردار یا کھیتوں میں پیداوار میں اضافہ ـــــ یہ شاعری کے موضوعات نہیں بن سکتے اسی طرح بڑھتی ہوئی آبادی جس طرح ملک کو بحران کے آتش فشاں تک لے آئی ہے یا بجلی اور پانی کے مسائل جو ہر روز اہمیت اختیار کرتے جا رہے ہیں یا ہر روز بڑھتی ہوئی گرانی یا پھر بین الاقوامی سطح پر سوویت یونین میں اشتراکیت کا المیہ اور اس کی تقسیم، بوسنیا میں نسل کشی کی کوشش، دوسری جنگ عظیم کے دوران روسی سپاہیوں کی ایک لاکھ نوّے ہزار عورتوں کے ساتھ زنا بالجبر اور اسی طرح کی اطلاعات ـــــ تو کیا پھر ان سب پر شعر کہے جائیں گے۔ کیا ہمارا موضوع سخن ایک ایک لمحہ کی بوند میں سمٹ کر رہ جائے گا۔؟

یہ وہ سوالات ہیں جو اکثر و بیشتر کیے جاتے ہیں اور اگر ان کا جواب اثبات میں ہو تو پھر قومی یک جہتی اور قومی ایکتا پر شعر کہنے کا جواز ہو سکتا ہے۔ ہنگامی موضوعات کو شعری و فکری نگاہ کا مرکز توجہ بنایا جا سکتا ہے۔

یہاں دو باتیں غور طلب ہیں:

(۱) کیا کسی زبان کا کوئی شاعر اپنے عہد اور اس کے عصری تقاضوں سے یا تاریخ کے کسی کربناک لمحہ سے بے نیاز رہ سکا ہے؟ کیا دمشق کی بربادی پر سعدی کے اشعار کوئی اہمیت نہیں رکھتے؟ کیا چھ سو سپاہیوں کی موت کی وادی میں پیش رفت نظم کا موضوع نہیں بن سکی؟ پھر میر صاحب کے وہ اشعار جن میں دلی کا دل دھڑکتا ہے ادبی معیار پر پورے کیوں نہیں اترتے؟

آج یہ سوچنا پڑے گا کہ بہت سے مسائل ایسے ہیں کہ اگر ادیب اور شاعر ان سے صرف نظر کرتے ہیں تو شاید ادبی تاریخ انھیں معاف کر دے مگر ان کے ضمیر انھیں کبھی معاف نہیں کر سکیں گے۔

اصل بات یہ ہے کہ موضوع مہتم بالشان ہو تو بھی شاید اگر نکات فن سے بے خبر اور اپنے رویّہ کے اعتبار سے خام کار ہے تو بے ثباتی دنیا پر نظیر اکبرآبادی کے قطعہ جیسا شعری کارنامہ وجود میں آئے گا اور یہی موضوع میر صاحب کے یہاں چار مصرعوں میں کائنات کو زیر و زبر کرے گا۔ شعری رویّہ جس میں جذبے کی شدّت اور اظہار کا خلوص دونوں شامل ہیں دراصل ساری اہمیت اسی کی ہے۔ کچھ لوگوں نے واقعی شعر نہیں کہے بلکہ نعرے لگائے۔ مگر جب شعر کہے تو راہی معصوم رضا کی "سب سے چھوٹی اقلیت" وامق کی "میر کارواں" مظفر شاہجہاںپوری کی "یہ خام شعور آزادی" جیسے کارناموں نے جنم لیا یا پھر وہ ہزاروں شعر وجود میں آئے جو اُردو شاعری کے روایتی استعارہ سے سجائے گئے کیا انھیں کوئی فراموش کر سکتا ہے۔

اس لیے قومی یک جہتی پر لکھی جانے والی ہر نظم یا اشعار کو نظرانداز نہیں کیا جانا چاہیے بلکہ ان کی ادبی قدر و قیمت کا تعین ہونا چاہیے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ آج تشدد، انتہاپسندی اور جنگجویت کے ہاتھوں اگر ہماری تہذیب، ہمارا ادب، ہماری اخلاقیات جل کر خاکستر ہو گئیں تو ہم جمالیات کی تلاش کہاں کریں گے، حسن کہاں نظر آئے گا۔ وہ جو جلے ہوئے مکانوں اور لاشوں کی بستیاں آباد ہو رہی ہیں کیا انھیں دیکھنے کے بعد شاخ گل کی یاد رہ جائیگی۔

گزشتہ نصف صدی میں قومی یک جہتی کو کئی خطرات پیش آئے ملک کی سالمیت کو خطرہ، فرقہ واریت، علاقائیت، ذات پات، طبقاتی استحصال وغیرہ کا خطرہ، لیکن جو خطرہ آج درپیش ہے وہ کبھی سامنے نہیں آیا تھا۔ یہ خطرہ تیسری جنگ عظیم (جو کبھی نہ ہو خدا کرے)



علی جواد زیدی

اے ۵-۱۵ گرین فیلڈس ۔ جہاکالی کیوس روڈ
بمبئی ۴۰۰۰۹۳

نیادور کا زرّیں دور

اسّی۸۰ برس تک زندگی کی سختیاں جھیل لینے کی ایک سزا تو یہ تھی کہ بہت سی تلخ اور روح فرسا یادیں رہ رہ کر نشتر چبھوتی رہتی ہیں کہاں گئے وہ زمانے، کیا ہوئے وہ بے فکری کے دور، کیا ہوئے وہ عزیز دوست اور پیارے اقارب، جن سے زندگی عبارت تھی ۔؟ اسی کے ساتھ بہت سی پرمسرت اور روح پرور یادیں بھی تو ہوتی ہیں جو اندھیروں کو جگمگا دیتی ہیں ۔ سراسیمہ و غمگین لمحوں میں خوشبوئیں بکھیر دیتی ہیں اور دل میں یہ احساس جگا دیتی ہیں کہ ؎

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم۔

میرا سر فخر سے اونچا ہو جاتا ہے جب میں سوچتا ہوں کہ ثقافتی اور سیاسی سطح پر جو بعض اہم زرّیں جشن حال میں منائے گئے ہیں ان سے میرا گہرا ربط رہا ہے۔ اس ربط نے میری زندگی کو مستحکم معنویت دی ہے اور میری ناچیز ہستی کو وسیع تر معاشرے سے اور اس کی تاریخ سے اٹوٹ طور پر جوڑ دیا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں آل انڈیا اسٹوڈنٹس کانفرنس کا قیام اور اس میں میری شرکت، اسی سال ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کا انعقاد اور اس کے ایک گوشے میں میری بھی موجودگی اور پھر ان کے جشنِ زرّیں میں میری حاضری، ساری یادوں کا حاصل معلوم ہونے لگی ہیں۔

ابھی ان جشنوں کی یادیں تازہ ہی تھیں کہ دو اور جشنوں کی اطلاعیں ملیں۔ خاص کر محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامۂ حکومت اترپردیش نے نیادور کے جشنِ زرّیں کی اطلاع دے کر تخیل کو پھر گدگدایا ہے۔ اس ماہنامے کی تاسیس ہی میں نہیں بلکہ اس کے ماضی و حال سب سے میری وابستگی رہی ہے۔ آئندہ بھی کوشش یہی رہے گی کہ ؎

جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

رسالے کے موجودہ مدیر سید امجد حسین صاحب رسالے کے بانی مدیر کا ہدیۂ تبریک قبول کریں اور دوسرے زعمائے محکمہ اور وزیر اطلاعات تک پہونچا دیں۔

ایک اور جشنِ زرّیں کی اطلاع سرحد اُس پار سے موصول ہوئی ہے یہ جشن صہبا لکھنوی کے ماہنامہ "افکار" کا ہے جو اپریل ۱۹۹۵ء میں منایا جا رہا ہے۔ 'افکار' کے مدیر ہی لکھنوی نہیں ہیں بلکہ یہ رسالہ بھی بھوپال سے شائع ہوا تھا، بعد میں کراچی منتقل ہو گیا لیکن ہندوستان کے ادیبوں اور شاعروں سے اس کا رابطہ بدستور قائم رہا۔ یہ دونوں ملکوں کی ترقی پسند تحریکوں اور استوارِ ہند۔ پاک تعلقات کے قیام کا حامی ہے۔ ۱۹۸۲ء میں کراچی میں ایک اور لکھنوی رسالے کا "جشن طلائی" منایا گیا تھا۔ یہ صرف لکھنؤ ہی نہیں بلکہ برصغیر کا سب سے مشہور آزاد خیال ادبی جریدہ "نگار" تھا۔ یہ وابستہ تو بھوپال، لکھنؤ اور کراچی سبھی سے رہا لیکن اس کا فروغ لکھنؤ ہی میں ہوا۔ اس کے مدیر شہیر نیاز فتحپوری سے کون ناواقف ہے؛ وہ اردو کے ممتاز ترین صحافیوں ہی میں نہیں بلکہ ممتاز ترین ادیبوں میں بھی ایک نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ اتفاق سے مجھے بھی اس جشنِ طلائی میں شرکت اور آخری اجلاس میں حکیم محمد سعید صاحب (چیرمین ہمدرد فاؤنڈیشن) کے ہمراہ شریک صدر بھی رہنے کا اتفاق ہوا۔

ان دونوں صحافتی جشنوں سے نیادور کے جشن کی نوعیت مختلف ہے۔ نیادور سے میری وابستگی کہیں زیادہ گہری ہے۔ تفصیلات میں جانے سے پہلے مورخینِ صحافت و ادب کے نقطۂ نظر سے یہ وضاحت ضروری ہے کہ جشن کا نقطۂ آغاز "نیادور" نہیں بلکہ اسکا

پیش رو ماہنامہ اطلاعات" ہے۔ نیا دور کوئی نیا رسالہ نہیں تھا بلکہ اپنے پیش رو ماہنامہ اطلاعات کا بدلا ہوا نام اور بدلی ہوئی کیفیت وہیئت کا حامل تھا۔ اس کی زندگی میں کئی اُتار چڑھاؤ آئے ہیں اور اسی لیے یہ کہانی دُہرائے جانے کے لائق ہے۔

مَیں حکومتِ اترپردیش کے محکمۂ اطلاعات میں ۱۹ر جولائی ۱۹۴۴ء کو افسر انچارج شعبۂ اُردو کی حیثیت سے وارد ہوا۔ میرے آنے کے پہلے اردو، ہندی اور انگریزی کے بھی شعبے الگ نہیں تھے۔ میرے ہی ساتھ ہندی شعبے کے انچارج وِدیا بھاسکر جی (جو بعد میں ہندی روزنامہ "آج" کے ایڈیٹر ہوئے) اور شری پی۔ پی۔ سنگھ شعبۂ انگریزی کے انچارج جو پہلے پنجاب یونیورسٹی میں صدر شعبۂ صحافت رہ چکے تھے۔ اس تبدیلی سے پہلی بار محکمے میں شعبۂ اُردو کا مستقل وجود تسلیم کیا گیا۔ ۱۹۳۷-۳۹ء میں ڈاکٹر محمودُالظفر (نام ٹھیک سے یاد نہیں) اُردو کے ڈپٹی ڈائرکٹر ضرور مقرر ہوئے تھے لیکن ۱۹۳۹ء میں جنگ کے سوال پر پہلی کانگرسی وزارت مستعفی ہوئی تو وزرا کے ساتھ ڈاکٹر صاحب نے بھی استعفا دے دیا۔ اُردو کے مترجم اور صحافتی کام کرنے والے دو تین سال بغیر کسی افسر کے ہی کام چلاتے رہے۔ جب ہم تینوں افسر ۱۹۴۶ء میں مقرر ہوئے تو ان شعبوں کو ایک انتظامی وقار ملا۔ ہم تینوں ادبی اور صحافتی حیثیتوں کے علاوہ، مجاہدینِ آزادی ہونے کی وجہ سے سیاسی حلقوں میں بھی بخوبی متعارف تھے۔ ان حلقوں میں رسائی کی وجہ سے محکمۂ اطلاعات کے تینوں شعبوں، بالخصوص شعبۂ اُردو کے لیے آئندہ ترقی کی راہیں کھلتی گئیں اور استحکام کی شکل نکلی۔ وزیر اطلاعات سمپورنانند جی تھے جو ہندی پرستی کے علاوہ اُردو میں شعر بھی کہتے تھے۔ آنند تخلص کرتے تھے اور مختصر علمی اجتماعات میں کبھی کبھی اصرارِ شدید پر سُنا بھی دیا کرتے تھے۔ وزیر اطلاعات کے پارلیمنٹری سکریٹری، پنڈت کیشو دیو مالویہ، پنڈت مدن موہن مالویہ کے خاندان کے چشم و چراغ تھے، مگر آزاد خیال تھے اور سیکولر مزاج رکھتے تھے۔ ہندی کے ساتھ ساتھ اُردو کے بھی سچے دوست تھے۔ وزیر اور پارلیمنٹری سکریٹری دونوں ہی اُردو کی اہمیت تسلیم کرتے تھے، لیکن ابھی ایک افسر انچارج کے علاوہ دفتری یا صحافتی سطح پر اور کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔ ڈائرکٹر مسٹر اگا تھے جن کا تعلق کشمیری پنڈتوں کے ایک قدیم گھرانے سے تھا، وہ اُردو سے خاص شغف رکھتے تھے۔ سکریٹری سر تیج بہادر سپرو کے فرزندِ ارجمند، آنند نرائن سپرو آئی۔ سی۔ ایس تھے۔ اس خوش گوار فضا میں محکمے کی تنظیم نو کے منصوبے بنے اور اُردو کے لئے بھی کچھ نئی اسامیاں نکلیں، لیکن سب مترجم یا صحافی کی سطح کی سب ایڈیٹر کے مساوی تھیں۔ کافی بعد میں ان میں سے بعض کو انفارمیشن افسر اور ایڈیٹر بھی کہا جانے لگا۔

میں پہلے ہی سے شعبۂ اُردو کے اہم کارکنوں سے واقف تھا اور وہ بھی مجھے جانتے تھے۔ ان میں فرحت اللہ انصاری مرحوم فرنگی محلی اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے نمایاں اراکین میں رہ چکے تھے، اس واسطے سے ان سے تعلقات نسبتاً زیادہ ہی تھے، وہ اچھے حافظ اور اچھے مقرر بھی تھے۔ بعض اوقات ہڑتالی طلبا کے حد سے بڑھے ہوئے جوش کو قابو میں لانے یا ذاتی اغراض کے ماتحت کی جانے والی ہڑتال کو ختم کرانے کے لئے ان کے زورِ خطابت کے حیرت انگیز مظاہرے میں نے دیکھے ہیں۔ بڑے خوش باش، آزاد خیال اور قوم پرورانہ بلکہ کسی قدر سیاسی رجحانات رکھتے تھے۔ بعض حضرات مولانا برکت اللہ مرحوم فرنگی محلی کے اس فرزند کو چھیڑنے کے لئے یہ مصرع دُہرایا کرتے تھے ؎

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

اور مرحوم بھائی فرحت محظوظ ہوا کرتے تھے۔ صباح الدین عمر صاحب سے سیاسی قربت تو نہ تھی لیکن ایک اور قربت ان کے وطن نگرام کی بدولت پیدا ہوئی۔ اسی نگرام میں شمیم کرہانی اور سید احتشام حسین کی شادیاں مشہور ایڈوکیٹ سید فدا حسین صاحب کے صاحبزادے عسکری صاحب کے یہاں ہوئیں۔ بڑی بہن شمیم کو منسوب تھیں اور چھوٹی احتشام کو۔ شمیم ہمارے ننہالی عزیزوں میں تھے اور ان کے سسرال والوں سے عرصہ سے گہرے روابط تھے۔ ان رشتوں کی لطافتوں سے اوقاتِ فرصت میں محظوظ ہونے کے لیے ہم لوگ "مزاحُ المومنین" کی عبارت کا لطف اٹھالیا کرتے تھے۔ پھر اس رشتے کو محکمے کے عزیز دوستوں نے بھی اپنا لیا۔ صباح الدین عمر صاحب خود بھی محظوظ ہوتے تھے۔ شعبے کے

ایک اور رکن ندیم الرحمٰن قدوائی، شہر کے مشہور لیگی احسان الرحمٰن قدوائی کے صاحبزادے تھے لیکن والد کی زندگی ہی میں علی الاعلان قوم پروروں میں شامل ہو گئے تھے اور اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے فعال رکن بھی رہ چکے تھے. بعد میں خورشید احمد بھی (جو میرے ماموں زاد بھائی تھے) 'قومی آواز' سے شعبۂ اُردو میں آ گئے. ادھر سانگ پبلسٹی میں غلام احمد فرقت بھی کچھ دنوں کے لئے آ گئے تھے. غرض محکمۂ اطلاعات ایک ادبی خاندان سا بن گیا تھا.

اب محکمۂ اطلاعات کا شعبۂ اُردو (اگرچہ غیر رسمی ہی شعبہ تھا) شہر میں ایک ادبی مرکز بن گیا تھا. شہر کے ادیب اور شاعر تو سبھی شناسا اور بہت سے دوست بھی تھے، برابر میرے کمرے کو نوازتے. باہر سے آنے والے ادبا، اور صحافی بھی لکھنؤ آتے تو درشن ضرور دیتے. محکمے سے صباح الدین عمر صاحب، فرحت اللہ صاحب، خورشید بھائی آ جاتے. کبھی کبھی ندیم بھی شامل ہو جاتے. اکثر فرقت بھی آ نکلتے تو چھیڑ چھاڑ شروع ہو جاتی فقرے چُست اور قہقہے بلند ہوتے، لیکن آداب دفتر کا خیال ضرور رکھا جاتا. باہر سے آنے والوں میں مجاز، سلام مچھلی شہری، سردار جعفری، انصار ہروانی، امین سلونوی، علی عباس حسینی، مرزا جعفر حسین، سراج لکھنوی، اسلم لکھنوی، مسیح الحسن رضوی، عبدالمجیب سہالوی، بھگوتی چرن ورما، امرت لال ناگر، گرجا کمار ماتھر، مفتی رضا انصاری، فضل نقوی جیسے اہم لوگ تھے. عابد سہیل بھی دو ایک بار آئے. اور ہاں ہمارے افسر (فوٹوگرافی) جناب شیر سنگھ کو کیسے بھولا جا سکتا ہے؟ وہ اُردو کے ایم اے تھے، بڑا اچھا ذوق تھا، یونیورسٹی میں میرے ساتھی تھے وہ بھی ان صحبتوں میں شریک ہو جایا کرتے تھے. میرے کہنے پر انھوں نے ایک پمفلٹ "نہروں کے کنارے کنارے" لکھا بھی تھا جو ان کی تصویروں سے مزین تھا.

چھوڑیئے ان قصہ ہائے پارینہ کو، بات کہاں سے کہاں جا پہونچی اگر اس دور کی سبھی یادیں یکجا کرنے کی کوشش کی جائے تو پورا شمارہ بھی ناکافی ہوگا. جب میں نے شعبے کا چارج لیا تو دوران جنگ جاری ہونے والا "دیشی پکار" بند ہو چکا تھا. اب تازہ دم دیشی سرکار کے دور میں اس بدیشی پکار کی گنجائش کہاں تھی؟ اب خانہ پُری کے لئے ایک اُردو ماہنامہ "مرکزی اطلاعات" کی طرز پر یہاں سے نکلتا تھا، اس کا نام "اطلاعات" تھا یہ ماہنامہ کیا تھا پریس نوٹوں کا ایک پُلندہ تھا جسے کسی ایڈیٹنگ کے بغیر شائع کر دیا جاتا تھا. پریس نوٹ انگریزی میں لکھے جاتے تھے. ساتھ ساتھ اُردو ہندی میں ترجمہ کا کام بھی ہوتا رہتا تھا. یہ روز کے کام تھے کیونکہ اخبارات کو اُردو ہندی میں بھی پریس نوٹ اسی دن مہیا کرنے ہوتے تھے ان پریس نوٹوں کی سُرخیوں تک کا ترجمہ کر دیا جاتا تھا. اُردو ہندی کے صحافی ضرورت کے مطابق کبھی کبھی حاشیائی تبدیلیاں کر لیتے تھے.

ترجمے کا کام صباح الدین عمر صاحب، فرحت اللہ انصاری صاحب اور ان کے دو ایک دوسرے ساتھی انجام دیتے تھے. صباح الدین صاحب کے ذمے پریس نوٹوں کی دیکھ بھال بھی تھی. دوسرے جونیر صحافیوں کے ترجمے پر بھی وہ نظرثانی کر لیا کرتے تھے لیکن فرحت اللہ انصاری صاحب اس پر کسی طرح راضی نہ ہوئے اور اصرار کرتے تھے کہ ان کے ترجموں کو کوئی دوسرا نہ دیکھے. صباح الدین صاحب پھر بھی ان کے ترجموں پر نظر رکھتے اور کوئی بات نظر آتی تو مجھے متوجہ کرتے. غرض یہی سب پریس نوٹ زمانی ترتیب کے ساتھ بہت ہی معمولی تغیر کے ساتھ اکٹھا کر کے "اطلاعات" میں چھاپ دیئے جاتے تھے. ان کی حیثیت صرف اطلاعاتی تھی اور صرف ان دور دراز علاقوں میں بسنے والوں کے لئے اہمیت رکھتے تھے. جہاں روزانہ اخبارات نہیں پہونچتے تھے، یا پھر ان لوگوں کے لئے جو انھیں حوالوں کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے. تقریباً سبھی کاپیاں مفت تقسیم ہوتی تھیں. لوگ ورق اُلٹ پلٹ کے کنارے رکھ دیتے تھے اور پھر اُن کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتے تھے.

میں نے جاتے ہی یہ محسوس کیا کہ یہ محنت اور پیسے دونوں کا غلط مصرف ہے. رسالے میں کچھ ایسی تبدیلی فوراً ضروری تھی جس سے اس کی دلچسپی اور افادیت دونوں میں اضافہ ہو. پہلی تبدیلی تو یہ کی گئی کہ اشاعت کے پہلے پریس نوٹوں کی تدوین کی جانے لگیں. سرخیاں بدل دی جاتی تھیں اور پریس نوٹوں کو خبروں کی شکل دے دی جاتی تھی (اگرچہ سرکاری رسالہ ہونے کی وجہ سے پریس نوٹ کے قریب تر رکھنا بھی ضروری ہوتا تھا) ان جزوی اور کچھ صوری تبدیلیوں کے لئے میں نے سینیر صحافیوں

یعنی صباح الدین صاحب اور فرحت اللہ صاحب سے مشورہ کیا۔ ایک مشکل یہ تھی کہ گورنمنٹ پریس کا صدر دفتر الہ آباد میں تھا، خاص کر خطاطی کا کام وہیں ہوتا تھا۔ سینئر صحافیوں میں سے کسی کو پریس جانا ہی پڑتا تھا، چاہے وہ اس رسالے کی طباعت کا معاملہ ہو یا پمفلٹ وغیرہ کی طباعت کا۔ طباعت وَنڈائک طریقے پر ہوتی تھی۔ یہ طریقہ پریس کے سابق سپرنٹنڈنٹ نے ایجاد کیا تھا اور انھیں مسٹر وَنڈائک کے نام سے یہ طریق طباعت منسوب ہو گیا۔ اس طریقے کے ماتحت کتابت مکھن کاغذ (بٹر پیپر) پر سیاہ روشنائی سے ہوتی تھی اور پھر وہ براہ راست زود اثر (SENSITHIC) پلیٹ پر منتقل ہو جاتی تھی۔ یہ پتھر کے لیتھو کی ترقی یافتہ شکل تھی اور گورنمنٹ پریس الہ آباد کی یہ ایجاد آناً فاناً ہندستان بھر میں پھیل گئی اور جب تک آفسیٹ کی طباعت ایجاد نہیں ہوئی، اس کا نعم البدل کوئی نہیں تھا۔ آفسیٹ کی ایجاد کے بعد کئی مشینیں عیش باغ گورنمنٹ پریس لکھنؤ میں نصب ہو گئیں پھر رسالے کی طباعت آہستہ آہستہ لکھنؤ میں منتقل ہوئی اور کتابت کا شعبہ بھی بڑی حد تک یہیں آ گیا۔ اس انتظام سے صحافیوں کی دوڑ لکھنؤ اور الہ آباد کے مابین تقریباً ختم ہو گئی۔

ابتدائی مرحلے پر صوری اور جزوی تزئینی تبدیلیوں کے بعد مجھے یہ خیال آیا کہ "اطلاعات" میں ادبی عنصر کا بھی اضافہ کرنا چاہیے ـــ یہ بنیادی معنوی تبدیلی تھی جس پر باقاعدہ مہر تصدیق کا ثبت ہونا روایتۃً لازمی ہوتا لیکن میں نے تجربے کے طور پر یہ عنصر بڑھا دیا۔ باہر سے نظم و نثر حاصل کرنے میں مالی مشکل تھی، کیوں کہ بجٹ میں اس کی کوئی مد نہیں تھی اور خرچ کی نئی مد کے لئے مالیات کے محکمے کی اجازت ضروری تھی۔ میں نے اپنے چند دوستوں سے، جن میں شمیم کرہانی، فرقت کاکوروی، امین سلونوی وغیرہ سے یہ دوستانہ فرمائش کی کہ وہ، ہمیں مضامین/نظمیں بطور عطیہ چھپنے کے لئے دیں۔ انھوں نے بخوشی منظور کر لیا۔ خود میں نے ادبی خاکوں کا سلسلہ "آپ سے ملیئے" کے عنوان سے شروع کیا جسے بعد میں مکتبہ شاہراہ دہلی نے کتابی شکل میں شائع کیا[1] اس طرح خاموشی کے ساتھ ادبی عنصر کا اضافہ کر دیا گیا۔ اس کا کوئی باضابطہ اعلان نہیں ہوا تھا، لیکن عوام و خواص دونوں ہی نے خیر مقدم کیا۔ کئی قارئین نے باقاعدہ خطوط لکھ کر اس تبدیلی کو سراہا۔ کچھ دنوں بعد ان خطوط کو یکجا کر کے میں نے ایک باضابطہ تجویز وزیر اطلاعات کو پیش کی۔ میں نے تجویز میں لکھا تھا کہ جو تبدیلی تجربتہً از خود کی گئی تھی اس سے رسالہ کی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہے۔ اگر اسے مستقل شکل دے دی جائے تو "اطلاعات" کا حلقۂ اشاعت وسیع ہو جائے گا۔ شروع میں مضامین کے معاوضے کے طور پر ایک معمولی سی رقم کے اضافے سے کام چل جائے گا۔ یہ رقم منظور شدہ بجٹ کے اندر ہی خفیف ردّ و بدل سے مہیا ہو جائے گی۔ ڈائرکٹر نے اتفاق کیا اور وزیر اطلاعات سمپورنانند جی نے منظوری دے دی۔

میں نے تجویز میں لکھا تھا کہ ایسی ہی تبدیلی ہندی کے "سماچار" اور انگریزی کے "انفارمیشن" میں بھی کر لی جائے۔ یہ دونوں علی الترتیب محکمۂ اطلاعات کے ہندی اور انگریزی کے ماہنامے تھے۔ اس طرح محکمے کے تینوں رسالوں میں ایک ساتھ ہیئتی اور معنوی تبدیلیاں آ گئیں اور نتیجہ بے حد خوش گوار رہا۔ میں اس زمانے میں پبلی کیشنز افسر کی حیثیت سے پورے طباعتی شعبے کا نگراں تھا۔ افسر انچارج اردو سکشن کا عہدہ باقی نہ تھا، لیکن میرے ادبی خدمات کے پیش نظر "اطلاعات" کی ادارت کی ذمہ داری مجھ ہی پر برقرار رہی۔ پھر رسالے کی ترقی کی وہ منزل بھی آئی کہ اس کے "آزادی نمبر" اور "گاندھی نمبر" شائع ہونے لگے۔ محکمے میں میری آمد کے چند ہی ماہ بعد اعلان آزادی ہو گیا اور پہلے یوم آزادی کے مبارک موقع پر میرا مرتب کیا ہوا آزادی کی نظموں کا ایک مجموعہ "پیام آزادی" کے نام سے شائع ہوا۔ اسی اہم تاریخی موقع پر محکمے کی جانب سے ایک ہندی دستاویزی فلم بھی "طلوع آزادی" کے نام سے تیار ہوئی جس میں آزادی کی کہانی میری ہی آواز میں صدا بند کی گئی۔ تحریر بھی میری ہی تھی۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ میرے ذمے کیسی کیسی ذمہ داریاں عائد کر دی جاتی تھیں۔ پھر بھی میں نے اپنی پوری توجہ "اطلاعات" کی ترقی و بہبود پر مرکوز رکھی اور اس کی ادارت کے تمام فرائض انجام دیتا رہا۔ شاعروں اور ادیبوں کو خطوط لکھنا، خطوط کا جواب دینا، مضامین وغیرہ کے لئے موضوعات تجویز کرنا، موصولہ مضامین و منظومات کو ایک نظر ضرور دیکھ لینا اور اس میں مناسب ترمیم و تنسیخ

[1] یہ کتاب حکومت اتر پردیش کی متعلقہ کمیٹی کے انعام کی مستحق قرار پائی۔

عبدالحلیم شرر نمبر

نیا دور

مارچ، اپریل سنہ ۱۹۹۳ء



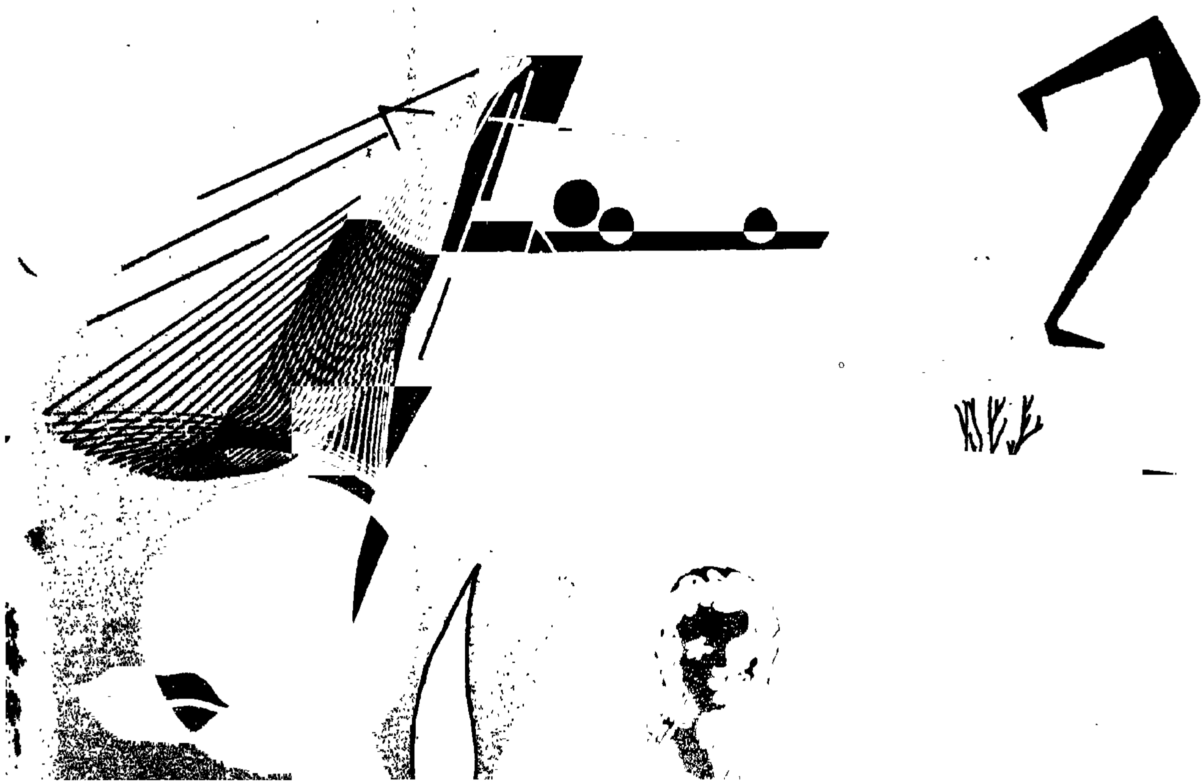
مئی

جون

جولائی

۹۶۴ء

ایک روپیہ پچاس پیسے



میری ذمہ داری رہی۔

جیسے جیسے رسالہ ترقی کرتا رہا، اس سلسلے کے کاروباری خطوط کافی تعداد میں آنے لگے۔ پھر بہت سے کرم فرما بے طلب کیے ہوئے مضامین اور نظمیں/غزلیں بھیجنے لگے، ان کو پڑھنا ضروری ہو گیا اور ان کی اشاعت کا فیصلہ کرنا بھی اہم کام تھا۔ یہ کام تنہا ایڈیٹر انجام نہیں دے سکتا تھا۔ اہم ذمہ داریاں دو تھیں، پروف ریڈنگ اور بے طلب آنے والے مضامین کی جانچ۔ کام کا یہ بوجھ بانٹنا ضروری ہوا۔ سرکاری رسالے میں بہت سی باتیں شائع نہیں ہو سکتی تھیں۔ ذرا ذرا سی بات پر اکثر حضرات برہم ہو سکتے تھے، سیاسی سوال اُٹھ کھڑا ہو سکتا تھا۔ سیاسی اور فرقہ وارانہ نوعیت کے اختلافات بھی در آ سکتے تھے۔ سرسری دیکھ لینے والے تو کئی تھے، لیکن دفتر کے صحافیوں میں صباح الدین عمر صاحب کی ذات ایسی تھی جو ایک ایک نقطے اور ایک ایک نکتے پر نظر رکھتے تھے۔ ان کی نظر سے کوئی لغزش بچ کے نہیں جا سکتی تھی۔ بعضوں کو شکایت تھی کہ ان کے احتساب میں شدّت ہے۔ اسی مزاج کے خورشید بھائی بھی تھے۔ فرحت اللہ انصاری ادبی سطح کے قابلِ اعتبار پارکھی تھے۔ لیکن عام آزادہ روی کی بدولت دفتری احتیاط کی شدّت ان کے بس میں نہیں تھی۔ غرض یہ کام بانٹ دیا گیا تھا۔ ممتاز ادیبوں اور شاعروں کی نظمیں، غزلیں میں خود بھی دیکھ لیتا تھا۔ مضامین کے بارے میں عمر صاحب، فرحت صاحب وغیرہ مجھ سے مشورہ کر لیا کرتے اور آخری فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیتے تھے فیصلہ تو مجھے کرنا ہی پڑتا تھا۔ میں خود بھی مضامین لکھتا، اداریے لکھتا تبصرے لکھتا۔ میری ہر وقت یہی کوشش رہتی کہ رسالے کو خوب سے خوب تر کیسے بنایا جائے کہ سرکاری رسالے کے بجائے یہ ایک مستند اور معتبر ادبی اور ثقافتی جریدہ بن جائے۔

رسالے کا نام برابر کھٹکتا رہتا تھا "اطلاعات"۔ یہ بھی کوئی نام تھا! وہ بھی ایک ایرانی روزنامے سے ماخوذ، جہاں اس وقت شہنشاہی نظام مسلط تھا! نام پکارتا رہتا تھا کہ میں سرکاری رسالہ ہوں۔ نیا نام کیا ہو اس پر کافی غور و خوض کیا گیا۔ کئی نام ذہن میں آئے۔ اس میں ادبی شان بھی ہو اور سماجی معنویت بھی۔ انھیں میں ایک نام "نیا دور" بھی ذہن میں آیا۔ پہلے اس نام کا ایک رسالہ بنگلور سے ممتاز شیریں اور صمد شاہین کی ادارت میں شائع ہوتا تھا، لیکن وہ لوگ کاروبار بند کر کے بیرونِ ملک چلے گئے۔ اب یہ نام خالی تھا۔ رجسٹرار نیوز پیپرس آف انڈیا سے دریافت کر کے نام تبدیل کرنے کی تجویز میں نے ڈائرکٹر کی وساطت سے ڈاکٹر سمپورنانند کو بھیجی۔ انھوں نے نام پسند تو کیا لیکن ساتھ ساتھ یہ اشارہ بھی دیا کہ کچھ اور نام بھی سوچ لیے جائیں تو اچھا ہو۔ میں نے کچھ اور نام بھی تجویز کر کے بھیجے لیکن اسی عرصے میں وہ وزیرِ اطلاعات نہ رہے اور عارضی طور پر یہ محکمہ خود وزیرِ اعلا پنڈت گووند بلبھ پنت نے سنبھال لیا۔ اب فائل ان کے پاس پہونچی تو انھوں نے نام "پنچایت راج" تجویز کر دیا۔ اس کے مقابلے میں تو اطلاعات ہی غنیمت معلوم ہونے لگا۔ بارے سمپورنانند جی نے پھر وزارت سنبھالی اور میں نے انھیں صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ انھوں نے میرے خیال سے اتفاق کرتے ہوئے "نیا دور" نام کی منظوری دے دی — اب صحیح معنوں میں اس رسالے کا نیا دور شروع ہوا۔

اب "نیا دور" اس محکمے کا تنہا ادبی رسالہ نہیں رہ گیا تھا۔ ہندی کے مشہور مزاح نگار اور صحافی بھر مرجی کی ادارت میں ماہنامہ "تری پتھگا" بھی شائع ہونے لگا تھا۔ کچھ عرصے بعد صباح الدین عمر صاحب انگریزی "انفارمیشن" کی ادارت کا کام دیکھنے لگے اور "نیا دور" سے متعلق وہ تمام امور جن کی طرف سطورِ بالا میں اشارہ کیا گیا ہے، مولوی فرحت اللہ صاحب دیکھنے لگے۔ ایڈیٹر کے فرائض خصوصی میرے ذمے تھے۔ اداریے، تبصرے اور مضامین میں خود لکھتا۔ خاص خاص ادیبوں کو خطوط بھی لکھتا اور ان کے مضامین کو میں خود دیکھتا۔ دوسرے مضامین کی ابتدائی جانچ فرحت اللہ صاحب کرتے، کتابت و طباعت سے متعلق سب کام وہی دیکھتے، پروف بھی وہی پڑھتے۔ کچھ کام صباح الدین صاحب بھی دیکھ لیا کرتے۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ محکمے کے سینیر صحافی کے ذمے صرف جرائد سے متعلق کام نہیں تھا۔ وہ پریس نوٹوں کا ترجمہ بھی کرتے تھے اور پھر چھوٹے چھوٹے عام پبلسٹی کے کتابچے بھی مرتب کرتے اور ان کی طباعت و کتابت وغیرہ کی دیکھ ریکھ کرتے تھے

اسی طرح پروف ریڈنگ اور پرنٹنگ کے کام میں بھی سب ہاتھ بٹالیا کرتے تھے۔ ماہنامہ ہو یا ہفتہ وار یا روزنامہ۔ کہیں بھی ایڈیٹر سب کام نہیں کرتا اور نہ سب ایڈیٹر ہی سب کچھ کرتا ہے۔ یہ ایک اجتماعی کوشش ہوتی ہے۔ نیا دور اس سے مستثنیٰ نہیں تھا۔ لیکن رسالے کی تاسیس، اس کی ترتیب کو آخری شکل دینا، معیاری مضامین کی فراہمی، تبصرے، اداریے وغیرہ خود ایڈیٹر ہی کرتا ہے۔ ایسا ممکن ہے کہ کوئی ایڈیٹر جو واقعی ایڈیٹر ہو، رسالے کے سرورق پر اپنا نام صرف "زیب عنوان" کے طور پر لکھا لے۔ باہر رہ کر تو یہ ممکن بھی ہے لیکن سرکاری رسائل میں 'مدیر' کو اپنی ذمہ داری تسلیم کرنا پڑتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ انگریزی دور میں محکمے کا ڈائرکٹر ہی ایڈیٹر بھی تسلیم کرلیا جاتا تھا لیکن وہ دور افسانہ ہو چکا تھا۔ صحافتی برادری اب ایک خاندانی حیثیت اختیار کر چکی تھی اور اس میں افسری ماتحتی والی سخت گیری نہیں تھی۔

نیا دور پر ایک مشکل وقت بھی آپڑا تھا۔ میں مختصر سی رخصت پر لکھنؤ کے باہر گیا اور میری غیر حاضری کے دوران میرا کام میرے رفیق بلبھدر مشرا (ڈپٹی ڈائرکٹر) معمول کے مطابق دیکھنے لگے۔ ان کے پاس معاوضوں کی رقم میں حاشیائی اضافے کی فائل بھیجی گئی۔ کبھی کبھی ایسا ہو جایا کرتا تھا کہ محکمے سے نکلنے والے رسائل میں سے کسی ایک کے یہاں خصوصی شمارے وغیرہ کی اشاعت کے باعث ماہانہ مقررہ رقم سے تجاوز ہو جاتا تھا لیکن ایسی کمی بیشی اشاعت کے مجموعی بجٹ سے پوری کرلی جاتی تھی۔ یہ ایک معمول تھا اور دفتر نے ایسی ہی تجویز رکھی بھی تھی۔ مشرا جی نے اچانک یہ سوال اٹھا دیا کہ نیا دور کو بند کر دینا چاہیے۔ کیوں کہ اب سرکاری زبان ہندی بن گئی ہے! اس کے بعد فائل نہایت تیزی اور خاموشی سے، حد یہ ہے سکریٹری محکمہ کے بالا ئے سر، آگے بڑھتی ہوئی وزیر اطلاعات کے پاس پہونچ گئی اور انھوں نے تعرض کے بغیر مہر تصدیق ثبت کر دی سکریٹریٹ کے قاعدے کے مطابق وزیر کے یہاں سے فائلیں واپسی سفر پر سکریٹری کے پاس لازمی طور سے آتی تھیں۔ سکریٹری آنند نرائن سپرو آئی۔ سی۔ ایس، سر تیج بہادر سپرو کے فرزند تھے۔ انھیں یہ بات بے حد ناگوار گزری کہ اتنے اہم مسئلے سے متعلق فائل بالا بالا وزیر کو بھیج دی گئی۔ اس کے علاوہ انھیں یہ بھی حیرت ہوئی کہ راقم الحروف نے ابتدائی منزلوں میں یہ تجویز، اختلاف و احتجاج کے بغیر کیسے قبول کرلی۔ انھیں یہ معلوم تھا کہ اردو سے متعلق تمام کام میری ہی وساطت سے انجام پاتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے مجھے بلا بھیجا اور اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ تب پہلی بار مجھے اس کارروائی کا علم ہوا۔ میں نے بتایا کہ یہ ساری کارروائی میری مختصر سی غیر حاضری کے دوران ہوئی ہے اور مجھے تو اب پہلی بار معلوم ہو رہا ہے۔ انھوں نے مجھ سے یہ تصدیق چاہی کہ رسالہ تو وزیر اعلا کے حکم کے بغیر جاری نہیں ہوا ہوگا؟ میرے اثباتی جواب پر انھوں نے ایک تفصیلی نوٹ براہ راست وزیر اعلا کو لکھوایا اور یہ بات زور دے کر کہی کہ اس فیصلے سے اردو کا نہیں حکومت کا نقصان ہوگا کہ حکومت کی اطلاعات اردو داں طبقے کو نہیں پہونچ سکیں گی اور اس سے اردو داں طبقے میں خواہ مخواہ کی بے چینی پیدا ہوگی۔ وزیر اعلا پنڈت گوبند بلبھ پنت نے سکریٹری کی اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے رسالے کو جاری رکھنے کا حکم دے دیا۔ یہ ایک بڑی کامیابی تھی اور شعبۂ اردو میں اس فیصلے پر جشن کی سی کیفیت طاری ہوگئی اور رسالہ پوری آب و تاب سے ترقی کے زینے طے کرتا ہوا آگے بڑھا۔

رسید بود بلائے ولے بخیر گذشت

دفتر میں اس وقت میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر تھا۔ چھ ماہ عارضی ڈپٹی ڈائرکٹر بھی رہ چکا تھا لیکن نیا دور کی ادارت مسلسل میرے ہی ذمہ رہی۔

میں ۱۹۵۷ء کے آغاز میں حکومت ہند کے پریس انفارمیشن بیورو میں منتقل ہو گیا اور ریاستی حکومت سے تعلقات باقی نہ رہے۔ لیکن نیا دور سے تعلق برقرار رہا۔ کیوں کہ میں ان منزلوں کو کیسے بھول سکتا ہوں جب میں نے اس رسالے کو زینہ بہ زینہ آگے بڑھایا تھا، اس کا بانی مدیر تھا۔ میرے چلے جانے کے بعد فرحت اللہ انصاری صاحب نے ادارت کا کام سنبھالا۔ ایک ذرا سی بات پر اسمبلی میں ہنگامہ برپا ہوا۔ ایک مضمون ایسا شائع ہو گیا تھا جسے قابل اعتراض سمجھا گیا۔ اس وقت حافظ محمد ابراہیم صاحب لیڈر آف دی ہاؤس تھے

اور انھوں نے بروقت یہ اعلان کردیا کہ رسالے کی ادارت کا کام کسی دوسرے مدیر کو سونپا جارہا ہے۔ اب میرا یہ کہنا تو مشتے بعد از جنگ ہوگا کہ خواہ مخواہ رائی کا پہاڑ بنایا گیا۔ اب محکمے میں کوئی ایسا نہیں تھا جو غریب مدیر کی حمایت کرتا، لیکن صحافتی حلقے مطمئن تھے کہ فرحت اللہ صاحب کی فروگذاشت ایسی نہ تھی اور سب کی ہمدردیاں ان کے ساتھ تھیں۔ ادارت تو اضافی کام تھا۔ فرحت صاحب بدستور اپنے عہدے پر کام کرتے رہے۔

فرحت اللہ صاحب کے چلے جانے کے بعد ادارت کا تاج صباح الدین عمر صاحب کو پہنایا گیا اور انھوں نے اپنے تجربے ذہانت اور فعال کردار کی بدولت اس کو مزید ترقی دی۔ صباح الدین صاحب پہلے "نگار" سے منسلک رہ چکے تھے۔ وہ جلد ہی اپنی تمام صلاحیتوں کے ساتھ اتر پردیش اردو اکادمی کی ابتدائی تعمیری منزلوں میں، اس نئے ادارے میں منتقل ہوگئے۔ یہ ملک میں پہلی اُردو اکادمی تھی اور یہاں انھوں نے جو رہبرانہ کام کیا وہ ہمیشہ یادگار رہے گا۔ صباح الدین صاحب کے چلے جانے کے بعد ادارت کے فرائض سید خورشید احمد صاحب نے سنبھالے انھیں بھی "قومی آواز" میں رہ کر ادارتی فرائض کا پورا پورا تجربہ تھا، پھر نیا دور سے وہ غیر رسمی مدیر کی حیثیت سے وابستہ تھے۔ سابقہ روایتوں کے پورے امین ثابت ہوئے اور رسالہ مزید تابانیوں سے ہمکنار ہوا۔ اب رسالے نے ادبی جرائد کی صف میں اپنے لیے ایک باوقار جگہ پیدا کرلی تھی۔

خورشید صاحب کے بعد یکے بعد دیگرے امیر احمد صدیقی شاہ نواز قریشی صاحب اور اب امجد حسین صاحب اس کے ایڈیٹر ہیں بیچ میں رسالے کی اشاعت میں تاخیر ہوجایا کرتی تھی۔ اب یہ رسالہ باقاعدگی سے نکل رہا ہے اور لکھنؤ، یو۔ پی اور اردو کے ادبی وقار کا امین ہے۔ خدا سے دُعا ہے کہ اُردو کی اس قدیم راجدھانی میں یہ تادیر زندہ رہے۔ خوش قسمتی سے جناب لائق سنگھ یادو کی وزارت اعلامیں از سرِ نو نیا دور کی اہمیت واپس آئی ہے۔ صوری اور معنوی تبدیلیوں کی وجہ سے اس میں تازگی اور دل کشی پیدا ہوئی ہے خود اُردو کے لئے جو خوش گوار ماحول پیدا ہوگیا ہے اس کے پیش نظر یقین ہے کہ رسالہ مزید ترقیاں کرے گا۔

پہلی بار رسالے نے "اودھ نمبر" شائع کرکے ایک جاندار روایت قائم کی ہے۔ امید ہے کہ آئندہ بھی نیا دور خصوصی شمارے شائع کرکے یہاں کے عظیم ثقافتی سرمایے کی بازیافت کی کوشش کرے گا۔

"جشنِ نیا دور" کی ایک بار اور مبارک باد!

مضمون طویل ہوگیا اور بہت کچھ کہنے کو باقی ہے طول کلام کی معذرت میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں ؎

لطیف بود حکایت دراز تر گفتم

□□

اُردو شاعری میں قومی یک جہتی کی روایت ---- صفحہ ۶۸ کا بقیہ

ایٹم بم، ہائیڈروجن بم، آئی سی۔ بی۔ ایم وغیرہ سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ اس لیے کہ یہ لمحات کی پیداوار ہوں گے لمحات میں ختم ہوجائیں گے لیکن تشدد اور انتہاپسندی ایک نظریہ ہے۔ دہشت انگیزی پر خاموش۔ بہ نا پریم چند کے الفاظ میں "اب زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی"۔ یہ مقصد نہیں ہے کہ ہمارے شاعروں نے اس رجحان کے خلاف آواز نہیں اٹھائی۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اصل بیماری کے بجائے جو اس کی مختلف شاخیں تھیں یعنی فسادات وغیرہ اس پر زیادہ زور قلم صرف ہوا۔ سچ یہ ہے کہ آج ہر محاذ پر تشدداد عدم تشدد و شائستگی اور دہشت گردی اور انتہاپسندی ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں۔ ملک میں قومی یک جہتی کا انحصار عدم تشدد، قانون کی بالادستی، تہذیب و شائستگی اور مشترکہ تہذیب کے فروغ پر ہے۔ آج پھر اُردو شاعری کا امتحان ہے۔ یہ توقع بے جا نہ ہوگی کہ پچاس برس قبل شعر و ادب کے جس قافلے نے بدیسی سامراج کو شکست دی تھی، حملہ آوروں کو للکارتے ہوئے ملک کو حوصلہ عطا کیا تھا وہی اُردو شاعری آج پھر انتشار پسندی، دہشت گردی اور انتہاپسندی و تشدد کے خلاف نبرد آزما ہوگی۔

شاید
ایک نئی تاریخ لکھنے کے لئے مورخ کو شعر و نغمہ کا انتظار ہے۔

■■

گربچن چندن
جی ۳۵ - جنگ پورہ ایکسٹینشن
نئی دہلی ۱۴ ۱۱۰۰

ہم عصر اردو صحافت

علم و شعور کے سفر پر ہندوستان کی مطبوعہ اردو صحافت پچھلے تقریباً پونے دو سو سال سے گامزن ہے۔ بنگلہ صحافت کے بعد برصغیر کی قدیم ترین لسانی صحافت ہے۔ اس نے اپنے طویل اور جانگداز سفر میں وطن کے کئی علمی، سماجی، سیاسی اور ثقافتی گوشوں کو سیراب کیا ہے اور اس عمل میں اس کے خدمت گزاروں نے جانِ عزیز تک کی قربانیاں دی ہیں۔ اس کی تحریروں اور مدیروں کی سرگرمیوں کے محاسبے کے لیے فرنگی حکومت کو بے شمار تادیبی اور قانونی اقدام کرنا پڑے۔

حصول آزادی سے قبل یہ ملک کی مجموعی صحافت میں ایک امتیازی مقام رکھتی تھی۔ اس وقت اردو زبان انگریزی کے بعد برصغیر کی طاقتور ترین زبان تھی۔ اگست ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان تقسیم اور آزاد ہوا تو یہاں انگریزی اور دیسی زبانوں کے تمام اخباروں کی تعداد اندازاً ایک ہزار سے کچھ زیادہ تھی ان میں اردو اخباروں کی تعداد ۵۴۸ تھی جو ملک کے تقریباً ہر حصّہ سے شائع ہوتے تھے۔ ان میں سے تقریباً چالیس اس خطے سے نکلتے تھے جو پاکستان میں شامل ہوا۔

تقسیم سے قبل اور فوراً بعد ہولناک فرقہ وارانہ فسادات ہوئے جن کی وجہ سے سرحد کی دونوں طرف لاکھوں لاکھوں لوگوں کو اپنے اپنے گھر بار چھوڑنا پڑے۔ اس سے اردو صحافت کو جو تقسیم کی سیاست میں بڑی گرم جوشی سے شامل ہو گئی تھی بہت نقصان پہنچا۔

بہر حال نئی مرکزی حکومت کے جمہوری اور سیکولر آئین اور وقت کے مرہم نے اسے ڈھارس دی اور تھوڑی ہی مدت کے بعد اس میں نئی ہمت اور سرگرمی پیدا ہو گئی۔

آج ہر صبح ملک کے کم از کم ۱۴ لاکھ ۳۸ ہزار لوگوں کے ہاتھ میں اردو کا کوئی نہ کوئی روزنامہ ہوتا ہے۔

پریس رجسٹرار کی ۱۹۹۳ء کی رپورٹ کے مطابق جو اس موضوع پر تازہ ترین دستاویز ہے اور جس میں دسمبر ۱۹۹۲ء تک کے اعداد شامل ہیں۔ ان روزناموں کی کل تعداد ۳۷۳ تھی جن میں ۱۷ سہ روزہ اور دو دو روزہ اخبار بھی شامل تھے اس عدد کی بدولت اردو روزنامے ملک کی تمام زبانوں کے نقشے میں دوسرے مقام پر تھے۔ یہی مقام اس کے ہفت ناموں کو بھی حاصل تھا جن کی کل تعداد ۹۶۲ تھی۔

اتر پردیش

ملک کے ہر وقفہ کے اردو اخباروں کی مجموعی تعداد ۳۰۰۲ تھی جو اگست ۱۹۴۷ء کی تعداد سے تقریباً چار گنا تھی۔ اس تعداد کی بدولت اردو صحافت ملک کے مجموعی نقشے میں تیسرے مقام پر تھی۔ پورے ملک میں ۱۵ ریاستوں اور دو یونین علاقوں سے اردو کے اخبار شائع ہو رہے ہیں۔

ان میں سب سے زیادہ اردو اخبار اتر پردیش سے شائع ہو رہے تھے اور ان کی مجموعی تعداد ۹۴۴ تھی جن میں ۸۷ روزنامے تھے۔ ان میں چار سہ روزہ بھی شامل تھے۔ ریاست کے دیگر میقاتی جریدوں میں ۶۲۹ ہفت روزہ، ۵۶ نیم ماہی، ۹۵ ماہنامے، ۱۴ سہ ماہی اور ۲ ششماہی تھے ان کا مجموعی سرکولیشن ۸ لاکھ ۷۰ ہزار تھا اور اس اعتبار سے بھی یہ ریاست پورے ملک میں سرفہرست تھی۔

مختلف ریاستوں کے اعداد

اس ضمن میں ملک کی دوسری ریاستوں کے کوائف حسب ذیل ہیں۔

نام ریاست	کل اخبار	سرکولیشن (ہزاروں میں)
آندھرا پردیش	۴۰۵	۴۶۶
اڑیسہ	۰۲	عدد درج نہیں
بہار	۱۵۶	۵۲۲
پنجاب	۱۰۵	۱۲۱
تامل ناڈو	۱۲	۱۶
جموں و کشمیر	۱۸۴	۲۱۹
دہلی	۳۶۱	۴۳۳
راجستھان	۱۹	۰۳
کرناٹک	۱۰۱	۵۹
گجرات	۰۲	عدد درج نہیں
مدھیہ پردیش	۲۱	۶۶
مغربی بنگال	۶۳	۹۹
مہاراشٹر	۱۶۸	۱۰۵
ھریانہ	۱۶	۰۱
ھماچل پردیش	۰۶	عدد درج نہیں
چنڈی گڑھ	۰۲	عدد درج نہیں

کوائف کی نیرنگیاں

مجموعی کوائف کے تجزیے سے بڑی دلچسپ معلومات حاصل ہوتی ہیں مثلاً تعداد کے لحاظ سے آندھرا پردیش کے بعد پورے ملک میں دوسرے نمبر پر آ سرکولیشن کے لحاظ سے یہ مقام بہار کو حاصل ہے آندھرا پردیش اس اعتبار سے تیسرے مقام پر ہے پھر تعداد کے لحاظ سے دہلی تیسرے نمبر پر ہے۔ لیکن سرکولیشن کے اعتبار سے یہ چوتھے نمبر پر ہے۔ اگرچہ سب سے زیادہ اخبارات اترپردیش سے شائع ہوتے ہیں لیکن ماہناموں کے شعبے میں دہلی کا مقام سب سے اوپر ہے۔ اس کے ماہناموں کی تعداد ۱۸۲ تھی۔ بہرحال اپنے سرکولیشن کے اعتبار سے یہ پورے ملک میں سب سے آگے تھے۔ اس سرکولیشن کا عدد دو لاکھ ۲۷ ہزار تھا۔ بہار کے اخباروں کی تعداد جموں و کشمیر سے کم تھی لیکن سرکولیشن اس کے دوگنا سے بھی زیادہ تھا۔ کرناٹک کے اخباروں کی تعداد سو سے اوپر تھی لیکن سرکولیشن کا عدد صرف ۵۹ ہزار تھا۔ مغربی بنگال نے اخباروں کی تعداد صرف ۶۳ تھی لیکن سرکولیشن ۹۹ ہزار تھا۔ پنجاب کی ریاست میں جو ماضی میں معرکہ خیز اردو اخباروں اور رجحان ساز مدیروں کا مسکن تھی۔ آج بھی جب کہ سرکاری طور پر یہ پنجابی زبان کی یک لسانی ریاست ہے اردو کے ایک سو سے زیادہ اخبارات شائع ہوتے ہیں جن کا مجموعی سرکولیشن ایک لاکھ ۲۱ ہزار ہے اردو کا سب سے زیادہ چھپنے والا روزنامہ اسی ریاست سے نکلتا ہے۔ ۱۹۹۱ء تک یہ مرتبہ جالندھر کے۔ ہند سماچار۔ کو حاصل تھا لیکن تازہ ترین دستیاب رپورٹ میں یہ مقام لدھیانہ کے اخبار۔ لدھیانہ پوسٹ۔ اس کی روزانہ اشاعت ۵۰۸۵۴ دکھائی گئی ہے۔ یہ انکشاف اہل صحافت کے لئے نہایت حیرت افزا ہے۔

آزادی کے بعد نیا منظر

ان امور کے علاوہ اردو صحافت کے کچھ اور پہلو بھی قابل توجہ ہیں۔ ماضی میں اس صحافت کو اپنی زبان کی مقبولیت کی بدولت ملک کے لسانی رواج اور مزاج میں جو خصوصیت حاصل تھی وہ آزادی کے بعد ابھرنے والے نئے سماج میں برقرار نہ رہی۔ تقسیم کی سیاست میں دو قومی نظریے کے سیاستدانوں نے اسے ایک مذہب سے جوڑنے کی غلط اور نامبارک کوشش کی تھی جس سے کچھ طبقوں کو یہاں اس کے خلاف تعصب بڑھانے کا موقع ملا اور یہ اپنے جنم بھوم یعنی اترپردیش اور دہلی میں بے توجہی اور سخت گیری کا شکار رہوئی۔ بہرحال مرکزی حکومت نے ملک کے آئین میں اسے بڑی زبانوں میں شامل کیا اور یہ منتخبہ سولہ زبانوں میں شریک ہوئی۔ جموں و کشمیر میں اسے روز اول سے ریاست کی سرکاری زبان بنایا گیا۔

تحریک آزادی کے زمانے میں انڈین نیشنل کانگریس نے اپنی متعدد قراردادوں کے ذریعہ یہ وعدہ کیا تھا کہ آزادی ملنے کے بعد ہندستان کی تنظیم نو علاقائی زبانوں کی بنیاد پر کی جائے گی۔ اس وعدے کی تعمیل ہوتے ہی ملک کی مختلف ریاستوں میں ان کی علاقائی زبانیں سرفہرست ہوگئیں۔ اردو اپنی حدود کی وجہ سے کسی ریاست میں سرفہرست نہ آئی جموں و کشمیر میں اسے یہ امتیاز ضرور ملا لیکن بدقسمتی سے وہاں کے اہل اقتدار نے اپنی ریاست کی تین دیگر زبانوں یعنی کشمیری، ڈوگری اور لداخی کے ورثے میں اس پر اولین توجہ نہ دی۔ خود اس کے صحافیوں نے بھی باقی ہندوستان پر اپنے امتیاز کا وہ اثر نہ

ڈالا جس کے وہ مجاز تھے۔ بہار، مہاراشٹر اور آندھرا پردیش کے منتخبہ اضلاع میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا مرتبہ یا سہولتیں دی گئی ہیں اور اتر پردیش میں بھی امکانات روشن ہو رہے ہیں لیکن مجموعی طور پر حالات اطمینان بخش نہیں ہیں اور ہندستان کی اس اپنی دھرتی کی دوشیزہ آزادی کے بعد اپنے سہاگ کے انتظار میں ہے۔ تعصبات اور کم فہمیوں نے اس کے تشخص کو دھندلا دیا ہے اب یہ اپنی باطنی قوت، ادبی وراثت اور پرستاروں کی عقیدت کی بدولت نہایت دشوار مرحلے طے کر رہی ہے اور اپنی سنگلاخ زمین میں بھی گلکاریاں کر رہی ہے۔ یہ امر قابل توجہ اور حوصلہ افزا ہے کہ اتر پردیش، آندھرا پردیش بہار اور ہریانہ کے اردو اخبار اپنی ریاست کی سرکاری زبان کے اخباروں کے بعد تعداد اور سرکولیشن کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر ہیں اور جموں و کشمیر میں تو اردو اخبار اپنی ریاست کی پانچ زبانوں کے اخباروں میں ہر لحاظ سے سرفہرست ہیں۔ ملک کی تقریباً دس ریاستوں میں اردو کے ایسے روزنامے شائع ہو رہے ہیں جو ملک کی کسی بھی صف اول کے اخبار سے آنکھ ملا سکتے ہیں۔

نئی ٹیکنالوجی نئے انداز

ان میں سے اکثر کمپیوٹری کتابت، مصور اوراق اور فوٹو آفسیٹ طباعت کی نئی ایجادوں سے کام لے رہے ہیں۔ ان جدید طریقوں سے اردو صحافت کا معیار اور مرتبہ ہی بدل گیا ہے۔ اب اس کے متعدد اخبار کاتب کے تکان اور متلوّن مزاجی کا شکار نہیں ہوتے اور ایسے مارننگ ایڈیشن شائع کرتے ہیں جن میں تاریخ اشاعت کے تڑکے کی اہم خبریں بھی شامل ہوتی ہیں۔ اس صحافت کو اب اپنی زبان میں ٹیلی پرنٹر کی نیوز سروس میسّر ہے جس کا انتظام ملک کی ممتاز انگریزی نیوز ایجنسی یو این آئی (یونائیٹڈ نیوز آف انڈیا) کے ہاتھ میں ہے۔

اس سروس کی دستیابی سے ہندستان کی اردو صحافت کو یکتائی حاصل ہے کیونکہ دنیا کے کسی اور ملک میں ایسی سروس ابھی تک شروع نہیں ہوئی۔ مرکزی حکومت اس کے فروغ کے لیے کوشاں ہے۔ ۵ دسمبر ۹۴ء کو انسانی وسائل کے مرکزی وزیر جناب ارجن سنگھ نے اردو ایڈیٹروں کے اجتماع میں اعلان کیا کہ ان کی وزارت کی نیشنل کونسل برائے فروغ اردو نے فیصلہ کیا ہے کہ جو اردو اخبار یہ سروس لیں گے ان کا نصف ماہانہ بل کونسل ادا کرے گی پھر اردو صحافت کے ہاں ایسی ایجنسیاں ہیں جو حالات حاضرہ اور موضوعات

تازہ پیار اردو زبان ہی میں خصوصی [illegible] رہتے ہیں۔ اس کے ارکان کو اپنی زبان میں معیاری لغات اور حوالہ جاتی کتب [illegible] ہیں۔ اس کے قلم کاروں میں انگریزی کے صف اول کے جرنلسٹ شامل [illegible] ان میں کلدیپ نیر، اندر کمار گجرال، خشونت سنگھ اور ایم جے اکبر نمایاں ہیں جو اردو کے موضوعات پر ہونے والے عوامی جلسوں میں رغبت سے [illegible] کرتے ہیں۔ کمپیوٹری کتابت نے اخباروں اور رسالوں کے کالموں میں [illegible] آفسٹ طباعت نے خوشنمائی اور دلکشی پیدا کر دی [illegible]۔ آج ہمارے بعض رسالے اپنے مواد اور حسن کی بدولت غیر ممالک اور [illegible] خلیج کے ممالک میں مقبول و معروف ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں [illegible] ہیں۔

تصویر کا دوسرا رخ

ان سارے کوائف [illegible] ہماری وادی اونچے اور پھلدار درختوں سے بھری ہوئی [illegible] اس کے ہر گوشے میں رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ امر واقع یہ [illegible] یہ چھوٹے چھوٹے پودوں کی پناہ گاہ ہے جس میں کچھ پودے اپنے باغبانوں کی [illegible] سے سردار بن گئے ہیں اخباروں کی زمرہ بندی کے [illegible] اعتبار سے پوری اردو صحافت میں ایک بھی بڑا اخبار نہیں ہے بلکہ لغوی معنی میں ہمارے بڑے اخبار بھی سرکاری میزان میں چھوٹے ہو جاتے ہیں۔ اس میزان میں بڑے زمرے کا آغاز ۷۵۰۰۱ سے ہوتا ہے۔ اس کے نیچے ۲۵۰۰۱ [illegible] ۷۵۰۰۰ تک متوسط زمرہ ہے اور ۲۵ ہزار سے کم سرکولیشن والے اخبار چھوٹے اخبار تسلیم [illegible] ہمارے ملک میں انگریزی اور ہندی کے علاوہ کئی علاقائی زبانوں کے [illegible] اور رسالے بھی فی شمارہ ایک لاکھ سے زیادہ چھپتے ہیں [illegible] پنجابی، کنڑ، ملیالم تیلگو، تمل ایسی زبانوں کے اخبار بھی [illegible] لی لیکن آزادی کے ۴۹ سال بعد بھی ۱۹۹۴ء کی دستیاب تازہ ترین رپورٹ میں بھی اردو کے کسی بھی اخبار یا رسالے کی [illegible] اشاعت اس حد تک نہیں پہنچی تھی۔ چند سال پہلے دلی کے [illegible] شمع نے ایک لاکھ کے عدد کو پار کر لیا تھا۔ لیکن وائے افسوس [illegible] اور ایک ماہنامہ علی الترتیب [illegible] پہنچے۔ تین روزنامے اور ۵ پیراڈیکل ۲۵ تا ۵۰ ہزار کے درمیان [illegible] ۴۵ روزنامے اور ۵۰ پیراڈیکل پانچ تا ۱۵ ہزار کے درمیان [illegible] ۵۹ پیراڈیکل دو تا ۵

ہمارے درمیان تھے اور ۳ روزناموں اور ۵۰ منتقال جریدوں کا سرکولیشن دو ہزار سے بھی کم تھا یعنی ۲۰۰۳ کی مجموعی تعداد میں کل ملاکر ۲۹۱ روزنامے اور پیریاڈیکل سرکولیشن کے متوسط اور چھوٹے زمروں میں مقید تھے۔ باقی ۱۲، ۱۷ نے اپنے سرکولیشن کے بارے میں اعداد مہیا نہیں کئے۔

نووارد وں کے اندراج کا مسئلہ

یہ کوتاہی دوسری زبانوں کی صفوں میں بھی واقع ہوتی ہے اور اس سے ہماری زبانوں کی صحافت کی حقیقی صورتحال اپنے ناشروں کی بے توجہی سے کسی حد تک مخفی نہیں ہے لیکن غیر حاضر اخباروں کے حوالے سے جہاں ایک طرف یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ یہ ادنیٰ اشاعت والے اخبار تھے اس لئے انھوں نے اپنے کوائف مہیا کرنے سے پہلو تہی کی وہاں یہ بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ اخبار سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔ قواعد یہ کہتے ہیں کہ جب بھی کوئی اخبار اپنی اشاعت بند کر دے تو وہ متعلقہ حکام کو اس کے بارے میں اطلاع کرے لیکن اکثر اور بیشتر اس قاعدے کی تعمیل نہیں کی جاتی اور پریس رجسٹرار کی رپورٹ میں فوت شدہ اخبار بھی شامل ہوتے رہتے ہیں۔ اس پہلو پر اب توجہ کی جا رہی ہے اخبارات وکتب کے رجسٹریشن سے متعلق ۱۸۶۷ء کے مروجہ قانون کو جو برطانوی عہد کا نشانِ سلف ہے ہمعصر تقاضوں سے ہم آہنگ نیز اخبارات کے حقیقی احوال سے مناسبت رکھنے والا قانون بنانے کے اقدام کئے جا رہے ہیں اس سلسلے میں حکومت ہند کے پرنسپل انفارمیشن آفیسر کی سرکردگی میں قائم کردہ خصوصی جائزہ کمیٹی نے حال ہی میں اپنی رپورٹ پیش کردی ہے جس کی سفارشات کی تعمیل پر حکومت غور کر رہی ہے۔

اس معاملے کا حساب کتاب ریاستی حکومتوں کی داخلہ وزارتوں میں بھی رہتا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس باب میں ریاستی اور مرکزی محکموں میں مناسب تال میل نہیں ہوتا جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بے جان اور بے برگ و نوا اخباروں کے ٹائٹل منجمد اور بے فیض ہو جاتے ہیں۔

کشید کا حقیقت

یہاں ایک اور پہلو قابل ذکر ہے۔ پریس رجسٹرار کے دفتر میں اندراج شدہ ہر اخبار اپنی اشاعت کے حساب سے نیوز پرنٹ یعنی اخباری کاغذ کے کوٹے کے لئے درخواست دے سکتا ہے اور اگر وہ یہ کوٹا نہ لے تو اس کی ہستی مشکوک ہو جاتی ہے۔ اس معاملے میں ۱۹۹۳ء کی رپورٹ کے مطابق اردو کے ہر متقاضی کے مستحق اخباروں کی کل تعداد صرف ۱۸۰ تھی جن میں ۱۲۹ روزنامے تین سہ روزہ ۳۶ ہفت نامے دو پندرہ روزہ اور دس ماہنامے تھے یعنی ۲۰۰۳ کی مجموعی تعداد میں سے صرف ۱۸۰ نے نیوز پرنٹ حاصل کیا مجموعی تعداد میں سے کتنے اخباروں نے نیوز پرنٹ حاصل کرنے کے لیے درخواستیں داخل کیں اس کے علاوہ اعداد میسر نہیں آئے۔ رپورٹ میں صرف انھیں کی تعداد درج ہے جن کے لیے لازمی جنس منظور ہوئی۔ بہر حال مذکورہ رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے دوماہی اور سہ ماہی رسالوں اور رسالوں کے ناشرین میں سے ایک بھی ناشر نے نیوز پرنٹ نہ پایا یا غالباً اس کے لئے درخواست ہی نہ دی۔

لمحۂ فکریہ

ان اعداد سے اردو صحافت کی ایک مختلف صورتحال سامنے آتی ہے جسے خوش کن نہیں کہا جا سکتا بلکہ جس سے ایک لمحۂ فکریہ قائم ہوتا ہے جو آنے والی ۲۱ ویں صدی میں اردو صحافت کی ہستی کے بارے میں خطروں کا اشارہ کرتا ہے۔ خطروں کے علاوہ یہ امر بھی آشکار ہوتا ہے کہ اردو صحافت کو اپنی حیات سے وابستہ اپنے دفتری معاملوں پر زیادہ اور مسلسل توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اس کے ناشرین کو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ سرکاری محکمے ضابطوں کے پابند ہوتے ہیں اور جو امیدوار ضابطہ کو نظر انداز کرتا ہے وہ خواہ کتنا ہی باوصف ہو بعض اہم اور مستحقہ سہولتوں سے محروم ہو جاتا ہے۔

اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ سرکولیشن کے لحاظ سے اردو صحافت چھوٹے اخباروں کا تکیہ ہے۔ ہمارے ناشروں اور داعیوں کا دعوا ہے کہ ایک اردو اخبار کم از کم دس دس قاریوں تک پہنچتا ہے اور اس کی ساری رسائی عوام کے وسیع حلقوں تک دراز ہے۔ اس تصوراتی درازی سے ایک نفسیاتی راحت تو مل سکتی ہے لیکن حقیقی طور پر نہ تو آمدنی میں کوئی اضافہ ہوتا ہے اور نہ اشتہار دینے والے طبقوں میں اردو صحافت کی قبولیت یا پذیرائی ہوتی ہے۔

اشتہارات اخبارات کی حیات کا آکسیجن اور حرارت کا ایندھن ہوتے ہیں۔ اب کوئی چکبست یا دیا نرائن نگم، حسرت موہانی، مجید حسن یا نیاز فتحپوری محض اپنے علم و فضل یا عزم کے زور سے اپنا اخبار نہیں چلا سکتا۔ اسے اپنے کاروبار کے لئے ایک پورا نظام قائم کرنا ہوگا جس میں نگارش، ادارت، طباعت،

تجارت، تقسیم اور فروخت کے سب شعبے مستعد اور فعال ہوں۔ اسی مستعدی کے فیض سے اشتہار کنندگان اس کی طرف مائل ہوں گے۔

سماج کی کج روی

اس نظام کی کمزوری اور کوتاہی سے ہمارے ناشر بری الذمہ نہیں ہیں لیکن اس امر سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ ہمارے اربابِ اقتدار اور سماج اردو صحافت سے انصاف نہیں کر رہے ہیں۔ کچھ سرکاری ادارے تو اپنے بجٹ کے کسی حاشیے پر اردو اخباروں کو شامل کر لیتے ہیں لیکن نیم سرکاری اور نجی ادارے مسلسل غفلت روا رکھتے ہیں وہ اپنے اشتہارات کے بجٹ میں ان اخباروں کا کوئی خانہ ہی نہیں کھولتے۔ ان کے یہاں غالباً یہ نظریہ کارفرما ہوتا ہے کہ ان کے گاہک اردو اخبار نہیں پڑھتے لہٰذا ان کے مقاصد کے لئے اردو پریس کی کوئی اہمیت نہیں۔ یہ نظریہ سراسر غلط ہے۔ پریس رجسٹرار کی تازہ ترین رپورٹ کے مطابق اردو پریس کی مجموعی اشاعت کا عدد ۲۹ لاکھ ۸۸ ہزار ہے یعنی تقریباً ۳۰ لاکھ لوگ اس کے باقاعدہ خریدار ہیں جو روزناموں کے علاوہ رسالے بھی خریدتے ہیں۔ اردو کے ایک اچھے روزنامے کی قیمت اوسطاً ڈیڑھ روپیہ ہے ہفت روزہ کی اوسطاً پانچ روپے اور ماہنامے کی قیمت اوسطاً دس روپے ہے۔ ان کے علاوہ ہر وقفے کے اخبار کے خصوصی نمبر شائع ہوتے ہیں جن کی قیمت اکثر کئی کئی گنا زیادہ ہوتی ہے اور بعض رسالوں کے خصوصی نمبروں کی قیمت پچاس روپے فی شمارہ سے بھی تجاوز کر جاتی ہے۔ ان ۳۰ لاکھ خریداروں میں ہندو مسلم سکھ عیسائی سب شامل ہیں جن میں سے لاکھوں لوگ نجی کاروبار میں کامیاب اور خوش حال ہیں۔ وہ زندگی کے جدید لوازمات اور شوق کا ولولہ رکھتے ہیں۔ اپنی آمد و رفت کے لئے اسکوٹر اور کاریں استعمال کرتے ہیں اپنے غیر اردو ہمسایوں اور احباب سے خوش سلیقہ تعلقات رکھتے ہیں۔ ان کے گھروں میں پرتکلف دعوتیں ہوتی ہیں۔ وہ غیر ممالک کی سیاحتیں کرتے ہیں اور یہ پھر ۳۰ لاکھ خریدار اکیلے دکیلے افراد نہیں ہیں بلکہ نہایت اغلب ہے کہ ۳۰ لاکھ کنبے ہیں جن کے بہت سارے ارکان اپنے والدین سے کچھ زیادہ خوش حال ہیں لہٰذا یہ ایک وسیع اور وسعت پذیر دنیا ہے جہاں ہمارے صنعت کاروں اور فروخت کنندوں کی تجارت بہت پھل پھول سکتی ہے

اپنا تعارف دو

ضرورت یہ ہے کہ اپنے تعارف کے لئے ہمارے ناشر اور مدیر خود بھی مستعد اور سرگرم ہوں۔ صنعت کاروں اور ایڈورٹائزروں کو اپنی حیثیت اور اہمیت سے واقف کرائیں اور ان کی بے خبری اور کم فہمی دور کرنے کے لیے منظم طور سے کام کریں۔

ملک میں کم از کم چار کروڑ ایسے لوگ ہیں جن کی مادری زبان اردو ہے ان کے علاوہ لاکھوں لوگ ایسے ہیں جو اردو جانتے ہیں پڑھتے ہیں اور اس کی مطبوعات خریدتے ہیں۔ ہماری سیکڑوں فلمیں اسی لئے مقبولیت پاتی ہیں کہ ان کے مکالموں اور گانوں میں اردو زبان کی ترکیب اور مٹھاس ہوتی ہے۔ ان کے کروڑوں ناظرین میں لاکھوں اردو سے مانوسیت بڑھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

بدقسمتی سے ہمارے پاس اردو ناشرین کی ایسی کوئی فعال انجمن یا ادارہ نہیں ہے جو اردو اخباروں کی ہستی اور خصوصیات کی اشاعت کرے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کی صورت میں ایک ملک گیر جماعت ہے جس کی سیکڑوں شاخیں ہیں لیکن آج کل یہ جماعت اپنی بیشتر توجہ اہلِ اردو پر ہی صرف کرتی ہے اور ان کی اطلاعات کے لئے اردو زبان کی ادبی، ثقافتی اور علمی سرگرمیوں ہی پر مرکوز رہتی ہے۔ یہ اردو صحافت یا اس کی ضرورتوں کو اپنے لائحہ کار کا لازمہ تصور نہیں کرتی۔ بہرحال اردو کی ترقی سے وابستہ ملک کے تمام رضاکاروں میں یہ جماعت سب سے زیادہ باوسائل اور باذرائع ہے۔ اس کے مقاصد کی بنیادی کڑی اردو زبان کا فروغ ہے لہٰذا ایک آزاد اور خود مختار ادارہ کی حیثیت سے یہ اردو صحافت کے ابلاغ اور ترسیل کے لئے مفید کام کر سکتی ہے۔

سرکاری سطح پر ہمارے پاس ترقی اردو بیورو ہے جو انفرادی وسائل کی ترقیات کی مرکزی منسٹری کے تحت کام کرتا ہے۔ حال ہی میں اکتوبر ۱۹۹۲ء اسے ایک خود مختار ادارہ بنا کر نیشنل کونسل کا درجہ دے دیا گیا ہے جس سے اس کے اختیارات اور دائرہ کار میں اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ نیشنل کونسل جو ٹیلی پرنٹر نیوز ایجنسی کی سروس کے حصول میں اردو اخباروں کی مدد کرنے کا اعلان کر چکی ہے۔ اپنے یہاں اردو پریس کی ترقیات سے متعلق ایک مستقل شعبہ قائم کر سکتی ہے جو باقاعدگی سے ملک کے اردو اخبارات کی حیات اور چلن سے تعلق خاطر رکھے۔ خوش قسمتی سے اس کونسل کو اردو اکادمیوں کا تعارف حاصل ہے جو آج ملک کی تیرہ ریاستوں میں قائم ہیں۔ یہ کونسل ان اکادمیوں

کے لیے ان کی ریاستی حکومتوں کے ذریعہ ایک ایسالائحہ عمل تجویز کرسکتی ہے جس کی بنیاد پر یہ اکادمیاں اپنے ہاں اپنے علاقے کی اردو صحافت سے متعلق ذیلی شعبوں کو قائم کریں جو باقاعدگی سے اپنے اردو اخباروں کے کوائف فراہم کریں اور ان کوائف پر سالانہ رپورٹ شائع کریں۔ اس رپورٹ میں اخباروں کی حقیقی تعداد، ان کے مقامات اشاعت، قیمت، اوراق، ناشروں، نامہ نگاروں اور کالم نگاروں کے نام و پتے، طباعتی حالات اور دیگر معلومات شامل ہوں۔

پھر انھیں اکادمیوں کے کام کو نیشنل کونسل اپنی معلومات اور دریافتوں سے مربوط کرکے پورے ملک کے اردو پریس پر ہر سال ایک جامع رپورٹ شائع کرسکتی ہے۔ اس تدبیر سے یہ ادارہ نہ صرف حقیقی حالات اور جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہوگا بلکہ اس کی افادیت میں عہد آفریں سمت پیدا ہوگی۔

ماس میڈیا کے نئے دور کے تقاضے

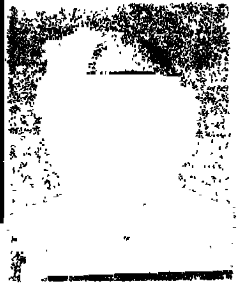
ماضی میں اہل اردو شعر و ادب کو اردو زبان کی تعمیر و ترقی کا ذریعہ سمجھتے تھے اور اس مقصد کے لئے رسالوں کو صحافت کا بڑا محور سمجھتے تھے۔ کسی بھی زبان کی سر بلندی میں اس کے شعر و ادب کی اہمیت اور قوت سے انکار یا انحراف نہیں ہوسکتا لیکن آج ماس میڈیا کا زمانہ ہے۔ آج تقریباً تمام خواص و عوام صحافتی اور نشریاتی تدبیروں کو بہت اہمیت دیتے ہیں اپنے ہر پروگرام اور ہر کام کی سرخروئی کو نشر و اشاعت کے سلسلے سے جوڑتے ہیں۔ ملک کی ہر ریاست سے نت نئے اخبار نکل رہے ہیں خواندگی کے فروغ سے پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ ان پڑھ لوگ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی خدمات سے خراماں خراماں مستفید ہو رہے ہیں۔ آنے والے زمانے اور بالخصوص جلد ہی طلوع ہونے والی اکیسویں صدی میں ان خدمات کی قدر و قیمت میں زبردست اضافہ ہوگا۔ قیاس اغلب ہے کہ سرکاری اداروں کے ساتھ ساتھ نجی ادارے بھی اس شعبے میں سرگرم ہوجائیں گے۔ اس سرگرمی سے دور رہنے والے عوام ہی سے دور ہوجائیں گے۔ لہٰذا اردو صحافت کے ناشرین کو اپنے شعبے میں ان احوال پر مخصوص اور منظم توجہ دینے کی اشد ضرورت ہے۔

زندگی کا کوئی شعبہ اس وقت تک کامیاب اور ترقی یافتہ نہیں ہوسکتا جب تک اہل شعبہ اپنی صفوں کو تعمیر و افزائش پر مسلسل توجہ نہ دیں۔ اس توجہ میں یہ شامل ہے کہ ہر روزنامے کے پاس اپنے باصلاحیت ایڈیٹر اور نامہ نگار ہوں۔ کم از کم ایک ٹیلی پرنٹر نیوز ایجنسی کی سروس ہو۔ نصف شب یا اس سے بھی کچھ آگے تک کی برآمدہ خبروں کو شائع کرنے کے لئے خاطر خواہ انتظام ہو اور اخبار کی دور دور تک تقسیم کے ذرائع اور وسائل ہوں۔ اسی طرح ہفت روزے، پندرہ روزے اور دیگر رسالوں کے پاس بھی باقاعدگی سے کام کرنے والے اور اپنی زبان کے علاوہ دوسری زبانوں کے عصری اخباروں پر نظر رکھنے والے قلم بدست اور فعال ایڈیٹر ہوں۔ اشتہار حاصل کرنے کے امور کے لیے کارگر نظام اور لائق عملہ ہو۔ مزید ناشروں کے لئے یہ بھی واجب اور مناسب ہے کہ وہ اپنے صحافیوں کو معقول تنخواہ اور اجرت دیں اپنے قلمی معاونوں کو معقول معاوضہ دیں اور اپنے صحافیوں کی پیشہ ورانہ تقویت کے لیے وقتاً فوقتاً ان کے لئے ریفریشر کورسوں کا اہتمام کریں۔

اردو صحافت اس برصغیر کی نہایت قدیم خدمت گذار ہے۔ آج بھی جب کہ اردو زبان طرح طرح کی دشواریوں سے دوچار ہے۔ متعدد ریاستوں کے لسانی نقطوں میں یہ مقام اول یا مقام دوم پر ایستادہ ہے اسے یہ امتیاز بھی حاصل ہے اور یہ پوری دنیا کی واحد ٹیلی پرنٹر اردو نیوز سروس کے نظام سے سرفراز ہے۔ اس کی کتابت اور طباعت جسے کبھی سرکنڈے کے قلم، ڈورے دار مسطر اور پتھر دوست لیتھوگرافی سے رہائی پانا ناممکن تصور کیا جاتا تھا کمپیوٹر اور لیزر کی جدید ترین دریافتوں سے لیس ہے۔ قومی کھاتے میں سیکڑوں اردو اخبار ہیں جو اپنی تعداد کے اعتبار سے ملک میں ہندی اور انگریزی کے بعد تیسرے مقام پر ہیں۔ وائے نصیب کہ سرکولیشن کے اعتبار سے یہ قومی صحافت کے نقشے میں آٹھویں مقام پر ہیں اور اس کے کارگذاروں کو اپنی گذر بسر میں گہری پریشانیوں کا سامنا ہے۔

یہ وہ شخصیت ہے جس کے سر پر تعداد کا پگڑ ہے۔ دل میں امروزِ رفت کی یادگاریں جسم پر قدیم خلعت ہے۔ کمر میں زمانۂ حال کے سوتی دھاگے ہیں۔ ہاتھوں میں اشتہاروں کی تمنا کا کشکول ہے اور پاؤں ننگے ہیں جن میں چھالے ہی چھالے ہیں اس لئے کچھ تماشا اور بعض اپنی توجہ اس کے پگڑ ہی پر اور پھر اس کی خلعت پر مرکوز کر دیتے ہیں اور باقی اس کے ننگے پاؤں ہی سے برگشتہ اور پریشان رہتے ہیں۔ ضرورت یہ ہے کہ ان سب عناصر کو دھیان میں رکھا جائے اور اردو صحافت کی صرف خدشاتی ہی نہیں بلکہ مجموعی اور امکانی ہستی پر غور و خوض کیا جائے۔

(باقی صفحہ ۱۰۲ پر)



چودھری سبط محمد نقوی
چیف ایڈیٹر "ہماری توحید"
لکھنؤ - ۳

نیا دور کے ادارت کار

علی جواد زیدی

زیدی صاحب شمار سنین و شہور میں تو مجھ سے دس ہی سال بڑے ہیں کہ ان کی پیدائش ۱۹۱۹ء کی ۱۷ مارچ بتائی جاتی ہے۔ مگر وہ مجھے صدیوں بڑے لگتے ہیں۔ اس کے مختلف اسباب ہیں۔ جتنا ان کے بارے میں سنا دیکھا، پڑھا اور پرکھا اس سے ان کی بزرگی کی دھونس بیٹھتی ہی چلی گئی۔ یہی سید علی جواد زیدی نیا دور کے پہلے اڈیٹر تھے۔ نیا دور ہی نہیں اس کے نقش اول اطلاعات کے بھی اور اسے بھی سرکاری خبر نامے کی ہیئت سے آگے بڑھا کے ادبی رنگ و آہنگ زیدی صاحب ہی کے دور میں ملا۔ پہلے یہ سرکاری مجموعۂ اخبار سے زیادہ کچھ نہ تھا۔

لیکن یہ بات تو رہ ہی گئی کہ میں نے زیدی صاحب کو صدیوں بڑا بزرگ کیسے تسلیم کیا۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ وہ ہمارے سجاد بھائی یعنی سید علی سجاد زیدی کے ہم دور کے طلاب میں ہماری مادر درسگاہ سلطان المدارس و جامعہ سلطانیہ کے ان اکابر سرگانہ میں سے تھے جنھوں نے یہاں عصریت کا رنگ و روپ لانے کے لئے ایک لمبی ہڑتال کی حال حال میں رہنمائی کی تھی جس میں مدارس جامعہ ایک طویل مدت تک تعطل کا شکار رہی تھی۔ میں مدرسہ کھلنے کے ہفتہ عشرہ کے اندر ہی داخل ہوا اس لئے سجاد بھائی کے عقیدت مندوں میں شامل ہوا۔ ظاہر ہے کہ ہمارے مجاہد کبیر کے حقیقی بڑے بھائی ہمارے لئے کتنی عظمت کے مالک ہو سکتے تھے۔ پھر وہ ہمارے مدرسہ کے نامی اور معزز اساتذہ، استاذی مولانا سید الطاف حیدر صاحب مرحوم کے بہت قریبی اور استاذی مولانا سید محمد حسن صاحب کے نسبتاً کچھ دور کے رشتہ دار تھے۔ یہ حضرات زیدی صاحب کی بڑی قدر فرماتے اور اس پر تاسف رہا کرتے کہ حالات نے انھیں شرقیات کی تعلیم سے محروم کر دیا ورنہ قدرت نے ان میں علامہ حلی رحمۃ اللہ کی خصوصیات کا کچھ حصہ ودیعت کیا تھا۔ اس سلسلے میں بیان کیا جاتا ہے کہ زیدی صاحب نے دس بارہ سال کی عمر ہی میں قلم و قرطاس سنبھال لیا تھا۔ نظم میں بھی نثر میں بھی۔ پھر انھوں نے طلبا کی تحریک کی راہ سے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ بجبر و قہر انھیں بھی سیاست [illegible] سے گزرنا پڑا۔ اگرچہ واقعہ یہی ہے کہ ان کا یہی سیاسی جہاد یوپی کی [illegible] شامل ہونے اور نتیجۃً اطلاعات کے تحویل حال اور نیا دور کے اجرا [illegible] بنیاد بنا۔ حق یہ ہے کہ خداوند کریم نیکو کاروں کے اجر ضائع کرتا ہی نہیں۔

ہوا یہ کہ ۱۹۴۶ء میں جب کانگریس نے زمام اقتدار سنبھالی تو دو قومی نظریے کے خلاف اردو میں پرچار کی بڑی ضرورت تھی۔ اس کام کے لئے زیدی صاحب سے بہتر کانگریس کے اپنے ٹولے میں اور کوئی [illegible] مسند پر لا کر متمکن کیا جاتا۔ اس تقرب سے وہ اتر پردیش سرکار کے محکمۂ اطلاعات میں داخل ہوئے اور شعبۂ اردو کے نگراں قرار پائے۔ یہاں انھیں [illegible] خداداد طور پر مستعد اور مخلص رفقائے کار بھی ملے۔ یہ تھی اردو کی معروف عصری شخصیت صباح الدین اور فرحت اللہ انصاری [illegible] علی اور خود زیدی صاحب کے حقیقی ماموں زاد بھائی سید خورشید احمد۔ حالات نے فرحت اللہ صاحب کو مدیر کے رتبے تک تو نہیں پہنچنے دیا لیکن انھیں ایک مدت [illegible] مستور طور پر سارا کاروبار ادارت سنبھالنا پڑا۔ ویسے بھی نیا دور کے فروغ کے لئے ان کا کردار کسی بھی طرح کم اہمیت کا حامل نہیں۔

ان سطروں کا راقم جس بات پر زور دینا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ زیدی صاحب کی یہ اپنی خصوصیت کا خاصہ تھی کہ بظاہر سرکار کے نقطۂ نظر پر آنچ آنے دئے بغیر انھوں نے اپنے نقطۂ نظر کا پرچار بھی ان جریدوں سے کیا [illegible]

پرانی ہو چکی ہے پھر بھی مجھے ایسا یاد پڑتا ہے کہ تعمیری ادب کے ذیل میں علی جواد صاحب نے اپنے نئے خیالات کے اظہار کا سلسلہ اس وقت شروع کیا۔ اس تحریک کو لے کر انھیں اپنے خالص ترقی پسند دوستوں کی بدگمانی اور تشنیع کا سامنا بھی کرنا پڑا لیکن وہ جو سوچتے اور سمجھتے تھے یا جو سوچتے اور سمجھتے ہیں اس پر اپنے استدلال کے سہارے اٹل رہنے کا گر جانتے ہیں چاہے وہ لکھنؤ اور دلی کے مقابلے میں اعظم گڑھ ادبی اسکول کا ادعا ہی کیوں نہ ہو خالص وطن پرستانہ تصور۔

آج نیا دور کے خصوصی شماروں کی بات بہت آگے بڑھ چکی ہے لیکن جہاں تک یاد پڑتا ہے اس کا سلسلہ زیدی صاحب ہی کے دور سے شروع ہوا۔ وہ وقت ایسا تھا کہ اردو کا مسئلہ سیاست کے بھنور میں ہچکولے کھا رہا تھا۔ کیا سرکار کیا اس کے انتظام کار، اردو کی ان بن سبھی سے تھی یہ زیدی صاحب اور ان کے رفقار کار ہی کا فیضان ہے کہ اردو اور نیا دور سے حکومت اور ریاست کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے یہ بات سلیقے سے ارباب اقتدار کو سمجھاتے رہتے اس لئے خصوصی شمارے علی جواد صاحب کے وقت میں نکلے اور بہت کامیابی سے نکلے۔ پبلی کیشنز افسر اور اسسٹنٹ ڈائرکٹر اطلاعات کے عہدوں پر کام کرکے جو فنی مہارت وہ حاصل کر چکے تھے اس کے سہارے اپنے کو مرکز کی خدمت کے لئے پیش کیا اور پبلک سروس کمیشن کے انتخاب میں کامیاب ہو کر دہلی چلے گئے اور پھر سال بھر کے ہی بعد حسن خدمات کے صلے میں وہ جموں و کشمیر میں بیک وقت ریجنل افسر اور انفارمیشن افسر کے عہدے پر تبدیل ہو گئے وہاں کچھ ایسا رنگ جما کہ زیدی صاحب کی خدمت حکومت جموں و کشمیر نے مستعار لے لی جہاں وہ وزیر اعلا کے خصوصی اور محکمہ اطلاعات و نشریات کے سکریٹری رہے۔ ۱۹۶۲ء میں یہ سلسلہ ٹوٹا اور زیدی صاحب دلی واپس آ گئے ۱۹۶۷ء میں مہاراشٹر اور گجرات کے لئے ڈپٹی پرنسپل انفارمیشن افسر بنائے گئے۔ مستقر بمبئی تھا اب کے دلی آئے تو ۱۹۷۵ء میں آل انڈیا ریڈیو نے مغربی ایشیا میں اپنا خصوصی نمائندہ مقرر کیا اب مستقر تہران، ایران ٹھہرا۔ یہیں سے سبکبار ملازمت ہوئے۔

وظیفہ یابی کے بعد زیادہ تر علی گڑھ میں رہے یہاں فرصت و فراغت کے ساتھ مولانا آزاد لائبریری کا عظیم الشان ذخیرہ کام آیا اور کمیت قلم اپنی جولانی دکھانے لگا۔ کچھ کتابیں مکمل ہوئیں ——— متفرقات میں جو انبار لگا وہ الگ۔ ان قلمی خدمات کے علاوہ کئی ملکی اور بین ملکی سیناروں میں شرکت کا موقع ہاتھ لگا۔

۱۹۹۱ء میں اترپردیش اردو اکادمی کے صدر نامزد ہوئے۔ پروفیسر ڈاکٹر محمود الہٰی چیرمین بنائے گئے۔ شاہجہاں کے شیراز۔ یعنی دیار مشرق کے ان مستحکم علمی اساس کے مالک دانشوروں نے اردو اکادمی میں تازہ روح پھونکی اور ایک ایسی شاہراہ ہموار کی جس پر اکادمی کا کارواں حالات کا نشیب و فراز جھیلتے ہوئے آگے بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ خدا کے فضل سے زیدی صاحب کا تخلیقی سفر اب بھی جاری ہے۔ ہرچند عمر کافی ہو چکی ہے، دل نے روگ بھی لگا لیا ہے۔ اولاد کی تمنا میں دور دراز کے سفر کا بار بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔ یہ ایک بیٹے کے ساتھ بمبئی میں اقامت کا ہی فیض تھا کہ القلم جیسا ایک علمی و ادبی جریدہ انکی ادارت میں نکلا یہ خصوصی شمارے کی سمائی اختصار و ایجاز کی طالب ہے اس لئے یہ ذکر جمیل تمام کرنا ہے۔ پھر کوئی مناسب موقع ہوا تو یہ ذکر چھیڑا جا سکتا ہے یار زندہ صحبت باقی۔

صباح الدین عمر

سطور بالا میں یہ نام کئی بار آیا ہے۔ یہ بھی عرض کر چکا ہوں کہ محکمۂ اطلاعات میں سید علی جواد زیدی کی تاریخی کارگزاری میں صباح الدین صاحب کی سرگرمیوں کا کافی ہاتھ ہے۔ وہ محکمے میں دس سال پہلے سے تھے یعنی ۱۹۳۹ سے۔ زیدی صاحب ۴۹ء میں آئے لیکن زیدی صاحب بہتر حیثیت میں داخل ہوئے۔ مجاہد آزادی کا اعزاز رکھتے تھے اس لئے منصوبوں کی منظوری اعلیٰ حکام سے انھیں کی جد و جہد سے ملتی۔ پھر فرحت اللہ صاحب، عمر صاحب، خورشید صاحب وغیرہ ل کے منصوبوں کو بروئے کار لاتے۔

مرحوم کو دانش محل کی بزم دانشوراں کے سرخیل کی حیثیت سے دیکھنے کا اتفاق تو مدتوں سے ہوتا رہا تھا۔ جب وہ براجمان ہوتے تو خود نسیم احمد صاحب کی حیثیت ثانوی ہو جاتی اور وہ بس دوکانداری کے کام کے رہ جاتے صباح الدین صاحب کی گل افشانی گفتار کو گزند پہنچائے بغیر گاہک کو سرگوشی کر کے کام چلاتے۔ راقم کو ان سے ملاقات کا لطف و اکرام تب حاصل ہوا جب اترپردیش اکادمی کی تاسیس ہوئی اور صباح الدین صاحب روح رواں کی طرح مسند نظامت پر متمکن ہوئے۔ اکبرپور بلدیہ کے نمائندے کی حیثیت سے وہاں کے ڈاکٹر رام منوہر لوہیا یادگار پستکالیہ کے لئے امداد کی درخواست

دینے کے سلسلے میں معلومات کے لئے اردو اکادمی کے دفتر جانا پڑا۔ پرچہ لے جانے میں چپراسی کو کچھ دیر شاید لگی ہو، طلبی میں تاخیر نہیں ہوئی۔ صاحب سلامت کے بعد میں بیٹھ گیا۔ کوئی کاغذ دیکھ رہے تھے۔ چند منٹ بعد فرمایا۔ ارشاد؟ میں حیرت میں پڑ گیا۔ وضع قطع، شیروانی ٹوپی سے لکھنویت اور وضعداری یوں بھی جھلک رہی تھی۔ اب جو "ارشاد" سے استفسار حال ہوا۔ سمجھ میں آیا کہ اس شخص و غیر متوقع وجود میں لکھنویت کی روح حلول کئے ہوئے ہے۔ بہرحال میں نے عرض مطلب کیا۔ مرحوم نے درخواست کا فارم منگوا کر دیا، خانہ پری کا اسلوب بتایا، منسلکات کی نسبت ضروری باتیں بتائیں۔ کام کی بات ہو چکی تو فرمایا کہ "ابھی حال میں قومی آواز کے ضمیمہ میں راجہ درگا پرساد مہر سندیلوی پر جو مضمون نکلا ہے وہ آپ ہی کا ہے؟" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ کچھ کہا نہیں چہرے پر کوئی تاثر بھی نہیں اُبھرا۔ اتفاق وقت سے محترمی ڈاکٹر شجاعت علی صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ یہ مضمون تو آپ نے شکیل کے مضمون پر لکھا ہے۔ میرے لئے اعتراف کے سوا چارہ کار ہی کیا تھا۔ اندازہ یہ ہوا کہ ان حضرات کو اس موضوع پر میری کاوش پسند نہیں آئی۔ میں نہ اس وقت کوئی مضائقہ سمجھا تھا اور نہ اب سمجھتا ہوں آخر بات سے بات نکلتی ہی ہے۔

لوہیا پستکالے کی امداد کے سلسلے میں جو کچھ گذری اس کے لئے یہ نتیجہ ہاتھ لگا کہ قانون اور قاعدے کے معاملے میں بہت محتاط اور سخت گیر ہیں مجھے وہ احتیاط اور سخت گیری زائد از ضرورت معلوم ہوتی تھی لیکن بعد کے واقعات سے یہ پتہ لگا کہ ان کے دور نظامت میں اگر اکاڈمی غبن وغیرہ سے پاک رہی تو یہ ان کی سخت گیری ہی کا ثمرہ تھا۔

صباح الدین صاحب رہنے والے تو لکھنؤ کے ایک مشہور مضافاتی قصبے نگرام کے تھے لیکن ثقہ قسم کی لکھنویت ان کے مزاج میں رچ بس گئی تھی جیسا کہ عرض کیا گیا۔ بات چیت، نشست و برخاست سب پر لکھنویت کی گہری چھاپ تھی لیکن لب و لہجہ کی وہ لطافت جو خاص اہل لکھنؤ کا حصہ ہے البتہ کم معلوم ہوتی تھی غالباً وہ اس لئے کہ شروع میں ان کا سابقہ نیاز فتح پوری، امین سلونوی اور نسیم انہونوی مرحوم سے رہا۔ اس لئے لہجے کا وہ مدھورن کہاں سے آتا۔ ہاں زبان و بیان پر پوری طرح لکھنویت کا رنگ چھایا ہوا تھا اور یہ محض سرسری چیز نہ تھی جو کچھ تھا وہ تحقیق و تدقیق کے ساتھ تھا۔ لفظوں کے برمحل استعمال کا بہت دھیان رکھتے اس سلسلے میں تبادلہ معلومات و استفسار سے بھی عار نہ تھی۔ ایک بار راقم سے برمی اور دیسی کی مجلسوں کا فرق پوچھا۔ شاید کچھ اور حضرات بھی گفتگو کر چکے تھے میرے جواب سے مطمئن ہوئے تو پسندیدگی ظاہر کی۔

صباح الدین صاحب کا دائرہ تعلقات بہت وسیع تھا۔ حکیم حافظ خواجہ شمس الدین اور ان کے بھائی خواجہ قمر الدین مرحوم کے بعد میں نے صباح الدین ہی کو پایا کہ میل جول اور آمد و رفت میں لکھنؤ کے موجودہ ماحول اور مسلکی امتیازات کو راہ میں نہیں آنے دیتے تھے۔

صباح الدین صاحب آزادہ رو بزرگ تھے لیکن بر اندک تحریک مرکز کی طرف پلٹ آتے تھے۔ بیگم اختر پران کا مضمون اس وقت پیش نظر نہیں ہے لیکن اس میں نماز روزہ تلاوت سب عبادات کی بجا آوری کا ذکر ہے۔ یہ تو عام طور سے معلوم ہے کہ مرحوم عمرہ بجا لا چکے تھے سفر حج کے قصد میں تھے کہ سفر آخرت پیش آ گیا۔

مرحوم صاحب مقدرت اہل قلم تھے۔ نثر نویسی پر تو ماہرانہ دسترس تھی شاعری نہیں کرتے تھے مگر موزوں طبع تھے۔ شعر گوئی میں بھی بند نہ تھے۔ نگار سے لے کر اکاڈمی تک ان کے قلم سے بہت کچھ نکلا ہے۔ مضامین و مراسلات کی بھی بہت بڑی تعداد ہے۔ مکتوب نگاری میں ایک خاص و منفرد اسلوب رکھتے تھے۔ کاش کوئی مرد کار پردۂ غیب سے نکلتا اور ان چیزوں کے جمع و تدوین کا معرکہ سر کر دیتا۔ صباح الدین عمر نے معلوم نہیں کتنے اہل قلم کی کاوشوں کی اشاعت و طباعت میں اپنی جان کھپائی لیکن اپنے مضامین کی ترتیب نہ کر سکے بار بار ارادہ کیا اور وہ برابر ٹلتا رہا۔ مرحوم کے برادر و فرزند صاحب صلاحیت بھی ہیں صاحب مقدرت بھی۔ کرنا چاہیں تو یہ کام بحسن و خوبی کر سکتے ہیں۔ خود نہ کریں تو کسی نوجوان معتمد قلم کار سے امداد باہمی کی شکل میں یہ کام لے سکتے ہیں بلکہ اسی نہیں جو کچھ انگریزی یا ہندی میں ہوا ہے بھی یکجا کیا جانا چاہئے۔

اب وہ ناز از خاک گور کی کشش بھی کیا چیز ہے۔ تمام عمر لکھنؤ میں گزری تعلیم کے مراحل، بی اے، عربی ایم اے امتیاز کے ساتھ اور ایل ایل بی۔ سب یہیں سے۔ ملازمت کا بیشتر دور یہیں گزرا۔ اچھے نیچے خوش و خرم اعزا سے ملنے بریلی گئے۔ وہاں کی خاک دامن گیر ہوئی۔ ۲۲ر ۲۳ر نومبر ۱۹۹۱ء کی درمیانی رات میں جان جانِ آفریں کو سپرد کر دی ۱۹۱۱ء سنہ ولادت تھا اس لئے اسّی برس کی عمر پائی۔

جان کر منجملۂ خاصانِ مے خانہ تجھے مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے

سید خورشید احمد

خورشید صاحب سے بھی کم و بیش اسی زمانے سے ربط رہا ہے جس میں علی جواد صاحب سے ہوا تھا۔ تقریب بھی وہی تھی یعنی استاذی سید مولانا الطاف حیدر صاحب اور استاذی مولانا سید نیر حسین صاحب سے ان کی قرابت قریبہ۔ خورشید صاحب تب لکھنؤ میں زیر تعلیم تھے اور ان حضرات سے ملنے آتے رہتے۔ کبھی اکیلے، کبھی زیدی صاحب برادران مرگ بھائیوں علی اعتماد اور علی بنیاد کے ساتھ۔ ان کی تواضع میں ہم طلاب اساتذہ کرام کا ہاتھ بٹانا پڑتا۔ اس طرح خورشید صاحب سے اچھے روابط ہو گئے۔ ہر چند خورشید صاحب زیدی صاحب سے کچھ بڑے تھے۔ کم سخن، کم آمیز اور کمبیر پھر بھی معلوم نہیں کہ کیا بات تھی کہ ان کی بزرگی کا اثر ہم طلاب پر نہیں پڑا۔ خورشید صاحب تلاش ملازمت میں بھی لکھنؤ کے چکر کاٹنے پڑتے۔ ہر چند کہ ایل ایل بی پاس تھے مگر وکالت کا پیشہ اختیار نہیں کیا۔ سول سپلائز کے محکمہ میں جگہ مل گئی تھی مگر وہاں ماحول کو برداشت نہ کر سکے۔ ان کی نفاست پسندی اور رکھ رکھاؤ محض اوپری یا دکھاوے کی نہ تھی بلکہ ان کی سرشت میں شامل تھے بہر حال وہاں سے ہٹنے کے بعد فوراً پھر سرکاری ملازمت میں داخل نہ ہو سکے۔ قومی آواز کے شعبۂ ادارت میں جگہ مل گئی اسے قبول کر لیا۔ بی اے (آنرز) اور ایم اے (اردو) دونوں میں فرسٹ ڈویژن لائے تھے چونکہ کم آمیز اور تنہائی پسند تھے لہٰذا مطالعہ بہت وسیع ہو گیا تھا۔ سخت نوائی کا شوق تھا اس لئے مراثی پر نظر تھی۔ ان باتوں کی وجہ سے سوچنے اور نکتہ پیدا کرنا عادت بن گئی تھی۔ زبان صاف ہو گئی تھی اس لئے قومی آواز میں کامیاب رہے ان صلاحیتوں کے ساتھ جب صحافت کا عملی تجربہ ہوا تو محکمہ اطلاعات میں جرنلسٹ ہو گئے۔ وہاں فرحت اللہ انصاری اور صباح الدین عمر کے ایسے خوش مذاق و علم دوست یاروں کا ساتھ رہا۔ پھر سید علی جواد زیدی، ان کے سگے بھائی نژاد بھائی شعبۂ اردو سربراہ کے طور پر آ گئے۔ اتفاق وقت کہ یہ سب مسلم لیگ کے دو قومی نظریے کے خلاف تھے۔ علی جواد تو تحریک آزادی میں سزا یابی کی سند اور مجاہد آزادی کا اعزاز رکھتے تھے۔ خورشید صاحب عملی سیاست کا مزاج نہیں لائے تھے لیکن تھے زیدی صاحب کے ہم خیال و ہم نوا۔ صباح الدین صاحب بہت شگفتہ سی مزاج رکھتے تھے۔ جناح صاحب کی لکھنؤ آمد پر سیاہ جھنڈیاں دکھلانے میں شامل تھے۔ فرحت اللہ صاحب اشتراکی خیال کے ساتھ کانگریس سے بھی رکھتے تھے۔ یہ محض اتفاق وقت تھا مگر نیا دور اور محکمہ اطلاعات دونوں شعبے کے بہت کام آیا۔

خورشید صاحب بڑے فرض شناس، مستعد اور محنتی آدمی تھے علی جواد زیدی تو ہر طرح ان کے اپنے تھے۔ صباح الدین صاحب کے دور ادارت میں بھی انھوں نے بہت محنت اور مستعدی سے ہاتھ بٹایا۔ یہ بات صباح الدین صاحب سے خود راقم نے کئی بار کہی۔ جب ادارت کی امانت کا قرعۂ فال خود ان کے نام نکلا تو پھر پوچھنا ہی کیا تھا ایسی محنت شاقہ برداشت کی کہ دل کو روگ لگا بیٹھے اگرچہ یہاں ان کو امیر احمد صدیقی ایسے کہنہ مشق اور شاہنواز قریشی ایسے تازہ دم اور انتھک کام کرنے والے رفقار کی معاونت مہیا تھی مگر پھر بھی اپنے کام سے کام کرنے کا چسکا اور ہر رطب و یابس پر نظر رکھنے کی فکر تھی۔ کہ نیا دور کا معیار ان کے دور ادارت میں چاہے بلند تر نہ ہو سکا ہو گرنے بھی نہیں پایا۔ ویسے بھی مرحوم کے مزاج میں خشکی تھی لیکن رسالے کے مشمولات کے بارے میں کچھ زیادہ ہی سخت گیر تھے ان کے دور ادارت کے خصوصی شمارے بھی یادگار رہے۔

ظن غالب یہ ہے کہ خورشید صاحب نے جو کچھ بھی لکھا وہ سب کار سرکار ہی تھا۔ زیدی صاحب کی قلم کاری میں جو پیوند کاری کی وہ صلہ رحم کی مد میں تھی۔ ان کے آزاد اثر خامہ راقم کی نظر سے نہیں گذرے۔

سبک بار ملازمت ہوئے تو اردو اکاڈمی میں لے لئے گئے۔ وہاں کے مسائل میں دلچسپی لینے لگے۔ وطن مالوف کرہاں ضلع اعظم گڑھ (اب مئو) سے انس عود کر آیا وہاں بھی اچھا خاصا وقت گزارنے لگے۔ وطن سے الفت کی ایک تعمیری یادگار بھی چھوڑی جو ایک نسواں اسکول ہے اور غالباً یہ مرحوم تسنیم کرہانی کے نام سے منسوب ہے صحت بگڑ ہی چکی تھی۔ محنت کی خو گر طبیعت نچلے بیٹھنے نہ دیتی تھی اس عالم میں دن کٹ رہے تھے کہ ایک رات سوتے میں نقد جاں قدر انداز قضا کے حوالے کر دیا۔ سید خورشید احمد مارچ یا اپریل ۱۹۱۵ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۲۱ر نومبر ۱۹۸۳ء کو عالم فانی سے رخصت ہوئے تال کٹورے کی کربلا میں آرام گاہ ملی۔

عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

امیر احمد صدیقی

۱۹۷۱ء میں خورشید صاحب وظیفہ یاب ہوئے تو اسی سال اگست میں امیر احمد صدیقی نے ادارت کی باگ ڈور سنبھالی جو غالباً ۱۹۷۲ء سے بحیثیت جوائنٹ ایڈیٹر نیا دور سے وابستہ تھے۔ غالباً صدیقی صاحب کے ہی دور ادارت میں نیا دور کے اوراق میں مجھے پہلے پہل جگہ ملی لیکن ملاقات کی نوبت

یاب آئی۔ اگرچہ وہ نیا دور سے ۱۹۷۲ء میں متعلق ہوئے لیکن محکمۂ اطلاعات سے ان کا تعلق کافی پرانا تھا۔ وہ ۱۹۴۸ء میں محکمہ میں آئے تھے۔ اسی سال انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے اور ایل ایل بی کی سند لی تھی۔ اس وقت ان کی عمر اسکولی اندراج کے مطابق ۲۰ سال تھی۔ تاریخ ولادت ۲۰ر نومبر ۱۹۲۸ء درج ہے۔

مرحوم صباح الدین عمر کی طرح امیر احمد صدیقی بھی مضافات لکھنؤ کے باشندے تھے اول آبائی گاؤں اجریاؤں لکھنؤ شہر کا سرحدی گاؤں تھا اب تو اپنے مزعول سمیت نئے لکھنؤ کے سب سے آباد اور ترقی یافتہ علاقہ گومتی نگر میں بدل گیا ہے معلوم نہیں وہ کون صاحب تھے جو دور کی کوڑی لائے تھے اور گومتی پر نام رکھ دیا۔ یہ تو دراصل ککریل نالے کے کنارے ہے اس نالے کو پار کرکے لکھنؤ زمانۂ طالب علمی میں سائیکل سمیت آنے کی صعوبتیں صدیقی صاحب کو اب بھی یاد ہیں۔ زمین چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا۔ یہ دیکھنا ہو تو ملاحظہ فرمائیے کہ امیر احمد اجریاؤں کے زمیندار گھرانے سے متعلق تھے لیکن اب وہ نشاط گنج میں رہتے ہیں۔ معلوم نہیں ان کی اپنی زمین پر کون کون سے کھنڈ آباد ہیں۔

امیر احمد صاحب محکمہ اطلاعات میں آئے تو ان کا پہلا سابقہ پاکستانی اخبارات پر رپٹ تیار کرنے کے کام سے ہوا۔ یہ سلسلہ کوئی تین سال چلا ہوگا پھر پاکستانی اخبارات پر پابندی لگ گئی تو دیش پردیش کے اخبارات پر سرکاری نظر رکھنے کا کام سونپا گیا۔ دس بارہ سال کی محنت کے بعد انفارمیشن افسر کے منصب پر فائز ہوئے۔ ۷۲ء میں نیا دور کے جوائنٹ ایڈیٹر بنائے گئے یہاں سید خورشید احمد کی رفاقت میں کام کرنے لگے۔ انھیں کے ساتھ ادارت کا کام اور خصوصی شماروں کی تدوین میں مہارت حاصل کی۔ یہیں اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اردو) کے عہدے پر ترقی پائی ۱۹۸۴ء میں ڈپٹی ڈائرکٹری مل گئی مگر تعیناتی گورکھپور کی گئی تھی یہ امیر احمد صدیقی تھے، ریاض خیرآبادی نہ تھے کہ گورکھپور کی گلیوں میں شباب گم گشتہ کے سراغ کی فکر ہوتی۔ یہ فدائے لکھنؤ تھے اس لئے ترقی کی پیشکش مسترد کردی۔ اس تیاگ کا ثمرہ بھی ملا ۱۹۸۹ء میں وظیفہ یاب ہوئے تو تین سال کا ازسر نو تقرر مل گیا۔ آخر ساری عمر محکمۂ اطلاعات اور نیا دور کی نظر کر ڈالی تھی۔ یہ انعام نہ ملتا تو تعجب ہوتا۔ صدیقی صاحب جب تک ملازمت میں رہے جو کچھ لکھا وہ سب نذر سرکار ہی ہوا۔ بالکل خورشید احمد صاحب مرحوم کی طرح۔ بس ایک فرق کے ساتھ وہ یہ ہے کہ خورشید صاحب نے وظیفہ یابی کے بعد بھی قلم برائے اشاعت نہ سنبھالا۔ صدیقی صاحب لکھتے رہتے ہیں۔ اس وقت تو اپنے گاؤں اجریاؤں کی تاریخ زیر قلم ہے۔ صحافت سے بھی تعلق کچھ وسیع کر رکھا روزنامہ سیاست جدید کانپور کے نمائندے ہو گئے ہیں۔ جنرل کونسل کی رکنیت کی وجہ سے اردو اکادمی سے بھی دلچسپی لینے لگے ہیں۔ آل انڈیا رفیع احمد قدوائی کمیٹی کے جنرل سکریٹری ہیں۔ مذہب سے بھی لگاؤ گہرا ہو گیا ہے ۱۹۹۰ء میں فریضۂ حج بھی بجالائے۔ اس عمر میں بھی ماشاء اللہ تندرست و فعال ہیں زیارت حرمین شریفین کے باوجود چہرے کو جھاڑ جھنکار سے صاف رکھتے ہیں آپ پہلے پہل دیکھیں تو عمر کا صحیح اندازہ نہ لگا سکیں۔ خداوند عالم ان کی صلاحیتوں سے اردو کو تا دیر فائدہ پہنچاتا رہے۔ آمین۔

شاہ نواز قریشی

قریشی صاحب سے ملاقات کب اور کہاں ہوئی؟ یہ تو یاد نہیں لیکن انھیں یار دیرینہ شمار کرتا ہوں تو ضمیر معذرت نہیں کرتا۔ یہ شاہ نواز صاحب کی باکمالی اور خلوص کا ثمرہ بھی ہو سکتا ہے۔ اہل کمال سے میری عقیدت کا بھی۔ ملک الشعراء ذوق مرحوم کی بلند پروازی کو کون پہنچ سکتا ہے کہ اپنے ہم دمینہ کو مسیحا و خضر سے آگے بڑھا دیا۔ لیکن میرے معدودے چند لکھنوی احباب (شاہ نواز صاحب) ایسے فرد فرید ہیں کہ جن سے ملاقات نسیم صبا کا لطف دیا کرتی ہے۔ اس دور کشاکش میں یہ کوئی معمولی بات نہیں۔

اصل میں ذکر شاہ نواز اور نیا دور کے تعلق کا کرنا تھا مگر میں نے داستان اپنی نیاز مندی کی چھیڑ دی۔ اسے بھی ایک انسانی کمزوری سمجھ آپ معاف کر دیں۔ شاہ نواز قریشی علی جواد زیدی (مدظلہ) اور مرحوم صباح الدین عمر کے ہم قبیلہ ہیں کہ قلم و قرطاس کے ساتھ فطری مناسبت لائے ہیں کالج کے وسیلے سے لکھنؤ یونیورسٹی سے گریجویٹ ہونے کے بعد لکھنؤ کے ہفتہ وار جدید شاہراہ سے وابستہ ہوئے۔ یہ کوئی ۱۹۷۰ء کی بات ہوگی تب اس کے مدیر عظیم آبادی تھے ۱۹۷۵ء سے شاہنواز نے ادارتی ذمہ داریاں سنبھالیں سلسلہ ۱۹ر اگست ۱۹۷۷ء کو منقطع ہوا جب اگلے دن انھوں نے انفارمیشن (اردو) کی حیثیت سے محکمۂ اطلاعات عامہ اتر پردیش میں اپنی ذمہ داری کا چارج لیا۔ سید خورشید احمد ایڈیٹر اور امیر احمد صدیقی جوائنٹ ایڈیٹر کا ساتھ ہوا۔ صدیقی صاحب خورشید صاحب کے جانشین ہوئے تو شاہ نواز صاحب نیا دور کے جوائنٹ ایڈیٹر ہوئے اس سلسلے نے دس سال کا طول کھینچا یعنی جون ۱۹۸۷ء تک۔ اسے نیا دور کے

خصوصی شماروں کے عہد زریں کا آغاز سمجھنا چاہئے جس میں اطفال نمبر، منشی نول کشور نمبر، منشی دیا نرائن نگم نمبر، بہادر شاہ ظفر نمبر، فراق نمبر دو حصوں میں، یادرفتگاں نمبر نکلا یہ کہنہ مشق اہل قلم امیر احمد صدیقی اور تازہ دم ادب سرشت شاہ نواز قریشی کے سعی و امتزاج کا سلیقہ سمجھنا چاہئے۔ ان میں فراق نمبر اور نول کشور نمبر کی تو بڑی پذیرائی ہوئی۔

۱۹۸۹ء میں امیر احمد صاحب سبکدوش ہوئے تو قائم مقام ایڈیٹر کی حیثیت سے شاہ نواز سربراہ ادارت ہوئے جب اگست، ستمبر ۱۹۹۰ء کا مشترکہ شمارہ شائع ہوا تو اس پر شاہ نواز قریشی کا نام ایڈیٹر کے طور پر شائع ہوا۔ اپریل ۹۱ء میں شاہ نواز اور ان کے رفقاء نے امید کر نمبر نکال کے خصوصی شماروں کو ایک نئی جہت سے روشناس کیا۔ یہ کسی اردو جریدے کا اس عنوان پر پہلا شمارہ تھا۔ اسے حد درجہ سراہا گیا۔

اب پبلک سروس کمیشن سے اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اردو) کا چناؤ ہوا قریشی صاحب اس مقابلے میں شرکت کی عمر پار کر چکے تھے اس لئے انھیں منتخب افسر سید امجد حسین کے لئے جگہ خالی کرنی پڑی لیکن انھیں بھی اسسٹنٹ ڈائرکٹر کے منصب پر ترقی ملی۔ آج کل وہ اردو اکاڈمی کے سکریٹری ہیں اور اس طرح صباح الدین عمر مرحوم کی روایت پھر تازہ ہوئی ہے۔ یقین ہے کہ یہ دور نظامت بھی اپنی خوبیوں اور خصوصیتوں کے لئے یادگار رہے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ شاہ نواز صباح الدین صاحب کی طرح ایک زبردست لکھاڑ ہیں، افسانے، فیچر، مضامین نثری نظمیں، بہت سے اصناف ادب میں شاہ نواز کے قلم کے جوہر کھلے ہیں۔ ان کی تخلیق سے ہندوستان ہی نہیں پاکستان کے رسائل و جرائد بھی فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ شاہ نواز ایک سرگرم سماجی شخصیت ہیں۔ شاید ہی کوئی ادبی اجتماع ہو جہاں شاہ نواز نہ ہیں۔ ریڈیو کی بدولت ان کی آواز اور دوردرشن کے ذریعہ ان کی صورت کافی جانی پہچانی ہے۔ شاہ نواز کی سیدھی سادی شخصیت کی طرح ان کا انداز تحریر بھی ہے جس کے فہم کے لئے کسی کو معلم و مفسر کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ وہ عام آدمی کے ادیب ہیں اور برابر اس کے قریب ہی ملتے ہیں۔

شاہ نواز عمر کی ۴۰ بہاریں دیکھ چکے ہیں لیکن بالکل تازہ دم نوجوان لگتے ہیں اس میں ان کے گھر کی کدبانو کا بھی ہاتھ ہے جس سے وہ بال بال بندھے ہیں جس کی بدولت ان کے خضاب کی تازہ کاری میں سرمو فرق نہیں پڑنے پاتا۔ شاہ نواز کے سامنے ابھی زندگی کا وسیع میدان اور اردو کی خدمت کے بے شمار عنوان پڑے ہیں، ہم ان کے آثار قلم سے زیادہ سے زیادہ فیضیاب ہونے کے متمنی ہیں۔ خداوند علیم انھیں یہ نعرہ لگانے کی توفیق ارزانی کرے۔

نگار رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار

سید امجد حسین

ابھی سید امجد حسین کے محکمہ اطلاعات میں داخلے کا ذکر گزرا ہے۔ وہ بی اے ایم اے اور ایم فل سبھی میں فرسٹ ڈویژن کی ڈگری لائے تھے اور امتیاز بھی حاصل کیا تھا۔ امجد صاحب نے ۱۱ر جون ۱۹۹۱ء سے ادارتی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ ہر آنے والا عمارت تو بناتا ہی ہے اس لئے امجد صاحب کے ساتھ بھی کچھ خوشگوار تبدیلیاں ہوئیں لیکن جو چیز انتہائی قابل داد ہے وہ خصوصی شماروں کی وہ باڑھ ہے جو امجد صاحب کے ساتھ نیا دور میں آئی۔ ساڑھے تین چار برس میں شیخ علی حزیں نمبر، قومی یک جہتی نمبر، صباح الدین عمر نمبر نکلے اور پسند کئے گئے۔ اودھ پر تو دو ضخیم خصوصی شمارے نکلے۔ یہ دو ضخیم حصوں میں تھے، ایک ضمیمہ ان کے علاوہ تھا۔ یہ پیش کش خاصہ کی چیز ثابت ہوئی۔ اس خصوصی شمارے نے نیا دور کا نام اردو کی دنیا کے باہر بھی پہنچایا۔ سنا ہے کہ اس میں سے کچھ ہلکی پھلکی پر لطف چیزیں ہندی میں پیش کئے جانے کا منصوبہ ہے۔ اودھ نمبر (۲) کی رسم اجراء ابھی مکھیہ منتری ملائم سنگھ انجام نہیں دے پائے تھے کہ امجد صاحب نے نصف صدی نمبر پر کام شروع کر دیا۔ یقیناً امجد صاحب کی نحایت نے نیا دور کی شہرت و اہمیت کو ایک نیا افق مہیا کیا ہے۔ وزیر اعلا کو امجد صاحب کے کام اور بگانی صاحب کے اہتمام نے نیا دور کی طرف متوجہ کر لیا ہے اور یہ بڑی فال نیک ہے خداوند کریم نظر بد سے بچائے۔ آمین۔

امجد صاحب نیا دور میں داخلہ سے پہلے اردو دنیا میں ایسے تنقیدی و تحقیقی مضامین کے ساتھ بخوبی متعارف ہو چکے تھے۔ اردو کے غیر مسلم مرثیہ نگاروں پر ان کا تحقیقی مقالہ ابھی شائع نہیں ہو سکا ہے یہ مقالہ شائع ہوئے تو ان کے گلستان خدمات کی بہار کا اندازہ ہو۔ امید ہے کہ ادبی صحافت کے میدان میں جس طرح انھوں نے اپنا پایۂ اعتبار بلند کیا ہے جس کے اعتراف میں اردو صحافت کاروں کی ایک تنظیم نے راجپال دورا جی کے ہاتھوں امجد صاحب کو اردو صحافت ایوارڈ پیش کیا ہے اسی طرح تنقید و تحقیق کی دنیا میں وہ نامور ہوں گے۔

امجد حسین نے ابھی بہار زندگی کی ۳۲ فصلیں گزاری ہیں۔ ان کی تاریخ ولادت

عرفان عباسی
۹۱۔ باغ منو۔ نیا گاؤں لکھنؤ



نیا دور کے پچاس سال

سرسری جائزہ

اِس وقت جون ۱۹۵۶ء کا شمارہ پیش نظر ہے جس کے سرورق پر جلد ۱۱ نمبر ۳ درج ہے۔ اس اندراج کے مطابق نیا دور کا سالِ اجرا یقینی طور پر ۱۹۴۶ء قرار پاتا ہے۔ اس حقیقت پر فروری ۱۹۵۷ء کے شمارہ (جلد ۱۲ نمبر ۲) کے مرتب فرحت اللہ انصاری مرحوم کے ایڈیٹوریل (عرضِ حال) کی مندرجہ ذیل سطور مزید روشنی ڈالتی ہیں:

"زیدی صاحب (علی جواد زیدی جو جنوری ۱۹۵۷ء
تک ایڈیٹر تھے) نیا دور کے اس وقت بھی ایڈیٹر تھے
جب ان کا نام زینت دہِ نیا دور نہ تھا۔ وہ اس وقت بھی
نیا دور کے سرپرست تھے جب فائلوں کے انبار
میں دبے رہتے تھے ..... نیا دور جو کچھ ہے وہ
انھیں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔"

(نیا دور جمہوریت نمبر فروری ۱۹۵۷ء ص ۱۳۴)

علی جواد زیدی صاحب ۱۹۴۹ء میں محکمۂ اطلاعات سے وابستہ ہوئے تھے۔ جون ۱۹۵۶ء کے شمارہ میں ان کا نام بحیثیت ایڈیٹر درج ہے اور جنوری ۱۹۵۷ء تک وہ اس عہدہ پر فائز رہے۔

جون ۱۹۵۶ء سے قبل نیا دور کی ترویج و ترقی اور ادبی حیثیت دینے کے سلسلے میں ان کی کاوشوں کا ذکر جن الفاظ میں کیا گیا ہے وہ جون ۱۹۵۶ء سے قبل کا ہی زمانہ ہو سکتا ہے اور اس تحریر کی موجودگی میں جون ۱۹۵۶ء سے قبل اس کے شائع ہوتے رہنے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی ہے۔

ماہنامہ نیا دور اور پندرہ روزہ "اطلاعات"

اسی زمانے میں صوبائی حکومت کا ایک پندرہ روزہ خبرنامہ مہتمم پبلی کیشن ڈویژن محکمۂ اطلاعات کی نگرانی میں ہر ماہ کی پہلی اور ۱۵ ر تاریخ کو "اطلاعات صوبۂ متحدہ" کے نام سے شائع ہوتا تھا۔ اس کا سالانہ چندہ تین روپیہ اور ایک کاپی کی قیمت دو آنے ہوتی تھی البتہ بعض خصوصی ضخیم نمبروں پر قیمت آٹھ آنے درج ملتی ہے۔ یہ خبرنامہ صوبائی حکومت کی پالیسیوں، منصوبوں، قواعد و ضوابط، ترقیاتی کاموں اور مفاد عامہ کے سلسلے میں ہونے والے فیصلوں کا نقیب تھا۔ شروع میں مختلف سائز $\frac{20 \times 30}{4}$ وغیرہ اخباری سائز میں چھپتا تھا پھر "9 × 15" کے سائز پر شائع ہونے لگا۔ رسالہ کا سائز تبدیل کرتے ہوئے مہتمم نے ۱۵ ر اپریل ۱۹۴۹ء کے شمارہ میں اشتہار شائع کیا تھا:

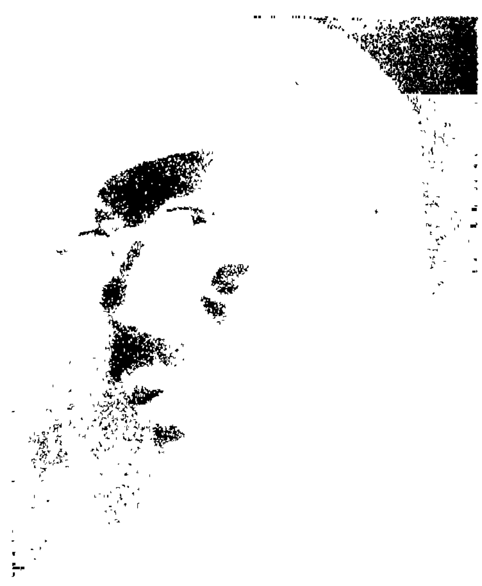
"ناظرین کی اطلاع کے لیے
اطلاعات صوبہ متحدہ کے اس نمبر کے سائز اور ترتیب وغیرہ میں ناظرین کو کافی تبدیلی نظر آئے گی۔ ہم اطلاعات کو بے حد دلچسپ، خوبصورت اور باتصویر جریدہ بنانا چاہتے ہیں۔ اطلاعات کا سالانہ چندہ تین روپیہ اور ایک کاپی کی قیمت دو آنہ رکھی گئی ہے تاکہ لوگ بآسانی خرید سکیں۔"

"اطلاعات" جنوری ۱۹۴۹ء کا پہلا شمارہ جس پر جلد ۴ اور نمبر ۱ درج ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس جریدہ کا اجرا بھی ۱۹۴۶ء



امتیاز علی عرشی

۱۹۰۴ء - ۱۹۸۱ء



مسعود حسن رضوی

۱۸۹۳ء - ۱۹۷۵ء



کرشن چندر

۱۹۱۴ء - ۱۹۷۷ء



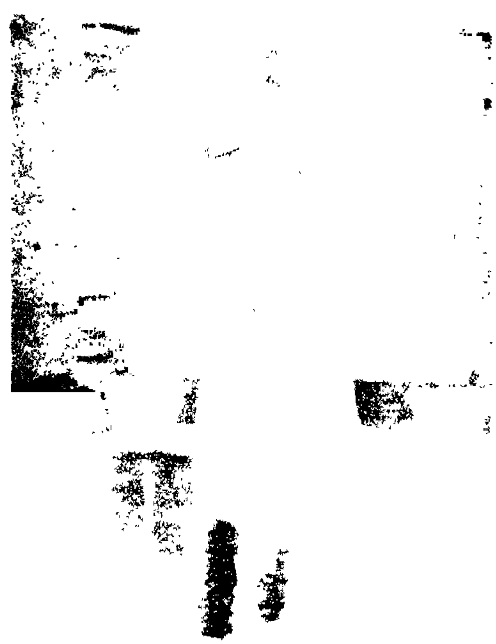
راجندر سنگھ بیدی

۱۹۱۵ء - ۱۹۸۴ء



سید احتشام حسین

۱۹۱۲ء - ۱۹۷۲ء



مجنوں گورکھپوری

۱۹۰۴ء - ۱۹۸۸ء



شوکت تھانوی

۱۹۰۴ء - ۱۹۶۳ء



سعادت حسن منٹو

۱۹۱۲ء - ۱۹۵۵ء

میں ہی ہوا تھا، بنیادی طور پر وہ سرکاری خبر نامہ تھا جس میں سرکاری خبریں، اطلاعات و اشتہارات وغیرہ شائع ہوتے تھے لیکن ہر سال اس کے دو خاص نمبر یعنی ۱۵ر اگست یوم آزادی نمبر اور گاندھی جینتی نمبر (اکتوبر) بھی نکلتے تھے۔ اس وقت ۱۹۴۹ء کے یہ دونوں نمبر میرے سامنے ہیں ۱۵ر اگست نمبر کی ضخامت ۱۳۶ صفحات ہے قیمت آٹھ آنے درج ہے اور گاندھی جینتی نمبر (اکتوبر) کی ضخامت ۸۸ صفحات ہے اور آٹھ آنے قیمت درج ہے۔ ان دونوں خاص نمبروں میں جن اہم ادبی شخصیات کی تخلیقات شائع ہوئی ہیں ان میں فراق گورکھپوری، پروفیسر محمد مجیب، حیات اللہ انصاری، سراج لکھنوی، علی عباس حسینی، شمیم کرہانی، عبادت بریلوی، وامق جونپوری، اعظم حسین اعظم، پروفیسر محمد سلطان، اسلم لکھنوی، غلام احمد فرقت، اوپیندر ناتھ اشک، نیاز فتحپوری، پروفیسر محمد عاقل، ساغر نظامی، صالحہ عابد حسین، آثم لکھنوی، ڈاکٹر عابد حسین، سید اعجاز حسین، کشن پرشاد کول، انتصار بیوتنوی، آنند نرائن ملا اور ڈاکٹر سید محمود وغیرہ شامل ہیں۔

۱۹۵۶ء میں جب نیا دور کے ایڈیٹر علی جواد زیدی اور جوائنٹ ایڈیٹر فرحت اللہ انصاری باقاعدہ طور پر مقرر ہوئے اور ان کے نام رسالہ میں شائع ہونے لگے تو اس کی سابقہ پالیسی، ضخامت اور ادبی معیار میں بتدریج اضافہ ہونے لگا۔ علی جواد زیدی اور فرحت اللہ انصاری دونوں ہی ادب پر گہری نظر رکھنے والے باصلاحیت ادیب اور ادبی حلقوں سے متعارف تھے۔ انھوں نے زیادہ از زیادہ مشاہیر ادب کی تخلیقات حاصل کرکے شامل اشاعت کیں اور رسالہ کی ترتیب و تزئین پر خاص توجہ مرکوز کی۔ اس طرح ادبی دنیا میں نیا دور کی مقبولیت میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ چندہ سالانہ ۳ روپیہ اور ایک شمارہ کی قیمت چار آنے برقرار رہی اور سائز میں بھی کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔

—— اپریل ۱۹۵۷ء کے شمارہ کے ایڈیٹوریل میں اعلان کے ساتھ اسی شمارہ میں ابتدا سے شائع ہونے والی تاریخ و سنہ عیسوی کے بجائے پہلی چیتر ۱۸۷۹ شک سمت (مطابق ۲۲ر مارچ ۱۹۵۷ء) سے شروع ہونے والی تاریخ درج کی جانے لگی۔ چند شماروں کے بعد شک سموت کے ساتھ ماہ و سال عیسوی پھر لکھا جانے لگا قیمت و سائز وغیرہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی

—— اگست ۱۹۵۰ء کے شمارے سے جو اسپیشل نمبر "۱۸۵۷ء" تھا، ایڈیٹر سرلا ساہنی اور جوائنٹ ایڈیٹر صباح الدین ہوئے۔

—— کارتک سموت ۱۸۷۹ شک (مطابق نومبر ۱۹۵۷ء) کے ... پبلشر و ایڈیٹر کی حیثیت سے بھگوتی سرن اور جوائنٹ ایڈیٹر صباح الدین عمر کے نام درج ہونے لگے۔

—— مارچ ۱۹۵۸ء کے شمارہ سے ماہنامہ نیا دور کا سائز تبدیل کیا گیا اور ابتک تقریباً اسی سائز پر شائع ہو رہا ہے۔ سائز کی تبدیلی، ضخامت میں اضافہ اور گٹ اپ میں معقول سدھار کے باوجود قیمت فی شمارہ ۲۵ پیسے ہی رہی اور ایڈیٹر و جوائنٹ ایڈیٹر بھی وہی رہے۔

—— جون ۱۹۵۹ء کے شمارے سے صرف صباح الدین عمر کا نام بحیثیت ایڈیٹر شائع ہونے لگا۔ انھوں نے عرصے تک اس عہدہ پر فائز رہ کر رسالہ کی ادبی حیثیت، مقبولیت اور وقار میں بہت اضافہ کیا، بڑے حوصلہ مند اور نوک پلک والے ایڈیٹر تھے۔

—— اگست ۱۹۶۹ء سے صباح الدین چیف ایڈیٹر اور سید خورشید احمد ایڈیٹر مقرر ہوئے۔

جنوری ۱۹۷۲ء تک صباح الدین عمر چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے قابل قدر خدمات انجام دے کر اتر پردیش اردو اکادمی کے سکریٹری ہو کر چلے گئے تو چیف ایڈیٹر کا عہدہ ختم کرکے رسالہ سے حذف کر دیا گیا، اور سید خورشید احمد ایڈیٹر بحال رہے۔

—— اپریل ۱۹۶۲ء سے رسالہ کی قیمت ۲۵ پیسے کے بجائے ۵۰ پیسے اور سالانہ چندہ تین روپے کے بجائے پانچ روپے کر دیا گیا تھا وہ بحال رہا۔

—— مئی ۱۹۷۴ء سے ایڈیٹر سید خورشید احمد کے نام و عہدہ کے ساتھ جوائنٹ ایڈیٹر امیر احمد صدیقی کا نام بھی شائع ہونے لگا۔

—— اگست ۱۹۶۸ء میں امیر احمد صدیقی نے ادارت کی ذمہ داری سنبھالی۔

اکتوبر ۱۹۷۹ء میں شاہ نواز قریشی جوائنٹ ایڈیٹر ہوئے۔
اپریل ۱۹۸۵ء سے رسالہ کی قیمت میں اضافہ کر کے فی شمارہ ایک روپیہ اور سالانہ چندہ دس روپے کر دیا گیا۔
جولائی، اگست ۱۹۸۹ء کے شمارہ سے صرف شاہ نواز قریشی کا نام ایکٹنگ ایڈیٹر کی حیثیت سے چھپتا رہا، اس کے بعد اکتوبر ۱۹۹۰ء میں وہ ایڈیٹر ہوئے اور جولائی ۱۹۹۱ء تک رہے۔
— اگست ۱۹۹۱ء سے موجودہ ایڈیٹر سید امجد حسین نے ادارت سنبھالی اور ان کے معاونین میں نجیب انصاری و محمد الیاس خاں کے نام شامل اشاعت ہونے لگے۔ اس تبدیلی سے رسالہ کے معیار، حسنِ کتابت وطباعت اور عوامی مقبولیت میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔
— نومبر ۱۹۹۱ء سے رسالہ کی قیمت میں اضافہ کر کے فی شمارہ ایک روپیہ کے بجائے تین روپے کر دیا گیا اور سالانہ چندہ دس روپے کے بجائے تیس روپے ہو گیا جسے رسالہ کی ضخامت وخوبصورتی کو دیکھتے ہوئے ہوش رُبا گرانی کے دور میں غیر مناسب نہیں کہا جا سکتا۔
— مارچ، اپریل ۱۹۹۳ء کے شمارہ سے ایڈیٹر سید امجد حسین اور سب ایڈیٹر نجیب انصاری، معاونین محمد الیاس خاں اور مبین احمد صدیقی کے نام شائع ہوتے رہے۔
— جون، جولائی، اگست ۱۹۹۳ء کے شماروں میں ایڈیٹر سید امجد حسین کے ساتھ جوائنٹ ایڈیٹر نجیب انصاری درج ہے۔
نومبر ۱۹۹۳ء سے ایڈیٹر سید امجد حسین اور معاونین میں محمد الیاس خاں و مبین احمد صدیقی کے نام شائع ہوئے۔
جنوری ۱۹۹۵ء سے جوائنٹ ایڈیٹر سید اسرار حسین کے نام کا اضافہ ہو گیا ہے۔
آغازِ اشاعت سے نیا دور اور "اطلاعات" کی کتابت طباعت گورنمنٹ پریس الہ آباد اور لکھنؤ میں ونڈ اکس طریقہ پر ہوتی تھی جس کی وجہ سے کتابت وطباعت کی غلطیوں، بے قاعدگیوں اور طباعت میں غیر معمولی تاخیر وغیرہ کی شکایات عام تھیں۔ شعبۂ ادارت اغلاط کے لئے بار بار معذرت شائع [illegible] تھا اور اکثر کئی کئی ماہ کے مشترک شمارے نکالنا پڑتے تھے۔ چند سال [illegible] قبل انتظامیہ نے عوامی شکایات کے ازالے اور روایات سے انحراف [illegible] تے ہوئے شعبۂ ادارت کو اجازت دیدی کہ نجی کاتبوں اور پریس سے بہتر کتابت، طباعت کرائیں۔ اس طرح دیدہ زیب کتابت اور خوبصورت رنگین آفسیٹ طباعت سے مزین کر کے رسالہ کے حسن، معیار [illegible] نہ کرنے کی کوششوں کا راستہ ہموار کر دیا ہے جس کے نتائج رفتہ رفتہ سامنے آ رہے ہیں اور ناظرین محسوس کر رہے ہیں۔
"نیا دور" کے موضوعات [illegible] وقتاً حذف و اضافہ ہوتا رہا ہے مثلاً بچوں کا گوشہ۔ آپ سے ملیے۔ دُنیا کا حال۔ تبصرہ کتب۔ ناظرین کے مکتوبات وغیرہ۔ لیکن اداریہ میں صوبائی حکومت کے کارناموں کے ذکر [illegible] عصری مسائل، اہم ادبی خبروں، مشاہیر ملک، شعرا و ادبا کی [illegible] ان کی خدمات اور مختصر تعارف وغیرہ پر خاص توجہ دینے کی [illegible] برقرار ہے۔
ادبی معیار کے اعتبار سے نیا دور [illegible] کثیر الاشاعت اور مقبول رسالہ ہے جس کے آنے [illegible] شماروں کا ادبی حلقوں میں بے چینی سے انتظار کیا جاتا ہے۔ کسی دوسری [illegible] کا سرکاری رسالہ شاید ہی نیا دور کا مقابل ٹھہرے۔ خصوصاً اس کے ضخیم، معیاری، ارزاں قیمت اور تاریخی دستاویزی [illegible] خاص نمبروں کی اس زمانے میں مثال ملنا دشوار ہی [illegible] ممکن ہے۔

مدیرانِ نیا دور۔ اجمالی تذکرے

علی جواد زیدی



زیدی صاحب کا وطن محمد آباد گوہنہ ضلع اعظم گڑھ [illegible] ہیں خوش حال زمیندار گھرانے میں ۱۰ مارچ ۱۹۱۶ء کو ولادت ہوئی [illegible] کا نام علی امجاد زیدی اور [illegible] تھا۔ خاندانی رواج کے مطابق ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد

کالون ہائی اسکول محمود آباد، گورنمنٹ جوبلی کالج لکھنؤ اور لکھنؤ یونیورسٹی میں اعلا تعلیمی مراحل طے کیے۔ ۱۹۳۹ء میں بی۔ اے اور ۱۹۴۲ء میں ایل ایل بی کی ڈگریاں لیں۔ جنگِ آزادی میں حصہ لیا اور مقید ہوئے۔

آزادی کے بعد صوبائی حکومت نے افسر اطلاعات و پبلی کیشن کی حیثیت سے محکمہ اطلاعات میں مقرر کیا۔ اس کے ماہنامہ نیا دور کے ایڈیٹر ہو گئے۔ جوائنٹ ایڈیٹر فرحت اللہ انصاری مرحوم تھے۔ ان تقرریوں سے نیا دور جو اس وقت تک سرکاری پالیسیوں، اعلانات شائع کرنے والا اطلاعاتی اور نیم ادبی رسالہ تھا، خالص ادبی رسالہ بننے کی سمت پیش رفت بھی کرنے لگا۔ مشاہیر ادب سے ان کی تخلیقات حاصل کرنے کی کوشش کی گئی اور بیشتر ادبی مضامین شاملِ اشاعت ہونے لگے۔ زیدی صاحب مرکزی حکومت سے وابستہ ہو کر کچھ دن دہلی و کشمیر میں تعینات رہے اور مشرق وسطیٰ و بیشتر مغربی ممالک میں حکومت ہند کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ کر ۱۹۷۸ء میں سبکدوش ہوئے۔

معروف شاعر، کثیر التصانیف ادیب و محقق ہیں۔ اتر پردیش اردو اکادمی کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔

آج کل بمبئی میں قیام پذیر ہیں۔

محمد فرحت اللہ انصاری فرنگی محلی



فرحت اللہ انصاری خانوادۂ علمائے فرنگی محل لکھنؤ کے فرد تھے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے گریجویشن کیا اور حکومت یوپی کے محکمۂ اطلاعات سے وابستہ ہو کر مدت تک محکمہ کے اردو جرائد 'اطلاعات' اور 'نیا دور' کی ترتیب میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ ۱۹۴۶ء میں نیا دور کے باقاعدہ جوائنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے اور چھٹی دہائی کے اواخر میں ایڈیٹر کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ ان کا دورِ ادارت بہت مختصر رہا۔

فرحت اللہ انصاری مرحوم ترقی پسند ادیب، کثیر المطالعہ اور باصلاحیت صحافی تھے۔

ان کے مفصل حالات دستیاب نہیں ہو سکے۔

صباح الدین عمر



ضلع لکھنؤ کے قصبہ نگرام (نگوہان) میں ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے، ایل ایل بی اور پھر عربی میں امتیازی حیثیت سے ایم اے کیا۔ صحافت سے زمانۂ طالب علمی سے ہی دلچسپی تھی۔ چنانچہ روزنامہ "ہمدم" اور "حرم" کے جوائنٹ ایڈیٹر رہے۔ تعلیم سے فراغت حاصل کر کے محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش میں ملازمت اختیار کی اور سرکاری جریدہ "اطلاعات" و "نیا دور" سے وابستہ رہے۔ دسمبر ۱۹۵۸ء میں نیا دور کے جوائنٹ ایڈیٹر ہوئے اور جون ۱۹۵۹ء میں ایڈیٹر کا عہدہ سنبھالا۔ اپریل ۱۹۶۹ء میں پھر ستمبر ۱۹۶۹ء سے جنوری ۱۹۷۲ء تک چیف ایڈیٹر رہے۔ ان کے زمانۂ ادارت میں نیا دور کے ادبی معیار میں مسلسل اضافہ ہوا اور کئی خاص نمبر نکلے جنھیں ادبی دنیا میں سراہا گیا۔ وہ مشہور رسالہ "نگار" کے نائب مدیر بھی رہے تھے اور اتر پردیش اردو اکادمی کے بانی سکریٹری بھی۔ اس کے بعد عرصہ تک اکادمی کے رکن رہے۔ ۲۲ر نومبر ۱۹۹۱ء کو قلبی دورہ پڑنے سے رائے بریلی میں انتقال ہوا۔

سید خورشید احمد



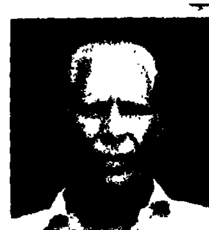
کرہان ضلع اعظم گڑھ کے معزز و تعلیم یافتہ گھرانے کے فرد سید محمد رضا کے صاحبزادے تھے۔ ۱۹۱۵ء میں کرہان میں ولادت ہوئی۔ ابتدائی گھریلو و مذہبی تعلیم مقامی طور پر حاصل کرنے کے بعد ہائی اسکول، ویسلی ہائی اسکول اعظم گڑھ سے کرنے کے بعد لکھنؤ کے جوبلی کالج سے انٹرمیڈیٹ پھر بی اے (آنرز)، ایم اے (اردو) اور ایل ایل بی کی اسناد حاصل کیں اور کچھ دن غازی پور میں وکالت کی۔ لیکن ماحول راس نہ آیا تو محکمہ غذا و رسد میں انسپکٹر کی حیثیت سے ملازمت کر لی۔ کچھ دن بعد استعفیٰ دے کر

روزنامہ قومی آواز لکھنؤ کے شعبۂ ادارت سے وابستہ ہو گئے۔ پھر ۱۹۴۸ء میں محکمۂ اطلاعات میں جرنلسٹ کی حیثیت سے داخل ہو گئے اچھے مترجم اور کثیر المطالعہ تھے ترقی کر کے ۱۹۶۹ء میں ماہنامہ "نیادور" کے ایڈیٹر کا عہدہ سنبھالا اور جولائی ۱۹۷۰ء تک فرائض منصبی بحسن و خوبی انجام دے کر ایڈیٹر نیا دور اسسٹنٹ ڈائرکٹر اطلاعات کے عہدہ سے سبکدوش ہو گئے۔

خورشید صاحب کے زمانۂ ادارت میں تقریباً ایک درجن ضخیم و قیع خاص نمبر نکلے جن کی پذیرائی ہوئی۔ وہ دوران ملازمت ہی میں قلبی شکایات میں مبتلا تھے۔ ۲۱ر نومبر ۱۹۸۳ء کو قلبی دورہ پڑنے سے انتقال ہو گیا۔

مرحوم خورشید صاحب کو ان کی ادبی خدمات کے صلہ میں اسٹیٹ ایوارڈ ملا تھا اور ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اترپردیش اردو اکادمی کے رکن بھی نامزد ہوئے تھے۔

امیر احمد صدیقی



موضع اجریاؤں لکھنؤ کے ایک متوسط گھرانے میں ۲۰ر نومبر ۱۹۲۸ء کو آنکھ کھولی۔ والدہ کی نگرانی میں ابتدائی تعلیم مقامی طور پر حاصل کرنے کے بعد ۱۹۴۲ء میں نیشنل انٹر کالج لکھنؤ سے ہائی اسکول اور امیر الدولہ اسلامیہ انٹر کالج سے انٹرمیڈیٹ (۱۹۴۴ء) پھر ۱۹۴۶ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے بی۔ اے اور ۱۹۴۸ء میں ایم۔ اے (اردو) اور ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ذہین طلباء میں شمار ہوتے تھے۔ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں محکمہ اطلاعات میں داخل ہوئے۔ ۱۹۷۰ء میں ماہنامہ نیا دور سے پہلے معاون پھر جوائنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے وابستہ ہوئے۔ اس زمانے میں ایڈیٹر سید خورشید احمد تھے۔ ان کی وابستگی کے زمانے میں نیادور کے بعض اہم تاریخی و دستاویزی نمبر شائع ہوئے جن میں غالب نمبر احتشام حسین نمبر۔ جعفر علی خاں اثر نمبر۔ مسعود حسن رضوی ادیب نمبر۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نمبر شامل ہیں۔

۱۹۷۹ء میں خورشید احمد کے سبکدوش ہونے پر ایڈیٹر کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ اپنی ادارت میں انہوں نے منشی نول کشور نمبر۔ منشی دیا نرائن نگم نمبر، اطفال نمبر، فراق نمبر، اندرا گاندھی نمبر، یادِ رفتگاں نمبر اور عثمان عارف نمبر وغیرہ شائع کر کے اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا اور شہرت حاصل کی۔

شاہنواز قریشی



لکھنؤ میں ۱۲ر مارچ ۱۹۴۸ء کو ولادت ہوئی۔ مختلف علمی مراحل طے کرتے ہوئے لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے کی سند لی۔ ۱۹۷۷ء میں محکمۂ اطلاعات و رابطہ عامہ اترپردیش میں انفارمیشن آفیسر مامور ہوئے۔ صحافت سے شروع سے لگاؤ تھا۔ قبل ازیں ہفت روزہ جدید شاہراہ کے ایڈیٹر تھے۔ ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۹ء تک ماہنامہ نیا دور کے جوائنٹ ایڈیٹر، جولائی ۱۹۸۹ء سے ستمبر ۱۹۹۰ء تک ایکٹنگ ایڈیٹر اور اکتوبر ۱۹۹۰ء سے جولائی ۱۹۹۱ء تک ایڈیٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اس زمانے میں خصوصی نمبران فراق نمبر (دو حصے)، اندرا گاندھی نمبر، منشی نول کشور نمبر، دیا نرائن نگم نمبر، اطفال نمبر، بہادر شاہ ظفر نمبر اور یادِ رفتگاں نمبر وغیرہ نکلے جن کی ترتیب و تدوین میں انہوں نے خصوصی دلچسپی لی اور اہم کردار ادا کیا۔ ۱۹۹۳ء میں ترقی کر کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر اطلاعات ہوئے آجکل اُردو اکادمی کے سکریٹری ہیں۔

سید امجد حسین

ادبی ذوق رکھنے والے صاحب علم معزز سادات گھرانے میں یکم جنوری ۱۹۶۲ء کو الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی سے انٹرمیڈیٹ تک تعلیم یادگار حسینی انٹر کالج الہ آباد میں حاصل کرنے کے بعد الہ آباد یونیورسٹی سے



امتیازی حیثیت سے بی' اے اور ایم' اے کی اسنادلیں' پھر دہلی یونیورسٹی سے "غیر مسلم مرثیہ نگار" کے موضوع پر ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی نگرانی میں مقالہ لکھ کر ایم۔فل کیا۔ بی' اے سے ایم فل تک انھوں نے فرسٹ پوزیشن حاصل کی۔ دوران تعلیم دہلی کے رسالہ" سماچار" میں لکھتے رہے۔ پھر یو'پی پبلک سروس کمیشن سے منتخب ہوکر اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اُردو) محکمہ اطلاعات کا عہدہ سنبھالا اور اگست ۱۹۹۱ء میں دیگر فرائض منصبی کے ساتھ ایڈیٹر نیا دور ہوگئے۔ قلیل مدت میں اپنی ادبی صلاحیتوں اور صحافتی سرگرمیوں کی بنا پر نیا دور کی ادبی حیثیت، ترتیب و تزئین اور معیار میں اضافہ کرکے مقبولیت حاصل کی۔ اپنے چار سالہ دور ادارت میں نیا دور کا شیخ علی حزیں نمبر' صباح الدین عمر نمبر اور قومی یک جہتی نمبر" کے علاوہ دستاویزی حیثیت کا حامل اودھ نمبر (دو حصوں میں) نکال چکے ہیں جسکی ادبی حلقوں میں زبردست پذیرائی ہوئی اور اب "نصف صدی نمبر" کی ترتیب میں منہمک ہیں۔

مدیران نیا دور میں سید امجد حسین سب سے کم عمر مدیر ہیں جو اپنی بھرپور علمی و ادبی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے روشن مستقبل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

معاونینِ نیا دور- اجمالی تذکرے



نجیب انصاری

۵ر جنوری ۱۹۵۷ء کو کان پور میں پیدا ہوئے۔ اُردو' عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم کا آغاز مولانا ظہیر الحسن رشک جامعی (بلیاوی) کی سرپرستی میں ہوا۔ بڑے محنتی، ذہین اور ہونہار طالب علم رہے۔ ہائی اسکول سے لے کر ایم' اے تک امتیازی پوزیشن حاصل کی۔ ایم' اے میں یونیورسٹی میں فرسٹ کلاس رہے۔ اپنے استاد سید علی رضا حسینی صاحب کی تحریک پر انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں شرکت کرنا شروع کی' بعد میں انجمن کی کان پور یونٹ کے جوائنٹ سکریٹری بھی رہے' انجمن کی میٹنگوں کی رپورٹنگ بڑی باقاعدگی کے ساتھ اخباروں میں کرتے تھے۔ کچھ عرصہ روزنامہ "الجمعیۃ" دہلی سے وابستہ رہے۔ دہلی میں کئی دیگر اخباروں میں بھی کام کیا اور آکاش وانی میں بھی کچھ دن بحیثیت "ٹرانسلیٹر کم نیوز ریڈر" کام کیا۔ ۱۹۸۵ء میں یوپی سنی سنٹرل بورڈ آف وقفس میں بحیثیت انسپکٹر منتخب ہوگئے' لیکن وہاں کا ماحول اور کام مزاج کو راس نہ آیا۔

نجیب انصاری ۱۹۸۸ء سے محکمہ اطلاعات سے وابستہ ہوئے اور ابتدا ہی سے نیا دور کے ادارتی شعبہ سے منسلک کیے گئے۔ بعد میں پبلک سروس کمیشن اترپردیش سے مترجم اور سب ایڈیٹر دونوں عہدوں کے لیے الگ الگ منتخب ہوئے لیکن سب ایڈیٹر کے عہدہ پر کام کرنا پسند کیا۔ اس انتخاب کے چند ماہ بعد ہی پبلک سروس کمیشن اترپردیش سے انفارمیشن افسر کے عہدے کے لیے منتخب ہوئے اور چند ماہ تک ماہنامہ نیا دور کے جوائنٹ ایڈیٹر رہے۔

سید اسرار حسین



نوجوان ادیب و شاعر سید اسرار حسین (اسرار سید) شعر و ادب کا ستھرا ذوق رکھنے والے خاندان کے فرد سید ممتاز حسین (مرحوم) کے گھر ۲ر جولائی ۱۹۵۰ء کو الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیمی مدارج طے کرتے ہوئے الہ آباد یونیورسٹی سے ایم' اے (اُردو) کی سند لی۔

اسرار حسین کو ادبی ذوق والد سے ورثہ میں ملا تھا جو اعلیٰ سرکاری عہدہ پر فائز اور زبان و ادب کے شیدائی تھے۔ اسرار کی ادبی زندگی کا آغاز زمانۂ طالب علمی میں پروفیسر سید مجاور حسین رضوی کی رہنمائی میں صحافت سے شروع ہوا تھا۔ ۱۵ سال کی عمر میں محمود احمد ہنر مرحوم کے مشہور ڈائجسٹ "شاہکار" کے مدیر معاون ہوئے۔ اس کے بعد اپنا ڈائجسٹ "پھوار" نکالا جو کافی مقبول ہوا۔ لیکن والد کی ناوقت وفات نے ساری ادبی سرگرمیوں پر پانی پھیر دیا اور کنبہ کی ذمہ داری و کفالت نے انھیں معاشی تگ و دو میں لگ جانے پر مجبور کر دیا۔ محکمہ اطلاعات میں

انفارمیشن افیسر کی حیثیت سے ملازمت کرلی۔ ۱۹۹۱ء سے نیا دور کے شعبہ ادارت میں سرگرم رہے اور جنوری ۱۹۹۵ء سے باقاعدہ جوائنٹ ایڈیٹر ہیں۔

سید اسرار حسین (اسرار سید) کی شعری و نثری تخلیقات کم سنی سے ہی ملک کے ادبی جرائد میں بکثرت شائع ہو چکی ہیں اور اب بھی صلہ و ستائش کی فکر و تمنا سے بے نیاز ہو کر علمی، ادبی و تخلیقی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

خاص نمبر

دستاویزی حیثیت رکھنے والے خاص نمبر نیا دور کا ناقابلِ فراموش کارنامہ ہیں جو ادبی دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ مشاہیر ادب کی تخلیقات سے آراستہ کچھ خاص نمبر اہم ادبی شخصیات پر ہیں، کچھ تحقیقی، تاریخی، تہذیبی، ثقافتی اور سیاسی اہمیت کے حامل ہیں۔

خاص نمبر	سالِ اشاعت	صفحات	ایڈیٹر	قیمت
تعمیری ادب نمبر	جنوری ۱۹۵۷ء	۷۲	علی جواد زیدی	سہ آنے
جعفر علی خاں اثر نمبر	ستمبر ۱۹۶۷ء	۱۲۸	خورشید احمد	۵۰ پیسے
افسانہ نمبر	۱۹۶۸ء	۷۲	〃	
غالب نمبر	فروری، مارچ ۱۹۶۹ء	۲۰۰	〃	ایک روپیہ
احتشام حسین نمبر	مئی، جون ۱۹۷۳ء	۱۶۸	〃	〃
امیر خسرو نمبر	دسمبر ۱۹۷۴ء	۱۴۴	〃	
مسعود حسن رضوی ادیب نمبر	مارچ، اپریل ۱۹۷۷ء	۱۰۲	〃	ایک روپیہ
عبدالماجد دریابادی نمبر	اپریل، مئی ۱۹۷۸ء	۱۸۴	〃	〃
اطفال نمبر	نومبر، دسمبر ۱۹۷۹ء	۱۲۰	امیر احمد صدیقی	〃
منشی نول کشور نمبر	نومبر، دسمبر ۱۹۸۰ء	۲۳۲	〃	〃
بہادر شاہ ظفر نمبر	اکتوبر ۱۹۸۱ء	۷۲	〃	۵۰ پیسے
دیا نرائن نگم نمبر	جون، جولائی ۱۹۸۲ء	۱۲۸	〃	ایک روپیہ
فراق نمبر حصہ اول	مارچ تا مئی ۱۹۸۳ء	۲۵۲	〃	۱/۵۰ روپے
فراق نمبر حصہ دوم	مئی تا جولائی ۱۹۸۴ء	۲۲۸	امیر احمد صدیقی	۱/۵۰
اندرا گاندھی نمبر	جنوری تا مارچ ۱۹۸۵ء	۲۴۸	امیر احمد صدیقی	
عثمان عارف نمبر	مارچ، اپریل ۱۹۸۷ء	۱۹۸	〃	دو روپے
یادِ رفتگاں نمبر	اپریل تا ستمبر ۱۹۸۸ء	۲۴۴	〃	۵ روپے
قومی ہم آہنگی نمبر	اگست، ستمبر ۱۹۹۰ء	۱۰۸	شاہنواز قریشی	۲ روپے
ڈاکٹر امبیڈکر نمبر	مارچ، اپریل ۱۹۹۱ء	۵۲	〃	ایک روپیہ
شیخ علی حزیں نمبر	جنوری ۱۹۹۲ء	۴۸	سید امجد حسین	تین روپے
صباح الدین عمر نمبر	ستمبر ۱۹۹۲ء	۴۸	〃	〃
قومی یک جہتی نمبر	مارچ، اپریل ۱۹۹۳ء	۱۲۰	〃	۵ روپے
اودھ نمبر حصہ اول	فروری، مارچ ۱۹۹۴ء	۱۶۴	〃	۶ روپے
ضمیمہ اودھ نمبر	جون ۱۹۹۴ء	۴۸	〃	۳ روپے
اودھ نمبر حصہ دوم	اکتوبر، نومبر ۱۹۹۴ء	۲۰۰	〃	دس روپے

گوشے

نیا دور ابتدا سے ضخیم خاص نمبروں کے علاوہ بعض معروف شعرا و ادبا کے یادگاری گوشے بھی شائع کرتا رہا ہے۔

چند شماروں کے شائع شدہ گوشے پیش ہیں:

شاعر/ادیب	ماہ و سال گوشہ	صفحات	ایڈیٹر
ڈاکٹر ذاکر حسین	جون ۱۹۶۹ء (نذرِ ذاکر)	۱۵	صباح الدین عمر
سلام مچھلی شہری	جولائی ۱۹۷۵ء	۱۷	خورشید احمد
شمیم کرہانی	مارچ ۱۹۷۶ء		〃
نسیم انہونوی	جون ۱۹۸۹ء	۱۷	امیر احمد صدیقی
جمیل مہدی	جولائی، اگست ۱۹۸۹ء	۸	〃

نیا دور کے آزادی نمبر، جمہوریت نمبر اور گاندھی جینتی نمبر وغیرہ پابندی کے ساتھ اگست، جنوری اور اکتوبر میں شروع ہی سے شائع ہوتے رہے ہیں اور پسند کیے جاتے ہیں۔ □□

امیر احمد صدیقی
اندرا برج - فیض آباد روڈ۔ نشاط گنج
لکھنؤ



نیا دور
کچھ یادیں کچھ باتیں

نیا دور کا شمار اس وقت ملک کے مقتدر اور بلند معیاری جریدوں میں کیا جاتا ہے اس کی شہرت کی خوشبو ملک کی سرحدوں سے باہر نکل کر بیرون ممالک میں بھی اردو دوستوں، ادیبوں اور دانشوروں کے مشام جاں کو مہکا رہی ہے یہ موقر جریدہ تقریباً نصف صدی سے اردو زبان و ادب کی بیش بہا خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس عرصہ میں اس کے ایک سے ایک بڑھ کر ادبی، تاریخی اور ثقافتی خصوصی نمبر شائع ہوئے جو باذوق حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ اس کے مشتاقانِ دید برطانیہ، امریکہ، عرب ممالک اور بنگلادیش میں بھی قابل ذکر تعداد میں موجود ہیں۔ پاکستان میں تو نیا دور ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے اور یہ اپنی سطح پر بہترین سفارتی خدمات انجام دے رہا ہے۔ وہاں سے آنے والے نامور ادیب اور شاعر جب بھی لکھنؤ تشریف لاتے ہیں نیا دور کے دفتر میں ضرور حاضری دیتے ہیں اور خصوصی نمبروں کی فرمائش کرتے ہیں۔ مشفق خواجہ صاحب بھی ایک بار صباح الدین عمر صاحب کو ساتھ لے کر تشریف لائے تھے پاکستان کے معروف اہلِ قلم و دانش جیسے جمیل جالبی، انتظار حسین، رئیس امروہوی، سید سبط حسن، پروفیسر ممتاز حسین اور مختار زمن نے بھی اپنی گرانقدر نگارشات و تخلیقات اس جریدے کے لیے وقتاً فوقتاً مرحمت فرمائی ہیں۔

نیا دور کو یہ مرتبہ اور عظمت دلانے اور ادبی حلقوں میں اُسے مقبولِ خاص و عام بنانے میں اس کے سابق مدیران کی بے پناہ محنت، لگن اور ان کا خونِ جگر شامل ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے۔

آساں نہیں گل شگفتہ بننا   سینہ غنچے کا چاک ہوجاتا ہے

ان مدیران میں سب سے پہلا نام ملک کے ممتاز ادیب، نقّاد اور شاعر علی جواد زیدی صاحب کا ہے۔ انھیں کی تجویز پر وزیر اعلا بابو سمپورنا نند کے دورِ حکومت میں اس کا نام نیا دور رکھا گیا۔ شروع میں یہ اطلاعات کے نام سے شائع ہوتا تھا۔ علی جواد زیدی صاحب تقریباً ہر شمارے میں "آپ سے ملیے" کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا کرتے تھے۔ جن میں ملک کے مشاہیر ادب کے خاکے ہوتے تھے جن کو پڑھنے کے لئے نیا دور کے قارئین کو بہت اشتیاق رہتا تھا۔ زیدی صاحب بفضلہ تعالیٰ اب بھی اس کبرسنی میں اردو ادب کی خاموش خدمت انجام دے رہے ہیں اور موصوف نے اردو ادب میں اپنا ایک مقام بنالیا ہے۔ زیدی صاحب جب بخشی غلام محمد وزیر اعلا جموں کشمیر کے پرائیویٹ سکریٹری کی حیثیت سے کشمیر چلے گئے تب نیا دور کی ادارت کا پورا بار فرحت اللہ صاحب مرحوم کے سر پر آگیا۔ زیدی صاحب کے دورِ ادارت میں بھی وہ نیا دور سے منسلک تھے۔

زیدی صاحب کے بعد مس سرلا ساہنی نیا دور کی ایڈیٹر ہوئیں جو برائے نام تھیں کیونکہ نیا دور کا سارا کام فرحت اللہ صاحب کو انجام دینا پڑتا تھا فرحت اللہ صاحب کا نام بطور جوائنٹ ایڈیٹر شائع ہوتا تھا۔ فرحت اللہ صاحب ایک سلجھے ہوئے اردو صحافی اور ادیب تھے۔ اردو زبان و ادب پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ مجاز، سبط حسن اور جذبی کے ساتھیوں میں سے تھے۔ ان کا تعلق فرنگی محل کے ایک علمی خانوادے سے تھا لیکن وہ ذہنی طور پر ایک پکے کمیونسٹ تھے وہ نہایت ہی بذلہ سنج، حاضر جواب اور صاحبِ ذوق تھے جس محفل میں بیٹھ جاتے اپنی حاضر جوابی اور چٹکلوں سے اس کو زعفران زار بنادیتے تھے ریٹائرمنٹ سے چند ماہ قبل ہی کینسر جیسے موذی مرض نے ان کو آدبوچا اور اپنی دونوں بیگموں اور بچوں کو روتا بلکتا چھوڑ کر راہیٔ ملکِ عدم ہوگئے۔ ان کی دلچسپ باتیں اب بھی یاد آتی ہیں۔ دفتر میں ایک بار ہندی زبان کا ذکر چھڑ گیا ایک ہندی ادیب نے ازراہِ مذاق کہا کہ اردو والے نہ ہندی اچھی لکھ پاتے ہیں اور

نہ بول بھی سکتے ہیں۔ فرحت اللہ صاحب کہاں چوکنے والے تھے برجستہ جواب دیا "میاں وہ دن دور نہیں کہ جب مسلمان ہندی پڑھنے لکھنے پر آجائے گا تب وہ اتنی صلاحیت پیدا کر لے گا کہ وہ ایک دوسری رامائن جیسی آفاقی کتاب لکھ ڈالے گا"۔ یہ جواب سُن کر ہندی ادیب منہ تکتے رہ گئے۔ دفتر میں ایک دن ایک صاحب نے کسی بات پر ایک چپراسی کو ڈانٹ دیا جس کا تعلق کمایوں سے تھا۔ فرمانے لگے کہ جانتے ہیں آپ کس کو ڈانٹ رہے ہیں۔ یہ شاہی خاندان (ر) سے تعلق رکھتا ہے۔ اس وقت اتر پردیش کے وزیر اعلا پنڈت گووند بلبھ پنت جی تھے۔ مرحوم نے نیا دور کے ایک شمارے میں انجام سے بے خبر پروفیسر گوپی چند نارنگ کا ایک مضمون "واجد علی شاہ" پر شائع کر دیا جس میں ایک شعر واقعی بہت ہی قابلِ اعتراض تھا۔ شعر کو مضمون سے فوراً حذف کر دینا چاہئے تھا لیکن چونکہ مضمون ایک ہندو ادیب کا تھا اور جس کا شعر تھا وہ شاعر بھی واجد علی شاہ کے دَور سے تعلق رکھتا تھا اس لئے فرحت اللہ صاحب کی نظر چوک گئی۔ غالباً دفتر ہی کے ان کے رفقائے کار اور ہر وقت کے ہم نوالہ و ہم پیالہ دوستوں نے لیجِسلیٹو کونسل میں ایک جن سنگھی ممبر سے یہ سوال کرا دیا کہ ایک سرکاری پرچے میں ایسا قابلِ اعتراض شعر کیوں شائع کیا گیا جس سے ایک فرقے کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچ سکتی ہے۔ اعتراض بجا طور پر صحیح تھا۔ حافظ محمد ابراہیم صاحب اس وقت کونسل میں کانگرس کے لیڈر تھے انھوں نے معذرت کرتے ہوئے جواب دیا کہ ایڈیٹر کو فوراً ہٹا دیا جائے گا چنانچہ دوسرے ہی دن فرحت اللہ صاحب کی جگہ پر صباح الدین عمر صاحب کی تقرری کر دی گئی اور خورشید احمد صاحب بھی نیا دور سے منسلک ہو گئے۔

صباح الدین عمر صاحب بھی ایک مشّاق صحافی اور کہنہ مشق ادیب تھے اردو زبان و ادب کا بھی ان کا گہرا مطالعہ تھا۔ وہ میرے ایک بزرگ دوست اور مشفق ناصح تھے اور گوناگوں صفات کے حامل تھے۔ اگرچہ رائے بریلی کے رہنے والے تھے لیکن لکھنؤ آکر یہیں کی گنگا جمنی تہذیب میں رچ بس گئے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مرحوم نیا دور کی کتابت، طباعت اور اس کو نکھارنے اور سنوارنے میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ کتابت کے رموز و فن سے پوری طرح واقف تھے اس لئے رضی صاحب اور آغا صاحب جیسے شہر کے مشہور خطاط ان کی نکتہ چینیوں سے پناہ مانگتے تھے لیکن دل سے ان کا بہت ہی احترام کرتے تھے۔ عمر صاحب کو سیاست سے گہرا لگاؤ تھا۔ اسی لیے انھوں نے اپنے دورِ ادارت میں جتنے بھی نیا دور کے خصوصی نمبر شائع کئے وہ سب ملک کے عظیم سیاسی رہنماؤں کے انتقال پر ہی شائع کئے جن میں مہاتما گاندھی نمبر، پنڈت جواہر لال نہرو نمبر، لال بہادر شاستری نمبر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ تمام نمبر اپنی جامعیت کے لحاظ سے نہایت ہی وقیع، معیاری اور ریفرنس کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھیں کے زمانے میں شہنشاہ تغزل حضرت جگر مرادآبادی کا انتقال ہوا۔ اس وقت میں محکمہ سے شائع ہونے والے انگریزی ماہنامہ "اتر پردیش" کا جز وقتی ایڈیٹر تھا۔ میں نے اس کے تازہ شمارے میں جگر صاحب پر ایک نہایت ہی جامع مضمون شائع کیا تھا جس میں ان کی شاعری پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا تھا۔ آپ کو یہ جان کر نہایت تعجب ہوگا کہ اس کے لکھنے والے تھے استادِ محترم پروفیسر احتشام حسین مرحوم صاحب۔ جن کو انگریزی زبان و ادب پر بھی پورا عبور حاصل تھا۔ صباح الدین صاحب محکمہ اطلاعات سے ابھی سبکدوش بھی نہ ہوئے تھے کہ ان کو اتر پردیش اردو اکادمی کا سکریٹری نامزد کیا گیا۔ ملک میں سب سے پہلے اتر پردیش ہی میں اردو اکادمی کا قیام عمل میں لایا گیا تھا چنانچہ اردو اکادمی کا از سر نو ڈھانچہ تیار کرنے میں اس کو پروان چڑھانے اور اس کو ملک کا ایک مثالی ادارہ بنانے میں عمر صاحب نے بہت ہی اہم رول ادا کیا جہاں وہ اپنی انتظامی صلاحیت اور اعلا کارکردگی کی ایسی چھاپ چھوڑ گئے ہیں کہ اکادمی ان کی بیش بہا خدمات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ وہ ایک سخت گیر اور اصول پرست افسر تھے اس لئے دفتری امور اور ڈسپلن میں کسی جھول کو برداشت نہیں کر سکتے تھے دفتر کے جملہ فرائض وہ خود بھی نہایت انہماک اور تندہی سے انجام دیتے تھے۔ اپنے اصولوں سے سمجھوتا کرنا ان کو نہیں آتا تھا ایک دن سید حامد صاحب میرے کمرے میں تشریف لائے وہ اس وقت مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر تھے غالباً ۲۱ جنوری کی تاریخ تھی۔ موصوف اپنی ایک تازہ تصنیف (جس کا نام مجھے یاد نہیں) اکادمی میں جمع کرنا چاہتے تھے لیکن ان کے پاس اس کی صرف دو جلدیں تھیں جب کہ بیک وقت اکادمی کے ضابطے کے مطابق آٹھ جلدیں جمع ہونا چاہئے۔ میں اس وقت نیا دور کے ایڈیٹر کے فرائض انجام دے رہا تھا اور نیا دور کا "اندرا گاندھی نمبر" نکالنے میں مصروف تھا۔ اس نمبر میں سید حامد صاحب کا بھی ایک نہایت ہی جامع اور وقیع مضمون شامل ہے۔ میں نے عمر صاحب کو فون کیا اور ان کو صورتحال سے مطلع کیا۔ سبھی جانتے ہیں کہ عمر صاحب اکادمی کے ضوابط اور قوانین پر سختی سے عمل کرتے تھے۔ فرمایا کہ بیک وقت آٹھ جلدوں سے کم نہ

ہونا چاہئے۔ اور یہ ہماری اکادمی کا اصول ہے۔ انھوں نے اس کی بھی پروا نہ کی کہ سید حامد صاحب ہمارے کمرے میں تشریف فرما ہیں۔ بہت ہی منت سماجت کے بعد اتنی رعایت ضرور کی کہ بقیہ جلدیں تین دن کے اندر اکادمی میں جمع ہو جانا چاہئے۔ سید حامد صاحب کو غالباً معلوم نہیں تھا کہ کسی تصنیف کی بیک وقت آٹھ جلدیں جمع ہوتی ہیں کیونکہ وہ خود بھی ایک سخت گیر اور اصول پرست افسر رہ چکے ہیں۔

صباح الدین عمر صاحب ایک وضعدار، خلیق اور مخلص انسان تھے وہ متعدد ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کو زیور طبع سے آراستہ کرنے میں اپنا قیمتی وقت صَرف کرتے رہتے تھے چونکہ کتابت اور طباعت کے فن میں ان کو ملکہ حاصل تھا اور شہر کے اچھے کاتبوں سے بھی ان کے مراسم تھے اس لئے ہمارے بہت سے ادیب اور شاعر ان کی صلاحیتوں کا سہارا لیتے اور خوشی خوشی وہ ان کا کام انجام دیتے۔ اگرچہ دفتری فرائض کے سبب ان کو لکھنے پڑھنے کا وقت زیادہ نہیں مل پاتا تھا لیکن جو بھی لکھتے غائر مطالعہ اور بہت ہی تحقیق اور چھان پھٹک کے بعد ہی لکھتے لیکن افسوس تو اس کا ہے کہ خود موصوف نے موسیقی، ادبی، ثقافتی اور ادبی شخصیتوں پر درجنوں مضامین لکھے ہیں جو مختلف جرائد کے اوراق میں بکھرے پڑے ہیں لیکن ان کو یکجا کرنے اور ان کو زیور طبع سے آراستہ کرنے کی طرف کبھی توجہ نہیں کی۔

عمر صاحب ایک پکے نیشنلسٹ تھے۔ ذہنی اعتبار سے بہت ہی سیکولر تھے اور مذہبی عصبیت تو ان میں نام کو بھی نہیں تھی۔ اسی لئے حلقۂ احباب ان کا بہت وسیع تھا۔ وہ ایک اچھے اور مخلص دوست تھے اور دوستی کے فرض کو نبھانا بھی خوب جانتے تھے۔ چنانچہ ملک کے ممتاز ادیبوں شاعروں اور دانشوروں یہاں تک حکومت کے اعلا افسران سے بھی گہرے روابط تھے جو اکادمی سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی قائم رہے کیونکہ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ ملک کا کوئی بھی ممتاز ادیب یا شاعر لکھنؤ تشریف لاتا ان کے دولت کدہ واقع نعمت اللہ روڈ پر ضرور حاضری دیتا۔ اگرچہ انھوں نے عربی میں ایم اے کیا تھا مگر مذہبی اور دینی امور سے دور کا لگاؤ تھا۔ میں نے مرحوم کو صرف ایک بار دفتر سے قریب واقع مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھتے دیکھا ہے لیکن ایک مردِ مومن کی دیگر خوبیاں ان میں پائی جاتی تھیں۔ غالباً وہ اپنے استاد محترم اور یگانۂ روزگار سابق صدر شعبۂ عربی و ڈین فیکلٹی آف آرٹس ڈاکٹر وحید مرزا کے نقشِ قدم پر چل رہے تھے جو اپنی وضع داری اور اخلاق اور شرافت کے لئے لکھنؤ یونیورسٹی میں مقبول خاص و عام تھے کیونکہ جہاں تک مجھ کو معلوم ہے وہ صرف عیدین کی نماز پڑھنے کے لئے سال میں دو مرتبہ عیدگاہ جاتے تھے اپنی وفات سے دو سال قبل عمر صاحب کو اپنی بیگم کے ساتھ عمرہ کی سعادت بھی نصیب ہوگئی تھی۔ اب تو حج بیت اللہ شریف کی تمنا بھی دل میں انگڑائیاں لینے لگی تھی۔ لیکن حیف صد حیف کہ آناً فاناً اپنے مالک حقیقی سے جا ملے اور ہمارے شہر نگاراں کی ادبی سماجی اور تہذیبی محفلیں سونی کر گئے۔ ؎

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

صباح الدین عمر صاحب کے بعد خورشید احمد صاحب نے جن کو مرحوم لکھتے ہوئے اب بھی دل کانپ اٹھتا ہے نیا دور کی ادارت کی باگ ڈور سنبھالی کچھ عرصہ بعد میں بھی جوائنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے منسلک ہوگیا۔ خورشید صاحب بہت ہی نوک پلک کے انسان تھے۔ نیا دور کو خوب سے خوب تر بنانے میں انھوں نے بڑی جانفشانی اور جد و جہد کی۔ مرحوم سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے انھوں نے مجھ سے ہمیشہ ایک چھوٹے بھائی کی طرح سلوک کیا۔ انھوں نے اپنے دور ادارت میں نیا دور کے ایک سے ایک بڑھ کر معیاری اور دیدہ زیب خصوصی نمبر شائع کئے جن میں غالب نمبر، پروفیسر احتشام حسین نمبر، جعفر علی خاں اثر نمبر، پروفیسر مسعود حسن رضوی نمبر اور مولانا عبدالماجد دریابادی نمبر ادبی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ملازمت کے دوران ہی دفتر میں ہی ان پر قلبی دورہ پڑ چکا تھا جو رٹائرمنٹ کے دو ہی تین سال کے اندر جان لیوا ثابت ہوا۔ خدا مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

خورشید صاحب کے سبکدوش ہونے کے بعد اگست ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۹ء تک میں نے نیا دور کی ادارت کے فرائض انجام دئے اور شاہنواز قریشی صاحب جو اس وقت اتر پردیش اردو اکادمی کے سکریٹری ہیں جوائنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ میں نے خورشید صاحب ہی کے نقش قدم پر چلنے کی پوری کوشش کی اور میں اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب رہا نیا دور کے قارئین ہی بتا سکتے ہیں۔ میں نے اس عرصے میں نیا دور کے متعدد معیاری اور دیدہ زیب خصوصی نمبر شائع کئے جن میں منشی نول کشور نمبر، منشی دیا نرائن نگم نمبر، فراق نمبر (دو حصوں میں) اندرا گاندھی نمبر اور یادِ رفتگاں نمبر خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ کسی ادبی جریدے کا معیاری خصوصی نمبر نکالنے میں کتنی محنت، جانفشانی

اور جد وجہد کرنا پڑتی ہے اور کتنی دشواریاں اور دقتیں پیش آتی ہیں انھیں کچھ وہی حضرات سمجھ سکتے ہیں جو کبھی اس خارزار سے گذرے ہیں۔ جریدے کو پسندیدہ اور محبوب بنانے کے لئے ملک کے ممتاز ادیبوں دانشوروں اور شاعروں سے مسلسل رابطہ قائم رکھنا پڑتا ہے۔ بار بار ان کو یاد دہانی کے لئے خطوط لکھنا پڑتے ہیں تب کہیں ان کی گرانقدر نگارشات و تخلیقات موصول ہوتی ہیں بڑی جد وجہد کے بعد بفضلہ خدا ملک کے ممتاز ارباب علم و دانش سے میرے بھی رشتے استوار ہو گئے تھے۔ مجھے انتہائی خوشی ہے کہ نیا دور کے موجودہ جواں سال ایڈیٹر سید امجد حسین صاحب نے بھی موجودہ ادیبوں اور دانشوروں سے گہرے روابط قائم کر لئے ہیں جن کے تعاون ہی سے نیا دور کا اُردو نمبر (حصہ اوّل و حصہ دوم) جیسا معیاری اور دلکش نمبر منظر عام پر لا سکے ہیں جو ایک ادبی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ آزادی کے ۴۷ سال بعد اردو کا حلقہ کافی سکڑ گیا ہے اس عرصہ میں ہمارے درمیان سے ہمارے بیشتر معتدد اور جلیل القدر ادیب، دانشور اور باکمال شاعر ابدی نیند سو چکے ہیں۔ کافی لمبی فہرست ہے کس کس کا نام گنایا جائے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر احتشام حسین رضوی مولانا امتیاز علی عرشی، سید مسعود حسن رضوی ادیب، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، مولانا عبدالماجد دریابادی، قاضی عبدالودود، پروفیسر کلیم الدین احمد، آنند رام۔ ظ انصاری، فکر تونسوی، سید حرمت الاکرام، سید صباح الدین عبدالرحمٰن روش صدیقی، اعجاز صدیقی، نشور واحدی، نازش پرتابگڈھی، علی عباس حسینی سید اختر علی تلہری، سید حسن، حامد اللہ افسر، مرزا جعفر حسین جیسی قد آور اور عہد ساز ادبی شخصیتیں ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئیں جنھوں نے اپنے بیش بہا علمی و ادبی کارناموں سے علم و ادب کے خزانے کو مالا مال کیا ہے۔ ایسے منفرد، باکمال ادیبوں اور شاعروں کے اٹھ جانے سے اردو ادب اور شاعری کا ایک تابناک اور عظیم الشان دور ختم ہو گیا جن کی موت سے ادبی اور شعری دنیا میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جس کا پر ہونا ممکن ہی نظر نہیں آتا ہے۔

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں

اَب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

خورشید احمد کے زمانے تک نیا دور گورنمنٹ پریس عیش باغ ہی میں چھپتا تھا جو انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ سے بہت دور واقع ہے اس لئے اسکی کتابت اور طباعت میں بڑی دشواری ہوتی تھی۔

کچھ عرصہ تک نیا دور لکھنؤ کے مشہور پریس پرکاش پیکیجرس گولہ گنج میں چھپتا رہا۔ اب ایک عرصے سے یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس لاٹوش روڈ میں مستقل طور سے نہایت آب و تاب کے ساتھ آفسیٹ پر چھپ رہا ہے جس کی طباعت میں اس کے جواں سال مالک راجیو اروڑا ذاتی دلچسپی لیتے ہیں اور لکھنؤ کے مشہور خطاط حسن اختر صاحب اس کی کتابت اور تزئین کاری کرتے ہیں جس سے اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگ گئے ہیں۔

آج نیا دور ایک تناور درخت بن چکا ہے جو نہ صرف حکومت اتر پردیش کی اردو نوازی کا مظہر ہے بلکہ ارباب علم و ادب کی ذہنی تسکین کا ذریعہ بھی ہے۔

■■

نیا دور کے ادارت کار ـــ صفحہ ۸۷ کا بقیہ

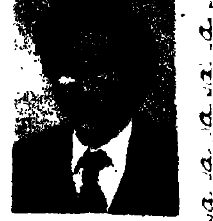
یکم جنوری ۱۹۶۲ء ہے اور مولد طیبہ پور ضلع الہ آباد ہے۔ اس جواں بخت و جواں سال ادیب و صحافی سے اردو کے مختلف اصناف کی تمنائیں وابستہ ہیں جہاں تک خیال ہے وہ سید علی جواد زیدی کے بعد نیا دور کے سب سے جواں سال مدیر ہیں اور انھیں زیدی صاحب کی طرح مختلف اصناف سخن پر توجہ دینی چاہئے۔ نیا دور سے ان کی دلچسپی کہیں کہیں ان کے قلمی سفر کے تنوع و رنگارنگی میں سد راہ نہ ہو۔ آخر میں میں انھیں فارسی کی وہ بیت سناتا ہوں جو پہلے مبتدیوں کو تختی پر مشق کے لئے یاد کرائی جاتی تھی۔

قلم گوید کہ من شاہ زمانم　　قلم کش را بدولت می رسانم

افسوس ہے کہ فرحت اللہ صاحب فرنگی محلی پر الگ سے کچھ لکھنے کا میں سرو سامان بہم نہیں پہنچا سکا بعض ارباب قلم سے رجوع بھی کیا مگر کچھ حاصل نہ ہو سکا میں اسے کھلے دل سے تسلیم کرتا ہوں کہ ہر چند فرحت اللہ انصاری صاحب باضابطہ مدیر کبھی نہ ہوئے جیسے ماضی قریب میں پنڈت آنند نرائن ملا کے قلم کی سیاہی کی ایک بوند دو دھان سمجھا میں ہنگامے کا سبب بن گئی تھی۔ اس طرح کوئی جملہ چھپ گیا تھا جس نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ اور فرحت اللہ صاحب کو صباح الدین صاحب کے لئے جگہ خالی کرنا پڑی۔ یہ تقدیری معاملے ہیں اور انھیں قسمت نویس ہی جانے فرحت اللہ صاحب کے بارے میں البتہ ڈاکٹر حاجی ولی الحق انصاری بھی بہت کچھ جانتے ہوں گے۔ ادارہ نیا دور کو ان سے فرمائش کر کے لکھوانا چاہئے۔

احمد ابراهیم علوی

ایڈیٹر "آگ" ۰۔۴۔ ہلیفہ اسکوائر
لکھنؤ



نیا دور: پچاس سال کا سفر

اُردو زبان کی تاریخ میں خوش حالی کا کوئی ایسا دور اب تک نہیں آیا جس میں مصنفین اور صحافیوں کو آسودگی میسر رہی ہو۔ اردو کے مصنفین نے ہمیشہ خون جگر سے زبان و ادب کی آبیاری کی ہے انھیں لکھنے پڑھنے، چھپنے اور قارئین تک اپنا پیغام پہونچانے کے لئے وہ وسائل کبھی حاصل نہیں رہے جو کہ دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے ادیبوں کو حاصل رہتے ہیں۔ اچھی اچھی کتابوں اور اخبارات و رسائل تک کو اتنی بڑی تعداد میں قارئین نہیں مل پاتے ہیں کہ کتب و اخبارات کی فروخت سے تمام ضرورتیں بحسن و خوبی پوری ہو سکیں۔ اس حقیقت کے پیش نظر لکھنؤ کے ماہنامہ "نیا دور" کی اشاعت کے پچاس سال پورے ہونے پر حیرت بھی ہوتی ہے اور مسرت بھی۔

اردو کے اخبارات اور رسائل کیوں نہیں مقبول ہو پاتے وہ کیوں نہیں دراز عمر پاتے، اس کے متعدد اسباب ہیں ان میں ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ زیادہ تر اخبارات اور رسائل وقتی ضرورتوں یا پھر کاروباری اغراض سے ان لوگوں کے ذریعے نکالے جاتے ہیں جن کا علم و ادب سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا ایک اقتباس بڑا مفید اور دلچسپ ہے:

"اردو اخباروں اور رسالوں کے موجودہ ذوق کو دیکھتے ہوئے یہ دعویٰ عجیب سا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری زبان، اس کے ادب، شاعری، تنقید اور اسالیب کی نشوونما اور فروغ میں سب سے زیادہ حصہ اخباروں اور رسالوں کا ہی ہے۔ اوّل تو کتابیں ہمارے یہاں لکھی ہی کم جاتی ہیں، شائع ہونے والی کتابوں کی تعداد اور بھی کم ہوتی ہے پھر ان کتابوں کے پڑھنے والے اور کم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے اسباب بہت سے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہر سال جتنے مضامین کتابوں میں اور اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتے ہیں ان کی اور ان کے پڑھنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے ان میں ہر طرح کے اخبار اور رسالے ہیں ایسے بھی جنھیں صرف کاغذی چیتھڑے کہا چاہیے اور جو ہمارے ایک دوست کے کتب خانوں اور ادبی اداروں میں محفوظ کرنا تو در کنار، اس قابل بھی نہیں ہوتے کہ کتب خانے کی زینت بن سکیں۔ ان میں بعض صرف مُردوں پر زندہ ہیں بعض پرانی قبروں کے مجاور ہیں بعض ناگفتہ اور ناگفتہ مردانہ اور زنانہ جنسی بیماریوں کے علاج اور قوت مردمی کی دواؤں کے اشتہارات کی برکت سے زندہ ہیں، ان اشتہاروں کو پڑھ کر بہتوں کا بھلا ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو ان کے شائع کرنے والوں کا بھلا ضرور ہوتا ہے۔ بعض رسالے ارباب سیاست، ارکان سیاست اور سیاسی جماعتوں کی سرپرستی سے زندہ ہیں انھیں سرکاری اشتہارات ملتے ہیں ان کے پرچوں کی ایک بڑی تعداد مفت تقسیم کی جاتی ہے اور ردّی میں بیچنے کے لئے خریدی جاتی ہے۔"

(ماہنامہ "نگار" نیاز نمبر، دوم ۱۹۶۲ء پاکستان مضمون "نیاز اور نگار")

اُردو میں اخبارات اور رسائل کے نکلنے اور بند ہونے کی روایت

بڑی پرانی ہے۔ اسی لیے جب کوئی اچھا اخبار یا رسالہ نکلتا ہے تو لوگ بجائے خوش ہونے کے غمگین ہوتے ہیں کہ یہ اپنے محدود وسائل کے سبب زیادہ نہ چل سکے گا۔ ہوتا بھی یہی ہے۔ 'تہذیب الاخلاق'، 'مخزن'، 'ریاست'، 'نگار'، 'ہمایوں'، 'ندیم'، 'زمانہ' اور 'آئینہ' جیسے ہر اعتبار سے معیاری اور قابل قدر اخبارات و رسائل بھی زیادہ زندگی نہ پا سکے۔

'تہذیب الاخلاق' وہ رسالہ تھا جس نے اردو زبان میں ہر طرح کے مضامین اور مباحث کی بنا ڈالی۔ سر سید احمد خاں نے اس رسالے کے ذریعہ اُردو زبان کو وسعت خیال و اظہار عطا کی اور آج جو ہر ہر موضوع پر ہم طرح طرح کے رسائل اور مضامین اُردو میں پڑھتے ہیں وہ اسی کے رہین منّت ہیں۔

'مخزن' شیخ عبدالقادر کا وہ معیاری رسالہ تھا جس کے ذریعے انھوں نے نہ صرف جلیل القدر شخصیتوں کے خیال و افکار کو شائع کیا بلکہ شخصیتوں کو بنایا، نکھارا اور بام عروج پر پہونچایا۔ 'ہمایوں' معیاری ادب پیش کرنے والے رسائل کا سرخیل کارواں رہا ہے۔ 'ریاست' کو پابندیِ وقت سے نکالنے اور معیاری و معتبر بنائے رکھنے کے لیے کہنا چاہیے سردار دیوان سنگھ مفتون نے اپنی 'ریاست' ہی ختم کر دی۔

'نگار' اپنی علمی، ادبی وجوہس کے باوجود نیاز فتحپوری کو ترکِ وطن سے باز نہ رکھ سکا۔ 'زمانہ' کو منشی دیا نرائن نگم اپنی تمامتر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے عہد کے تمام قابل قدر ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کی خدمات حاصل کرنے کے باوجود لمبی عمر نہ دلا سکے۔ 'آئینہ' کو ماہنامہ 'شمع' کے مالکان کی تمام صلاحیتیں، وسائل اور تجربے بھی زندہ رہنے کی صلاحیت نہ عطا کر سکے۔ علی گڑھ سے پندرہ روزہ 'خبر و نظر' کو انگریزی صحافت کے معیار کے مطابق نکالا گیا۔ اس کو ایک بڑے گھرانے کی سرپرستی حاصل ہوئی اور اس رسالے نے جرائم نمبر، کینسر نمبر، دیوبند نمبر، کرکٹ نمبر اور الکشن نمبر جیسے خاص نمبر شائع کیے اور بڑا نام پیدا کیا۔ پھر بھی یہ تین سال سے زیادہ کی زندگی حاصل نہ کر سکا۔

گیا (بہار) سے نکلنے والا 'ندیم' بہار کا بڑا ہی معیاری رسالہ تھا۔ اس میں جلیل القدر ادیب اور شاعر نمودار ہوتے تھے، بڑی اہم بحثیں اس کے صفحات میں بکھری پڑی ہیں۔ لیکن یہ بھی طویل عمر نہ پا سکا۔ حیدر آباد دکن میں سلیمان اریب کی ادارت میں نکلنے والے 'صبا' نے بھی بڑا وقار حاصل کیا اور اس میں شائع ہو جانا بڑے بڑے ادیبوں کا کمال فن سمجھا جاتا تھا لیکن اس کے سبب سلیمان اریب کی تنگ دستی بڑھتی رہی اور بالآخر انھوں نے دم توڑ دیا۔ رسالہ بھی بند ہو گیا۔

بنگلور سے ماہنامہ 'نیا دور' محمود ایاز اور ممتاز شیریں کی ادارت میں بڑی آب و تاب سے نکلا اور ہند و پاک کے انتہائی معیاری رسائل میں شمار ہوا، لیکن جلد ہی دم توڑ گیا۔

لکھنؤ کا ماہنامہ 'نیا دور' اپنی زندگی کے پچاس سال بخیر و خوبی تمام کر کے مزید تب و تاب اور جاہ و جلال سے نکل رہا ہے تو اس پر خوشی سے زیادہ حیرت ہو رہی ہے۔ اگر ان لوگوں کی مساعی جمیلہ کو بنظر تحسین نہ دیکھا جائے تو صریحاً ناانصافی ہوگی جنھوں نے شروع ہی سے نیا دور کو حکومت وقت کا ڈھنڈورچی بنانے کے بجائے زیادہ سے زیادہ علمی و ادبی اور معلوماتی باوقار رسالہ بنانے کی کوشش کی تو اس سلسلے میں حکومت اترپردیش اور اس کے محکمۂ اطلاعات کو بھی داد دینا ضروری ہوگا جس نے کبھی نیا دور کے معاملات میں غیر ضروری مداخلت نہیں کی بلکہ اس کو بڑی خوشی سے ایک آزاد خیال معیاری ادبی رسالہ بنتے دیکھ کر اظہار مسرت ہی کیا۔ یہ بات اس لیے مزید قابل تعریف ہے کہ ہندستان کی ہر ریاست سے ایک سرکاری اردو اخبار یا رسالہ ضرور نکلتا ہے جیسے دہلی سے "دلی"، آندھرا پردیش سے "آندھرا پردیش" بہار سے 'بہار کی خبریں' مغربی بنگال سے 'مغربی بنگال'، کشمیر سے 'شیرازہ' پنجاب سے 'پاسباں' وغیرہ لیکن ان میں کسی کی وہ ادبی حیثیت نہیں جو حکومت اترپردیش کے اُردو ماہنامہ نیا دور کی ہے جب کہ سب کو کم و بیش وہی سہولیات حاصل ہیں جو کہ نیا دور کو حاصل ہیں۔

قابل ذکر امر یہ بھی ہے کہ نیا دور اپنے موجودہ نام اور ہیئت کے ساتھ پچاس سال پورے کر چکا ہے جبکہ یہ اس سے پہلے 'اترپردیش'، 'اطلاعات' اور 'ہماری آواز' کے نام سے بھی نکلتا رہا ہے۔

آزادیِ وطن سے پہلے جب برطانوی حکومت تھی اور اترپردیش صوبۂ متحدہ ہوا کرتا تھا تب اس کا سیاسی دارالسلطنت الہ آباد تھا اس وقت انگریزی حکومت نے اپنے کارناموں کی تشہیر و اشاعت کے لئے اور جنگ کے لیے زیادہ سے زیادہ ہندستانی جوانوں کی خدمات حاصل کرنے کے لئے "ہماری آواز" کے نام سے اردو ہفتہ وار نکالا تھا جو کہ منسٹری آف وار کا ترجمان تھا۔ یہ غالباً ۱۹۴۲ء میں نکلنا شروع ہوا تھا، یہ آج کے عام رسالوں کے سائز کا ہوتا تھا۔ اس کا سرورق آرٹ پیپر پر ہوتا تھا اور اس پر ہندستان کا نقشہ بنا ہوتا تھا، بالکل درمیان میں ساڑی میں ملبوس ایک عورت بگل بجاتی ہوئی ہوتی تھی۔ ڈیزائن یہی رہتا تھا مگر رنگ بدلتا رہتا تھا۔ اس کے ایڈیٹر جناب بشیر احمد علوی ناظر کاکوروی تھے۔ پہلے نستعلیق کتابت ہوتی تھی پھر ٹائپ کمپوزنگ سے شائع ہونے لگا۔ اس میں دُنیا کے ان تمام ممالک کی خبریں اختصار سے دی جاتی تھیں جہاں جہاں اس وقت انگریزوں کی حکومت تھی۔ اس کے علاوہ جاپان کے خلاف بہت کچھ چھپتا تھا۔ عموماً ایک چوہا بنایا جاتا تھا اور نعرہ ہوتا تھا: "تیرا میرا دشمن جانی یہ چوہا جاپانی"۔ سرورق کے صفحات تصاویر سے مزین ہوتے تھے، اکثر آخری صفحے پر کتب و رسائل پر تبصرہ بھی ہوتا تھا ایسی نظمیں بھی شائع ہوتی تھیں جن کے ذریعے قارئین کو جنگ میں شامل ہونے کے لئے اکسایا جاتا تھا۔ یکم جنوری ۱۹۴۵ء کے اخبار میں صفحہ ۲ پر فراق گورکھپوری کی کتاب "اندازے" پر تبصرہ ہے جو ناظر کاکوروی نے کیا ہے۔ اس میں ایک جگہ لکھا ہے: "اُردو زبان کو فراق پر ناز کرنا چاہیئے۔"

آزادی کے بعد جب ملک میں اپنی حکومت قائم ہوئی اور اترپردیش کا وجود عمل میں آیا لکھنؤ پھر دارالسلطنت بنا، تب ریاستی حکومت کو اپنے کاموں سے عوام کو واقف رکھنے کے لئے کسی ذریعے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ محکمۂ اطلاعات حکومت کے کاموں سے عوام کو خبروں کے بلیٹن سے واقف کراتا رہتا تھا، اردو داں عوام کے دلچسپی کی خبریں ترجمہ کر کے اُردو اخباروں کو برائے اشاعت بھیجی جاتی تھیں پھر ان کو باقاعدہ یکجا کر کے چھپوا کر تقسیم کیا جانے لگا۔ اس کام کے لئے کئی افسر اطلاعات تھے انھیں میں اُردو داں جناب علی جواد زیدی تھے۔ جناب زیدی نے ازراہِ ذرہ نوازی مجھے خود بتایا کہ نیوز بلیٹن کو باقاعدہ رسالہ بنانے کا خیال انہیں کی تجویز تھی، انھوں نے اس بلیٹن کو دلچسپ اور قابلِ مطالعہ بنانے کے لئے اپنے دوستوں سے ان کی نظمیں غزلیں لے کر شائع کرنا شروع کر دیں۔ یہ کاوش پسند کی گئی تو انھوں نے مضامین کا بھی سلسلہ شروع کر دیا۔ اس طرح ایک نیوز بلیٹن ایک باقاعدہ رسالہ بن گیا۔ یہ عرصے تک "اطلاعات" کے نام سے نکلتا رہا۔ چونکہ اس نام کے رسالے میں اطلاعات کے علاوہ کچھ اور کی گنجائش نہ تھی اسلئے اس کا نام 'اترپردیش' رکھا گیا اور خبروں کے علاوہ 'کچھ اور' کی گنجائش نکالی گئی۔ اس زمانے میں بھی اس میں بعض بہت مفید اور اہم مضامین شائع ہوتے تھے۔

جناب علی جواد زیدی نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اسی اثنا میں بنگلور سے محمود ایاز کی ادارت میں نکلنے والا "نیا دور" بند ہو گیا تو انھوں نے حکومت اترپردیش اور خصوصاً وزیر اعلیٰ ڈاکٹر سمپورنانند کو یہ تجویز پیش کی کہ 'اطلاعات' کا نام 'نیا دور' کر دیا جائے تو اس کی اہمیت اور افادیت میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔ ڈاکٹر سمپورنانند نے یہ تجویز منظور کر لی اور تب ہی سے "نیا دور" باقاعدہ ادبی رسالہ بن کر نکلنے لگا۔ اس کے پہلے ایڈیٹر جناب علی جواد زیدی ہوئے۔ جب وہ ترقی کر کے دہلی چلے گئے تو جناب فرحت اللہ انصاری نے کچھ عرصہ تک یہ ذمہ داریاں سنبھالیں۔ ان کے بعد جناب صباح الدین عمر ایڈیٹر ہوئے۔ انھوں نے اس کو ایک ٹھوس ادبی رسالے کی حیثیت دی۔ ملک کے تمام ممتاز اور مقبول ادیبوں، شاعروں کا تعاون حاصل کیا۔ اس سے یہ رسالہ بڑا اہم ادبی مجلہ بن گیا اور اس میں شائع ہونا کسی بھی ادیب یا شاعر کے لیے باعثِ افتخار سمجھا جانے لگا۔ صباح الدین عمر صاحب نے معیار کو برقرار رکھنے کے لئے سخت اصولوں کو اپنایا اور اس سلسلے میں انھوں نے بڑے بڑے ادیبوں تک کو کوئی چھوٹ نہ دی۔ انھوں نے کتابت، طباعت، معیار، مواد سب پر ہمیشہ نظر رکھی۔

جناب صباح الدین عمر صاحب کے ترقی پا جانے پر جناب خورشید احمد نے نیا دور کی ادارت کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ ان کے بعد جناب امیر احمد صدیقی ایڈیٹر ہوئے۔ ان کے سبک دوش ہونے

کے بعد جناب شاہ نواز قریشی [redacted] ایڈیٹر ہوئے اور ان کے بعد جناب سید امجد حسین ایڈیٹر ہوئے جو گزشتہ چار سال سے یہ فرائض بحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں۔

افسوس کا مقام ہے کہ نیا [redacted] کے پچاس سال کے شمارے کہیں دستیاب نہیں ہیں اس لیے [redacted] سے بتانا مشکل ہے کہ کب "ہماری آواز" "اطلاعات" بنا اور پھر کب "اطلاعات" سے "اتر پردیش" ہوا اور کس ماہ اور کس سنہ سے موجودہ "نیا دور" نکلنا شروع ہوا۔ اس سلسلے میں جناب علی جواد زیدی یقیناً رہبری کر سکتے ہیں اور انھیں کرنا بھی چاہیے کیوں کہ یہ مفید [redacted] ہوگی۔

نیا دور کا وصف خا [redacted] یہ حکومت اتر پردیش کا ترجمان ہے اور محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ کی [redacted] میں نکلتا ہے لیکن یہ ہمیشہ سرکاری بندشوں سے آزاد رہا ہے [redacted] اور اس کو کبھی محض پروپیگنڈہ کے لئے ہی نہیں نکالا گیا بلکہ اس [redacted] ادبی ذوق رکھنے والوں کے لئے ہمیشہ وہ سب کچھ ہوا جو کچھ کہ وہ ایک [redacted] اور ادبی رسالے سے توقع رکھتے ہیں۔ نیا دور نہ صرف کتابت، طباعت اور گٹ اپ کے لحاظ سے بہترین رسالہ ہے بلکہ اس کا [redacted] بھی ہمیشہ بہت بلند رہا ہے اس میں ہمیشہ قابل قدر ادیبوں اور شاعروں کے رشحات قلم شریکِ اشاعت رہے ہیں۔ [redacted] کے معیاری خاص نمبروں کی اشاعت کا سلسلہ اس کا وقار اور [redacted] ہے۔

نیا دور کے پچاس [redacted] اردو زبان وادب کی رفتار اور افتاد کو سمجھنے میں [redacted] ثابت ہو سکتے ہیں اس میں شائع شدہ اف [redacted] تو کتنے ہی شاہکار افسانے سامنے آسکتے ہیں، اس کے مضا [redacted] مختلف عنوانات کے تحت تقسیم کر کے کتنی ہی مفید کتابیں [redacted] سکتی ہیں۔ اس میں چھپی غزلیں اور نظمیں اُردو شاعری پر [redacted] الزامات کی تردید کر سکتی ہیں۔

نیا دور کو یہ فخر حاصل ہے کہ [redacted] کو اُردو کے سبھی قابل قدر ممتاز ومقبول ادیبوں اور شاعروں کا [redacted] حاصل رہا ہے اسی لیے اس کا معیار اور وقار برقرار [redacted] ضرورت اس بات کی ہے کہ کسی یونیورسٹی کا شعبۂ اُردو اس [redacted] ہو اور کسی ایسے طالب علم کو جو تحقیق کا حقیقی ذوق رکھتا ہو اس [redacted] سپرد کیا جائے کہ وہ نیا دور کے پچاس سالہ کارناموں کا جا [redacted] اور یہ بتائے کہ مجموعی طور سے نیا دور میں کتنے افسانے شائع ہو [redacted] کتنے مضامین شائع ہوئے کتنی کتابوں پر تبصرے شائع ہوئے [redacted] شروع سے آخر تک کون کون سے ادیبوں کی تخالیق اس میں شامل رہی [redacted]۔

اُردو کے قارئین کو یہ بھی [redacted] ہیئے کہ جہاں اردو میں رسائل واخبارات آنکھ جھپکتے ہی دم توڑ [redacted] ایسے بھی ہوتے ہیں جو پچاس پچاس سال زندہ رہ کر بڑا [redacted] حاصل کرتے ہیں۔

□□

ہم عصر اردو صحافت

صفحہ ۸۱ کا بقیہ

یہ صحافت صرف ۱۹۴۷ء کے بعد [redacted] نہیں ہے بلکہ اس سے قبل کی سوا سو سال کی وراثت کی امین ہے۔ یہ [redacted] کے علم وشعور کی وہ شاخ ہے جس نے اس کے جدید ذہن کی تعمیر [redacted] حصہ ڈالا ہے اور آج جب ہم اپنی نئی علم یافتہ اور شعور یافتہ نسل کی بات کرتے [redacted] کے مستقبل کے منصوبے بناتے ہیں تو اس کے ایک اہم [redacted] معمار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اگر ہمارے اکابر نے اسے نظر انداز کرنے کی غلطی کی [redacted] مستقبل کے مؤرخ کو جواب دہ ہوں گے۔

مثنوی گلزارِ [redacted]

"مثنوی گلزارِ نسیم لکھ [redacted] گزری ایام کی شائستہ ترین مذاق کی ادبی یادگار ہے۔"

—— [redacted] سر عبدالقادر سروری

"اس مثنوی کا خاص جوہر [redacted] اختصار، پختگیِ کلام، تناسب لفظی، بندش کی چستی ہے [redacted] تو یہ ہے کہ نسیم نے تناسب لفظی کی صنعت کو [redacted] کمال تک پہونچا دیا۔ انھوں نے دنیا کو راستہ [redacted] کہ اس میدان میں یوں قدم اُٹھایا جائے تو بجا [redacted] کے خرام ناز کا لطف پیدا ہو سکتا ہے [redacted]"

—— پروفیسر اعجاز حسین

گلزار زتشی دہلوی
سی ۹۹۔ سیکٹر ۲۶۔ نوئیڈا (یوپی)
۲۰۱۳۰۱

اُردو کا قافلہ سالار! ناقابلِ فراموش ▫ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر صاحب (مرحوم) کی ہمہ صفت موصوف، ہمہ جہت شخصیت، متعدد و مختلف شعبہ ہائے حیات میں ان کی وابستگی سے ایک ہفت رنگ و ہشت پہلو شخص کا پیکر اُبھرتا ہے۔ آج سے پچاس سال پہلے جب وہ دلی آئے، اسی وقت سے ان کی محبوب شخصیت نے ہر بڑے چھوٹے، رئیس، استادِ فن، عالم، شاعر، اور شرفائے دلی کے دل میں گھر کرلیا۔ بہ ظاہر وہ ایک مجسٹریٹ کے عہدے پر سرفراز تھے مگر خاندانی ریاست، نجابت و شرافت اور گنگا جمنی مخلوط تہذیب اور مشترکہ تمدن کے پیکر ہونے کی وجہ سے وہ جملہ ہندو مسلمانوں اور سکھ عیسائیوں میں یکساں مقبول و معروف تھے۔

۱۹۴۲ء میں وہ زربفت، کمخواب، مخمل، پرنیاں اور بہترین لباس زیبِ تن کرتے تھے۔ ان کی اچکن کسی مغل شہزادے کے لباس سے کم نہ ہوتی تھی۔ چوڑی دار پاجامہ، اصلی سنہری تلے اور سچی زری کی پشاوری یا لاہوری جوتیاں پہنتے تھے۔ انگریزوں کا دور دورہ ابھی ختم نہ ہوا تھا۔ جہادِ آزادی کی تحریک بھی شباب پر تھی ۱۹۴۲ء کے انقلاب کا زمانہ، اور کنور صاحب اس دور میں بھی حسنِ انتظام اور حسنِ عمل سے ایک طرف اور اردو دوستی، ادب نوازی، بزرگ اساتذہ پرستی میں دوسری طرف اپنی مثال آپ تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے لئے بھی کوشاں رہتے اور نیشنل وار فرنٹ اور وار پبلسٹی کے ذریعہ مشاعرے اور خدمتِ ادب کی لگن بھی دن رات رہتی۔ روشن آرا کلب دلی اور جیمس فورڈ کلب دلی میں بھی ادب کا چراغ روشن کرتے اور بڑے سے بڑے رئیسِ شہر اور اعلیٰ ترین افسران سے بھی گھرے رہتے اور متوسط طبقے کے علاوہ غربا و مساکین، ادبا، شعرا، حکما سے بھی خود ان کے گھروں پر جا جا کر ملتے۔ استاد بیخود دہلوی سے خصوصی عقیدت اور لگاؤ تھا۔ علامہ پنڈت دتاتریہ کیفی دہلوی (والدِ بینا)، علامہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، ابوالمعظم نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی، خواجہ حسن نظامی دہلوی، پروفیسر خواجہ عبدالمجید خواجہ محمد شفیع دہلوی، مولانا راشد الخیری، حاجی حافظ رحمت الٰہی مشکف آغا شاعر قزلباش مرحوم کے صاحبزادگان جناب آغا آفتاب و آغا سرخوش دہلوی، آغا محمد یعقوب دواسش مُدیر آجکل، جناب فصیح الدین احمد سکریٹری دلی لٹریری سوسائٹی، بیرسٹر شبیہ الحسن بختیاری وغیرہم سے خصوصی تعلق تھا۔ جون ۱۹۴۲ء میں جن لوگوں سے ان کا مزید تعارف ہوا اور وہ عمر بھر کے لئے کنور صاحب کے گرویدہ ہوگئے ان میں دھرم پال وفا (مدیر تیج)، ڈگمبر پرشاد جین گوہر، منشی شیش چند سکسینہ طالب دہلوی، منشی چندی پرشاد نگم شیدا، مولانا ماہر القادری، بسمل شاہجہاں پوری، نخشب جارچوی، صابر دہلوی، فیض جھنجھانوی، عرش ملسیانی، ظریف دہلوی اور یہ نیازمند (گلزار دہلوی) شامل ہیں۔

تقسیم سے پہلے جگر مرادآبادی، پنڈت لبھورام جوش ملسیانی مجاز لکھنوی کو ہر مشاعرے میں باہر سے ضرور بلاتے۔ تقسیم اور آزادی کے بعد اس فہرست میں مزید اضافہ ہوا اور حضرت جوش ملیح آبادی کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ ان کے حلقہ بگوش ہوگئے اور ساری عمر دونوں میں بے پناہ تعلقِ خاطر رہا۔ پنڈت ہری چند اختر، جگن ناتھ آزاد، انور صابری، روش صدیقی، ناطق گلاؤٹھی، بسمل سعیدی ٹونکی اور ساحر ہوشیارپوری وغیرہ ان کے قریب ترین احباب میں شامل تھے۔

اُردو سے انھیں والہانہ عشق تھا۔ اُردو زبان اہلِ زبان کی طرح لکھتے اور بولتے تھے۔ بے تکلف، برجستہ، بامحاورہ، ٹکسالی زبان روزمرہ بولتے تھے۔ اس زبان سے عشق انھیں نواب افتخار علی خاں آف پٹودی کی دوستی سے گورنمنٹ کالج لاہور کے زمانے ہی میں پیدا ہو چکا تھا۔ جس پر دلّی آنے کے بعد جلا ہوئی۔ استاد بیخود دہلوی، فیض جھنجھانوی کے علاوہ مولانا جلال مرادآبادی سے فیضِ سخن پایا۔

ہم ایسے لوگ جو سیاسی، قومی اور انقلابی شاعری کی طرف زیادہ راغب تھے اور منظومات پڑھتے تھے، ہمیں بھی انھوں نے ۴۲ء ۴۳ء کے دور میں آزادی سے پہلے بھی فراموش نہیں کیا اور بعد کو تو یہ حالت تھی کہ ۱۹۴۴ء سے ۱۹۵۸ء تک بلکہ جب تک وہ دلّی سے ٹرانسفر ہو کر پنجاب واپس نہیں گئے، ان کا ہمارے بغیر اور ہمارا ان کے بغیر کوئی جلسہ، مشاعرہ، دعوت، ادبی محفل یا ہندو مسلم اتحاد کا اجتماع عرسِ محبوبِ الٰہی یا رام لیلا دسہرہ کا تہوار، بابا نانک جنم دن کے جلوس یا اسکاؤٹ اور والنٹیرز (سماجی رضاکار نوجوانوں کی جماعتیں) غرض یہ کہ کوئی محاذ ایسا نہ تھا جہاں کنور صاحب سرپرست یا مہمان یا میزبان و مددگار نہ رہے ہوں۔ ہندو کالج، کمرشل کالج، رام جس کالج، لا کالج دلّی یونیورسٹی اور اندرپرستھ کالج کے مشاعروں میں کنور صاحب ہمیشہ ہمارے شریکِ کار اور زینتِ محفل و رونقِ بزم رہے۔ ڈراموں کا افتتاح، محفلِ رقص و سرود، محفلِ موسیقی ہو یا کوئی اور تہذیبی و ثقافتی پروگرام، کنور صاحب ہر محفل کا اٹوٹ حصہ تھے۔

غریب نوازی، ادب نوازی، ادیب پروری۔ اُردو سے عشق شعر و شاعری اور شاعرے ان کا جزوِ ایمان تھا۔ ادبی حلقوں کے تو وہ مشکل کشا و حاجت رَوا تھے اس کے علاوہ سماج کے کمزور طبقے کے افراد کی بھی اتنی ہی پذیرائی اور خاطر مدارات کرتے تھے جتنی کسی بھی رئیس دوست، بڑے ادیب یا معززینِ شہر کی کرتے ہوں۔

صوفیوں کی محفل ہو تو سراپا فریدی، نظامی نظر آئیں گے۔ سیرت کا جلسہ ہو یا شہدائے کربلا اور مولا علیؑ کی نیاز کی محفل، رام لیلا کے جلوس ہوں یا تعزیوں کے جلوس — کنور صاحب ہر جگہ ناگزیر تھے، عوام کے لیے بھی، خواص کے لئے بھی، حکام کے لیے بھی اور مجاہدینِ آزادی کے لئے بھی۔

مولانا احمد سعید، مولانا حفظ الرحمٰن، مفتی عتیق الرحمٰن یا حاجی محمد صابع سے بھی کنور صاحب کی عقیدت و تعلق ہمیشہ قلبی و روحانی رہا۔ لالہ شام ناتھ، شری گوپی ناتھ امن، نورالدین احمد بیرسٹر بھی ان کے گرویدہ اور قائل تھے۔

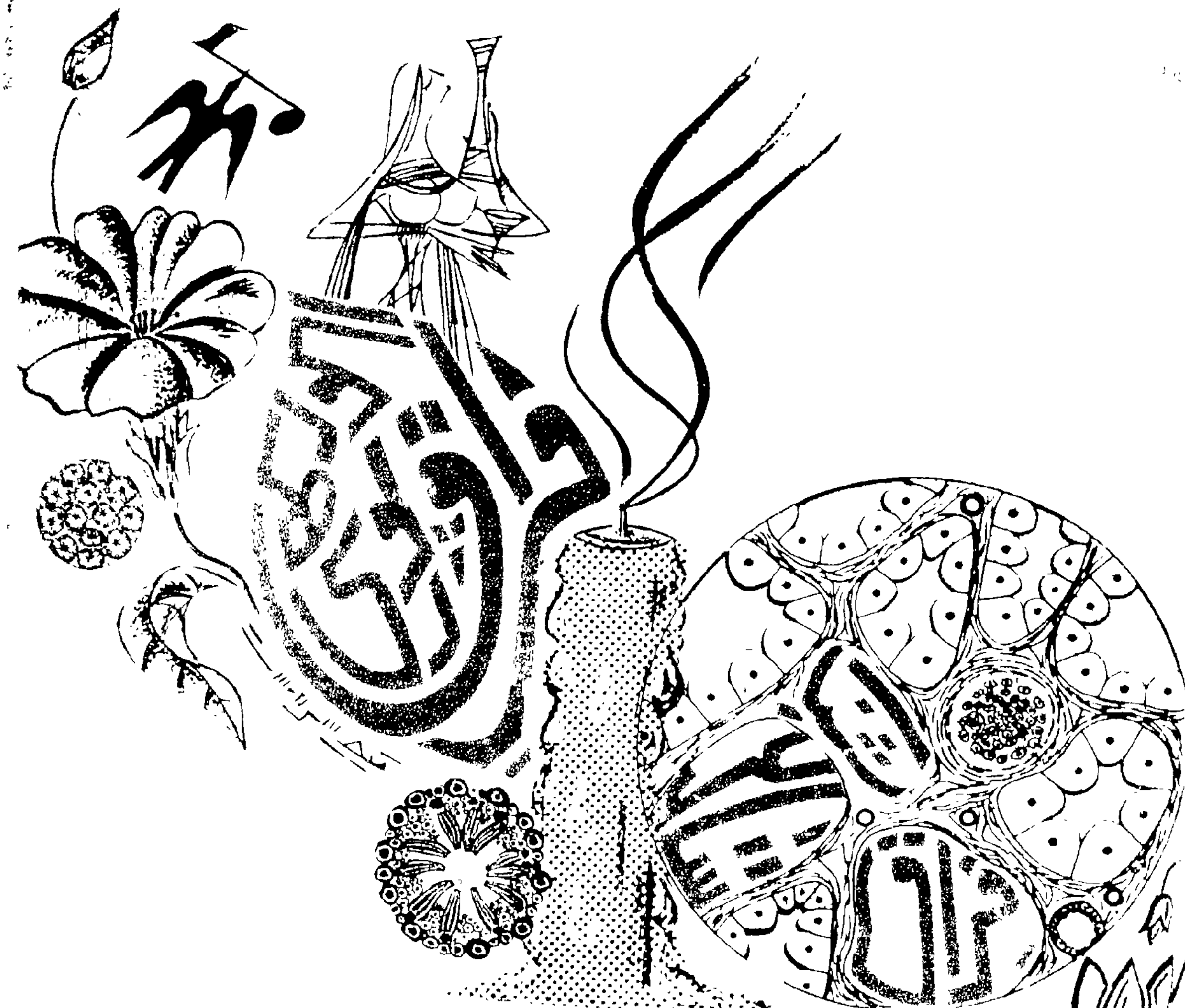
۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۸ء تک سیاسی مقدمہ خاص کر وہ جو کانگرس اور اسٹوڈنٹس کہلاتے دار کے نوجوان آزادی کے پروانوں کے جملہ مقدمے آپ ہی کے سپرد ہوتے تھے۔ ان میں سے اکثر وہ حضرات جو شاعر ہوں یا ادیب، ان کے ساتھ عجب عجب رعایتیں برتتے مثلاً اپنا کھانا کھلانا، صبح سے شام تک اپنی عدالت میں بٹھائے رکھتے، چائے ناشتہ کراتے۔ شعر سنتے اور سناتے اور شام کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر ان کے گھر دنا پر پہنچوا دیتے۔ مشکل سے چند ہی افراد مجاہدین کو کبھی سزا دی ہو، وہ بھی بہت معمولی۔ میں تو ان سے ہمیشہ جلسوں میں اور بڑے اجتماعات میں بھی اور ذاتی ملاقاتوں میں بھی کہتا تھا کہ اگر آپ کہیں مجھے آٹھ دن کی بھی سزا دے دیتے اور قید خانے بھجوا دیتے تو آج میں بھی ایک بڑا سیاسی لیڈر اور وزیر بن گیا ہوتا۔ خدا جانے آپ نے میری سرپرستی اور دوستی کا حق ادا کیا اور اپنی نوازش کرتے رہے یا دشمنی کہ مجھے دو چار دن کی بھی سزا نہ دی اور میرا کیریر بدل گیا یا ادھورا رہ گیا۔

کنور صاحب نے آزادی سے پہلے اپنی تنخواہ کبھی خود وصول نہ کی اور نہ اپنے لئے خرچ کی بلکہ وہ احباب کی خاطر داری، اپنے ڈرائیور اہلمد، ناظر، عدالتی عملہ اور گھریلو نوکروں کی فلاح پر ہی خرچ ہوتی تھی — البتہ تقسیم ملک اور آزادیِ وطن کے بعد ضرور انھوں نے تنخواہ قبول کی۔

بعض حضرات کو حیرت ہوگی کہ آزادی کے بعد مغربی پنجاب سے آنے والے مہاجرین (REFUGE) صاحبان کو ان کی زمین جائداد وغیرہ کو جو کاٹ پیٹ کر آدھے تہائی (Accepted claims) ملے، ان کے مطابق کنور صاحب کے گھرانے کا آٹھ کروڑ کا منظور شدہ کلیم تھا اور خود انھوں نے اپنے بھائیوں کے سامنے یہ بات ایک مرتبہ ذکر آنے پر مجھے بتائی تھی۔ وہ مجسٹریٹ رہے، سٹی مجسٹریٹ رہے

جواز

مارچ، اپریل، مئی ۱۹۸۳ء

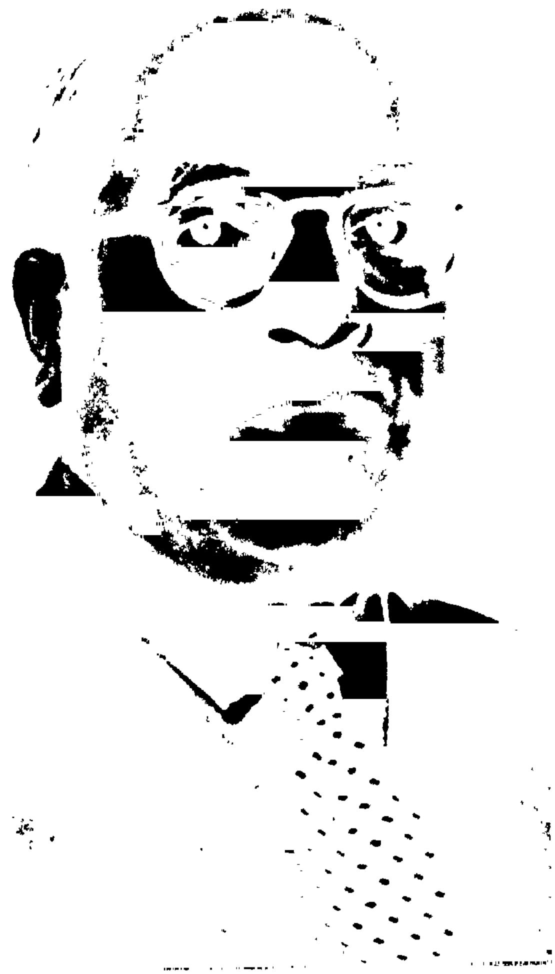


فراق حصہ اول

قیمت: ایک روپیہ پچاس پیسے

نیا دور

ایک شمارہ ڈاکٹر امید



مارچ، اپریل ۱۹۹۱ء

ایک روپیہ

پی سی، ایس اور آئی اے ایس نامزد ہوئے۔ ڈپٹی کمشنر اور کلکٹر نیز کمشنر رہے۔ سکریٹری ٹو گورنر پنجاب رہے۔

دلّی، گڑگاؤں، سنگرور، شملہ، دھرم شالہ غرض ہر جگہ انھوں نے اپنی چھاپ چھوڑی، اپنی شخصیت اور شاعری کو اپنوں ہی سے نہیں بیگانوں سے بھی منوایا۔ آزادی سے پہلے ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں کی شکل میں جس طرزِ تمدن کی بنیاد ان کے مزاج میں پڑ چکی تھی وہ تقسیم اور آزادی کے بعد خصوصاً ۱۹۵۵ء سے تا حال ہند پاک دوستی اور رواداری، افہام و تفہیم اور ہر کس و ناکس کے لئے محبت تقسیم کرنے میں گزری، اس کے لیے انھوں نے رئیس امروہوی کے ساتھ مل کر پاکستان میں پاک ہند پریم سبھا قائم کی اور یہاں ہند پاک پریم سبھا کی بنا ڈالی اور مجھے دہلی میں اس کا سکریٹری مقرر کیا اس جلسہ کی صدارت جناب عبدالستار سفیر پاکستان نے غالب اکادمی کی ایک تقریب میں فرماکر خود اس کا اعلان کر کے اخبارات کو اعلان ارسال فرمایا۔

میر مشتاق احمد صاحب کی صدارت میں جب جولائی ۱۹۴۶ء میں ہم نے ایک انجمن تعمیر اردو کی دلی میں بنیاد ڈالی تو اس کے وہ سرپرست بنے اور مرتے دم تک سرپرست رہے۔ علامہ کیفی، علامہ آزاد، حکیم عبدالحمید، مولانا حفظ الرحمٰن اس کے دیگر سرپرستوں میں تھے

اسمارٹ بیگز ایسوسی ایشن کے نام سے سوشل ورکرس، اسکاؤٹ اور والنٹیرز کی ایک یوتھ آرگنائزیشن میں نے ۱۹۴۰ء میں قائم کی تھی، ۱۹۴۳ء سے ۱۹۵۸ء تک اس کے سرپرست رہے اور نوجوان رضاکاروں کو سند سرٹیفکیٹ خود اپنے دستخطوں سے عطا کرتے رہے۔

جب ہم لوگوں نے ۱۹۸۵ء میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو میموریل کونسل بنائی تو اس کے بھی سرپرست رہے۔

عزت مآب جناب آر وینکٹ رمن جب نائب صدر جمہوریہ ہند تھے تو ہم لوگوں نے ۱۹۸۴ء میں ایک "آل پارٹی اردو مرکزی کونسل بنائی اور نائب صدر جمہوریہ کے دولت کدہ پر ایک جلسہ ہوا اس میں نائب صدر جمہوریہ نے اس کی سرپرستی قبول فرمائی۔ میں اس انجمن کا بھی سکریٹری ہوں۔ کنور صاحب اس کے سات آٹھ برس صدر رہے۔

۴۹۔ ۱۹۴۸ء میں بڑے زور شور سے ایک انجمن بنام "اردو سبھا" قائم کی گئی تھی۔ لالہ دیش بندھو گپتا (مالک تیج)، شری وی شنکرن (ذاتی معتمد سردار پٹیل) مولانا حفظ الرحمٰن اور کنور صاحب کے ایما پر یہ انجمن قائم ہوئی اور کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اس کے جنرل سکریٹری مقرر ہوئے۔ علامہ پنڈت دتاتریہ کیفی شروع میں اس کے صدر رہے۔ گوپی ناتھ امن صاحب، گوپال متل صاحب اور راقم الحروف (گلزار دہلوی) پہلے اس اردو سبھا کے جوائنٹ سکریٹری اور پھر یکے بعد دیگرے اس کے سکریٹری رہے۔

جس دور میں کنور صاحب ریٹائر ہونے کے بعد دوبارہ دہلی تشریف لاکر مستقل یہیں آباد ہوئے تو کئی برس تک مسلسل آپ دلی آٹو موبائلز کے شوروم آفس آصف علی روڈ نئی دہلی میں روزانہ باقاعدہ آکر بیٹھتے تھے اور دہلی و نئی دہلی کے ادبی حضرات سے نئے ادبا و شعرا اور نئے اداروں اور سماجی و تہذیبی و ادبی جماعتیں چلانے والوں سے ان کا پہلے کی طرح ربط رہا اور وہ ضرورت مندوں کی حاجت روائی کرتے رہے۔ تمام ہندستان کے کونے کونے سے مشاعرہ منعقد کروانے والے میزبان و منتظم یہاں ان کے پاس آتے اور کشمیر سے حیدر آباد اور بمبئی سے کلکتہ تک مشاعرے منعقد کرانے کا یہ ایک عظیم مرکز بن گیا تھا

شریمتی اندرا گاندھی، ڈاکٹر ذاکر حسین، جناب فخر الدین علی احمد اور گیانی ذیل سنگھ سے آپ کے ہمیشہ بڑے قریبی روابط رہے۔ اور ان رہنماؤں پر کنور صاحب کی نظمیں سب تاریخی ہیں۔

جناب رام پرکاش ساحر ہوشیارپوری ہمیشہ ان کے دست راست اور سب سے زیادہ قریب رہنے والے دوست بمصداق بھائی رہے ہیں دیگر احباب دلّی میں بسمل سعیدی صاحب کے بعد میں (گلزار)، عزیز وارثی، پنڈت رام کرشن مضطر اور اس کے بھی بعد امیر آغا قیصر حیدری، مخمور سعیدی، رفعت سروش اور مشیر جھنجھانوی ان کے پسندیدہ شاعر دوست تھے اور آخر تک رہے۔ گزشتہ دس پندرہ سال سے ساحر صاحب کے بعد کنور صاحب کے سب سے قریب ایک اور عقیدت مند دوست شری کے ایل ساقی نارنگ صاحب کا نام سرِ فہرست ہے۔

وہ اردو اکادمی دلی، اُردو اکادمی ہریانہ، لینگویج ڈپارٹمنٹ پنجاب، غالب انسٹی ٹیوٹ (ایوانِ غالب) دلی، غالب اکادمی دلی، آل پارٹی اُردو مرکزی کونسل، انجمن تعمیر اُردو کے ہمیشہ سرپرست و سربراہ رہے اور بے شمار ادبی انجمنوں کو سارے ملک میں فیض پہونچاتے رہے

آزادی کے بعد لال قلعہ میں پہلا چار روزہ جشن جمہوریت، فروری، مارچ ۱۹۵۰ء میں کنور صاحب ہی کی کوششوں سے منعقد ہوا جس کے وہ جنرل سکریٹری تھے اور ساحر صاحب، میں (گلزار)، بیگم پوڈی صاحبہ بیگم حمیدہ سلطان صاحبہ چار سکریٹری تھے، لالہ سر شنکر لال اس کی استقبالیہ کے صدر تھے اور انتظامیہ کے شری شنکر پرشاد چیف کمشنر صدر تھے۔

کنور صاحب ۱۹۵۵ء سے ۱۹۷۲ء تک پاکستان، لندن اور یورپ پانچ بار کلچرل ڈیلیگیشن لے گئے، جن میں سے تین میں میں بھی ان کے ساتھ شریک تھا۔ پاکستان کے وفد میں چیمسفورڈ کلب نئی دہلی کے سکریٹری جناب مہربان سنگھ دھوپیہ، شری رادھا کشن سوامی، شری ساحر ہوشیارپوری اور یہ نیازمند شامل ہے۔

ان کے اشعار میں شوخی، رندی، زبان و محاورہ، ہلکا ہلکا طنز و مزاح اور بھرپور تعشق و تغزل، نشاط و انبساط، کیف و سرور اور لطافت و حلاوت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ تصوف، فلسفہ اور سیاسی موضوعات پر بھی جب قلم اٹھایا تو حق ادا کر دیا۔

ایک طرف وہ کہتے ہیں ؎

روک دے گردشِ زمانہ کو   تیرے ہاتھوں میں جام ہے ساقی

تو دوسری طرف وہ یہ بھی کہتے ہیں ؎

حسن کو مطلقاً نہیں ہے ثبات
عشق آیا ہے پی کے آبِ حیات

آل انڈیا ریڈیو اور انفارمیشن براڈ کاسٹنگ مشاورتی کمیٹی کے بھی وہ ممبر رہے۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) کے بھی اقدامات میں ہمیشہ دست گیری کی، خصوصاً اُردو گھر کی تعمیر کے بعد تو گزشتہ دس بارہ سال میں انجمن اور ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کی ہمیشہ اعانت کرتے رہے۔

وہ اُردو کے سرپرستوں اور مربیّوں میں قافلہ سالار و امیر کارواں اور ادیبوں کی دست گیری کے معاملہ میں مشکل کشا اور اشرافت و رؤسا میں اُردو زبان و ادب اور تہذیب کے سفیر اور DOYEN رہے۔ وہ اپنی ذات سے اُردو کا اتنا بڑا ستون تھے کہ انھیں اُردو کی قطب مینار کہنا بجا ہوگا۔

ہندستان اور بیرونِ ہندستان جگہ جگہ "جشن بیدی سحر" منایا جا چکا ہے۔ ہم لوگوں نے دلی اور لکھنؤ میں ان کی سلور جوبلی، گولڈن جبلی، ڈائمنڈ جوبلی اور پلاٹینم جوبلی منائی ہے۔

بمبئی میں دلیپ کمار اور اوم پرکاش ان کے لیے کئی محفلیں سجا چکے ہیں اور موصوف حضرت کنور صاحب کی دعوت پر ہندستان کے متعدد مقامات پر اُردو کے جلسوں اور مشاعروں اور نوجوان شعراء کے امدادی جشن وغیرہ کی تقاریب میں شریک ہوتے رہتے ہیں۔

جناب ساگر سوری، ساحر ہوشیارپوری، کنور صاحب کے برادر عزیز راجندر سنگھ بیدی، کے ایل ساقی نارنگ اور اردو اکاڈمی دلی کے علاوہ ہمیں امید ہے کہ مرکزی حکومت (وزارتِ تعلیم و شعبۂ ثقافت) اور دہلی انتظامیہ ان کی یاد میں ضروری اقدامات کریں گے۔ اس سلسلے میں میری چند تجاویز پیش ہیں:

(۱) کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کا ادبی ٹرسٹ یا اکادمی کا قیام۔ (۲) کسی کالج، اسکول یا ہسپتال کو ان کے نام سے منسوب کرنا۔ (۳) کسی سڑک کو ان کے نام سے منسوب کرنا (۴) ان کی یاد میں ڈاک ٹکٹ کا اجراء (۵) ہند و پاک حسنِ رواداری اور ہندو مسلم اتحاد اور سیکولرزم کے لئے اور اردو زبان و ادب اور شعر و فن کی نشو و نما کے لئے انکی یاد میں ایک سالانہ قومی ایوارڈ کا قیام وغیرہ۔

آخر میں اپنے طول کلام کو اپنے ایک شعر پر ختم کرتا ہوں جو ان کی شخصیت کی یاد ہمیشہ تازہ رکھے گا ؎

مُدّت کے بعد ہوتے ہیں پیدا کہیں وہ لوگ
مٹتے نہیں ہیں دہر سے جن کے نشاں کبھی ۔ گلزار دہلوی

باقی رہے نام اللہ کا۔ سب خدا کے ہیں اور اسی کے پاس لوٹ جائیں گے۔

□□

صلاح الدین عثمان
۶/۳ بستہ کارپورم، گومتی نگر، لکھنؤ

صباح الدین عمر مرحوم

صباح الدین عمر صاحب کے بغیر رسالہ نیا دور کا ذکر ناتمام رہتا ہے انہوں نے نیا دور کو اس دور میں معیاری زبان دی کیونکہ اس دور میں زبان کی صحت کا التزام ختم ہو رہا تھا زبان اردو کو نوک و پلک سے درست رکھنے کی جد و جہد کی اور اس میں بہت حد تک کامیاب رہے۔ اردو ادبی صحافت کو ایک ایسا معیار دیا جس کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ نیا دور کو جو ادبی وقار صباح الدین عمر صاحب کی ادارت میں ملی وہ ان سے قبل نہ تھی۔ وہ ادبی اور صحافتی ذوق لے کر پیدا ہوئے تھے ان کا یہ ذوق خداداد تھا۔

صباح الدین عمر صاحب طالب علمی کے زمانہ ہی میں اچھے مضمون نویس اور کامیاب صحافی بن چکے تھے۔ اسی وقت رسالہ نگار اور اس کے شہرہ آفاق مدیر جناب نیاز فتحپوری سے ان کے قریبی تعلقات پیدا ہو چکے تھے۔ ان ہی خوبیوں کی بنا پر اخبار ہمدم کے مالک اور ایڈیٹر نواب عبداللہ خاں نے ان کو اپنے اخبار کا اسسٹنٹ اڈیٹر بنا لیا تھا حالانکہ اس وقت صباح الدین عمر صاحب صرف طالب علم ہی تھے۔ جب وہ ہمدم کے اسسٹنٹ اڈیٹر مقرر ہوئے تو ہمدم کا دور عروج نہیں رہ گیا تھا پھر بھی ہمدم یو۔پی (صوبہ جات متحدہ آگرہ و اودھ) کا سب سے اہم اردو روزنامہ سمجھا جاتا تھا۔ اس اخبار کی جو آن بان جناب جالب دہلوی کے زمانہ میں تھی وہ ختم ہو چکی تھی۔ مگر جہاں تک خبروں اور خبروں پر تبصروں کا تعلق ہے اس کا مقابلہ کسی بھی اردو اخبار سے کیا جا سکتا تھا۔ صباح الدین عمر صاحب کی ابتدائی دور کی اردو نگارشات رسالہ نگار کی اب بھی زینت ہیں مگر اس دور کے نگار کی کاپیاں اب ہندوستان میں نایاب ہیں۔ جس وقت وہ نیا دور کے اڈیٹر مقرر ہوئے اس وقت وہ زبان اردو کے ماہر اور اس کے مستند ادیب بن چکے تھے۔

عمر صاحب نے ابتدائی دور تعلیم میں حسب رواج انگریزی کے علاوہ (جس کا اس دور کے نظام تعلیم میں ایک خصوصی درجہ تھا) اردو اور فارسی پڑھی تھی۔ مگر یونیورسٹی پہونچتے پہونچتے وہ عربی ادب کے طالب علم بن گئے یونیورسٹی میں ان کو ڈاکٹر وحید مرزا جیسا صاحب علم عربی استاد ملا۔ اس لئے صباح الدین صاحب کی نظر عربی ادب کا بھی احاطہ کئے ہوئے تھی اور فارسی کا بھی۔

ان کے والد محترم نے ان کی تعلیم تو اس نظریہ سے کرائی تھی کہ وہ اعلیٰ سرکاری عہدوں کے مقابلہ کے امتحانوں میں شریک ہوں گے یا بڑے وکیل بنیں گے۔ مگر وہ لیلیٰ صحافت کے شیدا بن گئے ۱۹۳۷ء میں وہ پبلک سروس کمیشن کے ایک مقابلہ کے امتحان میں بیٹھے یہ امتحان تھا محکمہ اطلاعات کے لئے صحافی کے عہدے کا۔ امتحان میں کامیاب ہونے پر وہ انگریزی زبان میں شائع ہونے والے کتب و رسائل کے ذمہ دار (Incharge English Publications) بنائے گئے۔ مگر زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ان کو اردو زبان میں اشاعت کا بہت سا کام سونپ دیا گیا ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو یکایک سکریٹریٹ کے اس مختصر سے محکمہ پر جنگ کی پبلسیٹی کی ذمہ داریاں بھی آپڑیں جس کو اس محکمہ نے بہت خوبی سے انجام دیا۔

ہندوستان آزاد ہوا تو آزاد ہندستان کی صوبائی حکومت کو محسوس ہوا کہ اس کو عوام کی ہمدردیاں قائم رکھنے کے لئے نشر و اشاعت کے کام کو زیادہ وسعت دینا ہوگی۔ چنانچہ اس کام کے لئے ایک الگ ڈائرکٹریٹ آف انفارمیشن قائم ہوا۔ اس نظامت کے قائم ہونے کے بعد صباح الدین صاحب کو انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں پبلسیٹی کی ذمہ داریاں سونپ دی گئیں اور اس پر مزید یہ کہ ان کو انگریزی کے ماہوار رسالہ "اتر پردیش" کی ذمہ داریاں بھی سنبھالنے کا حکم دیا گیا اور انہوں نے یہ سب ذمہ داریاں بخوشی قبول کر لیں۔ کام کی کثرت نے ان کو کبھی پریشان نہ کیا۔ حکومت کی سطح پر یہ پالیسی اس لئے اختیار کی گئی تھی کہ اس وقت اردو کو نظر انداز کرنے کی پالیسی اختیار کی گئی تھی۔ رہ گئی انگریزی تو عوام میں پبلسٹی کے لئے اس کی زیادہ ضرورت نہیں سمجھی گئی تھی لیکن

حقیقت دوسری تھی کیونکہ اس وقت تعلیم یافتہ لوگوں میں اردو جاننے والوں کی اکثریت تھی۔ کام کا بار تو اتنا بڑھا دیا گیا مگر اس کا معاوضہ کچھ نہ تھا۔ یہ صباح الدین عمر صاحب ہی کا دم تھا کہ اس بار کو نہ ستائش تمنا نہ صلے کی پروا کیئے ہوئے سنبھال لیا۔ اور اپنے کام سے شغف کی ایک درخشندہ مثال پیش کی۔ کثرت کار کی اس ذمہ داری کو سن کر دوسرے پریشان ہو جاتے مگر صباح الدین عمر صاحب کو اس کا کوئی غم نہ تھا۔ وہ صبح دس بجے ڈائرکٹریٹ پہونچ جاتے اور رات تک کام میں لگے رہتے حالانکہ ان کے دوسرے ساتھی گھنٹوں پہلے دفتر چھوڑ چکے ہوتے۔ ان کا کام ہی ان کے لئے محنت کا معاوضہ تھا۔

اس زمانہ میں اردو کے مشہور ادیب علی جواد زیدی صاحب افیسر آن اسپیشل ڈیوٹی اردو مقرر ہوئے۔ وہ اردو کے تمام پبلسٹی کے ذمہ دار ہوتے کے علاوہ "نیا دور" کے اڈیٹر بھی تھے مگر رسالہ کی اشاعت کی ذمہ داری فرحت اللہ انصاری صاحب کے سپرد تھی علی جواد زیدی صاحب نے ہی سرکاری رسالہ "اطلاعات" کا نام تبدیل کر کے نیا دور نام تجویز کیا تھا اور اس کی منظوری حکومت اتر پردیش سے حاصل کی تھی۔ علی جواد زیدی تھوڑے ہی عرصہ بعد کشمیر میں ڈائرکٹر انفارمیشن ہو کر چلے گئے ان کے جانے کے بعد اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں پبلسٹی کی ذمہ داری مس سرلا سہائی کے سپرد کی گئی جنہوں نے چند دنوں پہلے ڈپٹی ڈائرکٹر انفارمیشن کا عہدہ سنبھالا تھا۔ اس سے قبل مس سہائی مرکزی حکومت کی وزارت اطلاعات میں کئی سال انفارمیشن افیسر کے عہدہ پر رہ چکی تھیں۔ اس کے چند دنوں بعد صباح الدین عمر صاحب کو نیا دور کا اڈیٹر مقرر کیا گیا۔ اب وہ دو رسالوں کے مدیر تھے۔ ایک انگریزی "اتر پردیش" اور دوسرا "نیا دور"۔ صباح الدین صاحب کی زیادہ دلچسپی نیا دور سے تھی اور انہوں نے اس رسالہ کو ایک ادبی اور معیاری پرچہ بنانے کی سعی بلیغ کی انگریزی کا رسالہ "اتر پردیش" کچھ عرصہ بعد بند کر دیا گیا تو انھیں "نیا دور" کو تمام خوبیوں سے مرصع کرنے کا پورا موقعہ مل گیا۔ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ نیا دور اردو کے اہم ادبی رسالوں میں شمار کیا جانے لگا۔ صباح الدین صاحب کے اردو ادیبوں اور شاعروں سے وسیع تعلقات تھے۔ انہوں نے ان سب کو نیا دور سے مضمون نگار کے طور پر وابستہ کر لیا۔ اچھے شاعروں اور ادیبوں کا مستقل تعاون حاصل کر لینا بھی ایک بڑی کامیابی تھی۔ ان سب حضرات کی کوششوں کے نتیجہ میں نیا دور کی اتنی اہمیت ہو گئی کہ سرکاری پرچہ ہونے کے باوجود جسکو لوگ عموماً تحفہ کے طور پر "فری" حاصل کرنا چاہتے تھے اردو داں حضرات کا ایک بڑا طبقہ نیا دور کا خریدار بن گیا۔

صباح الدین صاحب نے نیا دور کو ادبی معیار دیا۔ وہ زبان و بیان محاورہ اور قواعد عروض و قافیہ سے پوری طور پر واقف تھے اور رسالہ میں شائع ہونے والے ہر مضمون کی ہر سطر اور شعر کے ہر مصرعہ میں زبان اردو کے محاورہ کی پابندی چاہتے تھے۔ مشہور ادیبوں کی بھی زبان درست کرتے نہ ہچکچاتے تھے۔ عروض کی خامیاں خود درست کر دیتے اگرچہ اس کی وجہ سے دوستوں کی ناراضگی برداشت کرنا پڑی۔ الفاظ اور محاورہ کے بارے میں وہ بہت سخت تھے الفاظ کے استعمال میں بہت احتیاط برتتے تھے۔ الفاظ کے غلط استعمال پر ان کی گرفت فوراً ہوتی اور اس پر ناراضگی بہت شدید ہوتی تھی۔

ان کی کاوشیں صرف زبان کی درستگی تک محدود نہ تھیں۔ اردو کتابت کی تمام خوبیوں اور نکات کا بھی ان کو پوری طور پر علم تھا اور یہ ممکن نہ تھا کہ رسالہ کی اشاعت میں کتابت کی ادنیٰ سی بھی خامی رہ جائے۔ اخبار و رسالہ کے صفحات میں مضامین سجانے (lay out) میں تو وہ ماہر تھے۔ لکھنؤ کے اچھے کاتبوں کا کہنا ہے کہ ان کے بعد کتابت اور صفحات کے سجانے کا ہنر جاننے والا کوئی نہیں رہ گیا۔

کام سے شغف اور اردو زبان سے محبت نے ہی انکو یہ ہمت اور طاقت دیدی تھی کہ انہوں نے اتر پردیش اردو اکادمی کی سکریٹری شپ کی ذمہ داری اسوقت قبول کر لی جب نہ تو اکادمی کے پاس ایک پیسہ تھا نہ منشی نہ چپراسی۔ یہانتک کہ سکریٹری کے بیٹھنے تک کی کوئی جگہ نہ تھی۔ وہ اس زمانہ میں انفارمیشن کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر تھے مگر اردو اکادمی کے سکریٹری بننے کے بعد وہاں کا کمرہ اور میز کرسی دوسرے کی ہو گئی تھی۔ اس بے کسی کو دیکھ کر اکادمی کی صدر بیگم حامدہ حبیب اللہ نے اپنی کوٹھی کا ایک کمرہ چند دنوں کے لئے اکادمی کو دے دیا تھا۔ صباح الدین صاحب کے پاس مہینوں تک صرف وہی کمرہ رہا۔ مگر جب گورنمنٹ گرانٹ آئی اور عملہ کا تقرر ہوا تو صباح الدین صاحب نے ایک ایسا ادارہ قائم کیا جو ہندوستان میں ایک مثال بن گیا۔

"خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں"

□□

۲۷

پروفیسر سید محمد عقیل

محمود منزل - دریا آباد - الہ آباد

میرا الہ آباد : ادبی اور تہذیبی جھلکیاں

۱۹۴۷ء سے ۵۳-۱۹۵۲ء کی باتیں ہیں جب الہ آباد شہر کی ادبی اور تہذیبی زندگی اپنے عروج کو پہنچ رہی تھی۔ ایک طرف مشاعرے ہوتے جن میں فراق، احمد مجتبٰی، وامق، مسعود اختر جمال، معصوم رضا راہی، تیغ الہ آبادی، نوح ناروی مقامی شعرا میں ہوتے اور باہر سے جوش، مجاز، جذبی، آنند نرائن ملّا، مشاعروں میں شرکت کے لئے آجاتے۔ انھیں دنوں ساحر لدھیانوی بھی لاہور سے نکل کر ہندوستان چلے آئے اور پھر الہ آباد آکر اقامت پذیر ہو گئے۔ پہلے کچھ دنوں تک اعجاز صاحب کے یہاں قیام کیا پھر اپنی ایک عزیزہ کے یہاں محلہ گڑیا تالاب میں اُٹھ آئے اور مشن پریس کے اوپر کے ایک حصے میں قیام کیا۔ اعجاز صاحب کبھی کبھی تھرس ڈے کلب میں بھی ساحر کو لے آتے۔ ایک کتھئی رنگ کی شیروانی پہنے ہوئے چھریرے بدن کے ساحر، ہم طلبا کو بہت اچھے لگتے۔ ہم اس وقت تک ان کی اسی ایک نظم سے واقف تھے۔ وہی تاج محل' والی نظم۔ تھرس ڈے کلب ہی میں ساحر نے اپنی وہ غزل سنائی تھی جس کی ردیف کیا گزری۔ اُن کے یہ شعر ہم طلبا کی زبان پر ہر وقت رہا کرتے۔

زمیں نے خون اُگلا، آسماں نے آگ برسائی
جب انسانوں کے دن بدلے تو انسانوں پہ کیا گزری
مرا الحاد تو خیر ایک لعنت تھا سو اب بھی ہے
مگر اس عالمِ وحشت میں، ایمانوں پہ کیا گزری

خود ہی بتلاتے تھے کہ یہ غزل انھوں نے لاہور میں کہی تھی اور وہیں کے ایک مشاعرے میں پڑھی اور جب یہ شعر پڑھا۔

چلو، وہ کفر کے گھر سے سلامت آگئے لیکن
خدا کی مملکت میں سوختہ جانوں پہ کیا گزری

تو لوگ کافی خفا ہوئے۔ حکومت کی نگاہیں بھی بدلیں اور پھر ساحر ہندوستان چلے آئے۔ کچھ لوگوں نے یہ بھی کہا کہ وہ صرف امرتا پریتم کی وجہ سے ہندوستان واپس ہوئے۔ معلوم نہیں کہ سچ بات کیا ہے۔ مسعود اختر جمال بھی بنارس سے آکر الہ آباد محلہ اکبر پور میں رہنے لگے۔ ترقی پسندوں کی ادبی نشستوں میں وہ برابر شریک ہوئے۔ چھوٹے موٹے مقامی مشاعروں میں بھی شرکت کرتے۔ انکی ایک غزل اس زمانے میں بہت مشہور ہوئی تھی۔ جس کا مطلع تھا۔

مئے دوشینہ کا یہ جام کسے نذر کروں
ناشنیدہ سا یہ پیغام کسے نذر کروں

مسعود اختر جمال ایک خاص لہجے میں اپنا کلام پیش کرتے۔ ہم طلبا بھی اکثر ان کے لہجے کی نقل اتارتے۔ اسی زمانے میں وامق صاحب کا تبادلہ غالباً بنارس سے الہ آباد کا ہوا۔ وہ راشننگ کے دفتر میں غالباً اسسٹنٹ ٹاؤن راشننگ افسر تھے۔ اور اعجاز صاحب کے بنگلے کے ایک حصّے میں رہنے لگے۔ اعجاز صاحب کے یہاں اکثر ادبی نشستیں ہوا کرتیں۔ کوئی ادیب یا شاعر کہیں سے آیا اعجاز صاحب کے یہاں اس کا پہنچنا لازمی تھا۔ مجاز کو بھی میں نے سب سے پہلے اعجاز صاحب کے نشیمن ہی میں دیکھا تھا اور انھیں کے منھ سے وہ نظم وہیں سنی تھی جو انھوں نے گاندھی جی کے مرنے پر کہی تھی جس کا یہ شعر بہت مشہور ہوا۔

ہندو چلا گیا نہ مسلماں چلا گیا
انساں کی جستجو میں اک انساں چلا گیا

وامق صاحب کو اپنی آواز پر بڑا ناز تھا۔ اپنی غزلیں وہ بڑے اہتمام سے پیش کرتے تھے لحن سے پڑھتے پہلے لحن سیدھا ہوتا پھر درمیان میں آواز موٹی کر دیتے اور الفاظ کی ادائیگی میں گمبھیرتا بڑھاتے جاتے۔ یہ معلوم ہوتا کہ کوئی بڑی اہم بات کہہ رہے ہیں۔ مجھے اُن کی ایک بات کبھی نہیں بھولتی۔ انھیں دنوں وامق صاحب نے ایک غزل کہی تھی مطلع تھا۔

سُرخ دامن میں شفق کے کوئی تارا تو نہیں
مجھ کو مستقبلِ زریں نے پکارا تو نہیں

ایک دن اعجاز صاحب کے گھر گیا تو وامق صاحب بیٹھے تھے۔ وامق صاحب نے اعجاز صاحب کو مخاطب کر کے کہا حضور آج نئی غزل ہوئی ہے۔ ابھی ریڈیو پر ریکارڈ کرا کے آ رہا ہوں۔ چاہتا ہوں آپ کو سناؤں اور یہ کہہ کر انھوں نے غزل شروع کی۔ ایک دو شعر پڑھے ہوں گے کہ رک گئے۔ پھر اُٹھ کر کمرے کے دروازے بند کئے اور پھر غزل پڑھنی شروع کی۔ انھیں یہ خیال گزرا کہ کمرہ بند ہوگا تو آواز گونجے گی تو آواز کا جادو زیادہ جاگے گا۔ گویا کلام سے زیادہ انھیں آواز کی فکر تھی۔ معلوم نہیں وامق صاحب کو یہ بات یاد ہے یا نہیں مگر مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں اُس وقت بی اے میں پڑھ رہا تھا۔ وامق صاحب کی اس وقت دو نظمیں الہ آباد میں بہت مشہور ہوئی تھیں۔ ایک پنجاب اور دوسری مینا بازار۔ پنجاب سے آئے ہوئے شرنارتھی وامق صاحب سے پنجاب نظم کی فرمائش ضرور کرتے اور جب وامق صاحب یہ مصرعہ پڑھتے ع

اب یہ دو آبہ ہے سہ آب ہے پنجاب نہیں

تو سب لوگ ایک افسوس کے لہجے میں اسے دہرانے لگتے تھے۔ شاید ”چیخیں“ مجموعے میں بھی یہ نظم شامل ہے۔

غالباً ۱۹۴۹ء کی تاریخیں رہی ہوں گی جب مسلم بورڈنگ ہاؤس الہ آباد یونیورسٹی میں سالانہ مشاعرہ ہوا اس میں جگر صاحب، جذبی، ساحر، وامق، راہی معصوم رضا، مسعود اختر جمال، نوح ناروی اور بھی کچھ مقامی حضرات شامل تھے جگر صاحب نے اپنی وہ نظم نما غزل یا غزل نما نظم کہہ لیجئے پڑھی جس کا مطلع تھا؛

فکرِ جمیلِ خوابِ پریشاں ہے آجکل — شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آجکل

اور جب یہ شعر پڑھا۔

دلّی و دہرا دون و نواکھالی و بہار — انساں ہے اور ماتم انساں ہے آجکل

تو لوگ آبدیدہ ہو گئے۔ جذبی نے اپنی نظم ”بڑے ناز سے آج ابھرا ہے سورج“ سنائی۔ پھر ایک غزل بھی جس کا مطلع تھا۔

زمیں آسماں چاند سورج ستارے — ہمارے ہیں لیکن نہیں ہیں ہمارے

ساحر جب آئے تو حسب معمول اُن سے تاج محل کی فرمائش کی گئی۔ ساحر نے کہا کہ میں آپ کو ایک نئی نظم سناتا ہوں اس وقت انھوں نے اس کا نام ”آہنگ انقلاب“ بتایا تھا نظم شروع ہوئی تھی۔

مرے جہاں میں سمن زار ڈھونڈنے والے — یہاں بہار نہیں آتشیں بگولے ہیں

دھنک کے رنگ نہیں سُرمئی فضاؤں میں — اُفق سے تابہ اُفق پھانسیوں کے جھولے ہیں

(بعد کو یہی نظم تلخیاں میں ”لہو نذر دے رہی ہے حیات“ کے نام سے شائع ہوئی) اور پھر ”شکستِ زنداں“ سنائی۔ یہ وہ وقت تھا جب لوگ انقلابی نظمیں سننا پسند کرتے تھے۔ اگرچہ ہندوستان ایک طرح کے انقلابی دور سے گزر چکا تھا لیکن ہندوستانیوں کی ایک بہت بڑی تعداد یہ سمجھ رہی تھی کہ ابھی انقلاب نہیں آیا۔ یہ جو کچھ ہوا ہے انقلاب کی طرف ایک قدم ہے۔ اُسی زمانے میں سید احتشام حسین الہ آباد یونیورسٹی کسی سرکاری کام سے آئے ہوئے تھے۔ یونی ورسٹی کے ایک طالب علم نے ان کی طرف آٹو گراف بک بڑھادی احتشام حسین نے اس پر لکھا۔

”روس میں انقلاب آیا چین میں انقلاب آیا۔ سوچئے کہ ہندوستان میں انقلاب کب آئے گا۔“

قریب قریب یہی عبارت تھی ہو سکتا ہے کہ کچھ الفاظ اِدھر اُدھر ہو گئے ہوں۔ وہ طالب علم سب کو یہ عبارت دکھا رہا تھا۔ اس وقت جو الکشن ہوا اس میں کمیونسٹ پارٹی کے جلوسوں میں یہ نعرہ لگتا تھا۔

”دیش کی جنتا بھوکی ہے۔ یہ آزادی جھوٹی ہے“۔ اب ذرا فیض کا وہ شعر دیکھئے۔

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

پھر سردار جعفری کا شعر

تم نے فردوس کے بدلے میں جہنم لے کر — کہہ دیا ہم سے گلستاں میں بہار آئی ہے

یہاں تک کہ ابھی شاعری کے میدان میں نئے نئے آنے والے شاعر، راہی معصوم رضا کی ایک نظم ”پڑاؤ“ کافی پسند کی گئی جو اس طرح شروع ہوئی تھی۔

تھکے ہوئے مسافرو یہاں نہ ڈیرے ڈالنا

اور شعرا نے بھی اس طرح کے شعر سنائے مظفر شاہجہاں پوری کی نظم ”شعور آزادی“ اچھی خاصی مشہور ہوئی۔ اور غزل کا ایک شعر بھی۔

اُس طرف روس، اِدھر چین، ملایا، برما
اب اجالے مری دیوار تک آ پہنچے ہیں

اس وقت ایک عام خیال تھا کہ امروز فردا میں ہندوستان سُرخ انقلاب سے دو چار ہونے والا تھا۔ راقم الحروف نے بھی شعبۂ اردو کی ایک نشست میں ایک غزل پڑھی تھی جس کا ایک شعر اسی طرح کا تھا۔

برما و ملایا کے میداں لینن کے ترانے گاتے ہیں
لہراؤ بغاوت کے پرچم، اب دامنِ جاناں کیا ہوگا

ایک دوسری غزل کے دو شعر اور پیش ہیں۔

آدمی اس دورِ آزادی میں کیا کیا بن گیا
آپ بھی تو تختِ شاہی سے اتر کر دیکھئے
بھوک، قحط و مفلسی میں گم ہے نبضِ کائنات
کب تلک اس شوخ کی زلفِ معنبر دیکھئے

تو یہی موڈ، اس وقت طلباء سے لے کر تمام سیاسی نباضوں پر بھی طاری تھا کہ بس بہت جلد ہندوستان میں کمیونسٹ انقلاب آنے والا ہے۔ الٰہ آباد کے جنوبی حلقے سے ڈاکٹر زیڈ احمد کمیونسٹ پارٹی کے ٹکٹ سے الکشن لڑے۔ ان کا جلوس جب الٰہ آباد میں پارٹی آفس سے نکلتا تو ایک سرا اس کا ہیوٹ روڈ (دیویا نند مارگ) کے چوراہے پر ہوتا اور دوسرا کوتوالی کے پاس سے نخاس کہنہ کی طرف مڑتا ہوتا۔ پورے شہر میں ہر طرف سُرخ جھنڈے لہراتے ہوتے۔ یہاں تک کہ ان جلوسوں کی تصویریں امریکہ سے شائع ہونے والی شہرہ آفاق میگزین نیشنل جاگرنک میں بھی اس وقت شائع ہوئیں اور پھر ایک دن امریکی حکومت نے سر تیغ بہادر سپرو کے بنگلے کو کرائے پر لے کر اس میں کوئی سوشل سروس ڈپلوما کورس کھولا۔ بہت امریکی مرد عورت تعلیم دینے کے لئے الٰہ آباد میں اس بنگلے میں رہنے کے لئے آئے اور کئی برسوں تک یہ کورس چلایا گیا۔ گویا کمیونسٹ خیالات کا استیصال کرنے کے لئے یہ صورت اختیار کی گئی۔ امریکہ کو سب سے زیادہ سُرخ خطرہ الٰہ آباد میں نظر آنے لگا۔ کمیونسٹ پارٹی الٰہ آباد میں ہار گئی اور یہ ہار بنائی ہوئی (Manipulated) ہار تھی۔ اس زمانے میں کیرالا میں کمیونسٹ حکومت بن گئی اور بنگال بھی تیزی سے کمیونزم کی طرف جا رہا تھا۔ اب مظفر شاہجہاں پوری کے اس شعر کو دیکھئے جو پچھلے صفحے میں لکھا گیا ہے تو اندازہ غلط نہیں تھا مگر امریکہ کی مشنری بھی تیزی سے کام کر رہی تھی۔ ایسی صورت میں انقلابی نظموں کا پسند کیا جانا لازمی سی بات تھی۔ غزل کی سطح پست ہو چکی تھی۔ اگر کوئی شاعر رومانی نظم پڑھتا تو معذرت کے ساتھ یا معذرتی انداز میں یہاں تک کہ فراق صاحب بھی جو اپنے کو شاعرِ جمال کہتے تھے امریکی بنجارہ نامہ اور دھرتی کی کروٹ جیسی نظمیں لکھنے لگے۔ فراق صاحب نے ایک دن یونی ورسٹی کے اساتذہ اور طلبا کو اپنے گھر پر بلایا اور ایک نشست میں اپنی نظم آدھی رات سنائی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ نظم احساسات اور رعنائی خیال کے لحاظ سے بے حد حسین نظم ہے مگر لوگ سر ہلا کر رہ گئے مگر جب انھوں نے دھرتی کی کروٹ سنائی تو سننے والوں کو اس وقت یہ نظم بہت پسند آئی۔ کچھ لوگ ہنسے کچھ نے سراہا۔ اس نظم میں شاعری تو کیا ہے مگر خیال بدلتے ہوئے ہندوستان اور اس کے مستقبل کی پوری تصویر کھینچ دیتا ہے۔ مثال کے لیے چند اشعار پیش ہیں۔

دنیا جسے آج کہتی ہے
سنگم کئی جگوں کا ہے
بیتا ہوا کل اوروں کا تھا
آنے والا کل اپنا ہے

●

انگڑائی توڑتا ایشیا
بند آنکھیں ملتا افریقہ
دمن دلت حبشی امریکہ
گہری نیند سے چونک اٹھے ہیں

●

کاریگر مزدور کسان
کڑیل اور بگڑیل جوان
کاندھے سے کاندھا جوڑیں گے
دنیا پہ دھاوا بولیں گے

اور اب آدھی رات کے بھی کچھ اشعار دیکھئے۔

فراق صاحب کے اوپر کے اشعار چاہے جتنے غیر شاعرانہ ہوں ان کی شاعری میں جو بھی سقم ہو مگر یہ یقیناً ہے کہ نظر وقت کی رفتار اور دنیا کی بدلتی ہوئی صورتوں پر رہتی تھی اور دھرتی کی کروٹ اس کی اچھی مثال ہے۔ فراق صاحب بند اور گھٹی ہوئی فضا کے شاعر نہیں بلکہ ان کی شاعری میں ایک کھلی ہوئی بسیط فضا کا احساس ہوتا ہے۔ اور اسی سے ان کے یہاں اکثر اصولِ شاعری ٹوٹ بھی جاتے ہیں۔ اب آدھی رات نظم کے بھی کچھ اشعار دیکھتے ہیں۔

گلوں نے چادرِ شبنم میں منھ لپیٹ لیا
لبوں پہ سو گئی کلیوں کی مسکراہٹ بھی
ذرا بھی سنبلِ تر کی لٹیں نہیں ہلتیں
سکوتِ نیم شبی کی حدیں نہیں ملتیں
اب انقلاب میں شاید زیادہ دیر نہیں
گزر رہے ہیں کئی کارواں دھندلکے میں

یہ نظم آزادی سے کچھ ہی پہلے کہی گئی تھی۔

الہ آباد میں شعر و ادب کے دو مستقر تھے شاعری میں فراق صاحب اور عام ادب میں اعجاز صاحب (یہاں میرا مطلب سنجیدہ ادبی صورتوں سے ہے ورنہ تو الہ آباد میں بہت سی ادبی انجمنیں تھیں اور آج بھی ہیں۔ جہاں مشاعرے ہوتے رہتے ہیں) اعجاز صاحب نے اسی زمانے میں ایک اردو کا ادبی رسالہ شعاع اردو کے نام سے نکالا۔ اردو کا ایک اور ادبی رسالہ ۱۹۲۵ء میں اعظم کریوی، آغا علی خاں محمود اور طالب الہ آبادی نے اکبر کے نام سے نکالا تھا مگر کچھ دنوں تک نکلنے کے بعد یہ بند ہو چکا تھا (راقم الحروف کے پاس ۱۹۲۵ء اور ۱۹۲۶ء کی اکبر کی فائلیں ہیں) یہ رسالہ اکبر الہ آبادی کی یاد میں نکالا گیا تھا۔ اور انجمن دار الادب الہ آباد کا یہ رسالہ تھا جس کے مالک سید سجاد حسین شاہ پوری تھے۔ ایڈیٹر اعظم کریوی اور چیف ایڈیٹر آغا علی خاں محمود تھے۔ شعاع اردو بعد کو کارواں میں بدل گیا۔ ہم لوگوں سے اسی رسالے میں اپنی کچی پکی تحریریں اور ریویو چھپواتے اور کبھی کبھی اعجاز صاحب کی غیبت میں اداریہ بھی لکھتے اسی زمانے میں افسانہ نگاروں کی بھی ایک نئی کھیپ آئی۔ بلونت سنگھ، محمود احمد ہنر اور اطہر پرویز نے مل کر ایک رسالہ کٹرہ الہ آباد سے فسانہ نام کا نکالا جس میں پرانے افسانہ نگاروں کے ساتھ کچھ نئے لوگ بھی آئے۔ ان میں سید سہروردی اور صالحہ نکہت (اصلاً یہ تیغ تھے) کلیم نخشب، محی الدین عرفان اور صدیقہ بیگم سیوہاروی خاص تھے۔ صدیقہ بیگم سیوہاروی کی حیثیت فسانہ سے خاصی بنی۔ ان کے دو مجموعے پلکوں میں آنسو، اور ہچکیاں بھی شائع ہوئے۔ صدیقہ بیگم سیوہاروی اطہر پرویز کی بیوی تھیں۔ وہ پس پردہ ہی افسانہ لکھتی تھیں۔ نہ کبھی کسی ادبی محفل میں انھیں کسی نے دیکھا اور نہ وہ کسی علمی ادبی مذاکرے میں کبھی شریک ہوئیں نہ کبھی کسی سے ان کی گفتگو ہو سکی۔ الہ آباد میں عام خیال یہ تھا کہ اصلاً یہ اطہر پرویز ہی تھے جو صدیقہ بیگم سیوہاروی کے نام سے لکھتے تھے۔ واللہ اعلم۔ پھر محی الدین عرفان نے اسی زمانے میں نیا رسالہ جھنکار، الہ آباد سے نکالا۔ ایک اور رسالہ بحر الہ آبادی نے پروین کے نام سے شائع کرنا شروع کیا۔ پھر حسن منزل سے نکہت نام کا ایک رسالہ نکلا جس کے ایڈیٹر عباس حسینی تھے۔ اس میں تیغ الہ آبادی اور اسرار ناروی (ابن صفی) بھی لکھنے لگے۔ مگر بہت جلد اسرار ناروی ابن صفی کے جاسوسی دنیا لکھنے لگے۔ نکہت نکلتا تو رہا مگر عباس حسینی کی دلچسپیاں جاسوسی دنیا سے ہو گئیں۔ اب عباس حسینی جاسوسی دنیا کے ساتھ رومانی دنیا نکالنے لگے۔ اگرچہ ان رسالوں کی ادبی سطح بلند نہ تھی مگر عوام میں یہ بے حد مقبول ہوئے اور بہر حال کچھ نہ کچھ

ان تمام رسالوں نے ادبی ذوق سنوارنے میں تو مدد دی ہی۔ رومانی دنیا میں کچھ اچھے لکھنے والے بھی آئے جن میں ابن سعید اور شاہد اختر نے چند اچھے رومانی ناول لکھے۔

الہ آباد ہمیشہ سے ہندی کے ادیبوں کا گڑھ رہا ہے۔ اس وقت بھی اردو کے مقابلے میں ہندی کا ادب بہتر تھا، اور ہندی کے مشاہیر ادب بھی الہ آباد میں اقامت پذیر تھے۔ تاہم انجمن ترقی پسند مصنفین میں اردو ہندی دونوں کے ادیب بڑے شغف سے شرکت کرتے تھے۔ پرانے افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں میں سری کرشن داس اور ایلا چند جوشی کے جھنڈے گڑے ہوئے تھے۔ ان کے بعد دوسری نسل میں بھیروں پرساد گپت اور امرت رائے تھے جو بڑی لگن اور محنت سے ادب کی تخلیق میں منہمک تھے۔ امرت رائے اور ایلا چند جوشی منٹو روڈ نالے کے پاس رہتے تھے اور وہیں سری کرشن داس بھی تھے۔ امرت رائے کی ایک کتابوں کی دکان بھی زیرو روڈ پر تاج محل ہوٹل کے نیچے ہو کرتی تھی جہاں سے پریم چند کا ہنس بھی ایسٹرے میرٹھ سے نکل رہا تھا۔ مگر ان قدرے پرانے لوگوں کے بعد کی نسل نسبتاً طاقت ور تھی ایک خاص تیور کے ساتھ ادب کے میدان میں اتر رہی تھی کملیشور تو میرے ساتھ ہی یونی ورسٹی میں تھے اور مارکنڈے مجھ سے ایک سال پیچھے تھے۔ امر کانت نے بھی اسی وقت لکھنا شروع کیا تھا۔ یہ سب لوگ انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں بڑی باقاعدگی سے آتے۔ مگر ان کی تحریروں اور مباحثوں سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ اپنا راستہ الگ بنانے کی فکر میں ہیں۔ انجمن کے جلسے کبھی امرت رائے کے گھر پر ہوتے کبھی بھیروں پرساد گپت کے گھر پر اسٹنلی روڈ پر ہوتے کبھی اعجاز صاحب کے یہاں کبھی پی۔ سی۔ گپت اور پہاڑی کے یہاں پی۔ سی۔ گپت کا شمار ہندی کے اچھے نقادوں میں ہوتا تھا۔ اس وقت کملیشور مارکنڈے اور راقم الحروف صف نعال میں ہوتے۔ اسی وقت ایک صاحبزادے بھی آئے جو ہندی میں غزل کہنے کی مشق کر رہے تھے۔ یہ زبان تو ہندی اردو کی ملی جلی استعمال کرتے مگر بحریں سب فارسی غزلوں کی ہوتیں۔ یہ دشینت کمار تھے۔ خوب لہک کر غزلیں اردو مشاعروں کے شعرا کی طرح پڑھتے۔ ہندی کی شعری دنیا میں یہ ایک نئی آواز تھی انھی جلسوں میں شمشیر بہادر اور ترلوچن شاستری بھی آتے اور اپنی تخلیقات پیش کرتے۔ دشینت کمار اور شمشیر بہادر نے ہندی کی شاعری میں اردو طور طریقوں سے بڑا نام کمایا۔ انھیں دنوں فاروق جنوں نام کے اردو شاعر نے لائٹ آف ایشیا کا اردو اشعار میں ترجمہ کیا جو خاصہ اچھا تھا۔ پھر انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے کانپور روڈ کے



افسر میرٹھی

۱۸۹۵ء - ۱۹۷۴ء



ن.م. راشد

۱۹۱۰ء - ۱۹۷۵ء



علی عبّاس حسینی

۱۸۹۷ء-۱۹۵۹ء



رضیہ سجاد ظہیر

۱۹۱۸ء-۱۹۷۹ء

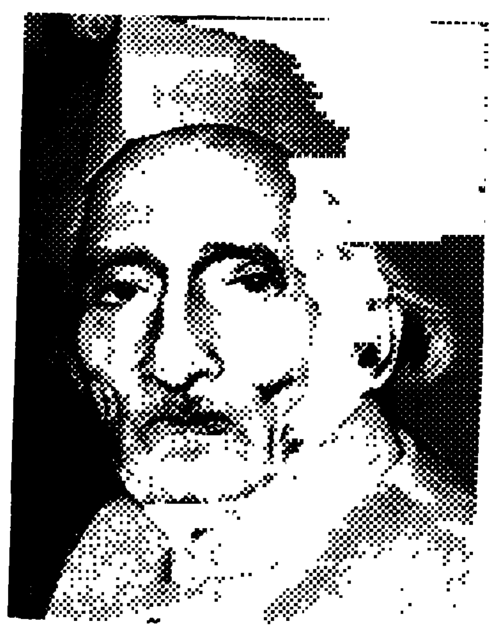


سلام مچھلی شہری

۱۹۲۱ء-۱۹۷۳ء

نشور واحدی

۱۹۱۲ء - ۱۹۸۳ء





رام لعل نابھوی

۱۹۱۸ء - ۱۹۹۵ء



جاوید وششٹ

۱۹۲۰ء - ۱۹۹۴ء

ایک بنگلے میں رہنے لگے تھے جہاں میں نے پہلے پہل ناگار[illegible] جن اور رام بلاس شرما کو دیکھا اور ان کی نئی ہندی شاعری پر تقریریں سنیں۔ وہیں ایک دن [illegible] اپنا نیا شعری مجموعہ لئے ہوئے آئے اور کافی دیر تک [illegible] سناتے رہتے جو ایک طرح کی تجرباتی شاعری تھی۔ یہ حسن شہیر تھے اور مجموعہ [illegible] ہیر نے نئے ڈھنگ کی تجرباتی شاعری میں خوب ہاتھ پیر [illegible] اور موت کی شہنائی کے نام سے ان کے دو تین مجموعے اسی درمیان [illegible] کے گیت پر آل احمد سرور صاحب کا مقدمہ بھی [illegible] سرور صاحب کے مقدمے پر سب کو بڑی حیرت [illegible] تیغ اب ہم لوگوں سے کٹنے لگے تھے۔ سبب معلوم [illegible] ن شہیر جب تک الٰہ آباد میں رہے برابر نشستوں میں آتے [illegible] شعر و شاعری سے تائب ہو چکے ہیں۔ لمبی سی ڈاڑھی رکھ لی [illegible] شعر و شاعری کو خرافات تصور کرنے لگے ہیں [illegible] ادبی والا جذبہ اُن میں پیدا ہو گیا۔

ہم لوگ ایم۔ اے سال دوم میں تھے [illegible] میں انڈین پیپلز تھیٹر (IPTA) کا ایک اجلاس ریلوے انسٹی ٹیوٹ میں [illegible] میں اپٹا سے دلچسپی لینے والوں میں نمی چند جین اور ان کی بیوی [illegible] نمی چند جین کی ادب سے دلچسپیاں اس وقت منظر عام [illegible] سول لائنز میں پیوپلس بک ہاؤس چلاتے تھے اور [illegible] ادب پر دھواں دھار بحثیں کرتے تھے۔ اب تو نمی چند جین ہندی [illegible] مگر اس وقت ہندی ادب میں ان کی کوئی خاص حیثیت [illegible] اپٹا کے لئے باہر سے آنے والوں میں پریم دھون اور حبیب تنویر تھے۔ [illegible] تنویر کا آگرہ بازار نہیں آیا تھا اور نہ ڈرامے سے ان کی کوئی خاص دلچسپی [illegible] کے درمیان معلق تھے۔ الٰہ آباد تو وہ ایک مشاعرے کے [illegible] کہ مسلم بورڈنگ ہاؤس کے مشاعرے کے لیے یا کسی اور مشاعرے کے [illegible] مگر انھوں نے مسلم بورڈنگ ہاؤس کے مشاعرے میں شرکت کی [illegible] سے پڑھی تھی جس کا ایک شعر یاد ہے۔

آج تیرے آنچل کی نرم سرسراہٹ میں [illegible]
اور مجھ کو یہ بجلی اونچے اونچے محلوں پر [illegible] ہی گرانی ہے

پھر وہ مشاعرے کے بعد ہی کلیم نخشب کے ساتھ مانک پور [illegible] ہے

دن واپس آکر اپٹا میں شرکت کی تھی۔ اپٹا میں ریکھا جین نے بہترین رقص پیش کیا تھا اور پریم دھون نے ایک خاص دھن میں اپنا تانگے والا گانا "چل میرے گھوڑے ٹپاٹپ" پیش کیا تھا اور پھر ایک گیت بھی جس کا ٹکڑا تھا۔

"آج ہڑتال۔ ہڑتال۔ آج چکا بند" بیچ میں اور کئی مصرعے تھے مگر یہ چند اور یاد آرہے ہیں۔

ظلم کا چکا آج چلے گا نہ چلے گا
آج کوئی بوئیلر چلے گا نہ چلے گا
آج ہڑتال۔ ہڑتال۔ آج چکا بند

اور جب پریم دھون "آج ہڑتال۔ ہڑتال" کہتے تو پورا مجمع ان کے ساتھ پرزور آواز میں کہتا "آج چکا بند" اور اس "آج چکا بند" کہنے پر پوری فضا گونج اٹھتی تھی اس مجمع میں زیادہ تر نوکری پیشہ، قلی اور مزدور تھے اور پریم دھون کی اس آواز کو لوگ اپنے دل کی آواز سمجھتے تھے۔ اپٹا (IPTA) نے دو تین ایک پروگرام اور دکھائے۔ راجہ اندر کا ایک دربار سجایا گیا اور اس میں بھوک بیکاری افلاس سب پریاں بن کر آتیں اور اپنی اپنی فریاد ناچ ناچ کر راجہ اندر کو سناتیں۔ اور راجہ اندر سب کو تسلی دیتے کہ ہم نے اعلان کیا ہے کہ لوگ اپنے اپنے گھروں کی چھتوں پر اناج اگائیں، ترکاری لگائیں تبھی غلّے اور کھانے پینے کا مسئلہ ختم ہوگا اور سب کو کام بھی مل جائے گا۔ یہ نقل اس بیان کے لیے تھی جو وزیر اعظم نہرو نے کہیں دیا تھا۔ ریکھا جین، عذرا فاروقی، کلاوتی آغا اور کشور انصاری پریاں بنی تھیں۔ ریکھا جین بڑی اچھی آرٹسٹ تھیں۔ انھوں نے بمبئی کے اپٹا میں بھی کام کیا تھا۔ جب وہ پری بنیں تو واقعی لوگ ان پر لہلوٹ ہو گئے۔ ہم طالب علموں کا تو کہنا ہی کیا۔ ہمارے تو دن ہی تھے لہلوٹ ہونے کے۔ انھیں ریکھا جین کو تین چار سال پہلے دلی میں دیکھا تو انگلی پر ڈالنے لائق ہو گئی تھیں۔ الٰہ آباد میں اپٹا کی یہ پہلی اور آخری مقبولیت تھی۔ ہندی تھیٹر بھی انھیں دنوں الٰہ آباد میں خاصا مقبول ہوا۔ سری کرشن داس نے الٰہ آباد کے اس وقت کے ایک کلکٹر جگموہن رینا کی بیوی کے ساتھ مل کر ایک رنگ منچ کی تشکیل کی۔ یہ تھیٹر "رنگ شالہ" کے نام سے موسوم ہوا۔ اسٹیج اور تھیٹر کا شوق رکھنے والے بہت سے فن کار ان کے گرد جمع ہو گئے اور رنگ شالہ کا رنگ کچھ دنوں تک خوب چوکھا رہا۔ سری کرشن داس اچھے آرگنائزر اور ڈرامہ نویس بھی تھے۔ انھوں نے اعجاز صاحب کو بھی اپنے ساتھ لپیٹا۔ اعجاز صاحب نے بھی ان کے لیے دو ایک ڈرامے لکھے مگر اعجاز صاحب کے ڈرامے رنگ شالہ میں چلے

نہیں بھر اعجاز صاحب نے یونی ورسٹی کے اردو اسوسی ایشن کے لیے کچھ اور ڈرامے لکھے، جو اسٹیج بھی ہوئے اور بعد کو ادبی ڈرامے کے نام سے کئی مرتبہ شائع ہوئے

ہندی میں نرالا، پنت، مہادیوی ورما اور رام کمار ورما چھایا وادیوں کا ایک گروپ الگ تھا جو بعد کو ایک اسکول بن گیا مگر ۱۹۵۰-۵۱ء تک یہ مزاج باسی ہوگیا۔ ہندی کی نئی نسل نے چھایا وادیوں کو توڑ کر رکھ دیا کہ یہ حقیقت سے گریزاں ہیں۔ چھایا وادی زندگی کی تیز گامی کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اس کا ایک عجیب سین دیکھنے میں آیا۔ الٰہ آباد یونی ورسٹی کے شعبۂ ہندی کے کسی ڈرامے کا افتتاح ہو رہا تھا۔ مہادیوی ورما نے ایک تقریر اپنے ڈھنگ کی کی جب تقریر ختم ہوئی تو وجے دیونارائن ساہی مجمے سے اٹھے اور انھوں نے کہا کہ دیوی جی نے جو کچھ کہا ہم کچھ نہیں سمجھتے یہ کیا بھاشا بولتی ہیں اور کس کے لیے۔ اس پر کچھ ہنگامہ ہوا اور دیوی جی روٹھ کر چلی گئیں۔ وجے دیونارائن ساہی ہم لوگوں کے گروپ کے آدمی تھے۔ وہ خود کو سوشلسٹ کہتے تھے مگر یہ سوشلزم رام منوہر لوہیا والی سوشلزم تھی ساہی تھے تو شاعر مگر انھوں نے ہندی کی نئی تنقید میں بھی نئی نسل کو راہ دکھائی۔ مگر نرالا، پنت، مہادیوی اور بچن جیسا شاعر الٰہ آباد میں نہ ہوا ہاں کہانیوں کا جو نیا منچ سجا اس میں کچھ لوگوں نے راستے پیدا کیے اور آج بھی اس راہ میں ترقی کر رہے ہیں

مارکنڈے، کملیشور اور امرکانت کے بعد دودھ ناتھ سنگھ کالیا اور ان کی بیوی ممتا کالیا نے کہانیوں کی دنیا کی توسیع کی شاعری کی ہندی دنیا سست پڑ گئی۔

اردو دنیا میں الٰہ آباد میں شاعری کی بساط تقریباً اسی وقت بچھی جب دلی میں شاعری کی ابتدا ہوئی ہے مگر الٰہ آباد نے شعری دنیا میں کوئی خاص ترقی نہ کی اکبر الٰہ آبادی کے علاوہ کسی اور کو عروج حاصل نہ ہوا۔ عجیب بات ہے کہ فراق نے الٰہ آباد سے شاعری شروع کی اور الٰہ آباد ہی میں ان کی شاعری نے جوانی اور بڑھاپے سب کی منزلیں طے کیں۔ مگر وہ ہمیشہ اپنے کو گورکھپوری ہی لکھتے رہے۔ یہی صورت قریب قریب اصغر گونڈوی کی بھی ہوئی۔ میرے سامنے الٰہ آباد میں چھوٹی چھوٹی انجمنیں اردو کی قائم تھیں جن کا مقصد صرف معاشی مشاعرے کرنا رہ گیا تھا۔ ان میں خوب جھگڑے بھی ہوتے اور خوب شاعری بھی۔ نوح ناروی کی انجمن سفینۂ ادب تھی۔ پھر ایک انجمن ان سے اختلاف کر کے ان کے شاگرد بسمل الٰہ آبادی نے بھی قائم کی۔ نوح صاحب کے شاگردوں کی ایک فوج تھی جس میں ہر طرح کے لوگ ہوتے۔ شاگردوں کا ایک باقاعدہ رجسٹر رکھا جاتا جس میں ہر پیشے کے لوگ شامل تھے۔ سائیکل کا پنکچر جوڑنے والے کپڑے رنگنے والے رنگریز، آوارہ گھومنے والوں سے لے کر تاجر پیشہ فقرا اور مساکین سے لے کر امرا و شرفا میں بسمل صاحب، پنڈت رادھے ناتھ کول گلشن منوا جی رئیس الٰہ آبادی سب شامل تھے بسمل، گلشن، جدت، سراج اور راز کافی مشہور رہے۔ قریب قریب سبھی کے دیوان شائع ہوئے۔ راز ملک گیر شہرت کے حامل ہیں مگر مشاعروں کے شاعر ہیں۔ استاد نوح ناروی کو کبوتر پالنے کا بڑا شوق تھا۔ الٰہ آباد کے رئیس منوا جی بھی کبوتر پالتے تھے۔ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ شوق کبوتر بازی استاد کو منوا جی سے قریب لے گیا یا ذوق شاعری منوا جی کو استاد کے قریب لایا مگر ایک وقت وہ آیا کہ استاد اپنے شاگرد کی کوٹھی محلہ کیٹ گنج میں اٹھ آئے اگرچہ حسن منزل میں استاد نوح کی اپنی خود کوٹھی تھی۔ یہ شوق کبوتر بازی بھی خوب ہے۔ خان بہادر سید کلب عباس، جو بعد کو الٰہ آباد ڈرابیونل کے جج بھی ہو گئے تھے۔ انھیں بھی کبوتر بازی کا بڑا شوق تھا۔ کبوتروں پر انھوں نے ایک کتابچہ بھی لکھا تھا۔ جب وہ جج تھے، راقم الحروف نے انھیں خود دیکھا ہے کہ الٰہ آباد کے گدڑی بازار میں جہاں کبوتروں کی خرید فروخت ہوتی اور کچھ مشاقانِ کبوتر اکٹھا ہوتے، کلب عباس صاحب بھی آتے۔ ہم ابرار رضوی کی پرانی کتابوں کی دکان پر ہوتے تو یہ سین دیکھا کرتے۔ جو کبوتر پسند آجاتا اس کی ٹانگیں بندھوا کر اپنی شیروانی کی جیب میں رکھ لیتے (کوئی اسے مبالغہ نہ سمجھے اور بچشم دیدہ گواہ ابھی موجود ہیں) سید احتشام حسین کلب عباس صاحب کے عزیزوں میں سے تھے۔ وہ گڑھیا تالاب پر رہتے تھے۔ ایک مرتبہ کلب عباس صاحب ان سے ملنے آئے تو ایک کبوتر ان کی شیروانی کی جیب سے جھانک رہا تھا۔ اب اسے کیا کہا جائے۔ اپنا اپنا شوق ہے۔ الٰہ آباد کے ایک رئیس نے جب اپنی فورڈ کار خریدی تو اسے دکان سے لینے کے لیے نور جہاں نام کی اپنی طوائف کو دیہات سے لے کر آئے کہ سب سے پہلے کار پر وہ بیٹھے گی۔ نام تو اس کا نور جہاں تھا مگر وہ چہرے مہرے سے طلسم ہوشربا کی تاریک شکل کشش لگ رہی تھی۔ اب یہاں بھی اپنا اپنا شوق والی بات صادق آتی ہے۔ شوق کبوتر بازی اصلاً رئیسوں کا شوق تھا۔ خود واجد علی شاہ کا ایک بہت بڑا کبوتر خانہ تھا انگلستان میں بھی یہ شوق رہ چکا ہے۔ آج بھی ٹرافالگر اسکوائر میں کبوتروں کی وہ بہتات ہے کہ جب وہ دانہ چگنے کے لیے نیچے آتے ہیں تو ہمیں ہندوستان کا مزہ آتا ہے اور

یہ سب کبوتر پالے ہوئے کبوتر ہیں۔ انگریز جب کوئی شوق کرتا تھا تو اسے عزت (Glorify) دے کر کرتا تھا۔ چنانچہ کبوتر کو امن و آشتی کا پرندہ (BIRD OF PEACE) کہہ کر پالنا شروع کیا۔ اور ہندوستانیوں کے شوق کبوتر بازی کو مذموم کر کے پیش کیا۔ اودھ کے خلاف ایک الزام یہ بھی تھا کہ بادشاہ کبوتر اڑاتا ہے اور رات بھر مشاعرے کراتا ہے میجر سلیمن صاحب کو اس پر بھی اعتراض تھا۔ خیر بات کہاں پہنچی۔

بارہ دائروں کا یہ شہر الٰہ آباد ایک رنگا رنگ تہذیب اور زندگی کا حامل ہے۔ الٰہ آباد اسٹیشن پر ایک مزار ہے جسے لائن بابا کا مزار کہا جاتا ہے۔ اس مزار پر ہر جمعرات کو باقاعدہ قوالی کی محفل سجتی ہے۔ اب تو باقاعدہ پختہ اور شاندار مزار بن گیا ہے مگر میری طالب علمی کے زمانے میں یہاں صرف چونے سے رنگی ہوئی ایک قبر ہوا کرتی تھی۔ ہم لوگ بھی قوالی سننے اور شیرنی لینے اکثر یہاں جاتے۔ یہاں حاضرین میں ہندو مسلم، عیسائی سب پہلے بھی ہوتے تھے اور آج بھی ہوتے ہیں۔ اکثر ہندو حضرات اپنے سفر کے آغاز سے پہلے بابا کے مزار پر حاضری دیتے ہیں۔ کچھ اسٹانک ڈنڈوت بھی کر کے بابا سے اپنے منگل مے سفر کی دعا مانگتے ہیں۔ یہی صورت لکھنؤ کے اسٹیشن پر کھمو پیر بابا کے مزار پر بھی ہوتی ہے جہاں ستر فی صد ہندو حضرات اور ان کی عورتیں اور بچے ہوتے ہیں جو ہاتھوں میں بتاشے کے بندے اور پھولوں کی چنگیاں لیے مزار پر حاضری دیتے ہیں۔ اور پھر الٰہ آباد تو اس تہذیب کا سنگم ہے۔ ایک مرتبہ میرے دوست جاوید وششٹ (افسوس کے حال ہی میں اُن کا انتقال ہو گیا) ایک قصیدہ خوانی کی محفل میں شرکت کے لیے الٰہ آباد آئے رات میں انھوں نے قصیدہ پڑھا اور صبح مجھ سے سنگم نہانے کی خواہش ظاہر کی۔ ہم لوگ ناؤ سے سنگم گئے۔ ہمارے ساتھ ڈاکٹر وحید اختر (اردو کے مشہور شاعر اور علی گڑھ یونیورسٹی کے پروفیسر) اور اردو کے مشہور شاعر رضا امروہوی بھی تھے۔ وحید اختر تو ناؤ ہی میں لیٹے رہے اور سنگم کا نظارہ کرتے رہے۔ مگر ہم لوگوں نے جاوید وششٹ کے ساتھ سنگم پر اشنان کیا۔ جب پنڈتوں نے وششٹ جی سے مورتی پر پھول چڑھانے کو کہا تو وششٹ جی نے کہا کہ تم پیسے لے لو مگر میں مورتی پوجا نہیں کرتا میں موحد ہوں۔ پھر ہم لوگ بھاپھامئو گنگا نہانے بھی ساتھ ساتھ گئے۔ الٰہ آباد کی خانقاہوں میں ہندو بھی آتے ہیں اور مسلمان گنگا بھی نہاتے ہیں۔ یہی ہماری ملواں اور گنگا جمنی تہذیب ہے۔ اب چاہے ہندو اس کے لیے ناک بھوں چڑھائیں یا مسلمان چیں بہ جبیں ہوں یہ سب کچھ اس تہذیب میں ساہوتا رہا ہے

اور یہی ہوتا رہے گا۔ محرم میں چوک الٰہ آباد کے ہندو تعزیوں پر پھولوں کی بارش کرتے ہیں تعزیوں پر سے اپنے بچوں کو وارتے ہیں اور اونچے مچان باندھ کر دس محرم کو اس پر بیٹھ کر ریوڑیاں بھی عوام میں تقسیم کرتے ہیں۔ یہ سب برٹش حکومت میں بھی ہوتا تھا اور آج بھی ہوتا ہے۔ اب خواہ کوئی کتنی بھی کوشش کرلے مگر کم از کم الٰہ آباد کا ہندو اپنی روایات کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اور مسلمان میلے جانا اور گنگا میں نہانا نہیں چھوڑ سکتا کہ یہی الٰہ آباد کی تہذیب ہے۔

□□

فرخ آباد کا ادبی سفر

صفحہ ۱۲۹ کا بقیہ

ان کا ایک شعری مجموعہ "نوائے دل" ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا جس پر یوپی اردو اکادمی نے انھیں ایوارڈ سے نوازا۔ ان کا یہ شعر دیکھیں۔

دل رو رہا ہے آنکھ میں لیکن نمی نہیں　　جینے کو جی رہا ہوں مگر زندگی نہیں

جناب مجنوں گورکھپوری سے تلمذ حاصل ہے۔

جناب سرور حسین سرور غزل گو شاعر ہیں۔ ان کا ایک شعری مجموعہ "سہانی بارش" ۱۹۹۴ء میں شائع ہو چکا ہے جس پر اترپردیش اردو اکیڈمی نے انھیں ایوارڈ عطا کیا۔ تحت سے کلام پڑھتے ہیں۔

راقم الحروف راجیندر بہادر موج ایڈوکیٹ نے حمد، نعت، سلام، منقبت، نظم، رباعی، غزل اور ساری اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ اب تک آٹھ شعری مجموعے طوفان، موج و ساحل، موج در موج، ساگر، موجیں لہریں، شکنتلا اور آکاش شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں چھ آخری پر یوپی اردو اکادمی سے ایوارڈ مل چکے ہیں۔ آل انڈیا اردو اکادمی نے امتیاز میر ایوارڈ سے نوازا۔ راقم الحروف انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی۔ فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ کا رکن ہے۔ پہلے یوپی اردو اکادمی کا وائس چیرمین رہ چکا ہے ایک شعر ملاحظہ فرمائیں۔

نمائش ان کے جلوؤں کی زمیں سے آسماں تک ہے
وہ اتنا دیکھ سکتا ہے نظر جس کی جہاں تک ہے　(موج)

فرخ آباد فتح گڑھ میں آج بھی اعلا پیمانے کے مشاعرے ہوتے ہیں۔ ماہانہ نشستیں ہوتی ہیں۔ اردو کی لائبریریاں اور شبینہ اسکول چلتے ہیں اور عوام میں اردو لکھنے پڑھنے کا شوق قائم ہے بلکہ بڑھتا جا رہا ہے۔

□□

عبدالقیوم دسنوی
۲۰ پرنس کالونی۔ عیدگاہ ہلز۔ نعمت پورہ
بھوپال ۴۶۲۰۰۱

بھوپال کے ادبی سفر کی نصف صدی

پہاڑوں، جنگلات سے گھرا ہوا۔ چھوٹے بڑے تالابوں کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے، پہاڑوں کو اپنے سینے پر سنبھالے ہوئے یہ شہر بھوپال نمونۂ کشمیر، حسن کی تصویر، ماضی سے ہم آغوش، حال سے ہم دوش واقعی دارالاقبال کہلانے کا مستحق ہے۔ اس لئے بھی کہ اٹھارہویں صدی کی ابتدا سے نصف بیسویں صدی تک یہ شہر ریاست بھوپال کا دارالحکومت رہا تو ریاست کے انضمام کے بعد مدھیہ پردیش کا دارالسلطنت بن کر ابھر رہا ہے۔

چونکہ یہ صوبہ مدھیہ پردیش ہندوستان کے ان مختلف سات صوبوں۔ بہار، اتر پردیش، راجستھان، گجرات، مہاراشٹر، آندھرا پردیش، اڑیسہ سے گھرا ہوا ہے اس لئے مختلف تہذیبوں اور زبانوں کے نمائندہ لوگ اس شہر میں یا تو آکر بس گئے یا آتے جاتے رہے ہیں۔ چنانچہ اس شہر کی تہذیبی زندگی اور علمی، تعلیمی اور ادبی فضا مختلف انداز سے ان صوبوں کی رنگا رنگ تہذیبوں، اور زبانوں سے متاثر ہوتی رہی ہے جس کے نتیجہ میں اس شہر کا مزاج، معاشرتی زندگی، معاشی حالات اور اس کی تعمیرات میں تبدیلی اور وسعت آہستہ آہستہ آتی جاتی رہی ہے۔ ترقی اور تبدیلی کی یہ رفتار دیکھئے اس شہر کو کہاں سے کہاں پہنچاتی ہے۔

تاریخ کے پچھلے اوراق ذرا تیزی سے پلٹے جائیں تو آج سے پونے تین سو سال قبل ۱۷۲۲ء میں افغان سردار دوست محمد خاں اس ریاست کی بنیاد ڈالتے ہوئے ملیں گے۔ چونکہ دوست محمد خاں اور ان کے بعد کے دوسرے حکمراں علم و ادب کے قدرداں تھے اس لئے ابتدا ہی سے اس شہر میں علمی فضا قائم ہوگئی تھی جو کہ ریاست کے انضمام یکم جون ۱۹۴۹ء تک جاری و ساری رہی۔

اس طرح اٹھارہویں صدی کی ابتدا یعنی ۱۷۲۲ء میں یہاں جس ریاست کی بنیاد پٹھانوں نے ڈالی تھی وہ بیسویں صدی کی نصف یعنی یکم جون ۱۹۴۹ء میں ۲۲۷ سال کی طویل مدت گزار کر ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی۔

ان سوا دو سو برسوں کی مدت میں چند چھوٹی لڑائیوں کے علاوہ کسی بڑی جنگ سے اس ریاست کو واسطہ نہیں پڑا۔ البتہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اس ریاست کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی لیکن یہاں کی ہوشمند حکمراں نواب سکندر جہاں کی بدولت یہ ریاست اس طوفان کی زد سے محفوظ رہی۔

اس مدت میں ریاست بھوپال امن و اماں کا گہوارہ، اتحاد و اتفاق کا چمن زار، تہذیب و تمدن کا جلوہ گاہ اور علم و ادب کی آماجگاہ بنا رہا۔ اس دوران میں یہاں کے حکمرانوں کی انصاف پسندی اور ہر مذہب و ملت کے لئے کشادہ دلی کی وجہ سے یہ ریاست میل ملاپ کی خوشبو میں رہی اور دوسروں کے لئے عزت اور احترام کے جذبے سے سرشار رہی۔ یہاں کی علم نوازی اور ادب پروری نے جہاں یہاں ادب کے رنگ برنگ کے پھول کھلائے وہیں بیرونِ ریاست سے علماء، فضلاء، ادباء کو بار بار یہاں آنے اور یہاں کے علم و ادب کی خدمت کرنے پر مجبور کردیا۔

یہ اس ریاست کی اردو دوستی ہی تھی جس کی وجہ سے نواب سکندر جہاں بیگم کے زمانے میں (۱۸۵۹ء) اس زبان کو ریاست کی سرکاری اور عدالتی زبان قرار دیا گیا تھا جس کی وجہ سے یہاں اردو سے دلچسپی بہت زیادہ بڑھی شاعری میں غزل سرائی کے علاوہ قصیدہ گوئی اور مثنوی نگاری کا رواج عام ہوگیا تھا مختلف انداز سے شعری نشستیں جمنے لگی تھیں۔ جن کی وجہ سے یہاں شعر و شاعری کو فروغ ملتا رہا اور ادبی فضا خوب سے خوب تر بنتی گئی اور نثری میدان میں بھی فتوحات حاصل ہونے لگے تھے۔

بیرونی شعراء اور ادباء جو اس ریاست کے زمانے میں یہاں بار بار آتے رہے یا یہیں بود و باش اختیار کرتے رہے ان میں خاص طور سے یہ نام؛

شیخ عبدالواحد سکین، ظہیر دہلوی، مولانا محمد اسلم جیراجپوری، عبدالغفور شہباز امیر مینائی، نواب صدیق حسن خاں، امجد علی اشہری، امجد علی شوق، نیاز فتح پوری عبدالرزاق کانپوری، مضطر خیرآبادی، عبدالرحمان بجنوری، سر راس مسعود اور علامہ سید سلیمان ندوی وغیرہ اہم ہیں ان کی وجہ سے یہاں کی علمی ادبی اور شعری فضا میں بڑی گرماگری پیدا ہو گئی تھی۔

بہت سے ایسے مشاہیر بھی ہیں جو یہاں نہیں آسکے لیکن اس ریاست کی ادبی فضا کو کسی نہ کسی طرح متاثر کرتے رہے۔ ان میں مرزا اسد اللہ خاں غالب کا نام اہم ہے۔ غالب بھوپال کبھی نہیں آسکے لیکن ۱۲۳۷ء کا ان کا قلمی دیوان نواب سکندر جہاں کے ماموں فوجدار محمد خاں کے ہاتھوں بھوپال پہنچا جو بعد میں نسخۂ بھوپال کہلایا اور ۱۹۲۱ء میں نسخۂ حمیدیہ کے نام سے ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری کے مضمون محاسن کلام غالب اور مفتی انوار الحق کی تمہید کے ساتھ شائع ہوا اور ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ نواب سکندر جہاں اور فوجدار محمد خاں کے علاوہ یہاں غالب کے کئی قدرداں اور شاگرد تھے۔ کہا جاتا ہے کہ نواب سکندر جہاں نے دہلی کے سفر میں غالب سے ملاقات بھی کی تھی۔

اس ریاست کی علمی، ادبی، تعلیمی اور قومی کاموں سے دلچسپی اور علم و ادب کی قدردانی کی وجہ سے سر سید احمد خاں، علامہ شبلی نعمانی، علامہ اقبال، مولوی عبدالحق، جگر مرادآبادی، حفیظ جالندھری اور عطیہ فیضی وغیرہ نے بھی کسی نہ کسی ضرورت سے بھوپال کا سفر کیا اور یہاں علمی ادبی چہل پہل پیدا کی۔

علامہ اقبال کی علالت کے موقع پر نواب حمید اللہ خاں والی بھوپال نے ان کی جس انداز سے خدمت کی اس کے متعلق رشید احمد صدیقی نے ٹھیک ہی تحریر کیا ہے۔

> " زندگی کے آخری عہد میں مرحوم (علامہ اقبال) کا توسل دربار بھوپال سے ہو گیا تھا اس تعلق کے پیدا کرنے میں سر راس مسعود مرحوم کی کوششوں کو بڑا دخل تھا۔ اقبال کو جن دقتوں کا سامنا تھا اب اس سے نجات ہو گئی تھی۔ دور آخر کی بعض مشہور نظمیں مرحوم نے بھوپال ہی میں لکھیں۔ بھوپال کا یہ کارنامہ میرے نزدیک ان کارناموں میں سے ہے جن کو آئندہ آنے والی نسلیں کبھی فراموش نہیں کر سکیں گی۔ اگر افرادکی مانند اداروں کی بھی کوئی حیات ہے تو اسی ایک نیک کام کے صلے میں بھوپال کی نجات اُخروی یقینی ہے "۔ [1]

سر راس مسعود کو نواب بھوپال نے ۱۹۳۵ء میں بھوپال بلا کر شعبۂ تعلیم اور ہوم ڈپارٹمنٹ کا کام ان کے سپرد کیا تھا۔ ان کی بھوپال میں آمد کی وجہ سے یہاں کی ادبی زندگی میں بہت گرماگری پیدا ہو گئی تھی۔ سراج میر خاں سحر کے کلام کا مجموعہ "بیاض سحر" بھی سر راس مسعود کی ہی توجہ سے ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا تھا۔

نیاز فتحپوری کا قیام یہاں چند سال رہا۔ انھوں نے ماہنامہ نگار کے چند شمارے یہاں سے نکالے تھے۔ ان کی وجہ سے بھی یہاں کی ادبی فضا میں بڑا جوش و خروش پیدا ہو گیا تھا۔

انضمام سے چند سال قبل سے جگر مرادآبادی کا تعلق بھوپال سے کچھ ایسا ہو گیا تھا کہ وہ بار بار بھوپال تشریف لانے لگے تھے جس کی وجہ سے یہاں شعر و شاعری کے ماحول میں بڑی جان پیدا ہو گئی تھی۔ قیام بھوپال کے دوران میں جگر صاحب اور ان کے دوسرے رفقا نے یہاں ایک انجمن "دائرۃ الکہلا" کی بنیاد ڈالی تھی جس کی نیس ایک تکیہ تھی اور یہ بات بھی طے ہوئی تھی کہ اس انجمن میں بیٹھا ہوا آدمی کھڑے کو اور لیٹا ہوا آدمی بیٹھے ہوئے اور کھڑے ہوئے کو کسی کام کے لئے حکم دے سکتا ہے۔ لیٹا ہوا آدمی اول درجے کا کاہل شمار کیا جاتا تھا اور بیٹھا ہوا دوسرے درجے کا اور کھڑا ہوا تیسرے درجے کا سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے عام طور سے اس انجمن کے ممبران دروازے پر پہنچنے کے بعد کھڑے کھڑے لیٹ جاتے تھے تاکہ اسے کام کرنے کے لئے حکم نہ دیا جا سکے۔ اس انجمن کے صدر جگر مرادآبادی جو صدر "الکہلا" یا رئیس الکہلا کہلاتے تھے۔ باقی عہدے نائب الکہلا، ناظم الکہلا اور نقیب الکہلا کہے جاتے تھے۔ اس انجمن نے کچھ دنوں تک بھوپال کو قہقہہ زار بنائے رکھا۔

۱۸۵۶ء میں نواب سکندر جہاں بیگم نے دفتر تاریخ کی بنیاد رکھی تھی جس کے مہتمم نواب صدیق حسن خاں تھے۔ کتابوں کی اشاعت کے لئے مطبع سکندری کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اس زمانے میں یہاں سے کئی اہم کتابیں شائع ہوئی تھیں

اس دور میں یہاں ذاتی کتب خانوں کا رواج بہت زیادہ تھا۔ ابتدا میں نواب فوجدار محمد خاں کا کتب خانہ نادرات کے لئے بہت مشہور تھا۔ بعد میں کتب خانہ حمیدیہ کی بنیاد پڑی جو بہت مشہور ہوئی۔ پھر ۱۹۳۹ء میں علامہ اقبال کی یاد میں

---

[1] گنج ہائے گرانمایہ۔ از رشید احمد صدیقی ص ۱۵۷

اقبال لائبریری کی بنیاد ڈالی گئی جو بہت مفید ثابت ہوئی اور آج تک اردو کی خدمت کر رہی ہے۔

البتہ اس دور میں تعلیم گاہیں زیادہ نہ تھیں۔ ہائی اسکول کا تعلق پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور آگرہ یا الٰہ آباد یونیورسٹی سے تھا۔ لیکن نواب حمید اللہ کے زمانے میں یہاں کے ہائی اسکول الگزنڈریا اور جہانگیریا کا الحاق عثمانیہ یونیورسٹی سے ہو گیا تھا جس کی وجہ سے یہاں کے طلبہ کی اردو سے دلچسپی بڑھ گئی تھی اور معیار بھی بلند ہو گیا تھا۔

شعر و شاعری سے اس زمین کو پہلے ہی سے دلچسپی رہی ہو۔ غالب اور مومن کے یہاں کئی شاگرد تھے اس لئے یہاں ابتدا میں دہلویت کا اثر تھا پھر خاص طور سے نواب صدیق حسن خاں کی آمد کی وجہ سے لکھنؤ سے تعلق بڑھا اور لکھنویت کے آثار نمایاں ہوئے لیکن شعری معیار قائم رہا اور ابتذال سے یہاں کی شاعری محفوظ رہی۔ شاعری کا ذوق یہاں مسلمانوں میں بھی تھا ہندؤں میں بھی اور خواتین میں بھی رہا۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام جب عمل میں آیا تو اس کے صدر قدوس صہبائی بنائے گئے اور احمد علی خاں الیس کامل، ارشد تھانوی، کوثر چاندپوری محمد احمد سبزواری، نہمی ترمذی، اے آر رشدی، صہبا لکھنوی اس کے بنیادی رکن سمجھے گئے۔ انجمن کے ممبروں نے اس تحریک کو زندہ رکھنے اور اس کے ذریعہ ذہنوں میں انقلاب پیدا کرنے کی کوششیں کیں۔

۱۹۴۴ء تک بھوپال کا ادبی پس منظر یہ تھا اس کے بعد ۱۹۴۵ء سے ۱۹۹۴ء تک پچاس سال کی مدت میں یعنی نصف صدی کی ادبی روداد کچھ اس طرح ہے۔

پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوا اور یکم جون ۱۹۴۹ء کو یہ ریاست ہند یونین میں ضم ہو گئی اور پھر کچھ عرصہ بعد یہ شہر بھوپال مدھیہ پردیش جیسے بڑے صوبے کا دارالسلطنت بن کر سامنے آیا۔ یہ ایک خوشی کی بات تھی لیکن اس کے بعد رفتہ رفتہ اس کی پرانی خصوصیات ختم ہونے لگیں سب سے بڑا نقصان اردو کو پہنچا۔ اس کی حیثیت سرکاری زبان کی نہیں رہی نہ اس کو کوئی خاص رعایت دی گئی نتیجہ یہ ہوا کہ سرکاری دفتروں سے اردو کا عمل دخل اچانک ختم ہو گیا۔ ملازمتوں کے حصول میں اردو بے حیثیت نظر آنے لگی۔ البتہ دینی مدرسوں میں اس کی اہمیت میں کمی نہیں آئی۔ اردو اسکولوں میں ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جانے لگی۔ پہلے حمیدیہ آرٹس کالج تھا جہاں اردو ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی تھی پھر حمیدیہ ڈگری کالج کے زمانے میں بھی اس کی حیثیت ایک مضمون کی ہی رہی۔ بعد میں ایم اے اردو کی تعلیم شروع ہوئی اور پھر پی ایچ ڈی کے لئے تحقیقی کام کی ابتدا ہوئی تو اس کالج میں اردو کی سرگرمیاں بڑھیں۔ یہاں کے اردو کے اساتذہ میں جاں نثار اختر، صفیہ اختر، سلیم حامد رضوی، ڈاکٹر گیان چند اور ڈاکٹر ابو محمد سحر کے نام اہم ہیں۔

ڈاکٹر سلیم حامد رضوی نے "اردو کی ترقی میں بھوپال کا حصہ" کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ یہ مقالہ جنوری ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا جو بھوپال میں اردو ادب کی تاریخ پر پہلی اہم کتاب ہے۔ پھر تقریباً پچیس سال بعد ڈاکٹر محمد نعمان نے "بھوپال میں اردو انضمام کے بعد" پر نہایت مفید کام کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اس کی اشاعت کی تیاریاں ہو رہی ہیں اس کی اشاعت کے بعد بھوپال کی اردو ادب کی تاریخ تقریباً مکمل ہو جائے گی۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے اور ڈاکٹر ابو محمد سحر نے اس کالج کے زمانے میں کئی اہم تحقیقی و تنقیدی کام کئے اور طلبہ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے کئی اہم تحقیقی کام کرائے خود ڈاکٹر گیان چند نے حمیدیہ کالج کی ملازمت کے زمانے میں ۱۹۶۰ء میں "اردو مثنویاں شمالی ہند میں" پر ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر نے "امیر مینائی حیات اور خدمات" پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ یہ مقالہ "مطالعہ امیر مینائی" کے نام سے شائع ہوا۔ یہاں سے کئی طلبہ نے ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کیں جن میں ڈاکٹر عبدالودود مرحوم نے "اردو نثر میں ادب لطیف" پر کام کیا۔ یہ مقالہ ۱۹۶۷ء میں نسیم بکڈپو سے شائع ہوا۔ مرحوم کی دوسری کتاب "اردو سے ہندی تک" ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی۔ وفات کے بعد ان کی شریک حیات ڈاکٹر صفیہ ودود نے "مضامین ڈاکٹر عبدالودود" کے نام سے ان کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین کو یکجا کر کے ۱۹۸۴ء میں شائع کیا۔ ڈاکٹر حنیف نقوی نے "شعرائے اردو کے تذکرے" پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ یہ مقالہ ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر یونس حسنی نے "اختر شیرانی اور جدید اردو ادب" پر ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کی۔ یہ کتاب بھی ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی۔ ڈاکٹر خلیل احمد صدیقی نے پی ایچ ڈی کے لئے "ریختی کا تنقیدی مطالعہ" قلم بند کیا۔ یہ مقالہ ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر اخلاق اثر نے ریڈیو ڈرامہ پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ بعد میں یہ مقالہ بھی شائع ہوا اور ڈاکٹر

مختار شمیم نے "ظہیر دہلوی۔ حیات اور فن" پر مقالہ لکھا۔ یہ کتاب بھی شائع ہوئی ڈاکٹر حنیف کیفی نے ایم اے کے لئے "اردو شاعری میں سانیٹ" کے موضوع پر اپنا مقالہ لکھا جو ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا اور ڈاکٹر کشور سلطان نے "جاں نثار اختر حیات اور خدمات" پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ کتاب شائع ہو گئی ہے۔

سیفیہ کالج کے شعبۂ اردو سے بھی طلبہ نے پی ایچ ڈی کے لئے تحقیقی مقالے لکھے اور ڈگریاں حاصل کیں ان میں ڈاکٹر مظفر حنفی، ڈاکٹر صدیقہ بیگم اور ڈاکٹر صغیرہ وغیرہ کے مقالے "شاد عارفی شخصیت اور فن"۔ "نقد بجنوری"، "تخلص بھوپالی حیات اور خدمات" کتابی صورت میں شائع ہوئے۔

مہارانی لکشمی بائی کالج سے بھی طلبہ نے مختلف موضوعات پر پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اردو کی ترویج و اشاعت اور طلبہ میں ادبی ذوق و شوق پیدا کرنے کے لئے ان کالجوں میں مشاعرے ہوتے تھے۔ ادبی محفلیں جتی تقین تحریری تقریری مقابلے ہوتے تھے اور بیت بازی کے نہایت دلچسپ مقابلے ہوتے تھے۔ حمیدیہ اور مہارانی لکشمی بائی کالج میں اردو، ہندی اور انگریزی کے ملے جلے میگزین شائع ہوتے رہے اور سیفیہ کالج میں اردو کا ضخیم "مجلہ سیفیہ" شائع ہوتا رہا ہے۔ ایک زمانے میں شعبۂ اردو سیفیہ کالج سے سہ ماہی "نوائے سیفیہ" کی بھی اشاعت ہوتی تھی۔ ان دنوں میں سیفیہ کالج کے طلبہ اور اساتذہ کے مضامین کے علاوہ دوسرے اہلِ قلم کی تحریریں بھی شائع ہوتی رہی ہیں۔ اس مجلہ کے "غالب نمبر" اور "یادگار اقبال" نے بڑی شہرت حاصل کی۔ شعبۂ اردو سیفیہ کالج نے اردو کا ایک قیمتی اور مفید کتب خانہ بھی قائم کیا جس کے خاص طور سے گوشۂ غالب، گوشۂ اقبال اور گوشہ بھوپال نے بڑی اہمیت اختیار کی ہے۔ اس کتب خانہ میں رسائل کا بھی نہایت اچھا ذخیرہ ہے۔ مجلّہ سیفیہ اور نوائے سیفیہ کے علاوہ اس کالج کے حسب ذیل اردو مطبوعات ہیں:-

(۱) اور ہندوستان جاگ اٹھا (مرتب عبدالقوی دسنوی) (۲) غالب اور بھوپال (عبدالقوی دسنوی) (۳) قادر نامہ غالب (مرتب عبدالقوی دسنوی) (۴) نسخۂ بھوپال اور نسخۂ بھوپال ثانی (عبدالقوی دسنوی) (۵) شہرت غالب بہ گیتی (مرتب حیدر عباس رضوی) (۶) غالب بہ نثر اد نو (مرتبین حیات عمر خان غوری، ظہور الاسلام، اقبال مسعود) (۷) نذر سجاد (مرتب عبدالقوی دسنوی) (۸) ارمغان سیفیہ (مرتبین عبدالقوی دسنوی، محمد نعمان) (۹) جواہر و آزاد (مرتبین عبدالقوی دسنوی، محمد نعمان) (۱۰) علامہ اقبال بھوپال میں (عبدالقوی دسنوی) (۱۱) مسارح حیات (عبدالقوی دسنوی)

نوائے سیفیہ کے تین بھوپال نمبر بھی شائع ہوئے جو مقبول ہوئے۔

شعبۂ اردو سیفیہ کالج میں ادیبوں کے ساتھ دلچسپ اور مفید ادبی محفلیں بھی منعقد ہوتی رہی ہیں جن میں راجیندر سنگھ بیدی، ڈاکٹر محمد مجیب شیخ الجامعہ، ڈاکٹر عابد حسین، صالحہ عابد حسین، پروفیسر احتشام حسین، آنند نرائن ملّا، کیفی اعظمی، سردار جعفری، مجروح سلطان پوری، ڈاکٹر گیان چند جین فیض احمد فیض، مشفق خواجہ، جاں نثار اختر، اختر الایمان، قاضی عبدالستار، مالک رام، ڈاکٹر خلیق انجم، علی جواد زیدی، ساگر سرحدی، رضا عابدی (بی بی سی) تخلص بھوپالی، مرتضیٰ علی شاد وغیرہ سے متعلق تقاریب بہت اہم اس لئے ہیں کہ ان کی وجہ سے طلبہ اور اساتذہ اور نئے لکھنے والوں میں لکھنے پڑھنے کا ایک خاص جذبہ بیدار ہو جاتا تھا اور اردو کے کچھ کرنے کا حوصلہ ملنے لگتا تھا۔ علمی ادبی تقاریب کے لئے سیفیہ کے شعبۂ اردو کی سرپرستی میں مجلس یارانِ اردو، اردوئے معلّیٰ، کاروان سیفیہ اور کاروانِ تحقیق جیسی انجمنیں کام کرتی رہی ہیں۔

یہاں مادھو راؤ سپرے اسمرتی، سماچار سنگھرالیہ نے ۱۹۸۹ء میں "مدھیہ پردیش میں اردو صحافت" کے نام سے ایک معلومات افزا کتاب شائع کی اس کے سرپرست و مرتب اشتیاق عارف، قمر جمال اور شوکت رضوی ہیں۔ اس سنگھرالیہ نے اردو کے پرانے رسائل اور اخبارات کے ساتھ کچھ کتابیں بھی جمع کی ہیں۔

یہاں کئی ادبی انجمنیں بھی ہیں جن کے ذریعہ مشاعرے اور دوسری ادبی تقریبات منعقد ہوتی رہتی ہیں ان میں خاص طور سے رائٹرز گلڈ کے ذریعہ عشرت قادری یہاں کے ادبی ماحول میں گرما گرمی پیدا کرتے رہتے ہیں یہاں کی ادبی انجمنوں کے ذریعہ کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں لیکن انجمنوں کے علاوہ جن لوگوں کی انفرادی طور پر کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ان میں چند نثری کتابیں یہ ہیں:-

• کوثر چاند پوری - "دیدۂ بینا"، "حکیم اجمل خاں خاندان اور شخصیت"، "اطبائے عہد مغلیہ"، "کارواں ہمارا"، "فکر و شعور"، • شرقی خالدی - "مرا زنے"، • ڈاکٹر ابو محمد سحر - "تنقید و تجزیہ"، "اردو میں قصیدہ نگاری"، "انتخاب قصائد"، • عبدالقوی دسنوی - "ایک شہر پانچ مشاہیر"، "سات تحریریں"، "تلاش و تاثر"

"جہدی افادی" • ڈاکٹر حامد حسین۔ "نثر اور انداز نثر"، "تحقیق اور حاصل تحقیق" "جدید ادبی تحقیقات و تعبیرات"، "ہندو فلسفہ مذہب اور نظام معاشرت" • قاضی وجدی الحسینی۔ "برکت اللہ بھوپالی" "ہندوستان اسلام کے سایے میں" "تاریخ قضاۃ و مفتیان بھوپال"، "بھوپال تحریک آزادی کے آئینے میں"، "تاریخ ریاست بھوپال" • ایم عرفان۔ "برکت اللہ بھوپالی" • متین سید۔ "نئی نسل کی نئی غزل"، "غزل گائیکی کے بدلتے رنگ" • جاں نثار اختر۔ "خاموش آوازہ" • ڈاکٹر مظفر حنفی۔ "نقد ریزے"، "جہات و جستجو" • محمود الحسینی "شخصیات" (مرتبہ صادق حسین) • حکیم قمرالحسن۔ "نگارشات" (مرتبہ آفاق حسین) • شمیم احمد۔ "اصناف سخن اور شعری ہیئتیں"، "ادراک" • نسیم شہنوی۔ "مطالعات" • خواجہ محمد یوسف ہما۔ "گل افکار" • ڈاکٹر اخلاق اثر۔ "ریڈیو ڈرامہ کی تاریخ" "مکاتیب احتشام"، "اردو ڈرامے کا مطالعہ"، "ریڈیو ڈرامے کا فن"، "اردو کا پہلا ڈرامہ"، "ریڈیو ڈرامے کی اصناف" • آفاق حسین صدیقی۔ "جاں نثار اختر (شخص اور شاعر)" • خالد عابدی۔ "اردو انٹرویوز" • مہدی جعفر "نئے افسانے کا سلسلہ عمل" • ڈاکٹر محمد نعمان۔ "بھوپال ادب کے سائے میں" • یعقوب یاور "امروز"

ان مطبوعات کے مطالعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بھوپال میں تحقیقی، تنقیدی، علمی ادبی اور تصنیفی سرگرمیاں کس طرح کی رہی ہیں اور ان کا معیار، مزاج اور رجحان کیا تھا۔

انضمام ریاست کے کچھ عرصہ بعد ہی انجمن ترقی پسند مصنفین نے ۲۵ سے ۲۹ جنوری ۱۹۴۹ تک بھوپال میں کل ہند کانفرنس منعقد کی جس کا افتتاح علامہ سید سلیمان ندوی کے ہاتھوں ۲۵ جنوری کی شام کو ہوا۔

اس کے منتظمین میں ڈاکٹر جاں نثار اختر، صفیہ اختر، صہبا لکھنوی، قمر جمال وغیرہ نے بڑی دلچسپی لی جس کی وجہ سے کانفرنس نہایت کامیاب ہوئی بیرونی شرکا میں جوش ملیح آبادی، عصمت چغتائی، کرشن چندر، غلام ربانی تاباں، مجروح سلطان پوری اور بھندر ناتھ شریک ہوئے تھے۔ پانچ دن تک یہ شہر ترقی پسند تحریک کے افکار و خیالات سے سرشار رہا اور ترقی پسند تحریک کی گونج یہاں برسوں سنائی دیتی رہی اور شعر و نثر کے ذریعہ ظاہر ہوتی رہی۔

۱۹۶۲ء میں جب چین نے ہندوستان پر حملہ کیا تو سارے ہندوستان میں خاص طور سے اردو شعرا نے اتحاد و اتفاق کے نغمے الاپے اور حملہ آور چین کے خلاف بڑی جوشیلی نظمیں کہیں۔ بھوپال کے شعرا بھی اس سلسلے میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔

اس موقع پر شعبۂ اردو سیفیہ کالج نے چین کے حملہ کے خلاف کہی گئی اردو شعرا کی انتالیس (۳۹) نظموں کا انتخاب "اور ہندوستان جاگ اٹھا" کے نام سے شائع کیا جس میں بھوپال کے شعرا اظہر سعید خاں، مرتضیٰ علی شاد، اختر نظمی، جہاں قدر چغتائی، ساحر بھوپالی، شفا گوالیاری، کیف بھوپالی، کامل بہزادی اور کرشن موہن کی اس سلسلے کی نظمیں شامل کی گئی تھیں جو ہر طرف پسند کی گئیں۔

فروری ۱۹۶۹ء میں جب سارے ہندوستان میں غالب صدی کا غلغلہ بلند ہوا تو بھوپال نے اس کا استقبال بڑے جوش و خروش کے ساتھ کیا حمیدیہ کالج میں بزم ادب کے زیر اہتمام ڈاکٹر گیان چند کی صدارت میں ۱۲ اپریل ۱۹۶۹ء کو بزم مقالات منعقد کی گئی بعد میں یہ مقالات حمیدیہ کالج کے میگزین کے اردو سکشن میں کچھ اور مقالوں کے ساتھ "غالب نمبر" کی صورت میں پیش کیا گیا۔

شعبۂ اردو سیفیہ کالج نے غالب سے متعلق جلسے کئے اور مجلہ سیفیہ کا "یادگار غالب نمبر" شائع کیا اور حسب ذیل کتابیں شائع کیں۔

(۱) بھوپال اور غالب (عبدالقوی دسنوی) (۲) نسخۂ بھوپال اور نسخۂ بھوپال ثانی (عبدالقوی دسنوی) (۳) نادر نامہ غالب (مرتبہ عبدالقوی دسنوی) (۴) شہرت غالب بر گیتی (مرتبہ حیدر عباس رضوی) (۵) غالب بانداز نو (مرتبہ عمر حیات خاں، ظہور الاسلام، اقبال مسعود)

اور "گوشۂ غالب" کی بنیاد ڈالی گئی جس میں غالب کی تصانیف کے علاوہ ان سے متعلق کتابوں اور نمبروں کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جسے دیکھ کر ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنے اس طرح کے تاثرات کا اظہار کیا تھا۔

"مجھے گوشۂ غالب دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کیوں کہ اس میں نہ صرف غالبیات کی زیادہ تر کتابیں موجود ہیں بلکہ بعض نوادر بھی ہیں۔ ان میں سے چند نوادر کی یہ کیفیت ہے کہ غالبیات کے عالموں نے بھی ان کے نام نہ سنے ہوں گے۔"

عین غالب صدی کے زمانے میں بھوپال میں غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ۱۸۱۶ء کا نسخۂ غالب بخط غالب ملا جو توفیق احمد خاں کے ہاتھوں بھوپال سے باہر چلا گیا۔ جسے بعد میں نسخۂ امروہہ، نسخۂ عرشی زادہ اور نسخۂ لاہور کے

چ۔اپریل ۱۹۸۷ء

ت ۱۰ روپے



عثمان عارف


اندرا گاندھی نمبر

نام دئے گئے۔ اس زمانے میں اس نسخہ نے پورے ہندوستان اور پاکستان میں بڑی دھوم مچادی تھی۔ شعبۂ اردو سیفیہ کالج نے اسے "نسخہ بھوپال ثانی" کا نام دیا۔

غالب سے متعلق اہل بھوپال نے کئی کتابیں شائع کرائیں۔ کوثر چاندپوری کی جہان غالب، عبدالقوی دسنوی کی غالبیات اور مطالعہ خطوط غالب اور ڈاکٹر ابو محمد سحر کی کتاب "غالبیات کے چند مباحث" اسی زمانے کی یادگار ہیں۔

۱۹۷۷ء میں جشن ولادت علامہ اقبال کی سارے ہندو پاک میں بڑی دھوم رہی۔ بھوپال بھی اس جشن میں کتابوں کی اشاعت، اقبال نمبروں میں مضامین تحریر کرکے، اقبال نمبر شائع کرکے اور تقریبات کے ذریعہ نہایت جوش و خروش کے ساتھ شریک ہوا۔

مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے ۱۹۷۸ء میں اقبال سے متعلق سمینار کیا۔ اور بعد میں سمینار میں پڑھے گئے مقالات کو یکجا کرکے "اقبال آئینہ خانہ میں" کے نام سے شائع کردیا۔ مرتب کی حیثیت سے آفاق احمد صاحب کا نام درج ہے۔

سیفیہ کالج نے مجلہ سیفیہ کا یادگار اقبال نمبر شائع کیا۔ انفرادی طور پر اس جشن میں اور اس کے بعد علامہ اقبال سے دلچسپی رکھنے والوں کی یہ مطبوعات منظر عام پر آئیں۔

ڈاکٹر حامد حسین: اردو ترجمہ اسرار خودی

عبدالقوی دسنوی: "اقبال انیسویں صدی میں" "اقبال اور دلّی" "اقبال اور دارالاقبال بھوپال" "اقبالیات کی تلاش" "بچوں کا اقبال" "ہندوستان میں اقبالیات"

ڈاکٹر اخلاق اثر: "اقبال اور شیش محل" "اقبال نامے"

ماسٹر اختر: "ریاست بھوپال اور اقبال (حقیقت کے آئینہ میں)" "اقبال کے کرم فرما"

محمد حیات خاں غوری: "اقبال اور مودودی کا تقابلی مطالعہ"

۱۹۷۳ء میں جشن انیس کے سلسلے میں عبدالقوی دسنوی کا مرتب کردہ "انیس نما" شائع ہوا۔

۱۹۷۷ء میں جشن دبیر کے موقع پر عبدالقوی دسنوی کا مرتب کردہ کتاب نما کا دبیر نمبر شائع ہوا۔

۱۹۸۱ء میں جشن صد سالہ پریم چند کے دوران میں عبدالقوی دسنوی کا مرتب کردہ کتاب نما کا ایک خصوصی شمارہ "دھنپت رائے، نواب رائے، پریم چند" شائع ہوا۔ اس موقع پر مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے پریم چند پر ایک مفید سمینار کیا۔

جشن صد سالہ علامہ سید سلیمان ندوی کے موقع پر دارالعلوم تاج المساجد کے زیر اہتمام ۱۹۸۵ء میں ایک نہایت اہم سہ روزہ سمینار ۲۴ ستمبر سے ۲۶ ستمبر تک منعقد کیا جو ہر اعتبار سے منفرد علمی اجتماع تھا۔ تین دن تک اس سمینار کی وجہ سے شہر میں علمی رونق رہی۔ دارالعلوم نے بڑا کام یہ کیا کہ تمام پڑھے گئے سمینار کے مقالات کو ایک خوبصورت مجلد کتاب "مطالعۂ سلیمان" مرتبہ مسعود الرحمان ندوی، محمد حسان خاں "میں شائع کردیا۔

عبدالقوی دسنوی نے اس موقع پر علامہ سید سلیمان ندوی سے متعلق ایک اشاریہ "یادگار سلیمان" تیار کیا۔ جسے بہار اردو اکادمی نے نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا۔

جشن ولادت مولانا ابوالکلام آزاد کے سلسلے میں ۱۹۸۸ء میں حکومت مدھیہ پردیش کے ڈیپارٹمنٹ آف کلچر نے ایک سمینار منعقد کیا لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ مقالات کی اشاعت کا انتظام آج تک نہیں ہو سکا۔

سیفیہ کالج نے اس موقع پر مولانا آزاد سے متعلق ایک ادبی نشست رکھی اور "جواہر و آزاد" کے نام سے ایک کتاب ۱۹۹۰ء میں شائع کی جس میں مولانا آزاد اور جواہر لال نہرو سے متعلق کئی مضامین اور نظمیں یکجا کی گئی ہیں۔

اس دوران میں عبدالقوی دسنوی کی حسب ذیل مطبوعات منظر عام پر آئیں:

(۱) مضامین لسان الصدق (۲) مطالعہ غبار خاطر (۳) ابوالکلام آزاد (۴) ابوالکلام محی الدین آزاد (۵) ماہنامہ لسان الصدق (۶) یادگار آزاد (۷) ہفتہ وار پیغام (تقدیم ثانی عبدالقوی دسنوی) (۸) تلاش آزاد۔

اردو ادیبوں کی خدمات کے اعتراف میں محکمہ ثقافت حکومت مدھیہ پردیش نے ۸۷-۱۹۸۶ء سے کل ہند اقبال اعزاز دینے کا اعلان کیا۔ پہلے یہ اعزاز پچاس ہزار کا تھا اب ایک لاکھ کا ہوگیا ہے۔ یہ اعزاز اب تک سردار جعفری، اختر الایمان، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، آنند نرائن ملا، مجروح سلطانپوری اور معین احسن جذبی کو دیے جاچکے ہیں۔

مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی طرف سے بھی ایک کل ہند اور آٹھ صوبائی اعزاز دئے جاتے ہیں۔ اردو کتابوں کی اشاعت کے لئے مالی امداد بھی دی جاتی ہے اور اردو کتابیں بھی شائع ہوتی ہیں۔ البتہ یہاں اچھی کتابوں پر انعامات نہیں

دیئے جاتے ہیں۔ کتب خانوں کو مالی امداد دی جاتی ہے۔

یہاں اقبال مرکز کا قیام بھی عمل میں آیا ہے۔ جس کے تحت مخصوص سیمنار ہوتے رہتے ہیں۔

یہاں کے اخبارات کی حیثیت علاقائی ہے۔ مختلف وقتوں میں یہاں سے ندیم، افکار، الحمرا، آفتاب، اردو ایکشن روزنامہ کی حیثیت سے شائع ہوتے رہے ہیں۔ آج کل صرف تین روزنامے ندیم، اردو ایکشن اور آفتاب شائع ہو رہے ہیں۔

یہاں مختلف وقتوں میں ادبی رسائل نکلتے رہے ہیں۔ لیکن عام طور سے انھوں نے مختصر عمریں پائیں۔ آج یہاں سے کوئی ادبی رسالہ نہیں نکل رہا ہے۔

یہاں اردو کے اہم کتب خانے نہیں ہیں جس کی کمی ہمیشہ محسوس کی جاتی ہے۔

نثر نگاروں کا اگر جائزہ لیا جائے تو سب سے پہلے افسانہ نگاروں پر نظر پڑتی ہے۔ یہاں کے افسانہ نگاروں میں خاص نام ہیں کوثر چاندپوری، ابراہیم یوسف، شاہد میر راہی، عیسیٰ صدیقی، قمر جمالی، زہرہ جمال، شفیقہ فرحت، نعیم کوثر، اطہر صابری، شمیم احمد، گھنشیام تومر، اقبال مسعود، مظفر حنفی، یعقوب یاور، اقبال مجید، اقبال جعفری، کوثر جہاں، مختار شمیم، نشار راہی، رضیہ حامد قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں چند افسانہ نگاروں کے افسانوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں جو یہ ہیں:

آوازوں کی صلیب (کوثر چاندپوری) رات کا سورج (کوثر چاندپوری) شعلۂ سنگ (کوثر چاندپوری) پرشور خاموشی (آفاق احمد) نئے راستے (شاہد میر راہی) مشعل (کبیر کوثر) یادوں کے چراغ (اقبال جعفری) جادو نگری (کوثر جہاں) پسِ غبار (مختار شمیم) بازیافت (فرحت جہاں) سنہری پت جھڑ (نشار راہی) اینٹ کا جواب (مظفر حنفی) دو غنڈے (مظفر حنفی) دیدۂ حیراں (مظفر حنفی) زخم ہنستے ہیں (اطہر صابری) روشنی کے چھینٹے (سکندر ضمیر)

ان سب کے افسانے زندگی کے مختلف پہلوؤں، احساسات، جذبات، مسائل و مشکلات، حادثات و واقعات سے روشناس کراتے رہے ہیں۔

ناول نگاروں میں اس دور میں کوثر چاندپوری کا نام اہم ہے ان کے چودہ[1] ناول شائع ہو چکے ہیں جن میں "پتھر کا گلاب"۔ ویرانہ، داستانیں، اغوا، سب کی بیوی، توڑ دو زنجیریں، پیاسی جوانی، ہنی مون، فریدہ موہن کی ڈائری، ساکھ اور کلیاں، محبت اور سلطنت، شامِ غزل، سکرات زندگی[1]، عشق نہ دیکھے، پتھر کا گلاب، گوشہ لگا بھگوان اہم ہیں۔ کوثر چاندپوری کے بعد سب سے زیادہ ناول وسیم بانو قدوائی نے لکھے ہیں جن میں چند یہ ہیں "آنسو بہا لے" "کوئی ہری جنت"

جگمگاتے اندھیرے۔ "غبار کے پیچھے"، سہانی آنچ، "نفرت کی آندھی"، "مسیحا"، "معصوم گناہ"، "سنہرا سنگم"۔ "خاموش آہ"۔ "ابھی راہیں"۔ "احساس کی جھنکار"۔ "آندھی کا گیت"۔ "مرحوم"

ان کے علاوہ آبلے اور منزلیں (ابراہیم یوسف) چوٹ پر چوٹ (آصف شاہ میری) فریبِ تمنا (ہارون ایوب) درد آہٹوں کا (ہارون ایوب) وغیرہ شائع ہوئے ہیں۔

بھوپال کے ڈرامہ نگاروں میں سب سے اہم نام ابراہیم یوسف کا ہے جنھوں نے ڈرامہ کے فن، فنکار اور تاریخ پر کئی کتابیں قلمبند کیں۔ اور ڈرامے بھی قلمبند کئے۔ ان کے ڈراموں کے مجموعے یہ ہیں "سوکھے درخت"۔ "دھوئیں کے آنچل"۔ "طنزیہ ڈرامے"۔ "پانچ چھ ڈرامے"۔ اور "دو اداس موڑ"

بھوپال کے دوسرے ڈرامہ نگاروں میں جہاں قدر چغتائی، مرتضیٰ علی شاد مرحوم، رشید انجم، نضل تابش، خالد عابدی، شفیقہ فرحت، نعیم کوثر اور قمر جمالی کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ ان میں رشید انجم کے ڈرامے "فرعون" اور "صلیب زندہ ہے" کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔

طنز و مزاح کے میدان میں ملا رموزی کے بعد سب سے بڑا نام تخلص بھوپالی کا آتا ہے۔ انھوں نے پاندان والی خالہ (تین حصے) پوسٹ مارٹم، شیطان جاگ اٹھا اور غفور میاں کے ذریعہ بھوپال کی تہذیب و زبان اور انداز فکر سے نہ صرف روشناس کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ انھیں اس طرح محفوظ بھی کر دیا ہے کہ آئندہ بھی بھوپال کی ان خصوصیات سے آگاہی ہوتی رہے۔ تخلص مرحوم کے علاوہ نثر کے میدان میں شفیقہ فرحت، ماسٹر اختر اور مصطفیٰ تاج کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی یہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ لو آج ہم بھی (شفیقہ فرحت)، اب میں کیا کروں؟ (مصطفیٰ تاج) روبرو (ماسٹر اختر) اس میدان میں جوہر قریشی اور جہاں قدر چغتائی کے نام بھی اہم ہیں لیکن ان کے مضامین کے مجموعے اب تک شائع نہیں ہوئے ہیں۔ جہاں تک مزاحیہ شاعری کا تعلق ہے محمد ایم نعمی اس میدان میں بڑی سنجیدگی کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں

---

[1] بھوپال میں اردو انضمام کے بعد۔ ڈاکٹر محمد نعمان۔ غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی ص ۱۹۰۔ کوثر چاندپوری کے ناولوں کے نام مجھے ڈاکٹر نعمان کے اس مقالہ سے بھی ملے ہیں۔ عبدالقوی دسنوی

ان کی دو کتابیں ۔ آہ سے واہ تک [redacted] ہے۔ ان کے علاوہ ساجد یحییٰ کی "نگوڑیات" شائع ہوئی ہے۔

جہاں تک شعر و شاعری کا تعلق ہے۔ یہاں [redacted] معاملے میں شعراء ہمیشہ بہت زیادہ رہے ہیں۔ پچھلے پچاس [redacted] شعری فضا میں چہل پہل شعراء پیدا کرتے رہے ہیں۔

یوسف قیصر، محوی صدیقی، حامد [redacted]، ذکری بھوپالی، شعری بھوپالی، وکیل بھوپالی، فضل علی سرور، [redacted] اشارا اختر، سورج کلا سرور، عظمت بھوپالی، عمران انصاری، ساحر بھوپالی، [redacted] بھوپالی، کیف بھوپالی، عرشی بھوپالی، نسیم بھوپالی، مقصود عرفان، محمد علی تاج، [redacted] خان، اظہر سعید خاں، ابو محمد سحر، تسنیم فاروقی، قیصر محمود، شباب [redacted] صدیقی، مظفر حنفی، عشرت قادری، شاہد بھوپالی، [redacted]، نصرت صدیقی، کبیر کوثر، واحد پریمی، اختر نظمی، وقار کاظمی، حامد [redacted] محمود، شاہد میر، انصار الفطر، ظفر صہبائی، فضل تابش، نور [redacted] ناز ہاشمی، محمد یوسف ہما، رہبر جونپوری، علی عباس امید، اویس کاوش، [redacted] رموزی، اختر علی خان، امیاز [redacted] نیازی، حفیظ بھوپالی، آنند موہن اعجاز، طرزی بھوپالی، عابدا اختر، [redacted] دانش، مختار شمیم، شفق تنویر، مظفر رئیس، کاشف الہاشمی، عبدالمتین نیاز، [redacted] فرخی، یعقوب [redacted]، افتخار آذر، خالد غنی، آصف منظور، ایاز قمر، حبیب [redacted] جذباتی، نور محمد یاس، تاج الدین تاج، احمد پکاش، حامد حسین شاد، [redacted] دتے، رضا رامپوری، سکندر منیر، بنیر الحوی، کوثر صدیقی، منظر بھوپالی، [redacted] رضوی، کاظم رضا راہی، عبدالغنی ساحر۔

وغیرہ کے نام یاد آتے ہیں۔ [redacted] شعراء کے شعری مجموعے شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ یہاں نمونے کے لئے چند مرحوم شعراء کے کلام پیش کیے جاتے ہیں:

نہ آنا تو بہت آساں ہے جب چاہا نہیں آئے
مزا جب ہے کہ آؤ اور گھبراتے ہوئے آؤ

——— -اسد بھوپالی

ہم سے خراب حال و دوانوں کا غم نہ کر
عبرت بھی ہو گئے تو بُرا کام کر گئے

-تاج بھوپالی

تم ہو وہ کہانی جو بھلانے سے نہ بھولے
میں ہوں وہ مسافر جو کسی کو نہ رہا یاد

———— شعری بھوپالی

اس ستم گر کو ستم گر بھی نہیں کہہ سکتے
ہائے ہم عشق کے ماروں کی زباں تو دیکھو

———— کیف بھوپالی

یہ سب حالات کی بازی گری ہے
وطن میں دور ہیں جو ہم وطن سے

———— واحد پریمی

ہمیں سے زندگی پائی دلِ زمانہ نے
ہمیں پہ تنگ ہوئیں وسعتیں زمانے کی

———— مرتضیٰ علی شاد

وہ لوگ کرتے ہیں تفسیر موسم گل کی
جنھیں طلسم بہار و خزاں نہیں معلوم

———— وکیل بھوپالی

یہ رات بہت تاریک سہی یہ رات بھیانک لاکھ سہی
اس رات کے سینے سے پیدا اک صبح درخشاں کرنا ہے

———— عرشی بھوپالی

اک عمر گزاری ہے تب راز یہ سمجھا ہے
جو کچھ ہے محبت ہے دنیا ہے نہ عقبیٰ ہے

———— بختیار ضیاء

کھُل گئے فکر نو کے دروازے
دل نے پھر سے چوٹ کھائی ہے

———— مقصود عرفان

یہ ہے بھوپال کے ادبی سفر کی نصف صدی کا جائزہ جس سے یہ اندازہ ہو ہی جاتا ہے کہ نثر نظم دونوں میدان میں بھوپال نامواقف حالات اور وسائل کی کمی کے باوجود کچھ نہ کچھ کرتا رہا ہے۔ شاعری کا یہاں ابتداء سے زور زیادہ رہا ہے اس لئے شاعروں کی کمی کسی زمانے میں محسوس نہیں کی گئی۔ البتہ اب ایسے شعراء بھی شعری محفلوں میں نظر آتے ہیں جو اردو رسم الخط سے ناواقف ہونے کی وجہ

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی
بیرو باڑی۔ گوہاٹی ۱۶-۷۸۱

آسام میں ادبی سرگرمیاں

بیرونِ ریاست آسام کہہ لائے جانے والے [illegible] پردیش کو باشندگان آسم (ASOM) تلفظ کرتے ہیں اور اپنی زبان کو [illegible] کہتے ہیں۔ ملحوظ رہے کہ س، ش کو اسمیہ بھاشا میں بالترتیب پرتھم سا (اوّلین سن) دوم کو دُتیہ سا (द्वितीय स) اور ش کو سا اور [illegible] کی طرح تلفظ کرتے ہیں۔ آسم پردیش میں دو زبانیں اسمیہ اور بنگال سر فہرست ہیں۔ [illegible] تحریروں پر نظر ڈالنے سے پیشتر ابھی کچھ اور ملحوظات کو پیش نظر رکھنا [illegible] ضروری ہے۔ بنگالی کا رواج کاری کے اضلاع کچھار، ہیلاکانڈی اور کریم گنج [illegible] کی بیشتر آبادی بنگلا دیش (سابق مشرقی پاکستان) سے بھارت کو نقل [illegible] نے پر مجبور خاندانوں پر مشتمل ہے نیز گوالپاڑہ ضلع جو برہم پتر وادی [illegible] ہے بنگالی مروج ہو مگر اس ضلع کے لوگ اپنی زبان کو بنگالی نہ کہہ کر [illegible] کہتے ہیں۔ لسانی اعتبار سے یہ پردیش ۱۵۶ زبانوں اور بولیوں کا عجائب گھر ہے۔ برہم پتر وادی میں اسمیہ زبان کا بول بالا ہے اور یہی پردیش کی سرکاری زبان ہے۔ بنگالی کو دوسری راجیہ بھاشا بنانے کے مطالبہ پر بھری سے دریائے برہم پتر میں [illegible] خون بہنے لگے۔ وہ تو کہئے بنگالی دل و دماغ صورت حال کو [illegible] ہے بخوبی واقف ہے لہٰذا بنگالیوں نے کبھی زبان [illegible] تعلق سے کوئی فتنہ و فساد برپا کرنے سے گریز کیا ہے جبکہ اسمیہ اور بنگالی [illegible] رسم الخط ایک ہی سا ہے صرف ر . ر . کو (ৰ) بنگالی میں (ব) [illegible] یہ میں ৰ (پیٹ چرا ৰ) لکھتے ہیں۔ ایک آدھ فرق اور ہے۔ لفظیات [illegible] کی ۹۰ ، ۹۵ فی صد ایک ہی ہیں۔

غرض کہ اس ریاست میں ثقافت کے [illegible] ترسیل میں اسمیہ زبان کو نفیسی کردار کا حامل سمجھنا چاہئے۔ اردو [illegible] نقطۂ نظر سے یہ سب کچھ پس منظر کے بطور پیش کیا گیا ہے۔ آسام میں [illegible] اور عربی زبانوں کو ISLAMIC STUDIES کہتے ہیں یعنی تنظیم اسلامی مطالعات میں شامل ہیں۔ عربی پڑھانے والے مدارس کو مدرسہ اسکول کہا جاتا ہے۔ مدرسہ ہائی اسکول اور مدرسہ ہائر سکنڈری اسکول امتحان کو ہائی اسکول اور ہائر سکنڈری اسکول کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ مدرسہ اسکولوں میں اردو بھی پڑھائی جاتی ہے مگر مدرسہ میں اردو پڑھائی سے کوئی ادبیاتی نتائج نہیں ابھرتے۔ اردو میں لکھی ہوئی دینی کتب کی اردو بھی ملائی ہوتی ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اسمیہ اور بنگالی اردو کے ادیب نہیں ہو سکتے۔ یہاں ایک اور حقیقت کو پیش کرنے سے غالباً مزید وضاحت ہوگی۔ فارسی کی تعلیم کے لئے یونیورسٹی سطح تک التزام کیا گیا ہے وہ پروفیسر اور طلبہ جو مقامی ہوتے ہیں ٹائپ میں مطبوعہ فارسی کتب ہی پڑھ سکتے ہیں۔ ہاں نصابی کتب میں غالب و اقبال کو ٹائپ میں بخوبی پڑھ سکتے ہیں۔

اردو داں حضرات صرف وہ ہیں جو باہر سے آئے ہوئے ہیں۔ اپنی زبان و ادب کو بہ محبت سینے سے لگائے ہوئے ہیں مگر یہ محبان اردو چونکہ مختلف و متعدد شعبوں سے تعلق رکھتے تھے لہٰذا جو کام بھی کیا گیا اس کو انفرادی حیثیت ہی حاصل رہی۔ میں انگریزی کا پروفیسر ہو کر ۱۹۵۸ء میں آسام آیا اور قریب ۲/۱ ۱ سال پی جی کلاسز کو پڑھاتا رہا۔ بعد ازاں ریاستی انتخابی کمیٹی نے پرنسپل کے عہدے پر فائز ہونے کے لئے میرا انتخاب کر لیا۔ یونیورسٹی میں باہر سے آئے ہوئے فارسی و عربی کے پروفیسروں نے مجھ سے تعلقات استوار کرنا شروع کر دئے کیونکہ بطور ناقد اردو ادب میں میرا نام و مقام شہرت پذیر ہو چکے تھے۔ ریٹائر ہونے کے چند سال بعد گوہاٹی میں اپنے رہائشی مکان پر اقبال اسٹڈیز سنٹر قائم کیا۔ پہلے پہل صرف اقبالیات ہی تک مختص تھا اور اس کی مجالس انگریزی و فارسی زبانوں ہی میں ہوا کرتی تھیں مگر مرور ایام کے ساتھ اردو زبان و ادب کو بھی فروغ حاصل ہوتا گیا

اور انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ اس فروغ پذیری کو دوردرشن کے پروگراموں نے ہیز کیا بالخصوص صنف غزل کی گائکی سے بکھرنے والے رنگ آہنگ نے اسمیہ دل ودماغ بھی مسحور ہوتے چلے گئے۔ بے شمار طلبہ نے اردو سیکھنے کے لئے مجھ سے رابطہ قائم کیا۔ گفتگو کے دوران یہ حقیقت وانکشاف ہوئی کہ وہ غزل کی تفہیم کی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے خواہشمند ہیں لہٰذا میں نے سنٹر کی ایک میٹنگ میں مجوزہ امور پر غور وخوض کرنے کے لیے ایک ضمنی کمیٹی کی تشکیل کی جس کی تین نشستوں میں درج ذیل خطوط پر کام کرنے کا فیصلہ لیا گیا۔

(۱) غزل میں مستعمل لفظیات کی فہرست ترتیب دی جائے۔

(۲) ہر لفظ کے معنی ومفہوم، استعاراتی پس منظر بیان کیا جائے۔

(۳) غزل، رباعی، قطعہ کے اصناف عملاً لفظیات کی سطح پر یکساں ہوتے ہیں لہٰذا آسام کی ثقافت بالخصوص اسمیہ ادبیاتی رنگ وآہنگ سے بھرپور ثقافت میں لفظیات کو کشید کیا جائے۔

ایسے ہی دیگر پروگراموں پر ارتکاز نظر کرتے ہوئے کام کیا گیا۔ نتیجتاً اب سنٹر میں ایسا مواد بہ کوشش بسیار دستیاب وتیار ہوگیا ہے جسے اردو کی تدریس وتفہیم کے لئے استعمال میں تین سال سے لایا جارہا ہے۔ اس موضوع پر ایک علاحدہ مضمون درکار ہے جو میں بعد کو لکھوں گا اور نیا دور ہی کو دوں گا۔

سینٹر کے زیر اہتمام محافل مذاکرہ یعنی سیمناروں کا انعقاد بھی کیا جاتا ہے ابھی تک جو اہم سیمنار ہوئے ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ غالب اور بیدل ... رنگ وآہنگ بیدل کے پس منظر میں۔

۲۔ سرسید احمد خاں پر روہیلکھنڈ کے اثرات

۳۔ چکبست واقبال

۴۔ اسمیہ شاعری اور افسانوی ادبیات پر ہندی اور اردو کے اثرات۔

۵۔ اسمیہ زبان وادب کی لفظیات ہندی سے قریب ہے کہ اردو سے:

۶۔ بہار کے سابق گورنر دیوکانت بروا، رگھونا تھ چودھری کی شاعری میں اردو شاعری کی بازگشت۔

۷۔ انگریزی اور امریکی فکشن کا اردو افسانوی ادب پر اثر۔

۸۔ اسمیہ شعر وادب اور آسام میں سکونت پذیر اردو علاقوں سے آئے ہوئے عوام۔

۱۹۹۵ء سے شروع ہونے والے سال کے لئے سیمناروں کے لئے موضوعات کی فہرست ترتیب دی جاچکی ہے۔ یہاں ایک موضوع کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کیونکہ نوعیت کے اعتبار سے جدت کا حامل بھی ہے اور افادیت سے بھرپور بھی۔ موضوع ہے۔ ہند وپاکستان کے موقر ادبیاتی جرائد کا تجزیہ: اقبال سٹڈیز سنٹر کی لائبریری میں قریب قریب سبھی جریدے آتے ہیں۔ جن میں پاکستان کے جرائد میں ارتقار، طلوع افکار، منشور، کندن اور ہمارے ملک کے جریدوں میں شاعر بمبئی، کتاب نما دہلی، زبان وادب پٹنہ، نیا دور لکھنؤ وغیرہ خصوصی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ ہماری زبان ہفتہ وار اور اردو ادب بھی مقبول ہیں۔

آسام میں اردو خاصی ترقی پر گامزن زبان وادب ہے۔ ہمارا سنٹر محدود مرکز ہے جو بغیر امداد چلایا جارہا ہے۔ ایک بہت بڑی خدمت جو سنٹر انجام دے رہا ہے وہ ہے RESEARCH COUNSELLING یعنی فارسی وعربی کے ریسرچ اسکالرز کو تحقیقی مشورے دینا اور ابھی تک سنٹر کی اعانت سے ۵ طلبہ پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرچکے ہیں۔

حاصل کلام اردو ادبی ذوق وشوق آسام میں روز افزوں ترقی کررہا ہے مستقبل اور بھی تاباں ودرخشاں ہوگا۔

□□

بھوپال کے ادبی سفر کی نصف صدی

صفحہ ۱۲۲ کا بقیہ

سے دیوناگری میں اپنا کلام لکھتے ہیں اور اپنی کم مائگی کو محسوس نہیں کرتے۔ پھر بھی ابھی بھوپال میں ایسے شعراء کی کمی نہیں ہے جن کی آوازیں اپنی پہچان رکھتی ہیں۔ جو دلوں کو چھوتی ہیں اور کیفیت پیدا کرتی ہیں۔ البتہ نثر کا میدان خالی خالی نظر آتا ہے۔ اگرچہ یہاں ڈرامہ نگار بھی ہیں، ناول نگار بھی اور افسانہ نگار بھی، پھر بھی نثر کا حال تشفی بخش نہیں ہے۔ طنز ومزاح کا حال بھی اچھا نہیں ہے لیکن ان کے مقابلے میں تحقیق وتنقید کا میدان زیادہ سنسان ہوتا جارہا ہے اس لئے کہ تحقیق کے لئے جس صبر وضبط اور مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے وہ عام طور سے ناپید ہے اور تنقید کے لئے جس خبر ونظر کی ضرورت ہوتی ہے وہ عام طور سے میسر نہیں ہے۔ وجہ ظاہر ہے، کتب بینی کا شوق ختم ہورہا ہے۔ اخبارات اور رسائل سے بے توجہی بڑھتی جارہی ہے۔ ایسا اس لئے ہورہا ہے کہ تعلیم گاہوں میں اردو ختم ہورہی ہے، گھروں سے اردو نکل رہی ہے۔ یہ اردو بولنے والوں کے لئے سوچنے کی بات بھی ہے اور فکر مند ہونے کی بات بھی ہے۔

□□



راجندر بہادر موج
موج مارگ۔ فتح گڑھ (یوپی)

گزشتہ نصف صدی میں فرخ آباد کا ادبی سفر

میر ان نیم باز آنکھوں میں   ساری مستی شراب کی سی ہے
میر

دیا ہے خلق کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے   بنا تھا عیش تجمل حسین خاں کیلئے
غالب

کوئی نام و نشاں پوچھے تو اسے قاصد یہ کہہ دینا
تخلص داغ ہے اور عاشقوں کے دل میں رہتے ہیں
داغ

اشراف کا بناؤ رئیس کی شان ہے
شاہوں کی آبرو ہے سپاہی کی جان ہے
انیس

نالۂ بلبلِ شیدا تو سُنا ہنس ہنس کر   اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی
جوہر (رادھو رام)

ضلع فرخ آباد کبھی ہندوستان کے اردو ادبی نقشے پر ایک اہم مقام تھا اور علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ میر، غالب، داغ، انیس اور جوہر جیسے عظیم شاعروں کی مہمان نوازی کا شرف اسے حاصل رہا۔ انھیں نامور ہستیوں کے قدوم میمنت لزوم سے یہاں کی ادبی سرگرمیوں کو فروغ ملتا رہا۔ مندرجہ بالا اشعار وہی ہیں جو ان حضرات نے دورانِ قیام فرخ آباد کہے۔ مرزا رفیع سودا نے بھی یہاں قیام کیا۔ اور مرزا کلب حسین خاں نادر بحیثیت ڈپٹی کلکٹر یہاں آئے تھے اور جنھوں نے محمد اسمٰعیل منیر شکوہ آبادی کے خلاف بغاوت کے مقدمے کی سماعت کی تھی۔ انھیں یہ جگہ اتنی پسند آئی کہ وہ یہیں کے ہوگئے۔ انھوں نے موجودہ موج روڈ فتح گڑھ پر ایک عالی شان امام باڑہ تعمیر کرایا اور یہیں سپردِ خاک ہوئے۔ اسی دور میں لالہ رادھو رام جوہر نے بھی فرخ آباد کو رونق بخشی۔ ان دونوں کے تلامذہ یہاں کثیر تعداد میں تھے اور اس وقت ادب کو بہت عروج حاصل ہوا اس حسین ادبی ماضی کی یادگاریں جگہ جگہ ابھی موجود ہیں۔

پچھلی نصف صدی میں یہاں اعلیٰ پیمانے کی ادبی چہل پہل رہی ملک کے نامور مرحوم شعرا مختلف ادبی تقریبوں اور کل ہند مشاعروں میں شرکت کرتے رہے۔ جگر مرادآبادی نے تو یہاں مہینوں قیام کیا علّامہ سرشار سیکش اکبرآبادی بالخصوص عرش ملسیانی، انور صابری، اسرار الحق مجاز، علّامہ نشور واحدی، سکھدیو پرشاد بسمل الہ آبادی، روش صدیقی، امین سلونوی، عزیز سلونوی، فنا نظامی کانپوری، دل لکھنوی اور سرورش اناوی کے نغمات سے یہاں کی فضا گونجتی رہی۔ دورِ حاضر کے معروف شعرا میں بھی شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے یہاں کی ادبی محفلوں میں شرکت نہ کی ہو۔

پچھلی پانچ دہائیوں کی مدت میں ضلع کے بہت سے بزرگ اور نامی شعرا راہی ملکِ عدم ہوئے اور کچھ نئے شعرا نے یہاں کی دنیائے سخن کو جگمگایا۔

فرخ آباد اور فتح گڑھ قریب چار کیلو میٹر کے فاصلے پر دو الگ الگ شہر واقع ہیں۔ جن میں فتح گڑھ ضلع کا صدر مقام ہے مگر دونوں کی نگر پالیکا ایک ہے دونوں شہروں کے شعرا کی سہولت کے مدِ نظر اعلیٰ پیمانے کے مشاعروں کے علاوہ ماہانہ نشستیں دن میں ہی ہوتی رہی ہیں۔ ماہانہ نشستوں میں بھی باہر کے شعرا کو مدعو کیا جاتا ہے۔

فرخ آباد میں ڈاکٹر برج ناتھ سرین ایک طویل مدت تک چیرمین میونسپل بورڈ (نگر پالیکا) رہے۔ ان کا دولت کدہ ماہانہ نشستوں کے لئے مخصوص رہا اور ان کی مہمان نوازی مشہور رہی۔ جناب خانصاحب امجد علی خاں رئیس فرخ آباد کی کوٹھی پر بھی ادبی تقاریب ہوتی رہیں مگر یہ دونوں ہستیاں ۱۹۷۵ء کے آس پاس راہی ملکِ عدم ہوگئیں۔ فتح گڑھ میں راقم الحروف کے غریب خانہ پر نشستیں ہوتی رہیں اور شعرائے بیرون جات آتے رہے۔ راقم الحروف کل ہند مشاعروں کا اہتمام کرتا رہا۔ اس دور کے مقامی شعرا میں

جنھوں نے بحیثیت شاعر فرخ آباد کا نام روشن کیا ہے۔ جناب غلام ربانی تاباں کو امتیازی مقام حاصل ہے۔ تاباں صاحب کی ولادت ضلع کے مشہور مقام گرام پتورہ تحصیل قائم گنج میں ہوئی۔ آگرہ میں تعلیم کے دوران مزاحیہ شاعری کرتے تھے اس وقت ان کا تخلص فریچٹ تھا۔ فتح گڑھ میں ۱۵ - ۱۴ سال بسلسلۂ وکالت قیام کیا اور تاباں تخلص اختیار کیا۔ یہاں سے مکتبہ جامعہ کے جنرل منیجر ہو کر دہلی چلے گئے۔ ان کے کئی شعری مجموعے، ساز لرزاں، حدیث دل، ذوق سفر اور نوائے آوارہ وغیرہ شائع ہو چکے ہیں۔ یوپی اردو اکاڈمی نے انھیں ایوارڈوں سے نوازا۔ سوویٹ لینڈ نہرو ایوارڈ اور ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ بھی ملے اور صدر جمہوریہ نے انھیں پدم شری اعزاز بھی دیا۔ فروری ۱۹۹۴ء کو یہ مالک حقیقی سے جا ملے۔ ان کا ایک شعر ہے۔

ہونٹ جلیں یا سینہ سلگے کوئی ترس کب کھاتا ہے
جام اسی کا جس نے تاباں جرأت سے کچھ کام لیا

دیگر شعراء کے ذکر سے پہلے فتح گڑھ کی ایک ایسی شخصیت کا ذکر بھی ضروری ہے جو شاعر نہ تھے مگر جب تک حیات رہے کوئی مشاعرہ بغیر ان کے کامیاب نہ ہو سکا۔ انھیں خاص طور پر مشاعروں میں لے جایا جاتا تھا۔ وہ تھے جناب سید اشفاق حسین عرف قیصر جرمنی۔ یہ لقب انھیں اس لئے ملا تھا کیونکہ ان کی شکل و شباہت اور خاص طور پر مونچھیں قیصر جرمنی کی طرح تھیں۔ یہ بڑے صاحب دل تھے اور ہر دلپذیر شعر سن کر بیخود ہو جاتے تھے اور وارفتگی کے عالم میں اس طرح تعریف کرتے تھے کہ نیا شخص یہ سمجھے کہ مذاق کر رہے ہیں مگر وہ نہایت سنجیدگی سے مدح سرائی کرتے تھے۔ ایسا ہی ایک بار ہوا۔ مرحوم جناب امجد علی خاں صاحب کی کوٹھی پر ایک کل ہند مشاعرہ میں جگر مرادآبادی غزل سرا تھے جیسے ہی انھوں نے یہ شعر پڑھا:-

یہ عشق نہیں آساں اتنا ہی سمجھ لیجے   اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

بس جناب اشفاق حسین صاحب کی حالت غیر ہو گئی۔ ان کی زبان پر یہی الفاظ تھے۔ واہ واہ سبحان اللہ! وہ متواتر یہی کہتے رہے۔ جگر صاحب نے سمجھا یہ مذاق کر رہے ہیں۔ وہ برہم ہو کر ڈائس سے چلے گئے مگر جب انھیں سمجھایا گیا کہ یہ حضرت صاحب دل ہیں اور سخن شناسی کا اچھا مذاق رکھتے ہیں اور صحیح معنوں میں اچھے شعر کی داد دیتے دیتے بیخود ہو جاتے ہیں جگر صاحب دوبارہ تشریف لائے اور خاص طور پر اشفاق صاحب کی جانب مخاطب ہو کر کئی اشعار پڑھے۔ جگر صاحب کی یہ غزل شاہکار ہے۔ ہر شعر ایک سے ایک بلند ہے۔ اشفاق صاحب داد دیتے رہے اور جگر صاحب لطف اندوز ہوتے رہے جب جگر صاحب نے مقطعہ پڑھا کہ۔

آنسو تو بہت ہیں آنکھوں میں جگر لیکن
بندھ جائے تو موتی ہے رہ جائے تو دانا ہے

اس وقت اشفاق صاحب کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور واہ واہ سبحان اللہ سبحان اللہ ورد زبان تھا۔ اشفاق صاحب ۱۹۷۸ء میں دار فانی سے کوچ کر گئے۔

نشور واحدی صاحب کو بھی فرخ آباد سے والہانہ محبت تھی۔ غالباً پچیس سال قبل فتح گڑھ میں ایک مشاعرہ تھا جس کا کنوینر راقم الحروف تھا۔ اسی دن کانپور میں بھی حلیم مسلم کالج میں بھی ایک مشاعرہ تھا مگر نشور صاحب اپنے وہاں کے مداحوں سے چھپ کر بذریعہ بس فتح گڑھ آ گئے۔ لوگ انھیں ٹرین پر تلاش کرتے رہے۔

جب تک سفر کے قابل رہے جناب آیرن سلونوی یہاں کے بیشتر کل ہند مشاعروں میں نظامت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد جناب قمر رشید کانپوری نے یہ فرض سنبھالا۔ افسوس اب وہ بھی نہیں رہے۔

اس ضلع کے سپوتوں میں صدر جمہوریہ مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین بھی شاعر و ادیب تھے مگر سیاست میں نمایاں حصہ لینے کی وجہ سے انھیں لوگ اس حیثیت سے کم جانتے ہیں۔ ان کے یہ اشعار دیکھیں۔

مانا ہجوم درد بھی ہے جزو زندگی   پُرکیف زندگی نہ سہی زندگی تو ہے
للہ اس کے ذکر سے نفرت نہ کیجئے   ذاکر شگفتہ حال نہیں آدمی تو ہے

اسی سلسلے میں ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب عابد متوطن موضع داعی پور تحصیل قنوج ضلع فرخ آباد کا ذکر بھی ضروری ہے۔ ڈاکٹر صاحب ادیب فلسفی مفکر، دانشور اور شاعر سب ہی کچھ تھے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی سے وابستہ رہے۔ ان کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیں۔

اہل دنیا ہیں فقط صورت شناس روز عیش
شام غم کی تیرگی میں کون کس کا آشنا

اس نصف صدی کے شعرا میں پہلے ان کا ذکر ضروری ہے جو سالوں ضلع کی دنیائے ادب پر چھائے رہے اور اسی مدت میں راہی ملک عدم بھی ہو گئے

ان شاعروں کے طور طریقے، لباس اور شعر پڑھنے کا اپنا مخصوص انداز تھا
جناب حکیم الدین برق نہایت خوش گو اور خوشحال شاعر تھے وہ دو زانو بیٹھ کر پڑھتے تھے مگر قافیہ تک آتے آتے گھٹنوں کے بل کھڑے ہو جاتے تھے اور رک جاتے تھے۔ توقع یہ کرتے تھے کہ ردیف کو سامعین پورا کریں۔ ایک طرحی مشاعرے میں انھوں نے یہ مطلع پڑھا۔

مبارک ہو جناب قیس کو چکر بیاباں کا   ہمارے واسطے کافی ہے دورہ کوئے جاناں کا

بیاباں، اور جاناں، کے بعد رک گئے۔ اور سامعین نے کا کہہ کر شعر پورا کیا۔ سامعین سے یہ بھی امید کرتے تھے کہ وہ زیادہ سے زیادہ شور مچا کر انھیں داد دیں اس نصف صدی کے اوائل ہی میں انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

نواب بھگوت نرائن شائق فرخ آبادی باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے بیک وقت اچھے شاعر، اچھے مصور بھی تھے۔ موسیقی سے کافی لگاؤ تھا غرضکہ ہر فن لطیفہ میں انھیں دخل تھا۔ ادب نوازی اور مہمان نوازی کے لئے بھی مشہور تھے اسی لئے نواب صاحب کے نام سے موسوم ہو گئے ۱۹۵۱ء میں راہیِ ملک عدم ہو گئے۔ انکی وفات کے بعد ادارہ فروغ اردو لکھنؤ نے ان کا شعری مجموعہ کلیاتِ شائق کے نام سے شائع کیا۔ ان کا ایک شعر دیکھیں۔

ذوقِ جمالِ یار نے جلوہ جہاں دکھا دیا   سجدہ بے نیاز نے کعبہ وہاں بنا دیا

جناب شیر سنگھ شبنم حضرت عزیز لکھنوی کے تلامذہ میں تھے اپنے گاؤں گوری میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے تھے مگر مشاعروں میں شریک ہوتے تھے شکار اور گھوڑ سواری کے بھی دلدادہ تھے۔ ان کا ہی یہ ایک مطلع کیا خوب ہے :-

نالاں ہی درد و غم سے رہے ہم جہاں رہے
بس گئے ہزار پھر بھی تہہ آسماں رہے

منشی بالو رام شریف، بیک وقت نامور ایڈووکیٹ، شطرنج کے ماہر کھلاڑی اور فارسی کے عالم اور بلند پایہ شاعر تھے۔ مولانا حاجی کشمیر سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ دو شعری مجموعے شائع ہوئے جن میں ایک بہار کشمیر ہے۔ یہ کتاب جموں کشمیر کے نصاب تعلیم میں مدت تک شامل رہی ان کی ذیل رباعی ملاحظہ فرمائیں۔

اے شاعر ہند گرم رانی کب تک   افسانۂ سوزش نہانی کب تک
ذرات وطن میں نور پیدا کر دے   تابانی طور کی کہانی کب تک

افسوس ۱۹۶۲ء میں الہ آباد میں رکشہ کے ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے۔

جناب رفیع احمد سالک رمانی [redacted] جد سے ریٹائر ہو کر سکریٹری وقف بورڈ رہے۔ فتح گڑھ کے محلہ گاڑی [redacted] ۱۹۱۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۷۹ء میں دارالبقا کو سدھار گئے۔ کلاسیکی انداز [redacted] رہتے تھے ان کا شعری مجموعہ آشوب آگہی۔ ۱۹۷۰ میں شائع کیا۔ کیا خوب مطلع کہا ہے۔

زندگی رقص بھی ہے رقص کی جھنکار بھی ہو   زندگی جنگ بھی ہے جنگ کی للکار بھی ہے

نواب محمد عباس صوفی طالب شمس آباد [redacted] ضلع کے معزز بیدار گھرانے کے فرد تھے ان کا شعری مجموعہ دل صد پارہ۔ ۱۹۵۳ء [redacted] ۱۹۷۹ء میں دار فانی سے کوچ کر گئے۔ ان کا یہ شعر ان کے پختہ کلام کا [redacted]۔

انھیں فرصت کہاں ہو [redacted] کے سُن جائیں
میں خود ان کی طرف سے دل [redacted]

مولانا حفیظ الرحمٰن خان مجیبی [redacted] دار مجیب کی ادبی خدمات ناقابل فراموش۔ خود اچھے شاعر تھے [redacted] بناتے تھے۔ اقتصادی حالات زیادہ اچھے نہ ہوتے ہوئے مہمان نواز بھی [redacted] کے قدر داں تھے مشاعروں کا اہتمام بھی کرتے تھے۔ ماہنامہ مشاعرہ۔ بھی کئی سال نکالتے رہے ۱۹۸۰ء میں دار فانی کو چھوڑ گئے۔ حسین [redacted] عقیدت کا یہ شعر دیکھیں۔

راہ میں جنت حنیفا آواز دیتی ہی رہی   [redacted] کربلا جاتے ہوئے

جناب قاضی علی احمد قیس فرخ آبادی کا تعلق معزز خانوادے سے [redacted] ان کے کئی شاگرد بھی اچھے شاعر ہیں۔ ان کی ایک [redacted] ملاحظہ فرمائیں۔

وہ کہتے ہیں ذہن ان کے جہاں تک پہنچے   معراج میں عرش ولامکاں تک پہنچے
مجھ کو ابھی اس میں شک ہے اے ختم رسل   یہ آپ ہی فرمائیں کہاں تک پہنچے

۱۹۶۴ء میں جناب قیس کی [redacted] ۱۹۷۴ء میں دنیا کو خیرباد کہہ گئے۔

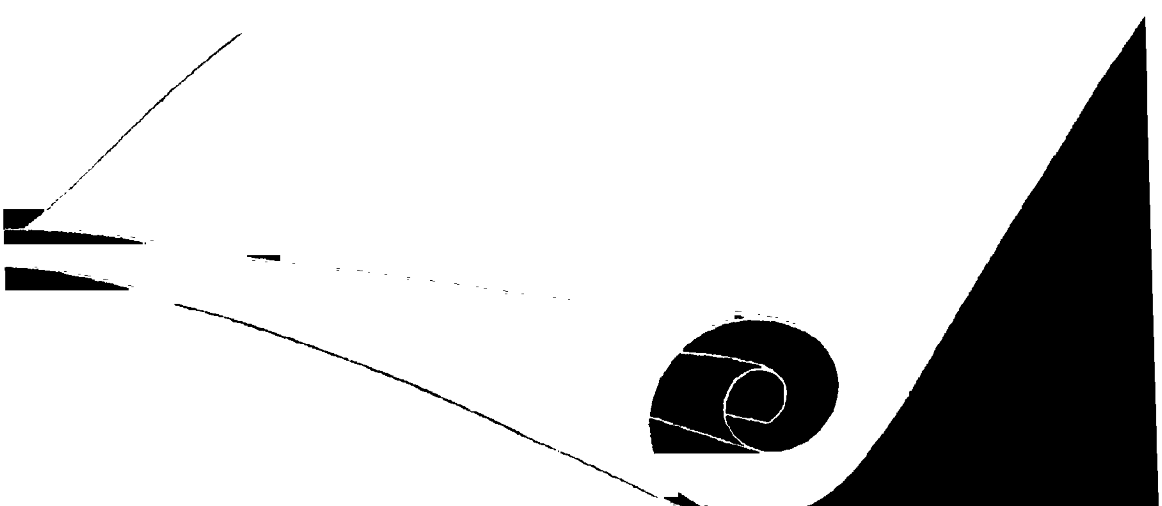
جناب یونس قنوجی غزلوں اور [redacted] ان کے دو شعری مجموعے۔ شعلۂ افکار۔ اور [redacted] اور ۱۹۷۹ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

ساقی صبو کو تھام غزل کہہ رہا ہوں میں   اک مہ جبیں کے نام غزل کہہ رہا ہوں میں

یونس صاحب ۱۹۸۳ء میں [redacted]۔

جناب نواب بہار الدین بخت [redacted] سخن کی آبرو تھے۔ خوش گوئی اور خوش الحانی [redacted]







نمبر

اے جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ھیں

خواجہ احمد عباس

راجندر سنگھ بیدی

صباح الدین عبدالرحمن

فکر تونسوی

احمد جمال پاشا

روپے

مارچ تا ستمبر ۱۹۰۰

میں دارالبقا سدھار گئے۔ غزل کے شاعر تھے کیا خوب کہا ہے :۔

کر دی تعمیر حرم حسن خود آرائی نے سر پہ محراب بنا کر تری انگڑائی نے

جناب عبدالجلیل خاں جلیل ایڈوکیٹ نظمیں اور غزلیں دونوں خوب کہتے ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ شاہکار ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔ مولانا احسن مارہروی کے شاگردوں میں تھے۔ سیاست کی مشغولیت کی وجہ سے شاعری کی طرف وقت کم دے پاتے تھے ۱۹۸۴ء میں رحلت فرما گئے۔ ان کی نظم کا ایک شعر دیکھیں :۔

صبح آزادی تری رنگیں بہاروں کو سلام گل بدوش ان گلستانوں لالہ زاروں کو سلام

جناب عبدالرؤف حسرت فرخ آبادی بہت خوش فکر شاعر تھے۔ ان کا ایک شعری مجموعہ "نقش تخیل" ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا۔ مدت سے بیمار تھے ۱۹۸۸ء میں عالم جاودانی کو کوچ کر گئے حمد، نعت، سلام اور غزل سبھی اصناف میں شعر کہتے تھے۔ ان کی غزل کا ایک شعر کتنا معنیٰ خیز ہے۔

کبھی دل کی وسعتوں سے کبھی بزم لامکاں سے
مرے ظرف نے صدائیں تجھے دیں کہاں کہاں سے

اس نصف صدی کے معروف و مرحوم شعرا کا اگر مکمل ذکر کیا جائے تو مضمون بہت طویل ہو جائے گا لہٰذا ان چند ناموں پر اکتفا کرتے ہوئے موجودہ ادبی حالات اور چند حیات شعرا جن کے شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں کا ذکر کر رہا ہوں حالات کے تغیرات کے اثرات کے باوجود اس ضلع میں ادب نوازی اور شعر و ادب کی قدیم روایات ابھی قائم ہیں۔ یہ فرخ آباد کا طرۂ امتیاز ہے کہ دہلی اور لکھنؤ سے دور ایک چھوٹا ضلع ہو کر بھی یہاں کے مرحوم اور حیات شعرا کے اتنی زیادہ تعداد میں شعری مجموعے شائع ہوئے۔ البتہ نثر نگاری کی جانب یہاں رجحان کم رہا۔

اس وقت ضلع میں دو افسانہ نگار ہیں۔ ایک ظہور احمد خاں جو حال ہی میں ریلوے میں کنٹرولر کے عہدے سے ریٹائر ہو کر محلہ ہاتھی خانہ میں سکونت پذیر ہیں اور دوسرے جناب آل حسن ایڈوکیٹ جو تحصیل قائم گنج میں وکالت کر رہے ہیں ان دونوں کے افسانے جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ جناب ظہور محمد خاں کا افسانوی مجموعہ "الجھن" کے نام سے ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا ہے۔ ویسے تو دہلی میں مقیم جناب انیس مرزا جو مشہور ناول اور افسانہ نگار ہیں بھی فرخ آباد سے چند سال قبل ہی منتقل ہوئے ہیں مگر اب وہ دہلی کے ہی ہو گئے۔ ان کے متعدد ناول اور افسانوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

نثری تصنیفات کے میدان میں تنہا خاتون شکنتلا سوج صاحبہ بی اے وشارد ہیں۔ ان کی دو تصنیفات "تذکرہ شعرائے فرخ آباد" اور "نل دمینی" ۱۹۸۵ء اور ۱۹۸۷ء میں شائع ہوئیں۔ دونوں پر یوپی اردو اکیڈمی سے ایوارڈ عطا ہو چکے ہیں۔

حیات شعرا میں جناب شمشاد احمد شمس فرخ آبادی ہیں جو ۱۹۵۳ سے لکھنوی ہو گئے ہیں جناب عمر انصاری کے شاگرد ہیں۔ ان کے دو شعری مجموعے۔ "جلتے کنول" اور "ملن کی آس" ۱۹۶۵ء اور ۱۹۸۱ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا یہ شعر کتنا خوبصورت ہے :۔

کچھ اور دیر نہ ٹوٹے یہ سانس کا رشتہ کسی کے جسم کی خوشبو ابھی ہواؤں میں ہے

حاجی نعیم اللہ بیگ زائر وارثی قادری غزل گو شاعر ہیں۔ ان کے تین شعری مجموعے "آواز دل"، "رموز زندگی"، اور "سنہری صبح" بالترتیب ۱۹۸۷ء، ۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۴ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ ایک نثر کی کتاب "فیض رحمت خلق عظیم" ۱۹۹۴ء میں شائع ہوئی۔ کلام ترنم سے پڑھتے ہیں پہلے رسوا تخلص کیا کرتے تھے حاجی ہونے کے بعد زائر تخلص کر لیا ہے۔ شعری مجموعہ آواز دل پر یوپی اردو اکاڈمی سے ایوارڈ مل چکا ہے۔ ان کا یہ شعر دیکھیں۔

زباں پر مرحبا آنکھوں میں آنسو دل میں ہلچل ہے
اثر انداز محفل میں بیاں ہوتا ہے یوں میرا

جناب راجیندر نرائن سکسینہ بسمل ایڈوکیٹ جناب جگر بریلوی کے خویش بھی ہیں اور تلمیذ بھی۔ غزل کے شاعر ہیں ان کے تین شعری مجموعے "گل صحرا"، "زخم نہاں" اور "رستے چھالے" ۱۹۸۷ء ۱۹۸۹ء اور ۱۹۹۳ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ آخر الذکر دو شعری مجموعوں پر انھیں یوپی اردو اکادمی لکھنؤ سے ایوارڈ مل چکے ہیں۔ تحت سے پڑھتے ہیں۔ ان کا ایک شعر ہے۔

گئی دم زدن میں یہ فصل گل کہ مثال برق شرار تھی
جو ذرا سی جھک کے نظر اٹھی تو نہ پھول تھے نہ بہار تھی

جناب شریف قریشی شریف غزل کے شاعر ہیں۔ کلاسیکی اور جدید لب لہجہ دونوں انداز کی شاعری کرتے ہیں۔ جلیل مرحوم کے شاگرد ہیں۔ ان کے تین شعری مجموعے۔ "نقش دوام"، "الہام"، اور "ندی کنارے پیاس" ۱۹۹۰ء ۱۹۹۲ء اور ۱۹۹۴ء میں شائع ہوئے ہیں جن میں الہام پر یوپی اردو اکادمی سے ایوارڈ دیا جا چکا ہے۔ ترنم سے کلام پڑھتے ہیں۔

جناب جیوتی سروپ حیرت تنہا سیمی شاعر ہیں صرف غزلیں کہتے ہیں

ظفر محمود
۱۴۳، مرزا واڑی، اجین
۴۵۶۰۰۶



اجین میں اردو ادب کی نصف صدی

اجین شہر تاریخی عظمت کا حامل ہے اور اس کی اہمیت علم و ادب کے مرکز کی حیثیت سے بھی رہی ہے۔ اس شہر کو شاعر اعظم کالیداس اور مفکر و دانشور بھرتری ہری کی شہرۂ آفاق تخلیقات سے وابستہ قرار دیا جاتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہاں کی درسگاہ "سانداپنی آشرم" میں چودہ علوم اور چونسٹھ فنون کی تعلیم دی جاتی تھی شاعری بالخصوص ڈرامہ نگاری کا فن یہاں اپنے پورے لوازمات کے ساتھ دنیا بھر میں مشہور رہا ہے۔ ایسی حسین روایات کا امین یہ شہر اردو زبان و ادب کے اہم مرکز کی حیثیت کا بھی حامل ہے۔ گو کہ اس کا اعتراف کم کیا گیا۔ مگر یہ خطہ گمنام بھی نہیں رہا۔ اردو زبان کا تعلق جن مقامات سے ہے ان میں بھی اس شہر کا شمار کیا جاسکتا ہے کیونکہ یہاں سنسکرت پالی اور مقامی بولی کے ساتھ عربی، فارسی، ترکی، افغانی زبانوں کے میل ملاپ کے مواقع رہے ہیں۔ التمش (۱۲۱۱ء تا ۱۲۳۶ء) نے اس کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا اور یہاں اس کے حکام رہنے لگے تھے ان کے علاوہ اسی عہد میں حضرت خواجہ مغیث الدین چشتیؒ کو ان کے پیر حضرت خواجہ نظام الدینؒ نے سند خلافت دے کر اس علاقے میں بھیج دیا تھا۔ ان کی خانقاہ مرجع خلائق رہی خود خواجہ صاحب ادبی ذوق رکھتے تھے حضرت امیر خسرو ان کے ہم عصروں میں تھے ان کی علم و عرفان کی مجالس میں ہر طبقہ اور مذہب کے لوگوں کو بھی شرکت کی عام اجازت تھی، ہندوں کے مذہبی تیرتھ گاہ ہونے سے یہاں ملک بھر کے مختلف علاقوں سے سادھو، سنت، برہمن، پنڈت کافی تعداد میں آتے رہتے تھے۔ یہاں ان کے بڑے بڑے آشرم مٹھ اور دھرم شالائیں قائم رہی ہیں ان تمام لوگوں کے میل جول سے جو مقامی بولی بن رہی تھی وہی آگے چل کر اردو، ہندی یا ہندوستانی زبان کہلائی ہے۔ امیر خسروؔ کی ہندوستانی زبان پر مالوی بولی کے جو اثرات ملتے ہیں اس کا ایک سبب خواجہ مغیث الدین چشتی سے ان کی رفاقت کو بھی قرار دیا جاتا ہے۔

جب یہ زبان ارتقائی دور میں داخل ہوئی تب بھی یہاں نامور شاعر موجود رہے ہیں شیداؔ اجینی، ارشدؔ اجینی کے علاوہ مفتی خیر اللہ صدیقی (۱۸۰۸ء) نے ایک ۲۴۴، اشعار کی اردو مثنوی بھی تخلیق کی تھی اس مثنوی کے لئے اردو کے ممتاز محقق ڈاکٹر گیان چند جین نے لکھا ہے کہ۔

> "حیرت ہے کتنے ابتدائی دور میں جبکہ میر کی عمر صرف سولہ سال کی تھی یہاں ولی کا ہم عصر شاعر ۲۴۴ اشعار کی ایک مکمل مثنوی لکھ رہا تھا۔"

انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد جب ملک کے حالات بگڑے اور دلی اجڑنے لگی تب اس افراتفری کے عالم میں جو علاقے پرسکون تھے ان میں اجین اور مالوہ کا علاقہ بھی ہر لحاظ سے امن و سکون کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ دور دور سے اہل علم یہاں پہنچے اور یہیں بس گئے۔ ان میں عالم بھی تھے شاعر بھی اور دیگر علوم کے ماہرین بھی۔ اس علاقے میں مراٹھا حکومت نے ان کی پذیرائی بھی کی اور قدردانی بھی اس دور میں اردو و ادب سے وابستہ جن فنکاروں کی تخلیقات یہاں زیور طبع سے آراستہ ہوئیں۔ ان میں سید کرامت علی بشر، مولانا یاد علی، مفتی محمود احمد صدیقی نانوتوی، پنڈت سروپ نرائن، منشی پربھولال گوڑ، اشہر سردار بھوسنگھ صادق، ہیرالال وکیل وغیرہ کافی مقبول فنکار رہے ہیں۔ سید کرامت علی بشر "فخر مالوہ" کہلاتے تھے ان کو فیض آباد سے "ملک الشعراء" کا خطاب بھی ملا تھا بشر صاحب کے میلاد نامے، محرم نامے، خطبات جمعہ، مثنوی شان اسلام کے علاوہ غزلیات کے مجموعے اور مسودے بھی غیر مطبوعہ کافی ملتے ہیں۔ اجین سے ایک ادبی ماہنامہ "آفتاب مالوہ" بھی انھوں نے شائع کیا تھا جس میں ملک بھر کے لکھنے والوں کا کلام اور مضامین چھپتے تھے۔ آفتاب مالوہ کی رسم اجراء پر منشی تاج محمد تاج نے قطعہ تاریخ بھی لکھا تھا۔

کوشش حضرت بشر کے کیوں نہ ہوں ممنون ہم
ہند کو دکھلائی جس نے آب وتاب مالوہ
اس کے اجراء کی لکھو تاریخ تم بھی تاج یہ
جاوداں تاباں مبارک آفتاب مالوہ

۱۳۴۸ھ

منشی پربھولال اشہر کے قصائد کا مجموعہ "سوغات اشہر" بمبئی سے شائع ہوا اور مجموعہ کلام بھی شائع ہو چکا ہے۔ پنڈت سروپ نارائن ایمن کا مجموعہ کلام "شعر ایمن" دہلی سے شائع ہوا تھا۔ مولوی مفتی محمد احمد نانوتوی کے سیرت پر لکھے مقالات کا انتخاب بھی دہلی سے شائع ہوا تھا۔ سردار کچھو سنگھ صادق شاعر بھی تھے اور ناول نگار بھی ان کا ناول "عروس عبرت" لاہور سے چھپا تھا۔ پنڈت چاند نرائن رازداں یونس بھی ناول لکھتے تھے آپ کا ناول "دھوپ چھاؤں" لاہور سے اور ایک طویل نظم "چڑیا گھر" اور مجموعہ کلام "کلام یونس" الہ آباد سے شائع ہوئے تھے۔ منشی تاج محمد تاج کا شعری مجموعہ "کلام تاج" کراچی سے شائع ہوا تھا۔ ہیرالال وکیل کا گیتا کا منظوم ترجمہ بھی مقبول ہوا تھا۔ گویا قریشی کا شعری مجموعہ "خم خانہ" علامہ سیماب اکبرآبادی نے آگرہ سے شائع کیا تھا۔ ساغر چشتی کا مجموعہ کلام "دور ساغر" ادارہ مست قلندر لاہور نے چھاپا تھا۔ امیر اوجینی کے دو شعری مجموعے "شان غم" اور "شیرازے موتی" اجین سے شائع ہوئے تھے۔ عطا الٰہی صدیقی کے بھی دو شعری مجموعے "سخن نامہ" اور "غبار جاں" دلی اور اجین سے شائع کئے گئے تھے۔ حسرت قریشی کا مجموعہ شاعری "صف مژگاں" دہلی سے چھپا تھا۔ حکیم محمد عمر مہر کا مجموعہ کلام "مہر درخشاں" ضلع بستی سے چھپا تھا ان کے علاوہ سید منور علی وکیل، اخلاق حسین وکیل، سید مصبر علی، سلطان احمد صدیقی مبتدی، رہبر وغیرہ کی تخلیقات بھی شائع ہوتی رہی ہیں منشی ریاض احمد جوہر، عزیز محمد قیصر بھی اچھے ادیب و شاعر رہے ہیں جن کی تخلیقات بھی شائع ہوتی رہی ہیں۔ اس پس منظر اور ادبی روایت رکھنے والے شہر اجین کو ۱۹۴۷ء کے تقسیم ہند کے ساتھ آزادی ملنے کے مرحلہ سے بھی کچھ اس طرح گزرنا پڑا کہ یہاں کے فنکار حالات کی تبدیلی اور اردو کے ساتھ برتی جا رہی بے اعتنائی سے مایوس ہونے لگے۔ ادبی محفلیں اجڑ گئیں فنکار نئی تخلیق کرنے کے بجائے اپنی بیاضوں کو گم کر بیٹھے۔ لیکن وقت کا دھارا بہہ رہا تھا بدلتے ہوئے ماحول میں نئے جوش و امنگ کے ساتھ ایک نوجوان طبقہ ابھرا جس کی قیادت جناب محمد زکی صاحب اور ان کے رفقاء صہبا قریشی، باسط اوجینی، رفیق احمد قمر، کاشف الہاشمی، سید مدثر علی حبیب عالم، اقبال انصاری، حکیم اسماعیل ذبیح جیسے مخلص جواں فکر حلقے نے سنبھال لی تھی ان سب کی کوششوں سے ادبی اجتماعات شروع ہوئے زبان کی تدریس اور تعلیم کے اہم کام کے لئے منصوبے بنائے گئے محمد زکی صاحب نے قاضی عبدالغفار صاحب کو لکھ کر انجمن ترقی اردو ہند کی شاخ یہاں قائم کی اور بہت جلد اس کے تحت گرین کیسل میں "اردو کالج" کا قیام عمل میں آیا۔ سید مدثر علی صاحب کی صدارت میں یہ تعلیمی سلسلہ چلا تو شعر و ادب کی تنظیم بزم ادب کو از سر نو فعال کر کے گویا قریشی صاحب کی صدارت میں ادبی و شعری مجلسیں منعقد کی جانے لگیں۔ علم و ادب کی سرگرمیاں برق رفتاری سے آگے بڑھیں اور بہت بڑا حلقہ تخلیق کاروں کا یہاں ابھرا۔ یہاں کے فنکاروں نے تخلیق ادب کے سوتے تو جاری کر لئے مگر ترسیل کے ذرائع ان کے پاس محدود تھے۔ اس کے لئے بھی محمد زکی صاحب ریاض احمد صدیقی اور باسط اجینی نے اردو صحافت سے رابطے قائم کئے۔ محمد زکی صاحب نے چوٹی کے اردو اخبارات میں بحیثیت نامہ نگار، کالم نگار، تبصرہ نگار، مضامین لکھنے شروع کئے اور بہت جلد اجین سے اردو اخبار "نیا سماج" بھی جاری کر لیا۔ ادبی ماہنامہ "شعلہ و شبنم" میں بھی وہ بحیثیت ایڈیٹر شامل تھے۔ اخبارات میں اجین اور مالوہ کے علاقے کے تمام فنکاروں کو آپ نے بھرپور نمائندگی دی۔ اُن کے کلام اور نثری تحریریں شامل اشاعت کراتے رہے۔ اس طرح ہندستان گیر شہرت یہاں کے فنکاروں کی ہونے لگی۔ نوجوان طبقہ بھی لگن اور محنت کے ساتھ اردو کے لئے آگے بڑھا۔ یہاں تک کہ اردو کی تدریسی خدمات کے لئے یہاں کے نوجوان دہلی، بھوپال وغیرہ میں اپنا مقام بنانے لگے۔

آیئے ان میں سے کچھ فنکاروں کا تعارف اور جائزہ بھی یہاں لیتے چلیں۔

محمد زکی۔ سید محمد زکی صاحب جد امجد ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں انگریزوں کے عتاب کا شکار ہو کر خانماں بربادی کے عالم میں مالوہ کی طرف آئے تھے۔ یہاں اجین میں ان کے والد سید پیر علی صاحب کی شادی حاجی عبدالرحمن صاحب کی صاحب زادی سے ہوئی اور ۱۹۳۱ء میں اجین میں محمد زکی پیدا ہوئے والد صوفی منش انسان تھے ان کے تعلقات صوفیوں، حکیموں اور شاعروں سے قائم تھے والد کے ساتھ زمانہ طفلی میں ہی یہ ادبی محفلوں میں جانے لگے تھے، اردو فارسی اپنے نانا جان سے، عربی حضرت مولانا مسعود احمد صدیقی سے، طب حکیم

عبدالرحیم ٹونکی اور صوفی غلام حیدر صاحب سے پڑھی، شاعری کی ابتدا ۱۹۵۵ء سے کی اور پہلی غزل کی اشاعت کے لئے غزلوں کا ایک انتخاب "نقوش" کتابی شکل میں شائع کیا۔ شعری مجموعہ "اعتبار" اور شاعرِ اعظم کالی داس پر ایک تعارفی تحقیقی مقالہ "کالی داس ایک مطالعہ" شائع ہوچکے ہیں۔ انھیں علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں آل انڈیا میر اکادمی لکھنؤ سے "امتیازِ میر" ایوارڈ مل چکا ہے۔ مدھیہ پردیش اُردو اکیڈمی کے ممبر اور صوبائی اقلیتی تعلیمی ادارہ کی امداد و جائزہ کمیٹی کے رکن ہیں تعلیمی تنظیم مدھیہ پردیش مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی کے جنرل سکریٹری اور جامعہ اسلامیہ اجین کے صدر کی حیثیت سے سرگرم عمل ہیں۔ دانشور، صحافی، ادیب، محقق، اور شاعر کی حیثیت سے پورے اردو حلقوں میں اپنی شناخت بنا چکے ہیں۔ اردو صحافت، تصوف، تاریخ اور تعلیمی امور پر ان کے مضامین رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ نمونۂ کلام دیکھئے:

ہر نفس ایک نئی تمیں لئے آتا ہے
زندگی جبرِ مشیّت کے سوا کچھ بھی نہیں

مسکراتا ہوں جبر پیہم پر	وقت سے انتقام لیتا ہوں

رفیق احمد قمر۔ ۲۴ نومبر ۱۹۳۰ء کو پیدا ہوئے۔ شہر کے مشہور رامپور والے زمیندار جناب شفیق احمد صاحب کے فرزند ہیں صوفی عبدالحمید سنبھلی سے اردو فارسی اور عربی پڑھی۔ اپنے ماموں منشی ریاض احمد جوہر سے شاعری میں مشورہ لیتے رہے ۱۴ سال کی عمر سے شعر کہنے لگے تھے۔ بزم ادب کے سکریٹری کی حیثیت سے اچھے مشاعرے بھی آپ نے منعقد کئے محمود زکی صاحب کے ساتھ علمی و ادبی تحریکات میں سرگرمی سے حصہ لیتے رہے اجین کے قلمی ماہنامہ ماحول کی نگرانی کے فرائض بھی انجام دیئے۔ شاعری کی جملہ اصناف میں طبع آزمائی کرتے رہے ہیں۔ نمونۂ کلام دیکھئے:

تو قیر سے مرنے کی دعا کرتا ہوں	تحقیر سے جینا مجھے منظور نہیں

ہزار آئے زمانے میں انقلاب مگر	وہی مرا دلِ محزوں وہی ترا غم ہے

نیاز محمد باسط۔ جاگیردار منشی غلام محمد صاحب کے فرزند ہیں ۱۹۱۹ء میں اجین میں پیدا ہوئے حسرت قریشی سے اصلاح لی نثر نگاری میں بھی نام پیدا کیا۔ بمبئی اور بھوپال کے [illegible] کے ادارتی عملے میں شامل رہے۔ بزم سخن بھوپال میں [illegible] استاد شاعر کی حیثیت سے ادبی حلقے کی تربیت بھی فرمائی [illegible] اجین کی ادبی تحریکات سے بھی محمود زکی صاحب کے ساتھ وابستہ رہے [illegible] مندی سے زندگی بسر کی اور ۱۹۷۰ء میں عارضہ تپ میں [illegible] انتقال کیا۔ دو شعری مجموعے شائع ہوچکے۔ "نقش آرزو" [illegible] برادرے اعجاز شمش نے ۱۹۸۵ء میں شائع کرایا اس [illegible] تقریظ محمود زکی صاحب نے لکھی تھی۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

وہ شعورِ غم عطا ہے [illegible] فطرتاً ازل سے
کہ شکستِ غم پہ باسط [illegible] آنکھ نم نہیں ہے

منزل تو بڑی چیز ہے [illegible] ہیں نہیں ملتیں
جب شوقِ طلب [illegible] منزل نہیں ہوتا

سید ولایت علی کاشف الہاشمی۔ منشی قدرت علی صاحب کے فرزند ہیں۔ ۱۹۲۲ء میں پیدا ہوئے۔ [illegible] فارسی اپنے والد سے پڑھی۔ مادھو کالج سے میٹرک پاس کیا۔ محکمۂ تعلیم میں مدرس ہوگئے۔ شعر و شاعری کا ماحول اپنے بڑے بھائی سید [illegible] علی ہاشمی کی وجہ سے قائم تھا۔ محمود زکی، حسرت قریشی، امیر اجینی [illegible] قمر صاحب وغیرہ کے ہم عصر ہیں، تمام ادبی تحریکات [illegible] شاعر شریک رہے۔ بزم ادب کے نائب صدر بھی رہے۔ اردو [illegible] رکھتے ہیں۔ شعری مجموعہ "تپشِ حیات" شائع ہوچکا ہے۔ موجودہ دور میں اساتذہ کی صف میں شمار کئے جاتے ہیں۔ نمونۂ کلام [illegible]:

ہمارے ساتھ چلے ہو تو سوچ لو یارو	سفر یہ ختم سرِ دشت کربلا ہوگا

محمود احمد سحر۔ اجین کے بزرگ [illegible] وفا کے صاحبزادے ہیں ۱۹۳۵ء میں پیدا ہوئے اردو میں ایم۔اے [illegible] سے کرچکے ہیں میونسپل کارپوریشن میں ملازم ہیں۔ جدید شاعری کے بھی اجین میں پیش رو رہے ہیں۔ شاعری کے دو مجموعے "[illegible]" اور "دشت شب زندہ" شائع ہوچکے ہیں۔ "گل پوش" محمود زکی [illegible] شعلہ و شبنم دہلی کے ادارے سے تعارف کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ ناول نگار کی حیثیت سے

بھی زبردست کارنامے انجام دیتے رہے ہیں۔ چار سو سے زاید ناول لکھ چکے ہیں آپ نے میگھ دوت کا بھی آزاد شاعری میں ترجمہ کیا تھا نمونۂ کلام دیکھیں۔

دور تک دھند میں میرا ہی سفر لمبا ہے
ساتھ کس شخص کا مانگوں کہ ہر اک اندھا ہے

نئے مزاج کی شفافیوں میں تازہ تھا
میں پانیوں کی طرح پتھروں سے نکلا تھا

ڈاکٹر صادق۔ سید صادق علی۔ سید ببر علی صاحب کے صاحبزادے اور محمود زکی صاحب کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ۱۹۴۳ء میں اجین میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت گھر کے ماحول اور محمود زکی صاحب کی علمی و ادبی سرگرمیوں نے خاطر خواہ کی۔ اجین سے بی۔ اے کرنے کے بعد اورنگ آباد چلے گئے وہاں اُردو سے امتیازی پوزیشن ایم۔ اے سے کیا اور مراٹھواڑہ یونیورسٹی سے "ترقی پسند تحریک اور اُردو افسانہ" پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند لی۔ پیپلس کالج ناندیڑ میں شعبہ اردو کے صدر بنے پھر ترقی اردو بیورو دہلی میں ریسرچ اسسٹنٹ کے عہدے پر منتخب ہوئے بعد میں دلی یونیورسٹی میں شعبہ اردو میں لیکچرر ہوئے اب ترقی کرکے ریڈر بن چکے ہیں۔ اب تک دس کتابیں جن میں تین شعری مجموعے بھی شامل ہیں شائع ہو چکی ہیں۔ متعدد طلباء ان کی نگرانی میں ایم۔ فل اور پی ایچ ڈی کر چکے ہیں۔ ان کی شخصیت اور فن پر درجنوں مقالے ملک کے معتدر جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ مدھیہ پردیش، اتر پردیش، مغربی بنگال، مہاراشٹر وغیرہ سے مختلف ادبی ایوارڈ اور خصوصی انعامات آپ کو مل چکے ہیں۔ ہندی اور مراٹھی ادب پر بھی آپ نے کام کیا ہے جو کتابی شکل میں منظرِ عام پر آچکا ہے۔ اچھے شاعر، ادیب، نقاد، محقق اور افسانہ نگار ہونے کے علاوہ اچھے مصوّر اور کارٹونسٹ بھی ہیں ان کے بنائے ہوئے سرورق ملک بھر کے ادیبوں کی کتابوں اور رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ مختلف ادبی سیمناروں میں مقالے پڑھ چکے ہیں۔ غیر ملکی زبانوں میں بھی ان کی تخلیقات کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ علمی و ادبی انجمنوں اور رسالوں میں سرپرست و نگراں کی حیثیت حاصل ہے۔ دور درشن ان کے فن اور حیات پر ایک ڈاکو منٹری بنا کر پیش کر چکا ہے۔ نمونۂ کلام دیکھئے۔

مبتلا سچائیوں کی قبر میں　　کیا کرے صادق بچارا دہر میں

تنگ تہہ خانوں سے باہر نکلو　　کائناتوں کو صدا دو لوگو

ڈاکٹر عتیق اللہ۔ ۲ر جولائی ۱۹۴۰ء کو اجین میں پیدا ہوئے ان کے والد افغانستان سے یہاں تشریف لائے تھے۔ سلسلۂ نصب شاہ ابوالحسن گورشی سے ملتا ہے آپ نے وکرم یونیورسٹی اجین سے اردو اور انگریزی میں ایم۔ اے فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن حاصل کرکے پاس کئے مراٹھواڑہ یونیورسٹی سے "جدید اردو نظم۔ اسالیب اور رجحانات" پر مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند لی اورنگ آباد کے مولانا آزاد کالج میں لکچرر ہوئے پھر دہلی آگئے اور دلی یونیورسٹی میں اردو کے ریڈر ہیں۔ ایم فل اور پی۔ ایچ ڈی کے طلباء ان کی نگرانی میں کام کر رہے ہیں کچھ ڈگریاں لے چکے ہیں۔ ۱۹۵۶ء سے شاعری کر رہے ہیں اچھے نقاد، محقق بھی ہیں ترقی پسند گروپ میں شامل ہوئے، دو شعری مجموعے، نثر میں تنقیدی کتاب "قدر شناسی" بہت مقبول ہوئی اس کے بعد نئی کتاب "تنقید کا نیا محاورہ" بھی ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ دہلی کے اردو نظم پر بھی ایک کتاب آچکی ہے مضامین اور کلام ملک بھر کے جرائد میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ اُتر پردیش اور مغربی بنگال سے ادبی انعامات اور اعزاز مل چکے ہیں۔

توڑ لے اپنے سبھی لمس کے رشتے مجھ سے
تاکہ محسوس نہ ہو عمر بہت لمبی ہے

ان شعراء کے علاوہ واجد قریشی، شبیر آرزو، خوشنود ثمر، سراج احمد سراج، رئیس نظامی، حسنات قریشی، شکیب نیازی، امرت لال امرت، راز ردمانی، حمید گوہر، رئیس خیری، رشید امکان، احمد کمال پروازی، دھنی رام بادل، سحر اندوری، اعجاز شمس، اقبال حیدری، حافظ ایاز، سید اقبال علی اقبال، نور اجینی، ڈاکٹر قیوم ساجد، کلیم جاوید، عظیم، محمود حسن، نسیم حسن، احمد نور شمیم، ڈاکٹر ضیا احمد ضیا، نواب زاہد، انیس لٹیانی، حبیب عالم، شاہد اقبال، حکیم منظور قریشی وغیرہ ایسے فنکار ہیں جن سے اجین کی ادبی و شعری فضا منوّر اور تابناک بنی ہوئی ہے۔

□□



یوسف ناظم
۱۹۔ 'الہلال' ۱۳۔ باندرہ ری کلیمیشن
بمبئی ۴۰۰۰۵۰

غالبِ خستہ کے بغیر....

خرّم آباد اُردو اکادمی کے اعلان کے چھپنے کی دیر تھی کہ سارے ملک میں ایک تہلکہ مچ گیا بلکہ عالم بالا کے بھی روایتی امن و سکون میں خلل پڑ گیا۔ اعلان یہ تھا کہ خرم آباد اُردو اکادمی ۱۹۹۵ء سے اسداللہ خاں غالب کے نام سے منسوب ایک ادبی ایوارڈ جاری کرے گی جس کی مالیت سوا لاکھ روپئے ہوگی اور یہ پس از مرگ ایوارڈ کہلائے گا اور ان مرحومین میں سے کسی ایک ادیب یا شاعر کو دیا جائے گا (یعنی اس کے جائز ورثا کو دیا جائے گا) جس کا انتقال پہلی جنوری ۱۹۹۱ء کے بعد اور دسمبر ۱۹۹۲ء سے پہلے ہوا ہو۔ خرم آباد اُردو اکادمی کے عہدہ داروں اور اراکین کو اس بات کا اندازہ تھا کہ اس ایوارڈ کے سلسلے میں کافی چہ می گوئیاں ہوں گی۔ طرح طرح کے اعتراضات ہونگے کئی سوالات کھڑے ہوں گے اس لیے انھوں نے پہلے ہی سے متوقع سوالوں اور اعتراضوں کے بارے میں ایک غیر رسمی پریس کانفرنس میں صحافیوں اور چند علمی ادبی اداروں کے سربراہوں کو بتایا کہ:

(۱) ایوارڈ کی رقم سوا لاکھ اس لیے مقرر کی گئی ہے کہ اُردو کے اکثر محاوروں میں سوا لاکھ کا ہندسہ آیا ہے۔

(۲) اسداللہ خاں غالب کے نام سے ایوارڈ کے قائم کیے جانے کی وجہ یہ بتائی گئی کہ گو میر تقی میر بھی بہت محترم شاعر تھے لیکن نام غالب ہی کا چلتا ہے اور برصغیر میں ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی اس نام کی اہمیت کو مان لیا گیا ہے۔ ہندوستان میں تو غالب اتنے مقبول ہیں کہ لوگ سمجھتے ہیں وہ اب بھی بقید حیات ہیں اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ان کا انتقال ہو چکا ہے تو وہ کہتے ہیں کب ہوا؟ ابھی تو ہم نے انھیں ایک سیریل میں ٹی۔ وی پر دیکھا تھا، کتنی اونچی کلاہ ان کے سر پر تھی۔ گھر کے آنگن میں گولیاں بھی کھیل رہے تھے۔ صدر اکادمی نے بڑے گلوگیر لہجے میں بتایا کہ اکثر لوگوں پر تو غالب کے انتقال کی خبر بجلی کی طرح گری لیکن جب ان سے کہا گیا کہ غالب کے مرنے پر کئی لوگ زندہ ہوگئے اور غالب صدی کے دوران اُنکی مالی حالت بہت اچھی ہوگئی تو وہ لوگ مطمئن ہوگئے، اور انھوں نے غالب کے حق میں دُعائے خیر کی۔

(۳) اکادمی کے نائب صدر نے بھی صدر کی اجازت سے بتایا کہ غالب صاحب کا نام استعمال کرنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ ایوارڈ شاعری کے لیے بھی ہے اور نثر کے لیے بھی، اس لیے ہمیں ایک ایسے شخص کا انتخاب کرنا تھا جسے دونوں اصنافِ ادب پر عبور ہو اور ہمیں غالب اللہ خاں آسد سے بہتر کوئی اور شخص نہیں ملا۔ (رَو میں موصوف نے اسداللہ خاں کو غالب اللہ خاں کہہ دیا، لیکن لوگ چوں کہ گفتگو سننے کے ساتھ ساتھ نمکین کاجو اور ویفر کھانے میں بھی مصروف تھے اس لیے بات آئی گئی ہوگئی، لیکن خود نائب صدر صاحب جھینپ گئے)

(۴) زیر بحث ایوارڈ کو "پس از مرگ" بنانے کے جواز میں بتایا گیا کہ ملک کی کسی بھی اکادمی نے اس نوعیت کا ایوارڈ جاری نہیں کیا ہے۔ کچھ لوگوں کو پس از مرگ ایوارڈ ضرور دیئے گئے ہیں لیکن برائے نام۔ ہمارے ایوارڈ پر صرف مرحومین کا حق ہوگا۔ صدر اکادمی نے زوردار الفاظ میں کہا کہ کم سے کم ہمارے علم میں ایسا کوئی واقعہ نہیں ہے کہ اردو کے کسی شاعر

یا ادیب کو اس کی زندگی میں اس کا حق ملا ہو۔ کتنے ادیب اور شاعر تو زندگی بھر صرف 'تسلیم کیے جانے' کی آرزو میں مرتے رہے (یہاں موصوف نے رک کر پانی کا ایک گھونٹ پیا اور دستی سے ہونٹوں سے ٹپکتا ہوا پانی پونچھا)۔ اس ایوارڈ کو پس از مرگ کی خصوصیت دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مرحومین میں سے اکثر نے ترکے میں کچھ نہیں چھوڑا بلکہ بعض صورتوں میں تو قرض وغیرہ کی بھی خبریں ہیں (اللہ تعالیٰ مغفرت کرے) اس ایوارڈ سے کم سے کم ورثا کو کچھ تو راحت ملے گی۔ مرحومین میں سے کچھ کی نثری کتابیں اور مجموعۂ کلام ضرور شائع ہوئے لیکن اکادمیوں کی جزوی امداد سے۔ ستر ستر ہزار کے تخمینے پر اکادمیوں نے پانچ ہزار کی رقم منظور کی۔ ان پر کتنا بار پڑا ہوگا؟ (یہاں انھوں نے پھر پانی کا ایک گھونٹ پیا۔ سانس لی اور بولے) میں اس موضوع پر زیادہ نہیں بولنا چاہتا۔ اس میں مرحومین کی ذم کا بھی پہلو نکلتا ہے اور میرا حاشا وکلا یہ ارادہ نہیں ہے۔ یہ پس از مرگ ایوارڈ بہت اہم ہے اور میں چاہونگا کہ یہ جلد از جلد سب کو مل سکے۔

(۵) زیرِ بحث ایوارڈ کو صرف ۳ سال کی حد تک کیوں محدود رکھا گیا ہے اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے موصوف نے کہا، ہمارے بہت سے اراکین صرف انہی ادیبوں اور شاعروں سے واقف ہیں جنھوں نے ہمیں پچھلے تین سالوں میں داغِ مفارقت دیا ہے۔ ان کی یاد تازہ ہے، ہمیں انتخاب میں بھی سہولت ہوگی۔ ان سے پہلے جن لوگوں کے انتقالات ہوئے ہیں ان کے مسائل تو اب تک سلجھ چکے ہوں گے اور ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ ہمارا "تجرباتی اقدام ہے۔ ممکن ہے آئندہ چل کر ہم اپنے دائرۂ عمل کو وسیع سے وسیع تر کر سکیں اور اسے دور تک پھیلانے میں ایک قانونی پیچ یہ بھی ہے کہ زیادہ مدت گزر جانے پر جائز ورثا کی تلاش مشکل ہو جاتی ہے۔

(۶) جب یہ پوچھا گیا کہ اکادمی نے مستحق ادیب کے انتخاب کا کیا طریقہ مقرر کیا ہے تو صدر اکادمی نے اعتراف کیا کہ بغیر جھول والا کوئی طریقہ اب تک تو ہماری سمجھ میں نہیں آیا ہے۔ ہم مشورے کر رہے ہیں۔ مستحقین کی فہرست تو تیار کر لی گئی ہے اور ہم ملک کے علمی ادبی اداروں سے ربط پیدا کر رہے ہیں۔ ہم حتی الامکان کوشش کریں گے کہ یہ ایوارڈ مستحق ترین شخص کے حق میں جائے۔ لیکن آپ جانتے ہیں (یہاں موصوف کی آواز بھرا گئی اور غالباً ایک آنکھ میں آنسو بھی آگیا) کہ یہ کتنا مشکل مرحلہ ہے۔ وہ ادیب اور شاعر جن کا نام فہرست میں شامل ہے تو مجبور ہیں وہ لوگ اس معاملے میں کوئی دخل نہیں دے سکتے لیکن ان کے رفقا اور ورثا، جہاں تک ہمیں علم ہے، سرگرمِ عمل ہو چکے ہیں۔ کچھ لوگوں کے تو برسرِ پیکار ہونے کی بھی خبریں ملی ہیں۔

یہ پریس کانفرنس بہت دیر تک چلتی رہی اور اس لحاظ سے کامیاب رہی کہ اس کا اختتام ایک پانچ نصابی (کورس) لنچ پر ہوا۔ کچھ صحافیوں نے تو جذبات سے مغلوب ہو کر اکادمی کے صدر کو اس انوکھے اقدام پر کاندھوں پر اٹھا لیا اور صرف اس وقت نیچے اتارا جب انھوں نے ان لوگوں سے ان کے کان میں کچھ کہا ــــ مبصرین کا خیال ہے کہ یہ کچھ ایسی ہی بات ہوگی جس کا بھری عدالت میں کہنا مناسب نہیں سمجھا جاتا ہے۔

اُدھر عالمِ بالا میں شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ بہت طیش میں تھے۔ جونہی یہ خبر وہاں پہونچی کہ ان کے نام کے ایک ایوارڈ کا اعلان ہوا ہے' ان کا موڈ بگڑ گیا۔ انھیں غصہ اس بات کا تھا کہ یہ اُردو والے ہر کسی معاملے میں ان کا نام کیوں گھسیٹ لاتے ہیں ــ؟ غالب صدی تک تو خیر ٹھیک تھا۔ لیکن اب ـــ اب تو اردو کافی ترقی کر چکی ہے۔ پڑھنے والے کم ہیں تو کیا ہوا' لکھنے والوں کی تعداد میں تو مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندستان میں اُردو کے فروغ کے لئے اب ان کا نام ہرگز ہرگز استعمال نہیں کیا جانا چاہیئے۔ انھیں کسی نے یہ خبر بھی پہونچا دی تھی کہ کچھ ادیب اور شاعر جو سمجھتے ہیں کہ اس ایوارڈ پر اُن کا حق ہے' ان سے ملنا بھی چاہتے

ہیں۔ یہ خبر شاید انھیں حسرت نے پہنچائی ہوگی۔ جن حسرت کا ہم ذکر کر رہے ہیں ان سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ یہ شیفتہ کی طرح غالب کے بہت ہی قریبی دوستوں میں تھے اور ان سے غالب کی اتنی گاڑھی چھنتی تھی کہ غالب نے ایک مرتبہ یہ تک کہہ دیا تھا کہ ان کے (غالب کے) انتقال پر شیفتہ کے علاوہ حسرت بھی ایک مرثیہ ضرور لکھیں گے۔ یہ بات ہمیں یاد رہ گئی کہ غالب کے ایک مقطع میں وحشت کا ذکر موجود ہے ؎

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید
مر گیا غالبِ آشفتہ نوا کہتے ہیں

ہمارے کسی بھی محقق کو اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ غالب کے اتنے عزیز دوست کے بارے میں کہیں دو چار لفظ لکھ دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو تحقیق کو ہم سارے اصنافِ ادب میں آخری درجے پر رکھتے ہیں وہ بھی اخلاقاً۔ (تنقید جیسی بھی ہے اس سے بہتر ہے)۔

غالب یہ خبر سُن کر پریشان ہو گئے اور انھوں نے شیفتہ کو بلا بھیجا اور ان سے پوچھا بھئی تمھاری اُردو دُنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ مجھے یہاں آئے برسوں ہو گئے۔ ہم تم دونوں بلکہ تینوں آگے پیچھے یہاں آئے لیکن تمھیں اور حسرت کو تو لوگوں نے معاف کر دیا لیکن یہ لوگ میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتے۔ میں نے اردو کلام کہا ہی کتنا تھا اور تم نے شیفتہ اس میں سے کتنا چھانٹ دیا۔ اساتذہ کے دیوان رکھے ہوئے ہیں اور ان میں سے بہتوں پر تو تحقیقی کام بھی ہوا ہے۔ لیکن ان لوگوں کو جنھیں کوئی دوسرا کام نہیں ہے نام یاد ہے تو بس میرا یاد رہے۔ ـــــ اب یہ حسرت مجھے بتا رہے ہیں کہ یہاں کچھ لوگ مجھ سے ملنا بھی چاہتے ہیں۔ یہ سب ہماری برادری۔ برادری نہ بھی ہمارے قبیلے کے لوگ ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ ان میں سے کسی کی دل شکنی ہو ـــــ اور شیفتہ تم تو جانتے ہو یہ پیروی ویروی میرے بس کی بات نہیں ہے یہ ہنر مجھے آتا تو میں اپنی پنشن کے لئے اِدھر اُدھر مارے مارے نہ پھرتا اور نہ کوتوال شہر کی ہمت ہوتی کہ وہ میرے ساتھ وہ سلوک کرتا جو آج کل دہشت گردوں کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ لیکن خیر یہ موقعہ ان باتوں کا نہیں ہے۔ اس وقت تو میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ میرے بھائی شیفتہ تم کسی طرح اس بے تکے ایوارڈ سے میرا نام نکلوا دو۔

شیفتہ جیسا کہ سب جانتے ہیں، غیر معمولی متین اور مہذب آدمی تھے۔ غالب کا لحاظ بھی بہت کرتے تھے۔ لیکن اس وقت غالب کی باتیں سُن کر ان کا منہ حیرت سے کھل گیا (اور کافی دیر تک کھلا رہا)۔ حسرت نے جب توجہ دلائی تو شیفتہ نے خود کو سنبھالا اور غالب سے بولے:

"قبلہ! آپ تو غضب کرتے ہیں۔ میں اس معاملے میں کیا کر سکتا ہوں آپ کو معلوم ہے عالمِ بالا پر نہ تو کوئی ویزا آفس ہے اور نہ کوئی ڈاک خانہ۔ خود زمین پر ڈاک کا انتظام اتنا ناقص ہے کہ وہاں 'مُردہ خطوں' کے انبار لگے ہوئے ہیں۔"

غالب نے پوچھا، یہ مردہ خط کیا ہوتے ہیں؟ ہمارے نام تو کوئی ایسا خط نہیں آیا۔!

حسرت کا بہت دیر سے جی چاہ رہا تھا کہ کچھ وہ بھی بولیں، فوراً گویا ہوئے: شیفتہ صاحب نے 'ڈیڈ لیٹرس' کا ترجمہ مردہ خطوط کیا ہے یہ وہ خط ہوتے ہیں جن کے مکتوب الیہ کا پتہ نہیں چلتا۔ اسی طرح وہاں منی آرڈر وغیرہ بھی ڈیڈ تو نہیں ہوتے لیکن جن لوگوں کے نام بھیجے جاتے ہیں وہ بس آپ کا مصرع پڑھتے رہتے ہیں ؏

اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

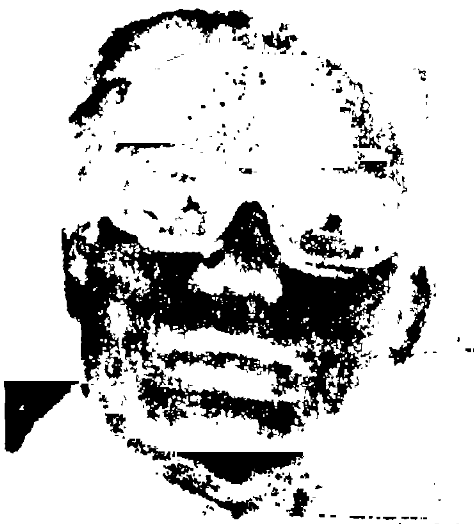
شیفتہ نے کہا: گویا جس طرح یہاں کوئی ڈاک خانہ نہیں ہے اسی طرح کوئی ویزا آفس بھی نہیں ہے کہ جب آپ چاہیں عالمِ بالا سے کسی کو وہاں بھیج دیں۔ یوں بھی وہاں اب تل دھرنے کی جگہ نہیں ہے۔ یہاں سے آمد و رفت شروع ہو گئی تو لوگوں کی سانس کی آمد و رفت خطرے میں پڑ جائے گی۔

غالب بولے، شیفتہ! تم کیا ہولناک باتیں کر رہے ہو۔ کیا اب یہاں سے کوئی فرشتہ بھی اُدھر نہیں جاتا ہے؟

جواب ملا، ضرور جاتا ہے۔ لیکن فرشتۂ اجل وہاں گیا تو واپس ہی نہیں آیا۔ سُنا ہے بہت معروف ہو گیا ہے اور کچھ لوگ تو کہتے ہیں کہ خود فرشتۂ اجل کی جان پر بن آئی تھی۔ اور قبلہ! آپ بھی غضب کرتے ہیں جب تک خود دنیا میں تھے، یہ تمنا فرماتے رہے کہ

عرش سے پرے ہوتا کاش کے مکاں اپنا

اور اب یہاں آرام سے ہیں تو دنیا کی فکر میں دُبلے ہو رہے ہیں۔



ظ۔ انصاری

۱۹۲۵ء - ۱۹۹۱ء



اختر علی تلہری

۱۹۰۲ء - ۱۹۷۱ء



ساغر نظامی

۱۹۰۵ء - ۱۹۸۴ء



غلام ربانی تاباں

۱۹۱۴ء - ۱۹۷۸ء



راہی معصوم رضا

۱۹۲۷ء - ۱۹۹۲ء



زیب غوری

۱۹۲۷ء - ۱۹۸۵ء



صباح الدین عبدالرحمٰن

۱۹۱۱ء - ۱۹۸۷ء



مسیح الزماں

[illegible]۲۵ء - ۱۹۷۵ء

حسرت نے فی الفور غالب کو بنظر غائر دیکھا اور بولے۔ واقعی آپ پچھلے چند دنوں میں کتنے لاغر ہو گئے ہیں۔ لاغری کے بارے میں آپ نے ایک شعر بھی کہا تھا۔

غالب نے کہا: ہاں۔ کہا تھا۔ لیکن وہ شاعری تھی۔ میری صحت ان دنوں اچھی خاصی تھی اور فرغل وغیرہ پہن کر تو اور جسیم دکھائی دیتا تھا۔ اور شیفتہ! ہاں تم وہ فرشتۂ اجل کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے۔!

شیفتہ نے کہا، وہی تو میں عرض کر رہا تھا کہ خود فرشتۂ اجل کو اب اپنے فرائضِ منصبی ادا کرتے وقت محافظ کا لباس پہن لینا پڑتا ہے اس طرح اسے آسانی رہتی ہے۔

غالب نے یہ سن کر ایک آہِ سرد بھری (وہ فردوسِ بریں میں بھی سرد آہیں بھرنے کا شغل کرتے رہتے ہیں) اور گو کہ وہ عام طور پر کسی دوسرے شاعر کے اشعار نہیں پڑھتے لیکن فرشتۂ اجل کا حال سن کر انھوں نے کہا ؎

محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

شیفتہ مسکرائے (ویسے شیفتہ تھے ہی متبسم قسم کے آدمی اور غالب ان کی اسی خصوصیت کے شیدائی تھے) اور بولے، آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں۔ حالاں کہ آپ نے کہا تھا کہ ؎

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

لیکن اس وقت بھی اور ان حالات میں جب کہ اردو وہاں 'معرضِ الفت' بنی ہوئی ہے، آپ کا نام احترام اور احتیاط سے لیا جاتا ہے۔

غالب نے پوچھا، اور اُردو کا کیا حال ہے۔؟

شیفتہ، جنھیں غالب کے تقریباً سارے شعر ازبر تھے، بولے:
"آپ کو اپنے قصائد یاد ہیں؟"

غالب نے کہا، وہ سب طاقِ نسیاں ہو گئے۔ لیکن میرے قصائد کا یہاں کیا ذکر ہے؟ شیفتہ! تم کبھی ایک موضوع پر نہیں بول سکتے بات شروع کرتے ہو حقانی اور ظہوری کی اور پھر یکایک کوچۂ بلی ماران میں داخل ہو جاتے ہو۔!

شیفتہ نے کہا: سنیئے تو سہی۔ آپ نے وہ قصیدہ کہا تھا جس کا مطلع تھا ؎

ہاں مہِ نو! سنیں ہم اس کا نام
جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

غالب نے کہا: ہاں یاد ہے۔ لیکن یہ مطلع میں نے اُردو کی مدح میں تھوڑے ہی کہا تھا۔

شیفتہ نے کہا: وہ تو صحیح ہے۔ لیکن اسی قصیدہ شریف میں آپ کا ایک شعر تھا ؎

ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا
تیرا آغاز اور ترا انجام

بس۔ اُردو کے بارے میں لوگ آج کل یہی شعر پڑھ رہے ہیں۔!

غالب ہنس پڑے اور بولے: میں نے کہا تھا کہ تم بات شروع کرتے ہو ترک شیرازی کے ذکر سے اور لاکر ختم کرتے ہو دلی کے ترکمان گیٹ پر۔ ا غالب کا موڈ اب شگفتہ ہو گیا تھا۔ بولے "شیفتہ! ایک نکتہ میرے ذہن میں آیا ہے"۔

شیفتہ نے کہا، غیب سے آیا ہوگا۔ کیوں کہ آپ کے تو سارے مضامین وہیں سے آتے تھے۔

غالب نے کہا۔ یہ فرشِ زمین سے آیا ہے اور وہ یہ کہ اُردو غریب کو بابائے اُردو کی محبت تو ملی لیکن شیفتہ تم جانتے ہو صرف شفقتِ پدری سے کیا ہوتا ہے۔ ہمارے اس مولوی نے سچ پوچھو تو اس زبان کا درد جانا ہی نہیں۔

حسرت تو یہ بات سن کر جھینپ گئے لیکن شیفتہ نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا لیکن غالب معانقے کے لئے یہ کہتے ہوئے ان کی طرف بڑھے کہ

غالب ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیے

□□

گنگنایا ہے مرے ساتھ زمانہ اکثر
ایک ایسا بھی حسیں دور یہاں گزرا ہے
——— بیتاب بریلوی

دلیپ سنگھ
۵۹/۴ ، راجندر نگر - نئی دہلی ۶۰

اردو ادب اور بھینس

قارئین کرام، یہ اس سیمنار کی رپورٹ ہے جو پچھلے ہفتے اردو زبان و ادب پروموشن کمیٹی کے زیر اہتمام دہلی کے وگیان بھون میں منعقد کیا گیا تھا۔

حالانکہ سیمنار کو صبح دس بجے شروع ہونا تھا۔ اردو ادیب ۹ بجے ہی ہال میں پہنچ گئے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اردو ادیب اپنی زبان اور اس میں تخلیق ہونے والے ادب سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ ایک ضمنی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ سیمنار کے سلسلے میں جو دعوت نامے بھیجے گئے تھے اُن پر چائے کا وقت ۹ بجے لکھا ہوا تھا حالانکہ ۱۱ بجے لکھنا چاہئے تھا۔ چائے نہ ملنے پر جب ادیبوں نے ناراضگی کا اظہار کیا تو کمیٹی کے سکریٹری نے الزام کاتب کے سر تھوپ دیا۔ کاتب نے جو اس جلسے میں موجود تھا بخوشی یہ الزام اپنے سر لے لیا کہ اسے ادیبوں اور ایڈیٹروں کی غلطیوں کو اپنے سر لینے کی عادت ہو چکی تھی۔

ہال کے باہر دو بھینسیں بھی صبح آکر بیٹھ گئی تھیں لیکن ٹھیک طرح سے یہ تصدیق نہ ہو سکی کہ وہ حضرت داغ کی طرح جہاں بیٹھ گئیں، بیٹھ گئیں تھیں یا وہ سیمنار میں حصہ لینے کے لئے تشریف لائی تھیں لیکن دعوت نامہ پاس نہ ہونے کی وجہ سے ہال کے باہر ہی ڈیرہ لگا لیا تھا۔

سیمنار کا آغاز اردو زبان و ادب پروموشن کمیٹی کے سکریٹری کی تقریر سے ہوا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں سیمنار کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ بھینس نے اردو ادب کو بہت کچھ دیا ہے لیکن آج تک کسی اردو ادارہ نے اس کی خدمات کا باقاعدہ اعتراف نہیں کیا۔ یہ سیمنار اسی غلطی کا ازالہ کرنے کے لئے منعقد کیا گیا ہے۔ مرکزی سرکار نے ہمیں اس سیمنار کے لئے ۵۰ ہزار کی رقم دی ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ سرکار نے اس سلسلے میں فراخدلی کا ثبوت نہیں دیا۔ سرکار کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس مہنگائی کے زمانے میں اس کی دی ہوئی رقم میں دو اچھی بھینسیں بھی خریدی نہیں جا سکتیں۔ اس پر حاضرین نے شیم شیم کے نعرے لگائے لیکن یہ کسی نے نہ پوچھا کہ سکریٹری صاحب مرکزی سرکار سے گرانٹ لے کر بھینس کا بھاؤ کیوں پوچھ رہے تھے۔

سکریٹری کی ابتدائیہ تقریر کے بعد جناب بفیلو گوالوی نے اپنا مقالہ "اردو ادب اور بھینس" پڑھ کر سنایا۔

اپنے مقالے میں انھوں نے کہا کہ ہمارے بہت سے ادیب خصوصاً شاعر ادب کی تخلیق کے لئے شراب کو ضروری سمجھتے چلے آئے ہیں۔ اس میں کوئی برائی بھی نہیں کہ جس قسم کی شاعری آج کل ہو رہی ہے اسے باہر نکالنے کے لئے جس جرأت کی ضرورت ہے وہ شراب سے بآسانی دستیاب ہو جاتی ہے۔ شاعروں نے شراب کی اس خوبی کا حق اس طرح ادا کیا ہے کہ اردو شاعری کا تین چوتھائی حصہ اسی موضوع پر لکھ مارا۔ غالب جیسے بڑے شاعر نے شراب کو اس قدر ضروری سمجھا کہ جب وہ پینے کے قابل نہ رہے تو خواہش ظاہر کی کہ ساغر و مینا ان کے سامنے رکھے رہیں ورنہ ان کی شاعری کا سرچشمہ خشک ہو جائے گا۔

شراب کی افادیت اپنی جگہ لیکن اس چکر میں بے چاری بھینس ماری گئی ہم لوگ بھول گئے کہ ان ادیبوں نے بچپن میں اگر بھینس کا دودھ نہ پیا ہوتا تو شاید اس عمر تک پہنچ ہی نہ سکتے جب وہ شراب پینے کے لائق ہوئے۔ اردو کے ایک عظیم افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی کے بارے میں مستند شواہد موجود ہیں کہ وہ نہ صرف بھینس کا دودھ پیتے تھے بلکہ انھوں نے ایک بھینس پال بھی رکھی تھی۔ یقیناً دودھ ہی سے ان کے ادب میں پختگی آئی اور بھینس کو دیکھ دیکھ کر وہ انسپائر ہوتے رہے۔

یہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ اتنے بڑے ادیب نے

جس کے جسمانی اور ادبی قد میں بھینس کا بڑا خاصہ حصہ ہے۔ اتنا بھی نہ کیا کہ اپنی ایک کتاب کا انتساب ہی اپنی بھینس کے نام کر دیتا۔ انتساب سے بھینس کا کچھ سنورنے والا نہیں تھا کہ اردو کی کتاب کے جملہ حقوق سے بھی آج تک کسی کا کچھ سنورا نہیں ہے لیکن اس انتساب کو دیکھ دیکھ کر وہ خوش تو ہو سکتی تھی اور پھر یوں کرنے سے بیدی صاحب کو کوئی نقصان بھی نہ ہوتا۔

بیدی صاحب کے خلاف تو زیادہ سے زیادہ اتنا ہی الزام آتا ہے لیکن ان ادیبوں کو آپ کیا کہیں گے جو اس بات کا اقبال کرتے ہوئے شرماتے ہیں کہ انھوں نے کبھی بھینس کا دودھ پیا ہے۔

کچھ لوگ کہیں گے کہ ادیبوں کے تخلیقی جذبے کو متحرک کرنے کے لئے حسن کی ضرورت ہوتی ہے اور بھینس چونکہ اس خوبی سے عاری ہے اس لئے اس کا ذکر ادب میں نہیں ملتا۔ مجھے اس بات سے اتفاق نہیں ہے۔ یہ کہنا کہ بھینس خوبصورت نہیں ہوتی سراسر زیادتی ہے۔ بھینس تو ایسی ہی ہوتی ہے جیسی اسے ہونا چاہیئے اگر اس کے ایک خوبصورت دم لگا دی جائے جس پر پچھے دار بال ہوں۔ اس کے سینگ غائب کر دئے جائیں اور کمر پتلی کر دی جائے تو وہ گھوڑی ہو جائے گی اور اگر وہ گھوڑی بن گئی تو پھر دودھ کیسے دے گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ ادیب جو بھینس کی شکل و صورت کی وجہ سے اسے درخور اعتنا نہیں سمجھتے انھیں خود بھی کبھی کبھی آئینہ دیکھنا چاہیئے اگر وہ ایسا کریں گے تو شاید ان کی سمجھ میں آ جائے کہ جب کوئی بھینس انھیں دیکھ کر چنگھاڑنے لگتی ہے تو اس کی وجہ کیا ہے۔ وجہ یہی ہے کہ بھینس بھی ان کی شکل و صورت کو درخور اعتنا نہیں سمجھتیں۔

تیسری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب شاعروں نے گائے اور بکری کی تعریف میں شعر کہے ہیں تو بیچاری بھینس کا کیا قصور ہے۔ گائے اور بکری کو کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں جو بڑے بڑے شاعروں نے ان پر نظمیں لکھ دیں اسمٰعیل میرٹھی صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ۔

رب کا شکر ادا کر بھائی   جس نے ہماری گائے بنائی

اور ڈاکٹر اقبال بکری کی شان میں یوں گویا ہوئے۔

یوں تو چھوٹی ہے ذات بکری کی   دل کو لگتی ہے بات بکری کی

لیکن کسی سے اتنا بھی نہ ہوا کہ بھینس پر کوئی نثری نظم ہی لکھ دے حالانکہ اسے لکھنے میں دشواریاں نہیں ہیں جو پابند نظم میں ہوتی ہیں۔

بھینس پر ادیبوں نے کچھ لکھا لکھایا تو ہے نہیں الٹا کچھ ایسے محاورے گڑھ لئے جن کی بنا پر بھینس اگر چاہے تو ہتک عزت کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ محاورہ ہی دیکھئے۔ "بھینس کے آگے بین بجانا" مطلب اس محاورے کا یہ بتایا جاتا ہے کہ بھینس چونکہ کلاسیکی موسیقی سے واقف نہیں ہے اس لئے اس کے سامنے بین بجانا شوقِ فضول ہوگا لیکن سوال یہ ہے کہ اردو کے کتنے ایسے ادیب ہیں جن کے سامنے بین بجانا فائدے مند ثابت ہوگا۔ مجھے تو کئی دفعہ یوں محسوس ہوا ہے کہ بھینس کلاسیکی موسیقی سے اچھی طرح واقف ہے۔ اگر وہ شاعرہ کے حاضرین کی طرح جبڑے چوڑے کرکے اور اچھل اچھل کر بین کی داد نہیں دیتی تو یہ اس کی شرافت کی دلیل ہے۔ اپنی شرافت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ محاورہ بھی بے ہودہ سا لگتا ہے کہ عقل بڑی کہ بھینس۔ اگر بھینس ایک ادیب کے پورے وجود سے بڑی ہے تو اس کی عقل سے یقیناً بڑی ہوگی کہ جس کا وجود عام ادیب کے دماغ میں ع

ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

اپنے مقالے کو سمیٹتے ہوئے جناب بیفلو گوالوی نے مطالبہ کیا کہ اب وقت آگیا ہے جب بھینس کو اس کا جائز حق ملنا چاہیئے۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ ہر صوبے کی اردو اکیڈمی کو اپنے متعلقہ دفتروں میں کم از کم ایک بھینس کے رہنے سہنے اور پالنے پوسنے کا اہتمام ہونا چاہیئے تاکہ وہ سڑکوں پر آتی جاتی بسوں سے نہ پٹیں اور جس طرح بیمار اور معذور ادیبوں کو گرانٹ دی جاتی ہے ایسے ہی معذور بھینسوں کی دیکھ بھال کا انتظام ہونا چاہیئے۔

گوالوی صاحب نے جونہی اپنا مقالہ ختم کیا ہال سے باہر بیٹھی ہوئی بھینسوں نے چنگھاڑنا شروع کر دیا۔ یہ بات البتہ کسی کی سمجھ میں نہ آئی کہ وہ گوالوی صاحب کو ان کے مقالے پر داد دے رہی تھیں یا ان کو ہوٹ کر رہی تھیں۔

میں یہ بات آپ کو بتانا بھول گیا کہ اس سیمنار کی صدارت جناب ہردم صدارتی کر رہے تھے جنھیں اس سیمنار میں حصّہ لینے کے لئے بذریعہ ہوائی جہاز بمبئی سے دہلی لایا گیا تھا چنانچہ سب سے پہلے انھیں زحمت دی گئی کہ وہ اس مقالے پر اپنا تاثر پیش کریں۔ انھوں نے کہا کہ میری دانست میں یہ سیمنار بالکل فضول ہے کہ ادیب بھینس کا دودھ پئے یا بکری کا ہمیں اس سے کچھ لینا دینا نہیں ہے ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ اس نے کس قسم کا ادب تخلیق کیا ہے۔ اتنا سنتے ہی سکریٹری نے ان کے کان میں کہا کہ حضرت اگر آپ یوں کہیں گے کہ اس موضوع پر سیمنار ہونا ہی نہیں چاہیئے تھا تو آپ سے ہوائی جہاز

کے کرایے کی واپسی کا مطالبہ کیا جائے گا کہ آپ دلی میں لائے ہی کاہے لئے گئے تھے۔ یہ سن کر موصوف نے کانٹا بدلا اور کہنے لگا کہ۔ ہاں ہاں اگر کسی ادیب نے بھینس کا دودھ پیا ہے تو اسے اس دودھ کی قیمت ضرور چکانی چاہیئے کیونکہ کئی فلموں میں ایک ماں کو یہ کہتے سُنا ہے کہ۔ بیٹا میرے دودھ کی قیمت دو" اگر ایک ماں اپنے دودھ کی قیمت کا مطالبہ کر سکتی ہے تو بھینس کیوں نہیں"، یہ کہنے کے بعد انھوں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر تسلی کی کہ بمبئی واپس جانے کا ہوائی جہاز کا ٹکٹ ان کی جیب میں ہے یا نہیں۔

ایک اور شخص نے اعتراض کیا کہ فاضل مقالہ نگار نے (فاضل کا لفظ اس نے اس طرح استعمال کیا جیسے مقالہ نگار کو گالی دے رہا ہو) اپنے مقالے میں ایک جگہ ادیبوں کی شکل و صورت کا مذاق اڑایا ہے اور آئینہ دیکھنے کا مشورہ دیا ہے۔ میں انھیں مشورہ دوں گا کہ اگر وہ خود بھی کبھی آئینہ دیکھنے کی زحمت گوارہ کریں تو انھیں محسوس ہوگا کہ بھینس کے ساتھ ان کی قریبی رشتے داری ہے۔ یہ سنتے ہی گوالوی صاحب اور اس شخص کے درمیان جو گفتگو ہوئی اسے ہر شخص نے نہایت غور سے سننے اور لطف اندوز ہونے کے بعد سکریٹری سے درخواست کی کہ اس گفتگو کو سیمنار کی کارروائی سے خارج کر دیا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

اگلے مقرر نے ماحول کو مزید گرما دیا۔ انھوں نے کہا کہ گوالوی صاحب نے یہ کیا بے ہودہ بات کی ہے کہ ہر اردو اکیڈمی کے دفتر میں ایک بھینس پالنے کا انتظام کیا جائے۔ اگر ایسا کیا گیا تو یہ ضابطے کے خلاف ہوگا اور میں ضابطے کے خلاف کوئی بات ہونے نہیں دوں گا۔

اگر ضابطے میں ترمیم کر کے ایسا کر بھی دیا گیا تو سوال یہ پیدا ہوگا کہ وہ بھینس جو دودھ دے گی اس کا کیا بنے گا۔ اکیڈمیاں اُسے بیچیں گی یا خود ہی پی جائیں گی۔ میں چاہوں گا کہ اس دودھ کی فروخت کا پورا پورا حساب رکھا جائے۔

یہ سنتے ہی ایک اور شخص اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ اردو اکیڈمیوں کو ڈیری فارمز میں تبدیل کرنا سراسر زیادتی ہوگی۔ اکیڈمی ادب کی خدمت کرنے کا لئے ایک ادارہ ہے اور ...... ابھی وہ اپنا جملہ پورا نہیں کر پائے تھے کہ ایک اور صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے کہ جب میں بہت سے لوگوں کو خدمت کرنے والے اس ادارے کی گورننگ کونسل میں شامل ہونے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگاتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھے شک ہونے لگتا ہے کہ کہیں ان لوگوں کو اس خدمت میں دودھ کی چمکتی ہوئی سفید دھاریں تو نظر نہیں آ رہیں۔

اس جملے کے بعد ہال نے ایک چراگاہ کی صورت اختیار کر لی جہاں بہت سے جانور ہنہنا رہے ہوں۔

اس شور پر قابو پانے کے لئے سکریٹری صاحب نے اعلان کیا کہ اب لنچ کا وقت ہو گیا ہے۔ مقرر مہمانوں سے درخواست ہے کہ وہ ڈائننگ ہال میں تشریف لے چلیں۔

حاضرین سب بھول بھال کر لنچ کے لئے جو ڈائننگ ہال میں وارد ہوئے تو کبابوں کی خوشبو نے ہر ایک کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ کباب منہ میں رکھتے ہوئے ادیب حضرات ادب کے مسائل بھول کر کبابوں کی تعریف کرنے لگے۔ پھر اچانک کسی کو خیال آیا کہ اس طرح کے لنچ میں کوئی ادبی بات بھی ہونی چاہیئے چنانچہ انھوں نے دو کباب منہ میں رکھتے ہوئے اردو زبان و ادب پروموشن کمیٹی کے سکریٹری کو مشورہ دیا کہ اگلا سیمنار "اردو ادب اور بکری"، پر ہونا چاہیئے۔ کہ اس نے اپنی جان پر کھیل کر اردو ادب کی خدمت کی ہے۔

□□

قطعات

پرواز چڑھ رہی ہے سیاست پلین میں
ہونے لگی جوان، قیادت پلین میں
نیتا ہمارے پلین میں اُڑتے ہیں اس طرح
جیسے ہوئی ہے ان کی ولادت پلین میں[1]

(۲)

کبھی روٹی، کبھی چاول بنانا بھول جاتے ہیں
کبھی چولہے پہ برتن ہی چڑھانا بھول جاتے ہیں
انھیں سونپی گئی ہے اب ہماری میزبانی بھی
جو دستر تو بچھاتے ہیں، کھلانا بھول جاتے ہیں

—— طالب خوندمیری

اے/۲/۱۱۱۰-۹-۵ مقابل شیر گیٹ
کنگ روڈ۔ حیدرآباد۔
۵۰۰۰۲۹

[1] ایر انڈیا کے زیر اہتمام ایک مشاعرہ میں فی البدیہہ کہا گیا۔

افسانہ

م۔م۔ راجندر
۶۸۔ چترودھار۔ دھلی
۱۱۰۰۹۲



صدیوں کا بھروسہ

رام پرکاش لوہا بازار میں ایک ہتھوڑی خریدنے گیا تھا۔ ایک مضبوط سی ہتھوڑی چُن کر اور اس کے دام چکاکر وہ دکان دار کو پیسے دینے ہی والا تھا کہ اچانک سارے بازار میں بھگدڑ سی مچ گئی۔ لوگ بے تحاشہ اِدھر اُدھر دوڑنے لگے اور دُکانیں بند ہونے لگیں۔ ایک آدمی یہ کہتا ہوا بھاگ گیا کہ کوچہ دیارام میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا جھگڑا ہوگیا ہے۔ دکان دار نے رام پرکاش کے ہاتھ سے ہتھوڑی چھین لی اور دُکان کے شٹر گرانے لگا۔ رام پرکاش بھی وہاں سے سرپٹ بھاگا اور بچتا بچاتا اپنے محلے میں پہونچ گیا۔ جب وہ اپنے گھر میں داخل ہوا تو وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ اس نے اپنے کمرے کا تالا کھولا اور اندر گھس گیا۔ اس کا کتا موتی جو اس کی غیر موجودگی میں کمرے کے باہر بنے ہوئے تھڑے پر کم بیٹھتا تھا اور محلے کی گلیوں میں زیادہ پھرتا رہتا تھا——— رام پرکاش کو آتا دیکھ کر اس کے پیچھے پیچھے بھاگ آیا تھا اور تقریباً اس کے ساتھ ہی کمرے میں گھسا تھا۔ رام پرکاش ایک منٹ خالی کمرے میں کھڑا رہا۔ پھر اس نے پانی کا لوٹا اُٹھاکر اوک سے پانی پیا اور ایک ہاتھ سے اپنی چھوٹی سی کھٹیا اُٹھاکر باہر تھڑے پر آگیا اور کھٹیا نیچے پٹک کر اس پر بیٹھ گیا۔ موتی بھی اس کی ٹانگوں سے اُلجھتا ہوا اس کے ساتھ ہی نکل آیا تھا' اور اس کے سامنے منہ کر کے بیٹھ گیا تھا۔

رام پرکاش کا سانس ابھی تک تیزی سے چل رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ موتی بھی اس کی اس حالت کو دیکھ کر کچھ فکرمند ہوگیا تھا کیوں کہ تھڑے پر بیٹھنے کے بعد موتی اس کی طرف دیکھ کر سوالیہ انداز میں بھونکا تھا اور رام پرکاش کی ڈانٹ کھاکر ہی چپ ہوا تھا۔

رام پرکاش بہار کا رہنے والا تھا۔ اس کے گاؤں محمد پور سے بڑی تعداد میں چھوٹے بڑے لڑکے' شادی شدہ بھی اور غیر شادی شدہ بھی، کام اور مزدوری کی تلاش میں دوسرے صوبوں کے بڑے بڑے شہروں میں نکل جاتے تھے۔ محمد پور ایک پچھڑا ہوا گاؤں تھا اور زیادہ تر لوگوں کے پاس یا تو زمین تھی نہیں یا بہت کم تھی اور سارے کُنبے کا گزارہ بڑا مشکل تھا۔ باہر کے بڑے شہروں میں مزدوری بھی بہت اچھی تھی اور جب تک چاہو کام لگا رہتا تھا۔ پھر ان میں سے بہت سے لڑکے ایسے شہروں میں کام سیکھ کر اور تجربہ حاصل کر کے مستری اور اعلا کاریگر بھی بن جاتے تھے۔ محمد پور میں' چاہے ہندو ہو یا مسلمان' جہاں لڑکا سترہ سال کا ہوا اس کی شادی کر دی جاتی تھی۔ قانون کی طے کردہ شادی کی عمر کا گاؤں والوں کو نہ تو شاید پتہ تھا اور نہ وہ اس کی پروا کرتے تھے۔ کسی نے پوچھ تاچھ کی بھی تو لڑکے اور لڑکی دونوں کی عمر زیادہ بتا دیتے تھے۔ رام پرکاش کی شادی بھی دو سال ہوئے سترہ سال کی عمر میں ہوگئی تھی مگر گونا اس کا دیر میں ہوا تھا اور صرف چھ مہینے ہوئے تھے۔ اسے اس بڑے اور تجارتی شہر میں کام کرتے ہوئے ایک سال ہوگیا تھا، وہ سترہ سال کی نئی نویلی دلہن کو گھر لے آیا تھا اور صرف چار دن اس کے ساتھ ٹھہر کر یہاں اپنے کام پر واپس آگیا تھا۔ گھر میں پیسے کی بھی ضرورت تھی اور پھر ٹھیکیدار کا بھی ڈر تھا کہ اگر اس نے گاؤں سے لوٹنے میں دیر کی تو وہ کسی اور کو اس کی جگہ کام پر رکھ لے گا۔ اس ٹھیکیدار کے پاس کام بھی بہت تھے اور وہ اپنے کاریگروں کو پیسے دینے میں بالکل تنگ نہیں کرتا تھا۔

رام پرکاش ذہین تھا اور اسے پڑھنے کا بھی شوق تھا مگر محمد پور میں تو پرائمری اسکول بھی نہیں تھا اور اس کی نو سال تک کی عمر تو گاؤں کی گلیوں کی دھول چھانتے گزر گئی۔ پھر جب گاؤں کے کاکا بنارسی

نے جو پڑھے لکھے تھے اور پٹواری رہ چکے تھے، اپنے گھر میں بچوں کو ایک روپیہ مہینہ کی فیس پر پڑھانا شروع کیا اور کئی بڑے بچے ان کے یہاں پڑھنے لگے تو رام پرکاش بھی اپنے چاچا سے پوچھ کر اس اسکول میں جانے لگا۔ وہ تین سال تک پڑھتا رہا۔ وہ ہندی اچھی طرح پڑھنے اور لکھنے لگا تھا اور جمع، تفریق اور تقسیم کے سوال بھی کرلیتا تھا۔ پھر ایک روز اس کے چاچا نے اس کی پڑھائی چھڑوا کر اسے ننھے خاں کے ساتھ کام سیکھنے اور کرنے کے لئے مظفر نگر بھیج دیا۔ ننھے خاں تھے تو اسی گاؤں کا رہنے والا مگر کوئی آٹھ دس سالوں سے مظفر نگر میں بجلی کے مستری کے طور پر کام کر رہا تھا اور بجلی کی فٹنگ کے چھوٹے موٹے ٹھیکے بھی لے لیتا تھا۔ اس نے دو تین مہینے رام پرکاش کو کام سکھایا اور اپنے پاس ہی رکھا مگر بعد میں اس کی دس روپئے روز کی دہاڑی کردی۔ رام پرکاش نے اپنے رہنے اور کھانے کا انتظام بھی کسی اور جگہ دوسرے مزدوروں کے ساتھ کرلیا۔ تھوڑی سی کمائی میں بھی وہ آدھے پیسے بچاکر گھر بھیج دیتا تھا۔ رام پرکاش نے ننھے خاں کے ساتھ چار سال تک کام کیا مگر جب ننھے خاں نے مظفر نگر چھوڑنے اور پٹنہ جاکر کام کرنے کا فیصلہ کیا تو وہ اس کا کام چھوڑ کر اپنے گاؤں لوٹ آیا تھا۔ چھ مہینے گاؤں میں گزارنے کے بعد وہ کام کرنے کے لئے پھر نکل پڑا تھا اور اب کے وہ زیادہ دور آگیا تھا۔ یہاں بہادر کے کافی مزدور اور کاریگر تھے اور چونکہ وہ بجلی کا سارا کام جانتا تھا اس لئے اسے ایک دو دن میں ہی پینتیس روپئے روز پر ایک بڑے ٹھیکیدار کے ساتھ کام مل گیا تھا۔ وہ کھا پی کر پانچ سو روپئے مہینہ بچالیتا تھا۔ یہ روپیہ ہر دوسرے تیسرے مہینے وہ کسی آتے جاتے کے ہاتھ گھر بھیج دیتا تھا اور اس کا چاچا اسی میں سے وہ قرضہ بھی ادا کر رہا تھا جو انھوں نے رام پرکاش کی شادی میں بیاج پر لیا تھا۔ اس کمرے کا کرایہ تین سو روپئے ماہوار تھا مگر رام پرکاش کو صرف سو روپئے دینے پڑتے تھے کیوں کہ اس نے اپنے ساتھ دو اور کاریگر رکھ لیے تھے۔ ایک ضلع میرٹھ کا یاسین اور دوسرا اسی کی طرف کا رہنے والا کنھیا۔ یاسین راج مستری تھا اور ٹھیکیدار اسے ستر روپئے روز دیتا تھا مگر یاسین کے گھر والوں کو بھی پیچھے گاؤں میں کافی قرضہ دینا تھا۔ کنھیا کارپنٹر تھا جو اس کا خاندانی پیشہ تھا۔ یہاں سارے بڑھئی اپنے آپ کو کارپنٹر کہتے تھے، اس لفظ سے شاید وہ احساس برتری حاصل کرتے تھے جو بڑھئی میں نہیں تھا۔ کنھیا کو چالیس روپئے روز ملتے تھے مگر وہ بھی اپنے گھر میں اکیلا کمانے والا تھا اور پیچھے گاؤں میں اس کے پیسوں کا ہر وقت انتظار کرتے ہوئے اس کی عورت سمیت نو افراد تھے۔ کنھیا کا رام پرکاش اور یاسین کو سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ وہ ہر روز شام کو ایک چھوٹی سی بوری میں لکڑی کا برادہ، چھیلن اور ٹکڑے لے آتا اور روٹی بنانے کے لئے ایندھن مفت میں مہیا ہو جاتا۔ روٹی تینوں مل کر باری باری بنالیتے۔ ڈیڑھ سو روپئے مہینے سے زیادہ فی آدمی روٹی کا خرچ بھی نہیں آتا تھا۔

رام پرکاش نے کوئی چھ مہینے سے داڑھی رکھ لی تھی۔ وہ تو ایک سادہ، محنت کش گاؤں والا تھا مگر ایسا اس نے صرف صبح صبح جب کام پر جانے کی جلدی ہوتی تھی، داڑھی بنانے کی تساہلی اور سستی کی وجہ سے کیا تھا اگرچہ اس کے یہ دونوں ساتھی ہر دوسرے تیسرے روز ٹھنڈے پانی، گھٹیا کپ سوپ کے بچے کھچے ٹکڑے اور ہفتوں سے استعمال کیے جانے والے کھنڈے بلیڈ سے اپنی داڑھی کھرچنے بیٹھ جاتے۔ مگر رام پرکاش کو اس سارے عمل میں بڑا جھنجھٹ محسوس ہوتا۔ اس لیے اس نے داڑھی رکھنے کا فیصلہ کرلیا اور اب تو وہ بھرپور داڑھی ہو گئی تھی۔

رام پرکاش اپنی کھٹیا پر بیٹھا ہوا ابھی تک آج کے واقعہ کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ یکے بعد دیگرے یاسین اور کنھیا اپنے کام سے واپس آگئے اور سیدھے کمرے میں گھس گئے۔ کیوں کہ آج صبح رام پرکاش نے روٹی بنالی تھی اس لیے یاسین اور کنھیا آتے ہی اپنے چیلے کونے میں رکھ کر روٹی بنانے کے کام میں جٹ گئے۔ ان تینوں کو ہی کام سے لوٹتے ہی سخت بھوک لگی تھی کیوں کہ تینوں مزدور تھے اور کام میں سخت محنت کی وجہ سے تین چار گھنٹوں میں ہی صبح کی کھائی ہوئی روٹی کا وزن پیٹ میں غائب ہو جاتا اور پیٹ خود چپاتی کی طرح چپٹا ہو جاتا۔ ہاں کبھی ٹھیکیدار یا کوئی اور چائے منگوا لیتا تو چھوٹے چھوٹے دو تین کپوں میں ذرا ذرا سی چائے ڈال دی جاتی اور اس کی دو چار چسکیوں سے خالی پیٹ بجنا بند ہو جاتا۔ کبھی کبھی یہ خود بھی چائے منگوا لیتے۔ چائے منگوانا بھی آج کل کون سا آسان ہے کام کی جگہ پر بھی ایک روپئے کا سکڑا ہوا چھوٹا ننھا سا کپ ملتا تھا۔

جب یاسین نے آٹا گوندھ لیا تو کنھیا نے اپنے بُرادے اور لکڑی کے ٹکڑوں سے آگ جلالی۔ اگرچہ دھواں پیچھے کی خالی جگہ میں سے باہر نکل رہا تھا مگر تھوڑا تھوڑا کمرے میں بھی پھیل رہا تھا۔ رام پرکاش ابھی باہر ہی بیٹھا تھا اور موتی اپنا منہ دونوں اگلے پنجوں میں اڑا کر ایسے لیٹ گیا تھا جیسے سو گیا ہو۔ رام پرکاش نے اپنے کُرتے کی جیب سے بیڑی کا بنڈل نکالا اور بیڑی سلگانے اندر چلا گیا۔ یاسین نے اپنا ٹرانزسٹر اونچی آواز میں چلا کر فلمی گانے سننے شروع کر دیئے تھے۔ کاریگروں اور مزدوروں کا ٹرانزسٹر ان کی دلجمعی کے لیے بڑا قیمتی سہارا ہوتا ہے۔ شاید فلمی گانے سننا ان کی تکان کو دور کرتا ہو۔ رام پرکاش نے چولھے کی آگ سے اپنی بیڑی سلگائی اور ایک کش لگا کر یاسین کے برابر اس کی کھٹیا پر بیٹھتا ہوا بولا:

"یاسین بھائی! آج کام سے لوٹتے ہوئے لوہا بازار ایک ہتھوڑی خریدنے چلا گیا تھا لیکن اس طرف ہندو مسلمانوں کا جھگڑا ہو گیا ہتھوڑی بھی نہیں خرید سکا اور بڑی مشکل سے بچ کر آیا ہوں۔ تم دونوں تو دوسری طرف کام کرتے ہو، ادھر تو کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔؟"

"نہیں۔ اُدھر تو کچھ نہیں ہوا" یاسین بولا۔ "ادھر تو ساری کوٹھیاں ہی کوٹھیاں ہیں۔ یہ دنگے فساد تو شہر میں ہی ہوتے ہیں۔ ساڑھے سات بجے کی خبریں سنیں گے۔"

سوا سات بجے تک کنھیا نے ساری روٹیاں سینک لی تھیں بھوک تو سب کو ہی لگی تھی، فوراً سب نے اکٹھے بیٹھ کر کھانا شروع کر دیا۔ ریڈیو پر گانے چل ہی رہے تھے۔ دس منٹ میں ہی تینوں کا کھانا ختم ہو گیا۔ پھر یاسین نے خبریں لگا دیں۔ خبروں میں بتایا گیا کہ بمبئی میں کئی جگہ بم پھٹ گئے تھے اور کافی لوگ ہلاک یا زخمی ہو گئے تھے۔ یہاں کی خبر صرف یہ تھی کہ ایک عبادت خانے کے پاس دو فرقوں میں جھگڑا ہو گیا جس میں دو آدمی مارے گئے اور متعدد زخمی ہو گئے۔ مگر پولیس نے جلد ہی حالات پر قابو پالیا۔ جب خبریں ختم ہو گئیں تو یاسین نے ٹرانزسٹر بند کر دیا۔ تینوں ایک ہی چارپائی پر ایک دوسرے سے جڑے ہوئے بیٹھے تھے اور کافی سنجیدہ تھے۔ یاسین بولا:

"ابے رام پرکاش! تو آج جس بازار میں پھنس گیا تھا اس میں تو سب کے سب ہندو ہیں اور تو نے داڑھی رکھی ہوئی ہے۔ تُو بچ گیا ورنہ تجھے ہندو مسلمان سمجھ کر مار دیتے۔"

"داڑھی سے کیا ہوتا ہے۔ میں تو ہندو ہوں۔" رام پرکاش نے کہا۔

"جمانہ بڑا کھراب ہے بھیا رام پرکاس۔" کنھیا اُٹھتے ہوئے بولا "یاسین بھیا ٹھیک کہت ہیں۔ کٹوا لیو اپنی داڑھی۔ کِس کِس کو کہتے پھروگے کہ ہندو ہوں۔"

"رام پرکاش!" یاسین پھر بولا۔ "ملک کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ سیاست میں مذہب داخل ہو گیا ہے۔ فساد تو اب روز کا قصہ ہو گئے ہیں۔ کنھیا ٹھیک کہتا ہے داڑھی کٹوا لے۔ کم از کم اپنے مذہب کے آدمیوں کے ہاتھوں تو نہیں مارا جائے گا۔ ابے ہندو تو کپڑے اتروا کے دیکھ لیتے ہیں کہ ہندو ہے یا مسلمان! سمجھ رہا ہے میری بات یا نہیں۔؟"

"سمجھ رہا ہوں۔ سمجھ رہا ہوں۔" رام پرکاش کچھ جھنجھلا کر بولا "تو تیرا مطلب ہے کہ اگر میں داڑھی کے ساتھ مسلمانوں کے محلے سے گزروں تو وہ مجھے مسلمان سمجھ کے چھوڑ دیں گے۔؟"

"نہیں۔" کنھیا یاسین سے پہلے ہی بول پڑا۔ "وہ بھی تیرا پاجامہ اُتروا کے دیکھیں گے۔"

"بھئی میں نے سُنا ہے۔" یاسین نے وضاحت کی "پاجامہ نہ بھی اُتروائیں تو کلمہ ضرور پڑھواتے ہیں۔"

ان خوفناک باتوں کے باوجود یاسین اور کنھیا منگل بازار میں گھومنے اور دو ایک چیزیں خریدنے کے لیے نکل گئے۔ انھوں نے رام پرکاش سے بھی چلنے کے لیے کہا تھا مگر رام پرکاش نے انکار کر دیا تھا۔ ان کے جاتے ہی رام پرکاش کل آئی ہوئی اپنے چاچا کی ہندی کی چٹھی طاق سے اُٹھا کر باہر آگیا اور اپنی کھٹیا پر بیٹھ کر عین اس کے سامنے لگے بجلی کے کھمبے کی روشنی میں دوبارہ اسے پڑھنے لگا۔ چٹھی پڑھ چکا تو وہ پھر سوچنے لگا کہ آج وہ بلوائیوں کے ہاتھوں مارا جاتا تو کیا ہوتا۔ اس کے گھر والوں اور اس کی بیوی پر کیا بیتتی۔ وہ روٹی کہاں سے کھاتے۔ چودھری کا قرضہ کہاں سے ادا کرتے؟ کیا ہوتا ان سب کا؟

ایک ہی دیس کے رہنے والے دھرم اور مذہب کے نام پر ایک دوسرے کا گلا کیوں کاٹ رہے ہیں۔ اگر دھرم ہی جھگڑے کی جڑ ہے تو ہم دھرم کو ختم ہی کیوں نہ کر دیں یا پھر ساری دنیا کا دھرم ایک ہی کیوں نہ ہو جائے! اور پھر وہ دھرم ہی کیا ہوا جو نہ کسی نے تلاش کیا اور نہ اپنی محنت سے حاصل کیا بس جو جس کے گھر میں پیدا ہوا اسی مذہب کا ہو گیا۔ یہ تو دھرم یا مذہب نہیں ایک حادثہ ہو گیا۔

معمولی سے پڑھے لکھے رام پرکاش کا ذہن تیزی سے یہ سب باتیں سوچ رہا تھا کہ اچانک اس کا ہاتھ اپنی داڑھی پر چلا گیا اور ایک خوف نے اسے جکڑ لیا۔ آج اگر اسے فسادی ہندو پکڑ لیتے تو شاید مسلمان سمجھ کر مار ڈالتے۔ ایسے پر اشتعال لمحوں میں اس کے کپڑے اتروا کے دیکھنے کی کون سوچتا۔ اسے فوراً خیال آیا کہ یاسین کے بازار سے لوٹتے ہی وہ اپنی داڑھی نوچ کے اس کے چہرے پر لگا دے گا۔ مگر اس کی داڑھی تو ڈرامے کی نقلی چپکی ہوئی داڑھی نہیں تھی! پھر بھی ہو وہ یہ سوچ کر حیران ہوا کہ آدمی کا مذہب صرف داڑھی سے ادلا بدلا جا سکتا تھا۔ مگر پھر اسے اچانک خیال آیا کہ داڑھی تو بہت سے ہندوؤں نے بھی رکھی ہوئی تھی۔ ہندوؤں کے رشی، منی اور سادھو بابا تو پہلے بھی داڑھی رکھتے تھے اور آج بھی رکھتے ہیں۔ کیا داڑھی کا بھی کوئی مذہب ہوتا ہے۔ کیا ہندو داڑھی اور مسلمان داڑھی بھی ہوتی ہے — ؟ اس کا ذہن بری طرح الجھ گیا۔

آٹھ بج گئے تھے اور رام پرکاش ابھی تک سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اچانک پاس لیٹا ہوا یا سویا ہوا موتی اچھلا اور رام پرکاش کے بالکل پاس آ کر اور پچھلے دونوں پاؤں کے بل بیٹھ کر بھونکنے لگا۔ رام پرکاش نے اس کی طرف دیکھا تو موتی نے بھونکنا بند کر دیا مگر جب رام پرکاش اسی طرح بیٹھا رہا تو پھر اس نے زور زور سے بھونکنا شروع کر دیا۔ رام پرکاش کو معاً سوجھ گیا کہ موتی اپنی روٹی مانگ رہا تھا کیوں کہ یہی وقت تھا جب وہ اپنی روٹیاں کھا کر موتی کو دو روٹیاں دے دیتے تھے۔ موتی کو بھی اپنے کھانے کے وقت کا پتہ تھا اور اسے بھی اس وقت سخت بھوک لگتی تھی اور اگر یہ لوگ دیر کر دیتے تو وہ بھونک بھونک کر انھیں یاد دلا دیتا اور روٹی مانگتا۔ رام پرکاش نے دیکھا کہ موتی کی آنکھوں بلکہ اس کے تمام [redacted] اس کی بھوک عیاں تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ جہاں تک [redacted] یا دوسرے جانوروں کا تعلق تھا، ان کی بھوک پیا[redacted] تمام بنیادی ضرورتوں اور محسوسات میں کوئی بھی فرق نہیں تھا سوا[redacted] ن کے کہ جانوروں کا کوئی مذہب نہیں تھا اور انسان نے نہ جا[redacted] سے مذہب کو پکڑ لیا تھا جس نے انسان کو انسان سے جدا [redacted] انسانیت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھے۔ مگر رام پرکاش کی سو[redacted] مقابلے میں موتی کی بھوک اس وقت زیادہ ضروری تھی۔ وہ اٹھا [redacted] موتی کی روٹیاں اندر سے اٹھا لایا اور انھیں توڑ کر موتی کے سا[redacted]۔ پھر اس نے موتی کے لئے اس کے چوڑے منہ کے [redacted] پانی سے بھر دیا۔

اتنے میں یاسین [redacted] کنہیا آ گئے اور ان کے آتے ہی رام پرکاش بازار کی طرف نکل گیا۔ اس [redacted] ن دو نئے بلیڈ خریدے اور واپس آ گیا۔ اگلے دن وہ کام پر [redacted] میں گیا پہلے اس نے نئے بلیڈ سے کھرچ کھرچ کر وہ داڑھی کا [redacted] اسے مسلمان بنا رہی تھی۔ جان کے معاملے میں خطرہ مول لینا عقل [redacted] نہیں تھی۔ گاؤں میں اس کی بالکل نئی بیوی، ماں، چاچا اور کئی [redacted] ایک تھا۔ پھر اس بڑے شہر میں اس کے آس پاس جو محلے تھے ان میں تقریباً ساری آبادی ہندوؤں کی تھی اور داڑھی کے ساتھ اس کا ہندوؤں کے ہاتھوں مارا جانا [redacted] زیادہ اغلب تھا۔

لیکن شام کو رام پرکاش جب کام سے لوٹا اور اپنی کھٹیا پر بیٹھ کر بیڑی سلگا کر سوچنے لگا تو اسے ایک اور اندیشہ لاحق ہو گیا اس کے چہرے پر داڑھی تھی [redacted] ن کے مسلمان ہونے کا ایک شناختی نشان تھا اور خطرہ صرف ہندوؤں [redacted] تھا۔ لیکن اب تو وہ دیکھنے میں نہ ہندو تھا اور نہ مسلمان۔ ا[redacted] گاؤں میں بھی کوئی ہندو لڑکا چوٹی نہیں رکھتا تھا۔ تو گویا اسے اب [redacted] سے بھی ہو گیا تھا اور مسلمانوں سے بھی! اور مشتعل ہندوؤں [redacted] مسلمانوں کے پاس وقت ہی کہاں ہوگا کہ چھرا گھونپنے سے پہلے [redacted] کر دیکھ لیں کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان۔! یہ کتنی عجیب [redacted] تھی۔ رام پرکاش سوچنے لگا کہ کسی ہندو یا مسلمان کی، [redacted] کوئی جسمانی شناخت

نہیں تھی!

تھوڑی ہی دیر میں یاسین اور کنھیا اپنے تھیلوں کو کاندھے پر لٹکائے کام پر سے واپس آ گئے۔ دونوں کے چہرے تکان اور آنتیں کاٹتی بھوک سے پژمردہ تھے۔ بھوک اسے بھی زور کی لگی تھی اور تینوں کے چہروں پر ایک سی ہی پژمردگی تھی۔ رام پرکاش نے سوچا کہ مذہب سے اچھی چیز تو بھوک اور محنت تھی جو ہمیں مل کر رہنے کا سبق تو سکھاتی تھی۔

اگرچہ فساد ہوئے کئی دن گزر گئے تھے مگر پرانے شہر میں کشیدگی قائم تھی۔ یہ تناؤ شہر کے باہری حصوں تک پھیل گیا تھا۔ محبت کا پیغام کتنا سست قدم ہوتا ہے اور نفرت کے پیروں میں کتنے تیز رفتار پہیئے لگے ہوتے ہیں۔ ایک روز ان تینوں کے کام پر جانے سے پہلے ہی کرفیو لگ گیا اور اگلے دن بھی نہیں ہٹا۔ وہ تینوں کام پر نہیں جا سکے اور دن بھر بیڑی پھونکتے رہے یا سوتے رہے۔ تینوں کی دو دو دن کی دہاڑی کا نقصان ہو گیا تھا۔

دو تین دن کے بعد شہر میں پھر امن قائم ہو گیا اور کرفیو تمام علاقوں سے ہٹا لیا گیا۔ کرفیو ہٹتے ہی سڑکوں اور بازاروں میں لوگوں کی بھیڑیں امڈ آئی تھیں جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے کندھے سے کندھا ملائے ہوئے چل رہے تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے ہی دکانیں کھول لی تھیں اور دونوں کی ہی دکانوں پر ہندو اور مسلمان گاہک اپنی ضرورت کی چیزیں خرید رہے تھے۔ گویا ایک دوسرے پر وہ صدیوں کا بھروسہ لوٹ آیا تھا۔ یا شاید یہ کبھی ٹوٹا ہی نہیں تھا۔ پھر ایسا کیوں ہو جاتا تھا اور وہ کون سے لوگ تھے جو اس امن کو آگ لگا دیتے تھے۔ اہلِ مذہب، شاید نہیں۔ سیاست داں، شاید ہاں۔ مگر یہ سیاست داں بھولے بھالے عوام کے مذہبی جذبات کو کیوں بھڑکاتے تھے؟ سیاست اور مذہب یوں گڈمڈ کیوں ہو جاتے ہیں۔؟

تینوں دوست، رام پرکاش، یاسین اور کنھیا کام پر سے لوٹ کر اور روٹی کھا کر نیچے فرش پر تاش کھیلنے بیٹھ گئے تھے۔ — وہ صرف "کوٹ پیس" کھیلنا جانتے تھے۔ ابھی ایک دو بازی ہی کھیلے تھے کہ باہر چبوترے پر بیٹھے موتی نے دروازے میں بھونکنا شروع کر دیا اور تینوں جان گئے کہ وہ روٹی مانگ رہا ہے۔ یاسین نے اٹھتے ہی آواز دی۔

"رستم۔ رستم۔ آ جا اندر۔"

موتی دُم ہلاتا ہوا اندر آ گیا اور یاسین نے اس کی روٹیاں توڑ کر وہیں اس کے سامنے زمین پر ڈال دیں۔

"کھا لے رستم کھا لے۔ باہر تیرے صحن میں پانی بھرا ہوا ہے۔"

"ابے تو اسے رستم رستم کیا کہہ رہا ہے؟" رام پرکاش بولا۔ "اس کا نام تو موتی ہے۔"

"جانتا ہوں بے۔ لیکن میں تو اسے کئی دن سے رستم کہہ رہا ہوں اور وہ میرے رستم کہتے ہی بھاگ کر آتا ہے۔"

مشکل سے تینوں آدھ گھنٹہ تاش کھیلے ہوں گے کہ تھکے ہارے جسموں کو نیند آنے لگی اور وہ اپنی اپنی کھاٹ پر ٹانگیں پسار کر لیٹ گئے۔ یاسین اور کنھیا تو لیٹتے ہی سو گئے، مگر رام پرکاش کی نیند ابھی دور تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ یاسین نے موتی کا نام رستم رکھ کر اچھا نہیں کیا کیوں کہ رستم تو مسلمانوں کا نام ہوتا ہے۔ مگر یہ موتی کو کیا ہوا تھا کہ وہ موتی کے نام پر بھی دوڑا آتا ہے اور رستم کے نام پر بھی۔ کیا موتی پہلے ہندو تھا اور اب مسلمان ہو گیا یا وہ ہندو بھی ہے اور مسلمان بھی، سکھ بھی ہے اور عیسائی بھی یعنی اسے جس نام سے چاہو بلا لو۔ تو کیا کتا انسان سے بہتر ہے۔؟

مگر رام پرکاش کو یہ خوف دامن گیر ہو گیا کہ یاسین نے موتی کا نام رستم رکھ کر اچھا نہیں کیا کیوں کہ کتا اپنے نئے نام کی وجہ سے ہندوؤں کے محلے میں مارا جائے گا۔ اگر وہ صرف موتی ہوتا تو مسلمانوں کے محلے میں ہی مارا جاتا۔ لیکن اب تو دونوں کے ہی محلوں میں اس کے مارے جانے کا خطرہ ہو گیا تھا۔ کتنے دکھ کی بات تھی کہ انسان نے ایک جانور کو بھی اپنے ساتھ اس قسم کے خطروں سے دوچار کر دیا تھا اور موتی تو انسان بھی نہیں تھا جو لامذہب بلوائی اس کے کپڑے اتروا کے دیکھ لیتے کہ وہ ہندو تھا یا مسلمان۔ اور رام پرکاش اس قسم کی بے ہنگم باتیں سوچتا سوچتا سو گیا۔

تقریباً ایک مہینہ آرام سے گزر گیا اور ملک کے کسی بھی حصے سے

فرقہ وارانہ فساد کی خبر نہیں آئی۔ مگر جیسے یہ فسادات کسی منظم سازش کا نتیجہ ہوں، احمد آباد میں فساد ہوگیا۔ یہ فساد بھی کسی مذہبی جلوس کے نکالے جانے کے موقع پر ہوا تھا اور ریڈیو نے یہ خبر سناتے ہوئے یہ بھی بتایا تھا کہ احتیاط کے طور پر اس شہر میں بھی پولیس نے اپنے انتظامات کڑے کرلیے ہیں۔ اس پر رام پرکاش بولا:

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جھگڑا کتنی ہی دور کسی دوسرے شہر میں کیوں نہ ہو، اس کا اثر ہمارے شہر میں یا دوسرے شہروں میں کیوں ہوتا ہے۔ ہم میں دھرم کے نام پر آتنا ایکا ہے دے"؟

"ایکے کی بات غلط ہے رام پرکاش۔ مسلمانوں میں بھی آپس میں لڑائی ہوتی ہے اور ہندوؤں میں بھی۔" یاسین جوش میں آکر بولا "ذات پات اور فرقے ہمارے مذہب میں بھی ہیں اور تمہارے میں بھی۔ ایسے ہندو بھی جنونی ہیں اور مسلمان بھی۔ یہ جو ہمارے نیتا ہیں، لیڈر ہیں اسے آگ بھی لگاتے ہیں۔ ہم ہیں اَن پڑھ، جاہل، جو انھوں نے کہہ دیا کرنے کو تیار ہوگئے اور مرتے سالے غریب ہی ہیں۔"

"مجھے تو ایسا لگے ہے۔" کنھیا بولا "کہ کل یہاں پھر کرفیو لگ جائے گا اور ہماری دہاڑی ماری جائے گی۔"

کنھیا یہ کہہ کر اُداس ہوگیا۔ اس کے گھر سے چٹھی آئی تھی کہ "اب کے اناج بہت کم ہوا ہے اور پیسے زیادہ بھیجنا۔" اس کا اندیشہ صحیح ثابت ہوا۔ کیوں کہ رات ہی کو یہاں گڑبڑ ہوگئی تھی اور اسی وقت سے سارے شہر میں کرفیو لگ گیا تھا۔ چوں کہ احمد آباد میں ایک مندر اور ایک مسجد کو نقصان پہونچا تھا۔ کئی سو میل پرے یہاں کے لوگوں نے بھی ایک مسجد اور مندر کو نقصان پہونچا کر اپنے دھرم اور مذہب کے تئیں اپنے راسخ عقیدے کا ثبوت دے دیا تھا۔ ان تینوں نے حسب معمول اپنی روٹی بنائی اور کھالی۔ گاؤں سے سائیکل پر آنے والا دودھیا کرفیو کے باوجود نہ جانے کیسے آگیا تھا۔ رام پرکاش نے آج دودھ تھوڑا سا زیادہ لے لیا کیونکہ کام پر نہیں جائیں گے تو چائے تو کئی دفعہ پینی ہی پڑے گی۔ سوکر اور تاش کھیل کر کتنا وقت کٹے گا۔

ابھی دن کے گیارہ بھی نہیں بجے ہوں گے کہ یاسین اور کنھیا اپنی اپنی کھاٹ پر لیٹ گئے اور شاید سو گئے۔ رام پرکاش بھی اکتا کر لیٹ گیا مگر ذہن کچھ کچھ سوچتا رہا [illegible] جین نماز پڑھتا ہے اور نہ میں اور کنھیا کوئی پوجا کرتے ہیں۔ تو ہم تو نا[illegible] ہندو اور مسلمان ہوئے۔ شاید ہماری طرح دوسرے لاکھوں کروڑوں لوگ [illegible] کے ہندو اور مسلمان ہوں گے۔ کہیں مذہب اور دھرم سے ان نا[illegible] احتی نہیں بنادیا تھا؟ رام پرکاش ابھی تک ذہن سے یہ [illegible] نہیں جھٹک سکا تھا کہ وہ اس روز لوہا بازار میں مارا جاسکتا تھا۔

وہ یاسین کی طرف دیکھنے لگا [illegible] فکر ہوکر سو رہا تھا۔ وہ ہندوؤں کے محلے میں تو ہندوؤں [illegible] رہ رہا تھا اور اسے ذرا سی بھی فکر نہیں تھی۔ کیا وہ بے وقوف [illegible] اسے اپنے ہندو دوستوں پر اٹوٹ بھروسہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی [illegible] سے یاد آیا کہ اس کے گاؤں میں تو کوئی سوچتا بھی نہیں تھا کہ کون ہندو ہے [illegible] کون مسلمان اور کتنا بھائی چارہ تھا سب میں۔ اسے کام سکھانے والا [illegible] س کا اُستاد ایک مسلمان ہی تھا۔

رام پرکاش نے پھر یاسین کی طرف [illegible] گیا۔ یاسین اسی طرح بے دھڑک سو رہا تھا [illegible] پرکاش سوچنے لگا کہ اگر میں اور کنھیا دونوں مل کر یاسین کو ختم کر دیں [illegible] ہم پر بھروسہ چور چور نہیں ہو جائے گا یا میں اکیلا ہی اگر اس [illegible] پیٹ میں وہ سامنے پڑا ہوا چاقو گھسیڑ دوں تو؟ وہ یہ الٹی سیدھی [illegible] سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک یاسین ہڑبڑا کر اٹھ گیا اور پھٹی پھٹی نظروں [illegible] کے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ رام پرکاش تیزی سے اٹھا اور یاسین [illegible] کر بولا۔

"یاسین! کیا تو نے کوئی بھیانک سپنا دیکھا ہے۔ سچ بتا۔ کیا میں نے تیرے سینے میں [illegible] پیٹ میں چاقو گھونپ دیا تھا؟ نہیں ڈرے میں ایسے دھرم [illegible] نہیں رکھتا —— تو میرا دوست، میرا بھائی ہے —— [illegible] ایک دوسرے پر وہ پُرانا بھروسہ یوں نہیں ٹوٹے گا۔"

> اہلِ دانش نے جو [illegible] بنائے نہ رہے
> مسلکِ اہلِ محبت ہے کہ باطل نہ ہوا
>
> — حبیب احمد صدیقی



غزل

نہ تیرے لیے ہے نہ میرے لیے ہے
یہ دُنیا ہے سب کی، یہ سب کے لیے ہے

دیئے جا رہی ہے وہی رات دھو کے
خدا جانے کتنے سویرے لیے ہے

وہ سادہ نظر، سادگی میں بھی اپنی
بڑے دل نشیں استعارے لیے ہے

نظر میں دِوالی تو ہونٹوں پہ ہولی
یہ ہر رُت کا سنگار کس کے لیے ہے

خدا کر سکا طے نہ انساں کے جھگڑے
ہر اک اپنے اپنے صحیفے لیے ہے

بھری رہ رَووں سے نگاہوں کی راہیں
یہ دل کتنی یادوں کے میلے لیے ہے

نہیں چشمِ مُلّاؔ میں بس نورِ فردا
یہ ماضی کے بھی کچھ دُھندلکے لیے ہے

(جنوری ۱۹۹۲ء)

——— آنند نرائن مُلّاؔ

آنند نرائن مُلّا اُردو ادب کی تاریخ کی ناقابلِ فراموش شخصیت کا نام ہے اور اودھ نمبر حصہ دُوم میں راقم الحروف کو ان کا انٹرویو شائع کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ خداوندِ عالم ان کا سایہ اُردو والوں کے سروں پر سلامت رکھے۔ ——— ایڈیٹر



غزل

بُزرگوں سے سُنا ہے کہ

معین احسن جذبی کا مجموعہ "فروزاں" جب شائع ہوا تھا تو اس کی بیشتر غزلیں' اور نامکمل نظم "موت اور نظرت ایک مفلس کی نظر میں" بچے بچے کی زبان پرتھیں۔ وہ علی گڑھ میں تدریس کے پیشہ سے وابستہ رہے کم کہا لیکن جتنا کہا، بہت خوب کہا۔ خدا انھیں سلامت رکھے۔

———— ایڈیٹر

چمن سے لالہ و گل کے سلام آتے ہیں
ہمارے نا[redacted] جنوں کے پیام آتے ہیں

نہ جانے ساقیِ خم زن پہ آج کیا گزری
کہ [redacted]ے کو لیے تشنہ کام آتے ہیں

وہ . [redacted] کی منزلِ مقصود کہکشاں سے پرے
ہمارے [redacted]تھ بس اک چند گام آتے ہیں

وہ خو[redacted] خرامیِ آوارگانِ راہِ وفا
جہاں سے دا[redacted]رسن کے مقام آتے ہیں

[redacted]

[redacted]حسن جذبی (اگست ۱۹۵۶ء)

بوڑھا مالی

علیم انصاری

امین آباد پارک، لکھنؤ

جب گرم ہوائیں چلتی تھیں، اُمید نہ تھی ہریالی کی
تھی سوئی ہوئی اندھیارے میں ہر ایک کرن اُجیالی کی
یہ پھول، یہ کلیاں، یہ پودے، تصویر تھے جب پامالی کی
ہمت تھی اسی رکھوالے کی، اس وقت بھی جو رکھوالی کی
ہر بات ہے ابتک یاد ہمیں اس باغ کے بوڑھے مالی کی

یہ بیج اسی نے بویا تھا، کیا پوچھنا اسکی ہمت کا
آزادی جس کو کہتے ہیں، یہ پھل ہے اسی کی محنت کا
یہ باغ نظر آتا ہے ہمیں جو آج نمونہ جنت کا
یہ باغ ابھی کچھ روز ہوئے تصویر تھا اک پامالی کی
ہر بات ہے ابتک یاد ہمیں اس باغ کے بوڑھے مالی کی

اس کے ہی خون پسینے کا سینچا ہوا بوٹا بوٹا ہے
اسی کی آنکھ کے سوتوں سے یہ میٹھا چشمہ پھوٹا ہے
اس کے ہی رسیلے ہونٹوں سے ہر بھونرے نے رس لوٹا ہے
یہ پیڑ اسی نے لگایا تھا، ہے جان جو آب ہریالی کی
ہر بات ہے ابتک یاد ہمیں اس باغ کے بوڑھے مالی کی

اس باغ کی پتی پتی پر تحریر ہے اسکے ہاتھوں کی
پھولوں میں سنائی دیتی ہے گونج اس کی انوکھی باتوں کی
کلیوں میں ہیں نیندیں سوئی ہوئی، جاگی ہوئی لاکھوں راتوں کی
دکھ جھیل کے بھی جاں بیچ کے بھی رکھوالا تھا، رکھوالی کی
ہر بات ہے ابتک یاد ہمیں اس باغ کے بوڑھے مالی کی

ہے بادل اس کی اہنسا کا برسا ہے جو ساری دنیا پر
اک ہاتھ میں اسکے قرآں تھا، اک ہاتھ تھا اس کا گیتا پر
کچھ رام رحیم کے ناموں میں تھا فرق نہ اس کی مالا پر
سب دن تھے عید ملن کے دن، سب راتیں تھیں دیوالی کی
ہر بات ہے ابتک یاد ہمیں اس باغ کے بوڑھے مالی کی

ہر مندر اس کا مندر تھا، ہر راہ تھی اس کی راہ گزر
کچھ نیچ اور اونچ میں فرق نہ تھا، دونوں پہ تھی اسکی ایک نظر
ہر وقت نگاہیں رکھتا تھا اس باغ کے پنچھی پنچھی پر
ہر آن بلائیں لیتا تھا اس باغ کی ڈالی ڈالی کی
ہر بات ہے ابتک یاد ہمیں اس باغ کے بوڑھے مالی کی

کہنے کو تو دبلا پتلا تھا، لڑتا تھا مگر تقدیروں سے
یہ دور تھا اس کی ضعیفی کا اور کھیلتا تھا زنجیروں سے
مشکل تھے اٹھانا پاؤں مگر تھا آگے سب رہگیروں سے
تھا بھیس کسی سنیاسی کا، اور شان کہیں کے والی کی
ہر بات ہے ابتک یاد ہمیں اس باغ کے بوڑھے مالی کی

یہ گیتا اس کی گیتا ہے، یہ چرخا اس کا چرخا ہے
وہ سامنے اس کا مندر ہے، یہ سامنے اس کی کٹیا ہے
یہ اس کا قلم اور کاغذ ہے، وہ عینک، دھوتی، لٹیا ہے
یہ پھول ہیں اس کی پوجا کے، یہ شمع ہے اس کی تھالی کی
ہر بات ہے ابتک یاد ہمیں اس باغ کے بوڑھے مالی کی

سائے میں ترنگے جھنڈے کے جب چور غموں سے ہوتا تھا
خواب اس کے جاگا کرتے تھے، وہ جتنی دیر بھی سوتا تھا
جب پھول کوئی کمھلاتا تھا تو پہروں بیٹھ کے روتا تھا
اور رو کے دعائیں کرتا تھا، اس گلشن کی ہریالی کی
ہر بات ہے ابتک یاد ہمیں اس باغ کے بوڑھے مالی کی

حیات اللہ انصاری

ہندستان اور کشمیر کے لوک [redacted]

ماضی کے جھروکے سے .....

جنابِ حیات اللہ انصاری خود اپنی ذات سے ایک ادارہ ہیں۔ وہ صحافی افسانہ نگار، ناول نگار اور اردو کے مجاہد ہیں۔ خدا اُنھیں سلامت رکھے۔ یہ اُن کی اگست ۱۹۴۹ء کی تحریر ہے ——— اڈیٹر

کچھ دن ہوئے ایک جگہ کیرتن میں یہ بھجن گایا جا رہا تھا:

"گائے جا گیت بھجن کے تو ہر کے ملن کے
موہن گھر جانا ہے"

یہ بھجن ایک بہت مشہور فلمی گانے سے ماخوذ ہے جس کے بول یوں ہیں:

"گائے جا گیت ملن کے تو اپنی لگن کے سجن گھر جانا ہے"

ایک تو یہ بول میٹھے ہیں دوسرے قافیہ مترنم ہے اور تیسرے جس لَے میں یہ گایا گیا ہے وہ عام پسند اور دل میں اتر جانے والی ہے ان وجہوں سے یہ گانا ایسا مقبول ہوا ہے کہ گھر گھر اس کے ریکارڈ بجائے جاتے ہیں، گلی گلی گایا جاتا ہے اور تقریباً روزانہ آل انڈیا ریڈیو سے فرمائشی ریکارڈوں میں نشر ہوتا ہے۔ یہی مقبولیت تھی جس نے اس سے ایک بھجن پیدا کر دیا۔ جہاں تک ادبی حیثیت کا تعلق ہے بیٹی یعنی بھجن اپنی ماں یعنی اصل گیت سے بھی کمزور ہے۔ اصل گیت کے بولوں میں کوئی گہرا خیال یا کوئی گہرا جذبہ نہیں پایا جاتا ہے لیکن بیٹی کا تو ہر بول بالکل بھرتی کا ہے اور آمد کا پتہ تک نہیں لیکن اس کے باوجود بیٹی کی قسمت ماں سے اچھی ہو سکتی ہے۔ فلمی گیت لَے کے زور پر چل رہا ہے اور عام پسند لَے میں جہاں یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ زبانوں پر چڑھ جاتی ہے، وہاں یہ عیب بھی ہوتا ہے کہ اس سے لوگ بہت جلد اُکتا بھی جاتے ہیں کیوں کہ ہر طرف وہی لَے سُنائی دیتی ہے، جو [redacted] ن لَے میں گنگناتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر دماغ میں [redacted] اور بچوں آزاد کے حُور ہو یا پری، گلے کا ہار ہو جائے [redacted] اجیرن ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جی بھر جاتا ہے اور نئی چیز [redacted] کرنے لگتا ہے۔ پھر کوئی دوسرا چلتی پھرتی لے والا گیت [redacted] تا ہے اور اس کی جگہ پر قبضہ کر لیتا ہے پھر پہلے والا اس طرح فنا [redacted] کبھی تھا ہی نہیں۔ بہت گیتوں کا یہی حشر ہو چکا [redacted] یقین ہے کہ "گائے جا گیت ملن کے" کا بھی یہی حشر ہوگا لیکن ہو [redacted] بھجن بھجن گانے والوں میں محفوظ رہ جائے اور ایک سے دو [redacted] منتقل ہوتا رہے اور یوں صدیوں تک باقی رہ جائے۔

لیکن یہ بھجن اگر باقی رہے گا تو اس کے بول بھی بہتر ہو جائیں کیونکہ پھر اس پر سیکڑوں [redacted] حیں ہوں گی۔ بھرتی کی جگہ آمد آئے گی۔ وہ جذبات اور [redacted] عوامی سطح نہیں برداشت نہیں کر سکتی ہے اس میں آ جائیں گے۔ اس بھجن کی بیٹی، پوتی اور پرپوتی پیدا ہوتی جائیں گی [redacted] پہلی نسل سے بہتر ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ اس نسل کا کوئی بھجن [redacted] سال پار کر کے دور دراز مستقبل تک پہونچ جائے۔

اس نسل کا شمار [redacted] سے کیا گیا ہے باپوں سے نہیں حالانکہ

ہر بیٹی کا ماں کے ساتھ باپ بھی ہوتا ہے، یعنی وہ گمنام شاعر جو ماں کو اپنے ذوق سے متاثر کرکے بیٹی کو پیدا کرتا ہے۔ ہر گویّا، ہر گنگنانے والا اور ہر سُننے والا کبھی ارادے سے اور کبھی بلا ارادے گیتوں پر اپنی چھاپ لگا دیتا ہے۔ پھر یہ چھاپ اگر دوسروں کو بھلی معلوم ہوتی ہے تو رہ جاتی ہے ورنہ اس پر ایک اصلاح اور ہو جاتی ہے۔ اس نسل کا شمار خواہ ماں سے کیجئے یا باپ سے، ہوتے سب کے سب گمنام ہیں صرف اولاد ان کا نام لینے کو رہ جاتی ہے

جتنے عوامی اور زبان زد گیت ہمارے ملک میں رائج ہیں جو شادی بیاہ اور بچے کی پیدائش اور زندگی کی مختلف رسموں میں گائے جاتے ہیں، سب کی سوانح عمری یہی ہے کہ وہ کبھی دور دراز ماضی میں کسی چھوٹے موٹے شاعر سے شروع ہوئے تھے اور پھر ان گنت اصلاحیں قبول کرتے ہوئے آج ہمارے پاس آئے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جن کی ابتدا ہی اتنی اچھی ہوئی ہوگی کہ ان پر کسی نے اصلاح کی ضرورت ہی نہ سمجھی ہوگی لیکن دونوں صورتوں میں وہ ملک و قوم کے عوامی جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر ہم مردوں، عورتوں اور بچوں کا رہن سہن، رسم و رواج، جذباتی اتار چڑھاؤ وغیرہ وغیرہ معلوم کر سکتے ہیں، اُسی طرح جیسے آنکھوں سے دیکھ کر اور سابقہ میں آکر۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ اگر دو ملکوں کے گیت ملتے جلتے ہوں تو یقینی طور پر ان دونوں میں بہت قریبی تہذیبی ناتا ہوگا۔

جن لوگوں نے کشمیر جاکر وہاں کی جھیلوں، پہاڑوں، باغوں، عمارتوں اور صنعت و حرفت کے اعلا نمونوں کے ساتھ وہاں کے انسانوں کو بھی دیکھا ہے اور ان کے رہن سہن، رسم و رواج، گیت اور ناچ سے لطف اندوز ہوئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ کس طرح کشمیر کی زندگی کا ہر پہلو لوک گیتوں سے مالا مال ہے۔ وہاں بھی شادی کی ہر رسم کیلئے جداگانہ گیت ہے۔ حنابندی کے گیت ہیں، شب عروسی کے گیت ہیں، رخصتی کے گیت ہیں، زچہ خانے کے گیت ہیں اور لوریاں ہیں، اون اور ریشم کاتنے کے گیت ہیں، کشتی کھینے کے گیت اور بھیڑیں چرانے کے گیت ہیں۔ موسم اور مناظر سے لطف اندوز ہونے کے گیت ہیں پیا کی یاد میں تڑپنے کے گیت ہیں۔ اگر ان گیتوں کا ہندستانی گیتوں سے مقابلہ کیا جائے تو ایسا نظر آتا ہے کہ ان دونوں میں باہم کوئی گہرا رشتہ ہے۔ مثال میں کشمیر کے یہ چند گیت ملاحظہ ہوں۔ دیکھئے کس طرح محبوبہ اپنے محبوب کو یاد کرتی ہے ؎

خدارا مجھے بتا دو
میرا رسیا کہاں گیا ہے
وہ کیوں نہیں آتا
ارے کیوں نہیں آتا

دُور کے پہاڑوں پر سبزہ اُگ آیا ہے
پیارے کیا تجھ تک میری صدا نہیں پہنچی ؟
نارسار کی جھیل کی طرح سب پہاڑی جھیلیں پھولوں سے ڈھکی ہوئی ہیں
کیا تو نے میری پکار نہیں سُنی میرے پیارے ؟

میرا پیارا پمپور[1] کو سدھارا
زعفران کے پھولوں کی مہک نے اسے آغوش میں لے لیا
آہ وہ وہاں ہے اور میں یہاں
اے خدا، میں اس کا مکھڑا کب دیکھوں گی

اب ہندستان کے ان گیتوں کو دیکھئے :
جائیے کہو اس پیارے سے ہرسن
تم تو رہے پردیس میں برسن
ہر برہن درشن کا ترسن

جھک آئی بدریا ساون کی
ساون کی من بھاون کی
بادل چمکے بجلی کڑکے
رُت ہے جیا ترساون کی
جب سے پیا پردیس سدھارے
سدھ نہیں لینی گھر آون کی

[1] وہ صحرا جو زعفران کی کاشت کیلئے مشہور ہے

ان میں بھی کشمیر ہی کے گیت کی طرح محبوبہ پیا کو یاد کرتی ہے اور اچھے موسم کے آنے پر پیا کے بغیر کسی چیز میں لطف نہیں آتا ہے کشمیر کا ایک اور گیت ہے :

میرا پیارا اپنی بھیڑیں چرانے گیا ہے
وہاں وہ ہار گوندھ رہا ہوگا
تازے شبنم بھرے سوسن کے ہار
میرے لیے ہاں سکھیوں میرے لیے

اس کوشش کر کئی ہندستانی گیت یاد آجاتے ہیں ۔ ایک گیت یوں شروع ہوتا ہے :

انار کلی توڑ لاؤ مورے سیہیا

آگے چل کر محبوبہ کہتی ہے کہ میں ان پھولوں سے اپنی چوٹی سجاؤں گی ۔ پھر وہ کہتی ہے کہ چمپا کا پھول اور اس سے میں اپنا جوڑا سجاؤں گی پھر چنبیلی یا موتیا مانگتی ہے. کہتی ہے اسے کان میں پہنوں گی ـــــ

ایک اور کشمیری گیت ہے :

مجھے اپنے حسن پر بہت گھمنڈ ہے
او زعفران کے پھول
میں تجھ سے زیادہ خوبصورت ہوں
او زعفران کے پھول

اپنے حسن کا بھی احساس ہندستان کے متعدد گیتوں میں پایا جاتا ہے گیت ہے :

مورے جُبنا پہ آئی بہار بلم پردیسیا نہ جا

اسی مفہوم کو ایک دوسرے ہندستانی گیت میں زیادہ ادبی انداز سے ادا کیا گیا ہے ۔ اس ٹیپ کا بند ہے : "گھنگھٹا والی نازنین کر نیچے"۔ (یعنی گھونگھٹ والی عورت، آنکھیں نیچی رکھو) ۔ گھونگھٹ کا لفظ یہ بھی بتا دیتا ہے کہ مخاطب نئی نویلی دلہن ہے ۔ بہو کہتی ہے کہ گگری لاؤ تو میں جا کر پانی بھر لاؤں ۔ ساس کہتی ہے کہ اگر تو پانی بھرنے جائے گی تو بہت سے چھیل چھبیلے جوان مر جائیں گے ۔ بہو کہتی ہے :

نہ میں باندھوں چھری کٹاری نہ میں باندھوں تلوار

ساس جواب دیتی ہے :

پلکیں تیری چھری کٹاری بھوویں ہیں تلوار
گھنگھٹا والی نازنین کر نیچے

ظاہر ہے کہ ایسے گیت ساس نہیں گاتی ہیں، بہوویں گاتی ہیں ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ساس کی زبان سے اپنے حسن کی تعریفیں خود گاتی ہیں.

یہاں ہم نے صرف چند کشمیری گیتوں کا ہندستانی گیتوں سے مقابلہ کیا ہے ۔ اگر یہ مقابلہ بڑے پیمانہ پر کیا جائے تو اختلافات کے بھی بہت سے پہلو نظر آئیں گے ۔ یہ اختلافات جغرافیہ، تاریخ، روایات اور مواد ہر چیز میں ہیں ۔ کشمیر کے گیتوں میں سر بفلک پہاڑ، موجیں لینے والی اور ساکن جھیلیں، مست خرام جھیلم، زعفران کے کھیت اور پھول، سیب اور اخروٹ کے درخت، شال کا بننا اور رنگنا، ریشم کے کیڑے پالنا اور ریشم کاڑھنا وغیرہ ملتا ہے، جن کا ہندستانی گیتوں میں پتہ نہیں ۔ وہاں محبت کے ہیرو اور ہیروئن رادھا اور کرشن نہیں ہیں ان کے بجائے شیریں اور خسرو ہیں ۔ آیا مقامی روایتی ہیرو اور ہیروئن نگرالی اور ہیمال ہیں ۔ کشمیر کے گیتوں میں بہار کے، جس کا ہندستان میں پتہ نہیں، ترانے ہیں ۔ وہاں سوسن پھولتی ہے جس کا یہاں کے عام لوگوں نے نام تک نہ سنا ہوگا ۔ اس طرح رسم و رواج اور رہن سہن کے اختلافات بھی ہیں ۔ کشمیر میں چوں کہ پردے کا رواج نہیں اور وہاں کی عورت کی آمدنی صنعت و حرفت کے ذریعہ مردوں کے برابر برابر ہوتی ہے اس وجہ سے اس کی سماجی پوزیشن یہاں کے مقابلے میں بہت اچھی ہے ۔ اس کے برخلاف ہندستان کے گیتوں میں بسنت آتی ہے، آم میں بور آتا ہے، رم جھم مینہ برستا ہے، گنگا اور جمنا ہیں ۔ یہاں سوسن کی جگہ بیلا چنبیلی ہیں اور یہاں کی عورت وہاں کے مقابلے میں بہت دبی سکڑی ہے ۔

لیکن ان اختلافات کے باوجود دونوں جگہ کے گیتوں میں یکسانیت صاف جھلکتی ہے ۔ اگر اختلافات کو دیکھیے تو خود ہندستان کے اندر دو صوبوں کے گیتوں میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے ۔ جن گیتوں کا ہم نے تذکرہ کیا ہے وہ اودھی زبان میں ہیں اور یہیں کی جغرافیہ، تاریخ، روایات اور رہن سہن کی نقاشی کرتے ہیں ۔ یہاں سے صرف پچاس میل دور ہمالیہ کے دامن میں بالکل دوسرے قسم کے گیت

عابد سہیلؔ

بُنیادی اصُول

مُمتاز صحافی اور منفرد افسانہ نگار عابد سہیل نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز اُردو روزنامہ قومی آواز سے کیا، لیکن جلد ہی انگریزی روزنامہ نیشنل ہیرالڈ کے ادارے میں شامل ہوگئے اور انگریزی صحافی کی حیثیت سے امتیاز حاصل کیا۔ اُردو افسانوں میں انہوں نے معاشرے کی کش مکش اور سیاسی و سماجی انتشار کے موضوعات پر اہم تخلیقات پیش کی ہیں۔ اور آج بھی اُردو ادب کی خدمت میں مشغول ہیں۔ زیرِ نظر تحریر اکتوبر ۱۹۵۶ء کی ہے۔

—— ایڈیٹر

ہر سیاسی نظریہ کی بنیاد چند ایسے اصولوں پر قائم ہوتی ہے جن کی صحت ناقابلِ تردید طور پر تسلیم کر لی جاتی ہے۔ یہ اصول مابعد الطبیعاتی، اخلاقیاتی، رُوحانی اور نفسیاتی ہوتے ہیں۔ ہر سیاسی مسلک کے لئے ان تمام اصُولوں کو بُنیاد بنانا ضروری نہیں، ان میں سے ایک یا دو یا ان سے زیادہ کو بنیادی طور پر تسلیم کر لیا جاتا ہے اور پھر ان پر سیاسی نظریہ کی تکمیل کی جاتی ہے گاندھی جی کے سیاسی نظریے کی بنیاد ان کے اس اصول پر ہے کہ انسانی فطرت کا رُجحان بنیادی طور پر "رُوح" کی جانب ہوتا ہے۔ نیکی، سچائی اور اعلیٰ اقدار کے حصُول کی کوشش میں وہ ہمیشہ مسرت محسوس کرتا ہے اور بدی آخر کار اسے تکلیف میں مبتلا پاتی ہے۔ ان کے بارے میں اکثر کہا گیا ہے کہ وہ انسانی فطرت سے اس طرح کی اُمید کرتے ہیں جو ناممکن ہے اور حقیقت پسندانہ رویّہ اختیار کرنے کے بجائے وہ انسانی فطرت کی رطب اللسانی میں لگے رہتے ہیں اور اس کے بارے میں ضرورت سے زیادہ رجائی نقطۂ نظر رکھتے ہیں، برخلاف اس کے گاندھی جی اپنے آپ کو "ایک عملی تصوّریت پسند" کہا کرتے تھے۔

انسانی فطرت کے بارے میں گاندھی جی کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لئے ان کے مابعد الطبیعاتی اور اخلاقی نظریات کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ وہ انسان کے جسمانی اور ظاہری برتاؤ ہی نہیں بلکہ اس کی اصلی فطرت، سچّی خودی اور روحانی عنصر کو بھی پیشِ نظر رکھتے تھے۔ ان کے سامنے انسانی فطرت کا صرف موجودہ پہلو اور موجودہ صورتِ حال ہی نہیں بلکہ اس کے اندر زیادہ بہتر بننے، زیادہ بہتر بنانے، سچائی کو آگے بڑھانے، سچے راستہ پر گامزن ہونے اور امن و آشتی قائم رکھنے کا بھی جذبہ ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس رجائی نقطۂ نظر کی وجہ سے وہ حقیقت سے دامن چھڑا لیتے ہیں۔ وہ انسان کو سراپا نیکی نہیں سمجھتے:

"ہم میں سے ہر ایک نیکی اور بدی کا مجموعہ ہے، کیا ہم میں کافی بُرائی موجود نہیں۔؟"

—— خود مجھ میں بھی کافی بدی ہے، انسانوں میں فرق صرف "کم و بیش" کا ہے۔

لیکن ان دونوں قوتوں کے باوجود انسان فطری طور پر نیکی کی جانب مائل ہوتا ہے۔ اس کا تخیل اسے سچّائی اور خیر کی جانب لے جاتا ہے، بدی سے وہ ہر لمحہ نبرد آزما رہتا ہے۔ یہ جنگ شعوری طور پر بھی ہوتی ہے اور غیر شعوری طور پر بھی۔ لیکن ہم شعوری کوشش سے شر کے خلاف فطری غیر شعوری مہم کو تیز تر اور سچائی کے اصول کو قریب تر کر سکتے ہیں۔ گاندھی جی کے نزدیک اس شعوری کوشش کی بڑی اہمیت ہے اور اس کوشش کے لیے کسی مخصوص مذہب کو اختیار کرنا ضروری نہیں۔ ہر انسان خواہ وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو غیر شعوری طور پر بھی سچائی اور خیر کے حصول کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ مذہب کے بارے میں گاندھی جی کے خیالات بہت وسیع تھے۔

"چونکہ میں دُنیا کے تمام مذاہب کی مساوات میں یقین رکھتا ہوں، میں کسی شخص کو صرف اس لئے گندا نہیں سمجھ سکتا کہ اس نے درخت کی ایک شاخ کو جس پر وہ بیٹھا ہوا تھا، چھوڑکر اسی درخت کی کسی دوسری شاخ پر اپنا گھونسلہ بنالیا ہے۔"

پھر ایک جگہ انھوں نے کہا ہے:

"میرا فرض مجھے اس قابل بناتا ہے کہ میں دنیا کے تمام بڑے مذاہب میں جوکچھ اچھا ہے وہ سب اپنے اندر جذب کرلوں۔ خدا نے جو محدود عقل مجھے عطا کی ہے اسے دُنیا کے پیغمبروں کی تعلیمات کو سمجھنے کے لئے استعمال کرنا میرا فرض ہے۔"

سیاسی اور اخلاقیاتی نظریہ کے اس پس منظر کی روشنی میں فلسفۂ ستیہ گرہ پر غور کرنا ضروری ہے۔ گاندھی جی نے لفظ ستیہ گرہ کا استعمال عدم تشدد پر مبنی اس براہ راست عمل DIRECT ACTION کے لیے کیا تھا جو افریقہ کے ہندستانیوں نے وہاں کی حکومت کے خلاف شروع کیا تھا لیکن ستیہ گرہ کو مجہول مدافعت PASSIVE RESISTENCE سمجھنا غلط ہے یہ دراصل ایک گروپ عمل کی حیثیت رکھتا ہے۔

ستیہ گرہ کے لفظی معنی ہیں 'سچائی پر عمل کرنا' یا 'سچائی پر زور دینا' گاندھی جی کے نزدیک روحانی اتحاد ہی سب سے بڑی حقیقت ہے اور اس کے حصول کا واحد ذریعہ عدم تشدد ہے۔ اسی وجہ سے گاندھی جی کے نزدیک 'محبت کی طاقت'، 'روح کی طاقت'، اور 'ستیہ گرہ' ہم معنی الفاظ ہیں۔ اس طرح ستیہ گرہ میں تمام تعمیری اور اصلاحی کوششیں اور ہر طرح کی خدمات شامل ہوجاتی ہیں۔

موجودہ صدی کی انگلستان کی مجہول مدافعت کی تحریک عدم تعاون اور CIVIL DISOBEDIENCE کے معنی سمجھنے میں غلطی نہیں کرنی چاہیئے۔ مجہول مدافعت اور ستیہ گرہ دونوں جارحانہ حملہ کا مقابلہ کرنے، متنازعہ امور کو طے کرنے اور سماجی اور سیاسی تبدیلیاں لانے کے ذرائع ہیں۔ لیکن اس مماثلت کے باوجود دونوں میں بنیادی فرق بھی ہے اور وہ فرق یہ ہے کہ مجہول مدافعت ایک سیاسی حربہ ہے جبکہ ستیہ گرہ ایک اخلاقی ہتھیار ہے۔ اس کی بنیاد روحانی قوت کی جسمانی قوت پر برتری ہے۔ مجہول مدافعت کمزوروں کا ہتھیار ہے۔ ستیہ گرہ اس طاقت ور انسان کے ہاتھ میں بُرائی پر نیکی کو فتح دلانے کا ایک ہتھیار ہے جو مارے بغیر مرنے کے لیے تیار ہے۔ مجہول مدافعت کا مقصد دشمن کو کسی خاص کام کے لیے مجبور کرنا ہے جبکہ ستیہ گرہ میں اس کی غلطی کو محبت اور صبر سے درست کیا جاتا ہے۔ مجہول مدافعت میں دشمن کے لئے محبت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ برخلاف اس کے ستیہ گرہ میں نفرت کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا۔

بقول مہادیو ڈیسائی:

"ستیہ گرہ رواں دواں ہے اور مجہول مدافعت ساکت و جامد ہے۔ مجہول مدافعت کے اثرات منفی ہوتے ہیں اور مصائب مجبوراً برداشت کرنے پڑتے ہیں جبکہ ستیہ گرہ کے اثرات مثبت ہوتے ہیں اور ستیہ گرہی خوشی سے مصائب برداشت کرتا ہے۔"

عام طور سے ستیہ گرہ کو صرف ایک سیاسی ہتھیار ہی سمجھا جاتا ہے۔ یہ دراصل اسے محدود کرنے اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں اس کی قوت سے منکر ہونے کے مترادف ہے۔ ستیہ گرہ صرف سیاسی ہتھیار ہی نہیں ہے بلکہ:

"یہ ایک ایسی قوت ہے جو فرد اور جماعت دونوں استعمال کرسکتے ہیں۔ یہ سیاسی مسائل میں بھی استعمال کی جاسکتی ہے اور گھریلو مسائل میں بھی۔ اس کے آفاقی طور پر استعمال ہونے کی قوت ہی اس کے دائمی ہونے کی دلیل ہے۔"

گاندھی جی نے ایک جگہ لکھا ہے:

"میرے لیے ستیہ گرہ کا قانون محبت کا قانون ہے میں ہر اس چیز سے تعاون کرتا ہوں جو اچھی ہے۔ میں ہر اس چیز سے عدم تعاون کرنا چاہتا ہوں جو بُری ہے، خواہ اس کا تعلق میرے بچوں سے ہو، میری بیوی سے یا خود میری ذات سے۔"

درحقیقت ستیہ گرہ کو زندگی کے تمام مراحل، مسائل اور پہلوؤں میں استعمال کرنا چاہیے۔ عدم تشدد اور ایک بااخلاق زندگی، قول و فعل کی بنیاد بننا چاہیے۔

عدم تشدد کو زندگی کا اصول بنانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو دوسرے انسانوں سے ہر طرح کے تعلقات میں عدم تشدد پر کاربند ہونا چاہیے اس کی ضرورت ناانصافی اور بدی کا مقابلہ کرتے وقت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ ستیہ گرہی کی اصول پرستی کا امتحان تو دراصل مصیبت اور پریشانی میں ہوتا ہے لیکن اس برائی کا مقابلہ کرنے سے قبل جو دوسروں کی ذات سے شروع ہوتی ہے اس کو خود اپنی ذات میں چھپی ہوئی برائی کو ختم کر دینا چاہیئے۔ خارجی زندگی صرف اس وقت ہی سدھر سکتی ہے جب اندرونی حالات بھی ٹھیک ہو جائیں۔ دوسروں پر ستیہ گرہ کا استعمال کرنے سے قبل اس کو خود اپنے خلاف استعمال کرنا ضروری ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اسے ذاتی منفعت اور مفاد کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس کا استعمال صرف اسی وقت جائز ہے جب اس کے پیچھے کوئی سماجی منفعت ہو کیونکہ جو شخص ذاتی نفع نقصان کے تصورات سے اوپر نہیں اٹھ سکتا وہ ستیہ گرہ کرنے کے قابل ہی نہیں ہے۔

"ایک سرمایہ دار عدم تشدد کے ذریعہ اپنے اس سرمایہ کی حفاظت نہیں کر سکتا جس کے جمع کرنے میں ہمیشہ تشدد کارفرما رہا ہے۔"

(ہریجن ۱۱ر فروری، ۱۹۴۲ء)

ستیہ گرہ کا مقصد برباد کرنا، شکست کرنا، مجبور کرنا یا دشمن کی قوتِ ارادی کو ختم کرنا نہیں ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ستیہ گرہی دشمن سے ایک انسان کی طرح محبت کرتا ہے اور اخلاقی طور پر اس کو اس غلطی کا احساس دلاتا ہے۔ اور اس طرح پُرامن طریقہ سے اختلافات ختم ہو جاتے ہیں۔

عدم تشدد کے اصول پر مبنی عدم تعاون ستیہ گرہ کی ہی ایک شاخ ہے اور عدم تعاون کا مطلب ہمیشہ ہی اس وقت تعاون کرنے کے لیے تیار رہنا ہے جبکہ مخالف تشدد سے باز آجائے۔

گاندھی جی نے ایک بار مس اگتھی ہیری سن نے کہا:

"میرے عدم تعاون کے پیچھے تعاون کرنے کی ایک نہایت شدید خواہش چھپی ہوئی ہے اور میں بڑے سے بڑے دشمن سے بھی تعاون کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

عدم تعاون کو روزانہ کی زندگی کے مسائل میں بھی بہ آسانی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ عزیز دوستوں اور رشتہ داروں پر بھی اس کا استعمال ممکن ہے۔ گاندھی جی نے ایک جگہ لکھا ہے:

"اگر میرا بیٹا قابلِ شرم زندگی گزار رہا ہے —— تو میری محبت مجھے اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ میں اس کی طرف سے تعاون کا ہاتھ کھینچ لوں چاہے اس سے اس کی موت ہی کیوں نہ ہو جائے اور یہی محبت مجھے اس بات پر بھی مجبور کرتی ہے کہ بدی سے توبہ کر لینے کے بعد میں اسے خوش آمدید کہوں۔"

(ینگ انڈیا ۱۱ ص ۲۴۳)

لیکن عدم تعاون کرتے وقت اس بات کا خاص طور سے خیال رکھنا چاہیے کہ مخالف کو یہ گمان بھی نہ ہونے پائے کہ عدم تعاون کرنے والا اس کا دشمن ہے۔ دشمن، ستیہ گرہ اور عدم تعاون ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ان میں کوئی بھی قدر مشترک نہیں۔

گاندھی جی کے نظریات کی بنیاد انسان کی فطری نیکی پر ہے۔ اس کی فطرت اسے اچھے راستے پر چلنے، شر سے نبرد آزما ہونے اور سچ کی مدد کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ فطرت بنیادی ہے اور مذہب اور دوسری قیود سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ستیہ گرہ انسانیت کے ہاتھ میں ایک ایسا ہتھیار ہے جس سے دوسروں کو نقصان پہنچائے بغیر حق کو باطل پر فتح یاب بنایا جا سکتا ہے۔

زمانہ تم سے کیا اسبابِ خاموشی نہ پوچھے گا
تمہارے مختصر کرنے سے قصہ مختصر کیوں ہو
([illegible])



غزل

شارب لکھنوی
درگاہ حضرت عباس روڈ لکھنؤ ۳

زندگی بھر زندگی کا حق ادا ہوتا نہیں
آدمی جب تک محبت آشنا ہوتا نہیں

جسم بٹ جاتے ہیں، دل سے دل جُدا ہوتا نہیں
عشق کی دوری میں کوئی فاصلہ ہوتا نہیں

بیٹھا رہنے دو اگر محفل میں بیٹھا ہے رقیب
آئینے کے سامنے کیا آئینہ ہوتا نہیں

اِک ذرا سی بات پر نظریں نہ ہم سے پھیریے
اتنی جلدی دو دلوں کا فیصلہ ہوتا نہیں

رکھتے ہیں تقدیر پر الزام اس انداز سے
وہ بھی لکھ دیتے ہیں ہم جو کچھ لکھا ہوتا نہیں

دھیرے دھیرے زندگی میں سب جدا ہوتے گئے
اک تصور ہے کہ جو ہم سے جدا ہوتا نہیں

کون سا گھر ہے جہاں ملتے نہیں ہیں بے وفا
کون سا گھر ہے جہاں ذکرِ وفا ہوتا نہیں

شرط ہے دل بھی جھکا دے بارگاہِ حسن میں
سر جھکا دینے سے تو سجدہ ادا ہوتا نہیں

اس طرح سے درد رہتا ہے ہمارے دل کے ساتھ
شمع سے جس طرح پروانہ جدا ہوتا نہیں

آدمی کا دل صفا ہونا بھی شارب شرط ہے
آئینہ کہنے سے تو دل آئینہ ہوتا نہیں

□□

جناب شارب صاحب کا گزشتہ ۳۰ جون ۱۹۹۵ء کو انتقال ہو گیا آپ کلاسیکی مزاج کے شاعر تھے آپ نے غزلیں بھی کہیں۔ ان کی یہ غزل ان کے انتقال سے کچھ دنوں قبل مجھے ملی تھی جو ان کی آخری غزل ہے۔

— ایڈیٹر

(آنجہانی) ڈاکٹر جاوید وششٹ
وششٹ آشرم فتح پور بلوچ ۔ فریدآباد
(ہریانہ)

تول سنگیت

ہمارے ذہن کے یادگھر میں بچپن کی ایک یاد آج بھی رہ رہ کر جگنو کی طرح چمکتی اور دمکتی رہتی ہے۔ جب ہم محلے کے بچے مل کر کھیتوں اور کھلیانوں میں 'تول سنگیت' سننے جایا کرتے تھے اور گھنٹوں وہاں بیٹھ کر بوڑھے سگرہے کے پلّے دار کے اناج تولنے اور مسلسل تول کو ایک مخصوص آہنگ کے ساتھ دُہرانے کا منظر دیکھا کرتے تھے۔ تول سنگیت کا آرکیسٹرا صرف ایک ترازو اور دھڑی (پانچ سیر کے باٹ) پر مشتمل ہوتا جیسے ایک گیت کار گانے کا آغاز حمدیہ اشعار سے کرتا ہے ایسے ہی وہ بوڑھا پلّے دار تول سنگیت کا آغاز 'برکت' سے کرتا یعنی پہلا پلڑا جب تولتا تو "برکت ہے، برکت ہے"۔ کا ورد کرتا رہتا، جب تک دوسرا پلڑا نہ تُل جاتا۔ اس کے بعد "دو واں ہیں، دو واں — تیناں ہیں، تیناں" اور جب پلڑا خالی کرتا تو بنیسری کا پلّہ دھڑ سے زمین پر ٹکتا اور اس سے ایسی ہی صدا نکلتی جیسے طبلہ یا مردنگ پر تھاپ پڑی ہو۔ بس اب تول سنگیت شروع ہوگیا۔ گنتی کی یہ تکرار ایک خاص لحن اور آہنگ کے ساتھ برابر جاری رہتی اور ٹھیک یکساں وقفے سے دھڑی کی طبلئی یا مردنگی تال اس آہنگ کو موسیقیت عطا کردیتی۔

تول سنگیت کا آغاز جیسے 'برکت' سے شروع ہوتا ویسے ہی اختتام بھی 'برکت' پر ہوتا۔ یعنی آخری دھڑی جب تل جاتی تو آخری گنتی دہرانے کے بعد 'برکت ہے'، پر سنگیت رک جاتا۔ ہم پلّے دار کو بابا کہتے تھے۔ ہم نے بابا سے پوچھا:

"یہ برکت کیا بلا ہے؟"

تو وہ مسکرا کر کہتا: "برکت نیک شگون کے لئے کہتے ہیں — برکت یعنی زیادتی، بڑھوتری، اضافہ۔ اناج کے اس ڈھیر کی تول بڑھ جائے۔"

ہم نے پوچھا: "صرف برکت کہنے سے اناج کی تول کیسے بڑھ جائے گی۔؟ اناج تو جتنا ہے اتنا ہی رہے گا۔"

اس نے جواب دیا: "تولنے سے پہلے ڈھیر کا وزن کوُتتے ہیں، تخمینہ لگاتے ہیں کہ اتنے من تو ہوگا ہی، تو برکت کا مطلب اتنا ہی ہے کہ تولنے پر وہ تخمینہ سے سُوا ہو تو ہوگی نا برکت۔ سب کوُت رہے تھے کہ پچاس من سے زیادہ نہیں ہوگا اور تولنے پر وہ اکیاون من نکلے تو برکت ہوئی نا؟"

پھر ہم نے پوچھا کہ تول کے آخر میں بھی 'برکت' چہ معنی دارد؟"

تو اس نے کچھ سنجیدہ ہوکر کہا کہ "یہاں برکت کے معنی یکسر بدل جاتے ہیں۔ یہاں ختم ہونے کے معنی یعنی تول تمام ہوئی۔"

'برکت' کی اس تشریح سے ہم بہت حیران ہوئے کہ ایک ہی لفظ "ہونا" اور "نا ہونا" کا مفہوم کیسے ادا کرتا ہے؟ ہم کو برکت میں

آنجہانی جاوید وششٹ اُردو کے اُستاد تھے۔ انھوں نے شاعری میں مرثیہ، سلام غزل وغیرہ تمام اصناف میں طبع آزمائی کی تحقیق میں دکنیات ان کا خاص میدان تھا۔ قلی قطب شاہ اور مُلّا وجہی پر تحقیقی مضامین لکھے۔ موصوف راقم الحروف کے حال پر خصوصی شفقت فرماتے تھے۔ نیا دور کیلئے باعثِ فخر ہے کہ ان کی تحریریں راقم الحروف کے پاس موجود ہیں اور شائع ہو رہی ہیں۔ ——— امجد حسین

برہما، وشنو اور مہیش کے درشن ہوئے۔ برہما سرشٹی رچتے ہیں، پیدا کرتے ہیں۔ وشنو پالن کرتے ہیں، پرورش کرتے ہیں اور مہیش یعنی شو سنگھار کرتے ہیں، مارتے ہیں۔ گویا آغاز ہونے سے، زیادتی یا اضافہ ہونے اور تمام ہونے تک 'برکت' کا ہی راج رہتا ہے۔ اس لیے برکت ہی قوالی سنگیت 'کا KEY NOTE ہے۔

ایک دن بابا نے ایک دل چسپ حکایت سنائی کہ ایک کسان کا اللہ میاں سے یارانہ ہوگیا اور اس قدر بے تکلفی ہوگئی کہ اللہ میاں اس کے کھیت پر آجاتے۔ کسان خوب آؤ بھگت کرتا۔ کبھی بونٹ کھلاتا کبھی ہولے کرتا۔ باجرے کی بالی اور بھٹے بھون کر کھلاتا۔ کبھی گرم گرم گڑ کھلاتا۔ اللہ میاں کے آگے گنوں کا ڈھیر لگا دیتا۔ اللہ میاں بھی اس کے کھیت پر تبھی آتے جب کوئی فصل ہوتی تھی۔ بے رت میں آنے کا کیا مزہ؟ کسان کی گیہوں کی کھیتی پک کر تیار ہوگئی تھی۔ کٹائی کرنے کی تیاری تھی کہ اس نے اللہ میاں سے پوچھ لیا کہ میرے کھیت میں کتنا اناج ہوگا۔؟

"پچاس من"۔ اللہ میاں نے بتایا۔

بات آئی گئی ہوگئی۔ جب اللہ میاں چلے گئے تو کسان نے سوچا کہ پچاس من تو اپنے کھیت میں ہوگا ہی، کیوں نہ اس میں اور برکت کی جائے مگر برکت کیسے ہو؟ یہ مسئلہ تھی۔ آخر اس نے ترکیب نکال لی کہ رات کو وہ اوروں کے کھیتوں اور کھلیانوں سے 'لانک' (کٹے ہوئے گیہوں کے پولے) چرا کر اپنے کھلیان میں لاکر ڈال دیتا۔ غرض اس نے کئی رات "برکت راتیں" منائیں اور بڑا خوش تھا کہ اس سال دوگنی پیداوار ہوگی۔ مگر جب پیداوار کی تول کی گئی تو ٹھیک پچاس من ہی گیہوں ہوا۔ اب تو کسان اپنے یار پر بہت بگڑا کہ میں نے کتنی راتیں آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹیں اور خاک برکت نہ ہوئی۔ تو اللہ میاں نے اپنا سر کھجاتے ہوئے کہا کہ "تو اپنے کھلیان میں جو پولے ڈال جاتا تھا میں انہیں اٹھا کر واپس اس کے کھیت میں ڈال آتا تھا۔ میں بھی تیری طرح بوجھ ڈھوتا رہا۔ مگر چوری کے مال سے کبھی کوئی برکت ہوئی ہے؟ میں نے تو یاری نبھا دی کہ تجھے حرام مال سے بچالیا"۔۔۔ کسان نے اپنی غلطی تسلیم کی۔ اپنے کان اینٹھے اور توبہ کی کہ آئندہ وہ کبھی ایسی حرکت نہیں کرے گا۔

ایک دن ہم اپنی پڑوسن دادی نصیبن کے آنگن میں کھیل رہے تھے کہ ایک بھکاری آیا۔ اس نے صدا لگائی مگر دادی نے جواب میں کہا کہ "برکت ہے"۔ فقیر بغیر کچھ لیے چلا گیا۔ ہم چونکے کہ قوالی سنگیت کی برکت دادی نصیبن کے گھر بھی آپہونچی۔ ہم نے دادی سے پوچھا "برکت ہے کا کیا مطلب۔؟"

انھوں نے بتایا کہ عورتیں ردِ سائل کے لیے یہ کلمہ بولتی ہیں اور مقصود یہ ہوتا ہے کہ نہیں ہے، ختم ہوگیا۔ ایک شعر بھی انھوں نے کسی کا سنایا تھا ؎

پی چکے سب اب آئے زاہد آپ
جائیے بس جناب برکت ہے

یعنی شراب کی ایک بوند بھی نہیں بچی کہ آپ کی تواضع کرتے۔

دادی نصیبن نے عورتوں کے ایک اور محاورے "برکت کے دن" کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ عورتیں اس زمانے کو جب چیزیں سستی ملتی ہوں 'برکت کے دن' کہتی ہیں۔ اب تو ہر چیز باوا کے مول ہے۔ ہم نے دادی نصیبن سے کہا کہ "دادی! شب برات کا حلوہ نہیں کھلاؤگی؟" تو وہ کہنے لگیں کہ تم پنڈتوں کے لونڈے ہمارے گھر کا حلوہ کھاؤگے؟

ہم نے کہا: لاؤ تو سہی۔ ہم یہیں کھالیں گے اور کسی سے نہیں کہیں گے کہ دادی نے ہمیں حلوہ کھلایا۔ وہ ہم سب کو حلوہ کھلاتیں۔ ہم حلوہ کھا کر منہ پونچھتے ہوئے اور "دادی برکت" زندہ باد کا نعرہ لگاتے ہوئے اپنے گھروں کو چلے جاتے۔ ہم بھی ہولی، دیوالی پر دادی کے لیے گجھیا اور کھیل بتاشے لے جاتے۔ وہ بہت دعائیں دیتیں۔ مگر اس سے پہلے وہ یہ ضرور پوچھتیں کہ یہ پیسے کہاں سے آئے؟ جب ہم کہتے کہ ہم ایک مہینے سے اپنے جیب خرچ سے بچا بچا کر جمع کر رہے تھے تو دادی بہت خوش ہوتیں۔ دادی کی عید کی سویوں کا مزا آج تک کام و دہن میں محفوظ ہے۔

ایک روز دادی نے امیر مینائی کا شعر سنا کر پھر 'برکت' کی بات چھیڑ دی۔ شعر تھا ؎

ہائے صنم سے کبھی جی نہیں بھرتا
برکت اب اٹھ گئی زمانے سے

اور برکت سے متعلق کئی محاورے، ہمیں بتائے۔ اب تو یاد بھی نہیں رہے۔ جب ہم ان سے رخصت ہوتے تو وہ ہمیشہ آشیرواد دیتیں کہ خدا عمر و اقبال میں برکت دے۔

دیکھا آپ نے 'تول سنگیت'، کے سُر کہاں کہاں نغمہ سرائی [illegible]ں۔ ایک دن بابا چلے دادا دادی نصیبن کے گھر صحن میں برکت سرائی کرر ہے تھے کہ ہم لوگ بھی وہاں جا پہونچے۔ علیک سلیک کے بعد بابا نے ایک اور دلچسپ بات بتائی کہ "نوے سو پورا ہوئے" اور اس طرح اس کی وضاحت کی کہ اگر ہم اناج تولتے وقت ترازو کے پلڑے کو ذرا جھکا ہوا تولیں گے تو تول کبھی کم نہیں ہوگی، پوری بیٹھے گی۔ یہ تو ترازو باٹ کے تعلق سے بات ہوئی۔ اب تو ڈنڈی مارنے کو بھی یار لوگوں نے فن بنا دیا ہے اور اس میں مہارت حاصل کرلی ہے ہیں۔ دوسرا مفہوم اور بھی گہرا اور اس کے پردے میں، ہمیں نصیحت کرنا تھا۔ بابا نے کہا:

"جو آدمی جھکتا ہے، وہی پورا یعنی کامل ہوتا ہے۔ جھکنا زرا انا کے لیے اشد ضروری ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہم اللہ میاں کے سامنے دن میں پانچ بار جھکتے ہیں اور اس طرح ہم غرور و تکبّر سے نجات حاصل کرلیتے ہیں۔ تم لوگ بھی مندر میں ٹھاکر جی کے سامنے "ساشٹانگ پرنام" (سر، ہاتھ، پیر، آنکھ، ران، دل، بچن اور تن ــ ان آٹھوں کا مجموعی سجدہ) کرتے ہو تو یہ بھی وہی عمل ہے۔ سوال اس کا نہیں کہ کس کے سامنے جھک رہے ہو؟ سوال صرف جھکنے کا ہے۔ فارسی ضرب المثل اپنی جگہ صحیح ہے کہ ؎

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

لیکن اگر سفر کا موقع نہ ملے تو بھی آدمی جھکنے اور سمرپن (SURENDER) کے ذریعے سے پختہ ہوسکتا ہے، کامل ہوسکتا ہے۔

آپ نے بہت سے "آسن سِدّھ" سادھو سنت دیکھے ہوں گے آسن سِدّھ اس درویش کامل کو کہتے ہیں جو اپنے بوریے پر ہی براجمان رہتا ہے اور بیٹھے بیٹھے تمام مراحل طے کرلیتا ہے۔ خواجہ میر درد نے ایک شعر میں اس مقام کی نشان دہی کی ہے ؎

آپ سے ہم گزر گئے کب کے
کیا ہے ظاہر میں گو سفر نہ کیا

صوفی اپنے بوریے پر ہی بیٹھ کر سفر کرتا ہے اور تصوف کے جملہ مراحل طے کرلیتا ہے۔ اس کا یہ سفر فارسی ضرب المثل کے سفر سے زیادہ اہم ہے۔

تول سنگیت کی برکت' ایک طرف ازل اور دوسری طرف ابد کی بھی علامت ہے۔ گویا وہ آغاز و انجام اور ابتدا و انتہا دونوں کو محیط ہے۔ لیکن ویدانت کہتا ہے کہ ازل سے پہلے بھی "کچھ ہے" اور ابد کے بعد بھی کچھ ہے، وہی حقیقتِ ابدی ہے۔ برکت تو سنگیت کی ایک تان ہے، ایک سُر ہے جو ساز کے چھڑنے سے ابھرتا ہے اور فضا میں ارتعاش پیدا کر دیتا دوسرے الفاظ میں حقیقتِ ابدی جیسے ایک ساگر ہے اور برکت اس کی ایک لہر، ایک موج۔ یہ حقیقت ہے کہ لہر ساگر نہیں ہوتی مگر ساگر میں تو ہوتی ہے۔ ساگر بغیر لہر کے ہوسکتا ہے مگر لہر بغیر ساگر کے نہیں ہوسکتی۔ سنگیت کی یہ تان جب سرمدی موسیقی سے ہم آہنگ ہوتی ہے تو وقتی طور پر جزو و کل کا امتیاز ہی ختم ہوجاتا ہے۔ تومن شدی من تو شدم کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔

تول کا تعلق توازن سے ہوتا ہے۔ یعنی ترازو کے دونوں پلڑے جب برابر ہوتے ہیں تو تول پوری ہوتی ہے اور یہ توازن صرف ترازو کے پلڑوں کا ہی نہیں، آدمی کے کردار کا بھی معاملہ ہے۔ اس میں بھی توازن کی بڑی اہمیت ہے۔ توازن کے بغیر آدمی انسان نہیں بن سکتا۔ توازن کا مدار HARMONY پر ہوتا ہے۔ یعنی وہ خوش آہنگی اور موزونیت جس پر توازن قائم ہوتا ہے۔

کسی ماہر نفسیات کا قول ہے کہ آدمی (POLY-PSYCHIC) ہوتا ہے۔ یعنی اس کے بہت سے من ہوتے ہیں۔ وہ ایک من نہیں ہوتا اس میں یک جہتی نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ وہ DISINTERGRATED ہوتا ہے صبح اس کا من کچھ اور ہے، دوپہر کچھ اور، شام کو کچھ، رات کو کچھ اور۔ توازن کا مطلب ہے ایک من ہونا۔ جیسے سنگیت میں جب تک ساز نہیں ملتے سنگیت پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح جب تک آدمی کے جذبات و احساسات اور عقل و خرد ہم آہنگ نہیں ہوتے، ان میں توازن پیدا نہیں نہیں ہوتا۔ توازن دو انتہاؤں کے مابین وہ مرکزی نقطہ ہے جہاں پوری طرح سکون ہوتا ہے۔ انتہا کبھی پرسکون نہیں ہوتی، وہاں ہنگامہ ہوتا ہے۔ وہ

سری نیواس لاہوٹی
"راجستھان بھون". دارالشفا. حیدرآباد - ۵۰۰۰۲۴

مولوی عبدالحق ہندستان اور پاکستان میں

اس مضمون میں مولوی عبدالحق کی زندگی ہندوستان میں کس طرح گذری اور پاکستان میں کس طرح بسر ہوئی اس کا مختصر سا حال بیان کروں گا تاکہ اردو کا کام کرنے والے اس سے کچھ عبرت حاصل کر سکیں۔

مولوی صاحب ۱۸۷۰ء میں یو پی کے ایک گاؤں ہاپوڑ میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم غیر منقسم پنجاب میں ہوئی اور انہوں نے ۱۸۹۴ء میں علی گڑھ سے گریجویشن کیا اور اس کے بعد محسن الملک کے پاس بمبئی چلے گئے اور انہیں کی ایما پر حیدرآباد کا قصد کیا کرنل افسر الملک کے مشورہ پر رسالہ "افسر" کے مدیر بنائے گئے اور بعد میں مدرسہ آصفیہ کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ لیکن یہ پیشہ ان کو راس نہیں آیا اور یہ حیدرآباد کے ایک محکمہ میں بحیثیت مترجم کارگزار ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مولوی صاحب ہندوستان کے مختلف رسائل میں مضامین لکھتے تھے۔ اور اورنگ زیب پر ایک کتاب بھی لکھی جو زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکی۔ ان کی معرکتہ الآرا کتاب "قواعد اردو" ہے جو آج بھی اپنے موضوع کے اعتبار سے مستند مانی جاتی ہے مولوی صاحب ۱۹۱۲ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) کے معتمد بنائے گئے اور یہیں سے اردو کے لئے ان کی عملی زندگی کا آغاز ہوا۔ انجمن سے وابستگی کے بعد ان میں تحقیق و تنقید کا جو جوہر پوشیدہ تھا وہ عوام کے سامنے آیا اور دکھنی ادب پر ان کے کارناموں نے اُردو ادب کی تاریخ میں بیش بہا اضافہ کیا۔ تنقید کے موضوع پر ان کی کوئی کتاب تو نہیں ہے لیکن انہوں نے جو سیکڑوں کتابوں پر تبصرے تحریر فرمائے ہیں وہ ہماری تنقید کا قابل قدر سرمایہ ہے۔

حیدرآباد اور اورنگ آباد کے قیام کے دوران انہوں نے سر اکبر حیدری کی ایما پر دارالترجمہ اور جامعہ عثمانیہ کے قیام میں جو پارٹ ادا کیا ہے اس کو ان کے مخالفین بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ اردو کی پروفیسری سے سبکدوشی اختیار کرنے کے بعد یہ پورے انہماک کے ساتھ اردو تحریک انجمن کی تنظیم کے کام میں جٹ گئے اور تقسیم ملک تک اس کے سربراہ رہے وہ جس کا لوہا مولانا آزاد بھی مانتے تھے۔ یہ ان کے ایسے عروج کا زمانہ تھا کہ وہ جس سے چاہتے اپنے کام لے لیا کرتے تھے۔ اردو تحریک کے سلسلے میں ان میں ایک طرح کی شدت پائی جاتی تھی جیسی کہ ہندی کے تعلق سے پرشوتم داس ٹنڈن اور بابو ... میں تھی جس کی وجہ سے ان کی ایک بار گاندھی جی سے بھی ... ہو گئی تھی اور یہیں سے اردو ہندی کا تنازعہ پیدا ہوا جو آج بھی ... ہندوستان میں ہندی کو قومی زبان کا درجہ تو مل گیا لیکن آج بھی انگریزی کو بالادستی حاصل ہے جس کی بنا پر ہندی ... اور دوسری علاقائی زبانیں بھی اپنے اپنے علاقوں میں وہ مقام حاصل نہیں کر سکیں جس کی وہ مستحق ہیں۔

اورنگ آباد کے بعد انجمن کا صدر دفتر دہلی منتقل کر دیا گیا اور ۱۹۴۷ء تک مولوی صاحب اور ان کے رفیق ... پنڈت دتاتریہ کیفی کی رفاقت سے انجمن کے علمی کاموں میں پہلے سے کہیں زیادہ اضافہ ہوا۔ تین ادبی رسالے ... ایک نیم ماہی "ہماری زبان" شائع کئے جانے لگے۔ ان تراجم کے علاوہ مولوی صاحب کا بڑا وقت اردو کی اس دفاعی جد و جہد کے لئے وقف تھا جس کے سلسلے میں انہوں نے ہندوستان کے دور دراز گوشوں کا دورہ کیا۔ انجمن کی شاخیں قائم کیں، مکتب، مدرسے اور کتب خانے قائم کئے۔ غرض کہ اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لئے انہوں نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ ان کی ان سرگرمیوں کا مفصل حال لکھنے کی اس مختصر سے مضمون میں گنجائش نہیں ہے۔ ان شاندار کامیابیوں

الہ آباد سے حیدرآباد تک سری نیواس لاہوٹی کی کاوشوں کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے بہت اہم رکن تھے۔ مخدوم محی الدین اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کے قریبی ساتھیوں میں تھے۔ آخری سانس تک اُردو کے لیے وقف رہے۔ حیدرآباد میں ان کا خانہ زہرا اور الاور سرحوق کے درمیان ان کا گھر تھا۔ اردو پورے حیدرآباد میں ہندو مسلم اتحاد کی روشن ترین علامت سمجھے جاتے تھے۔ کچھ سال قبل ان کا انتقال ہوا۔ ان کی زیر نظر تحریر نیا دور کے فائل میں تھی اس لیے شائع کی جا رہی ہے
ایڈیٹر



ناظر خیامی

۱۹۳۸ء - ۱۹۷۹ء



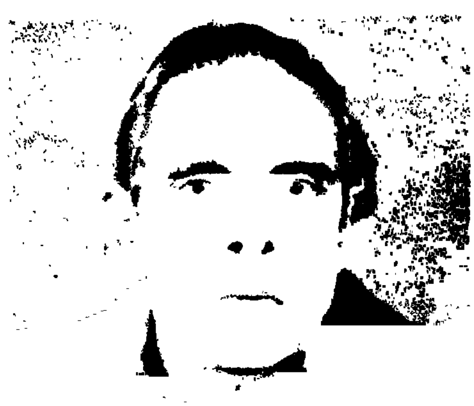
مہذب لکھنوی

۱۹۰۶ء - ۱۹۸۵ء



نسیم انہونوی

۱۹۰۹ء - ۱۹۸۹ء



جمیل مہدی

۱۹۲۸ء - ۱۹۸۸ء



انجمن ترقی ادب لکھنؤ کی جانب سے ۱۹۶۰ء میں ایک شامِ ملاقات کا انعقاد کیا گیا جس میں سلام مچھلی شہری، نازش پرتاپ گڑھی، غلام ربانی تاباں
جگن ناتھ آزاد، روش صدیقی، رام لعل اور شیشر پردیپ جیسے اہم شعراء و ادباء نے شرکت کی۔



ایک یادگار تصویر۔ جس میں پروفیسر سید اعجاز حسین، پروفیسر سید احتشام حسین اور ڈاکٹر سید مسیح الزماں ایک ساتھ نظر آرہے ہیں۔


نیا دور
فروری، مارچ ۱۹۹۳ء
اودھ نمبر


یوور

کے باوجود ان کو ہندوستان چھوڑنا پڑا اور وہ جنوری ۱۹۴۸ء میں پاکستان منتقل ہو گئے۔ یہ چاہتے تھے کہ اردو کام وہ دونوں ملکوں میں انجام دیں لیکن مولانا آزاد نے دو ٹوک الفاظ میں کہا کہ وہ یا تو ہندوستان میں رہ کر اردو کا کام کریں یا پاکستان سدھار جائیں۔ انہوں نے پاکستان کو ترجیح دی اور وہاں ان پر جو گذری اس کا کچھ حال ان کی اور کچھ دوسروں کی زبان سے ملاحظہ فرمائیے کراچی ہجرت کرنے کے بعد مولوی صاحب نے تعلیم کے میدان میں قدم رکھا اور اردو ذریعہ تعلیم کا کالج قائم کیا تو دوسری طرف انجمن کی تنظیم کی جانب متوجہ ہوئے۔

کالج کے بارے میں وہ خود اپنی یادداشتوں میں تحریر فرماتے ہیں کہ۔

"کالج قائم کر کے میں نے بیٹھے بٹھائے ایک پریشانی مول لے لی کونا یونی ورسٹی اس کے الحاق کے لئے آمادہ نہیں تھی۔ سندھ یونی ورسٹی نے الحاق سے انکار کر دیا۔ پنجاب یونی ورسٹی کے حدود وارضی سے باہر تھا۔ ہم ہندوستان سے لٹ پٹ کر آئے تھے، توقع تھی کہ پاکستان ہمارے آنسو پونچھے گا لیکن یہاں حال ہی دوسرا تھا۔ مرکز کا محکمۂ تعلیم ہمارے کاموں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔ خود کچھ نہیں کرتا تھا دوسرے کرتے تو انہیں کرنے نہیں دیتا تھا۔"

اب انجمن کا حال بھی انہیں کی زبانی سُن لیجئے۔

"میرے ساتھی ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے، جو باقی بچے انہوں نے مجھے اذیت پہنچانے اور رسوا کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ میرا کتب خانہ سربمہر کر دیا گیا۔ میرے مسودات کتب خانہ میں بند کر دیے گئے۔ سازشوں کا بازار گرم ہو گیا۔ اپنی خیانت اور بد دیانتی پر پردہ ڈالنے کے لئے طرح طرح کی الجھنیں پیدا کر دی گئیں۔"

اس تعلق سے ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ وہ لوگ جو تک بندی بھی نہیں کر سکتے تھے اپنی سازشوں میں کامیاب ہونے کے بعد اس مال مسروقہ کے سہارے محقق اور نقاد بن گئے جن کے نام سے نہ صرف کتابیں شائع ہوئیں بلکہ ان کی تعریف اور توصیف میں بھی بہت کچھ لکھا گیا۔ ہم یہاں ہندوستان میں بیس لاکھ دستخطوں کا رونا روتے ہیں لیکن پاکستان کا حال اس سے بدترین تھا۔ چنانچہ مولوی صاحب ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ۔

"۱۹۵۴ء میں دستور ساز اسمبلی میں زبان کا مسئلہ پیش ہونے والا تھا۔ میں ایک لاکھ افراد پر مشتمل جلوس لے کر مئی کی گرمی میں تین میل پیدل چل کر ایوان اسمبلی پہنچا ـــــ پولیس اور مسلح فوج مشین گنیں اور ٹینک لئے کھڑی تھیں ـــــ مجھے بات چیت کے لئے بلایا گیا۔ سمجھوتہ بھی ہوا لیکن عمل اس کے خلاف۔ جن صاحبوں کے ہاتھ میں اقتدار تھا ان کو (اردو) زبان اور علم وادب سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔"

ان واقعات کے پیش آنے کی بنا پر بڑھاپے میں مولوی صاحب بڑے دل برداشتہ ہو گئے۔ اور ان کی آخری عمر کس طرح کٹی اس کا حال سجاد مرزا صاحب سابق معتمد تعلیمات حکومت حیدرآباد نے تحریر کیا ہے جو مولوی صاحب کی ماتحتی بھی کر چکے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ۔

"انجمن کے دفتر میں تنگ و تاریک سیڑھیوں سے گذرتا ہوا اوپر کی منزل پر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دو چھوٹے کمروں کے سامنے برآمدہ اور اس برآمدے میں ایک کرسی پر مولوی صاحب اکیلے بیٹھے ہیں۔ جب میں نے اپنا نام زور سے لیا تو مولوی صاحب ایک دم کرسی چھوڑ کر کھڑے ہو گئے اور مجھے گلے لگایا۔ مولوی صاحب بہت دبلے ہو گئے ہیں۔ آنکھوں کے اطراف سیاہ حلقے پڑ گئے ہیں۔ معاشی مشکلات کا شکار ہیں۔ عسرت کی زندگی نے صحت کمزور کر دی ہے۔"

مولوی صاحب کے قدیم ساتھی غلام ربانی صاحب نے ایک طویل خط لکھا تھا جس میں ان کے شاندار ماضی کی یاد دلائی تھی اور ان کی خدمات کا اعتراف کیا تھا۔ غلام ربانی صاحب کا یہ خط پڑھنے کے بعد وہ جواباً تحریر فرماتے ہیں کہ۔

"تم نے خط لکھ کر مجھے ایسا زمانہ یاد دلایا کہ مجھے وہ زمانہ یاد کر کے ذرا دیر کے لئے خوشی ہوئی لیکن اس کے بعد دماغ پر افسردگی چھا گئی۔ اس زمانے کا مقابلہ جب میں آجکل کے حالات سے کرتا ہوں تو میرے دل پر جو گذرتی ہے اس کے لئے الفاظ ڈھونڈھتا ہوں تو نہیں ملتے۔ تمہارے خط نے مجھے بڑا سہارا دیا اور مجروح دل کے لئے مرہم نکلا"

میں نے مولوی صاحب کی دونوں ملکوں کی زندگی کا یہ موازنہ اس لئے پیش کیا ہے کہ برصغیر میں اردو کا کام کرنے والوں کو جو مشکلات پیش آتی ہیں اس کی جھلک دکھائی دے سکے۔ اس لئے کہ ہمارے ملک میں برسرِ اقتدار سیاسی شعبدہ بازوں نے اردو کے ساتھ صرف زبانی ہمدردی کا اظہار کیا ہے لیکن عملی طور پر کوئی قدم نہیں اٹھایا ہے جس کی بنا پر اردو ہندوستان کی زبان ہونے کے باوجود آج کسمپرسی کا شکار بنی ہوئی ہے۔ پاکستان کا حال ہندوستان سے مختلف ہے اس لئے کہ پاکستان کے کسی بھی علاقے کی زبان اردو نہیں ہے۔ وہاں کا مزدور اور کسان اردو نہیں بولتا ہے بلکہ اپنے اپنے علاقوں کی زبان روزمرہ کے استعمال میں لاتا ہے۔ اردو وہاں مہاجرین کی زبان ہے جو کراچی اور لاہور کے مخصوص علاقوں میں آباد ہو گئے ہیں اس کے برعکس ہندوستان کے ہر علاقے میں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے اور فرقہ پرستوں اور بنیاد پرستوں کی مخالفت کے باوجود وہ زندگی کا ثبوت دے رہی ہے اس لئے کہ عوام اسے کام میں لاتے ہیں اسی بنا پر میں ہندوستان میں اس کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں۔ یہاں سوال صرف یہ ہے کہ جن لوگوں کی یہ مادری زبان ہے وہ اس کے ساتھ امتیازی سلوک کرنا چھوڑ دیں تو وہ علاقائی اور جامعاتی زبان کے طور پر پھل پھول سکتی ہے اور اپنا جائز مقام حاصل کر سکتی ہے اس کے لئے شرط یہ ہے کہ اردو والوں کو ان قافلوں کا ساتھ دینا ہوگا جو جمہوریت اور انصاف کی بقا کے لئے جد وجہد کر رہے ہیں تاکہ ہم جمہوریت اور مساوات کا ایک ایسا آفتاب طلوع کر سکیں جو تمام زبانوں بشمول اردو بولنے والوں کو اپنے نور کی موجوں سے غسل دے سکے۔

□□

لوک گیت ـــــ صفحہ ۱۵۲ کا بقیہ

صفحہ ۱۵۲ کا بقیہ

سننے میں آتے ہیں۔ بنگال اور جنوبی ہند کے گیتوں میں تو زمین و آسمان کا فرق ہو جاتا ہے۔ لیکن ان تمام اختلافات کے باوجود ہندستانی گیتوں میں ایک ہی روح سرایت کیے ہوئے ہے۔ کیوں کہ جغرافیہ تاریخ وغیرہ تو صرف لباس ہیں جذبات کے۔ اگر ان کو ہٹا کر جذبات کو دیکھو تو وہ ایک ہیں۔

اسی طرح جغرافیہ اور تاریخ کو ہٹانے کے بعد کشمیر اور ہندستان کے گیت بھی ایک روح کے حامل نظر آتے ہیں۔ کشمیر کی شاعری میں اظہارِ محبت عورت کی طرف سے ہوتا ہے۔ صرف یہی ایک خصوصیت کشمیر کو تمام ملکوں سے جدا کر کے ہندستان سے وابستہ کر دینے کے لیے کافی ہے۔ اگر تفصیل کو دیکھئے تو یہ رشتہ اور مضبوط ہو جاتا ہے۔ عورت کا اپنے حسن پر گھمنڈ کرنا، اپنے محبوب کے بغیر موسم کی رنگینیوں کو بے لطف سمجھنا، محبوب کا پردیس میں ہونا اور محبوبہ کا اس کو یاد کرنا اسے محبوب کے بغیر زندگی کے تمام مشاغل ہیچ نظر آنا۔ یہ وہ مضامین ہیں جو دونوں جگہ مشترک ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لباس اور رنگ روپ کے اختلافات کے باوجود دونوں کے سینوں میں ایک ہی دل دھڑکتا ہے۔

□□

تول سنگیت ـــــ صفحہ ۱۵۹ کا بقیہ

صفحہ ۱۵۹ کا بقیہ

شور و شر، انتشار و اضطراب سے عبارت ہے۔ لیکن دو انتہاؤں کے بیچ میں جو نقطہ ہوتا ہے وہ ہر شور و شر سے بری ہوتا ہے۔ وہاں سکون اور ٹھہراؤ ہوتا ہے۔ اسی نقطے پر جب سارے من آ کر جمع ہو جاتے ہیں تبھی انسان کے کردار میں توازن قائم ہوتا ہے اور اس میں سنگیت پیدا ہو جاتا ہے۔

تول سنگیت تو گویا حیات و کائنات کا محور ہے۔ وہ جملہ جمادات، نباتات اور حیوانات کو ایک متوازن نہج پر رکھتا ہے۔ ہاں! یاد آیا۔ ایک بار ایسا منظر بھی دیکھا کہ جب بابا تپے دار کا تول سنگیت اپنے نقطۂ عروج پر تھا تو اچانک ترازو کی رسی ٹوٹ گئی اور ترازو دھڑام سے زمین پر گر پڑی۔ سنگیت کی تان ٹوٹ گئی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ساز کے تار ٹوٹ گئے جن سے سنگیت کی لے اور سُر بہہ رہے تھے۔ ایسے ہی کبھی کبھی آفاقی موسیقی میں رخنہ پڑ جاتا ہے اور ساز و نغمہ کی ہم آہنگی وقتی طور پر متاثر ہوتی ہے اور قدرتی توازن بگڑ جاتا ہے۔ ایسا تبھی ہوتا ہے جب اچانک کوئی انقلاب رونما ہوتا ہے۔ زلزلہ، طوفان اور ایسا ہی کوئی غیر متوقع اور غیر معمولی قدرتی حادثہ ہوتا ہے تو فطرت کا تول سنگیت بھی کچھ دیر کے لئے رک جاتا ہے، اس کی ترازو کا پلڑا ابھی ٹوٹ جاتا ہے۔ مگر کچھ وقفہ کے بعد ہی قدرتی توازن بھی از خود اپنے معمول پر آجاتا ہے اور پھر تول سنگیت شروع ہو جاتا ہے۔

اگر انسان تول سنگیت کو پوری طرح سے جیون میں اُتار لے

امیر حسن نورانی
مؤلف دانش محل، امین آباد لکھنؤ

اُردو میں سفرناموں کی روایت

سیر و سفر کا شوق انسان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ اور اس کا سلسلہ وجودِ انسانی کے آغاز سے جاری ہے، ہر انسان ہوش سنبھالنے کے بعد اپنے گرد و پیش سے واقف ہوتا ہے۔ اس کے بعد اپنے ملک کے دوسرے مقامات دیکھنے کی خواہش دامن گیر ہوتی ہے اسی کے ساتھ دنیا کے دوسرے ملکوں کی سیر و سیاحت کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ اور یہی شوق و جذبہ سفر کا محرک بن جاتا ہے۔ لیکن ایسے خوش نصیب کم ہوتے ہیں، جن کا یہ جذبۂ شوق کامیابی سے ہمکنار ہو۔ سفر انسان کی بصیرت اور تجربات میں اضافہ کا ذریعہ ہے۔ اسی کی بدولت دنیا کے دوسرے ملکوں اور قوموں کی تاریخ اور تہذیب و معاشرت سے واقف ہونے کا موقع ملتا ہے۔ اسی لئے سفر کو وسیلۂ ظفر کہا جاتا ہے۔

سفر بھی کئی قسم کے ہوتے ہیں، کچھ لوگ اپنے مذہبی عقائد کے مطابق متبرک و مقدس مقامات کی زیارت کے لئے سفر کرتے ہیں، بعض تجارتی کاروبار کے لئے کمربستہ ہوتے ہیں۔ اور اکثر لوگوں کو جذبۂ سیر و سیاحت کی کشش سفر کے لئے آمادہ کرتی ہے۔ یہ سلسلہ زمانۂ قدیم سے جاری و ساری ہے۔ دنیا میں ایسے سیاح بھی پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ سیر و سیاحت کی نذر کر دیا، انھوں نے ایسے زمانے میں دور دراز ملکوں کی سیاحت کے لئے سفر کیا، جب قدم قدم پر خطرات کا سامنا تھا، تیز رفتار سواریوں اور ہموار راستوں کا فقدان تھا۔ انھوں نے بے خوف خطر اپنی ہمّت و جرأت اور عزم محکم کے سہارے ہزاروں میل کا سفر کیا۔ خوفناک جنگلوں، دشوار گذار گھاٹیوں، پرپیچ وادیوں اور تیز رو دریاؤں کو عبور کیا، اور اپنی منزلِ مقصود تک پہونچے، ہر مقام کے باشندوں نے ان کی مدد کی۔ ان کے ساتھ دوستوں اور مہمانوں جیسا سلوک کیا، شیخ سعدیؒ کی اس نصیحت کو پیش نظر رکھا کر ؎

غریب آشنا باش و سیاح دوست کہ سیاح جلاّبِ نام نیکوست

انسان جب عزم سفر کرتا ہے تو قدرت اس کے لئے آسانیاں فراہم کرتی ہے، بقول آتشؔ ؎

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے ہزار ہا شجر سایۂ دار راہ میں ہے

ان مشہور اور ممتاز سیاحوں میں، ابنِ بطوطہ، مارکوپولو چینی سیاح فاھیان، ابنِ جبیر اندلسی، سلیمان تاجر، ادریسی، ابوریحان بیرونی کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں جنھوں نے دنیا کے دور دراز علاقوں کا سفر کیا، اور جس ملک میں پہونچے وہاں کی تہذیب و معاشرت اور تاریخی حالات کا جائزہ لیا، اور ان کو اپنے سفرناموں میں درج کیا۔ اس طرح تاریخ کی گمشدہ کڑیوں کو مربوط کرنے میں مؤرخوں کی مدد کی اور ان کے لئے گراں قدر مواد فراہم کیا۔ آج علمی دنیا ان کی خدمات کی معترف ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پندرھویں صدی کے بعد یورپ کے سیاحوں

علوم مشرقیہ کے ماہر امیر حسن نورانی بہت سی کتابوں کے مصنّف اور اسلامیہ کالج لکھنؤ میں اُستاد تھے بعد میں دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں پبلی کیشنز آفیسر کی حیثیت سے وابستہ رہے، اور بہت سی کتابوں کی ترتیب دی۔ نول کشور پریس لکھنؤ کے شعبۂ اشاعت سے بھی منسلک رہے تحقیقی موضوعات پر اُن کے مضامین اہمیت کے حامل ہیں۔
—— ایڈیٹر

نے دنیا کا گوشہ گوشہ چھان مارا اور اپنی سیاحت کے حالات قلمبند کرکے بیش قیمت معلومات فراہم کیں۔ لیکن ان سے پہلے عرب سیاح ان راہوں سے گذر چکے تھے۔

اردو زبان میں سفرنامے لکھنے کی روایت بہت قدیم نہیں ہے۔ اٹھارھویں صدی سے قبل کسی ایسے ہندوستانی سیاح کا سراغ نہیں ملتا جس نے کسی دوسرے ملک کی سیاحت کی ہو، اور حالات سفر تحریر کئے ہوں۔ اٹھارھویں صدی کے آخر میں دو ہندوستانی سیاحوں نے انگلستان کا سفر کیا۔ لیکن سفرنامے فارسی زبان میں لکھے۔ پہلے سیاح اعتصام الدین بنگالی کا سفرنامہ، "شگرف نامہ ولایت" ہے۔ اور دوسرے مشہور سیاح ابوطالب لکھنوی ہیں جن کا سفرنامہ "مسیر طالبی" اپنے معیار و مواد کے اعتبار سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔

پہلا سفرنامہ جو اردو زبان میں لکھا گیا، "عجائبات فرنگ" ہے جس کے مؤلف مشہور، آزاد منش سیاح یوسف خاں کمبل پوش ہیں۔ انھوں نے ۱۸۳۷ء میں انگلینڈ کا سفر کیا۔ ان کا مقصد محض سیر و تفریح تھا۔ لیکن اس ملک کی صنعتی ترقی نے ان کو حیرت زدہ کر دیا۔ وہاں کی ایجادات و اختراعات کو دیکھ کر ان کو ہندوستان کی غربت اور بدحالی کا احساس ہوتا ہے جس پر انھوں نے اظہار افسوس کیا ہے۔ اس سفرنامے میں انگلینڈ کی تہذیب و معاشرت کا جائزہ لیا ہے اور ان کے محاسن و معائب پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ یوسف خاں حیدرآباد کے رہنے والے تھے کچھ عرصہ بادشاہ اودھ نصیر الدین حیدر کی ملازمت میں رہے۔ انگلستان کی سیاحت کے بعد جب واپس آئے تو مختلف شہروں میں گھوم پھر کر لکھنؤ پہونچے۔ ان کا سفرنامہ پہلی بار ۱۸۴۷ء میں دہلی سے شائع ہوا تھا۔ دوسرا اڈیشن مطبع نول کشور نے کچھ عرصہ بعد شائع کیا — یہ اردو زبان کا پہلا سفرنامہ ہے۔ اس لئے اس کی اہمیت مسلم ہے۔ اس کی زبان اور انداز بیان قدیم طرز کی عام نثری تحریروں کا نمونہ ہے۔

اردو میں سفرناموں کا ارتقاء ۱۸۵۷ء کے ہنگامے ختم ہونے کے بعد شروع ہوا۔ اور رفتہ رفتہ یہ اردو ادب کی ایک اہم صنف شمار ہونے لگی۔ اس زمانے میں مسافروں اور سیاحوں کو بری اور بحری سفر کے لئے تیز رفتار سواریاں ملنے لگیں۔ اور مختلف طبقوں کے لوگوں میں سیر و سیاحت کا ذوق و شوق بڑھنے لگا۔ سفر کرنے والوں میں ان لوگوں کی اکثریت تھی جو حج اور مقامات مقدسہ کی زیارت کے لئے سفر کرتے تھے اور اپنے حالاتِ سفر اردو میں لکھتے تھے۔ اسطرح اردو میں سفرناموں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ ان سفرناموں میں بعض کو ادبی حیثیت بھی حاصل ہے۔ ان میں نئے انداز بیان اور اسلوب نگارش کے دلکش نمونے بھی ملتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد جو سفرنامے لکھے گئے اور جو ادبی حیثیت سے بھی معیاری ہیں۔ ان میں محمد حسین آزاد کا سیر ایران زبان اور انداز بیان کے اعتبار سے بہت دلکش اور دلچسپ ہے۔ اس کے بعد سرسید احمد خاں کا سفرنامہ، مسافران لندن بہت اہم ہے۔ سرسید احمد خاں نے لندن کا سفر وہاں کے نظام تعلیم کا جائزہ لینے کیلئے کیا تھا۔ ساتھ ہی اپنے بیٹوں کو جدید تعلیم حاصل کرنے کے لئے وہاں داخل کرانا مقصود تھا۔ ان کا سفرنامہ ہر قسم کی معلومات پر مشتمل ہے اور بہت دلچسپ ہے، سرسید کی زبان اور انداز بیان بہت سادہ زبان نہایت شگفتہ ہے۔ یہ سفر سرسید نے ۱۸۶۹ء میں کیا تھا۔

سرسید کے سفرنامے کے بعد مولانا شبلی نعمانی کا سفرنامہ "مصر و شام اور روم بہت اہم ہے شبلی نے یہ سفر سیر و سیاحت کے علاوہ مذکورہ ممالک کی علمی اور معاشرتی حالات سے واقفیت کے لئے اور خاص طور پر مذکورہ ممالک کے نظام تعلیم اور مشہور کتب خانوں کے مخطوطات اور مطبوعات کا جائزہ لینے کے لئے اختیار کیا تھا۔ شبلی کی دلکش انشاء پردازی نے اس سفرنامہ کو ایک ادبی شہ پارہ کی حیثیت دی ہے۔ اس زمانے میں متعدد سفرنامے شائع ہوئے، اور یہ سلسلہ بڑھتا رہا۔ علامہ شبلی نعمانی کے سفرنامے کے بعد، مولوی محبوب عالم اڈیٹر پیسہ اخبار لاہور کا سفرنامہ یورپ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ۱۹۰۰ء کا یہ سفرنامہ یورپ کی صنعتی ترقی کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس میں انہوں نے بلا مبالغہ آرائی وہی حالات اور واقعات لکھے ہیں۔ جو اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ انداز بیان اور سادہ و شستہ زبان کے اعتبار سے بھی یہ معیاری سفرنامہ ہے۔ اور نہایت دلچسپ ہے۔

اردو ادب کی یہ صنف بتدریج ترقی کی طرف گامزن رہی۔ بیسویں صدی کے وسط سے اردو کے بعض ترقی پسند ادیبوں نے مختلف ممالک کی سیر و سیاحت کی اور اپنے حالات سفر کچھ نئے انداز سے لکھے۔ ان میں پروفیسر احتشام حسین کا سفرنامہ ساحل و سمندر بہت مشہور ہے۔ احتشام حسین نے ۱۹۵۲ء میں امریکہ کی سیاحت خاص علمی مقاصد کے تحت کی تھی۔ کچھ دن انگلینڈ میں بھی گزارے تھے۔ یہ سفرنامہ نئی دنیا کے تعلیمی اور ادبی حالات کے علاوہ وہاں کی مادی ترقی پر بھی روشنی ڈالتا ہے اور نہایت دلچسپ ہے۔ ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوا — "ساحل و سمندر" ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا تھا۔

مذہبی رنگ کے بعض سفرنامے جو ادبی حیثیت سے بھی اہم ہیں، ان میں مولانا عبدالماجد دریاآبادی کا سفرنامہ حج اور دو ہفتہ پاکستان میں بہت دلچسپ ہیں جن میں ان کا خاص اسلوب و انداز نمایاں ہے۔ اسی سلسلہ میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کا سفر ترکی بہت دلچسپ اور علمی اور تاریخی حالات پر مشتمل ہے۔ موصوف نے خاص طور پر علمی اور دینی حالات کا جائزہ لینے کے لئے یہ سفر کیا تھا انھوں نے انگورہ۔ استنبول قسطنطنیہ اور حلب جیسے مشہور مقامات کی سیر کی۔ مولانا کا طرز تحریر بہت شگفتہ ہے ان کی نثر میں علامہ شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی کا رنگ جھلکتا ہے۔ اسی کے ساتھ ان کے انداز بیان میں بڑی دلکشی ہے۔ انہوں نے دنیا کے مختلف ممالک کا سفر کیا ہے اور بعض ملکوں کے حالات سفر مضامین کی صورت میں پیش کئے ہیں۔ ان میں بھی ان کے طرز تحریر کی خصوصیات نمایاں ہیں۔ ان سب کو یکجا کر دیا جائے تو ممالک اسلامیہ، یورپ اور امریکہ کے اخلاقی، معاشرتی اور دینی حالات پر مشتمل ایک علمی، ادبی اور تاریخی سفرنامہ ہوگا۔ اور اس صنف میں اضافہ متصور کیا جائے گا۔ ادبی اعتبار سے اردو نثر کا دلکش نمونہ ہمارے لئے ایک علمی دستاویز کی حیثیت سے قابل قدر ہوگا۔ مولانا موصوف سے پہلے ان کے والد ماجد مولانا حکیم عبدالحی صاحب گلِ رعنا نے ایک سفرنامہ دہلی اور اس کے اطراف تحریر کیا تھا۔ یہ ایک تاریخی اور تاثراتی سفرنامہ ہے، جس میں دہلی کی مشہور عمارات، علماء و صلحا کے مزارات اور دیگر اسلامی یادگاروں کی تاثراتی مرقع کشی بہت ہنرمندی اور حسن عقیدت کے ساتھ کی ہے۔ جس کے ایک ایک لفظ سے ان کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ مولانا عبدالحی اردو زبان و ادب کے رمز شناس تھے۔ انھوں نے اردو میں کئی کتابیں تصنیف کی ہیں۔

صنفِ سفرنامہ کی ایک قسم مزاحیہ سفرناموں کی ہے۔ اس صنف نے بھی ترقی کی طرف رخ کیا ہے اور بعض دلچسپ نمونے ادبی دنیا کے سامنے آچکے ہیں، ان کا مختصر ذکر ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں کرنل محمد خاں کا نام بہت نمایاں ہے۔ انہوں نے ایک فوجی افسر کی حیثیت میں، بیروت سے ایران تک سفر کیا تھا جس کا حال "اپنے مشہور سفرنامہ" "بجنگ آمد" میں کیا ہے۔ انہوں نے اپنے حالات سفر ایک انوکھے مزاحیہ اور طنزیہ انداز میں لکھے ہیں کہ پڑھنا شروع کرو تو کتاب ختم کئے بغیر ہاتھ سے رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ زبان اور اندازِ بیان نہایت دلکش ہے۔ ہر جملہ لطف سے خالی نہیں۔ یہ اپنی نوعیت کا منفرد سفرنامہ ہے۔ اور مذکورہ ممالک اور ان کے باشندوں کی خصوصیات اور معاشرت کا آئینہ دار ہے۔ اس کے بعد مشہور ادیب اور مزاح نگار ابن انشا کا نام اس صنف میں سرفہرست ہے۔ انہوں نے ایک نئے اسلوب و انداز کی بنیاد ڈالی۔ اپنے حالات ایجاز و اختصار کے ساتھ، دلچسپ طنزیہ اور مزاحیہ انداز میں تحریر کئے ہیں۔ وہ اپنے اس خاص طرز کے موجد ہیں۔ ان کا سادہ و شگفتہ طرز بیان اور ایما و اشارات اور تلمیحات نے ان کے حالات سفر کو نہایت دلکش بنا دیا ہے۔ ان کی تحریروں سے لطف اندوز ہونے کے لئے قدیم و جدید علوم سے کسی قدر واقف ہونا ضروری ہے تاکہ ان کے ایما و اشارات سے پورے طور پر لطف اندوز ہو سکیں۔ انشا کے اکثر جملوں پر مسکراہٹ کے بجائے قہقہہ لگانے کی نوبت آجاتی ہے۔ انہوں نے کوئی مسلسل سفرنامہ نہیں لکھا۔ اپنے ملک کے نمائندہ کی حیثیت سے تقریباً تین چوتھائی دنیا کا سفر کیا۔ اور ہر جگہ اپنے مختصر قیام میں اپنی ذہانت اور وسیع النظری سے پورے ملک کی اہم خصوصیات سے واقفیت حاصل کر لی اور ان کو مختصر مضامین کی صورت میں اپنے مزاحیہ انداز میں تحریر کر دیا۔ یہ مضامین اخبارات میں قسط وار شائع ہوتے رہے۔ ان کے مشہور مجموعہائے مضامین میں' آوارہ گرد کی ڈائری "، "دنیا گول ہے" اور "چین چلو چین" بہت مشہور اور مقبول عام ہیں۔ مزاحیہ انداز کے سفرناموں سے قطع نظر۔ اس صنف میں جدت طرازی کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ نئے اسلوب و انداز کے دلچسپ سفرنامے نظر آنے لگے ہیں۔ جن کی بدولت اس صنف کا مستقبل روشن نظر آتا ہے۔ اس طرز کا پہلا سفرنامہ "جرنیلی سڑک" ہے جسے رضا علی عابدی نے مرتب کیا ہے۔ یہ شیر شاہ سوری کی بنوائی ہوئی سڑک کے کنارے آباد مقامات کا نہایت دلچسپ اور معلومات افزا سفرنامہ ہے۔ شیر شاہ نے کلکتہ سے پشاور تک ایک پختہ سڑک تعمیر کرائی تھی جو جرنیلی سڑک اور گرانڈ ٹرنک روڈ کے نام سے مشہور ہے۔ عابدی صاحب نے بی۔ بی۔ سی۔ لندن کی طرف سے اس سڑک کے کنارے آباد شہروں اور مشہور مقامات کا سفر کیا۔ جو ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں آباد ہیں۔ تمام مقامات کے تاریخی حالات، تہذیب و معاشرت اور تبدیلیوں کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ ان کا انداز تحریر نہایت دلچسپ اور اثر آفریں ہے۔ زبان نہایت دلکش، شگفتہ اور عالمانہ ہے۔ یہ سفرنامہ قسطواً بی۔ بی۔ سی۔ لندن سے نشر کیا گیا۔ اب کتابی صورت میں شائع ہو گیا ہے۔

□□

پریس رجسٹریشن آف بکس ایکٹ ۱۹۵۶ء (۱۹۵۶ء میں ترمیم شدہ)
کی دفعہ ۱۹۔ ڈی، قاعدہ نمبر ۸ کے مطابق ماہنامہ نیا دور لکھنؤ کی ملکیت وغیرہ کے بارے میں
مندرجۂ ذیل تفصیلات شائع کی جا رہی ہیں:

(۱) مقام اشاعت: لکھنؤ
(۲) وقفۂ اشاعت: ماہوار
(۳) پرنٹر کا نام: شری راجیو اروڑا
قومیت: ہندستانی
پتہ: یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس۔ گوتم بدھ مارگ، لکھنؤ
(۴) پبلشر کا نام: شری روہت نندن
قومیت: ہندستانی
پتہ: ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامّہ اترپردیش لکھنؤ
(۵) ایڈیٹر کا نام: شری سیّد امجد حسین
قومیت: ہندستانی
پتہ: ایڈیٹر نیا دور، محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامّہ اترپردیش لکھنؤ
(۶) ان اصحاب کے نام اور پتے جو اس رسالہ کے مالک یا اسکے تمام سرمایہ کے ایک فیصد سے زیادہ کے حصّہ دار ہیں } نیا دور سرکاری جریدہ ہے

"میں روہت نندن اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کی حد تک درست ہیں۔"

(دستخط)
روہت نندن
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامّہ اترپردیش
لکھنؤ

یادِ رفتہ

اَب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

اِس اِنتخاب کے آئینے میں گزشتہ پچاس سال کے ادبی اِرتقا کی تصویر دیکھی جاسکتی ہے اور اِن تخلیقات کے ذریعے اِس کا عرفان بھی حاصِل ہوسکتا ہے کہ نِصف صدی کے اِس سفر میں ہم نے کیا کھویا ہے اور کیا پایا ہے اور یہ کہ ہماری تاریخ اور ہمارا سماج اُس وقت کیا تھا اور اب کیا ہے۔

——— ایڈیٹر

مہاتما گاندھی کی اُردو تحریر کے

دو عکس

20-9-41

بی بی سلطانہ کو میں نے میرا
کوٹ دیا ہے۔ اُسے وہ بیچے گی
اور اُس میں سے جو پیسے ملینگے
وہ دین بندھو میموریل میں
دیے جاینگے۔ مو۔ک۔ گاندھی

تم نے میری بحث دیکھی
تھی سچ بات یہ ہے کہ
میں نے کبھی ایسا نہیں
کہا ہے۔ میں نے جو کہا تھا
وہ چھپا ہے میں نکال
کے بھیج سکتا ہوں
کیا کیا جائے؟ اخباروں میں
میرے بارے میں بہت سے
غلط باتیں لکھی جاتی ہے اگر
کل تک رہنا ہے تو آجاو کچھ
بات کرینگے اور کچھ
بتاونگا۔

یہ مہاتما گاندھی کی اُردو تحریر کا عکس ہے اِس عکس میں چند سطریں ہیں لیکن اُن میں اُن کی شخصیت بھی موجود ہے، اور ساتھ ہی ساتھ اُردو میں اُن کی یہ تحریر راقم الحروف کی نظر میں پورے ہندوستان کے لئے ایک ایسا پیغام ہے جس کے لئے دیدۂ بینا کی ضرورت ہے۔ ——— ایڈیٹر

غزل

فراق گورکھپوری

چشمِ سیہ سے گھٹا جو اُٹھی ہے — مے خانے پر جھوم پڑی ہے
ہوتے ہوتے صُبح ہوئی ہے — کٹتے کٹتے رات کٹی ہے
نغمہ ہے مے ہے مستی ہے — ساقی پھر بھی کوئی کمی ہے
دُنیا میں نفسی نفسی ہے — سب کو اپنی اپنی پڑی ہے
دے دے ہم اہلِ دل کو دو عالم — یہ تو ہماری کم طلبی ہے
دیس کو دیکھا دیس ہمارا — کتنا بڑا ہے کتنا دُکھی ہے
لٹ چھٹکائے، بال سنوارے — یاد تری دل سے گزری ہے
کہتی ہے جو تری خاموشی — اے لبِ جاناں بات وہی ہے
لاکھ عذابِ جہاں ہیں یارو — ایک عذابِ محبت بھی ہے
مجھ کو کفن سرکا کے دیکھو — غم کی رات بھی کٹ جاتی ہے
پچھلا پہر ہے مے خانے میں — نرگسِ میگوں جاگ رہی ہے
کیا کہنا زلفوں کی درازی — سچ ہے بڑوں کی بات بڑی ہے
اک ساغر اے چشمِ خماریں — مے خانے میں صُبح ہوئی ہے
یارو! وہ کیا نعمت ہے کہ جس سے — دُنیا کی دُنیا خالی ہے
میری حیات اور غزلوں پر — موت نے بھی انگڑائی لی ہے
اے غمِ جاناں، اے غمِ جاناں — کیا تو ہی غمِ دوراں بھی ہے
وقتِ سخن اس کے لبِ نازک — جیسے کوئی کلی کھلتی ہے
وقت نہ کٹنے والے دیس میں — صبح بھی کی ہے شام بھی کی ہے
جس کو بانکپن کہیئے، تیری — اک ادائے کج کلہی ہے
شاید اس نے پلک جھپکائی — دل پر پرچھائیں سی پڑی ہے
کاش یہ دُنیا دُنیا ہوتی — دُنیا میں دُنیا کی کمی ہے
صدمۂ ہجر نہ دے پچھلی شب — یار رات ہی اب کتنی ہے

سُن کے فراق کہانی تیری
فطرت کی آنکھوں میں نمی ہے

پیمانے کی رگ جو دُکھی ہے ۔۔۔ شیشے کو بھی چوٹ لگی ہے
چشمِ سیہ میں جو بھیگی ہوئی ہے ۔۔۔ مئے خانے کی رات وہی ہے
بزمِ ادب گو بھری ہوئی ہے ۔۔۔ پھر بھی میری جگہ خالی ہے
جس سے دُنیا خائف بھی ہے ۔۔۔ یارو وہ بھی دُنیا ہی ہے
ہر غم کٹ جاتا ہے لیکن ۔۔۔ بات یہ ہے تیرا غم بھی ہے
اے دلِ غمگیں، اے دلِ غمگیں ۔۔۔ دیکھ کہیں دُنیا میں خوشی ہے
کہتے چلو افسانۂ ہجراں ۔۔۔ یارو! رات کی رات بڑی ہے
کون بتا سکتا ہے، یہ دھرتی ۔۔۔ کس محور پر گھوم رہی ہے
عشق اُٹھا دُنیا سے شبِ غم ۔۔۔ جیسے کوئی شمع بجھی ہے
دردِ بھرے اشعار سُنا کر ۔۔۔ دیکھیں کوئی روتا بھی ہے
اب تو آجا، اب تو آجا ۔۔۔ ہوتے ہوتے رات ہوئی ہے
دادِ سخن اس کو کہتے ہیں ۔۔۔ اس کی نظر بھی بول اُٹھی ہے
کوئی سخن ہو ایک ہی مطلب ۔۔۔ کوئی بات ہو بات وہی ہے
خاک میسّر ہے اس در کی ۔۔۔ میری جبیں قسمت کی دھنی ہے
برقِ نظر میرے تن من میں ۔۔۔ آگ لگا کر دور کھڑی ہے
درد سے ہر پیکر ہے عبارت ۔۔۔ جو رگ ہے کچھ دُکھتی ہوئی ہے
عشق کی بستی میں کیا سوجھے ۔۔۔ یہ نگری اندھی نگری ہے
تیری صدائے قُم کے صدقے ۔۔۔ نبضِ عالم ڈوب رہی ہے
ترکِ محبت پر بھی دل [illegible] ۔۔۔ درد اُٹھا ہے ٹیس اُٹھی ہے
اہلِ کارواں چال نہ چوکیں ۔۔۔ رین اندھیری، راہ کڑی ہے
زُلف میں ہے جو، آنکھ میں ہے جو ۔۔۔ رات وہی ہے بات وہی ہے
عشق ابھی اِک راز ہے، لیکن ۔۔۔ دُنیا آنکھیں مار رہی ہے

تم بھی فراق اب آنکھیں کھولو
دھرتی دُنیا جاگ رہی ہے

فراق گورکھپوری آفتاب آمد دلیلِ آفتاب کے مصداق اُردو کی منفرد ادبی شخصیت تھے۔ مفکر، شاعر اور نقاد تینوں صفتیں ان میں موجود تھیں۔ سیاست کی دُنیا سے ادبی دُنیا میں آئے۔ ان کا شعری مجموعہ "گلِ نغمہ" اور ان کی رُباعیات "رُوپ" کے نام سے مشہور ہیں۔ تنقیدی مجموعہ "اندازے" ہے۔ وہ اُردو کی پہلی شخصیت ہیں، جنہیں گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا گیا۔

——— ایڈیٹر

غزل

جاں نثار اختر خیرآباد ضلع سیتاپور کے رہنے والے تھے مضطر خیرآبادی کے فرزند تھے۔ مجاز کے حقیقی بہنوئی تھے۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے۔ بمبئی میں فلمی دنیا سے منسلک رہے۔ ان کے صاحبزادے جاوید اختر شاعر بھی ہیں۔ مرحوم کا ایک مشہور شعر تبرکاً پیش ہے ؎

اور تو مجھ کو ملا کیا مری محنت کا صلہ
چند سکے مرے ہاتھوں میں ہیں چھالوں کی طرح

ایڈیٹر

جاں نثار اختر

موجِ گل، موجِ صبا، موجِ سحر لگتی ہے
سر سے پا تک وہ سماں ہے کہ نظر لگتی ہے

لمحے لمحے میں بسی ہے تری یادوں کی مہک
آج کی رات تو خوشبو کا سفر لگتی ہے

ہم نے ہر گام پہ سجدوں کے جلائے ہیں چراغ
اب تری راہ گزر راہ گزر لگتی ہے

واقعہ شہر میں کل تو کوئی ایسا نہ ہوا
یہ تو اخبار کے دفتر کی خبر لگتی ہے

کوئی آسودہ نہیں اہلِ سیاست کے سوا
یہ صدی دشمنِ اربابِ ہنر لگتی ہے

اے لکھنؤ کیا تری گلیوں کا مقدر تھا یہی
ہر گلی آج تری خاک بسر لگتی ہے

غزل

سلام مچھلی شہری

اُسے بھی اپنے مسائل میں مُبتلا نہ کرو
اُداس ہو تو کسی دوست سے مِلا نہ کرو

تجھے تو اتنے پریشان، اتنے افسردہ
چراغ بن کے کہا تھا کبھی جلا نہ کرو

کلی کھلے گی، ستارے ضرور چمکیں گے
یہ اور بات کہ تم شکریہ ادا نہ کرو

گنہ کی راہ میں اک روشنی کا موڑ بھی ہے
مرے لیے ابھی اے دوستو دُعا نہ کرو

نئے رفیقو! مرے حال پر ترس کھا کر
ابھی سے ترکِ تعلق کی ابتدا نہ کرو

جو حسن کا رہو، ساری فضا تمھاری ہے
اگر نہیں ہو، تو پھر شکوۂ فضا نہ کرو

یہ کم نہیں ہے کہ اس دور میں بھی زندہ ہو
سلام! صورتِ حالات کا گلا نہ کرو

□□

سلام مچھلی شہری نے کم عمری ہی میں شاعری کا آغاز کیا۔ مچھلی شہر ضلع جون پور کے رہنے والے تھے، فیض آباد میں ابتدائی تعلیم حاصل کی، الہ آباد یونیورسٹی لائبریری میں بھی کام کیا۔ عرصہ تک لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے وابستہ رہے نئے لب و لہجے کے شعراء کے میر کارواں تھے: ناچ ”ساتِ رنگ“ اور ”ڈرائنگ روم“ وغیرہ مشہور نظمیں ہیں۔ ”پھول اور انگارے“ پہلا مجموعۂ کلام تھا۔ دوسرا مجموعہ ”وسعتیں“ اور گیتوں کا مجموعہ ”پائل“ بہت مشہور ہوا۔ تبرکاً ایک شعر درج ہے ؎

جب بہ ایں غم دوراں میں بھی جی ہی لیتا ہوں
اس حسیں دنیا پر کیوں نہ اعتبار آئے

ایڈیٹر

دیکھئے کب تک رہے

حسنِ حقیقت نہاں دیکھئے کب تک رہے
شوقِ نظارہ جواں دیکھئے کب تک رہے

عشق کے اظہار پر، حسن کی گفتار پر
تہمتِ حسنِ بیاں، دیکھئے کب تک رہے

وقت کے آفاق میں، دہر کے بازار میں
جنسِ محبت گراں دیکھئے کب تک رہے

ناقدِ اخلاص ہے، ممتحنِ آرزو
سلسلۂ امتحاں، دیکھئے کب تک رہے

چینِ جبیں دل شکن، خندۂ لب دل رُبا
ایسی نہیں جیسے ہاں دیکھئے کب تک رہے

غنچۂ جانِ چمن رُوحِ بہارِ چمن
لقمۂ کامِ خزاں دیکھئے کب تک رہے

خلق کے سینے میں درد، دہر کے ماتھے پہ گرد
وقت کے رُخ پر دھواں دیکھئے کب تک رہے

دوڑ چکی دہر میں رُوحِ نئے دَور کی
عہدِ کہن نیم جاں، دیکھئے کب تک رہے

شمیم کرہانی

شمیم کرہانی کرہان ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے، وہ پروفیسر سید احتشام حسین کے ہم زلف تھے۔ وطن پرست شاعر اور تحریکِ آزادی کے پرجوش مجاہد اور تقسیم ہند کے شدید مخالف تھے۔ ان کی نظموں میں "جگاؤ نہ باپو کو نیند آگئی ہے" بہت مقبول تھی۔ تبرکاً نظم کا ایک شعر پیش ہے۔

آبرو کا چاند جب آشوب کے ہالوں میں تھا
اپنا بھائی بھی تماشا دیکھنے والوں میں تھا

ایڈیٹر

دوپٹہ

ڈاکٹر راہی معصوم رضا

کون ہے یہ
جو برگد کے میٹھے سائے میں
بیٹھ کے ماتھا پونچھ رہی ہے

گنگا کی تہذیب کا کُرتا
اور اس پانی سے کُرتے میں
گومتی اور سرجو کی کلیاں

دامن پر
اور چاکِ گریباں پر
شہروں کی بیل ٹنکی ہے
دیہاتوں کے پھول کڑھے ہیں
جمنا کے چنچل پانی کا نرم دوپٹہ
لہروں کی چٹکی جس کو چُنتی رہتی ہے
مینڈھوں کے دھاگے میں
جس کے
لمبے کالے بال گندھے ہیں
بنسی کی میٹھی تانوں کی چادر اوڑھے
"رسیا" اور "بدریا" کے آویزے پہنے
پیروں میں "ٹونے" کے لچھے
"سوہے" اور "جنتے" کے گھنگھرو
سانس نئی برسات کی خوشبو
بیلے اور چنبیلی کی چاندی میں ہے جوہی کا نگینہ
سرسوں کے پھولوں کا ٹیکہ
گیہوں کی بالی کا چھپکا
ہاتھوں میں "بابل" کی چوڑی
"برہے" کے تلبنے کے کنگن پر خوابوں کے سُنہرے پتّر
ماتھے پر متھرا کی بندی
ہونٹوں پر کاشی کی سُرخی

رخساروں پر
شامِ اَوَدھ کی شفق کی لالی
پور پور میں رچی ہوئی محنت کی مہندی
آنکھوں میں "کجری" کا سُرمہ
ماضی، حال اور مستقبل کی
آدھی
پوری
کچھ تصویریں

یہ باون[1] بچوں کی ماں ہے
پھر بھی جواں ہے۔

□□

---

[1] جن لوگوں کو اعداد و شمار میں بہت دل چسپی ہو، وہ "جون" پڑھیں۔ —— راہی

ڈاکٹر راہی معصوم رضا غازی پور کے رہنے والے تھے، ادارہ نکہت سے وابستہ رہے۔ شعری مجموعہ "اجنبی شہر اجنبی راستے" کے علاوہ ایک طویل رزمیہ نظم "۱۸۵۷ء" بھی لکھی۔ "طلسم ہوش رُبا کا تہذیبی مطالعہ" ان کا تحقیقی مقالہ ہے۔ انھوں نے ہندی میں کئی ناول لکھے جن میں "آدھا گاؤں" بہت مقبول ہوا اُردو میں شاہد اختر کے نام سے ان کے بہت سے ناول شائع ہوئے لیکن انتقال سے بارہ برس قبل سے وہ صرف فلمی دنیا تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ ان کی شہرت کا سبب بہت سے ٹی۔وی سیریل ہیں جن میں "مہا بھارت" خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔

—— ایڈیٹر

غزل

بھر آئی آنکھ تو اکثر کسی کے نام کے ساتھ
مگر وہ اشک جو چھلکا کیے ہیں جام کے ساتھ

فروغِ جلوۂ ساقی فروغِ جام کے ساتھ
چراغ جلتے ہیں کس حسنِ اہتمام کے ساتھ

مرے تمام کی باتیں مرے تمام کے ساتھ
وہ رات ہوگئی منسوب اُن کے نام کے ساتھ

قفس میں رہ کے بھی اکثر بہار کا دامن
نظر سے چوم لیا ہم نے احترام کے ساتھ

چمن پہ سایۂ ابرِ بہار کیا کہیے
وہ زلف رخ پہ بکھرتی ہے التزام کے ساتھ

وفا تو دولتِ ناموس دل لٹا بیٹھی
ہوس کو ربطِ مبارک ہو ننگ و نام کے ساتھ

کوئی سمجھ نہ سکا رازِ دلبری تاباںؔ
یہ لطفِ خاص ہے اک شانِ انتقام کے ساتھ

——— غلام ربانی تاباںؔ

غلام ربانی تاباںؔ ترقی پسند تحریک کے علمبرداروں میں ایک تھے، غزل اور نظم کے ساتھ شگفتہ نثر بھی لکھتے تھے۔ حال ہی میں اُن کا انتقال ہوا۔ (ایڈیٹر)

بولی پہلی کوئل

شہاب سرمدی

ڈالی ڈالی بور سے بوجھل
ٹپکے رس کی بوند
نس نس کانپے، کونپل پھوٹے
چمکیں چکنے پات
بھوشن بھار سہے امریاں
جیسے سُندر نار
کان میں جھمکا، مانگ پہ جھومر
پہنے جھک جھک جائے

ہر ہر ہر ہر پھاگن ڈولے
چھن چھن رُت بھرمائے
پچھوا چھوڑ چلے چوبائی
ناچت گھونگھرو، ناچت گوری
گھم گھم گھم گھم چوٹ لگائے
لے سے لے ٹکرائے
جیسے جوگن کی سنگت میں
آڑی تال پہ سم آ جائے

آمن کی ہریالی مہکے
مہکیں پکتے بور
شام سویرے شاما چہکے
رین بسیرے پکیں مور
کنجن کنج میں بیٹھی کوئل
چیت کی دھوم مچائے
کہک کہک ہر ڈال پہ ڈولے
اِت بولے اُت جائے
جیسے کوئی نئی نویلی
بات کرت شرمائے
جیسے برہن کا دکھیا دل
دھڑکے دھڑک نہ پائے

بلاغت حسین شہاب سرمدی الہ آباد کے موضع امرادا کے رہنے والے تھے، بڑی وجیہ شخصیت کے مالک تھے۔ محکمۂ ایکسائز میں ڈرامائی کارنامے انجام دینے کے بعد استعفیٰ دے کر تحقیق و تنقید کے کاموں میں منہمک ہو گئے۔ موسیقی سے خصوصی شغف تھا ابھی چند ماہ قبل ان کا انتقال ہوا۔ ——— ایڈیٹر

نیاز فتحپوری

فنِ تمثیل کا آغاز و ارتقاء

نیاز فتحپوری کا ایک مجموعہ انتقادیات کے نام سے مشہور ہے جس میں ان کے تنقیدی مضامین ہیں۔ انھوں نے رومانی افسانے بھی لکھے اور نگار میں تقریباً ہر موضوع پر معرکہ آرائی کی لیکن ادبی تاریخ میں وہ بحیثیت صحافی نمایاں ہیں اور نگار کے مدیر ہونے کی وجہ سے وہ رئیس التحریر کہلاتے ہیں۔ ایک زمانے میں نگار میں کسی کی تخلیق کی اشاعت اس کے ادبی وزن اور وقار کی ضمانت ہوا کرتی تھی۔ نیاز فتحپوری بعد میں پاکستان چلے گئے اور وہیں انتقال کیا۔

——— ایڈیٹر

ڈراما اور رومان دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ جو بات صرف تفریحِ طبع اور عبرت کے لئے قصہ کی صورت میں لکھی جائے وہ رومان ہے اور جس سے مقصود یہ ہو کہ چند مخصوص افراد اسے تمثیل کے طور پر بھی پیش کریں وہ ڈراما ہے۔

رومان اصل میں وہ قصہ ہے جو عوام کی زبان میں لکھا جاتا ہے اس کا موضوع کبھی تاریخی ہوتا ہے (جیسے قصہ بنی ہلال اور سیرۃ عنترۃ) کبھی محض وہمی اور خیالی (جیسے کلیلہ دمنہ کے اکثر قصے) کبھی رمزی اور اعتقادی جس سے محض تلقین و تدریس مقصود ہوتی ہے۔ چوں کہ لوگ قدیم زمانے سے اس قسم کی حکایتوں سے دلچسپی لیتے چلے آئے ہیں اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ قصہ گوئی انسانی تاریخ کے ساتھ شروع ہوتی ہے تو بیجا نہ ہوگا۔

ابتدا میں تو رومان اشعار کی صورت میں لکھا جاتا تھا جس کے ذریعہ سے لڑائیوں کے حالات، انقلاباتِ حکومت وغیرہ کے واقعات قصہ کی صورت میں بیان کئے جاتے تھے پھر رفتہ رفتہ اس نے نظم و نثر میں مختلف صورتیں اختیار کیں جن میں سب سے آخری اور مہذب صورت تمثیلی حکایات یا ڈراما کی ہے۔ ڈراما اور رومان دونوں میں انسانی اخلاق و عادات کا تجزیہ ہوتا ہے اور حسن و قبح کے دونوں پہلو دکھائے جاتے ہیں مگر فرق یہ ہے کہ ڈراما کا دائرہ رومان سے تنگ ہوتا ہے کیونکہ ڈراما کا موضوع ایک ہیئتِ مخصوصہ سے تعلق رکھتا ہے اور اس میں چند خاص امور کا التزام بھی ضروری ہے۔ برخلاف اس کے رومان ان قیود سے آزاد ہے اور اس کا میدان زیادہ وسیع ہے۔ ڈراما خصوصیتِ موضوع دیکھتے ہوئے رومان سے زیادہ مشکل ہے کیونکہ تمثیل واقعات کے لئے تمام لوازم و عوارض کا جمع کرنا ضروری ہے تاکہ واقعہ حکایت کی حد سے ترقی کرکے حدودِ مشاہدہ میں داخل ہو جائے اور حوادث کا پورا منظر نگاہ کے سامنے آجائے۔ قصہ گو، یا رومان نگار زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوتا ہے اور اسے تمثیل حوادث کے لئے تمام لوازم فراہم کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی اس کو صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ بہترین اسلوب اور فصیح ترین تعبیر کے ساتھ موثر پیرایہ میں اپنے مقصود کو ظاہر کر دے کیوں کہ عبارت ہی ایک قصہ کو پر لطف یا غیر دلچسپ بنا سکتی ہے۔

یونانی رومان

ابتداءً عہد کے رومان صرف حوادث تاریخی پر مبنی ہوتے تھے اور خیال و تصور سے کام نہ لیا جاتا تھا چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ سکندر اعظم کے بعد یونانیوں نے جس قدر قصے اور رومان لکھے ہیں ان سب میں یونانیوں ہی کی فتوحات کا تذکرہ ہے۔ البتہ سلسلۂ فتوحات میں غیر ملکوں کی جو عجیب و غریب باتیں انھوں نے دیکھی تھیں ان کا ذکر بھی ضمناً کر دیا گیا ہے۔ یونانیوں میں اس قسم کا جو سب سے پہلا رومان لکھا گیا وہ چند خیالی قصوں پر مبنی ہے جس میں عشق و محبت کی داستان بھی شامل ہے۔ اس کے ایک زمانہ بعد ارسٹیڈس پیدا ہوا۔ اس نے متعدد قصے لکھے جن میں ہیجانِ جذبات کا پہلو زیادہ غالب تھا۔ ان میں صرف ایسے عشقیہ مضامین ہیں جن میں خلافِ تہذیب عریانی سے کام لیا گیا ہے۔ اٹلی میں بھی ارسٹیڈس کی تقلید میں بہت سے قصے لکھے گئے لیکن زمانے نے ان سب کو فراموش کر دیا۔ یونانیوں

کے ان قصوں میں علم الاصنام کی حکایت سے بہت کچھ لی گئی ہے جس کا زمانہ دراز تک یونان میں بھی رواج رہا۔

ڈراما کی تفصیل

تمثیل یا ڈراما میں انسان کے اخلاق و عادات کی وہ تصویر پیش کی جاتی ہے جو معاشرت انسانی کے باہمی تعلقات سے پیدا ہوتی ہیں۔ ڈراما کا بیان ایسا ہوتا ہے گویا تمام کردار سامنے موجود ہیں۔

ڈرا کی دو قسمیں ہیں ایک متین و سنجیدہ جس کے پڑھنے سے خوشی و رنج کے جذبات میں تحریک پیدا ہوتی ہے۔ دوسری قسم میں مذاق و ہزلیات کا پہلو غالب ہوتا ہے اور اس کا ذریعہ ہے کم ہمت اور پست طبقہ کے لوگوں کی اخلاقی حالت دکھائی جاتی ہے۔ پہلی قسم کو تراجدیا (ٹریجڈی TRAGEDY) یا روایات حزنیہ کہتے تھے اور دوسری قسم کو کومڈیا (کومیڈی COMEDY) یا روایات ہزلیہ۔ موجودہ عہد میں اس ڈراما کو جس کا انجام غم پر ہو ٹریجڈی کہتے ہیں اور جس کا نتیجہ مسرت انگیز ہو اسے کومیڈی کہتے ہیں لیکن پہلے ان دونوں کا مفہوم وہی تھا جو بیان کیا گیا۔

ٹریجڈی کی حقیقت

تراجیڈیا، یونانی لفظ ہے جو اصل میں جو اصل میں تراکوڈیا تھا یعنی وہ گانا جو بکرے کے سامنے گایا جائے۔ اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ یونانی اپنے معبود شراب (BACCHUS) باخوس پر بکرے کی قربانی چڑھایا کرتے تھے۔ انگور کی فصل میں ہر سال باخوس کے گرد لوگ جمع ہوتے تھے اور خوشی و مسرت کے گانے گاتے تھے۔ چوں کہ یہ زمانہ شراب کی کثرت کا ہوتا تھا اس لئے تمام لوگ شراب کے نشہ میں چور گلی کوچوں میں گاتے اور طرح طرح کا مذاق کرتے پھرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک یونانی شاعر تھس بیس کو خیال ہوا کہ اگر اس موقع پر باخوس کی مدح میں قصائد پڑھے جایا کریں تفریح طبع کے لئے ہومر وغیرہ مشہور شعرا یونان کا کلام لوگوں کو سنایا جائے تو زیادہ مناسب ہے چنانچہ اس خیال کے تحت عید باخوس میں ہر یونانی جماعت کے ساتھ ایک قصیدہ خواں بھی رہنے لگا جو مختلف اشعار کے ذریعہ سے جنسی جذبات میں ہیجان پیدا کرتا تھا۔ یونانی شوق سے یہ اشعار سنتے تھے اور سنانے والا گاتے وقت ایسے حرکات اور اشارات کرتا تھا جو مقصود کے سمجھنے میں مدد دیتے اور قصہ کی تمثیلی صورت نظروں کے سامنے پیش ہو جاتی۔

یونان میں ڈراما کی ترقی

اس کے بعد   نے قصہ خواں کے ساتھ ایک آدمی اور شریک کر دیا۔ اب یہ دونوں شخص سوال و جواب کے طریقہ پر کہنے لگے اور ضرورت کے لئے ایسے قصے وضع کئے گئے جو سوال و جواب کے اسلوب پر لکھے جانے لگے۔ کچھ عرصہ کے بعد یونان میں فن انشا کے بڑے ماہر اور مشہور شاعر سوفیکلس اور اربیڈس پیدا ہوئے۔

سوفیکلس کا کلام بہت سنجیدہ، پر معنی اور موثر ہوتا تھا۔ وہ اپنے قصوں میں ترغیب و ترہیب دونوں پہلو رکھتا تھا۔ اربیڈس اس مرتبہ کا شاعر تو نہ تھا لیکن اس کا کلام پھر بھی نہایت لطیف ہوتا تھا اور وہ ایک خاص اسلوب تعبیر سے جذبات محبت میں غیر معمولی ہیجان پیدا کر دیتا تھا۔ ان دونوں شاعروں کی بدولت فن تراجیدیا تکمیل تک پہنچا اور مخصوص مقامات متعین کئے گئے جہاں ان قصوں کی تمثیل ہوتی تھی۔ ان مقامات کو تھیٹر کہتے تھے۔ لوگ اوقات فرصت میں وہاں جمع ہوتے اور عورتیں بہترین کپڑے اور زیور پہن کر ان میں شریک ہوتیں۔

ڈراما اور سلطنت روما

جب یونانی حکومت کا خاتمہ ہوا اور سلطنت رومہ قائم ہوئی تو رومن لوگوں نے بھی اپنے شہروں میں تھیٹر قائم کئے جہاں وہ فرصت و فراغت کے اوقات میں جمع ہوتے۔ ابتدا میں انھوں نے صرف یونانی ٹراجدیات کی تقلید کی۔ لیکن ان قصوں میں تحریک عواطف اور ہیجان جذبات کا پہلو بہت کم ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ شاعر سنیکا بھی جو اپنے حسن انشا اور لطافت اسلوب کے لحاظ سے مشہور تھا اپنے کلام میں وہ خصوصیت پیدا نہ کر سکا جو ڈرامانگاری کے لئے ضروری ہے۔ ہر چند رومن افسانہ نویس اور وقائع نگار بھی تحریک جذبات کی کوشش کرتے تھے لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہوئے کیوں کہ ان کی روایات تمثیل میں تکلف و تصنع کا رنگ بہت نمایاں تھا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ رومن قوم میں جذبات لطیف مفقود تھے اور ان کا میلان صرف جنسی اور فاتحانہ خواہشات تک محدود تھا اسی لئے۔ ان کے نقطہ نظر سے نیرون بہت بڑا شخص (ڈرامانگار) تھا جو اپنے قصوں میں بربریت اور وحشت کے شرمناک واقعات کو نہایت خوبی سے ادا کرتا تھا۔

ڈراما اور دیگر ممالک

سوفیکلس اور اربیڈس کے بعد مغربی دنیا کے دوسرے متمدن ممالک نے تراجدیا کے اصلی ذوق اور مقصد کو پہچانا اور ان میں بڑے بڑے شعرا و ارباب قلم پیدا

ہوئے جنھوں نے عواطفِ انسانی اور جذبات بشری کے مطابق قصص وحکایات لکھے قرونِ آخرہ میں فرانس کے اندر کورنیل، راسین، والٹیئر کرنیلیوں، انگلستان میں شکپیر اسپین میں لوبرڈی اور کلڈرون اٹلی میں ٹرسین، ٹورے وغیرہ متعدد ادیب گذرے جن میں سے ہر ایک نے قصص وحکایات لکھے مگر سب کا اسلوب بلاغت اور طرز ایک دوسرے سے علاحدہ ہے۔

ڈراما متاخرین کے نزدیک

متاخرین نے تراجدیا (ٹریجڈی (Tragedy) کا موضوع صرف یہ قرار دیا کہ اس کے ذریعے سے حسیات شفقت کی تحریک پیدا ہو اور وہ اگر اس موضوع سے متجاوز ہوگا تو تراجدیا کی قسم سے خارج ہو جائے گا۔ تراجدیا کے لئے ایک شرط یہ بھی مقرر کی کہ اس میں صرف پانچ فصلیں ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی ڈراما نگار پانچ سے زیادہ فصلیں نہیں لکھتا۔ ڈراما کی ہر فصل میں چند حصے ہوتے ہیں جنھیں مشاہد SCENES کہتے ہیں۔ ان حصوں میں مخصوص افراد کا مکالمہ ہوتا ہے اور یہ صورت اس لئے اختیار کی جاتی ہے کہ واقعات کی ترتیب اچھی طرح ذہن سامع میں آجائے۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اول سے آخر تک ایک ہی واقعہ بیان کیا جائے تاکہ حسن ترتیب فوت نہ ہو۔ واقعہ کی زمانی ومکانی رعایت بھی ضروری قرار دی گئی تاکہ سلسلہ حوادث غیر منقطع طریقہ پر ذہن سامع میں مرتسم ہوتا جائے۔

ڈراما نگاری کے لوازم

ڈراما کے موضوع میں متانت اور سنجیدگی ضروری ہے اور موضوع کے موثر بنانے کے لیے مشاہد Sceners کا طبعی ترتیب کے مطابق ہونا اور ایکٹروں کا فن نقل وتقلید میں پوری طرح ماہر ہونا بھی ازبس ضروری ہے۔ ڈراما کو سب سے زیادہ دل چسپ بنانے والی چیز یہ ہے کہ واقعات اس طرح بیان کئے جائیں کہ ہر واقعہ سننے اور دیکھنے کے بعد آئندہ واقعہ کی طرف شدید اشتیاق پیدا کر دے اور اس کی صورت صرف یہ ہے کہ ترتیب حوادثات اور فاصلہ واقعات اس طرح ہو کہ ہر واقعہ آئندہ کے ساتھ شدید ارتباط وتعلق رکھتا ہو اور رافت وشفقت کا سلسلہ بھی ہر واقعہ میں پایا جائے یہاں تک کہ آخری فصل میں موت یا قتل پر قصہ ختم کر دیا جائے تاکہ اس کا اثر طبائع پر تا دیر باقی رہے۔

کمیڈی

کومڈیا وہ تمثیل ہے جس میں مضحکہ خیز واقعات اور حوادث بیان کئے جائیں لیکن کومڈیا کے مصنف کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنی تالیف میں کسی مفید غایت اور عبرت خیز نتیجہ کا لحاظ رکھے اور جن افراد کی تمثیل ڈراما میں کی جاتی ہے انکے اخلاق وعادات کی پوری تصویر سامنے آجائے۔ چونکہ کومڈیا کا مقصود مختلف قوموں کے اخلاق وعادات کی تمثیل پیش کرتا ہے اس لئے ہر قوم اور ہر زمانہ کا کومڈیا دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ انگریز کی نظر امور مادیہ کی طرف زیادہ رہتی ہے اور وہ ذاتیات یا شخصی صفات پر زیادہ ناز کرتا ہے۔ اٹلی والے اپنے اجداد کی جامد اور غیر متحرک طبائع کی تقلید کرتے ہیں اور فرانس کی نظر چونکہ اغراض ذاتی کی طرف نہیں ہے اس وجہ سے ان کے ڈرامے زیادہ لطیف زیادہ موثر اور زیادہ مفید ہوتے ہیں فرانس کا سب سے زیادہ مشہور کومڈیا نگار شاعر مولیار تھا۔

اوپیرایا اوپیرا کومک

کومڈیا کی ایک قسم اوپیرایا "اوپیرا کومیک" ہے یہ اصل میں ایک قصہ ہوتا ہے جس کی بنیاد مسرت بخش اور طرب انگیز واقعات ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ رقص وسرود بھی شامل ہوتا ہے اور قصہ کی لطافت بڑھانے کے لئے جا بجا اشعار سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ چنانچہ پندرہویں صدی عیسوی سے اٹلی میں اسکا رواج چلا آرہا ہے اور اٹلی کے رہنے والے خوشگوار موسم میں شراب پی کر کومیک کا لطف اٹھاتے ہیں۔ فرانس میں بھی اوپیرا یا کومیک اٹلی ہی سے آیا ہے۔ سترہویں صدی میں ایک اوپیرا فرانس میں قائم کیا گیا جس میں شاعر کونیل کی منظومات خاص دلچسپی سے پڑھی جاتی تھیں۔ اس کے بعد مولیار اور کینول کا زمانہ آیا۔
انگلستان میں ملٹن نے اطالوی طرز پر اس فن کو رواج دیا لیکن انگلستان سویڈن اور اسپین میں سترھویں صدی کے بعد اس فن کی تکمیل ہوئی۔ تمام ممالک کے مقابلہ میں اٹلی جرمنی اور فرانس کی موسیقی زیادہ مکمل ثابت ہوئی۔ بعد میں شعراء نے کومڈیا میں اس قدر تصنع سے کام کیا کہ اسے کومڈیا تراجڈیا دونوں کا مجموعہ بنادیا۔

کومڈیا کی ایک قسم فارسا (FARSA) بھی ہے۔ یہ ایک ادنی قسم کا کومڈیا ہے جس سے مقصود لوگوں کو صرف ہنسانا ہوتا ہے چونکہ اس میں ہزلیات اور مضحکات زیادہ ہوتے ہیں اس لئے عوام میں زیادہ مقبول ہے۔ اٹلی اسپین اور فرانس ڈراموں میں اس کا رواج کثرت سے ہے اور شکسپیر نے بھی اس میں حصہ لیا ہے۔ مولیار نے بھی اس قسم کے چند قصے لکھے ہیں لیکن اس نے طبعی حدود سے تجاوز نہیں کیا۔

کمیڈی اور یونان

کومڈیا کی شہرت یونان میں بمقابلہ ٹراجیڈیا کے بہت ہوئی کیونکہ یونانی طبائع میں وقار و سنجیدگی کا پہلو غالب تھا اور وہ ہزلیات کو پسند نہ کرتے تھے۔ بعد کو اس میں اس قدر احتیاط کی گئی کہ قانونی طور پر کومڈیا تصنیف کرنے کی ممانعت کردی گئی لیکن بعد میں رفتہ رفتہ اس نے بھی ترقی کی اور اس کے ذریعہ سے ارباب حکومت، امراء اور دوسرے طبقات کے افراد کے اخلاق وعادات کی تمثیل ہونے لگی اس میں سب سے زیادہ حصہ ارسٹو فانس نے لیا۔ عورتیں کومڈیا میں شریک نہیں ہوتی تھیں کیونکہ شریف طبیعت افراد اس سے نفرت کرتے تھے اور یونانیوں کا علو نفس اس کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ عورتوں کا ذکر ایسی مجالس میں آئے۔

اسٹیج کی تعمیر

ابتداء میں اہل یونان کے ملاعب یا تھیٹر کی عمارت لکڑی کی ہوتی تھی اس کے لئے سب سے پہلے پختہ عمارت یونان میں تمسکلیس نے بنائی اس کے بعد اور بہت سے ملاعب تعمیر کئے گئے۔

یونانی ملاعب تھیٹر میدان میں بہت کم ہوتے تھے بلکہ زیادہ تر پہاڑ کے دامن میں بنائے جاتے تھے تاکہ دیکھنے والوں کو آسانی ہو۔ اس کا منظر شمال کی طرف رکھتے تھے تاکہ دیکھنے والوں کے منہ پر شعاعیں نہ پڑیں۔ عمارت کے دو حصے ہوتے تھے۔ ایک حصے میں دیکھنے والے بیٹھتے تھے اور دوسرے میں ایکٹر حرکات تمثیلی کرتے تھے۔ تماشائیوں کی نشستگاہ نصف دائرے کی صورت میں ہوتی تھی اور اس میں سیڑھیاں بنی رہتی تھیں تاکہ آگے والا شخص پیچھے والے کی نظر میں حائل نہ ہو۔ جو سیڑھیاں سب سے بلند ہوتی تھیں وہاں عام لوگ پھر ان کے نیچے درجہ بدرجہ خواص کی نشستیں ہوتی تھیں جن میں حکام، قضاۃ اور امراء سب شامل تھے۔

روم کے تھیٹروں میں یہ ترتیب نہ تھی بلکہ مرد عورت امیر غریب جسے جہاں موقعہ ملتا تھا بیٹھ جاتا تھا۔ قیصر اگسٹس کے زمانہ میں البتہ روم کے تھیٹروں میں بھی نشستگاہیں مخصوص اور بالترتیب کردی گئی تھیں۔ یونانی اور رومن تماشہ گاہوں میں عورتوں اور غلاموں کے لئے مخصوص جگہیں ہوتی تھیں جو اسٹیج سے دور ہوتی تھیں۔ اس کے قریب ہی گانے والوں کی نشست ہوتی تھی جہاں کسی دوسرے کو بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ اسٹیج کی آرائش کے لئے خوبصورت تصویریں اور تاریخی واقعات کے نقشے بھی استعمال ہوتے تھے اسٹیج کے پیچھے وہ جگہ ہوتی تھی جہاں ایکٹر لباس بدلتے تھے۔

رومیوں اور یونانیوں کے نزدیک عبادت گاہوں کے بعد تھیٹروں کا ہی مرتبہ ہوتا تھا۔ یونان میں متعدد تھیٹروں کے آثار پائے گئے ہیں۔ اسپارٹا کا تھیٹر سب سے زیادہ خوبصورت تھا اور سنگ مرمر کا بنا ہوا تھا۔ ایتھنس کے تھیٹر کے آثار میں زہرا (میلو) کا مجسمہ نکلا ہے جو اس وقت پیرس کے عجائب خانہ میں محفوظ ہے ایشیائے کوچک اور صقلیہ میں بھی متعدد تھیٹروں کے آثار نکلے ہیں۔

روم میں بھی تھیٹروں کے آثار پائے جاتے ہیں۔ روم کا سب سے پہلا تھیٹر بنائے روم سے ۳۹۰ سال بعد تعمیر ہوا تھا۔ روم میں تھیٹروں کی عمارت لکڑی کی ہوتی تھی، جہاں لوگ کھڑے کھڑے تماشہ دیکھتے تھے۔ روم کا سب سے پہلا تھیٹر بنائے روم کے ۶۹۹ برس بعد بنا تھا۔ یہ عمارت اس قدر وسیع تھی کہ اس میں ۴۰ ہزار آدمی سما سکتے تھے اس کے قریب ایک دالان بنایا گیا تھا جس میں ایک سو ستون تھے جہاں بارش برستے وقت لوگ آکر پناہ لیتے تھے۔ اس کے علاوہ اور بہت سے تھیٹروں کے آثار زیر زمین پنہاں ہیں جن میں سے بعض دریافت کرلئے گئے ہیں اور بعض ہنوز زیر خاک پوشیدہ ہیں، فرانس، اٹلی اور اسپین میں بھی متعدد آثار ان کے موجود ہیں۔

جب یورپ میں مسیحیت کا غلبہ ہوا تو تھیٹر ختم ہوگئے کیونکہ مسیحی قدیم بت پرستوں کی رسوم سے سخت نفرت کرتے تھے۔ بعد کو جب علوم وفنون کی اشاعت ہوئی تو سب سے پہلے اٹلی میں قدیم طرز کا ایک تھیٹر بنایا گیا جس میں ۹ ہزار آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ (اب یہ عمارت منہدم ہوچکی ہے) پھر رفتہ رفتہ یورپ کے تمام شہروں میں متعدد تھیٹر قائم ہوئے اور اصلاحات ہوتے ہوتے موجودہ صورت ہوگئی۔

ہندوستان میں ڈرامہ

ہندستان میں سنسکرت ڈرامہ کی تاریخ بھی بڑی قدیم ہے ہندستان کی "مائیتھالوجی" کی ایک روایت کے مطابق تو ڈرامہ برہما جی کی دین ہے۔ کہتے ہیں کہ دیوتاؤں نے زندگی کی یکسانیت اور بے کیفی کم کرنے کے لئے، خالق کائنات 'برہما جی' سے درخواست کی کہ ان کی دلچسپی اور تفریح کے لئے ایک نیا وید ترتیب دیں۔ برہما نے اس درخواست کو شرف قبولیت بخشتے ہوئے چاروں ویدوں سے راگ، نغمہ، جذبات اور نقالی اخذ کرکے ایک نیا وید ترتیب دیا۔ یہ نیا وید جب تیار ہوکر سامنے آیا تو شیوجی اور پاروتی جی نے اپنا رقص اور

(باقی صفحہ ۱۹۳ پر)

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب

اودھ کے تفریحی مشغلوں میں ڈرامائی عناصر

سید مسعود حسن رضوی ادیب اُردو تحقیق کے چار ستونوں میں سے ایک ہیں۔ اودھ کی تہذیب پر ان کی گہری نظر کا زمانہ قائل تھا۔ 'مقدمۂ شعر و شاعری' میں غزل پر جو اعتراضات تھے' ان کا سنجیدگی اور متانت سے انھوں نے 'ہماری شاعری' میں دفاع کیا۔ لائق باپ کے لائق فرزند کی اصطلاح محترم پروفیسر نیّر مسعود (صدر شعبۂ فارسی) پر صادق آتی ہے۔

ایڈیٹر

آج سے صدیوں پہلے ڈرامے نے ہندوستان میں جتنی ترقی کی تھی اتنا ہی اس کو تنزل بھی ہوا۔ یہاں تک کہ اب سے ڈیڑھ دو سو برس پہلے ڈراما اپنا وقار بالکل کھو چکا تھا اور ایکٹنگ کا فن بالکل ذلیل سمجھا جانے لگا تھا۔ راجاؤں اور بادشاہوں کا کیا ذکر، سماج کے اونچے طبقوں میں سے کسی کو بھی ڈرامے کی طرف کوئی توجہ نہیں رہتی تھی۔ البتہ عوام کی مذہبی عقیدت کی بدولت چند مذہبی ناٹک باقی رہ گئے تھے، جن میں سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ مقبول وہ ناٹک تھے جن کے ذریعہ سے راجا رام چندر جی اور شری کرشن مہاراج کی زندگی کے بعض واقعات اسٹیج پر پیش کئے جاتے تھے اور جو رام لیلا اور کرشن لیلا کے نام سے موسوم تھے۔ ان کے لئے کہیں کوئی مخصوص عمارت نہ تھی، کوئی باقاعدہ اسٹیج نہ تھا۔ یہ کھلے میدانوں میں، سڑکوں پر، بازاروں میں دکھائے جاتے تھے۔

رام لیلا کے لئے سال میں چند دن مخصوص تھے، جن میں وہ ایک سالانہ یادگار کے طور پر جگہ جگہ دکھائی جاتی تھی۔ اس ناٹک میں مشاق اور پیشہ ور ایکٹر کام نہیں کرتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے رام، لچھمن اور سیتا کی شبیہیں بنائے جاتے تھے اور یہ ایک ثواب کا کام سمجھا جاتا تھا یعنی رام لیلا کو صرف مذہبی حیثیت حاصل تھی، ڈرامے کی حیثیت سے اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور آج بھی یہی حالت ہے۔

کرشن لیلا کی حالت کسی قدر مختلف تھی۔ اس کے لئے کوئی زمانہ مقرر نہ تھا۔ وہ بالعموم ان میلوں میں دکھائی جاتی تھی جو سال کے مختلف حصوں میں ہوتے رہتے ہیں؛ کرشن لیلا "رہس" کے نام سے مشہور ہو گئی تھی اور اس کو کھیلنے والے "رہس دھاری" کہلاتے تھے۔ رہس دھاریوں کی باقاعدہ منڈلیاں یعنی جتھے یا گروہ تھے۔ میلوں کے علاوہ بھی یہ منڈلیاں لوگوں کے یہاں اجرت پر رہس کھیلنے جایا کرتی تھیں۔ ان منڈلیوں میں ایکٹنگ کی کچھ بری بھلی تعلیم بھی ہوتی تھی مگر استاد خود بھی اس فن سے بخوبی واقف نہ ہوتے تھے تو ان کے شاگردوں سے کیا توقع کی جا سکتی تھی۔ رہس منڈلیوں میں کام کرنے والے ادنیٰ درجے کے اَن پڑھ لڑکے اور ان کے استاد بھی بالعموم جاہل ہوتے تھے۔ غرض کہ رہس کی ڈرامائی حیثیت رام لیلا سے کچھ بہتر ہونے کے باوجود بہت پست تھی۔

دنیا کی ہر چیز بدلتی رہتی ہے مگر مذہبی عقیدت میں تبدیلی بہت مشکل سے اور بہت دیر میں ہوتی ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جب اور سب طرح کے ناٹک فنا ہو گئے، اس وقت بھی ان مذہبی ناٹکوں کا وجود باقی رہا لیکن مذہبی عقیدت بھی ایک ہی چیز کی تکرار سے آخر کار اکتا ہی جاتی ہے۔ اس لئے رہس منڈلیوں نے یہ طریقہ نکالا کہ شروع میں کرشن کی لیلاؤں میں سے کوئی لیلا مثلاً متھیا رن لیلا، ڈاڑھی لیلا، کالی ناگ لیلا، ماکھن چوری، کنس مردن، چیر ہرن وغیرہ دکھا کر گویا رسم پوری کر دی۔ اور اس کے بعد مشہور اور عام پسند قصوں میں سے کوئی مذہبی یا غیر مذہبی قصہ کھیلا مثلاً ہرِیش چندر، مور دھوج، پرہلاد، دھرو، دیارام گوجر یا سیاہ پوش کا قصہ یا آلھا اودل کی کوئی داستان۔ ایک مدح کا عام پسند ناٹک اور تھا۔ جس میں جاندار انسان نہیں بلکہ کاٹھ کی بے جان پتلیاں کام کرتی تھیں اور جو کٹھ پتلی کا تماشا کہلاتا تھا۔ یہ تماشا کرنے والے بالعموم خانہ بدوش

لوگ ہوتے تھے جو شہر شہر بلکہ گاؤں گاؤں پھرا کرتے۔ یہ سب کھیل ادنیٰ درجے کے ساز و سامان کے ساتھ بہت معمولی طور پر دکھائے جاتے تھے اور صرف نیچے طبقے کے ان پڑھ لوگوں کے لئے تفریح کا سامان بہم پہنچاتے تھے۔ جن لوگوں کا مذاق بلند تھا ان کی دلچسپی کا کوئی ذریعہ باقاعدہ ڈرامے کی شکل میں موجود نہ تھا مگر اونچے طبقوں کے تفریحی مشغلوں میں تین چیزیں ایسی تھیں جن میں ڈرامائی عنصر پائے جاتے تھے۔ (۱) قصہ خوانی یا داستان گوئی (۲) بھانڈوں کی نقلیں (۳) بہروپیوں کے روپ۔

قصہ خواں اپنی پوشاک میں کوئی تبدیلی نہیں کرتے تھے، چہرے پر کسی طرح کا پینٹ نہیں لگاتے تھے مگر آواز کے اتار چڑھاؤ، لہجے کی تبدیلی، چہرے کے تغیر، آنکھوں کی گردش اور جسم کی حرکتوں سے مختلف نفسیاتی حالتوں کی تصویر کھینچ دیتے تھے اور مختلف طبقوں کے لوگوں کی تمثیل پیش کر دیتے تھے۔ قصہ خوانی کا فن ہندوستان میں ایران سے آیا تھا۔ اچھے اچھے قابل ادیب اور بلند پایہ شاعر اس فن میں مہارت پیدا کرتے تھے اور بادشاہوں اور امیروں کو خوش کر کے انعام و اکرام حاصل کرتے تھے۔ بعض نیچے درجے کے قصہ خواں میلوں اور بازاروں میں بھی اپنے فن کی نمائش کرتے تھے۔ شمس العلماء آزاد دہلوی نے ایسے ہی قصہ خوانوں کے بارے میں لکھا ہے :-

"ایران کے بازاروں میں اور اکثر قہوہ خانوں میں ایک شخص نظر آئے گا کہ سرو قد کھڑا داستان کہہ رہا ہے اور لوگوں کا انبوہ اپنے ذوق و شوق میں مست اسے گھیرے ہوئے ہے۔ وہ ہر مطلب کو نہایت فصاحت کے ساتھ نظم و نثر سے مرصع کرتا ہے اور صورتِ ماجرا کو اس تاثیر سے ادا کرتا ہے کہ سماں باندھ دیتا ہے۔ کبھی ہتھیار بھی لگائے ہوتا ہے۔ جنگ کے معرکے یا غصے کے موقع پر شیر کی طرح بپھر جاتا ہے، خوشی کی جگہ اس طرح گاتا ہے کہ سننے والے وجد کرتے ہیں، غرضکہ غیض و غضب، عیش و طرب، غم و الم کی تصویر اپنے کلام ہی سے نہیں کھینچتا بلکہ خود اس کی تصویر بن جاتا ہے۔ اسے درحقیقت بڑا صاحب کمال سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ اکیلا آدمی ان مختلف کاموں کو پورا پورا ادا کرتا ہے جو کہ تھیٹر میں ایک سنگت کر سکتی ہے ایسے مشلوں کو قصہ خواں کہتے ہیں۔" (سخندانِ فارس ص۱۵)

ہندوستان میں قصہ خواں بعد کو داستان گو کہلانے لگے تھے۔ مولوی علی حیدر نظم طباطبائیؒ ایک مرتبہ میرزا ذاکر حسینؒ یاس کے ساتھ لکھنؤ کے مشہور داستان گو حکیم میر اصغر علیؒ کے یہاں ان کی داستان سننے گئے۔ اس کا مختصر ذکر انھیں کی زبان سے سنئے :-

"حکیم صاحب نے داستان شروع کر دی ......
راویان اخبار و ناقلانِ آثار' کے الحان سے محفل گوش برآواز ہو گئی۔ یہیے! پریوں کا تخت اترا عیش و عشرت کے دور کی تصویر کھینچنے لگی۔

جامِ زمردیں کا ہے دور انجمن میں
طاؤس ناچتا ہے جس طرح سے چمن میں

دوڑ ساقی کہ مجھے لغزشِ مستانہ ہے
پاؤں قابو میں نہیں ہاتھ میں پیمانہ ہے

اس کے بعد ہی ایک شاہزادہ فقیروں کا بھیس بدلے سر بصحرا نظر آیا۔ سنسان بیابان نہ آدمی نہ آدم زاد۔ بوئے عمرانات سے دور۔ ریگ تپ رہی ہے۔ خاک اڑ رہی ہے۔ لو چل رہی ہے۔ دانہ زمین پر گرتا ہے تو بھن جاتا ہے۔ شاہزادہ ان مصیبتوں کو جھیلتا ہوا اپنی دھن میں چلا جاتا ہے۔ دھوپ اس طرح آنکھیں نکالے ہوئے ہے جس میں ہرن کالے ہوتے ہیں۔ غنیمت یہ ہوا کہ پہاڑ کا ایک درّہ سامنے آیا جیسے آفتاب میں سایہ۔ سایہ کیسا منزلوں ظلمات بے آبِ حیات۔ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا۔ کئی دن اس تاریک گھر میں اس نے گزار دیئے۔ آخر اکتا گیا۔ دل الجھنے لگا، دم گھٹنے لگا۔ جینے سے یاس ہو گئی۔ سمجھا کہ بس یہی درّہ اس کا مقبرہ ہے۔ ایک دن چلتے چلتے معلوم ہوا جگنو سا چمک گیا اور پھر نظر سے اوجھل ہو گیا۔ اب اس نے آگے بڑھ کر، آنکھیں مل کر، نظر جما کر جو دیکھا تو جگنو نہیں، یہ تو کوئی تارا طلوع کر رہا ہے۔ چلو ایک سیدھ تو مل گئی۔ یہ اسی رخ پر چلا۔ جوں جوں آگے بڑھتا ہے ستارا بڑا ہوتا جاتا ہے۔ گمان یہ ہوا کہ تارہ نہیں، یہ تو آفتاب

نکل رہا ہے۔ اور آگے بڑھا تو حال کھلا کہ آفتاب نہیں دریے کا دوسرا نکاس ہے۔

(سبحان اللہ حکیم صاحب سحر بیانی اس کو کہتے ہیں۔ یہ مضمون وجد کرنے کے قابل ہے، کیا تخیل ہے، کیا حسن بیان، آفریں صد آفریں)۔

"اب حکیم صاحب رزم کے میدان میں اتر آئے۔ مہیب آوازے وہ نعرے کئے کہ .... پھر رجز تو اس طرح ڈانٹ کر پڑھا کہ .... اس داستان کی ایک تخیل اور مجھے یاد آگئی۔ لڑائی میں تیروں کا مینھ اس قدر برسا تھا کہ زمین کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔"

داستان گوئی کے فن نے لکھنؤ میں بہت ترقی کی۔ میں نے اپنے لڑکپن میں یہاں داستان کہنے اور سننے کا شوق بہت عام پایا۔ لیکن اس وقت بھی کوئی ایسا داستان گو موجود نہ تھا جو فی البدیہہ داستان کہتا ہو یا اپنی تصنیف کی ہوئی داستان بیان کرتا ہو۔ آخری باکمال داستان گو، جن پر اس فن کا خاتمہ ہو گیا، دہلی کے میر باقر علی مرحوم تھے۔ خوش قسمتی سے میں نے ایک مرتبہ ان کو فرنگی محل لکھنؤ میں داستان کہتے سنا۔ خداوند لقا کے دربار میں خواجہ عمرو کی ایک عیاری انھوں نے اس طرح بیان کی اور لہجے کی تبدیلیوں اور اعضا کی جنبشوں سے یوں کام لیا کہ ساری محفل ہنسی کے مارے لوٹ لوٹ گئی۔ ان کی زبان کی پاکیزگی اور بیان کی دلکشی تعریف سے مستغنی ہے۔ صرف دو چار فقرے یاد رہ گئے ہیں، سنیے۔ "مینھ برس کر کھل گیا۔ چھتوں کا پانی ماہی پشت کا جال بناتا ہوا پرنالوں سے بہہ رہا ہے" "رات کا وقت ہے۔ بادل چھنٹ چکے ہیں۔ مطلع صاف ہو گیا ہے۔ وہ نیلا آسمان، چھلکے چھلکے تارے، دھلی دھلی چاندنی، کیسا سہانا سماں ہے۔" اب اس فن کا کوئی ماہر شاید ہندوستان میں کہیں باقی نہیں ہے۔

بھانڈوں کی نقلیں چھوٹے چھوٹے ہنسانے والے ڈرامے ہوتے ہیں جن کو انگریزی میں فارس (FARCE) اور ہندی میں پرہسن (प्रहसन) کہتے ہیں۔ اکثر نقلوں کی صرف ایک یا دو تین ڈرامائی سین ہوتے ہیں۔ لکھنؤ میں میلوں میں، بازاروں میں، جشنوں میں اور خوشی کی تمام تقریبوں میں بھانڈ ضرور ہوتے تھے جو اپنی مضحک نقلوں سے حاضرین کا دل خوش کرتے تھے۔ بھانڈوں کا یہ قول مشہور ہے کہ "محفل ویران جہاں بھانڈ نہ باشد" شاہی محفلیں بھی بھانڈوں سے خالی نہ ہوتی تھیں۔ اکتوبر ۱۸۲۳ء میں جنرل ہیجٹ لکھنؤ آئے۔ اودھ کے بادشاہ غازی الدین حیدر کے یہاں ان کی دعوت ہوئی اس وقت تفریح کے جو سامان مہیا کئے گئے ان میں بھانڈ بھی تھے۔ "یہ نقل ہائے عجائب و غرائب نقالان عشرت پرواز، لب ہائے تماشائیاں بہ خندہ باز" اسی بادشاہ نے دسمبر ۱۸۲۵ء میں نورا بھانڈ کو کمخواب کی ایک چکن عنایت کی۔ جولائی ۱۸۳۷ء میں نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کے انتقال کے بعد فریدون بخت میرزا منا جان تخت نشین ہوئے تو "جو حاضر تھے ان کی نذریں گزریں، باقی صبح پر موقوف رہیں۔ اللہ والے، نورا بھانڈ کا بیٹا ناچنے لگا۔ ہر ایک محو تماشا ہوا۔" محمد علی شاہ بادشاہ اودھ جب حسین آباد کی عمارتیں بنوا چکے تو جلوخانے کے سامنے والے میدان میں روز سہ پہر کو بازار لگنے لگی۔ اس میں "ایک جا قصہ خواں ہمزہ و اَمَر (کذا) کی داستان، نقال (بھانڈ) جدا نیفہ کھولنے مسخراپن کرتے ہیں۔ ہر ایک پیٹ کے واسطے ظاہر اپنا فن کرتے ہیں۔"

بھانڈ تھوڑا بہت ناچ گانا بھی سیکھ لیتے تھے مگر ان کا اصل کام نقالی تھا۔ وہ عوام کو خوش کرنے کے لئے بیہودہ بلکہ فحش نقلیں بھی کرتے تھے۔ لیکن بیشتر پڑھے لکھے ہوتے تھے اور پاک و صاف زندگی بسر کرتے تھے۔ واجد علی شاہ اس فرقے کے متعلق لکھتے ہیں:-

"..... وہ فرقہ بھانڈ اور نقال مشہور ہوا۔ ہر چند اس فرقے کو سوائے نقل کو اصل کر کے دکھانے کے لے سُر میں مطلق تمیز نہیں ہوتی مگر البتہ جو کام ان کا ہے یعنی نقل نمائی وہ انھیں پر ختم ہے اور اس فرقے کو راقم نے بہ چشم خود دیکھا ہے کہ ایسے پابند صوم و صلوٰۃ ہوتے ہیں کہ سبحان اللہ ہزار روپے کی تھیلی سامنے دھر دو اور فرمائش کرو کہ نماز فوت ہونے دو، اگر نقل کے بجاؤ گے ہزار روپیہ یہ تمہارا ہے۔ کبھی قبول نہ کریں گے، پر نماز وقت پر بجا لائیں گے۔"

بھانڈ جہاں عوام کو ہنسانے کے لیے ادنیٰ درجے کی ظرافت سے کام لیتے تھے۔ وہاں اہل علم کی محفلوں میں ایسی نقلیں بھی کرتے تھے جن کے لیے کافی علمی استعداد کی ضرورت ہوتی تھی۔ مثلاً اس طرح کی دو نقلیں یہاں لکھی جاتی ہیں۔ ایک نقل کو خوب سمجھنے کے لیے دو باتوں کا ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ بانی محفل کتنے ہی بڑے مرتبے کا آدمی کیوں نہ ہو،

اگر اس میں کوئی کمزوری موجود ہے یا محفل کے انتظام میں کوئی کمی رہ گئی ہے تو بھانڈ ان چیزوں کو اپنی نقلوں کا موضوع ضرور بناتے تھے۔ دوسری یہ کہ اگلے زمانے میں بڑے سے بڑے درجے کے ذی علم لوگ کچھ طالب علموں کو درس دیتے تھے، مگر اس کا کوئی معاوضہ نہ لیتے تھے۔ ان دونوں باتوں کو نظر میں رکھئے اور بھانڈوں کی ایک نقل سنیئے۔

فرنگی محل لکھنؤ کے ایک عالم، اودھ کی شاہی زمانے میں کسی بہت بڑے عہدے پر فائز تھے۔ وہ عربی کی ایک بہت بلند پایہ اور مشکل کتاب کا درس دینے میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے، بلکہ فی سبق ایک اشرفی لیتے تھے۔ اسلئے صرف امرا کے لڑکے ان کی تعلیم سے مستفید ہو سکتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کے یا ان کے کسی عزیز کے یہاں کوئی تقریب ہوئی اور بھانڈ بلائے گئے۔ انھوں نے پہلی ہی نقل کی کہ مسند بچھائی گئی، گاؤ تکیہ لگایا گیا اور ایک بھانڈ انھیں عالم صاحب کی وضع قطع بنا کر آیا اور مسند پر گاؤ سے لگ کر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر کے بعد ایک نوجوان طالب علم بغل میں ایک کتاب دبائے حاضر ہوا اور ان مصنوعی عالم کو سلام کر کے سامنے مودب بیٹھ گیا۔ عالم صاحب نے آنے کا سبب پوچھا۔ اس نے عرض کیا کہ میں فلاں کتاب پڑھنا چاہتا ہوں۔ اگر حضور اپنے فیض تعلیم سے مستفیض فرمائیں تو میں تمام عمر حضور کا احسان مند رہوں گا۔ عالم صاحب نے پر غرور انداز میں فرمایا کہ یہ ہو تو سکتا ہے مگر تم کو فی سبق دو اشرفیاں دینا ہوں گی۔ طالب علم کو یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی اور بولا حضور نے یہ کیا فرمایا۔ بھلا کوئی بڑا آدمی پڑھانے کی اجرت لیتا ہے۔ عالم صاحب نے کہا کیوں نہیں آخر مولوی فلاں صاحب لیتے ہیں کہ نہیں؟ طالب علم بولا جی ہاں وہ ایک دنیا سے زالی بات کرتے ہیں مگر وہ بھی فی سبق ایک اشرفی لیتے ہیں اور آپ نے فی سبق دو اشرفی معاوضہ قرار دیا ہے۔ عالم صاحب نے فرمایا کہ بھئی میرا ایک سبق ان کے دو سبقوں کے برابر ہوتا ہے۔ اس لئے میں ان سے دونا معاوضہ بھی لیتا ہوں خیر اسی طرح بھاؤ تاؤ ہونے کے بعد معاملہ طے ہو گیا۔ طالب علم نے دو اشرفیاں نذر کر کے کتاب کھولی اور مشکل مقام نکال کر پڑھنا شروع کیا۔ عالم صاحب نے اس کے مطالب بیان کرنے میں ایسی ایسی موشگافیاں کیں اور ایسے ایسے علمی نکات بیان کئے کہ سب اہل علم حیرت آمیز دلچسپی سے یہ درس و تدریس کا منظر دیکھنے میں محو ہو گئے۔ اور وہ اصلی عالم اپنا لب و لہجہ اور اپنے الفاظ و فقرات سنتے سنتے اس قدر متعجب ہوئے کہ آخر ضبط نہ کر سکے۔ اٹھ کر نقلی عالم کے پاس آئے اور پوچھا کہ تو نے یہ کتاب کس سے پڑھی اور تجھ کو اس کا پڑھانا کہاں سے آ گیا۔ وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور عرض کیا کہ فلاں زمانے میں ایک نواب زادہ حضور سے پڑھنے آیا کرتا تھا۔ وہ یہی خادم تھا۔ بھلا حضور ایک بھانڈ کے لڑکے کو کیا پڑھاتے اس لئے مجبوراً غلام کو نواب زادہ بننا پڑا۔

اب دوسری نقل بیان کرنے سے پہلے یہ تمہید سن لیجئے کہ میر محمد باقر داماد ایران میں ایک بہت بڑے عالم اور فلسفی گزرے ہیں۔ ان کی کتاب افق المبین فلسفے کے نہایت دقیق مسائل پر مشتمل ہے اور اس کے مطالب کا سمجھنا بڑے بڑے فاضلوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس تمہید کے بعد نقل سنئے۔

ایک محفل میں اہل علم کا مجمع تھا۔ بھانڈوں نے یہ نقل کی کہ ایک شخص میر باقر داماد بن گیا اور مر گیا۔ جنازہ قبر میں اتارا گیا۔ منکر نکیر آئے اور حسب معمول سوال کیا "من ربک" یعنی تیرا رب کون ہے۔ میت نے جواب دیا "ہو الاسطقس فوق الاسطقسات" یعنی وہ ایک عنصر ہے تمام عناصر سے بالاتر اس جواب کا مطلب فرشتوں کی سمجھ میں نہیں آیا۔ فرشتوں نے ایک دوسرے کا منہ دیکھا اور پھر وہی سوال کیا۔ میت نے پھر وہی جواب دیا۔ فرشتوں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ خیال ہوا کہ شاید یہ ہمارا سوال نہیں سمجھتا۔ تین مرتبہ بہت آہستگی میں کہا کہ حضرت ہمارے سوال کو سمجھ کر اس کا جواب دیجئے۔ ہم پوچھتے ہیں "من ربک" میت نے کہا کہ اسی سوال کا تو ہم جواب دیتے ہیں کہ "ہو الاسطقس فوق الاسطقسات۔" فرشتوں نے کہا کہ حضرت یہ بات تو ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ ذرا آسان لفظوں میں کہئے۔ میت نے کہا کہ اس سے زیادہ آسان الفاظ اور کیا ہوں گے۔ اب فرشتوں نے عاجز آ کر یہ طے کیا کہ چلو اللہ میاں کے پاس چل کر یہ مشکل آسان کریں۔ ایک بھانڈ فوراً اللہ میاں بن گیا۔ منکر نکیر آئے اور اللہ میاں سے عرض کیا کہ جب سے دنیا قائم ہوئی ہے۔ ہم بیشمار قبروں میں جا کر یہ سوال پوچھ چکے ہیں کہ "من ربک" اور اس کے جتنے جواب دیئے گئے ہیں وہ سب ہماری سمجھ میں آ گئے۔ آج ایک ایسے شخص سے سابقہ پڑ گیا ہے جس کا جواب کسی طرح ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ اللہ میاں نے کہا کہ ذرا وہ جواب میں بھی تو سنوں۔ فرشتوں نے کہا وہ کہتا ہے "ہو الاسطقس فوق الاسطقسات" اللہ میاں بولے آہاہ معلوم ہوتا ہے تم میر باقر داماد کی قبر میں چلے گئے۔ "او در افق المبین چیز ہا نوشتہ کہ من ہم نہ فہمیدم" یہ سن کر

ساری محفل بے اختیار ہنسنے لگی۔

بہروپیے طرح طرح کے روپ بھر کے نقل کو اصل کر دکھانے میں بڑا کمال رکھتے تھے۔ یہ فن بھی ہندوستان میں بہت مدت سے چلا آرہا ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے شہنشاہ ہمایوں کے عہد کا ایک آنکھوں دیکھا واقعہ یوں بیان کیا ہے۔ ۹۰۵ھ میں ایک دن مشہور ایرانی شاعر حیدر تونی کا بیٹا ابن حیدر، جو بڑا اڈر پوک تھا، ہمایوں کے دربار میں حاضر تھا، اور جہاز پر بیٹھنے سے جتنا خوف اس کو معلوم ہوا تھا اس کی کیفیت بیان کر رہا تھا۔ اس وقت بھی خوف کے آثار اس پر طاری تھے۔ میں نے پوچھا کہ تم تو شاید حج کے لیے سفر کر کے پچھتائے ہو گے۔ وہ بولا ہاں۔ بادشاہ نے فرمایا یہ کعبے کے سفر سے کیا پشیمان ہوئے ہوں گے، ہاں جہاز پر بیٹھ کو پچھتائے ہوں گے۔ اسی اثنا میں بادشاہ کے اشارے سے "معتقد شیریں کار" میتھے خاں ایسے شخص کی صورت بنا کے جو کتے کے کاٹنے سے پاگل ہو گیا ہو، کتے کی طرح بھونکتا ہوا آیا اور ابن حیدر کو پکڑ کر کھینچ لیا۔ وہ اس طرح بدحواس ہو کر بھاگا کہ پگڑی کہیں گئی اور جوتا کہیں گیا آخر ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ سب لوگ بہت ہنسے۔ جب اس کو حقیقت حال معلوم ہوئی تو وہ بہت شرمندہ ہوا اور بادشاہ نے اس کو تسلی دی۔

اودھ کے آخری بادشاہ واجد علی شاہ نے اپنی ولی عہدی کے زمانے میں ایک بہروپیے کا ذکر یوں کیا ہے کہ ایک دن میرے چند مصاحب حاضر تھے اور دلچسپ حکایتوں اور رنگین لطیفوں سے میرا دل خوش کر رہے تھے۔ اس وقت میرا جی چاہا کہ ان کی وفاداری کا امتحان کروں۔ چنانچہ میرے ایما سے ایک ایک بہروپیا ایک زخمی آدمی کی صورت بن کر، جسم سے خون بہتا ہوا، ننگی تلوار ہاتھ میں لیے ہوئے زینے سے اترا اور مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے بھی بہت اضطراب ظاہر کیا۔ یہ دیکھ کر ایک مصاحب نے اٹھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور ایک نے جھپٹ کر اس کی کمر پکڑ لی اور چاہا کہ اسی کی تلوار سے اس کا کام تمام کر دیں۔ وہ فریاد کرنے لگا کہ میں بہروپیا ہوں۔ میں نے بھی ان لوگوں کو روکا۔ اس طرح اس کی جان بچی مگر چوٹ بہت آگئی۔ میں نے بہروپیے کو انعام دیکر نوکر رکھ لیا اور مصاحبوں کو پانچ پانچ سو روپے اور ایک ایک تلوار، ڈھال بندوق اور سات فیر کا تمنچہ مرحمت کر کے مصاحبان خاص اور جوانان پہرہ خطاب دیا اور اپنے پلنگ کے پہرے کی خدمت سپرد کر کے ان کو عزت بخشی۔

میں نے بہروپیوں کو طرح طرح کے روپ بھرتے دیکھا ہے مگر ایک باکمال بہروپیے کے تین روپ ذکر کے قابل ہیں۔ ایک سو برس کی پراتم بڑھیا کا روپ، چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی، گردن ہلتی ہوئی، ہاتھوں میں رعشہ، پیر لڑکھڑاتے ہوئے، آواز میں تھرتھری، ایک لٹھیا ٹیکتی چلی آرہی ہے۔ دوسرے ادھ انگی کا روپ۔ سر سے پیر تک آدھا جسم مرد کا آدھا عورت کا، ایک چادر اس انداز سے اوڑھے ہوئے کہ ایک ذرا سی جنبش میں وہ ایک طرف ہٹ گئی اور ایک خوبصورت عورت زنانی پوشاک پہنے ہوئے زیوروں سے آراستہ نظر کے سامنے آگئی۔ تیسرا نکٹے سپاہی کا روپ۔ اگلے زمانے کا ایک شمشیر باز ڈھال تلوار لگائے ممنمنی آواز سے بولتا ہوا ایک لڑائی کا حال بیان کر رہا ہے جس میں حریف کی تلوار نے اس کی ناک صاف کر دی تھی۔ معلوم نہیں اچھی بھلی ناک کو اس نے کیونکر غائب کر دیا۔

بعض بہروپیے جانوروں کا روپ بھرنے کی مشق کرتے تھے۔ ایک معتبر راوی نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ ایک رئیس کے یہاں چند آدمی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک بڑا سا لنگور دُم اٹھائے اچھلتا کودتا سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ سب لوگ ڈر کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ جب لنگور نے کھڑے ہو کر سلام کیا اور انعام مانگا تب یہ حقیقت کھلی کہ وہ بہروپیا تھا۔ سب لوگ اس کے کمال کے قائل ہو گئے۔ اور سب نے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اس کو انعام دیا۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے اونچے طبقوں کے تفریحی سامان میں داستان گوئی، نقالی اور بہروپ یہی تین چیزیں ایسی تھیں جن میں ڈرامائی عناصر کم و بیش پائے جاتے تھے۔ داستان گو زیادہ تر صرف لہجے کی تبدیلی سے اور کبھی کبھی جسم کی جنبش سے بھی کام لیتے تھے۔ زیادہ حرکت کرنا، اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا داستان گو کے فن سے باہر تھا۔ نقال سب طرح کی حرکتیں کرتے تھے۔ ان کا فن کسی واقعے کو بیان کرنا نہیں بلکہ اس کو کر کے دکھانا تھا۔ بہروپیوں کا کام صرف بھیس بدلنا تھا، کسی واقعے کو پیش کرنا نہ تھا۔ داستان گو نہ اپنے چہرے کو بدلتے تھے نہ لباس کو۔ نقال حسب ضرورت اپنے لباس میں تھوڑی سی تبدیلی کر لیتے تھے۔ اور چہرے کو بھی کبھی کبھی رنگ لیتے تھے اور کبھی مصنوعی داڑھی مونچھیں بھی لگا لیتے تھے۔ بہروپیے جس کا بھیس بناتے تھے اس کی پوری نقل اتارتے تھے۔ لباس، چہرہ، آواز، چال سب اسی کی سی بنا لیتے تھے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ داستان گو اگر کسی عورت کو پیش کرے گا تو صرف اپنی آواز میں نرمی اور نزاکت پیدا کرے گا۔ نقال اس موقع پر صرف دوپٹہ اوڑھ لینا کافی سمجھے گا، اور بہروپیا اسی مقصد کے لیے داڑھی مونچھیں صاف کروائے گا، چہرے پر غازہ، دانتوں میں مسی، آنکھوں میں

(باقی ص۲۱۱ پر)

پروفیسر سیّد احتشام حُسین

اُردو میں تحقیق آزادی کے بعد

یہ کہنا تو درست نہ ہوگا کہ ادبی تحقیق کی جانب باقاعدہ توجہ کی شروعات بیسویں صدی کی تیسری دہائی سے ہوتی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اُردو میں تحقیق کو کوئی ایسا مقام اس سے پہلے حاصل نہ تھا جس پر فخر کیا جا سکے۔ تذکرے جن سے اس کی امید ہو سکتی تھی، تحقیق کا کوئی قابلِ ذکر نمونہ پیش نہ کر سکے۔ اگر سر سیّد کی 'آثار الصنادید' کو نظر انداز کر دیا جائے، جو ایک خاص نوعیت کا علمی اور تحقیقی کارنامہ تھا، تو اردو کا دامن بہت دنوں تک فراہمی مواد اور ترتیب و تدوینِ کتب کے نقطۂ نظر سے خالی خالی نظر آتا ہے۔ مولانا حالی جنھیں غالب سے قرب حاصل تھا اور ذرائع کی بھی کمی نہ تھی، 'یادگارِ غالب' میں تحقیق کا حق ادا نہ کر سکے۔ محمد حسین آزاد نے 'آبِ حیات' میں تحقیقی انداز اختیار کیا لیکن اس میں ایسی خامیاں رہ گئیں جو اسے متنازعہ فیہ تصنیف بناتی ہیں۔ مولانا شبلی نے 'موازنۂ انیس و دبیر' میں نہ تو اردو مرثیہ کی تاریخ کے ساتھ انصاف کیا اور نہ انیس کے حالات کی طرف توجّہ کی۔ مولانا نذیر احمد کا ذہن منطقی ضرور تھا لیکن ادبی تحقیق کی جانب ان کا میلان نہ ہونے کے برابر تھا۔ عبد الحلیم شرر کی چند تاریخی، سوانحی اور علمی تحریریں یقیناً ان کے ذوقِ تحقیق کا ثبوت ہیں لیکن انھیں معیاری نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اس طرح ہمارے اہم ترین عالموں اور مصنفوں نے بھی تحقیق کا کوئی معیار قائم نہیں کیا۔ ہاں ان کے بعد خاص طور سے مستشرقین کے خیالات عام ہونے کی وجہ سے اردو میں بھی تحقیق کی راہیں کھلنے لگیں۔ چنانچہ مولانا سلیمان ندوی، مولانا ابو الکلام آزاد، خواجہ محمد شفیع، پروفیسر محمود شیرانی، مولانا عبد الحق، حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور پھر ان کے بعد پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب، امتیاز علی عرشی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، پروفیسر نجیب اشرف ندوی، پروفیسر عبد القادر سروری وغیرہ نے مختلف حیثیتوں سے تحقیق کے میدان کو وسیع کیا۔

یونیورسٹیوں میں اُردو کی تعلیم عام ہونے لگی تو اس کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے موضوعات کی طرح تعلیم کے معیار میں بھی تبدیلی ہوئی۔ نئی کتابیں تیار ہونے لگیں۔ متن کی صحت اور ترتیب کی جانب توجّہ ہوئی اور سب سے بڑھ کر یہ ہوا کہ قدیم سرمائے کی تلاش نے ایک رومانی کیفیت اختیار کر لی۔ اُردو کے لسانیاتی مطالعہ کی داغ بیل تو بہت پہلے پڑ چکی تھی اور یورپی مصنفوں کی تحقیقات کا سہارا لے کر یونیورسٹیوں میں بھی غور و فکر کے دروازے کھل گئے تھے لیکن علم اللسان کے اصولوں سے عام عدم واقفیت کی وجہ سے قابلِ اعتماد نتائج نہیں نکالے جا سکے تھے۔ جیسے جیسے اردو کے قدیم نمونے سامنے آنے لگے، لسانیات کی معلومات بڑھنے لگیں اور ہندستان کی دوسری جدید بھاشاؤں کی تاریخ مرتب کی جانے لگی۔ اُردو کے آغاز اور ماخذ سے متعلق چھان بین بڑے پیمانے پر شروع ہو گئی۔ اس سلسلے میں حافظ محمود شیرانی

پُروفیسر سیّد احتشام حُسین ترقی پسند ادبی تنقید کے میر کارواں تھے، انھوں نے اپنے عہد کی حسّیت کو اپنی تنقیدوں میں سمو کر اس ادبی مزاج و سفر کی رہنمائی کی جس کا نقطۂ آغاز پریم چند کا وہ تاریخی نقرہ تھا "ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا"۔

ایڈیٹر

مولانا عبدالحق، ڈاکٹر زور، مولانا سلیمان ندوی، نجیب اشرف ندوی وغیرہ نے آزادی سے پہلے تحقیق کی راہیں کھول دی تھیں، جس کا بہت سا حصہ آج بھی غور و فکر کا سرمایہ فراہم کرتا ہے۔ اگرچہ زیادہ تر تحقیقی کام یونیورسٹیوں کے دائرہ میں ہو رہا تھا لیکن اس کے باہر بھی مولانا امتیاز علی عرشی، قاضی عبدالودود، مرحوم نصیرالدین ہاشمی، مالک رام اور سخاوت علی وغیرہ بھی تحقیق کی سطح بلند کر رہے تھے۔

۱۹۴۷ء کے بعد تحقیق کی جانب اور توجہ ہوئی۔ جہاں تک تنقید نگاری کا تعلق تھا، نقاد مختلف دبستانوں میں تقسیم تھے ایک دوسرے سے اختلاف ادبی یا فکری نقطۂ نظر کا نتیجہ ہوتا تھا۔ لیکن تحقیق میں اس طرح کی پیچیدگی نہ تھی۔ اگر بحث ہو سکتی تھی تو مواد کی دریافت، شواہد کی صحت یا اخذ نتائج کی بنیاد پر ہو سکتی تھی۔ اس لحاظ سے تحقیق میں بحث و نظر کا انداز الگ الگ ہونے کے باوجود کسی مرکزی حکومت کے متعلق زیادہ سے زیادہ معتبر مواد اور اخذ نتائج سے متعلق ہوتا ہے۔ ہاں، اس میں زیادہ موشگافی کرنے کی وجہ سے کبھی کبھی بہت غیر ضروری اور غیر اہم بحثیں بھی چھڑ جاتی ہیں۔ لیکن تحقیق کا مقتضا یہی ہے کہ جذباتیت، جانبداری، ذاتی پسند، پہلے سے قائم کیے ہوئے نقطۂ نظر سے بلند ہو کر محض حقائق اور ٹھوس مواد کی بنیاد پر نتائج نکالے جائیں۔ یہ کام مشکل بھی ہے اور صبر آزما بھی۔ تحقیق جس قسم کی ریاضت، دیدہ ریزی اور دقتِ نظر کا مطالبہ کرتی ہے اس کے لیے بہت تھوڑے سے لوگ موزوں ہو سکتے ہیں۔ اگر تحقیق معیار اور شرائطِ صحت کو پیشِ نظر رکھ کر کی جائے تو نہ صرف اپنے نتائج کے اعتبار سے غیر معمولی ادبی کارنامے کی حیثیت سے زندۂ جاوید ہو سکتی ہے بلکہ اپنے طریقِ کار کی درستی اور دشوار پسندی سے سائنٹفک اصولوں سے کام لینے کا عملی نمونہ بھی بن سکتی ہے بہت تھوڑے سے محققین حقائق کی تلاش، حقائق کی اہمیت تجزیہ، شہادتوں کی نوعیت، مختلف علوم اور متعلقہ مسائل کی مدد سے اخذ نتائج اور اس کے ساتھ ہی نتائج کی ادبی اہمیت کا صحیح شعور رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے گزشتہ پچیس سال میں اگرچہ تحقیق کے نام پر ہزارہا صفحات کا مواد سامنے آیا ہے لیکن اس کا کچھ ہی حصہ ایسا ہے جو تاریخ ادب میں اپنا مقام بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ درست ہے کہ اکثر تحقیق کا خیال کسی متنازعہ مسئلے سے پیدا ہوتا ہے لیکن بدقسمتی سے مسئلہ اپنی جگہ پر رہ جاتا ہے اور چھوٹے بڑے محققین اپنی بات کی پچ رکھنے کے لیے غیر ضروری باتوں میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ بہرحال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بہت سی خامیوں کے باوجود تحقیق کا ایک معیار بن رہا ہے اور تحقیقِ ادب کے ذخیرے میں اضافہ بھی ہو رہا ہے۔ یہ بات البتہ قابلِ ذکر ہے کہ خود اصولِ تحقیق پر چند مضامین کے علاوہ صرف دو توجہ طلب کتابیں لکھی گئی ہیں، وہ بھی موضوع کے چند ہی پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے متنی تنقید کے لوازم سے بحث کی ہے اور عبدالرزاق قریشی نے کچھ سرسری اصولوں سے۔ اس سلسلے کا سب سے ضروری کام کتابیات اور حوالہ جات کی تیاری ہے جن کے بغیر تحقیق کا کام مشکل ہی سے آگے بڑھ سکتا ہے۔ بعض رسائل میں بالالتزام جیسے نوائے ادب بمبئی میں اور بعض میں کبھی کبھی، جیسے اردو ادب اور ہماری زبان علی گڑھ میں کچھ ایسا مواد یکجا کر دیا جاتا ہے جو تحقیق میں مدد دے سکتا ہے لیکن یہ ناکافی ہے۔ مختلف موضوعات، مختلف مصنفین، مختلف رسائل اور اخبارات سے متعلق یہ کام سائنٹفک طور پر بہت کم ہوا ہے اور جیسی کہ ہماری عادت ہے، جہاں ایک نے کسی موضوع کی طرف توجہ کی، کئی محقق اور نقاد اسی میں الجھ جاتے ہیں اور اکثر تکرار کے سوا بہت کم نیا مواد ہاتھ آتا ہے۔ گزشتہ چند برسوں کے اندر غالب کی قسمت جاگ اٹھی ہے اور حوالہ جات کی اچھی بری کئی کتابیں مرتب ہو گئی ہیں۔ میر، سودا، آتش، انیس، حالی، آزاد، شبلی اور بہت سے غیر معمولی طور پر اہم شاعروں اور ادیبوں کا کوئی پوچھنے والا نہیں۔ یہ درست ہے کہ ہمارے ملک میں ایسے ادارے، اکادمیاں اور علمی

انجمنیں نہیں ہیں جو ان کاموں کو سنجیدگی اور ذمہ داری سے اپنے ہاتھ میں لے سکیں، لیکن کام اتنا اہم ہے کہ اسے یونیورسٹیوں، سرکاری امداد سے چلنے والی انجمنوں اور تحقیق کا صحیح ذوق رکھنے والے افراد کو اسے اپنے ذمے لینا ہی چاہیے۔ اگر اصول تحقیق پر چند کتابیں اور رسائل مرتب ہو جائیں اور حوالہ جات کی مختلف جلدیں شایع ہو جائیں تو امید کی جا سکتی ہے کہ تحقیق کی رفتار میں اضافہ ہوگا۔

جہاں تک موجودہ تحقیقی ادب کا تعلق ہے اس کا تنقیدی اور تحقیقی جائزہ لینا بھی ایک بڑا کام ہے کیونکہ جیسا کہ کہا گیا اس کا بڑا حصہ نکتہ چینی، لفظی گرفت، ذاتی اختلافات اور خردہ گیری پر مشتمل ہے اس میں کہیں کہیں کار آمد باتیں بھی نظر آجاتی ہیں لیکن وہ کبھی اپنے غیر ادبی اندازِ بیان کی وجہ سے متوجہ کرنے میں ناکام رہتی ہیں اور کبھی محض خطوں، مراسلوں اور مختصر معلوماتی بیانوں کی شکل میں ہونے کی وجہ سے رسائل کے اوراق میں کھو جاتی ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ بچ رہتا ہے وہ یقیناً ہمارے علم میں اضافے کا ذریعہ بنتا ہے۔

اس ضرورت کا بار بار اظہار کیا گیا ہے کہ شعرا کے کلیات اور ادیبوں کی تخلیقات کے صحیح متن شایع کیے جائیں ورنہ تاریخ و تنقید کی ساری عمارت غلط بنیادوں پر قائم ہوگی۔ یہ کام جتنا آسان نظر آتا ہے اتنا ہے نہیں، خاص کر قدیم قلمی نسخوں کی بنیاد پر صحیح قرأت اور صحیح متن کا تعین محض ادبی ذوق کی مدد سے نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے لسانیات، عروض، معنی و بیان، علم لغت، تاریخ، تصوف، طب، حکمت اور نجوم، مذہبی علوم اور اساطیری تلمیحات کا علم رکھنا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں کچھ بُرا بھلا کام کیا جا رہا ہے لیکن ان متنوں کی طرف توجہ کم ہے جن سے اکثر سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ مثلاً اس وقت تک میر، سودا، مومن، ظفر، شیفتہ، میر انیس، آتش، ناسخ کے دواوین اس حیثیت سے مرتب نہیں کیے گئے ہیں کہ ان پر کامل اعتماد کیا جا سکے۔ نثر میں تو اور برا حال ہے۔ پھر بھی گزشتہ ربع صدی میں چند ایسے متن مرتب کیے گئے ہیں جن پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ہر محقق اور ادیب نے ترتیب و تدوین میں اپنے طرزِ فکر سے کام لیا ہے یعنی کسی نے متن کئی نسخوں سے مرتب کرنے اور اختلاف نسخ کے واضح کرنے پر زور دیا ہے تو کسی نے مقدمہ اور حواشی میں مفید اور کار آمد معلومات یکجا کی ہیں۔ لیکن علمی اور تحقیقی اعتبار سے ان میں سے کسی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان میں ہر ممکن احتیاط مدِ نظر رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میرے خیال میں جنھیں مختلف حیثیتوں سے اہمیت دی جا سکتی ہے وہ ہیں کتاب نورس، دیوانِ غالب، کربل کتھا، اندر سبھا، ارشاد نامہ، قصہ مہر افروز و دلبر، من سمجھاون، ابراہیم نامہ، لیلیٰ مجنوں، مینا ستونتی، پرت نامہ، بکٹ کہانی، دیوانِ عزلت، گلِ رعنا، گنج خوبی، کلمۃ الحقائق وغیرہ۔ ان میں سے بعض کی تحقیقی اہمیت یہ ہے کہ ہمیں ان کے وجود کا علم پہلی بار ہوا ہے اور بعض اپنے مقدمہ، حواشی، ترتیب اور معلوماتی نکات کی وجہ سے توجہ طلب ہیں۔ ان میں سے چند کی بعض خصوصیات کی جانب اشارہ شاید مفید مطلب ہو۔

کتاب نورس کا ذکر ڈاکٹر زور، مولانا عبد الحق، نصیر الدین ہاشمی اور دوسرے محققین کی تحریروں میں اکثر آتا تھا اور بعض غیر تشفی بخش مضامین بھی لکھے گئے تھے۔ لیکن اُس کی اصل صورت اس وقت واضح ہوئی جب ڈاکٹر نذیر احمد نے اس کے متعدد نسخے ڈھونڈ نکالے۔ ڈاکٹر نذیر احمد کا موضوعِ تحقیق ظہوری تھا۔ ان کا طریق کار یہ ہے کہ وہ جہاں تک ممکن ہوتا ہے موضوع سے تعلق رکھنے والے سارے مواد کا زیادہ سے زیادہ حصہ دیکھ لیتے ہیں۔ پھر جب انھوں نے عادل شاہی دور کا مطالعہ شروع کیا اور ظہوری کی نثروں کا تجزیہ کیا تو انھیں ابراہیم عادل شاہ کے کارناموں سے بھی دلچسپی پیدا ہوئی اور اس طرح ان کی رسائی نورس کے متنوں تک ہوئی۔ ان کی دلچسپی کا دائرہ پوری عادل شاہی تہذیب تھا۔ انھوں نے اس عہد کی مصوری، خطاطی، شاعری، زبان اور زندگی کے کئی پہلوؤں کا مطالعہ گہری نظر سے کیا۔ چونکہ نورس کی صحیح ترتیب و تدوین ان تمام متعلقات کے بغیر ممکن نہیں تھی اس لیے کوئی ایسا ہی محقق اس کو ہاتھ لگا سکتا تھا جس کی نگاہ صرف ایک اچھے نسخے کے نقل کر دینے پر نہ ہو بلکہ جو ان دوسرے لوازم پر بھی نگاہ رکھتا ہو جو صحیح متن کی تیاری میں معاون ہوتے ہیں۔ اتنی معلومات کے ساتھ ایڈٹ کرنے کی وجہ سے کتاب نورس کے کئی

پہلو روشن ہو گئے۔ چنانچہ اس کے انگریزی اڈیشن کو اس لیے اہمیت حاصل ہوئی کہ اس سے اس ہندستانی موسیقی کی تاریخ مرتب کرنے میں مدد لی جا سکتی ہے جو سولھویں اور سترھویں صدی کے دکن میں رائج تھی اور جس کے فروغ میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کا ہاتھ تھا۔

مولانا امتیاز علی عرشی کے مرتب کیے ہوئے دیوانِ غالب کے متعلق بھی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کے سلسلے میں بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ عرشی صاحب اس سے قبل دستورُ الفصاحت، مکاتیبِ غالب اور نادراتِ شاہی شایع کر کے اپنے طرزِ تحقیق سے لوگوں کو روشناس کرا چکے تھے۔ دیوانِ غالب کو نئے انداز سے ترتیب دے کر انھوں نے تحقیق کی کچھ نئی راہیں روشن کیں کیونکہ اس کا طریق کار مرکب اور پیچیدہ ہے۔ بہت سے قلمی اور مطبوعہ دواوین غالب کی مدد سے متن کی تیاری خود ایک مشکل کام ہے لیکن عرشی صاحب نے اس کے گرد ایک مخصوص ترتیب سے وہ غیر متداول کلام، جو عام اڈیشنوں میں شامل نہیں ہے، اور وہ کلام بھی جو غالب کے نام سے مشہور ہے، جمع کر دیا ہے۔ مقدمہ اور حواشی، مختلف اشاریے ایسی معلومات سے بھرپور ہیں، جن سے غالب کے سمجھنے میں غیر معمولی مدد لی جا سکتی ہے۔

کربل کتھا کی اشاعت، محض اس لحاظ سے بھی ایک تاریخ ساز واقعہ تھی، کہ جس کتاب کے وجود سے کم و بیش مایوسی ہو چکی تھی، اس کا مکمل نسخہ سامنے آ گیا لیکن مالک رام اور ڈاکٹر مختار الدین نے اسے جس طرح ایڈٹ کیا ہے وہ بھی ایک بے مثال تحقیقی کارنامہ ہے۔ اس کتاب کی تلاش کی کہانی بھی دلچسپ ہے اور یہ بات بھی کم تعجب خیز نہیں کہ تقریباً ایک ہی زمانے میں اس کے دو اڈیشن الگ الگ تیار کیے گئے۔ ایک کے مرتب ہیں ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی اور دوسرے کے ڈاکٹر مختار الدین اور مالک رام۔ بعض وجوہ سے ڈاکٹر فاروقی کا اڈیشن طباعت کی منزلوں سے گزر جانے کے باوجود شائع نہیں ہو سکا، دوسرا اڈیشن عام ہو چکا ہے۔ اس کی ترتیب اور تدوین میں ان تمام باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے جو کسی کتاب کا محض ایک نسخہ دستیاب ہونے کی صورت میں کیا جا سکتا ہے۔ تاریخی، لسانی، ادبی خصوصیات کے علاوہ مذہبی تلمیحات، روایات اور اشارات، اعلام اور املا کو حل کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے اور وہ ساری باتیں واضح کی گئی ہیں جو کسی ایسی تصنیف کے مطالعہ کے وقت ذہن میں پیدا ہوتی ہیں۔ اگر اس میں فضلی کے حالات نہیں ملتے یا نواب اشرف علی خاں کے متعلق کچھ نہیں معلوم ہوتا تو یہ سمجھنا چاہیے کہ موجود مواد میں کچھ نہیں مل سکا، ہو سکتا ہے کہ آئندہ کسی ذریعے سے حالات کی گتھی حل ہو سکے۔ اور اگر اتفاق سے کربل کتھا کا کوئی دوسرا نسخہ ہاتھ آ جائے تو املا اور تلفظ کے علاوہ محض الفاظ کی لسانیاتی ساخت کے متعلق بھی یقین کے ساتھ کچھ کہا جا سکے۔

خیر، کربل کتھا کے متعلق کم سے کم یہ تو معلوم تھا کہ اس نام کی کوئی کتاب محمد شاہی عہد میں لکھی گئی تھی لیکن قصۂ مہر افروز و دلبر کی صورت تو یہ ہے کہ کسی کو اس کے وجود ہی کا علم نہ تھا۔ غالباً اس داستان کا واحد نسخہ گویا برسوں حضرت جی کے کتاب خانے کی زینت تھا اور ۱۹۲۹ء میں ایک بزرگ نے اسے پروفیسر آغا حیدر حسن کو تحفۃً پیش کر دیا۔ موصوف نے اسے ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے حوالہ کیا کہ وہ اس کو مرتب کر کے شایع کریں۔ اس واحد نسخہ میں نہ کوئی ابتدائیہ ہے نہ ایسا خاتمہ جس سے کتاب کے مصنف، زمانہ، وطن، مقام کتابت، زمانۂ کتابت کے متعلق کچھ معلوم ہو سکے۔ کتاب کے سرورق پر ایک جگہ عیسوی خاں بہادر، ایک دوسرے خط میں لکھا ہوا ہے اور ایسی جگہ پر جہاں عام طور سے مصنف کا نام نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر مسعود حسین نے عیسوی خاں کو عارضی طور پر اس داستان کا مصنف قرار دے کر قصہ کی اندرونی شہادتوں اور لسانی خصوصیات کی بنیاد پر اس کے زمانہ کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ علم اللسان کے ماہر ہونے کی حیثیت سے یہ کام وہی خوبی کے ساتھ کر سکتے تھے۔ تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اس کا زمانۂ تصنیف ۱۷۳۲ء اور ۱۷۵۰ء کے درمیان قرار دیا ہے۔ میری ذاتی رائے میں ایسے سارے نتائج عارضی ہی ہو سکتے ہیں کیونکہ جس کاتب نے اسے لکھا ہے، اس نے الفاظ کے لکھنے میں کس طرح کا املا استعمال کیا ہے، یہ اس کا انفرادی عمل ہے۔ ممکن ہے کوئی دوسرا

نسخہ ملے اور اس کا کاتب الفاظ کو اپنے انداز سے یا اپنے علاقائی لہجے کے تعصبات کے ساتھ لکھے اور تلفظ بدلے ہوئے معلوم ہوں۔ بہرحال اس داستان کا آغا قاً ہاتھ لگنا تو کوئی بڑی بات نہیں لیکن اس کا آغا حیدر حسن کے توسط سے ڈاکٹر مسعود حسین خاں تک پہنچنا اس کی مناسب ترتیب، تحشیہ اور اشاعت کے لیے شگونِ نیک تھا۔ ہمارے وہ محقق جن کا ذوق لسانیاتی نہیں ہے، اس کو مرتب کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ رہ گیا عیسوی خان کا مصنف ہونا، یہ قطعاً ایک بحث طلب مسئلہ ہے اور جب تک کوئی اور شہادت دستیاب نہ ہو قطعی رائے قائم کرنا بہت مشکل ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے بکٹ کہانی اور ابراہیم نامہ کے شائع کرنے میں بھی اسی دیدہ وری اور علمی ذوق سے کام لیا ہے۔

فورٹ ولیم کالج میں جو کتابیں ترجمہ ہوئی تھیں یا مرتب کی گئی تھیں انھیں آج کلاسیکی ادب کا درجہ حاصل ہے۔ وہاں کی کتابوں میں باغ و بہار سرِ فہرست ہے اور میر امّن کا نام سب سے اوپر۔ ان کی دوسری کتاب گنجِ خوبی (اخلاقِ محسنی کا ترجمہ) کے متعلق خاصی بے خبری تھی اگرچہ وہ اردو اور ہندی دونوں میں چھپ چکی ہے۔ چند سال ہوئے ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے اسے اپنے مقدمہ کے ساتھ دہلی یونیورسٹی کے سلسلۂ مخطوطاتِ اردو میں شائع کر دیا۔ اس کا متن خود میر امّن کے قلم سے لکھے ہوئے ایک نسخہ پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر فاروقی نے بڑی احتیاط سے اس کا مقابلہ مطبوعہ نسخہ سے کیا ہے اور اس طرح جو متن تیار کیا ہے وہ دونوں کی خصوصیات کا مظہر ہے۔ اس سے میر امّن کے املا، تلفظ اور طرزِ کتابت کا تحفظ بھی ہو گیا ہے اور پونے دو سو سال کی اردو کی بعض خصوصیتیں بھی پیشِ نظر ہو گئی ہیں۔ ڈاکٹر فاروقی نے مقدمہ میں میر امّن کے حالات، ان کے عہد اور فورٹ ولیم کالج کے متعلق بعض باتیں پہلی بار پیش کی ہیں۔ تحقیقی نقطۂ نظر سے یقیناً اسے اعلیٰ درجے کے کارناموں میں شمار کیا جائے گا۔

مرزا غالب پر تحقیقی مواد یوں تو خود ان کی زندگی ہی میں جمع ہونا شروع ہو گیا تھا لیکن یادگارِ غالب کے بعد سے باقاعدہ ان پر نظر جانے لگی اور ان کی زندگی، شخصیت اور کارناموں کے سلسلے میں ہر طرح کی چھان بین شروع ہو گئی۔ اردو میں جتنا بھی تحقیقی ادب موجود ہے، یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس کا ایک بڑا حصہ غالب ہی سے متعلق ہے۔ جن محققوں نے خصوصیت سے غالب پر توجہ کی اُن میں ڈاکٹر عبداللطیف، امتیاز علی عرشی، قاضی عبدالودود، مالک رام، مختارالدین احمد، اکبر علی خاں، نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر خلیق انجم بہت اہم ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نے کسی نہ کسی انداز میں غالبیات کا اضافہ کیا ہے۔ عرشی کے مکاتیبِ غالب، دیوانِ غالب اور مضامین، پروفیسر مسعود حسن رضوی کی متفرقاتِ غالب، قاضی عبدالودود کے متعدد مقالات، مالک رام کی ذکرِ غالب، تلامذۂ غالب، اکبر علی خاں کی نکات و رقعات، ڈاکٹر خلیق انجم کی غالب کی نادر تحریریں، نثار احمد فاروقی کی تلاشِ غالب اور بہت سے دوسرے محققوں کی تحریریں گزشتہ پچیس سال کے اندر یکجا جمع ہوئی ہیں لیکن دو سال پہلے گلِ رعنا کی اشاعت خصوصی توجہ کی مستحق ہے۔ یوں دیکھا جائے تو یہ کوئی غیر معمولی کتاب نہیں، انھوں نے کلکتہ کے دورانِ قیام میں اپنے اردو و فارسی کلام کا ایک انتخاب کیا تھا جس میں ایک مختصر سا دیباچہ اور ایک خاتمہ فارسی میں تھا۔ لیکن تحقیق کی نظر سے اس کی جستجو ضروری تھی تاکہ ان کے کلام کا تاریخی تعین ہو سکے اور ان کے ذہنی ارتقا کے سمجھنے میں مدد ملے۔ مالک رام نے برسوں کی محنت سے مفید مقدمہ، حواشی، اختلافِ نسخ اور سفرِ کلکتہ کے سلسلے میں ضروری معلومات کا اضافہ کر کے اسے شائع کر دیا ہے اور تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔ اس میں وہ سب کچھ ہے، گلِ رعنا کے مطالعہ کے لیے جس کا ہونا ضروری تھا اور ایسی تفصیلات نہیں ہیں جو محض پچھلی معلومات کی تکرار ہوں۔ جو محقق یہ سمجھتا ہے کہ کیا ضروری ہے اور کیا غیر ضروری، وہی اہم قرار دیا جا سکتا ہے۔

اگر دیوانِ عزلت (مرتبہ عبدالرزاق قریشی)، من سمجھاون اور سکھ انجن (مرتبہ ڈاکٹر سیدہ جعفر)، لیلیٰ مجنوں (مرتبہ ڈاکٹر غلام عمر خاں)، نو سرہار (مرتبہ ڈاکٹر نذیر احمد)، ارشاد نامہ (مرتبہ اکبرالدین صدیقی)، بکٹ کہانی (مرتبہ ڈاکٹر مسعود حسین و ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی)، پرت نامہ (مرتبہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں)

مینا ستونتی (مرتبہ ڈاکٹر غلام عمر خان) اور کئی دوسری دکنی مطبوعات کو بھی پیش نظر رکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ صحیح متنوں کے مرتب کرنے کی طرف جو رجحان ہے وہ خوش آیند بھی ہے اور حوصلہ افزا بھی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اہم دواوین اور نثری تخلیقات کی طرف اور توجہ کی جائے۔ مکتبۂ جامعہ نے کلاسیکی ادب کی اشاعت کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اس میں شک نہیں کہ وہ بہت مفید ہے لیکن متنوں کی صحت کی جانب جتنی گہری توجہ کی ضرورت ہے وہ ابھی کم ہے۔ ہر کتاب میں ایک مختصر لیکن جامع مقدمہ اختلاف نسخ اور فرہنگ کا ہونا ضروری ہے تاکہ طلبہ استفادہ کر سکیں اور عام پڑھنے والا متکدر نہ ہو۔

تذکروں کی جستجو اور ترتیب و اشاعت نے اردو تاریخ کے مرتب کرنے میں جو مدد بہم پہنچائی ہے اس کی اہمیت کا اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا — گارساں دتاسی نے بہت سے تذکروں کا ذکر کیا تھا، آبِ حیات میں کچھ کے نام آئے تھے، خود بعض تذکرہ نویسوں نے دوسرے تذکروں کا ذکر ضمناً کر دیا تھا۔ اس طرح آہستہ آہستہ ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ آزادی سے پہلے ہی انجمن ترقی اردو اور بعض دوسرے اداروں نے چند اہم تذکرے شائع کر دیے تھے لیکن کئی ایسے تذکرے جو گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے تھے یا جنھیں غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کیا جاتا تھا، محققوں کو متوجہ کرنے میں کامیاب ہوئے اور گزشتہ پندرہ بیس سال کے اندر تلاش کی رفتار بھی تیز ہوئی ہے اور رفتار اشاعت بھی۔ چونکہ زیادہ تر تذکرے فارسی میں لکھے ہوئے تھے اس لیے کبھی کبھی ان کے خلاصے اور ترجمے بھی شائع کیے گئے ہیں اور گو تحقیقی نقطۂ نگاہ سے انھیں زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی لیکن ان کی اضافی افادیت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بعض تذکروں کی دوبارہ اشاعتیں بھی اس لیے مفید ہیں کہ دوسرے خطی نسخوں کے دستیاب ہونے سے بعض کے متن اختلافی نظر آنے لگے ہیں۔ جن چند تذکروں کی اشاعت خاص طور پر قابل ذکر ہے وہ ہیں عمدۂ منتخبہ (مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی)، تذکرۂ ابن طوفان (مرتبہ قاضی عبدالودود) گلشن سخن (مرتبہ مسعود حسن رضوی)، تذکرۂ مسرت افزا (مرتبہ قاضی عبدالودود) خوش معرکۂ زیبا (مرتبہ ڈاکٹر شمیم انہونوی) مجمع الانتخاب، طبقات الشعرا اور گل رعنا (مرتبہ نثار احمد فاروقی)، گلشن ہند (مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد)، دو تذکرے (مرتبہ کلیم الدین احمد)۔ ان کے علاوہ بعض تذکروں کے خلاصے کبھی رسائل میں اور کبھی کتابی شکل میں شائع ہو کر عام ہو رہے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہمیت شاہ عطاالرحمان کاکوی کے شائع کردہ تذکروں کو حاصل ہے۔ انھوں نے تقریباً سبھی اہم تذکرے اپنے اشاعتی پروگرام میں شامل کر لیے ہیں۔ یہ کام اہم سہی لیکن پھر بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ تذکروں کے اچھے اڈیشن شائع کرنے کے علاوہ ہر مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تذکرے میں شامل افراد کی ایک مجموعی فہرست ببلیوگرافی کے طور پر شائع کی جائے تاکہ تحقیق کرنے والوں کو کچھ آسانیاں فراہم ہو سکیں۔

جیسا کہ کہا گیا یونیورسٹیوں میں تحقیقی کام علمی اور غیر علمی مقاصد کے پیش نظر بڑھ رہا ہے۔ ہمارے ملک میں ہر سال پندرہ بیس مقالے پی ایچ ڈی، ڈی فل یا ڈی لٹ کے لیے منظور ہوتے ہیں جن میں سے بعض شائع بھی ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ ان مقالوں کو تحقیق ہی کہا جاتا ہے لیکن ان میں سے بیشتر ایسے ہوتے ہیں جن میں تحقیق برائے نام ہوتی ہے۔ بعض یونیورسٹیوں میں متن کی تصحیح و ترتیب پر بھی ڈگریاں دی گئی ہیں لیکن ان کی تعداد کم ہے۔ بعض موضوع ایسے ہوتے ہیں جن میں تحقیق کی زیادہ گنجائش بھی نہیں ہوتی کیونکہ نئے حقائق تو اکثر قدیم ادب کے متعلق ہی مل سکتے ہیں۔ اس لیے زیادہ تر مقالے ایک نیا تنقیدی جائزہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ صرف مثال کے طور پر ایک مقالہ کا ذکر کر کے اپنی بات واضح کرنا چاہتا ہوں۔ کوئی بیس سال ہوئے ایک طالب علم نے پنڈت برج نرائن چکبست کی زندگی اور شاعری پر کام شروع کیا۔ تقریباً دو برس تک وہ ایسے اشخاص سے ملتا رہا جن کے متعلق ذرا سا بھی خیال ہوا کہ وہ چکبست کے بارے میں کچھ معلومات رکھتے ہوں گے۔ اس سے فائدہ ہوا لیکن تحقیقی نقطۂ نظر کوئی ایسا مواد نہ ملا جو ان کی زندگی یا اُن کے کلام کے متعلق کوئی غیر معمولی بات بتاتا۔ بہت سے لوگ ان کی وضع قطع رفتار گفتار، وکالت کی کامیابی، بحث کے انداز ہی کے متعلق بتلاتے

رہے۔ کسی نے ان کے شعر پڑھنے کے طریقے کا ذکر کیا، کسی نے عزیزوں کا اور عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ برتاؤ کا، کسی نے ان کے سیاسی خیالات کا۔ ان میں سے اکثر باتیں مفید تھیں لیکن مقالہ کے لیے بہت ضروری نہ تھیں۔ بڑی تلاش کے بعد ان کی کچھ ڈائریاں اور رجسٹر ملے۔ ڈائریاں معمولی تھیں، اُن میں زیادہ تر مقدمات کے متعلق یادداشتیں تھیں، کہیں کہیں کسی ادبی جلسہ، مشاعرہ یا مجلس عزا (خاص کر خورشید حسن عرفت دولھا صاحب عروج کی) میں شریک ہونے کا ذکر تھا۔ رجسٹروں میں البتہ کئی کام کی چیزیں ملیں۔ یہ انجمن اصلاح کشمیریان کی کارروائی کے رجسٹر تھے۔ چکبست کا ذکر ان میں "کریٹک" (نقاد) کی حیثیت سے تھا وہ ہر مباحثہ کے آخر میں مختلف اصلاحی مباحث پر تبصرہ کرتے تھے جن سے ان کے مذہبی، تعلیمی، تہذیبی اور سیاسی خیالات کا اندازہ ہوتا تھا۔ یہ کارروائیاں نسبتاً مفید تھیں لیکن سب سے زیادہ مفید کاغذ کا ایک معمولی ورق ثابت ہوا جس پر چکبست نے اپنی ایک نظم لکھ کر آثر لکھنوی کے بیٹے "بڑے بھیا" کے پاس بھیجی تھی اور ان سے درخواست کی تھی کہ چونکہ انھیں یہ نظم شام کو ایک جلسہ میں پڑھنا ہے اس لیے وہ اس پر ایک نظر ڈال لیں۔ عام خیال یہی ہے کہ چکبست نے کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی۔ اس کاغذ سے کم سے کم اتنی بات تو معلوم ہوتی ہے کہ ابتدائی دورِ شاعری میں باقاعدہ نہ سہی دوستانہ طور پر کسی کو اپنا کلام دکھا لیتے تھے۔ جی چاہے اسے تحقیق کہہ لیجیے لیکن کسی اور ذریعہ سے اس مسئلہ پر کوئی اور روشنی نہ پڑ سکی۔ نظم بھی غیر مطبوعہ نہ تھی بلکہ جہاں تک یاد آتا ہے، وہی نظم جو آبِ انگور کے نام سے صبحِ وطن میں شامل ہے اور ۱۹۰۶ء میں لکھی گئی تھی۔ اس مثال کے پیش کرنے کا مقصد یہ تھا کہ بعض قسم کے "تحقیقی" مقالات میں تحقیق کی گنجائش بہت کم نکلتی ہے۔

بہرحال یونیورسٹیوں میں جو مقالات منظور ہوتے ہیں اُن کے تحقیقی معیار میں یکسانیت نہیں ہو سکتی اور نہ ہوتی ہے کیونکہ ہر موضوع کے مطالبات مختلف ہوتے ہیں۔ تاہم چند مقالات جنھیں دوسروں کے مقابلہ میں معیاری کہا جا سکتا ہے طالب علمانہ کاوش ہی کا نتیجہ ہیں۔ اس وقت جن کا خیال آ رہا ہے ان میں مرزا رفیع سودا (ڈاکٹر خلیق انجم)، اُردو مثنوی شمالی ہند میں (ڈاکٹر گیان چند)، رجب علی بیگ سرور (ڈاکٹر نیر مسعود)، خواجہ میر درد (ڈاکٹر وحید اختر)، ذوق (ڈاکٹر تنویر علوی)، قابل ذکر ہیں کیونکہ ان میں تحقیقی مواد بھی محنت، علمی ذوق اور تجسس کے بعد جمع کیا گیا ہے۔ چند اور مطبوعہ مقالات بھی پیش نگاہ ہیں لیکن ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

شروع کی سطروں میں اس بات کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ بہت سا تحقیقی سرمایہ صرف ادبی مباحث اور تنازعات میں بکھرا پڑا ہے جو رسائل میں اکثر اعتراض، جواب، جواب الجواب اور جواب الجواب کی شکل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اس کا کچھ حصہ ترتیب پا کر کتابی شکل میں شائع ہو جاتا ہے اور کچھ یونہی ادھوری معلومات کی صورت میں کچھ دن زندہ رہ کر ختم ہو جاتا ہے۔ حال میں جو ادبی ہنگامہ بھارت [illegible] دیوان غالب کے سلسلہ میں چھڑی جو دیوانِ غالب بخط غالب کہا جاتا ہے، وہ تحقیقی دنیا میں یادگار رہے گی۔ امروہہ کے ایک تاجر کو بھوپال میں ایک دیوانِ غالب دستیاب ہوا، جو کچھ دن بعد ہند و پاک میں شائع ہوا۔ تین چار سال سے اس بحث کا موضوع بنا ہوا ہے [illegible] آپ کے قلم کا لکھا ہوا ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کس عمر میں لکھا گیا کیونکہ ترقیمہ میں سن کی جگہ خالی ہے۔ کچھ لوگوں نے تو ایک آدھ صفحوں کا عکس دیکھا اور اعلان کر دیا کہ غالب کا دیوان ہے اور انھیں کے قلم سے، کچھ نے شک ظاہر کیا، کچھ نے اپنی تصدیق واپس لی اور [illegible] کہ یہ دیوان بخط غالب ہے اور وہ بھی انیس سال کی عمر [illegible] اس بحث میں درجنوں اربابِ قلم نے حصہ لیا، ہزارہا صفحات [illegible] کئی کتابیں شائع ہوئیں اور کئی ناخوشگوار واقعات پیش آئے۔ اس میں شک نہیں کہ اس سلسلہ میں جو تحقیقی موشگافیاں کی گئی ہیں اُن سے غالب شناسی میں اضافہ ہوتا ہے نہ اُردو شاعری کی تاریخ پر اس کا اثر پڑتا ہے لیکن ذوقِ تجسس کے وسیع دائروں میں پھیلنے کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔ ابھی یہ بحث ختم نہیں ہوئی ہے اس لیے بہت سے لوگ نتیجہ کا انتظار کر رہے ہیں کیونکہ تحقیق کے وہ ذرائع ابھی ہر محقق اور قاری کی دسترس میں نہیں ہیں جن کی مدد سے یہ مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے۔

غالب ہی کے سلسلہ میں یہ بحثیں بھی تحقیق ہی کے میدان میں چھڑ چکی ہیں کہ عبدالصمد یا ہرمزد واقعی غالب کا استاد تھا یا یہ محض ایک فرضی نام ہے؟ غالب کو محقق کہا جا سکتا ہے یا نہیں؟ ۱۸۵۶ء کا وہ سکہ جو غالب سے منسوب ہے انھیں کا ہے یا نہیں؟ مفتی صدرالدین آزردہ کے انتقال کے بعد انھوں نے جو خط نواب رام پور کو لکھا وہ ان کی اخلاقی حیثیت اور شخصیت کو ایک نئے پہلو سے پیش کرتا ہے یا نہیں؟ اس طرح کی کئی بحثیں کبھی کبھی اٹھتی رہتی ہیں اور کچھ نہ کچھ کارآمد نکتے اس سے برآمد ہوتے ہیں۔ اسی طرح بکٹ کہانی کے مصنف کے وطن، زبان اور شاعری کے متعلق بھی بعض اہم سوالات اٹھے ہیں اور کچھ ادیبوں کو متوجہ کر رہے ہیں۔ یہ بحث پہلے بھی اٹھ چکی ہے کہ معراج العاشقین کو سید گیسو دراز کی تصنیف کہا جا سکتا ہے یا نہیں؟ حال میں ڈاکٹر حفیظ قتیل نے ایک کتاب اس موضوع پر لکھ کر معاملہ کو اگر قطعاً نہیں تو تقریباً یکسو کر دیا ہے۔ ولی کے دکنی یا گجراتی ہونے کا جھگڑا کچھ سست پڑ گیا ہے لیکن تاریخ کے طلبہ کے لیے تحقیق کا دروازہ ابھی بند نہیں ہوا ہے۔ آب حیات صرف اغلاط کا مجموعہ ہے یا اس میں کارآمد علمی اور تاریخی مواد بھی ہے، دلچسپ بحثوں کا موضوع رہ چکا ہے اور ابھی بہت دنوں تک رہے گا۔ میر ضاحک کے دیوان کی دستیابی نے بعض خیالات پر نظر ثانی کرنے پر مجبور کیا ہے۔ غرضکہ تحقیق سے دلچسپی لینے والوں کے لیے روزانہ کوئی نہ کوئی سوال پیدا ہوتا ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ جو لوگ اس کے اہل ہیں وہی ان بحثوں میں حصہ لیں اور اس ذمہ داری کا خیال رکھیں کہ اگرچہ تحقیق کا تعلق "حقائق" سے ہے لیکن ہمارے سامنے بہت سے واقعات حقائق کی شکل میں آتے ہیں، کبھی ایک ہی حقیقت دو تین طرح بیان ہوتی ہے اور کبھی تاریخ، ماحول، شخصیت اور فنی روایات کے سیاق و سباق میں حقائق کو معنی پہنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ عجلت اور اپنی بات پر اڑے رہنے سے تحقیق کا خون ہوتا ہے۔

گزشتہ پچیس سال کے تحقیقی ادب کا یہ ایک نامکمل جائزہ ہے کیونکہ اس میں ہر محقق اور ہر تحقیق کا تفصیلی ذکر نہیں کیا گیا ہے لیکن اس کا یہ مقصد بھی نہیں تھا۔ میرے پیش نظر یہ تھا کہ ان واضح خطوط کی نشاندہی کر دوں جن پر اس وقت کاروان تحقیق چل رہا ہے اور اُن دشواریوں کا ذکر کر دوں جو اس راستہ میں حائل ہوتی ہیں۔ اسی ضمن میں چند اہم کارناموں کا ذکر بھی آ گیا کیونکہ اُن کے بغیر مسائل کو سمجھا نہیں جا سکتا تھا۔ کوتاہیوں کا تذکرہ بھی ضمناً آ گیا ہے حالانکہ جی چاہتا تھا کہ ڈاکٹر عبدالعلیم نامی اور پروفیسر مسعود حسن رضوی نے اُردو ڈرامے کے آغاز پر جو کام کیا ہے، اس پر نگاہ ڈالتے ہوئے یہ کہوں کہ جب تک انیسویں صدی کے ڈراموں کی صحیح نقلیں دستیاب نہ ہو جائیں کسی نتیجہ تک پہنچنا بہت مشکل ہے۔ مسعود صاحب نے اندر سبھا کا ایک تحقیقی ایڈیشن شائع کر دیا ہے لیکن پارسی تھیٹر کے ڈراموں کا بھرپور جائزہ اسی وقت لیا جا سکے گا جب وہ شائع ہو جائیں (خوش قسمتی سے امتیاز علی تاج مرحوم نے پاکستان میں انھیں شائع کر دیا ہے لیکن ابھی یہاں کے محققوں نے ان کا مطالعہ نہیں کیا ہے) پھر بھی پروفیسر مسعود حسن اور ڈاکٹر نامی کے تحقیقی کاموں کو مشعل راہ بنا کر نئے محقق آگے بڑھ سکتے ہیں۔ اُردو ناول کے آغاز پر ابھی کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اُردو میں ناول کا آغاز مغرب کے اثر سے ہوا لیکن ڈاکٹر اقتدار عالم کا یہ خیال بھی غور طلب ہے کہ اٹھارویں اور شروع انیسویں صدی میں ہندستانی فارسی میں جو قصے ہندستان میں لکھے گئے اور جو حقیقت نگاری کے نقطۂ نظر سے ناول کی بعض شرطوں کو پورا کرتے ہیں، ان کے اثرات کو بھی کیوں نہ پیش نگاہ رکھا جائے۔ یہی حال دوسرے اصناف کا بھی ہے، خاص کر ان کی ابتدائی تاریخ کا۔ یہ کام منظم علمی ریاضت چاہتا ہے جسے ادبی اور تحقیقاتی اداروں کی نگرانی ہی میں انجام دیا جا سکتا ہے۔ لکھنؤ میں اُردو کی ابتدا، فورٹ ولیم کالج، اردو نثر کا آغاز، اُردو اور علاقائی بولیوں کا تعلق چند ایسے موضوعات ہیں جن پر ابھی بہت کام کرنے کی گنجائش ہے۔

جن محققوں کا ذکر اوپر آ چکا ہے ان کے علاوہ بھی چند ایسے نام ہیں جو اپنی جگہ بنا چکے ہیں یا تیز رفتاری سے شہرت کی جانب بڑھ رہے ہیں کیونکہ ان کی تحریروں میں حقائق کی تلاش اور ان سے نتائج نکالنے کی مخلصانہ کوشش پائی جاتی ہے۔ بعض کی کئی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں، بعض کے مقالات متوجہ کرتے ہیں اور بعض کی تحریریں امید افزا

ہا جیسے ڈاکٹر محمود الٰہی: (نکات الشعراء اور خطِ تقدیر)، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ: (اُردو نثر کا ارتقا ۱۸۰۰ء تک)، علی جواد زیدی: (دو ادبی اسکول)، عتیق صدیقی: (گل کرسٹ اور اس کا عہد، ہندستانی اخبار نویسی)، رشید حسن خاں: (باغ وبہار، گلزار نسیم، انتخاب ناسخ)، مسیح الزماں: (اُردو مرثیہ کا ارتقاء)، ڈاکٹر عبدالستار دلوی: (من سمجھاون)، ڈاکٹر اکبر حیدری: (دیوانِ میر، کلیات دلگیر)، ڈاکٹر انصار اللہ نظر، ڈاکٹر محمد عقیل، عبدالغفار شکیل، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (ہندستانی قصوں سے ماخوذ اُردو مثنویاں)، ڈاکٹر نورالسعید اختر (تاج الحقائق)، ڈاکٹر ابو محمد سحر: (امیر مینائی)، عبدالقوی دسنوی، ڈاکٹر نعیم الدین، ڈاکٹر نعیم احمد (شہر آشوب) اور کئی دوسرے ادیب۔ کچھ ایسے بھی ہیں جنھوں نے خاص طور پر تحقیق کو اپنا موضوع نہیں بنایا ہے لیکن اس کے اصولوں اور طریق کار پر ان کی نظر ہے۔

اس مختصر جائزے کی بنیاد پر چند اہم نتائج نکالے جا سکتے ہیں اور مستقبل میں تحقیقی ادب کے ارتقا کے لئے انھیں پیش نظر رکھا جا سکتا ہے:

(۱) اگرچہ متنی تنقید کی طرف توجہ کی جا رہی ہے لیکن بہت سے اہم شعراء اور ادیبوں کے کارنامے یوں ہی پڑے ہیں۔ کاموں میں تکرار کی طرف رجحان ہے۔

(۲) متنی تنقید کے علاوہ تحقیق کے دوسرے پہلوؤں مثلاً حوالہ جات اور کتابیات کی تیاری بھی ضروری ہے۔

(۳) تحقیقی کاموں میں ادبی حسن بھی ملحوظ رکھنا مفید ہوگا۔

(۴) تحقیق سے دلچسپی رکھنے والوں کو لسانیات، تاریخ، لغت، سماجی علوم، معنی و بیان، ادبی اور شعری روایات کے ارتقاء کا علم بھی ہونا چاہیئے۔

(۵) اس وقت تک جو کام ہوا ہے وہ قابل قدر سہی لیکن اس کا بہت سا حصہ نہ تو معیاری ہے اور نہ تاریخ ادب میں اضافہ کرتا ہے۔ ضروری اور غیر ضروری، اہم اور غیر اہم میں تمیز کرنا بھی ضروری ہے۔

(۶) تحقیق میں کوئی بات حرف آخر نہیں، اس لیے اس وقت تک زبان و ادب کے سلسلے میں جو علمی کام ہوئے ہیں انھیں نئے کام کے لیے مواد ہی سمجھنا چاہیئے۔

(۷) ہمارے اچھے محققوں کو تحقیق کے طریق کار پر بھی اظہار خیال کرنا چاہیئے اور اپنے تجربوں سے نئے محققوں کو واقف کر کے ان کی راہ آسان بنانا چاہیے۔

(۸) یونیورسٹیوں میں جو مقالے لکھے جاتے ہیں، ان کے معیار کی طرف اور زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

■■

فنِ تمثیل کا آغاز و ارتقا — صفحہ ۱۷۹ کا بقیہ

وشنو جی نے چار ڈرامائی طرز ایجاد کر کے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اس کے بعد دیوتاؤں نے بھرت کو حکم دیا کہ وہ فن ڈرامہ پر ایک مکمل کتاب تیار کریں اور بھرت نے ناٹیہ شاستر لکھ کر اس حکم کی تعمیل کی۔

ہند قدیم کے ابتدائی ڈراموں کی بنیاد اگرچہ کرشن جی اور رام جی کے حالاتِ زندگی ہوا کرتے تھے لیکن ڈرامہ کے دوسرے لوازم بھی اسی عہد میں متعین ہو گئے تھے۔ چنانچہ بھرت نے فن تمثیل کی دوسری باریکیوں کی تشریح کے ساتھ ساتھ جذبات و احساسات کے اقسام بھی بتائے ہیں ناٹیہ شاستر میں ملاعب کی تعمیر کے متعلق بھی تفصیلی ہدایتیں ملتی ہیں۔ فن تمثیل اور اس کے متعلقات پر سنسکرت میں اور بھی کتابیں پائی جاتی ہیں۔

ہندستان کی سرزمین نے نہایت اعلیٰ پایہ کے تمثیل نگار بھی پیدا کئے مثلاً کالی داس، بھوبھوتی، بھاشن وغیرہ۔ ان تمام تمثیل نگاروں کا عہد سن عیسوی سے قبل کا ہے ان تمثیل نگاروں نے اپنے ڈراموں میں حسین تشبیہات و استعارات، دل آویز ترکیبوں اور منظر نگاری سے جو دلکش مرقعے پیش کئے ہیں انہوں نے انھیں دنیا کے ممتاز تمثیل نگاروں کی صف میں ہمیشہ کے لئے جگہ دیدی ہے۔

□□

ترقی ہی ترقی ہو رہی ہے علم و دانش کی
فروزاں نیتر ادراکِ انساں ہوتا جاتا ہے

——— منہاؔل رضوی

نصیر الدین ہاشمی

ہشت چمن : لکھنؤ کی ایک قدیم نثری داستان

"نصیر الدین ہاشمی دکنیات کے ماہر اور مخطوطات کی دریافت میں اہم ترین شخصیت تھے، ان کی کتاب "دکن میں اردو" کچھ تسامحات کے باوجود بے حد اہم ہے۔"

ایڈیٹر

کتب خانہ نواب سالار جنگ (حیدر آباد) میں ایک قلمی نثری داستان "ہشت چمن" کے نام سے موسوم محفوظ ہے۔ اس کی تصنیف امجد علی شاہ (۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۷ء) والیٔ اودھ کے زمانے میں ہوئی ہے۔ امجد علی شاہ اپنے خاندان کے دوسرے فرمانرواؤں کی طرح علم و فن کے سرپرست تھے اور مصنفین اور شعراء کو ان کی کاوشوں کا صلہ دے کر نہال کرتے تھے۔

اس داستان کے مصنف لالہ گنگا پرشاد ہیں۔ چونکہ ڈاکٹر گیان چند صاحب کی کتاب "اردو کی نثری داستانیں" میں اس کا تذکرہ نہیں ہے اس لئے یہاں اس پر مختصر روشنی ڈالی جاتی ہے:

لالہ گنگا پرشاد، لالہ روشن لال کے فرزند تھے اور لالہ روشن لال امجد علی شاہ کے دیوان تھے۔ گنگا پرشاد کو داستان گوئی کا شوق تھا۔ اسی شوق کے مدنظر اس کتاب کی تصنیف ہوئی۔ یہ کتاب ½۱۱ × ۷، سائز کے ۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے دیباچہ سے کئی امور واضح ہوتے ہیں اسلئے اس کا ایک اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے:

"اب کیفیت قلم اور پرشاخسار وصف شہریار گردوں وقار کی مترنم اور شور افگن ہے اور قمری زبان زیبِ مدح ابو المظفر مصلح الدین ثریا جاہ سلطان عادل خاقان زماں محمد امجد علی شاہ بادشاہ غازی کی کوکر زن۔ سبحان اللہ کیا بادشاہ جم جاہ ہے کہ نگاہ اس کی فیض دستگاہ ہے اور وہ خلائق کا پشت و پناہ کسی بشر کو عہد دولت میں اسکے محتاج نہیں پایا.... اما بعد راقم ژولیدہ بیان ضعیف البنیان احقر العباد بندہ گنگا پرشاد واسطے دلچسپی کے عالم بے شغلی میں ساتھ شغل تحریر اس قصہ عجیب کے مشغول ہوتا ہے اور رنگین خیالان چمن زار نکتہ دانی سے آرزو مند قبول گلگشت نصیبان بہاریں طبع بہارستان معانی سے امید یہ ہے کہ اس بہارستان رو کش گلہائے فردوس کو کہ ساتھ نام ہشت چمن کے موسوم ہے بشکر..... عبوبت بینی سے پامال نہ فرمائیں اور افواج اخزاں یعنی سہو و خطا سے برگ ریزاں نہ کریں"۔

دیباچہ کے بعد ترقیمہ کی عبارت ملاحظہ ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گنگا پرشاد روشن لال کے فرزند تھے:

"الحمد للہ والمنۃ کہ کتاب مستطاب المسمی بہ ہشت چمن بزبان اردو من تصنیف ابلغ البلغا افصح الفصحا لالہ گنگا پرشاد صاحب خلف دیوان روشن لال.... (اسکے بعد آدھی سطر کی عبارت پڑھی نہیں جاتی) تمام شد۔ فقیر، حقیر خاکپائے اہل قلم از فرمائش جمعدار محمد یوسف صاحب دام اللہ ظلالہ.... باتمام رسید بتاریخ بست و پنجم بروز جمعہ از دست عوثو میاں عاصی وکثیف تحریر نمود۔ باللہ التوفیق.... تحریر شہر محرم الحرام ۱۲۶۵ھ"

یہ داستان آٹھ باب یعنی آٹھ چمن پر منقسم ہے۔ اس لیے اس کو ہشت چمن سے موسوم کیا گیا ہے۔ پہلے چمن کے افسانہ کا خلاصہ یہ ہے:

ایک بادشاہ تھا جو عدل اور انصاف میں مشہور تھا۔ اسکے پاس

ملک ، مال بے حساب تھا مگر اولاد نہیں تھی۔ شب و روز دعا کرتا۔ آخر اس کی دعا قبول ہوئی اور فرزند تولد ہوا۔ فرزند کی پرورش اور تعلیم ہوتی رہی۔ جب جوان ہوا تو ملک دکن کی ایک شہزادی کے حسن کی تعریف سن کر نادیدہ عاشق ہوگیا اور اپنی معشوقہ کو حاصل کرنے کے لئے سفر کرنے کا ارادہ کیا۔ ماں باپ نے بہت کچھ فہمائش کی مگر نصیحت کارگر نہ ہوئی۔ فہمائش کا اثر نہ ہوا اور وزیرزادے کو ساتھ لے کر معشوقہ کی جستجو میں چل پڑا۔ راستہ میں کئی مصیبتیں پیش آئیں۔ اولاً ایک ناگ نے شہزادہ کو ڈس لیا۔ وزیرزادہ تمام دن اور ساری رات خدا کی درگاہ میں عاجزی سے دعا کرتا رہا۔ آخر دعا قبول ہوئی۔ ایک درویش ادھر سے گزرا اور واقعات سن کر شہزادے کی لاش کو ایک ٹھوکر ماری۔ ٹھوکر کھاتے ہی شہزادہ زندہ ہوگیا۔ وزیر زادے سے کل واقعات سن کر اس کی دوستی اور رفاقت کا معترف ہوا اور پھر سفر پر روانہ ہوگیا۔ ایک شہر میں پہنچ کر ایک مکان میں دونوں مقیم ہوئے۔ رات کو شہزادہ نے مکان کی چھت پر آرام کیا۔ اتفاقاً ایک پری کا تخت ادھر سے گزرا۔ پری، شہزادہ کا جلوہ دیکھتے ہی اس پر ہزار جان سے عاشق ہوگئی اور شہزادہ کے پلنگ کو اپنے تخت پر رکھ کر لے اڑی۔ صبح جب بیدار ہوکر شہزادہ نے وزیرزادے کو نہ پایا اور اپنے آپ کو ایک نئی جگہ دیکھا تو بہت پریشان ہوا۔ آخر پری نے جو ماہ رخ کے نام سے موسوم ہے سارا راز کھولا اور شہزادے سے وصل کی طلب گار ہوئی۔ شہزادہ داد عیش دینے پر راضی نہیں ہوا اور کہنے لگا کہ جب تک میں اپنی محبوبہ سے نہ مل لوں گا مجھے دنیا کی کوئی خوشی اور مسرت شاد نہیں کرسکتی۔ ماہ رخ یہ سن کر خفا ہوگئی اور شہزادہ کو ایک گھنے جنگل کے ایک کنویں کے اندر قید کردیا۔ ادھر وزیرزادہ نے جب شاہزادہ کو نہ پایا تو بہت حیران ہوا۔ چاروں طرف شاہزادہ کو ڈھونڈتا رہا مگر پتہ نہ چلا۔ آخر پریشان ہوکر خدا کی درگاہ میں دعا کرنے لگا۔ ایک بار دعا پھر قبول ہوئی اور وہ جب سو گیا تو خواب میں دیکھا کہ شہزادہ ایک جنگل میں قید ہے۔ خواب سے بیدار ہوکر وزیرزادہ شہزادہ کی تلاش میں روانہ ہوا۔ چلتے چلتے ایک ایسے جنگل میں پہنچا جو جنگلی جانوروں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر رات کے وقت درندوں سے محفوظ رہنے کے لئے اس نے ایک درخت کے اوپر پناہ لی۔ تھوڑی دیر بعد ایک مینا اور طوطے نے اس درخت پر اپنا بسیرا کیا اور آپس میں کہنے لگے کہ میں جس شاخ پر بیٹھا ہوا ہوں اگر کوئی اس کو اپنے پاس رکھ لے تو وہ لوگوں کی نظر سے پوشیدہ ہو جائے گا۔ طوطے نے کہا جس شاخ پر میں بیٹھا ہو ں

اس کو اپنے پاس رکھ کر کوئی خواہش کی جائے تو وہ پوری ہوگی۔ وزیرزادہ نے یہ سن لیا اور صبح جب طوطا مینا اڑ گئے تو درخت کی دونوں شاخیں تراش کر اپنے پاس رکھ لیں اور جنگل سے روانہ ہوا۔ چلتے چلتے ایک ایسے شہر پہنچا جہاں کوئی آدم زاد نہیں تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ وزیرزادہ کو ایک وسیع محل دکھائی پڑا اور وہ اس کے اندر چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ ایک حسینہ کی لاش پلنگ پر رکھی ہوئی ہے۔ وزیرزادہ چار دن اس محل میں رہا اور درختوں کے میوے کھا کر رات کو سوتا رہا۔ آخر پانچویں دن ساتھ لائی ہوئی درخت کی شاخ کو آزمانے کا ارادہ کیا اور لاش کے پاس جاکر اس حسینہ کے زندہ ہونے کی خواہش کی۔ اس خواہش کے ساتھ ہی حسینہ زندہ ہوگئی اور وزیرزادے سے بتایا کہ میں ایک بادشاہ کی لڑکی ہوں اور مجھے ایک دیو نے یہاں قید رکھا ہے۔ جب دیو محل سے جاتا ہے تو جادو سے مجھے مردہ کر دیتا ہے اور جب آتا ہے تو زندہ کرلیتا ہے۔ شہزادی باتیں کر ہی رہی تھی کہ ہوا چلنے لگی اور دیو آگیا۔ یہاں وزیرزادہ کے پاس درخت کی شاخ تھی اس کو دیو نے دیکھا نہیں اور وزیرزادہ نے دیو کو ضرب شمشیر سے دو ٹکڑے کردیا۔ اس کے بعد شہزادی اور وزیرزادہ دونوں کچھ عرصہ تک اس محل میں اقامت گزیں رہے۔ پھر شہزادی نے وزیرزادہ کو ایک گھوڑا دے کر کہا کہ اس پر سوار ہوکر راستہ طے کیا جائے مگر گھوڑے کو چابک ماری جائے۔ کئی میل راستہ طے کرنے پر وزیرزادہ نے بھولے سے گھوڑے کو ایک چابک ماردی۔ چابک کا لگنا تھا کہ گھوڑا وزیرزادہ کو لے کر ہوا میں اڑ گیا اور ایک سمندر میں اسے گرا کر غائب ہوگیا۔ جب وزیرزادہ سمندر کی لہروں میں غوطے کھانے لگا تو بارگاہ رب العزت میں دعا کی۔ دعا قبول ہوئی اور کشتی وزیرزادہ کو مل گئی۔ اس کے ذریعہ وہ کنارے پر پہنچا اور کئی دن کی مسافت طے کرنے کے بعد ایک فقیر کی قیام گاہ ملی۔ فقیر نے وزیرزادہ کو ایک دعا بتائی اور کہا اسے پڑھ کر تمہاری مشکل آسان ہوجائے گی اور تم اپنے آقازادہ سے ملاقات کروگے۔ فقیر نے یہ بھی کہا کہ یہاں سے بیس منزل کے بعد ایک دوراہہ ملے گا۔ اس دوراہے کے سیدھے طرف جانا، بائیں طرف قدم بھی نہ رکھنا۔ وزیرزادہ جب بیس منزل طے کر کے دوراہے پر پہنچا تو فقیر کی راہنمائی یاد نہ رہی۔ بجائے سیدھے طرف جانے کے بائیں طرف چلنے لگا۔ دس بیس کوس چلا ہوگا کہ ایک دیو کوہ پیکر نمودار ہوا اور وزیرزادہ کو اپنا لقمہ بنانا چاہا۔ وزیرزادہ دعا پڑھ کر دیو سے کشتی لڑنے لگا اور اسے ہرا دیا۔ اس پر دیو بہت حیران ہوا اور اس واقعہ کی اطلاع اپنے بادشاہ کو دی۔ بادشاہ نے

حکم دیا کہ آدم زاد (وزیرزادے) کو گلستان ارم میں رکھو۔ گلستان ارم بادشاہ کی عشرت گاہ تھا۔ بیسیوں پریاں یہاں رہا کرتی تھیں۔ ایک پری جس کا نام سبز پری تھا وہ وزیرزادے پر عاشق ہو گئی لیکن اپنی ایک عزیز اور راز دار سہیلی کے مشورہ سے اس نے اپنے عاشق کو پوشیدہ رکھا۔ اس کے بعد راز دار سہیلی نے مشورہ دیا کہ جب بادشاہ مصروف عیش و نشاط ہو، شراب اور کباب کا شغل ہو تو رقص کر کے بادشاہ کو خوش کرے اور اس سے انعام میں آدم زادے کو مانگ لے۔ سبز پری نے اس کے کہنے کے مطابق عمل کیا۔ بادشاہ اس کے رقص سے بہت خوش ہوا اور کہا "مانگ کیا مانگتی ہے؟" اس پر سبز پری نے وزیرزادے کو انعام میں مانگا۔ بادشاہ یہ سن کر بے حد غضب ناک ہوا مگر کہا کہ میں زبان دے چکا ہوں اس لئے وزیرزادہ تجھے عنایت کیا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ بادشاہ نے یہ بھی حکم دیا کہ سبز پری اور اس کے عاشق وزیرزادہ کو شمال کے جانب پھینک دیا جائے۔ حکم کی تعمیل ہوئی اور دونوں غلطاں و پیچاں اس دور اہے پر گرے جہاں سے وزیرزادہ نے غلطی کی تھی۔ یہاں ایک حوض مصفّا پانی کا نظر آیا۔ وزیرزادہ حوض میں نہایا اور نماز پڑھی۔ اب پری نے اس سے بتایا کہ میں گلستان ارم کی مشہور سبز پری ہوں اور تجھ پر عاشق ہو کر میں نے یہ دن دیکھا ہے۔ وزیرزادہ نے بھی اپنا سارا حال بیان کیا۔ سبز پری نے کہا کہ تمام پریاں اور دیو، تہور شاہ بادشاہ اجنہ کے زیر حکم ہیں۔ اگر تہور شاہ چاہے تو شاہزادہ کو رہائی مل سکتی ہے۔ مگر بادشاہ کے چوکیدار آدم خوار دیو ہیں اس لئے اس تک پہنچنا دشوار ہے۔ وزیرزادہ نے کہا مجھے ایک اسم اعظم یاد ہے جس کے باعث مجھے دیو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ غرض وزیرزادہ اسم اعظم کے زور سے تہور شاہ کے دربار میں پہنچا اور بادشاہ اجنہ کی نظر اس پر پڑی۔ بادشاہ نے وزیر کو حکم دیا کہ اس تازہ وارد کو میرے سامنے لایا جائے۔ وزیرزادہ بادشاہ کے حضور میں پہنچا اور شروع سے آخر تک اپنا حال بیان کیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ ماہ رخ پری کو حاضر کیا جائے۔ چنانچہ وہ حاضر ہوئی۔ بادشاہ زادہ بھی طلب کیا گیا اور وزیرزادہ سے اس کی ملاقات ہوئی۔ وزیرزادے کی وفاداری کا حال سن کر وہ بہت خوش ہوا۔

اس نوبت پر پہلا چمن ختم ہوتا ہے اور دوسرے چمن شروع ہوتے ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے۔

شہزادہ، وزیرزادہ اور سبز پری منزل مقصود کی طرف روانہ ہوتے ہیں اور پھر مختلف نہج کے واقعات پیش آتے ہیں۔ بیچ بیچ میں دیو اور پریوں کے کئی اور قصے آتے ہیں۔ شہزادہ اور وزیرزادہ متعدد آفتوں سے دوچار ہوتے ہیں۔ کبھی جادو کے زور سے پرند بنا دیے جاتے ہیں اور کبھی رہائی پاتے ہیں۔ آخر شہزادہ اپنی محبوبہ کو حاصل کر کے خوش و خرم اپنے ملک واپس ہوتا ہے۔

داستان کے اسلوب بیان اور زبان کے اندازہ کے لئے مختصر طور پر داستان کی عبارت کا کچھ نمونہ پیش کیا جاتا ہے:

"بلبلان شیفتہ گلہائے چمنستان قصص رنگینی اور قمریان فریفتہ سروستان حکایات دل نشینی کی یوں بیان کیا ہے کہ بیچ شہر مینو سواد فردوس آباد کے ایک شہریار تھا مشہور خاص و عام میں.... رضوان شاہ نام گلستان سلطنت نسیم عنبر شمیم اقبال لایزال اوسکے سے شگفتہ و خنداں تھا اور بوستان خلافت آبیاری سحاب جاہ جلال اوسکے سے سرسبز تھا۔"

"بے اختیار ہو کر تخت کو اوتار لائی اور دو گھڑی تک اوسکے پلنگ کے نیچے بیٹھی صورت اوس کی دیکھتی رہی۔ آخرش استیلائے اشتیاق میں پلنگ شاہزادے کو تخت پر رکھ کر اپنے مکان میں لے گئی۔ بعد چار گھڑی شاہزادہ کی آنکھ کھلی۔ کیا دیکھتا ہے کہ نہ وہ مکان ہے نہ وہ سامان۔ یہاں نقشہ اور ہے۔ مانند نقش دیوار متحیر ہوا۔ ماہ رُخ نے دیکھا کہ شہزادہ حیران ہے۔ دوری یار و دیار سے اس کو پریشانی ہے۔ اب بغیر افشائے راز کوئی تدبیر اطمینان اس نوجوان کی نظر نہیں آئی۔ آخر کار حال تعشق اپنا مفصل بیان کیا۔ شہزادہ نے مطلق جواب نہ دیا۔ پری نے سمجھا کہ ابھی تازہ وارد ہے، اسے زیادہ چھیڑنا مناسب نہیں۔ دو تین روز تک سب نعمتیں دنیا کی واسطے شہزادہ کے موجود ہوتی رہیں لیکن کسی چیز سے ملتفت نہ ہوا۔"

آخری چمن کے آخری حصہ کا اقتباس یہ ہے:

"آخرش شہزادہ، وزیرزادہ و سبز پری کو با چشم اشکبار رخصت کیا۔ لشکر شاہزادہ کا بعد چند روز کے خانہ خسرا دل میں پہنچا۔ بادشاہ نے تمام لشکر کی دعوت کی اور شاہزادہ اور وزیرزادہ کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ سوائے ملکہ ماہ رُخ اور سبز پری کے محل میں حسب الحکم بادشاہ کے اتارے اور ملاقات ملکہ ماہ رُخ کی محل اول سے ہوئی۔ اس طرف بھی شرائط ظاہر داری جو مناسب تھے ادا ہوئے اور طرف ثانی سے بھی جو قواعد محبت و جہاں داری کے چاہیے ظہور میں آئے۔"

(باقی صـ۲۳۲ پر)

جعفر علی خاں اثر لکھنوی

لکھنؤ کے چند الفاظ اور محاورے

نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی تہذیب کا مُرقع تھے، شاعر، محقق اور اُردو میں عملی تنقید کا مشرقی انداز پیش کرنے والے اہم نقاد تھے انھوں نے میر کا انتخاب "مضامینِ میر" کے نام سے شائع کیا۔
ایڈیٹر

"سرمایۂ زبانِ اُردو" اور نورُاللغات اُردو کی دو مشہور کتبِ لغات ہیں۔ پہلی حضرت جلال لکھنوی کی تالیف ہے اور دوسری جناب نورالحسن نیّر کاکوروی کی۔ یہ دونوں کتابیں اپنی جگہ نہایت اہم ہیں۔ خصوصاً اس لیے کہ یہ انفرادی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ لیکن مجھے ان کتابوں میں مندرج متعدد الفاظ کے معانی و مفہوم سے اختلاف ہے۔ میں نے اپنے خیالات کو تحریر میں لانا شروع کیا تو اس نے ایک کتابی صورت اختیار کرلی جو فرہنگِ اثر (حصہ اول و دوم) کے نام سے شائع ہوگئی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے لیے حکومتِ اترپردیش نے ایک عطیہ بھی دیا، جس کا اعتراف میں فرہنگِ اثر میں کرچکا ہوں۔

کتاب کی اشاعت کے بعد میں نے نوراللغات کو پھر دیکھنا شروع کیا تو ایسا محسوس ہوا کہ اس میں اب بھی بہ کثرت ایسے الفاظ اور محاورات ملتے ہیں جن کے معنی صحیح نہیں لکھے ہیں یا جن امثال، محاورات اور الفاظ کو لکھنؤ سے منسوب کیا گیا ہے وہ یہاں دوسری طرح سے بولے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سے ایسے امثال، محاورات اور الفاظ بھی ہیں، جو نوراللغات میں درج ہی نہیں ہیں۔ میں نے ایسے امثال، الفاظ اور محاورات پر پھر لکھنا شروع کیا تو ان کی ایک طویل فہرست بنتی جارہی ہے۔ ذیل میں اِدھر اُدھر سے صرف چند امثال، محاورات اور الفاظ پیش کیے جارہے ہیں جن کے لکھنؤ میں وہ معنی و مفہوم نہیں ہیں جو نوراللغات میں درج ہیں، یا یہاں بدلی ہوئی صورت میں مستعمل ہیں:

سُوپ تو سُوپ چھلنی کیا بولے جس میں بہتّر سو چھید:
مثل (عو)۔ کسی مبتذل آدمی کے دخل درمعقولات دینے پر بولتی ہیں۔
اثر: صحیح مثل اس طرح ہے: "سوپ بولے تو بولے چھلنی بھی بولی جس میں بہتّر (نہ کہ بہتر سو) چھید۔" (اودھ پنچ)

پُروا: پورب کی ہوا۔ وہ ہوا جو پورب کی طرف سے پچھم کی طرف چلے۔
اثر: لکھنؤ میں پُروا کے علاوہ پُروائی بھی ہے "ہَوا پروائی ہے" برابر مستعمل ہے۔ پُروا کی ایک صورت پروائی فیلن میں بھی درج ہے

تھوتھا: (دہلی) اندر سے خالی، بے مغز۔
اثر: لکھنؤ میں اس کے معنی ہیں بھیگا ہوا، تر بہ تر۔ شلاً "بچے نے دری موت موت کے تھوتھا کردی"۔ یہی مفہوم تھکا کرنے سے بھی ادا ہوتا ہے۔ یہ مفہوم بھی درج نہیں۔

دوڑا دوڑی: (عم) بھاگا بھاگ۔
اثر۔ لکھنؤ میں دوڑا دوڑ بولتے ہیں اور بھاگا بھاگ کی جگہ بھاگم بھاگ بھی۔

اڑاڑڑرا دھڑیم: کسی کے بے تحاشا گرنے کی آواز۔

اشؔر ۔ لکھنؤ میں اڑاڑادھڑیم بولتے ہیں۔ یا اڑاڑڑادھڑیم ۔ رائے دوم بجائے ثقیلہ کے مہلہ ۔

کھلے بندھن : (لکھنؤ) کنایہ اس شخص سے جو آزاد ہوا اور پابند کسی چیز کا نہ ہو۔

اشؔر ۔ لکھنؤ میں کھلے بندھن نہیں بلکہ کھلے بندوں بولتے ہیں جس کی مثال میں خود ہی گلزار نسیم کا یہ شعر پیش کیا ہے ؎

کہہ کر کھلے بندوں جی کی تنگی
بے ننگ ہوئی وہ شوخ ننگی

اوت : (واو معروف) وہ شخص جو جوان ہو کے بن بیاہا مر جائے۔

اشؔر ۔ منتخب اللغائس میں صاف صاف لکھا ہے کہ یہ تصباتی زبان ہے۔ علاوہ برایں جوان یا بوڑھا ہونا یا مرنے کی قید نہیں ۔ اوت ہر اس شخص کو کہتے ہیں جو بن بیاہا ہو ۔ جوان ہو یا بوڑھا ۔

کُتّے خسّی : (بہ ظاہر کتّے کشّی کا بگڑا ہوا ہے جو ذلیل لوگوں کا کام ہے)۔ ذلیل کام ۔ بے عزتی کا کام ۔ جھگڑے کا کام ۔

اشؔر ۔ اس کا املا کتّے خصی ہے ۔ کتّے کو خصی یا بدھیا کرنا جو ایک بیکار سی بات ہے ۔ محاورے کی بنیاد ایک طویل قصّے پر ہے کہ ٹھگوں نے خصی بکرے کو کتا کہہ کہہ کر ایک شخص سے بکرے کو پھنکوا دیا اور خود دبا بیٹھے ۔ پورا محاورہ خالی کتّے خسی (خصی) نہیں ہے بلکہ کتّے خصی میں پڑتا ہے یا کتّے خصی میں کون پڑے ۔

اُلٹ پلٹ : مونث (ع و) الٹا سے الٹ ۔ پلٹا سے پلٹ دونوں حاصل مصدر یہاں تابع متبوع کے طور پر ہیں ۔

اشؔر ۔ مجھے اتفاق نہیں ۔ الٹ کی طرح پلٹ کو بھی بضم اوّل بولتے ہیں اور تابع مہمل قرار دیتے ہیں ۔ ایسے بہ کثرت دیگر الفاظ ہیں مثلاً الگ تھلگ ۔ ٹالا بالا ۔ چہکوں پہکوں (رونا) وغیرہ ۔ فیلن کی ڈکشنری بھی میری مؤید ہے ۔ الٹ پلٹ کا اندراج اس طرح ہے ۔ ULAT PULAT نہ کہ ULAT PALAT اسی کے مطابق پلیٹس میں بھی اندراج ہے اور یہی لکھنؤ کی بولی ہے ۔ کھانے کی ایک قسم اُلٹے پُلٹے (ہر دو بضم اوّل) ہے نہ کہ پلٹے بالفتح اوّل ۔ نور اللغات میں اُلٹے پُلٹے درج ہی نہیں ۔

الماس خانی : ایک قسم کے کرتے ہوتے ہیں ۔

اشؔر ۔ حسب اودھ پنچ یہ ایک قسم کی بڑی اینٹ ہے جو لکھنؤ میں ایک شخص الماس علی خاں نے ایجاد کی تھی ۔

الما غونچی : وہ شخص جس کے نام نسب کا ٹھکانا نہ ہو ۔ ۲ ۔ خراب اور ناکارہ چیزیں ۔ الم غلم ۔ ۳ ۔ دغابازی اور دھاندھلی سے کوئی چیز دبا بیٹھنے اور اڑا لینے کے موقع پر بھی بولتے ہیں ۔

اشؔر ۔ میرے پاس ایک لغت ہے (نام نامعلوم) اس میں الما غونچی کے معنی واہیات، خرافات، بیہودہ باتیں درج ہیں ۔

آباد : ۴ ۔ رونق ۔ چہل پہل ۔ غالبؔ ؎

کم نہیں جلوہ گری میں تیرے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

اشؔر ۔ شعر میں آباد کے معنی رونق یا چہل پہل نہیں ۔ یہ مفہوم جلوہ گری میں آگیا ۔ آباد سے شعر میں لوگوں کی کثرت، بھیڑ بھاڑ کی طرف اشارہ ہے ۔

آتش عناں : تیز رو ۔

اشؔر ۔ اتنی تشریح کرنا چاہئے تھی کہ صرف تیز رو گھوڑے کیلئے مستعمل ہے ۔

آگ میں پھونک ڈالنا : آگ میں ڈال کر جلا دینا ؎

جو وہ کرتے ہیں مرا امتحان پڑے بیچ والے نہ درمیاں
اگر آگ میں بھی وہ پھونک دے تو خلیل کچھ مجھے ڈر نہیں

اشؔر ۔ مثال ہی سے ظاہر ہے کہ محاورہ آگ میں پھونک دینا ہے نہ کہ آگ میں پھونک ڈالنا ۔

آم گٹھلی کی بھینٹ ہوئی جاتی ہے ۔ آم گٹھلی کا کیا ساتھ نہ ہوگا : گٹھلی پکانے میں آم کی کھٹائی دی جاتی ہے ۔ اس وجہ (سے) آم گٹھلی کا ساتھ کہا گیا ہے ۔ جب کوئی کسی کو زک دے کر چل دیتا ہے یا چھپ رہتا ہے تو، زک اٹھانے والا کہتا ہے ۔ یعنی پھر بھی تو ملاقات ہوگی اس وقت سمجھ لونگا ۔

اشؔر ۔ لکھنؤ میں اس طرح کوئی نہیں بولتا ۔ دیہات کی زبان ہو تو ہو ۔ ایک بات اور ہے یہاں گٹھلی پکانے میں کھٹائی ڈالی ہی نہیں جاتی ۔

آنسو چلنا : آنسو بہنا (فقرہ) بے اختیار آنکھوں سے آنسو چلنے لگے ۔

اشؔر ۔ معلوم کہاں کی زبان ہے ۔ لکھنؤ میں آنسو امنڈ آئے، یا ٹپک پڑے یا بہنے لگے، بولتے ہیں ۔ آنسو چلنا ہرگز نہیں ۔

اسی طرح "آنسو ڈالنا" مہمل ہے ۔ کسی نامعلوم شاعر کا یہ شعر ثبوت نہیں ہو سکتا ؎

" شمع روئے قبر پر، گل رو رہا رہے واسطے
حیف تو ڈالے نہ دو آنسو ہمارے واسطے"

آنکھ اونچی نہ ہونا: نگاہ نہ اٹھنا ضعف سے۔ مصحفیؔ ؎

اے مسیحا اب تو پہنچا ہے نقاہت سے یہ حال   آنکھ اونچی ہو نہیں سکتی ترے بیمار سے

اشرؔ۔ خود شعر سے ظاہر ہے کہ یہ مفہوم آنکھ اونچی ہو نہ سکنا سے نکلتا ہے نہ کہ آنکھ اونچی نہ ہونا سے۔

ابھی چھٹی کا دودھ نہیں سوکھا: کسی کے لڑکپن، نادانی، ناتجربہ کاری ظاہر کرنے کو طنزاً کہتے ہیں۔

اشرؔ۔ عموماً اس طرح بولتے ہیں: "ابھی منھ سے دودھ کی بو آتی ہے۔"

اتر جانا: لازم۔ ۲۔ دبلا ہو جانا۔

اشرؔ۔ یہ مفہوم بغیر منھ یا چہرے کا اضافہ کئے نہیں ادا ہوتا۔ خود مثال میں "بچے کا منھ اتر گیا" درج ہے۔

سانپ مرے نہ لاٹھی ٹوٹے: دفع شر بھی ہو جائے اور کوئی نقصان نہ پہنچے۔

اشرؔ۔ صحیح مثل اس طرح ہے: "سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے" مندرجہ معنی یوہیں ادا ہوتے ہیں۔

غڑاپ سے: جلد۔ پھرتی سے (رویائے صادقہ) یقین ہے یہ شخص کسی وقت غڑاپ سے بھنور میں جا رہے گا۔

اشرؔ۔ یہ فقرہ صرف پانی میں اچانک گرنے اور ڈبکیاں کھانے پر استعمال ہوتا ہے جیسا کہ خود پیش کردہ مثال سے واضح ہے۔

رگڑا جھگڑا: فساد۔ بحث تکرار۔ لڑائی بھڑائی۔ (انشاؔ) ؎

مجھ میں اور آپ میں رہتے ہیں جو رگڑے جھگڑے
آپ ہی ان کو نبیڑیں تو نبڑ سکتے ہیں

اشرؔ۔ شعر ہی سے ظاہر ہے کہ مستعمل رگڑے جھگڑے بصیغۂ جمع ہے۔

ایسے تو میری جیب میں پڑے رہتے ہیں: یعنی میں تم سے زیادہ ہوشیار ہوں۔ میں تمہارے دم میں نہیں آسکتا۔

اشرؔ۔ یہ روزمرّہ اس طرح بھی ہے، "ایسے تو میرے ناخونوں میں ہیں۔"

چیز بست: اسباب۔ جنس۔

اشرؔ۔ بول چال میں "چیز بس" ہے۔

تسلّط: حکومت۔ قبضہ۔ دخل (بیٹھنا بٹھانا کے ساتھ)

اشرؔ۔ "جمانا" کے ساتھ بھی بولتے ہیں۔

آدبا لینا: دبوچ لینا۔ پکڑ لینا۔

اشرؔ۔ یہ آدبانا ہے۔ آدبا لینا کوئی نہیں بولتا۔

آگرنا: گر پڑنا۔ رات کو ایک آدمی کنوئیں میں آگرا۔

اشرؔ۔ یہاں گر پڑا بولیں گے نہ کہ آگرا۔

آب: شراب ؎

آب حیات بن گئی ناسخ شراب صاف   جو اس نے جام آب سے اپنے لگائے ہونٹ

اشرؔ۔ یہ محض شاعری ہے۔ خالی آب کو شراب کوئی نہیں کہتا۔

آبلہ پیدا ہونا: چھالا نکلنا۔ پھپھولا نمودار ہونا۔

اشرؔ۔ یہ کوئی محاورہ نہیں۔ "آبلہ پڑتا ہے" ورنہ آبلہ نمودار ہونا بھی محاورہ ہے۔

آبلہ ڈالنا: چھالا پیدا کرنا۔ ذوقؔ ؎

نہ ڈال آبلے، اے گرمیٔ فغاں منھ میں
کہ چپکے بیٹھ رہوں منھ میں گھنگنیاں بھر کے

اشرؔ۔ یہ آبلے ڈالنا بصیغۂ جمع ہے جیسا کہ خود پیش کردہ مثال سے واضح ہے۔ نیز شعر آتشؔ ؎

اس قدر مجھ سے زمانے کی ہوا ہے برخلاف
کیا عجب بوے حنا ڈالے بدن میں آبلے

آپ: اشارہ خدائے تعالیٰ کی ذات کی طرف (نکہت) ؎

وہی آئینے میں وہی سنگ میں ہے   غرض آپ ہی آپ ہر رنگ میں ہے

اشرؔ۔ خدا کی طرف شعر میں اشارہ لفظ "وہی" سے ہوتا ہے نہ کہ لفظ "آپ" سے۔

آپ تو گرم کر کے شربت پلاتے ہیں: آپ کو ابھار کر دھیما کرنا خوب آتا ہے۔ ذوقؔ ؎

لطف بوسہ نہ رہا، ہم پہ ہوا جب تو گرم   شربت قند دیا کر کے پر آتش خوگرم

اشرؔ۔ محاورہ صرف "گرم کر کے شربت ملانا" ہے۔ باقی الفاظ جزو محاورہ نہیں۔

آڑا لگا لینا: جو پتنگ کسی طرف کو زیادہ جھکا ہو اس کو ڈور دیکر روکنا اور ہوا کی تہ پر لے آنا۔

اشرؔ۔ لکھنؤ میں اسے بھپکا دے کر سیدھا کرنا کہتے ہیں۔

آڑا لگنا: پتنگ کا آڑا اڑنا۔

اشرؔ۔ لکھنؤ میں اسے بچرنا، دبنا، یا اڑانا کہتے ہیں۔

آڑا ماننا: پتنگ کا دہنے یا بائیں کسی طرف رخ دے کر اڑتا۔

اشرؔ۔ لکھنؤ میں کہیں گے کہ دہنے یا بائیں کو دبتا ہے۔ کنکوا پیچ لڑانے میں رُخ دے کر کھینچا بھی جاتا ہے۔

تحفۂ معجون۔ طرفہ معجون : عجیب شخص۔ مسخرا۔

اشر ۔ لکھنؤ میں طرفہ معجون مستعمل ہے۔

مناہی : بفتح اوّل و کسر چہارم۔ منع کی ہوئی چیزیں۔ ناجائز امور۔ خلافِ شرع کام۔ اس معنی میں لکھنؤ میں مذکر، دہلی میں مؤنث ہے۔

اشر ۔ جہاں تک مجھے علم ہے لکھنؤ میں اس موقع پر مناہی مستعمل ہی نہیں۔ منہیات بولتے ہیں یا دامر و نواہی۔

مناہی بہ معنی ممانعت کی صحت میں شک نہیں مگر یہ بلا اختلاف مؤنث ہے (مرزا رسوا)

شامل حال اس کے تائید الٰہی ہوگئی   باغ میں گل چیں کے آنے کی مناہی ہوگئی

لکھنؤ کے عوام مناہی کی جگہ منادی بھی بولتے ہیں۔

ٹوٹی بانہہ گل جندرے : جب بانہہ ٹوٹ جاتی ہے۔ اس کو پٹی باندھ کر گلے میں لٹکا لیتے ہیں۔ اس پٹی کو جس میں ہاتھ ڈالتے ہیں گل جندرا کہتے ہیں۔ دہلی۔ مثل۔ اس خراب ناقص چیز کے لیے بولتے ہیں جس کو ترک نہ کر سکیں۔ غریب یا اپاہج کا بارِ کفالت اس کے آسودہ بھائی بندوں کے ذمے پڑتا ہے۔

اشر ۔ اول تو یہ لفظ جندرے رائے مہملہ سے نہیں بلکہ جندڑے رائے ثقیلہ سے ہے۔ دوسرے یہ مثل آخر میں لفظ "پڑی" کے اضافہ کے ساتھ ہے تیسرے اس کا استعمال دہلی تک محدود نہیں۔ عورتیں لکھنؤ میں بھی بولتی ہیں یا بولتی تھیں۔ اودھ پنچ کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو : "ٹوٹی بانہہ گل جندڑے پڑی۔ حکیم اور کہار دونوں مجبور، جس طرح بنا ٹھاکر کو ٹھکانے لگایا۔"

ایک بات اور ہے جب یہ لفظ تنہا استعمال ہوتا ہے تو اس کا تلفظ یائے مجہول کے بجائے یائے معروف سے ہوتا ہے۔ بہ معنی جان یا زندگی۔ دیکھیے فیلن۔ اس نے بھی اسے عورتوں کی زبان قرار دیا ہے۔

چیتا : (ع و) ذہن۔ حافظہ۔

اشر ۔ عورتوں میں چیتا۔ معنی دل ہے۔ "اگر چیتا ٹھکانے رہا اور افکار کے ہجوم سے مہلت ملی تو آئندہ کچھ لکھیں گے۔" (اودھ پنچ)

دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا : نکما بے کار آدمی۔

اشر ۔ مثل اس طرح ہے، "دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا" یعنی پہلا "نہ" جزوِ مثل نہیں۔ مثل میں تحریف جائز نہیں۔

تاظورہ : معشوقہ۔ محبوبہ۔ یہ مفہوم درج نہیں۔ میرا شعر ہے۔

تاظورۂ نازنیں ہے اور میں   کشمیر کی سرزمیں ہے اور میں

گانجنا۔ گانجھنا : (نون غنہ) کپڑے کی تہیں بدتمیزی سے توڑ کر بل ڈالنا۔

اشر ۔ لکھنؤ میں اس جگہ گنجولنا بولتے ہیں (نون غنہ) جو فیلن میں بھی درج ہے۔

آج زبان کھلی ہے کل بند ہے : زندگی کا کچھ اعتبار نہیں۔

اشر ۔ آخری "ہے" محاورے کا جز نہیں۔ کسی شعر میں اگر موجود ہے تو ہو۔ شعر سے محاورہ نہیں بنتا۔

پاپی کنواں : وہ کنواں جس میں اکثر آدمی ڈوب کر مر جائیں (ہجر)

کس و ناکس کو ڈبو کر ہوا پاپی مشہور   بھینٹ مجھ کو یہ ترا چاہ زنخداں لیتا

اشر ۔ پاپی کنواں اس کنویں کو کہتے ہیں جس میں آدمی گرنے کے بعد پانی جوش کھاتا ہے اور آدمی کو ڈبو دیتا ہے۔

پاپڑ بیلنا : چالیں چلنا۔ بری حرکتیں کرنا۔ شوق قدوائی

داغوں سے اس عشق نے میرا سارا دل بے کار کیا
ایسے پاپڑ بیلے جن سے جینا بھی دشوار کیا

اشر ۔ پاپڑ بیلنا سخت مصیبت برداشت کرنا ہے۔ شعر میں بھی اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

پادالونی : (لکھنؤ) بزدل

اشر ۔ لکھنؤ میں اس کے معنی ہیں نازک۔ لاغر۔ دبلا پتلا۔

پار : ا۔ گزرا ہوا سال جیسے پار سال۔

اشر ۔ یہ پارسال کے معنی ہوئے، نہ کہ صرف پار کے۔

چاہے سو ہو : کچھ ہی ہو۔ جو ہو سو ہو۔

اشر ۔ لکھنؤ میں چاہے جو کچھ ہو، یا ہو جائے بولتے ہیں۔ دوسری صورت ہے "جو ہو سو ہو"

چاہو : اگر مرضی میں آئے۔ تمہارا دل چاہے۔ چاہو کا استعمال خواہ کا سا ہے۔

اشر ۔ لکھنؤ میں چاہو کے بجائے چاہے بولتے ہیں۔

چاہیتا : لاڈلا۔ محبوب۔

اشر ۔ لکھنؤ میں اس جگہ چہیتا (عورت کیلئے چہیتی) بولتے ہیں۔

چائدان : وہ ظرف جس میں چائے گرم کر کے رکھتے ہیں۔

اشر ۔ لکھنؤ میں اسے کیتلی یا چائے دانی (باضافہ یائے معروف) کہتے ہیں۔

چپ و راست : دائیں بائیں۔ اِدھر اُدھر۔

اشؔر ۔ اس کی دوسری صورت چپ وراس ہے، وہ درست نہیں ۔
چپ : خاموشی۔ سکوت۔
اشؔر ۔ عورتیں بچوں کو خاموش رہنے کے لئے چپےّ رہو کہتی ہیں ۔
چپکی : خاموشی۔ سکوت۔
اشؔر ۔ لکھنؤ میں اس جگہ بولتے ہیں۔ چُپ لگنا۔ چپ سادھنا۔
چپّن : سرپوش۔ ہانڈی کا ڈھکن۔
اشؔر ۔ لکھنؤ میں چپنی کہتے ہیں۔ اسی طرح گھٹنے کی ہڈی کو بھی چپنی کہتے ہیں نہ کہ چپتن "چپنی بھر پانی میں ڈوب مرو" کہتے ہیں نہ کہ چپن بھر...
چپنا : شرمندہ ہونا۔ جھینپنا۔
اشؔر ۔ یہ دیہاتی زبان ہے۔ لکھنؤ میں چپ ہو جانا بولتے ہیں ۔
چتون بنانا : تیوری چڑھانا۔ غضب کی نظر ڈالنا ۔
اشؔر ۔ یہ چتون چڑھانا ہے نہ کہ چتون بنانا ۔
چُچھّا : زخمی اور پٹا ہوا بٹیر جسے دوسرے بٹیر نے مجروح کیا ہو ۔
اشؔر ۔ چُچھّا بٹیر وہ کھگا بٹیر ہے جسے لڑنے والے بٹیر سے نچواتے ہیں تاکہ اس کا ہواؤ کھلے اور دوسرے بٹیر سے اچھی طرح لڑے ۔
چُٹکیلی دھوپ : گرم اور تیز دھوپ۔ چلچلاتی دھوپ۔
اشؔر ۔ لکھنؤ میں چلچلاتی دھوپ کہتے ہیں۔
چُچکارنا : پیار کرنا۔ پچکار کرنا ۔
اشؔر ۔ لکھنؤ میں پچکارنا یا چمکارنا ہے۔
چرّاٹا : کاغذ یا کپڑا پھٹنے کی آواز ۔
اشؔر ۔ لکھنؤ میں چھرّاٹا کہتے ہیں۔ رائے ثقیلہ بجائے مہملہ ۔
چراغ بتی کا وقت : شام کا وقت۔
اشؔر ۔ لکھنؤ میں چراغ جلے کہتے ہیں جیسے علیحدہ لکھا ہے ۔
چراغ رخصت ہونا : چراغ بجھنا۔ چراغ خاموش ہونا۔ بحرؔ ؎
کیا خبر تھی صبح ہو جائے گی تیرے نور سے　　شام سے میرا چراغ خانہ رخصت مانگتا
اشؔر ۔ اسی شعر سے محاورہ گڑھنا "چراغ خانہ رخصت مانگتا" سے چراغ رخصت ہونا کیوں کر بن گیا۔
چراغ تیز کرنا : چراغ چاق کرنا۔ بتی اکسا کر لو تیز کرنا۔
اشؔر ۔ یہ چراغ کی لو تیز کرنا ہوا نہ کہ چراغ تیز کرنا ۔

چرچٹا : بہ کسر اوّل وسوم۔ (دہلی) ایک خاردار پودے کا نام جس کی بالیں اکثر چمٹ جاتی ہیں۔
اشؔر ۔ لکھنؤ میں بھی بولتے ہیں مگر بہ فتح اوّل وسوم۔
چرچراہٹ : بہ کسر اول وسوم۔ تنک مزاجی ۔
اشؔر ۔ لکھنؤ میں بجائے رائے مہملہ رائے ہندی سے ہے۔ بمعنی بدمزاجی ۔
چرچنا : (ہندو) پوجا کرنا۔ (عو) سمجھ جانا۔ پہچان لینا۔
اشؔر ۔ لکھنؤ میں رائج نہیں۔ یہاں صاحب نوراللغات نے فیلن سے بھی انحراف کیا ہے۔ اس نے فتح اوّل کے علاوہ بہ کسر اول بھی لکھا ہے۔ مرادف چھڑکنا (بہ کسر اوّل ودوم) اور معنی لکھے ہیں صندل کا برادہ وغیرہ مورت پر چھڑکنا۔ ۲۔ پوجا کرنا۔ سمجھ جانا۔ پہچان لینا کا ذکر نہیں۔ یہ معنی حضرت مؤلف نے نہ معلوم کہاں سے حاصل کئے۔ لکھنؤ میں چھڑکنا بہ کسر اوّل وفتح دوم ہے۔ چرچنا سننے میں نہیں آیا۔
دوخصمی : وہ عورت جس نے دوسرا بیاہ کیا ہو ۔
اشؔر ۔ لکھنؤ میں دوہاجو کہتے ہیں۔ عورت ہو کہ مرد۔ دوخصمی کا تو یہ مطلب ہوا کہ ایک ہی وقت میں دو شوہر ہیں۔
دودھینڈی : ہانڈی جس میں دودھ دُھتے ہیں۔ دودھ کی ہانڈی ۔
اشؔر ۔ لکھنؤ میں متھانی یا دودھ کا برتن کہتے ہیں۔
ڈوری ڈھیلی چھوڑنا : (عو) کسی طرف سے غافل ہو جانا۔ نگرانی چھوڑ دینا۔
اشؔر ۔ لکھنؤ میں عورتیں ڈور ڈھیلی چھوڑ دینا اور مرد باگ ڈھیلی چھوڑ دینا بولتے ہیں۔
رکاب پہ پاؤں رکھے ہونا : سفر پر آمادہ ہونا ۔
اشؔر ۔ صحیح محاورہ اس طرح ہے: "رکاب پر پاؤں ہونا" لطف یہ ہے کہ دوسری جگہ خود بھی اسی طرح لکھا ہے۔ مگر بجائے ہونا کے "رکھنا" لکھا ہے: رکاب میں پاؤں رکھنا۔
مان نہ مان میں تیرا مہمان : رضامند ہو جانا۔ (فقرہ) اس نے تمہارا کہا مان لیا۔ مان نہ مان میں تیرا مہمان ۔
اشؔر ۔ محاورے کا صحیح مفہوم کہ کسی کی رضامندی کے بغیر اپنا بار اس پر ڈالنا۔ ناخواندہ مہمان بننا۔
نیکی برباد گناہ لازم : وہاں بولتے ہیں جہاں نیکی کرنے کے بدلے اُلٹی برائی حاصل ہو۔
اشؔر ۔ یہ مثل اس جگہ بولتے ہیں جہاں نیکی کی قدر نہ ہو۔ احسان ماننے کے عوض اُلٹا الزام لگایا جائے۔ علاوہ بریں مثل زیادہ تر گناہ کے بدلے اس کے مخفف گنہ کے ساتھ بولی جاتی ہے۔ "نیکی برباد گنہ لازم"
□□

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

ہندستان کی شاہانہ دعوتیں

صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم اردو کے اُن اہم ترین علما میں سے تھے جنھوں نے تاریخ سماجیات اور دیگر علوم سے اردو ادب کا رشتہ جوڑا، ان کی وقیع تالیف "ہندستان: عہدِ وسطیٰ کی ایک جھلک" ہے۔
ایڈیٹر

ہماری زبان سے اکثر یہ نکل جاتا ہے کہ فلاں صاحب نے بڑی شاہانہ دعوت کی تھی۔ اس سے مراد یہی ہوتی ہے کہ دعوت ایسی پُرتکلف تھی جیسے ہمارے بادشاہ کیا کرتے تھے یا خود ان کی جس پیمانے پر دعوت ہوتی تھی۔ اس مضمون میں عہدِ وسطیٰ کے ہندستان کے بادشاہوں کی دعوتوں کا ذکر ہے۔ ان دعوتوں کے سلسلے میں مختلف قسم کے کھانوں کی تفصیل قصداً نظرانداز کردی گئی ہے کیوں کہ ان میں جو کھانے پیش کیے جاتے تھے ان کا ذکر ۲۶ر جنوری ۱۹۰۰ء کے نیا دور میں "ہندستانی کھانے" کے عنوان سے کیا جاچکا ہے۔

سلاطینِ دہلی اور مغل بادشاہوں کے یہاں جب کوئی دعوت ہوتی تو ان کے دسترخوان پر انواع واقسام کے کھانے ہوتے۔ امیر خسرو نے "قران السعدین" میں بغرا خاں (بنگال کے حکمراں) اور سلطان کیقباد (دہلی) کی ملاقات کے وقت ایک دعوت کی جو تفصیل لکھی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ شاہی دعوتوں میں ایک سے زیادہ اقسام کے کھانے ہوتے، شربت، قند کے سینکڑوں پیالے رکھے جاتے، منہ کا مزہ بدلنے کے لیے شربت گلاب ہوتا، پلاؤ کی کئی قسمیں ہوتیں۔ ایک قسم کا زردہ ہوتا جس میں خرمے اور انگور ڈالے جاتے بکرے، دُنبے اور ہرن کے بھنے ہوئے گوشت کی مختلف شکلیں ہوتیں پرندوں میں بٹیر، تیتر، تیھو اور چرز وغیرہ کے بھی گوشت ہوتے اور آخر میں پان تقسیم کیا جاتا تھا۔

سلطان محمد تغلق کے شاہی مطبخ میں دو طرح کا کھانا پکتا۔ ایک خاص اور دوسرا عام۔ خاص کھانے میں بادشاہ کے ساتھ ممتاز امرا، اعزا یا خاص بیرونی مہمان ہوتے۔ سلطان جب دسترخوان پر کسی کی طرف توجہ کرتا تو خود رکابی اٹھا کر اس میں ایک روٹی رکھ کر اپنے ہاتھ سے اس شخص کو دیتا وہ شخص بائیں ہتھیلی پر رکابی لے لیتا اور داہنے ہاتھ سے سلام کرتا۔ کبھی یہ خاصہ باہر بھی بھیجا جاتا۔

عام دسترخوان پر کھانا مطبخ سے لایا جاتا تو اس کے ساتھ نقیب النقبا ہوتے۔ اس کے ہاتھ میں سونے اور اس کے نائب کے ہاتھ میں چاندی کی چھڑی ہوتی۔ جب وہ چوبتے دروازہ سے داخل ہوتے تو دیوان خانے کے تمام لوگ کھڑے ہوجاتے، صرف سلطان بیٹھا رہتا۔ جب کھانا زمین پر رکھا جاتا تو نقیب صف باندھ کر کھڑے ہوجاتے، ان کا سردار سب کے آگے کھڑا ہوکر سلطان کی تعریف کرتا۔ اس وقت جو شخص جہاں ہوتا چپ چاپ کھڑا ہوجاتا، کسی کو حرکت کرنے کی اجازت نہ ہوتی۔ نقیب کا نائب بھی اسی طرح تعریف کرتا۔ پھر سب زمین بوسی کے لیے بیٹھ جاتے متصدی سب حاضرین کے نام لکھ لیتا۔ سلطان کا کوئی لڑکا ناموں کی فہرست اس کے پاس لے جاتا۔ اس کو دیکھ کر سلطان کسی امیر کو کھانا کھلانے کی خدمت انجام دینے کا حکم دیتا۔ کھانے میں عموماً چپاتیاں، بھنے ہوئے مرغ اور سموسے ہوتے۔ دسترخوان کے صدر میں قاضی، خطیب، فقیہ سادات اور مشائخ ہوتے۔ ان کے بعد سلطان کے رشتہ دار اور امرا ترتیب وار بیٹھتے۔ ہر شخص کی جگہ مقرر ہوتی۔ جب سب لوگ بیٹھ جاتے تو شربت دار آتے۔ ان کے ہاتھوں میں سونے، چاندی، تانبے اور کانچ کے پیالے ہوتے جن میں شربت ہوتا۔ کھانے سے پہلے شرکا،

شربت پیتے، جب وہ پی لیتے تو حاجب بسم اللہ کہتا۔ اس وقت کھانا شروع کیا جاتا۔ ہر شخص کے سامنے ہر قسم کے کھانے کے علاوہ ایک رکابی موجود ہوتی۔ لوگ علٰحدہ علٰحدہ رکابیوں میں کھاتے۔ کھانے کے بعد فقاع یعنی نبیذ پیالوں میں لائی جاتی اور جب حاجب بسم اللہ کہتا تو لوگ اس کو پینا شروع کر دیتے۔ اس کے بعد پان اور چھالیہ تقسیم کی جاتی۔ ہر ایک آدمی کو چھالیہ کے ساتھ پان کے پندرہ بیڑے دیے جاتے۔ جس پر سرخ ریشم کا دھاگہ بندھا رہتا۔ جب پان تقسیم ہو جاتا تو حاجب پھر بسم اللہ کہتے اور سب کھڑے ہو جاتے۔ جو امیر کھانا کھلانے پر مامور ہوتا وہ زمیں بوسی کرتا۔ اس کے بعد تمام شرکا اسی طرح زمیں بوسی کر کے رخصت ہو جاتے۔ اس طرح کا کھانا دو دفعہ ہوتا۔ ایک تو ظہر سے پہلے اور دوسرا عصر کے بعد[۱۹]

مسالک الابصار کا مصنف شیخ مبارک کی زبانی لکھتا ہے کہ سلطان ہر روز دو دفعہ اجلاس کرتا، ایک صبح کو دوسرا شام کو۔ اجلاس کے ختم ہونے کے بعد عام دسترخوان بچھائے جاتے۔ اس پر تقریباً بیس ہزار آدمی کھانا کھاتے۔ سلطان کے ساتھ خاص دسترخوان پر دو سو علماء و فضلا شریک ہوتے اور اس وقت علمی گفتگو ہوتی۔ مسالک الابصار کے مصنف نے شیخ ابوبکر بن خلال بزی کی زبانی لکھا ہے کہ سلطان کے مطبخ کے لیے روزانہ ڈھائی ہزار بیل، دو ہزار بکریاں اور بھیڑیں ذبح ہوا کرتی تھیں۔

ابن بطوطہ سلطان محمد تغلق کی والدہ کے محل میں ایک دعوت میں شریک ہوا تھا۔ وہ اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ جب ہم محل میں داخل ہوئے تو ہم کو ایک دالان میں بیٹھنے کا حکم ہوا۔ اس کے بعد کھانا آیا۔ اسی کے ساتھ طلائی مٹکے بھی آئے جو دیگوں کے مانند تھے۔ ان کی کفگیریں اور چمچیاں بھی جن کو سبو کہتے طلائی تھیں۔ پھر پیالے، رکابیاں اور لوٹے لائے گئے، جو سب سونے کے تھے۔ دسترخوان بچھائے گئے تو وہ دو صفیں تھیں۔ سب سے پہلے وہ شخص بیٹھتا جو مہمانوں میں سب سے زیادہ ممتاز ہوتا۔ جب ہم کھانے کے واسطے آگے بڑھے تو حاجبوں اور نقیبوں نے تعظیم کی۔ ہم نے بھی تعظیم کی۔ پہلے شربت لایا گیا۔ جب ہم شربت پی چکے تو حاجبوں نے بسم اللہ کہا۔ اس وقت ہم نے کھانا شروع کیا۔ جب کھانا کھا چکے تو نبیذ کا دور چلا۔ اس کے بعد پان تقسیم ہوئے، پھر حاجبوں نے بسم اللہ کہا۔ ہم سب نے تعظیم کی۔ اس کے بعد ایک خاص جگہ جا کر بیٹھے، جہاں ہم کو زربفت کے خلعت دیے گئے، پھر ہم محل کے دروازے پر آئے۔ وہاں پہنچ کر ہم سب نے پھر تعظیم کی۔ حاجبوں نے پھر بسم اللہ کہا تو وزیر ٹھہر گیا۔ ہم سب بھی ٹھہر گئے۔ محل کے اندر سے ریشم، کتان اور سوتی تھان آئے، جو ہم میں سے ہر ایک کو علٰحدہ علٰحدہ حصوں میں دیے گئے۔ اس کے بعد طلائی سینی آئی، جس میں خشک میوے تھے۔ دوسری سینی میں گلاب اور تیسری میں پان تھے۔ اس ملک میں دستور ہے کہ جس کے واسطے یہ چیزیں سینی میں لائی جاتی ہیں تو وہ سینی کو ہاتھ میں لیتا ہے اس کو اپنے ایک ہاتھ پر رکھ کر دوسرے ہاتھ سے زمین کو چھوتا ہے۔ وزیر نے سینی کو اپنے ہاتھ میں لے کر مجھ کو بتایا کہ میں کس طرح سینی کو لوں۔ پھر میں نے بھی اسی طرح کیا۔ اس کے بعد ہم سب ہی قیام گاہ پر واپس آ گئے[۲۰]

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ سلطان کھانے پینے کی چیزیں اپنے خاص مہمانوں کے پاس بھجوا دیتا تاکہ وہ اپنی خواہش کے مطابق پکوا کر خرچ کریں۔ ایک بار ابن بطوطہ سلطان محمد تغلق کے محل میں بھی گیا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ میں سلطان کے محل میں گیا تو پہلے وزیر کو جا کر سلام کیا۔ اس نے مجھ کو ہزار ہزار کی دو تھیلیاں دیں اور کہا یہ میرے سر شوئی (سر دھونے) کے لیے ہیں۔ اس کے بعد ایک ریشمی خلعت دیا۔ میرے ساتھ کچھ ہمراہی، غلام اور خادم بھی تھے۔ وزیر نے ان سب کے نام لکھے اور ان کے چار درجے مقرر کیے۔ پہلے درجہ والوں کو دو دو سو، دوسرے کو ڈیڑھ ڈیڑھ سو، تیسرے کو سو سو اور چوتھے کو پچھتر پچھتر دینار دیے۔ اس کے بعد سلطان کی طرف سے ضیافت کا حکم دیا اس کے لیے ایک ہزار رطل آٹا اور ایک ہزار رطل گوشت آیا۔ آٹا ایک ثلث میدہ تھا اور باقی دو ثلث بغیر چھنا ہوا تھا۔ گھی، چینی اور چھالیہ بھی کئی کئی رطل تھیں۔ ہزار ورق پان کے بھی تھے[۲۱] (اس زمانہ میں ایک رطل چودہ سیر کے برابر ہوتا تھا۔

سکندر لودی رات کا کھانا علماء و فضلاء کی موجودگی میں کھاتا۔ اس کی خواب گاہ میں مسہری کے پاس دسترخوان لگتا۔ انواع اقسام کے کھانے چنے جاتے۔ علماء و فضلاء کے سامنے بھی کھانا لگایا جاتا لیکن وہ اس وقت نہ کھاتے۔ جب سلطان کھا لیتا تو ان کے سارے کھانے ان کے گھروں پر بھیج دیے جاتے اور وہ وہیں کھاتے[۲۲]

سلاطین دہلی کے مطبخ کا نگراں اعلیٰ چاشنی گیر کہلاتا۔ اس کے نائب چاشنی گیر کہلاتے۔ پانی اور دیگر مشروبات کا مہتمم شرب دار کہلاتا۔

اکبر کے زمانے میں محل کے اندر تین قسم کے کھانے پکتے (۱) صوفیانہ جس میں گوشت نہ ہوتا (۲) گوشت با برنج جس میں چاول اور گوشت دونوں ملے ہوتے۔

(۳) آب زیرکس میں مسالے کے ساتھ گوشت پکتا۔ اکبر ہر جمعہ، اتوار کو تحویل (سال شمسی کا پہلا دن) روز مہر (چاند اور سورج کے گرہن کے دن کے پہلے دوشنبہ اور تخت نشینی کے دن صوفیانہ کھانا کھایا کرتا تھا۔ ان مقررہ دنوں میں جانور ذبح نہیں کئے جاتے تھے۔ جہانگیر کو کالے تیتر کا گوشت زیادہ پسند تھا۔ وہ پورنہ کا گوشت بھی شوق سے کھاتا۔ بھیڑ سے زیادہ تیار حلوان کے گوشت کو پسند کرتا۔ مچھلیوں میں روہو کھاتا یا پھر اس کو وہ مچھلیاں پسند تھیں جن کے ڈسنے ہوتے۔ نورجہاں کے آنے کے بعد شاہی محل کے کھانوں میں ایرانی اثرات کی وجہ سے لطافت اور نفاست زیادہ بڑھ گئی اور شاہجہاں کے زمانے میں وہ انتہا تک پہنچ گئی۔ اورنگ زیب کا کھانا سادہ ہوتا۔ عموماً کھچڑی بریانی اور قبولی زیادہ کھاتا لیکن اس کے عہد میں بھی جب کبھی اس کی طرف سے دعوت ہوتی تو اس کا پورا اہتمام کیا جاتا۔ اسکے عہد میں ایران سے ایک سفیر آیا تو اس کے اعزاز میں لاہور میں ایک دعوت کی گئی۔ کھانے میں چار سو قابیں تھیں۔ تواکہات اور عطریات کے سات سو خوان تھے۔ شاہی دسترخوان بچھتا تو پہلے گلاب پاش سے گلاب چھڑکا جاتا، پھر کیوڑہ، پھر عطر حسن یا کوئی اور عطر۔ مغلوں کی حکومت کے آخری دور میں قلعہ معلیٰ کے اندر دسترخوان پر اتنی قسموں کے کھانے لگائے جاتے کہ ان کی گنتی ممکن نہ ہوتی۔ (ان کھانوں کے نام ہم نیا دور کی ایک گذشتہ اشاعت میں لکھ چکے ہیں)

بہادر شاہ ظفر کے دسترخوان کے آداب یہ تھے۔ سب سے نیچے چمڑا، چمڑے پر ستیل پاشیان، ستیل پائیوں پر بیچ میں چار گز لمبا اور آدھ گز بلند تخت اور اسکے چاروں طرف پرتکلف دسترخوان۔ بادشاہ تخت پر آکر بیٹھتا۔ اس کے دائیں طرف بیگمیں، بائیں طرف شہزادیاں، سامنے مرد اور لڑکے ہوتے۔ سیلابچی پہلے بہادر شاہ ظفر کے سامنے آتی۔ اس کے بعد دائیں طرف سے سلسلہ شروع ہوتا۔ شاہی سیلابچی میں صرف بیگمیں ہاتھ دھوتیں، دوسری سیلابچی میں شہزادیاں اور تیسری میں مرد ہاتھ دھوتے۔ کھانے سے پہلے گلاب پاش سے چاروں طرف گلاب چھڑکا جاتا۔ اس کے بعد عطریات کا چھڑکاؤ ہوتا۔ بادشاہ کسی کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاتا تو چوبدار طعام مبارک کی آواز بلند کرتا۔ کھاتے وقت کسی کو بولنے کی اجازت نہ تھی اور جب بادشاہ کسی کو کوئی خاص کھانا مرحمت کرنا چاہتا تو وہ بچہ ہو یا جوان، عورت ہو یا مرد، اپنی جگہ سے اٹھ کر جائے ادب پر جاتا اور جھک کر تین سلام بجا لاتا۔ بہادر شاہ کا ہاتھ رک جاتا تو سب شرکا ہاتھ روک لیتے۔ لیکن خود بادشاہ ہاتھ اس وقت تک روکتا جب تک کہ اس کو یہ اطمینان نہ ہو جاتا کہ تمام شرکا سیر ہو کر کھا چکے ہیں۔ کوئی پانی مانگتا تو چاندی کی صراحی سے پانی سونے کے کٹورے میں انڈیلا جاتا، اور کٹورہ کو سنہری طشتری میں رکھ کر پیش کیا جاتا۔ کھانا کھانے کے بعد بہادر شاہ کے ہاتھ بارگاہ الٰہی میں شکرانے کے لئے اٹھ جاتے۔ اس کے تمام شرکا بھی ہاتھ اٹھاتے۔ پھر سیلابچی بدستور سابق سب کے سامنے آتی۔ ابٹنہ، کھل، بیسن اور صابن سے ہاتھ دھوئے جاتے۔ ہاتھ صاف کرنے کے لئے رومال بکثرت موجود ہوتے۔ کھانے کے بعد بہادر شاہ ظفر کے سامنے سونے کی طشتری میں سونے کا خلال پیش ہوتا۔ بیگمات پاندان کھول کر گلوریاں بنانے میں لگ جاتیں دسترخوان پر کھانا بہت بچ جاتا اسی میں سے بہادر شاہ جس کو کہتے اس کے پاس خاصہ بھیجا جاتا۔

بادشاہوں کی تقلید میں امرا بھی اپنا دسترخوان اسی شان سے سجاتے امیر خسرو کے نانا عماد الملک سلاطین دہلی کے عہد میں میر عرض کے عہدے پر مامور رہے۔ وہ اپنے ماتحتوں اور ملازموں کو روزانہ کھانا کھلاتے تھے۔ ان کے لئے پچاس طشت بہترین کھانے کے آتے۔ عہد تغلق کے ایک امیر خداوند زادہ قوام الدین کی ایک ضیافت میں ابن بطوطہ ملتان میں شریک ہوا تھا۔ اسی سلسلہ میں وہ اس زمانے میں دعوتوں کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ پہلے روٹیاں لاتے ہیں جو نہایت پتلی ہوتی ہیں۔ پھر مسلم بھنی ہوئی بکریاں لاتے ہیں۔ ہر ایک کے چار یا چھ ٹکڑے کر کے ایک ایک آدمی کے سامنے رکھتے جاتے ہیں۔ پھر گھی میں تلی ہوئی روٹیاں آتی ہیں جن کے جوف میں حلوا صابونیہ بھرا ہوا ہوتا ہے اور ہر ایک ٹکیہ کے اوپر ایک میٹھی روٹی ہوتی ہے جس کو خشتی کہتے ہیں۔ یہ آٹے، شکر اور گھی سے بنتی ہے۔ پھر ایک خاص چیز لاتے ہیں جس کو سموسہ کہتے ہیں۔ وہ قیمہ کیا ہوا گوشت ہوتا ہے۔ اس میں بادام، جائفل، پستہ، پیاز اور گرم مسالہ ڈال کر پتلی چپاتیوں میں لپیٹ دیتے ہیں اور پھر گھی میں تل لیتے ہیں۔ ہر ایک شخص کے سامنے پانچ یا چھ سموسے رکھے جاتے ہیں پھر گھی میں پکے ہوئے چاول لاتے ہیں۔ اس کے اوپر مرغ ہوتا ہے۔ پھر لقیمات القاضی لاتے ہیں جس کو ہاشمی کہتے ہیں۔ پھر قاہریہ لاتے ہیں۔ کھانا شروع کرنے سے پہلے چاندی، سونے اور کانچ کے پیالوں میں مصری اور گلاب کا شربت پیتے ہیں جب شربت پی لیتے ہیں تو سب بسم اللہ کہہ کر کھانا شروع کرتے ہیں۔ کھانا ختم ہونے پر فقاع (یعنی نبیذ) کے پیالے آتے ہیں اور جب اس کو پی لیتے ہیں تو پان آتا ہے۔ چھالیہ کے ساتھ پان لینے کے بعد سب اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ اگر کسی دعوت

میں سلطان بھی ہوتا ہے تو کھانے سے پہلے اس کی تعظیم کرتے ہیں اس طرح کہ سر کو رکوع کی طرح نیچے جھکاتے ہیں اور رخصت ہوتے وقت بھی یہی تعظیم بجالاتے ہیں۔[۸]

عہد مغلیہ میں امرا کا دستر خوان اور بھی پر تکلف ہو گیا تھا۔ اکبر کے وزیر ابوالفضل کے دستر خوان پر طرح طرح کی چیزیں ہوتیں۔ وہ خود بھی اکبری وزن سے بائیس سیر کھانا ایک وقت میں تنہا کھاتا یہ ماثر الامراء کی بس اتنی روایت ہے لیکن مولانا محمد حسین دربار اکبری میں اپنے خاص انداز میں لکھتے ہیں کہ شیخ ابوالفضل کے کھانے کا حال سن کر تعجب آتا ہے۔ بائیس سیر کے اجناس کی مختلف چیزیں مختلف رنگوں سے یک کر دستر خوان پر لگتی تھیں — ابوالفضل کا لڑکا عبدالرحمٰن پاس بیٹھتا تھا اور خانساماں کی طرح دیکھتا رہتا تھا۔ خانساماں بھی سامنے حاضر رہتا۔ دونوں خیال رکھتے تھے کہ ہر رکابی سے دو تین یا کئی نوالے کھائے جائیں جس کھانے کو صرف ایک دفعہ کھایا اور چھوڑ دیا وہ دوسرے وقت دستر خوان پر نہ آتا۔ کسی کھانے میں آب و نمک کا فرق ہوتا تو شیخ صرف اشارہ کر دیتا منھ سے کچھ نہ کہتا۔ خانساماں کو دے دیا جاتا وہ اس کا تدارک کرتا۔ جب شیخ دکن کی مہم پر تھا دستر خوان وسیع اور کھانے ایسے پر تکلف اور عمدہ ہوتے تھے کہ آج کل کے لوگوں کو یقین نہ آئے۔ بڑے خیمہ میں دستر خوان چنا جاتا تھا۔ کھانے کی ہزار عمدہ قابیں مع لوازمات کے ہوتی تھیں۔ اور سب امرا میں بٹ جاتی تھیں پاس ہی ایک دوسرا بڑا خیمہ ہوتا تھا۔ اس میں کم درجہ کے لوگ جمع ہوتے تھے اور کھانا کھاتے تھے۔ باورچی خانہ میں کھانا برابر گرم رہتا تھا اور کھچڑی کی دیگیں ہر وقت چڑھی رہتی تھیں۔ جو بھوکا آتا رزق پاتا اور کھاتا۔

جہانگیری عہد کے ایک فوجی سردار باقر خاں نجم ثانی کے باورچی خانے کے لیے دو سو بکرے، چالیس اونٹ اور ایک ہزار دوسرے جانور ذبح ہوتے تھے[۹] شاہجہاں کا خسر یمین الدولہ آصف خاں دن رات میں شاہجہانی تول سے ایک من وزن کا کھانا کھایا کرتا تھا۔[۱۰] اس کے لڑکے اعتقاد خاں کے یہاں کھانوں کے اتنے اقسام ہوتے کہ کوئی اور امیر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا[۱۱]

امرا جب بادشاہ کو اپنے یہاں مدعو کرتے تو وہی شان و شوکت دکھاتے جو درباروں میں ہوا کرتی تھی۔ اعتماد الدولہ نے جہانگیر کو چودھویں سال جلوس جشن نوروز کے موقع پر اپنے یہاں مدعو کیا تو جہانگیر کی رہ گذر کو طرح طرح کے فانوس سے روشن کیا اور جو نذرانے پیش کئے ان میں سونے کا ایک تخت بھی تھا جو تین سال کی مدت میں ساڑھے چار لاکھ روپے میں تیار ہوا تھا۔

عہد جہانگیری میں آصف خاں (نور جہاں کے بھائی) نے برطانوی سفیر کو جو دعوت دی اس کا ذکر ایڈورڈ ٹیری نے بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ آصف خاں نے سفیر کی دعوت ایک بہت بڑے اور خوبصورت خیمہ میں کی۔ وہاں میرے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ خیمہ ایسی خوشگوار قسم کی خوشبوئیات سے معطر کیا گیا تھا جو بادشاہوں اور امیروں کو مرغوب ہوا کرتی تھیں۔ خیمے کے اندر بڑے قیمتی قالین بچھے تھے اور جہاں کھانا چنا گیا تھا وہاں پر اور بھی عمدہ قالین بچھائے گئے تھے۔ ان کے اوپر اعلیٰ قسم کے بوٹے دار سفید دستر خوان تھے۔ ان پر چاندی کے ظروف رکھے تھے جن کے حاشیے سونے کے بنے ہوئے تھے۔ یہ ظروف ہماری ان بڑی سی بڑی پلیٹوں سے بڑے نہ تھے جن میں نان پاؤ رکھ کر کاٹے جاتے ہیں۔ ہم لوگ ایک مثلث کی شکل میں بیٹھے۔ سفیر، آصف خاں کے دائیں جانب تھوڑی دور پر بیٹھا اور میں ان دونوں کے سامنے تھا۔ ہم سب زمین ہی پر بیٹھے کیوں کہ یہاں لوگ اسی طرح کھانا کھاتے ہیں۔ ہمارے چہرے ایک دوسرے کے سامنے تھے اور ہم سب کے کھانے علیحدہ علیحدہ تھے۔ سفیر کے کھانوں میں دس قسم کے کھانے میزبان سے زیادہ تھے۔ میرے کھانے میں دس قسم کی چیزیں میزبان سے کم تھیں۔ پھر بھی میرے سامنے پچاس قسم کے کھانے تھے ..... میں نے ان سب کو چکھا۔ سب کا ذائقہ بہت ہی عمدہ تھا۔ بڑی قابوں میں مختلف قسم کے چاول تھے جن کا رنگ سفید بھی تھا، زعفرانی بھی، سبز بھی، روغنی بھی۔ یہ کس طرح پکائے گئے تھے۔ یہ تو میں نہیں بتا سکتا لیکن بہت ہی مزیدار تھے۔ کھانے میں گوشت کی بھی کئی قسمیں تھیں۔ مرغ اور پرندوں کے گوشت کاٹ کاٹ کر ہندوستانی طرز پر پکائے گئے تھے۔ میٹھی اور ترش چیزیں بھی تھیں۔ چاول کی فیرنی بہت میٹھی بھی تھی، خوشبودار بھی اور ٹھنڈی بھی۔ چاول کے آٹے کی ایک اور بہت ہی میٹھی چیز تھی۔ اس میں میٹھے بادام بہت ہی باریک تراش کر کے ڈالے گئے تھے اور اس میں مرغ کے گوشت کے ٹکڑے بھی ملے تھے جن کو تمیز کرنا آسان نہ تھا۔ ان میں کیوڑے کے عرق کے ساتھ عنبر بھی تھا۔ طرح طرح کی روٹیاں بھی تھیں۔ بعض میں بادام اور قند ملے تھے۔ بعض بہت ہی خوشبودار تھیں۔ آلو کی بھی عمدہ چیزیں تھیں۔ مختلف قسم کے پھل بھی تھے۔ بادام، کشمش اور آلو بخارا کی چیزیں بھی تھیں۔ اور پھر حلوا نہیں کیا کیا تھا۔ غرضیکہ یہ ضیافت عمدہ سے عمدہ تھی۔ روٹیاں بہت اچھے گیہوں کی تھیں۔ سفید، ہلکی اور گول بھی۔ پانی سادہ تھا۔ ہم لوگ اس دعوت میں بہت

دیر تک رہے۔ یہ روم کے مشہور اپی کیور کی دعوت سے یقینی بہتر کہی جاسکتی ہے جو اپنے بھوک کو رفع کرنے کی خاطر زمین ہوا اور سمندر کی تمام چیزیں فراہم کرنے کا عادی تھا۔[21]

آصف خاں اپنے محل میں بلاکر بادشاہ، شہزادوں اور شہزادیوں کی ضیافت کرتا تو ان کے استقبال اور دعوت میں جتنا زیادہ تکلف اور اہتمام ممکن ہو سکتا تھا وہ کیا کرتا تھا۔ اسی زمانہ میں ایک فرنگی سیاح اف۔ اس۔ منرلق آیا تھا اس کا بیان ہے کہ اس نے آصف خاں کے محل کے پہرہ داروں کی سازش سے اس کے محل کے اندر چھپ کر ایک ضیافت کو دیکھنے کی کوشش کی۔ اس کا بیان ہے کہ آصف خاں نے شاہجہاں کو اپنے زنانخانہ میں مدعو کیا تو جس وسیع ایوان میں اس نے یہ دعوت کی اس کو فرش فروش اور زرنگار قالین سے آراستہ کیا۔ چاندی کی انگیٹھیوں میں جا بجا عنبر اور دوسری خوشبودار چیزیں جلائی جارہی تھیں جن سے تمام فضا معطر تھی۔ مرصع اور زریں ظروف سے پورا ایوان جگمگا رہا تھا۔ ایوان میں جس طرف داخلہ کا راستہ تھا وہاں چاندی کی ایک بڑی مچھلی آویزاں تھی۔ اس کے منھ سے سات معطر فوارے چھوٹ رہے تھے۔ بیچ میں دسترخوان بچھے تھے جو باریک اور مہین سوتی کپڑے کے تھے۔ ان پر قدرتی خوشبودار پھولوں کے گلدستوں کے بجائے نقرئی اور طلائی پھول کڑھے تھے۔ ایک نمایاں جگہ پر دو طلائی مسندیں بچھی تھیں۔ ان کے پاس جا بجا نقرئی مسندیں بھی تھیں۔ جب شاہجہاں ایوان میں داخل ہوا تو بغل کے کمروں سے سرود و نغمہ کی آواز بلند ہوئی۔ شاہ جہاں کے آگے آگے شہزادیاں تھیں جو طلائی اور نقرئی کام سے لپے ہوئے زرق برق لباس پہنے تھیں۔ ان کے گلوں اور سروں پر سونے اور موتیوں کے ہار جگمگا رہے تھے۔ شاہ جہاں اندر داخل ہوا تو دائیں طرف اس کی خوش دامن اور بائیں طرف اس کی چہیتی بیگم ممتاز محل تھی۔ خود بیچ میں تھا۔ اس کے پیچھے داراشکوہ اور آصف خاں تھے۔ شاہ جہاں زرنگار مسند پر آکر بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی دو حسین عورتیں مورچھل ہلانے لگیں۔ اس کے فوراً ہی بعد آصف خاں کے گھر والے اور خود شاہ جہاں کے شہزادے اور شہزادیاں آگے بڑھیں اور جھک کر کورنش اور چہار تسلیمات بجالائیں۔ شاہ جہاں اپنی خوش دامن سے بڑی تواضع کے ساتھ پیش آیا۔ اسے اپنے دائیں جانب بٹھایا اور دوسروں کو بھی بیٹھنے کو کہا۔ پہلی اور دوسری بار کہنے پر وہ سب کھڑے رہے لیکن تیسری بار ان سے کہا گیا تو وہ مودب بیٹھ گئے۔ ان کے بیٹھتے ہی بہت ہی شیریں نغموں کی آواز آنی شروع ہوئی۔ ان نغموں میں بادشاہ کے جنگی کارنامے بیان کیے جارہے تھے۔ دعوت کا اہتمام شروع ہوا تو پہلے چار حسین لڑکیاں داخل ہوئیں جو آصف خاں کے خاندان کی تھیں۔ وہ اپنے حسن و جمال میں کسی جگہ کی بھی حسین عورتوں سے کم نہ تھیں۔ وہ بہت ہی مودب ہوکر بادشاہ کی طرف بڑھیں۔ ان میں سے ایک نے اس کے سامنے سفید ساٹن کا ایک کپڑا بچھایا۔ دوسری نے ایک خوبصورت طلائی سیلابچی سامنے رکھی جس میں جواہرات بھی جڑے تھے۔ تیسری نے اسی قسم کے جواہرات سے مرصع طلائی برتن سے ہاتھ دھلایا اور چوتھی نے ہاتھ پونچھنے کے لیے تولیہ بڑھایا۔ ان چاروں کے بعد بارہ عورتیں داخل ہوئیں جو پہلی چار لڑکیوں کی طرح معزز تو نہ تھیں لیکن تہذیب میں کم بھی نہ تھیں۔ انھوں شہزادوں اور شہزادیوں کے ہاتھ اسی طرح دھلائے۔ جب کھانا دوسرے دروازے سے آنا شروع ہوا تو طرح طرح کے نغمے بھی تیز ہونے لگے۔ خواجہ سرا طلائی ظروف میں کھانا لارہے تھے ان خواجہ سراؤں کا لباس بہت ہی اچھا اور معطر تھا۔ چار خواجہ سرا کھانا لاکر دو خواجہ سراؤں کو دیدیتے۔ پھر یہ دونوں ان دو حسین عورتوں کو جو بادشاہ کے پاس کھڑی رہتیں یہ برتن دیتے۔ دونوں عورتیں گھٹنے ٹیک کر بادشاہ کے سامنے ظروف رکھتیں۔ دسترخوان پر روٹیوں اور مٹھائیوں کی بہت سی قسمیں تھیں۔ کھانے کے بعد رقص بھی ہوا۔ پھر نذرانے پیش ہوئے جن میں طرح طرح کے جواہرات تھے۔[22]

شاہی مطبخ کے چار حصے ہوتے تھے۔ (۱) مطبخ جہاں کھانا پکتا تھا (۲) آب دار خانہ جہاں پینے کا پانی اور دوسرے مشروبات ہوتے تھے۔ (۳) میوہ خانہ جہاں پھل رکھے جاتے تھے۔ (۴) رکاب خانہ جہاں آٹے کی چیزیں پکتی تھیں۔

مطبخ میں حسب ذیل ملازم ہوتے تھے۔ (۱) میر بکاول۔ وہ پورے مطبخ کا نگراں ہوتا اور دیوان بیوتات کی مدد سے ہر قسم کی چیزیں فراہم کرتا۔ اکبری عہد میں سکھداس چاول بہرائچ، دیوزیرہ چاول گوالیار، جنجن چاول راجواری سے آتا کیوں کہ اکبر ان کو خاص طور سے پسند کرتا تھا۔ گھی حصار فیروزہ سے منگوایا جاتا۔ قاز، مرغابیاں اور اکثر ترکاریاں کشمیر سے آتیں۔ بکریاں، بھیڑ، بربری مرغ اور قاز وغیرہ پالے بھی جاتے۔ مذبح شہر سے باہر تالاب کے کنارے ہوتا۔ وہاں سے گوشت کیسوں میں لایا جاتا۔ باورچیوں کی مہر کے بعد کیسے مطبخ میں بھیجے جاتے۔ یہ سب کچھ میر بکاول کی نگرانی میں ہوتا۔ (۲) خزانچی۔ وہ ایک سال کا تخمینہ پیش کرتا جس کے بعد سال بھر کی رقم اس کو دیدی جاتی۔ روپیوں کی تھیلیوں پر میر بکاول کی مہریں ہوتی تھیں۔ اجناس پر بھی اس کی مہر ہوتی۔

خزانچی روزانہ اخراجات کی فہرست بھی میر بکاول کے سامنے پیش کرتا۔ اس کی رسید پر دو عہدہ داروں کی مہریں ہوتیں۔ (۳) خورش شناس۔ وہ کھانا چکھا کرتا۔ (۴) وہ تمام اخراجات لکھنے کے لئے مقرر ہوتا۔ ان کے علاوہ بکاول، باورچی رکابدار سقے وغیرہ ہوتے۔

کھانا پکاتے وقت پکانے والے آستین چڑھا کر دامن کمر سے باندھ لیتے اور اپنا منہ اور ناک بند کر لیتے۔ کھانا پک جاتا تو اس کو پہلے بکاول پھر چاشنی گیر اور آخر میں میر بکاول چکھتا۔ پھر کھانا قابوں میں نکالا جاتا۔ طلائی اور نقرئی قابیں سرخ کپڑوں اور چینی اور تانبے کے ظروف سفید کپڑوں میں باندھ لئے جاتے۔ میر بکاول ان کپڑوں پر اپنی مہر لگا دیتا اور ہر پکی ہوئی چیز کا نام لکھ دیتا۔ باورچی خانہ کا منشی ان تمام کھانوں کی فہرست اپنے پاس رکھ لیتا پھر یہ محل کے اندر بھیج دیے جاتے۔ کھانے کی قابیں بکاول اور دوسرے ملازمین لیکر چلتے۔ چوبداران کے ساتھ ہوتے۔ جب کھانے کی قابیں اندر پہنچ جاتیں تو پھر دہی، اچار اور لیموں وغیرہ اسی طرح مہر کر کے بھیجے جاتے۔ محل کے اندر ملازمین ان کھانوں کو چکھ لیتے تو دسترخوان پر چنتے۔ دسترخوان بچھانے والے شیلاچی کہلاتے اور جب بادشاہ دسترخوان پر بیٹھتا۔ پہلے فقرا کا حصہ علیحدہ کر دیا جاتا۔ تمام ملازمین اس پاس کھڑے رہتے۔ اکبر دودھ یا دہی کھا کر کھانا شروع کرتا اور جب کھانا ختم ہو جاتا تو خدا کا شکر بجالایا جاتا۔ میر بکاول ہر وقت حاضر رہتا اور آخر میں فہرست کے مطابق برتنوں کو لے کر واپس جاتا۔[12]

مختلف قسموں کے کھانے علیحدہ علیحدہ بکاول پکایا کرتے تھے۔ مغل بادشاہوں کے آخر دور میں کھانا پکانے والوں کی تین قسمیں ہو گئی تھیں۔ دیگ شو، باورچی اور رکابدار۔ دیگ شو صرف دیگ اور دوسرے برتن دھویا کرتے، باورچی دیگوں میں کھانا پکایا کرتے۔ رکابدار صرف چھوٹی ہانڈیاں پکاتے اور میوہ جات کے پھول کتر کر کھانوں پر نقش و نگار بناتے۔

بادشاہ اپنے دسترخوان پر سے امرا اور خاص خاص لوگوں کو کھانے بھیجا کرتا تھا جس کو الوش، خاصہ کہا جاتا تھا۔[13] جو امیر رات کو محل کا نگراں ہوتا اس کو بھی کھانا شاہی خاصہ سے ملتا۔ خاصہ پاتے وقت ایک خاص رسم ادا کی جاتی۔ امیر کھڑے ہو کر بادشاہ کے محل کی طرف رخ کر کے تین دفعہ تسلیمات بجالاتا یعنی اپنا دایاں ہاتھ جھک کر زمین سے سر تک اٹھاتا۔[16]

کسی تقریب کے موقع پر بادشاہ کی طرف سے مختلف لوگوں کو تورہ بھی بھیجا جاتا۔ ترکی زبان میں تورہ، آئین اور قانون کو کہتے ہیں۔ لیکن مغل بادشاہوں کے عہد میں تورہ کھانے کے خوان کو بھی کہا جاتا خصوصاً وہ خوان جس میں شادی بیاہ کے موقع پر حصے بھیجے جاتے۔ بادشاہوں کی تقلید میں اچھی حیثیت والے لوگ بھی شادی بیاہ میں وزیروں اور دوستوں کو تورہ بھیجتے۔ ایک تورہ ایک کہار کی بہنگی میں بھیجا جاتا۔ بہنگی پر لکڑی کا رنگین خوان ہوتا۔ خوان میں مٹی کے لاکھی ہوتے جن میں عموماً حسب ذیل چیزیں ہوتیں:۔

(۱) ڈھائی سیر پختہ وزن کی دو عدد باقرخانیاں (۲) دو پیالے قورمہ۔ ہر پیالہ میں کم سے کم آدھ سیر قورمہ ہوتا (۳) شامی کباب پانچ عدد (۴) بریانی دو طباق (۵) متنجن دو طباق (۶) فرنی دو پیالے۔ ہر پیالہ میں آدھ سیر (۷) آم کا مربہ ایک پیالی (۸) کئی قسم کے اچار (۹) دہی ایک پیالہ جس میں کم از کم آدھ سیر دہی ہوتا۔ (۱۰) گاؤزبان دو عدد (۱۱) گاؤدیدہ دو عدد (۱۲) نان تنور یعنی آبی روٹی دو سیر کی چار عدد۔ یہ سب چیزیں مانڈوں سے ڈھکی ہوتی تھیں۔ مانڈہ باریک چپاتی کو کہتے تھے۔ بادشاہوں کے یہاں کے تورے اور بھی پرتکلف ہوتے تھے۔ یہ چاندی اور چینی کے برتنوں میں بھیجے جاتے تھے۔ ان میں کھانے کی مختلف چیزوں کی اتنی فراوانی ہوتی کہ جہاں بھیجی جاتی تھیں وہاں کا صحن بھر جاتا تھا۔

□□

حواشی

۱؎ قران السعدین علی گڑھ ایڈیشن ص ۸۶-۱۸۳

۲؎ سفرنامہ ابن بطوطہ (اُردو ترجمہ) ص ۱۱۲-۱۱۱

۳؎ ایضاً ص ۲۰۶-۲۰۴ ۴؎ ایضاً

۵؎ واقعات مشتاقی ص ۱۳۹ ۶؎ عالمگیر نامہ ص ۶۰۷-۶۱۴

۷؎ سفرنامہ ابن بطوطہ (اُردو ترجمہ) ص ۲۷-۲۹

۸؎ ماثر الامراء جلد اوّل ص ۶۸۴ ۹؎ ماثر الامراء جلد اول ص ۳۰۸

۱۰؎ ایضاً ص ۱۵۸ ۱۱؎ ایضاً ص ۱۸

۱۲؎ تزک جہانگیری ص ۲۶۸

۱۳؎ آزاد ترجمہ بحوالہ اکبر اعظم (AKBAR, THE GREAT MOGUL) از وی۔ اے۔ اسمتھ ص ۳۰۵

۱۴؎ تفصیل کے لیے دیکھئے: جرنل آف دی پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی جلد اول ص ۱۱ سنہ ۱۹۱۱ء

۱۵؎ تفصیل کے لیے دیکھیں آئین اکبری جلد اوّل ص ۲۲

۱۶؎ ماثر عالمگیری ص ۲۵، عالمگیر نامہ ص ۲۱۶

۱۷؎ سفرنامہ برنیر اُردو ترجمہ ص ۲۸۶

افسانہ

علی عبّاس حُسینی

مانجھی

علی عبّاس حُسینی افسانہ نگاروں کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس نے پریم چند کی روایات اور تکنیک کو اپنایا۔ وہ کلاسیکی مزاج کے حامل تھے۔ ان کا بہترین ناول "انوکھی داستیں" ہے جو ان کے نام سے شائع نہیں ہوا تھا، ان کی اہم ترین کتاب "اردو ناول کی تاریخ و تنقید" ہے۔

——— ایڈیٹر

دریا طغیانی پر تھا۔ دونوں ساحل میلوں تہِ آب تھے ہر موج غرّا کر اٹھتی اور دور تک فرشِ آب کو الٹتی پلٹتی چلی جاتی۔ ہر لہر اس زور سے کنارے سے آکر ٹکراتی کہ دریا کے قریب کی زمین ہلتی محسوس ہوتی۔ کبھی کبھی ایسے بڑے بڑے گرداب پڑتے کہ معلوم ہوتا کہ پورے پورے جزیرے غرقاب ہو جائیں گے۔ کبھی کبھی ایسا دھماکہ ہوتا کہ جیسے اندر ہی اندر کوئی آتش فشاں پہاڑ پھٹ گیا۔ خود ساحل پر نہ جانے کیا کیا دریا نے لاکر پھینک دیا تھا۔ مری ہوئی مچھلیاں، نیم جان کچھوے، سیپ، گھونگھے، سڑی ہوئی لاشیں، الٹی ہوئی ہانڈیاں، ٹوٹے ہوئے گھڑے۔ پانی ان کو کبھی شوق میں بڑھ کر اپنی آغوش میں سمیٹ لیتا۔ کبھی خفا ہو کر اترتی ہوئی پاپوش کی طرح اچھال کر ان کو دور پھینک دیتا۔

اس پر پچھم سے بادل اٹھے۔ دیو ہیکل، گرجتے ہوئے بل کھاتے ہوئے اور چند ہی منٹ میں پوری فضا پر چھا گئے۔ شام کا زرد رو آفتاب ڈر کر چھپ گیا۔ تاریکی نے سیاہ چادر پھیلا کر ہر چیز کو ڈھک دیا اور بڑی سخت کڑک کے ساتھ آسمان پھٹا اور موسلا دھار مینہ گرنے لگا۔ ہوا نے بوندوں کے تیر اس کثرت سے دریا کے سینے پر مارے کہ وہ کرب و غصہ سے اور بھی تلملا اٹھا اور اس کی درد بھری چیخ اور اس کی جھلاہٹ بھری چنگھاڑ سے سب کے دل لرزنے لگے۔

ایسے ہولناک موسم میں بوڑھے مانجھی نے کنارے پڑی ہوئی اپنی چھوٹی کشتی کھولی۔ لوگوں نے اچنبھے سے دیکھا یہ بڈھا کیا کرنے والا ہے مگر جب وہ کشتی کو ریت سے ڈھکیل کر پانی میں لے آیا تو کئی چیخ پڑے: "کیوں جان دے رہا ہے بڈھے، کیا ہم سب کے سامنے ڈوب مرنے کا ارادہ ہے؟"

مانجھی نے مسکرا کر دوسرے ساحل کی طرف اشارہ کر دیا وہاں چاندی کا ایک محل تھا۔ اس اندھیرے میں بھی چمکتا ہوا، ایسا سفید کہ آنکھ نہ ٹھہرتی تھی۔ محسوس ہوتا کہ چاندی میں پارہ ملا کر کسی مخصوص سانچے میں دیوتاؤں نے اسے ڈھالا ہے اور تیاری پر دودھ میں نہلا کر اسے یہاں لاکر کھڑا کر دیا ہے اور اس کی بیچ والی محراب میں ایک دیوی کھڑی ہے بقعۂ نور اور اس میں اس بلا کی کشش ہے کہ جہاں ایک بار نظر پڑی پھر درشن کیے بغیر چین ناممکن ہو۔

مانجھی کے اس اشارے نے جادو کا کام کیا جتنے پاس کھڑے تھے وہ سب گرتے پڑتے، پھسلتے لڑھکتے، گھٹنے گھٹنے پانی میں اترتے کشتی میں آکر بیٹھ گئے بلکہ مجمع اتنا بڑھا کہ دس پانچ ڈونگیاں اور ساتھ ہو گئیں۔ مانجھی کے اشارے پر سب اس طرح ایک ساتھ کشتی میں باندھ دی گئیں کہ تختِ رواں کی صورت پیدا ہو گئی۔

مسافروں میں نہ کسی کے پاس چھتری، نہ کسی کے جسم پر برساتی سب یوں ہی بھیگے کیچڑ میں اَٹے بیٹھے رہے اور اس یقین کے باوجود کہ چاندی کے

نیا دور

اکتوبر، نومبر ۱۹۹۴ء

اودھ نمبر

حصۂ دوم

مئی۔جون سنہ ۱۹۷۳ء



ایک روپیہ

کے محل تک پہنچنا محال ہے اور دیوی کے درشن کی آرزو موت کے گھاٹ اتارے گی کشتی میں ڈٹے بیٹھے رہے۔ ہاں جب کبھی وہ سردی یا خطرے سے کانپ اٹھتے تو نظریں اٹھا کر اپنے مانجھی کو دیکھ لیتے۔

ٹہا تقار تھا بوڑھے مانجھی کے چہرے پر۔ سوکھا سا، سانولا سا آدمی ننگے بدن کی ہڈیاں پسلیاں گن لیجئے چہرے کا کٹ بھی خوبصورت نہیں نہ ہاتھ پاؤں ہی ڈھنگ کے جسم میں سوائے ایک گھٹنوں سے اونچی لنگی کے کوئی کپڑا نہیں لیکن جہاں اس کی آنکھوں سے آنکھیں ملیں اور معلوم ہوا معصوم چاندنی آہستہ آہستہ دل میں اترتی جاتی ہے اور اس طرح کا اطمینان اور اس طرح کا یقین پیدا ہوتا جاتا ہے جیسے نہ تو اب کسی خطرے کا ڈر ہے نہ کسی چیز کی دل میں خواہش۔ بس اگر کوئی لگن ہے تو اتنی کہ یہ جو کچھ کہے وہی کیا جائے۔ یہ جو راستہ دکھائے اسی پر چلا جائے اور یہ جس رخ پر چاہے بہاتا لے جائے۔ دنیا کی راحتیں اتنے ہی میں ملتی ہیں کہ اس کی مرضی پر اپنے آپ کو چھوڑ دیا جائے۔ لوگ حیرت سے اس کے استقلال کو اس کے عزم کو دیکھ رہے تھے۔ ایسا طوفان، یہ بھرا اور دھارے کا تیز بہاؤ پھر اس پر بڑھتی ہوئی تاریکی۔ قدم قدم پر بھنور، چپہ چپہ پر مگرمچھ، گھڑیال اور راستے میں ٹوٹنے، ڈوبنے والے دشمن کے جہاز اور یہ اکیلا بوڑھا مانجھی، اس کے کمزور ہاتھ پاؤں، اس کی چھوٹی سی کشتی، مگر اس کے یہاں ڈر کا احساس ہی نہ تھا۔ اسے اپنی فتح کا یقین کامل تھا۔ اس طرح کا یقین کہ وہ دوسروں میں بھی تیزاب کی طرح سرایت کر جاتا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر یہ کہتا ہے کہ یہ ہمیں چاندی کے مندر تک لے جائے گا۔ یہ ہمیں دیوی کے درشن کرائے گا! تو ایسا ہو کر رہے گا۔

اس لئے لوگ کبھی جھلملا جھلملا کر چمکنے والے مندر کو دیکھتے اور کبھی اس بوڑھے مانجھی کو۔

مانجھی نے کمر سے اوپر تک پانی میں اتر کر کشتی کو آہستہ آہستہ دھارے کے خلاف موڑا مگر جیسے ہی وہ خود کشتی پر چڑھا پانی کے ایک تھپیڑے نے ناؤ پھر دھارے پر موڑ دی۔ وہ اس طرح ڈگمگانے لگی کہ بیٹھنے والے بے ساختہ چیخ اٹھے۔

مانجھی نے ان لوگوں پر اطمینان دلانے والی نظر ڈالی اور ڈنڈا اٹھا کر بڑی سہولت سے کشتی پھر دھارے کے خلاف موڑ دی۔ کشتی چلی تھپیڑوں سے کھیلتی، موجوں سے لڑتی گردابوں کو جھیلتی چلی۔ پانی رک گیا، ہوا کی تیزی کم ہو گئی، موجوں کی بلندی پست ہو گئی مگر تاریکی بڑھ گئی، ہولناکی بڑھ گئی۔ گھڑیالوں کا تاک میں لگا گروہ بیٹھ گیا۔

کنارے کی سوکھی دوری پران میں سے ایک اچھلا۔ ایک چیخ پیدا ہوئی اور ساتھ کی کشتیوں میں سے ایک مسافر کم ہو گیا۔ ساتھیوں نے خوف سے کانپتے ہوئے مانجھی کے قریب سمٹنا شروع کیا۔ وہ بالکل اسی طرح سمٹ رہے تھے جس طرح چوزے چیل کے جھپٹنے پر ماں کے پروں میں چھپنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مانجھی مسکرایا "یہ ڈر و نہیں۔ دیوی کے درشن کے لئے اتنی قربانیاں دینی پڑیں گی" وہ اپنا اپنا زیادہ اور کم ڈر چھپا کر خاموش بیٹھ گئے مگر جیسے ہی پاس سے دھارے پر بہتی گیس کی لالٹین جلائے ہوئے ایک بڑی کشتی گذری اور اس پر بیٹھنے والوں نے انھیں بلایا۔

ساتھ کی کشتیوں میں سے کئی مسافر اچک اچک کر اس پر ہو لئے بیٹھے ہوئے مسافروں نے انھیں بزدل، بودا، غدار اور نہ جانے کیا کیا کہا لیکن مانجھی کے چہرے پر شکن نہ آئی۔ وہ ڈنڈا چلائے گیا۔ گھڑیال اچھلتے گئے، موجوں کے پہاڑ آ آ کر کشتی کو کن چن چنگائے جاتے، پھر پاتال میں پٹکتے رہے۔ بڑی بڑی بھنوریں ناؤ کو لٹو کی طرح نچاتی رہیں۔ بدحواس گرتے رہے، بزدل چیخ چیخ کر اپنے کو بچانے کی کوششیں کرتے رہے لیکن مانجھی کی ناؤ چلتی رہی، ڈگمگاتی، ہچکولے کھاتی، لہروں پر چڑھتی اترتی رہی۔

ایک بڑا سا لائف بوٹ آیا اس پر کئی ہنڈے جل رہے تھے۔ اس پر ایک شامیانہ لگا ہوا تھا۔ اس کے نیچے مسند تھی۔ گاؤ تھے۔ کچھ لوگ بڑی شان سے ان پر بیٹھے تھے۔ پچوانیں منہ میں، خاصدان سامنے اور ان کے بیچ میں ایک رقاصہ کولہے مٹکا مٹکا کر ناچ رہی تھی۔ پانی کے تلاطم میں اس کے پازیب کی چھم چھم، تبلے کی گمک اور سارنگی کی ریں ریں بہت ہی دلکش معلوم ہوتی تھی۔ لائف بوٹ والوں نے اسے موڑ کر اس طرح راستے میں کر لیا کہ چھوٹی ڈونگی اس سے آکر ٹکرائی اور رک گئی۔ ان لوگوں نے مانجھی کے ساتھیوں کو ترغیب دی۔ دھمکایا، ڈرایا۔ اپنے بے خطر ہونے اور ان کے خطروں سے گھرے ہونے کی طرف دھیان دلایا اور دو چار کمزور دلوں کو اپنے ساتھ لے کر آگے بڑھ گئے۔

مانجھی نے کوئی روک ٹوک نہ کی وہ مسکراتا رہا اور اپنی کشتی دھارے کے خلاف چلاتا رہا۔ اور وہ ڈگمگاتی، ہچکولے لیتی، پانی کے بڑے بڑے گھونٹ پیٹ میں اتارتی چلی گئی۔ چلتی رہی۔

ایک بڑا اسٹیمر آیا جس کے بعض مسافر ٹوپ لگائے، بعض لال انگوچھا باندھے تھے۔ انھوں نے ڈانٹا، گھڑکا، منع کیا کہ دھارے کے خلاف نہ جا لیکن مانجھی نے سنی ان سنی کر دی۔ وہ کشتی چلاتا رہا، چلاتا رہا۔ ان میں سے ایک نے خفا ہو کر کہا "اسے باندھ لو" اور بڑی بڑی زنجیروں سے کشتی اسٹیمر سے باندھ دی گئی اور وہ اسے کھینچتا ہوا چلا۔ دریا کے سینے پر گہری لکیر ڈالتا۔ طلاطم سے بے پروا، ہوا سے بے خطر۔ لیکن مانجھی بھی اپنی کشتی کو دھارے کے خلاف چلاتا رہا چلاتا رہا یہاں تک کہ بڑا اسٹیمر سست ہو گیا۔ پھر اس طرح سے جھٹکے لے کر چلنے لگا جیسے کوئی چیز بار بار پہیے میں پھنستی ہو پھر مطلقاً رک گیا۔ افسر نے چلا کر کہا۔ "کشتی کاٹ دو" اور زنجیریں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر پڑیں اور مانجھی اپنی ڈونگی لے کر پھر چلا۔ متانت کے ساتھ، یقین کے ساتھ، دھارے کے خلاف، موڑ کے رخ کے خلاف، ساتھیوں کی تعداد سے بے پروا، ڈرنے والوں ڈرانے والوں کی چیخ اور ڈانٹ کی طرف سے کان بند کئے ہوئے۔

ایک اس سے بھی بڑا جہاز آتا دکھائی دیا۔ کشتی کے مسافر سمجھے اب کے یہ باندھ ہی نہ لے گا بلکہ کشتی ہی اٹھا کر ڈیک پر رکھ لے گا۔ انھوں نے گھبرا کر مانجھی کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرایا، اس کی آنکھوں میں خود اعتمادی جھلک کر چھلک گئی۔ اس طرح جھلک گئی کہ مٹھی بھر آدمیوں کا مجمع ایک نئی شراب سے چہک گیا۔ ان کو خطرے میں مزہ آنے لگا۔ انھیں بھی رات کی تاریکی، بجلی کی کڑک اور دریا کے غرابوں میں لطف ملنے لگا۔ ایک سرور و کیف کا عالم ہر ایک پر چھا گیا۔

جہاز والے پاس سے گزرے مسکراتے ہوئے۔ انھوں نے کچھ زبان سے نہ کہا لیکن ان کی ہنسی کہتی تھی کوئی بھید ہے جو چھپایا جا رہا ہے انھوں نے کشتی کو کسی نئی مصیبت میں پھنسانے کا خاموش انتظام کیا ہے جب ہی وہ چپ بھی ہیں اور مسکرا بھی رہے ہیں۔

مسافر گردنیں جھکائے بیٹھے تھے۔ مانجھی کی نظریں پار والے چاندی کے محل اور اس میں استادہ دیوی کے چہرے پر جمی تھیں۔ اندھیرے میں کچھ اور سجھائی بھی نہ دیتا تھا کہ دفعتاً نصف کشتی کسی چیز میں پھنس کر پانی میں چلی گئی مانجھی نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا ساتھیوں سے پوچھا کیا ہے۔ ان میں سے ایک پانی میں غوطے کھا رہے تھے۔ دو ایک خوف سے چیخ رہے تھے۔ جواب کون دیتا۔ وہ آگے بڑھ کر اپنی جگہ سے اٹھا بیچ میں جو مسافر دہشت سے کانپ رہے تھے انھیں دلاسا دیتا اور سہارا دیتا اس سرے پر آیا جو غرقاب تھا۔ اس نے ٹٹول کر دیکھا جو ایک فولادی جال تھا جو اندر ہی اندر نہ جانے کتنی دور تک بچھا تھا وہ اس سرے پر پانی میں بیٹھ گیا۔ اور اس نے آہستہ آہستہ اس جال کو توڑنا شروع کیا۔ جس جس طرح یہ جال ٹوٹتا جاتا تھا ویسے ویسے کشتی بلند ہوتی جاتی تھی۔ بڑھتی جاتی تھی۔ ٹیڑھی، ترچھی ہوتی ہوئی، ڈگمگاتی ہوئی، ہچکولے کھاتی ہوئی، پانی کے بڑے بڑے گھونٹ نگلتی ہوئی بڑھتی ہی جاتی تھی بلند ہی ہوتی جاتی تھی دفعتاً چھن سے آواز ہوئی جال دو ٹکڑے ہو گیا اور کشتی ایک بندھی ہوئی ڈونگی کا ساتھ چھوڑ کر سیدھی ہو گئی ابھری اور لہروں پر تیزی سے چلنے لگی۔

ترا لیجیے سہاگ کے طیور نے چتر پھیلایا۔ صبح کے دھندلکے میں چاندی کے محل کی روشنی پھیلی اور آفتاب کی پہلی کرن نے بڑھ کر محراب میں کھڑی دیوی کے رخ شہابی اور مانجھی کے سانولے چہرے کو ایک سنہری رشتے میں باندھ دیا۔

□□

اودھ کے تفریحی مشغلوں میں ڈرامائی عناصر صفحہ ۱۴۲ کا بقیہ

سر پر لگا سکتا ہے سر سے پیر تک زنانی پوشاک پہنے گا، اور ہر طرح کے زیور سے اپنے کو آراستہ کر کے بالکل ایک عورت بن جائے گا۔ ایک بات اور ہے۔ داستان گو اور بہروپ اپنا اپنا کام انفرادی طور پر انجام دیتے ہیں، لیکن نقالوں کی پوری منڈلی ہوتی ہے اور کئی کئی آدمی مل کر کسی واقعے کو پیش کرتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ڈرامے اور اسٹیج کی حیثیت سے نقالی کو داستان گوئی اور بہروپ پر فوقیت حاصل تھی۔ نقال صرف بہت چھوٹے چھوٹے اور محض ہنسنے ہنسانے والے واقعات دکھاتے تھے۔ کوئی مسلسل واقعہ جس کا آغاز، ارتقا اور انجام نگاہوں کے سامنے آ جائے، پیش نہیں کرتے تھے۔ اس لحاظ سے دیکھیے تو رہس کی ڈرامائی حیثیت بہت پست ہونے کے باوجود نقالی سے بہتر تھی۔

□□

شانتی رنجن بھٹاچاریہ

گومتی سے ہگلی تک

فورٹ ولیم کالج کی سرزمین جہاں میر امن، حیدر بخش اور للو جی لعل نے اپنی تخلیقی کاوشوں سے اردو ادب کو ایک نئی جہت دی تھی اور جس کلکتہ کا ذکر کرتے ہوئے حضرتِ غالب کہا کرتے تھے ؎ اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے۔ اسی کلکتہ سے ایک دیدہ ور اٹھا تھا جس نے بیحد قیمتی، اہم تحقیقی نوادرات اکٹھا کیے تھے۔ اس کا نام شانتی رنجن بھٹاچاریہ تھا۔ اب وہ ہم میں نہیں ہے لیکن ان کی تحقیقات آج بھی ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔

زبان انسانی تہذیب کی ایک نشانی ہے بلند علمی و ادبی زبانیں بلند تہذیب کے نشان ہیں۔ پرچم ہیں۔ اردو کے دامن سے بھی ایک بلند تہذیب وابستہ ہے۔ یہ تہذیب کہاں کی ہے۔ اس کی داغ بیل کب پڑی اور کس علاقے کے باشندوں کا اس تہذیب کے پروان چڑھانے میں کتنا حصّہ ہے؟ اس بات کا فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ آج تک محققین اور ماہرین لسانیات اردو کی تاریخ اور مقام پیدائش کے سلسلے میں کسی ایک نتیجہ پر متفق نہیں ہو پائے ہیں۔ کیونکہ اس عظیم اور بلند تہذیبی زبان میں ان کو کہیں گوداوری، کہیں کرشنا، کہیں برہم پتر، کہیں گنگا جمنا، کہیں گومتی اور کہیں ہگلی کا ترنم ملا ہے تو کہیں باضیں پڑا اور سیگھنا کے لہروں کا مستانہ رقص بھی دکھائی دیا ہے۔ لہٰذا میں یہاں نہ اردو زبان کی تاریخ کے سلسلے میں کچھ کہوں گا اور نہ اس کے تہذیبی سرچشموں کا پتہ لگانے کی کوشش کروں گا بلکہ آج صرف گومتی سے ہگلی کی لہروں کے ملاپ کا ذکر کرنا مقصود ہے۔

ماقبل تاریخ کے زمانے سے ہی انسانی تہذیب کا دریاؤں سے بہت گہرا تعلق رہا ہے۔ دنیا کے تمام بڑے بڑے شہر اور عظیم تہذیبیں دریاؤں کنارے ابھریں کیونکہ انسان پانی سے دور نہیں بھاگ سکتا تھا۔ پانی جو آبِ حیات ہے، امرت ہے۔ انسانی تہذیب نے لہروں کے رقص اس کی ٹھنڈی ٹھنڈی بھیگی بھیگی ہواؤں میں سانس لیا۔ دریاؤں نے ان کے کھیتوں اور باغوں کو سرسبز رکھا اور دھرتی کی پیاس بجھائی۔ دریاؤں کے طوفانی سینوں پر بادبان اٹھاتے ہوئے انسان دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک چلا گیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ تمام قدیم تہذیبیں دریاؤں کے کنارے ابھریں اور پروان چڑھیں ہیں۔ گومتی اور ہگلی کے کنارے کنارے کتنی تہذیبیں ابھریں اور کتنے شہر آباد ہوئے اور ڈوب گئے۔ کون کہہ سکتا ہے ان کی کہانی۔ ان کا حال سب کچھ ان دریاؤں کی لہروں کے ترنم اور ان کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں ہی پوشیدہ ہیں۔

گومتی کے کنارے آباد دلکش شہر لکھنؤ کا جس کی زبان اور تہذیب پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ ہگلی کے کنارے آباد عظیم شہروں مثلاً الادستی، بنوڑا، چندن نگر، سریرا مپور، اترپاڑہ، ہگلی، بردوہ اور کلکتہ سے جو تعلق ہے اس کی داستان طویل اور نہایت دلچسپ ہے۔ اس بحث میں صرف چند باتیں عرض کرنے پر اکتفا کی جاتی ہیں۔

شام اودھ کے سیکڑوں متوالے جب گومتی سے ہگلی کے کنارے پہنچے تو وہ سحر بنگالہ میں کھو گئے اور اودھ کے ان گنت باسیوں نے زلف بنگالہ کی گھنی چھاؤں میں زندگی بسر کرنا پسند کیا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے توسط سے گومتی اور ہگلی کا ملاپ ہوا۔ اور نتیجتاً گلشن اردو میں بے شمار نئے نئے گل کھلے۔ وہ گل جن میں شام اودھ کی بھینی بھینی خوشبو کے ساتھ رس گلے کی شیرینی ہے اور یہی وہ رنگ ہے جسے بجا طور پر رنگ بنگالہ کہا جاتا ہے۔ ایک نیا رنگ، انوکھا حسن!

گومتی اور ہگلی کے تہذیبی سنگم کے سب سے اہم ستون آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ اختر ہیں۔ جن کا ایک پیارا نام پیا بھی ہے۔ وہ

"نہ رخصت اے اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں" کہہ کر گومتی سے ہگلی کے کنارے بمقام مٹیابرج پہنچے تو مٹیابرج لکھنؤ ثانی بنا۔ واجد علی شاہ ایک فردِ واحد کی حیثیت سے نہیں آئے بلکہ وہ اپنے ساتھ اودھ کی زبان و تہذیب بھی لائے لکھنوی مذاقِ سخن کا ایک پورا کارواں بنگال آیا جس میں بہت سے اہلِ علم و فن تھے۔

مولانا عبدالحلیم شررؔ نے اس لکھنؤ ثانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

"میرا بچپن اور نیز شباب کا ابتدائی زمانہ مٹیابرج میں بسر ہوا۔ میں نے دنیا میں آنکھ کھول کر اس مشہور لکھنؤ کو تو نہیں دیکھا جو تہذیب کا مرکز، شائستگی کا منبع اور علمی و ادبی برکتوں کا خزانہ بتایا جاتا ہے مگر مٹیابرج کو دیکھا ہے جو شمع اودھ کا آخری شمع دان اور در اصل اس زمانے کا زندہ لکھنؤ تھا۔ لکھنؤ اجڑ گیا تھا مگر اس کے منتخب صاحب کمال وہاں پہنچ کے ظل اللہ جہاں پناہ کے سایۂ عاطفت میں دریائے بھاگرتی کے کنارے بس گئے تھے۔ مٹیابرج نہ تھا بلکہ دربار مغلیہ و دربار اودھ اور ہندوستان کے اسلامی تمدن کی آخری شمع بنگالے کے ایک کونے میں روشن ہوئی تھی۔"

اس دور کے مٹیابرج، وہاں کی علمی اور ادبی محفلوں، ناچ رنگ، ڈراموں اور مشاعروں کا ذکر۔ غیرہم کلکتے کے قدیم اردو اخبارات مثلاً۔ اردو گائیڈ، دارالسلطنت، گوہر، بھارت اخبار، دوربین، ایسرالاخبار وغیرہ کے علاوہ ادبی رسائل مثلاً گلدستہ، تیجۂ سخن کے صفحات پر بکھرا ہوا پاتے ہیں۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اس دور میں جبکہ واجد علی شاہ کے حق میں ایک لفظ کہنا اپنے لیے مصائب کو دعوت دینا تھا۔ اس وقت بھی کلکتے کے بے باک اور حق پرست صحافیوں اور اہلِ قلم حضرات نے واجد علی شاہ کی طرفداری کی ہے چاہے کتنے ہی ڈھکے چھپے الفاظ میں کیوں نہ ہو مگر انھوں نے اپنی آواز بلند کی ہے۔ کاش کوئی ان تمام اخبارات و رسائل کی مدد سے واجد علی شاہ اور ان کے قیام کلکتہ کے زمانے کا نقشہ پیش کرتا اور اس طرح اس عہد کی ایک تاریخ کتابی شکل میں سامنے آتی۔

یہاں صرف ایک اخبار "دارالسلطنت" کلکتہ، مورخہ ۱۴/ستمبر ۱۸۸۱ء کے طویل اداریے سے مختصر اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ اداریے میں جناب اڈیٹر محمد احسان اللہ نے حکومت وقت سے اپیل کی ہے کہ واجد علی شاہ کے اخراجات میں اضافہ کیا جائے۔ اخبار لکھتا ہے:-

"ہم کو اپنا فرض یعنی گورنمنٹ سے رعایا کا حال عرض کرنا ادا کرنا واجب و لازم ہے۔ آئندہ گورنمنٹ مختار ہے..... یہ امر آج ہمارے ذہن میں آیا ہے جو قابل ملاحظہ گورنمنٹ اور لائق توجہ پارلیمنٹ ہے اور ہماری یہ عرض ہر طرح کی لوث اور غرض سے خالی ہے اور کسی اپنے فائدے ذاتی پر مبنی نہیں اور نہ ہم کو کسی سے کسی نوع کا تعلق ہے نہ کسی نے اس تحریر پر ہم کو آمادہ کیا ہے بلکہ ہم اپنی گورنمنٹ آف انڈیا کی انصاف پروری پر پوری پوری توجہ کر کے ایک حال واقعی جو قابل غور اور لائق فکر ہے اور جس کے دیکھنے اور خیال کرنے سے ہر ایک شخص عاقل اور واقف حال کے دل پر ایک اثر موثر پیدا اور نمونۂ عبرت و مایوسی ہویدا ہے۔ عرض کرتے ہیں۔ شاہ اودھ کے حالات قابل غور سنانے ہیں اور سنانا ہی نہیں بلکہ اپنی گورنمنٹ سے اس عرض کا ایک عمدہ نتیجہ ظاہر ہونے کی امید رکھتے ہیں...

... ہم دیکھتے ہیں کہ شاہ اودھ جن کو سرکار نے کسی باعث سے معزول کر کے ایک لاکھ روپیہ ماہوار ان کے خرچ و اخراجات کے واسطے مقرر فرمایا ہے یہ ماہوار قلیل ان کے مصارف کے واسطے کافی وافی نہیں کیونکہ ان کی بذات سے ہزارہا بندگان خدا پرورش پاتے ہیں اور طرح بر طرح کے فائدے اٹھاتے ہیں۔

..... پس اب ہماری گورنمنٹ کو بھی ایسے وقت میں جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اس طرف توجہ فرما کر مصارف شاہ اودھ کے واسطے جہاں کے خرچ اور شان کے لائق ہو اضافہ کرنا چاہیے۔"

بہرحال ہم دیکھتے ہیں کہ بنگال کے اہلِ قلم نے اس عہد میں بھی جس طرح ان سے ممکن تھا شاہ اودھ کا ساتھ دیا ہے۔ اس دور کے مٹیابرج کا جو کہ اودھ ثانی تھا۔ آج درست نقشہ کھینچنا ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ آج کے مٹیابرج میں ایک دو ٹوٹے پھوٹے شاہی محل اور قبرستان کے علاوہ ایسی کوئی قابلِ ذکر تاریخی نشانی باقی نہیں ہے لیکن بعض بعض قدیم تصانیف میں اس لکھنؤ ثانی کا کچھ ذکر موجود ہے۔ ایک جھلک دیکھئے جسے حقیقی معنوں میں اردو زبان کے پہلے پروفیسر گارساں دتاسی نے گومتی سے ہگلی سے لاکھوں

کروڑوں میل دور فاصلے پر دریائے سیم کے کنارے بیٹھ کر ملک فرانس میں اپنے اردو ہندی پڑھنے والے طلبا کو ۱۸۴۴ء میں پیش کیا تھا۔ انھوں نے لکھا ہے :-

"واجد علی شاہ اختر اپنے ہمعصروں میں ممتاز ہیں۔ کلکتہ سے تین میل دور دریائے ہگلی کے کنارے کوئی بیس[۱] سال سے قیام پذیر ہیں۔ موسیقی، مصوری اور شاعری سے شغف ہے۔ ان کے بنائے ہوئے گیت کلکتہ اور بنارس کے گھروں اور بازاروں میں گائے جاتے ہیں۔ وہ جس شاہی محل میں رہتے ہیں اسے ان کی محل داری کہنا چاہئے۔ ان کی رعایا کی تعداد ۶ ہزار ہے اور دربار داری کی وہ ساری شان باقی ہے جو لکھنؤ کی زینت تھی۔ وہ اپنے محل سے کبھی باہر قدم نہیں رکھتے۔ خود وائسرائے سے ملنے نہیں جاتے البتہ وہ ان سے ملنے آیا کرتا ہے۔ اپنی رہائش گاہ کے لیے بادشاہ نے تین محل بنوائے ہیں۔ سلطان خانہ جسے شاہی محل کہنا چاہئے، اسد منزل اور زرد کوٹھی۔ حرم میں دو بیگمیں ہیں اور ایک سو اکتیس[۲] خواصیں۔ اس چھوٹی سی ریاست کی سب سے عجیب چیز اس کا چڑیا گھر ہے جو سارے عالم میں انتخاب ہے اس میں سب ملا کر بیس ہزار جانور ہیں جن میں کئی نایاب بھی ہیں کبوتروں کا ایسا انتخاب کہیں نہ ہوگا۔ سانپوں اور رینگنے والے دوسرے جانوروں کی اتنی قسمیں کہیں دیکھنے میں نہ آئیں گی۔ باغات کی آرائش نظر افروز ہے اور ان کی دیکھ بھال تین سو مالیوں کے سپرد ہے۔"

یہ ہے ہگلی کے کنارے آباد اس لکھنؤ ثانی کا ایک چھوٹا سا خاکہ جسے اب سے سو سال پہلے گارساں دتاسی نے کھینچا ہے۔ واجد علی شاہ اگرچہ ان دنوں برائے نام ہی شاہ تھے لیکن علم و فن کے وہ ہمیشہ سے متوالے تھے اور فنکاروں کی دل و جان سے قدر کرتے تھے۔ مٹیا برج میں رہ کر بھی انھوں نے فنکاروں کی کتنی عزت کی اس کی ایک مثال دیکھئے۔

دبیر جب کلکتہ آئے تو ان کی آؤ بھگت واجد علی شاہ نے کس طرح کی اس کا ذکر کرتے ہوئے دتاسی لکھتا ہے۔

"پچھلے سال دبیر جب کلکتہ گئے تو سابق شاہ اودھ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ واجد علی شاہ نے ان سے برابری کا سلوک کیا اور خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا۔ واجد علی شاہ نے ان کے خیر مقدم میں ایک شعر بھی کہا جس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے چمپا کی مہک سے دبیر کے کلام کی مہک زیادہ پسند ہے۔ رخصت کے وقت انھوں نے دبیر کو پانچ سو روپے کی پیش کش دی اور اس سال بھی اتنی ہی رقم بھیجی۔"

یہ کہنا مشکل ہے کہ خود واجد علی شاہ کی تصانیف کی تعداد کیا ہے مولانا شرر لکھنوی نے لکھا ہے :-

"حضرت جہاں عالم نے سیکڑوں مرثیے اور سلام کہہ ڈالے اور اتنی کتابیں نظم و نثر میں تصنیف کر دیں کہ ان کا شمار بھی شاید آج کسی کو معلوم نہ ہوگا۔"

خود راقم الحروف کی نظر سے واجد علی شاہ کی جو تصانیف گزری ہیں ان میں (۱) ہیبت حیدری، ۱۲۹۲ھ (۲) مثنوی حزن اختر (۶۱۲۹ (۳) بنی ۱۲۹۵ھ (۴) مباحثہ بین النفس ۱۲۹۱ھ (۵) ضیائے اختر ۱۸۵۹ء (۶) جوہر عروض ۱۸۴۵ء (۷) دولہن ۱۲۹۰ھ وہ تصانیف ہیں جو مطبع سلطانی مٹیا برج کلکتہ میں چھپی ہیں اور کلکتہ کے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔

واجد علی شاہ کے ہمراہ اور پھر ان کے بعد گومتی کے کنارے سے نکل کر ہگلی کے کنارے آکر ان گنت اہل علم و کمال بس گئے۔ کہا جاتا ہے کہ واجد علی شاہ کے دور مٹیا برج کی آبادی چالیس ہزار تھی۔ مثنوی حزن اختر میں خود بادشاہ نے بتایا ہے کہ کلکتہ میں ان کے محلات اور اولاد وابستگان دامن کا شمار پانچ سو کے قریب تھا۔ گومتی کے کنارے سے گئے ہوئے اہل فن میں کئی ایسے ہیں جن کو ہگلی کے کنارے کی مٹی پسند آ گئی۔ کئی ایسے بھی ہیں جنھوں نے لکھنؤ ثانی میں جنم لیا اور جن کی شہرت ہگلی سے گومتی تک اور پھر پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔ ایسے ہی چند نامور فنکاروں میں خواجہ آتش کے شاگردوں میں آغا حجو اور میر دوست علی خلیل ہیں۔ مرزا کاظم علی خاں کے صاحبزادے مرزا محمد رضا خاں برق بھی جو ناسخ کے شاگرد تھے ترک وطن کر کے مٹیا برج میں سکونت اختیار کی اور وہیں کے ہو رہے۔ علی حیدر جو پہلے حیدر تخلص فرماتے تھے۔ نظم طباطبائی کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کی

زندگی کا ایک بڑا حصہ کلکتہ میں گزرا۔ وہ لکھنؤ سے مٹیا برج آئے اور شاہان اودھ کے شاہی مدرسہ میں صدر مدرس رہے لیکن بعد میں حیدرآباد دکن چلے گئے اور وہیں پیوندِ خاک ہوئے۔ مرزا دبیر لکھنوی کے شاگرد سید محمد تقی فیض بھی مٹیا برج میں آکر بس گئے تھے جہاں سے ان کی مشہور تصنیف "لیلا مجنوں" ۱۸۹۱ء میں شائع ہوئی۔ خود مٹیا برج سے ابھر کر کئی صاحب علم نے دنیا میں نام روشن کیا جن میں سب سے اہم مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی کا ہے۔ ان کا ادبی زندگی کا آغاز بھی مٹیا برج سے ہوا اور اس کی تکمیل لکھنؤ پہونچ کر ہوئی۔ یعنی وہ ہگلی کے کنارے سے گومتی کے کنارے آکر چمکے۔ جن دنوں مولوی حیدر لکھنوی مدرسہ حضرت شاہ اودھ کے مدرس تھے ان دنوں مٹیا برج اور کلکتہ میں ان کے کئی شاگرد تھے۔ خود حیدر لکھنوی (نظم طباطبائی) نے کئی مشاعروں میں شرکت کی۔ ایسے کئی مشاعروں کی روداد ہم کلکتے کے قدیم اخبارات و رسائل میں بکھری ہوئی پاتے ہیں۔ بنگال میں ان کے شاگردوں میں تمیز الدین احمد شرف، سید فتح علی فرخ، صاحبزادہ احمد شاہ خاندان میسور ٹیپو سلطان، منشی مرزا مہدی، آغا مرزا علی نجم، منشی نثار احمد وغیرہ رہے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ خود سلطان عالم اختر کے بھی کئی شاگرد ہوئے۔ مثلاً عمید الدولہ بہادر برتر، مرزا محمد عباس شاد، عمید الدولہ بہادر قیاس، مولوی صادق علی مائل اور منشی مرزا مظفر علی بشر لکھنوی وغیرہ۔

فورٹ ولیم کالج کلکتہ نے جو ہندوستان بھر میں اردو کا پہلا کالج تھا۔ دیگر ہندوستانی زبانوں کے علاوہ اردو زبان و ادب کی جو خدمت کی ہے اس کا کم و بیش ذکر ہر تاریخ ادب میں موجود ہے۔ اودھ کے کئی علماء کا تعلق بھی اس کالج سے رہا ہے۔ جن میں مرزا مغل نشاں کا وطن شہر لکھنؤ تھا۔ وہ مرزا کاظم علی خاں جواں کے شاگرد تھے اور انھوں نے گل گرائسٹ کے حکم سے بوستان سعدی کا ترجمہ "باغ سخن" کے نام سے ۱۲۱۸ھ مطابق ۱۸۰۲ء میں عام فہم لکھنوی زبان میں کیا لیکن یہ ترجمہ ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے۔ سید بخشش علی اگرچہ فورٹ ولیم کالج کے ملازم نہیں تھے لیکن انھوں نے سیر المتاخرین کے کچھ حصے کا کالج کے لئے ترجمہ کیا تھا۔ محمد علی ابن سید نثار علی بھی کلکتہ سے لکھنؤ گئے اور فورٹ ولیم کالج میں ۱۸۱۱ء میں شمشیر خانی کا ترجمہ اردو میں "شہنامہ ہندی" کے نام سے کیا جس کے قلمی نسخے کے صفحات ۵۶۷ ہیں۔ اور یہ بھی ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے۔ مرزا محمد فطرت لکھنوی بھی فورٹ ولیم کالج کے مترجمین میں رہے ہیں۔ انھوں نے مقدس بائبل کا ترجمہ "عصر جدید" کے نام سے کیا۔ اس کا پہلا اڈیشن ۱۸۰۵ء میں اور دوسرا ۱۸۱۴ء میں شائع ہوا۔ دوسرے ایڈیشن کے صفحات ۹۲۸ ہیں۔

ایسے اہل فن جو فورٹ ولیم کالج سے وابستہ نہیں تھے بلکہ کاروبار یا ملازمت کے سلسلے میں کلکتہ جا بسے تھے ان میں بھی کئی نام قابل ذکر ہیں۔ عبدالرحیم شاہ آبد لکھنوی کی کئی تصانیف مثلاً گنجینۂ عشاق، ۱۳۰۱ھ، سوز آبد ۱۸۸۴ء اور افضل الشعار ۱۸۹۵ء وغیرہ کلکتہ میں چھپی ہیں۔ آپ ایک اچھے صحافی بھی تھے۔ کلکتہ سے آپ نے کئی اخبار و رسائل بھی نکالے جن میں بہار ہند، "پیک صبا" اور "تحفۂ حجۃ" شامل ہیں۔ مول چند تخلص منشی لکھنوی کا ادبی کارنامہ شاہنامہ کا منظوم اردو ترجمہ ہے جس کا پہلا ایڈیشن کب شائع ہوا اس کا علم نہ ہو سکا لیکن دوسرا ایڈیشن ۱۸۴۶ء میں غلام حیدر نے کلکتے سے شائع کیا۔

اس دوسرے ایڈیشن کے صفحات کی تعداد ۵۹۳ ہے۔ محمد عبدالواحد علی واحد لکھنوی عرصہ تک کلکتہ میں مقیم تھے۔ دیوان نعتیہ اور دیوان رندانہ کے عنوان کے تحت دو حصوں پر مشتمل ان کا دیوان ۱۲۰۹ھ میں کلکتہ سے شائع ہوا۔ مرزا رجب علی بیگ سرور کا امر کارنامہ فسانۂ عجائب ہے مرزا ۱۸۶۳ء میں کلکتے آئے تھے۔ فسانۂ عجائب کے کئی ایڈیشن کلکتے سے نکلے تھے جن میں پہلا ایڈیشن ۱۸۶۸ء کا ہے جو کالج پریس کلکتے سے چھپا۔

بیسویں صدی کے نامور شعراء میں جن کی وجہ سے اردو اور بنگال کا رشتہ مزید گہرا ہوا ہے۔ دو نام ایسے ہیں جن پر جتنا فخر اہل لکھنؤ کر سکتے ہیں اس سے کم حق بنگال والوں کا ان پر نہیں ہے۔ یہ اس لیے کہ ان کا میدان عمل زیادہ بنگال ہی رہا ہے۔ یہ وہ عظیم شاعر ہیں جن کو فن شاعری میں استاد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ان کے نام نامی ہیں علامہ آرزو لکھنوی اور حکیم ناطق لکھنوی علامہ آرزو کے نام سے آج بھی کلکتہ میں "آرزو مجلس" قائم ہے۔ بنگال بھر میں ان کے کئی شاگرد ہیں۔ جن میں برتر محمد آبادی، نازش سکندر پوری، انجم اعظمی، شیدا رامپوری، ثمر غفر پوری، خیر مظفر پوری، ممتاز گونڈوی، ناز غازیپوری، شمیم غفر پوری، صبر مظفر پوری، حسن دریابادی، اختر اعظمی، نواب دھلوی، سراج علی آرزو، ناوک لکھنوی، کلیم فیض آبادی، تنویر لکھنوی، لائق لکھنوی، بسم کلکتوی، منی لال جواں سندیلوی اور جناب ابراہیم وغیرہ چند اہم نام قابل ذکر ہیں

اردو کی منظوم تاریخ بنظمِ اُردو لکھنے والے حکیم ناطق لکھنوی سے کون واقف نہیں۔ آپ ایک بار بنگال آئے تو وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ جولائی ۱۹۵۰ء میں آپنے مشرقی بنگال کی سرزمین کو اپنی آرام گاہ کے لیے پسند فرمایا حکیم ناطق لکھنوی کا دیوان بھی مشرقی بنگال سے ہی ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔ وحشت کلکتوی نے تاریخ وفات کہی تھی:

ناطق لکھنوی ہوئے بزمِ جہاں سے منتقل
شاعرِ نکتہ سنج کی آج ہوئی زباں خموش
سالِ وفات کی جو فکر وحشتِ خستہ دل نے کی
ہاتفِ غیب سے سنا ناطقِ رازداں خموش

۱۳۶۹ھ

آج کے شعرا بنگال میں بھی کئی ایسے ہیں جو اپنے آپ کو لکھنوی کہتے ہیں جس سے شہر لکھنؤ سے ان کا تعلق واضح ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر بادک لکھنوی، مائل لکھنوی، مشیر لکھنوی، تنیر لکھنوی، اختر لکھنوی، حافظ لکھنوی، سالک لکھنوی، شہاب لکھنوی، ضرب لکھنوی اور محرم لکھنوی وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

اب تک گومتی کے کنارے سے ہگلی کے کنارے آنے والوں یعنی ان شعرا اور ادبا کا تذکرہ کیا تھا جو اودھ سے بنگال آئے۔ لیکن یہ تصویر کا ایک رخ ہے۔ اس لیے بنگال کے چند ایسے ستاروں کا ذکر بھی ضروری ہے جن کی چمک دمک کو دیکھ کر لکھنؤ والوں نے ان کو بڑے پیار سے، نہایت ادب سے اپنا لیا۔ ان کی عزت کی اور اپنے دامن محبت میں جگہ دی۔ بنگال کے ان جوہروں میں سب سے پہلا نام انشاء اللہ خاں انشاؔ کا ہے جو مرشدآباد میں پیدا ہوئے اور بڑے ہو کر دہلی گئے اور دہلی سے لکھنؤ آئے جہاں وزیر سعادت علی خاں نے ان کی قدر دانی فرمائی۔ دوسرا اہم نام عبدالغفور نساخ کا ہے جو کلکتے سے ایک بار لکھنؤ آئے۔ لکھنؤ والوں سے ادبی چھیڑ چھاڑ بھی رہی خاص طور سے ان کا انتخاب نقص لکھنؤ کے ارباب ذوق کا ایک مدت تک موضوع بحث بنا رہا۔ ناسخ لکھنوی کے دیوان دفتر پریشاں کے جواب میں اپنے اوّلین دیوان کا نام انھوں نے دفتر بے مثال رکھا۔ ان کا دوسرا دیوان اشعار نساخ بھی لکھنوی رنگ میں ہے۔ نشتر لکھنوی کا ذکر اس سے قبل کیا جا چکا ہے اور کہا گیا ہے کہ وہ ہگلی کے کنارے بمقام مٹیابرج پیدا ہوئے لیکن ایک اور نام ایسا ہے جو تاریخ ادب میں سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ ایک نام جو اَودھ پنچ کے صفحات میں سب سے قابل ذکر رہا ہے وہ ہیں بنگال کے عظیم فنکار نواب سید محمد آزاد۔ ان کے مضامین۔ اودھ پنچ اور ۔مشیر لکھنؤ“ میں عرصہ تک چھپتے رہے۔ ان کی مشہور تصنیف نشی ڈکشنری کا سلسلہ اودھ پنچ نے جنوری ۱۸۷۸ء میں شروع کیا تھا۔ نواب صاحب کے ظریفانہ مضامین کا جواب اردو ادب میں بڑی مشکل سے ملے گا۔ آپ کے مضامین کا ایک مجموعہ دوفر کلب کے نام سے ۱۹۰۰ء میں مطبع شام اودھ لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔

بنگال کے کئی نامور اہل قلم کی تصانیف لکھنؤ میں چھپی ہیں جن میں نساخ کے مشہور تذکرہ سخنِ شعرا کو منشی نول کشور نے ۱۸۷۴ء میں شائع کیا اگر کوئی ایسی فہرست مرتب کی جائے کہ بنگال کے کن کن اہل قلم کی کون کون سی کتابیں لکھنؤ سے شائع ہوئی ہیں تو وہ کافی طویل فہرست ہوگی کیونکہ ان تصانیف کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے۔ مختصر یوں سمجھ لیجئے کہ نساخ سے لیکر خود میری بھی ایک تصنیف شہر لکھنؤ سے شائع ہو چکی ہے۔ ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ کئی بنگالی ہندوؤں نے آ کر سرزمین اَودھ کو آباد کیا۔ انھوں نے نہ صرف اردو زبان سیکھی بلکہ ان میں چند ایسے بھی ہیں جنھوں نے ادب کی خدمت بھی کی مثلاً ڈاکٹر دیال چندر سوم مصنّف درسِ جرّاحی آپ عرصہ تک کنگس اسپتال لکھنؤ کے انچارج اور دیسی زبانوں کی طبّی کتب نصاب کمیٹی کے رکن تھے۔ ڈاکٹر نوبن چندر متر بھی کنگس اسپتال لکھنؤ کے انچارج رہے اور ۱۸۹۰ء میں پنشن پانے کے بعد بھی لکھنؤ ہی میں آباد ہو گئے آپ نے اردو میں چند ناول لکھے ہیں جو لکھنؤ ہی سے شائع ہوئے۔ ناگیندر ناتھ بنرجی بھانسی اور لکھنؤ میں رہے ہیں۔ آپ کی تصنیف ۔شبستانِ عاشقی ۱۸۷۸ء میں لکھنؤ ہی سے شائع ہوئی۔ رام لال چکروتی تخلص جوہر لکھنؤ کے اچھے شاعر تھے۔ آپ ہاکی کے نامور کھلاڑی بھی گزرے ہیں جن کے نام سے رام لال میموریل ٹورنامنٹ اب بھی ہوتا ہے۔ دیپک کمار راہی نوجوان ہیں اور عرصہ سے لکھنؤ میں مقیم ہیں۔ کبھی کبھی افسانے لکھتے ہیں۔ ان کے چند افسانے مختلف اردو رسائل واخبار چھپ چکے ہیں۔

لکھنؤ کی سرزمین خوش نصیب ہے کہ یہاں کی خاک تیر کو بھا گئی اور وہ

جہاں ہمیشہ کے لیے میٹھی نیند سو گئے۔ لہٰذا میرؔ پر حق نہ اکبر آباد کا رہا نہ دہلی کا بلکہ لکھنؤ نے یہ بازی جیت لی۔ اور آج بھی لکھنؤ آل انڈیا میر اکاڈمی کا گھر ہے لیکن عظیم فنکار جغرافیائی حدود میں قید ہو کر محدود نہیں رہ جاتا۔ اس کا پیغام چونکہ سارے جہاں کے لیے ہوتا ہے اس لیے اس کا احترام ہر جگہ کیا جاتا ہے بنگال نے بھی میرؔ کی قدر و منزلت کی اور اس زمانہ میں کہ جب میرؔ زندہ تھے فورٹ ولیم کالج میں میرؔ کو ایک باعزت مقام دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا لیکن میرؔ کافی بوڑھے ہو چکے تھے اور وہ لکھنؤ سے کلکتہ جانے کے لائق نہ تھے چنانچہ ان کے بڑھاپے کے پیش نظر ان کو کلکتہ بلانے کا خیال ترک کر دیا گیا۔ ابھی یہ چرچے دھیمے بھی نہ پڑے تھے کہ میرؔ جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ ایک اور بنگالی منشی تارنی چرن متر جو اپنے زمانے میں سنسکرت، عربی، فارسی، اردو، ہندی اور بنگلہ زبانوں کے عالم تھے اور ان دنوں فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ ہندوستانی کے صدر منشی تھے۔ وفات میرؔ کے فوراً بعد ان کی نگرانی میں میرؔ کے کلام کو یکجا کرنے اور ترتیب دینے کا کام شروع ہوا۔ تارنی چرن متر کی انتھک محنت اور کوشش سے کلیات میرؔ پہلی بار ۱۸۱۱ء میں ہندوستانی پریس کلکتہ سے شائع ہوا۔ یہ کلیات جو اس قسم کی اولین کوشش ہے ٹائپ میں چھپا اور بڑے سائز کے ۱۰۸۵ صفحات پر مشتمل ہے۔

ایک اور عاشق، بنگلہ زبان اور ہندوستانی کے مشہور باغی شاعر قاضی نذر الاسلام گذرے ہیں۔ نذر الاسلام نہ صرف شاعر تھے بلکہ گیت کار اور اداکار بھی تھے۔ ایک فلم میں نذرل نے میرؔ کا رول بھی ادا کیا ہے نذر الاسلام کی اس اداکاری کا ذکر کرتے ہوئے علّامہ وحشتؔ کلکتوی مرحوم نے لکھا ہے۔

"کوئی نو سال کا ذکر ہے کہ ایک فلم کمپنی نے جس کا اسٹوڈیو ٹالی گنج کلکتہ میں تھا ارادہ کیا کہ ایک فلم بنائیں جس میں عالم ارواح کا ایک مشاعرہ دکھایا جائے۔ مشاعرے میں شرکت کرنے والے میرؔ، غالبؔ، مومنؔ اور داغؔ قرار پائے اور ایسا انتظام ہوا کہ میرؔ کا پارٹ نذر الاسلام صاحب کو دیا جائے۔ شاعر نذر الاسلام کی شخصیت کو میں نے بہت جاذب پایا۔ میرا خیال تھا کہ اردو میں مکالمہ اور میرؔ کے اشعار کا پر اثر طریقے سے پڑھنا نذر الاسلام کے لیے مشکل ہوگا لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے ان کو اپنا پارٹ ادا کرتے ہوئے دیکھا۔ میرؔ کے اشعار جذبات کی تصویر ہیں ان کی اداکاری کے لیے ہی جیسا شخص چاہئے جس کو قدرت نے بلا کا احساس دل دیا ہے۔ جب ہم لوگ اپنا اپنا پارٹ ادا کر چکے تو میں شاعر نذر الاسلام سے ہمکلام ہوا اور کہا کہ میرؔ جس کا آپ نے پارٹ ادا کیا ہے۔ آپ کے خیال میں کیسا شاعر ہے۔ انھوں نے کہا کہ میرؔ کا کلام مجھے دیوانہ بنا دیتا ہے۔ دیوانہ تو خدا کے فضل سے میں اصلاً ہی۔ میرؔ میری دیوانگی میں اضافہ کرتا ہے۔"

بیسویں صدی میں بنگال کے جیسے بڑے شاعر خان بہادر رضا علی وحشت کلکتوی نے کئی اشعار میں میرؔ سے عقیدت کا اظہار کیا ہے اور ان کا یہ مصرعہ تو مشہور ہے۔ ؎

کلامِ میرؔ پڑھ پڑھ کر ہوا ہوں نکتہ ور

اب آخر میں وحشتؔ کلکتوی کی نظم میرؔ کا ایک بند سنیے۔

وفا و مہر کا ایسا نہ ہوگا رازداں ہرگز لکھے گا یوں نہ کوئی دردِ غم کی داستاں ہرگز
نہ آئی ہے نہ آئے گی کسی کو یہ زباں ہرگز میسّر ہو نہیں سکتا یہ اندازِ بیاں ہرگز
جو اس کا رنگ ہے وہ کسب سے حاصل نہیں ہوتا
الم پرور وہ اس کا سا کسی کا دل نہیں ہوتا

بہرحال ہماری تاریخ گواہ ہے کہ جب سے اودھ اور بنگال کا ملاپ ہوا ان میں محبت اور دوستی کا جذبہ پروان ہی چڑھتا رہا ہے اور روز بروز وہ قریب سے قریب تر ہوتے گئے ہیں۔ ان کے دلوں میں تاریخ کے کسی دور میں بھی ایک دوسرے کے خلاف نفرت کی آگ نہیں بھڑکی اور میں ایک بار پھر یقین دلاتا ہوں کہ جب تک گومتی اور ہگلی کی مستانہ وار لہریں رقص کرتی بہتی رہیں گی۔ پیار و محبت کے ترانے اسی طرح گائے جاتے رہیں گے۔"

حاشیہ [1] بادشاہوں اور نوابوں کے رکھ رکھاؤ اور ذوق و شوق کا اثر بنگالی رئیسوں کی زندگیوں پر بھی خوب پڑا تھا اور انھوں نے بھی خوب خوب نقل کی ہے کلکتے کے شوبھا بازار راجہ خاندان اور ملک گھرانے پر اس قدر اس تہذیب کا اثر خوب پڑا غالباً واجد علی شاہ کے باغ اور چڑیا گھر سے متاثر ہو کر ہی راجیندر ملک نے بھی باغ اور چڑیا گھر قائم کیا تھا۔ آج بھی ملک خاندان کا محل اور چڑیا گھر جیسا کہ وہ اب قائم ہے دیکھنے ہزاروں لوگ جاتے ہیں اور خاص کر وہ لوگ جو کلکتہ دیکھنے آتے ہیں۔ "ملک باڑی" ملک خاندان کا قدیم مکان دیکھنے جاتے ہیں۔ جہاں دنیا کے مختلف ملکوں سے طرح طرح کے طوطے لا کر رکھے گئے ہیں اور آرٹ کے کئی انمول نمونے بھی محفوظ ہیں۔

□□

فرحت اللہ انصاری

جھلکیاں

مرحوم فرحت اللہ انصاری فرنگی محل لکھنؤ کے اس علمی اور ادبی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے جس میں بہت سے ایسے ممتاز علماء اور دانش ور گزرے ہیں جنھوں نے مختلف موضوعات میں غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں۔ زیرِ نظر "جھلکیاں" مرحوم کی ۱۹۵۶ء کی تحریر ہے۔

—— ایڈیٹر

۱۹۱۵ء کا زمانہ ہے۔ گاندھی جی افریقہ سے واپس آ رہے ہیں، بمبئی کی بندرگاہ پر اخبار نویسوں کا اچھا خاصا مجمع ہے۔ ایک پارسی نوجوان جھپک کر آگے بڑھتا ہے۔ اس خیال سے کہ سب سے پہلے وہی گاندھی جی سے بات کرے۔ حسبِ دستور اس نے انگریزی میں سوال کیا۔ گاندھی جی نے سوال کا جواب دینے سے پہلے اپنے نرم و نازک لہجے میں کہا،

"آپ بھی ہندستانی، میں بھی ہندستانی۔ میری مادری زبان بھی گجراتی۔ آپ کی مادری زبان بھی گجراتی۔ پھر آپ مجھ سے انگریزی میں سوال کیوں کرتے ہیں؟

کیا آپ کا خیال ہے کہ میں جنوبی افریقہ میں رہ کر اپنی مادری زبان بھول گیا ہوں۔؟"

گاندھی جی شانتی نکیتن میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ وہ کل ہی آئے ہیں۔ آج پہلی صبح ہے۔

شانتی نکیتن کے لوگ جن میں اس زمانے میں کاکا کلیلکر بھی ہیں حسبِ معمول کام پہ چلے جاتے ہیں۔ کام یہ ہے کہ شانتی نکیتن کی کٹیوں کے سامنے ایک تالاب ہے جسے وہ ہر صبح پاس کے ٹیلہ کو کھود کر پاٹتے ہیں۔ ایک گھنٹہ کی اس مشقت کے بعد جب پلٹتے ہیں تو ناشتہ تیار کرتے ہیں، کھاتے ہیں۔ پھر دوسرے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔

آج جو یہ ٹولی پلٹی تو کیا دیکھتی ہے کہ پھل پھلاری سب قاعدے سے کٹی بنی تھالیوں میں لگی ہوئی ہے۔

کاکا نے مہاتما گاندھی جی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا،

"آئیں! یہ سب کس نے کیا ہے؟

مہاتما جی نے جواب دیا "میں نے۔"

کاکا: "آپ نے! یہ تو کچھ اچھا نہیں لگتا کہ آپ یہ سب کریں اور ہم لوگ بیٹھ کر کھائیں۔"

مہاتما: "اس میں حرج ہی کیا ہے۔ تم کام پر گئے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا اتنی دیر میں میں تمھارا ناشتہ تیار کردوں۔"

بمبئی میں ۱۹۱۵ء کی کانگریس ہو رہی ہے۔ گاندھی جی مارواڑی ودیالیہ میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ایک دن ان کو کہیں باہر جانا تھا۔ انھوں نے اپنے ڈیسک کی چیزوں کو سلیقہ سے سمیٹنا شروع کردیا۔ سب چیزیں رکھ لینے کے بعد بھی وہ کسی چیز کو بڑے دھیان سے اِدھر اُدھر ڈھونڈنے لگے۔ کاکا کلیلکر نے پوچھا،

"باپو! آپ کیا ڈھونڈھ رہے ہیں۔؟"

باپو، "ایک پنسل ڈھونڈھ رہا ہوں۔ ننھی سی ہے۔"

کاکا: "لیجیے آپ یہ پنسل رکھ لیجیے۔ میں اس پنسل کو ڈھونڈھ کر رکھ لوں گا"۔ مقصد یہ تھا کہ باپو کا قیمتی وقت کیوں ضائع ہو، اور وہ بلا وجہ کیوں تھکیں۔

باپو: "نہیں، مجھے وہی پنسل چاہیے۔ وہ مجھے ایک چھوٹے سے بچے نے دی تھی۔ میں اسے کھو نہیں سکتا!"

کاکا بھی باپو کے ساتھ ڈھونڈنے میں لگ گئے۔ اور جب تک اس ننھے بچے کا وہ ننھا سا تحفہ مل نہیں گیا، باپو کو چین نہیں آیا۔

گاندھی جی نے گجرات میں مستقل سکونت اختیار کرلی ہے ـــ جب گجراتیوں کو معلوم ہوا کہ گاندھی جی لسانی صوبوں کی تشکیل پسند کرتے ہیں تو کچھ لوگوں کو "گجرات راجکیہ پریشد" (گجرات پولٹیکل کانفرنس) قائم کرنے کی سوجھی۔

گاندھی جی ٹھیک وقت پر کانفرنس پہنچ گئے۔

مہاراج تلک بھی مدعو تھے۔ وہ جیسا کہ اکثر ہوا کرتا تھا، آدھ گھنٹہ دیر سے پہونچے۔

گاندھی جی نے ان کا بڑے تپاک اور احترام سے خیر مقدم کیا مگر کہا:

"لوک مانیہ آدھ گھنٹہ دیر سے آئے ہیں۔ اگر ہمیں سوراج لینے میں آدھ گھنٹہ اور لگا تو اس کا عذاب لوک مانیہ کے سر رہے گا!"

۱۹۳۰ء کا زمانہ ہے۔ گاندھی جی یرودا جیل میں ہیں۔ میجر مارٹن جیل سپرنٹنڈنٹ گاندھی جی کے لئے فرنیچر اور برتن وغیرہ کا انتظام کررہے ہیں۔ جب یہ چیزیں گاندھی جی کے پاس پہونچنا شروع ہوتی ہیں تو گاندھی جی جیل سپرنٹنڈنٹ سے کہتے ہیں:

"یہ سب کس کے لیے آرہا ہے؟"

جیل سپرنٹنڈنٹ نے جواب دیا: "آپ کے لئے۔ میں نے گورنمنٹ کو لکھا ہے کہ اتنے بڑے معزز مہمان کے خورد و نوش کے لیے تین سو روپے مہینے کا انتظام ہونا چاہیے۔ اور مجھے امید ہے کہ گورنمنٹ اسے بھی منظور کرلے گی۔"

گاندھی جی نے کہا: "آپ کا بہت بہت شکریہ۔ مگر میرا ماہانہ خرچ ۳۵ روپئے سے زیادہ نہ ہوگا۔ مجھے اس سب سامان کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ میری صحت ٹھیک ہوتی تو میں کھانا بھی 'سی' کلاس کا کھاتا۔ اس لیے مہربانی کرکے یہ سب لوازمات ختم کیجیے۔"

ساری کراکری واپس ہوگئی اور اس کی جگہ وہی تسلا اور چمچہ گاندھی جی کے لیے بھی آگیا۔

شام کی پرارتھنا ختم ہوچکی ہے۔ باپو تکیہ سے ٹیک لگائے اپنی چارپائی پر بیٹھے شری روجی بھائی پٹیل سے باتیں کررہے ہیں اتنے میں 'با' اٹھیں اور ایک چادر کو دوہرا تہرا کرکے انھوں نے باپو کے شانوں پر ڈال دیا۔ باپو اسی انہماک سے باتیں کرتے رہے۔

تھوڑی دیر کے بعد روجی بھائی کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بڑا سا کالا سانپ باپو کی پیٹھ سے رینگتے رینگتے ان کے داہنے شانے کی نوک پر آگیا ہے اور ادھر ادھر دیکھ رہا ہے کہ اب کدھر جائے۔ روجی کی نظر اس پر گڑ کر رہ گئی۔ دوسرا ہوتا تو چیخ اٹھتا اور نہ جانے کیا ہو جاتا۔

مگر روجی بھائی ان غیر معمولی آدمیوں میں تھے جن کے حواس کبھی نہیں جاتے۔ پھر بھی ان کے سلسلۂ کلام میں اتنا فرق آہی گیا کہ باپو نے پوچھا:

"کیا بات ہے۔ تمھارا دھیان کہاں ہے۔؟"

روجی بھائی نے نہایت آہستہ سے کہا:

"کچھ نہیں باپو۔ بس ایسے ہی بیٹھے رہیے۔ آپ کے شانے پر سانپ چڑھ آیا ہے۔"

باپو: "میں بیٹھا رہوں گا۔ مگر تم کیا کرنا چاہتے ہو۔؟"

روجی: "میں چاہتا کہ چادر مع سانپ کے آپ کے اوپر سے اٹھا کر پھینک دوں!"

اتنی سی گفتگو سے بھی سانپ کو کچھ بھنک لگ ہی گئی۔ اس نے منہ پھیرا اور کسی تہہ میں چپکے سے غائب ہوگیا۔

روجی اٹھے تو باپو نے چپکے سے کہا:

"میں تو بے حس و حرکت بیٹھا ہوں مگر تم اپنے کو بچائے رہو۔"
روجی نے احتیاط سے کونے پکڑ کر چادر اتار لی اور جیسے ہی سانپ نے منہ نکالا انھوں نے اسے جھٹک کر دور پھینک دیا۔

سانپ کے بارے میں تو مشہور ہی ہے کہ اگر وہ کسی کے سر پر پھن کاڑھ دے تو وہ شخص بادشاہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ دوسرے روز جب اخبار نویسوں نے اپنی جولانیٔ طبع دکھائی تو ایسی ہی قیاس آرائیاں شروع ہوگئیں۔

خود کاکا کلیلکر سے ایک صاحب نے پوری سنجیدگی سے کہا:
"اگر وہ باپو کے شانے سے سر پر چڑھ جاتا تو باپو ضرور ہندستان کے بادشاہ ہو جاتے۔"

باپو سے پوچھا گیا کہ آپ کو کیا محسوس ہوا جب آپ کو پتہ چلا کر سانپ آپ کے شانے پر چڑھ آیا ہے۔ تو انھوں نے کہا:
"گھڑی بھر کو تو میں ڈرا۔ اس کے بعد خیال بھی نہیں ہوا۔"

گاندھی جی برما کے چند روزہ دورہ سے واپس ہی ہوئے تھے کہ تار آیا (فروری ۱۹۱۵ء) اور معلوم ہوا کہ گوکھلے جی اب نہیں رہے۔

گاندھی جی نے فوراً ہی یہ عہد کیا کہ وہ آج سے سال بھر تک ننگے پیر رہیں گے، اور پونا روانہ ہو گئے جہاں گوکھلے جی کا انتقال ہوا تھا۔

گوکھلے جی کی خواہش تھی کہ گاندھی جی ان کی سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی میں شامل ہو جائیں، مگر گاندھی جی کو اس سوسائٹی سے پورا اتفاق نہیں تھا اس لیے وہ ان کی زندگی میں کوئی فیصلہ نہ کر سکے۔

جب گوکھلے جی مر گئے تو ان کی وہ خواہش گاندھی جی کے لیے ایک وصیت سی ہو گئی۔ اس لیے انھوں نے سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کی ممبری کے لئے درخواست دے دی۔

سوسائٹی بڑے چکر میں پڑ گئی۔ گاندھی جی کو ممبر بناتی ہے تو مشکل کہ وہ اپنے راستے سے تو ہٹیں گے نہیں، اور ممبر نہیں بناتی ہے تو بھی مشکل کہ گاندھی جی کی درخواست اور رد کر دی جائے۔

جب گاندھی جی کو سوسائٹی کی اس الجھن کا پتہ لگا تو انھوں نے اپنی درخواست واپس لے لی مگر سوسائٹی کی سرپرستی کرتے رہے۔

شنکر لال جی کا کہنا ہے کہ جب ہم کالج میں پڑھتے تھے تو ہمارا خیال تھا کہ میں، جیوت رام کرپلانی اور عمر شبمانی نے ہوم رول کا بڑا کام کیا ہے اور بمبئی کی ساری سیاست پر چھائے ہوئے ہیں۔

ایک دن ہم نے سنا کہ ایک آدمی گاندھی ہندستان آیا ہے جو بہت کچھ کرنے والا ہے۔ خیال ہوا کہ چلو اس سے ملیں اور دیکھیں کہ اس سے کہاں تک کام لیا جا سکتا ہے۔ ہم لوگ گئے۔ گاندھی جی زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے کرسیاں گھسیٹیں، بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ نہ پوچھیے کیسے ستے پرستانہ لہجے میں گفتگو کی ہے۔

مگر جب پلٹے تو محسوس ہوا کہ ہم اس سے بہت متاثر واپس آئے ہیں۔

□□

صحبت

"مصحفی کو شاعری میں اگر واقعی مصیبت پیش آئی تو اس بدمذاقی میں شریک ہونے کے وقت آئی جس نے انشاؔ کو اور جس کو انشاؔ نے اُچھال رکھا تھا۔ کاش انشاؔ نے اپنے خاص رنگ کو سلیقے اور قرینے سے نباہا ہوتا اور نئی راہ نکال کے اتنا نہ لپکتے تو آج وہ زبردست، سنجیدہ اور صاحبِ طرز شاعر ہوتے ....

اگر انشاؔ کو اہلِ دہلی یا سنجیدہ لوگوں کی صحبت نصیب ہوئی ہوتی تو وہ بڑا زبردست شاعر ہوتا۔ میں کہتا ہوں کہ انشاؔ کو خود اپنی صحبت اگر نصیب ہوئی ہوتی تو وہ غضب کا شاعر ہوتا۔"

——— فراق گورکھپوری

"انداز سے"

ڈاکٹر مسیح الزماں

اردو شاعری میں ہولی

ڈاکٹر مسیح الزماں الہ آباد یونیورسٹی میں ریڈر تھے ۴۸ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ مرحوم جائس کے رہنے والے اور مسعود حسن رضوی ادیب کے داماد تھے۔ مرثیے کے مستند عالم تھے۔ ان کی کتاب "اردو مرثیے کا ارتقاء" آج بھی طالب علموں کے لیے مشعل راہ ہے۔ —————— ایڈیٹر

ہولی ہندوستان کے موسم بہار کا تیوہار ہے جب جاڑے کی برفیلی ہواؤں کی تیزی خوشگوار اٹھکھیلیوں میں بدل جاتی ہے، آم کے بور کی خوشبو ہر طرف پھیل کر کوئلوں کو دیوانہ کر چکی ہوتی ہے ہزاروں پیلے پیلے تاج پہنے ہوئے درخت سبز موتیوں جیسی کیریوں سے لد جاتے ہیں جب لہلہاتی کھیتوں کی ہریالی زرد دوشالہ اوڑھ لیتی ہے اور پیاری زمین اپنے بچوں کی مسکراہٹ سے مسکرا کر سونا اگل دیتی ہے تو اس ملک کے رہنے والوں کے چہرے خوشی سے دمکنے لگتے ہیں۔ اپنی محنت کو پھل اور اپنی امیدوں کو کامیابی سے ہمکنار دیکھ کر ان کی نگاہوں سے شراب چھلکنے لگتی ہے۔ ہونٹوں سے نغمے پھوٹ نکلتے ہیں اور خوشی کی شدت میں بے تاب ہو کر عورت مرد سبھی ڈھولک کی کی مدھر تھاپ پر جھومنے لگتے ہیں۔ رنگ کی پچکاریاں چلنے لگتی ہیں۔ گلرنگ دھاریں فضا میں لہرانے لگتی ہیں۔ قہقہے گنگناتے ہیں اور شوخیاں ناچتی ہیں۔ نظیر اکبرآبادی اس عالم کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

آ جھمکے عیش و طرب کیا کیا جب رنگ دکھایا ہولی نے
ہر آن خوشی کی دھوم ہوئی یوں لطف جتایا ہولی نے
ہر خاطر کو خورسند کیا، ہر دل کو لبھایا ہولی نے
دف رنگیں نقش سنہری کا جس وقت بجایا ہولی نے
بازار گلی اور کوچوں میں غل شور مچایا ہولی نے
ہر آن خوشی ہیں آپس میں سب ہنس ہنس رنگ چھڑکتے ہیں
رخسار گلالوں سے گلگوں، کپڑوں سے رنگ ٹپکتے ہیں
کچھ راگ اور رنگ جھمکتے ہیں کچھ مے کے جام چھلکتے ہیں
کچھ کودے ہیں کچھ اچھلے ہیں کچھ ہنستے ہیں کچھ بکتے ہیں
یہ طور یہ نقشہ عشرت کا ہر آن بنایا ہولی نے

دیہات کے رہنے والے ہوں یا شہر کے بسنے والے سب ہی اپنی اپنی طرح ہولی مناتے ہیں خوش ہوتے ہیں اور اس خوشی کو طرح طرح ظاہر کرتے ہیں۔ کہیں پینے پلانے کی محفل سجتی ہے کہیں راگ رنگ کا جلسہ جمتا ہے نظیر کے بقول:

جب پھاگن رنگ جھمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
اور دف کے شور کھڑکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
پریوں کے رنگ دمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
اور ساغر کے چھلکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
محبوب نشے میں چھکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
سامان جہاں تک ہوتا ہے اس عشرت کے مطلوبوں کا
وہ سب سامان مہیا ہو اور باغ کھلا ہو خوبوں کا
ہر آن شرابیں ڈھلتی ہوں اور ٹھٹھ ہو رنگ کے ڈوبوں کا
اس عیش مزے کے عالم میں اک غول کھڑا محبوبوں کا
کپڑوں پر رنگ چھڑکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

اور ایک طرف دل لینے کو محبوب بھویوں کے لڑکے
ہر آن گھڑی گت بھرتے ہوں کچھ گھٹ گھٹ کے کچھ بڑھ بڑھ کے
کچھ ناز جتاویں لڑ لڑ کے کچھ ہولی گاویں اڑ اڑ کے
کچھ لچکے شوخ کمر پتلی کچھ ہاتھ چلے کچھ تن پھڑکے
کچھ کافر نین مٹکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

شاعر کو تو آپ جانتے ہی ہیں کہ وہ سب سے الگ نظر رکھتا ہے حالات اور مناظر کی ہو بہو تصویریں کھینچنا ہی اس کا کام نہیں بلکہ وہ اپنی تخیل کی مدد سے ایسی چیزیں دیکھ لیتا ہے۔ زمین پر ہولی کی جو بہاریں اس نے دکھائی ہیں وہ تو سب ہی دیکھ لیتے ہیں لیکن دیکھئے۔ وہ آسمان پر بھی ہولی کی سرمستیاں دیکھتا ہے۔

جو گھر کے ابر کبھی اس مزے میں آتا ہے   تو بادلوں میں وہ کیا کیا ہی رنگ لاتا ہے
خوشی سے رعد بھی ڈھولک کے گیت گاتا ہے   ہوا کو ہولیاں گا گا کے کیا سناتا ہے
تمام رنگ سے پر ہے بہار ہولی میں

آسمان تو آسمان ہے اسے ہر طرف ہولی کی بہاریں نظر آتی ہیں دیکھئے پھلواری کی کیا کیفیت ہو رہی ہے۔

گلوں نے پہنے ہیں کیا کیا ہی جوڑے رنگ برنگ   کہ جیسے لڑکے یہ عاشق پہنتے ہیں تنگ
ہوا کے پتوں سے بجتے ہیں تال اور مردنگ   تمام باغ میں کھیلیں ہیں ہولی گل کے سنگ
عجب طرح کی مچی ہے بہار ہولی میں

جب اس طرح ساری کائنات ہی ہولی منا رہی ہو تو پھر یہاں کے بسنے والوں کا کیا کہنا۔ خوشی سے بیخود اور کیف میں کھوئی حسیناؤں کی حالت جوش نے اس طرح ایک جگہ بیان کی ہے۔

آرائشوں کی فکر نہ زیبائشوں کا ہوش   وارفتگی لالہ رخاں دیدنی ہے آج

نظیر نے اپنے اشعار میں اس وارفتگی کا منظر پیش کیا ہے اور وہ بھی کنھیا جی کے دیس کی وارفتگی کا منظر۔

گھروں سے سانوری اور گوریاں نکل چلیاں   کسنبھا اوڑھنی اور مست کرتی اچھلیاں
جدھر کو دیکھیں ادھر مچ رہی ہیں رنگ رلیاں   تمام برج کی پریوں کی بھر رہی گلیاں
مزا ہے سیر ہے در ہر کنار ہولی میں
جو کوئی سیانی ہے ان میں تو کوئی ہے ناکند   وہ شور بور ہیں سب رنگ سے نپٹ یک چند
کوئی ملائی ساجن کو یار کی سوگند   کہ اب تو جامہ و انگیا کے ٹوٹے ہیں سب بند

پھر آ کے کھیلیں گے ہو کر دو چار ہولی میں

اجتماعی مسرت اور خوش حالی کی کتنی خوش آئند تصویر ہے جس میں غم و الم سے دور نشاط و کیف کا راج ہے۔ جیسے جوانی نے روپ نکھارا ہو جیسے فطرت نے دھرتی کے سارے خزانے لٹا دیے ہوں اور شاعر کی فنکاری اور قدرت دیکھئے کہ وہ ان چہلوں اور شوخیوں کی کیسی جاندار تصویر پیش کرتا ہے۔

یہ عوام کی زندگی اور متوسط طبقے کی چہلیں تھیں لیکن اونچے طبقے کے لوگ بھی ہندو مسلمان سب بڑے چاؤ سے اسے مناتے رہے اور یہ صرف پبلک سے مخصوص نہیں تھا بلکہ راجا اور نواب، حاکم اور بادشاہ سب کا یہی طریقہ تھا۔ نواب آصف الدولہ کے ہولی منانے کا بیان میر تقی میر نے اس طرح کیا ہے۔

ہولی کھیلا آصف الدولہ وزیر   رنگ صحبت سے عجب ہیں خورد و پیر
دستہ دستہ رنگ میں بھیگے جواں   جیسے گلدستے تھے جوؤں پر رواں
زعفران رنگ سے رنگیں لباس   عطر داں سے سبھوں میں گل کی باس
رنگ افشانی سے پڑتی ہے پھوار   رنگ باراں تھا مگر ابر بہار
قمقمے جو مارتے بھر کر گلال   جس کے لگتا آن کر پھر منہ ہے لال
برگ گل ملواں اڑاتے تھے عبیر   تھی ہوا میں گردنا چرخ اثیر
ہاتھی آئے کوہ پیکر کیا بنے   جیسے دھواتے جواں ہوں ان کے

ہولی کی بہاریں رنگا رنگ ہیں۔ یہ ہولی جہاں لوگوں کے لیے سرور و کیف عشرت و مستی کا پیغام لے کر آتی ہے وہاں بہتوں کے لئے آنسوؤں کے ریلے بھی لاتی ہے جو لوگ اپنے چاہنے والوں سے دور ہیں ان کے لئے یہی پچکاریاں یہی مسرتوں میں ڈوبے قہقہے چھری اور کٹار بن جاتے ہیں اور موسم کی شگفتگی دوری کے احساس کو بڑھا کر دل کی ہوک تیز کر دیتی ہے۔

لئے ہاتھوں میں پچکاری پھرت ہیں   عبیرا پنے بیا کے مکھ ملت ہیں
گلال اور رنگ سب کچھ کھیلت ہیں   گلاب اور مشک اس میں میلت ہیں
اری عالم میں ہولی مچ رہی ہے   دف و مردنگ کی گت لگ رہی ہے
سبھی ہنس ہنس کے پی کے سنگ بولیں   خوشی سیتی پیا کے سنگ جھولیں
رنگیلی چونری پر رنگ ڈالیں   بھئیں ہو رکا ہیں پوری ساری ناریں
تمامی رات ناچیں دن کو گائیں   سکل سب نار پی کے من کو بھائیں
ابھی یہ دیکھ کر ہنگام ہولی   مرے جی پر قیامت آ گئی ہولی
(بکٹ کہانی)

افضل کے اس بیان کے بعد وہ بٹے برہا کی داستان ملاحظہ ہو۔

سبھی ہل مل کے کھیلیں پھاگ ہوری   لئے بھر بھر سکھی ابرا کی جھوری
سبھوں کو گیت رنگ اب لاگ بھاوے   مرے تن کو تو ہوری سی جرا دے
سکھی ہل مل کے جو ہوری کو گا دیں   مری بیراگ سوں چھاتی جلا دیں
سکھی ری جگ میں نا یہ پھاگ بجے گا   ہمارے جیو کا بیراگ بجے گا
نہ جانوں آگ جب ہوری پڑے گی   بچاری جیو کو تب کیا کرے گی

جذبات سے بھرپور محبت کی ماری کے دل پر جو گزرتی ہے اور دوسروں کو رنگ کھیلتے دیکھ کر سینے پر سانپ لوٹ جانے کی کیفیت ہوتی ہے اس کا یہ کامیاب نقشہ ہے۔ ایک برہنی کے احساسات مقصود پیش کرتے ہیں۔

لگا پھاگن مچی ہوری دو عالم   ہزار افسوس ہے پردیس بالم
پیا سے پھاگ کھیلیں ناریاں سب   اڑا دیں رنگ اور پچکاریاں سب
رہیں شرابور سب کی چولیاں بھی   عبیر و لعل بھر بھر جھولیاں بھی
کوئی گا دے سکھی کوئی بجا دے   پیا بن آہ مجھ کو کچھ نہ بھا دے
اری سکھیو مبارک باد تم کو   دئے اچھے خدا نے بھاگ تم کو
ہکے دل میں سب مجھ کو دوانی   چلی یہ ہاتھ سے فصل جوانی
سکھی سب ڈھاک پھولے انبوا بورے   پیا اب تک نہ مورے آہ بہورے
پیا کے غم میں بس ساری گئی سوکھ   مرے جوبن کی پھلواری گئی سوکھ

(بارہ ماسہ مقصود)

آپ نے دیکھا ہمارے سماج کے اس گونگے طبقے کے جذبات کو بھی اردو شاعروں نے نظر انداز نہیں کیا جسے عورت کہتے ہیں بلکہ جذبات کے ساتھ ساتھ لب و لہجہ میں بھی اس کا لحاظ رکھا ہے تاکہ اصلیت کا دامن ہاتھ سے نہ جانے پائے لیکن ان شعروں سے آپ کو یہ غلط فہمی نہ ہونا چاہئے کہ عورت کی زبان سے صرف برہا کی داستان ہی شاعر بیان کرتا ہے۔ اردو میں کتنی ہی ہولیاں اور گیت ایسے لکھے گئے ہیں جن میں عورتوں کی زبان سے باتیں کہی گئی ہیں۔ گیتوں کا انداز تو عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے۔ اودھ پنچ لکھنؤ کا ایک مطبوعہ گیت ملاحظہ ہو۔

جانے نہ دے مو ہے پنیا بھرن کو   روکے ڈگر پچکاری کے مارے
رنگ میں بھوئے موری بہیاں پکڑ کے   کیسے بتاؤ کوئی ساری سنبھارے

آگے کے بول تو ذرا شوخ زیادہ ہیں لیکن ان سے خیال حسرت موہانی کی تین شعروں کی طرف چلا جاتا ہے۔

منہ پر رنگ نہ ڈال مراری   منتی کرت ہوں تہاری
پنیاں بھرن کا ہ نہ جانے دیہیں   شیام بھر کے پچکاری
تھر تھر کانپت لاجن حسرت   دیکھت ہیں نرناری

ہولی کا ذکر غزلوں میں بھی ہے اور جدید شاعری میں بھی۔ اردو کا سب سے ٹھاٹ شاعر میر تقی میر کہتا ہے۔

منہ پہ عبیر عاشق اصرار سے ملے ہیں   کب ہاتھ کھینچتے ہیں معشوق کی نہیں سے

اور اس شعر میں دیکھئے کیسی تصویر کھینچی ہے۔

یکسو گلال منہ پر خوباں کے مل رہے ہیں   الجھے ہیں ہاتھ یکسو گیسوئے نازنیں سے

اودھ پنچ کی ایک غزل مطبوعہ ۱۸۸۱ء ملاحظہ ہو۔

سرخ ہے اس غیرت گل پیرہن کا رنگ آج   پھوٹ نکلا پیرہن سے کیا بدن کا رنگ آج
پان کا لاکھا جما کر ناز سے کہتے ہیں وہ   غنچۂ گل سے کہو دیکھے دہن کا رنگ آج
ہو گیا ہے سرخ پانی حوض کا مثل گلاب   غسل میں چھوٹا مگر تیرے بدن کا رنگ آج
لال ہے چہرہ بھی آنکھیں بھی الٰہی خیر ہو   کچھ تو بے ڈھب ہے مرے ناوک فگن کا رنگ آج
رنگ ہولی کا ہے یا پھولا ہے ٹیسو ہر طرف   رشک صحرائے جنوں ہے ہر چمن کا رنگ آج
دیکھئے اے پنچ اس مضمون رنگیں کی بہار   سوز کا غذ دکھاتا ہے چمن کا رنگ آج

بھوک اور گرانی غریبی کا احساس ہمارے شاعروں کے یہ جنگ عظیم کے بعد کی چیز نہیں۔ احمد علی شوق قدوائی نے ۱۸۷۸ء میں یہ نظم لکھی تھی۔

گرانی میں اب کی جو آئی ہے ہولی   نیا سوانگ میں سوانگ لائی ہے ہولی
نہ پوری کچوری نہ آلو نہ اروی   دہائی ہے ہولی دہائی ہے ہولی
جلایا تھا جس طرح سو کھے نے ہم کو   اسی طرح ہم نے جلائی ہے ہولی
گرانی نے پہلے سے پھیری تھی جھاڑو   مگر بھانکنے خاک آئی ہے ہولی
یہ افلاس دیکھے یہ ٹیکس اور مہنگی   یہ کیوں آئی کیا بوکھلائی ہے ہولی
للائن کی نتھنی بٹیوا کی مڑیا   گرو گانٹھ کر کے منائی ہے ہولی

ہولی پر اردو شاعری میں اور بھی کہا گیا ہے۔ صرف ہولی ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے مختلف تیوہاروں مثلاً بسنت، دیوالی وغیرہ پر کافی تعداد میں اشعار ملتے ہیں۔

□□

حامد اللہ افسر

اُردو میں بچّوں کا ادب

یوں تو حامد اللہ افسر نے تنقیدیں بھی لکھی تھیں، لیکن وہ بچّوں کے ادیب کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ اگر مولوی اسمٰعیل میرٹھی کے بعد کسی کا نام لیا جاسکتا ہے تو وہ حامد اللہ افسر تھے۔
ایڈیٹر

بچوں کے ادب سے مراد وہ ادب ہے جو خاص طور پر بچوں کے لئے وجود میں لایا گیا ہو۔ بچوں کے ادب کی تخلیق ایک مخصوص فن ہے جسکی صلاحیت خداداد ہوتی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو میں بچوں کے ادب کی طرف بہت ہی کم توجہ دی گئی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اردو ادب ابھی نوعمر ہے لیکن اس قلیل مدت میں بھی ہمارے ادب کے اور شعبوں کی طرح بچوں کا ادب بھی ظہور میں آنا چاہئے تھا۔ یہ ناممکن ہے کہ اس عرصہ میں بچوں کے ادب کی تخلیقی صلاحیتیں رکھنے والے شاعر اور ادیب موجود نہ رہے ہوں پھر کیا وجہ ہے کہ انکی کوششوں کے نتائج منظر عام پر نہیں آئے؟

بہ ظاہر اس کے دو سبب معلوم ہوتے ہیں، پہلا سبب تو یہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے یہاں بچوں کے لئے کچھ لکھنا کبھی قابل تعریف بات نہیں سمجھی گئی اور وہ شاعر جو سنجیدہ اور سخن فہم حلقوں میں داد سخن حاصل کرنا چاہتے تھے بچوں کے لئے لکھنے کی خداداد صلاحیت کو ہمیشہ چھپاتے رہے۔ اردو کے ایک اچھے خاصے شاعر جو مشاعروں میں اکثر اپنی شاعری کا سکہ جما دیتے تھے میرے پاس تشریف لایا کرتے تھے۔ میں نے ان کے مذاق سخن کا اندازہ کر کے ایک روز ان سے کہا کہ "آپ بچوں کے لئے چھوٹی چھوٹی نظمیں اور گیت لکھئے۔ اردو میں ان چیزوں کی بہت کمی ہے۔" انھوں نے اس امر کو تسلیم کیا کہ اردو میں بچوں کے ادب کی سخت ضرورت ہے لیکن ان کے ساتھ اپنی معذوری بھی ظاہر کی اور وجہ یہ بتائی کہ مجھے بچوں کے لئے کچھ لکھتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ان کے لئے تو ایک معمولی قابلیت کا آدمی بھی کچھ لکھ سکتا ہے اور اصل میں یہ ایک معمولی قابلیت رکھنے والے آدمی ہی کا کام ہے۔" میں نے ان سے عرض کیا: "آپ نے بالکل بے سوچے سمجھے اس اہم مسئلہ پر اظہار خیال کیا ہے۔ ہر قسم کے خیالات کو آسان زبان میں اور دل کش انداز میں ظاہر کرنا کسی معمولی قابلیت کے آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔ سارے یورپ میں اور خاص طور پر فرانس میں اور اب امریکہ میں بھی جتنی زیادہ قدر بچوں کے شاعروں اور ادیبوں کو ہوتی ہے اتنی اور کسی فن کار کی نہیں ہوتی۔ کسی زبان میں ادب کی کسی صنف کی تخلیق اتنی نہیں ہے جتنی بچوں کے ادب کی تخلیق ہے۔" ان سب باتوں کو صحیح تسلیم کرنے کے باوجود وہ اس "ادبی پستی" کی طرف رجوع ہونے کے لئے تیار نہ ہوئے اور اس "معمولی کام" کو انجام دینے کی ہمت نہ کر سکے۔

دوسرا سبب اردو میں بچوں کے صحیح قسم کے ادب کے ظہور میں نہ آنے کی یہ غلط فہمی ہے کہ بچوں کا ادب صرف نصیحتوں کا مجموعہ ہوتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ بچوں کے صحیح تخلیقی ادب کو اس ناصحانہ ادب سے کوئی تعلق نہیں ہے جس کا انبار بچوں کے ادب کے نام سے ہمارے لٹریچر میں ہو گیا ہے جسے تربیتی ادب کے نام یاد کرنا زیادہ مناسب ہے۔

مندرجہ بالا اسباب کے علاوہ ایک رکاوٹ بچوں کے صحیح ادب کی راہ میں یہ بھی رہی کہ ہمارے ان نوجوان شاعروں کے لئے جو بچوں کے تخلیقی ادب کو ظہور میں لانے کی صلاحیت رکھتے تھے اردو میں بچوں کے ادب کے نمونے موجود نہیں تھے اور جو نصیحت آمیز نمونے موجود تھے بھی وہ جب بچوں کو کبھی پسند نہیں آئے تو

نوجوانوں کو کیا پسند آتے اور وہ کیونکر ان کی تقلید کرتے۔

ان تمام حزامتوں کے باوجود اردو ادب کی اسی مختصر عمر میں بھی کوئی دور آپ کو ایسا نہیں ملے گا جو بچوں کے "نام نہاد" ادب سے خالی رہا ہو، یہاں تک کہ اردو میں نظم کہنے یا نثر لکھنے کی سب سے پہلی کوششیں خاص طور پر بچوں ہی کے لئے مخصوص تھیں۔ اردو میں سب سے پہلے دکن میں کچھ ہلکی ہلکی مذہبی نظمیں موزوں کی گئی تھیں۔ ان کا مقصد خاص طور پر بچوں کی تعلیمی ضرورتوں کو مہیا کرنا اور انھیں مذہبی تعلیم دینا تھا۔ یہ نظمیں اردو کے دکنی روپ میں تھیں اور ان کا شمار اردو کے ابتدائی ادب میں ہوتا ہے۔ لیکن ان ابتدائی نظموں پر نثری عبارتوں کو بچوں کے صحیح ادب سے کوئی واسطہ نہیں بلکہ ان سے بچوں کے ادب کو نقصان پہنچا اور وہ غلط راستے پر پڑ گیا یعنی اس ابتدائی دور کے بعد جتنے دور آئے ان میں بچوں کے ادب کے اس ابتدائی دور کی تقلید کی گئی اور آسان نصیحت آمیز اور اخلاقی نظموں اور تحریروں کو بچوں کا ادب سمجھ لیا گیا۔ گویا اس عمارت کی پہلی اینٹ ٹیڑھی رکھی گئی اس لئے ساری عمارت ٹیڑھی ہو کر رہ گئی۔ اس ابتدائی دور سے نظیر اکبرآبادی کے زمانے تک بچوں کے لئے اردو میں اسی قسم کی بے مزہ اور بے ڈھنگی ناصحانہ کوششوں کا سراغ ملتا ہے جن کے ہونے سے نہ ہونا بہتر تھا۔

نظیر کے یہاں بہت سی نظمیں ایسی ہیں جن کو ہم صحیح معنوں میں بچوں کی شاعری یا بچوں کے لئے شاعری کہہ سکتے ہیں۔ نظیر کا زمانہ اٹھارھویں صدی کے نصف آخر اور انیسویں صدی کے ربع اول کا زمانہ تھا نظیر عوام کا شاعر ہے اور اس نے روزمرہ کے مشاہدات و تجربات کو شعر کا موضوع قرار دیا ہے وہ پہلا شاعر ہے جس نے اردو میں روایت سے بغاوت کی اور اپنے لئے ایک بالکل نیا راستہ بنایا۔ نظیر مدرس تھے چھوٹے چھوٹے بچوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ اور یہ بات ایک حد تک یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ انھوں نے اکثر نظمیں اپنے شاگردوں کیلئے لکھی تھیں۔ نظیر کو روزمرہ کی آسان زبان میں مشاہدات و تجربات و کیفیات کے بیان کرنے میں بڑی مہارت اور قدرت حاصل تھی۔ جن چیزوں کو بچے دیکھتے رہتے ہیں یا جو حالات و واقعات انھیں معلوم ہیں ان کا منظوم حال انھیں ضرور اچھا معلوم ہونا چاہئے اور ان کو وہ بار بار پڑھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور کچھ لفظ اور کچھ مصرعے ان کی زبانوں پر چڑھ بھی جاتے ہیں۔

لیکن نظیر کی نظموں کو بچوں کے ادب کے احاطے میں لاتے وقت ہمیں دو خامیاں نظر آتی ہیں جن پر ہمیں رکنا اور تامل کرنا پڑتا ہے۔ پہلی خامی تو یہ ہے کہ ان میں شاعرانہ تخیل کا عنصر بہت ہی کم ہے اسی لئے تاثیر کی کمی ہے اور یہی وجہ ہے کہ بچے نظیر کی نظموں سے لطف اندوز نہیں ہوتے اور نہ وہ انھیں گانے اور گنگنانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ انھیں ان نظموں میں سرسری سی دلچسپی ہوتی ہے۔ وہ ان نظموں کو پڑھتے چلے جاتے ہیں اور کہیں کہیں شاعر کی باتوں پر ہنس پڑتے ہیں۔ دوسری خامی یہ ہے کہ ان کی اکثر نظمیں میں ابتذال اور سوقیانہ پن ہوتا ہے اور وہ بازاری زبان کے استعمال سے بھی گریز نہیں کرتے۔ البتہ اس میں شبہ نہیں کہ نظیر کے کلام سے بچوں کی نظمیں منتخب کر کے اگر ان کو اڈٹ کیا جائے اور ان کی باقاعدہ ترتیب و تدوین کی جائے اور ان کے نامناسب حصے خارج کر دئے جائیں تو بچوں کے لئے ایک قابل مطالعہ اور دلچسپ نظموں کا مجموعہ تیار ہو سکتا ہے اور وہ ہمارے بچوں کے روایتی ادب سے کچھ بہتر رہے گا۔

نظیر کے بعد مولوی محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی اور مولوی محمد اسمٰعیل نے قریب قریب ایک زمانے میں بچوں کے لئے نظمیں لکھی۔ مولوی محمد حسین آزاد، لاہور کے سررشتۂ تعلیم میں ملازم۔ میجر فلر جنہیں السنۂ مشرقیہ سے بہت ذوق تھا ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم تھے۔ انہوں نے آزاد کو اردو فارسی کی درسی کتابیں لکھنے پر مامور کیا۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں انہوں نے اردو کی تین کتابیں ترتیب دیں پہلی دوسری اور تیسری۔ اور انھیں کتابوں کے لئے بچوں کی نظمیں لکھیں مثلاً "محنت کرو" "جیسے چاہو سمجھ لو" اور "جغرافیہ طبعی کی پہیلی" وغیرہ۔ یہ نظمیں بھی تمام تر ناصحانہ ہیں اور انھیں بچوں کی نفسیات سے کوئی واسطہ نہیں۔ بچوں کی دنیا میں بچوں کے ساتھ رہ کر انھیں مخاطب نہیں کیا گیا ہے بلکہ ایک بوڑھا اور نیک کردار اور تجربہ کار آدمی ان کی رہنمائی کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

مولانا الطاف حسین حالی اردو میں طرز جدید کے موجد تسلیم کئے جاتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ان کی مسدس کے کچھ حصے اعلیٰ درجہ کی نظموں میں شمار ہونا چاہیے لیکن انہوں نے خاص طور پر بچوں کے لئے جو نظمیں لکھی ہیں وہ بالکل روکھی پھیکی اور بے مزہ ہیں اور بعض تو تک بندی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ حالی کی نظمیں کبھی بچوں میں مقبول نہیں رہیں۔ وہ درسی کتابوں میں ان کی نظمیں اس طرح پڑھتے ہیں جیسے کڑوی دوا پی رہے ہوں۔

مولوی محمد اسمٰعیل نے ۱۸۹۲ء کے قریب جب وہ سنٹرل نارمل اسکول آگرہ میں ہیڈ مولوی تھے اردو کی ریڈریں لکھیں جو مدتوں یو۔پی اور دوسرے صوبوں میں داخل درس رہیں۔ یہ سب کتابیں بہت دلکش اور بے تکلف انداز میں لکھی گئی

نظمیں اور بچوں کو اردو پڑھانے کے لئے بہت مفید ثابت [redacted] گو اب درسی کتابوں کا انداز زمانے [redacted] مولوی صاحب موصوف کی ابتدائی کتابیں اب تک مقبول ہیں۔ مولوی محمد [redacted] بچوں کی نظمیں اپنی درسی کتابوں کے لئے لکھی تھیں۔ ان کی نظموں میں [redacted] اور زبان کی خوبی اور مضامین کی خوش اسلوبی کے لئے وہ ممتاز ہیں مگر شاعرانہ [redacted] سے وہ بھی محروم ہیں۔ مولوی محمد اسمٰعیل جو کچھ کہتے [redacted] کر کہتے ہیں۔ بچے انکے کلام میں اپنا ماحول اور اپنے جذبات نہیں پاتے۔ [redacted] کی دنیا کا پرتو پاتے ہیں جس سے [redacted] اور کلام کی روانی ان پر اثر انداز ہوتی ہے مگر ان کو موہ نہیں سکتی۔ [redacted] تی۔ ان کی نظمیں بچوں کے دل کے تاروں میں جھنکار نہیں پیدا کرتیں۔

مولوی محمد [redacted] ہے اس میں بچوں کے ادب کی طرف بہ نسبت پہلے کے توجہ زیادہ ہے [redacted] کا کوئی ایسا شاعر میں نہیں آیا جو سچ مچ ان کی دنیا کا ایک فرد بن گیا ہو اور [illegible] میں ان کے ساتھ رہتا سہتا ہو، کھیلتا کودتا ہو، ہنستا بولتا ہو، انھیں [redacted] کرتا ہو۔ انھیں کی طرح گرتا ہو اور گر کر سنبھلتا ہو۔ انھیں کی طرح [redacted] پودوں سے پھول توڑ لیتا ہو، چڑیوں کے گھونسلوں سے انڈے [redacted] طرح مٹی کے گھروندے بناتا ہو، انھیں کی طرح کھلونوں سے [redacted] انھیں کی طرح بھولی بھولی باتیں کرتا ہو، انھیں کی طرح روٹھتا [redacted] کی طرح ہر چیز کو حیرت سے دیکھتا ہو، انھیں [redacted] چاند کو حاصل کر کے دامن میں چھپا لینے کی ضد کرتا ہو اور انھیں [redacted] کی کوشش کرتا ہو اور نہ سمجھ سکتا ہو۔ بچوں کے [redacted] رہے۔

ایک اور بات قابل توجہ ہے۔ [redacted] وقت تک جتنی بھی نظمیں اور جیسی بھی نظمیں لکھی گئیں وہ سات آٹھ برس سے اوپر [illegible] والے بچوں کیلئے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کے لئے اردو میں ہلکے پھلکے گیت یا [redacted] گیت بالکل ناپید ہیں۔ لوریوں اور گود کے گیتوں اور جھولے کے گیتوں کا جہاں تک [redacted] ہم ہندی یا پوربی وغیرہ دوسری مقامی زبانوں سے مستعار لے کر کام [redacted]۔ بچوں کی شاعری کے اس خلا کو پر کرنے کی مدت سے ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ [illegible] نے نرسری گیت لکھنے کی کوشش کی [redacted] ہوئے۔ شاید ان کے مقبول ہونے کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ وہ ایک [redacted] کر رہے ہیں جس کیلئے اردو میں اس قسم کی کوئی دوسری چیز موجود نہیں ہے۔

یہ ذکر تھا بچوں کے ادب کی نظموں اور گیتوں وغیرہ کا۔ جب ہم بچوں کے ادب کی نثر کی طرف نظر کرتے ہیں تو وہاں باوجود تلاش و جستجو کے کچھ نہیں ملتا۔ اردو کی ابتدائی نثر اس وقت کی مروجہ فارسی نثر کے انداز پر نہایت رنگین اور پر تکلف ہوتی تھی۔ ابتدائی نثر کی کوششوں میں زیادہ تر فارسی اور عربی کتابوں یا مقالوں کے ترجمے ملتے ہیں یہ ترجمے عموماً مذہبی کتابوں کے ہیں یا پھر فقرا اور اہل دل حضرات کے اقوال و امثال ہیں۔ غرض نثر کی ابتدائی کوششوں میں کوئی تحریر ایسی نظر سے نہیں گزری جو خاص طور پر بچوں کے لئے لکھی گئی ہو۔

انیسویں صدی کے ابتدائی چند برسوں میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی نگرانی میں جو کتابیں لکھی گئیں وہ بے شک درس و تدریس کے لئے لکھی گئیں مگر ان کو بچوں سے کوئی واسطہ ہے نہ بچوں کے ادب سے۔ وہ کتابیں ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز ملازموں کو ہندوستانیوں کی زبان سکھانے کے لئے لکھی گئی تھیں۔ سب سے پہلے بچوں کے لئے مضامین بھی مولوی محمد حسین آزاد اور مولوی محمد اسمٰعیل نے اپنی درسی کتابوں کے لئے لکھے۔ یہ مضامین اخلاقی یا معلوماتی ہیں یا پھر ایسی کہانیاں ہیں جن سے کچھ سبق ملتا ہو۔ اسی زمانے میں گلستاں اور انوار سہیلی وغیرہ چند فارسی کتابوں کے ترجمے بھی اردو میں کیے گئے مگر وہ مقبول نہ ہوئے۔

□□

مشرقِ خوابِ آشنا کے مطلعِ تاریک سے
اک طلوعِ نو بہ اندازِ دگر ہونے کو ہے

لے رہی ہے کروٹیں ہر شے میں رُوحِ ارتقا
غنچۂ گل ہونے کو ہے، قطرہ گہر ہونے کو ہے

جس کے پیکاں کا ہدف ہوتا ہے قلبِ ہست و بود
ترکشِ امکاں کا وہ ناوک بھی سر ہونے کو ہے

—— سرور تونسوی

سید اظہر حسین ہاشمی

جگر مرادآبادی ◻ عظیم شاعر ◻ عظیم انسان

سید اظہر حسین ہاشمی اُردو کے اچھے ادیبوں و صحافیوں میں ایک تھے وہ ہفتہ وار "کائنات" کے مدیر تھے جو ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۸ء تک شائع ہوا۔ انھوں نے جو دلچسپ انشائیے لکھے ان میں کلاسیکی زبان کی چاشنی بھی ملتی ہے اور طنز کا تیکھا پن بھی۔

ایڈیٹر

تاریخ ادب اردو میں بیسویں صدی کا نصف اول ایک ایسا زخشندہ اور درخشاں دور ہے کہ جس کی تابانی و گہرباری نے تغزل کو چار چاند لگا دیئے اور سرمایۂ ادب اردو میں بیش بہا اضافہ کیا۔ فکر سخن کا انداز کہن بدلا۔ رفعتِ خیال اور اسلوب بیان کا اچھوتا ڈھنگ معرضِ وجود میں آیا۔ اور صنفِ غزل اپنے حقیقی رموز سے آشنا ہوئی۔ یعنی حسن کو نزہت و پاکیزگی اور عشق کی لطافت و عظمت کا افتخار حاصل ہوا۔ حسن کے سر پر جور و ظلم کا جو اتہام چلا آ رہا تھا وہ دور ہوا اور عشق رسوا سر بازارے سے محفوظ و مامون ہو گیا۔ اور اس میں بھی شک و شبہ نہیں کہ اگر ایک طرف شاعری پر ابتذال کا رنگ غالب آچلا تھا اور عوام و خواص کی نظر سے گرتی بھی جا رہی تھی تو دوسری طرف اندیشہ لاحق ہو گیا تھا کہ قصرِ شاعری کے ایوان غزل کی یہ خوبصورت عمارت متزلزل ہو کر اپنے وجود ہی سے محروم نہ ہو جائے۔ غرض اس پُرآشوب دور میں اردو کے افق شاعری پر عناصر خمسہ۔ حسرت۔ فانی اصغر۔ جگر اور فراق مہر و ماہ بن کر نمودار ہوئے۔ انھوں نے ایسی مسیحانفسی کی کہ غزل ایک بار پھر اپنی رعنائیوں اور جمال کی حسن آرائیوں سے بزم شعر و ادب میں جلوہ افروز ہو گئی۔

ان عناصر خمسہ نے تغزل کی قدیم شاہ راہ کے متوازی جدید شاہراہ قائم کر کے غزل کو صوری و معنوی اعتبار سے ایسا اعزاز و افتخار بخشا کہ وہ مقبول عوام و خواص ہو گئی۔ حضرت جگر مرادآبادی اس بزم سخن میں ممتاز و منفرد حیثیت سے چمکے۔ ان کے یہاں برجستگی و اسلوب بیان ایک خاص رنگ میں جلوہ فرما ہے۔ مشاعروں کی مقبولیت میں جگر کا بہت بڑا حصہ ہے۔ وہ جب غزل سرا ہوتے تھے تو در و دیوار جھوم اٹھتے تھے۔ ان کی دلنواز شخصیت نے ایک نسل کو متاثر کیا۔ وہ شہنشاہ متغزلین کے لقب سے یاد کیے گئے۔ مقبولیت کا سحر و اعجاز وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔

میں نے جگر صاحب کو اس وقت قریب سے دیکھا جب وہ بھوپال ہاؤس لکھنؤ میں قیام پذیر تھے۔ اس کا احوال مختصراً یوں ہے۔ سنہ ۱۹۴۷ء کی آزادی کے بعد بھوپال ہاؤس اور نور منزل (جو اُن کے چھوٹے بھائی نورالحسن کی کوٹھی کا نام تھا) کے مکیں پاکستان چلے گئے، تو سرکاری املاک قرار پا گئے۔ علی حسن خاں کے اہل خاندان کے لیے بہت مختصر سی جگہ چھوڑ دی گئی۔ نور منزل میں سرکاری دماغی اسپتال قائم کر دیا گیا۔ بھوپال ہاؤس اور نور منزل دونوں محلہ لال باغ ہی میں واقع ہیں۔ آپ اگر جانب شمال سے بھوپال ہاؤس میں داخل ہوں تو سامنے پیلے رنگ کی لمبی سی عمارت کی جو دیوار نظر آتی ہے۔ جگر اسی کے وسطی حصہ میں رہتے تھے۔ ایک لمبا کمرہ تھا جس کے دو حصے تھے۔ دوسرے میں میرے عزیز سید انوارالحسن ترمذی قنوجی جو صدر ڈاکخانہ حضرت گنج میں ملازم تھے اور نواب علی حسن خاں کے فرزند نواب سید شمس الحسن کے دوستوں میں تھے، مستقل طور پر رہتے تھے۔ میں غالباً سنہ ۱۹۳۰ء میں دو ڈھائی ہفتے انھیں کا مہمان رہا۔ اس طرح مجھے جگر کی خدمت میں حاضری کا شرف رہا۔ اُن کے شب و روز دیکھنے اور اُن کے احباب سے ملاقات کرنے کے بیشتر مواقع بھی میسر آتے رہے۔

جگرؔ کا میانہ قد سیاہ فام چھریرا جسم، سیاہ فرنچ کٹ داڑھی تھی، رخسار پر بال کم تھوڑی پر گھنے تھے۔ گردن فرازنہ تھی۔ پیشانی چوڑی قدرے ابھری ہوئی جس پر گہری لکیروں کے خط نمایاں۔ ایسے ہی لکیروں کے خط چہرہ پر بھی نمودار تھے۔ چہرہ روکھا پھیکا۔ دلکشی نام کو نہ تھی۔ سر پر سیاہ گھنے بال جو کانوں کی لو تک بڑھے ہوئے تھے۔ کبھی گردن کبھی چہرہ ڈھک لیتے تھے۔ درمیان سے مانگ نکلی ہوئی مگر بے ترتیب۔ اس شباہت کے باوجود جب ہنستے تھے تو چہرہ دلکش نظر آتا تھا۔ غزل پڑھنے کے سبب آواز میں قدرے بھاری پن تھا۔ عمر کا اندازہ پینتالیس سال تھا۔ جگرؔ ہمیشہ سیاہ بالوں کی اونچی باڑھ کی ٹوپی پہنتے تھے۔ سفید چوڑی دار پاجامہ، قمیص واسکوٹ، شیروانی ان کا مخصوص لباس تھا۔

سیاہ وارنش کا پھول دار پمپ جوتا علی العموم پہنتے تھے۔ پان سگریٹ چائے سے رغبت۔ شراب گویا گھٹی میں پڑ گئی تھی۔ الائچی بجید استعمال کرتے تھے۔ "تاش بہت کھیلتے" ہارتے زیادہ تھے۔ لہٰذا پارٹنر سے جز بز رہا کرتے تھے۔ دن میں شراب کے نشہ میں کبھی نہیں دیکھے گئے۔ جس شب شراب زیادہ چڑھا جاتے اور چاند آسمان پر روشن ہوتا تو شب کے نصف پہر جب شغل مے خواری سے واپس جاتے تو بھوپال ہاؤس کے چمن میں سونے والوں کی نیند میں مخل ہوتے تھے تاکہ ان کی غزل سنیں۔ لوگ معذرت خواہ ہوتے تو بستر پر جاکر سو رہتے۔ بیدار کرنے والی بات اعظم گڑھ، بھوپال اور دلی میں بھی ان کے میزبانوں کو پیش آتی رہی۔

جگرؔ کی تعلیم گو انگریزی نویں درجہ تک تھی مگر فارسی۔ اردو دواوین کا مطالعہ بالاستیعاب کیا تھا، حافظہ تیز تھا، جو پڑھتے یاد ہو جاتا تھا۔ مشاعرہ میں کبھی غزل لکھ کر نہیں لے گئے۔ شعرائے فارسی میں حضرت امیر خسروؔ اور شیخ سعدی پسند تھے۔ لیکن لسان الغیب حافظ شیرازیؔ سے خاص عقیدت تھی۔ فرماتے ہیں ؎

میں نہیں بسملِ تیغِ جگرؔ   حافظِ خوش کلام نے مارا
تا کہ جگرؔ ایں مستی بشنو سخنِ حافظ   رندی و خراباتی در عہد شباب اولیٰ
ہر روز فیض گیرم از روحِ قدس حافظ   بر من جگرؔ گواہ است ایں جوشش روحانی

اردو شعرا میں خواجہ میر دردؔ، میر سوزؔ ان کے پسندیدہ شاعر تھے۔ مگر غالبؔ نکتہ داں سے خاص ارادت تھی۔ اُن کو دوسروں پر ترجیح دیتے تھے۔ ایک روز شعرا کے ذکر میں میں نے پوچھا۔ جگرؔ صاحب۔ غالبؔ کے کلام میں کون سی غزل پسند ہے۔ فرمایا ؎

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

فرماتے تھے کہ عام قیاس سے جو بالاتر باتیں ہیں۔ غالب نے اپنی طبعی جدت سے اُن کو حقیقت کا جامہ پہنا دیا ؎

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہوگئیں

ایک بار کسی نے غالبؔ کی مشکل پسندی کا ذکر کیا۔ جگرؔ نے پوچھا۔ حضرت وہ کونسا شعر ہے جو آپ کو مشکل نظر آیا۔ انھوں نے یہ شعر پڑھا ؎

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

جگرؔ یہ سن کر بولے۔ آپ نے غالبؔ کی اس جدت پسندی کی داد نہ دی کہ کس قدر فرسودہ مضمون کو زندہ کر دیا۔ پھر نصیحتاً فرمایا بیت جناب کو پڑھئے اور بار بار پڑھیے۔ جتنا زیادہ پڑھیں گے اتنے ہی ان کے کلام کے محاسن نظر آئیں گے اس وقت آپ کو غالبؔ کا امتیاز معلوم ہوگا۔

بھوپال ہاؤس میں جگرؔ کے میل ملاقاتی اور مہمان آتے رہتے تھے میرے پہنچنے سے قبل اُن کے ایک بھوپالی دوست ٹھہرے ہوئے تھے شاعر بھی تھے اور نقاد بھی بسملؔ تخلص فرماتے تھے۔ جگرؔ کا کبھی ریاست بھوپال مستقر رہ چکا تھا۔ اس وقت سے دوستانہ رسم و راہ چلی آرہی تھی۔ اور مراسلت کا بھی سلسلہ قائم تھا۔ میری پہلی نظر پڑی تو میں سمجھا کوئی بچہ کھیلتا ہوا آنکلا ہے۔ بچوں جیسا قد، ویسے ہی ہاتھ پاؤں کرسی پہ بیٹھے تھے مگر پاؤں زمین سے ایک بالشت اونچے تھے۔ انگریزی برائے فرانٹے سے بولتے تھے۔ سرخ سفید رنگ کلین شیو، سر بڑا، آواز بھاری چالیس پینتالیس سال کی عمر۔ ———— کم سخن، مذاق ستھرا صاف صاف لباس، ململ کا کرتا، کشتی نما ٹوپی۔ چھوٹی موری کا پاجامہ، شیروانی۔ مگر شیروانی ہر وقت پہنے رہتے تھے۔ ممکن ہے۔ اس خیال سے کہ قد کی کوتاہی بری نہ معلوم ہو۔ شعرا کے کلام کی تشریح

اس ڈھنگ سے کرتے کہ معمولی فہم کا آدمی بھی سمجھ لے۔ جب تک قیام رہا شعر و شاعری ہی موضوع رہا۔ چند روز قیام کے بعد واپس بھوپال چلے گئے۔

انھیں دنوں جگرؔ کے ایک اور مہمان ٹھہرے ہوئے تھے۔ مرادآباد وطن تھا۔ شاعر تھے اور شوقؔ تخلص کرتے تھے۔ کلام پر جگرؔ سے اصلاح لینے آئے تھے۔ مشہور تھا کہ جگرؔ سے غزلیں کہلوا رہے ہیں۔ جگرؔ ہی کے کمرہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ باہر کم نظر آئے۔ کبھی کبھی شب کے ایک ایک دو دو بجے تک جگرؔ کو کلام پر اصلاح دیتے دیکھا۔ ادھیڑ عمر، لمبا قد، چہرہ متبسم، آنکھیں روشن۔ سیاہ گول ایک بالشت داڑھی۔ کمرہ سے باہر جاتے تو مسکراتے ہوئے نکلتے تھے۔

ایک روز روشؔ صدیقی تشریف لائے۔ شب بھر ٹھہرے۔ دوسری صبح عازم سفر ہو گئے۔ کسی مشاعرہ میں مدعو تھے۔

ایک روز ایک اور جگرؔ کے مہمان آگئے۔ چشمہ کا کاروبار کرتے تھے چونکہ جگرؔ بھی یہی کام کرتے رہے تھے۔ وہ اُن کے شاگرد تھے۔ نام عتیق الرحمٰن اور سکونت چکا پور تھی۔ فربہ جسم، چیچک رو، رنگ سُرخ سفید۔ آنکھوں پر خوبصورت فریم کا چشمہ۔ دو یوم ٹھہرے تیسرے دن اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔

جگرؔ کے مہمانوں کے قیام اور آسائش کی جو سہولتیں بھوپال ہاؤس میں مہیا تھیں۔ لکھنؤ میں کوئی اور ان کے بار کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ سب میزبانیاں علی حسن خاں کے انتقال کے بعد بھی برقرار رہیں۔

ایک روز کسی یونیورسٹی کے کئی پروفیسر جگرؔ کی ملاقات کو تشریف لائے۔ جگرؔ نے بخندہ پیشانی خیر مقدم کیا۔ بڑے مزے مزے کی قہقہہ آمیز باتیں ہوتی رہیں۔ تنقید نگاروں کا بھی ذکر آیا۔ سب اس بات پر متفق تھے کہ آج کل محض تعریف یا تنقیص ہی کو تنقید نگاری سے منسوب کیا جانے لگا ہے۔ خوبیاں نظر انداز کر دی جاتی ہیں۔ حالانکہ اس سے شاعر یا ادیب کی تخلیق پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ تنقید نگار میں تجزیہ کی صلاحیت اور مطالعہ اور معلومات ہونا چاہئیں۔ بجز سچائی و صداقت کے پہلے سے اپنا کوئی زاویہ نظر نہ قائم کر لیا گیا ہو۔ ساتھ ساتھ سبھی نے یہ بات بھی تسلیم کی کہ فن تنقید کے بغیر ادب آگے نہیں بڑھ سکتا۔

انھیں میں قاضی خورشید احمد بھی تھے۔ خوش مزاج، شگفتہ طبیعت اور بذلہ سنج۔ اپنی پرلطف باتوں سے اس مجلس میں وہی چھائے رہے۔ انھوں نے خود اپنا ایک واقعہ بیان کیا کہ یونیورسٹی میں ایک آل انڈیا طرحی مشاعرہ تھا۔ بیرونجات کے کافی تعداد میں صاحب کلام شعرا شریک ہوئے۔ مصرع طرح کی ردیف۔ قافیہ ذرا مشکل سا تھا۔ غزلیں کم کامیاب رہیں۔ انھوں نے کہا۔ میں نے بھی اپنے ایک طالب علم شاگرد کو غزل لکھ دی۔ نادر تشبیہات اور شوکت الفاظ کا ایسا امتزاج رکھا کہ جو سُنے سر دُھننے پر مجبور ہو جائے۔ شاگرد نوعمر خوش رو، خوش الحان اور مترنم آواز تھا۔ بڑی اچھی لے سے غزل پڑھی۔ اساتذہ تک ایسے مسحور ہوئے کہ ہر ہر شعر کی داد دیتے ہی بنی۔ لیکن ستم ظریفی یہ تھی کہ کوئی شعر مہملیت سے خالی نہ تھا۔ اچھے اچھے استاد کی بھی نظر نہ گئی۔

قاضی جی کے اس لطیفہ پر ایک قہقہہ پڑا۔ اس کے بعد انھوں نے کہا۔ میں نے جب اساتذہ سے غزل کے مہمل ہونے کا انکشاف کیا تو سب کے چہروں پر پھیکی پھیکی مسکراہٹ نمودار ہو کر رہ گئی۔ قاضی جی کے اس جملہ پر اور زوردار قہقہہ پڑا۔ سبھوں نے اس دلچسپ تفریحی مذاق کی داد دی۔

وقت کافی گذر چکا تھا۔ شب کی ٹرین سے واپس بھی جانا تھا۔ چائے ناشتہ سے فارغ ہو کر اُن پروفیسروں نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ اس کے بعد جگرؔ نے دو غزلیں پڑھیں۔ جس وقت جگرؔ شعر پڑھ رہے تھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ غزل کے شعر جگرؔ کے دل سے نکل رہے ہیں۔ ان پر خود وجد کی سی کیفیت طاری نظر آ رہی تھی۔ اور یہ بھی یہی حقیقت کہ خود جگرؔ کو بھی ایسی ہی نشستوں میں غزل پڑھنے میں لطف آتا تھا۔ اُن کے کلام کی اہمیت بھی ایسی ہی نشستوں میں ظاہر ہوتی تھی۔ پہلی غزل کا مطلع اور حسنِ مطلع تھا ؎

قطرے کو حسن دو عالم گرا دیا تو نے ۔۔۔ نہ جانے کونسا عالم دکھا دیا تو نے
جوابِ حسنِ طلب اور کیا دیا تو نے ۔۔۔ حیات و موت کو یکجا دکھا دیا تو نے

اور مقطع کا شعر تھا ؎

ہر ایک دل کو عطا کر کے مدعائے حیات ۔۔۔ جگرؔ کو ایک دل بے مدعا دیا تو نے

اس کے بعد دوسری غزل پڑھی جس کا مطلع اور مقطع تھا ؎

اب مرے سامنے ٹھہرے تو گلستاں کوئی
ہو چلا ہے مری صورت سے نمایاں کوئی

ہائے وہ حسن کا انداز کہ جس وقت جگرؔ
عشق کے بھیس میں ہوتا ہے نمایاں کوئی

دونوں غزلیں داد و تحسین سے سراہی گئیں۔ بعض اشعار دوبارہ پڑھنے کی زحمت دی گئی جگرؔ میں یہ وصف تھا کہ سامعین کی علمی ادبی حیثیت کے مطابق غزل انتخاب کرکے سناتے تھے اور ترنم کی بھی یہ خوبی تھی کہ غزل کے صوری و معنوی اعتبار سے اختیار کرتے تھے۔ آج جب ان اہل علم لوگوں کی نشستوں کا خیال آتا ہے تو غالبؔ کا بیساختہ شعر زبان پر آجاتا ہے ؎

یاد تھیں ہم کو بھی رنگارنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہوگئیں

۱۹۳۸ء میں ایک سال کے لیے دِلّی چلا گیا تھا اور ایک روزنامہ سے وابستہ تھا۔ قنوج ضلع فرخ آباد کا مشہور تاریخی قصبہ ہے میں وہیں کا باشندہ ہوں۔ محمود علی خاں جامعی فرخ آبادی سے جوان دنوں جامعہ ملیہ میں تھے ایک صحافی اور ہم وطن ہونے سے دیرینہ تعلقات تھے میں ان سے ملنے اکثر جاتا رہتا تھا۔ اور جگرؔ جب دِلّی تشریف لے جاتے تو محمود علی خاں کے مہمان ہوتے یا جامعہ میں قیام کرتے تھے۔ دِلّی میں ایک ہفتہ قبل جگرؔ سے شرف نیاز حاصل ہو چکا تھا دوسرے ہفتہ یعنی ۱۴ر اکتوبر ۱۹۳۸ء کو جامعہ گیا تو دوبارہ ملاقات ہوگئی۔ جگرؔ اور محمود علی خاں جامعی اس روز چائے پر مدعو تھے۔ ندوۃ المصنفین والوں نے لے جانے کے لیے تانگہ بھیج دیا تھا۔ جگرؔ اور محمود علی خاں کے علاوہ میں اور حکیم عبدالجلیل بھی ہمراہیوں میں تھے۔ ہم لوگ صبح کے وقت پہنچ گئے۔ دار المصنفین کے لوگ منتظر تھے۔ وہاں موجود اس وقت لوگوں میں مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن جن کی طرف سے دعوت نامہ تھا۔ اُن کے علاوہ مورخ اسلام' عالم دین حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مشہور صحافی مولانا حامد الانصاری غازی بھی تھے۔ ایک اور معمر بزرگ بھی موجود تھے۔ ان کا نام ذہن سے محو ہے۔ مولانا حامد الانصاری غازی نے افغانستان کے چشم دید واقعات سنا کر ہم سب کو حیرت میں ڈال دیا۔ مصری صحافت کے متعلق بھی ان کو معلومات تھیں۔ انھوں نے بتایا کہ مصر کے اخبارات کے نمبر چالیس چالیس صفحات پر مشتمل شائع ہوتے ہیں۔ پھر فلسطین کانفرنس کے ذکر میں کہا کہ اس میں انگریز کے ہوا خواہ زیادہ ہیں لہٰذا ناکامی یقینی ہے اسی قسم کی گفتگو ہوتی رہی۔ پھر چائے ناشتہ کے دور کے بعد جگرؔ نے ایک غزل سنائی۔

دسمبر ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں سرکاری اہتمام و انصرام میں ایک اعلیٰ پیمانہ پر آل انڈیا صنعتی، زراعتی اور ثقافتی نمائش کیمپ باغ چوک کے وسیع و عریض میدان میں منعقد ہوئی تھی۔ نمائش کے پروگرام میں ایک آل انڈیا غیر طرحی مشاعرہ کا بھی اہتمام تھا۔ اُس دور کے قریب قریب سبھی اساتذہ شریک ہوئے۔ بعض ایسے بزرگ کہ جن کی موجودگی میں ان کا کلام دوسروں نے پڑھا۔ دلی سے فصیح العصر مرزا داغؔ دہلوی کے جانشین حضرت آغا قزلباش بھی تشریف لائے تھے۔ مشاعرہ کے روز کثیر اژدھام تھا۔ بیرونجات کے اہل ذوق بھی کثیر تعداد میں مشاعرہ سننے کے اشتیاق میں آئے تھے۔ مشاعرہ کا پنڈال بھر گیا تھا۔ بہتوں کو جگہ نہ ملی تو کرسیوں پر دور دور کھڑے تھے۔ اسٹیج بہت خوبصورت بلند' اور وسیع و عریض تیار کیا گیا تھا۔ اساتذہ اہل علم و ادب' صاحب قلم' اور شعراء اور ان کے مقربین سبھی کو جگہ دی گئی۔ اساتذہ کے کلام داد و تحسین سے سراہے گئے۔ جگرؔ کے نام کا اعلان ہوا تو سامعین جگر تھام کے بیٹھ گئے۔ جگرؔ نے اپنی غزل اور ترنم سے مشاعرہ کو تاریخ ساز حیثیت دیدی۔ جیسی ان کی عمر عروج پر تھی ویسے ہی ان کا کلام اور ترنم بھی عروج پر تھا۔ غزل کی بحر' وزن اور ردیف قافیہ میر تقی میرؔ کا مستعار تھا۔ اس روز جگرؔ کی غزل شاہ کار قرار دی گئی اور خود بھی شاہ کار نظر آرہے تھے۔ اس غزل میں ان کا اپنا فطری رنگ پورے طور پر نمایاں تھا۔ میر تقی میرؔ نے ایک بار کہا تھا۔ "مستند ہے میرا فرمایا ہوا" آج جگرؔ غزل مستند فرما رہے ہیں۔ چند شعر آپ بھی سنئے ؎

شاعرِ فطرت ہوں میں جب فکر فرماتا ہوں میں
روح بن کر ذرّے ذرّے [redacted] جاتا ہوں میں
آ کر تجھ بن اس طرح لے [redacted] تا ہوں میں
جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں
ہائے ری مجبوریاں، ترکِ محبت کے لیے
تجھ کو سمجھاتے ہیں وہ اور اُن کو سمجھاتا ہوں میں
میری ہمت دیکھنا، میری طبیعت دیکھنا
جو سلجھ جاتی ہے گتھی [redacted] الجھاتا ہوں میں
حسن کو کیا دشمنی ہے [redacted] کو کیا بیر ہے
اپنے ہی قدموں کی خود ہی ٹھوکریں کھاتا ہوں میں
واہ رے شوقِ شہادت [redacted] قاتل کی طرف
گنگناتا، رقص کرتا، [redacted] جاتا ہوں میں

جگر شریف الطبع اور کریم [redacted]۔ کسی کو محروم کرنا جانتے ہی نہ تھے۔ جس کسی نے اپنا کلام [redacted]۔ لفظی ردوبدل کر دیتے تھے یا معنوی ضرورت کے لحاظ سے [redacted] بتا دیتے۔ لیکن انھوں نے استاد شاگردی کا کوئی شعبہ قا[redacted] ہی نہیں کیا۔ اُن کے نام نہاد شاگردوں کی ایک لمبی فہرست میری [redacted]ی ہے۔ اس مسئلہ کے حل کے لیے میں ان کے ہم[redacted]رب خاص ساجد علی خاں راز مرادآبادی اور جگر کے [redacted]وان اور ہمدرد اختر علی تلہری کے یہاں جو جگر کی وفات [redacted] شائع ہوئے ہیں۔ پیش کر رہا ہوں:۔

راز مرادآبادی فرماتے ہیں [redacted] مری غلط فہمی جگر صاحب کے بارے میں یہ ہے کہ جگر صاحب [redacted]گردوں کی تعداد خاصی طویل ہے۔ یہ بات بالکل غلط ہے۔ جگر [redacted]گردی کی رسمِ کہن سے سخت بیزار تھے۔ بلکہ اس پیشہ [redacted] ہیئت کو سخت نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اکثر فرماتے تھے۔ میاں۔ بلبل کو چہکنا کس نے سکھایا کہ کوئی کسی کو شعر کہنا سکھائے۔ [redacted] بامروت اور خلیق انسان تھے اور ابتدائی دور میں خمریات سے [redacted]۔ چنانچہ جہاں لوگ اُن کی سادگی و مجبوری سے [redacted] اٹھا کر بٹوہ اور بڑنکوں پر ہاتھ صاف کرتے رہتے تھے۔ ان کی غزلیں اپنے نام سے پڑھ دیتے تھے۔ اسی طرح اکثر نام نہاد شاگرد بھی اُن سے منسلک ہو جاتے تھے اور وہ غریب اُن بالجبر شاگردوں کو ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کے مصداق دیکھتے اور گھلتے رہتے تھے۔ کبھی کسی محرمِ راز سے کہہ دیتے تھے۔ خدا کے لیے ان شاگردوں سے مجھے بچاؤ۔ انھوں نے میری زندگی تلخ کر دی ہے۔

البتہ ایک شخص جسے جگر صاحب نے بخوشی شاگرد بنایا اور جس سے ہر حال میں محبت رہی وہ برادرم دوّر ہاشمی کانپوری ہیں۔ دوّر کا اٹھان ایسا تھا کہ اگر وہ لہو لعب میں نہ پڑ جاتا تو یقیناً جگر صاحب کا صحیح جانشین وہی ہوتا۔ لیکن وہ شراب اور افیون کی نذر ہو گیا جس کا جگر صاحب کو تادمِ آخر افسوس رہا۔ شارق کانپوری نے بھی چند دن جگر صاحب کو اپنا کلام دکھایا ہے اور انھیں بھی جگر صاحب پسند فرماتے تھے۔

راز مرادآبادی کے بعد سید اختر علی تلہری کا بیان راز مرادآبادی کے بیان پر مہرِ صداقت جیسی حیثیت رکھتا ہے۔

سید اختر علی تلہری جگر کی عیادت اور مزاج پرسی کو اُن کے انتقال سے ایک سال قبل گونڈہ گئے تھے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

گفتگو کے اس قنوطی سلسلہ کو ختم کرنے کے لیے میں نے جگر صاحب سے یہ پوچھ ڈالا کہ جگر صاحب! آپ کے تلامذہ (شاگردوں) میں کس کس کو امتیاز حاصل ہے۔ مرحوم نے ذرا بلند آواز میں کہا ــــ بھائی میرا کوئی شاگرد نہیں ہے۔ میں نے یہ سلسلہ کبھی قائم ہی نہیں کیا۔ اب اگر کوئی صاحب اس قسم کے انتساب کی جرأت کرتے ہیں تو یہ ان کا ذاتی فعل ہے۔

اس کے بعد سید اختر علی تلہری خود بھی اپنا خیال ظاہر کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

مرحوم (جگر) کی آشفتہ مزاجی، شاگردی و استادی کے ان جھمیلوں کو برداشت بھی نہیں کر سکتی تھی۔ مرحوم ان مختصر باتوں کے بعد پھر شدید تنفس میں مبتلا ہو گئے اور ہم لوگ بھی با صد درد و الم اُن سے اجازت لے کر رخصت ہوئے۔ لیکن مرحوم نے اس حالت میں

بھی مشرقی تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اور وہ ہمیں الوداع کہنے کی غرض سے دروازے باہر تک آتے اور بڑے اصرار کے بعد انھیں واپس کیا جاسکا۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جگرؔ کے مداحوں اور ثنا خوانوں میں تھے۔ اور دائمی رفیق بھی۔ انھوں نے جگرؔ کی حیات اور شاعری پر بہت کچھ لکھا۔ جگرؔ کی شہرت کو ادبی حلقوں میں اور طبقہ اہل علم تک پہنچانے میں ان کا بہت ہاتھ ہے۔ جگرؔ کی شخصیت اور شاعری کے موضوع پر کوئی ناقد یا مقالہ نگار بغیر ان کے قلم کا سہارا لیے اپنے منصب سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے اپنے ایک طالب علم شاگرد۔ صاحب زادہ رشید الظفر سے جو والی ریاست بھوپال کے قریب ترین عزیز تھے، سفارش کرکے سو روپیہ ماہانہ مستقل وظیفہ کا انتظام کر دیا تھا۔ جو عرصہ دراز تک ان کو ملتا رہا اور اس وقت بند ہوا جب آزادی کے بعد جاگیرداری کا خاتمہ ہوا۔ ایک روز جگرؔ نے صاحب زادہ رشید الظفر سے احساس احسان مندی میں کہا نواب صاحب! میں آپ کا مشکور ہوں لیکن کیا کروں طبیعت سے مجبور ہوں۔ میں آپ کی شان میں دو لفظ قصیدہ کے بھی پیش نہ کر سکا۔

اب آپ سنیئے۔ اس رئیس ابن رئیس عالی ظرف نے جگرؔ کو کیا جواب دیا۔ انھوں نے کہا۔ جگرؔ صاحب! مجھے تو اس سے پہلے آپ سے کوئی شکایت نہ تھی۔ البتہ اس وقت ضرور پیدا ہو گئی ہے کہ آپ میرے متعلق کیا سوچتے ہیں۔

اور یہ حقیقت ہے کہ انسانیت اور شرافت کا اس سے بڑا اور صحیح معیار اور کیا ہوگا ؎

عرش تک ہو نہیں سکتی جو رسائی نہ سہی
یہی انساں کی معراج ہے کہ انساں ہو جائے — جگرؔ

جگرؔ کے ہمدرد اور ثنا خواں سید صدیق حسن آئی۔ سی۔ ایس جگرؔ کی وفات کی تعزیت کے سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

جگرؔ لکھنؤ آتے تو بھوپال ہاؤس میں ٹھہرا کرتے۔ ملک کے بٹوارے کے بعد بھوپال ہاؤس کے زیادہ تر افراد پاکستان چلے گئے اور اس کا بڑا حصہ سرکاری قبضہ میں آگیا۔ صرف ایک چھوٹی سی جگہ پسماندگان کے حصہ میں رہ گئی۔ کوئی تین سال کا ذکر ہے۔ (۱۹۵۰) مجھے معلوم ہوا کہ جگرؔ لکھنؤ آئے ہوئے ہیں، بیمار ہیں اور بھوپال ہاؤس میں ٹھہرے ہیں۔ میں خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں بھی آپ کی دوستی کا شرف رکھتا ہوں غریب خانہ پر ٹھہریئے۔ کہنے لگے میں اس گھر میں نہ جانے کب سے ٹھہرتا چلا آیا ہوں۔ یہاں سے چلا جاؤں گا تو ان حضرات کی دل شکنی ہوگی اور یہ میں کسی قیمت پر گوارا نہیں کر سکتا۔ چونکہ ان کی طبیعت ان دنوں ناساز تھی۔ لہٰذا میں چاہتا تھا کہ وہ زیادہ آرام و سکون سے رہیں۔ ان کو آمادہ کرنے کے لیے نہ جانے کتنی دلیلیں پیش کی گئیں۔ کس کس طرح سمجھایا گیا مگر وہ نہ مانے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں۔

جگرؔ کو بیماری کے زمانہ میں روپیہ کی خاص ضرورت تھی مگر یہ ضرورت بھی انھیں اس پر آمادہ نہ کر سکی کہ وہ کوئی ایسا قدم اٹھائیں جس سے ان کی خودداری کو ٹھیس لگے۔ آتش گل (تیسرا مجموعہ کلام) کی طباعت ہو چکی تھی۔ اس کی جلدیں میرے پاس رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے دو ایک دوستوں سے مشورہ کے بعد طے کیا کہ کوئی پچاس جلدوں پر جگرؔ اپنے دستخط کر دیں تاکہ یہ نسخے زیادہ قیمت پر بک سکیں۔ میں جگرؔ کی خدمت میں کافی گستاخ تھا۔ چنانچہ ایک سہ پہر کو جب میں نے دیکھا کہ جگرؔ بہت ہی اچھے موڈ میں ہیں۔ میں نے نہایت بے تکلفی سے کہا کہ کچھ نسخوں پر دستخط کر دیجئے۔ کہنے لگے۔ کیا کیجئے گا؟ میں نے کہا کروں گا کیا۔ جہاں اور نسخے بکیں گے انھیں بھی بیچ دوں گا اور شاید مصنف کے دستخطوں کی وجہ سے ان کی قیمت اچھی آجائے یہ سن کر مسکرا دیئے۔ کہنے لگے۔ میں اپنے دستخط بیچوں؟ جی نہیں۔ میں نے ہر چند اصرار کیا۔ مگر جگرؔ کو آمادہ نہ کر سکا۔

بیماری کے ایام میں ہم لوگوں کی خواہش ہوئی کہ صوبائی حکومت کو توجہ دلائی جائے اور علاج کے لیے ایک رقم کی درخواست کی جائے۔ جگرؔ کا عندیہ لیا گیا۔ وہ کوئی درخواست دینے کے

اپنی بات

اودھ نمبر کی شان دار کامیابی کے بعد بہت کچھ اشاعتی پروگرام زیر غور ہیں اور یہ [illegible] ہے کہ جس گرم جوشی سے اودھ نمبر کا خیر مقدم کیا گیا ہے اسی جوش و خروش سے آئندہ شائع ہونے والے نمبروں کا بھی خیر مقدم ہوگا۔

تغیر اور تبدل قانون فطرت ہے۔ موسم بدلا کرتے ہیں۔ ابھی کچھ دن پہلے اتر پردیش گرمی کی شدید لہر سے دوچار تھا ایسا لگتا تھا کہ آفتاب سوا نیزے پر آگیا ہے۔ گرم ہوائیں اور تپش [illegible]۔ اسی میں [illegible] اور اب موسم کچھ خوش گوار ہو چلا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ موسم کی یہ خوش گوار تبدیلی ریاست کے عوام کے لئے خوش حالی لائے۔

تبدیلی کی جو لہر چلی ہے اس کا ایک رخ ہمارے صوبے کی نئی وزیر اعلا محترمہ مایاوتی کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔ ہندستان کی جمہوری تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے جب اتر پردیش جیسے صوبے میں پہلی بار ایک دلت طبقہ کی خاتون وزیر اعلا کے عہدے پر مقرر ہوئی ہیں۔ اور وہ اتر پردیش کی سب سے کم عمر وزیر اعلا ہیں۔ اتر پردیش کی پہلی خاتون وزیر اعلا آنجہانی سچیتا کرپلانی تھیں جو اچاریہ کرپلانی کی اہلیہ تھیں۔

محترمہ مایاوتی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ:

——— وہ دلت طبقے سے تعلق رکھتی ہیں

——— وہ سب سے کم عمر وزیر اعلا ہیں

——— انھوں نے انتہائی نامساعد حالات میں اپنی سیاسی فراست اور تدبر کا ثبوت دیا اور اس اعلا ترین منصب پر فائز ہوئیں۔

ان کی پیدائش ضلع بجنور میں ۱۹۵۶ء میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی اور بعد میں دہلی یونیورسٹی سے گریجویشن کی تکمیل کی اور قانون کی سند حاصل کی۔ ۱۹۷۸ء سے وہ سیاست میں داخل ہوئیں اور ۱۹۸۵ء سے باقاعدہ عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ وہ لوک سبھا اور راجیہ سبھا کی ممبر بھی رہیں لیکن ان کی اہمیت حالیہ واقعات سے بہت بڑھ گئی جب انھوں وزیر اعلا کا عہدہ سنبھالتے ہی یہ بیان دیا کہ " وہ کسی سیاسی پارٹی کی نہیں بلکہ پوری ریاست کی رہنما ہیں اور سبھی کی بھلائی کے لئے کام کریں گی "۔ بعد میں انھوں نے اپنے نقطۂ نظر کے بارے میں اور ترقیاتی کاموں کو آگے بڑھانے کے سلسلے میں اپنی ترجیحات کا اعلان کیا۔ انھوں نے یہ واضح کیا کہ سب سے اہم اور ضروری مسئلہ یہ ہے کہ عوام خود کو محفوظ سمجھیں، انھیں اطمینان رہے کہ ان کی زندگی، ان کا سرمایہ اور ان کی عزت نفس مکمل طور سے محفوظ ہے۔

وزیر اعلا نے صراحت کے ساتھ کہا کہ غیر سماجی عناصر اور جرائم میں ملوث لوگوں کو سزا ملتی رہے گی اسی کے ساتھ ساتھ دلتوں، غریبوں پسماندہ لوگوں اور اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لئے جو پروگرام چل رہے ہیں انھیں مزید تیز رفتاری سے بڑھایا جائے گا امبیڈکر گاؤں کی ترقی کو بھی ترجیح دی جائے گی اور ساتھ ہی ساتھ دیہی علاقوں میں بجلی، پانی وغیرہ کی جو سہولتیں دی جاتی ہیں انھیں اور بڑھایا جائے گا انھوں نے اس بات کی مزید وضاحت کی کہ جو بھی کام ہوگا وہ [illegible] عملی نتائج بھی سامنے آنا چاہئیں۔

[illegible]

دو غزلہ

سمجھ نہ اس کو ہی سب کچھ جو کائنات میں ہے
بہت کچھ اس کے علاوہ بھی شش جہات میں ہے

نظر ستاروں پہ کیا ڈالتا ہے اے ناداں
ترا نوشتۂ تقدیر تیرے ہات میں ہے

اسے بھی تو کبھی پہچاننے کی کوشش کر
چھپا ہوا جو ترے جسمِ بے ثبات میں ہے

کرے بھلا وہ حقائق کا سامنا کیسے
پھنسا ہوا جو طلسمِ توہمات میں ہے

فنا بقا سے جُدا اور کوئی چیز نہیں
شرابِ تلخِ اجل کاسۂ حیات میں ہے

نہ ڈھونڈھ لفظِ وفا کو کتابِ ہستی میں
یہ لفظ وہ ہے جو فرہنگِ مہملات میں ہے

میں اس کو واقفِ اسرار کس طرح مانوں
ابھی جو منزلِ فہمیدنِ نکات میں ہے

گئی نہ تیرگیٔ غم سے دل کی تابانی
ستارہ اب بھی یہ روشن سیاہ رات میں ہے

تری صفات ہی مظہر ہیں ذات کی تیری
مگر جو ذات میں ہے کب تری صفا ت میں ہے

یہ چاہتا ہے کرامات اس سے ہوں صادر
بشر جو خود یدِ قدرت کے معجزات میں ہے

ولی کی قدر کرو اہلِ لکھنؤ کہ وہ اب
تمھارے شہرِ ادب کے تبرکات میں ہے

بہشت میں ہے نہ دُنیائے بے ثبات میں ہے
سکونِ قلب جو عرفانِ کُنہِ ذات میں ہے

دماغ کا ہے تقاضا کچھ اور دل کا کچھ
بشر جو مجھ میں ہے وہ کتنی مشکلات میں ہے

حیات و مرگ کے آگے نظر نہیں جس کی
گرفتہ کشمکشِ ہستی و ممات میں ہے

متاعِ ہستیٔ فانی پہ کیوں ہے اتنا ناز
سنبھل! کہ راہزنِ مرگ تیری گھات میں ہے

دماغ نام ہے جس کا وہ ایک پارۂ گوشت
کریں جو غور تو خود وہ عجائبات میں ہے

امیدِ رفعتِ پرواز ہے فضول اس سے
ابھی تو طائرِ دل دامِ خواہشات میں ہے

خدا ہی جانے حقیقت کی شکل کب پاوے
سکونِ زیست ابھی تو تصورات میں ہے

یہ مہر و لطف کا اظہار بے سبب تو نہیں
سمجھ رہا ہوں کہ کیا تیرے التفات میں ہے

کبھی تو سیدھے طریقے سے یار باتیں کر
یہ کیا کہ طنز چھپا تیری بات بات میں ہے

ترا وجود ہے جس کا حقیر سا قطرہ
ولی وہ چشمۂ[۱] فیض آج بھی ہرات میں ہے

۱؎ شاعر کے جدِ اعلیٰ شیخ الاسلام ابو اسماعیل عبداللہ انصاری ہروی

پروفیسر محمد ولی الحق انصاری ، ۲، زنگی محل، لکھنؤ۔۳

عابد پیشاوری
شعبہ اردو۔ جموں یونیورسٹی
جموں-۱۸۰۰۰۱

رانی کیتکی کی کہانی

نثر میں انشا کی دو تصانیف شاہکار کا مرتبہ رکھتی ہیں۔ رانی کیتکی کی کہانی، اور "دریائے لطافت" فارسی میں ہے۔ یہ پہلی کتاب ہے جو کسی ہندستانی نے اردو زبان و قواعد سے متعلق لکھی۔ زبان و قواعد کی بحث کے ضمن میں جتنی مثالیں پیش کی گئی ہیں وہ سب اردو میں ہیں اور ان میں اردو نثر کے اعلا نمونے موجود ہیں۔ رانی کیتکی کی کہانی، ایک طبعزاد قصہ ہے یہ جس دور کی تصنیف ہے وہ آغاز داستان گوئی کا زمانہ ہے۔ ایک طرف بڑی بڑی ضخیم و جسیم داستانیں لکھی گئیں بلکہ اکثر عربی و فارسی یا بعض دیسی بولیوں سے ترجمہ کی گئیں تو دوسری طرف "فسانۂ عجائب" اور "باغ و بہار" جیسے مختصر قصے وجود میں آئے انشا کی یہ کہانی نہ تو "طلسم ہوش ربا" اور "داستان امیر حمزہ" جیسی طویل داستانوں میں شمار ہو سکتی ہے اور نہ "باغ و بہار" اور "فسانۂ عجائب" جیسی مختصر داستانوں میں۔ اسے داستان اور افسانے کے بیچ کی کڑی کہنا چاہیئے۔ ناول بعد کے دور کی پیداوار ہے۔ مختصر افسانہ اس سے بھی بعد کی۔ ناول بھی اپنی ضخامت کے اعتبار سے متوسط داستانوں سے کم طویل نہیں ہوتے بلکہ کچھ زیادہ ہی ہوتے ہیں۔ رانی کیتکی کی کہانی، ان دونوں اصناف کے درمیان کی چیز ہے۔ اسے طویل مختصر افسانہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اگرچہ اصطلاحاً طویل مختصر افسانہ بھی بعد کی پیداوار اور مغرب کی دین ہے۔

یہ کہانی انشا کی طباعی اور جودت ذہن کی عجیب و غریب مثال ہے اس کی ضخامت مشکل سے ۵۰ صفحے ہے۔ ٹائپ میں یہ کتابی سائز کے باسٹھ صفحوں پر محیط ہے۔ عام لیتھو چھپائی میں پچاس اور ہندی میں چالیس صفحوں پر آج کے اکثر مختصر افسانے بھی اس سے زیادہ طویل ہوتے ہیں۔ اس کا اختصار اس کی زبان و بیان کا مرہون منت ہے۔ اس میں انشا نے التزام کیا ہے کہ ہندی (ہندوی) کے علاوہ کسی دوسری زبان کا کوئی لفظ نہ آنے پائے کہانی کی تمہید میں لکھتے ہیں:

"ایک دن بیٹھے بیٹھے یہ بات اپنے دھیان میں چڑھی کوئی کہانی ایسی کہئے جس میں ہندوی چھٹ اور کسی بولی کا پٹ نہ ملے۔ باہر کی بولی اور گنواری کچھ اس کے بیچ میں نہ ہو۔"

(انشا، ان کا کارنامہ رانی کیتکی کی کہانی۔ مرتبہ برج رتن داس ص ۹)

اس التزام نے کہانی کی ضخامت کو بڑھنے نہیں دیا ورنہ اس کا ڈول پھیلاؤ جیسا ہے، اگرچہ اس میں داستانوں جیسی پیچیدگی اور قصہ در قصہ کا انداز نہیں ہے اس کی ساری عظمت و اہمیت زبان و بیان میں ہے۔ یہ سادہ زبان و بیان اس سے پہلے اردو میں نایاب ہے۔ ہندی میں بھی اس سے قبل کوئی ایسی چیز نہیں ملتی۔ فارسی اور کسی باہری بولی کی پٹ نہ ہونے کے سبب ہندی والوں نے رانی کیتکی کو ہندی کہانی میں اولین مقام دیا ہے۔ انشا ہندی کے پہلے چار آچاریوں (عالموں) میں شمار ہوتے ہیں۔ ان عالموں میں دو: پنڈت للو لال اور سدل مشر کا تعلق فورٹ ولیم کالج سے ہے۔ تیسرے منشی سدا سکھ لال نیاز پریاگ میں تھے اور انشا لکھنؤ میں۔ تحقیق سے ثابت ہے کہ انشا ان چاروں میں پہلے ہیں جنھوں نے طبعزاد کہانی پر قلم اٹھایا۔

زمانۂ تصنیف

ہندی کے عالموں نے اس کہانی کی تصنیف کے مختلف زمانے بتائے ہیں۔ ڈاکٹر جھوی ناتھ ترپاٹھی سنہ ۱۸۰۳ء، ڈاکٹر پرمانند سریواستو سنہ ۱۸۰۳ء۔ سنہ ۱۸۱۰ء، برج رتن داس سنہ ۱۸۶۰ (سنہ ۱۸۰۳ء) پنڈت شیام سندر داس سنہ ۱۸۵۶ تا سنہ ۱۸۶۵ (سنہ ۱۷۹۹ء۔ سنہ ۱۸۰۸ء) ڈاکٹر گوپی ناتھ تیواری، سنہ ۱۸۰۳ء۔ سنہ ۱۸۱۰ء، ڈاکٹر کانتا اوجھا سنہ ۱۸۱۳ء۔ اور پنڈت رام چندر شکل نے اس کا زمانہ سنہ ۱۷۸۹ء اور سنہ ۱۸۰۳ء کے درمیان قیاس کیا ہے لیکن اپنے قیاس کی وجہ کسی نے بھی بیان نہیں کی۔ اردو

کے محققوں نے بالاتفاق ۱۸۰۳ء کو اپنا لیا ہے سوائے مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے۔ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اردو میں اس قیاس کی بنیاد کس نے ڈالی۔ مولوی عبدالحق نے ۱۹۲۶ء میں اسے رسالہ اردو میں اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کیا تھا اس کے بعد بھی یہ دو بار شائع ہو چکی ہے (اور اب تو مزید دو بار لکھنؤ اور بمبئی سے بھی شائع ہوئی ہے) طبع ثانی میں بھی مولوی عبدالحق کا مقدمہ موجود ہے لیکن اس میں سنہ تصنیف کا کوئی ذکر نہیں۔ اس کے بعد متعدد لوگوں نے اس پر قلم اٹھایا۔ اکثر نے زمانۂ تصنیف کا ذکر نہیں کیا جنھوں نے کیا ہے انھوں نے بغیر کسی حوالے کے ۱۸۰۳ء لکھ دیا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے "اردو کی نثری داستانیں" میں پہلی مرتبہ اس پر کسی قدر بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"رام بابو سکسینہ اور احسن مارہروی نے اپنی تواریخ ادب میں داستان کی تاریخ تصنیف ۱۸۰۳ء لکھی ہے لیکن مولانا عرشی نے سلک گوہر کے دیباچے میں ۱۸۰۸ء طے کی ہے:

وہ آگے لکھتے ہیں:

"ہندی ساہتیہ کے اتہاس میں رام چندر شکل نے اس کہانی کا زمانہ ۱۷۹۸ء اور ۱۸۰۳ء کے درمیان قیاس کیا ہے۔ کہانی میں سعادت علی خاں کی مدح ہے۔ ۱۷۹۸ء اس کا سالِ جلوس ہے لیکن آخر سال یعنی ۱۸۰۳ء کے تعین کی کوئی وجہ ظاہر نہیں کی گئی۔ فی الحال یہی قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۰۳ء تک یہ کتاب وجود میں آ چکی تھی۔" (ص ۲۴۰۔ نثری داستانیں طبع ثانی)

اس بحث کے باوجود ڈاکٹر جین نے ۱۸۰۳ء کو آخری حد مقرر کرنے کا کوئی سبب نہیں لکھا۔ کہانی میں سعادت علی خاں کی مدح نہیں ہے اس لئے ۱۷۹۸ء کے قیاس کا بھی کوئی جواز نہیں۔ مولانا عرشی نے سلک گوہر میں ملنے والے ایک ادھورے ہندی جملے کی بنا پر رانی کیتکی کو ۱۸۰۸ء کے بعد کی تصنیف بتایا ہے چونکہ وہ ادھورا فقرہ اس مکمل فقرے کا جزو ہے جو رانی کیتکی میں موجود ہے اس لئے عرشی صاحب کا قیاس درست نہیں ہے۔ ہم نے انشا کے سوانح کی بنیاد پر اس کہانی کا زمانۂ تصنیف ۱۷۸۹ء ۱۷۹۰ء کے درمیان طے کیا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے چند سال پیشتر ادارۂ تحقیق پٹنہ کے سیمینار کے لئے راقم کے تحقیقی مقالے پر تبصرہ کرتے ہوئے ہمارے قیاس اور استدلال سے اتفاق کیا تھا۔

اردو ہندی کی بحث

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا۔ اس کہانی کو اہل ہندی، ہندی کہتے ہیں اور اہل اردو، اردو۔ اس میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔ ادب کسی خاص قوم، فرقے یا مذہب کی میراث نہیں ہوتا۔ وہ بین الاقوامی بلکہ آفاقی ہوتا ہے تاہم اصلاً کوئی شاہکار اُسی ملک، قوم یا زبان کا مانا جاتا ہے۔ جس میں اس کی تخلیق ہوئی ہو۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو رانی کیتکی کی کہانی "اردو ہی میں لکھی گئی۔ اگرچہ سب سے پہلے اس کی اشاعت ہندی میں ہوئی۔ اس کی بازیافت کے لئے اردو والے ہندی کے مرہونِ منّت ہیں لہٰذا اس پر ہندی کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا اردو کا۔ ہندی کی کوئی اہم تاریخ یا تحقیق اس کے ذکر سے خالی نہیں۔ کہانی پر تنقید کرتے ہوئے کسی قابل ذکر ناقد نے اس سے صرف نظر نہیں کیا اور یہ ممکن بھی نہیں تھا لیکن جیسا کہ کہا جا چکا ہے اصلاً یہ کہانی اردو میں لکھی گئی اگرچہ اپنی زبان کے اعتبار سے یہ ہندی بلکہ ہندوستانی سے زیادہ قریب ہے۔ اسی سبب سے ہندی والوں نے اسے اپنایا بھی ہے لیکن اسلوب کے اعتبار سے یہ خالص اردو ہے۔ انشاؔ نے ہندی لکھنے کا دعویٰ بھی نہیں کیا۔ ہندوی۔ کو ہندی بنا دینا بعد کی تحریف ہے۔ اس کے اردو ہونے کے متعدد وجوہ ہیں یہاں ان کی تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں صرف ایک دلیل کافی ہے۔ ہندی میں کوئی ایسی کتاب لکھنا جس میں عربی فارسی یا کسی اور باہر کی بولی کا کوئی لفظ نہ آئے معمولی بات ہے لیکن اردو میں ایک ایسا ورق بھی لکھنا کمال کی دلیل ہے۔

قصّہ

رانی کیتکی کا قصہ مختصراً اس طرح ہے:

کنور اُدے بھان کسی دیس کے راجہ سورج بھان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جب سولہ برس کا ہوا تو جوانی کے جوش میں کسی کو کچھ نہ سمجھتا تھا۔ ایک دن گھوڑے پر سوار ہو کر سیر کو نکلا۔ راستے میں ایک ہرنی سامنے آئی۔ اس کے پیچھے گھوڑا ڈال دیا اور تھوڑی دیر میں اپنے ساتھیوں سے جُدا ہو گیا۔ ہرن کا پیچھا کرتے کرتے شام ہو گئی۔ کنور بھوکا پیاسا ٹھکانے کی تلاش میں چلا۔ اتفاقاً آموں کا ایک جھنڈ نظر آیا۔ دیکھا تو چالیس پچاس حسینائیں جھولا جھول رہی ہیں۔ کنور کو دیکھتے ہی ان میں کھلبلی پڑ گئی۔ ہر طرف "یہ کون، یہ کون" کا غل مچ گیا۔ اچانک ان کی سرتاج رانی کیتکی سے نگاہیں ملیں اور دونوں دل ہی دل میں ایک دوسرے پر عاشق ہو گئے لیکن سہیلیوں کو دکھانے کی غرض سے رانی کنور پر برس پڑی

"اس ڈھنگ چلنے کو بھلا کیا کہتے ہیں؟ ہٹ دھک جو تم جھٹ سے ٹپک پڑے یہ نہ جانا یہاں رتیاں اپنے جھول رہی ہیں۔ ابھی! تم اس روپ کے ساتھ بدھڑک چلے آئے ہو، ٹھنڈے ٹھنڈے چلے جاؤ، کنور یہ سن کر ملول ہوا اور التجا کی کہ میں دن بھر کا تھکا ہارا مسافر ہوں کسی پیڑ کی اوٹ میں رات کاٹ لوں گا۔ اور علی الصبح منہ اندھیرے چلا جاؤں گا۔ اس پر رانی کیتکی کنور کو سنا کر اپنی سہیلیوں سے بولی۔ ان سے کہہ دو کہ جہاں جی چاہے اپنے پڑ رہیں اور جو کچھ کھانے پینے کو مانگیں انھیں پہنچا دو، گھر آئے کو آج تک کسی نے مار نہیں ڈالا۔ ان کا چہرہ اور ظاہری حالت انھیں سچا ثابت کرتی ہے۔ لیکن ہمارے ان کے درمیان کسی کپڑے کی اوٹ کر دو۔ یہ آسرا پا کر کنور نے ایک طرف آموں کے نیچے ڈیرا ڈال دیا۔ لیکن دل میں آگ لگی ہوئی تھی نیند نہ آسکی۔ اُدھر رانی کیتکی کو بھی چین نہ آیا۔ اس نے اپنی منہ لگی سہیلی مدن بان کو اپنی حالت بیان کی اور اسے اپنے ساتھ لے کر کنور کے پاس آئی اور اپنا اور رانی کا مفصل تعارف کروا کر مدن بان نے کہا، "اب اپنی کہانی کہو۔ تم کس دیس کے کون ہو؟" کنور نے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ اس کے بعد مدن بان کے مشورے سے نہ صرف انگوٹھیاں بدل لی جاتی ہیں بلکہ اقرار نامے بھی لکھ دیے جاتے ہیں۔ صبح رانی کیتکی اپنی سہیلیوں کے ساتھ اپنے محل کی طرف چلی گئی اور کنور اپنے ساتھیوں سے آملا۔"

اب کنور کی حالت غیر ہو گئی۔ کھانا پینا بھول گیا۔ رات کی نیند، دن کا چین جاتا رہا۔ ہوتے ہوتے بات مہاراج اور مہارانی تک پہنچی۔ انھوں نے کنور سے پوچھنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ مارے شرم کے کچھ بتانے پر تیار نہ ہوا۔ آخر وہ اپنے دل کی بات لکھ بھیجنے پر راضی ہوا اور تحریر کے ساتھ کیتکی کی دی ہوئی انگوٹھی اور اقرار نامہ بھی والدین کے پاس بھجوا دیا۔ جب راجا سورج بھان کو حقیقت کا علم ہوا تو اس نے کیتکی کے والدین کو شادی کا پیغام بھجوایا لیکن راجا جگت پرساد نے جواب دیا۔ "ان کے ہمارے ناتا نہیں ہونے کا۔ ان کے باپ دادا ہمارے باپ داداؤں کے آگے سدا ہاتھ جوڑے باتیں کیا کرتے تھے۔ کیا ہوا جو اب وہ آگے بڑھ گئے اور اونچے چڑھ گئے جس کے ماتھے ہم بائیں پاؤں کے انگوٹھے سے ٹیکا لگا دیں، وہ مہاراجوں کا راجا ہو جاوے، کس کا منہ ہو جو یہ بات ہمارے منہ پر لاوے۔" پیغامبر کے اس جواب پر، "اگلے بھی کچھ ایسا ہی بے چارے ہوئے ہیں۔" اسے قید کر دیا گیا۔ جب یہ خبر سورج بھان کو پہنچی تو اس نے جگت پرکاس پر چڑھائی کر دی گھمسان کی لڑائی ہونے لگی۔ اسی دوران راجا جگت پرکاس نے اپنے گورو جوگی مہندر گر کو جو کیلاش پربت پر رہتا تھا، اپنی بپتا لکھ بھیجی۔ وہ اپنے نوسے لاکھ چیلوں کے ساتھ آندھی اور طوفان کے ساتھ آپہنچا اور آتے ہی نہ صرف راجا سورج بھان، رانی لچھمی باس اور کنور اودے بھان کو ہرن بنا ڈالا بلکہ ان کی تمام فوج بھی ہرن بنا دی گئی جاتے جاتے اپنا بگھمبر اور کچھ بھبھوت دیا گیا تاکہ بوقت ضرورت گورو جی کو طلب کیا جا سکے۔ بھبھوت کی خوبی یہ ہے کہ اسے آنکھوں میں لگانے والا سب کچھ دیکھتا ہے لیکن خود کسی کو نظر نہیں آتا۔

کچھ مدت گزرنے پر رانی کیتکی کسی طرح اپنی ماں سے وہ بھبھوت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ پہلے وہ بہلا پھسلا کر مدن بان کو بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہے۔ لیکن اس کے تیور بدلے دیکھ کر ایک دن چپکے سے بھبھوت آنکھوں میں لگا کر کنور کی تلاش میں نکل کھڑی ہوتی ہے۔ اِدھر اس کے والدین سخت پریشان ہوتے ہیں۔ بالآخر مدن بھان بھی بھبھوت لگا کر اپنی سہیلی کو ڈھونڈنے نکلتی ہے۔ دونوں سہیلیاں جنگل میں مل جاتی ہیں۔ مدن بان کیتکی کو گھر لے آتی ہے۔ راجا جگت پرکاس بیٹی کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے اور پھر اپنے گورو کو یاد کرتا ہے لیکن تلاش کے باوجود جوگی جی کو اودے بھان اور اس کے والدین نہیں ملتے۔ مہندر گر اپنے گورو راجا اندر سے امداد طلب کرتے ہیں اور ان کے کرم سے اودے بھان اور اس کے والدین اور تمام فوج کو اپنی اصلی صورت میں لایا جاتا ہے۔ اندر کنور کو بیٹا بنا لیتا ہے اور رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی شادی کر دیتا ہے اور کہانی اس معروف دعا پر ختم ہو جاتی ہے کہ جیسے ان لوگوں کے دن پھرے اور بچھڑے ہوئے ملے ویسے ہی ہمارے تمہارے سب کے دن پھریں۔

ظاہر ہے کہ اس سیدھی سادی مختصر سی کہانی میں آج کوئی خاص دل کشی محسوس ہوتی ہے نہ پیچیدگی۔ اگرچہ انشا نے فوق الفطرت عنصر داخل کر کے اس میں کچھ پیچیدگی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور مہندر گر کی ناکامی کے بعد راجا اندر کا کردار قصے میں داخل کر کے کہانی کی طوالت کے ساتھ ساتھ اس کی پیچیدگی میں بھی اضافہ کرنا چاہا ہے۔ تاہم جن مواقع پر تفصیل کی ضرورت تھی وہاں اختصار اور جہاں اختصار ضروری تھا وہاں تفصیل سے کام لیا جس سے کہانی میں تشنگی اور ناہمواری کا احساس ہوتا ہے اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ انشا نے قصہ ہندوانہ چُنا ہے۔ اور ہندو رسم و رواج سے ان کی واقفیت معمولی اور سُنی سنائی باتوں پر مبنی ہے اس لئے وہ حسب موقع جزئیات اور تفصیل کو نظر انداز کر جاتے ہیں لیکن جہاں اچھل کود دکھانے کا موقع ہوتا ہے انشا اسے اپنے مزاج کے مطابق پا کر

مکمل کھیلتے ہیں جس سے کہانی کے وزن و وقار کو ٹھیس لگتی ہے اور اس میں سنجیدگی نہیں آپاتی۔ سنجیدگی شاید انشاء کا مقصود بھی نہیں ہے۔ انھوں نے ایک عوامی کہانی تھا اس کو نبھانے کی دُھن میں وہ ایسی خامیوں کی طرف توجہ بھی نہیں کرتے یوں بھی انشاء داستان گو ہیں نہ افسانہ نگار پھر بھی ان کی یہ کوشش قابلِ قدر ہے خصوصاً اس لئے کہ ان کے پیشِ نظر کوئی نمونہ نہیں تھا۔ زبان کے علاوہ اس کہانی کی اہمیت اس کی تاریخی حیثیت اور اوّلیت میں ہے۔ یہاں پلاٹ اور قصّے کے ضمن میں کچھ مستند طلبا کے خیالات پیش کردینا بے محل نہ ہوگا۔ ان میں دونوں طرح کی رائیں ہیں۔ پروفیسر حامد حسن قادری، داستانِ تاریخ اردو، میں لکھتے ہیں۔

" نثری تصانیف کا انشاء کے گرد و پیش کوئی رواج نہیں تھا لیکن انھوں نے زبانِ اردو اور نثرِ اردو کی دو عجیب خدمتیں کی ہیں۔ رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی کہانی، انشاء کی ذہانت کی عجیب و نادر کارستانی ہے... ایک داستان لکھی ہے کوئی چھوٹی سی حکایت نہیں۔ پچاس صفحوں کی مکمل داستان ہے۔ قصّہ بھی عجیب اور اندازِ بیان بھی دلکش.... انشاء بڑے زندہ دل اور شوخ مزاج تھے۔ اس کہانی کی ایجاد بھی ان کی شوخیٔ طبیعت کی دلیل ہے۔ سارے قصّے میں یہی شوخی جلوہ گر ہے:

" پوری سڈول، کڑھی گڑھائی بنی بنائی اچھی بڑی کہانی ہے جس میں نئے نئے سماں باندھے ہیں۔ ڈھنگ ڈھنگ کی بات چیت لکھی ہے۔ کہیں چاؤ پیار کی باتیں ہیں، کہیں چھیڑ چھاڑ کی گھاتیں، نئے روپ نرالے بہروپ، لگاوٹ کی چاندنی لاگ کی دھوپ، راج نیت اور راج ہٹ، تریاہٹ اور بالک ہٹ، جوگ بروگ، جنتر منتر، لڑائی بھڑائی، میل ملاپ سبھی کچھ ہے: (ص ۱۴۳، طبع ثانی)

وقار عظیم نے ہماری داستانیں، میں رانی کیتکی کا نہایت بلیغ تجزیہ کیا ہے۔

• کچھ اقتباسات ملاحظہ ہوں:

" انشاء کی کہانی لکھنے کے فن اور اس کے انداز کی دلنشینی کی طرف بھی توجہ دی ہے اور یہ بات برابر ذہن میں رکھی ہے کہ کہانی دوسروں کو سنانے اور انھیں تفصیلوں میں منہمک رکھنے کے لئے لکھی اور کہی جاتی ہے۔ کہانی کی ابتدا اور اسکی اٹھان اور خاتمہ ایسا ہونا چاہئے کہ سننے والا اسے برابر اشتیاق اور توجہ سے سنتا رہے۔ انشاء کی کہانی میں اس پہلو سے کئی باتیں ہیں جن کی طرف عموماً داستان گو کی پوری توجہ نہیں ہوتی۔"

حمد، نعت اور منقبت .... کے بعد انشاء نے کہانی کا یہ عنوان قائم کیا ہے کہانی کا ابھار اور بول چال دلہن کا سنگار۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کہانی کا ابھار کیسا روپ دکھاتا ہے۔ اس سلسلے میں پہلی چیز جس پر پڑھنے والے کی نظر فوراً پڑتی ہے کہانی کے آغاز اور عنوان ہی میں لفظ ابھار کی موجودگی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ لفظ استعمال کرتے وقت انشاء کے ذہن میں کہانی کے ارتقا اور اس کے مختلف اجزا کے درمیان مکمل ربط اور ہم آہنگی اور تسلسل کا وہ نفسیاتی تصور اور نقطۂ عروج کی اہمیت کا وہ احساس موجود نہیں تھا جو آج کل کہانی کے حسن کے ساتھ لازمی طور پر وابستہ سمجھا جاتا ہے لیکن اس میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ انشاء نے جان بوجھ کر یہ لفظ استعمال کیا تو ان کے ذہن میں یقیناً یہ بات ہوگی کہ کہانی ابتدا سے انجام تک کچھ ایسی منزلیں طے کرتی ہے جس میں پڑھنے والا اشتیاق کے ساتھ یہ جاننے کا منتظر رہتا ہے کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔ انشاء نے کہانی کی ساخت جس انداز سے کی ہے اور جس اسلوب سے اسے ترتیب دیا ہے اس سے بھی اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے۔

کہانی کی پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ انشاء نے اسے واقعات کے اعتبار سے مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر ٹکڑے کا موزوں عنوان قائم کیا ہے۔ اس طرح کے عنوان ہمیں اکثر اپنی مثنویوں میں۔ انشاء کی داستانوں میں بھی ملتے ہیں لیکن ان ٹکڑوں میں ربط اور تسلسل پیدا کرنے کی کسی واضح کوشش یا رجحان کا سراغ بہت کم ملتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ کہانی کے کچھ کرداروں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہاں کی یہاں ہی رہنے دو، اب آگے سنو۔ اس آگے سنو کے بعد کہانی بڑی نرمی اور آہستگی سے پڑھنے اور سننے والے کے ذہن کو کوئی دھچکا لگائے بغیر دوسرا رُخ اختیار کرتی ہے۔ اسی طرح ایک اور موقع پر ایک نیا عنوان قائم کرتے ہی بات یوں شروع کی ہے۔ یہاں کی بات اور چہلیں جو کچھ ہیں سو یہیں رہنے دو۔ اب آگے سنو۔

ایک دوسری بات جو اس چھوٹی سی کہانی میں کئی جگہ ظاہر ہوتی ہے یہ ہے کہ انشاء اپنی کہانی کو پیچیدہ یا طویل بنا کر سامع یا قاری کے ذہن کو کہانی کی اصل ڈگر سے ہٹانا اور اسے بھٹکا کر کسی اور طرف لے جانا قصہ گوئی کے منصب کے خلاف جانتے ہیں اس لئے جہاں کہیں اس کی گنجائش بھی ہے کہ تخیل اور تصورات کو بڑھائے وہاں قاری سے معذرت کے بعد اختصار کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ یوں تو کہانی میں ایسے مواقع بہت ہیں لیکن یہاں دو ایک مثالوں کے ذریعے

اس میلان کی وضاحت کی کوشش کی گئی ہے گرد ہندر گر کی خصوصیات بیان کرتے کرتے کہتے ہیں راس کی (کو) اور (اور) باتیں اس ڈھب کی دھیان میں تھیں جو کچھ کہنے سننے سے باہر ہیں:

رانی کیتکی کی چہلوں کا حال بیان کرتے کرتے اسے یوں مختصر کرتے ہیں. کیا کہوں ایک چہل تھی جو کہئے تو کروڑوں پوتھیوں میں جیوں کی تیوں نہ آسکے، راجا اندر نے کنور اودے بھان کے بیاہنے کا جو ٹھاٹھ باندھا ہے تو اس کی مصوری میں انشا نے تخیل کی خوب خوب گل کاریاں دکھائی ہیں لیکن جب یہ احساس ہوا کہ بات حد سے آگے بڑھتی جارہی ہے تو اسے اس طرح ختم کر دیا:

"جس بیاہنے کی یہ کچھ پھیلاوٹ اور جماوٹ اور رچاوٹ اوپر تلے اس جگھٹے کے ساتھ ہو اس کا اور پھیلاوا کیا کچھ ہوگا. دھیان کرلو: یہ ناظر اور قاری کو تصوّر سے مدد لینے کا موقع دینا اور اسے اپنے تخیل اور تصور کا ہم عنان بنانا بھی اچھی قصہ گوئی کی شان ہے" (ہماری داستانیں ترمیم واضافہ شدہ اڈیشن، ص ۱۱۱، ۱۱۲)

ڈاکٹر گیان چند نے لکھا ہے کہ:

"انشا نے بول چال کی زبان کو نظر میں رکھا ہے اس لئے داستان میں سنائی ہوئی کہانی کا مزہ آجاتا ہے. قصہ فعل ماضی میں بیان کیا گیا ہے لیکن بیچ بیچ میں حال کا صیغہ لے آنے سے کہانی پن آجاتا ہے مثلاً اودے بھان پڑا پڑا اپنے جی سے باتیں کر رہا تھا اتنے میں کیا ہوتا ہے. جو رات سائیں سائیں بولنے لگتی ہے اور ساتھ والیاں سب سو رہتی ہیں اور رانی کیتکی اپنی سہیلی مدن بان کو جگا کر یوں کہتی ہے..." (اردو کی نثری داستانیں، ص ۲۴۶)

اس خصوصیت پر وقار عظیم یوں تبصرہ کرتے ہیں،

"انشا نے بیان کے اور التزامات (کے) ساتھ اپنی قصہ گوئی میں ایک خاص چیز سے مدد لی ہے. وہ کہانی کہتے کہتے قاری یا سامع کے ذہن کو فوراً ماضی سے حال کی طرف اس طرح لے آتے ہیں کہ وہ اس تبدیلی کو محسوس بھی نہیں کرتا اور گذرے ہوئے زمانے کی بات اس کی آنکھوں میں پھر جاتی ہے جیسے وہ ماضی کی نہیں حال کی بات ہے" واقعہ نگاری میں ماضی و حال کا یہ امتزاج افسانہ خواں کو کہانی کے واقعات میں اس طرح شریک شامل کر دیتا ہے جیسے وہ خود بھی کہانی کے کردار ہیں"

(ہماری داستانیں، ص ۱۱۲ - ۱۱۳)

واقعہ نگاری کا ایک اہم جز ہوتا ہے رانی کیتکی میں واقعہ نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے وقار عظیم لکھتے ہیں:

"قصہ گوئی میں واقعہ نگاری کی اہمیت اسی لئے تسلیم کی گئی ہے کہ اس کی مدد سے تخیل و تصور میں حقیقت کا رنگ بھی پیدا ہوتا ہے اور قصہ گو اور قصہ خواں کے درمیان اور پھر قصے کے کرداروں اور پڑھنے اور سننے والوں کے درمیان یگانگت کے رشتے استوار اور مستحکم ہوتے ہیں. یہی وجہ ہے کہ قصوں میں ہمیشہ کسی نہ کسی مخصوص زندگی اور معاشرے کا پس منظر پیدا کرکے انھیں حقیقت سے قریب لانے کی کوشش کی جاتی ہے. انشا نے قصہ گوئی کی اس اہمیت کا اندازہ بڑی ذہانت اور فنکارانہ دانشمندی سے لگایا ہے. انشا نے اپنے دوسرے ہم عصروں کے خلاف تفصیل کی جگہ اختصار کو کہانی کی دلکشی اور دلچسپی کے لیے زیادہ مؤثر جانا. اور اسے مختلف طریقوں سے بڑی کامیابی سے برتا ہے لیکن معاملہ جب واقعہ نگاری کا اور اس سے بھی زیادہ مقامی معاشرت کے فکری، تہذیبی اور جذباتی عناصر کی رنگ آمیزی کا ہو تو ان کا قلم کسی طرح کے بخل سے کام نہیں لیتا بلکہ سچ پوچھئے تو اس خاص معاملے میں ان کا تخیل اپنی پوری جولانی دکھانے اور کہانی کی فضا کو رنگین بنانے اور اس پر پوری طرح چھا جانے کے قائل ہیں" (ص ۱۱۴ - ۱۱۵)

ناول اور داستان کی بحث

ان طویل اقتباسات کے پیش کرنے کا مقصد یہ دکھانا تھا کہ ہمارے دوسرے داستان گویوں کے برعکس انشا قصہ گوئی کے فن پر زیادہ قادر ہیں. وہ قصے میں ربط و ترتیب کی اہمیت کو سمجھتے ہیں اسی لئے رانی کیتکی کا پلاٹ مربوط ہے اور اس کی یہ خصوصیت اسے داستان کی نسبت ناول سے قریب لے آتی ہے. ناول اور افسانے کے ایک اور معتبر نقاد ڈاکٹر قمر رئیس نے ایک جگہ لکھا ہے:

"داستانوں کو ناول اور افسانے کے فنی معیاروں پر پرکھنا اور ان میں پلاٹ کی چستی، واقعیت کردار نگاری اور حقیقت نگاری کے مرقعے تلاش کرنا صحیح نہیں. اس لئے ہمیں داستانوں کو ہی سامنے

رکھ کر علیحدہ اصول منضبط کرنا ہوں گے اور فنی معیار بنانا ہوں گے۔ مثلاً داستان نگار سے ہم یہ مطالبہ نہیں کر سکتے ہیں وہ قصّے کو فوق الفطری واقعات سے ملوث نہ کرے یا کہانی اور کرداروں کو صرف ہندوستان کی سرزمین تک محدود رکھے اور عراق، عجم اور سیستان کی باتیں نہ کرے۔ اس قسم کے تقاضے ناول نگار سے کر سکتے ہیں داستان گو سے نہیں۔

(ہماری داستانیں اور ان کا ورثہ مشمولہ نگارشاتِ ادیب ص ۵۸۔۵۹)

قمر رئیس صاحب نے جن عناصر کو ناول کی خصوصیات قرار دیا ہے ان میں سے بیشتر رانی کیتکی کی کہانی میں موجود ہیں۔ خود انھوں نے اپنے مذکورہ مضمون میں لکھا ہے:

"رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی کہانی ایک مختصر اور سیدھی سادی داستان ہے جو صرف ۶۵ صفحات پر مشتمل ہے اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ یہ خالص ہندوستانی یا ہندی زبان میں لکھی گئی ہے اور اس میں ابتدا سے آخر تک عربی و فارسی کے الفاظ استعمال نہیں ہوئے۔ (جو دو چار لفظ استعمال ہوئے ہیں وہ اتنے عام ہیں کہ جب تک خصوصیت سے اس پر غور نہ کیا جائے یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ الفاظ باہر کی بولی کے ہیں۔ ان پر ہم نے اپنے تحقیقی مقالے میں مفصل گفتگو کی ہے) اس کے باوجود انشا کا کمال یہ ہے کہ قصّہ کی زبان و بیان میں کہیں سوقیانہ پن نہیں پیدا ہوا۔ اس کی زبان ہی کی وجہ سے ہندی افسانہ کی تاریخ میں اسے بڑی اہمیت اور امتیاز حاصل ہے... قصہ کا پس منظر اس کے تمام کردار اور واقعات ہندوستانی ہیں۔ کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کے گرد گھومتی ہے۔ پلاٹ مربوط اور شاید انشا اس راز سے واقف تھے کہ کہانی میں اتحاد اور تاثر پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ قاری کا ذہن ادھر اُدھر نہ بھٹکے۔ اس قصّے کی تعمیر و ترتیب عام داستانوں سے بہت مختلف ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کہانی کو کلائمکس تک لانے کے لئے انشا کو فوق الفطری واقعات کا سہارا لینا پڑا ہے۔ لیکن اس سے قطع نظر انشا نے عشق و محبت کی واردات اور ہند و معاشرت کے بعض اہم پہلوؤں کی جو اہم تصویریں پیش کی ہیں وہ ان کی نفسیاتی گرفت اور مشاہدے کی وسعت کے ساتھ ساتھ فنی شعور کا ثبوت ہیں... سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہندوستانی معاشرت اور تہذیب کا بڑا سچا اور پکا رنگ اس میں جگہ جگہ گھلا ہوا ہے۔ فن کی یہ ارضیت اور زندگی سے یہ قربت وہ وصف ہے جس نے آگے چل کر ناول کی صورت اختیار کی۔"

(ہماری داستانیں اور ان کا ورثہ مشمولہ نگارشاتِ ادیب ص ۶۳، ۶۴، ۶۶، ۶۷، ۶۹)

اس میں شک نہیں کہ مذکورہ خصوصیات نے آگے چل کر ناول کی صورت اختیار کی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ رانی کیتکی کی کہانی کی روایت سے بعد کے آنے والے داستان گویوں اور ناول نگاروں نے استفادہ نہیں کیا ورنہ اردو ناول کا آغاز نذیر احمد سے پچاس ساٹھ سال پہلے ہی ہو جاتا لیکن اردو ادب کی تاریخ اس صنف کے لئے مغرب کی رہنمائی اور دست گیری کی منتظر تھی۔ اس باب میں اردو ناول کے تاریخ نویس علی عباس حسینی لکھتے ہیں:

"جس چیز نے موجودہ ناول کی اساس رکھی وہ صحیح طور سے انشا کے دو کارنامے ہیں... رانی کیتکی کی کہانی اور دریائے لطافت... لطف یہ ہے کہ انشا نے یہ دونوں چیزیں قصہ سنانے کے لئے نہیں بلکہ زبان دانی کے جوہر دکھانے کے لئے لکھیں... رانی کیتکی کی کہانی خالص ہندوستانی میں ہے لیکن قصہ بھی کوئی کم دلچسپ نہیں۔ زبان کی اس قید و بند پر بھی اس کہانی میں معاشرت اور سیرت کے نمونے موجود ہیں اور وہ ایک جیتی جاگتی پھڑکتی ہوئی چیز ہے۔ دریائے لطافت فارسی میں لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کا پہلا حصّہ انشا کا ہے اور دوسرا قتیل کا۔ پہلے حصہ میں جو اردو کی عبارتیں، مکالمے کے نمونے کے طور پر پیش کی گئی ہیں وہ اس زمانے کے مختلف طبقوں اور پیشہ وروں کی زبان کا بہترین مرقع ہیں۔ انشا کے ان احسانات کے سامنے نہ تو اردو نثر سر اٹھا سکتی ہے اور نہ اردو قصہ گوئی۔ تعجب تو یہ ہے کہ میر انشا کی رانی کیتکی اور دریائے لطافت کے باوجود رجب علی بیگ سرور نے فسانۂ عجائب، شبستان سرور، گلزار سرور، شرر عشق، شگوفۂ محبت اور سرورِ سلطانی میں اپنی نثر کو صنائع بدائع کے ذریعہ رنگین اور قافیہ پیمائی کے وسیلے گراں قدر بنانے کی کوشش کی... عجیب بات یہ ہے کہ صرف

لکھنؤ والوں ہی کو یہ اسلوب پسند نہ آیا بلکہ غالب دہلوی نے بھی اپنی تقریظوں اور محمد بخش نے گلشن بہار میں اسی کی نقاسی کی۔ اور تصدق حسین داستان گو سے لے کر پنڈت رتن ناتھ سرشار ناولسٹ تک اسی طرز کے مبتلا بنے۔"

رانی کیتکی کے اردو ناول کا نقش اول ہونے کی طرف ایک زمانے تک ہمارے ناقدوں کی توجہ نہیں گئی۔ اس کا ایک سبب اس کہانی کی کم یابی ہو سکتا ہے مولوی عبدالحق نے ۱۹۲۶ء میں اسے رسالہ اردو میں شائع کر دیا تھا۔ اس کے باوجود اس کا محتاج توجہ رہنا ممکن ہے اس لئے ہو کہ خود اردو تنقید کا فن بھی محتاج توجہ تھا۔ اس میں جتنی ترقی گذشتہ چند برسوں میں ہوئی ہے اس سے پہلے مفقود تھی چنانچہ تنقید کی ترقی کے ساتھ ساتھ ادب کے قدیم سرمائے کو کھنگالا گیا تو بہت سے جواہر پارے گوشۂ گمنامی سے باہر آئے اور رانی کیتکی پر ناقدوں کی نظریں پڑنے لگیں۔ مندرجہ بالا بیانات اس کے شاہد ہیں آخر میں ڈاکٹر احسن فاروقی کی رائے پیش کر دینا نامناسب نہ ہوگا یہ رائے اگرچہ زبان و بیان سے متعلق ہے لیکن چونکہ انھوں نے رانی کیتکی کی زبان کو اردو ناول کا سنگ بنیاد کہا ہے اس لئے یہاں اس کا اقتباس بے جا نہ ہوگا۔

"انشاء اللہ خاں نے رانی کیتکی کی کہانی زبان کے جوہر دکھلانے کے لئے ہی لکھی۔ یہ کہانی.... مابعد کی داستانوں سے زیادہ ناول کے قریب آجاتی ہے۔ انشا نے زبان کے جوہر دکھانے کے سلسلے میں ایک نئی راہ بھی نکالی۔ لکھنؤ کی اردو شاعری میں زبان کی طرف تمام تر توجہ کا اثر یہ بھی ہوا کہ ایک مخصوص قسم کی منجمد زبان ہر شاعر پر حائد ہو گئی اور شاعری محض الفاظ کے الٹ پھیر کا نام ہو گیا۔ نثر میں بھی یہی روش عام رہی۔ مگر یہی زبان داں جب افسانہ نگاری اور داستان نویسی کی طرف متوجہ ہوئے تو انھوں نے زبان کا وہ راز پالیا جو ناول نگاری کے لئے بہت ہی بنیادی اور ضروری ہے۔ ان زبان دانوں نے قصوں کو شروع تو بندھی ٹکی زبان میں کیا مگر جب مختلف طبقوں اور مختلف افراد کی بات چیت رقم کی تو ہر طبقہ اور ہر زبان کا اختلاف نمایاں کیا انشا پہلے شخص ہیں جنھوں نے عام زبان کو اس کی طبقاتی اور انفرادی خصوصیات کے ساتھ رقم کیا۔ رانی کیتکی کی کہانی خالص ہندوستانی یا ہندی میں لکھی گئی۔ لکھنؤ میں اردو کو خالص ملکی زبان بنانے کی یہ خاص مثال ہے۔ ظاہر ہے کہ خالص ہندوستانی اور مقفّیٰ زبان ہی ہو سکتی تھی.... اس معنی میں تو یہ تصنیف محض ایک تجربہ ہے مگر عام زبان کی طرف نظر نے یہ گل کھلایا کہ اس تصنیف میں کالوں کی صحیح زبان پیدا ہو گئی۔ یہاں ہر شخص اپنے طبقے، اپنی انفرادیت اور موقع سے مناسب زبان بولتا ہے۔ ہر ڈھنگ کی بات چیت رقم ہوتی ہے اور بالکل اسی طرح جیسے ناولوں میں چاہئے ویسی نہیں جیسی داستانوں میں سب کی ایک ہی زبان ہوتی ہے انشا کی توجہ مختلف طبقوں اور پیشہ وروں کی زبان کی طرف بہت گہری تھی۔ ان کی اس سلسلے میں واقفیت ان کی تصنیف دریائے لطافت سے بھی ظاہر ہے۔ اس امر نے کہ عام زبان کے مختلف رنگ اور اس کی مختلف نوعیتیں ہیں اردو ناول نگاری پر گہرا اثر کیا یہ اثر بہت دور تک گیا اور اردو ناول نگاری کا سنگ بنیاد ثابت ہوا۔" (اردو ناول کی تنقیدی تاریخ۔ طبع دوم۔ ص ۱۳-۱۴)

مندرجہ تمام بیانات میں مختلف اوصاف کی طرف اشارے ہوئے جو کسی داستان کو ناول کا درجہ دلانے کے لئے کافی ہیں۔ کسی نے پلاٹ کے ربط و ترتیب کو، کسی نے زبان و بیان کو اور واقعہ نگاری کو، کسی نے تہذیب و معاشرت کی سچی عکاسی کو، کسی نے حقیقت نگاری اور ارضیت کو ناول کی خصوصیت قرار دیا ہے اور سب نقادوں نے رانی کیتکی میں مختلف عناصر ڈھونڈے ہیں اور انھیں سراہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ تمام عناصر رانی کیتکی کی کہانی میں موجود ہیں لیکن پھر بھی اسے اردو ناول کا نقش اول کہنا مشکل ہے۔ بالفرض اسے نقش اول مان بھی لیا جائے تو بھی اسے ناول کا سنگ بنیاد کہنا کسی طرح درست نہیں۔ اس لئے کہ ناول اپنے نام سمیت مغرب کی دین ہے۔ اردو ادب میں اس کے بانی کریم الدین ہوں، نذیر احمد ہوں یا سرشار، انگریزی زبان و ادب سے واقف تھے۔ انگریزی کے ناول دیکھ کر ہی انھیں اردو میں اس صنف کی ترویج کا خیال آیا ہوگا۔ ہمیں یہ ماننے میں تامل نہیں کہ رانی کیتکی میں ناول کی خصوصیات موجود ہیں لیکن اس حقیقت کو کیونکر فراموش کر دیا جائے کہ اردو ناول کے بانیوں کے سامنے نہ تو رانی کیتکی کی کہانی موجود تھی نہ انھوں نے اسے نمونہ بنایا۔

کردار نگاری اور مکالمہ نگاری

انشا کے عہد تک اردو قصہ گوئی میں کردار اور مکالمہ نگاری کی روایت نہیں ملتی بلکہ اردو میں قصہ گوئی کا وجود ہی مشکوک ہے۔ داستانوں میں کرداروں کی عظمت ان کے محیر العقول کارناموں پر منحصر ہوتی ہے داستان گو عام طور سے مکالمے کی عظمت و اہمیت سے ناواقف ہیں۔ بقول ڈاکٹر احسن فاروقی۔ مکالمہ نگاری ہی وہ خصوصیت ہے جسے اردو داستانوں سے ناول کی طرف پہلا قدم بلکہ سنگ بنیاد قرار دیا جاسکتا ہے۔ انشا پہلے شخص ہیں جنھوں نے دوسرے داستان نویسوں کے برعکس عام زبانوں کو طبقاتی اور انفرادی خصوصیات کے ساتھ رقم کیا۔ ان کا قول ہے کہ "رانی کیتکی کی کہانی میں" ہر شخص اپنے طبقے اپنی انفرادیت اور موقع سے مناسب زبان بولتا ہے۔ ہر ڈھنگ کی بات چیت رقم ہوتی ہے اور بالکل اسی طرح جیسی کہ ناول میں چاہئے ویسی نہیں جیسی کہ داستانوں میں سب کی ایک ہی زبان ہوتی ہے۔" مختلف کرداروں کی زبان سے جو مکالمے ادا ہوئے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ فطری ہیں بلکہ ہر کردار کے مخصوص مزاج اور اس کی ذہنی کیفیت سے مطابقت رکھتے ہیں۔ پوری کہانی میں بے شمار مکالمے ہیں اور ان میں بیشتر نہایت برجستہ اور ادبی حسن و لطافت کے حامل ہیں۔ البتہ کہیں کہیں مکالمے ضرورت سے زیادہ طویل ہوگئے ہیں جس سے کہانی کے روانی میں ٹھہراؤ کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ تاہم انشا کی اولیت کے پیش نظر اس سے چشم پوشی کرنی پڑے گی۔ اس کے علاوہ کہیں کہیں مزاح پیدا کرنے کی کوشش میں ان کی سنجیدگی میں فرق آگیا ہے جس سے بعض کرداروں کے وزن اور وقار کو ٹھیس پہنچتی ہے۔

اس کہانی کی ایک قابل ذکر خصوصیت اس کی کردار نگاری بھی ہے جس کو نہ جانے کیوں ہمارے بیشتر ناقدوں نے قابل اعتنا نہیں سمجھا جیسا کہ ذکر ہوچکا ہے داستانوں میں کرداروں کی عظمت، ان کے محیر العقول اور فوق البشری کارناموں میں ہوتی ہے۔ داستانوں کے کرداروں پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر قمر رئیس نے لکھا ہے۔

> "اچھائی اور برائی، نیکی اور بدی ہمیشہ ایک دوسرے سے متصادم رہے ہیں.... داستانوں میں نیکی اور بدی یا حق اور باطل کی اس کشمکش کا صرف خارجی روپ نظر آتا ہے۔ ہر داستان کے اشخاص کو ہم بڑی آسانی سے نیک اور بد میں تقسیم کرسکتے ہیں اور ان کی باہمی جنگ دراصل حق اور باطل کی جنگ ہوتی ہے داستان امیر حمزہ میں اسلام کا لشکر حق و صداقت کی عظیم طاقت ہے اور اس کے مقابلے میں جادوگروں اور طلسم سازوں کا گروہ بدی اور باطل کا محاذ ہے۔ آرائش محفل میں حاتم طائی انسانیت، محبت، مروت اور سخاوت جیسے اعلا اوصاف سے مسلح ہوکر بربریت، شقاوت، خود غرضی اور خونخواری کے مقابلہ میں حق کی فتح کے لئے نکلتا ہے۔" (ہماری داستانیں ایران کا ورثہ)

کم و بیش تمام داستانوں میں حق و باطل کی معرکہ آرائی یا پند و موعظت، جذبہ تسخیر و تبلیغ کا زور نظر آتا ہے۔ اس دور کی ہندی اردو دونوں زبانوں کی تصانیف میں اس عنصر کی فراوانی ہے۔ اس لحاظ سے ڈاکٹر محمد حسن کا یہ قول بجا ہے کہ،

> "انشا کی رانی کیتکی کی کہانی ان معنوں میں پہلی ادبی تصنیف کہی جاسکتی ہے جو نہ اخلاق و نصیحت کے لئے لکھی گئی ہے اور نہ مذہبی تبلیغ کے لئے۔" (ہندی ادب کی تاریخ۔ ص ۱۶۵)

انشا کے کردار نہ فرشتے ہیں نہ شیطان۔ اس لحاظ سے انشا قابل ستائش ہیں کہ انھوں نے کہانی کے مرکزی کرداروں کو فوق البشر قوتوں کا حامل نہیں بنایا اس کے لئے ان کے پاس جوگی مہندر گر اور راجا اندر جیسے کردار موجود ہیں بقول ڈاکٹر گیان چند:

> "یہاں دیو پری یا جادوگر نہیں محض ایک جوگی مہندر گر اور اس کے ساتھی ہیں۔ یہ لوگ فوق انسانی طاقتوں کے مالک ہیں اس کے باوجود فوق فطری عناصر کی طغیانی نہیں ہے۔"
>
> (اردو نثر کی داستانیں)

علاوہ ازیں انشا کے ہاں ہیرو پرستی کا وہ جذبہ نہیں ملتا جو داستان گویوں کی کمزوری رہا ہے اسی لئے ان کے کردار معمول ہونے کے باوجود ایک سادگی اور دلکشی کے حامل ہیں۔ ان کا خمیر ارضیت سے اٹھایا گیا ہے اس لئے ان کی کوتاہیاں ہمیں انسانی فطرت کی کمزوریاں اور کوتاہیاں لگتی ہیں ہم انھیں اپنے ہی جیسا انسان سمجھنے پر مجبور ہیں۔ اگرچہ انشا کی غیر سنجیدگی نے ان کی عظمت کو کسی حد تک نقصان پہنچایا ہے پھر بھی دو نسوانی کردار بڑی حد تک ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ یہ ہیں رانی کیتکی اور اس کی سہیلی مدن بان۔ رانی کیتکی کے کردار میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ وہ نیک ہے، معصوم ہے، اس میں جوانی کی شوخی اور چنچلتا بھی ہے

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

وارث کرمانی
دیوی شریف، بارہ بنکی

امیر خسرو (۱) فارسی غزل

خسرو سے پہلے فارسی غزل اپنے ابتدائی دور میں بھی سادہ، توانا اور بے تکلف، اس کی مکمل نمائندگی ہمیں شیخ سعدی کے یہاں مل جاتی ہے۔ ان کے یہاں غزل اپنے پورے قد و قامت اور جامہ زیبی کے ساتھ نظر آتی ہے اس میں شدت احساس، خلوص اور سچائی اس درجہ پر ہے کہ پڑھنے والے کا دل کانپ جاتا ہے اور آنکھ نم ہو جاتی ہے۔ سعدی خسرو کے پیش رو بھی تھے اور کسی قدر ہمعصر بھی۔ ان کا تعلق ایران کے فصیح ترین خطۂ فارس سے تھا اس لئے ان کے کلام کی چند مثالیں سامنے رکھ کر ہی خسرو کا اندازہ ہو سکے گا۔ پہلے اس غزل پر غور کیجئے۔

ای نفس خرّم باد صبا — از بر یار آمدہ ای مرحبا
قافلۂ شب چہ شنیدی ز صبح — مرغ سلیمان چہ خبر از سبا
بر سر خشم است ہنوز آن حریف — یا سخنی می رود اندر رضا
از در صلح آمدہ ای یا خلاف — با قدم خوف روم یا رجا
بار دگر گر بسر کوی دوست — بگذری ای پیک نسیم صبا
گو رمقی بیش نماند از ضعیف — چند کند صورت بیجان بقا
آن ہمہ دلداری و پیمان و عہد — نیک نکردی کہ نکردی وفا
دوست نباشد بحقیقت کہ او — دوست فراموش کند در بلا

ترجمہ

"اے باد صبا کے تر و تازہ جھونکے تجھ پر مرحبا کہ تو میرے معشوق کے پاس سے آیا ہے۔ اے رات کے قافلے والے تو نے صبح سے کیا سنا اور اے مرغ سلیمان تو شہر سبا سے کیا خبر لایا ہے۔ میرا معشوق مجھ سے خفا ہے یا موافقت کی بات چل رہی ہے (اے تازہ ہوا کے جھونکے) تو صلح کے دروازے سے آیا ہے یا مخالفت کے۔ میں خوف کی حالت میں جاؤں یا امید لے کر۔ اے نسیم تو اگر اب پھر دوست کی گلی میں جائے تو کہنا کہ اس ضعیف میں زندگی کی ایک رمق باقی رہ گئی ہے اور ایسی بے جان صورت کب تک زندہ رہ سکتی ہے۔ وہ دلداری اور عہد و پیماں تو بھلا دے یہ اچھا نہیں کیا۔ اگر کسی مصیبت زدہ دوست کو دوسرا دوست بھلا دے تو حقیقت میں وہ دوست نہیں ہے"۔

یہ غزل قدرے تفصیل سے اس لئے درج کی گئی ہے تاکہ خسرو کو جس قسم کی غزل ملی اس کا قارئین کو اندازہ ہو سکے اور وہ اس کی سادگی و معصومیت کو محسوس کر سکیں۔ سعدی کا ہی ایک اور شعر دیکھئے۔

دل و جانم بتو مشغول و نظر بر چپ و راست — تا نداند حریفان کہ تو منظور منی

ترجمہ: "میرا دل اور میری جان تجھ میں محو ہے لیکن میری نظر داہنے اور بائیں جانب لگی ہوئی ہے تاکہ حریف لوگ یہ نہ سمجھ پائیں کہ تو میرا منظور نظر ہے"۔

اس شعر میں اوپر دی ہوئی غزل کے برعکس سوز و گداز کے بجائے تھوڑی سی چالاکی ظاہر کی گئی ہے لیکن یہ چالاکی کتنی معصوم ہے۔ بہرحال سعدی کے جیسے عظیم شاعر کے یہاں شعری فکر محض دزدیدہ نگاہی یا ذہنی تلذذ تک محدود نہیں رہ سکتی تھی بلکہ ان کے سوز دروں سے دوسری شعاعیں بھی نکلتی تھیں اور یہ شعاعیں حیرت انگیز فاصلوں تک پہنچ گئیں۔

میں آج کی عرضداشت میں جس چیز کو سامنے لانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ خسرو کی عظمت نہ تصوف میں ہے نہ مابعد الطبیعاتی مضامین میں۔ خسرو کے زمانے تک سنائی، عطار اور رومی جیسے عظیم شاعر تصوف کی پوری پائیں

بلکہ قرآن در زبان پہلوی ہے[۳] تیار کر چکے تھے۔ اور اس کے بعد تصوف کے نام پر کسی شاعر کا عظیم یا غیر قانونی ہونا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ یہ جو جامی اور حافظ کو عظمت حاصل ہوئی وہ بھی خسرو کی طرح تصوف سے نہیں بلکہ دوسرے اسباب سے تھی۔ امیر خسرو کے دوسرے اسباب میں جانے سے پہلے انھیں تصوف کے دھندلکے سے نکالنا ضروری ہے کیونکہ اکثر ناقدین نے خسرو کو صوفی شاعر کہہ کر بزعم خود ان کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔

خسرو کے بارے میں اگر کچھ غلط فہمیاں یا خوش فہمیاں ہوں یا انھیں اسی قسم کی داد دی جا رہی ہو تو اسے برطرف کرنا راقم کے خیال میں ان کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔ خود فارسی شاعری کے پیغمبر سعدی کم و بیش اسی غلط فہمی کا شکار رہیں۔ ہندوستان کے بہت صوفیوں نے بقول پروفیسر نظامی[۴] اپنی تصنیفات میں سعدی کے اشعار درج کئے ہیں اور ان کو عرفان و تصوف کے حصول کا ذریعہ بتایا ہے۔ نظامی صاحب خود بھی سعدی کے عرفان اور تصوّف سے متاثر معلوم ہوتے ہیں جو اس معنی میں صحیح بھی ہے کہ ہر بڑا شاعر صوفی مشرب اور ولی صفت ہوتا ہے تاہم آخر میں وہ بھی اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہندوستان میں تصوف کے جذبات و احساسات، صوفیوں اور عارفوں کی ملفوظات یا ان کی معیاری کتابوں اور اخلاقی مقالوں سے کہیں زیادہ فارسی اشعار سے پیدا ہوتے تھے اور توانائی حاصل کرتے تھے۔ وہ اسے سعدی کی صوفیانہ ریاضت یا بزرگانہ کرامات کے بجائے ان کی شاعری سے منسوب کرتے ہیں اس رجحان کا نتیجہ یہ ہوا کہ سولہویں صدی سے اٹھارہویں صدی تک ہندوستان میں ہر شاعر صوفی مشرب بننا چاہتا تھا اور اپنے پیش روؤں کو بھی توڑ مروڑ کر صوفی شاعر بنانا چاہتا تھا۔ اس زمانے میں "تصوف برائے شعر گفتن خوب است" کی مثل بہت تھی لیکن تصوف اس زمانے تک آتے آتے پامال اور فرسودہ ہو چکا تھا بلکہ ہندوستان کے صف اول کے شعرا کے یہاں بھی تصوف کے دوسرے درجے کے شعر ملتے ہیں کیونکہ وہ تقلیدی کئے گئے تھے۔ امیر خسرو کے بعد ضیاء الدین بخشی، مسعود بک، مولانا حمید قلندر مطہر کڑا، مولانا جمالی کنبوہ، نسبتی تھانیسری، ناصر علی بیدل، سعد اللہ گلشن شاہ فقیر اللہ آفریں، چندر بھان برہمن، آنند رام مخلص، مرزا مظہر جان جاناں اور خواجہ میر درد پانچسو برس کے عرصہ پر پھیلے ہوئے ہیں اس میں بیدل کے علاوہ ایک بھی شاعر بارہویں اور تیرہویں صدی کے شاعروں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ہندوستان میں عام طور سے شعرا وحدت الوجود فلسفہ کے مضامین الفاظ بدل بدل کر بیان کرتے تھے جبکہ یہی موضوعات سنائی، عطار اور رومی کے یہاں کچھ اور ہی لطف رکھتے ہیں۔

میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ ہندوستان کی بیشتر شاعری میں تصوف فرسودہ شکل میں ملتا ہے کیونکہ تصوف کا عہد زریں دلی تک فارسی شاعری پہنچتے پہنچتے ختم ہو چکا تھا تاہم ہندوستان کے صوفی بزرگوں کے لئے ہم ایسا نہیں کہہ سکتے بلکہ اس کے برعکس ہے ان صوفی حضرات کی خانقاہوں میں تصوف نے جو بلند مدارج طے کئے اور اس کے ماننے والوں نے جو خدمت خلق انجام دی وہ تاریخ ہند ہی نہیں بلکہ تاریخ عالم کا ایک روشن باب ہے۔ شیخ علی حزیں، خواجہ معین الدین سنجری، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، شیخ فرید الدین گنج شکر، سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا اور ان کے سلسلے کے بہت سارے صوفی ایسے لوگ ہیں جن کے کارنامے بقائے دوام حاصل کر چکے ہیں اور جن پر ہم کیا سرزمین خراسان اور ماوراء النہر کو فخر ہونا چاہئے۔

بات ذرا اپنے محور سے ہٹ گئی ہے مجھے یہ کہنا تھا کہ فارسی غزل خسرو کو سعدی کے وسیلے سے بہت پاک و صاف ملی تھی کلام سعدی سے اس کی مثالیں دی جا چکی ہیں جس چیز کو بعض ناقدین نے خسرو کے تصوف سے تعبیر کیا ہے وہ عراقی اور بوعلی شاہ قلندر شرف جیسے مجذوب شاعروں کے اثرات کہے جا سکتے ہیں جو خسرو کے تقریباً ہمعصر تھے اور غزل کے مستند شاعر بھی تھے لیکن سعدی اور خسرو کے مقابلے پر ان میں مجذوبیت اور خود فراموشی زیادہ تھی۔ بوعلی شاہ قلندر کے دو شعر مثال میں درج کئے جاتے ہیں۔

من محو جمال او نمی دانم کجا رفتم   شدم غرق وصال او نمی دانم کجا رفتم[۵]

ترجمہ: میں اس کے جمال میں کھو گیا ہوں مجھے نہیں معلوم کہاں پہنچ گیا ہوں میں اس کے وصال میں غرق ہوں نہیں جانتا کہاں آ گیا ہوں۔

دوسرا شعر: جنبد از جا رفتہ بر سر افلاک برین
بشنود عرش اگر نعرۂ مستانہ ما[۶]

ترجمہ: عرش اگر میرا نعرۂ مستانہ سن لے تو اپنی جگہ سے ہل جائے اور بلند آسمانوں پر پھٹ پڑے۔

خسرو مزاجاً سعدی سے زیادہ قریب ہیں۔ خسرو اور حسن دونوں

بقول حضرت نصیر الدین چراغ دہلی سعدی کے رنگ میں شعر کہنے کی کوشش کرتے تھے ؎ اور سعدی کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ ان کے بہت سے اشعار عشق مجازی کے ہوتے ہوئے اپنے اندر اتنی کشادگی اور گہرائی رکھتے ہیں کہ ان کی تعبیر بلند تر روحانی مطالب سے کی جا سکتی ہے جیسے یہ شعر:

ای تماشا گاہ عالم روی تو — تو کجا بہر تماشا می روی [8]

ترجمہ: تیرا چہرہ تو تمام دنیا کے لیے تماشا گاہ تھا اب تو خود کس چیز کا تماشا دیکھنے جا رہا ہے۔

کہتے ہیں سلطان المشائخ کی وفات پر خسرو نے بے قرار ہو کر یہی شعر پڑھا تھا۔ یہاں جس چیز کی وضاحت مقصود ہے وہ یہ ہے کہ غزل میں روحانیت اور ماورائیت کا ہونا محض صوفی شاعروں کی خصوصیت نہیں ہوتی بلکہ ہر عظیم شاعر کی فکر میں ایسی لچک اور خیال افروزی پوشیدہ ہوتی ہے۔ سعدی کے بعد خسرو کو بھی میں اسی زمرے میں رکھنا چاہتا ہوں۔ یہ دونوں جذباتی تو تھے لیکن ان کے یہاں ضبط و تحمل بھی تھا جس سے ان کے کلام میں ایک خوشگوار توازن پیدا ہو گیا ہے۔ انگریزی میں آپ اسے refinement یا restraint یا Sense of proportion کہہ سکتے ہیں۔

حالی نے اسی صفت کو قوتِ متخیلہ پر قوتِ ممیزہ کی گرفت لکھا ہے فنکاری میں حسن اور کشش اسی توازن سے پیدا ہوتی ہے۔ تاج محل اسی وجہ سے خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ خسرو کے کلام کی خوبی اور اس کے دوام کا ایک بڑا سبب معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے دل کی تڑپ اور جذب و جنوں کو فنکاری کے اصولوں اور جمالیاتی تقاضوں کے باہر نہیں جانے دیا مثلاً اپنے عشق کا اظہار بھی انھوں نے کپڑے پھاڑ کر یا چیخ و پکار اور بعید از عقل باتوں سے نہیں کیا۔ شعری مثالوں سے بات زیادہ واضح ہو گی۔ ان کا بہت مشہور اور بہت اچھا شعر ہے۔

بلبم رسید جانم تو بیا کہ زندہ مانم — پس ازاں کہ من نمانم بچہ کار خواہی آمد [9]

ترجمہ: میری جان ہونٹوں پر پہنچ گئی ہے تو آ جا کہ زندہ رہ سکوں اس کے بعد جب میں زندہ نہ ہوں گا تو کس کام آئے گا۔

اب اس شعر کی خوبی دیکھیے حالت تو یہ ہے کہ جان ہونٹوں پر آ گئی ہے جب ہذیانی کیفیت طاری ہو سکتی ہے لیکن خسرو عقل کا دامن یہاں بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور معشوق کو بلانے کے لیے کتنا معقول پیرایۂ بیان اختیار کرتے ہیں۔ کہ جب میں ہی نہ رہوں گا تو تم کس کام آؤ گے۔ تمہارا سب سے بڑا مصرف تو اسی حال میں ہے اسی طرح معشوق کے حسن کو بیان کرنے میں مبالغہ کرنے کے بجائے ایسا نکتہ پیش کرتے ہیں کہ معشوق سارے حسینوں سے بڑھ بھی جائے اور کسی کو بات غلط بھی نہ معلوم ہو۔ شاعر کی بات پر ایمان بھی لے آئے شعر ملاحظہ کیجیے۔

آفاق را گردیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام — بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزی دیگری [10]

ترجمہ: میں نے تمام دنیا کی سیر کی بہت سے معشوقوں سے محبت کی بہت حسینوں کو دیکھا لیکن تو دوسری چیز ہے۔

اس شعر میں دیکھنا یہ ہے کہ کیا بات کہی ہے اور کیا بات بے کہے چھوڑ دی گئی ہے۔ کہہ یہ رہے ہیں کہ میں نے تمام دنیا کی سیر کی۔ بہت سے حسینوں سے واسطہ پڑا، بہتوں سے محبت بھی کی لیکن تجھ جیسا کسی کو نہ پایا۔ تعریف کی حد کر دی لیکن اب بھی یہ دیکھیے خسرو نے کیا نہیں کہا ہے کہ اے معشوق تو تمام حسینوں سے زیادہ حسین ہے بلکہ یہ کہہ رہے ہیں کہ تو سب سے مختلف ہے۔ اس دعوے کی کون تردید کر سکتا ہے۔ یہ بیان تو قانونی عدالت میں بھی دیا جا سکتا ہے۔ کوئی مخالف وکیل اسے جھوٹا نہیں ثابت کر سکتا تاہم خسرو نے ایک بیان واقعہ کو شعر میں ڈھال دیا ہے۔ سارے زمانے میں معشوق کی برتری اور اپنے حسنِ انتخاب کو ثابت کر دیا ہے۔ مولانا حالی نے اپنے مخصوص انداز میں اس شعر کی معنویت کو اور بھی نمایاں کیا ہے۔

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

خسرو پر کوئی مضمون حسن سجزی کی یاد دلائے بغیر نہیں لکھا جا سکتا۔ حسن کی غزل کئی اعتبار سے خسرو کی غزل سے زیادہ تابناک اور زیادہ دلسوزی اور سرشاری کی حامل ہے بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ گہری اور طویل دوستی کی وجہ سے خسرو کے حسن کے عاشقانہ مزاج اور جمالیاتی ذوق سے گہرا اثر قبول کیا ہو گا جس کے اکثر اشعار حسن کاری اور نغمہ ریزی میں خسرو کے آگے نکل جاتے ہیں مثالیں پیش ہیں۔

سر مرا چہ باشد اگر کہ سوئے دوستاں گذر کنی
بجز او ما نفسی زنی بہ نیاز ناظری کنی [11]

ترجمہ: اے میرے چاند کیا بگڑ جائے گا اگر کبھی دوستوں کی طرف بھی تم

گذر جاؤ ہمارے دل کے مطابق باتیں کرو اور ہماری حاجتوں اور خواہشوں پر ایک نظر ڈالو۔

شب من تیرہ گر برو تیرہ شد سوقعم زعنایتت
کہ نقاب بر فگنی ز رخ شب تیرہ را سحری کنی (۱۲)

جہاں تک عشق کی سرشاری و بیخودی کا تعلق ہے خسرو کا ہندوستان کا کوئی فارسی شاعر حسن پر سبقت نہیں لے جا سکتا۔ ان شعروں کی موجودگی و دل گرفتگی پر کیسے وجد نہ آئے گا۔

ای دوست ترا دارم ای دوست ترا جانم   شمع شب تاریکم گنج دل ویرانم (۱۳)

ترجمہ:۔ (اے جان سے زیادہ عزیز دوست میں تجھ سے محبت کرتا ہوں تو میری اندھیری راتوں کی شمع ہے اور میرے ویران دل کا خزانہ ہے)

خود نیست مرا قبلہ جز کعبۂ روی تو   گر روی بگردانی من قبلہ بگردانم (۱۴)

ترجمہ:۔ (میرا قبلہ تیرے چہرے کے کعبہ کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے اگر تو اپنا چہرہ پھیرے تو میں اپنا قبلہ بھی پھیر لوں گا۔)

ہم اہل مشرق تاریخی حقائق کو پڑھ کر داستانوں کی طرح لطف اندوز ہو لیتے ہیں۔ ان پر غور و فکر نہیں کرتے۔ حسن اور خسرو کے ساتھ ایسا ہی کچھ ہوا ہے۔ ہم نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ آخر شاعری کے ایسے جواہرات کے ساتھ حسن کو خسرو کا درجہ کیوں نہیں دیا گیا۔ یا اگر مجموعی شاعرانہ حیثیت سے نہیں تو کم از کم غزل گو کی حیثیت سے ہی انھیں فوقیت دی جاتی۔ ایسا نہیں کہ حسن کی غزل نے لوگوں کو متوجہ نہ کیا ہو۔ ان کے ڈیڑھ سو برس بعد بھی مولانا جامی خسرو کے ساتھ حسن کا نام لینا نہیں بھولتے اور وسط ایشیا میں ان کی عزت ہندوستان کے مقابلے پر آج بھی بہت زیادہ ہے تو پھر ان کے اپنے وطن ہندوستان نے خسرو کو اتنی بڑی کرسی کیوں دی ہے اور خسرو کو اپنے دل و دماغ پر کیوں طاری کر رکھا ہے۔ صدیوں پر صدیاں گذرتی چلی گئیں۔ آہن پوشوں فاتحوں نے اپنی اپنی سلطنتیں قائم کیں اور زمین کا پیوند ہو گئے نئے نئے نظام آئے اور مٹ گئے۔ محمود و تیمور اور نادر کا نام تاریخی کتابوں کے علاوہ اور کہیں باقی نہیں رہ گیا لیکن خسرو گھر گھر زندہ ہیں۔ ان کی بادشاہت کو گردش زمانہ ختم نہیں کر سکی۔ خانقاہوں کی محفل سماع میں، دانشگاہوں کے لیکچروں میں، اہل علم کی صحبتوں میں، بازار کی گفتگو میں، دیہات کے تہواروں میں کسانوں اور مزدوروں کی منطق میں، چھوٹے بچوں کے لیے نانی اماں کی کہانیوں میں خسرو کہاں نہیں ہیں۔ حافظ شیراز نے کیا خوب کہا ہے۔

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی   بجز بنائی محبت کہ خالی از خلل است (۱۵)

ترجمہ: (جس عمارت کو دیکھو اس میں مٹنے کے آثار نظر آتے ہیں بس ایک محبت کی عمارت ایسی ہے جو بے خلل ہے۔)

مسئلہ بڑا پر فریب ہے کیونکہ ظاہری اسباب و شواہد سب خسرو کے حق میں جاتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ خسرو کی شاعری کا کنوس حسن کی شاعری سے بڑا ہے جس میں ان کی تاریخی مثنویاں اور خمسۂ نظامی کا جواب بھی شامل ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ خسرو دربار شاہی اور خانقاہ دونوں سے وابستہ تھے جبکہ حسن بچارے صرف شیخ کی ملفوظات لکھا کرتے تھے۔ خسرو کی شخصیت بہت رنگا رنگ تھی موسیقی میں انھیں کمال حاصل تھا۔ ہندوؤں نے ان کی شاعری کو دیہات میں گھر گھر پہنچا دیا تھا اور مقبولیت بھی عطا کی تھی لیکن یہ سب باتیں خسرو کے بڑے فنکار ہونے پر تو دلالت کرتی ہیں بڑا غزل گو ہونے کا ثبوت پیش نہیں کرتیں جبکہ ہندوستان نے ان کو حسن کے مقابلے میں بڑا غزل گو بھی بنایا ہے بلکہ ہندوستان کی فارسی غزل کا بانی اگر کسی کو قرار دیا جا سکتا ہے تو وہ خسرو ہی ہیں حسن نہیں خود راقم نے اپنے ایک انگریزی مضمون کا عنوان Amir Khusrau the founder of Indo-Persian ghazal رکھا تھا (۱۶)۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ انڈو پرشین غزل کیا چیز ہے کیا یہ انڈو پرشین شاعر جیسی چیز ہے جسے خانۂ فرہنگ ایران دہلی نے پاسداران زبان فارسی در ہند کا خطاب دیا ہے یہ تو خالص جغرافیائی تاریخ ہو گئی جبکہ بات اتنی آسان اور سطحی نہیں ہے۔ اس بات کی تہہ میں جو نکتہ پوشیدہ ہے وہ یہ ہے کہ خسرو نے جس غزل کی بنیاد ڈالی تھی وہ اپنی گہرائی میں ہندوستانی تخلیق بن کر ایران سے علیحدہ حیثیت اختیار کر لی ہے اس میں ہندوستانی فضا اور اس کی دھرتی کی خوشبو پیدا ہو گئی ہے جبکہ فارسی غزل اس وقت اس خوبی سے عاری تھی۔ تقابل کے لئے معشوق کی جدائی کا پس منظر پیش کیا جاتا ہے جسے خسرو اور سعدی نے اپنے اپنے طور سے غزل میں بیان کیا ہے۔ سعدی کہتے ہیں۔

اے ساربان آہستہ ران کارام جانم می رود
وان دل کہ با خود داشتم با دلستانم می رود (۱۷)

ترجمہ:۔ اے ساربان اونٹ کو آہستہ چلا کیونکہ اس کی محمل میں میرا آرام جان جا رہا ہے اور وہ دل جو پہلے میرے پاس تھا میرے دلستاں کے ساتھ چلا جا رہا ہے۔

سعدی ایک ریگستان میں ناقہ معشوق کو آغاز سفر میں دکھلا رہے ہیں اور عاشق ساربان سے آہستہ آہستہ چلنے کی درخواست کر رہا ہے کیونکہ اس کا دل اسے چھوڑ کر محمل نشین معشوق کے ساتھ ہمسفر ہوا جا رہا ہے۔

اب خسرو کے معشوق کی جدائی کا منظر دیکھئے۔

ابری باردو من می شوم از یار جُدا　　چوں کنم دل بچنیں روز ز دلدار جدا

ترجمہ: ابر چھایا ہوا ہے پانی برس رہا ہے اور میں اپنے محبوب سے جدا ہو رہا ہوں۔ ایسے خوبصورت دن میں اپنے آپ کو دلدار سے کیسے جدا کروں

ابر باراں و من و یار ستادہ بوداع　　من جُدا گریہ کناں، ابر جدا یار جُدا [16]

ترجمہ: بارش ہو رہی ہے میں اور محبوب ایک دوسرے سے رخصت ہو رہے ہیں الگ رو رہا ہوں ابر الگ رو رہا ہے اور محبوب الگ رو رہا ہے۔

خسرو کے اشعار ساون کے مہینے میں ہندوستان کی تصویر پیش کرتے ہیں جب کالی کالی گھٹاؤں کے سائے میں ایک چاہنے والا اپنے محبوب سے رخصت ہو رہا ہے حالانکہ موسم ملاقات کے لئے اکسا رہا ہے۔ ٹھنڈی ہواؤں کے ساتھ ہلکی پھوار ہم آغوشی کی دعوت دے رہی ہے اور اس دعوت شوق کے پورا نہ ہونے پر عاشق الگ رو رہا ہے معشوق الگ رو رہا ہے اور ابر الگ آنسو بہا رہا ہے۔ خسرو کے ہاں ایسے اشعار بہت ملتے ہیں جو سعدی یا رومی یا عراقی کی شاعرانہ فکر سے گریز کر کے ہندوستانی رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ خسرو ہندوستانی مسلمان تھے لیکن غالب کی طرح اپنا رشتہ توازن یا افراسیاب سے جوڑنے کے بجائے اپنے وطن پر فخر کرتے تھے اقبال کی طرح ان کا بھی عقیدہ تھا۔ ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

خسرو نے ہندوستان کو روئے زمین کی جنت کہا ہے اور ثبوت میں سات دلیلیں اپنی مثنوی نہ سپہر میں پیش کی ہیں

کشور ہند است بہشتی بزمیں　　حجتش اینک بروی صفحہ ببیں

حجت ثابت کہ دراں نیست شکی　　ہفت بگویم بدرستی نہ یکی [19]

انھوں نے جس پیار اور محبت سے یہاں کے موسموں، پرندوں اور ملک کے مختلف حصوں کا ذکر کیا ہے جس تفصیل سے یہاں کی زندگی کے رنگ رنگ پر نظر ڈالی ہے جس تعلق خاطر سے یہاں کی مختلف قوموں مذہبوں اور پیشہ وروں کا استقبال کیا ہے کیا وہ انھیں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا معمار اعظم بنانے کے لئے کافی نہیں ہے اور اس مشترکہ تہذیب کے معمار کی غزل نے کیا آنے والی نسلوں کے پھولنے پھلنے کے لیے کچھ ذہنی اور روحانی غذا فراہم نہیں کی ہے۔

ہندوستان کی فارسی غزل کا ظرف اور اس کی پوری معنویت خسرو کی ان تمام شاعرانہ خصوصیات کے باوجود نامکمل رہتی ہے۔ اجازت دیجئے اس نکتہ کو حل کرنے کے لئے اپنے ایک سابق مضمون کا اقتباس پیش کروں۔

"یہ غزل ایک ایسی روایت کی حامل ہے جس کی نظیر شاید کسی اور زبان کے ادب میں نہیں ملتی۔ یہ روایت ہندوستان کے مخصوص تاریخی حالات اور طرز معاشرت یا جبر معاشرت کی پروردہ ہے جو برصغیر میں مسلمانوں کی عمل داری کے بعد رونما ہوئے اور جن کی شدت و تمازت ہندوستان والوں نے برداشت کی۔ ایران والوں کو اس کی کیا خبر کہ وہاں نہ شیخ و برہمن کی آویزش، نہ دیر و حرم کا جھگڑا، نہ مسلمان حاکم اور غیر مسلم آبادی کی کشمکش، نہ اتنا وسیع و عریض ملک جس میں قوموں، مذہبوں، زبانوں اور آب و ہوا کا فرق، معاشرہ میں تصادم و تلاطم کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ نہ علماء و فقہاء کی اتنی آمریت جو اسلامی مرکز سے دور افتادہ علاقے کے نیم واقف عوام پر بزور علم اور پھر بزور شمشیر عائد کی جاتی ہے۔ ان کے یہاں بات سیدھی اور براہ راست ہوتی تھی۔ اور غزل میں بھی عام طور سے ایک لفظ کے ایک معنی اور ایک شعر کا ایک ہی مفہوم لیا جاتا تھا۔ عجمی غزل میں ہندوستانی روایت کی آمیزش کے بعد اس میں ایک مخصوص رمزیت اور پیچیدہ بیانی پیدا ہو گئی جس کی بنا پر ایران والے ہماری فارسی غزل کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔ اور اسے سبک ہندی کا نام دے کر بیگانہ روش قرار دے چکے ہیں" [21]

خسرو نے جس روایت کی بنیاد ڈالی وہ غزل کے ایرانی اور تورانی مفہوم سے تجاوز کر کے ہندوستان کے مختلف النوع سماجی و سیاسی محرکات کے زیر اثر قوس قزح کی طرح متعدد رنگ پیدا کرنے کا رجحان رکھتی ہے۔ بظاہر تو وہ حسن و عشق کی واردات پر مبنی ہے لیکن اس کا بیان اس موضوع کے باہر

بعض حقائق کی عکاسی اور بعض محسوسات کی نشاندہی کرنا معلوم ہوتا ہے۔ آپ خسرو کے اس شعر پر غور فرمائیں۔

می‌نشست خون خلق کہ ہمی خوری دمادم   مخور ایں قدح کہ فردا بخمار خواہی آمد ۲۱

ترجمہ: خسرو کہتے ہیں۔ تو ہر وقت پبلک کا خون شراب کی طرح پیتا رہتا ہے ایسا نہ کر ورنہ ایک دن اس کا انجام تجھ کو بھگتنا پڑے گا۔ غزل کا شعر ہے تخاطب بظاہر محبوب سے ہے لیکن کیا یہ شعر اس زمانے کے کسی حاکم یا ظالم و جابر عہدیدار پر صادق نہیں آتا۔ رسمی طور سے عاشقانہ ہوتے ہوئے کیا ہم اسے خسرو کے محبت بھرے اشعار میں شامل کر سکتے ہیں جیسے ابری بارد و من می‌شوم از یار جدا والی غزل کے اشعار یا مثال کے طور پر ایک اور شعر۔

رسید باد صبا تازہ کرد جان مرا   نہفتہ داد بمن بوی دلستان مرا ۲۲

ترجمہ: باد صبا کے جھونکے نے اتنے چپکے سے میرے دلدار کی خوشبو مجھ تک پہنچائی کہ دماغ معطر ہو گیا اور روح تازہ ہو گئی۔ ملاحظہ کیجئے۔ کہاں وہ خونخوار اور عبرت انگیز شعر اور کہاں یہ شبنم و گل کی طرح نرم و نازک انداز۔ ایسا لگتا ہے کہ خسرو نے اپنے زمانے کی ناپسندیدہ اور جابرانہ روش کے خلاف آواز بلند کرنے کے لئے اپنی غزل کو استعمال کیا ہے۔ خسرو چونکہ عوام سے ہمدردی رکھتے تھے۔ اپنے پیر و شیخ کے بھی چہیتے اور وفادار مرید تھے اور دربار شاہی سے بھی تعلق تھا۔ یہ تھی وہ صورتحال جس نے انھیں رمز و ایما کی زبان اختیار کرنے پر مجبور کیا ہوگا اور غزل سے بہتر یہ کام کس صنف سخن سے پورا ہو سکتا تھا کیونکہ معشوق کو ستمگر کہنے میں بجانے کتنے ستمگروں کی قلعی کھلتی ہوگی۔ آپ ان اشعار کو اس تاریخی پس منظر میں رکھیں تو ان کے پورے معنی سمجھ میں آجائیں گے۔

من ندیدم چون تو ہرگز دلبری   سرکشی عاشق کشی غارتگری ۲۳

ترجمہ: میں نے تجھ جیسا معشوق ہرگز نہیں دیکھا جو سرکش بھی ہو عاشقوں کو مار ڈالنے والا بھی ہو اور غارت و برباد کرنے والا ہو۔

ملک دل کردی خراب از تیغ ناز   و اندریں ویرانہ سلطانی ہنوز ۲۴

ترجمہ: تونے ملک کو اپنی ناز و ادا کی تلوار سے تباہ و برباد کر دیا ہے اور پھر بھی اس ویرانے کا بادشاہ بنا بیٹھا ہے۔ خسرو کی اس رمزیت نے آگے چل کر مغل عہد میں زیادہ گہرائی اور پیچیدگی اختیار کر لی۔

اس زمانے کا عظیم شاعر نظیری سماجی و سیاسی خطرات سے بھاگ کر احمد آباد گجرات کے دور دراز شہر میں سکونت پذیر ہو گیا تھا وہ سمجھتا تھا۔

بند بجان پر و بالش سر و منقار   مرغی کہ بلند از ہر این شاخ نوا کرد ۲۵

ترجمہ: اگر کسی چڑیا نے اس شاخ سے اپنی آواز بلند کی تو اس کے پر و بال کاٹنے کے بجائے چونچ اور سر کو کاٹ دیا جاتا ہے۔

مرزا غالب اپنے مخصوص فلسفیانہ انداز میں اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہیں۔

آں راز کہ در سینہ نہانست نہ وعظ است   بر دار تواں گفت و بہ منبر نتواں گفت ۲۶

ترجمہ: وہ راز جو میرے سینے میں پوشیدہ ہے وعظ نہیں ہے جسے منبر پر مولوی لوگ بیان کرتے ہیں اس راز کو صرف پھانسی کے تختے ہی پر بیان کیا جا سکتا ہے۔)

ہندوستان کی فارسی غزل کی اس رمزیت و روایت کی ہمہ گیری نے ہر دور میں شاعروں کو ظلم و ستم کے خلاف آواز بلند کرنے اور کلمۂ حق کے ادا کرنے کا حوصلہ اور سلیقہ عطا کیا۔ غزل جیسی حسین اور دلکش صنف سخن وقت پڑنے پر شاعروں کے ہاتھ میں شاخ گل کے بجائے تلوار بن گئی جس کی کاٹ سے بڑے سے بڑا حکمراں تھرا جاتا تھا۔

چونکہ میں اردو کو بھی فارسی کی طرح عجمی روایت کا پروردہ سمجھتا ہوں اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تقریباً چھ سات سو برس کی ہندوستانی غزل امیر خسرو کے ڈالے ہوئے راستے پہ گامزن رہی ہے اور ابھی تھوڑا عرصہ پہلے جب غالب ہند میں آکر چیخنے لگے تھے۔

چھوڑوں گا میں نہ اس بت کافر کا پوجنا   چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

تو یہ صدا و اصرار خسرو کے آئین سخن کے عین مطابق معلوم ہوتا ہے اور انہیں کے شعر کی آواز بازگشت معلوم ہوتی ہے۔

خلق می‌گوید کہ خسرو بت پرستی می‌کند   آری آری می‌کنم با خلق ما را کار نیست

ترجمہ: (دنیا کہتی ہے خسرو بت پرستی کرتا ہے۔ ہاں ہاں میں کرتا ہوں مجھے دنیا سے سروکار نہیں ہے)

ہمارے وطن کی سرزمین نے فارسی کے کئی جلیل القدر شاعر پیدا کئے فیضی، بیدل، غالب اور اقبال نے ساری دنیا سے خراج تحسین وصول کیا ان شاعروں کی فکری عظمت سے کسے انکار ہو سکتا ہے لیکن کیا یہ عظیم شاعر ہندوستان کی رگ و پے میں امیر خسرو کی طرح سرایت ہو سکے ہیں۔ سوال خطرناک بھی ہے اور مشکل بھی سوچ کر جواب دیجئے گا۔ میں اب کچھ

نہ کہوں گا۔

حواشی

(۱) کلیات شیخ سعدی با تصحیح محمد علی فروغی تہران ۱۳۳۸ شمسی۔ صفحہ ۵۱۹ (۲) ایضاً صفحہ ۶۸۲۔

(۳) جامی مولانا روم کی تعریف میں کہتے ہیں

من چہ گویم وصف آں عالیجناب — نیست پیغمبر ولی دارد کتاب
مثنوی مولوی معنوی — ہست قرآں در زبان پہلوی

(۴) خلیق احمد نظامی Persan Influence on the Development of Literary and Sufi Traditions in South Asia. The foundation of Iranian Studies U.S.A., 1992, Page 25, 26

(۵) دیوان بو علی شاہ قلندر شرف صفحہ ۳۲، ۳۳۔ (۶) ایضاً صفحہ ۲

(۷) خلیق احمد نظامی Persian Influence صفحہ ۲۵

(۸) یہ شعر سعدی سے منسوب ہے غزل بھی کلیات میں موجود ہے لیکن یہ شعر اس میں نہیں ملا۔ دیکھئے کلیات سعدی صفحہ ۶۱۱۔

(۹) دیوان امیر خسرو لکھنؤ ۱۹۶۷ء صفحہ ۳۶۷۔ (۱۰) ایضاً صفحہ ۴۸۸

(۱۱) کلیات حسن سنجری حیدرآباد ۱۳۵۲ھ صفحہ ۳۸۴ (۱۲) ایضاً ص ۳۴۴

(۱۳) ایضاً صفحہ ۲۵۷ (۱۴) ایضاً صفحہ ۲۵۷

(۱۵) دیوان حافظ بہ اہتمام ڈاکٹر نذیر احمد و ڈاکٹر نائینی۔ شمارہ ۲۔ سازمان امور فرہنگی و کتابخانہا صفحہ ۹، فٹ نوٹ (۱۶) مطبوعہ انڈو امریکہ کلکتہ

(۱۷) کلیات شیخ سعدی صفحہ ۵۹۰ (۱۸) دیوان امیر خسرو دہلوی لکھنؤ ۱۹۶۷ء صفحہ ۵۱ (۱۹) امیر خسرو مثنوی نہ سپہر کلکتہ ۱۹۴۹ء ص ۵۷، ۱۵۱

(۲۰) وارث کرمانی۔ افکار و انشار علی گڑھ صفحہ ۷۹۔

(۲۱) دیوان امیر خسرو دہلوی لکھنؤ ۱۹۶۷ ص ۲۹۷ (۲۲) ایضاً ص ۸۹

(۲۳) ایضاً ص ۹۰۵۔ (۲۴) ایضاً ص ۵۵۷

(۲۵) نظیری کا شعر۔ اقتباس از افکار و انشار ص ۸۸

(۲۶) کلیات فارسی غالب لکھنؤ ۱۹۶۸ء ص ۸۰

رانی کیتکی کی کہانی ... صفحہ ۱۱ کا بقیہ

زیرک اور ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں وفا کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اس کردار پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں:

"رانی کیتکی کا کردار شاہکار ہے۔ وہ پہاڑی دوشیزاؤں کی طرح اتنی صاف اور معصوم ہے کہ اپنے جی کی بات ہمیشہ بغیر کسی پیچ و خم کے ادا کر دیتی ہے"

مدن بان کا کردار کیتکی سے بھی زیادہ دلکش زیادہ جاندار اور زیادہ فعال ہے وہ نہ صرف کیتکی کے ہر راز سے واقف ہے بلکہ اس کی مشیر و صلاح کار بھی ہے۔ کیتکی جب کوئی قدم اٹھاتی ہے مدن بان کو اس میں شریک کر لیتی ہے۔ وہ کیتکی کی ہم سن ہے لیکن اس سے زیادہ چنچل، زیادہ بے باک اور زیادہ باعمل ہے۔ وہ جذبات رکھتے ہوئے بھی جذبات سے الگ رہ کر سوچ سکتی ہے اور راہ عمل کے صحیح انتخاب کا ادراک رکھتی ہے اس کے جوان کندھوں پر بوڑھا سر ہے۔ غرض اس کردار میں انشا نے تمام عمل اور وسعت بھر دی ہے۔ رانی کیتکی کے قصے میں آج کے ذہن کے لئے کچھ ایسی دلکشی نہیں جو دل پر نقش ہو جائے لیکن کیتکی اور مدن بان کے کرداروں میں اتنی دلکشی اور کشش ہے کہ قاری انھیں آسانی سے نہیں بھول سکتا۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے سرشار کے فسانۂ آزاد پر لکھتے ہوئے ایک مضمون لکھا ہے کہ سرشار نے ناول نگاروں کے لئے ایک اہم درس چھوڑا یعنی ہر اچھے ناول کے ساتھ ایک اچھے کردار کی تخلیق۔ حقیقت یہ ہے کہ انشا سرشار سے بہت پہلے یہ درس چھوڑ گئے تھے لیکن ان کی سعی ناشکور رہی کیونکہ رانی کیتکی کو کسی نے نمونہ نہیں بنایا۔

مختصر یہ کہ اس چھوٹی سی کہانی میں وہ تمام عناصر موجود ہیں جو کسی ناول میں ہونے چاہئیں اس کے باوجود ہم اسے ناول نہیں کہہ سکتے۔ یہ داستان ہے لیکن داستانوں سے مختلف۔ یہ ناول نہیں لیکن ناول کی خصوصیات کی حامل ہے۔ اگر اس کی پیروی کی جاتی تو ممکن تھا کہ ہم صنف ناول کے لئے مغرب کے محتاج نہ رہتے لیکن اس کے لئے صنعتی دور کی کشمکش اور آویزش بہرحال ضروری تھی جو غلبۂ مغرب سے پہلے ممکن نہ تھی۔

غزل

دل میں خودی کا پاس رکھ دے
نہیں مجبور، یہ احساس رکھ دے

فرشتوں کو تری جنت مبارک
مرے حصے میں تو بن باس رکھ دے

اندھیرا بخش کر اتنا کرم کر
نظر میں روشنی کی آس رکھ دے

تو مرے ضبط کا بھی امتحاں لے
ندی کے پاس میری پیاس رکھ دے

بہار آئی ہے کھل اٹھے گا سب کچھ
یہ کانٹے بھی گلوں کے پاس لا رکھ دے

صراحی، جام، دینا، زہر تریاق
یہ سب کچھ آج میرے پاس رکھ دے

یہ چوب نے جگا سکتی ہے جادو
کوئی اس میں مرے انفاس رکھ دے

مصور! ہاں مری تصویر ہے یہ
پر اس کا نام 'غم کی پیاس' رکھ دے

محبت میں نئی لذت کی خاطر
رقابت کا بھی کچھ احساس رکھ دے

—— رفعت سروش

اے ۸۰، سیکٹر ۲۶
نوئیڈا ۲۰۱۳۰۱

[illegible]

اب تو گیہوں نہ دھان بوتے ہیں
اپنی قسمت کسان بوتے ہیں

بھوک کی چیونٹیوں کی راہوں میں
کچھ بھکاری پسان بوتے ہیں

دھوپ ہی دھوپ جن کی کھیتی تھی
اب وہی سائبان بوتے ہیں

پودے شیشے کے اگنے لگتے ہیں
کھیت میں جب چٹان بوتے ہیں

گاؤں کی کھیتیاں اجاڑ کے ہم
شہر جا کر مکان بوتے ہیں

تیر ترکش سے جب نہیں اگتے
لوگ زہ بر کمان بوتے ہیں

اب اجالوں کی چوٹیوں پہ نہ جا
تیرے سائے ڈھلان بوتے ہیں

فصل تحصیل کاٹ لیتی ہے
ہم مسلسل لگان بوتے ہیں

اب حرم میں نماز اگتے نہ اگے
ہم فضا میں اذان بوتے ہیں

رت کے آنسو زمین پر بیکل
ان دنوں آسمان بوتے ہیں

[illegible]

ڈاکٹر آصفہ زمانی
ریڈر شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی
لکھنؤ

فارسی ضرب الامثال

اردو زبان و ادب اور ہماری روزمرہ گفتگو

اس میں دو رائے نہیں کہ اردو کا تمام تر شعری سرمایہ خواہ وہ غزل ہو یا مثنوی، قصیدہ ہو یا رباعی اور کسی حد تک اردو مرثیہ بھی فارسی سے متاثر ہے غزل کی تو تمام تر فضا ہی فارسی سے مستعار ہے حتیٰ کہ اردو کا عروض و بیان بھی فارسی کا رہینِ منت ہے۔

فارسی ہندوستان میں تقریباً چھ سو سال تک پھلتی پھولتی رہی مغلوں کا زمانہ (۹۳۲ھ تا ۱۲۷۵ھ) فارسی کے عروج و ارتقاء کے لئے بہت سازگار ثابت ہوا۔ خصوصاً اکبر کا زمانہ (۹۶۳ھ ۱۰۱۴ھ) نہ صرف فارسی ادب کے لحاظ سے انتہائی بار آور زمانہ رہا ہے بلکہ یہی وہ دور ہے جب فارسی کی جڑیں ہندو کائستھ گھرانوں میں بھی مستحکم و استوار ہوئیں۔

آخری مغل حکمراں بہادر شاہ ظفر (۱۲۵۳ھ - ۱۲۷۵ھ) ہی کے زمانے سے اگرچہ فارسی زبان و ادب کا انحطاط شروع ہو چکا تھا اور اردو نے اس کی جگہ حاصل کر لی تھی تاہم ابھی بھی فارسی میں اتنا دم خم باقی تھا کہ غالبؔ جیسے عظیم اردو کے شاعر بھی ہمیشہ اپنی فارسی دانی ہی پر فخر کرتے رہے اور یہی کہتے رہے۔ ؎

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ منست

وہ زبان و ادب، جو کسی ملک میں چھ سو سال تک نشو و نما پاتا رہا ہو اور جس نے پوری ایک تہذیب کو جنم دیا ہو یقیناً وہ ادب دور رس اور دیرپا اثرات کا حامل ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ فارسی کے ہمارے تمام تر شعبہ ہائے زندگی میں آج بھی محسوس کئے جا سکتے ہیں۔

ہندوستان میں فارسی کی تخم ریزی دسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں سبکتگین کے زمانے سے وابستہ ہے جبکہ اس سے کہیں پہلے عربی زبان و ادب کا اثر و نفوذ آٹھویں صدی عیسوی میں صوبہ سندھ پر محمد بن قاسم کے حملے کے ساتھ اپنی جڑیں مستحکم کر چکا تھا لیکن آپ غور فرما لیجئے کہ آج بھی ہماری روزمرہ گفتگو میں عربی الفاظ "صوم و صلوٰۃ" کے بجائے فارسی الفاظ "روزہ و نماز" ہی مستعمل ہیں۔ اسی طرح ہندوستان میں برطانوی حکومت کے ۲سو سالہ تسلط کے باوجود اور بہت حد تک ہماری زندگی کے انگریزی آداب و رسوم کے زیر اثر ہونے کے بعد بھی ہماری زبان سے آج بھی بجائے انگریزی کے بیشتر فارسی ہی کے الفاظ ادا ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی معالج کے پاس ہم اپنا حال کہنے جاتے ہیں تو ہم خواہ کتنے ہی انگریزی داں کیوں نہ ہوں یہ کبھی نہیں کہتے کہ "ہمارا ہیڈک کر رہا ہے" بلکہ ہم کہتے ہیں "ہمارے سر میں درد ہے" یہاں "سر" اور "درد" دونوں ہی الفاظ فارسی کے ہیں۔

اسی طرح ایک نظر ذرا اپنی روزمرہ کی زندگی پر ڈالئے ہماری نشست و برخاست پر کس طرح آج بھی فارسی الفاظ حاوی ہیں جن کو ہم کوشش کے باوجود بھی اپنی زندگی سے خارج نہیں کر سکتے۔

مثال کے طور پر ہم اپنے ناموں پر غور کریں تو مسلمان ہی کیا کتنے غیر مسلم نام آج بھی ایسے ہیں جو اصلاً فارسی ہیں مثلاً بیدار بخت، شیر جنگ لال بہادر، اقبال سنگھ وغیرہ۔ ہمارے جسم کے اعضا کے نام بیشتر فارسی ہیں جو ہندوستان کی مختلف زبانوں میں آج بھی اسی طرح مستعمل ہیں مثلاً خون، دل، جگر، گردن، کمر، سر، زبان وغیرہ۔ کھانے پینے کی اشیاء کی طرف نظر دوڑائیے تو قورمہ، بریانی، پلاؤ، زردہ، قیمہ، کوفتہ، شیرمال تمام الفاظ فارسی ہی تو ہیں۔ پھلوں اور میووں میں انگور، انار، امرود، ناشپاتی، تربوز، کشمش، خربوزہ، شہتوت یہ تمام الفاظ فارسی ہی ہیں۔ ظروف میں لگن، دست پناہ، کفگیر، سینی، گلدان، پاندان، اگالدان وغیرہ فارسی ہی کے الفاظ ہیں۔

کپڑوں میں پائجامہ، شلوار، قمیص، ازار بند، موزا، جیب، لحاف وغیرہ سب فارسی الفاظ ہیں۔ زیورات میں گلوبند، دست بند، پازیب، طوق وغیرہ فارسی ہی الفاظ ہیں یہاں تک کہ ہمارے محلے اور شہروں کے ناموں میں بھی فارسی کا ہی عمل دخل ہے یہ نام عموماً آباد، گنج یا پور۔ پر ختم ہوتے ہیں مثلاً الہ آباد، محمود آباد حیدر آباد، ملیح آباد، یحییٰ گنج، گولہ گنج، حضرت گنج، کانپور، شاہ جہانپور رجے پور اُدے پور وغیرہ۔ جانوروں میں شیر، بلبل، فاختہ، کبوتر، شاہین، مرغ وغیرہ سبھی الفاظ فارسی ہیں۔ عدالتی کاموں میں آج بھی تحصیلدار، ضلعدار، مختار، ترق امین، جرح، وکیل، دیوانی، الزام، سزا، جرمانہ، گواہ، گواہی تمام الفاظ فارسی ہی کے استعمال کیے جاتے ہیں۔ لکھنے پڑھنے کے الفاظ مثلاً کتاب کاغذ قلم، دوات، ورق، کتابت وغیرہ فارسی الفاظ ہیں۔ یہاں تک کہ ہم کسی کو سرزنش بھی کرتے ہیں تو اس میں اکثر الفاظ فارسی ہی کے ہوتے ہیں۔ مثلاً حرام زادہ، کمینہ بے شرم، بدمعاش، نالائق، بیہودہ، بیوقوف وغیرہ۔

یہی حال فارسی ضرب الامثال کا بھی ہے کتنے ہی محاورے اور امثال ایسے ہیں جو آج بھی ہماری روزمرہ گفتگو کا جزو ہیں۔ انیسویں صدی کی ابتدا تک اردو زبان و ادب میں تقریباً ڈیڑھ دو ہزار ضرب الامثال ایسے مستعمل تھے جو خالص فارسی تھے۔ لیکن اب جوں جوں اردو کا رجحان و اثر کم ہوتا جا رہا ہے فارسی کے الفاظ و محاورات اور ضرب الامثال کا چلن بھی ظاہر ہے اسی مناسبت سے خاصا کم ہو گیا ہے پھر بھی دو ڈھائی سو ضرب الامثال یقیناً اب بھی ایسے ہیں جو آج بھی ہماری روزمرہ کی زندگی میں بولے اور سمجھے جاتے ہیں اس میں مسلم و غیر مسلم حتیٰ کہ تعلیم یافتہ وغیر تعلیم یافتہ اشخاص کا کوئی تخصص نہیں۔ ہم یہاں پہلے وہی فرہنگ پیش کرنا چاہتے ہیں جو عموماً زبان زد خاص و عام ہیں مثلاً۔

۱۔ جب ہم کسی دوسرے شخص کا قول نقل کرتے ہیں تو عموماً "بقول شخصے" استعمال کرتے ہیں۔

۲۔ نظر بد نہ لگے اس کے لئے کون ہے جو "چشم بد دور" نہ کہتا ہو۔

۳۔ جب کوئی شخص کسی شخص کی کسی سخت بات کا سخت جواب دیتا ہے تو ہم فوراً کہہ اٹھتے ہیں۔ کیا "ترکی بہ ترکی" جواب دے رہے ہو۔

۴۔ اس میں کیا شک ہے کی جگہ۔ "دریں چہ شک" ہم عموماً ہی بولتے ہیں

۵۔ کوئی شخص کسی مصیبت میں مبتلا ہو آپ اس کی حالت پوچھ بیٹھیں تو وہ فارسی ہی فقرہ بولے گا کہے گا۔ ارے کیا بتاؤں "بس زندہ در گور ہیں"

۶۔ اکثر لوگ کسی واقعہ کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے ہی واویلا مچانا شروع کر دیتے ہیں اس وقت ہم کہتے ہیں "قبل از مرگ واویلا"

۷۔ جو شخص خود سری پر آمادہ نظر آئے تو ہم کہتے ہیں ارے اس کا کیا کہنا وہ تو "شتر بے مہار" ہے۔

۸۔ کوئی ہو کی جگہ فارسی کلمہ "کسی باشد" کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔

۹۔ ہم اکثر لوگوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ کوئی چیز اچھی بھی ہو اور کم قیمت بھی تو بات ہے اس کے لئے ہم فارسی کا یہ فقرہ بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ "کم خرچ بالا نشین"۔

۱۰۔ نیک کام کا نیک بدلہ ملتا ہے۔ فارسی میں کہتے ہیں "نیکی نیک راہ بدی پیش راہ"

۱۱۔ جو کام اپنی ابتدائی حالت میں ہوتا ہے اس کے لئے ہم کہتے ہیں۔ "ہنوز روز اول"

۱۲۔ جب کوئی چیز کم ہو اور اس کی ضرورت زیادہ لوگوں کو ہو تو فارسی کا یہ قول استعمال کرتے ہیں۔ "یک انار و صد بیمار"

۱۳۔ جب دو لوگوں میں بے حد محبت ہوتی ہے تو اپنے لوگوں کو کہتے سنا ہوگا بھئی وہ تو "ایک جان دو قالب" ہیں۔

۱۴۔ "یک نہ شد دو شد" اس موقع پر بولتے ہیں جب یہ کہنا مقصود ہو کہ ایک بات تو تھی ہی دوسری بھی پیدا ہو گئی۔

۱۵۔ "یک سر ہزار سودا" کہہ کر فکروں کی کثرت کا اظہار کرنا ہوتا ہے۔

۱۶۔ جو شخص اپنے فن سے کما حقہ آگاہی نہ رکھتا ہو اس سے خطرناک غلطی سرزد ہونے کا اندیشہ لاحق ہوتا ہے اس کے لئے فارسی کی مثل ہے "نیم حکیم خطرۂ جان نیم ملا خطرۂ ایمان"

۱۷۔ نیکی کر کنویں میں ڈال۔ اس کے لئے فارسی کی ضرب المثل ہے "نیکی کن و بدریا انداز"

۱۸۔ اکثر لوگ بجائے احسان ماننے کے الٹے شکایت کر بیٹھتے ہیں اس وقت کہتے ہیں۔ "نیکی برباد گنہ لازم"

۱۹۔ نوبت یہاں تک پہونچی۔ اس کے لئے فارسی میں کہتے ہیں "نوبت بہ ایں جا رسید"

۲۰۔ بہت جلد مٹ جانے والی چیز کے لئے "نقش برآب" استعمال کرتے ہیں۔

۲۱۔ اکثر طنزیہ جملہ کے طور پہ کہتے ہیں جناب میں آپ کو خوب پہچانتا ہوں فارسی میں اسے یوں ادا کرتے ہیں۔ "من خوب می شناسم پیران پارسا را"

۲۲۔ کوئی مشکل ایسی نہیں جو آسان نہ ہو جائے اس کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ "مشکلے نیست کہ آسان نہ شود"۔

۲۳۔ اگر کوئی مصیبت ایک سے زیادہ لوگوں پر آ پڑے تو وہ بھی علاحدہ ہی لطف رکھتی ہے اس کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ "مرگ انبوہ جشنی دارد"۔

۲۴۔ مجبور کے ساتھ صاحب اختیار جو چاہے سلوک کرے اس وقت یہ فقرہ بولتے ہیں۔ "مردہ بدست زندہ"۔

۲۵۔ غریب بے بس آدمی کسی دوسرے کا تو کچھ بگاڑ نہیں پاتا بس اپنا غصہ اپنے ہی اوپر اتار لیتا ہے۔ اس وقت کہتے ہیں "قہر درویش بجان درویش"

۲۶۔ جب یہ کہنا مقصود ہو کہ اگر انسان ہمت کرے تو خدا بھی مدد کرتا ہے اس وقت ہم کہتے ہیں "ہمت مرداں مدد خدا"

۲۷۔ تھوڑا تھوڑا بہت ہوتا ہے۔ فارسی کی مثل ہے "قطرہ قطرہ دریا می شود"

۲۸۔ موتی کی قدر بادشاہ جانتا ہے یا جوہری۔ یعنی کسی چیز کی قدر وہی کر سکتا ہے جو اس کی خوبیوں سے واقف ہو اس وقت ہم کہتے ہیں۔ "قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری"

۲۹۔ سنی ہوئی بات دیکھی بات کی طرح نہیں ہوتی اس کے لئے بیشتر استعمال ہوتا ہے "شنیدہ کی بود مانند دیدہ"

۳۰۔ جب کوئی سخت مصیبت آن پڑتی ہے تو اس وقت ہم کہتے ہیں "تنگ آمد وسخت آمد"

۳۱۔ جب کسی کے سامنے کوئی بات بہت تفصیل سے بیان کی جاتی ہے اور اسے پھر بھی وہ نہیں سمجھتا اور پوچھتا ہے اچھا تو پھر کیا ہوا تو ہم کہتے ہیں ساری داستان کہہ سنائی یہ بھی نہ سمجھے کہ سیتا عورت تھی یا مرد۔ فارسی میں اسے یوں کہتے ہیں۔ "زلیخا زن بود یا مرد"

۳۲۔ خلقت کی زبان کو نقارۂ خدا مانا گیا ہے اسے بھی تو ہم فارسی ہی میں ادا کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔ "زبان خلق نقارۂ خدا"

۳۳۔ اس بات پر تو سبھی متفق ہیں کہ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے اس کو یوں کہتے ہیں۔ "رضائے مولا از ہمہ اولیٰ"۔

۳۵۔ جب ہم کسی سے کوئی بہت رازداری کی بات کرتے ہیں تو اس کے کان میں جھک کر فارسی زبان میں کیا کہہ گذرتے ہیں۔ "دیوار ہم گوش دارد" (دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں)۔

۳۶۔ اکثر ہم اپنے مہمان سے بے تکلف ہو کر کھانا کھانے کو کہتے ہیں تو یہی تو کہتے ہیں۔ "دست خود دہان خود"

۳۶۔ جب کسی بات کے سچ یا جھوٹ ہونے میں شبہ ہو تو کہتے ہیں۔ "دروغ و راست برگردن راوی"۔ ہمیں یاد ہے جب ہماری دادی اماں ہمیں کہانی سنانا شروع کرتیں تو اس کی ابتدا اسی قول سے ہوا کرتی۔

۳۷۔ جب مخاطب ہماری کسی بات کو سن کر نہ اقرار کرے نہ انکار اور خاموش رہے تو ہم یہ مان لیتے ہیں کہ وہ کسی حد تک رضامند ضرور ہے اس وقت کہتے ہیں "خاموشی نیم رضامندی"

۳۸۔ جب کوئی شخص کسی دوسرے کے لئے ہر طرح مدد کرنے کو تیار ہو تو اس وقت وہ فارسی کا ہی سہارا لیتا ہے اور کہتا ہے "بمی ہم تو از درے، قدمے سخنے ہر طرح تیار ہیں۔"

۳۹۔ کہتے ہیں اگر کوئی غم نہ ہو تو بکری پال لو۔ فارسی میں کہتے ہیں۔ "غم نداری بز بخر"

۴۰۔ بات کرتے وقت کوئی بری بات اچانک منہ سے نکل جائے تو معذرت کے طور پر ہم فارسی ہی کا جملہ استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں "خاک بدہنم"

۴۱۔ جس بات کی انسان کو خواہش ہو تو پہلے اسے اپنے کو اس لائق بنانا چاہئے۔ اس کے لئے فارسی کی مثل ہے "حلوا خوردن روئے باید"

۴۲۔ جب حق حقدار کے پاس پہنچ جاتا ہے تو کہتے ہیں۔ "حق بحقدار رسید"

۴۳۔ جب ہم کسی چیز پر کسی دوسری چیز کی اہمیت گردانتے ہیں تو کہتے ہیں "چہ نسبت خاک را با عالم پاک"

۴۴۔ انسان اپنے والدین کی صفت لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اگر کسی برے شخص کا بیٹا برا نکل جائے تو کہتے ہیں۔ "گرگ زادہ گرگ شود"

۴۵۔ کسی بات پر اپنی رضامندی ظاہر کرنے کے لئے اکثر ہم بے اختیار کہہ

اٹھتے ہیں ۔ چشم ما روشن دلِ ما شاد "

۴۶۔ جو ڈھونڈتا ہے وہ پاتا ہے اس کے لئے فارسی کا یہ محاورہ اکثر استعمال ہوتا ہے ۔ جوئندہ یابندہ "

۴۷۔ کبھی کوئی جاہل کسی سے الجھ پڑتا ہے تو اکثر ہم دوسرے شخص کو خاموش کرنے کے لئے کہہ اٹھتے ہیں. خاموش ہو جاؤ بھئی اس لئے کہ " جوابِ جاہلاں باشد خموشی "

۴۸۔ جب کوئی شخص یا کئی لوگ کسی کام کو بخوبی انجام نہیں دے پاتے اور انھیں کسی دوسرے شخص کی مدد یا ہدایت کی ضرورت ہوتی ہے تو اکثر ان کی زبان پر آجاتا ہے " جائے استاد خالی است "

۴۹۔ جب کسی شخص کا سارا رعب و دبدبہ ختم ہو جاتا ہے تو کہتے ہیں " ترکی تمام شود "

۵۰۔ آج بھی جب ہم اپنی عظمتِ پارینہ پر فخر کرتے ہیں تو بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں ۔ پدرم سلطان بود " (میرا باپ بادشاہ تھا)

۵۱۔ ہم نے کسی سے بات شروع کی. تمہید کے بعد جب ہم اپنی اصل بات پر آتے ہیں تو ہمارے منہ سے بے اختیار نکلتا ہے ۔ آمدم بر سرِ مطلب "

۵۲۔ ہمارے یہاں کوئی مہمان آتا ہے ہم اسے روکنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں ۔ آمدن بارادت رفتن باجازت "

۵۳۔ کوئی شخص سخت بیمار ہو تو اس کے لئے " آفتاب لبِ بام " یا لبِ گور کلمات کا استعمال کیا جاتا ہے ۔

چند مشہور فارسی ضرب الامثال اور ان کے مترادف اردو کہاوتیں

۱۔ آبکش بہ کفگیر بگہ ہفتاد کلا نج داری = سوپ بولے تو بولے چھلنی کیا بولے جس میں بہتر چھید "

۲۔ آبگینہ بحلب بردن = اُلٹے بانس بریلی کو

۳۔ آجیل کوک بودن = پانچوں انگلی گھی میں

۴ آلو چو بالو نگرد رنگ بری آرد = خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے ۔

۵۔ آہن بہ آہن نرم می شود = لوہے کو لوہا کاٹتا ہے ۔

۶۔ آئینہ داری در مجلس کوراں = اندھے کے آگے روئے اپنی آنکھیں کھوئے

۷۔ ا ہ ا ہ ز کہ کہ = ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے. جد کا بھائی گرہ کٹ .

۸۔ از پوست بروں آمدن = آپے سے باہر ہونا ۔

۹۔ از خرس موئی بس است = بھاگتے چور کی لنگوٹی بھلی ۔

۱۰۔ از خندہ رودہ بر شدن = ہنسی کے مارے پیٹ میں بل پڑنا

۱۱۔ از در خشکہ تا بالا رفت = ماں پر پوت پتا پر گھوڑا بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا

۱۲۔ از رود خشک ماہی گرفتن = ہتھیلی پر سرسوں جمانا

۱۳۔ از کیسہ خلیفہ بخشیدن = حلوائی کی دکان دادا جی کا فاتحہ

۱۴۔ اسپ را گم کردن و پی نعلش گشتن = اشرفیاں لٹیں کوئلوں پر مہر.

۱۵۔ استخارہ دل است = نیکی اور پوچھ پوچھ

۱۶۔ استخواں خون کردن = خون پسینہ ایک کرنا .

۱۷۔ اگر اسپ تازی است یک تازیانہ = بھلے مانس کو ایک بات گھوڑے کو ایک لات

۱۸۔ اگر راستی کارت آراستی = سانچ کو آنچ نہیں .

۱۹۔ آمدم ثواب کنم کباب شدم = گئے تھے نماز بخشوانے روزے گلے پڑ گئے .

۲۰۔ امروز در قلمرو دل دست دست تست = بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لو

۲۱۔ امروز نقد فردا نسیہ = آج نقد کل اُدھار

۲۲۔ اینجا مرغ بر عصا راہ می رود = پھونک پھونک کر قدم رکھنا

۲۳۔ این مگس عرصہ سیمرغ نہ جولانگہ تست = کہاں راجہ بھوج کہاں گنگو تیلی

۲۴۔ این چنیں را این چنیں تری کند = جیسے کو تیسا

۲۵۔ این خانہ ہمہ آفتاب است = آوے کا آوا ہی بگڑا ہے

۲۶۔ این کاسہ نیم کاسہ زیر دارد = دال میں کالا

۲۷۔ آری واللہ گفتن = ہاں میں ہاں ملانا

۲۸۔ بآب حمام ضیافت کردن = ہینگ لگے نہ پھٹکری رنگ آئے چوکھا

۲۹۔ بچہ در شکم و نامش مظفر = سوت نہ کپاس جلاہے سے لٹھم لٹھا

۴۰۔ بچہ حکم طوطی دارد = بندر بالک ایک سماں

۴۱۔ بخود آتش بیشکن جاش = جس ہنڈیا میں کھائے اسی میں چھید کرے۔

۴۲۔ برات بر شاخ آہو = زبانی جمع خرچ

۴۳۔ برائے شیطان با پوش بند عقن = شیطان کے کان کترنا

۴۴۔ بر دیدہ جائی دادن = سر آنکھوں پر بٹھانا

۴۵۔ بروت بر تافتن = مونچھوں پر تاؤ دینا

۴۶۔ بر ہر خوم آخرنی بند د = یہ منہ اور مسور کی دال

۴۷۔ بز لبسقر لانصیر الدین = کرے کوئی بھرے کوئی

۴۸۔ بسوراخ مار انگشت کردن = آ بیل مجھے مار

۴۹۔ پشہ روی آب افتادن = پول کھولنا

۵۰۔ پزحالی وجیب خال = اونچی دکان پھیکا پکوان

۵۱۔ پوست بر دھل بستن = ڈھنگ رلیاں منانا

۵۲۔ خدا دیر گیر واما نی گذارد = خدا کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں ہے۔

۵۳۔ خون سیاوش بجوش آمدن = باسی کڑھی میں اُبال

۵۴۔ خون ماتیت جانب خون کشد = گھٹنا آخر پیٹ کی طرف ہی مڑتا ہے۔

۵۵۔ دل تاجداراں ہراساں شود = کوٹھے والا روئے چھپر والا سوئے

۵۶۔ روی ترش کردن یا روی تلخ کردن = تیوری چڑھانا یا ماتھے پر بل ڈالنا

۵۷۔ زر پاک از عیار نمی ترسد = سانچ کو آنچ نہیں

۵۸۔ ز ریسمان متنفر بود مار گزیدہ = دودھ کا جلا چھاچھ پھونک کر پیتا ہے۔

۵۹۔ شتر دیدن نہ دیدن = دیکھی اَن دیکھی کرنا

۶۰۔ شتر در خواب بیند پنبہ دانہ = بلی کو خواب میں چھیچھڑے ہی نظر آتے ہیں

۶۱۔ غریقی دست انداز د بکاہی = ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کافی ہوتا ہے۔

۶۲۔ ما افسوں بردار نیست = یہ وہ گڑ نہیں جسے چیونٹے کھا سکیں

۶۳۔ موی دماغ کسی شدن = ناک کا بال ہونا

۶۴۔ نہ پائی رفتن نہ جای ماندن = نہ چلنے کو پاؤں نہ رہنے کو ٹھاؤں

۶۵۔ نہ دختر دنیا نہ پسر آخرت = نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم

۶۶۔ ہر کہ با دیگ نشیند سیاہ برخیزد = کوئلوں کی دلال میں منہ کالا

۶۷۔ ہر کسی ارزاں خرد ارزاں دہد = مالِ مفت دلِ بے رحم

۶۸۔ آب ندیدن و موزہ کشیدن = قبل از وقت واویلا

۶۹۔ از دوست ناداں دشمن دانا بہتر ست = نادان دوست سے عقلمند دشمن بھلا۔

۷۰۔ آواز دہل شنیدن از دور خوش است = دور کے ڈھول سہانے

۷۱۔ آئینہ داری در مجلس کوراں = اندھوں کی محفل میں آئینہ

۷۲۔ بلائے طویلہ بر سر میموں = کرے داڑھی والا پکڑا جائے مونچھوں والا

۷۳۔ بیک کرشمہ دو کار = ایک پنتھ دو کاج

۷۴۔ رقص کردن خود نداند صحن را گوید کج است = ناچ نہ آئے آنگن ٹیڑھا

۷۵۔ سرکۂ مفت از عسل شیریں تر است = مالِ مفت دلِ بے رحم

۷۶۔ آہن بر آہن تواں کرد نرم = لوہے کو لوہا کاٹتا ہے

۷۷۔ دل را دل خوب می شناسد = چور کا بھائی جیب کترا

۷۸۔ یک یوسف و ہزار خریدار = ایک انار سو بیمار

جس طرح صنائع لفظی و معنوی کلام کا لطف دوبالا کرتے ہیں اور اسے ایجاز و اختصار بخشتے ہیں اسی طرح ضرب الامثال نثر کو ایجاز و اختصار بخشتے ہیں اور دریا کو کوزے میں بھرنے کے مترادف ہیں۔ گفتگو کو پر وزن اور پر تاثیر بنانے کے لئے کہاوتیں اور ضرب الامثال بے مثال کام انجام دیتے ہیں لیکن اگر ان کا محل استعمال درست نہ ہو تو اکثر یہ مضحکہ خیز بھی بن جاتے ہیں۔ اس وقت مجھے اپنی ایک دوست کا قصہ یاد آ رہا ہے بے چاری کو اردو زبان سے بے حد کم واقفیت تھی لیکن اردو بولنے کی چاہ بے حد تھی ایک روز میں نے اس سے اپنی کامیابیوں کا ذکر کیا جو مجھے بیک وقت حاصل ہوئی تھیں۔ وہ اردو بولنے کے زعم میں جلدی سے بولی اچھا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آجکل تمہارا ستارہ خوب گردش میں ہے۔ یہ تو تھی اردو سے متعلق بات۔ مضمون کے آخر میں فارسی ضرب المثل کے غلط محل استعمال کی بات بھی سنتے چلئے۔ ایک صاحب نے اپنے استاد کو اپنی کتاب پیش کی اس پر جلی حروف میں لکھا۔ ”عطائے تو بر لقائے تو“ ان کا مقصد تھا۔ آپکا تحفہ آپ کے سامنے ہے جبکہ اس کہاوت کا اصل مقصد ہے۔ تیری دی ہوئی چیز تیرے منہ پر“ جسے اردو میں کہتے ہیں ”یہاں کی جوتی یہاں کا سر“ چنانچہ ان امثال کے درست محل استعمال سے واقفیت کی بھی اشد ضرورت ہے۔ کیونکہ بقول میرزا نیس۔

ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامی دارد

□□



گورنر شری موتی لال ووراراج بھون میں ریاست کی وزیر اعلیٰ
محترمہ مایاوتی سے ملاقات کرتے ہوئے

گورنر شری موتی لال ووراراج بھون میں مس عارفین بانو کی
ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی پر لکھی ہوئی کتاب کی
رسمِ اجرا انجام دیتے ہوئے



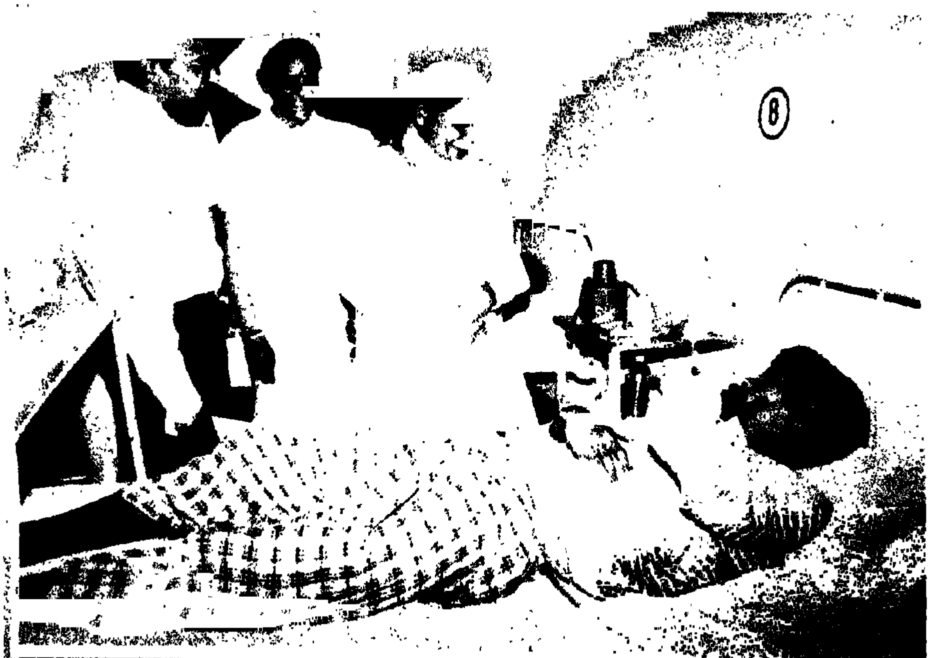




وزیر اعلا
محترمہ مایاوتی
بیجوالیہ اینکسی
میں
صحافیوں



اترپردیش
کی ...
محترمہ مایاوتی
۔ جون ۱۹۹۵ء کو
... میں
...
کے سلسلے میں ...
میٹنگ ...
کرتے ہوئے



وزیر اعلا اترپردیش
محترمہ مایاوتی
۶ جون ۱۹۹۵ء کو
سیتاپور روڈ پر
...ا اسپتال کا
افتتاح کرنے کے بعد
... مریضوں کی
... پرسی کرتی ہوئی



وزیر اعلیٰ اتر پردیش محترمہ مایاوتی اقلیتی کمیشن کے ممبر سردار رندھیر راجن
سے ملاقات کرتے ہوئے

سکریٹری راجیہ سماجی بہبود سردار بلبیر سنگھ ۱۰ جون ۱۹۹۵ء کو
بے بے نانکی جی سنائی مرکز گوردوارہ سنتا نگر لکھنؤ کا افتتاح
کرتے ہوئے۔



چودھری سبطِ محمد نقوی
چیف ایڈیٹر "ہماری توحید" (ہندی)
امام باڑہ غفراں مآب۔ چوک لکھنؤ

رام لعل نابھوی

جن حضرات نے مشرقیات کی تحقیق خصوصاً عربی و فارسی اور اُردو کے غیر مُسلم دانشوروں کے کارنامے سامنے لانے میں اپنا خونِ جگر صرف کرکے قومی یکجہتی کی راہ روشن کی ہے اور ہندستان کے ساتھ عرب و ایران کے رشتوں کو تقویت پہنچائی ان کی اگر سخت سے سخت شرائط اور بلند سے بلند معیار کے ساتھ کوئی فہرست بنائی جائے تو بھی اس فہرست میں رام لعل نابھوی کا نام یقیناً بلند جگہ پائے گا۔ لیکن اسے ایک المیہ سمجھنا چاہیئے کہ اس دانش مندِ یگانہ نے خود اپنے قلم کی بدولت اپنا نام جتنا بھی روشن کیا ہو' ان کے کام کی قدرشناسی کا میدان صاف ہے۔ بس ایک استثنا جس کی خبر اب تک ان سطروں کے قلیل الاطلاع راقم کو ہے وہ ہمارے لکھنؤ کی میر اکادمی ہے جس نے نابھوی صاحب کو غالباً ۱۹۸۸ء میں اعزاز پیش کیا۔

اس صورتِ حال کا احساس خود نابھوی صاحب کو بھی تھا اور اس احساس میں غیر مُسلم اردو اور فارسی ادیبوں کے ساتھ بے انصافی کا درد بھی شامل تھا۔ اگست ۱۹۹۲ء کے مجلۂ علمیہ معارف دارالمصنفین اعظم گڑھ (یو۔ پی) میں ان کا شاہکار مضمون "فارسی زبان کے ہندو انشا پرداز" شائع ہوا۔ اس مضمون پر معارف کے مدیرِ مسئول اور میرے مخلص کرم فرما مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے ادارتی ملاحظے کے طور پر اردو فارسی کے ساتھ ہندوؤں کی بیگانہ وشی کا اشارہ کیا۔ مولانا دورِ حاضر کے بارے میں خیال ظاہر کررہے تھے مگر نابھوی صاحب نے اسے عمومی تبصرہ سمجھا۔ افسوس ہے کہ وہ شمارہ پیشِ نظر نہیں ہے۔ تلاشِ بسیار کے باوجود لکھنؤ میں دستیاب نہ ہوسکا۔ وقت کے دامن میں اتنی گنجائش نہیں کہ اُسے اعظم گڑھ سے منگوایا جاسکے۔ بہرحال نابھوی صاحب نے اس سلسلے میں جو لکھا وہ سال بھر سے بھی کچھ زیادہ کے بعد ستمبر ۱۹۹۳ء کے معارف میں شائع ہوا' اسے یہاں تمام و کمال نقل کیا جارہا ہے؛

نابھا (پنجاب)
۲۵ اگست ۱۹۹۳ء

مکرمی ایڈیٹر صاحب معارف اعظم گڑھ۔ آداب

میرے مضمون "فارسی زبان کے ہندو انشا پرداز" مطبوعہ معارف اگست ۱۹۹۲ء میں آپ نے اپنے نوٹ میں فارسی اور اُردو زبانوں کے تئیں ہندوؤں کی شدید بیگانگی کا ذکر کیا ہے اور اسے ظلم و ناانصافی تنگ نظری اور علم دشمنی بتایا ہے۔ مجھے آپ کے نظریے سے اختلاف ہے۔

صرف پنجاب میں فارسی ادب پڑھانے کے لئے پنجاب یونیورسٹی۔ پنجابی یونیورسٹی، گورونانک دیو یونیورسٹی اور شیر خاں انسٹی ٹیوٹ مالیرکوٹلہ سرکاری سطح پر قائم ہیں۔ پنجاب میں فارسی ادب پر آج تک کوئی سیمینار نہیں ہوا کوئی مضمون نہیں لکھا گیا۔ چاروں جگہوں پر سربراہ غیر ہندو ہیں۔

ملکی سطح پر فارسی زبان میں رامائن' مہابھارت یوگ واشششٹ۔ گیتا۔ اپنشد وغیرہ کا تو کیا ذکر' کسی بھی غیر مسلم فارسی داں کے نام کا احاطہ نہیں کیا گیا

سب جگہوں پر سربراہ غیر ہندو ہیں۔

اب آئیے اُردو کی طرف۔ ملک میں اُردو اکادمیوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ بہت سے پرچے نکلتے ہیں۔ دُوردرشن، ریڈیو اسٹیشنوں پر باقاعدگی سے اردو کے پروگرام ہوتے ہیں ان میں "بزم" دوردرشن دہلی "اردو سروس" اُردو مجلس آل انڈیا ریڈیو نمایاں ہیں آپ کو کتنے ہندوؤں کے مضامین ملیں گے۔ کتنے ہندوؤں کو دوردرشن اور ریڈیو اسٹیشنوں پر بلایا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ آپ کے سامنے ہے، اعداد و شمار جمع کر لیجیے۔

"ایوانِ اُردو" دہلی اُردو اکادمی کا مقتدر پرچہ ہے اس میں خطوط کا ایک سلسلہ شروع ہوا کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ یہ سلسلہ اس وقت بند ہوا جب میں نے ایڈیٹر کو لکھا کہ اُردو مسلمانوں کی زبان کبھی تھی ہی نہیں، زبان پر کسی کی اجارہ داری نہیں زبان اس کی ہے جو سیکھتا ہے اور سیکھنے پر کوئی پابندی نہیں۔ یہ خط چھپا بھی تھا۔

"ادبی دنیا" لاہور کے فروری ۱۹۴۰ء کے شمارہ میں "اُردو۔ فارسی کے شیدائی ہندو" کے عنوان سے ۱۲۰ مقتدر اور مستند ہندوؤں کے نام درج ہیں۔ کتنے لوگ ہیں جو ان کا نام بھی آج نہیں جانتے ہیں جب ذکر ہی نہیں ہوگا تو فکر کون کرے گا۔ یہ ایک سازش ہے۔ میں ثابت کرنے کے لیے حاضر ملوں گا۔

طوالت کے خوف سے بات یہیں ختم کرنے پر مجبور ہوں۔ میرا یہ خط شائع فرما دیں۔

نیازمند

رام لعل نابھوی

معارف کے مدیر عارف نے تو اسے شکوہ بے جا ہی قرار دیا لیکن راقم عاجز کے خیال میں ادب میں جنبہ داری کا وجود ایسی چیز نہیں ہے جس سے انکار کیا جا سکے۔ یہ مذہب کی بنیاد پر، علاقوں کی بنیاد پر، اپنے پرائے کی بنیاد پر، مکتب و دبستان کی بنیاد پر اور یافت و نایافت کی بنیاد پر موجود تھی، موجود ہے اور غالباً موجود رہے گی غالب نے کتنے ہی اشتعال یا مایوسی و دل گرفتگی کے عالم میں ایسا کیا ہو قتیل کو تحقیر کی نیت سے "کھتری بچہ" کہا۔ "بوئے کچوری می آید" کی پھبتی چاہے ازراہِ تفنن و مزاح کہی گئی ہو مگر وہ ہندو فارسی نگاروں کی تحقیر قرار دی گئی اور ہمارے دور میں پنڈت کشن پرشاد کول ایسے متوازن بزرگ نے اس کی بدمزگی محسوس کی۔ اب یہ بات حسرت بن کے رہ گئی کہ مجھے اس شکوہ و جواب شکوہ میں مداخلت کا خیال جناب نابھوی صاحب کی حیات میں نہ آیا۔ ورنہ یہ بات میں اطلاع کے لیے ان سے دریافت کرتا کہ کیا کالی داس گپتا رضا، مالک رام، دوارکا داس شعلہ، گیان چند جین جیسے اہلِ قلم نے موضوع کے بارے میں کچھ لکھا۔ راقم کی نظرِ قاصر سے تو کچھ گزرا نہیں، ہمارے ڈاکٹر نریندر بہادر سریواستوا کے تو نابھوی صاحب سے دوستانہ روابط تھے۔ ملاقات و مراسلت سبھی سلسلے تھے لیکن ڈاکٹر صاحب نے نوابی عہد کے ہندوؤں کے فارسی ادب میں یوگ دان کا لیکھا جوکھا تو کیا لیکن اپنے اس معاصر محقق پر لکھنے کا خیال نہ آیا۔ اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ نابھوی صاحب کے ساتھ اس بے التفاتی میں محض عصبیت کا دخل ہے۔ بہرحال اسباب جو بھی ہوں نابھوی صاحب کے شکوے کی بنیاد موجود ہے۔ نابھوی صاحب کی شان میں کچھ منظومات ضرور نظر سے گزرے ہیں، ان کی نسبت تفصیلی گفتگو دوسری قسط میں ہوگی۔

اب ہمیں محقق متوفی کی ان کاوشوں کا جائزہ لینا ہے جن کی بدولت فارسی، اُردو اور عربی کے غیر مسلم خدمت گزاروں سے ہم متعارف ہوئے یا ان کی یاد تازہ ہوئی اور عربی و فارسی ادبیات سے سنسکرت ادبیات کے لین دین کی جان کاری ہوئی۔

اس گفتگو کے ذیل میں سب سے زیادہ اہمیت ان کے اگست ۱۹۹۲ء کے معارف والے مضمون "فارسی زبان کے ہندو انشا پرداز" کی ہے۔ لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں وہ

شمارہ پیش نظر نہیں ہے۔ وہ مضمون پیش نظر ہوتا اور اس کے محتویات سے ہم مستفید ہو سکتے تو یہ مضمون نیا دور کے اس خصوصی شمارے سے جو ہند۔ ایران روابط کی تقریب سے نکل رہا ہے زیادہ ہم آہنگ اور مقتضائے حال کے مطابق ہوتا۔

افسوس کہ معارف کے مجلات اس وقت راقم کے دسترس میں نہیں ہیں۔ ہوتے تو بھی یہ ممکن نہ تھا کہ نا بھوی صاحب کے سب مضامین سے تعرض کیا جا سکے لیکن پھر بھی بہتر و موزوں تر چیزوں کا انتخاب ہو سکتا تھا لیکن جو چیزیں سامنے ہیں انھیں پر اکتفا کرنا ہے۔ سب سے پہلے جولائی ۱۹۹۰ء کے معارف میں شامل مضمون "فارسی زبان میں رامائن" پر نظر ڈال رہے ہیں۔ ۱۰ صفحات پر محیط اس مضمون کے تعارف میں محقق بصیر نے بتایا ہے کہ

"مہرشی والمیکی ہندستان میں سنسکرت کے کوی و شاعر ہیں۔ ان کی پوری شاعری کا آغاز سنسکرت شاعری میں رامائن سے ہوتا ہے اور پورے سنسکرت ادب پر ان کی چھاپ ہے۔"

پھر سنسکرت کی دوسری رامائنوں، ہندستانی زندگی پر ان کے اثرات اور تب رامائن اور اس کے اثرات کے تعلق سے تحقیقی کاوشوں کی سیر کراتے ہوئے نا بھوی، فارسی، اردو اور عربی زبان کی رامائنوں پر اپنی تلاش کا حاصل پیش کرتے ہوئے بتاتے ہیں:

"چنانچہ ان زبانوں میں رامائنوں کی تلاش جاری رکھی اور عربی میں ۳، فارسی میں ۹، اور اردو میں ۱۰۰ رامائنوں کا پتہ چل گیا۔ ابھی اور ملنے کی امید ہے۔ اس مضمون میں صرف کچھ فارسی رامائنوں کا ذکر ہوگا۔"

ہندستان میں فارسی کے اثر و نفوذ کا ذکر بھی بہتر ہے کہ آپ فاضل محقق ہی کی لفظوں میں ملاحظہ کریں:

"مغل حکمرانوں سے پہلے بھی ہندستان میں فارسی کا چلن تھا اور یہ زبان ہندستان میں عام تھی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی درباری زبان فارسی تھی .... صفوی خاندان کے آنے سے پہلے ایران میں داستان سکندر، بختیار نامہ، دربار نامہ وغیرہ فارسی زبان میں لکھے گئے وہ اتنے مشہور ہوئے کہ فارسی نثر میں دوسری رامائن مہابھارت۔ دیومالائی کہانیاں ترجمہ ہوئیں۔"

پورا مضمون تو نقل نہیں کیا جا سکتا۔ مشتاق اہل ذوق کو اصل ماخذ کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

ستمبر ۱۹۹۰ء کے معارف میں ہمیں نا بھوی صاحب کا ایک مکتوب ملتا ہے۔ لیکن اب اس پر دوسرے مکاتیب کے ساتھ دوسری قسط میں نظر ڈالی جائے گی۔ اکتوبر ۱۹۹۱ء کے معارف میں نا بھوی صاحب نے "پنجاب میں فارسی ادب" پر مبصرانہ نگاہ ڈالی ہے یہ تحریر ص۲۹۰ سے ص۳۰۲ پر مشتمل ہے۔ تمہید میں فارسی کے پنجاب میں رواج اور ترقی کا ذکر ہے۔ یہ محض دلچسپ ہی نہیں اطلاع بخش بھی ہے۔ اس جائزے میں مصنف اس نتیجے پر پہونچا ہے کہ "جو فارسی نہیں جانتا تھا وہ غیر تعلیم یافتہ تصور کیا جاتا تھا۔" پھر نا بھوی صاحب نے سکھ گوروؤں کے فارسی ذوق کی روایت کی ہے۔ شاعری کے ارتقا کا ذکر کیا ہے۔ شعرا کا تعارف کرایا ہے اور بہت سے نام بتائے ہیں جن کا ذکر محض تخلص سے ہوا ہے ان کا مذہب طے کرنا کیسے ممکن ہوگا۔ ہاں! ہم ان ہندو شاعروں کا نام یہاں نقل کر رہے ہیں: چندر بھان برہمن، آنند رام مخلص، سیال کوٹی مل وارستہ، جگت نرائن برہمن، بیغم بیراگی، اندرجیت، دیوان مول رائے وغیرہ۔ اسی ذیل میں ہم اس مضمون سے یہ بھی معلوم کرتے ہیں کہ "آج بھی مشرقی پنجاب میں فارسی میں کہنے والے شاعر موجود ہیں۔" اس کے بعد محقق بصیر نے چندر بھان برہمن کی فارسی نثری تصنیف چہار چمن کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اس کے بعد تاریخ نگاری، انشا پردازی پر نگاہ ڈالی ہے اس میں بہت سے متقدمین و معاصرین کے نام پیش کیے ہیں۔ ان میں اگر ہم ہندو اور سکھ مصنفوں کے نام بھی پیش کریں تب بھی طوالت ہے۔ آخر میں اپنی نسبت کہتے ہیں:

"اس خاکسار نے عربی، فارسی اور اردو میں متعدد

راماٗئنیں، گیتا، مہابھارت، یوگ واشسٹ، سراماؔ
چرتر، پوران وغیرہ دریافت کیے ہیں اور فارسی میں
راماٗئنیں " کے عنوان سے مضامین لکھے ہیں۔"

"کیا شیخ سعدی ہندستان آئے تھے؟" یہ سوال نابھوی صاحب نے معارف جنوری ۱۹۹۲ء میں ایک نسبتاً مختصر مضمون میں چھیڑا ہے۔ مگر اس مضمون کی جھلک دکھانا میری اس تحریر اور نیا دور کے مجوزہ شمارے سے ہم آہنگ نہ ہوگا، اس لیے اس پر مزید گفتگو پھر کبھی ہوگی۔

معارف کا شمارہ بابتہ مارچ ۱۹۹۳ء ہمیں "عربی، فارسی اور اردو میں سکھ گرو اور پوتھیاں" کے عنوان سے رام لعل نابھوی صاحب کے افادات سے مالامال کرتا ہے۔ اس کی بدولت ہم یہ جان سکتے ہیں کہ سکھ مسلک کے ساتھ عربی، فارسی اور اردو والوں کی قلمی خدمتیں کیا ہیں۔ ص۲۱۱ سے ص۲۲۴ تک پھیلا ہوا یہ مضمون اپنے سلسلے کی دوسری قسط ہے۔ بہ ظاہر پہلی قسط فروری ۱۹۹۳ء میں نکلی ہوگی اور وہ شمارہ فی الوقت پیشِ نظر نہیں۔ پہلی قسط میں ۱۰۶ کتابوں اور ان کے مصنفوں کے نام آئے ہیں کیونکہ پیشِ نظر قسط ۱۰۷ سے شروع ہوتی ہے اور ۱۴۲ پر "تلاش جاری ہے" کے نوٹ کے ساتھ تمام ہوتی ہے۔

جون ۱۹۹۳ء کے شمارے میں اس محقق یگانہ نے فیضی کی "بھگوت گیتا" پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ مضمون بھی مختصر سا ہی ہے محض پانچ صفحات پر مشتمل۔ اس میں فیضی کی گیتا کے تراجم کے ذکر کے ساتھ ناقدین کرام کی ان نکتہ چینیوں کا ذکر ہوا ہے جو فیضی کے ترجمہ پر ہوئی ہیں، ان میں پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی، منور لکھنوی، کنور بدری کرشن فروغ وغیرہ کا حوالہ آیا ہے۔ بحث اس حاصلِ کلام پر تمام ہوتی ہے: "

"اس مختصر بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ فیضی فیاضی
نے بھگوت گیتا کا ترجمہ فارسی نظم و نثر دونوں میں
کیا ہے۔"

ہمیں جو شمارے دستیاب ہوئے ان میں اکتوبر ۱۹۹۳ء آخری شمارہ ہے جس کے صفحات ۲۸۸۔۲۹۸ پر "ہندوؤں میں عربی" کے عنوان سے اپنا حاصلِ مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس میں بھی یہ شکوہ موجود ہے کہ "عربی میں ہندوؤں کے کام پر کوئی کتاب، کوئی مضمون، کوئی مقالہ ہماری نظر سے نہیں گزرا ہے۔" ٹیک چند بہار کا نام "ٹک چند بہار" درج ہوگیا ہے۔ یہ صریحاً کتابت کی غلطی ہے۔ نابھوی صاحب ٹیک چند بہار اور سیالکوٹی مل وارستہ کی عربی دانی پر استدلال کرتے ہیں کہ:—

" ان کی کتابوں کو ایران میں استناد کا درجہ حاصل ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ ان علما کو عربی لغت کا پتہ نہ ہو۔" اس کے بعد نابھوی صاحب نے تقریباً تیس ہندو افاضل کے نام گنوائے ہیں جن میں ٹیک چند بہار اور راجہ رام موہن رائے جیسے متقدمین سے لے کر مالک رام اور ادیس کے ملوارڈ جیسے معاصرین شامل ہیں۔ یہ فاضلانہ تحریر ایسی جدول پر تمام ہوئی ہے، جس میں ۱۳ ایسے عربی دانوں کے نام اور ان کے کام کی تفصیل ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ ان تیرہ مصنفین کی عربی تصنیفیں موجود ہیں۔

اس محقق یگانہ کی ابھی حال ہی میں وفات ہوئی ہے۔ تاریخ وفات تک کا پتہ نہیں۔ اس لیے اب ہم اس گفتگو کو آئندہ کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ البتہ معارف نے، جس کی بدولت ہم ان تحقیقی جواہر سے مالامال ہوئے۔ جو تعزیتی شذرہ سپرد قلم کیا ہے اسے معارف بابتہ اپریل ۱۹۹۵ء سے ہم یہاں نقل کر رہے ہیں لیکن یہ عرض کردیں کہ اس عظیم قلم کار کی زندگی ہی نہیں موت کے ساتھ بھی میڈیا نے پوری بے پروائی اور بے خبری کا ثبوت دیا۔ معارف پہلا مجلہ ہے جس میں یہ نوٹ نکلا۔ "امن کا مسیحا" ڈاکٹر نریندر بہادر کی ادارت میں نکلتا ہے۔ یقین ہے کہ اس میں تفصیل سے ذکر کیا جائے گا۔ "قومی آواز" لکھنؤ میں تو میرے اور ڈاکٹر سریواستوا کے مراسلوں کے بعد شائع ہے۔
اب آپ معارف کا نوٹ ملاحظہ فرمائیں:

"جناب رام لعل نابھوی
قارئینِ معارف اور اردو کے شیدائیوں کو جناب
رام لعل نابھوی کے انتقال کی خبر سن کر بڑا دکھ ہوگا
وہ ہندوؤں کی اس نسل سے تعلق رکھتے تھے جو اردو

کو اپنی زبان اور مسلمانوں سے زیادہ اس پر اپنا حق سمجھتی تھی وہ کہتے تھے کہ نہ زبان کا کوئی مذہب ہے اور نہ اس پر کسی قوم اور گروہ کی اجارہ داری ہے۔

کہ پروانہ چراغ دیر و حرم نہ داند

رام لعل صاحب بڑے زود نویس تھے، مگر ان کا قلم پختہ اور منجھا ہوا تھا اور وہ موزوں طبع بھی تھے، خاکہ اور مزاح نگاری میں ان کو زیادہ کمال حاصل تھا لیکن ان کا اصل میدان "تلاش و تحقیق تھا" پچھلے کئی برسوں سے معارف میں ان کے مضامین برابر شائع ہو رہے تھے، اپنی اس کد و کاوش سے وہ یہ بتانا چاہتے تھے کہ ہندوؤں کے پرکھوں نے اردو ہی نہیں فارسی اور عربی کی بھی مفید خدمت انجام دی ہے اور مسلمانوں کے بزرگوں کی خدمات برج بھاشا اور سنسکرت میں کم نہیں ہیں ...

دل میں درد مندی، طبیعت میں شرافت اور مروت اور انکسار تھا، ایک بار لکھنؤ میں ملاقات ہوئی تو ان کی خوبیوں اور علم و ادب سے شغف و انہماک کا اندازہ ہوا، مجھے لے کر کئی کتب خانوں اور کتابوں کی دکانوں پر گئے اور جلدی جلدی کچھ نوٹ تیار کیے، اس پر متاسف تھے کہ وقت کی تنگی کی وجہ سے میرے ساتھ ندوہ کا کتب خانہ دیکھنے نہ جا سکے۔

ان کے صاحبزادے امریکہ میں رہتے تھے وہ اپنی ماں کو بھی اپنے ساتھ لیتے گئے۔ صاحبزادی اپنے گھر رہتی تھیں۔ اصرار کے باوجود ان کے یہاں جانا گوارا نہیں تھا، اپنے گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر قرطاس و قلم سے واسطہ رکھتے۔ پڑھنے لکھنے میں ایسا محو ہو جاتے کہ دن دن بھر کھانے کا خیال نہ ہوتا۔ صحت کب تک ساتھ دیتی، آخر کینسر کا مرض جان لیوا ثابت ہوا۔"

(ض)

پس نوشت: اس ناچیز تحریر کی کتابت ہو چکی تھی تو یہ اطلاع ملی کہ ہمارے رام لعل جابڑا صاحب کو ہریانہ اردو اکادمی کے وسیلے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ نابھوی صاحب نے ۱۶ مارچ ۱۹۹۵ء کو ہماچل پردیش میں اپنی صاجزادی کے گھر انتقال کیا تھا۔

غزل

نگۂ شوق نہیں دیدۂ نم ہی دے دے
میرے حصے کے جو باقی ہیں وہ غم ہی دیدے

میں جو لکھوں گی وہ میں خود ہی مٹا جاؤں گی
مجھ کو تحریر نہیں لوح و قلم ہی دیدے

شاخ گل لے کے چلوں گی تو کہاں جاؤں گی
میرے ہاتھوں میں یہ کانٹوں کا علم ہی دیدے

دل کے ریشم سے یہ جڑتے تو نہیں ہیں پھر بھی
مجھ کو ٹوٹے ہوئے پتھر کے صنم ہی دیدے

میں بھی ہوں اس کے کسی خواب کا پرتو زریںؔ
صرف جینے کے لئے اتنا کرم ہی دیدے

عفت زریں

۵۴۳۔ گلی حکیم جی۔ چوڑی والان۔ جامع مسجد
دہلی ۱۱۰۰۰۶

یہ جنگل، یہ پربت، یہ دریا، یہ جھرنے، یہ بادل، یہ صحرا
یہ پاگل ہوائیں
یہ سنسان راتیں
یہ بے مہر جلوے
یہ بے نور آنکھیں
یہ بے نام سڑکوں پہ گمنام خوابوں کا اندھا گزرتا ہوا قافلہ
یہ کمزور باہوں میں گم سُم سے سہمے ہوئے ناتواں زرد بچے
یہ منظر، یہ منظر سلگتا ہوا خیمۂ جاں
حوادث کے پیہم رواں سرخ لمحوں میں جکڑا ہوا منتظر ہے
مسیحا صفت ایک ساعت کا
جس میں
یہ سنسان رستے جہاں اُڑ رہے ہیں
بگولے گھٹن کے
پھر آباد ہو جائیں
یہ پاگل ہوائیں
کہ جن کا نہیں کوئی مسکن
انھیں آب و دانہ ملے
اک ٹھکانہ ملے
کہ بے خواب راتوں کی آنکھوں میں نیندوں کی پریاں
اُتر آئیں
سما جائیں
کہ گمنام خوابوں کے اندھے سفر کو نئی روشنی سبز منظر دکھا دے

حوادث کے پیہم رواں سرخ لمحوں میں جکڑا ہوا خیمۂ جاں
ابھی منتظر ہے!
ابھی منتظر ہے!

—— ساجد حمید
سوائی پالیہ
شیموگا ۵۷۷۲۰۱

چاندنی

سرد موسم اور اس پر ڈس رہی ہے چاندنی
ہر طرف میرے لیے ناگن بنی ہے چاندنی
نور کا پیکر لگے ہے ان کا کندن سا بدن
سر سے پا تک جسم سے لپٹی ہوئی ہر چاندنی
چودھویں کا چاند جب نکلا تو آیا یہ خیال
شعر ہے ان کا سراپا، شاعری ہے چاندنی
چاندنی کا روپ بھی اک جلوۂ صد رنگ ہے
ذہنِ ماضی کے لئے جلوہ گری ہے چاندنی
چاندنی میں زلف رخ سے جب ہٹا کر آئے ہیں
دیکھ کر پھر ان کو خود شرما گئی ہے چاندنی
اللہ اللہ جسم سیمیں سے چھلکتی ہے شراب
چاند ہے اک میکدہ اور مے کشی ہے چاندنی
نور میں پر ہے فقط اور ان کا جلوہ ہر طرف
سوچ تو لے کس کے آخر منہ لگی ہے چاندنی
جب گلے سے نیم شب مل کر کوئی رخصت ہوا
سر پٹکتے جسم تک دیکھی گئی ہے چاندنی
نا امیدی اور اسیری کو کبھی کی دیکھ کر
رات بھر روتی رہی، ہنستی رہی ہے چاندنی
چاند کو بھی کیا فراقِ دوست کا احساس ہے
زرد ہو کر دیر تک پھیلی ہوئی ہے چاندنی
چاندنی میں فوق وہ ہوں اور ہو فکرِ غزل
چاندنی پھر زندگی ہے، زندگی ہے چاندنی

—— فوق کرہی
کرہی بلڈنگ
مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

محمد اسحق صدیقی

۱۳۹ رویندر گارڈن۔ علی گنج سیکٹر ای
بی
لکھنؤ ۲۲۶۰۲۰

فارسی اور سنسکرت الفاظ کا تقابلی مطالعہ

اگر فارسی اور سنسکرت کے ہم معنی الفاظ کا ایک دوسرے سے تقابل کیا جائے تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ بیشتر بنیادی الفاظ کا تلفظ ملتا جلتا ہے۔ اس کا کیا سبب ہے؟ ماہرینِ لسانیات (PHILOLOGISTS) کا کہنا ہے کہ یہ دونوں زبانیں سگی بہنیں ہیں جنھیں ہند آریائی (INDO-ARYAN) یا ہند ایرانی (INDO-IRANIAN) زبانیں کہتے ہیں۔

جب سنسکرت اور فارسی کے الفاظ کا مقابلہ یورپ کی مشہور و معروف زبانوں (یونانی، لاطینی، فرنچ، جرمنی، روسی، انگریزی وغیرہ) کے ہم معنی الفاظ سے کیا جاتا ہے تو یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ یورپ کی زبانیں بھی (چند زبانوں کو چھوڑ کر) سنسکرت اور فارسی کی قریبی رشتے دار ہیں۔ ہندستان، ایران اور یورپ کی زبانوں کے اس بڑے خاندان کو ہند یورپی (INDO-EUROPEAN) خاندان کہتے ہیں۔ ان کا دوسرا نام آریائی زبانیں (ARYAN LANGUAGES) ہے۔

بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان زبانوں کے بولنے والے ابتدا میں ایک ہی نسل کے لوگ تھے جو اپنے کو "آریہ" (आर्य) کہتے تھے (آریہ سنسکرت زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں "اعلیٰ" یا "شریف" عربی لفظ "عالیہ" اس سے مشابہ ہے) بعد میں ان کی زبان کو مختلف نسل کے لوگوں نے اپنایا۔

پہلے آریائی زبانیں بولنے والے کسی خاص خطے میں آباد تھے جہاں ان کے قبیلے مختلف اسباب کی بنا پر ہجرت کر کے ہزاروں سال کے عرصے میں دور دراز کے ملکوں تک پہونچ گئے۔ چوں کہ آریائی زبانوں میں سنسکرت قدیم ترین زبان ہے اور ہندستان سے مخصوص ہے اسی لیے بیشتر ہندستانی عالموں کی رائے ہے کہ آریوں کا اصلی وطن شمالی مغربی ہندستان تھا جہاں سے وہ ایران ہوتے ہوئے یورپ تک پہنچ گئے۔ برخلاف اس کے مغربی محققین کی رائے ہے کہ آریوں کا اصلی وطن یورپ یا وسطی ایشیا تھا جہاں سے ان کے قبائل ہجرت کر کے ترکی، عراق اور ایران ہوتے ہوئے ہندستان تک جا بسے۔ بہر حال آریوں کے اصل وطن سے زیادہ ہماری دل چسپی ان کی زبانوں خصوصاً سنسکرت اور فارسی میں ہے۔

اگر سنسکرت اور فارسی زبانوں کے مشترک الفاظ کی مکمل فہرست بنائی جائے تو اس بات کا پتہ چل سکتا ہے کہ جب ان زبانوں کے بولنے والے کسی خاص جگہ آباد تھے تو اس مقام کی آب و ہوا کیسی تھی وہاں کون کون سے نباتات و حیوانات پائے جاتے تھے۔ ان زبانوں کے بولنے والوں کا تمدن کس منزل میں تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے مضمون کے چند صفحات کافی نہیں۔ تاہم اس نوع کی تحقیق کی اہمیت اور افادیت کے پیشِ نظر سنسکرت اور فارسی کے مشترک الفاظ[1] کی مختصر فہرست نمونے کے طور پر پیش کی جاتی ہے:

[1] مولانا محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں ایسے الفاظ لکھے ہیں جو فارسی اور سنسکرت میں مشترک ہیں۔ آبِ حیات میں ان کی تعداد صرف ۱۴۴ ہے فاضل مصنف صدیقی صاحب کا مضمون گویا اسی کی توسیع ہے انھوں نے تقریباً ۹۵ ایسے الفاظ تلاش کیے ہیں اور ان کی زمرہ بندی بھی کی ہے۔ یہ تلاش قابلِ تحسین ہے۔ ——— ایڈیٹر

اعضائے جسم

سنسکرت:	तनु	शिर	केश	भ्रू	दंत
فارسی:	تن	سر	گیسو	ابرو	دنداں
معنی:	جسم	سر	بال	بھوں	دانت

سنسکرت:	जीभ	ग्रीवा	बाहु	हस्त	अंगुष्ठ
فارسی:	زبان	گلوُ	بازو	دست	انگشت
معنی:	زبان	گردن/گلا	بازو	ہاتھ	انگلی/انگوٹھا

سنسکرت:	नख	नाभि	जानु	पद	चर्म
فارسی:	ناخن	ناف	زانو	پا	چرم
معنی:	ناخن	ناف	گھٹنا	پیر/پاؤں	چمڑا/جلد

انسانی رشتے

سنسکرت:	पितृ	मातृ	भ्रातृ	स्वसृ	पुत्र
فارسی:	پدر	مادر	برادر	خواہر	پسر
معنی:	باپ	ماں	بھائی	بہن	بیٹا

سنسکرت:	दुहितृ	श्वसुर
فارسی	دُختر	خسُر
معنی	بیٹی	خسُر

جانوروں کے نام

سنسکرت:	अश्व	खर	उस्ट्र	गो	शृगाल
فارسی:	اسپ	خر	اُشتر	گاوٗ	شغال
معنی:	گھوڑا	گدھا	اونٹ	گائے	سیار/گیدڑ

سنسکرت:	मूष	शकुन	काक	कपोत	मक्षी
فارسی:	موش	زغن	زاغ	کبوتر	مگس
معنی:	چوہا	چیل	کوّا	کبوتر	مکھی

کھانے پینے کی چیزیں

سنسکرت:	यव	गोधूम	माष	अप	क्षीर
فارسی:	جَو	گندم	ماش	آب	شیر
معنی:	جو	گیہوں	اُرد	پانی	دودھ

مناظرِ فطرت

سنسکرت:	आश्मन	तारा	वात	अभ्र	वर्षा
فارسی:	آسمان	ستارا	باد	ابر	بارش
معنی:	پتھر کا بنا ہوا/آسمان	ستارا	ہوا	بادل	بارش

سنسکرت:	मास	वृक्ष	तनु	शाखा	छाया
فارسی:	ماہ	درخت	تنہ	شاخ	سایہ
معنی:	مہینہ	درخت	تنہ	شاخ	سایہ

گنتیوں کے نام

سنسکرت:	एक	द्वा	चतुर	पंच	षट
فارسی:	یک	دو	چہار	پنج	شش
معنی:	ایک	دو	چار	پانچ	چھ

سنسکرت:	सप्त	अष्ट	नव	दश	शत
فارسی:	ہفت	ہشت	نُہ	دہ	صد
معنی:	سات	آٹھ	نو	دس	سو

متفرق الفاظ

سنسکرت:	बन्दि		भीम	पूर	तप
فارسی:	بندی/بندہ	بار	بیم	پرُ	تپ
معنی:	غلام	بوجھ	خوف	بھراہوا	بخار

سنسکرت:	तपस	तृष्णा	शुस्क	दूर	देहि
فارسی:	تپش	تشنہ	خشک	دُور	دہ
معنی:	گرمی	پیاسا	خشک	دور	دینے والا

سنسکرت:	रहस्य	हरिद्र	श्वेत	शोक	सृष्टि:
فارسی:	راز	زرد	سفید	سوگ	سرشت
معنی:	راز	زرد	سفید	سوگ	پیدائش

سنسکرت:	स्थान	कार्य	धर्म	न	नाम	नर
فارسی:	ستاں	کار	گرم	نا	نام	نر
معنی:	مقام	کام	گرم	نہ/نہیں	نام	نر

سنسکرت:	नव	नम्र	सहस्र	मः
فارسی:	نو	نرم	ہزار	ما

معنی :	نرم	نرم	ہشیار	ہشم
سنسکرت :	त्वम		अस्ति	नास्ति
فارسی :	تو		است	نیست
معنی :	تم		ہے	نہیں ہے

مصادر

سنسکرت :	पत्	वप	तप	दा
فارسی :	اُفتادن	بافتن	تپیدن	دادن
معنی :	گرنا	بُننا	تپنا	دینا
سنسکرت :	भृज	मृ	स्पृ	स्था
فارسی :	برشتن	مردن	سپردن	اِستادن
معنی :	بھونتا	مرنا	سونپنا	کھڑا ہونا
سنسکرت :	क्री	भृ		
فارسی :	خریدن	بُردن		
معنی :	خریدنا	لے جانا		

فارسی اور سنسکرت کے مشترک الفاظ پر نظر ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ سنسکرت کے مقابلے میں فارسی الفاظ کا تلفظ آسان ہے، ان میں اختصار بھی ہے اور ترنم بھی۔ غالباً یہی وجہ اس کی مقبولیت کی ہے۔ فارسی عوام و خواص دونوں کی زبان ہے جو نہ صرف ایران بلکہ ہندستان میں بھی مقبول رہی ہے جبکہ سنسکرت ہندستان کے ایک مخصوص طبقے کی زبان ہو کر رہ گئی۔ وہ عوام کی زبان نہیں بن سکی۔

فارسی الفاظ کے ترنم کا راز کرخت آوازوں سے گریز ہے دیوناگری کے مندرجہ ذیل پندرہ ثقیل حروف فارسی میں کام نہیں آتے :

ख	घ	ट	ढ	ड़	ण	भ	फ	थ	ठ
کھ	گھ	ٹ	ڈ	ڑ	ڑاں	بھ	پھ	تھ	ٹھ

झ	छ	ध	ढ	ढ़
جھ	چھ	دھ	ڈھ	ڑھ

اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ فارسی حروف کی تعداد کم ہو گئی اور عربی کی مخصوص آوازوں والے حروف (ث۔ خ۔ ز۔ ض۔ ظ۔ غ) شامل کرنے کی وجہ سے نہ صرف نئی آوازوں کا بلکہ الفاظ کے ترنم میں مزید اضافہ ہوا۔ فارسی الفاظ کی تراش خراش، موسیقیت اور معنی آفرینی قابلِ تعریف ہے۔ سنسکرت کی کون سی آوازیں فارسی کی کن آوازوں سے بدل جاتی ہیں۔ آوازوں کے الٹ پھیر یا حذف کرنے سے تلفظ میں کیسے آسانی پیدا کی جاتی ہے اس کا اندازہ فارسی اور سنسکرت کے مشترک الفاظ پر غور و فکر کرنے سے ہو سکتا ہے۔

■■

صفر سہ

(تین ہم وزن مصرعوں پر مشتمل مکمل نظمیں)

(۱)
یاد اک غزل بن کر
خواب کے منڈیروں پر
گنگنا رہی تھی کل

(۲)
خواب کے دریچوں پر
زلفِ مشک بو بکھری
لمس یاد آنے لگے

(۳)
بارشوں کے شہزادے
جب منڈیر پر اترے
خواب کسمسانے لگے

(۴)
نیم باز آنکھوں میں
خواب کے جزیرے تھے
میرے لب مچل اُٹھے

(۵)
اُنگلیاں کاٹ لیں ہواؤں نے
فکر پر اژدہوں کا پہرا ہے
میرا فن خون کی لکیروں میں

(۶)
میری بستی میں سانپ پلتے ہیں
میری گلیوں میں خوف کا موسم
فصلیں تنہائیوں کی اگتی ہیں

(۷)
ایک مجروح خواب آنکھوں میں
اک شفق رنگ یاد بستر میں
نیند آنگن میں کھیلتی ہوگی

(۸)
ذائقہ نیند کا نہیں بدلا
ذہن کا بوجھ بھی رہا قائم
خواب ہر پل مگر بدلتے تھے

شعیب شمس
نیشنل سیمپل سروے۔ ڈیری فارم ۲۴۴۱۰۳،
انجمان

قومی ایکتا

شہید میسور ٹیپو سلطان
کے نذر

تمھیں دنیا بھلا نہیں سکتی
تمھارے خون کے قطرے
وطن کی مٹی میں
ہزار پھول اگاتے رہے ہیں
ہزار پھول اگائیں گے
ہزار رنگ کے پھول
ہر ایک پھول کی خوشبو
ہمیں بتائے گی
قومی ایکتا کیا ہے؟

□□

ڈاکٹر امام اعظم
اردو ادبی سرکل
قلعہ گھاٹ۔ دربھنگا (بہار)

ایسے میں کیا رقص ہو

نین میں کاجل نہیں
سر پہ اب آنچل نہیں
دل میں بھی ہلچل نہیں
ایسے میں کیا رقص ہو

پھول بھی مرجھا گیا
چاند بھی سنولا گیا
وقت سب کچھ کھا گیا
ایسے میں کیا رقص ہو

پھول اب کومل نہیں
پھوٹتی کونپل نہیں
سر پہ اک بادل نہیں
ایسے میں کیا رقص ہو

سونا سونا ہے چمن
آگ اگلے ہے گگن
بھیک مانگے ہے بدن
ایسے میں کیا رقص ہو

تیر سی بولی چلے
گلیوں میں گولی چلے
خون کی ہولی چلے
ایسے میں کیا رقص ہو

کوئی ہندو ہے یہاں
کوئی مسلم ہے یہاں
اب یہاں انساں کہاں
ایسے میں کیا رقص ہو

ایکتا کی دھن بجا
پیار کے نغمے تو گا
مل کے سب محفل سجا
جھوم کے پھر رقص ہو

□□

صادق جعفری

آنکھیں
(ہندی نظم)

کچھ اپنی ہنسی چھوڑ جاتے ہیں
کچھ (اپنی) یادیں
لیکن
جب ہنسی دھندھلانے لگے
اور یادیں تھک چلی ہوں
تو آنکھیں اپنا کام شروع کرتی ہیں

آخری بار بچ جاتا ہے
آنکھ بھر دیکھنا
آدمی آنکھوں میں بدل جاتا ہے
اور انھیں میں زندہ رہتا ہے

(۲)
جب ساری جانچ پڑتال
چوک گئی ہو
تو آنکھیں بتاتی ہیں
کہ آدمی کیا ہے

(۳)
آنکھیں لوٹتی ہیں وہاں
جس کو دیکھنا نہیں چاہتیں
بند ہوتی ہیں اور
بے چین سی
کھلتی ہیں وہیں
یہ سوچنے کے لئے کر
اس زندگی میں
کیا کیا دیکھ لیا
کیا کیا دیکھنا ہوگا

ـــــ راجیش شرما
سوچنا بھون لکھنؤ

ڈاکٹر نہال احمد صدیقی
۶۰۳ - حسن منزل - الہ آباد

اُردو داستانوں کے فارسی ماخذ

داستانوں میں کسی معاشرے کو زمانی یقین کے ساتھ پہچانا جاسکتا ہے اور انھیں داستانوں کے ذریعہ کسی تہذیب کے خدوخال کی شناخت بھی کی جاسکتی ہے۔ داستانیں صرف تخیل کی پرواز نہیں ہوتیں بلکہ ان کے طرز بیان میں جو ڈراما ہوتا ہے اور واقعات کی ترتیب میں جو صناعی ہوتی ہے وہ اہم ہوتی ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ داستانوں میں قصہ اور واقعات اپنی اہمیت کے اعتبار سے ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ دراصل ان کی ساری اہمیت تخلیق کار کے اسلوب ہی کی وجہ سے ہوتی ہے۔

اُردو میں داستانیں عالمی ادب میں منفرد حیثیت رکھتی ہیں ان میں سے بعض داستانیں اپنی طوالت کی وجہ سے بھی غیر معمولی کہی جاسکتی ہیں۔

ایک عام خیال یہ بھی ہے کہ اردو داستانوں کی اصل یا ان کا ماخذ فارسی ہے اور اس سے انکار ممکن نہیں ہے کہ اردو داستانوں کی عظیم الشان عمارت میں کچھ نقش و نگار یقیناً فارسی کے ہیں لیکن خود فارسی کے یہ نقوش سنسکرت سے ماخوذ ہیں۔

تمام داستانوں کا تفصیلی جائزہ ممکن نہیں ہے اس لیے کچھ اہم داستانوں کی نشان دہی کی جارہی ہے اور فارسی سے ان کے ربط کی وضاحت پیش خدمت ہے۔

اُردو کی اہم داستانوں میں 'سب رس'، 'باغ و بہار' اور داستان امیر حمزہ ہیں۔ 'فسانۂ عجائب' بنیادی طور پر کئی قصوں کا مجموعہ ہے۔ ان داستانوں پر لکھنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ کچھ امور کی وضاحت کردی جائے جو ضمنی سہی مگر نقطۂ نظر کی صراحت میں معاون اور مددگار ثابت ہوں گے۔

پہلی بات یہ ہے کہ ہندستانی مزاج ہی قصہ گوئی کا حامل تھا چنانچہ پنج تنتر جس کا ترجمہ کلیلہ دمنہ کے نام سے معروف ہے۔ پنج تنتر کے مصنف وشنو شرما ہیں۔ کلیلا دمنہ کے راجہ دابشلیم اور بیدپا برہمن ہندستانی ہیں اور اس کے ہندستانی الاصل ہونے سے کسی نے اختلاف نہیں کیا ہے۔ یہاں اس کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ ایشیائی ممالک میں فوق فطری مخلوق کی تجسیم اور انھیں متشکل کرنا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ عرب و ایران میں اگر دیو رہے ہیں تو اپنے ہندستان میں راکشش اور اسُور رہے ہیں۔ البتہ 'جن' جیسی مخلوق ہندستان میں نہیں تھی۔ پریوں کا جواب ہندستان کی اپسرائیں تھیں۔ بقول شرر "یہ ساری کی مدد سے اُڑتی تھیں"۔ دیو کے سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ ہندستان، ایران، عرب ہر جگہ سر پر سینگ ضرور رکھتا ہے۔ بہرحال خیر و شر کے تصادم کی وضاحت کے لیے اس طرح کی مخلوق ایران اور ہندستان دونوں جگہ موجود تھیں۔ گیان چند لکھتے ہیں:

> "سترھویں صدی میں اصفہان کے ایک درویش نے ہزار ایک روز لکھا جس کا ماخذ ہندستانی قصے ہیں۔"

اردو کی ایک اہم داستان 'سب رس' ہے جو مُلّا اسد اللہ وجہی کی تخلیق ہے اور جو ۱۰۴۵ھ میں وجود میں آئی۔ اس داستان کا ماخذ قصہ حسن و دل یا فتاحی نیشاپوری کی دستور العشاق کو بتایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر پرکاش مونس نے بڑے فاضلانہ دلائل کے

ساتھ یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ ثناحی کا ماخذ پر بود ھ چندر دے' ہے جس کے مصنف کرشن مشر ہیں۔

لیکن اس بحث سے قطع نظر کہ سب رس کا ماخذ کیا ہے اور یہ فارسی الاصل ہے یا سنسکرت الاصل ہے' دیکھنا یہ ہے کہ سب رس کی اہمیت کا کیا سبب ہے۔ ظاہر ہے کہ سب رس کی اہمیت اس کا جاندار رمزیہ اور تمثیلی اسلوب ہے۔ قوافی کا انتظام' جگہ جگہ بے تکلفی سے ہندی، عربی، فارسی کے مقولوں کو برمحل استعمال کرنا اور لفظوں کی نشست سے ایسے بیانیہ کو جنم دینا لگتا ہے کہ وہ ہم سب کے درمیان بے تکلفی سے بیٹھا ہوا ہے۔ ہم سے براہ راست تعلق ہے اور وہ ہم کو قصہ سنا رہا ہے۔(آنجہانی) جاوید وششٹ نے سب رس میں اکٹھ انشائیے دریافت کیے تھے۔ اس طرح وجہی اردو میں تمثیل اور رمز نگاری کا موجد ہونے کے ساتھ ساتھ انشائیہ نگاری کا بھی موجد و خالق ہے۔ اس نے گیارہ انشائیوں میں صرف عشق پر روشنی ڈالی اور یہ عشق حقیقی اور مجازی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ تمام گوشے رکھتا ہے جس سے انسانی وجود میں فعالیت پیدا ہوتی ہے اور وہ گداز قلب پیدا ہوتا ہے جس کی نشاندہی اقبال نے کی ہے۔

اس اعتبار سے سب رس کی اہمیت اس کے اسلوب کی وجہ سے ہے اس کے قصے کی وجہ سے نہیں۔ اس کا قصہ تو پانچ سطر سے زیادہ نہیں ہے جسے لکھنے کے لئے کسی خاص ذہانت کی ضرورت نہیں ہے۔

'باغ و بہار' کا ماخذ تو حسین عطا خاں تحسین کی نوطرز مرصع ہے۔ لیکن حسین عطا خاں تحسین کی نوطرز مرصع کا ماخذ فارسی کا قصہ چہار درویش ہے فارسی قصہ ۱۷۱۲ء میں لکھا گیا یا امیر خسرو نے کہا یا بعد میں کسی نے لکھا یا ترکی کے قصے 'چہل وزیر' اور اسی طرح دوسری داستانوں کو جوڑ کے یہ قصہ تیار کیا گیا ہے۔ یہ ساری باتیں ضمنی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ میر امن کی باغ و بہار کو کسی طرح کا خزاں کا ڈر نہیں۔ یہ باغ ہمیشہ پُر بہار ہے اور اس کا سبب ہے میر امن کا معجزاتی اسلوب۔ وہ چھوٹے چھوٹے فقرے جن میں روح عصر موجود ہے۔ وہ محاورے کہاوتیں، زبان کے سلسلے کے اجتہادات، لطافت بیانیہ کا حسن کارانہ پہلو اور معاشرتی آداب، رسوم، ضروری تہذیبی تفصیلات، عبارت میں کہاوت کا برجستہ استعمال، ڈرامائی کیفیت، روح عصر پر مضبوط گرفت، متحرک تصویریں اور آنے والے دور میں افسانہ نگاری اور ناول نگاری کے لیے ایک جاندار اسلوب کی داغ بیل ڈالنا۔

اس طرح یہ داستان بھی اردو کا اپنا فخریہ کارنامہ ہے جس کیلئے کسی بھی زبان کا وہ رہین منت نہیں ہے۔

اردو کی سب سے "بزرگ" داستان' داستان امیر حمزہ ہے۔ اس کا ماخذ ڈاکٹر سہیل بخاری (ڈاکٹر سید محمد محمود نقوی صاحب) مغازی حمزہ کو قرار دیتے ہیں۔ گیان چند ان سے اتفاق کرتے ہیں۔ مغازی حمزہ کا تذکرہ ملک الشعراء محمد تقی بہار نے تاریخ سیستان کے حوالے سے کیا اور یہ بتایا ہے کہ حمزہ بن عبداللہ الشاری والخارجی کے محاربات اس میں ہیں اور دلچسپ دلیل دی گئی ہے کہ سیستان اور نیشاپور میں بہت سے عیار رہا کرتے تھے اور ان کے سردار ہوا کرتے تھے اور یہ کہ حمزہ خارجی کا وطن سیستان تھا۔ یہ دلیل عجیب و غریب ہے اور اس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ اگر کہیں عیار پائے جاتے تھے تو یقیناً وہاں عیاروں پر کوئی کتاب لکھی گئی ہو گی۔ اس نظریہ پر کچھ اور باتیں غور طلب ہیں:

(۱) حمزہ خارجی ہے اور سیستان یا نیشاپور میں کسی خارجی کو ہیرو نہیں بنایا جا سکتا تھا۔

(۲) داستان امیر حمزہ کا محور و مرکز عمرو بن امیہ ضمری ہے۔

تاریخ طبری جلد اول ص ۲۵۹ میں صراحت کے ساتھ یہ بات درج ہے کہ عمرو نے سرکار رسالت کے زمانے میں جاسوسی کے فرائض انجام دیے تھے۔ یہ واقعہ بھی درج ہے کہ ایک گھر میں داخل ہوئے تو ایک لاش دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ یہ اپنے ساتھی کو بلانے گئے اور جب لوٹ کر آئے تو لاش غائب تھی۔ پتہ نہیں اسے زمین کھا گئی یا آسمان۔ اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ داستان کے کرداروں کے نام حقیقی ہیں بقیہ سب رنگ آمیزی ہے۔

(۳) داستان امیر حمزہ میں طلسم ہوش ربا کی ضمنی داستان دیگر داستانوں سے کہیں زیادہ مشہور و معروف ہے بلکہ یہی کہنا درست ہوگا کہ داستان امیر حمزہ کی روح و جان داستان طلسم ہوش ربا ہے۔ فارسی میں یہ داستان لکھی گئی لیکن ایران میں داستان کی بے حد مقبولیت کے باوجود یہ اس طرح معروف نہیں ہے جس طرح اردو میں طلسم ہوش ربا ہے۔ عمرو عیار کی زنبیل، لقا کی داڑھی، ملکہ بہار کا گلدستہ۔ یاقوت سخنداں کا عفریت۔ لیکن ایران میں سچی بات یہ ہے کہ کردار یا واقعات اہم نہیں تھے بلکہ داستان گو کا اسلوب اور اس کا طرز بیان اہم تھا۔ چنانچہ محمد حسین آزاد لکھتے ہیں :

"ایران کے بازاروں میں اور قہوہ خانوں میں ایک شخص نظر آئے گا کہ سروقد کھڑا داستان کہہ رہا ہے اور لوگوں کا انبوہ اپنے ذوق و شوق میں مست لیے گھیرے ہوئے ہے۔ وہ ہر مطلب کو نہایت فصاحت کے ساتھ نظم و نثر سے مرصع کرتا ہے اور صورت ماجرا کو اس تاثیر سے ادا کرتا ہے کہ سماں باندھ دیتا ہے ....."

اب ایران کا بازار ہو یا طنجہ کا قہوہ خانہ، داستان گو کا انداز سب سے اہم ہے لیکن اردو میں بے شک اصغر علی یا باقر علی جیسے داستان گو مشہور ہوئے لیکن جو داستانیں محمد حسین جاہ اور احمد حسین قمر نے لکھیں ان کے بہت سے واقعات نے بھی شہرت پائی اور بعض جادوگرنیوں کے جادو اور بعض کردار ادب کا آرکی ٹائپ بن گئے اور ان سب کے ساتھ ان لوگوں کا اسلوب اپنے عہد کے بعض بے تکے واقعات پر پھبتی، نام کے رئیسوں کا استہزائیہ تذکرہ، عیاریوں میں ذہانت اور جودت اور لکھنوی فضا اور ماحول میں سارے کرداروں کا عمل طلسم ہوش ربا کو اہم بناتا ہے اور ان سب پر مستزاد وہ جان دار بیانیہ اسلوب ہے جس کا کوئی جواب ہی نہیں ہے۔ فارسی میں نہ ملکہ بہار، نہ ملکہ محبوب، نہ بوٹیے (برق) کی عیاریاں۔

خاتمہ کلام میں اس کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ داستانوں میں جو سحر و ساحری ہے وہ قطعی ہندستانی ہے۔ پروفیسر مجاور حسین رضوی لکھتے ہیں :

"رستم کا ہفت خواں، حمزہ ہفت بلا کے سامنے واقعاتی اعتبار سے بہت کمزور معلوم ہوتا ہے اور دونوں میں بہت فرق ہے۔ رستم جسمانی طاقت کے بل بوتے پر ہفت خواں سر کرتا ہے۔ عمرو اپنی ذہانت اور بھیس بدلنے کے فن کے سہارے مشعل جادو تاریک شکل کش سے شہنا نے نواز تک منزلیں طے کرتا ہے البتہ حمزہ جم کا عفریت طلسمی ملکہ محبوب کی عشق میں بے مثال قربانی کی وجہ سے قتل ہوتا ہے۔ ان لوگوں نے رامائن اور مہابھارت کے فوق فطری قصے یقیناً سنے ہوں گے مہابھارت تو اتنی مقبول تھی کہ میر انیس نے اپنے مرثیے میں ارجن کو جگہ دی تھی۔ اس لیے یہ قرین قیاس ہے کہ اردو میں طلسم ہوش ربا میں سحر و ساحری اور محاربات کا ماخذ مہابھارت اور رامائن ہو۔"

اس اقتباس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اردو داستانوں کے افراد قصہ بھلے ہی ترکستان، عربستان یا سیستان کے ہوں، کوہ عقیق کہیں بھی پایا جاتا ہو لیکن ان داستانوں کا سرچشمہ ہندستان ہے یہاں کی روایات یہیں کا ماحول، معاشرہ، تہذیب اور فضا ہے مرثیہ کی طرح داستان بھی وہ صنف ہے جس کی راہ کی طرف فارسی نے ضرور اشارہ کیا لیکن جس کا رنگ و آہنگ ہندوستانی ہے اور عجمی ساز پر یہ گیت ہندی اور ہندستانی لے رکھتا ہے۔

□□

"ہم کوشش کریں گے کہ ہم سب کو وہ امن و امان، تحفظ اور انصاف دلائیں جس پر آپ کا حق ہے۔"

— مایاوتی
وزیر اعلا اتر پردیش

عبدالسلام صدیقی
۲۵۲-اے، براہمپترا ہوسٹل
جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی ۶۷

ہندستانی آئین کے فرماں روا :

ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر

بیسویں صدی ہندوستان کی بیداری نو کے لئے مشہور و معروف ہے۔ اس صدی کے دوران ملک میں ایک نئی بیداری اور سماجی شعور پیدا کرنے میں جن شخصیتوں نے اپنا سب کچھ قربان کیا تھا ان میں امبیڈکر جی کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے ان کی زندگی مسلسل جدوجہد سے عبارت ہے۔ انھوں نے تحریر و تقریر اور اپنے کردار و عمل سے دبے کچلے اور ستم زدہ طبقوں میں ایک نئی روح پھونکی۔ ایک نئی زندگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ساتھ ہی ساتھ ان کے اندر اپنے حقوق کے لئے لڑنے کا عزم پیدا کیا۔

بھارت رتن سے سرفراز ڈاکٹر امبیڈکر متنوع صفات کی حامل شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے قومی یک جہتی اور فرقہ وارانہ میل ملاپ کے لئے اپنی پوری زندگی وقف کر دی۔ سماجی ترقی اور بنی نوع انسان کی بہبود کے لئے وہ ہمیشہ جدوجہد کرتے رہے اور مخالفت و اہانت کے باوجود مساوات اور سوشلزم کے اپنے نصب العین سے کبھی نہیں ہٹے۔

ہندوستان کی اس عظیم دھرتی پر عہد جدید میں راجہ رام موہن رائے، لالہ لاجپت رائے، بال گنگادھر تلک، مہاتما گاندھی، جے پرکاش نرائن، مولانا ابو الکلام آزاد، رام منوہر لوہیا اور ڈاکٹر امبیڈکر وغیرہ نے ملک میں آزادی، اتحاد اور رواداری کا ماحول قائم کرنے میں اپنی پوری زندگی صرف کر دی۔ یہ عجب ستم ظریفی ہے کہ ایسے لوگ جو اپنی زندگی کو بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کر دیتے ہیں انھیں اپنے زمانے میں اتنی مقبولیت نہیں ملتی جتنی کہ ملنی چاہئے۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے تاریخ اقتصادیات، سیاسیات اور قانون جیسے مضامین میں اعلا تعلیم حاصل کی نیز برطانیہ اور امریکا کی تین یونیورسٹیوں سے اعلا ترین ڈگریاں بھی حاصل کیں۔

سب سے پہلے ۱۹۲۷ء میں جب امبیڈکر جی نے استحصال زدہ اور انسانی حقوق سے محروم سماج کی بہبود کے لئے آواز اٹھانا شروع کی تو ان کی حمایت کرنے کے بجائے انتہا پسند اور فرقہ پرست عناصر نے ان کی تذلیل کرنے کی کوشش کی لیکن ہندوستان کا یہ بہادر سپوت سماج کی فلاح و بہبود کے اپنے مقصد سے پیچھے نہیں ہٹا بلکہ اس نے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور سماج میں برابری لانے کے لئے اپنی پوری طاقت لگا دی۔ انھوں نے اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ برتری کسی مخصوص ذات میں پیدا ہونے پر منحصر نہیں اور نہ اس پر کسی مخصوص مذہب کی اجارہ داری ہو سکتی ہے۔ ہندوستان کے موجودہ آئین کو وجود میں لانے کے لئے ان کے رول کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ آئین تیار کرنے والی ڈرافٹنگ کمیٹی کے چیرمین کی حیثیت سے انھوں نے ۲۹ راگست ۱۹۴۷ء سے لیکر ۲۵ رنومبر ۱۹۴۹ء تک جس محنت اور تگ و دو سے آئین کا مسودہ تیار کیا اس کے لئے ان کی بہت ستائش کی گئی۔ اس اہم آئین ساز شخصیت کو "بھارت رتن" کا اعزاز ان کی زندگی ہی میں دیا جانا چاہئے تھا جسے حاصل کر کے وہ بیحد مسرور ہوتے۔

ڈاکٹر امبیڈکر کی آئین سازی پر ان کے ذہن و زندگی اور امنگوں نے بلاشبہ اپنی گرفت رکھی تھی۔ ۱۹۵۰ء کا آئین ان کی ذاتی جیت تھی وہ جانتے تھے کہ زندگی کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں۔ افراد کی ضرورتوں اور حوصلوں میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ سماجی حالات بھی بدلتے ہیں۔ اس لئے انھوں نے اپنے مکمل مربوط آئین کو بھی ایک بے جان تحریری مجموعہ بنانے سے انحراف کیا اور آئین کے آرٹیکل ۳۶۸ کے تحت آئین میں ترمیم کا اختیار پارلیمنٹ کے حوالے کر دیا۔ آرٹیکل ۳۶۸ کے تحت پارلیمنٹ

کا یہ اختیار لامحدود نہیں تھا بلکہ ہر اصولوں کی بالادستی کو برقرار رکھنے کی خاطر آئینی ترمیموں کے جائزے لینے کے حق و اختیار بہر حال عدلیہ کو دئے گئے تھے۔

امبیڈکر جی مہاتما بدھ، سنت کبیر، جیوتی با پھلے کے خیالات سے بہت متاثر تھے۔ اسی وجہ سے وہ ایسے سماج کی تعمیر کرنا چاہتے تھے جس میں مساوات، آزادی اور بھائی چارے کی حکمرانی ہو۔ وہ دلت، پامال اور استحصال زدہ طبقے کا حوصلہ برابر بڑھانے کی کوشش کرتے رہے نیز برتری اور کمتری کے جذبے سے سماج کو نجات دلانا چاہتے تھے۔ امبیڈکر جی ہندوستان کے اتحاد، آزادی اور سالمیت پر بہت زور دیتے تھے۔ درج فہرست ذاتوں کے لوگوں سے ان کا کہنا تھا کہ وہ انتہائی مشکلوں سے حاصل کی ہوئی آزادی کی حفاظت کریں۔

امبیڈکر جی ایک منصف مزاج انسان تھے۔ انھوں نے ہمیشہ ناانصافی ظلم و ستم اور استحصال کے خلاف جدوجہد کی۔ وہ ہر مسئلے کا حل آئین کی روشنی میں تلاش کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو ملک میں طوائف الملوکی پھیل جائے گی۔ ان کا یقین تھا کہ برطانیہ میں غیر تحریری روایات کی وجہ سے پارلیمنٹ کی یہ بالادستی کوئی خرابی نہیں پیدا کر سکتی لیکن ہندوستان میں یہ روایات موجود نہیں تھیں ان کو پروان چڑھانے کا فرض بھی تحریری آئین پر عاید ہوتا ہے۔ اس لئے امبیڈکر جی نے پارلیمنٹ کی جگہ آئین کی بالادستی کا اصول اختیار کیا اور عدلیہ کو قانون سازی کی تشریح و تعبیر کا حق دے دیا۔ ہندوستانی آئین میں عاملہ، عدلیہ اور قانون ساز اداروں کے درمیان اندرونی تناسب شامل کر کے امبیڈکر جی نے آئین کے بنیادی ڈھانچے اور اس اصولوں کو ترمیم و تنسیخ سے ماورا قرار دے دیا جس پر اب بھی عمل ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر امبیڈکر نے آزاد ہندوستان کو بنیادی حقوق، جمہوری آزادی اور ضمیر کی آزادی کے ان تصورات کا تحفہ دیا جس پر آج ملک کی جمہوریت کی ساری عمارت کھڑی ہوئی ہے۔ اس عمارت کی مضبوطی اور دلکشی کے حقیقی معمار امبیڈکر جی اس لئے ہیں کیونکہ مسودہ کمیٹی نے آئین کا جو مسودہ مرتب کیا تھا اس کا شاید ایک ایک حرف ان کے ذہن میں ڈھل کر ان کے قلم سے نکلا تھا۔

انھوں نے گاؤں کی جگہ فرد کو بنیادی اکائی قرار دینے پر زور دیا اور اس مشن میں پورے طور سے کامیاب بھی ہوئے۔ اس طرح ہندوستان واقعی بیسویں صدی کی روشن خیالی کو قبول کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس وقت ساری دنیا میں فرد کی اہمیت کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ انھوں نے ۱۹۵۰ ہی میں ہندوستان کے کروڑوں انسانوں کو ایک فرد کی حیثیت سے وہ سب کچھ دے دیا تھا جو بیسویں صدی کے آخری دہائی میں دنیا کے عوام ہر جگہ حاصل کر رہے ہیں۔ یہ شخصی آزادی کے زبردست حامی تھے۔ اس سلسلے میں ان کا یہ نظریہ بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ ،، سماج میں رہنے کی وجہ سے انسان کی شخصیت معدوم نہیں ہو سکتی۔ اس کی ایک آزادانہ زندگی ہے اور آزادانہ وجود ہے۔ اس کا وجود ہی شخصی ترقی کے لئے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی یافتہ قومیں شخصی آزادی کو سلب نہیں کرتیں۔

ڈاکٹر امبیڈکر نے مساوات، آزادی اور اخوت پر ہمیشہ زور دیا۔ جو جمہوریت کی بقا کے لئے لازمی ہے۔ درج فہرست اقوام و قبائل اور پسماندہ ذاتوں کے افراد کو خود مختاری اور خود اعتمادی کی بنیاد پر اوپر اٹھنے کے لئے ہمیشہ متوجہ کیا۔ ان کی یہ بارہا کوشش رہی کہ حقوق اور وسائل سے محروم افراد کو ترقی کرنے کا موقع ملے اور ملک خوشحال بنے۔

بابا صاحب ہمیشہ مذہب، ذات اور علاقہ پرستی سے بلند ہو کر قومی یکجہتی کو مستحکم کرنے پر زور دیتے رہے۔ ان کا یقین تھا کہ مذہب انسانیت کو اختیار کئے بغیر نہ تو قومی یکجہتی قائم رہ سکتی ہے اور نہ جمہوریت ہی زندہ رہ سکتی ہے۔ جمہوریت میں عوام کی آواز ہی سب کچھ ہے۔ سماج میں جب افراد کو تحریر و تقریر اور اپنے رسم و رواج نیز مذہبی امور کے مطابق زندگی گذارنے کی آزادی حاصل ہوتی ہے تو اس سے قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ میل ملاپ کو تقویت ملتی ہے۔ قومی یکجہتی پر زور دیتے ہوئے ایک بار انھوں نے کہا تھا:-

> ،، اکثریتی طبقے کا یہ عظیم کام ہوگا کہ وہ ہندوستان میں رہنے والے سبھی طبقوں کو اتحاد کی لڑی میں پرونے کی کوشش کریں اگر مستقل اتحاد قائم کرنا ہے تو یہ بھائی چارے کے جذبات پر منحصر ہونا چاہئے یعنی ایسے جذبے ہونے چاہئیں جن کی مدد

ہے روحانی اتحاد قائم کرنے میں مدد ملے۔"

(ڈاکٹر بی آر امبیڈکر)

قومی یکجہتی کے ساتھ انھوں نے قومیت پر بھی زور دیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ بغیر قومیت کے جذبے کے قوم پرستی نہیں پیدا ہو سکتی اور ان دونوں کے لئے سماجی اصلاح کو بے حد ضروری سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ سماجی اصلاح کے بغیر حقیقی قومیت ممکن نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ذات پات، چھوا چھوت اور اونچ نیچ کی تفریق کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ۔ ذاتیں ہندو سماج کی اقتصادی اور سماجی تنظیم میں حائل ہوتی ہیں اس لئے انھیں توڑ دینا چاہئے۔

آزادی کے بعد سماج میں پنپنے والی خرابیوں کو دیکھ کر وہ بہت فکرمند ہوئے اور انھوں نے واضح طور پر کہا کہ:-

"مجھے پڑھے لکھے لوگوں نے بڑا دھوکا دیا ہے۔ ان لوگوں سے امید تھی کہ پڑھ لکھ کر اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے سماج کی خدمت کریں گے لیکن میں دیکھتا ہوں کہ غلام کلرکوں، افسروں اور سیاستدانوں کی ایک بھیڑ اکٹھا ہو گئی ہے جو سماجی خدمت کے بجائے اپنا پیٹ پالنے میں لگی ہے"

اس طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر امبیڈکر جنھوں نے ہندوستان کا آئین بنایا اور ملک کے اتحاد و آزادی کو دائمی بنانے پر زور دیتے رہے وہ یہ چاہتے تھے کہ جیسے بھی ممکن ہو ہندوستان میں مثالی سماج کے قیام کو یقینی بنایا جائے۔ آج جبکہ ہم بیسویں صدی کی آخری دہائی میں سانس لے رہے ہیں۔ جب شعر و ادب، سیاسی و سماجی فلسفوں اور انسانی ذہن میں فرد کی اہمیت اور تقدیس کو مرکزی درجہ حاصل ہونے جا رہا ہے لیکن آج سے چار دہائی قبل ۱۹۵۰ء میں فرد اور اس کے انسانی حقوق کی تقدیس پر مکمل یقین صرف امبیڈکر جی کو ہی تھا۔ یہ ان کی عظمت اور امتیازی شان تھی۔ فرد کی اہمیت عزت اور وقار، ان کی فکرمندی نے ہندوستانی آئین کا سنگ بنیاد رکھا۔ یہ ان کی اپنی زندگی کے تجربات اور احساس کا نتیجہ تھی۔ ان کے شعور میں انسانیت اور انسان دوستی کی جو روشنی جلوہ گر تھی وہ ہر ظلمت پسندی سے لڑ کر برابر فتح حاصل کرتی رہی لیکن ہندوستان کی آئین سازی ان کی سب سے بڑی کامیابی اور کامرانی تھی جس کی وجہ سے امبیڈکر جی ہندوستان کے ماضی سے نکل کر مستقبل کا ایک اٹوٹ حصہ بن گئے: ایسے مستقبل کا حصہ جس کی تعمیر خود انھوں نے شروع کی تھی جو آج بھی ایک فرد کو امید اور اعتماد کے سہارے فراہم کرتا ہے۔ حوصلہ عطا کرتا ہے اور یہ یقین دلاتا ہے کہ فرد ہی سب سے بالاتر ہے اور جو کچھ بھی ہے وہ فرد کے لئے، اس کے ذریعے اور فرد کے مفاد میں ہے کیونکہ فرد ہی انسانی زندگی کی اکائی ہے۔

آج کے بدلتے ہوئے دور میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کے بنائے ہوئے راستے پر گامزن ہوں اور ہندوستان کو خوشحال، متحد اور طاقتور بنانے میں کوئی کسر باقی نہ اٹھا رکھیں۔ یہی ان کو ہمارا سچا اور صحیح خراج عقیدت ہوگا۔

"مذہب کو ضابطۂ اخلاق کی آزادی اور مساوات اور برادرانہ جذبے کے آدرشوں کو پورے طور پر تسلیم کرنا چاہئے۔"

(ڈاکٹر امبیڈکر)

ایم۔ کوٹھیاوی راہی
مدیر ہفت روزہ اشتراک۔ قاضی پور خورد۔ گورکھپور

افسانہ

دریچہ اور گلی

اندھیرا گاڑھا ہوگیا۔ ہوا بند ہوگئی۔ کالے بادلوں کے ٹکڑے ایک ایک کر کے ایک دوسرے میں تحلیل ہوگئے۔ کوئی تارا، کوئی جگنو، کوئی زخم نہیں، جس سے روشنی ہوسکتی — مگر ایسا نہیں ہے۔ زخم ایک نہیں کئی تھے ..... اور وہ زخم دل میں نہیں تھے — (روشنی دل کے زخم تو دیتے ہیں نا!) وہ زخم ایک بوڑھی عورت کے اوپر والے ہونٹ پر تھے۔ اور ایک بیس سالہ لڑکی کے گلے میں تھے۔ زخم جو بوڑھے تھے، نمایاں تھے — زخم جو کنوارے تھے، نمایاں نہیں تھے — اپنی اپنی جگہ دونوں زخموں کے بدن تڑپ رہے تھے۔ ایک آواز گلی کے نکڑ سے پھوٹ رہی تھی۔ ایک آواز حویلی کے اس کمرے سے، جس کا ایک دریچہ میرے کمرے کی طرف کھلتا تھا۔ دریچہ سے پھوٹتی آواز رہ رہ کر ابھرتی تھی۔ مگر نکڑ کی طرف سے آنے والی آواز مسلسل — اور یہ سلسلہ پچھلے کئی مہینوں سے جاری تھا۔

میں جب گھوم گھام کر تھکا ہارا گھر آتا اور اپنے کمرے میں خود کو صبح تک کے لئے مقید کر لیتا تو وہ دونوں آوازیں میرے کانوں میں آآ کر عجیب سا تاثر پیدا کرتیں۔

بوڑھی آواز اکثر دل کی گہرائیوں میں اتر کر آنکھوں کو نم کر دیتی۔

کنواری آواز ایک یاس اور ایک حسرت بن کر عجیب سا تاثر دے جاتی۔

کبھی دونوں آوازیں کتوں کی آواز میں گم ہو جاتیں۔

ایک رات دو کتے آپس میں بری طرح لڑ رہے تھے۔

"مجھے اٹھ کر وہاں جانا چاہیے۔" میں نے سوچا۔ حالانکہ زوردار بارش شروع ہو چکی تھی۔

پھر میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

میرے قدم آپ ہی آپ متحرک ہوگئے۔

چلنے لگے

پھسل پھسل کر

ڈب ڈب ڈب

میرے بال بھیگ گئے

چپلیں، کرتا، پاجامہ، ہاتھ پاؤں، آنکھ، ناک، کان عضو عضو ..... سب پانی پانی۔ شرابور .....

پھر بجلی چمکی

اس آواز کا بدن کوڑے کے ڈھیر میں دب گیا تھا شاید۔

میں نے ٹٹولنا چاہا۔

آواز ابھری

کراہ کی آواز۔ مگر بہت دھیمی ... مردہ سی آواز۔ میرے ہاتھ کانپ گئے۔

میں وہاں مزید رکا نہ رہ سکا۔

ایک رات پھر دو کتے شاید آپس میں لڑ رہے تھے۔

مگر میں نہ اٹھا، نہ وہاں گیا۔

گشت پر پھرنے والے کانسٹبل نے وسل بجائی

کتے لڑائی چھوڑ کر چپ ہوگئے

کانسٹبل کے بوٹوں کی کھٹ کھٹ کے ساتھ بوڑھی آواز ابھری۔

"بابو۔ بابو"

گلی کے نکڑ سے آئی اس آواز، اس دل دوز آواز پر کانسٹبل کے بوٹوں کی کھٹ کھٹ مدھم پڑ گئی۔

"کیا بات ہے بڑھیا! کیوں کراہ رہی ہے؟" کانسٹبل نے پوچھا۔

اس طرف سے جانے کیا جواب ملا

اور پھر وہ آواز زور زور سے ابھرنے لگی

کانسٹبل کے بوٹوں کی کھٹ کھٹ تیز ہو کر آہستہ آہستہ ڈوبتی چلی گئی۔

مگر آج اس کنواری آواز کو کیا ہوا؟ کیوں نہیں آئی؟

کروٹ بدل کر میں نے سوچا۔

بوڑھی آواز تیز تیز آنے لگی۔

ذرا آج پھر اٹھوں، چلوں اور پوچھوں ــــ مہینوں کا یہ کرب روح میں اترتا چلا تھا۔

"کیا بات ہے ماں؟"

میں نے گلی کے نکڑ پر کوڑے کے ڈھیر کے پاس پڑی بوڑھیا پر ٹارچ کی روشنی پھینکی اور پوچھا۔

"بولو ماں کیا بات ہے؟"

جواب کی جگہ آواز اور تیز ہو گئی۔ بے معنی آواز ــــ

زخم سرخ تھے۔ گوشت کا ایک لوتھڑا سا اوپر کے ہونٹ سے نیچے کی طرف لٹک رہا تھا۔

میں نے روشنی بجھا دی۔

"بہت درد ہے ماں۔؟"

"ہاں بابو بہت ......" کراہ کو چیرتی نحیف آواز نے دل پہ ایک زوردار ضرب لگائی۔

"کوئی ہے نہیں تمھارا؟"

کوئی جواب نہیں ملا۔

"کوئی نہیں ہے ماں۔؟"

پھر کوئی جواب نہیں ملا۔

"اچھا ماں ..... اچھا..."

میں تیزی سے اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔

مگر وہ آواز پیچھا کرتی ہوئی میرے ساتھ آ کر فرش پر لیٹ گئی۔

اس لیٹی آواز کو وہ آواز یاد آنے لگی جو سامنے والے دریچہ سے ایک ہفتہ قبل تک آتی رہی تھی۔

ایک بوڑھی آواز

ماں کی طرح

جو میرے ساتھ ہی فرش پر لیٹی ہوئی تھی۔

ایک کنواری آواز، کرب انگیز آواز، زخمی روحانی آواز، جانے آج بھی کہاں تھی، آج بھی نہیں آ رہی تھی۔ کہیں اس آواز کی تکلیف، جلن ختم تو نہیں ہو گئی؟

مگر کیا اس لیٹی آواز کی تکلیف کبھی ختم نہیں ہو گی؟

اُف ماتا کی یہ آواز۔

دونوں زخموں کی آواز

ایک کھلے زخم کی

ایک بند زخم کی

وہ آواز آج کہاں ہے؟

اور یہ آواز؟

میری روح کو رلانے والی

میرے ساتھ فرش پر لیٹی ہوئی، مسلسل کراہ رہی ہے

کبھی تیز، کبھی مدھم

کسی مرقد کے اس چراغ کی طرح، جو ہوا میں بھی جلتا رہتا ہے۔

کبھی تیز کبھی مدھم!

گوشت کا لوتھڑا سا، سرخ سرخ، اوپر کے ہونٹوں سے لٹکا ہوا۔

یہ کیسا لوتھڑا تھا؟

یہ کیسا زخم تھا؟

اور وہ آواز؟

کیا ہوا اس کو۔؟

ایک دوسرے میں تحلیل ابر کے ٹکڑوں میں اچانک بجلی سی چمکی۔ ہلکی

گرج کے ساتھ باہر بارش ہونے لگی
فرش سے اٹھ کر وہ آواز چلی گئی۔
پھر وہ آواز بارش کے شور میں دب گئی۔
ہڑبڑا کر میں نے سوچا، آواز کا بدن بھیگ رہا ہوگا۔
اور اب گلی کے نکڑ پر، بدبودار کوڑے کے ڈھیر کے پاس اس مقدس بزرگ عورت کے اوپری ہونٹ سے لٹکے گوشت کے لوتھڑے سے، خون اور پیپ کے بجائے پانی ٹپک رہا ہوگا۔
اور وہ آواز جو آج بھی چپ ہے۔ اپنے جسم کو حویلی کے اس کمرے میں سکون سے سویا دیکھ رہی ہوگی جس کا ایک دریچہ میرے کشادہ کمرے کے سامنے کھلتا ہے۔
بجلی پھر چمکی۔
اس دریچے کو بند دیکھ کر کچھ عجیب سا محسوس ہونے لگا — ہوسکتا ہے اس کنواری آواز کا بدن مر چکا ہو۔ مگر ایسا ہوتا تو جنازہ اٹھتا۔
کسی دولت مند کے جنازے میں شہر کے سارے رئیس شامل ہوتے ہیں۔ محلہ بھر میں رت جگا ہوتا ہے۔ چراغاں ہوتا ہے امیر مرتا ہے تو اس کی حویلی کے پچھواڑے بھی روشنی ہوتی ہے۔
بارش اور تیز ہوگئی
بجلی بار بار چمکنے لگی
اس آواز کا بدن، بوڑھا، نحیف بدن، بدبودار کوڑے کے ڈھیر پر پڑا بدن، کیچڑ میں پھنسا، رینگتا تڑپتا، مقدس بزرگ بدن۔ مگر غلیظ کتوں سے بھی غیر اہم! کوئی کتا اس طرح بھیگتا کہاں ہے؟
میری آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔
میں نے اپنے کمرے کی کشادگی کو دیکھا، جس کے بوسیدہ طاق میں ایک چھوٹی سی موم بتی دم توڑ رہی تھی۔
اچانک میری آنکھیں بارش کے پانی میں بھیگ گئیں۔
پانی ہی پانی
آخر اس آواز کے بدن کا کیا ہوگا؟
دل پر پھر ایک زوردار ضرب لگی۔
کمرے کی دھندلی کشادگی پانی پر پھیلتی چلی گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی خود میرا وجود بھی ....
صبح جانے کہاں تھی۔
اب بارش کی آواز مدھم ہونے لگی تھی۔
اور اب فضاؤں میں بارش کی یہ مدھم آواز ہی رہ گئی تھی۔
کوئی اور آواز اب کہاں تھی؟

صبح حویلی میں تجہیز و تکفین کی تیاری ہو رہی تھی۔
یتیم خانے کے معصوم بچے صحن میں جمع تھے
قرآن خوانی ہو رہی تھی
دولت مند کینسر زدہ کنواری لڑکی'
بیس سالہ عالیہ کی لاش کان پور سے لائی جا رہی تھی۔

اور
گلی کے نکڑ پر چندہ ہو رہا تھا
غریب کینسر زدہ بڑھیا مر گئی تھی۔!

□□

غزل

ثانیہ انجم

گھر کی اک تصویر لیے میں پھرتی ہوں
یہ کیسی زنجیر لیے میں پھرتی ہوں

آنکھوں میں وہ خواب سجائے بیٹھا ہے
خوابوں کی تعبیر لیے میں پھرتی ہوں

وہ تو کارِ کوہ کنی سے باز آیا
عزم جوئے شیر لیے میں پھرتی ہوں

وہ تدبیر کے رنگ محل میں چین سے ہے
اور پھوٹی تقدیر لیے میں پھرتی ہوں

رنگ اور خوشبو میں نہلا کر اُسے حنا
زخموں کی جاگیر لیے میں پھرتی ہوں

نقد و تبصرہ

تبصرے کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: "تجلیاتِ برق"
شاعر: راجندر نگم برق
قیمت: پینسٹھ روپے (۶۵/-)

یہ دیوناگری رسم الخط میں شاعری کی کتاب ہے۔ اگر یہ ہندی ہے تو اُردو کسے کہتے ہیں؟ شاید یہ اُردو شاعری ہی ہے جو ہندی لپی کے شال میں لپیٹ کر ظاہر ہوئی ہے۔ شاعر کا نام ہے راجندر نگم برق۔ برق صاحب اُردو رسم الخط سے نابلد ہیں، نہ لکھ سکتے ہیں نہ پڑھ سکتے ہیں اس کے باوجود اُردو زبان اور شعری روایات کا اتنا عرفان رکھتے ہیں، یہ بھی کرامت ہے۔ وہ ہندی میں اردو کے سفیر ہیں۔ انھوں نے ۱۳ برس کی عمر میں شاعری کا آغاز کیا ۱۵ برس کی عمر میں پہلی نظم کی اشاعت ہوئی۔ وہ نہ صرف ہندی اُردو بلکہ انگریزی میں بھی تخلیق کرتے ہیں۔ تجلیات برق کے بعد اُردو میں ایک دوسرا مجموعہ "تاثراتِ برق" کے نام سے لانے کا ارادہ ہے۔

برق جب اپنے کلام کو اُردو میں منتقل کر رہے ہیں تو انھیں اُردو کے پیمانوں پر کھرا اُترنا ہوگا۔ بہرحال ان کے کلام جذبہ و فکر حیات و ممات کا فلسفہ، موجودہ معاشرے کے معاشی و نفسیاتی مسائل وارداتِ حسن و عشق، خمریات، کلاسیکی رنگ اور جدیدیت سبھی کچھ ملتا ہے۔ غزل کے دوامی موضوع کاروبارِ دلداری، حسیت و جنسیت وغیرہ میں انھوں نے کیسے کیسے مستی بیز دلکش ریزہ اشعار نکالے ہیں، ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

وہ جانے کب مرے پہلو سے جا چکا تھا، مگر
مہک ابھی بھی ہے اس کی مرے پسینے میں

برق صاحب جب اُردو کی بزم میں وارد ہوا چاہتے ہیں تو میری تجویز ہے کہ وہ کسی مشاق استاد سے مشورہ کر لیا کریں تاکہ وہ ان کے اشعار کو اردو کے فنی پیمانوں کے مطابق کر دے۔

——— گیان چند

نام کتاب: یازدہ مجلس میر حسن دہلوی
معروف بہ **اخبار الائمہ**
مرتب: پروفیسر حکیم کمال الدین حسین ہمدانی (۱۹۹۴ء)
ناشر: مرتب، ۴/۱۳۰۵ نیو سر سید نگر۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲
قیمت:- دو سو (۲۰۰/-) روپئے

میر غلام حسن، حسن دہلوی اردو دنیا میں اپنی مثنوی "سحر البیان" کی بدولت معروف ہیں۔ انھوں نے کئی اور بھی مثنویاں کہیں۔ وہ اچھے غزل گو بھی تھے، اور فارسی زبان میں ان کا تذکرہ شعرائے اُردو ہماری ادبی تاریخ کے بنیادی ماخذوں میں شمار ہوتا ہے لیکن اردو نثر میں ان کی کوئی تحریر دست یاب نہیں تھی۔ ڈاکٹر اشپرنگر نے اپنی ایک رپورٹ میں ان کی کتاب "اخبار الائمہ" کا ذکر کیا تھا، لیکن خیال تھا کہ یہ کتاب اب ناپید ہو چکی ہے۔ حکیم کمال الدین حسین ہمدانی ہم سب کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس کتاب کا ایک مخطوطہ کتب خانہ سید خیرات علی ہمدانی، گڑھی جلالی ضلع علی گڑھ سے ڈھونڈھ نکالا اور اسے اپنے مبسوط مقدمے کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔

اردو میں وہ مجلس کا رواج ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی تالیف "روضۃ الشہداء" کے زیر اثر ہوا۔ روضۃ الشہداء محرم میں پڑھی جانے والی مجلسوں کا مجموعہ ہے۔ ہندستان میں فارسی کا رواج کم ہو جانے کی وجہ سے روضۃ الشہدا کے اُردو ترجموں کے علاوہ بہت لوگوں نے بطور خود بھی اردو میں مجلسوں کے مجموعے تیار کیے جو ایک صنف کی حیثیت سے وہ مجلس کہلاتے تھے، اگرچہ ان میں مجلسوں کی تعداد کم و بیش بھی ہو سکتی تھی۔ حکیم کمال الدین نے بڑی تلاش و تحقیق سے مختلف

وہ مجلسوں کا پتہ لگا کر مقدمۂ کتاب میں ان کا تعارف کرایا ہے۔ اس کے بعد میر حسینؔ کے مختصر حالات اور مخطوطہ "اخبار الائمہ" کا تعارف ہے۔

"اخبار الائمہ" اور دوسری دہ مجلسوں میں محتشم کاشی کے مرثیہ دوازدہ بند کا بہ کثرت استعمال ہوا ہے۔ فارسی کا یہ مرثیہ رثائی ادب کا مقبول ترین شاہکار ہے۔ کمال الدین صاحب نے ایک مفید کام یہ کیا ہے کہ اس مرثیے اور محتشم کے بارے میں بھی ضروری معلومات فراہم کرنے کے علاوہ مرثیے کا اصل فارسی متن اور اردو نثر میں اس کا ترجمہ (از حاذق الحکما حکیم سید محمد ریاض الدین ہمدانی) شامل کتاب کر دیا ہے۔

اصل کتاب "اخبار الائمہ" کی اہمیت ظاہر ہے۔ یہ میر حسنؔ کی سی اہم کلاسیکی ادبی شخصیت سے نسبت رکھنے کے علاوہ شمالی ہند کی قدیم اردو نثر کا نمونہ ہونے کی حیثیت سے بھی بیش قیمت چیز ہے کتاب مجلس عزا میں پڑھنے کی غرض سے لکھی گئی ہے، شاید اسی لیے اس میں ادبی صنعت گری دکھانے کے بجائے سیدھی سادھی عبارت میں واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ اس خصوصیت نے کتاب کی اہمیت اور بڑھا دی ہے اور اس کے مطالعے سے ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ اٹھارھویں صدی عیسوی میں اردو نثر کا عمومی اسلوب کیا تھا۔ نمونہ دیکھئے،

"جو وہ ملعون چھوٹا، غلام کے ایسی تلوار ماری کہ سر قلم ہوا۔ بیٹے نے کہا کہ اے پدر، یہ کیا غضب ہے کہ ماں کو میری زخمی کیا اور غلام کو کہ بجائے بھائی کے تھا، قتل کیا۔ از بہر خدا اس غضب کو زد کر۔ اُس ملعون نے بیٹے کو بھی قتل کیا۔ جو دونوں لڑکوں نے تین تین آدمی کشتہ دیکھے، جانا کہ ہم کو ضرور مارے گا۔"

(صفحہ ۱۸۰)

لسانی حیثیت سے "اخبار الائمہ" کا مطالعہ افادیت سے خالی نہ ہوگا۔ سرسری مطالعے میں اس کا اسلوب تحسینؔ کی "نو طرز مرصع" کے سادہ اسلوب والے حصوں سے ملتا جلتا نظر آتا ہے، لیکن یہ کتاب محققوں اور نقادوں سے دقیق مطالعے کا تقاضہ کرتی ہے۔ اب سے اُردو ادب خصوصاً اردو نثر کی تاریخ میں اس کتاب کا حوالہ ناگزیر ہوگا۔

پروفیسر حکیم سید محمد کمال الدین داد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایک بہت اہم متن کو دریافت کر کے اُردو دنیا کے سامنے پیش کر دیا ہے۔

——— نیّر مسعود

نام کتاب: "تقدیر حنا" (شعری مجموعہ)
شاعر: عرشی بھوپالی قیمت: بیس روپے
ناشر: سید شمس الدین شمیم ۶۲-۶۱ نیل کنٹھ کالونی عیدگاہ ہلز۔ بھوپال

ہمارے نقاد حضرات کا المیہ یہ ہے کہ ہر برس ایک یا دو صدی پرانے شعرا پر وہی گھسی پٹی باتیں لکھ کر کتابوں کا انبار لگا دیں گے اور دوسرے اہم شعرا کی پہچان بھی نہیں کرنے کی زحمت کریں گے یا پھر اس وقت کے شعرا کی فہرست میں سے کسی ایک پر توصیفی یا تنقیدی صفحات کالے کر دیں گے۔ عام پڑھنے والوں سے نقاد کی الگ نشانی یہ ہونی چاہئے کہ وہ تھوڑے سے کلام سے کسی شاعر کا لب و لہجہ اور انفرادیت کی نہ صرف شناخت کر سکے بلکہ اسے منتشر کرے۔

شعری بھوپالی نے ۱۹۴۲ سے ۱۹۵۵ء تک لکھا اور مجاز کی وفات اور دوسرے ذاتی صدمات نے ان کی ہوش و حواس کی زندگی ختم کر دی حالاں کہ بیس برس تک وہ اس کے بعد بھی جئے ایک بار تو اپنی بیاض کو بھی نذر آتش کر دیا...

اب ان کے بھائی نے، جو کلام مل سکا اس کا زیر تبصرہ مجموعہ شائع کیا ہے۔

اس مجموعے کو پڑھنے کے بعد یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ آخر اس پائے کے شاعر کو نظر انداز کیوں کیا گیا۔ ۱۲ برس تک ناقدین نے ان کا کلام پڑھا ہوگا، کیا ان کو کوئی انفرادیت نہیں دکھائی دی اس شاعر میں، جسے جگرؔ مرادآبادی جیسے غزل گو نے بڑھاوا دیا اور جو ماہر القادری کا قریبی ساتھی رہا۔ ہاں باسط بھوپالی اور کیف بھوپالی بھی اسی عہد میں نمایاں تھے لیکن شعری صاحب کو شاید

اسی لیے نظر انداز کیا گیا کہ وہ نقاد حضرات سے مخاطب ہوکر یہ کہہ رہے تھے ؎

جنھیں حادثات کی جستجو، نہ لذّتِ درد وغم
انھیں تبصرے کا نہیں حق مری زندگیِ دوام پر

——— پرکاش چندر

نام کتاب: "کوہِ نور" (شعری مجموعہ)
شاعر: ضیا جبل پوری قیمت: ۲۵/ روپئے
ملنے کا پتہ: دفتر 'گونج' اعظم روڈ نظام آباد

ضیا جبل پوری کا دوسرا شعری مجموعہ ہے "کوہ نور"۔ پہلا مجموعہ کلام "بیاضِ فکر" شائع ہوکر ادبی دنیا سے دادِ تحسین حاصل کرچکا ہے۔ 'کوہ نور' میں کچھ قیمتی اشعار بھی ملتے ہیں۔ ان کے یہاں آمد ہے آورد نہیں ہے زندگی کے متعلق ان کا مطالعہ بڑا عمیق ہے۔ غزل کے میدان میں ان کے جوہر زیادہ کھلتے ہیں۔ دیکھیے یہ شعر:

اپنے پلکوں پہ کوئی خواب سجائے رکھیے
اپنی خاکوں میں کوئی تاج بنائے رکھیے

ان کا لہجہ دھیما ضرور ہے مگر قاری کے دل کو چھو جاتا ہے کیوں کہ ان کے یہاں بات کہنے کا ایک اچھوتا ڈھنگ اور سلیقہ ہے جو تغزل کو بھی قائم رکھتا ہے۔ ان کے کلام کی ایک نمایاں خوبی ان کی خود اعتمادی بھی ہے۔ مگر کہیں کہیں ان کا انداز روایتی ہوگیا ہے جس سے عامیانہ پن جھلکنے لگتا ہے۔

'کوہ نور' میں غزلوں کے علاوہ کچھ نظمیں بھی شامل ہیں۔ قومی یکجہتی (چار مینار)، تلاش، پہچانو، لے میرے گاؤں ۔۔ ان کی بہت دل آویز نظمیں ہیں۔

مجموعی طور پر 'کوہ نور' ایک قابلِ مطالعہ شعری مجموعہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ ضیا جبل پوری کی تخلیقی شخصیت کو منوانے میں معاون ثابت ہو سکے گا۔

——— تسکین زیدی

نام کتاب: آشوب (جلد اوّل)
ترتیب: ڈاکٹر راجیش کمار پرتی
قیمت: باسٹھ روپئے
ملنے کا پتہ: نیشنل آرکائیوز آف انڈیا
نئی دہلی

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی، جسے انگریزوں نے 'غدر' کا نام دیا تھا، انقلاب کی ایک ناکام کوشش تھی، آزادی کی ایک جنگ تھی جسے انگریزوں نے سختی سے دبادیا تھا۔ انقلاب اور آزادی کے لیے جو لڑائیاں لڑی جاتی ہیں، ان کی ناکامی میں ایک طرح کی کامیابی پوشیدہ رہتی ہے کیوں کہ ناکامی کا احساس ہی آئندہ نسلوں کے دلوں میں ولولے کی جوت جگاتا ہے۔ آزادی کی یہ تحریک وقتی طور پر دب ضرور گئی تھی مگر آزادی کی چنگاری دھیرے دھیرے، اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔ ناکامی کا احساس ہر طبقۂ فکر کے لوگوں کو تھا اور ہر شخص اپنی استطاعت کے مطابق مادرِ وطن کے گلے سے طوقِ غلامی اتارنے میں سرگرم تھا۔

ادیبوں اور شاعروں نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا، اور نوجوانانِ قوم کے دلوں میں صورِ آزادی پھونکتے رہے، انھیں بروقت غلامی کا احساس دلاتے رہے۔ ان کے ضمیر کو خوابیدہ کرتے رہے ہر چند کہ اس میں ان کے ہاتھ قلم ہوتے رہے مگر انھوں نے خونِ دل میں انگلیاں ڈبولی تھیں۔ حکومت نے ان شعرا و ادبا کی زبانیں بند کرنے کی کوشش کی، ان کی تخلیقات کو ضبط کرلیا۔ انھیں ضبط شدہ نظموں، غزلوں کو اکٹھا کیا ہے ڈاکٹر راجیش کمار پرتی صاحب نے، جو نیشنل آرکائیوز آف انڈیا کے ڈائرکٹر جنرل ہیں۔

پرتی صاحب نے بڑی جانفشانی کے ساتھ اس سرمایے کی مائکروفلم انڈیا آفس لائبریری سے حاصل کرکے نیشنل آرکائیوز آف انڈیا میں محفوظ کرلی ہے اور ان کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے اس طرح کی اشاعت کا سلسلہ نیشنل آرکائیوز نے ۱۹۸۶ء میں

شروع کیا تھا۔ ابھی تک 'آزادی کے ترانے' 'دیش بھگتی کے گیت'، 'دھرتی کی پکار' 'زنجیریں' وغیرہ طبع ہو چکی ہیں۔ انڈیا آفس لائبریری سے مائکروفلم کی شکل میں لائی گئی ساری تخلیقات کی اشاعت غالباً ممکن نہ ہو سکے اس لیے منتخب شعری و نثری تخلیقات کو طبع کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ آشوب کی پہلی جلد ہے۔ اس میں ۱۱۱ تخلیقات ہیں جو ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۱ء کے دوران لکھی گئیں۔ لکھنے والوں میں علامہ شبلی نعمانی، اکبر الہ آبادی، مولانا نواب علی، مولوی وجاہت حسین مظہر جمیل نگینوی، قاری محمد حق، چودھری مختار احمد، نند لال عرف بھر تیندر گپتا کیفی، دنکر شرما، ادھو شکل، چندر کوی وغیرہ ہیں۔ ایک نام حسرت کا لکھا ہوا ہے غالباً یہ حسرت موہانی ہیں۔ ۱۹۲۰ء کے بعد کی تخلیقات امید ہے دوسری جلد میں شائع کی جائیں گی۔

یہ کتاب طالبانِ علم کے لئے ایک گراں قدر تحفہ ہے جس کے لئے راجیش کمار صاحب لائق مبارک باد ہیں۔

——— رفیق احمد خاں

نام کتاب: "سفر گزار" (شعری مجموعہ)
شاعر: شفیق طاہری۔ قیمت: ۴۰/- روپے
ملنے کا پتہ: شفیق طاہری، محلہ نادر شاہ، قصبہ میران
شاہ جہان پور

'سفر گزار' میں شاعر نے اپنی زندگی کے نشیب و فراز کو بخوبی بیان کیا ہے۔ ان کی شاعری پڑھتے وقت ان کے درد و غم میں قاری خود کو بھی شریک محسوس کرتا ہے۔ شاعری کی یہ خوبی بھی مانی گئی ہے۔

روایتی انداز میں اس شعری مجموعہ کا آغاز حمد سے ہوا ہے۔ حمد کے بعد شاعر نے "بارگاہِ رسالت میں" کے عنوان سے ایک نظم قلم بند کی ہے۔ اس کے بعد صدرِ معلم کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے اس میں رسولِ خدا کی مدح کی گئی ہے اور اس کی مقبولیت کے ساتھ اپنے دل کی دعا بھی پیش کی گئی ہے۔ غزلوں کے اس مجموعہ کو اس شعر سے شروع کیا گیا ہے۔

گونج تھی مجھ میں نہ جانے کن رُتوں کی اے شفیق
اتنا دل آزاد ہو کر بھی غزل لکھتا رہا

شفیق طاہری کی شاعری میں مذہب، فلسفہ، تاریخ، نفسیات سبھی کچھ مل جائے گا۔ یہ آسان لفظوں کی شاعری ہے اور خوب ہے یہ زبان نئے شاعروں کے لیے نشانِ راہ کا کام دے سکتی ہے۔ شاعروں کو صرف الفاظ کی جادوگری نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ یہ شعوری فکر کے تابع بھی ہوتی ہے۔

——— شبنم رضوی

نام کتاب: "پیش رفت"
شاعر: ڈاکٹر محبوب راہی قیمت: ۵۰/- روپے
ملنے کے پتے: (۱) ایم ایم ایجنسی، پارس ناگی ضلع اکولہ (مہاراشٹر)
(۲) اسباق پبلی کیشنز، ۲/۴۲ نیتا پارک، ایروڈہ (پونہ)

"پیش رفت" ڈاکٹر محبوب راہی کی غزلوں کا چوتھا شعری مجموعہ ہے۔ یوں تو راہی صاحب مختلف موضوعات اور اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کرتے رہتے ہیں، بچوں کی شاعری، قومی اور وطنی نظمیں، طنز و مزاح، نسوانی موضوعات پر نظمیں، قطعات و رباعیات وغیرہ لیکن ان کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں تمام اصناف میں غزل زیادہ عزیز ہے۔

پیشِ نظر مجموعۂ کلام "پیش رفت" ۱۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اچھا کاغذ، بہتر کتابت اور آفسیٹ کی طباعت ہے۔ ظ۔ انصاری، مظفر حنفی، وزیر آغا، مخمور سعیدی اور نذیر فتحپوری نے ان کی شاعری سے متعلق اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں، ان سبھی ادیبوں نے راہی صاحب کے روشن مستقبل کے امکانات پر اظہارِ خیال کیا ہے۔

ڈاکٹر محبوب راہی جدید نسل سے تعلق ضرور رکھتے ہیں مگر ہوش مند ہیں کہ انھوں نے روایت سے اپنا رشتہ استوار رکھا ہے ؎

ہنگامۂ شہرِ جاں میں مسلسل لہو سے ہے
احساس میں جو جتنی بھی ہلچل لہو سے ہے

——— سلیم عمر

اودھ نمبر (۲)

تاثرات کے آئینے میں

آپ نے اودھ کی مرقع نگاری کا جو بیڑا اُٹھایا ہے، معلوم نہیں وہ کب مکمل ہوگا۔ میرا خیال تھا کہ پہلے اودھ نمبر میں اتنا کچھ لکھا جاچکا ہے کہ مزید کہنے کو کچھ نہیں بچا، لیکن جب اودھ نمبر حصہ دوم نظر افروز ہوا تو معلوم ہوا کہ آپ کی زنبیل میں بہت سے گوہر و جوہر موجود ہیں۔ ابھی آپ کا قلم ادارت تھکا نہیں۔ عام شماروں میں بھی اس موضوع پر ترزبانی کر رہا ہے۔ اسی کو کہتے ہیں رئیس تحریر!

متعدد مضامین میرے جی کو لگے۔ ان کے نام گنواؤں تو بقیہ مضمون نگاروں کے شیشۂ دل کو ہلکی سی ٹھیس لگے گی، جو مجھے منظور نہیں۔ ہاں ایک مضمون کا نام لیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ ہے ڈاکٹر نیر مسعود کا مضمون "اودھ میں فنِ سپہ گری"۔ کیا کیا معلومات ہیں! ایک نئی دنیا ہے! نیر مسعود اس کم عمری میں جہاں دیدہ بزرگوں کے انداز کے مضامین لکھنے پر قادر ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے خود مسعود حسن رضوی مرحوم معلومات کے پٹارے کھول رہے ہیں۔

شرر نے 'گزشتہ لکھنؤ' لکھی۔ نیا دور کے دونوں نمبر اتنے ہی اہم ہیں۔ انھیں کتابی شکل میں آنا چاہیے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اودھ نمبروں کے بعد کے عام شماروں میں سے بھی منتخب مضامین لیے جائیں اور اودھ نمبروں میں سے چند مضامین خارج کر دیے جائیں۔ جملہ قابلِ اشاعت مضامین کی موضوعی گروہ بندی کی جائے اور انھیں کتابی شکل دی جائے۔ کتاب تیار ہو جائے تو گزشتہ لکھنؤ کی طرح مفید ہوگی، یہ اس معنی میں اس کا تکملہ اور تتمہ ہوگی کہ اس میں گزشتہ لکھنؤ کے ساتھ موجودہ لکھنؤ بھی جلوہ بار ہوگا۔

—— (پروفیسر) گیان چند
لکھنؤ

چند روز قبل 'نیا دور' کا اودھ نمبر (۲) ملا۔ بہت بہت شکریہ! آپ نے بیحد اچھا نمبر نکالا۔ مضامین بھی بہت کارآمد اور معلومات افزا ہیں اور تصاویر اور حسنِ طباعت نے اسے چار چاند لگا دیے ہیں۔ میں نے فوراً ایک ہی نشست میں تمام ضروری چیزیں پڑھ لیں۔ آپکی یہ کوشش قابلِ صد ستائش اور لائقِ مبارکباد ہے۔

—— اسلوب احمد انصاری
علی گڑھ

آج کی ڈاک سے نیا دور کا اودھ نمبر حصہ دوم ملا۔ بہت بہت شکریہ۔ صاحب، یہ نمبر دیکھ کر بے ساختہ یہ الفاظ زبان پر جاری ہو گئے:

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

مبارک باد۔ بہت خوبصورت، بہت سلیقہ سے، بہت اچھا نمبر آپ نے شائع کیا ہے۔ مضامین سب بہت اچھے ہیں۔

—— محمد انصار اللہ
علی گڑھ

مجھ بیمار پر آپ نے کیا "قہر" نازل کر دیا ہے، لکھنؤ کا ایک چھوٹا علمی خزانہ عنایت کر دیا! اب دن کا چین اور رات کا آرام گیا۔ جب سے نیا دور آیا ہے، سونا محال ہو گیا ہے۔ آپ نے بیحد کرم اور "ظلم" بھی کیا ہے۔ میں عمرِ طبیعی کی آخری منزل میں قدم رکھ چکا ہوں۔ آپ کو چاہیے تھا کہ مجھ پر رحم کریں نہ کہ "ستم"! میں بنیادی طور پر ایک قاری ہوں جس نے رابرٹ موزیل کی کتابیں پڑھی ہیں اب جاکے میلان کنڈرا نے اس کی عظمت تسلیم کی ہے۔

—— باقر مہدی
بمبئی

اودھ نمبر کا دوسرا حصہ ملا۔ دیکھ کر آنکھیں روشن ہو گئیں۔ اس دستاویزی نمبر میں اودھ کے ادبی و لسانی، تہذیبی، ثقافتی اور معاشرتی حالات و حقائق پر بڑے مفید اور معلوماتی مضامین شامل ہیں۔ اودھ کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے دونوں نمبر حوالے کا کام دیں گے۔ اس صحافتی کارنامے پر میری طرف سے مبارک باد قبول کیجئے۔

—— فضا ابن فیضی مئو ناتھ بھنجن

عنوانات

اپنی بات	ایڈیٹر	۲
اشعار	جگن ناتھ آزاد	۳
کلیاتِ میر	اکبر حیدری کشمیری	۴
غزلیں	ضیاء قادری - حیات لکھنوی	۲۰
	اکبر علی بیگ	۲۰
خودنوشت سوانحی خاکہ	ڈاکٹر عبد المغنی	۲۱
آنکھ (انشائیہ)	محمد زماں آزردہ	۲۵
غزل	شکیب رضوی	۲۶
اور ہم ناچیز بندے (نظم)	شباب للت	۲۷
لہو کی شفق (نظم)	آفاق فاخری	۲۷
شاہ ولایت منگلوری	تنویر چشتی	۲۸
غزلیں	ظفر مہدی - اسد رضا	۳۴
	زبیر شفائی	۳۴
چھت (افسانہ)	م۔ک۔ مہتاب	۳۵
ڈاکٹر راہی معصوم رضا: حیات اور شاعری	حیدر علی خاں	۳۷
پتنی (نظم)	نظر برنی	۴۰
نئی حکومت کے نئے عزائم	احمد نسیم صدیقی	۴۱
نئی حکومت، نئے ارادے	شکیل احمد	۴۲
نئی حکومت اور اقلیتیں	محمد سبطین	۴۳
نقد و تبصرہ	اختر بستوی - اسحاق سنبھلی	۴۴
	خلیل اللہ خاں - ظفر محمود -	۱۰
	دانش لکھنوی - عتیق الہ آبادی	۴۷
	عقیل احمد - بدر الدین	
اودھ نمبر (۲) تاثرات کے آئینے میں		۴۸

نیادور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اتر پردیش اُن سے بہر حال متفق ہو

اودھ نمبر (۲)

تاثرات کے آئینے میں

آپ نے اودھ کی مرقع نگاری کا جو بیڑا اُٹھایا ہے، معلوم نہیں وہ کب مکمل ہوگا۔ میرا خیال تھا کہ پہلے اودھ نمبر میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ مزید کہنے کو کچھ نہیں بچا، لیکن جب اودھ نمبر حصہ دوم نظر افروز ہوا تو معلوم ہوا کہ آپ کی زنبیل میں بہت سے گوہر و جوہر موجود ہیں ابھی آپ کا قلم ادارت تھکا نہیں۔ عام شماروں میں بھی اس موضوع پر تر زبانی کر رہا ہے۔ اسی کو کہتے ہیں رئیس تحریر!

متعدد مضامین میرے جی کو لگے۔ ان کے نام گنواؤں تو بقیہ مضمون نگاروں کے شیشۂ دل کو ہلکی سی ٹھیس لگے گی، جو مجھے منظور نہیں۔ ہاں ایک مضمون کا نام لیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ ہے ڈاکٹر نیّر مسعود کا مضمون "اودھ میں فنِ سپہ گری"۔ کیا کیا معلومات ہیں! ایک نئی دنیا ہے! نیّر مسعود اس کم عمری میں جہاں دیدہ بزرگوں کے انداز کے مضامین لکھنے پر قادر ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے خود مسعود حسن رضوی مرحوم معلومات کے پٹارے کھول رہے ہیں۔

شرر نے 'گزشتہ لکھنؤ' لکھی۔ نیا دور کے دونوں نمبر اتنے ہی اہم ہیں۔ انھیں کتابی شکل میں آنا چاہیے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اودھ نمبروں کے بعد کے عام شماروں میں سے بھی منتخب مضامین لیے جائیں اور اودھ نمبروں میں سے چند مضامین خارج کر دیے جائیں جملہ قابلِ اشاعت مضامین کی موضوعی گروہ بندی کی جائے اور انھیں کتابی شکل دی جائے۔ کتاب تیار ہو جائے تو گزشتہ لکھنؤ کی طرح مفید ہوگی، یہ اس معنی میں اس کا تکملہ اور تتمہ ہوگی کہ اس میں گزشتہ لکھنؤ کے ساتھ موجودہ لکھنؤ بھی جلوہ بار ہوگا۔

——— (پروفیسر) گیان چند
لکھنؤ

چند روز قبل نیا دور کا اودھ نمبر (۲) ملا۔ بہت بہت شکریہ! آپ نے بیحد اچھا نمبر نکالا۔ مضامین بھی بہت کارآمد اور معلومات افزا ہیں اور تصاویر اور حسنِ طباعت نے اسے چار چاند لگا دیے ہیں میں نے فوراً ایک ہی نشست میں تمام ضروری چیزیں پڑھ لیں۔ آپکی یہ کوشش قابلِ صد ستائش اور لائقِ مبارکباد ہے۔

——— اسلوب احمد انصاری
علی گڑھ

آج کی ڈاک سے نیا دور کا اودھ نمبر حصہ دوم ملا۔ بہت بہت شکریہ۔ صاحب، یہ نمبر دیکھ کر بے ساختہ یہ الفاظ زبان پر جاری ہو گئے؛

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

مبارک باد۔ بہت خوبصورت، بہت سلیقہ سے، بہت اچھا نمبر آپ نے شائع کیا ہے۔ مضامین سب بہت اچھے ہیں۔

——— محمد انصار اللہ
علی گڑھ

مجھ بیمار پر آپ نے کیا "قہر" نازل کر دیا ہے، لکھنؤ کا ایک چھوٹا علمی خزانہ عنایت کر دیا! اب دن کا چین اور رات کا آرام گیا۔ جب سے نیا دور آیا ہے، سونا محال ہو گیا ہے۔ آپ نے بیحد کرم اور "ظلم" بھی کیا ہے۔ میں عمرِ طبعی کی آخری منزل میں قدم رکھ چکا ہوں، آپ کو چاہیے تھا کہ مجھ پر رحم کریں نہ کہ "ستم"! میں بنیادی طور پر ایک قاری ہوں جس نے رابرٹ موزیل کی کتابیں پڑھی ہیں اب جا کے میلان کنڈیرا نے اس کی عظمت تسلیم کی ہے۔

——— باقر مہدی
بمبئی

اودھ نمبر کا دوسرا حصہ ملا۔ دیکھ کر آنکھیں روشن ہو گئیں۔ اس دستاویزی نمبر میں اودھ کے ادبی و لسانی، تہذیبی، ثقافتی اور معاشرتی حالات و حقائق پر بڑے مفید اور معلوماتی مضامین شامل ہیں۔ اودھ کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے دونوں نمبر حوالے کا کام دیں گے۔ اس صحافتی کارنامے پر میری طرف سے مبارک باد قبول کیجئے۔

——— فضا ابن فیضی مئوناتھ بھنجن

جلد ۵۵ نمبر ۴

عنوانات

اپنی بات	ایڈیٹر	۲
اشعار	جگن ناتھ آزاد	۳
کلیاتِ میر	اکبر حیدری کشمیری	۴
غزلیں	ضیاء قادری ۔ حیات لکھنوی	۲۰
	اکبر علی بیگ	۲۰
خود نوشت سوانحی خاکہ	ڈاکٹر عبد المغنی	۲۱
آنکھ (انشائیہ)	محمد زماں آزردہ	۲۵
غزل	شکیب رضوی	۲۶
اور ہم ناچیز بندے (نظم)	شباب للت	۲۷
لہو کی شفق (نظم)	آفاق فاخری	۲۷
شاہ ولایت منگلوری	تنویر چشتی	۲۸
غزلیں	ظفر مہدی ۔ اسد رضا	۳۴
	زبیر شفائی	۳۴
چھت (افسانہ)	م.ک. مہتاب	۳۵
ڈاکٹر راہی معصوم رضا:— حیات اور شاعری	حیدر علی خاں	۳۷
پتنی (نظم)	نظر برنی	۴۰
نئی حکومت کے نئے عزائم	احمد نسیم صدیقی	۴۱
نئی حکومت، نئے ارادے	شکیل احمد	۴۲
نئی حکومت اور اقلیتیں	محمد سبطین	۴۳
نقد و تبصرہ	اختر بستوی ۔ اسحاق سنبھلی	۴۴
	خلیل اللہ خاں ۔ ظفر محمود ۔	۱۰
	دانش لکھنوی ۔ عتیق الہ آبادی	۴۷
	عقیل احمد ۔ بدر الدین	
اردو نمبر (۲) تاثرات کے آئینے میں		۴۸

اپنی بات

نظیر اکبرآبادی نے "برسات کی بہاریں" ایک طرف پیش کی تھیں، دوسری طرف اس سے پہلے میر صاحب نے برسات کا ایک نقشہ کھینچا تھا، جس میں کیفیت یہ تھی کہ

آقا جو ڈگمگائے تو نوکر پھسل پڑا!

رجب علی بیگ سرور نے لکھنؤ کی برسات کی تو تعریف کی ہے مگر کان پور کی برسات کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ یقیناً دورِ حاضر کی برسات پر کسی حد تک صادق آتا ہے۔ برسات کا آغاز ساون کے مہینے سے ہوتا تھا۔ جھولے پڑتے تھے باغوں میں۔ جھیلوں میں، "تالابوں میں لہریں اٹھتی تھیں اور جذباتِ انسانی کو آواز دیتی تھیں ـــــ مگر دورِ حاضر کی تیز رفتار صنعتی زندگی نے یہ سارا حُسن چھین لیا ہے۔ اب تو فطرت نے بھی اپنا مزاج بدل دیا ہے، ساون کی بدلی مشہور تھی، اب ساون میں دُھوپ چٹخنی ں ہے۔ برسات نہ ہو جب بھی مسائل پیدا ہوتے ہیں اور جب برسات ہوتی ہے تو بھی مسائل پیدا ہوتے ہیں! کتنا اچھا ہوتا اگر انسان اور فطرت کی ہم آہنگی کے دن لوٹ آتے۔!

ادارہ ان تمام بزرگوں اور کرم فرماؤں کا ممنون و متشکر ہے جنھوں نے حوصلہ افزائی کے کلمات لکھے۔ عظیم محقق پروفیسر گیان چند نے اس خادم کو رئیس تحریر کا جو تمغۂ عنایت فرمایا ہے وہ ہمارے لئے باعثِ صد افتخار ہے۔ اسی طرح اور بھی بزرگوں نے ہمت افزا کلمات کے ذریعہ اودھ نمبر کی توصیف کی۔ ہم انھیں یقین دلاتے ہیں کہ آئندہ نمبر خصوصاً نصف صدی نمبر ادارے کی روایات کے شایانِ شان ہوگا۔

باباصاحب بھیم راؤ امبیڈکر نے ہندستان کے عظیم آئین و دستور کی شکل میں ملک کو جو تحفہ دیا تھا وہ ناقابلِ فراموش ہے، یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کے ایک خواب کی تعبیر اترپردیش کی موجودہ حکومت ہے جس کی سربراہ محترمہ مایاوتی ہیں جو کہ دلت طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود بارہا اس کا اعلان کر چکی ہیں کہ وہ پورے سماج کی بہتری اور اترپردیش کی فلاح و بہبود کے لیے کام کریں گی۔

ادارہ اُن کے نیک مقاصد میں کامیابی کے لئے دُعاگو ہے۔

گزشتہ ۳۰ر جون ۱۹۹۵ء کو ۸ بجے شب میں شارب لکھنوی کا انتقال ہوگیا۔ وہ کلاسیکی مزاج اور نستعلیق ادبی شخصیت کے مالک تھے۔ غزلیں بھی کہتے تھے لیکن ان کا مخصوص رنگ قصائد میں نکھرتا تھا ان کے چار مصرعے بے حد معروف ہیں ؎

کفن کو صرف نشانۂ موت ہی نہ کہو کہ روشنی کی کرن بھی کفن سے ملتی ہے
محبِّ آلِ نبیؐ کو کہیں بھی دفن کرو یہ خاک جا کے درِ پنجتنؑ سے ملتی ہے

شارب لکھنوی طبیبِ حاذق تھے اور دستِ شفا بھی رکھتے تھے۔ ادارہ ان کے لیے سوگوار ہے، ان کے پس ماندگان کے ساتھ شریکِ غم ہے۔ یقین ہے کہ اترپردیش اُردو اکادمی ان کی ناقابلِ فراموش ادبی خدمات کا لحاظ کرے گی۔

ـــــــــــ ایڈیٹر

اشعار

پروفیسر جگن ناتھ آزاد
شعبۂ اردو، جموں یونیورسٹی، جموں توی ۱۸۰۰۰۱

خار بن کر کبھی دل میں چبھتے رہیں، پھول بن کر کبھی مسکراتے رہیں
آج سرمایۂ زندگی ہے یہی، وقت گزرے ہوئے یاد آتے رہیں
جسم بھی تھک چکا، روح بھی تھک چکی، راستہ کیا خبر کتنا تاریک ہو
اپنی یادوں کے بجھتے دیوں سے کہو، ٹمٹماتے رہیں، جھلملاتے رہیں
کیا خبر کیا حقیقت ہے کیا خواب ہے، میں تو یہ راز سمجھا ہوں بس اس قدر
خواب کی طرح سے آپ آتے رہے، خواب کی طرح سے آپ آتے رہیں

اب اس مقام پہ اے دل تو اس قدر نہ ٹھہر
کہ واپسی پہ یہیں سے مجھے گزرنا ہے

واعظ تری دُنیا میں ہے تقویمِ جہاں اور
رندوں کا ہے اندازِ جہانِ گزراں اور

جن سے وابستہ ہیں اے آزادؔ! افسانے بہت
آج یاد آئے وہ سب گم گشتہ یارانے بہت
دَرد ہو دل میں تو دَرد آگاہ دیوانے بہت
شمع کو جلنے کا ڈھنگ آئے تو پروانے بہت
جو حقیقت ہے حقیقت ہے فسانوں پہ نہ جا
یوں تو دُنیا نے بنا ڈالے ہیں افسانے بہت
طالبِ پیمانہ مستی کا تعلق دل سے ہے
دل میں ہو مستی تو اس محفل میں پیمانے بہت
قافلے والوں میں شاید کوئی دیوانہ نہیں
یوں تو ہونے کو ہیں چاروں سمت ویرانے بہت
اے وطن[۱] صحراؤں سے آباد تیری ہی طرح
میرے سینے میں بھی ہیں آباد ویرانے بہت

جس طرح ٹوٹتا ہے نشہ جامِ مے کے بعد
رات اس طرح سے میرا بدن ٹوٹتا رہا

---

۱ اپنی زاد بوم عیسیٰ خیل اور میانوالی کا علاقہ مراد ہے (آزادؔ)

اکبر حیدری کشمیری
۱۲۱۔ نیا گاؤں (ایسٹ)، لکھنؤ

کلیاتِ میر

سودا کے انتقال کے بعد نواب آصف الدولہ بہادر نے میر کو زادِ راہ بھیج کر دہلی سے لکھنؤ طلب کیا۔ بقول مرزا علی لطف (گلشنِ ہند ص۱۵۲ سالِ تصنیف ۱۸۰۰ء) میر ۸۳-۱۷۸۲ء میں لکھنؤ پہونچے اور پھر آخر عمر تک یہیں کے ہو رہے۔ انھوں نے ۱۸۱۰ء میں انتقال کیا۔ تذکروں سے ثابت ہے کہ قیامِ دہلی تک میر نے ایک ہی دیوان ترتیب دیا تھا۔ مبتلا لکھنوی نے اپنا تذکرہ گلشنِ سخن ۱۱۹۴ھ (مطابق ۱۷۸۰ء) میں ترتیب دیا تھا۔ وہ میر کے ترجمے میں لکھتے ہیں:

"مسموع شد کہ در شاہجہان آباد، تا حالتِ تحریر
این گلشنِ سخن کہ سنہ یک ہزار و یک صد و نود و چہار
ہجری ست بسلامت استقامت دارد...... دیوان
فصاحت بیانش چہار پنج ہزار بیت۔"

(گلشنِ سخن ص۲۰۵)

مصحفی (تذکرۂ ہندی ص۲۰۴ سالِ تصنیف ۱۲۰۹ ہجری مطابق ۹۵-۱۷۹۴ء) اور لطف (گلشنِ ہند ص۱۵۲ سالِ تصنیف ۱۲۱۵ھ م ۱۸۰۰ء) نے میر کے چار دواوین کا ذکر کیا ہے۔ سرور (عمدۂ منتخبہ ص۵۵۵ سالِ تصنیف ۱۸۰۲ء) اور شاہ کمال (مجمع الانتخاب قلمی سالِ تصنیف ۱۸۰۳ء) نے میر کے پانچ دیوان لکھے ہیں۔ یحیٰ لکھنوی نے دستور الفصاحت میں میر کا ترجمہ میر کے انتقال کے بعد لکھا ہے۔ انھوں نے میر کے چھ دیوان اور ایک "دیوانچہ" کا ذکر کیا ہے (دستور الفصاحت ص۲۲)۔ ان شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ میر نے دہلی میں صرف ایک اور لکھنؤ میں پانچ دیوان مرتب کیے تھے۔ دیوانچہ کا نام و نشان نہیں مل رہا ہے۔

ہمارے پیشِ نظر ادبیاتِ اُردو حیدرآباد کے میر کے دیوانِ دوم کا عکس ہے۔ یہ نسخہ ۱۱۹۲ھ (۱۷۷۸ء) کا مکتوبہ ہے اور میر کا قدیم ترین دیوان ہے، جو دہلی میں لکھا گیا تھا۔ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ میر نے دہلی میں کتنے اور لکھنؤ میں کتنے دیوان مرتب کیے تھے۔ بہر حال ان کے انتقال سے قبل ہی ان کا کلیات چھ دیوان پر مشتمل مع مثنویات، قصائد، مناقب مرتب ہو چکا تھا جو ان کی زندگی میں چھپنا شروع ہوا اور پھر ان کی وفات کے ایک سال بعد ۱۲۲۶ھ (مطابق ۱۸۱۱ء) میں شائع ہوا۔ یہ کلیات (نسخۂ کلکتہ) اب نادر و نایاب ہے اور مشکل سے برصغیر میں دو تین نسخے موجود ہوں گے۔ راقم الحروف نے اس پر دیوان میر نسخۂ محمود آباد اور نقوشِ لاہور میر تقی میر نمبر ا میں مفصل بحث کی ہے۔ نسخۂ محمود آباد کمیاب اور نسخۂ لاہور ہندوستان میں دستیاب نہیں ہے۔ ذیل میں کلیاتِ میر کے ان نادر الوجود مطبوعہ اور قلمی نسخوں کی تفصیلات مختصراً درج کی جاتی ہیں، جو راقم کے مطالعہ میں رہے ہیں:

(۱) کلیاتِ میر (نسخۂ کلکتہ) کتب خانۂ شبلی نعمانی، لکھنؤ ۱۸۱۱ء تقطیع "۸×۱۱" صفحات ۱۰۸۵ لیتھو ٹائپ۔ سرورق پر ذیل کی عبارت درج ہے:

"کلیاتِ میر تقی مدرسۂ عالیہ کے لئے نوازش و تفضلات سے صاحبانِ عالی شان کالج کونسل کے عہدِ حکومت میں زبدۂ نوئینانِ عظیم الشان مشیر خاص شاہ کیوان بارگاہ انگلستان لارڈ منٹو گورنر جنرل بہادر دام ظلہ، کے حسب الارشاد کپتان ٹیلر صاحب مدرس ہندی دام اقبالہ اور اعانت و پرورش سے ڈاکٹر ولیم ہنٹر صاحب دام حشمتہ اور عنایت و کرم سے کپتان

کالوی صاحب دام ثروتہ اور مرحمت و امداد سے کپتان
تامس روبک صاحب دام افضالہ کی بتصحیح مرزا کاظم علی
جوان اور مرزا جان طپش و مولوی محمد اسلم و تارنی چرن
متر و منشی غلام اکبر ۱۸۱۱ عیسوی میں مطابق ۱۲۲۶ھ
ہندوستانی چھاپے خانے میں چھاپا کیا ہوا منشی
مدار بخش کا۔"

ابتدا میں "قصائد و منقبت وغیرہ" کے تحت ۱۰ صفحوں میں حضرت علیؑ، حضرت امام حسینؑ اور نواب آصف الدولہ بہادر کی تعریف میں چند قصائد ہیں۔ قصائد کے بعد دواوین شروع ہوتے ہیں۔ ذیل میں ہر دیوان کا ابتدائی شعر (مطلع) درج کیا جاتا ہے:

دیوانِ اوّل صفحہ ۱۹ سے

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا

دیوان دُوم صفحہ ۲۵۵ سے

ہر ذی حیات کا ہے سبب جو حیات کا
نکلے ہے جی ہی اس کیلئے کائنات کا

دیوان سِوم صفحہ ۴۳۸ سے

میرے مالک نے میرے حق میں یہ احسان کیا
خاک ناچیز تھا میں سو مجھے انسان کیا

دیوان چہارم صفحہ ۵۲۸ سے

کرتا ہوں اللہ اللہ درویش ہوں سدا کا
سرمایۂ توکل یاں نام ہے خدا کا

دیوان پنجم صفحہ ۶۱۱ سے

دل رفتۂ جمال ہے اس ذوالجلال کا
مستجمع جمیعِ صفات و کمال کا

دیوان ششم صفحہ ۸۰۰ سے

فلک نے پیس کر سرمہ بنایا
نظر میں اس کی میں تو بھی نہ آیا

غزلیات کے بعد فردات صفحہ ۶۹۰، تضمین مطلع خود با مطلع استاد، ۹۰۰-۹۶۹، رباعیات صفحہ ۹۰۰، مستزاد صفحہ ۹۹۵، قطع بند در منقبت امیرالمومنین، صفحہ ۹۹۷، مخمس در منقبت، ۹۹۷، ایضاً ترکیب بند صفحہ ۸۱۳، مخمسات، مسدسات، مثلث، ہفت بند صفحہ ۸۸۴ تک۔ پھر صفحہ ۸۸۵ سے ۱۰۹۹ تک مثنویاں ہیں۔ اس طرح کلیات کا خاتمہ مثنوی 'خواب و خیال' کے اشعار ذیل پر ہوتا ہے:

دکھایا نہ اس مہ نے رو خواب میں — نہ دیکھا پھر اس کو کبھو خواب میں
بہت بے خود و بے خبر ہو چکا — ہم آغوشی طالع بہت سو چکا
نہ دیکھا کبھو میر پھر وہ جمال
وہ صحبت تھی گویا کہ خواب و خیال

اس کے بعد یہ عبارت ہے: "بعون اللہ در ساعت مسعود زمان محمود کلیات میر تمام شد۔"

صفحہ ۱۱۰۰ سے ۱۱۰۳ تک فہرست کلیات میر ہے صفحہ ۱۱۰۴ تا ۱۱۰۵ غلط نامہ ہے۔ پھر دو سطروں میں یہ عبارت ہے:

"ناظرین پر ظاہر ہو کہ جہاں جہاں مرکز کاف کاف کے نقطے ٹوٹ گئے ہوں اور عبارت کے قرینے سے وے الفاظ پڑھے جائیں ان کو غلط نامہ میں داخل نہ کیا۔"

غلط نامے کے آخر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے سرکاری پریس کی مہر ہے جس میں یہ حروف ہیں: "FINIS" اسی طرح دیوان ششم کے خاتمے میں صفحہ ۹۶۸ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی مہر ہے۔ اس کے دائیں بائیں انگریزی میں ذیل کے حروف ہیں:

'DIFU ET MONDROIT'

کلیات میر نسخہ کلکتہ میں میر کا سارا کلام نہیں چھپا ہے اور یہ نامکمل ہے۔ معلوم نہیں کہ مسودہ میر کی نظر سے گزرا تھا کہ نہیں۔ اس میں میر کا دیوان مرثیہ، ترجیع بند، کچھ مثنویاں اور قصائد کا فقدان ہے۔ بعض مقامات میں غزلوں کی تکرار ہے۔ مثال کے طور پر صفحہ ۲۳۰ دیوان دوم میں ذیل کی تین غزلیں درج ہیں ؎

(۱) اے نکیلی یہ تھی کہاں کی ادا
کھب گئی جی میں تری بانکی ادا

۲۔ رہا میں تو عزت کا اعزاز کرتا   چلا عشق خواری کو ممتاز کرتا

۳۔ عید آئندہ تک رہے گا گلا   ہو چکی عید تو گلے نہ ملا

یہ غزلیں دوبارہ دیوان پنجم صفحہ ۶۱۶۔۱۷ میں شامل کی گئی ہیں۔

یہ بے ترتیبی اور بے احتیاطی کلیات میر (قلمی) مکتوبہ ۱۲۳۸ھ مطابق ۲۰ جنوری ۱۸۲۳ء اور سبھی کلیات میر کے مطبوعہ نسخوں میں پائی جاتی ہے۔ ترقی اُردو بورڈ نئی دہلی نے اگست ۱۹۸۳ء میں ظل عباس عباسی کا مرتب کردہ کلیاتِ میر شائع کیا۔ اس میں بھی دیوان دوم صفحہ ۲۷۶۔۷۷ اور دیوان پنجم صفحہ ۶۹۴ اور ۶۹۶ میں یہ غزلیں دوبارہ شامل کی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ ذیل کی غزلوں میں بھی تکرار واقع ہوئی ہے ؎

۱۔ سمندر کا میں کیوں احسان سہوں گا

دیوان دوم صفحہ ۳۷۸، دیوان پنجم صفحہ ۶۹۶

۲۔ کب وعدے کی رات وہ آئی جو آپس میں نہ لڑائی ہوئی

دیوان چہارم صـ ۶۴۷، دیوان پنجم صـ ۷۰۰

ترقی اُردو بورڈ کے نسخے میں صرف غزلیں ہیں۔ اسے کلیات کہنا درست نہیں ہے۔ بعد میں میر کی جو غزلیں دریافت ہوئی ہیں وہ بھی اس میں نہیں ہیں۔

کلیاتِ میر: نسخہ لکھنؤ

نسخۂ کلکتہ کے بعد کلیاتِ میر پہلی مرتبہ مطبع نول کشور لکھنؤ سے ۱۸۶۸ء میں چھپا۔ سرورق پر یہ عبارت ہے:

"کلیاتِ میر

یعنی تمام نتائج افکار، ندرت آثار، قدوہ شعرائے اُردو
بیسوائے زبان آوران نغز گو میر کاروان متاع معانی دلپذیر
مغفرت مآب جناب میر تقی صاحب متخلص بہ میر اعانت
والاہمم بحر کرم، قیمت افزائے جواہر، ثمینۂ علم و فن، قدردان
اجناس نفیسۂ شعر و سخن جناب فیض مآب نواب علی بہادر
صاحب سابق والی باندہ مقیم اندور ابداللہ افضالہم
بترتیب و تہذیب پسندہ کتابت و صحت چیدہ۔
مطبع منشی نول کشور لکھنؤ میں بہ حسن اہتمام چھاپا گیا
مرتبہ اول ۱۸۶۸ء"

پورا نسخہ جلی خط میں دبیز کاغذ پر چھپا ہے۔ یہ بھی کمیاب اور نامکمل ہے۔ نسخۂ کلکتہ کی نقل اور مرثیوں سے خالی ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن مطبع نول کشور لکھنؤ سے ۱۸۷۴ء میں چھپا۔ اس میں کوئی اضافہ نہیں ہے، یہ بھی مرثیوں سے خالی ہے۔

اس کے بعد اس کے کئی ایڈیشن متن اور حواشی میں شائع ہوئے ۱۹۴۱ء میں اسی مطبع سے کلیات میر مرتبہ آسی جدید طرز میں شائع ہوا۔ ابتدا میں آسی کا ایک مبسوط مقدمہ ہے۔ مرتب نے کلیات کی ترتیب بدل دی ہے، لکھتے ہیں:

"چوں کہ قلمی نسخوں میں ترتیب مختلف تھی اور مطبوعہ
سب نسخوں کی ترتیب ایک تھی۔ ان میں ایک خاص نقص یہ
تھا کہ کوئی چیز ترتیب وار نہ تھی۔ کہیں عشقیہ قصہ، مثنوی
اور اسی کے ساتھ ہجو۔ اسی کے بعد مدح وغیرہ
لہٰذا ہر چیز کا ایک سلسلہ علیٰحدہ قائم کر کے صفحے میں ٹائٹل
یا لوح کی ایک صورت قائم کر دی گئی۔"

آسی مرحوم نے پہلی دفعہ زیرِ نظر کلیات میں کچھ غیر مطبوعہ کلام بھی دریافت کر کے شائع کیا۔ تفصیل یہ ہے:

(۱) مثنوی در ہجو شخصے ہیچمدان کہ دعویٰ ہمہ دانی داشت صفحہ ۵۹
(۲) مثنوی جنگ نامہ ″ ۶۴
(۳) ترجیع بند در منقبت حضرت علیؓ ″ ۶۰۷
(۴) دو غزلیں ″ ۶۷

۴۔ کلیاتِ میر: مرتبہ عبادت بریلوی

میر کا یہ نسخہ ادبی دنیا کراچی نے ۱۹۵۸ء میں شائع کیا، اور یہ لکھنؤ یونیورسٹی میں ڈی لٹ ڈگری کے لئے پیش ہونے والا تھا کلیات میں ۱۴۵۴ صفحات ہیں۔ ابتدا میں سو صفحات کا مقدمہ ہے۔ اس میں کوئی نئی بات نہیں ہے، البتہ بریلوی صاحب نے ڈاکٹر گیان چند جین صاحب کی دریافت کردہ دو اور خواجہ احمد فاروقی صاحب کی ایک مثنوی کلیات میں دوبارہ شامل کی ہیں اور وہ یہ ہیں:

(۱) مثنوی جوان و عروس (۲) مور نامہ
(۳) مثنوی کتخدائی بشن سنگھ

مثنویوں کے علاوہ مرتب نے ایک غزل صفحہ ۱۰۷۲ میں نقل کی ہے اور اس کے ساتھ "غزلِ غیر مطبوعہ" بھی لکھا ہے۔ مطلع یہ ہے:

رہے عمر بھر دیکھتے سادگاں کو
یہی جینے نہیں دیتے دلدادگاں کو

ڈاکٹر بریلوی صاحب کو اس غزل کے بارے میں غلط فہمی ہوگئی ہے۔ یہ دراصل نسخۂ آسی میں صفحہ ۹۱ میں "غزلِ غیر مطبوعہ" کے نام سے چھپی ہے۔ مرتب کا یہ دعویٰ درست نہیں ہے کہ ان کے سامنے ترتیبِ کلیات کے وقت تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخے موجود تھے۔ اس کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اس نے رامپور، سالار جنگ میوزیم اور راجہ صاحب محمود آباد کے کتب خانوں کی سیر کی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے تقریباً ڈیڑھ ہزار صفحات کی ضخیم کتاب میں ایک غیر مطبوعہ شعر کا بھی اضافہ نہیں کیا۔ یہ نسخہ بھی تکرار اشعار کا شکار ہوگیا ہے اور اس میں بہت سے اشعار غلط درج کیے گئے ہیں۔ ان غلط اشعار کی نشان دہی ہم نے دیوانِ میر نسخۂ محمود آباد اور نسخۂ لاہور میں کی ہے۔ یہاں صرف ایک مثال دی جاتی ہے۔ مطبوعہ کلیاتِ میر نسخۂ کلکتہ، نسخۂ لکھنؤ اور نسخۂ آسی میں دیوانِ چہارم میں ایک شعر یوں چھپا ہے ؎

ان پریوں سے لڑکوں کے چھیڑے میں دل آئے
حیرت زدۂ عشق میں دیوار ہیں ہم لوگ

ڈاکٹر بریلوی صاحب نے بھی یہ شعر جوں کا توں لکھا ہے۔ اگر انھوں نے راجہ صاحب محمود آباد کے کتب خانے کو اصلیت میں دیکھا ہوتا تو یہ غلطی نہ کرتے۔ یہ شعر میر کے دیوانِ چہارم میں دو اشعار اس طرح درج ہیں ؎

ان پریوں سے لڑکوں کے چھیڑے میں دل آئے
بے ہوش و خرد جیسے پری دار ہیں ہم لوگ
در پر کسو کے جا کے کھڑے ہوں تو کھڑے ہوں
حیرت زدۂ عشق ہیں دیوار ہیں ہم لوگ

ڈاکٹر صاحب کا شامل کردہ مرثیہ بھی اغلاط سے پر ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر مسیح الزماں مرحوم کے میر کے دریافت کردہ جو مرثیے شامل کئے ہیں ان میں بھی متعدد اغلاط موجود ہیں۔ بریلوی صاحب نے کلیاتِ میر کے مقدمے میں ایک قلمی نسخے کا بھی ذکر نہیں کیا ہے۔

(۴) کلیاتِ میر (قلمی) کتب خانہ شبلی نعمانی لکھنؤ

سائز "۸×۱۲" سطر ۱۵ سال کتابت ۱۲۴۵ھ

یہ میر کے دیوان دوم اور دیوان ششم پر مشتمل ہے۔ غزلوں کے علاوہ اس میں رباعیات، مثنویاں، مخمس اور مناقب ہیں۔ ترجیع بند در منقبت حضرت علیؑ غیر مطبوعہ ہے۔ آسی نے اپنے مرتب کردہ کلیات میر میں یہ ترجیع بند یہیں سے اخذ کرکے شامل کیا۔ دیوان دوم کا خاتمہ ان اشعار پر ہوتا ہے ؎

شان سے کہتے ہیں محیط کل — قدرے قادر و خدائے قدیر
تو موالی علیؑ پرست نصیر — چاہے سو ہم کو کہہ لے اب اے میر
ہم علیؑ کو خدا نہیں جانا
پر خدا سے جدا نہیں جانا

دیوان ششم اس غزل پر ختم ہوتا ہے ؎

عشق کیا کوئی اختیار کرے — وہی جی مارے جس کو پیار کرے

(۷ شعر)

ترقیمہ: "دیوان میر تقی صاحب بتاریخ بستم شہر ذی الحجہ ۱۲۴۵ھ (مطابق ۲ر مئی ۱۸۲۹ء) .... اتمام پذیرفت۔ بخط بندہ جانکی پرشاد عرف کپو لعل قوم کایستھ اشرف آباد۔"

کلیاتِ میر (نسخۂ دوم) کتب خانہ شبلی نعمانی لکھنؤ

مخطوطہ نمبر ۵۸۹ - سائز "۶×۱۰½" سطر ۲۰، سال کتابت ۱۲۳۸ھ

نسخۂ کلکتہ کی نقل معلوم ہوتی ہے۔ ابتدا میں قصائد و مناقب، پھر چھ دیوانِ غزلیات ہیں۔ دیوان اوّل ورق ۱۲۱ ب پر ختم ہوتا ہے۔ اس کے آخر میں ذیل کا ترقیمہ ہے:

"تمام شد دیوان اول میر تقی عفی اللہ عنہ، ۱۲ر جمادی الاوّل ۱۲۳۸ھ مطابق ۲۱ر جنوری ۱۸۲۳ء یوم یکشنبہ۔"

دیوان دوم اور دیوان پنجم کے آخر میں ذیل کے ترقیمے بالترتیب درج ہیں:

"تمت دیوان دوم بعونہ تعالیٰ بتاریخ ۱۶ر جمادی الاوّل"

"تمام شد دیوان پنجم من تصنیف میر تقی میر عفی اللہ عنہ بتاریخ یازدہم جمادی الاول ۱۲۳۸ھ مطابق ۳۰ر جنوری ۱۸۲۳ء یوم جمعہ"

دیوانِ ششم کے بعد ۵۵ اوراق میں مثنویاں ہیں۔ پھر مزید ۵۵ اوراق میں فردیات، رُباعیات، ترکیب بند، مخمسات، مناقب اور قصیدہ مدح آصف الدولہ ہے۔ کلیات کا خاتمہ "در ہجو خواجہ سرا" پر ہوتا ہے۔ پورا کلیات ایک ہی کاتب کا لکھا ہوا اور نسخۂ کلکتہ کے مطابق ہے۔ اس میں بھی بعض غزلوں میں تکرار پائی جاتی ہے۔

(۵) **کلیات میر** (نسخۂ رامپور) کتب خانہ رضا رامپور۔ مکتوبہ رمضان ۱۲۴۶ھ (مطابق فروری ۱۸۳۱ء)

یہ کلیات میر کا بیش بہا نسخہ ہے۔ اس کی اہمیت یوں واضح ہو جاتی ہے کہ اس میں میر کی منظومات کے علاوہ میر کا کلیات نثر بھی شامل ہے۔ یعنی دیوان اُردو، اول سے چھ تک، دیوان فارسی، فیض میر، نکات الشعراء اور ذکر میر۔

تعداد اوراق ۸۲۳ (۱۶۴۶ صفحات) فی صفحہ ۱۷ سطر۔ دیوان اوّل کے خاتمے میں ذیل کا ترقیمہ ہے:

"دیوان اول من تصنیف میر محمد تقی صاحب بتاریخ
بست و ہفتم شہر رمضان سنہ یک ہزار و دو صد و چہل و پنج
ہجری بخط مربوط فقیر پر تقصیر بندہ شیخ لطف علی حیدری
حسب فرمائش مرزا صاحب کرم گستر مرزا قبر علی دام اشفاقہ
اختتام پذیرفت۔"

کلیات کے آخری صفحہ پر ذیل کی عبارت ہے:

"الحمد للہ کہ بفضل ایزد مستعان و عنایات ائمہ
علیہم الصلوٰۃ والسلام کہ کلیات میر محمد تقی صاحب غفر اللہ
ذنوبہ بتاریخ سلخ شہر رمضان المبارک سنہ یکہزار و دو صد و چہل
و شش ہجری بروز دوشنبہ یک پاس روز باقی ماندہ از خط
مربوط احقر العباد شیخ لطف علی حیدری بپاس خاطر
و فرمائش مرزا قبر علی صاحب زاد اشفاقہ صورت اختتام
پذیرفت۔"

مخطوطہ میں پہلے تین دیوان کے بعض مصرعوں اور شعروں کی تشریح اور متبادل الفاظ مندرج ہیں۔ مطبوعہ نسخوں میں ایک مثنوی بہ عنوان "مثنوی در ہجو نا اہل مسمی بہ زبان زد عالم" درج ہے۔ اس نسخے میں اس کا عنوان ہے "مثنوی در ہجو محمد بقا"۔ شارح نے اس کے مقابل لکھا ہے "شاعر بود"۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی بقا اللہ بقا کی ہجو میں ہوگی۔ کلیات میں مثنوی "دریائے عشق" کی فارسی نثر بھی ہے۔ ابتدائی الفاظ یہ ہیں:

"عشق یعنی محبت مفرط، در بیان این طکر، فاصلہ کہ ہیچ موجودے ازاں خالی نیست۔ زبان دراز قلم قاصر است۔ اگرچہ ہر فرد کامل انسان دفترہا دارد۔ حالات عشق انواع است۔"

(۶) **کلیات میر**۔ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ مکتوبہ ۱۸۰۸ء۔

نمبر مخطوطہ ۴۵۲۔ سائز "۸ × ½۱۲" متن در جدول "۵ × ۱۰" سطر ۱۷، اوراق ۲۹۵، سال کتابت ۱۲۲۳ھ (۱۸۰۸ء)

یہ میر کے پانچ دیوان کا مجموعہ ہے۔ مجموعی اوراق مکتوب ۲۸۵ ہیں آخر میں ۸ اوراق ساقط ہو گئے ہیں یعنی ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳۔ دیوان ششم ورق ۴۰۳ الف میں ختم ہوتا ہے۔ کلیات میں دیوان اول نہیں ہے۔ دیوان دوم سے دیوان ششم تک (۵ دیوان) ہیں۔ دیوان دوم کے آخر میں ذیل کا ترقیمہ ہے:

"تمام شد نسخہ دیوان میر تقی صاحب بتاریخ بست و چہارم
ربیع الاول ۱۲۲۳ھ۔"

دیوان ششم مثنوی مور نامہ کے اس شعر پر ختم ہوتا ہے:

یہ فسانہ رہ گیا عالم کے بیچ
باز ماندہ ان کے ہیں سب غم کے بیچ

کلیات میں نواب جلال الدولہ مہدی علی خان بہادر شجاعت جنگ کی کئی مہریں ہیں، ان میں ۱۲۱۳ھ کی تاریخ ہے۔

(۷) **کلیات میر**۔ سالار جنگ میوزیم حیدرآباد۔ نمبر مخطوطہ ۱۹۳/۵۳۵، کل اوراق ۱۹۴ ب، مکتوبہ ۱۸۲۵ء

آخری صفحہ میں ذیل کا ترقیمہ ہے:

"تمام شد دیوان میر تقی میر تخلص بتاریخ ششم
ربیع الثانی ۱۲۴۱ھ (نومبر ۱۸۲۵ء) از خط نقشام الدین
و غلام امام حیدری۔"

مندرجات : ورق الف سے ۸۹ ب تک غزلیں ہیں۔ ورق ۹۰ الف سے ۹۸ الف تک رباعیاں اور پھر ۹۹ ب سے ۱۰۶ ب تک متفرقات ہیں۔ اسی صفحہ سے مثلث تضمین ۱۰۷ الف تک درج ہیں۔ پھر مخمس ہے۔ پہلا مصرعہ :

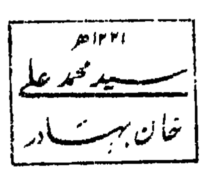
یہ بات جھوٹ نہیں صدق کی صفا کی قسم ۔ ۱۴ بند

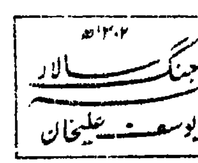
ورق ۱۰۸ ب سے ۱۹۲ ب تک مثنویاں اور قصیدے ہیں۔

مخطوطہ دراصل میرؔ کا دیوان دوم ہے۔ پہلا مصرعہ ہے :

ہر ذی حیات کا ہے جو سبب حیات کا

لیکن اس میں ردیف یا کی جو غزلیں ہیں ان میں سے کوئی ستّر غزلیں دیوانِ اول کی ہیں۔ ہم نے ان سبھی غزلوں کی نشاندہی کرکے ایک فہرست مرتب کردی ہے۔ کلیات کے آخر میں دو مہریں ہیں۔ ایک میں نواب سالار جنگ سوم یوسف علی خاں اور دوسری میں ان کے پردادا اور نواب مختارالملک سالار جنگ اول کے والد سید محمد علی خان بہادر کے نام اور تاریخیں اس طرح درج ہیں :





کتب خانہ میں کلیات کا ایک اور نسخہ ہے جس کی ابتدا میں دیوان اوّل ہے۔ اس کے بعد دیگر اصنافِ سخن ہیں۔ نسخہ ناقص الاوّل ہے۔

(۸) **کلیاتِ میرؔ۔** کتب خانہ ادبیاتِ اُردو، حیدرآباد کتوبہ ۱۱۹۴ھ مطابق ۱۷۷۸ء

نمبر مخطوطہ ۸۰، سائز ۲۳ × ۱۳ س م، اوراق ۱۶۵ فی صفحہ ۱۷ سطر۔

جہاں تک معلوم ہو سکا ہے یہ کلیاتِ میرؔ کا قدیم ترین نسخہ ہے جو میرؔ کے قیام دہلی کے زمانے میں لکھا گیا ہے۔ اس نسخے سے مردان علی خاں مبتلا صاحبِ گلشن سخن کے اس بیان کی تردید ہوتی ہے کہ ۱۱۹۴ھ یعنی ۱۷۸۰ء تک میرؔ نے ایک دیوان مرتب کیا تھا جس میں چار یا پانچ ہزار شعر تھے۔ یہ بات مبتلا نے غالباً میرؔ کے دیوانِ اوّل کے بارے میں کہی تھی۔ ثبوت یہ ہے کہ مبتلا نے میرؔ کے ترجمے کے ساتھ جو انتخاب دیا ہے وہ سب اشعار دیوانِ اول کے ہیں۔

کلیات کی ابتدا میں سادہ ورق ہے، اس کے بائیں طرف کونے میں ذیل کی عبارت لال روشنائی سے درج ہے :

"مــ ۶۲ ورق ۔ دیوان حال الجزء الاول من دیوان میر تقی بتاریخ یازدہم شہر شوال ۱۱۹۲ھ شروع بوشتن کردن نمودہ شد"

دیوانِ غزلیات ورق ۵۵ ب میں ختم ہوتا ہے۔ آخری غزل کا مطلع اور مقطع یہ ہیں ؎

تجھ کنے بیٹھے گھٹا جاتا ہے جی
کاہشیں کیا کیا اُٹھاتا ہے جی

کاش کہ برقع رہے اس رُخ پہ میرؔ
منھ کھلے اس کے چھپا جاتا ہے جی

غزل میں ۱۲ شعر ہیں۔ اس کے بعد ذیل کا ترقیمہ لال روشنائی میں درج ہے :

"تمت تمام شد۔ بتاریخ دویم روز یکشنبہ شہر ذی قعدہ سنہ ۱۱۹۲ ہجری نبوی۔ بحسب فرمائش شیخ محمد شاکر جیو سلمہ ربہ بدست میر محمد علی تحریر پذیرفت سنہ ۲۰ شاہ عالم بادشاہ"

ورق ۵۶ سے ورق ۹۲ ب تک رباعیات اور مخمس ہیں۔ آخری مخمس در ہجو "بلاس رائے" ہے۔ ورق ۹۲ میں ذیل کا ترقیمہ ہے :

"تمت تمام شد، دیوان میر تقی میرؔ بتاریخ چہارم شہر ذیقعدہ بروز سہ شنبہ بحسب فرمائش میاں محمد علی رضوی موافق ۱۱۹۲ ہجری تحریر یافت سنہ ۲۰ شاہ عالم بادشاہ غازی"

ورق ۹۳ الف سے ورق ۹۷ ب تک مخمس ہیں۔ آخری مخمس کے ساتھ لال روشنائی میں عنوان اس طرح درج ہے :

"ہشت آنہ روز از سرکار دالا بخش برائے من مقرر شدہ بود قبول نہ کردم" (۲۹ بند)

پہلا بند ؎

دستخطے زد کا سنو احوال بے دماغی سے میں تو دی تھی ڈال

ایک مشفق کو تھا ادھر کا خیال
مہربانی سے اُونے کھرچ نکال
شیخ جی کار ہے سو عجائب مال

ورق ۸۳ الف سے ورق ۱۷۴ الف تک مناقب، قصائد، مثنویاں ہیں۔
ورق ۱۷۵ ب پر ذیل کا ترقیمہ ہے:

"تمت تمام شد دیوان میر تقی بتاریخ بیست ونہم
شوال روز پنجشنبہ سنہ ۲۰ جلوس شاہ عالم مطابق سنہ ۱۱۹۲ھ
بحسب فرمائش میاں محمد شکر اللہ من مقام دار الخلافہ
شاہ جہاں آباد، بخط اضعف العباد رادھا کشن کاتب
تحریر یافت۔"

کلیات کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک مثنوی اور ایک قصیدہ ایسے ہیں جو کلیات میر نسخۂ کلکتہ اور نسخۂ آسی وغیرہ میں نہیں ہیں۔
مثنوی کا عنوان ہے "مثنوی در مبارکبادی کدخدائی کشن سنگھ پسر خورد راجہ ناگرمل کہ بفقیر حقہا داشتند۔" (۷۶ شعر)

مطلع ؎ آؤ ساقی کہ بزم عشرت ہے
چشم بد دور خوب صحبت ہے

قصیدہ۔ ورق ۱۷۴ ب، بعنوان "قصیدہ در شکایت نفاق یاران زماں"

مطلع ؎ جہاں میں کون ہے جس کو کسی سے الفت ہے
خراب کوچہ و بازاریاں محبت ہے

یہ نسخہ حیدر آباد کے رئیس اعظم اور وزیر اعظم سر آسمان جاہ کے صاحبزادے نواب سید عنایت حسین کی ملکیت میں تھا۔ انھوں نے اسے ڈاکٹر سید محی الدین زورؔ کے کتب خانہ ادبیات اُردو کی نذر کیا تھا۔ اس نسخے کو میں نے ترتیب دیا ہے اور عنقریب ان شاء اللہ شائع ہوگا۔

(۹) کلیات میر۔ نسخۂ آصفیہ حیدر آباد

نمبر داخلہ ۱۴۰۷، فن۔ نمبر ق د ۱۵۔ ۹۶ دواوین، سائز ۲۳×۱۳ سنٹی میٹر، کل اوراق ۲۹۶ ب، فی صفحہ ۱۷ سطر۔ ترقیمہ: ورق ۲۹۶ ب۔

"تمت بالخیر بعنوان الملک الوہاب، بدستخط ذوالفقار علی
باتمام رسید۔ دیوان کلیات میر تقی سلمہ"

قیام حیدر آباد کے زمانے میں میں نے اس نسخہ کا بخوبی مطالعہ کیا۔ یہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ نسخہ مستند ہے اور اس میں میر کا غیر مطبوعہ کلام بھی موجود ہے۔ اس کی کتابت میر کی زندگی میں ہوئی۔ کاتب پڑھا لکھا اور محتاط تھا۔ غالباً میر کے شاگرد ذوالفقار علی صفا کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں جو کلام ہے وہ سب ہم نے جمع کیا ہے۔ ابتدا میں میر کا دیوانِ اول ہے۔ پہلی غزل میں ۱۱ شعر ہیں، جبکہ تمام مطبوعہ نسخوں میں ۱۰ ہی شعر ہیں۔

مطلع ؎ تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا

غزل کا چوتھا شعر غیر مطبوعہ ہے اور یہی جانِ غزل ہے۔ یہ شعر نسخہ محمود آباد میں بھی موجود ہے جس کا ذکر اپنے مقام پر آئے گا ؎

اس فصل میں کہ گل کا گریباں بھی ہے ہوا
دیوانہ ہو گیا سو بہت ذی شعور تھا

آخری غزل ۱۹۲ الف میں ختم ہوتی ہے۔ مطلع یہ ہے ؎

دن دوریٔ چمن میں جو ہم شام کریں گے
تا صبح دو صد نالہ سرانجام کریں گے

ورق ۱۹۳ ب سے ورق ۳۰۷ الف تک مخمسات، مسدسات، واسوخت، مناقب، ترجیع بند، رُباعیات، مثنویات اور قصائد وغیرہ ہیں۔ ورق ۲۱۵ الف میں ایک مخمس ہے۔ اس کا عنوان لال روشنائی سے اس طرح درج ہے:

"ہنگامیکہ لشکر بادشاہ در فرخ آباد بود، فقیر
افغانان نیز وارد شد۔ این قضایا در ہمان ایام اتفاق
افتاد۔" (۹ بند)

پہلا بند ؎ جس کسو کو خدا کرے گمراہ
آوے لشکر میں رکھ اُمید رفاہ
یاں نہ کوئی وزیر بھی ہے نہ شاہ
جس کو دیکھو سو ہے بحال تباہ
طرفہ مردم ہوئے اکٹھے تباہ

ورق ۲۶۸ الف: "ہنگامیکہ فقیر از کامان کہ سہ منزلیست بسرحدے راجہ جینکر برآمدہ بود۔ این مخمس گفتہ شد۔"

مطلع ؎ قابل ہے میر سیر کے اطوار روزگار (۱۳ بند)

ورق ۲۸۱ الف، مثنوی مسمی بشعلۂ عشق۔ ۱۴۴ ۔ اس کے عنوانات لال روشنائی سے فارسی میں مندرج ہیں۔ یہ بھی ایک خوبی ہے۔

ابتدا: محبّت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور

عنوانات: "آغاز قصۂ جانکاہ کہ در عہد محمد شاہ در عظیم آباد پیش۔ دفع وشریف بظہور رسید بود۔ روزے رفتن جواں پیش عاشق وشکایت کردن او از ہجراں دعذر خواستن پر سرام کہ موجب ایں کہ خداشد نست واظہار نمودن محبت زن و باورنہ کردن آں بے تہہ، سخنہا ساختہ۔ فرستادن آں عاشق خود غرض نفرے را برائے امتحان محبت ہر شش وبمجرد شنیدن مردن آں زن۔ و ایں واقعہ بے حواس شدن جوان پشیماں شدن آں دیوانہ شدن آں جواں، وبعد از چندے بدریا رفتن و از آنجا نشان معشوق مردہ یافتن از دادارنے کہ برلب آب سکونت داشت وبسر کردن شب بصد بے تابی قرب جواں را۔ صبح رفتن آں دیوانہ پیش ہماں عاشق و اورا فریب دادہ تکلیف بسیر کشتی کردن وراضی شدہ، رفتن آں دلفریب و بہ حیلہ ہمراہی گرفتن دادار بمیان آوردن و سوار شدن برکشتی و ہمراہ گرفتن دادار و تفحّص حرف شب کردن واز دور نشان معشوق مردہ یافتن و بہ ہماں لب آب دیدن آں واقعہ غریب در قریب شعلہ رفتہ سوختہ شدن آں"۔

ورق ۲۰۷ب سے آخر تک مرثیے ہیں۔ ان کی تعداد ۳۲ ہے۔ مرثیوں کے علاوہ سات سلام بھی ہیں۔ پہلا مرثیہ یہ ہے:

پھر کیا یہ دھوم ہے کہ جہاں ہے یہ سب تمام
پھر کیا یہ ماجرا ہے کہ ہوگئی ہے صبح شام ۔ ۱۲ بند

مرثیہ کی تمہید میں ذیل کی فارسی نثر بھی ہے:

"ترجمہ مرثیہ محتشم کاشی چوں بعضے ادا بتنزل است
باحتیاط ترجمہ گفتہ می شود وگرنہ ایں جدا وآں جدا۔"

اوپر مثنوی شعلۂ عشق کا ذکر ہوا ہے اس لیے یہ کہنا مناسب ہے کہ شعلۂ عشق کا ایک مطبوعہ نسخہ ۱۲۵۹ھ (۱۸۴۳ء) کا راجہ صاحب محمود آباد کے کتب خانہ میں راقم کی نظر سے گزرا ہے۔ یہ مصطفائی پریس لکھنؤ میں چھپا تھا۔ اس کے آخر میں ذیل کا ترقیمہ ہے:

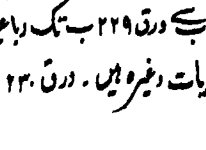
"الحمد للہ کہ مثنوی شعلۂ شوق (عشق) من تصنیف میر تقی میر مرحوم بتاریخ غرۂ شعبان ۱۲۵۹ھ باہتمام محمد مصطفٰے خان ولد حاجی محمد روشن خان .... در مطبع مصطفائی واقع بیت السلطنت زیر اکبری دروازہ محلہ محمود نگر حلیۂ طبع پوشیدہ"۔

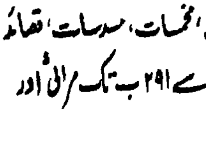
اس کے بعد مسجد آصف الدولہ، آصفی امام باڑہ، رومی دروازہ، مسجد ٹیلہ شاہ پیر محمد مرحوم، امام باڑہ بھوانی مہر، مسجد جانب پیر بخارا وغیرہ عمارتوں کا ایک خوش نما نقشہ ہے۔ رومی دروازے سے چوک کا راستہ بھی صاف نظر آتا ہے۔ جانب شمال دریائے گومتی کا منظر ہے جس میں کشتیاں موجود ہیں۔ نقشے پر یہ عبارت ہے:

"نقشہ نوشتہ مرزا علی بخش نقاش در مطبع میر حسن رضوی طبع شد در ۱۲۵۹ھ"

(۱۰) کلیات میر۔ نسخہ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب

کل اوراق ۳۱۴ب، سائز "۸×۱۳" متن "۱۰×۵"، جدول سرخ و سیاہ، سطر ۱۱، کاغذ کشمیری، خط نستعلیق۔ عنوانات اور تخلص کے لیے خالی جگہ چھوڑ دی گئی ہے۔ کاتب نے غالباً لال روشنائی سے لکھنے کے لیے جگہ رکھی ہے۔ ورق ۱الف کی ابتدا میں "حوالہ لالہ سندر رام کردند ۸ ربیع الاول" اس کے بعد کی عبارت کرم خوردہ ہے۔ اس کے بعد دوسری تاریخ اس طرح ہے "۱۸ رجب ۱۲۲۱ ہجری"۔ ورق ۱ب کی پیشانی پر لکھنؤ کے رئیس اعظم شمس الدولہ نجم الملک احمد علی خاں صولت جنگ بہادر کی مہر ہے۔ اس کے اندر ۱۲۱۳ھ کا سال درج ہے۔ ورق ۱۷۵ب اور ورق ۲۳۰الف میں نواب مہدی علی خاں جلال الدولہ کی دو مہریں ہیں۔ دونوں کی مہریں اس طرح ہیں:





ورق ۱ب سے ۱۳۲الف تک غزلیں ہیں۔ ان کی تعداد ۵۲۵ ہے، ورق ۱۳۲ب سے ورق ۲۲۹ب تک رباعیات، مخمسات، مسدسات، قصائد اور مثنویات وغیرہ ہیں۔ ورق ۲۳۰الف سے ۲۹۱ب تک مراثی اور

سلام ہیں۔ مراثی ۴۳ اور سلام ۵۔ ورق ۲۹۲ ب سے ورق ۳۰۹ الف تک مناقب ہیں۔ ورق ۳۰۹ ب سے ۳۱۴ ب تک نواب آصف الدولہ کی تعریف میں قصیدہ اور ایک نظم ہے "در ہجو شخصے ہیچمدان کہ دعویٰ ہمہ دانی داشت۔"

کلیاتِ آدیب میں کئی غزلیں غیر مطبوعہ ہیں۔ تفصیلات کیلئے ملاحظہ ہو "کلیاتِ میر کا ایک نادر الوجود مخطوطہ" مطبوعہ آجکل دہلی بابت جون ۱۹۹۴ء۔

(۱۱) کلیاتِ میر۔ نسخہ کتب خانہ راجہ صاحب محمود آباد

کتب خانے میں میر کے کئی کلیات کے مخطوطے ہیں۔ تفصیلات دیوانِ میر نسخۂ محمود آباد مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ان میں میر کا دیوانِ چہارم بہت ہی اہم اور بیش بہا نسخہ ہے۔ میر نے دیوان کا مسودہ اپنے داماد اور ہمشیر زادہ میر حسن علی تجلی کو دیا تھا۔ انھوں نے اپنے ہاتھ سے پورے دیوان کو لکھا۔ تجلی کا انتقال ۱۲۱۴ھ مطابق ۱۷۹۹ء کو ہوا۔ ان کے انتقال کے بعد یہ لکھنؤ کے ایک ممتاز شخص مرزا جعفر (متوفی ۱۲۳۰ھ) کے صاحبزادے مرزا محمد محسن کے ہاتھ لگا۔ ان کے پاس اپنے والد کا بہت بڑا کتب خانہ تھا۔ راقم الحروف نے اس دیوان پر ایک مفصل مضمون لکھا جو نقوش لاہور میر نمبر ۲ میں شائع ہوا۔ اس میں میر کا غیر مطبوعہ کلام بھی درج ہے۔ دیوان کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے ؎

کرتا ہوں اللہ اللہ درویش ہوں سدا کا
سرمایۂ توکل یاں نأوں ہے خدا کا

خاتمہ ؎

سر کا جانا ہی ہر قدم ہے میر
کیا کوئی اس کی راہ پر گذرے

غزلیں ص۲ سے ۱۳۹ تک ہیں۔ ص۱۴۰ میں "سوانح محمد تقی میر" درج ہیں۔ اس کا ماخذ ایک کتاب ہے جس کا نام "نوادر الکملا" ہے۔ افسوس کہ یہ کتاب اب عنقا ہوگئی ہے۔ لیکن ہم نے میر سے متعلق یہ تاریخی دستاویز نسخۂ محمود آباد میں محفوظ کر رکھی ہے۔

ص۱۴۱ سے ۱۴۳ تک رباعیاں ہیں۔ ان کی تعداد ۸ ہے۔ ص۱۴۴ میں ہولی نامہ، ص۱۴۵ میں مثنوی بزنامہ، ص۱۵۱ میں مثنوی جگر سوز (چمن سے عنایت کے بادام وار) ص۱۹۵ میں ساقی نامہ اور اس کے بعد ایک اہم مثنوی "جنگ نامہ آصف الدولہ" ہے۔ اس میں آصف الدولہ کے فتح رامپور کی تاریخ ۱۲۰۹ھ (۱۷۹۴ء) بھی درج ہے۔ مثنوی آسی کے مرتب کردہ کلیات میں پہلی مرتبہ شائع کی گئی ہے۔

میر کا یہی وہ دیوان ہے جس کی ابتدا میں مرزا محمد محسن نے میر کی تاریخ وفات اور ان کے قبرستان کی نشاندہی کی ہے۔ اگر یہ دیوان محفوظ نہ رہتا تو میر کی زندگی کا ایک تاریخی گوشہ ہمیشہ کے لیے آنکھ سے اوجھل رہتا۔ ذیل میں مرزا محمد محسن کی لکھی ہوئی یادداشت من و عن نقل کی جاتی ہے:

"بروز جمعہ بستم ماہ شعبان المکرم وقت شام
سنہ ۱۲۲۵ یک ہزار دوصد بست و پنجم ہجری بودہ، میر محمد تقی
میر تخلص صاحب ایں دیوان چہارم در شہر لکھنؤ در محلہ
ستہٹی بعد طے نہ عشرۂ عمر بجوار رحمت ایزدی پیوستند
در روز شنبہ بست و یکم ماہ مذکور سنہ الیہ دو پہر
در اکھاڑہ بھیم کہ قبرستان مشہور است نزد قبور اقربائے
خویش مدفون شدند و چہار دیوان چہارم از آں جملہ است۔"
محرر سطور محمد محسن المخاطب بہ زین الدین احمد، تجاوز اللہ عن
سیاتہ در حین حیات خویش بکمال رغبت بحل کردہ بخشیدند
خدا ایش بیامرزاد۔

حررہ محمد محسن عفی عنہ، روز جمعہ بست و ہشتم ماہ شعبان سنہ الیہ
بوقت چہار گھڑی روز باقی ماندہ

ایں دیوان از دستخط میر حسن علی تجلی داماد میر مغفور است

اس عبارت کے بعد مرزا محمد محسن نے میر کی تاریخ وفات کے دو قطعۂ تاریخ بھی درج کیے ہیں۔

دیوانِ چہارم کے مخطوطے کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اسے اودھ کے تین بادشاہوں کے کتب خانے میں رہنے کا شرف حاصل ہوا۔ ان کی مہریں مرزا محمد محسن کی تحریر پر ثبت ہیں۔ اوپر امجد علی شاہ (۱۲۵۸۔۱۲۶۳ھ) اور نیچے نصیر الدین حیدر (۱۲۴۳۔۵۳ھ) اور جان عالم سلطان واجد علی شاہ کی ہیں۔ دیوان کے آخری صفحہ میں یہی تین مہریں نمایاں ہیں۔ امجد علی شاہ والے کتب خانے کی مہر کے بیچ میں تاج شاہی ہے

تینوں مہروں پر الگ الگ ذیل کی عبارتیں ہلکے لال رنگ میں درج ہیں، اور اس طرح ہیں:

مخطوطہ امجد علی شاہ کے کتب خانے میں ۱۰ ربیع الاول ۱۲۶۲ ہجری (مارچ ۱۸۴۶ء) کو موصول ہوا تھا۔ اصل عبارت مرزا محمد محسن کی تحریر کے داہنی طرف اس طرح درج ہے:

"بتاریخ دہم ربیع الاول ۱۲۶۲ھ بجائزہ رسید"

(۱۲) کلیاتِ میر، نسخہ دوم، کتب خانہ راجہ صاحب محمود آباد۔
سالِ کتابت ۱۲۰۳ھ (۱۷۸۹ء)

یہ دیوان میر کا نادر الوجود نسخہ ہے۔ اس کا سالِ کتابت ۱۲۰۳ھ آخر میں درج ہے۔ کاتب کا نام موتی لال ہے جو بھوانی پرشاد دیوان آصف الدولہ کی سرکار سے منسلک تھے۔ میرے خیال میں یہ وہی موتی لال ہیں جن کا تخلص حیف تھا اور جو میر سوز کے شاگردوں میں تھے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ دیوان میر کی نظر سے گزرا ہو، کیوں کہ بھوانی پرشاد اور میر دونوں نواب آصف الدولہ کی سرکار سے وابستہ تھے۔

یکتا لکھنوی نے اپنے تذکرہ دستور الفصاحت میں میر کے چھ دیوان کے علاوہ "دیوانچہ" کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس دیوان کا اب نام و نشان نہیں ملتا ہے اور نہ نام کے سوا ہی اس کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکا۔ ہو سکتا ہے کہ میر نے دیوانچہ میں اپنے کلام کا انتخاب کیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انھوں نے قیام دہلی کے زمانے میں ہی انتخاب کیا ہو انتخابِ کلام کی تائید خود میر کے ایک غیر مطبوعہ غزل سے بھی ہوتی ہے جو اس نسخے میں موجود ہے ؎

تذکرے سب کے پھر رہیں گے دھرے   جب مرا انتخاب نکلے گا

دیوان میں میر کا اچھا خاصا غیر مطبوعہ کلام بھی موجود ہے۔ علاوہ ازیں اس میں میر کی خاص زبان پائی جاتی ہے۔ میر کی زبان کی خصوصیت یہ تھی کہ خود دہلی والے بھی سمجھنے سے قاصر تھے۔ کہتے ہیں ؎

رہی نہفتہ میرے دل میں داستاں میری
نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

یہ دیوان میر کا ایک مستند اور قدیم نسخہ ہے۔ اس میں میر کی خاص زبان اور قرأت پائی جاتی ہے۔ مثال میں دو شعر دیکھیے ؎

افسوس میرے مردہ پر اتنا نہ کر کہ اب
پچھتاؤ نا عبث ہے جو ہونا تھا ہو چکا

آگو تو لعلِ نوخطِ خوباں کے دم نہ مار
ہر چند اے مسیح وہ باتیں رہیں نہیں

میر کے تمام قلمی اور مطبوعہ نسخوں میں ذیل کے دو شعر اس طرح درج ہیں ؎

۱۔ سرہانے میر کے آہستہ بولو   ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے
۲۔ جبیں سجدہ کرتے ہی کرتے گئی   حقِ بندگی ہم ادا کر چلے

زیر نظر نسخے میں دونوں شعر کے پہلے مصرعے اس طرح ہیں ؎

(۱) سرہانے میر کے کوئی نہ بولو
(۲) جبیں سجدہ کرتے ہی کرتے گھسی

آخری صفحہ میں ذیل کا ترقیمہ ہے:-

"حق تعالیٰ حسن اخلاق و مروت و صفت جود و سخاوت مرتبہ علم و اقبال و رتبہ و بذات ستودہ صفات لالہ بھوانی پرشاد صاحب کرامت فرمودہ و نظر یتش و فیض رسانی ہر کس و قدر دانی مردم اہل ہنر و غریب نوازی خاکسارانِ جہاں بغایت مصروف است۔ فقیر حقیر ہیچدان موتی لعل نیز در زمرۂ خیر اندیشانش جا یافتہ بموجب فرمائش آں والا منش کتاب دیوان بزبان ہندی تصنیف میر تقی میر صاحب در عہد وزارت نواب فلک اقتدار سکندر منش، جم جاہ، حاتم عصر نواب آصف الدولہ بہادر

دام اقبالہ بخط خود بتاریخ بیست و یکم شہر جمادی الاول
سن یکہزار و دو صد سہ ہجری باتمام رسانید۔"

ذیل میں میر کا کچھ غیر مطبوعہ کلام درج کیا جاتا ہے، جو راقم نے میر کے متعدد قلمی نسخوں سے دریافت کیا ہے۔ دیگر اصناف سخن کا غیر مطبوعہ کلام آئندہ پیش کیا جائے گا۔

اس فصل میں کہ گل کا گریباں بھی ہے ہوا
دیوانہ ہو گیا سو بہت ذی شعور تھا

دیکھو رونا میرا اس نے ہنس دیا   برق چمکی ابر باراں تھم رہا

وہ جو پی کر شراب نکلے گا   کس طرح آفتاب نکلے گا
میر دیکھو گے رنگ نرگس کا
اب جو وہ مست خواب نکلے گا

جب مضطر تھا زندگی میں دل   وہ ہیں میں نے مزار میں دیکھا

ہم تو گئے تھے شیخ کو انسان بوجھ کر   پر اب سے خانقاہ میں جایا نہ جائیگا

بے نالہ و بے زاری بے خستگی و خواری   امروز کبھی اپنا فردا نہ ہوا ہوگا

منتظر اس کے کرخت ہو گئے بیٹھے بیٹھے
جس کے مردے کو اٹھایا سو لٹایا نہ گیا

مرتا ہوں جان ہیں وطن داریوں پہ لوگ
اور سنتے جاتے ہیں کہ ہر اک نے سفر کیا

تسلی ہوا صبر سے کچھ میں تجھ بن   کبھو یہ قیامت طرحدار ہوگا

نالے میں اپنے ہر شب آتے ہیں ہم بھی پنہاں
غافل تری گلی میں میدان ہے ہمارا

کوری چشم کیوں نہ زیارت کو اس کی آئے
یوسف سا جس کو منظر نور دیدہ تھا

ہیں دشت اب یہ جینے بستی تھی شہر سارے
ویرانہ کہن ہے معمورہ اس جہاں کا

ابر جاتا رہا رہیں بوندیں   اب تو ساقی مجھے شراب پلا

ہو تار تار سیتے ہی سیتے جو اڑ گیا   اب تک عبث میں اپنا گریباں سیا کیا

سن سن کے تری بات تو کیا کیا نہ کہہ سنا
کیا کیا کہوں میں تجھ سے کہ کیا کچھ کیا کیا

یوں خاک میں ملایا اس بن کہ کچھ نہ پوچھ
اس ظلم دیدہ دل کا ہم اضطراب دیکھا

واعظ زبون مت کہہ مے خانہ کو کہ اس جا
پیراہن نکویاں رہن شراب دیکھا

تو نے "تلوار رکھی"، سر رکھا میں بندہ ہوں
اپنی تسلیم کا بھی اور تری جلادی کا

دختر رز نے کیا تھا میرے تئیں   شیخ کی ضد پہ میں حرام کیا

میں نے تلوار سے ہرن مارے   عشق کر تیری چشم و ابرو کا

کاکل میں نہیں خط میں نہیں زلف میں نہیں
روز سیہ کے ساتھ مرا دل کدھر گیا

گئی ہوتی سر آبلوں کے پر ہوئی خبر
بڑا قضیا خاروں سے برپا ہوا تھا

نہیں ایسا کوئی جو میرا ماتم دار ہوئے گا
مگر اک غم ترا اے شوخ بیکس ہو کے روئے گا

تجھ سے کیا کیا توقعیں تھیں ہمیں   سو ترے ظلم نے نراس کیا

دیکھا ڈھٹا ہے جن نے خانہ بنا   زیر افلاک ست اساس کیا

جو اے قاصد وہ پوچھے میر بھی ادھر کو چلتا ہے
تو کہیو جب چلا ہوں میں تب اس کا جی نکلتا تھا

سماں افسوس و بے تابی سے تھا کل قتل کو میرے
تڑپتا تھا ادھر میں اور ادھر وہ ہاتھ ملتا تھا

کیوں کر میں فتح پاؤں تیری زلفوں پہ کہ اب
یکدل شکستہ خوردہ میرا دو طرفہ ہوا

جلا کیونکر نہ ہوگا آشیان بلبل بے کس
برنگ آتش خس پوش رنگ گل دہکتا تھا

مجھے تو نور نظر نے تنک بھی تن نہ دیا   بہار جاتی رہی دیکھنے چمن نہ دیا

تھا زعفران پہ ہنسی کو دل جس کی گرد کا
مشتاق سو نہ میرا ہے اسی رنگ زرد کا

جب کہ تابوت میرا جائے شہادت سے اٹھا
شعلۂ آہ دل گرم محبت سے اٹھا

تماشے دیکھتے ہنستا چلا آ کرے ہر شیشہ بازی میرا رونا
طفل مطرب جو میرے ہاتھ آتا چٹکیوں میں رقیب اڑجاتا
مدعے الفت تھی تیغ سے اس کی قتل کرتا تو لوہو جم جاتا
خواب میں بھی رہا تو آنے سے دیکھنے ہی کا تھا یہ سب ناتا
جو نہ کہنا تھا سو بھی میں نے کہا دل کی بے طاقتی سے خوار ہوا
پھر گیا ہے زمانہ کیا کہ مجھے ہوتے خوار ایک روزگار ہوا
محشر سوائے کیا ہوا سے التیام میر یہ زخم سینہ جائے گا میرا اوہیں سیا
لہو پینے کو مرا بس تھی میری تشنہ لبی کاہے کو کیجے تصدیع یہ جلاد آیا

ہو بلبل گلگشت کر اک دن ہے خزاں کا
اڑتا ہے ابھی رنگ گل باغ جہاں کا

مجھ کو ہے یقیں تجھ میں وفا ایسی جفا پر
گھر چاک برابر ہوئے اس میرے گماں کا

سنو ہو جل ہی بجھوں گا کہ ہو رہا ہوں میں
چراغ مضطرب الحال صبح گاہی کا

تا کجا غنچہ صفت رکنا چمن میں دہر کے
کب گرفتہ دل میرے سینے میں خوں ہو جائے گا

لاشہ میر تسلی نہ زیر زمیں ہوا جب تک نہ آن کر وہ سر گور ہو گیا

اک عالم کی ہیں لگ رہی چھت سے آنکھیں
تو اے ماہ کس دن لب بام ہو گا

دل کے ڈھنے کا تمہیں تو نہیں کچھ غم لیکن
سب کو افسوس ہے اس قصر کی ویرانی کا

ہم جانتے ہیں یا جگر خستہ ہمارا
ملنا تھا پلک کا کہ کوئی خنجر کیں تھا

اس میں حیراں ہوں کہ کس کس کا گلا تجھ سے کروں
بدگمانی کا تغافل کا ترے کینے کا

نگہ تمام تو اس کی خدا نہ دکھلاوے کرے ہے قتل اثر جس کی کم نگاہی کا

شیخ کے شکوے سے کیا نفع ہے اے اوباشاں
وہ تو حیواں ہے مذکور کرو انساں کا

محراب میں سر مارنے کا کچھ بھی نہ دیکھا اب ہم نے دعا مانگنے سے ہاتھ اٹھایا

شب زخم سینہ اوپر چھڑکا تھا میں نمک کو
ناسور تو کہاں تھا ظالم بڑا مزا تھا

آشیاں سے جو چلے اٹھ کے گرفتار ہوئے
لطف کچھ ہم نے تو پایا نہ پر افشانی کا

ردیف ب

رویا تھا تیری چشم و مژہ یاد کرکے میں
ہے نیزہ نیزہ تب سے نواح ختن میں آب

ت

رہ گیا دیکھ کے تجھ چشم پہ یہ سطر مژہ
ساقیا! یوں تو پڑھے تھے میں خط جام بہت (کذا)

چ

کرتی ململ کی پہن آئے ہو رندوں میں شیخ صاحب کہیں جنتی پڑے شان کے بیچ

ح

سو طرح دیکھ دیکھ طبیبوں نے یہ کہا صحت پذیر ہوئے یہ بیمار ایک طرح

خ

ہے نئے دشمن جاں وہ شوخ ان دنوں کچھ مہرباں وہ شوخ

ن

کیا چہرہ تجھ سے ہوگا اے آفتاب طلعت
منہ چاند کا جو ہم نے دیکھا تو چھائیاں ہیں

جنوں جیب سے ہے اس کا دشمن ہوں ناصح
تو کب سے ہوا دوستدار گریباں.

بحث کرتا ہوں ہو کے ابجد خواں کس قدر بے حساب کرتا ہوں
کوئی رو دے کوئی تڑپے ہے کیا کروں یسے ہی کرتے ہیں
ورنہ میں میر ہوں مرے آگے دشت غم میں نبھتے پاتے ہیں
کھود گاڑوں زمین میں دونوں کو گرچہ یہ آسماں پہ جاتے ہیں
ترے عاشق ترے رسوا کہائے میرے ہو کر کہہ اب کس کے کہاویں
گئے وے دن جو آنسو روتے تھے میر جھمکتا ہے لہو اب چشم نم میں

ہمیشہ دل میں کہتا ہوں یہاں جاؤں وہاں جاؤں
ترے غم کو اکیلا چھوڑ کر پیارے کہاں جاؤں

ادھر صحرائے بیتابی ادھر مشہد ہے اے قاتل
جو فرمائیے تو واں جاؤں جو فرمائے تو یاں جاؤں

اگر جیتا رہا اے زلف تو میں تیر ہوں سینو
بلائے ناگہانی کے سر اوپر ناگہاں جاؤں

دشت کے پھوٹے مقبروں پہ نہ جا — روضے سب گلستان ہوتے ہیں
خوب پہچانتا ہوں تیرے تئیں — اتنا بھی تو میں بے شعور نہیں
قتل ہی کر کہ اس میں راحت ہے — لازم اس کام میں مرور نہیں

خون جگر تو کچھ نہ رہا تو ہی سب ہوا
بس اے سرشک آنکھیں تیری کیا مگر نہیں

کیوں الاماں کرے ہے دل شب گھڑی گھڑی
برچھی لگاتی آہ ہماری اگر نہیں

رات سے آنسو جو کچھ آتے تھے سو گلگوں نہیں
غالباً دل میں، جگر میں، مطلقاً اب خوں نہیں

گاہ گاہے دردمند عشق کرتے ہیں نمود
خاک اگر اب سر میں ڈالے دشت تو مجنوں نہیں

بے ستوں بھی ہے وہی اور وہی جوئے شیر
تھا نمک شہرت شیریں کا سو فرہاد نہیں

نے فلک پر راہ مجھ کو نہ زمیں پر رو مجھے
ایسے کس محروم کا میں آہ بے تاثیر ہوں

یوں سعادت ایک جوہر مجھ کو بھی گزرانیے
منصفی کیجے تو میں تو محض بے تقصیر ہوں

کیونکر دیکھی جائے یہ بیگانہ وضعی مجھ سے شوخ
تو تو ادھر یک نگاہ آشنا کرتا نہیں

خرابی عشق سے رہتی ہے دل پر اور نہیں رہتا
نہایت عیب ہے یہ اس دیار غم کے والی میں

کہیں کھول مکھڑا اپنا تو شگفتہ روشتابی
کہ رہا ہے غنچہ ہو کر گل آفتاب تجھ بن

بے رحم ٹک تو پاؤں تو چھاتی پہ رکھے وہ
مارا بھی ہے کبھو تئیں کسی خستہ جاں کے تئیں

ہر لحظہ ہے تزاید رنج و غم و الم کا — غالب کہ طبع دل کو مغلوب کر چکے ہیں

عشق کرنے کو جگر چاہیئے آساں نہیں
سب کو دعویٰ ہے ولے ایک میں یہ جاں نہیں

کس طرح منزل مقصود پہنچیں گے میر
سفر دور ہے اور ہم کنے ساماں نہیں

—— و ——

ز بس حسرت جنوں میری ہوا آہن عجب مت کر
نہ ہو گر حلقہ در خانہ زنجیر سازاں کو

آنکھوں سے دل تلک ہیں چنے خوان آرزو
نومیدیاں ہیں کتنی ہی مہمان آرزو

پامال یاس آہ کہاں تک رہوں گا میر
سر عشق کیوں کیا تھا میں دیوان آرزو

کرشمہ چشم پُرخوں اے مست درد الفت
دیتے ہیں سرخ مے سے بھر کر ایاغ کس کو

زاہدان دیتے نشان ان بتوں کا ڈرتا ہوں
توڑ کر کعبہ کہیں دیر نہ آباد کرو

نہ آ دام میں مرغ فریاد کیجو — ٹک اک خاطر خواب صیاد کیجو

حشر پہ موقوف تھا ہر سو نظر آیا نہ یاں
کیا بلا در پیش آئی وعدۂ دیدار کو

مجھ کو آوارہ جور کھتا ہے مگر چاہے ہے چرخ
ماتم آسائش غفراں پناہی بھی نہ ہو

اس بے گنہ کے قتل میں اب دیر مت کرو
جو کچھ کہ تم سے ہو سکے تقصیر مت کرو

آنکھوں میں اشک حسرت اور لب پہ شیون آیا
اے حرف شوق تو بھی آیا زباں تلک تو

وہی مجھ پہ غصہ وہی یاں سے جا تو — وہی دور ہو تو وہی پھر نہ آ تو

—— ہ ——

دامان و جیب چاک و خرابی و خستگی
ان سے ترے فراق میں ہم نے کیا تباہ

یا

گا ہے آتا ہوں آپ میں سو بھی   جیسے کوئی مہمان جاتا ہے
صیاد عرض حال کروں اور تجھ سے کیا   ظاہر اضطراب میرا زیر دام ہے
مرے دردِ دل کا تو یہ جوش ہے   کہ عالم جواں سیہ پوش ہے

ہر چند کہ ان ترکوں میں ہو جلد مزاجی
پر کام ہیں ملنے کی یہ تاخیر کریں گے

ملک زیرِ طاق نیلی وسواس سے رہا کر
مدّت سے گرنے پر یہ ایوان ہو رہا ہے

تب ٹھکانے لگی ہماری خاک   جب ترے آستان پر آئی

ہے قتل گاہ کس کی کوچہ ترا ستم گر
یک عمر خضر ہو گئی خوں متصل رواں ہے

کیا فکر ملک گیری میں ہے تھے جو پیش ازیں
ان میں سے تو ہی دیکھ جہاندار کون ہے

اٹھتے ہی صبح کے تئیں عاشق کو قتل کرنا
خوباں کی سلطنت میں دستور ہے تو یہ ہے

نہیں سوجھتا کچھ جو اس بن رہیں   بغیر اس کے جیتے ہیں ہم گور سے
سن کے صفت ہم سے خرابات کی   عقل گئی زاہد بد ذات کی
جی میں ہمارے بھی تھا پیویں شراب   پیرِ مغاں تونے کرامات کی

مرنا بھلا ہے ظالم اس زندگی بد سے
یوں چاہیے کہ کوئی تجھ سے نہ یار ہوئے

گاہ نالاں طپاں گئے بے دم   دل کی میری عجب ہی حالت ہے

ہے وہ بلائے عشق کہ آئے سو آئے ہے
کلول نہیں ہے ایسی محبّت کہ ٹل سکے

تیغ برہنہ کف میں وہ بیداد گر ہے آج
ہے مفت وقت اس کو جو کوئی جان کھو سکے

ملیا خاک کر دامن سے اشکوں میں ڈوبایا پھر
مرے ہاتھوں کی تردستی گریباں یاد کرتا ہے

گھر دودِ جگر سے بھر گیا آہ   کب تک مری چشم تر نہ ہوئے
ہم جنوں میں خاک اڑادیں گے   دشت میں آندھیاں چلادیں گے

میرے دامن کے تار خاروں کو   دشت میں پگڑیاں بندھادیں گے
جوں جوں ساقی تو جام بھرتا ہے   میری توبہ کا جان ڈرتا ہے
سیر کر عاشقوں کی جانبازی   کوئی سکتا ہے کوئی مرتا ہے
جو خوشہ تھا صد خرمنِ برق تھا یاں   جلایا ہوا ہوں میں حاصل کا اپنے
اڑا برگِ گل کو دکھاتی ہے وادی   کہو کس طرح نہیں صبا چور بادی

تو خاطر جمع رکھ دامن کہ اب شہر گریباں سے
تیری خاطر ہزاروں چاک تحفہ ہاتھ لاتا ہے

داغ ہی اگتے رہے دل میں مری نومیدے
ہارا میں تخمِ تمنّا کو بھی بوتے بوتے

کیا تفاوت ہے بڑے چھوٹے میں گر سمجھے کوئی
کیا عجب ہے مشک کو سقا اگر دریا ہے

سو گیا وہ سمجھ کے افسانا   دردِ دل اب کہاں تلک کہیے

عشقِ بتاں سے نبض میری دیکھ کر حکیم
کہنے لگا خدا ہی ہو، اب تو تو یہ جیجئے

چلی جاتی ہے نکلی جان ہی تدبیر کیا کریئے
مداوا سے مرض گزرا کہو اب میر کیا کریئے

گر زندگی یہی ہے جو کرتے ہیں ہم اسیر   تو وے ہی جی گئے جو گرفتار مر گئے
اسیری میں سارا قفس بوئے گل سے   معطر ہوا گو دماغ اب کہاں
ہے بس شاہدِ حالِ رنگِ شکستہ   جو دل میں ہے میرے سو منہ پر عیاں ہے
دن میں سو سو کتابیں لکھیے   یار جو حرف آشنا ہووے

ہوتا نہیں ہوں حضرت ناصح میں بے دماغ
کر کر کے پوچ کوئی میری جان کھائیے

نہیں ہے تاب و تواں کی جدائی کا اندوہ
کہ ناتوانی بہت ہے مزاج داں میری

کیا جانیے کیا کیا میں لکھوں شوق میں قاصد
پڑھنا نہ کرے خط کا کہیں اس پہ گرانی

پی نہ ہرگز شراب جیسا چاہ   اس کے نشے کا تار رہتا ہے
خون ہوتا نظر آتا ہے کسو کو مجھ کو   ہر نگہ ساتھ ترے صلوتِ ابرو ہے
مضطرب گریہ ناک ہے یہ گل   برق ابرِ بہار ہیں ہم بھی

ذوق تیرے وصال کا میرے   ننگے سر تا بہ گور آیا ہے

بے حرف بکھر رویا ہے حال پر ہمارے
قاصد کے ہاتھ میں خط نمناک ہو گیا ہے

دیدار کی گرسنگی اپنی یہیں سے دیکھ
ایک ہی نگاہ یاروں کی اوقات ہو گئی

شیخ جی سندیل کچھ بگڑی سی ہے کیا آپ بھی
رندوں بانکوں میکشوں آشفتہ وساروں میں تھے

داغِ فراق و حسرتِ وصل، آرزوئے دید
کیا کیا لیے گئے ترے عاشق جہاں سے

قتل کو میں کہا تو اٹھ بولا   آج کل صبح و شام ہوتا ہے
زلف سیاہ یار کی رہتی ہے چت چڑھی   یہ تازہ میرے جی کو کہاں کی بلا لگی

نے صبر ہے نہ ہوش ہے گل بن نہ تاب ہے
بے طاقتی ہے بے کلی ہے اضطراب ہے

سیکڑوں مرتے ہیں سدا پھر بھی یاں   واقعہ اک شام و سحر چاہیے
جیسی جرس پارہ گلو کیا کروں   نالہ و فغاں میں اثر چاہیے

بے قراری سے دلِ زار کی آزار ہو جائے
خواہش اس حد کو کھنچی آہ کہ بیمار ہو جائے

پڑے ایسے اسباب پایانِ کار   کرناچاریوں جی جلا کر چلے

ہر شب جہاں میں جلتے گزرتی ہے اب نسیم
گویا چراغِ وقف ہوں میں اس دیار کا

غالب کہ یہ دلِ خستہ شبِ ہجر میں مر جائے
یہ رات نہیں ہے جو کہانی میں گزر جائے

ہے طرفہ مفتن نگہ اس آئینہ رو کی
ایک پل میں کرے سیکڑوں خوں اور مکر جائے

خط اس کتابی چہرے کا قرآن تمام ہے   مصحف کی ترک اس کا دہن لا کلام ہے

ہے مغتنم جو تن میں کوئی زورِ جاں رہے
رہنا کہاں بنے ہے جہاں تک جہاں رہے

میر پھر کہیو سرگذشت اپنی
بارے یہ کہ مزاج تو خوش ہے

ٹپکے ہے خون ٹھہر ٹھہر دل کے ہر اک خراش کے
چھیڑو اس کو ہمدموں سر قلم تراش کے

ہر بار اٹکتا ہے تو کیوں نوکِ مژہ سے
اے لختِ جگر کیا تجھے منصور کی سوجھی

رونے سے اپنے ابر کا ہنگامہ سرد ہے
آنکھیں اگر نہیں ہیں تو دریا بھی گرد ہے

دامن کشاں زمیں سے ٹھوکر لگا چلے
جس جا ہماری خاک تھی دامن اٹھا چلے

عرضِ وفا ہے میر عبث شوق دہر میں
یاں ایسی جنسِ ہر کا خریدار کون ہے

کچھ تو کہے گا ہم کو خاموش دیکھ کر وہ
اس بات کے لیے اب چپ ہی رہا کریں گے

کس مشکل سے احوال کہوں جا کے الٰہی
صورت سے مری جی میں وہ بیزار نہ ہووے

اٹھایا ہاتھ سب اسباب سے یہ تہمت کی
فقیر ہونے پہ ہم نے بھی خرچ دولت کی

دیکھتے پھرتے ہیں مونہہ سب کے سحر آئینے
جلوہ گر ہو کہ یہ مجمع شوق میں حیران ہوئے

یہ کلول نہیں ٹلتی جی پر سے اس کے
حلاوت ہوا جس کو خنجر سے اس کے

ہجر میں جانِ امیدوار گئی   حسرتِ وصل ہائے مار گئی

کیا گل کے مونہہ لگی سی شگفتہ دماغ ہے
پھولا پھرے ہے مرغِ چمن باغ باغ ہے

ستم نہ کم کرو گو ہم میں دم رہے نہ رہے
بہت تم ہی رہو دنیا میں ہم رہے نہ رہے

حاجت بیاں کروں پہ پیر و جواں کہاں
جاتی ہے آہ فکرِ پریشاں کہاں کہاں

گل گئے پھر سے آئے ہو کے نئے   میر صد حیف ہم گئے سو گئے
آہستہ ٹک اغیار سے مت باتیں کہا کر   دل خون ہے ترے سخنِ زیرِ لبی سے

رشکِ یوسف ہے گو کہ وہ پر اب کس کو طاقت جفا اٹھانے کی

اب بے پری سے ہم کو چپ لگ گئی ہے ورنہ
گلزار میں ہمارے کیا چہچہے تھے پر کے

دل سے لے لب تئیں اپنی شکایت ہی ہے اور
بات کہنے کی نہیں ہے ہم کو رخصت ہائے ہے

غیر سے آگے مرے مت کر سخن ایسی باتوں میں سنا جاتا ہے جی

رباعیات

کیا کہیے کہ فتنہ شوق نے جی مارے — دکھ اگلے بھلا دیئے ہم سارے
اے میر شمار دم کے کس کو ہیں ہواس — اب یاد نہیں اپنے ہیں ہم پیارے

(۲)

اے میر محبت میں اذیت ہی رہی — پر ہم نے کسو سے اپنے دل کی نہ کہی
کٹ کٹ کے موا کیے ہیں اس پر اب تک — طور اپنا رہا یہی طرح ان کی وہی

(۳)

کب حالت زار پر تلطف نہ کیا — کب دیکھ مرے موہنہ کو تاسف نہ کیا
موہنہ کھول دیا سوتے جو میں آنکلا — بارے میں کبھو ان نے تکلف نہ کیا

(۴)

آئے ملے عاقل و کامل سے بھی — سائل ہوئے عالم اور جاہل سے بھی
کیا ہی نہ کہا کنہوں نے اس کا اسرار — پوچھا خلوت میں دیر تک دل سے بھی

(۵)

مسجد کے موذن سے گئی خواب پگاہ — بد منظر و بد نغمہ تھا وہ بے راہ
موہنہ دیکھ کراہت سے سحر میں نے کہا — لاحول ولا قوۃ الا باللہ

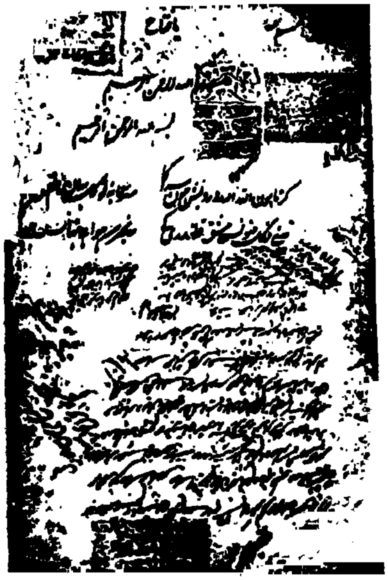
(۶)

اے میر بہت صبر کیا ہجراں میں — اب تاب نہیں ظلم رسیدہ جاں میں
کڑھتے کڑھتے ہی ہم کہیں گے اس بن — عشق کی کیفیت کہاں انساں میں

(۷)

اے میر محبت نہ کسو سے کریئے — یہ روگ ہے وہ کہ جس میں جیسے مریئے
کہتے ہیں لگی آنکھ تو آرام کیا — اس آنکھ لگی چونکتے سوتے ڈریئے
ہم رفتہ کسو کے جو ہوئے سر پائے — کیا میر کہیں سانگ بہت لائے
عزلت عزت کی بھی نداں اپنی گئی — رسوا ہوئے بازار میں رقصاں آئے

میر کا دیوانِ چہارم بخطِ میر حسن علی تجلی



یہ دیوان میر نے اپنے ہاتھ سے اپنے داماد اور ہمشیر زادہ میر حسن علی تجلی کو عنایت کیا تھا۔

قصاید اندر منقبت وغیرہ

جب سے خورشید ہوا ہے چمن افروز عمل — رنگ گل چمکے ہے ہر ہات ہرے کے اوجھل
وقت وہ ہے کہ زبس شوق سے چشم بلبل — ہو بہ دلکش گل دیکھنے کو ہو احول
جوشش گل ہے ہی جہاں تنگ کرے ہے ہر طرف — لالہ و نرگس و گل سے ہیں بھرے دشت و جبل
لطف روئیدگی مت پوچھ کہ جیں شبہ ہیں ہیں — سبزہ و خطاں ہیں لب جو پہ کہ خواب مخمل
شبنم رکھتا ہے نو گل بھی ہوا کو ٹک دیکھ — نرگس آگیں ہے جہاں وہی نہیں دہقاں نے بہال
سیر کر تازگی و خرمی و صفا ابی — خشک بھی شاخ ہے اب سبز نہالی گو ل
خون صد پارہ کش عاشقاں و بہجۂ گل — دونوں نکلے ہیں نمناک سے اب وسعت و نقل
برگ گل فیض ہوا کرتا ہے ہر اک کو — آگ کی گر کہیں ستا کے رکھے ہیں مشعل
بیسہ جیتی کتنیں مرغ چمن آئے ہزار — کسو گلبن کے تلے آپ بھی اب پڑھئے غزل

مطلع ثانی

نکلے ہی الا زبس ہاتھ کر اب سینہ گل — آتش گل سے جلا کرتا ہی سارا جنگل

کلیات میر، نول کشور لکھنؤ، مطبوعہ ۱۸۶۷ء کا عکس، پہلا صفحہ

غزلیں

روشن ضمیر بنتا ہے تحریر کا لباس — فانوس جیسے ہوتا ہے تنویر کا لباس
بے شک عطا ہے یہ تو بزرگانِ دین کی — اللہ نے بدل دیا تقدیر کا لباس
یہ میرا ظرف تھا جو ترے کام آگیا — میں بھی اتار سکتا تھا شمشیر کا لباس
ہر شخص آج یوں تو لباسِ وفا میں ہے — کس کے بدن پہ باقی ہے توقیر کا لباس
انسانیت برتتا ہے اخلاق بے ادب — حق کر اب اتر گیا تصویر کا لباس
ان کا خلوص، پیار، وفا تجھ سے ہے ضیاء
جملوں سے تجھ پہ کَس دیا زنجیر کا لباس

ضیاء قادری اجمیری
سہارا انڈیا بھون، لکھنؤ

پسِ طوفان سب منجدھار میرے — رہے ہیں قافلہ سالار میرے
گزر آیا ہوں جب دشواریوں سے — نکل آئے ہیں سب غم خوار میرے
وہ آیا آئینہ خانے کو لے کر — سجا کر لے گیا کردار میرے
مہکتا جھومتا موسم تمہارا — جھلستی دھوپ کے اشجار میرے
تمنائی تھا میں جنسِ وفا کا — تماشے ہیں سرِ بازار میرے
کبھی اس کی زباں سے بھی ادا ہوں
حیاتؔ ایسے کہاں اشعار میرے

حیاتؔ لکھنوی
۵۔ امامیہ ہال۔ پنچکوئن روڈ
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

یوں تو جہاں کی کر گزرے — اپنی ہستی سے بے خبر گزرے
تھے بھی دنیا میں یا نہیں تھے ہم — ایسے دنیا سے بے اثر گزرے
عمر بھر نیند اب نہ آئے گی — جانے کس وقت تو ادھر گزرے
اے صبا بوئے یار لیتی آ — اس کے کوچے سے تو اگر گزرے
ہم سا رسوائے خلق ہو نہ کوئی — انگلیاں اٹھ گئیں جدھر گزرے
وضعداری کے واسطے اکبرؔ
جو نہ کرنا تھا ہم وہ کر گزرے

مرزا اکبر علی بیگ
سردار پٹیل روڈ
سکندرآباد ۵۰۰۰۰۳

ڈاکٹر عبدالمغنی
پروفیسرس کوارٹر - سائنس کالج کیمپس
پٹنہ - ۸۰۰۰۰۵

خودنوشت سوانحی خاکہ

میری پیدائش ۴؍جنوری ۱۹۳۶ء کو ریاست بہار کے ضلع اورنگ آباد کے صدر مقام میں ہوئی، جو ہمارا آبائی وطن ہے اور چند سال قبل تک ضلع گیا کا ایک سب ڈویژن تھا۔ یہ شہر شیر شاہ کی گرینڈ ٹرنک روڈ پر واقع ہے اور اس کے مضافات میں پہاڑیوں کا ایک سلسلہ ہے۔ اس جگہ ہمارے آباواجداد مغلوں کے آخری دور میں الہ آباد کے علاقے کی ایک بستی دم گڑھ سے آئے تھے اور ان کا تعلق ایک بزرگ باسط علی شاہ قلندر کے خاندان سے تھا۔ شاہ عالم کے زمانے میں ہمارے پردادا رجب علی صاحب قاضی کے منصب پر فائز کیے گئے۔ میرے والد مولانا سید عبدالرؤف ندوی اورنگ آبادی مرحوم بھی قاضی تھے اور "معارف" اعظم گڑھ کے اولین لکھنے والوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ میرے نانا شاہ یحییٰ مرحوم سہسرام کی اس خانقاہ کے سجادہ نشین تھے جس کی تولیت میں کہا جاتا ہے کہ شیر شاہ کا روضہ بھی تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ ان کے جدِ امجد سہسرام کے وہ شاہ بڈھا تھے جن کا دستخط "فتاویٰ عالم گیری" پر ہے۔ میری والدہ وکیل النساء مرحومہ اپنے والد کی سب سے بڑی اولاد تھیں۔

میرا نام والد صاحب نے ابو المبرد سید عبدالمغنی رکھا۔ لیکن میں صرف عبدالمغنی لکھتا ہوں، میری ابتدائی تعلیم عربی اور فارسی میں میرے والد صاحب کے ہاتھوں گھر پر ہوئی، جس کے بعد میرا نام مدرسۂ اسلامیہ اورنگ آباد کے درجہ وسطانیہ چہارم میں لکھوا دیا گیا۔ یہاں سے میں نے فوقانیہ (ملاّ) کا امتحان درجۂ اول میں پاس کیا۔ اس کے فوراً بعد ۱۹۴۹ء میں میرا داخلہ مدرسۂ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے درجۂ مولوی میں کرا دیا گیا۔ یہ ادارہ بہار مدرسہ ایجوکیشن بورڈ سے ملحق ہے اور اس کا سارا انتظام سرکاری ہے۔ یہاں سے میں نے ۱۹۵۱ء میں درجۂ اولیٰ میں اول حیثیت سے عالم کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد ۱۹۵۴ء میں ضلع اسکول گیا سے میٹرک کا امتحان درجۂ اول میں پاس کرکے پٹنہ کالج، پٹنہ یونیورسٹی میں داخل ہو گیا، جہاں سے ۱۹۵۶ء میں آئی اے کا امتحان درجۂ اول میں وظیفۂ لیاقت کے ساتھ پاس کرکے ۱۹۵۸ء میں انگریزی آنرز کے ساتھ بی اے، پھر ۱۹۶۰ء میں ایم اے کیا اور ۱۹۶۱ء میں بہار پبلک سروس کمیشن کے مقابلے کے امتحان میں شریک ہوکر، جو انٹرویو کی شکل میں ہوتا تھا، پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی میں لکچرر کی حیثیت سے منتخب اور مقرر کر لیا گیا۔ بروقت میں یونیورسٹی پروفیسر آف انگلش اور پٹنہ یونیورسٹی کے ایک کونسٹی ٹیوٹ کالج، بی این کالج میں صدر شعبہ ہوں۔

میں نے مضمون نگاری ۱۹۴۹ء میں شروع کی اور شاید ۱۹۵۰ء میں میرا کوئی مضمون شائع بھی ہوا۔ بہرحال ۱۹۵۱ء سے مختلف علمی و ادبی موضوعات پر میرے مضامین شائع ہونے لگے، خاص کر روزنامہ "ساتھی" پٹنہ کے ہفتہ وار ادبی ایڈیشن میں۔ ۱۹۵۸ء میں میرا پہلا قابلِ ذکر تنقیدی مضمون "اردو ادب علی گڑھ میں" "اقبال اور تنقیدیں" کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس کے بعد "نقوش" لاہور میں متعدد مضامین شائع ہوئے۔ میرا پہلا مجموعۂ مضامین "نقطۂ نظر" مطبوعہ کتاب منزل پٹنہ، ۱۹۶۵ء، ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۲ء تک کے مطبوعہ مضامین پر مشتمل ہے۔ اب تک میرے تنقیدی مضامین کے نصف درجن سے زیادہ مجموعے ہندوستان اور پاکستان کے مختلف معروف

اداروں سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ کم از کم ایک درجن تصانیف مختلف موضوعات پر ہیں، جن میں متعدد کے ایک سے زیادہ ایڈیشن ہندوپاک میں شائع ہوئے ہیں۔ ان میں کئی کتابیں یونیورسٹیوں کے بی۔اے اور ایم اے کے نصابات میں شامل رہی ہیں اور ان میں چند پر کچھ بڑے انعامات بھی دیئے گئے ہیں۔ میری زیادہ تر کتابیں اردو میں ہیں اور چند انگریزی میں۔ میری ایک درجن سے زیادہ کتابیں اردو اور انگریزی دونوں میں مذہبی، سیاسی اور سماجی موضوعات پر ہیں، جن کے لیے ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ ان کے علاوہ مختلف اردو اور انگریزی اخبارات ورسائل میں متنوع موضوعات بالخصوص مسائل حاضرہ پر میرے لاتعداد مضامین چھپے ہوئے ہیں، جن کے مجموعے مرتب ہوکر ہنوز شائع نہیں ہوئے ہیں۔

مدرسہ کی تعلیم کے آخری دور سے یونیورسٹی کی تعلیم تک، پھر یونیورسٹی کی ملازمت کے دوران میں آج تک میری گہری اور وسیع دلچسپی اور سرگرمی اجتماعی معاملات کے ساتھ رہی ہے۔ چنانچہ میں برابر متعدد اداروں سے وابستہ اور بسا اوقات ان کے کلیدی مناصب پر فائز رہا ہوں۔ پچھلے انیس سال سے میں انجمن ترقی اردو بہار کا منتخب صدر ہوں۔ بہار کی اردو تحریک میں وہ منزل میرے ہی دورِ صدارت میں آئی۔ جب ۱۹۸۰ء میں ریاست کی اسمبلی نے ایک ایکٹ پاس کرکے دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے اردو کا قانون منظور کیا، پھر پٹنہ میں حکومت بہار نے سہ منزلہ اردو بھون انجمن ہی کے مطالبے پر تعمیر کیا، جس کی دوسری منزل پر انجمن کا دفتر ہے۔ اس کے علاوہ پرائمری سے یونیورسٹی کی سطحوں تک بہار میں اردو کی تعلیم کی جو سہولت ہے وہ انجمن کی چلائی ہوئی تحریک اردو ہی کا فیض ہے۔ انجمن کا ادبی ادارہ "حلقۂ ادب" کے نام سے کام کر رہا ہے۔ جس کا ترجمان ماہنامہ "مرّیخ" ایک مدت سے میرے زیر ادارت شائع ہو رہا ہے۔ انجمن ایک مدت سے غیر اردو دانوں کو آسان اور جدید طریقے پر اردو پڑھانے کا ایک کیمپ بھی بڑی کامیابی سے ڈاکٹر عزیز الحسن صاحب کے زیر نگرانی چلاتی رہی ہے۔ تعلیمی مسائل کے حل کے لیے انجمن کا اقلیتی تعلیمی بورڈ کام کر رہا ہے۔ انجمن کے علاوہ مختلف دفتروں میں ان سرکاری و نیم سرکاری اداروں کی مجالس عاملہ کا رکن رہا ہوں جن کا تعلق تعلیمی و تہذیبی امور سے ہے، جیسے بہار اردو اکاڈمی، بہار مدرسہ ایجوکیشن بورڈ، مذہبی و لسانی اقلیتی کمیشن، اردو مشاورتی کمیٹی راج بھاشا، بہار ٹکسٹ بک پبلشنگ کارپوریشن، مجلس منتظمہ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ۔

تقریباً پینتیس سال سے مجھے ملک کے مختلف بڑے شہروں میں منعقد ہونے والے کنونشنوں، کانفرنسوں، سیمناروں اور عام جلسوں سے خطاب کرنے یا ان میں مقالات پڑھنے کے مواقع بکثرت ملے ہیں۔ ان کے علاوہ میں انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی، جامعہ اردو علی گڑھ اور بورڈ آف اسلامک پبلی کیشنز دہلی کی مجالس عاملہ کا رکن ایک مدت سے ہوں اور ان کی نشستوں میں شریک ہوتا رہتا ہوں۔ بہتیرے مرکزی سرکاری کمیشنوں سے بھی گفت و شنید کا موقع ملتا رہتا ہے۔ متعدد علمی، تعلیمی اور ادبی ادارے بسا اوقات مجھ سے اپنے بعض مسائل کے حل کے لیے مشورے طلب کرتے ہیں۔ افراد اور طلبہ بھی رجوع کرتے ہیں۔ جن میں بعض نے میرے زیر نگرانی انگریزی ادب میں کامیابی کے ساتھ پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالات لکھے ہیں۔ خود میں نے ۱۹۶۰ء میں ٹی، ایس، ایلیٹ کے تصور تہذیب پر انگریزی میں ایک تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ یہ مقالہ کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے اور اس کے ایک سے زیادہ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

میں نے سب سے زیادہ مضامین اور کتابیں اقبال پر تحریر کی ہیں، جن کی کل تعداد چھ ہے اور ان میں ایک انگریزی میں ہے۔ ترقی اردو بورڈ نئی دہلی نے کئی سال قبل میری ایک کتاب جارج برنارڈ شا پر شائع کی تھی، جس کا پہلا اڈیشن ختم ہوئے ایک مدت ہو چکی۔ غالب، ابوالکلام آزاد، اور قرۃ العین حیدر پر بھی میری کتابیں ہیں۔ چند برسوں قبل ایوان غالب دہلی نے مجموعی خدمت زبان و ادب کا اپنا خاص ایوارڈ مجھے ایک تقریب میں عطا کیا تھا۔

میری شادی ۱۹۶۰ء میں گیا میں شہر بانو بنت ضمیر الدین صاحب مرحوم سے ہوئی۔ میرے دو لڑکے اور چار لڑکیاں ہیں، جو سب خدا کے فضل سے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ میری رشتہ داریاں زیادہ تر غیر منقسم مگدھ یا پٹنہ ڈویژن کے اضلاع میں پھیلی ہوئی ہیں، جب کہ اعزا و احباب

دنیا کے بیشتر ممالک میں پائے جاتے ہیں۔ میں بعض اوقات دعوتوں کے باوجود ابھی تک ملک سے باہر کسی سلسلے میں نہیں گیا ہوں، لیکن ملک کے اکثر بڑے شہروں میں جلسوں کی شرکت کے لیے جاتا رہا ہوں۔ ہندوستان، پاکستان، امریکہ اور یورپ کے مختلف خطوں سے میرے پاس خطوط کے علاوہ افراد بھی وقتاً فوقتاً تبادلۂ خیال کے لیے آتے رہتے ہیں اور متنوع مسائل پر انٹرویو ٹیپ کر کے لے جاتے ہیں۔ لوگ سوانح اور تصویریں بھی طلب کرتے رہتے ہیں۔ قومی پریس کے نمایندے مختلف واقعات پر میرا ردّ عمل جاننے کے لیے آتے رہتے ہیں اور میرے تبصرے اپنے اخبارات و رسائل میں شائع کرتے رہتے ہیں۔ میں خود بھی متعدد موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار اردو اور انگریزی جریدوں میں کرتا رہتا ہوں۔

میں نے دورانِ تعلیم مشرقی و مغربی نصابات میں تفسیر، حدیث، فقہ، قدیم منطق و فلسفہ وغیرہ عربی میں وسیع پیمانے پر پڑھا ہے، پھر انگریزی میں ادب کے علاوہ جدید منطق و فلسفہ کا مطالعہ کیا ہے۔ غیر درسی طور پر اپنے شوق سے انگریزی میں مختلف علوم و فنون اور ان کی جدید ترین ترقیات کا مطالعہ بکثرت اور مسلسل کرتا رہا ہوں، جس کا حوالہ میرے متعدد مضامین اور کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ میری دلچسپی کے خاص موضوعات ادب، مذہب اور سیاست ہیں جنھیں میں مہذب سماج کے تین بنیادی عناصر سمجھتا ہوں۔ چنانچہ میری تحریر و تقریر اور علمی سرگرمیوں کے موضوعات بھی یہی ہیں۔ ذہن و کردار کی تعمیر کے لیے اردو کے پانچ مصنفین کو میں بہت زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔ یہ ہیں علامہ شبلی، علامہ اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی۔ میرا خیال ہے کہ یہ مشرق سے ابھرنے والے عصرِ حاضر کے بہترین دماغ ہیں جن کے لٹریچر کا مقابلہ دورِ جدید میں مشرق کی کوئی زبان نہیں کر سکتی۔ مشرق کے ان عظیم دانشوروں کا موازنہ مغرب کے دانشوروں سے بھی بخوبی کیا جا سکتا ہے اور بلا خوفِ تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ تہذیبی قدروں کے فروغ اور انسان سازی میں مشرق کے مذکورہ دانشوروں نے جو خدمات ہمارے زمانے میں انجام دی ہیں ان کا مقابلہ کوئی مغربی دانشور نہیں کر سکتا۔

عصرِ حاضر کی مغربی ادبیات میں میں نے سب سے زیادہ مطالعہ جارج برنارڈ شا اور ٹی ایس ایلیٹ کا کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ برنارڈ شا یورپ کا سب سے بڑا انشا پرداز اور دورِ جدید کا سب سے بڑا ڈرامہ نگار اور انشا پرداز ہے۔ جبکہ ٹی ایس ایلیٹ سب سے اہم تنقید نگار۔ برنارڈ شاہ کا ایک بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے بیسویں صدی کے اوائل میں ادب برائے ادب کا لایعنی طلسم توڑ کر ادب برائے زندگی کا سکہ جما دیا اور اپنی تحریروں سے زوال آمادہ یورپ میں تہذیبی قدروں کی بقا کے لیے جدوجہد کی۔ یہی مہم ٹی ایس ایلیٹ نے بھی اپنے طور پر انجام دی، اگرچہ فنی طور پر شاعری میں نظمِ آزاد کو فروغ دینے کی جو کوشش اس نے انگریزی میں کی اس سے شاعری کے زوال کا سامان ہوا اور تنقید میں اخلاقیات کو معیارِ عظمت قرار دینے کے باوجود ایلیٹ سے غلطی یہ ہوئی کہ اس نے الہیات اور عمرانیات کو خلط ملط کر دیا۔ بہرحال شا اور ایلیٹ مجموعی طور پر مغربی یا انگریزی ادب میں مثبت تعمیری قدروں کے سب سے بڑے علمبردار ہیں۔ گرچہ ان کی کوششیں اس انتشار کو نہیں روک سکیں جو مغربی ادب میں خاص کر دوسری جنگِ عظیم کے بعد پھیل گیا۔

اس انتشار کا منفی اثر اردو کے جدید ادب پر بہت گہرا پڑا ہے، خاص کر تقسیمِ ہند کے بعد آزاد نظم نگاری اور تجریدی افسانہ نگاری نے اردو کے تخلیقی ادب کو بڑی حد تک غارت کر دیا ہے۔ اس غارت گری میں اس نئی تنقید نے نہایت تخریبی رول ادا کیا ہے جو مغرب کے بالکل سطحی مطالعے اور خام تقلید پر مبنی ہے۔ اردو ادب کے ان بگڑتے ہوئے رجحانات پر میں نے اپنی تنقیدوں میں شدید ترین گرفت کی ہے۔ چنانچہ میں دیکھ رہا ہوں کہ تجریدی افسانے کی رَو آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہے اور اس کی حامی تنقید بھی اپنے رویے پر نظرِ ثانی کر رہی ہے، لیکن نظمِ آزاد کی گرم بازاری ابھی کم نہیں ہوئی ہے، شاید اس لیے کہ تجدد پسند شاعروں کا ذوق و مزاج بگڑ چکا ہے یا انھیں اپنے فن پر ہنوز قدرت نہیں حاصل ہوئی ہے۔

میری کتابوں کی فہرست حسب ذیل ہے :

تنقیدی مضامین کے مجموعے

اردو

١۔ نقطۂ نظر ١٩٦٥ء کتاب منزل پٹنہ
٢۔ جادۂ اعتدال ١٩٧٢ء " " "

۳۔ تشکیل جدید ۱۹۷۶ء احمد مسعود پٹنہ
۴۔ معیار و اقدار ۱۹۸۱ء حکمت پبلی کیشنز پٹنہ
۵۔ تنقید مشرق ۱۹۸۸ء اردو بک فاؤنڈیشن نئی دہلی
۶۔ تصورات ۱۹۸۸ء ادارۂ فکر جدید، نئی دہلی
۷۔ اسلوب تنقید ۱۹۸۹ء عاکف بک ڈپو دہلی
۸۔ تنقیدی زاویے ۱۹۹۳ء آصف پبلی کیشنز علی گڑھ

تنقیدی کتابیں

۱۔ اقبال اور عالمی ادب ۱۹۸۲ء کورینٹ گیا۔
۱۹۹۰ء اقبال اکاڈمی، لاہور
۲۔ اقبال کا نظام فن ۱۹۸۳ء مکتبۂ مریخ پٹنہ۔
۱۹۹۰ء اقبال اکاڈمی لاہور
۳۔ قرۃ العین حیدر کا فن ۱۹۸۵ء، ۸۹ موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی۔ ۹۱ گلوب پبلشرز لاہور۔
۴۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ ذہن و کردار ۱۹۸۹ء، انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی
۵۔ قرآن کا ادبی اعجاز ۱۹۸۹ء، مرکزی مکتبۂ اسلامی دہلی
۶۔ عظمت غالب ۱۹۹۰ء، انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی
۱۹۹۳ء القرآن پبلیشرز، لاہور
۷۔ مولانا مودودی کی ادبی خدمات۔ ۱۹۸۹ء مرکزی مکتبۂ اسلامی دہلی
۱۹۹۳ء، فاران پبلی کیشنز کراچی
۸۔ تنویر اقبال۔ ۱۹۹۰ء، مکتبۂ تعمیر انسانیت لاہور
۹۔ اقبال کا ذہنی و فنی ارتقا۔ ۱۹۹۱ء، انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی
۱۰۔ اقبال کا نظریۂ خودی۔ ۱۹۹۱ء مکتبۂ جامعہ نئی دہلی
۱۱۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا اسلوب نگارش۔ ۱۹۹۱ء، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۔

تنقیدی کتابیں

انگریزی

۱۔ جارج برنارڈ شا ۱۹۶۷ء ترقی اردو بورڈ نئی دہلی

۲- T.S.ELIOT'S CONCEPT OF CULTURE 1986 S.CHAND & COMPANY NEW DELHI
۳- IQBAL THE POET 1992 BAZME IQBAL LAHORE

علوم اجتماعی اور مسائل حاضرہ

۱۔ قرآن کا نظریۂ جنس ۱۹۸۸ء، مرکزی مکتبۂ اسلامی نئی دہلی
۲۔ مابعد صنعتی معاشرہ اور اسلام ۱۹۸۸ء " " " "
۴- TERRORISM AND ISLAM " " " "
۵- INTRODUCTION TO ISLAMIC CIVIL CODE 1989 " " " "
۶- THE WAY OF ISLAM 1992, KERLA
۷۔ اورنگ زیب۔ ۱۹۹۲ء، ۱۹۹۳ء مرکزی مکتبۂ اسلامی دہلی
۸۔ ٹیپو سلطان ۱۹۹۰ء، ۱۹۹۲ء " " " "
۹۔ قرآن کا فلسفۂ تاریخ ۱۹۹۱ء " " " "
۱۰۔ محمود غزنوی ۱۹۹۳ء " " " "
۱۱۔ قرآن کا نظریۂ کائنات ۱۹۹۳ء " " " "
۱۲۔ قرآن کیوں پڑھیں؟ ۱۹۹۳ء " " " "
۱۳۔ ہندوستان کے لیے مستقبل کا نقشۂ عمل ۱۹۹۴ء " " " "

متفرقات

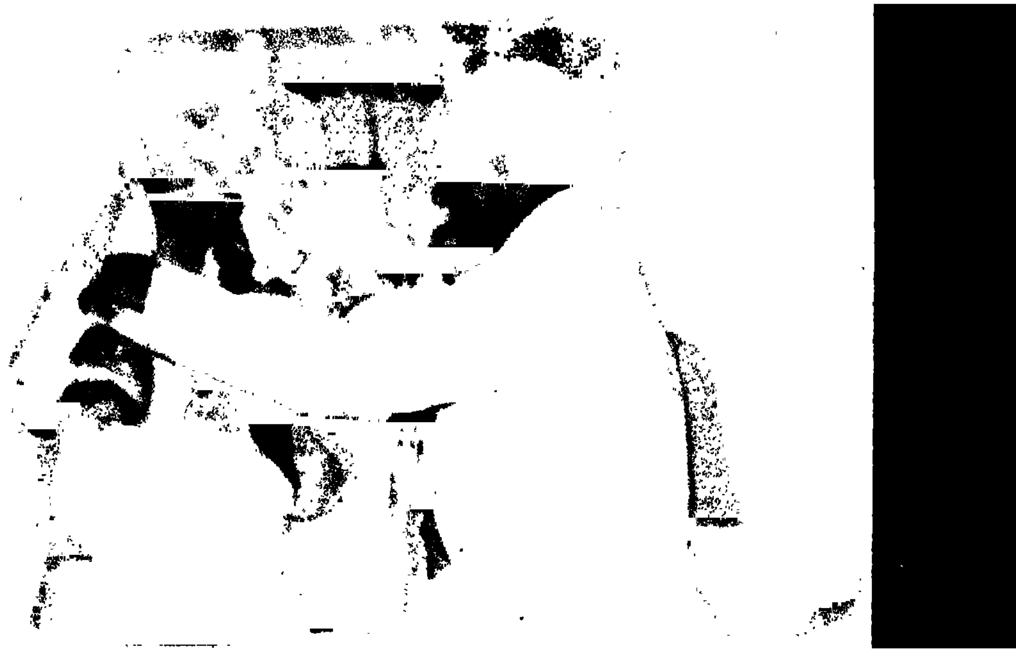
۱۔ سلور کنگ آغا حشر ترتیب مع مقدمہ ۱۹۹۳ء مکتبۂ فروغ اردو لکھنؤ
۲۔ اختر اورینوی کے افسانے ۱۹۷۷ء، بہار اردو اکاڈمی پٹنہ
۳۔ طرز تعلیم۔ توسیعی خطبات۔ ۱۹۸۵ء مرکزی مکتبۂ اسلامی دہلی

زیر عمل

THE QURAN: AN AUTHENTIC, MODERN AND IDIOMATIC ENGLISH TRANSLATION.

زیر ترتیب

[redacted] تنقیدی مضامین کا نیا مجموعہ



△ گورنر اترپردیش شری موتی لال ووراہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ کمیٹی کے جلسہ میں

پروفیسر راجندر ناتھ چودھری کو ایوارڈ دیتے ہوئے

(تصاویر جاوید ہاشمی)

وزیر برائے اقلیتی بہبود اور محکمہ اوقاف شری بشیرالدین

اپنے دفتر میں عوام کے مسائل سنتے ہوئے۔ ▽





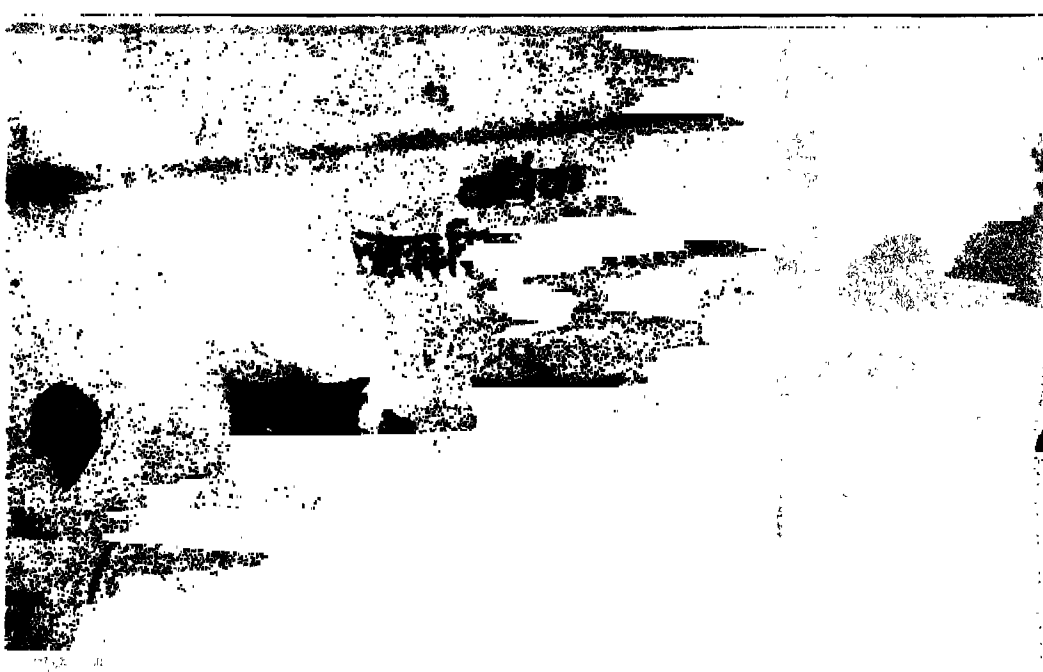
وزیر اعلیٰ اتر پردیش محترمہ مایاوتی عوام کے مسائل سنتے ہوئے



وزیر ریاست
مال شری بدالدین
جولائی ۱۹۹۵ء
..... میں
کے ترقیاتی کاموں
کے سلسلے میں
سطح کے افسران
کی میٹنگ کو
کرتے ہوئے



وزیر اعلیٰ [illegible]
[illegible]
اور ممبر [illegible]





[ی]ر یعت شری آر کے، چودھری سکھوں کے ایک وفد سے
[ملا]قات کرتے ہوئے۔

(تصویر: جاوید ہاشمی)

ہندی اُردو ساہتیہ ایوارڈ کمیٹی کے جلسہ میں ایوارڈ حاصل کرنے والے فن کار
درمیان میں شری انیس انصاری اور ان کے دائیں طرف پروفیسر گوپی چند نارنگ



انشائیہ

پروفیسر محمد زماں آزردہ
شعبۂ اردو، جموں یونیورسٹی
(جموں کشمیر)

آنکھ

آدمی کی شخصیت میں آنکھ کا حصہ بہت ہی اہم ہے۔ انسانی زندگی کے سفر میں آنکھ کو نظر انداز کرنا انتہائی غلطی ہے۔ زندگی کا سفر آنکھ کے کھولنے سے شروع ہوتا ہے اور یہ سفر آنکھ کے بند ہونے کے ساتھ ختم ہوجاتا ہے۔ زندگی کے اس سفر کے لئے عام گفتگو میں سوا آنکھ کے کسی اور عضوئے جسم کا نام نہیں لیا جاتا۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ جب تک آنکھ ساتھ دے آدمی زندہ ہے اور جب یہ ساتھ چھوڑ دے تو زندگی ختم ہوگئی۔

انسانی زندگی کا صحیح مزا دیکھئے تو صرف آنکھ کی بدولت ہے۔ اتنے بڑے انسانی جسم میں آنکھیں بہت ہی مختصر جگہ گھیرتی ہیں مگر ان کی وسعت دیکھئے کہ ساری دنیا ان ہی آنکھوں میں سمائی رہتی ہے۔ مسرت کا احساس ہو یا غم کا اظہار، محبت کا اقرار ہو یا غصہ کا اظہار، آنکھیں اپنا حصہ ضرور ادا کرتی ہیں۔ زبان کو بڑی اہمیت ہے یہاں تک کہ لوگ قوت گفتار کو آدمی کی پہچان سمجھتے ہیں مگر کتنا ہی باتونی آدمی ہو، زبان اور طرزِ ادا پر کتنی ہی قدرت کیوں نہ ہو اگر آنکھیں نہ ہوں تو کتنی داستانیں ان کہی رہ جائیں گی۔

بہت کم کام ایسے ہیں جن میں آنکھ کا ذکر اور آنکھ کا استعمال نہیں ہوتا۔ آدمی کو حیوانِ ناطق ہونے کی بنا پر مخلوقات میں اشرف ہونے کا درجہ دے دیا گیا ہے لیکن جب قوت نطق مجبور ہوجاتی ہے وہاں آنکھیں سہارا دیتی ہیں۔ بلکہ کہنا یہ چاہئے کہ اگر زبان کے ساتھ آنکھ کا جیسا ہدایت کار اور نگہبان نہ ہو تو ہر کام بگڑ جائے گا۔ آدمی جذبات کا ایک پتلا ہے چاہے یہ جذبات غصّے کے ہوں، خوف کے ہوں یا محبت اور مسرت کے۔ اگر آنکھیں ساتھ چھوڑ جائیں تو ان جذبات کا صحیح اظہار ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ آنکھ مار سکتے ہیں مگر زبان نہیں مار سکتے اس کو صرف چلا سکتے ہیں۔ اِدھر آپ نے آنکھ دبائی اُدھر مطالب کی ایک دنیا دوسرے دیکھنے والے تک منتقل ہوگئی مگر اس کے برعکس آپ نے زبان دبائی تو گئے کام سے۔

آپ کا دل اگر بہت زیادہ دکھی ہے اور آنکھوں میں آنسو نہیں ہیں تو دل کا یہ درد اندر ہی اندر خاک کردے گا۔ دل بھی آپ کی آنکھ کا محتاج ہے اس نے ساتھ نہ دیا تو اس کا دھڑکنا اور تڑپنا بے معنی ہے۔ صاحب دل ہونا اپنی جگہ ایک خوبی ضرور ہے مگر اس کے ساتھ صاحب نظر ہونا ضروری ہے۔ البتہ اس بحث کی یہاں گنجائش نہیں کہ آدمی پہلے صاحب نظر ہوتا ہے یا صاحب دل، مگر یہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ جیسے زندگی کا سفر آنکھ کے کھلنے سے شروع ہوجاتا ہے ویسے ہی ہر روداد اور ہر واردات کے پیچھے ایک نظر ضرور کارفرما ہوتی ہے۔ اسی لئے عاشق دل سے زیادہ نظر کا تقاضا کرتے ہیں اور اسی سے مات کھا جاتے ہیں۔ جگر کہتے ہیں ؎

کیا چیز تھی کیا چیز تھی ظالم کی نظر بھی
اٹھ کر کے وہیں بیٹھ گئے درد جگر بھی

نظر کی قوت جسم کے دیگر حصّوں کی حرکت کی قوت سے کہیں زیادہ ہے۔ ایک حسرت بھری نگاہ کسی داستان سے کم نہیں، اس میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ آپ جیسے چاہیں اس کو مفہوم بخش سکتے ہیں۔ یہ نگاہ رازدار بھی ہے اور ایک سربستہ راز بھی۔ یہ چپ بھی ہے اور گویا بھی۔ افسوس نے نگاہ کی اس قوت کا اظہار یوں کیا تھا ؎

گراں گزرے گا حرفِ آرزو اس طبعِ نازک پر
نگاہِ شوق اس مضمونِ رنگین کو بیاں کردے

آپ کا دل بھر آئے تو کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا مگر آنکھ بھر آئے تو ہزاروں کی ہمدردی آپ کے ساتھ ہوگی۔ لوگ کہتے ہیں کہ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے مگر نظر کا معاملہ کچھ اور ہے۔ آنکھیں تو ہمراز ہیں ہی کہ آنکھوں آنکھوں میں گفتگو ہوتی ہے لیکن اصل قوت اس کی یہ ہے کہ نگاہ دل سے جگر تک اتر جاتی ہے۔ ایک نظر میں قلعہ فتح ہوتے ہیں۔ یہ بھی ایک معمولی کارنامہ ہے قلعہ تو

ہتھیاروں سے بھی فتح ہو سکتے ہیں اس کی طاقت تو ایسی ہے کہ یہ انسانی دلوں کو فتح کرتی ہے جو کسی قوت سے قابو میں نہیں آتے۔ غالب نے جب کہا تھا کہ لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں۔ تو مطلب اسی نگاہ سے تھا۔ تلوار تو کاٹ کے پھینک دیتی ہے مگر نظر جو آنکھ کی مرہون منت ہے، ایک تیر نیم کش ہے جس کی خلش ہمیشہ باقی رہتی ہے۔

آنکھ کے بارے میں لوگوں نے طرح طرح سے اظہار خیال کیا ہے لیکن اس کا سحر کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ شعراء تو اس کے اس قدر متوالے ہیں کہ ساری زندگی ایک نگاہ کے بھروسے گزارتے ہیں۔ اپنی طرف سے خوبصورت سے خوبصورت تشبیہیں تلاش کرتے ہیں مگر جو آنکھ ہر چیز اور خیال کو اپنے اندر سمو لیتی ہے اس کو کسی چیز میں نہیں سمو سکے۔ بڑی دریافت کے بعد نرگس کو تلاش کیا، اس کی حیرانگی، شکل و صورت وغیرہ سے فائدہ اٹھانا چاہا لیکن جب مرزا دبیر نے غور کیا تو یہ کہنے پر مجبور ہوئے۔ ؎

گر آنکھ کو نرگس کہوں ہے عینِ حقارت
نرگس میں نہ پلکیں ہیں نہ پتلی نہ بصارت

آنکھ آدمی کے پاس بہت بڑا ہتھیار ہے۔ ذرا سا آنکھیں دکھائیں اور غلط بیانی کرنے والا چپ ہو گیا۔ نگاہ کے سامنے کوئی عیب نہیں چھپ سکتا۔ یہ اتنی ہوشیار ہوتی ہے کہ بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑتی ہے اور اسے مناسب سبق سکھاتی ہے۔ ایک ذرا آپ نے اس کو جھکا دیا کہ زندگی کا مفہوم ہی بدل گیا۔ اس کا سب سے بڑا ہتھیار اس کے آنسو ہیں۔ جن کا استعمال بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ ان آنسوؤں میں مقناطیس کی قوت ہے۔ یہ آنسو بیک وقت حرارت کو بڑھاتے بھی ہیں اور کم بھی کرتے ہیں۔ محبت اور ہمدردی میں اضافہ ہو جاتا ہے اور بے مروتی اور غصے میں کمی آجاتی ہے۔ آنسوؤں کے سامنے کوئی قوت نہیں ٹھہرتی۔ آنکھوں کا تعلق انسانی زندگی کی کامیابی سے بھی بہت گہرا ہے۔ جو اپنی آنکھیں کھلی رکھتا ہے وہ زندگی کی بازی میں مات نہیں کھاتا اور جو آنکھ بند کر کے چلتا ہے وہ منھ کے بل گر جاتا ہے۔ زندگی کے فیصلوں میں کھلی آنکھیں سب سے فائدہ مند رہتی ہیں۔ آنکھیں دوسرے کا دل دیکھ کے آتی ہیں اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی، یہ اپنے دل کا حال دوسرے کی آنکھوں کے ذریعے اس کے دل تک پہنچاتی ہیں اور دوسرے لوگ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

آنکھیں تو دل کا دروازہ ہیں اگر آپ کسی کی آنکھوں میں سما گئے تو سمجھ لیجیے کہ آپ نے اس کے دل میں جگہ کر لی۔ اور اگر کوئی آپ کو ایک آنکھ نہ بھایا تو آپ کا دل اسے کبھی قبول نہیں کرے گا۔

آنکھ کا استعمال کرنا نہ آئے تو یہ جھیل جیسی گہری اور کنول جیسی خوبصورت کیوں نہ ہوں، ان پر پلکوں کا خوبصورت سائبان اور ابروؤں کی محرابیں کیوں نہ ہوں۔ سب بیکار ہے۔ آنکھیں ایک طرف تو دل کا دروازہ ہیں اور دوسری طرف کائنات کے رازہائے سربستہ کی کنجی ہیں لیکن اگر اس دروازے پر مادیت کا قفل چڑھا دیا تو اس سے نہ خود کو فائدہ ہوگا اور نہ کسی اور کو۔ یہی آنکھیں باب اجابت ہیں اور یہی دنیائے دعا۔ شرط یہ ہے کہ اس پر مادیت کے پردے نہ ہوں اور نہ اس کے اندر مگرمچھ کے آنسو ہوں۔ ان کثافتوں کے نہ ہونے سے آنکھ کا پانی کبھی نہیں مرے گا اور یہ آئینہ ہو جائے گی۔ جس میں آدمی ایک طرف خود کو دیکھے گا اور دوسری طرف اسرار کائنات کا مشاہدہ کرے گا۔

غزل

ہیں وسعتوں کی کھوج میں شہپر نواز سر
محصورِ خواب گاہ مقدر نواز سر
جی چاہتا ہے پھر وہی موسم پلٹ کے آئے
وہ سنگ بار ہاتھ، وہ پتھر نواز سر
مایوس ہو کے لوٹ گئے سب رداکشاں
شاید نہیں ملا کوئی چادر نواز سر
ان کو دماغِ تصۂ سر دادگاں کہاں
یہ کھاتے پیتے لوگ یہ پیکر نواز سر
کوئی کہیں سے ڈھونڈھ کے لاؤ شکیب کو
پھر احتیاجِ دہر ہے خنجر نواز سر

شکیب رضوی
کرائسٹ چرچ انٹر کالج
کانپور

اور ہم ناچیز بندے

گاہے گاہے ——— شاذونادر ہی سہی
ہم بھی
نظر انداز کر دیتے ہیں
اپنے ناسمجھ، کم فہم بچوں کی خطائیں
آسمانی باپ بھی
اپنے کروڑوں بالکوں کی
یعنی ہم نادان بچوں کی
بہت سی لغزشوں کو درگزر کرتا ہے
کتنی بار
اپنے ظرفِ عالی، رحم و بخشش کے
خطاپوشی کے صدقے
وہ کبھی دل میں نہیں رکھتا ملال

اور ہے اپنا یہ حال
دل کے آئینے میں پڑجاتا ہے بال
دل کو ہم سمجھا نہیں پاتے
جب اپنے ہی عزیز
کرتے ہیں دانستہ اپنے دل شکن اقدام سے
حرکات سے افعال سے
اپنے بزرگوں کو ذلیل
ایسی ناشائستگی کو کر نہیں پاتے معاف
ضبط کی تلقین سے کرتے ہیں اکثر انحراف

آسمانی باپ کا کیا ہے
کہ وہ تو
قادر و مختارِ مطلق ہے شباب
اس کا کرم ہے بے حساب بے مثال
اس کو سبھی کہتے ہیں ربّ ذوالجلال
اور ہم ناچیز بندے
فطرتِ سفلی کے قیدی اور پابندِ حواس
ہم کہ ہیں
مجبور و پابند و غلام
کچھ سمجھ سکتے نہیں اس ذاتِ مطلق کا نظام
ہم کہاں سے پائیں گے
اس ذاتِ بخشندہ کے
اوصافِ جمیل
جس کی رحمت کی نہ کوئی حد
نہ اندازہ
نہ ہے کوئی عدیل

□□

شباب للت
۹۔ ایڈوڈلے
چوڑا میدان
شملہ ۔۱۷۱۰۰۴

لہو کی شفق

ختم ہوگا کہاں بے سحرائے شبِ غم ترا سلسلہ
آنسوؤں سے لکھیں کب تک داستانِ الم
شرق سے غرب تک
کربلا، کربلا
زہر آلود ساری فضا
اور بارود کی بو سے بوجھل ہے آب و ہوا
رقص کرتی ہے ہر سمت موجِ بلا
دشتِ صوت و صدا میں رجز ہی رجز
ایشیا اور افریقہ کی سرحدوں پر ہوئیں
جب سے تیزاب کی بارشیں
شاخِ زیتون بھی خشک ہونے لگی
قتل و خوں ریزی، غارت گری اور ظلم و تشدد
ہو رہے ہیں شب و روز حد سے سوا
تار تار ہو گئی ہے قبا آئین و جمہور کی
اب تو انسانیت بھی ندامت کے آنسو بہانے لگی
منجمد ہوگئے لب پہ حرفِ دعا
شرق سے غرب تک کربلا، کربلا
اے خدا! تو علیم و خبیر
اے خدا! کر عطا اتنی طاقت ہمیں
تاکہ دستِ دعا ہم بلند کرسکیں
تیری درگاہ میں
آنسوؤں سے لکھیں کب تلک داستانِ الم
چار سُو بس دھواں ہی دھواں
کوئی منظر نہیں صرف لامنظری
آسماں سے لہو کی شفق کا عذاب
کب تلک نسلِ آدم کے ننگے سروں پر اترتا رہے گا ..

□□

ڈاکٹر آفاق فاخری
[illegible]

پروفیسر تنویر چشتی
درگاہ حضرت شاہ ولایت منگلوری، شاہ ولایت مارگ
منگلور ضلع ہردوار

حضرت مخدوم شاہِ ولایت منگلوریؒ

تصوّف اسلام کی ایک ایسی سچی تعبیر ہے، جو انسانوں کو روحانی نظریہ عطا کرتی ہے، اور وہ نظریہ انسان کے باطن کی تہذیب اور تذکیۂ نفس کرتا ہے۔ اس لیے تصوف کی ایک تعریف یہ بھی کی جاتی ہے کہ اعمال متعلق بہ ظاہر کا نام شریعت یا فقہ ہے، اور اعمالِ متعلق بہ باطن کا نام طریقت یا تصوّف ہے۔ مگر فقہ اعمالِ باطن کی نفی نہیں کرتا اور تصوّف اعمالِ ظاہری کو مسترد نہیں کرتا اس لیے بعض علما، اور صوفیا اسلام کو ان دونوں دائروں (فقہ اور تصوّف) پر محیط سمجھتے ہیں۔

سرکارِ رسالت پناہ حضرت محمدؐ رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ: "میں علم کا مدینہ (شہر) اور علیؓ اس کا دروازہ ہیں"۔ اس حدیثِ مکرم کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ صوفیا، اور علما، دونوں کا علم اور اس کے متعلقات پر کمند ڈالنا ضروری ہے۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے فرمایا ہے کہ تصوّف کی ابتدا علم، اس کا اوسط عمل اور انتہا عشق نیز عطائے الٰہی ہے۔ اس تعریف کی رو سے تصوّف کے تین پہلو ہیں: علمی۔ عملی اور عشقی یعنی کشفی اور باطنی۔ یہاں یہ نکتہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ عالم کا صوفی ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ صوفی کا عالم ہونا ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو حضرت قطب الدین بختیار کاکی اوشیؒ، حضرت شیخ فرید الدین گنج شکرؒ، حضرت سید نظام الدین اولیاؒ، حضرت شیخ نصیر الدین روشن چراغ دہلویؒ، حضرت سید محمد بندہ نواز گیسو درازؒ عظیم المرتبت صوفی ہو کر، ممتاز عالم نہ ہوتے۔ حضرت شاہ ولایت منگلوری بھی اسی قافلۂ علم و تصوّف کی روشن جہت ہیں جنھوں نے اپنی ظاہری حیات میں نہ صرف یہ کہ ابنائے انسانیت کی علمی راہبری فرمائی بلکہ ایک مدرسہ مدرسۂ جہانگیریہ، حلقۂ جہانگیریہ یا ضیاء المدارس کے نام سے قائم فرمایا اور مدتوں اس مدرسہ کے بانی، مہتمم اور شیخ الحدیث والقرآن کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ حضرت شاہ ولایت منگلوری ایک طرف صوفی صافی اور دوسری طرف عالم صادق ہیں۔

تصوف کے تین پہلوؤں میں پہلا علمی ہے، دوسرا عملی اور تیسرا کشفی ہے۔ علمی پہلو میں علم الادیان اور علم الابدان یعنی دینی اور دُنیاوی دونوں طرح کے علوم شامل ہیں۔ عملی پہلو میں عبادت و ریاضت کے علاوہ انسانوں سے برتاؤ اور سماجی و معاشرتی روابط شامل ہیں۔ تیسرے پہلو یعنی کشفی اور روحانی پہلو میں خدا اور بندے کی روح کا سچّا اور پُراسرار رشتہ اور اس کے مضمرات و نتائج شامل ہیں۔ اس طرح تصوّف کی راہ پر چل کر، انسان ظاہری اور باطنی طور پر ایک مثالی انسان بن جاتا ہے، جس کا رشتہ ایک طرف انسانوں اور دوسری طرف خدائے بزرگ و برتر سے قائم ہو جاتا ہے۔ صوفی حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کا حق، خوش اسلوبی سے ادا کرتا ہے، وہ اپنی جگہ مردِ مومن ہوتے ہوئے ایک آدرش انسان اور ایک آدرش انسان ہوتے ہوتے "مردِ مومن" بن جاتا ہے۔ حضرت شاہِ ولایت منگلوریؒ ایک ایسے ہی عارفِ کامل اور آدرش انسان ہیں جنھوں نے اپنی حیاتِ ظاہری میں ایک طرف اللہ کے بندوں کو اپنے حسنِ عمل سے متاثر کیا، ان کی تربیت فرمائی اور دوسری طرف ذات باری تعالیٰ سے سچّا روحانی رشتہ قائم کر کے تہذیب ذات اور تزکیۂ نفس کا حق ادا کیا۔ یہی سبب ہے کہ اتنی مدّت گزر جانے کے بعد بھی حضرت شاہِ ولایت منگلوریؒ کی درگاہ ایک طرف فیوض و برکات کا سرچشمہ ہے اور دوسری طرف انسانی اقدار، تہذیبی افکار اور قومی اتحاد کا منظر نامہ ہے۔

حضرت شاہِ ولایت کا اسم گرامی سیّد عثمان، لقب جہانگیر اور نسبت چشتی ہے۔ شاہی فرامین اور دوسری دستاویزات میں حضرت

کا اسمِ گرامی مخدوم شاہ عثمان جہاں گیر چشتی لکھا ہوا ہے۔ عوام میں شاہِ ولایت کے نام سے مشہور ہیں۔ خاندان کی ایک روایت کے مطابق حضرت کا ایک نام سید شاہ عباس بھی ہے۔ اس طرح پورا اسم گرامی حضرت مخدوم شاہ سید عثمان جہاں گیر چشتی شاہ ولایت منگلوری عرف عباس شاہ ولایت ہے۔ حضرت کا آبائی وطن بخارا ہے۔ آپ کا شمار اس دور کے اُمرائے بخارا میں ہوتا تھا۔ چونکہ حضرت کا دل کاروبارِ جہاں میں نہ لگتا تھا اس لیے حضرت نے باطنی اشارہ پاکر، آرام کی زندگی کو خیرباد کہا اور ہندستان کی طرف چل دیئے۔ ابتدا میں پور قاضی ضلع مظفر نگر میں قیام فرمایا۔ آخرکار منگلور ضلع ہردوار میں سکونت اختیار کرلی۔ یہیں حضرت کا مزار ہے۔ ۱۵، ۱۶ اور ۱۷ جمادی الاول کو حضرت کا عُرس ہوتا ہے۔

بخارا سے ترکِ وطن کرتے وقت حضرت کے ہمراہ ان کی اہلیہ اور تین بیٹے بھی تھے جن کے مزارات بھی حضرت کے روضے کے اندر ہیں۔ حضرت شاہِ ولایت اپنے دور کے جیّد عالم اور ولی کامل ہیں۔ حضرت کو دینی اور دنیاوی علوم پر زبردست دستگاہ تھی۔ علم دین فقہ، تفسیر، حدیث اور دوسرے اسلامی علوم پر حاوی تھے۔ حضرت شاہ ولایت منگلوری کی خانقاہ میں ایک مدرسہ بھی تھا جو حضرت کے علمی کمالات کا مظہر تھا۔ اس مدرسہ میں اس دور کے جیّد علماء اور صوفیاء نے تعلیم پائی ہے۔ حضرت شاہ ولایت منگلوری نے اپنی ظاہری حیاتِ طیبہ میں دو طرح کی خدمات انجام دی ہیں، ایک تو اپنے کردار اور حُسنِ عمل سے، انسانوں کی رہنمائی اور بہبودی کا فرض انجام دے کر، دوسرے تعلیم و تعلم سے انسانوں کے ذہن و ضمیر میں روشنی کر کے۔ تعلیم و تعلّم کی یادگار کے طور پر مدرسہ جہانگیریہ حلقۂ جہاں گیریہ یا ضیاء المدارس کا نام لیا جاسکتا ہے۔ غرض آپ نے اپنی حیاتِ ظاہری میں اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کی زبردست خدمات انجام دی ہیں۔

ہر ذی نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا پڑتا ہے۔ اولیاء اللہ بھی فطرت کے اس اصول سے ظاہری طور پر ماورا نہیں۔ چنانچہ جو ہونا تھا وہ ہوا۔ حضرت منگلوری نے ظاہری طور پر پردہ فرمالیا۔ ولی کا جہاں وصال ہوتا ہے، اس کی تجہیز و تکفین اور تدفین بھی وہیں ہوتی ہے۔ حضرت شاہ ولایت کا وصال منگلور میں ہوا تھا، اس لیے تدفین بھی وہیں ہوئی تھی چنانچہ جہاں حضرت کا مزار مبارک ہے وہی اصل جائے تدفین ہے۔ قیاس ہے کہ حضرت کا وصال صبح یا دوپہر کے اولین لمحوں میں ہوا ہوگا۔ اس لیے تدفین کا وقت عصر اور مغرب کے درمیان بتایا جاتا ہے۔ اسی وقت مخصوص انداز کا قل ہوتا ہے۔ چوں کہ حضرت کا قیام پور قاضی میں رہ چکا تھا، وہاں حضرتؒ کے عقیدت مندوں اور مریدوں کی خاصی تعداد تھی۔ حضرتؒ کے ایک خلیفہ شاہ رکن الدین چشتیؒ بھی پور قاضی میں تھے اس لیے پور قاضی کے محبانِ شاہِ ولایت کا ایک وفد حضرت کا جسد مبارک لینے کے لئے منگلور آیا، مگر اس کو یہ دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی کہ اصولاً حضرت کی تدفین ہوچکی ہے۔ خانوادۂ شاہ ولایت خاص طور پر سید عبداللہ چشتی نے اہلیانِ پور قاضی کی عقیدت کے پیشِ نظر اور انھیں مزید مایوسی سے بچانے کے لیے پور قاضی میں تدفین کے لئے حضرت کے بعض تبرکات بشمول پارچہ جات عنایت فرمادیئے۔ وہ وفد تبرکات لے کر پور قاضی کے لیے روانہ ہوگیا اور رات دیر گئے منتظر محبّوں کے ہمراہ ان تبرکات کی تدفین کی۔ پور قاضی میں، جہاں تبرکات کی تدفین ہوئی تھی، وہاں آج تک حضرت کا مزارِ ثانی موجود ہے جس کے دروازے پر بعض حضرات نے "بندگی شاہ" کا بورڈ لگا رکھا ہے۔ اہلیانِ پور قاضی اس راز سے واقف ہیں کہ یہ حضرت شاہ ولایت منگلوری کا مزارِ ثانی ہے اور یہاں حضرت کے تبرکات دفن ہیں۔ یہ مزار آج بھی حضرت شاہ ولایت کا ہی کہلاتا ہے۔ یہ مزار پور قاضی کے بس اسٹینڈ کے قریب، منگلور سے جانے پر بائیں طرف سڑک کے کنارے واقع ہے۔ یہاں کبھی بہت بڑا بن رہا ہوگا۔ اب بھی اس کا رقبہ بہت بڑا ہے۔ یہاں ایک عیدگاہ بھی وجود میں آگئی ہے۔ یہ پورا رقبہ کھانڈی والے تالاب سے ملحق ہے۔ اربابِ باطن، اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اس مزار مبارک پر بھی وہی باطنی کیفیات محسوس ہوتی ہیں جو حضرت شاہ ولایت منگلوری کے اصل مزار منگلور میں محسوس ہوتی ہے اور ایسا کیوں نہ ہو کہ پور قاضی کا مزار حضرت شاہِ ولایت کے تبرکات کی وجہ سے حضرت کا مزارِ ثانی ہے۔ اس واقعے

سے چند نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

۱۔ حضرت شاہ ولایت منگلوری کا اصل مزار منگلور ہی میں ہے۔

۲۔ حضرت شاہ ولایت کے تبرکات کی تدفین کی وجہ سے پور قاضی میں حضرت کا مزار ثانی ہے۔

۳۔ حضرت سے نسبت اور تبرکات کی تدفین کی بدولت پور قاضی میں مزار شاہ ولایت پر وہی کیفیات محسوس ہوتی ہیں جو منگلور میں حضرت ولایت کے اصل مزار پر محسوس ہوتی ہیں۔

۴۔ یہ ایک کرامت ہے کہ ایک بزرگ کے نام سے دو دو مزارات منسوب ہیں اور دونوں کا روحانی احوال اور کیفیات یکساں ہیں۔

۵۔ مگر یوم وصال سے اب تک حضرت شاہ ولایت منگلوری کا عرس صرف اصل مزار پر منگلور ہی میں ہوتا ہے۔ حضرت شاہ ولایت کا خاندان منگلور ہی میں آباد ہے اور اسی خاندان کا فرد سجادہ نشین و متولی ہوتا ہے۔ ان دنوں پروفیسر عنوان چشتی سجادہ نشینی اور تولیت کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

جیسا کہ پہلے تحریر کیا گیا، حضرت شاہ ولایت منگلوریؒ نے بخارا سے ترکِ وطن کر کے اپنا ابتدائی اور عارضی پڑاؤ پور قاضی ہی میں ڈالا تھا۔ یہاں حضرت کا قیام ایک تالاب کے کنارے پر تھا۔ شاہراہ بھی قریب ہی تھی۔ ایک شخص اپنے گھوڑوں یا خچروں پر کھانڈ لے جا رہا تھا۔ حضرت نے خچروں کی طرف اشارہ کر کے معلوم کیا۔

"بھائی! ان بوروں میں کیا ہے؟"

کھانڈ کے بیوپاری نے ازراہِ تمسخر جواب دیا،

"ان میں نمک ہے!"

حضرت پر باطنی طور پر انکشاف ہو گیا کہ بیوپاری تمسخر کر رہا ہے۔ چنانچہ اس کے بوروں میں کھانڈ کا نمک بن گیا۔ بازار پہونچ کر جب بیوپاری کو کھانڈ کی جگہ نمک نظر آیا تو وہ بہت پریشان ہوا۔ اپنے نمک کو بوروں میں بھر کر واپس حضرت شاہ ولایت کی خدمت میں آیا اور اپنی گستاخی کی معافی چاہی۔

حضرت نے فرمایا: "اس نمک کو یہیں تالاب میں الٹ دو اور اس تالاب کے کنارے سے مٹی بھر کر لے جاؤ۔ اللہ نے چاہا تو کھانڈ بن جائے گی۔"

اس بیوپاری نے ایسا ہی کیا۔ وہ مٹی کھانڈ بن گئی۔ اس دن سے اس تالاب کا نام کھانڈی والا تالاب پڑ گیا جو آج بھی موجود ہے۔ صدیوں اس تالاب کا پانی پینے میں میٹھا محسوس ہوا۔ اسی تالاب کے کنارے وہ بن ہے جس کے تقریباً وسط میں حضرت شاہ ولایت کا مزار ثانی ہے اور اسی بن میں حضرت شاہ رکن الدین چشتی خلیفۂ مجاز حضرت شاہ منگلوری کا مزار مبارک ہے۔ یہ حضرت شاہ ولایت کی ایک ایسی کرامت ہے جو پور قاضی میں آج بھی زبان زد ہے۔ وہاں کے اکثر ثقہ اور صوفی منش حضرات اس روایت کو آج بھی بڑے اشتیاق اور ولولے سے بیان کرتے ہیں۔

حضرت شاہ ولایت منگلوری کا ایک واقعہ بہت مشہور ہے۔ اس کی پشت پر تاریخی اسناد بھی کارفرما ہیں۔ کرنال کے قریب پنڈاری نام کا ایک گاؤں ہے۔ پنڈیر کھاپ کے راجپوتوں کا نکاس اسی گاؤں سے ہے۔ اس گاؤں میں راجپوتوں کا ایک ممتاز خاندان آباد تھا۔ اس خاندان میں ایک بزرگ کا نام بابا ست ماسا جی عرف بابا الم سنگھ (علم سنگھ) تھا۔ انھوں نے کسی وجہ سے پنڈری گاؤں سے بود و باش ترک کر کے ۱۰۱ (بکرمی سمبت) میں یعنی ۴۴ء میں جوالاپور کے پاس بابا پور میں سکونت اختیار کی۔

بابا ست ماسا جی کی نسل بڑھتی رہی، جوالاپور نیز رڑکی کے اطراف پھیلتی رہی۔ بابا جی کی گیارھویں پیڑھی میں بھوپت سنگھ جی اور بارھویں پیڑھی میں شری امر دیو ہوئے ہیں۔ امر دیو جی نے خوش حالی اور ترقی کا نیا ریکارڈ قائم کیا اور راجہ امر دیو کہلائے۔ انھیں راجہ امر دیو نے دیوبند (ضلع سہارن پور) کے قریب ۱۲۲۲ بکرمی یا ۱۱۶۵ عیسوی میں بنہیڑہ گاؤں کو آباد کیا اور خود بھی وہیں قیام کیا اور یہیں وفات پائی۔ چوں کہ ہندوؤں میں عام طور پر لیکن راجپوتوں میں خاص طور پر ستی کی رسم صدیوں سے پائی جاتی ہے جس میں شوہر کی وفات پر اس کی بیوی بھی اس کے جسد مردہ کے ساتھ چتا پر جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ راجہ امر دیو کی وفات پر ان کی اہلیہ جاجن دے بھی ۱۳۰۵ بکرمی یا ۱۲۴۸ء میں ستی ہو گئیں۔ یہ ستی

آج بھی بنہیڑہ گاؤں میں "دادی کی سَتی" کے نام سے جانی جاتی ہے جس کی دیکھ بھال راجہ امردیو اور جاجن دے کی اولاد میں وہ راجپوت کرتے ہیں، جو عقیدے کے اعتبار سے کٹر مسلمان ہیں ـــــ یہ بھی حضرت شاہ ولایت منگلوری کی ایک کرامت ہے کہ ان کے سلسلے میں آج تک انسانوں کے درمیان نفرت نہیں پیدا کی جاتی، بلکہ محبت اور رشتۂ اخوت قائم کیا جاتا ہے اس سے بڑھ کر اور قومی ایکتا کیا ہو سکتی ہے۔

راجہ امردیو کے یہاں یکے بعد دیگرے چار بچے پیدا ہوئے سب سے بڑے بیٹے کا نام سلطان سنگھ رکھا گیا۔ ان کے بعد بالترتیب ملتان سنگھ، ناگ مل اور اودے سنگھ ہیں۔ سلطان سنگھ کے بارے میں بھاٹوں کی بہیوں میں درج ہے کہ منگلور والے شاہ عثمان جہانگیر (چشتی) کے وچنوں دوارا مسلمان ہو گئے اور سلطان سنگھ کے بجائے سلطان شاہ کہلائے۔ انھیں سلطان شاہ خلیفۂ مجاز حضرت منگلوریؒ کے خاندان میں ایک ممتاز فرد راؤ طیّب ہوئے ہیں۔ اب جن کے نام پر یہ گاؤں راؤ طیّب کا بنہیڑہ کہلاتا ہے۔ یہاں کے سارے راجپوت حضرت شاہ سلطان کی اولاد میں ہیں۔ دوسرے بھائی ملتان سنگھ لاولد تھے لیکن انھوں نے بنہیڑا گاؤں کو خوب ترقی دی اور اپنے باپ راجہ امردیو پنڈیر کی زندگی ہی میں بنہیڑا گاؤں میں ۱۳۹۰ بکرمی یعنی ۱۲۳۳ء میں رفاہِ عام کے لئے ایک کنواں بنوایا تھا اور اس کے نزدیک پیپل کا درخت لگوایا تھا۔ یہ دونوں چیزیں آج بھی، ڈاکٹر راؤ ارشاد علی خاں صاحب سجادہ نشین حضرت سلطان شاہؒ کے مکان کے نزدیک موجود ہیں تیسرے بھائی ناگ مل کی اولاد رڑکی میں آباد ہے۔ چوتھے بھائی اودے سنگھ کی اولاد پنہیالا گاؤں اور اس کے نواح میں آباد ہے اس طرح راجہ امردیو کی اولاد، جو ہندو اور مسلمان دونوں پر مشتمل ہے ضلع ہردوار اور سہارن پور میں آباد ہے۔ اس گفتگو سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ،

(۱) حضرت شاہ ولایت منگلوریؒ ولی کامل ہونے کی وجہ سے مستجاب الدعوات ہیں۔ حضرت کی دعا سے راجہ امردیو اور ان کی اہلیہ جاجن دے کے یہاں اولادِ نرینہ پیدا ہوئی۔ یہ محض وقتی اور ہنگامی معاملہ نہ تھا۔ آج بھی ان کے مزارِ مبارک سے فیض جاری ہے۔ عقیدت مند منّت (نذر) مانتے اور مُرادوں سے اپنی جھولی بھر کر لے جاتے ہیں۔ اس نوع کے کئی واقعات میرے علم میں ہیں، جن سے طوالت کے ڈر سے صرف نظر کرتا ہوں۔

(۲) حضرت شاہ ولایتؒ کے سلسلے میں رنگ، نسل اور مذہب کی قید نہیں۔ یہاں جو آتا ہے اپنا دامنِ مراد بھر کر لے جاتا ہے اور قومی اتحاد کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان اضلاع (سہارن پور اور ہردوار) میں ہندو اور مسلمان بھائیوں کی طرح رہتے ہیں۔

میں نے سطورِ بالا میں حضرت سلطان شاہ کے سلسلے میں ایک خاص واقعے کا ذکر کیا ہے۔ اس خاص واقعے کی بدولت ہی شری سلطان سنگھ حضرت سلطان شاہ کہلائے اور حضرت سید شاہ عثمان جہانگیر کے خلیفۂ مجاز قرار پائے۔ یہ روایت زبان زدِ عوام ہے کہ حضرت شاہ ولایت منگلوری کی دعا سے اللہ تعالیٰ نے راجہ امردیو اور رانی جاجن دے کے گھر میں اُجالا فرمایا اور بانجھ کوکھ کو ہرا کر دیا۔ راجہ امردیو اور رانی جاجن دے نے یہ منّت (نذر) مانی تھی کہ اگر شاہ ولایت منگلوری کی دُعا سے ایک سے زیادہ اولادِ نرینہ ہوئی تو وہ سب سے بڑا لڑکا حضرتؒ کی نذر کر دیں گے۔ چنانچہ حضرت شاہ ولایتؒ کی دُعا پوری ہوئی اور راجہ امردیو کے یہاں یکے بعد دیگرے چار لڑکے پیدا ہوئے۔ (تفصیل پہلے گزر چکی ہے) لیکن نامعلوم وجوہات کی بنا پر سب سے بڑے بچے کی پیش کشی میں دیر ہوتی گئی۔ اس تاخیر پر، راجہ امردیو کے چاروں بچے (سلطان سنگھ، ملتان سنگھ، ناگ مل اور اودے سنگھ) بیک وقت بیمار پڑ گئے اور شفا کی امید باقی نہ رہی۔ اس دوران از خود یا کسی کے یاد دلانے پر، راجہ امردیو اور رانی جاجن دے کو اپنی منّت پوری کرنے میں تاخیر کا خیال آیا۔ انھوں نے فوراً حضرت شاہ ولایت کی خدمت میں حاضری دی اور اپنی وجہ تاخیر بیان کرتے ہوئے معذرت پیش کی، ساتھ ہی اپنے بڑے بیٹے سلطان سنگھ کو ۱۲ سال کی عمر میں حضرت شاہ ولایت کی نذر کر دیا۔ اور اس طرح اپنی منّت پوری کر دی سلطان سنگھ کو حضرت شاہ ولایت نے اپنے بیٹے حضرت سید عبدالرحیم

خلیفۂ مجاز کی طرح پالا ۔ شری سلطان سنگھ بھی بہت مانوس ہو گئے ۔ چنانچہ بھاٹ نے اپنی پوتھی میں لکھا ہے کہ سلطان سنگھ حضرت شاہ ولایت کے وچنوں سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گئے اور ان کا نام سلطان سنگھ کی جگہ سلطان شاہ رکھ دیا گیا ۔ حضرتؒ نے سلطان شاہ کی تربیت فرمائی، مُرید کیا اور اپنا خلیفۂ مجاز نامزد کیا ۔ چنانچہ راؤ لیتب کے بنہیڑہ کے راجپوت حضرت سلطان شاہ کی اولاد ہیں اور بڑی آن بان سے زندگی گزارتے ہیں ۔ اس گفتگو سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ :

(۱) اسلام میں منّت (نذر) ماننی جائز ہے ۔ انسان کو اپنی منّت ضرور پوری کرنی چاہیئے ۔

(۲) حضرت سلطان شاہ نے حضرت شاہ ولایت منگلوری سے بطورِ خاص تربیت حاصل کی اس لئے وہ ان کے ممتاز خلفاء میں شامل ہیں، جن کا فیض بنہیڑا کی زمین سے آج بھی جاری ہے ۔

حضرت شاہ ولایت ان صوفیائے عظام میں شامل ہیں، جن کا احترام سلاطین وقت تک نے کیا ہے ۔ حضرت کی درگاہ پر سلاطین دہلی اور امرائے سلطنت حاضری دیا کرتے تھے ۔ بلبن بادشاہ تو خاص طور پر معتقد تھا ۔ چنانچہ حضرت شاہ ولایت کے وصال کے بعد اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کے لیے حضرت شاہ ولایت کے احاطے میں حضرت خواجہ سید عبداللہ چشتی کے ایما پر کچی مسجد کے مقام پر ایک پختہ مسجد بنوائی جو بفضل خدا آج تک موجود ہے اور مسجد شاہ ولایت منگلوری کے نام سے مشہور ہے ۔ اس میں بلبن شاہ کا لگوایا ہوا کتبہ موجود ہے ۔ بقول مولانا سیف اللہ ہاشمی (مبلغ دارالعلوم دیوبند) :

"مسجد شاہ ولایت کی دیوار میں آج بھی بلبن کے نام کا ایک ہجری کتبہ خطِ کوفی میں کھدا ہوا محفوظ ہے ۔"

یہ وہی مسجد ہے جس میں ماضیِ قریب کے ولیِ کامل حضرت شاہ رحم الٰہی صاحب اپنے گھر کی مسجد کو نظر انداز کر کے نماز ادا فرماتے تھے ۔ اس مسجد کی توسیع اور مرمت مختلف اوقات میں ہوتی رہی ۔ چنانچہ رامپور کے نواب صاحب نے بھی یہ کارِ خیر کرایا ۔ ابھی تک ان کی یادگار بھی باقی ہے ۔ اب یہ مسجد پھر کسی ابراہیم کی منتظر ہے ۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حضرت شاہ ولایت منگلوری کی اولاد کو سلاطینِ دہلی نے بحقِ سیادت و سجادگی، مددِ معاش کے لئے جاگیر عطا کی تھی ۔ جب ایک کے بعد دوسرا بادشاہ تخت نشین ہوتا تو اپنے فرمان کے ذریعے اس جاگیر کی از سرِ نو توثیق کرتا رہا ۔ چنانچہ اللہ کے فضل سے آج بھی چند فرامین اور اہم دستاویزات موجود ہیں جو خاندان شاہ ولایت منگلوری (پیرزادگان یا چشتی فیصلی) کی بزرگی اور عظمت پر دلالت کرتی ہیں ۔ یہ جاگیر ۱۸۵۷ء کے بعد تک باقی رہی ۔ لیکن ایک خاص واقعہ کے بعد انگریزوں نے اس کو ضبط کر لیا ــــ اس سلسلے میں بعض حقائق توجہ طلب ہیں ۔ خاندانی روایت کے مطابق پہلی جاگیر بلبن شاہ نے عطا کی تھی ۔ اس کی توثیق سلاطینِ دہلی یکے بعد دیگرے کرتے رہے جو جاگیر خاندانِ چشتیہ کے نام تھی اس کی تفصیل اس طرح ہے ۔ حضرت پیرزادہ شاہ انوار الحسن انوار منگلوری نے اپنی ایک یادداشت میں تحریر فرمایا ہے :

"میرے اجداد کو شاہانِ مغلیہ کے دورِ حکومت میں سات گاؤں مددِ معاش برائے اولادِ امجاد حضرت شاہ ولایت منگلوری عطا ہوئے تھے (۱) شکرپور (۲) بیگھا (۳) چندن پور (پرگنہ تغلق پور موجودہ طغل پور ضلع مظفر نگر (۴) بھانگل پور (۵) بھونری (۶) کھرنجہ (۷) نورونر پور (پرگنہ جوراسی تحصیل رڑکی ضلع سہارنپور قدیم حال ہردوار) میں عین حیات معاف تھے ۔ چار گاؤں جو تحصیل رڑکی کے تھے، دوامی طور پر لگان معاف تھے ۔ ضلع مظفر نگر کے تینوں گاؤں کی جائداد کو ہمارے خاندانی افراد نے فروخت کر کے فائدہ اٹھایا ۔"

یہ امر اس بات کا شاہد ہے کہ حضرت شاہ ولایت منگلوری کا احترام شاہانِ وقت تک کرتے تھے ۔ دورِ حاضر میں گیانی ذیل سنگھ جی نے، حضرت شاہِ ولایت کی نئی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا اور دربار شاہ ولایت منگلوری کے سبب کرسیِ صدارت تک پہونچے ۔

حضرت شاہ ولایت منگلوری کی کرامتوں کے بہت سے قصّے مشہور ہیں جو خاندانی روایات کے طور پر سینہ بسینہ چلے جاتے ہیں نیز منگلور اور بنہیڑا گاؤں کے قرب و جوار کے عوام و خواص میں بھی مشہور

ہیں۔ راجہ امر دیو کی اولاد ہونے کی طرح شاہ ولایت منگلوری کی ایک اور کرامت تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ مہاراشٹر یا گجرات کا ایک راجہ اشنان کے لیے ہر دوار جا رہا تھا۔ راجہ کے ساتھ اس کا وزیر اور دوسرا عملہ بھی تھا۔ راستہ کی دیکھ بھال اور منزل مقصود تک بروقت پہونچانے کی ذمہ داری وزیر کے سر تھی۔ ہر دوار میں اشنان کا ایک خاص وقت مقرر تھا۔ مقررہ وقت پر منت کے مطابق اشنان کرنا ضروری تھا۔ راجہ اپنے وزیر اور دوسرے عملے کے ساتھ سفر کرتا ہوا منگلور تک آیا تھا کہ شام ہوگئی۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ مقررہ تاریخ پر راجہ سورج غروب ہونے سے قبل ہر دوار پہونچ کر اشنان کرلیتا۔ راجہ اپنے وزیر پر سخت برہم ہوا اور کہا کہ اگر آج وقت پر اشنان نہیں ہوا تو اس کو جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔

وزیر گھبرا گیا۔ منگلور اور اس کے گرد و نواح میں شاہ ولایت کے فیوض اور کرامات کی دھوم تھی۔ کسی نے وزیر کو مشورہ دیا کہ وہ حضرت شاہ ولایتؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر مشکل کشائی کی درخواست کرے۔

وزیر، حضرت کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا اور سارا ماجرا کہہ سنایا، اور وہ راجہ کو حضرتؒ کی خدمت میں لایا۔ حضرت شاہ ولایت نے اُس راجہ کو اپنا کمبل اڑھایا اور فرمایا کہ آنکھیں بند کرلیجیے اور ایک قدم چلیے۔

راجہ نے محسوس کیا کہ وہ ہر کی پوڑی پر ہر دوار میں ہے۔

حضرت نے پھر فرمایا، "اشنان کرلیجیے اور آنکھیں بند ہی رکھیے"۔

پھر فرمایا "ایک قدم پیچھے کی طرف چلیے۔"

راجہ نے دیکھا کہ وہ منگلور میں ہے۔

چنانچہ راجہ، وزیر اور ان کے سارے ہمراہی حضرت شاہ ولایت منگلوری کے عقیدت مند ہوگئے۔ راجہ نے واپس جاکر حضرت کی خانقاہ کے لئے ایک رقم مخصوص کردی جو ماہ بہ ماہ آتی رہی۔ اس راجہ کے انتقال کے کے بعد یہ رقم راجہ کے خاندان کے افراد ۱۹۱۰ء تک خاندانِ شاہ ولایت کو ارسال کرتے رہے۔ اس کے بعد خدا جانے کس وجہ سے نذرانے کی یہ رقم بند ہے۔

اس واقعہ میں کرامت کا جو پہلو نمایاں ہے وہ وقت کی تنگی کے باوجود ہر کی پوڑی پر اشنان کرنا تو ہے ہی۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ راجہ نے جب واپس ہو کر آنکھیں کھولیں تو خود کو نہ صرف یہ کہ منگلور ہی میں پایا بلکہ اس نے اپنے بدن کو پانی میں بھیگا ہوا اور تر و تازہ محسوس کیا۔ اس میں یہ پہلو بھی ہے کہ:

(۱) اپنی ذات پر دوسروں کو فوقیت دینا ہی تصوف کی بنیاد ہے

(۲) ضرورت مندوں کی حاجت روائی کے لیے اگر کرامتوں کا ظہور بھی ہو جائے تو کوئی ہرج نہیں ہے۔

(۳) دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کی دل جوئی اور ان کے عقیدے کے مطابق، خیر سگالی کے جذبے کے تحت، ان کی مدد کرنا ضروری ہے۔

حضرت شاہ ولایت منگلوری کی کرامتوں کے بہت سے دلچسپ قصے مشہور ہیں۔ ایک بار حضرت شاہ ولایت نے ایک بکری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک گوالے سے فرمایا:

"اس بکری کا دودھ نکال دو!"

گوالے نے عاجزی سے کہا۔

"یہ تو ابھی پٹھیا (بن بیاہی) ہے۔ اس کو دودھ کہاں اتر سکتا ہے۔"

حضرت شاہ ولایت نے پھر فرمایا:

"اپنا برتن لاؤ۔ ہم خود اس کا دودھ نکالتے ہیں۔"

یہ کہہ کر حضرت نے اس کے تھنوں کو ہاتھ لگایا تو دودھ بہہ نکلا۔

اس واقعہ کی یاد میں آج بھی حضرت شاہ ولایت منگلوری کے حضور گائے یا بھینس کے پہلی بار بچہ دینے پر علاقے کے ہندو اور مسلمان دودھ نذر کرتے ہیں اور عقیدت کے چراغ جلاتے ہیں۔

اسی طرح ایک اور اہم واقعہ ہے جس کا ذکر ناگزیر ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد شمالی ہند میں انگریز کا تسلط ہوگیا تھا چنانچہ اس نے زمام حکومت سنبھالتے ہی ان قبرستانوں میں تدفین بند کرنے کا حکم نافذ کردیا جو آبادی کے اندر تھیں۔ اس حکم کی زد پر دیگر قبرستانوں کے ساتھ درگاہ حضرت شاہ ولایتؒ کا قبرستان بھی آگیا اور درگاہ کے قبرستان میں حضرت کی اولاد کی تدفین بھی بند ہوگئی۔ حضرت شاہ ولایت کی کرامت سے پہلا حکم منسوخ ہوا اور تدفین کی اجازت کا دوسرا حکم جاری ہوا۔

ہوا یوں کہ احاطہ حضرت شاہ ولایتؒ کے قبرستان میں جوں ہی

غزلیں

جب بھی تجھ سے کلام کرتے ہیں
سبزہ و گل سلام کرتے ہیں

ہر سفر سے نئے سفر کا ہم
عادتاً اہتمام کرتے ہیں

گردشِ زندگی مبارک ہو
اب یہ قصہ تمام کرتے ہیں

خامشی جن کی گفتگو ٹھہری
ان کا ہم احترام کرتے ہیں

سینۂ دشت میں خدا جانے
کتنے دریا قیام کرتے ہیں

دن میں آئینہ سازیاں کرکے
رات چہروں کے نام کرتے ہیں

رات اب ڈھل چلی ہے، باتوں کا
لیجئے اختتام کرتے ہیں

ظفر مہدی

۲۶ سلیم پور ہاؤس
قیصر باغ، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

ہم جب سے اپنی ذات میں محدود ہو گئے
فکر و نظر کے راستے مسدود ہو گئے

بندہ نواز کوئی ملے بھی تو کس طرح
کل تک تھے جو ایاز وہ محمود ہو گئے

نفرت کی اور بغض کی ایسی ہوا چلی
رشتے خلوص و انس کے مفقود ہو گئے

ہم نے خلیلؑ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا
کیوں آپ میرے واسطے نمرود ہو گئے

ہم نے تعصبات کا ایسا سبق دیا
معصوم ذہن بھی یہاں بارود ہو گئے

عہدہ کے ساتھ شہرت و توقیر کیا ملی
سجدے جو کر رہے تھے وہ معبود ہو گئے

ملعون مفلسی میں اسدؔ تھے کبھی مگر
دولت ہوئی نصیب تو مسعود ہو گئے

اسد رضا

E-11/47 حوض رانی۔ مالویہ نگر
نئی دہلی ۱۱۰۰۱۷

خلا سے آگے نظر کی حد تک نشان دیکھو
یہیں کہیں چشم پوش ہے اک جہان دیکھو

میں اب زمیں کے مدار سے ہوں نکلنے والا
کہ شہ پروں کے بغیر ہے یہ اڑان دیکھو

بھنور سے امواج تک ہے کاریگری خدا کی
شکستہ کشتی ہے ناخدا کا مکان دیکھو

زمین ذروں کے ساتھ آزاد گھومتی ہے
بنا سہارے فلک نما سائبان دیکھو

چراغ ظلمت شکن کی لو مستعد کھڑی ہے
مگر ہوا بھی چڑھا رہی ہے کمان دیکھو

□□

زبیر شفائی

۹/۴۱۔ سفید کالونی، جوہی
کانپور
۲۰۸۰۱۴

افسانہ

م۔ کے۔ مہتاب
اے ۲/۱ - پچھم وہار - نئی دہلی

چھت

ہمارے گھر کے دروازے پر شہتوت کا ایک پیڑ ہے۔ دسمبر جنوری میں اس پر خزاں نازل ہوتی ہے۔ درخت پر کہیں ایک پتہ دکھائی نہیں دیتا۔ ننگی شاخیں کسی کے لٹے ہوئے سہاگ کی طرح دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن فروری کے مہینے میں درخت پر تازہ سبز کونپلیں اور پتے اس کثرت سے پھوٹ پڑتے ہیں گویا بہار کا قافلہ اسی درخت پر اترا ہے۔ چند روز بعد شاخوں پر پھل آجاتا ہے۔ اور مارچ کے مہینے میں شاخوں پر اتنی تعداد میں سُرخ رسیلے لمبے شہتوت نمودار ہو جاتے ہیں گویا قدرت نے درخت پر سُرخ اور سبز رنگوں سے گل کاری کر دی ہو۔

اب پرندوں کے جھنڈ درخت پر اُترنے لگتے ہیں۔ کئی دن تک علی الصباح درخت پر چڑیوں کا مدھر آرکیسٹرا بجتا رہتا ہے۔

صبح صبح جب ٹھنڈی ہوا چلتی ہے تو پکے ہوئے رسیلے شہتوت گرتے ہیں۔ کتنے ہی راہ گیر بچے عورتیں قدرت کی اس شیرینی سے لطف اندوز ہونے کے لیے پل بھر کے لیے درخت کے گھنے سایہ میں ٹھہر جاتے ہیں۔ کچھ بے صبر بچے درخت پر پتھر بھی پھینکتے ہیں لیکن کچھ شاکر قسم کے بچے درخت کے نیچے بیٹھے درخت سے شہتوت گرنے کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔

کچھ بچے رات میں گرے شہتوت چننے کے لیے سویرے ہی وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ گلیوں سے ردّی کاغذ۔ پلاسٹک، دھجیاں، پرانے جوتے اکٹھے کرنے والے بچّے اور عورتیں بھی تڑکے ہی درخت کے نیچے گھومتی دکھائی دیتی ہیں۔

اس لڑکے کو میں کچھ دن سے وہاں شہتوت اکٹھے کرنے آتے دیکھ رہا ہوں۔ یہی کوئی دس گیارہ برس کا قدرے خوش شکل لڑکا۔ مٹیالا رنگ، الجھے ہوئے بال، ڈھیلی سی نیلی پتلون، زرد بو شرٹ، برہنہ پاؤں، کندھے سے سفید پلاسٹک کا بڑا سا تھیلا اٹھائے درخت کے نیچے گھومتا دکھائی دیتا ہے۔ پرسکون مطمئن چہرہ روشن آنکھیں، مجھے اُس لڑکے میں ایک جاذبیت دکھائی دی ہے۔ ایک روز میں دروازے میں سے دیکھتا ہوا باہر گیٹ تک آگیا۔ اُسے اشارے سے اپنی طرف بلایا تو وہ ڈر کر بھاگ نکلا۔ شاید یہ سوچ کر کہ میں اس کو بھی درخت پر پتھر پھینکنے والا لڑکا سمجھ کر ڈانٹ دوں گا۔

"ادھر آؤ۔ میں تمھیں کچھ نہیں کہہ رہا۔ یہاں اندر کچھ شہتوت گرے ہیں وہ بھی اٹھا لو۔"

"وہ رک گیا۔ دھیرے دھیرے میرے پاس آگیا۔ میں نے اندر گرے شہتوت اٹھا کر اُسے دے دیے۔"

"انکل! بہت ٹھنڈے اور میٹھے ہوتے ہیں جیسے کوکا کولا کی بوتل" وہ کچھ شہتوت منھ میں رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"کیا ہر روز آتے ہو؟"

"نہیں بابو جی چار دن سے آرہا ہوں۔"

"تمھارا نام کیا ہے؟"

"دلبر!"

"بہت خوبصورت نام ہے۔ کس نے رکھا ہے؟"

"مجھے نہیں پتہ"

"تمھارے باپ کا کیا نام ہے؟"

"سوہنی"

"کیا کام کرتے ہو؟"
"پلاسٹک کی پرانی تھیلیاں اور جوتے اکٹھے کرتا ہوں۔"
"انھیں کیا کرتے ہو؟"
"کباڑی کے پاس فروخت کر دیتا ہوں۔"
"کتنے پیسے ملتے ہیں؟"
"نو روپے کلو۔"
"کتنے بجے کام شروع کرتے ہو؟"
"صبح پانچ بجے۔"
"اتنی جلدی؟"
"ورنہ دوسرے لوگ پلاسٹک اٹھا کر لے جاتے ہیں؟"
"کیا پورا دن یہی کام کرتے ہو؟"
"نہیں صبح پانچ بجے سے گیارہ بجے تک اور شام کو تین بجے سے چھ بجے تک۔"
"کتنے پیسے کما لیتے ہو؟"
"بیس پچیس روپے روز۔"
"پڑھتے کیوں نہیں؟"
"دو جماعت پڑھا ہوں۔ سوہنی کہتا ہے تو نے پڑھ کر کون کلکٹر بن جانا ہے۔ جا کر کچھ کما لا۔"
"سوہنی کیا کام کرتا ہے؟"
"اسی کباڑی کے پاس پلاسٹک کی چھٹائی کرتا ہے۔"
"اُسے کتنا پیسہ ملتا ہے؟"
"تیس روپے روز۔"
"رہتے کہاں ہو؟"
"کیمپ میں۔"
"کیا تمھاری ماں بھی کام کرتی ہے؟"
"وہ سوہنی کا کھانا لے کر دوپہر کو کباڑی کے ہاں جاتی ہے۔ شام تک وہاں ہی پلاسٹک کی گٹھریاں باندھتی ہے۔ میرا چھوٹا بھائی اور میں بھی دوپہر وہیں رہتے ہیں۔"
"اسے کیا ملتا ہے؟"
"دس روپے۔"
"کبھی اپنے یہ میلے گندے پاؤں دیکھے ہیں؟ جوتا کیوں نہیں پہنتے؟"
"سوہنی کہتا ہے، جوتے بہت مہنگے ملتے ہیں۔ ہم نہیں پہن سکتے۔"
"کمال ہے! تم مل کر اتنے پیسے کما لیتے ہو جوتا نہیں خرید سکتے؟ تم اپنے پیسے کا کیا کرتے ہو؟"
"سب پیسے سوہنی کباڑی کے پاس رکھ دیتا ہے میرے پاس کچھ نہیں ہوتا اسی لیے تو صبح صبح شہتوت کھا رہا ہوں۔ بھوک لگ رہی تھی...."
میں نے چُن کر رکھے ہوئے کچھ شہتوت دلبر کو دے دیے اور پوچھا
"سوہنی بڑا اچھا آدمی ہے۔ تم لوگ اتنے پیسے کماتے ہو کیا وہ ان سے شراب پی جاتا ہے۔؟ تمھیں کچھ نہیں دیتا۔"
"نہیں۔ انکل نہیں۔"
"پھر کیا وجہ ہے؟"
"ماں کہتی ہے خرچہ بہت ہے۔ روٹی بھی نہیں چلتی۔ سوہنی کہتا ہے اُسے ہر مہینے کمیٹی بھرنی ہوتی ہے۔"
"کمیٹی کیسی؟"
"بابو جی! کیمپ میں ہم نے جس زمین پر جھگی ڈال رکھی ہے سوہنی اس کا سو روپیہ مہینہ کرایہ دیتا ہے۔ سوہنی کہتا ہے کہ ہم نے کرائے سے بچنے کے لیے وہ زمین خرید لی ہے۔ اس کا پیسہ بھرنا ہے۔ جب ہم بائیس ہزار روپیہ دے دیں گے تو مالک زمین کرایہ بند کر دے گا۔"
"کہاں سے دو گے؟"
"سوہنی نے کمیٹی ڈال رکھی ہے۔ ہر مہینے بارہ سو روپیہ دیتا ہے۔"
"زمین خرید کر کیا کرو گے؟"
"سوہنی کہتا ہے اس میں اپنی چھت ڈلوا لیں گے۔"
"چھت کے لیے پیسہ کہاں سے لاؤ گے؟"
"سوہنی کہتا ہے کہ جب پہلی کمیٹی کا پیسہ پورا ہو جائے گا تو دوسری کمیٹی ڈال دیں گے۔ تب تک میرا چھوٹا بھائی بھی پلاسٹک

(باقی صفحہ پر)

حیدر علی خاں
۱۸، مشم ہوسٹل الہ آباد یونیورسٹی
الہ آباد

ڈاکٹر راہی معصوم رضا

حیات اور شاعری

غازی پور کی سرزمین سے ہمیشہ سے علوم و معارف کے پھول کھلتے رہے، مولانا آسی غازی پوری کے نام نامی اور اسم گرامی سے کون ناواقف ہوگا۔

اردو میں افسانوی ادب کے ذیل میں جب کوششیں تیز ہوئیں تو علی عباس حسینی (پارہ غازی پور) نے اپنے قلم کے جوہر "گھر آنگن" اور "گاؤں" کے آئینے میں پیش کیے۔ ترقی پسند تحریک نے جب اپنی افادیت کو منوانا چاہا تو اس وقت بھی غازی پور کی سرزمین نے اسے اپنی رفاقت سے استحکام بخشا۔

مشہور ترقی پسند شاعر اور دانشور راہی معصوم رضا بھی یہیں سے متعلق تھے ان کا گھرانہ ایک علمی اور ادبی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا، ان کے والد بشیر حسین صاحب جہاں ایک کامیاب وکیل تھے وہیں شعر و ادب کے دلدادہ بھی۔

معصوم رضا نے راہی تخلص اختیار کیا اور دنیائے ادب میں ڈاکٹر راہی معصوم رضا کے نام سے مشہور ہوئے اور شاہد اختر کے نام سے بھی ناول اور افسانے لکھتے رہے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے اپنے وطن غازی پور میں حاصل کی اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے علی گڑھ گئے، وہاں مسلم یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی اور اردو ادب سے ایم اے کرنے کے بعد 'طلسم ہوش ربا' پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، دوران طالب علمی سے ہی انھیں لکھنے پڑھنے اور تقریر کرنے کا شوق تھا وہ نظمیں، غزلیں نیز ناول وغیرہ لکھا کرتے تھے۔ ۱۹۵۳ء میں الہ آباد سے ماہنامہ "نکہت" کی اشاعت شروع ہوئی تو راہی اس ماہنامے کے لئے نظمیں، غزلیں وغیرہ لکھنے لگے اس کے بعد اسی ادارہ سے ماہنامہ "رومانی دنیا" شائع ہونے لگا تو اس میں راہی معصوم رضا نے بھی شاہد اختر کے نام سے چند ناول لکھے مثلاً "دائرہ"، "کاروبار تمنا" "ھمسفر" وغیرہ اس طرح راہی کی شخصیت نظم و نثر میں یکساں مشہور و مقبول ہے۔ راہی نے مقررہ مدت حیات میں صرف نظموں اور ناول کی تخلیق ہی نہیں کی بلکہ فلمی گیت ڈرامے اور مکالمے بھی لکھے ہیں۔ راہی کے درج ذیل شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

"نیا سال" ۱۹۵۲ء "موج گل موج صبا" طویل نظم ۱۹۵۲ء "رقص مے" نظموں کا انتخاب ۱۹۶۰ء میں "اٹھارہ سو ستاون" اجنبی شہر اجنبی راستے —— شعری مجموعہ "نیا سال" کا انتساب انھوں نے ۱۹۵۳ء کے نام کیا ہے۔ اس مجموعے میں اگر سال گزشتہ سے وابستہ یادوں کی تلخی ہے تو سال آئندہ سے متعلق چند سنہرے خواب بھی اس شعری مجموعے کا سرمایہ ہیں۔ اس میں درج ذیل نظمیں ہیں۔ "ھندوستان اور پاکستان کے سرمایہ داروں کے نام" "زندان نشین ساتھیوں کے نام" "بھائی صاحب کے نام" "کسی شہناز کے نام" "دنیا کے نام"۔

راہی معصوم رضا بنیادی طور پر ترقی پسند شاعر و ادیب ہیں وہ اپنی شاعری کے ذریعہ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف زبردست آواز اٹھاتے رہے۔ نظم بعنوان "ھندوستان اور پاکستان کے سرمایہ داروں کے نام" میں انھوں نے سرمایہ داروں کے خلاف زبردست آواز بلند کی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ یہ سچ ہے کہ اس دنیا میں اب فیض

اور مخدوم محی الدین نہیں رہے لیکن انھوں نے بہت سارے فیضؔ اور مخدومؔ پیدا کر دیے ہیں۔ اس نظم کے ذریعہ انھوں نے سرمایہ دارانہ نظام اور اس کے جور و ظلم کو ختم کرنے کی آواز اٹھائی ہے۔ یہ نظم محض ایک سیاسی نعرہ نہیں ہے بلکہ اس میں فنی محاسن اور شعریت موجود ہے خوبصورت اور نادر تشبیہات کے ساتھ ساتھ کلاسیکی شعری روایت کا پاس بھی ان کی اس نظم میں ملتا ہے۔ وہ اپنی آواز کو فیضؔ اور مخدومؔ محی الدین کی آواز کہتے ہیں لیکن ان کی اس نظم میں جوشؔ کے انداز بیان کی پیروی کی کوشش واضح طور پر نظر آتی ہے مثال کے طور پر نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو ؎

خونِ شبنم میں شرابور کرن دیکھی ہے　　میں نے سیندور کے لاشے پہ دلھن دیکھی ہے
میں نے بیچارگیٔ صحنِ چمن دیکھی ہے　　میں نے عصمت دریٔ خلدِ وطن دیکھی ہے
انقلاب آنے سے پہلے میں نہیں مر سکتا
میں کوئی جرم فراموش نہیں کر سکتا "

"ہندوستان اور پاکستان کے سرمایہ داروں کے نام"

اس مثال کا قطعاً یہ مطلب نہیں ہے کہ راہی معصوم رضا فیضؔ اور مخدومؔ سے متاثر نہیں تھے کیونکہ انھوں نے اس کا اعتراف خود اپنی نظم "ہندوستان اور پاکستان کے سرمایہ داروں کے نام" میں ہی کیا ہے کہ ان کی آواز فیضؔ اور مخدومؔ کی آواز ہے ؎

فیضؔ کے ساتھ مرا دل بھی دھڑکتا ہے سنو　　وہی سورج مری آنکھوں میں چمکتا ہے سنو
وہی نعرہ مرے ہونٹوں پہ بہکتا ہے سنو　　وہی غنچہ مری نظموں میں چٹکتا ہے سنو
میں بھی گاتا ہوں وہی گیت اسی ساز کے ساتھ
میری آواز ہے مخدومؔ کی آواز کے ساتھ "

راہی معصوم رضا کی ایک اہم نظم "موج گل موج صبا" کے عنوان سے ۱۹۵۳ء میں شائع ہوئی۔ یہ نظم اٹھاسی بندوں پر مشتمل ہے مسدس کی شکل میں لکھی گئی ہے۔ نظم فنی نقطۂ نظر سے مستحکم ہے اور جوشِ مضمون آفرینی کی اعلیٰ مثال ہے۔ نظم کا موضوع وہ سیاسی سماجی مذہبی واقعات و انقلابات ہیں جو اس زمین نے اب تک دیکھے ہیں گو کہ یہ نظم کوئی مربوط اور مفصل تاریخ نہیں بلکہ اہم واقعات اور ان کے اثرات کا ایک مختصر سا جائزہ ہے پھر بھی لطافتوں اور صداقتوں کی آئینہ دار ہے، اس نظم میں کہیں پر کورو پانڈوں کی باہمی معرکہ آرائی کا تذکرہ کرتے ہیں. کہیں گوتم بدھ کے پیام امن کا ذکر کہیں وہ اشوک اعظم کو ہندوستان کا سپوت اور امن کی علامت کہتے ہیں کہیں پران جنگوں کی جانب اشارہ کرتے ہیں جو اس سرزمین پر اپنے اپنے اقتدار کے لیے لڑی گئیں وہ عظمتِ وطن کے گیت گاتے ہیں۔ تلسیؔ اور غالبؔ و سورداس کی ستائش کرتے ہیں۔ کرشن جی کی بنسی و رادھا کی وفا کو ہندوستان کا عظیم سرمایہ بتلاتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ان تمام جنگوں کا جو نتیجہ ہے یعنی حق سے باطل کی شکست اس کو بظاہر اپنے اشعار میں پیش کرتے ہیں۔

اپنی نظم تاج محل میں راہیؔ صاحب نے ہندوستان کی عظمت گزشتہ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اس ملک کی سب سے اہم خوبی مشترکہ تہذیب، ہندو مسلم دو مختلف اقوام کے باہمی ربط و ضبط، میل ملاپ کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس طویل نظم میں ڈاکٹر راہی معصوم رضا نے امن اور راستی کے راستے کو سب سے افضل اور بالاتر راستہ قرار دیا ہے اور یہ بھی اشارہ کیا ہے کہ اس ملک کے باشندے ازل ہی سے امن پرست ہیں اس کی مثال ان کے ایک بند سے واضح ہو جاتی ہے ؎

"امن گلشن میں شگوفوں کی طرح رہتا تھا　　سبز ئی سبز نقابوں کی طرح رہتا تھا
شاہراہوں پہ نگاہوں کی طرح رہتا تھا　　گھر میں جاتے ہوئے لوگوں کی طرح رہتا تھا
جنگ اس ملک میں اوروں کی بدولت آئی
آریہ آئے تو اس گھر میں قیامت آئی "

"موجِ گل موجِ صبا"

اس طرح بہت سارے بند ان کی نظموں میں دکھائی پڑتے ہیں۔ اس نظم کے ذریعہ ڈاکٹر راہی معصوم رضا کی وطن پرستی اور ملک کے بے شمار شاعر، ادیب، مذہبی پیشوا، سیاسی لیڈروں سے ان کی عقیدت ظاہر ہوتی ہے۔

ڈاکٹر راہی معصوم رضا کی تیسری دستیاب شدہ تصنیف "رقصِ مے" ہے جو ان کی نظموں کا انتخاب ہے۔ یہ انتخاب ۱۹۶۰ء میں پہلی بار شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی "رقص مے" شباب شاعری کی جان ہے، ان کے اس شعری مجموعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ فن شاعری کو شرابِ حیات پلا رہے ہیں اور پورا شعری خزینہ اس کے گرد محورِ رقص ہے وہ اس مجموعے میں زبان و بیان کو اس معراج کمال تک پہونچا رہے ہیں جہاں

انا الحق اور ہو الحق پر غور کرنے کی منزل ختم ہو جاتی ہے اور ہر طرف یکسانیت کا رنگ چھا جاتا ہے سوچنے کا طرز بدل جاتا ہے انداز بیان اپنا خود پتہ دینے لگتا ہے۔

اپنے سلسلے میں راہی خود رقم طراز ہیں :

" میرے سوچنے کے طریقے میں کس کس طرح تبدیلیاں ہوئی
ہیں انداز بیان کن کن منزلوں سے گزرا ہے اور موضوعات
نے کیسے کیسے بہروپ بدلے ہیں "

اس انتخاب کو ڈاکٹر صاحب نے ترقی پسند تحریک کے نام معنون کیا ہے جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی سوچ و فکر جذبہ احساس بھی ترقی پسند تحریک کے اغراض و مقاصد کی ترجمان ہے وہ پورے انتخاب میں سماجی بیداری، جوش و ولولہ، ہمت اور استقلال پر زور دیتے ہیں، وہ فن شاعری کے ذریعہ انسان کے روز مرہ مسائل، سماج میں پھیلی ہوئی برائی غریب کمزور کے اوپر ڈھائے جانے والے زور ظلم کو نمایاں کرتے ہیں۔ وہ اپنی ایک مشہور نظم "اے اجنبی" میں ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت قائم ہونے پر ان کے حکمرانوں نے کسان مزدور ہندوستان کی صنعت گری ہندوستانی تہذیب و تمدن قوم و ملت کو کس کس طرح تباہ کیا ہے اس کی مثال ان کی اس نظم سے واضح ہو جاتی ہے مثال ملاحظہ ہو ؎

"جب سے انگریزوں کا اس میں آیا قدم — زندگی بن گئی ایک شاعر کا غم
اجنبی جعفر اہرمن کی قسم — ایک طوائف کا گھر بن گیا ہے حرم
رات بڑھتی گئی دام لگتا گیا
ہیر رانجھا کے شاہ وارث بکا "

——— "اے اجنبی"

راہی ہندوستانی تہذیب و تمدن سے پوری طرح واقف ہیں اور وہ اپنی بعض نظموں میں ہندوستانی عناصر کو بخوبی سموتے ہیں۔ گہرا سماجی شعور ان کے یہاں ہے وہ دجلہ و فرات کی جگہ گنگا اور جمنا کا ذکر کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔

اس انتخاب کی پہلی ہی نظم "بت ٹوٹ چکا" میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی شاعری کا اصل مقصد بیان کیا ہے۔ وہ "ادب برائے ادب" کی جگہ "ادب برائے زندگی" کو ہی اصل شاعری سمجھتے ہیں وہ اس نظم میں ان لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو شاعری میں گل و بلبل، شراب و شباب، عشق کی بیخودی، لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد اور پرانی طرز کی شاعری اور محاورات کو ہی اصل شاعری مانتے ہیں ایسے لوگوں پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

"تمہاری آنکھیں جو کھل سکیں تو — یہ دیکھ لو میں کہاں کہاں ہوں
میں جانتا ہوں کہ حسن کیا ہے، — میں حسن فطرت کا رازداں ہوں
گلاب بے حد حسین ہے لیکن — زمیں کی محنت کو کیا کہو گے
قریب آؤ بتاؤ مجھ کو، — کرن کی شفقت کو کیا کہو گے
ہمارے عشقوں میں ہیر رانجھا کے دل کا پیمان جی رہا ہے
اوڈسے کے رقصوں میں دیو مالا کا داستان جی رہا ہے"

مجموعی طور پر ڈاکٹر صاحب کے اس انتخاب میں وہ تمام موضوعات موجود ہیں جو ان کے اصل مقصد شاعری کو نمایاں کرتے ہیں انھوں نے ایک نظم میں شاعروں اور ادیبوں کی اہمیت کو بھی جتایا ہے ؎

"سمجھتے ہو گے کہ صرف نظمیں ہیں کاغذوں پر لکھی گئی ہیں
نہیں یہ نظمیں نہیں، ہماری زمیں کی یہ تیوریاں چڑھی ہیں
حیات کے ہم نقیب ہیں اور اسی نے یہ بانکپن دیا ہے
زباں رکے بھی تو کیوں کہ ہم کو زمین نے اذن سخن دیا ہے
تمہارے ہی ہاتھوں سے ہمیشہ لٹی ہے خوابوں کی انجمن بھی
ہمارے ہی سر پہ قرض آیا کہ سر کریں منزل رسن بھی"

ڈاکٹر راہی معصوم رضا نے پابند نظم کے علاوہ نثری نظمیں بھی کہی ہیں جو بے حد مشہور و مقبول ہیں۔

راہی کی غزلوں کا ایک خاص انداز ہے گو کہ وہ اس سلسلے میں کسی نئی طرز اور مزاج کے موجد نہیں کہے جا سکتے۔ غزل کا بنیادی مزاج سوز و گداز کا ہے اور راہی کی غزلیں بھی غزل کی اہم خصوصیت سے مبرا نہیں ہیں بعض غزلیں ان کی بے حد خوبصورت ہیں اور زبان و بیان پر ان کی گرفت کی دلیل ہے چند جستہ جستہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

"تو ہی مقصد ہے عرض مدعا کرنے کہاں جائیں
ترے کوچے سے اٹھ کر ہم وفا کرنے کہاں جائیں

یہ بستی ان دنوں اپنی خردمندی پہ نازاں ہے
ہم اب اپنے جنوں کا تذکرہ کرنے کہاں جائیں

نہ صبح چمن نے نہ شامِ صحرا نے
ہمیں تو لوٹ لیا حیرتِ تماشا نے

ہم تو یوسف بھی نہ بن پائے کہ بک جائیں کہیں
تفتۂ پاکیٔ داماں کے سوا کیا لائیں "

ان کی غزلوں کی مجموعی فضا بے حد حسین ہے اور ان کے مطالعہ سے راہی کی قدرتِ کلام کا اندازہ ہوتا ہے ان کی غزلوں میں زبان و بیان کی پختگی پائی جاتی ہے جو اساتذہ کا طرۂ امتیاز ہے۔

راہی معصوم رضا کو ترقی پسند شعراء کی فہرست میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ آخری دنوں میں انھوں نے اپنی توجہ فلمی دنیا کی جانب مرکوز کر دی تھی وہاں انھوں نے بہت نمایاں کامیابیاں حاصل کیں اور فلم نیز ٹی وی سیریل کے ذریعہ انھوں نے اپنی فنی مہارت کا لوہا منوالیا۔ "مہابھارت" کے مکالمے بہت ہی جاندار اور دلکش حقائق پر مبنی ہیں۔ وہ ڈرامے کے فن سے بھی بخوبی واقف تھے اسی لیے ان کی شاعری میں ڈرامائی عناصر بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

راہی نے اپنے کلام میں جرأت و بیباکی سے اپنے فن کے نگارخانہ کو بڑی خوبصورتی سے سجایا ہے۔

□□

[illegible] صفحہ [illegible] کا بقیہ

کی تھیلیاں اکٹھی کرنے لگے گا۔"

"کیا اُسے بھی نہیں پڑھاؤ گے؟"

"سوہنی کہتا ہے ہم نے کون سا کلکٹر بننا ہے؟"

"کیا وہ بھی ننگے پاؤں ہی گھومے گا"؟

"مجھے کیا معلوم۔"

ٹھنڈی ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور بہت سے شہتوت گر گئے۔ دلبر کہہ رہا تھا۔ "انکل یہ سب اٹھالوں۔ اپنے بہن بھائی کے لئے لے جاؤں گا۔"

دلبر شہتوت اٹھاتے اٹھاتے آگے نکل گیا۔ میں گیٹ کا آہنی پائپ پکڑے وہیں ساکت کھڑا تھا۔ جیسے دلبر مجھے لوٹ کر لے گیا ہو مجھے ایک بھنور میں پھینک گیا ہو سوچنے کے لیے مجبور

"کیا ہر ایک کے لیے چھت ہونا ضروری ہے؟ کیا ایک چھت کے لیے اتنی معصوم زندگیاں صلیب پر چڑھائی جاسکتی ہیں؟"

□□

شاہ ولایت منگلوریؒ صفحہ ۳۳ کا بقیہ

تدفین بند کرنے کا حکم جاری کیا گیا تو حاکم علاقہ کی بیوی رات کو سوتے میں چونکنے لگی۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ اس کو خوابِ راحت سے جگا کر کہتے ہیں؛

"تمہیں یا کسی کو ہماری اولاد کو ہم سے دور کرنے کا کیا اختیار ہے؟"

حاکم علاقہ کی اہلیہ کئی دن تک یہی خواب دیکھتی رہی۔ آخر اپنے خواب کا ذکر اس نے اپنے انگریز شوہر سے کیا۔ یہ خواب سن کر انگریز افسر نے اپنا تدفین بند کرنے کا حکم واپس لے لیا اور دوسرا حکم جاری کر دیا جس کی رو سے آج بھی قلب شہر میں حضرت شاہ ولایت منگلوریؒ کے احاطے میں صرف ان کی اولاد کی تدفین ہوتی ہے۔

□□

بستی

گھر کے اندر بستی چھائی گھر کے باہر افسر
یہ بھی افسر، وہ بھی افسر، گول ہے اپنا بستر
گول ہے اپنا بستر پیارے، مفت میں شامت آئی
گھر میں جھگڑا، باہر جھگڑا، ایسی قسمت پائی
کہہ برقی کوی رائے ہر ایک سے کان کھول کر سن لو
زیور یا ساڑی لے کر گھسنا گھر کے اندر

نظر برنی

ڈی - ۲۵، مجیب باغ، پوسٹ جامعہ نگر
نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

نئی حکومت کے نئے عزائم

ریاست اتر پردیش ایک ایسی ریاست ہے جو ملکی پیمانہ پر ہونے والی تبدیلیوں اور سیاسی و سماجی انقلابات میں زمانۂ قدیم سے اہم اور موثر کردار ادا کرتی رہی ہے ۔ آزادی کے بعد جب جمہوری نظام قائم ہوا تو اپنی آبادی کے تناسب سے اس ریاست اتر پردیش نے سب سے بڑی تعداد میں اپنے نمائندے بھیجنا شروع کیے اور اسی بنیاد پر ملکی حکومت کی تشکیل نیز لوک سبھا میں عوامی فلاح سے متعلق پروگراموں کی وضع کاری اور ان پر عمل آوری کے سلسلے میں بھی موثر رول اس ریاست کے حصہ میں آیا۔

لہٰذا ایسی اہم اور پُر اثر ریاست کے اندر بھی امن و امان کی برقراری اور اس کے عوام کی فلاح و بہبود کو اولین ترجیح ملنا چاہیئے۔ ریاست میں حال ہی میں یعنی محض ایک ماہ قبل نئی حکومت برسرِ اقتدار آئی ہے ۔ اس نئی حکومت کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ ریاست کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک دلت خاتون کو وزیر اعلا کے منصب پر فائض ہونے کا موقع فراہم کیا گیا ہے۔ سماج میں عورت اور دلتوں کو مساوی حقوق دینے کی باتیں تو سیمیناروں اور مضامین میں اکثر و بیشتر ہوتی رہتی ہیں مگر انھیں واقعی مساوی حقوق اور مواقع دینے کی مثالیں چند ہی ملتی ہیں ۔ ریاست اتر پردیش نے ایک دلت خاتون کو وزیر اعلا کی ذمہ داریاں دے کر ایک تابندہ اور درخشاں مثال قائم کی ہے۔

نئی حکومت نے اقتدار میں آنے کے فوراً بعد یہ واضح کر دیا ہے کہ اس کی اولین ترجیحات میں ریاست کے امن و قانون کی حالت بہتر بنانا اور عوام کے تمام طبقوں کو ان کے جائز حقوق دلانا ہے ۔ وزیر اعلا بار بار یہ اعلان کر رہی ہیں کہ ان کی اور ان کی حکومت کی اولین ذمہ داری عام شہری کو اس کے جان و مال محفوظ ہونے کا احساس و یقین دلانا ہے اور اس سلسلے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھیں گی ۔ یہ محض اعلان نہیں ہے بلکہ اپنی حکومت کے اول دن سے ہی انھوں نے اس سلسلے میں عملی اقدامات کی ابتدا بھی کر دی ہے ۔ اپنی جانب سے عملی قدم اٹھانے کے ساتھ ہی وہ عوام کے بھرپور اور واقعی تعاون کی خواہاں ہیں اور بار بار عوام کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلاتی رہتی ہیں۔

وزیر اعلا جس دوسرے اہم نکتہ پر مسلسل زور دے رہی ہیں وہ یہ ہے کہ ان کی حکومت کی جانب سے تمام شہریوں کے ساتھ یکساں سلوک ہوگا۔ گو کہ ان کی حکومت کمزور اور دلتوں کی ہمدرد اور ہم نوا ہے تاہم اس کا یہ مطلب قطعی نہیں ہے کہ وہ کسی کے ساتھ زیادتی یا ظلم محض اس بنیاد پر کرے گی کہ وہ شخص دلت کے علاوہ کسی دوسرے طبقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ وزیر اعلا کی پالیسی ہے کہ ہر شہری کو اس کے حقوق ملیں۔ کوئی بھی شخص محض اپنی ذات یا طبقہ کی بنیاد پر کسی دوسرے کے ساتھ زیادتی نہ کر سکے ۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ 'سروسم بھاؤ سماج' تشکیل کرنا چاہتی ہیں۔ جہاں ذات پات' اونچ نیچ' امیر غریب' کمزور' زور آور کی بنیاد پر کوئی تفریق نہ ہو۔ ہر شخص کو اپنے انداز اور طریقہ پر زندگی جینے کا حق ہو۔ ان کی حکومت محض طبقہ یا ذات کی بنیاد پر کسی کی لیاقت اور قابلیت کو ضائع نہیں ہونے دینا چاہتی ہے۔ اس کا تو نصب العین ہی یہ ہے کہ ایک ایسا سماج تشکیل پائے جہاں کسی کو کسی سے خطرہ نہ ہو' کوئی بدگمانی نہ ہو' بے وجہ کا تعصب نہ ہو ۔ ہر کوئی خود کو اس سماج کی بہتری کے لیے ذاتی طور پر ذمہ دار تصور کرے ۔

نئی حکومت کے عزم اور استقلال کے ساتھ عملی اقدامات کو دیکھتے ہوئے بہتر اور خوش آئند مستقبل کی امید کی جا سکتی ہے۔

—— احمد نسیم صدیقی

نئے ارادے، نئی منزلیں

کسی بھی حکومت کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ امن و امان قائم کرے، لاقانونیت ختم کرے اور اس کے شہری چین و سکون کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔

نئی حکومت نے محترمہ مایاوتی کی قیادت میں اپنا پہلا فریضہ یہ قرار دیا ہے کہ قانون کی بالادستی تسلیم کرائی جائے گی۔ قانون کا احترام کرایا جائے گا۔ اور جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا جو رجحان ہے اُسے ختم کیا جائے گا۔

انھوں نے کھلے لفظوں میں یہ اعلان کیا ہے کہ میں اب تک بہوجن سماج پارٹی کی نمائندہ تھی لیکن اب وہ پورے پردیش کی ذمہ دار ہیں اور تمام امتیازات سے بلند ہو کر وہ صوبہ کے عوام کی فلاح کے لیے کام کریں گی۔ چنانچہ جو کابینہ انھوں نے تشکیل دی ہے اس میں بھی اس کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ سماج کے ہر طبقہ کے لوگوں کو نمائندگی دی جائے چنانچہ تقریباً ہر ذات اور طبقے کے افراد کو شامل کیا گیا ہے۔

محترمہ مایاوتی نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ ان کی حکومت بغیر کسی سیاسی دباؤ کے اپنے اُصولوں اور نظریات کی روشنی میں کام کرے گی۔

اور ان کا اصول و نظریہ ہے، سماج کے کمزور پسماندہ طبقات پر مظالم کا خاتمہ، اور ان کے معیارِ زندگی کو بلند کرنا، انھیں انصاف دلانا اور جو ان کے حقوق ہیں انھیں دینا۔

باباصاحب بھیم راؤ امبیدکر نے جو روشنی دکھائی تھی اور ہندستان کے آئین میں جو حقوق دئے گئے ہیں، ان سب کو دلانا مایاوتی سرکار کی ترجیحات میں شامل ہیں۔

اس حکومت کا قیام صرف ایک ماہ قبل عمل میں آیا ہے اسے ایوان کا اعتماد حاصل ہو چکا ہے اور مختلف سیاسی جماعتوں نے اس حکومت کو اپنی تائید کا یقین دلایا ہے۔ عوام میں جس طرح اس حکومت کا خیر مقدم کیا گیا ہے وہ آپ اپنی مثال ہے۔ بالخصوص کمزور طبقات کی خواتین نے محترمہ مایاوتی کے وزیر اعلیٰ بننے پر اپنی بے پایاں مسرت کا اظہار کیا ہے۔ یہ امید کی جاتی ہے کہ آنے والے دنوں میں وہ اپنے اقدامات کو واضح شکل دیں گی اور ایسی تبدیلیاں سامنے آئیں گی جن سے آئین کا احترام، لاقانونیت کا خاتمہ اور جنتا کو سکھ اور چین کا سانس لینا نصیب ہو اور غریبوں میں کچلے ہوئے طبقوں میں، عورتوں میں احساسِ تحفظ پیدا ہو اور اعتماد بھی بیدار ہو۔

——— شکیل احمد

> "آج سے قبل بہوجن سماج پارٹی کی قومی سکریٹری ہونے کے باعث میرے کاندھوں پر محض بہوجن سماج کی ذمہ داری تھی، لیکن آج میرے کاندھوں پر پورے سماج کی ذمہ داری آگئی ہے۔ میں آپ لوگوں کو یقین دلاتی ہوں کہ آپ کو کبھی ایسا محسوس نہیں ہوگا کہ ہمارے ساتھ سوتیلے پن کا رویہ اختیار کیا جا رہا ہے۔"
>
> ——— مایاوتی
> وزیر اعلیٰ اترپردیش

نئی حکومت اور اقلیتیں

محترمہ مایاوتی وزیراعلیٰ بننے سے قبل جب پہلی بار سیاسی افق پر ابھری تھیں۔ اسی وقت سے انھیں اقلیتوں کا خیال رہا اور انھوں نے ہمیشہ ان کے لیے بھرپور کوشش کی کہ ان کے مفادات بھی محفوظ رہیں۔ اور ان کے جذبات کا احترام کیا جائے۔ بالخصوص مسلمانوں کے سلسلہ میں محترمہ مایاوتی نے کھل کر ہر موقع پر ان کے جائز مطالبات کی حمایت کی۔

انھوں نے بہت ہی غور وفکر کے بعد بہت پہلے یہ کہا تھا کہ مسلمانوں کو ہر جگہ مناسب تحفظ (ریزرویشن) دیا جائے گا چاہے وہ زندگی کا کوئی شعبہ ہو، یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ ملازمتوں میں مسلمان مشکل سے چار فیصد ہی ہیں بعض محکموں میں یہ تناسب اور کم ہے۔ اگر یہ جگہیں مسلمانوں سے بھری گئیں تو عملاً مسلمان بھائیوں میں بے روزگاری کا بالکل خاتمہ ہو جائے گا اور تلاش کرنے پر بھی کوئی بے روزگار نہ ملے گا۔

حالانکہ ابھی انھیں اپنے ہاتھوں میں اقتدار لیے ایک مہینہ ہوا ہے اس عرصہ میں اُن پر خاصہ بوجھ رہا ہے۔ ایوان میں اعتماد کا ووٹ حاصل کرنا، اپنی اکثریت ثابت کرنا اور اسی کے ساتھ اپنی کابینہ کو تشکیل دینا لیکن ان تمام پیچیدگیوں کے باوجود انھوں نے اقلیتی بہبود کا محکمہ قائم کیا ہے۔ یہ محکمہ پورے ہندوستان میں کہیں نہیں ہے اور اترپردیش میں پہلی بار اس کا قیام عمل میں آرہا ہے۔ اس کا دائرہ کار وسیع ہوگا اور اقلیتوں کی فلاح وترقی سے متعلق سارے امور یہ محکمہ انجام دے گا۔ اس کے قیام کے اعلان کا اقلیتوں نے زبردست پیمانے پر خیر مقدم کیا ہے اور عام طور سے یہ محسوس کیا جارہا ہے کہ اس کے قیام کے بعد وہ تمام اسکیمیں اور منصوبے جو بنتے ہیں مگر جن پر عملدرآمد نہیں ہوتا اور جو فائل کے کاغذات میں گم ہو جاتے ہیں، اب ان سب پر عمل ہوگا اور یہ محکمہ یہ دیکھے گا کہ اقلیتوں کو ان کے جائز حقوق مل رہے ہیں۔

محترمہ مایاوتی نے اپنی کابینہ میں چار مسلم وزرا شامل کیے ہیں اور یہ بھی اعلان کیا ہے کہ آئندہ جب کابینہ میں توسیع عمل میں آئے گی تو اس وقت بھی اقلیتوں کی نمائندگی کا خیال رکھا جائے گا۔

ہمارے یہاں کہاوت ہے کہ "تار باجا راگ بوجھا" یا پوت کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ابتدا میں ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔ محترمہ مایاوتی نے حکومت سنبھالتے ہی اپنے بیانات، اعلانات اور اقدامات سے یہ واضح کر دیا کہ انھیں اقلیتوں کا مفاد بے حد عزیز ہے اور آنے والے دنوں میں وہ اقلیتوں کی فلاح وبہبود کے لیے کام کریں گی۔ اقلیتوں کے لیے جگہوں کا مخصوص کیا جانا، اور محکمۂ اقلیتی بہبود کے قیام کا اعلان یہ دو ایسے اہم رُخ ہیں جن پر نہ ماضی میں سوچا گیا اور نہ ابھی تک کسی نے اس جہت سے اقلیتی مسائل کا جائزہ لیا ہے۔ یہ یقین ہے کہ ان کے سارے منصوبے اور ان کے اقدامات اقلیتوں کی ترقی کے لئے نیا راستہ بنائیں گے۔

—— محمد سبطین

"میں آپ لوگوں کو یقین دلانا چاہتی ہوں کہ اترپردیش میں کسی کو یہ احساس نہیں ہوگا کہ وزیر اعلا نے ذات یا مذہب کی بنیاد پر انصاف کیا"۔

—— مایاوتی
(وزیر اعلا اترپردیش)

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: "تحقیق نما"
مصنف: ڈاکٹر صابر سنبھلی — قیمت: ۳۶ روپے
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر
نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

ڈاکٹر صابر سنبھلی کی تصنیف "تحقیق نما" ایک ایسی کتاب ہے جو طریق تحقیق RESEARCH METHODOLOGY کے موضوع پر لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب اس بنا پر بھی اہم ہے کہ اس موضوع پر اردو میں زیادہ کتابیں نہیں ملتیں، لیکن اس کی اصل اہمیت اس خصوصیت پر مبنی ہے کہ یہ ایسے لوگوں کی علمی ضرورتوں کو نظر میں رکھ کر تحریر کی گئی ہے جو ادبی تحقیق کا کام کرتے ہیں۔ اس سے پہلے طریق تحقیق پر جو تصانیف منظر عام پر آئی ہیں ان کی سطح آتنی عالمانہ اور ان میں زبان و بیان کا انداز اتنا دقیق ہے کہ طلباء اور ریسرچ اسکالران سے مناسب طور پر استفادہ نہیں کر پاتے۔

یہ کتاب دو حصّوں میں منقسم ہے، پہلے حصّے کا عنوان "عرفانِ تحقیق" ہے اور یہ تین ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اوّل میں تحقیق کی تعریف، اس کی ضرورت و اہمیت اور اس کے ذرائع اور محقق کی صفات، اس کی دشواریوں اور اس کے ذریعے برتی جانے والی احتیاطوں کا ذکر ہے۔ باب دوم میں ادبی تحقیق کی مختلف شکلوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور باب سوم میں اردو تحقیق کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح کتاب کا پہلا حصہ "تحقیق کے علمی پہلوؤں سے متعلق ہے۔ دوسرے حصّے کا عنوان "میدانِ تحقیق" ہے اور یہ تحقیق کے عملی پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ اس حصّے میں چار ابواب ہیں جو کتاب کے باب چہارم، پنجم، ششم اور ہفتم ہیں۔ باب چہارم میں اُن ابتدائی تیاریوں کی تفصیل دی گئی ہے جو کسی موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھنے کے لئے کرنی ہوتی ہیں۔ باب پنجم ان طریقوں کے ذکر پر مبنی ہے جن کی مدد سے تحقیقی مقالے کے لیے مواد اکٹھا کیا جاتا ہے۔ باب ششم میں یہ بتایا گیا ہے کہ متن کی تدوین کس طرح کی جانی چاہیے، اور باب ہفتم میں کچھ ایسی متفرق اطلاعات فراہم کی گئی ہیں جو ریسرچ اسکالروں کے لیے تحقیقی مقالے کی کاپیاں تیار کرنے اور اسے یونیورسٹی میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے داخل کرنے کے سلسلے میں کارآمد ہیں۔

ڈاکٹر صابر سنبھلی نے ۲۱۶ صفحات کی اس کتاب کی قیمت صرف ۳۶ روپے رکھ کر اسے زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے قابل حصول بنا دیا ہے۔ ان کی یہ تصنیف ادبی تحقیق سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ہر لحاظ سے ایک قابل قدر تحفہ ہے۔

—— ڈاکٹر اختر بستوی

نام کتاب: "نواب والاجاہ اور حضرت العلام عبد العلی بحر العلوم فرنگی محلی"
مصنف: علیم صبا نویدی — قیمت: تیس روپے
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار، جامع مسجد دھلی

علیم صبا نویدی نے نواب والاجاہ اور ملا بحر العلوم لکھ کر اُردو دنیا خاص کر نئی نسل پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔

نواب والاجاہ فرماں روا ارکاٹ کی سیاسی طور پر اچھی تاریخ نہیں ہے لیکن انھوں نے جس طرح علم و ادب کی سرپرستی اور فن و ہنر نوازی کی ہے اس نے ان کے سیاسی کاموں کو پیچھے ڈال کر بہت بلند قامت ثابت کر دیا ہے۔

علیم کا مزاج تحقیق اور تجسس کا دھنی ہے انھوں نے جنوبی ہند کی ادبی اور علمی شخصیتوں کو جتنی بڑی تعداد میں تلاش کیا ہے وہ ان کا کارنامہ ہے۔

علوم مشرقیہ کے ماہروں اور سماجی مصلحوں نے اپنے کام کیلئے

ایسے سنگلاخ راستے منتخب کیے جہاں انسانیت سسک رہی تھی اور اونچ نیچ، امتیاز نقطۂ عروج پر تھا، ایسی حالت میں انسانیت کا فرض ادا کرنا بجلی کی قوت پیدا کرنے سے بھی مشکل ہے۔ عوام کو برابری عطا کرنا اور اونچ نیچ و نیز امتیاز کا مقابلہ کرنا دشوار ہے جبکہ سمندر سے موتی نکال لینا آسان ہے۔ بقول شیخ بی. علی "دل کے بجھتے چراغ طبی کرشمہ سے پھر سے بھڑکانا اتنا محال نہیں جتنا ہر فرزند آدم کو روٹی، کپڑا اور مکان مہیا کرنا۔"

علیم صبا کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ کتنے عظیم اہل علم شمالی ہند سے جنوب میں پہنچے اور انھوں نے وہاں علم و عرفان کے ذریعہ انقلاب برپا کر دیا، ان ہی میں سردار قافلہ حضرت علامہ عبدالعلی ملا بحر العلوم ہیں جن کو حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی نے 'بحر العلوم' کا خطاب دیا تھا اور اپنی خداداد صلاحیتوں سے موصوف نے شمالی ہند خاص کر خانوادہ فرنگی محل کو اطراف ہند بلکہ سارے عالم میں روشناس کرایا۔

مصنف کی کاوش قابل قدر ہے۔ انھوں نے اس سے پیشتر "مولانا باقر آگاہ ویلوری" لکھ کر ہندو پاکستان کے ادیبوں سے خراج تحسین حاصل کیا ہے۔

"نواب والاجاہ اور علامہ بحر العلوم" ایک تحقیقی اور قابل قدر کتاب ہے۔ اردو ادب کے متلاشی اس سے بہت کچھ حاصل کر سکیں گے امید ہے کہ اردو ادب میں اس قیمتی اضافہ کو اہل زبان کی قبولیت حاصل ہو گی۔

——— اسحاق سنبھلی

نام کتاب: "اکیلی" (شعری مجموعہ)
مصنفہ: شبنم عثمانی　　قیمت: بیس روپئے
ناشر: ذہن جدید۔ پوسٹ بکس نمبر ۷۰۴۲
نئی دہلی ۲...۱۱

'اکیلی' شبنم کی جدید آزاد نظموں کا مجموعہ ہے جو 'ذہن جدید' کی پیش کش ہے۔ اُلجھے اُلجھے، مبہم خیالات جن میں آج جدید ذہن الجھا ہوا ہے، وہ اس ہندستانی لڑکی کے جذبات کی پوری شدت اور سچائی سے عکاسی کرتے ہیں جو ماڈرن سماج میں تمام جسمانی و ذہنی تجربات سے لذت یاب ہونے اور شوریدہ سر و مضر عناصر سے ہم کنار ہونے کے بعد، اس نتیجہ پر پہنچتی ہے کہ وہ اقتصادی، ذہنی اور جسمانی ہر لحاظ سے اکیلی ہے۔ اس کا سماج میں کوئی مقام نہیں ہے۔ وہ ایک ایسے کھلونے کے مانند ہے جس کو دل بہلانے کے بعد توڑ دیا گیا ہو۔

شبنم کو اپنی ذات کے تموج کے لگاؤ کے باوجود خود سپردگی کے ساتھ اٹوٹ پیار کی خواہش ہے۔ شاید ان کے پیار بھرے دل کو کوئی شدید ٹھوکر لگی ہے جو ان کی نظموں میں حسرت اور ناکامیابی کے گرم آنسوؤں کے روپ میں اتر آئی ہے۔

شبنم کے عجیب بے ہنگم سے خیالات ہیں لیکن بار آور نتائج پیش کرتے ہیں۔ شہر کی گھٹن، لوگوں کی انا پرستی اور بے حسی کی عکاسی انھیں کا حصہ ہے۔ ان کی شاعری پختہ تجربات کے نتائج سے بھرپور ہے۔ حالات و تجربات انسان کے موم سے دل کو پتھر بنا دیتے ہیں، اور اس کے احساسات اور تخیلات معدوم ہو جاتے ہیں۔

شبنم کی شاعری میں نیچر کی کسک ہے جو ان کے تخیلات اور احساسات کو نیا لمس بخشتے ہیں۔ اس کے خیالات نادر اور نظریے نئے ہیں۔ ان کی ہر نظم لاجواب ہے اور انتخاب بہت معیاری ہے کتابت، طباعت اور جلد بندی بہت دیدہ زیب ہے۔

——— خلیل اللہ خاں

نام کتاب: "ظہیر دہلوی: حیات و فن"
مصنف: ڈاکٹر مختار شمیم۔　　قیمت: سو روپے
ناشر: نصرت پبلشرز۔ امین آباد۔ لکھنؤ

"ظہیر دہلوی: حیات و فن" ڈاکٹر مختار شمیم کے پی ایچ ڈی کیلئے لکھے گئے مقالے کا کتابی روپ ہے جسے انھوں نے نظر ثانی کے بعد شائع کرایا ہے۔

ظہیر دہلوی خاقانی ہند استاد ذوق کے عزیز ترین شاگردوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کے معاصرین میں استاد داغ اور امیر مینائی ان سے کہیں زیادہ مشہور ہو گئے۔ اہل نظر ناقدین فن ظہیر کے معترف اور مداح تو ضرور رہے مگر ان پر وہ کام نہیں ہو سکا جو ان کا بھرپور تعارف کرا سکتا۔ مختار شمیم نے خصوصی توجہ سے اس موضوع کو اپنے مقالے کے لیے پسند کیا اور صحیح معنوں میں ظہیر شناسی کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان کی شاعری کی مروجہ مختلف اصناف حمد، نعت، منقبت، رباعیات و قطعات، نظمیں، مراثی، قصائد اور غزل و نظم میں ان کی انفرادی شناخت پر بھی پوری توجہ دلائل کے ساتھ دی ہے۔ نثر نگاری میں قصہ ممتاز اور داستان غدر کے علاوہ جو تقریظیں لکھی تھیں ان پر بھی سیر حاصل تبصرے کیے ہیں۔

کتاب اپنی معنوی خوبیوں کی وجہ سے اُردو کے طلبا، اور اساتذہ کے لیے کارآمد ماخذ کی حیثیت کی حامل قرار دی جا سکتی ہے۔

——— ظفر محمود

نام کتاب: "سورج کاندھے پر لیے" (شعری مجموعہ)
شاعر: احمد یار خاں شفق تنویر   قیمت: ۵۰/- روپئے
ملنے کا پتہ: ظہیر پبلیکیشنز، ۹۱ - چرچ روڈ، جہانگیر آباد بھوپال

ہندستان ایک وسیع ملک ہے اور اس کے مختلف صوبوں میں رہنے والے اُردو ادیب بذریعہ نظم و نثر گیسوئے اُردو کو سنوارنے میں مصروف ہیں۔ زمانہ تغیر پذیر ہے نتیجہ یہ ہے کہ جہاں زندگی کے دیگر شعبوں پر اس کے اثرات مرتب ہوئے ہیں اسی طرح برصغیر کی اُردو شاعری پر بھی اس کے بدلے ہوئے رنگ و آہنگ نمایاں ہو رہے ہیں۔

انھیں جدید شعری آہنگ و بیان میں ڈوبا ہوا زیر نظر شعری مجموعہ "سورج کاندھے پر لیے" ہے جو مدھیہ پردیش اُردو اکادمی کے تعاون سے شائع ہوا ہے۔ اس مجموعے میں شفق تنویر اور رخسانہ نکہت کے تعارفی صفحات کے علاوہ بیالیس غزلیں، ۲۸ نظمیں بھی موجود ہیں۔

شفق تنویر بیک وقت دو تخلص استعمال کرتے ہیں جیسا کہ اس مجموعے سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے شعروں میں جدید شاعری کے رجحانات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ لہٰذا جگہ جگہ ہندی اور انگریزی کے استعمال کو روا رکھا گیا ہے۔ بظاہر یہ ترکیب نئی نسلوں کے لیے مرغوب ثابت ہو گی مثلاً ؎

سارا جیون کاٹا ہے ہم نے نرک سمان
انساں کی یونی میں بھی انھیں ملا آرام

شفق صاحب کی نظموں کے عنوانات۔ زمین کا مذہب۔ نئی نسل اور ہم۔ بھوپال گیس ٹریجڈی کے بعد۔ مہمان انسان۔ ردعمل۔ عورت۔ لب جوئے شیر۔ ہرجائی۔ مثلث۔ آہنی دیوار۔ ۱۹۹۵ء کی دیوالی۔ کمندیں سورج پر۔ حسینؑ جمہوریت کے علمبردار۔ اور معجزہ بیسویں صدی کا وغیرہ ہیں، جن کے شعروں میں نئی آب و تاب و رعنائی ہے۔

یقین ہے کہ شفق تنویر کا یہ مجموعہ مقبول خاص و عام ہو گا۔ مجموعہ کی کتابت اور طباعت معمولی ہے جو موجودہ دور سے مطابقت نہیں رکھتی۔

——— دانش لکھنوی

نام کتاب: "دست خط"
(شعری مجموعہ)
شاعر: اختر عزیز

"دست خط" اختر عزیز کا پہلا مجموعۂ کلام ہے جو کہ ۱۲۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں حمد، نعت اور غزلیں شامل ہیں۔ اختر اپنے عہد کے حالات و واقعات پر کڑی نظر رکھتے ہیں۔ وہ جذبات و احساسات کو جس خوش سلیقگی کے ساتھ الفاظ کا پیرہن عطا کرتے ہیں اور زبان کی صفائی اور بیان کی وضاحت کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں یہ ان کا اپنا کمال ہے۔

اختر بے یقینی، جھوٹ اور مکر کے ماحول میں نہ خود زندہ رہنا چاہتے ہیں اور نہ ہی دوسروں کو زندہ رہنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ انھوں نے اپنے مشاہدات اور تجربوں کو بڑے سلیقے سے اپنے

کلام میں ڈھالا ہے۔ ملاحظہ ہو ۔

غبارِ راہ بن جاؤ گے تم بھی
اگر الجھو گے میری رہ گزر سے

اختر کی شاعری کی ایک اور خوبی ہے۔ ان کے اشعار سے گاؤں کے پنگھٹ کی سوندھی سوندھی خوشبو اُٹھتی ہے جو اپنے اطراف کو بھی معطر کردیتی ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ " دست خط " شہر میں پھیلی گرد اور دھویں سے آلودہ نہیں ہوسکی ہے۔

"دست خط" اختر کی شاعری کا نقشِ اول ہے جو پہلی بارش کے بعد کی سوندھی مٹی کی خوشبو کی طرح لوگوں کے ذہن میں گدگدی پیدا کررہی ہے اور اختر کے لیے دل میں وہ مقام جو اسے کافی بلندی تک پہونچائے گا۔

——— عتیق الہ آبادی

> نام کتاب: "لبِ خاموش" شعری مجموعہ
> شاعر: عابد حسین جلال مرادآبادی قیمت: بیس روپے
> ملنے کا پتہ: ارم پبلی کیشنز۔ قصر قمر بارہ دری
> مرادآباد ۲۴۴۰۰۱

" لبِ خاموش " جلال مرادآبادی کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ پہلا مجموعۂ کلام نعتوں پر مشتمل " نشاطِ مدینہ " کے نام سے شائع ہوکر منظرِ عام پر آچکا ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب "لبِ خاموش" ان کی پچاس برسوں سے زائد کی شعری کدوکاوش کا مظہر ہے اس میں ۱۲۲ غزلیں اور سات نظمیں ہیں۔ مجموعہ کی ابتدا حمد باری تعالیٰ سے ہوتی ہے۔ مجموعۂ کلام دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جلال کی محبوب صنف غزل ہے۔ ان کی غزلوں میں ماضی کی صالح روایات کی پاسداری بھی ہے اور عصری تقاضوں کی حیثیت بھی۔

جلال کی شاعری اپنے عہد کی ذہنی، فکری، قومی، سماجی اور سیاسی محرکات کی آئینہ دار ہے جس میں ایک طرف جدتِ فکر، کلاسیکیت اور قدیم روایات کے تجربے کے ساتھ نازک جذبوں کی گویائی ہے تو دوسری طرف قوم کا درد اور قومی یک جہتی کا پیغام عام ہے۔

کاغذ، کتابت اور طباعت معیاری ہے۔ یہ کتاب ایک سو ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ امید ہے کہ ان کا یہ شعری مجموعہ اہلِ ذوق حضرات کی توجہ کا مرکز بنے گا۔

——— عقیل احمد

> نام کتاب: "سلگتی ریت" (شعری مجموعہ)
> شاعر: ڈاکٹر اسلم الہ آبادی۔ قیمت: ساٹھ روپے
> پتہ: انجمن تہذیبِ نو۔ ۲۰۲، چک الہ آباد

ڈاکٹر اسلم آبادی عوام و خواص دونوں کے پسندیدہ شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کی عمر طویل ہے۔ وہ تقریباً پچھلے ۲۵ برسوں سے باقاعدہ شاعری کررہے ہیں۔ زیرِ نظر شعری مجموعہ " سلگتی ریت" ان کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے۔ آج سے تقریباً پندرہ برس پہلے ان کا شعری مجموعہ " محبت خدا ہے " کے نام سے شائع ہوا تھا۔ پہلے شعری مجموعہ کی طرح اس میں آنچلوں کی نرم ہوائیں، گمنام آرزوئیں اور چاند کو چھو لینے کی خواہشیں نہیں ہیں۔ وہ ٹھنڈی ریت جس پر بیٹھ کر کبھی شاعر نے چاند کو چھونے کی تمنا کی تھی، وہ ریت اب سلگتی ہوئی نظر آتی ہے۔ خود اسلم الہ آبادی کے الفاظ میں:

" سلگتی ریت، جلتے اور تپتے ہوئے صحرا کا ایک لمبا سفر ہے، جس میں دور دور تک کوئی سائبان نہیں اور نہ تو کوئی میل کا پتھر ہی دکھائی پڑتا ہے ..."

" سلگتی ریت " میں جدید رنگ بالکل نمایاں ہے۔ اس میں وقت اور سیاست پر سیدھی تنقید ہے۔ زبان سادہ اور سلیس ہے مگر اس میں شمشیر کی سی تیزی اور بلا کا تیکھاپن ہے جو سماج اور سیاست کے کھوکھلے پن کو ظاہر کرتا ہے۔ نمونہ کے طور پر شعر ملاحظہ ہو ۔

لوگوں نے اٹھائی ہیں تعصب کی فصیلیں
اس پار سے اس پار دکھائی نہیں دیتا

——— بدرُ الدین

اودھ نمبر (۲)

تاثرات کے آئینے میں

مکرمی! اودھ نمبر حصّہ دوم دیکھ کر جی خوش ہوگیا۔ کس سلیقے سے آپ نے نمبر نکالا ہے۔ سرورق سے لے کر آخری صفحہ تک لکھنؤ کی نفاست کی تصویر ہے۔ اودھ کے بارے میں یہ دونوں نمبر ایک دستاویز ہیں جس کی ہمیشہ لوگوں کو ضرورت رہے گی۔ سلطنت اودھ کا مصور توقیت نامہ بھی خوب ہے۔ نورالحسن ہاشمی، شمس الرحمٰن فاروقی، نیر مسعود اور مجاور حسین کے مضامین نے خاص طور پر متاثر کیا۔ اطہر مسعود کا مضمون 'لکھنؤ کے پھیری والے' بہت دل چسپ ہے۔ اسلم محمود صاحب کے مضمون سے بعض نئی کتابوں کا علم ہوا۔ اسلم محمود صاحب کی عنایت کردہ دو تصاویر کی شناخت نہیں کر سکا۔ ایک کا عنوان ہے 'محل کا ایک منظر' اور دوسری 'لکھنؤ کا ایک مقبرہ'۔ یہ کب کی تصاویر ہیں اور کس جگہ کی ہیں ان دونوں تصاویر میں جو مسجد ہے اس کے بلند مینار سے احتمال ہوتا ہے کہ ٹیلے والی مسجد ہوگی لیکن اس کے آس پاس اس طرح کے آثار میں نے نہیں دیکھے۔

تصاویر کی طباعت، کتابت اور اشاعت کا جو معیار آپ نے پیش کیا ہے وہ اُردو رسالوں میں نظر نہیں آتا۔ اس بہترین نمبر کی اشاعت پر میری دلی مبارکباد قبول کریں۔

—— شارب رُدولوی۔ دہلی

مکرمی! بہت دنوں کے بعد آپ کی ادارت کا ایک حسین تحفہ ملا۔ جتنا خوبصورت خطۂ اودھ ہے اتنا ہی خوبصورت اودھ نمبر حصّہ دوم۔ اس قدر معلومات آفریں، اس قدر بلیغ مضامین اور اس پر مستزاد حُسنِ کتابت و طباعت! اس زمانے میں ایسا خوبصورت پرچہ نکالنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ جو تاریخی، ثقافتی اور ادبی مضامین اس نمبر کی زینت ہیں وہ بلاشبہ آپ کی محنتِ شاقہ کا ثمرہ ہیں۔ میں ان منزلوں سے گزرا ہوں کہ اپنے مطلب کے مضامین مقتدر اہلِ قلم سے لکھوانا بڑی ہمّت کا کام ہے۔ قرۃ العین حیدر، سرور صاحب، نورالحسن ہاشمی، علی جواد زیدی، فاروقی، عبدالقوی دسنوی اور نیّر مسعود جیسے اہلِ قلم جہاں یک جا ہوں وہ مجلّہ ہم عصروں کا نگارخانہ کہا جائے گا۔

—— رفعت سروش۔ نوئیڈا

مکرمی! نیا دور کا گرانقدر اودھ نمبر حصّہ دوم وصول ہوا۔ ظاہری اور معنوی ہر دو اعتبارات سے یہ خصوصی نمبر لاجواب ہے۔ حصّہ اول بھی اپنی مثال آپ تھا۔ حصّہ دوم بلاشبہ اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ نے اودھ کی ادبی، علمی، ثقافتی اور سماجی زندگی کے سارے پہلوؤں کا احاطہ کرلیا ہے۔ ان دونوں اشاعتوں کو نہ صرف ہمارے ادب میں بلکہ تاریخِ اودھ کی بھی دستاویزی اہمیت حاصل رہے گی۔ کن کن مضامین کا تذکرہ کروں۔ ہر مضمون اپنی جگہ آپ داد و تحسین کا مستحق ہے۔ مضامین لکھنے والوں کو مبارکباد اور آپ کو بھی کہ ایسا شان دار گلدستہ پیش کیا۔

—— سلیمان اطہر جاوید۔ ترپتی

برادرم! نیا دور مجھے نہایت پابندی سے ملتا ہے۔ مکروہاتِ زندگی نے فرصت ہی نہ دی کہ آپ کو خط لکھ سکوں۔ اپنی بے ہنگم زندگی کی وجہ سے اپنے آپ سے اکثر شرمندہ رہتا ہوں۔ نیا دور کو آپ جس لگن اور خلوص کے ساتھ نکال رہے ہیں اس کی داد نہ دینا ادبی بددیانتی ہوگی۔ "اودھ نمبر" نکال کر تو آپ نے کمال ہی کر دیا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی ادارت میں نیا دور ملک کا نہایت مؤقر رسالہ بن جائے گا (بلکہ اب بھی بن چکا ہے)۔

—— مجتبیٰ حسین۔ دہلی

محترم! اودھ نمبر حصہ دوم کو اودھ کی دلکش تہذیب کا ایک خوبصورت مظہر کہا جائے تو بجا ہے۔ ظاہر جس قدر حسین اور دیدہ زیب ہے باطن اتنا ہی گہرائی اور گیرائی لیے ہوئے ہے۔ اودھ کی تہذیب کے مختلف پہلوؤں پر مضامین ہیں اور سب ایک سے بڑھ کر ایک۔ اس خوبصورت نمبر کے لیے آپ کو جتنی مبارکباد دی جائے کم ہے۔

—— انور خاں

ماہنامہ نیا دور

جلد ۵۰ | نمبر ۵

اگست ۱۹۹۵ء

ایڈیٹر
سید امجد حسین
فون نمبر ۲۱۳۴۷۸

جوائنٹ ایڈیٹر: سید اسرار حسین

معاونین
محمد الیاس خاں ۔ مبین احمد صدیقی

پبلشر
روہت نندن
(ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامّہ اتر پردیش)

مطبوعہ
یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس، لکھنؤ

شائع کردہ، محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامّہ اتر پردیش لکھنؤ

زر سالانہ: تیس روپے
عام شمارہ: تین روپے

ترسیل زر کا پتہ
سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ
انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ، اتر پردیش لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر نیا دور پوسٹ بکس نمبر ۱۴۶ لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری
ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ
اتر پردیش لکھنؤ

کتابت زیر نگرانی: حسن اختر

اپنی بات	ایڈیٹر	۲
گلہائے عقیدت (نعت)	رباب رشیدی	۳
لکھنؤ میں اردو صحافت	پروفیسر محمود حسن	۴
آزادیٔ ہند کی سالگرہ (نظم)	ناوک حمزہ پوری	۹
اردو رسالوں کا ماضی اور حال	عشرت علی صدیقی	۱۰
اپنا وطن (نظم)	کاوش الٰہ آبادی	۱۸
دانہ دام	باقر مہدی	۱۹
غزل	اوپیندر ناتھ اشک	۱۹
حیدرآباد میں اردو ادب میں رجحانات	راج بہادر گوڑ	۲۰
کسانی غزل	بیکل اتساہی	۲۴
غزل	وجاہت علی سندیلوی	۲۴
غزل	بشیر بدر	۲۵
غزل	ساغر اعظمی	۲۵
آزادی کے بعد رامپور کی ادبی خدمات	شبیر علی خاں شکیب	۲۶
۱۵ر اگست (قطعات)	عبد المنان صدیقی	۳۴
اے مسیحا نفس (نظم)	ایس' ایم' عباس	۳۵
قومی یکجہتی (نظم)	آزاد سونی پتی	۳۵
یہ جگنو میرے ہیں تمھارے نہیں (افسانہ)	وجے موہن دمٹو	۳۶
غزل	بلند اقبال نیازی	۳۸
غزل	مجاہد الاسلام	۳۸
غزلیں	علی باقر زیدی ۔ بیخود نگرامی ۔ حیدر مصطفےٰ آبادی	۳۹
	آصف لکھنوی، صارم مہدی، ترابی اعظمی	۳۹
نئی حکومت اور اقلیت	رضوان حیدر	۴۰
ڈاکٹر امبیڈکر کی عظمت	سہیل احمد	۴۱
نقد و تبصرہ	وقار ناصری، راحت علی خاں، احمد ابراہیم علوی	۴۳
	ڈاکٹر ای' اے' حیدری' نہال احمد' ارشاد امروہوی	تا
	فاطمہ وصیہ جائسی ۔ اقبال احمد اعجازی	۴۷
اودھ نمبر ۲ تاثرات کے آئینے میں		۴۸

اپنی بات

سُنو! اے بستگانِ زلفِ گیتی — ندا کیا آ رہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر — غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

جوش ملیح آبادی کے ان مصرعوں کی گونج اگست میں تیز ہو جاتی ہے۔

اگست کا مہینہ ہندستان میں بہت اہم ہوتا ہے اس لیے کہ اسی مہینے میں بھادوں ریشمی پھواروں کے ساتھ رخصت ہوتا ہے۔ لیکن تاریخ نے موسم کی اس رنگینی کو پس منظر میں ڈال دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اگست کا نام آتے ہی یہ خیال آتا ہے کہ ۹ اگست ۱۹۴۲ء کو ہندستان نے جہد آزادی کی طرف قدم بڑھایا تھا اور پورا ملک آتشیں نعروں سے گونج اٹھا تھا۔ اسی تحریک کا اثر تھا کہ صرف پانچ برس بعد ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندستان آزاد ہو گیا

۶ اگست میں اس حادثہ کی بھی یاد منائی جاتی ہے جب ہیروشیما اور ناگا ساکی پر ایٹم بم گرایا گیا تھا۔ ہمارا ملک اور ہمارے عوام صرف یہی چاہتے ہیں کہ پوری دنیا اس خطرہ سے آزاد ہو کر اطمینان کی سانس لے سکے اور کبھی بھی ہیروشیما اور ناگاساکی کی تاریخ نہ دہرائی جا سکے۔

۱۵ اگست یوم آزادی، مسرتوں کا دن، خوشیوں کا دن، جشن منانے کا دن، ساتھ ہی ساتھ عہد کرنے کا دن ہے۔ اڑتالیس برس گزرنے کے بعد ہمیں بھی یہ عہد کرنا ہوگا کہ ہم ہندستان کے مستقبل کو ساری دنیا کے لیے قابلِ تقلید بنا کر سنواریں گے اور اس کی کوشش کریں گے کہ چور دروازے سے جو کچھ برائیاں گھس آئی ہیں، ان کا مقابلہ کرتے ہوئے انھیں ختم کیا جا سکے اور ہندستان شاہراہ ترقی پر تیز رفتاری سے گامزن رہے ـــ ایسے موقع پر ہمیں ان شہیدانِ وطن کو یاد کر لینا چاہیے جنھوں نے اپنے خون کی سرخی سے اپنے دور میں مستقبل کے ہندستان کے نقشہ کو روشن اور تابناک بنانے کی کوشش کی تھی۔ اصل میں ماضی کی یاد ہی مستقبل کی طرف بڑھنے کا عزم و حوصلہ عطا کرتی ہے۔

اس لئے اس مبارک موقع پر اپنے تمام ہم وطنوں کی خدمت میں تہنیت پیش کرتے ہوئے یہ کہنے کو دل چاہتا ہے کہ آئیے! آج کے اس پُرمسرت مگر مقدس دن ہم یہ عہد کریں کہ ہم ملک کے استحکام، سالمیت اور وقار و سربلندی کے لیے پورے خلوص و لگن کے ساتھ کام کریں گے۔

اس مہینے کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ عید میلاد النبی کا متبرک دن اسی مہینے میں ہے۔ عید میلاد النبی محسن انسانیت، سرکار دو عالم، رحمت للعالمینؐ کے یوم پیدائش کے موقع پر منایا جاتا ہے۔ اس مبارک موقع پر سب کی خدمت میں خصوصاً مسلمان بھائیوں کی خدمت میں مبارکباد پیش کی جاتی ہے اور یہ بھی کہ ہماری تہذیب کی خصوصیت ہے کہ ہمارے سارے تہوار سب لوگ مل جل کر مناتے ہیں چنانچہ عید میلاد النبی کے موقع پر بھی ہندستانی تہذیب کی وحدت کا بھرپور مظاہرہ ہوتا ہے۔ شاید ہی ایسا دنیا کے کسی ملک میں تہذیبی وحدت اور رنگا رنگی میں ایک رنگی کا مظاہرہ ملتا ہو۔

مہاراشٹر اردو اکیڈمی کی جانب سے (۹۵-۱۹۹۴ء) میں ظ۔ انصاری سے منسوب قومی ایوارڈ ترقی پسند شاعر و ادیب علی سردار جعفری کو، جاں نثار اختر ریاستی ایوارڈ مشہور نقاد باقر مہدی کو اور صحافت کا پہلا ایوارڈ عالم نقوی کو دیا گیا۔ ادارہ اردو ادب کی ان گرانقدر شخصیتوں کو اپنی تہنیت پیش کرتا ہے۔

ـــــــ ایڈیٹر

گلہائے عقیدت

بحضور سید المرسلین رحمۃ للعالمین نازشِ کائنات نبیِ کریم صلعم

دھوپ کی شدت میں کیا احساس پیدا ہوگیا
آپ کے دامن کو سوچا اور سایا ہوگیا

رحمۃ للعٰلمین آپ کے شایاں ہوئی
جس سے تخلیق کا پورا تقاضا ہوگیا

جب حضورؐ آئے تو دنیا میں اجالا ہوگیا
تیرگی سے رسنے والا زخم اچھا ہوگیا

جب خیال آیا مدینے کا طبیعت کھل اٹھی
جو بھی منظر ذہن میں ابھرا سنہرا ہوگیا

پاگئے اک عمر کے تپتے ہوئے صحرا قرار
سبز موسم آتے ہی ماحول ٹھنڈا ہوگیا

اُن کے قدموں کی طرف جھکنا ہی معراجِ حیات
سر ہمارا اور اونچا اور اونچا ہوگیا

بجھتے بجھتے پھر چراغِ آشتی روشن ہوا
واسطوں کا، سلسلوں کا بول بالا ہوگیا

کل کے شب خوں میں درودوں کی سپر کام آگئی
اور اچانک لشکرِ غم آپ پسپا ہوگیا

بھولنے والوں کو پھر انسانیت یاد آگئی
سیرتِ آقاؐ سے ہر غم کا مداوا ہوگیا

دیدۂ تر کی پہنچ جب سے وہاں تک ہوگئی
سارے مظلوموں کے جینے کا سہارا ہوگیا

قطرے دریا بن گئے، دریا سمندر بن گئے
آپؐ کی نسبت سے ہر ذرّہ ستارا ہوگیا

لو لگا کر آپ سے ہم پاگئے دل کی مراد
ہر نفس خوش فکر و ہم رنگِ تمنّا ہوگیا

ایک دستورِ مکمّل یعنی قرآنِ عظیم
تا قیامت بس وہی رہبر ہمارا ہوگیا

میں نہ کہتا تھا کہ ذکرِ مصطفیٰؐ ہونے تو دو
دیکھ لو ماحول کیسا کیف والا ہوگیا

آگہی آئی تو جذبوں میں طہارت آگئی
شاہدِ فطرت سے دل کا ربط گہرا ہوگیا

کچھ ندامت کے یہ آنسو، کچھ عقیدت کے یہ شعر
اب یہ سرمایہ ہماری زندگی کا ہوگیا

کیا رباب اس کو سرابوں کے سفر سے واسطہ
جو بھی توفیقِ خدا سے اُن کے در کا ہوگیا

رباب رشیدی
۶۵ - تارین، شاہجہاں پور

پروفیسر محمد حسن
ڈی ۷ ، ماڈل ٹاؤن ۔ دہلی
۱۱۰۰۰۹

لکھنؤ میں اُردو صحافت

اودھ میں صحافت کا رواج اٹھارھویں صدی سے ہوا۔ شروع شروع کے اخبارات میں خبریں، تبصرے، کارٹون، ادبی مضامین اور مباحثے سبھی شامل ہوتے تھے۔ پرانے اخبار آج پڑھے جائیں تو ایک انوکھی اَن دیکھی دُنیا کی تصویریں نظروں کے سامنے آتی ہیں۔ حد یہ ہے کہ پرانے زمانے اور آج کے زمانے میں پسند اور ناپسند کا معیار بدل گیا ہے۔ کل جو خبریں تھیں آج معمولی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اتنی بات البتہ طے شدہ ہے کہ کل سے لے کر آج تک اردو صحافت مغرب کی پیروی کرتی آئی ہے ـــــ مگر اپنے ڈھنگ سے۔

زمانہ وہ تھا جب اودھ، ہنستے بولتے، گاتے گنگناتے اودھ پر انگریزوں کا قبضہ ہوا تھا۔ ۱۸۵۶ء کے بعد واجد علی شاہی دولہ کی بے فکری اور عیش پسندی ختم ہوئی اور ایک غیر ملکی انجانا اقتدار اچانک پورے علاقے پر قابض ہو گیا اور یہ نیا اقتدار اپنا کلچر اور اپنی تہذیب بھی ساتھ لایا اور اس کلچر اور اس تہذیب کی ایک قدر تھی صحافت!

لکھنؤ نے اس صحافت کو تو اپنایا مگر اس کے مزاحیہ اور طنزیہ رُخ کو اہمیت دی اور اسی کا نتیجہ تھا ــــ 'اودھ پنچ'۔ اور اس کے بعد اودھ اخبار اور ــــ وہ سب کچھ جو ان اخباروں میں چھپا اور ان کے ذریعے سے ادب اور ثقافت میں رائج ہوا۔ برج نرائن چکبست لکھتے ہیں :

"ہندستان کے جس جس گوشے میں اُردو زبان کا نغمہ سُنائی دیتا ہے وہاں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جس کے کان اودھ پنچ مرحوم کے ذکرِ خیر سے آشنا ہوں

اودھ پنچ نے تیس پینتیس سال تک اپنی عالمگیر شہرت و وقار کے پردے میں اخباروں کی دنیا میں سلطنت کی ہے اور اس کی پرانی جلدوں کے گورِ غریباں میں اکثر ایسے اہلِ کمال دفن ہیں جن کے قلم کی دھاک دلوں میں لرزہ پیدا کرنے کے لیئے کافی تھی۔"

اور یقین مانیے ان میں سے کوئی لفظ غلط نہیں ہے چکبست شاعر تھے مگر ان کے بیان کا ہر لفظ مبالغے سے پاک ہے یوں تو اودھ پنچ ۱۸۷۷ء میں نکلا جبکہ ۱۸۳۶ء میں حکومت برطانیہ نے اخبارات نکالنے کی اجازت دے دی تھی۔ بلاشبہ اس چالیس سال کی مدت میں بہت سے اُردو اخبارات شائع بھی ہوئے مثلاً لاہور سے 'اخبار عام' اور 'کوہ نور'۔ دہلی سے اشرف الاخبار اور دلّی سے اُردو اخبار۔ بمبئی سے کشف الاخبار اور مدراس سے جریدۂ روزگار اور خود لکھنؤ سے کارنامہ اور اودھ اخبار شائع ہوتے تھے۔ میرٹھ سے لارنس گزٹ چھپتا تھا مگر چکبست کا یہ قول درست ہے کہ :

" اُردو اخبار نویسی کی تاریخ میں اودھ پنچ اور ہندوستانی پہلے دو اخبار ہیں جنھوں نے اخبار کو محض تجارت کا ذریعہ نہ سمجھا بلکہ مغربی اصولوں پر اخبار نویسی کی شان پیدا کی اور اپنا خاص مسلک قائم رکھا۔"

بے شک اودھ پنچ اودھ کا ہی نہیں اس دور کے ہندستان کا اہم اخبار تھا۔ اس کی خبروں میں بھی لطف تھا اور مضامین میں بھی طنز و مزاح کی چاشنی موجود تھی مگر سب سے زیادہ اہم بات یہ تھی

کہ اس نے لکھنے والوں کی ایک کھیپ تیار کر دی جنھوں نے اُردو ادب کو نیا مزاج بخشا۔ اُن میں مدیر اعلیٰ منشی سجاد حسین کے علاوہ مرزا مچھو بیگ ستم ظریف۔ احمد علی شوق۔ تربھون ناتھ ہجر۔ نواب سید محمد آزاد۔ جوالا پرشاد برق۔ منشی احمد علی کسمنڈوی اور ان سب سے بڑھ کر خود اکبر الہ آبادی تھے جن کی شاعری نے اُردو میں طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کی مستحکم بنیاد قائم کی۔

اسی دور کا دوسرا اخبار تھا "ہندوستانی" جس کا ذکر اسی کے ساتھ کیا جانا چاہیئے۔ یہ سنجیدہ اخبار تھا اور کانگریس کا حامی تھا۔ پھر انہی دونوں اخباروں کے ساتھ اودھ اخبار بھی جاری ہوا جس میں رتن ناتھ سرشار کا چار جلدوں والا ناول فسانۂ آزاد قسط وار چھپا۔ اودھ اخبار اور اودھ پنچ میں چونچیں بھی چلیں اور سرشار کے ناول پر اعتراضات بھی کیے گئے لیکن سچائی یہ ہے کہ دونوں اخباروں نے بیک وقت ادب کی خدمت بھی انجام دی ہے اور اس وقت کی سیاسی ضرورتوں اور صحافتی تقاضوں کو پورا کیا۔

اس کے بعد لکھنؤ سے اخبارات و رسائل نکلنے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ گو اودھ پنچ اور اودھ اخبار کی سی مقبولیت کسی کو حاصل نہ ہوئی اور نہ کسی اخبار نے اس پائے کے لکھنے والے پیدا کیے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ طنز و مزاح کے پیرائے میں اخبار کے سبھی تقاضوں کو پورا کرنے کی روش انہی دونوں کے ذریعہ شروع بھی ہوئی اور انہی پر ختم بھی ہوگئی دوسرے اخبارات نے اس طرز کو اپنانے کی کوشش کی اور اس میں کچھ کامیابی بھی حاصل کی مگر اس بلندی کو نہ چھو سکے۔

لکھنؤ سے حق اور حقیقت نکلے۔ دونوں کا اپنا اپنا حلقہ تھا اور ہندوستانی سیاست کے نہایت پُر آشوب دَور میں بھی دونوں نے اپنی انفرادیت قائم رکھی۔ پھر عبدالماجد دریابادی کا ہفتہ وار اخبار صدق تھا جو مدتوں پابندی سے نکلتا رہا۔ یہ دراصل خبروں سے زیادہ خیالات پر زور دیتا تھا۔ عبدالماجد صاحب اپنے تاثرات بے کم و کاست اس اخبار کے ذریعہ عوام تک پہنچاتے تھے۔

پھر قومی آواز لکھنؤ سے شائع ہونے لگا۔ حیات اللہ انصاری نے ۱۹۴۵ء یا ۱۹۴۶ء کے نہایت ہنگامہ پرور دور میں اسے نکالنا شروع کیا۔ خبروں کے معیار اور ترتیب و تدوین کے اعتبار سے اخبار اپنے پیش رووں سے بالکل مختلف اور منفرد تھا کہ انگریزی اخبارات کے ساتھ ہی قومی آواز بھی خبریں دیتا تھا۔ اس کے علاوہ خبروں کے پس منظر کی وضاحت کے لئے مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔

کان پور سے بھی اخبارات برابر نکلتے رہے۔ سیاست کانپور نے اپنا مقام جلد بنالیا۔ پھر اس کا نام سیاست جدید قرار پایا۔

اردو اخبارات کے سامنے سب سے بڑا سوال خبروں کو وقت سے پیش کرنے کا تھا۔ ٹیلی پرنٹر کا بھرپور استعمال وہ اس لیے نہیں کر سکتے تھے کہ ٹیلی پرنٹر انگریزی میں خبریں دیتا ہے اور انھیں اُردو میں ترجمہ کرنے کا مرحلہ پھر بھی باقی رہتا ہے۔ یہی نہیں ترجمہ ہونے کے بعد ان خبروں کی کتابت، پھر ان کی تصحیح اور پھر ان کی کاپی جوڑنے کے مرحلے اور اس کے بعد چھپائی کی منزل ہے۔ اس لحاظ سے اردو کے اخباروں کے سامنے تازہ کاری، خبر رسانی اور وقت سے شائع ہو کر پڑھنے والوں کے ہاتھوں تک پہنچنے کے مرحلے دوسرے اخباروں کے مقابلے میں زیادہ دشوار ہیں

پھر بھی اخبارات سیکڑوں کی تعداد میں نکلتے ہیں اور مختلف حلقوں میں مقبول بھی رہے ہیں۔ ہفتہ وار اخباروں کی تعداد اس سے بھی کہیں زیادہ رہی ہے اور ان کی تعداد اشاعت اور مقبولیت بھی زیادہ رہی ہے۔ پھر ان میں سے بعض اخبارات کے خصوصی ہفتہ وار ایڈیشن بھی چھپتے تھے جن میں مختلف ادبی مباحث بھی چھیڑے جاتے اور خیال انگیز سیاسی اور ثقافتی مسائل بھی زیر بحث آتے تھے۔ اس سلسلے میں قومی آواز کے اجرا سے پہلے ایک ہفتہ وار اخبار "ہندوستان" کا ذکر ضروری ہے جس کی ادارت حیات اللہ انصاری کے سپرد تھی جس میں ڈاکٹر کنور اشرف اور اس دور کے آزاد خیال مصنفین کے مضامین شائع ہوتے تھے۔

اس کے ساتھ مختلف رسالوں کا ذکر بھی لازم ہے۔ رسالہ معیار بیسویں صدی کے شروع میں جاری ہوا جس میں مرزا محمد ہادی رسوا کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ یہ مضامین ادبی رسالوں کی عام روش کے برخلاف فلسفہ جمالیات اور دیگر علوم کی روشنی میں شعریات کے مسائل

سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی گئی جن میں بعض کو راقم الحروف نے 'مرزا رسوا کے تنقیدی مراسلات کے عنوان سے یکجا کرکے شائع کیا ہے. اسی زمانے میں لکھنؤ سے مرزا محمد ہادی نے مختلف رسائل بھی شائع کیے تھے جن میں سے ایک کا نام "جن" تھا اور جن میں اسی قسم کے نیم روحانی اور نیم فلسفیانہ مضامین چھپتے تھے.

لکھنؤ سے شائع ہونے والے ادبی رسالوں کی فہرست خاصی طویل ہے جن میں سرفہرست نیاز فتحپوری کے رسالے 'نگار' کا نام ہے. نیاز نے جراَتِ فکر اور آزادیِ خیال کی جو شمع روشن کی وہ اس وقت سے آج تک یادگار ہے. یہ محض ایک ادبی رسالہ نہیں تھا بلکہ اس کے رشتے اس وقت کے تعصبات اور تاثرات سے آزاد کرنے کی جدوجہد سے ملے ہوئے تھے اور اردو میں یہ ایک بالکل نئی روایت تھی.

نگار اپنے باب استفسارات 'مکتوباتِ نیاز' اور ملاحظات کی وجہ سے مشہور تھا اس کے ساتھ مذہب اور عقیدے کو عقل و فہم کی میزان پر تولنے اور پرکھنے کی کوشش تھی جو اس زمانے میں خاصی مقبول ہوئی ادب میں بھی نگار نے اپنی نئی روش نکالی اور پرانے اساتذہ کو نئے سرے سے پرکھنے کے لئے خاص نمبر شائع کیے. ان میں مصحفی، نظیر اکبرآبادی نمبر نکالے. معاصر شاعروں کے اپنے منتخب کردہ کلام اور ان کے خود نوشت حالات زندگی بھی شائع ہوئے اور معاصر شاعروں کے منتخب کردہ غزلیات پر پانچ نقادوں کے تفصیلی تبصرے بھی ایک خاص نمبر کی شکل میں شائع کیا.

نگار نے آزاد خیالی اور وسعتِ نظر کی ایسی روایت قائم کی، جس نے پورے دور کو متاثر کیا. اسی کے کچھ عرصے بعد 'نیا ادب' شائع ہونے لگا جس کی ادارت کی ذمہ داری اسرار الحق مجاز، سید سبط حسن اور علی سردار جعفری کے سپرد تھی. اس رسالے نے ترقی پسند تحریک کے نمائندے کی حیثیت سے ادب میں نئے تصورات کو متعارف کرایا اور ایک نئی ادبی سرگرمی کا حرفِ آغاز لکھا. گو رسالہ کا آغاز محدود مالی سرمائے سے شروع ہوا تھا مگر اس کے پیچھے نظریاتی توانائی تھی اس رسالے کے خاتمے سے کچھ پہلے جوش ملیح آبادی کا رسالہ کلیم بھی شائع ہونے لگا تھا جو بعد میں نیا ادب ہی میں شامل کر لیا گیا.

دونوں کے خاتمے کے بعد رضا انصاری نے 'منزل' شائع کیا جس نے اس روایت کو کچھ دن اور زندہ رکھا.

یوں تو لکھنؤ سے شائع ہونے والے رسالوں کی فہرست خاصی طویل ہے لیکن ان میں اہمیت حاصل ہے نسیم کے رسالے "نئی نسلیں". شوکت صدیقی اور علی ظہیر رضوی کے رسالے "مندر" کو، جس کی ادارت میں غالبؔ، انیس، شیشر پردیپ بھی شامل تھے. پھر سرویشور دیال سکسینہ اور راقم الحروف نے ۱۹۴۴ء میں "مضراب" شائع کیا جس میں سلام مچھلی شہری بھی شریک تھے. اس کے بعد کے دور میں کمال احمد صدیقی کا رسالہ "ہمارا ادب" میرا جی کے لکھنؤ آنے کے بعد شائع ہوا.

لکھنؤ سے نکلنے والے رسالوں کی فہرست خاصی طویل ہے لیکن اس فہرست میں عابد سہیل کے رسالے "کتاب" کو خصوصی اہمیت حاصل ہے. زمانہ جدیدیت کا تھا اور اس ریلے میں اچھے اچھے رسالوں کے پاؤں اکھڑ گئے تھے. عابد سہیل نے بڑی متانت اور سنجیدگی سے اس طوفان کا مقابلہ کیا اور اسے ایک مثبت سمت دینے کی کوشش کی. لیجیے. اہم ترین رسالے کا نام تو رہ ہی گیا، یہ تھا عبدالحلیم شرر کا رسالہ "دل گداز" جس نے اردو کے ادبی افق کو وسعت دی. ناول قسط وار پڑھنے کا ذوق و شوق نکھارا اور پروان چڑھایا اور علمی اور تاریخی مضامین کا ذوق پیدا کیا. سب جانتے ہیں کہ تاریخ کا ذوق شرر کے ناولوں سے جتنا پنپا اور بڑھا اتنا شاید ہی کسی اور ذریعے سے ہوا ہو. علمی اور ادبی مضامین کو نیا پیرا ملا اور شاعری نے نئی آواز پائی. شرر کا دل گداز" اس اعتبار سے منفرد حیثیت کا رسالہ تھا کہ اس نے اپنے دور کے ذوق کو بدل ڈالا اور شاعروں کے "گلدستوں" کے دور میں سنجیدہ علمی مضامین کو مقبولیت بخشی.

ناول کا ذکر آیا ہے تو اسی زمانے کے رسالے "ناول" کا تذکرہ بھی ضروری ہے جسے مہادیو پرشاد شائع کرتے تھے اور جس میں کوئی نہ کوئی ناول شائع ہوا کرتا تھا. اس کے تھوڑے ہی دن بعد ظفر الملک کا "الناظر" چھپنے لگا تھا اور اس نے سنجیدہ ادب اور علمی مباحث کو عام کرنے میں مفید خدمات انجام دیں. کچھ عرصے بعد نسیم انہونوی کے ادارے سے رسالہ "حریم" شائع ہوا جو عورتوں کے مسائل کے لئے وقف تھا اور

اس اعتبار سے منفرد حیثیت رکھتا تھا۔

یہ صرف چند رسالوں اور اخباروں کا تذکرہ تھا جس کا اختتام اترپردیش سرکار کے اردو رسالے نیا دور اور اترپردیش اردو اکادمی کے رسالے "اکادمی" کے تذکرے پر ہونا چاہیئے۔ یہ دونوں رسالے گو کہ سرکاری اور نیم سرکاری اداروں سے وابستہ ہیں لیکن علم و ادب کی خاطر خواہ خدمات انجام دے رہے ہیں۔

یہ جائزہ گو مختصر بلکہ بہت مختصر ہے مگر اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اردو اخبارات و رسائل لکھنؤ سے برابر نکلتے رہے ہیں اور ان میں بعض مضامین کی رنگا رنگی اور نقطۂ نظر کی اہمیت کی وجہ سے یادگار کی حیثیت رکھتے ہیں جن میں دل گداز۔ الناظر۔ نیا ادب۔ منزل اضطراب اور کتاب جیسے رسالے اور اودھ پنچ۔ اودھ اخبار حق۔ حقیقت۔ قومی آواز۔ سرفراز جیسے روزنامے شامل ہیں ان کے علاوہ بھی ان گنت اخبارات و رسائل اس فہرست میں شامل ہونے سے رہ گئے ہیں

(۱)

کہ جو کچھ لکھا گیا ہے محض یادداشت کے سہارے پر۔ اور یہ سہارا خاصا ناقابل اعتبار ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ لکھنؤ سے شائع ہونے والے اخبارات و رسائل کی ایک جامع وضاحتی فہرست تیار کی جائے۔

(۲)

ان اخبارات و رسائل کا شمار اپنی جگہ پر — ان کی ادبی اور صحافتی حیثیت کیا رہی ہے؟ رسالوں کے سلسلے میں تو یہ بات بڑی حد تک واضح ہے کہ دل گداز اور نیا ادب کی خدمات کا اعتراف عام ہے۔ پھر ان دونوں سے بڑھ کر نگار کی خدمات ہیں۔ ان تینوں رسالوں نے اردو ادب کی دنیا ہی بدل ڈالی۔ اخبارات کے سلسلے میں البتہ مسئلہ زیادہ اہم ہے۔ اودھ پنچ اور اودھ اخبار کا معاملہ تو کسی قدر مختلف تھا کہ انھوں نے طنز و مزاح کو اپنایا اور اسی وسیلے سے سماجی شعور اور مجلسی اشعار عام کیا لیکن بعد کے اخبارات میں قومی آواز کی منفرد حیثیت تھی۔

دراصل اردو صحافت پر الہلال اور البلاغ کا اثر اس حد تک غالب رہا ہے کہ صحافت بھی اظہار ذات کا وسیلہ ہی بنی رہی۔ الہلال کے اداریوں کے پرجوش انداز تحریر پر اس کے مدیر اعلا کی شخصیت کا سایہ رہا ہے اور یہ سایہ محض اداریوں تک محدود نہیں رہا بلکہ اس کا سلسلہ خبروں کی ترتیب بلکہ ان کے انتخاب تک پہونچتا ہے۔ یہ روایت اردو میں کوئی نئی نہیں ہے کہ سرسید احمد خاں کے زمانے میں بھی جو اخبارات نکلے یا ان سے کسی قدر پہلے بھی شائع ہوئے ان میں خبریں تک مدیر کی ذاتی پسند اور ناپسند میں رنگی ہوئی ہوتی تھیں۔ دلی اردو اخبار کے فائل آج بھی گواہی کے لئے موجود ہیں۔ سرسید احمد خاں کے تہذیب الاخلاق کا اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا بھی یہی حال ہے دونوں میں معروضیت کی آواز ہلکی اور شخصی اور ذاتی لہجہ غالب ہے مگر اس میں گھن گرج کے بجائے گفتگو اور استدلالی گفتگو کا رنگ نمایاں ہے۔

مگر ابوالکلام آزاد کے الہلال نے صحافت میں انانیت کا زور شور اس انداز سے داخل کیا کہ وہ مدتوں اردو صحافت اور خاص طور پر اداریوں پر چھایا رہا۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اخبارات زیادہ تر مدیر کی شخصیت کی تصویر ہوتے تھے اور یہ شخصیت پورے زور و شور کے ساتھ اداریوں میں اظہار پاتی تھی۔ ابوالکلام آزاد سے ظفر علی خاں تک یہی تصویر نظر آتی ہے۔ یوں تو اس میں بھی انداز بیان کے نت نئے پہلو نکلتے ہیں اور جوش اور ولولے کے لیے خاصی گنجائشیں ہیں مگر اس سے صحافت کی معروضیت مجروح ہوتی ہے اور اخبار نویسی انانیتی ادب کی ایک شق بن کر رہ جاتی ہے اور صحافت کا معیار برقرار نہیں رہتا۔

اور معروضیت مجروح ہو جائے تو خبروں پر سے بھی اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ اردو اخبارات کے پاس خبریں فراہم کرنے کے وسیلے بھی بہت کم تھے — اور ہیں' اور جو ہیں ان کی بھی معروضیت کا عنصر نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہر نامہ نگار خبر بھیجتے وقت اپنی ذاتی پسند اور ناپسند کو واقعات پر ترجیح دیتا ہے اور اسی بنا پر خبر محض ایک ذاتی تاثر بن کر رہ جاتی ہے۔ پھر مسئلہ خبر کے جلد از جلد اور وقت سے پہونچ جانے کا بھی ہے۔

ان سب کے علاوہ ایک اور معاملہ خبروں کی مناسب ترتیب کا ہے اُردو کے اکثر اخبارات من مانی سرخیاں قائم کرتے ہیں اور ان کو اپنی اپنی پسند اور ناپسند کے مطابق جلی اور خفی لکھواتے ہیں اور ان کی اہمیت یا یوں کہیے کہ معروضی اہمیت کو اکثر پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ اس میں بھی سنسنی خیزی کی طرف ہمارے اخبارات کی جانبداری کو بڑا دخل ہے لیکن اس سنسنی خیزی سے ممکن ہے اخبار کی بکری پر اثر پڑتا ہو مگر اخبار کا معیار ضرور بری طرح متاثر ہوتا ہے اور اس کی ساکھ عام پڑھنے والوں کی نظر میں گرتی ہے۔

(۳)

ان اخبارات و رسائل نے ہندستان بھر کی صحافت کے لئے جو معیار و اقدار قائم کی ہیں وہ بھی ظاہر ہیں لیکن یہ بھی قابل غور ہے کہ لکھنؤ سے نکلنے والے اخبارات میں (رسائل کا ذکر سردست حذف کر کے دیکھا جائے تو بھی) کس حد تک اس مزاج کی آئینہ داری ہوتی رہی ہے۔ سامنے کی بات ہے کہ ان اخبارات میں سنسنی خیزی کی بیماری نہ ہونے کے برابر ہے اور یہ کوئی آج سے نہیں، اس وقت بھی جب ۱۹۴۲ء کی "کرو یا مرو" کی تحریک چل رہی تھی یا مسلم لیگ اور کانگرس کے جھگڑے اور تقسیم ہندستان کی تحریکیں پورے زور شور سے چل رہی تھیں اُردو اخبارات ملک بھر میں طرح طرح کے شور شرابوں میں مبتلا تھے مگر اس کے باوجود لکھنؤ کے اردو اخبارات میں وہ دھوم دھاکا نہیں تھا۔

اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ ۱۹۴۶ء کے ہی آس پاس قومی آواز جاری ہوا جو کانگرس کا ترجمان تھا اور اس کے اداریوں سے خواہ کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو مگر اس کی مقبولیت اس اختلاف سے کچھ کم نہیں ہوئی۔ یہی حال دوسرے اخبارات کا بھی تھا۔ "حق" اور "حقیقت" بھی سیاست کی عام روش سے ہٹ کر اپنی ایک الگ راہ نکالتے تھے مگر اس کے باوجود ان کی مقبولیت کچھ کم نہ تھی۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ لکھنؤ کی اُردو صحافت تجارت کے تابع نہیں رہی اور جن لوگوں نے اس کوچے میں قدم رکھا انھوں نے بھی اسے نفع خوری کا ذریعہ نہیں بنایا اور اس کے ذریعے دوسروں کو بدنام کر کے یا کیچڑ اچھال کر پیسے جمع نہیں کیے۔ لکھنؤ کے چھوٹے سے چھوٹے اردو اخبار کے بارے میں بھی یہ الزام عاید کرنا بہت دشوار ہوگا۔ بے شک ان کی آب و تاب انگریزی اخبارات کے مقابلے میں بہت پھیکی تھی، ان کی طباعت بھی (چند کو چھوڑ کر) اعلیٰ معیار کی نہ تھی خبریں بھی وہ دوسرے اخبارات کے مقابلے میں دیر سے دیتے تھے مگر پھر بھی وہ سستے سمجھوتوں اور گھٹیا کردار کشی کے دھندوں میں نہیں پھنستے تھے اور اس لحاظ سے ان کا دامن داغدار نہیں ہے۔

اُردو والوں کے لیے بڑی بات یہ ہے کہ ان اخبارات کے ذریعہ اُردو زبان مختلف مضامین کو ادا کرنے کے قابل بنی، اسے روزمرہ کی زندگی کا کس بل ملا اور جو اردو نثر صرف قصّہ کہانی کے لئے وقف تھی اب معروضی ڈھنگ سے مختلف موضوعات پر اظہار خیال کے لائق ہوئی۔ اس میں صرف جوش اور جذبے کا اظہار ہی نہیں ہوا بلکہ افکار تازہ کی چھوٹ اور حالیہ واقعات کی معروضیت نے بھی جگہ پائی۔

بے شک ابھی اُردو صحافت کے لیے کئی منزلیں سر کرنا باقی ہیں لیکن اس کی رسائی، بلاغت اور انداز بتاتا ہے کہ وہ معروضیت کے ان مرحلوں سے بھی کامیابی کے ساتھ گزرے گی اور درپیش مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ہوگی۔

□□

آزادیٔ ہند کی سالگرہ

ہر دل میں مسرت کی لہر تیز ہے آج
ہر لمحۂ زیست کیا طرب خیز ہے آج
ہے سال گرہ ہند کی آزادی کی
سورج کی کرن کیسی ضیا ریز ہے آج

رخشندہ ہے اک شان سے خورشید کچھ اور
تابندہ ہے آج شمع اُمید کچھ اور
ہوتی ہے بلاشبہ خوشی عید کے دن
لیکن ہے سرور بخش یہ عید کچھ اور

ہر سمت ہے آج اک بہارِ رنگیں
لالہ ہے شگفتہ، متبسم نسریں
درشن کے لئے آئی ہیں ہندوستاں کے
جنت سے پرا باندھ کے حُورانِ حسیں

جذباتِ خوشی کا ساز گونجا ہر سُو
اک نغمۂ دل نواز گونجا ہر سُو
"جے ہند" کا پُرجلال نعرہ گونجا
یہ حرف طرب طراز گونجا ہر سُو

ہر دل میں ہے روشن ایک شمعِ اُمید
معمور مسرت سے ہے ہر گفت وشنید
ہر لب پہ مُبارک و سلامت ہے آج
آج آئی ہے آزادیٔ بھارت کی عید

—————— ناوک حمزہ پوری
پوسٹ: شیرگھاٹی ضلع گیا۔ ۸۲۴۲۱۱

عشرت علی صدیقی
۱۸۳۔ زنبور خانہ۔ کینٹ روڈ
لکھنؤ

اُردو رسالوں کا ماضی اور حال

رسالوں میں اور شاید سبھی ہندستانی زبانوں میں سب سے معمر رسالہ 'شاعر' ہے جو ۵۶ برس سے جاری ہے اور صبر و استقامت کے ساتھ زمانے کی سرد گرمی اور اُردو زبان کی سرد مہری برداشت کر رہا ہے۔ اسے سیماب اکبر آبادی نے آگرہ سے جاری کیا تھا مگر بعد میں یہ بمبئی منتقل ہو گیا۔ ویسے پہلا ماہنامہ 'خیر خواہِ ہند' ۱۸۳۶ء میں نکلا تھا۔ یعنی پہلے ہفت روزہ 'جام جہاں نما' کے ۱۴ برس بعد یہ عیسائیوں کا تبلیغی رسالہ تھا اور مرزا پور سے جاری ہوا تھا۔ اردو رسالوں کی تاریخ میں ایک اور سال بہت اہم ہے۔ ۱۹۰۳ء ایک طرح سے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سال بریلی سے منشی راج بہادر نے ماہنامہ 'زمانہ' نکالا، جسے اس کے ایڈیٹر منشی دیانرائن نگم بعد کو کان پور لے آئے۔ اسی سال حسرت موہانی نے علی گڑھ سے اُردوئے معلّی جاری کیا اور ابو الکلام آزاد نے جن کی عمر اس وقت ۱۵ سال تھی، کلکتہ سے لسان الصدق شروع کیا۔ اپنے ایڈیٹروں کی طرح یہ تینوں رسالے اب فوت ہو چکے ہیں لیکن اردو ادب، صحافت اور سماج پر ان کی چھاپ اور تاریخ میں ان کا اور ان کے ایڈیٹروں کا نام آج بھی تابندہ ہے۔ ان کا زمانہ اُردو کے باغ میں بہار کا زمانہ تھا۔ ان دنوں لاہور کے مخزن، شباب۔ اور ہمایوں، لکھنؤ کے دل گداز، خدنگ نظر الناظر، تہذیب اور معیار اور میرٹھ کے عصر جدید نے علمی اور ادبی حلقوں میں دھوم مچا رکھی تھی اور ان کا اپنا اپنا رنگ اور اپنا اپنا حلقہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں ناکامی کے بعد بدیسی حکومت کے مظالم نے محرومی اور مایوسی کا جو ماحول پیدا کر دیا تھا اس میں شعر و ادب کے فروغ نے نہ صرف تفریح اور تفنن کا بلکہ فکر اور تجزیے کا بھی سامان فراہم کیا۔ اخباروں پر جن میں روزنامے اور ہفت روزہ دونوں شامل تھے، حکومت کی کڑی نگرانی رہتی تھی اور معمولی نکتہ چینی بھی اربابِ اقتدار کے لئے ناقابلِ برداشت بن جاتی تھی لیکن ادبی پرچوں میں مزاحیہ تحریروں اور علامتی شاعری کے ذریعہ عوام کو حکومت کی ناانصافیوں اور اس کی پیدا کی ہوئی محرومیوں پر توجہ دلائی جاتی تھی۔ دوسرے ملکوں کے حالات، واقعات اور تاریخ ساز شخصیتوں کے سوانح ایسے انداز میں بیان کیے جاتے تھے کہ ہندستان کے لوگوں میں ہمت اور حوصلہ پیدا ہو۔ اتحاد و ایثار کا جذبہ ترقی کرے اور انتشار پسند فکر و عمل کی، جسے بدیسی حکومت بڑھاوا دے رہی تھی، روک تھام ہو سکے۔

مقصدیت کو اوّلیت

محرومی اور مایوسی سے متاثر ہو کر کچھ لکھنے والوں نے خوشامدی انداز اختیار کر لیا تھا اور کچھ کڑوی حقیقتوں کی طرف سے چشم پوشی کر رہے تھے، کچھ کی تحریروں میں اشاریت پسندی حقیقت پسندی پر حاوی ہو جاتی تھی اور عوام کے لیے معاملے کی تہ تک پہونچنا یا لکھنے والے کے مقصد اور پیغام کو سمجھنا دشوار ہو جاتا تھا۔ دیانرائن نگم کے 'زمانہ'، حسرت موہانی کے 'اُردوئے معلّی' اور ابو الکلام آزاد کے 'لسان الصدق' نے مقصدیت کو اوّلیت دی اور علم و ادب کو قومی تعمیر و ترقی اور سماج کی اصلاح کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی۔ ماہنامہ 'زمانہ' کے مالک و مدیر عملی سیاست سے الگ تھے۔ تاہم اس رسالے کا موقف یہ تھا کہ علمی ضرورتوں کے ساتھ عملی باتوں کا بھی لحاظ رکھا جائے اور "حالات زمانہ پر پورے غور و فکر کے بعد نیک، محتاط اور دور اندیشانہ مشورہ دینے کے علاوہ ایک رسالے کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ باہمی میل جول اور قومی اخوت و اتحاد کے اصولوں

کو محبت اور صداقت کے ساتھ فروغ دے۔ روزمرہ خانہ جنگیوں کے شور و غل میں حل طلب معاملات اور مسائل پر کسی ایک فریق یا جماعت کا طرف دار بن کر نہیں بلکہ تمام ملک اور سب قوموں کا مربی اور منصف ہو کر ملک کو اتفاق و اتحاد کے اصولوں پر عمل پیرا ہونے کی ہدایت کرے اور اپنے پاک فرائض ادا کرنے میں ضمیر اور اپنے خدا کی خوشنودی کے سوا اور کسی گروہ یا فرقے کی ناراضگی کا خوف نہ کرے۔"

منشی دیا نرائن نگم نے اپنے موقف کی یہ وضاحت جولائی ۱۹۰۴ء کے اداریے میں کی تھی۔ کچھ لائق و فائق ہم عصروں اور رفقا نے قومی تحریک، ہندو مسلم اتحاد اور قومی یک جہتی جیسے موضوعات سے اجتناب کا مشورہ دیا اور کہا کہ علمی اور ادبی پرچے میں ان معاملات سے بحث بے تکی معلوم ہوگی۔ لیکن دیا نرائن نگم کا عقیدہ تھا کہ ادب کو زندگی سے الگ نہیں رکھا جا سکتا۔ اس طرح ان کے رسالے سے اردو رسائل کی تاریخ میں ایک نئے رنگ کی ابتدا ہوئی۔ انھوں نے سیاست میں براہِ راست حصہ نہیں لیا مگر ان کے رسالے کے ۴۶ شماروں میں جن کا موضوعاتی انتخاب خدا بخش لائبریری پٹنہ نے کئی کتابوں کی شکل میں شائع کر دیا ہے۔ بیسویں صدی کے اوّل نصف کی قومی زندگی کے تمام شعبوں کا احوال موجود ہے اور بعد کے بہت سے رسالوں نے 'زمانہ' کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی۔ ایک طرح سے اس رسالے کو ترقی پسند ادب کی تحریک کا ہراول کہا جا سکتا ہے لیکن اس نے خود کو پروپیگنڈہ بازی اور موقع پرستی سے پاک رکھا۔

خوب تر کی تلاش

مولانا ابوالکلام آزاد جیسے دیو قامت صحافی اور ادیب نے رسالہ 'زمانہ' کو اس زمانے کے رسالوں میں منفرد قرار دیا ہے۔ انھوں نے اپنے ماہنامہ "لسان الصدق اپریل ۱۹۰۵ء والی اشاعت میں اردو رسالوں کی زبوں حالی کم معیاری اور پسماندگی سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے اس وقت جتنے رسالے اردو میں شائع ہو رہے ہیں وہ یورپ اور امریکہ کے رسالوں کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ اور دو رسالوں یعنی زمانہ کانپور اور عصرِ جدید میرٹھ کے سوا اور کسی رسالے پر کارآمد ہونے کا اطلاق جائز نہیں ہو سکتا۔ مولانا آزاد یورپ اور امریکہ کے رسالوں کے حسنِ صورت اور حسنِ سیرت کے مداح تھے اور اپنا رسالہ لسان الصدق انھوں نے اسی نہج پر چلانے کی کوشش کی۔ اس کے مقاصد یہ بتائے گئے:

(۱) سوشل ریفارم یعنی مسلمانوں کی معاشرت اور رسومات کی اصلاح کرنا (۲) ترقی اردو یعنی اردو زبان کی علمی ادبی ترقی کی کوشش کرنا (۳) تنقید یعنی ملک کی مشہور تصنیفوں پر منصفانہ ریویو کرنا اور (۴) علمی مذاق کی اشاعت بالخصوص بنگال میں۔

پڑھنے والوں کو مخاطب کرتے ہوئے مولانا نے لکھا: "اس کا (لسان الصدق کا) فرض ہے کہ قوم کو کذب سے بچائے اور راستی پر لائے اس کی امید نہیں رکھنی چاہیے کہ یہ ...... ایسے ترانے سنائے گا جو نہایت شیریں معلوم ہوں گے .... سچی بات ہمیشہ کڑوی ہوتی ہے ..... یہ ہمیشہ تم کو کڑوی کسیلی باتیں سنائے گا۔ ... جو تمھیں ناگوار معلوم ہوں گی۔"

لسان الصدق نے علمی و ادبی جواہر پاروں، اعلا درجے کی نظموں، سائنس اور سوانح، مذہب اور سیاحت سے متعلق بلند پایہ مضامین شائع کیے۔ پھر بھی اس کے ایڈیٹر نے خوب کو خوب تر بنانے کی کوشش جاری رکھی۔ دوسری جلد کے اختتام اور تیسری جلد کے آغاز پر انھوں نے لسان الصدق کی خدمات اور ہندستان کے نامی پرچوں میں اس کے مضامین نقل کیے جانے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ اپنے پرچے کی گزشتہ حالت پر فخر تو کیا مسرت کا اظہار بھی نہیں کر سکتے۔ نئے سال کے لیے انھوں نے جس جامع پروگرام کا ذکر کیا اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انھیں زیادہ وقت نہیں ملا۔ انھیں بمبئی جانا پڑا۔ دو ایک پرچے وہاں اور کچھ آگرہ میں چھپے اور جب مولانا عراق کے دورے پر گئے تو مئی ۱۹۰۵ء میں لسان الصدق بند ہو گیا۔

رسالے کا جو مقصد اور معیار مولانا آزاد نے مقرر کیا تھا اور جو مختلف موضوع اور عنوان انھوں نے طے کیے تھے، اس کی

پوری پابندی کوئی دوسرا رسالہ آج تک نہیں کر سکا ہے۔ البتہ مولانا ہی کا ہفتہ وار الہلال اسی ڈگر پر چلا۔ اسے کہا تو اخبار جاتا ہے مگر اس میں رسالے کی تمام تر خصوصیات بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اُردو صحافت کے بالکل ابتدائی دور کے بعد ہی سے ہفتہ وار پرچے اور ان کے کسی مقررہ دن یا خاص خاص موقعوں پر نکلنے والے ضمیمے میں رسالوں کے لائق مواد بھی شائع کرتے رہتے ہیں۔

الہلال میں اخبار اور رسالے دونوں کی خوبیاں موجود تھیں۔ اور لسان الصدق کی طرح وہ بھی ابھی تک اپنی آپ مثال بنا ہوا ہے۔

اُردوئے معلّیٰ کا انوکھا پن

مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی کی شخصیت کی طرح ان کے رسالے، اُردوئے معلّیٰ میں بھی ایک انوکھا پن تھا۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔ اے پاس کرنے کے بعد ایل ایل بی میں داخلہ لینے کی سوچ رہے تھے۔ بی۔ اے کا نتیجہ نکلنے سے پہلے ہی انھوں نے رسالے کے ڈکلریشن کی درخواست دے دی۔ بہ ظاہر وہ چاہتے تھے کہ رسالے سے ان کے ادبی ذوق کی تسلّی کے علاوہ کچھ آمدنی بھی ہونے لگے تاکہ تعلیم کا خرچ نکل آئے لیکن پہلا مقصد دوسرے مقصد پر حاوی ہوگیا اور یہ کوئی اتفاقی بات نہیں تھی۔

پہلے شمارے میں اغراض و مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے حسرت نے لکھا کہ اس رسالے کا مقصد صرف ایک ہے یعنی دوستی مذاق چنانچہ اس لحاظ سے امور مندرجہ ذیل کی پابندی کی جائے گی:۔

(الف) مضامین نظم و نثر ہر قسم کے ہوں گے یعنی سوانحی، تاریخی، علمی، فلسفی، اخلاقی، تمدنی، ادبی، تنقیدی اور متعلق بہ افسانہائے مختصر و مکمل“۔

(ب) مضامین نہ حد سے زیادہ خشک ہوں گے نہ حد سے زیادہ ہلکے اور ان کی ترتیب ایسی ہوگی جو ہر قسم کے مذاق کے لوگوں کو گوارا ہو۔

(ج) حصۂ نظم میں صرف اس قسم کی نظمیں شائع کی جائیں گی جن کے انداز بیان میں کوئی خصوصیت ہو۔ ان نظموں کے متعلق طرز قدیم و طرز جدید کی قید نہ ہوگی۔

(د) نظم و نثر میں حتی الامکان صحتِ زبان کا سختی سے لحاظ رکھا جائے گا۔

(ہ) مضامین منتخب شائع ہوں گے اور جو انتخاب میں نہ آئیں گے وہ بجنسہ واپس کر دیے جائیں گے۔

مدیر زمانہ، دیا نرائن نگم کے برخلاف مدیر لسان الصدق“ ابوالکلام آزاد اور مدیر اُردوئے معلّیٰ حسرت موہانی سیاست میں بھی عملی حصّہ لیتے تھے اور انھیں نیز ان کے پرچوں کو اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑا، جبکہ دیا نرائن نگم قید و بند کی مصیبتوں سے مامون رہے۔ اگرچہ لسان الصدق نے خود کو سیاست سے الگ رکھا اور مولانا آزاد نے سیاست سے ادب و صحافت کا رشتہ الہلال کے زمانے میں جوڑا تاہم انھوں نے لسان الصدق میں کانگریس کے بیسویں اجلاس کی اطلاع ایک تائیدی نوٹ کے ساتھ شائع کی۔ الہلال اور اس کے ایڈیٹر نے حکومت کے ہاتھوں بڑی بڑی مصیبتیں جھیلیں لیکن لسان الصدق خود سے بند ہوگیا۔ البتہ اُردوئے معلّیٰ نے کانگریس کے سالانہ جلسوں کی کارروائی خاصی تفصیل سے شائع کی اور وہ پہلی بار ۱۹۱۳ء میں اسلئے بند ہوا کہ حکومت کی طلبی پر تین ہزار روپیے کی ضمانت داخل نہیں کر سکا جُرم و سزا کا یہ قصہ بھی کچھ عجیب ہی تھا۔ علی گڑھ کالج کے قائم مقام پرنسپل ڈاکٹر ضیاء الدین نے جو برطانوی حکومت کے حامی تھے، ایک طالب علم سید ہاشمی فرید آبادی کو، جو بعد میں جنگِ آزادی کے سپاہی بنے، غیر موزوں سرگرمیوں کے الزام میں کسی نوٹس کے بغیر آدھی رات کو جب پانی برس رہا تھا، بورڈنگ سے نکال دیا تھا اور ان کے جس ساتھی نے انھیں پناہ دی تھی، وہ بھی ایسے ہی عتاب کا نشانہ بنا۔ یہ کارروائی ذاتی پرخاش کی بنا پر کی گئی تھی۔ ہاشمی کا حسرت کے وہاں جانا بھی کالج کے ذمہ داروں کو ناپسند تھا اور جب حسرت کو معاملے کی تفصیل کا علم ہوا تو انھوں نے بہت ہی سخت الفاظ میں اس پر نکتہ چینی کی۔ اس کی پاداش میں ان سے ضمانت طلب کی گئی جسے جمع کرنا ان کی استطاعت سے باہر تھا۔ اس زمانے میں الہلال طلوع ہو چکا تھا اور مولانا آزاد نے حکومت کے قانون

اور کانوڈوں کی اس کارروائی پر تین قسطوں میں ایک مضمون لکھا۔

پریس کی آزادی کی حمایت اور اس آزادی پر بندش لگانے والے آفیشل سیکرٹ (سرکاری راز) بل کی مخالفت نیز اُردو پریس کی مناسب اور فعال تنظیم سے مولانا آزاد انیسویں صدی کے آخری برسوں ہی سے دل چسپی لے رہے تھے۔ اس تنظیم کی تحریک پیسہ اخبار کے ایڈیٹر منشی محبوب عالم نے ۱۸۹۵ء میں کی تھی۔ مولانا نے اپنے ماہنامہ لسان الصدق کی اپریل مئی ۱۹۰۵ء کی اشاعت میں محمڈن پریس ایسوسی ایشن کے سلسلے میں ظاہر ہونے والی شورا شوری اور ثابت ہونے والی بے نمکی کا ذکر کیا ہے۔

حسرت کی بیباکی

حسرت موہانی کا پرچہ اُردوئے معلّٰی اپنی ادبی حیثیت کے باوجود عوام کے مزاج اور سوچ میں سُدھار کا کام کرتا رہا۔ سرسید احمد خاں کے کام اور رجحان کی آڑ لے کر مسلمانوں کو قومی تحریک سے الگ رکھنے کی جو کوشش کچھ لوگ کر رہے تھے، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حسرت موہانی نے اپنے پرچے کی پہلی ہی اشاعت میں لکھا کہ:۔

"سرسید مسلم قوم کے رہنما تھے، انھوں نے اس وقت جو کچھ کیا بہتر کیا لیکن ہم سوال کرتے ہیں کہ کیا زمانے کی اب بھی وہی حالت ہے جو سرسید کے وقت میں تھی۔"

حسرت چوں کہ دل کے صاف تھے اس لیے زبان اور قلم کے بیباک تھے۔ ان کے رسالے نے آزادی کی تحریک سے براہ راست حمایت کرنے کے علاوہ دانش ور طبقے کو اس طرف راغب کرنے کے لیے عظیم سیاسی مفکروں کے فکر و عمل کی تشہیر بھی کی۔ ادب کے معاملے میں بھی وہ نڈر رہے۔ چنانچہ حالی کی مسلّم لیاقت اور عوام میں ان کی مقبولیت کے باوجود حسرت نے زبان کے سلسلے میں ان کی بعض لغزشوں کی نشان دہی کی اور یہ کہہ کر کہ "ہندستان کا بڑا حصہ بدقسمتی سے ان کے کمالِ شاعری کا قائل ہے اور ان کی پیروی کو قابلِ فخر سمجھتا ہے"

اُردوئے معلّٰی کو بجا طور پر اردو مجلّات کی سیاسی صحافت کا پیشوا کہا گیا ہے۔ ادبی صحافت میں بھی اس نے حال کو سنوارنے، مستقبل کو ٹھیک رکھنے اور ماضی کے کاموں کو سامنے لانے کا بے مثال کام کیا۔ "انتخاب سخن" کے عنوان سے دو سو شاعروں کا انتخاب اُردوئے معلّٰی میں شائع کیا گیا۔ اس انتخاب میں دیوانوں کے علاوہ مخطوطوں اور بیاضوں سے بھی مدد لی گئی۔ نکاتِ سخن کی قسط وار اشاعت کے علاوہ 'متروکاتِ سخن'، 'معائبِ سخن' اور 'نوادرِ سخن' کے سلسلے بھی مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ کتابی شکل میں بھی شائع کیے گئے ہیں اور ان کتابوں کے کئی کئی ایڈیشنوں کی اشاعت سے حسرت کے کام کی افادیت اور ان کے رسالے کی اہمیت پر ایسی روشنی پڑتی ہے جو کبھی ماند نہیں ہوگی۔ اس روشنی میں پرانے شعراء کے نام بھی چمکتے رہیں گے۔

اردوئے معلّٰی کے جون ۱۹۱۳ء میں بند ہو جانے کے بعد بھی حسرت اپنے لگائے ہوئے پودے کی آبیاری کرتے رہے۔ جولائی ۱۹۱۴ء میں انھوں نے "تذکرۃ الشعراء" کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ کتابی صورت میں جاری کیا کیوں کہ اس کا ڈکلریشن نہیں مل سکا تھا یہ رسالہ ۱۹۱۶ء میں حسرت کی گرفتاری کے بعد بند ہو گیا۔ قید سے رہائی کے بعد ۱۹۱۹ء میں انھوں نے اس کی اشاعت پھر شروع کی مگر اس سال کے وسط میں وہ کان پور منتقل ہو گئے، جہاں سے انھوں نے 'مستقل' نام کا روزنامہ نکالا۔ یہ روزنامہ ۹ مہینے کے بعد ہفتہ وار بن گیا۔ پھر ہفتے میں دو بار اور تین بار نکلنے لگا۔ لیکن جنوری ۱۹۳۲ء میں ماہنامہ ہو گیا۔ ۱۹۳۶ء سے اس کی حیثیت اُردوئے معلّٰی کے ضمیمے کی ہو گئی۔

نگار کا کام، نیاز کا کردار

جس طرح حسرت کا اردوئے معلّٰی اپنی بیباکی اور اپنے باذوق انتخابات کے لئے مشہور ہے، اسی طرح نیاز فتحپوری کے 'نگار' نے اپنے خاص نمبروں کے ذریعے اردو رسائل کی تاریخ میں ایک مستقل حیثیت حاصل کر لی ہے۔ 'بہادر شاہ ظفر نمبر'، 'نظیر اکبر آبادی نمبر'، 'اردو شاعر نمبر'، 'افسانہ نمبر'، 'علم تنقید نمبر'، 'غالب نمبر'، 'اقبال نمبر'، 'داغ نمبر'، 'علماء اسلام نمبر'، 'اسلامی فرماں روا نمبر'، 'شیخ الاسلام نمبر'، 'اسلامی ہند نمبر' اور 'پاکستان نمبر' ـــــ ہاں ایک اور چونکا دینے والا نام "خدا نمبر" بھی ہے

نگار ۱۹۲۱ء میں آگرہ سے چلا، ۱۹۲۳ء میں بھوپال پہونچا، ۱۹۲۷ء میں لکھنؤ آگیا اور آزادی کے کچھ عرصے بعد پاکستان منتقل ہوگیا۔ نیاز اور ان کے نگار نے ادبی، سماجی اور مذہبی تینوں معاملے میں مجتہد کا رول ادا کیا۔ شروع میں نیاز قریب قریب تمام مضامین خود ہی لکھ لیتے تھے۔ وہ صاحب طرز ادیب، شاعر، نقاد، افسانہ و ناول نگار اور ماہر لسانیات کے علاوہ ماہر جنسیات بھی تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع اور حافظہ بہت قوی تھا۔ انھوں نے اپنے رسالے کو ادب اور علوم کا سنگم بنانے کی کوشش کی۔ اور جب رسالے کی اشاعت کم ہونے لگتی تو وہ کوئی جھٹکا دینے والی بات لکھ دیتے۔ مباحثہ چھڑ جاتا اور اشاعت بڑھنے لگتی۔

ان کو ترقی پسند ادیبوں کی پہلی صف میں جگہ دی گئی ہے مگر اپنی ادبی عظمت اور زور بیان کے باوجود وہ عقیدے کے معاملے میں اتنے مضبوط نہیں تھے۔ یہ بات ان کے مذہبی عقائد کے بارے میں نہیں بلکہ اپنے ذاتی تجربوں کی بنا پر لکھ رہا ہوں۔ ۱۹۴۲ء کی 'ہندوستان چھوڑو' تحریک سے پہلے میں لکھنؤ کے اردو ہفتہ وار 'ہندوستان' میں کام کرتا تھا۔ یہ اخبار پہلے نیاز کے پریس میں چھپتا تھا جو انھوں نے ایک شخص کو ٹھیکے پر دے رکھا تھا۔ ان دنوں ۲۶ جنوری کو یوم آزادی منایا جاتا تھا، اور عام جلسوں میں آزادی کا عہدنامہ پڑھا جاتا تھا جو ۱۹۳۰ء کے کانگریس اجلاس میں مرتب اور منظور کیا گیا تھا۔ بہت سے دوسرے اخباروں کی طرح 'ہندوستان' بھی اسے ہر سال شائع کرتا تھا لیکن اس مرتبہ پریس کے ٹھیکیدار نے نیاز کو کاپی دکھائی تو انھوں نے اُسے آزادی کا عہدنامہ چھاپنے سے منع کر دیا۔ میں نے خود نیاز صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ برطانوی حکومت کی وفاداری کا دم بھرنے والے اور انگریزوں کی ملکیت والے اخبارات تک اس عہدنامہ کو شائع کرتے رہے ہیں اور حکومت نے اس کی اشاعت پر کوئی پابندی نہیں لگائی ہے۔ مگر نیاز صاحب اپنے فیصلے پر جمے رہے اور ہمیں اخبار کے اس صفحے پر سے آزادی کا عہدنامہ ہٹا کر یہ لکھنا پڑا کہ "پریس نے چھاپنے سے انکار کر دیا۔"

دوسری مثال زیادہ دلچسپ ہے اور سبق آموز بھی۔ آزادی اور ملک کی تقسیم کے بعد ایک بار میں ہوش بلگرامی کی خیریت اور پتہ پوچھنے نیاز صاحب کے گھر گیا۔ انھوں نے گفتگو کے دوران بتایا کہ لاہور کے ایک معروف رمّال نے پیشین گوئی کی ہے، کہ ہندستان اور پاکستان میں جنگ ہوگی اور پاکستان فتحیاب ہو جائے گا نیز یہ کہ کسی قدیم روایتی فارسی قصیدے میں بھی یہی بات کہی گئی ہے میں نے کہا کہ میرے مطالعے اور تجزیے سے بالکل دوسری بات نکلتی ہے۔ نیاز صاحب نے ثبوت میں ایک اخبار بھی دکھایا اور مجھ سے کہا کہ اسے گھر جا کر پڑھ لو۔ مگر میں اس حکم کی تعمیل نہیں کر سکا۔

بعض اوقات پڑھے لکھے لوگ بھی خوف اور توہم پرستی کا شکار ہو جاتے ہیں لیکن ان کی یہ کمزوری چھپی رہتی ہے تاہم اس معمولی سی کمزوری کے ظاہر ہو جانے کے باوجود نیاز کی ادبی اور علمی عظمت اور اجتہادی صلاحیت نے اپنا لوہا منوا لیا اور ان کے رسالے نے تاریخ میں اپنی جگہ بنالی۔

نگار اور دہلی کے ماہنامے 'ساقی' کی پیدائش ایک ہی سال کی ہے اور شاہد احمد دہلوی اپنے رسالے کو 'نگار' سے پہلے ہی پاکستان لے گئے لیکن خوشتر گرامی اپنے ماہنامے 'بیسویں صدی' کو پاکستان سے ہندستان لے آئے۔ ان کا لگایا ہوا یہ درخت اب رحمٰن نیّر کی دیکھ ریکھ میں پھل پھول رہا ہے۔

ادارہ جاتی رسالے

انجمن ترقی اردو ہند کا سہ ماہی رسالہ 'اردو' ہندستان کی تقسیم کے بعد پاکستان چلا گیا اور انجمن کا دفتر علی گڑھ منتقل ہوگیا۔ جہاں اس نے 'اردو ادب' جاری کیا جو بعد میں انجمن کے ساتھ دہلی آگیا۔ قدیم ادارہ جاتی رسالوں میں دہلی کالج کا ادبی رسالہ فوائد الناظرین (۱۸۴۵ء) قابل ذکر ہے۔ دہلی یونیورسٹی کا ششماہی رسالہ 'اردوئے معلی' اب نظر نہیں آتا لیکن یہ اپنے خاص نمبروں کے لئے عرصے تک یاد رکھا جائے گا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کا ششماہی 'غالب نامہ' غالب اور ان کے زمانے سے متعلق علمی مضامین شائع کرتا رہتا ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کا ماہنامہ 'جامعہ'

اپنی ساکھ ابھی تک برقرار رکھے ہوئے ہے۔ وہیں سے ایک اور رسالہ 'کتاب نما' نکلتا ہے جس میں کتابوں کے اشتہاروں اور کتابوں پر تبصروں کے علاوہ علمی مضامین بھی ہوتے ہیں اور ادھر کچھ عرصے سے وہ مہمان مدیروں سے اداریے لکھواتا ہے جو ایک ندرت ہے۔ رسالہ جامعہ سے وہاں کے فضلا، پروفیسر محمد مجیب اور ڈاکٹر عابد حسین وابستہ رہے ہیں۔ ڈاکٹر عابد حسین نے ملک کی تقسیم کے بعد ہفتہ وار "نئی روشنی" نکالا، جس میں 'اخبارپن' کے ساتھ 'رسالہ پن' بھی تھا نئی روشنی کی اس دوسری خصوصیت پر اس بات سے روشنی پڑتی ہے کہ اس کے بند ہونے کے بعد ڈاکٹر عابد حسین کی ادارت میں 'اسلام اور عصر جدید نام کا جو سہ ماہی رسالہ اسی نام کے ایک ادارے کے زیر اہتمام جامعہ نگر نئی دہلی سے نکلا، اس میں نئی روشنی کے اداریے اور مضامین اکثر دوبارہ شامل ہوتے رہے اور برمحل اور کارآمد ثابت ہوئے۔ یہ رسالہ سیاسی تو نہیں تھا مگر مذہبی سے زیادہ علمی تھا اور اس کی مجلس ادارت میں ہندستان کے علاوہ یورپ اور امریکہ کے فضلا، بھی اعزازی مدیر کی حیثیت سے شامل تھے۔

اب اپنے بانی کی طرح یہ رسالہ بھی مرحوم ہوگیا ہے مگر دونوں کے نام اور کام اور مقصد اور سلیقے کو اونچی جگہ حاصل ہے۔ دار المصنفین اعظم گڑھ سے سید سلیمان ندوی نے ۱۹۱۸ء میں ماہنامہ معارف نکالا اور ندوۃ المصنفین دہلی کا برھان بھی ابھی زندہ اور تندرست ہے۔ دہلی ہی سے ایک بلند پایہ دینی، علمی اور ادبی ماہنامہ ذکر و فکر جو اسلام اور عصر جدید سے کسی قدر مشابہ تھا۔ خواجہ احمد فاروقی کی ادارت میں نکلا مگر وہ دس بارہ مہینے سے زیادہ نہیں چل سکا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا سہ ماہی فکر و نظر علی گڑھ تحریک کی روایات اور علیگوں کے نام اور کام کی تشہیر کے ساتھ علم و ادب کی گراں قدر خدمت بھی انجام دے رہا ہے۔ رابطہ ادب اسلامی (عالمی) کے سہ ماہی ترجمان کاروانِ ادب (لکھنؤ) کے ابھی چار ہی شمارے نکلے ہیں، اس پر اسلام کی چھاپ ضرور ہے مگر اس کا ادبی معیار بھی خاصا بلند ہے۔

ملک کی بعض دوسری یونیورسٹیوں اور کالجوں سے بھی اُردو کے یا اردو ہندی اور انگریزی کے ملے جُلے رسالے نکلتے ہیں، جن سے طلبا میں مطالعہ کا شوق اور اظہار کا سلیقہ پیدا ہوتا ہے مختلف ریاستوں کی اردو اکادمیاں اور ریاستی حکومتوں کے شعبۂ اطلاعات و تعلقاتِ عامّہ بھی اُردو رسالے نکالتے ہیں۔ البتہ ہندستانی اکادمی الہ آباد کا رسالہ 'ہندستانی' اب نہیں نکلتا۔ یہ اردو ہندی دونوں زبانوں میں نکلتا تھا۔ الہ آباد ہی سے ایک اور اپنی قسم کا اکیلا رسالہ "نیا ہند" پنڈت سندر لال نے جاری کیا۔ اس میں نیاپن یہ تھا کہ ایک ہی صفحہ پر ایک ہی عبارت اردو اور ہندی دونوں لکھاوٹوں میں ہوتی تھی۔ بہت مشکل لفظوں کے معنی صفحوں کے نیچے لکھ دیئے جاتے تھے۔ یہ مہاتما گاندھی کے تصوّر والی ہندستانی زبان کو فروغ دینے کی کوشش تھی۔

سرکاری پرچے

اردو ادب کے فروغ میں سرکاری رسالوں نے خاصا اہم حصّہ لیا ہے۔ ان پرچوں میں متعلقہ حکومت کی کارکردگی سے متعلق مضامین بھی ہوتے ہیں لیکن پروپیگنڈے کا اثر دبا رہتا ہے۔ احتیاطاً صرف اس بات کی رکھی جاتی ہے کہ حکومت کی پالیسی کے خلاف کوئی چیز نہ شائع کی جائے۔ اس حد بندی کے باوجود نثر اور نظم میں سرکاری رسالے خاصے کی چیزیں چھاپتے رہتے ہیں اور لکھنے والوں میں چوٹی کے شاعر اور ادیب شامل رہتے ہیں۔ ان کی قیمت عام طور سے لاگت سے بہت کم ہوتی ہے مگر ان کی فروخت، تقسیم اور ان کے اشتہاروں کی فراہمی پر توجہ ضرورت سے بہت کم دی جاتی ہے۔

اترپردیش کے محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ کا ماہنامہ نیا دور اپنے معمول والے شماروں کے علاوہ موقع موقع سے خصوصی نمبر بھی نکالتا رہتا ہے جو ادبی اور معلوماتی ادب میں پائدار حیثیت رکھتے ہیں۔ اس میدان میں مرکزی حکومت کے پبلی کیشن ڈویژن کے زیر اہتمام نکلنے والے ماہنامے 'آجکل' نے بڑا نام کمایا ہے اور اس کے خصوصی نمبروں میں ایک موضوع کے مختلف پہلوؤں پر ماہرین کی نگارشات جانے والوں کی یاد تازہ رکھنے کے علاوہ آنے والوں کی رہنمائی کرتی ہیں۔ اس کے مدیروں میں جوش ملیح آبادی کا نام بھی شامل ہے

جو ایک زمانے میں دہلی سے ماہنامہ 'کلیم' نکالتے تھے۔ پبلی کیشن ڈویژن نے کچھ سال ہوئے 'بساطِ عالم' نام کا رسالہ بھی نکالا تھا جو اب بند ہو چکا ہے مگر 'یوجنا' نام کا رسالہ منصوبہ بندی سے متعلق مضامین شائع کر کے صحافت کو ایک نئی سمت دے رہا ہے۔ اس کے خاص نمبر بھی خاصے کی چیز ہوتے ہیں۔

کچھ رسالوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی مخصوص نقطۂ نظر سے منسلک ہو جاتے ہیں۔ اسی نقطۂ نظر کو پھیلاتے ہیں اور اپنے پھیلاؤ کے لئے اسی نقطۂ نظر کا سہارا لیتے ہیں جیسے ترقی پسند ادب کی تحریک سے وابستہ نیا ادب۔ میزان۔ عصری آگہی اور شاہراہ — یہ سب رسالے اب بند ہو چکے ہیں مگر ڈاکٹر محمد حسن اسی قسم کے سہ ماہی رسالے 'عصری ادب' کو ابھی تک زندہ رکھے ہوئے ہیں اور علی سردار جعفری کا رسالہ 'گفتگو' بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔ گوپال متل کا ماہنامہ 'تحریک' ترقی پسند کہلائے جانے والے ادب، ادیبوں اور سیاسی، سماجی، معاشی نظریوں کا شدید مخالف تھا۔ اور جدیدیت کا علمبردار 'شب خون'، شمس الرحمٰن فاروقی کی رہنمائی میں تخلیق اور تنقید دونوں میدانوں میں چونکا دینے والی کارروائیاں کرتا رہتا ہے۔ مالک رام، جو اپنے تحقیقی کاموں کے لئے مشہور ہیں، ایک سہ ماہی علمی، ادبی رسالہ 'تحریر' بھی نکالتے تھے۔ اب یہ رسالہ بند ہو چکا ہے مگر اس کے کئی خاص نمبر اس کی افادیت کو ہمیشہ برقرار رکھیں گے۔

گلدستے

جس طرح یہ کہا جاتا ہے کہ ادب کی ابتدا شاعری سے ہوئی اسی طرح یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اردو رسائل شروع میں گلدستوں کی شکل رکھتے تھے۔ ان میں مشاعروں کی روداد شائع ہوتی تھی اور چوں کہ شاعروں کے مختلف گروہ آپس میں رقابت رکھتے تھے اس لیے گلدستوں کی اشاعت میں بھی کثرت اور مسابقت پائی جاتی تھی۔ رسائل کی اس صنف میں 'شانِ ہند' ایک نرالی شان رکھتا ہے۔ یہ رسالہ جو سرور تونسوی نے دسمبر ۱۹۵۰ء میں دہلی سے جاری کیا، مشاعروں کا آنکھوں دیکھا حال اور ان میں حصہ لینے والوں کا کلام تفصیل سے اور دلچسپ انداز میں شائع کرتا ہے۔ 'گلدستے' شہروں کے علاوہ قصبوں سے بھی نکلتے تھے اور قصبوں سے نکلنے والے بعض رسالے بھی وقیع خیال کیے جاتے تھے تبھی تو ہردوئی کے 'مرقع عالم' نے ۱۹۰۲ء میں علومِ جدیدہ اور اسلام کی جو بحث چھیڑی اس میں مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی حصہ لیا۔ لاہور سے ماہنامہ 'مخزن' شیخ عبدالقادر نے سال ہی بھر پہلے نکالا تھا اور اس رسالے میں مولانا کے مضمون شائع ہوتے تھے۔

دراصل اردو رسالوں اور اخباروں کے ادبی ضمیموں نے زبان و ادب کو پروان چڑھانے اور ادیبوں اور شاعروں کو آگے بڑھانے میں بہت اہم حصہ لیا ہے۔ آج آسمان ادب پر ہم جن شاعروں اور ادیبوں کی چمک دمک دیکھ رہے ہیں، ان میں سے بیشتر کو لکھتے رہنے اور بامِ عروج تک پہنچنے میں رسالوں سے سہارا ملا ہے۔ ان رسالوں اور ان میں لکھنے والوں کی فہرست بہت لمبی ہے۔ یہاں کچھ ناموں کا ذکر صرف نمونے کے طور پر کیا جا رہا ہے۔

متفرقات

اردو رسائل علم و ادب کے علاوہ قومی اور سماجی زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً فلمی رسالے، بچوں کے لیے نکلنے والے رسالے، عورتوں کے رسالے، مذہبی پرچے، اسپورٹس میگزین اور طنز و مزاح۔ فلمی رسالوں میں 'شمع' ہندوستان کے اندر ہی نہیں باہر بھی معروف اور مقبول ہے۔ اس کی ترقی میں ادبی معموں کا بھی خاصا دخل ہے اور یہ ادبی حیثیت اور اہمیت بھی رکھتا ہے۔ رسالہ "روبی" بھی اسی خاندان اور فلمی صحافت سے تعلق رکھتا ہے۔ شمع والوں نے بچوں کے لیے 'کھلونا' بھی نکالا اور جامعہ نگر سے نکلنے والے 'پیام تعلیم' نے بچوں کے لئے ادب کی تیاری کو ایک مستقل فن بنا دیا۔ یہ رسالہ جامعہ برادری سے تعلق رکھتا ہے۔

بجنور کا 'غنچہ' بچوں میں بہت مقبول تھا اور دہلی میں 'بچوں کا باغ' بھی اپنی بوقلمونی کی وجہ سے توجہ کا مرکز بن گیا۔ عورتوں کے رسالوں میں صادق الخیری اور رازق الخیری کے پرچے 'بنات' اور 'عصمت' اپنے زمانے میں بہت مقبول تھے۔ ان کے ہجرت کر جانے کے بعد 'خاتونِ مشرق'، 'حریم' اور 'بانو' نے یہ مورچہ سنبھال رکھا ہے۔ 'بانو' نئی دہلی کا پرچہ ہے جبکہ دہلی کا 'خاتونِ

مشرق" اور لکھنؤ کا "حریم" پُرانی روایات کے علمبردار ہیں۔

مذہبی پرچے

مذہبی پرچوں میں 'آستانہ' اور 'منادی'، جو خواجہ حسن نظامی کے زمانے میں ہفتہ وار اور ان کی شخصیت کا آئینہ دار تھا، لیکن اب ماہنامہ ہوگیا ہے، تصوّف سے تعلق رکھنے کے باوجود الگ الگ رنگ رکھتے ہیں۔ نظام المشائخ ملّا واحدی نے کوچۂ چیلاں دہلی سے جاری کیا تھا اب نہیں نکلتا اور عزیز حسن بقائی کا 'پیشوا' بھی مرحوم ہوگیا ہے لیکن منشی عبدالحمید کا سادہ اور روایتی طرز کا 'مولوی'، ابھی تک ایک حلقے میں پڑھا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی مختلف دینی تعلیم گاہوں اور تبلیغی اداروں سے بھی رسالے نکلتے ہیں لیکن عیسائیوں، آریہ سماجیوں اور سناتن دھرمیوں کے جو رسالے پہلے نکلتے تھے وہ اب نظر نہیں آتے۔ بعض مذہبی پرچوں میں پہلے مناظرہ بازی کا جو رجحان تھا وہ بھی قریب قریب ختم ہوگیا ہے مذہبی مباحث میں اب سنجیدگی آگئی ہے اور اسی وجہ سے علمی قسم کے مذہبی پرچے قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ 'ہُدیٰ' اور 'ہما' عوامی مذاق کی تسکین کرتے ہیں لیکن 'مستانہ جوگی'، جو صوفی لچھمن پرشاد نے ۱۹۰۵ء میں لاہور سے نکالا تھا، اس کی جگہ خالی ہوگئی ہے اس بے میل رسالے میں صحت، علاج، صنعت، تجارت اور روزمرہ زندگی میں کام آنے والی باتوں پر مضامین کے ساتھ قرآن، گیتا، انجیل، گرو گرنتھ صاحب کی تعلیمات اور صوفیوں، سنتوں کے اقوال شائع کیے جاتے تھے۔ سبھدرا جوشی نے سیکولر ڈیموکریسی جس مقصد کے لیے نکالا تھا وہ ابھی حاصل نہیں ہوا ہے۔ مگر یہ رسالہ بند ہوگیا ہے اور اس طرح کا کوئی دوسرا پرچہ ابھی تک نہیں نکلا ہے

بعض ڈائجسٹ قسم کے پرچے بھی نکلتے ہیں' ان میں مذہبی مواد کے ساتھ جاسوسی کے قصّے، سفرنامے اور ادب پارے بھی ہوتے ہیں۔ اُردو رسالوں میں شائع ہونے والے مواد کی مقبولیت اور افادیت ڈائجسٹوں کے علاوہ اس بات سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ چند سال ہوئے اُردو ساہتیہ کے نام سے ایک ہندی روزنامہ نکلا تھا اور آج کل بھی اچھے ہندی رسالے اردو میں لکھنے والوں کی چیزیں چھاپتے ہیں اور ان کے پڑھنے والے ان چیزوں کو پسند کرتے ہیں۔

سائنسی ادب

اُردو میں سائنسی صحافت کی ابتدا سرسیّد احمد خاں کے پرچوں سائنٹفک سوسائٹی کے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، اور 'تہذیبُ الاخلاق' سے ہوئی جو اخبار اور رسالے کی مشترکہ حیثیت اور ہیئت رکھتے تھے۔ لیکن 'سائنس'، نام کا رسالہ انجمن ترقی اردو نے آزادی سے کوئی تین سال پہلے جاری کیا تھا۔ آزادی کے وقت کی آندھی اسے اڑا لے گئی۔ آزادی کے بعد وزیر تعلیم مولانا ابو الکلام آزاد نے جو انڈین کونسل آف سائنٹفک ریسرچ کے نائب صدر بھی تھے (صدر خود وزیراعظم ہوتے ہیں) تجویز کیا کہ عوام کے لئے سائنسی ادب اور سائنسی معلومات کی ترویج واشاعت اردو میں بھی کی جائے۔ مرکزی کابینہ کی اصولی منظوری کے بعد رُکی ہوئی گاڑی چل پڑی مگر رفتار سُست رہی۔ عوامی دلچسپی والے سائنسی رسالے کے لئے رقم بھی منظور ہوگئی مگر یہ بیل اندرا گاندھی کی وزارت عظمیٰ کے زمانے میں منڈھے چڑھ سکی جب گلزار زُتشی کو سائنس سے متعلق رسالہ نکالنے کا کام سپرد کیا گیا۔ آخرکار ۲۰ر جون ۱۹۷۵ء کو راشٹرپتی بھون میں صدرجمہوریہ کے ہاتھوں سہ ماہی رسالے 'سائنس کی دنیا'، کی رسم اجرا انجام پائی۔ گلزار زتشی سائنس کے آدمی نہیں ہیں لیکن شاعرانہ مزاج کے ساتھ وہ اُردو سے عشق اور سائنس سے شغف رکھتے ہیں۔ ۱۹۸۶ء میں انھوں نے بتایا تھا کہ اس رسالے کی اشاعت ۳۵، ۴۰ ہزار تک پہونچ گئی ہے اور خصوصی نمبر پچاس ہزار تک گئے ہیں۔!

طب اور صحت اور صنعت وحرفت سے متعلق کچھ چھوٹے چھوٹے رسالے جیسے 'ہمدرد صحت' اور 'رہبر چرم' نکلتے ہیں اور محدود حلقوں میں پڑھے جاتے ہیں لیکن لکھنؤ کا ماہنامہ 'ایپک'، جو ڈاکٹر خلیل اللہ خاں اپروپریٹ ٹکنالوجی ڈیولپمنٹ ایسوسی ایشن کے زیراہتمام لکھنؤ سے نکالتے ہیں۔ سائنسی ادب اور سائنسی فکر کی ترویج کا ٹھوس تعمیری کام کر رہا ہے۔ البتہ 'سائنس کی دُنیا'، گلزار زتشی کے ریٹائر ہونے کے بعد سُونی سونی ہوگئی ہے۔

باہر کے اُردو پرچے

آزادی کی جد وجہد کے زمانے میں کچھ ہندستانیوں نے باہر جاکر آزادی کی تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے ہفتہ وار اور ماہانہ پرچے نکالے۔ یہ پرچے انگریزی ہندی اور گورکھی کے علاوہ اردو میں بھی ہوتے تھے اور ترکی، فرانس، جرمنی، انگلستان، امریکا، کناڈا چین اور جاپان تک سے اُردو کے پرچے نکلے۔ انھیں نکالنے والوں میں برکت اللہ بھوپالی، مقبول الرحمٰن سرحدی، راجہ رائے سنگھ، لالہ امرناتھ، لالہ ہر دیال اور موہن سنگھ بھکنہ نیز متعدد دوسرے مجاہدوں کے نام اُردو رسالوں کی تاریخ کے اس باب میں سنہرے حرفوں سے لکھے ہوئے ہیں۔ یہ صحیفے اور صحافی ریسرچ کا موضوع بن سکتے ہیں۔

باہر کے اردو رسالوں میں ایک قابل ذکر پرچہ 'نوائے کیمبرج' ہے۔ کیمبرج یونیورسٹی کے اردو طلبا کا یہ پرچہ وہاں کی انجمن اردو نے ۱۹۲۱ء میں جاری کیا تھا۔ یہ ہر ٹرم میں یعنی سال میں تین بار نکلتا تھا اور لکھنؤ کے نول کشور پریس میں چھپتا تھا۔

تاریخ کا اُلٹ پھیر

اُردو رسالوں کی تاریخ میں اردو زبان اور اردو سماج ہی کی نہیں ہندستان کے ماضی اور حال کی تاریخ بھی جھلکتی ہے۔ اس تاریخ میں رزم و بزم، امید و بیم، رنج و خوشی، محرومی اور خوش حالی، بہار اور خزاں کے دور برابر آتے جاتے رہے ہیں۔ بہت سے رسالے بند ہو گئے لیکن بہت سے نئے رسالے نکل بھی آئے۔

محفل تو تری سونی نہ ہوئی کچھ اٹھ بھی گئے کچھ آ بھی گئے

جو پرچے اب نہیں رہے ان میں ایک قابلِ ذکر نام 'آواز' کا ہے جس میں آل انڈیا ریڈیو کے مختلف اسٹیشنوں سے نشر ہونے والے پروگراموں کی تفصیل کے علاوہ نشر کیے جانے والے نثری اور شعری مواد کے منتخب حصے بھی شائع ہوتے تھے۔ 'آواز' کے بند ہو جانے سے آکاش وانی اور دوردرشن کی افادیت میں بھی کمی آگئی ہے۔

اُردو رسالوں کی ادبی اور سیاسی اہمیت اور حیثیت پر تو تھوڑا بہت کام ہوا ہے لیکن ان کی تاریخ کے سماجی اور معاشی پہلو پر بہت کم کام ہوا ہے۔ اگر اس میں دیر لگی تو اس دولت کا بڑا حصہ ضائع ہو جائے گا

□□

ارضِ وطن

یہ زمینِ ہند ہے اس کا احترام کر

اس کے جسمِ ناز پر عظمتوں کا پیرہن
اپنی گود میں لیے فصلِ گل کی انجمن
آسماں کی کہکشاں دوشِ پاک پر لیے
ماہِ نو کی روشنی فرشِ خاک پر لیے
آفتابِ صبحِ نو سجدہ ریز ہو جہاں
ہے وہی مرا وطن ہند، خلد کا نشاں
جس کو دیکھ کر ملک خود کہیں قیام کر
یہ زمینِ ہند ہے اس کا احترام کر

حسن کی تجلیاں خسروی میرا وطن
منزلوں کی فکر میں راہِ نو پہ گامزن
چمنیوں کا یہ دھواں آسماں کی ہے ردا
لہلہاتی کھیتیاں دل بہار جاں فزا
زلفِ مادرِ وطن کو سنوارتا چلا
پھر نہ جنگ ہو کہیں یہ پکارتا چلا
صنعتِ محاذ پر اور تیز گام کر
یہ زمینِ ہند ہے اس کا احترام کر

نوجوان شوخ شنگ جن کے حوصلے بلند
سرحدوں پہ جن کی آنکھ تیز تند فکرمند
جن کا آہنی اصول موت سے بھی سخت تر
جن کے عزم کی کمند جا کے آسمان پر
برق بار بن گئی سینۂ سحاب میں
کوندتی ہے رات کو دشمنوں کے خواب میں
کاوش آج باادب پھر انھیں سلام کر
یہ زمینِ ہند ہے اس کا احترام کر

□□

کاوش الہ آبادی

۲۳۰، [illegible] الہ آباد - ۲۱۱۰۰۳

دانہ دامؔ[1]

(مجروح سلطان پوری کے نام)

چہرے پہ چھائی زردی ہے پھیلی ایک سیاہی ہے!
اوروں کا کیا ذکر کریں اپنوں ہی کی کوتاہی ہے!

ہم روپ نگر کو دیکھ چکے، ٹھوکر ٹھوکر تنہائی ہے
فٹ پاتھ پہ بیٹھے رات ہوئی، شاید یہ شہر پناہی ہے

ہٹ دھرمی کی حد سے گزرے، کون تمہیں سمجھائے گا
مندر مسجد جانے والو! بولو حکمِ الٰہی ہے؟

یہ بھی ایک تماشا ہے ٹی۔وی پہ آکر جاتا ہے
ناکا بندی کھیل ہے شاید ہر کونے پہ سپاہی ہے!

حرص و ہوس کے جال میں پھنس کر، اپنی چالیں بھول گیا
یہ معصوم بہت تھا پہلے، اب بیچارہ راہیؔ[2] ہے!

سرکش رہ کے مرتے جیتے، ہم نے تو دنیا دیکھی
ٹوٹے پھوٹے رستے ہیں اور قدم قدم گمراہی ہے!

باقرؔ آنکھ ملاکر دیکھو بھوکے پیاسے چہروں سے
اہلِ نظر[3] کے شعروں میں ابتک دزدیدہ نگاہی ہے!

باقر مہدی

ای/۱ روی درشن، کارٹر روڈ، باندرہ (ویسٹ)
بمبئی ۴۰۰۰۵۰

[1] یہ عنوان بیدی کے افسانوی مجموعے سے لیا گیا ہے
[2] میرے سابق دوست راہی معصوم رضا مرحوم
[3] مجروح سلطان پوری

تار ہو جس کے دل سے بلا آپ کا
وہ تو گائے گا گن برملا آپ کا

یہ زمیں آپ کی، وہ خدا آپ کا
ہم غریبوں سے کیا سلسلہ آپ کا

آپ کے ظلم نے خوب ہمیز کی
زندگی کٹ گئی شکریہ آپ کا

جھوٹ کی سلطنت میں جو مردِ خدا
سچ پہ قائم رہا سو ہوا آپ کا

آپ کے غم نے دکھلایا اوروں کا غم
کی نظر وہ عطا ہو بھلا آپ کا

اپنے ایماں ہی میں تھی کوئی کمی
جو نہ ہم پا سکے کچھ پتا آپ کا

جب زمانہ ہوا خود غرض بے وفا
پھر کرے کوئی کیسے گلہ آپ کا

لہریں ساگر کی مجبوب ہو کے رکیں
جو بنے آئیں جب نقشِ پا آپ کا

آپ عشم میں غریبوں کے اونچے اٹھے
اب غریبوں سے کیا واسطہ آپ کا

اوپیندر ناتھ اشک

۵۔ خسرو باغ روڈ، الہ آباد

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ
پتنجلی کا منڈوا ۔ ۹۹/۱-۸-۱۰۰ سوریہ نگر،
حیدرآباد ۔ ۵۰۰۰۲۰

حیدرآباد میں اُردو ادب میں رُجحانات

۱۹۰۰ء سے ۱۹۵۰ء تک

تلگو علاقہ جو کاکیتہ حکومت کے زوال کے بعد بکھر گیا تھا پھر سے قطب شاہی دور میں متحد ہوا۔ اور یہی وہ دور تھا جب کہ تلگو اور اُردو (اپنے دکنی روپ میں) دونوں ہی زبانیں پھلیں پھولیں محمد قلی قطب شاہ (جو تھا قطب شاہی بادشاہ) اُردو کا پہلا شاعر ہے جو صاحب دیوان تھا۔

دکنی کی بنیادی خصوصیتیں یہ ہیں:

(۱) اس کے الفاظ کا ذخیرہ زیادہ تر کھڑی بولی کا ہے جو دہلی اور اس کے اطراف بولی جاتی تھیں۔

(۲) اس میں کافی الفاظ ایسے تھے جو 'برج' سے ماخوذ تھے اور برج اس زمانے میں ادبی زبان تھی۔ دکنی میں کئی الفاظ پنجابی سے بھی آئے ہیں۔ خاص طور پر جمع پنجابی طرز پر بنائی جاتی تھی جیسے شاعر سے شاعراں، کتاب سے کتاباں وغیرہ۔

(۳) دکنی سنسکرت کے "اپ بھرنش" الفاظ تو قبول کر لیتی تھی لیکن 'تت سم' الفاظ اس کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ لفظ 'بجلی' کو اس نے آسانی سے قبول کر لیا جو 'دریوت' کا اپ بھرنش ہے۔

(۴) دکنی بہ آسانی مقامی زبانوں اور بولیوں سے الفاظ قبول کر لیتی ہے من و عن بھی اور کبھی انھیں اپنی ساخت اور اپنے مزاج کے مطابق ڈھال کر اس نے احمد آباد میں گجراتی سے، بیجاپور میں کنڑی سے اور گول کنڈہ میں تلگو سے کافی الفاظ حاصل کیے۔ "نکو" (بہ معنی نہیں) اور گمت (بہ معنی تماشہ) مرہٹی زبان سے اخذ کیے ہیں۔ "گمپا" (بمعنی ٹوکرا) اور گتہ (بمعنی ٹھیکہ) اور متعدد ایسے الفاظ تلگو سے لیے ہیں۔

(۵) دکنی کی ادبی تخلیقات میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں ہی کے مذہبی اعتقادات، رسوم و رواج کا امتزاج ملتا ہے۔ دکنی صوفیوں کی تخلیقات میں ایرانی تصوّف اور ہندو ویدانت کا میل نظر آتا ہے۔ مثنوی "چندر بدن" — ایک ہندو اور ایک مسلمان کے عشق کی داستان ہے۔

دکنی اس طرح بول چال کی سطح پر جنوب میں رابطے کی زبان بن رہی تھی اور برہان پور اور احمد آباد سے لے کر رائچوٹی اور بنگلور تک کے علاقے پر محیط تھی۔ وہ اپنا ادب اور ادیب پیدا کر رہی تھی۔

اس عوامی رجحان کے مقابلہ میں دہلی اور لکھنؤ میں پڑھے لکھوں کی ایک معیاری زبان ڈھل رہی تھی جو عصری اردو ہے۔ یہ دونوں رجحان ایک ساتھ بڑھ رہے تھے اور ٹکراتے بھی تھے۔ وَلی اورنگ آبادی نے شروع میں تو دکنی میں شعر کہے لیکن بعد میں دہلی کی ٹکسالی اُردو میں لکھنے لگے۔

آصف جاہ اوّل نے اعلان آزادی کے بعد جب اورنگ آباد کو راجدھانی بنایا تو دکنی پر بُرے دن آنے شروع ہوئے اور رفتہ رفتہ اس میں تخلیقی ادب کم ہوتا گیا۔

نظام علی خاں سے آصف جاہ ثانی نے جب اورنگ آباد کو چھوڑ کر اٹھارھویں صدی کے اواخر میں حیدرآباد کو اپنا پایۂ تخت بنایا اور ارسطو جاہ ان کے وزیر تھے، تب سے دکنی ختم ہونے

لگی اور تہذیبی محاذ پر دہلی کی "معیاری زبان" چھانے لگی۔

انیسویں صدی کی ابتدا میں چندو لال شاداں کا دور شروع ہوتا ہے۔ انھوں نے بھی معیاری اردو ہی کی سرپرستی کی۔ ان کے زمانے میں ایک شاعر قیس گزرا ہے اس نے پہلے تو یہ شعر کہے ؎

کون یہ ہے گا نگوڑا تلے کو بیٹھ کے کھڑا
گھوڑے جو چیتی کو مرے دیکھ کے ہر آن ڈرا

اور پھر یوں کہنے لگا ؎

ہے جو اسکندر یہ دوراں کا وزیر اعظم
جس کے ہے سایۂ الطاف میں عالم چلتا

دکنی کو مسترد کرنے اور دہلی کی اعلیٰ طبقے کی معیاری اُردو کو اختیار کرنے کا عمل انیسویں صدی کے پہلے نصف تک مکمل ہو چکا تھا۔ انیسویں صدی ختم ہوتی ہے داغ اور امیر مینائی (۱۸۹۰ء) کے حیدرآباد منتقل ہو جانے پر۔

اب حیدرآباد سطح مرتفع دکن پر چسپاں کیا ہوا ایک قطعۂ دہلی لگتا تھا۔

اٹھارھویں صدی کے اواخر اور پُوری انیسویں صدی کا زمانہ وہ ہے جبکہ حیدرآباد میں اردو ادب میں دور رس تبدیلیاں نمودار ہوئیں۔ یہی وہ زمانہ ہے جب شمس الامرا نے بڑی محنت سے انگریزی اور فرانسیسی سے اُردو میں ترجمے کروائے۔

فورٹ ولیم کالج میں جو کتابیں ترجمہ ہو چکی تھیں، انھیں حیدرآباد لایا گیا۔ ماہرین کو مقرر کیا گیا جو انگریزی اور فرانسیسی سے اُردو میں ترجمہ کرتے تھے۔ شاعری کے میدان میں دہلی کی زبان کی حکمرانی تھی، پھر بھی ہم کو واصل اور مائل جیسے شاعر ملتے ہیں۔ جنھوں نے داغ جیسے دہلوی شاعروں کے "احساسِ برتری" کے خلاف جد و جہد کی اور مقامی شاعروں کی ہمت بندھائی کہ وہ "احساسِ کمتری" کا شکار نہ ہوں۔

یہاں ہم دکنی علاقہ پرستی کے ان عوامل کو دیکھتے ہیں جو دہلی کی بالادستی کے خلاف اُبھرتے ہیں اور آگے چل کر بیسویں صدی کے چوتھے دہے میں اچھی خاصی "ملکی" تحریک کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

لیکن داغ اور امیر مینائی ایسے شاعر ہیں جنھوں نے ایک طرف اُردو کو اور بھی سنوارا نکھارا اور اسے عام پسند بنایا اور دوسری طرف انھوں نے شاعری میں سستی جنسیت اور ادنیٰ جذبات کو جگہ دی۔ یہی تو وہ ابتذال ہے جس کے خلاف حالی اور سرسید نے بغاوت کی۔

بیسویں صدی کے آغاز میں اسی ابتذال کے خلاف جہاد شروع ہوا اور نشاۃ الثانیہ کی بنیادیں پڑیں۔ اس جد و جہد کے بنیادی عناصر یہ تھے:

۱۔ ادب کو زندگی سے قریب لایا جائے اور اسے بے بسی کے احساس کے خلاف جد و جہد اور اعتماد کی بحالی کے لیے ہتھیار بنایا جائے۔

۲۔ زبان کو سادہ بنایا جائے اور ادبی تخلیقات میں بول چال کے عام فہم الفاظ اور ترکیبیں استعمال کی جائیں۔

۳۔ انشائیے اور ناول لکھے جائیں اور سائنسی ادب پیدا کیا جائے۔

۴۔ عوامی صحافت کی بنیاد

۵۔ طنز و مزاح کو زوال پذیر جاگیردار طبقے کے ادنیٰ جنسی جذبات سے کھیلنے والے ادب کے بجائے سماجی ارتقاء کے لئے اور سماج میں در آئی بُرائیوں کے خلاف جہاد کے لئے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جائے۔

یہ تھے ادبی نشاۃ الثانیہ کے مقاصد۔ چاہے وہ اُردو میں سر سیّد احمد خاں، خواجہ الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی اور نذیر احمد وغیرہ کی کوششوں سے آیا ہو یا اسے ہندی میں بھارتیندو نے شروع کیا ہو یا تلگو میں ویریشلنگم اور تامل میں بھارتی کی دین ہو۔

حیدرآباد جس کی حیثیت ایک ابھرتے اُبلتے ہندستان کے بیچوں بیچ دورِ وسطیٰ کے ایک سامنتی جزیرے کی تھی، بہت دنوں تک ان نئی اور خوش گوار ہواؤں سے بچ نہیں سکتا تھا۔

۱۹۱۷ء میں حیدرآباد میں دار الترجمہ قائم ہوا، اور پھر ۱۹۱۹ء میں جامعہ عثمانیہ قائم ہوئی یہ ایک موڑ تھا۔ جامعہ عثمانیہ میں اعلیٰ تعلیم

اُردو میں اور نسبتاً کم خرچ پر دی جاتی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بڑی تعداد میں متوسط طبقے بلکہ نچلے متوسط طبقے کے نوجوان اعلیٰ تعلیم سے لیس میدان میں آ گئے۔ لیکن جاگیرشاہی ڈھانچے میں اول تو اونچے جاگیردار طبقات کی حمایت میں جانبداری برتی جاتی تھی اور پھر اقتصادی ترقی پر پہرے بٹھا دیئے تھے اور نئے تعلیم یافتہ نوجوان روزگار کے موقعوں سے محروم تھے۔

اس کے برخلاف دارالترجمہ اور یونیورسٹی کی وجہ سے یو۔پی بہار اور پنجاب سے ماہرین آنے لگے تھے۔ عدالتوں میں اور نظم و نسق میں فارسی کی جگہ اُردو کے استعمال سے ان لوگوں کی آمد اور بھی بڑھ گئی تھی۔

اس کی وجہ سے کچھ نئے تناؤ اور نئے رُجحان پیدا ہو گئے تھے ترجمے کے محاذ پر دو مکتب پیدا ہو گئے۔ ایک تو وہ اسکول تھا جس کی رہنمائی وحیدالدین سلیم کرتے تھے، جو چاہتا تھا کہ عام فہم زبان میں اصطلاحیں تیار کی جائیں اور دقیق الفاظ استعمال نہ ہوں۔ دوسرا اسکول چودھری برکت علی کا تھا جو فارسی اور عربی سے الفاظ حاصل کرنے پر زور دیتے تھے۔

سرکاری ملازمتوں کے لئے مسابقت کے میدان میں مقامی نوجوان شمال سے آئے ہوئے حضرات کے مقابل تھے اور 'ملکی' اور 'غیر ملکی' کا قضیہ کھڑا ہو گیا تھا۔

تخلیقی ادب کے میدان میں ہم رومان پسندی کا اُبھار دیکھتے ہیں۔ شاعری میں ہم غزل کے مقابلے میں نظم کو دیکھتے ہیں جہاں فطری مناظر کے ساتھ ساتھ سماجی مسائل کا بھی احاطہ ملتا ہے۔ یہاں جامعہ عثمانیہ کے نوجوانوں کی ہمت افزائی خود مجلہ عثمانیہ میں اشاعت سے ہوتی تھی۔ اس زمانے میں متعدد ادبی رسائل بھی شائع ہونے لگے۔ اُردو صحافت بھی فروغ پا رہی تھی۔ بیسویں صدی کے تیسرے اور چوتھے دہے میں حیدرآباد سے کوئی ۵۰ سے ۶۰ اخبارات اور رسائل شائع ہوتے تھے۔

مولوی عبدالحق کی رہنمائی میں انجمن ترقی اردو نے بھی جس کا صدر دفتر اورنگ آباد میں تھا، اُردو کی زبردست خدمت کی ہے سکندر علی وجد، اکبر وفاقانی، باقی، محمد علی تیر، تحسین سروری، عبدالصمد رضوی ساز، محمد علی خاں میکش، مخدوم محی الدین اور دوسرے افق پر چمکنے ستارے تھے۔

یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ اس نسل کے نوجوان لکھنے والوں نے بلبل ہند سروجنی نائیڈو سے بھی انسپریشن لیا ہے۔ اکثر تو ان کی قیام گاہ "گولڈن تھریشولڈ" (سنہری دہلیز) پر ملتے جن میں ڈاکٹر جے سوریا (سروجنی نائیڈو کے فرزند اکبر) بھی ہوتے، ادبی مسائل پر گفتگو کرتے اور سروجنی نائیڈو چائے سے ان کی تواضع بھی کرتیں اور اپنی موجودگی سے ان کی ہمتیں بھی بڑھاتیں۔

ایک دوسرے دانشور بھی تھے جنھوں نے اس دور کے نوجوانوں کی ذہنی تربیت میں بڑا حصّہ لیا ہے وہ ہیں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم جو خود بھی گولڈن تھریشولڈ اکثر جایا کرتے۔

اردو ڈرامے کو مہمیز ہوئی تو وہ جامعہ عثمانیہ کے طلبا کی یونین کے جلسوں اور کلچرل محفلوں کی وجہ سے۔ ظفر الحسن، میر حسن اور مخدوم محی الدین نے اس میدان میں کام کیا ہے۔

یہی وہ زمانہ تھا جبکہ ملکی اور غیر ملکی تنازعے نے دکنی شاعری کو اُبھارا۔ غلام علی، دہقانی، اعجاز حسین کھٹا اس دور کے اہم شعراء ہیں جنھوں نے دکنی میں اعلا درجے کی شاعری کی ہے۔ پھر بھی اس میں ہنسنے ہنسانے والی باتیں زیادہ ہیں اور چبھتے ہوئے طنزیہ اشارے بھی کافی ہیں۔

بیسویں صدی کے چوتھے دہے میں ایک نیا رجحان ملتا ہے جو اس سے پہلے نہیں تھا۔

سوشلزم کی مسلسل کامیابیاں اور سرمایہ داری کے بڑھتے ہوئے بحران نے نئے میدان کھول دیئے اور ہندوستان کی آزادی کی تحریک کو نئی مہمیز ہوئی۔ خود ملک کے اندر نئے دور طبقہ ابھر رہا تھا جو سامراج دشمن محاذ پر ایک طاقت ور دستے کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور سامراج دشمن آزادی کی لڑائی کو ایک نئے سوشلسٹ افق سے آشنا کرتا تھا۔ کسان بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا اور زمینداروں کے خلاف جدوجہد کر رہا تھا۔ ریاستی عوام کی آزادی، جمہوریت اور باقی ہندوستان

کے اپنے ہی بھائی بندوں سے اتحاد کی تحریک بھی چل پڑی تھی۔

ان عوامل کا اثر ادب پر بھی پڑ رہا تھا۔ ترقی پسند ادب کی تحریک بھی اسی زمانے (۱۹۳۶ء) میں شروع ہوئی۔ اور غالباً یہ نشاۃ الثانیہ کے بعد سب سے بڑی ادبی تحریک تھی جس نے ادب کے تعلق سے تصورات ہی کو ہلا کر رکھ دیا اور تخلیقی ادب کو نئے افق سے آشنا کیا۔

حیدرآباد میں بھی نوجوان ادیب سلیمان اریب، یوسف ناظم، لطیف ساجد، نظر حیدرآبادی، کنول پرشاد کنول، ابراہیم جلیس، حسینی شاہد، خیرات ندیم، عشرت، اقبال متین، شاذ تمکنت، عزیز قیسی، قمر ساحری، سردار الہام، نجمہ نکہت، جیلانی بانو اور دوسرے بیسویں صدی کے پانچویں دہے تک، اس ترقی پسند ادبی تحریک سے وابستہ رہے ہیں۔

روزنامہ پیام نے جس کے ایڈیٹر قاضی عبدالغفار تھے اور روزنامہ رعیت نے جس کے مدیر ایم۔ نرسنگ راؤ تھے، اپنے صفحات ان نئے لکھنے والوں کے لئے مختص کر دیئے تھے۔

گہری انسان دوستی، مظلوم اور مجبور کروڑوں عوام سے وسیع ہمدردی، شدید سامراج دشمنی، فاشزم سے انتہائی نفرت اور سوشلزم سے لگاؤ، یہ سب اس ادب کا امتیاز تھے۔ تلنگانہ کی دیسکھوں اور جاگیرداروں کے خلاف عظیم جدوجہد اور نظام کی مطلق العنانی کے خلاف جمہوری لڑائی، سبھی اس ادب میں نمایاں تھے مخدوم اور اریب نے تلنگانہ کی جدوجہد پر لکھا۔ بیکش نے جنگاؤں کے کسانوں کی ویشنو دیسکھ کے خلاف لڑائیوں پر شعر کہے۔ تاج وہ رسالہ تھا جس میں یہ کلام چھپتا تھا۔ پیام نے جس کے ایڈیٹر اب اختر حسن تھے، ان لکھنے والوں کی بڑی ہمت افزائی کی اریب اور اختر حسن کو تو اس پاداش میں قید و بند بھی بھگتنا پڑا۔

یہ ماننا پڑے گا کہ اردو کے دانش وروں میں 'ملکی' کا رجحان ہمیشہ سے رہا ہے جو "شمال" کے خلاف تھا۔ اس رجحان کی بہت جھلکیاں ملتی ہیں کبھی دکنی سے محبت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے تو کہیں حیدرآباد کی شناخت کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

اور یہ رجحان اس صدی کے پانچویں دہے میں اور بھی سخت ہو جاتا ہے۔ حیدرآباد کی "آزادی" کی صدا دیتا ہے اور انجانے میں قاسم رضوی کی افسوس ناک تحریک کا مددگار ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی جو اب تک ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ اب قاسم رضوی کی "آزاد حیدرآباد" تحریک کے مددگار بن جاتے ہیں، ان میں ابراہیم جلیس۔ نظر حیدرآبادی اور شاہد صدیقی اہم نام ہیں۔ جبکہ مخدوم، اریب، حسینی شاہد، اقبال متین اور دوسرے فیوڈلزم کے خلاف جمہوریت کے لئے میدان میں ڈٹے رہے۔

۱۹۴۸ء میں "پولیس ایکشن" کے بعد "آزاد حیدرآباد" کا رجحان بنیادوں سے ہل گیا اور پھر شاہد صدیقی اور دوسرے ترقی پسند تحریک کی صف میں واپس آ گئے۔ وہ جو پاکستان چلے گئے تھے جیسے ابراہیم جلیس، وہاں جمہوری قدروں کی حمایت میں آواز اٹھاتے رہے۔

ایک دکنی ادبی رجحان بھی موجود ہے لیکن اس کے جید علمبردار سرور ڈنڈا اور سلیمان خطیب اب نہیں رہے۔ نئے لکھنے والے زیادہ تر مزاح ہی کو موضوع سخن بنائے ہوئے ہیں۔

ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس جو ۱۹۴۵ء میں حیدرآباد میں منعقد ہوئی تھی، اس سفر کے ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ آسمانِ اردو کے ایسے درخشاں ستارے فراق گورکھپوری، حسرت موہانی، احتشام حسین، قاضی عبدالغفار، سجاد ظہیر، کرشن چندر، سبط حسن، وامق جونپوری، ڈاکٹر عبدالعلیم اور دوسرے اس کانفرنس میں موجود تھے۔ انھوں نے اور ان کے ارشادات نے ایک پوری نسل کو انسپائر کیا ہے۔ عابد علی خاں، محبوب حسین جگر اس کے کرتا دھرتا تھے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کانفرنس اس بلندی کی نشان دہی کرتی ہے جس تک اردو ادب پہونچ چکا تھا اور مخدوم کا شعری مجموعہ "سرخ سویرا" جو مخدوم کی شعری تخلیق 'معصوم رومان' سے لے کر انقلابی شان تک ایک طیف کا منظر پیش کرتا ہے' جو اسی زمانے میں شائع ہوا تھا، ایک دور کے اختتام اور ایک دوسرے دور کے آغاز کا اعلان کرتا ہے۔

□□

کسانی غزل

آئی برکھا کسانوں کے آنسو اُگے
جو پیڑوں کے منڈیروں پہ جگنو اُگے

کیا برس جائیں بادل، بھروسہ نہیں
دھان بوؤ تو ممکن ہے بالو اُگے

گاؤں وہ جو دعاؤں کا مشہور تھا
اس کے ہر کھیت میں ٹونا جادو اُگے

عہدِ حاضر کی مٹی کی زرخیزیاں
پیار بویا گیا اور چاقو اُگے

ناچنے کا ارادہ زمیں نے کیا
چرخ پر چاند تاروں کے گھونگھرو اُگے

ہم تھے صحرا کے پودے تو سب دوست تھے
لوگ جلنے لگے جب لبِ جو اُگے

تم چھپا آئے تھے قاتلوں کو جہاں
ان گپھاؤں میں پھر کیسے سادھو اُگے

آؤ اک بار پھر خود کو بو ڈالیں ہم
مہکے مٹی کہ جب میں اُگوں تو اُگے

سرکو بیکل نے بو کر زمیں سے کہا
میری ماں تیرے آنچل کا پلّو اُگے

(پدم شری) بیکل اُتساہی
بلرام پور۔ گونڈہ

غزل

اس کی شوخی اور ادا کو بس ہمیں سے پوچھیے
کیوں ہوئے برباد ہم یہ اس حسیں سے پوچھیے

خارزاروں پر لہو ہم نے بہایا کس لیے؟
فرشِ گلشن پر جو بیٹھے ہیں انھیں سے پوچھیے

دولتیں کس کام کی نادار ہی سمجھا کیا
شہر کی رونق ہے کیا صحرا نشیں سے پوچھیے

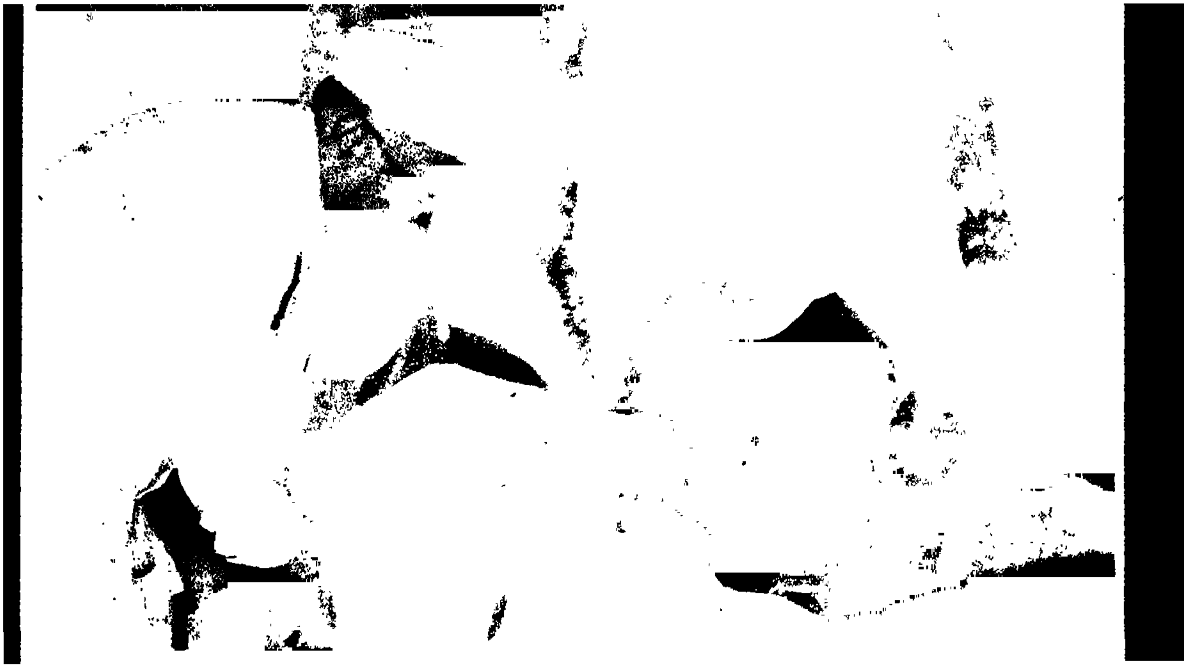
اُن کو دیکھا شادمان و کامراں سب نے مگر
چوکھٹیں کتنی گھِسیں ان کی جبیں سے پوچھیے

لے کے ہم آئے ہیں کیا، گھر میں سبھی ہیں جانتے
پیر میں کانٹے چُبھے کتنے، ہمیں سے پوچھیے

یوں بظاہر اک حسیں، دوشیزۂ نوخیز ہے
کھا چکی ہے آسماں کتنے، زمیں سے پوچھیے

کیوں مصیبت کی چٹانوں میں تراشے ہیں صنم
بھر دلِ بشاش تابندہ جبیں سے پوچھیے

وجاہت علی سندیلوی
نصرت منزل
سندیلہ (ہردوئی)








कल्याण
उत्तरप्रदेश









غزلیں

دالانوں کی دھوپ، چھتوں کی شام کہاں
گھر سے باہر گھر جیسا آرام کہاں

بازاروں کی چہل پہل سے روشن ہیں
ان آنکھوں میں مندر جیسی شام کہاں

میں اس کو پہچان نہیں پایا تو کیا
یاد اسے بھی آیا میرا نام کہاں

لوگوں کو سورج کا دھوکا ہوتا ہے
آنسو بن کر چمکا میرا نام کہاں

چندا کے بستے میں سوکھی روٹی ہے
کاجو، کشمش، پستے اور بادام کہاں

دن بھر سورج کس کا پیچھا کرتا ہے
روز پہاڑی پر جاتی ہے شام کہاں

بشیر بدر
اے-۱ - بادشاہ اپارٹمنٹ، کوہِ فضا
بھوپال (ایم پی)

اے فرعون زمانہ اک دن تیرا لشکر ڈوبے گا
تو ڈوبے گا ساتھ میں اپنے سب کو لیکر ڈوبے گا

دنیا دن بھر کی رونق پر اتنا کیوں اتراتی ہے
شام کو جب سورج ڈوبے گا سارا منظر ڈوبے گا

باندھ توڑ کر شہر ڈبونے کی کوشش جو کرتا ہے
اس کو شاید ہوش نہیں ہے اس کا گھر بھی ڈوبے گا

قاتل بن کر زندہ رہنا اتنا تو آسان نہیں
اک دن خود تیرے ہی لہو میں تیرا خنجر ڈوبے گا

جس کو تیرتا دیکھ رہے ہو پانی پر پھولوں کی طرح
اک دن ایسا بھی آئے گا پتھر بن کر ڈوبے گا

اب کے برس سیلاب جو آیا وقت سے پہلے کیا کہدوں
کس کس کا گھر بچ جائے گا کس کس کا گھر ڈوبے گا

اس کی آنکھوں کی گہرائی سے اندازہ ہوتا ہے
ایک نہ اک دن ان آنکھوں میں تو بھی ساغر ڈوبے گا

ساغر اعظمی
بارہ بنکی (یو پی)
۲۲۵۰۰۱

شبّیر علی خاں شکیب

بنگلہ آزاد خاں - رام پور - ۲۴۴۹۰۱

آزادی کے بعد رام پور کی ادبی خدمات

دلّی اور لکھنؤ کے بعد رام پور کو تیسرا دبستانِ شاعری تسلیم کیا جاتا ہے۔ اردو کے علاوہ یہاں فارسی اور عربی میں جو گرانقدر خدمات انجام دی گئی ہیں ان کا بیشتر حصہ مطبوعہ اور قلمی صورت میں رضا لائبریری اور صولت لائبریری میں محفوظ ہے۔ افسوس ہے کہ مخطوطات شائع نہ ہوسکنے کی بنا پر ہنوز عوام کی دسترس سے باہر ہے۔ چونکہ اس وقت آزادی کے بعد رام پور کی ادبی خدمات کا ذکر مقصود ہے، اس لیے قبل آزادی کی تصنیفات کے بارے میں کچھ لکھنا بے موقع ہے اور صرف آزادی کے بعد جو کچھ ادبی اور علمی کاوش یہاں ہوئی ہے انھیں اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان میں جو سیاسی انقلاب رونما ہوا، یہاں کی ثقافت پر بھی اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ بالخصوص اردو، فارسی اور عربی کے اہلِ قلم کو خاصی دشواریوں سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن خاتمۂ ریاست کی بنا پر اہلِ رام پور کو کچھ عرصہ تک معاشی مشکلات سے بھی سابقہ پڑا اور تصنیف و تالیف کا کام رک سا گیا۔ بہرحال شاعری کا بازار گرم رہا۔ غمِ جاں سے زیادہ غمِ دوراں نے شعرگوئی پر مجبور کیا۔ مشاعرے کا آغاز تو ۱۷۷۴ء سے رام پور میں ہوگیا تھا جبکہ اس نئے شہر کو دارالریاست کے طور پر آباد کیا گیا تھا اور قائم چاندپوری اپنے شاگرد نواب محمد یار خاں امیر کے ساتھ یہاں مستقلاً آگئے تھے۔ چنانچہ شاعروں میں اور شاعروں کی تعداد میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ البتہ نثرنگاری کی طرف توجہ کم ہوگئی۔

حالات درست ہونے اور حکومت کی اہلِ قلم کو سرکاری امداد اور تصانیف پر انعامات نے تصنیف و تالیف کے سلسلے میں شاعروں اور ادیبوں کی بڑی حد تک ہمت افزائی کی اور نظم و نثر میں اس چھوٹے سے شہر میں کافی ادبی خدمات ہونے لگیں جس کا اندازہ زیرِ قلم فہرست سے ہوسکتا ہے۔ طباعت کی سہولیات کی کمی اور گرانی کی بنا پر ابھی خاصی تعداد میں اہلِ قلم کی کاوشیں زیورِ طبع سے محروم ہیں۔

راقم الحروف نے پیرانہ سالی اور علالت کے باوجود کوشش کر کے یہ معلومات حاصل کی ہیں۔ اسے مکمل نہیں کہا جاسکتا۔ بہرحال اس سے رام پور کی ادبی خدمات کا اندازہ ہوسکے گا۔ علاوہ تصانیف کے رسائل اور اخبارات کی بھی فہرست شامل کی گئی ہے جو آزادی کے بعد جاری ہوئے۔ نیز ادبی انجمنوں اور اداروں کا بھی ذکر ضروری سمجھ کر کیا گیا ہے۔

نظم :- (دواوین و مجموعہ ہائے کلام)

۱- جذباتِ محمود۔ افضل الشعراء محمود علی خاں محمود شاگرد داغ متوفی ۱۹۳۴ء مرتبہ ابراہیم علی خاں مہر مطبوعہ ۱۹۵۳ء

۲- مہرِ تاباں۔ ابراہیم علی خاں مہر شاگرد محمود رامپوری مرحوم ۱۹۷۰ء

۳- سفینہ چاہیے۔ مجموعۂ کلام احمد علی خاں شاد عارفی مطبوعہ ۱۹۶۵ء

۴- تجلّیات۔ ابراہیم علی خاں بدر تسلیمی متوفی مطبوعہ ۱۹۵۶ء

۵- کیفِ تمام۔ جلیل احمد خاں جلیل متوفی ۱۹۸۵ء مطبوعہ ۱۹۶۴ء

۶- کربِ شب۔ واحد علی خاں واحد القادری مرحوم مطبوعہ ۱۹۸۴ء

۷- خود کلامی۔ اظہر علی خاں اظہر عنایتی مطبوعہ ۱۹۸۰ء

۸- احساس۔ رئیس الرحمٰن خاں رئیس رامپوری مطبوعہ ۱۹۸۸ء

۹- فاصلے۔ عثمان علی خاں شوق اثری مطبوعہ ۱۹۶۵ء

۱۰۔ ڈھنک۔ سعادت علی خاں نازش نیازی مطبوعہ ۱۹۸۰ء

۱۱۔ متاعِ فکر۔ سید فیاض علی عروج زیدی بدایونی ثم رام پوری (متوفی ۱۹۸۰ء) مطبوعہ ۱۹۸۵ء

۱۲۔ جھلکیاں۔ " " " " ۱۹۵۳ء

۱۳۔ شمع فروزاں۔ " " " " ۱۹۶۷ء

۱۴۔ صہبائے سخن صابر رضا خاں محشر عنایتی (متوفی ۱۹۷۶ء) " ۱۹۶۹ء

۱۵۔ دیہات رس " " " "

۱۶۔ نقشِ قدم سید محمد میاں ذوقی (متوفی ۱۹۸۲ء) " ۱۹۶۲ء

۱۷۔ رنگ اشک۔ صاحبزادہ واجد علی خاں عرف اچھن صاحب (متوفی ۱۹۵۸ء) " ۱۹۶۲ء

۱۸۔ رنگ روپ۔ جمیل الرحمٰن خاں صبا افغانی مرحوم " ۱۹۷۱ء

۱۹۔ ماہ و انجم۔ اظہار حسین خاں اظہار رام پوری (متوفی ۱۹۶۲ء) " ۱۹۶۳ء

۲۰۔ لمحوں کا حصار۔ آفتاب شمسی سابق صدر شعبۂ اردو رضا ڈگری کالج رام پور " ۱۹۷۵ء

۲۱۔ نوائے شوق۔ یوسف علی خاں یوسف (متوفی ۱۹۶۶ء) " ۱۹۶۵ء

۲۲۔ سمندر در سمندر۔ قیس رام پوری ۱۹۸۶ء

۲۳۔ چمن جاگے۔ سید نجم الدین نقوی مرحوم ۱۹۶۴ء

۲۴۔ باغِ تازہ۔ " " " " ۱۹۶۶ء

۲۵۔ نغمۂ روح افزا۔ " " " " ۱۹۶۸ء

۲۶۔ مشعلِ جاں۔ مرزا محسن برلاس محسنی (متوفی ۱۹۹۴ء) " ۱۹۸۹ء

۲۷۔ سفینۂ غزل۔ سید عروج زیدی (متوفی ۱۹۸۰ء) " ۱۹۶۵ء

۲۸۔ عکسِ بادہ۔ غلام جیلانی خاں ساغر جیلانی (متوفی ۱۹۸۸ء) " ۱۹۶۶ء

۲۹۔ اشک و تبسم۔ سنتوش کمار سکسینہ موج " ۱۹۶۶ء

۳۰۔ ویرانیاں۔ نفیس الرحمٰن خاں دور آفریدی مرحوم " سنہ

۳۱۔ تشنگی۔ مرزا عابد علی بیگ سحر (متوفی ۱۹۸۷ء) " ۱۹۶۸ء

۳۲۔ منزل کی طرف۔ رگھبیر سرن دواکر راہی " ۱۹۶۹ء

۳۳۔ چراغِ منزل۔ " " " " ۱۹۸۱ء

۳۴۔ میں بھی شاعر (طنز و مزاح) قیصر شاہ خاں استاد رام پوری (متوفی) مطبوعہ ۱۹۷۰ء

۳۵۔ سخن اکبر علی خاں عرشی زادہ (زیر طبع)

۳۶۔ آشوبِ آگہی۔ سید رفیع الدین سالک رحمانی مرحوم مطبوعہ ۱۹۶۵ء

۳۷۔ قیدِ حیات و بندِ غم۔ شکیل شمسی مطبوعہ ۱۹۸۵ء

۳۸۔ سلامِ گل ادا۔ دل عارفی مرحوم " ۱۹۹۴ء

۳۹۔ سرخرو۔ سید محمد علی موج " ۱۹۹۵ء

۴۰۔ سنہری آنچل۔ واجد سحری " ۱۹۸۳ء

۴۱۔ مرصع حلم۔ سید وقار حلم " ۱۹۹۴ء

۴۲۔ اثاثۂ منصور۔ سید زین العابدین منصور مرتبہ سید نذر الحسن " ۱۹۶۳ء

۴۳۔ مسدس بے نظیر۔ میر یار علی جان صاحب مرتبہ مع مقدمہ از محمد علی خاں اثر رام پوری مرحوم " ۱۹۵۸ء

۴۴۔ خاکِ پروانہ۔ ارمان رام پوری " ۱۹۶۶ء

۴۵۔ بہاراں۔ ادب فیضی مرحوم " ۱۹۶۴ء

۴۶۔ آئینہ در آئینہ۔ " " " ۱۹۶۴ء

۴۷۔ موسمِ گل کے آنے تک۔ شبیر علی خاں شکیب " ۱۹۶۳ء

۴۸۔ درد کی سوغات۔ " " " " زیر طبع

۴۹۔ متاعِ شکیب " " " " "

۵۰۔ سوگوار لمحے " " " " "

۵۱۔ ہچکیاں راہی ٹانڈوی " ۱۹۷۰ء

۵۲۔ انتخاب کلامِ بیدار۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار " ۱۹۶۹ء

۵۳۔ زمزم و فرات۔ شرافت یار خاں ہوش نعمانی " سنہ

۵۴۔ گھاؤ شبدوں کے۔ " " " " "

۵۵۔ کائنات۔ " " " " "

۵۶۔ شہادت نامہ مسدس مرثیہ " " " "

۵۷۔ زندہ دلاں (منظوم خاکے) " " " "

۵۸۔ ادب گاہِ رام پور (منظوم خاکے) " " " "

۵۹۔ انتخاب کلام نظام رام پوری مرتبہ شبیر علی خاں شکیب غیر مطبوعہ

۶۰۔ انتخاب کلام قائم چاند پوری " " " " "

۶۱- انتخاب کلام عرشی مرتبہ شبیر علی خاں شکیب غیر مطبوعہ

۶۲- انتخاب کلام شبیر " " " "

۶۳- کلیات شاد عارفی رام پوری مرتبہ مظفر حنفی مطبوعہ ۱۹۷۵ء

نثر (اردو)

۱- فرہنگ غالب (غالب کی تصنیفات میں سینکڑوں الفاظ کے معانی سے بحث کی گئی ہے)
مرتبہ: امتیاز علی خاں عرشی مطبوعہ اگست ۱۹۴۷ء

۲- مکاتیب غالب۔ (آخری ساتواں ایڈیشن مع مزید خطوط و حواشی)
مرتبہ: امتیاز علی خاں عرشی مطبوعہ ۱۹۴۹ء

۳- دیوانِ غالب نسخۂ عرشی " " " ۱۹۵۸ء

۴- وقائع عالم شاہی از منور ہریم کشور فراقی " ۱۹۴۹ء
(جب شاہ عالم نے مرہٹوں پر چڑھائی کی تو فوج میں افسر تھا۔ اس دور کا قیمتی تاریخی ماخذ)

۵- سلک گوہر تیغنیغ مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی " ۱۹۴۳ء

۶- تاریخ محمدی از مرزا محمد حارثی بدخشی دہلوی " " ۱۹۶۰ء
(مولانا نے ۱۱۰۰ھ سے ۱۱۶۰ھ تک کی وفیات کے حصہ کو جو مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا۔ مخزونہ رضا ہے۔ مفید حواشی کے ساتھ مرتب کیا ہے)

۷- تاریخ اکبری عرف تاریخ قندھاری مرتبہ عرشی مطبوعہ ۱۹۶۲ء
(عہد اکبری کے ایک درباری کی لکھی ہوئی تاریخ۔ مولانا نے رام پور اور کیمبرج کے نسخوں کو سامنے رکھ کر متن تیار کیا ہے)

۸- تاریخ بابری از زین الدین خوافی وفائی مرتبہ عرشی
(یہ تزک بابری کے بعد اس دور کی اہم ترین تاریخ ہے۔ مولانا نے اس کے تین دستیاب خطی نسخوں پر اس کے متن کی بنیاد رکھی ہے)
(مطبوعہ زیر سرپرستی وزارت تعلیم ہند)

۹- دیوانِ غالب نسخۂ عرشی (کلام متداول) مرتبہ عرشی مطبوعہ ۱۹۶۸ء

۱۰- امیر خسرو کا فارسی تلفظ " " ۱۹۶۳ء

۱۱- مقالات عرشی " " ۱۹۶۰ء

۱۲- تاریخی ترتیب دیوانِ غالب نسخۂ عرشی " " ۱۹۵۸ء

۱۳- مسودہ قاطع برہان " بالاقساط رسائل میں شائع ہو چکا ہے
(غالب نے برہانِ قاطع کے جس نسخے کے حاشیے پر اپنے اعتراضات لکھے تھے وہ رضا لائبریری میں موجود ہے۔ غالب نے قاطع برہان میں سب اعتراضات نقل نہیں کیے ہیں۔ مولانا نے سب حواشی کو مع تبصرہ و محاکمہ پیش کیا ہے)

۱۴- اردو اور افغان (اردو پر پشتو کا اثر) مرتبہ عرشی مطبوعہ ۱۹۶۱ء

۱۵- عرشی صاحب کے خطوط (مرتبہ ڈاکٹر زکیہ جیلانی) " ۱۹۸۹ء

۱۶- دیوان مومن (دیوان غالب نسخۂ عرشی کے انداز پر مرتب کیا گیا ہے) " غیر مطبوعہ

۱۷- انتخاب کلام ناظم۔ مرتبہ عرشی "

۱۸- نفائس المآثر۔ مصنفہ میر علاء الدولہ قزوینی " "
(عہد اکبری کے شعراء کا تذکرہ ہے) " "

۱۹- باغ دودر۔ (غالب نے اپنی وفات سے قبل سبد چین کا دوسرا ایڈیشن اس نام سے مرتب کیا تھا۔ اس میں فارسی نظم و نثر دونوں شامل ہیں۔ مولانا نے مفصل حواشی قلم بند کیے ہیں۔) " "

۲۰- مکاتیب غالب فارسی (غالب کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ فارسی خطوط کے تاریخی ترتیب سے جمع کر کے ان کے متن کی مشہور مآخذ سے تصحیح کی گئی ہے) " "

۲۱- تحفۃ الہند از مرزا خاں ابن فخر الدین احمد " "
(مصنف اورنگ زیب عالمگیر کا معاصر تھا۔ اس نے ہندی زبان کے علم لسان، عروض، معانی و بیان، موسیقی اور فراست الید وغیرہ پر قیمتی معلومات جمع کی ہیں۔) "

۲۲- اسلام میں تجارت کا درجہ روزنامہ آغاز رام پور، ۲۷/۲۸ فروری ۱۹۴۳ء

۲۳- پشتو میں تذکیر و تانیث — مولانا عرشی — اورنٹیل کالج میگزین لاہور مئی ۱۹۴۳ء

۲۴- وفا رام پوری۔ ایک گمنام شاعر (عبدالہادی خاں وفا) — " — برہان دہلی ۱۹۴۹ء

۲۵- غالب کی شعر گوئی اور ان کے دواوین — " — علی گڑھ میگزین غالب نمبر ۱۹۴۹ء

۲۶- کتب خانے کے آداب — " — ہفتہ وار نئی روشنی دہلی یکم فروری ۱۹۴۹ء

۲۷- اردو شاعری پر غالب کا اثر — " — ماہنامہ فاران کراچی ۱۹۴۹ء

۲۸- اردو زبان کی بناوٹ میں افغانوں کا اثر — " — معارف اعظم گڑھ مارچ تا مئی ۱۹۴۹ء

۲۹- غالب کے فارسی خطوط۔ ایک نئی تحقیق — " — ماہ نو کراچی فروری ۱۹۵۰ء

۳۰- اقبال کے چار شعر — " — نئی روشنی دہلی ۱۴ اکتوبر ۱۹۴۹ء

۳۱- خط نستعلیق — " — یکم جون ۱۹۵۰ء

۳۲- مرزا غالب کی تعلیم۔ تحقیق و اجتہاد کے دوراہے پر — " — فاران کراچی فروری ۱۹۵۰ء

۳۳- دیوان مخلص کا ایک نادر نسخہ — " — برہان دہلی ستمبر ۱۹۵۰ء

۳۴- آنند رام مخلص کے اردو شعر — " — معاصر پٹنہ حصہ ۱۔ مئی ۱۹۵۱ء

۳۵- غالب کی اپنے کلام پر اصلاحیں — " — آجکل دہلی فروری ۱۹۵۲ء

۳۶- کچھ داغ کے بارے میں — " — خاور ڈھاکہ مارچ ۱۹۵۳ء

۳۷- کلیات طالب آملی (آملی کے خطی نسخوں کا تعارف) — " — برہان دہلی دسمبر ۱۹۵۳ء

۳۸- اِنّہ من سلیمان (مولانا سلیمان ندوی کے ۱۲ خطوط بنام عرشی) — " — ریاض کراچی اپریل ۱۹۵۴ء

۳۹- دیوان ابوطالب کلیم (کلیم کا مجموعۂ اشعار مخزونہ رضا لائبریری) — " — برہان دہلی فروری ۱۹۵۴ء

۴۰- شاعر کا قول و عمل — " — معیار تنقید نمبر میرٹھ ۱۹۵۴ء

۴۱- نہج البلاغہ کا استناد (مولانا نے قدیم ماخذ کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ یہ رضی کا جعل نہیں ہے۔) — مرتبہ: مولانا عرشی — فاران کراچی مئی ۱۹۵۴ء

۴۲- مولانا فضل حق خیرآبادی کا فتویٰ جہاد — " — تحریک دہلی اگست ۱۹۵۸ء

۴۳- غالب کی چند نئی اردو تحریریں — " — شاعر بمبئی مارچ اپریل ۱۹۵۹ء

۴۴- دیوان غالب کا ایک اور نادر نسخہ — " — نقوش لاہور جون ۱۹۶۰ء

۴۵- ایک قلمی کتاب کی سرگزشت — " — نیا دور لکھنؤ نومبر ۱۹۶۰ء

۴۶- نسخۂ حمیدیہ اور بجنوری — " — " مئی ۱۹۶۱ء

۴۷- دیوان ناسخ کا ایک اہم نسخہ — " — صحیفہ لاہور اکتوبر ۱۹۶۱ء

۴۸- کلیات میر کا ایک نادر نسخہ — " — دہلی کالج میگزین میر نمبر ۱۹۶۲ء

۴۹- دیوان غالب کا اردو نسخۂ عرشی — " — نقوش لاہور جون ۱۹۶۴ء

۵۰- دیوان مومن کا ایک نادر مخطوطہ (مومن کے ذاتی نسخۂ مخزونہ رضا کا تعارف) — " — آجکل دہلی دسمبر ۱۹۶۵ء

۵۱- صوفیا کے اہم تذکرے (رضا لائبریری رام پور نے جداگانہ ۱۹۶۹ء میں بھی اسے چھاپ دیا ہے) — " — اسلام اور عصر جدید اپریل ۱۹۶۹ء

۵۲- ہندو اہل قلم کی اہم تصنیفات کتب خانہ رام پور (رضا) میں — " — ۱۹۷۰ء

۵۳- کتابوں کا تاج محل (رضا لائبریری رام پور کے بارے میں) — " — آجکل ستمبر ۱۹۷۰ء

۵۴- عمر خیام اور خاقانی کا رشتہ — " — تحریک دہلی اپریل ۱۹۷۰ء

۵۵- ازبکستان اور برصغیر پر اس کے تہذیبی اور ثقافتی اثرات — مولانا عبدالسلام خاں (زیر طبع) سابق پرنسپل گورنمنٹ اورنٹیل کالج رام پور

۵۶- مصحفی اور اس کے دیوان کا رامپوری نسخہ — " — مطبوعہ

۵۷- عرشی صاحب۔ جیسا میں نے پایا اور جانا — غالب نامہ عرشی نمبر ۱۹۹۴ء

۵۸- برصغیر کے علمائے معقولات اور ان کی تصنیفات — " — (زیر طبع)

۵۹۔ علوم مشرقیہ کے فروغ میں رام پور کا حصہ — مولانا عبدالسلام خاں — ,, مشمولہ جرنل رضا لائبریری رام پور

۶۰۔ ہندوستانی معاشرے کو صوفیا اور بھگتوں کی دین — ,, ,, ۱۹۸۵ء

۶۱۔ شنکراچاریہ کا اُپ نشدی وحدت الوجود اور مسلم صوفیا کی تعبیر — ,, ,, ,,

۶۲۔ ابن عربی کا نظریۂ وحدت الوجود — ,, مشمولہ نذر ذاکر

۶۳۔ ذوالقرنین اور کورش — ,, مشمولہ نذر حمید

۶۴۔ اشک رام پوری — ,, آجکل دہلی جنوری ۱۹۷۰ء
(صاحبزادہ واجد علی خاں عرف اچھن صاحب نبیرۂ نواب یوسف علی خاں کا تعارف)

۶۵۔ عرفانیات رومی — ,, مشمولہ نذر زیدی

۶۶۔ اقبال کی تاریخ پیدائش — ,, ہماری زبان ۱۹۷۷ء

۶۷۔ اسلامیات مصنفہ مالک رام پر تبصرہ — ,, مشمولہ مالک رام ایک مطالعہ مرتبہ علی جواد زیدی

۶۸۔ ہندوستان اور مغرب میں فلسفہ کی شرح نگاری — مولانا عبدالسلام خاں مشمولہ جرنل رضا لائبریری ۱۹۸۹ء

۶۹۔ اقبال کا نظریۂ دینیات — ,, پیغام حق لاہور

۷۰۔ اقبال کا نظریۂ اخلاقیات — ,, معارف اعظم گڑھ

۷۱۔ اقبال کا نظریۂ ریاست — ,, ,,

۷۲۔ اقبال کا نظریٔ ارتقاء — ,, نگار رامپور اپریل ۱۹۶۳ء

۷۳۔ اقبال کے اقتصادی تصورات (مالک رام کی ۶۵ ویں سالگرہ پر) — ,, مشمولہ ارمغان مالک ۱۹۷۱ء

۷۴۔ اقبال کے مابعد الطبیعاتی افکار کا ارتقا — ,, معارف اعظم گڑھ جنوری، فروری ۱۹۷۰ء

۷۵۔ ابن سینا کے فلسفہ پر اقبال کی رائے پر تنقید — ,, معارف ستمبر اکتوبر ۸۳ء

۷۶۔ اقبال کی شاعری میں فرد اور جماعت کا تصور — ,, کتاب نما دہلی اپریل ۱۹۸۳ء

۷۷۔ اقبال اور برگساں (ایک تقابلی مطالعہ) — مولانا عبدالسلام خاں — ,, معارف اعظم گڑھ

۷۸۔ اقبال اور نطشے (ایک تقابلی مطالعہ) — ,, غیر مطبوعہ

۷۹۔ اقبال اور نطشے (,, ,, ,,) — ,, ,,

۸۰۔ اقبال اور ابن عربی (,, ,, ,,) — ,, برہان دہلی

۸۱۔ افکار رومی (رومی کے تصور الہیات پر سب سے پہلی جامع تصنیف جس پر بنگال اردو اکاڈمی نے انعام سے نوازا) — ,, مطبوعہ

۸۲۔ تقریب القرآن (تفسیر قرآن جس پر اردو اکادمی اترپردیش نے انعام دیا) — ,, مطبوعہ ۱۹۹۲ء

۸۳ قواعد صرف اردو از پروفیسر فدا علی خاں رام پوری — زیر طبع باہتمام خدا بخش لائبریری پٹنہ
(مولانا نے اس کی ترتیب و تکمیل کی ہے)

۸۴۔ 'اور زرتشت نے کہا' (مولانا نے ترجمہ کیا ہے) — ,, ماہنامہ ہمدرد جوہر

۸۵۔ مولانا محمد علی جوہر اور قومی یکجہتی — ,, ,,

نوٹ: ان کے علاوہ ہزاروں صفحات پر مشتمل مختلف علمی و ادبی مضامین اور ریڈیائی تقریریں ہیں۔

۸۶۔ ترجمہ: بین الافادۃ والقبول از شاہ محب اللہ الہ آبادی — مترجم مولانا عبدالسلام خاں — فکر و نظر علی گڑھ

نثر (عربی میں)

۸۷۔ دیوان الحادرہ از قطبہ بن اوس الغازی الفزاری
(قطبہ جاہلی شاعر کا یہ دیوان جرمن مستشرق ڈاکٹر نکلسن نے پچھلی صدی میں شائع کیا تھا۔ مولانا عرشی نے رام پور، قاہرہ اور لندن کے نسخوں کو سامنے رکھ کر اس کی تصحیح کی ہے اور بعض دوسرے ماخذوں سے اس میں کچھ اشعار کا اضافہ کیا ہے۔) — مرتبہ مولانا عرشی مطبوعہ قاہرہ ۱۹۴۹ء

۸۸ - تفسیر قرآن الکریم مرتبہ مولانا عرشی مطبوعہ
الامام سفیان ثوری الکوفی باہتمام وزارت تعلیم حکومت ہند ۱۹۶۵ء
(امام سفیان ثوری (متوفی ۱۶۱ھ/ ۷۷۷ء) کی تفسیر کی اشاعت علمی دنیا کا قابل فخر کارنامہ ہے۔ سورہ بقرہ سے سورہ طور تک کا نامکمل مخطوطہ رضا لائبریری رام پور میں دریافت کر کے مولانا نے پورے اہتمام اور حواشی کے ساتھ شائع کیا ہے)

۸۹ - دیوان ابی محجن - لعمرو بن حبیب الثقفی الصحابی " مشمولہ مجلہ ثقافۃ الہند دہلی ۱۹۵۲ء
(عمرو بن حبیب صدر اسلام کا شاعر ہے۔ ۳۰ھ میں فوت ہوا۔ خمریات کا بلند پایہ شاعر تسلیم کیا گیا ہے۔ مولانا نے قدیم نسخوں کو سامنے رکھ کر اسے ترتیب دیا ہے۔)

۹۰- الامثال السائرہ من شعر المتنبی " " ستمبر ۱۹۵۲ء و مارچ تا جون ۱۹۵۴ء
مولفہ لابی قاسم وزیر فخر الدولہ دیلمی
(مولف پہلے متنبی کا کٹر مخالف تھا۔ بعد میں اس قدر مداح ہو گیا کہ یہ کتاب تالیف کی۔ اس میں متنبی کے اشعار کو پیش کیا ہے جو ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ مولانا عرشی نے اسے عمدگی سے ترتیب دیا ہے۔)

۹۱- قصیدہ لامیۃ الہند از عبد المقتدر بن محمود الکندی الدہلوی " " ستمبر ۱۹۵۰ء

۹۲- قصیدہ الدالیہ - شیخ احمد التھانیسری " جون ۱۹۵۲ء
(شیخ احمد تھانیسری عربی کے قادر الکلام شاعر تھے)

۹۳- فصل الخطاب بعمر بن الخطاب - " غیر مطبوعہ
(افسوس ہے کہ حضرت عمرؓ کے خطبات کو جس محنت سے مرتب کیا۔ ان کی زندگی میں طبع نہ ہو سکے)

۹۴- شواہد القرآن - لامام ابن جریر الطبری " غیر مطبوعہ
۲ جلدوں میں ہے۔ مرتبہ مولانا عرشی غیر مطبوعہ
(امام طبری نے اپنی تفسیر میں جو ہزاروں اشعار بطور استناد و استشہاد درج کیے ہیں۔ مولانا عرشی نے انھیں یکجا کر دیا ہے۔)

۹۵- دیوان النمر - (النمر (متوفی تقریباً ۱۴ھ/ ۶۳۵ء) کے اشعار کا مجموعہ مختلف ماخذوں سے) " غیر مطبوعہ

۹۶- رسالہ فی اختلاف الملل فی العربیۃ والامۃ " غیر مطبوعہ

۹۷- فلسفہ وید (عربی میں) مولانا عبد السلام خاں مشمولہ مجلہ ثقافۃ الہند
حسب الارشاد مولانا ابو الکلام آزاد " دہلی شمارہ جات ۱۹۵۳ء و بعد ازاں

۹۸- فلسفہ چیرک " " " " "

۹۹- فلسفہ اپنشد " " " " "

۱۰۰- فلسفہ بدھ مذہب " " " " "

۱۰۱- فلسفہ جین دھرم " " " " "

۱۰۲- مجموعہ الفاظ معرب و مستعار (عربی زبان میں) " غیر مطبوعہ

۱۰۳- فلسفہ منو بھارت (عربی میں) " " مشمولہ مجلہ ثقافۃ الہند ۱۹۹۰ء

۱۰۴- افکار اقبال (اتر پردیش اردو اکادمی کا انعام) " مطبوعہ ۱۹۹۱ء

۱۰۵- توقیتی تضاد (ایک معرکۃ الآرا تحقیق) مولوی اسحاق النبی نقوش سیرت نمبر لاہور

۱۰۶- دیوان غالب بخط غالب نسخہ عرشی زادہ اکبر علی خاں عرشی زادہ ۱۹۶۹ء

۱۰۷- استدراک مشمولہ دیوان غالب نسخہ عرشی طبع ثانی و ثالث " " ۱۹۸۲ و ۱۹۹۲ء

۱۰۸- پھیڑ غالب سے چلی جائے " ۱۹۶۵ء

۱۰۹- اقبال اور ان کے اہل و عیال " شاعر اقبال نمبر ۱۹۸۸ء

۱۱۰- عطیۂ شبلی (شبلی کے فارسی کلام کا منظوم ترجمہ) " تحریک دہلی ۱۹۶۸ء

۱۱۱- غالبیہ (غالب سے متعلق ان کے ہمعصر شعرا و ادبا کی تحریروں کا مجموعہ) " مطبوعہ ۱۹۶۳ء

۱۱۲- رشید حسن خاں کی تحقیقی غلطیاں " نقوش لاہور ۱۹۶۵ء

۱۱۳- سحر البیان اور اس کا مصنف " درس علی گڑھ ۱۹۵۵ء

۱۱۴- قاعدہ عرشی زادہ حصہ اول و دوم " " ۱۹۹۴ء

۱۱۵۔ الف بائے فارسی — اکبر علی خاں عرشی زادہ — درس علی گڑھ
(اردو کے قدیم ترین قاعدے کا تعارف) — مطبوعہ ۱۹۸۷ء
۱۱۶۔ رام پور کا دبستانِ شاعری — شبیر علی خاں شکیب — زیر طبع
(قیامِ ریاست سے دورِ موجودہ تک) — (رضا لائبریری رام پور)
۱۱۷۔ چار بیت — " — زیر طبع
(چار بیت پر تحقیقی مقالہ مع دو صد سالہ کلام)
۱۱۸۔ نظام رام پوری۔ حیات اور شاعری — " — خدا بخش لائبریری پٹنہ
۱۱۹۔ قائم چاند پوری۔ شخصیت اور فن — " — غیر مطبوعہ
۱۲۰۔ تنقیدی جائزہ۔
"شاد عارفی۔ شخصیت اور فن" تحقیقی مقالہ از مظفر حنفی۔ تہذیب کراچی ۹۵ء
قسط وار زیر طبع
۱۲۱۔ صوفیا اور بھگتی سنتوں کے ہندوستانی — " — جنرل رضا لائبریری
تہذیب پر اثرات — " — رام پور ۱۹۹۵ء
۱۲۲۔ حکیم غلام نبی خاں غربت رام پوری — " — تحریک دہلی
۱۲۳۔ شعرائے خاندان نوابین رام پور — " — غیر مطبوعہ
۱۲۴۔ موسیقی کا رام پور گھرانہ — " — زیر طبع
۱۲۵۔ رام پور کے فارسی گو شعراء — " — غیر مطبوعہ
۱۲۶۔ میرا علی گڑھ (۱۹۴۳ء تا ۱۹۴۸ء) — " — زیر طبع
۱۲۷۔ روہیلوں کا عروج و زوال — " — زیر ترتیب
۱۲۸۔ نظام رام پوری از شاد عارفی کا — " — نقوش لاہور
تنقیدی جائزہ — زبان و ادب پٹنہ
۱۲۹۔ نظام رام پوری اور شاگردیِ غالب — شبیر علی خاں شکیب — ماہی لف و نشر رام پور ۱۹۹۵ء
۱۳۰۔ میر سے منسوب کلام کی حقیقت — " — ہماری زبان ۱۹۷۶ء
۱۳۱۔ مولانا محمد علی جوہر کا وطن — " — " "
۱۳۲۔ دو ہمعصر شاعر مولانا محمد علی جوہر — " — زیر طبع
اور علامہ اقبال — " — "
۱۳۳۔ میرے عرشی صاحب۔ کچھ یادیں کچھ باتیں — " — غالب نامہ عرشی نمبر
۱۳۴۔ مہارانا پرتاپ۔ جدید تحقیق کی روشنی میں — " — تقریر ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ

۱۳۵۔ امیر خسرو۔ ایک عہد ساز شخصیت — شبیر علی خاں شکیب — ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ
۱۳۶۔ مولوی اسحٰق النبی علوی کا کارنامہ — " — نقوش لاہور
(توفیقی تضاد کے معمہ کا حل) — " — تیسیر نمبر و مجلہ ثقافۃ الہند
۱۳۷۔ رام پور کی سیاسی تحریکات ۱۹۳۰ء تا ۱۹۴۷ء — " — زیر ترتیب
۱۳۸۔ محشر عنایتی۔ جشنِ محشر میں پڑھا گیا) — " — مشمولہ جشن بہاراں نمبر
۱۳۹۔ جلیل نعمانی رام پوری (جشن جلیل نعمانی میں — " — "
۱۴۰۔ قرآن۔ الٰہی زبان — "
(ایک غیر مسلم متلاشی حق کی فرمائش پر) — غیر مطبوعہ
۱۴۱۔ شاعر اعظم نظیر اکبر آبادی (برائے فیچر فلم) — " — مراد رامپوری کے فلم کے لیے
۱۴۲۔ چاند سلطانہ (اسٹوری برائے فلم) — " — غیر مطبوعہ
۱۴۳۔ ڈرامہ زیب (برنارڈ شا کے ڈرامہ — "
کینڈرا کا اردو ورژن — "
(مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ۱۹۴۷ء میں اسٹیج "
کیا گیا)
۱۴۴۔ تصویر کا تیسرا رُخ۔ مجموعہ افسانہ — " — غیر مطبوعہ
۱۴۵۔ مولانا عرشی بحیثیت شاعر مع انتخاب کلام — " — غیر مطبوعہ
۱۴۶۔ شاد عارفی کے معاشقے۔ افسانہ اور حقیقت — " — تحریک دہلی جوبلی نمبر
۱۴۷۔ رام پور کے مہمان شعراء — " — روزنامہ قومی جنگ رامپور
۱۴۸۔ آثار الصنادید۔ ایک مطالعہ — " — غیر مطبوعہ
۱۴۹۔ قائم چاند پوری مرزا غالب کی نظر میں — " — زیر طبع
۱۵۰۔ ڈرامہ انارکلی مصنفہ امتیاز علی تاج۔ ایک مطالعہ — " — غیر مطبوعہ
۱۵۱۔ رام پور تہذیب و تمدن کے آئینے میں — " — "
۱۵۲۔ یادش بخیر۔ صولت علی خاں مرحوم — " — اردو سروس دہلی سے نشر ہوا۔
۱۵۳۔ ہندوستانی آئین اور انسانی حقوق — " — غیر مطبوعہ
۱۵۴۔ — " — "
(رام پور کی ادبی تاریخ) — " — "
۱۵۵۔ اردو تحریک کا معرکۂ بدر — " — روزنامہ ناظم رامپور
۱۵۶۔ میرا وطن — ہوش نعمانی — مطبوعہ ۱۹۶۰ء
۱۵۷۔ مولانا محمد علی جوہر — ڈاکٹر ظہیر صدیقی — مطبوعہ

۱۵۸۔ افسانوں کے معمار — ڈاکٹر ظہیر صدیقی — مطبوعہ

۱۵۹۔ پلکوں سے پلکوں تک (مجموعہ افسانہ) محترمہ نکہت افلاک — "

۱۶۰۔ رئیس رام پوری۔ شاعری اور زندگی — اظہر مسعود خاں — مطبوعہ ۱۹۸۸ء

۱۶۱۔ سیفینے — ابرار حسنی — " ۱۹۵۲ء

۱۶۲۔ مولانا سید محمد شاہ نقوی محدث رام پوری — سید بہاء الحق رضوی — معارف اعظم گڑھ فروری ۱۹۸۰ء

۱۶۳۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا رام پور سے سیاسی و علمی رشتہ — " — الرشاد اعظم گڑھ مئی، جون ۱۹۹۲ء

۱۶۴۔ خطیب اعظم و محدثی اصول — " — ماہنامہ یادوجیہہ رامپور

۱۶۵۔ مولانا امتیاز علی عرشی — " — تہذیب الاخلاق علی گڑھ

۱۶۶۔ یادِ ایام (علی گڑھ کی یاد میں) — " — مطبوعہ

۱۶۷۔ مولانا عبدالدائم جلالی — " — مشمولہ حیات جلالی

۱۶۸۔ نواب یوسف علی خاں۔ بحیثیت فرمانروا — بشارت علیخاں فروغ — ماہنامہ ضیاء وجیہہ اگست ۱۹۹۴ء

۱۶۹۔ راز یزدانی رام پور (خاکہ) — " — آج کا اعلان ۲۰ نومبر ۱۹۸۸ء

۱۷۰۔ شوق اثری۔ شخصیت اور شاعری — " — " مطبوعہ روزنامہ ناظم رامپور

۱۷۱۔ حضرت محشر عنایتی (خاکہ) — " — روزنامہ ناظم ۹ اگست ۸۲ء

۱۷۲۔ میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند — " — ۱۳ مارچ ۱۹۸۷ء

۱۷۳۔ پروفیسر ذکاء الرحمٰن صدیقی (شخصی خاکہ) — " — ۴ جنوری ۱۹۷۶ء

۱۷۴۔ میں بھی حاضر تھا وہاں (تبصرہ) — "

۱۷۵۔ یادِ رفتگاں — " — (زیر ترتیب)

۱۷۶۔ نوبہار — ڈاکٹر زہرہ عرشی — ۱۹۷۶ء

۱۷۷۔ ذکر و زباں — دور آفریدی (مرحوم) — ۱۹۸۷ء

۱۷۸۔ مکاتیب معاصرین — " — ۱۹۷۸ء

۱۷۹۔ نظام رام پوری — " — مطبوعہ

۱۸۰۔ نثر کا حسن — مرتبہ ڈاکٹر عابد رضا بیدار — ۱۹۶۸ء

۱۸۱۔ قندیلِ حرم — مسرت حسین خاں آزاد — ۱۹۶۷ء

۱۸۲۔ قلمرو (مجموعۂ مضامین طنز و مزاح) — محمد ذاکر علی خاں — ۱۹۷۴ء

۱۸۳۔ میاں کی اٹریا دلچسپ پیرایہ بیان۔ سفرنامہ — "

۱۸۴۔ رختِ سفر — محمد ذاکر علی خاں — ۱۹۸۵ء

۱۸۵۔ حضرت شاہ بلاقیؒ مراد آباد (حالات) — سید نذر الحسن قادری — روزنامہ ناظم رام پور ۱۹۹۰ء

۱۸۶۔ سید رستم علیؒ رام پوری — " — " ۱۹۸۵ء

۱۸۷۔ حضرت جمال الدینؒ رام پوری — " — " ۱۹۹۱ء

۱۸۸۔ سخن ساز خطوط — تدبر تسلیمی — ۱۹۸۲ء

۱۸۹۔ نئی کہانی (انتہائی مختصر کہانی) — مسعود الظفر خاں
(مصنف کی ۴۰ مختصر ترین کہانیاں مختلف رسائل اور اخبارات میں آزادی کے بعد شائع ہو چکی ہیں) — کتابی شکل میں زیر ترتیب

۱۹۰۔ مفتاح التقویم — حبیب الرحمٰن خاں (متوفی ۱۹۸۰ء)
(اس کتاب پر مصنف کو حکومت سعودی عرب نے گراں قدر انعام دیا تھا) — مطبوعہ ۱۹۷۵ء

اردو رسائل جو آزادی کے بعد جاری ہوئے

۱۔ صبوحی (علمی۔ ادبی) — مدیر میرزا کی حسین پری رامپوری مرحوم — بند ہوگیا

۲۔ شفق (" ") — " — " "

۳۔ آنچل (ترقی پسند ادب) — رام ناتھ نازاں — " "

۴۔ نئی لکیر (اردو ادب کو ہندی رسم خط میں پیش کیا گیا) — اکبر علی خاں — " "

۵۔ نگار رام پور (علامہ نیاز فتحپوری کی تحریری اجازت سے) — مدیر اعزازی اکبر علی خاں — " "

۶۔ اردو ڈائجسٹ (منتخب علمی و ادبی مضامین) — مدیر آفتاب خاں — " "

۷۔ شیرازہ (علمی۔ ادبی) — نازش نیازی — " "

۸۔ الفاروق (مذہبی و ادبی) — مسرت حسین خاں آزاد — " "

۹۔ ہمدرد جوہر — ڈاکٹر قمر اقبال — جاری ہے

۱۰۔ الحسنات (جماعت اسلامی ہند رام پور کا آرگن) — مدیر ابو سلیم عبدالحیٔ مرحوم بعدہٗ سلیم ملک — " "

۱۱۔ زندگی — مدیر سید حامد علی بعدہٗ عروج قادری — " "

۱۲۔ اتحادِ اسلامی — " سید عبدالدائم جلالی (مرحوم) — بند ہوگیا

۱۳۔ ضیائے وجیہہ — " مولوی وجاہت علی خاں — جاری ہے

۱۴۔ حجاب — مدیر مائل خیرآبادی — جاری ہے
۱۵۔ الحسن — مدیر شوق اثری بعدہٗ بشارت علی خاں فروغ — بند ہوگیا
۱۶۔ ذکریٰ — مدیر مولانا یوسف اصلاحی — جاری ہے
۱۷۔ ستارہ — 〃 مرزا محمود علی شفق مرحوم
بعدہٗ مسرت حسین خاں آزاد — بند ہوگیا
۱۸۔ دریچے — 〃 حسین احمد خاں ماجد رمن
〃 مرتب ایم پاشا — بند ہوگیا
۱۹۔ جنت کا پھول — 〃 خلیل محمودی — 〃 〃
۲۰۔ لعت ونشتر — 〃 ظہیر رحمتی (مرتب سعید رامش) جاری ہے
۲۱۔ تہذیب الاخلاق (رام پور) — 〃 سید فرید الدین (مرحوم) — بند ہوگیا
۲۲۔ آہنگ — 〃 سید عظمت علی (مرحوم) — 〃 〃
۲۳۔ عکسِ تحریر — 〃 زبیر گستاخ — 〃 〃
۲۴۔ یوسف — 〃 حکیم مسیحا نظامی (مرحوم) — 〃 〃
۲۵۔ ناہید — 〃 زرینہ عرفان فہیم — 〃 〃
۲۶۔ نور — 〃 — 〃 〃
۲۷۔ تختِ سبا — 〃 مضطر بہزادی — بند ہوگیا

اخبارات

۱۔ ناظم روزنامہ — مدیر ناظم علی خاں — جاری ہے
۲۔ قومی جنگ 〃 — 〃 ہاشم رضا عابدی (مرحوم) — 〃 〃
〃 دہوش نظامی — 〃 〃
۳۔ اعلان 〃 〃 — 〃 مشکور احمد — 〃 〃
۴۔ ماحولِ رام پور 〃 — 〃 مسرت حسین خاں آزاد — 〃 〃
۵۔ نشتر ہفت روزہ — 〃 برق زیدی — 〃 〃
۶۔ تعمیر ادب 〃 〃 — 〃 ظہور الحسن خاں — 〃 〃
۷۔ آغاز روزنامہ — 〃 محشر عنایتی بعدہٗ راز یزدانی مرحوم — بند ہوگیا
۸۔ رام پور گزٹ ہفت روزہ — 〃 قیصر شاہ خاں استاد رام پوری مرحوم — 〃 〃
۹۔ اردو ڈائجسٹ — 〃 آفتاب خاں — 〃 〃

۱۰۔ سہارا ہفت روزہ — 〃 — 〃 〃
۱۱۔ پرچم ہفت روزہ — 〃 مسلم صدیقی — جاری ہے
۱۲۔ نیا خواب ہفت روزہ — 〃 احمد کاوش — بند ہوگیا

جرنل رضا لائبریری رام پور — ۱۹۹۴ء — ۱۹۹۴ء
〃 〃 — ۱۹۹۵ء — زیرِ طبع

ادارے

۱۔ انجمن ترقی اردو رام پور	۴۔ انجمن دربار ادب رام پور
۲۔ انجمن تنظیم ادب 〃	۵۔ رضا لائبریری 〃
۳۔ انجمن ارتقائے ادب 〃	۶۔ صولت پبلک لائبریری 〃

۱۵ ر اگست

شادمانی ساتھ لے کر آگیا ۱۵ ر اگست
نکہت گلہائے آزادی سے ہر اک مست
چل رہی بادِ بہاری سارے ہندستان میں
بن گیا رشکِ جناں ہے ہند کا ہر ایک دشت

آج ہے ۱۵ اگست شاداں ہیں سب پیر و جواں
دن ہے یہ اک یادگار آزادیٔ ہندوستاں
کیوں نہ ہو مسرور ہندوستان کا ہر اک بشر
اب غلامی کا مٹا بھارت سے ہے نام و نشاں

ماسٹر عبد المنان صدیقی
محلہ بنگلہ
پرانا سیتا پور (یوپی)

نغمہ

اے وطن!
گل بدن۔ میرے پیارے چمن
تجھ پہ صدقے ہیں یہ جان و تن
روشنی تیرا اندیش سب کے لئے
آشتی تیرا اندیش سب کے لئے
زندگی تیرا اندیش سب کے لئے
تیری خوشبو سے مہکے یہ دیر و حرم
تیرے قربان ہم

حسن خیر و صداقت کے پرچم تلے
کاروانِ محبت بڑھے
سر اُٹھا کر چلے
آرزو تھی تری
کیسی شیشہ گری
تو نے چاہا کہ سب مل کے آگے بڑھیں
آسماں تک چڑھیں
تیری روشن جبیں اور روشن کریں
عام تھے تیرے فیض و کرم
تیرے قربان ہم

ایکتا تیری آواز ۔ ہے جو امر
تو نے چاہا کہ سج جائے ہر بام و در
تیرا گھر ۔ پیار کا یہ نگر
جس پہ برسا تھا ابرِ کرم ٹوٹ کر
تیرے نقشِ قدم
محتشم ۔ مقتدر ۔ محترم
اے مسیحا نفس ۔ جانِ من ۔ اے وطن!
تجھ پہ صدقے ہیں یہ جان و تن!
تیرے قربان ہم

انیس انجم عباسی
۸۸، جاڑ زبر - جون پور ۲۲۲۰۰۱

قومی یک جہتی

جذبۂ حُبِ وطن دل میں جگاتے کیوں نہیں
باہمی رنجش سے ہم بچتے بچاتے کیوں نہیں
تلخیاں بغض و کدورت کی مٹاتے کیوں نہیں
سازِ دل پر پیار کے نغمے بجاتے کیوں نہیں

کیوں گلے ملتے نہیں عید اور دیوالی پہ ہم
ملک میں تہوار اب مل کر مناتے کیوں نہیں

کیوں بھلا بیٹھے ہیں ہم ان کا پیامِ آشتی
چشتیؔ و نانکؔ ہمیں اب یاد آتے کیوں نہیں

کس لیے فرقہ پرستی کو ہوا دیتے ہیں ہم
نفرتوں کی آگ کے شعلے بجھاتے کیوں نہیں

سرحدوں پر بڑھ رہی ہیں سازشیں اغیار کی
ہوش میں میرے وطن کے لوگ آتے کیوں نہیں

جذبۂ انسانیت کو کیوں نہیں دیتے فروغ
آپسی بغض و کدورت کو مٹاتے کیوں نہیں

پھر جگا کر اپنے دل میں جذبۂ حُبِ وطن
دیش کو برباد ہونے سے بچاتے کیوں نہیں

تم روایت قومی یک جہتی کی رکھ کر برقرار
رشکِ جنت اپنی دھرتی کو بناتے کیوں نہیں

□□

آزاد سونی پتی
۱۶۴۳۔ سیکٹر ۱۴
سونی پت ۱۳۱۰۰۱

افسانہ

ڈاکٹر وجے موہن ومتو
۲۰۹ ۔ ڈوڈز روڈ کارنوال ۔ اونٹاریو
کنیڈا

یہ جگنو میرے ہیں تمہارے نہیں!

اگر تم بھول نہیں ہو تو تمھیں نینی تال کی وہ حسین شام یاد ہوگی، جب تم پہلی بار مجھ سے ملی تھیں۔ میں کاربیٹ پارک کے سفر کے بعد نینی تال کے نیلو ڈیر ہوٹل میں ٹھہر گیا تھا اور تم لکھنؤ واپس جانے سے پہلے اس ہوٹل میں ٹھہری ہوئی تھیں۔ یہ ہوٹل مجھے کافی سالوں سے پسند ہے۔ ایک تو یہ نینی تال کی چوٹی پر ہے دوسرے ہر کمرے سے وہ نینی تال کی جھیل بے حد خوبصورت نظارہ پیش کرتی ہے۔ ہوٹل کی بیٹھک میں وہ سنگار کئے ہوئے ٹنگے شیر، پھولوں سے بھرے گلدستے دل کو ایک عجیب سی تسکین اور جذباتی آسودگی دیتے ہیں۔ پھر صبح ہی صبح مسجد سے اذان، مندر سے بھجن اور گوردوارے سے گوربانی ذہن میں روحانی رشتہ سا بھی قائم کرتے ہیں۔

مجھے یاد ہے اس رات ہوٹل میں قوال آئے ہوئے تھے اور ہم کس جذبے کے ساتھ دل میں ہر غزل اور قوالی کی داد دے رہے تھے۔ پھر جب قوالیوں کی آوازیں ڈوب گئیں، دوسرے مہمان اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ نہ جانے صرف ہم اور تم کیوں بیٹھے رہے اور ایک عجیب جھجک کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ دل کہتا تھا باتیں شروع ہوں۔ تم بولو یا میں بولوں۔ پھر جب بات شروع ہوئی تو تمھارے کہنے پر میں، اس رات کے علاوہ اگلی رات کے لیے بھی ہوٹل میں رک گیا تھا۔

اگلی صبح ہم کس طرح دونوں نینی تال کے بازار میں گھومنے نکلے تھے۔ سبزیوں کی دکانیں، پھل فروٹ، اور وہ اکیلی سی پوری پراٹھے بیچنے والے حلوائی کی دکان ـــــ ہم سب چکر کاٹتے رہے۔ دل کرتا تھا ہاتھ میں ہاتھ دیے تمھارے ساتھ ہمیشہ اسی بازار میں گھومتا رہوں اور پھر دونوں ہمیشہ اس چھوٹے سے پہاڑی شہر میں رہنے لگیں۔

پھر جب شام ڈھلنے لگی تھی، نینی تال کی سڑکوں کی مدھم سی بتیاں جل گئیں تھیں اور ان اندھیری سی گلیوں، چھوٹے چھوٹے سے بازاروں میں ہم دونوں پھر سیر بینی کو نکل کھڑے ہوئے تھے۔ دو دن پہلے ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے، بالکل خاموش تھے، سوچوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ لیکن کل کی شام، وہ ہوٹل میں ٹھہرنا، رات گئے تک آپس کی باتیں کرنا ـــــ ہمیں اتنا قریب لے آئے تھے کہ جیسے برسوں سے ہم ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ ہم کافی دیر تک نینی تال کی خاموش پہاڑی سڑکوں پر گھومتے رہے۔ پھر ایک جگہ تمھیں یاد ہوگا جہاں کتنے ہی جگنو جگمگا رہے تھے اور تم نے مجھ سے کہا تھا کہ دنیا کی ہزاروں خوبصورت چیزیں تمھارے لیے ایک طرف اور ان اڑتے ہوئے جگنوؤں کی روشنی اور دلکشی ایک طرف۔ تم نے محبت سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا تھا کہ شیشے کی بوتل تو پاس نہیں ہے جس میں ان جگنوؤں کو قید کر سکیں اور پھر کمرے کے اندھیرے میں جگمگانے کے لیے ان جگنوؤں کو چھوڑ سکیں۔ آؤ ایک دو جگنو پکڑیں۔ میں نے محبت سے تمھیں دیکھا تھا تم نے بھی خاموشی سے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دلوں کا ملاپ سا کیا تھا۔ مجھے بھی جگنو بچپن سے پسند ہیں اور جب بچپن میں روہتک شہر میں بیریوں کی جھاڑیوں میں شام کو گزرتا تھا تو ہاتھ خود بخود ان جگنوؤں کو پکڑنے کے لیے اٹھ جاتے تھے۔ ایک آدھ مٹھی بند کر کے پکڑا بھی جاتا تھا لیکن جونہی مٹھی کھولتا تھا دیکھنے کو کہ جگنو ہے کہ نہیں۔ وہ جگنو فوراً اڑ جاتا تھا۔

وہ نینی تال کا ٹھہرنا، تم سے ملنا ایک زندگی کی گھڑی یاد ہے۔
تم نے چاندنی راتوں کی دل کشی کے گیت گائے تھے، تم نے کہا تھا کہ پہاڑی راتیں ہر شخص کو خواہ وہ بوڑھا ہو یا جوان دلفریب لگتی ہیں۔ اِن چھوٹے چھوٹے پہاڑی علاقوں میں جب سورج کی سرخیاں مغرب میں ڈوب جاتی ہیں تو پرندوں کو بھی نیند سی آنے لگتی ہے، ان کی چہکار خاموش سی ہو جاتی ہے اور دور کسی چرواہے کی بانسری ایک عجیب سا رومانس کا سماں باندھ دیتی ہے۔ تمہیں یاد ہوگا۔ جب بانسری بج رہی تھی ہم کیسے خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف محبت اور پیار سے دیکھ رہے تھے۔ جیسے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے ملے تھے اور ایک دوسرے کے لیے عمر بھر ساتھ رہنے کے لیے تھے۔ تم نے عجیب سا سوال پوچھا تھا کہ بانسری کے ساتھ محبت کیوں وابستہ ہے، کیوں دل کی چاہت بانسری کے سُروں کے ساتھ جڑی ہوتی ہے۔ کیوں بانسری میں پیار اور لگن کے گیت گائے جاتے ہیں۔ کیوں دریا کے کنارے یا جھیل کے ساتھ ساتھ بانسری کے نغموں کی ابھرتی اور ڈوبتی تانیں ہر حسین اور جوان لڑکی کے دل میں ایک احساس سا جگا دیتی ہیں، محبت کا احساس، کسی کے ساتھ ہمیشہ کو رہنے کا احساس۔

تمہیں یاد ہوگا نینی تال کی ان دو رنگین راتوں میں ہم نے اپنے دل کے افسانے ایک دوسرے کو سنائے تھے، ہیر گاتے ہوئے پنجابنوں کی کہانیاں سنائی تھیں، جھیل کی لہروں کے راگ چھیڑے تھے، چپ چاپ خاموش سی پہاڑی صبحوں اور شاموں کی باتیں کی تھیں، رقص کرتے ہوئے دل کو محسوس کیا تھا، اور نہ ہوتے ہوئے بھی تمہاری ہر چال میں ہم نے گھنگھروؤں کی آوازیں سنی تھیں۔ تمہاری پاکیزگی اور خوبصورت نگاہوں کی بات کی تھی، رات گئے تک ہم باتیں کرتے رہے تھے ایک دوسرے کی، اندھیری اور جگمگاتی راتوں کی، اور ان خوشی سے اڑتے ہوئے، جگمگاتے ہوئے، خوشی سے فضا میں روشنی بکھیرتے ہوئے جگنوؤں کی۔

پھر جب ہم نینی تال چھوڑنے لگے تھے، تمہاری اور میری آنکھوں میں پیار بھرے آنسو تھے، ایک دوسرے کے پیار اور دوستی کے وعدے تھے ______ دن بیتتے چلے گئے۔ راتیں گزرتی گئیں۔ تم لکھنؤ واپس جا چکی تھیں میں دلی میں دن گزار رہا تھا۔ اس عرصے میں تمہاری یاد میرے ذہن میں زیادہ سے زیادہ ابھرتی رہی اور ایک دن تمہارا خط جب مجھے ملا۔ تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ تمہارے خط میں پیار بھرے دل کی تمنائیں، جدائی کی راتوں کے گیت، گزرے ہوئے دنوں کی تڑپ، پیار سے بھری ہوئی باتوں کی یاد، ایک دوسرے سے ملنے اور ساتھ رہنے کے وعدے، اور ان جگنوؤں کی رقص کرتی ہوئی روشنی۔ ...سب تھے سب۔ تمہارے خط میں۔ میں نے تمہارا خط بار بار پڑھا اور تمہاری خوبصورت تصویر، وہ معصوم چہرہ میری نگاہوں کے سامنے ابھرتے رہے، پھر میری آنکھوں میں آنسو ابھرتے رہے۔

پھر وقت گزرتا گیا۔ تمہارا دامن ایک دوسرے آدمی کے ہاتھوں میں دے دیا گیا، میں بھی کسی کا ہو گیا تھا۔ لیکن اس دل نے ابھی تک کسی کو ایسا نہیں اپنایا جیسا کہ اس نے تمہیں اپنا بنایا تھا۔ میں کسی کا ہوتا ہوا بھی کبھی کسی کا نہ ہو سکا۔ میں تمہارا رہا اور ہمیشہ تمہارا رہوں گا۔ آج کی رات چاندنی سے بھری ہے، ہر کونے پر، زمین پر، پیڑوں پر، گلیوں میں، چھتوں پر ہر جگہ چاند کی کرنیں متحرک رہی ہیں۔ جہاں تم ہو نہ معلوم وہاں بھی اسی طرح چاندنی کھلی ہے یا دل کی گہرائی کی طرح وہاں اندھیرا پن ہے۔ میں جب چاند کو دیکھتا ہوں، مجھے ایسا لگتا ہے۔ جیسے وہ تمہارا جھومر ہو۔ کہتے ہیں چاند کے اندر ایک بڑھیا بیٹھی چرخہ چلا رہی ہے۔ میں جب بھی کھاٹ چھت پر لے جاتا ہوں اور تمہاری یادوں میں چاند کی طرف دیکھتا ہوں تو ایک بڑھیا کی بجائے مجھے چاند میں صرف تم نظر آتی ہو۔ وہی شوخ و شنگ چہرہ، وہی حسین مسکراہٹ، وہی خوبصورت آنکھیں۔ بالکل تم۔ ویسی ہی جب ہم تم دونوں ملے تھے۔ میں کئی بار چاند میں تمہیں گہنوں میں ڈھکی اور ریشمی رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس، سمٹی سمٹائی، شرمائی ہوئی دلہن سی دیکھتا ہوں۔ میں تمہیں دلہن بنے تو نہ دیکھ سکا لیکن میرے دل میں تم ہمیشہ دلہن رہو گی۔ کسی کی دلہن نہیں۔ میری صرف میری۔ کاش میں تمہارا گھونگھٹ الٹ سکتا۔ کاش میں شادی کی رات کو وہ فطری شرم اور شرمیلی ادا دیکھ سکتا ان جھکی پلکوں کی۔ یہ چاندنی سب کے لیے ہے لیکن اس چاند میں تم بیٹھی ہو میرے لیے صرف

میرے لیے۔ اور میں ہمیشہ اس چاند میں تمھیں دیکھتا رہوں گا۔ اس تصور اور تصویر کو جو صرف میرے ہیں اور کبھی بھی کوئی مجھ سے نہ چھین سکے گا۔

رات کافی گذر چکی ہے، میں اکثر ان چاندنی راتوں میں جاگتا رہتا ہوں کیونکہ ان راتوں میں تم میرے اور قریب آجاتی ہو۔ میں کبھی تمھیں نہ بھلا سکا اور مجھے یقین ہے کہ تم اب بھی میری ہو جیسا کہ میں ہمیشہ تمھارا رہا اور تمھارا رہوں گا۔ ہم اس زندگی میں ایک دوسرے کے ہونے کے بجائے عزیزوں کے ہو جاتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ اکثر وہ لوگ جو ایک دوسرے کو چاہتے رہے، پھر کبھی نہ مل سکے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ خیالوں میں، چاند کے اندر تمھیں دیکھنے میں میرے لیے بالکل ایسا ہے کہ جیسے میں تمھیں مل رہا ہوں۔ ہم ایک دوسرے کے نہ ہو سکے لیکن مجھے یقین ہے ہم دونوں عزیزوں کے بھی نہ ہو سکے۔ میں اب بھی اپنی آنکھوں کے سامنے اکثر تمھیں دیکھتا ہوں، شہنائیوں کی آوازوں میں تمھاری آواز سنتا ہوں۔ پرندوں کی چہچہاہٹ میں تمھاری مدھر اور سُریلی باتیں یاد آتی ہیں۔ جب بھی سگائیوں، شادیوں میں ڈھولک پر ہنسی خوشی کے گیت گائے جاتے ہیں، میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ گانے ہمارے لیے ہیں۔

نہ وقت نہ یہ فاصلے ہم دونوں کو کبھی جدا کر سکیں گے۔ ہم ایک دوسرے کے لیے تھے اور ایک دوسرے کے لیے رہیں گے۔ ایک دوسرے کے لیے جئیں گے۔ تم جہاں بھی ہو خوش رہو۔ یہ اداسیاں، خوشیاں زندگی کا عجیب سا ساتھ ہیں۔ ان اداسیوں میں بھی محبت کے گیت ہیں۔ ہر آنسو مجھے بھاتا ہے کیونکہ ہر آنسو میں تمھاری یاد ہے۔ تمھاری محبت ہے۔ میں تمھارا ہوں اور اس زندگی میں تمھارا رہا ہوں۔ اور ہمیشہ تمھارا رہوں گا۔ اس جذبے کو نہ کوئی شادی بدلے گی نہ کوئی اندھیری رات۔

اور ہاں۔ جب بھی کسی رات کو کہیں جگنو جگمگاتے ہیں۔ میں انھیں اُڑتے دیکھتا ہوں۔ اور ایک دو کو مُٹھی میں پکڑ کر پھر چھوڑ دیتا ہوں۔ مجھے یہ جگنو ایک عجیب راحت دیتے ہیں، ایک گہرا سکون اور دلی تسلی۔ میں تمھیں کہنا چاہتا ہوں۔ کہ یہ جگنو میرے ہیں، تمھارے ہیں۔ جیسا کہ میں تمھارا ہوں، تم میری ہو۔ ہم ایک دوسرے کے ہیں۔

□□

غزل

جان جاں تو ہے جاں سے کیا مطلب
پردۂ درمیاں سے کیا مطلب

میری کشتی کا ناخدا تو ہے
مجھ کو سیل رواں سے کیا مطلب

جگمگاتا ہے میرا نقشِ یقیں!
مجھ کو وہم و گماں سے کیا مطلب

دُور رہ کر بھی میرے پاس ہیں وہ
شب کی آہ و فغاں سے کیا مطلب

خاکِ راہِ نیاز ہوں اقبالؔ
مجھ کو رسمِ جہاں سے کیا مطلب

ڈاکٹر بلند اقبال نیازی
رام نرائن بازار، کان پور

ھزل

نفرت کی شب ہے بغض کے بادل بھی چھائے ہیں
ہم لے کے لالٹین محبت کی آئے ہیں

مجنوں کا حقّہ دیکھ کے لیلیٰ نے یہ کہا
لا ایک کش لگا لیں تھکے ماندے آئے ہیں

اے لالٹین آپ بھی ہیں کتنے بیوقوف
دو چار شعر کہہ کے قیامت اٹھائے ہیں

مجاہد لالٹین
مئو آئمہ۔ ضلع الہ آباد

زباں پہ حرفِ صداقت لیے دُعا کی طرح
چلو تو جادۂ منزل پہ حق نما کی طرح

ہمیں یقین ہے بستی کے لوگ جاگیں گے
ہماری بات ہے درویش کی صدا کی طرح

زبان سے تو وہ رشتوں کی بات کرتا ہے
مگر لباس ہے حکّام کی قبا کی طرح

نظر اٹھا کے نہ دیکھا نہ تھوڑی دیر رُکے
مری گلی سے وہ گزرے مگر صبا کی طرح

سُناؤ شعر تو باقرؔ خودی کا پاس رہے
جھڑک دو شاہ کو بھی میر کی انا کی طرح

ڈاکٹر علی باقر زیدی

ایل ۹/۱ سیکٹر این، علی گنج
لکھنؤ ۲۰

نہ وہم میں تھا نہ ایسا مرے گمان میں تھا
اسی نے قتل کیا جس کی میں امان میں تھا

مکاں کے سارے مکینوں میں اسکی لاش بھی تھی
چھپا ہوا وہ پرندہ جو سائبان میں تھا

جوابِ ظلم جو دیتا تو کس طرح دیتا
وہ اک رسول تھا، اور دورِ امتحان میں تھا

ستم یہ ہے کہ وہی دشمنوں سے مل بیٹھا
وہ ایک مردِ مجاہد جو خاندان میں تھا

اسی نے کر دیا حیدرؔ کا سب کو دیوانہ
وہ ایک سحر، جو رنگینیِ بیان میں تھا

ڈاکٹر حیدر مصطفےٰ آبادی

روبی کلینک، پولیس چوکی جہان آباد
رائے بریلی ۲۲۹۰۰۱

دنیا میں کچھ ہو، میری نظر میں بُرا نہ تھا
میری کتاب میں کہیں لکھا ہوا نہ تھا

جو سامنے تھا اسکے ہی سینے کے پار تھا
نیزہ ہمارا کوئی بدن دیکھتا نہ تھا

تابوت لیکے آئے تھے کچھ لوگ تو مگر
بستی میں میرا نام کوئی جانتا نہ تھا

اتنے بلند مقام پر لکھا ہے تیرا نام
ابتک کسی کا نام وہاں پر لکھا نہ تھا

صارمؔ تیرے وجود سے کیوں آگ لگ گئی
تو گھر نہ تھا، چراغ نہ تھا اور ہوا نہ تھا

صارم مہدی

حسین آباد
لکھنؤ ۳

غزلیں

ذرّے کی آفتاب سے باتیں
جیسے میری جناب سے باتیں

تم سے مل کر گُمان ہوتا ہے
خواب کرتا ہو خواب سے باتیں

ظرف خالی ہوا تو کرتا ہے
ایک خانہ خراب سے باتیں

چاند سے پہلے چاند نکلا ہے
کیا کریں ماہتاب سے باتیں

سُن کے ساغر نے پیاس کی محسوس
تیری بیخودؔ شراب سے باتیں

انور جمال بیخود نگرامی

۲۳/۱۸ قطب پورہ، ڈالی گنج
لکھنؤ

عُروج دیکھ چکے ہو زوال بھی دیکھو
سحر کے بعد چراغوں کا حال بھی دیکھو

نگار خانوں سے فرصت اگر ملے تم کو
ہماری آنکھوں میں اپنا جمال بھی دیکھو

تمہارے حُسن کی رعنائیاں سب اپنی جگہ
ہماری بے ہُنری کا کمال بھی دیکھو

نظر ہٹا کے کبھی قہقہوں کی دنیا سے
خوشی کے چہرے پہ گردِ ملال بھی دیکھو

شرارے پھُوٹ نکلتے ہیں دامنِ گل سے
جواب دینے سے پہلے سوال بھی دیکھو

آصف لکھنوی

مبارک کا احاطہ
مفتی گنج، لکھنؤ

ثبات و عزم کا ذہنوں میں نور چھوڑ گیا
بجھے کے ظلم کا سارا غرور چھوڑ گیا

وہ اس کا ظرف تھا کہ تشنگی کے صحرا میں
سمندروں کو مگر دُور دُور چھوڑ گیا

پلا پلا کے لہو تپتے ریگ زاروں میں
وہ ذرّے ذرّے میں اپنا ظہور چھوڑ گیا

ہوس خرید سکے گی نہ اب خودی کا ضمیر
وہ ایک ایسا مزاج غیور چھوڑ گیا

صحیفہ لکھ گیا جو خون سے شہادت کا
ترابیؔ صبر کی بھی اک زبور چھوڑ گیا

مظفر سلطان ترابی اعظمی

لیکچرر گورنمنٹ کالج
مراد آباد ۲۴۴۰۰۱

نئی حکومت اور اقلیت

موجودہ حکومت نے اقلیتوں کے لیے کئی اقدامات کیے ہیں۔

اس میں سب سے اچھا قدم مسلم اقلیت کے پچھڑے ہوئے طبقے کے لیے ہے۔ ملازمتوں میں تحفظات یعنی (Reservation) کا ایک اصول طے ہوا تھا کہ مسلم اقلیت کے پچھڑے ہوئے پسماندہ طبقات کو بھی تحفظات کے زمرے میں ملازمتوں میں جگہ ملے گی اور جو فہرست بنی تھی اس کے اعتبار سے مسلمانوں کو کم از کم ۴۴ء۸ فیصد جگہ ملنی چاہیئے تھی لیکن اس پر عمل درآمد نہ ہوا۔ محترمہ مایاوتی نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی اپنے اس ارادے کا اعلان کیا کہ وہ اقلیتوں کو کم از کم ۱۵ فیصد تحفظات دینے کے حق میں ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی مخالفت ہوئی۔ یہ بھی ایک سچائی ہے کہ اس ۱۵ فیصد کے لیے پہلے مسودۂ قانون تیار ہوگا پھر وہ مختلف مراحل سے گزرتا ہوا جب قانونی شکل اختیار کرے گا تو اس پر عمل درآمد کا سوال پیدا ہوگا۔

ان امور کا خیال کرتے ہوئے محترمہ مایاوتی نے بہت ہی دانشمندی، فراست اور عملی پہلو کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے تدبر کا ثبوت دیا۔ انھوں نے احکامات نافذ کر دیے کہ اب جو بھی تقرر کیے جائیں ان میں ۴۴ء۸ فیصد کے اعتبار سے مسلمان اقلیت کے پسماندہ اور پچھڑی ہوئی برادری کے افراد کو جگہ دی جائے اور وہ جگہیں فوری طور پر بھری جائیں۔ بہت ہی زبردست احکام ہیں، اس وقت ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب ۴ فیصد سے زائد نہیں ہے لیکن اس اعلان پر عمل درآمد کے بعد یہ تعداد دوگنی ہو جائے گی اور بہرحال وہ مسلمانوں کی کسی بھی برادری سے تعلق رکھتے ہوں، ہوں گے تو مسلمان ہی۔ اور اس طرح سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی کمی کے سبب سے بہت سارے فلاحی اقدامات اور مسلمانوں کی بہبودی کے لیے جو اسکیمیں ہیں اور جن پر عمل درآمد نہیں ہوتا اور جن پر عمل درآمد کے سلسلے میں ٹال مٹول سے کام لیا گیا وہ اب ممکن نہ ہو سکے گا۔ وزیر اعلا کے اس واضح اعلان اور حکم نامے کی وجہ سے اب سرکاری عملہ پھرتی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔

اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ۴۴، ۸ فیصد والے فارمولے پر بہت پہلے عمل ہونا چاہیئے تھا لیکن سچ بات تو یہ ہے کہ اس طرف توجہ ہی نہیں کی گئی اور اسے سرد خانے میں پڑا رہنے دیا گیا۔ بہرحال ع

ہرچہ کہ دیر آید درست آید

کے مصداق محترمہ مایاوتی وزیر اعلا کے اس حکم نامے کی بدولت مسلمانوں میں بے روزگاری کا تناسب کافی حد تک کم ہو جائے گا۔

۲ — محترمہ مایاوتی وزیر اعلا اتر پردیش نے حال ہی میں یہ اعلان بھی کیا کہ اردو اساتذہ کی مزید تقرری کا جو سلسلہ ملتوی کیا جا رہا تھا اسے نئے مالی سال میں ہی تکمیل کی منزل تک پہنچا دیا جائے گا اور پانچ ہزار مزید اردو اساتذہ کا تقرر کیا جائے گا۔ ساتھ ہی ساتھ جو تقرریاں ہوئی تھیں مگر جن کی تکمیل نہیں ہوئی تھی اور جگہیں خالی رہ گئی تھیں وہ بھی پُر کی جائیں اور اس سلسلے میں بہت ہی تیزی سے عملی اقدامات کیے جائیں۔

اب یہ یقینی ہے کہ مزید پانچ ہزار اردو اساتذہ کا تقرر تو ہوگا ہی۔ گذشتہ تقررات کے وقت جو لوگ رہ گئے تھے ان کا تقرر بھی ہو جائے گا۔

اس کے علاوہ تقریباً ۱۴۴ ایسے اسکولوں کا قیام جلد ہی عمل میں آنے والا ہے جو مسلم اکثریت آبادی والے علاقے میں کھولے جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس کا مکمل فائدہ اقلیتوں کو ہوگا۔

۳ — مترجمین کے تقرر کے سلسلے میں بہت ساری پیچیدگیاں اور دشواریاں پیدا ہوئی تھیں محترمہ مایاوتی وزیر اعلا اتر پردیش نے احکامات نافذ کر دیے ہیں اور اب مترجمین کی تقرری، تنخواہ کی شرح اور خالی جگہوں کا پُر کیا جانا یقینی امر ہے۔ اور اعلانات کے بموجب اس پر عمل بھی شروع ہو چکا ہے ——

(باقی صفحہ پر)

ڈاکٹر امبیڈکر کی عظمت

میری نگاہ میں بابا بھیم راؤ امبیڈکر کی شخصیت ایک تربیت گاہ ایک انسٹی ٹیوشن کی ہے۔ جس کے سائے میں بیٹھ کر ہندوستان کی روح کو سمجھا جاسکتا ہے۔ اُس کا عرفان حاصل کیا جاسکتا ہے۔ بابا صاحب ہمیشہ سے میری دلچسپی کا مرکز رہے ہیں۔ ان کی فکر اور سوچ کو میں نے کسی قدر سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ میں برابر ان پر کچھ نہ کچھ لکھتا رہا ہوں وہ تحریریں میرے جذبات کی صحیح عکاسی کرتی ہیں۔ ایک دبے کچلے طبقے میں آنکھیں کھولنے کے عوض انھوں نے زندگی کے ہر مرحلے میں بڑی دشواریاں اٹھائیں لیکن انھیں دشواریوں نے اُن کی صلاحیتوں کو چمکانے اور روشن کرنے میں بڑا تعاون بھی دیا۔ بچپن سے ہی متضاد حالات نے ان کو اپنے سماج کا مطالعہ کرنے کا عملی تجربہ دیا۔ جس سے وہ بہت جلد ملک کے طبقاتی نظام سے اچھی طرح واقف ہوگئے۔ یہیں سے ایک مستقل اضطراب ان کے ذہن کو بے چین کرنے لگا۔ اسی اضطراب کا نتیجہ تھا کہ فطرت نے انھیں ایک عظیم کام کے لیے منتخب کرلیا۔ پھر اسی کی کرشمہ سازی نے ڈاکٹر امبیڈکر کو آئین ساز کمیٹی کا چیرمین بنادیا۔ یعنی ان کی عمر بھر کی ریاضت کام آگئی۔ آئین سازی کی تشکیل میں انھوں نے بڑی دلسوزی سے اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر رات دن ایک کردیے۔ اور اسے تکمیل سے ہمکنار کرکے ایسا کارنامہ انجام دے دیا جس نے نہ صرف جمہوری قدروں کو دست بُردِ حالات سے محفوظ کردیا بلکہ وہ خود بھی جاوید ہوگئے۔ اس وسیع و عریض ملک میں اتنے مذاہب، اتنی تہذیبیں، اتنی زبانیں ہیں کہ دنیا میں کوئی دوسری مثال نہیں ہے۔ ان سب کا احترام، ان سب کا تحفظ، ان سب کو پھولنے پھلنے کے بہترین مواقع فراہم کرنا۔ پھر سماجی ناہمواری، عدم مساوات کا ماحول، جہالت و غربت کے گہرے سائے۔ ہزاروں برس سے ایک طبقہ کا استحصال۔ ان سب کو سازگار فضا کے تحت زندگی کی صحیح سمت لے جانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ نہ ہی یہ چشمِ زدن میں حل ہونے والے مسئلے تھے۔ ان کے لیے مرحلہ وار نظام بنانا تھا۔ اسی نظام کے تحت رزرویشن اور دیگر مراعات کو قانونی شکل دی گئی۔

دستورِ ہند ملک کے مستقبل کا امین اور اس کی سالمیت و یکجہتی کا پاسبان ہے۔ آزادی سے اب تک کیسے کیسے آئینی بحران آئے مگر دستورِ ہند کی واضح رہنمائی میں اُس کا سدِّ باب کرلیا گیا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ آج تک یہ محسوس نہیں ہوا کہ ہماری زندگی سے ہمارا آئین کہیں میل نہیں کھاتا۔ بلکہ اس کے برخلاف ہر اندھیرے میں دستورِ ہند نے اپنی تابناک کرنیں بکھیر کر ہمیں بکھرنے سے بچایا۔ ہمیں کبھی مایوس نہیں ہونے دیا۔ جو لوگ دستورِ ہند میں ترمیم و تنسیخ کی بات کرتے ہیں وہ اس کی عظمت سے انحراف کرتے ہیں۔ بابا صاحب کو دلتوں کا مسیحا کہا جاتا ہے۔ واقعی یہ اُن کی مسیحائی کا اعجاز ہے کہ ایک زمانے سے اُجالوں کو ترسنے والے اب روشنی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ گندے اور بوسیدہ ماحول سے اب تازہ و شگفتہ فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ حقیقی اور سچی خوشی کو محسوس کر رہے ہیں۔ سربلندی و سرافرازی کے تصور سے بھی کترانے والے۔ اب سربلندی و سرافرازی کی راہوں پر گامزن ہیں۔ یہ کتنی بڑی تبدیلی ہے۔ مگر ابھی اس تبدیلی کو جاری رہنا ہے۔ علم کے پھیلاؤ کو اور بڑھانا ہے۔ غربت و افلاس سے جنگ لڑتے رہنا ہے۔ ابھی امبیڈکر کا خواب پوری طرح تعبیر آشنا نہیں ہوا۔ انھیں یقین تھا کہ ایک روز دلت اور پسماندہ طبقے مل کر اپنی محرومی کا ازالہ کریں گے۔ نیز حکومت سازی میں بھی اہم رول ادا کریں گے۔ بیداری کی لہر پورے ملک میں آئی ہے۔ مگر ابھی اسے پورے زور شور سے بہنا ہے۔ ابھی جہالت و غربت کا تناسب گھٹنے کے بعد بھی خاصا ہے۔ جب تک یہ قابلِ لحاظ حد تک نہیں گھٹ جاتا ہے۔ ترقی کے تقاضے ادھورے رہیں گے۔ بابا صاحب کو ذات

پات کے نظام، چھوت چھات اور قدیم نابرابریوں سے نفرت تھی۔ انھوں نے ان برائیوں کا سیاسی ہنرمندی سے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ایک زیرک سیاستداں کی طرح انھوں نے غیر ملکی آزادی کے عبوری دور میں اپنے فرقے اپنی درج فہرست ذاتوں کے زیادہ سے زیادہ فائدے اور تحفظات کی بات کی۔

بھارت کی قوم پرستی کی تحریک میں سماجی سطح پر عدم مساوات اور استحصال کے خلاف ایک جذباتی عنصر کی شمولیت ڈاکٹر امبیدکر کا کرشمہ تھا۔ انھوں نے بھارتی سماج کے سب سے نچلے طبقہ میں سماجی و سیاسی شعور کو بیدار کیا اور منظم کیا۔ ایک زمانہ میں کچھ لوگ ان کی قوم پرستی پر شک کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں انھوں نے کہا تھا کہ یہ ملک ذاتوں اور عقیدوں میں بٹا ہوا ہے اور اسے اس وقت تک ایک متحد، خود مختار قوم نہیں بنایا جاسکتا جب تک کہ اقلیتوں کے لیے کافی تحفظات آئین کا حصہ نہیں بن جاتے۔ ایک ایسی صورتِ حال ہے جس کے بارے میں کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک آزاد اور متحد بھارت کے حامی تھے۔ انھوں نے آئین ساز اسمبلی کو متنبہ کرتے ہوئے ایک بار کہا تھا۔ مجھے اس بات سے بہت تشویش ہوئی ہے کہ بھارت نے نہ صرف پہلے ایک بار آزادی کھوئی ہے بلکہ وہ اپنے ہی لوگوں کی دھوکہ بازی اور غیر وفاداری کے سبب آزادی سے محروم ہوا ہے۔ تب انھوں نے ہر جماعت سے اپیل کی کہ وہ اپنے مخصوص عقائد کو قومی مفادات سے بالاتر نہ رکھے۔ اور کہا کہ ہمیں خون کی آخری بوند تک اپنی آزادی کی حفاظت کا تہیہ کرنا چاہیے۔ ایسے شخص کی حب الوطنی پر کیا کچھ اور بھی کہنے کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ اپنی سیاسی زندگی میں انھوں نے نئے زاویے سے سیاسی اور سماجی خیالات پیش کیے۔ جنھوں نے ملک کے اندازِ فکر کی آبیاری کی اور یہاں پارلیمانی طرز کی جمہوریت اپنانے کے فیصلے میں مدد کی۔ آئین کی منظوری سے پیشتر انھوں نے اپنی آخری تقریر میں کہا کہ ۲۶ جنوری سنہ ۱۹۵۰ء کو ہمیں سیاست میں مساوات حاصل ہو جائے گی۔ جب کہ سماجی اور اقتصادی زندگی میں عدم مساوات ہوگی۔ ہمیں اس عدم توازن کو جتنی جلد ہوسکے ختم کرنا ہوگا نہیں تو جو نابرابری کے سبب نقصان اٹھا رہے ہیں وہ سیاسی جمہوریت کے ڈھانچے کو اڑا دیں گے۔ جسے اس اسمبلی نے اتنی محنت سے تعمیر کیا ہے۔

ڈاکٹر امبیدکر کے ایک سوانح نگار نے گول میز کانفرنس لندن کے دوران ڈاکٹر امبیدکر کی شاہ جارج پنجم سے ملاقات کا حال بیان کیا ہے۔ بکنگھم پیلس کے باغیچے میں بیٹھے ہوئے شاہ جارج نے ڈاکٹر امبیدکر سے بھارت میں اچھوتوں کی حالت کے بارے میں پوچھا اور ڈاکٹر امبیدکر نے بھارتی سماج میں اچھوتوں کی حالت پر دردناک تصویر پیش کی۔ سوانح نگار کہتا ہے کہ شاہ اس تفصیل کو سن کر کانپ گئے۔ مگر یہ شاہ کی ذاتی کیفیت تھی۔ اس وقت تو ان کی حکومت تھی وہ چاہتے تو بہت کچھ سدھار ہوسکتا تھا۔ لیکن برطانوی حکومت کو بھارتی عوام کے دکھ درد سے کیا لینا دینا تھا انھیں تو حکومت کسی نہ کسی طرح قائم رکھنی تھی۔ یہ تھا انگریزی مزاج۔

آئین ساز اسمبلی میں اپنی یادگار تقریر کے دوران امبیدکر نے نئی آزاد قوم کو تین خطرات سے آگاہ کیا تھا۔ پہلا خطرہ آئینی حکومت کو تھا۔ ان کی دلیل تھی کہ ہمیں اپنے مقاصد کی تکمیل میں لازماً آئینی طریقے اپنانے چاہئیں۔ خواہ وہ مقاصد سیاسی ہوں سماجی یا اقتصادی۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ وہ سماجی انقلابی تھے اور اپنے سماجی نظام کے معترض بھی تھے۔ نیز ان خرابیوں کے تدارک کے لیے صرف آئینی راستہ اختیار کرنے پر زور دیا۔ دوسرا خطرہ جس کے بارے میں انھوں نے ملک و قوم کو آگاہ کیا شخصیت پرستی کا تھا۔ ان کا نظریہ عوامی جھکاؤ کے برعکس نظر آتا ہے کہ آنکھ بند کرکے ہر بڑے کے آگے سر خم کردے۔ انھوں نے تلقین کی کہ اپنی آزادی خود مختاری کسی بھی شخص کے قدموں پر خواہ وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو نہ رکھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے آئرلینڈ کے محب الوطن ڈینیل اوکونر کے مشہور قول کا بھی حوالہ دیا، کہ کسی مرد کو اپنی عزت، کسی عورت کو اپنی پاکدامنی اور کسی قوم کو اپنی آزادی کی قیمت پر کسی کا شکرگزار نہیں ہونا چاہیے۔ امبیدکر کی تیسری نصیحت سرکار کو بھارتی سماج کی وراثت میں ملی خرابیوں اور برائیوں کو خصوصاً چھوت چھات اور ذات پات کے نظام کو ختم کرنے کے لیے ضروری کارروائی کے بارے میں تھی۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ یہ سب کسی نہ کسی طرح جڑ سے اکھاڑ پھینکی جائیں۔ مگر انھیں احساس تھا کہ یہ سب آسان نہیں ہے۔ بتدریج عمل ہی کہیں ان کو ختم کرسکتا ہے۔ ذات پات کی خرابیاں اپنی جگہ پر۔ مگر گھٹی میں پڑی روایات قانون سے زیادہ مستحکم ہوتی ہیں۔ وہ ٹوٹتے ٹوٹتے بھی کئی نسلوں کو پار کر جاتی ہیں۔

(باقی صفحہ ۴۸ پر)

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: "انتخاب رقعات و اشعار غالب"
مرتب: کالی داس گپتا رضا   قیمت: اسی روپے
ملنے کا پتہ: ول پبلی کیشنز، ۱۵۷۔ جولی بھون۔ ۱
۱۵۔ نیو میرین لائن، بمبئی ۔ ۴۰۰۰۲۰

اُردو میں چند محقق ایسے ہیں جن کی تحریر سے یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ فن تحقیق کو بہتر ڈھنگ سے برتنے کا ہنر جانتے ہیں۔ جناب کالی داس گپتا رضا کا شمار بھی انہی محققین میں کیا جاتا ہے جن کی عالمانہ نظر تلاش و جستجو اور محنت موضوع تحقیق کو معیار اور اعتبار کا نمونہ بنا دیتی ہے۔

غالبیات اُردو تحقیق کا ایک خاص موضوع رہا ہے۔ کالی داس گپتا نے "انتخاب رقعات و اشعار غالب" میں غالبیات کے کچھ اوراق ترتیب دے کر تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ غالب کی یہ تحریر (رقعات غالب) کن کن مراحل سے گزری، کہاں کہاں شائع ہوئی، اور خود غالب کے قلم سے کیا حک و اصلاح ہوئی، وہ سب اس انتخاب میں شامل ہے۔

محقق نے اس رسالہ کی اہمیت کے لیے جن باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے وہ یقیناً لائق توجہ ہیں۔ ایک تو غالب کی تحریر، دوسرے خود ان کی اصلاح شدہ تیسرے ان کی نثروں کا اولین مخطوطہ۔

امید ہے کہ قارئین صحت متن اور تحقیق و ترتیب کی بنا پر انتخاب رقعات و اشعار غالب کی خاطر خواہ پذیرائی کریں گے۔

—— وقار ناصری

نام کتاب: "سنگِ آتشیں"
مصنف: بدرالدین انصاری   قیمت: تیس روپے
ملنے کا پتہ: مکتبۂ دین و ادب۔ امین الدولہ پارک
لکھنؤ

"سنگ آتشیں" کے شاعر بدرالدین انصاری صاحب کے پہلے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں لیکن انھیں شکایت ہے کہ جس سرد مہری سے ادبی حلقوں میں ان کی شاعری کی پذیرائی ہوئی ہے، اس سے وہ دل برداشتہ ہیں۔ ظاہر ہے اس دور میں اس کثرت سے شعری مجموعے منظر عام پر آتے ہیں کہ جب تک کسی مجموعے میں کوئی چونکا دینے والی بات نہ ہو قاری کا متوجہ ہونا ذرا مشکل ہوتا ہے، اس لیے اس نکتہ کو بھی نظر رکھنا ضروری ہے۔

بہرحال زیر نظر مجموعۂ کلام سنگ آتشیں جدید اور قدیم اور آزاد نظموں کا ایک سنگم ضرور ہے۔ شاعر اگرچہ استعارے اور علامات سے کام لینا چاہتا ہے اور وہ ہمہ جہت شعر تخلیق کرنے پر قادر بھی ہے جہاں شعری مطالبے اسے نت نئے امکانات کی جستجو میں سرگرداں بھی کرتے ہیں مگر اس کے لیے موزون طبع لازمی شرط ہے۔

ابتدا میں بدرالدین انصاری کا پیش لفظ بھی ہے اس کے بعد صفحہ ۱۲ تا ۱۰۱ تک غزلیات کا سلسلہ ہے آخر میں نظمیں شامل ہیں۔ کتابت طباعت اور سرورق اچھا ہے۔

روایت اور جدت کے ساتھ ساتھ "سنگ آتشیں" کی شاعری پڑھنے کے لائق ہے۔ جگہ جگہ ایسے اشعار بھی ہیں جو قاری کو محسوسات کی دنیا میں دور دور تک لے جاتے ہیں۔

—— راحت علی خاں

نام کتاب: "میری پلکیں تیرے آنسو"
شاعرہ: پروین مسعودی   قیمت: ۱۵/- روپے
ملنے کا پتہ: دانش محل۔ امین الدولہ پارک، لکھنؤ

پروین مسعودی سوز دروں کے اظہار کے لئے شاعری کو وسیلہ بنا کر ایک گونہ سکون حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں سے انھوں نے

دنیا کو سنوارنے، سجانے اور نکھارنے کی حتی المقدور کوشش کی ہے۔ اس کوشش میں کامیابی کے لیے انھیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ وہ بہت کچھ کرنے کے لیے تیار نظر آتی ہیں۔ انھیں اپنے فن کی ناپختگی کا احساس ہے اسی لیے وہ بے ہنری کو ہنرمندی سے بدل دینے کے لیے کوشاں ہیں ان کی دعا ہے ؎

بے ہنر ہوں سخن وری دے دے
میرے شعروں کو زندگی دے دے

ان کے کلام کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ غزل کہنے کا سلیقہ رکھتی ہیں اور اس کے لوازم سے بھی خود کو واقف اور آشنا کر چکی ہیں۔ وہ اکثر و بیشتر بالکل آمادہ نظر آتی ہیں، زمانے کے تیور سمجھتی ہیں۔ بیتے دنوں کی خوش گوار یادوں کو حال کی تلخیوں کے بدلنے میں استعمال کرتی ہیں۔ دھڑکتا ہوا دل رکھتی ہیں تو چشم بینا بھی رکھتی ہیں۔ یہ خوبیاں غزل کہنے کے لیے ضروری ہوتی ہیں اس لیے اگر وہ گیت وغیرہ کے چکر میں نہ پڑ کر سنجیدگی سے غزل کے گیسو سنوارنے میں منہمک رہیں تو بہت سے ایسے اشعار پیش کر سکتی ہیں جن کو برسوں یاد رکھا جائے گا۔ ان کے یہاں غزل کے تمام لوازم موجود ہیں۔ تراش و خراش کی ضرورت باقی ہے۔

ان کے کلام میں حزن و ملال کے غالب عنصر کے ساتھ ساتھ دل کشی اور سرکشی بھی نمایاں ہے۔ جلال میں جمال کا پرتو ہے کہیں کہیں تجربہ اور پختگی بھی جھلکتی ہے اس لیے اچھی امید رکھنا غلط نہیں ہے۔

"میری پلکیں تیرے آنسو" میں اکثر ایسے اشعار ملتے ہیں جن سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ اگر شاعرہ نے مشق سخن جاری رکھی تو یقیناً کچھ کر گزرے گی۔ شعر ملاحظہ ہو ؎

جن کو اڑنے کا کوئی شوق نہیں
دوسروں کی ہنسی اڑاتے ہیں

یہ مختصر سا شعری مجموعہ فرصت کے لمحوں کو مسرت بخش سکتا ہے۔ کتابت، طباعت نفیس ہے مگر قیمت اور سرورق الجھن میں مبتلا کرتا ہے۔

——— احمد ابراہیم علوی

نام کتاب: سفر (شعری مجموعہ)
مصنف: حیرت رزاقی۔ قیمت: ۵۰/ روپئے
ملنے کا پتہ: حیرت رزاقی محلہ گنپت سرائے سہارن پور

سفر سید مہتاب حسین حیرت رزاقی کی ۴۴ نظموں کا مجموعہ ہے جس میں ان کی زندگی کے تلخ و شیریں تجربات کا عکس نمایاں ہے۔ زندگی کے سفر میں شاعر نے اپنے سماج میں روزمرہ پیش آنے والے واقعات کو جس رنگ میں دیکھا ہے اسی رنگ میں قاری کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

رکشہ والا۔ بھکارن۔ اور طوائف کے ذریعہ شاعر نے موجودہ دور کی بے کاری، غربت و افلاس، بے حیائی اور بے غیرتی کی صورت حال واضح کرتے ہوئے سماج کی گھناؤنی تصویروں کو انوکھے انداز میں پیش کیا ہے غریب بھکارن کی عصمت کے سوداگر اور لٹیرے تو قدم قدم پہ نظر آتے ہیں لیکن عزت کے ساتھ تحفظ فراہم کرنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔

"ترقی" اور "اداکار" میں مادی ترقیوں کے منفی زخم کی بھی ایک جھلک پیش کر کے قاری کو غور و فکر پر آمادہ کرنے کی سعی کی ہے۔

ان کے علاوہ ماں۔ سہاگ رات۔ آخری وعدہ۔ مشورہ۔ ایک بھکاری ایک پجاری۔ خانہ بدوش۔ امنت۔ اور سانپ وغیرہ اچھی نظمیں ہیں۔

حیرت نے نظموں میں اپنے تجربات و مشاہدات کے اظہار کے لیے جو زبان استعمال کی ہے وہ نہایت آسان اور سادہ ہے۔ علامات و اشارات سے جہاں کام لینا ناگزیر ہوا ہے وہاں بھی اس بات کا خیال رکھا ہے کہ بہت زیادہ ابہام اور پیچیدگی نہ پیدا ہو۔

آخر میں ان نظموں کو ہندی رسم الخط میں شائع کیا گیا ہے اور بعض مشکل الفاظ کے معنی بھی درج کر دیئے گئے ہیں تاکہ اردو داں طبقے کے ساتھ ساتھ ہندی داں افراد بھی استفادہ کر سکیں۔

"سفر" میں کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں بھی ہیں مگر مجموعی طور پر کتابت و طباعت اور کاغذ اچھا ہے۔

——— ڈاکٹر ای، اے، حیدری

نام کتاب: **ڈاکٹر ذاکر حسین**
مصنف: محمد مجیب ۔ مترجم: محمد طیب جامعی
قیمت: باون روپئے (۵۲/-)
ملنے کا پتہ: نیشنل بک ٹرسٹ (انڈیا)، گرین پارک
نئی دہلی

ڈاکٹر ذاکر حسین ہندستانی تاریخ کی روشن ترین شخصیتوں میں سے ایک تھے جنھوں نے ہر طرح سے اور ہر میدان میں اپنا شان دار ریکارڈ چھوڑا اگر بچوں کے لیے ادب کی تلاش ہو تو "ابّو خاں کی بکری"۔ اگر فلسفہ کے میدان میں اعلیٰ ترین ذہنی تربیت کے لیے نگاہ اٹھے تو افلاطون کی کتاب کا ترجمہ اور ان کے خطبات، عملی زندگی میں بحیثیت ماہر تعلیم جامعہ ملیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ان کی خدمات اور ہندستان کی سیاسی زندگی میں بہار کے گورنر، نائب صدر جمہوریہ اور صدر جمہوریۂ ہند کی حیثیت سے ان کا وقار اور روشن کارنامہ سنہرے حروف میں لکھا جائے گا۔

پروفیسر مجیب نے ان کی شخصیت کے ہر رُخ کو پیش کیا ہے اور ان کی شخصیت کے ساتھ ساتھ بیسویں صدی کی ساتویں دہائی تک جو سیاسی تحریکات تھیں شخصیات کا جو انانیتی تصادم تھا اور جس رُخ سے ملک میں مختلف تہذیبی، معاشی، تعلیمی دھارے سرگرم تھے۔ ان سب کا اس کتاب میں احاطہ کیا گیا ہے۔

ذاکر صاحب کی زندگی کے ابتدائی نقوش، ان کا خاندانی پس منظر اور ان کے بھائیوں کے حالات، ان کی والدہ کی یہ تمنا اور تڑپ کہ ان کے گھر میں کوئی لڑکی پیدا ہو اور فطرت کا یہ فیصلہ کہ انھیں سات لڑکے عطا کیے اور ان میں سے بھی چار نوجوانی کی منزل تک ہی آسکے اور داغ مفارقت دے گئے۔ ذاکر حسین خاں، یوسف حسین خاں، محمود حسین خاں نے زندگی کی شاہراہ پر اپنے نقوش قدم کو ابھارا۔ یہ پہلو بھی بہت دل چسپ ہے کہ اس خاندان کا سلسلہ قائم گنج ضلع فرخ آباد (یوپی) سے حیدرآباد (اے پی) تک پھیلا ہوا ہے۔

مجیب صاحب کا طرز تحریر اپنے تخلیقی اظہار کے لیے شہرت رکھتا ہے۔ ان کا یہ فقرہ ملاحظہ ہو:

"ہندستان کی تاریخ میں پٹھان بہت سی برائیوں کا سبب اور علاج ثابت ہوئے ہیں"

محمد طیب صاحب نے اچھا ترجمہ کیا ہے۔ تقریباً ڈھائی سو صفحات کی یہ کتاب بہترین کاغذ اور اعلیٰ ترین طباعت کے ساتھ صرف باون روپے کی ہے۔ نیشنل بک ٹرسٹ مبارک باد کا مستحق ہے کہ اس نے قومی سوانح حیات کے سلسلے میں ڈاکٹر ذاکر حسین پر اتنی اچھی کتاب پیش کی ہے۔

ڈاکٹر فہمال احمد

نام کتاب: **"سفر حجاز"**
مصنف: شارق علوی
ملنے کا پتہ: سی۔۸، دگیان پوری۔ مہانگر۔ لکھنؤ

سفرنامے تاریخی ہوں یا شخصی، کافی حد تک مفید معلومات کا وسیلہ ہوا کرتے ہیں۔ ادھر کچھ عرصے سے سفرناموں کی اشاعت میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔ جہاں تک شارق علوی صاحب کے سفر حجاز کا تعلق ہے، اس کے بغور مطالعے کے بعد اس کی افادیت و انفرادیت کا شدید احساس ہوتا ہے جس کا اصل سبب یہ ہے کہ مذکورہ سفرنامہ فریضۂ حج بیت اللہ، اس کی روحانی افادیت، پاکیزگی نفس اور صحت ایمانی کی نہ صرف ترجمانی کرتا ہے بلکہ عازمین حج کے لیے گراں قدر معلومات فراہم کرتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے مصنف نے اپنے ارکان حج کے دوران دیگر مومنین کی خواہشات کو بھی ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ ابتدائے تحریر میں غالب کے شعر

کعبہ کس منہ سے جاؤگے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

کا تصرف اپنی ذات کے تجزیے کے لیے توجہ طلب ہے۔ مقام مدینہ یعنی صفا و مروہ کی پہاڑیوں کا تذکرہ، میدان عرفات میں حجاج کی کیفیات، جبل النور کی وضاحت، مسجد نبوی کی منظر کشی اور مسجد قبلتین کی اہمیت کی عکاسی تصنیف کی وہ صفات ہیں جو بیک وقت قاری کے دل و دماغ میں شوق زیارت بیت اللہ کو بھی بیدار کرتی ہیں اور اس کتابچہ کو ان

کتب کی فہرست میں بھی شامل کرتی ہیں جو قبل حج برائے مطالعہ ضروری تصور کی جاتی ہیں۔

اس طرح سفر حجاز مجموعی طور پر سفرناموں کی فہرست میں ایک بیش قیمت اضافہ ہے جس کے لئے مصنف قابلِ مبارک باد ہے۔

—— ارشاد امروہوی

نام کتاب: "کائناتِ روش"
شاعر: نواب باقر علی خاں روشؔ لکھنوی
ملنے کا پتہ: دانش محل، امین الدولہ پارک لکھنؤ

"کائناتِ روش" باقر علی خاں روشؔ لکھنوی کے مراثی وسلام کا مجموعہ ہے جو پانچ مراثی اور سات سلاموں پر مشتمل ہے۔ بقول شارب ردولوی

"واقعاتِ کربلا پر مرثیے لکھنے کی تاریخ بہت پرانی ہے جب سے اُردو شاعری شروع ہوئی ہے اسی وقت سے مرثیے لکھنے کی ابتدا بھی ہوئی۔ اس وقت ان کا نام خواہ کچھ بھی رہا ہو اور اسے غزل کی ہیئت میں نظم کیا گیا ہو یا مثنوی کی شکل میں، اس کی نوعیت سلام و نوحے کی رہی ہو یا کچھ اور لیکن قلی قطب شاہ ہوں یا ملّا وجہی، اشرف ہوں یا نصرتی سب کے یہاں کسی نہ کسی شکل میں غمِ حسین کا اظہار ملتا ہے۔ غمِ حسین کا یہی اظہار مرثیے کے ارتقا کا تاریخی تسلسل ہے جس کے فن کی اعلاترین منزل کا نام میر انیسؔ ہے۔"

چنانچہ باقر علی خاں روشؔ کی شاعری کی ابتدا ہی غمِ حسین سے ہوئی جس کے لیے انھیں اپنے گھر کا ماحول سازگار ملا۔ روشؔ ایک درد آشنا دل رکھتے ہیں اور اس کے لیے مرثیہ تو مرثیہ ہے غزل بھی شاید اس وقت تک کامیاب نہیں ہوتی جب تک کربلا کے پس منظر میں کوئی شعر نہ ہو جاتا۔ اہلِ نظر خوب جانتے ہیں کہ در اصل ہیئت پر جبہ سائی کرنے کے لیے سید سجاد حسین کے الفاظ میں: "خاکِ کربلا سے تیمم کرنا پڑتا ہے تب نمازِ عشق ادا ہوتی ہے۔"

روشؔ اس سے بخوبی واقف ہیں اور اسی غم کو اپنا ملجا و ماویٰ سمجھتے ہیں۔ بے شک آنسو اگر سچے ہیں تو ایسا ہی اثر رکھتے ہیں۔ روشؔ کے اشعار شعری کمالات کا مظہر ہیں۔

مجموعی طور پر ان کی یہ کاوش اس دور میں ایک کامیاب کوشش ہے اور ناظرین کو متوجہ کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں اس لئے عوام میں یہ کاوش ضرور مقبول ہوگی۔

—— فاطمہ وصیّہ جائسی

نام کتاب: قوام العقائد
مصنف: محمد جمال قوام ترجمہ: پروفیسر نثار احمد فاروقی
قیمت: چالیس روپئے
ملنے کا پتہ: دانش محل، امین الدولہ پارک لکھنؤ

صوفیاء سلسلے کے اہم بزرگ حضرت نظام الدین اولیاء ہیں جو مفسّر بھی تھے محقق بھی اور نہایت لطیف اور نکتہ سنج طبیعت کے مالک بھی تھے۔ حضرت امیر خسروؒ بھی حضرت نظام الدینؒ اولیاء کے عاشقوں میں شمار ہوتے ہیں۔

حضرت نظام الدین اولیاء خواجہ فریدؒ گنج شکر کے خلیفہ تھے اور حضرت بابا فرید حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے خلفاء میں تھے۔ اس سے حضرت نظام الدین کی عظمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ حضرت خواجہ نظام الدینؒ کے سلسلے کی کتابوں میں فوائد الفواد اور سیر الاولیاء بہت مشہور ہیں۔

قوام العقائد کا واحد مخطوطہ جامعہ عثمانیہ کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ اس کے لکھنے والے محمد جمال قوام ہیں۔ اس کتاب کا سنِ تالیف ۷۵۲ھ ہے یعنی حضرت شیخ کے وصال کے صرف تیس سال بعد لکھی گئی۔ اس کا ترجمہ پروفیسر نثار احمد فاروقی نے کیا ہے۔ یہ کتاب نو ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک سو ایک حکایتیں اور نویں باب میں انچاس "فائدے" درج ہیں۔ ان تمام حکایات میں حضرت نظام الدین اولیاء کے ساتھ مختلف طبقے کے افراد کے واقعات درج ہیں۔

اس پوری تصنیف کا سب سے اہم پہلو وہ معرکۃ الآرا فقرے ہیں جن کی

روشنی میں آج بھی اور آنے والے کل میں بھی انسان اپنی زندگی کی شب تاریک کو سحر میں بدل سکتا ہے۔ ایسے کچھ فقرے درج کیے جاتے ہیں:

(۱) " اوّل تو کسی کو مشہور نہیں ہونا چاہیے اور جب کوئی مشہور ہو ہی گیا تو چاہیے کہ ایسے رہے جو کل قیامت کے دن رسول اللہ کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔"

(۲) "اولیاء کی کرامات حق ہے مگر ولی پر کرامت کا چھپانا فرض ہے۔"

پروفیسر نثار احمد فاروقی نے ترجمہ کا اعلا ترین معیار پیش کیا ہے اور ترجمہ کی مشق کے لیے اس طرح کی کتابیں بہت مفید ہیں۔ کتاب میں جملہ ایک سو اکتیس صفحات ہیں۔

——— اقبال احمد اعجازی

بابا صاحب امبیڈکر ...... ص۲۲ کا بقیہ

بہر نوع یہ بات اپنی جگہ مسلّم ہے کہ ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر ہندوستان کے ایک ایسے فرزند عظیم ہیں جن کے افکار و خیالات اور عملی جدوجہد نے ایک بڑے طبقہ کو زندگی کا احساس دلایا۔ وہ بلندیوں پر پہنچ کر بھی ہمیشہ ملول و مضطرب رہے۔ دلت اور پسماندہ طبقوں کا درد کبھی ان کے دل سے کم نہیں ہوا۔ اُن کی آنکھیں سدا بھیگی رہیں۔ لیکن ان کا جذبہ ختم نہیں ہوا ہے۔ وہ آج بھی لاکھوں افراد کے دلوں کی دھڑکن بنا ہوا ہے۔ عظیم ہندوستان کی بقا اور سالمیت کے لیے اس جذبہ کی بڑی اہمیت ہے۔ لیکن ان کے جذبات کی پیروی کے لیے صحیح سمت اور راستہ اختیار کرنا ضروری ہے۔ بڑی باریکی سے ان کے افکار کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ وہ ساری عمر کانٹوں بھرے راستوں سے گزرے۔ مگر ان پر آنے والی نسلوں کے لیے ایسے سدا بہار پھول کھلائے گئے جو ہر موسم میں چمکتے رہیں گے اور منظر کی شادابی میں اضافہ کرتے رہیں گے ——— یہی پھولوں کے رنگ آسمان پر دھنک بن کر جگمگائے ہیں۔

——— سہیل احمد

اقلیتوں کی فلاح کے لئے

نئی حکومت کے عزائم

- اقلیتی طبقے کے لیے مرکزی سرکار کے منصوبوں سے متعلق کام۔
- [illegible] سے متعلق کام۔
- [illegible] اقلیتی [illegible] سے متعلق [illegible]
- اقلیتی طبقے کی [illegible] کے لیے [illegible] جائے [illegible] پر [illegible] [illegible] سے متعلق [illegible]
- [illegible] اقلیتی [illegible] زبانی [illegible] سے متعلق تمام کام
- [illegible] سے متعلق تمام کام۔
- [illegible] سے متعلق [illegible]
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible] اور [illegible] کا کنٹرول۔
- [illegible] سے متعلق [illegible] نے [illegible] منصوبوں سے متعلق [illegible] کام۔
- [illegible] کی ادائیگی کے معاملات
- [illegible] وقف [illegible] سے متعلق معاملات
- [illegible] اور وثیقہ سے متعلق دیگر کام

نئی حکومت اور اقلیت .... ص۴۴ کا بقیہ

یہ توقع کی جاتی ہے کہ بہت جلد پورے صوبے میں ہر سرکاری دفتر میں اردو مترجمین کا تقرر ۱۹۹۵ء کے اختتام تک مکمل ہو جائے گا۔

نئی حکومت نے محترمہ مایاوتی وزیر اعلا اتر پردیش کی قیادت میں بہت سارے منصوبے تیار کر رکھے ہیں جن کی طرف محترمہ مایاوتی نے اشارہ بھی کیا ہے لیکن ان سب سے زیادہ اہم وہ احکامات ہیں جو انھوں نے حال ہی میں جاری کیے ہیں اور جن کی وجہ سے ہر دفتر میں بغیر کسی امتیاز کے مسلمانوں کا تقرر یقینی ہو جائے گا۔

——— ڈاکٹر رضوان حیدر

اودھ نمبر (۲)
تاثرات کے آئینے میں

محبِ مکرم! آپ نے اودھ نمبر دو جلدوں میں بہت عمدہ نکالا مبارکباد! ابھی صرف آلِ احمد سرور اور علی جواد زیدی کے مضامین پڑھے ہیں۔ دونوں بہت پسند آئے۔ جموں میں پڑھنے کا موقع کم ملتا ہے۔ یہ کام سفر ہی میں کرتا ہوں۔ سرور صاحب نے جوش صاحب کی رباعی کا پہلا مصرع یوں لکھا ہے ؎

غنچے تری بے بسی پہ دل ہلتا ہے

جہاں تک یاد پڑتا ہے جوش صاحب کی زبان سے لاتعداد مشاعروں میں یہ مصرع یوں سُنا ؎

غنچے تری زندگی پہ دل ہلتا ہے

——— پروفیسر جگن ناتھ آزاد

ابھی ابھی نیا دور کا اودھ نمبر جلد دوئم ملا۔ یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ مکمل پڑھ لیا ہے، لیکن آدھا پڑھنے پر یہ تاثرات ظاہر کر رہا ہوں کہ پہلی جلد بہت بڑھیا تھی لیکن جلد دوئم کا کیا کہنا۔ الفاظ نہیں مل سکتے اس کی تعریف کے لئے۔ خاص کر قرۃ العین حیدر، آلِ احمد سرور، نیر مسعود اور محمود الحسن کے مضامین۔ کتابت اور سرورق کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے ان دو جلدوں میں آپ نے اودھ کی تہذیب کو نہ صرف زندہ کر دیا ہے بلکہ حال کی اور مستقبل کی پیڑھیوں کے لیے ایک مشعل راہ قائم کر دی ہے کیوں کہ وہ صرف اپنے ماضی سے بیگانہ ہی نہیں ہیں، جاننے کی کوشش بھی نہیں کرتے اس لیے میری درخواست ہے کہ ان دونوں جلدوں کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے اور اگر ممکن ہو تو ہندی اور انگریزی ترجمہ میں شائع کر کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنے ماضی کا احساس دلائیں۔ اودھ کی تہذیب ہندستانی تہذیب کا ایک نمایاں حصہ ہے سنہری حصہ ہے اور ہمیں اس پر فخر کرنے کا حق ہے بلکہ آپ کی کوششوں سے اگر اس کا کچھ حصہ بھی واپس آ سکا تو بہت اہم بات ہے۔

——— پرکاش چندر لکھنؤ

نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اوّل، کا نظریہ کبھی کبھی کسی ماہر اور چابکدست نقاش کے اعلیٰ معیارِ فن کی بنا پر غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ نیا دور کا پہلا اودھ نمبر شائع ہوا تو ایسا معلوم ہوا کہ یہ خاص نمبروں کے معاملے میں حرفِ آخر ہے اور اب کوئی دوسرا نقش اس کا ہمسر نہ ہو سکے گا۔ لیکن جب حصہ دوم اپنے حُسن اور ذوقِ جمال کے اعلا ترین نقش کی صورت میں نظر نواز ہوا تو ایسا معلوم ہوا کہ کوئی بھی شاہکار حرفِ آخر نہیں ہو سکتا۔ انسانی ذہن کی شائستگی اور خوب سے خوب تر کی تلاش معنویت، رعنائی اور دل کشی کے خوبصورت نقوش تیار کرنے میں کبھی معذور نہ رہے گی۔

انگریزی اور ہندی کے معاصر ماہنامے اپنے وسیع تر وسائل سے معیار کو اس سطح تک پہونچا چکے ہیں کہ کسی اردو رسالہ کا اس منزل تک پہونچنا ناممکن نظر آتا تھا مگر آپ کی ہمت اور احساسِ جمال نے اسے ممکن کر دکھایا ہے۔

متنوع موضوعات اور علمی اعتبار سے ان پر قلم اٹھانے والوں کا صحیح ترین انتخاب ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے جسے آپ نے غیر معمولی شائستگی اور ذاتی جدوجہد سے حل کر لیا ہے۔ درجنوں رنگین تصاویر کی شمولیت نے قاری کو گومتی کے کنارے لا کھڑا کیا ہے جہاں سے اخترپیا کا شہر لکھنؤ آئینہ کی طرح روشن نظر آتا ہے گویا یہاں کسی انقلاب کے قدم پہونچے ہی نہیں۔ احسنت احسنت۔ مرحبا مرحبا!!

زندہ باد نیا دور، اس کا خوش ذوق ادارتی عملہ اور وزیرِ اعلا کی وسعتِ قلب۔

——— تاباں نقوی۔ دہلی

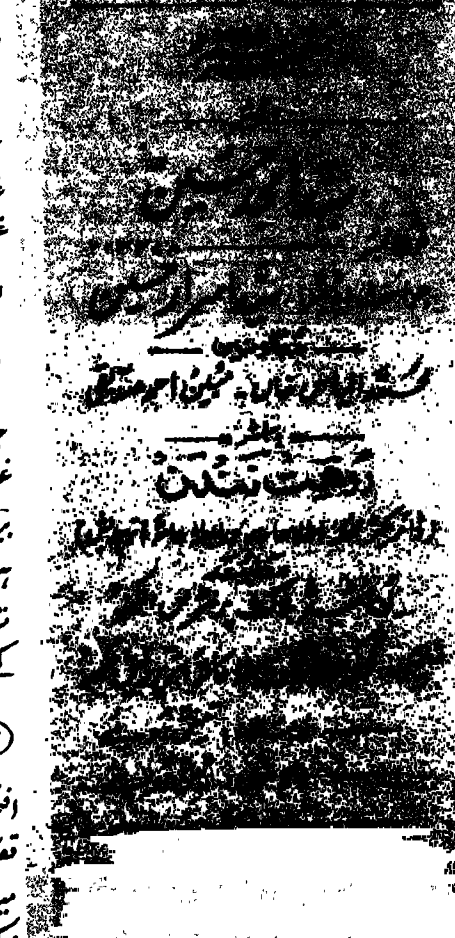
مکرمی! ابھی اودھ نمبر ۱ کا مطالعہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ آپ نے اودھ نمبر ۲ کس شان و شوکت کے ساتھ تیار کیا ہے۔ مبارکباد قبول کیجیے اس دور میں جب کہ اودھ کی سبھی نشانیوں کو نظر انداز کیا جا رہا ہے آپ نے دو نمبر نکال کر اودھ کی یاد تازہ کر دی ہے۔ سبھی مضامین ایک سے بڑھکر ایک ہیں۔ آپ کی محنت کو دیکھ کر ایک قطعہ یاد آتا ہے ؎

درحقیقت اہلِ ہمت کے لیے   کام دُنیا کا کوئی مشکل نہیں
محنت سے جی چُرا کے ترقی کی آرزو   ایسا خیال عقل کے بالکل خلاف ہے

——— شریف احمد چودھری مظفرنگر

نیا دور

جلد ۵۰ نمبر ۶



عنوانات

اپنی بات	ایڈیٹر	۲
سچائی (نظم)	زاہدہ زیدی	۳
ایک میں ہوں کہ ابھی جاگ رہا ہوں ساقی (خودنوشت)	عمر انصاری	۴
غزل	ثامن عبّاس	۱۱
غزل	مظفر حنفی	۱۲
غزل	حامدی کشمیری	۱۲
ویڈیائی خاکہ نگاری	رفعت سروش	۱۳
غزلیں	خورشید اختر بسوانی ۔ وسیم بریلوی	۱۶
	چندرپرکاش جوہر بجنوری	۱۶
جدید اردو تنقید کے کوہ کن: پروفیسر احتشام حسین	فضل امام رضوی	۱۷
غزل	ڈاکٹر نریش	۱۹
بیدی کی افسانہ نگاری: چند پہلو	کاظم علی خاں	۲۰
ہزاروں خواہشیں ایسی (نظم)	مہدی پرتاپگڈھی	۲۲
متاعِ معتبر (نظم)	رضا امروہوی	۲۲
کھلے دریچے یادداشت کے	لئیق اختر فیض آبادی	۲۳
غزلیں	محبوب پاشا	۲۸
	عبدالاحد ساز ۔ انیس امام	۲۸
افتخار اعظمی مرحوم: دبستان لکھنؤ کا ممتاز نقاد و دانشور	شمس تبریز خاں	۲۹
قصہ چہار درویش (اردو): ایک تحقیقی نظر	زاہد حسین ندوی	۳۴
میرے خوف (افسانہ)	اقبال مجید	۳۷
خودکشی (افسانہ)	ناہید جعفری	۴۰
اقلیتوں کی فلاح و بہبود کیلئے علاحدہ محکمہ کا قیام	خورشید ظفر	۴۱
اقلیتوں کے لیے بہترین اقدامات	عابد حسین	۴۲
نقد و تبصرہ	راجندر بہادر موج ۔ رحمت علی خاں	۴۴ تا
	نوشابہ سردار ۔ تسنیم فاروقی ۔ شمیم عثمانی ۔ شبنم رضوی	۴۷
اودھ نمبر (۲) تاثرات کے آئینے میں	قارئین	۴۸

اپنی بات

کوئی غرقاب کوئی ماہیِ بے آب ہوا
ابرِ بے فیض جو برسا بھی تو کیا برسا

ہر لمحہ بادل سے برستی ہوئی بوندیں ایک طرف تو شمالی ہندستان میں آبِ رحمت کے بجائے سیلاب کی شکل اختیار کر رہی ہیں اور ہریانہ، دہلی میں سیلاب کی تباہ کاریاں عروج پر ہیں — اترپردیش کے میدانی علاقوں میں دریا جھاگ اُڑاتے ہوئے غضب ناک انداز میں آگے ہی بڑھتا چلا جا رہا ہے اور الہ آباد میں پھاپھامئو سے بلیا تک کے درمیان دریائے گنگا خطرے کے نشان کو پار کر گیا ہے، لکھیم پور میں گاؤں کے گاؤں ڈوب گئے ہیں۔

اور دوسری طرف بندیل کھنڈ پانی کی ایک ایک بوند کو ترس رہا ہے اور وہاں خشک سالی کے آثار نمودار ہیں۔

ہم مجبور و لاچار بندے سوائے آسمان کی طرف سر اٹھاکر دیکھنے کے اور کیا کر سکتے ہیں۔؟ کس کی مجال ہے جو دم مار سکے۔ البتہ ایسے موقع پر حکومت سے جتنا ممکن ہو سکا عوام کی راحت رسانی کے لیے کوشاں ہے۔

وزیر اعلا نے لکھیم پور کے سیلاب زدہ علاقے کا خود جائزہ لیا اور برابر ہدایات جاری کیں۔ وہ بندیل کھنڈ بھی گئیں اور وہاں خشک سالی سے متاثر عوام کے تپتے ہوئے دلوں پر ہمدردی اور خلوص کی بوندیں برسائیں۔ اور ان کی تکلیفوں کو دُور کرنے کا عزم کیا۔

ہماری دُعا ہے کہ یہ آفتِ سماوی جلد سے جلد دُور ہو اور عوام سکون و راحت، سکھ چین سے سانس لے سکیں۔ (آمین)

یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ۱۱ ستمبر کو مایاوتی سرکار نے اپنے سو سنہرے دن کامیابی کے ساتھ پورے کر لیے ہیں اور اس موقع پر عوام کی توقعات بجا طور پر یہ ہیں کہ حکومت کا ہر قدم اترپردیش کو شاہراہ ترقی پر گامزن رکھے گا۔ اور دلت، پس ماندہ طبقات اور اقلیتوں کو مزید راحت اور سماجی انصاف مل سکے گا۔ اس ضمن میں موجودہ حکومت نے اُردو کے لئے کچھ خصوصی اقدامات کیے ہیں۔ غیر رسمی تعلیم کے سلسلے میں ۶۰ ہزار مدرسین کی تقرری کا اعلان اور اس میں دس فیصد اُردو ذریعہ تعلیم کا بندوبست اور اردو اساتذہ کی تقرری بے حد خوش گوار اور باعثِ تشکر ہے اُردو کے ایک ادنیٰ خادم کی حیثیت سے اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے ہمیں امید ہے کہ اُردو کے شیدائی اس سنہرے موقع سے استفادہ کریں گے۔

——— ایڈیٹر

سچ کی تلاش — (۲)[۱]

زاہدہ زیدی

"آبشار"، ۴- ... علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

وہ بھی شاید میرا وہم تھا
یا کوئی خواب تھا
جس میں اک مشعلِ خوش نما
تھی مری راہنما
اور وہ سچ کی قندیل تھی

پر میں آگے بڑھی جب — تو دیکھا
کہ کچھ لوگ — شاید
جو میری ہی دُنیا کے افراد تھے
مشعلیں اپنی اپنی اُٹھائے ہوئے
دوسری سمت میں گامزن تھے
جب وہ گزرے مرے پاس سے
میری مشعل کو پھونکوں سے اپنی بجھانے لگے
اور میں اسکی لَو کو بچانے کی کاوش میں
مجروح ہوتی رہی

پھر یکایک ہر اک سمت سے
یوں اُمڈنے لگے
لاکھوں لوگوں کے بپھرے ہوئے کارواں
جیسے طوفان یا زلزلہ ہو کوئی بے اماں
اور ہر قافلے میں — بڑی دُور تک
مختلف رنگ کی —
لاکھوں شمعیں بھی تھیں ضو فشاں
اور یہ مشعلیں
روشنی کی لکیروں سے ٹکراتی
اور ہر طرف سے انھیں کاٹتی
بڑھ رہی تھیں بڑے زعم سے

سب کو دعویٰ یہ تھا
سچ کی قندیل ہے
ان کی تحویل میں

میں بھی ٹکراتی کرنوں کے نرغے میں حیران سی
اپنی قندیل کی لو کو ہاتھوں سے ڈھانپے ہوئے
منزلِ شوق کی سمت بڑھتی رہی
اور پھر رفتہ رفتہ
اسی عرصۂ حشر میں
تند و سفاک کرنوں کی یلغار میں
میری منزل بھی معدوم ہونے لگی
اور اب میں نے دیکھا
کہ وہ شمع لرزاں
کہ جس کو بچانے کی کاوش میں
جھلسے ہوئے تھے مرے دست و پا —
وہ فقط میرا سچ تھی
کسی اور کی روشنی وہ نہ تھی —
اور وہ سچ
کہ جس کی تمنا میں نکلی تھی میں
مشعلِ جاں کو ہاتھوں پہ اپنے سجائے ہوئے
خود تراشیدہ سچائیوں کی جنوں خیز پیکار میں
وہ تو شاید کہیں جاں بلب تھا —
— یا
ابھی سات پردوں میں مستور تھا

□□

۱ے اس سلسلے کی پہلی نظم "نصف صدی نمبر" (مارچ، اپریل، مئی ۱۹۹۵ء) میں شائع ہو چکی ہے۔ ایڈیٹر

خود نوشت

عمر انصاری

۲۰، امین آباد پارک لکھنؤ ۱



سو گئے کب کے نئے بادہ گساران قدیم
ایک میں ہوں کہ ابھی جاگ رہا ہوں ساقی

لکھنؤ صفی، عزیز، یگانہ اور چکبست کا لکھنؤ، ظریف، آرزو اور ملا کا لکھنؤ میرا مولد و مسکن ہے۔ یہیں میں ۲۳ ستمبر ۱۹۱۲ء کو پیدا ہوا اور یہیں کے خاک کے ذروں میں ہنوز اپنی زندگی کی تلاش جاری ہے۔

آباد اجداد لکھنؤ قدیم کے باشندے تھے۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے آصف الدولہ کو فیض آباد سے آکر لکھنؤ میں بستے، اور واجد علی شاہ کو لکھنؤ سے اجڑتے دیکھا تھا۔ اس زمانے کے سکھ چین اور عشرت کے قصّے میرے نانا ماموں بڑی ہائے کے ساتھ سناتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے جنگ آزادی کے دوران جسے غدر کا نام دیا گیا، لکھنؤ سے بھاگ کر بندگی میاں کی امیٹھی میں اس طرح پناہ گزیں ہوئے تھے کہ راستے میں جہاں کہیں انگریزی افواج کی ٹکڑیوں کے گھوڑے گرد اڑاتے دکھائی پڑتے وہیں آس پاس بکھری ہوئی لاشوں کے درمیان خود بھی لاش بن کر لیٹ جاتے اور جب گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں مدھم ہو جاتیں تو پھر اٹھ کر بھاگنا شروع کر دیتے۔ اسی میں نانی جو میرے ماموں کو بھی اپنی پیٹھ پر جھولے میں لادے ہوئے تھیں جدا ہو گئیں اور کسی دوسرے قافلے کے ساتھ کسی دوسرے گاؤں پہنچ گئیں۔ تین مہینے تک نہیں ملیں اور تین مہینے کے بعد جب نانا گھر واپس آئے تو نانی کے گاؤں سے کوئی لکھنؤ آ رہا تھا جس کے ہاتھ انھوں نے اپنا سندیسہ بھیجا جس پر جا کر نانا ان سے ملے اور انھیں گھر لے آئے۔ بتاتے تھے کہ جب نانی ملی ہیں، اور نانا نانی مل کر روئے ہیں ان کا نقشہ لفظوں سے نہیں کھینچا جا سکتا کہ نہ صرف اس گھر کے لوگ جہاں نانی نے تین مہینے گزارے تھے بلکہ تمام اہل محلہ اور گاؤں کے در و دیوار تک رو دئے تھے۔

میرے دادا حاجی حسین بخش، جنھیں آنکھیں کھول کر میں نے نہیں دیکھا۔ قدیم لکھنؤ کے محلہ مصاحب گنج کے رہنے والے تھے اور فوج کے لیے رسد رسانی کا کام انجام دیتے تھے۔ غدر کے ایام میں پہلے تو لکھنؤ ہی میں دن کہیں رات کہیں، صبح کہیں شام کہیں بسر کرتے پھرتے۔ پھر وہ بھی امیٹھی بندگی میاں پہنچ گئے تھے کیونکہ انگریزوں نے ان کا وارنٹ گرفتاری نکال دیا تھا۔ کئی ماہ بعد جب طوفان ذرا ٹھہرا اور عام معافی کا اعلان ہوا تو لکھنؤ آکر گھر دیکھا جس کی تاراجی کا حال میرے باپ نے مجھے یوں سنایا تھا کہ گھر کا کوئی سامان صحیح سلامت نہیں تھا۔ زیور اور نقدی جو لٹیرے اپنے ساتھ لے جا سکتے تھے زمین سے کھود کر نکال لے گئے تھے۔ باقی سامان اس طرح توڑ پھوڑ گئے تھے کہ سب کچھ رہ گیا تھا، سب کچھ برباد ہو گیا تھا۔ کتنا سامان تو کنوئیں میں اس طرح ڈال گئے تھے کہ کنواں پٹ گیا تھا۔ اسی میں کچھ ایسا ریکارڈ، دستاویزات اور کتابیں بھی تھیں جن کا میرے والد کو آخر دم تک قلق رہا اور جو کہیں سے بھی پھر وہ فراہم نہ کر سکے۔

والد الحاج محمد اسحاق سوداگر شہر کے بڑے تاجروں میں شمار ہوتے تھے۔ گورنمنٹ کنٹریکٹر تھے اور لکھنؤ سے مغل سرائے تک ریلوے کے قلیوں کا اور اسٹالوں کا ٹھیکہ بھی ان کے پاس تھا۔ ان کے بڑے بھائی محمد حسین سوداگر تھے۔

میری ماں، میری سب سے بڑی وکیل اور نانا سب سے بڑے حمایتی تھے ان دونوں کے رہتے مجھے کبھی سوچنا ہی نہیں پڑا کہ کب مجھے کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں جب جو دل چاہا کر ڈالا کس کی مجال تھی جو مجھ سے کچھ بول سکتا۔ ماموں فارسی کے بڑے اسکالر تھے۔ ہر بات کے جواب میں گلستاں کا شعر پڑھ دیتے۔ گلستاں انھیں پوری حفظ تھی۔ میں نے آمدنامہ سے لیکر گلستاں، بوستاں تک فارسی انھیں سے پڑھی۔

میرے والد کی دس اولادوں میں سے ایک بہن اور ہم دو بھائی بچے تھے جن میں سے بہن کا تو کافی عرصہ ہوا انتقال ہو گیا تھا۔ دو ڈھائی سال ہوئے چھوٹے بھائی محمد فاروق سہیل انصاری بھی داغ مفارقت دے گئے۔

برس پندرہ، یا کہ سولہ کے ہی سن سے شاعری کا ایسا چسکا لگا کہ پھر اسے چھوڑنا بھی چاہا تو اس سنگی نے مجھے ہی نہ چھوڑا۔ یہ تو مجھے یاد نہیں کہ میں نے پہلا شعر کب اور کس عالم میں کہا لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ ۱۹۳۰ء سے باقاعدہ مشاعروں میں شرکت شروع ہو گئی تھی۔ میری شاعری کے اصل محرکات موسیقی، مصوّری اور قدرتی مناظر ہیں۔ بچپن ہی سے مجھے گانا سننے کا بے حد شوق تھا۔ کسی کے پاؤں میں بندھے ہوئے گھنگھروؤں کی آواز مجھے ایک ساحر کے معمول کی طرح میلوں پیدل چلا سکتی تھی۔ اس وقت تقریبات بھی ہوتی تھیں اور ہر تقریب میں مجروں کا بے حد رواج تھا مجھے جہاں کہیں بھی کسی ایسی تقریب کے انعقاد کی خبر ملتی خوانده یا ناخوانده پہنچنے کی کوشش ضرور کرتا۔ ساری ساری رات مجھ پر ایک محویت کی سی کیفیت طاری رہتی اور جب اُٹھتا تو دل میں ایک نامعلوم سی کسک اور عجیب قسم کی بے قراری لے کر پلٹتا۔ ایک ایک محفل کا سوز و گداز اور سرور کئی کئی دن تک قائم رہتا۔ سنے ہوئے شعر دہرائے جاتے اور ان کے متوازی اشعار گڑھنے کی کوشش ہوتی۔ اور اسی عمل میں ایک روز مجھے محسوس ہوا کہ میں نے اپنے اندر چھپے ہوئے شاعر کو پا لیا ہے۔

ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ حافظ عبدالکریم صاحب نے ناظرہ ختم کرایا۔ بڑی دھوم سے "آمین" کی تقریب منعقد ہوئی۔ ماسٹر تجمل حسین صاحب سے اردو، انگریزی اور دیگر مضامین میں تعلیم حاصل کی۔ ماموں شیخ محمد بخش صاحب نے فارسی شروع کرادی جس کے بعد امین آباد ہائی اسکول میں پانچویں درجہ میں داخلہ مل گیا۔ اور میں نے ابھی چھٹا کلاس ہی پاس کیا تھا کہ میری بڑی بہن کا طویل علالت کے بعد انتقال ہو گیا اور مجھے بھی بیماری نے پکڑ لیا۔ والدین نے از راہ محبت تعلیم منقطع کرادی۔ امین آباد سبزی منڈی کے سامنے ہوزری اور جنرل مرچنٹس کی دوکان کھلوا دی اور سوداگر صاحب بنا کر اس پر بٹھا دیا۔ لیکن شاعر کو اس طرح اپنی شاعری کے لیے ایک اور میدان ہاتھ آگیا۔ دوکانداری کے اوقات میں بھی فکر سخن جاری رہتی اور جو بکری ہوتی اس کی کتابیں اور رسائل خرید لیے جاتے۔ شاعروں کی تواضع پر بھی خاصا صرفہ ہو جاتا، بالآخر جب دوکان پر شاعروں کا جمگھٹا ان کے صبر و تحمل سے تجاوز کر گیا تو میرے والد نے ایک روز دوکان کا بچا کھچا سامان اٹھوا کر گھر میں رکھ لیا اور دوکان میں تالا لگوا دیا۔ پھر کیا تھا۔ یہی تو میں چاہتا تھا۔ دوکان سے اٹھا تو سیدھا لکھنؤ کرسچین کالج پہنچا اور اس طرح نو سال بعد میری تعلیم کا دوبارہ آغاز ہوا۔ بہرحال ۱۹۴۲ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے میں نے امتیاز کے ساتھ بی اے آنرز کی ڈگری حاصل کر لی۔

لکھنؤ کرسچین کالج کے وہ چار سال جن میں میں نے ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کیا میرے ادبی اور شعری ذوق کی تربیت کے لیے بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں کہ ایک تو مجھے وہاں ڈاکٹر جعفر حسین جیسے قابل اور شفیق استاد مل گئے جنھوں نے مجھے اردو پڑھائی نہیں پلادی۔ اور اردو کی کلاسکل شاعری کا تو وہ چٹخارہ پیدا کرادیا، کہ زمانہ بدل گیا، میں خود بدل گیا۔ لیکن آج بھی "وہ نہیں بھولتی جہاں جاؤں"، دوسرے یہ کہ میری شادی جب میں ۱۴ سال کا تھا اسی وقت اینٹوں کے بھٹہ کی مشہور فرم "رجب علی محمد علی" کے مالک شیخ رجب علی صاحب کی صاحبزادی کے ساتھ کر دی گئی اور ابھی میں نے انٹرفائنل کا امتحان بھی نہ دیا تھا کہ ۳۰ر نومبر ۱۹۳۸ء کو چار اولادیں چھوڑ کر ان کا انتقال ہو گیا۔ اس واقعے نے میری زندگی کے شب و روز ہی بدل کر رکھ دیے۔ میں وہ پہلے والا عمر انصاری ہی نہیں رہ گیا اور عقد ثانی کے بعد بھی میں نے زندگی کے سفر کی وہ ڈگر ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب نہ ہو سکا جس پر میں نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔

اور شاید یہی پس منظر تھا، جب لکھنؤ ریڈیو پر ایک انٹرویو کے دوران شفاعت علی صدیقی کے ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا تھا۔

شفاعت صاحب شاعری تو میں نے یہاں سے شروع کی۔

سیر کی خوب جلوہ گاہوں کی　　　جھولیاں بھر گئیں نگاہوں کی

لیکن جلد ہی لَے بدل گئی اور یہ کہنے لگا:-

ثبات عشق نہیں ذوقِ دید کا ممنوں　　　ترا خیال مُبارک تری تلاش جنوں

اور اَب یہ کہہ رہا ہوں:-

آدمی ایسا گھرا شورشِ افکار میں ہے　　　وہی سب کچھ ہے غزل میں بھی جو اخبار میں ہے

لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے آنرز کر لینے کے بعد باہر قدم رکھا تو دوسری جنگِ عظیم کا سامنا تھا۔ میرے ایک ساتھی وحید الحسن مجھے ملٹری

اکاؤنٹس آفس لے گئے جہاں نہ صرف یہ کہ مجھے نوکری مل گئی بلکہ اپنی عملی لیاقت کی بنا پر جلد ہی سپرنٹنڈنٹ بھی بنا دیا گیا۔ جنگ کے خاتمہ پر میرا تبادلہ الہ آباد کر دیا گیا۔ میں چونکہ لکھنؤ چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا لہٰذا گھر بیٹھ رہا۔ اسی دوران لکھنؤ آئیڈیل اسٹوڈیوز میں۔ دی سائن ٹون لمیٹڈ۔ کے بینر پر ایک فلم۔ رشید دلہن۔ بننا شروع ہو گئی جس کے نغمہ نگار کی حیثیت سے جگر مراد آبادی اور خمار انصاری کے نام قرعہ فال نکل آیا اور یہیں سے میری فلمی زندگی کا آغاز ہوا۔

رشید دلہن کے گانوں کی موسیقی کے لیے مشہور موسیقار غلام محمد کی خدمات حاصل کی گئیں۔ وہیں بمبئی ہی میں گانوں کی ریکارڈنگ ہوئی۔ ایم ایچ وی کے ریکارڈ ریلیز بھی ہوئے جن کی گونج کبھی کبھی اب بھی ریڈیو سیلون۔ اور "ودیودھ بھارتی" سے سنائی دے جاتی ہے لیکن فلم مکمل نہ ہو سکی جس کے بعد ہی میں سنہ ۱۹۴۹ء میں بمبئی چلا گیا جہاں نوشاد صاحب اور سنی صاحب میرے منتظر تھے۔ میرے وہاں پہنچتے ہی ان دونوں نے مجھے بحیثیت کنٹرولر آف پروڈکشن لے کر سنی آرٹ پروڈکشن کی داغ بیل ڈال دی اور فلم۔ بابل۔ بنانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں جس کے پہلے لیٹر ہیڈ سے لگا کر اس کی تکمیل، سنسر اور ریلیز تک کے سب مراحل میں نے ہی طے کئے۔ اس کے پریمیئر شو میں شرکت کی غرض سے دلی، لکھنؤ، کلکتہ، مدراس، احمد آباد (ہندوستان میں) لاہور، کراچی راول پنڈی، ملتان اور حیدر آباد سندھ گیا، اور بڑے تحفے تحائف لے کر واپس آیا۔ وہاں نئے پرانے دوستوں، ادیبوں اور شاعروں سے بھی خوب خوب ملاقاتیں رہیں۔ فلم بابل سنہ ۱۹۵۱ء میں ریلیز ہو گئی تھی۔ اسی سال میں نے "ایشین فلمس" کی بنیاد ڈال کر اس کے سول پروپرائٹر اور پروڈیوسر کی حیثیت سے فلم "شیشہ" بنانا شروع کر دی۔ کہانی عصمت چغتائی سے لکھوائی، اور ڈائرکشن شاہد لطیف کے سپرد کیا۔ نرگس سے میں وعدہ بابل کی شوٹنگ کے دوران ہی لے چکا تھا اور اس طرح فلم "شیشہ" بھی ۱۹۵۲ء میں مکمل ہو کر ہندوستان بھر میں ریلیز ہو گئی۔

"شیشہ" فلم کے بعد میں نے "اجنبی" بنانے اعلان ضرور کیا لیکن احتیاطاً فلم فلور پر نہیں ڈالی۔ اس لیے کہ ان دنوں پاکستانی کسٹم پر جو ہندوستانی فلمیں روک لی گئی تھیں۔ انھیں میں ایک میری فلم "شیشہ" بھی تھی اور میرے سامنے یہ سوال آ کھڑا ہوا تھا کہ اب اگر میں فلم بنانا چاہوں مجھے مارکیٹ سے فینانس لے کر بنانا ہوگی جس کے لیے بیک وقت کئی فینانسر تیار بھی تھے کیونکہ میں نے جتنے مختصر عرصہ میں بابل اور شیشہ جیسی دو کامیاب فلمیں بنا کر ریلیز کر دی تھیں وہ ایک بڑے کریڈٹ کی بات تھی لیکن بہر حال ایک بڑے خطرے کا سودا تھا۔ راتوں کی نیندیں حرام کر دینے والا اور میں چونکہ اس کے لیے تیار نہیں تھا لہٰذا ۱۹۵۵ء میں لکھنؤ واپس چلا آیا یعنی یہ کر کے۔

جتنے دن گذری، گذاری زاہدوں میں زندگی
پھر وہی میں تھا وہی مے تھی، وہی میخانہ تھا

بہر حال فلمی زندگی میں فلم سازی کے علاوہ فلم "رشید دلہن" کے لکھنؤ میں۔ فلم "شیشہ" کے بمبئی میں۔ اور فلم "سوہنی مہیوال" کے لاہور (پاکستان) میں گانے بھی لکھے جب میں وہاں فلم "شیشہ" کی کسٹم سے ریلیز کی کوشش میں گیا ہوا تھا اور شوکت تھانوی کے وہاں مقیم تھا۔ فلمولڈ میں سانگ رائٹری کو کیریر نہ بنانے کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہوا کہ اگر میں گانے لکھتا تو موسیقار اعظم نوشاد کے ساتھ ہی لکھتا، کہ وہ میرے عزیز بھی ہیں دوست بھی، اور میری شاگردی کا دم بھی بھرتے رہے ہیں۔ اور ان دنوں نوشاد اور شکیل کی جوڑی اپنے عروج پر تھی، لہٰذا ظاہر ہے کہ اس طرح میری وجہ سے اس جوڑی کو ٹوٹنا پڑتا۔ اور یہی بات میرے دل کو قبول نہ ہوئی۔

اس دوران کا ایک واقعہ بھی یقیناً میری زندگی کا اہم واقعہ ہے کہ "رشید دلہن" کے گانے لکھ دینے کے بعد اس کے منیجنگ ڈائرکٹر نسیم سندیلوی نے مجھے "سکریٹری" دی سائن ٹون لمیٹڈ" بنا دیا تھا اور ان کے ساتھ میرے بہت ہی دوستانہ اور برادرانہ تعلقات استوار ہو گئے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں جب ہر طرف فسادات بھڑک اٹھے تھے اور اس کے ساتھ "رشید دلہن" کی شوٹنگ بھی معطل تھی، مستقبل بھی غیر یقینی حالات کا شکار تھا۔ لوگ دھڑا دھڑ پاکستان چلے جا رہے تھے۔ یکایک نسیم صاحب نے بھی پاکستان چلے جانے کا پروگرام بنا لیا اور مجھ سے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم نیشنلسٹ مسلم ہوں یا لیگی، ابھی کچھ پرانی نسل کے لوگ موجود ہیں جو اس فرق کو سمجھتے ہیں اور ہماری قربانیوں کی قدر کرتے ہیں۔ آنے والی نسلیں اس امتیاز کو ختم کر دیں گی اور پھر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کیا ہوگا۔ بہر حال دن گذرتے گئے اور ساتھ ہی ان کا اصرار بھی بڑھتا گیا۔ آخر وہ رات آ گئی جس کی صبح کو نسیم صاحب کے کوچ کی تیاری تھی۔ میں ساری رات نہ سو سکا۔ ساری رات رویا اور ساری رات

ایک نظم "اجڑا دیار" لکھنے میں گذار دی۔

دوسرے دن صبح تڑکے ہی تڑکے جب میں نسیم صاحب کے وہاں پہنچا تو میرا چہرہ بھرا بھرایا ہوا تھا، آنکھیں سرخ، قدموں میں لغزش، اور آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔ میں نے خود پر قابو پانے کے لیے بغیر کسی تمہید کے نظم ترنم میں شروع کر دی۔ مجھے احساس بھی نہ ہوا کہ کب میں نے نظم شروع کی اور کتنی دیر میں پڑھتا رہا اور اس دوران ہم دونوں وہاں حاضر تھے کہ غائب بہرحال نظم کے خاتمے پر ہم دونوں کے پاس بجز آنسوؤں کے تبادلے کے اور کچھ باقی نہ بچا تھا۔

فلمی دنیا کی جانب مڑ جانے سے پہلے میری زندگی ایک شاعر اور صحافی ہی کی زندگی تھی اور اس کا سلسلہ ۱۹۳۲ء سے لے کر ۴۴/ ۴۵ء تک کے دورانیے پر محیط ہے اور اس وقت ختم ہوا جب سائن ٹون لمیٹڈ کے سکریٹری کی حیثیت سے میری تمام تر توجہ ادھر ہی مرکوز ہو گئی اور میرے پاس کسی اور کام کے لیے وقت ہی نہیں رہ گیا۔ چنانچہ اس دوران میں نے ماہنامہ "صاعقہ" لکھنؤ ماہنامہ "عارف" کانپور، ہفت روزہ "ترقی اخبار" لکھنؤ، پندرہ روزہ "نظم اشارہ" لکھنؤ اور روزنامہ "الہند" لکھنؤ کے مدیر اعلیٰ کے فرائض انجام دیے۔

لکھنؤ ہمیشہ ہی سے انجمنوں کا شہر ہے۔ یہاں ہر دور میں بیک وقت کئی کئی انجمنیں سرگرم رہیں بلکہ محلے محلے انجمنوں کا زور رہا لیکن یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ مرکزی حیثیت ہمیشہ ایک ہی انجمن کو حاصل رہی۔ میں نے جب مشاعروں کی دنیا میں قدم رکھا تو معیار کے مشاعروں کا زور ٹوٹ چکا تھا جن کی ایک زمانے میں بڑی دھوم تھی۔ اور معیار الادب کی جگہ معین الادب لے چکی تھی۔ سر تیج بہادر سپرو اس کے سرپرست تھے۔ مولانا صفی صدر اور بہار لکھنوی سکریٹری۔ اس وقت معین الادب کی ممبری بڑی مشکل اور متعدد امتحانوں سے گذرنے کے بعد ہی حاصل کی جا سکتی تھی اور مجھے معلوم نہیں کہ ان امتحانوں سے میں کیونکر گذرا لیکن مجھے یہ معلوم ہے کہ فارم ممبری مجھے پیش کر کے مجھ سے دستخط کرا لیے گئے۔

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ہر ابھرتے فنکار پر نظر رکھی جاتی اور اگر وہ اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اسے ممبر بنا لیا جاتا ہے۔

معین الادب میں بہار صاحب کی سکریٹری شپ بھی اپنی نوعیت کی ایک ہی سکریٹری شپ تھی۔ پہلے وہ جا کر دعوت نامہ پیش کرتے اور مشاعرے میں شرکت کا وعدہ لیتے۔ پھر یہ پوچھنے جاتے کہ حضور نے غزل شروع کر دی ہے اور کوئی شعر کہہ بھی لیا ہے یا نہیں، کیونکہ اس طرح انھیں یقین ہو جاتا کہ شاعر نے اگر کچھ شعر کہہ لیے ہیں تو پھر وہ مشاعرے میں ضرور آئے گا۔ پھر ایک مرتبہ یاد دہانی کے لیے جاتے۔ کہ "حضور کل یا پرسوں مشاعرہ ہے تجدید وعدہ کے لیے حاضر ہوا ہوں۔" میں اس زمانے کا جب آج کے زمانے سے موازنہ کرتا ہوں کہ اکثر دستی لائے ہوئے دعوت نامے بھی لیٹر بکس میں پڑے مل جاتے ہیں۔

عام طور پر طرحی مشاعرے ہوتے تھے۔ طرح نکلنے سے پہلے ہی ہر طرف سے تقاضے شروع ہو جاتے "اجی حضت، طرح نکلی؟" اور جب طرح تقسیم ہو جاتی تو شہر کے ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک ایسی لہر پیدا ہو جاتی جیسے عید، بقرعید، ہولی، دیوالی کی تیاریاں ہو رہی ہوں۔ یہی حال مشاعرہ کے بعد دیکھنے میں آتا کہ جگہ جگہ تبصرے اور بحث مباحثے چلتے رہتے۔ طرح بھی اس طرح نکالی جاتی کہ سات آٹھ قافیے غزل کے لئے مخصوص کر دیے جاتے اور مطلع کے لیے علاحدہ ایک ہی قافیہ مخصوص ہوتا۔

بہار صاحب کو معین الادب میں اپنی خدمات کا صلہ اس طرح ملا کہ ان کے انتقال کے بعد معین الادب اور شہر کی ایک اور انجمن معراج الادب کے الحاق کے بعد ایک نئی انجمن کی تشکیل کی گئی اور اس کا نام انجمن بہار ادب رکھا گیا۔

قدیر لکھنوی اور عمر انصاری دونوں بہار ادب کے سکریٹری مقرر ہوئے اور پنڈت آنند نرائن ملا اور سید آل رضا، باری باری اس کے جنرل سکریٹری بنائے جاتے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہر جنرل سکریٹری اس بات کی کوشش کرتا کہ وہ اپنے عہد میں کوئی ایسی تقریب منعقد کر جائے جو اس سے پہلے نہ ہوئی ہو۔ چنانچہ اس ہم کی یادگار وہ دو مشاعرے ہیں جن میں سے ایک "محفل شعر و نغمہ" کے نام سے موسوم ہوا اور دوسرا "دریائی مشاعرہ" کہلایا۔ "محفل شعر و نغمہ" میں جہاں ایک طرف ہندوستان بھر کے مشہور و معروف شعراء اساتذہ کو دعوت شرکت دی گئی اور ایک رات قیصر باغ کی بارہ دری میں ایک عظیم الشان مشاعرہ ہوا جو پھر دیکھنے میں نہ آیا۔ وہیں دوسری رات اس وقت کی مشہور گانے والیوں نے انھیں شعراء کی منتخب غزلیں ساز پر گا کر سنائیں اور یہ پروگرام ایسا ہوا کہ محفل تو ایک رات بجی اور ختم ہو گئی لیکن اس کے چرچے برسوں چلے اور بعض شعراء نے تو اپنی گانے والیوں

کے کوٹھوں کو اپنا شام کا بیٹھکا ہی بنا لیا۔ سراج لکھنوی نے یہ شعر اپنی گانے والی ہی کے لیے کہا تھا:۔

کبھی تو گا کے، کبھی گنگنا کے لوٹ لیا
مرا کلام مجھی کو سُنا کے لوٹ لیا

خود میں نے بھی اس وقت تو بس ایک نظم "رقّاصہ" ہی لکھ کر سمجھا تھا کہ حق ادا ہو گیا لیکن برسوں بعد جب پھر ادھر سے گذر ہوا تو یہ شعر میری زبان پر تھا:۔

رہتا تھا اسی گھر میں وہ شوخ حسیں پہلے
اپنی تو گذرتی تھی ہر شام یہیں پہلے

دریائی مشاعرے کی نوعیت یہ تھی کہ گرمی کا زمانہ تھا، چاند کی چودھویں تاریخ، گومتی کے پانی کی سطح پر اس طرح پنڈال تیار کیا گیا کہ پورا پنڈال ایک بڑا شاندار بجرو نظر آتا تھا۔ چاروں طرف پانی چاندکی کرنوں کو اپنی لہروں میں سمیٹے پوری روانی کے ساتھ بہہ رہا تھا اور شعراء اس روانی کے ساتھ مختلف پھولوں اور خوشبوؤں سے بسے پنڈال میں باری باری اپنا کلام سُنا رہے تھے۔ مصرعۂ طرح بھی اسی مناسبت سے مولانا صفی نے نکالا تھا: "دریا کی روانی ہے بہتا ہوا پانی ہے"۔ مشاعرے میں میری غزل کا مطلع تھا۔

رو کے بھی تو کیا کوئی اشکوں کی روانی ہے
بہتا ہوا پانی تو، بہتا ہوا پانی ہے

بہار ادب کے ٹوٹنے کا سبب یہ ہوا کہ مولانا صفی کے انتقال کے بعد اس میں دو گروپ ہو گئے۔ ایک گروپ نے مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کو صدر منتخب کیا اور دوسرے نے صدر الدین صدر کو جو اس وقت یہاں آئی جی پولیس تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں ہی گروپ چل نہ سکے اور ایسے وقت میں انجمن فردوس ادب نے میدان سنبھالا، جس کا آج بھی میں جنرل سکریٹری ہوں۔ دراصل "فردوس ادب" میرے گھر کا نام تھا۔ وہ اس طرح کہ ۱۹۳۲ء میں جب میں اور امین سلونوی میرٹھ ایک مشاعرے میں گئے اور نوگنجے میں ساغر نظامی کے وہاں قیام کیا تو ان کے گھر پر "ادبی مرکز" کی تختی لگی دیکھی وہیں مولانا سیماب اکبرآبادی سے ملاقات ہوئی۔ جنھوں نے کچھ دن بعد آگرہ ایک مشاعرے میں مدعو کیا۔ ان کے گھر کا نام قصر الادب تھا چنانچہ میں نے بھی واپسی پر اپنے گھر کا نام "فردوس ادب" رکھ دیا اور انجمن بنانے کا خیال آیا تو اسی نام سے انجمن بنائی۔ یہ کہنا غلط ہے کہ اسے مولانا آسی نے قائم کیا تھا کیونکہ آسی صاحب نے جو انجمن قائم کی تھی اس کا نام خاصان ادب تھا اور اس کے سکریٹری زماں خاں تھے جو حسن منزل گھسیاری منڈی محال میں رہتے تھے وہیں اس کا دفتر بھی تھا۔

اس انجمن کے کارناموں میں وہ مشاعرے ہیں جو یوم ناسخ، یوم آتش، یوم خواجہ وزیر، یوم چکبست اور یوم آسی کے نام سے موسوم ہوئے لیکن اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے محافل میلاد کے ساتھ نعتیہ مشاعروں کو جوڑ کر ایک ایسی فضا بنا دی کہ ہندو پاک کے تمام غزل گو شعراء نعت گوئی کی طرف راغب ہو گئے۔ اس کے سیرت کے جلسوں میں لاکھوں کا مجمع ہونے لگا اور اس کی شہرت ملکوں ملکوں ہو گئی جس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ اراکین کی تمام تر توجہ ادھر ہی ہو جانے کی خبر پر اس کی ادبی سرگرمیاں برائے نام رہ گئیں۔

اس درمیان حبیب احمد صدیقی آئی، اے ایس کا تبادلہ لکھنؤ ہو گیا حبیب صاحب کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ جہاں بھی وہ رہے ایک انجمن ضرور بنا کے چھوڑ آئے۔ چنانچہ لکھنؤ میں بھی سید صدیق حسن آئی سی ایس، محمد ذوالنورین آئی اے ایس، مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی، پنڈت آنند نرائن ملاّ، سراج لکھنوی، ایس این سنہا امپلائمنٹ افسر، سروش طباطبائی، عمر انصاری اور امین سلونوی کے ساتھ مل کر ایک "بزم شعراء" قائم کر دی ڈاکٹر سمپورنانند جو اس وقت کے وزیر اعلا تھے انھوں نے سرپرستی قبول کر لی۔ حافظ ابراہیم اور علی ظہیر جو کیبنٹ منسٹرس تھے اس کے روح رواں بن گئے اور اس طرح گویا یہاں کی ادبی و شعری سرگرمیوں میں ایک نئی جان پڑ گئی اس کے پہلے کنوینر امین سلونوی مقرّر ہوئے۔ ان کے بعد سے یہ فرائض میں انجام دے رہا ہوں۔

اس بزم کے مشاعروں کی کامیابی کے گواہ ہندو پاک کے وہ موقر جریدے اور اخبارات ہیں جن میں ان مشاعروں کے اقتباسات شائع ہوتے رہے ہیں اور آل انڈیا اور دوردرشن کے ادارے جو اس کی ماہانہ نشستوں کو اپنے پروگراموں میں شامل کرتے رہے ہیں۔ مفتی محمد رضا انصاری "قومی آواز" کے لیے کنٹری لکھتے اور اس کے مشاعرے راج بھون، وزیر اعلا کی کوٹھی اور دیگر منسٹران اور آئی اے ایس افسران کے بنگلوں اور معززین شہر کی محل سراؤں میں منعقد ہوتے۔ لکھنؤ بار کے ممبران اور جج

صاحبان ان کی پذیرائی کرتے اور بیرون لکھنؤ کے وہ شعراء جو سیکڑوں، ہزاروں سے کر بھی کسی مشاعرے میں جاتے تو ان کی ناک بھویں سیدھی نہ ہوتیں۔ بزم شعراء لکھنؤ کے مشاعروں میں اپنی جیب خاص سے صرفہ کر کے آتے اور ان مشاعروں میں غزل پڑھنا اپنے لیے اعزاز سمجھتے۔ کتنے تو باذوق سامعین مشاعرہ سننے باہر سے آتے۔ اور خدا کا شکر ہے کہ یہ کم و بیش اب بھی جاری ہے۔

شاعری بڑی حد تک اپنے ماحول اور گرد و پیش کی پروردہ بھی ہوتی ہے چنانچہ مجھے جہاں ایک طرف قدیم لکھنؤ کے اس روایتی دور کی زیارت نصیب ہوئی وہیں دوسری طرف لکھنؤ کا وہ دور اور ماحول بھی دیکھنے کو ملا جس نے نئے خیالات اور نئے اسالیب کو اپنانا شروع کر دیا تھا۔ وہ سماجی تبدیلیاں جو بڑی تیزی کے ساتھ ہمارے معاشرے میں گھر کرتی چلی جا رہی تھیں میری نظر کے سامنے تھیں اور جہد آزادی کی وہ گونج بھی پورے طور پر کانوں کو اپنی طرف متوجہ کیے ہوئے تھی جس سے ہندوستان کا ہر حساس انسان اپنے شعور اور ذہنی میلان کے مطابق متاثر ہو رہا تھا۔ ایک جنگ عظیم کے پس منظر میں میری شاعری پروان چڑھ رہی تھی اور دوسری جنگ عظیم میری نظروں کے سامنے لڑی جا رہی تھی۔ میں نے غلامی کے زنداں سے آزادی کی منزل تک کا سفر خود اپنے پیروں پر چل کر طے کیا چنانچہ میری ایک نظم "ترانۂ آزادی" انگریز سرکار نے ضبط بھی کر لی جو میں نے موتی نگر لکھنؤ میں منعقد ہونے والے کانگرس کے اکیاونویں اجلاس میں پڑھی تھی۔ جس کا افتتاح پنڈت جواہر لال نہرو نے اور صدارت مسز سروجنی نائیڈو نے کی تھی۔ مجھے خوشی ہے کہ میری اس نظم کے اقتباسات دلی سے شائع ہونے والی اس کتاب میں شامل ہیں جس کا نام ہی ہے "ضبط شدہ نظمیں"

حکومت اتر پردیش کی جانب سے شائع کی جانے والی "قومی شعرا کی تاریخ" میں مجھے بحیثیت قومی شاعر تسلیم کیا گیا ہے۔ اور اتر پردیش کی درسی کتابوں میں بھی میری بعض نظموں "بوڑھا مالی" "لوری" اور "ننھا سپاہی" کا شامل کیا جانا بھی تقویت خاطر کا باعث ہے۔ ان مضامین تبصروں اور انٹرویوز کے علاوہ جو ملک کے بیشتر جریدوں اور اخباروں میں شائع ہوتے رہے ہیں یا آکاش وانی اور دوردرشن سے نشر ہوئے ہیں

لکھنؤ یونیورسٹی کی ریسرچ اسکالر شیبا شاہ کا طویل مقالہ "عمر انصاری، حیات اور شاعری" بھی کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔

مجموعہ ہائے کلام میرا کلام ۲ ہزار سے بھی زائد صفحات پر مشتمل ہے جس میں تقریباً تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی گئی ہے اور اب تک حسب تفصیل ذیل میرے نو مجموعہ ہائے کلام شائع ہو چکے ہیں جن پر تبصرہ لکھنے والوں میں مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا نیاز فتحپوری، مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی، پنڈت آنند نرائن ملا، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر احتشام حسین رضوی، پروفیسر نیر مسعود، پروفیسر نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، پدم شری مقبول احمد لاری اور ایڈیٹر عزائم جمیل مہدی کے نام شامل ہیں۔

(۱)	جرس کارواں	(قومی نظمیں)	۱۹۳۸ء
(۲)	بازگشت	(مجموعۂ غزلیات)	۱۹۴۵ء
(۳)	سازِ بیخودی	(مجموعۂ نظمیات و قطعات و رباعیات)	۱۹۶۵ء
(۴)	صنم کدہ	(مجموعۂ غزلیات)	۱۹۷۳ء
(۵)	ترانۂ نعت	(نعتیہ کلام)	۱۹۷۵ء
(۶)	حرف ناتمام	(مجموعۂ غزلیات)	۱۹۷۸ء
(۷)	نقش دوام	(مجموعۂ غزلیات و نظمیات و رباعیات و مثنوی)	۱۹۸۲ء
(۸)	کشید جاں	(مجموعۂ غزلیات)	۱۹۸۷ء
(۹)	سخن جاں	(قصیدۂ نعت)	۱۹۸۸ء
(۱۰)	مصحف عمر	(مجموعہ غزلیات و نظمیات)	زیر طبع ہے۔

مندرجہ بالا مجموعہ ہائے کلام کے علاوہ میری کئی نظمیں اردو، ہندی، اسکرپٹ میں بھی کتابچوں کی صورت میں شائع ہو چکی ہیں اور اب میں اپنے سارے کلام کا ایک مختصر انتخاب شائع کرانے کی فکر میں ہوں کہ اس کے لیے احباب کے تقاضے بھی بہت ہیں۔

اعزازات اور انعامات

۱۹۵۴ء میں نیشنل فورم آف انڈین لنگویجز نے "سرٹیفکٹ آف پرفیسی انسی" دیا۔

۱۹۶۵ء میں ساز بیخودی کی اشاعت پر حکومت اتر پردیش اور آل انڈیا میر اکاڈمی نے انعامات سے نوازا۔

۱۹۷۱ء میں "جرس کارواں" کے ریوائزڈ ایڈیشن کی اشاعت پر اتر پردیش اردو اکاڈمی نے انعام دیا۔

۱۹۷۲ء میں آل انڈیا میر اکاڈمی نے سند امتیاز میر پیش کی۔

۱۹۷۳ء میں صنم کدے کی اشاعت پر عزت مآب اکبر علی خاں صاحب گورنر اتر پردیش نے رسم اجرا ادا کی اور اتر پردیش اردو اکاڈمی نے اپنا اس سال کا سب سے بڑا انعام دیا۔

۱۹۷۵ء میں "ترانۂ نعت" کی اشاعت پر "نعتیہ مشن لکھنؤ" نے "نعتیہ ادب ایوارڈ" دیا۔

۱۹۷۸ء میں حرف ناتمام کی اشاعت پر اتر پردیش اردو اکاڈمی نے سال کے سب سے بڑے ایوارڈ کے ساتھ سال کی بہترین کتاب قرار دیتے ہوئے پبلشرز ایوارڈ بھی دیا۔

۱۹۸۱ء میں آل انڈیا میر اکاڈمی نے میر ایوارڈ دیا۔

۱۹۸۲ء میں "نقش دوام" کی اشاعت پر پھر اتر پردیش اردو اکاڈمی نے اپنا سال کا سب سے بڑا ایوارڈ دیا۔

۱۹۸۵ء میں میری مجموعی ادبی خدمت کے اعتراف میں اتر پردیش اردو اکاڈمی نے اپنا سب سے بڑا ایوارڈ دیا اور سند پیش کی۔

۱۹۸۹ء میں لائنس کلب کانپور نے بیش قیمت ایوارڈ اور توصیفی سند سے نوازا۔

۱۹۹۳ء میں آل انڈیا میر اکاڈمی نے ایوارڈ دیا اور "افتخار میر" کے خطاب سے نوازا۔

اساتذہ

خدا کروٹ کروٹ انھیں جنت نصیب کرے۔ میرے اساتذہ الارشد رشید لکھنوی، لسان الہند مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی، مصور درد مولینا عبدالباری آسی، پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب اور ڈاکٹر جعفر حسین اپنے اپنے وقتوں کے وہ روشن چراغ تھے جن کی روشنی آج بھی میں اپنے اندر محسوس کر رہا ہوں۔

سفر حج

الحمد للہ کہ ۱۹۷۹ء میں حج بیت اللہ اور زیارات مقدسہ کا بھی شرف حاصل ہوا اور تقریباً پانچ ماہ وہاں قیام کا موقع ملا۔ اس دوران مکہ کے علاوہ جدہ، طائف اور مدینہ منورہ میں بھی کافی دنوں تک قیام رہا۔ جدہ کے شعراء سے بھی ملاقاتیں رہیں اور اعزازی نشستوں میں بھی شرکت کی لیکن اس سفر کی سب سے خاص بات یہ رہی کہ روانگی سے قبل میرے وہ داماد عبدالقیوم اور بیٹی نفیس قیوم جو سعودی عرب ہی میں مقیم ہیں چھٹیاں آئے ہوئے تھے ان کا اصرار تھا کہ میں اس سال نہ جاؤں اگلے سال جاؤں جب وہ وہاں موجود ہوں۔ لیکن میرا کہنا تھا کہ جب ہم اگر نفیس اور قیوم کے لیے جا رہے ہوتے تو ضرور رک جاتے، لیکن ہم تو اس کے لیے جا رہے ہیں جس نے ہمیں بلایا ہے۔

بحیثیت نثر نگار

میں نے معتد بہ تعداد میں افسانے، ڈرامے، تنقیدی مضامین، تقریظیں اور انشائیے بھی لکھے ہیں، جو مختلف کتابوں اور ہندو پاک کے متعدد رسائل و اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ سوچتا ہوں، بلکہ سوچا کرتا ہوں کہ ان سب کو بھی یکجا کر کے شائع کرا دیا جائے۔ میرا پہلا افسانہ "خوابہائے رنگیں" فروری ۱۹۳۳ء کے نیرنگ خیال میں شائع ہوا تھا۔

ہاں اس سلسلے کا ایک واقعہ یقیناً دلچسپی سے خالی نہیں کہ میں نے قاضی عبدالغفار کے لیلیٰ کے خطوط کے جواب میں مجنوں کے خطوط بھی لکھنا شروع کیے تھے اور ان کی ساخت یہ رکھی تھی کہ لیلیٰ کا خط پڑھئے تو مجنوں کے خط کا جواب معلوم ہو اور مجنوں کا خط پڑھئے تو لیلیٰ کے خط کا جواب لگے۔ کافی خطوط صدیق بکڈپو سے نکلنے والے ماہنامہ "انتخاب" میں شائع بھی ہوئے جس کے ایڈیٹر مولانا سیفی ندوی تھے پھر یہ سلسلہ یوں روک دیا گیا کہ قاضی صاحب موصوف نے خود مجنوں کی ڈائری لکھنا شروع کر دی تھی۔ انھیں دنوں جب میں مجنوں کے خطوط لکھ رہا تھا۔ میرے ایک بے تکلف دوست کا معاشقہ ایک لڑکی سے چل پڑا تھا لڑکی نے انھیں کچھ ایسے خطوط لکھنا شروع کر دیے جن کے جوابات لکھنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ چنانچہ وہ خط لا کے مجھے دے دیتے۔ میں جواب لکھ دیتا اور وہ بھیج دیتے۔ خدا کا کرنا یہ کہ معاشقہ کامیاب ہوا اور دونوں کی شادی ہو گئی۔

طنز و مزاح سے دلچسپی

میں سخت اور کھرا پتھر نہیں، گیلی مٹی ہوں اور ادب کی ہر صنف

کھنگال کر رکھ دینے کا عزم ہمیشہ میرا پیچھا کرتا رہا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ طنز و مزاح سے بھی مجھے دلچسپی رہی ہے۔ میں نے نثر میں مزاحیہ خاکے بھی لکھے ہیں اور طنزیہ نظمیں اور مثنوی بھی لکھی ہے اور جب لکھ ہی چکے تو ان کا چھپانا کیا۔ میرے شاگرد عزیز جنجھٹ لکھنوی مجھے اسی لیے عزیز رہے۔ کہ وہ طنز و مزاح سے دلچسپی رکھتے تھے۔

اولاد

چار بیٹوں اور پانچ بیٹیوں میں جو سب سے بڑے تھے اور ابھی چند ماہ پہلے تک حیات تھے۔ شوکت عمر ایم۔اے، شاعر ادیب، صحافی دانشور، ٹریڈ یونین لیڈر، روزنامہ قومی آواز کے چیف سب ایڈیٹر اور پندرہ روزہ "جائزہ" کے چیف ایڈیٹر۔ خود بھی تین بیٹیوں اور ایک بیٹے فیضان شوکت کے باپ، کئی نواسے نواسیوں کے نانا بھی تھے۔ پترکار پورم گومتی نگر میں اپنا مکان بھی بنوا لیا تھا اور آرام سے رہ رہے تھے کہ ۲۹ رنومبر ۱۹۹۳ء کو مختصر علالت کے بعد بعمر ۶۱ سال انتقال کر گئے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

دوسرے بیٹے اقبال عمر شاعر ہیں اور صاحب دیوان شاعر۔ "عرض و قیمی" مجموعہ کلام ہے جس کی رسم اجرا صدر جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ نے ادا کی تھی دلّی میں ڈائرکٹر کوآپریٹیو ایجوکیشن ہیں۔ وہیں دلی ہی میں اپنا گھر بھی بنوا لیا ہے۔ ایک بیٹی خوش ادا اور ایک بیٹے خوش نوا کے یہ بھی باپ ہیں۔

تیسرے بیٹے کرنل فرحت عمر بی ایس سی، بی ڈی ایس، ایم ڈی ایس اسپشلسٹ ان پائریا آرمی میڈیکل کور میں ڈاکٹر اور کمانڈنگ افسر ہیں ان کے ابھی ایک ہی صاحبزادے کامران فرحت ہیں جنہوں نے ۱۹۹۲ء میں فرسٹ اسکول فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا ہے۔

چوتھے بیٹے رفعت عمر بی ایس سی۔ ایل ایل بی ایٹریکس میں بزنس افسر ہیں پچھلے دنوں ان کی شادی سے سبکدوش ہو چکا ہوں۔

چار بیٹیاں (۱) بلقیس ربیع، انٹر (۲) نفیس قیوم بی اے۔ (۳) عشرت شمیم بی اے اور (۴) خورشید ظفر ایم اے۔ بی ایڈ ہیں۔ چاروں کے شوہر محمد ربیع، عبدالقیوم، شمیم اقبال اور ظفر مسعود بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ اور برسر روزگار ہیں۔ میری بہوویں کلثوم شوکت، فاطمہ اقبال، نادرہ فرحت اور یاسمین رفعت سب نہایت ہنرمند، اچھی منتظم اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔

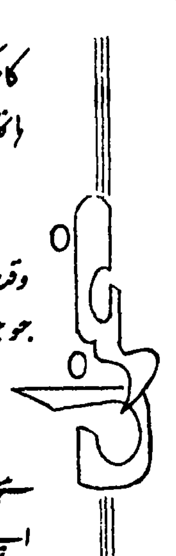
پانچویں بیٹی رئیس جہاں ابھی زیر تعلیم ہیں اور بس اب انھیں کی باری ہے۔ اور اس طرح میں بیٹے سے باپ، باپ سے دادا، نانا۔ اور دادا نانا سے اب پردادا اور پرنانا بھی بن چکا ہوں اور زندگی جتنا کچھ مجھے دے سکتی تھی وہ سب وصول کر چکا ہوں۔

تلامذہ

اتر پردیش اردو اکاڈمی کا خبر نامہ۔ غالباً مارچ ۱۹۸۶ء کے اپنے شمارے میں یہ خبر بڑے ہی وثوق سے شائع کر چکا ہے کہ عمر انصاری کثیر التلامذہ استاد شاعر ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ آج میں اپنے آپ کو اس کثیر الاولاد باپ کی مانند پا رہا ہوں جسے اپنی ساری اولادوں کے نام ہی یاد نہیں رہتے اور محسوس کر رہا ہوں کہ مبادا میں کچھ کے نام لکھوں اور کچھ کے فراموش کر جاؤں اور یہ امر کسی کی دل شکنی کا باعث بنے۔

مزید برآں میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ یہ کام استاد کا نہیں کہ وہ گنائے کہ فلاں فلاں صاحبان میرے شاگرد ہیں۔ میرے نزدیک تو یہ حق شاگردوں کا ہے کہ وہ بتائیں کہ فلاں حضرت ہمارے استاد ہیں۔

□□



کام کر کے اجیر ہو جائیں
ہاتھ اپنی لکیر ہو جائیں
دل کے چھوٹے غریب لٹتے ہیں
چاہے جتنا امیر ہو جائیں
وقت کی مار پوچھیے اُن سے
جو جوانی میں پیر ہو جائیں
سلسلہ ہو دراز زلفوں کا
آپ اپنے اسیر ہو جائیں
ہے سبھی کو یہ آرزو ثامن!
اپنے وقتوں کے میر ہو جائیں

ثامن عباس
۸۸۔ چیک، الہ آباد

غزل

پھیلوں کو راستا چاہیے
اب تو آگے چلا چاہیے

سورج لے کر کیا کرتے ہم
چھوٹا سا اِک دیا چاہیے

دونوں عالم آپ سنبھالیں
ایک سانس بھر ہوا چاہیے

طوفانوں کو پرچے بھیجو
کشتی کو ناخدا چاہیے

جھوٹے سچے سب ہی چپ ہیں
ایسے میں بولنا چاہیے

کیوں بیٹھا ہے باندھ لگا کر
دریا ہے تو بہا چاہیے

اس کی یاد میں اس کی باتیں
دل کو اک مشغلہ چاہیے

اس محفل میں یاد خدا کی
خطا وار ہوں سزا چاہیے

ہم ہیں اک اندوہِ مجسم
دوا چاہیے دعا چاہیے

ایسے کج مج شعر مظفر
نقادوں سے ڈرا چاہیے

ڈاکٹر مظفر حنفی
پروفیسر اقبال چیئر و صدر شعبۂ اردو
کلکتہ یونیورسٹی۔ کلکتہ۔۔۔

غزل

ولولے دل کے کارساز ہوئے
بند دروازے خود ہی باز ہوئے

وہ ہوا و ہوس کے بندے تھے
باریابِ حریمِ ناز ہوئے

ابتدا ہی سے لاتعلق تھے
ہم بھی آخر میں بے نیاز ہوئے

عام تھیں خوں فشانیاں اُن کی
دشت میں بھی چمن طراز ہوئے

آرزو عزتِ نفس کی تھی
سر کو دے کے وہ سرفراز ہوئے

بلبلوں نے زبان بند نہ کی
چپ تھے گل، آشنائے راز ہوئے

حامدی کشمیری
مسعود منزل۔ شالیمار

رفعت سروش
۲ بی۔ پاکٹ سی۔ سدھارتھ ایکسٹینشن
نئی دھلی ۱۱۰۰۱۴

ریڈیائی خاکہ نگاری

خاکہ نگاری نسبتاً نئی صنفِ ادب ہے۔ اگرچہ ہماری کلاسیکل کتابوں مثلاً فسانۂ آزاد میں بہت سے کرداروں کے خاکے ملتے ہیں آبِ حیات میں قلمی چہرے نظر آتے ہیں اور دیگر بہت سے ناولوں میں کرداروں کے خاکے موجود ہیں۔ لیکن ایسی سب تحریریں ناولوں، افسانوں یا تذکروں کا حصّہ ہیں اور کردار نگاری کا نمونہ ہیں۔

فسانۂ آزاد میں خوجی کا کردار بہت سے صفحات میں پھیلا ہوا ہے ڈپٹی نذیر احمد کے کردار ناولوں کے شروع سے آخر تک چلتے ہیں رسوا کی امراؤ جان ادا ایک کردار ہی ہے جس پر ناول کی عمارت کھڑی ہے۔ راشدالخیری کے ناولوں میں بھی کردار نگاری کے خوبصورت نمونے ہیں۔ لیکن خاکہ نگاری بحیثیت ایک الگ صنفِ ادب ریڈیو کی رہینِ منت ہے۔ انشائیہ نگاری شروع ہو چکی تھی اور مضامین پطرس نے اہلِ ادب کو چونکا دیا تھا۔ خیال کو کم سے کم الفاظ میں سمیٹ کر بیان کرنے کا چلن شروع ہوا۔

ریڈیو کے عالمِ وجود میں آنے کے بعد ہمارے مشہور و معروف ادیبوں کو جب کہانیاں سنانے کے لئے بلایا گیا تو ان سے یہ بھی عرض کرنا پڑا کہ وقت کا خیال رکھیں اور زبان آسان ہو تاکہ ایک عام سننے والا اور کم پڑھا لکھا آدمی بھی کہانی سمجھ جائے۔ اگر کسی کہانی میں الجھاؤ ہے اور وہ رسالے یا کتاب میں چھپی ہے تو اسے دو تین بار پڑھ کر سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن ریڈیو پر تو لفظ زبان سے ادا ہوتے کے بعد فوراً ہوا میں اڑ جاتا ہے، اسے پکڑنا ممکن ہی نہیں، اس لیے عام فہم خیالات اور زبان کی ضرورت پر ریڈیو نے بہت زور دیا اور دراصل خاکہ نگاری اسی ضرورت کو پورا کرنے کا ایک ذریعہ بنی۔

ایسا نہیں ہے کہ ریڈیو کے علاوہ خاکے نہیں لکھے گئے۔ عصمت چغتائی کا خاکہ 'دوزخی'، جو انھوں نے اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی کی موت پر لکھا تھا، ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اسی طرح رشید احمد صدیقی کی کتاب "گنج ہائے گراں مایہ" مشہور شخصیات کے خاکوں پر مشتمل ہے خواجہ حسن نظامی نے نہایت سادہ اور سلیس زبان میں بہت سے کرداروں کے خاکے لکھے مگر جب ریڈیو نے کہانی کی طرح خاکہ نگاری کو بھی ایک الگ صنفِ ادب کی طرح اپنے پروگراموں میں جگہ دینا شروع کی تو ہمارے ادیب خاکہ نگاری کی طرف متوجہ ہوئے اور اس صنف کو وقار کا درجہ ملا۔

ریڈیائی خاکہ نگاری کی حیثیت یہ ہے کہ اس میں کہانی جیسا پلاٹ نہیں ہوتا، ادھر ادھر کی ہوائی باتیں نہیں ہوتیں۔ انشا پردازی اور عبارت آرائی کی گنجائش نہیں ہوتی بلکہ خاکہ نگار اپنے قلم کو کردار پر ہی مرکوز رکھتا ہے، اس کا قلمی چہرہ پیش کرتا ہے۔ اس کے اٹھنے بیٹھنے کے انداز اور زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو لفظوں میں پروکر اس کی تصویر ابھارتا ہے۔ وہ ایسی تصویر بناتا ہے جو ہوا میں معلق نہ ہو، بلکہ اس ماحول اور معاشرہ کی تصویر کے ساتھ پیوست ہو جس میں وہ کردار زندگی گزار رہا ہے اور جس معاشرہ کے لیے وہ اپنے دائرہ عمل میں رہ کر کوئی نہ کوئی کام کر رہا ہے اور اس طرح خاکہ نگار اپنے کردار کو سماج کا ایک فرد بنا کر پیش کرتا ہے اور بغیر کوئی اعلان کیے اس کی مقصدیت خود بخود واضح ہو جاتی ہے۔ سننے والے کا ذہن بھی ادھر ادھر نہیں بھٹکتا اور اگر خاکہ نگار اچھا قلم کار ہے تو وہ اپنے کردار کو آواز کے ذریعہ سننے والوں کی محفلوں میں زندہ اور متحرک بنا دیتا ہے۔ اس حد تک کہ بعض دفعہ کسی سننے والے کو بھی یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ اس کا خاکہ ہے۔

میرے علم میں ایک دو ایسے واقعات ہیں جب خیالی کردار کا خاکہ پیش کیا گیا لیکن اتنا حقیقت پسندانہ کہ ایک دو صاحبان سچ مچ شکایت کرنے آئے کہ فلاں صاحب نے ہمارا خاکہ اڑایا آپ کے پروگرام میں۔ اور ہمیں اس صورت حال سے نپٹنے کے لیے دقت کا سامنا کرنا پڑا۔

آل انڈیا ریڈیو کے ابتدائی دنوں سے جن ادیبوں نے ریڈیائی خاکے لکھے اور اس صنف کو اپنی نگارشات سے مالامال کیا ان میں امتیاز علی تاج، حاجی لق لق، شوکت تھانوی، کنھیا لال کپور، خواجہ حسن نظامی، رشید احمد صدیقی، مختار صدیقی اور اعجاز بٹالوی وغیرہ کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ خواجہ حسن نظامی عوامی زندگی کے کرداروں کا خاکہ تو پیش کرتے ہی تھے، کبھی کبھی ان کے خاکے غیر جان دار چیزوں کے نقش و نگار بھی اس طرح پیش کرتے تھے کہ وہ چیزیں متحرک معلوم ہوتی تھیں۔ ان کے خاکوں کی سب سے بڑی خصوصیت زبان کی سادگی، لطافت اور مٹھاس ہے۔ دلّی کی ٹکسالی زبان میں دلّی اور دلّی والوں کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔

امتیاز علی تاج اور حاجی لق لق دونوں نے آزادی سے پہلے لاہور کی زندگی کو اپنے خاکوں میں پیش کیا۔ امتیاز علی تاج، سماج کے دلچسپ کرداروں کو موضوعِ قلم بناتے تھے۔ ان کا خاکہ پان والی بہت مشہور ہوا تھا۔ حاجی لق لق کا قلم مزاحیہ انداز لیے ہوئے تھا۔ مزاح نگار جب خاکہ نگاری کرتا ہے تو وہ اپنے قلم کو بہت احتیاط سے جنبش دیتا ہے کیونکہ خاکہ لکھنا اور خاکہ اڑانا دو مختلف چیزیں ہیں۔ مزاح نگار سے ہمیشہ یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ نہ جانے کب وہ خاکہ اڑانے اور پھبتی کسنے پر اتر آئے اس لیے حاجی لق لق ہوں یا کنہیا لال کپور یا شوکت تھانوی ـــ ان حضرات کے خاکے چٹخارے دار مگر تلوار کی دھار کی طرح تیز ہوتے تھے۔ فقروں میں طنز و مزاح کی کاٹ ہوتی تھی۔ ایسے خاکوں سے کسی کی دل شکنی نہ ہو یا سماج کے کسی حصہ پر ضربِ کاری نہ پڑ جائے، یہ دیکھنا ریڈیو پروگرام ترتیب دینے والوں کا تھا، اور ہے ـــ

طنز و مزاح سے بھرپور، جن لوگوں نے ریڈیائی خاکہ نگاری کو آگے بڑھایا اور بامِ عروج تک پہونچایا ان میں تخلص بھوپالی، احمد جمال پاشا، فکر تونسوی، مجتبیٰ حسین اور یوسف ناظم خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ان خاکہ نگاروں نے ہنستے ہنساتے سماج کے کھوکھلے پن کو بے نقاب کیا اور ایسے کرداروں کے خاکے پیش کیے جو اس معاشی سماج میں حالات کا شکار ہیں مگر ہمت سے جی رہے ہیں۔ رشید احمد صدیقی، مختار صدیقی اور اعجاز بٹالوی اپنی اپنی طرز کے قلم کار تھے۔ رشید صاحب کی تحریر پڑھ کر یا سُن کر ایک زیرِ لب تبسم آجاتا ہے، اور مختار صدیقی اور اعجاز بٹالوی کا شمار سنجیدہ قلم کاروں میں کیا جاتا ہے۔ ان کے ہلکے پھلکے خاکے آزادی سے قبل آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر ہوتے تھے اور اپنے دور کی تصویر پیش کرتے تھے۔

آزادی کے بعد نئے خاکہ نگار سامنے آئے ان میں سب سے نمایاں نام مرزا محمود بیگ کا ہے۔ مرزا محمود بیگ دلی والے تھے تصنیف و تالیف ان کا شغل نہ تھا۔ پیشے سے وہ معلم تھے، ایک عرصہ تک وہ دہلی کالج سے وابستہ رہے۔ وہ لکھتے تھے صرف ریڈیو کے لیے، مگر اس قدر ٹکسالی زبان کہ سننے والے اور اہلِ قلم انھیں سن کر اپنی غلطیاں درست کرلیں۔ انھوں نے ہلکے پھلکے کرداروں کے روپ میں دلی والوں کی زندگی، ان کے مصروفیات، ان کے شوق، ان کی بود و باش اور اخلاقی قدروں کو پیش کیا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو کے اردو مجلس پروگرام میں ان کے خاکوں کا ایک سلسلہ پیش کیا گیا تھا جس کے عنوانات تھے ـــ امّاں۔ ابّا۔ بھائی جان۔ خالہ جان۔ ماموں جان وغیرہ وغیرہ ـــ ان خاکوں کے ذریعہ انھوں نے ان رشتوں کی معنویت اور معاشرہ میں ان کے وجود کی اہمیت کو پیش کیا تھا۔ پُرانی اور روایتی دلّی کی جیتی جاگتی تہذیب بیگ صاحب کے خاکوں میں پوری طرح جلوہ گر ہے۔

ریڈیائی خاکہ نگاروں میں ایک نمایاں نام م۔م۔ راجندر کا ہے جو ۱۹۴۵ء سے لکھ رہے ہیں۔ انھوں نے ایسے کرداروں کے خاکے پیش کیے ہیں جو اپنے اپنے میدانِ عمل میں تعمیری سرگرمیوں میں حصہ لے رہے ہیں۔ انھوں نے تخلیق کیے ہیں ایسے کردار جو ہمارے مشترکہ کلچر کے نمائندے ہیں اور آپسی میل، ملاپ، بھائی چارے اور سچّی دوستی پر یقین رکھتے ہیں۔ اسکول ماسٹر، کسان، درزی، دھوبی، دکان دار، معمولی درجے کے لوگ کتنے اہم ہیں، اس کا اندازہ م۔م۔ راجندر کے خاکے پڑھ کر ہوتا ہے اور ایسی تصویر کشی کہ یہ کردار چلتے پھرتے نظر آئیں۔ ان کے ریڈیائی خاکے شیخ جمال الدین۔ گنگو دادا، اور کریما ان کے فن کی خوبصورت مثالیں ہیں

ادھر گزشتہ چند سال میں معین اعجاز اور دلیپ سنگھ کی خاکہ نگاری نے اہلِ نظر کو چونکا دیا ہے۔ دلیپ سنگھ آج کل بے حد تیزی سے لکھ رہے ہیں۔ ذرا سنبھل کے چلیں تو ان کی رفتار میں سرپٹ دوڑنے کے بجائے پرواز آسکتی ہے ـــ معین اعجاز اردو سروس سے متعلق ہیں، ان کا انداز ڈرامائی تھا ہے۔ فکر کی گہرائی اور تنوع کے ساتھ۔

ضمیر الحسن دہلوی اگرچہ دہلی والوں کی خاکہ کشی کرتے ہیں مگر وہ بات نہ آسکی جو بیگ صاحب کی تھی ـــ نریندر لوتھر کا قلم جب خاکہ نگاری کی طرف مائل ہوتا ہے تو سماج پر طنز کرتا ہے۔

آزادی کے بعد خواتین کی صفوں میں سے بھی کئی خاکہ نگار سامنے آئیں۔ مثلاً رضیہ سجاد ظہیر، سلمیٰ صدیقی، ڈاکٹر صغریٰ مہدی، پروفیسر شگفتہ فرحت، ڈاکٹر شمیم نکہت اور انور نزہت۔ خواتین کی زندگی اور ان کے مسائل کو خواتین ہی زیادہ سمجھ سکتی ہیں اور ان کے مسائل کی شدت کو محسوس کر کے زیادہ موثر انداز سے بیان کر سکتی ہیں ـــ رضیہ آپا براہِ راست عوامی مسائل اور طبقۂ نسواں کی جدوجہد سے وابستہ تھیں اور ان کی فکر کا کینوس بہت بڑا تھا اس لیے ان کے ریڈیائی خاکے بھی اپنے اندر ایک دنیا سمیٹے ہوتے ہیں۔ آسان لفظوں میں دریا کو کوزے میں بند کر دینے کا فن انھیں آتا تھا۔ ان کے کردار چونکھی لڑائی لڑتے ہیں اور زندگی میں جدوجہد کرنے کا سلیقہ سکھاتے ہیں۔ سلمیٰ صدیقی کے خاکوں کا موضوع زیادہ تر تعلیم یافتہ عورت ہے علی گڑھ، دلی اور اب بمبئی کی زندگی ان کے خاکوں میں سانس لیتی ہے۔ ان کا ایک خاکہ مہمان کافی مقبول ہوا تھا۔ پروفیسر شگفتہ فرحت بھوپال میں رہتی ہیں اور ان کے علاقے کی مہذب زندگی کی تصویریں ان کے خاکوں میں ملیں گی۔ ڈاکٹر شمیم نکہت لکھنوی زندگی کی نفاست کے خاکے لے کر ریڈیو کی دنیا میں داخل ہوئیں۔ زبان کی لطافت، پرتکلف نشست و برخاست اور ہر بات میں رکھ رکھاؤ، ان کے ریڈیائی خاکوں میں نمایاں ہے۔ گلشن بُوا۔ بی مغلانی۔ ثروت آپا ان کے مقبول خاکے ہیں۔

انور نزہت پرانی دلی کی گلیوں میں بسے متوسط طبقے کے لوگوں کی زندگی کی نباض ہیں۔ انھوں نے اس طبقے کی خواتین کے گوناگوں مسائل، ان کے غم، ان کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور زندہ رہنے کے لیے ان کی جدوجہد کو اپنے ریڈیائی خاکوں میں پیش کیا۔ ان کے دو دلچسپ کرداروں کے نام یاد آگئے ــ خالہ شدر اور بمبئی والی بوا۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ریڈیائی خاکے ریڈیو پروگراموں کا ایک خوبصورت حصہ ہیں۔ ان میں نہ بے جا طوالت ہوتی ہے، نہ زبان و بیان کے اعتبار سے ایسی سنجیدگی اور خشکی کہ سننے والا بور ہو جائے۔ ریڈیائی خاکوں کے کردار آپ کے آس پاس اُٹھتے بیٹھتے اور چلتے پھرتے نظر آتے ہیں اس لیے آپ ان سے لطف اندوز بھی ہوتے ہیں۔ لکھنے والا نہایت چابکدستی سے ان کرداروں سے ایسی بات کہلواتا ہے کہ آپ سوچتے ہی رہ جائیں ؎

واہ ری تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ڈاکٹر صغریٰ مہدی متوسط طبقے کی زندگی اور اس کی جزئیات کو نہایت چابکدستی سے پیش کرتی ہیں۔ ان کے کامیاب خاکوں میں سلمیٰ پھوپھی اور "نیا فن بُو الذہن والی" بہت پسند کیے گئے تھے۔

دراصل تمام خاکہ نگاروں کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ خاکہ ریڈیائی نشریات کی اصناف میں ایک مقبول صنفِ ادب ہے اور درجنوں ریڈیو اسٹیشنوں پر اُردو پروگراموں کے ساتھ خاکے بھی براڈکاسٹ ہوتے ہیں۔ اب یہ ممکن نہیں کہ ان مقامی لکھنے والوں کو نام بہ نام یاد کیا جائے جو اپنے قلم کے جوہر سے ریڈیو پروگراموں کو نئی توانائی بخشتے ہیں۔ مگر ان سب کی اجتماعی کوشش ہے جس کے باعث مختصر نگاری سہل نگاری اور قدرے ہنسانے اور قدرے مسکرانے پر مجبور کرنے والی یہ صنف فروغ پا رہی ہے۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ ابھی ہمارے ادب کے ناقدوں نے اور یونیورسٹیوں میں تحقیقی مقالے لکھانے والے اور لکھنے والوں نے ریڈیائی ادب کو وہ اہمیت نہیں دی ہے جس کا وہ مستحق ہے۔ ریڈیو براڈکاسٹ نے ادب کی زبان کو آسان کرنے میں اور براہِ راست سننے والے سے تعلق پیدا کرنے میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جدید تحقیق کے اصولوں پر اگر کام ہو تو پطرس اور رشید احمد صدیقی

قتل ہوئی ایک ایک لہر بہت دن ہوئے
پختہ سڑک کھا گئی نہر بہت دن ہوئے

یہ جو ہے بنجر زمین کون کرے گا یقین
تھا اسی مٹی پہ ایک شہر بہت دن ہوئے

ہم نہ شنکر ہی تھے اور نہ ارسطو مگر
ہم کو پئے وقت کا زہر بہت دن ہوئے

ایک زباں قتلِ عام کر گئی عرصہ ہوا
ایک نظر ڈھا گئی قہر بہت دن ہوئے

اب نہ زمانہ ہے وہ اثر اب نہ وہ نگاہ
ختم ہوئے معجزاتِ دہر بہت دن ہوئے

ڈاکٹر ... رضوان
... بجنور

میرے اس دردِ سفر کو کوئی سمجھا ہی نہیں
اس پہ چلنا ہے مجھ کو جو مرا رستا ہی نہیں

جس نے یہ چاہا کہ بن جائے مری کمزوری
میں نے پھر اس کی طرف لوٹ کے دیکھا ہی نہیں

میرے احساس کو دھوکا کہاں دیتے الفاظ
میں نے جب غیر سمجھ کر انھیں برتا ہی نہیں

مڑ کے دیکھے تو ابھی ساری حقیقت کھل جائے
میں تجھے چھوڑنے والوں میں اکیلا ہی نہیں

چاہتیں ایسی کہاں ہوں گی جسے چاہا وسیم
اس کا حقدار تو خود کو کبھی سمجھا ہی نہیں

وسیم ...

لیں

بہارِ غنچہ و گل ہے برائے نام ابھی
کہ انقلابِ گلستاں ہے ناتمام ابھی

خلوصِ حسنِ عمل ہے نہ اعتمادِ خودی
ہوس بھی خام ابھی ہے طلب بھی خام ابھی

قدم قدم پہ جہاں امتحانِ دل ہوگا
ملیں گے راہ میں ایسے بھی کچھ مقام ابھی

بجا یہ خوبیِ طرزِ بیاں، مگر واعظ
گراں ہے گوشِ جہاں پر ترا پیام ابھی

خود اپنی تشنگیِ شوق ہی ہے کم ورنہ
وہی ہے ساقیِ محفل وہی ہے جام ابھی

کچھ اور فکر و نظر کو بلند کر جوہر
کہ مہر و ماہ سے ہونا ہے ہمکلام ابھی

آنجہانی چندر پرکاش جوہر بجنوری
۶۰ ریوا بلڈنگ، لیڈر روڈ، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳

پروفیسر سید فضل امام رضوی
۱۰/۱۰۔ جیت روڈ، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳

جدید اردو تنقید کے کوہ کن
پروفیسر سید احتشام حسین

آج سے لگ بھگ اسّی سال قبل اردو تنقید نگاری کے افق پر ایک آفتاب طلوع ہوا تھا جس نے تنقید کو فن کا درجہ عطا کر دیا۔ تنقید بحیثیت تنقید اور تنقید بحیثیت فن سے روشناس کرانے کا سہرا جس کوہ کن کو حاصل ہے وہ سیّد احتشام حسین کے نام نامی سے جانا جاتا ہے جس نے اردو تنقید کے کشکول کو اپنے تنقیدی نظریات اور تنقیدی رویّے سے گراں مایہ بنا دیا۔ یہ بات ابتدا میں ہی عرض کر دینا ضروری ہے کہ میں احتشام حسین کی تنقید نگاری کو قرآن و حدیث اور اقوال ائمہ کا درجہ نہیں دیتا ہوں۔ لیکن یہ بھی ایک نا قابل تردید حقیقت ہے کہ انہوں نے اردو تنقید کو جو وزن و وقار بخشا ہے وہ اردو کے کسی نقاد کے بس کا نہیں ہے۔ حالانکہ اردو تنقید میں نت نئے ناموں کا اضافہ ہوتا جاتا ہے اور کوئی دن ایسا نہیں جاتا جب کوئی ایک آدھ تازہ کار نقاد خود رو درخت کی طرح روئیدہ نہ ہو جائے یہ صحیح ہے کہ انہوں نے اردو تنقید کے ذیل میں کوئی مستقل تصنیف نہیں پیش کی ہے مگر ڈھائی سو کے قریب ان کے مضامین اردو تنقید کے مختلف گوشوں کو آج بھی اجاگر کر رہے ہیں ان میں نظریاتی مضامین اور عملی تنقید سے متعلق مضامین موجود ہیں۔ پروفیسر سید احتشام حسین کا نقطۂ نظر ہے کہ :-

—— "ادبی تنقید ایک ایسی کوشش ہے کہ جس کے ذریعہ سے شعر و ادب کے صحیح مفہوم، عملِ تخلیق اور مقصدِ اظہار کو سمجھنے کی طرف قدم اٹھایا جاتا ہے۔" ۱۱

—— "ادب کی تنقید، زندگی اور زندگی کی قدروں کی تنقید ہے۔ کیا ہے اور کیا ہونا چاہئے کہ تنقید اور ادب کے اندر عقیدے اور بہتر نظام زندگی کی تلاش ہے تنقید نہ تو تاریخ ہے نہ فلسفہ نہ سیاست ہے اور نہ سائنس۔ لیکن علوم جس حد تک انسانی ذہن میں داخل ہوتے ہیں اسے متاثر کرتے اور شعور کا جز و بنتے ہیں۔ اس کی جستجو ہے۔ اگر تنقید کوئی علمی کام ہے اور محض تاثرات کا بیان نہیں ہے تو ان تمام جدید علوم سے کام لینا ہوگا جن سے زندگی اور ادب کو سمجھا جا سکتا ہے۔" ۱۲

—— "وہ نقاد جو ہر ادبی کارنامے پر سر دھنتا ہے ہر ادیب اور شاعر کو پسند کرتا ہے اور کسی نقطۂ نظر سے تعرض نہیں کرتا۔ بقول آسکر وائلڈ، اس کا حال اس نیلام کرنے والے کا سا ہے جو ہر مال کی تعریف کرتا ہے۔" ۱۳

—— "ادب مقصد نہیں ذریعہ ہے۔ ساکن نہیں متحرک ہے، جامد نہیں تغیر پذیر ہے اسے تنقید کے چند مقررہ، فرسودہ اصولوں کی مدد سے نہیں پرکھا جا سکتا بلکہ ایک فلسفیانہ تجربہ ہی کام آ سکتا ہے جس کی بنیاد تاریخ کی مادی ترجمانی اور ارتقا بالضد کے اصولوں پر رکھی گئی ہو۔" ۱۴

—— "ادب لکھنے والے کے شعور اور خیالات کا وہ اظہار ہے جسے وہ سماج کے دوسرے افراد تک پہنچانے کے لئے ایسے فنی ذرائع سے نمایاں کرتا ہے جسے وہ سیکھ سکیں اور جن سے لطف حاصل کر سکیں یا کم سے کم سمجھنے کی کوشش کر سکیں۔ اگر فن اور ادب کی یہ نوعیت نہ ہوگی اور اسے محض وہ اظہار مراد لیا جائے گا یا لیا گیا جو فن کار کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے اور سماجی اظہار کا محتاج نہیں رہتا تو پھر تنقید کا کوئی سوال پیدا نہ ہوگا۔" ۱۵

درج بالا اقتباسات کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ احتشام حسین نے ادبی تنقید کے ذیل میں جو معیار پیش نظر رکھا ہے وہ ترقی پسندانہ نقطۂ نظر ہے۔ ادب اور سماج کے روابط، ادب و شعر کے بنیادی تصورات اور مضمرات، تنقید کے بنیادی مقاصد اور فرائض کے ذیل میں انہوں نے صرف ترقی پسندانہ اور مارکسی رویّوں کی پابندی نہیں برتی ہے بلکہ ترقی پسندانہ نقطۂ نظر اور رویوں سے منحرف ہوئے بغیر انہوں نے اپنے ذاتی علم اور مشاہدے، اپنی فکری سطح، نجی محسوسات سے کام لے کر اردو تنقید کو نئی اور توانا روایت سے روشناس کرایا ہے یہ ان کی اپنی منفرد کوشش ہے جس سے اردو تنقید میں وزن و وقار پیدا ہوا ہے۔ وہ نقاد کے منصب کو ارفع اور اعلا قرار دیتے ہیں وہ صرف مارکسی طرز فکر کے حصار میں ہی نہیں رہتے بلکہ اس سے باہر نکل کر ادب کی حقیقت کو تلاش کرتے ہیں وہ ادب

کے محرکات تخلیق کا پتہ لگاتے ہیں ان پرتوں کو کریدتے ہیں جہاں سے ادیب زندگی حاصل کرتا ہے اس فلسفہ کی کھوج میں سرگرداں رہتے ہیں جس سے ادیب اپنے خیال کو ربط دیتا ہے۔ وہ ادیب اور شاعر کے ساتھ ساتھ ہر اس دشت و بیاباں میں صحرانوادی کرتے نظر آتے ہیں جہاں جہاں سے ادیب اور شاعر نے اپنی تخلیق عمل کو استوار بنایا ہے۔ اس کے بعد ہی وہ شاعر و ادیب کے ذہنی سفر کا تجزیہ کرتے ہیں۔ بات بالکل واضح ہے کہ جو نقاد اس سطح تک تخلیق کار کے ساتھ رہ کر اس کے فن کا تجزیہ پیش کرتا ہو وہ ان تنقیدی نظریات کا کیسے حمایتی ہو سکتا ہے۔ جو شعر و ادب کو صرف تلذذ اور حظ کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ تنقید کے مختلف اسالیب اور انداز فکر سے غیر مطمئن نظر آتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ ان اسالیب تنقید کے دائرۂ عمل اور انداز فکر کو محدود سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے انتقادیاتی عمل کو تخلیقی عمل کا حصہ قرار دیتے ہیں تنقید کو کسی ایک دائرۂ فکر اور عمل میں محصور اور محدود کر دینے سے تخلیق کو نقصان پہنچتا ہے اور اس طرح سے تخلیق صرف کسی ایک مخصوص انداز فکر کی حاصل ہو کر رہ جاتی ہے دراصل تخلیق ایک ابلتا ہوا چشمہ ہے اس کو روکا نہیں جا سکتا۔

پروفیسر احتشام حسین مارکسی تنقید کی کمزوریوں سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ وہ اس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ سماجی اور تاریخی نقطۂ نظر ادیب اور شاعر کی شخصیت اور انفرادیت کا مکمل مطالعہ کرنے میں مددگار ثابت نہیں ہوتا۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ سیاسی اور معاشی نظریات کی طرف زیادہ توجہ دینے سے ادب کی جمالیاتی قدر و قیمت اوجھل ہو جاتی ہے۔

اس حقیقت کا اظہار بہت سے مارکسی نقاد کرتے ہوئے پہلو تہی برتتے ہیں مگر وہ صاف اور واضح لفظوں میں اس سچائی کو تسلیم کرتے ہیں ان کا بیان ملاحظہ ہو:۔

> " تاریخی اور سماجی نقطۂ نظر سے ادب کی تنقید، روایت تبدیلیٔ ذوق، تہذیبی اقدار اور آفاقی معیار، اخلاقی مقصد اور ادبی شعور کے متعلق بہت سی گتھیاں سلجھاتی اور بہت سے سوالوں کا جواب دیتی ہے، لیکن کبھی کبھی شاعر یا ادیب کی انفرادیت اور عظمت کا اندازہ لگانے میں زیادہ دور تک نہیں چلتی حالاں کہ اگر دیکھا جائے تو ایسے نقاد کو ان امتیازی خصوصیات کی وضاحت پر بھی قادر ہونا چاہیے جو کسی فرد کو سماج کے دوسرے افراد سے الگ کرتی ہیں یہ بات اس فرد کے ذہنی اور سماجی شعور کے تجزیے سے نمایاں ہو سکتی ہے۔ پھر بھی کبھی کبھی تاریخی اور سماجی تنقید میں یہ نقص پیدا ہو گیا ہے کہ اس سے ادب کی جمالیاتی قدر پس پشت پڑ گئی ہے۔" ۶

پروفیسر احتشام حسین اس مقام پر پہونچ کر مارکسی تنقید کی کوتاہیوں کا اعتراف کرتے ہیں اور تنقیدی وسعت اور ہمہ گیری کے پیش نظر اپنے ذہن سے جن فنکار و نظریات کو ربط دے کر ایک نیا انداز تنقید پیش کرتے ہیں وہ مارکسی تنقید کے امتزاج اور اتصال سے سائنٹیفک نظریہ تنقید کے خالق قرار پاتے ہیں اور یہی ان کی تنقید کا وصف خاص ہے جس سے اردو تنقید ایک متوازن اور مستحکم جادہ پر گامزن نظر آتی ہے یہ بات بالکل واضح ہے کہ وہ بنیادی طور پر عقلیت پسند اور حقیقت پسند ہیں وہ دانستہ اور شعوری طور پر ایک واضح مربوط اور مکمل فلسفۂ حیات کو لازمی قرار دیتے ہیں اور باعتبار نقاد اس فلسفہ کی تدوین و ترتیب کے لئے متفکر رہتے ہیں۔ انہوں نے فلسفۂ حیات اور فلسفۂ ادب میں اشتراک و تعاون اور ہم آہنگ پر زور دیا ہے۔

میں نے ابتدا میں ہی عرض کر دیا ہے کہ احتشام حسین کی تنقید کوئی قرآن اور حدیث نہیں ہے ان کے اصول و نظریات سے اختلاف ممکن ہے لیکن کسی ادیب پر پابندی عاید نہیں کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے منحرف ہو جائے یا چھوڑ کر دوسرے نقطۂ نظر کو اپنائے۔ ظاہر ہے کہ نقاد ہو یا شاعر و ادیب وہ کسی اصول و نظریہ کو اس وقت اپناتا ہے جب اپنے مطالعہ، مشاہدے، عقل ذہن، شعور، ذوق اور فکر کو کسوٹی پر پرکھتا ہے اور جانچتا ہے لہٰذا اس سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ اپنے نقطۂ نظر کو تبدیل کر دے مناسب نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان نظریات کا تجزیہ کرنے کے بعد جو اوصاف نظر آئیں ان سے اتفاق کیا جائے۔ ایک مخصوص نقطۂ نظر کے افراد احتشام حسین کے تنقیدی نظریات کو تسلیم نہیں کرتے ہیں لیکن احتشام حسین نے جس استدلال کے ساتھ اپنے موقف کی وضاحت کی ہے اور اردو تنقید کو اپنے واضح اور مدلل نظریات کے ذریعہ جس منزل پر پہنچایا ہے اس سے انکار ممکن نہیں۔ انہوں نے اردو تنقید کو ذہنی بصیرت اور مدلل انداز عطا کیا ہے وہ آئی۔ اے۔ رچرڈس کے عملی تنقید کے

نقطۂ نظر کو بھی تسلیم نہیں کرتے ہیں وہ رقم طراز ہیں :-

"میرے یہاں اس لفظ (عمل) کا استعمال ڈاکٹر رچرڈس کے یہاں "پریکٹیکل" کے لفظ سے مختلف ہے ..... میں صرف ادب پاروں کے لفظی و معنوی تجزیہ اور ادبی تشریح کو عملی تنقید نہیں سمجھتا بلکہ سارے تنقیدی عمل کو، جو کسی تنقیدی نقطۂ نظر کے ماتحت ہو عملی تنقید کہتا ہوں۔ اسی وجہ سے میں نے کہیں کہیں اصول تنقید کے لئے نظریہ اور اس کے اطلاق اور استعمال کے لئے عمل کے لفظ سے کام لیا ہے۔ اس مفہوم میں عملی تنقید کا دائرہ وسیع تر ہے گویا میں نے اس لفظ کو کسی مخصوص اصطلاحی مفہوم میں نہیں بلکہ تقریباً اس کے لغوی مفہوم میں ہی استعمال کیا ہے۔"[۸]

درحقیقت پروفیسر سید احتشام حسین نے خواجہ الطاف حسین حالی کی تنقیدی روایت کو گراں مایہ بتاتے ہوئے اس کی توسیع کا کام انجام دیا ہے انہوں نے اپنے ذاتی اور مخصوص فلسفیانہ نقطۂ نظر سے اردو تنقید میں اہم اضافے کئے ہیں۔ احتشام حسین کے عہد تک اردو تنقید، تقریظ، تنقیص، اور تبصرہ کی منزل سے آگے نکل چکی تھی۔ کوئی ادب کے اخلاقی پہلوؤں کو بنیاد بنا کر تنقید کر رہا تھا کسی نے جمالیاتی اور تاثراتی پہلوؤں پر ہی اپنی توجہ مرکوز کر رکھی تھی کسی نے فرائڈ کی تحلیل نفسی اور نفسیات کے بغیر ادب کی تنقید کو ناکافی قرار دیا۔ کہیں سماجی اور تاریخی حقائق پر زور دیا جا رہا تھا۔ مختلف تنقیدی دبستان اپنا عمل دخل دکھا رہے تھے۔ ایسے دور میں پروفیسر احتشام حسین اپنا تنقیدی عمل پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ابتدا میں احتشام حسین ادب کے جمالیاتی مطالعہ کو ضروری نہیں قرار دیتے ہیں ان کا خیال تھا کہ جمالیاتی ذوق مطلق نہیں ہوتا اس لئے انہوں نے جمالیاتی اور تاثراتی تنقید کو شعر و ادب کے لئے نامکمل قرار دیا۔ وہ شعر و ادب کو غیر شعوری کوشش اور ادیب کی نیوراتی نہیں سمجھتے تھے اس لئے انہوں نے ادبی تنقید کے ذیل میں نفسیاتی مطالعہ کو بھی کارآمد نہیں سمجھا۔ انہوں نے روح عصر اور تاریخیت پر بھی کافی زور دیا۔ ادب میں مقصدیت کو لازمی قرار دیا۔ یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ شعر و ادب کا مطالعہ اس کے ماحول اور پس منظر میں ہی ضروری ہے۔ اس کے بعد کارل مارکس کے نقطۂ نظر سے بھی اثر انداز ہوئے اور ادب کے سماجی نظریے کو تسلیم کرتے ہوئے طبقاتی کشمکش، اقتصادی اور مادی نقطۂ نظر کے پیش نظر تنقیدی رویے سے کام لیا وہ ادب اور زندگی کے رشتے کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ لیکن ان کے نظریات، تجربات اور مشاہدات کے ہر دور سے گذرتے ہوئے اور خود اپنی ذہنی بصیرت اور تخلیقی قوت سے پرکھتے ہوئے وہ اپنی تنقید کو میکانکی اور انتہاپسند ہونے سے محفوظ کر لیتے ہیں اور سائنٹی فک نقطۂ نظر سے کام لے کر اردو تنقید کو متوازن اور باوقار بنا دیتے ہیں۔ اردو تنقید میں ترقی پسند سائنٹی فک تنقید، صرف اور صرف سید احتشام حسین کی لازوال دین ہے۔

□□

حواشی :

[۱] افکار و مسائل، ص۴ ۔ [۲] ذوقِ ادب اور شعور، ص ۲۵۲
[۳] تنقید اور عملی تنقید ص ۲۲ [۴] تنقیدی جائزے (دیباچہ) ص ۷، و ص ۸
[۵] تنقید اور عملی تنقید ص ۱۹، ص ۲۰ [۶] ذوق ادب اور شعور۔ سید احتشام حسین ص ۱۰۵ [۷] تنقید اور عملی تنقید (دیباچہ دوم)۔ سید احتشام حسین ص۹، ص۱۰

ریڈیائی خاکہ نگاری

.... صفحہ ۱۵ کا بقیہ

سے لے کر سلمیٰ صدیقی، فکر تونسوی، دلیپ سنگھ اور ڈاکٹر شمیم نکہت تک کتنے ہی خاکہ نگار ایسے ملیں گے جن کی بہت سی تخلیقات ممکن ہے اب تک چھپی ہی نہ ہوں ___ ممکن ہے خود ڈاکٹر شمیم نکہت یا پروفیسر شیفتہ فرحت ایچ ایچ یونیورسٹی ۔ یعنی دہلی اور برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال سے اس موضوع پر کسی ہونہار طالب علم سے کام کرائیں۔ مجھے یقین ہے کہ مختصر خاکہ نگاری کے بہت سے گوشے سامنے آئیں گے۔ اور یہ بیشک ایک مستحسن قدم ہوگا۔

غزل

اے غمِ الفت ایسا بھی
زخم کوئی اک گہرا بھی

شہرِ حسیں لِلّٰہ کبھی
تازہ ہوا کا جھونکا بھی

عمر کی شام کو ڈھلنے دو
ساتھ نہ دے گا سایہ بھی

حسن تمہارا یکتا سہی
دیکھو کبھی آئینہ بھی

وہ جو خدا ہے سب کا نرِش
کاش وہ ہوتا میرا بھی

کاظم علی خاں
۲۰۔ بی/۱ - چاپلنگ روڈ لکھنؤ

بیدی کی افسانہ نگاری — چند پہلو

مختصر افسانہ اردو ادب میں ایک ایسی صنف ہے جس کا سن ۱۹۹۲ء میں ابھی سورج کے گرد زمین کی سو گردشوں سے بھی کم ثابت ہوتا ہے۔ یہ اسی بیسویں صدی عیسوی کی دین ہے۔ اس کی پیدائش اور نشو و نما میں مغربی ادبیات کے اثرات کی کارفرمائی سے انکار ممکن نہیں۔ اردو میں افسانہ نگاری کو چند دہائیاں پہلے "کل کی چھوکری" کہا جاتا تھا مگر اب یہ جوان ہو کر بہ قول ایک ناقد "اپنی تمام تر رعنائیوں اور برنائیوں کے ساتھ ہماری توجہ کا مرکز" بنی ہوئی ہے۔ مغربی ادبیات سے ہماری بڑھتی ہوئی دلچسپیوں اور طباعت و اشاعت کی روز افزوں آسانیوں کی بدولت رسائل و اخبارات کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ اردو افسانہ نگاری کی توسیع و ترقی میں معاون اسباب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ افسانہ نگاری کے میدان میں آج ایک "انبوہ کثیر" نظر آتا ہے مگر افسانہ نگاروں کے اس "جم غفیر" میں جن چند گنے چنے فن کاروں نے اپنا انفرادی اور امتیازی مقام حاصل کر لیا ہے ان میں راجندر سنگھ بیدی (زمانہ حیات یکم ستمبر ۱۹۱۵ء تا ۱۱ نومبر ۱۹۸۴ء) بھی شامل ہیں۔ بیدی نے افسانہ نگاری کی تاریخ میں کچھ ایسے دل نشین، روشن اور "سدا بہار" نقش و نگار تیار کیے ہیں جو وقت کی گرد اور گم نامی کے تاریک نہاں خانوں میں معدوم ہونے سے یقیناً مامون و محفوظ رہیں گے۔ بیدی کے باب میں یہاں حافظ کے ایک مصرع پر غالب کی یہ تضمین لطف سے خالی نہیں۔

غالب بہ قولِ حضرتِ حافظ ز فیضِ عشق

"ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما"

کسی فن کار کا قبول عام کے ساتھ ساتھ بقائے دوام کے دربار میں بار پانا وہ کار دشوار ہے جس کے لئے فن کار کو فن کی ناہموار اور "گھاٹ گھاٹیوں" میں بے شمار ہفت خوان طے کرنا پڑتے ہیں۔ فن پاروں کو خونِ جگر سے سیراب کرنا ہوتا ہے۔ اپنی ادبی تخلیقات کو فکر و نظر کی روشنی اور فنی تجربات کی گرمی سے معمور کرنا پڑتا ہے۔ حیات و کائنات کے مطالعے اور مشاہدے میں نہ صرف بصارت صرف کرنا پڑتی ہے بلکہ اس کے نتیجے میں فن کار جو اخذ و اکتساب کرتا ہے اسے اپنے شاہکار فن پاروں میں پیش کرنے کے لئے بصارت کا بھی ثبوت دینا ہوتا ہے۔ قبولِ عام اور بقائے دوام کا دربار اہل قلم سے بصارت و بصیرت کے ساتھ ساتھ جرأت اظہار کا بھی طالب ہوتا ہے۔ دار و رسن کی اس منزل پر اظہار حق میں بہ قول غالب ہاتھ بھی قلم ہو سکتے ہیں اور فن کار پھر بھی جنوں کی حکایات خوں چکاں لکھنے سے باز نہیں آتا۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے[۳] (غالب)

راجندر سنگھ بیدی نے اپنے افسانوں میں مقدار سے زیادہ معیار کو برقرار رکھنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ افسانہ نگار کی حیثیت سے بیدی نے اپنے کم بیش چالیس پینتالیس سال کے تخلیقی سفر میں جو ادبی اثاثہ افسانوں کے اساسی مجموعوں کی شکل میں چھوڑا ہے وہ مقدار و تعداد کی بنیاد پر نصف درجن کتابوں سے بھی کم ثابت ہوتا ہے جیسا کہ سطور ذیل میں پیش ہونے والے اعداد و شمار سے ظاہر ہے[۴]:

۱۔ **دانہ و دام**: یہ بیدی کا پہلا اساسی افسانوی مجموعہ ہے جس کا پہلا اڈیشن سنہ ۱۹۳۶ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ یہ ایک سے زیادہ بار چھپ چکا ہے۔

۲۔ **گرہن**: بیدی کا دوسرا اساسی افسانوی مجموعہ ہے جو سنہ ۱۹۴۲ء میں پہلی بار شائع ہوا تھا اور یہ بھی اب تک ایک سے زیادہ مرتبہ چھپ چکا ہے۔

۳۔ **کوکھ جلی**: بیدی کا تیسرا اساسی افسانوی مجموعہ ہے۔ یہ پہلی بار مارچ سنہ ۱۹۴۹ء میں منظر عام پر آیا تھا اور اب تک یہ دو سے زیادہ بار چھپ چکا ہے۔

۴۔ **اپنے دکھ مجھے دے دو**: بیدی کے افسانوں کا یہ چوتھا اساسی مجموعہ پہلی بار اگست ۱۹۶۵ء میں چھپا تھا اور اب تک یہ بھی دو سے زیادہ مرتبہ شائع ہو چکا ہے۔

۵۔ **ہاتھ ہمارے قلم ہوئے**: یہ بیدی کا پانچواں اساسی افسانوی

مجموعہ ہے جس کی پہلی اشاعت مارچ ۱۹۷۴ء میں منظرِ عام پر آئی تھی۔ بیدی کی اس کتاب پر نیا دور لکھنؤ دسمبر ۱۹۷۵ء (ص ۴۷ تا ۴۸) میں میرا تبصرہ چھپ چکا ہے[۵۶]

یہ اعداد و شمار بیدی کے اساسی افسانوی مجموعوں کی تعداد محض ۵ بتاتے ہیں۔ یہ تعداد بہت زیادہ نہیں لیکن ان کتابوں کے افسانوں میں بیدی نے جگہ جگہ شعورِ فن کے ثبوت ضرور دیے ہیں۔ بیدی کی افسانہ نگاری کے بارے میں جوگندر پال کا بیان ہے،

"بیدی نے ایک بار مجھے لکھا تھا کہ جانے میرے ساتھی کیوں کر اپنی کہانیاں قلم برداشتہ لکھ لیتے ہیں، میں تو ہر سطر رُک رُک کر بڑی اذیت جھیل جھیل کر لکھتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ بیدی کو تیز تیز پڑھنے سے اس کے لکھے ہوئے کا سرا انگلیوں سے پھسل جاتا ہے۔ اس سرے کو گرفت میں لانا مقصود ہو تو اُلجھے ہوئے باریک دھاگے کو سنبھل سنبھل کر۔۔۔ [سلجھانا] ہوگا عجلت میں جھٹک دینے سے ہم اسے درمیان میں ہی کہیں توڑ بیٹھیں گے۔ بیدی سوچ سوچ کر لکھنے کا عادی ہے اور اس کا قاری بھی سوچوں کے گھیرے میں آکر اسے رُک رُک کر پڑھتا ہے گویا کہانی کو اپنے طور پر۔۔۔ [تخلیق کرتے] ہوئے آگے بڑھ رہا ہوں۔ قاری کے لئے کھوج کی یہ گنجائش روا رکھ کر بیدی نے ایک طرح سے مطالعے کو تخلیق کی سرحدوں سے جوڑ دیا ہے۔[۵۷]

راجندر سنگھ بیدی افسانہ نگاری میں لکیر کے فقیر نہیں رہے ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری کسی ایک پامال راہ پر چلنے کے بجائے اپنے ارتقائی سفر میں مختلف متعدد جہتوں سے دوچار ہوتی رہی ہے۔ ان کے افسانوں میں اگر ایک طرف ہندستان کی دیہی زندگی کی جھلکیاں ملتی ہیں تو دوسری جانب ان کے افسانوں میں عصری شہری زندگی بھی جلوہ گر نظر آتی ہے۔[۵۸] ان کے افسانوں میں سماج کے نچلے اور کچلے ہوئے طبقے کے دوش بدوش متوسط اور اعلا طبقوں کے کردار بھی ملتے ہیں۔ خارجی حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ ان کے افسانوں میں داخلی کیفیات کے بھی کامیاب تجزیے موجود ہیں۔ یہ امور اس بات کا اثبات کرتے ہیں کہ بیدی کا فن یک رُخے پن کی خامی سے پاک ہے۔ ان کی دنیا محدود نہیں۔ ان کے نت نئے فنی تجربات میں بوقلمونی اُن کی افسانہ نگاری کو جمود سے محفوظ رکھتی ہے۔

افسانہ نگاری میں جن فن کاروں نے اپنے فن پاروں میں خارجی واقعیت پر توجہ دی ہے ان میں بیدی بھی قابلِ ذکر ہیں۔ بیدی کے متعدد افسانوں کو اُردو میں ترقی پسند تحریک کے تحت پیدا ہونے والے ادب کا یادگار سرمایہ قرار دیا گیا ہے۔ اس تحریک سے وابستہ افسانہ نگار اپنے افسانوں میں عام طور پر ایک فکری نظام کی تبلیغ و اشاعت کا رجحان رکھتے ہیں۔ بیدی کی متعدد کہانیاں کسی واضح سیاسی رجحان کی نشان دہی تو نہیں کرتی ہیں لیکن ان میں سماجی، معاشی اور معاشرتی موضوعات کے گہرے نقوش ضرور ملتے ہیں۔ بیدی کے افسانوں میں ملنے والی خارجی واقعیت میں قطعیت نہیں کے برابر کم ہوتی ہے۔ ان کی حقیقت نگاری میں رومانیت اور تخیل کا امتزاج بھی قابلِ ذکر پہلو ہے جس کا اظہار و اقرار انھوں نے اپنے افسانوی مجموعے گرہن (اشاعتِ اول) کے پیش لفظ میں خود بھی کیا ہے:

"مجھے تخیلِ فن میں یقین ہے۔ جب کوئی واقعہ مشاہدے میں آتا ہے تو میں اسے من و عن بیان کر دینے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ حقیقت اور تخیل کے امتزاج سے جو چیز پیدا ہوتی ہے اسے احاطۂ تحریر میں لانے کی سعی کرتا ہوں۔ میرے خیال میں اظہارِ حقیقت کے لئے ایک رومانی نقطۂ نظر کی ضرورت ہے۔ بلکہ مشاہدے کے بعد پیش کرنے کے انداز کے متعلق سوچنا بجائے خود کسی حد تک رومانی طرزِ عمل ہے اور اس اعتبار سے مطلق حقیقت نگاری بہ حیثیت فن غیر موزوں ہے۔۔۔[۵۹]

استادِ محترم ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بیدی دوسرے "افسانہ نگاروں کے برخلاف رومانیت، انقلابیت، جنس یا اسی نوع کے ہیجان انگیز تجربات سے ہٹ کر زندگی کے مانوس اور چھوٹے چھوٹے مسائل کو اپنا موضوع بناتے ہیں، وہ کسی حقیقت کے فوری ردِ عمل کو بنیاد بنا کر خلا میں نہیں اُڑنے لگتے بلکہ ان حقائق پر نظر جما کر اس کی گہرائیوں میں جاتے ہیں اور تحلیل و تجزیہ کے بعد ایک مکمل فن پارے کی تخلیق کرتے ہیں۔ اسی لئے ان کا ہر افسانہ اپنی جگہ پر ایک نقش ہوتا ہے جس کی تخلیق میں فن کار نے ضبط و اعتدال اور معروضیت سے کام لیا ہے۔ ان کا افسانہ پڑھنے والے کے جذبات کو مشتعل یا برانگیختہ نہیں کرتا اور نہ اپنے مقصد کو قاری پر مسلّط کر کے تلقین و تبلیغ کا وسیلہ اختیار کرتا ہے۔ ان کی کہانیاں ایک ایسا

ہزاروں خواہشیں ایسی

کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں
کہ میرے آنگن میں چاند اُترے
میں اُسکے ہمراہ تیرہ ذہنوں کو روشنی کی نوید دے کر
انھیں بتاؤں کہ تنگ نظری کی سرحدوں سے
قریب ہی وسعتِ نظر کی بھی مملکت ہے
جہاں کا ہر لمحہ معتبر ہے

کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں
کہ سخت خود غرضیوں کے سائے طویل ہوکر
کہیں نہ انسانیت کے سُورج کو قید کرلیں
مرے خدا! خودکشی نہ کرلے
جہاں میں ایثار کا اُجالا

کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں
خود اپنی کج فہمیوں کے باعث
بشر مذاہب کی تیرگی میں پھنسا ہوا ہے
بھلا اسے وسعتِ نظر مل سکے گی کیونکر
کہ آپ اپنے میں کوئی تبدیلی پیدا کرنے کی
دل میں خواہش / نہ ہی ارادہ
اُفق نہ امکان کا ہے روشن

کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں
کہ تتلیاں آکے میرے اک اک زخم بدن کو چومیں
مجھے بھی احساس ہو کہ دلداریوں کی رسمیں
ابھی ہیں زندہ۔

□□

مہدی پرتاپ گڑھی
۲۸ ۔ اسکول وارڈ
پرتاپ گڑھ ۲۳۰۰۰۱

مَتاعِ مُعتَبر

غم ہے متاعِ معتبر، غم سے رہِ فرار کیا
خوشیوں کی بات کیا کہیں، خوشیوں کا اعتبار کیا

رنگِ شفق شرر فشاں، لالہ و گُل ہیں شعلہ بار
زیست کی تلخیاں نہ پوچھ، زیست میں ہی بہار کیا

تازہ ہَوا کے واسطے کھڑکیاں ساری کھول دو
کمرے میں ہے دُھواں دُھواں، پھیلا ہی انتشار کیا

آؤ کسی درخت کے سائے میں بیٹھ جائیں آج
کل یہ درخت ہو نہ ہو اس کا بھی اعتبار کیا

پیڑوں کے زرد پتّے ہی اپنا نصیب بن گئے
صحنِ چمن میں چھوڑ کر رُوٹھ گئی بہار کیا

چاروں طرف ہجومِ غم، خوشیوں کا نام تک نہیں
بھُول گیا ہے دل میرا، چین ہے کیا، قرار کیا

بیٹھ گئے جہاں کہیں، سج گئی انجمن وہیں
تیرے لیے رضا میاں دشت ہے کیا دیار کیا

رضا امروہوی
بلاک نمبر ۱۳، کوارٹر، ا۔ سی
کالی دیوی مارگ
نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۱

لئیق اختر فیض آبادی
امامباڑہ - فیض آباد (یو پی)

کھُلے دریچے یادداشت کے

وہ دور تھا فارغ البالی کا، اخلاص و محبّت کا، تہذیب و شرافت کا، وضعداری اور پاسداری کا، سخن فہموں کا، سخن پروروں کا، نکتہ بینوں کا، لفظ شناسوں کا ـــــ آج جو شہرت کی نازک شاخوں پر بیٹھے ہیں، اُس دور میں ایک تنگ و تاریک کمرے میں کس مپرسی کی زندگی گزارا کرتے تھے۔ آج جنھیں انعام و اکرام سے نوازا جا رہا ہے کل وہ فاقہ مستی کا شکار تھے۔ ادب پروروں کے جگمگھٹے تھے، ادب نوازوں کے ادب کدے تھے۔ بدری ناتھ روڈ پر مرزا جعفر حسین ایڈوکیٹ کی ادب گاہ تھی، جہاں روزانہ شام ڈھلے لان پر ادبا، و شعراء کے پہلو بہ پہلو دانش ورانِ لکھنؤ اور حکمائے لکھنؤ بھی تشریف رکھتے تھے۔

جوشؔ ملیح آبادی اُن دنوں لال باغ کے قریب نظر باغ میں رہتے تھے وہ بھی اس بزم کی رونق بڑھاتے۔ گاہے گاہے پروفیسر اختر علی تلہری، پروفیسر احتشام حسین، پرنسپل علی عباس حسینی، سید اعظم حسین اعظم، اسرار الحق مجازؔ، حکیم شمس الدین، مفتی محمد رضا انصاری صاحبان بھی آجاتے تھے۔ وہ یادگار نشستیں اور وہ عدیم المثال محفلیں اب خواب و خیال ہو چکی ہیں ـــــ صد شکر ہے کہ اس اجڑے ہوئے لان اور یادِ رفتگاں میں اُداس میدان کو آباد کرلیا ہے، گلزار بنا دیا ہے مرزا جعفر حسین صاحب مرحوم کے صاحبِ قلم، عبادت گزار، مہمان نواز، وضعدار، غربا پرور، ہمدرد بے کراں بھتیجے اور داماد جسٹس مرتضیٰ حسین صاحب نے اپنے "المرتضیٰ" سے۔

ایک شام اس لان کے ایک گوشے میں واقع چھوٹی سی مسجد میں حسبِ معمول مرزا جعفر حسین صاحب کی اہلیہ نے شمع روشن کی، جلتی ہوئی شمع کی عمرِ طبیعی پر جوشؔ صاحب بغور نگاہیں جمائے ہوئے تھے۔ کچھ دیر جلنے کے بعد شمع کی مختصر سی حیات کا چراغ جیسے ہی گل ہوا، جوشؔ صاحب کی طبعِ رواں نے فی البدیہہ حاضرینِ بزم کو یہ شعر سُنایا ؎

چراغ دیر و حرم کب کے بُجھ گئے اے جوشؔ
ہنوز شمع ہے روشن شراب خانے کی

واقف کارانِ جوشؔ اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ جوشؔ صاحب پیمانہ بکف اس وقت طلوع ہوتے تھے جب سورج شفق کی چادر منھ پر ڈال کر مغرب کے بستر پر غروب ہو جاتا تھا، گرمیوں کی وہ ایک شام تھی جب سورج مغرب کی سرحد پہ منجمد ہو گیا تھا۔ نہ ابھر رہا تھا نہ غروب ہو رہا تھا۔ جوشؔ صاحب کی جھنجھلاہٹ دیکھنے کے قابل تھی۔ اسی جھنجھلاہٹ میں جوشؔ صاحب نے ایک رُباعی کہہ دی جس کا تیسرا اور چوتھا مصرع آج بھی مجھے یاد ہے ؎

کب سے بیٹھے ہیں پیاسے رندانِ کرم
اے سنگِ رہِ گُناہ! کب ہوگا غروب

اسی زمانے میں جوشؔ صاحب ایک طویل نظم بعنوان "حرفِ آخر" کہہ رہے تھے، کبھی کبھی وہ مجھے حکم دیتے کہ تازہ اشعار خوشخط لکھتے جاؤ۔ بلا مبالغہ دو ڈھائی ہزار اشعار میں نے اُن کے رجسٹر پر لکھے ہوں گے۔ متفرق مصرع اور اشعار آج بھی میرے ذہن میں موجود ہیں۔ مثلاً ایک جگہ خلقتِ آدم کی منظر کشی کرتے ہوئے جوشؔ صاحب اس مقام تک پہونچتے ہیں جب خدائے لایزل نے ملائک کو حکم دیا کہ

آدم کے سامنے سجدہ کرو۔ تمام ملائکہ تو سربسجود ہو گئے لیکن ابلیس نے سجدہ ریزی سے انکار کر دیا۔ اس نافرمانی اور حکم عدولی پر خدا اور شیطان کے درمیان مکالمہ ہوا۔

خدا نے ابلیس سے پوچھا: تو نے آدم کو سجدہ کیوں نہیں کیا؟

شیطان نے جواب دیا:

ع خاک کے قدموں پہ گرنا آگ کی توہین ہے

خدا نے اپنے مقرب بارگاہ جبرئیل امین کو حکم دیا:

ہاتھ دینا بڑھ کے گدی میں ذرا اے جبرئیل

ابلیس نے اس حکم پر طنزاً کہا:

غصہ آتا ہے اسے ملتی نہیں جس کو دلیل

یا "حرفِ آخر" کا وہ پیراگراف جب جناب آدم نے روئے زمین پر اپنی تنہائیوں کا کرب بارگاہ ایزدی میں پیش کیا تو ارحم الراحمین نے خلقت حوا کر کے جناب آدم سے کہا ؎

مبارک باد مرگِ نو بہ آدم مہیا زخم کا ہوتا ہے مرہم

ایک شام میں جوش صاحب کے پاس بیٹھا ہوا تھا، وہاں کوئی عبداللہ صاحب لمبے تڑنگے اور سرخ و سفید بیٹھے ہوئے تھے۔ جوش کے بھائی رئیس احمد خاں، جن کو جوش صاحب "ساقی" کہا کرتے تھے، یہ وہی ساقی تھے جن کی عدم موجودگی پر مغموم ہو کر بوقت نا ؤنوش جوش صاحب نے کہا تھا " ساقی بغیر کل جو پیا آبِ آتشیں" وہ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ دونوں صرف حقیقی بھائی نہ تھے بلکہ ہم پیالہ و ہم نوالہ بھی تھے۔ جوش صاحب نے مجھ سے کہا:

"میری رازقہ اور رزاقہ بیگم سے شب کا آذوقہ تو لے آؤ۔"

میں نے بھی صاحبہ سے جوش صاحب کا رزق مانگا۔ خلاف معمول وہ اس وقت موڈ میں تھیں، خالی بوتل مجھے دے کر کہا:

"جاؤ یہ دے آؤ۔"

جوش صاحب نے خالی بوتل دیکھ کر کاغذ کے ایک ٹکڑے پر لکھا: "اے جوش کی رازق و رزاق بیگم!

دریا کے ساتھ اس کی روانی بھی بھیجدو
جب آگ بھیج دی ہے تو پانی بھی بھیجدو

یادش بخیر لکھنؤ کے محلہ نخاس میں ایک تھا دواخانہ معدن الادویہ اس کے مالک تھے عالمی شہرت کے حکیم حاذق، ماہر نباض، قادرالکلام شاعر، بحرالعلوم حکیم صاحب عالم صاحب۔ غرباء کے ناخدا، یتیموں کے سرپرست، حاجت مندوں کے ظلِ الٰہی، اُمراء کا سہارا، رؤساء کا ملجاد ماویٰ، شعراء اور ادباء کے مونس و یاور۔ ان کے کارخانے کی تیار کردہ "شراب الصالحین" چار دانگ عالم میں مشہور تھی۔ لکھنؤ کے جید شعراء ان کے یہاں کی نشستوں میں برابر شرکت کرتے رہتے تھے دواخانہ کے بالائی حصے کے ایک کشادہ اور ہوادار کمرے میں زیادہ تر شعری نشستیں ہوتی تھیں۔ ماحول کی پروقار سنجیدگی اور شائستگی کی وجہ سے کبھی کبھار دو ایک عالم دین بھی قصائد سننے کے لئے تشریف لے آتے تھے۔ ایک دن کرٹرہ ابو تراب خاں لکھنؤ کے طباطبائی خاندان کے چشم و چراغ کیپٹن سرورش طباطبائی بھی نشست میں تشریف لائے۔ عالم دین کی موجودگی میں جب انھوں نے بڑے ادب اور آہستگی کے ساتھ اپنی غزل کا یہ مطلع پڑھا ؎

اٹھا لو جام کہ باہم نہ ہوں گے پھر موجود
یہ کنجِ باغ یہ ہم تم یہ آتشِ بے دود

تو گراں گوش حکیم صاحب عالم صاحب نے فرمایا تھا: "خدا نظر بد سے بچائے ان شعری نشستوں کو، تمھاری نگاہیں مستقبل کو دیکھ رہی ہیں"۔

سچ کہا تھا سرورش طباطبائی نے، اب نہ وہاں معدن الادویہ ہے نہ حکیم صاحب عالم ہیں، نہ وہ شعری نشستیں ہیں، نہ وہ شراب الصالحین نہ وہ ادیبوں اور شاعروں کی علمی و ادبی گفتگو۔

کتنے سادہ لوح تھے ناطق امیٹھوی مرحوم۔ جب بھی وہ لکھنؤ آتے تو اپنے رفیقِ دیرینہ نسیم انہونوی صاحب سے ملنے ضرور جاتے۔ نسیم بکڈپو سے اُن دنوں ماہنامہ "حریم" اور ہفت روزہ "سرپنچ" نکلا کرتا تھا۔ "سرپنچ" کے متعلق خبر نہیں البتہ ماہنامہ حریم نسیم انہونوی مرحوم کے فرزند فہیم انہونوی کے زیرادارت اب بھی شائع ہوتا ہے اُن دنوں نسیم بکڈپو سے مرحوم شوکت تھانوی، مرحوم خان محبوب طرزی وغیرہم وابستہ تھے۔ ناطق صاحب کا بھولا پن، سادہ مزاجی، نیک نیتی



وزیراعلیٰ
اترپردیش
محترمہ
مایاوتی
لکھنؤ میں
کسان
منڈی بھون
کا
افتتاح
کرتی
ہوئی



وزیراعلیٰ
محترمہ
مایاوتی
چیمبرس آف
کامرس اینڈ
انڈسٹریز
کے پہلے
سالانہ
جلسہ
افتتاح
کرتی
ہے



وزیر اعلیٰ اترپردیش
محترمہ مایاوتی
وارانسی منطقہ کے
ترقیاتی کاموں کا تجزیہ
کرتے ہوئے





وزیر اعلیٰ
محترمہ مایاوتی ۲۹ اگست ۹۵ء
اپنی رہائش گاہ کالیداس مارگ پر
مسلم نمائندوں کے ایک وفد سے
گفتگو کرتے ہوئے





[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
مسائل
نمائندہ وفد
گفتگو
ہوئی۔

وزیر اعلیٰ اتر پردیش محترمہ مایاوتی اپنی رہائش گاہ واقع کالی داس مارگ لکھنؤ پر سماجک بدلاؤ کے مضبوط ارادے نامی کتابچہ کی رسم اجراء انجام دیتی ہوئی۔



سے شوکت تھانوی مرحوم کی مزاح خصلتی نت نئے کھیل شروع کر دیتی تھی

ناطق صاحب کا تعارف ان کے ایک شعر کے ذریعہ ہو سکتا ہے ۔

میں کون ؟ تیرا عاشقِ سابق سلام کر
اب ہو گیا جوان تو پہچانتا نہیں ؟

ایک دن ناطق صاحب نسیم انہونوی کے پاس کچھ گھبرائے اور کچھ حیران و پریشان سے آئے ۔ نسیم صاحب نے خیریت دریافت کی تو ناطق صاحب بولے :

"کیا بتاؤں حضرت ! آج شوکت تھانوی کے والد ماجد سے ملاقات ہو گئی ۔"

نسیم صاحب نے چونک کر پوچھا :

"کس کے والد ماجد سے ۔ ؟"

ناطق صاحب نے جواب دیا" شوکت تھانوی کے والد سے ۔"

نسیم صاحب نے دل میں سوچا کہ ناطق صاحب یا تو سنک گئے ہیں یا کسی غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں ۔ شوکت تھانوی کے والد تو کب کے مرحوم و مغفور ہو چکے ہیں آخر بعد از مرگ ان کو کہاں مل گئے ۔ نسیم صاحب نے دریافت کیا :

"کہاں ملاقات ہوئی شوکت صاحب کے والد سے ؟"

ناطق صاحب نے جواب دیا : " شوکت صاحب کے گھر پر ہوئی اور کہاں ہوئی ۔ واللہ کیا نورانی چہرہ ہے ۔ سن سفید داڑھی ، سن سفید سر کے بال ، غضب کی پاٹ دار آواز ، دھندلکا پھیل چکا تھا ، ان کے باہری کمرے میں ہلکا ہلکا اندھیرا تھا ، ایک کرسی پر خود تشریف فرما تھے ، سامنے چھوٹی سی میز پر جلتی آئینہ دھرا تھا ، دوسری کرسی پر بنی ٹھنی شوکت صاحب کی بیگم صاحبہ بیٹھی تھیں ۔

مجھ سے پوچھا : " ابے کیا نام ہے تیرا ؟"

اس ابے تبے سے گھبرا کے میں نے کہا :

"خادم کو ناطق امیٹھوی کہتے ہیں ۔" اجی اتنا سنتے ہی آگ بگولا ہو گئے ، کہنے لگے :

" بدبختو ، بدنصیبو ، اٹھائی گیرو ! تم سب نے مل کر شوکت کو تباہ کر دیا ، ہماری خاندانی اعلیٰ نسلی پر پانی پھیر دیا ۔ یہ کم بخت جو میرے سامنے بھی سنوری بیٹھی ہے ، یہ ڈومنی کی اولاد ، یہ بدنسلی اب میری بہو ہے ۔"

اتنا کہہ کے موصوف اپنا سینہ اپنے ہاتھوں سے کوٹنے لگے ۔ نسیم صاحب بیٹا شوکت تو ہم سے ڈینگ مارا کرتے تھے کہ میری بیوی نواب بھوپال کے گھرانے کی معزز بیٹی ہے ۔"

نسیم صاحب دفتر سے اٹھے اور پہونچے شوکت صاحب کے یہاں وہاں دیکھا کہ دونوں میاں بیوی میں ٹھنی ہوئی ہے ۔ شوکت کی بیگم کہہ رہی تھیں :

" آپ نے بہروپ بھر کے مجھے کہیں کا نہیں رکھا ۔ ناطق صاحب دنیا جہان میں کہتے پھر رہے ہوں گے کہ میں ڈومنی ہوں بدنسلی ہوں ـــ میں کہاں کہاں صفائی دیتی پھروں گی کہ شوکت صاحب نے مذاقاً کہا ہے ۔

جن دنوں جگر مرادآبادی صاحب گونڈہ میں سخت علیل تھے ، میں اپنے دوست اقبال حسین قیصر لکھنوی کے ساتھ فیض آباد سے گونڈہ جگر صاحب کی عیادت کے لیے پہونچا ، ان کی نقاہت کا یہ عالم تھا کہ کمزور و نحیف آواز میں ہر سوال کا مختصر جواب دے رہے تھے یکبارگی انھوں نے فرمایا :

" ادھر کئی دنوں سے کسی نامعلوم شاعر کا ایک شعر میرے دل و دماغ میں سمایا ہوا ہے ۔ ہر چند کہ شعر میں "چیز" کا لفظ مبتذل ہے لیکن اس ابتذال کے باوجود شعر مجھے بہت پسند ہے ۔ شاید تم دونوں آخری بار کسی نامعلوم شاعر کا شعر سنو گے ، آج کے بعد تم لوگ مجھ سے کوئی شعر نہ سن پاؤ گے ۔ لو سنو ۔

جب سے دل ہو گیا ہے گم اپنا
چیز رکھتے ہیں بھول جاتے ہیں

فیض آباد کی مشہور و معروف درس گاہ ۔ فاربس انٹر کالج میں ہر سال عدیم النظیر مشاعرہ ہوا کرتا تھا تقسیم وطن سے قبل اس درسگاہ کے مشاعروں میں ملک کے مایۂ ناز اور ممتاز شعرا شریک ہوتے تھے حفیظ جالندھری ، احسان دانش ، ساغر نظامی ، ادیب سہارنپوری ، فراق گورکھپوری ، جگر مرادآبادی ، روش صدیقی ، خمار بارہ بنکوی ، نوح

نادری، افقر موہانی، بیخود موہانی وغیرہم برابر تشریف لاتے تھے۔ جگر صاحب ایک بار تشریف لائے ہوئے تھے ان دنوں میرا عنفوانِ شباب تھا رگ رگ تھرکتی رہتی تھی، فنِ میزبانی اور علمِ مہمان نوازی سے ناواقف تھا۔ جگر صاحب کے ایک حریف نے مجھے لگتے پر چڑھا دیا۔ جب وہ محترم بزرگ میری نام نہاد سخن فہمی کو اپنی مصری سے لیپ پوت چکے تو مجھ سے کہنے لگے کہ "جگر صاحب سے ان کے دو شعروں کے معنی و مطلب دریافت کرلو۔" ہوگئی مجھ سے حماقت، کر بیٹھا ان سے سوال:

"آپ کے دو شعر نہ میری سمجھ میں آئے ہیں نہ میرے احباب کے"۔

جگر صاحب نے مجھے غور سے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ ماتھے پر بلکے سے بل پڑے۔ پھر مجھ سے باندازِ برہمی پوچھا:

"وہ کون سے اشعار ہیں؟"

میں نے عرض کیا: (۱) ؎

تمہارے چہرے سے جس وقت کہ نقاب اٹھا
تمام ذرّے پکارے کہ آفتاب اٹھا

ہم تو "آفتاب طلوع ہوا"، "آفتاب نکلا" جانتے ہیں۔ یہ "آفتاب اٹھا" کیا ہے؟ اور دوسرا شعر یہ کہ ؎

جس سے ڈرتے تھے وہی بات ہوئی
راہ میں ان سے ملاقات ہوئی

عشاق تو مرے جاتے ہیں اسی تمنا میں کہ محبوب سے ملاقات ہو جائے بطورِ ثبوت ایک قدیم شاعر کا شعر حاضر ہے ؎

ترے کوچے اس بہانے مجھے دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا

تبلا! کیا آپ کا محبوب سود پر روپے چلانے والا کوئی کابلی پٹھان ہے؟"

غضب ہو گیا میرا اتنا کہنا۔ اتنا برہم ہوئے کہ فوراً ارادہ سفر کر بیٹھے وہ تو خیریت ہوئی کہ اس وقت صدر مجلس استقبالیہ اور پرنسپل فارسی انٹر کالج آ گئے اور ان سے دونوں بزرگوں نے خوشامد درآمد اور دست بستہ معذرت سے جگر صاحب کی برہمی دور کی۔ پرنسپل صاحب نے مجھے حکم دیا کہ خبردار تم جگر صاحب کے پاس اس وقت سے تا اختتام مشاعرہ ہرگز نہ جانا۔

دوسرے دن میں نے جگر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی گستاخی کی معافی مانگی۔ اللہ رے ان کی کشادہ دلی اور شرافت نفسی کہ انھوں نے مجھے فوراً گلے سے لگالیا۔

ہارڈنگ لائبریری دلّی کے سالانہ مشاعرہ میں شرکت کے لئے لکھنؤ کے چار باغ اسٹیشن سے ایک قافلہ روانہ ہوا۔ اس قافلہ میں اس عہد کے وہ نامور افراد شامل تھے جن کے نام کا ڈنکا اقصائے ہند اور بیرون ملک بجا ہوا تھا یعنی الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر ضامن علی، پروفیسر اعجاز حسین، پروفیسر احتشام حسین (لکھنؤ یونیورسٹی) اسرارالحق مجاز۔ مجاز صاحب سب کے منھ لگے، سب کے چہیتے سب کے لاڈلے۔ سفر شروع ہوا۔ خاک پائے احتشام حسین یعنی یہ حقیر بھی گرد کارواں کی طرح شریک سفر تھا۔ مجاز بالائی برتھ پر بستر بچھا کر لیٹ گئے۔ نیچے کی برتھوں پر دیگر حضرات محوِ خواب ہوئے۔

ابھی صبح انگڑائی لے کے پوری طرح مشرق کی خلوت گاہ میں جاگنے بھی نہ پائی تھی کہ مجاز نے نعرہ لگایا:

"ہوگئی بھائی ہوگئی!"

نعرے کی تکرار اتنی زوردار تھی کہ سب کی آنکھ کھل گئی۔ سب اپنے اپنے بستر پر اٹھ کے بیٹھ گئے۔ سب نے بیک زبان مجاز سے پوچھا:

"کیا ہوگئی۔؟"

مجاز نے کہا: "غزل"۔

سب نے اصرار کیا "سنا دے شہزادے اپنی نومولود غزل"۔

مجھے آج بھی مطلع، دو مکمل شعر اور ایک مصرع یاد ہے ؎

رخصت اے ہم سفرو! شہر نگار آ ہی گیا
میرا خلد آ ہی گیا، میرا ستار آ ہی گیا
مہ جبینوں سے کہو اور حسینوں کو بتاؤ
ایک صید آ ہی گیا، ایک شکار آ ہی گیا

ایک خراب گل نسرین و بہار آ ہی گیا

خیر مقدم کو کوئی میکدہ بہ ہنگام سحر
اپنی آنکھوں میں لیے شب کا خمار آ ہی گیا

سلطان پور میں ایک کل ہند مشاعرہ منعقد ہوا تھا۔ اس مشاعرہ کی صدارت یو۔پی اسمبلی کے اسپیکر نفیس الحسن صاحب کر رہے تھے۔ اس دور کے جانے مانے شعراء مدعو تھے: عرش ملسیانی، جگر مرادآبادی، مخمور دہلوی وغیرہم۔ شوق بہرائچی بھی موجود تھے اور ایک ایسے خوش گلو شاعر بھی جو زیادہ تر ٹخنے سے نیچے تک گیروا ڈھیلا ڈھالا کرتا پہنتے تھے موٹے تازے، دراز قد، پارہ صفت سیاہ رُو شاعر۔ وہ جس مشاعرے میں جاتے وہاں کوئی گل ضرور کھلاتے تھے۔ سلطان پور کے اس مشاعرے میں ان کی جگلے بازیاں عروج پر تھیں۔ ناظم مشاعرہ نے بور ہوتے ہوئے سامعین کے ہنسنے ہنسانے کے لیے شوق بہرائچی کو دعوتِ سخن دی۔ شوق صاحب جیسے ہی اپنی جگہ سے اُٹھے جگر صاحب نے ان کے کان میں کچھ چپکے سے پھونک دیا۔ شوق صاحب نے مائک سنبھالا اور مطلع پڑھا ؎

کوئی مکروہ صورت سامنے آئی تو کیا ہوگا
طبیعت شاعرِ فطرت کی متلائی تو کیا ہوگا

سامعین جھوم اُٹھے، پورا مجمع جاگ اٹھا، زندگی کی لہریں دوڑ گئیں۔ شوق صاحب نے دوسرا شعر پڑھا ؎

جنابِ شیخ کا یہ زہد و تقویٰ سب مسلّم ہے
مگر خلوت میں آئی جانکی مائی تو کیا ہوگا

پندرہ بیس ہزار کے مجمع نے داد و تحسین کا ایسا طوفان اٹھایا کہ پناہ بخدا۔ واہ وا کا شور تھا تو شوق صاحب نے جگلے باز شاعر کو اپنی زد پر لیتے ہوئے کہا: "یہ شعر آپ کی نذر ہے" ؎

اگر تم ابنِ آدم ہو تو وہ بھی بنتِ آدم ہے
مری بیوی نے تم کو کہہ دیا بھائی تو کیا ہوگا

داد و تحسین کی آوازیں، مکرّر ارشاد کی صدائیں۔ واہ واہ کی گونج سے جیسے زمین و آسمان گونجنے لگے۔ ڈائس پر انتہائی مہذب صدر نشین نفیس الحسن صاحب اور بزم شعرا کے ثقہ شاعر جگر مرادآبادی بھی بیساختہ ہنسنے لگے۔

لکھنؤ میں ایک زود گو استاد الشعرا شاعر تھے، بلا مبالغہ وہ ایک ہی نشست میں اور ایک ہی ردیف و قافیہ میں تین چار درجن غزلیں کہہ دیا کرتے تھے۔ سماج کے ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد اُن کے شاگرد تھے وہ اپنے شاگردوں کو بامعاوضہ غزلیں عنایت فرماتے تھے جو غزلیں لال روشنائی سے لکھی جاتی تھیں ان کی قیمت بیس روپے فی غزل ہری روشنائی کی ۱۵ روپے فی غزل، سیاہ روشنائی کی دس روپے فی غزل۔ شاگرد آتے، استاد محترم سے اپنی پسند اور اپنے حسب حیثیت غزل خریدتے، پھر اُستاد کو سناتے تاکہ اگر تلفظ میں کوئی غلطی ہو رہی ہو تو اسکی اصلاح بھی ہو جائے۔ استاد رٹوا دیتے تھے کہ دیکھو جب مطلع کے بعد دوسرا شعر پڑھنا تو کہنا: حاضرین بزم! اب آپ حسنِ مطلع سماعت فرمائیں۔ یا "صدر محترم! یہ تین قطعہ بند شعر آپ کی خدمت میں نذر ہیں"۔ استاد نے اپنے ایک اناڑی شاگرد کو ایک غزل مرحمت فرمائی۔ ساتھ ہی ساتھ یہ ہدایت بھی کی کہ جب بھی شعر سنانا پہلے کہنا:

"ملاحظہ فرمائیں"

اناڑی شاگرد صاحب جس طرحی نشست میں غزل پڑھنے گئے اس کی صدارت کر رہے تھے ان کے استاد معظم۔ اناڑی شاگرد کی جب باری آئی تو اس نے بڑے ادب سے استاد کی خدمت میں عرض کیا

"قبلہ! مطلع ملاخظہ فرمایئے۔"

استاد "ملاخظہ" کہنے پر چونکے۔ گھور کر شاگرد کو دیکھا، آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارہ کیا۔ لیکن اناڑی شاگرد نہ استاد کے چونکنے پر چونکا نہ ان کے اشارے کو سمجھا۔ دوسرا شعر سنانے سے قبل استاد کی خدمت میں سلام عرض کر کے پھر کہا:

"سرکار! یہ شعر بغور ملاخظہ فرمائیں"۔

اُستاد سے ضبط نہ ہو سکا، بھری بزم میں گرجے: "کم بخت! یہ نقطہ بجائے اُدھر کے اِدھر کیوں لے آیا۔؟"

اُن دنوں لکھنؤ میں دُبلے پتلے منحنی سے وصل بلگرامی بھی رہا کرتے تھے۔ شوکت تھانوی ان کو "سینک سلائی" اور جوش صاحب ان کو "کچالو کا تنکا" کہا کرتے تھے۔ انتہائی مخلص، وضعدار، انتہائی مہمان نواز اور بڑے رکھ رکھاؤ والے شاعر تھے۔ جاڑے کا موسم تھا، صحن خانہ میں دھوپ کھانے کے لیے بستر پر لیٹے تھے۔ پلنگ سے متصل کرسی پر ان کی موٹی تازی اور بھاری بھر کم بیگم صاحبہ بیٹھی ہوئی

غزلیں

لبِ جاں بخش و شکر بار کہاں سے لاؤں
شرمیٔ ابروِ خم دار کہاں سے لاؤں

وہ شب و روز و مہ و سال وہ عہدِ رفتہ
بزمِ یارانِ طرح دار کہاں سے لاؤں

دھوپ میں تم کو مرے ساتھ ہی چلنا ہوگا
دشت میں سایۂ دیوار کہاں سے لاؤں

آج بھی منبر و محراب ہیں موجود مگر
عظمتِ جبّہ و دستار کہاں سے لاؤں

اب تو ہر موڑ پہ خیبر نظر آئے ہے مجھے
بازوئے حیدرِ کرّار کہاں سے لاؤں

[illegible]

حسابِ زخم نہ لے ہم نے کھائے ہیں کیا کیا
بھری بہار میں صدمے اُٹھائے ہیں کیا کیا

فضا میں زہر، زمیں پر لہو، دلوں میں فساد
سحر نے آتے ہی فتنے جگائے ہیں کیا کیا

وہ ایک ناگ جو گیسوئے تابدار بنا
ہمارے شانوں پہ بل اُس نے کھائے ہیں کیا کیا

ہوا کے دوش پہ پھر آئی بوئے خوں ہم تک
صبا نے جانے کہاں گل کھلائے ہیں کیا کیا

لگا کے تہمتِ خوں ہم پہ باغباں نے انیسؔ
روش روش پہ تماشے دکھائے ہیں کیا کیا

انیس اصلاحی

ذرا آنکھ اُٹھی، لب ہلے، کھو گئے
تحمّل کے نازک صلے کھو گئے

پریشاں ہیں قربت کے صحرا میں ہم
سمٹتے ہوئے فاصلے کھو گئے

بس اک منکرِ مصلحت رہ گئی
وہ فِقرے، وہ شکوے گلے کھو گئے

دِیا دل کے خیمے کا گُل ہو گیا
پہنچتے ہوئے قافلے کھو گئے

یہاں تک کس اُمید پر آئے تھے
یہاں آ کے جو سلسلے کھو گئے

کنائے تھے معنی کے یا گُل صدف
کہ جو بن کھُلے، بن کھِلے کھو گئے

گماں آئینوں کا تھا عدسوں پہ سازؔ
دکھائی دیئے، بے سلے کھو گئے

عبد الاحد ساز

شمس تبریز خاں
شعبہ عربی، لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

افتخار اعظمی مرحوم

دبستانِ لکھنؤ کا ممتاز نقاد و دانش ور

اپنے عزیز ترین دوست افتخار اعظمی صاحب کو بہت قریب سے جاننے کے باوجود میرے لئے ان کی قلمی تصویر کھینچنا تقریباً ناممکن اور محال ہے، اس کی وجہ ان کی شخصیت کی ہمہ جہتی اور ہمہ گیری اور اسکی زنگا رنگی ہے، ان کا دلکش سراپا، ان کی موہنی شخصیت، ان کی گل افشانیٔ گفتار، ان کی روانیٔ تحریر و حسن تقریر، ان کی بے خطا ذہانت و فطانت، اور ان کی زبردست انفرادیت (Dominating individuality) کی تصویر کشی آسان کام نہیں، ان کی شخصیت کی چمک دمک زبان و بیان کے آئینے میں دھندلی سی لگتی ہے، ان کی زندہ دلی کے بیان کے لئے الفاظ نیم جان محسوس ہوتے ہیں، ان کی خوشنوائی لفظوں کے ریکارڈر میں اپنا آہنگ کھو دیتی ہے، اور ان کی شخصیت کا شعلہ الفاظ کی راکھ میں دبتا نظر آتا ہے اور مجھکو اعتراف ہے کہ میری خاکہ نگاری کے ذریعے افتخار صاحب کی شخصیت کے صرف ادھورے نقوش اور دھندلے خط و خال ہی نمایاں ہو سکیں گے اور اس میں ان کے مثالی اور جگمگاتے پیکر کا ایک جھلملاتا عکس ہی نظر آسکے گا۔

کچھ ایسی ہی مشکل اس فارسی شاعر کے ذہن میں تھی جو مصور کو اپنے محبوب کی تصویر کشی کے لئے نااہل پا رہا تھا اور یہ کہہ رہا تھا کہ ؎

گر مصور صورتِ آں دلستاں خواہد کشد
سخت حیرانم کہ نازش راچساں خواہد کشد؟

سرخ و سفید رنگ، ستواں ناک، بلند پیشانی، پتلے ہونٹ، مسکراتی اور ذہانت سے چمکتی آنکھیں، سر پر لمبے بال، اکہرا بدن، دراز قامت اور متوازن رفتار اور دلکش صاف ستھرا لباس افتخار صاحب کی ظاہری شخصیت کے عناصر ترکیبی تھے، اور ان کی حقیقی شخصیت اسلامی تعلیمات پر مبصرانہ ایمان، مشرقی و غربی علوم و فنون کی پیدا کردہ بصیرت و ذہانت، زندگی کے ہر پہلو کو قریب سے دیکھنے اور پرکھنے اور تجرباتی طور پر سمجھنے اور برتنے کے عزم و حوصلہ، شریفانہ انسانی اقدار کی جستجو، ادب و زندگی میں جدت و معنویت کی تلاش، عالمگیر انسانیت پر یقین، امن و اخوت پر مبنی عالمی نظام کی خواہش، اور فرد کی عظمت و انفرادیت پر بے پناہ اصرار اور ہر طرح کے جبر و استحصال اور اجارہ داری کو تسلیم کرنے سے صاف انکار سے عبارت تھی، فارسی محاورے کے مطابق ان کا علم ایک من تھا تو ان کی عقل و دانش دس من کی تھیں، وہ سقراط کی طرح نامعلوم سے معلومات میں اضافہ کرتے تھے، اور ان کی ذہانت کسی بات کی سطح سے اس کی تہ تک پہنچ جاتی تھی، کوئی محفل ہو مگر وہ اپنی بات اس سلیقے اور انوکھے ڈھنگ سے پیش کرتے تھے کہ میر محفل اور شمع انجمن بن جاتے تھے اور کبھی کم علمی کا الزام ان کے سر نہیں آپاتا تھا۔

وہ برصغیر میں فرد کی آزادی، اظہار خیال کی آزادی، اور حریت فکر کے علمبرداروں میں تھے اور اس کے لئے انھوں نے قربانی بھی دی، عزیزوں دوستوں اور بزرگوں کی مخالفت مول لی اور بالآخر اپنی عزیز اہلیہ سے بھی جدائی گوارا کرلی ان کی زندگی میں سقراط کی تلاش حق بھی نظر آئی، اور حق گوئی کی سزا بھگتے اور زہر کا پیالہ پینے کی ہمت و جرأت بھی ان کی شخصیت میں مہاتما بدھ کا عرفان زندگی بھی نظر آتا ہے اور راہ حق میں تیاگ کا حوصلہ بھی۔

ان کی شخصیت کے نمایاں عناصر میں ان کے حسن تقریر و تحریر کو امتیاز حاصل ہے ان کی گفتگو اور تحریر دونوں ہی حشو و زوائد

سے پاک، ادائے مطلب میں کامیاب، شستہ وشگفتہ، تروتازہ اور جدت وانفرادیت کا اچھوتا نمونہ ہوتی تھیں۔

۱۹۶۴ء میں ان سے پہلی ملاقات ہوئی جب وہ اپنی اہلیہ عطیہ خلیل عرب کو پاکستان رخصت کرکے دیوبند آئے، اس ملاقات میں انھوں نے اقبال سہیل اور مولانا حمید الدین فراہی کا تعارف کراتے ہوئے مولانا کے نظریۂ نظم قرآن پر بھی روشنی ڈالی، گفتگو کے انداز اور فکر وذہانت کی چمک نے چونکایا اور پھر ان سے مراسلت کا سلسلہ بھی قائم ہوگیا۔ میں گونڈہ میں تھا کہ انھوں نے مجھے لکھنؤ آکر اپنے قائم کردہ حلقۂ ارباب فکر میں مقالہ پڑھنے کی دعوت دی چنانچہ میں نے قرآن کے معاشرتی فکر پر ایک عربی مقالہ 'التفکیر العمرانی فی القرآن' احسان الٰہی مرحوم کے مکان پر پڑھا جس میں اہل خانہ کے علاوہ مولانا احسان ندوی، ڈاکٹر ہرش نارائن، اور اختر الملک وغیرہ متعدد احباب شریک ہوئے اور حسب معمول مقالہ پر بحث ہوئی۔

۱۹۶۸ء میں جب ندوۃ العلماء سے میری وابستگی ہوئی تو پھر ان سے مسلسل ملاقاتوں کا سلسلہ جاری ہوگیا اور ان کی قیام گاہ مرکز ادب جہانگیر آباد پیلس، کافی ہاؤس اور دوسری جگہوں پر حلقہ کی ادبی وفکری نشستیں ہونے لگیں جن میں شہر کے شاعر وادیب بڑی تعداد میں شریک ہوتے اور ادبی وفکری موضوعات پر کھل کر بحث ہوتی و حلقۂ ارباب فکر میں آنے جانے والوں میں شہر کے دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں میں ڈاکٹر داؤجی گپتا، م. نسیم، عرفی آفاقی، شہاب سرمدی، انور ندیم، مولانا ولی کمال، مولانا احسان ندوی، مولانا اسلم ندوی، رضا حیدر مخدومی، اختر الملک، غلام رضوی گردش، پروفیسر عبید اللہ فراہی، خان محمد عاطف، روش صدیقی، یوسف سرسوی، احمد جمال پاشا، اور ڈاکٹر غلام محمد خاں، اور سید منور شیر کے علاوہ بھی بہت سے لوگ تھے جو اس حلقۂ فکر ونظر سے وابستہ تھے۔ کبھی کبھی دلی کے کچھ دانشور مسٹر پروار اور مسٹر ٹی۔ این زتشی بھی آجاتے تھے۔ اس بیت الحکمت یا بزم اخوان الصفا کے دروازے سب کے لئے کھلے ہوئے تھے جہاں ہر موضوع پر بے تکلف اور برجستہ اظہار خیال کیا جاسکتا تھا، اس حلقے کے مختلف الفکر افراد کو یکجا دیکھ کر لوگوں سے بدنام اور متہم بھی کرنے کی کوشش کی اور کسی مکتب فکر سے عدم وابستگی کے سبب بھی وابستہ لوگ اس کے بارے میں شک وشبہ میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ افتخار اعظمی صاحب کا ہر مسئلے پر انوکھے اور نئے انداز سے غور وفکر کا انداز بھی کند اور بند ذہنوں پر گراں گزرتا تھا، وہ اپنی رائے دینے اور خیال ظاہر کرنے میں شاید ہی کبھی کسی کا لحاظ کرتے ہوں، وہ کسی شخص یا فکر کے کمزور پہلوؤں پر اپنی بے پناہ ذہانت سے ایسی گرفت کرتے اور چٹکی لیتے کہ اس کی دکھتی رگ بھی پھڑک اٹھتی تھی اور لوگ ان کی شیریں گفتاری سے گالیاں کھاکر بھی شاید بے مزہ نہیں ہوتے تھے۔

اعظمی صاحب کی شخصیت صحیح معنوں میں ایک دلکش شخصیت تھی، جس میں ایسی موہنی اور کشش تھی کہ اجنبی انسان بھی ان کی طرف بے ساختہ کھنچتا اور ان کا ہوکر رہ جاتا، ہم نے بارہا دیکھا کہ اپنی قیام گاہ جہانگیر آباد پیلس سے نکل کر انڈین کافی ہاؤس یا کرشنا ریستوراں جارہے ہیں کہ کوئی ہندوستانی یا غیر ملکی اجنبی شخص مل گیا اور مزاج پرسی کے بعد وہ ملاقاتی اور پھر دوست بن گیا۔ یورپ سے آنے والے ریسرچ اسکالر اکثر ان سے ٹکراتے اور پھر ان کی شخصیت میں دلچسپی لینے لگتے تھے، فرانس رابنسن، مسز باربرا، بی۔ بی۔ سی (لندن) کے نامہ نگار مارک ٹلی، ڈیوڈ پیج، اور ریچل کینیڈی، اتفاقیہ ملاقاتوں ہی میں ان کے دوست بن گئے اور موخر الذکر آج ان کی بیوہ اہلیہ ہیں۔

قدرت نے انھیں خوبصورتی اور موزوں قد وقامت عطا کی تھی، سرخ وسیاہ لمبے بالوں کے سبب ان پر لوگوں کو کسی انگریز سیاح کا دھوکا ہو جاتا تھا، مشرقی اور مغربی دونوں لباس ان پر بھلے لگتے تھے اور دونوں کے استعمال میں پورے سلیقے سے کام لیتے تھے، صفائی اور کریز کا بڑا خیال رکھتے تھے، سگریٹ بھی خاص انداز سے پیتے جس سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا دھواں ان کے افکار کو مہمیز کر رہا ہے۔ فن گفتگو کے تو وہ ماہر کہے جاسکتے ہیں، میرا اور ان کے اور میرے اکثر احباب کا خیال ہے کہ ان جیسا خوش گفتار آدمی شاید ہی ان کی نظر سے گزرا ہو، اور ہم سب ان کے حسن تاثیر کا اعتراف یہی کہہ کر کرسکتے ہیں کہ وہ بات کرتے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے، دھیمے اور پر اعتماد لہجے میں رک رک کر اپنی بات کہتے اور اپنے مفہوم کی ادائیگی میں

انگلیوں اور آنکھوں کے اشاروں سے ان کے کام لینے کا انداز بالکل منفرد تھا، لکھنؤ کی صاف ستھری زبان میں حسب موقع اور برمحل عربی یا انگریزی الفاظ یا فارسی ترکیب کا استعمال بھی گفتگو میں جان ڈال دیتا تھا، صحت الفاظ کے ساتھ صحت مخارج سے بھی انکی گفتگو کا حسن بڑھ جاتا تھا، تحریر و تقریر دونوں ہی میں مناسب لفظوں کا انتخاب گفتار کی معنویت بڑھا دیتا تھا۔ عام طور پر ان کا لہجہ دھیما رہتا اور غصّے یا اختلاف کی حالت میں بھی ان کی آواز کا ٹھہراؤ باقی رہتا تھا، اسی طرح ان کی ہنسی بھی قہقہوں میں بدلنے کے بجائے مسکراہٹوں ہی میں چھپی رہتی تھی، ان کی گفتگو غیر ضروری اور رسمی تکلفات سے بری تھی اور براہِ راست "کیوں صاحب آپ کا اس سلسلے میں کیا خیال ہے"؛ سے شروع ہو جاتی تھی پھر مخاطب کو پوری طرح سننے کے بعد اس پر وہ اپنا مثبت یا منفی ردعمل بڑی صفائی، مگر سلیقے سے ظاہر کرتے اور اپنے دلائل کو معقولیت کے ساتھ پیش کرتے تھے اور مخاطب کی معقول باتوں کی داد بھی دیتے جاتے تھے۔ اور اگر مخاطب دھاندلی پر آمادہ ہوتا تو پھر اسے دیگر سامعین کے حوالے کر دیتے اور خود لفظی بازیگری کا تماشا دیکھنے لگتے تھے۔

ازدواجی زندگی کی ناکامی نے ان کی زندگی میں زہر گھول دیا تھا اور ان کو زندگی سے مایوس اور لوگوں سے بدگمان اور ان کی زندگی کی کشتی کو بے لنگر اور بے پتوار کر دیا تھا، بڑی حد تک ان کی باضابطگی ختم ہو گئی تھی اور ان کی زندگی نظم و ضبط، جد و جہد، اور سخت کوشی کے بجائے بے قاعدگی، لاتعلقی (Detachment) اور تن آسانی اور سہل انگاری و سہولت پسندی کا نمونہ بن کر رہ گئی تھی اور وہ اس شعر کا مرقع بن کر رہ گئے تھے کہ ؎

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

ان کے باطن کا کرب اس وقت جھلکتا جب کبھی وہ اپنی پہلی بچی نائلہ سلمہا کے بچپن کی تصویر دکھاتے اور اس کی یاد میں کھو جاتے، اسی زمانے میں وہ ظفر اور مصحفی کے اس طرح کے غم انگیز اشعار سناتے تھے کہ ؎

شمع جلتی ہے پر اس طرح کہاں جلتی ہے
ہڈی ہڈی مری اے سوزِ نہاں جلتی ہے
اس بیابانِ خطرناک سے اپنا ہے گذر
مصحفی قافلے جس راہ سے کم گزرے ہیں، وغیرہ

اپنی اداسی و محرومی پر پردہ ڈالنے اور اپنے دردِ پنہاں کو چھپانے یا بھلانے اور جی بہلانے کے لئے انھوں نے شعر و ادب، فلسفہ اور بحث و مباحثہ میں پناہ لی تھی، اور 'مرکز ادب' کے نام سے کچھ کتابوں کا اشاعتی سلسلہ بھی قائم کر رکھا تھا جس کی طرف سے 'پیارے نبی کی پیاری زبان' مولانا اقبال سہیل کا مجموعۂ کلام 'تابشِ سہیل' و 'ارمغانِ حرم' شائع کیں، اور ایک ماہوار رسالہ بھی "لالہ زار" کے نام سے کچھ عرصے نکالا مگر یہ ساری مصروفیتیں جی بہلانے کا اک بہانہ تھیں ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے

مگر اس بدنظمی میں بھی ایک نظام، اور اس انتشار میں بھی جمعیتِ خاطر کی کچھ صورتیں پیدا کر لی گئی تھیں، صبح کو غسل و ناشتہ اور اخبار سے فراغت کے بعد حضرت گنج کے ریستورانوں کا رخ کیا جاتا جن میں زیادہ تر انڈین کافی ہاؤس، بن بوز، کرشنا، اور کبھی کبھی رائل کیفے اور کوالٹی کی باری آتی اور ہر طبقے کے لوگوں سے تبادلۂ خیال شروع ہو جاتا، یہ حلقہ سب کی نگاہوں میں کچھ نامانوس، عجیب و غریب اور سیاسی لوگوں کی نظر میں کچھ مشتبہ نظر آتا اور چہ میگوئیوں کا شکار رہتا مگر کسی کی پروا کئے بغیر اپنے حال میں مست، اپنی فکروں میں گم اور اپنی بحثوں میں سرگرم رہتا تھا، کبھی تو پورا پورا دن بیکار مصروفیتوں میں ختم ہو جاتا اور جگہوں کی تبدیلی کے ساتھ صبح سے شام ہوتی اور کبھی رات کے ۱۱، ۱۲ بج جاتے، ہماری "فرصت کے رات دن" بظاہر عملی سرگرمیوں سے تو خالی تھے مگر فکری و ذہنی معرکہ آرائیوں سے بھرے ہوئے تھے اور ہماری دوڑ دھوپ، اور دربدری اس طرح کی تھی جس کے لئے مرزا رسوا نے کہا ہے کہ ع آوارگی میں ہم نے زمانے کی سیر کی

بالآخر ان کی زندگی کے جہاز کو ایک لنگر اس وقت مل گیا جب آٹھویں دہائی میں ریکھا کنیڈی ان کے نکاح میں آگئیں اور خانہ آبادی کی صورت

پیدا ہوئی، مسز ریکھی نے مشرقی خاتون کی طرح ان کا خیال رکھا اور ان کے حسن خدمت کے سبب وہ انگلستان کے شہری بن گئے، اب نائلہ کے علاوہ ان کے پسماندگان میں دو بچیاں رابعہ اور مریم ہیں جو انشاءاللہ مشرقی و مغربی اقدار کا عمدہ نمونہ ثابت ہوں گی۔

افتخار صاحب اور ان کے مذکورہ حلقۂ فکر میں سنہ ۶۰، ۷۰ء کی دہائیوں میں جدیدیت اور وجودیت کے نظریات کی موافق و مخالف بحثیں بہت زور شور سے ہوتی رہیں، سنہ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں وہ اسلامی ادب کے حلقے سے قریب رہے اور ہمارے مشترک دوست اور ادیب طنّاز م. نسیم صاحب کے رسالہ "نئی نسلیں" کے شعبۂ ادارت میں بھی رہے اور اس رسالے میں ان کی انشائے لطیف کے کچھ بہت نفیس نمونے بھی شائع ہوئے تھے ایک نمونہ وہ یاد آرہا ہے جو مصری ادیب منفلوطی کے کسی افسانچے کا ترجمہ تھا اور اصل سے بڑھا ہوا لگ رہا تھا۔ اسلامی ادب سے وابستگی کے زمانے میں ان کی تخلیقی سرگرمیاں تیز رہیں مگر جدیدیت اور وجودیت کے بعض منفی اور یاس انگیز اقدار، تنہائی، جبر و بیچارگی، جہد للبقاء، بوریت، لاتعلقی، خوف مرگ، بے مقصدیت، بے چہرگی کے نتیجے میں کشمکش حیات سے بھاگ کر اندرون اور باطن میں پناہ لینے کے فلسفے نے بھی ان کی زندگی اور نظریے پر بہت اثر ڈالا اور وہ باقاعدہ لکھنے پڑھنے، جلسوں اور مشاعروں میں شریک ہونے کے بجائے اپنی نجی محفلوں کو آباد کرنے لگے اور چھپنے چھپوانے سے بالکل قطع تعلق کر لیا۔ جدید رنگ کی بہت سی غزلیں اور نظمیں کہیں اور ہم لوگوں کو سنائیں مگر ان کی اشاعت کے روادار نہ ہوئے وجودی مفکروں کرکے گارد (Kierkegaard) بودلیر (C.P. Baudelaire) البرٹ کامو (Albert Camus) اور سارتر (Sartre) کی کتابوں کا مطالعہ بھی کرتے اور ان پر بحث بھی کرتے تھے مگر ان کی تقلید کے قائل نہ تھے، امریکن لائبریری اور برٹش کونسل لائبریری کے ذریعے مغربی ادب کا انھوں نے منتخب مطالعہ کیا اور اپنے حلقے کو اپنے دلیل مطالعہ سے مستفید کیا۔

وہ نظری و عملی طور پر ہند و مسلم اتحاد بلکہ اتحاد انسانیت کے قائل تھے اسی لئے ان کے غیر مسلم احباب کا بھی ایک بڑا حلقہ تھا۔ ہند و پاک جنگوں اور بنگلہ دیش کے قیام کے بعد بعض ہند و مسلم دانشوروں نے طے کیا کہ مغربی ممالک کی سازش کے تحت ہند و پاک میں جو جنگی ہیجان پیدا کیا جاتا ہے اسے بے نقاب کر کے ہند، پاک، بنگلہ دیش کا وفاق اور فیڈریشن قائم کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ ایک طاقتور برصغیر کی تعمیر ہو سکے اور ان کی مشترکہ تجارتی منڈی کے ذریعے انھیں ترقی دی جائے۔ اس فیڈریشن کی تحریک کے اغراض و مقاصد لکھے گئے، اس کا بینر تیار کیا گیا اور پہلی عارضی حکومت ہند کے صدر محترم اور بزرگ انقلابی راجہ مہندر پرتاپ کی قیادت میں جی۔ پی۔ او پارک میں گاندھی جی کے مجسمے سے چل کر حضرت گنج میں ہم لوگوں نے ایک جلوس نکالا جس میں اردو ہندی کے ادیبوں اور دانشوروں کے علاوہ سیاسی لوگ بھی تھے۔ اس کے سرپرستوں میں ہردلعزیز میئر ڈاکٹر داؤجی گپتا بھی تھے میڈیا نے بھی اس کی اچھی رپورٹنگ کی اور جلوس کی تصویر کے ساتھ ایک تفصیلی رپورٹ مشہور ہندی رسالہ "دنمان" میں بھی شائع ہوئی اور ہم لوگوں کی کمزور آوازوں کی بازگشت پاکستان تک سنائی دی۔

مسائل پر گفتگو کے لئے انھوں نے سقراطی طریقہ اپنایا تھا یعنی سوال و جواب ہی میں مسئلے کا حل نکالنے کی کوشش کرتے، اور دنیا کے ہر موضوع پر اظہار خیال کرتے، دوسروں کی رائے معلوم کرتے اور طے شدہ فیصلوں اور دریافت نتیجوں سے بے اطمینانی ظاہر کرتے تھے۔ شخصیت میں انفرادیت کی طرح افکار و خیالات میں بھی جدت پسند واقع ہوئے تھے، اور کسی بھی موضوع پر مروجہ انداز سے غور و فکر کو ناپسند کرتے تھے، سیدھے سادہ لوح اور رسم و رواج کے پابند لوگوں کو دیکھ کر کہتے کہ یہ بالکل ناک کی سیدھ میں چلتے ہیں، اس جدت پسندی میں ان کی ذہانت ان کی مدد کرتی تھی۔ بدصورتی میں حسن اور حسن میں عیب اور نقص و خامی کی دریافت ان کے لئے بہت آسان تھی۔ ان کی شخصیت کا وصف خاص حسن مذاق و حسن طبیعت، خوب سے خوب تر کی جستجو، اور نفاست و عمدگی (Excellence) کی خواہش تھی جو ہر شے میں حسن و نفاست کی جویا رہتی تھی، اس نے ان کی شخصیت کو بھی حسین بنا دیا تھا اور ادب و زندگی میں بھی سلیقہ مندی، خوش مذاقی، خوش طبعی و وسیع النظری، انسان دوستی و رواداری کی اقدار کو

فروغ دیا تھا، اگر غلط معنوں میں نہ لیا جائے تو "حسن پرستی" ان کا مسلک و مشرب کہا جاسکتا ہے جس کے لیے جگر فرماتے ہیں ؎

حسن جس حال میں ہوتا ہے جہاں ہوتا ہے
اہل دل کے لیے سرمایۂ جاں ہوتا ہے

ان کے ذوق و مسلک اور جمالیاتی نقطۂ نظر پر اردو کے جمالیاتی دبستان کے اساطین شبلی، مہدی افادی، نیاز فتحپوری، اور مجنوں گورکھپوری وغیرہ کے اثرات نمایاں تھے۔ اردو میں رومانی ادب اور ادب لطیف کا ایماندارانہ جائزہ لیا جائے تو افتخار اعظمی صاحب کی تحریروں اور ان کے خطوط کا ذکر ناگزیر ہوگا۔

لکھنؤ ادب و تہذیب کے فروغ میں ان کی تقریر و تحریر کا بہت اہم حصہ ہے، اس میں انھوں نے جس شستگی و شائستگی، نفاست و نزاکت، شگفتگی اور برگزیدگی کے انداز پیدا کیے، وہ بہت قابل قدر ہیں شعوری اور غیر شعوری طور پر ان کے قریب آنے والے ادیب و دانشور ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے اور اس طرح ان کی شخصیت اور افکار و گفتار نے لکھنؤ کے روایتی ثقافتی ماحول میں جدیدیت کے بعض عمدہ پہلوؤں کو روشناس کرنے اور نوجوان اور نئی نسل کے ذہین افراد کے ذہن و فکر، اسلوب و آہنگ پر خوشگوار اثرات مرتب کرنے کا اہم کردار ادا کیا۔

گفتگو میں وہ اپنے مخصوص انداز میں اظہار خیال کرتے اور بعض سنجیدہ و غیر سنجیدہ اصطلاحات ایجاد کرتے جو ان کے حلقے میں مروج ہو جاتے تھے جیسے کسی شخصیت کی بے اعتدالی کے لیے "اُلار" ہونے کی بھونڈے انداز سے نمائش کے لیے "حسن بغبغ" جاہل اور اڑیل شخص کے لیے "پھانے خاں" ناپسندیدہ شخصیت کے لیے "عزازیلی شخصیت" کمزور اور دبلو لوگوں کے لیے "کیچوے" کی دلچسپ اصطلاحیں استعمال کرتے تھے۔ رسم و رواج کے پابند شخص کیلیے "بٹن بند شخصیت" کا طعنہ دیتے تھے۔ کسی کمزور شخص کے لیے کہتے کہ "فلاں کی جیب گھڑی اور چھڑی ہیں۔ مادہ پرست لوگوں کے لیے کہتے کہ "یہ دماغ کے بجائے معدے سے سوچتے ہیں" پرانے لکھنؤ کے مدعیان علم و ادب کے لیے "نخاس یونیورسٹی کے پروفیسر" کا طنز استعمال کرتے تھے۔ تبلیغ کے ساتھ تفریح کو "ریلیجس پکنک" کہتے تھے۔ کسی شخص کی بے اعتدالی کو "کوبڑ" سے تعبیر کرتے تھے۔ رشید احمد صدیقی کو "یونان علیگڑھ کا لقمان" کہتے تھے۔ اس طرح کی رنگارنگ بزم آرائیاں اور نئی نئی اصطلاحیں اور ترکیبیں روزانہ ہی دیکھنے اور سننے میں آتی تھیں جو اب طاق نسیاں کا نقش و نگار ہوگئی ہیں۔

ان کے علمی و فکری سرمائے کا جائزہ اور ان کے اسلوب پر تبصرہ ایک مستقل مقالہ کا طالب ہے، بر سبیل تذکرہ یہاں یہ ذکر ضروری ہے کہ اسلامی ادب پر ان کے نظریاتی مضامین، اردو اور عرفی کے بعض شاعروں پر ان کے تبصرے، احمد حسن زیات کی تاریخ ادب عربی، کے اردو ترجمے پر ان کا فاضلانہ مقدمہ، تابش سہیل، کا دیباچہ، ولایت کا سفرنامہ، اور ان کے غیر مطبوعہ خطوط اپنے اندر بڑا ادبی و تنقیدی مواد اور بڑا شائستہ و شگفتہ اور لطیف و نفیس انداز بیان رکھتے ہیں جن کی قدر و قیمت کے صحیح عرفان کی ضرورت ہے اور جس سے نئی نسلیں فیضان حاصل کر سکتی ہیں۔

اگر یہ صحیح ہے کہ اسلوب ہی شخصیت ہوتی ہے تو اس معیار پر افتخار اعظمی صاحب مرحوم بھی پورے اترتے ہیں۔ جنھوں نے ایک سچے فن کار کی زندگی گزاری اور فن کو اپنی شخصیت بنا دیا بلکہ زندگی کو شعر و نغمہ، رنگ و آہنگ، عالمگیر شرافت و انسانیت، تامل و تفکر، بلند نگاہی و دل نوازی، حکمت و بصیرت، فیضان و وجدان، اور لطافت و نفاست میں ڈھالنے کی امکانی کوشش کی اور مجموعی طور پر ادب و زندگی کو ایسی نئی جہت و معنویت عطا کی جو ہمارے لیے سرچشمۂ فیضان بنی رہیں گی اور اردو ادب کے ایماندار اور باشعور ناقد کے لئے کبھی نہ کبھی اس کو پہچاننا اور اس کے محاسن کا اعتراف کرنا ضروری ہوگا، افتخار اعظمی مرحوم کے سانحۂ ارتحال پر ہم بجا طور پر یہ محسوس کرتے ہیں کہ ؎

کچھ ایسے بھی اس بزم سے اٹھ جائیں گے جن کو
تم ڈھونڈنے نکلو گے مگر پا نہ سکو گے

□□

ڈاکٹر زاہد حسین ندوی
کتب خانہ شبلی۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ

"قصّہ چہار درویش" (اُردو)

ایک تحقیقی نظر

محمد غوث زریں کی تالیف "قصّہ چہار درویش" شمالی ہند میں انیسویں صدی عیسوی کے نقطۂ آغاز کا وہ نثری کارنامہ ہے جو اس عہد کی زبان وادب، سماجی ومعاشرتی زندگی اور ثقافتی وتمدنی بزم آرائیوں پر روشنی ڈالتا ہے۔

شمالی ہند میں اُردو کی ابتدائی نثر نگاری کے خدوخال، اسکے تاریخی سفر اور ارتقائی منازل کے نقوش وخطوط کے جائزے کے تناظر میں زریں کی یہ تالیف بھی خاص اہمیت کی حامل ہے۔

عہد نواب آصف الدولہ ۱۱۸۸ھ (۱۷۷۵ء) تا ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۸ء) میں جن شعراء اور نثر نگاروں نے اپنے فکر وفن سے شعر وادب کے دامن کو مالا مال کیا، ان میں محمد غوث زریں کا نام بھی قابل قدر ہے۔ ان کو لکھنؤ کے معروف ومستند شاعر مرزا محمد فاخر مکین سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ محمد غوث زریں لکھنؤ کے نواحی قصبہ بجنور کے رہنے والے تھے جو لکھنؤ سے سات آٹھ میل جنوب مغرب میں واقع ہے۔ افسوس ہے کہ معاصر تذکروں میں زریں کے حالات زندگی کا ذکر نہیں ملتا۔ البتہ زریں کے حالات زندگی کا مختصر تذکرہ موہن لال انیس، شاگرد مرزا فاخر مکین نے اپنی فارسی تصنیف "انیس الاحبا" میں کیا ہے جو زریں کے تشخص کا واحد وسیلہ ہے "انیس الاحبا" مرزا محمد فاخر مکین کے تلامذہ کے مختصر اور اجمالی تذکروں پر مشتمل ہے۔

نمونۂ کلام کے طور پر زریں کی ایک مرصّع فارسی غزل ہے جسے طوالت کے خوف سے یہاں پیش نہیں کیا جارہا ہے۔ تذکرۂ "انیس الاحبا" ۱۲۳۵ھ (۲۰-۱۸۱۹ء) میں اختتام پذیر ہوئی اور زریں کے سلسلے میں درج بالا عبارت کا آخری فقرہ "روزگار لعلی می کردو درگذشت" سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ ۱۲۳۵ھ (۲۰-۱۸۱۹ء) سے قبل ہی زریں کا انتقال ہو چکا تھا۔

زریں نے ۱۱۹۸ھ (۸۴-۱۷۸۳ء) میں "قصّہ چہار درویش" اپنے آقا راجا رام دین کی فرمائش پر مستند فارسی نثر میں تحریر کیا تھا جو اُن کی ادبی کاوش کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ ٹیگور لائبریری لکھنؤ یونیورسٹی میں موجود ہے۔ ملاحظہ ہو نمبر شمار P398/G28C-

ڈاکٹر گیان چند جین کے مجموعۂ مضامین "حقائق" میں دی گئی اطلاع کے مطابق زریں کے فارسی قصّہ چہار درویش کے مندرجہ ذیل مزید تین قلمی نسخے ہندستان میں موجود ہیں:

۱. شعیب انٹر کالج لائبریری۔ آگرہ
۲. جموں یونیورسٹی لائبریری۔ جموں
۳. کشمیر یونیورسٹی لائبریری۔ سری نگر

راجا رام دین، نواب آصف الدولہ کی جانب سے چکلہ دار (میوار طرد چند اضلاع اودھ) کے منتظم تھے اور محمد غوث زریں راجا صاحب موصوف کے یہاں ملازم تھے اور قیاس غالب ہے کہ زریں راجا صاحب کے یہاں معلّی کے فرائض پر مامور تھے۔ راجا رام دین مع اپنے معتبر والد لالہ ٹھاکر داس اور دو معتبر بھائیوں (راجا سیتل پرشاد اور راجہ بھوانی پرشاد) کے چار افراد تھے چنانچہ زریں نے فارسی قصّہ چہار درویش کے دیباچہ میں مذکورہ راجاؤں کا ذکر کرتے ہوئے چاروں افراد کے لئے دعائیہ شعر کہا ہے ؎

الٰہی بود تا جہاں برقرار
به اقبال باشند ایں ہر چہار

زرّیں نے قصہ چہار درویش (فارسی) کی تالیف کے اٹھارہ انیس سال بعد ۱۲۱۷ھ (۱۸۰۲ء) میں اپنے ان مربی راجاؤں کی فرمائش پر فارسی سے اُردو میں منتقل کیا۔

ہندستان میں زرّیں کے قصہ چہار درویش (اردو) کے مندرجہ ذیل تین قلمی نسخوں کا پتہ چلتا ہے:

(۱) یہ نسخہ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی (دہلی یونیورسٹی) کی ذاتی ملکیت ہے۔
(۲) مولانا آزاد لائبریری (علی گڑھ) کے شعبۂ مخطوطات کی ملکیت ہے۔
(۳) نواب سالار جنگ میوزیم (حیدرآباد) کے شعبۂ مخطوطات کی زینت ہے۔

چوتھا وہ مطبوعہ نسخہ ہے جسے سرفراز علی جری شاگرد برق لکھنوی نے ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) عہد نواب واجد علی شاہ میں اصل کتاب کے محاورے، تراکیب الفاظ اور تذکیر و تانیث کو اپنے زمانے کے مطابق درست کر کے مطبع حسنی (لکھنو) سے "قصہ چہار درویش اشک مرتع موسوم بہ نوطرز مرصع" کے نام سے شائع کرایا تھا۔ اس طرح کتاب کا نام بھی غلط مشہور ہو گیا اور اس سلسلے میں بعض ناقدین کی رائے دُرست ہے کہ

> "غالباً میر محمد حسین عطا خاں تحسین کا قصہ چہار درویش موسوم بہ نوطرز مرصع کی شہرت کی بنا پر ناشرین نے قصداً یا سہواً زرّیں کے قصہ چہار درویش کا نام بھی 'نوطرز مرصع' رکھ دیا۔"

زرّیں نے جب قصہ چہار درویش" (اردو) تصنیف کی اس وقت فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آچکا تھا اور اس کی ماتحتی میں لکھی جانے والی تصانیف بھی منظر عام پر آنا شروع ہو گئی تھیں۔ زرّیں کی نگاہ سے فورٹ ولیم کالج کی کوئی تصنیف گزری تھی یا نہیں، اس سلسلے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ زرّیں نے اپنی تصنیف قصہ چہار درویش (اردو) کی تاریخ بھی باغ و بہار سے نکالی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ میر امن کی "باغ و بہار" زرّیں کی نگاہ سے نہیں گزری تھی۔ بہرکیف زرّیں کی نثر نگاری کا تعلق قدیم اسلوب نگارش سے ہے اور زرّیں کی نثر پر فورٹ ولیم کالج کے اسلوب نثر کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوتا۔

اسلوب نگارش

زرّیں کے اسلوب نگارش پر رائے زنی سے قبل یہ وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ زرّیں نے اپنے آقا کی فرمائش پر اپنے مفصل فارسی قصۂ چہار درویش' کا اردو میں "خلاصہ" پیش کیا تھا۔

داستان نگاری جس توضیحی اور بیانیہ اسلوب نگارش کی متقاضی ہے برخلاف اس کے زرّیں کے ایجاز و اجمال کی روش کے نتیجے میں قصّے کے جزئیات و لوازم کو جو نقصان پہونچ سکتا تھا اور زیب داستان پر ضرب آسکتی تھی وہ ایک قدرتی بات تھی۔ چنانچہ زرّیں کے قصہ چہار درویش میں لذت و دل نشینی کا فقدان ہے اور بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ زرّیں کا اسلوب نگارش داستان نگاری کے شایان شان نہیں۔ باوجود ان خامیوں کے زرّیں کی نثر جن محاسن سے آراستہ ہے ان میں زبان و بیان کی سلاست و سادگی، ہلکے الفاظ کا استعمال اور طویل مفہوم کو مختصر فقروں میں سمونے کا سلیقہ قابلِ ذکر ہے۔

اگرچہ زرّیں کی نثر مروجہ سجع و قوافی کے طوق و سلاسل سے گراں بار ہے لیکن زرّیں چونکہ فارسی اور اردو کے شاعر، قادر الکلام انشا پرداز اور ادب و شعر سے رچی ہوئی طبیعت کے مالک تھے اس لیے ان کی مسجع نگاری اور قافیہ طرازی میں بجائے آورد و تصنع کے بے ساختگی و برجستگی کی نمایاں جھلک محسوس ہوتی ہے اور اگر عبارت میں اس قدر اختصار و اجمال سے کام نہ لیا گیا ہوتا اور فقرے قدرے طویل و ہموار ہوتے تو مسجع نگاری اور قافیہ بندی یقیناً کیفیت و لطف سے خالی نہ ہوتی۔

ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ایک روز میں بہ ارادۂ شکار سوار ہوا۔ صحن صحرا فرش زمردیں سے آراستہ تھا اور رستہ خس و خاشاک سے پیراستہ۔ ناگاہ ایک آہوئے مشکیں یا زیور طلائی بصد زیبائی، نظر آیا۔ میں نے یاروں سے فرمایا۔ میں خود جاتا ہوں، زندہ اسیر کر اسے لاتا ہوں۔ پس گھوڑا خیز کیا اور آہو نے گریز۔ تا دو پہر ہاتھ نہ آیا۔ گھوڑا میرا عرق لایا۔ لاچار ایک تیر او پر ران اس نخچیر کی، بزور بازو تراز و کیا۔ اس نے رستہ پہاڑ کا لیا۔ میں گھوڑا چھوڑا اور پیادہ دوڑا۔ وہاں ایک چشمہ ملا، آب زلال خنک بدرجۂ کمال۔ میں نے پانی پیا اور وضو کیا۔

متصل ایک گنبد تھا بانقش ونگار۔ گرداس کے درخت
سایہ دار۔ وہاں سے ایک آواز آئی کہ اے مونس تنہائی
جس نے تجھے ادا ہو خانماں برباد ہوا اور آوارہ۔"

شمالی ہند میں اٹھارھویں صدی عیسوی کے نصف آخر سے انیسویں صدی عیسوی کے وسط تک، جسے اردو نثر کے تشکیلی وارتقائی مراحل کا عہد زریں کہا جا سکتا ہے۔ اس پوری صدی کے نثر پاروں پر ایک نگاہ ڈالی جائے تو بر اعتبار ایجاز واختصار کے زریں کی نثر ایک منفرد اور انوکھا نمونہ نظر آتی ہے۔ اپنے عہد کے مروجہ دستور کے مطابق زریں نے بھی اشعار کے ذریعہ جابجا عبارت کو رنگین وآراستہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

کتاب میں شامل تمام اشعار خود زریں کے ہیں اور چہار مصرعی قطعات کی شکل میں کہے گئے ہیں۔ پوری کتاب میں پچاس سے زائد قطعات ہیں اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ تمام قطعات ایک ہی بحر (وزن شعر) میں کہے گئے ہیں اور وہ بحر "متقارب مثمن محذوف" ہے۔

فَعُولُن فَعُولُن فَعُولُن فَعَل

قطعہ ملاحظہ ہو ے

یہ لازم ہے جو آدمی پیر ہو
اسے زاد عقبیٰ کی تدبیر ہو
مرے حق میں اکسیر ہے بندگی
کہ بے بندگی ہیچ ہے زندگی

□□

حاشیہ:

لہ تذکرہ "انیس الاحبا" کے دو قلمی نسخے برٹش میوزیم میں ہیں ایک نسخہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں۔ ایک برلن لائبریری اور ایک خدابخش لائبریری (پٹنہ) میں محفوظ ہے۔ سید انوار احمد شعبۂ فارسی، دانش گاہ پٹنہ نے "انیس الاحبا" کا ایک مستند نسخہ، سید عطاء الرحمٰن عطا کاکوی کی نگرانی میں تیار کر کے پٹنہ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ تلخیص کے لیے ملاحظہ ہو "انیس الاحبا" مرتبہ عطا کاکوی۔

بیدی کی افسانہ نگاری ۔۔۔۔۔۔ ص ۲۱ کا بقیہ

تاثر چھوڑتی ہیں جس سے ہماری بصیرت میں اضافہ ہوتا ہے اور ہمارے تفکر کو مناسب سمت اور روشنی ملتی ہے۔[۹]

□□

حواشی:

۱ بہ حوالہ: (۱) روزنامہ قومی آواز لکھنؤ مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۸۴ء (وفات بیدی کی خبر) ص ۱
(۲) مالک رام: تذکرۂ ماہ وسال، مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی۔ طبع نومبر ۱۹۹۱ء ص ۹۱

۲ غالب: اردوئے معلّی (حصہ اول)۔ اکمل المطابع دہلی۔ طبع اول مطبوعہ اپریل ۱۸۶۹ء ص ۴۱۵

۳ دیوانِ غالب۔ مطبع صدر محبس لکھنؤ۔ طبع اپریل ۱۸۸۲ء ص ۵۹

۴ بہ حوالہ ڈاکٹر شمس الحق عثمانی: بیدی نامہ۔ لبرٹی آرٹ پریس نئی دہلی۔ طبع دسمبر ۱۹۸۶ء ص ۱۰۳ تا ۱۱۱

۵۔ ان پانچ اساسی افسانوی مجموعوں کے علاوہ بیدی کے افسانوں کے درج ذیل پانچ ضمنی مجموعے بھی ہیں: (۱) گرم کوٹ (۲) لمبی لڑکی (۳) جوگیا (۴) مہمان (۵) کنواری۔ بیدی کی کتاب مکتی بودھ (مطبوعہ دسمبر ۱۹۸۲ء) کے نثر پاروں میں بھی شامل ہیں (بہ حوالہ بیدی نامہ ص ۱۰۷ تا ۱۱۰)

۶ بہ حوالۂ بیدی نامہ ص ۱۳۲ تا ۱۴۳

۷ بیدی کے افسانوی مجموعے ہاتھ ہمارے قلم ہوئے (طبع ۱۹۷۴ء) کے افسانے اس کی اچھی مثال ہیں۔ ۸ بہ حوالۂ بیدی نامہ ص ۱۲۶

۹ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک۔ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ۔ طبع مارچ ۱۹۷۲ء ص ۲۲۴ تا ۲۲۵

اہل قلم معاونین سے گزارش ہے کہ وہ اپنی نثری یا شعری تخلیقات کی اصل کاپی ہی ادارہ کو بھیجیں، زیراکس (الیکٹرواسٹیٹ) کاپی ہرگز ہرگز نہ بھیجیں، نیز تخلیقات کا صاف اور خوشخط ہونا ضروری ہے۔

ایڈیٹر

افسانہ

اقبال مجید
۴۰، شالہ روڈ، بھوپال ۴۶۲۰۰۲

میرے خوف

جب میں جوانی کی سرحدوں میں قدم رکھ رہا تھا تو انھیں دنوں کی بات ہے کہ اکثر رات میں مجھے عجیب عجیب طرح کے خواب دیکھنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ان خوابوں میں سے شاید ہی کوئی خواب ایسا رہا ہو جس کے انجام سے مجھے طمانیت یا سرشاری کا احساس ہوا ہو۔ ایسے خواب جن میں انجام کار مجھے مسرت حاصل ہوئی ہو، شاید ہی میں نے کوئی دیکھا ہو۔

انھیں راتوں میں دیکھے گئے ایک خواب کا ذکر اگر میں یہاں کروں تو بے جا نہ ہوگا۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک خوبصورت کار بڑے پر فضا راستے پر ڈرائیو کر رہا ہوں۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ اُس وقت میں کار تو کار، اسکوٹر چلانا بھی نہیں جانتا تھا۔ خیر تو میں کسی فلمی ہیرو جیسے فیشن زدہ کپڑے پہنے اس پُر فضا راستے پر بڑے اطمینان سے کار چلا رہا تھا کہ یکایک دل نے کہا کاش ایسے راستے پر اور ایسی شان دار کار میں میرے ساتھ کوئی خوبصورت ہمسفر بھی ہوتا تو کیا ہی لطف آتا۔ پاس کی سیٹ پر، جو خالی پڑی تھی، میں نے حسرت بھری ایک نگاہ ڈالی۔ اور ابھی میں اس پر کسی دل پذیر نازنین کا تصور کر ہی رہا تھا کہ میری نظر سامنے پڑی تو دور سڑک کے کنارے کسی کو اس ویرانے میں کھڑا پایا۔ کار جب قریب پہونچی تو دیکھا واقعی ایک دلنواز حسینہ کھڑی ہے۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی ہاتھ کے اشارے سے لفٹ مانگی اور میں نے ایک جھٹکے کے ساتھ بریک لگا کر گاڑی روک لی۔ گاڑی رُکتے دیکھ کر وہ جوان اور خوبصورت لڑکی مسکرائی اور ایک قدم آگے بڑھ کر بولی،

"کیا آپ مجھے لفٹ دینا پسند کریں گے۔؟"

اس کا یہ سوال کرنا تھا کہ پوری فضا میں جیسے نشہ سا بھر گیا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ آس پاس کے درختوں کے پتّوں کو چھوتی ہوا نے کچھ ایسی موسیقی پیدا کر دی کہ پورا جسم تھرک اُٹھا۔ میں جس قدر دانت ممکن ہو سکے، باہر چمکا کر بولا:

"یہ تو میری خوش قسمتی ہوگی۔"

زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے اور ہاتھ نے بڑھ کر اندر سے اُس غیبی نعمت کے استقبال کے لیے دروازہ کھول دیا۔ میرا جواب سُن کر اس نے ایک شانِ بے نیازی سے کندھوں پر جھولتے ہوئے اور شیمپو سے دُھلے بالوں کو ایک طرف جھٹکا دیا اور شعلے کی لپک کی طرح اندر آئی اور سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس وقت مجھے اس بات پر پورا یقین ہو گیا کہ انسان کے دن پھرتے دیر نہیں لگتی۔

وہ خاموش اور ویران سا راستہ اب ہزاروں گیت گنگنا رہا تھا۔ بس ایک بالشت کی دوری پر ایک قیامت بیٹھی تھی جس کے لباس کی سرسراہٹیں میرے جسم کو اپنی پوری شدت سے محسوس ہو رہی تھیں۔

اب گاڑی کی رفتار جیسے اپنے آپ کم ہو گئی۔ بار بار یہ دل چاہ رہا تھا کہ کاش کچھ ایسا ہو کہ گاڑی دراصل ایک ہی جگہ ٹھہری رہے مگر بہ ظاہر چلتی ہوئی محسوس ہو ۔۔۔ سفر جاری رہا۔ میں اسے اور کبھی کبھی وہ مجھے دیکھتی رہی۔ ایک آدھ کیلومیٹر یونہی نکل جانے کے بعد وہ بڑی ادا سے بولی:

"کیا آپ ایک ہاتھ چھوڑ کر گاڑی نہیں چلا سکتے۔؟"

یہ جملہ سننا تھا کہ ایسا لگا جیسے کسی نے سارا بدن پھونک دیا ہو۔ چہرہ خون سے چلبلا اٹھا اور مجھے اس پری رو کی ہمت اور کھلی ہوئی دعوتِ دست درازی پر جتنی حیرت ہوئی اتنی ہی اپنی عقل پر غصہ بھی آیا۔

میں نے جلدی سے اسٹیرنگ پر سے اپنا ہاتھ ہٹا کر نیچے

دیکھ لیا اور بولا:

"بہت آرام سے چلا سکتا ہوں۔ آپ حکم کریں۔"

لڑکی نے میرے خالی ہاتھ کو دیکھا اور پھر میرے چہرے کی طرف ایک اچٹتی سی نظر ڈالتے ہوئے جلدی سے اپنے چہرے کو باہر کی جانب موڑ کر بولی ــــ

"اب آپ اس ہاتھ سے خدا کے لئے جلدی سے اپنی ناک صاف کر لیجئے مجھے گھِن آرہی ہے۔"

اس کا یہ کہنا تھا کہ میری آنکھ کھُل گئی اور دیکھا کہ میں ندامت کے پسینے میں نہا رہا ہوں۔

بہت دنوں تک مجھے اس خواب پر شدید غصّہ آتا رہا۔ آخر ایک دن میں نے اپنے ایک دوست سے اس خواب کا بڑی رازداری کے ساتھ ذکر کیا۔ وہ بولا،

"یہ تو درحقیقت ایک لطیفہ ہے، تم کو کسی نے سنایا ہوگا جو ذہن کے کسی کونے میں پڑا رہ گیا اور ایک شب خواب کی شکل میں سامنے آگیا۔"

مجھے اپنے دوست کی یہ وضاحت پسند نہیں آئی۔ تب سے لگاتار میں اپنی جوانی کے شب و روز پر نگاہ کرتا رہا کہ میری زندگی میں کبھی کوئی ایسا دن بھی آئے گا جب مجھے اپنے خالی ہاتھ سے ناک پونچھنے کے علاوہ بھی کوئی کیف پرور کام کرنے کو ملے گا۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا اور میں بوڑھے ہونے کے قریب آگیا، تب مجھ پر یہ راز کھلا کہ ہم خواب بھی اپنی ہمّت اور حوصلوں کے مطابق ہی دیکھ سکتے ہیں۔

ایسا نہیں تھا کہ میرے ہاتھ ہمیشہ مصروف رہے۔ بہت لمبے عرصے تک ایسا بھی ہوا کہ دونوں ہاتھوں کو کچھ بھی کرنے کے لئے نہ تھا لیکن جو خوف میں نے پال رکھے تھے اُن سے میری محبّت اور عقیدت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اب اتنی بڑھ چکی تھی کہ میں انھیں توڑنے یا ان سے باہر نکلنے میں اپنے کو بے حد غیر محفوظ محسوس کرنے لگا تھا۔ پھر یہ خوف میری زندگی کی ریڑھ کی ہڈی بن گیا اور میں جوانی کی سرحدوں سے نکل کر کفن بردوشی سے خرقہ پوشی کی منزلوں کی طرف بڑھنے لگا تب ہی ایک رات میں نے ایک خواب دیکھا،

ایک بھیانک رات ہے۔ دُور دُور تک کوئی محفوظ جگہ نہیں ہے۔ میں تنہا ایسی حالت میں چلا جا رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ کیسی مسافت ہے کہ اتنی رات ہونے کو آئی اور سر چھپانے کو کوئی جگہ نہ ملی تب ہی دُور کچھ روشنیاں سی جھلملاتی نظر آئیں۔ میں گرتا پڑتا، خوفزدہ اور ہراساں ان روشنیوں کی طرف بڑھا، کچھ دیر چلنے کے بعد اندھیروں میں ایک عمارت کے آثار نظر آئے، جس کے ایک دو کمروں کی کھڑکیوں کے پیچھے سے روشنی آرہی تھی۔ یہ دیکھ کر خدا کا شکر کیا کہ اس بیابان میں ایک عمارت تو نظر آئی۔ میں تیزی سے عمارت کے صدر دروازے کے قریب پہونچا تو پتہ لگا کہ وہ کوئی قدیم اور غیر آباد حویلی تھی۔ عمارت میں درجنوں کمرے تھے سنسان راہداریاں تھیں برآمدے تھے اور صدر دروازے پر چارپائی ڈالے اور اپنے سرہانے ٹوٹی سی لالٹین رکھے ایک بوڑھا اور پراسرار چہرے اور اداس آنکھوں والا ایک چوکیدار پڑا کھانس رہا تھا۔

میں اس کے قریب پہونچا تو اس نے لالٹین اٹھا کر میرے چہرے کے قریب کرتے ہوئے سوال کیا،

"کون ہے؟"

"ایک مسافر ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا چاہیئے ــ؟"

بس یہ رات گزارنے کے لئے تھوڑی سی جگہ۔"

"زینے سے اوپر چلے جاؤ۔ جگہ ہی جگہ ہے۔" وہ بولا اور اطمینان سے اپنی جگہ پر لیٹ گیا۔

میں نے نظر اٹھائی تو سامنے ہی ایک لق و دق مگر بوسیدہ سا زینہ اوپر چلا گیا تھا۔ نہ وہاں کوئی چراغ تھا اور نہ کوئی شمع دان۔ میں زینے کو تکتا رہا۔ خدا جانے اس زینے پر کب سے کسی ذی روح نے قدم رکھے بھی تھے یا نہیں۔ میں زینے کی طرف بڑھا لیکن پہلی سیڑھی پر ہی میرے قدم ٹھہر گئے۔ پلٹ کر میں نے بوڑھے چوکیدار کی طرف دیکھا وہ مزے سے لیٹا تھا۔ میرے اندر خوف کی ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔ میں ڈرا ڈرا سا بولا۔

"چوکیدار ایک بات بتاؤ گے؟"

"جی ــــ" اس کی آواز جیسے کہیں بہت دور سے آئی۔

"میں اوپر تو چلا جاؤں ـ مگر یہ بتاؤ کہ ــــ" میں رُک گیا۔

"ہاں ہاں بولیے" چوکیدار نے میری گھبراہٹ کو تاڑتے ہوئے پوچھا۔

"یہ بتاؤ" میں نے اپنے کو سنبھالتے ہوئے کہا "اس عمارت میں کبھی کوئی غیر معمولی واقعہ تو نہیں ہوا"

"غیر معمولی واقعہ؟" چوکیدار نے دُہرایا۔

"ہاں۔ کوئی پریشان کن بات"

"اچھا اچھا۔ آپ کا مطلب کسی اَن ہونی سے ہے"

"ہاں"——

"ہاں۔ ایک بار تو ایسا واقعہ ہوا ہے"

"کیا تھا وہ واقعہ ——؟" میں نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا

چوکیدار لالٹین کو میرے چہرے کے قریب لایا اور بولا:

"ایسی ہی ایک اندھیری رات میں ایک صاحب رات کاٹنے کے لئے ایک بار اس زینے سے اوپر گئے تھے"۔

"تو——" میں جلدی سے انتہائی خوف کے ساتھ بولا۔

"تو جب صبح ہوئی تو یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ ہنستے کھیلتے صحیح و سالم مسکراتے ہوئے نیچے اتر رہے ہیں۔ بلکہ نیچے آنے کے بعد تو انھوں نے مجھ سے ناشتے کا بھی مطالبہ کیا"

"یہ سن کر میں بڑا چکرایا کہ چوکیدار کا آخر مطلب کیا ہے —— میں نے اسے ٹوکا۔

"تو اس میں ایسی غیر معمولی بات یا اَن ہونی بات کیا تھی"

چوکیدار نے دھیرے سے ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا:

"پچھلے پندرہ سال سے تو میں ہی دیکھ رہا ہوں کہ جو اس زینے سے اوپر گیا، پھر کبھی زندہ واپس نہیں آیا۔ سوائے اس اکیلے مسافر کے، تو اسے غیر معمولی واقعہ نہیں کہا جائے گا تو کیا کہا جائے گا"

یہ سننا تھا کہ میری آنکھ کھل گئی اور میں نے اپنے کو خوف و دہشت کے پسینے میں غلطاں پایا۔

دوستوں سے خواب بیان کیا تو انھوں نے بتایا کہ یہ دراصل ایک لطیفہ ہے جو میں نے کہیں سن رکھا ہوگا اور وہی اب خواب کی شکل میں واقع ہو گیا ہے۔

آج سوچتا ہوں اور پلٹ کر دیکھتا ہوں تو مجھے پتہ چلتا ہے کہ میں نے کبھی ایسے زینے پر قدم نہیں رکھا جو صحیح سلامت واپس لانے کی ضمانت نہ دیتا ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلامتی کے بارے میں میرا پیمانہ اس قدر محدود اور مضحکہ خیز ہو کر رہ گیا کہ آج تک میں زینے کی پہلی سیڑھی پر ہی کھڑا ہوں۔ نہ تو میں ان میں سے ہوں جو زینہ چڑھ کر گئے اور واپس نہ آسکے اور نہ اس خوش قسمت میں ہوں جو —— واپس کیسے آتے ہیں —— کی جوکھم اٹھانا جانتا ہے اور برملا سے وقت آنے پر اٹھانے کی ہمت دکھاتا ہے میں تو بس اپنے خوف کی رضائی کی گرمی میں لپٹا باہر کی تخ بستہ ہواؤں سے محفوظ اپنے کو کامیاب ترین آدمی سمجھ رہا ہوں اور زینے کی پہلی سیڑھی پر کھڑا ہوں۔

اگر کوئی صاحب میری اس تحریر کو پڑھ یا سُن رہے ہیں تو ان سے میری ایک ہی گزارش ہے کہ اپنے خوابوں کی جانب سے بہت ہوشیار رہیں۔ دراصل یہ بات میری سمجھ میں ہرگز نہ آتی اگر ایک دن میرا بیٹا مجھ سے اپنا خواب نہ بیان کرتا۔ اس وقت میرے بیٹے کی عمر مشکل سے سات سال کی رہی ہوگی۔

اسی زمانے کی بات ہے کہ وہ میرے پاس بڑا پریشان سا آیا اور بولا —— "ابّو! میں نے ایک خواب دیکھا ہے آپ کو سناؤں۔؟"

"ہاں سناؤ"

"میں نے دیکھا کہ میری ایک ٹیچر مجھ سے کہہ رہی ہیں کہ آٹھ اور آٹھ سولہ ہوتے ہیں، ابھی میں اس بات کو یاد ہی کر رہا تھا کہ دوسری ٹیچر آئیں اور بولیں دس اور چھ سولہ ہوتے ہیں۔ میں ان کی بات کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ تیسری ٹیچر آئیں اور بولیں؛ یاد رکھنا نو اور سات سولہ ہوتے ہیں۔ یہ سن کر میں پریشان ہو گیا اور اپنی پرنسپل کے پاس گیا اور تینوں ٹیچروں کی بات بتائی اور سوال کیا کہ ان میں سے کون سی استانی صحیح کہہ رہی ہے۔ پرنسپل نے جواب دیا کہ تینوں استانیاں صحیح کہہ رہی ہیں۔"

مجھے خوشی ہے کہ زندگی میں کتنی ہی طرح سے سولہ ہو سکتے ہیں یہ بات میرا بیٹا آج اچھی طرح جانتا ہے جبکہ میں اپنے خوف کے بخشے ہوئے تعصبات میں آج بھی گھرا ہوں اور صرف ایسے ہی خواب دیکھ سکتا ہوں جن میں آٹھ اور آٹھ سولہ ہو سکتے ہوں۔ اس کے علاوہ نہیں۔ □□

افسانہ

ڈاکٹر ناہید جعفری
محمود نگر۔ لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۰۳

خودکشی

تاریک رات، بھیانک سناٹا، خاموشی، تنہائی، سرد ہوائیں گھر سے نکل پڑی۔ سامنے شائد کوئی مقصد ہو۔ کہاں جارہی ہے۔ کیا خبر کسی کو... مجھے بھی تو نہیں۔ کیا گھبرا گئی ہے زندگی سے.... لیکن.. زندہ ہے کہاں...؟ ایک لاش ہی تو ہے... پھر کہاں جارہی ہے.... لیکن کہوں..؟ بہت ٹوٹی ہوئی لگتی ہے... زندگی سے ہار مان لی شائد... کیا دنیا کو پہچان نہیں سکی..؟ روک کر پوچھتے ہیں.....

کہاں جارہی ہو...؟

موت کے منھ میں، لیکن تم سے مطلب....؟

لیکن کیوں....؟

میری مرضی.... زندگی میری ہے... میں چاہوں جیوں.. چاہوں مرجاؤں... کسی کو کیا دخل....؟

شائد۔ بہت ستم ڈھائے ہیں زمانے نے تم پر... بہت درد ملے ہیں زمانے سے تمہیں... زمانے کے پاس اور ہے کیا کسی کو دینے کے لئے...؟

جو ہے وہی تو دے گا... کیا مجھے نہیں بتاؤ گی، زمانے نے تمہیں کیا دیا۔؟

ٹپ ٹپ... ٹپ....؟ آنسو کے قطرے میری ہتھیلیوں پر گرے۔

تنہا زندگی،... بے چارگی،... فریب،... بے بسی،... نفرتیں...

آنسو،... آہیں..... میں اتنا بوجھ نہیں اٹھا سکتی...

لیکن یہ بوجھ تو اٹھانا ہی پڑے گا.... یہ تو سزا ہے دنیا میں آنے کی۔

میں اس دنیا میں اپنی مرضی سے تو نہیں آئی۔

اپنی مرضی سے تو کوئی نہیں آتا... اور اپنی مرضی سے جاتا بھی نہیں۔

تم اپنی مرضی سے نہیں آئیں... تو جانے کی اپنی مرضی سے کیوں سوچ رہی ہو۔

مجھے تمہاری فلاسفی میں کوئی دلچسپی نہیں...

کوئی بات نہیں... آؤ زندگی کی باتیں کرتے ہیں...

مجھے زندگی سے کوئی لگاؤ نہیں... یہاں کچھ نہیں ہے میرے لئے۔

لیکن، ایک چیز تو ہے...

وہ کیا....؟

امید....

مجھے کوئی امید نہیں... پھر سے ٹپ.. ٹپ... ٹپ... میں تنہا غموں کے سمندر میں غوطے کھاتی رہی... جانتی ہو کیوں... ؟ خوشیوں کے چند لمحوں کی تلاش میں... جو مجھ سے کوسوں دور تھے لیکن... امید تھی،... شائد حاصل ہو سکیں... جانتی ہو ہاتھ کیا آیا...؟ صرف ناکامی... مایوسی... محرومی.... مجھ میں آج کوئی امید باقی نہیں رہی، البتہ لوگوں کی امیدیں مجھ سے ضرور وابستہ ہیں.... وہ چاہتے نہیں... میں قربانیاں دیتی رہوں... میں باولی ہوں نا... نہیں... شائد مقدر کی ہیٹی.... روٹھتی کس سے اور کہتی کس سے... کوئی نہیں... سناٹا... گھٹا ٹوپ اندھیرا... چاروں سمت مایوسی... تنہائی سمندر میں... ڈوبتی، ابھرتی....

وقت کا تقاضہ... نفرتوں کا ڈھیر... پھر بھی...

بس تم ہار گئیں....!

نہیں... میں ہار نہیں گئی... ٹوٹ گئی ہوں... ٹپ.. ٹپ... ٹپ... ٹپ... رفتار بڑھ گئی...

تم جانتی ہو، خودکشی حرام ہے...؟

ہاں... لیکن زندگی بھی تو حرام ہے... کوئی اپنا نہیں ہے... کوئی میرے جذبات و احساسات کو نہیں سمجھتا... سب یہی چاہتے ہیں... میں خاموشی سے لوگوں کے ظلم سہتی رہوں... اور اف بھی نہ کروں... یہ بھی نہ کہوں... تم نے مجھے دکھ دیا... کیونکہ شکوہ کسی کو پسند نہیں ہے... شکوے شکایتوں سے زندگی اور تلخ ہو جاتی ہے... کوئی یہ کیوں نہیں سمجھتا اس

(باقی)

اترپردیش میں اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لئے

علاحدہ محکمہ کا قیام

ایک سیکولر ملک ہونے کی حیثیت سے ہمارے ملک کا آئین اپنے سبھی شہریوں کو مساوی، اقتصادی اور سیاسی حقوق کی گارنٹی دیتا ہے۔ یہاں سبھی باشندوں کو بلاتفریق مذہب وملت عبادت کی آزادی کے ساتھ اظہار رائے کی آزادی بھی حاصل ہے اور سبھی کو یکساں طور پر قانون کی سرپرستی بھی ملتی ہے۔ ہمارا آئین جہاں انفرادی آزادی، قومی یک جہتی، ملک کی سالمیت برقرار رکھنے کا پابند ہے وہیں برادرانہ ماحول قائم کرنے کے لیے بھی پابند ہے۔

ہمارے آئین کے معمار بابا صاحب امبیڈکر چاہتے تھے کہ سماج کا ڈھانچہ انسانیت کی بنیاد پر قائم ہو۔ آدمی آدمی کے باہمی تعلقات مضبوط ہوں۔ انصاف، مساوات، برادرانہ تعلقات، آزادی اور بے خوفی بابا صاحب کی زندگی کے آدرش تھے۔ انھوں نے عوام الناس کی بہبود کی بنیاد پر آئین بناکر ہندستان کو ایک خوش حال ملک بنانے کی کوشش کی۔ وہ خود عملی طور پر تازندگی عدم مساوات کے خلاف جدوجہد کرتے رہے

ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کے نقش قدم پر چلنے والی ریاستی حکومت کی موجودہ وزیراعلا مس مایاوتی نے جب ریاست کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لی تو ریاست کے کمزور طبقے، دبے کچلے، غریب عوام اور اقلیتوں میں اپنی سرکار بننے کی جھلک ایک نئی امید اور حوصلے کے ساتھ نمودار ہوئی۔ پہلی بار ان طبقوں کو محسوس ہوا کہ اترپردیش میں غریبوں اور پس ماندہ افراد کی سرکار آئی ہے۔

موجودہ حکومت نے اپنے قیام کی مدت کے دوران غریبوں، دبے کچلے پس ماندہ افراد، خواتین اور اقلیتوں کے تحفظ اور ان کے لئے سماجی، معاشی انصاف کو یقینی بنانے کے مقصد سے کئی اہم اور ٹھوس اقدامات کیے ہیں۔ ان اقدامات سے نہ صرف سماج کے دبے کچلے پسماندہ اور کمزور طبقے بلکہ اقلیتی طبقے کے لوگ بھی پوری طرح مستفید ہو رہے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اترپردیش کی مایاوتی حکومت کو اقلیتوں کی اقتصادی، سماجی اور تعلیمی پس ماندگی کا بخوبی احساس ہے اور اس کا ماننا ہے کہ جب تک سماج کے سبھی طبقوں کی فلاح کو سامنے رکھ کر ترقیاتی پروگرام ان کو آخری مرحلے تک پہونچانے کی دلی کوششیں نہیں ہوں گی سماج میں خوش حالی اور ترقی ممکن نہیں ہو سکے گی۔

ریاست میں یہ پہلا موقع ہے جب کسی دبے کچلے طبقے کی نمائندگی کرنے والی ہر دلعزیز وزیر اعلا محترمہ مایاوتی نے بنیادی سوالوں کی جانب شروع ہی سے توجہ دینا شروع کی۔ ان کی اعلا ترجیحات میں اقلیتوں کا تحفظ اور ان کی ترقی نیز فلاح و بہبود کے پروگرام سرفہرست ہیں۔

اقلیتوں کے مفاد کی حفاظت کے لیے پرعزم موجودہ حکومت نے اس طبقے کی سماجی، اقتصادی اور تعلیمی ترقی و بہبودی کے لئے پہلی بار اقلیتی فلاح کے لیے ایک الگ محکمہ قائم کیا ہے جو اقلیتوں سے متعلق سبھی معاملوں کو نپٹائے گا۔ اس محکمہ کے ساتھ اقلیتوں سے متعلق سبھی اداروں اور کارپوریشن وغیرہ کو وابستہ کر دیا گیا ہے تاکہ اس فرقہ کے افراد کو اپنے کام کے لئے ادھر اُدھر نہ بھٹکنا پڑے اور اس محکمے کے توسط سے چلائی جانے والی اسکیموں اور پروگراموں سے وہ پوری طرح مستفید ہو سکیں اقلیتی فلاحی اسکیموں کا فائدہ اقلیتوں تک پہونچانے کی غرض سے وزیراعلا نے یہ اہم قدم اٹھایا ہے۔ واضح رہے کہ اس محکمہ کے قیام کا اعلان وزیر اعلا نے موجودہ مالی سال کا بجٹ پیش کرنے کے دوران کیا تھا۔

ریاستی حکومت نے گزشتہ ۱۲ اگست ۱۹۹۵ء کو ایک سرکاری

(بقیہ ص ۴۴ پر)

ریاستی حکومت کے

اقلیتوں کے لئے بہترین اقدامات

ہندستان جیسے جمہوری ملک میں جمہوریت کی بنیاد آزادی
پر رکھی گئی ہے
سماجی و معاشی برابری، بھائی چارہ، اخوت اور انصاف
ہندستانی آئین کے معمار ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر نے کہا تھا کہ جمہوری
نظام کے معنی ہیں مذہب، اونچ نیچ اور سماجی برائیوں سے پاک نظام
کی تشکیل۔ ہندستان میں جمہوریت اس وقت تک باقاعدہ قائم نہیں
ہوسکتی جب تک عام لوگوں کو سماجی انصاف نہیں مل سکے گا۔ بابا صاحب
کا قول تھا کہ جب تک ہندستانی سماج کے سبھی مذاہب و مکتبہ فکر
کے لوگ، تمام طبقوں اور لسانی اقلیتوں کو ان کے جائز حقوق حاصل
نہیں ہوتے انھیں سماج میں مساوی درجہ نہیں ملتا نیز ان کو ملک
کی ترقی کے لئے بھرپور تعاون دینے کا موقع فراہم نہیں ہوتا، اس
وقت تک سماجی و معاشی برابری، قومی یک جہتی و قومی اتحاد کی منزل
تک پہونچنا دشوار کن مرحلہ ہے۔

ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کے نظریات اور ان کے مشن کو شرمندہ تعبیر
کرتی ہوئی اترپردیش کی وزیر اعلا مس مایاوتی نے ریاست میں سماجی و
معاشی تفریق دور کرنے نیز سماج کے دبے کچلے، کمزور، پس ماندہ اور
اقلیتی طبقہ کی ترقی و بہبودی کے لئے اہم فیصلے کیے ہیں، جو ان کے قول و
فعل کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔

سماجی انصاف سے متعلق وزیر اعلا مس مایاوتی کا نظریہ ہے کہ:
"جہاں تک سماجی انصاف کا تعلق ہے اس
سلسلے میں میں وضاحت کرنا چاہتی ہوں کہ جب تک
اس ملک میں سماجی تبدیلی نہیں آئے گی تب تک
ہمارے لوگوں کو سماجی انصاف نہیں مل پائے گا اس لئے
[illegible]

اترپردیش کی وزیر اعلا مس مایاوتی اور ان کی حکومت کے گزرے ہوئے
تین ماہ چیلنجوں کا کامیاب مقابلہ کرنے اور ریاست کی ترقی کی رفتار
تیز کرنے نیز سبھی کو بالخصوص سماج کے دبے کچلے، پس ماندہ، کمزور،
خواتین اور اقلیتوں کو سماجی، معاشی انصاف کو یقینی بنانے کے
فیصلوں میں بسر ہوئے۔ اس مختصر سی مدت میں ان افراد کے مفاد میں کئی اہم
فیصلے کیے گئے ہیں۔

موجودہ سرکار اقلیتوں کی سماجی، معاشی اور تعلیمی پس ماندگی
دور کرنے کے لیے پرعزم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اتنی قلیل مدت میں
مایاوتی سرکار نے اقلیتوں کی ترقی و بہبود کے لیے ریاست میں پہلی بار
ایسی اسکیمیں اور پروگرام نافذ کیے ہیں جو قابل تعریف و لائق مبارکباد ہیں۔
اقلیتی طبقے کی سماجی، معاشی اور تعلیمی پس ماندگی دور کرنے
اور ان کی ترقی و بہبودی کے لئے ایک الگ محکمہ کا قیام بلاشبہ
ایک فعال قدم ہے۔ اس محکمے کے توسط سے اقلیتوں سے متعلق
سارے امور انجام دیے جائیں گے۔

پہلی بار ریاست اترپردیش میں اقلیتی طبقے کے طلبا کو تعلیم کیلئے
متوجہ کرنے کی غرض سے اس طبقے کے درجہ ایک سے دس تک کے
طالب علموں کو وظیفہ دینے کی اسکیم نافذ کی گئی ہے۔ اس کے لیے تقریباً
۱۵ کروڑ روپے کا بندوبست کیا گیا ہے۔

مسلم فرقے کے پس ماندہ افراد کے لئے ۲۷ فی صد ریزرویشن
کے فائدے کو یقینی بنانے کے لئے انھیں ذات سرٹیفکیٹ جاری کرنے
کا کارگر بندوبست کیا گیا ہے۔

موجودہ [illegible] حکومت نے روزگار کے مواقع فراہم کرنے کے
لیے اقلیتوں کے لیے [illegible] اسکیم کو اور زیادہ فعال اور مؤثر بنایا
تاکہ اس کا فائدہ [illegible] سکے [illegible] اس کے لیے

روپے کا بجٹ مختص کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ۱۳ مسلم اکثریتی اضلاع میں آئی، ٹی آئی اداروں میں ۱۹۰ سیٹوں کا اضافہ کیا گیا ہے تاکہ اقلیتی طبقے کے بے روزگار لوگوں کو ٹریننگ دی جاسکے۔

اُردو کے فروغ اور اسے روزی روٹی سے جوڑنے کے سلسلے میں موجودہ حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ جن اسکولوں میں پانچ یا اس سے زیادہ بچوں کی مادری زبان اُردو ہے، ان میں اُردو اساتذہ کی تقرری کی جائے گی۔

ریاست کے پرائمری اور جونیر ہائی اسکولوں میں پانچ ہزار اردو اساتذہ کی تقرری کی جارہی ہے۔ اسی کے ساتھ جن سرکاری دفاتر میں اُردو مترجم/جونیر کلارک کی تقرری نہیں ہوسکی تھی ان کی تقرری کے لئے بھرتی کا کام شروع کردیا گیا ہے۔

اتر پردیش کی موجودہ حکومت نے اقلیتی مسلم فرقہ کی تعلیمی پسماندگی دور کرنے کی غرض سے مسلم آبادی والے مواضعات/قصبوں میں جہاں پہلے سے تعلیم کی سہولت نہیں مہیا کرائی جاسکی ہے وہاں اوّلیت کی بنیاد پر اسکول کھولے جائیں گے۔ اس اسکیم کے تحت مالیاتی سال رواں میں ریاست کے ۱۳ مسلم اکثریتی اضلاع میں ۵۷۷ جونیر بیسک اور ۱۴۱ سینیر بیسک اسکول قائم کیے جائیں گے۔

اتر پردیش کے مسلم اوقاف کو مستحکم اور فعال بنانے کے لئے سرکار پرعزم ہے۔ اس سے متعلق کئی اہم فیصلے کیے جارہے ہیں۔

اقلیتوں کی فلاح اور انھیں سہولتیں دینے کی سمت جو اقدام کیے گئے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وزیر اعلا اقلیتوں کی سماجی معاشی اور تعلیمی پسماندگی دور کرنے کے لئے پرعزم ہیں۔

——— عابد حسین

علاحدہ محکمہ کا قیام ۔۔۔۔۔ صفحہ ۱۴ کا بقیہ

اعلانیہ جاری کرکے اس محکمے کے لیے ریاست کے متعدد محکموں سے چلائی جانے والی اقلیتی فلاحی اسکیموں، اداروں اور کارپوریشن وغیرہ کی فہرست جاری کرکے اسے اقلیتی فلاح میں شامل کردیا ہے۔

اس محکمہ میں مرکزی حکومت کی جانب سے اقلیتوں کی فلاح کے لئے چلائے جارہے پندرہ نکاتی پروگرام کے تحت ریاست کے محکموں میں چلنے والی سبھی اقلیتی بہبود کی اسکیمیں بھی شامل کی گئی ہیں۔ اقلیتی فلاح کے محکمے کے تحت اب اقلیتوں سے متعلق مرکزی حکومت کی پالیسی، مرکزی اقلیتی کمیشن کے رہنما اصول، اقلیتی کمیشن اتر پردیش سے متعلق سارے معاملات کے ساتھ ہی ساتھ اقلیتوں کے سماجی اقتصادی اور تعلیمی بہبود سے متعلق بھی امور اس محکمے کے تحت انجام دیئے جائیں گے۔

اقلیتی فلاح کا محکمہ اب اقلیتی مالیاتی ترقیاتی کارپوریشن سے متعلق کام بھی دیکھے گا۔ واضح رہے کہ ابھی تک یہ کارپوریشن سماجی بہبود کے تحت کام کرتا تھا۔ اس محکمہ کے تحت اب سنی سنٹرل وقف بورڈ، شیعہ سنٹرل وقف بورڈ، مدارس عربی سے متعلق امور، وقف کمشنر آفس اور اقلیتوں کی زبان اور ان سے متعلق اداروں کے سارے امور نپٹائے جائیں گے۔

ریاست میں پہلی بار اقلیتی فلاح کے محکمہ کا قیام اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لئے پرعزم وزیر اعلا محترمہ مایاوتی کی نیک نیتی کو صاف ظاہر کرتا ہے۔

——— ڈاکٹر خورشید ظفر

کھلے دریچے یادداشت کے صفحہ ۲۲ کا بقیہ

سوہان بن رہی تھیں۔ جلنے یا انجانے میں محترمہ نے موٹی موٹی پنڈلیوں والا ایک پیر وصل صاحب کے پچکے ہوئے پیٹ پر رکھ دیا۔ وصل صاحب سے جب اس پیر کی گرانی برداشت نہ ہوسکی تو انھوں نے کہا:

"بیگم صاحبہ! چشم بددور آپ حکمار کے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اور خانوادۂ ملک الموت سے بھی آپ کا رشتہ ہے۔ لہٰذا اتنا بتا دیجئے کہ موت بہتر ہوتی ہے یا عالمِ نزع؟"

بیگم صاحبہ نے جواب دیا: "موت!"

وصل بلگرامی نے عرض کیا۔ "پھر آپ دوسرا پیر بھی پیٹ پر کیوں نہیں رکھ دیتیں۔؟"

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: "نقش حیات" (شعری مجموعہ)
شاعر: رحمٰن ربانی
قیمت ۲۵/- روپے
ملنے کا پتہ: نگہبان پبلیکیشن. کالپی (یو. پی)

"نقش حیات" رحمٰن ربانی کا پانچواں شعری مجموعہ ہے. اس کے علاوہ حمد و نعت اور منقبت پر مشتمل ایک مجموعہ بھی وہ شائع کر چکے ہیں رحمٰن صاحب کو شاعری کی ہر صنف میں کافی ادراک ہے. زیر نظر مجموعہ میں قطعات، رباعیات، غزلیں اور نظمیں ہیں، ساتھ ہی کچھ طنز و مزاح پر مشتمل کلام بھی ہے.

رحمٰن ربانی نے حیوانات پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جس سے علم حیوانات سے بھی ان کی واقفیت پتہ چلتی ہے. سانپ، بچھو، بندر، پھروٹا، گدھا، بیل، کتا اور الو کو بھی انھوں نے اپنے کلام کا موضوع بنایا ہے جو قابلِ ستائش ہے. ان حیوانات کی جبلت کے علاوہ طنز و مزاح کا پہلو ان کی معلومات کا اظہار کرتا ہے.

غرضکہ رحمٰن صاحب کا کلام اردو ادب میں ایک وقیع اضافہ ہے. ملاحظہ ہو سے

ظلمتِ زندگی مٹانے کو
علم و فن کا چراغ جلتا ہے

—— راجیندر بہادر موج

نام کتاب: ہندستانی سماج
مصنف: شیاما چرن دوبے مترجم: عزیز پریہار
قیمت: اکتیس روپے
ملنے کا پتہ: نیشنل بک ٹرسٹ نئی دہلی

ہندستانی سماج کی تشکیل میں مختلف عناصر کارفرما رہے ہیں اس کی تنظیم، سماجی ارتقا میں مختلف نسلوں کے باہمی تفاعل (Interaction) کی ہزارہا برس کی کہانی، مختلف مذاہب کے اثرات سیاسی نظام میں تبدیلیاں، معاشرتی آداب اور ثقافتی عناصر کا کیا کردار رہا ہے، اس پر یہ کتاب بڑے عالمانہ انداز میں روشنی ڈالتی ہے. فاضل مصنف نے بڑی تفصیل و جامعیت کے ساتھ ہندستان کے اس علاقے کے بارے میں بھی معلومات فراہم کی ہیں جس کے بارے میں عام طور سے بہت کم واقفیت ہے یعنی شمالی مشرقی علاقہ. ان میں اروناچل پردیش، میگھالیہ، میزورم اور ناگالینڈ کے لوگ ہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ بوڈو نام کسی مخصوص قبیلے کا نہیں ہے بلکہ لسانی خاندان کی متعدد برادریوں سے ہے. اسی طرح آسام کے جنوبی خطے میں رہنے والے کوکی چین، وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے روایتی طرز زندگی کو برقرار رکھا ہے ان میں سے بیشتر افراد نے عیسائیت قبول کر لی ہے. آسام کے شری شنکر دیو جو کائستھ رئیسوں کے خاندان سے تھے انھوں نے مذہبی اصلاحات کی، وحدت الوجود کا پیغام دیا. اگرچہ وہ ذات پات کے نظام کو جڑ سے اکھاڑنے میں کامیاب نہ ہو سکے. لیکن آسامی سماج کو یک جہتی اور اتحاد کے دھاگے میں پرو گئے.

دوبے جی نے شمال مشرقی ہندستان کے ساتھ جنوب کو بھی نظر انداز نہیں کیا اور تامل کلاسک تیروکرل جو تین سو عیسوی میں لکھی گئی اور جس میں ۱۳۲، ابواب ہیں اور کل تیرہ سو تیس (۱۳۳۰) اشعار یا کرل ہیں. اس کتاب کو انھوں نے کوٹل کے شاستر اور منو کی سمرتیوں کے ہم پلہ قرار دیا ہے.

انھوں نے بہت فاضلانہ انداز میں ۵۲ عیسوی میں سینٹ تھامس اور سینٹ بارتھولومیو کی آمد سے ہندستان میں عیسائیت کے آغاز

پر روشنی ڈالی ہے، اُس زمانے میں پرتگالیوں کو نصرانی کہا جاتا تھا۔

محترم دوبے جی کا زاویۂ نظر علمی ہے اور انھوں نے بہت غیر جانبدارانہ طریقے سے بہت سارے حساس اور نازک مسئلوں پر بحث کی ہے خصوصاً مسلمانوں کے پرسنل لا کے سلسلے میں ان کا نقطۂ نظر قابل تعریف ہے۔

انھوں نے غیر ضروری ترقی پسندی کا مظاہرہ بھی نہیں کیا ہے بلکہ ہندستانی سماج کے علمی پہلو پر نظر رکھی ہے عورت اور مرد کے تعلقات کے سلسلے میں لکھتے ہیں :

" سیاسی اور سماجی نظام سے ایسا ظاہر ہوتا ہے
کہ مرد اور عورت کے درمیان نابرابری کی خلیج حائل رہے
گی برابری کا راستہ طویل اور پرخار نظر آتا ہے۔"

آخر میں فرہنگ بھی ہے جو بہت ہی مفید ہے۔ اردو کی کتاب ہونے کی وجہ سے یہ پہلو بے حد قابل تعریف ہے کہ اس میں کتابت کی غلطیاں نہیں ہیں۔ ترجمہ بھی بہت اچھا ہے۔ البتہ ایک جگہ "شتاری" لکھا ہے جو کہ "شطاری" ہونا چاہیئے۔

—— ڈاکٹر رحمت علی خان

نام کتاب: "قرۃ العین حیدر کی منتخب کہانیاں"
قیمت : پچاس روپیے
ملنے کا پتہ : نیشنل بک ٹرسٹ اے/۵ گرین پارک
نئی دھلی

قرۃ العین حیدر دور حاضر کی وہ تخلیق کار ہیں جنھوں نے اپنی زندگی میں ہی ایک (LEGEND) یا اساطیری حیثیت اختیار کرلی ہے

انھوں نے اپنی کہانیوں میں ہمیشہ وحدت تاثر کا خیال رکھا اسی کے ساتھ ایک خوش گوار استعجابی فضا، کہانی میں موڑ اور دھیما دھیما سا تجسس ان کے وہ اوصاف ہیں جن سے نئی نسل کے افسانہ نگار ہی نہیں بلکہ مستقبل میں کہانی لکھنے والے بھی فیضان حاصل کرتے رہیں گے۔

موضوع کے اعتبار سے یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی طبقے کی معاشرت یا کسی عہد کی سماجیات یا تاریخی عوامل یا تہذیبی شناخت کا مسئلہ یا کوئی فلسفیانہ نکتہ ان سب میں زیریں لہر عورت کی زندگی کے المیہ کی شکل میں ملتی ہے انھیں پڑھتے ہوئے ایک ناتمام حسرت، ایک لازوال کسک اور ایک تیر نیم کش والا کرب محسوس ہوتا ہے اور یہ چھپا ہوا کرب بہت چپکے سے آہستہ آہستہ کہانی کے پردوں سے پھوٹ کر نکلتا ہے۔ وہ عورت کی زندگی کے اس رُخ کو خاص طور پر پیش کرتی ہیں جہاں اس کی امنگیں اور آرزوئیں اپنے ہی ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹ کر رہ جاتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر کی منتخب کہانیوں کے اس مجموعے میں بھی "کارمن" میں فلپائنی لڑکی منیلا میں اپنے نِک کا انتظار کرتے ہوئے اپنی آرزوؤں کے مرجھائے ہوئے پھول سے خود کو سجائے نظر آتی ہے۔ "فوٹوگرافر" میں بھی فوٹوگرافر کی دنیا نہیں بلکہ اس خاتون کی دنیا ہے جو اپنے چہرے پر وقت کی گرد کو اپٹن نہ بنا سکی۔ یا "ملفوظات حاجی گل بابا بیکتاشی" کی وہ خاتون جو طرح طرح کے لوگوں کو خط لکھ کر اپنے بچے کے باپ کی تلاش میں مصروف تھی۔ یا "کہرے کے پیچھے" کی کیتھرین یا مارتھا کا المیہ یا "حسب نسب" کی چھمی بیگم یا "سینٹ فلورا آف جارجیا کے اعترافات" کی فلورا "روشنی کی رفتار" کی مس پدما اور پھر "ڈالن والا" کی ڈائنا اور ریشم (بلی) ان سب میں عورت کا المیہ اس کی کچلی ہوئی خواہشات محدود مرکز کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ان کہانیوں میں بعض غیر فانی کردار ملتے ہیں۔ جس طرح نذیر احمد یا شرر یا پریم چند کی کہانیوں کے اکثر کردار ناقابل فراموش حیثیت اختیار کرچکے ہیں اسی طرح قرۃ العین حیدر کی کہانیوں میں بھی اکثر کردار ایسے ہی ہیں۔ "قلندر" کے اقبال بخت سکینہ ہیں جو ہر ملک ہر زمانے اور ہر دور میں رہے ہیں اور رہیں گے۔

انھوں نے کہیں کہیں بڑے نازک اور گہرے خیالات کو اشاریت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان میں فلسفہ ہے، معنی کی ہزار تہیں ہیں اور یہ فقرے بذات خود اپنی جگہ پر میر و غالب کے شعر کی طرح لطیف و نفیس معلوم ہوتے ہیں۔

"... لیکن وہ بچے انگوروں کی بیل میں چھپی اس
کوٹھی میں شاید اسی طرح موجود قہقہے لگا رہے ہیں۔"
——— (جگنوؤں کی دنیا)

" خداوندا ! میں انتہائی عجز سے اقرار کرتی ہوں

زندگی کی نظرت —— ساڑھے تیرہ سو برس قبل کی
بند ہونے کے بعد بھی نہیں بدلتی۔

(سینٹ فلور آف جارجیا کے اعترافات)

اس مجموعے میں بارہ کہانیاں ہیں اور اکثر پہلے شائع ہو چکی ہیں۔ ان افسانوں کے نیچے ان کی تاریخ تخلیق بھی دے دی گئی ہوتی تو اسکولوں کے طلبا و طالبات کے لئے بھی اس کی افادیت اور بڑھ جاتی۔ طباعت اور کتابت کے اعتبار سے بھی کتاب بہت خوبصورت ہے۔ صفحات ۱۶۰ ہیں۔

—— نوشابہ سردار

نام کتاب: "لگی"
مصنف: انصاری اصغر جمیل قیمت: ۳۰/- روپے
ملنے کا پتہ: انتخاب پبلشنگ ہاؤس۔ مومن پورہ
ناگ پور ۴۴۰۰۱۸

انصاری اصغر جمیل کی اس کتاب میں بائیس مضامین ہیں جنھیں مزاحیہ خاکوں کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یہ خاکے انھوں نے ادب کے موجودہ متغیر رجحانات و تجربات پر لکھے ہیں۔ ان تحریروں کا ہدف وہ حقائق ہیں جن سے معاشرے میں عدم توازن جنم لے رہا ہے۔ آج کے مجروح حالات پر انھوں نے اپنے قلم سے نشتر زنی کا کام بھی لیا ہے اور مرہم بھی لگایا ہے۔

بقول ڈاکٹر شرف الدین ساحل (کتاب میں شامل مضمون):

"انھوں نے مشہور مقامی فن کاروں کی زندگی اور
ان کی شخصیت پر جو خاکے لکھے ہیں وہ بھی مثالی ہیں
اور غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں"۔

کتاب کے مصنف قابلِ لحاظ مزاح نگار ہی نہیں، ناگ پور کے معروف شاعر بھی ہیں، اس لیے جا بجا شعری چٹکیاں بھی عبارتوں کی جان ہیں۔ کتاب اپنی طباعت، کتابت اور آراستگی کی بنا پر منفرد گٹ اپ کی حامل ہے۔ کاغذ عمدہ ہے۔ لاگت کے اعتبار سے بھی کم قیمت ہے۔

—— تسنیم خان صدیقی

نام کتاب "مہکے مہکے پھول" (شعری مجموعہ)
شاعر: عاصم گونڈوی قیمت ۲۵/- روپے
ملنے کا پتہ: وزیر آباد کالونی، جی۔ این۔ مندر
گورکھپور

ہر زبان کا تقاضہ اور اہلِ علم کا فریضہ ہے کہ ادب میں ایسے شہ پارے تخلیق ہوں جو ملک و قوم کے نونہالان کی ذہنی نشو و نما اور معاشرتی زندگی کو بہتر بنانے میں معاونِ خاص کا رول ادا کر سکیں۔

"مہکے مہکے پھول" کے گلدستے کے تزئین کار مشہور شاعر اور صحافی جناب عاصم گونڈوی ہیں جو اس سے قبل "خیالوں کا سفر" "نور و نکہت" "گلِ فردوس" اور "نگارِ تکیہ" کے بھی تخلیق کار ہیں۔ "مہکے مہکے پھول" کئی لحاظ سے قابلِ توجہ بھی ہے اور لائقِ ستائش بھی جو کم و بیش ۴۵ نظموں پر مشتمل ہے۔

اسلوب بیان آسان اور سریع الفہم ہے۔ عنوانات دل چسپ اور مفید ہیں۔ مثلاً "اونچا اپنا نام کرو"۔ "علم سے میرا دامن بھر دے" حروف تہجی کی ترتیب سے اوصافِ حمیدہ کی تعلیم کی کوشش میں ایک نظم بڑی دل چسپ ہے۔ تلفظ کی صحیح ادائیگی کا لحاظ بھی عاصم صاحب نے لازم سمجھا ہے۔

مجموعی طور پر عاصم صاحب کا زیرِ نظر مجموعۂ نظم ہر لحاظ سے مستحسن ہے کتابت، طباعت خاصی اور گٹ اپ جاذبِ نظر ہے۔ یقین ہے کہ عاصم صاحب کا یہ مجموعہ نونہالانِ قوم کو مہکانے کے ساتھ ساتھ ان میں ارزو دانی سے شغف اور انہماک کی عطر بیزی بھی کرے گا۔

—— شمیم عثمانی

نام کتاب: "ندی" (ناولٹ)
مصنف: شموئل احمد قیمت: ۵۰/- روپے
ملنے کا پتہ: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ نئی دہلی

شموئل احمد کا یہ دوسرا ناول ہے۔ ندی کی روانی اس ناولٹ میں صحافت سے بہت کراتی ہے۔ اس کے کردار جس قدر عجلت پسند ہیں اسی قدر

معنف کبھی عجلت پسند ہے۔ اسے کہانی بڑھانے سے زیادہ ختم کرنے کی جلدی ہے اور ناولٹ کی قابل تعریف بات یہ ہے کہ یہی عجلت قاری کے اندر بھی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ایک ہی نشست میں پورا ناولٹ پڑھ لیتا ہے۔

اس کے موضوع میں قاری اپنے آپ کو Involve پاتا ہے۔ اس کی کہانی دراصل ایک بیڈروم کی الجھن بھری کہانی ہے۔ قاری پڑھتے پڑھتے اس میں ڈوب جاتا ہے اور پتہ بھی نہیں چلتا کہ ناول کب ختم ہو گیا جبکہ اس کے اختتام کے بعد بھی اور آگے پڑھنے کی خواہش برقرار رہتی ہے۔

اس ناولٹ کا ہیرو حالاں کہ اچھی تنخواہ پاتا ہے اور اس کے پاس آسائش کے بھی تمام سامان موجود ہیں مگر وہ صرف مادی ضرورتوں کے لیے زندہ ہے۔ ہر کام وقت پر، ہر چیز مقرر کردہ جگہ پر۔ یہی اس کی زندگی کا مقصد ہے۔ اس کی اسی غیر فطری سلیقہ مندی سے اس کی بیوی عاجز ہے۔ اس کا ہر کام وقت پر صرف اپنے لیے ہوتا ہے۔ اس کا طریقۂ کار اس کو خود غرض اور مطلب پرست بنا دیتا ہے۔ مردوں کی اس صدیوں پرانی بیماری کو شموئل احمد نے بیان کرنے کی جرأت کی ہے۔ یہ مصنف کی خوبی ہے۔ اردو کے مصنف عام طور پر عورت کی کمزوریوں کو بیان کرتے آئے ہیں۔ شاید پہلی مرتبہ ہوا ہے کہ کسی مرد مصنف نے عورتوں کے بجائے مردوں کی کمزوریوں کو بیان کیا ہے۔ اس حق گوئی کے لیے شموئل احمد مبارکباد کے مستحق ہیں۔

——— شبنم رضوی

خودکشی

صفحہ ۴۴ کا بقیہ

جسم میں بھی جان ہے اس میں بھی ایک دل ہے ... جو دھڑکتا ہے جس میں خوشی اور غم کا احساس ہوتا ہے ... جس میں کسی کی تلخ کلامی سے تیر لگتے ہیں ... میں ہر لمحہ ٹوٹتی رہتی ہوں ... خود کو سنبھالتی رہتی ہوں ... لیکن اب ... ناممکن ہو گیا ہے ....

لیکن تمہارے مر جانے سے کیا کسی کو تکلیف ہوگی ... ؟

نہ ہو ... مجھے پرواہ نہیں ... مجھے تو سکون مل جائے گا ... میرا کون ہے، جو میرے لئے تڑپے گا ... یہ کام تو صرف میرا ہے ... تڑپنا یاد کرنا فریاد کرنا صرف میرے نصیب میں ہی ہے .... لوگوں کو کیا کرنا ... میں مروں یا جیوں کیا فرق پڑتا ہے ... میں رات دن گھٹتی رہتی ہوں ... روتی رہتی ہوں ... میں نے بہت سوچا ... لیکن مجھے کوئی راستہ نظر نہیں آیا ... سوائے موت کے۔

موت کیا کوئی راستہ ہے ... ؟

نہ سہی، منزل تو ہے میری ———

لیکن یہ موت کہاں ہے ... یہ تو خودکشی ہے ———

یونہی سہی ... مر تو جاؤں گی ———

لیکن ... تم تو روز خودکشی کرتی ہو ... مریں نہیں ابھی تک ...

میں روز خودکشی نہیں کرتی ———

کرتی تو ہو ... روز تم زہر پیتی ہو ———

میں زہر نہیں پیتی ———

ابھی تو تم نے بتایا ... تم لوگوں کی نفرتوں، فریب، ناکامی اور محرومی کا زہر روز پیتی ہو ... پھر یہ آج نیا انداز کیوں اپنا رہی ہو ...

میں روز زہر پیتی ہوں ... ہاں پیتی تو ہوں ———

لیکن ... مریں کیوں نہیں ——— ؟

کیونکہ تمہیں جینا ہے ———

——— ابھی تمہیں دنیا میں پھیلی ہوئی نفرتوں کا مقابلہ کرنا ہے ———

——— تمہیں ان لوگوں سے مقابلہ کرنا ہے؛ جو سماج میں صرف نفرت بانٹتے ہیں ———

——— ابھی ان کا انجام دیکھنا ہے، جو کسی کی معصومیت کو چھیلتے ہیں، جو اپنے حصے میں خوشیاں سمیٹ کر دوسروں کو غموں کے حوالے کر دیتے ہیں ——— !

تمہیں دیکھنا ہے دنیا انہیں کیا دیتی ہے ... لوٹ جاؤ واپس ... اور بغیر کوئی امید باندھے اس دنیا میں زندہ رہو ... پھر کبھی خودکشی کی ضرورت نہیں پڑے گی ... !!

□□

اودھ نمبر (۲)

تاثرات کے آئینے میں

عزیز مکرم!

اودھ نمبر (۲) نظر افروز ہوا۔ تمھیں مبارکباد کا خط لکھنے ہی والا تھا کہ آج کی ڈاک سے یہ ادبی تحفہ ملا۔ لکھنؤ تہذیب کے خوبصورت مرقعوں ہی کی طرح حسین و جمیل! اس میں لکھنؤ کے مطبعوں اور ان کی طرف سے پیش فرمودہ اشاعتوں پر بھی ایک مقالہ شامل ہونا چاہیے تھا۔ اس وقت کتھک ڈانس کا بھی خیال آرہا ہے۔

میری طرف سے شکریہ قبول کرو۔

——— تنویر احمد علوی۔ دہلی

مکرمی! نیا دور کا اودھ نمبر کچھ عرصہ قبل موصول ہوا۔ یہ نمبر بھی آپ نے اس قدر خوبصورت اور بھرپور نکالا ہے کہ اس کی تعریف ممکن نہیں۔ شروع سے آخر تک یہ آپ کے سلیقے، نفاست اور خلوص کا نمونہ ہے۔ صوری اعتبار سے تو یہ شاید اودھ نمبر۔ ۱" سے بھی بہتر ہے اور معنوی اور موضوعاتی اعتبار سے دونوں نمبر ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ بیشتر مضامین بڑے خلوص اور ذوق و شوق سے لکھے گئے ہیں اور کافی معلوماتی اور دلچسپ ہیں اور مجموعی طور پر یہ اودھ کی طرز زندگی، تہذیب اور تمدن کے مختلف پہلوؤں کو بڑی خوبی سے پیش کرتے ہیں۔ البتہ اکثر مضامین میں تجزیاتی عناصر کی کمی محسوس ہوتی ہے جس کی ایک جھلک قرۃ العین حیدر کی تحریر "شہر آمد و" میں دیکھی جا سکتی ہے کیوں کہ انھوں نے حالیہ صورت حال کے تعلق سے کچھ اہم اور پریشان کن سوال اٹھائے ہیں۔

——— زاہدہ زیدی۔ علی گڑھ

برادرم! سب سے پہلے اودھ نمبر کی شاندار اور پرکشش اشاعت پر مبارکباد قبول فرمائیے۔ اتنا خوبصورت رسالہ ہے کہ دیکھتے ہی فریفتہ ہو جائیے اور پڑھتے جائیے تو چھوڑنے کی خواہش نہیں ہوتی۔ ویسے تو آپ کے سبھی نمبر ایک سے ایک ہیں۔ میرے پاس آپ کے "فراق نمبر" کے دونوں حصے موجود ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس رسالہ کو معیاری اور جاذب نظر بنانے میں آپ کی انتھک محنت کو دخل ہے۔ کس محنت اور لگن سے آپ نے سارے مواد اکٹھا کیے ہیں، اس کا اندازہ کچھ وہی کر سکتے ہیں جو کبھی رسالہ نکالنے کی جسارت کر چکے ہیں۔ خدا کرے آپ اچھے رہیں اور یوں ہی ترقی کی ساری منزلیں طے کرتے رہیں۔ آمین

——— صابر آروی۔ پٹنہ

مکرمی! اودھ نمبر حصہ دوم نظر نواز ہوا۔ نقشِ اول سے زیادہ کامیاب آپ کا نقش دوم ہے، جس میں آپ نے ہر مکتب خیال کے ادیب کو اودھ کی تہذیبی اور ثقافتی جھلک دکھلانے کے لیے آمادہ کیا ہے۔

"نیا دور" اس طرح ہر لحاظ سے ایک مکمل دستاویز ہے جو آنے والی نسلوں کے لیے آئینے کا کام دے گا۔

چونکہ میرا خمیر گومتی سے نکلا ہے یعنی میری پیدائش لکھنؤ اور وہ بھی فرنگی محل کی ہے اس لیے تھوڑا بہت حق اور مناسبت اس جریدے سے ہوتی ہے۔

——— سید علی محمد۔ حیدرآباد

مکرمی! نیا دور کا اودھ نمبر حصہ دوم نظر نواز ہوا۔ شروع سے آخر تک سبھی مضامین قابل ستائش ہیں۔ یہ شمارہ اپنے مواد اور مشمولات اور تزئین و آرائش کے لحاظ سے ایک نہایت وقیع اور یادگار ادبی و ثقافتی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

خصوصی مضامین "لکھنؤ: کچھ یادیں۔ کچھ باتیں" (آل احمد سرور) "یادوں کی رہ گزر" (علی جواد زیدی)۔ "لکھنؤ کا گم شدہ دسترخوان" (حسن واصف عثمانی) اور "ندوۃ العلماء کا تاریخی پس منظر" (نذر الحفیظ ندوی) کافی اہمیت کے حامل ہیں۔

اس نادر شمارے کے لیے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں، جسے قبول فرمائیں۔

——— محمد شمیم الاسلام۔ لکھنؤ

ماہنامہ
نیا دور

جلد ۵ نمبر

عنوانات

اپنی بات	ایڈیٹر	۲
وہ جن کو کہتے ہیں ہم سب مہاتما گاندھی (نظم)	رباب رشیدی	۳
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا (خودنوشت)	سید علی رضا حسینی	۴
غزلیں	قضا ابن فیضی	۹
	مظہر امام	۹
ایک اہم بیاض	سید امیر حسن عابدی	۱۰
میرا بھارت مہان (نظم)	امام اعظم	۱۳
زوال کا وقت (نظم)	جعفر عسکری	۱۳
تصورِ تمثیل	عتیق اللہ	۱۴
تھانہ بھون: آزادی کے سورماؤں کی سرزمین	اسحاق سنبھلی	۲۰
محبت (نظم)	اختر عمر اختر	۲۴
غزلیں	بشیر فاروقی	۲۵
	شاعر فتحپوری	۲۵
	مظہر رائے بریلوی	۲۵
شیر واڈکر: شخص اور شاعر	فیاض رفعت	۲۶
دیمک (افسانہ)	آصف فرخی	۳۰
غزل	شبنم گورکھپوری	۳۷
جدیدیت	خورشید انور	۳۸
نوچندی میلہ: مذہبی رواداری کا نقیب	شیخ عارف الدین	۴۱
غزل	معصوم اعظمی	۴۲
دیوالی کا سندیس (نظم)	مومن خاں شوق	۴۳
تاج محل (قطعہ)	معراج احمد	۴۳
نقد و تبصرہ	سبط محمد نقوی۔ نامی انصاری	۴۴
	امیر احمد صدیقی۔ سلیم عمر۔ اخلاق احمد	تا
	جمیل عسکری۔ عابد نظر۔ سید محمد فصیح	۴۷
اودھ نمبر (۲) تاثرات کے آئینے میں	خطوط قارئین	۴۸

اپنی بات

دسہرے کا تہوار ایک طرح سے زندگی کی اعلا قدروں کی فتح کی یادگار کے طور پر منایا جاتا ہے۔ دس دن تک یہ تہوار بڑی آن بان اور شوکت و تجمل کے ساتھ جوش و خروش سے منایا جاتا ہے۔ مریادا پرشوتم رام چندر جی کی سیرت و کردار کے مختلف گوشے، ان کی شجاعت اور بہادری اور اطاعتِ والدین کے پہلو جھانکیوں کے ذریعہ عوام کے سامنے آتے ہیں۔ یہ تہوار سب لوگ مل کر مناتے ہیں دسہرے کا جلوس دیکھنے والوں میں یا بھرت ملاپ کے نرم و نازک اور نفیس جلوس کا نظارہ کرنے والوں میں ہر طبقے ہر خیال اور ہر مذہب کے لوگ شامل ہوتے ہیں — اور یہی ہندستانی تہذیب کی بے مثال خصوصیت ہے جس کی نظیر عالمی تاریخ ادب میں نہیں ملتی۔

یوں تو اُردو شاعری میں دسہرے پر بے شمار نظمیں ملتی ہیں لیکن یہ بات بھی یادگار رہے گی کہ سب سے اچھی نظم علامہ اقبال کی ہے جنھوں نے رام کو 'امامِ ہند' کے عالی مرتبت لقب سے یاد کیا ہے

اسی اکتوبر کے مہینے میں دیوالی کا تہوار بھی پڑ رہا ہے جو دراصل ہماری قومی تحریک کا جشنِ چراغاں ہے اب جگمگاتے ہوئے دیے تو کم ہو گئے ہیں اس کی جگہ بجلی کے قمقموں نے ماحول کو روشن اور منور کر دیا ہے، اس تہوار میں ہر شخص کی یہ تمنّا ہوتی ہے کہ لکشمی دیوی اس کے مکان کو شرف بخشیں اور دراصل انھیں کے خیر مقدم کے لیے چراغاں بھی ہوتا ہے تاکہ خوشحالی اور امن و سکون کا دور دورہ ہو۔

جشنِ چراغاں کے اس مبارک موقع پر ہماری دُعا ہے کہ پورے ملک میں امن اور شانتی رہے اور ان چراغوں کے ساتھ اور ان ہی کی طرح عوام کی مسکراہٹوں کے چراغ بھی روشن رہیں۔

اکتوبر ہی کے مہینے میں بابائے قوم مہاتما گاندھی کا یوم پیدائش بھی عقیدت و احترام کے ساتھ پورے ملک میں منایا جاتا ہے۔ مہاتما گاندھی کا یوم پیدائش سارے ہندستانیوں کے لئے یہ پیغام لاتا ہے کہ عدم تشدّد اور سچّائی کا راستہ ہی وہ راستہ ہے جس پر چلنے میں پورے ملک بلکہ ساری دنیائے انسانیت کی نجات ہے اور یہ کہ تشدد دہشت گردی، انتہا پسندی نہ کبھی مسئلے کا حل تھا اور نہ ہو سکتا ہے۔ مہاتما گاندھی کے اس پیغام کی اشاعت ملک کو ترقی کے راستے پر لے جائے گی۔ ان الفاظ کے ساتھ ادارہ نیا دور بابائے قوم کو خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔

——— ایڈیٹر

وہ جن کو کہتے ہیں ہم سب مہاتما گاندھی

وہ میرِ قافلہ وہ پاسبانِ آزادی
وہ افتخارِ ہمالہ، نشانِ آزادی

ورق ورق پہ درخشاں وہ کہکشاں کی طرح
وہ خود شناس وہ رُوحِ روانِ آزادی

کیا تو صرف اہنسا کا انتخاب کیا
بڑے جگر سے دیا امتحانِ آزادی

وہ حرف حرف میں تاثیر دوڑتی جیسے
وہ دلنواز وہ سحرُ البیانِ آزادی

طلوعِ مہر کی تعبیر بھی تراشی گئی
چمک ہوئی وہ سرِ آسمانِ آزادی

نگاہ و فکر کی ان وسعتوں کا کیا کہنا
سمٹ کے آگیا جن میں جہانِ آزادی

جو لوگ دُور تھے اور اختلاف رکھتے تھے
وہ پاس آکے ہوئے ہم زبانِ آزادی

غرضکہ اہلِ وطن ساتھ ساتھ چلنے لگے
کوئی بھی رہ نہ سکا بدگمانِ آزادی

بس ایک رنگ ہی مرغوب و دل پسند ہوا
سبھی دکھائی دیئے ترجمانِ آزادی

بہار آگئی، ہندوستاں مہکنے لگا
مشامِ جاں میں کھلا گلستانِ آزادی

جو اُس میں شخص تھا، کامل تھا رہبری کیلئے
بڑا عجیب تھا وہ کاروانِ آزادی

اُداس لمحوں میں پھر یاد آگئے باپو
ہمیں کچھ اور بھی غمگیں بنا گئے باپو

تصوّرات میں پرچھائیاں اُبھرنے لگیں
گئے دنوں کے مناظر دکھا گئے باپو

اُٹھے تو ایسے اُٹھے سامراجیت کے خلاف
فضا پہ ابر کی مانند چھا گئے باپو

وہ امتیاز وہ نخوت وہ برتری وہ سلوک
نجات جن سے سدا کو دلا گئے باپو

وہ ملک و قوم کی خاطر سفر چٹانوں کا
مٹایا خود کو تو منزل کو پا گئے باپو

انھیں سے آج بھی ماحول میں اُجالا ہے
چراغِ راہ میں کیا کیا جلا گئے باپو

مگر یہ فرقہ پرستی کا ایک سیلِ گراں
کہ جاں سے جس کیلئے بار ہا گئے باپو

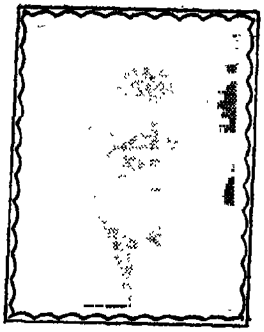
وہی اصول ضروری ہیں زندگی کے لئے
کہ جن اصولوں پہ چلنا سکھا گئے باپو

وہ ان کے خوابوں کا ہندوستاں بنانا ہے
نحیف جسم پہ کیا دُکھ اٹھا گئے باپو

محبتوں کا وہ پیغام ہی سبھی کچھ ہے
لہو سے اپنے جسے جگمگا گئے باپو

رباب رشیدی
۱۲۶ - تازی خانہ، لکھنؤ ۱۸

خود نوشت



سید علی رضا حسینی
سابق صدر شعبۂ اردو، کرائسٹ چرچ پوسٹ گریجویٹ کالج
کانپور

مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا...

نرمی ہے وہی گدازِ صبحگاہی ہے وہی
دل ہے وہی دل کی بادشاہی ہے وہی
مٹنے کو تو مٹ گئے ہیں لیکن اے دوست
اندازِ مزاجِ کج کلاہی ہے وہی

آج جب میں زندگی کی پچھترویں سیڑھی پر قدم رکھنے کو ہوں، میرے شاگرد، میرے ہمدرد، میرے دوست، میرے خیرخواہ اور میرے عزیز واقارب باربار یہ اصرار کرتے ہیں کہ جاتے جاتے کچھ اپنے بارے میں بھی تو بتاتے جائیے۔ اس اصرار پر یہ خیال کرکے تھوڑی دیر کے لئے خوشی تو ضرور ہوتی ہے کہ یہ سب میرے بعد مجھے تحریری شکل میں محفوظ رکھنا چاہتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ خیال آتے ہی کہ اتنے دن ساتھ رہنے کے باوجود بھی یہ سب نہ تو مجھے سمجھ پائے، نہ جان پائے اور میں آج تک ان سب کے لئے بس ایک اجنبی کی صورت میں ہوں، دکھ بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس سرائے فانی میں رہنے والوں کا یہی حال ہر جگہ نظر آتا ہے۔ تبھی تو اکثر سوچتا ہوں کہ اس زندگی سے تو وہ موت بہتر ہے کہ جس پر سب آنسو بھی بہاتے ہیں، روتے بھی ہیں، یاد بھی کرتے ہیں اور ہر وقت و ہر لمحہ اپنے پاس یاد کے طور پر ہی سہی لیکن محفوظ تو رکھتے ہیں۔

غرضکہ ان دنوں شاگردوں اور محبّت کرنے والوں کا یہ اصرار بڑھتا جارہا ہے کہ کچھ اپنے بارے میں لکھیے۔ اب ذرا تصوّر کیجیے کہ میری عمر کے کسی بھی آدمی سے یہ کہیے کہ ذرا آنکھ بند کرکے اُلٹے قدم چلیے اور جتنی سیڑھیاں اوپر چڑھ چکے ہیں اتنی ہی ایک ایک کرکے پھر اتریئے تو کیا اس کے لیے یہ کام آسان ہوگا؟ اور پھر ایسی حالت میں کہ جب بینائی بھی کم ہو گئی ہو، ہاتھوں میں قلم پکڑنے کی قوت بھی گھٹ گئی ہو، مسلسل بیمار رہنے کی وجہ سے زیادہ دیر تک بیٹھ کر لکھنا بھی دشوار ہوگیا ہو۔ اوّل تو یہ کام مشکل دوسرے بقول غالبؔ ؎

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے؟
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

بات آج کی اسی سیڑھی سے شروع ہوتی ہے جس پر میں آج کھڑا ہوں ان دنوں اپنے ماموں جناب محمد صادق حسنا مرحوم کے مکان ۹۶/۲۳، چوراہا کرنل گنج، کان پور کے بالائی حصّے میں رہ رہا ہوں۔ (ماموں صاحب جن کا شمار کان پور کے صفِ اوّل کے وکیلوں میں ہوتا تھا، اور آج بھی لوگ موصوف کی اس خوبی کے معترف ہیں کہ عدالت میں ان سے اچھی جرح کوئی نہیں کرتا تھا اور جن کے حافظے کا یہ عالم تھا کہ ساری کی ساری نظیریں ان کے ذہن میں اس طرح محفوظ رہتی تھیں کہ کتابوں کے صفحات مع سطور یاد رہتے تھے۔ گھر میں قانون کی ایک کتاب بھی نہ تھی، جو کتاب بار ایسوسی ایشن میں ایک بار دیکھ لی وہ حفظ ہوگئی)۔ میرے ساتھ میری رفیقۂ حیات (ماموں محمد صادق کی بڑی صاحبزادی)، میری چھوٹی بیٹی اور اس کے دو بچے رہتے ہیں۔ روز و شب زیادہ تر کتب بینی میں خرچ ہوتے ہیں یا پھر کبھی ایک آدھ غزل کہہ لی، یا کچھ لکھ لیا اور بس۔ اس کے علاوہ اللہ اللہ کرتے گزرتی ہے۔ ادبی نشستوں کے لیے دعوت نامے اب بھی آتے ہیں لیکن اب وہ ہمت نہیں رہی کہ ان میں شرکت کرسکوں۔ یہی صورت یونیورسٹی سے متعلق آئے ہوئے کاموں کی ہے کہ ملک کی متعدد یونیورسٹیز سے بحیثیت ممتحن بلایا جاتا ہوں، جی بھی چاہتا ہے اور کچھ آمدنی کے امکانات بھی رہتے ہیں لیکن صحت کی خرابی نے ایسا مجبور کر رکھا ہے کہ انکار کردینے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔

آج سے پندرہ سال قبل ۱۹۸۰ء میں کرائسٹ چرچ پوسٹ گریجویٹ کالج، کان پور سے بحیثیت صدر شعبۂ اُردو ریٹائر ہوا تھا۔ اس وقت تک ہاتھ پیر کام کر رہے تھے۔ درس گاہوں کا ماحول بھی اس قدر آلودہ نہیں ہوا تھا جو صورتِ حال آج ہے۔ خوش قسمتی سے کچھ بہت اچھے شاگرد بھی تھے جن میں کچھ سیکھنے کی لگن بھی تھی اور صلاحیت بھی۔ ان کے اس ذوق نے ہمیشہ ہی میرے رخشِ حیات و ادب کو مہمیز رکھا اور میں درس و تدریس کے علاوہ بھی کالج اور کالج سے باہر کچھ نہ کچھ کرتا رہا۔ مشاعروں کا انعقاد، بین المدارس اردو مباحث، سیمینار، مقالہ نگاری یہ سارے کام محض تفریحِ طبع کے طور پر نہیں بلکہ اس لیے بھی اپنا رکھے تھے کہ اوّل تو اُردو کا چراغ اسی تابندگی سے روشن اور منوّر رہے، دوسرے نئے طالبانِ علم ان شخصیات سے متعارف ہوسکیں جن کی سربراہی میں کاروانِ اُردو اپنا طویل سفر طے کرتا ہوا یہاں تک پہونچا تھا۔ چنانچہ اسی مقصد کے پیشِ نظر ۱۹۶۰ء میں جب دوبارہ کرائسٹ چرچ کالج جوائن کیا تو کالج کی ان مخصوص نشستوں میں ایک بار پروفیسر احتشام حسین صاحب کو بلا کر مقالہ نگاری کے ایک پروگرام کا انعقاد کروایا جس میں "میر مثنویات کے آئینہ میں" پر سیر حاصل مقالے پڑھے گئے۔ دوسرا خاص موقع کالج کے طلبا کو کئی اہم شخصیات سے متعارف کرانے کا تھا جب میں نے غالب صدی پر محترم خواجہ احمد فاروقی کو کالج آنے کی دعوت دی۔ ان دنوں یونیورسٹی کے وائس چانسلر آچاریہ جگل کشور جی تھے جنھوں نے اس جلسہ کی صدارت فرمائی تھی —— غالب کی الم پسندی۔ غالب کے مزاج کے بنیادی عناصر اور غالب آئینہ ایام میں —— جیسے مخصوص عنوانات پر مبنی ایک سیمینار کا انعقاد عمل میں آیا (اس پروگرام کے شرکا کی فہرست قدرے طویل ہے یہاں سب کے نام لکھنا مناسب نہ ہوگا لیکن یہ یاد آتا ہے کہ مسیح الزماں صاحب بھی موجود تھے۔ منٹ مشاعروں، سیمینار اور ڈبیٹ کا یہ سلسلہ بہر حال ۱۹۸۰ء یعنی میرے ریٹائر تک جاری رہا۔

۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۰ء تک کے اس طویل عرصہ میں میری برابر یہ کوشش رہی کہ کالج میں اُردو ایم۔اے کلاسز بھی شروع ہو جائیں۔ اس سلسلے میں میرے ایک بہت ہی لائق شاگرد، جو تعلیم مکمل کرنے کے بعد سیاست میں آگئے اور حکومت اترپردیش میں وزیر کے عہدے پر بھی فائز رہے اور جنھیں لوگ مختار انیس کے نام سے جانتے ہیں، انھوں نے بھی اپنے دورِ حکومت میں بہت کوشش کی مگر وہ دور اُردو کے لیے سازگار نہ تھا اور اپنے پرائے سب ہی اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے تھے لہٰذا کامیابی نہ مل سکی۔ جب میں ملازمت سے سبک دوش ہونے لگا تو معلوم ہوا کہ اب سرکار نے کالج میں ایم۔اے (اردو) کلاسز چلانے کی اجازت دے دی ہے تب تک بہت دیر ہو چکی تھی اور میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اب اگر کوئی کوشش کرنے والا ہو تو امید ہے کہ موجودہ سرکار اس کی منظوری دے دے۔

۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۰ء تک پاکستان میں رہا۔ حیدرآباد (سندھ) ان دنوں مرزا عابد عباس صاحب کی وجہ سے ادبی مرکز بنا ہوا تھا۔ وہاں کی ادبی سرگرمیوں میں حصّہ لینے کا موقع ملا۔ گیا تو تھا اپنے عزا سے ملنے لیکن حسنِ اتفاق سے وہاں کے سٹی کالج میں وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے تقرری مل گئی۔ حالاں کہ نہ مجھے پاکستان میں رہنا تھا اور نہ ملکوں کی یہ تقسیم میرے حساب سے صحیح تھی۔ مجھے لوٹ کر بہرحال اپنے وطن ہندستان آنا تھا اور کرائسٹ چرچ کالج میں ہی رہ کر کام کرنے میں مزہ آرہا تھا، لیکن دوستوں اور عزیزوں کے بے حد اصرار پر میں نے وقتی طور پر وہ کالج جوائن کر لیا جہاں مجھے ہندستان سے آئے ہوئے پروفیسر کی حیثیت سے اچھی خاصی عزت ملی۔ کالج کے پرنسپل ان دنوں مرزا عابد عباس صاحب تھے، جو بعد میں پنجاب ایجوکیشن بورڈ کے سکریٹری ہو گئے تھے۔ موصوف اپنی ذات میں ایک انجمن کی حیثیت رکھتے ہیں اور اب تک وہاں کے معیاری ادبی حلقوں کے روحِ رواں ہیں۔ مرزا صاحب کے گھر پر ہی وہاں کی مقتدر ہستیوں کا ہجوم رہتا تھا۔ حمایت علی شاعر، عظیم عباسی، سید محمد جعفری، عبدالقوی صاحب، محمد نصیر صاحب، محترم عقیل قدوائی جناب آر۔کے۔ فیضی (کلکٹر) اور دیگر معتبر حضرات کے علاوہ ہندستان سے جانے والے ادبا و شعرا سب کے سب مرزا صاحب کے یہاں روز ہی جمع ہوتے تھے، وہیں جوش ملیح آبادی، شوکت تھانوی، ظریف جبل پوری جمال الدین نقوی، پروفیسر کرار حسین (وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی) سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ ان سب حضرات سے برابر ملتے رہنے پر اوّل تو بات سمجھ میں یہ آئی کہ اگر دونوں ممالک کے دانش ور، صاحبِ نظر اور

اہلِ علم حضرات باہم اسی طرح وقتاً فوقتاً ملتے رہیں تو ایک دوسرے کو سمجھنے کا بھی موقع ملے گا دوسرے یہ دُوریاں ختم ہوتے ہوتے ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب ہمارے تعلقات ایک دوسرے سے نہایت اچھے ہو جائیں گے اور ذہنوں کی یہ کشادگی، قربت اور اچھی ہم سائیگی میں تبدیل ہو جائے گی۔

بہرحال وہاں رہ کر مجھے یہ احساس ہر لمحہ ہوا کہ سیاسی بندھنوں کو توڑ کر ہم دونوں اب بھی ساتھ ساتھ رہنا پسند کرتے ہیں۔ میں کیا اور میری حیثیت کیا! لیکن پھر بھی وہاں میری جس صورت سے پذیرائی ہوئی اسے بھول پانا کچھ آسان نہیں۔ ہر ادبی پروگرام میں تو میری شمولیت کو ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ریڈیو پروگرام خاصے ملے اور ہندستان کی نمائندگی کرنے کا بھی خاصا موقع ملا۔ آپسی تعلقات کو بہتر اور مستحکم بنانے کی غرض سے ہی میں نے مرزا عابد عباس صاحب کو بھی ہندستان آنے کی دعوت دی اور اپنے کالج میں طالب علموں اور ساتھیوں سے متعارف کرانے کی غرض سے موصوف کے لیے ایک مخصوص نشست کا اہتمام بھی کیا۔ کان پور شہر کے مختلف حلقوں کے متعدد حضرات کو یکجا کر کے یہ بتانے کا موقع ملا کہ پاکستان کے لوگ بھی حقیقتاً اس خلیج کو پاٹنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ مرزا صاحب سے مل کر سب ہی کو خوشی ہوئی۔ اسی صورت سے ایک سال ریڈیو پاکستان کی ایک ذمہ دار شخصیت اور شاعر و ادیب جناب زاہد نقوی صاحب نے کالج کے ایک خصوصی پروگرام میں اپنی غزلوں اور نظموں کے ذریعہ دونوں ملک کو اچھے ہمسایوں کی طرح رہنے کا پیغام دیا۔

۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۶ء تقریباً دس برسوں تک گونڈہ کے ٹامسن کالج میں درس و تدریس کے ساتھ ساتھ برابر اس کوشش میں لگا رہا کہ آنے والی نسل پُرانی تہذیب و اقدار سے ناواقف نہ رہ جائے لہٰذا اسی مناسبت سے وہاں بھی ثقافتی، ادبی اور تہذیبی پروگرام ترتیب دیتا رہا۔ پہلا مشاعرہ جو میں نے ٹامسن کالج میں کیا اس کی صدارت کے لئے نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی کو زحمت دی۔ ڈاکٹر معصوم رضا راہی، وامق جون پوری، فنا نظامی، نشور واحدی اور ہندستان کے دیگر شعراء نے کالج کے ان سالانہ مشاعروں میں شریک ہو کر بہرحال میرے مقصد کو کامیابی سے ہمکنار کرنے میں مجھے تعاون دیا۔ مشاعروں کے ساتھ ساتھ وہاں بھی سمینار کا سلسلہ چلتا رہا جس میں پروفیسر احتشام حسین صاحب نے متعدد بار میری دعوت پر پہونچ کر اساتذہ اور طلباء میں ادب میں تنقید و تبصرے کا شعور بیدار رکھنے میں ہر طرح سے تعاون فرمایا۔

گونڈہ میں رہائش میرے لیے دو خاص وجوہ سے اہمیت رکھتی ہے۔ اوّل تو یہ کہ میرے ایک بہت ہی ہونہار، باشعور و باصلاحیت شاگرد سرور عثمانی، جو بعد میں شاہ جہاں پور کالج میں انگلش کے ہیڈ ہوئے، نے مجھے شعر کہنے کی ترغیب دی:

"آپ شکل و صورت سے بالکل شاعر نظر آتے ہیں، تو پھر آپ شعر کیوں نہیں کہتے؟"

چنانچہ وہیں رہ کر ایک غزل میری پہلی شعری کاوش کی شکل میں عالمِ وجود میں آئی۔ اس پہلی غزل کے چند اشعار کچھ اس طرح ہیں ؎

نگاہِ ناز جو مائل بہ التفات نہ تھی
کمی تھی ذوقِ طلب میں کچھ اور بات نہ تھی

کبھی بھری تھیں جوانی سے چاندنی راتیں
گداز دل کا کرشمہ تھا واردات نہ تھی

فضائے عالمِ امکاں سنوار دی ہم نے
ہمارا حسنِ نظر آئینے کی بات نہ تھی

سکوں بلا تھا کبھی زندگی کے سائے میں
وجہ یہ تھی کہ ادھر چشمِ حادثات نہ تھی

کہیں پہ شورِ عنادل کہیں پہ خندۂ گُل
مہک رہی تھیں فضائیں اُداس رات نہ تھی

چمن سے دُور جب اہلِ چمن کی یاد آئی
جو دل پہ بیت گئی کیف و کم کی بات نہ تھی

یہ غزل میں نے کالج کے مشاعرے میں پڑھی تھی، پسند بھی کی گئی، کرشن چندر حیرت نے "آئینہ کی بات" پر کافی داد دی اور کہا کہ آپ کو تو باقاعدہ شاعری کرنی چاہیے۔ اس غزل کے بعد پھر خود بھی طبیعت شعر کہنے کی طرف مائل ہوئی اور بہت کم کہنے پر بھی اب تک تقریباً سو سوا سو غزلیں، ان کے علاوہ قصائد، شخصی مراثی، قطعات و رباعیات نظمیں اور منظوم خطوط کی تعداد بھی خاصی ہو گئی ہے۔ کچھ غزلیں، چند نظمیں، دو ایک قصائد اور بہت تھوڑے سے مضامین کے علاوہ

نثری و شعری تخلیق کا زیادہ تر حصہ تشنۂ اشاعت رہ گیا اور اب تک باقاعدہ کتابی شکل میں مرتب نہیں کیا جا سکا اس لیے کہ میرے ننھیال (جہاں میرے عقل و شعور کی پرورش ہوئی) میں شائع کرانے یا شہرت حاصل کرنے کا شوق اس زمانے کے مستند شعرا اور ادیب حضرات کو جیسے تھا ہی نہیں۔ چنانچہ مجھے بھی کبھی دھیان نہ آیا کہ ان سب کی باقاعدہ اشاعت بھی ہونی چاہیے۔ اس طرف میرے ایک بہت ہی لائق و فائق شاگرد محمد نجیب انصاری سلمہٗ جو آجکل محکمۂ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش میں انفارمیشن افسر ہیں (خدا ان کے مراتب میں روز افزوں ترقی فرمائے) گزشتہ کئی برسوں سے مُصر ہیں کہ سب کچھ یکجا کر کے شائع کروا لیجیے۔ خدا جانے یہ کام میری حیات میں پایۂ تکمیل تک پہونچے گا بھی یا نہیں۔

جن دنوں میں گونڈہ میں تھا، اس زمانے میں ترقی پسند ادبی تحریک اور کمیونسٹ تحریک، دونوں ہی عروج پر تھیں۔ ان تحریکوں نے مجھے بھی بے حد متاثر کیا اور میں بھی نام آوری کی شہرت کی فکر کے بغیر اس کارواں میں عملی طور پر اس صورت سے شامل ہو گیا کہ اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ پس ماندہ طبقے کی پرجوش وکالت کرنے لگا۔ نتیجتہً ایک بار ۱۹۴۹ء میں تین ماہ کے لیے اور دوسری بار ۱۹۵۲ء میں چھ مہینے کے لیے جیل بھی گیا جہاں رہ کر یہ احساس شدّت اختیار کر گیا کہ ہمیشہ سچ کی ہی پیروی کرتے رہنا بھی ایک قسم کی عبادت ہے۔ چنانچہ اس تحریک سے مدّتوں جڑا رہا اور آج بھی جو لوگ پس ماندہ طبقے کی حمایت میں کوشاں و سرگرداں ہیں۔ میں بھی ان کا ہر حال اور ہر زمانے میں حمایتی ہوں۔ میرے اسی مزاج نے مجھے معاشی طور پر تنگ دست رکھا اور ایک بار جب یادگار حسینی انٹر کالج، الہ آباد میں بطور پرنسپل میری تقرری ہوئی تو وہ جگہ مجھے صرف اس سبب سے پسند نہ آئی کہ وہاں رہ کر میرے اس جذبے کی تسکین نہ ہو پاتی لہٰذا تین مہینے کے بعد ہی وہاں سے چلا آیا۔

غرضکہ گھوم پھر کر میری ملازمت کا زیادہ تر زمانہ کرائسٹ چرچ کالج کان پور میں ہی گزرا۔ یہاں میں پہلی بار ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۶ء تک رہا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب کالج میگزین میں میں نے پہلی بار اردو سیکشن شامل کروایا۔ اردو ڈبیٹ کا سلسلہ بھی میں نے ہی شروع کیا اور مقالہ نگاری اور سمینار کی بنیاد بھی ڈالی۔ اس زمانے میں ڈاکٹر اعجاز حسین، پروفیسر احتشام حسین علی عباس حسینی، محمد مہدی صاحب اور شعرا میں جگر مرادآبادی اور ان کے بہت سے نامور ہمعصروں نے میرے پروگراموں میں شرکت فرما کر میری بہت حوصلہ افزائی فرمائی۔

پندرہ دن گورکھپور یونیورسٹی میں بھی گزرے۔ یہ موقع اس طرح ہاتھ آیا کہ اس زمانے میں محترم محمود الٰہی صاحب نے یونیورسٹی میں ٹیچرس ری اورینٹیشن کورس کی داغ بیل ڈالی۔ پندرہ دنوں کا سمینار تھا۔ یہ پروگرام دراصل یو۔ جی۔ سی کی طرف سے تھا۔ پروفیسر مسیح الزماں اور پروفیسر احتشام حسین اکسپرٹ کی حیثیت سے تھے۔ ایک پیپر روز پڑھا جاتا تھا اور شام کو نشست ہوا کرتی تھی جس میں جناب اثر لاری صاحب، مسیح الزماں صاحب، احتشام صاحب، سلام سندیلوی صاحب بھی موجود رہا کرتے تھے۔ میرے لیے یونیورسٹی میں ٹھہرنے کے لیے ایک علاحدہ کمرے کا انتظام تھا۔ وہاں گزرا ہوا پندرہ دنوں کا یہ مختصر ترین عرصہ اس لحاظ سے نہایت اہمیت کا حامل ہے اس دوران جو سیر حاصل مباحث کا سلسلہ رہا اس نے ذہن کے افق پر کچھ نئے دریچے کھولے۔

میری زندگی کی یہ وہ چند مخصوص یادیں ہیں جن کی یاد جب بھی آتی ہے تو روح میں تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ میں اپنی بات یہیں پر ختم کر دیتا لیکن اگر ابتدائی دورِ حیات کے بارے میں کچھ نہ بتاؤں تو یہ تعارف ادھورا رہ جائے گا۔

جس چھتنار درخت کی میں ایک معمولی سی شاخ ہوں اور جس کی متعدد شاخیں دُنیا کے مختلف ممالک و مقامات پر دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں، اس درخت کی اصل بھی صوبۂ یو۔پی کے دو اضلاع فتحپور اور رائے بریلی کے درمیان بہنے والی ہندستان کی پاک و پاکیزہ ندی گنگا کے دونوں کناروں پر آباد سادات کی دو مشہور و معروف بستیوں (قصبہ مصطفےٰ آباد ضلع رائے بریلی اور پیٹی سادات ضلع فتحپور) پر منحصر ہے۔ پیٹی سادات میرا ددھیال اور مصطفےٰ آباد ننھیال۔ یہ دونوں خاندان اپنے اپنے علاقوں کے بڑے زمیندار گھرانوں میں شمار ہوتے تھے۔ سرٹیفکیٹ کے حساب سے میری پیدائش ۱۲ فروری ۱۹۲۰ء میں پیٹی سادات میں ہوئی تھی۔ ابتدائی تعلیم حسبِ دستور گھر پر ہی ہوئی۔ ابتدائی کتب کی تعلیم میرے دادا نے خود دی۔ چوں کہ پیٹی سادات شہر فتحپور سے کافی فاصلے پر گنگا کے ساحل پر آباد ہے۔ وہاں اُن دنوں

کوئی معقول سرکاری یا غیر سرکاری درس گاہ نہیں تھی۔ اس کے برعکس قصبہ مصطفےٰ آباد کا ماحول نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ یہاں پرائمری اور مڈل اسکول سرکار کی طرف سے قائم ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ میرے ننہال میں میرے سب ماموں صاحبان بے حد روشن خیال اور تعلیم یافتہ تھے۔ قصبہ کے دیگر حضرات بھی کافی پڑھے لکھے تھے اور وہ پورا کا پورا ماحول یقیناً اس وقت بھی نہایت تعلیم یافتہ تھا۔

چوں کہ لکھنؤ کی کچھ بے حد مقتدر ہستیاں مثلاً ناصر الملت مولانا ناصر حسین صاحب قبلہ، میر مونس، میر نفیس، دولہا صاحب عروج، مولانا سبط حسن صاحب اور اس زمانے کے اور بہت سارے ادیب و شاعر برابر ہی مصطفےٰ آباد آتے رہتے تھے لہٰذا مصطفےٰ آباد ایک طرح سے علم کی آماجگاہ بنا ہوا تھا جس کا سہرا مولوی مظہر حسن صاحب، میر مصحف حسین صاحب مشتاق مصطفےٰ آبادی، مولوی محمد مہدی صاحب ادیب کے سروں پر رہے۔ اس قصبے کی تہذیب لکھنوی آداب و تہذیب سے متاثر بلکہ بے حد متاثر تھی۔ وہی بول چال، وہی چال چلن، وہی طور طریقے ــ بس فرق تھا تو اتنا کہ لکھنؤ والوں کا جیسا تصنع نہ تھا بلکہ قصباتی رکھ رکھاؤ میں خلوص و سچائی بے حد تھی۔ سیدھے سادے لوگ جن میں رتی برابر چھل کپٹ نہیں تھی۔

اس خیال سے کہ میری تعلیم و تربیت بہتر طریقے پر ہو، میری ماں نے مجھے ننہال اپنے بھائیوں کے پاس بھیج دیا۔ میری ماں خود بھی ایک پڑھی لکھی اور روشن خیال خاتون تھیں۔ ان کے سارے بھائی اپنی اپنی ذات میں ایک انجمن کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہ سب ہر محفل اور ہر مجلس کی جان ہوا کرتے تھے۔ جب سب مل جاتے تو اپنی جگہ ایک محفل آراستہ ہو جاتی۔ اتنا نکھرا ہوا مذاق کہ لوگ صرف ان کی باتوں سے درس حاصل کریں۔ ہنسنے پر آجائیں تو پورا ماحول زعفران زار بن جائے۔ کسی مجلس میں بیٹھ جائیں تو ان کے رونے کی آوازوں سے پوری مجلس غم آلودہ ہو جائے۔ سب کے سب پڑھے لکھے، نئی اور پرانی ملی جلی قدروں کے حامل۔ جس شہر میں گئے اپنا سا ماحول بنا کر رہے۔ ہر جگہ اپنی ایک خاص شناخت سے پہچانے جاتے تھے۔

ایسے ماحول میں میری پرورش ہوئی اور وہیں سے باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ قصبہ مصطفےٰ آباد کے ایک صاحب علم بزرگ سید حسن الدین عرف ننھو میاں صاحب سے گلستاں، بوستاں، اُمّ الصّبیان، منشا اور دیگر ضروری عربی و فارسی کتابوں کا درس لیا۔ بعد میں ماموں صاحبان کے حکم پر انگریزی تعلیم کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ انگریزی تعلیم کا سلسلہ حلیم انٹر کالج کان پور سے شروع ہو کر کرائسٹ چرچ کالج کان پور سے ہوتا ہوا الہ آباد یونیورسٹی پر ختم ہوا۔ الہ آباد میں کیپٹن ضامن علی، جنھیں میں "ضامن دادا" کہتا تھا کی خاص توجہ اور محبت کی وجہ سے بہت سی اعلا شخصیتوں کی صحبت میں بیٹھنے اور ان سے کچھ حاصل کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ ایم اے کرنے کے بعد تلاشِ معاش کی فکر پیدا ہوئی اور اپنے ہی کالج یعنی کرائسٹ چرچ کالج میں ملازمت ملتے ہی میں نے تعلیم کا سلسلہ خود ختم کر دیا۔ اب پڑھنے سے زیادہ پڑھانے میں لطف آنے لگا بلکہ پڑھانے کے بعد احساس ہوا کہ میری اصل پڑھائی تو اب شروع ہوئی ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ علم وہ بحرِ بیکراں ہے کہ آدمی زندگی کی آخری سانس تک بس پڑھتا رہے اور معلومات حاصل کرتا رہے اور پھر تشنہ کا تشنہ!

ددھیال یعنی پٹی سادات ضلع فتحپور سے تو اب ہمیشہ کے لئے کنارہ کش ہو چکا ہوں کیوں کہ والد ماجد جناب محمد حسن صاحب مرحوم و مغفور کے تین بیٹے جن میں سب سے چھوٹا میں ہوں، باقی دو میرے بڑے بھائی محمد رضا صاحب مرحوم (سب میں بڑے) اور ان کے بعد حسن رضا صاحب مرحوم، دونوں ہی سلسلۂ تعلیم و ملازمت میری طرح ترک وطن کر کے دور دراز کے شہروں میں آباد ہو گئے۔ مصطفےٰ آباد، جہاں میرے نانا میر فرزند حسین صاحب کے سات بیٹوں اور تین بیٹیوں کی اولادیں اور پھر اولادوں کی اولادیں اب تک الحمدللہ وہاں کے مکان اور زمینوں کو جوں کا توں محفوظ بھی کیے ہیں اور سال میں دو ایک بار ہم سب وہاں جمع بھی ہوتے ہیں لہٰذا مصطفےٰ آباد سے تعلق آج بھی باقی ہے۔ اب تو فیروز گاندھی تھرمل پاور پلانٹ، اونچاہار قائم ہو جانے کی وجہ سے مصطفےٰ آباد کی چار سو سال پرانی سادات کی بستی بھی گم ہو کر رہ گئی ہے اور اسے سب اونچاہار کے نام سے ہی جانتے ہیں۔ پوسٹ آفس کا نام اب تک مصطفےٰ آباد ہی ہے ورنہ دو دہائی پہلے تک صرف ریلوے اسٹیشن کا نام اونچاہار ہوا کرتا تھا۔

یادوں کے اس طویل لیکن پھر بھی نامکمل سفر کا حال غالب کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں ؎

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

□□

غزلیں

سحر کے خون سے، تاریخِ شب نہ لکھوں گا
زیاں ادب کا ہو، ایسا ادب نہ لکھوں گا

یہ خواب خواب سماں، یہ طلسم چہرہ لوگ
میں اس سراب کو شہرِ طرب نہ لکھوں گا

یہ عہد آگ کا جنگل ہے، پیاس کا صحرا
سمندروں کو بھی آسودہ لب نہ لکھوں گا

یہ جانتا ہوں، کہ ہیں تجھ پہ، سات خون معاف
یقین رکھ کہ تجھے بے ادب نہ لکھوں گا

یہ کس چراغ کی لَو پہ ہیں، انگلیاں میری!
میں خط نہ لکھنے کا اس کو سبب نہ لکھوں گا

بہت ہی تلخ رہا، ذائقہ معانی کا
میں اپنے لفظوں کو، قندِ رُطب نہ لکھوں گا

مری نبوّتِ فن کا، وہ اب بھی منکر ہے
یہ اِس ہمسر اُسے میں بُولہب نہ لکھوں گا

بچائے رکھوں فضا! کچھ تو روشنائیِ عمر
جو کرب ذہن میں ہے سب کا سب نہ لکھوں گا

فضا ابن فیضی
مئوناتھ بھنجن ۲۷۵۱۰۱

آج کی رات کوئی وار نہ خالی جائے
سنگِ آہنگ سے ہی اک نہر نکالی جائے

جس کو جانا ہے وہاں، بن کے سوالی جائے
ہاں مگر جاتے ہوئے میری دُعا لی جائے

آخرِ شب ہے، نکلنے کو ہے نجمِ سحری
اُس کے بستر سے ذرا نیند چُرالی جائے

خشک سالی کی گھٹائیں تو برسنے سے رہیں
جوئے خوں ناب ہی آنکھوں سے بہالی جائے

کوئی قصہ تو بنے، کوئی حکایت تو لکھے
اس سلیقے سے تری بات اُچھالی جائے

فیض اس کا ہے اگر عام تو آگے بڑھ کر
اپنے حصّے کی بھی اک بُوند اُٹھالی جائے

اب تو گرنے کو ہے دیوارِ محبت ہی امام
اس کی تصویر درِ دل سے ہٹالی جائے

مظہر امام
۱۷۹۔ بی پاکٹ ۱۱، مَیور وہار، فیز ۱
دہلی ۱۱۰۰۹۱

پروفیسر سید امیر حسن عابدی
دہلی یونیورسٹی ۔ دہلی

ایک اہم بیاض

بمبئی کے مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر اور لائبریری میں ایک قلمی بیاض[1] ہے، جس میں ایک جگہ، ربیع الاول ۱۰۸۳ھ (۱۶۷۲ء) اور دوسری جگہ ۲۰ ربیع الاول ۱۰۸۳ھ لکھا ہوا ہے۔ بہرحال اس قدیم بیاض سے جو نظم و نثر دونوں میں ہے، ہماری تہذیب و تاریخ کے گوناگوں گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔ بدقسمتی سے یہ خوبصورت نسخہ شروع سے کچھ ناقص ہے، مگر اس سے ہمارے مطالعے میں کوئی کمی یا نقص نہیں آتا۔

سب سے پہلے اس میں پان کی بیالیس خوبیاں بیان کی گئی ہیں، نیز پیغمبر اسلام کی اس حدیث کو نقل کرکے اس کے نفع کو واضح کیا گیا ہے:

لَوْلَا وَرَقَةٌ فِی الْهِنْدِ کَاُذُنِ الْفَرَسِ، لَنُهْلِكَ اَهْلَهٗ بِالْجُذَامِ وَالْاَبْرَصِ، یعنی اگر گھوڑے کے کان کی طرح کا ایک پتہ ہندوستان میں نہ ہوتا، تو لوگ جذام اور برص سے ہلاک ہوجاتے۔

پھر صاحب بیاض لکھتا ہے کہ پان دانت کی جڑوں کو مضبوط کرتا ہے۔ دوسرے ممالک کے لوگوں کے دانت میوے کھانے سے گرنے لگتے ہیں، جبکہ ہندوستانیوں کے دانت جو اس کثرت سے پان کھاتے ہیں کم گرتے ہیں، نیز دوسرے ملکوں کے لوگوں کے منھ میں میوے کھانے سے بُو ہوتی ہے، بیت ؎

دانکہ تنبول خورد پیوستہ   نبود بوی دہانش ہرگز

پان کے ساتھ کے اجزا "یاران دیند فوفل و چونہ و آرنگ" ہیں۔

پھر ستیاروں کے متعلق یہ مصرعہ ہے ؎

میوہ است و طفیلی ولیست اندر خورد

اس کے بعد حضرت امیر خسرو[2] کی یہ دو رباعیاں نقل کی گئی ہیں ؎

دلدار کہ در خانہ سوید اکردست
در خوردن برگ شہد شیدا کردست
آن سرخی تنبول بر آن لب گوئی
خونخوارگی نہفتہ پیدا کردست

چوں لعل کنند در خود دلبندان
زاں برگ کہ شد تحفۂ دولتمندان
بر بام بر آیند شبی گر خندان
پروین نکند سفید ہرگز دندان

تنباکو، حقہ اور چلم کی تعریف میں بھی مختلف ہندوستانی اور ایرانی شعراء اور امراء کا کلام دیا گیا ہے ؎

شہباز: شہبا بیا میل بہ تنباکو کن
دودی بدر آر از دل دانگہ ہو کن
چون حقہ بآب دیدہ باگریہ بساز
مانند چلم و می باآتش خو کن
تنباکوی ما چو بزم را نوش دارد
دایم طلب لبان مہوش دارد
مرغابی کیست کردہ الفت با نار
یا بر سر آب و بر سر آتش دارد

عزیز الملک

عالم ہمہ طالبست تنباکو را
یارب چہ خواص خوب دادی او را
اشک ست مرا بطالع او کہ چو می
ہمدم شدہ گلرخان آتش خو را

خانخاناں[3]: تنباکو کہ کار اکب انگور کند
دیں پنج مرض را ز تنت دور کند

ضیق النفس سرفہ بو اسیر د سپرز
خاکستر این مرہم ناسور کند
تنباکو را کہ مایہ جز لطف نبود
گو کس بخشد جای تاسف نبود
تعریفش را ازین زیادہ چہ کنم
بی ما حصلی باین تصرف نبود

محمد شریف معمائیؒ

ساقی دل ما سوخت پی تنباکو
در جام چلم ریز می تنباکو
گر توبہ کنم از و ہما ندم گردد
انگشت ندامتم نی تنباکو
قلیان بکف تو بہرہ ور می گردد
نی در دہن تو نیشکر می گردد
برگرد رخ تو دود تنباکو نیست
ابریست کہ در دور قمر می گردد

ملا محمد باقر

باقر چلمی چو نافۂ آہو کو
چون فاختہ تا چند زنم کو کو کو
در حشر اگر آتش دوزخ بینم
فریاد بر آورم کہ تنباکو کو
از لخت جگر برگ تنباکو کنمش
وز آتش دل اخگر سوزان نہمش
از دیدہ چلم سازم و نی از رگ جان
آنگاہ بآن شوخ کشیدن دہمش

اس بیاض میں نثر و نظم دونوں میں بے شمار شعراء، ادباء اور امراء کے منتخب اشعار اور خطوط ہیں۔ اس میں ایک خط وہ ہے جو سکندر نے کسی ہندوستان کے بادشاہ کو لکھا تھا۔ اس کے علاوہ بوعلی شاہ قلندرؒ کا خط ہے، جو غلطی سے بابرؒ کے لیے بتلایا گیا ہے۔ میرے ایک مضمون میں اس خط کا مفصل ذکر کیا جا چکا ہے۔ دراصل یہ خط سلطان علاؤالدین خلجیؒ کو لکھا گیا تھا۔

اسی مضمون میں اخلاق جہانگیری کے حوالے سے محمود غزنویؒ اور درباری مسخرہ کا قصہ دیا ہوا ہے، جو اس بیاض میں بھی موجود ہے۔

بہر حال ان خطوط میں وہ خط بھی ہے جو ظہوریؒ نے ملا ملکی کی ہجو میں لکھا تھا۔ نیز فیضیؒ، میر شریف علامؒ اور نصیر الدین ہمدانیؒ کے خطوط ہیں، جو خانخاناں، میر قاسم بغدادی اور اصفہان کے ایک وزیر کو لکھے گئے تھے۔ انھیں میں وہ خط بھی ہے جو عبدالحاکم نے اپنی محبوبہ خیر النساء خانم کو لکھا اور اس نے ہر کلمہ کے نیچے اس کا جواب لکھ کر بعینہٖ وہی خط واپس کر دیا تھا۔

منظومات میں ملا نورسی اور نظام خاں کی حسب ذیل منتخب غزلیں دی گئی ہیں۔

ملا نورسی

جان من از من بریدی عہد الفت را چہ شد
طرح یکرنگی [و] آغاز محبت را چہ شد
پیش ازین ہر ساعتم صد لطف می کردی کنون
مہربانی را چہ پیش آمد مروت را چہ شد
ہیچ کس گوم تعصب نیست در ایام من
اختلاف کیش ہفتاد و دو ملت را چہ شد
غیر خورسندست از گرمی مہرش نورسی
زود ترکن فکر کار خویش غیرت را چہ شد

نظام خاں نظامی

تاب جفا ندارم خون در جگر نماندہ
من چون کنم جہانی جان در بدن نماندہ
شیرین بناز گفتہ فرہاد را ز حسرت
مایوس گشتہ خسرو در اصفہان نماندہ
صبری ز جور خوبان گر ممکنست نظامی
حقا ز صبر دولت جور از نشان نماندہ

دوسری غزل اس لیے دی گئی ہے کہ نظام خاں کا تخلص بھی نظامی تھا۔ اس لیے اگر نظامی تخلص کے ساتھ کوئی شعر خاص کر غزل میں دیا جائے، تو لازم نہیں ہے کہ وہ نظامی گنجویؒ ہی کا ہو۔

اسی بیاض میں یہ غزل حافظؒ کی طرف منسوب کی گئی ہے جو ان

کی نہیں ہے ع

ایں چہ شوریست کہ در دور قمری بینم

قطعات میں عمر خیام کا حسب ذیل قطعہ دیا گیا ہے جو ان کے مطبوعہ کلام میں نہیں ملتا ؎

دوشش باعقل در سخن بودم
کشف شد بردلم مثالی چند
گفتم ای مایۂ ہمہ دانش
دارم الحق ز تو سوالی چند
چیست ایں زندگانی دنیا
گفت خوابست یا خیالی چند
گفتم اہل زمانہ در چہ فنند
گفت در بند جاہ و مالی چند

اس بیاض میں بہت بڑے شعرا کی رباعیاں دی ہوئی ہیں، جن میں سے یہاں صرف وہ نقل کی جا رہی ہیں، جو اب تک چھپی نہیں ہیں اور نہ مطبوعہ دیوانوں میں موجود ہیں ؎

عمر خیام

حاشا کہ قمر مقابل روت شود
یا مشک ختن برنگ گیسوت شود
من قول تو چون قدت می دانستم
کی دانستم کہ ہمچو ابروت شود

از نور رخت ماہ ملاحت گیرد
رنجور ز دیدن تو راحت گیرد
اندر رخ تو سیر نیارم نگریست
ترسم کہ ز دیدنت جراحت گیرد

ابوالفرج رونی

تا دورم از آن دو زلف مشکین تاب
بر آتش دل ز دیدہ می ریزم آب
اکنون چہ کنم کہ بخت برگشتہ مرا
گفتار نبالکہ گرد و دیدار بخواب

تا از تو جدا کرد مرا چرخ کبود
بی طلعت زیبای تو جانم فرسود
المنۃ للہ کہ در ایام فراق
ہرگز نزدم دمی کہ بی یاد تو بود

ای لالہ رخا چو لالہ ام سوختہ دل
پیش تو چو لالہ ماندہ ام خوار و خجل
ناکردہ ز لالۂ تو بوئی حاصل
ماندہ ز غمت چو لالہ پائی اندر گل

مسعود بیگ

رخسار تو آئینہ، سبحان اللہ
گیسوئی تو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ
من ہر چہ بجز ذات تو بینم گویم
لَاحَولَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہ

ہجویات میں حسب ذیل رباعی اکبر بادشاہ کی مذمت میں کسی نے مایوس ہو کر کہی ہے ؎

بر اہل ہنر ستد سکندر در تو
یا جوج کہ گویند صف لشکر تو
در دور تو آثار قیامت پیداست
دجّال توئی خواجہ امینا خر تو

مگر معلوم نہیں کہ خواجہ امین سے مراد کس کی ذات ہے۔ بہرحال اسی طرح سے کسی قاسم نامی شخص نے فیضی کی مذمت میں شعر کہا تھا اور فیضی نے اس کا جواب بھی شعر ہی میں دیا تھا، مگر فحش ہونے کی وجہ سے یہاں اسے نقل نہیں کیا جا رہا ہے۔

اس بیاض میں بہت سے معمّے بھی شعر کی صورت میں ہیں، جنھیں حمیدی، فیروزی، حسینی، نادری، مقری، شوقی، مدامی، شاہ جی شیرازی، برہان، ماجرمی، خیالی، جمالی اور حضرت امیر خسرو نے کہا تھا۔ ریختہ اور ہندوی میں اس سلسلے میں سعید شیرازی اور حسن شوقی کی رباعیاں دی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ میران، میاں خوب، نظام اور میاں میراں کا کہا ہوا جھولا دیا گیا

میرا بھارت مہان

سامنے پھیکا ہے سارا جہان
میرا بھارت مہان

اس میں کشمیر کی خوش نما وادیاں
اس کے دامن میں چاروں طرف ندیاں
اس کے سر پر ہمالہ کی انگڑائیاں
اس کے پہلو میں قدرت کی رنگینیاں
کوئی شاعر کرے گا کہاں تک بیان
میرا بھارت مہان

یہ ہے نانک کی دھرتی یہ چشتی کا گھر
بھیم و ارجن کی بھومی وفا کا نگر
اس میں آزاد سب ہیں نہیں خوف و ڈر
کوئی ناپاک سازش کرے بھی اگر
تو بچے گی نہیں ایسے ظالم کی جان
میرا بھارت مہان

یہ ہے تاج و اجنتا کا دلکش وطن
اس میں باپو جواہر کا ہے بانکپن
یہ ہے آزاد کے خواب کی انجمن
سیکڑوں رنگ کے پھول کا یہ چمن
کتنا پیارا ہے سب کو ترنگا نشان
میرا بھارت مہان

ذات و مذہب، زباں یا کسی نام پر
ملک کی ایکتا کوئی توڑے اگر
تو کچل دو وہیں ایسے دشمن کا سر
باہری دشمنوں پر بھی رکھو نظر
دیش کے واسیو ملک کے نوجوان
میرا بھارت مہان

ڈاکٹر امام اعظم
اردو ادبی سرکل، قلعہ گھاٹ، دربھنگہ۔ ۴ (بہار)

زوال کا وقت

گماں ہے جن کو
کہ وہ زمیں پر
خدائے عزوجلیل کے ہیں چُنیدہ بندے
اسی لیے وہ ہمیشہ شاید
مراتبِ ذی وقار و اعلیٰ پہ سربلندی کے ساتھ مسند نشیں رہیں گے
گماں ہے جن کو
کہ گویا ان کے ہی اک اشارے پہ رقص کرتے ہیں ماہ و انجم
گماں ہے جن کو
کہ ان کے احکامِ عالیہ کی
یہ اہلِ کاراں سرِ خمیدہ یوں ہی سدا پیروی کریں گے
انھیں یہ مژدہ سُنا دے کوئی!
کہ ان سے پہلے جو ان مسانِد پہ جلوہ گر تھے
کسی کو یہ تک خبر نہیں ہے
کہ کن زمینوں میں دفن ہیں وہ
کہاں گیا وہ ٹھکانہ مزاج ان کا؟
جُدا کیا کس فنا کے خنجر نے تن سے ان کا سرِ رعونت؟
انھیں یہ مژدہ سُنا دے کوئی!
کہ آج یا کل انھیں بھی آخر
بلند سے بھی بلند تر مسندوں سے نیچے اترنا ہوگا
زمیں کی آغوش منتظر ہے
زوال کا وقت آچکا ہے!

جعفر عسکری
ممتاز محل کمپاؤنڈ
گولہ گنج، لکھنؤ

کی نہیں ہے ع

ایں چہ شوریست کہ در دور قمری بینم

قطعات میں عمر خیام[۱۲] کا حسب ذیل قطعہ دیا گیا ہے جو ان کے مطبوعہ کلام میں نہیں ملتا ہے

دوش با عقل در سخن بودم
کشف شد بردلم مثالی چند
گفتم ای مایۂ ہمہ دانش
دارم الحق ز تو سوالی چند
چیست ایں زندگانی دنیا
گفت خوابست یا خیالی چند
گفتم اہل زمانہ در چہ فنند
گفت در بند جاہ و مالی چند

اس بیاض میں بہت بڑے شعرا کی رباعیاں دی ہوئی ہیں، جن میں سے یہاں صرف وہ نقل کی جا رہی ہیں، جو اب تک چھپی نہیں ہیں اور نہ مطبوعہ دیوانوں میں موجود ہیں ے

عمر خیام

حاشا کہ قمر مقابل روت شود
یا مشک ختن برنگ گیسوت شود
من تول تو چون قدت می دانستم
کی دانستم کہ ہمچو ابروت شود

از نور رخت ماہ ملاحت گیرد
رنجور ز دیدن تو راحت گیرد
اندر رخ تو سیر نیارم نگریست
ترسم کہ ز دیدنت جراحت گیرد

ابوالفرج رونی[۱۳]

تا دورم از آن دو زلف مشکیں تاب
بر آتش دل ز دیدہ می ریزم آب
اکنوں چہ کنم کہ بخت برگشتۂ من
گفتار نبالہ کرد و دیدار بخواب

تا از تو جدا کرد مرا چرخ کبود
بی طلعت زیبای تو جانم فرسود
المنۃ للہ کہ در ایام فراق
ہرگز نزدم دمی کہ بی یاد تو بود

ای لالہ رخا چو لالہ ام سوختہ دل
پیش تو چو لالہ ماندہ ام خوار و خجل
ناکردہ ز لالۂ تو بوئی حاصل
ماندہ ز غمت چو لالہ پائی اندر گل

مسعود بیگ

رخسار تو آئینہ، سبحان اللہ
گیسوئی تو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ
من ہر چہ بجز ذات تو بینم گویم
لَاحَولِ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللہ

ہجویات میں حسب ذیل رباعی اکبر بادشاہ[۱۴] کی مذمت میں کسی نے مایوس ہو کر کہی ہے ے

بر اہل ہنر ستد سکندر در تو
یاجوج کہ گویند صف لشکر تو
در دور تو آثار قیامت پیداست
دجال توئی خواجہ امینا خر تو

مگر معلوم نہیں کہ خواجہ امین سے مراد کس کی ذات ہے۔ بہرحال اسی طرح سے کسی قاسم نامی شخص نے فیضی کی مذمت میں شعر کہا تھا اور فیضی نے اس کا جواب بھی شعر ہی میں دیا تھا، مگر فحش ہونے کی وجہ سے یہاں اسے نقل نہیں کیا جا رہا ہے۔

اس بیاض میں بہت سے معمے بھی شعر کی صورت میں ہیں، جنھیں حمیدی، فیروزی، حسینی، نادری، مقری، شوقی، مدامی، شاہ جی شیرازی، برہان، عاجزی، خیالی، جمالی اور حضرت امیر خسرو نے کہا تھا۔ ریختہ اور ہندی میں شاہ جی شیرازی اور حسن شوقی کی رباعیاں دی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ میراں، میاں خوب، نظام اور میاں میرن کا کہا ہوا بھولہ دیا گیا ہے۔ (باقی)

میرا بھارت مہان

سامنے پھیکا ہے سارا جہان
میرا بھارت مہان

اس میں کشمیر کی خوش نما وادیاں
اس کے دامن میں چاروں طرف ندیاں
اس کے سر پر ہمالہ کی انگڑائیاں
اس کے پہلو میں قدرت کی رنگینیاں
کوئی شاعر کرے گا کہاں تک بیان
میرا بھارت مہان

یہ ہے نانک کی دھرتی یہ چشتی کا گھر
بھیم و ارجن کی بھومی وفا کا نگر
اس میں آزاد سب ہیں نہیں خوف و ڈر
کوئی ناپاک سازش کرے بھی اگر
تو بچے گی نہیں ایسے ظالم کی جان
میرا بھارت مہان

یہ ہے تاج و اجنتا کا دلکش وطن
اس میں باپو جواہر کا ہے بانکپن
یہ ہے آزاد کے خواب کی انجمن
سیکڑوں رنگ کے پھول کا یہ چمن
کتنا پیارا ہے سب کو ترنگا نشان
میرا بھارت مہان

ذات و مذہب، زباں یا کسی نام پر
ملک کی ایکتا کوئی توڑے اگر
تو کچل دو وہیں ایسے دشمن کا سر
باہری دشمنوں پر بھی رکھو نظر
دیش کے واسیو ملک کے نوجوان
میرا بھارت مہان

ڈاکٹر امام اعظم
اردو ادبی سرکل، قلعہ گھاٹ۔ دربھنگا۔ ۴ (بہار)

زوال کا وقت

گماں ہے جن کو
کہ وہ زمیں پر
خدائے عزّ و جلیل کے ہیں چنیدہ بندے
اسی لیے وہ ہمیشہ شاید
مراتب ذی وقار و اعلیٰ پہ سربلندی کے ساتھ مسند نشیں رہیں گے
گماں ہے جن کو
کہ گویا ان کے ہی اک اشارے پہ رقص کرتے ہیں ماہ و انجم
گماں ہے جن کو
کہ ان کے احکام عالیہ کی
یہ اہلِ کاروانِ سرخمیدہ یوں ہی سدا پیروی کریں گے
انھیں یہ مژدہ سنا دے کوئی!
کہ ان سے پہلے جوان مسند پہ جلوہ گر تھے
کسی کو یہ تک خبر نہیں ہے
کہ کن زمینوں میں دفن ہیں وہ
کہاں گیا وہ تمکنت مزاج ان کا؟
جدا کیا کس فنا کے خنجر نے تن سے ان کا سرِ رعونت؟
انھیں یہ مژدہ سنا دے کوئی!
کہ آج یا کل انھیں بھی آخر
بلند سے بھی بلند تر مسندوں سے نیچے اترنا ہوگا
زمیں کی آغوش منتظر ہے
زوال کا وقت آچکا ہے!

جعفر عسکری
ممتاز محل کمپاؤنڈ
گولہ گنج۔ لکھنؤ

عتیق اللہ
۲۲۱۔ غالب اپارٹمنٹ۔ پریتم پورہ
دہلی

تصورِ تمثیل

تمثیل انگریزی لفظ allegory کا مترادف ہے۔ بطور اصطلاح allegory دو یونانی لفظوں سے مل کر بنا ہے allos کے معنی دیگر یا دوسرے کے ہیں اور agoreuein کے معنی کہنے یا بولنے کے ہیں۔ یعنی بیان کا وہ طرز جس میں ایک بات کہہ کر دوسری بات مراد لی جائے۔

اشیا کو محسوس کرنے اور دیکھنے کا ایک طرز۔

تخلیقی و مذہبی ادب کی ایک تکنیک، جس میں کسی حقیقت، خیال واقعے یا تجربے کو بہ جنسہٖ ادا کرنے کے بجائے بہ شکلِ دیگر ادا کیا جاتا ہے۔

اس نوع کی تحریر میں معنی کی ایک سطح ظاہری ہوتی ہے اور دوسری ضمنی۔ مفہوم وہ نہیں ہوتا جو پہلی سطح سے ظاہر ہے بلکہ پہلی سطح کے سارے کردار اور اعمال ایک دوسرے باطنی معنی کو راجع ہوتے ہیں۔

"وہ منظوم یا منثور قصہ یا تحریر جس میں مجرد اوصاف یا مجرد تصورات کو متشخص کر کے یا غیر ذی روح اشیاء کو ذی روح فرض کر کے مجسّم شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ جہاں مرئی کردار یا اشخاص پیش کیے گئے ہیں، وہاں بھی ان سے مراد کچھ اور ہوتی ہے۔ بعض نے ذی روح کو غیر ذی روح ملبوس میں بھی پیش کیا ہے۔ اس نوع کی مثالیں بالعموم کسی شعری یا نثری شہ پارے میں محض ایک جزو کا حکم رکھتی ہیں۔"

تمثیل نگار مجازی پیرائے میں زندگی کے داخلی و معنوی حقائق بیان کرتا نیز ابدی حقائق کو مطمحِ نظر رکھتا ہے۔

تمثیل کے ضمن میں یہ ضروری نہیں کہ وہ ایک ایسا قصہ ہو جو مسلسل نظامِ مساوات کا حامل ہو۔ یا ایک ایسا قصہ جس کے مرئی اختصار کے پس پشت لازماً کوئی اخلاقی معنی پوشیدہ ہوں۔ اخلاقی قصوں کے علاوہ طنزیہ و ہجائیہ، خفیہ اور سائنسی افسانوی ادب میں اس نوع کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔

نمائندگی کا ایک طرز جس میں کسی شخص یا کسی مجرد خیال یا کسی واقعے اور حتیٰ کہ محل و مختلف مقامات کے نام اور اعمال کو مجازی پیرائے میں پیش کیا جاتا ہے۔

تمثیل، داستان کی طرح بالعموم زمان و مکان کے تعین سے عاری ہوتی ہے کیوں کہ تمثیلی قصہ، دورانِ محض میں واقع ہوتا ہے۔ اسے خارجی وقت کے پیمانے سے ناپا نہیں جا سکتا۔

تمثیل ایک توسیعی اور مسلسل استعارے کا حکم رکھتی ہے۔

استعارہ دو مختلف النوع اشیاء کے موازنے پر منتج ہوتا ہے۔ استعارہ در استعارہ توسیع (یا طویل استعارہ جس کا تصور استعارہ بالتصریح سے قریب تر ہے) کے ذریعے کہانی کسی خاص نتیجے تک پہونچتی ہے۔

سب سے پہلے اس طرز کا استعمال فنِ تقریر میں ہوا۔ مگر فنِ تقریر میں اس کے معنی بہت محدود ہیں۔ ادب اور فنِ تقریر دونوں ہی استعارے کی حد تک متفق ہیں مگر ادب میں اس کے معنی پیچیدہ ہیں۔ اپنے وسیع معنی میں سارا ادب ہی تمثیلی ہے۔ نارتھروپ فرائی ادب کی تمام تشریحات کو تمثیلی کہتا ہے کہ:

"ادب میں ایک نوع کے معنی دوسرے معنی کا قالب اختیار کر لیتے ہیں۔"

انگس فلیچر کے نزدیک ادب کی حدود جتنی وسیع ہیں اتنی ہی

وسعت تمثیل رکھتی ہے وہ کہتا ہے :

> تمثیلی طرزِ اظہار ایک غیر معمولی صنفِ ادب ہے جس میں مخاطراتی دہماتی قصّے، جدید مغربی مثالیں، سیاسی، ہجائی ادب، نیم فلسفیانہ تشریحات باستانی حکایات، مکاشفاتی تصورات قاموسی رزمیے، وہ ناول جو فطرتیت naturalism: پر استوار ہیں اور سماجی تبدیلی جن کا مقصد ہے ۔خیالی بحری سفرنامے، جاسوسی اور پریوں کی کہانیاں وغیرہ سب کچھ شامل ہیں ۔

تمثیل ایک قدیم ترین طرزِ اظہار ہے۔ اس کے منابع میں اسطوری مذاہب کا درجہ اولیات میں سے ہے۔ اساطیر کا ایک بہت بڑا حصہ تمثیلی نوع کا ہے۔

> انسان نے اپنی بیش بہا اور فطری تمثیلی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاکر ان اشیاء کو حرکت میں بدل دیا جو مجہول تھیں انھیں مجسّم کر دکھایا جو مجرد تھیں یا محض کیفیات وادصاف سے جن کا تعلق تھا، ان جانوروں اور اشیاء کو زبان دے دی گئی جو غیر ناطق تھیں۔ آہستہ آہستہ اساطیر نے انفرادی اور اجتماعی حافظے میں اپنی جڑیں گہری کرلیں۔ اعادے اور تکرار، نیز زمانہ بہ زمانہ فاصلو میں اضافے ہونے کے باعث ان کی اصلیتیں بھی تبدیل ہوتی رہیں اور مختلف قوموں، قبیلوں اور فرقوں میں ان کی حیثیت اخلاقی رہنما کی ہوگئی ۔ بعد ازاں یہود نے سب سے پہلے اسطور پر ضرب لگائی تاہم اسطوری دانش کا فیضان جاری رہا۔ مذاہب نے انھیں خرافات کا نام دیا لیکن ان سے اپنے اصول بھی وضع کیے۔ اس طور پر اساطیر کی علامتی معنویتوں میں اضافہ ہوتا گیا اور اب وہ محض ایسے مظاہر میں بدل گئے ہیں جو انسانی حقائق اور قوتوں کی نمائندگی کرتے ہیں ۔

تمثیل اپنی معنوی توانگری کے باوجود علامتی اضافیت نیز علامتی خودکار تخلیقی تفاعل سے عاری ہوتی ہے ۔

"تمثیل بالعموم اس تناؤ کی کیفیت سے بری ہے جس سے قاری علامت کی گرہ کشائی کے وقت دوچار ہوتا ہے"۔

تمثیل کی بنیاد ہی تعقل پر قائم ہے ۔جب کہ علامت، اپنی حرکت میں تعقل شکن بھی ہے ۔ تمثیل کی اپنی ایک میکانکیت اور حد ہے جبکہ علامت کا سفر ہی میکانکی حدود کے رد سے شروع ہوتا ہے۔

> "تمثیل زندگی سے عاری پیکر، ایک ایسا تصور ہے جس پر بہت زیادہ عقل کا بار ڈال دیا گیا ہے۔ اس لیے وہ جزوی علامتی معنویت کی حامل تو ہوسکتی ہے، لیکن حقیقی معنی میں اسے علامت کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔"
>
> ——— باپ لارڈ

> "علامت کا بنیادی کام نامعلوم کی جستجو ہے اور ستم ظریفی یہ کہ وہ ناقابلِ ترسیل کی ترسیل کی سعی کرتی ہے ۔ علامت، تمثیل کی طرح کبھی دو اشیا کے مابین متوازیت اور مشابہت کی جستجو نہیں کرتی ۔ یہ عمل ہمیشہ معنی کی تحدید اور درجہ بندی کو راہ دیتا ہے ۔ اس طرح تمثیل علامت کی ایک محدود قسم ہے کیوں کہ وہ حرکی معنی کے کئی سلسلوں میں سے کسی ایک پر قناعت کرلیتی ہے"۔ (درتھ)

کاروبار وجہ اسطور کی علامتی توضیحات اور معنویت کے خلاف ہے۔ اس کے خیال کے مطابق :

> " جب یہ باور کرایا جاتا ہے کہ مریخ Mars رومی رزم کا دیوتا اور یونانی اسطوری ہیرو ہرقل، قوت کی علامت ہے، تو اس نوع کی نسبتیں، خطیبوں، عینیت پسند فلسفیوں اور قدیم دیوی دیوتاؤں پر عقیدہ رکھنے والوں کے نزدیک تو درست ہوسکتی ہیں لیکن اس گروہ کے لیے اطمینان بخش نہیں کہی جاسکتیں جس کا خیال ہے کہ علامت اس وقت واقع ہوتی ہے جب قدامتی مذاہب (جیسے اساطیری و فطرت پرست مذاہب) اپنے زوال پر ہوتے ہیں ۔ مریخ کو جنگ اور ہرقل کو قوت یا شفقت کی علامت کہنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم علامت کا درجہ پست کر رہے ہیں۔"

ماڈ باڈ کن ، سوزان کے لینگر اور نارتھروپ فرائی وغیرہ علماء پر مشتمل ایک بہت بڑا حلقہ تمثیل کی علامتی نوعیت اور اسطور کی تمثیلی نوعیت پر بہ یک زبان اصرار کرتا ہے ۔ مثلاً آرفیس (یونانی اسطوری مغنی) اور اس کی محبوب ترین رفیقۂ حیات یوریڈس کا قصہ نجات کی تمثیل کی بہترین مثال ہے ۔ (D.L.T.)

افلاطون کی تحریروں میں بھی جا بجا تمثیلی فکر کار فرما ہے ۔ چوں کہ تمثیل اپنی اساس میں تشابہ سے علاقہ رکھتی ہے اس لیے یونانی فلسفۂ قدیم اپنے مجرد طرز گفتار کے باوصف تمثیلی اجزا سے خالی نہیں ہے ۔

" تکنیک کے اعتبار سے ماورائی تمثیل کے وہ نمونے جن میں خواب کے تجربے کو اساس بنایا جاتا ہے، سب سے قدیم ہیں ۔"

ان تمثیلات میں مصنف اپنے جسم کی مادّی حدود سے ورا ہو جاتا ہے ۔ بالعموم خواب یا خواب کی سی ذہنی حالت میں کوئی روحانی قوت یا ہستی اسے آسمانوں اور زمینوں کی سیر کراتی ہے ۔ عدم اور ہستی کے رنگا رنگ مظہروں، اشخاص اور کیفیات سے وہ دو چار ہوتا ہے ۔ اس پر متنوع معجزنما تجربات منکشف ہوتے ہیں ۔ جیسے سیسرو کی De Republica (کتاب ششم) میں ایمیلیانس ، خواب میں افلاک کی سیر کرتا اور وہاں سے تمام کائنات کی ساخت کا مطالعہ کرتا ہے ۔ بعد ازاں آسمانوں ، زمینوں اور پاتال کے سفر نے مغربی ادب ، اور مذہبی صحائف میں ایک لامتناہی اور مسلسل روایت کی شکل اختیار کرلی ۔

موضوعات اور رویّوں کے اعتبار سے تمثیل و تمثیلی اجزا کے درج ذیل نمونے نمایاں ہیں ۔

تاریخی و سیاسی تمثیل :

"اس نوع کی تمثیلات میں تاریخ کی اہم شخصیتوں اور واقعات کو تمثیلی پیرائے میں پیش کیا جاتا ہے ۔ تمثیل نگار کا ایک واضح مقصد ہوتا ہے اور یہ مقصد از اوّل تا آخر جاری و ساری رہتا ہے ۔"

جیسے ڈرائڈن کی تصنیف موسوم بہ Absolam and Achitophel 1681 کا ماخذ انجیل مقدس کا ایک معنمہ episode: ہے اور جسے تمثیل کے پیکر میں ڈھال کر عصری انگلستان کے سیاسی بحران کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ طنز و ہجا کی یہ ایک نمایاں مثال ہے ۔ اس تمثیل میں کنگ ڈیوڈ ، چارلس دوم اور ڈیوک آف مون ماؤتھ ابسولم کی نمائندگی کرتا ہے ۔

ملک محمد جائسی کی پدماوت ، کو اس ذیل میں لیا جاسکتا ہے ۔

نفسیاتی تمثیل :

" اس نوع کی تمثیل میں داخلی ، ذہنی و نفسی تصادمات کو موضوع بنایا جاتا ہے ۔ قرون وسطیٰ میں نفسیاتی تمثیل کے موضوعات مخصوص تھے جن کا مقصد انسانی روح کو آلائشوں سے پاک کرنا تھا ۔"

پروڈینٹیس کی تصنیف Psychomachia (چوتھی صدی عیسوی) اس نوع کی ایک عہد ساز تمثیل ہے ۔ جس کا اثر ہمہ گیر ثابت ہوا ۔ یہ تمثیل بھی انسان کے ذہنی و نفسیاتی تصادم کی مظہر ہے کہ کس طرح ——— خیر و شر کی قوتیں روح پر قابض ہونے کے لیے باہم دیگر جنگ و جدال سے دو چار ہوتی ہیں ۔

تفکیری تمثیل :

" اس نوع کی تمثیل میں مجرّد وجود کو مشخص شکل میں پیش کیا جاتا ہے ۔ کردار آپ اپنے میں کسی مجرد تصور کی نمائندگی کرتے ہیں اور تمثیل کے پلاٹ کا مقصد کوئی مذہبی اصول عقیدہ یا دعویٰ پیش کرنا ہوتا ہے ۔"

جان بنین کی تصنیف 1678 Pilgrims Progress اس نوع کا ایک مکمل شاہ کار ہے ۔ یہ ایک اخلاقی تمثیل ہے جو مذہبی تعلیم پر مبنی ہے ۔ بنین نے خواب کے طور پر ہستی سے عدم تک کے سفر کی روداد بیان کی ہے جس کے کردار مجرد تصورات کی نمائندگی کرتے ہیں ۔ جیسے دنیادار ، عاقل، یاس ، وفادار ، اور رحم وغیرہ کردار اسم بامسمّٰی ہیں ۔ بنین نے جن مقامات کا ذکر کیا ہے وہ بھی تمثیلی نوع کے ہیں ۔

اُردو میں مُلّا وجہی کی " سب رس " میں مجرّد تصورات و اوصاف کو مشخص شکل میں پیش کیا گیا ہے اور جو اپنے میلان میں عارفانہ و حکیمانہ ہے، اسی نوع کی ایک مثال ہے ۔

رجب علی بیگ سرور کی تصنیف گُلِ زارِ سرور جو ملا محمد رضی ترمذی کی مثنوی حدائق العشاق کا نثری ترجمہ ہے ، ایک عارفانہ تمثیل کا حکم رکھتی ہے ۔ اس تمثیل میں روح ، دل ، عقل ، عشق اور حسن جیسے قوائے جسمانی اور اسمائے صفات کو نہ صرف مشخص کیا گیا ہے بلکہ ملک روحانیاں اور قلعۂ جسم اور دیارِ حقیقت (بنین کی طرح) جیسے مقامات کی معنویت بھی تمثیلی خصائص کو عکس ہے ۔

" یہ تمثیل از اول تا آخر ایک مسلسل آویزش سے عبارت ہے اسی لیے اس میں رزم نامے کی خصوصیت بھی پیدا ہو گئی ہے ۔"

محمد حسین آزاد کی نیرنگِ خیال کے تمثیلی قصے بھی اپنی بیش تر صورت میں مبنی بر تصورات ہیں ۔ اور اسامیًا جو اپنے مقصد میں اخلاقی ہیں ۔

بعض تمثیلات مذکورہ بالا تمام اجزا و تدابیر سے مرکب ہیں ۔ جیسے اسپینسر کا منظوم رومان پارہ Faerie Queene 1590-1596 ایک ایسی مثال ہے جس کا تناظر بے حد وسیع ہے اور جو بہ یک وقت تاریخی سیاسی ، اخلاقی اور مذہبی مقاصد پر محیط ہے ۔ تعیین کے لحاظ سے سوئفٹ

Gulliver's Travels 1726 کی کا مقام بلند ہے۔ اس میں مصنف نے بڑی چابک دستی کے ساتھ اپنے عہد کے علم فروشوں پر کاری ضرب لگائی ہے۔ یہ ایک تازیانہ بھی ہے احتجاج بھی، تلقین بھی ہے درس بھی۔

بارہویں صدی سے سولہویں صدی تک کا زمانہ allegorical drama کے عروج اور پھر زوال کا زمانہ ہے۔ تمثیلی ڈراموں کا ارتقا تلقینی ناٹکوں morality plays: کے زوال کے بعد رُک گیا۔ اصلاً ان ناٹکوں کا سرچشمہ قرونِ وسطیٰ کے آخری زمانوں کے اعجازی ناٹک miracle plays اور سرّی ناٹک mystery plays: ہیں۔ بیسویں صدی میں جیروم کا ڈراما The Passing of the third Floor Back 1908

کاریل کاپیک کا The Insect Play 1921 اور ایڈ ورڈ البی کا Tiny Alice 1964 اس نوع کی دلچسپ مثالیں ہیں۔

اُردو میں محمد حسن کا ڈراما 'ضحاک' ایک مکمل سیاسی ہجائیہ تمثیل ہے۔ محمد حسن کا پلاٹ ایک قدیم تلمیح پر استوار ہے۔ انھوں نے اُسے عصری معنویت عطا کر کے بڑے حسن و خوبی کے ساتھ ڈرامائی پیکر میں ڈھال دیا ہے۔

کئی ادبیا طرز ہائے عمل میں نمائندگی کا طور تمثیل سے مماثل ہے اور وہ اپنی دوہری معنویت اور مجازی خصوصیت کی بنا پر تمثیل کے نزدیک تر خیال کیے جاتے ہیں۔

مثلاً تمثیلیہ: fable:

"ایک ایسا منظوم یا منثور مختصر قصہ ہوتا ہے جس میں کسی اخلاقی دعوے یا انسانی کردار یا کسی رہ نما اصول کو مثال قرار دے کر سمجھایا جاتا ہے۔ اس کے کردار بالعموم غیر ذی روح اشیا یا غیر انسانی مخلوق ہوتے ہیں۔ قصے کے آخر میں مصنف یا کردار مقولے کی صورت میں اخلاق کا درس دیتا ہے۔ لوک روایت folk lore ان قصوں کا ماخذ ہے"۔

جے۔ اے۔ کڈن نے تمثیل، تمثیلیہ اور مثالیہ parable: کے مابین امتیازات کو ایک عربی تمثیلیے کے ذریعے واضح کیا ہے کہ:

" ایک مینڈک اور ایک بچھو، دونوں دریائے نیل کو عبور کرنا چاہتے تھے۔ مینڈک نے بچھو سے کہا کہ اگر تم ڈنک نہ مارو تو میں تمھیں اپنی پیٹھ پر بٹھا کر دریا کے پار لے جا سکتا ہوں۔ بچھو نے مینڈک کی شرط مان لی مگر اس سے دریا میں نہ ڈبونے کا وعدہ بھی لے لیا۔ اس طرح دونوں نے اپنے وعدے کا پاس رکھا اور دریا کے پار پہونچ گئے۔ بچھو نے کنارے پر پہونچ کر مینڈک کو ڈنک مار دیا۔ مینڈک نے مرتے ہوئے بچھو سے پوچھا تم نے ایسا کیوں کیا؟ کیوں۔؟

بچھو نے جواب دیا: کیوں کہ ہم دونوں عرب ہیں ہیں نا؟

کڈن کہتا ہے کہ اس تمثیلیہ میں مینڈک کی جگہ جنابِ خیر اندیش اور بچھو کی جگہ جنابِ فریبی یا جنابِ دولخت کا کردار رکھ دیں اور "ہم دونوں عرب ہیں" کی جگہ "ہم دونوں آدمی ہیں" کا جملہ چسپت کر دیں تو تمثیلیہ fable: تمثیل allegory: میں بدل جائے گا۔

مزید برآں مینڈک کو باپ اور بچھو کو بیٹے کا نام دے دیں (یعنی ملاح اور مسافر) اور پھر بیٹا اپنی زبان سے یہ الفاظ ادا کرے کہ "ہم دونوں خدا کے بیٹے ہیں، ہیں نا؟" تو اسے انسان کی ضرر رساں فطرت یا بد طینتی اور قتلِ اَب کے گناہ سے متعلق مثالیہ parable: سے تعبیر کیا جائے گا۔"

مذہبی مثالیہ exemplum:-

"کسی مذہبی خطبے یا انجیلی حکایت کے متن کی بنیاد پر گڑھا ہوا اخلاق آموز مثالیہ ہوتا ہے۔ اس کی خوبی اس کے اختصار اور انسانی فطرت و اعمال کی پیش کش میں مضمر ہے"۔

اس صنف کی جڑیں بھی انجیل ہی میں پیوست ہیں۔ بالخصوص قرون وسطیٰ میں اسے کافی مقبولیت حاصل ہوئی مذہبی مبلغین نے نئے اور پرانے ہزاروں مذہبی مثالیوں پر مشتمل کئی ضخیم مجموعے بھی تیار کیے ہیں۔ مولانا روم۔ شیخ سعدی اور اقبال کے یہاں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں

چاسر نے بھی کئی جگہ ان مذہبی مثالیوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ مثال کے طور پر The Pardner's Tale میں پارڈن، مثالیہ موسوم بہ طمع ساری برائیوں کی جڑ ہے۔ ان تین خرمستوں کا قصہ سناتا ہے۔ جو موت کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ لیکن انھیں موت تو نہیں ملتی سونے کا ایک خزانہ مل جاتا ہے۔ اب ان میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ خزانے کا مالک وہ بن جائے۔ طمع میں آکر بالآخر تینوں ایک دوسرے کا قتل کر دیتے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ طمع بہت بُری چیز ہے۔

تمثیلی داستانیں، قصے اور ڈرامے اب ماضی کا حصہ بن چکے ہیں، تاہم ادبی اسالیب میں تمثیلی عناصر اب بھی دانستہ و نادانستہ طور پر در آتے ہیں بیسویں صدی میں ان عناصر کو نہ صرف یہ کہ نثری ادب میں بروئے کار لایا گیا ہے بلکہ یہ خاصہ

بعض شعری شہ پاروں میں بھی بڑے حسن و خوبی کے ساتھ کار فرما ہے۔ پریم چند جیسے حقیقت پسند افسانہ نگار کی انمول رتن اور گنج محور نام کی کہانیاں مکمل تمثیلی کہانیاں ہیں مگر یہ ان کے ابتدائی سفر کے نشانات ہیں بعد ازاں جب انھوں نے اپنے فن کو حقیقت کی فہم سے ہم آہنگ کیا تب بھی ان کے اسلوب میں تمثیل کا آب و رنگ اکثر اوقات بے ساختگی کے ساتھ ابھر آیا ہے۔ مثلاً نمک کا داروغہ جیسی بعد کی کہانی میں درج ذیل ٹکڑا ملاحظہ فرمائیں :

" دولت ' فرض کی اس خام کارانہ جسارت اور اس زاہدانہ نفس کشی پر جھنجھلائی اور اب ان دونوں طاقتوں کے درمیان بڑے معرکے کی کش مکش شروع ہوئی۔ دولت نے پیچ و تاب کھا کر مایوسانہ جوش کے ساتھ کئی حملے کیے، ایک سے پانچ ہزار تک، پانچ سے دس ہزار تک، دس سے پندرہ، پندرہ سے بیس ہزار تک نوبت پہونچی۔ لیکن فرض مردانہ ہمت کے ساتھ اس سپاہ عظیم کے مقابلے میں یک و تنہا پہاڑ کی طرح اٹل کھڑا تھا۔"

جدید دور میں کرشن چندر۔ انتظار حسین۔ انور سجاد جوگندر پال۔ بانو قدسیہ۔ مستنصر حسین تارڑ۔ غیاث احمد گدی۔ زاہدہ زیدی اور رشید امجد میں تمثیل و علامت کے عناصر کا دلآویز اشتراک نمایاں ہے۔ رشید امجد طویل استعارے یا کسی ایک حاکمانہ استعارے کے تحت مختلف نوعیت کے استعاروں کے تسلسل کو اپنے اسلوب فن کی اساس نہیں بناتے۔ وہ وقوعہ بہ وقوعہ اور صورت حالات کے مطابق ایسے پیکر اور پیکروں کی جھرمٹ خلق کرتے ہیں جو اصلاً و معناً کہیں استعارہ اور کہیں تمثیلی علامت کا حکم رکھتے ہیں، جیسے درج ذیل اقتباس سے مظہر ہے :

" بیڈ پر لیٹے لیٹے اسے اپنا آپ کبوتر میں تبدیل ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ تیز پنجوں اور چمکیلی آنکھوں والی بلی دبے پاؤں اس کے پیچھے آتی ہے۔ وہ سمٹ سمٹ کر دیوار کے ساتھ لگ جاتا ہے۔ ساتھ والے پلنگ پر سوئی ہوئی اس کی بیوی اس کے بوجھ سے گھبرا کر کروٹ لیتی ہے۔ وہ کہنی کے بل بستر پر گر جاتا ہے۔ چند لمحے یونہی پڑا رہتا ہے۔ پھر صحن میں نکل کر آتا ہے۔ کبوتر سامنے والی دیوار پر سفید دھبا بنا دبکا بیٹھا ہے۔ بلی اسے دیکھ کر صحن سے غائب ہو جاتی ہے۔ پانی پی کر وہ واپس بیڈ پر آتا ہے اور ٹکٹکی باندھے صحن کو دیکھتا رہتا ہے۔ بلی جا چکی ہے اور ابھرتی ہوئی چاندنی میں سامنے دیوار پر بیٹھا کبوتر صاف نظر آتا ہے۔"

پریم چند کے دو بیل کے بعد رسید رفیق حسین کا افسانہ بیرو ہے جو حیوانی کرداروں پر مشتمل ہے، میرزا ادیب کے افسانے دل ناتواں اور مولوی محمد ظفر کے افسانے ' پلکھن میں پودوں کو کرداروں کے طور پر متشکل کیا گیا ہے۔ ممتاز مفتی نے اپنے افسانے اندھیرا میں روغنی پتلیوں اور میرزا ادیب نے درون تیرگی میں ذرّوں کو کردار بنایا ہے۔ ان افسانوں میں تمثیلی پیرائے ہیں۔ کسی خاص حقیقت اور معنویت کو ابھارا گیا ہے۔

جوگیندر پال کے تمثیلی افسانوں کا کینوس بڑا وسیع ہے۔ پال کے حیوانی (مثلاً چڑیا، کوا، سانپ، کتا وغیرہ) کردار یا نباتاتی (درخت اور شاخیں وغیرہ) اور جماداتی (جیسے پہاڑ وغیرہ) کردار بالترتیب، کتھا ایک پیپل کی، ہرا [illegible] اور بیک لین، چہار درویش اور اس طرف جیسی کہانیوں میں گہری رمزیت اور تہ داری کے ساتھ متشکل ہوئے ہیں۔ پال نے نوعی تقاضوں اور مماثلتوں کی روشنی میں ان حیوانی اور نباتاتی کرداروں کو اخذ نہیں کیا ہے بلکہ بیش تر صورتوں میں وہ زیادہ انسان فہم بشریت کے حامل نیز حرص، آز، مکر اور سالوسی سے آگاہ ہیں۔ اس تمام باخبری کے باوجود ان کی سیرتیں معصوم اور ان کی جرأتیں پر سکوت ہیں۔

اردو مثنویوں اور قصیدوں میں ضمنی طور پر کئی جگہ تمثیلی عناصر کا استعمال کیا گیا ہے مگر ان نظموں کی بھی خاصی تعداد ہے جو مکمل طور پر تمثیلی ہیں مثلاً میر تقی میر کی مثنوی اژدر نامہ، نظیر اکبرآبادی کی ہنس نامہ، محمد حسین آزاد کی مثنویاں صبح امید، خواب امن، داد انصاف، وداع انصاف، اور گنج قناعت، حالی کی مناظرۂ رحم و انصاف اور نشاط امید، اقبال کی شعاع امید اور عقل و دل، شاد عظیم آبادی کی مثنوی مادر ہند اور درگا سہائے سرور کی شیون عروس، جلوہ امید، امید اور طفلی وغیرہ نظمیں۔ ان نظموں میں بیش تر مقصدی اور اصلاحی نوعیت کی حامل ہیں۔

جدید شعرا میں اختر الایمان، جیلانی کامران، اور محمد علوی، وغیرہ نے تمثیلی عناصر کو بڑی خوبی کے ساتھ تخلیقی آہنگ عطا کیا ہے۔

ان نظموں میں معنوی سطح پر ابہام پایا جاتا ہے کیونکہ تکنیک کے اعتبار سے ان میں داخلی توسیع کا عمل تمثیلی نوعیت کا ہے مگر معنی کی حرکیت کے اعتبار سے ان کا جھکاؤ علامتی اضافیت کی طرف ہے۔

اختر الایمان کی نظم ' سب رنگ '، ایک مکمل تمثیلی شاہ کار ہے۔ اس

کے آغاز میں زبور سے اخذ کردہ یہ آیت درج ہے۔

"اے خداوند! بچالے۔ کیوں کہ کوئی دین دار نہیں رہا اور
امانت دار لوگ بنی آدم سے مٹ گئے وہ اپنے ہمسایہ سے
جھوٹ بولتے ہیں اور خوشامدی لبوں سے باتیں کرتے ہیں۔"

اس نظم میں سانپ، گدھا، بندر، چڑیا، گینڈا، خچر، بیل، ہدہد، کتا، الو اور گدھ جیسے حیوانی کردار ہیں۔ زمان، مکان اور قوتِ حیات ونمو جیسے مجرد کردار ہیں۔ تاریک سیارہ میں خواب اور حقیقت کے مابین مکالمہ ہے۔ خاک وخون میں قوتِ نمو اور راہی کے کردار ہیں۔ ایک کہانی میں دیگر کرداروں کے علاوہ ماضی اور مستقبل کو کردار کے طور پر متشکل کیا گیا ہے ان تمام نظموں کے رگ وریشے میں حزن وملال کی کیفیت جاری وساری ہے۔ شاعر نے انسان کے داخل وخارج کے تضاد کو بڑی نکتہ رسی سے اجاگر کیا ہے۔

اعتماد جیسی مختصر نظم میں اخترالایمان نے تمثیل کی تکنیک کو بڑی چابک دستی سے استعمال کیا ہے۔

بولی خود سر ہوا، ایک ذرہ ہے تو
یوں اڑا دوں گی میں، موجِ دریا بڑھی
بولی میرے لیے ایک تنکا ہے تو
یوں بہا دوں گی میں، آتشِ تند کی
اک لپٹ نے کہا میں جلا ڈالوں گی
اور زمین نے کہا میں نگل جاؤں گی
میں نے چہرے سے اپنے الٹ دی نقاب
اور ہنس کر کہا میں سلیمان ہوں
ابنِ آدم ہوں میں، یعنی انسان ہوں

محمد علوی کا شمار بھی اخترالایمان کے سلسلے کے ان شعرا میں کیا جائے گا جو مردم گزیدہ ہیں انسان کی درندگی و وحشت ناکی سے شاکی اور اپنے عصر کے تضادات سے ہراساں۔ عقیدہ شکنی نے انسان کے باطن میں جو خلا پیدا کیا ہے اس کے تکلیف دہ احساس سے ان کی آوازیں مملو ہیں بالخصوص تمثیلی یا جزوی تمثیلی نظموں میں اس قسم کے موضوع نے زیادہ بار پایا ہے۔ اس ضمن میں محمد علوی کی نظم ویل کم دیکھیے:

تو اک گدھ اڑا
اور پورب میں پچھم میں
چار دشاؤں میں جاکر
ہر اک دوست کو
اس نے کل صبح کھانے پہ مدعو کیا
اور پھر شام کو
شہر میں آکے آرام سے سو گیا
صبح مہمان آئے تو ان کے لیے
شہر کی سونی سڑکوں پہ لاشیں سجی تھیں
اور گدھ چوک میں
آئے مہمانوں کو
دونوں پر کھوں کے
ویل کم کہہ رہا تھا!!

□□

سیاق

1. Northrop Frye, Anatomy of Criticism (1971)
2. Angus Fletcher,
   Allegory; The Theory of a Symbolic Mode (1964)
3. Edwin Honig,
   Dark Conceit; The Making of Allegory (1959)
4. A.D. Nuttal, The Concepts of Allegory (1967)
5. John Macqueen, Allegory (1970)

ایک اہم بیاض ۔۔۔۔ صفحہ ۱۲ کا بقیہ

علاوہ بریں ہندی تصائد میں قصیدۂ چرخیات لطفی اور خیالی شوق منتخب کیا گیا ہے۔ ہندی اشعار میں شوقی، محمود، میراں، شوری، حسینی، مدامی، ملک، بابو، یوسف، ملا نورسی، ایاغی، عبداللہ نیازی، وجہی، رشیدی، یہی، سالک، فیروزی، خیالی، لطفی، معجز، احمد، راحتی، فراقی اور فصحی کے ابیات کا انتخاب کیا گیا ہے، نیز ضرورت ہے کہ ان کا بغور مطالعہ کیا جائے۔

□□

حواشی:

۱؎ نمبر ۱۱۔ ۲؎ ۶۵۱-۲۵،۷۵۳ھ/۱۲۵۳-۱۳۲۵ء۔ ۳؎ مرزا عبدالرحیم خانخاناں ۹۶۴-۱۰۳۶ھ/۱۵۵۶-۱۶۲۷ء۔ ۴؎ شرف، بوعلی شاہ قلندر، وفات: ۷۰۱ھ/۱۳۰۱ء۔ ۵؎ ظہیرالدین بابر: ۹۳۲-۹۳۷ھ/۱۵۲۶-۱۵۳۰ء۔ ۶؎ اخلاق جہانگیری، العلم، بمبئی، فروری ۱۹۹۳ء۔ ۷؎ ۶۹۵-۷۱۶ھ/۱۲۹۶-۱۳۱۶ء۔ ۸؎ ۳۸۹-۴۲۱ھ/۹۹۸-۱۰۳۰ء۔ ۹؎ نورالدین ظہوری، وفات: ۱۰۲۵ھ/۱۶۱۶ء۔ ۱۰؎ ۹۵۴-۱۰۰۴ھ/۱۵۴۷-۱۵۹۵ء۔ ۱۱؎ نصیر، ابونصر نصیرالدین، وفات: ۱۰۷۸ھ/۱۶۶۷ء۔ ۱۲؎ وفات: تقریباً ۶۰۴ھ/۱۲۰۷ء۔ ۱۳؎ وفات: ۷۹۱ھ/۱۳۸۹ء۔ ۱۴؎ وفات: ۵۱۷ھ/۱۱۲۳ء۔ ۱۵؎ وفات: ۴۸۴ھ/۱۰۹۱ء۔ ۱۶؎ ۹۶۳-۱۰۱۴ھ/۱۵۵۶ء-۱۶۰۵ء

(مولانا) اسحٰق سنبھلی
سنبھل، مرادآباد - ۲۴۴۳۰۲

آزادی کے سورماؤں کی سرزمین تھانہ بھون

تھانہ بھون جو کبھی انگریزی حکومت کی فوجی بھرتی کا ایک اہم مرکز اور نہایت خوشحال قصبہ تھا ۱۸۵۷ء میں انگریزی حکومت کے خلاف جنگ آزادی اور مسلح بغاوت کا مرکز بن گیا۔

۱۰ مئی ۱۸۵۷ء میں آزادی کی لڑائی کے آغاز پر جب فوج کے محب وطن سپاہی بغاوت پر اترے تو تھانہ بھون کے رہنے والے فوجی ڈیوٹیاں چھوڑ کر وطن آگئے اور قصبے کے عوام کو جہاد آزادی میں شرکت کے لئے آمادہ کرنے کے لئے سرگرم ہوگئے۔

اس وقت قصبہ کی آبادی تقریباً ۳۵ ہزار تھی اس میں قریب سات ہزار آدمی فوج میں ملازم تھے ان میں ۴۲ تو صرف رسالدار تھے۔ دفعدار، جمعدار، حوالدار، نائک بڑی تعداد میں تھے سپاہی تو ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ یہ مشہور ہے کہ محکمہ فوج سے ہر ماہ تنخواہ اور پنشنوں کی شکل میں ایک لاکھ چوراسی ہزار روپیہ آتے تھے۔ چونکہ یہاں سے فوج کو بڑی تعداد میں سپاہی ملتے تھے اس لئے یہاں ایک اہم پولیس اسٹیشن تھا جس زمانہ میں صرف اہم جگہوں پر ہی پولیس اسٹیشن قائم کئے جاتے تھے۔

جب یہاں کے فوجی اپنی ڈیوٹیاں چھوڑ کر آگئے تو پولیس ایسے فوجیوں کی تلاش میں لگ گئی۔ یہ فوجی نہایت خاموشی سے قصبہ کی پبلک کو انگریزوں سے بغاوت اور جنگ آزادی میں حصہ لینے کے لئے آمادہ کرتے رہے۔ اسی درمیان ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ قاضی عنایت علی خاں (ریٹائرڈ فوجی افسر) کے بھائی رعایت علی خاں ہاتھی خریدنے کے لئے سہارنپور آئے اس زمانہ میں ہاتھی ریاست اور امیری کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ مگر اس وقت تو تھانہ بھون کے باشندوں کی ہر نقل و حرکت مشتبہ تھی اس موقع سے قاضی صاحب کے مخالفوں نے فائدہ اٹھانا چاہا اور ایس۔ بنکی کلکٹر سہارنپور کو اطلاع دی کہ قاضی صاحب کچھ فوجیوں کو لے کر آپ پر چڑھائی کرنے والے ہیں اور اس کے لئے ہاتھی خرید رہے ہیں۔

سہارنپور اس وقت فوجی نقطۂ نظر سے بہت اہمیت رکھتا تھا شمالی ہند کی جنگ آزادی کو دبانے کے لئے پنجاب سے فوجیں لائی جارہی تھیں ان کے لئے سہارنپور ہی سب سے مضبوط سنٹر تھا۔

کلکٹر ایس۔ بنکی روز روز کے انگریزی فوجوں پر حملوں سے حواس باختہ اور پریشان تھا اس خبر نے اس کے ہوش و حواس گم کر دیے چنانچہ اس نے فوراً ہی قاضی صاحب کی تلاش شروع کر دی اور قاضی رعایت علی خاں کو مع ان کے چند خادموں اور حامیوں کے گرفتار کر کے گولیوں سے اڑا دیا۔ جب یہ خبر تھانہ بھون پہونچی تو قصبہ میں آگ لگ گئی پہلے ہی آزادی کے متوالے شہریوں کو بغاوت پر آمادہ کر رہے تھے ان کا کام آسان ہوگیا اور مرحوم کے بھائی جو ابھی تک کھل کر باغیوں کے ساتھ نہ آئے تھے یعنی قاضی عنایت علی خاں ریٹائرڈ فوجی افسر کھل کر میدان میں آگئے۔

جہادِ آزادی کی تنظیم

تھانہ بھون اس وقت نہایت خوشحال قصبہ اور علم و فضل کا مرکز تھا بڑے بڑے عالم، بزرگ، صوفی و مرشد یہاں موجود تھے ان میں سب سے بڑی شخصیت حضرت حاجی امداد اللہ کی تھی جن کو سب عالم و فاضل بھی اپنا بزرگ مانتے تھے۔ حاجی صاحب عوام و خواص میں بیحد مقبول تھے۔

اس صورتحال پر غور کرنے کے لئے تھانہ بھون میں علماء کا اجتماع ہوا اس زمانہ میں ضلع مظفرنگر کے قصبات جھنجھانہ، کیرانہ، کاندھلہ اور شاملی میں بڑے بڑے علماء اور مرشد موجود تھے جلسہ میں ضلع سہارنپور اور میرٹھ تک کے علماء نے شرکت کی۔ حاجی صاحب نے جلسہ کی صدارت کی۔ جلسہ میں انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے کی تجویز اتفاق رائے سے پاس ہوئی۔

کلکٹر کی طرف سے پیش کش

پولیس اسٹیشن تھانہ بھون یہاں کے حالات کی کلکٹر ضلع کو برابر اطلاع دے رہا تھا۔ ایس۔ بنکی کلکٹر سہارنپور کو جب یہ اطلاع ملی تو وہ اپنی غلطی (قاضی رعایت علی کو شہید کرنے اور جلد بازی) پر بہت پچھتایا اور وقت کی نزاکت کا

احساس کرتے ہوئے اس نے قاضی عنایت علی کو پیشکش کی کہ سرکار پورا پرگنہ تھانہ بھون آپ کو دے کر آپ کو اس کا نواب تسلیم کرلے گی آپ تحریک آزادی سے الگ ہو جائیں۔ قاضی عنایت علی خاں نے اس پیشکش کو حقارت سے ٹھکرا دیا اور جہادِ آزادی کے سرگرم رہنماؤں میں شامل ہو گئے۔

بقول مؤرخ تحریک آزادی مولانا محمد میاں دیوبندی (علماء ہند کا شاندار ماضی) اب تھانہ بھون مسلم جدوجہد کا مرکز بن چکا تھا۔

آزادی کے مُجاہدوں کا پہلا حملہ

جہاد کے اعلان کے بعد انگریزوں پر بہت ہیبت چھا گئی اور انہوں نے انتظامیہ اور پولیس اسٹیشن سے اپنے عملے کا بڑا حصہ واپس بلا لیا جو رہ گئے ان میں بھی جو مادرِ وطن کی آزادی سے دلچسپی رکھتے تھے انہوں نے اپنی خدمات باشندگان و مجاہدین تھانہ بھون کے حوالہ کر دیں۔

ایس نیکی سہارنپور کے کلکٹر کے علاوہ فوج کا ریجنل (علاقائی) کمانڈر بھی تھا، تھانہ بھون کے حالات سے متاثر ہو کر اس نے علاقہ کے انگریز ادارں اور فوجی لحاظ سے اہم جگہوں کی حفاظت کے لئے فوجی امداد بھی اور اسلحہ و گولہ بارود بھی روانہ کیا۔ ایسی ہی ایک فوجی ٹکڑی پر جو اسلحہ اور فوج کی ضرورت کا سامان لے کر قصبہ شاملی ضلع مظفر نگر جا رہی تھی باغ شیر علی جس کو اس وقت خان والا باغ اور اب ماما والا باغ کہا جاتا ہے مجاہدوں نے حملہ کیا پوری ٹکڑی کو ختم کر دیا اور پورا اسلحہ آزادی کے متوالوں کو مل گیا۔ حملہ کے بعد جبکہ پوری ٹکڑی کام آگئی تھی صرف ایک گھوڑا سوار سپاہی کسی طرح جنگل کی طرف بھاگ جانے میں کامیاب ہوا مگر تھوڑے ہی فاصلہ پر وہ گھوڑے سے گر کر مر گیا۔

آزادی کے سُورماؤں کا دُوسرا حملہ

پہلے حملہ کے بعد مجاہدین کے کیمپ میں اطلاع ملی کہ ایس نیکی کلکٹر سہارنپور تھانہ بھون اور آس پاس کے حفاظتی انتظامات کا معائنہ کرنے کے لئے شاملی آیا ہے۔ مجاہدین آزادی اس فوجی کمانڈر اور مرحوم قاضی رعایت علی کے قاتل کی فکر میں تھے یہ موقع غنیمت ہاتھ آیا۔ آزادی کے شیدائی محبتِ وطن کا ایک مختصر سا لشکر شاملی پر حملہ آور ہوا لشکر کی قیادت حافظ ضامن علی مولانا رشید احمد گنگوہی۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا محمد منیر نانوتوی کر رہے تھے ایک دستہ کی کمان قاضی عنایت علی کے ہاتھ میں تھی۔ شاملی پہونچ کر مجاہدوں کا انگریزی فوج اور مسلح پولیس سے سخت مقابلہ ہوا مجاہدوں کے جوش اور پے در پے حملوں کا انگریزی فوج مقابلہ نہ کر سکی اور وہ پسپا ہو کر قلعہ بند ہو گئی تحصیل شاملی کی عمارت جو ایک قلعہ کی شکل کی تھی اب انگریزوں کے لئے جنگی قلعہ کا کام دے رہی تھی۔ نہایت مضبوط صدر دروازہ بند کر لیا گیا اور دیواروں میں سوراخ کر کے ان میں سے مجاہدین پر گولیاں چلائی جا رہی تھیں۔ مجاہدین کے پاس بندوقیں بہت ہی کم تھیں اور وہ کھلے میدان میں تھے اس لئے دو روز کی لڑائی میں ان کا جانی نقصان بہت ہوا۔ تیسرے دن حافظ ضامن علی نے کسی طرح وہ دروازہ توڑ لیا انگریز فوجیوں نے ان پر گولیوں کی بارش کر دی اور وہ وہیں شہید ہو گئے۔ دروازہ ٹوٹ جانے پر مجاہدین میں نیا جوش پیدا ہو گیا اور انہوں نے تحصیل میں گھس کر انگریزی فوج اور مسلح پولیس کو زیر کر لیا۔ تحصیل کو لوٹ لیا انگریزی فوجی زیادہ تر قتل ہوئے کچھ نے معافی مانگ لی۔ تحصیل کے جو لوگ نہیں لڑے تھے ان سے مجاہدین نے کچھ نہیں کہا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ایس۔ نیکی کے آنے کی اطلاع غلط تھی۔ اب آزادی کے سپاہیوں کے حوصلے بہت بلند تھے لوگ بڑی تعداد میں حضرت گنگوہی اور حضرت حاجی صاحب کے آس پاس جمع ہو گئے تھے اور آئندہ اقدام پر غور کر رہے تھے۔ مجاہدین کے ساتھ اب عام شہری کھل کر آچکے تھے اور خیال تھا کہ انگریزوں کو اب تھانہ بھون میں قدم نہ جمانے دیا جائے گا۔

انگریزی فوج کا پہلا حملہ

تحصیل شاملی کے لٹ جانے کی اطلاع جب ایس نیکی کلکٹر سہارنپور و کمانڈنگ آفیسر ریجنل آرمی فورسس کو ملی تو وہ سخت پریشان ہوا اب اس نے پوری تیاری کے ساتھ فوج اور توپ خانہ انگریز کمانڈر کی کمان میں تھانہ بھون روانہ کیا کمانڈر کے علاوہ کئی انگریز افسر اس فوج میں شامل تھے۔ توپ خانہ کا افسر مسلمان اور حضرت حاجی امداد اللہ کا مرید تھا۔ اس فوج نے تھانہ بھون کا محاصرہ کر کے ریتی دروازہ کے باہر مزار پر اپنا توپ خانہ قائم کیا اور پوری رات قصبہ پر توپوں سے گولہ باری کی گئی۔ افسر توپ خانہ کو معلوم تھا کہ حضرت حاجی امداد اللہ اس کے پیر و مرشد قصبہ میں موجود ہیں اس لئے اس نے تمام توپوں کے منھ اوپر کو کرا دئے جس سے تمام رات کی گولہ باری میں ایک گولہ بھی شہر کی آبادی پر نہیں گرا۔ انگریزی کمانڈر نے صبح کو حالات معلوم کئے

اور قصبہ کو صحیح حالت میں سن کر آگ بگولا ہو گیا اور اس نے فوراً افسر توپ خانہ کو گرفتار کر لیا جس کو کورٹ مارشل کے بعد وہیں گولیوں سے شہید کر دیا گیا اور اسکی جگہ ایک انگریز افسر کو توپ خانہ کا انچارج بنا دیا گیا جس نے آبادی کا نشانہ لے کر گولہ باری شروع کرا دی جس سے مکانات گرنے لگے اور آدمی شہید ہونے لگے اس سے قصبہ میں کہرام مچ گیا۔ قصبہ کے مجاہدوں کے پاس کوئی توپ نہ تھی محض دیسی اور گھریلو ہتھیار تھے جن سے شہر کے دروازہ کی حفاظت کا کام لیا جا رہا تھا۔ مجاہدین میں سے ایک توپچی نے اس ہوشیاری سے ایک گولہ داغا جو انگریزی فوج کی توپ کے دہانے پر لگا اور وہ توپ بیکار ہو گئی دوسرے گولہ نے دوسری توپ کو نقصان پہونچایا۔ آزادی کے پروانوں کے پاس اسلحہ کی بیحد کمی تھی ہزاروں مجاہدین میں سے چند کے پاس بندوقیں تھیں تلوار، تیر کمان، نیزے اور آتشبازی کے گولے تھے۔ مجاہدین کو خیال تھا کہ انگریزی فوج کو مزید کمک پہونچ جائے گی اس لئے محاصرہ کے دوسرے ہی روز شہر سے نکل کر انگریزی فوج پر حملہ کر دیا۔ سات گھنٹہ کی دست بدست جنگ کے بعد انگریزی فوج شکست کھا گئی مگر وہ بڑی باقاعدگی سے پسپا ہوئی اور جاتے ہوئے اپنا توپخانہ اور تمام اسلحہ ساتھ لے گئی۔ ایک اندازہ کے مطابق اس جنگ میں دونوں فریق کے تقریباً پانچ سو آدمی کام آئے جن میں زیادہ تعداد مجاہدین کی تھی مگر ان کے جوش اور آزادی کے جذبہ نے انگریزی فوج کے چھکے چھڑا دئے تھے۔

انگریزی فوج کا دوسرا حملہ

پہلے حملہ میں شکست کے بعد سکھ فوجیوں کو ساتھ لے کر پہلے سے بڑی فوج اور بہت بڑے توپخانہ کے ساتھ تھانہ بھون پر دوسرا حملہ کیا گیا۔

فوج نے قصبہ کا محاصرہ کر کے پہلے توپوں سے سخت گولہ باری کی اور شہر کے صدر دروازہ کو تباہ کر دیا جب آبادی کی طرف سے کوئی جواب یا ڈیفنس کی کارروائی نہ ہوئی تو انگریزی فوج قصبہ میں داخل ہو گئی پہلے تو لوٹ مار کا بازار گرم ہوا۔ لوگ قصبہ خالی کرتے وقت سامان تو چھوڑ ہی گئے تھے بعض اپنا روپیہ، پیسہ اور زیورات تک نہیں لے جا سکے تھے۔ فوج نے خوب خوب ہاتھ رنگے مکانوں کو لوٹا اور اچھے مکانوں کو آگ لگائی جو انسان نظر آیا خواہ معذور یا بیمار ہی کیوں نہ ہو اس کو گرفتار کر لیا گیا زیادہ تر کو تو گولیوں سے اُڑا دیا گیا۔ قاضی عنایت علی کے پرسنل اسسٹنٹ مولوی عبدالرحیم اور ان کی بوڑھی والدہ کو شہید کیا گیا باقی ۱۳۲ لوگوں کو گرفتار کر کے مہاجنوں والی باغیچی میں پھانسی دیدی گئی۔

اس طرح سورماؤں کی اس سرزمین پر انگریزی قبضہ کا آغاز ہوا۔

اب انگریز حکومت کی کوشش ان رہنماؤں کو گرفتار کر لے اور سزائیں دینے کی تھی لیکن حیرت کی بات ہے کہ اتنی بڑی شکست کے بعد بھی عوام کے دل میں کوئی خوف و ہراس پیدا نہیں ہوا۔ عوام کو لالچ دئے گئے۔ خوف دلائے گئے مگر کسی نے بھی ان رہنماؤں کا سراغ نہیں دیا۔ اس لئے اس وقت کسی کو گرفتار نہ کیا جا سکا۔

اس شکست کے بعد آزادی وطن کے پروانوں نے اپنی حکمت عملی بدلی اب وہ تھانہ بھون کی بجائے دوسرے قصبوں۔ شہروں اور دیہات میں آزادی وطن کی روح پھونکنے اور انگریزی حکومت سے عدم تعاون کے لئے کام کر رہے تھے اس سلسلہ میں حضرت حاجی امداد اللہ دو سال تک گاؤں گاؤں اور قصبہ قصبہ جا کر عوام کو بغاوت کے لئے تیار کرتے رہے۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی آنکھوں کی خرابی کی وجہ سے باہر کا سفر نہ کر سکے کچھ عرصہ گنگوہ کے آس پاس روپوش رہے اور پھر گرفتار کر لئے گئے ان کو جیل خانہ میں ناقابل بیان اذیتیں دی گئیں مولانا حسین احمد مدنی کے بیان کے مطابق حضرت گنگوہی کی ساری پشت اذیتوں سے داغ دار کر دی گئی تھی چھ ماہ جیل میں رہے پھر جب انگریزوں نے عام معافی کا اعلان کیا تب وہ رہا ہوئے اور قصبہ کے جو اور مجاہد ہاتھ آ گئے تھے اور جیل میں تھے رہا ہوئے۔ آزادی کے مجاہدوں نے اب دہلی کو اپنا مرکز بنایا مگر تھانہ بھون اب بھی مجاہدوں کا مرکز کہلاتا تھا اور انگریز باشندگان قصبہ کی ہر نقل و حرکت پر نظر رکھتے تھے۔ قصبہ اگرچہ اُجڑ چکا تھا مکانات مسمار ہو چکے تھے مال و دولت انگریز فوجیوں کے ہاتھوں لٹ چکا تھا مگر جو بھی قصبہ میں موجود تھے وہ انگریزوں سے متنفر اور آزادیٔ وطن کے دیوانے تھے۔

مجاہدین نے منتشر ہو کر مختلف علاقوں کو سنبھالا۔ حضرت حاجی امداد اللہ دو سال تک مجاہدین تیار کرنے کے بعد مکۂ مکرمہ کو ہجرت کر گئے تھے مگر وہاں بھی آزادی وطن کے لئے عرب میں مقیم ہندوستانیوں کو تیار کرتے رہے۔ انگریزوں نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن کو گرفتار کر لیا اور ملک سے باہر لے جا کر مالٹا میں نظر بند کر دیا وہاں راجہ مہیندر پرتاپ پہلے سے نظر بند تھے۔ مالٹا میں دوسرے ملکوں۔ ٹرکی، بلقان اور عرب رہنما بھی نظر بند تھے۔ وہاں تشدد چھوڑ کر اور برادران وطن کو ساتھ لے کر عدم تشدد (اہنسا) تک کے

ساتھ تحریکِ آزادی شروع کرنے کا تاریخی فیصلہ کیا گیا۔ قاضی عنایت علی اب بھی اپنے شکست خوردہ دستہ کو لئے ہوئے انگریزوں کی تلاش میں تھے مختصل بجا ضلع مظفر نگر سے ضلع بجنور میں داخل ہو گئے۔ اس سفر کے دوران ان کو محبانِ وطن کی ایک خاصی تعداد مل گئی جو ان کی فوج میں شامل ہو گئی۔ قاضی صاحب کی روز بروز طاقت بڑھنے سے انگریز بہت خائف تھے اور انہوں نے فوج کی کئی ٹکڑیاں قاضی صاحب کی گرفتاری کے لیے بھیج دی تھیں، آخر نجیب آباد یا اس کے قریب کسی قصبہ میں انگریزوں کی مسلم فوج نے جس کے پاس توپخانہ بھی تھا سخت مقابلہ ہوا۔ مجاہدین کی تعداد انگریزی فوج کے مقابلہ میں بہت کم تھی اور توپخانہ تو برائے نام تھا۔ دس گھنٹہ کی لڑائی میں انگریزی فوج کے قدم اکھڑ گئے۔ قاضی صاحب ایک ماہر جنگ تھے۔ میدان جنگ میں دو دستہ تلوار چلاتے تھے۔ ان کے داہنے ان کا معتمد ساتھی چودھری ہماچل سنگھ راجپوت اور بائیں جانب ان کا ایک جاں نثار کلو لڑتا تھا۔ چودھری ہماچل سنگھ کو اس لڑائی میں تو گولیاں لگیں اور وہ "قاضی جی خدا حافظ" کہتے ہوئے گھوڑے پر گر گئے قاضی صاحب فوراً اپنے گھوڑے سے کودے اور چودھری ہماچل کو گود میں اٹھا کر اپنے خیمہ میں لے گئے اور اپنے فدائی کی موت کا اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ بہت دیر تک اپنے کو نہ سنبھال سکے اب میدان انگریزوں کے ہاتھ تھا۔ قاضی صاحب اپنے زندہ فدائیوں کو نکال لینے میں کامیاب ہوئے مگر سامان جنگ پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔

قاضی عنایت علی قصبہ تھانہ بھون کے با اختیار قاضی تھے ان کا خاندان شاہجہاں کے زمانہ سے اس عہدہ پر تھا۔ بائیس گاؤں جاگیر میں ملے ہوئے تھے۔ بہترین شہسوار اور جنگ کے فن میں ماہر تھے علاقہ کے معزز ترین ہستی مانے جاتے تھے ساتھ ہی نہایت سچے خوبصورت اور جنگ باز تھے اس وقت انکی عمر ۳۰ یا ۳۲ سال تھی۔ ضلع بجنور سے نکل کر وہ میرٹھ ہوتے ہوئے بندیل کھنڈ پہونچے اور وہاں کے آزادی پسندوں کو لے کر انگریزوں پر حملے کرتے ہوئے وہ بھوپال پہونچ گئے اور اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ رہنے لگے وہاں ایک دن ہز ہائی نس قدسیہ بیگم بھوپال کی سواری آتی نظر پڑی یہ اپنے گھوڑے پر سوار تھے مردم شناس بیگم نے ایک ہی نظر میں شہسوار کی خوبی کو پہچان لیا۔ ہز ہائی نس نے ان کو معقول تنخواہ پر سواروں اور گھوڑوں کی تربیت کا اعلیٰ افسر مقرر کیا وہاں سے وہ جودھپور چلے گئے وہاں بھی ان کی شہسواری اور فنِ سپہ گری نے ان کے لئے خطرہ پیدا کر دیا۔ موصوف جودھپور چھوڑ کر ریاست الور کے قصبہ تجارہ کے قریب ایک گاؤں میں اپنے ایک پرانے تلواریں بنانے والے دوست کے یہاں آ گئے اور ۱۹۱۰ء میں زندگی یہیں ختم کر دی۔

۱۸۵۷ء کے بعد تھانہ بھون کی حالت

انگریزوں کے آخری حملے سے قصبہ بالکل برباد اور ویران ہو گیا تھا۔ قصبہ کے لوگوں نے کچھ قریب کے علاقوں اور کچھ دور دراز کی ریاستوں میں پناہ لی تھانہ بھون کے کچھ خاندان حیدرآباد۔ بھوپال، جودھپور اور الور میں اب بھی موجود ہیں ان کی اولادیں تھانہ بھون سے بالکل ناواقف اور بیگانہ ہیں۔ جن سرکاری ملازموں نے تحریک آزادی میں حصہ نہ لیا تھا ان کے مکانات بھی انگریزی فوج نے تباہ و برباد کر دئے تھے۔ بچے کھچے فوجی ملازموں کو ذمہ دارانہ جگہوں سے ہٹا کر فوج کے معمولی شعبوں میں لگا دیا گیا تھا ان پر اور مجاہدینِ آزادی پر بغاوت کے مقدمے چلائے گئے اور زیادہ تر کو سزائے موت دے دی گئی۔ قاضی عنایت علی کے ملازموں۔ ساتھیوں اور عزیزوں میں کسی کو زندہ نہ چھوڑا گیا۔ قاضی صاحب کے مختار عام دیوان روپ سنگھ کو پھانسی دی گئی اور جائیداد ضبط کر لی گئی حالانکہ دیوان صاحب نہایت ہی شریف اور غیر سیاسی آدمی تھے۔ مجاہدین قصبہ کی بارہ ہزار بیگھ زمین کو ضبط کر کے محال باغیان بنا دیا گیا۔ قاضی صاحب کے بائیس گاؤں جو ان کی مستقل جاگیر ان کی اولاد تک کے لئے تھی ضبط کر لی گئی بڑے بڑے عالیشان مکانات اور قیمتی جائدادیں کوڑیوں کے مول نیلام کر دی گئیں قصبہ دو سال ویران رہا جو مکانات یا کھنڈر بچ گئے تھے وہ مرمت نہ ہونے کی وجہ سے منہدم ہو گئے۔

حیرت انگیز شہیدوں کی لاشیں

ملکہ وکٹوریہ کی عام معافی کے اعلان کے بعد جب دوبارہ قصبہ آباد ہوا اور لوگ اپنے وطن کو لوٹے تو یہ دیکھ کر حیرت میں رہ گئے کہ 132 شہیدوں کی لاشیں درختوں پر ٹنگی ہوئی ہیں جن کو مہاجنوں والی باغیچی میں پھانسی دی گئی تھی۔ ان لاشوں کو جانوروں نے کھایا تھا نہ گلی اور سڑی تھیں ہاں گوشت اور کھال سوکھ گئے تھے (جنگ آزادی میں علماء کا حصہ جلد دوم) ایسا کوئی ریکارڈ میسّر نہیں آتا ہے کہ جس سے تھانہ بھون کے آزادی کی جدوجہد میں شہید ہونے والوں کی صحیح تعداد مل سکے۔ بزرگوں کے بیان کے مطابق ایک ہزار افراد کی شہادت ثابت ہوتی ہے جن میں مردوں کے علاوہ عورتیں اور بچے بھی شامل ہیں۔ وہ لوگ

اس کے علاوہ ہیں جو قصبہ سے جاتے ہوئے حادثوں کا شکار ہوئے یا انگریزوں کا مقابلہ کرتے ہوئے دوسرے قصبوں اور مواضعات میں شہید ہوئے۔

بغاوت کی بو آتی ہے

انگریزوں پر قصبہ تھانہ بھون کے آزادی کے مجاہدین کی ہیبت بہت عرصہ تک رہی۔ برسوں تھانہ بھون بلیک لسٹ رہا وہاں کے باشندوں کو نہ فوج اور پولیس میں لیا جاتا تھا نہ کوئی اور سرکاری ملازمت دی جاتی تھی۔ پہلی بڑی لڑائی ۱۹۱۴ء تک یہاں کے ایک شخص کو بھی فوج میں نہیں لیا گیا۔ قصبہ میں نہ اسکول کھولا گیا نہ اسپتال بنایا گیا نہ سڑکوں کی مرمت کی گئی نہ روشنی کا انتظام کیا گیا۔ یہ واقعہ آج بھی قصبہ کے لوگوں کی زبان پر ہے کہ ۱۹۱۴ء میں ایک انگریز پلٹن تھانہ بھون سے گزر رہی تھی اس کے انگریز کمانڈر کے دریافت کرنے پر لوگوں نے قصبہ کا نام بتایا تو وہ حیرت سے بولا" اوہ تھانہ بھون ابھی تک آباد ہے"!

اس طرح ۱۹۱۷ء میں مسٹر سی۔ مور کلکٹر ضلع مظفر نگر تھانہ بھون آئے انہوں نے قاضی احسان الحق سے معلوم کیا کہ آپ کے اور قاضی عنایت علی کے کیا تعلقات تھے انہوں نے خاندانی رشتہ داری بتائی تو سی مور نے کہا کہ وہ باغی ابھی تک زندہ ہے اور کبھی کبھی یہاں بھی آتا ہے قاضی احسان الحق نے کہا کہ مجھ کو کوئی علم نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ سی۔ مور نے تھانہ بھون دیکھنے کے بعد برملا کہا کہ" تھانہ بھون سے اب بھی بغاوت کی بو آتی ہے۔"

ہر ترقی سے محروم

انگریزوں نے اس قصبہ کو زندگی کی ہر نعمت اور ترقی سے محروم رکھا مگر وطن کی آزادی کے دیوانوں کی یہ انقلابی سرزمین اور جنگ آزادی کے سورماؤں کا بے مثال مرکز آج بھی تمام ترقیوں سے محروم ہے نہ وہاں کوئی کارخانہ ہے نہ کوئی معقول اسپتال ہے نہ کوئی ڈگری کالج ہے معلوم ہوتا ہے انگریزوں سے بغاوت کی سزا آج بھی وطن کے شیدائیوں کی سرزمین بھگت رہی ہے۔

اس کی ضرورت ہے کہ یہاں آزادی کے کسی مجاہد کے نام پر اسپتال، کالج اور ویمنز کالج قائم کیا جائے۔ کوئی کارخانہ کھولا جائے اور آزادی کے پروانوں کی قربانی کی یادگار قائم کرتے ہوئے ان کے وارثوں کو ملازمتوں اور آزادی کے ایوارڈ دئے جائیں۔

□□

محبت

ہزار دل میں کدورتیں ہوں
ہزار ذہنوں میں نفرتیں ہوں
مگر محبت ہی سر چڑھے گی

تمہاری رنجش کے بیج پودے
"نہ اُگ سکے ہیں نہ اُگ سکیں گے"
اگر رہے گی تو بس محبت
جہاں میں چمکے گا نام تیرا

یہ نام کالونیوں میں زندہ
یہ نام تابندیوں میں زندہ
یہ نام آنکھوں میں ہے سمایا
یہ نام پھولوں میں جگمگایا
یہ نام پاکیزگی کا آنچل
ہر ایک لب پہ ہے جلوہ گر یہ
مگر محبت ہی سر چڑھے گی

کہ اب زمانہ پلٹ رہا ہے
ہر ایک کانٹا بھی کٹ رہا ہے
محبتوں کا مزاج بن کر!
ہزار دل میں کدورتیں ہوں
ہزار ذہنوں میں نفرتیں ہوں
مگر محبت ہی سر چڑھے گی

اختر عمر اختر
۱۲۸/۲۲۵۔ محمود نگر
لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

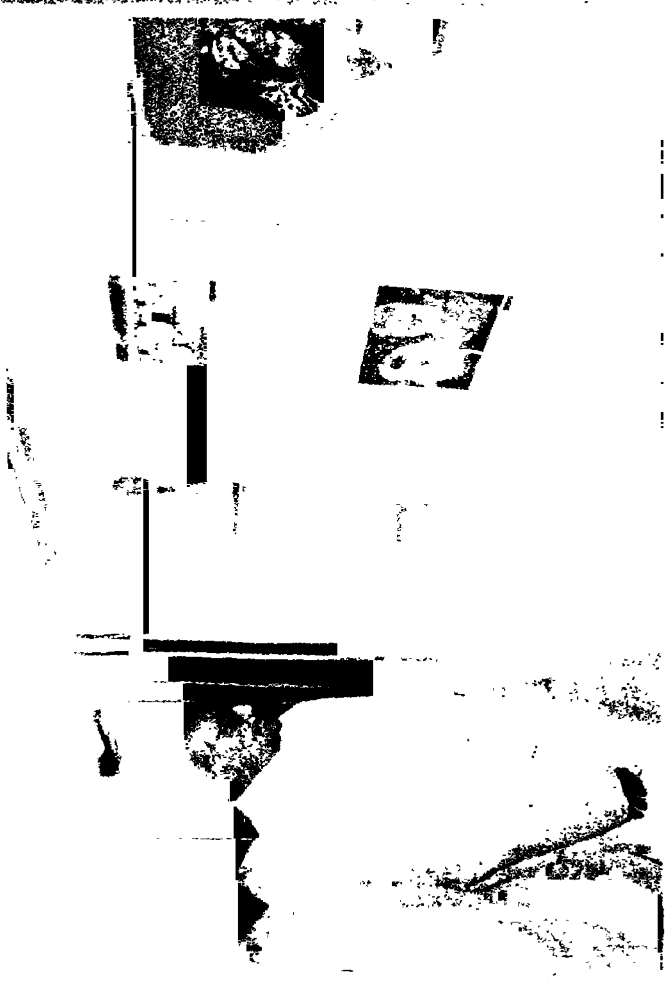


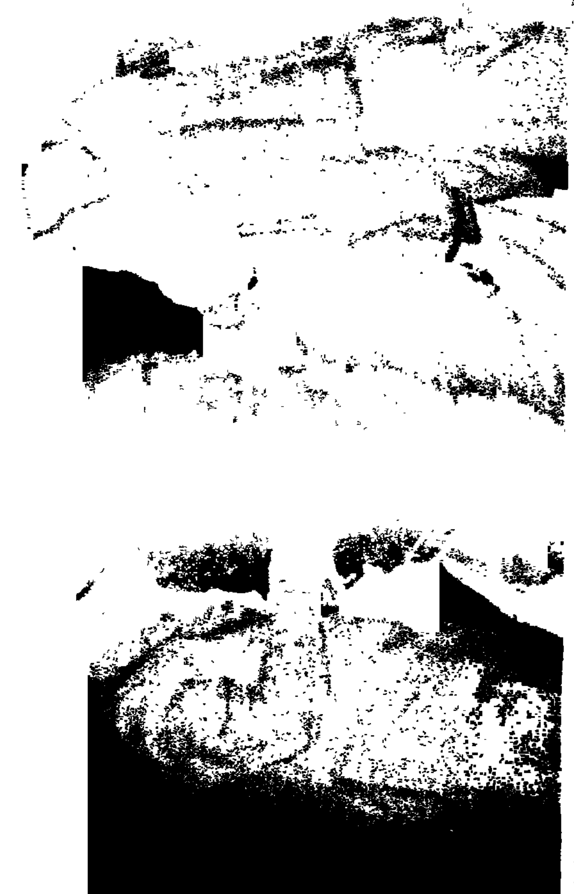
گورنر اتر پردیش شری موتی لال وورا دیوالی کے موقع پر راج بھون میں
مٹھائی تقسیم کرتے ہوئے۔

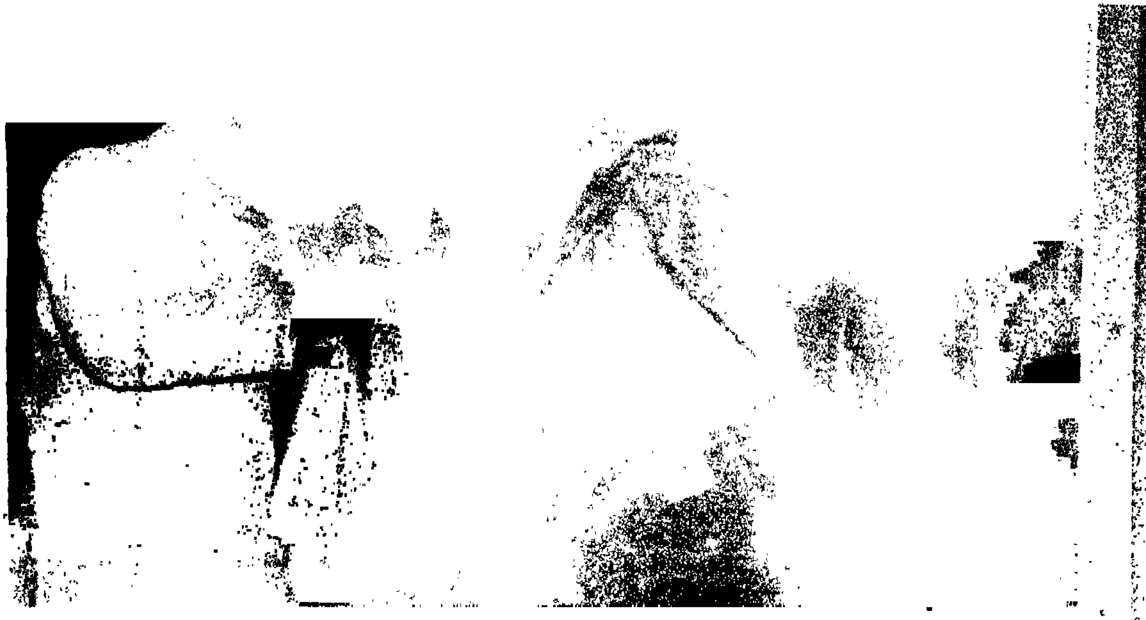
گورنر شری موتی لال وورا ۲۹ راکتوبر کو راج بھون میں "راشٹریہ پریاورن اُجالا"
اخبار کی رسمِ اجراء انجام دیتے ہوئے۔











گورنر اترپردیش شری موتی لال وورا ۲۰ر اکتوبر کو نئی دہلی میں "ماتر مندر سمیتی سنستھا" کے اعزازی جلسہ میں مخصوص افراد کو اعزاز عطا کرتے ہوئے۔

لیڈی گورنر شریمتی شانتی وورا ۲۲ر اکتوبر ۱۹۹۵ء کو راج بھون (لکھنؤ) میں مویشی اسپتال کی نوتعمیر عمارت کا افتتاح کرتی ہوئی۔ ساتھ میں گورنر شری موتی لال وورا بھی موجود ہیں۔



غزلیں

یوں بھی ہوتا ہے جو ملتے ہیں گلِ تر لے کر
وہی آتے ہیں انہی ہاتھوں میں پتھر لے کر

حادثے میرے مخالف ہیں کہ میں کیوں نکلا
اپنی آنکھوں میں نئی صبح کا منظر لے کر

میں نے ان آنکھوں میں جھانکا تو نظر آئیں مجھے
ایسی موجیں جو ابھرتی ہیں سمندر لے کر

آدمی وہ ہے جو شاداب درختوں کی طرح!
چھاؤں دے اوروں کو دھوپ اپنے بدن پر لے کر

پیاس کی جھیل کی، پنچھی کی کہانی یہ ہے
ابر آتے نہیں صحرا میں سمندر لے کر

یوں تو سب اپنے ہیں لیکن یہ بھروسا بھی نہیں
کون کس وقت نکل آئے گا خنجر لے کر

آبرو اپنی قناعت کی نہ بیچوں گا بشیر
میں نہ جاؤں گا یہ چہرا کسی در پر لے کر

بشیر فاروقی

۵۱۵، قندھاری لین،
ودھان سبھا مارگ
لکھنؤ

دیارِ عشق میں آشفتہ کار ہم بھی ہیں
زفرق تا بقدم شعلہ زار ہم بھی ہیں

گزر رہے ہیں گلستاں سے بوئے گل کی طرح
شریکِ موجِ نسیمِ بہار ہم بھی ہیں

جو سن سکو تو ہماری بھی عرضِ غم سن لو
کہ اک دکھے ہوئے دل کی پکار ہم بھی ہیں

نوازتے ہیں نگاہِ کرم سے جو سب کو
یہ ان سے کون کہے بے قرار ہم بھی ہیں

کبھی کبھی تو ہمیں فرصتِ مسرت دے
ترے شکارِ غمِ روزگار ہم بھی ہیں

شریکِ محفلِ واعظ جو ہو گئے تو کیا
بہ فیضِ تشنہ لبی بادہ خوار ہم بھی ہیں

شبِ فراق میں شاعر یہ کہہ گئے آنسو
بنائے رحمتِ پروردگار ہم بھی ہیں

شاعر فتحپوری

۸۹/۸۰۰، جگر اکاڈمی،
چمن گنج، کانپور

درد ہے، چارہ ساز کوئی نہیں
دل تو ہے، دل نواز کوئی نہیں

ہاتھ میں سب اٹھائے ہیں پتھر
ان میں آئینہ ساز کوئی نہیں

میرے جیسا گناہ گار، کرم!
نہیں، بندہ نواز کوئی نہیں

راہبر اور راہزن دونوں
دوست ہیں، ساز باز کوئی نہیں

مے ہے، ساقی ہے، جام ہے لیکن
مے کشو! مے نواز کوئی نہیں

جس میں شامل نہ ہو، تری آواز
ایسا دنیا میں ساز کوئی نہیں

ایک اس کے سوا زمانے میں
مظہر آگاہِ راز کوئی نہیں

مظہر رائے بریلوی

۷، بشیر مارکیٹ
رائے بریلی

فیّاض رفعت
دوردرشن کیندر۔ پناجی گوا
۴۰۳۰۰۱

شیرواڈکر ــــ شخص اور شاعر

"میری شاعری فتح کی سرشاری کا کبھی منظرنامہ نہیں بنی، شاید اس لئے میری شاعری شکست کے خوف سے ماورا رہی، یہ شاعری ازبسکہ اپنے وجود کے لیے کوشاں نہیں رہی شاید اسی لئے یہ مرنے کے خوف سے عاری ہے۔"

شیرواڈکر کی ان چار سطروں سے اُن کے آفاقی احساس کا اندازہ ہوتا ہے اور شاعرانہ عظمت کا بھی، وہ ایک رَمتے جوگی کی طرح سودوزیاں کے احساس کے بغیر زندگی کے رزمیہ پر نظر ڈالتے ہیں اور اپنی شاعری کو آزاد فضاؤں میں سانس لینے کے لیے کھُلا چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کی ادبی شخصیت کی تہذیب میں ایک عجب سی پیغمبرانہ شان ہے۔ شاید اِس لئے وہ زندگی کے رمز کو شاعری کے اس (IDIOM) میں اس خوبصورتی کے ساتھ سموتے ہیں کہ روشنی کا ایک سمندر ہماری آنکھوں کے سامنے وا ہوجاتا ہے۔ مگر وہ خود اس نور کی چادر کا حصہ نہیں بنتے، اِن کی سادگی بدستور قائم رہتی ہے۔ جسے نقروستی سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اِن کی فقیری ہی میں بقولِ اقبالؔ تونگری کا راز سربستہ اور پوشیدہ ہے۔ گیان پیٹھ کا اعزاز اپنے آپ میں ادبی دنیا کا امتیازی اعزاز ہے۔ یہ اور بات ہے کہ شیرواڈکر نے اس اعزاز کو اپنے لیے وجہ امتیاز نہیں بننے دیا۔ مشہور صوفی سنت تکارام کی خدمت میں پیشوا جی کے کارندے شاہی پشواز اور زروجواہر کی سوغات لے کر حاضر ہوئے تو انھوں نے یہ کہہ کر ان شاہی تحفوں کو لوٹا دیا "مجھے یہ زہر نہ دو" اعزازات کے تعلق سے شیرواڈکر کا بھی یہی نقطۂ نظر ہے۔

وشنو وامن شیرواڈکر مہاراشٹر کے ادبی منظرنامے پر نصف صدی سے چھائے ہوئے ہیں۔ ان کی شاعری، ڈرامے، ناول، افسانے سے قطع نظر ان کی شخصی سحرانگیزی روشن روایتوں کی جوت جگاتی رہی ہے۔ شخصیت کی توانائی اور اخلاقی ضابطوں کی قوّتِ نمو نے شیرواڈکر کو جاں فزا انفرادیت عطا کی ہے۔

انھوں نے سماجی شعور کی ایسی قندیل روشن کی ہے جو تاریکیوں کا سینہ چیرتی ہوئی زندگی کی صحت مند قدروں کو پروان چڑھاتی ہے اور انسانی آئین اور بصیرت میں اضافہ کرتی ہے۔

اس البیلے ادیب و شاعر کا جنم ستائیس فروری ۱۹۱۲ء میں پُونے میں ہوا۔ ان کا شاعرانہ نام "کوسماگرج" ہے جبکہ پیدائش کے وقت انھیں گجانند رنگا ناتھ شیرواڈکر کا نام دیا گیا تھا۔ ان کے والد "پمپل گاؤں" بشونت" ناسک میں وکالت کے پیشہ سے وابستہ تھے۔ بچپن ہی میں ان کے چچا نے شیرواڈکر کو گود لے لیا تھا۔

ان کی ابتدائی تعلیم پمپل گاؤں میں ہوئی، بعد میں وہ نیو انگلش ہائی اسکول ناسک میں زیرتعلیم رہے۔ اسکول کے دنوں ہی میں انھیں اسٹیج کے ساتھ دلچسپی پیدا ہوچلی تھی۔

اپنی مشہور تصنیف شودہ شیکسپیرچا" (شیکسپیئر پر ایک تحقیق) میں انھوں نے ایک جگہ تحریر کیا ہے کہ چچا کے مکان کے ایک کمرہ میں دنیا بھر کا کوڑا کرکٹ جمع تھا اور بہت سی پرانی کتابوں کا انبار بھی اسی گردوغبار سے اَٹے کمرے میں انھیں شیکسپیر کے بعض ڈراموں کے مطبوعہ نسخے ملے تھے۔ اصل میں ہوا یوں تھا کہ آزادی کی لڑائی عروج پر تھی۔ ناسک کے کلکٹر جیکسن کو جیالے باغیوں نے قتل کردیا تھا۔

پولیس باغیانہ لٹریچر کی تلاش میں تھی۔ شہر کی ایک لائبریری کی سبھی کتابوں کو ان کے چچا کے کمرہ میں ڈھیر کردیا گیا تھا تاکہ پولیس کے عتاب سے محفوظ رکھا جاسکے۔ شیرواڈکر میں مطالعہ کا ذوق تھا ہی۔ انھوں نے شکسپیر کو ازبر کرلیا۔ بعد میں انھوں نے میکبتھ اور اوتھیلو کو مراٹھی میں ترجمہ بھی کیا۔ شکسپیر کا پہلا ڈرامہ جس سے شیرواڈکر کا سابقہ پڑا تھا (Titus Andronicus) تھا۔

شعور کی پختگی کے ساتھ ساتھ شیرواڈکر کو احساس ہوا کہ شکسپیر کا فن اپنے طربیوں سے زیادہ المیوں میں زندہ وتابندہ ہے۔

شکسپیر کے ساتھ شیرواڈکر کی ذہنی وابستگی کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے امتحان کے دوران اس کی تحریروں کو بڑی روانی اور اعتماد کے ساتھ حوالے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

۱۷ برس کی عمر میں شیرواڈکر نے "بچوں کے لیے" لکھنا شروع کیا وہ ان دنوں ایچ۔پی۔ٹی کالج ناسک میں پڑھ رہے تھے۔ یہ ۱۹۳۰ء کی بات ہے۔ ان کی نظمیں مشہور زمانہ رسالہ "رتناکر" کی زینت بننے لگی تھیں۔ وہ بہ خوبی عصری ادبی تقاضوں کو پورا کر رہے تھے۔ دھیرے دھیرے شہرت ان کے نام کا حصہ بننے لگی۔ ان کا کلام اور مضامین متعدد مراٹھی اخباروں میں بھی شائع ہونے لگے۔

۱۹۳۳ء میں شیرواڈکر نے اپنا پہلا شعری مجموعہ "جیون لہری" اپنے اہتمام میں شائع کرایا۔ اگلے برس ہی انھوں نے مراٹھی اور انگریزی مضامین کے ساتھ بی۔اے کا امتحان پاس کرلیا۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۸ء کے درمیانی وقفے میں شیرواڈکر کی زندگی میں ایک نیا موڑ آیا۔ وہ ایک فلم کمپنی کے ساتھ وابستہ ہوگئے اور اسی دوران انھوں نے اپنا پہلا فلمی اسکرپٹ "ستی سلوچنا" کے نام سے تحریر کیا۔ نہ صرف یہ بلکہ اپنی تحریر کردہ اس فلم میں لکشمن کا کردار بھی خود ہی ادا کیا۔ ہندوستانی سینما کے خالق دادا صاحب پھالکے کا وطن بھی ناسک ہی تھا، اس اعتبار سے نوجوان شیرواڈکر کی فلمی سرگرمیوں کے ساتھ وابستگی فطری ہی تھی۔ ۱۹۳۸ء میں شیرواڈکر مراٹھی صحافت کی طرف منتقل ہوگئے اور بالترتیب "پربھات" "پونا" "سارتھی" "دھنردھاری" اور "نوگیگ" جیسے مشہور زمانہ اخباروں میں صحافت کی ذمہ داریوں کو نبھاتے رہے۔ کئی اعتبار سے ۱۹۴۲ء شیرواڈکر کے لیے سنگ میل ثابت ہوا۔ اسی زمانہ میں ان کی ولولہ خیز نظمیں "وشاکھا" کے نام سے اشاعت پذیر ہوئیں۔ ان نظموں کی اشاعت کے فوراً بعد مراٹھی ادب میں زبردست اثرات مرتب ہوئے۔ ان نظموں کے ناشر مراٹھی کی عظیم ادبی شخصیت شری وی۔ ایس کھانڈیکر ہی تھے۔ اسے بھی ایک خوشگوار اتفاق پر ہی محمول کیا جائے گا کہ کھانڈیکر پہلے مراٹھی ادیب تھے جنھیں ۱۹۷۴ء میں "گیان پیٹھ ایوارڈ" سے نوازا گیا۔

شعری مجموعے "وشاکھا" میں شیرواڈکر کی شعلہ انگیز شرربار نظمیں شامل ہیں جو عوامی اور ادبی حلقوں میں بیحد مقبول ہوئیں۔ ان کا مشہور قومی نغمہ "گرجا جے جے کار" (تخلیق ۱۹۳۹ء) اہم ترین قومی نغمہ ہے۔ جس کی گونج مراٹھا انچلوں ہی میں نہیں بلکہ پورے ہندوستان میں آج بھی سنی جاسکتی ہے۔ اس نغمہ کا ایک اقتباس اردو میں پیش خدمت ہے ؎

گاؤ انقلاب کی شادمانی کا گیت گاؤ
گاؤ انقلاب کی وجاہت کا گیت گاؤ
کہ یہ گیت، محتشم گیت ہے۔
اس گیت کے سُر سنگار میں
بے پناہ انسانی عزم کی طاقت پنہاں ہے
کہ اس گیت نے ہماری چھاتی کو
انقلاب کی آگ سے بھر دیا ہے
اور ہمارے ہاتھوں اور پاؤں کی زنجیروں کو
جوشیلی جھنکار عطا کی ہے۔
زنجیریں نغمہ بار ہیں۔
اے میری مادر وطن
تیری آنکھیں اشکبار کیوں
فرسودہ نظام کے بطن سے
روشن سویرا ہویدا ہوگا
مقدس آگ میں
جب ہمارے جسم جل رہے ہوں گے

تو ان شعلوں کے آنچل سے
انقلابی رہنمائی بشارتیں لے کر آئیں گے

کھانڈیکر، شیرواڈکر کے پہلے شعری مجموعے کے پیش لفظ میں یوں رقمطراز ہیں:

"کسوما گوج" کی شاعری میں انقلاب کی قوّتِ نمو ہے۔ ان کی شاعری کو شرار آہنگ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ پرانی قدروں کی شکست و ریخت اور نئی قدروں کی آمد آمد ان کی شاعری کا موضوع ہے۔ فرسودہ تر نظام کے بطن سے آرزوؤں کے نئے چراغ روشن ہو رہے ہیں۔ نئی روشنی اندھیروں کو جھٹلا رہی ہے۔ بے انصافی اور ظلم کے اندھیرے اپنی موت آپ مر رہے ہیں۔"

۱۹۴۲ء میں شیرواڈکر کا پہلا ناول "ویشنو" (Vaishnow) منظرِ عام پر آیا۔ اسی سال ان کا پہلا کھیل اسٹیج پر پیش کیا گیا۔ یہ "دورچے دیوے" (Doorchi Dive) تھا۔ اسکر وائلڈ کے مشہور زمانہ ڈرامے "ایک مثالی شوہر" (Ideal Husband) کی تلخیص، ۱۹۵۰ء سے شیرواڈکر نے خود کو مکمل طور پر لکھنے پڑھنے کے لئے وقف کر دیا۔ ناسک میں اقامت پذیر رہ کر وہ تصنیف و مطالعہ کے کام میں مشغول رہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ملک کے دور دراز علاقوں کا سفر بھی کرتے رہے، تاکہ سماجی، سیاسی تبدیلیوں سے مکمل طور پر آشنا رہ سکیں۔ وہ تقریر کی لذّت اور اُس کے سحر کے بھی قائل تھے۔ اسی لئے خود بھی شعلہ بار مقرر کی حیثیت سے خود کو منوا چکے تھے۔

شیرواڈکر ادبی انجمنوں کے ساتھ ہمیشہ وابستہ رہے۔ اس طرح عصری، ادبی تقاضوں پر ان کی نگاہ رہی۔ سیاسی اعتبار سے بھی وہ نہایت بیدار مغز شخص ہیں: "سمیکت مہاراشٹر تحریک" میں وہ قائد کی حیثیت سے شریک رہے اور ۱۹۵۹ء میں انھوں نے ستیہ گرہ میں بھی حصّہ لیا۔

گوا کی آزادی کے بعد شیرواڈکر نے وہاں کے مراٹھی بولنے والوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے آواز بلند کی۔ دس ہزار سے زیادہ لوگوں نے "مارگا و ساہتیہ سمیلن" میں شرکت کی جس کے سرخیل شیرواڈکر ہی تھے۔

یہ ادبی اجتماع انتہائی کامیاب رہا۔ اس کا اندازہ اس حقیقت سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ گوا کے اُس وقت کے وزیر اعلا شری ڈی بی بنڈوڈکر نے ادبی اجتماع کی مانگوں پر لبیک کہا اور مراٹھی کلچر اور زبان کے تحفظ کو بسر و چشم قبول بھی کیا۔

۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۲ء تک شیرواڈکر عوامی لائبریری ناسک کے صدر رہے۔ اس ادارے کے ساتھ ان کی وابستگی بڑی حد تک جذباتی تھی اور روحانی بھی۔ ۱۹۵۶ء سے ۱۹۷۵ء تک وہ پونا یونیورسٹی سینیٹ (Senate) کے رکن رہے۔ ۱۹۶۰ء میں "مراٹھی ناٹیہ سمیلن" کولہاپور میں منعقد ہوا، جس کی آپ نے صدارت کی۔ ان کا عظیم الشان کھیل "ناٹیہ سمراٹ" ابھی اسٹیج نہیں ہوا تھا اور نہ منظرِ عام پر ہی آیا تھا۔ مگر ان کی غیر معمولی ادبی صلاحیتوں کے اعتراف میں "ساہتیہ اکاڈمی" نے ان کے کھیل "ناٹیہ سمراٹ" کو ادبی اعزاز سے نوازا اور اسے ۱۹۷۴ء کی بہترین تصنیف قرار دیا۔ ایک طرح سے اگر یہ کہا جائے کہ ان پہ ادبی اعزازات کی بارش سی ہونے لگی تو مطلق غلط نہ ہوگا۔

گوا کے مشہور اور ممتاز شاعر بی۔ بی بورکر نے "کسوما گوج" کی شاعری پر اظہارِ خیال فرماتے ہوئے کہا:

"میں کسوما گوج کی بعض نظموں کو پڑھ کر حیرتوں کے طلسماتی آئینہ خانہ میں کھو گیا۔ ان کی نظموں کی رزمیہ کیفیت ہمارے شعور کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ خارج کے اظہار میں تو ان کا بیانیہ مابعد الطبیعاتی حقائق کی تہوں کو کھولتا ہے۔ اس کے باوجود عصری احساس زندہ اور تابندہ رہتا ہے۔ خصوصاً "خوابوں کی دولت" اور "دھرتی کا پریم گیت" ان کے دو عظیم الشان کارنامے ہیں اور یہ دونوں نظمیں رزم و بزم کی کیفیتوں سے بھرپور ہیں۔"

"دھرتی کا پریم گیت" میں انھوں نے "شرنگاروس" کو مختلف ستاروں اور سیاروں میں تلاش کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی ایک نظم "انقلاب کا استحصال" بھی ہمارے وجود کو نئی قوتوں سے بھر دیتی ہے۔ یقیناً اس نظم کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ شاعر کا قلم انقلاب کی شورش اور اس کی گھن گرج کو لفظوں کی رُوح میں اُتار سکتا ہے۔

کسوماگرج کی شاعری کے دو منتخب قرینے ہیں پہلا "قومی غنائیہ" اور دوسرا "سماجی شعور" جس کا انعکاس "کیشو سُت" ہے۔ کسوماگرج پہلے شاعر ہیں جنھوں نے سیاسی انقلاب کے شکوک کا خیر مقدم کیا۔ کسوماگرج کسی پیغمبر سے کم نہیں۔ ان کے کلام کا الہامی اور القائی مزاج ان کی شاعری کو جہاں بلند جبیں بناتا ہے۔ وہاں عوام کی دھڑکنوں سے بھی قریب کر دیتا ہے۔ کسوماگرج کے معاصرین بہ طور خاص بی۔ ایس مردھیکر، ریگے حتیٰ کہ کوی انل بھی نئی شاعری کے غالب ہوجانے کی بنا پر معدوم ہو گئے تھے۔ کسوماگرج کا اعتماد متزلزل ہوا نہ ہی انھوں نے اپنے شعری رویے میں کوئی تبدیلی کی۔ ان کا شعری سفر اس کامیاب کوشش سے عبارت ہے جو ادب کو اس کے تمام غوامض کے ساتھ انسان سے وابستہ کرتا ہے۔ ان کی شاعری کی دوسری خصوصیت غنائیت اُس کی نفسیات اور انقلاب آشنا رومانی امتزاج صرف کسوماگرج ہی سے عبارت ہے۔ ان کی ایک نظم جو ۱۹۳۶ء میں کہی گئی تھی اردو میں پیش خدمت ہے۔ یہ نظم مچھیرے کا سراپا کھینچتی ہے ؎

"مراٹھی آب و گل نے ایک محبت آمیز بُت تراشا
مغربی ہوائیں جس کے جسم کو چومتی ہوئی گزرتی ہیں
اس کا نادیدہ سینہ تن کر آمادۂ پیکار ہونے کا تصور
پیش کرتا ہے
اور جب یہ منظر سمندر دیکھتا ہے
اس کی بپھری ہوئی موجیں رفتہ رفتہ پُرسکون ہوجاتی ہیں
مدجزر میں تبدیل ہوجاتا ہے"

شجاعت اور حسن، ایثار اور المیہ یہ مچھیرے کی زندگی کے چار پہلو ہیں جو انتہائی خوبصورتی اور صداقت کے ساتھ مندرجہ بالا مصرعوں میں نظر آتے ہیں۔

کسوماگرج کی ایک نظم "ون رانی" جو ۱۹۳۰ء میں منظر عام پر آئی تھی، آج بھی ان کی بلند ذوق رومانیت اور حساس منظر نگاری کی عمدہ مثال ہے۔ نظم کے اقتباس ملاحظہ ہوں ؎

"مٹی کا برتن قدموں کی دُھن پر
سر کے بل چلتا ہے
چھلکتا ہوا پانی کشادہ ریشمی آنچل کو بھگوتا ہے
گھنگریالے بال پیشانی پر لہراتے ہیں
اور چوڑیاں ہاتھوں میں
جوانی کا گیت چھیڑتی ہیں"

اگر ہم ان کی ۱۹۳۳ء کی نظم "انتظار" کا مطالعہ کریں تو ہمیں احساس ہوگا کہ کسوماگرج اپنے وقت سے کتنا آگے تھے ؎

"تم نے چاند کو انڈیل دیا
اور ہر شے کو آگ کی پوشاک پہنا دی۔
میں اپنے بستر پر
آنسوؤں سے تکیے بھگوتا ہوں اور
تم نے اپنی باہیں میری گردن میں حائل کر دیں۔"

مندرجۂ بالا مصرعوں میں "لاونی" (ایک مراٹھی طرز) کے پرانے غنائیہ کا آہنگ ہے۔ اس کے باوجود شرنگار شہوت انگیز نہیں۔ نظم "انتظار" میں محبت، وابستگی اور واردات قلبی کا خوبصورت جمالیاتی اظہار ہے۔ ان کی ۱۹۴۳ء کی ایک اور منتخب نظم "ابودھ" کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ جس میں محبت اور محبت کے معاملات کو نہایت نزاکت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ریشمی زلفیں تکیہ پر منتشر اور چاندنی محبوب کی خوابیدہ آنکھوں میں آباد ہے۔ کسوماگرج نے سنسکرت کی کلاسیکی شاعری سے استفادہ کیا ہے لیکن استفادہ کے باوجود اکتساب کا شبہ نہیں ہوتا۔ الفاظ اور پیکر، آب رواں کی طرح مصروف سفر رہتے ہیں۔

اس قبیل کی تمام نظمیں ان کے مجموعۂ کلام "کنارہ" میں شامل ہیں۔ کھانڈیکر نے "وشاکھا" کے پیش لفظ میں لکھا ہے۔

"کسوماگرج" تقدس کے پجاری یا روحانی پیشوا نہیں ہیں۔ بلکہ شاعر ہیں اور ایسے انقلابی ہیں جو حسن اور قوت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور وہ بھی اس یقین کے ساتھ کہ زندگی کی یہ دو علامتیں روحانی تقدس میں بالآخر تبدیل ہو جائیں گی اور قوم، معاشرہ اور انسانیت کے کام آئیں گی۔"

کھانڈیکر اپنے اس پیش لفظ میں معترض بھی ہیں "کیا سبب

(باقی ص ۳۴ پر)

افسانہ

آصف فرخی
معرفت "ادبستان" دین دیال روڈ، لکھنؤ

دیمک

اس مکان میں کچھ تھا، مجھے شروع ہی سے احساس تھا۔ جب میں نے پہلی مرتبہ اسے دیکھا تھا تو مجھے اس آدمی کا خیال آیا تھا جس کے جسم میں سینکڑوں جراثیم پل رہے ہوں، جو بظاہر چل پھر رہا ہے لیکن اندر ہی اندر کسی مہلک بیماری کا شکار ہو چکا ہے۔ یہ خیال کیوں آیا تھا اس کی وجہ میں نہیں سمجھ سکا۔ تھی کوئی ایسی بات جو ٹھیک نہیں تھی اور یہیں اسی مکان کے اندر وقوع پذیر ہو رہی تھی۔ لیکن وہ تھی کیا، اس سے میں بے خبر تھا۔ اگر کچھ معلوم تھا تو بس اتنا کہ کچھ ہو رہا ہے یہاں، کوئی ایسی چیز ہے جس کا نام مجھے نہیں معلوم، جس کو میں دیکھ نہیں سکتا تھا مگر جو خاموشی کے ساتھ، خفیہ طور پر، بڑھتی پھیلتی جا رہی ہے۔ جو کچھ ہو رہا تھا اس نے مجھے اپنی موجودگی کا احساس دلا دیا تھا احساس ہوتا کیسے نہیں؟ ہر چیز میں موجود تھی۔ مکان کا ایک کونہ اس کے زیر اثر تھا۔ اس نے ساری چیزوں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا کیسے؟ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا ـــــ میں نے اسے دیکھا ہی کہاں تھا؟ ـــــ لیکن اتنا ضرور سمجھتا تھا کہ جو ہو رہا ہے، اسی کی وجہ سے ہو رہا ہے چیزیں اندر سے بدل چکی تھیں۔ اسی کی وجہ سے، مجھے اب یقین ہو گیا تھا۔ یہ نظر نہ آنے والی پھر بھی اپنا احساس دلا جانے والی اور چیزوں پر حاوی ہو جانے کی کیفیت گھر کے در و دیوار میں، تمام ساز و سامان میں اندر تک سرایت کر چکی تھی (اب یہ ناممکن تھا کہ آپ کسی بھی چیز پر نظر ڈالیں اور یہ خیال نہ آئے کہ وہ اس کے بھی پس پردہ کام کر رہی ہے) وہ کمرے کی فضا میں غبار کی طرح بھری رہتی، چھت سے مہین مہین بُرادے کی طرح جھڑتی تھی۔ میں اس کو پکڑنا چاہتا تھا، مٹھی میں بھینچ کر اسے جاننا اور اس کا نام پوچھنا چاہتا تھا، مگر یہ کبھی میرے ہاتھ نہیں آ سکی۔ سارے گھر میں بکھری بکھری سی رہتی۔ دھوپ کی طرح اداسی کی طرح، کسی ایک مخصوص جگہ بھی نہیں۔ پھر بھی ہر جگہ۔ اس وقت مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے رات کے سناٹے میں ایسا لگتا ہے کہ مکان سانس لے رہا ہے، کراہ رہا ہے کسی ذی رُوح کی طرح تکلیف میں مبتلا ہے۔ دیواریں لرزتی ہیں، کنڈیاں کھڑکھڑا کر کھل جاتی ہیں۔ دروازے چرچراتے ہیں۔ چھت کی کڑیوں سے چٹخن سنائی دیتی ہے۔ سیڑھیاں آپ ہی آپ اوپر کھسکنے لگتی ہیں اور کھڑکیوں کے پٹ سہمے ہوئے دل کی طرح رہ رہ کر دھڑکتے ہیں۔ دیواروں کے سینے، معلوم ہوتا تھا کہ پھٹ پڑیں گے (ان میں کیا دفن تھا، کون سے راز بھرے ہوئے تھے؟) چوکھٹ پر ہاتھ رکھو تو ڈھینے لگتی تھی۔ اوپر لکڑی کی پرت باریک چھلکے کی طرح برقرار تھی، اندر سے بالکل کھوکھلی۔ اس مکان میں کیا ہو رہا تھا؟ وہ خود تو نظر نہیں آ رہا تھا مگر اس کے نتائج ہر سمت پھیلے ہوئے تھے۔ دھول کی طرح سانس کے ساتھ چڑھ رہے تھے۔ آنکھوں میں گھس رہے تھے۔ تمام زندہ اور تمام جامد اشیا پر جمتے جا رہے تھے۔ پہلے پہل ایک شبہ سا تھا جس نے ایسا ان جانے اندھیرے گوشے سے سر اٹھایا تھا جہاں ہر وقت اندھیرا، سیلن اور پھپھوند رہتی تھی۔ پھر اس نے وہاں جڑ پکڑ لی تھی اور اب دھیرے دھیرے پھیل رہا تھا۔ راستے میں آنے والی چیزوں کو چپکے چپکے نگلتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ بے آواز کیفیت اس کے رینگنے کی تھی۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ چھت کی کڑیوں، دیوار کے اندرونی حصّوں، درزوں اور ریخوں میں کوئی چیز چل رہی ہے۔ بہت سی ٹانگوں والی اور بے آواز، اس کے منہ کا لعاب تیزاب کی طرح ہر چیز کو کاٹتا، نرم گودے کے ڈھیر میں تبدیل کرتا جا رہا ہے۔ اس مکان کو اندر ہی اندر کچھ کھائے جا رہا ہے۔ تب مجھے معلوم ہو گیا کہ اس

چیز کا نام کیا ہے ۔ یہ دیمک تھی ۔

دیکھنے میں وہ دوسرے مکانوں جیسا تھا ، نئے رنگ روغن کے بعد چمکتا ہوا اور دھوپ سے بھرا ہوا ، کوئی کہہ بھی نہیں سکتا تھا کہ اندر ہی اندر وہ غارت ہو چکا .... آنے سے پہلے ہم نے اس پر سفیدی کرائی تھی اور حالاں کہ یہاں آنے کے خیال سے کوئی بھی خوش نہیں تھا ، پھر بھی سب نے مل کر فرنیچر کو ترتیب سے رکھا تھا ۔ یہ فیصلہ تو ہم نے پہلے ہی سے کرلیا تھا کہ کون کس کمرے میں رہے گا ۔ سونے والے کمرے کون سے ہوں گے اور ملاقاتیوں سے ملنے والے کون سے ۔ جو کمرے سونے کے لئے طے کرلیے گئے تھے ، سب سے پہلے ان میں مسہریاں بچھائی گئی تھیں اور بندھے ہوئے سامان سے چادریں ، تکیے رضائیاں نکال کر بچھونے بچھا دیئے گئے تھے تاکہ تھک ہار کر رات کو سونے لیٹیں تو نیند آجائے ۔ (مجھے اس کے باوجود نیند نہیں آئی ۔ اس مکان کا سناٹا نامانوس تھا اور رات میں آنے والی مدھم صدائیں اجنبی ـــ کچھ راتوں کے بعد مجھے مسلسل یہ محسوس ہو رہا تھا کہ رات بھر، برابر کے کمرے میں کہیں کسی جگہ ہزاروں جبڑے چل رہے ہیں ، مسلسل حرکت میں ہیں)

اگلے دن فرش پر قالین بچھ گیا ۔ صوفے اپنی اپنی جگہوں پر جم گئے اور پردے ٹانک دیئے گئے تو گھر کی سی شکل بن گئی ۔ خالی مکان میں بسا ہوا وہ دبا دبا سا سونا پن رخصت ہو گیا اور رستا بستا گھریلو پن اس کی جگہ لینے لگا ۔ ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار بھی نہ تھا کہ سر چھپانے کا یہ جو آسرا ہو گیا ہے اس پر صبر شکر کرکے اور اس کو گوشۂ عافیت سمجھ کر بیٹھ رہیں اور جیسے جیسے ہم وہاں رہنے لگے تو وہ ابتدائی مایوسی ، بددلی اور یہ احساس کہ ہم اپنے درجے سے نیچے گر گئے ہیں ، یہ سب بھی کسی قدر مندمل ہونے لگے ۔

میں نے ان میں سے کسی کو نہیں بتایا تھا کہ اس مکان کو دیکھ کر میرا پہلا تاثر کیا ہوا تھا ۔ مجھے اسی وقت اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی ایسی بات ہے ضرور اس مکان میں جس کی وجہ سے یہاں آگے چل کر خرابی پیدا ہوگی ۔ اس وقت سامنے کی دیوار پر دھوپ پھیلی ہوئی تھی ۔ مکان کا دروازہ کھلا ہوا تھا ۔ صبح کے وقت وہ مکان آرام دہ اور پُرسکون محسوس ہو رہا تھا ۔

معاً مجھے یہ محسوس ہوا کہ یہ طمانیت محض ایک دھوکا ہے ، اس کی اصلیت ایسی نہیں ہو سکتی ۔ اس کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی ، اس لیے میں یہ بات کہتے کہتے رک گیا تھا ۔ اب یہ شک یقین میں بدلنے لگا تھا ۔ تازہ سفیدی والی دیواریں ، کھڑکیوں میں پنکھے کی ہوا سے اُڑتے ہوئے پردے ، کھلے ہوئے دروازے ، کمروں میں ترتیب سے رکھا ہوا سامان ۔ ان کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ یہ سب اوپری ہے ۔ اندر ہی اندر شدید اعصاب شکن تناؤ اور دشمنی سانپ کی طرح کنڈلی مارے بیٹھے ہوئے ہیں اور ذرا سا موقع ملتے ہی پھن کاڑھ لیں گے ۔ مجھے دیواروں سے ان سانپ جیسے جذبوں کے سرسرانے کی آوازیں آتی تھیں ، ان کا رینگنا محسوس ہوتا تھا ۔

اس احساس میں بھی میں نے کسی کو شریک نہیں کیا ۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ باقی گھر والوں کی اور زیادہ دل شکنی ہو ۔ ہم میں سے کوئی بھی یہاں اپنی خوشی سے نہیں آیا تھا ۔ بات یہ ہے کہ ہم نئے گھر میں آئے تو تھے لیکن بہت کچھ پیچھے چھوڑ دینے کے دکھ کے ساتھ ۔ میں تو اس بات کو سمجھتا تھا کہ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ ہم اس پچھلے مکان میں بہت خوش و خرم رہے ہیں لیکن آخر کو وہ سرکاری مکان ہے اور ملازمت کی مدت ختم ہو جانے کے بعد ہم اس میں نہیں رہ سکتے ۔ اتنے برس سے اس میں رہنے کی وجہ سے ہمارا اس پر کوئی حق نہیں بنتا تھا ۔ لیکن بیوی اور بچوں کو یہ بات قبول کرنے میں بڑی مشکل پیش آرہی تھی کہ جس مکان میں ہم اتنے برسوں سے رہتے آئے ہیں ، جہاں ہماری زندگی بڑے سکون اور سبھاؤ سے چلتی رہی ہے وہ ، ہمیں اب چھوڑ دینا ہوگا ۔ اس بات میں جبری فیصلے کی سی قطعیت تھی ۔ وہ بار بار یہ سوال پوچھتے تھے کہ یہ تو ہمارا گھر ہے ہم اسے کیوں چھوڑ دیں ، دوسروں کے حوالے کردیں ، آخر کیوں ؟

شاید وہ اس بات سے خوف زدہ تھے ـــــ اس بات کو پوری طرح جانے بغیر ـــ کہ یہاں ان کی زندگی کا جو انداز تھا اور جو اچھا وقت بیتا تھا وہ ختم ہو جائے گا ، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بگڑ جائے گا ۔ میں بھی اس لمحے سے بہت ڈرتا ہوں جب وقت ماضی بننے لگتا ہے لیکن میں جانتا تھا کہ ہماری بے خبری میں وہ وقت بیت چکا ہے اور وہ زندگی ختم ہو چکی ہے اور اس کے ساتھ ہم تھوڑا سا مر چکے ہیں ۔ جس وقت تک پورے کے پورے مر نہیں جاتے ، سامنے مستقبل ہے

اور مستقبل کا مطلب ہوتا ہے بے یقینی۔

ہم لوگ اس مکان میں اتنی مدّت سے رہتے آئے تھے کہ گھر کا تصور اسی سے بندھ گیا تھا۔ کبھی رات گئے کہیں سے آ رہے ہوتے تو بندر روڈ سے گارڈن روڈ کی طرف مڑتے ہی احساس ہونے لگتا کہ بس اب گھر آ رہا ہے، نزدیک آ رہا ہے۔ گھر —— یہ پیلے فلیٹوں والی سرکاری ملازمین کی کالونی ہمارا گھر ہے۔ اس جگہ کی کتنی ہی چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں جن کے ہم اس طرح عادی ہو گئے تھے جیسے یہ ہماری زندگیوں کا حصّہ ہوں۔ ہفتے بھر دفتروں میں شوڈ بوڈ منقطع بنے ہوئے صاحب لوگ چھٹی کے دن کرتے پاجامے پہن کر اور کپڑے کے تھیلے لے کر گوشت ترکاری خریدنے نکلتے تھے تو انھیں دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ ہم بے تکلفی سے اپنے آنگن میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ دو پہر کی خاموشی میں قریبی واقع گاندھی گارڈن سے کوئی تیز آواز والا پرندہ اچانک بولتا ہوا اُڑ جاتا دو پہر کا سناٹا شام کے سایوں میں گھلنے لگتا تو چڑیا گھر میں آنے والوں کی تعداد بڑھتی جاتی۔ ہم اس وقت کو رکشاؤں اور ٹیکسیوں کی آوازوں سے پہچان لیتے تھے۔ چڑیا گھر کے گھنے پیڑوں پر سینکڑوں پرندے رات بھر بسیرا کرنے کے لئے جمع ہونے لگتے اور سڑک کے شور میں ان کا شور گھل مل جاتا۔ بعض صبحوں کو ایسا ہوتا تھا کہ کالونی نیند سے پوری طرح جاگی نہ ہوتی اور سرکاری ملازم اپنے دفتروں کو روانہ نہیں ہوئے ہوتے کہ چڑیا گھر سے شیر کے دہاڑنے کی آواز آتی۔ مکانوں کا گمبھیر اور پرسکون سناٹا ٹوٹ جاتا۔ لیکن ہمیں معلوم تھا کہ شیر کے پنجرے کی سلاخیں لوہے کی ہیں۔ بلکہ ہم اس گرج پر تھوڑا سا فخر محسوس کرتے تھے۔ شہر میں اور کس جگہ یہ ممکن تھا کہ اپنے گھر بیٹھ کر شیر کو دہاڑتے ہوئے سُن سکیں ــ؟ ایک دفعہ رکھوالے کی غلطی سے پنجرے کا تالا ٹوٹ گیا تھا مگر شیر پھر بھی پنجرے سے باہر نہیں نکلے تھے۔

اس علاقے کے سب جتنے چہرے تھے وہ ہمارے لیے مانوس تھے ہم یہاں اتنے عرصے سے رہ رہے تھے کہ وہ سب ہمارے لیے ایک بڑے سے کنبے میں تبدیل ہو چکے تھے۔ ان کے درمیان اپنائیت کا احساس ہوتا تھا۔ شام کو دفتر سے آنے کے بعد نہا دھوکر، اُجلے سفید کپڑے پہننے اور چائے پینے کے بعد میں برابر کے کسی گھر میں چلا جاتا اور تنخواہوں کے گریڈ، گریجویٹی، ایکری منٹ، چھٹیوں اور دوسری مراعات کے بارے میں باتیں اور ہلکی پھلکی خوش گپیاں کرتا۔ میری بیوی رئیسہ کسی پڑوسن کے ساتھ سُپر ہائی وے پر اسمگلڈ غیر ملکی سامان کی دکانوں میں جانے کا پروگرام بناتی۔ میری دونوں لڑکیاں وی سی آر پر ہندستانی فلمیں دیکھتیں اور ٹیلی ویژن کے ڈراموں میں آنے والی لڑکیوں کے انداز میں قمیصیں سلواتی تھیں اور بیٹا فراز (جس کا نام میں نے بڑے چاؤ سے رکھا تھا کیوں کہ اس کی پیدائش کے ہفتہ بھر بعد میرا پرموشن ہوا تھا) اپنی عمر کے دوسرے لڑکوں کے ساتھ رات گئے گلی کے نکڑ پر کھڑے ہو کر تیز رفتار گاڑیوں، ہوائی جہاز کے نئے ماڈلوں اور تیز آہنگ کے گیتوں کی باتیں کرتا تھا۔

اس محلے سے اپنے آپ کو اُکھاڑنا ہمارے لیے بڑا مشکل تھا اکھاڑنا تو مشکل تھا ہی، دوسری جگہ اپنے آپ کو جمانا اس سے بھی مشکل کام تھا۔ جب میں رئیسہ اور تینوں بچوں کو وہ مکان دکھانے لے گیا جہاں ہمیں منتقل ہونا تھا تو ان کے چہرے اُتر گئے۔ دونوں لڑکیوں کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا فراز میری طرف دیکھ کر ناراض ہونے لگا۔

"اب ہم یہاں رہیں گے؟ اس دڑبے میں ـ؟"

اس دڑبے میں رہنے کے علاوہ ہمارے پاس کوئی اور متبادل بھی نہیں تھا۔ بڑے مکان سے چھوٹے مکان میں منتقل ہونا ہی تو ایک تکلیف کا سبب نہیں تھا۔ میرے سامنے اس سے بھی زیادہ بھیانک مسائل تھے۔ کبھی ان کا خیال آجاتا تو سر پکڑ کے بیٹھ جاتا کہ کیسے ہوگا ان سے کیوں کر نپٹوں گا۔ تنخواہ کے بعد معمولی سی، برائے نام پنشن میں گزارا کیسے ہوگا، گھر کی دال روٹی کیسے چلے گی؟ بیوی بچے زندگی کی جن سہولتوں کے عادی ہو گئے تھے، قدم قدم پر ان کی محرومی کا احساس کچوکے لگائے گا۔ دفتر سے مجھے گاڑی اور ڈرائیور ملے ہوئے تھے، وہ واپس ہو گئے۔ فراز کو کالج جانے کے لیے پہلے ہی دن بس میں لٹکنا پڑا اور واپسی میں خالی بس کے انتظار میں دھوپ میں کھڑے رہنے سے منھ تمتما گیا۔ اس کی شکایت پر میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مجرم کی طرح سر جھکا لیا۔ میرا جرم یہ تھا کہ میرے بچے جس طرز زندگی کے عادی ہو گئے تھے میں اب انھیں فراہم نہیں کرسکوں گا۔

اس احساس نے مجھے اپنی ہی نظروں میں گرادیا، اور یہ خلش گھن کی طرح مجھے کھانے لگی۔

ابتدا میں میرے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وقت کیسے کٹے پہاڑ کا دن سر پر کھڑا تھا۔ صبح کی دھوپ دیواروں پر پھیلنے لگی تو ایک عجیب سی بے چینی نے مجھے آلیا۔ مجھے ایسا لگا کہ میں یہاں فالتو اور بے کار ہوں اور اگر ان دیواروں سے باہر نہیں نکلا تو میرا دم گھٹ جائے گا میں نے سوچا کہ ذرا چہل قدمی کر کے دیکھوں۔ مکان سے تھوڑی ہی دور گیا ہوں گا کہ مجھے نوردین نظر آیا۔ اسے میں نے ہی اپنے دفتر میں چپراسی رکھوایا تھا۔ وہ میرے سامنے آرہا تھا۔ مگر اس کے چہرے پر اتنی اجنبیت اور لاتعلقی کیوں تھی — اور وہ بھی زبردستی طاری کی ہوئی لاتعلقی؟ مجھے اس بات پر بہت تعجب ہوا کہ یہ میرے سامنے سے آرہا ہے اور اس نے مجھے سلام نہیں کیا۔ شاید اس نے مجھے نہیں دیکھا، میں نے دل میں سوچا۔ (کاش اس نے مجھے دیکھا ہی نہ ہو، میں اس کی نظروں سے چھپنے کی خواہش کرنے لگا کہ یوں میرا بھرم رہ جائے اور میری انا کو ٹھیس نہ لگے)۔

وہ میرے قریب سے گزرا تو میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں میری طرف تھیں، لیکن وہ مجھے نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ میرے آر پار دیکھ رہا تھا۔ جیسے میں وہاں نہیں ہوں، میری جگہ خلا ہے اور وہ اس خلا کے آگے کسی چیز کو دیکھ رہا ہے۔ مجھے ایسا لگا کہ میں چلتے پھرتے انسان کے بجائے خلاؤں کا تاریک اندھا گڑھا بنتا جا رہا ہوں۔ میں نے سوچا کہ یہ یا تو بیمار ہے یا پھر نشہ کرنے لگا ہے۔ دفتر جاکر اس کی مزاج پرسی کروں گا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ میں اب کبھی دفتر نہیں جاؤں گا۔ اور فوراً ہی میری سمجھ میں آگیا کہ نوردین کو میں کیوں دکھائی نہیں دیا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ کبھی برائی نہیں کی تھی، پھر کیوں اس نے مجھے پہچاننے اور سلام کرنے سے انکار کردیا تھا؟ محض اس لیے کہ اب میں اس کے دفتر کا صاحب نہیں رہا تھا؟ میں افسری سے دست بردار ہوا تھا، انسانیت سے تو نہیں۔ لیکن اگر اس نے مجھے سلام نہیں کیا تو میری عزت میں کون سا بٹہ لگ گیا۔ ؟ اپنی آزردگی پر میں خود ہی ناراض ہونے لگا۔ لیکن میں اس احساس کو اپنے دل سے نہیں نکال سکا، اور ذلت کے اسی احساس کے ساتھ میں چہل قدمی کیے بغیر گھر واپس آگیا۔

بوجھل قدموں سے مجھے گھر آتا ہوا دیکھ کر رئیسہ میری طرف متوجہ ہوگئی۔ میں نے اس سے کہا کہ "بیگم! ذرا ایک پیالی چائے تو بنادو"۔

چائے کا نام سن کر وہ ناراض ہونے لگی۔

"یہ دفتر نہیں ہے جہاں دن بھر بیٹھے چائے پیتے رہو۔ یہ گھر ہے اور تم نے یہ بھی سوچا کہ یہاں اب کیا ہوگا؟ دو جوان بیٹیاں بیاہنی ہیں، کچھ ان کی بھی فکر ہے؟ ریٹائرڈ سرکاری افسر کا رشتہ مانگنے کون آئے گا؟"

میں دم بخود رہ گیا جیسے اس نے جلتا ہوا بھوبل میرے چہرے پر مل دیا ہو۔ مگر وہ اس نظر نہ آنے والے زخم پر اور چنگاریاں بھری راکھ انڈیلتی رہی —

"ہاتھ جھلاتے چلے آئے نوکری سے۔ جیسے گئے تھے ویسے ہی آگئے۔ ایک وہ بھی تو ہیں جنھوں نے سرکاری ملازمت میں بڑی بڑی کوٹھیاں کھڑی کر لیں، دروازوں پر تین تین گاڑیاں ہاتھیوں کی طرح جھول رہی ہیں"۔

"بس بس ہار رہنے دو — مجھے بھی خبر ہے کہ انھوں نے یہ کیسے کیا ہے۔ میں اتنے برس سرکاری نوکری کر کے باعزت ریٹائر ہوا ہوں۔ میرا ضمیر مطمئن ہے۔ میں نے ایمان نہیں بیچا۔ کبھی کوئی غلط کام نہیں کیا..."

"تو چاٹو اپنے ایمان اور عزت کو دھر کے ...." رئیسہ بڑبڑاتی ہوئی باورچی خانے میں چلی گئی۔ اب اسے روٹی بھی خود ہی پکانی پڑتی تھی۔

میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ دروازے کے سامنے تینوں بچے حیران پریشان کھڑے تھے۔ وہ گھر میں تیز آوازیں سننے کے عادی نہیں تھے۔

بڑی بیٹی میرے پاس آکر بیٹھ گئی اور گود میں سر رکھ دیا۔

"اس بات کا افسوس نہیں ہے کہ ہمارے پاس کیا کیا تھا جو چھن گیا،

لیکن ابو کیا ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ اگر ہمارے پاس پیسے نہیں تھے تو ہم سچ مچ کے غریب گھرانے میں پیدا ہوئے ہوتے ؟"

فراز وہاں سے اُٹھ کر باہر جانے لگا۔ اس نے غصّے سے میری طرف دیکھا اور دانت پیس کر اس طرح سے کہا جیسے مجھے گالی دے رہا ہو ــــ "مڈل کلاس" ــــ اور وہ باہر چلا گیا۔

اس نے کئی دن تک اپنے آپ کو ظاہر نہیں کیا۔ جیسے وہ دُور بیٹھ کر ہماری قوتِ برداشت کا اندازہ لگا رہی ہو، دشمن کی طرح گھات لگائے بیٹھی ہو اور دور سے ہماری ہمّت اور مدافعت کو ٹوٹتے ہوئے دیکھنا چاہ رہی ہو۔ اور ہم کو اس کی موجودگی کے بارے میں بھی علم نہیں تھا ہمیں تو اس وقت بھی خبر نہیں ہوئی جب وہ حملہ آور غنیم کی طرح ہماری صفوں کو تہس نہس کر رہی تھی۔ ہمیں جب خبر ہوئی تو اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی۔ ورنہ ہمیں پتہ ہی نہ تھا کہ دیمک ہمیں اندر ہی اندر کھوکھلا کر چکی ہے۔ دیمک سے ہونے والے نقصان کا اندازہ بھی مجھے اس طرح ہوا کہ گھر میں دھول بہت بڑھ گئی تھی۔ جتنا بھی صاف کرو، ہر چیز پر گرد کی تہ جمی رہتی تھی۔ گھر میں ہر وقت خاک اڑنا محض اتفاق نہیں تھا۔

مجھے مٹی بہت بری لگتی ہے اور وہ دن مجھے بہت تکلیف دیتے ہیں جب ہوا میں خاک اُڑتی رہتی ہے۔ روشنی کے رُخ سے دیکھو تو ہوا میں سینکڑوں چھوٹے چھوٹے ذرّے تیرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مٹّی کی تہ ہر جگہ جم جاتی ہے۔ جس چیز کو ہاتھ لگاؤ ریت ہی ریت ہوتی ہے اتنی خاک دھول سے میری سانس گھٹنے لگتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے پھیپھڑوں پر بھی ریت کی تہہ جم جائے گی اور وہ سانس کے ساتھ پھیل بھی نہ سکیں گے۔ میں ہاتھ میں چھوٹا سا رومال رکھتا ہوں اور گھر کے سامان کو جھاڑتا پونچھتا رہتا ہوں تاکہ مٹی نہ اُڑے، سانس کے ساتھ نہ جائے لیکن یہ عجیب مٹّی تھی کہ صاف ہی نہیں ہوتی تھی۔ میں بار بار رگڑتا تھا بار بار جھاڑتا تھا اور پھر بھی ہر چیز گرد آلود، خاک کے پردے میں چھپی ہوئی ہوتی۔ میں نے دیوار پر انگلی پھیر کر دیکھا۔ اس مٹّی کے ذرّے موٹے سے تھے۔ ان کو دیکھ کر بھی میں کچھ نہیں سمجھا تھا۔

سمجھ میں تو اس وقت آیا تھا جب میں نے بھورے رنگ کی لکیر دیکھی تھی۔ کیکر کی ٹہنی جیسی پتلی لکیر، جو چلتی ہوئی الماری کے اوپر والے حصّے کی طرف جا رہی تھی۔ وہاں ہم نے بہت سی ایسی پرانی دُھرانی چیزیں ڈال رکھی تھیں جن کا کوئی مصرف نہیں تھا (یا اگر پہلے کبھی تھا تو وہ عمر ہوا ختم ہو چکا تھا اور بھلایا جا چکا تھا) اور جو پھینکی بھی نہیں جا سکتی تھیں (پرانی چیزوں سے ہمارے کیسے جذباتی رشتے ہوتے ہیں!) ان میں پرانی تصویریں بھی شامل تھیں۔ ٹوٹے پھوٹے اور مکڑی کے جالوں سے لپٹے ہوئے فریموں میں لگی ہوئی یہ تصویریں، جن کے شیشے شکستہ ہو گئے تھے اور کاغذوں کی رنگت بھی بوسیدہ ہو گئی تھی، کسی اور وقت کی مٹّی سے میلی ہو رہی تھیں۔ ان میں جو گروپ فوٹوز تھے ان میں الگ الگ چہروں کو پہچان کر نام دینا اب ممکن نہیں تھا۔ میری طالب علمی کے زمانے میں کالج یونین کے عہدے داروں کے ساتھ تصویر (بہت پہلے کسی زمانے میں اس بات پر بڑی فخر ہوتا تھا کہ میں ان کے ساتھ تصویر کھنچوانے میں کامیاب ہو سکا)۔ گریجویشن ڈے کی تصویر۔ ان دفتروں کے ساتھی ملازمین کے ساتھ تصویریں جن کی ملازمت میں مدتوں پہلے چھوڑ چکا اور وہ تقریبات جن کے خاص موقعے بھی ذہن سے محو ہو گئے۔ ان تصویروں میں دیمک لگ گئی تھی، بعض تصویریں تو دیمک پوری کی پوری چاٹ چکی تھی اور بعض میں چند ایک چہرے دیمک کی زد میں آئے تھے اور ایک آدھ تصویر تو ایسی تھی کہ دیمک صرف فریم تک پہنچی تھی، میں نے دیمک کی سخت مٹی کو چٹکی سے مسل دیا۔ مٹی جھاڑ دی اور تصویروں کو واپس مچان پر ڈال دیا۔ پھر میں دیمک کے بارے میں بھول گیا۔

اس وقت میں شاید یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ صرف چند پُرانی تصویروں کی بات ہے۔ اصل میں پاکستان کوارٹرز کی سرکاری رہائش سے عزیز آباد کے معمولی سے مکان میں آ بسنے کے اپنے مسائل ہی اتنے زیادہ تھے کہ دیمک کو کون یاد رکھتا۔ میں دیمک کو بھول گیا اور وہ اندر ہی اندر چیزوں کو کھاتی رہی۔ مجھے پتہ ہی اس وقت چلا جب دیمک حد سے بڑھ چکی تھی۔ اس گھر میں اپنی بنیادیں مضبوط کر چکی تھی۔ کئی دنوں کے بعد میں نے کیکر کی ٹہنی سی پتلی سی وہ لکیر پھر دیکھی۔ اب کی بار اس کا رخ کتابوں کی شیلف کی طرف تھا۔

ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو غلطی میری بھی تھی۔ اب میں روز تو

کتابوں کو الٹتا پلٹتا نہیں۔ نہ میں نے ان کو کبھی دھوپ میں رکھا۔ ایک زمانے میں تو بڑا شوق تھا۔ اب دن بھر دفتر میں مغز کھپانے کے بعد اتنا وقت ہی کہاں ملتا ہے کہ کوئی کتاب لے کر بیٹھوں۔ اس دن میں نے کتابوں کو زور زور سے جھاڑا۔ کئی کتابوں کو دیمک بالکل چاٹ گئی تھی۔ کرشن چندر کی مرتب کردہ 'نئے زاویے' (جلد دوم) جو مجھے کالج کی بزم ادب سے بیت بازی میں انعام کے طور پر ملی تھی، ہاتھ لگاتے ہی مٹی کا ڈھیر بن گئی۔ جسٹس امیر علی کی 'اسپرٹ آف اسلام' کی صرف اوپری جلد اور نام کا سنہری ٹھپا رہ گیا۔ کلائیو بیل کی 'سویلائزیشن' (جس کا ہلکے آبی رنگ کے سرورق والا پینگوئن ایڈیشن برسوں میرے زیر مطالعہ رہا ہے) دونوں کو دیمک نے کھا کر ختم کر دیا۔

اب میں ان کتابوں کا کیا کرتا؟ کتاب چاہے دیمک زدہ ہی کیوں نہ ہو، اسے پھینکا تو نہیں جا سکتا۔ غصّے اور بے بسی کے عالم میں میں نے ان پر مٹی کا تیل چھڑکا اور دیا سلائی دکھا دی۔ کتاب جل کر راکھ ہو گئی اور دیمک کی مٹی کے کچھ ٹکڑے باقی رہ گئے کیوں کہ ان میں آگ مشکل سے لگتی ہے۔

کتابوں کو آگ لگا دینے کے بعد میں ایک بار پھر مطمئن ہو گیا کہ بات ختم ہو گئی ہے مگر مجھے جلد ہی پتہ چل گیا کہ یہ محض شروعات تھی۔ اور دیمک کا لشکر ایسے چھوٹے چھوٹے شب خون مارنے کے بعد بھرپور حملہ کیا چاہتا ہے۔ لیکن یہ معلوم ہو جانے سے بھی کیا فرق پڑا؟ میں کون سی روک تھام کر لیتا۔ ہوتا تو کچھ نہیں، شاید اپنے آپ کو تسلّی دے لیتا لیکن مجھے پتہ ہی اس وقت چلا جب غنیم مجھے اندر سے کھوکھلا کر چکا تھا۔

مکان دیمک سے بھرا ہوا تھا، جلد ہی دروازوں پر بھوری بھوری لکیریں ابھر آئیں، جو دروازوں کی چوکھٹ، روغن کی ہوئی لکڑی پر ایسے پھیلنے لگیں جیسے صحت مند بدن پر کوڑھ۔ کھڑکیوں کے پٹ اتنے پھول گئے کہ نہ پوری طرح بند ہوتے نہ کھلتے تھے۔ چوکھٹیں ایسی ہو گئیں کہ کسی کا ہاتھ لگ جائے تو ڈھے پڑتی تھیں۔ جگہ جگہ سے اکھڑ سی گئی تھیں اور دروازے ان میں ایسے جھول گئے تھے جیسے فالج زدہ آدمی کے ہاتھ اور پاؤں۔ چھت کا پنکھا چلاؤ تو اس میں سے بھی دیمک جھڑتی تھی۔ صوفے کے ہتھے میں دیمک لگ گئی اور پھر اس نے جگہ جگہ سے صوفے کا کپڑا بھی چھید ڈالا۔ کرسیوں کے پائے گھس گئے اور وہ لنگڑی ہو گئیں۔ پردوں کے پیلمٹ کو دیمک نے اس طرح سے کھایا کہ وہ بیچ میں سے ٹوٹ گیا۔ پردے کی پوری لمبائی میں جا بجا دیمک نے گھر بنا لیے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گھر پر کسی آسیب کا سایہ ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم دیمک کو ایک جگہ سے ڈھونڈھنے کے بعد اس کا قلع قمع کرنے کی ترکیب سوچتے، وہ دوسری جگہ ظاہر ہو جاتی۔ وہ کسی ان دیکھی فوج کی طرح گھر کو برباد کیے دے رہی تھی۔ میں اس کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ دیمک کو اپنا گھر غارت کرتے ہوئے دیکھتا، دل ہی دل میں کڑھتا رہتا۔ میں بس یہی کر سکتا تھا کہ دیمک کے گھروں کو جہاں دیکھتا اس کی بھربھری مٹی کو اکھاڑنے لگتا، دیمک کی تعمیر کو توڑنے لگتا۔ سفید لجلجے سے پروں والے کیڑے اپنے گھر کی چھت سے محروم ہو جانے کے بعد جلدی جلدی بھاگتے نظر آتے۔ میں انھیں جوتے سے دبا کر پیس ڈالتا مگر کیا فائدہ، کہاں تک؟ میں ایسے دشمن کا بھلا کیا مقابلہ کرتا جو میرے ہتھیار اٹھانے سے پہلے ہی مجھے پسپا کر چکا تھا۔

دیمک سے کوئی چیز نہیں بچتی تھی اور کسی چیز کو بچانے کا موقع ہی کہاں ملتا تھا۔ آناً فاناً وار کرتی تھی، اور دیکھتے ہی دیکھتے تہس نہس کر ڈالتی تھی۔ ایک دن الماری کے پٹ پر ذرا سا خاکستری دھبّہ نظر آیا، اگلے دن الماری میں ٹنگے ہوئے کپڑوں میں چھید اور بغارے نظر آنے لگے —— ایک دن رک جاؤ تو کپڑوں کا نام و نشان بھی نہ ملتا۔

دیمک کے خلاف میری آخری کوشش وہ تھی جب میں نے پیسٹ کنٹرول والوں کو بلوایا تھا۔ اوّل تو ان کو بلوانے کے لیے ہی مجھے کتنے پاپڑ بیلنے پڑے تھے۔ رئیسہ اور بچے مان کے ہی نہیں دیتے تھے کہ انھیں بلانا چاہیے۔

"اس کی آخر ضرورت ہی کیا ہے۔؟" وہ بحث کر رہے تھے۔

"کمال ہے! کیا تم لوگ دیکھ نہیں رہے کہ دیمک گھر کو کھنڈر بنائے دے رہی ہے اور تم پوچھتے ہو کہ اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔"

"اس کام میں بے کار اتنے پیسے خرچ ہوں گے۔"

وہ کہتے تھے ۔" ہم تو اپنی ایک ایک خواہش پر دل مار کر رہ جاتے ہیں اور آپ اس فضول غیر ضروری کام میں اتنا خرچہ کر رہے ہیں۔"

" مجھے نئے کپڑے چاہیئے تھے اور آپ نے منع کر دیا تھا یہ کہہ کر کہ پیسے نہیں ہیں ــــ مجھے نئی قمیص، مجھے نئے جوتے۔ مجھے یہ، مجھے وہ ...... اور ان کے بجائے آپ اس میں اتنے پیسے ضائع کر رہے ہیں۔ ؟"

چند دن بحث کرنے کے بعد میں خاموش ہو گیا۔ ضرورت کا احساس میں کیسے دلاتا ان کو ؟ کیا انہیں خود نظر نہیں آ رہا تھا ؟ اور اب کچھ اور کہنا سننا فضول تھا۔ گھر کو تباہی سے بچانے کے لیے کسی نہ کسی کو تو کچھ کرنا ہی تھا اور اب اس خطرے کا احساس صرف مجھی کو تھا، اس لیے احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کی ذمہ داری بھی میرے ہی کاندھوں پر آن پڑی تھی۔ مجھے کوئی نہ کوئی عملی قدم اٹھانا ہی تھا۔ مخالفت کی پروا کیے بغیر۔

ایک دن کسی کو بتائے بغیر، میں نے جا کر پیسٹ کنٹرول کے دفتر میں اپنے گھر کا پتہ لکھوا دیا اور ان سے زبانی درخواست بھی کی کہ میرے گھر کو ڈس انفیکٹ کر دیں۔ گھر کے خرچ کے لئے جو پیسے رکھے ہوئے تھے وہ میں نے وہاں ایڈوانس کے طور پر جمع کرا دیئے۔

وہ لوگ سرخ رنگ کی بڑی سی گاڑی میں آئے تھے جس میں آگے دو آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی اور پیچھے سارا سامان رکھا ہوا تھا ان کے پاس اسپرے کرنے کی مشینیں بھی تھیں، جن کا رنگ بھی سرخ تھا۔ انھوں نے ہم سے کہا کہ کمروں سے باہر نکل آئیں ــ اور کھانے پینے کی چیزیں ہٹا لیں۔ انھوں نے سارے گھر کی دروازے بند کر دیئے پھر اپنے چہروں پر ماسک چڑھا لیے اور اسپرے کرنے لگے (اس غبار سے بچنے کے لیے میں نے پہلے ہی سے منہ پر کپڑا باندھ لیا تھا مگر رئیسہ کو بہت کھانسی اٹھی اور رات کو پیٹ میں درد اٹھا اور اسے درد کی گولی کھانا پڑی)۔ اسپرے کرنے کے بعد انھوں نے پھاٹک کے پاس بنی ہوئی کیاری میں ایک گول گڑھا کھودنا شروع کر دیا اور اس میں دوا ڈالنے لگے تاکہ دیمک مکان کی بنیادوں تک نہ پہنچ جائے۔

ان کی سرخ رنگ والی کھڑکھڑاتی ہوئی گاڑی ابھی گلی سے مڑی ہی ہو گی، میں پھاٹک بند کر کے اندر جانے ہی والا تھا کہ میری نظر اس پر پڑی میں نے دیکھا ــــ وہی مٹی کا نشان اور اس سے پھوٹتی ہوئی کیکر کی ٹہنی جیسی لکیر ــــ دیمک!

اس کو دیکھ کر میں ہکا بکا رہ گیا۔ ابھی، اتنی جلدی دیمک آن پہونچی ؟ اور جو میں نے اتنا خرچ کیا تھا، وہ سب بیکار گیا ــ ؟ کیا ہم کبھی دیمک سے نجات حاصل نہیں کر سکیں گے ؟ کیا دیمک ــ ہماری چیزوں کو کھاتے کھاتے ہمیں بھی نگل جائے گی۔ ؟

میں نے رئیسہ کو آواز دی اور سامنے والے دروازے کے اس حصّے کی طرف اشارہ کیا جس پر مجھے دیمک کا نشان نظر آیا تھا۔

" وہ دیکھو۔ دیمک لوٹ آئی ہے ! " میں نے سراسیمہ ہو کر کہا۔

رئیسہ کچھ نہیں بولی۔ اس نے پہلے دروازے کی طرف دیکھا، پھر میری طرف۔

" دیمک ۔ ؟ " اس کے لہجے میں برہمی تھی اور وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے دیمک والے دروازے کو اسی طرح دیکھا جیسے نوردین نے مجھے دیکھا تھا۔ جیسے وہ دیکھ رہی ہو اور اسے وہاں کچھ نظر نہیں آ رہا ہو۔ اس نے مجھے دیکھا اور کچھ کہے سنے بغیر اندر چلی گئی۔

میں پھاٹک کھول کر باہر چلا آیا۔ اور میری سمجھ میں یہی آیا کہ سب کو بتا دوں کہ دیمک لگ رہی ہے، ہر چیز میں دیمک لگ رہی ہے۔ دیمک! کھڑکیوں میں دیمک، چھتوں اور دیواروں میں دیمک، مکانوں کی بنیادوں میں دیمک، کرسی اور میز اور پلنگ کے پاؤں میں دیمک۔ صوفے، پردے اور قالین میں دیمک۔ کپڑوں میں دیمک۔ کتابوں میں دیمک ...... اس درخت کو ہاتھ نہ لگانا، اس کا تنا دیمک سے کھوکھلا ہو چکا ہے، چھوتے ہی گر پڑے گا اور تم ملبے میں دب جاؤ گے۔ ... ــــ خبردار ! کسی چیز کو ہاتھ نہ لگانا، یہاں دیمک ہے۔ ہر جگہ دیمک ہے۔ زمین کو دیمک لگ رہی ہے، آسمان کو دیمک لگ رہی ہے پیڑ پودوں اور جانوروں کو دیمک لگ رہی ہے ..... ہر جگہ

پھاگئی ہے دیمک۔ !

دیمک بہت مصروف ہے۔ مٹی کا یہ گھر تیزی سے دوڑتے ہوئے چھوٹے چھوٹے مستعد کیڑوں سے بھرا ہوا ہے۔ یہ ہر جگہ ہیں۔ جہاں جاتے ہیں اپنا نشان چھوڑ جاتے ہیں۔ اس جگہ پہلے جو کچھ تھا، اسے کھا لیتے ہیں اور اس کے بجائے ان کی اُگلی ہوئی مٹی کی یہ نلکی نما تعمیر بڑھتی جاتی ہے۔ ان کے لعاب نے اس مٹی کو بہت مضبوط کر دیا ہے سرنگ کی طرح۔ اسے ناخن سے آسانی کے ساتھ کھُرچا نہیں جا سکتا کہ اس کی قلعہ بندی نظر آ سکے۔ ناخن کو اتنی زور سے دبانا پڑتا ہے کہ اُنگلی کی پوریں سفید ہو جاتی ہیں۔ کچھ دیر تک انھیں پتہ ہی نہیں چلتا کہ ان کے گھر میں ایک روزن ہے جس سے ان کی تمام سرگرمیوں پر نظر رکھی جا رہی ہے۔ لیکن اگر انھیں ذرا سا بھی شبہ ہو جائے تو یہ سفید کیڑے تتر بتر ہو کر ادھر اُدھر بھاگنے لگتے ہیں۔ آپ انھیں چٹکی سے پکڑ کر مسل سکتے ہیں۔ پھر بھی اس خاکی سرنگ کا دوسرا حصّہ آپ کی آنکھ سے اوجھل رہتا ہے۔ یہ سرا ان کے گھر کے مرکز تک جاتا ہے، جہاں دیمک سماج پل بڑھ رہا ہے۔ ایسی نہ جانے کتنی سُرنگیں ہیں، کچھ آدھی کچھ پوری، کچھ بننے کے عمل میں، جو کارکن دیمک اور سپاہی دیمک سے بھری ہوئی ہیں۔ ان کے منھ دن رات چل رہے ہیں، یہ جو کچھ اپنے سامنے پاتے ہیں، اسے چبا کر غذا بنا لیتے ہیں اور اس سے اپنے پُورے دیمک دل کا پیٹ بھرتے ہیں۔ ان کے ان تھک جبڑے مسلسل حرکت میں ہیں۔ جو کچھ ان کے سامنے آتا ہے، لکڑی کاغذ کپڑا چمڑا اسے نگل جاتے ہیں۔ تمام سرنگیں ایک جگہ پہونچ کر ختم ہو جاتی ہیں جہاں کھائی ہوئی لکڑی سے گنبد جیسی کوئی چیز بنا دی گئی ہے تاکہ شاہی جوڑا اس میں رہ سکے۔ یہ ساری جگہ ملکہ دیمک نے گھیر رکھی ہے۔ اس کے بے ہنگم اور بے تحاشہ پھیلے ہوئے جسم کے نیچے ہی کہیں بادشاہ دیمک دبا ہوا پڑا ہے ——— ملکہ محض ایک بڑا سا پیٹ ہے جو انڈوں سے اس قدر بھرا ہوا ہے کہ پھٹ پڑنے کو ہے۔ وہ رُکے بغیر ہزاروں کی تعداد میں انڈے (ننھے ننھے بندکی دانوں جیسے) خارج کیے جا رہی ہے جنھیں کارکن کیڑے وصول کر لیتے ہیں اور ان کی پرورش کرتے ہیں۔ سینکڑوں کارکن اس سے چمٹے ہوئے ہیں، اسے چاٹ رہے ہیں، رزق کی تلاش میں اسے چوس رہے ہیں۔ لگتا ہے کہ اسے بھنبھوڑ کھائیں گے۔ کارکن اور سپاہی کیڑے اپنے سامنے آنے والی ہر چیز کو اپنے جبڑوں کے ذریعے بُرادے میں تبدیل کرنے میں مصروف ہیں کہ ایک دن مکو راکی زرخیزی کو زوال آ جائے گا۔ پہلے پہل کچھ نہیں ہوگا۔ پھر ان بے زبان کیڑوں میں دبی دبی مخاصمت سر اٹھانے لگے گی۔ دیمک کے گھر میں ایک نئی سازش پلنے لگے گی۔ اپنا جمع کیا ہوا سارا شہد پی کر چھتہ چھوڑنے کے بخار میں مبتلا مکھیوں کی طرح دیمک میں بے چینی پھیلنے لگے گی۔ ان کا زیرِ زمین سماج ایک بے چین بھنبھناہٹ سے بھر جائے گا۔ کیڑوں کی بھاگ دوڑ اور گھبراہٹ نقطۂ عروج کو پہونچ جائے گی اور پھر اچانک کوئی خفیہ اشارہ، جس کے پاتے ہی ایک نقل مکانی شروع کر دے گی۔ آنکھوں سے عاری اور جنس سے محروم کارکن ہزاروں کی تعداد میں اُمڈنے لگیں گے۔ دیمک کے کھائے ہوئے اس مکان کے کونے کھدروں سے باہر نکل آئیں گے، اپنے جفاکش اور بلا نوش جبڑوں کی کبھی نہ ختم ہونے والی بھوک مٹانے کے لیے بے تاب ہو کر آگے بڑھتے جائیں گے۔ مٹی کی یہ لکیر اور آگے سفر کرنے لگے گی۔ دیمک نے اب کسی نئے گھر کا رُخ کیا ہے۔

□□

غزل

اے ذوقِ طلب تیری عجب راہ گزر ہے
جلتے ہوئے جذبات ہیں خوابوں کا سفر ہے

آئینۂ تخیل کا شاید یہ اثر ہے
ہر گزرا ہوا لمحہ مرے پیش نظر ہے

اس دورِ ترقی کی نئی چارہ گری میں
زخموں سے لہو رنگ ہر اک جسم بشر ہے

ماضی کے دُھندلکوں میں جہاں چھوڑ چکا تھا
اب تک اسی منزل پہ مری شام و سحر ہے

کیوں ہنستی بہاروں میں بھی اے شبنمِ گریاں
ہر پھول کا دامن ترے آنسوؤں سے تر ہے

شمیم گورکھپوری

[illegible] گورکھپور، یو۔ پی

ڈاکٹر خورشید انور
جواہر لال نہرو یونیورسٹی ۔ نئی دہلی

جدیدیت

جدیدیت پچھلے تقریباً پچاس برسوں اور خصوصاً دوسری جنگِ عظیم کے بعد سے مسلسل موضوعِ بحث بنی ہوئی ہے ۔ آج نہ تو اس کی حد ہی متعین کی جا سکی ہے اور نہ ہی اس کی کوئی ایسی تعریف ہو سکی ہے جو عام طور پر قابلِ قبول ہو ۔

عام طور پر اس کی یہی تعریف کی گئی ہے کہ جدیدیت عہدِ جدید کے ساتھ شانہ بہ شانہ چلنے کا نام ہے ۔ اپنے عہد کی روشن خیالی کا نام ہے جو فرسودہ ذہنیت کی عین ضد ہے ۔ اس کے علاوہ بھی جدیدیت پر اور بہت سارے تبصرے ہوئے ہیں ۔ کسی نے اسے روایت شکنی سے تعبیر کیا تو کسی نے اسے نئے تجربات سے گزرنے کا نام دیا ۔ کبھی یہ فلسفۂ وجودیت کا حصہ بتائے گئے اور کبھی اسے نظریاتی بندشوں سے آزاد ہو کر کھلی فضا میں سانس لینے کا عمل بنایا گیا ۔ جس نقطہ پر سب سے زیادہ زور دیا گیا وہ روایت سے بغاوت کا تھا ۔

لفظ جدیدیت باقاعدہ رواج میں آنے سے قبل جدید زمانے سے جڑا ہوا تھا ۔ جدیدیت نہ تو کوئی فلسفہ تھا اور نہ ہی کوئی ذہنی رویہ ۔ تحریک یا رجحان کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ۔ یوسف جمال خواجہ اپنے مضمون " جدیدیت کیا ہے ؟ " میں لکھتے ہیں ؛

> " جدیدیت پرستی Modernism کا لفظ موجودہ مفہوم میں سب سے پہلے انیسویں صدی کے آخری دہے میں قدامت پرست کیتھولک کلیسا کے حلقوں میں استعمال کیا گیا ۔ اس لفظ سے وہ اُبھرتی ہوئی لبرل تحریک مراد رہی جو پروٹسٹنٹ عیسائیت کے ایک طبقے میں زور پکڑ رہی تھی ۔ اس طرح جدید پرستی کو مذہب کی کائنات سے جوڑ دیا گیا ...
>
> ... وسیع تر معنوں میں جدیدیت کے معنی یہ رہے ہیں کہ ہمعصر جدید رجحانات و میلانات کو روایتی اور قدیم اقدار پر زندگی کے ہر شعبے میں فوقیت دی جائے ۔ " [1]

یہ درست ہے کہ کیتھولک چرچ کے اندر پروٹسٹنٹ ایک لبرل ذہنی رویہ رکھتے تھے اور قدامت پرست کیتھولک چرچ میں اس کی قدامت پسندی پر اختلاف بھی تھا اور اس لحاظ سے پروٹسٹنٹ جدید ضرور کہے جا سکتے ہیں لیکن باقاعدہ جدیدیت کی روایت کا آغاز پروٹسٹنٹ کے لبرلزم سے نہیں ہوتا اور آج جدیدیت کا لفظ پروٹسٹنٹ کی جدیدیت سے بالکل الگ معنوں میں استعمال ہوتا ہے ۔ پروٹسٹنٹ کی جدید پرستی بدلتے ہوئے حالات میں کیتھولک چرچ کی قدامت پسندی کے خلاف آواز ، احتجاج تھی لیکن اس کے پاس کوئی ایسا فلسفہ نہ تھا اور نہ ہی اس قسم کا کوئی ذہنی رویہ تھا جو اسے آج کے مفہوم میں جدیدیت سے تعبیر کرا سکے جیسا کہ خود یوسف جمال خواجہ کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہمعصر جدید رجحانات اور میلانات کو روایتی اور قدیم اقدار پر زندگی کے ہر شعبے کو فوقیت دینے کو ہی اصل جدیدیت سمجھتے ہیں اور اس لحاظ سے پروٹسٹنٹ کی جدید پرستی آج کے مفہوم میں موجودہ جدیدیت کے مترادف ہے ۔ لیکن اگر جدیدیت کی جڑیں کسی فلسفے تک پہونچتی ہیں یا پھر اسے ایک خاص ذہنی رویہ یا رجحان یا تحریک سمجھا جاتا ہے تو یقینی طور پر جدید پرستی کا لفظ آج کے مفہوم میں پروٹسٹنٹ تحریک کی جدیدیت سے مختلف ہے ۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخرکار جدیدیت میں ایسی

کیا بات ہے جو اسے جدت سے علاحدہ کرتی ہے اور اس کا استعمال ایک خاص مفہوم میں ہوتا ہے۔ مختلف ادیبوں نے اس سوال پر مختلف قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے

پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں:

> "جدیدیت ایک تاریخی تصور ہے، ایک فلسفہ ہے اور ادبی تصور ہے۔ مگر جدیدیت ایک اضافی چیز ہے۔ یہ مطلق نہیں ہے۔ ماضی میں ایسے لوگ ہوئے ہیں جو آج بھی جدید معلوم ہوتے ہیں۔ آج بھی ایسے لوگ ہیں جو دراصل ماضی کی قدروں کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں اور آج کے زمانے میں رہتے ہوئے پرانے ذہن کے آئینہ دار ہیں۔" [۲]

جدیدیت کی اس تعریف سے دو باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ماضی کی قدروں سے انحراف کرنا جدیدیت کی خوبی ہے اور دوسری بات یہ کہ جدیدیت دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ بیدار ذہن کی مالک ہے اور وہ لوگ جو جدیدیت کے پرستار نہیں ہیں، پرانے تصورات میں گرفتار ہیں۔

ماضی کی تمام قدریں بے معنی نہیں ہو جایا کرتیں۔ ماضی پر ہی حال کی بنیاد ہوتی ہے۔ وہ قدریں جو آج بھی ہماری زندگی، سماج اور فن میں اہمیت کی حامل ہیں، ان سے انحراف کرنا دانائی نہیں بلکہ جدیدیت کے نام پر صحت مند روایات اور تاریخ سے انحراف کرنا ہے۔ ہماری ادبی تاریخ اور ادبی روایت آج بھی ہمارے لیے مشعلِ راہ بنتی ہے۔ محض تجربے کے بل بوتے پر بہترین ادب کی تخلیق ناممکن ہے۔ بیدار ذہنیت کا مطلب صرف اتنا نہیں ہو سکتا کہ انسان اپنے گرد و پیش کا مشاہدہ کر کے تجربات کر کے اپنے زمانے کے لحاظ سے جدید ہو جائے اگر جدیدیت کو صرف زمان و مکان کے مفہوم میں بھی دیکھا جائے تو کسی عہد کے مقابلے میں جدید ہونا جدیدیت کہی جائے گی۔ اگر جدیدیت ماضی اور ماضی کی قدروں سے انحراف کر کے صرف حال ہی میں جینے کا نام ہے تو جدید ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیوں کہ ہم تب ہی جدید کہلانے کے حقدار ہو سکتے ہیں جب ماضی کی اہمیت کو قبول کریں اور ساتھ ہی اس کے مقابلے میں اپنے کو جدید پائیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جدیدیت محض ماضی کی قدروں کو برطرف کر دینے کا نام نہیں۔ اگر جدیدیت کی یہی خصوصیت ہے تو جدیدیت بیدار ذہنیت نہیں ہو سکتی۔ جدیدیت کی تعریف کرتے ہوئے اروِن ہو (IRWIN HOUGH) لکھتے ہیں:—

> "پچھلے سو برسوں میں ہمارے سامنے ایک خاص قسم کا ادب آیا ہے۔ ہم اسے جدید کہتے ہیں اور اسے ہم عصریت سے مختلف سمجھتے ہیں کیوں کہ جہاں ہم عصریت عہد کی طرف اشارہ کرتی ہے، جدیدیت ادراک (Sensibility) اور اسٹائل کی طرف جھکتی ہے۔ جہاں ہم عصریت غیر جانبدار ہے وہیں جدیدیت تنقیدی سوجھ بوجھ سے منسوب ہے۔" [۳]
>
> (انگریزی سے ترجمہ)

یہاں ایک بات جو بالکل صاف ہو جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ جدیدیت اور ہم عصریت میں بہت واضح فرق ہے۔ ایک دوسری جگہ وہ لکھتے ہیں:—

> "وہ ادب جسے جدید کہا جاتا ہے، ہمیشہ سمجھ سے باہر ہوتا ہے۔ یہ اس کی جدیدیت کی خصوصیت ہے۔ تہذیب کی مستحکم اقدار سے انحراف جدید مصنف کی شعوری کوشش معلوم ہوتی ہے۔ وہ غیر مانوس ہیئت کا استعمال کرتا ہے۔ وہ ایسے عنوان تلاش کرتا ہے جو قاری کو مضطرب کریں اور اس کی حسیت کو دھکا پہونچائیں۔ وہ روایتی ناقدین کو غیر صحت مند اور زوال پذیر وغیرہ کہہ کر ورغلاتا ہے ....
>
> جدید مصنف یہ تصور کرتا ہے کہ جس وقت وہ کام شروع کرتا ہے، وہ وقت ادراک و احساس اور شعور کا ایک مروج طریقہ کار ہے اور اس کی جدیدیت ان مروج

اقدار کے خلاف بغاوت میں ہے۔ لیکن خود جدیدیت اپنا طریقہ کار رواج میں نہیں لاتی اور اگر ایسا ہوجاتا ہے تو وہ اس سے انکار کرتی ہے اور اس طرح جدید ہونے سے انکار کرتی ہے۔" [۴]

(انگریزی سے ترجمہ)

جدیدیت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ پوری عالم انسانیت، سماج، زندگی، موت، ماضی، حال اور مستقبل وغیرہ کو عام روش سے الگ ہٹ کر اپنے مخصوص انداز میں دیکھتی رہی ہے۔ جدیدیت زندگی اور سماج کے کسی پہلو کو رجائیت کی نظر سے نہیں دیکھتی۔ اس کا رویّہ مایوس کن ہوتا ہے۔ اسے اپنے گرد و پیش سازشیں ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ ہر شے اسے زوال پذیر نظر آتی ہے۔ اس کا یقین کسی بھی چیز میں نہیں ہے۔ جدیدیت کی نظر میں دُنیا اور سماج بالکل بے معنی ہیں لیکن ہم سماج میں جینے پر مجبور ہیں۔ جدیدیت حال میں جیتی ہے اور حال میں بھی "لمحۂ موجود" میں۔ نہ تو وہ ماضی کی طرف مڑ کر دیکھتی ہے اور نہ ہی مستقبل کا اسے خیال آتا ہے۔ وہ ماضی کو تو روایت اور تاریخ سے بغاوت کے ساتھ ہی دفن کر چکے ہوتے ہیں، مستقبل کی تمنا کرنے کا موقع ان کو دُکھ درد نہیں دیتا۔ وہ اسی دُکھ درد میں مسرور بھی ہوتے ہیں اور جب یہ دکھ درد زیادہ پریشان کرتے ہیں تو اُن کا تیار شدہ حل انھیں موت میں دکھائی دیتا ہے، مستقبل میں نہیں۔ چنانچہ جدیدیت کے ادب میں جگہ جگہ زندگی اور حقائق سے فرار اور موت کی تمنّا دکھائی دیتی ہے۔ لہٰذا لمحۂ موجود ہی غنیمت لمحہ رہ جاتا ہے، جسے جیا جا سکتا ہے۔

اس طرزِ فکر کو تاریخی پس منظر میں رکھ کر دیکھتے ہوئے ڈاکٹر نگیندر لکھتے ہیں:

"..... آدرش ٹوٹنے لگے اور اقدار کے زوال کی ذہنیت زور پکڑنے لگی۔ یہ یقین زور پکڑنے لگا کہ زندگی کے تیز سیلاب میں ماضی تو تقریباً ڈوب چکا ہے اور مستقبل اندھیرا ہے۔ حقیقت اگر کچھ ہے تو لمحۂ موجود کا احساس۔ انسان لمحۂ موجود میں جیتا ہے کیوں کہ اس کا تجزیہ لمحے ہی میں موجود ہے۔ تجربہ زندگی کی واحد حقیقت ہے اور تجربے کا نہ تو ماضی ہوتا ہے اور نہ مستقبل۔ اس کا صرف حال ہوتا ہے۔ اس طرح لمحہ پسندی ایک نئی شکل میں اُبھر کر سامنے آ رہی ہے۔" [۵]

(ہندی سے ترجمہ)

یہی لمحہ پسندی ہی زندگی اور سماجی حقائق سے فرار کی حالت ہے۔ یہ فرار کی صورتِ حال جدیدیت کے ادب کو مایوس کُن بناتی ہے، جہاں ادب برائے ادب کا نظریہ سماج سے کٹا ہوا ہوتا ہے وہیں جدیدیت کا نظریہ ان سماجی حقائق سے لڑنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ لہٰذا یہ ان سے دُور بھاگنا چاہتا ہے۔

جدیدیت انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اوّل کے طویل عرصے میں ہونے والے واقعات کے پس منظر میں مایوس کُن ادبی و فنی رجحان کی شکل میں ابھری۔ جدیدیت کو اس پس منظر میں رکھ کر دیکھنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ رویّہ جو کسی بھی صورت سے صحت مند رویّہ نہیں ہے، اپنے عہد کے نشیب و فراز کا عطیہ ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ رویّہ جس سماج کا عطیہ ہے، جن حالات کی دین ہے، ان سے مقابلہ کرنے کی طاقت اور صلاحیت انسان میں ہمیشہ رہی ہے، اور اسی لیے انسان انسان ہے۔ انسان بخوبی ان حالات اور پُورے سماجی نظام سے مقابلہ کر سکتا تھا لیکن جدیدیت نے روایت سے بغاوت اور بیدار ذہنیت کے نام پر سماجی حقائق سے فرار اختیار کیا اور ادب کو ایک بار پھر سماجی مسائل سے دُور کرنے کی کوشش کی۔

□□

حواشی: [۱] یوسف جمال خواجہ، "جدیدیت کیا ہے؟"۔ "جدیدیت اور ادب" مرتب آل احمد سرور۔ علی گڑھ ۱۹۶۹ء ص ۳۰ [۲] جدیدیت کیا ہے۔ آل احمد سرور ص ۱۳۵

[۳] Irwin Hough 'The Idea of Modernism' (New York 1967) P. 12-13

[۴] ایضاً Irwin Hough 'The Idea of Modernism' (New York 1967) P. 3

[۵] نگیندر، "نئی سمیکشا نئے سندربھ" میک ملن۔ دہلی ۱۹۸۳ء ص ۶۵

شیخ عارف الدین صابری
۸۱۹/۵ کوٹھی خان بہادر۔ لال کرتی - میرٹھ

مذہبی رواداری اور قومی یکجہتی کا نقیب : میلہ نوچندی

ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی کا پرچم بلند کرنے والے تاریخی شہر میرٹھ میں منعقد ہونے والے میلہ نوچندی کا شمار نہ صرف اتر پردیش بلکہ شمالی ہند کے نامور اور عظیم میلوں میں ہوتا ہے۔ میرٹھ اور قرب وجوار کے ہزاروں شائقین مہینوں سے اس تاریخی میلے کا بڑی شدت بیتابی کے ساتھ انتظار کرتے ہیں۔ ہولی کے تہوار کے ٹھیک ایک ہفتہ بعد شروع ہونے والا یہ میلہ ہندو مسلم اتحاد و قومی یک جہتی کا علمبردار اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا آئینہ دار ہے اسی لئے نوچندی کا نام زبان پر آتے ہی قومی یک جہتی کا حقیقی تہوار سامنے آجاتا ہے۔ ویسے تو ہندوستان کے اکثر شہروں میں نمائش اور میلے قومی اتحاد کا مظہر ہوا کرتے ہیں لیکن دو عظیم مذاہب کے عقائد اگر کسی میلے سے وابستہ ہوں تب یقیناً وہ میلہ مذہبی رواداری کی زندہ علامت کہا جاسکتا ہے۔ اس میلے میں جہاں ایک طرف زائرین برصغیر کے نامور اور صوفی بزرگ حضرت سید سالار مسعود غازی المعروف بالے میاں صاحبؒ کے آستانۂ مبارک پر گلہائے عقیدت پیش کرتے ہیں وہیں دوسری جانب چنڈی دیوی کے مندر پر ہزاروں عقیدت مند درشن کر کے اور پرشاد چڑھا کے قلبی سکون پاتے ہیں۔ ایک جانب اگر چنڈی دیوی کے مندر سے بھگتوں اور شردھالوؤں کی جے جے کار کی آوازیں سنائی دیتی ہیں تو دوسری طرف حضرت بالے میاں کے آستانۂ عالیہ میں قوالیوں کی وجد آفریں دھنیں عوام کے روحانی سکون کا سبب بنتی ہیں۔ اگر بالے میاں کے مزار پر عوام مرادوں سے اپنے دامن بھرتے ہیں تو چنڈی دیوی بھگتوں کی منوکامنا پوری کرتی ہیں۔ ہندوستان کی قدیم گنگا جمنی تہذیب کے اس حسین امتزاج کا تصور یہاں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ ان ہی منفرد خصوصیات کے پیش نظر مذکورہ میلہ قومی اتحاد و یک جہتی کا سنگم اور مذہبی رواداری کی ایک زندہ علامت بن گیا ہے۔

میلے کے انعقاد کے پس منظر میں مختلف روائتیں بیان کی جاتی ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ بالے میاں سلطان محمود غزنوی کی افواج میں سپہ سالار تھے اور یہاں ایک جنگ کے واقعہ میں ان کی انگلی کٹ کر گر پڑی۔ عقیدت مندوں نے اسے وہیں دفن کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ دہلی کے حکمراں سلطان قطب الدین ایبک نے ۱۱۹۴ء میں حضرت کی درگاہ تعمیر کرائی۔ بالے میاں کی اصل درگاہ بہرائچ میں ہے جو مرجع خاص وعام ہے۔ ایک روایت کے مطابق قطب الدین ایبک نے ہی بالے میاں کے سالانہ عرس مبارک کی ہجری چاند کے مہینہ کی پہلی یعنی نوچندی جمعرات کو شروع کیا اسی سبب بعض حضرات میلہ نوچندی کو بالے میاں کے عرس سے موسوم کرتے ہیں۔

اسی طرح میرٹھ کا قدیمی نام "راشٹر" بتایا جاتا ہے۔ قدیمی روایتوں کے مطابق میرٹھ راون کی بیوی مندودری کا مائکہ تھا۔ مندودری راجہ دانو کی دختر تھی اور چنڈی دیوی کی خصوصی معتقد تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اسی نے چنڈی مندر کی بنیاد ڈالی۔ بعد ازاں گوالیار کی مہارانی اہلیا بائی نے دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نوچنڈی میدان میں چنڈی مندر کی تعمیر کرائی۔ دریں اثناء نوراتری کے موقع پر بھگتوں نے مندودری کی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اسے ایک میلے کی شکل دی۔ بعد ازاں کلکٹر میرٹھ نے میلے کی میعاد میں توسیع کر دی۔ اس سے قطع نظر کہ حقیقت کچھ بھی ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ اس وقت یہ میلہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی روحانی عقیدت کا مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ باشندگانِ میرٹھ کا قومی تہوار بن گیا ہے۔

ابتدا میں ہولی کے رنگین تہوار کے بعد صرف تین دن کے لئے

مویشیوں کا ایک بڑا میلہ لگتا تھا جس میں راجاؤں، نوابوں، جاگیرداروں کے علاوہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارندے اور ان کے ایجنٹ اچھی نسل کے گھوڑے اور خچر خریدنے آیا کرتے تھے۔ ساتھ ہی میلے میں زراعتی سامان اور جلیبیوں کی دکانیں بھی قابلِ ذکر تھیں۔ بعد ازاں یہ میلہ تین دن سے بڑھ کر نو دن کا ہو گیا اور اس میلے میں حضرت بالے میاں و چنڈی دیوی کے مندر میں مذہبی رسومات کی ادائیگی ہونے لگی۔ اسی لیے چنڈی دیوی اور بالے میاں کے عرس کی چاند سے مناسبت ہونے پر یہ میلہ نوچندی کے نام سے مشہور ہو گیا اور آج ایک ماہ تک میلہ لگتا ہے۔ میلہ کی شروعات میں کمشنر اور کلکٹر کے علاوہ خان بہادر بھیا حافظ شیخ عبدالکریم صاحب کا اہم رول رہا ہے۔

باشندگانِ میرٹھ کے لیے میلہ نوچندی کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اکثر گھرانوں میں آج بھی یہ عام رواج ہے کہ ماں باپ اپنی بیٹی کی شادی کے بعد پہلی نوچندی آنے پر اپنی بیٹی کو میلہ نوچندی کے کچھ تحفہ جات خرید کر دیا کرتے ہیں جسے نوچندی دیے جانے کی رسم کہتے ہیں اور وہ لڑکیاں جو بیاہ کر کہیں دیگر شہر چلی جاتی ہیں ان میں سے اکثر نوچندی کے موقع پر اپنے میکے میرٹھ آجاتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میلہ نوچندی نے ہمیشہ دورِ حاضر کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے خود کو اسی سانچے میں ڈھالا۔ آج کے ترقی یافتہ جدید ٹکنالوجی کے اکثر مناظر بے شک نئے دور کی غمازی کر رہے ہیں۔ نصف صدی سے قبل میلے میں کورنتھین تھیٹر کمپنی کلکتہ کی خاتون آرٹسٹ کو پر اور گجن بائی کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ بھرت پور کی تھیٹر کمپنی کے شہرۂ آفاق ایکٹر ماسٹر رُوپی کے مجنوں کے رول پر لوگ فدا تھے۔ لوگ بتاتے ہیں کہ ایک ہفتہ تک اکثر شائقین صرف لیلیٰ مجنوں کا ڈرامہ ہی دیکھنے کو جاتے تھے۔ بمبئی کی الیگزینڈر تھیٹر کمپنی کا ڈرامہ قتل تمیزن جس کا تعلق میرٹھ کی اک معروف طوائف کے قتل کے واقعہ سے ہے اُس زمانہ کے لوگوں کو ہمیشہ یاد رہے گا۔ ۱۹۲۶ء کے میلے میں رستم زماں گاما پہلوان اور رستمِ ہند امام بخش کی کُشتی کو بھی لوگ بھلا نہیں پائے ہیں۔ ۱۹۴۱ء میں گونگا پہلوان کا فنی مظاہرہ بھی کشتی کے شائقین کو یاد ہے۔ اس کے علاوہ شہر کے سرکردہ رئیسوں، نوابوں اور جاگیرداروں کے ڈیروں پر تمام شب طوائفوں کی محفلوں کی بھی یاد لوگوں کے ذہنوں پر چھائی ہوئی ہے۔ بعض حضرات کو سر سیتارام، چاند میاں۔ رائے بہادر بُدھ پرکاش اور لال کرتی میرٹھ کے بھیا جی شیخ الٰہی بخش والوں کے ڈیروں کی رونق و زیبائش آج بھی یاد ہے۔

گیس کی ٹنکی سے پیدا شدہ روشنی اور جاپانی ٹیوبس کے علاوہ مٹی کے تیل کے چراغوں سے جس میلہ کی ابتدا ہوئی وہی میلہ نوچندی آج بجلی کے مرکری لیمپوں۔ ٹیوب لائٹوں اور رنگین بلبوں سے جگمگا رہا ہے۔ مویشی میلے کی جگہ اب ٹریکٹر، ماروتی کار، اسکوٹر اور سائیکلوں کے شوروم نے لے لی ہے۔ جدید قسم کے جھولے، اپّو گھر، مختلف شہروں کی مصنوعات، زراعتی نمائش، بچوں کے کھیل، کھلونوں کے اسٹال، چاٹ پکوڑی، دہی بڑے اور حلوا پراٹھے کی دکانیں نوچندی کی زیبائش میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔ میلے کے پٹیل منڈپ میں منعقد ہونے والے مختلف ثقافتی پروگرام عوام کی دلچسپی کا سبب بنتے ہیں۔

اس وقت جبکہ پورا ملک فرقہ پرستی کی لعنت میں مبتلا ہے۔ بھائی بھائی کے درمیان نفرت کی دیواریں کھڑی ہو گئی ہیں۔ میلہ نوچندی ہمیں اتحاد، مذہبی رواداری اور خیرسگالی کا درس دیتا ہے۔ کاش اتحاد اور بھائی چارہ کا یہ سلسلہ پورے سال اسی طرح جاری رہے۔

□□

غزل

سوئے منزل بڑھ رہا ہے کاروانِ زندگی
اور مکمل ہو رہی ہے داستانِ زندگی

یہ حقیقت ہے اجل کے ماسوائے دوستو
غیر ممکن ہے بشر سمجھے زبانِ زندگی

موت کا دھارا انھیں اک دن بہا لے جائے گا
ترجمانی کیا کریں گے ترجمانِ زندگی

ایک دن آباد کرنا ہے زمیں کی گود کو
ناز کرتا تھا نہ خود پر آسمانِ زندگی

رہگزارِ عشق میں معصوم مٹ جانے کے بعد
درحقیقت اور بڑھ جاتی ہے شانِ زندگی

معصوم اعظمی
۴۲۔ شاہ گنج۔ الٰہ آباد

شیرواڈکر ۔۔۔۔ ص۲۹ کا بقیہ

ہے کہ کسوماگرج آج کل لکھتے نہیں کیا ان کے اطراف و اکناف کی زندگی میں ایسا کوئی واقعہ، حادثہ، لمحہ نہیں جو ان کے قلم کو رواں کر دے؟ وسنت باپٹ اور وندا کرندیکر سماجی آلودگیوں کو اپنی نظموں میں بے نقاب کرتے ہیں۔ معاشرے کی بدلتی ہوئی کروٹوں پر ہمیشہ ان کی نظر رہتی ہے لیکن کسوماگرج نے معلوم نہیں کیوں بے نیازی کو اپنا شعار بنا رکھا ہے۔ حد یہ کہ دنوبا بھاوے کی "بھودان تحریک" بھی ان کے تخیل میں ہلچل پیدا نہیں کرتی۔ بہر حال یہ خاموشی کا ایک عارضی دور تھا۔ کسوماگرج کا مجموعۂ کلام ایسی نظموں سے آزاد ہے جو سیاسی اور سماجی پستیوں کو اپنا موضوع بناتی ہیں۔ مثلاً "جیوتی راؤ" وہ نظم ہے جو عظیم سماجی خدمت گذار جیوتی با پھلے کے مجسمے سے گفتگو کرتی ہے اور اپنے آپ میں بابا آمٹے اور ان کے رفقاء سے منسوب ہے۔ بالفاظ دیگر کسوماگرج اپنے ابتدائی دور میں اپنے شائقین کی توقعات کے مطابق اتنے خلاق نہیں تھے۔ یہ دور غور و فکر، رد و قبول کا دور تھا۔ پھر ان کے قلم نے کہانیوں، ڈراموں اور مضامین کے انبار لگا دیے۔

□□

تاج محل

تاج بے لوث چاہت کی تصویر ہے
تاج اک خوابِ اُلفت کی تعبیر ہے
چاندنی رات میں دیکھنا مت اسے
ورنہ ہوگا جنوں، ایسی تاثیر ہے

وقت کے گال پر، عشق کی آنکھ سے
گر کے جو جم گیا اشک، وہ تاج ہے
—— (خیالِ ٹیگور سے)

پروفیسر معراج احمد (شعبۂ سماجیات) لکھنؤ یونیورسٹی۔ لکھنؤ

دیوالی کا سندیس

آؤ آؤ مل کر گاؤ
دیوالی کے دیپ جلاؤ

بھید بھاؤ کو آج ہٹا لو
پیار کا کوئی گیت سنا لو
ہم سب ایک ہیں ایک رہیں گے
سب کو اپنے گلے لگا لو
جو بچھڑے ہیں انھیں ملاؤ
دیوالی کے دیپ جلاؤ

ہر بھاشا ہے میٹھی بھاشا
مت اپناؤ، دل میں نراشا
بولتے ہیں سب اپنی بولی
کتنا ہے دلچسپ تماشا
پیار کی بولی پر بک جاؤ
دیوالی کے دیپ جلاؤ

بھارت دھرموں کا گلدستہ
سب کا اپنا اپنا رستہ
شوق سے مل کر کام کرو تم
نہیں رہے گا کوئی بھی خستہ
پیار محبت کو اپناؤ
دیوالی کے دیپ جلاؤ

مومن خاں شوق

اشرف ولا ۲۳-۳-۱۱
لے پلی
حیدر آباد-۱

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: ادبیاتِ کشمیر
مصنف: علی جواد زیدی۔ مرتب و ناشر: عابد حسین حیدری
قیمت: اسّی روپے (۸۰/-)
ملنے کے پتے: (۱) ۱۸۶/۴ باغ گھاسی وزیر گنج۔ لکھنؤ
(۲) نصرت پبلشر امین آباد (۳) دانش محل، امین آباد
لکھنؤ

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ـــــ ہے تو ایک ملک لیکن دنیا جہاں کے تنوع اور رنگارنگی سے مالامال ہے انھیں متنوع اور رنگارنگ مناظر میں سے ایک خطۂ بے نظیر کشمیر ہے جس کے بارے میں فارسی کے نامور شاعر نے کہا ہے:

ہزار قافلۂ شوق می کند شب گیر
کہ بارِ عیش کشا یش کہ خطۂ کشمیر

خطۂ کشمیر محض مادی مناظر کا خدا ساز مرقع نہیں ہے اس خطہ نے ذہن و ذکاوت کے بھی نادر نمونے پیش کیے ہیں۔ اس مردم خیز سرزمین کے وہ خانوادے جو نقل وطن کر کے ہندوستان جنت نشان کے دوسرے اقطاع میں آباد ہو چکے تھے ان کی نسل میں آج تک ذہانت و ذکاوت جلوہ گر ہے اور یہی ان کی اپنی شناخت ہے بعض نام تو ایسے ہیں کہ جن کا مانند مادرِ ہند پیدا کرنے سے عاجز رہی۔ نام تو بہت سے گنائے جا سکتے ہیں لیکن آپ علامہ اقبال اور پنڈت جواہر لال نہرو کو کشمیری ذہن و دماغ کی جاوداں علامتیں سمجھ لیں۔

اس خاک دان کے علمی مرقعوں پر جس حد تک روشنی پڑنا چاہیے تھی وہ نہیں پڑی ہے لیکن کشمیر پر جو کچھ بھی ہوا ہے اس میں سید علی جواد زیدی کے مجموعۂ مضامین" ادبیاتِ کشمیر کی ممتاز حیثیت ہے۔ زیدی صاحب نے خدا انھیں صحت و قوت اور خاطر جمعی کے ساتھ قلم و قرطاس کی مصاحبت کا طویل موقع دے۔ اس سرزمین کی وسیع سیاحت کی ہے آپ اس اظہار کا تاثر انھیں کی لفظوں میں ملاحظہ فرمائیں،

"کیا ایشیا و افریقہ، کیا یورپ و امریکا، کہیں بھی ہو کشمیر کی دلآویزی، نشاط انگیزی، فسوں آفرینی اور حسن پروری نہیں ملی۔ ان قدرتی اور فطری عنایتوں کے ساتھ قدرت نے اہلِ کشمیر کو صناعانہ ذہانت، فن کارانہ اور تخلیقی ندرت ادبی اور علمی ذوق و شوق سے بھی مالامال کیا غرض جس پہلو سے بھی ہندستان کے اس پاکیزہ اور نظر نواز خطے کو دیکھیے

ع کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا است

حالات نے مجھے ان کرشمہ سازیوں سے لطف اندوز ہونے کے بہت اچھے مواقع مہیا کیے۔" (تعارف)

زیدی صاحب نے اربابِ علم اور فن کاروں سے جو کچھ حاصل کیا انھیں سینت کر اپنے پاس چشمِ مردم سے محجوب نہیں رکھا۔ جتنا وقت اور موقع ملا وہ لکھتے رہے، جو لکھتے رہے وہ شائع کرتے رہے۔

زیرِ نظر مجموعۂ موصوف کے اس ارادے کی تکمیل ہے کہ:

"انھیں ترتیب دے کر ایک مجموعے کی شکل میں اہلِ اردو کی شکل میں پیش کروں گا۔" اس ارادے کی تکمیل میں میرے نوجوان اور ادب شناس دوست عابد حسین حیدری، ریسرچ اسکالر لکھنؤ یونیورسٹی کی مدد شاملِ حال رہی ہے۔ اس امر کا اعتراف وسیع النظر، فراخ دل اور قدر شناس مصنف نے خود کیا ہے

ـــــــ سید سبط محمد نقوی

نام کتاب: "شو کھی ٹہنی پر ہریل" (نظمیں)
شاعر: عنبر بہرائچی قیمت: سو روپے
ملنے کا پتہ: دانش محل، امین آباد۔ لکھنؤ

زیرِ نظر کتاب "شو کھی ٹہنی پر ہریل" عنبر بہرائچی کی نظموں کی تیسری کتاب ہے۔ اس سے قبل ان کی طویل نظم "مہا بھنشکرمن" اور

"روپ" میں شامل نظمیں اہلِ نظر کو متوجہ کر چکی ہیں۔ عنبر بہرائچی کی شاعری کا ایک خاص اسلوب ہے جس میں شاعری کی مروجہ روایات کے ساتھ ساتھ اودھ کی سرزمین سے اگنے والے لہجے اور آہنگ کی جھنکار بھی شامل ہے۔ اُردو شاعری میں بھی ایک نئے رنگ کی آمد کا احساس ہوتا ہے۔ انھوں نے اودھی اور بھوجپوری کے مانوس لفظوں کو محض برائے بیت نہیں استعمال کیا ہے بلکہ ان سے ایسے مناظر کی تخلیق کی ہے جو ان "غیر اشرافیہ" آوازوں کے بغیر اپنا پورا حسن ظاہر ہی نہیں کر سکتے مثلاً ؎

پو پھٹی، جنگلی بیار چلی، ہر ڈگر تازگی میں ڈوب گئی ——— (صبح)

ہریل پنکھ بچھائے گم صُم بیٹھا ہے ——— (شوکھی ٹہنی پر ہریل)

بانس کی ٹوٹی مڑیا میں وہ بوڑھا شخص تنہا آنسوؤں کے ملگجے میں

——— (مجاہد)

انھیں سوپ میں بھر لیا اور پچھورا ——— (رہائی ہوئی ہے پسینے میں لیکن)

اُداس لمحوں کے ملگجے پن میں پھر کوئی مور پنکھ چمکا ——— (مورپنکھ)

ان مصرعوں میں جنگلی بیار، ہریل، ٹوٹی مڑیا، سوپ، پچھورا اور مور پنکھ اس منظرنامے سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں جو ان سے متعلقہ نظموں میں پیش کیا گیا ہے۔

عنبر بہرائچی خود کو شہرِ روایت کے حصاروں میں اسیر نہیں رکھتے بلکہ گھر سے باہر نکل کر گاؤں کے انوکھے منظروں کو اپنی آنکھوں میں بھر لیتے ہیں اور پھر ان کو لفظوں کے پیکر میں کاغذ پر نظموں کی صورت میں سجا دیتے ہیں۔ عنبر بہرائچی کی بعض نظمیں فراق گورکھپوری کی "روپ" کی رُباعیات کا توسیعی منظرنامہ پیش کرتی ہیں مگر ان کے یہاں جو اپنی اسلوبی کائنات ہے۔ وہ فراق اور اختر الایمان دونوں سے جداگانہ ہے اور یہی ان کا انفرادی تشخص ہے اپنی لفظیات کے بارے میں عنبر صاحب نے جو مدلل مقدمہ اس کتاب میں شامل کیا ہے اس سے نہ صرف ان کی بوطیقا کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے بلکہ اُردو شاعری کے حوالے سے لسانیات کے نئے دروازے بھی کھلتے ہیں۔

امید ہے کہ اُردو شاعری کے غزل زدہ ماحول میں عنبر بہرائچی کی نظموں کی یہ کتاب تازہ ہواؤں کا خوش گوار جھونکا ثابت ہوگی۔

——— نامی انصاری

نام کتاب: ماہنامہ جدید فروغ اُردو، لکھنؤ کا
"سعادت علی صدیقی نمبر"
قیمت: بیس رُوپئے
ملنے کا پتہ: جدید فروغ اُردو، ۳۰ ۔ امین آباد پارک
لکھنؤ

جب بھی اُردو زبان کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں بے غرض اور باحوصلہ افراد کی کاوشوں کا ذکر آئے گا، تو ڈاکٹر سعادت علی صدیقی مرحوم پہلی صف میں نمایاں نظر آئیں گے۔ آج جب اردو زبان و ادب میں کاروباری حضرات کا عمل دخل زیادہ ہوگیا ہے، سعادت کا اچانک رختِ سفر باندھ لینا ایک المیہ ہے۔ وہ نام و نمود سے دور تن من دھن سے اپنی مٹتی ہوئی زبان کے لیے جوجھتے رہے۔ حتیٰ کہ اپنی صحت بھی گنوا بیٹھے۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ مرزا غالب کی زبان میں کہہ رہے ہوں ؎

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

جدید فروغ اُردو نے ۱۲۶ صفحات کا یہ نمبر نکال کر آنے والی نسلوں کے لیے مرحوم سعادت علی صدیقی کے کارناموں کو محفوظ کر دیا ہے۔ اس نمبر میں جہاں سید حامد، حفیظ نعمانی، رشید حسن خاں، پروفیسر ظہیر احمد، پروفیسر عتیق احمد صدیقی جیسے نامور لوگوں کی تاثراتی تحریریں شامل ہیں، وہاں ان کے رفقا کے تفصیلی مضامین بھی ہیں۔

——— امیر احمد صدیقی

نام کتاب: "سرِ شام" (شعری مجموعہ)
شاعر: خورشید افسر بسوانی — قیمت: چالیس رُوپئے
ملنے کے پتے: (۱) دانش محل، امین آباد لکھنؤ (۲) نصرت پبلشرز
امین آباد، لکھنؤ

"سرِ شام" خورشید افسر بسوانی کا چوتھا مجموعہ کلام ہے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ "نقشِ جنوں" ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد

قومی نظموں کا مجموعہ "سوندھی سوندھی مٹی بھینی خوشبو" شائع ہوئی اور ۱۹۸۲ء میں تیسرا مجموعہ کلام "دوپہر" شائع ہوا۔

خورشید افسر بسوانی ادبی دنیا میں محتاج تعارف نہیں ہیں، ان کی ادبی خدمات کے بارے میں ہندو پاک کے کئی ممتاز ادیبوں، دانشوروں نے اظہار خیال کیا ہے ان کی شاعری کے متعلق جو مضامین لکھے گئے، ان سارے مضامین میں ایک بات مشترک ہے وہ یہ کہ ہر ادیب و شاعر نے لکھا ہے کہ خورشید افسر نے زندگی کے مسائل سے غزل کے دامن کو وسیع کیا ہے۔

'سرشام' میں فراق، فیض، کیفی، نشور واحدی، شمیم کرہانی، جمیل الدین عالی، عتیق احمد صدیقی، ظ۔ انصاری، نازش پرتاپ گڑھی اور ملک زادہ منظور احمد کی آرا بھی شامل ہیں۔ یہ مجموعہ تقریباً سو غزلوں پر مشتمل ہے۔ صوری اور معنوی اعتبار سے بھی "سرشام" دامنِ دل اپنی طرف کھینچتا ہے۔

——— سلیم عمر

نام کتاب: "درد کی آگ"
مصنف: ایس۔ ایم۔ عبّاس قیمت: ۲۰/ روپئے
ملنے کا پتہ: ایس۔ ایم۔ عباس (ایڈوکیٹ) محلہ ناصر نگر
جون پور

"درد کی آگ" ایس، ایم، عباس جون پوری کے افسانوں کا مجموعہ ہے اس سے قبل ان کی دو تصانیف "شفیق جون پوری: شخصیت اور فن"۔ اور "وامق جون پوری: شخص اور شاعر" شائع ہو کر منظر عام پر آ چکی ہیں۔

عباس کے افسانے معاشرے کی بہترین تصویر کشی کرتے ہیں۔ معاشرے میں پھیلی برائیوں کو اشاروں اور کنایوں میں بیان کرنے کا فن انھیں آتا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں جو کردار پیش کیے ہیں وہ بالکل زندہ کردار معلوم ہوتے ہیں اور جن موضوعات پر افسانے پیش کیے ہیں ان میں رشوت خوری، جہیز کی لعنت اور فرقہ وارانہ کشیدگی پر خاص طور سے قلم اٹھایا ہے۔ وہ ملک کو خوش حالی اور ترقی کی راہ پر گامزن دیکھنا چاہتے ہیں، اس لیے معاشرے میں پھیلی برائیوں کو دور کرنا ان کا فرض ہے۔ عباس کے افسانوں کو پڑھ کر صرف تاثر ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ ان کی حقیقی اور سچی تصویر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتی ہے۔

انھوں نے غربت اور تنگ دستی کا اس انداز سے ذکر کیا ہے کہ ایک غریب ماں اپنی بیٹیوں کی شادی اس لیے نہیں کر پا رہی ہے کہ اس کے پاس جہیز کے لیے رقم نہیں ہے۔ چنانچہ ماں اپنی بیٹیوں کو اپنے لیے بدقسمتی تصور کرتی ہے اور کہتی ہے:

"کمبختو! تم دونوں مر کیوں نہیں جاتیں؟ اس طرح سامان اکٹھا کرنے سے تو اچھا ہے میں اپنے ہاتھوں سے تم دونوں کا گلا گھونٹ دوں اور کھود کر خود ہی گاڑ دوں!"

ایس۔ ایم۔ عباس کے افسانوں کے زندہ کردار ہی ان کی کہانیوں کو جلا بخشتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی کہانیوں میں مقبولیت اور بڑھ جاتی ہے۔

——— اخلاق احمد

نام کتاب: "عصری ہندی کہانیاں"
مرتب: دھننجے ورما قیمت: ۶۸/ روپئے
ملنے کا پتہ: نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا۔ نئی دہلی

اُردو میں اچھے تراجم بہت کم ہیں پھر عموماً ترجمے کے لیے سات سمندر پار کا انتخاب زیادہ تر کیا گیا۔ یہ عجیب المیہ تھا کہ انگریزی کے چمکتے ہوئے نقوش پر تو نظر کی گئی لیکن اپنی ہی حقیقی بہن کے پاس جو لعل و جواہر تھے ان کی طرف کم توجہ کی گئی۔ اس سلسلے میں نیشنل بک ٹرسٹ خصوصی مبارکباد کا مستحق ہے کہ اس نے عصری ہندی کہانیوں کا انتخاب پیش کیا ہے۔

"عصری کہانی" کے پہچان کے عنوان سے اس مجموعے کے مرتب دھننجے ورما لکھتے ہیں:-

"عصری کہانی کا تسلیم کرتا ہے کہ ایک عام آدمی کی حیثیت سے روزمرّہ زندگی میں پیش آنے والے تجربات و حادثات کو کہانی کے حوالے سے پیش کرنا اور اپنے آس پاس کے اپنے ہی جیسے بے شمار انسانوں کی بے اطمینانی اور مظلومیت کو زبان عطا کرنا ہی آج کی کہانی کا مقصد ہے۔"

اس میں بیش کہانیاں ہیں، بعض کہانیاں بہت اچھی ہیں اور ان میں سے کئی ایسی ہیں جن پر تفصیل سے لکھا جانا چاہیئے۔

رام کمار کی "دیمک" پڑھتے ہوئے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہوجاتا ہے کہ کہانی ختم کرنے کے بعد کوئی بیٹا کرب سے تڑپ اٹھا ہے اور اپنی سخت دل ناخلفی پر اپنے بال نوچنا چاہتا ہے یا کوئی بوڑھا باپ گھٹنوں کا لمس رکھتے ہوئے خاموشی سے اپنے آنسو پونچھتا چلا گیا ہے۔

کچھ کہانیاں ایسی ہیں جن میں آج کی زندگی کی تنہائی، بے کیفی، اکتاہٹ کا تصور ہے۔ مسلم معاشرے کی بنیاد پر بھی کچھ کہانیاں ہیں۔ رمیش بخشی کی "اگلے محرم کی تیاری" یا ستین کمار کے "جہاز" میں مسلم نام تو ملتے ہیں لیکن مسلم معاشرے کی پہچان نہیں ملتی۔

سلام بن رزاق ان کہانیوں کے مترجم ہیں وہ اردو کے معروف افسانہ نگار ہیں ان کا طرز تحریر بھی مسحور کن ہے۔ صفحات ۲۳۹ ہیں۔ کتابت کہیں اوسط درجہ کی اور کہیں بہت معمولی ہے۔ طباعت عمدہ ہے۔

——— جمیل عسکری

نام کتاب: انتخاب قصائد سید سرسوی
مرتب: کشور جہاں زیدی
ملنے کا پتہ: (۱) ادارۂ بزم خضر راہ۔ غفار منزل ایکسٹینشن، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ (۲) دانش محل۔ امین آباد لکھنؤ

اتر پردیش کے مردم خیز اور تاریخ ساز قصبہ سرسی کے استاد شاعر علامہ سید سرسوی مرحوم کے غیر مطبوعہ قصائد کا یہ انتخاب محترمہ کشور زیدی نے بڑی عرق ریزی سے ترتیب دیا ہے جس سے موصوف کا فن اجاگر ہو کر منظر عام پر آگیا ہے۔ مجموعہ انتخاب سید سرسوی ۴۳ قصائد پر مشتمل ہے جس میں ۱۲ قصائد غیر مردف ہیں، بیشتر میں ردیف کی پابندی کی گئی ہے۔ ۲ میں نظم کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ قصائد اتنے طویل ہیں کہ کہیں کہیں ۵۔۶ مطلعے کہے گئے ہیں، یہ اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ ان کے کلام میں بلا کی آمد ہے جہاں انھوں نے قرآنی آیات اور ان کے کوائف کو نظم کیا ہے اس چیز کو الہامی مدد سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

'صبح ازل' کے عنوان کے ذیل میں انھوں نے حضرت آدم تا ختمی مرتبت کے سلسلے کو موثر انداز میں نظم کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی اسلامی تاریخ پر کتنی گہری نگاہ تھی۔

ان کے کلام کے گہرے مطالعے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ اقبال و جوش کی شاعری اور رنگ سے بہت متاثر تھے جس کی جھلک ان کے کلام میں نمایاں ہے۔

مختصر یہ کہ کشور زیدی کی سعی لائق تحسین ہے۔ انھوں نے سید صاحب کے ورثا اور معتقدین کے لیے کتابی شکل میں اچھا مواد فراہم کر دیا ہے کتابت اچھی ہے کہیں کہیں نقص بھی ہے۔ امید ہے کہ مستقبل میں مجموعہ کی افادیت میں اضافہ ہوگا۔

——— سید عابد نظر

نام کتاب: "رفت و گذشت"
مصنف: ڈاکٹر سعید گورکھپوری   قیمت دس روپے
ملنے کا پتہ: سی/۱۸۳/۱۰۔ محلہ ترکمان پور گورکھپور

ڈاکٹر سعید کو شروع ہی سے لکھنے پڑھنے کا شوق تھا، اسی شوق نے ڈاکٹر صاحب کو مختصر افسانوں کا مجموعہ "رفت و گذشت" شائع کرنے پر مجبور کیا۔ ڈاکٹر سعید نے اسی مختصر افسانوی مجموعہ میں چھ افسانوں کا ذکر کیا ہے جس میں سے پہلے افسانے کا عنوان "ڈاکٹر صاحب" کی قناعت، ایمانداری نیز ان کے نیک ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔

ان کے دوسرے افسانوں کے نام یوں ہیں: "کیا کچھ نہ کر جانا" "خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا"۔ "میں خود ہی جا رہا ہوں"۔ "آنے کا انتظار" اور "حیات چلی گئی"۔

طباعت لیتھو کی ہے اور کاغذ بھی اوسط درجے کا ہے۔ بہر صورت کتاب اپنے آپ میں بہت خوب ہے اور تمام افسانے پڑھنے کے لائق ہیں اور معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا انداز تحریر بھی قابل ستائش ہے۔

——— سید محمد فصیح

اودھ نمبر (۲)

تاثرات کے آئینے میں

مکرمی! اودھ کی صدیوں پر پھیلی ہوئی عظیم الشان تاریخ اور ثقافت کو ابھی تک پوری طرح نمایاں کرنے کا کام خوش اسلوبی، جامعیت، ہمہ گیری غیر جانبداری سے بہت کم ہوا ہے۔ جو کوششیں ہوئی بھی ہیں وہ بکھری بکھری اور غیر مربوط انداز کی ہیں۔ اس پس منظر میں نیا دور کے دونوں خصوصی شمارے خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ اس میں بڑی کاوش اور دیدہ وری کے ساتھ تاریخ، تہذیب، سماجی زندگی، فنون لطیفہ، عام علوم و فنون اور ان کے ماہرین کے بارے میں مختلف اور متنوع مضامین یکجا کرنا اور وہ بھی مشہور و معروف اہل قلم سے، بجائے خود ایک کارنامہ ہے۔ اب بھی چند گوشے تشنہ رہ گئے ہیں۔ عام ادارتی رجحان سے ظاہر ہوتا ہے۔ آپ ان گوشوں کو پُر کرنے کی کوشش آئندہ شماروں میں یقیناً کرتے رہیں گے۔

نیا دور کے دونوں اودھ نمبر "کوزہ میں سمندر" ہیں۔ یہ اودھ کی زرخیز اور مردم خیز سرزمین کے بارے میں بیش بہا معلومات فراہم کرتے ہیں جن سے عام قاری ہی نہیں بلکہ متخصصین بھی برابر استفادہ کرتے رہیں گے۔ برصغیر میں خالص ادبی نوعیت کے خصوصی شمارے تو شائع ہوتے رہے ہیں، لیکن ایک پورے علاقے کی تاریخ و ثقافت و ادب سب کو سمیٹنے کی کوشش شاذ ہی کی گئی ہے۔ اس اعتبار سے ان شماروں نے ایک بہت بڑا خلا پر کر کے منفرد مقام حاصل کر لیا ہے۔ اس کامیاب کوشش پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ان مندرجات کو ایک کتابی صورت میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کرنے کا اقدام کیا جائے گا تاکہ عام لکھنے والے اور اعلا تعلیمی ادارے بھی برابر فیض یاب ہوتے رہیں —— آپ کا یہ کارنامہ یادگار رہے گا۔ معنوی اور صوری دونوں ہی حیثیتوں سے یہ شمارے دل کش بھی ہیں اور مفید بھی مبارکباد! یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ نیا دور ہر اعتبار سے ایک نئے دور کا پیامی بن گیا ہے۔ امید ہے کہ آپ کی ادارت میں یہ جریدہ نئی منزلیں طے کرتا رہے گا۔

علی جواد زیدی۔ بمبئی

محب مکرم! اودھ نمبر حصہ دوم (اکتوبر، نومبر ۱۹۹۴ء) ملا۔ ہر لحاظ سے خوبصورت۔ مواد بھی وقیع، لکھنے والے بھی وقیع۔ آپ کی کوشش لائق صد داد ہے۔ آپ کی ادارت میں 'نیا دور' کا گویا نیا دور شروع ہوا ہے۔

—— کالی داس گپتا رضا۔ بمبئی

محترمی! موقر ماہنامہ نیا دور کا اودھ نمبر حصہ دوم نظر نواز ہوا۔ اپنی صوری و معنوی خصوصیات کے لحاظ سے یہ نمبر پہلے سے بھی بڑھ گیا ہے ؎

نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول

اودھ نمبر نے اودھ کی تاریخ و تہذیب اور ادب و ثقافت، اشخاص و فنون کو مستقبل کے مؤرخ کے لئے محفوظ کر دیا ہے اور اس کے لیے قیمتی مواد فراہم کر دیا ہے، اس لیے آئندہ کام کرنے والوں کے لئے اودھ نمبر مشعل راہ ثابت ہوگا۔

حصہ دوم میں بشمبھر ناتھ صاحب، ملا صاحب، سُرور صاحب، زیدی صاحب نے گزشتہ لکھنؤ کو بڑے موثر انداز میں یاد کیا ہے اور قرۃ العین حیدر صاحبہ نے گذشتہ لکھنؤ کی تہذیبی میراث کے لٹنے اور مٹنے پر بجا طور پر اپنے رنج و غم کا اظہار کیا ہے جس میں ہم سب ان کے شریک ہیں۔

ہاشمی صاحب، فاروقی صاحب، نیر مسعود صاحب، محمود الحسن صاحب مجاور حسین صاحب، اسلم محمود صاحب، یوگیش پروین صاحب، وقار ناصری صاحب نذر الحفیظ صاحب، اطہر مسعود صاحب، انجم قدر صاحب اور آپ کے مضامین نے اودھ کی تاریخ کے اہم پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے۔ محمود الحسن صاحب اور سبط محمد نقوی صاحب نے تاریخ اودھ پر تحقیقی نظر ڈالی ہے۔ بہر حال آپ کی محنت اور سلیقے کی داد نہ دینا بیداد ہے۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔

—— شمس تبریز خاں۔ لکھنؤ

اودھ نمبر حصہ دوم باصرہ نواز ہوا۔ اُردو ادب میں جناب والا کا یہ تحفہ قابل تحسین کارنامہ ہے۔ کتابت، طباعت، کاغذ اور مضامین نے اس کے حُسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ خاص طور سے اطہر مسعود صاحب اور نور الحسن ہاشمی صاحب کے مضامین قابل تعریف ہیں۔ باقی مضامین بھی ادب میں اپنا مقام رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جناب والا کو اسی طرح اردو کی مزید خدمات کے مواقع عطا فرمائے۔

—— طارق شمسی اٹاوہ



عنوانات

اپنی بات	ایڈیٹر	۲
غزل	محمد ولی الحق انصاری	۳
میں اپنی تلاش میں ہوں (خود نوشت)	گروبچن چندن	۴
اے جواہر لال نہرو (نظم)	رباب رشیدی	۱۲
حادثہ گر (نظم)	مصطفیٰ زیدی وفا	۱۳
مخطوطات کلیاتِ ولی (تحقیق)	اکبر حیدری کشمیری	۱۴
زمین کا ظلم (نظم)	اختر بستوی	۲۱
خاموشی (نظم)	ملکہ نسیم	۲۱
ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات	مناظر عاشق ہرگانوی	۲۲
شطرنج کا مہرہ (نظم)	عابد پشاوری	۲۸
زخمِ امارت (نظم)	اقبال ماہر	۲۸
جمیل مظہری اور جدید مرثیہ گوئی	سید محمد ارشد	۲۹
ہائیکو	عطا عابدی	۳۲
بند دروازہ (نظم)	قمر ادیب	۳۲
شاخِ سرسبز پہ اک پھول (نظم)	شعیب شمس	۳۲
فتح پور سیکری: روایتوں اور حقیقتوں کا شہر	عبید الرحمٰن غازی پوری	۳۳
غزل	حسن کاظمی	۳۷
غزلیں	تسنیم فاروقی	۳۸
	اصغر یاسر، نواب احسن	۳۸
شائستہ لوگ (افسانہ)	انور خاں	۳۹
غزلیں	مضطر تاجپوری ۔ ساحر زیدپوری	۴۱
	صفد الکھنوی ۔ محمود الحق محمود	۴۲
	یونس رحمانی ۔ حافظ لکھنوی	۴۱
ستائی (کہانی)	شمس الدین	۴۲
نقد و تبصرہ	ناوک حمزہ پوری ۔ عرفان عباسی	۴۵
	احمد ابراہیم علوی ۔ شمس تبریزی	[illegible]
	ای، اے، حیدری ۔ آفاق ناخری	۴۸
	ظفر حسین	

۱

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومتِ اُتر پردیش اُن سے بہر حال متفق ہو

اپنی بات

ھندستان نے بہت سی عظیم شخصیتوں کو جنم دیا ہے ان میں صُوفی، سنت، بڑے بڑے بادشاہ، عظیم موسیقار شاعر، ادیب، فلسفی، مؤرخ سبھی گزرے ہیں۔ لیکن ہندستانی تاریخ کو اس پر ناز ہے کہ اس نے ایک ایسی شخصیت سے بھی روشنی حاصل کی جو محبِ وطن، مجاہد آزادی، سیاسی رہنما اور ملک کا پہلا وزیراعظم ہونے کے ساتھ ساتھ حساس، نازک خیال اور شاعرانہ مزاج رکھنے والے مورخ کی شخصیت تھی۔ ماضی کی وادی میں بھٹکنے والا مؤرخ بڑی معروضیت کا حامل ہوتا ہے۔ لیکن جواہر لال نہرو کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ شاعرانہ مزاج رکھنے والے مؤرخ تھے مگر کہیں بھی تاریخی واقعات پر انھوں نے اپنی جذباتیت کو حاوی نہیں ہونے دیا۔ یہ بھی ایک یادگار پہلو ہے کہ وہ رابرٹ فراسٹ کے پرستار ہونے کے ساتھ ساتھ فارسی اور اُردو شاعری کے بھی دلدادہ تھے۔ خصوصًا علامہ اقبالؔ اور جوشؔ ملیح آبادی کا کلام انھیں بہت پسند تھا۔ یہ پہلو بھی ہوسکتا ہے کہ غیراہم سمجھا جائے لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ مردم شماری کے موقع پر ہمیشہ اپنی مادری زبان "اُردو" لکھواتے تھے۔

ادارہ نیا دَور کے لئے یہ پہلو بھی مہتم بالشان ہے کہ وہ بہت بڑے صحافی تھے۔ ماڈرن ریویو میں ۱۹۳۶ء میں انھوں نے اپنے قلمی نام سے خود اپنی شخصیت کا جو فیچر لکھا تھا وہ صحافتی دنیا میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اسی طرح صحافت سے ان کی مکمل وابستگی کا زندہ ثبوت قومی آواز، نوجیون اور نیشنل ہیرالڈ ہیں جنھوں نے تینوں زبانوں میں عظیم صحافیوں کی تربیت بھی کی اور ملک کی تقدیر بنانے میں ان صحافیوں نے عظیم کردار بھی ادا کیا۔

مولانا ابوالکلام آزادؔ بھی پنڈت نہرو کی ہی طرح عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ اس فرق کے ساتھ کہ مولانا عالمِ دین تھے، مفسّرِ قرآن تھے، اور اپنی خطابت کے زور سے شبنمی بوندوں کو چنگاریوں میں بدل دینے پر قادر تھے۔ سیاست، جہدِ آزادی اور سیکولر مزاجی ان کی خصوصیات تھیں جو ہندستانی تاریخ کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں۔ وہ بے مثال انشاپرداز اور تاریخ کا سچّا عرفان رکھتے تھے۔ اور ان تمام خوبیوں کے ساتھ وہ اُردو صحافت کے سب سے بڑے رہنما بھی تھے۔ الہلال اور البلاغ ان کی ادارت میں جدید تکنیک کے ساتھ شائع ہوا کرتے تھے۔ ان کے پرچوں میں نہ چٹ پٹا مسالہ ہوتا تھا نہ چٹخارے دار مضامین۔ بلکہ بے حد سنجیدہ عالمانہ اور فلسفیانہ موضوعات پر نگارشات پیش کی جاتی تھیں۔ عالمی صحافت کی تاریخ میں مولانا آزادؔ کی واحد شخصیت تھی جنھوں نے ثابت کردیا تھا کہ عالمانہ مضامین بھی دل چسپ بنائے جاسکتے ہیں اور صحافت کا کام عوام کے مزاج کے مطابق چلنا نہیں ہوتا بلکہ بالغ نظر صحافت عوام کی رہنمائی کرتی ہے اور اُنھیں اپنے مزاج کے مطابق ڈھال لیتی ہے۔

مادرِ وطن کے ان دونوں عظیم صحافیوں کو ادارہ نیا دَور اپنا خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔

—— ایڈیٹر

غزل

(تقدیم حضرت شادؔ عظیم آبادی)

میخانۂ اُلفت میں یارو، اِک جامِ شرابِ ناب ہیں ہم
اور بزمِ نفاق اندیشاں میں تلخیِ سم و زہراب ہیں ہم

ہم کیا ہیں، تجھے کیا بتلائیں، اس پیکرِ آب و گِل میں نہاں
اک شعلۂ دُنیا سوز ہیں ہم، اک گوہرِ عالم تاب ہیں ہم

ہم نرم مزاج سہی، لیکن نرمی یہ نہیں ہے کمزوری
یاروں کیلئے ہیں آبِ خنک، اعداء کے لیے تیزاب ہیں ہم

رفتارِ زمانہ نے اب تو فطرت ہی بدل ڈالی اپنی
تھے آب مگر اب آتش ہیں، تھے سیم پر اَب سیماب ہیں ہم

پامال نقوشِ پا جس سے مٹ جاتے ہیں، ہم وہ آندھی ہیں
ملتی ہیں نئی سمتیں جس سے دریاؤں کو وہ سیلاب ہیں ہم

ہم بحرِ حقیقت کے بچھڑے[1] پانی کے سوا کچھ اور نہیں
ساحل پہ اترتی لہروں سے بن جائے جو، وہ تالاب ہیں ہم

ذرّہ ہیں جدائیٔ صحرا کی بے چین کیے رہتی ہے ہمیں
قطرہ ہیں، سمندر سے اپنے ملنے کے لیے بیتاب ہیں ہم

ہم زہر بلب ہوکر بھی جہاں کو نورِ بصیرت دیتے رہے
پس کر بھی جو سرمہ بنتے ہیں ایسے دُرِ خوش آب ہیں ہم

ہم ایک صحیفہ ہیں ایسا، جس کی ہیں ہزاروں تفسیریں
جس کی ہیں ہزاروں تعبیریں، اے اہلِ جہاں وہ خواب ہیں ہم

ہوتے نہ جو ہم، ہوتا نہ جہاں میں کچھ بھی سوائے خاموشی
ہم سے ہے تری رونق دُنیا! تو ساز ہے اور مضراب ہیں ہم

ہے شاملِ حال اپنے جب تک تائیدِ الٰہی، شاداں ہیں
جب تک ہے یہ شبنم فیض رساں پھولوں کی طرح شاداب ہیں ہم

ندی تھے، پریشاں حال رہے جب تک نہ ہوئے بڑھ کر دریا
دریا ہیں جو اَب، پانے کو سمندر کی وسعت بیتاب ہیں ہم

ہے ایک نظامِ خاص ایسا پابند ہے جس کا کُل عالم
جب تک ہیں جہانِ فانی میں تحتِ علل و اسباب ہیں ہم

طوفان سے لڑنے کی لذّت محسوس کریں کیا ہم، کہ ابھی
موجوں کے تلاطم سے لرزاں، ترساں زِ رُخِ گرداب ہیں ہم

جب قول و عمل پر اپنے نظر کرتے ہیں تو دل یہ کہتا ہے
مانو، ہے منافق ہم میں چھپا، اقرار کرو کذاب ہیں ہم

ہم درسِ اخوت دیتے رہے تا عمر زمانے بھر کو مگر
خود اپنے دل کو ٹٹولا جب، محسوس ہوا کذاب ہیں ہم

ہونے پہ بھی صاحبِ فکر و نظر ہم جلبِ توجہ کر نہ سکے
گرمی کا روزِ درخشاں یا جاڑے کی شبِ مہتاب ہیں ہم

طوفانِ حوادث میں بیتی کیا کس پر، کوئی کیا جانے
جو لوگ لبِ ساحل ہیں انھیں کیا علم تہِ گرداب ہیں ہم

کیا شور مچاتا ہے ظالم اب "دوڑو کوئی ڈوب گیا"
کیا ہاتھ بڑھاتا ہے کشتی سے اپنی جب غرقاب ہیں ہم

کیا اپنے پرائے، ہاتھ سبھی کے خون سے جس کے رنگیں ہیں
ہیں آج کی دُنیا کے وہ کرن[2]، اس عہد کے وہ سہراب[3] ہیں ہم

غیروں سے وفا کی کیا امید، اپنوں ہی سے جب وہ مل نہ سکی
اعدا کی جفا کا شکوہ کیا، جب جورکشِ احباب ہیں ہم

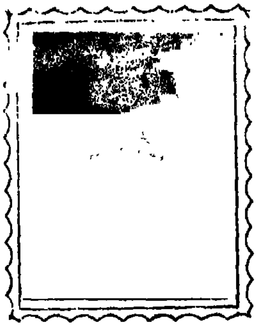
ہونٹوں پہ تولے کے بھی ہے وہی اب، شادؔ کبھی جو کہتا تھا
"اے اہلِ زمانہ قدر کرو، نایاب نہ ہوں کمیاب ہیں ہم"

محمد ولی الحق انصاری
"دارالامان" ۲۷۔ فرنگی محل لکھنؤ
۲۲۶۰۰۳

۱؎ اصطلاحی نام پیڈلے پول (Padley Pools)   ۲؎ مہابھارت کا ایک سورما   ۳؎ شاہنامے کا ایک قہرمان

خود نوشت

گربچن چندن
جی - ۴۶، جنگ پورہ ایکسٹینشن
نئی دہلی ۱۱۰۰۱۴



میں اپنی تلاش میں ہوں

ربّ العالمین کے حکم سے جو بھی فرد اس دنیا میں آتا ہے اس کے ماتھے میں اس کا فریضۂ رفتہ ہوتا ہے۔ میری پیدائش کی چھٹی کی رسم کو خاندانی برہمن نے اس وقت پر مختلف سیاروں کے مقامات کے حساب سے جو میرا زائچہ تیار کیا اس میں میرا نام نکھت رام درج کیا گیا۔ اس نام کی رو سے میرے مقسوم میں حکمرانی کا عنصر نمایاں تھا۔

میں دقیانوسی خیالات کا حامل نہیں ہوں لیکن میں نے دیکھا کہ زائچے کی پیش قیاسی کا اثر میری اسکول کی طالب علمی ہی سے شروع ہو گیا۔

میرے والدین نے وہ زائچہ ایک خاندانی روایت کے تحت ضرور بنوا لیا لیکن انھوں نے میرا نام نکھت رام نہیں رکھا۔ سنا ہے کہ ان ابتدائی ایام میں کبھی بار وہ سب مجھے اسی نام کے مخفف سے "نکھتو" پکارتے تھے۔ لیکن ان کے پیش نظر ایک اور امر بھی تھا۔ میری پیدائش سے قبل میرے والدین کے دو دیگر بچوں کا کمسنی میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد وہ ایک سکھ زیارت گاہ چھ ہٹہ صاحب (چھ دروازوں والا تیرتھ) میں جانے لگے تھے اور وہاں سے آئندہ اولاد کی سلامتی اور طویل عمری کی منت ماننے لگے تھے۔

یہ تیرتھ میرے جنم بھوم باغبان پورہ سے، جو موجودہ پاکستان کے ضلع لاہور کا ایک قصبہ ہے، تقریباً ۲۵ میل دور تھا اور ضلع امرتسر کا حصہ تھا۔ اس کی متعدد یاتراؤں کے بعد جب آٹھ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو (اسکول کے رجسٹر میں اپنے ایک بزرگ کے سہو سے یہ تاریخ یکم ستمبر ۱۹۲۲ء درج ہوئی ہے) میری پیدائش ہوئی تو انھوں نے وہاں پھر حاضری دی اور مراد پوری ہونے کا شکرانہ ادا کیا اور وہاں سے میرا نام "گربچن سنگھ" عطا ہوا۔ میرے والدین عقیدتاً ہندو تھے چنانچہ اس گھریلو ماحول میں میرا نام رفتہ رفتہ گربچن داس ہو گیا۔ اس زمانے میں وسیع المشربی اور کشادہ دلی ایک روزمرہ تھا۔ لہٰذا ہر مقدس مقام اور نام کا عملاً احترام کیا جاتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میرے والد "مادھو لال حسین" نام کی ایک مقامی درگاہ میں جا کر چراغ جلایا کرتے تھے اور میری سلامتی کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔

میری درازیٔ عمر کے تبرکات کے لیے میرے مونڈن کی رسم ویشنو دیوی کے آستانے پر ہوئی۔ یہ تیرتھ جموں کے صوبہ میں واقع ہے اور میرے مولد سے قریب ۳۰۰ میل دور ہے۔

میرے والد لالہ ایشر داس ایک ساہوکار اور تاجر تھے۔ وہ اپنی خدا ترسی، نیک مزاجی اور انسان دوستی کے لیے مشہور تھے۔ قصبے کی وسیع آبادی میں، جس میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، ان کے حسن سلوک کا شہرہ تھا۔ ان کی مقبولیت کے صدقے میرے بڑے بھائی نالرچرن داس، جو خود بھی ایک دانش مند تاجر اور منظور شدہ گورنمنٹ کنٹریکٹر تھے، قصبے کے مسلم سماج میں بہت ہر دلعزیز تھے۔ باغبان پورہ کے سرکردہ رئیس میاں افتخار الدین، جو پہلے انڈین نیشنل کانگریس اور بعد میں پاکستان کے ممتاز سیاست داں اور مرکزی وزیر ہونے کے علاوہ لاہور کے 'امروز'، 'پاکستان ٹائمز' اور 'لیل و نہار' نامی اخباروں کے بانی تھے، انھیں اپنا رفیق عزیز اور تجارتی معاملوں میں مشیر خاص مانتے تھے۔

میری ابتدائی تعلیم مقامی گورنمنٹ اسکولوں میں ہوئی اور ۱۹۳۸ء میں میں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ہائی اسکول ہی کے زمانے میں میرا قلم فعال ہو گیا۔ اس عمل کو میں ادبی زندگی کا آغاز نہیں کہہ سکتا کیونکہ ایسی زندگی کو اکثر رسالوں میں چھپنے یا نشستوں میں ادبی کاوشیں پیش کرنے سے جوڑا جاتا ہے۔ میرے حق میں ایسا آغاز تو کالج کے زمانے میں ہوا

البتہ میری قلمی سرگرمیوں کی بسم اللہ اسکول کے زمانے سے ضرور ہو گئی۔

مجھے یاد ہے کہ ان دنوں جب بھی کسی ہم جماعت لڑکے یا اسکول کے اور کسی شوخ لڑکے سے جھگڑا ہو جاتا تو میں اس سے تو تو میں میں کرنے کی بجائے قلمی لڑائی کرتا۔ اس کو نیچا دکھانے کے لئے کسی واقعے پر افسانہ تراشی کرتا اور اس کی چند نقلیں تیار کر کے اسے اسکول کے منتخب طلبا میں بانٹ دیتا۔

اسی سلسلے میں ایک معرکہ مجھے خوب یاد ہے۔ میں اس وقت ساتویں درجے میں تھا کہ جماعت کے لڑکوں سے ایک مخالف گروہ سے ٹھن گئی۔ اس گروہ کا سرغنہ بہت بنتا تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ اس کا باپ ہمارے ہیڈ ماسٹر کا دوست تھا۔ چنانچہ وہ لڑکا بات بات پر اکڑ فوں دکھاتا اور ڈینگوں کے طومار باندھ دیتا تھا۔ ایک بار وہ اپنے ساتھیوں کو یہ کہہ کر ایک باغ میں لے گیا کہ وہ باغ اس کے ماموں کا ہے اور وہاں کا مالی ان کا خاندانی نوکر ہے۔ وہاں انھوں نے امرود توڑ توڑ کر نہ صرف پیٹ بھر کھائے بلکہ انھیں گھر لے جانے کے لیے جھولیاں بھی بھر لیں۔ جب وہ لوٹ رہے تھے تو مالی نے انھیں پکڑ لیا اور نہ صرف ان سے وہ امرود چھین لیے بلکہ ان کو کمار سے تھپڑ لگا کر ان کی قمیصیں بھی اتروا لیں۔

میں نے اس سارے واقعے پر تھوڑا سا رنگ چڑھا کر "میاں احمق کی شامت" کے عنوان سے ایک پرچہ تحریر کیا اور اس کی نقلیں اسکول میں بانٹ دیں۔ اس لڑکے کا نام احمد تھا، اس لیے میرے عنوان میں نام کی تبدیلی سے ہیر پھیر چھپ نہ سکا اور وہ اس پرچے کو لے کر ہیڈ ماسٹر کے پاس پہونچ گیا۔ ہیڈ ماسٹر نے مجھے بلایا اور اسکول کے ڈسپلن کے نام پر اس کی صفائی مانگی۔ میں نے انھیں کہا کہ اس پرچے میں کسی کا نام نہیں ہے اور اس میں ایک فرضی واقعے کی مدد سے چوری کی عادت سے بچنے ہی کے لیے کہا گیا ہے۔ ہیڈ ماسٹر مسکرا دیئے لیکن مسکراہٹ کے ساتھ ہی یہ نصیحت بھی کہہ دی کہ اسکول کے ڈسپلن کا خیال رکھنا چاہیئے۔

کالج کے زمانے میں میری ان سرگرمیوں نے کچھ سیاسی رنگ اختیار کر لیا۔ انٹرمیڈیٹ کے لیے میں نے سکھ نیشنل کالج میں داخلہ لے لیا۔ یہ کالج ہمارے قصبے سے نزدیک ترین تھا اور ۱۹۳۸ء ہی میں قائم ہوا تھا۔ امرتسر کے خالصہ کالج کے چند نیشنلسٹ پروفیسروں کا اپنے انتظامیہ سے جھگڑا ہو گیا تھا اور یہ اختلاف نہ صرف ان کی علاحدگی پسندی بلکہ ایک نئے کالج کے قیام پر منتج ہوا۔ اس کے پرنسپل سردار نرنجن سنگھ مشہور اکالی لیڈر ماسٹر تارا سنگھ کے بھائی تھے اور اپنی قوم پرستی کے لئے مشہور رہے۔

کالج کے ابتدائی ایام میں اس کے نشان کا معاملہ طے ہونا تھا۔ کالج کی ورکنگ کمیٹی نے ایک ایسا نشان تجویز کیا جس میں قومی ترنگے جھنڈے کے دو نقوش کے درمیان شمشیر و سنان کا سکھ مذہب کا عکس تھا۔ یعنی مذہب اور سیاست کو مخلوط کر دیا گیا تھا۔ مجھے اس ملاوٹ میں کالج کے معلومہ مسلک میں تضاد نظر آیا۔ میں نے چند ساتھیوں کے ساتھ ایک گروپ قائم کیا اور مجوزہ نشان کے خلاف ایک مضمون لکھا جس کے نیچے اپنے گروپ کے سکریٹری کی حیثیت سے میرے دستخط تھے۔ اس میں تمام طلبا کو کالج کی مطلوبہ قومی فضا کو ابھارنے اور مستحکم کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ میرے مضمون کی حمایت میں طلبا کی کئی میٹنگیں ہوئیں اور فضا میں کچھ گرمی پیدا ہو گئی۔ اسی مرحلے پر پرنسپل نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور بتایا کہ کالج جس فرقے کے منصوبے اور سرمائے سے شروع ہوا ہے اس کے اعتقادات کی جھلک کا اس کے نشان میں آنا واجب ہے اور اس جھلک میں تو شمشیر و سنان ہی کا عکس ہے جو طلبا میں گرمیِ احساس اور جوشِ عمل بھرے گا۔

میں نے انھیں بتایا کہ میں ان کے خیالات کا احترام کرتا ہوں لیکن مذہب اور سیاست کی آمیزش کو اچھا نہیں سمجھتا۔ پرنسپل موصوف نے میری صاف گوئی کی تعریف کی اور نشان کے بارے میں ہمارے گروپ کی شکایت کالج کے ورکنگ کمیٹی کو بھیج دی گئی۔ کمیٹی کا فیصلہ آنے میں کئی ہفتے لگ گئے لیکن انجام کار اسی کی اصلی تجویز کو عملی شکل دی گئی۔ اس معرکے میں ہمارے گروپ نے شاعر کے اس مصرعے پر قناعت کی کہ:

مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

بہر حال یہ سب میرے قلمی شوق کے شاخسانے تھے۔ اس شوق نے جلد ہی ادبی کاوشوں کا رخ اختیار کر لیا۔ ان کاوشوں کے لیے کالج کا میگزین ہی دستیاب تھا۔ چنانچہ اس کے ہر شمارے میں انگریزی کے حصے میں میرا

کوئی مضمون یا اُردو کے حصّے میں میرا کوئی افسانہ شائع ہوتا تھا لیکن اُس دور کے اپنے افسانوں کو میں زیادہ قابلِ ذکر تصوّر نہیں کرتا۔ یہ قدرے طفلانہ تھے۔ مثلاً ایک افسانے کا عنوان تھا "رس گلے"۔

میری قابلِ ذکر افسانہ نگاری کی ابتدا بی۔اے کے زمانے میں ہوئی۔ بی۔اے میں نے دیال سنگھ کالج سے کی۔ مولانا تاجور ہمارے اُردو کے پروفیسر تھے اور وہ کالج کی میگزین کے اُردو حصّے کے چیف ایڈیٹر تھے۔ اپنے ادبی شوق کی وجہ سے میری ان سے جلد ہی صاحب سلامت ہو گئی۔ ان کا پڑھانے کا طریقہ نہایت دل نشین اور خیال انگیز تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میں کبھی ان کے پیریڈ سے غیر حاضر نہ ہوا۔ وہ ہمیں دیوانِ غالب پڑھاتے تھے۔ اکثر غالب کا ایک شعر شروع کرتے اور ادب کی سحر آفرین گہرائیوں میں پہنچ جاتے۔ امتحان کے لیے میری تیاری ان کے سنے ہوئے لیکچر اور اپنا جنونِ تحریر تھا۔ اس میں نصاب پر انحصار بے حد کم تھا چنانچہ جب سالانہ امتحان کے بعد ہمارے جوابات کے پرچے تقسیم ہونے کا دن آیا تو میں کلاس میں بہت سہما ہوا بیٹھا تھا۔ تاجور صاحب ہر طالبِ علم کا پرچہ دیتے وقت اس کے نمبروں کا اعلان کرتے جاتے۔ میرا پرچہ اپنی ترتیب سے چھوٹ گیا تھا اور میرے اوسان خطا ہو رہے تھے بالآخر عین آخر میں میرا پرچہ آیا۔ مولانا صاحب اسے ہاتھ میں لے کر ایک منٹ کے لئے رک گئے۔ اس وقت میری حالت یہ تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ اچانک مولانا صاحب گویا ہوئے:

"اس پرچے کو میں نے جان بوجھ کر آخر میں رکھا اور جان بوجھ کر اس کے دو نمبر بھی کم کیے ورنہ پورے کے پورے نمبروں کا مستحق تھا۔ دو نمبر میں نے اس لیے کم دیئے کہ اردو کے پرچے میں پچاس میں پچاس پر کسی کو یقین نہ آئے گا۔"

میں اس کامیابی سے ہکّا بکّا رہ گیا۔ میری گھبراہٹ مسرّت میں بدل گئی۔ تاجور صاحب نے کہا کہ اس لڑکے کے جواب میں کتابی شرح کم اور ذہنی اپج زیادہ ہے اور اسی وجہ سے میں نے اسے فوقیت دی ہے اسی فوقیت کے صدقے ۱۹۴۲ء کی کالج کی سالانہ تقریب میں مجھے اس کے مہمانِ خصوصی خواجہ غلام السیدین کے ہاتھوں اردو کے بہترین طالب علم کا انعام ملا۔

تاجور صاحب کو میری تحریر اس قدر پسند تھی کہ جو چیزیں کالج میگزین کے اُردو حصّے کے لئے میں دیتا تھا انھیں وہ اپنے ماہنامہ "شاہکار" میں شائع کرا دیتے تھے۔ چنانچہ میرا پہلا ادبی مضمون جس کا عنوان "اگر" تھا، اور پہلا قابلِ ذکر افسانہ "روشنی" سب سے پہلے "شاہکار" ہی میں شائع ہوئے۔

بی۔اے کے زمانے میں میری سیاسی تحریریں چوکھا رنگ لے آئیں دراصل بی۔اے کا امتحان میں نے پاس کر لیا تھا اور اب ایم۔اے میں داخل ہونے والا تھا۔ یہ ۱۹۴۲ء کی ہندوستان چھوڑو تحریک کا زمانہ تھا میں نے اپنے قصبے کے نوجوانوں کو ساتھ لے کر تحریکِ آزادی کو مضبوط کرنے کا پرچار کیا۔ اس پروگرام کے پیچھے میرا وہی جنونِ تحریر تھا۔

ہم حکومت برطانیہ کے خلاف بڑے جوشیلے پوسٹر اور خبرنامے لکھتے اور آدھی آدھی رات کو لوگوں کے لیٹر بکسوں میں ڈال دیتے اور قصبے کے اہم مقامات کی دیواروں پر چسپاں بھی کر دیتے۔ ان خبرناموں میں نیتا جی سبھاش چندر بوس کے آزاد ہند ریڈیو کی خبریں کثرت سے شامل ہوتی تھیں۔

مقامی فضا میں بلا کا جذبہ پیدا ہو جانے کے باوجود پولیس کو اس کے محرک کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ پھر ہمارے ایک ساتھی نے مخبری کر دی اور ۹ اگست ۱۹۴۲ء کو میری گرفتاری ہو گئی۔ وہ رمضان کا ایک دن تھا۔ خصوصی پولیس کا ایک ۱۴ نفری دستہ میرے گھر کی تلاشی لینے آیا۔ وہ سارا دن میرے مراسلات، کاغذات اور مسودات کی چھان بین کرتا رہا۔ شام کو جب روزہ افطاری کا نقارہ بجا تو اس کے سربراہ کو احساس ہوا کہ شام ہو گئی چنانچہ انھوں نے میرے بہت سارے مسودات اور مراسلات کا پلندہ اپنے قبضے میں کر لیا اور مجھے اپنی حراست میں لے لیا۔ جب انھوں نے حوالات کی گاڑی میں مجھے بٹھایا تو قصبے کے ہزاروں لوگ، جو میری تلاشی کی خبر پاتے ہی ہمارے گھر کے باہر جمع ہونا شروع ہو گئے تھے، وہاں موجود تھے۔ وہ منظر دیدنی تھا۔ کسی کو یہ توقع نہ تھی کہ ایک متمول اور غیر سیاسی خاندان کا یہ لڑکا حکومت کا باغی بھی ہو سکتا ہے۔ چاروں طرف حیرت اور سراسیمگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ میرے والدین کو مجھ سے ایسی حرکت کی بالکل توقع نہ تھی۔ میری والدہ تو میری گرفتاری کے منظر کو برداشت ہی نہ کر سکی اور اس کے

صدمے سے بے ہوش ہوگئیں اور چند ہی ہفتے بعد وہ اللہ کو پیاری ہوگئیں مجھے جیل میں ڈال دیا گیا اور مجھ پر بغاوت کے دو مقدمے قائم ہوئے ایک قابلِ اعتراض تحریریں رقم اور تقسیم کرنے کا، اور دوسرا قابلِ اعتراض مواد گھر میں جمع کرنے کا۔ میرے والدین جو مجھے آئی سی ایس کے امتحان کے لیے تیار کر رہے تھے، بے حد پریشان تھے اور انھوں نے ضمانت پر میری رہائی کے لیے دن رات دوڑ دھوپ کی۔ ضمانت کی اپیل لوور اور سیشن دونوں عدالتوں میں نامنظور ہوگئی اور پھر اس دور کے سینیر ایڈوکیٹ ملک جیون لال کپور کی نمائندگی سے ہائی کورٹ میں منظور ہوئی اور میں نے پھر اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری کر دیا۔ ۱۹۴۵ء میں پنجاب (لاہور) یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری لی اور اسی سال جرنلزم کا ڈپلوما بھی حاصل کیا۔

اسی زمانے میں "بھیڑیے" کے عنوان سے ایک افسانہ لکھا جس میں اپنی گرفتاری سے وابستہ کرداروں اور وارداتوں کو موضوع بنایا تھا۔ یہ افسانہ میرے ایک دوست رام پال نے لاہور کے ماہنامہ "ادبی دنیا" کے مدیر مولانا صلاح الدین مرحوم کو دیا۔ انھوں نے اسے نہایت اشتعال انگیز پایا اور کبھی آئندہ استعمال کرنے کے لیے رکھ لیا۔

۱۹۴۵ء میں لاہور کے یورپین انگریزی روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ کو ایک سب ایڈیٹر کی ضرورت پیش آئی، جس کے لیے اس کے ایڈیٹر ایف ڈبلیو بسٹن نے ہمارے شعبۂ جرنلزم کے صدر پروفیسر پی. پی. سنگھ سے ایک منتخبہ امیدوار بھیجنے کے لیے درخواست کی۔ پروفیسر پی. پی. سنگھ نے میرا نام بھیج دیا اور میں اس اخبار میں سب ایڈیٹر مقرر ہوگیا۔

اُردو اخباروں میں میرے افسانے برابر چھپ رہے تھے۔ ۱۹۴۶ء میں لاہور کے ایک اُردو ہفت روزہ "ساگر" کے ناشر نے اپنے اخبار کی ادارت کے لئے میری معاونت مانگی۔ میں نے اپنے انگریزی اخبار کے ایڈیٹر کی اجازت سے "ساگر" کی جز وقتی ادارت کی ذمہ داری قبول کر لی۔ یہ ایک ادبی اور فلمی ہفت روزہ تھا۔ اس میں اخبار کی ضرورتوں کے مطابق میں تقریباً دس ماہ تک متعدد کالم لکھتا رہا۔

اس زمانے میں مجھے اُردو میں اپنا ایک اخبار نکالنے کا شوق پیدا ہوا اور جنوری ۱۹۴۷ء میں اپنے ایک دوست رام لال دوہرا کی شرکت میں میں نے لاہور کا ہفت روزہ اخبار "آفتاب" ۱۲ سو روپے میں خرید لیا۔ اسے ہم بیساکھی کے دن یعنی ۱۳ اپریل ۱۹۴۷ء سے جاری کرنے والے تھے لیکن ان دنوں دو قومی نظریے اور ملک کی تقسیم کی تحریک نے بہت زور پکڑ لیا تھا اور ۱۹۴۶ء کے اوائل میں کلکتہ میں فرقہ وارانہ فسادات کے بعد یہ طوفانی آگ شمالی ہند میں بھی داخل ہو چکی تھی۔

۴ مارچ ۱۹۴۷ء کو لاہور میں اس کی پہلی وسیع واردات ہوگئی اس کے بعد زندگی کا سارا نظام درہم برہم ہوگیا۔ یہ شورش کسی ایک فرقہ کے صرف جان و مال کو نقصان پہنچانے ہی تک محدود نہیں تھی بلکہ اپنے سے غیر مذہب والے باشندوں کو ان کے وطن سے نکالنے پر مصر تھی۔ ایسے حالات میں کوئی نیا کاروبار شروع کرنے کا امکان ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ چنانچہ اخبار کا اجراء تو ایک طرف، خود ہمارا وہاں قیام ہی مخدوش ہوگیا۔

فروری ۱۹۴۷ء میں میری شادی ہوئی تھی اور اس سے قبل میرے والدین نے ایک نئی آبادی میں نئی کوٹھی بنوائی تھی۔ چنانچہ ہم وہاں منتقل ہوگئے۔ گنجان آباد پرانی گلیوں سے دور یہ نسبتاً ایک محفوظ علاقہ تھا لیکن فرقہ وارانہ فسادات کی آگ برابر پھیلتی جا رہی تھی۔ اس کے سامنے نہ کوئی محلہ اور نہ کوئی غیر مذہب کا شخص محفوظ تھا۔ چاروں طرف خوف و ہراس اور خطرات کا دور دورہ تھا۔ چنانچہ شادی کے بعد اپنے شہر سے باہر جا کر ہنی مون منانے کا شوق دل ہی دل میں ٹھنڈا ہوگیا۔

میری بیوی پرکاش رانی پنجاب کے ایک ممتاز الیکٹریکل انجینیر ٹھاکر راج مہتہ کی بیٹی ہیں، جنھوں نے دیہات کو برقیات کرنے میں یادگار کام کیا۔ شادی سے قبل گرمیوں کے موسم میں پرکاش رانی اپنے والدین کے ساتھ کسی پہاڑی مقام بالخصوص کشمیر جایا کرتی تھی۔ وہ ایسی تفریحات کی بڑی شائق ہے لیکن شادی کے فوراً بعد بلکہ اس سے قبل ہی ملک میں جو حالات پیدا ہوگئے تھے ان کی وجہ سے دل مسوس کر رہ گئی۔ دو قومی نظریے کے بانیوں کی سیاست نے نہ جانے کتنے ایسے انسانی جذبوں اور ارادوں کو عاجز و آزردہ کر دیا۔ اس محرومی کا ازالہ بعد کی سیاحتوں سے کیا گیا لیکن ان کی حیثیت عید پیچھے چاند مبارک کی تھی۔ میری سسرال موگہ ضلع فیروزپور میں تھی جو ایک ہندو سکھ اکثریتی علاقہ تھا۔ چنانچہ لاہور کے فسادات کی پھیلتی ہوئی آگ سے بچنے کے لیے کچھ ماہ ہم نے یہیں

گزارے لیکن بیچ بیچ میں ہم یہ امید لیے کہ باغبان پورہ جلتے رہے کہ فرقہ وارانہ دیوانگی ختم ہو جائے گی اور ہم بالآخر اپنے آبائی گھروں ہی میں آباد رہیں گے لیکن برصغیر کی ۱۹۴۷ء کی سیاسیات نے ان تمام انسانی اور قدرتی توقعات کو ناممکن بنا دیا۔

اگست ۱۹۴۷ء میں چار و ناچار ہمیں اپنی جنم بھومی چھوڑنا پڑی۔

آزاد ہندوستان میں آکر کئی ماہ تک تو بے سروسامانی اور خانہ بدوشی سے سابقہ رہا لیکن پھر رفتہ رفتہ سب کچھ بحال ہو گیا۔ مئی ۱۹۴۸ء میں ایک امتحان میں اوّل آنے کی بنیاد پر مجھے مرکزی حکومت کے پریس انفارمیشن بیورو میں ملازمت مل گئی۔ یہ دفتر ان دنوں رائے سینا روڈ نئی دہلی کے این بلاک میں واقع تھا۔ یہ دو منزلہ عارضی عمارت دوسری جنگِ عظیم کی فوجی ضرورتوں کے لیے تعمیر ہوئی تھی جسے پچاس کی دہائی میں مسمار کر دیا گیا اور آج اس کی جگہ پر ریل بھون کی عظیم عمارت کھڑی ہے۔ پریس انفارمیشن بیورو کا شعبۂ اردو اپنے مسلمان عملے کے اکثر افراد کی پاکستان ہجرت کے سبب تہی دامن اور محتاج ہو گیا تھا چنانچہ مجھے اسی شعبے میں متعین کر دیا گیا۔ یہاں میرے فرائض میں نہ صرف ہندوستان بلکہ پاکستان کے اردو اخباروں کا مطالعہ بھی شامل تھا جس سے میرا رشتہ اور مضبوط ہوا۔

میری شادی سے دو اولادیں ہوئیں۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ دونوں کی شادی ہو چکی ہے اور وہ اپنے اپنے گھروں میں بسے ہوئے ہیں میرا بیٹا انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس کا رکن ہے اور خدا کے فضل سے اپنے فرائض کی انجام دہی میں بہت شہرت پا چکا ہے۔ (احمد نگر، مہاراشٹر) میں اپنی کلکٹری کے زمانے میں اس نے ضلعی نظم و نسق کا ایک نیا طریقہ رائج کیا جسے بے حد پسند کیا گیا۔ اس کی افادیت اور عوامی مقبولیت کی ستائش میں حکومت ہند نے انھیں "پدم شری" کا اعزاز عطا کیا۔ میری بیٹی کا شوہر سڑکوں کی تعمیر کی مشینری بنانے کے ایک کارخانے کا مالک ہے اور پروردگار کے کرم سے اپنے کاروبار میں شاداں ہے۔

میں نے ترکِ وطن کے واقعات کو اپنے افسانے "نئی صبح" میں رقم کیا۔ یہ افسانہ بہت دیر تک میرے پاس رکھا رہا پھر ۱۹۶۵ء میں ہندوستان و پاکستان کے تاشقند معاہدے کے موقع پر چند تبدیلیوں کے بعد اسے اشاعت کے لیے بھیج دیا گیا۔

ملک کی آزادی کے بعد عرصۂ دراز تک میں افسانے ہی لکھتا رہا اور یہ ہندوستان و پاکستان کے مختلف اخباروں و رسالوں میں چھپتے رہے۔ ان میں بھروسہ۔ غمِ دل۔ پیاس نہیں بجھی۔ انتقام۔ کلی اور بگولے۔ غنچے کی موت اور ہجوم شامل ہیں۔ ادیبوں اور شاعروں کی عالمی انجمن P.E.N نے ۱۹۶۵ء میں میری افسانہ نگاری کو دادِ تحسین دی

میں افسانہ نگاری میں کسی گروہ کا حواری یا کسی نظریے کا مبلغ نہیں ہوں بلکہ اپنے افسانوں کے ذریعہ اپنے آپ کو جاننے کی کوشش کرتا ہوں۔ میرے افسانے نتیجہ نہیں بلکہ وسیلہ ہیں ذہن کی ان گہرائیوں اور تنہائیوں سے واقفیت حاصل کرنے کا جو محسوس تو ہوتی ہیں لیکن گرفت میں نہیں آتیں۔ ہم کیا ہیں؟ ہمارا مشن کیا ہے؟ ہماری منزل کہاں ہے بنی نوع انسان کے درمیان ہمارا رول کیا ہے؟ ایسے تمام سوالوں کا جواب ہمیں آسانی سے نہیں ملتا۔ کم از کم روز مرہ کے معمولات میں تو ملنا دشوار ہے۔ خارجی واقعات بلاشبہ حقیقی اور ٹھوس ہیں لیکن باطنی شکووں اور سوالوں کو چپ نہیں کرا سکتے۔ داخلی سوالوں کا اطمینان اظہار سے ہوتا ہے لیکن یہ اطمینان مکمل ہوتا ہے نہ قطعی۔ چنانچہ ایک فن کار، ایک ادیب ایک حساس شخص کی اظہار کی کاوش اور تمنا اکثر و بیشتر ناآسودہ اور بے چین رہتی ہے۔ وہ سُر، تان، رنگ، شعر، افسانہ وغیرہ کے ذریعے سے اظہار کرتا رہتا ہے اور زندگی کے ابدی اور پر پیچ راستوں کے اسرار ڈھونڈتا رہتا ہے۔ اس کی قوتِ اظہار سہی کی حقیقت کا ادراک کرنے کی ایک کاوش ہے۔

میں کوئی فلسفہ بگھارنے کی کوشش نہیں کر رہا ہوں۔ صرف یہی کہنا چاہتا ہوں کہ میں اپنے دل و دماغ کی بے کلی اور زندگی کے تجربات سے پیدا ہونے والے محسوسات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے افسانے کا وسیلہ اختیار کرتا رہا۔ افسانہ میرے نزدیک زندگی کو جاننے کی ایک کاوش ہے۔ گویا یہ ایک آئینۂ زندگی ہے جس میں ذہنی احساسات اور قلبی واردات کا عکس اترتا ہے۔ میں اپنے ہر افسانے میں کسی نہ کسی طرح سے شامل ہوتا ہوں۔ بعض اوقات کردار میں، بعض اوقات اس کے پلاٹ کے واقعات میں، بعض اوقات اس کی تنقیدِ حیات میں اور بعض اوقات اس کے نقطۂ نظر میں۔ اس میں کہیں نہ کہیں میرے احساس یا ادراک کی کوئی

کرمی ضرور ہوتی ہے اور جب یہ کرمی قارئین کے دل میں بھی اتر جائے یا انھیں کسی طرح متاثر کرے تو اس سے زندگی کی ہمہ گیری اور صداقت اجاگر ہوتی ہے زندگی اپنی رنگارنگی کے فرق اور تضاد کے باوجود ایک سالم حقیقت ہے ۔ ایک حساس اور ذی شعور شخص کے محسوسات، خواہ وہ کسی ماحول میں رہتا ہو ساری دنیا کے لوگوں کو توجہ اور متاثر کر سکتے ہیں۔ اسی وجہ سے ادب کی وسعت اور عظمت، خواہ وہ کسی بھی زبان کا ہو مسلم ہے ۔

میں سمجھتا ہوں کہ سارا ادب وجدان سے پیدا ہوتا ہے اور وجدان عرفان کے حلقے کی چیز ہے لیکن ہم باہر کی دنیا سے کٹے ہوئے نہیں ہیں خارجی حالات ، واقعات ، دیکھی سنی باتیں سب ادیب کے ذہن میں اترتی ہیں اور وہاں اپنی جگہ بھی ڈھونڈھ لیتی ہیں لیکن جگ بیتی کی کوئی نہ کوئی کڑی اس کے احساس اور شعور سے اس طرح وابستہ ہو جاتی ہے جیسے اس کی اپنی ہی ہو اور پھر وہ اس ہم آہنگی سے پیدا ہونے والے ذہنی عوامل کی عکاسی کرتا ہے ۔

بنیادی طور پر میرا اعتقاد یہ ہے کہ افسانے میں کوئی سماجی یا نفسیاتی بات ہونی چاہیے ۔ یہ اس کے پلاٹ، سماں بندی، کردار نگاری، نفسیاتی تجزیہ اور اسلوب سب میں نظر آنی چاہیے۔ ان سب کے ساتھ ساتھ اس میں وحدتِ تاثر ہونی چاہیے۔ اس کے بغیر افسانہ افسانہ نہیں ہو سکتا۔ بظاہر شاید یہ محسوس ہو کہ یہ سب صرف اچھے مواد اور اچھے اسلوب ہی سے حاصل ہو سکتا ہے لیکن حقیقی کامیابی وجدان کی کیفیت پر منحصر ہے۔ فن کا حسن ادیب کے اپنے ذہن ہی کا ایک جمالیاتی مشاہدہ ہے اور اس کا اظہار اس کی اپنی ہی قدرت کا جوہر ہے ۔

۱۹۷۵ء تک کچھ ایسے ہی خیالات سے سرشار رہا۔ اسی زمانے میں افسانوں کے علاوہ ادب کی دوسری اصناف میں بھی طبع آزمائی کی — ان کاوشوں میں چانکیہ کی زندگی کے انسانی پہلو پر میرا ڈرامہ "آتریکی" طنزیہ مضمون "فلمی شاعروں کی کل ہند کانفرنس" اور ہند و چین جنگ (۱۹۶۲ء) کے موضوع پر "ہیون سانگ کا خط ماؤزے تنگ کے نام" شامل ہیں۔

میرا آخری افسانہ غالباً "ایک اور سفر" تھا جو میں نے ۱۹۷۵ء میں خواتین کے بین الاقوامی سال کے موقع پر لکھا۔ اس میں جہیز کی لعنت کو نمایاں کیا گیا تھا۔ یہ افسانہ "آج کل کی کہانیاں" کے عنوان کے تحت مرکزی حکومت کے پبلی کیشنز ڈویژن کے انتخاب میں شامل ہوا۔

۱۹۷۵ء کے اوائل میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونی کیشن کے ادارے سے جو وزارت اطلاعات و نشریات کا ایک شعبہ ہے، ایک دعوت نامہ ملا جس میں کہا گیا کہ میں اُردو صحافت پر ان کے مجوزہ ورکشاپ اور سیمینار کے لیے ایک تحقیقی مقالہ لکھوں جو منتخبہ اردو، ہندی اور انگریزی روزناموں کے مشمولات کے تجزیے پر مبنی ہو۔ اس سیمینار میں جو فروری ۱۹۷۵ء میں لکھنؤ میں ہوا۔ ہندوستان بھر کے سرکردہ اُردو روزناموں کے ایڈیٹر شریک ہوئے اور یہ اپنی نوعیت کا اولین پروگرام تھا۔ اس کا موضوع بھی ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا تھا۔ میں نے اسے لبیک کہا۔

سیمینار کا آغاز میرے ہی مقالے سے ہوا۔ سارے اجلاس میں اسی پر بحث ہوتی رہی۔ شرکا نے عام طور پر اسے بہت پسند کیا اور بعد میں ملک بھر کے اخباروں میں اس کا خوب چرچا ہوا۔ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر جناب ایم۔ وی۔ ڈیسائی نے نہ صرف اسے اپنے ادارے کے آرگن "کمیونی کیشن" کی زینت بنایا بلکہ اُردو صحافت کے بارے میں مجھے اپنا غیر سرکاری مشیر بنالیا۔ ۱۹۷۸ء میں مرکز میں جنتا پارٹی کی حکومت قائم ہوئی اور اس نے ۲۹ مئی ۱۹۷۸ء کو دوسرا پریس کمیشن قائم کیا۔ ڈیسائی صاحب اس کے سکریٹری مقرر ہوئے ۔ انھوں نے عہدہ سنبھالتے ہی میرے دفتر سے رابطہ قائم کیا اور اُردو پریس سے متعلق کمیشن کی رپورٹ کے حصے کے لیے میری خدمات حاصل کرلیں۔ انھوں نے بتایا کہ مجھے نہ صرف پہلے پریس کمیشن کے قیام ۱۹۵۲ء سے دوسرے پریس کمیشن کے قیام تک اردو پریس کی رفتارِ ترقی کا سروے کرنا ہے بلکہ اس پریس کے منتخبہ ماہرین اور وابستگان سے اس کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقی مقالے بھی لکھوانا ہے۔ چنانچہ اس کام کا پراجیکٹ بنا کر میں نے ان کو دیا، اور خود اپنی طرف سے ۱۹۵۲ء تا ۱۹۷۷ء کے اردو پریس کے ۲۵ سال کے کوائف پر ایک تحقیقی مقالہ بھی مرتب کیا۔ ڈیسائی صاحب کے ساتھ یہ بھی طے ہوا تھا کہ اردو پریس کے موضوع پر رپورٹ کے لیے موصول ہونے والے تمام مقالوں کا مجموعہ الگ طور پر شائع کیا جائے گا اور اس کی ترتیب و ادارت میرے ذمے ہوگی۔ اسی طرح دیگر علاقائی زبانوں کے پریس پر موصول ہونے والے مقالوں کے الگ الگ مجموعے شائع کرنے کی بھی تجویز تھی جس کے لیے کمیشن کے صدر کی منظوری

حاصل ہوتا تھی لیکن ۱۹۷۹ء میں وسط مدتی انتخابات کے بعد جنتا پارٹی کی حکومت ختم ہوگئی اور مرکز میں پھر کانگریس کی حکومت قائم ہوگئی۔ جنوری ۱۹۸۰ء میں پریس کمیشن کا صدر اور ارکان اپنے عہدوں سے مستعفی ہو گئے لہٰذا یہ اسکیم آگے نہ بڑھ سکی۔ اگرچہ ڈلیائی صاحب، جو سول سروس کے رکن تھے، بدستور اپنے عہدے پر قائم رہے اور اپنی سروس کی مدت پوری ہونے پر ۳۱ر اکتوبر ۱۹۸۰ء کو ریٹائر ہوئے تاہم نئے کمیشن نے اپریل ۱۹۸۰ء جس اپنی تشکیل کا اعلان ہونے کے بعد، اس کے سابقہ امور تحقیق پر نظر ثانی کردی تھی۔ لہٰذا اس کی توجہ اور کارکردگی کا رخ بھی بدل گیا تھا۔ بہر حال کمیشن کی رپورٹ میں، جو نومبر ۱۹۸۲ء میں پارلیمنٹ میں پیش ہوئی، میرا مقالہ شامل تھا۔

پریس کمیشن کا خصوصی کام ملنے کے بعد میرے دفتر کے پرنسپل انفارمیشن آفیسر (سربراہ) شری جی۔ ایس۔ بھارگو نے مجھے اُردو پریس کی بہتری اور ترقی کے لئے ایک منصوبہ مرتب کرنے کے لئے کہا۔ چنانچہ میں نے ۱۹۷۹ء میں انھیں ٹیلی پرنٹر کے ذریعہ اُردو نیوز و فیچرس شروع کرنے کا ایک پراجکٹ بناکر دیا۔ اس پروجکٹ میں یہ تجویز کی گئی کہ پبلک سیکٹر کے ادارے ہندوستان ٹیلی پرنٹرز کے تیارکردہ عربک ٹیلی پرنٹر کے کی بورڈ (Key board) میں ضروری رد و بدل کراکے حکومت انھیں دہلی اور ہندوستان کی دیگر ان تمام ریاستوں میں جہاں اُردو اخبار چھپتے ہیں اور جہاں پریس انفارمیشن بیورو کی شاخیں قائم ہیں، نصب کرادے اور نئی دہلی سے اُردو کی اپنی ساری نیوز و فیچر سروس کی اسی نظام پر ترسیل کرے۔ یہ اپنی قسم کی نہایت اولین اسکیم تھی اور اس کی بدولت پورے ہندوستان کے اردو اخباروں کو بلا خرچ حکومت کی خبریں اور مضامین حاصل ہوسکتے تھے۔ میں نے اپنے پراجکٹ میں بتایا کہ اس سے نہ صرف پورے ملک کے اُردو اخباروں کو بہ سرعت یہ سروس مہیا ہو جائے گی بلکہ اس کی خبروں اور مضامین کا ایک ہی بار ترجمہ ہوگا اور دفتر کی مختلف شاخوں میں الگ الگ اور وقتاً فوقتاً ترجمے ہونے اور اس عمل میں تاخیر روا ہو جانے کے امکانات کی اصلاح ہو جائے گی۔ تذکرہ سربراہ نے اسے بڑی رغبت سے منظور کیا اور حکومت کے مسلمہ ضابطے کے تحت اسے اپنی وزارت کو غور و خوض اور منظوری کے لیے بھیج دیا۔

۳۱ر اگست ۱۹۸۰ء کو میں پریس انفارمیشن بیورو کی سروس سے ریٹائر ہوگیا۔ مجھے دفتر میں توسیع کی پیش کش کی گئی لیکن میں نے اسے قبول نہ کیا۔

میری توجہ اب اردو صحافت پر از خود کام کرنے پر مرکوز ہوگئی اور افسانہ نگاری پس پشت پڑ گئی۔ چند سال سے میں آل انڈیا ریڈیو کی دعوت پر ہر سال پریس رجسٹرار کی سالانہ رپورٹ کی اشاعت کے موقع پر اردو پریس کی رفتار ترقی پر تبصرے نشر کر رہا تھا۔ یہ سلسلہ میرے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی کئی سال تک جاری رہا۔ اور صحافت کے ماضی اور حال پر میں اردو اور انگریزی اخباروں میں درجنوں مضامین لکھ چکا ہوں جو ملک بھر کے اخباروں اور رسالوں میں چھپتے رہتے ہیں۔

سرکاری ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے فوراً بعد حیدرآباد (اے پی) کے روزنامۂ منصف، نے جو ملک کے نامور صحافی جناب محمود انصاری کی ادارت میں چھپتا ہے، مجھے دہلی میں اپنا نامہ نگار خصوصی مقرر کیا اور حکومتِ ہند کے پریس انفارمیشن بیورو نے اسی حیثیت سے اسی سال میرا ایکریڈیٹیشن کیا۔ اس منصب پر میں بدستور قائم ہوں اور اس اخبار میں میرے ہزاروں مضامین شائع ہوچکے ہیں۔ یہ سلسلۂ تحریر ہنوز جاری ہے۔

۱۹۸۲ء میں مرکزی حکومت کے پبلی کیشنز ڈویژن کے اُردو رسالے "آجکل" نے اُردو صحافت پر ایک خصوصی نمبر نکالنے کا فیصلہ کیا۔ رسالے کے ایڈیٹر راج نرائن رازؔ نے اس کے لئے میرا تعاون حاصل کیا اور میں نے اس کی تشکیل و ترتیب کے لیے کافی کام کیا۔ اس خصوصی نمبر کے لیے دو مضامین لکھے جن میں سے ایک عصری اُردو صحافت پر تھا جس میں ٹیلی پرنٹر پر اردو ہی میں خبریں مہیا کرنے والی ایجنسی کی ضرورت کی اہمیت بھی اجاگر کی گئی تھی۔ دوسرا مضمون اس پریس پر حکومت کی ۱۹۴۲ء کی ایک خفیہ رپورٹ پر مبنی تھا جو تب تک طشت از بام نہیں ہوئی تھی۔ اس میں بتایا گیا کہ دوسری جنگ کے دوران اس کے سرکاری پروپیگنڈے میں مختلف اُردو اخبارات نے کیا کردار پیش کیا۔

۱۹۸۶ء میں دہلی کی اُردو اکادمی نے اردو صحافت پر ایک کل ہند سیمینار منعقد کیا، اس کے لئے مجھے کلیدی مقالہ لکھنے کے لیے کہا گیا۔ "اردو صحافت پر ایک نظر" کے عنوان کے تحت میرا یہ مقالہ ۵ صفحات پر مشتمل تھا جس میں اُردو صحافت کی صورت حال اور مسائل پیش کیے گئے تھے۔

اس میں پہلی بار ماضی اور حال کے اعداد و شمار کی روشنی میں اُردو صحافت کا جائزہ لیا گیا۔ اکادمی نے اسے ایک کتابچے کی صورت میں شائع کیا اور اس کے سمینار کا افتتاح اسی مقالے سے ہوا، جس کا اجرا اس وقت کے دہلی کے چیف ایگزیکیوٹو کونسلر شری جگ پرویش چندر نے کیا۔

اسی زمانے میں مجھے ساہتیہ اکادمی کی طرف سے اس کے انسائیکلوپیڈیا آف انڈین لٹریچر کے لئے ہندستان کی اُردو کی ادبی صحافت پر مقالہ لکھنے کے لیے کہا گیا۔ اس موضوع پر اس سے قبل متفرق مضامین تو شائع ہوئے تھے لیکن روزِ اوّل سے تاحال اس کا ایک مجموعی جائزہ ایک سراسر نیا کام تھا۔ اس کے لیے مجھے کافی تفتیش و تحقیق کرنا پڑی اور میرا یہ مقالہ اکادمی کے اس انسائیکلوپیڈیا کی دوسری جلد میں ۱۹۸۸ء میں چھپا۔

اکادمی کی ایک اور فرمائش پر اسی انسائیکلوپیڈیا کے لئے میں نے منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی پر بھی ایک مقالہ لکھا جو ۱۹۸۹ء میں اس کی تیسری جلد میں چھپا۔

۱۹۹۱ء میں مجھے انسانی وسائل کی ترقیات کی مرکزی وزارت کے ترقی اُردو بیورو نے اپنے اردو انسائیکلوپیڈیا کے لیے اردو صحافت پر ایک مقالہ لکھنے کے لیے کہا۔ میں نے اس تجویز کو قبول کیا اور اس موضوع پر ۱۱۶ صفحات کا ایک مقالہ لکھ کر بیورو کی ڈائرکٹر ڈاکٹر فہمیدہ بیگم کو دے دیا۔

اسی زمانے میں میں برصغیر کے اولین اُردو اخبار "جام جہاں نما" پر تحقیق کر رہا تھا۔ یہ اخبار مارچ ۱۸۲۲ء میں شروع ہوا تھا اور صحافت کے ہمارے مورخوں نے اسے ایک سرکاری گزٹ سمجھ کر اس کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا تھا۔ ان کی تشخیص کی بنیاد یہ تھی کہ اس کے ابتدائی چند برسوں میں اس کی پیشانی پر برٹش گورنمنٹ کی مہر کے دو عکس چھپتے رہے۔ لہٰذا یہ سرکار کا معاون، وظیفہ خوار اور بے وقعت اخبار تھا۔ میں نے نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، نئی دہلی میں اس کا اصل ریکارڈ دیکھا اور دو سال تک اس کے کوائف پر تحقیق کی۔ اس تحقیق سے مجھے اس زمانے کے چیف سکریٹری ولیم بٹر ورتھ بیلے کی ایک رپورٹ ملی جس میں اس اخبار کے پہلے چھ ماہ کے شماروں پر تبصرہ کیا گیا تھا۔ اس تبصرے سے معلوم ہوا کہ یہ عکس صرف اس کی صورت ہی کی آرائش تھے، اس کی سیرت پر حاوی نہیں تھے۔ اپنی سرشت میں جام جہاں نما ایک آزاد، خوددار اور صحافت شناس اخبار تھا جس کی تحریروں نے حکامِ وقت کو خاصا برہم کیا۔ انھوں نے اسے سیاسی بیداری کے جذبات پیدا کرنے والا جریدہ اور "سنگین شرانگیزی کا انجن بننے کی صلاحیت رکھنے والا" وسیلہ تصور کیا۔ بیلے کے اسی جائزے کی بنیاد پر گورنر جنرل جان ایڈم نے ۱۸۲۳ء میں کمپنی حکومت کا اولین پریس آرڈی ننس جاری کیا۔ اس آرڈی ننس کے خلاف راجا رام موہن رائے نے قانونی احتجاج کیا، جس سے دیسی صحافت کو زبان بندی کے سب سے پہلے قانون کے خلاف آواز اٹھانے کا شرفِ اولیت ملا۔

'جام جہاں نما' کے بانی ہری ہر دت ناشر اور مدیر دونوں اوصاف کے حامل تھے۔ اُن میں پیشے کی آبرو اور اس کے تحفظ کی جرأت تھی۔ انھوں نے ڈاک کے محصول کے بارے میں جو اس زمانے میں کسی بھی اخبار کے لیے زندگی اور موت کا سوال تھا، انگریزی اور دیسی زبانوں میں فرق کرنے کی حکومت کی امتیازی پالیسی کے خلاف تحریری احتجاج کیا اور تمام اخباروں سے مساوی سلوک کا مطالبہ کیا۔ یہ نمائندگی نامہ اُردو صحافت کی اپنی اوّلین مجاہدانہ دستاویز ہے۔ ہری ہر دت کے حکومت کے نام اس مراسلے کا پورا متن کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔

یہ کتاب ۱۹۹۲ء میں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی نے شائع کی اور دہلی اردو اکاڈمی نے اپنے سالانہ ایوارڈوں کی اسکیم کے تحت اسے صحافت کے موضوع پر اس سال کی بہترین کتاب قرار دیا۔ بعد میں نومبر ۱۹۹۳ء میں اترپردیش اردو اکادمی نے بھی اسے ۱۹۹۲ء کی اردو کی ایک بہترین کتاب ہونے کا انعام دیا۔

جام جہاں نما اُردو صحافت کے مورخوں کی فروگزاشت کی واحد مثال نہیں، میری حقیر رائے میں یہ صحافت ایسے کئی تشنہ گوشوں پر شاکی ہے۔ اس موضوع پر میں نے ایک پورا مقالہ لکھا، جسے ماہنامہ "کتاب نما" نئی دہلی نے اپنے ستمبر ۱۹۹۳ء کے شمارے میں مہمان اداریے کی حیثیت سے شائع کیا۔ بعد میں یہ مقالہ روزنامہ "قومی آواز" نئی دہلی اور ملک کے دوسرے اخباروں میں بھی چھپا۔ اس میں میں نے اردو صحافت کی تقریباً پونے دو سو سال کی تاریخ کی گم شدہ کڑیوں کی نشان دہی کی۔

مجھے کئی دفعہ احساس ہوا کہ اسی گم شدگی کے احساس نے مجھے اُردو صحافت سے باندھ رکھا ہے گو ان سب کی بازیافت میرے بس کا

روگ نہیں۔ میری عمر ستر سال سے تجاوز کر چکی ہے لہذا میں اپنے ضعف کی وجہ سے تن تنہا اس کا بار نہیں اٹھا سکتا۔ البتہ کچھ کام کیے جا رہا ہوں۔

میرا نظریہ ہے کہ ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے قیام سے اُردو صحافت کے انداز اور کردار میں ایک نئی کروٹ آئی۔ یہ کانگریس نہ صرف ملک کے ممتاز اہلِ فکر و دانش کی پہلی منظم کل ہند جماعت تھی بلکہ نئے سیاسی دور میں ہندستان میں متحدہ قومیت کا احساس اور شعور جگانے اور بڑھانے والی اولین تحریک تھی۔ اس وقت یہ فرنگی اقتدار کے اخراج یا قومی آزادی کے لیے جہاد کرنے والی جماعت نہیں تھی۔ صرف حکومت کے طور طریقوں میں انصاف پسندی اور ملک کے تمام لوگوں میں ترقی کی خواہش بڑھانے والی ایک جماعت تھی۔ اس جماعت کے دانش وروں نے برطانوی حکومت کے ہاتھوں ہندستان کے اقتصادی استحصال کے احوال کو فاش کیا۔ ملک کے تمام لوگ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی اس استحصال کا شکار ہوئے۔ چنانچہ اس جماعت کی بدولت ملک میں اقتصادی قومیت کا نیا شعور پیدا ہوا جس نے بیسویں صدی کے فیصلہ کن جہادِ آزادی کو توانائی بخشی۔ ان احوال کی کچھ تفصیل میرے مضمون "انیسویں صدی میں ہندستان کا اقتصادی استحصال" میں پیش کی گئی جو ماہنامہ 'نیا دور' کے اگست ۱۹۹۳ء کے شمارہ میں شائع ہوا۔

اس جماعت کی نشو و نما میں اُردو صحافت نے کیا کردار ادا کیا، اس کا آج تک کوئی جائزہ نہیں لیا گیا۔ میں کم از کم اس موضوع پر اپنے مطالعات مرتب کرنا چاہتا ہوں۔ مزید ماضی تا حال اُردو صحافت کی ایک منتخبہ تاریخ لکھنا چاہتا ہوں جس میں اس کے زیادہ اہم سنگ ہائے میل شامل ہو جائیں۔

میں نے صحافت کے کام کو ایک ربّانی قرض سمجھ کر اپنے اوپر عائد کر لیا ہے لیکن میرا ہمزاد یہ کہتا ہے کہ "تمھارا کارِ جہاں کچھ اور بھی ہے، تمھیں افسانہ نگاری میں مراجعت کرنی ہے"۔

اگر پروردگار نے اجازت دی تو میں اس درازیٔ کار کو دل و جان سے قبول کروں گا۔

□□

اے جواہر لال نہرو

اے نقیبِ امنِ عالم اے وقارِ ملک و قوم
تو بچھڑ کر بھی ہے اب تک اعتبارِ ملک و قوم
شاہدِ گنگ و جمن اے نازشِ ہندوستاں
رونقِ بزمِ سیاست، تابشِ ہندوستاں
تو جمالِ حریّت کی خوش نما اک یادگار
سر سے پا تک افتخار و افتخار و افتخار
اے ترا حسنِ تکلّم حکمتوں کا ترجماں
اے ترا نازِ تبسّم فصلِ گل کا پاسباں
زندگی تیری عبارت تھی عمل کے نام سے
تجھ کو نسبت ہی نہ تھی کوئی مذاقِ خام سے
اے کہ تو سرچشمۂ فیضِ محبت سر بسر
روشنی، تابندگی کی اک علامت سر بسر
اک عجب محبوبیت تھی تیرے ہر انداز میں
رنگِ غالب دل نشیں ہی تھی سوز و ساز میں
مشکلوں کا ایک طوفاں اور ترے پائے ثبات
جیسے تجھ پر کھل گئے ہوں سارے اسرارِ حیات
کوششِ پیہم سے خالی دامنوں کو بھر دیا
ملک کے ماحول کو تو نے منوّر کر دیا
ایسا رقصِ آرزو پہلے کبھی دیکھا نہ تھا
اس سے پہلے ارتقا کا یہ سفر سوچا نہ تھا
اے جواہر لال تیری فکر کی روشن دلیل
پنچ شیل و پنچ شیل و پنچ شیل و پنچ شیل
تو کہ اربابِ نظر کو یاد آئے گا سدا
آئینوں میں عکس تیرا جگمگائے گا سدا

رباب رشیدی
۶۵۔ تارین۔ شاہجہاں پور

حادثہ گر

کیا تم نے کبھی سوچا یا غور کیا ہے
حادثے کیوں ہوتے ہیں، کیا ہوتے ہیں
یہ گیتی اور اس کے مکیں، یہ ذی رُوح سارے
سمندر، ہوائیں، گھٹائیں، پھواریں
جھاڑیاں، پیڑ پودے، لتائیں
گلوں، موسموں، رنگ و انوار کے
یہ مسلسل بدلتے نظارے،
خموشی۔ صدا۔ شور و غل
محبت، مروّت، اخوت، شرافت
بشر حس کے بے نام جذبے
تشدّد، غلامی، تفوّق کی جنگ
گراں، بیکراں چادراں آسماں
روشنی، دُھند، نور و آتش کے
دمساز، عکّاس ان گنت چاند اور تارے
یہ کیا ہیں؟ یہ کیوں ہیں؟
نہیں حادثہ گر
کہیں پر اگر
نہ آئے نظر،
کار فرما ارادہ ہے اس کا مگر
کیا کبھی تم نے سوچا، کبھی تم نے جانا
تمھارے جوانب، عواقب
یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کیوں ہو رہا ہے؟
عمل اور ردّ عمل کی بھی تھیوری
یہاں ہے ادھوری
کہ اوّل عمل، کب، کہاں، کیسے
کس نے کیا؟
ہاں وہی، حادثہ گر، جو نہ آئے نظر
اس کو پہچان لو، دل سے تم مان لو

□□

مصطفےٰ زیدی وفا
۱۲/ ٦۰۔ ڈالی باغ
لکھنؤ ۲۲٦۰۰۱

اکبر حیدری کشمیری
۱۲۱۔ نیا گاؤں (ایسٹ)۔ لکھنؤ

مخطوطاتِ کلیاتِ وَلی (آصفیہ)

وَلی پر اچھا خاصا کام ہو چکا ہے۔ ان کے حالاتِ زندگی کم و بیش سبھی تذکروں میں درج ہیں، لیکن راقم کی رائے میں تاریخِ وفات کا مسئلہ ہنوز طے نہیں ہوا ہے۔ اس میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس وقت میرے پیشِ نظر اردو کا مشہور رسالہ "نگار" لکھنؤ ہے، اس کی جلد ۳۸ نمبر ۶ بابت دسمبر ۱۹۴۰ء میں کسی "م۔ الف" کا مضمون صفحہ ۹ تا ۲۹ میں بہ عنوان "سطحیات سید سلیمان ندوی" موجود ہے۔ مضمون نگار ص۱۱ میں لکھتا ہے:

"سید صاحب نے وَلی کا سال وفات ۱۱۵۵ ہجری لکھا ہے۔ یہ آج سے ۵۵ سال پہلے کی تحقیق معلوم ہوتی ہے وَلی کے متعلق جو نئی تحقیقات ہوئی ہیں ان سے سید صاحب کو غافل نہیں رہنا چاہیئے۔ صحیح ۱۱۱۹ھ ہے۔ بعض حضرات ۱۱۴۳ھ کو صحیح سمجھتے ہیں۔ انھیں اس شعر سے دھوکا ہوا ہے

دل وَلی کا لیا دلّی نے چھین
جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

یہ شعر دراصل مضمونؔ کا ہے اور گلشن گفتار اور چمنستان شعرا میں اس شعر کو خفیف تعرف کے ساتھ مضمونؔ کے نام منسوب کیا ہے ؎

اس گدا کا دل لیا دلّی نے چھین
جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

اب رہی ۱۱۱۹ھ کی سند، اس کے لیے یہ قطعہ ملاحظہ ہو ؎

مطلعِ دیوانِ عشق سید اربابِ دل
والیِ ملکِ سخن صاحبِ عرفاں ولی
سالِ وفاتش خرد از سرِ الہام گفت
باد پناہِ ولی ساقیِ کوثر علیؑ

کچھ دن ہوئے لاہور کے ایک پروفیسر صاحب نے اورینٹل کالج میگزین میں ایک مضمون لکھا تھا جس میں لکھا تھا کہ وَلی کا سال وفات ۱۱۱۹ھ نہیں ۱۱۱۸ھ ہے اور اس قطعہ سے بھی مستخرج ہوتا ہے۔ لیکن شاعر کے "سرِ الہامؔ" سے تعمیہ ہے، اب ۱۱۱۹ھ ہو گئے ہیں"

اُردو کے مشہور ادیب اور شاعر مولوی محمد یحییٰ تنہاؔ میرٹھی اپنی کتاب "مراۃ الشعراء" جلد ۲ ص۵ میں لکھتے ہیں کہ:

"تبصرہ نگار 'از سرِ الہامؔ' سے صرف 'را' مراد لیتے ہیں اور ہم 'الہا' جس کے عدد ۳۷ ہوتے ہیں اور چوتھے مصرعے کے عدد ۱۱۱۸ لے کر عبدالجبار خاں مؤلف "تذکرۂ شعرائے دکن" نے لکھا ہے اور دیگر تذکرہ نویسوں نے اس کی تقلید کی ہے لہٰذا جس تاریخ پر استدلال کیا جاتا ہے وہ تو اب مشتبہ ہو گیا۔"

تنہاؔ نے وَلی کا سالِ انتقال ۱۱۵۵ھ تسلیم کیا ہے۔

اوپر جو قطعۂ تاریخ درج ہوا ہے وہ دراصل مولوی عبدالحق کی دریافت ہے۔ یہ قطعہ دیوانِ حالیؔ کے اس نسخے کے آخر میں ہے جو کتب خانہ جامع مسجد میں محفوظ ہے۔ مولوی صاحب نے اسے سب سے پہلے رسالہ "اردو" شمارہ جنوری ۱۹۳۴ء (ص۱۹۶ تا ۱۹۸) میں شائع کیا تھا۔

ڈاکٹر جالبی صاحب کو ڈاکٹر عبدالحق کے دریافت کردہ متذکرہ بالا قطعہ سے اختلاف ہے۔ موصوف نے وَلی کا سالِ وفات اپنی کتاب تاریخ ادب اردو جلد اول ص ۵۲۵ تا ۵۳۹ میں ۱۱۱۹ھ کے بجائے ۱۱۳۳ھ تا ۱۱۳۸ھ قرار دیا ہے۔ انھوں نے اپنے موقف کی بنیاد دیوانِ وَلی کے اس نسخہ پر رکھی ہے جو پنجاب یونیورسٹی لاہور کے کتب خانے میں موجود ہے

اس کے ترقیمے میں لکھا ہے کہ : یہ نسخہ جلوس محمد شاہی کے آٹھویں سال یعنی ۱۱۳۸ھ (۱۷۲۵ء) کا لکھا ہوا ہے۔ اس کے آغاز کا یہ جملہ قابل ذکر ہے:

"دیوان اشعار ولی مسمی سید ولی محمد مرحوم"

جالبی صاحب کو نسخہ جامع مسجد بمبئی کے اس قطعہ سے اس لیے اختلاف ہے کہ بقول ان کے یہ قطعہ اس خط میں نہیں لکھا ہے جس میں دیوان لکھا ہے۔ کسی دوسرے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

اُردو کے بزرگ اور معتبر محقق پروفیسر نورالحسن ہاشمی صاحب نے اپنے تازہ ترین ایڈیشن کلیات ولی مطبوعہ اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۹ء ص ۲۵ میں بھی تسلیم کیا ہے کہ ولی کا انتقال ۱۱۱۹ھ میں ہوا تھا انھوں نے ڈاکٹر عبدالحق کے نسخہ بمبئی کے قطعۂ تاریخ کو بھی پیش کیا ہے البتہ حاشیے میں موصوف نے ڈاکٹر جالبی صاحب کے اختلاف کے ساتھ محتاط رویہ اختیار کیا اور لکھا ہے کہ ممکن ہے کہ قطعۂ تاریخ کسی دوسرے ولی کے بارے میں ہو۔

راقم الحروف نے دیوانِ ولی نسخۂ جامع مسجد کو نہیں دیکھا ہے اس لیے وہ ولی کے سالِ وفات کے بارے میں اظہار خیال کرنے سے قاصر ہے۔ جالبی صاحب کی جدید تحقیق کہ ولی کا انتقال ۱۱۳۲ھ تا ۱۱۳۸ھ کے مابین ہوا ہے قابلِ غور ہے۔ لیکن کسی ٹھوس شہادت کی عدم موجودگی میں ڈاکٹر عبدالحق کا بیان کیا ہوا قطعۂ تاریخ رد نہیں کیا جا سکتا۔

دیوانِ ولی کے متعدد قلمی نسخے مختلف کتب خانوں میں دستیاب ہیں۔

سب سے پرانا نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے۔ اس کا ترقیمہ یہ ہے:

(۱) "بحمداللہ والمنۃ در شہر اورنگ آباد کتاب دیوانِ ولی با تمام رسید بتاریخ بست ششم ماہ ربیع الاول روز جمعہ ۱۱۲۰ ہجری"۔

(۲) ایک نسخہ سالار جنگ میوزیم حیدر آباد میں ہے۔ اس میں ۴۳ اوراق ہیں یہ راقم کی نظر سے گزرا ہے۔ آخر میں یہ ترقیمہ ہے:

"تمام شد، کار من نظام شد، نسخہ دیوان ولی بخط شکستہ و ناشائستہ خیرالدین، بتاریخ نہم شہر ذی حجہ ۱۱۲۵ھ تحریر یافت۔"

(۳) ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں موجود ہے۔ اسی کی بنیاد پر جالبی صاحب کی جدید تحقیق قائم ہے۔ ترقیمہ یہ ہے:

"دیوان اشعار ولی مسمی سید محمد ولی مرحوم بتاریخ چہاردہم شہر محرم الحرام سنہ ہجری از جلوس میمنت مانوس محمد شاہ بادشاہ غازی خلد اللہ تعالیٰ ملکہ و سلطانہ روز چہار شنبہ وقت چاشت در بلدۂ خیر البلاد احمد آباد حمیت عن الفساد بخط فقیر اضعف العباد کلب محبوب سبحانی، نمود بے بود ثناء اللہ فانی سمت انجام و صورت اتمام پذیرفت۔"

(۴) ایک نسخہ پروفیسر نورالحسن ہاشمی نے انڈیا آفس لندن نمبری ۱۱۵ لکھنؤ یونیورسٹی کے توسط سے منگوایا تھا۔ اس میں ۱۳۴ اوراق ہیں۔ ترقیمہ یہ ہے: ——

"تمام شد دیوان مغفرت نشان میاں ولی محمد مرحوم متوطن دکن بتاریخ دویم شہر ذی قعدہ سنہ ۱۱۵۶ھ بروز پنج شنبہ بوقت صبح تحریر یافت۔ مالک و کاتب ایں دیوان عاجز المذنب محمد تقی ولد سید ابوالمعالی است۔ کسے کہ دعویٰ کند باطل است۔"

مندرجہ بالا نسخوں کے علاوہ متعدد نسخے ایسے ہیں جن کا ذکر ڈاکٹر ہاشمی صاحب نے اپنی کتاب کلیاتِ ولی اور محمد اکرم چغتائی نے اپنے مضمون "دیوان ولی کے قلمی نسخے" مطبوعہ رسالہ اُردو کراچی شمارہ جولائی ۱۹۶۶ء میں کیا ہے۔

دیوان ولی کے سات قلمی نسخے کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد میں راقم کی نظر سے گزرے ہیں ان میں کچھ ناقص ہیں اور پروفیسر ہاشمی صاحب نے اپنے مرتب کردہ کلیاتِ ولی میں کسی کا ذکر نہیں کیا ہے۔ تفصیلات ذیل میں درج ہیں: ——

نسخۂ اوّل

نمبر داخلہ ۴۳،۱۴۶ تاریخ داخلہ: آخر آبان ۱۳۲۱ف

نام کتاب: کلیات ولی، نمبر ۶۹۲ کل اوراق ۱۱۲ الف، سطر ۱۷۔

خصوصیت اغلاط، غیر محتاط۔ سال کتابت ۱۱۵۹ ہجری۔

ابتدا: ؎

کیتا ہوں ترے ناؤں کوں میں ورد زباں کا
کیتا ہوں ترے شکر کو عنوان بیاں کا (۷ شعر)

خاتمہ: رُباعی ؎

تجھ عشق میں نت بے سر و ساماں ہوں میں
تجھ زلف سوں بے تاب و پریشاں ہوں میں

تجھ مکھ کی صفائی کوں نظر میں رکھ کر
مدت سستی چوں آئینۂ حیراں ہوں میں

تمت تمام شد کار من نظام شد برکہ بخواند از دعا یاد بکند

ترقیمہ: "بتاریخ ہفتم شہر ذی الحجہ سنہ ۱۱۵۱ھ قلمی گشت تمت تمام شد"

مخطوطے کی ابتدا میں دو ورق ہیں، پہلے صفحہ پر حافظ کی ایک غزل نہایت ہی بدخط میں لکھی گئی ہے۔

مطلع ؎ غلام نرگس مستانۂ تا جدارانند
خراب بادۂ لعل تو ہوشیارانند

اس ورق کی پشت کا صفحہ خالی ہے۔ دوسرے ورق کے پہلے صفحے کے اوپر ایک مہر چسپاں تھی۔ یہ ایسی مٹائی گئی کہ لفظ کا ذکر کیا کوئی حرف نظر نہیں آتا ہے اس کے بعد اس زمانے کے رواج کے مطابق دوسرے صفحے میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھا ہے۔ پھر غزلیں شروع ہوتی ہیں۔ ان کی تعداد ۴۰۱ ہے۔

مخطوطے میں غزلیں بے ترتیب اور غیر مربوط ہیں۔ ردیف ک میں ردیف ہ کی دو غزلیں شامل ہیں مثلاً ؎

(۱) گریاں ہے ابر چشم مری اشکبار دیکھ
ہے برق بے قرار مجھے بے قرار دیکھ

(۲) جیو چل بچل ہوا ہے چنچل تیری چال دیکھ
دل جا پڑیا خلل میں ترے مکھ کا خال دیکھ

در اصل مخطوطے میں ک ردیف کی تین غزلیں اس طرح ہیں ؎

(۱) جب انجمن میں ہووے وہ یار سبز رنگ ۔ ۵ شعر
(غیر مطبوعہ۔ کسی نسخے میں نہیں ہے)
(۲) گریاں ہے ابر چشم مری اشکبار دیک ۔ ۷ شعر
(۳) جیو چل بچل ہوا ہے چنچل تیری چال دیک ۔ ۷ شعر

ورق ۴۶ الف میں ردیف و کے تحت ایک غزل ہے۔ مطلع ہے ؎

ہر رات اپنے لطف و کرم سوں دکھا کرو
ہر دن کوں عید موج مستی سوں لگا کرو (۶ شعر)

اس کے بعد ردیف ہ کی غزل ہے۔ مطلع یہ ہے ؎

تیرے نین کا دیکھ کہ ہے خانۂ آئینہ
ہے تجھ نگاہ مست کا دیوانہ آئینہ (۷ شعر)

پھر اسی ورق ۴۶ الف سے ن ردیف کی غزلیں شروع ہوتی ہیں، پہلی اور آخری غزل کے مطلعے یہ ہیں ؎

ورق ۴۶ الف تجھ قد او پر جب سوں پڑی جگ میں نگاہ عاشقاں
تب سوں گئی طوبیٰ تلک جیو تیر آہ عاشقاں (۵ شعر)

ورق ۵۹ ب۔ ن ردیف کی آخری غزل ؎

مطلع ؎ اے سامری توں دیکھ مری ساحری کے تئیں
شیشے میں دل کے بند کیا ہوں تری کے تئیں (۵ شعر)

مقطع ؎ پیدا ہوا ہے جگ میں ولی صاحب سخن
میری طرف سوں جا کے کہو انوری کے تئیں

پھر ورق ۵۹ ب سے ردیف و کی غزلیں دوبارہ درج ہیں۔ ان کی تعداد ۱۱ ہے
ورق ۶۲ الف سے ہ ردیف کی غزلیں پھر ملتی ہیں۔ یہ ورق ۶۳ ب تک ہیں ان کی تعداد ۹ ہے۔

ورق ۶۴ الف سے ردیف ی کی غزلیں ۹۴ ورق ب تک ہیں۔ ورق ۹۵ الف اور ۹۵ ب میں مستزاد ہیں۔ پہلی مستزاد یہ ہے ؎

معلوم نہیں کس نے مرے دل کوں لیا ہے ان عشوہ گراں میں
کس شوخ ستمگر نے مجھے پیچ دیا ہے اس موکراں میں

آخری مستزاد ؎

فرہاد کی آتی ہے صدا روح صباحی مجھ شعر کوں سنے
مذکور ہے از بسکہ ولی میرے سخن میں شیریں سخناں کا

ورق ۹۶ الف سے ورق ۱۰۱ تک مخمسات ہیں۔ پہلے مخمس کا مطلع ہے

کر اے دل سدا تجرید کی ترک مت کر گفتگو تفرید کی
عاشق ہے ابتدا توحید کی جس کوں لذت ہے سجن کے دید کی
اس کو خوش وقتی ہے صبح عید کی

مخمسات کی تعداد ۱۰ ہے اور ان میں کل ۶۰ بند ہیں۔ مطبوعہ نسخوں میں صرف ۹ ہیں۔ ورق ۱۰۱ ب۔ "ترجیع بند" ۷ بند۔ ہر بند میں ۸ شعر ہیں۔ اور آٹھواں شعر ہر بند میں یکساں ہے

ورق ۱۰۳ ب سے بغیر عنوان کے مثنوی شروع ہوتی ہے اور ورق ۱۰۵ ب میں ختم ہوتی ہے۔ اس میں کل ۵۰ شعر ہیں۔ یہ دو مثنویاں بلا فصل ہیں۔ پہلا اور آخری شعر درج ہیں۔

الٰہی عشق میں عشاق کر مجھ　　آپس کے شوق کا مشتاق کر مجھ

عبث باتاں سوں بس کر لے ولی توں
نہ کر مقصد یوں اپنی کاہلی توں

ورق ۱۰۵ سے ورق ۱۰۹ الف تک قصیدہ بغیر عنوان کے ہے۔ اس میں ۱۲۴ شعر ہیں۔ پہلا شعر یہ ہے ؎

بے زباں اوپر توں اول اول　　نام پاک خدائے عزّوجل

آخری شعر ؎

گوش حاسد میں جب پڑے یو شعر
داگھ ہو جائے رشک سوں جل جل

ورق ۱۰۹ب تا ۱۱۰ الف۔ قصیدہ از ولی (مطبوعہ) در نعت حضرت خیر البشرؐ

اس میں ۸۹ شعر ہیں۔ پہلا شعر ؎

عشق میں لازم ہے اول ذات کوں فانی کرے
ہو فنا فی اللہ دایم یاد سُبحانی کرے

آخری شعر ؎ عارفاں بولیں کہ جان و دل سوں لاکھاں آفریں
جب ولی تیری مدح میں گوہر افشانی کرے

ورق ۱۱۰ب سے ۱۱۲ الف تک ۱۹ رباعیاں ہیں، اور اسی ورق پر یہ ترقیمہ ہے :۔ "بتاریخ ہفتم شہر ذی الحجہ ۱۱۵۹ ہجری قلمی گشت۔ تمت تمام شد"

مخطوطے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں ولی کے وہ اشعار بھی ہیں جو کلیات ولی نسخۂ ہاشمی صاحب (لکھنؤ) میں نہیں ہے۔ میں نے یوں ہی ان غزلوں کا انتخاب کیا کہ ان کے نقل کرنے میں کوئی دشواری نہ تھی۔ افسوس کہ کتب خانۂ ہذا میں مجھے کوئی دیوان ولی کا مطبوعہ نسخہ دستیاب نہ ہو سکا۔ اگر مل گیا ہوتا تو حوالے میں آسانی ہوتی اور بہت سے اشعار غیر مطبوعہ مل جاتے۔ بہر حال ذیل میں چند غزلوں کے اشعار پیش کیے جاتے ہیں ؎

یا رجانی پوچھ فدا ہے گا　　غمزۂ چشم خوش ادا ہے گا

جب صنم کوں خیال باغ ہوا　　طالب تشنۂ فراغ ہوا

صحنِ گلشن میں جب خرام کیا　　سرو آزاد کوں غلام کیا

جلوہ گر جب سوں او جمال ہوا　　نُورِ خورشید پائمال ہوا

چشم دلبر میں خوش ادا پایا　　عالم دل کوں مبتلا پایا
اسم اللہ سو جسم احمد میں　　آرزوسوں میں صد مزا پایا

نئیں اس میں کچھ سخن حق سے[۳]
حق ستیں حق کوں حق نما پایا

شوخ سرکش کہ دل ربا ہے الغیاث　　دشمن مہر و وفا ہے الغیاث
وہ قیامت قامت گلزار رشک[۴]　　حق میں ہما کے بلا ہے الغیاث
عاشقوں کے حق منیں وہ شوخ طبع　　بے میاں ہے پُر جفا ہے الغیاث
وہ ہلالِ ابرو بہ رنگ ماہ نو　　ان دنوں میں کم نما ہے الغیاث
پائمالِ قاتلِ رنگیں ادا　　خون عاشق جیوں حنا ہے الغیاث[۵]

دام میں زلف کمند انداز کے
آ ولی بے دل پھنسا ہے الغیاث[۶]

غیر مطبوعہ غزل :

آج رسنا ہے حال کچ کا کچ　　کیوں نہ گزرے خیال کچ کا کچ
دلِ بے دل کو آب کرتے ہیں　　شوخ چنچل کے حال کچ کا کچ
اثر بادیہ جوانی ہے　　کر گیا ہوں سوال کچ کا کچ
مجھ کوں لگتا ہے اے پری پیکر　　آج تیرا جمال کچ کا کچ

اے ولی جی کوں آج کرتے ہیں
باغ بوسئے وصال کچ کا کچ

جو آیا مست ساقی جام لے کر　　گیا یکبارگی آرام لے کر

جب تک ہے چمن بیچ بہارِ گل و نرگس
ہے باغ سخن بیچ بہارِ گل و نرگس
اس شوخ کی بیمار انکھاں دیکھ ولی توں
خواہش ہے جو من بیچ بہارِ گل و نرگس

لب پہ دلبر کے جلوہ گر ہی جو خال　　حوض کوثر پہ جیوں کھڑا ہے بلالؓ

عبارت تجھ زلف میں ہے تسلسل　　ہوا تیری کمر میں گم تامل

شمع بزم وفا ہے انبرت نعل
سرو باغ ادا ہے انبرت نعل[٩]

زلف اس کی دو جنم ہے خم کی قسم　　چشم معشوق جم ہے جم کی قسم[١٠]
اے سجن مج سوں کیوں نہیں ملتا　　لعل تیرے دو فم ہے فم کی قسم

نازمت کر تجھے ادا کی قسم　　بے تکلف ہو مل خدا کی قسم

ظلم کم کر تجھے جفا کی قسم　　رحم کر آ تجھے حیا کی قسم
مصحف مکھ ترا یو سورت القمر　　مجکوں والنجم اذا ہویٰ کی قسم

سیر ہے باغ میں نظارا ہے
سبز ہے لال ہے ہزارا ہے

شوخ مست شراب نکلیا ہے　　کیا سبب بے حجاب نکلیا ہے

مفلسی سب بہار کھوتی ہے　　حسن کا اعتبار کھوتی ہے

دیوانِ ولی نسخۂ دوم

نمبر مخطوطہ ۱۹۳۷، تقطیع ۲۴ × ۱۳ سنٹی میٹر، سطر ۱۵، کل اوراق ۱۱۹ سالِ کتابت ندارد۔

اس میں ولی کا غیر مطبوعہ کلام بھی ہے۔ اس کے علاوہ قصائد، مثنویات مخمسات، ترجیع بند۔ دیوان ورق ۱۱۹ ب میں مثنوی در تعریف شہر سورت پر ختم ہوتا ہے۔ ورق ۱۰۷، الف سے ورق ۱۰۸ الف تک غزلیں ہیں۔ نسخے میں سہ مستزاد اشعار نہیں ہیں۔ ان کے نمبر ۶، ۷، ۸، ۹ ہیں۔ غزلیات کے بعد درج ذیل اشعار "بازگشت" کے تحت ورق ۱۰۹ میں ہیں، چند شعر پیش ہیں ؎

سب چمن کے گل رخاں کا توں ہے زیب اے گلبدن
گلبدن تجھ سا نہ دیکھا گرچہ دیکھا سب چمن
انجمن میں تجھ وراں دوجا نہیں کوئی زیب ور
زیب ور سو تج ہے مانند شمع انجمن

اس کے بعد اسی ورق ۱۰۹، الف میں "چار در چار" کے تحت یہ اشعار ہیں ؎

صنم ساتھ جب آ کے یاری لگے　　یو دُکھ درد آ عشر ساری لگے
جسے عشق کا تیر کاری لگے　　اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے

دل رُبا آتا نظر میں آج میرے خوش ادا
ایسا نہیں دیکھا ہوں دو چار

متذکرہ بالا "بازگشت" اور "چار در چار" اشعار دوسرے نسخوں میں نہیں ملتے۔ ورق ۱۰۹ ب سے "مثلث" کے اشعار ہیں ان کی تعداد ۱۰ ہے۔

دیوان ولی نسخۂ سوم

نمبر مخطوطہ ۱۵۹۹، تقطیع ۱۵×۹ سم۔ اوراق ۱۲۳ ب، سالِ کتابت ندارد۔ املا درست، کاتب محتاط۔

ابتدا: ؎　کیا یک بات میں واقف مجھے راز نہانی کا
یکھوں غنچے اُپر حرف اس دہن کی نکتہ دانی کا

خاتمہ: ؎　آج دلبر نے مج پیام کیا
شکر اللہ فلک نے کام کیا

غزلیں ورق ۱۰۶ الف پر ختم ہوتی ہیں۔ آخری غزل کا شعر ملاحظہ ہو ؎

کاں ملگ بیاں کروں تج بالاں کے کھب کی شوخی
جس کن ہے موے سوں کم واد الحب کی شوخی

ورق ۱۰۹ ب سے مستزاد، مخمس، ترجیع بند، مثلث، قصیدے، مثنویاں اور رباعیاں ہیں، اس طرح پورا دیوان ورق ۱۲۳ پر ختم ہوتا ہے۔

ورق ۱۰۷، الف میں مخمس ہے۔ اس میں ۱۵ بند ہیں۔ مطبوعہ نسخوں میں صرف ۱۰ بند ہیں۔ مخمس کا پہلا بند یہ ہے ؎

نازسوں آ تجھے ادا کی قسم　　مہرباں ہو تجھے دیا کی قسم
میں وفادار ہوں وفا کی قسم　　خیر خواہاں میں ہوں خدا کی قسم
مان اس صادق آشنا کی قسم

ورق ۱۱۰ الف سے ورق ۱۱۲ الف تک ترجیع بند ہے۔ اس میں سات بند ہیں۔ ہر بند کے آخر میں یہ شعر درج ہے ؎

شتابی خبر لے کہ بیتاب ہوں
تری ہجر میں بے خور و خواب ہوں

قلمی اور مطبوعہ نسخوں میں بڑا اختلاف ہے۔ مثال میں آخری بند پیش کیا

بجاتا ہے۔ چھٹا شعر زیادہ ہے اور غیر مطبوعہ ہے ؎

ترے مکھ پہ اے نازنین پر نقاب — جھلکتا ہے جیوں مطلعِ آفتاب
ادا فہم کے دل کی تسخیر کوں — ترا قد ہے جیوں مصرعِ انتخاب
بجا ہے ترے حُسن کی تاب سوں — تری زلف کھاتی اگر پیچ و تاب
نظر کرکے تجھ مکھ کی صافی اُپر — ہوئی شرم سوں آرسی غرقِ آب
ترے وصل میں اس قدر ہے نشاط — کہ مجھ کوں آئے ہے راحت سوں خواب
اگر بخت میرے کریں ٹک مدد — ولی اس سجن سے ملوں بے حجاب
تعلل تغافل کا اب وقت نئیں — مرا حال سُن کر اے عالی جناب

شتابی خبر لے کہ بے تاب ہوں
تری ہجر میں بے خور د خواب ہوں

انتخاب کلام ولی۔ نسخۂ چہارم

نمبر مخطوطہ ۵۰۱۲ ، اوراق ۲۰ ، جدول سُرخ ، سالِ کتابت ۱۳۰۴ھ
کاتب سید عبدالغفار۔ کرم خوردہ۔

ابتدا میں سادہ ورق کی عبارت یہ ہے:

"دیوان حضرت مولانا ولی دکھنی۔ حضرت ولی کے زمانۂ مُبارک کا ہے۔ حضرت والد صاحب قبلہ نے ولی کی اس کتاب کی تصدیق فرمائی ہے۔ یہ نسخہ نہایت صحیح ہے۔ کئی ایک کتابوں سے اس کا مقابلہ کیا ہے۔ ۲۱ ذی قعدہ ۱۳۰۴ھ الراقم سید عبدالغفار جاگیردار، شاہ نور علاقہ بیبی ضلع دربار دوار۔ خاندان امیرالامرار بلدہ دارالظفر، بیجاپور، عادل شاہی"

ابتدا کے سادہ ورق پر ایک مہر بھی ہے۔ اس میں شمس الدین لکھا ہے۔

ابتداء : ؎ کیتا ہوں تیرے ناؤں کوں میں ورد زباں کا
کیتا ہوں ترے شکر کو عنوان بیاں کا

آخری غزل کا مطلع یہ ہے ؎
نکل اے دل رُبا گھر سیں کہ وقتِ بے حجابی ہے ۔ شعر

مقطع یہ ہے ؎

ولی اس بے وفا کے قول پر کیا اعتبار آوے
ہٹیلا ہے ستم گر ہے جفا جو ہے شرابی ہے

مطبوعہ نسخوں میں مقطع یوں ہے ؎

ولی پایا رُباعی چار اُبرو کے تصور میں
تخلّص چشم گریاں کا بجا ہے گر سحابی ہے

مخطوطے میں اس غزل کے بعد دو اور اوراق جوڑ دیئے گئے ہیں۔ صفحوں کے اوپر ۹۴ اور ۹۵ ورق لکھے ہیں۔ ان میں یہ غزل ہے ؎

سرود عیش گاویں ہم اگر وہ عشق ساز آوے
بجاویں طبل شادی کے اگر وہ دلنواز آوے

اس کے بعد ردیف م کی یہ غزل ہے ؎

شراب شوق سوں سرشار ہیں ہم

اس کے بعد یہ غزل ہے ؎

اگر گلشن طرف وہ نو خطی رنگیں ادا نکلے

پھر ردیف ر کی یہ غزل ہے ؎

سجن تج گلبدن کا آج ثانی نئیں چمن بھیتر

اس کے بعد کبت پھر (؟) (کذا) لکھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ۱۱۲۱ ہجری کی تاریخ ہے۔ اس کے نیچے اُردو رسم الخط میں کچھ ہندی عبارت بھی ہے۔ آخر میں سادہ ورق خالی ہے۔ اس پر مُہر ہے اور مُہر میں یہ عبارت ہے:-

"قاضی محمد باقر۔ عنایت علی اللہ المتوکل"

اس کے بعد کے صفحے میں سید عبدالغفار شاہ نوری نے ۱۳۰۵ھ میں ولی کے حالات یوں لکھے ہیں:-

"سید عبدالغفار نے اپنے والد بزرگوار مولانا سید قاسم شاہ نوری سے پیدائش ولی ۱۰۷۹ھ (لکھی) ہے پہلے ۱۱۴۱ھ میں وہ مجلس کی۔ دیوان، دکھنی نثر وغیرہ۔ وہ مجلس و دیوان محمد ولی محمد شمس الدین المتخلص بہ ولی۔ حضرت مولانا سید محمد اسمٰعیل صاحب شیخ الحدیث مدرسہ علویہ گجرات۔ دارالظفر بیجاپور و شاہ نور کے ملاحظہ میں پیش کیا کرتے۔ محمد ولی کی اورنگ آباد میں ولادت ہوئی۔ شوق تحصیل علم نے گجرات کے مدرسہ علویہ کی طرف کھینچ دیا۔ بعد الفراغ تحصیل علم بانیٔ مدرسہ سجادہ نشین مدرسہ علوی کے عقیدت مندوں میں

داخل ہوئے۔ المرقوم ۱۳۰۵ھ۔ سید عبدالغفار شاہ نوری۔"

دیوان کی ابتدا میں جو مہر ہے اور جس میں "شمس الدین" لکھا ہے معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کون تھے۔ مخطوطے میں ولی کے ساتھ "شمس الدین" بھی لکھا ہے۔ ولی نے دیوان میں جن لوگوں کا نام لیا ہے ان میں ایک شمس الدین بھی ہے۔

ہر طرف ہے جگ میں روشن نام شمس الدین کا
چین میں ہے شور جس کے ابروئے پُر چین کا

اگر ولی اپنے نام کے ساتھ شمس الدین بھی لکھا کرتے تھے تو ہو سکتا ہے کہ مہر اُن ہی کی ہو۔ بہر حال یہ امر تحقیق طلب ہے۔

راقم الحروف کے خیال میں دیوان میں ولی کا انتخاب ہے۔ پہلی غزل یہ ہے۔

کیتا ہوں ترے ناؤکوں میں ورد زباں کا
کیتا ہوں ترے شکر کوں عنوان بیاں کا

جس گرد اُپر پانو دھریا ہیر رسولاں
اس گرد کو میں کحل دیدۂ جاں کا (کذا)

مجھ صدق طرف عدل سوں اے اہلِ حیا دیکھ
بجز علم کے چہرے میں نہیں رنگ گماں کا

ہر ذرۂ عالم میں ہے خورشید حقیقی
یوں بوجھ کے بلبل ہوں ہر اک غنچہ دہاں کا

کیا خوف ہے آفاتِ قیامت ستی اس کوں
کھایا ہے جو کوئی تیر تجھ ابرو کماں کا

جاری ہوئے آنجھو مرے تجھ سبزۂ خط دیکھ
اے خضر قدم! سیر کر اس آبِ رواں کا

کہتا ہے ولی دل ستیں یہ مصرعِ رنگیں
ہے یاد تری مجھکوں سببِ راحتِ جاں کا

مطبوعہ نسخۂ ہاشمی صاحب (۹۳-۹۴) میں دو غزلیں ہیں۔ ان میں ۱۰ شعر ہیں۔ مخطوطہ میں دونوں کا انتخاب اس طرح دیا گیا ہے۔

دیکھنا ہر صبح تجھ رخسار کا ہے مطالع مطلعِ انوار کا
آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں تشنہ لب ہوں شربتِ دیدار کا

کیا کہے تعریف دل ہے بے نظیر حرف حرف اس مخزنِ اسرار کا
عاقبت کیوں ہوئے گا معلوم نئیں دل ہوا ہے مبتلا دلدار کا
گر ہوا ہے طالبِ آزادگی بندمت ہو سبحہ و زنّار کا
مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

اے ولی ہونا سری جن پر نثار
مدعا چشمِ گوہر بار کا

آصفیہ میں مخطوطہ دیوانِ ولی کے دو اور نسخے ہیں۔ دونوں بے ترتیب اور ناقص ہیں۔ اگر ان سبھی نسخوں کا موازنہ مطبوعہ نسخے کے ساتھ کیا جائے تو متعدد اشعار غیر مطبوعہ نکلیں گے۔

مخطوطات کی فراہمی کے لئے جناب رفعت رضوانہ ریسرچ آفیسر کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد شکریہ کی مستحق ہیں۔

□□

حواشی:

۱ کلیات میں ہر جگہ تجھ کے بدلے "تج"۔ مکھ کے بدلے "مکو" اور دیکھ کے بدلے "دیک" کے الفاظ درج ہوئے ہیں۔ یہ قدیم املا ہے۔ اکثر دواوین میں یہی املا ہے۔ (اکبر حیدری)

۲ مطبوعہ نسخوں میں اختلاف ہے۔ نسخہ ہاشمی میں مصرعہ یوں ہے:
حق ستیں حق کوں حق نما پایا

۳ یہ مصرعہ نسخۂ ہاشمی میں نہیں ہے۔ مطبوعہ غزل کی ترتیب غلط ہے۔ مطبوعہ کا پانچواں شعر مخطوطے میں نہیں ہے۔
حفظ کرنے کوں مصطفٰے مدکوں فیہ خیراً و حافظ پایا

۴ مطبوعہ: ترکش ۵ مطبوعہ: دو قیامت قامت و رشکِ پری

۶ مطبوعہ نسخہ: خونِ عاشق بر ملا ہے الغیاث

۷ ڈاکٹر ہاشمی صاحب نے مطبوعہ کلیاتِ ولی میں دو ضمیمے (الف و ب) شامل کیے ہیں۔ ضمیمہ الف (ص ۳۱۱) میں لکھتے ہیں:

"ذیل کی غزلیں کلیات ولی (طبع سوم انجمن ترقی اردو کراچی) کے متن میں شامل تھیں، لیکن ان کی تصدیق محمد شاہی دور کے معتبر نسخوں سے ابھی تک نہیں ہو سکی۔ اس لیے ضمیمے میں دی جا رہی ہے۔ اگر تصدیق ہو گئی تو متن میں شامل کی جا سکتی ہیں۔"

(باقی ص ۴۴ پر)

زمین کا ظلم

فلک کے جور و ستم کی شکایتیں ہیں بہت
زمیں کے ظلم پہ جاں نہیں نظر زنہار
فلک نے حضرت آدم کو دہر میں بھیجا
زمیں کی وجہ سے ان کو ملا عذابِ فشار
فلک تو جسم کو دیتا ہے روح کی دولت
زمیں گلا کے اسے خاک میں ملاتی ہے
جنھیں گلہ ہے فلک سے وہ اس پہ غور کریں
کہ آدمی پہ زمیں ظلم کیسے ڈھاتی ہے

بے فیضیٔ بہار

موسم ہے جواں کیف میں ڈوبی ہیں فضائیں
رعنائی و زیبائی کے حامل ہیں نظارے
دے پائیں گے مجھ کو نہ مگر لذت و مستی
فطرت کے یہ رنگین و فسوں ساز اشارے
شاعر ہوں میں، لیکن غمِ دوراں کا ہوں مارا
یوں میرے لیے ہوتی ہیں بے لطف بہاریں
جیسے کسی جلتے ہوئے گھر کے لیے اے دوست
بے کار ہوا کرتی ہیں ساون کی پھواریں

ڈاکٹر اختر بستوی
شعبۂ اردو، گورکھپور یونیورسٹی
گورکھپور (یوپی)
۲۷۳۰۰۹

خاموشی

کہاں ہیں موسم وہ خوشبوؤں کے
رفاقتوں کے صداقتوں کے
کہاں گئے خوش نما جزیرے وہ اُلفتوں کے
جہاں پہ کچھ مختلف پرندے
الگ الگ تھیں زبانیں جن کی
سنا رہے تھے بس ایک نغمہ
محبتوں کا.....
چھلکتی شاخیں ثمر بکف وہ درخت سارے
وہ لالہ و گل کہ جن کی سرخی
شفق پہ جلوہ نما ہے اب بھی
زمیں کے ماتھے پہ بوسہ لیتی
سنہری شاخیں
لرزتی کلیوں پہ امن کی داستاں سجی تھی
کہاں ہیں اب وہ .... ؟

ہر اک گلی میں،
ہر اک ڈگر پر
حکومت ہے اب خاموشی کی
ہے آج حرف و نوا پہ کیسا سکوت طاری
بلند و بالا عمارتوں کے مہیب سائے
سروں کو اپنے اٹھائے کرتے ہیں جیسے شکوہ
مرے الٰہی یہ شہر گریہ ....
یہ خوں کے چھینٹے،
اداس شامیں،
سلگتی آنکھیں ____
ہر اک شجر پر گناہ کے پھل لدے ہوئے ہیں
چمن کی ہر رہ روش پہ شعلے بھڑک رہے ہیں
وہی پرندے،
جو راگ الفت کے گا رہے تھے
اب ان میں آپس میں رنجشوں کے معاملے ہیں
یہ کون ہیں ......؟
نفرتوں کی فصلیں اُگانے والے
جو آج اس کو بھی ایک موسم کا نام دے کر
خدائی میں بھی مداخلت کر رہے ہیں تیری
تو چپ ہے ....
کب تک تو چپ رہے گا
تری خموشی سے حوصلے ان کے بڑھ رہے ہیں
یہ بن چکے ہیں فرعون اس صدی کے

□□

ملکہ نسیم
پوسٹ بکس ۴۳
جے پور (راجستھان)

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
مارواڑی کالج، بھاگلپور (بہار)

ساختیات، پسِ ساختیات اور مشرقی شعریات

پروفیسر گوپی چند نارنگ ماہر لسانیات اور ادبی تنقید کے خیال افروز ناقد ہیں۔ ساختیاتی فکر کی گہری بصیرت سے انھوں نے ادبی تنقید کے نئے دبستان کو اُردو میں باضابطہ طور پر روشناس کرایا ہے، ساختیات و پس ساختیات اور ردِ تشکیل کے ساتھ ہی مشرقی شعریات کو اپنی گرفت میں لے کر نئی ادبی توقعات سے اردو ادب کو مالامال کیا ہے، کردار و نظریات کی نئی شناخت قائم کی ہے اور فکر و معنی کے نئے افق روشن کیے ہیں۔

ان کی نئی کتاب "ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات" دراصل تین کتابوں کا مجموعہ ہے۔ پہلی کتاب "ساختیات" ہے جس میں پانچ ابواب ہیں۔ پہلے باب میں "ساختیات اور ادب: ابتدائی باتیں"۔ عام ادبی نظریات کو چیلنج، ساختیات بطور ذہنی تحریک، ساختیات بطور اصطلاح، لسانیاتی فکر سے رشتہ، تنقیدی دبستان اور ساختیات اور پس ساختیاتی فکر ——— دوسرے باب میں ساختیات کی لسانی بنیادیں کے تحت سوسیئر، رومن جیکب سن، نوام چومسکی اور دیگر مفکرین، زبان، سماج اور آئیڈیالوجی میں رشتہ، اور زبان ہی حقیقت کو نظم عطا کرتی ہے ——— تیسرے باب میں روسی ہیئت پسندی شعری زبان، اجنبیات کا عمل، پلاٹ اور کہانی کا فرق، آزاد اور پابند خیال، مادی محرکات، باختن اسکول اور جمالیاتی تفاعل ——— چوتھے باب میں فکشن کی شعریات اور ساختیات، ولادیمیر پروپ اور لیوی سٹراس، نارتھروپ فرائی، گریما، تودوروف، زینت ——— پانچویں باب میں شعریات اور ساختیات، رومن جیکب سن، لیوی سٹراس، جونتھن کلر اور پس ساختیات کی جانب، جیسی سرخیوں کے تحت گوپی چند نارنگ نے ذہنِ انسانی کی کارکردگی، ادبی متن، معنی کی نوعیت قاری کا کردار، قرأت کا عمل اور ادراکِ حقیقت کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے اور ساختیات کے مروجہ نظریات کے بنیادی نئے سوال سے بحث کی ہے اور ساختیات و پس ساختیات کے بنیادگزاروں پر روشنی ڈالی ہے۔ ساختیات فن پاروں کی انفرادی خصوصیات کو ثانوی حیثیت دیتی ہے۔ اس کی جستجو کا اصل مقصود وہ نظام ہے جس کی رو سے فن پارہ خلق ہوا ہے۔ ساختیات کا اصل دعویٰ ادبی سرگرمی کے اس نظام کو دریافت کرنے کی سعی کرنا ہے جس کی رو سے ادب بطور ادب پڑھا جاتا ہے۔ رومانیت کی رو سے مصنف کی شخصیت فن پارے پر مقدم ہے۔ اس کے برعکس ساختیات کی رو سے ادبی اظہار (Writing) سے پہلے ادبی لانگ کا نظام ہے۔ چنانچہ اس اعتبار سے ہر ادبی اظہار (متن) پہلے سے موجود نظام کی رو سے تشکیل پاتا ہے۔ گوپی چند نارنگ نے پہلی کتاب میں ساختیات کے اس حصے سے سروکار رکھا ہے جس کو بالعموم 'کلاسیکی ساختیات' کہا جاتا ہے۔ اس طرزِ فکر کے موئید یقین رکھتے ہیں کہ خاص طرح کے لسانی رشتے اور اصول تمام لسانی مظاہر کی تہہ میں کارفرما رہتے ہیں اور انفرادی اظہارات ان داخلی ساختوں سے اسی طرح نمو پذیر ہوتے ہیں جس طرح زمین کا منظر نامہ زیرِ زمین ارضیاتی پرتوں اور ان کے خصائص سے نمو پاتا ہے ساخت ایک مرکز، ایک ماخذ یا منبع کی طرح ہے۔ اس پہلی کتاب کے بارے میں گوپی چند نارنگ خود لکھتے ہیں:

> "پہلی کتاب تمام و کمال کلاسیکی ساختیات
> کے لیے وقف ہے جس میں ابتدائی تعارف کے بعد
> ساختیات کی لسانیاتی بنیادوں، روسی ہیئت پسندی
> اور فکشن کی شعریات اور شعریات سے متعلق تمام بنیادی

مباحث کو سمیٹ لیا گیا ہے. قارئین سے گزارش ہے کہ آگے بڑھنے سے پہلے ان ابواب کا بغور مطالعہ فرمالیں بالخصوص لسانیاتی بنیادوں والے باب کا جس میں سوسیئر کے کلیدی خیالات کی بحث ہے. یہ مطالب اگر ذہن نشین نہ ہوں گے تو کتاب دو اور کتاب تین کے مباحث کی تفہیم پر گرفت نہ رہ سکے گی"

(دیباچہ ص۱۵)

ساختیات اور پس ساختیات میں رشتہ تقدم یا تاخیر ہی کا نہیں بلکہ ساختیات ہی کے بعض مقدمات سے پس ساختیات میں گریز کیا گیا ہے یا ان کی اس حد تک تقلیب کی گئی ہے کہ ترجیحات بدل گئی ہیں.

گوپی چند نارنگ کی دوسری کتاب "پس ساختیات" ہے. اس کتاب میں چھ ابواب ہیں. پہلے باب میں رومن بارتھ: پس ساختیات کا پیش رو. ابتدائی دور، دوسرا دور —— دوسرے باب میں پس ساختیات لاکاں، فوکو اور کرسٹیوا — تیسرے باب میں ژاک دریدا اور ردتشکیل[1] —— چوتھے باب میں ردتشکیل (۲)، دریدا بہ سوسیئر، نظریۂ افتراق کی وضاحت، دریدا اور فلسفے کی قدیم روایت، طریق مطالعہ، ردتشکیل اور امریکی تنقید، اعتراضات —— پانچویں باب میں مارکسیت، ساختیات اور پس ساختیات، لوسی ین گولڈمن، پیئر ماشیرے، لوئی آلتھیوسے، ٹیری ایگلٹن، فریڈرک جیمسن —— اور چھٹے باب میں قاری اساس تنقید، حالی کی تعریف، ترسیل ماڈل میں قاری کی حیثیت بطور مخاطب، رچرڈز اور نارتھروپ فرائی قاری اساس تنقید کے پیش رو، علم تفہیم، فریڈرخ سلائرماخر، ولہلم ڈلتھے، ہائیڈیگر، تفہیمیت اور مظہریت، ہانس گیورگ گدامر، مظہریت، ایڈمنڈ ہوسرل اور مظہریت، مظہریاتی تنقید، ولف گانگ ایزر اور نظریۂ قبولیت، ہانس روبرٹ یاؤس، جنیوا اسکول اور ژورژ پولے، اینگلو سیکسن قاری اساس تنقید، اسٹینلے فش، مائیکل رفاٹیر، جوناتھن کلر اور قاری اساس تنقید اور نفسیات جیسی سرخیوں کے تحت گوپی چند نارنگ نے تازگی فکر کی نئی راہ کھولی ہے.

ساختیات کے جو منطقی نتائج ہو سکتے تھے، پس ساختیات ان کو بروئے کار لاتی ہے اور ساختیات نے جو سائنسی معروضی توقعات پیدا کی تھیں، پس ساختیات ان کو رد کرتی ہے. انسانی نظام نشانات کے راز پر قدرت پانے کا جو عزم ساختیات نے کیا تھا، وہ انتہائی حوصلہ مندانہ تھا، لیکن پس ساختیات ایسے دعووں کی حوصلہ شکنی کرتی ہے. اس طرح ساختیات پر پس ساختیات کے اعتراضات اصلاً خود احتسابی اور خود تنقیدی رویوں کی دین ہیں کیونکہ پس ساختیات کے ماہرین دراصل ساختیات ہی کے ماہرین ہیں جن کو ساختیات کی معذوریوں کا احساس ہے اور وہ سختی سے اپنا محاسبہ کرتے ہیں. گوپی چند نارنگ کی وضاحت کے مطابق معنی کا مرکز چوں کہ رشتوں کا نظام ہے نہ کہ انسان کا ذہن یا ما ورائے انسان کوئی چیز، اس لیے معنی بے مرکز ہے اور جب معنی بے مرکز ہے تو موضوعیت قائم ہی نہیں ہو سکتی. پس ساختیات کی وہ شاخ جو ردتشکیل کہلاتی ہے گویا قرأت کا ایسا طریقہ کار ہے جو سامنے کے مروّجہ یا متعینہ معنی کو رد کرتا ہے اور اس معنی کو بروئے کار لاتا ہے جو دبا ہوا ہے یا پس پشت ڈال دیا گیا ہے یا جسے جبر اور استحصال کی قوتوں نے اقتدار کے کھیل میں عمداً نظر انداز کر دیا. اس باغیانہ نقطۂ نظر کا ادبی تنقید پر بالخصوص اثر پڑا ہے کیونکہ رومانی نقطۂ نظر جو مصنف کی ذات پر زور دیتا تھا اسے نئی تنقید نے رد کر دیا تھا یہ کہہ کر کہ فن پارہ خود مکتفی ہے.

ساختیات اور مظہریت کی رو سے قاری یا نقاد متن کو 'موجود' بناتا ہے. متن میں معنی بالقوہ موجود ہے قاری اس کو برآمد کرتا ہے. سو فن پارہ نہ خود مختار ہے نہ خود کفیل کیونکہ قرأت کا عمل خلا میں نہیں ہوتا. یوں دیکھا جائے تو پس ساختیاتی فکر نہ صرف قرأت کے عمل اور قاری کی واپسی پر زور دیتی ہے بلکہ ادب کے مسائل کو سماج اور تاریخ کے اندر بھی لے آتی ہے، لیکن تاریخ کا ردتشکیلی تصور بھی کوئی سادہ فکری تصور نہیں ہے. گوپی چند نارنگ نے ساختیاتی اور پس ساختیاتی اصولوں اور تحلیلی و آزاد تنقید کی وضاحت تفصیل سے کی ہے. ان کا کہنا ہے کہ باشعور موضوعیت یا موضوع انسانی کی مرکزیت یا عدم مرکزیت سب مسئلوں کی جڑ ہے. پس ساختیات اور مابعد جدیدیت کا سب سے بڑا کرائسس یہی ہے کہ ہیومن سبجکٹ کی صدیوں سے چلی آ رہی کارٹیسیائی بنیاد متزلزل ہو گئی ہے. معنی وجدانی نہیں ہے، یہ جتنا سامنے ہے اتنا غیب میں بھی ہے. جتنا ہے اتنا نہیں بھی ہے. گویا ہومن

سیمینٹکس کے بے مرکز ہونے سے معنی کی طرفیں کھل گئی ہیں یا تکثیر معنی کی راہ کھل گئی ہے۔ یہ فقط فی الوقت مختلف تشریحات کا عمل نہیں ہے بلکہ معنی سیال ہے اور مستقبل میں سفر کرتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ معنی قاری در قاری، نسل در نسل، عہد در عہد اور زمانہ درزمانہ سفر کرتا ہے۔ یہ تاریخ اور تہذیب کی پیچیدہ قوتوں کے Net work کا نتیجہ ہے اور اس کی قطعیت کی گارنٹی نہیں دی جاسکتی۔

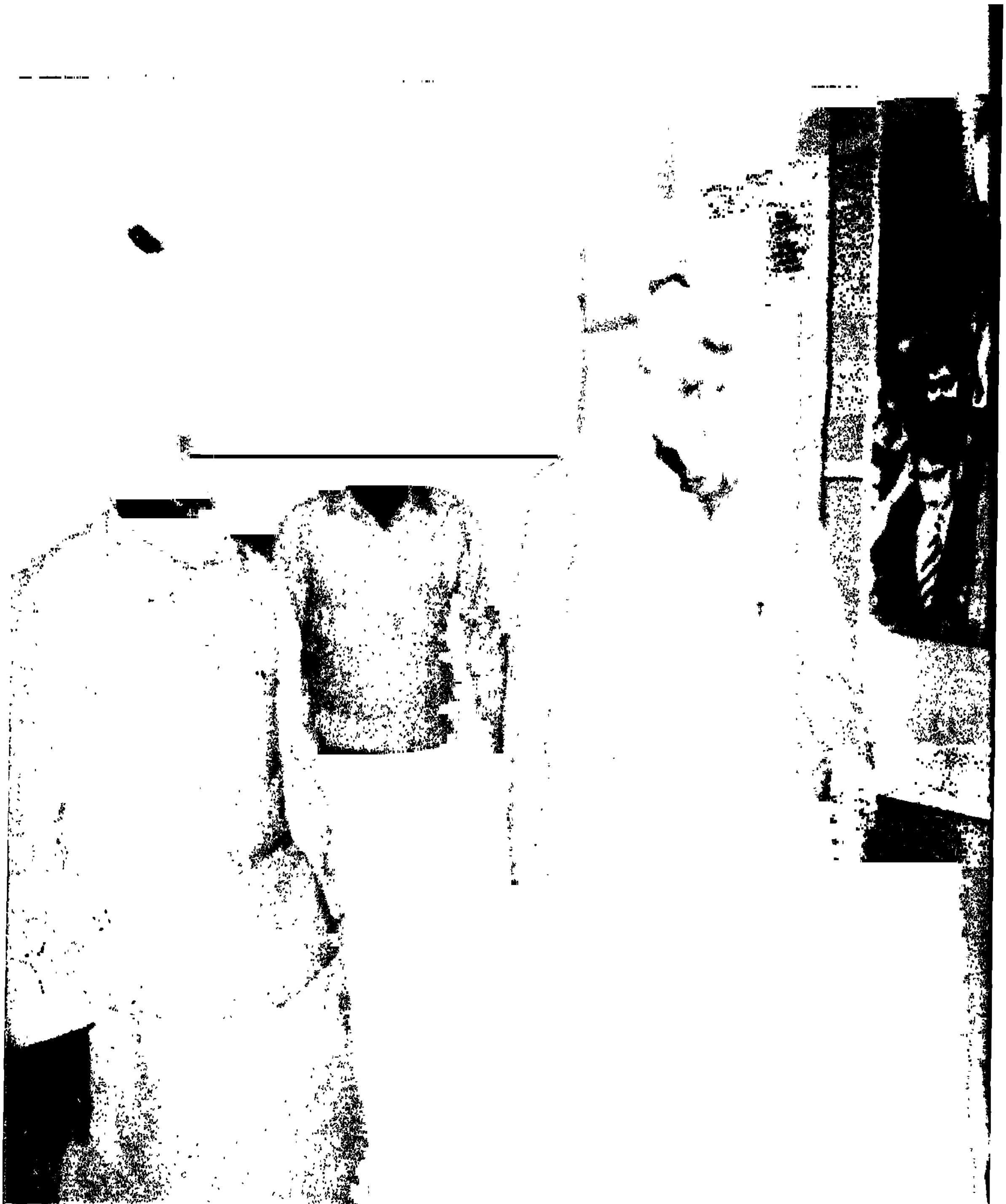
گوپی چند نارنگ نے ادب میں بدلتے ہوئے نظریات کو جس فراخدلی سے قبول کیا ہے اور ساختیات، پس ساختیات اور ردتشکیل کو جس فکر وخیال اور تشریح وتوضیح سے برتا ہے اور رہنما اصولوں پر جس تفصیل سے خامہ فرسائی کی ہے یہ انھیں کا حصّہ ہے۔ انھوں نے سنجیدہ گفتاری سے کام لیا ہے۔ انفرادیت وافادیت کو بحال رکھا ہے اور معقولیت، توازن اور علمی وقار کو برقرار رکھا ہے۔ انھوں نے ادبی اقدار کی معنویت تک رسائی حاصل کرنے کے لئے جس ذہنی تجسس اور ادبی خلوص کو راہ دی ہے اس نے جامد اقدار میں ہلچل پیدا کردی ہے اور طریقہ کار کو برتنے میں ایک الگ راہ نکالی ہے، فکر وخیال کی گزرگاہوں کو روشن کیا ہے اور نئے افق میں نئی وسعت پیدا کی ہے۔ اس دوسری کتاب کے بارے میں نارنگ صاحب رقمطراز ہیں:

> "کتاب دوکلاسیکی ساختیات سے گریز یعنی پس ساختیاتی فکر کے لئے وقف ہے، ادبی نقاد ہونے کے سبب پہلے بار تفصیل سے بحث کی گئی ہے حالانکہ فکر وفلسفہ کے اعتبار سے فوقیت لاکاں، فوکو اور دریدا کو حاصل ہے۔ دوسرا باب لاکاں اور فوکو کے ذکر میں ہے، اور دریدا کے لئے تیسرا اور چوتھا باب وقف کیا گیا ہے۔ ردتشکیل کے جو مباحث تیسرے باب میں تشنہ رہ گئے تھے چوتھے باب میں ان کی مزید وضاحت کردی گئی ہے۔ ردتشکیل کی مزید بحث اختتامیہ میں ٹیری ایگلٹن اور دریدا کے تحت دیکھی جاسکتی ہے۔ آلتھیوسے اور بایئں بازو کی ساختیاتی فکر مارکسیت والے باب میں زیر بحث آئی ہے۔ کتاب کا آخری باب۔ قاری اساس تنقید پر ہے، یہ حصّہ مظہریت اور تفہیمیت کے مباحث کو سمیٹے ہوئے ہے کیوں کہ قرأت کے تفاعل اور قاری کی اہمیت کو تسلیم کرانے میں ان فلسفوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔"

(دیباچہ ص ۱۴-۱۵)

تیسری کتاب "مشرقی شعریات اور ساختیاتی فکر" بھی پہلی دو کتابوں کی طرح بنیادی نوعیت کی ہے بلکہ پوری کتاب کی جان ہے۔ اس کے پہلے باب میں سنسکرت شعریات اور ساختیاتی فکر، سنسکرت روایت، شبد اور ارتھ: نظریہ ابھدھا، بودھی نظریہ اپوہ، شونیہ، نظریہ سپھوٹ نظریہ دھونی، دھونی اور معنی کا دوسراپن، دھونی اور مہا بھوگ، نظریۂ رس اور قاری کا تصور، ختم کلام وغیرہ۔

دوسرے باب میں عربی فارسی شعریات اور ساختیاتی فکر، عربی روایت فارسی روایت، تصور لسان، ثنویت لفظ ومعنی وافضلیت لفظ، علم معانی اور بلاغت وبیان، زبان بطور مجاز وکذب، مسئلہ قصر وبحث ظاہریہ وحدت مضمون دربیان مختلف، کیا فصاحت وبلاغت بے تفاعل قاری ہے؟، مناسبت در تصور روایت وتصور لانگ وغیرہ جیسی سرخیوں کے تحت مباحث ہیں۔ گوپی چند نارنگ کا کہنا ہے کہ ہندستانی فکر وفلسفے میں زبان کی نوعیت وماہیت اور معنی کے مسئلے پر توجہ کی روایت نہایت قدیم ہے۔ ان میں میمانسا، نیایے، ویشیشک، بودھ اور جین فکری روایتیں بالخصوص شریک رہی ہیں۔ قدیم ہندستانی فکر میں فلسفے کے چھ دبستان خاص ہیں، ان میں فلسفۂ لسان پر کسی نہ کسی زاویے سے ضرور غور کیا گیا ہے۔ ان میں بعض متن نہایت پرانے ہیں اور ان کا زمانہ ویدوں کے فوراً بعد کا ہے۔ بعض متن دستبرد زمانہ سے محفوظ نہیں رہے، لیکن بعد کے لکھنے والوں کے یہاں ان کا ذکر ملتا ہے، اور ان کے اٹھائے ہوئے مسائل کی گونج ملتی ہے۔ سنسکرت میں یہ روایت رہی ہے کہ بعد میں آنے والے اچاریوں نے پہلے کے بنیادی متون کی شرحیں لکھیں اور مسائل کو صاف کیا۔ ان میں سے بعض شرحیں بجائے خود اس قدر اہم ہیں کہ ان کی نوعیت بنیادی متن کی ہوگئی ہے۔ فلسفیوں اور منطقیوں کے علاوہ ویاکرن (گرامر) النکار شاستر (بدیعیات) اور کاویہ شاستر (شعریات) کے ماہرین نے بھی شعری زبان اور معنی کے مسائل پر غور کیا ہے۔ لفظ ومعنی کے رشتے

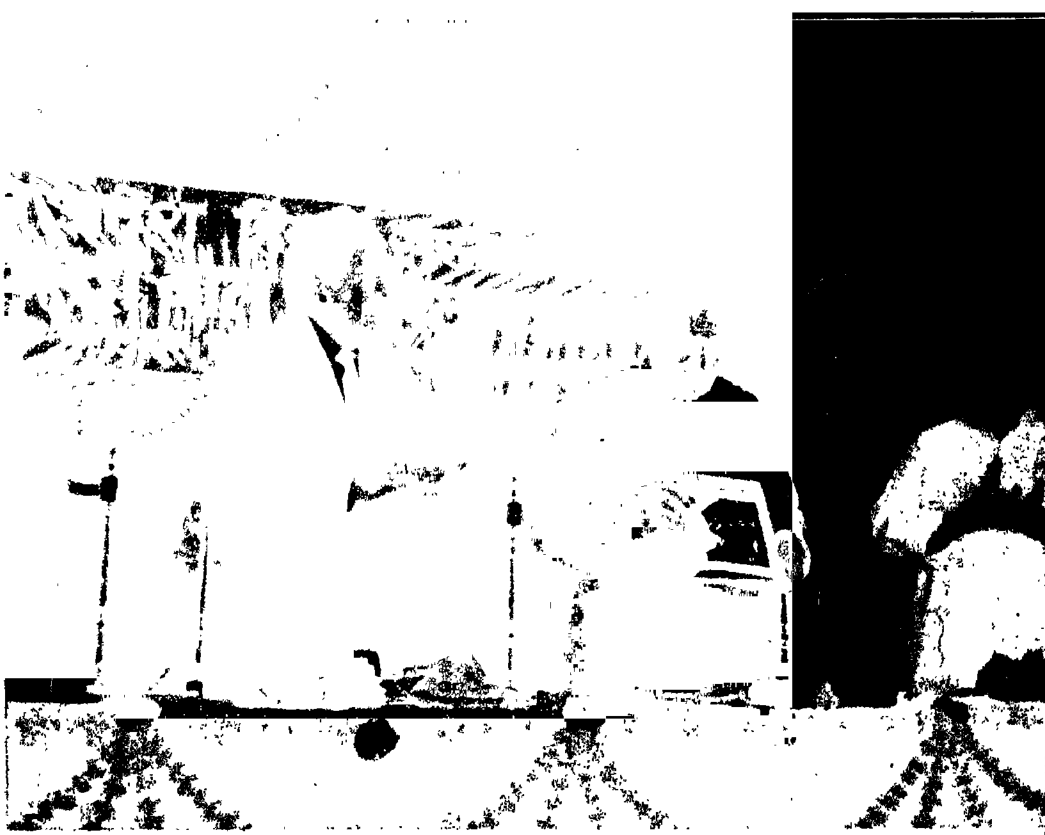


گورنر اترپردیش شری موتی لال ووَرا ۱۴؍نومبر ۱۹۹۵ء کو
قیصرباغ میں محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامّہ کی
جانب سے منعقدہ "بال میلہ" کی نمائش دیکھتے ہوئے۔



گورنر شری
وتی لال ورا
ار نومبر کو
صرباغ
ارہ دری کے
میدان میں
منعقدہ "بال میلہ"
مائش کے وقت
وام کے درمیان

گورنر اتر پر
شری موتی لال
اتر پردیش ہندی
لکھنؤ میں،
ھندی کے الم
قلم کا یک
میں پر
پر لکھ گئی
کتاب کے ا
کی رسم ا
کرتے ہو





گورنر شری موتی لال وورا ۱۴ر نومبر کو راج بھون میں پنڈت نہرو کی تصویر کے سامنے شمع روشن کرتے ہوئے۔



گورنر اترپردیش شری موتی لال وورا ۱۴ر نومبر ۱۹۹۵ء کو اترپردیش ہندی سنستھان میں "اترپردیش میں نہرو" نامی کتاب کی رسم اجراء انجام دیتے ہوئے



پردیش
ی سنستھان
نؤمیں
قلم کاروں کو
یفی اسناد
انعامات
یم کرتے ہوئے
رنر اتر پردیش
موتی لال وورا



گورنر اتر پردیش
شری موتی لال
ایشیائی کھیل
کی مقدس مشعل
جمن لال
کو
سونپتے ہوئے

اور معنی کے مسائل کے بارے میں جو کچھ قدیم ہندستانی فلسفیوں نے لکھا ہے اس کے بارے میں معلومات عام نہیں ہیں۔ گوپی چند نارنگ نے تفصیلی اور تحقیقی مباحث کے ذریعہ ثابت کیا ہے کہ ہندستانی فلسفیوں کے خیالات اس قدر فکر انگیز اور اس درجہ بنیادی ہیں کہ عہد حاضر کی فکری پیش رفت کے اعتبار سے ان کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔

پروفیسر نارنگ نے اس تیسری کتاب کو اسی مقصد سے لکھا ہے کہ سوسیئر کے فلسفۂ لسان، پس ساختیات اور رد تشکیل کے فلسفۂ معنی کے تناظر میں ہندستانی روایت میں کیا کیا بحثیں اٹھائی گئی ہیں اور ہندستانی ذہن کا موقف کیا رہا ہے۔ گوپی چند نارنگ رقمطراز ہیں:

> "جب ہم نے ہندستانی فکری روایت اور شعریات کا جائزہ لیا تو بعض حیران کن نتائج سامنے آئے۔ یعنی مغرب میں جو نکات اب ساختیاتی اور ردتشکیلی فکر کے ذریعے سامنے آرہے ہیں ان سے ملتے جلتے نکات ہندستانی فکر و فلسفے بالخصوص بودھ فلسفے میں صدیوں پہلے زیر غور رہے ہیں۔" (ص ۳۲۸)

اسی طرح گوپی چند نارنگ نے عربی، فارسی اور اردو شعریات اور اس کے خاص خاص نکات پر طویل بحث کی ہے اور یہ دکھایا ہے کہ بنیادی فرق اور مقامات اتصال کیا کیا ہیں یا یہ کہ مشرق میں لسان و لغت اور بلاغت و بیان پر غور و فکر کی روایت کتنی قدیم اور کتنی بسیار رہی ہے، اور اس بارے میں کیا کیا باریکیاں پیدا کی گئی ہیں۔ کتنے نکات ایسے ہیں جو جدید فلسفۂ لسان یا ساختیات کے پیش رو معلوم ہوتے ہیں۔ گوپی چند نارنگ نے اس کتاب کے ذریعہ روایت کی بازیافت اور شعریات کی نئی آگہی کی تشکیل میں مدد پہنچائی ہے۔ اس تیسری کتاب کے بارے میں نارنگ صاحب لکھتے ہیں:-

> "تیسری کتاب مشرقی شعریات اور ساختیاتی فکر کے بارے میں ہے۔ اس میں مشرقی شعریات کی صدیوں کی روایت کا اس لحاظ سے از سر نو جائزہ لیا گیا ہے کہ دو مختلف النوع روایتوں میں کیا کیا ملتے جلتے نکات یا مقامات اشتراک ہیں جن کی بنا پر مکالمہ کیا جا سکے اور افہام و تفہیم میں سہولت ہو۔ اس کے دو حصے ہیں، پہلے حصے میں سنسکرت روایت سے بحث کی گئی ہے اور دوسرے میں عربی، فارسی روایت سے جو براہ راست اردو روایت کا حصہ ہے۔ اس بحث کی نوعیت ایک آزاد مکالمے کی ہے یعنی غور و فکر کی کھلی دعوت کی، تاکہ یہ دیکھا اور دکھایا جا سکے کہ بنیادی فرق کے باوجود مقامات اتصال اور مماثلتیں کہاں کہاں ہیں۔ اس مطالعے سے یہ دل چسپ حقیقت بھی سامنے آئی کہ سوسیئر سنسکرت میں استعداد علمی رکھتا تھا اور قرینہ غالب ہے کہ اس نے سنسکرت، فلسفہ لسان اور بودھی فکر سے استفادہ کیا ہو۔ سوسیئر اور دریدا کی فکر اور نیا یے اور بودھی نظریہ اپوہ اور شونیہ میں حیرت انگیز مماثلت اور مطابقت ملتی ہے۔ اس مطالعے سے یہ توقع بھی پیدا ہوتی ہے کہ مشرقی شعریات کے وہ تصورات و نکات جو اپنی سرزمین میں بھولی بسری یاد بن گئے، ممکن ہے کہ نئی تھیوری سے فکری مشابہتوں کے باعث از سر نو دل چسپی کا مرکز بن جائیں اور نئی ادبی توقعات کے افق پر نئی معنویت کے حامل نظر آنے لگیں۔ یہی کیفیت عربی فارسی روایت میں بھی ملتی ہے۔ کتنے نکات ایسے ہیں جو جدید فلسفۂ لسان یا ساختیات کے پیش رو معلوم ہوتے ہیں۔ پہلے ہی ان کی منطقی تحلیل اس درجہ نہ کی گئی ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم ان سے غافل رہے ہیں۔ ہم بھول جاتے ہیں کہ عبدالقاہر جرجانی یا ابن حزم تک بھی ہم نے فلسفیوں کی وساطت سے پہنچے ہیں ورنہ مشرقی کتابیں تو بالعموم ان کے ذکر سے خالی ہیں بہرحال روایت کو چوں کہ ہم نئی معنویت کی نظر سے دیکھ رہے ہیں، ہمیں از سر نو پرانی بصیرتوں کا سراغ مل رہا ہے۔ لہٰذا ابواب میں گویا حقائق کی تشکیل نو کی کوشش بھی کی گئی ہے اور روایت کی بازیافت کی بھی۔ الگ الگ

نوعیت کی روایتوں میں یہ دو طرفہ عمل اس لیے بھی ضروری تھا کہ نئی آگہی کی تشکیل میں تو اس سے مدد ملے گی ہی، لیکن چوں کہ یہ جدلیاتی عمل ہے، نئی تھیوری کے ان عناصر کی افہام و تفہیم میں بھی اس سے مدد ملے گی جو مشکل ہیں یا اجنبی ہیں۔" (صفحہ ۱۷-۱۶)

کتاب "ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات" میں مندرجہ بالا تین کتابوں کے ساتھ ایک اور کتاب "اختتامیہ" ہے۔ ۷۰ صفحات کے اس اختتامیہ میں گوپی چند نارنگ نے صورت حال اور امکانات پر توجہ دی ہے اور درج ذیل سرخیوں کے تحت نئے مباحث کی تعمیر و تشکیل کی ہے۔

تھیوری پر اتنی توجہ کیوں، موضوع انسانی متھ کے سائے میں، پس ساختیات: پیش منظر، مابعد جدیدیت، کیا اور کیوں، بر قیاتی ذہن: علم کا نیا طور، علم بطور پیدا واری طاقت، سائنسی علم اور بیانیہ، روشن خیالی پروجیکٹ، خواب اور شکست خواب، مہا بیانیہ کی گم شدگی اور اجتماعی لاشعور، خواہش کا وفور اور نطشے کا اثر، تخلیقیت کا جشن جاریہ، دریدا اور مارکسیت، ٹیری ایگلٹن اور ردتشکیل، تنقید کے نئے ماڈل کی جانب، مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر، اردو تنقید کی موجودہ صورت حال اور نئے ماڈل کی جانب!

گوپی چند نارنگ نے اس حقیقت پر روشنی ڈالی ہے کہ اس وقت ادب کی دنیا میں سب سے زیادہ توجہ تھیوری یعنی نظریہ سازی پر ہے۔ اس کی وجہ سے علوم انسانیہ اور ادبیات کو ایک نئے چیلنج کا سامنا ہے۔ ساختیات و پس ساختیات یا مظہریت یا ردتشکیل کے حوالے سے یا شعریات کے حوالے سے جتنے بھی مسائل ہیں سب تھیوری کے ہی ہیں۔ تھیوری درحقیقت موجودہ کرائسس سے نپٹنے کے لئے انسانی آگہی کی ایک کوشش ہے۔ یہ کرائسس جو علوم انسانیہ کا مرکزی مسئلہ ہے ۱۹۶۰ء کے بعد شدت سے پیدا ہوا اور تھیوری کی یورش بھی کم و بیش اسی زمانے سے شروع ہوئی۔ اس کرائسس کی نوعیت کیا ہے اور موضوع انسانی یا اس پر مبنی ہیومنزم کی 'مقدس' روایت کس طرح ایک متھ کے سائے میں آگئی اور خود ہمارے لیے اس کا چیلنج کیا ہے۔ تھیوری کا اصل مسئلہ یہی ہے جن پر گوپی چند نارنگ نے تفصیلی نظر ڈالی ہے۔

پس ساختیات کا پیش منظر بیان کرتے ہوئے گوپی چند نارنگ نے کشادہ نظری اور کشادہ ذہنی کا ثبوت دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ موضوع انسانی کی بے دخلی کے علاوہ متن کی خود مختاری اور معروضیت کے طلسم کا ٹوٹنا، معنی کا وحدانی نہ ہونا، معنی کے تفاعل میں قاری کا در آنا نیز متن کا آئیڈیالوجیکل تشکیل ہونا، یہ پس ساختیات کے خاص مسائل ہیں جنھوں نے تھیوری کی سطح پر ادبی فکر کو نئی سمت و رفتار دی ہے۔ ساختیات سے پس ساختیات کی تھیوری بہت سوں کے لیے واضح نہیں ہے۔ ۱۹۷۰ء کے لگ بھگ جن فلسفیوں کی تحریروں سے پس ساختیات کا آغاز ہوا، ان میں سے زیادہ تر فرانسیسی تھے۔ لیکن فرانس میں اسے پس ساختیات نہیں کہا گیا۔ یہ نام باہر والوں کا دیا ہوا ہے اور شروع میں اس کے حدود بہت واضح نہیں تھے۔ ایسا نہ ہوتا تو دس بارہ برس پہلے جوناتھن کلر کو یہ کہنے کی ضرورت پیش نہ آتی کہ ساختیات، پس ساختیات کی حد امتیاز خاصی مبہم ہے۔ لیکن یہ صورت حال اب بدل چکی ہے اور نہ صرف انحراف مکمل ہو چکا ہے۔ اس بارے میں اس امر کو نظر میں رکھنا بہت ضروری ہے کہ سابقہ post 'مابعد' کے معنی میں تو ہے ہی، اس میں 'مبنی بر' یا 'منحصر' کا مفہوم بھی شامل ہے۔ یعنی بنیاد وہی ہے لیکن ساختیات کی فکری پروجیکٹ میں جو کوتاہیاں تھیں، پس ساختیات میں نہ صرف انھیں نشان زد کر کے ان سے انحراف کیا گیا بلکہ دوسرا موقف اختیار کیا گیا اور نتیجتاً بہت سی ترجیحات بدل گئیں۔ مزید یہ کہ پس ساختیات کا اثر پہلے امریکہ میں ہوا اور بعد میں برطانیہ میں، لیکن برطانیہ میں جو اثر مرتب ہوا وہ نوعیت کے اعتبار سے بہت مختلف ہے۔ امریکہ میں پس ساختیات کو ان لوگوں نے گلے لگایا جو امریکی نیو کریٹسزم (نئی تنقید) کی معروضیت سے نجات کی راہ ڈھونڈھ رہے تھے جبکہ برطانیہ میں پس ساختیاتی فکر کو ریڈیکل اور سیاسی قوت کے طور پر دیکھا گیا۔

اس اختتامیہ میں گوپی چند نارنگ نے مابعد جدیدیت کی بحث کو بھی چھیڑا ہے۔ یہ بحث بھی مدلل طور پر اردو میں پہلی بار نارنگ صاحب نے اٹھائی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

مابعد جدیدیت کا تصور ابھی زیادہ واضح نہیں ہے اور اس میں ادلہ

پس ساختیات میں جو رشتہ ہے، اس کے بارے میں بھی معلومات عام نہیں اکثر دونوں اصطلاحیں ساتھ ساتھ اور ایک دوسرے کے بدل کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں۔ البتہ اتنی بات صاف ہے کہ پس ساختیات تھیوری ہے جو فلسفیانہ قضایا سے بحث کرتی ہے جبکہ مابعد جدیدیت تھیوری سے زیادہ صورت حال ہے۔ یعنی جدید معاشرے کی تیزی سے تبدیل ہوتی ہوئی حالت' نئے معاشرے کا مزاج، مسائل، ذہنی رویے یا معاشرتی و ثقافتی فضا یا کلچر کی تبدیلی ہے جو کرائسس کا درجہ رکھتی ہے۔ اس حصے میں مابعد جدیدیت کے فلسفیانہ مضمرات پر کھل کر بحث کی گئی ہے۔

گوپی چند نارنگ نے تنقید کے نئے ماڈل کی نئی معنویت کو بھی اجاگر کیا ہے۔ اسی ضمن میں اردو تنقید کی موجودہ صورت حال کا بھی جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے پتے کی بات یہ کہی ہے کہ:

> جدید تنقید کا سب سے بڑا مسئلہ ترقی پسندی کو بے دخل کرنا تھا لہٰذا فن پارے کی خود مختاری اور خود کفالت کو ڈھال بناکر ادب کا رشتہ تاریخ اور سماج سے عمداً کاٹ دیا گیا' نیز معروضیت کی لے اس قدر بڑھا دی گئی کہ ادبی مطالعہ بالآخر عروض و آہنگ، تذکیر و تانیث اور معائب و محاسن کی میکانکی سطح پر آکر رک گیا۔ مختصر یہ کہ جدید تنقید کے 'بانجھ پن' کا منظرنامہ مکمل ہے۔ اگر زندگی کے کچھ آثار ہیں تو اس لیے کہ کچھ جینوین لکھنے والوں نے تاریخی اور ثقافتی احساس سے ہاتھ نہیں اٹھایا اور پورا ادب بانجھ ہونے سے بچ گیا۔"
> (ص ۵۶۵)

کتاب کے "اختتامیہ" کے بارے میں گوپی چند نارنگ خود لکھتے ہیں:

> "اختتامیہ میں صورت حال، مسائل اور امکانات کے تحت سات شقیں قائم کی گئی ہیں۔ تھیوری کی مرکزیت اور موضوع انسانی کے بدلتے ہوئے منظرنامے کی بحث کے بعد پس ساختیاتی فکر کی پیش رفت اور مارکسیت سے اس کے مکالمۂ جاریہ پر نظر ڈالی گئی ہے۔ پس ساختیات اور مابعد جدیدیت کے رشتے سے بھی بحث ضروری تھی تاکہ تازہ ترین چیلنج اور ردو ملتے جلتے رویوں کا فکری ارتباط بھی ذہن میں رہے۔ اسی تسلسل میں مارکسیت کی مزید بحث ٹیری ایگلٹن اور دریدا کے تحت آئی ہے اور آخر میں اردو کی صورت حال اور ضرورتوں کا جائزہ لیا گیا ہے کہ ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے اپنا اپنا متحرک کردار ادا کرکے بے اثر ہو جانے کے بعد آئندہ کے امکانات کیا ہیں، نیا تنقیدی ماڈل کیا ہوگا، اسے بہرحال وقت طے کرے گا، متن کی خود کفالت اور خود مختاری کا بھرم ٹوٹنے کے بعد جدید تنقید کا ہیئتی ماڈل رد ہو چکا۔ نشانیات کے اثر سے اب یہ طے ہے کہ معنی متن میں فقط بالقوۃ موجود ہے جسے قاری اور قرأت کا تفاعل بالفعل موجود بناتا ہے' یعنی معنی وحدانی نہیں ہے اور اخذ معنی کا سلسلہ لامتناہی ہے۔ قاری کے در آنے سے متن کا ثقافتی اور آئیڈیالوجیکل تشکیل ہونا بھی اب ثابت ہو چکا ہے۔ لیکن نئی تھیوری نہ کوئی لیبل لگاتی ہے اور نہ ضابطہ بناتی ہے۔ البتہ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ نئی تھیوری یا پس ساختیاتی فکر پر مبنی نیا ماڈل جو بھی ہوگا غیر مقلدانہ اور انحرافی ہوگا، دوسرے نجات کوش نظریوں مثلاً مارکسی تنقید اور نسوانیاتی تنقید سے ابھی اسے ربط ہوگا اور نئی تاریخیت، کی بھی اس میں گنجائش ہوگی جو ساختن اور فوکو کی بنیادوں پر وجود میں آ رہی ہے۔ تنقید کے اس نئے ماڈل کی نسبت فرسودہ اور از کار رفتہ فکر سے نہیں بلکہ تازہ کار ذہن سے ہوگی۔ یہ ہر طرح کے کلیت پسندانہ تصورات کے خلاف ہوگا کیونکہ کلیت پسندی، ضابطہ بندی یعنی ڈاکٹرین سازی کرتی ہے اور ڈاکٹرین، 'ڈوگما' میں بدل جاتے ہیں' اور یہ جبریت اور آمریت کی دوسری شکلیں ہیں۔ اسی لئے نیا ماڈل خود اپنی ضابطہ سازی کی بھی نفی کرے گا تاکہ فکر و نظر کی راہ کھلی رہے۔ یہ پیچیدہ عمل ہے۔ نئے ڈسکورس کو جگہ بنانے میں وقت لگے گا لیکن وکٹر ہیوگو کا یہ قول پیش نظر رہنا چاہیے کہ جب وقت آجاتا ہے تو خیال کی طاقت کو کوئی روک

نہیں سکتا۔

"No Bodycan stop an idea time 'has come."

زیرِ نظر کتاب کے مطالب اور مباحث کا اصل مقصود یہی ہے کہ افہام و تفہیم اور غور و فکر کا سامان فراہم ہو۔"

——— (۱۸-۱۶)

ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات میں شامل تینوں کتابوں کے اختتام پر "مصادر کتاب" یعنی کتابیات درج ہے۔ اور کتاب کے اختتام پر صفحہ ۵۸۹ سے ۶۰۹ تک "فرہنگِ مصطلحات" بھی دی گئی ہے۔

اس کتاب کے بارے میں مشفق خواجہ نے مختصر لفظوں میں جو رائے دی ہے اس سے بہتر رائے ممکن ہی نہیں :

"میں نے کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے ایک نئی دنیا تک رسائی کا راستہ مل گیا ہو۔ مقدمہ شعر و شاعری کے بعد اُردو کے پورے تنقیدی سرمائے میں یہ ایک ایسا فکر انگیز کام ہے جس کی دوسری کوئی مثال موجود نہیں ہے۔ پچھلی ایک صدی میں حالی ایک رہنما ستارے کی حیثیت رکھتے تھے، اگلی صدی گوپی چند نارنگ کی ہے اور مجھے یقین ہے کہ گوپی چند نارنگ کی یہ کتاب آئندہ کی تمام تنقیدی بحثوں میں رہنمایانہ کردار ادا کرے گی۔"

□□

مہرۂ شطرنج

میں اک حقیر سا مہرہ بساط میں تیری ———
جسے پیادہ کہیں
جسے تو، چاہے کسی کے بھی سامنے کر دے
کسی سے ٹکرا دے ———
لڑا دے، اور اگر موج آئے تو پھر بے دریغ بے قصور مروا دے
مرا قصور یہی ہے کہ بے زباں ہوں میں
میں احتجاج نہیں کر سکتا
مری خطا کہ میں تیری رضا کا ہوں پابند
قضا کا ہوں پابند !!

عابد پشاوری

زخمِ امارت

عذر بے کار ہے کچھ عذر سے حاصل تو نہیں
موجِ بیتاب ہو تم واقفِ ساحل تو نہیں
ایک تم ہی مری آسودگیِ دل تو نہیں
رہروِ شوق ہو تم، آخری منزل تو نہیں

میں نے پہلے بھی شبستانِ حرم دیکھے ہیں
کتنے راحت کدہ ناز و نعم دیکھے ہیں
کتنے ہونٹوں پہ یہی قول و قسم دیکھے ہیں
قصۂ جور جبینوں پہ رقم دیکھے ہیں

عشرتِ شیش محل، بربط و مضراب نہیں
سیج پھولوں کی نہیں بسترِ کمخواب نہیں
دشتِ پُرخار ہے یہ وادیٔ شاداب نہیں
یہ محبت ہے امارت کا حسیں خواب نہیں

میں نے پہلے ہی کہا تھا یہ عنایت نہ کرو
اک قلم کار کو پابند روایت نہ کرو
ایک شاعر کی طرف چشمِ مروّت نہ کرو
ایک فن کار سے بے وجہ محبت نہ کرو

تم ہو پابندِ روایت مجھے معلوم نہ تھا
نکتہ چیں ہوگی رعونت مجھے معلوم نہ تھا
تم ہو پروردۂ ثروت مجھے معلوم نہ تھا
حُسن ہے بنتِ امارت مجھے معلوم نہ تھا

زندگی تلخ حقیقت ہے کوئی کھیل نہیں
اس جگہ محنت و دولت کا کوئی میل نہیں

ڈاکٹر اقبال ماہر
نخاس کہنہ۔ الہ آباد

سید محمد ارشد
ریسرچ اسکالر شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی
لکھنؤ

جمیل مظہری اور جدید مرثیہ گوئی

ہم جس عہد میں سانس لے رہے ہیں، یہ عہد تلاش و جستجو کا عہد ہے تحقیق و تنقید کا عہد ہے، جہد وارتقاء کا عہد ہے، علم و عمل کا عہد ہے، منطقیانہ بحث و تمحیص کا عہد ہے، فلسفیانہ تحلیل کا عہد ہے۔ یعنی آج کے عہد کا ذہن کسی بھی بات کو بغیر سوچے سمجھے، جانے پرکھے من و عن قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا بلکہ کسی بھی چیز کو اپنے محسوسات و تجربات کی کسوٹی پر رکھ کے اسے جانچ پرکھ کر اور ناپ تول کر قبول کرتا ہے۔ اور شاعری دراصل وہی ہوتی ہے جو اپنے عہد کی آئینہ دار ہو۔ جمیل مظہری کو ہم اس عہدِ جدید کی رثائی شاعری کا علمبردار اسی لیے تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے یہاں حقیقتِ حیات و کائنات سے آگاہی کا جذبہ ملتا ہے۔ تحقیق و تلاش کی جستجو ملتی ہے، جہد و ارتقاء کا پیغام ملتا ہے۔

جب ہم مرثیے کا ذکر کرتے ہیں تو ہماری نظر قلی قطب شاہ، وجہی، غواصی، میر و سودا کے دور پر پڑتی ہے، جہاں مرثیہ نگاری تو بہت کی گئی لیکن یہ کبھی وجود میں آیا کہ، ——

" بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا گویّا مرثیہ خواں"۔

اسی بنا پر سودا نے آواز بلند کی اور مطالبہ کیا کہ مرثیہ میں ادب پیش کیا جائے نہ کہ فقط حصولِ ثواب کے لیے مرثیہ نگاری کی جائے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ دورِ ضمیر و خلیق میں مرثیے کی آبیاری کر کے اس کی جڑوں کو مضبوط کیا گیا۔ اور انیس و دبیر کے ذریعہ اس باغ میں ایسی بہار آئی کہ بقول رشید احمد صدیقی، " اردو شاعری کی آبرو بن گیا" اور بگڑے شاعر والی مثل نے تاریخ کے صفحات میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔ کیوں کہ اب اُردو شاعری مرثیہ کے بل پر دنیا کی ہر زبان کے شعری ادب سے آنکھیں ملانے کے قابل ہو گئی۔ لیکن اس معراج پر پہنچنے کے بعد ایک ٹھہراؤ آ گیا۔ حالانکہ انیس و دبیر کے بعد مرثیے بہت لکھے گئے، نفیس، رشید، عروج اور آوج جیسے مرثیہ نگار بھی ہوئے لیکن مرثیہ دورِ انیس و دبیر میں جس منزل پر تھا اس سے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اپنی وہ شان و شوکت بھی اسی انداز میں قائم نہ رکھ سکا۔ اس لیے اس دور کو اگر مرثیہ کے زوال کے دور سے تعبیر کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ مرثیہ اس میں اپنے لیے کچھ نئے راستے تلاش نہ کر سکا۔

بیسویں صدی کے ابتدائی دو دہائی کے بعد ایک نئے عزم و حوصلہ کے ساتھ لکھنؤ سے جوش ملیح آبادی، آلِ رضا، امروہہ سے نسیم امروہوی دکن سے نجم آفندی اور پٹنہ سے جمیل مظہری اٹھ کھڑے ہوئے اور ان شعراء نے اُردو مرثیے کو نئے راستے، نئی ڈگر اور نئی زندگی سے ہم کنار کیا۔ جوش، نسیم، نجم و رضا تو ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے اور وہاں سے مرثیہ کو زندگی عطا کرتے رہے۔ لیکن جمیل مظہری پٹنہ ہی میں رہے اور وہیں سے مرثیے کی جدید روایت میں نئی رُوح پھونکتے رہے۔

جمیل مظہری ۱۹۰۴ء میں پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط تھا۔ جمیل نے تقریباً ۱۰ سال کی عمر سے باقاعدہ شاعری شروع کر دی تھی۔ وہ ایک درد مند دل رکھتے تھے۔ ہندوستانی قوم کی بدحالی ان کی نظروں کے سامنے تھی۔ اسی لیے ان کی پوری شاعری میں فکری عناصر بھی شامل ہوتے گئے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ ان کی شاعری میں فکر و جذبہ ایک ہو گئے ہیں یعنی فکر جذبہ بن گئی ہے اور جذبہ فکر بن گیا ہے، تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کے باوجود ان کی شاعری متوازن ہے، یہ احساس ان کی مرثیہ نگاری میں بھی قائم ہے۔ ان کے مزاج میں ایک ٹھہراؤ ہے۔ وہ جس راہ پر چلتے ہیں قدم جما کے چلتے ہیں، جس سے نہ ان کے پیچھے رہ جانے کا خطرہ محسوس

ہوتا ہے اور نہ تیز رفتاری سے ٹھوکر کھا کر گرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے وہ اپنے ان اعتدال پسند نظریات کا اظہار خود اپنی مرثیہ نگاری میں اس طرح کرتے ہیں ؎

شاعری کیا جو سخن ولولہ انگیز نہ ہو
ہاں مگر خوانِ تکلم میں نمک تیز نہ ہو
لفظ و معنی کا توازن ہو سرا دیکھا نہ اُٹھے
آنچ جذبات کی دھیمی رہے شعلہ نہ اُٹھے

جمیل مظہری کی شاعری قدیم و جدید روایات کا ایک حسین سنگم ہے جہاں وہ مرثیوں میں جدید قدروں اور جدید تقاضوں کو جگہ دے کر مقصدیت پر زور دیتے ہیں، وہیں ساقی نامہ، گھوڑے اور تلوار کی تعریف کرتے ہوئے جنگ بھی پیش کرتے ہیں اور ان راستوں کو نئے انداز سے سنوارنا چاہتے ہیں۔ ان کے کلام سے ان کی ترقی پسندی کا بھی بھرپور اظہار ہوتا ہے وہ کہتے ہیں ؎

اور شاعر کو خرافات سے فرصت نہ ملی
ہجر اور وصل کے جذبات سے فرصت نہ ملی
خط و کاکل کی روایات سے فرصت نہ ملی
رنگ و نکہت کی علامات سے فرصت نہ ملی
منفعل جذبۂ جنسی کی زبانی کہتے
عمر گزری گل و بلبل کی زبانی کہتے

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ قدیم روایات سے بغاوت کرنا چاہتے ہیں بلکہ وہ قدیم روایات کو بھی ساتھ ساتھ لے کے چلنا چاہتے ہیں۔ ایک مرثیہ کے ساقی نامہ کا ایک بند ملاحظہ ہو ؎

دے وہ بادہ کہ جسے غالبِ دانا نے پیا
وحشت و حسرت و چکبست و رسوا نے پیا
میر و مومن نے پیا، آتش و سودا نے پیا
خم پہ منہ رکھ کے انیسِ سخن آرا نے پیا
میری تقدیر میں جو رہ گئی باقی دے دے
انھیں مے خواروں کی جھوٹی مرے ساقی دے دے

جمیل مظہری نے اُردو مرثیے کو ایک نئے موڑ، نئی ڈگر اور نئی راہ سے ہم کنار کیا۔ جمیل کے مرثیوں میں متانت اور سنجیدگی پائی جاتی ہے۔ وہ اپنی قوم کو زندہ، بیدار، آزاد اور متحرک دیکھنا چاہتے ہیں اور اسی لیے بہت سنجیدگی کے ساتھ سوئے ہوئے ذہنوں کو اس طرح بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ؎

حیف وہ قوم جو ملّت شاہِ شہدا
وہ حکومت کی کنیزی میں ہو حیرت کی ہے جا
جس طرف دیکھیے ہے موت کا اک سناٹا
نہ کوئی پیر تہ بتر نہ جوانِ رعنا
جسم ہے مدفنِ دل، مجلسیں گورستاں ہیں
بستیاں رُوح کی اک وادیٔ خاموشاں ہیں

جمیل کے ان بندوں کو پڑھ کر قاری کے ذہن میں برجستہ و بے ساختہ غالب والی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ جمیل بھی غالب ہی کی طرح کائنات کی ہر شے کے اسباب و علل اور اس کی سچائیوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں جو خود جمیل کے ذہن کا بھی خاص اپنا رجحان ہے ورنہ شروع میں تو جمیل اقبال والی راہ پر بھی چلے۔ لیکن چند ہی قدم آگے بڑھے تھے کہ وہیں سے انھیں غالب والی یہ شاہراہ بھی نظر آ گئی اور پھر جمیل ادھر ہی ہو لیے اور اپنی غزلوں اور نظموں کا قافلہ لے کر آگے بڑھے۔ لیکن وہ انیس سے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور انیس کے مرثیوں کی روشنی دیکھ کر ان سے بھی قریب ہوئے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ فکری لحاظ سے جمیل پر انیس کی ضیاپاشیاں نظر آتی ہیں۔ چناں چہ جمیل انیس سے ایک صدی کے فاصلے پر رہنے کے بعد بھی قریب نظر آتے ہیں بلکہ اسلوب اور پیرایۂ اظہار کے تناسب سے بھی جمیل اور انیس میں کافی قربت پائی جاتی ہے۔ اس تناظر میں جمیل مظہری کے مرثیے "شامِ غریباں" کا

شامِ غم شامِ الم شامِ غریباں ہے یہ شام

اور انیس کے مرثیہ کا

شمشاد بوستان رسالت حسینؑ ہے

کا مطالعہ کافی مفید ہوگا۔ ان دونوں مرثیوں میں اسلاف کی ارواح مقدس

کی موجودگی اور ان کی گفتگو پیش کی گئی ہے۔ جمیل نے یہاں اپنے لب و لہجہ اور زبان و بیان کو انیسؔ سے بہت قریب کر دیا ہے۔ یہ بند ملاحظہ ہو جس میں جناب زینبؑ اپنی مادر گرامی کی روح سے مخاطب ہو کے فرماتی ہیں ؎

کہہ یہ چپ جو ہوئیں خواہر شاہ دوسرا
سسکیاں لینے لگا رات کا وہ سناٹا
آئی خاتونِ قیامت کے جو رونے کی صدا
رُخ بیاباں کی طرف کر کے یہ زینبؑ نے کہا
آپ اب نیند سے چونکی ہیں دُہائی امّاں
لُٹ چکا گھر تو سواری ادھر آئی امّاں

یا آگے جمیل کر یہ پیش کش دیکھیے ؎

کیا کہوں شانِ علمدارِ دلاور امّاں
مشک تو بھر لی مگر لب نہ کیے تر امّاں

او بحیا ہاشم کے گھرانے کا بہت نام کیا
آج تو آپ کی بہوؤں نے بڑا کام کیا

اب یہاں جمیل انیسؔ سے کس قدر قریب نظر آتے ہیں، یہ فیصلہ آپ خود کریں گے۔ مجھے انیسؔ کا ایک مصرع یاد آتا ہے کہ

چھوٹی بہو عمل کی بڑا نام کر گئی

جدید مرثیے کا اصل مقصد شہدائے کربلا کے مصائب بیان کرنا نہیں ہے بلکہ مقصدِ شہادت کی تشہیر ہے۔ واقعہ کے اسباب و علل، قربانی حسینؑ کی عظمت اور اس قربانی سے ملنے والے پیغام کی تشہیر ہے جمیل مظہری کہتے ہیں کہ یہ واقعہ یوں رونما ہوا کہ امام حسین علیہ السلام سے نوعِ بشر کی رسوائی اور تذلیل و توہین برداشت نہ ہوئی کیوں کہ وہ میراث ابراہیم کے وارث تھے۔ ان کے دل میں قربانی کا عظیم جذبہ تھا۔

قدیم مرثیے کا مقصد سامع یا قاری کو رُلانا ہوتا تھا اس لیے یہ سمجھ لیا گیا کہ مرثیہ صرف رونے یا رُلانے کی چیز ہے۔ لیکن جدید مرثیہ نگاروں نے بنی نوعِ انسان کو بیدار کرنے کے مقصد پر زیادہ زور دیا۔ مرثیے کے ذریعہ سماجی اصلاح کی بھی کوشش کی گئی، بیداری کا درس بھی دیا گیا اور جہد و عمل کی تعلیم بھی۔ جمیل مظہری نے اپنے مراثی سے یہ کام بھی پوری طرح لیا ہے اور اس میں وہ بے حد کامیاب ہیں۔

بیسویں صدی کے آغاز تک مرثیے کے قاری اور دوسری اصناف کے قاری میں تفریق پائی جاتی تھی اور یہ صرف ایک فرقہ، ایک طبقے اور ایک حلقے تک محدود سمجھا جاتا تھا۔ لیکن جمیل مظہری اپنی مرثیہ نگاری میں امام حسین علیہ السلام کو نوعِ انسان کے ایک رہبر کی شکل میں لائے ہیں۔ جو عالمی مسائل سرمایہ، مزدور، تہذیب، اخوت اور تباہی سے تحفظ کی علامت بن گیا ہے۔ اس سے مرثیے کے حلقے میں وسعت پیدا ہوئی اور مرثیہ عوام کے قریب بھی آ گیا۔

جدید مرثیہ صرف ایک مسافر، ایک مظلوم بے کس و لاچار کا مرثیہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک عظیم انسان، ایک بہادر، ایک مجاہد، ایک سپاہی اور ایک فاتح کا مرثیہ ہے۔ اس لیے وہ آنکھوں میں آنسوؤں کے ساتھ ساتھ دل میں جوش، ولولہ، ہمت اور جرأت بھی پیدا کرتا ہے۔ اس راہ سے بھی جمیل اسی طرح گزرے ہیں کہ انھوں نے مرثیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنے دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

قسم اس دن کی جو لاشوں کو اٹھانے میں کٹا
ظہر تک ایک بھرے گھر کو لٹانے میں کٹا
امتحاں گاہ کی تاریخ بنانے میں کٹا
نوعِ انساں کو نئی راہ دکھانے میں کٹا

جمیل مظہری نے ہیئت کے اعتبار سے مرثیوں میں جو تجربہ کیا ہے اس کے بانی وہ خود ہی ہیں۔ یعنی بند کے ابتدائی چار مصرعوں میں انھوں نے تیسرے مصرعے کو ردیف و قافیہ کی پابندی سے آزاد کر دیا ہے، باقی تین مصرعے اور بیت کے دو مصرعے اسی طرح قائم رہتے ہیں، جیسے سوداؔ کے بعد ضمیرؔ، انیسؔ و دبیرؔ سے اب تک چلے آ رہے ہیں۔ جمیل کا کہنا ہے کہ تیسرا مصرعہ آزاد کر دینے سے چوتھے مصرعے میں زور پیدا ہو جاتا ہے۔ بات تو ٹھیک ہے لیکن کہیں کہیں چوتھے مصرعے کے زور کے سبب بیت ہلکی پڑ جاتی ہے، پھر بھی جمیل کا یہ تجربہ قابل ستائش ہے۔

□□

ھائیکو

نور کے حجرے سے
آتی ہے صدا، جاگو
کاش کہ ہم سُنتے!!

مایوس کیوں رہیں
پھیلی ہوئی ہیں دُور تک
امکان کی حدیں

جیون اک رستا
سانس کی منزل آنے تک
چلنا ہی چلنا

مشکل ہے نباہ
رکھنا ہے ہموار مگر
سمجھوتے کی راہ

خواب نہ کوئی بُن
دے رہا ہے وقت آواز
کان لگا کر سُن

□□

عطا عابدی

ای ۲۲؍ ۱۵۳، ذاکر نگر، جامعہ نگر
نئی دہلی - ۲۵

بند دروازہ

گُماں تک نہیں تھا
کبھی کُھردرا سا
یہ لہجہ
سراسیمگی کی علامت بنے گا
ہمارے دَروں میں
کواڑے مقفّل ہیں
لیکن مسلسل جِھری سے
کوئی جھانکتا ہے۔

□□

ہم رنگ

کہیں
داخلی منظروں میں بھی
انگور کی بیل ہوگی
وہ آنکھیں
بڑی دیر سے تک رہی ہیں
کہ بانسوں کی چھتری پہ
انگور کی،
سبز کیڑے،
کئی پتّیاں چُن گئے ہیں

■■

قمر ادیب

۱۴- ادریس گنج
ہردوئی ۲۴۱۰۰۱

شاخِ سرسبز پہ اِک پھُول

شاخ ہلتی ہے تو پھُولوں سے صدا آتی ہے
"میری رگ رگ میں چبھے گئے نشتر کتنے"
پتیاں شبنمی بوندوں کا کفن اوڑھے ہوئے
روز دکھلاتی ہیں ہم سب کو مناظر کتنے
اور غنچوں کی سسکتی ہوئی آہوں سے کبھی
دلِ پژمُردہ پہ چل جاتے ہیں خنجر کتنے
ایسے ماحول کی عادی ہوئیں آنکھیں میری
دل فزا رُت میں بھی رکنے لگیں سانسیں میری

شاہراہوں پہ رکھے پھُول کے گلدستوں سے
زہر میں ڈوبی ہوئی ایسی ہوا آتی ہے
جیسے مرگھٹ پہ سلگتی ہوئی لاشوں سے کبھی
چیخنے اور بلکنے کی صدا آتی ہے
جیسے ہر شامِ سیہ میں مری چھت پہ اکثر
سوگ میں ڈوبی ہوئی غم کی گھٹا آتی ہے
دلِ شاعر انھیں لمحات سے گھبراتا ہے
ساحلِ امن و سکوں پھر بھی نہیں پاتا ہے

آؤ ہم عہد کریں نغمۂ دل کش گائیں
شاخِ سرسبز پہ ہم پھُول نئے بکھرائیں

شُعیب شمس

نیشنل سیمپل سروے۔ ڈیری فارم
پوسٹ بلیر ۷۴۴۱۰۳
انڈمان

عبدالرحمٰن غازی پوری
معرفت ڈاکٹر جمال محمد صدیقی، ۴ اے۔ موریسن روڈ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

فتح پور سیکری: روایتوں اور حقیقتوں کا شہر

طبقاتِ اکبری کا مصنف نظام الدین احمد فتح پور سیکری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"اس سے قبل بادشاہ (اکبر) کے کئی ایک صاحبزادے ایام شیر خواری ہی میں وفات پا چکے تھے۔ مقدس پاکباز شیخ سلیم چشتیؒ نے بادشاہ کو ایک ہونہار بیٹا پیدا ہونے کی بشارت دی۔"

آگے چل کر وہ لکھتا ہے:

"اسی درمیان بیگمات میں سے ایک کے حاملہ ہونے کی اطلاع ملی۔ بادشاہ سلامت نے انھیں شیخ کے مکان کے پاس سیکری منتقل کر دیا۔"

وہ عمارت جہاں بیگم موصوفہ نے قیام کیا تھا، رنگ محل کے نام سے منسوب ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اکبر نے شیخ سلیم چشتی کے لیے ایک نئی خانقاہ اور ایک بڑی مسجد کی تعمیر کا حکم بھی دیا۔ انتظار کے بعد ۳۰ اگست ۱۵۶۹ء کو رانی کے یہاں لڑکا تولد ہوا۔ حضرت شیخ نے نومولود لڑکے کا نام اپنے نام پر یعنی محمد سلیم رکھنے کی بھی اجازت دے دی۔ اکبر نے بربنائے احترام محمد سلیم کو (جو بعد میں نورالدین محمد سلیم جہانگیر کے نام سے سلطنت مغلیہ کا بادشاہ ہوا) کبھی سلیم کہہ کر مخاطب نہیں کیا بلکہ ہمیشہ شیخو بابا کے نام سے مخاطب کرتا رہا۔

سیکری میں ایک نیا شہر بسانے اور پھر اسے دار الخلافہ کی حیثیت دینے کے اسباب مورخین کی نظر میں کچھ بھی ہوں لیکن خود جہانگیر کے الفاظ میں یہ تھے:

"میرے والد محترم نے سیکری گاؤں کو جہاں میری پیدائش ہوئی تھی اپنے لیے باسعادت و بابرکت تصور کرتے ہوئے اسے اپنے دار السلطنت کے طور پر منتخب کیا۔"

جون ۱۵۷۳ء میں اکبر جب خاندیش کے علاقے کو فتح کر کے لوٹا تب اس نے اس شہر کا نام فتح آباد رکھا۔ فتح آباد نام اکبر کے زمانے ہی میں مقبول نہ ہو سکا اور لوگ اسے فتح پور کہنے لگے۔ اس طرح سیکری کا نام اب فتح پور سیکری ہو گیا۔ آج کل پہاڑی کے اوپر مغرب اور جنوب جانب جو آبادی ہے اسے فتح پور کہا جاتا ہے اور شمال جانب دہلی دروازہ کے پاس اندرون شہر پناہ جو آبادی ہے اسے سیکری کہتے ہیں۔ خاندیش سے واپسی پر اکبر نے بلند دروازہ کی تعمیر کا بھی حکم دیا جو جامع مسجد کا جنوبی دروازہ ہے۔ ۱۵۶۹ء سے نئے شہر اور اس کی عمارات کی تعمیر کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ تقریباً سولہ سال جاری رہا۔ لیکن ابتدائی آٹھ سال یعنی ۱۵۶۹ء تا ۱۵۷۷ء تعمیرات کا کام وسیع پیمانے پر ہوا۔

۱۵۷۱ء کے واقعات قلم بند کرتے ہوئے ابوالفضل لکھتا ہے کہ بادشاہ نے ایک شاہی فرمان جاری کیا جس کے بموجب حکام کو بادشاہ کے لیے مخصوص عمارتیں اور ہر طبقہ اور ہر درجہ کے افراد کو اپنے لیے رہائشی مکان تعمیر کرانے کی عام اجازت دی گئی۔ عارف قندھاری تاریخ قندھاری کا مصنف بھی بادشاہ کی طرف سے عام اجازت کا ذکر کرتا ہے۔

اسی شاہی فیاضی اور عطا کی وجہ سے بقول جہانگیر:

"چودہ پندرہ سال کے عرصہ میں وہ پہاڑی جہاں جنگلی جانوروں کا مسکن تھا، ایک ایسے شہر میں تبدیل ہو گیا جہاں ہر قسم کے باغات، پرکشش محلات، عظیم الشان

دیدہ زیب عمارتیں نظر آتی ہیں"۔
رلف فچ جو ۱۵۸۵ء میں فتح پور سیکری آیا تھا۔ وہ فتح پور سیکری کو اس وقت کے لندن سے بڑا شہر لکھتا ہے۔

۱۵۸۵ء کے وسط میں شمال مغربی سرحدوں پر عبداللہ خاں ازبک کے حملوں کی وجہ سے اکبر کو لاہور جانا پڑا۔ وہاں کے حالات ایسے ہوگئے کہ اکبر کو اپنا پایہ تخت فتح پور سیکری سے لاہور منتقل کرنا پڑا۔ پایہ تخت کی تبدیلی کی وجہ سے فتح پور سیکری کی عظمت اور رونق ختم ہوگئی اور یہ شہر جس قدر تیز رفتاری سے بسا تھا اس سے زیادہ تیزی سے اُجڑ گیا۔ ایک یوروپین سیاح ترسے فینچلر کے بقول فتح پور سیکری اس پھول کے مانند تھا جو صبح ہوتے ہی کھل اٹھا اور شام ہوتے ہوتے مُرجھا گیا۔

اکبر نے فتح پور سیکری کیوں چھوڑا؟ یہ موضوع اختلاف رائے کا ہے بہر حال یہ کہنا کہ اکبر نے فتح پور سیکری پانی کی قلت کے سبب چھوڑا، غلط ہے پورے شہر میں باؤلی، حوض، تالاب، فوارے اور حمام کا جال جس طرح بچھا ہوا ہے اسے دیکھ کر یہ خیال کرنا کہ یہاں پانی کی قلت رہی ہوگی، ایک کمزور دلیل ہے جبکہ اکبر خود اپنے پینے کے لئے گنگا جل استعمال کرتا تھا جس کی فراہمی سوروں سے کی جاتی تھی۔

فتح پور سیکری کے تاریخی پس منظر کے بعد آیئے اب یہاں کی عمارتوں کا ایک جائزہ لیا جائے۔ تو اعتبار یہ سات کلومیٹر میں محصور اس شہر اور اس شہر کی عمارتوں کا تفصیلی جائزہ پیش کرنے کے لیے تو ایک کتاب درکار ہے۔ یہاں صرف ان چند عمارتوں کا ذکر کیا جائے گا جو بے بنیاد روایتوں کا شکار ہوگئی ہیں۔ یہ روایتیں برطانوی دور کی پیداوار ہیں جو آج بھی سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہیں۔ دیگر تاریخی عمارتوں کی طرح فتح پور سیکری میں بھی آپ کو گائڈ ملیں گے جو اپنی رنگین شوخ بیانی، ظرافت اور داستان زیبی سے سیاحوں کے لیے تفریح طبع کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ گزشتہ نو سال سے اس تاریخی شہر کی تحقیقی کھدائی کا سلسلہ جاری ہے ابھی خاصی پیوند زمین عمارتیں، مکانات، محلات، تالاب، حوض اور باغات وغیرہ منظر عام پر لائے گئے۔ ان زیر خاک عمارتوں میں سے بعض کا ذکر کسی تاریخی ماخذ میں نہیں ہے۔ موجودہ مضمون میں آثار قدیمہ کی کھدائی سے دریافت ان چند عمارتوں کا ذکر بھی شامل کیا گیا ہے جو انڈین آرکیولاجیکل ریویو میں مختصراً شائع ہوچکی ہیں۔

آگرہ دروازہ سے داخل ہوتے ہی نوبت خانہ یا نقار خانہ کی عمارت نظر آتی ہے جہاں سے بادشاہ کے آمد و رفت کا اعلان بذریعہ نوبت کیا جاتا تھا۔ آگرہ دروازے سے دوکانوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے جو نوبت خانے کے پیچھے چہارسُو پر ختم ہوجاتا ہے۔ اس بازار کا تفصیلی ذکر غیر ملکی سیاحوں کے سفرناموں میں کثرت سے ملتا ہے۔ یہ دوکانیں بھی دیگر عمارتوں کی طرح شکست و ریخت کا شکار ہوگئی تھیں۔ گزشتہ برسوں میں بازار کے علاقے کی کھدائی کی گئی جس کی لمبائی تقریباً ڈیڑھ کلو میٹر ہے۔ کھدائی کے بعد یہاں چار سو ساٹھ دوکانیں برآمد کی گئیں۔ سڑک کی چوڑائی ۵۰ فٹ ہے۔ اصل سڑک کھرانجہ کی تھی۔ قدیم اکبری سڑک پر موجودہ تارکول کی سڑک بچھی ہے جس سے اب ہم بذریعہ سواری یا پیدل گزرتے ہیں۔ اکبر کے دور میں یہ بازار فتح پور سیکری کا مصروف ترین علاقہ تھا۔ ان دکانوں میں انواع و اقسام کے قیمتی پتھر اور ریشمی کپڑے بکا کرتے تھے۔ یہاں پر خرید و فروخت میں مشغول لوگوں کا ایک ہجوم رہتا تھا ـــ خریداروں میں منصب دار، امراء، شہزادے، حکام اور سوداگروں کے علاوہ بیرونی ملکوں کے تاجر اور سیاح بھی شامل ہوا کرتے تھے۔

دیوان عام کے قریب باہر کی سمت سرخ پتھر کی ایک عمارت ہے جسے خزانہ کہا جاتا ہے۔ خزانے کی اس عمارت کا جائے وقوع خود اس امر کا شاہد ہے کہ یہ عمارت خزانہ کی نہیں ہوسکتی۔ خزانے کو محفوظ ترین مقام پر واقع ہونا چاہیے۔ ابوالفضل اور بدایونی دونوں کے بیان سے یہ واضح ہے کہ فتح پور سیکری میں اکبر کے قیام کے باوجود شاہی خزانے کا بیشتر حصہ آگرہ کے قلعہ میں محفوظ تھا۔ آگرہ کے قلعہ میں اکبر کی چند بیگمات بھی رہتی تھیں۔ آگرہ کا قلعہ فتح پور سیکری کے مقابلہ میں ہمیشہ محفوظ مقام رہا ہے۔ یہ عمارت اکبر کے وقت میں کسی دفتر کا حصہ رہی ہوگی جس کے لیے یہ عمارت موزوں ہے۔

خزانے کی اس عمارت سے جب آپ دیوان عام کی طرف بڑھیں گے تو بائیں ہاتھ پر آپ کو بہت سی عمارتوں کے آثار نظر آئیں گے جو کبھی زمین دوز تھیں۔ ماہرین آثار قدیمہ کی کاوشوں سے یہ آثار منظر عام پر آئے۔ یہ

عمارتیں اپنے وقت میں پاتَش خانہ (سرکاری مہمان خانہ) اور دفاتر تھے۔ ان دفاتر میں بڑے بڑے منصب دار بھی بیٹھا کرتے تھے۔

دیوانِ عام میں داخل ہوتے ہی سیدھے ہاتھ پر سبزہ زار میں سرخ پتھر کا ایک مضبوط حلقہ زمین میں گڑا ہوا دیکھنے کو ملے گا۔ سطحِ زمین پر صرف گول پتھر نظر آتا ہے۔ اس پتھر کے متعلق گائڈ یہ کہتے ہیں کہ اکبر کے عہد میں مجرموں کو یہاں سزا دی جاتی تھی۔ مجرم کا سر اس پتھر پر رکھ دیا جاتا تھا اور ہاتھی آکر اس کا سر اپنے پیر سے کچل دیتا تھا اور اکبر سامنے سے اس منظر کو دیکھا کرتا تھا۔ یہ روایت جس کی کوئی سند نہیں، سینہ بہ سینہ برطانوی عہد سے چلی آرہی ہے۔ جان سَرِیٹ جو اکبر کے عہد میں آیا تھا، واضح طور پر لکھتا ہے کہ مجرموں کو سزا دیوانِ عام میں نہیں دی جاتی تھی۔ دیوانِ عام میں صرف آلاتِ حرب اور سزا بطور نمائش، جلالِ شاہی کے اظہار کے لیے رکھے جاتے تھے۔ دیوانِ عام میں خاص موقعوں پر دربارِ عام کے علاوہ نمائش اور تماشہ وغیرہ کا اہتمام ہوا کرتا تھا۔

... ایک محقق کی رائے میں یہ حلقہ بازیگروں کے تماشے، نٹوں کی جسمانی ورزش کے لیے استعمال میں آتا تھا۔ ہلدی گھاٹی کی لڑائی کے بعد مہا رانا پرتاپ کا رام پرشاد نامی ہاتھی جو راجہ مان سنگھ نے قید کر کے اکبر کے لیے روانہ کیا تھا، اسی دیوانِ عام میں نمائش کے لئے پیش کیا گیا تھا اور اس حلقہ سے باندھا گیا تھا۔

دیوانِ عام سے آپ جیسے ہی پیچھے کی جانب اتریں گے آپ کو خوبصورت اور دیدہ زیب عمارتوں کا ایک سلسلہ نظر آئے گا۔ اس حصّے کو دولت خانہ کہتے ہیں، جہاں اکبر کا قیام رہتا تھا۔ عمارت کے اسی حصے میں اکبر کی نجی خواب گاہ بھی واقع ہے۔ جس عمارت کو گائڈ اب بھی عبادت خانہ بتاتے ہیں وہ دیوانِ خاص کا حصّہ ہے۔ اسی عمارت کی چھت پر جو کافی بلند ہے لکڑی کے ایک تخت پر بیٹھ کر اکبر غالباً سورج کی پرستش کے رسومات ادا کرتا تھا۔

صحن کے بائیں جانب ایک منزلہ عمارت ہے جہاں اب صرف ایک کمرہ باقی بچا ہے جس کے سامنے کھلا ہوا صحن ہے۔ اس عمارت کو اطہر عباس رضوی آبدار خانہ لکھتے ہیں۔ لیکن شعبۂ تاریخ کے ایک ماہر آثار قدیمہ کے۔ کے محمد کے خیال میں یہ عمارت اکبر کا میوہ خانہ رہی ہوگی۔ موجودہ دور کی اصلاح میں یہ اکبر کا ڈائننگ روم رہا ہوگا۔ کے کے محمد ہمعصر سیاح فادر مان سَرِیٹ کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ لکھتا ہے کہ اکبر کے ڈائننگ روم میں حضرت عیسیٰؑ، حضرت محمدؐ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت مریم کی شبیہیں بنی ہوئی تھیں جسے اکبر نے خود پادری کو دکھایا تھا۔ اس کمرہ کی دیواروں پر اب بھی کچھ دھندلی مٹی ہوئی شبیہ کے نقوش غور کرنے پر نظر آسکتے ہیں۔ اسی بنا پر کے۔ کے محمد کا خیال ہے کہ یہ کمرہ اکبر کا میوہ خانہ رہا ہوگا۔

میوہ خانہ کے جنوب مغرب سرخ پتھر کا ایک پختہ تالاب نظر آئے گا جسے انوپ تلاؤ یا بعض مورخوں نے کپور تلاؤ بھی لکھا ہے۔ ۱۵۷۸ء میں اکبر نے اس تالاب کو سونے چاندی اور تانبے کے سکوں سے لبریز کرا کے دس لاکھ سرسٹھ ہزار روپیہ بقول بدایونی غریبوں، محتاجوں میں تقسیم کرایا تھا۔ چوں کہ یہ رقم کافی تھی اس لیے بقول جہانگیر:

"کافی عرصے تک حاجت مند اور آرزومند حضرات فیاضی کے اس سرچشمہ سے سیراب ہوتے رہے۔"

یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ بانیِ درس گاہ سر سیّد احمد خاں جب ۱۸۴۲ء میں فتح پور سیکری بطور منصف متعین تھے تب انھوں نے اس تالاب کے فرش کی ازسرِنو تعمیر کرائی تھی جو اپنی موجودہ شکل میں اب بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

اس تالاب کے شمال جانب ایک عمارت ہے جو سنگ تراشی کا حسین اور نازک نمونہ ہے اسے عام طور پر ترکی سلطانہ رقیہ بیگم کا رہائشی مکان بتایا جاتا ہے۔ تاریخی ماخذ کی بنیاد پر یہ عمارت حجرہ انوپ تلاؤ ہے۔ یہ اکبر کی مخصوص نشست گاہ تھی۔ اپنے وقت میں یہ کمرہ بے انتہا سجا رہتا تھا اور اس کے طاقوں میں سونے اور چاندی کے ظروف رکھے رہتے تھے۔ اکبر اسی میں خاص لوگوں سے ملاقات کرتا تھا۔ بقول بدایونی: اکبر نے اپنے نئے مذہبی عقیدہ کو تقویت پہونچانے کے لیے جو محضر نامہ جاری کیا تھا وہ اسی حجرہ انوپ تلاؤ سے جاری کیا گیا تھا۔

دولت خانے کے شمال مشرقی کونے پر باہر کی جانب آپ کو ایک عمارت کے کھنڈرات نظر آئیں گے جس کی چھت اب غائب ہو چکی ہے۔ ماہرینِ آثار قدیمہ کی کاوشوں سے یہ عمارت منظرِ عام پر آئی۔ یہ مختصر مگر تاریخی عمارت اکبر کے عہد میں خوشبو خانہ تھی۔ یہاں عطریات، کیوڑہ، عرق وغیرہ شاہی استعمال کے لیے تیار کیے جاتے تھے۔ مان سَرِیٹ اسی خوشبو خانہ کا

ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اکبر جب عیسائی مذہب کی طرف مائل ہوا تب اس نے پادریوں کو خوشبو خانے میں ٹھہرایا تھا۔ اس خوشبو خانے کا مغربی دروازہ اکبر کی خواب گاہ میں کھلتا تھا۔ اس دروازے سے ہوکر اکبر اور پادری خفیہ ملاقاتیں کرتے تھے۔ پادریوں نے یہاں ایک عارضی چرچ بھی تعمیر کرلیا تھا۔

دورانِ کھدائی خوشبو خانہ کے آثار، حوض، بھٹی، کڑھائی عطر اور کیوڑہ کے ظروف اور ترمیم شدہ رہائش گاہ کے فرش اور طاق منظرِ عام پر آئے۔

دولت خانہ کے مغربی جانب دالان سے گزر کر آپ شبستانِ اقبال کے حصّہ میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ پورا حصّہ جو حرم سرا کا حصّہ ہے چاروں طرف سے محصور اور محفوظ ہے۔ داخل ہوتے ہی آپ کی نظر ایک خوبصورت سرخ رنگ کی عمارت پر پڑے گی جسے سُنہرا مکان کہا جاتا ہے اس کی دیواروں پر ہندو عقائد سے متعلق تصاویر بنی ہیں۔ اکبر کی ماں حمیدہ بانو بیگم جنھیں مریم مکانی کا خطاب ملا ہوا تھا مع گلبدن بیگم جو اکبر کی پھوپھی تھیں، اسی عمارت میں قیام کرچکی ہیں۔

حرم سرا کے اسی حصے میں سُرخ پتھر کی ایک دو منزلہ عمارت جس کا طرزِ تعمیر خالص ہندستانی ہے، واقع ہے۔ گائیڈ اسے بیربل کا مکان بتاتے ہیں۔ یہ وہی بیربل ہیں جن کے چٹکلے اور ملّا دو پیازے سے اُن کی چشمک روایتی تاریخ کا جز بن چکی ہے۔ لیکن اس عمارت کو بیربل کے مکان سے موسوم کرنا تاریخی حقیقت کے خلاف ہے۔ محل کے اس حصّے میں جسے ہم حرم سرا کے نام سے منسوب کرتے ہیں، بیربل یا کسی بھی مرد سوائے اکبر کے، داخل ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ مغلوں کے یہاں حرم سرا کے قوانین اور ضابطے بہت سخت تھے۔ اس حصّہ میں بیگمات کی نگرانی اور حفاظت کے لیے کنیزوں، مغلانیوں، ترکانیوں اور خواجہ سراؤں کی ایک فوج سی رہتی تھی۔ شہزادے بھی ایامِ شیر خواری کے بعد پرورش کے لئے محل کے اس حصّے سے باہر بھیج دیئے جاتے تھے۔ اس حصّے میں ان کے داخلے پر بھی پابندی تھی۔

حرم سرا کے اسی حصّے میں ایک محصور اور محفوظ عمارت اور بھی ہے جسے ابوالفضل شبستانِ اقبال کہتا ہے: اس عمارت کو سبھی جودھا بائی کا محل کہتے ہیں اور جودھا بائی کی وضاحت اکبر کی بیوی اور جہانگیر کی ماں کی حیثیت سے کرتے ہیں۔ اکبر کی کسی بھی بیوی کا نام جودھا بائی نہیں تھا۔ تاریخ میں یہ نام یا لقب کہیں بھی نہیں ملتا۔ جہانگیر کی ماں کے نام کا بھی ذکر نہیں ملتا۔ خود جہانگیر نے بھی اپنی ماں کے نام کا ذکر نہیں کیا خلاصۃ التواریخ میں جہانگیر کی ماں کا لقب مریم الزمانی تحریر ہے۔ لہٰذا اکبر کے وقت میں اس عمارت کا جودھا بائی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ جہانگیر کی ایک بیوی جس کا نام منو بہن تھا، راجہ بھگوان داس کی بیٹی تھی اس کا تعلق ریاست جودھ پور سے تھا اس بنا پر جہانگیر کی یہ بیوی رانی جودھ بائی کے نام سے بھی یاد کی جاتی ہے۔ لیکن اس جودھ بائی کا اکبر کی جودھا بائی کے محل سے کیا تعلق ہے۔ تاریخی مفروضہ کا موضوع ہے۔ اس محل کے بالکل پیچھے کنیزوں کی حرم سرا ہے جسے گائیڈ اصطبل بتاتے ہیں۔

حرم سرا سے باہر نکل کر آپ موجودہ ٹکٹ گھر کے پاس پہونچیں گے مغرب جانب رخ کرنے پر جامع مسجد کا بادشاہی دروازہ نظر آئے گا۔ اکبر اسی دروازہ سے مسجد آیا کرتا تھا۔ بادشاہی دروازے کے قریب ایک قبرستان ہے جس کے پیچھے ایک تین منزلہ چبوترہ آپ کو نظر آئے گا۔ چند برس قبل یہاں مٹی کا ایک ٹیلہ اور تودہ نظر آتا تھا۔ یہ عمارت اکبر کے شہرۂ آفاق عبادت خانے کا حصّہ ہے۔ اس کا جائے وقوع برسوں سے مورخین اور ماہرین آثار قدیمہ کے درمیان بحث کا موضوع رہا ہے ۱۵۷۵ء میں اکبر نے شیخ عبداللہ سرہندی کے مکان کو عبادت خانے میں تبدیل کیا تھا۔ یہ عبادت خانہ مذہبی مسائل پر بحث و مباحثہ کا مرکز تھا اور اکبر نے یہاں سے ایک نئے مسلک "دینِ الٰہی" کا بھی اعلان کیا تھا جس کی بنیاد صلح کل پر تھی۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے اس عمارت کو "خانۂ شدادی و فرعونی" لکھا ہے اور ابوالفضل اسے "عمارت مشترکہ" لکھتا ہے۔ نرسنگھ مصوّر کی بنائی ہوئی عبادت خانہ کی ایک تصویر جو لاہور میں بنائی گئی تھی، کی بنیاد پر اس عمارت کے جائے وقوع کا تعین کیا گیا ہے۔

دورانِ کھدائی برآمد ہونے والی عمارتیں فتح پور سیکری کی شہری زندگی پر بیش قیمت روشنی ڈالتی ہیں۔ امراء اور منصب داروں کے مکانات ملے ہیں لیکن ان مکانوں کے صاحبِ مکان کے متعلق کچھ کہنا ابھی مشکل ہے۔ جو مکاناتِ عہدِ اکبری کے امراء کے نام سے منسوب کردیئے گئے ہیں

اس کی کوئی سند نہیں۔ مثال کے طور پر جامع مسجد سے متصل شمال جانب ایک عمارت ہے جسے لوگ ابوالفضل اور فیضی کا مکان بتاتے ہیں۔ اگر اس عمارت کو غور سے دیکھا جائے تو یہ ایک شکل رہائشی مکان بھی نہیں۔ اسی عہد کے رہائشی مکانات جو کھدائی کے دوران منظر عام پر آئے' ان سے اگر اس عمارت کا مقابلہ کیا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ یہ عمارت رہائشی مکان نہیں ہے۔

امراء اور درباریوں کے رہائشی مکانات کے علاوہ ماہرین آثار قدیمہ متوسط اور غریب طبقے کے رہائشی مکان کی تلاش میں بھی مصروف رہے ہیں۔ چنانچہ دہلی دروازہ، گوالیار دروازہ اور چندر پول سے ملحق علاقے میں اندرون شہر پناہ اس طبقے کے رہائشی مکانات کے آثار دیکھنے میں آئے ابوالفضل اسی طبقے کے مکانات کا "غریب خانہ" کے نام سے ذکر کرتا ہے جسے اکبر نے اپنی غریب رعایا کے لیے تعمیر کروایا تھا۔

جامع مسجد میں داخل ہونے پر سنگ مرمر کا جو سفید مقبرہ نظر آتا ہے وہ اکبر کے عہد میں سرخ پتھر کا تھا۔ جہاں گیر کے دور حکومت میں حضرت شیخ سلیم چشتی رح کے اس مقبرہ کو قطب الدین خاں کوکہ نے سنگ مرمر میں تبدیل کرا دیا تھا۔ اسی مسجد میں حضرت شیخ کا جماعت خانہ سماع خانہ بھی ہے۔ یاد رہے کہ حضرت شیخ کے جس مزار پر کھڑے ہو کر آپ فاتحہ پڑھتے ہیں یا پھول اور چادر چڑھاتے ہیں وہ نقلی قبر ہے۔ شیخ رح کی اصل قبر تو بارہ فٹ نیچے سطح زمین پر کچی حالت میں ہے جہاں رسائی زنانہ روضہ کی طرف سے بذریعہ سیڑھی ہو سکتی ہے۔

اکبر نے جس شہر کی تعمیر کی ابتدا جذبۂ عقیدت مندی سے کی اور بعد میں پایۂ تخت کا رتبہ دے کر ایک سیاسی اہمیت کا حامل بنا دیا تھا وہ صرف چونے اور پتھر کے فوارے، حمام، حوض، مکانات محلات، مساجد اور سرائے کا مجموعہ ہی نہیں تھا بلکہ یہ شہر دور مغلیہ کے بہترین صنعتی شہروں میں سے ایک تھا۔ بظاہر طبی نقطہ نظر سے یہاں شراب خانہ بھی تھا اور اقتصادی حوصلہ افزائی کے لئے قمار خانہ بھی قائم کیا گیا تھا۔ اس شہر کے باہر لیکن شہر والوں کے لیے بقول بدایونی: "شیطان پورہ" (چکلہ) بھی آباد تھا۔ اکبر نے اس شہر میں بے شمار چھوٹے بڑے کارخانے، جن کی تعداد بقول ابوالفضل سو تک تھی، قائم کیے تھے۔ اس میں بیشتر بڑے کارخانے شاہی مصرف میں استعمال ہونے والے ملبوسات، زیورات، قالین، غالیچہ، فرش، اسلحہ وغیرہ تیار کرتے تھے۔ ہر قسم کے اہل صنعت و حرفت اکبر نے یہاں اکٹھا کر رکھے تھے۔ مصنوعات کی تیاری کا مشاہدہ اکبر بذات خود کیا کرتا تھا۔

بادشاہت ختم ہو گئی لیکن صنعت و حرفت کی جو بنیاد اکبر نے یہاں قائم کی تھی وہ آج بھی چھوٹے پیمانے پر صحیح طور پر یہاں قائم ہے۔ دری اور غالیچہ کی گھریلو صنعت یہاں کے لوگوں کا خاص ذریعہ معاش ہے۔ حضرت شیخ کی درگاہ، عہد اکبری کی عمارتیں اور گھریلو صنعت یہاں کی مقامی آبادی کے ذریعۂ معاش کا خاص سرچشمہ ہیں۔ اکبر کی عظمت کے سبھی قائل ہیں۔ لیکن مورخ کے اختلاف کے باوجود اس سرچشمہ فیض کے لیے سبھی بلا اختلاف مذہب و ملت حضرت شیخ کے مرہون منت ہیں اور ان کے فضل کا اقرار کرتے ہوئے بے ساختہ ان کے ہاتھ دعا کے انداز میں حضرت شیخ سلیم چشتی رح کے مزار کی طرف اٹھ جاتے ہیں۔

□□

غزل

زمانے کا اگر ڈر تھا تو پھر اک فاصلا رکھتے
ہمیں ڈستی نہ تنہائی اگر تم سلسلہ رکھتے
اگر آنے کا وعدہ تم نے ہم سے کر لیا ہوتا
بچھاتے رات بھر پلکیں، کواڑوں کو کھلا رکھتے
ہمارے بس میں کب تھا ورنہ ہم تو زندگانی بھر
لباسِ جسم سے اے زندگی تجھ کو جدا رکھتے
وہ روٹھے گا تو غزلوں کا ہنر نزدیک آئے گا
جو یہ معلوم ہوتا، عمر بھر اس کو خفا رکھتے
حسن اپنے اجڑنے کا کبھی شکوہ نہیں ہوتا
کسی کے غم میں اپنا دل اگر ہم مبتلا رکھتے

حسن کاظمی
پانی گاؤں بلڈنگ۔ چوتھی گلی نشاط گنج۔ لکھنؤ

غزلیں

اب تو رنگین تن کو دیکھتے ہیں
اب کہاں لوگ من کو دیکھتے ہیں

اس کی آنکھوں کے فن کو دیکھتے ہیں
نرگس و نسترن کو دیکھتے ہیں

یوں سب اس سیم تن کو دیکھتے ہیں
شیر جیسے ہرن کو دیکھتے ہیں

جا کے میلے میں سب پری چہرہ
اپنے اپنے سجن کو دیکھتے ہیں

سارے منظر ہیں گرد کے پیچھے
ہم غبارِ وطن کو دیکھتے ہیں

لوٹ کر ہم کو رہ نما جو ہوا
ہم تو اس راہزن کو دیکھتے ہیں

کوئی قاتل کو کچھ نہیں کہتا
سب مرے پیرہن کو دیکھتے ہیں

لکھنؤ درمیان ہے تسنیم
دلّی والے دکن کو دیکھتے ہیں

تسنیم فاروقی
تلسی داس مارگ
لکھنؤ ۳

یہ بھی سوچا ہے کہ تو بچ کے کدھر جائے گا
یہ جزیرہ جو سمندر میں اتر جائے گا

رات رنگینیاں ساتھ اپنے لیے جائے گی
صبح ہوتے ہی ہر اک خواب بکھر جائے گا

وہ مسافر کہ جسے ہوگا تجسّس تیرا
دشت کیا وہ حدِ امکاں سے گزر جائے گا

وہ کہ معصوم صفت، شدتِ غم میں نہ ملے
مجھ کو ہنستا ہوا دیکھے گا تو ڈر جائے گا

زرد ہاتھوں میں سیاہی کے سوا کچھ بھی نہیں
اب وہ کس منہ سے بھلا لوٹ کے گھر جائے گا

جب تک آئے گا یہاں ابر برسنے کے لئے
قافلہ وسعتِ صحرا سے گزر جائے گا

وہ کہے یا نہ کہے، ہے تو شناور یاسر
گہرے پانی میں کوئی کیسے اتر جائے گا

اصغر یاسر
تارن بہادر گنج
شاہجہاں پور ۲۴۲۰۰۱

کوئی دروازہ نہیں تھا کوئی الماری نہ تھی
میرا گھر ایسا تھا جس میں چار دیواری نہ تھی

بے غرض، بے لوث ہر اک شخص سے ملتے تھے ہم
یہ تصنّع، یہ بناوٹ، یہ اداکاری نہ تھی

جن کو اپنا جانتے تھے دشمنوں سے جا ملے
اب ہمارے دوستوں میں وہ رواداری نہ تھی

گاؤں کو کیوں تج دیا اس شہر میں کیوں آ گئے
کیا تمہارے کھیت کی آب و ہوا پیاری نہ تھی

پتھروں کے عہد میں بھی کچھ نہ کچھ کرتے تھے ہم
اس مشینی دور کی جیسی تو بے کاری نہ تھی

صاحبِ علم و ہنر کا حال احسن کیا لکھوں؟
سب کے سب فنکار تھے اور ان میں فنکاری نہ تھی

نواب احسن
۲۲۶/۲۵۱ بخشی بازار
الہ آباد

افسانہ

انور خاں
محمد علی روڈ۔ بمبئی

شائستہ لوگ

شائستہ، مہذب، گلاب کی طرح نازک، تاریخ کی گریجویٹ خوشنود اور وجیہ، خلیق اور نستعلیق وقار احمد ایک دوسرے سے ملے تو دونوں ہی ایک دوسرے کی طرف کھنچتے چلے گئے۔ ان کے دلوں نے گواہی دی کہ وہ ایک دوجے کے لیے ہی خلق ہوئے ہیں۔ ان کے دوستوں اور سہیلیوں کی یہ متفقہ رائے تھی کہ اس سے زیادہ موزوں جوڑے کا تصور ممکن نہیں۔

انھوں نے شادی کرلی۔ چند مہینے تو ایسے گزرے گویا وہ فردوس بریں میں ہوں۔ پھر پتہ نہیں کیوں پرفیکشن کے دلدادہ اس جوڑے کو بے حد معمولی، چھوٹی چھوٹی باتیں کھلنے لگیں۔ زرد رنگ کو دیکھتے ہی وقار احمد کی آنکھیں دکھنے کو آتی تھیں اور خوشنود کا یہ پسندیدہ رنگ تھا۔ جس دن وہ خوش ہوتی اسی رنگ میں رنگ جاتی۔ ساڑی ہو یا شلوار، قمیص، سینڈل، ربن ہر چیز زرد ہوتی۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ چاہتی تھی کہ وقار اس کو سراہیں۔ اس کے حسنِ انتخاب کی داد دیں۔ کوئی اچھی پارٹی ہو، کہیں جانا ہو، کسی تقریب میں شرکت کرنی ہو۔ وقار احمد کا جی اس تصور ہی سے الٹنے لگتا تھا کہ اب خوشنود سراپا بسنت میں ڈوب کر اس کے سامنے آئے گی۔ وہ بجھ جاتے۔

وقار احمد بچپن سے بات کے عادی تھے کہ کپڑے تبدیل کرتے تو قمیص، پتلون، دوسری چیزیں کرسی یا فرش پر چھوڑ دیتے بعد میں نوکر یا ان کی بہن اٹھا کر اسے کھونٹی میں لگا دیتے یا قرینے سے رکھ دیتے۔ خوشنود کو کمرے میں جہاں تہاں پڑے کپڑے بہت کھلتے تھے کہ اس سے گنوارپن جھلکتا تھا۔ اس کی کوئی سہیلی آجاتی اور اچانک صوفے پر پڑی ہوئی پتلون پر اس کی نظر پڑتی تو طبیعت مکدر ہو جاتی۔ اس نے نوکروں کو تاکید کر رکھی تھی کہ اس طرح کرسیوں یا صوفوں پر کوئی کپڑا پڑا ہوا دکھائی دے تو فوراً ہٹا لیں، لیکن انھیں اور بھی بہت سے کام تھے، وہ کہاں تک دھیان رکھتے۔ خوشنود خود بھی دھیان رکھتی مگر ہر وقت دھیان رکھنا بھی مشکل تھا۔ اسی طرح وقار احمد لکھنے پڑھنے کا کوئی کام کرتے تو فرش پر بچھے قالین پر کتابیں ہی کتابیں نظر آتیں۔ وہ خود قالین پر تقریباً اوندھے لیٹ جاتے۔ تکیہ بغل میں دبا ہوتا اور آنکھیں کتاب پر جمی ہوتیں۔ خوشنود کے لئے یہ منظر اس قدر کراہت آمیز ہوتا کہ وہ اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ دو ایک بار اس نے دبی زبان سے وقار احمد سے اس طرف توجہ دلائی بھی تو وقار نے ہنس کر ٹال دیا۔

"خوشنود! میں انسان ہوں۔ کوئی ڈیکوریشن پیس تو نہیں۔"

رفتہ رفتہ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ان کی زندگی میں اس قدر دخل انداز ہوئیں کہ انھوں نے ساتھ میں تقریبوں میں جانا ترک کر دیا۔ بے ضرورت آپس میں بات چیت اب وہ کم کرتے۔ ایک دوسرے کے مصروفیات میں بھی ان کی دلچسپیاں ختم ہو کر رہ گئیں اور وہ سوچنے لگے کہ کہیں شادی کرکے انھوں نے غلطی تو نہیں کی؟

اس صورت حال سے نپٹنے کے لیے انھوں نے طے کیا کہ شائستہ انسانوں کی طرح آپس میں تبادلۂ خیال کے ذریعہ اس مسئلے کو حل کریں گے۔ چنانچہ آپسی گفتگو کا ایک طویل دور شروع ہوا جو مہینوں جاری رہا۔ بالآخر وہ اس ناگوار نتیجے پر پہونچے کہ انھیں علاحدہ ہو جانا چاہیے۔ اپنے فیصلے پر انھیں بہرحال اطمینان ہوا کہ ایک انتہائی ناخوشگوار فیصلہ انھوں نے بغیر کسی تلخی اور آپسی رنجش کے کرلیا تھا۔

ان کے دوستوں کو جب اس فیصلے کا علم ہوا تو انھیں بڑا رنج ہوا۔ انھوں نے دونوں کو سمجھانے کی کوشش لیکن جب انھوں نے بتایا کہ یہ فیصلہ انھوں نے طویل تبادلۂ خیال کے بعد کیا ہے، تو وہ خاموش ہو گئے

بلکہ ایک دوست نے مشورہ دیا کہ چونکہ انھوں نے تہذیب اور شائستگی کی ایک نئی مثال قائم کی ہے اس لیے اس خوشی میں ایک شان دار پارٹی ہونی چاہیے۔

یہ تجویز سب کو پسند آئی۔ خوشنود اور وقار نے اعلان کیا کہ یہ پارٹی ان کی طرف سے ہوگی۔ دونوں نے مل کر پارٹی کا اہتمام کیا۔ مہمانوں کی فہرستیں بنیں۔ کھانوں کی تفصیلات طے ہوئیں۔ کھڑکیوں کے پردوں سے لے کر میزوں پر سجائے گئے پھول تک انھوں نے مل جل کر منتخب کیے۔ اس دوران وہ بالکل بھول گئے کہ ان میں شدید اختلافات ہیں اور وہ الگ ہونے والے ہیں۔ مہمانوں کے استقبال کے لیے خوشنود دروازے پر پیازی ساری میں ملبوس نظر آئی تو اس کی سہیلیوں نے فوراً سمجھ لیا کہ یہ وقار کی پسند ہے' اور اس نے اپنی سہیلیوں سے پیش گوئی کی یہ لوگ علاحدہ نہیں ہوں گے۔

پارٹی بڑی شان دار ہوئی۔ شائستگی اور بے تکلفی کے ساتھ ایک ہم آہنگی تھی جو کم ہی نظر آتی ہے۔ پرلطف فقرے' ہنسی مذاق اور پھر مختلف قسم کے کھیل جن سے سب لطف اندوز ہوئے۔ دعوت کا مزا عمدہ کھانوں نے دوبالا کر دیا۔ ہر شخص نے سیر ہو کر کھایا اور رخصت ہوتے وقت ہر جوڑے کی زبان پر یہی تھا کہ:

"جی تو نہیں چاہتا، لیکن وقت بہت ہو گیا۔ بڑا مزا آیا۔"

سب چلے گئے۔ وقار نے خوشنود کو اتنی عمدہ پارٹی کی مبارکباد دی اور خوشنود نے وقار کو۔ دونوں بہت خوش تھے اور اس بات کو فراموش کر چکے تھے کہ یہ پارٹی انھوں نے علاحدگی کی خوشی میں دی ہے۔ انھوں نے کپڑے تبدیل کیے اور پارٹی میں دوستوں' سہیلیوں کی باتوں' لطیفوں حرکتوں کا ذکر کرتے ہوئے بستر میں لیٹ گئے۔ بتی بجھائی اور ایک دوسرے کی باہوں میں سما گئے۔ یہ رات شاید سہاگ رات سے زیادہ سہانی تھی اس رات خوشنود کی سپردگی مکمل تھی اور وقار احمد کے جذبات کا سمندر انتہائی متلاطم۔ ایسی سرشاری انھیں کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ خوشنود تھک کر فوراً سو گئی۔ کروٹ بدلتے ہوئے وقار نے دیکھا کہ وہ نیند میں بھی مسکرا رہی تھی۔

سویرے خوشنود کی آنکھ کھلی تو وقار احمد جاگ چکے تھے۔

"صبح بخیر۔" خوشنود نے مسکرا کر کہا۔

وقار احمد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شادی کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ خوشنود کو اس کے سلام کا کوئی جواب نہ ملا ہو ۔۔۔ اس کا چہرہ اُتر گیا۔

دراصل وقار احمد نے اس کا سلام سنا ہی نہ تھا۔ وہ کچھ کھوئے کھوئے سے تھے۔

ناشتے پر رات کی پارٹی کا ذکر چھڑ گیا اور دیر تک وہ اپنے دوستوں' سہیلیوں' ان کی پرلطف باتوں' ہنسی مذاق اور گوناگوں چھوٹی چھوٹی باتوں کا ذکر کرتے رہے۔ یہ باتیں ابھی چل ہی رہی تھیں کہ وقار کے ایک دوست کا فون آیا۔ اس نے رات کی پارٹی کی مبارک باد دی۔ خوشنود سے بھی چند باتیں کیں۔ جب ریسیور پھر وقار احمد کے پاس آیا تو اس نے کہا:

"بہرحال یار پارٹی تو ہو گئی۔ لطف بھی آیا۔ لیکن ہم سب کی خواہش یہی ہے کہ آپ لوگ علاحدہ نہ ہوں۔"

وقار احمد نے کوئی جواب نہیں دیا۔

کچھ دیر بعد خوشنود کی سہیلی کا فون آیا، اور پارٹی کی مبارک باد دینے کے بعد اس نے بھی وہی بات دہرائی ۔۔۔ خوشنود نے کوئی جواب نہیں دیا تو اس نے پوچھا:

"اچھا یہ تو بتاؤ کہ آپ لوگ علاحدہ کب سے ہو رہے ہیں؟"

خوشنود ہنسی۔

"کیا خیال ہے؟" اس نے کہا "تمھارے ارادے نیک نہیں معلوم ہوتے؟"

مذاق میں ٹال تو دیا لیکن واقعی علاحدگی کی تاریخ تو انھوں نے طے نہیں کی تھی۔

اس نے وقار احمد سے کہا:

"لوگ پوچھ رہے ہیں کہ ہم کب سے علاحدہ ہو رہے ہیں۔"

"واقعی یہ تو ہم نے طے نہیں کیا۔" وقار احمد نے تعجب سے کہا۔

"بہرحال کیا مشکل ہے۔ ابھی طے کر لیتے ہیں۔"

اثنائے گفتگو انھیں اندازہ ہوا کہ یہ کام اتنا آسان نہ تھا جتنا (باقی)

غزلیں

احترامِ بہار کرتے ہیں
پھول پر دل نثار کرتے ہیں
وہ نہ آئے نہ آئیں گے ہرگز
پھر بھی ہم انتظار کرتے ہیں
مست آنکھوں کو دیکھ کر مے کش
توبہ کیوں بار بار کرتے ہیں
غمِ دل سن رہے ہوائے تارو!
ہم تمھیں رازدار کرتے ہیں
موسمِ گل کے آتے ہی مضطر
پیرہن تار تار کرتے ہیں

مضطر تاجپوری
تاج پور ڈیہمہ ضلع غازی پور

یہ زبانِ بے زبانی اور ہے
دردِ دل کی ترجمانی اور ہے
نشۂ جوشِ جوانی اور ہے
یہ شرابِ ارغوانی اور ہے
داغِ فرقت کے سوائے چارہ گر
تیرِ مژگاں کی نشانی اور ہے
یہ اثر بلبل کے نالوں میں کہاں
دُکھ بھرے دل کی کہانی اور ہے
نظم کر لینا تو آساں ہے صدا
شعر گوئی نغمہ خوانی اور ہے

مرزا محمد ہادی صدا لکھنوی
گولہ گنج۔ لکھنؤ

ہم یہ کارِ محال کرتے ہیں
یعنی خوش ہیں کمال کرتے ہیں
جرم قابیل ہی کے سر ہوگا
لوگ جنگ و جدال کرتے ہیں
عہدِ حاضر میں جستجوئے وفا
آپ بھی کیا کمال کرتے ہیں
میرا ماضی کریدنے والے
کیسے کیسے سوال کرتے ہیں
جن کا عزمِ سفر ہے پژمردہ
بس وہی قیل و قال کرتے ہیں
زندگی آئینہ دکھاتی ہے
جب بھی فکرِ مآل کرتے ہیں
بات کرتے ہیں آپ کی یونس
یوں بھی ذکرِ جمال کرتے ہیں

یونس رحمانی الٰہ آبادی
اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ

کوئی دیوار نہ آنگن ہے نہ در باقی ہے
پھر بھی کہتے ہیں بہت لوگ کہ گھر باقی ہے
وہ تھے بیہوش مگر ہوش میرے قائم ہیں
سامنے آؤ ابھی تابِ نظر باقی ہے
رونقِ آئینہ خانہ نہ کبھی پھر ہوگی
آئینے ٹوٹ گئے آئینہ گر باقی ہے
دیکھئے کیسے ہو اب مشقِ ستم کا آغاز
تیغ باقی ہے ابھی اور مرا سر باقی ہے
چاہے پژمردہ ہو یا ہو وہ شگفتہ ساحر
خاطرِ گل کے لئے حسنِ نظر باقی ہے

ساحر زیدپوری
چھوٹے صاحب عالم روڈ،
سعادت گنج، لکھنؤ

جینے کے لیے کوچۂ گمنام دیا ہے
اچھا یہ ہمیں آپ نے انعام دیا ہے
اچھی نہیں لگتیں ہمیں اب ہوش کی باتیں
اس جانِ تمنا نے عجب جام دیا ہے
ہم جان گئے راز ترا زندگی جب سے
اُلفت نے تڑپنے کا ہمیں کام دیا ہے
میرے لیے سب کچھ ہے وہی عشرتِ دنیا
خاموش نگاہی نے جو پیغام دیا ہے
محمود ہیں ہم خاک قدم پیش رووں کے
مانا ہمیں دُنیا نے بڑا نام دیا ہے

محمود الحق محمود
اے ۶۸-۵ ، برا ریلوے کالونی
لکھنؤ

سارا گلشن جیسے میرے حال کی تصویر ہے
پتے پتے پر میری ہی داستاں تحریر ہے
یہ ہمارے خون کی ادنیٰ سی اک تاثیر ہے
دور تک پھیلی ہوئی تنویر ہی تنویر ہے
حکمراں کل تھے مگر صیاد کا خطرہ ہے آج
وہ ہمارا خواب تھا یہ خواب کی تعبیر ہے
اس چمن کی ہر روش پر نام لکھا ہے میرا
پتے پتے پر ہماری داستاں تحریر ہے
روشنی پھیلی ہوئی ہے آج تا حدِ نظر
ہر طرف حافظ تیرے اخلاق کی تنویر ہے

حافظ لکھنوی
۳۶۔ منصور نگر۔ لکھنؤ

کہانی

شمس الدین
۱۵/۷۔ بیج ناتھ پاڑہ۔ رائے پور (ایم۔پی)

مستانی

پُونَہ سے قریب چکند کے گھنے جنگلوں کی جانب جانے والی راہ کو گاؤں کے لوگ اکثر چھوڑ دیتے تھے۔ لوگوں کا عقیدہ تھا کہ شام کے وقت ان گھنے جنگلوں کی جانب سے سنہرے پروں والی ایک چڑیا جس کے پروں میں قیمتی ہیرے اور جواہرات جڑے ہوتے تھے آتی تھی اور نوحہ خوانی کرتی تھی۔ اس کی دردناک آواز میں کسی تڑپتے اور دکھی دل کی پکار ہوتی تھی۔ ایک ایسا سوز و گداز جو صرف انسانی جذبات کی عکاسی کر سکتا ہے۔ لوگوں کے عقیدے کے تحت وہ چڑیا مستانی کی روح ہے جو اپنے وقت کی حسین و جمیل رقاصہ تھی، اور اپنے محبوب سے ملنے کے لیے جاتے وقت اسی جگہ پر ہمیشہ کے لیے موت کی آغوش میں سو گئی تھی۔

مہاراشٹر کی تاریخ میں پیار اور محبّت کی بہت کم داستانیں مستانی کے لازوال پیار کی کہانی کی طرح ذہن پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ شیواجی کے بعد مراٹھوں کی تاریخ کی سب سے اہم شخصیت پیشوا باجی راؤ اوّل تھا، جس نے مراٹھا حکومت کو عروج کی انتہائی منزلوں تک پہونچا دیا تھا۔ مستانی اسی کے دربار کی مشہور و حسین رقاصہ تھی۔

مستانی ایک قسمت والی عورت تھی، جس کے پیار و محبّت کی داستان آج بھی کہانیوں اور گیتوں میں لوگ گاتے ہیں۔ اس کے والدین مسلم تھے اور وہ ایسے طبقے سے تعلق رکھتی تھی جہاں جسم اور چہرے کی خوبصورتی ہی ذریعہ معاش ہوتی ہے۔ اپنی اداؤں اور ابروؤں کے اشاروں سے دیکھنے والوں کو غلام بنا لینا ہی ان کا فن تھا، اور یہ قسمت کی خوبی تھی کہ اسے وقت کے ایک اہم حکمراں اور باوقار شخص باجی راؤ کے پاس بھیج دیا گیا تھا۔

دو عظیم روحوں کا اتصال ہوا اور ایک رقاصہ کی زندگی بالکل تبدیل ہو گئی۔ مراٹھا حکمراں باجی راؤ اس کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہو گیا۔

"تم کو پا کر میں اپنے اوپر ناز کرنے لگا ہوں مستانی۔ آج تک جنگ میں کسی شخص نے اتنی قیمتی اور خوبصورت چیز نہ پائی ہوگی۔"

باجی راؤ اس کو اپنی مضبوط باہوں میں لے کر بولا۔ "تمھارا حسن و جمال اتنا مدہوش کُن ہے کہ میں سوچتا ہوں اس شراب محبّت کو کس طرح پیوں۔"

مستانی نے خواب آلود نگاہوں سے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور اس کے کشادہ سینے میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔ کبھی کبھی جذبات کا اظہار خاموشی اس انداز سے کر دیتی ہے کہ دنیا کی ساری زبانیں اور الفاظ بیگانہ ہو جاتے ہیں۔ دل کی دھڑکنیں جس افسانے کو دہراتی ہوں اسے ہم الفاظ میں کس طرح مقید کر سکتے ہیں۔

رات کی خاموشی میں جب دل کی دھڑکنیں پیار و محبت کے نغموں سے بوجھل قدرت کی آغوش میں گنگناتی ہیں، سرگوشیاں کرتی ہیں اور کسی کے پیار میں ڈوب جانے کے لیے بے قرار ہو جاتی ہیں۔

پیار کے اس وجدانی دور سے باجی راؤ اور مستانی گزر رہے تھے انھیں کسی بات کا ہوش نہیں تھا، کسی اور کا خیال ہی نہیں تھا۔ اس بے خودی نے باجی راؤ کو امورِ سلطنت سے بیگانہ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی شراب نوشی اور گوشت خوری وغیرہ نے اہلِ دربار کو برانگیختہ کر دیا۔

لیکن باجی راؤ کی پہلی بیوی کاشی بائی ایک سمجھ دار عورت تھی۔ اس نے مستانی سے کسی قسم کی حسد نہیں کی اور نہ ہی اس کو سوت تصوّر کیا۔ اس کے برعکس اس کا برتاؤ ایک سہیلی کی طرح رہا۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اپنے شوہر کی ہر خوشی کو اپنی خوشی سمجھتی تھی۔ اس کو خوش دیکھ کر خوش ہونا اور ایک وفادار بیوی کے تمام فرائض ادا کرنا وہ اپنا فرض

سمجھتی تھی۔ اسی وجہ سے اس نے ہمیشہ مستانی کے آرام کا خیال رکھا اور اس کے ساتھ ایک بہن کی طرح برتاؤ کیا۔

متعین وقت پر کاشی بائی اور مستانی کے گھر دو لڑکوں کی پیدائش ہوئی۔ کاشی بائی کے لڑکے کا نام راگھوبا اور مستانی کے بیٹے کا نام شمشیر رکھا گیا۔ حالاں کہ دونوں لڑکوں کا باپ ایک ہی تھا لیکن پھر بھی ایک مصیبت یہ ہوئی کہ کاشی بائی کے بیٹے کے لیے تمام شاہی عیش و آرام کا اہتمام کیا جاتا تھا اس کے برعکس شمشیر کو وہ عیش و آرام بہم نہ ہو پاتا۔ یہ جھگڑا اس وقت عروج پر پہونچ گیا جب جنیؤ پہنانے کے جشن کا اہتمام کیا گیا اور اس میں صرف راگھوبا کو جنیؤ پہنایا گیا۔ شمشیر کو اس جشن میں کوئی اہمیت نہیں دی گئی حالاں کہ اس موقع پر باجی راؤ سخت برہم ہوا۔ اس نے غصے اور جلال میں بہت دھمکیاں دیں لیکن مذہبی ٹھیکیداروں نے ایک مسلم ماں کے بطن سے پیدا شمشیر کو اس خالص مذہبی رسم میں شامل کرنے سے صاف انکار کردیا۔

اس حادثے نے باجی راؤ پیشوا کے ذہن پر بہت برا اثر ڈالا اور وہ حکومت کے کاموں سے بددل ہوگیا۔ یہاں تک کہ ایک بار جب اس کی ایک دشمن ریاست نے اس پر حملہ کرنے کی دھمکی دی تو اس نے اپنے لشکر کی سپہ سالاری سے بھی انکار کردیا۔

حکومت کے ذمہ داران اور دوسرے افسران سارا واقعہ جانتے تھے ان کے خیال میں ان سب باتوں کی ذمہ دار مستانی ہی تھی، جس نے اپنے حسن و جمال سے باجی راؤ کو غلام بنا رکھا تھا۔ اس لیے ان لوگوں نے مستانی کو راستے سے ہٹانے کی ترکیبیں سوچنا شروع کردیں۔

پونہ کے قلب میں ایک پرانا قلعہ واقع ہے، جس کے در و دیوار آج بھی ماضی کی عظمت و سطوت کی کہانی دہرا رہے ہیں۔ اس قلعہ کو باجی راؤ کی محبوبہ مستانی کے قید کرنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ جب دربار کے معززین نے دیکھا کہ ان دونوں محبت کے دیوانوں کو جدا کرنا مشکل ہے تو انھوں نے مستانی کو اغوا کرلیا اور اسی قلعہ میں اسے قید کردیا۔ حالاں کہ یہ حرکت ان لوگوں نے حب الوطنی کے جذبے کے تحت کی تھی لیکن باجی راؤ کے لیے زندگی جہنم بن گئی۔ مستانی کی جدائی سے باجی راؤ دیوانہ ہوگیا اور لشکر کو لے کر دشمن پر چڑھ دوڑا اس کو جھلاہٹ اور بے نیازی کا جذبہ ہی کہا جاسکتا ہے۔ لیکن جنگ میں فتح حاصل کرنے کے بعد بھی دل و دماغ کو سکون نہ حاصل ہوسکا۔

نتیجے میں وہ بستر پر دراز ہوگیا۔ اس کی اس مجنونانہ کیفیت سے سبھی پریشان ہوگئے، اور بالآخر باجی راؤ کو سیاحت کے لیے دور دراز کے مقامات پر لے گئے تاکہ اس کا بہتر علاج ہوسکے۔ اس کا یہ حال سن کر کاشی بائی اس کے پاس پہنچی اور اس کی تیمارداری میں دن رات ایک کردیا۔ لیکن یہ اس کی بدقسمتی ہی تھی کہ عالم بے ہوشی میں بھی باجی راؤ مستانی کو پکارتا رہا۔ اس نے کاشی بائی کو دیکھا تک نہیں وہ تصور میں مستانی ہی کو اپنے قریب دیکھتا جو کسی معجزے کے تحت قید خانے کی سنگلاخ دیواروں سے نکل کر اس کی تیمارداری کررہی تھی۔ اس کے دل کی ہر دھڑکن مستانی کو پکار رہی تھی۔ اس وقت کاشی بائی کے احساسات پر چوٹ لگی اور اسے یقین ہوگیا کہ اس کا سرتاج اور مالک اپنے دل میں کسی دوسری عورت کی پرستش کرتا رہا ہے۔ باجی راؤ کی حالت دن بدن بگڑتی رہی اور وہ موت سے قریب تر ہوگیا۔

کاشی بائی ایک وفادار بیوی کی طرح اپنے شوہر سے جدا ہونا نہیں چاہتی تھی، اس نے 'ستی' ہونے کی تیاری شروع کردی تاکہ اپنے شوہر کے جسم کے ساتھ ہی نذر آتش ہوکر ہمیشہ کے لیے امر ہوجائے

ادھر مستانی کو جس وقت باجی راؤ کی اس حالت کا علم ہوا تو اس نے اپنے مالک اور محبوب کے آخری وقت میں اس کی بالیں پر پہونچنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ اس نے ایک لالچی سپاہی کو کافی دولت کی لالچ دے کر اس سے ایک گھوڑا حاصل کرلیا۔ اس نے گھوڑا سرپٹ دوڑایا اور دھڑکتے دل سے اس جگہ پہونچنے کی کوشش کی جہاں باجی راؤ مقیم تھا۔ لیکن مستانی کے اس جگہ پہونچنے سے پہلے ہی باجی راؤ موت کے ظالم ہاتھوں میں پہونچ چکا تھا۔ مستانی کو یہ دل خراش خبر چکند کے گھنے جنگلوں کے درمیان ملی۔ وہ بالکل دیوانی ہوگئی۔ اس خبر کا اس پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ وہ اسی جگہ گر کر فوت ہوگئی۔ شاید اسے یہ امید تھی کہ وہ اپنے محبوب شوہر سے دوسرے جہان میں مل جائے گی۔

اس طرح پیار و محبت کی یہ بے مثال داستان ختم ہوگئی۔

اس جنگل میں جہاں مستانی نے آخری سانس لی تھی، آج بھی لوگ

ایک بے مثال چڑیا دیکھتے ہیں جس کے پر خوب صورت سنہرے رنگ کے ہیں اور پروں پر قیمتی اور خوبصورت منقش بنے ہوتے ہیں وہ چڑیا آہ و زاری کرتی ہے۔ اس کی نوحہ خوانی کسی تڑپتے اور تشنہ انسانی جذبات کی عکاسی کرتی ہے۔ یہ داستان مہاراشٹر کی سب سے المیہ داستان سمجھی جاتی ہے۔ اسی لیے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ وہ چڑیا مستانی ہی ہے جو اپنے محبوب سے آخری وقت میں نہ مل سکی، اس کی جدائی پر تڑپتی ہے ... آہ و زاری کرتی ہے۔

ہندوستان کی تاریخ میں بہت کم ہی پیار و محبت کی داستان انسانی ذہن کو متاثر کرتی ہے جتنی مستانی اور باجی راؤ پیشوا کی بے مثال عشق و محبت کی کہانی۔ آج مہاراشٹر کے جذباتی گیتوں اور کہانیوں میں دونوں کے پیار کی داستان موضوع بنی ہوئی ہے۔

یہ ہے ایک حسین رقاصہ اور پیشوا کی وہ لازوال داستان جو بزم طرب سے شروع ہو کر ایک المیہ پر ختم ہو گئی۔

□□

مخطوطہ کلیاتِ ولی —— صفحہ ۲۰ کا بقیہ

نسخہ آصفیہ کی یہ غزل جناب ہاشمی صاحب نے غزل نمبر ۲۷ ص ۲۸۹ میں ضمیمہ الف میں درج کی ہے اور انھوں نے اسے اشرف شاگرد ولی کی طرف منسوب کیا ضمیمہ میں یہ شعر زیادہ ہے ؎

بسکہ ہے بے ہر دو خوں خوار دل　　خون دل میرا پیا ہے الغیاث

۸ یہ غزل ڈاکٹر ہاشمی صاحب نے ضمیمہ (الف ص ۲۹۱) میں غزل نمبر ۱۶ کے تحت پانچ شعر میں درج کی ہے۔ حاشیے میں یہ غزل اشرف کی دکھائی گئی ہے۔ نسخہ آصفیہ میں اس میں پانچ شعر ہیں۔ مقطع ایک جیسا ہے لیکن غزل کا چوتھا شعر نسخۂ ہاشمی میں غزل نمبر ۴۴ (صفحہ ۱۵۸) میں ذیل کی غزل کا تیسرا شعر ہے ؎

میں جب مستی دیکھا ہوں بہار گل نرگس
ہے وحشی دل تب سوں شکار گل نرگس

۹ نسخہ ہاشمی میں غزل کے سات شعر ہیں۔ ذیل کے دو شعر نسخۂ آصفیہ میں نہیں ہیں ؎

دل مرا کیوں نہ بند ہو اس کا　　آج رنگیں قبا ہے امرت لال

لعل تیرے بھرے ہیں امرت سوں　　نام تیرا بجا ہے امرت لال

۱۰ یہ غزل ہاشمی صاحب نے ضمیمۂ الف (غزل نمبر ۴۳ ص ۱۰۴) میں درج کی ہے اور اس کے آخر میں (ن ۲۰) لکھا ہے۔ اس سے مراد ہے دیوان ولی نسخۂ سالارجنگ مکتوبہ ۱۱۲۵ھ

۱۱ مطبوعہ ہاشمی ؎ مصحف رُخ ترا ہے سورت فجر

□□

شائستہ لوگ ۔۔۔۔۔۔۔ صفحہ ۴۴ کا بقیہ

وہ سمجھ رہے تھے۔ دو ماہ بعد خوشنود کی بہن کی شادی تھی، اور علاحدگی کی خبر سے اس پر اثر پڑ سکتا تھا۔ وقار احمد نے ابھی اپنے والدین سے گفتگو نہیں کی تھی۔ یہ مرحلہ اور بھی کٹھن تھا۔ اس وقت انھیں بہتر یہی معلوم ہوا کہ اس فیصلے کو کم از کم دو ماہ کے لیے ٹال دیا جائے۔

اس کے بعد ایک بار پھر آپسی گفتگو کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا جو آج تک جاری ہے۔ وقار احمد کی کنپٹی کے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی ہے۔ خوشنود کی زلفوں میں کبھی کبھی چاندی کا ایک تار چمک اٹھتا ہے۔ وہ اپنے فیصلے پر قائم ہیں لیکن گفتگو بہرحال جاری ہے اور شاید آئندہ بھی جاری رہے۔

□□

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: عزم و علم (شعری مجموعہ)
شاعر: صغیر ریاض جبلپوری۔ قیمت: تیس روپے
ملنے کا پتہ: صغیر ریاض ۹۹/۴۴۔ ساؤتھ ملونی گنج
جبل پور

جناب صغیر ریاض مدت مدید سے گیسوئے سخن کی مشاطگی میں مصروف ہیں۔ ۱۹۸۹ء میں ان کی غزلیات کا گراں قدر مجموعہ "قرطاس و قلم" شائع ہو کر مقبول عام ہوا تھا۔ "عزم و علم" ان کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔

حضرت ریاض کا شمار ان شعراء کے زمرے میں ہوگا جو عمر رسیدگی کے باوجود ہمیشہ تازہ دم رہتے ہیں اور ہر آن اپنے عزم کے ساتھ نئی شان کا پھریرا لہراتے ہوئے منزلوں پر منزلیں سر کرتے جاتے ہیں اور اپنے با مقصد قلم سے ایمان افروز گل بوٹے صفحۂ قرطاس پر اگاتے رہتے ہیں۔

چنانچہ ان کی غزلوں میں ان کی جیسی طباعی، تنوع، زندہ تخلیقیت عصری حسیت اور اظہار و ادا کے جیسے تیور دیکھنے میں آئے تھے۔ اب کچھ ویسی ہی تازہ کاری کے ساتھ نظموں کی دنیا میں بھی وہ ہر آن نئے طور اور نئی برق تجلی کا جلوہ دکھلانے کو حاضر ہوئے ہیں۔

"عزم و علم" ان کی حمد و نعت اور مناجات و منقبت کا دل کو زندہ اور ایمان کو تازہ کرنے والا مجموعہ ہے خصوصاً اس مجموعے میں آپ نے سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام کے تئیں جیسی محبت اور عقیدت کا والہانہ اظہار کیا ہے وہ ان کے جوشِ ایمانی کی دلیل ہے ؎

جب بھی تاریخ امامت کا سوال آئے گا
وقت شبیرؑ کے اعلان کو دہرائے گا

عام شائقین علم و ادب کے ساتھ ساتھ یہ مجموعہ ان حضرات کیلئے بیش قیمت تحفہ ہے جن کے دل اہل بیت کی محبتوں سے معمور ہیں۔

—— ناوک حمزہ پوری

نام کتاب: "دن رات" (شعری مجموعہ)
شاعر: نعیم صبا قیمت: ۵۰/- روپے
ملنے کا پتہ: بھوپال بک ہاؤس۔ بدھوارہ
بھوپال

"دن رات" غزلوں اور پابند و آزاد نظموں پر مشتمل نعیم صبا کا شعری مجموعہ ملک کی اردو اکادمیوں کی مالی اعانت سے چھپنے والے لاتعداد شعری مجموعوں کے انبار میں ایک اور اضافہ ہے۔

کتاب کے دیباچہ نگار نے نعیم صبا کا کلام ملک کے مختلف جرائد میں شائع ہوتے رہنے اور ان کی شعری خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"..... انھوں نے کچھ ایسے پیکر تراشے ہیں جو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں"

"دن رات" کے چند شعر بطور نمونہ درج ہیں جو شاعر کی صلاحیتوں کا اندازہ لگانے اور ان کے تراشیدہ پیکروں کے بارے میں رائے قائم کرنے میں معاون ہوں گے ؎

حالانکہ روکتا رہا میں اس کو بار بار
آیا نہ باز ڈوب گیا وہ غبار میں

ہے خیالوں میں کبھی دھوپ، کبھی چھاؤں کبھی آئینہ
مسکراتے ہیں مرے خواب میں تیرے پیکر

رنج و غم اوڑھ کر صبا تن پر — کیوں یہ غمگین سی فضا چہکے

اچھے کاغذ پر چھپے اس مجموعہ کی کتابت و طباعت بھی دیدہ زیب ہے۔

—— عرفان عباسی

نام کتاب: معترضینِ ابوالکلام آزاد
مصنف: عبداللطیف اعظمی قیمت: ۲۶/- روپے
ملنے کا پتہ: عبداللطیف اعظمی۔ ۲۴۹، ذاکر نگر، جامعہ نگر
نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۲۵

عبداللطیف اعظمی صاحب آزاد شناسی کے لئے شہرت رکھتے ہیں۔ انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کو سمجھنے اور سمجھانے کا ایک طرح ذمہ لے رکھا ہے۔ مختلف اخبارات اور رسائل میں مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت اور کارناموں کے سلسلے میں انھوں نے متعدد مضامین لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی چار کتابیں بھی قابلِ ذکر ہیں۔

"معترضینِ ابوالکلام آزاد" میں عبداللطیف اعظمی نے مولانا آزاد پر اعتراضات کرنے والوں کو نہ صرف جوابات دیئے ہیں بلکہ معقول کرنے کی حتی المقدور کوشش کی ہے۔

اگرچہ اعظمی صاحب یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں کہ "مولانا آزاد کو ہر قسم کے عیوب و نقائص سے بالاتر نہیں سمجھتے۔ لیکن انھوں نے جس طرح مولانا ابوالکلام پر اعتراضات کرنے والوں کے اعتراض کا برا مانا ہے اور ہر طرح اعتراض کرنے والے ہی کو قابلِ اعتراض قرار دینا چاہا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ مولانا ابوالکلام آزاد کو ایک ایسے انسان کی حیثیت سے دیکھتے ہیں جس سے کوئی غلطی اور خطا ممکن نہیں وہ مولانا آزاد کے چاہے جتنے بڑے پرستار ہوں اور مولانا کو چاہے جتنا عظیم ثابت کرنے کی کوشش کریں' ان کی۔ بات تو بہرحال نہیں تسلیم کی جاسکتی کہ مولانا آزاد نے کبھی کوئی غلطی نہیں کی۔

اعظمی صاحب کی زیرِ تبصرہ مختصر سی کتاب ان کی ابوالکلام آزاد سے بے پناہ عقیدت کی مظہر ہے لیکن اس کے مطالعے سے یہ بھی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی آزاد پرستی کے جوش میں ہر اس شخصیت کو مسخ کر دینے کی اور ہر اس آدمی کو جاہل ثابت کرنے میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی جس نے مولانا آزاد پر ذرا بھی انگلی اٹھائی۔ حد یہ ہے کہ مولانا غلام رسول مہر جو کہ مولانا آزاد کے (خود اعظمی صاحب کی تحریر کے مطابق) مرید اور عقیدت کیش تھے اور پایہ کے صحافی اور جید مصنف تھے انھیں بھی اعظمی صاحب نے غلط ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کی' لیکن اس کے باوجود آج بھی مولانا آزاد کی شخصیت سے متعلق بہت سے اہم سوال ابھرتے ہیں اور جب بھی مولانا آزاد کا نام آتا ہے تو مولانا کی ادبیت، ان کی عظمت دینی خدمات اور دانش وری سب کچھ تسلیم کرتے ہوئے یہ سوال ابھرتا ہے کہ کیا مولانا نے اپنی شخصیت کے حصار کو توڑ کر عوام الناس اور خصوصاً پس ماندہ، ناخواندہ اور درماندہ مسلمانوں کے لیے کچھ کیا۔؟ اور یہ سوال بھی کہ ملک کے بہت ہی طاقت ور اور با اثر وزیر تعلیم ہوتے ہوئے بھی اُردو کے فروغ کے لئے وہ کیوں نہیں کچھ کر سکے؟ جبکہ وہ اُردو کے بڑے پرستار' انشا پرداز اور قدرداں تھے۔؟! حقیقت نگاری تو یہ ہے کہ جب بھی کسی پہلو کو دیکھا جائے تو مثبت اور منفی دونوں حیثیتوں سے ایماندارانہ جائزہ لیا جائے۔

بحیثیت مجموعی عبداللطیف اعظمی صاحب کی کتاب خاصی دلچسپ ہے اور اس سے بہت سی مفید باتیں معلوم ہوتی ہیں اور ایک عام قاری کے لیے تو اس میں بہت سی معلومات یکجا ہیں۔ کتابت اور طباعت معیاری ہے اور قیمت بہت مناسب ہے۔

———— احمد ابراہیم علوی

نام کتاب: "دُرگت"
شاعر: ٹی۔ این۔ راز قیمت: ستر روپے
ملنے کا پتہ: ۱۳۹۵، سیکٹر ۱۵، پنچکولہ ۱۳۴۱۰۹
(ہریانہ)

ٹی۔ این۔ راز کا تعلق پنجاب اور ہریانہ کی سرزمین سے ہے یہ وہ علاقہ ہے جہاں سے اُردو طنز و مزاح کا پہلا شاعر جعفر زٹلی پیدا ہوا تھا۔ لیکن پنجاب کی تقسیم در تقسیم کے مسئلے اور الجھن نے جیسے یہاں کے مزاحیہ مزاج ہی کو ڈس لیا تھا تب ہی تو تقریباً نصف صدی سے یہاں کا کوئی باقاعدہ اُردو کا مزاحیہ شاعر سامنے نہیں آیا۔ آزادیٔ وطن کے بعد ٹی۔ این۔ راز شمالی ہندستان کا پہلا شاعر ہے جس کا شعری مجموعہ "درگت" پوری آب و تاب کے ساتھ منظرِ عام پر آیا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ یہ مجموعہ کسی بھی سرکاری یا غیر سرکاری ادارے

کے مالی تعاون سے پاک ہے۔ اس اعتبار سے بھی راز کا مجموعہ "دُرگت" ایک قابلِ قدر پیش کش ہے۔

دُرگت ایک ایسا مزاحیہ شعری مجموعہ ہے جو پڑھنے والوں کو ایک تحفے کے طور پر دوستوں میں بانٹنے پر مجبور کرتا ہے۔ انتہائی دیدہ زیب سرورق جو تین رنگوں پر مشتمل ہے۔ مجموعے میں راز نے "ہم سے ملئے" عنوان کے تحت بہترین مزاحیہ انداز میں اپنی شاعری کی بابت مضمون شامل کیا ہے۔ شاعری اور شاعر کا تعارف ڈاکٹر ناشر نقوی نے دیا ہے۔

مجموعے کے پہلے حصے میں راز نے غالب کی چالیس غزلوں کی زمینوں میں چھیڑ خانی کی ہے۔ یہ چھیڑ خانی از خود غالب شناسی میں ایک اضافہ ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مجموعے کی خوبصورتی مزاحیہ شاعروں کے اسکیچوں سے بڑھی ہوئی ہے۔ غالب کی زمین میں شعر ملاحظہ ہو

بہتا دریا کاٹ دو تلوار سے
اس طرف کا میرا پانی اور ہے

مجموعے کے دوسرے حصے میں "حماقتا" کے عنوان سے چھبیس نظمیں شامل ہیں۔ کچھ ہزلیں بھی ہیں جو ذوق۔ جوش۔ شکیل۔ کنور مہندر سنگھ بیدی، قتیل اور جگر وغیرہ کی زمینوں میں ہیں۔ 'جاڑے میں' 'چائے' 'گزر جا' اور 'نیتا جی' نظمیں بے حد جاذبِ نظر اور جاذبِ سماعت ہیں شعر ملاحظہ ہو

گاؤں کی پنہاریوں کے ہونٹ چھونے کیلئے
چین سے ہندوستان تک کی ہے ہجرت چائے نے

مجموعی طور پر ٹی۔ این۔ راز کا مجموعہ مزاح ظریفانہ شاعری میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے کلام میں تبسم کی ایسی خوشبو ہے جو سماج کے گھٹے ہوئے ماحول پر اس طرح چھا گئی ہے کہ پڑھنے والوں کو ایک عجیب صحت افزا لطف ملتا ہے۔ مجموعے کی کمزوری یہ ہے کہ اس میں کتابت، طباعت اور پروف ریڈنگ کی کوئی غلطی نظر نہیں آتی۔ اس غلطی کے لیے بھی راز مبارکباد کے مستحق ہیں۔ دُرگت خرید کر پڑھنے سے اردو دوستوں کی اردو نوازی مضبوط ہوگی۔

——— شمس تبریزی

نام کتاب: "دُور کے پہاڑ" (افسانوں کا مجموعہ)
مصنف: خواجہ عبدالرزاق کھڑگ پوری
قیمت: تیس روپئے۔ ملنے کا پتہ: ۱۱۹، ایل ٹو اسٹریٹ، مال روڈ ساکچی۔ جمشید پور ۱

دور کے پہاڑ خواجہ عبدالرزاق کھڑگ پوری کے بارہ منتخب اور نمائندہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اسے مصنف نے اپنی زندگی ہی میں ترتیب دیا تھا مگر پس مرگ شفیق النساء زرین نے فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے مالی تعاون سے پیش کیا ہے۔

خواجہ عبدالرزاق کا نام افسانوی ادب میں نیا نہیں ہے وہ نہایت ہی کہنہ مشق افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کا لب و لہجہ نہایت کھرا اور اسلوب دل کی گہرائیوں میں اتر جانے والا ہے۔

اس مجموعہ کے بیشتر افسانے سماج کے متوسط طبقے کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی نقاب کشائی کرتے ہیں اور سماج و معاشرے کی تہذیبی اخلاقی زبوں حالی کا مرقع پیش کرتے ہیں۔ مجموعے میں شامل افسانے اپنے موضوعات کے اعتبار سے قابل ستائش ہیں۔ دُکھ سکھ، بات چھوٹی سی۔ مینار گر پڑا۔ دور کے پہاڑ۔ صبح کا بھولا۔ دھوپ چھاؤں۔ پیٹ کا سوال۔ بات کہاں ٹھہری وغیرہ افسانوں میں موجودہ سماج میں رائج برائیوں اور خرابیوں کو خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

زیر نظر مجموعہ کتابت، طباعت، گرد پوش اور اپنی ترتیب و تزئین کے اعتبار سے جاذب نظر ہے اور باذوق قاری کو دعوت مطالعہ دیتا ہے۔

——— ڈاکٹر ای اے حیدری

نام کتاب: "دیارِ صبا" (شعری مجموعہ)
شاعر: پیام فتحپوری قیمت: بیس روپئے
تقسیم کار: دانش محل۔ امین آباد، لکھنؤ

پیام فتحپوری کی شاعری پر ترقی پسند تحریک کے بھرپور اثرات نظر آتے ہیں۔ انفرادی جذبات کے ساتھ اجتماعی شعور کا ایسا مزاج

ملتا ہے جہاں ہر غم ذات غم کائنات بن جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے اشعار کے ذریعے حریم دل و جاں پر دستک دی ہے اسے ہی سچی اور اچھی شاعری کا معیار و میزان قرار دیا جا سکتا ہے۔

پیام فتحپوری کے کئی شعری مجموعے ارباب ذوق سے داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ "دیار صبا" انتخاب غزلیات پر مشتمل ان کا ساتواں مجموعۂ کلام ہے۔ ان کی غزلیات اپنے پورے کلاسیکی طمطراق کے ساتھ نمایاں ہیں۔ اس میں عشق و درماں کی فضا بھی ہے اور عشق کی ازلی حرماں نصیبی بھی۔

دیار صبا کی غزلیں کلاسیکی تہذیب، نئی حسیت اور الفاظ کی تازہ کار تراشیدگی سے عبارت ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پیام فتحپوری کی شاعری کی پہچان غزلوں کے حوالے سے ہے جو اپنے قاری کو بہت آہستگی سے اپنی گرفت میں لیتی ہیں اور اپنا گرویدہ بنا لیتی ہیں۔

پیام فتحپوری کی زبان صاف و سادہ، سلیس و شگفتہ ہے۔ ترکیبیں عام فہم اور تشبیہات سامنے کی ہیں۔ شعر ملاحظہ ہو ؎

بارش سنگ ملامت ہے ہر اک جانب سے
آئینہ ہوں میں تمہارا ہی بچا لو مجھ کو

"دیار صبا" ایک ایسا مجموعۂ کلام ہے جو ساری فنی و معنوی خوبیوں سے آراستہ و پیراستہ ہے۔ کتابت و طباعت مناسب ہے قیمت بھی زیادہ نہیں ہے۔ امید ہے کہ دیار صبا بھی پیام فتحپوری کے سابقہ مجموعوں کی طرح باذوق قارئین سے داد تحسین حاصل کرے گا۔

——— ڈاکٹر آفاق فاخری

نام کتاب: "نوائے فکر انگیز" (شعری مجموعہ)
شاعر: ڈاکٹر ذوقی   قیمت: /۴۰ روپئے
ملنے کے پتے: (۱) دانش بک ڈپو، ٹانڈہ۔ فیض آباد
(۲) دانش محل، امین آباد۔ لکھنؤ

ڈاکٹر ذوقی قصبہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد کے ایک کہنہ مشق و بزرگ شاعر اور گولڈ میڈل سے سرفراز کیے جانے والے ایک حاذق ڈاکٹر ہیں۔ نوائے فکر انگیز ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو تقریباً ۵۱ غزلوں، ۸ نظموں ایک حمد، ایک نعت اور سلام پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے کو بہت پہلے ہی منظر عام پر آجانا چاہیے تھا لیکن دیر آید درست آید کے مصداق، بہتر کتابت سے مزین ان کا یہ مجموعۂ کلام اخلاقی اقدار کا بہترین ترجمان بن کر ایسے وقت ہمارے سامنے آیا ہے جب اس کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔

ڈاکٹر ذوقی دور حاضر کی بدلتی ہوئی اقدار اور جدیدیت کے قائل نہیں ہیں کیونکہ وہ اس رمز سے بخوبی واقف ہیں کہ اخلاقی قدریں آفاقی ہوتی ہیں اور مذہب کے اصول کبھی تبدیل نہیں ہوتے۔ اسی لیے وہ اپنی منظومات میں نیکی اور خیر پر انحصار کرتے ہوئے ان تقاضوں کو ہی اپنے فن کی اساس قرار دیتے ہیں اور جدیدیت کو وہ ایک لاحاصل شے سے تعبیر کرتے ہیں ؎

کیا دیا اس جدیدیت نے ہمیں؟
کیوں نہ طرز کہن کی بات کریں

ساتھ ہی "مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا" کی ترجمانی کرتے ہوئے وہ قومی یکجہتی کے موضوع پر بھی بڑی بیباکی سے قلم اٹھاتے ہیں ؎

دل میں نہ بیج کینہ و نفرت کے بویئے
اس داغ کو خلوص و محبت سے دھویئے

غزل کے ان تمام حسین افکار سے قطع نظر کہیں کہیں انھوں نے اپنے قطعی مختلف خیالات، نئی آرزوؤں اور تمناؤں کا اظہار بالکل عجیب سے طرز و لب و لہجہ میں کیا ہے۔

ڈاکٹر ذوقی کا اصل میدان غزل ہے جس میں ان کے یہاں سادگی، سلاست، روانی، طنز اور اخلاقی اقدار کا احترام موجود ہے۔ اگرچہ ان کے کلام میں کوئی نیا پن نہیں ہے۔ ان کے کلام میں نہ تو فلسفیانہ گہرائی ہے اور نہ فکر کی گیرائی لیکن وہ غزل کے قدیم روایتی عشق کے بھی کچھ زیادہ دلدادہ نظر نہیں آتے۔ ان کے اسلوب میں نہ تو کوئی نیا رنگ ہے اور نہ جدید ڈھنگ، پھر بھی ان کے یہاں انفرادیت ہے۔

اپنے اس مجموعے کی اشاعت سے ڈاکٹر ذوقی، معتبر شعراء کی صف میں یقیناً شامل ہو گئے ہیں اس مجموعے کا مطالعہ قارئین کے لئے بہر صورت دلچسپی اور ذوق شعری میں اضافہ کا باعث ہوگا۔

——— ظفر حسین



گاندھی نمبر

عنوانات

حرفے چند	روہت نندن	۳
پیغام	عزت مآب موتی لال ووہرا (گورنر اتر پردیش)	۴
اپنی بات	امجد حسین	۵
ایک عہد، ایک یاد، ایک نذرانۂ عقیدت	"	۶
گاندھی جی کی اردو تحریر کی ایک جھلک	ادارہ	۷
سانحہ (نظم)	مجاز ردولوی	۸
ایسا ہے میرے خوابوں کا ہندستان	مہاتما گاندھی	۹
روشنی جو چلی گئی	جواہر لال نہرو	۱۰
گاندھی جی، فلسفی اور ادیب	ڈاکٹر سید عابد حسین	۱۲
باپو نے کہا	پیکر جعفری ردولوی	۱۴
کہا تھا کس نے (نظم)	ایم کوٹھیاوی راہی	۱۶
گاندھی جی دستخط کے آئینے میں	ادارہ	۱۷
تازہ امتحان (نظم)	علی جواد زیدی	۱۸
بشمبھر ناتھ پانڈے سے گفتگو	امجد حسین	۲۰
گاندھی جی: بھولی بسری یادیں	پی۔ ڈی۔ ٹنڈن	۲۳
امر رہنما: گاندھی جی (نظم)	تسنیم فاروقی	۲۶
گاندھی جی۔ سیواگرام۔ اور میں	حیات اللہ انصاری	۲۷
انسانیت کے چراغ، گاندھی جی	لکشمی کانت ورما	۲۹
آہ گاندھی (نظم)	نذیر بنارسی	۳۳
یقین نہیں آتا	رتن سنگھ	۳۴
گاندھی جی کی زندگی کے اہم واقعات	عبداللطیف اعظمی	۳۶

نیا دور

جلد ۵۰ ، نمبر ۱۰

جنوری ۱۹۹۶ء

ایڈیٹر
سید امجد حسین

معاون ایڈیٹر
سید اسرار حسین

معاونین: مرزا الیاس خاں، حسینی احمد صدیقی

پبلشر
روہت نندن
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

مطبوعہ: لیمنا سیٹ بلاک پرنٹرس، لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

زر سالانہ — تیس روپے
عام شمارہ — تین روپے

ترسیل زر کا پتہ:
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات
انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ اتر پردیش، لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ:
ایڈیٹر نیا دور پوسٹ بکس نمبر ۱۴۶ لکھنؤ

بذریعہ دستی
ایڈیٹر نیا دور انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ اتر پردیش لکھنؤ

کتابت رنگین ٹائٹل: حسن اختر

رہبرِ انسانیت (نظم) ـــــ ۴۲
ڈاکٹر سلمان عباسی

گاندھی جی نہ ہوتے تو! ـــــ ۴۳
علی جواد زیدی

نذرِ گاندھی (نظم) ـــــ ۵۰
رفعت سروش

مہاتما گاندھی اور مشترکہ زبان کا مسئلہ ـــــ ۵۱
پروفیسر گیان چند

سپہ ہمالہ کی بلندی تیری عظمت پر نثار ـــــ ۶۰
شفاعت علی صدیقی

باپو (نظم) ـــــ ۶۲
طارق متین

اُردو شاعری کے آئینے میں گاندھیائی تصورات کی جلوہ گری ـــــ ۶۳
ڈاکٹر کاظم علی خاں

نیا سال (نظم) ـــــ ۷۲
خان عزمی ردولوی

رہبرِ ایشیا (نظم) ـــــ ۷۳
پدم شری بیکل اتساہی

ہم ترے نقشِ قدم پر چل پڑے تھے ایک دن ـــــ ۷۴
دلیپ سنگھ

مہاتما گاندھی اور اُن کے رام ـــــ ۷۶
ڈاکٹر شیو انند نوٹیال

انسانیت کے پرستار: مہاتما گاندھی ـــــ ۷۹
مولانا اسحاق سنبھلی

گیت ـــــ ۸۱
انجم صدیقی

باپو کا جمالِ افکار (رُباعیات) ـــــ ۸۲
رباب رشیدی

اُردو نثر اور گاندھی جی ـــــ ۸۳
ڈاکٹر محمد انوار الدین

صبحِ درخشاں (نظم) ـــــ ۸۶
عبدالقیوم فرقت

گاندھی جی کے تعلیمی تصورات ـــــ ۸۷
مُظفر حسین غزالی

بابائے قوم۔ عدم تعاون تحریک اور چوری چورا ـــــ ۹۰
اسرار سید

صلح و آشتی کے علمبردار، مہاتما گاندھی ـــــ ۹۴
پرشوتم سنگھ سیٹھی

مہاتما (افسانہ) ـــــ ۹۶
ڈاکٹر بیگ احساس

قطعہ ـــــ ۹۸
عبدالمنان صدیقی

دو گاندھیوں کی آخری ملاقات ـــــ ۹۹
ترجمہ: احمد نسیم صدیقی

گاندھی جی (نظم) ـــــ ۱۰۰
شاعر فتح پوری

اُردو شاعری پر مہاتما گاندھی کے اثرات ـــــ ۱۰۱
ڈاکٹر نہال احمد صدیقی

حرفے چند

ایک ایسی دنیا میں، جہاں توپیں گرج رہی ہوں، گولیاں چل رہی ہوں ـــ بسمارک کی سیاست، گلیڈ اسٹون کی حکمت عملی اور لارڈ جارج کا نظریہ کہ :

" طاقت کے بل بوتے پر سب کو غلام بنایا جاسکتا ہے" ـــ ایسے ماحول میں جب ایک آواز گونجی تو ساری دنیا چونک پڑی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ شخص بغاوت کے شعلے بھڑکائے گا، قتل و خون کی ہولی کھلوائے گا اور برٹش راج سے اسلحہ کی ٹکر لے گا، مگر ساری دنیا حیرت زدہ رہ گئی جب اس دُبلے پتلے جسم والے شخص نے کہا کہ ہم ہنسا نہیں چاہتے، ہم اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں دینا چاہتے، ہم صرف غلامی کی زنجیروں کو توڑ دینا چاہتے ہیں۔ اس نے للکار کر کہا :

" کرو یا مرو " ـــــ

اور سارا ہندستان اس کی آواز کی گونج سے ایک جھنڈے تلے آگیا اور وہ چاہے روز ویلٹ رہے ہوں یا مارشل اسٹالن یا سر ونسٹن چرچل سب کو اعتراف کرنا پڑا کہ بم، پستول، بندوق اور توپ سے زیادہ طاقت ور اسلحہ انسان کی اخلاقی طاقت ہوتی ہے۔ آپ اسلحے کے بل پر کسی کو ختم کر سکتے ہیں اسے اپنا نہیں بنا سکتے، لیکن اخلاقی قوت دشمن کو بھی دوست بنا لیتی ہے۔

یہ فلسفہ کوئی معمولی آدمی نہیں سوچ سکتا تھا یہ ایک مہان آتما کا کام تھا جسے تاریخ نے مہاتما گاندھی کے نام سے اپنے اوراق میں سنہرے لفظوں کے ساتھ جگہ دی۔ جس نے دنیا کو یہ بتایا کہ اصل لڑائی اقدار کی ہوتی ہے، آدمی کچھ اصولوں کے لیے جیتا ہے اور جس کے اصول باقی رہتے ہیں وہی کامیاب ہوتا ہے۔

مہاتما جی نے ہمیں جو اصول سکھائے تھے اُن کی بنیاد نفرت پر نہیں تھی، محبت پر تھی۔ وہ مذہبی آدمی تھے مگر ان کا مذہب رُوح کی پاکیزگی کے لیے تھا وہ ایک ایسے سماج کا خواب دیکھتے تھے جس کی بنیاد پیار و محبت پر ہو، جہاں صداقت کا سکّہ چلتا ہو اور جہاں عدم تشدّد اپنے اخلاقی بل بوتے پر تشدّد کو شکست دے سکے، جہاں نفرت پرستی نہ ہو، چھوت چھات نہ ہو۔ اور ایسا ہی ہندستان ان کے خوابوں کا ہندستان تھا اور ایسے ہی راج کو وہ رام راج کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے۔

اُن کی ۱۲۵ ویں برسی منائی جارہی ہے۔ ۳۰ جنوری کو ان کی شہادت کا دن ہے۔ ادارۂ نیا دور نے اپنی شان دار روایات کے مطابق، ایک شان دار نمبر پیش کرنے کا فیصلہ کیا، جو آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اس نمبر سے قارئین کو وہ روشنی ملے گی اور وہ سبق ملے گا جو مہاتما گاندھی کے پیغام کا جز تھی۔

میں ادارۂ نیا دور کے ساتھ نیا دور کے تمام پڑھنے والوں کے دلوں کی دھڑکن سُن رہا ہوں، وہ دھڑکن جس میں صاف سُنائی دے رہا ہے ـــــــــــ

" مہاتما گاندھی کی جے !"

جے ہند !!

ـــــــ رُوہت نندن

ڈائرکٹر

محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامّہ اترپردیش

موتی لال وورا
گورنر اتر پردیش

راج بھون
لکھنؤ-۲۲۶۰۲۷

پیغام

مہاتما گاندھی تاریخ کی اُن عظیم شخصیتوں میں سے تھے، جن کا پیغام ساری دُنیائے انسانیت کے لیے تھا۔ یہ سچ ہے کہ انھوں نے ہندستان کی آزادی کے لیے ہماری قیادت کی۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ان کے افکار اور نظریات کی بنیاد پر بہت سارے ملکوں کو آزادی ملی، خصوصاً جنوبی افریقہ کی مثال اب بھی ہمارے سامنے موجود ہے۔

گاندھی جی نے عدم تشدد کو ایک بہت بڑے اخلاقی حربے کے طور پر استعمال کرنے کا سبق سکھایا تھا۔ ان کا اہنسا کا فلسفہ، ان کا عدم تشدد کا راستہ آج بھی وہی معنویت رکھتا ہے جو معنویت اُسے آزادی کی جدوجہد کے دوران حاصل تھی۔

آج دُنیا جس شدید بحران سے گزر رہی ہے اور جو گھُپ اندھیرا بڑھ رہا ہے، غارت گری اور دہشت گردی کے جو طوفان اُٹھ رہے ہیں ان کا مقابلہ کرنے کے لیے گاندھی جی کے اصولوں پر عمل کر کے روشنی حاصل کی جا سکتی ہے۔

نیا دور مُبارک باد کا مستحق ہے کہ وہ ایک اہم ضرورت کا احساس کرتے ہوئے اپنا خصوصی نمبر شائع کر رہا ہے۔ جس میں ملک کے ممتاز اہلِ قلم کی نگارشات شامل ہیں۔

اس نمبر کی کامیابی کے لیے میری نیک خواہشات، میری دُعائیں اور میرا آشیرواد۔

(موتی لال وورا)
گورنر اتر پردیش

۷ دسمبر ۱۹۹۵ء

اپنی بات

ہمارا نیا سال جب شروع ہوتا ہے تو چھبیس جنوری آتی ہے' اس لیے ہم اس مبارک موقع پر تمام قارئین کو مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ ۲۶ر جنوری دُنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کے اعلا اصُولوں اور عوام کی عظمت کے اعلان کا دن ہے اور جس طرح اس نے ہندستان میں ساری دُنیا کی رہنمائی کی ہے وہ اس دن کو ہمارے لیے اور قابلِ فخر بنا دیتی ہے۔

اِسے مُبارک موقع پر بے اختیار یہ عرض کرنے کو دل چاہتا ہے کہ نیا دور نے گزشتہ سال اپنی ترقی کی کئی راہیں طے کی ہیں۔ ہمیں مسرت ہے کہ بزرگوں سے جو وراثت ہم تک پہنچی تھی، ہم نے اس عالی شان خزانے کو امانت کی طرح سنبھال کر رکھا اور اس میں اپنے مقدور بھر اضافہ کیا۔ اودھ نمبر اور پھر نصف صدی نمبر ہماری صحافتی تاریخ کے دو عظیم سنگ میل ہیں۔ نصف صدی نمبر کی رسم اجراء ۱۲ر دسمبر کو عزّت مآب جناب موتی لال دورا کے دستِ مبارک سے عمل میں آئی تھی۔ ہمیں اس پر ناز ہے کہ اُردو دنیا کے بیشتر ادیب و دانش ور اس جگمگاتی تقریب میں شریک تھے اور اسی تقریب میں عزت مآب موتی لال ووراکے ارشاد کے مطابق ہمارے ہر دل عزیز ڈائرکٹر جناب رودھت نندن نے جلسے میں یہ اعلان کیا کہ اودھ نمبر کے اور اس کے ضمیمے کے منتخب مضامین کتابی شکل میں شائع کیے جائیں گے۔

ہمیں یقین ہے کہ آپ لوگوں کی دُعاؤں اور ساتھیوں کے تعاون سے یہ عظیم کام بھی معینہ مُدّت کے اندر انجام پاجائے گا۔ اس موقع پر ایک بار پھر Teny Son ٹینی سن کو یاد کرتے ہوئے New Ring out the old. Ring in the New. پُرانے سال کو رُخصت کرتے ہیں اور نئے سال کا خیر مقدم کرتے ہوئے آپ سب کو ادارے کی جانب سے مُبارکباد پیش کرتے ہیں۔

خدائے بزرگ و برتر کے حضور میں دُعا ہے کہ نیا سال ہمارے پُورے ملک کے لیے شادابی اور خوشحالی کا سال ہو، ترقی کا سال ہو اور ہر طرح کے حادثوں سے محفوظ رہنے کا سال ہو۔ آمین!

——— سیّد امجد حسین
(ایڈیٹر)

ایک یاد — ایک عہد — ایک نذرانۂ عقیدت

تاریخ کتنی ہی کروٹیں کیوں نہ بدلے،
زمانہ عروج وزوال کی کتنی ہی کہانیاں کیوں نہ سنائے۔
نشیب وفراز کی داستانیں کتنی ہی کیوں نہ لکھی جائیں
تغیرات کا کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ کتنا ہی کیوں نہ جاری رہے —— ہر شئے بدلتی ہے اور بدلتی رہے گی۔

لیکن سچائی کے اصول اور صداقت کا راستہ جو ہمیشہ سے تھا وہ ہمیشہ باقی رہے گا۔ اس سچ کے سورج کو کبھی گہن نہیں لگ سکتا۔ اور سب سے بڑا سچ یہ ہے کہ انسان ایک دوسرے کا احترام کرے۔ یہی اصول عدم تشدد کو جنم دیتا ہے، اسی سے رواداری کی کونپلیں پھوٹتی ہیں، اسی باہمی احترام سے امن کا دروازہ کھلتا ہے۔ یہی وہ سچائی ہے جس کا راز اگر کوئی پا گیا تو اس نے سربلندی حاصل کی اور دنیا کے لئے ایسا کچھ کر کے گیا —— کہ بہت یاد رہا۔

یہی وجہ ہے کہ اب جب ہم ایک نئے سال میں قدم رکھ رہے ہیں تو ہمارا نیا سال ہندستانی تاریخ کی ایک عظیم شخصیت کی شہادت کے مہینے سے شروع ہوتا ہے اور اسی لیے تیس جنوری کی تاریخ کو دراصل سنکلپ دیوس یا یوم عہد یا یوم صداقت کے طور پر منایا جانا چاہیئے کہ اس روز ہم سب سارے ہندستانی —— یہ عہد کریں کہ مہاتما گاندھی ساری زندگی جن اصولوں کے لیے سنگھرش کرتے رہے، لڑتے رہے اور یہاں تک کہ انھوں نے آخر میں اپنے لہو کی سرخی سے ان اصولوں کو نیا آب و رنگ دیا —— ہم لوگ بھی ان اصولوں کی حفاظت کریں گے، اس کے لیے زندگی کے آخری لمحے تک جدوجہد کرتے رہیں گے — ان میں ایک اصول تھا باہمی احترام! اور اسی کا ایک پھول عدم تشدد کی شکل میں کھلا، اسی پھول سے سب کے لیے پیار و محبت کی خوشبو نکلی، اسی پھول سے سماجی زندگی میں بدعنوانیوں اور بھرشٹاچار کی گندگی دور کی جا سکی۔

اس لیے گاندھی جی کی یاد میں یہ نمبر پیش کرتے ہوئے ادارے نے ایک بار پھر یہ کوشش کی ہے کہ گاندھی جی کے پیغام اور ان کی تعلیمات کو صرف ہندستان ہی تک نہیں بلکہ عالمی رابطے کی زبان اردو کے ذریعے اُن لوگوں تک بھی پہونچایا جائے جو ان اعلا اصولوں کی طرف سے آنکھ بند کر رہے ہیں۔ یہ بات غلط نہیں ہے کہ آج دنیا آتش فشاں کے دہانے پر کھڑی ہے، اسلحہ کی دوڑ جاری ہے، دہشت گردی اور تشدد روز کے معمول بن گئے ہیں، بدعنوانیوں کے سانپ سماج کے اعلا ترین اخلاقی اصولوں کو ڈستے جا رہے ہیں اور دنیا کا عام آدمی کچھ مایوسی، کچھ محرومی کا شکار اور کچھ بددل سا نظر آتا ہے۔

لیکن —— افق پر آج بھی جب سرخی چھا جاتی ہے تو اس سرخی کے پیچھے سے اپنی لاٹھی ٹیکتا ہوا ایک بوڑھا انسان چشمے کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی مسکراتی آنکھوں سے یہ سارا منظر دیکھنے کے بعد اپنی باوقار آواز میں دنیا کو جھنجھوڑتا ہوا اس کا نغمہ گونجتا ہے —— وہ نغمہ جو ساری دنیا کے لیے ہے سب کی بھلائی چاہتا ہے۔ سارے مذاہب کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے، جو نغمہ درس حیات بھی دیتا ہے، منزل کا تعین بھی کرتا ہے ؎

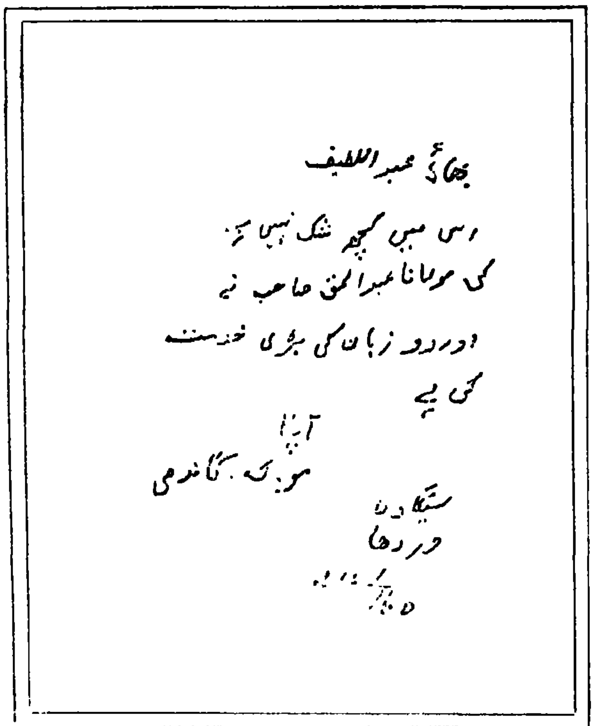
ایشور اللہ تیرو نام سب کو سنمت دے بھگوان

سید امجد حسین

مہاتما گاندھی

کی اردو تحریر کی ایک جھلک

بابائے قوم گاندھی جی کو اردو زبان سے جو شغف تھا۔ اس کا اظہار انھوں نے متعدد بار کیا۔ اردو کی حمایت میں متعدد تقریروں کے علاوہ انھوں نے خود بھی فارسی رسم الخط میں خطوط لکھے ہیں۔ پیش نظر خط گاندھی جی نے ۱۹۴۰ء میں جامعہ سے شائع ہونے والے رسالے کے لئے ایک پیغام کی شکل میں بھیجا تھا:


بھائی عبد اللطیف

اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ مولانا عبد الحق صاحب نے اردو زبان کی بڑی خدمت کی ہے

آپکا
موہن داس گاندھی

سیواگرام
وردھا

سانحہ

مجاز مرحوم

درد و غمِ حیات کا درماں چلا گیا
وہ خضرِ عصر و عیسیٰ دوراں چلا گیا

ہندو چلا گیا، نہ مسلماں چلا گیا
انساں کی جستجو میں اک انساں چلا گیا

رقصاں چلا گیا نہ غزلخواں چلا گیا
سوز و گداز و درد میں غلطاں چلا گیا

برہم ہے زلفِ کفر، تو ایماں ہے سرنگوں
وہ فخرِ کفر و نازشِ ایماں چلا گیا

بیمار زندگی کی کرے کون دلدہی
نبّاض و چارہ سازِ مریضاں چلا گیا

کس کی نظر پڑے گی اب "عصیاں" پہ لطف کی
وہ محرمِ نزاکتِ عصیاں چلا گیا

وہ رازدارِ محفلِ یاراں نہیں رہا
وہ غمگسارِ بزمِ حریفاں چلا گیا

اب کافری میں رسم و رہِ دلبری نہیں
ایماں کی بات یہ ہے کہ ایماں چلا گیا

اک جوئے سرورِ دل و جاں نہیں رہا
اک عاشقِ صداقتِ پنہاں چلا گیا

با چشمِ نم ہے آج زلیخائے کائنات
زنداں شکن وہ یوسفِ زنداں چلا گیا

اے آرزو وہ چشمۂ حیواں نہ کر تلاش
ظلمات سے وہ چشمۂ حیواں چلا گیا

اب سنگ و خشت و خاک و خزف سربلند ہیں
تاجِ وطن کا لعلِ بدخشاں چلا گیا

اب اہرمن کے ہاتھ میں ہے تیغِ خوں چکاں
خوش ہے کہ دست و بازوئے یزداں چلا گیا

دیوِ بدی سے معرکہ سخت ہی سہی
یہ تو نہیں کہ زورِ جواناں چلا گیا

کیا اہلِ دل میں جذبۂ غیرت نہیں رہا
کیا عزمِ سرفروشیِ مرداں چلا گیا

کیا باغیوں کی آتشِ دل سرد ہو گئی
کیا سرکشوں کا جذبۂ پنہاں چلا گیا

کیا وہ جنون و جذبۂ بیدار مر گیا
کیا وہ شبابِ حشر بداماں چلا گیا

خوش ہے بدی جو دام یہ نیکی پہ ڈال کے
رکھ دیں گے ہم بدی کا کلیجہ نکال کے



مہاتما گاندھی

ایسا ہے میرے خوابوں کا ہندستان

مجھے ٹھیک سے یاد نہیں، لیکن ۱۸۹۶ء میں آگرہ یا دہلی کے قلعہ کے کسی دروازے پر درج یہ شعر میں نے پڑھا تھا ؎

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

اس کا مطلب ہے کہ "دنیا میں اگر کہیں جنت ہے تو وہ یہیں ہے یہیں ہے یہیں ہے۔" حالانکہ وہ قلعہ شان و شوکت کے اعتبار سے بے مثال ہے لیکن میرے خیال میں جنت سے اس کو تشبیہ نہیں دی جا سکتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ جنت وہ جگہ ہے جہاں کوئی فقیر یا غریب نہیں، اونچ نیچ نہیں، کروڑپتی مالک اور اس کے بھوکے نوکر نہیں۔ جہاں نشہ آور مشروب یا دیگر اشیاء نہیں۔ جہاں عورتوں کا مردوں ہی کی طرح احترام ہوگا، اور عورت مرد باکردار ہوں گے۔ جہاں سبھی مذاہب کے لوگ ایک بیوی کے علاوہ دیگر عورتوں کو ان کے مرتبے کے اعتبار سے بیٹی، بہن یا ماں کی شکل میں دیکھیں گے ان میں چھوا چھوت نہیں ہوگی اور سبھی مذاہب کے تئیں رواداری برتی جائے گی۔ جہاں مزدوروں کا احترام ہوگا اور انھیں پیٹ بھر کر کھانا ملے گا۔

تعمیری پروگرام

تعمیری پروگراموں کو ہم مکمل آزادی قائم کرنے کا نام نہیں دے سکتے ہیں۔ یہ مکمل آزادی سچائی اور عدم تشدد کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں آزادی کا مطلب ملک کے ہر طبقے کے لئے آزادی ہے۔ یہ آزادی بلا تفریق ذات پات، رنگ و نسل اور مذہب و مسلک سب کو ملنی چاہیئے۔ یہ باہمی انحصار کے اصول کے مطابق ہے۔ لیکن اصول اور عمل میں فرق ہوتا ہے۔ ہمارا مکمل آزادی کا مطلب تبھی پورا ہوگا جب ہم اصولوں کو عمل میں بھی لائیں۔

کھادی اور چرخہ

میرے خیال میں کھادی ہندستانی انسانیت، اقتصادی آزادی اور برابری کی علامت ہے۔ نہرو جی کے الفاظ میں: "یہ ہندستانی آزادی کا بانا ہے۔"

کھادی سے ملک کی پیداوار اور تقسیم کے نظام کی لامرکزیت ہوتی ہے۔ اس طرح ہر گاؤں کو اپنی ضرورت کی چیزوں کی پیداوار کرنی چاہیے۔ ہر گاؤں کو شہر کے لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے بھی کچھ پیداوار کرنا چاہیے۔

بھاری صنعتوں کو قومیانا ہوگا، لیکن بھاری صنعتیں ملک کی معیشت کی بنیاد نہیں ہوں گی۔ ملک کی معیشت کی بنیاد گاؤں ہوں گے مجھے پورا یقین ہے کہ ہاتھ کی کتائی سے ملک میں استحکام ممکن ہوگا۔ چرخہ کی ملک کی معیشت میں بڑی اہمیت ہے۔

بنیادی تعلیم

تعلیم سے میری مراد ہے کہ بچوں، بڑوں سب کا جسمانی، ذہنی اور روحانی طور پر فروغ ہو۔ حرف شناسی تعلیم کی ابتدا یا اختتام نہیں ہے یہ ایک ذریعہ ہے جس سے لوگوں کو تعلیم یافتہ بنایا جا سکتا ہے۔ حرف شناسی بذات خود تعلیم نہیں ہے۔ بچوں کی تعلیم کا آغاز انھیں مفید دستکاریاں سکھانے سے ہونا چاہیے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اس تعلیم سے بچے کا مکمل ذہنی فروغ ہو سکتا ہے۔ اس تعلیم سے دیہات کے بچے آگے چل کر مثالی دیہی عوام بن سکیں گے۔ بنیادی تعلیم کا نظام خاص طور پر ان کے لئے ہے۔ اس کی تحریک دیہات سے ملی ہے۔

آزادی کی ابتدا نچلی سطح سے ہونی چاہیے۔ اس طرح ہر گاؤں بذاتِ خود ایک "جمہوریہ" یا پنچایت ہوگا، جس کے پاس مکمل اختیارات ہوں گے۔ اس کے لیے ہر گاؤں کو خود کفیل بنانا ہوگا اور اپنے کاموں کا بندوبست کرنے کی صلاحیت پیدا کرنی ہوگی۔ ہر گاؤں خود کو اس طرح تیار کرے گا کہ کسی بھی بیرونی حملے کا سامنا کر سکے، اور اس کے لیے مر مٹنے کو تیار ہو۔ بالآخر ہر شخص بذاتِ خود ایک اکائی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم ان پڑوسیوں سے مدد نہ لیں جو اپنی مرضی سے مدد کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا سماج لازمی طور پر مہذب ہوتا ہے، جس میں ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیے اور یہ بھی جانتا ہے کہ کسی ایسی چیز کا مطالبہ نہیں کرنا چاہیے جسے دوسرے لوگ (تنہا ہی) محنت سے نہیں حاصل کر سکتے۔

گاؤں کی تعمیر

ایک مثالی ہندستانی گاؤں کی تعمیر اس طرح کی جائے کہ وہاں صفائی کا مکمل بندوبست ہو۔ اس کی جھونپڑیاں پانچ میل کے دائرہ میں دستیاب اشیاء سے بنی ہوں اور ان میں روشنی اور ہوا کا پورا انتظام ہو۔ جھونپڑیوں کے ساتھ ایسے آنگن ہوں جن میں گھریلو استعمال کی ساگ سبزیاں پیدا کی جا سکیں اور مویشیوں کے لیے چارے کا بندوبست ہو۔ جہاں تک ممکن ہو، گاؤں کی گلیوں میں گرد نہ ہو۔ گاؤں میں کنوؤں کا مناسب بندوبست ہو جن کا استعمال سبھی لوگ کر سکیں۔ سبھی کے لیے عبادت گاہیں ہوں۔ ایک جلسہ گاہ ہو، مویشیوں کی چراگاہ ہو۔ امداد باہمی کی ڈیری ہو۔ پرائمری اور سکنڈری اسکول ہوں، جن میں صنعتی تعلیم کا خاص انتظام ہو۔ تنازعات کو سلجھانے کے لیے ایک گاؤں پنچایت ہو۔ گاؤں اپنے لیے اناج، سبزیاں، پھل اور کھادی خود تیار کرے گا۔

□□

"ہم اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ ہندوستانی کو ہندوستان کی راشٹر بھاشا ہونا چاہیے اور وہ اُردو اور دیوناگری دونوں لکھاوٹوں میں لکھی جانا چاہیے اور سرکاری دفتروں اور سبھاؤں میں دونوں لکھاوٹوں کو قبول کر لینا چاہیے۔" (ہریجن سیوک ۱۹۴۰ء)

روشنی جو چلی گئی —— صفحہ ۱۱ کا بقیہ

کے شکار ہو جائیں بلکہ اس کے برخلاف ہمیں مضبوطی سے اور متحد رہتے ہوئے ان ساری پریشانیوں کا مقابلہ کرنا چاہئے جو ہمیں درپیش ہیں۔ ہمیں متحد رہنا چاہئے اور اس زبردست سانحہ کے پیش نظر سارے چھوٹے موٹے اختلافات، پریشانیاں اور آویزشیں ختم ہو جانی چاہئیں۔ یہ عظیم سانحہ ایک ایسی علامت ہے جو ہمیں زندگی کی بڑی چیزوں کو یاد رکھنے اور ان چھوٹی چیزوں کو بھول جانے کے لئے کہہ رہا ہے جن پر ہم نے ضرورت سے زیادہ وقت صرف کیا ہے۔ گاندھی جی نے اپنی جان دے کر ہمیں زندگی کی بڑی چیزوں اور دائم و قائم رہنے والی سچائیوں کی یاد دلائی ہے اور اگر ہم نے یہ بات یاد رکھی تو یہ ہندستان کے لئے بہتر ہوگا۔

اور دعائیں مانگتے وقت سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ ہم خود کو سچائی اور اس مقصد کے لئے وقف کر دینے کا عہد کریں جن کے لئے ملک کا یہ عظیم سپوت ساری زندگی جدوجہد کرتا رہا اور اس نے جان دے دی۔ یہی وہ بہترین عبادت ہے جس کا نذرانہ ہم ان کو اور ان کی یاد کو پیش کر سکتے ہیں۔ یہی وہ بہترین دعا ہے جو ہم ہندستان اور خود کو دے سکتے ہیں۔ —— جے ہند!

(قوم کے نام نشریہ۔ ۳۰ر جنوری ۱۹۴۸ء)

اوپیندر ناتھ اشک نہیں رہے

اُردو ہندی کے ممتاز ناول نگار اور افسانہ نویس اوپیندر ناتھ اشک کا ۱۹ر جنوری ۱۹۹۶ء کو الہ آباد میں انتقال ہوگیا، وہ ۸۵ برس کے تھے۔ ان کی پیدائش جالندھر میں ۱۹۱۰ء میں ہوئی۔ انھوں نے ناول اور افسانوں کے علاوہ نظمیں بھی لکھیں۔

ادارۂ نیا دور اشک صاحب کے انتقال پر اپنے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے انھیں خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔

—— ایڈیٹر

جواہر لال نہرو

روشنی جو چلی گئی

زیر نظر مضمون 'آنجہانی' پنڈت جواہر لال نہرو کی اس تقریر کا اقتباس ہے جس میں پنڈت نہرو کی مہاتما گاندھی سے عقیدت و احترام کے ہر پہلو کی نشان دہی ہوتی ہے۔ نہرو جی کی یہ تقریر اس زبردست سانحہ کی یاد دلاتی ہے جس نے ساری قوم کے دل و دماغ کو ماؤف کر دیا تھا۔ بابائے قوم کے شہادت کے موقع پر نہرو جی کا یہ خراجِ عقیدت قارئین کے لئے پیش ہے۔

ایڈیٹر

دوستو اور ساتھیو!

ہماری زندگیاں روشنی سے محروم ہوگئی ہیں اور ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ آپ سے کیا کہوں اور کس طرح کہوں۔ ہمارے پیارے رہنما جنہیں ہم باپو کہہ کر پکارتے تھے، جو بابائے قوم تھے اب ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ شاید میں نے یہ غلط کہا ہے۔ لیکن جس طرح ہم انہیں برسوں سے دیکھتے آئے تھے اس طرح اب دوبارہ نہ دیکھ سکیں گے۔ اب ہم صلاح و مشورہ کے لئے دوڑے دوڑے ان کے پاس نہ جائیں گے اور نہ (اپنی پریشانیوں میں) ان سے تسلی پائیں گے اور یہ ایک ہولناک صدمہ ہے۔ صرف میرے لئے نہیں بلکہ ملک کے لاکھوں لاکھ افراد کے لئے۔ اور اس زبردست نقصان کے احساس کو کم کرنے کے لئے میرے یا کسی دوسرے کے لئے کوئی اور مشورہ دینا ذرا مشکل ہے۔

میں نے کہا کہ روشنی معدوم ہوگئی ہے لیکن میں نے غلط بات کہی ہے کیوں کہ جو روشنی ہندوستان میں چمکی تھی وہ کوئی معمولی روشنی نہیں تھی۔ وہ روشنی جس نے اس ملک کو برسہا برس منور رکھا ہے (مستقبل میں بھی) برسوں تک اسے پر نور بنائے رہے گی اور ہزار سال بعد بھی وہ روشنی اس ملک میں دکھائی دیتی رہے گی اور ساری دنیا کو بھی اور اس سے بے شمار دکھی دل سکون پائیں گے۔ کیوں کہ وہ روشنی جس چیز کی علامت تھی اس کا تعلق صرف زمانۂ حال سے نہیں بلکہ وہ علامت ہے زندہ اور دائمی سچائیوں کی جو ہمیں سیدھا راستہ بتاتی، غلطیوں سے روکتی اور ملک کو آزادی کی جانب بڑھاتی رہی ہے۔

یہ سب کچھ ایک ایسے وقت میں ہوا ہے جب ان کے کرنے کے بہت سے کام پڑے تھے۔ ہم کبھی سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ اب ان کی ضرورت نہیں رہ گئی ہے یا کہ وہ اپنا کام پورا کر چکے ہیں۔ لیکن اس وقت خاص طور سے ایسے وقت میں جب ہم بہت سی مشکلات میں گھرے ہوئے ہیں ان کا ہمارے درمیان نہ ہونا ایک ایسا نقصان ہے جسے برداشت کرنا بے حد اذیت ناک ہے۔

ایک پاگل نے ان کی جان لے لی ہے۔ میں ایسے شخص کو پاگل ہی کہہ سکتا ہوں۔ پھر بھی پچھلے کئی برسوں اور مہینوں میں اس ملک میں خاصا زہر پھیلتا رہا ہے اور اس زہر نے لوگوں کے دماغوں پر اثر ڈالا ہے۔ ہمیں اس زہر کا مقابلہ ضرور کرنا چاہئے اس زہر کو اکھاڑ پھینکنا اور ان زبردست خطرات کا مقابلہ کرنا چاہئے جنہوں نے ہم کو گھیر رکھا ہے لیکن پاگلوں کی طرح یا گھٹیا طریقے سے نہیں بلکہ اس طرح سے جو ان کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمارے محبوب رہنما نے ہمیں سکھایا تھا۔

اس وقت یاد رکھنے کی پہلی چیز یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی کسی قسم کی ناشائستہ حرکت (محض) غصہ میں آکر نہ کرے۔ ہمیں ایک طاقتور اور ثابت قدم قوم کی طرح عمل کرنا چاہئے جس نے ان سارے خطرات کا مقابلہ کرنے کا عہد کر رکھا ہے جو ہمیں گھیرے ہوئے ہیں۔ ایسی قوم کی طرح جو اس فرمان پر عمل پیرا ہونے کا پختہ ارادہ کر چکی ہے جو ہمارے عظیم معلم اور عظیم رہنما نے ہمیں یہ بات ہمہ وقت ذہن میں رکھتے ہوئے کہ اگر جیسا کہ مجھے یقین ہے ان کی روح نے ہم پر نظر ڈالی اور ہمیں دیکھا تو ہمیں گھٹیا حرکتیں کرتے اور تشدد سے کام لیتے ہوئے دیکھ کر ان کی روح کو جتنی آزردگی ہوگی اتنی کسی اور بات سے نہیں ہوگی۔

چنانچہ ہمیں اس طرح کا کوئی کام نہیں کرنا چاہئے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم کمزوری

(باقی صفحہ)

ڈاکٹر سید عابد حسین

گاندھی جی — فلسفی اور ادیب

گاندھی جی کی (SURCH FOR TRUTH) خود نوشت سوانح عمری کی شکل میں شایع ہوئی اور اس میں ان کے قیام جنوبی افریقہ کے حالات زندگی تھے۔ ڈاکٹر عابد حسین ان دانشوروں میں تھے جنھوں نے یہ کتاب ترجمہ کے لئے منتخب کی اور 'تلاش حق' کے عنوان سے اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۰ء کے قریب شایع ہوا تھا۔ ڈاکٹر عابد حسین کی ادبی شخصیت منفرد رہی ہے۔ ایک طرف وہ ماہر اقبالیات رہے اور اقبال کے فلسفۂ خودی کو خلیفہ عبدالحکیم کے علاوہ کسی نے اس شرح و بسط کے ساتھ نہیں لکھا جس طرح ڈاکٹر صاحب نے لکھا۔ دوسری طرف ان کا ڈرامہ پردۂ غفلت (جو السن کے ڈرامے سے ماخوذ ہے) پردۂ غفلت اردو ڈرامے کی تاریخ میں منفرد حیثیت رکھتا ہے، ڈاکٹر صاحب کی اہم ترین تصنیف 'قومی تہذیب کا مسئلہ' ہے۔ جس کا پیش لفظ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے لکھا تھا۔

ان مختلف جہتوں کی حامل شخصیت کے یہاں ہر جگہ گاندھی جی کے ارشادات نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے برلن سے فلسفے کی ڈگری حاصل کی تھی لیکن صداقت اور عدم تشدد کا فلسفہ انھیں تمام مذاہب میں ملا تھا اور گاندھی جی کے یہاں خاص طور سے انھوں نے اس فلسفے کی عملی شکل دیکھی تھی، بڑے فخر کے ساتھ اردو کے اس عظیم دانشور کی جو ادیب بھی تھا اور فلسفی بھی یہ تحریر شایع کی جا رہی ہے۔

—— سید امجد حسین

اگر ہم فلسفی اور ادیب کی منطقی تعریف کے جھگڑے میں نہ پڑیں اور سیدھے سادے لفظوں میں ان دونوں اصطلاحوں کا مطلب سمجھانا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں فلسفی وہ ہے جو دنیا کی اور انسانی زندگی کی حقیقت کو خواہشات اور جذبات سے الگ ہو کر مجرد ذہنی تصورات کی مدد سے سمجھے اور سمجھائے اور ادیب وہ ہے جو اس حقیقت کو فکر، احساس اور آرزو کی سموئی ہوئی نظر سے دیکھے اور دکھائے۔ جب تک انسانی ذہن میں تازگی اور بے ساختہ پن موجود تھا فلسفی اور ادیب دونوں زندگی اور دنیا کا براہ راست مشاہدہ کر کے اپنی ذاتی فکر کے نتیجوں کو فلسفے اور ادب کے نام سے پیش کرتے تھے۔ مگر جب یہ ذہن روایات کے بوجھ میں دب کر جولانی اور اُمنگ سے محروم ہو گیا تو فلسفی اسے کہنے لگے جو روایتی چشمے سے اور ادیب اسے جو روایتی ادب کی عینک سے حقیقت کا مطالعہ کرنے کی کوشش کرے۔ فلسفی اور ادیب کا یہ تصور لوگوں کے ذہن میں اتنا جم گیا ہے کہ اگر اتفاق سے کوئی ایسا شخص پیدا ہو جائے جو دنیا اور زندگی کا عکس کتابوں کے دھندلے آئینے میں دیکھنے کے بجائے ان کا سیدھا اور صاف مطالعہ کرے تو وہ اسے فلسفی اور ادیب کا درجہ دینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ایک بے ضابطہ سوچنے والا اور بے قاعدہ لکھنے والا مان لیں گے۔ گاندھی جی بھی ان فلسفیوں اور ادیبوں میں سے ہیں۔ جن کے فلسفے اور ادب کو ہم رسم و روایات قاعدے اور ضابطے کے پیمانوں سے نہیں ناپ سکتے صرف اصلیت اور حقیقت کے کانٹے پر تول سکتے ہیں۔

جہاں تک گاندھی جی کے فلسفے کا تعلق ہے، ظاہر ہے اس پر اس مختصر مضمون میں تفصیلی بحث تو ہو نہیں سکتی۔ ہم صرف ان کے حیات و کائنات کے بنیادی تصور پر ایک سرسری نظر ڈال سکتے ہیں۔ سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ان کی فلسفیانہ فکر کا موضوع اور مقصد کیا ہے۔ وہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں:

"وہ چیز جس کی مجھے تلاش ہے، جس کی آرزو اور سعی میں تیس سال سے بے چین ہوں۔ معرفت نفس، دیدار الٰہی حصول موکش ہے۔ یہی تلاش، یہی کوشش میرا اوڑھنا بچھونا ہے، یہی میری زندگی ہے

میری تحریر و تقریر کا میری ساری سیاسی جدوجہد کا یہی مقصد ہے"

اس کے معنی یہ ہیں کہ عہد قدیم کے ہندی فلسفیوں کی طرح گاندھی جی کے ہاں بھی فلسفے اور مذہب کی حدود الگ الگ نہیں ہیں بلکہ ان کے موضوع فکر میں مابعد الطبیعات اور الٰہیات ایک دوسرے سے ملے جلے ہوئے ہیں اور ان کا مقصد صرف نظری نہیں بلکہ عملی بھی ہے، عہد جدید کے فلسفی ان چیزوں کو ایک دوسرے سے الگ رکھتے ہیں۔ الٰہیات سے انھیں عام طور پر دلچسپی نہیں ہوتی اور اگر ہوئی بھی تو وہ صرف سرچشمۂ حقیقت کا پتہ چلانے تک محدود ہوتی ہے۔ مگر گاندھی جی اس کے علاوہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ اس منزل کا پتہ چلانے کے بعد روح انسانی کو وہاں تک پہنچانے اور سعادت ابدی کا وہ مقام حاصل کرنے کی کوشش کریں جسے مذہب کی اصطلاح میں نجات کہتے ہیں۔

لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ موضوع اور مقصد کے لحاظ سے تو گاندھی جی کی فکر عہد قدیم اور عہد وسطیٰ کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے لیکن سوچنے کا طریقہ انھوں نے ایسا اختیار کیا ہے جو عہد جدید کی علمی تحقیق کے معیار پر پورا اترتا ہے۔ فلسفے کی تاریخ میں عہد جدید کی یہ خصوصیت سمجھی جاتی ہے کہ بیکن سے لے کر کانٹ تک مفکروں کے ایک پورے سلسلے نے نظریہ علم کے مسائل پر غور کر کے تجربے اور مشاہدے کے طریق تحقیق کو نشوونما دی۔ یوں تو یہ طریقہ یونانیوں کے ہاں موجود تھا اور عربوں نے اسے خاصی ترقی دی تھی لیکن عہد وسطیٰ میں اسے ترک کر دیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فلسفہ بے سروپا خیال آرائیوں میں پڑ گیا اور حقیقی علمی ترقی رک گئی۔ عہد جدید کے سرا دلوں نے اسے پھر سے زندہ کیا اور تکمیل کو پہونچایا اور اس کے فیض سے علوم طبعی نے جو سائنس کہلاتے ہیں حیرت انگیز ترقی کی۔ گاندھی جی نے جدید فلسفے یا سائنس کی باقاعدہ تعلیم نہیں پائی تھی لیکن جب وہ بیرسٹری کا ڈپلوما لینے کے لئے انگلستان گئے تو انھوں نے اصول قانون کا مطالعہ کیا اور اپنے خداداد ذوق صحیح کے بدولت علمی طریق فکر کو اپنا لیا۔ جتنی چیزیں علمی مشاہدہ کے لئے ضروری ہیں ــــ احساس ذمہ داری، ذہنی دیانت، صبر، احتیاط، جذبات اور خواہشات سے الگ ہو کر ہر چیز کو معروضی نظر سے دیکھنا، اپنے مشاہدے کے نتائج کو بغیر کسی رنگ آمیزی کے اصلیت میں ڈوبی ہوئی سادگی کے ساتھ بیان کرنا، غرور اور ادعا کے بجائے عاجزی اور انکسار سے کام لینا ــــ وہ سب گاندھی جی میں اسی حد تک موجود تھیں جتنی آج کل کے بڑے سے بڑے فلسفی یا سائنسداں میں ہوتی ہیں بلکہ ان کے مذہبی جذبے نے ان صفات میں اور زیادہ وسعت اور گہرائی پیدا کر دی تھی۔ وہ ان تجربوں کے متعلق جو انھوں نے تلاش حق میں کئے، فرماتے ہیں:۔

"میرا ہرگز یہ دعویٰ نہیں کہ یہ تجربے مکمل ہیں۔ میں انھیں اس سے زیادہ قابل وثوق نہیں سمجھتا جتنا ایک دیانت دار سائنسداں اپنے تجربوں کو سمجھتا ہے۔ وہ بہت صحت کے ساتھ خوب سمجھ بوجھ کر ذرا ذرا سی باتوں کا خیال رکھتے ہوئے تجربے کرتا ہے۔ مگر پھر بھی اسے یہ دعویٰ نہیں ہوتا کہ جو نتیجے اسے حاصل ہوئے وہ آخری اور قطعی ہیں بلکہ وہ ان میں ترمیم اور اصلاح کی گنجائش سمجھتا ہے۔ میں نے بہت گہرے مشاہدۂ باطن سے کام لیا ہے، اپنے نفس کو اچھی طرح ٹٹولا ہے اور ہر نفسیاتی حالت کی تحلیل کی ہے۔ لیکن یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں کہ میں جن نتیجوں پر پہونچا ہوں وہ آخری اور قطعی یا خطا سے بری ہیں۔ البتہ اتنا دعویٰ مجھے ضرور ہے کہ میری ذات کے لئے یہ نتیجے بظاہر بالکل صحیح اور فی الحال قطعی ہیں۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں ان پر اپنے عمل کی بنیاد نہ رکھتا۔ لیکن میں نے ہمیشہ، ہر قدم اٹھانے سے پہلے غور کر لیا ہے کہ کس نتیجے کو قبول کروں اور کسے رد کروں اور اس کے بعد جو رائے قائم ہوئی اس پر عمل کیا۔"

اس جدید علمی طریق فکر سے کام لیتے ہوئے گاندھی جی نے اپنی دو تہائی زندگی تلاش حق میں صرف کی۔ اس کے نتائج کو انھوں نے مختلف تقریروں اور تحریروں میں عام طور پر عملی مسائل کے سلسلے میں بیان کیا ہے۔ ان بکھرے ہوئے موتیوں کو مسلسل اور مدلل نظریوں کی لڑیوں میں پرونا رسمی اور مکتبی فلسفیوں کا کام ہے مگر گاندھی جی کے بنیادی تصور کا جو سرسری خاکہ یہاں پیش کیا جاتا ہے اس سے اتنا اندازہ ضرور ہو جائے گا کہ یہ کام کرنے کا ہے اور اس سے نہ صرف مذہبی اور اخلاقی بلکہ علمی فائدے بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔

گاندھی جی کے فلسفے کا لب لباب آپ کو ذیل کے ٹکڑوں میں مل جائے گا۔

(۱) "میرے نزدیک حق اصل اصول ہے جس میں اور بہت سے اصول شامل ہیں۔ یہاں حق سے مراد محض لفظوں کی سچائی نہیں بلکہ خیال کی سچائی بھی ہے اور سچائی بھی ہمارے ادراک کی اضافی سچائی نہیں بلکہ حق محض۔ جو ہر ابدی یعنی خدا کی بے شمار تعریفیں کی گئی ہیں کیونکہ اس کے نور کی تجلیاں بے شمار ہیں۔ ان کے تصور سے مجھ پر رعب اور حیرت طاری ہوتی ہے

اور میں ایک لمحے کے لئے ان میں محو ہو جاتا ہوں۔ لیکن خدا کی پرستش میں اسے حق محض سمجھ کر کرتا ہوں۔"

(ب) "مجھے حق کے جو جلوے کبھی کبھی نظر آ گئے ان سے اس نور محض کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا جس کے آگے آفتاب ایک ذرۂ بے نور ہے۔ سچ پوچھئے تو جو کچھ میں نے دیکھا وہ فروغ تجلی کا ایک خفیف سا پرتو ہے۔ مگر اتنا میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ حق کا کامل دیدار اسی کو نصیب ہو سکتا ہے جو اہنسا کی تکمیل کر چکا ہوں۔"

(ج) "حق وہ روح کلی ہے جو کائنات میں جاری و ساری ہے۔ انسان اس کے جلوے کی تاب تب ہی لا سکتا ہے جب وہ ادنیٰ سے ادنیٰ مخلوق کو اپنی جان کے برابر عزیز رکھتا ہو۔"

(د) "ہر ذی حیات سے روحانی اتحاد کا احساس بغیر تزکیۂ نفس کے ناممکن ہے۔ جب تک نفس آلائشوں سے پاک نہ ہو جائے اہنسا کے قانون کی پابندی محض خیال خام ہے۔ جو شخص عفت سے محروم ہے اسے خدا کی معرفت کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ تزکیۂ نفس کے معنیٰ یہ ہیں کہ زندگی کے ہر شعبے میں عفت برتی جائے۔ پاک نفسی میں خدا نے بڑی تاثیر دی ہے۔ اگر انسان اپنے نفس کا تزکیہ کرے تو اس کا ماحول بھی آلائشوں سے پاک ہو جاتا ہے۔

مگر تزکیۂ نفس کی منزل بڑی کٹھن ہے۔ کامل عفت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے انسان خیال، قول اور فعل میں جذبات کی غلامی سے آزاد ہو جائے محبت اور عداوت، رغبت اور نفرت کی دوئی سے نجات حاصل کرے۔"

اگر آپ مندرجہ بالا عبارتوں کے مطلب پر غور کریں تو آپ ان سے گاندھی جی کے تصور کائنات اور فلسفۂ زندگی کے بارے میں حسب ذیل نتیجے اخذ کر سکتے ہیں۔

(الف) زندگی اور کائنات کے یہ سب مظاہر جو نت نیا رنگ بدلتے رہتے ہیں آنی و فانی، عارضی اور اعتباری ہیں۔ ان میں کوئی حقیقت نہیں۔ حقیقت صرف اس وجود مستقل اس جوہر ابدی میں ڈھونڈھنی چاہئے جو ان سب بدلتے ہوئے مظاہر کی تہ میں ہے اور خود کبھی نہیں بدلتا۔ یہی وہ ہستی ہے جو ہم کو اور ساری دنیا کے مظاہر کو پیدا کرنے والی اور پالنے والی ہے جسے مذہب کی اصطلاح میں خدا کہتے ہیں۔ اس کی بہت سی شانیں ہیں لیکن ہماری عبادت اور محبت کی سب سے زیادہ مستحق شان حقیقت یعنی حق محض ہونے کی شان ہے۔

(ب) وحدت وجود کے اس عقیدے کا لازمی نتیجہ ہے کہ انسان کل مخلوق کو، جن میں وہ خود بھی شامل ہے ایک ہی وجود حقیقی کے اجزا مان کر ایک رشتۂ اتحاد و محبت میں مربوط جانے۔ "ادنیٰ سے ادنیٰ مخلوق کو اپنی جان کے برابر عزیز رکھے۔"

(ج) اگر انسان کے نزدیک کل مخلوق ایک ہی نور ابدی کا پرتو ہے اور اپنی جان کے برابر عزیز ہے تو کسی جاندار کو کسی قسم کا دکھ دینا محض دکھ دینے کی خاطر یا تکلیف پہنچانا محض تکلیف پہنچانے کی خاطر ایسا ہے جیسے اپنی جان پر یا معاذاللہ حق تعالیٰ پر ظلم کیا جائے اس لئے جو انسان ہنسا سے کام لیتا ہے وہ دراصل اس رشتۂ اتحاد سے جو اسے کل مخلوق سے اور خالق سے مربوط کرتا ہے ناواقف دوسرے الفاظ میں خود اپنی حقیقت کا اور حقیقت مطلق کا نامحرم ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ معرفت نفس اور معرفت حق کے لئے ہنسا کو ترک کر کے اہنسا کو اختیار کرنا لازمی ہے۔

(د) ہنسا یا تشدد غصے، نفرت، شہوت اور اسی قسم کے شدید جذبات و خواہشات سے پیدا ہوتا ہے۔ اہنسا یا تشدد کے لئے ضروری ہے کہ نفس کو ان آلودگیوں سے پاک کیا جائے۔

(ہ) یہ تزکیۂ نفس بہت مشکل کام ہے۔ اس کے لئے انسان کو "خیال قول اور عمل میں جذبات کی غلامی سے آزاد ہونا چاہئے"۔ کامل ضبط نفس اور سکون قلب اہنسا کی اور اہنسا کے ذریعے سے ستیہ یا معرفت حق کی پہلی سیڑھی ہے۔

یہ ہے گاندھی جی کے فلسفے کا نچوڑ۔ دراصل اس میں کوئی خیال نیا نہیں۔ یہ سب تصورات قدیم ہندی فلسفے میں پائے جاتے ہیں۔ نئی چیز وہ ربط ہے جو گاندھی جی نے ان میں پیدا کیا اور اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ انھوں نے اس سلسلے کی ایک ایک کڑی کو اپنی زندگی میں عمل اور تجربے کی کسوٹی پر کسنے کے بعد قابل قبول سمجھا۔ مشہور حکیموں میں گاندھی جی سے پہلے فلسفے کے اصول روزمرہ کی عملی زندگی سے اخذ کرنے کی خصوصیت سقراط میں پائی جاتی ہے۔ ان دونوں میں اور بھی بہت سی باتیں ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دونوں کے ہاں فلسفے کی کشتیوں میں زندگی کی حرکت اور حرارت ہے جس کی وجہ سے

اور میں ایک لمحے کے لئے ان میں محو ہو جاتا ہوں۔ لیکن خدا کی پرستش میں اسے حق محض سمجھ کر کرتا ہوں۔"

(ب) "مجھے حق کے جو جلوے کبھی کبھی نظر آ گئے ان سے اس نور محض کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا جس کے آگے آفتاب ایک ذرۂ بے نور ہے۔ سچ پوچھئے تو جو کچھ میں نے دیکھا وہ فروغ تجلی کا ایک خفیف سایہ تو ہے۔ مگر اتنا میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ حق کا کامل دیدار اسی کو نصیب ہو سکتا ہے جو اہنسا کی تکمیل کر چکا ہوں۔"

(ج) "حق وہ روح کلّی ہے جو کائنات میں جاری و ساری ہے انسان اس کے جلوے کی تاب تب ہی لا سکتا ہے جب وہ ادنیٰ سے ادنیٰ مخلوق کو اپنی جان کے برابر عزیز رکھتا ہو۔"

(د) "ہر ذی حیات سے روحانی اتحاد کا احساس بغیر تزکیۂ نفس کے ناممکن ہے۔ جب تک نفس آلائشوں سے پاک نہ ہو جائے اہنسا کے قانون کی پابندی محض خیال خام ہے۔ جو شخص عفت سے محروم ہے اسے خدا کی معرفت کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ تزکیۂ نفس کے معنیٰ یہ ہیں کہ زندگی کے ہر شعبے میں عفت برتی جائے۔ پاک نفسی میں خدا نے بڑی تاثیر دی ہے۔ اگر انسان اپنے نفس کا تزکیہ کرے تو اس کا ماحول بھی آلائشوں سے پاک ہو جاتا ہے۔

مگر تزکیۂ نفس کی منزل بڑی کٹھن ہے۔ کامل عفت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے انسان خیال، قول اور فعل میں جذبات کی غلامی سے آزاد ہو جائے محبت اور عداوت، رغبت اور نفرت کی دوئی سے نجات حاصل کرے۔"

اگر آپ مندرجہ بالا عبارتوں کے مطلب پر غور کریں تو آپ ان سے گاندھی جی کے تصور کائنات اور فلسفۂ زندگی کے بارے میں حسب ذیل نتیجے اخذ کر سکتے ہیں۔

(ل) زندگی اور کائنات کے یہ سب مظاہر جو نت نیا رنگ بدلتے رہتے ہیں آنی و فانی، عارضی اور اعتباری ہیں۔ ان میں کوئی حقیقت نہیں۔ حقیقت صرف اس وجود مستقل اس جوہر ابدی میں ڈھونڈھنی چاہئے جو ان سب بدلتے ہوئے مظاہر کی تہ میں ہے اور خود کبھی نہیں بدلتا۔ یہی وہ ہستی ہے جو ہم کو اور ساری دنیا کے مظاہر کو پیدا کرنے والی اور پالنے والی ہے جسے مذہب کی اصطلاح میں خدا کہتے ہیں۔ اس کی بہت سی شانیں ہیں لیکن ہماری عبادت اور محبت کی سب سے زیادہ مستحق شان حقیقت یعنی حق محض ہونے کی شان ہے۔

(ب) وحدت وجود کے اس عقیدے کا لازمی نتیجہ ہے کہ انسان کل مخلوق کو، جن میں وہ خود بھی شامل ہے ایک ہی وجود حقیقی کے اجزا مان کر ایک رشتۂ اتحاد و محبت میں مربوط جانے۔ "ادنےٰ سے ادنےٰ مخلوق کو اپنی جان کے برابر عزیز رکھے۔"

(ج) اگر انسان کے نزدیک کل مخلوق ایک ہی نور ابدی کا پرتو ہے اور اپنی جان کے برابر عزیز ہے تو کسی جاندار کو کسی قسم کا دکھ دینا محض دکھ دینے کی خاطر یا تکلیف پہنچانا محض تکلیف پہنچانے کی خاطر ایسا ہے جیسے اپنی جان پر یا معاذ اللہ حق تعالیٰ پر ظلم کیا جائے اس لئے جو انسان ہنسا سے کام لیتا ہے وہ در اصل اس رشتۂ اتحاد سے جو اسے کل مخلوق سے اور خالق سے مربوط کرتا ہے ناواقف دوسرے الفاظ میں خود اپنی حقیقت کا اور حقیقت مطلق کا نامحرم ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ معرفت نفس اور معرفت حق کے لئے ہنسا کو ترک کر کے اہنسا کو اختیار کرنا لازمی ہے۔

(د) ہنسا یا تشدد غصّے، نفرت، شہوت اور اسی قسم کے شدید جذبات و خواہشات سے پیدا ہوتا ہے۔ اہنسا یا تشدد کے لئے ضروری ہے کہ نفس کو ان آلودگیوں سے پاک کیا جائے۔

(ہ) یہ تزکیۂ نفس بہت مشکل کام ہے۔ اس کے لئے انسان کو "خیال قول اور عمل میں جذبات کی غلامی سے آزاد ہونا چاہئے" کامل ضبط نفس اور سکون قلب اہنسا کی اور اہنسا کے ذریعے سے ستیہ یا معرفت حق کی پہلی سیڑھی ہے۔

یہ ہے گاندھی جی کے فلسفے کا نچوڑ۔ در اصل اس میں کوئی خیال نیا نہیں۔ یہ سب تصورات قدیم ہندی فلسفے میں پائے جاتے ہیں۔ نئی چیز وہ ربط ہے جو گاندھی جی نے ان میں پیدا کیا اور اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ انھوں نے اس سلسلے کی ایک ایک کڑی کو اپنی زندگی میں عمل اور تجربے کی کسوٹی پر کسنے کے بعد قابل قبول سمجھا۔ مشہور حکیموں میں گاندھی جی سے پہلے فلسفے کے اصول روزمرہ کی عملی زندگی سے اخذ کرنے کی خصوصیت سقراط میں پائی جاتی ہے۔ ان دونوں میں اور بھی بہت سی باتیں ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دونوں کے ہاں فلسفے کی کشتیوں میں زندگی کی حرکت اور حرارت ہے جس کی وجہ سے

اس کی حدود ادب سے مل جاتی ہیں۔

گاندھی جی کی تحریروں کی ادبی خصوصیات ان کی فلسفیانہ خصوصیات سے پیدا ہوئی ہیں۔ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ ان کے نزدیک ادب محض تفریح اور تفنن کا ذریعہ نہیں بلکہ اس کا کام زندگی کی اعلیٰ قدروں ستیہ اور اہنسا حق اور عدم تشدد کی ترجمانی اور تبلیغ ہے۔ اسی لئے ان کے ہاں نفس مضمون کے مقابلے میں زبان اور اسلوب بیان کی اہمیت کچھ کم ہے زیادہ اہتمام وہ اس کا کرتے ہیں کہ جو بات کہی جائے وہ سچی ہو، اور اپنی سچائی کی وجہ سے دل کو لگتی ہو۔ اس کی اتنی فکر نہیں کرتے کہ اسے کس ڈھنگ سے اور کس زبان میں کہا جائے۔ خالص ادبی مقصد کو پیش نظر رکھ کر کوئی کتاب لکھنا گاندھی جی کے رفیق ان کے لئے اور وہ خود اپنے لئے اس حد تک قابلِ اعتراض سمجھتے تھے کہ انھیں اپنی آپ بیتی تلاش حق لکھتے وقت خاص طور پر معذرت کرنی پڑی کہ یہ اس طرح کی آپ بیتی نہیں جیسی عام طور پر لکھی جاتی ہیں بلکہ محض ان تجربوں کی روداد ہے جو مصنف نے "تلاش حق" میں کئے۔ اعتراض ان کے ایک ساتھی نے ان لفظوں میں کیا تھا:۔

"یہ آپ کو کیا سوجھی کہ اس جھگڑے میں پڑ گئے۔ آپ بیتی لکھنا مغربی ملکوں کا دستور ہے۔ میں نے آج تک نہیں سنا کہ مشرق میں سوا ان لوگوں کے جن پر مغرب کا اثر ہوگیا ہے، کسی نے آپ بیتی لکھی ہو اور آپ لکھیں گے کیا؟ فرض کیجئے کہ آج آپ جن اصولوں کے قائل ہیں انھیں کل ترک کر دیں یا اب جو تجویزیں آپ کے سامنے ہیں وہ بدل جائیں، تو کیا اس کا اندیشہ نہیں کہ جو لوگ آپ کی تحریر اور تقریر پر عمل کرتے وہ دھوکے میں پڑ جائیں گے، کیا آپ کے خیال میں یہ بہتر نہیں کہ آپ ابھی اس قسم کی کتاب نہ لکھیں، بلکہ کبھی نہ لکھیں؟"

گاندھی جی اس کے جواب میں فرماتے ہیں:۔

"اصل میں میرا مقصد اس قسم کی کتاب لکھنا نہیں جو آپ بیتی کہلاتی ہے میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ میں نے حق کی تلاش میں جو تجربے کئے ہیں ان کی کہانی سنا دوں۔ یہ سچ ہے کہ میری ساری عمر انھیں تجربوں میں گذری ہے اس لئے یہ کہانی آپ بیتی بن جائے گی۔ لیکن اگر کتاب کے ہر صفحے میں سوا ان تجربوں کے کسی چیز کا ذکر نہ ہو تو میں ایسی آپ بیتی لکھنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ اب چاہے یہ میرے نفس کا دھوکا ہو مگر مجھے یقین ہے کہ ان تجربوں کا ایک مسلسل بیان پڑھنے والوں کے لئے فائدے سے خالی نہ ہوگا۔"

لیکن پھر بھی گاندھی جی اپنے اس عام اصول کے ماتحت کہ اچھے مقصد کے لئے وسائل بھی اچھے ہونے چاہئیں معنی کے مقابلہ میں صورت، مواد کے مقابلہ میں ہیئت یعنی نفس مضمون کے مقابلے میں طرز بیان کی اہمیت کو گھٹا نہیں سکتے تھے۔ انھوں نے بڑے اہتمام اور کوشش سے اپنی زبان اور اسلوب کو ایسے سانچے میں ڈھالا جو ان کے مقصد کے لحاظ سے سب سے زیادہ موزوں اور مناسب تھا چونکہ ان کا سب سے بڑا مقصد حق گوئی اور حق جوئی تھا اس لئے سب سے زیادہ زور وہ اسلوب بیان کی سادگی اور اصلیت یعنی حقیقت نگاری پر دیتے تھے۔ اپنی جنوبی افریقہ کی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"جس طرح آج "ینگ انڈیا" اور "نوجیون" میری زندگی کا آئینہ ہیں ان دنوں "انڈین اوپینین" تھا۔ ہر ہفتے اس میں اپنی واردات قلب کی داستان اپنے درد دل کی کہانی کہا کرتا تھا اور ستیہ گرہ کے عمل اور اصول کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کرتا تھا۔ دس سال کے عرصے میں یعنی ۱۹۱۴ء تک بجز اس زمانے کے جو میں نے قید میں گذارا کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے اس میں مضمون نہ لکھا ہو۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے ان مضامین میں ایک لفظ بھی بغیر سوچے سمجھے لکھا ہو یا کبھی جان بوجھ کر مبالغہ یا خوشامد کی ہو۔ سچ پوچھئے تو یہ اخبار نویسی میرے لئے ضبط نفس کی تربیت تھی اور میرے دوستوں کے لئے میرے خیالات سے باخبر رہنے کا ذریعہ، نقادوں کو اس پر اعتراض کا بہت کم موقع ملتا تھا بلکہ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ انڈین اوپینین" کے لہجے نے نقادوں کو قلم روک کر لکھنے پر مجبور کر دیا۔"

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:۔

"میری اول سے آخر تک یہی کوشش رہی کہ حق کا جو جلوہ مجھے نظر آیا اور جس طرح نظر آیا اسے بے کم و کاست بیان کر دوں۔"

"ستیہ" کے بعد گاندھی جی اہنسا کی خدمت کو اپنی تحریروں کا سب سے بڑا مقصد سمجھتے تھے۔ اس لئے ان کا اسلوب بیان بھی اہنسا کی روح سے معمور ہوتا تھا۔ وہ کبھی شدت جذبات کی رو میں نہیں بہتے تھے ہمیشہ ضبط، سکون اور توازن قائم رکھتے تھے۔ انھیں اپنی عمر میں بہت سی برائیوں کے خلاف قلمی جہاد کرنا پڑا، بہت سے حریفوں سے تحریری لڑائی لڑنی پڑی۔ لیکن کبھی انھوں نے اپنی عبارت کو بدگوئی سخت کلامی، طعن، طنز تضحیک یا تمسخر سے آلودہ نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے اس

بات کی انتہائی کوشش کی اور اکثر اس میں کامیاب ہوئے کہ ان کے الفاظ مخاطب کو سمجھائیں، قائل اور متاثر کریں یا زیادہ سے زیادہ چونکائیں اور جھنجوڑیں مگر اس کا دل نہ دکھائیں، اس کی خودداری کو ٹھیس نہ لگائیں۔ وہ جانتے تھے کہ دوسروں کی دل آزاری کا سب سے بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ لکھنے والا غرور یا خود پسندی سے کام لے کیونکہ اس میں مخاطب کی تحقیر کا پہلو نکلتا ہے۔ تلاشِ حق کے دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

"جو کچھ میں ان صفحوں میں لکھ رہا ہوں اگر اس میں سے کسی چیز میں پڑھنے والے کو غرور کا شائبہ بھی نظر آئے تو انھیں سمجھ لینا چاہئے کہ میری تلاش میں کوئی کھوٹ ہے، اور جو جھلک مجھے نظر آیا کرتی ہے وہ محض ایک سراب ہے۔ چاہے مجھ جیسے سیکڑوں کی شہرت خاک میں مل جائے مگر حق کا بول بالا رہے۔"

بحث خاصی طویل ہوگئی اور اس پر بھی ہم موضوع بحث کی اوپری سطح کو چھونے سے زیادہ کچھ نہیں کر سکے۔ اس لئے ہم اس مضمون کا خلاصہ ایک جملے میں بیان کر کے اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔ جو حضرات فلسفے کو خالص ذہنی ہوشگافیوں اور ادب کو محض جمالی سخن آرائیوں کا ذریعہ سمجھتے ہیں ان کو گاندھی جی کی فلسفیانہ اور ادیبانہ اہمیت کے بارے میں شبہہ ہو سکتا ہے لیکن جو لوگ فلسفے اور ادب کو زندگی کا آئینہ دار، اس کی بنیادی ضرورتوں کا ترجمان اور اس کی اعلیٰ قدروں کا خادم سمجھتے ہیں ان کو اس بات کے ماننے میں ذرا بھی تامل نہ ہوگا کہ گاندھی جی عہد حاضر کے سب سے بڑے اخلاقی رہنما، مصلح اور معلم ہونے کے علاوہ ایک سچے فلسفی اور ادیب بھی تھے۔

باپو نے کہا

مرحبا مرحبا اے جذبۂ اربابِ وطن
مرحبا مرحبا اے اہلِ قلم اہلِ سخن
مرحبا مرحبا ان ماؤں کی ان گودوں کو
جن کے بچوں کے لہو سے ہوا شاداب چمن

ڈاکٹر پیکر جعفری
ڈی۔۴۔۴۸۔ ایل ڈی اے کالونی عیش باغ لکھنؤ

گاندھی جی

ایم کے ٹھاوری آفاقی
قاضی بزار، گورکھپور

وہ فلسفی وہ مفکّر، وہ رہبرِ کامل
وہ بے مثال مُدبّر، عظیم دانش ور
بھلا سکے گا زمانہ، نہ تا اَبد جس کو
نہ ہوگا پیدا کبھی اس کے جیسا دیدہ ور
خدا کا بندہ، بھگت ایشور کا کہلایا
کہ جیسا کہتا تھا ویسا ہی کر کے دکھلایا

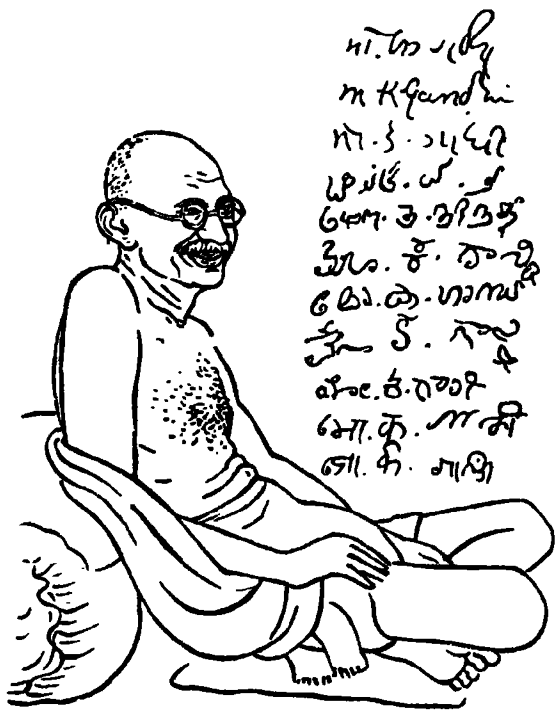
وہ مسجدوں کے منارے وہ مندروں کے کلش
سنا رہے ہیں ستاروں کو داستاں اُس کی
نئے نقوش فروزاں ہیں جن کی اینٹوں پر
چمک رہی ہے جہاں روحِ جاوداں اُس کی

تھا ایک ہاتھ میں قرآن ایک میں گیتا
وہ جس کے جذبوں سے کلماتِ بندگی تھے رَواں
وہ آدمی تھا مگر دیوتاؤں جیسا تھا
جسے بھجن میں بھی درکا تھا شعورِ اذاں

ہم اس کی یاد میں گم تھے کبھی، مگر اے دوست
چلو اب اس کی طرف، پھر چلیں اسی کی طرف!
کہ اس کے نقشِ قدم دیکھو ہٹ نہ جائیں کہیں
ہوائیں تیز، بہت تیز ہوتی جاتی ہیں
وہ مشعلیں جو جلائی تھیں اس کی یادوں نے
پھر آؤ دیکھیں ذرا جل کے بجھ نہ جائیں کہیں

ہم اس کی یاد میں گم تھے کبھی مگر اے دوست
کہا تھا اس نے جو ہم سے وہی کہا جائے
پھر اس کی یاد ہی کو رہنما کیا جائے
اسی کے نقشِ قدم پر سدا چلا جائے

□□



باپو

دستخط کے آئینے میں

تازہ امتحان

علی جواد زیدی
۵۰ گرو ونڈرس، پالی گرکس روڈ، بمبئی - ۴۰۰۰۹۲

(۱)

گزرتے وقت کی رَو کون روک سکتا ہے
صَدی کے بیتنے پر فکر محوِ حیرت ہے
کہاں گئی وہ تمنّا، وہ شوقِ بے پروا ؟
کدھر گئے وہ جَواں سال جدوجہد کے دن ؟
وہ سرپھرے، وہ جنونِ شفق کے پروردہ
جو میرے درد کو اپنا ہی غم سمجھتے تھے
جو اپنے پیار کو دُنیا میں بانٹ دیتے تھے
زمانہ بیتتا ہے، کروٹیں بدلتا ہے.
صدی کی بات ہے، دو ایک دن کی بات نہیں
اسی زمیں پہ شہیدوں کا کارواں ٹھہرا
شہادتیں جو کبھی رائیگاں نہیں جاتیں!
اسی زمیں پہ سجدے کیے ہیں غیروں نے
کہ اس زمین کی نظروں میں کوئی غیر نہیں!

میں سوچتا ہوں سَوا سَو برس تو بیت چکے
مگر وہ عزمِ جواں، آج بھی جوان ہے کیا ؟
کوئی سبَب تو ہے جو یہ خیال آتا ہے
رہِ وفا میں کوئی تازہ امتحان ہے کیا ؟
قریب آؤ تو اے دوستو! سُناؤں تمھیں
وہ بات جو کبھی پہلے بھی تم سے کی ہوگی ....

(۲)

خوشا وہ ہاتھ کہ سَردی بھرے اندھیرے میں
نکالی جس نے دلِ سنگ سے بھی چنگاری
خوشا وہ لوگ جنھوں نے یہ آگ بجھنے نہ دی
کسی نے شعلہ بہ شعلہ اسے فروغ دیا
کسی نے اس کی پرستش میں روشنی پائی!

یہ آگ جلتی رہی، روشنی مچلتی رہی
رگوں میں گرم رہا اس سے خونِ انسانی
یہ آگ وہ ہے کہ لاکھوں کے ہاتھ جھلسائے
مگر اسی نے شبِ تار کو جمال دیا
خوشا وہ ذہن کہ جس نے ذرا سے شعلے کو
اندھیرے گھر کے دیے کی چمک میں ڈھال دیا

دیے کی لو سے لڑیں تیز آندھیاں سو بار
کہیں تو چھپی آنچل ہی بن گیا دیوار
کہیں حنائی ہتھیلی بنی حسیں حصار
کسی نے اوٹ کی خاطر بنا لیے فانوس
بجھا جو ایک دیا سو دیے چمک اٹھے
اندھیرے ہار گئے روشنی کی فتح ہوئی

(۳)

ہزار شکل میں دیکھا گیا اندھیروں کو
ہزار بار اندھیروں نے سازشیں کی ہیں
ہزار بار ہوئی ہے شکستِ فاش انھیں
کہیں نفاق، کہیں محشر جدال و قتال
کہیں پہ جہل و توہم، کہیں پہ استحصال
کہیں پہ زعم کہ شمشیر و گرز اپنے ہیں
مگر بڑھا ہے کوئی لے کے لالہ گوں مشعل
نہ خوفِ صرصر و طوفاں، نہ خوف دار و صلیب
نظر کے سامنے ہے اک جلوس صدیوں کا
کسی کے سر پہ چمکتا ہے تاج کانٹوں کا
کسی کے دستِ قوی میں ہے زہر کا پیالہ
کسی کے پائے مجاہد میں آہنی زنجیر
کسی کے حلق بریدہ پہ روشنی کی لکیر

ہر ایک بار اندھیرے کو یہ گماں گزرا
کسی بھی شمع کی لو اب نہ تھرتھرائے گی
مگر ہر ایک جگہ شمع کی قطاریں تھیں
جدھر جدھر سے اندھیروں کا کارواں گزرا

(۴)

اسی صدی کا، اسی ملک کا ہے افسانہ
کہ نیم برہنگی کا جلالِ شاہانہ
اندھیرا چیر کے سورج کی شان سے نکلا

وہ زندگی کو جلاتا رہا دیے کی طرح
کہ خود جلے تو جلے بزم جگمگاتی رہے

گداز قلب و نظر شمع بھی تھا، تیشہ بھی
پگھل پگھل گئے کہسار، گر پڑی دیوار
بھلا یہ کس میں تھا دم خم کہ راستہ روکے؟

یہ ناتواں سا مسافر جفا کی راہوں کا
تمام عمر نبرد آزما رہا غم سے
کوئی سوال لیے سینۂ شہادت میں
کسی جواب کا طالب ہے آج بھی ہم سے
یہ امتحاں ہے کہ اب ہم جواب کیا دیں گے

■■

"میرا یقین ہے کہ عدم تشدد، تشدد کے مقابلے میں کہیں زیادہ بہتر ہے اور عفو، سزا سے زیادہ شجاعانہ ہے لیکن درگزر کرنا اسی وقت عفو میں شمار کیا جا سکتا ہے جب سزا دینے کی طاقت حاصل ہو۔ اگر کوئی مجبور و لاچار شخص درگزر کرنا چاہے تو اس کے کوئی معنی نہیں!"
—— مہاتما گاندھی

سید امجد حسین

عظیم دانش ور، مفکر، مؤرخ، مجاہد آزادی

بشمبھر ناتھ پانڈے سے گفتگو

مؤرخ سیاست داں، الہ آباد کارپوریشن کے پہلے میئر، مقرر، صحافی اور سابق گورنر اڑیسہ جناب بشمبھر ناتھ پانڈے جن کی پیری میں علمی شباب نظر آتا ہے، ہمیں فخر ہے کہ قومی یکجہتی کے اس علمبردار اور راسخ العقیدہ گاندھیائی کی سرپرستی نیا دور کو حاصل ہے۔

ایڈیٹر

آج بڑا دن ہے، دسمبر کی نرم دھوپ آہستہ آہستہ پھیلتی جا رہی تھی۔ جب میں لودھی اسٹیٹ کے بنگلہ نمبر ا میں پہونچا تو ایک لمحہ کے لئے مجھے یہ احساس ہوا کہ میں اپنے الٰہ آباد کے سب سے بڑے دانش ور، مورخ محقق اور گاندھی وادی سے دوبارہ ملنے جا رہا ہوں۔

ان کی وجیہ شخصیت اس عمر میں بھی پرکشش تھی اور چہرے پر علمی وقار کے ساتھ سادہ اور سچی زندگی کی معصومیت نظر آ رہی تھی۔ انھوں نے اپنی شفیق آواز میں راقم الحروف سے کہا:

"ہم لوگ آفس چلتے ہیں، وہیں پر باتیں کریں گے۔"

میں نے فوراً تعمیل کی۔ وہ اُٹھے اور ہم دونوں ساتھ ہو لیے اور پھر ان کے دفتر گاندھی اسمرتی، ۳۰ جنوری مارگ پر آ گئے۔ وہ ۱۲۵ویں جینتی تقریبات کمیٹی کے چیرمین بھی ہیں۔ وہاں کتابیں فروخت بھی ہو رہی تھیں اور الماریوں میں سلیقے سے سجی ہوئی تھیں۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ پڑھے لکھے آدمی کے دفتر میں بھی کتابوں ہی سے ملاقات ہوتی ہے۔ میں ابھی کتابوں کی دُنیا میں گم تھا کہ انھوں نے مجھے مخاطب کیا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بیٹھنے کے بعد خوش گوار ماحول میں رسمی گفتگو کے بعد میں نے عرض کیا:

(س) "آپ گاندھی جی سے کب ملے؟"

میں نے دیکھا کہ ان کی پیشانی کی لکیریں یہ بتا رہی تھیں کہ وہ ماضی کی وادیوں میں گشت کر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے دل نشین لہجے میں کہنا شروع کیا۔

(ج) "تاریخ مجھے کبھی نہیں بھول سکتی۔ دوسری اپریل ۱۹۲۱ء کو میں ان سے ملا تھا۔ اس سے پہلے دسمبر ۱۹۲۰ء میں ناگپور سیشن میں میں نے انھیں دیکھا تھا، میں اس وقت کانگرس کا والنیٹر تھا لیکن ملنے کا شرف ۱۹۲۱ء میں دوسری اپریل کو حاصل ہوا۔

(س) آپ تو اس وقت نوجوان رہے ہوں گے۔؟

(ج) میں اس وقت پندرہ سال کا تھا۔

میں نے دل ہی دل میں حساب لگایا کہ پانڈے جی کی تاریخ پیدائش ۱۹۰۵ء یا ۱۹۰۶ء ہوگی۔

(س) جی! (میں نے چونکتے ہوئے کہا) جب آپ نے مہاتما جی کو دیکھا اس وقت آپ نے کیا محسوس کیا۔ میرا مطلب ہے اس وقت آپکی ان کے بارے میں کیا رائے تھی؟

(ج) ان کی نگاہوں میں جادو کا سا اثر تھا۔ انھیں دیکھتے ہی آدمی خود کو ان کے سپرد کرنے میں اپنے کو مجبور سا پاتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس وقت سارے ہندستان کی اُمیدوں کا وہ مرکز

تھے، لوگ ان سے آس لگائے تھے۔ اس زمانے میں تحریک ترک موالات کا زور تھا کانگریس اور خلافت تحریک ساتھ ساتھ تھی۔ علی برادران یعنی مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی مرحوم گاندھی جی کے دائیں بائیں چلا کرتے تھے۔

(س) پانڈے جی! نوجوانی کا تقاضہ تو تشدد ہوتا ہے۔ آپ اس وقت تحریک آزادی کے بارے میں کیا رویہ رکھتے تھے؟

(ج) تمہاری اس بات میں کسی حد تک سچائی ہے۔ اس وقت میں انگریزوں سے شدید نفرت رکھتا تھا اور سوچا کرتا تھا کہ اگر ایک سے زائد انگریزوں کا خون کرنا پڑے تو ان کا خون کر دوں گا۔ میں نے سنا تھا کہ میرا بھرا پُرا خاندان تھا۔ خاندان میں ۲۵ آدمی تھے، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں ان سب کو مار ڈالا گیا تھا، عورتیں زندہ جلا دی گئی تھیں۔

میں نے دیکھا کہ وہ بہت زیادہ جذباتی ہو گئے تھے، ان کے چہرے پر غم آلود نرماہٹ دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے بات کا رُخ دوسری طرف موڑتے ہوئے کہا کہ آپ کی زبان اتنی شستہ ہے جی چاہتا ہے سنتے رہیں۔ ویسے آپ کا کیا خیال ہے۔

(س) ہندستان میں لسانی مسئلے پر گاندھی جی کے کیا خیال تھے؟

(ج) اس سلسلے میں میں نے اپنی کتاب "سمگر چنتن" میں تمام باتیں تفصیل سے لکھ دی ہیں۔ میں اسے پھر دوہراتا ہوں کہ جو لوگ اُردو زبان سے پوری طرح واقف ہیں وہ اس بات کو جانتے ہیں کہ اُردو ادب پر ودیشی ہونے کا الزام لگانا صریحاً ناانصافی ہے۔ (انھوں نے بڑی تفصیل سے اُردو شاعروں کے نام گناتے ہوئے اور تمام اصناف سخن کا حوالہ دیتے ہوئے میرؔ، میر حسن، دیا شنکر نسیم، چکبست اور اکبر وغیرہ کا حوالہ دیا اور پھر مرثیہ کے بارے میں کہا کہ) اگرچہ مرثیہ کے کردار اور واقعات ہندستان کے نہیں ہیں لیکن اس کی فضا قطعاً ہندستانی ہے۔

(س) گاندھی جی اس بارے میں کیا سوچتے تھے؟ میرا مطلب ہے ہندستان میں یہ اُردو ہندی والا معاملہ......

(ج) گاندھی جی کے لسانی نظریات کے سلسلے میں، میں نے اسی کتاب میں تفصیلی بحث کی ہے۔ گاندھی جی نے زبان سے متعلق پالیسی کے سلسلے میں، ۱۹۴۷ء میں دلّی کی اپنی پرارتھنا سبھا میں کہا تھا کہ

"لوگ کہتے ہیں کہ تو تو عرصے تک ہندی ساہتیہ سمیلن میں تھا جب وہاں تھا تو ہندی کی خوبیاں بتاتا تھا۔ جنوبی ہند میں تو نے ہندی چلائی وہاں کے لوگ تو تمل کو مانتے تھے وہاں تو نے ہندی چلا دی تو نے ہندی کی بڑی خدمت کی۔ اب تو ہندستانی کی بات کیوں کرتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ میں جس ہندی کو مانتا ہوں وہ ہندستانی تھی، میں اندور کے ہندی ساہتیہ سمیلن میں گیا وہاں میں نے کہہ دیا کہ میں جس ہندی کو مانتا ہوں اسے ہندو بھی بولتے ہیں، مسلمان بھی بولتے ہیں۔ میری ہندی وہ نہیں ہے جسے ہندی والے بولتے ہیں، میں تو ٹوٹی پھوٹی ہندی بولتا ہوں جسے سب سمجھ لیتے ہیں۔ مجھے نہ تو فارسی، عربی سے لدی اُردو چاہیئے اور نہ سنسکرت سے بھری ہندی۔ مجھے تو گنگا جمنا کا سنگم چاہیئے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ تو ناسمجھ ہے لوگ انجمن ترقی اُردو کی بات سُنیں گے، لوگ ہندی ساہتیہ سمیلن کی بات سنیں گے تیری بات کون سُنے گا؟

لیکن میرا دل تو باغی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں ہندستانی کیوں چھوڑ دوں۔ جب پریاگ جاتے ہیں تو سنگم میں نہاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سنگم انسان لوگوں کو پوتر کرتا ہے۔ اسی طرح اگر اُردو ہندی کا سنگم بنالوں تو میں پاون (مقدس) ہو جاؤں گا۔ اگر میں اکیلا رہوں گا تو بھی یہی کہوں گا کہ میں تو ہندستانی کو ہی راشٹر بھاشا مانتا ہوں۔ میں مرجاؤں گا تو بھی جھکنے والا نہیں ہوں۔ جیسا میرا دل کہتا ہے ویسے ہی آپ بھی بنیں تو اچھا ہے۔ ہندستان کے لئے اچھا ہے۔"

اپنی موت سے تقریباً ڈیڑھ ماہ پہلے گاندھی جی نے اپنے انھیں جذبات کو دوہراتے ہوئے کہا تھا:

"جب سے میں دکھن افریقہ سے واپس آیا ہوں تبھی سے برابر یہ کہتا ہوں کہ ہماری راشٹریہ بھاشا وہی ہو سکتی ہے جس کو

ہندو اور مسلمان زیادہ سے زیادہ تعداد میں بولتے اور لکھتے ہیں تب تو وہ دیوناگری لپی میں لکھی ہوئی یا اُردو لپی (رسم الخط) میں لکھی ہوئی ہندستانی ہی ہوسکتی ہے۔ میں نے تو کہا ہے کہ میں اُردو کا سمرتھن (تائید) کرتا ہوں لیکن ساری دُنیا کا منتر ہوتے ہوئے بھی میں انگریزی کا سمرتھن کیوں نہیں کرتا، یہ سمجھنے لائق بات ہے۔

انگریزی بھاشا کا یہاں استھان (مقام) نہیں ہے۔ انگریزوں نے یہاں راج چلایا اور پیچھے جو راج چلاتا ہے وہ اپنی بھاشا بھی چلاتا ہے وہ بدیسی بھاشا ہے سدیشی نہیں، اس لیے مجھ کو یہ کہتے ہوئے دُکھ نہیں بلکہ فخر ہوتا ہے کہ اردو ہندستان کی بھاشا ہے اور وہ ہندستان ہی میں بنی ہے۔

تلسی داس کے تو ہم سب بھگتا (مداح) ہیں اور ہونا ہی چاہیے ان کی رامائن میں عربی اور فارسی کے الفاظ بھرے پڑے ہیں جو شبد لوگ بازار میں بولتے تھے وہی انھوں نے لے لیے اس لیے جو تلسی کی بھاشا ہے وہی ہماری بھاشا ہے۔ اگر آپ کو فیصلہ کرنا ہے کہ کون سی ہماری راشٹریہ بھاشا ہے تو میں یہ دعوے سے کہہ سکتا ہوں، بیچھے ہندو مجھ کو چاہے مار ڈالیں کاٹیں یا کچھ بھی کریں، کہ ہماری راشٹریہ بھاشا وہی ہوسکتی ہے جو دیوناگری اور اُردو دونوں لپیوں میں لکھی جاتی ہے۔ آخر ہندی ساہتیہ سمیلن کا میں دو بار سبھاپتی (صدر) رہ چکا ہوں اور سبھاپتی کے پد سے میں نے یہی بات کہی اور کسی نے شکایت نہیں کی، اگر کی ہوگی تو شاید دو ایک نے کی ہوگی اور سب لوگوں نے تالیاں بجائیں اور کہا کہ میں بالکل ٹھیک بات کہتا ہوں۔ آج بھی میں وہی آدمی ہوں۔ تب آپ مجھ کو ایسا سنائیں کہ میں ہندی کا کچھ کم لیتا ہوں اور اسی لیے میں کم ہندستانی ہوں۔ مجھ کو تو ایسا لگتا ہے کہ جو آدمی اُردو پر اعتراض کرتا ہے وہی کم ہندستانی ہے۔"

میں یہ سوچ رہا تھا کہ کاش آجکل کے زمانے میں بھی گاندھی جی ہوتے پھر اک دم چونک کر میں نے کہا:

(س) آپ لوگ گاندھی پیس فاؤنڈیشن میں کیا کر رہے ہیں؟

(ج) اس کے تحت گاندھی پیس ایوارڈ ایک کروڑ روپئے کا دیا جا رہا ہے اور اس کا پہلا ایوارڈ ساؤتھ افریقہ کو دیا جا رہا ہے۔ اس کے تحت ۱۲۵ گاندھی گراموں کو ڈیولپ (Devlap) کیا جا رہا ہے اور اس پر قریب ایک ہزار کروڑ روپئے کا نشانہ رکھا گیا ہے۔

میں نے جنوبی افریقہ کی بات جیسے ہی سُنی مجھے نیلسن منڈیلا یاد آئے۔ میری نظروں کے سامنے وہ مناظر گھوم گئے جب مہاتما گاندھی نے نسل پرستی کے خلاف مغرب کو چیلنج کیا تھا۔ مجھے دوسری جنگ عظیم یاد آئی مجھے فسادات یاد آئے، مجھے کتابوں میں پڑھا ہوا کلکتہ کا وہ منظر یاد آیا جب کھڑکی کھول کر ایک بوڑھا انسان سینہ تانے ہوئے پچاس ہزار کے مجمع کو للکارتے ہوئے کہہ رہا تھا مجھے مارو۔ مارو۔۔۔ اور وہی مجمع جس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ وہی مجمع مہاتما گاندھی کی جے کے نعرے لگا رہا تھا۔ یہ سب سوچتے ہوئے مجھے اپنے گرد و پیش، پورے سماج کے حالات اور اخلاقی قدروں کے زوال کی باتیں یاد آئیں ـــ میں نے بے اختیار پوچھا:

(س) کیا آج کے دور کے لیے مہاتما گاندھی کا پیغام پُراثر ہوسکتا ہے۔؟

(پانڈے جی ایک لمحے کے لیے کھو سے گئے۔ ان کی آنکھوں میں چمک جاگ اٹھی انھوں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا)

(ج) آج کے دور کو مہاتما گاندھی کے پیغام پر عمل کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ اس لیے کہ مادیت کے دور میں مشینی زندگی نے آلودگی اتنی بڑھا دی ہے کہ آدمی کو سانس لینا دشوار ہے۔

(س) یہ آپ علامتی زبان میں کہہ رہے ہیں۔؟

(ج) تم جو سمجھو! آج یورپ میں جہاں ماحول کی آلودگی ہے وہیں امریکہ میں جانتے ہو کیا ہو رہا ہے۔؟

(س) آپ فرمائیں۔؟

(ج) ہزاروں ایکڑ زمین بنجر ہوچکی ہے۔ اس لیے ہوچکی ہے کہ کیمیاوی کھاد کا انجام یہی ہوتا ہے۔ درخت کٹتے جا رہے ہیں۔ اس کی وجہ سے بارش کم ہوتی ہے۔ زمین کی زرخیزی

(باقی)

پی۔ ڈی۔ ٹنڈن
۴۔ ایڈگن روڈ۔ الہ آباد



گاندھی جی : بھولی بسری یادیں

پروشوتم داس ٹنڈن الہ آباد کے ایک ایسے گھرانے کے چشم و چراغ رہے ہیں جس نے تحریک آزادی میں دامے، درمے، قدمے، سخنے ہر طرح سے تعاون کیا ہے۔ ٹنڈن صاحب کی خود نوشت (FLAME FROM THE ASHES) کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ٹنڈن جی کا تعلق نہرو خاندان سے بہت گہرا رہا ہے۔ نہرو جی کے توسط سے یہ گاندھی جی کے قریب آئے اور گاندھی جی کو قریب سے دیکھا۔ اس مضمون میں انھوں نے گاندھی جی کی زندگی کے ان پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے جس پر گاندھی جی کے حیات پر لکھنے والے دوسرے مصنفین کی نظر نہیں پہنچ سکی تھی۔ یہ جامع مضمون حاضرین کے لیے پیش کیا جا رہا ہے۔ [ایڈیٹر]

مہاتما گاندھی جہاں بیٹھتے تھے وہ جگہ مندر کا تقدس لیے ہوئے ہوتی تھی۔ ان کا اٹھایا ہوا ہر قدم حب الوطنی سے لبریز ہوتا تھا معروف سائنس داں آئنسٹائن نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ آنے والی نسلیں حیرت کریں گی کہ گاندھی جیسا انسان اس سرزمین پر چلا تھا۔ گاندھی جی کی خاموشی بھی ایک زبردست آواز ہوتی تھی۔ جب وہ آنکھیں بند کر کے غور و فکر کرتے تھے، تب وہ سب باتوں اور واقعات کو اور زیادہ صفائی سے دیکھتے اور سمجھتے تھے۔ وہ اپنے مخالفین سے بھی بڑی خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے، مگر ان کی اس ملائمیت کے پس پشت ایک آہنی طاقت ہوتی تھی، جب کبھی اصولوں کی بات آتی تھی تو گاندھی جی نے اپنے اصولوں سے کبھی سمجھوتا نہیں کیا۔ میں نے آج کل کے کئی نوجوانوں کو کہتے سنا ہے کہ وہ کسی معنی میں بد قسمت ہیں کہ انھوں نے گاندھی جی جیسی عہد ساز شخصیت اور عظیم انسان کو نہیں دیکھا اور یہ امید بھی نہیں پائی جاتی کہ ان کے جیسا کوئی شخص ان کی زندگی میں پیدا ہوگا۔

گاندھی جی کے خاندان کے لوگ ہی صرف ان کے خاندان کے نہیں تھے، سارا ملک ان کا خاندان تھا۔ جو لوگ ان کے ارد گرد رہتے تھے ان کی تو وہ گھر والوں سے بھی زیادہ فکر کرتے تھے۔ ۱۹۴۶ء میں گاندھی جی جب بنگال میں مقیم تھے ان کے آشرم کی ایک لڑکی بیمار پڑ گئی۔ جب گاندھی جی کچھ وقت کے لیے بنگال سے آسام گئے تھے اسے تھوڑا سا بخار تھا، اسے دیکھنے کے لیے ڈاکٹر ودھان چندر رائے کلکتہ سے بلائے گئے اور لڑکی کی دیکھ بھال کا پورا انتظام کیا گیا۔ اس وقت باپو کے صاحبزادے ہری لال گاندھی ساؤتھ افریقہ سے آئے تھے، وہ بھولے بھالے اور دل کے صاف آدمی تھے، باپو سے انھیں جو شکایت ہوتی تھی وہ اسے اکثر کہہ دیتے تھے۔ جب انھوں نے اس لڑکی کے معمولی سا بخار میں اتنی خاطر ہوتے دیکھا تو انھوں نے اپنے والد سے کہا کہ آپ نے اپنے خاندان کو ہمیشہ نظر انداز کیا ہے اور دوسروں کی خوب دیکھ بھال کی ہے۔ انھوں نے کچھ تلخی کے ساتھ یہ بھی کہا کہ جو لوگ باپو کے ساتھ رہتے ہیں ان کی زندگی بڑے مزے کی ہے۔ گاندھی جی نے جواب دیا "اگر میرے ساتھ لوگوں کو رہنے میں سکون ملتا ہے تو میرے سب لڑکے مجھے چھوڑ کر مجھ سے دور نہیں چلے گئے ہوتے۔

۱۹۴۲ء میں جب کرپس مشن آیا تھا اس وقت باپو پونا میں تھے۔ سر اسٹیفرڈ کرپس اور سر پیتھک لارینس گاندھی جی سے ملنے کے لیے بہت بے چین تھے۔ گاندھی جی کے دلی آنے کے

لیے ایک خاص گاڑی کا انتظام کیا گیا۔ ان کے مصاحبین کے لیے تیسرے درجے میں انتظام تھا۔ جہاں جہاں سے گاڑی گزرتی تھی وہاں لوگ اکٹھا ہو جاتے تھے اور گاڑی رکوا کر گاندھی جی کی جے جے کار کرتے تھے۔ جب گاندھی جی دلّی پہنچے تو انھوں نے وائسرائے کے پرائیویٹ سکریٹری کے پاس تیسرے درجے کے حساب سے ریل کا کرایہ جو ۲۵۵ روپیہ چودہ آنے ہوتا تھا بھجوایا۔ پرائیویٹ سکریٹری جارج ایول کو یہ بات بری لگی اور انھوں نے سدھیر گھوش سے جو روپئے لے کر آئے تھے، کہا کہ یہ کیا بات ہوئی، کیا میں کوئی اسٹیشن ماسٹر ہوں اور روپیہ کس نے مانگا ہے، گاڑی کا انتظام تو سرکار کی طرف سے ہوا ہے۔

جب اس کو سمجھایا گیا کہ باپو بغیر کرایہ دیے نہیں رہیں گے تو انھوں نے کہا کہ اگر کرایہ دیے بغیر نہیں رہیں گے تو انھیں اسپشل ٹرین کا ۱۸۰۰۰ روپیہ دینا ہوگا۔ جب یہ بات گاندھی جی کو بتائی گئی تو انھوں نے کہا کہ ۱۸۰۰۰ روپیہ کی مانگ غلط ہے کیونکہ وہ تو ہمیشہ تیسرے درجہ میں ہی چلتے ہیں اور وہی کرایہ دینا ہے۔ اسپیشل ٹرین انھوں نے نہیں مانگی تھی۔ اگر حکومت نے دی تو وہ جانے مگر گاندھی جی اور ان کے ساتھیوں سے تیسرے درجہ ہی کا کرایہ لینا مناسب ہے۔ گاندھی جی نے اسپیشل ٹرین کا کرایہ دینے سے انکار کیا اور تیسرے درجہ کا کرایہ دینے کی ضد کی۔ سکریٹری صاحب نے اس بحث سے پریشان ہو کر روپیہ لے لیا اور ریلوے بورڈ کے چیرمین کو بھیج دیا۔

ایک لڑکی نے آشرم میں گاندھی جی سے کہا باپو دیکھیے یہ کتے کی دم ہے — باپو نے جواب دیا "ارے کتوں کی دم ہے؟" اور کچھ تعجب کا اظہار کیا۔ ایک دو لمحے کے بعد باپو نے بچے سے پوچھا "کیا تمھارے بھی دم ہے؟" بچہ قہقہہ مار کر ہنسا اور بولا ارے باپو تم اتنے بڑے اور بوڑھے ہو گئے ہو لیکن تمھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ آدمی کے دم نہیں ہوتی، آپ واقعی بڑے ناسمجھ ہیں۔ باپو اور دوسرے لوگ جو وہاں موجود تھے خوب ہنسے۔

باپو جب بچوں کے ساتھ ہوتے تھے وہ اپنے آپ کو بھول جاتے تھے اور خود ایک بچہ کی طرح برتاؤ کرتے تھے چاہے وہ کتنے ہی کام میں مصروف ہوں لیکن وہ بچوں کو ہمیشہ یاد رکھتے تھے ان کا یہ انوکھا طریقہ تھا۔ ایک دن بمبئی میں باپو کوئی چیز ڈھونڈ رہے تھے۔ آچاریہ کاکا صاحب کالیکر نے ان سے پوچھا باپو آپ کیا ڈھونڈ رہے ہیں؟ باپو نے جواب دیا، ایک چھوٹی سی پنسل۔ کاکا کالیکر نے اپنی اٹیچی سے ایک پنسل نکال کر باپو کو دے دی باپو نے جواب دیا، نہیں میں وہی چھوٹی پنسل چاہتا ہوں جس کو میں ڈھونڈ رہا ہوں۔

۱۹۴۵ء میں باپو بنگال گئے تھے اور وہاں کے گورنر سے ملاقات کی۔ جب باپو گھر واپس آنے کے لیے اٹھے تب گورنر صاحب اچانک باپو کو پہنچانے کے لیے نیچے آگئے اور ان کو ان کی موٹر تک چھوڑنے چلے گئے جیسا کہ کبھی نہیں ہوتا تھا۔ اس دن انھوں نے ایک عجیب نظارہ دیکھا۔ ان کی کوٹھی کے سارے نوکر جو قریب دو سو تھے، سب نیچے ہال میں ہاتھ جوڑے گاندھی جی کے دیدار کے لیے کھڑے ہوئے تھے۔ کچھ لوگوں کے کپڑے ٹھیک طرح کے نہ تھے، ان کپڑوں میں وہ کبھی لاٹ صاحب کے سامنے آ ہی نہیں سکتے تھے۔ بات یہ تھی کہ جب ان لوگوں کو پتہ چلا کہ گاندھی جی اس دن کوٹھی پر آ رہے ہیں گے تو انھوں نے سوچا کہ اس سے اچھا انھیں اور کون سا موقع باپو کے دیدار کے لیے مل سکتا ہے۔ لاٹ صاحب کو دیکھ کر سب نوکر بہت پریشان ہوئے۔ لاٹ صاحب کو ان سب کو دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ انھوں نے نوکروں کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا، گاندھی جی یہ دیکھیے۔ میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میں نے ان کو یہاں جمع ہونے کے لیے نہیں کہا تھا۔

باپو آنند بھون کے ہر فرد کو ان کے تمام معاملات میں مشورہ دیتے تھے اور تمام گھر والے اپنی تمام دشواریاں ان کے سامنے رکھتے تھے۔ رنجیت پنڈت کے انتقال کے بعد وجے لکشمی جی کے ان کے دیور وغیرہ سے کچھ اختلافات ہو گئے۔ وہ فکرمند رہنے لگی تھیں۔ وہ باپو سے ملنے گئیں۔ باپو نے ان سے پوچھا، کہو

تمھاری تمھارے رشتہ داروں سے صلح ہوگئی؟

شریمتی پنڈت نے کہا، میں نے کسی سے لڑائی نہیں کی ہے لیکن میں ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی، جو ایک پرانے قانون کا فائدہ اٹھا کر مجھے مصیبت میں ڈالنا چاہتے ہیں۔

بات یہ تھی کہ رنجیت پنڈت کے کوئی لڑکا نہیں تھا اور ان کے بھائی وغیرہ شریمتی پنڈت کو یا ان کی لڑکیوں کو ان کا وارث نہیں مانتے تھے۔ اس وقت شریمتی پنڈت کو باپو نے سمجھایا اور یہ مشورہ دیا کہ تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اگر تمھیں کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے تو وہ صرف تمھاری ذات ہے۔ تمھارے مزاج میں بڑا غصہ ہے، اگر تم اس پر قابو نہیں رکھو گی تو تمھیں نقصان کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔

شریمتی پنڈت کو یہ الفاظ بہت اچھے لگے اور باپو کا یہ مشورہ انھیں ہمیشہ یاد رہا۔ انھوں نے کہا تھا کہ زندگی میں انھیں سب سے اچھا مشورہ یہی ملا جو باپو نے دیا تھا۔

بات بہت پرانی ہے۔ جون کا مہینہ تھا۔ الٰہ آباد کی گرمی بڑی سخت تھی اور لوگ بارش کے لیے ترس رہے تھے۔ ان دنوں ملک میں فرقہ وارانہ فسادات ہو رہے تھے اور باپو پریشان اور فکرمند تھے۔ ایک دن گاندھی جی الٰہ آباد سے گزرے۔ اسٹیشن پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ بہت سے لوگ چیخ چیخ کر باپو کی جے بول رہے تھے اور کہتے تھے، باپو جی آپ بہت دنوں سے الٰہ آباد نہیں آئے ہیں لوٹتے وقت یہاں ضرور قیام کیجیے گا۔

باپو ٹس سے مس نہیں ہوئے، جہاں بیٹھے تھے وہیں بیٹھے رہے۔ گرمی سے نجات پانے کے لیے باپو برف کی ایک سل کے پاس بیٹھے تھے، وہ بہت فکرمند تھے۔ فرقہ وارانہ فسادات سے ان کی روح کو تکلیف پہنچی تھی۔ میں ہمت کر کے باپو کے ڈبے میں پہنچ گیا اور مردلا سارا بائی سے بات کرنے لگا۔ نہ جانے کیوں مردلا نے باپو سے اچانک پوچھا، باپو اس کو پہچانا؟ کیوں نہیں، نیشنل ہیرلڈ والا ٹنڈن ہے نا۔ انھوں نے کہا۔ یہ سن کر میں بہت خوش ہوا۔ میں ان سے صرف دو مرتبہ پہلے مل چکا تھا۔ لاکھوں آدمی ان سے ملاقات کرتے تھے۔ انھوں نے مجھے پہچان لیا، میں نے اپنے آپ کو بہت خوش قسمت محسوس کیا۔

جاتے وقت میں نے انھیں جھک کر سلام کیا۔ باپو بولے ان لوگوں سے کہو کہ شور نہ مچائیں، ان کو اور بھی گرمی لگے گی۔

گاڑی روانہ ہوئی تو تمام لوگوں نے زوردار آواز میں کہا "مہاتما گاندھی کی جے" اور اسی کے ساتھ انھیں رخصت کیا گیا۔

بہت دن ہوئے میں نے ایک کتاب جواہر لعل جی پر لکھی تھی۔ میں نے باپو سے اس کتاب پر کچھ لکھنے کی درخواست کی تھی اور کرپلانی جی نے بھی میری سفارش کی۔ باپو فوراً راضی ہو گئے لیکن بعد میں نہ تو انھوں نے میرے خطوط کا جواب دیا اور نہ ہی کوئی تحریر بھیجی۔ میں بہت رنجیدہ تھا۔ تمام سیاسی لوگ جیل میں تھے، کس سے مدد لوں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد کرپلانی جی جیل سے رہا ہو کر آئے۔ میں نے تمام باتیں انھیں بتائیں۔ جب وہ وردھا گئے تو انھوں نے باپو سے کہا کہ آپ نے تمہید ابھی تک کیوں نہیں بھیجی؟ پتہ چلا کہ ایک خاتون نے میرے خلاف باپو کے کان بھرے تھے۔ کرپلانی جی نے کہا کہ باپو کو میرے بارے میں پہلے ان سے پوچھنا تھا اور دوسروں کی بات پر دھیان نہیں دینا چاہیے تھا۔ باپو کی سمجھ میں یہ بات آ گئی۔ انھوں نے مجھے فوراً ایک دل چسپ تمہید بھیجی اور اس کے ساتھ ایک خط بھی بھیجا جس میں لکھا تھا:

"بھائی ٹنڈن!

مجھے افسوس ہے تمھارے مجموعہ کے لیے اس سے قبل میں کچھ بھیج نہیں سکا۔ اس کی ایک وجہ میری مصروفیت تھی تو دوسری وجہ کچھ نہ لکھنے میں میری تساہلی لیکن بھائی جواہر لعل سے متعلق میں کچھ نہ لکھوں، یہ کیسے ہو سکتا تھا۔

مجھے یقین ہے کہ میری یہ تحریر آپ کو بروقت مل جائے گی۔

آپ کا

موہن داس کرم چند گاندھی"

باپو اپنے عہد کے ایک انوکھے شخص تھے۔ جیسے جیسے ہم ان کی

انسانیت اور شرافت کی کہانیاں سنتے رہے ہیں ہمارا یقین اور پختہ ہوتا جائے گا کہ باپو ایک عظیم انسان تھے۔ انھوں نے اپنی صلاحیت و شجاعت کی جو چھاپ تاریخ کے اوراق پر ثبت کی ہے۔ جب ان کا انتقال ہوا تو کروڑوں افراد نے سوچا کہ ان کے اپنے گھر کا کوئی ایک عزیز ان سے جدا ہو گیا ہے، باپو امر ہیں۔

گاندھی جی کی سیاست کا طریقہ کار بالکل منفرد تھا۔ انھوں نے ہر غم، ہر خوشی میں اپنے کو اسی طرح سے ڈھال لیا تھا کہ تکلیف و آرام ان کے لیے بے معنی سے لگتے تھے۔ لوگ جن حادثوں میں مرتے ہیں انھیں ان حادثوں نے پالا تھا۔ گاندھی جی اپنے مخالفین سے بھی مثالی طریقہ سے لڑتے تھے۔ وہ مذہب اور انسانیت کو اپنے مخالفین سے لڑتے وقت بھی پیش نظر رکھتے تھے۔ وہ انسانیت کے ایک عمیق سمندر تھے۔ وہ اپنی فتح کو دوسرے کی شکست نہیں سمجھتے تھے۔

□□

بشمبھر ناتھ پانڈے سے گفتگو

صـ۲۲ کا بقیہ

پر اثر پڑ رہا ہے اور اس کی وجہ سے دیہاتوں میں بے روزگاری پھیلتی جا رہی ہے۔ اس لیے آج اس کی ضرورت ہے کہ زیادہ سے زیادہ پیڑ لگائے جائیں تاکہ پیداوار بڑھے، پانی کا مسئلہ ٹھیک ہو اور ملک کی اقتصادی ترقی کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ گاؤں میں بھی روزگار اور دھندے ہوں۔

وہ ایک لمحے کے لیے رکے۔ اٹھے اور پھر بولے:

اب آخری بات کہتا ہوں۔ مہاتما گاندھی نے کہا تھا "ہندستان میں امن و امان کے لئے ہریجنوں کے مسئلہ کا سلجھنا بہت ضروری ہے۔ اور سب سے بڑھ کر اس ملک کے لیے ہندو مسلم اتحاد بھی بہت ضروری ہے۔"

وہ اٹھ چکے تھے۔ میں رخصت ہو کر باہر نکل آیا۔ دور پر گاندھی جی کا مجسمہ نظر آ رہا تھا۔ جیسے پورے ملک سے جواب طلب کر رہا ہو۔

صبح جو تھوڑے سے کہرے کی وجہ سے کچھ دھند تھی وہ چھٹ چکی تھی۔ آسمان پر سورج پوری طرح چمک رہا تھا۔ !!

□□

امر رہنما — گاندھی

نسیم فاروقی

[illegible] لکھنؤ

اے امر رہنما امن کے دیوتا تجھ سے آباد ہے پیار کی انجمن

فرق تجھ سے مٹا ذات اور نسل کا
تیرے قول و عمل میں وہ ایثار تھا
تیری کوشش سے طوق غلامی کٹا
تو ابھی زندہ ہے جب تک ہیں گنگ و جمن

برلا مندر ہو یا ہو وہ سابرمتی
تیرا پیغام ایک جیتی و آشتی
تیری نظروں میں یکساں تھا ہر بھارتی
ہندو مسلم کو تو نے دیا سنگٹھن

موت سے جنگ کی زندگی کے لیے
یوں اہنسا کے تو نے جلائے دیے
ایسے روشن ہوئے یوں فروزاں ہوئے
جیسے سورج کے چہرے کی پہلی کرن

تیری عظمت کا مداح ہے ایشیا
تجھ کو ارض ہمالا سے کیا مل گیا
اپنی دھرتی کو تو نے لہو دے دیا
مسکراتا رہے یہ گلابی چمن

اب جو جمہوریت کے وفادار ہیں
سب تری زندگی کے پرستار ہیں
ہر طرف تیری یادوں کے مینار ہیں
ہر طرف ہے تری ایکتا کا مشن

تیری ممنون ہے ارض ہندوستاں
سبز کھیتوں کی دھرتی ہوئی کہکشاں
گیت گاتی ہیں فصلوں کی شہزادیاں
تجھ کو ہر موڑ پر ڈھونڈتا ہے وطن

اے امر رہنما امن کے دیوتا تجھ سے آباد ہے پیار کی انجمن

□□

حیات اللہ انصاری
۲/۴۔ ریور بینک کالونی۔ لکھنؤ

گاندھی جی، سیوا گرام اور میں

حیات اللہ انصاری اردو ادب اور صحافت کے ایک مایۂ ناز شخصیت کے مالک ہیں، انھوں نے اپنی ساری زندگی ملک کے لیے وقف کر دی۔ ایک افسانہ نگار، ایک صحافی، ایک سیاسی رہنما اور ایک مدبر کی حیثیت سے حیات اللہ انصاری کی اپنی ایک منفرد شناخت ہے وہ اردو روزنامہ قومی آواز کے بانی مدیر تھے اور ۱۹۴۵ء سے ۱۹۷۳ء تک انھوں نے قومی آواز کو جس عروج پر پہنچایا وہ قابلِ تحسین ہے۔

——— ایڈیٹر

وہ دن کتنا خوشگوار تھا وہ دن میری زندگی کا سب سے خوبصورت دن تھا کہ جب پنڈت جواہر لعل نہرو جو میرے بہت عزیز ترین دوست تھے نے مجھ سے کہا کہ آپ گاندھی جی پر تمام مضامین لکھتے رہے ہیں اور باپو انھیں پسند بھی بہت کرتے ہیں، باپو کی زندگی کے بارے میں جس طرح سے آپ نے مضامین لکھے اور ان کی سیاسی اور سماجی زندگی کا تجزیہ کیا ہے وہ آپ کا ایک قابلِ تعریف کارنامہ رہا ہے بہتر ہوتا کہ آپ سیوا گرام میں جا کر گاندھی جی سے مل لیں۔

مجھے گاندھی جی سے بچپن سے ہی بے پناہ عقیدت رہی ہے۔ ان کے لکھنؤ کے سفر کے دوران جب میں نے گاندھی جی کو پہلی بار دیکھا تو اس وقت سے گاندھی کی تصویر میرے دل و دماغ پر ثبت ہو چکی تھی۔ نہرو جی کے حکم کی تعمیل میں گاندھی جی سے ملنے کے لیے رختِ سفر باندھا، دو دن کی تیاری کے بعد میں سیوا گرام کے لیے روانہ ہو گیا۔ ریل میں جگہ بالکل نہیں تھی بڑی شکل سے میں ڈبہ میں داخل ہو سکا لیکن وہ ساری صعوبتیں میرے عزائم کے سامنے بے معنی سے لگے۔ ریل کے ڈبہ میں جگہ نہ ہونے کے باوجود بھی مجھے تکلیف کا احساس بالکل نہیں ہوا کیونکہ مجھے اشتیاق تھا گاندھی جی کو قریب سے دیکھنے کا، ان سے کچھ سیکھنے کا، ان کے حالات زندگی پرکھنے کا۔

سیوا گرام آشرم اسٹیشن سے تقریباً تین ساڑھے تین میل کے فاصلے پر تھا۔ اسٹیشن سے آشرم تک پہنچنے کے لیے راستہ میں تین بڑے بڑے نالے پڑتے تھے جن کو پار کرنے کے لیے اونچی نیچی پہاڑیوں سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا، اور ان نالوں پر کوئی پل بھی نہیں تھا۔ میں ایک لمبا راستہ طے کرتا ہوا جب سیوا آشرم کے قریب پہنچا تو مجھے چاروں طرف کھپریل نظر آئی۔ چند خواتین و حضرات ان کھپریلوں کی طرف جاتے ہوئے نظر آئے۔ میں نے دور سے ہی گاندھی جی کی کٹیا کا اندازہ لگا لیا اور میرا اندازہ بالکل درست تھا وہ یقینی طور پر گاندھی جی کی ہی کٹیا تھی۔ کٹیا ایک کھپریل کے نیچے تھی۔ کھپریل کے نیچے ایک پکا چبوترہ تھا اور چبوترے سے ملی ہوئی ایک اور جگہ تھی جو برآمدہ کے طور پر استعمال کی جاتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ کٹیا کے پچھلے حصہ میں گاندھی جی ایک چٹائی پر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے سامنے ایک کرسی پر مولانا ابوالکلام آزاد بیٹھے ہوئے تھے۔ اور کچھ افراد جن کو میں اس وقت نہیں پہچانتا تھا۔ گاندھی جی کے سامنے چٹائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے جھک کر گاندھی جی کو سلام کیا۔ میرے سلام کا جواب دے کر انھوں نے کہا کہ تمھیں کئی دنوں تک میرے ساتھ رہنا پڑے گا۔ اور یہ کہہ کر وہ پھر مولانا ابوالکلام آزاد سے مخاطب ہو گئے۔ دونوں ایک

آزادی کے سلسلہ میں مشورہ کر رہے تھے۔ ان دونوں کی گفتگو میں بار بار ستیہ گرہ کا نام لیا جا رہا تھا، اس وقت میں ستیہ گرہ کا مطلب ہی نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن ایک ہفتہ بعد جب کرپس مشن ہندوستان آیا تو میری سمجھ میں ستیہ گرہ بھی آگیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کو رخصت کرنے کے بعد گاندھی جی نے دیگر حاضرین سے ستیہ گرہ کرنے کے لیے کہا تھا، تمام حاضرین نے ستیہ گرہ کرنے کے لیے اپنی رضامندی ظاہر کی جس پر گاندھی جی نے کہا کہ ستیہ گرہ کے لیے قربانیوں کی بھی ضرورت ہے اور تنظیم کی بھی۔ حاضرین نے کہا تنظیم بھی موجود ہے اور ہمارے دلوں میں جذبۂ ایثار و قربانی بھی موجود ہے۔ اس گفتگو کے بعد گاندھی جی میری طرف متوجہ ہوئے اور کہا میں سوچ رہا ہوں کہ ہریجن کو اردو میں بھی نکالا جائے تمہاری کیا رائے ہے؟ گاندھی جی ہفتہ وار ہندستانی کو ہی اردو ہریجن بنانا چاہتے تھے۔ میں نے گاندھی جی سے مسلمانوں اور ان کے مسائل کے سلسلے میں کافی دیر گفتگو کی، ابھی ہم گفتگو کر ہی رہے تھے کہ کچھ کانگریسی اندر آگئے جس کی وجہ سے میری گفتگو آگے نہ بڑھ سکی۔ گاندھی جی مجھ کو لے کر ایک دوسرے کمرے میں آگئے۔

گاندھی جی کے اوپر ایک پنکھا لٹک رہا تھا جس کو ایک صاحب کھینچ رہے تھے، ان صاحب کو کسی ضروری کام سے تھوڑی دیر کے لیے باہر جانا پڑا تو گاندھی جی خود ہی پنکھا کھینچنے لگے، میں نے گاندھی جی کو اپنی خدمات اس سلسلے میں پیش کیں تو گاندھی جی نے میری مدد لینے سے انکار کر دیا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد گاندھی جی نے کاغذ کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور کچھ لکھنے لگے۔

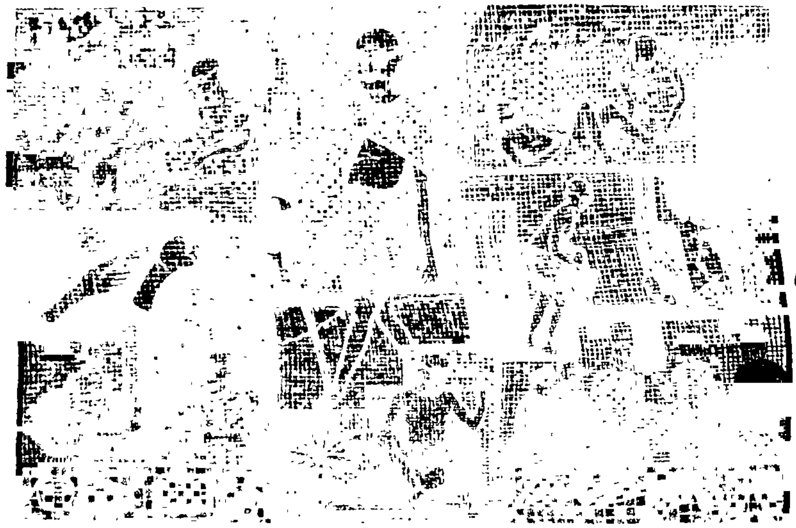
گاندھی جی کے پاس ہر قسم کے لوگ آتے تھے جن میں وزراء، کانگریس کے لیڈر اور سیاسی تنظیموں کے سربراہان یا رضاکاران بھی ہوتے تھے گاندھی جی جیسا ہندوستان دیکھنا چاہتے تھے جس قسم کی ترقی سے ملک کو روشناس کرانا چاہتے تھے ان سب کے نمونے سیواگرام میں موجود تھے مثلاً چرخہ تحریک، دیسی کپڑا تحریک، سادہ کھانا تحریک وغیرہ کو گاندھی جی فروغ دینا چاہتے تھے اور یہ سب تحریکیں سیواگرام میں چل رہی تھیں۔ گاندھی جی کی کٹیا کے قریب اور بہت سی جھونپڑیاں تھیں جن میں تمام تحریکوں سے وابستہ لوگ بھی رہتے تھے۔ ایسی جھونپڑیوں میں ایک کٹیا میں بھائی پیارے لال جی بھی رہتے تھے۔ وہ گاندھی جی کے خاص سکریٹری تھے، میں نے وہاں مختلف لوگوں سے گفتگو کی۔ میری گفتگو کا موضوع عموماً فرقہ واریت اور کانگریسی حکومت کی پالیسی ہوا کرتا تھا لیکن میرے سوالوں سے کسی کو کوئی دلچسپی نہ تھی محض پیارے لال جی کے جو میری بات غور سے سنتے تھے اور اس کا جواب بھی دیتے تھے۔ فرقہ واریت کے سوال پر پیارے لال جی نے مجھ سے کہا کہ ہم پیار سے سمجھاتے ہیں۔

گاندھی جی دیہات کی ترقی کے لیے چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتے تھے، دیہی باشندے حوائج ضروریات سے فراغت پانے کے لیے کیا کریں۔ اس کا انتظام بھی گاندھی جی کیا کرتے تھے۔ گاندھی جی ہمیشہ پرارتھنا کے بعد ایک چھوٹی سی تقریر بھی کرتے تھے۔ ایک دن اپنی تقریر میں انھوں نے کہا کہ ہمارے سیوا آشرم میں آج کل مکھیاں بہت ہو گئی ہیں، کیونکہ بیت الخلاء صاف نہیں رہتے اب یہ کام میں خود ہی دیکھوں گا اور دوسرے دن گاندھی جی خود ہی بیت الخلاء کی صفائی میں لگ گئے۔ بیت الخلاء سے بالٹیوں میں غلاظت بھر کر انھوں نے اپنی کٹیا سے دو فرلانگ کی دوری پر بنے ہوئے گڑھے میں غلاظت بھرنی شروع کر دی اور غلاظت کے اوپر مٹی ڈال کر اسے زمین میں دبانے لگے اس طرح ایک ہفتہ میں بیت الخلاء کی صفائی کر ڈالی۔

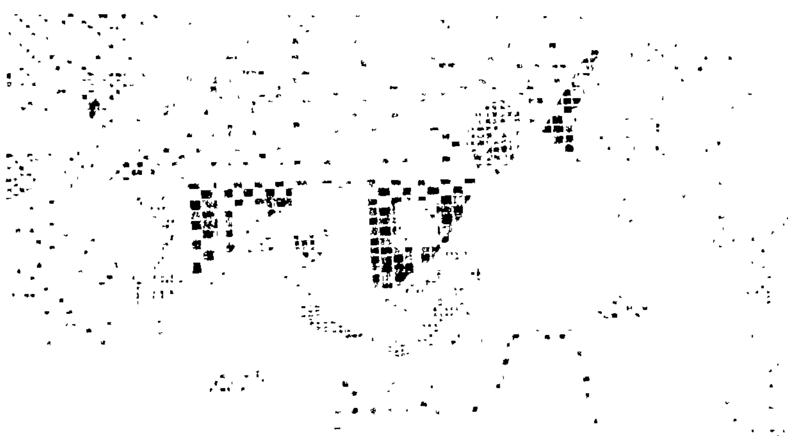
گاندھی جی نے عمل کے میدان میں نمایاں کام چرخہ اور کرگھا کو بنانے میں کیا زراعت کو فروغ دینے کا کام بھی وہ ساتھ ہی ساتھ کر رہے تھے۔

چرخہ اور کرگھا

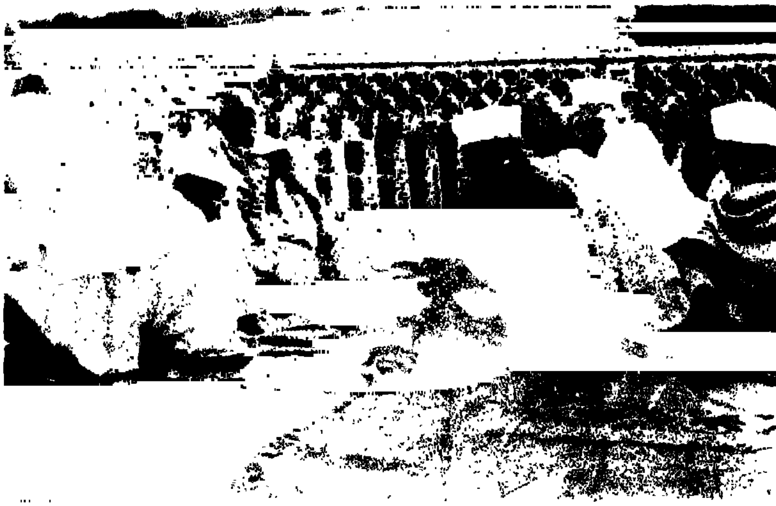
سوت کو کتنا بہتر بنایا جائے اور اس کی پیداوار کس طرح سے بڑھائی جائے، اس پر گاندھی جی کی پوری توجہ رہتی تھی اس کے لیے انھوں نے ایک ایسا طریقہ کار ایجاد کیا تھا کہ دو دھاگے ساتھ میں نئے طریقہ سے تکلی کے سوت پر بیلنوں کی مدد سے بڑھایا جائے نتیجہ میں ان کے سیواگرام میں ایک ایسی خاتون بھی تھیں جو چرخہ سے ایسا دھاگا نکالتی تھیں کہ لوگوں کا خیال تھا کہ ڈھاکے کی ململ بھی اس سے باریک نہ ہوگی۔ اس خاتون نے چرخہ کے سوت سے ایک ایسی چادر بنائی تھی جو چھ انچ کے ایک چھوٹے سے ڈبہ میں رکھی جا سکتی تھی لیکن اس چادر سے ایک ہاتھی کو ڈھکا جا سکتا تھا یہ گاندھی جی کی محنت کا ہی ثمرہ تھا کہ چرخہ سے



گاندھی واد یا فلسفۂ گاندھی



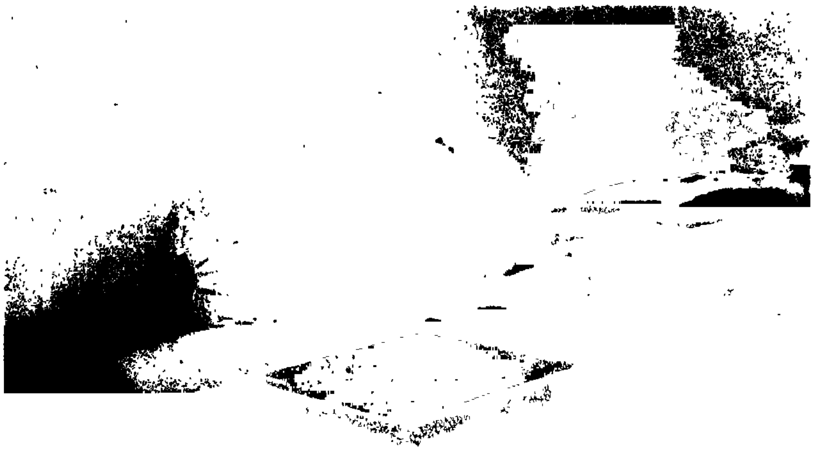
باپو اور با



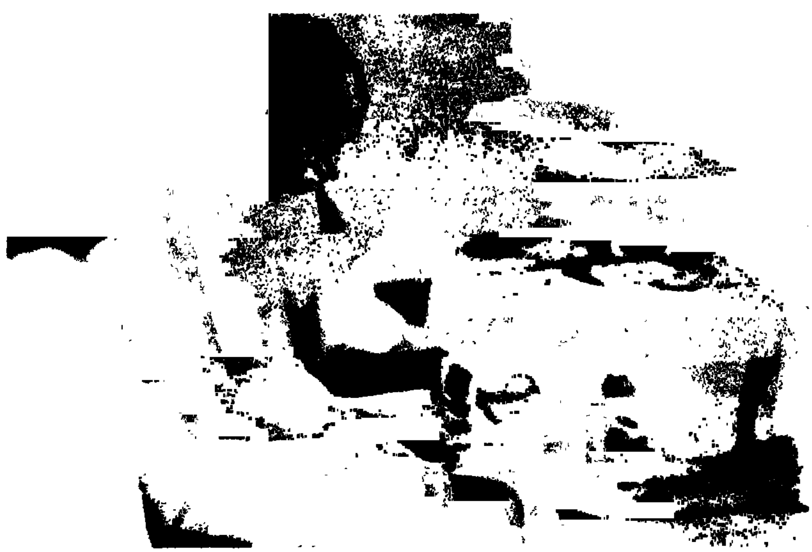
آنند بھون
الہ آباد میں
پنڈت موتی لال نہرو
کے انتقال
کے وقت



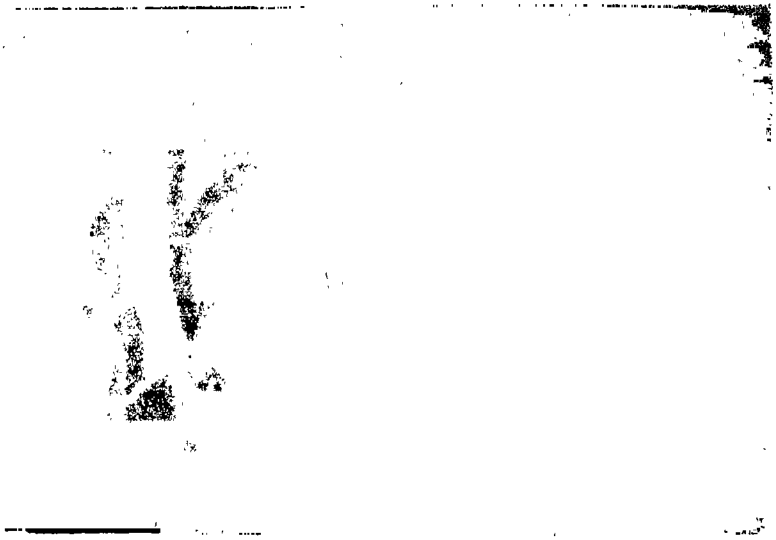
باپائے قوم
مہاتما گاندھی
اندرا پریتہ درشنی
(آنجہانی اندرا گاندھی)
کے ساتھ



گاندھی جی
کے
لکھنے پڑھنے
کی جگہ



مہاتما گاندھی
سوت
کاتتے ہوئے



ہندوستان
کے مستقبل
کی
پشت پر
بابائے قوم
مہاتما گاندھی



بابائے قوم
ملک کے عام
باشندوں
کی طرح
سائیکل
چلاتے ہوئے



گاندھی جی ایک تقریب میں جواہر لال نہرو کے ساتھ



مہاتما گاندھی سرحدی گاندھی کے ساتھ



گاندھی جی
سیوادل
رضاکاروں
کے ساتھ



الہ آباد میں
شریمتی
وجے لکشمی پنڈت
کے ساتھ
گاندھی جی

لکشمی کانت ورما

اِنسانیت کے روشن چراغ — گاندھی جی

فی زمانہ جس جدوجہد کے درمیان سیاست داں تیسری طاقت کی تلاش کر رہے ہیں اور معاشرت زندگی کو انسانی قدروں کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کر رہے ہیں، اسی کے خلاف ایسی قوتیں بھی روز بروز بڑھ رہی ہیں جو ہزاروں کو ختم کرنے کی سازش میں کوشاں ہیں۔ روزمرہ کی زندگی میں انسان کی قدر و قیمت گھٹ رہی ہے۔ پوری دنیا میں ہنسا اور تشدد نے جتنے بھی معیار زندگی، تہذیب کی ابتدا سے لے کر آج تک بنائے تھے، وہ ساری کی ساری کسوٹیاں جھوٹی ثابت ہو رہی ہیں۔ نفرت اور انتقامی جذبات، وسعت خیال اور دین و مذہب کے دائرے تنگ ہو رہے ہیں۔ اپنی کم ظرفی میں سیاسی حدود میں نفسیاتی معاملوں کو جنسی خود غرضی کے لیے شامل کیا جا رہا ہے۔ ساری دنیا میں فرقہ پرست قوتیں مشترکہ زندگی کی خوشحالی کے نام پر الگاؤ قائم کرنے کی مہم چھیڑے ہوئے ہیں۔ ہندوستان نے فلسفہ زندگی کو جن علامات سے پہچانا تھا، آج انسانیت کو فراموش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مشترکہ زندگی کے سارے قوانین فراموش کیے جا رہے ہیں۔ جس سرزمین پر زندگی کی اعلیٰ قدروں کے لیے ہم نے سیاست ہی نہیں زندگی کے ہر کارِ عمل میں بڑے سے بڑے خطروں کا سامنا کرنے کی مثال دنیا کے سامنے رکھی تھی آج اسی زمین کی بنیادی تربیتوں کی دھجیاں اڑائی جا رہی ہیں۔ جتنے بھی پیرو پیغمبر یا اوتار اس دنیا میں ہوئے ہیں ان سب نے مشترکہ زندگی اور ایک دوسرے کی بات کو سمجھنے کے لیے آئین بنائے تھے وہ سارے آئین جنون و وحشت میں مٹائے جا رہے ہیں۔ سماجی اور اخلاقی روایتوں کو شریعت زندگی سے نکال پھینکنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ یہی نہیں وہ سانچے بھی توڑے جا رہے ہیں جن میں دین، مذہب، ذات، رنگ اور جنسی پہچان سے اوپر اٹھ کر آدمی کی پاکیزہ ہیئتیں ملتی تھیں۔ ایک طرف سائنس کی ایجادیں درندوں کے خونی پنجوں سے پوری انسانی نسل کو مٹانے کا سامان مہیا کر رہی ہیں، دوسری طرف سیاست میں ایسے دروازے کھولے جا رہے ہیں جس سے دنیا بھر کے مجرموں کو اس بات کا حق ملے کہ وہ سیاست میں آئیں اور انسانی جذبات کو اتنا کند بنا دیں کہ ان کی قوتِ احساس ہی ختم ہو جائے۔ اگر یہی ماحول رہا تو سقراط کی قربانی، حضرت عیسیٰ کی شہادت اور کربلا میں یزید جیسے ظالم کے خلاف انسانی ضمیر کی آواز کو پہچاننے والی روشنی ہی بجھ جائے گی۔ ہماری آنے والی نسلیں کچھ دنوں میں پیرو پیغمبر کے نام بھی بھول جائیں گی۔ تاریخ زندگی میں ہم ہمیشہ ایسے ہرکاروں کی تلاش کرتے رہے ہیں جو جنسی خواہشات پر قابو پا کر ہر انسان میں وہ باطنی طاقت پیدا کریں جن سے حرص و ہوس کو مٹا کر ہی نوعِ انسان کو نئی زندگی دی جا سکتی ہے۔ خواہشات سے اوپر اٹھ کر مشترکہ زندگی کے اصولوں پر عمل کرنے کا جذبہ پیدا کرنا ہوگا۔

انسان نے اپنی اسی پہچان کی منزل تک پہنچنے کے لیے تاریخ روایات اور پیغمبروں کو اپنا رہنما بنایا تھا۔ انھیں کے دکھائے گئے اصولوں کو سماجی اور اخلاقی زندگی میں تعمیری جذبات کی بنیاد تسلیم کیا تھا۔ لیکن آج انسانیت کو ہی ترقی پسندی کے نام پر فراموش کیا جا رہا ہے۔ مشترکہ سماج کی ذمہ داریوں کو ختم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس انسان کو ہم لوگوں کو سمجھانا چاہیے تھا کہ اجتماعی ضمیر اور انفرادی ضمیر جب ایک ہو جاتے ہیں تبھی سماج میں ایک خوشگوار تبدیلی آتی ہے اور اسی کو جہالت کی طرف مائل کر رہے

ہیں۔ جس ترجمانِ زندگی نے آدمی کو اشرف المخلوقات کہلانے کا حق دیا تھا اسی حق کو حیوانیت میں بدلا جا رہا ہے۔ جس نظام نے صرف خدا کے سامنے ہی سجدہ کرنے کا آئین بنایا تھا، وہ شیطانیت کے سپرد کیا جا رہا ہے۔ اگر آدمی تب بھی ہوش میں نہیں آتا اور سائنس اور سماج کے درمیان کی حدیں نہیں قائم کرتا تو آنے والے دنوں میں ایسی بونی نسل پیدا ہوگی جو اپنے آبا و اجداد کو بھول جائے گی۔ پوری کی پوری دنیا غیبی روشنی سے نفرت کرنے لگے گی۔ اپنے اندر صدیوں سے دبے وحشی کے ہاتھوں ختم ہو جائے گی۔ شاید انھیں جذبات کے تحت جگر مرادآبادی نے اپنی غزل میں بہت ہی درد کے ساتھ لکھا ہے ؂

گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

سایہ کو بڑھانے کے لیے ہی آج کی سیاست کوشش کر رہی ہے، روشنی کو اندھیرے میں بدلنا چاہتی ہے، آدمی کو نہیں اس کی پرچھائیوں کو بڑھا رہی ہے۔ گاندھی، ٹالسٹائے، کنگ مارٹن لوتھر، ابراہم اور تھورو جیسے لوگوں نے تیسری دنیا کی لڑائی تیز کرنے کے لیے اپنی قربانیاں دی ہیں۔ یہ قربانیاں اس لیے نہیں دی گئی ہیں کہ آدمی کی جگہ اس کے سائے بڑھیں۔ گاندھی جی نے ہندوستان کو عدم تشدد کا راستہ دکھا کر دنیا کے سائنس داں اور ماہر سماجیات کو حیرانی میں ڈال دیا ہے۔ آج کے اس ایٹمی دور میں لوگوں کو یہ یقین نہیں کہ تشدد کو گاندھی کی تنہا آواز کیسے روک پائے گی۔ دراصل جس کا ضمیر صاف اور شفاف ہوتا ہے وہ اس بات کی فکر نہیں کرتا کہ اس کی بات تسلیم کی جائے گی یا نہیں۔ وہ تو صرف اپنے ضمیر کی آواز کی حفاظت کے لیے ہر غلط فیصلہ کے خلاف اپنی آواز بلند کرتا ہے۔ وہ خاموش نہیں بیٹھتا۔ اپنی جان تک قربان کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ آج کی ساری خوں ریزی اور تشدد نے انسان کے ضمیر کی آواز اور اس کی پہچان کو ہی ختم کر دیا ہے اس لیے آج کے سیاست داں اور سائنس داں دونوں ہی اپنے حرص اور جنون میں صرف پیسہ اور شہرت کے لیے جان دے رہے ہیں۔ وہ نہیں سمجھ پا رہے ہیں کہ انسانی قدروں کا گلا گھونٹ کر نہ تو سماجی انقلاب لایا جا سکتا ہے اور نہ ہی سائنس اور تکنیکی انقلاب کارگر ہو سکتا ہے۔ آج ان دونوں کے عمل کی وجہ سے سائنس اور سماجی آئینوں میں دل و دماغ کی کشمکش بڑھتی جا رہی ہے۔ گاندھی جی کہتے تھے کہ کوئی بھی نیا خیال سب سے پہلے دل میں آتا ہے۔ دل میں اگر کوئی تعصب ہے تو وہ ضمیر کی آواز کو دبانے کی کوشش کرتا ہے۔ آہستہ آہستہ آدمی کا دل اس گرد آلود آئینہ کی تہہ ہو جاتا ہے۔ جیسے جیسے یہ پہچان ختم ہوتی ہے، انسان روشنی سے کترانے لگتا ہے۔ گاندھی جی نے ستیہ گرہ اور عدم تشدد کی بنیاد جن اصولوں پر رکھی تھی ان میں ڈر یا خوف کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ موت سے ڈرنا ہی سارے فتنہ کی جڑ ہے۔ عدم تشدد میں موت سے ڈرا نہیں جا سکتا کیونکہ ان کا کہنا تھا جب دل صاف نہیں ہوتا ہے تو آدمی میں خوف ہوتا ہے۔ اگر باطن صاف ہے تو ڈر یا دہشت اس آئینۂ دل پر کوئی دھبہ نہیں ڈال سکتا۔ یہاں تک کہ موت کا خوف بھی دل پر غالب نہیں ہو سکتا۔ گاندھی جی کے خلاف جب کبھی الزام لگائے گئے تو انھوں نے باہر کے دباؤ کو اپنے اوپر غالب نہیں ہونے دیا۔ ان کا ماننا تھا کہ اگر اپنے دل میں کسی گناہ کا احساس نہیں ہے تو پھر کسی قسم کے ڈر کا بھی احساس نہیں ہونا چاہیے۔ خوف زدہ آدمی موت سے تو ڈرتا ہی ہے وہ سچائی سے بھی ڈرتا ہے۔ ایسا آدمی کوئی سیاست نہیں کر سکتا۔ سیاست جب ضمیر کی آواز سنے گی تبھی اس کے دائرے سے جتنے بھی جرائم ہیں وہ ایک ایک کر کے ختم ہونے لگیں گے چونکہ خوف زدہ آدمی کے ضمیر میں ہمیشہ موت کا ڈر سمایا رہتا ہے اس لیے وہ اپنے ضمیر کی آواز بھی نہیں سن پاتا۔ جس کے دل میں پاپ ہے یا دھوکا ہے وہ کسی قسم کی تبدیلی پسند نہیں کر سکتا۔ گاندھی نے اپنے اسی فکر اور فلسفہ کے تحت ہندوستان کے نہتے چالیس کروڑ انسانوں کے بجھے ہوئے دلوں میں صداقتِ زندگی کا احساس پیدا کیا تھا۔ ان کو خوف سے نجات دلائی تھی۔ آنے والے دور کے مورخین حیرت میں ہوں گے کہ گوشت اور ہڈی (نحیف و لاغر) کا چھوٹا سا اور معمولی آدمی ہندوستان کو سیاست کے مکر و فریب کی قید سے کیوں اور کیسے آزاد کر سکا۔

آج کی سیاست ضمیر کی سیاست نہ ہو کر ایک قسم کی ذاتی فائدے اور دنیا کی خواہش اور حکومت تہذیب سے کاروبار کی سیاست ہے جہاں اکثریت اور اقلیت کی سیاست میں آدمی اور ایمان کا فیصلہ مردم شماری پر مبنی ہے۔ انسان کی انفرادیت سے ہی ضمیر کی آواز اٹھتی ہے۔ مردم شماری میں آدمی کے ضمیر کو ہی چھوڑ دیا جاتا ہے پھر جو کچھ بھی کہا جاتا ہے اس میں ضمیر کی تائید کی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی۔ محض جھوٹ ہی جھوٹ پھیلایا جاتا ہے۔ اس جھوٹ کو ہی بار بار دہرانا سیاست کا کردار بن گیا ہے۔ وہی سیاست کے اس غلط رویہ کو درست کر سکتا ہے جس میں اپنے ضمیر کی آواز کو جان دے کر بھی بچانے کی ہمت ہوگی۔ ناانصافی، نظام حکومت کے خلاف جو بھی تنہا ضمیر کی آواز اٹھے گی اسے دبانے کی ہر کوشش نظام حکومت کرے گی۔

جس سماج کی تعمیر عدم تشدد پر ہوگی اسی سماج کی تنظیم میں انفرادیت اور ضمیر کی آواز کی قدر بنے گی۔ جس طرح آج سے تقریباً دو ہزار سال قبل حضرت عیسیٰ نے غریبوں، بیماروں اور سماج کے پسماندہ طبقوں کی نابرابری کو دور کرنے کے لیے اپنی تحریک شروع کی تھی ٹھیک اسی طرح مہاتما گاندھی نے سماج کے غریب و غربا لوگوں کو اپنی آزادی دلانے کے لیے ایک عجیب طرح کی قربانی دی۔ گاندھی جی کی لڑائی چونکہ عدم تشدد کی تھی۔ اس لیے انھوں نے ظاہری اور باطنی احساس کو نہایت ہی اخلاقی بنیاد پر کھڑا کیا تھا۔ گاندھی جی کے شعور زندگی میں اپنی خودی اور جنسی کیفیتوں کو مٹا کر دشمن کا دل بدلنے کی طاقت تھی۔ اس لیے وہ بار بار کہتے تھے کہ جب تک سماج میں ناانصافی رہے گی، غیر برابری رہے گی، انسان انسان کے درمیان وہم پیدا ہوتے رہیں گے، سچ اور جھوٹ کا فاصلہ قائم رہے گا تب تک قانون قدرت میں آدمی میں یہ فریب اور مکر کا سلسلہ رہے گا، تب تک ہر انسان کی ایمانداری اور نیک نیتی پر برابر سوالیہ نشان لگتے رہیں گے۔

گاندھی جی کی زندگی میں کچھ بھی ایسا نہیں تھا جو روزمرہ کی زندگی سے جڑا ہوا نہ ہو۔ ان کا یقین تھا کہ اگر ہم اپنے ذاتی ایمان اور امن میں توازن رکھیں گے تو اسی کے ذریعہ پوری دنیا کے ساتھ بھائی چارہ کا برتاؤ بھی کرسکیں گے۔ گاندھی جی نے اپنی زندگی میں اسی راستے پر چل کر بغض و نفرت کو اپنے اعمال زندگی سے نکال پھینکا تھا۔ اس کا سب سے بڑا نمونہ تو یہ ہے کہ ۱۹۴۲ء کی تحریک میں گاندھی جی نے انگریز حکمرانوں کے نام ایک خط لکھا تھا جس میں انھوں نے "بھارت چھوڑو" تحریک کو اپنا اخلاقی فرض تسلیم کر لیا تھا۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ "چونکہ انگریزی حکومت ہندوستان میں غیر اخلاقی حکومت ہے اور اس سے انگریز کی اخلاقیات پر کلنک لگتا ہے اس لیے انگریزوں کا دوست ہونے کی وجہ سے میرا یہ فرض بنتا ہے کہ میں آپ کو یہ صلاح دوں کہ آپ اپنی اخلاقی ساکھ کو بچانے کے لیے ہندوستان کی غیر اخلاقی حکومت کو چھوڑ کر چلے جائیں۔"

گاندھی جی نے اپنی زندگی کے آخری حصہ میں انھیں اصولوں پر عمل کرکے ہمارے سامنے ایک مثال پیش کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ میں ہندوستان کی آزادی کی لڑائی اس لیے نہیں لڑ رہا ہوں کہ میں ہندوستان میں رہتا ہوں یا ہندوستان میرا ملک ہے بلکہ عالمی بھائی چارہ کا تقاضہ ہے کہ ہم اپنی آزادی کی لڑائی میں ان سب غلام ملکوں کو آزادی دلائیں جو بے بس اور مجبور زندگی گزار رہے ہیں۔ اگر ہندوستان آزاد ہو جائے تو ان ملکوں کے لیے بھی آزادی کی لڑائی لڑنے کا راستہ ہموار ہو جائے گا۔ سچائی کی جنگ لڑنے کے لیے جن اخلاقیات اور خود اعتمادی کی ضرورت ہوتی ہے اس کی مثال کو صرف گاندھی جی ہی پیش کر سکتے ہیں۔ کیونکہ انھوں نے سچائی کو ایک بے جان اور ساکت عناصر نہیں مانا ہے اس لیے انھوں نے اپنے اخلاقی فرائض کو سچائی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ ان کی پوری زندگی MY EXPERIENTS WITH THE TRUTH جیسے جملے میں پنہاں ہے جس کا مطلب ہے کہ وہ سچائی کو جامد شے نہیں مانتے اور جتنی بڑی سچائی عبادت گزار کے باطن میں ہوگی اتنی ہی مطابقت اس کی نصیحت میں ہوگی۔

اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ سائنس نے ہماری زندگی میں اہم تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ لیکن اگر ان تبدیلیوں کا صحیح فائدہ اٹھانا ہے تو آدمی کو زیادہ سے زیادہ بھروسہ اپنے ہی اوپر کرنا ہوگا۔ لوگ کہتے ہیں کہ گاندھی جی مشین کے مخالف تھے۔ دراصل گاندھی جی اس زندگی کے پیروکار تھے جس میں آدمی کو اپنے ہاتھ اور اپنے دماغ پر زیادہ بھروسہ کرنا پڑے اور دوسرے پر کم سے کم منحصر ہونا پڑے۔ گاندھی جی کا فلسفہ اپنے اوپر خود پر زیادہ سے زیادہ بھروسہ کرنے کا ہے۔ کسی بھی مشینی حکومت کی غلامی یا اس کے متعلق کاموں کا محتاج ہونا انھیں پسند نہ تھا۔

گاندھی جی اچھی طرح جانتے تھے کہ آدمی جتنا زیادہ خود اعتماد ہوگا اتنا ہی اپنے اوپر بھروسہ کرے گا اور اتنا ہی زیادہ آزاد خیال ہوگا، اتنا ہی زیادہ بے خوف ہوگا، اتنا ہی زیادہ غیر جانب دار اور حساس ہوگا۔ وہ اپنی اندرونی قوتوں اور ضمیر کی گواہی کو تسلیم کرے گا کیوں کہ زندگی کی ضرورتوں کے لیے اسے کسی پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ وہ اپنی ضرورت کی چیز کو خود پیدا کرے گا تاکہ اسے کسی دوسرے کی مدد کی ضرورت نہ پڑے۔

ایسے ماحول میں جب آدمی کی انفرادیت آزاد ہوگی تو وہ کسی کے دباؤ میں نہیں آئے گا اور اپنے ان فطری حقوق کی حفاظت کرنے میں کامیاب ہوگا جو آزادی کی تشریح کر سکیں۔ □□

گاندھی جی، سیوا گرام اور میں ... صفحہ ۲۸ کا بقیہ

بھی ایسا باریک کپڑا بننے لگا تھا کہ مشین کے کپڑے بھی اس کے مقابلے میں موٹے نظر آتے تھے۔

گاندھی جی کے ساتھ میں پہلی بار تقریباً تین ہفتہ سیوا گرام میں مقیم رہا جہاں میں نے ان کی زندگی کے ہر ہر پہلو کو بہت قریب سے دیکھا۔ انھوں نے مجھ سے بہت پیار کیا اور میں نے ان کا بہت احترام کیا۔ گاندھی جی کے دل میں میرے لیے کتنی محبت تھی اس کا اندازہ اس خط سے لگایا جاسکتا ہے کہ جو پنڈت نہرو نے گووند بلبھ پنت کو لکھا تھا جس میں انھوں نے میرے اور گاندھی جی کے تعلقات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے:

I should like to say that I think Hayatullah is a very fine youngman both in intellectual attainments and character. I have know him for a dozen years or so. At my request he spent some time with Gandhiji at Sewagram and was greatly influnced by Gandhiji. Gandhiji himself liked him. I am sure he would be a credit to us if he was sent to the Assembly.

Yours Sincerely
Jawahar Lal Nehru

(Selected books of Jawahar Lal Nehru in Second Series Volume–7)

چھوت چھات

"ہم ہندو مسلم اتحاد کو حاصل کیے اور چھوت چھات کے ناگ کو ختم کیے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔ چھوت چھات وہ زہر ہے، جو اندر ہی اندر ہندو سوسائٹی کی جڑوں کو کھا رہا ہے۔ ورنا شرم برتری اور کمتری کا مذہب نہیں۔ کوئی شخص کسی دوسرے کو خود سے کمتر تصور نہیں کر سکتا۔ اسے ہر شخص کو اپنا حقیقی بھائی سمجھنا چاہئے۔ ہر مذہب کا اصل اصول یہی ہے۔"

——— مہاتما گاندھی

اے گاندھی!

نذیر بنارسی

ترے ماتم میں شامل ہیں زمین و آسماں والے
اہنسا کے پجاری سوگ میں ہیں دو جہاں والے

ترا ارمان پورا ہو گا اے امن و اماں والے
ترے جھنڈے کے نیچے آئیں گے سارے جہاں والے

مرے بوڑھے بہادر! اس بڑھاپے میں جواں مردی
نشاں گولی کے سینے پر ہیں گولی کے نشاں والے

نشاں ہیں گولیوں کے یا کھلے ہیں پھول سینے پر
گلستاں ساتھ لے کر جاتے ہیں گلستاں والے

اسی کو مار ڈالا، جس نے سر اونچا کیا سب کا
نہ کیوں غیرت سے سر نیچا کریں ہندوستاں والے

مرے گاندھی! زمیں والوں نے تیری قدر جب کم کی
اٹھا کر لے گئے تجھ کو زمیں سے آسماں والے

زمیں پر جن کا ماتم ہے فلک پر دھوم ہے ان کی
ذرا سی دیر میں دیکھو کہاں پہنچے کہاں والے

پہنچتا دھوم سے منزل پہ اپنا کارواں اب تک
اگر دشمن نہ ہوتے کارواں کے کارواں والے

سنے گا اے نذیر اب کون مظلوموں کی فریادیں؟
فغاں لے کر کہاں جائیں گے اب آہ و فغاں والے

کہانی

رتن سنگھ
۲۲- آدرش نگر، نربدا روڈ، جبل پور

"یقین نہیں آتا"

نیزہ بردار حبشی چاروں طرف سے گھیرے پتہ نہیں مجھے کہاں لے جا رہے تھے اور مجھے اپنی جان کے لالے پڑ گئے تھے

میں اپنے ایک افریقی دوست کی دعوت پر افریقہ کے جنگلوں میں شکار کھیلنے گیا تھا۔ چار دن اچھے گزر گئے۔ افریقہ کے گھنے جنگلوں میں شکار کھیلنے کا بڑا مزا آیا۔ جنگل بڑا گھنا تھا، اور جانور بے انتہا۔ میرا شغل صرف بھانت بھانت کی چڑیوں کا شکار کرنا تھا، اور ان کی وہاں بہتات تھی۔

وہاں بے حد گھنے جنگلوں میں پیڑوں کی شاخیں دوسرے پیڑوں کی شاخوں سے یوں الجھی ہوئی تھیں جیسے کرۂ زمین پر پڑوسی ملکوں کی حدیں ایک دوسرے ملک کی حد میں یوں دھنستی چلی جاتی ہیں کہ یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کس ملک کی حد کہاں ختم ہوتی ہے، اور کہاں دوسرے ملک کی حد شروع ہو جاتی ہے۔ ایسے میں وہاں شکار کھیلنا تو مشکل کام تھا ہی جنگل کی حد کا تعین کرنا بھی ممکن نہیں تھا اور اسی وجہ سے یہ سانحہ ہو گیا۔

ایک دن میرا دوست کچھ بیمار تھا۔ اس لیے میں اکیلا ہی بندوق لے کر نکل پڑا۔ سوچا تھا کہ میں ریسٹ ہاؤس کے آس پاس ہی کہیں رہوں گا۔ تبھی ایک رنگ برنگی چڑیا مجھے دکھائی دے گئی۔ بڑی خوبصورت۔ اسے حاصل کرنے کے لیے دل مچل اٹھا۔ لیکن وہ ایک جگہ بیٹھتی ہی نہیں تھی کبھی پھدک کر۔ اس شاخ پر اور کبھی اس شاخ پر دُم ہلاتی ہوئی نظر آتی۔ ادھر جنگل گھنا ہونے کی وجہ سے کئی بار تو بندوق تاننے کے لیے بھی پوری جگہ نہیں ملتی تھی۔ اور پھر دوپہر کے وقت بھی اندھیرا ایسا تھا کہ آسمان تو کہیں دکھائی نہیں پڑتا تھا۔ سورج کی کرن کی تو بات ہی نہ پوچھیے۔ کسی بہت اونچے پیڑ کی سب سے اونچی شاخ پر یوں بیٹھی تھی، جیسے غریب کی اندھیری کوٹھری میں داخل ہونے سے ڈرتی ہو کہ کہیں وہ اندھیرے میں گم ہو کر ہی نہ رہ جائے۔

ایسے میں اس رنگین چڑیا کا پیچھا کرتے کرتے مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ میں کب ایک عام جنگل کی حد کو پار کر کے، کب کسی قبیلے کے ذاتی جنگل میں داخل ہو گیا تھا، اور اب اس کے کارندے مجھے اپنے نیزوں کی نوک پر پتہ نہیں کہاں لیے جا رہے تھے۔

ہم کافی دیر تک چلتے رہے۔ چلتے چلتے میرے قدم ذرا سے دھیرے ہوتے تو ان حبشیوں کے نیزوں کی تیکھی نوکیں میرے جسم کو چبھتی ہوئی سی لگتیں۔ تبھی سامنے ایک بستی کا پھاٹک دیکھ کر میرا دل بیٹھنے لگا۔ ایک ہی پل میں ڈر کے مارے میں پسینے میں نہا گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ پھاٹک کی لمبی چوڑی محراب اور دونوں ستون انسانی کھوپڑیوں سے سجے ہوئے تھے۔ اور ہم جیسے ہی اس گیٹ کے اندر داخل ہوئے تو ہا ہیا، ہا ہیا کا شور مچاتے ہوئے نوجوان حبشیوں کی ایک ٹولی جن کے ہاتھوں میں تلواروں اور کلہاڑیوں سے ملتے جلتے ہتھیار پکڑے ہوئے تھے، وہ ناچتے گاتے ہمارے آگے ہو لیے۔

آخر یہ کارواں ایک پیڑوں کے گھنے جھنڈ میں جا کر رکا: جہاں لکڑی کے ستونوں کے اوپر کھلی سی چھت کے نیچے ایک بہت بڑا تخت بچھا ہوا تھا اس تخت پر ٹیک لگانے کے لیے گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ اس تخت کے سامنے دونوں طرف قبیلے کے بہت سے لوگ لکڑی کے گول گول سٹولوں پر بیٹھے تھے۔ نوجوانوں کی ہا ہیا، ہا ہیا کی آواز سنتے ہی ان حبشیوں کی توجہ ہماری طرف گئی اور مجھے نیزوں میں گھرا ہوا دیکھ کر ان کی باچھیں یوں کھل گئیں جیسے ان کے لیے آج کی تفریح کا انتظام ہو گیا ہو۔

اس چھت سے ذرا ہٹ کر پہلے سے گڑے ہوئے دو ستونوں کے اوپر ایک اور بڑا سا لٹھ رکھا تھا، جس سے بندھی ہوئی لوہے کی زنجیریں لٹک رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ جہاں وہ زنجیریں لٹک رہی تھیں، ان کے نیچے الاؤ جلانے کے لیے لکڑیاں جمع کی جانے لگیں۔

یہ دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ مجھے

ان لوہے کی زنجیروں سے لٹکا کر نیچے الاؤ کی آگ جلا دی جائے گی اور...

یہ سوچ کر میں زمین پر گرتے گرتے بچا۔

مجھے اپنے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی اور اگر تھی تو صرف اتنی کہ ابھی سامنے اونچے تخت والی مسند پر کوئی نہیں بیٹھا تھا۔ اس کا مطلب میں نے یہی لگایا کہ ابھی اس قبیلے کا سردار یہاں موجود نہیں ہے۔

ایک طرف تو الاؤ کے لیے موٹی موٹی لکڑیاں اس طرح کھڑی کی جانے لگیں کہ جب الاؤ جلے تو اس کے شعلے اوپر لٹکنے والے آدمی کو اپنی لپیٹ میں لے سکیں۔ اور دوسری طرف میں نے دیکھا کہ ایک حبشی کو کچھ کہا گیا اور وہ بھاگتا ہوا ایک طرف کو نکل گیا۔

میرا اندازہ ٹھیک نکلا۔ جس طرف وہ حبشی گیا تھا، تھوڑی دیر بعد ادھر سے کچھ پالکی بردار ایک خوبصورت سی پالکی اٹھائے نمودار ہوئے۔ اور جیسے ہی وہ پالکی اس لکڑی کی چھت کے بیچ و بیچ لاکر رکھی گئی، اس میں سے ایک لحیم شحیم حبشی باہر نکلا۔ وہ یقیناً ان کا سردار تھا۔ اس نے اپنے سر پر پھولوں کا بنا ہوا ایک تاج پہن رکھا تھا اور اس کی کمر میں ایک رنگین پٹکا سا بندھا ہوا تھا۔ جس کا ایک سرا اس کے گھٹنے پر لٹکا ہوا تھا۔ قبیلے کے سردار نے آتے ہی ایک سرسری نظر سے میری طرف دیکھا اور جیسے ہی وہ اپنے تخت پر جاکر بیٹھا، اس کے درباری میری طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے کچھ بتانے لگے۔ میرا خیال ہے کہ انھوں نے اسے میرے جرم کی تفصیل بتائی ہوگی، یا پھر یہ کہ مجھے سزا دینے کے لیے سارے انتظام مکمل کر لیے گئے ہیں۔ یہ اندازہ میں نے اس طرح لگایا کہ درباریوں میں سے کوئی ستونوں سے بندھی ہوئی زنجیروں اور اس کے جلنے والے الاؤ کے ڈھیر کی طرف ہی اشارے کر رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد میری قسمت کا فیصلہ ہونے کے لیے مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی۔

وہ نیزہ بردار جو مجھے پکڑ کر لائے تھے، انھوں نے اونچی آواز میں کچھ کہنا شروع کیا۔ وہ اپنی اپنی بات کہہ چکے تو سردار نے اشارے سے مجھے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔

میں نیزہ برداروں کے گھیرے میں گھرا سردار سے کوئی دس فٹ کے فاصلے پر جاکر کھڑا ہو گیا۔

"کس دیش کے باسی"؟ سردار نے مجھ سے انگریزی میں پوچھا۔

اسے انگریزی بولتے ہوئے دیکھ کر میری جان میں کچھ جان آئی کہ اب کم از کم کوئی میری بات سننے والا تو ہے۔ لیکن پھر بھی ڈر کے مارے میری آواز جیسے گلے میں ہی اٹک کر رہ گئی۔

سردار نے اپنا سوال دہرایا۔

"ہندوستان" بڑی مشکل سے میں یہ لفظ ادا کر پایا۔

"ہندوستان؟" سردار کو کچھ حیرانی ہوئی۔ پھر اس کی آنکھوں میں چمک سی آئی اور اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"ہندوستان" میں نے کچھ اونچی آواز میں کہا۔

"گون دی، گون دی" یہ کہتے ہوئے اس نے تالی بجائی۔

تالی کے بجتے ہی نیزہ بردار سپاہی پیچھے ہٹ گئے۔ اور سردار نے مجھے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔

میں ایک قدم آگے بڑھ کر رک گیا۔

اس نے مجھے پھر آگے آنے کو کہا۔

میں ایک قدم اور آگے بڑھ کر رک گیا۔

اب کی سردار نے اپنے تخت پر ہاتھ مارا۔ جس کا مطلب تھا کہ میں اس کے تخت پر اس کے پاس جاکر بیٹھ جاؤں۔

میں ڈرتا ڈرتا وہاں جاکر بیٹھ گیا۔

اب سردار کے چہرے پر مسرت کے آثار تھے۔ اس نے 'گون دی، گون دی' کہتے ہوئے پتہ نہیں اپنے لوگوں کو کیا کیا بتایا۔ اور پھر سارا ماحول بدل گیا۔

اسی وقت کھانے پینے کی چیزوں سے بھری ہوئی کتنی طشتریاں لاکر رکھی گئیں۔ ابھی میں سردار کے ساتھ مل کر میٹھے میٹھے پھل کھا ہی رہا تھا کہ میرا دوست بیمار ہوتے ہوئے بھی میری تلاش میں وہاں پہنچ گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب ہم دونوں قبیلے کے سردار کی پالکی میں بیٹھ کر واپس اپنے ریسٹ ہاؤس کی طرف آرہے تھے تو میرے دوست نے مجھے بتایا۔ "آج تو تم مہاتما گاندھی کے دیش کے باشندے ہونے کی وجہ سے بچ گئے، ورنہ بڑا غضب ہو جاتا۔ یہ سردار گاندھی کا بڑا بھگت ہے۔"

تبھی میرے کانوں میں اس کے الفاظ "گون دی گون دی" گونج گئے۔

عبد اللطیف اعظمی

گاندھی جی کی زندگی کے اہم واقعات

گاندھی جی کی حیات اور تحریک آزادی سے متعلق تفصیلات کا مختصر جائزہ عبد اللطیف اعظمی نے اپنے مضمون "گاندھی جی کی زندگی کے اہم واقعات" میں پیش کیا ہے۔ قارئین کی دلچسپی اور انھیں اطلاعات فراہم کرنے کے پیش نظر یہ مضمون پیش کیا جا رہا ہے۔

ایڈیٹر

۱۸۶۹ء ۲ اکتوبر۔ موہن داس کرم چند گاندھی، کاٹھیاواڑ کے ایک علاقے پوربندر میں پیدا ہوئے۔

۱۸۷۶ء۔ اپنے والد کے ساتھ پوربندر سے راج کوٹ گئے اور ایک پرائمری اسکول میں داخلہ لیا۔ اسی سال ایک تاجر گوکل داس مانک جی کی لڑکی کستوربائی سے گاندھی جی کی منگنی ہوگئی۔ کستوربائی گاندھی سے چھ ماہ بڑی تھیں۔ ۱۸۸۳ء میں دونوں کی شادی ہوگئی۔

۱۸۸۱ء۔ راج کوٹ کے کاٹھیاواڑ ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔

۱۸۸۵ء۔ گاندھی جی کے والد کا ۶۳ سال کی عمر میں انتقال ہوا، جو دیوان (وزیراعظم) کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے تھے اور ریاست راجکوٹ کے پنشن یافتہ تھے۔

۱۸۸۷ء دسمبر۔ احمد آباد کے سنٹر سے میٹرکولیشن کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد سامل داس کالج میں داخلہ لیا۔

۱۸۸۸ء ۴ ستمبر: لندن کے لیے روانہ ہوئے۔

" ۲۷ اکتوبر۔ لندن پہونچے

" ۴ نومبر۔ انرٹمپل میں بیرسٹری کے لیے نام لکھوایا

۱۸۹۰ء جون۔ لندن سے میٹرکولیشن کا امتحان پاس کیا۔

۱۸۹۱ء ۱۰ جون۔ بیرسٹری کا امتحان پاس کیا اور دوسرے دن ہائی کورٹ میں نام لکھوایا۔

۱۸۹۱ء ۱۲ جون: آسام جہاز سے ہندستان کے لیے روانہ ہوئے۔

۱۸۹۳ء اپریل: پوربندر کی ایک مسلمان فرم عبداللہ کمپنی کی دعوت پر جنوبی افریقہ روانہ ہوئے۔

" مئی: نٹال (ڈربن) کی بندرگاہ پر اترے۔

۱۸۹۴ء ۲۲ مئی: نٹال کے ہندستانیوں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی انجمن کا نام نٹال انڈین کانگریس کردیں۔ ۱۸۹۳ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس لاہور میں ہوا تھا۔ اس اجلاس کے بعد گاندھی جی کو خیال آیا کہ نٹال کے ہندستانی بھی اپنی انجمن کا نام کانگریس کے نام پر رکھیں۔ گاندھی جی کا یہ مشورہ شکریہ کے ساتھ مان لیا گیا۔

۱۸۹۶ء جون: بیوی اور بچوں کو جنوبی افریقہ لانے کے لئے چھ ماہ کے لیے ہندستان کے لیے روانہ ہوئے۔

۱۸۹۶ء ۱۴ ستمبر: ہندستان کے مختصر قیام میں گاندھی جی نے ایک پمفلٹ شائع کیا۔ اس کا ٹائٹل سبز تھا اس لیے یہ گرین پمفلٹ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس میں جنوبی افریقہ کے ہندستانیوں کی مشکلات کو دکھایا گیا تھا۔ اس کا خلاصہ دنیا کے اخبارات میں شائع ہوا جس سے نہ صرف جنوبی افریقہ کی حکومت خفا ہوگئی بلکہ وہاں کی گوری قوم بھی بپھر گئی۔

۱۸۹۷ء ۔ ۲۸ر نومبر: کورلینڈ جہاز سے مع بیوی، ۲ لڑکوں اور ایک بھانجے کے جنوبی افریقہ کے لیے روانہ ہوئے۔

۱۹ر دسمبر: ڈربن کی بندرگاہ پر اُترے۔

۳۰ر دسمبر: ایک انگریز مسٹر ہیری اسپارکس نے اعلان کیا کہ ایشیا والوں کے داخلے کے خلاف، جن میں گاندھی جی بھی شامل تھے، احتجاج کرنے کے لیے ۴ر جنوری کو ایک جلسہ ہوگا۔

۱۸۹۸ء ۔ ۴ر جنوری: ڈربن ٹاؤن ہال میں ایک جلسہ ہوا جس میں گاندھی جی کے خلاف تقریریں کی گئیں۔

۱۳ر جنوری: کورلینڈ جہاز کو، جسے ۲۳ دن کے قرنطینہ کے لیے روک لیا گیا تھا، گودی میں آنے کی اور مسافروں کے اترنے کی اجازت دی گئی۔ گاندھی جی جہاز سے اتر کر جب اپنی قیام گاہ پر جا رہے تھے تو ان کو روک کر اس قدر مارا پیٹا گیا کہ وہ سخت زخمی ہو کر بے ہوش ہو گئے۔

۱۸۹۹ء ۱۰ر اکتوبر: بوئر کی جنگ چھڑ گئی۔ گاندھی جی کی ہمدردیاں اگرچہ بوئروں کے ساتھ تھیں مگر انھوں نے انگریز فوجیوں کی مرہم پٹی کے لیے ایک ایمبولنس کور بنائی جس کو حکومت برطانیہ نے بڑے تامل کے بعد دسمبر میں خدمت کی اجازت دے دی۔

۱۹۰۰ء فروری: دو مہینے کے بعد ایمبولنس کور توڑ دی گئی۔ اس مختصر وقت میں اس نے بڑی شان دار خدمت انجام دی۔

۱۹۰۱ء نومبر: بال بچوں کے ساتھ نٹال سے ہندستان کے لیے روانہ ہوئے۔ روانگی سے قبل شان دار الوداعی پارٹی دی گئی اور قیمتی تحفے پیش کیے گئے جنھیں انھوں نے جنوبی افریقہ کے ہندستانیوں کی بھلائی کے کاموں کے لیے واپس کر دیا اور اس کے لئے ایک ٹرسٹ بنا دیا۔

۱۹ر دسمبر: ممبئی پہونچے۔

۱۹۰۲ء جنوری: کلکتہ سے راج کوٹ کے لیے روانہ ہوئے تو گوکھلے ان کو پہونچانے کے لئے ریلوے اسٹیشن پر آئے۔ راستہ میں بنارس، آگرہ، جے پور اور پالن پور میں مختصر قیام کیا اور بنارس میں مسز اینی بیسنٹ سے ملاقات کی۔

۱۹۰۲ء ۳۱ر مئی: بوئروں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ برطانوی اخبارات میں ہندستانی ایمبولنس کور کی خدمات کی بہت تعریف کی گئی اور گاندھی جی کو "وار میڈل" دیا گیا جو گاندھی میموریل میوزیم میں محفوظ ہے۔

" جون: بمبئی میں قیام کرنے اور وکالت کرنے کے لئے۔ ج کوٹ سے بمبئی تشریف لے گئے۔

دسمبر: جنوبی افریقہ سے تار ملنے پر، بیوی بچوں کے بغیر مگن لال جی گاندھی کے ساتھ نٹال کے لیے روانہ ہو گئے۔

۱۹۰۳ء یکم جنوری: چیمبرلین (وزیر نوآبادیات) کے سامنے ہندوستانیوں کے مطالبات پیش کرنے کے لیے پریٹوریا پہونچے۔

اپریل: ٹرانسوال ہائی کورٹ میں وکالت کرنے کے لیے جوہانسبرگ میں دفتر قائم کیا۔

۴ر جون: ایک ہفتہ وار اخبار "انڈین اوپینین" کے نام سے جاری کیا گیا جس کی ادارت میں نہ صرف یہ کہ گاندھی جی کا نام تھا بلکہ اس کو چلانے کی ذمہ داری بھی ان ہی پر تھی۔ گاندھی جی نے لکھا ہے:

"زیادہ تر کام مجھی کو کرنا پڑتا تھا بلکہ اکثر ادارت کے فرائض بھی میں ہی انجام دیتا تھا۔"

(گاندھی جی نے اپنی آپ بیتی میں اخبار کا سنہ اجرا ۱۹۰۴ء لکھا ہے مگر ان سے سہو ہوا ہے، دراصل اس کا پہلا شمارہ ۴ر جون سنہ ۱۹۰۳ء کو نکلا ہے)

۱۹۰۶ء اپریل: زولو بغاوت شروع ہوئی تو گاندھی جی نے ایمبولنس کور کے قیام کی تجویز اور اس کی خدمات کی پیش کش کی، جو فوراً منظور کر لی گئی۔ گاندھی جی کی حیثیت سرجنٹ میجر کی تھی۔

جولائی: زولو بغاوت ختم ہو گئی اور انڈین ایمبولنس کور کے ہر ممبر کو، جس میں گاندھی جی بھی شامل تھے، ان کی خدمات کے اعتراف میں میڈل دیئے گئے۔

جولائی: محاذ سے فونکس واپس پہونچنے کے بعد گاندھی جی نے اپنی بیوی کی رضامندی سے "برہمچریہ" کا عہد کیا۔

۲۲ر اگست: ٹرانسوال حکومت نے غیر معمولی گزٹ میں ایک نیا آرڈیننس شائع کیا جس کے مطابق ہر ایشیائی شہری کو رجسٹرار آفس میں اپنا نام

رجسٹر کرانا ضروری تھا۔

۴ ستمبر: ایشیائی رجسٹریشن بل آسمبلی میں منظوری کے لیے پیش کیا گیا۔

۱۱ ستمبر: ایک عام جلسے میں جو جیونش امپائر تھیٹر جوہانسبرگ میں ہوا تھا۔ اور جس میں ٹرانسوال کے ہر حصے کے ہندستانیوں کے نمائندے شریک ہوئے تھے، گاندھی جی نے رجسٹریشن بل کے خلاف سخت تقریر کی۔ اس جلسے کی صدارت برٹش ایسوسی ایشن ٹرانسوال کے قدیم ہندستانی باشندے جناب عبدالغنی نے کی۔

۳ اکتوبر: ہندستانی وفد کے سربراہ کی حیثیت سے لندن کے لیے روانہ ہوئے۔

۲۰ اکتوبر: لندن پہونچے اور اسٹیمر میں رجسٹریشن کے بارے میں عرضداشت کا جو مسودہ تیار کیا تھا، سکریٹری آف اسٹیٹ فار کالونیز لارڈ الگن (Lord Elgin) کے سامنے پیش کیا۔

۱۹۰۷ء ۲۱ مارچ: رجسٹریشن ایکٹ یا "کالا قانون" ایک ہی اجلاس میں پاس کر دیا گیا۔

یکم جولائی: رجسٹریشن ایکٹ نافذ کر دیا گیا۔

۳۱ جولائی: رجسٹریشن کے آخری دن ایک مسجد میں ایک عام جلسہ ہوا اور ستیہ گرہ کی ابتدا ہوئی۔

۲۸ دسمبر: گاندھی جی اور ۲۴ دوسرے ہندستانیوں کو حکومت نے حکم دیا کہ وہ ۴۸ گھنٹے کے اندر اندر یا تو ٹرانسوال چھوڑ دیں یا اپنا رجسٹریشن سرٹیفکیٹ پیش کریں۔

۱۹۰۸ء ۱۰ جنوری: گاندھی جی کو قید کر کے جوہانسبرگ کی جیل بھیج دیا گیا یہ پہلی سزائے قید تھی۔

۳۰ جنوری: پریٹوریا کے جنرل اسمٹس گاندھی جی سے گفتگو کرنا چاہتے تھے اس لیے عارضی طور پر جیل سے رہا کیے گئے۔ گفتگو کے بعد جوہانسبرگ آئے اور نیوٹن کی مسجد میں ایک عام جلسے کو خطاب کیا اور ہندستانیوں سے رجسٹریشن کرانے کی اپیل کی، چند پٹھانوں کے سوا سب لوگوں نے اتفاق کیا۔

۳۱ جنوری: سات بجے صبح کو اپنے کو پولیس کے حوالے کر دیا اور رہبر میں

مستقل طور پر رہا کر دیے گئے۔

۲۳ جولائی: پھیری والوں کی ہمدردی میں، جو جیل میں تھے، پہلی عام اسٹرائک کی تنظیم کی، جو بہت کامیاب رہی اور ٹرانسوال کے تمام ہندستانی تاجروں نے اس میں حصہ لیا۔

۸ اگست: رجسٹریشن کے بارے میں جنرل اسمٹس سے گفتگو ہوئی جو ناکام رہی۔

۲۳ اگست: ایک جلسہ میں، جسے گاندھی جی نے خطاب کیا تھا، بہت سے سرٹیفکیٹ جلائے گئے۔

۹ ستمبر: گاندھی جی مع پندرہ والنیٹر کے دوبارہ گرفتار کیے گئے۔

۱۵ اکتوبر: ۲۵ پاؤنڈ جرمانے کی سزا دی گئی، عدم ادائیگی کی صورت میں دو ماہ کی قید سخت کی سزا کا حکم سنایا گیا۔ گاندھی جی نے دوسری شکل کو ترجیح دی۔

۱۳ دسمبر: جوہانسبرگ جیل سے رہا کیے گئے۔

۱۹۰۹ء ۱۵ جنوری: رجسٹریشن سرٹیفکیٹ پیش نہ کرنے پر گرفتار کیے گئے۔

۲۵ فروری: رجسٹریشن سرٹیفکیٹ پیش کرنے اور انگلیوں کے نشانات کے دینے سے انکار کرنے پر، تین مہینے قید سخت یا پچاس پونڈ جرمانہ کی سزا دی گئی۔ گاندھی جی نے قید کو ترجیح دی۔

۲۴ مئی: پریٹوریا جیل سے رہا کیے گئے۔

۱۹۱۰ء ۳۰ مئی: ایک جرمن آرکیٹکٹ ہرمن کیلن باخ نے ایک ہزار ایک سو ایکڑ کی زمین ستیہ گرہ کے لیے عطیہ کے طور پر دی۔ گاندھی جی اور عطیہ دینے والے نے اس کا نام ٹالسٹائی فارم رکھا۔

۱۹۱۱ء یکم جون: تمام ستیہ گرہی رہا کیے گئے۔

۱۹۱۲ء ۲۲ اکتوبر: حکومت اور ستیہ گرہیوں کے درمیان سمجھوتہ کرانے کے لیے گوکھلے کیپ ٹاؤن آئے۔ ان کے قیام کے دوران مستقل طور پر گاندھی جی ان کے ساتھ رہے اور ان کے سکریٹری کی حیثیت سے کام کیا۔

۱۷ نومبر: گوکھلے جنوبی افریقہ سے روانہ ہوئے اور گاندھی جی نے ان کو الوداع کہا۔

۱۹۱۳ء ۱۲ر اپریل: یونین آف جنوبی افریقہ کے غیر معمولی گزٹ نیا امیگریشن بل شائع ہوا، جس کو پڑھ کر گاندھی جی کو بڑی مایوسی ہوئی۔
۳ر مئی: گاندھی جی نے ’انڈین اوپی نین‘ میں اس بل پر اعتراض کیا۔
۹ر ستمبر: اسٹنڈرٹن میں گاندھی جی کو دوبارہ گرفتار کرلیا گیا۔
۶ر نومبر: حکومت نے گاندھی جی کو گرفتار کرلیا، مگر ضمانت پر چھوڑ دیے گئے اور وہ ستیہ گرہیوں میں پھر شامل ہوگئے۔
۸ر نومبر: اسٹنڈرٹن میں پھر گرفتار کرلیے گئے اور اس مرتبہ بھی ضمانت پر رہا کر دیے گئے۔
۱۱ر نومبر: نو ماہ کی قید سخت کی سزا دی گئی۔
۱۸ر دسمبر: غیر مشروط طور پر رہا کر دیے گئے۔
۱۹۱۴ء ۱۸ر جولائی: اپنی اہلیہ کے ساتھ گوپال کرشن گوکھلے سے ملنے کے لیے انگلستان روانہ ہوئے۔
۶ر اگست: لندن پہونچے
۱۹ر دسمبر: ہندستان کے لیے پانی کے جہاز سے روانہ ہوئے۔
۱۹۱۵ء ۹ر جنوری: بمبئی پہونچے اور شاندار خیر مقدم کیا گیا۔
۳ر جون: بادشاہ کے یوم پیدائش کے موقع پر، برطانوی شہنشاہیت کی خدمت پر قیصر ہند میڈل دیا گیا۔
۱۹۱۶ء ۴ر فروری: بنارس ہندو یونیورسٹی کی افتتاحی تقریب منائی گئی اور اس موقع پر گاندھی جی نے ایک تاریخی تقریر کی، جس کے دوران ٹوکا ٹوکیاں ڈالی گئیں اور اعتراضات کیے گئے۔
۱۹۱۷ء ۱۰ر اپریل: صبح کو پٹنہ تشریف لے گئے اور راجندر پرشاد سے ملے۔ جو آزاد ہندستان کے پہلے صدر منتخب ہوئے تھے۔ رات کو ۱۰ بجے مظفرپور گئے۔ جہاں جے بی کرپلانی سے ملاقات ہوئی۔ کرپلانی جی اس وقت گورنمنٹ کالج میں پروفیسر تھے۔
۱۴ر اپریل: ترہت ڈویژن کے کمشنر سے ملے جس نے چمپارن سے چلے جانے کی ہدایت کی۔ (گاندھی جی نے لکھا ہے: کمشنر صاحب سے ملا تو وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے، انھوں نے مجھے بہت دھمکایا اور کہا کہ تم فوراً ترہٹ سے چلے جاؤ۔)
۱۷ر اپریل: سمن کی تعمیل کی گئی کہ ۱۸ر اپریل کو سب ڈویژنل آفیسر کے سامنے حاضر ہو۔ دوسرے روز عدالت میں پیش ہوئے اور رہا کر دیے گئے۔
۱۹۱۹ء ۲۸ر فروری: ایک بیان میں رولٹ بل کی مذمت کی۔
۴ر مارچ: رولٹ بل کے متعلق نئی دہلی میں وائسرائے سے گفتگو کی۔
۲۴ر جون: بمبئی کے ایک عام جلسے کی صدارت کی اور ہرنی من کی جلا وطنی کے خلاف احتجاج کیا۔
۷ر اکتوبر: گاندھی جی کی ادارت اور نگرانی میں ’نوجیون‘ کا پہلا شمارہ نکلا اور دوسرے دن ’ینگ انڈیا‘ کا پہلا شمارہ نکلا۔
۱۹۲۰ء ۱۸ر جنوری: مولانا ابوالکلام آزاد پہلی مرتبہ گاندھی جی سے ملے اور خلافت تحریک کے متعلق بات کی۔
۱۹ر جنوری: خلافت وفد کے سربراہ کی حیثیت سے وائسرائے سے ملاقات کی۔
۲۸ر اپریل: ہوم رول لیگ کے صدر منتخب ہوئے
۸ر مئی: عدم تعاون تحریک کے متعلق منشور شائع کیا
۲۸ر مئی: خلافت کمیٹی نے، جس کے گاندھی جی ایک رکن تھے، عدم تعاون کی حمایت کی۔
۳۱ر جولائی: یہ دن روزہ رکھنے اور عبادت کرنے کے لیے مخصوص کیا گیا اور دوسرے دن عدم تشدد کی بنیاد پر عدم تعاون کی تحریک شروع کی گئی۔
یکم اگست: قیصر ہند میڈل اور بوئر جنگ کے موقع پر حکومت کی طرف سے جو میڈل ملا تھا، انھیں وائسرائے کو واپس کر دیا۔
۴ر ستمبر: کانگریس کے اسپیشل اجلاس (منعقدہ کلکتہ) میں شرکت کی۔
۵ر نومبر: پنڈت موتی لال نہرو اور جیٹھانی کے ساتھ پونا پہنچے اور جلسہ عام میں تقریر کی۔
۲۶ر نومبر: بنارس ہندو یونیورسٹی کے طالب علموں کے ایک اجتماع میں تقریر کی۔
۱۹۲۱ء ۴ر فروری: کلکتہ میں پہلے نیشنل کالج کی افتتاحی تقریب انجام دی۔
۶ر فروری: پٹنہ میں ایک اور نیشنل کالج قائم کیا۔
۱۴ر فروری: دہلی میں یونانی اینڈ طبی کالج کا باقاعدہ افتتاح کیا۔

۱۹۲۱ء۔ ۶ راگست، علی گڑھ جامع مسجد میں تقریر کی۔
۱۶ رستمبر، بیگم مولانا محمد علی کے ساتھ مدراس گئے۔
۴ رنومبر، آل انڈیا کانگریس کمیٹی منعقدہ دہلی کے جلسے میں قانون شکنی کی تاریخی تجویز پیش کی، جو طویل بحث کے بعد معمولی تبدیلی کے ساتھ منظور کی گئی۔
۱۹۲۲ء ۲۲ رجنوری، قانون شکنی کی تحریک شروع کرنے کے لئے احمد آباد سے باردولی کے لیے روانہ ہوئے۔
یکم فروری: باردولی میں قانون شکنی کی تحریک شروع کرنے کے لیے حکومت ہند کو الٹی میٹم دیا۔
۵ رفروری: عوام کے ایک مجمع نے چوری چورا کی ایک پولیس چوکی کو اور ۲۱ سپاہیوں کو جلادیا۔
۹ رفروری: باردولی سے بمبئی آئے اور چوری چورا کے سانحہ کے متعلق مالویہ، جیکار، جناح، نٹراجن اور دوسرے لیڈروں سے مشورہ کیا۔
۱۲ رفروری: چوری چورا اور بریلی کے واقعہ کی وجہ سے قانون شکنی کی عام تحریک کو واپس لے لیا۔
۱۰ رمارچ: "ینگ انڈیا" میں تین مضامین کی اشاعت پر بغاوت کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا۔
۱۸ رمارچ: چھ سال قید محض کی سزادی گئی۔ جیل میں گجراتی زبان میں اپنی آپ بیتی لکھنا شروع کی، جس کا اردو ترجمہ بعد میں "تلاشِ حق" کے نام سے شائع ہوا۔
۱۹۲۴ء: ۵ رفروری: غیر مشروط طور پر رہا کیے گئے اور صحت کو بہتر بنانے کی غرض سے جوہو کے لیے روانہ ہوئے۔
۱۷ راگست: ہندو مسلم فساد کی وجہ سے دلی تشریف لائے۔
۱۳ رستمبر: ہندو مسلم فساد کی وجہ سے احمد آباد سے پھر دلی تشریف لائے۔
۱۸ رستمبر: ہندو مسلم اتحاد کے لیے ۲۱ دن کا برت رکھا
۸ راکتوبر: ۱۲ بجے دن کو اپنا برت توڑا
۱۹۲۵ء ۲۲ رجنوری: آل پارٹیز کانفرنس منعقدہ دہلی کی صدارت کی۔
۱۹۲۶ء جنوری: "ینگ انڈیا" کے لئے ایک مضمون لکھا جس میں عملی سیاست سے کنارہ کشی کا اعلان کیا۔
۱۹۲۸ء ۲۷ رجولائی: کانگریس کی صدارت کے لیے موتی لال نہرو کا نام تجویز کیا
۱۹۲۹ء ۵ رمارچ: رنگون کے لیے روانہ ہوئے
۲۲ رمارچ: کلکتہ کے لیے رنگون سے روانہ ہوئے۔
۹ راگست: ایم اے جناح سے فرقہ وارانہ مسئلے پر نجی گفتگو کی۔
۲۰ راگست: لاہور ریسپشن کمیٹی نے گاندھی جی کو کانگریس کی صدارت کے لیے منتخب کیا، مگر انھوں نے اپنے بجائے پنڈت جواہر لال نہرو کا نام تجویز کیا۔
۱۹۳۰ء ۱۲ رمارچ: صبح کو ساڑھے چھ بجے گاندھی جی اپنے ۷۸ ساتھیوں کے ساتھ نمک بنا کر قانون شکنی کے لیے سابرمتی آشرم سے ڈانڈی کے لیے روانہ ہوئے۔
۶ راپریل، نمک بنا کر قانون شکنی کی ابتدا کی۔
۴ رمئی، پون بجے رات میں، جب کہ وہ سو رہے تھے، گرفتار کر کے یرودا جیل بھیج دیئے گئے۔
۱۹۳۱ء ۲۶ رجنوری: جواہر لال نہرو، مسز سروجنی نائڈو اور ۲۵ دوسرے لیڈروں کے ساتھ گاندھی جی رہا کیے گئے۔
۶ رفروری: لکھنؤ میں موتی لال نہرو کو دیکھنے گئے، جس کے دوسرے دن موتی لال کا انتقال ہوا۔
۴ رمارچ: گاندھی اروِن معاہدے پر دستخط ہوئے۔
۲۳ رمارچ: آدھی رات میں بھگت سنگھ کو پھانسی دے دی گئی۔
۲۹ رمئی: وائسرائے کو خط لکھا کہ وہ صرف کانگریس کا نقطۂ نظر پیش کرنے کے لیے گول میز کانفرنس میں شریک ہوں گے۔
۱۰ رجون، کانگریس ورکنگ کمیٹی نے گول میز کانفرنس میں اپنی نمائندگی کے لیے گاندھی جی کو مکمل اختیارات دیئے۔
۲۹ راگست، بمبئی سے لندن کے لیے روانہ ہوئے
۱۲ رستمبر: لندن پہونچے۔
۵ ردسمبر: لندن سے ہندوستان کے لیے براہ پیرس روانہ ہوئے۔
۲۸ ردسمبر: بمبئی کی بندرگاہ پر اترے
۱۹۳۲ء ۴ رجنوری، بمبئی میں تین بجے رات کے وقت گرفتار کیے گئے اور

بروودا سنٹرل جیل میں نظر بند کر دیئے گئے۔

۱۷ راگست: میکڈونلڈ کمیونل ایوارڈ شائع کیا گیا۔

۱۸ راگست: کمیونل ایوارڈ کے خلاف مرن برت کا فیصلہ کیا۔

۲۰ رستمبر: دوپہر کو مرن برت شروع کیا۔

۲۶ رستمبر: حکومت کے اعلانیہ کے بعد سوا پانچ بجے شام کو مرن برت توڑا۔

۱۹۳۳ء ۲۹ راپریل: تین ہفتے کے برت کا اعلان کیا۔

۸ رمئی: ۱۲ بجے دن کو ۲۱ دن کا برت شروع کیا۔

۲۹ رمئی: ۲۱ دن کا برت بخیر و خوبی ختم ہوا۔

۱۹۳۴ء ۲۵ رجون: ان کی جان لینے کے لئے بم پھینکا گیا مگر خوش قسمتی سے بچ گئے۔

۱۹۳۶ء ۳۰ راپریل: وردھا سے پانچ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں، سیگاؤں کو اپنا مرکز بنایا۔

۱۹۳۷ء ۲۸ راگست: جن صوبوں میں کانگریسی حکومتیں قائم تھیں، ان میں شراب بندی پر زور دیا۔

۲۲، ۲۳ راکتوبر: وردھا میں ملک کے تعلیمی مسئلے پر غور کرنے کے لیے ایک کانفرنس بلائی اور اس کی صدارت کی۔ ایک اسکیم مرتب کرنے کے لیے ڈاکٹر ذاکر حسین کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔

۲۴ رنومبر: ذاکر حسین کمیٹی نے اپنی رپورٹ پیش کی۔

۱۹۳۸ء ۲۸ راپریل: مسٹر ایم۔ اے جناح سے بمبئی میں ملاقات کی اور ہندو مسلم سمجھوتے پر بات کی۔

۲۰ رمئی: مسٹر جناح کی رہائش گاہ پر ان سے گفتگو کی

۱۵ راکتوبر: پشاور میں گاندھی جی کا شاندار خیر مقدم کیا گیا۔

۹ رنومبر: شمال مغربی فرنٹیئر صوبہ کا دورہ ختم کر کے پشاور سے وردھا کے لیے روانہ ہوئے۔

۱۹۳۹ء ۳ رجنوری: مولانا شوکت علی کے انتقال کی خبر سن کر بے اختیار رو پڑے۔

۵ رجولائی: اپنے سکریٹری مہادیو ڈیسائی کے ساتھ فرنٹیئر کے دورے پر روانہ ہوئے۔

۱۹۴۰ء ۵ رمارچ: سیواگرام کا نام بدل کر سیواگاؤں رکھا۔

۱۵ راکتوبر: انفرادی ستیہ گرہ کی وضاحت کی۔

۱۷ راکتوبر: انفرادی ستیہ گرہ شروع کرنے کے لئے ونوبا بھاوے کو منتخب کیا۔ وردھا سے سات میل کے فاصلے پر ایک گاؤں میں انھوں نے جنگ کے خلاف تقریر کی۔ تقریر کے بعد انھیں گرفتار کر لیا گیا اور تین مہینے کی سزائے قید دی گئی۔

۱۹۴۲ء ۹ راگست: مولانا ابو الکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو اور ورکنگ کمیٹی کے دوسرے ممبران کے ساتھ گاندھی جی کو گرفتار کیا گیا۔

۱۹۴۳ء ۱۰ رفروری: آغا خاں محل میں برت شروع کیا۔

۱۷ رفروری: گاندھی جی کے برت کی ہمدردی میں سر ایچ۔ پی۔ موزی، این آر۔ سرکار اور ایم۔ ایس۔ اینے نے وائسرائے کی کونسل سے استعفا دے دیا۔

۱۹ رفروری: گاندھی جی کی رہائی کے لیے چرچل، ایمری اور وائسرائے کو بے شمار درخواستیں بھیجی گئیں۔

۲۰ رفروری: نئی دہلی میں آل پارٹی لیڈرس کانفرنس منعقد ہوئی اور گاندھی جی کی غیر مشروط رہائی کے لئے ایک متفقہ تجویز منظور ہوئی۔

۲۴ رفروری: چرچل نے گاندھی جی کی رہائی کی تمام درخواستوں کو نامنظور کر دیا۔

۱۹۴۴ء ۲۲ رفروری: گاندھی جی کی اہلیہ کستوربا کا آغا خاں محل قید میں انتقال ہوا

۵ رمئی: گاندھی جی غیر مشروط طور پر رہا کر دیے گئے۔

۱۱ رمئی: جوہو میں صحت کی بحالی تک قیام کیا۔

۲۹ رجولائی: مسٹر جناح سے ملنے کی خواہش کی اور مسٹر جناح نے رضامندی ظاہر کی۔

۳۰ رجولائی: ہندو مسلم مسئلے کے حل کے لئے راج گوپال اچاری کے فارمولا کی حمایت کی۔

۹ رستمبر: مسٹر جناح سے بمبئی میں ملاقات کی۔

۲۷ رستمبر: گاندھی جناح گفتگو بالکل ناکام رہی۔ ان کی خط و کتابت

شائع کردی گئی۔

۱۹۴۵ء ۲۴ جون: وائسرائے سے ملاقات کی اور ان کی یہ تجویز کہ شملہ کانفرنس میں صدر کانگریس مولانا آزاد کانگریس کی نمائندگی کریں گے وائسرائے نے منظور کر لی۔

۱۹۴۶ء ۵ نومبر: گاندھی جی نے فیصلہ کیا کہ اگر بنگال اور بہار میں فسادات بند نہیں ہوئے تو وہ برت شروع کر دیں گے۔

۶ نومبر: نواکھالی کے لیے روانہ ہوئے۔

۱۹۴۷ء ۳۱ مارچ: نئے وائسرائے وسکاونٹ ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کی۔

یکم اپریل: ایشیائی رابطہ کانفرنس کو جو پُرانے قلعہ نئی دہلی میں منعقد ہوئی تھی خطاب کیا۔

۷ اپریل: بنگال کے وزیر اعلیٰ کو لکھا کہ نواکھالی میں حالات پر قابو حاصل کرنے کے لئے فوری کارروائی کی جائے۔

۲۷ جولائی: راجہ مہاراجہ سے اپیل کی کہ وہ انڈین یونین میں شامل ہو جائیں۔

یکم اگست: سری نگر (کشمیر) تشریف لے گئے۔

۱۵ اگست: ہندوستان آزاد ہوا۔

یکم ستمبر: کلکتہ میں ہندو مسلم اتحاد کے لئے برت شروع کیا۔

۴ ستمبر: امن و امان قائم ہو جانے پر ۷۵ گھنٹے کا برت کھولا

۷ ستمبر: کلکتہ سے دہلی کے لیے روانہ ہوئے۔

۹ ستمبر: اپنی پرارتھنا سبھا میں دہلی کے شہریوں سے امن و امان بحال کرنے کی اپیل کی۔

۱۹۴۸ء ۱۳ جنوری: ہندو مسلم اتحاد کے لیے مرن برت رکھا۔ یہ ان کا آخری برت تھا۔

۱۷ جنوری: برت کھولنے کی شرطیں بیان کیں

۱۸ جنوری: امن کمیٹی کی یقین دہانی پر برت کھولا۔

۲۰ جنوری: برلا ہاؤس (نئی دہلی) کی پرارتھنا سبھا میں بم پھٹا۔

۳۰ جنوری: حسبِ معمول برلا ہاؤس کی پرارتھنا سبھا میں ۵ بجکر ۱۰ منٹ پر تقریر کرنے کے لیے جا رہے تھے کہ ناتھو رام ونائک گاڈسے نے گولی مار کر شہید کر دیا۔

□□

رہبرِ انسانیت

گاندھی جی کی یاد میں

امنِ عالم کا ستارا رونما ہونے کو ہے
آج دُنیا آدمیت آشنا ہونے کو ہے

عرش سے پھر رُوح کس کی آگئی ہے فرش پر
پھر یہ کس کی رہبری کی رسم ادا ہونے کو ہے

مدّتوں کے بعد اب احساس نے انگڑائی لی
اب سیاست سے ریاکاری جُدا ہونے کو ہے

لیلیٰ جمہوریت کرنے کو ہے سولہ سنگار
یعنی دیرینہ کوئی وعدہ وفا ہونے کو ہے

جلد بدلیں گے یقیناً انقلابی زاویے
اب فریب و مکر سے عاری فضا ہونے کو ہے

قبلِ آزادی جو گاندھی نے سُنایا تھا ہمیں
آج اس پیغام کی پھر ابتدا ہونے کو ہے

آنے والا ہے وطن میں ایک تازہ انقلاب
اک نئی جمہوریت چہرہ کشا ہونے کو ہے

ڈاکٹر سلمان عبّاسی
اے۔ ۳/۳، امپیریل کالونی، نشاط گنج
لکھنؤ ۲۲۶۰۰۶

حامی جواد زیدی
اے 5/15 گرین فیلڈس۔ مہاکالی کیوز روڈ
اندھیری (ایسٹ)۔ بمبئی ۴۰۰۰۹۳

گاندھی جی نہ ہوتے تو!

مجھ سے ایک نوجوان دانشور نے یکایک یہ سوال کیا کہ:

"اگر گاندھی جی نہ ہوتے تو؟"

اس کا یہ سوال مکمل بھی نہ ہونے پایا تھا کہ میں نے مدافعانہ انداز میں اپنی گھبراہٹ کو چھپانے کے لئے کہہ دیا تھا کہ:

"ہندستان تب بھی ہوتا!"

ظاہر ہے کہ یہ سوال کا جواب نہ تھا۔ اور چند لمحوں کے لئے ہم دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ یہ سوال غالباً پہلی بار پوچھا گیا تھا، کم از کم میرے کانوں تک یہ پہلے پہل پہونچا تھا۔ اس لیے سوال نے ایک لمحۂ فکریہ پیدا کر دیا تھا۔ واقعۃً اگر گاندھی جی ہندستان کے سماجی اور سیاسی افق پر نمودار نہ ہوئے ہوتے تو اس ملک کا نقشہ کیا ہوتا اور اس کی تاریخ کون سے موڑ لیتی؟ تمام منظرنامے میں ان کی آمد اور پھر شہادت سے کیا فرق پڑ گیا؟ آج یہ چھوٹا سا غیر متوقع سوال سو برس سے کچھ زیادہ مدت پر پھیل چکا ہے جب وہ نوجوان تو کیا، میں خود بھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ اور پھر ہمارے دیکھتے دیکھتے گاندھی جی کی زندگی کے ہماری قومی ہی نہیں بین الاقوامی زندگی کی تاریخ کا جزو بن جانے کی مدت ـــ اب ہم عدم واقفیت کا بہانہ کر کے خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ اس سوال نے ہمیں گہرائی سے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔

۲ر اکتوبر ۱۸۶۹ء سے شروع ہونے والی گاندھی اور ملک کی زندگی میں بہت سے اتار چڑھاؤ آ چکے ہیں۔ دو عظیم عالمی جنگوں کی تباہ کاریاں اور پھر کتنے ہی غلام ملکوں میں مسلسل آزادی کی لہریں اٹھی ہیں۔ عالمی جغرافیہ کے سیاسی نقشے میں کتنے خطوط اور رنگ بدل گئے ہیں۔ سوچنے کے طریقے اور عمل کے انداز تبدیل ہو چکے ہیں۔ موہن داس (بچپن کے موہنیا) کرم چند گاندھی، موہن داس کرم چند گاندھی، مہاتما گاندھی، نیم برہنہ فقیر اور باپو (پدر وطن)۔ ان کو جس طرح چاہے یاد کیجئے، ان کی آپ بیتی، دیش بیتی ہی نہیں جگ بیتی بن چلی گئی۔ ان کی مخالفتیں ہوئیں، ان کے بعض خیالات کا تمسخر تک کیا گیا، لیکن ان کا حلقۂ اثر بڑھتا ہی چلا گیا۔ میں نے تو بعض مہاراشٹرین اور گجراتی گھروں میں ان کی مورتی کی پوجا ہوتے بھی دیکھی ہے۔ ساری دنیا نے ان کے ابتدائی نظامِ فکر اور اس پر عمل درآمد کے نظارے دیکھے اور پھر کچھ ہچکچاتے ہوئے اسی ڈگر پر آہستہ آہستہ چل پڑی۔ اب یہ کہانی راج کوٹ اور راج گھاٹ میں و نوبا بھاوے اور نیلسن منڈیلا میں محدود نہیں رہ گئی بلکہ آفاقی ہو چکی ہے۔ اس طرح اس سوال کا جواز ہی نہیں اس کی عصری اہمیت بھی برقرار ہے!

گاندھی جی صرف ایک فرد نہیں تھے، وہ ادارہ بھی نہیں تھے وہ ایک نظریاتی مینارہ تھے جو وقت کے طوفانی سمندر میں بتانے کے لیے فطرت کی طرف سے نصب کیا گیا تھا کہ جہاز راستہ دیکھ کر چلیں، سطح کے نیچے جہاز شکن چٹانیں چھپی ہوئی ہیں۔ وہ ایک آفاقی تجربہ تھے جو وقت کے دھارے کے خلاف وجود میں آیا تھا، وہ اس نظریے کے موجد نہیں تھے بلکہ ایک قدیم وراثت کو وقت کی نزاکتوں سے تطابق کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور اس طرح انھوں نے سیاسی اور سماجی تجربوں کے ایک حیران کن سلسلے کا آغاز کیا تھا۔ جیسا کہ ایسے موقعوں پر اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ابتدا بالکل معمولی سی ہوئی، سفر ایک ناہموار راہ سے طے کرنا پڑا جو طویل تو تھی لیکن اسے ایک اہم منزل تک پہونچنا تھا۔

ابتدا میں تعلیمی طور سے انگریزی سے رابطہ کم ہونے کی وجہ سے انھیں کالج میں لکچر سمجھنے میں دشواری محسوس ہونے لگی تو وہ آگے تعلیم جاری رکھنے کے بارے میں سوچ میں پڑ گئے۔ مزاجاً مشکلوں میں نئی راہ تلاش کرنا ان کا مسلک سا بن گیا تھا۔ اسی الجھن میں خاندان کے ایک دوست نے انھیں انگلستان میں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دیا، کیوں کہ

شائع کردی گئی۔

۱۹۴۵ء ۲۴ جون: وائسرائے سے ملاقات کی اور ان کی یہ تجویز کہ شملہ کانفرنس میں صدر کانگریس مولانا آزاد، کانگریس کی نمائندگی کریں گے وائسرائے نے منظور کرلی۔

۱۹۴۶ء ۵ نومبر: گاندھی جی نے فیصلہ کیا کہ اگر بنگال اور بہار میں فسادات بند نہیں ہوئے تو وہ برت شروع کردیں گے۔

۶ نومبر: نواکھالی کے لیے روانہ ہوئے۔

۱۹۴۷ء ۳۱ مارچ: نئے وائسرائے وسکاونٹ ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کی۔

یکم اپریل: ایشیائی رابطہ کانفرنس کو جو پرانے قلعہ نئی دہلی میں منعقد ہوئی تھی، خطاب کیا۔

۱۰ اپریل: بنگال کے وزیر اعلیٰ کو لکھا کہ نواکھالی میں حالات پر قابو حاصل کرنے کے لئے فوری کارروائی کی جائے۔

۲۷ جولائی: راجہ مہاراجہ سے اپیل کی کہ وہ انڈین یونین میں شامل ہوجائیں۔

یکم اگست: سری نگر کشمیر تشریف لے گئے۔

۱۵ اگست: ہندستان آزاد ہوا۔

یکم ستمبر: کلکتہ میں ہندو مسلم اتحاد کے لئے برت شروع کیا۔

۴ ستمبر: امن و امان قائم ہوجانے پر ۷۳ گھنٹے کا برت کھولا

۷ ستمبر: کلکتہ سے دہلی کے لیے روانہ ہوئے۔

۹ ستمبر: اپنی پرارتھنا سبھا میں دہلی کے شہریوں سے امن و امان بحال کرنے کی اپیل کی۔

۱۹۴۸ء ۱۳ جنوری: ہندو مسلم اتحاد کے لیے مرن برت رکھا۔ یہ ان کا آخری برت تھا۔

۱۷ جنوری: برت کھولنے کی شرطیں بیان کیں

۱۸ جنوری: امن کمیٹی کی یقین دہانی پر برت کھولا۔

۲۰ جنوری: برلا ہاؤس (نئی دہلی) کی پرارتھنا سبھا میں بم پھٹا۔

۳۰ جنوری: حسب معمول برلا ہاؤس کی پرارتھنا سبھا میں ۵ بجکر ۱۰ منٹ پر تقریر کرنے کے لیے جارہے تھے کہ ناتھو رام ونائک گاڈسے نے گولی مار کر شہید کردیا۔

□□

رہبرِ انسانیت

گاندھی جی کی یاد میں

امنِ عالم کا ستارا رونما ہونے کو ہے
آج دنیا آدمیت آشنا ہونے کو ہے

عرش سے پھر روح کس کی آگئی ہے فرش پر
پھر یہ کس کی رہبری کی رسم ادا ہونے کو ہے

مدتوں کے بعد اب احساس نے انگڑائی لی
اب سیاست سے ریاکاری جدا ہونے کو ہے

لیلئ جمہوریت کرنے کو ہے سولہ سنگار
یعنی دیرینہ کوئی وعدہ وفا ہونے کو ہے

جلد بدلیں گے یقیناً انقلابی زاویے
اب فریب و مکر سے عاری فضا ہونے کو ہے

قبلِ آزادی جو گاندھی نے سنایا تھا ہمیں
آج اس پیغام کی پھر ابتدا ہونے کو ہے

آنے والا ہے وطن میں ایک تازہ انقلاب
اک نئی جمہوریت چہرہ کشا ہونے کو ہے

ڈاکٹر سلمان عباسی
اے۔ ۲/۲، پیپر مل کالونی، نشاط گنج
لکھنؤ ۲۲۶۰۰۶

حالی جواد زیدی
اے ۱۵/۵ گرین فیلڈس ۔ مہاکالی کیوس روڈ
اندھیری (ایسٹ) ۔ بمبئی ۴۰۰۰۹۳

گاندھی جی نہ ہوتے تو!

مجھ سے ایک نوجوان دانش جو نے یکایک یہ سوال کیا کہ :

" اگر گاندھی جی نہ ہوتے تو ؟ "

اس کا یہ سوال مکمل بھی نہ ہونے پایا تھا کہ میں نے مدافعانہ انداز میں اپنی گھبراہٹ کو چھپانے کے لئے کہہ دیا تھا کہ :

" ہندستان تب بھی ہوتا ! "

ظاہر ہے کہ یہ سوال کا جواب نہ تھا ۔ اور چند لمحوں کے لئے ہم دونوں ایک دوسرے کا منھ دیکھنے لگے ۔ یہ سوال غالباً پہلی بار پوچھا گیا تھا، کم از کم میرے کانوں تک یہ پہلے پہل پہونچا تھا ۔ اس لیے سوال نے ایک لمحۂ فکریہ پیدا کر دیا تھا ۔ واقعۃً اگر گاندھی جی ہندستان کے سماجی اور سیاسی افق پر نمودار نہ ہوئے ہوتے تو اس ملک کا نقشہ کیا ہوتا اور اس کی تاریخ کون سے موڑ لیتی ؟ تمام منظر نامے میں ان کی آمد اور پھر شہادت سے کیا فرق پڑ گیا ؟ آج یہ چھوٹا سا غیر متوقع سوال سو برس سے کچھ زیادہ مدت پر پھیل چکا ہے جب وہ نوجوان تو کیا، میں خود بھی پیدا نہیں ہوا تھا ۔ اور پھر ہمارے دیکھتے دیکھتے گاندھی جی کی زندگی کہ ہماری قومی ہی نہیں بین الاقوامی زندگی کی تاریخ کا جزو بن جانے کی مدت ۔۔۔ اب ہم عدم واقفیت کا بہانہ کر کے خاموش نہیں رہ سکتے تھے ۔ اس سوال نے ہمیں گہرائی سے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے ۔

۲ / اکتوبر ۱۸۶۹ء سے شروع ہونے والی گاندھی اور ملک کی زندگی میں بہت سے اتار چڑھاؤ آ چکے ہیں ۔ دو عظیم عالمی جنگوں کی تباہ کاریاں اور پھر کتنے ہی غلام ملکوں میں مسلسل آزادی کی لہریں اٹھی ہیں ۔ عالمی جغرافیہ کے سیاسی نقشے میں کتنے خطوط اور رنگ بدل گئے ہیں ۔ سوچنے کے طریقے اور عمل کے انداز تبدیل ہو چکے ہیں ۔ موہن داس (بچپن کے موہنیا) کرم چند گاندھی ، موہن داس کرم چند گاندھی ، مہاتما گاندھی ، نیم برہنہ فقیر اور باپو (پدرِ وطن) ۔ ان کو جس طرح چاہے یاد کیجیے ، ان کی آپ بیتی ، دیش بیتی ہی نہیں جگ بیتی بنتی چلی گئی ۔ ان کی مخالفتیں ہوئیں ، ان کے بعض خیالات کا تمسخر تک کیا گیا ، لیکن ان کا حلقۂ اثر بڑھتا ہی چلا گیا ۔ میں نے تو بعض مہاراشٹرین اور گجراتی گھروں میں ان کی مورتی کی پوجا ہوتے بھی دیکھی ہے ۔ ساری دنیا نے ان کے اہنسائی نظامِ فکر اور اس پر عمل درآمد کے نظارے دیکھے اور پھر کچھ ہچکچاتے ہوئے اسی ڈگر پر آہستہ آہستہ چل پڑی ۔ اب یہ کہانی راج کوٹ اور راج گھاٹ میں ونوبا بھاوے اور نیلسن منڈیلا میں محدود نہیں رہ گئی بلکہ آفاقی ہو چکی ہے ۔ اس طرح اس سوال کا جواز ہی نہیں اس کی عصری اہمیت بھی برقرار ہے !

گاندھی جی صرف ایک فرد نہیں تھے ، وہ ادارہ بھی نہیں تھے وہ ایک نظریاتی مینارہ تھے جو وقت کے طوفانی سمندر میں یہ بتانے کے لیے فطرت کی طرف سے نصب کیا گیا تھا کہ جہاز راستہ دیکھ کر چلیں ، سطح کے نیچے جہاز شکن چٹانیں چھپی ہوئی ہیں ۔ وہ ایک آفاقی تجربہ تھے جو وقت کے دھارے کے خلاف وجود میں آیا تھا ، وہ اس نظریے کے موجد نہیں تھے بلکہ ایک قدیم وراثت کو وقت کی نزاکتوں سے تطابق کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور اس طرح انھوں نے سیاسی اور سماجی تجربوں کے ایک حیران کن سلسلے کا آغاز کیا تھا ۔ جیسا کہ ایسے موقعوں پر اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ابتدا بالکل معمولی سی ہوئی ، سفر ایک ناہموار راہ سے طے کرنا پڑا جو طویل تو تھی لیکن اسے ایک اہم منزل تک پہونچنا تھا ۔

ابتدا میں تعلیمی طور سے انگریزی سے رابطہ کم ہونے کی وجہ سے انھیں کالج میں لکچر سمجھنے میں دشواری محسوس ہونے لگی تو وہ آگے تعلیم جاری رکھنے کے بارے میں سوچ میں پڑ گئے ۔ مزاجاً مشکلوں میں نئی راہ تلاش کرنا ان کا مسلک سا بن گیا تھا ۔ اسی الجھن میں خاندان کے ایک دوست نے انھیں انگلستان میں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دیا ، کیوں کہ

اس زمانے میں یونیورسٹی کے مقابلہ میں بیرسٹری کو نسبتاً آسان مانا جاتا تھا ہندستانی یونیورسٹیوں میں وقت بھی زیادہ لگتا، خرچ بھی زیادہ آتا اور مستقبل میں کلرکی سے زیادہ کچھ اور پانے کی امید بھی نہ ہوتی۔ یہ تو تھا لیکن لندن کے سفر اور بیرسٹری کی تعلیم کے اخراجات کا سوال تھا۔ گھر کے ایک بزرگ نے یہ بوجھ اٹھانے کی ہمت افزائی کی۔ تو دوسری مشکل یہ آپڑی کہ اس دور میں سمندری سفر سماج کی نظروں میں شجرِ ممنوعہ تھا۔ گاندھی کو ایک جین سوامی بیچارجی کے سامنے یہ عہد کرنا پڑا کہ وہ ہندستان کے باہر گوشت، شراب اور عورت کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ تب ماں راضی ہوئیں لیکن ان کی ذات والے مودھ بنیا راضی نہ ہوئے اور انھیں برادری سے خارج کرنے پر تل گئے۔ لیکن ابھی فیصلے کا اعلان نہیں ہوپایا تھا کہ ۴ ستمبر ۱۸۸۸ء کو ان کا جہاز بمبئی سے ساحل چھوڑ چکا تھا۔ جہاز پر اور لندن کے قیام کے دوران وہ اپنے عہد پر قائم رہے اگرچہ انھیں اس سلسلے میں تکلیفیں جھیلنا پڑیں۔ ارادے اور عقیدے کی یہ پختگی زندگی بھر ان کا ساتھ دیتی رہی اور سیاسی اور سماجی تحریکوں کو اصول پرستی کی راہوں پر لگائے رہی۔ لندن چھوڑنے سے پہلے انھوں نے اخبار ویجی ٹیرین (VEGETARIAN) میں لکھا تھا کہ:

"مجھے اس بات سے بڑی خوشی ہوتی ہے کہ میں شراب اور گوشت کا استعمال کیے بغیر وطن واپس جارہا ہوں۔"

اسی لگن کے ساتھ انھوں نے وہاں رہ کر انگریزی پر پوری قدرت حاصل کر لی بلکہ قانونی صلاحیتوں کو مکمل کرنے کے لیے لاطینی جیسی مشکل زبان پر بھی قابو پالیا وہ غیر محسوس طریقے پر اپنے کو آنے والی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تیار کررہے تھے۔

وکالت کی طرح بیرسٹری جمانے کے لیے بھی کوشش کرنی پڑتی ہے اس کا تجربہ انھیں ہندستان آکر ہوا۔ بمبئی چھوڑ کر راج کوٹ جانے اور وہاں عرضی نویس بیرسٹر کی حیثیت سے نام پیدا کرنے تک کی کھکیڑیں جھیلیں۔ راج کوٹ کی پریکٹس کے زمانے میں پولیٹکل ایجنٹ کے نسلی رویّے سے دل برداشتہ ہوکر عملی احتجاج پر آمادہ ہوگئے۔ اسی عرصہ میں ناٹال (جنوبی افریقہ) کے ایک مؤکل عبداللہ نے (جو وہاں کے سب سے مالدار تاجر تھے) ایک مقدمہ کی پیروی کا کام ان کو سونپا۔ مئی ۱۸۹۳ء میں وہ اس مہم پر پہلے ڈربن اور پھر پریٹوریا پہونچے۔ دونوں جگہ انھیں کھلّم کھلّا نسلی تعصب کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے ناخوشگوار واقعہ چارلس ٹاؤن سے اسٹینڈرٹن تک گھوڑا گاڑی کے سفر میں پیش آیا۔ یہاں ان سے کہا گیا کہ وہ یورپین مسافروں کے ساتھ گھوڑا گاڑی میں نہیں بیٹھ سکتے بلکہ کوچوان کے ساتھ بیٹھنا ہوگا۔ پھر فٹ بورڈ پر سوار ہوکر چلنے کو کہا گیا۔ انھوں نے اصرار کیا کہ وہ تو اسی سیٹ پر سفر کریں گے جس کے وہ حقدار ہیں۔ گاڑی کا سفید فام افسر اُن پر ٹوٹ پڑا اور بے رحمی سے مارنے لگا۔ انھوں نے مار برداشت کرلی لیکن اپنی نشست سے سرمو جنبش نہ کی۔ "خاموش ہمت اور انسانی تمکنت نسلی تکبر اور وحشیانہ طاقت سے نبرد آزما تھی۔"

ٹرانسوال میں بسنے والے ہندستانیوں کو اس سے کہیں بدتر نسلی تعصب کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اب یہ ان کا ذاتی تجربہ نہ رہا بلکہ اپنے وطن وقوم بلکہ انسانیت کی عزت کا سوال بن گیا اور حالات کا مقابلہ کرنے کا مسئلہ سامنے آگیا۔ انھوں نے ہندستانیوں کا ایک جلسہ بلایا اور وہاں اس رویّے کے خلاف کارروائی کرنے کے لئے ایک ادارے کا قیام عمل میں آیا۔ وہ پریٹوریا سے وطن واپس آنے ہی والے تھے کہ ان کی نظر ایک اخبار میں اس خبر پر پڑی کہ ناٹال کی مقننہ میں ہندستان کے نوآبادکاروں کو حق رائے دہندگی سے محروم کرنے کا ایک قانون پیش ہونے والا ہے۔ انھوں نے ہندستانی تاجروں کی توجہ اس طرف مبذول کرائی تو اُن سے رک کر سیاسی مہم کے لیے فضا ہموار کرنے کی استدعا کی گئی، جو انھوں نے منظور کرلی۔

گاندھی جی کی سیاسی زندگی کا یہ پس منظر قدرے تفصیل سے اس لیے بیان کیا گیا کہ آج کے پڑھنے والے اس سے کم واقف ہیں۔ گاندھی جی کسی سیاسی لائحۂ عمل کو لے کر آگے نہیں بڑھ رہے تھے، ان کے سامنے تو بیرسٹری کا پیشہ ورانہ کام تھا، لیکن حالات نے کچھ ایسی کروٹیں لیں اور ایسے واقعات ان کے ذاتی مشاہدے میں آئے کہ ان کی حساس طبیعت اور عزتِ نفس و حبِّ قومی کا جذبہ اُبل پڑا اور پھر وہ سیاست میں الجھتے ہی چلے گئے۔ ان کے سامنے ہم وطنوں کی کس مپرسی اور بے عزتی ابھر کے آگئی۔ سب سے بڑھ کر انھیں حق رائے دہندگی سے محروم کرنے کے علاوہ اس تجارت سے بھی محروم کرنے کے منصوبے بن رہے تھے جسے انھوں نے اپنے خون پسینے سے سینچ کر سرسبز کیا تھا۔ افریقہ میں بوئر حکومت پہلے ہی ہندستانی آبادکاروں کو آرینج قومی اسٹیٹ سے بھگا چکی تھی۔

جس دیوانی مقدمے کے لیے گاندھی جی پریٹوریا آئے تھے وہ ختم ہو چکا تھا۔ اب وہ ہندستان جانے کے لیے ڈربن پہونچے تو خبر ملی کہ ہندستانیوں کو حق رائے دہندگی سے محروم کرنے کا مسودۂ قانون ناٹال کی مقننہ میں پیش بھی ہوگیا۔ اس نسلی قانون کے بارے میں کہا گیا تھا کہ یہ "ہمارے تابوت میں پہلی کیل ہے۔" ہندستانی آبادکار غیر تعلیم یافتہ اور سیاست سے گویا نابلد تھے انھوں نے گاندھی جی سے رک کر اس قانون کے خلاف جد وجہد میں ان کی رہنمائی کرنے کو کہا، وہ راضی ہوگئے۔ انھوں نے ہندستان اور انگلستان میں سیاسی تبلیغی مہم شروع کی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ انڈین نیشنل کانگریس نے پہلی بار دسمبر ۱۸۹۴ء کے اجلاس میں بیرون ہند بھارتی آبادکاروں کے حق رائے دہندگی سے محروم کیے جانے پر احتجاج کیا۔ چارسو آبادکاروں نے قانون کے خلاف عرضداشت بھیجی لیکن قانون پاس ہوگیا۔ پھر بھی گاندھی جی مایوس نہ ہوئے انھوں نے دس ہزار ہندستانیوں کے دستخط سے ایک عرضداشت ملکۂ انگلستان کو بھیجی۔ انڈین نیشنل کانگریس کے نام پر یہاں بھی انھوں نے ناٹال انڈین کانگریس کے نام سے ادارہ قائم کیا۔ اس وقت ہندستان میں تو کانگریس سالانہ اجلاس میں بیدار ہوتی اور وہاں کے اعلا تعلیم یافتہ سیاست داں بحث و مباحثہ کے بعد کچھ تجاویز پاس کرکے منتشر ہوجاتے۔ لیکن ناٹال کانگریس سال بھر کام کرنے والے سیاسی اور فعال ادارے کی حیثیت سے وجود میں آئی۔ ۱۸۶۰ء - ۱۸۹۰ کے درمیانی وقفے میں کوئی چالیس ہزار مجاہدہ بند مزدور وہاں ہندستان سے لائے گئے تھے لیکن ان کی حیثیت نیم غلاموں کی سی تھی۔ انھوں نے اس بدیس کو اپنی محنت سے سنوارا تھا اور ان پر اب عرصۂ حیات تنگ کیا جارہا تھا۔

اب سے ٹھیک سو برس پہلے (۱۸۹۶ء) میں گاندھی بال بچوں کو لانے کے لیے ہندستان گئے۔ وہاں وہ مشہور لیڈروں مثلاً فیروز شاہ مہتا، گوکھلے اور تلک جیسے عظیم رہنماؤں سے ملے۔ بمبئی اور پونا اور مدراس میں عام جلسے ہوئے۔ کلکتہ میں عام جلسے سے پہلے وہ ناٹال واپس بلا لیے گئے۔ لیکن ان کے اس سفر سے ہندوستان کے سیاسی حلقے ان سے ذاتی طور پر واقف ہوئے۔ لیکن ناٹال پہونچ کر ان کو وہاں کے یورپینوں کے ایک متشددانہ حملے کا سامنا کرنا پڑا۔ سکریٹری آف اسٹیٹ نے ناٹال کی حکومت سے ایسے متشددین کے خلاف مقدمہ چلانے کا تار دیا لیکن گاندھی کا نیا اہنسائی تجربہ آڑے آیا اور انھوں نے کہا کہ وہ ذاتی بے انصافی کی عدالتی چارہ جوئی نہیں کریں گے۔ اس سے ہندستانیوں اور متوازن یورپینوں میں ان کا وقار بڑھا۔ پھر ۱۸۹۹ء میں جنگ بوئر چھڑ گئی۔ گاندھی اس میں شریک ہوئے اور وہ ایک ایمبولنس کور کے لیڈر تھے۔ اس کا ایک اثر تو یہ ہوا کہ یورپین اب ہندستانیوں کو فرزندانِ سلطنت کہہ کر یاد کرنے لگے لیکن حالات نے پھر نیا موڑ لیا۔ ۱۹۰۲ء میں خانہ جنگی پر گاندھی ہندستان آگئے تھے۔ یہاں کانگریس کے کلکتہ سیشن میں شریک ہوئے لیکن وہ ہندستان کے سیاسی حلقوں میں ناآشنا سے تھے اس لیے انھوں نے آزادانہ کانگریس کے جنرل سکریٹری کیلئے چپراسی اور کلرک کی حیثیت سے کام کرنے میں بھی عار نہ سمجھی۔ کلکتہ سے واپس آتے وقت ٹرین سے سفر کیا اور راستے میں بنارس، آگرہ، جے پور اور پالن پور اترے۔ تیسرے درجے میں سفر کرتے اور زیادہ تر دھرم شالاؤں میں قیام کیا تاکہ وہ ہندستان کے اعلا طبقاتی عناصر نہیں بلکہ عام ہندستانیوں کے حالات سے واقف ہوسکیں۔ یہاں وہ گوکھلے سے زیادہ متاثر ہوئے۔ پریکٹس شروع کی لیکن بہت جلد ناٹال سے بلاوا آگیا اور وہ ۱۹۰۲ء میں ڈربن واپس آگئے۔ آئے تو صرف چھ مہینوں کے لیے تھے لیکن بارہ برس رہ پڑے اور یہ عہد کیا کہ "جب تک گھرے ہوئے بادل چھٹ نہ جائیں یا ٹوٹ کر برس نہ پڑیں" یہاں سے واپس نہ جاؤں گا۔

جنوبی افریقہ کی تجربہ گاہ میں سیاسی طور پر انھوں نے جس طرح پیش قدمی کی اس کا امکان خود ان کے وطن میں اس وقت تک کم تھا۔ یہاں کی سیاست یا تو قانون ساز اداروں کی بحثا بحثی تھی یا پھر اکا دکا دہشت پسندی۔ سچائی اور اخلاقی عہد و پیمان کو اس میں مطلق دخل نہیں تھا بلکہ ایک ایسی نظریہ پرستی تھی جو عملاً دور تک ساتھ نہ دے سکتی تھی۔ لیکن اس کے برعکس ناٹال اور ٹرانسوال چھوٹے علاقے میں محدود تھے، وہاں ان کو نئے سیاسی اور عملی تجربوں کا بے روک ٹوک موقع ملا۔ انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ مل جل کر کام کیا اور پھر زندگی بھر ہندو مسلم اتحاد پر ان کا عقیدہ اٹل رہا۔ اس کے علاوہ ہر سطح کے کارکنوں کے ساتھ مل جل کر اور پوری ذہنی ہم آہنگی کے ساتھ کام کرنے کا طریقہ بھی اپنایا۔ یہاں اپنے وطن میں لیڈر کا رابطہ عوام تو درکنار دوسرے ہم خیالوں سے بھی دور کا رہتا تھا یہ بھی ایک نیا تجربہ تھا کیونکہ لیڈر کو پہلے سے عوام کے ردعمل کا پورا احساس

رہتا تھا۔ وہ اپنے پیرووں کو جس راہ پر چلانا چاہتے تھے اس پر پہلے خود عمل پیرا ہوتے تھے۔

۱۱ ستمبر ۱۹۰۶ء کو ہندستانی نوآبادکاروں کے جلسے میں مقاومت مجہول کا نظریہ پیش کرتے ہوئے انھوں نے ایشیائی رجسٹریشن قانون کے خلاف جدوجہد کے لیے مقاومت کا راستہ اختیار کرنے کی صلاح دی اور بے خوف ہوکر کہا:

"میری طرح کے لوگوں کے لئے صرف ایک ہی راستہ باقی رہ گیا ہے وہ یہ کہ جان دیں مگر قانون کے آگے نہ جھکیں"۔ [1]

اس نئے اصول کو انھوں نے ستیہ گرہ کا نام دیا اور پھر آٹھ برس تک جنوبی افریقہ میں 'ستیہ گرہ' کی تحریک چلاتے رہے۔ یہی تحریک ہندستان پہنچ کر وہاں کی نئی سیاست کا سنگ بنیاد بنی۔

جنوبی افریقہ سے آخری بار واپسی (۱۹۱۴ء) پر وہ پہلے کی طرح ہندستانی سیاست میں اجنبی کی طرح نہیں بلکہ ہیرو کی طرح آئے۔ اس کے کچھ عرصے پہلے گوکھلے نے کہا تھا کہ:

"گاندھی کے خمیر میں وہ عناصر ہیں جن سے ہیرو اور شہید بنتے ہیں"

خود گاندھی جی نے انکسار سے یہ کہا کہ "جنوبی افریقہ کے ہندستانیوں کو ان سے نہیں بلکہ ان کو وہاں کے ہندستانیوں سے تحریک ملی۔" گوکھلے کا اندازہ غلط نہیں تھا۔

یہ معمولی کارنامہ نہیں تھا کہ افریقہ سے اس واپسی کے پانچ برس کے اندر وہ ہندستانی سیاست کی سب سے نمایاں شخصیت بن گئے۔ ۱۹۲۰ء تک سبھی اہم لیڈر ان کے پرچم تلے آچکے تھے۔ سی، آر، داس اور موتی لال نہرو جیسے کامیاب وکیل اور تجربہ کار پارلیمانی مدن موہن مالویہ اور راجندر پرشاد جیسے عام انسانیت دوست اور ولبھ بھائی پٹیل اور گوپال آچاریہ جیسے کھرے حقیقت پسند، جواہر لال نہرو اور جے پرکاش نرائن جیسے عوام دوست اور سماج وادی رجحانات رکھنے والے چند ذہنی اختلافات کے باوجود ان سے ایک گہرا جذباتی رشتہ محسوس کرنے لگے تھے۔ ان کے لیے وہ لیڈر ہی نہیں بلکہ باپو تھے اور عوام کے لیے تو مہاتما جیسی عقیدت کا مرکز۔

[1] ستیہ گرہ ان افریقہ ص ۱۶۸

چوتھائی صدی تک گروہی سیاست سے اوپر اٹھ کر وہ ایک نقطۂ اتصال و اتفاق بنے رہے۔ جیکر اور تیج بہادر سپرو جیسے لبرل بھی ان سے خیالات اور مشوروں کا تبادلہ کرتے رہتے اور ان کی شہاب رفتار ترقی میں معاون ہوئے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اگر گاندھی جی یہاں کی سیاست میں اس وقت نمودار نہ ہوئے ہوتے تو ہماری تاریخ آزادی ہی کچھ اور ہوتی۔ جنوبی افریقہ کی جدوجہد سے ان میں پختہ کاری آئی۔

جنوبی افریقہ میں گاندھی جی نے ۱۹۱۰ء میں ٹالسٹائی فارم قائم کیا۔ یہ ضبط نفس کی تجربہ گاہ بھی تھا اور ستیہ گرہی قیدیوں کے خاندان والوں کے لیے ایک پناہ گاہ بھی۔ اس کا دھیان آتے ہی ہمارے ذہن میں سابرمتی آشرم کی تصویر ابھرنے لگتی ہے جو ہندستان واپس آنے کے بعد اسی نمونے پر بنایا گیا۔ یہ معمولی ابتدا کے بعد ڈیڑھ سو ایکڑ پر پھیل گیا۔ چند مہینوں کے اندر وہاں چھوت چھات کا اذیت رساں سوال اٹھ کھڑا ہوا اور احمد آباد کے مالی امداد دینے والے تاجروں نے امداد بند کردی۔ اب انھوں نے احمد آباد کی اچھوت بستیوں میں ان کے مکانوں میں رہنے اور اپنے ہاتھ سے اپنا رزق مہیا کرنے کا فیصلہ کیا۔ خود کستوربا کو اس آشرم میں اچھوتوں کے ساتھ رہنا گوارہ نہ تھا لیکن ان کے شوہر (گاندھی جی) نے کہا کہ انھیں دو راستوں میں سے ایک چننا ہوگا، یا تو وہ چھوت چھات ترک کریں یا آشرم چھوڑ دیں۔ بالآخر کستوربا آشرم کے اچھوت خاندان کو اپنے خاندان کی طرح قبول کرنے پر آمادہ ہوئیں۔ اسی طرح مگن لال جو آشرم کی روح رواں تھے وہ اور ان کی بیوی بھی اس چھوت چھات کا دباؤ محسوس کرنے لگے، ان سے مصالحت کا یہ راستہ ڈھونڈا گیا کہ وہ مدراس میں رہ کر بنائی سیکھیں اور ساتھ ہی اچھوتوں کے خلاف تعصبات کو بھلا سکیں۔ یہ تھی ہندستانی سیاست میں چھوت چھات ختم کرنے اور نئے گاندھیائی سماج کے قیام کی باقاعدہ تحریک کی ابتدا۔

آشرم ہی میں 'اہنسا' کے تصور کو سیاسی حربے کے طور پر استعمال کرنے کا تجربہ بھی شروع ہوا۔ یہ "اہنسا" جارحیت کے خلاف ایک منفی تصور نہیں تھی بلکہ اخلاقی اور روحانی ترقیوں کے ذریعہ آزادی اور محبت کے حصول کا ذریعہ بھی قرار پائی۔ آشرم والوں کو خوف، چھوت چھات اور نابرابری

سے پرہیز کا عہد لینا پڑتا تھا۔ پھر ہر شخص کے لیے جسمانی محنت ضروری تھی، جس میں بُنائی اور کتائی کا شعبہ شامل تھا۔ ان سب عناصر کو وہ اپنی سیاسی ستیہ گرہ کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ سابرمتی آشرم کو ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کی ستیہ گرہی تحریکوں میں اس طرح حصہ لینا تھا کہ نفرت اور تشدد سے پرہیز کیا جائے۔ اس کی بنیادی تصویر میں محنت کشی اور اقتصادی خود اعتمادی کے نشان کے طور پر 'چرخہ' ابھر کر سامنے آیا۔ یہ تصورات گاندھی جی کے گراں قدر عطیہ تھے اور انھوں نے انھیں بڑی دیدہ دری، خلوص اور بے خوفی سے برتا بھی۔ یہیں گاندھیائی تعلیم اور اقتصادیات کا تجربہ بھی کیا گیا۔

گاندھی جی ہوا کے رُخ پر چلنے کے قائل نہ تھے اس زمانے میں بھی جب مسز بینٹ کی ہوم رول کی مقبولیت عروج پر تھی اور تلک تک شامل ہو چکے تھے، انھوں نے مسز بینٹ کی تحریک کے باوجود اپنے کو اس سے علیٰحدہ رکھا، کیونکہ اس کا تصور ان کے بنیادی خیال سے ٹکراتا تھا۔ واقعات نے ثابت کیا کہ تحریک میں زندہ رہنے کی صلاحیت نہ تھی۔

۱۹۱۶ء میں چمپارن کے کسانوں کی مشکلات نے ان کی توجہ مبذول کی لیکن گاندھی جی نے کانگریس کے اجلاس کلکتہ (دسمبر ۱۹۱۶ء) میں بحث میں حصہ لینے سے اسی لیے انکار کر دیا کہ اصلی اور تفصیلی حالات انھیں معلوم کیے بغیر تو وہ کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتے۔ چمپارن کے راجکمار شکلا نے انھیں اس علاقے کا دورہ کرنے پر مجبور کیا اور وہ پٹنہ، مظفر پور، موتیہاری گئے۔ یہاں انھیں نوٹس ملا کہ پہلی ٹرین سے ضلع چھوڑ دیں کیونکہ امن عامہ کو خطرہ تھا۔ گاندھی جی نے نوٹس لینے سے انکار کیا اور کہا کہ ایسا کرنا میری "ضمیر کی آواز" کے خلاف ہوگا۔ مقامی کمشنر نے یہ حکم حکومتِ بہار کے مشورے کے بغیر جاری کیا تھا اور اسے واپس لینا پڑا اور گاندھی جی بدستور دورہ کرتے اور شہادتیں اکٹھا کرتے رہے بالآخر ایک "زرعی کمیٹی" کا قیام ہوا اور کسانوں کو کافی مراعات ملیں۔ دس برس کے اندر باغ مالک ضلع کے باہر نکال دیے گئے۔ اسی زمانے میں احمد آباد کے کپڑوں کی ملوں میں بھی مزدوروں نے ہڑتال کر دی۔ ہڑتال زیادہ دنوں تک چلی اور مزدوروں کی تابِ مقاومت پر اثر پڑنے لگا۔ ہڑتال سے مل مالک بھی متاثر ہوئے اور جزوی طور پر مانگیں مان لی گئیں یہ ثالثی کے طریق کار کا بڑا تجربہ تھا اور گلزاری لال نندا کے لفظوں میں "موجودہ دور کے ٹکسٹائل لیبر ایسوسی ایشن کی تشکیل میں اس کا اہم اثر رہا"۔ جلد ہی گھیڑہ ضلع کے کسانوں میں لگان کے چھوٹ کے مسئلے پر جھگڑا اٹھا اور زرعی ستیہ گرہ چلانا پڑی۔ اس طرح گاندھی جی کسانوں اور مزدوروں کی تحریکوں سے بھی بہت قریب آگئے اور ان کی بھی رہنمائی کی۔

گاندھی جی کی زندگی میں جو کچھ پیش آنے والا تھا اس پر تفصیل کا موقع نہیں لیکن امرتسر کے واقعات نے ان کو جھنجھوڑ دیا اس عرصے میں کچھ اصلاحات کا اعلان بھی ہوا لیکن گاندھی نے اسے ہندستانیوں کو نکما بنانے کا ایک لطیف طریقہ قرار دیا۔ امرتسر کے عظیم حادثے کے ساتھ خلافت کے خاتمے سے جون ۱۹۲۰ء تک گاندھی اور برطانوی راج کے مابین علیٰحدگی مکمل ہو گئی تھی۔ انڈین نیشنل کانگریس نے بھی ستمبر ۱۹۲۰ء کے خصوصی اجلاس میں عدم تعاون کا پروگرام گاندھی جی کی زوردار تحریک پر منظور کر لیا اب گاندھی قومیت اور خلافت دونوں ہی تحریکوں کے رہنما بن گئے۔ اب گاندھی جی ہی کے لفظوں میں (۳۱ دسمبر ۱۹۲۱ء) عدم تعاون کرنے والے حکومت کے خلاف "بغاوت کا فیصلہ" کر چکے ہیں۔ کانگریس اور خلافت تحریک کا یہ اتحاد ایک تاریخ ساز واقعہ ہے۔ ایک طرف برطانوی حکومت آپس میں لڑانے پر تلی ہوئی تھی۔ کچھ مفاد پرست بھی چاہتے تھے کہ سیاسی طاقتوں میں اتحاد نہ ہونے پائے۔ ان میں فرقہ پرست عناصر آگے آگے تھے لیکن گاندھی جی کی مقناطیسی قوت اور اتحاد کی زوردار حمایت کے آگے کسی کی نہ چلی اس اتحاد سے زبردست ہندستان گیر تحریک نے سامراج کو ہلا کر رکھ دیا۔ آگے کی تاریخ ہم سب کو معلوم ہے، رسمی اسکولوں کا بائیکاٹ کر کے قومی اسکول قائم کرنے کے تجربے کیے گئے۔ (جامعہ ملیہ اسلامیہ (علی گڑھ و دلّی)، کاشی ودیا پیٹھ اور ودیا پیٹھ اسی کے نتیجے میں وجود میں آئیں) تحریک عدم تعاون کا دوسرا شاخسانہ سدیشی اشیاء کا استعمال تھا، یہ طریقہ بھی جنوبی افریقہ ہی سے ان کے ذہن میں تھا چنانچہ بدیشی کپڑوں کے بائیکاٹ اور کھادی کا استعمال عدم تعاون کے اہم جزو بن گئے۔ کونسلوں کا بائیکاٹ بھی اس کا حصہ تھا۔ اس کے بعد کانگریس بالکل گاندھی جی کے نقشِ قدم پر چلنے لگی۔ اس زمانے میں فرقہ وارانہ فساد نے بھی سر اٹھایا اور کئی جگہ فسادات پھوٹ پڑے تو گاندھی جی نے کرب کے عالم میں اکیس دن کے برت کا اعلان کیا جو مولانا محمد علی جوہر کے گھر میں رکھا گیا تھا۔ اس طویل برت کا یہ اثر ہوا کہ ایک "اتحاد

کانفرنس" جس میں تین سو مندو بین شریک تھے بھائی چارے کی فضا پیدا کرنے پر آمادہ ہوگئی اور اکیس دن کا برت پورا کرکے گاندھی جی نے قرآن مجید کی تلاوت، اپنشدوں کے شلوک اور عیسائیوں کی دعاؤں کی گونج میں فاقہ شکنی کی۔

۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کو لاہور میں راوی کے کنارے مکمل آزادی کا جھنڈا لہرادیا گیا۔ گاندھی جی نے لاہور اجلاس کے بعد یہ کہا "عوام کو حق ہے کہ وہ بے انصاف حکومت میں تبدیلی کردیں یا اسے بالکل ختم کردیں۔" سن بیس بائیس کے مقابلے میں انھوں نے زیادہ تیز اور مضبوطی سے قدم بڑھایا۔ ۲۶ جنوری کو یوم آزادی منائے جانے کا اعلان کیا جس میں لاکھوں انسانوں نے یہ قسم کھائی کہ "حکومت برطانیہ کے آگے سر جھکانا خدا اور انسان کے خلاف ایک جرم ہے۔" اب انھوں نے "نمک کا قانون" توڑنے کی تحریک چلائی اور ستیہ گرہیوں کے پہلے جتھے کی قیادت کی جو ڈانڈی مارچ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ آگے بڑھ کر جنگلات کے قوانین کا توڑا جانا اور جہاز رانی، بیمہ کمپنیوں کا بائیکاٹ بھی شامل تھا۔ ۵ مارچ ۱۹۳۰ء کو گاندھی جی گرفتار کیے گئے، بڑے پیمانے پر اہم اور بڑے لیڈر جیسے موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو وغیرہ بھی گرفتار کیے گئے۔ گاندھی اور کانگریس کے دوسرے ممبر ۲۵ جنوری ۱۹۳۱ء کو رہا کیے گئے۔ گاندھی کا ایک طریقہ مصالحت بھی تھا چنانچہ گاندھی، اروِن معاہدے میں مکمل آزادی تو کیا نوآبادیاتی درجے کی بھی گارنٹی نہ تھی۔ لیکن پھر کانگریس ہی خلاف قانون قرار دے دی گئی۔ گاندھی اس معاہدے کو حکومت، کانگریس تعلقات میں ایک نیا باب تصور کرتے تھے۔ ۱۹۳۱ء میں ہی گول میز کانفرنس ہوئی جس میں کانگریس کی طرف سے گاندھی جی شریک ہوئے۔ کانفرنس ناکام رہی اور گاندھی جی ساحل بمبئی پر پہنچتے ہی پھر جیل پہنچ گئے۔ جواہر لال نہرو اور خان عبدالغفار خاں بھی گرفتار کیے گئے۔ گاندھی جی نے ایک اور برت کا یروا جیل سے اعلان کیا جس کا تعلق پسماندہ اقوام کے لئے جداگانہ اپنے انتخاب سے تھا اس خبر سے ہندستان بھر میں ہلچل مچ گئی اور مندر، کنوئیں اور دوسری عام جگہیں پسماندہ اقوام کے لئے کھول دیے گئے۔ یہ وہ مرن برت تھا جس میں پونا معاہدہ منظور کرلیا گیا۔ غرض عرصے تک جیل اور برت کا سلسلہ چلتا رہا۔ گاندھی نے اپنا اخلاقی اور سیاسی سفر جاری رکھتے ہوئے آخرکار وہ منزل دیکھ لی جب ہندستان کو ۱۹۳۵ء کا نیا برطانوی آئین ملا اور ۱۹۳۷ء میں صوبوں میں نئے آئین کے تحت حکومتیں قائم ہوئیں جس میں تدریجی خودمختاری حکومت کی پالیسی اپنائی گئی اور تھوڑے سے ردوبدل کے بعد کانگریس حکومتیں قائم ہوگئیں اس زمانے میں بھی گاندھی جی اصلاح معاشرت کا کام کرتے رہے مثلاً دیہاتوں میں صاف پانی کی فراہمی، نشہ بندی اور سودیشی کپڑوں کا استعمال وغیرہ۔ وردھا طریق تعلیم کے لیے ذاکر حسین کمیٹی کا قیام اور ایسے ہی دوسرے امور پر گاندھی جی کی توجہ رہی۔ گاندھی نے ایک اور برت راجکوٹ میں بھی اس دیسی ریاست کی عہد شکنی کے سلسلے میں کیا تھا۔ بیچ کی ایک اہم کڑی کرپس مشن کا ہندستان میں آنا اور یہاں سے ناکام جانا ہے۔ گاندھی کو اس ناکامی سے اس لیے مایوسی ہوئی کہ کرپس ہندستان کے دوست سمجھے جاتے تھے اور اب یہ واضح ہوگیا کہ جنگ کے دوران کوئی سمجھوتہ نہیں ہوسکتا۔

جولائی ۱۹۴۲ء میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ "ہندستان میں برطانوی راج کا فوراً خاتمہ ہونا چاہیئے۔" ۸ اگست کو اس پر مہر تصدیق ثبت کرنے کے لیے کمیٹی کا اجلاس بمبئی میں ہوا اور اس میں "ہندستان چھوڑدو" تحریک پاس کردی۔ اگرچہ گاندھی جی نے کہا تھا کہ ابھی جنگ کا آغاز نہیں ہو رہا ہے لیکن ۹ اگست کو صبح سویرے گاندھی، نہرو اور مولانا آزاد اور دوسرے لیڈروں کو گرفتار کرلیا گیا اب سارے بند ٹوٹ گئے۔ ڈاک خانے، تھانے، عدالتیں جلائی گئیں، ریل کی پٹریاں اکھاڑی گئیں، ٹیلی فون اور ٹیلی گراف تار کاٹ دیے گئے۔ حکومت نے پوری قوت سے عوام کو نشانہ بنایا۔ فروری ۱۹۴۳ء میں انھوں نے پھر قید خانے میں برت رکھا۔ ۱۹۴۴ء میں گاندھی جی رہا کیے گئے۔ ستمبر ۱۹۴۴ء میں گاندھی جناح گفتگو شروع ہوئی لیکن نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی۔ راجہ جی فارمولا میں، ملک کی تقسیم کا امکان تسلیم کرلیا گیا۔ مہاتما تقسیم کو پہلے گناہ کہہ چکے تھے لیکن اب حق خود ارادیت کی شیریں کی بات ہونے لگی، سیاسی تعطل کو ختم کرنے کے لیے دو اور بے نتیجہ کوششیں ہوئیں مگر بے کار۔ مسلم لیگ پاکستان کے حصول کی تحریک چلا رہی تھی۔ مارچ ۱۹۴۶ء میں کابینی مشن آیا اور ایک مصالحتی پلان پیش کیا۔

اگست ۱۹۴۶ء میں بنگال میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوگئے، پھر نواکھالی میں گاندھی جی نے حتی الوسع اس بھڑکتی ہوئی آگ کو بجھانے کی کوشش کی۔ پھر بہار میں فسادات ہوئے، ادھر پنجاب میں امرتسر اور لاہور میں بدنظمی پھیلی۔ ۱۹۴۷ء میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن اس لیے ہندوستان آئے کہ

آزادی کی تبدیلی کی طرف قدم بڑھایا جا سکے۔ اس پلان کے تحت ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو برطانیہ دو جانشین ریاستوں کو اختیار منتقل کرنے والی تھی، انجام پہلے ہی سے معلوم تھا کہ ملک کا بٹوارہ اور اسی کے ساتھ پنجاب اور بنگال کا بھی بٹوارہ ہو جائے گا۔ آخری مذاکرات میں گاندھی کا کوئی ہاتھ نہ تھا لیکن تقسیم کے لیے ان کی مخالفت کھلا ہوا راز تھا۔ لیکن اپنی شخصیت کا وزن پلان منظور کیے جانے کے حق میں استعمال کیا۔ یہ نفس کشی کانگریس کو پھوٹ سے بچانے کے لیے کی گئی۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندستان آزاد ہو گیا اور اس کا ایک حصہ پاکستان کی شکل میں وجود میں آ گیا۔ اس کے بعد جو لاقانونیت نئی سرحد کے دونوں طرف دیکھنے میں آئی وہ ابھی ذہنوں میں تازہ ہے۔ ۱۲ جنوری ۱۹۴۸ء کو انھوں نے برت رکھا اور دلی کی امن کی واپسی تک اسے جاری رکھنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس کا پاکستان پر خوشگوار اثر پڑا اور پورا ہندستان جذباتی اعتبار سے متزلزل ہو گیا۔ گاندھی جی کے کہنے پر حکومت ہند نے پاکستان کو وہ پچپن کروڑ روپے دے دیے جو متحدہ ہندستان کے اثاثے میں پاکستانی حصے کے طور پر واجب الادا تھے لیکن کشمیر کی نزاع کی وجہ سے روک لیے گئے تھے۔ ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کی شام کو وہ پرارتھنا سبھا کے میدان کی طرف چلے اور مجمع کو نمسکار کیا ہی تھا کہ پستول کی تین گولیاں ان کے سینے کے پار ہو گئیں اور وہ "ہے رام" کہتے ہوئے ہمیشگی کی نیند سو گئے۔ قاتل نے اپنے دل میں جو بھی سمجھا ہو لیکن آج بھی کروڑوں انسانوں کے لبوں پر ملک بھر میں "باپو امر ہیں" "گاندھی جی امر ہیں" کے نعرے بلند ہوتے رہتے ہیں ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

یہ ہے اس نوجوان کے سوال کا ادھورا جواب کہ اگر گاندھی جی نہ ہوتے تو کیا ہوتا؟ یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ ہندستان آزاد تو ضرور ہی ہو جاتا لیکن کہانی کچھ اور ہوتی۔

□□



مہاتما گاندھی کاشی ہندو یونیورسٹی کی سلور جوبلی تقریب کے موقع پر سارناتھ کے بدھ مندر میں

نذرِ گاندھی

ہندوستاں کی سرزمیں، گہوارۂ امن واماں
صد رنگ پھولوں کا چمن، تہذیب کا یہ گلستاں
وید، اپنشد، گیتا ہزاروں سال کی تحریر ہیں
رُوحانیت کا نور، علم وفضل کی تنویر ہیں
اس سرزمینِ کہنہ پر رشیوں کی ہے اک کہکشاں
گوتم کے نغمے، ویر کے اپدیش گونجے ہیں یہاں
چانکیہ کی نیتی اسی ہندوستاں کی دین ہے
گونجی اس ماحول میں باباگورونانک کی لے
تلسی، کبیر و سور کی بانی کا درپن ہے یہی
بابا فرید و صابر و چشتی کا گلشن ہے یہی
نغمے الگ، بانی الگ، ہاں ایک سب کی آتما
اس آتما کو گر چھوؤ، آئے اہنسا کی صدا
ہندوستاں کی آتما کے جس نے درشن کر لیے
اس کو امر جوتی ملی، اونچا اٹھا سنسار سے
صدیاں گزر جاتی ہیں تب، آتا ہے کوئی دیوتا
ماٹی کے اس سنسار میں لیتا ہے رُوپ انسان کا
اب سے سوا سو سال پہلے ہند میں ایسا ہوا
گجرات کے گلزار میں اک پھول اہنسا کا کھلا
ہندوستاں کے فلسفے کی رُوح تھی اس میں بسی
علم وعمل، روحانیت، انسانیت، پاکیزگی
یہ پھول 'موہن لال' تھا، شاخِ کرم چند پر کھلا
کیا جانے کتنی نیکیوں کا مل گیا اس کو صلا
مشہور گلشن میں ہوا گاندھی کے پیارے نام سے
اس کی مہربانی سے انگریزوں کے دل تھرا اُٹھے

اس دور میں گلشن غلامی کی خزاں کی زد میں تھا
کشتی شکستہ، قوم کا دریا بھی جزر و مد میں تھا
صیاد اُدھر تیر و کماں سے لیس تھا، لیکن اِدھر
تھا نیم جاں ہندوستاں اور لوٹتا تھا خاک پر
گاندھی نے اپنی رُوح کی آواز پر نعرہ دیا
صیاد کو معلوم ہو، ہتھیار اہنسا ہے مرا
اے سامراجی شاطرو! لے آؤ تم تیغ و تفنگ
'ستیہ گرہ' کے بل پہ ہم کرتے رہیں گے تم سے جنگ
جوشِ عمل پیدا ہوا گاندھی کی اس آواز پر
تفریقِ مذہب چھوڑ کر سب ہو گئے سینہ سپر
مقتل شہیدوں سے پٹے، جیلیں دوانوں سے بھریں
یہ جنگ آزادی کی تھی، گھر لُٹ گئے جانیں گئیں
انگریز اپنی چال پر خود مات کھا کر رہ گیا
ہندوستاں کو آخرش آزاد ہونا تھا، ہوا
فرزند ہندوستان کا اور وقت کا اپنے رشی
وہ اپنے خوں سے لکھ گیا تاریخ ملک و قوم کی
زندہ رہے گا حشر تک لوحِ ابد پر اس کا نام
آؤ عقیدت سے کریں ہم رُوحِ گاندھی کو سلام

□□

رفعت سروش
اے-۸۰، سیکٹر ۲۷
نوئیڈا ۲۰۱۳۰۱

(پروفیسر) گیان چند
۲۵/۹ - اندرانگر، لکھنؤ

مہاتما گاندھی اور مشترکہ زبان کا مسئلہ

برِصغیر ہند، بلکہ تقسیم کے بعد کے ہندستان میں بھی مذہب، زبان، نسل اور تہذیب کے لحاظ سے اتنے متنوع اور مختلف گروہ بستے ہیں کہ یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ ہندستان ایک قوم کہلانے کا مستحق ہے کہ نہیں دنیا کے اکثر ممالک میں مذہب، زبان اور ثقافت کے لحاظ سے جو یکسانیت ہوتی ہے وہ ہندستان میں ناپید ہے۔ اس مسئلہ کے حل بلکہ سمجھوتے کے لیے ایک نظریہ وضع کیا گیا: "کثرت یا تنوّع میں وحدت" — اسی مفروضے کے تحت ہندستان کو ایک قوم کہا گیا۔ میں فی الحال دوسرے عوامل کو ایک طرف رکھ کر صرف زبان کے مسئلے پر توجہ مرکوز کروں گا۔

ایک کثیر اللسان ملک میں تعلیم، نظم و نسق اور باہمی رابطے کی زبان کا معاملہ اتنا پیچیدہ ہوتا ہے کہ اس کا ایسا حل نکالنا ممکن نہیں، جو سب کو مطمئن کر سکے۔ مہاتما گاندھی اس مسئلے پر ۱۹۰۹ء سے ۱۹۴۷ء تک مسلسل لکھتے رہے۔ ایسے لاینحل مسئلے کا حل مہاتما گاندھی جیسے عظیم انسان سے بھی ممکن نہ تھا۔ ان کی کوشش رہی کہ کسی طرح وہ ہندستان کے تمام گروہوں کو ساتھ لے کر چل سکیں۔ زبان کے معاملے میں ان کی جملہ تحریروں میں ایک موج تہ نشین صاف دکھائی دیتی ہے: ہندو مسلم اتحاد کی کوشش۔ بدقسمتی سے زبان کا مسئلہ فرقہ دارانہ سیاست سے وابستہ ہو گیا۔ جو لوگ سیاسی معاملات میں مہاتما جی کے خلاف تھے وہ زبان کے معاملے میں بھی ان کے ہر قول کی مخالفت کرتے رہے۔ اس سلسلے میں ملاحظہ ہو پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقیِ اردو مرتبہ سید ہاشمی فریدآبادی (انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی ۱۹۵۳ء)۔ اس میں انھوں نے اور مولوی عبدالحق نے مہاتما گاندھی کے لئے ہر جگہ معاندانہ انداز میں لکھا ہے بلکہ مولانا آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین تک کو نہیں بخشا۔

زبان کے مسئلے پر مہاتما جی کے اقوال کا بہترین مجموعہ "مشترکہ زبان" از مہاتما گاندھی (انجمن ترقیِ اردو ہند طبع اوّل) ہے۔ اس کی اور پنجاہ سالہ تاریخ انجمن کی رو سے ان کا نظریۂ زبان واضح کیا جاتا ہے۔ زبان کے سوال پر مہاتما جی کی سب سے پرانی تحریر ۱۹۰۹ء کے "ہند سوراج" میں ملتی ہے:

> "سارے ہندوستان کے لیے تو ہندی ہی ہونی چاہیے۔ اُسے اُردو میں لکھا جائے یا ناگری میں۔ ہندو مسلمانوں کے وچاروں کو ٹھیک رکھنے کے لئے بہت سے ہندوستانیوں کے لیے دونوں لکھاوٹوں کا جاننا ضروری ہے ایسا ہونے پر ہم آپس کے بیوہار میں سے انگریزی کو نکال باہر کر سکیں گے۔"

کئی سال بعد انھوں نے ہندی کی یہ تعریف پھر دہرائی:

> "ہندی بھاشا میں اُسے کہتا ہوں جسے اُتر میں ہندو اور مسلمان بولتے ہیں اور جو دیوناگری یا اُردو لکھاوٹ میں لکھی جاتی ہے۔"

جو اُردو اور ہندی کو دو الگ زبانیں کہتے ہیں ان کے لیے مہاتما جی کا یہ جواب تھا کہ شمالی ہند میں مسلمان اور ہندو دونوں ایک ہی زبان بولتے ہیں۔ فرق صرف پڑھے لکھوں نے پیدا کیا ہے۔ ۱۹۱۸ء میں مہاتما جی پہلی بار ہندی ساہتیہ سمیلن کے صدر ہوئے۔ اپنی تقریر میں آپ نے پھر ہندی کی وہی تعریف کی۔ ۱۹۳۵ء میں دوسری بار سمیلن کے صدر ہوئے اور اس بار سمیلن سے ہندی کی اپنی تعریف منوالی۔ آپ نے اپنی تحریروں اور اقوال میں نہ صرف اُردو اور ہندی بلکہ ہندستانی کو بھی ایک زبان مانا ہے۔

> "ہندی، ہندوستانی اور اُردو — یہ تینوں شبد ایک ہی زبان کو ظاہر کرتے ہیں جسے اُتر بھارت میں ہندو مسلمان دونوں

بولتے ہیں اور جو دیوناگری یا فارسی لکھاوٹ میں لکھی جاتی ہے۔"

— ہریجن سیوک ۳ر جولائی ۱۹۴۰ء

" ہندی، ہندستانی اور اُردو یہ تینوں شبد ایک ہی بھاشا کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔" (ہریجن ۵ر جولائی ۱۹۴۶ء)

لیکن اس کے ساتھ ہی مہاتما جی کے ایسے قول بھی کافی ہیں۔ جن میں ان تینوں کو الگ الگ بھاشا کہا گیا ہے۔ مثال کے طور پر:

— " اگر ہندو اپنے بھائیوں کے نزدیک آنا چاہتے ہیں تو انھیں اُردو پڑھنی ہی چاہیئے اور ہندو بھائیوں کے نزدیک آنے کی خواہش رکھنے والے مسلمان کو بھی ہندی ضرور سیکھ لینی چاہیئے۔" ('نوجیون' ۱۱ر جولائی ۱۹۲۰ء)

" ہندوستانی کو اصل شکل دینے کے لئے ہندی اور اُردو کو اس کی پالنے والی بھاشائیں سمجھنا چاہیے۔ اس لیے کانگرس کو ان دونوں کی طرف اچھے وچار رکھنے چاہئیں۔"

— " کانگریس سے آزاد رہ کر ہندی اور اُردو برابر ترقی کرتی رہیں گی۔ ہندی زیادہ تر ہندوؤں میں اور اُردو مسلمانوں میں محدود رہے گی۔"

— " ایسے بھی کچھ لوگ ہیں جو اس بات کا سپنا دیکھتے ہیں کہ یہاں خالی اُردو یا خالی ہندی ہی رہے گی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ ایک سپنا ہے اور سپنا ہی رہے گا۔"

— ہریجن سیوک۔ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۴۰ء

۲۷ر جنوری ۱۹۴۲ء کو دکشن بھارت ہندی پرچار سبھا مدراس میں بولتے ہوئے کہا:

" ہندی اور اُردو دو ندیاں ہیں اور ہندوستانی ساگر ہے ان دونوں میں سے ہمیں کسی سے نفرت نہیں ہونی چاہیے ہمیں تو دونوں کو اپنانا ہے۔ ہندوستانی کا پیٹ اتنا بڑا ہے کہ وہ دونوں کو اپنا لے گی۔"

آپ یہ سن کر تعجب کریں گے کہ یہ دونوں باتیں سچ ہیں۔ اگر بول چال کے روپ کو سامنے رکھیں تو اُردو، ہندی اور ہندوستانی ایک بھاشا ہیں۔ اگر ان کا لکھا ہوا روپ اور ادب دیکھیں تو اردو اور ہندی الگ الگ زبانیں ہیں۔ اسی طرح کا ایک اور تضاد ملتا ہے۔ کئی بار وہ اُردو زبان اور خط کو مسلمانوں سے اور ہندی زبان اور دیوناگری خط کو ہندوؤں سے وابستہ کرتے ہیں۔ مثلاً:

" اگر ہندو اپنے بھائیوں کے نزدیک آنا چاہتے ہیں تو انھیں اُردو سیکھنا ہی چاہیے اور ہندو بھائیوں کے نزدیک آنے کی خواہش رکھنے والے مسلمان کو بھی ہندی ضرور سیکھ لینی چاہیے۔" ('نوجیون' ۲۱ر جولائی ۱۹۲۰ء)

اس کے برعکس ان کی تحریروں میں بہت سے ایسے ٹکڑے مل جائیں گے جہاں انھوں نے زور دیا ہے کہ اُردو صرف مسلمانوں کی اور ہندی صرف ہندوؤں کی زبان نہیں۔ مثلاً:

" ہندی بولنے والے حصّوں میں پیدا ہونے والے مسلمانوں کی مادری زبان ہندی ہی ہے۔ اسی طرح ایسے ہزاروں ہندو ہیں جن کی ماتر بھاشا اُردو ہے۔"

(ہریجن سیوک۔ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۴۰ء)

یہ دونوں باتیں ان میل ہیں لیکن گہرائی میں جاکر دیکھا جائے تو دونوں اپنی اپنی جگہ سچ ہے۔ اُردو پڑھنے والے زیادہ تر مسلمان اور ہندی پڑھنے والے ہندو ہوتے ہیں۔ لیکن سب مسلمانوں کی زبان اُردو آمیز نہیں ہوتی اور کچھ ہندوؤں کی زبان کا رنگ ہندی سے زیادہ اُردو معلوم ہوتا ہے جیسے میری زبان۔ مہاتما جی پہلے ہندی اور ہندوستانی میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔ ۱۹۲۱ء سے انھوں نے عام طور پر قومی زبان کو 'ہندوستانی' کہنا شروع کیا۔ چنانچہ ان کے اشارے پر ۱۹۲۵ء میں کانپور کانگریس نے اپنے دستور کی دفعہ ۳۳ یہ کردی کہ آئندہ سے کانگریس کی شاخوں اور ورکنگ کمیٹی کا کام ہندوستانی میں کیا جائے گا جو بولنے والے ہندوستانی نہیں بول سکتے وہ انگریزی یا کسی صوبائی بھاشا کا استعمال کرسکتے ہیں۔

مہاتما جی نے ۱۹۲۴ء کے ایک مضمون میں زبان کی پوری اسکیم یوں دی ہے:

" ایک خاص میعاد کے اندر ہر صوبے کی عدالتوں اور اسمبلیوں کا کام کاج اسی صوبے کی بھاشا میں جاری ہوجانا چاہیئے۔ اپیل کی آخری عدالت کی زبان ہندوستانی قرار دی جائے۔ لکھاوٹ چاہے دیوناگری ہو یا فارسی۔ مرکزی

سرکار اور بڑی اسمبلیوں کی بھاشا بھی ہندوستانی ہی ہو،
انتر راشٹریہ راج بیوپار کی زبان انگریزی رہے"۔

(نوجیون۔ ۲۹ر دسمبر ۱۹۲۴ء)

مہاتما جی نے آدرش وادی کی طرح یہ سب لکھ دیا ہے۔ ان باتوں پر عمل کرنے میں جو مشکلیں ہیں ۱۹۲۴ء میں اس کا اندازہ مہاتما گاندھی کے لئے مشکل تھا۔ آج ہم سب کو معلوم ہے۔ مثال کے طور پر ہائی کورٹوں کا کام۔ یا سبھی زبانوں میں ہو اور سپریم کورٹ کا ہندستانی میں، تو قانون اور عدلیہ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ پھر ہندوستانی میں یہ جان کہاں کہ وہ سپریم کورٹ یا مرکزی انتظامیہ کی زبان بن سکے۔ اس ذمہ داری کو اٹھانے میں تو خالص ہندی بھی لڑکھڑانے لگتی ہے بہرحال ۱۹۲۴ء میں ایک موٹے اصول کے روپ میں یہ مانگیں سراہنے کے لائق تھیں۔

ہندوستانی اور جنوبی ہند والے

ہندی یا ہندوستانی کو قومی زبان بنانے سے اصل دقت دراوڑ صوبوں کے رہنے والوں کو ہوتی۔ ان سے مہاتما جی نے بار بار اپیل کی کہ باقی اپنائے وطن کی خاطر ہندی سیکھ لیں۔ لکھتے ہیں:

"ساڑھے اکتیس کروڑ کی آبادی میں صرف تین کروڑ ۸۰ لاکھ سے کچھ اوپر مدراسی لوگ ہندوستانی بولنے والوں کی بات کو سمجھ نہیں سکتے۔ اس علاقے کے ۳۸ لاکھ لوگوں کا دھرم کیا ہے۔ کیا ان کے لئے ہندستان انگریزی سیکھے؟ یا پھر باقی ۲۷۷ لاکھ ہندستانیوں کے لیے انھیں ہندوستانی سیکھنی چاہیے۔!" (ینگ انڈیا۔ ۲۱ر جنوری ۱۹۲۱ء)

بنگلور میں ۱۹۳۵ء میں ہندی پرچار سبھا کے کنووکیشن میں کہا:

"بھارت کے ۲۰ کروڑ آدمیوں سے تعلق پیدا کرنے کے لیے کرناٹک کے ایک کروڑ دس لاکھ نرناریوں کو ان کی بھاشا ہندی سیکھنی چاہیے۔"

۵ر جولائی ۱۹۴۴ء کے "ہریجن" میں مہاتما جی نے پھر کرناٹک والوں سے اپیل کی کہ بیس کروڑ برادران وطن سے تعلق قائم کرنے کے لیے ہندی سیکھیں۔

مہاتما جی کی 'ہندوستانی' میں بڑی لچک تھی۔ وہ سنسکرت آمیز ہندی اور عربی فارسی آمیز اردو کے خلاف تھے لیکن یہ مانتے تھے کہ کبھی کبھی ہندوستانی میں سنسکرت یا عربی فارسی میں سے کسی ایک کا زور ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اہل دکن کے لیے ہندستانی میں سنسکرت الفاظ ہونے ہی چاہئیں، لکھتے ہیں:

"اگر سنسکرت جاننے والے ہندو سنسکرت شبدوں کا ایک حد تک استعمال کرتے ہیں تو ان کا ایسا کرنا ضروری ہے۔ صرف عربی جاننے والے مسلمان بھی یہی کرتے ہیں۔ تامل یا تیلگو کی کسی چیز کا ترجمہ آپ ہندی یا ہندستانی میں کریں اور اس میں سنسکرت شبد نہ آئیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ ان کا آنا قریب قریب لازمی ہے کیوں کہ ان میں سنسکرت شبد بہت زیادہ ہیں۔ یہی حال عربی لفظوں کا ہے۔ عربی کی کسی چیز کا ترجمہ اگر ہم ہندی یا ہندستانی میں کرنے بیٹھیں تو اس میں عربی شبدوں کو آنے سے ہم روک نہیں سکتے۔"

(ہریجن سیوک ۲۳ر جون ۱۹۳۶ء)

مہاتما جی نے ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۸ء میں یہ رائے ظاہر کی کہ چوں کہ دکھن کی بھاشاؤں اور بنگالی میں سنسکرت الفاظ زیادہ ہیں اس لیے سنسکرت الفاظ سے بھری ہوئی ہندی ہی ان لوگوں کو پسند آ سکتی ہے، اسی طرح جیسے پنجاب والوں کی ہندوستانی میں عربی فارسی الفاظ کی ملاوٹ ہوگی۔ اس کے برعکس ہاشمی فرید آبادی لکھتے ہیں:

"جنوبی ہند والوں کی سنسکرت پسندی ایک اور ڈھکوسلا تھا جسے گاندھی جی اور ان کے رفیق کالی دیدہ دلیری سے مشتہر کر رہے تھے۔ مولوی عبدالحق صاحب لکھتے ہیں کہ جنوبی ہند والے تو اس سنسکرت کے رائج کرنے سے ناراض ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ سنسکرت کا صرف بہانہ ہے، دراصل وہ (کانگریس والے) اس آڑ میں سنسکرت کو رواج دینا چاہتے ہیں اور ہماری زبان اور تہذیب کو مٹانے کے درپے ہیں۔۔۔

دوسری عجیب بات یہ ہے کہ مدراس کی حکومت نے اپنے مدرسوں کے لیے جو ریڈریں لکھوائی ہیں وہ خالص ہندوستانی زبان میں ہیں اور ان میں کہیں سنسکرت کے بوجھل اور نامانوس الفاظ نہیں پائے جاتے جس کی تائید گاندھی جی اور ان کے رفیق کرتے

ہیں۔ دکھشنی ناگری پرچار سبھا نے اپنے ٹریننگ اسکولوں کے لیے بھی انجمن ہی کی ریڈریں جاری کی ہیں اور اپنے دوسرے اسکولوں میں بھی انہی کو مقرر کرنا چاہتے ہیں، صرف رسم الخط بدل دیئے گئے ہیں' زبان وہی رہے گی۔ ان تمام باتوں سے گاندھی جی اور ان کے حامیوں کی تردید ہوتی ہے۔"

(رسالہ اُردو ۱۹۳۶ء ص ۱۱۲۶ بحوالہ پنجاہ سالہ تاریخ ص ۹۲-۹۱)

اس انکشاف پر مجھے حیرت ہے۔ میرا مشاہدہ ہے کہ اہلِ دکن دراوڑ ہونے کے باوجود سنسکرت کے عالم ہوتے ہیں۔ تامل کے علاوہ دوسری دکنی زبانوں میں سنسکرت کی بھرمار ہے۔ ملیالم میں تو ... ۹ فی صدی الفاظ سنسکرت کے ہیں۔ میرے ایک دوست کورگ (کرناٹک) کے ہندو فوجی افسر نے کہا تھا کہ ہم سنسکرت آمیز ہندی سمجھ سکتے ہیں، آپ کی اُردو نہیں۔

مہاتما جی نے دوسرے صوبوں والوں کو ہندی سیکھنے کی ترغیب دی۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا لیکن انھوں نے غضب یہ کیا کہ صوبائی زبان والوں کو بار بار یہ صلاح دی کہ وہ اپنی بھاشا دیوناگری میں لکھنے لگیں۔ ۱۹۳۵ء میں بنگلور کے ہندی پرچار کنووکیشن میں مہاتما جی نے کرناٹک والوں پر زور دیا کہ وہ ہندی سیکھ لیں۔ اس پر وہاں کے ایک شخص نے بگڑ کر لکھا۔

"تامل والا تامل کی جگہ انگریزی میں سوچتا ہے۔ آپ کی یوجنا کے بعد وہ ہندی میں سوچنے لگے گا۔ اس طرح اس نیتی کا صاف نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ اور ساری بھاشائیں مٹ جائیں اور صرف ہندی رہ جائے وہ بھی دونوں لکھاوٹوں میں کیوں کہ سب بھاشاؤں کی لکھاوٹ تو دیوناگری ہی ہو جائے گی۔"

اس پر مہاتما جی نے جواب دیا:

"اگر پورا راشٹر اپنی بھاشا کے سوا ایک کل بھارتی بھاشا جان لے تو کیا ہرج ہے۔ بھاشا ہندی یعنی ہندوستانی ہی ہو سکتی ہے۔ رہا ماتری بھاشا کا سوال تو آپ مجھے غلط سمجھے ہیں۔ ماتری بھاشا کو پہلی جگہ دیتا ہوں۔ لپی کے بارے میں مجھے اپنی رائے پر پچھتاوا نہیں ہے۔ جو الگ الگ بھاشائیں سنسکرت سے نکلی ہیں یا جن کے ساتھ اس کا گہرا رشتہ رہا ہے پر جُدا جُدا لکھاوٹوں میں لکھی جاتی ہیں' ان کی ایک ہی لپی ہونی چاہیے اور وہ لکھاوٹ دیوناگری ہی ہے۔"

(ہریجن۔ ۱۵ر اگست ۱۹۳۵ء)

اس کے بعد بھی مہاتما جی صوبائی زبانوں کے لیے دیوناگری کی وکالت کرتے رہے۔ لکھتے ہیں:

"اس میں شک نہیں کہ دیوناگری لکھاوٹ کا ایک آندولن چل رہا ہے جس کا ساتھ میں دل سے دے رہا ہوں اور وہ یہ ہے کہ مختلف صوبوں میں، خاص کر جن صوبوں میں سنسکرت شبدوں کا بہت زیادہ استعمال ہوتا ہے' بولی جانے والی تمام بھاشاؤں کے لئے دیوناگری لکھاوٹ کو مان لیا جائے۔" (ہریجن سیوک۔ ۲۴ر جون ۱۹۴۶ء)

"رومن لکھاوٹ نہ تو ہندوستان کی زبان ہو سکتی ہے اور نہ ہونی چاہیے۔ یہ برابری تو فارسی اور دیوناگری کے بیچ ہی ہو سکتی ہے اور اس کی بنیادی خوبیوں کو الگ رکھ دیں تو بھی دیوناگری ہی سارے ہندوستان کی سب کو منظور لکھاوٹ ہونی چاہیے۔ کیوں کہ مختلف صوبوں میں چالو زیادہ تر لکھاوٹیں بنیادی طور سے دیوناگری ہی سے نکلی ہیں۔... لیکن اس کے ساتھ ہی مسلمانوں پر یا دوسرے ایسے لوگوں پر جو اس سے انجان ہیں' اسے زبردستی لادنے کی ہمیں کسی طرح کی کوئی خواہش نہیں کرنی چاہیے۔" (ہریجن سیوک ۳ر جولائی ۱۹۴۷ء)

مہاتما جی کی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ تمام صوبائی بھاشائیں تو دیوناگری میں لکھی جائیں لیکن خود ہندی' دیوناگری اور اُردو دونوں خطوں میں لکھی جائے۔ ایسا ہی کچھ شبہ شمالی ہند کے کسی شخص کے دل میں اٹھا اور اس نے مہاتما جی سے کئی سوال کر ڈالے' جن کا جواب ۲۶ر اپریل ۱۹۴۲ء کے ہریجن سیوک میں ملتا ہے۔ سائل نے کہا تھا:

"اگر آپ ہندو مسلم ایکتا کے لیے اُردو سیکھنے کو کہتے ہیں تو بنگال، مہاراشٹر، گجرات، دکھنی بھارت وغیرہ کے مسلمان تو اُردو نہیں جانتے صوبائی بھاشائیں بولتے ہیں۔ اُتر بھارت کی تمام بھاشائیں سنسکرت سے نکلی ہیں اور دکھنی بھارت کی بھاشاؤں میں سنسکرت شبد آ گئے' ہیں۔

ان میں عربی فارسی جیسی اجنبی زبانوں کے شبدوں کا پرچار کیوں کیا جائے؟"

دوسرا سوال لپی کے بارے میں تھا کہ زیادہ تر صوبوں کی لپیاں دیوناگری سے نکلی ہیں، صرف پنجاب اور سندھ والے ناگری کیوں نہیں سیکھ لیتے، باقی لوگوں سے اُردو لپی سیکھنے کو کیوں کہا جائے۔؟

مہاتما جی نے جواب دیا:

"آپ کی بات میں بہت سچائی ہے۔ لیکن ہندو مسلم ایکتا کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے۔ اگر دوسرے صوبوں والے دیش پریم کے ساتھ ایک اور لپی اُردو سیکھ لیں تو ان کا فائدہ ہی ہے۔"

مہاتما جی اور انگریزی

آگے بڑھنے سے پہلے ہم انگریزی کے لیے مہاتما جی کے خیالات جانتے چلیں۔ وہ ۱۹۰۶ء سے کہتے چلے آئے ہیں کہ ہمیں انگریزی کو نکال باہر کرنا ہے ودیشی بھاشا ہمیں آزادی نہیں دلا سکتی لیکن انگریزی کی کوئی جگہ ہونی چاہیے یا نہیں اس کی طرف بھی انھوں نے اشارہ دیا ہے۔ اندور میں ۱۹۱۸ء میں کہا:

"یہ کہنا ضروری نہیں ہے کہ میں انگریزی بھاشا سے نفرت نہیں کرتا ہوں۔ انگریزی ساہتیہ بھنڈار ہے۔ میں نے بھی بہت سے رتنوں کا استعمال کیا ہے۔ انگریزی بھاشا کے ذریعہ ہم کو سائنس وغیرہ کی خوب جانکاری حاصل کرنی ہے، اس لیے انگریزی کی جانکاری بھارت واسیوں کے لئے ضروری ہے۔ لیکن اس بھاشا کو اس کی ٹھیک جگہ دینا ایک بات ہے، اس کی پوجا کرنا دوسری بات ہے۔"

۱۹۲۴ء میں بھاشا سے متعلق مہاتما جی نے اپنی پوری اسکیم کھل کر بیان کی۔ اس کا ذکر پیچھے آچکا ہے۔ اس میں انگریزی کو صرف دوسرے ملکوں سے کام کاج کے لیے باقی رکھا ہے۔ ملک کے اندر کوئی جگہ نہیں دی۔ یہ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ ۱۹۲۷ء میں جھریا میں کوئلے کی کانوں کے مزدوروں کی طرف سے مہاتما جی کو انگریزی میں ایک ایڈریس دیا گیا۔ آپ نے اسے سننے سے انکار کر دیا، اور اسے بغیر پڑھے ہی پڑھا ہوا مان لیا گیا۔ ۲۰ جنوری ۱۹۲۷ء کو نوجیون میں مہاتما جی نے یہ امید ظاہر کی کہ آئندہ کسی انجمن کی کارروائی کسی ایسی زبان میں ہو جسے زیادہ لوگ نہ جانتے ہوں تو اچھا ہوگا کہ وہ لوگ اس انجمن سے اٹھ کر چل دیں۔"

ظاہر ہے کہ باپو کا اشارہ انگریزی کی طرف تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مہاتما جی پڑھے لکھوں کے لیے انگریزی جاننا ضروری نہ سمجھتے تھے۔ صرف کچھ لوگ انگریزی پڑھ لیں، اسے ہی کافی سمجھتے تھے۔ ہریجن میں لکھتے ہیں:

"میں نے بار بار یہ سمجھایا ہے کہ ہماری ترقی میں انگریزی کی ایک جگہ مقرر ہے۔ ہمارے راجیوں کی اور ساری پچھمی دنیا کی بات سمجھانے کے لیے اور پچھم کی اچھی اچھی باتیں ہندستانی کو سکھانے کیلیے ہمارے کچھ آدمیوں کو انگریزی ضرور سیکھنی چاہیے کیوں کہ پچھمی بھاشاؤں میں اس کا سب سے زیادہ پرچار ہے۔" (ہریجن - ۱۵ اگست ۱۹۴۵ء)

اس تحریر میں انگریزی کو راجیوں کی باتیں سمجھنے کا ذریعہ بھی قرار دیا گیا ہے راجیوں سے مراد صوبے ہی ہو سکتے ہیں۔ صرف اس تحریر کے سوا ور کہیں یہ دیکھنے میں نہیں آیا کہ مہاتما جی نے صوبوں کے بیچ رابطے کے لیے انگریزی کو ضروری سمجھا ہو۔ سچ یہ ہے کہ مہاتما جی انگریزی کو ملک کی ترقی کے راستے کا روڑا سمجھتے تھے۔

— ایک جگہ انگریزی سیکھنے کو وقت برباد کرنا کہہ گئے ہیں:

"انگریزی زبان نے ہم پر جو جادو کر ڈالا ہے اس کے اثر سے ہم ابھی تک چھوٹے نہیں ہیں۔ اس جادو کے جال میں پھنس کر ہم لوگ ہندستان کو اپنے مقصد کی طرف آگے بڑھنے سے روک رہے ہیں۔ جتنے سال ہم انگریزی سیکھنے میں برباد کرتے ہیں اگر اتنے مہینے بھی ہم ہندوستانی سیکھنے کی تکلیف نہ اٹھائیں تو سچ مچ ہی کہنا ہوگا کہ ہم عام لوگوں کی طرف اپنے پریم کی جو ڈینگیں ہانکا کرتے ہیں وہ نری ڈینگیں ہی ہیں۔" (رچناتمک کاریہ کرم)

آج تعلیم کے ماہر عام طور پر مانتے ہیں کہ ہندستان میں سہ لسانی فارمولا کے تحت ہر پڑھے لکھے آدمی کو انگریزی ضرور پڑھنی چاہیے۔

مہاتما جی اور انجمن ترقی اُردو

مہاتما جی نے سب سے زیادہ حمایت اُردو کی کی، لیکن دُکھ کی بات ہے کہ ان کی سب سے زیادہ مخالفت اُردو والوں ہی نے کی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آزادی سے پہلے کی اُردو تحریک مسلم لیگ تحریک کے پیچھے چل رہی تھی — مہاتما جی اُردو سے محبت کرتے تھے۔ لیکن اپنی بعض گول مول مبہم باتوں سے انھوں نے اُردو والوں کے دل میں شک پیدا کر دیا۔ ۱۹۳۵ء میں وہ دوبارہ ہندی ساہتیہ سمیلن کے صدر ہوئے۔ اندور میں اس کے جلسے میں صدارتی خطبے میں انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ ایک اکھل بھارتیہ ساہتیہ پریشد بنایا جائے جس کا مقصد صوبائی زبانوں اور ان کے ادیبوں میں میل جول پیدا کرنا ہو۔ اس پریشد کی بیٹھک ۲۴ را پریل ۱۹۳۶ء کو ناگ پور میں ہوئی۔ پہلے ہی جلسے میں یہ قرارداد رکھی گئی کہ پریشد کا کام "ہندی ہندستانی" میں ہوگا۔

اس پر مولوی عبدالحق نے سخت اعتراض کیا کہ نیشنل کانگریس کی قرارداد میں صرف "ہندوستانی" کو ملک کی زبان تجویز کیا گیا ہے جو ناگری یا فارسی کسی خط میں بھی لکھی جائے۔ اس وقت ہندوستانی کے معنی کسی نے یہ نہیں سمجھے تھے۔ اس پر بقول مولوی صاحب گاندھی جی نے جواب دیا کہ:

"اب میں نے بتا دیے، اب سمجھ لیجیے۔" (پنجاہ سالہ تاریخ ص ۶۲)

مہاتما جی نہ مانے، اسے بدل کر "ہندی اتھوا ہندوستانی" کرنے کو تیار ہو گئے۔ 'اتھوا' کے معنی "یا" ہیں۔ مولوی صاحب نے تجویز کی کہ "ہندی ہندوستانی" کے بجائے صرف "ہندوستانی" یا پھر "ہندی یا اردو" کر دیا جائے ان کی بات نہ مانی گئی اور وہ پریشد چھوڑ کر چل دیے۔ پنجاہ سالہ تاریخ میں لکھا ہے:

"اسی بحث کے سلسلے میں گاندھی جی نے کہا کہ اردو مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا۔ مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں۔" (ص ۶۳)

یقین نہیں آتا کہ مہاتما گاندھی نے ایسی متعصبانہ بات کہی ہوگی۔ اُردو اور مسلمانوں کا کوئی دشمن بھی اس سے زیادہ کیا کہتا۔ یہ ان کے تمام اقوال اور اعتقادات کے خلاف ہے۔ جنوری ۱۹۴۲ء میں کسی اُردو والے نے مہاتما جی کو چٹھی لکھی جس میں دوسری باتوں کے سوا یہ بھی لکھا تھا:

"آپ تو اردو کو کھلم کھلا فارسی لکھاوٹ میں لکھی جانے والی مسلمانوں کی بھاشا کہہ چکے ہیں۔ آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر مسلمان چاہیں تو پہلے ہی اس کی حفاظت کریں۔"

مہاتما جی نے یہ چٹھی اور اس کا جواب ۸ر فروری ۱۹۴۲ء کے ہریجن سیوک میں چھاپا ہے۔ انھوں نے چٹھی کی دوسری غلط فہمیوں کو دور کیا ہے لیکن مندرجہ بالا بات سے انکار نہیں کیا۔ ۸ر جنوری ۱۹۶۰ء کے "ہماری زبان" میں اسکے ایڈیٹر پروفیسر آل احمد سرور نے ایک ایڈیٹوریل لکھا "کیا اُردو مسلمانوں کی زبان ہے" اس میں اوپر لکھی ہوئی بات کو سچ مچ مہاتما گاندھی کی رائے سمجھ کر لکھا:

"اُردو ہندو مسلم اتحاد کی یادگار اور ہماری مشترک قومی تہذیب کی نشانی ہے۔ اس کی اس حیثیت کو لاکھ کچھ لوگ فراموش کریں، یہ حیثیت برقرار رکھے گی۔ چاہے بقول گاندھی جی کے، قرآن کے حروف میں لکھی جائے، چاہے مسلمانوں کا بیشتر مذہبی اور تہذیبی سرمایہ اس میں موجود ہو۔ ہندوستان کے بیشتر مذاہب کے ماننے والوں کی زبان رہی ہے اور ہے۔"

اس پر مشہور گاندھی وادی ڈاکٹر جعفر حسن نے ۲۲ را پریل ۱۹۶۰ء کے 'ہماری زبان' میں ایڈیٹر کو مراسلہ لکھا جس میں اس بات کو لے کر اپنی اور باپو کی پوری چٹھی پتری دی ہے۔ ڈاکٹر جعفر حسن کہتے ہیں کہ ہمیشہ یہ بات کھٹکتی تھی کہ مہاتما جی جیسی ہستی ایسی جاہلوں والی اور دل دکھانے والی بات کیسے کہہ سکتی تھی۔ جعفر حسن نے ۱۵ر ستمبر کو مہاتما جی کو لکھ کر پوچھا کہ آپ کے نام سے یہ بول ان گنت بار نقل کیے جاتے ہیں، کیا آپ نے واقعی ایسا کہا تھا؟ اور اب آپ کی کیا رائے ہے؟

مہاتما جی نے ۲۹ر ستمبر ۱۹۴۱ء کو جواب دیا کہ "میں نے وہ جملے کبھی نہیں کہے۔ تم وہ کٹنگ بھیجو جس میں یہ بات مجھ سے جوڑی گئی ہے۔ میں نے تو خود اردو سیکھی ہے اور مولانا شبلی کی "سیرت النبیؐ" اور اُردو کی دوسری تحریریں پڑھی ہیں۔" جعفر حسن نے کچھ کٹنگ بھیجے۔ اس کے بعد ایک مرتبہ ان کا مہاتما جی سے ملنا ہوا تو باپو کو بتایا کہ یہ بات آپ نے مولوی عبدالحق کے سامنے ناگپور میں کسی بھرے جلسے میں کہی تھی۔ اس وقت مہاتما جی نے کچھ نہیں کہا، لیکن بعد میں ۳ر اپریل ۱۹۴۳ء کو بردولی سے لکھا:

"میرا ایڈریس لکھا ہوا تھا، میرے ریمارک اسی طرح کے ہو سکتے تھے جس طرح کا وہ ایڈریس تھا۔ اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو مولانا صاحب کے اعتراض کو ٹھیک قرار دے۔"

یہ ساری مراسلت ۲۲ اپریل ۱۹۶۰ء کے "ہماری زبان" میں دیکھی جا سکتی ہے۔

مہاتما گاندھی کی اس تردید کے دوسرے شاہد حیات اللہ انصاری ہیں۔ انھوں نے پہلے بھی مجھے بتایا تھا اور آج (۲۹ نومبر ۱۹۹۵ء کو) پھر واضح کیا کہ مولوی عبدالحق بہت اونچا سنتے تھے۔ پریشد کے اجلاس میں ان کے پاس ڈاکٹر اختر رائے پوری بیٹھے تھے، انھوں نے مولوی صاحب کی خوشنودی اور قرب حاصل کرنے کے لیے یہ جملے وضع کر کے مہاتما گاندھی سے منسوب کر دیئے اور مولوی صاحب نے یقین کر لیا۔ انصاری صاحب نے مجھے بتایا کہ اختر رائے پوری علی گڑھ میں ان کے کلاس فیلو رہ چکے تھے۔ انصاری ان کے مزاج کو جانتے تھے۔ انصاری صاحب اور بیگم سلطانہ حیات نے بنفس نفیس مہاتما جی سے ان جملوں کی تصریح چاہی۔ مہاتما جی نے ان دونوں کے سامنے انکار کیا کہ انھوں نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ انصاری صاحب ایک بار پاکستان گئے اور وہاں اختر رائے پوری سے اس کا ذکر چھیڑا، اختر ٹال گئے۔ میں اضافہ کروں کہ میں نے ان جملوں کے واضع کے طور پر ہاشمی فرید آبادی کا نام سنا تھا، لیکن حیات اللہ انصاری صاحب معاصر شاہد ہیں، ان کا قول صحیح ہوگا۔

مولوی عبدالحق ساہتیہ پریشد کے معاملے کے سلسلے میں سوچتے ہیں۔

"آخر اس قلب ماہیت کی کیا وجہ ہے؟ کون سے ایسے نئے اسباب رونما ہوئے ہیں جو اس حیرت انگیز انقلاب کا باعث ہوں؟ غور کرنے سے معلوم ہوا کہ اس تمام تغیر و تبدل، توڑ جوڑ اور داؤں پیچ کا باعث ہمارے بدنصیب ملک کا پالیٹکس ہے۔ جب تک مہاتما گاندھی اور ان کے رفقا کو یہ توقع تھی کہ مسلمانوں سے کوئی سیاسی سمجھوتہ ہو جائے گا اس وقت تک وہ ہندستانی، ہندستانی، پکارتے رہے جو تھپک کر سلانے کے لیے اچھی خاصی لوری تھی جب انھیں اس کی توقع نہیں رہی یا انھوں نے ایسے سمجھوتے کی ضرورت نہیں سمجھی تو ریا کی چادر اتار کر پھینک دی اور اصلی رنگ میں نظر آنے لگے۔" (اُردو اپریل ۱۹۳۶ء بحوالہ پنجاہ سالہ تاریخ ص ۱۳-۶۴)

مہاتما جی پر ریاکاری کا الزام لگانا بدگمانی کی حد ہے۔ ۱۹۰۵ء میں اور اس کے بعد تو کانگریس کو مسلمانوں سے سمجھوتہ کرنے کی ضرورت اور زیادہ تھی جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہے۔ مہاتما گاندھی نے زبان کے معاملے میں کسی قسم کی مفاہمت کی کوشش آخری دم تک جاری رکھی اور تقسیم ملک کے بعد بھی ہندوستانی کو چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئے جیسا کہ آئندہ اوراق سے واضح ہوگا۔

قرآنی حروف والا الزام جھوٹ سہی لیکن 'ہندی ہندوستانی' کی بات اُردو والوں کے لیے ایسی ثابت ہوئی جیسے غصیلے سانڈ کے لیے لال کپڑا۔ مولوی عبدالحق نے اُردو کے لیے ایک زبردست تحریک شروع کی اور کہا کہ بھارتیہ ساہتیہ پریشد اُردو کو ختم کرنے اور ہندی کو لادنے کی زبردست سازش ہے۔ مہاتما جی نے ۱۶ مئی ۱۹۳۶ء کے ہریجن میں "ہندی یا ہندوستانی" کے عنوان سے ایک مضمون میں لکھا کہ بھارتیہ ساہتیہ پریشد، ہندی ساہتیہ سمیلن کی پیداوار ہے۔ ۲۵ برس کی پرانی سنستھا سے میں نام بدلنے کو کیوں تو یہ گستاخی ہوگی۔ اگر کسی کو ہندی نام سے چڑ ہے تو اسے جاننا چاہیے کہ ہندی مسلمانوں کا دیا ہوا نام ہے۔

مہاتما جی نے ہریجن سیوک بابت ۲۹ اکتوبر ۱۹۳۶ء میں ایک تحریر میں اس بات پر دکھ ظاہر کیا کہ سمیلن نے ہندی کی تعریف میں اُردو لکھاوٹ کو ظاہر کر کے جو بڑا اقدام اٹھایا ہے، مسلمانوں نے اس کو نہیں سراہا۔

۱۹۳۷ء میں ہندوستان میں صوبائی حکومتیں قائم ہو گئی تھیں۔ ۲۸ اگست ۱۹۳۷ء کو پٹنہ میں انجمن ترقی اردو کا ایک جلسہ ہوا جس میں اسکولی جماعتوں میں ہندستانی کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی خواہش ظاہر کی گئی۔ اسی دن سہ پہر کو گاندھی جی کے ایما سے بابو راجندر پرشاد انجمن کے جلسے میں آئے، ان میں اور مولوی صاحب میں ایک سمجھوتہ ہوا جس کی رو سے طے ہوا کہ ہندستان کی مشترکہ زبان ہندوستانی ہونی چاہیے لیکن ہندی اور اردو کو بحیثیت ادبی زبانوں کے ترقی کرنے کے پورے مواقع دیے جانے چاہئیں۔ مارچ ۱۹۳۸ء میں ہندوستانی زبان کی لغت تیار کرنے کی ذمہ داری مولوی عبدالحق کو دی گئی۔ اصول یہ تھا کہ مستند ہندی مصنفوں نے جو عربی فارسی الفاظ اور اُردو مصنفوں نے جو ہندی اور سنسکرت الفاظ استعمال کیے ہیں ان کو جمع کر لیا جائے۔ مولوی صاحب نے یہ لغت تیار کر دی اور

اس کے مسودات پٹنہ بھیج دیئے۔ لیکن کتاب کی تکمیل کی نوبت کبھی نہیں آئی۔ (پنجاہ سالہ تاریخ ص ۹۶ - ۷۷)

مہاتما جی نے اس سمجھوتے کو بہت سراہا لیکن معلوم نہیں کیوں اس کا کام آگے نہ بڑھا۔ آخرکار ۱۹۳۸ء تک مہاتما جی کی پکی رائے ہو گئی کہ قومی زبان کا نام صرف ہندوستانی ہو۔ انھوں نے کانگریسیوں کو رائے دی کہ قومی زبان کا ذکر کرتے وقت وہ اردو یا ہندی نہ کہہ کر ہندوستانی ہی کہا کریں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ۵ر جولائی ۱۹۴۶ء کے ہریجن میں انھوں نے اہلِ دکن کو "ہندی ہندوستانی" سیکھنے کی رائے دی۔

۲۹ر دسمبر ۱۹۳۹ء کو انجمن ترقی اُردو ہند نے دہلی میں ایک اُردو کانفرنس منعقد کی اس میں مہاتما گاندھی کا اُردو میں لکھا ہوا خط نمائش میں رکھا گیا جس میں لکھا تھا:

"بھائی صاحب

آپ کا تار ملا تھا۔ مجھے دُکھ ہے کی آپ کے جلسہ میں حاضر نہیں ہو سکتا ہوں۔ میری امید ہے کی جلسہ ہر طرح کامیاب ہوگا۔ آپ جانتے ہیں کی میں اُردو زبان کی طرقی (کذا) چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کی سب ہندو جو ملک کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اُردو سیکھیں اور مسلم ہندی سیکھیں۔

سیگاؤں واردھا ۲۶ر دسمبر ۱۹۳۹ء"

(پنجاہ سالہ تاریخ ص ۱۰۰)

ایسے صلح کل، نیک خواہشات والے خط میں بھی مجاہدانِ اُردو نے مقاماتِ اعتراض تلاش کر لیے کہ مہاتما گاندھی نے ہندوؤں کی زبان ہندی اور مسلمانوں کی زبان اُردو قرار دی ہے۔ ۱۶ر جنوری ۱۹۴۰ء کے 'ہماری زبان' میں گاندھی جی کے اس خیال پر تاسف کیا گیا۔ پنجاہ سالہ تاریخ کے مطابق چند کانگریسی مسلمانوں سے گفتگو میں پنڈت نہرو نے گاندھی جی کی تردید کی اور خود اپنے کنبے برادری کی زبان کا اُردو ہونا مثال میں پیش کیا۔ (ص ۱۵۷)

مولوی صاحب نے گاندھی جی کو شکریے کا خط لکھ کر اس غلطی کی طرف توجہ دلائی۔ مہاتما جی نے ۷ر مارچ ۱۹۴۰ء کے انگریزی میں لکھے جوابی خط میں تسلیم کیا کہ: "اُردو اپنے علاقے میں ہندو مسلمان دونوں کی مادری زبان ہے اور ان کا مطلب تو یہ تھا کہ سبھی ہندو، اردو رسمِ خط اور مسلمان ہندی تحریر سے شناسائی حاصل کریں"۔

(پنجاہ سالہ تاریخ ص ۱۵۸)

۲ر مئی ۱۹۴۲ء کو مہاتما جی نے سیٹھ جمنا لال بجاج کی مدد سے ہندوستانی پرچار سبھا بنائی لیکن تین مہینے بعد ہی باپو کو ہندوستان چھوڑو تحریک کے سلسلے میں گرفتار کر لیا گیا اور سبھا کا کام رک گیا۔ ۴۴-۱۹۴۵ء میں یہ کام پھر سے چالو ہوا۔ مہاتما جی ڈاکٹر تاراچند کی یہ بات مانتے تھے کہ شروع میں اُتری بھارت میں ایک بھاشا تھی جسے ہندو مسلمان دونوں بولتے تھے، جو ایک تھی وہ دو ہو گئی۔ ہندوستانی پرچار سبھا کا کام ان دونوں کو پھر سے ایک بنانا ہے۔ فروری ۱۹۴۵ء کے تیسرے ہفتے میں سبھا کا جلسہ کرنا تھا جس کے لیے مولوی صاحب کو مدعو کیا گیا۔ ڈاکٹر تاراچند اور پنڈت سندر لال کو بطور خاص مولوی صاحب کے پاس بھیجا کہ انھیں شرکت کے لیے راضی کر لیں لیکن سبھا کی مجوزہ تاریخیں دیکھیں تو بمبئی کی انجمن ترقی اردو کانفرنس سے ٹکراتی تھیں۔ سبھا کے اجلاس کے دعوت نامے جا چکے تھے لیکن مہاتما جی مولوی صاحب کی شرکت کے لیے اس حد تک خواہاں تھے کہ سبھا کی تاریخیں آگے بڑھا دیں۔ مولوی صاحب آئے۔ ۲۷ر فروری ۱۹۴۵ء کو سبھا کے دوسرے اجلاس میں گاندھی جی نے کہا:

"عبدالحق صاحب نے ناگپور میں جو بات کہی تھی اسے اس وقت میں نہ سمجھ سکا۔ 'ہندی یعنی اُردو' اسے میں نے نہیں مانا تھا۔ اس وقت ان کی بات مان لیتا تو اچھا تھا......

ناگ پور میں بھارتیہ ساہتیہ سمیلن کیا تھا لیکن وہ وہیں شروع ہوا اور وہیں ختم ہوا۔ ہم لوگ ملنے آئے تھے اور پھر الگ الگ ہو گئے۔ ایسے سمیلن سے کیا فائدہ ہو سکتا تھا وہ ہندوستانی نہیں بلکہ بھارتیہ ساہتیہ سمیلن تھا۔"

مولوی عبدالحق طوعاً و کرہاً سبھا کے جلسے میں آئے تھے۔ انھوں نے سبھا کی مجوزہ کمیٹی میں شرکت سے قطعی انکار کر دیا۔ گاندھی جی سبھا کے صدر بنے۔ معلوم نہیں کہ ہندی ساہتیہ سمیلن نے ہندی کی اپنی تعریف بدل دی تھی یا کوئی اور بات تھی کہ مہاتما جی نے ہندی سمیلن کی ممبری سے استعفاد ینے

کی بات سوچی۔ سمیلن کے سبھاپتی پرشوتم داس ٹنڈن اور مہاتما جی کے بیچ چٹھی پتری ہوئی۔ ٹنڈن جی مہاتما گاندھی کے بہت بڑے بھگت تھے لیکن انھوں نے لکھا کہ میں آپ کے اس خیال سے کہ ہر دیش واسی ہندی اور اُردو دونوں سیکھے، اتفاق نہیں کرتا۔ آخر ۱۵ر جولائی ۱۹۴۵ء کو مہاتما جی نے سمیلن چھوڑ دیا۔

جون ۱۹۴۷ء میں جب ملک کے بٹوارے کا فیصلہ ہو گیا تب بھی مہاتما جی اپنی بات پر اٹل رہے۔ اعتراض کیا گیا کہ جب پاکستان ایک حقیقت بن گیا ہے تو ہندوستانی زبان کو ہندی اور اُردو لکھاوٹوں میں پھیلانے کی کوشش ریت کی رسّی بٹنا ہے اور پاگل پن ہے لیکن مہاتما جی اپنے عقیدے پر قائم رہے۔ جب انھیں بتایا گیا کہ قومی زبان ہندی ہوگی اور دیوناگری میں لکھی جائے گی تو انھوں نے ہریجن ۳ر اگست ۱۹۴۷ء میں لکھا کہ میں اس پر کبھی رضامند نہیں ہو سکتا۔

۱۵ر اکتوبر ۱۹۴۷ء دہلی ڈائری میں لکھتے ہیں:

"میں نے اخباروں میں ایک پیراگراف دیکھا ہے کہ آئندہ سے یو۔پی کی سرکاری زبان ہندی دیوناگری لپی کے ساتھ ہوگی، اس سے مجھے دکھ ہوا۔ ہندو مسلمان میں برابر کے سلوک کا تقاضا یہ ہے کہ اُردو لپی کو بھی باقی رکھا جائے ایک ایسا ملک نہ بنانا چاہیے جہاں مسلمانوں کے لیے عزت کی زندگی ناممکن ہو جائے۔"

۱۸ر اکتوبر کو لکھتے ہیں:

"ہماری قوم پرستی اگر دونوں لپیوں کے سیکھنے سے گھبراتی ہے تو وہ بہت گھٹیا قسم کی قوم پرستی ہے۔"

زبان کے بارے میں ان کا آخری قول ۱۸ر دسمبر ۱۹۴۷ء کو ملتا ہے۔ لکھتے ہیں،

"کیا اُردو اور ہندی کو ملا کر ایک زبان بنانے کی کوشش کر کے میں کمتر درجے کا ہندو یا ہندستانی ہو گیا۔ کیا وہ ایک اکھل بھارتیہ بھاشا کی سیوا کر سکتے ہیں۔ اگر اُردو لپی اور بھاشا کو اس سے نکال دیا جائے۔ میں تو ہمیشہ تمھارے پاس رہوں گا نہیں، مگر تم میرے رخصت ہو جانے کے بعد میرے شبدوں کو یاد کرو گے۔"

اور اگلے مہینے ہی وہ رخصت ہو گئے۔ لیکن ان کے ساتھ ہندوستانی ختم نہیں ہو گئی۔ بی۔جی۔ کھیر کی صدارت میں قائم شدہ پہلے سرکاری زبان کمیشن کی رپورٹ میں بھی اُردو ہندی کی قدر مشترک کی وکالت کی گئی ہے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے گجرال کمیٹی کی رپورٹ تک نے دونوں زبانوں کے مشترک دھارے اور دونوں زبانوں کو ہندوستانی کے رنگ میں ترقی دینے پر زور دیا ہے[1] دستورِ ہند کی دفعہ ۳۵۱ میں ہندی کو ہندوستانی سے استفادہ کرنے کی ہدایت دی گئی ہے پہلے ہی قانون زبان میں ہندستانی کو مقام دیا گیا ہو لیکن تمام ہند، آندھرا، مہاراشٹر اور تلنگانہ میں ہم رابطے کی جس زبان سے کام چلاتے ہیں اسے ہندی یا اردو کہنا غلط ہے۔ وہ ہندستانی ہے۔

بول چال کی زبان ایک اور ادب کی زبانیں دو۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ کسی طرح انھیں سمو کر ایک کر دیا جائے۔

□□

---

[1] گجرال کمیٹی رپورٹ دفعہ ۲۱-۲۰-۳ ص ۶۵-۶۸

ہندو مسلم اتحاد

"ہم سب ہندوؤں، مسلمانوں، پارسیوں، سکھوں اور عیسائیوں کو صلح و آشتی کے ساتھ بحیثیت ہندستانی کے رہنا چاہیے اور یہ عزم کر لینا چاہیے کہ ہم سب مادرِ وطن کے لیے زندہ رہیں گے اور مریں گے۔ ہمارا حوصلہ یہ ہونا چاہیے کہ ہم سب ایک ہی ماں کے بچوں کی طرح زندگی بسر کریں اور اپنے اپنے مذہب پر رہتے ہوئے بھی ایک درخت کی بے شمار پتیوں کی طرح ایک رہیں۔"

——— مہاتما گاندھی

شفاعت علی صدیقی
جے پر - ڈالی باغ - لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

ہے ہمالہ کی بلندی تیری عظمت پر نثار

گاندھی جی غیر معمولی ذہانت اور خداداد فکر بلیغ لے کر دنیا میں آئے تھے، ان کے جوہر ذاتی طالب علمی کے زمانے میں ہی کھلنے لگے تھے اور پھر ساری دنیا پر روشن ہو گئے، انھوں نے اپنے گرد و پیش کا اچھی طرح مطالعہ کیا تھا اور ماضی کی ان تمام قدروں کو دل میں جگہ دی تھی جو قابل تحسین اور لائق ستائش تھیں۔ جب انھوں نے ہوش سنبھالا تو ہندستان مکمل طور پر غلامی کی زنجیروں میں جکڑ چکا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی میں ناکامی سے ملک کے عوام انگریزوں کے ظلم اور بربریت کا بری طرح شکار تھے۔ سیاسی طور پر تو ہندستان بالکل بے بس تھا ہی ساتھ ہی یہاں کا سماجی، تہذیبی، تعلیمی و معاشی نظام بھی درہم برہم تھا، سیاست، سماج اور معاشرت و تہذیب کے میدانوں میں نئی راہیں نکالی جا رہی تھیں اور ہر شخص بدلتے ہوئے ان حالات کے تقاضوں کی زد میں تھا۔ گاندھی جی منفرد ہوش و خرد کے مالک تھے اور مسلسل جد و جہد کے قائل۔ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد جب انھیں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے لندن بھیجا گیا اور وہاں سے وہ بیرسٹر بن کر ہندستان واپس آئے تو انھیں وطن کی غلامی اور اپنے ہم وطنوں کے دکھ درد کا شدت سے احساس ہوا۔ انھیں دنوں وہ ایک مقدمے کی پیروی کے سلسلے میں جنوبی افریقہ گئے، یہاں بھی انھوں نے اسی طرح کے حالات دیکھے۔ جنوبی افریقہ کی حکومت ہندستانیوں کے ساتھ بہت برا برتاؤ کرتی تھی۔ انھیں بہت سی ذلت آمیز پابندیوں کے ساتھ اس حکومت میں رہنا پڑتا تھا۔ خود گاندھی جی کو بھی کئی بار ان پابندیوں کی وجہ سے ذلت اٹھانی پڑی تھی۔ ہندستانیوں کے ساتھ حکومت کے اس برتاؤ پر گاندھی جی نے ستیہ گرہ کی تحریک شروع کی اور انتہائی تحمل اور بردباری سے نامساعد حالات کا مقابلہ کیا۔

جنوبی افریقہ میں اپنی تحریک کو کامیابی سے چلانے کے بعد گاندھی جی ۱۹۱۵ء میں مستقل طور پر ہندستان واپس آگئے۔ یہ پہلی جنگ عظیم کا زمانہ تھا، گاندھی جی نے خاموشی سے حالات کا مطالعہ کیا۔ ملک کے عوام غیر ملکی حکومت کی وعدہ خلافیوں اور ظلم و جبر سے بہت پریشان تھے۔ ان میں غلامی سے نجات حاصل کرنے کا جذبہ زور پکڑتا جا رہا تھا۔ گاندھی جی کے ہندستان آنے سے پہلے ہی ایک سیاسی رہنما اور سماجی مصلح کی حیثیت سے ان کی شہرت یہاں پہنچ چکی تھی۔ عوام ان کی رہنمائی میں آزادی کی جنگ لڑنے کے لیے بیتاب تھے۔ چنانچہ گاندھی جی کی ہدایت قیادت میں بہت سی تحریکیں شروع ہوئیں اور ہر تحریک انگریزی حکومت کی بنیاد کھوکھلی کرتی گئی۔

گاندھی جی کا سب سے موثر ہتھیار عدم تشدد کا فلسفہ تھا۔ انھوں نے ہر محاذ پر اپنے اسی ہتھیار سے کام لیا۔ ظلم کا مقابلہ مظلومی اور تشدد کا مقابلہ عدم تشدد سے کیا۔ عوام کو بھرپور اعتماد تھا کہ انھوں نے ملک کی آزادی کا جو خواب دیکھا ہے گاندھی جی اس خواب کو حقیقت میں بدل دینے کی زبردست صلاحیت کے مالک ہیں، چنانچہ آزادی کے خواب کو حقیقت میں بدلنے کے لیے گاندھی جی نے دنیا کی سب سے بڑی اور طاقتور سامراجی قوت سے ٹکر لی اور عوام کو متحد کر کے ایسی بے نظیر سیاسی جنگ لڑی کہ انگریزی حکومت کا کبھی غروب نہ ہونے والا آفتاب، ہندستان میں ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ انھوں نے تشدد، طاقت، قوت اور خون خرابے کے بغیر ہندستان کو دو سو برس کی غلامی سے آزادی دلائی اور آزادی کا سورج عوام کے لیے نئی امنگوں اور نئے حوصلوں کا اجالا لے کر طلوع ہوا۔

حصول آزادی گاندھی جی کے میدان عمل کا صرف پہلا قدم تھا،

اس کامیابی سے انھوں نے یہ بات ثابت کر دی کہ جب کوئی قوم محبت، مساوات اور آپسی اتحاد کی طاقت کے ساتھ مادرِ وطن کو غلامی سے نجات دلانے کے لیے کھڑی ہو جاتی ہے تو بڑی سے بڑی طاقتور حکومت بھی اور کمزور مگر متحد انسانوں کے سامنے بیکار ہو کر رہ جاتی ہے۔ گاندھی جی نے ایک ایسے آزاد ہندستان کا تصور کیا تھا جس میں سب برابر ہوں، جہاں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی اپنے اور پرائے کی اصطلاحوں کا چلن ہی نہ ہو۔ وہ ہمیشہ آپسی اتحاد اور مذہبی رواداری پر زور دیتے تھے۔ انھوں نے لوگوں کو تلقین کرتے ہوئے کہا:

"ہم سب ہندوؤں، مسلمانوں، پارسیوں، سکھوں اور عیسائیوں کو بھائی بھائی اور ہندستانی بن کر رہنا چاہیے اور یہ عہد کرنا چاہیے کہ ہم جئیں گے تو مادرِ وطن کے لیے اور مریں گے تو مادرِ وطن کے لیے، ہمارے دل میں یہ جذبہ ہونا چاہیے کہ ہم سگے بھائیوں کی طرح رہیں۔ چاہے ہمارے عقیدے مختلف ہوں، پھر بھی ہم متحد ہو کر رہیں، جیسے ایک درخت پر بے شمار پتیاں ہوتی ہیں۔"

گاندھی جی نے ہندستانی عوام کے نصب العین اور سیاسی امنگوں کو ایک معین شکل، مقصدیت اور سمت عطا کی تھی، ایسی ہستی کی عظمت سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن ان کی بڑائی انکساری، تحمل، عفوودرگذر اور تزکیۂ نفس سے عبارت تھی، انھیں ہندستان ہی نہیں دنیا کے عظیم ترین رہنماؤں میں ایک اہم اور ممتاز مقام حاصل ہے۔ سیاسی اور سماجی میدان میں آج تک ساری دنیا میں ایک آدمی بھی ایسا نظر نہیں آتا جو گاندھی جی کے عزم و ایثار، شخصیت کی پاکیزگی، وطن پرستی، قومی جذبہ اور اخلاق و کردار کے اعتبار سے ان کی برابری کر سکے۔

گاندھی جی کی قیادت میں وطن کے جن سپوتوں نے اپنی بے نظیر قربانیوں اور لرزہ خیز آزمائشوں کی بدولت آزادی حاصل کی تھی، حصولِ آزادی کے بعد انھیں کی رہنمائی میں وہ ملک کی تعمیر و ترقی کی جدوجہد میں لگ گئے۔ گاندھی جی نے عوام کو بتایا کہ صرف اقتدار بدل جانے سے ہماری آزادی کا مقصد پورا نہیں ہوا بلکہ محنت اور جانفشانی کا دور تو اب شروع ہوا ہے۔ اب بھی اسی اتحاد و مساوات، جرأت و ہمت اور خلوصِ نیت کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت ہے جس سے آزادی کی جنگ لڑی گئی تھی تاکہ عوام میں خود اعتمادی پیدا ہو۔ وہ اپنے قومی نصب العین کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھیں۔ اپنے مفاد کی خاطر کبھی قومی مفاد کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کریں۔ فرقہ پرستی، تشدد، طبقاتی کش مکش اور فضول جھگڑوں کو آزاد ہندستان سے ختم کرنے کے لیے اپنے آپ کو منظم کریں تاکہ آزادی کی سچی خوشی اور اس کی برکتیں ہر ہندستانی تک پہنچ سکیں، گاندھی جی نے کہا تھا:

"سیاسی آزادی کے معنی حقیقی آزادی کے نہیں ہیں جب تک اقتدار کو عام آدمیوں کی خوشحالی اور فلاح کے لیے اس طرح نہ استعمال کیا جائے کہ دور گاؤں میں رہنے والا غریب اور پچھڑے طبقے کا آدمی بھی یہ محسوس کرے کہ وہ آزاد ہو گیا ہے، تب تک ملک اور قوم کے آزاد ہونے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔"

لیکن آج کا ہندستان اُس ہندستان سے مختلف ہوتا جا رہا ہے جس کا خواب گاندھی جی نے دیکھا تھا۔ انھوں نے تو ایک ایسے سماج کی داغ بیل ڈالی تھی جس میں جمہوری سوشلزم پر عمل کیا جاتا، جس کے لیے گاندھی جی چاہتے تھے کہ ملک میں آئندہ صرف وہی لوگ برسرِ اقتدار آئیں جو خدا ترس، دیانت دار اور خدمتِ وطن کے جذبہ سے سرشار ہوں۔ ایسے لوگ جن میں مادرِ وطن اور نوعِ انسانی کی محبت کا جذبہ موجزن ہو۔ جو ہندستان کو متحد رکھنے کے لیے اتحاد و یکجہتی کی پرخلوص کوششیں جاری رکھیں۔ گاندھی جی نے ایسے سوشلزم کی تعریف ان لفظوں میں کی تھی:

"سوشلزم ایک خوبصورت لفظ ہے، جہاں تک مجھے علم ہے سوشلزم میں سماج کے تمام ارکان برابر ہوتے ہیں۔ نہ کوئی چھوٹا نہ بڑا۔ انسان کے جسم میں سر اس لیے بلند نہیں ہے کہ وہ جسم کا اوپری حصہ ہے اور نہ ایڑی اس وجہ سے نیچی اور چھوٹی ہے کہ وہ زمین چھوتی ہے۔ جس طرح جسم کا ہر حصہ برابر ہے اسی طرح سماج کے تمام ارکان بھی برابر ہیں اور یہی سوشلزم ہے۔"

اسی طرح گاندھی جی چاہتے تھے کہ لوگ جمہوریت کے تقاضوں اور ذمہ داریوں کی طرف سے لاپرواہی اور غفلت نہ برتیں ورنہ مفاد پرستوں اور وطن دشمنوں کی سازشیں اور عیارانہ کوششیں فرقہ واریت اور تشدد کو جنم دے کر ملک میں بدنظمی کی کیفیت کو جنم دے سکتی ہیں جس سے ترقی کی رفتار میں رکاوٹیں آجائیں گی اور اس کی سمت اور منزل ہی بدل جائے گی۔ انھوں نے جمہوریت کو طرزِ حکومت کے بجائے طرزِ حیات کی صورت اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہوئے کہا تھا:

"اگر تعصب، جہالت اور قدامت پرستی کو جمہوریت پر حاوی ہونے دیا گیا تو نراج کی کیفیت پیدا ہو جائے گی اور جمہوری نظام تباہ ہو جائے گا۔ جمہوری نظام کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ افراد اجتماعی فیصلوں کا احترام کریں۔ اگر ہر فرد قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر انفرادی فیصلے کرنے لگے تو قانون کی عملداری ختم ہو جائے گی۔ موقع پرستی اور اصولوں پر سمجھوتے بازی جمہوریت کو زخمی کر دے گی۔"

گاندھی جی کاروانِ آزادی کے رہبر ہی نہیں بلکہ اس دور کے سب سے بڑے انسان تھے۔ انھوں نے ہندستان کو امن و اخوت کی جنت بنانے میں اپنی جان تک قربان کر دی تھی۔ ان کی ہستی بلند پایہ اور ہمہ صفات تھی۔ گاندھی جی نے سماجی، تعلیمی اور اقتصادی میدان میں بھی ہندستان میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ ان کی سیاسی بصیرت، معاملہ فہمی، تدبر اور تعلیمات نے انھیں لازوال شہرت کا مالک بنا دیا ہے۔

گاندھی جی کی اخلاقی قوت، سادگی اور رواداری، اتحاد و اتفاق کی تعلیم، ان کے جذبۂ صداقت، جمہوریت اور مذہب کے لیے ان کے خیالات اہنسا اور سچائی، اقلیتوں کے حقوق اور آپسی محبت و مساوات کے لیے ان کی ہدایات کی اہمیت اور ضرورت آج کے ہندستان کو اس سے کہیں زیادہ ہے، جتنی خود گاندھی جی کی زندگی میں تھی۔ □□

"زراعت اور دستکاری ہماری قومی جسم کے دو پھیپھڑے ہیں ان کو ہر قیمت پر ضائع ہونے سے بچانا چاہیے۔"
—— مہاتما گاندھی

یقین نہیں آتا

صفحہ ۳۰ کا بقیہ

وہ سانحہ تو ٹل گیا، لیکن بہت دیر تک مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ اس پردیس میں محض مہاتما گاندھی کے دیش کا باشندہ ہونے کی وجہ سے میری جان بچ گئی۔

اور جب مجھے یقین آگیا کہ میں زندہ ہوں تو مجھے احساس ہوا کہ کسی دن اس مفکر کی کہی ہوئی بات بھی غلط ثابت ہو گی جس نے کہا تھا کہ کچھ عرصے بعد لوگوں کو یہ یقین ہی نہیں آئے گا کہ موہن داس کرم چند نام کا کوئی شخص کبھی اس دھرتی پر آیا تھا۔

میرا خیال ہے کہ دنیا کو یقین کرنا پڑے گا۔

باپو

ہزاروں لوگ جیتے ہیں ہزاروں لوگ مرتے ہیں
مگر جس نے غلامی کی ہر اک زنجیر کو توڑا
وہ جس نے ہند کی مٹی کو بھی سونا بنا ڈالا
جسے ہندوستاں کے ذرّے ذرّے سے محبت تھی
وہ جس نے پاٹھ پڑھوایا اہنسا کا اخوت کا
وہ جس نے ایکتا کی خاطر اپنی جان تک دے دی
وہ جس کا نام گاندھی تھا جسے ہم باپو کہتے ہیں
وہ ہرگز مر نہیں سکتا، ہمارے دل میں زندہ ہے
وہ اب بھی یاد آتا ہے، وہ کل بھی یاد آئے گا

طارق متین
ایڈیٹر علم و ادب، لکھمنیا، بیگو سرائے
(بہار) ۸۵۱۲۱۱

ڈاکٹر کاظم علی خاں
8/10-27 - جاپلنگ روڈ، لکھنؤ

اُردو شاعری کے آئینے میں

گاندھیائی تصوّرات کی جلوہ گری

اُردو زبان ہندستان میں مختلف مذاہب و مسالک کے میل ملاپ سے پیدا ہونے والی اُس مشترکہ تہذیب کی شاندار یادگار ہے جس کی داستان جواہرلال نہرو کی کتاب "دی ڈسکوری آف انڈیا" میں مؤثر و مفصّل بیان کی گئی ہے[1]: ع

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

اردو زبان نے ہندستان کی گنگا جمنی تہذیب کی آبیاری کرکے ملک میں گاندھی اور نہرو کے پسندیدہ قومی یک جہتی کے رجحان کو پروان چڑھانے اور اسے تقویت و توانائی سے ہم کنار کرانے میں جو شاندار کردار ادا کیا ہے[1] اس سے انکار کرنا دوپہر میں چمکتے سورج کی روشنی سے انکار کرنے کے "فعل فضول" کے مترادف ہوگا جسے انگریزی میں

کہتے ہیں کہ جس طرح لفظ "اُردو" الف، رے، دال نیز واو جیسے چار بے جوڑ اور الگ الگ حرفوں کے ملاپ سے بنا ہے اسی طرح اردو زبان بھی ہندستان میں مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے میل ملاپ سے بنی ہے۔ لفظ اُردو جن چار حروف کے ملاپ سے بنا ہے وہ ہمارے نزدیک اُردو زبان کے درج ذیل چار بنیادی اوصاف کے آئینہ دار ہیں:

(۱) الف = اخوّت (بھائی چارہ) ا

(۲) رے = رواداری (تمام مذاہب کا احترام اور ان دھرموں کے ماننے والوں سے محبت) ر

(۳) دال = دوستی (انفرادی سطح کے ساتھ ساتھ اجتماعی و عالمی پیمانے کی انسان دوستی) د

(۴) واو = وحدت (ایکتا) و

اُردو

اُردو زبان ہمارے نزدیک ہندستان میں بسنے والے مختلف مذاہب و مسالک کے لوگوں کے درمیان "اخوّت"، "رواداری"، "دوستی" اور "وحدت" کی ایک شاندار اور گراں قیمت علامت ہے۔ اردو زبان کو "ہم" نے مل کر بنایا ہے۔ یہاں لفظ "ہم" کا املا بھی توجہ کا طالب ہے۔ یعنی لفظ "ہم" جن دو حروف کے ملاپ سے بنا ہے ان میں "ہ" اور "م" سے مراد ہیں ہندستان میں بسنے والے "ہندو" اور "مسلمان" جن کے درمیان باہمی اخوّت، رواداری، دوستی اور وحدت سے ہی اردو زبان بنی اور جن کے درمیان اردو زبان آج بھی اخوّت، رواداری، دوستی اور وحدت کو بنائے ہوئے ہے۔ گویا اردو زبان ہندستان میں قومی یک جہتی کا پھل بھی ہے اور بیج بھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ اردو ماضی میں قومی یک جہتی کا نتیجہ رہی ہے اور حال و مستقبل کے لیے اردو اس قومی یک جہتی اور "جذباتی ہم آہنگی" کا سبب بننے کی پوری پوری صلاحیت کی مالک ہے جو ملک کے موجودہ حالات میں وقت کا اہم ترین تقاضہ ہے اور ہمارے نزدیک وہ خوش آئند وقت بھی دور نہیں جب مغربی بنگال سے پنجاب اور کشمیر سے کنیاکماری تک گیسوئے اُردو کے رشتے میں بندھ کر ہندستانی عوام کے دلوں اور زبانوں پر میر کا یہ شعر سکۂ رائج الوقت بن کر جاری ہوگا کہ[2]

ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میر ہوئے
اُس کی زُلفوں کے سب اسیر ہوئے

ہندستان میں اردو زبان کی آبیاری میں اتحاد و اتفاق، وسیع القلبی و رواداری نیز قومی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی کے جن عوامل و محرکات کی کارفرمائی شامل رہی ہے یہ انھیں کا ثمرہ ہے کہ اردو زبان کے "لسانی شجر" میں جو "ادبی ثمر" آئے وہ بھی قومی یک جہتی، اتحاد اور رواداری کے اوصاف سے رچے بسے رہے ہیں کیونکہ درخت برگ و بار

لانے پر جو پھل دیتا ہے ان میں اُس کے بیج، مٹی اور پانی کی تاثیر بہرحال شامل رہتی ہے۔ ہندوستان کی گنگا جمنی مشترکہ تہذیب کی گود میں پروان چڑھنے والی اردو شاعری نے ماضی سے حال تک اپنی تاریخ کے مختلف ادوار میں قومی یک جہتی اور ہندو مسلم میل ملاپ جیسے گاندھی جی کے پسندیدہ اقدار کو ہندوستانی عوام میں مقبول بنانے کے لیے جو بھی کوششیں کی ہیں ان سے اردو شاعری کا دامن چھلک رہا ہے۔ یہاں اردو شاعری کے قدیم و جدید اثاثے سے بہ طور مثال صرف چند درجن نمونے پیش کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے ؎

کوئی تسبیح اور زنار کے جھگڑے میں مت بولو
کہ آخر ایک ہیں آپس میں دونوں بیچ رشتہ ہے — تاجی

وہی اک ریسماں ہے جس کو ہم تم تار کہتے ہیں
کہیں تسبیح کا رشتہ، کہیں زنار کہتے ہیں — ٹیک چند بہار

غرض کفر سے ہے، نہ کچھ دیں سے مطلب
تماشائے دیر و حرم دیکھتے ہیں — مرزا محمد رفیع سودا

اُس کے فروغِ حسن سے جھمکے ہے سب میں نور
شمعِ حرم ہو یا کہ دیا سومنات کا — میر تقی میر

شیخ نے مسجد بنا، مسمار بُت خانہ کیا
تب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا — میر اعلیٰ

نہیں کعبہ و دیر پر منحصر کچھ
کہ ایسے یہاں کارخانے بہت ہیں — مصحفی

اسرار سے کعبے کے، خبر شیخ جو رکھتا
بت خانے سے ہرگز اُسے انکار نہ ہوتا — میر سوز

میں نہ فریادی بتوں کا ہوں خدا کے سامنے
آشنا کا کیا گلہ نا آشنا کے سامنے — ناسخ لکھنوی

بُتوں سے محبت نہیں مجھ کو از خود
کہ ہوتا ہے وہ جو خدا چاہتا ہے — ناسخ لکھنوی

شریفِ کعبہ کو کعبہ مبارک ہم تو اے آتش
بتوں کے گھورنے کو جاتے ہیں دیرِ برہمن میں — خواجہ آتش

کیا بنایا ہے بتوں نے مجھ کو نام رکھا ہے مسلماں میرا — صبا لکھنوی

ایماں مجھے روکے ہے، جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے — غالب

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی — غالب

خدا کا قہر، بتوں کا عتاب رہتا ہے
اس ایک جان پہ کیا کیا عذاب رہتا ہے — صبا لکھنوی

پاسِ دیں کفر میں بھی تھا مرغوب
بُت کو پوجا خدا خدا کر کے — رند لکھنوی

لائے اس بُت کو التجا کر کے
کفر ٹوٹا خُدا خُدا کر کے — پنڈت دیا شنکر نسیم

تجلیِ قد و عارض ہے جلوہ گر ہر جا
حرم میں شمع ہے وہ، دیرِ برہمن میں چراغ — برق لکھنوی

اردو شاعری کے نگارخانے میں اخوت، رواداری، دوستی اور وحدت کی جو انبار در انبار تصویریں جلوہ گر ملتی ہیں یہ ان کا عشرِ عشیر بھی نہیں۔ مذہبی رواداری، ہندو مُسلم ایکتا اور مختلف مذاہب کے ماننے والوں کو میل ملاپ سے ہم کنار ہونے کا درس دینے والی اردو شاعری گاندھی جی کے اِن عزیز اقدار کا پرچار اس وقت سے کر رہی ہے جب خود گاندھی عالمِ ارواح کے نواسی تھے اور وہ اس سنسار کے باسی بھی نہ بنے تھے۔ گاندھی جی نے جب ۲؍ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو جنم لیا تو اردو شاعری اس سے بہت پہلے سے ہندستان کے باسیوں کو میل ملاپ کے گیت سنا رہی تھی۔ ان حقائق کی بنیاد پر ہمارا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اُردو شاعری قومی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی کے جن اقدار کی قرنوں سے علمبردار رہی ہے۔ گاندھی جی نے انھیں قدروں کی ہمنوائی کر کے اردو شاعری کی قلمرو میں بھی وقار و اعتبار حاصل کیا ہے۔

اردو شاعری میں گاندھی جی کی مقبولیت کی تفصیل آگے اپنے مقام پر آئے گی لیکن اس سے قبل گاندھی جی کے ہمعصر اردو شاعروں کے کلام سے قومی ایکتا کی مثالوں کا جائزہ لینا ضروری ہے تاکہ ہماری اس بات کا اثبات ہو سکے کہ اردو شاعری ماضی سے حال تک ہندو مسلم میل ملاپ کا پرچار کرتی رہی ہے ؎

ان بتوں کو مظہرِ ذاتِ خدا کہتا ہوں میں
جو نہ کہنا تھا وہی اب برملا کہتا ہوں میں

اُس بُت کے دل میں گھر جو کیا انکسار سے
مسجد ہماری، دیر میں تعمیر ہو گئی — کیفؔ لکھنوی

خبر کیا کس نے شیخ و برہمن میں جھگڑے ڈالے ہیں
مگر سب بزمِ رنداں میں تمھارا نام لیتے ہیں — جلالؔ لکھنوی

کہتا ہوں میں ہندو و مسلمان سے یہی
اپنی اپنی روش پہ تم نیک رہو — اکبر الہ آبادی

لاٹھی ہے ہوائے دہر، پانی بن جاؤ
موجوں کی طرح لڑو، مگر ایک رہو — ″

لفظ "ہم" میں جس طرح "ہ"، "م" ہیں شیر و شکر
چاہیئے ہند و مسلماں یوں ہی مل جل کر رہیں — صفیؔ لکھنوی

"قابل افسوس ہے وہ فرقہ وارانہ فساد
ملک میں جس سے لہو کی ندیاں ہر سو بہیں[۶] — ″

اذاں دیتے ہیں بت خانے میں جا کر شانِ مومن سے
حرم میں نعرۂ ناقوس ہم ایجاد کرتے ہیں — چکبستؔ لکھنوی

ناقوس سے غرض ہے، نہ مطلب اذاں سے ہے
مجھ کو اگر ہے عشق تو ہندوستاں سے ہے[۷] — ظفر علی خاں

بتانِ ماہ رُو کے حُسن پر ایمان لایا ہوں
انھیں کو دیکھ کر ہوتی ہے اب یادِ خدا مجھ سے[۸] — حسرتؔ موہانی

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا[۹]

ہندو مسلم اتحاد پر اقبالؔ کی متعدد منظومات میں نیا شوالہ بھی ایک پر اثر و قابل ذکر نظم ہے ؎

خدا کے واسطے کلمہ بتوں کا پڑھ تو لے زاہد
پھر اختیار میں غافل، زباں رہے نہ رہے[۱۰] — امیرؔ مینائی

خالِ ابرو کو جو دیکھا تو یہ معلوم ہوا
ملکِ ہندو میں ہے کعبے کی زمیں تھوڑی سی — ″

ہوں وہ کافر کہ جھکا سجدۂ بت میں ہر دست
ابھی خالق نے بنائی تھی جبیں تھوڑی سی — ″

دیر میں کون ہے کعبے میں گزر کس کا ہے
یار کا گھر یہ اگر ہے، تو وہ گھر کس کا ہے — امیرؔ مینائی

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے — ″

نہ ہم میں اتفاق ہے اب، نہ احباب ترقی ہیں
نہ ذوقِ علم ہے دل میں، نہ پاسِ دینداری ہے[۱۱] — عزیزؔ لکھنوی

نہ تو ہندو کوئی دیکھا، نہ مسلماں دیکھا
میں نے انساں کی نظر سے سوئے انساں دیکھا — اثرؔ لکھنوی

ہندوؤں کی ابھی مالا ہے بدستور وہی
ابھی تسبیح بھی باقی ہے مسلمانوں کی — رواںؔ اناوی

ہند مظلوم ہے فریاد کناں اے مالک
جلد لے جلد خبر اپنے پریشانوں کی

علی جواد زیدی کی طویل نظم ھولی قومی اتحاد پر دل نشیں فن پارہ ہے جس سے لطف اندوز ہونے کے لیے مکمل نظم ہی پڑھنے کی ضرورت ہے۔ آٹھ صفحات کی یہ طویل نظم زیدیؔ کے مجموعۂ کلام سلسلہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ زیدیؔ تحریک آزادیِ ہند میں حصہ لینے کی پاداش میں برٹش سامراج کے ہاتھوں قید و بند کے مصائب سے بھی دو چار ہو چکے ہیں۔ ان کی قومی شاعری میں گاندھیائی تصورات کے اثرات جگہ جگہ ملتے ہیں۔ اردو شاعری میں تحریک آزادیِ ہند سے متعلق نظموں کی جمع آوری اور حفاظت کے کام میں بھی زیدیؔ پیش پیش رہے ہیں۔

سیمابؔ اکبر آبادی کی نظم ھندستان قومی شاعری کا وہ معیاری نمونہ ہے جو درسِ اتحاد سے خالی نہیں[۱۲]۔

قومی اتحاد پر نظم آزادی کا یہ شعر ملاحظہ ہو: ؎

تفرقہ پڑتا ہے جب دنیا میں رنگ و نسل کا
لے کے میں آتی ہوں پرچم انقلابِ جنگ کا[۱۳] — سردار جعفری

ہر ایک سمت سے اک آفتاب ابھرے گا
چراغِ دیر و حرم تو بجھا کے دیکھ ذرا[۱۴] — جاں نثار اختر

کیفی اعظمی کی نظم بہروپنی[۱۵] اور طویل مثنوی خانہ جنگی فرقہ پرستی پر کاری ضرب ہیں ؎

چار سُو خون چار سُو لاشیں کو بکو خون رد بر د لاشیں

ردے کشمیر سے اڑائی آب — لوٹ لی شانِ شوکتِ پنجاب
زلفِ بنگال بڑھ کے بکھرادی — صبحِ کاشی پہ دھوپ دوڑادی
عارضوں کے گلاب توڑ لیے — ماہتاب آفتاب توڑ لیے[۱۶]

اٹھو کہ نہیں وقت یہ آرام کا لوگو
دم گھٹتا ہے ناقوس کا، دامن کی ہوا دو
دیوارِ حرم گرتی ہے سنبھلے تو سنبھالو — راہی معصوم رضا
اس صبحِ فرنگی کا یہ اندھیر تو دیکھو
رہنے بھی جو پائیں گے تو صحرائیں ہیں گے
یا رام و رحیم اب سے کلیسا میں رہیں گے[۱۷]

سرزمینِ ہند پر اقوامِ عالم کے فراقؔ
قافلے بستے گئے ہندوستاں بنتا گیا — فراقؔ گورکھپوری

رباعی ؎ بیکار کی باتوں نے ابھارا ہم کو
عیسیٰ بھی محمد بھی ہے پیارا ہم کو — کالی داس گپتا رضاؔ
تقسیمِ مذاہب سے نہیں کچھ بگڑا
انساں کی تقسیم نے مارا ہم کو

مشہور شاعر نذیرؔ بنارسی کی نظم فرقہ پرستی میں فرقہ پرستی پر جو طنز کیا گیا ہے ذرا اسے بھی محسوس کیجیے ؎

طاقت ہو کسی میں تو مٹادے مری ہستی — ڈائن ہے مرا نام، لقب فرقہ پرستی
میں نے بڑی چالاکی سے اک کام کیا ہے — پہلے ہی محبت کا گلا گھونٹ دیا ہے
میں دیش کی قاتل ہوں اور سب سے بڑی ہوں — بچوں کی بھی گردن پہ چھری بن کے چلی ہوں
معصوموں کے ماں باپ کا سر میں نے لیا ہے — بچوں کو یتیمی کا شرف میں نے دیا ہے
ہندو کا لہو ہو کہ مسلماں کا لہو ہو — مطلب ہے لہو سے کسی انساں کا لہو ہو
ہر فرقے کے لوگوں کا لہو چاٹ رہی ہوں — فصلوں کی طرح سب کے گلے کاٹ رہی ہوں
جس وقت جہاں چاہوں وہاں آگ لگادوں — جس بستی کو چاہوں اسے ویرانہ بنادوں
گلشن مرے ہاتھوں یونہی تاراج رہے گا — میں زندہ رہوں گی تو مرا راج رہے گا
طاقت ہو کسی میں تو مٹادے مری ہستی — ڈائن ہے مرا نام لقب فرقہ پرستی[۱۸]

نہ میں دیر و حرم سمجھوں نہ میں عرش و ارم جانوں
جہاں سجدے کو دل جھک جائے تیرا آستاں ہوگا — بیخود موہانی

شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی کی انقلابی اور قومی شاعری اُس مذہبی تعصب اور فرقہ وارانہ منافرت کے منھ پر زوردار طمانچہ ہے جس سے گاندھی جی اپنے سفرِ حیات میں برسوں برسرِ پیکار رہے اور آخر میں اسی کا شکار ہوکر ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کی شام کو شہادت سے ہم کنار ہوئے تھے۔[۱۹] جوش ملیح آبادی نے ۱۹۴۷ء کے فرقہ وارانہ فسادات کے خلاف "ماتمِ آزادی" اور "ہندو مسلم کا متحدہ نعرہ" جیسی پرجوش نظمیں لکھ کر ملک میں فرقہ وارانہ منافرت کے عفریت پر زبردست ضرب لگائی تھی۔ جوش کے مسدس "ماتمِ آزادی" کا یہ بند ہماری اس بات پر دال ہے ؎

سِکھ نے گرو کے نام کو بٹا لگادیا — مندر کو برہمن کے چلن نے گرادیا
مسجد کو شیخ جی کی کرامت نے ڈھادیا — مجنوں نے بڑھ کے پردۂ محمل جلادیا
اک سوئے ظن کو غلغلۂ عام کردیا
مریم کو خود مسیح نے بدنام کردیا

یہ کوئی راز کی بات نہیں کہ گاندھی جی تحریکِ آزادیِ ہند کے میرِ کارواں اور قافلہ سالار تھے۔ غلام ہندستان کو بدیسی انگریزی سامراج کی بیڑیوں سے آزاد کرانا اُن کے مقاصدِ حیات کا بنیادی تصور تھا۔ دیکھنا یہ ہے کہ حصولِ آزادی کے اس اہم گاندھیائی تصور کے سلسلے میں اردو شاعری نے کیا کردار ادا کیا ہے؟ اردو شاعری میں جنگِ آزادیِ ہند کی "حکایاتِ خوں چکاں" لکھنے کی روایتِ پارینہ کے ابتدائی نقوش سرزمینِ بنگال پر ۲۳ جون ۱۷۵۷ء کو ہونے والی اس جنگِ پلاسی کے بعد سے مل چکے ہیں جس میں والیِ بنگال سراج الدولہ برٹش سامراج سے مات کھاکر ۴ جولائی ۱۷۵۷ء کو شہید کیے گئے تھے۔ سراج الدولہ کی شہادت کی خبر جب عظیم آباد کے صوبیدار راجہ رام نرائن موزوں (متوفی اگست ۱۷۶۳ء۔ تذکرۂ ماہ و سال ص ۳۶۸) کو ملی تو انھوں نے بہ گریہ وزاری فی البدیہہ یہ شعر کہہ کر پڑھا تھا ؎

غزالاں تم تو واقف ہو، کہو مجنوں کے مرنے کی
دِوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

مزاحیہ اردو مجلّے اودھ پنچ لکھنؤ نے تحریکِ آزادیِ ہند کی پُرزور ہم نوائی کے ذریعے اس تحریک کو جو زبردست تقویت پہنچائی وہ اس تحریک کی تاریخ میں ایک نئے درخشاں باب کا عنوان بنی۔ یہ رسالہ یکم جنوری ۱۸۷۷ء سے ۱۹۳۲ء تک جاری رہا تھا۔ درمیان میں یہ

رسالہ ۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۵ء تک عارضی طور پر بند رہ کر ۱۹۱۶ء سے ۱۹۳۲ء تک زندہ رہا تھا۔ اس طرح اودھ پنچ لکھنؤ نے تقریباً ۵۶ سال تک تحریکِ آزادیِ ہند کی بھرپور ہمنوائی کی تھی۔ اودھ پنچ لکھنؤ کے بانی و مدیر منشی سجاد حسین کاکوردی (زمانۂ حیات ۱۸۵۶ء تا ۲۲ جنوری ۱۹۱۵ء) تحریکِ آزادیِ ہند کے حامی انڈین نیشنل کانگریس سے ۱۸۸۶ء سے اپنی وفات (۱۹۱۵ء) تک وابستہ رہے تھے۔ مدیر اودھ پنچ لکھنؤ ۱۸۸۶ء میں جب کانگریس سے وابستہ ہوئے تو اس وقت موہن داس کرم چند گاندھی (متولد ۲ اکتوبر ۱۸۶۹ء) اپنے سفرِ حیات کی ٹین ایج (Teen Age) کی منزل میں میٹرک کے نوخیز طالب علم تھے اور انھوں نے اس کے ۱۴ سال بعد ۱۹۰۱ء میں پہلی بار کانگریس کے اجلاس کلکتہ میں شرکت کی تھی۔ اودھ پنچ لکھنؤ نے اردو نثر و نظم دونوں ہی کے ذریعہ برٹش سامراج اور مغرب زدگی پر طنز و ظرافت کے وار کر کے ہندستان میں "عوامی بیداری" کی لہر کو جاری و برقرار رکھ کر اسے "غنودگی اور خوابیدگی" سے ہم کنار ہونے سے محفوظ رکھا تھا۔ معاونین اودھ پنچ لکھنؤ کی طویل فہرست کے چند قابلِ ذکر اردو شاعروں میں یہ نام شامل تھے۔

۱۔ اکبر الہ آبادی (۱۸۴۶ء تا ستمبر ۱۹۲۱ء) ۲۔ پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی (۱۸۸۲ء تا ۱۹۲۶ء) ۳۔ مرزا محمد مرتضیٰ عاشق لکھنوی عرف مچھو بیگ ستم ظریف (وفات ۱۸۹۲ء۔ تذکرۂ ماہ و سال ص ۲۵۹) ۴۔ پنڈت تربھون ناتھ ہجر (۱۸۵۳ء تا مارچ ۱۸۹۲ء۔ بہ حوالہ گلدستۂ پنچ ص ۱۵۲) ۵۔ نواب سید محمد آزاد (۱۸۴۲ء تا ۱۱ دسمبر ۱۹۱۶ء۔ تذکرۂ ماہ و سال ص ۶۶) اور ۶۔ جوالا پرشاد برق (۲۱ اکتوبر ۱۸۶۳ء تا ۲۶ مارچ ۱۹۱۱ء۔ گلدستہ پنچ ص ۱۵۲)۔ معاونین اودھ پنچ لکھنؤ کے ان مزاحیہ اردو شاعروں نے اپنے خونِ جگر سے ہماری قومی شاعری کی آبیاری کی اور اردو شعر و سخن کو سُرخرو کر کے اُسے جو آب و تاب بخشی اسے کسی طرح فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

مزاحیہ اردو شاعر اکبر الہ آبادی نے قومی اور سیاسی موضوعات پر جس بہتات سے منظومات لکھی ہیں انھیں مقالے کے حصار و حدود کی "لکشمن ریکھا" میں محصور و محدود کرنے سے ہم قاصر ہیں۔ اکبر الہ آبادی کی قومی اور سیاسی شاعری نے گاندھی جی اور ان کے تصوّرات کی جیسی اور جتنی ہمنوائی کی ہے اس کا ذکر مناسب مقام پر آگے کیا گیا ہے۔

اُردو شاعروں میں مولانا شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء تا ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء۔ تذکرۂ ماہ و سال ص ۲۱۷) نے برٹش سرکار کی عوام مخالف روش کے خلاف اپنی قومی نظموں میں اظہارِ خیال کرنے کی روایت جاری رکھی تھی جس کے ثبوت ان کی متعدد نظموں میں موجود ہیں۔ (رک۔ قومی شاعری کے سو سال ص ص ۱۴۳ تا ۱۴۹)۔ اُردو کے صاحبِ طرز نثر نگار، شاعر اور تحریکِ آزادیِ ہند کے صفِ اوّل کے مجاہد مولانا ابو الکلام آزاد (۱۸۸۸ء تا ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء۔ تذکرۂ ماہ و سال ص ۶۶) اس تحریک کی رہنمائی اور گاندھی جی کی ہمنوائی کرنے کی پاداش میں جس طرح بار بار قیدِ فرنگ سے دوچار ہوتے رہے تھے اس سے کون باخبر نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اردو کے اس شاعر و نثر نگار نے اس کام میں اپنی نظموں کے بجائے نثری تحریروں اور شعلہ نوا تقریروں سے کام لیا تھا۔ آزاد کے رسائل و جرائد نے بھی ہماری آزادی کی تحریک میں نئی روح پھونکی تھی۔ مولانا حسرت موہانی (وفات ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء) بھی اردو کے ان شاعروں اور نثر نگاروں کی صف میں شامل ہیں جو تحریکِ آزادیِ ہند میں سرگرم حصہ لے کر بار بار قیدِ فرنگ کی سختیاں برداشت کرنے میں کسی پس و پیش کے بغیر پیش پیش رہے تھے۔ حسرت موہانی کی غزلیہ اردو شاعری میں کم ہی سہی لیکن ان کی بعض نظموں میں تحریکِ آزادی کی ہمنوائی یا اس تحریک کے تلک کے ایسے بعض رہنماؤں کی تعریف و توصیف مل جاتی ہے (قومی شاعری کے سو سال ص ص ۲۰۱ تا ۲۰۳)

اُردو شعر و سخن میں قومی شاعری کے سربرآوردہ نقیبوں میں برج نرائن چکبست لکھنوی کا نام اور ادبی کام جس بلند مرتبہ و مقام کا حامل ہے اس سے کون باخبر نہیں۔ چکبست کی قومی شاعری میں، ہیرانِ تحریکِ آزادیِ ہند کی مدح سرائی، حبّ الوطنی کے نغمے، سماج سدھار کے گیت اور برٹش سرکار کے خلاف جدوجہد کی وہ گونج سُنی جا سکتی ہے جو گاندھیائی تصوّرات سے پوری طرح ہم آہنگ رہی ہے۔ ہماری کتاب مقالات و نثریات (ص ص ۲۸ تا ۲۹) میں چکبست کی قومی شاعری میں شامل ۱۸۹۴ء تا ۱۹۲۰ء کی اہم منظومات کی نشاندہی کی جا چکی ہے جسے دہرانا تحصیلِ حاصل ہے۔ چکبست کی ۱۹۱۴ء کی نظم فریادِ قوم کے متعلق ان کے مجموعۂ کلام صُبحِ وطن (طبع ۱۹۲۶ء ص ۴۳) میں یہ عبارت ملتی ہے:۔

"یہ نظم اُس زمانے میں تصنیف کی گئی ہے جب کہ دوافتادگان وطن جنوبی افریقہ میں ٹرینسوال کے حکام کی غیر منصفانہ کاروائیوں سے عاجز تھے اور مہاتما کرم چند گاندھی ان غریب الوطنوں کی حالت درست کرنے کی کوشش میں دل وجان سے مصروف تھے۔ یہ نظم ایک رسالے کی صورت میں شائع کی گئی تھی اور مہاتما گاندھی کا نام بصورتِ ذیل زیب عنوان کیا گیا تھا۔

بہ خدمت فدائے قوم مسٹر کرم چند گاندھی

نثار ہے دلِ شاعر ترے قرینے پر
کہاں ہے نام ترا نقش اس نگینے پر چکبست لکھنوی "

چکبست لکھنوی کی ۱۹۱۷ء کی ایک غزل کے اس شعر میں گاندھی جی کو قومی تحریک پر یوں نذرانۂ تبریک پیش کیا گیا ہے: ؎

دم سے گاندھی کے رہے شورِ وفا بستی میں
قیس جنگل میں رہے کوہ پہ فرہاد رہے (صبحِ وطن ص ۱۳۰)

گاندھی جی کی طرح چکبست لکھنوی بھی اُس وطن دوست اور حریت پسند جماعت کانگریس کے ہمنوا تھے جسے گاندھی جی کی فعّال قیادت کا فخر حاصل رہا تھا۔ کالی داس گپتا رضا نے کشمیر درپن جنوری ۱۹۰۶ء (ص ۱) کے حوالے سے انڈین نیشنل کانگریس کے اکیسویں اجلاس منعقدہ ۲۷ دسمبر ۱۹۰۵ء (بہ مقامِ بنارس) کے بارے میں چکبست لکھنوی کے درج ذیل منظوم تاثرات پیش کیے ہیں ؎

عزتو شرتِ اہلِ سخن ہے یہ بزم گلہائے مراد کا چمن ہے یہ بزم
پُر جوش، یہ حبِّ قوم ماشاء اللہ ہاں انجمنِ نازِ وطن ہے یہ بزم

(گاندھی جی کی رہنمائی میں جاری رہنے والی حصولِ آزادیٔ ہند کی تحریک نے جوشؔ ملیح آبادی کی قومی شاعری سے جیسی توانائی پائی تھی اس پر اس مقالے میں آگے روشنی ڈالی گئی ہے)

عدمِ تشدد، امن وآشتی، مساوات اور حُبّ الوطنی جیسے گاندھیائی تصورات کی پراثر ترجمانی کرنے اور ان قدروں کو عوام میں مقبول بنانے کا کام انجام دینے میں بھی اُردو شاعری پیش پیش رہی ہے۔ درجِ ذیل اُردو نظمیں ہمارے اِس دعوے کی تائید کرتی ہیں۔

۱۔ نظم سناٹا۔ سردار جعفری ۲۔ نظم خنجروں کی روشنی۔ سردار جعفری ۳۔ نظم نیلا پرچم۔ وامق جونپوری (ولادت ۲۳ فروری ۱۹۱۳ء۔ تذکرۂ ماہ وسال ص ۴۰۲) ۴۔ نظم زمین۔ وامق جونپوری ۵۔ نظم شہرِ آذر۔ تیغ الہ آبادی (مصطفیٰ زیدی) بہ حوالہ ڈاکٹر مجاور حسین ص ص ۲۱۴ تا ۲۲۲ ۶۔ مسدس اچھوتوں سے نفرت۔ مہاراج بہادر برقؔ دہلوی (۳ ۱۸۸۴ء تا ۹ فروری ۱۹۳۶ء۔ تذکرۂ ماہ وسال ص ۷۹) ۷۔ مسدس اہلِ ھند۔ برقؔ دہلوی (برقؔ کی دونوں نظمیں قومی شاعری کے سو سال ص ص ۲۳۲ تا ۲۳۵ میں شامل ہیں ...) ۸۔ غزل نما نظم سرفروشی کی تمنا۔ پنڈت رام پرشاد بسملؔ شاہجہانپوری (جنھوں نے ۱۹ دسمبر ۱۹۲۷ء کو مقدمۂ بغاوت کاکوری میں گورکھپور جیل میں پھانسی کی سزا پائی۔ تذکرۂ ماہ وسال ص ۸۱) اس نظم کے دو اشعار ملاحظہ ہوں ؎

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے
وقت آنے دے بتا دیں گے تجھے اے آسماں ہم ابھی سے کیا بتائیں کیا ہمارے دل میں ہے

ہند و پاک جنگ (۱۹۶۵ء) پر اپنی ایک نظم میں سردار جعفری نے پاکستان کو امن کا جو یادگار پیغام دیا تھا اس کے یہ اشعار حاضر ہیں ؎

مگر تمھاری نگاہوں کا طور ہے کچھ اور یہ بہکے بہکے قدم اٹھ رہے ہیں کس جانب
ادب سے آؤ کہ غالبؔ کی سرزمیں ہے یہ نظام و چشتی و کاکی کے آستانے ہیں
جھکا دو تیغ کے سر بارگاہِ رحمت میں ہمارے دل میں رفاقت بھی اور پیار بھی ہے
اگرچہ کہنے کو دل چاہتا نہیں لیکن جوابِ اہلِ ہوس تیغ آبدار بھی ہے

بہ حوالہ ڈاکٹر مجاور حسین صفحہ ۲۴۳، ۲۴۴

حصولِ آزادی سے قبل تقسیمِ ہند و تشکیلِ پاکستان کی تحریک کی گاندھی جی نے جتنی سخت مخالفت کی تھی وہ کوئی راز سربستہ نہیں۔ اردو شاعر شمیم کرہانی (۸ جون ۱۹۱۳ء ۱۹ مارچ ۱۹۷۵ء۔ تذکرۂ ماہ وسال ص ۲۲۵) کی نظم "پاکستان چاہنے والوں سے" مطالبۂ پاکستان کی پُرزور مخالفت کرکے جس طرح گاندھیائی تصورات کی ہمنوائی کرتی ہے وہ "عیاں را چہ بیاں" کی مثال ہے۔ اس نظم کے منتخب اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہم کو بتلاؤ تو کیا مطلب ہے پاکستان کا
جس جگہ اس وقت ہیں مُسلم نجس ہے کیا وہ جا!

وہ ہمارے پیشوا جو فرد تھے ایمان میں
اُن کے مدفن بن گئے کیا غیر پاکستان میں؟
نیشِ تہمت سے ترے، چشتی کا سینہ چاک ہے
جلد بتلا کیا زمیں اجمیر کی ناپاک ہے؟
کُفر کی وادی میں ایماں کا نگینہ کھو گیا
ہائے کیا خاکِ نجس میں شاہ مینا سو گیا؟
دین کا مخدوم جو کلیر کی آبادی میں ہے
آہ اُس کا آستانہ کیا نجس وادی میں ہے؟
آہ اس پاکیزہ گنگا کو نجس کہتا ہے تو
جس کے پانی سے کیا مُسلم شہیدوں نے وضو
گر وطن میں چھوٹی چھوٹی سی ریاست بن گئی
پھر تو یہ سمجھو کہ انگریزی حکومت بن گئی
پارہ پارہ ہو کے یورپ آ گیا ہے زیرِ دام
ہر ریاست ہے عرب کی شاہِ لندن کی غلام
کیا یہ مطلب ہے کہ ہم محرومِ آزادی رہیں
منقسم ہو کر عرب کی طرح فریادی رہیں

(بائیس اشعار کی یہ پوری نظم قومی شاعری کے سو سال ص ص ۳۶۷ تا ۳۶۸ میں شامل ہے)

گاندھی جی کی حصولِ آزادی کے لیے جد و جہد کی ہمنوائی کرنے میں اردو شاعری جس طرح پیش پیش رہی ہے اس کی بے شمار مثالوں میں سے ان چند منظومات کی نشاندہی کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے:

۱۔ آزادیِ وطن — مخدوم محی الدین (قومی شاعری کے سو سال ص ص ۳۲۲ تا ۳۲۳)
۲۔ اٹھو — سردار جعفری (ایضاً ص ۳۲۹)
۳۔ آزادی — سردار جعفری (ایضاً ص ص ۳۳۰ تا ۳۳۱)
۴۔ نئی دنیا — مسعود اختر جمال (ایضاً ص ص ۳۳۸ تا ۳۳۹)
۵۔ جگاوا — شمیم کرہانی (ایضاً ص ص ۳۴۰ تا ۳۴۱)
۶۔ قومی گیت — شمیم کرہانی (ایضاً ص ۳۴۲)
۷۔ نعرۂ آزادی — غلام احمد فرقت کاکوروی (ایضاً ص ص ۳۴۳ تا ۳۴۸)
۸۔ منزلیں — علی جواد زیدی (ایضاً ص ص ۳۵۴ تا ۳۵۵)
۹۔ روشن اندھیرا — شمیم کرہانی (ایضاً ص ص ۳۶۵ تا ۳۶۶)
۱۰۔ آخری مرحلہ — کیفی اعظمی (ایضاً ص ۳۸۳)
۱۱۔ نوائے آزادی — گوپی ناتھ امن (ایضاً ص ۳۸۴)
۱۲۔ نظامِ کہنہ — احتشام حسین (ایضاً ص ص ۳۰۲ تا ۳۰۳)
۱۳۔ صبحِ نو — سکندر علی وجد (ایضاً ص ۳۱۱)
۱۴۔ قوم سے خطاب — امین سلونوی (ایضاً ص ۳۱۲)

تحریکِ آزادیِ ہند کی تاریخ میں ۱۹۱۹ء کے جلیان والا باغ کے حادثے میں سیکڑوں مجاہدینِ آزادی جنرل ڈائر کے حکم پر گولیوں سے بھون ڈالے گئے تھے۔ اس سانحے پر تلوک چند محروم (یکم جولائی ۱۸۸۰ء تا ۶ جنوری ۱۹۶۶ء۔ تذکرۂ ماہ و سال ص ۳۳۵) ڈاکٹر اقبال اور ظفر علی خاں کے ایسے اردو شاعروں نے جو نظمیں کہی تھیں دامنِ وقت میں انھیں پیش کرنے کی گنجائش نہیں (ر۔ک قومی شاعری کے سو سال ص ص ۱۹۴ تا ۱۹۸)۔

ہمارے جن متعدد اردو شاعروں نے گاندھی جی کے عطا کردہ ثمرے آزادیِ ہند (۱۵ اگست ۱۹۴۷ء) یا یومِ جمہوریت (۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء) کو موضوعِ سخن بنایا ہے ان میں یہ نام شامل ہیں:

۱۔ استادِ محترم ڈاکٹر معین احسن جذبی (ولادت ۲۱ اگست ۱۹۱۲ء۔ تذکرۂ ماہ و سال ص ۱۱۴) نظم نیا سورج ۲۔ مجاز ردولوی (۱۹ اکتوبر ۱۹۱۱ء تا ۵ دسمبر ۱۹۵۵ء۔ تذکرۂ ماہ و سال ص ۳۳۲) نظم پہلا جشنِ آزادی (یادگارِ آزادی ص ۵۵) ۳۔ سراج لکھنوی (۱۸۹۴ء تا ۲۳ جنوری ۱۹۶۸ء۔ تذکرۂ ماہ و سال ص ۱۹۱) نظم جشنِ جمہور (یادگارِ آزادی ص ۵۶ تا ۵۷) ۴۔ امین سلونوی نظم اعلانِ آزادی (یادگارِ آزادی ص ۵۸) ۵۔ فراق گورکھپوری۔ نظم آزادی۔ (قومی شاعری کے سو سال ص ۳۷۶) ۶۔ مُلا لکھنوی۔ نظم آ ہی گیا (قومی شاعری کے سو سال ص ۳۹۰) ۷۔ بال مکند عرش ملسیانی (۲۰ ستمبر ۱۹۰۸ء تا ۲۵ ستمبر ۱۹۷۹ء۔ تذکرۂ ماہ و سال ص ۲۶۹) نظم جشنِ آزادی (قومی شاعری کے سو سال ص ۴۰۰)

اردو شاعری تحریکِ آزادیِ ہند کی ہمنوائی کرنے کے ساتھ ساتھ اس تحریک کی رہنمائی کرنے والے رہبروں کو بھی یاد کرتی رہی ہے۔ ملک و قوم کے جو متعدد فدائی اردو شاعری میں موضوعِ سخن بنتے رہے ہیں اُن

میں یہ نام شامل ہیں : ۱۔ گوکھلے ۲۔ تلک ۳۔ موتی لال نہرو ۴۔ جواہر لعل نہرو ۵۔ سردار پٹیل ۶۔ شہید بھگت سنگھ ۷۔ سبھاش چندر بوس ۸۔ مولانا محمد علی جوہر۔ اِن رہبران وطن کے علاوہ اردو شاعری کے دامن میں خود گاندھی جی پر بھی جو متعدد نظمیں ہمیں ملی ہیں ان میں درج ذیل تخلیقات شامل ہیں۔

۱۔ نظم ناٹال اور ھندستان۔ ظفر علی خاں (قومی شاعری کے سو سال ص ص ۱۵۴ تا ۱۵۵) ۲۔ نظم پیرِ مغاں کی یاد۔ آلِ احمد سرور (متولد ۹ ستمبر ۱۹۱۱ء۔ تذکرہ ماہ و سال ۱۹۳) (یادگارِ آزادی ص ۳۷) ۳۔ نظم شانتی کا چراغ۔ فضل نقوی (وفات ۱۴ مئی ۱۹۹۱ء۔ نیا دور اودھ نمبر ۱۔ ص ۱۴۴ مقالہ محمد اسحٰق صدیقی) صبح ہے کدہ فضل نقوی ص ص ۱۰۹ تا ۱۱۰۔ ۴۔ سانحہ مجاز ردولوی (وفات گاندھی پر) ۵۔ جگاؤ نہ باپو کو نیند آگئی ہے۔ شمیم کرہانی ۶۔ شمعِ امن علی جواد زیدی ۷۔ بوڑھا مالی عمر انصاری لکھنوی ۸۔ مہاتما گاندھی کا قتل مُلا لکھنوی ۹۔ گاندھی جی کی یاد میں۔ جگر مراد آبادی ۱۰۔ گاندھی اقبال احمد سہیل ۱۱۔ سونے کا درخت سلام مچھلی شہری ۱۲۔ میرِ کارواں وامق جونپوری ۱۳۔ السلام اے ھند کے شاہِ شہیداں السلام۔ جوش ملیح آبادی (انتخابِ جوش ص ص ۱۲۳ تا ۱۲۸) ۱۴۔ سوگ۔ اسرار ناروی ابن صفی (۲۶ جولائی ۱۹۲۸ء تا ۲۶ جولائی ۱۹۸۰ء۔ تذکرۂ ماہ و سال ص ۶۰) بہ حوالہ ڈاکٹر مجاور حسین ص ۱۷۴۔ ۱۵۔ گاندھی جی کے ورودِ لکھنؤ (۱۹۲۹ء) کے متعلق نظم از عزیز لکھنوی۔

اردو شاعری کا دامن تحریکِ آزادی کی ہمنوائی میں کہی جانے والی ایسی نظموں سے بھی خالی نہیں جنھیں برٹش سامراج نے اپنے مفاد کے خلاف ہونے کی پاداش بہ حقِ سرکار ضبط کر لیا تھا۔ کتاب ضبط شدہ نظمیں (دہلی طبع جون ۱۹۷۵ء ص ص ۱۸ تا ۲۷۹) ایسی ہی ۱۱۷ منظومات پر مشتمل ہے۔ اِن ۱۱۷ ضبط شدہ نظموں کے تخلیق کاروں کی فہرست میں یہ نام شامل ہیں : علی جواد زیدی، رام پرشاد بسمل، اشفاق اللہ خاں اشفاق شہید کاکوری، سردار نو بہار سنگھ صابر، کنور پرتاپ چندر آزاد، ٹیکا رام سخن، گورمکھ سنگھ، مہاراج بہادر برق، برج نرائن چکبست، حسرت موہانی، ظفر علی خاں، احسن پھپھوندوی، جوش ملیح آبادی، جمیل مظہری، اختر شیرانی، روشن صدیقی، احسان دانش، ساغر نظامی، مجاز، مخدوم محی الدین، جاں نثار اختر، شمیم کرہانی، عمر انصاری، احتشام حسین احتشام ماہلی، سردار جعفری، معین احسن جذبی، سلام مچھلی شہری اور ساحر لدھیانوی۔

شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی کی انقلابی اور قومی شاعری اپنے دامن میں وہ یادگار ادبی فن پارہ بھی رکھتی ہے جس میں فرقہ وارانہ جنون کے ہاتھوں قوم کے باپو مہاتما گاندھی کی شہادت پر انھیں پُراثر نذرانۂ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ جوش کی اس ادبی تخلیق کے چند نمونے ملاحظہ ہوں ؎

دہر پر تیری شہادت نے یہ ثابت کر دیا | حد سے بڑھ کر نیک ہونا کس قدر ہے ناروا
حرفِ حق ہے اہلِ باطل کے لیے طبلِ وغا | سخت ہوتی ہے گناہِ بے گناہی کی سزا

السلام اے کشتۂ خیبر فراواں السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

قاتلوں میں قتلِ انسانی پہ رونا جرم ہے | تخمِ نیکی سرزمینِ دل میں بونا جرم ہے
جذبۂ خدمت سے راتوں کو نہ سونا جرم ہے | مجرموں کے درمیاں معصوم ہونا جرم ہے

السلام اے پائمالِ ذوقِ عصیاں السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام

دردِ احساسِ یتیمی سے ہر اک دل ہے اداس | جادۂ روشن پریشاں روئے منزل ہے اداس
کون یہ مقتولِ اعظم ہے کہ قاتل ہے اداس | صدرِ محفل اٹھ گیا، محفل کی محفل ہے اداس

اے ابو الہند اے خدیوِ کشورِ جاں السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام (انتخابِ جوش ص ۱۲۳)

اس مقالے میں پیش کیے جانے والے شواہد و مواد کی بنیاد پر یہ معروضہ ہمارے نزدیک حقیقت سے بعید نہ ہوگا کہ اردو شاعری میں گاندھی جی اور اُن کے اہم تصورات کی جیسی اور جتنی ترجمانی و ہمنوائی کی گئی ہے وہ اس بات کا اثبات کرتی ہے کہ گاندھی جی اور ان کے نظریات سے اُردو شعر و سخن کا دامن خالی نہیں رہا ہے اور اردو شاعری کی قلمرو میں گاندھیائی تصورات "سکۂ رائج الوقت" کی طرح جاری رہے ہیں۔ گاندھی جی سے اردو شعر و ادب کی یہ قربت اور دوستی "گاندھی دشمن عناصر" کے دلوں میں خار بن کر اس لیے کھٹکتی رہی ہے کیونکہ دشمن کے دوست کو بھی دشمن سمجھنا زمانے کا چلن ہے۔ گاندھی جی ملک کے جن کم نظر، تنگ دل اور فرقہ پرست عناصر کی گولیوں کا شکار

ہوئے تھے وہی عناصر اردو جیسی ہندو مسلم میل ملاپ کی ہندستانی زبان کو بھی اپنے نِت نئے "ناوکِ ہائے ستم" کا ہدف بنانے پر تُلے ہوئے ہیں لیکن جس طرح گاندھی دشمنی ہندستان سے گاندھی جی کے نام اور کام کو نیست ونابود کرنے میں ناکام رہی ہے اسی طرح ہندستان کی مشترکہ تہذیب کی شان دار علامت وامانت اردو زبان بھی مادرِ وطن ہندستان کی گود کی امان میں پروان چڑھ کر اردو دشمنوں کی اُردو دشمنی کے شوقِ لایعنی کو ہوا سے لڑائی کا ڈوان کوٹ زائک فعل فضول ثابت کرتی رہے گی۔ مقتول گاندھی کی حمایت کرنے والے اُردو کے اہلِ قلم گاندھی کے قاتلوں کی جماعت سے کسی مفاہمت کی حماقت کے مرتکب نہ ہوں گے اور بہ قول فیض احمد فیض ؎

ہم پرورشِ لوح وقلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
ہاں تلخیِ ایام ابھی اور بڑھے گی
ہاں اہلِ ستم مشقِ ستم کرتے رہیں گے ۲۵

حواشی: ۱ انگریزی کتاب "دی ڈسکوری آف انڈیا" جواہرلال نہرو میموریل فنڈ نئی دہلی۔ طبع ۱۹۸۹ء ص ص ۲۴۲، ۲۴۴ تا ۲۵۲، ۲۵۷، ۲۶۰ تا ۲۶۴، ۲۶۵ تا ۲۶۸، ۲۷۰ تا ۲۷۰۔ ۲ رجوع کیجئے: (۱) انگریزی کتاب "مہاتما گاندھی۔ اے گریٹ لائف اِن بریف": وِن سینٹ شی این (VINCENT SHEEAN) پبلی کیشنز ڈویژن نئی دہلی۔ طبع مئی ۱۹۸۲ء ص ص ۱۴۴ تا ۱۴۴ نیز ۱۷۰ تا ۱۷۱۔ (۲) جواہرلال نہرو نے ہندستان میں تہذیبی، مذہبی اور لسانی اتحاد کی ضرورت پر پُرزور الفاظ میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے اردو کو ہندستان کی ایک ایسی زبان مانا ہے جو مُلک گیر شہرت ومقبولیت کی مالک رہی ہے (دی ڈسکوری آف انڈیا: نہرو۔ ص ص ۱۶۸ تا ۱۶۹، ۲۴۴ تا ۲۷۰ نیز ۳۱۷)۔ (۳) نہرو نے اپنی خودنوشت میں برٹش سرکار کے دورِ حکومت کے دوران اُردو کو عدالتی زبان مان کر اُس کے عام چلن کا اعتراف کیا ہے (انگریزی کتاب "این آٹو بایوگرافی": جواہر لال نہرو۔ جواہرلال نہرو میموریل فنڈ نئی دہلی۔ طبع ۱۹۸۹ء ص ۱۱۱)۔ (۴) نہرو نے گنگا جمنی ہندستانی تہذیب اور ہندو مُسلم میل ملاپ کو اپنی پسندیدہ اقدار کے طور پر اپنی تحریروں اور تقریروں میں بار بار پیش کیا ہے۔ انھوں نے ہندستانی زبان اردو کو ہندستان کی مشترکہ تہذیب کے قیمتی ورثے کی حیثیت سے تسلیم کرکے اس سے ہمدردی کا اظہار بھی کیا ہے۔

جواہرلال نہرو کی ایک تقریر کا یہ اقتباس بھی ملاحظہ ہو:

".....اُردو میرے گھر کی زبان تھی جسے میں نے آنکھ کھول کر سُنا اور بولا۔ .....اُردو کو آئین میں تسلیم کرلیا گیا ہے لیکن اس پر اُس طرح عمل نہیں ہوا جس طرح میں سمجھتا ہوں کہ ہونا چاہیے تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ اُردو کو خاص کر ان صوبوں میں جہاں اس کے بولنے والوں کی کثرت ہے، محبت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا ... یو۔پی۔ دہلی اور پنجاب ...(میں) اردو والوں کی بہت بڑی تعداد ہے۔ اتر پردیش میں غالباً عملی طور پر اردو کی طرف توجہ نہیں دی جاتی لیکن ہمارا طرزِ مخالفت کا نہیں ہونا چاہیے بلکہ دوستی کا۔ ! اس سے ہر ایک کا فائدہ ہے ...اُردو ... ایک جاندار زبان ہے۔ اُسے دبانا یا ختم کرنا ناممکن ہے لیکن تنگ نظری کے مظاہرے پر مجھے اکثر افسوس ہوتا ہے۔ میری خواہش ہے کہ اُردو ترقی کرے پھلے پھولے...."

(ہماری زبان نئی دہلی، مورخہ ۱۵ فروری ۱۹۸۹ء ص ۱ نیز ص ۱)

(ج) انگریزی کتاب "جواہرلال نہرو۔ اے بایوگرافی" (جلد ۳) از ایس گوپال۔ نئی دہلی طبع ۱۹۸۹ء ص ص ۲۶ تا ۲۸ کی انگریزی عبارت کا اردو مفہوم بھی ملاحظہ ہو:

نہرو کے سامنے لسانی مسئلہ تھا جس میں سب سے زیادہ اردو زبان کا مسئلہ تھا۔ انھوں نے ریاستی حکومت اور مرکزی وزیرِ داخلہ پنت کو ہدایات دیں کہ اردو کی مناسب ترقی کی کوشش ہو۔ پنت نے اردو کے فروغ سے فرقہ وارانہ فسادات کا خطرہ بتایا۔ نہرو نے سخت الفاظ میں کہا کہ اُردو کے ساتھ ناانصافی وہ نہیں چاہتے فرقہ وارانہ فساد ہوتی ہو ں۔

۳ ر۔ک: (۱) کلیاتِ میر (جلد ۱) مرتبہ ظلِ عباس عباسی۔ ترقی اُردو بیورو نئی دہلی۔ طبع اگست ۱۹۸۳ء ص ۲۹۲۔ دیوانِ اوّل (اس ماخذ کے لیے آئندہ "کلیاتِ میر ۱ طبع نئی دہلی" درج ملے گا)۔ (۲) کلیاتِ میر (بہ ترتیبِ جدید) [مرتبہ عبدالباری آسی]۔ مطبع نول کشور لکھنؤ۔ طبع ۱۹۴۱ء ص ۱۴۲۔

۴ گاندھی جی کی تاریخِ ولادت ۲ اکتوبر ۱۸۶۹ء کے لیے دیکھئے: (۱) انگریزی کتاب "مہاتما گاندھی۔ اے گریٹ لائف اِن بریف" وِن سینٹ شی این ص ۴۔ (۲) انگریزی کتاب "مہاتما گاندھی": رومین رولاں (ROMAIN ROLAND)

انگریزی ترجمہ از سی۔ ڈی۔ گرانتھ (C. D. Groth) پبلی کیشنز ڈویژن دہلی۔ طبع ستمبر ۱۹۹۰ء ص ۲۔ (۳) گاندھی جی کے مختلف روپ: انو بندھو پادھیائے اردو ترجمہ: شکیل اختر فاروقی۔ ترقی اردو بورڈ نئی دہلی۔ طبع اگست ۱۹۷۴ء ص ۲۰۹۔ ۵؎ کلیات اکبر: اکبر الٰہ آبادی۔ شانِ ہند پبلی کیشنز نئی دہلی۔ طبع ۱۹۹۱ء ص ۵۷۔ ۶؎ صفی لکھنوی۔ حیات اور کارنامے: ڈاکٹر مصطفیٰ فطرت لکھنوی طبع ۱۹۸۶ء ص ۱۸۶۔ ۷؎ اردو میں قومی شاعری کے سو سال: علی جواد زیدی۔ یوپی اردو اکادمی لکھنؤ۔ طبع ۱۹۸۲ء ص ۲۰۰ (اس کتاب کے لیے آئندہ "قومی شاعری کے سو سال" کا اندراج ملے گا) ۸؎ حسرت موہانی: خلیق انجم ص ۱۳۶۔ ۹؎ بہ حوالہ: (۱) کھوج: گیان چند جین۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ طبع ۱۹۹۰ء ص ۱۰۶۔ (۲) بانگ درا (مشمولہ کلیاتِ اقبال اردو) ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۔ طبع ۱۹۷۵ء ص ۸۳۔ ۱۰؎ مراۃ الغیب: امیر مینائی مکتبہ کلیان لکھنؤ (سنہ اشاعت ندارد) ص ۲۵۱۔ ۱۱؎ عزیز لکھنوی: حیات اور کارنامے: ڈاکٹر مسعود حسن رضوی رُدولوی۔ نظامی پریس لکھنؤ۔ طبع ۱۹۸۴ء ص ۱۸۸ ۱۲؎ قومی شاعری کے سو سال ص ص ۳۴۲ تا ۳۴۴۔ ۱۳؎ یادگارِ آزادی: مرتبہ سلمان عباسی داطہری۔ ہرد کلچرل ایسوسی ایشن لکھنؤ۔ مطبوعہ ۱۵ اگست ۱۹۷۲ء ص ۳۰۔ ۱۴؎ پچھلے پہر: جاں نثار اختر۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی۔ طبع اگست ۱۹۸۴ء ص ۷۲۔ ۱۵؎ منتخب قومی شاعری ص ص ۷۷ تا ۸۱ ۱۶؎ بہ حوالہ "کیفی اعظمی۔ عکس اور جہتیں" مرتبہ شاہد ماہلی۔ دہلی طبع ۱۹۹۲ء ص ص ۴۸۰، ۴۹۴۔ ۱۷؎ کتاب '۱۸۵۷ء': راہی معصوم رضا۔ فردوس پبلی کیشنز الٰہ آباد مطبوعہ ۲۶ جنوری ۱۹۶۰ء ص ۵۳۔ ۱۸؎ یادگارِ آزادی ص ص ۴۸ تا ۴۹۔ ۱۹؎ "مہاتما گاندھی۔ اے گریٹ لائف ان بریف" (انگریزی) ص ص ۱۶۶ تا ۱۷۳۔ ۲۰؎ ر۔ک: (۱) تلاشِ دبیر: کاظم علی خاں۔ نامی پریس لکھنؤ۔ طبع دسمبر ۱۹۷۹ء ص ص ۲۰ تا ۲۱۔ (۲) بیسویں صدی اور جدید مرثیہ: ڈاکٹر ہلال نقوی محمدی ٹرسٹ لندن۔ طبع فروری ۱۹۹۴ء ص ۷۶۔ (۳) آغا حجو شرف۔ احوال و آثار: کاظم علی خاں۔ نظامی پریس لکھنؤ۔ طبع ۱۹۹۰ء ص ۱۷۔

۲۱؎ بہ حوالہ آغا حجو شرف۔ احوال و آثار ص ۱۴۲۔

۲۲؎ عکسی کلام فیض: فیض احمد فیض ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۔ طبع ۱۹۸۲ء ص ۱۰۱ (دستِ صبا ص ۲۱)

□□

نیا سال

نئے سال کی ٹھنڈی گرمی یوں دل کو برماتی ہو
ایک اک پل سے عزمیؔ امن اور پیار کی خوشبو آتی ہو

ہر لمحہ ہو امن بداماں، ہر ہفتہ ہو پیار بدوش
قوم پرستی وقت کی لے پر میٹھے سُر میں گاتی ہو

خوش حالی کے گہرے بادل، دیش پہ آکر چھا جائیں
ہر ساعت حب الوطنی کا دھیما مینھ برساتی ہو

ہر دن جیسے عید کا دن ہو، ہر شب جیسے دیوالی
رنگ و نُور میں بھیگی خلقت باہم گلے لگاتی ہو

ہندو مسلم سکھ عیسائی ایسے بھائی بن جائیں
گندی اور مکروہ سیاست بازی منھ کی کھاتی ہو

محنت کش مزدور کے دامن علم و عمل سے بھر جائیں
قومی ایکتا کی پُروائی دل کا درد جگاتی ہو

صبحِ بنارس کا پرتو ہو دیش کے گوشے گوشے میں
شامِ اودھ کی رنگینی بھی اپنا حسن دکھاتی ہو

آنگن آنگن کوّا دے سندیس پیا کی آمد کا
سمٹی لجائی گوری اپنے گھونگھٹ میں شرماتی ہو

نئی رضائی دوہرے بیڈ کی عزمیؔ "پھر" بنوالینا
کون ٹھکانا! چنچل نٹ کھٹ ایکے سال نہ آتی ہو

خان عزمی رُدولوی
ارشاد منزل۔ رُدولی
بارہ بنکی ۲۲۵۴۱۱

عظمتِ امن، اے رہبرِ ایشیا

اس جنم شت پہ ترے سبھی ہیں مگن
ڈالیاں چاندتاروں کی لائے گگن
ہر طرف رقص فصلِ بہاراں کا ہے
کہہ رہی ہے یہی بن کے دھرتی دُلہن
اے اہنسا کی جاں ستیہ کے دیوتا
یاد میں تیری جشن گھر بار ہے
عظمتِ امن اے رہبر ایشیا
آ، کہ ہر بزم تیری طلب گار ہے

خود پرستی کا ہنگامہ و شور ہے
ذہنِ انساں میں تخریب کا چور ہے
بجلیاں بھی ہیں باہیں پسارے ہوئے
فرقہ پرور ہواؤں کا بھی زور ہے
آکے اک بار اپنا چمن دیکھ جا
اب تو کلیوں کا ہنسا بھی دشوار ہے
عظمتِ امن، اے رہبرِ ایشیا
آ، کہ ہر بزم تیری طلب گار ہے

داس موہن کا دُنیا تری داس ہے
موہ لینے کا ہر گُن ترے پاس ہے
تیری مُسکان بُنیادِ عزم و عمل
تیری بولی سیاست کا احساس ہے
زینتِ گُلستاں ہے ترا نقشِ پا
پھول تو پھول مسرور ہر خار ہے
عظمتِ امن اے رہبرِ ایشیا
آ، کہ ہر بزم تیری طلب گار ہے

جن پہ تھا ناز وہ بدگماں ہو لیے
لوٹ لیتے ہیں جو بن کے بہروپیے
وہ جو نورِ تبسم نے روشن کیے
آج کچھ ٹمٹماتے ہیں بیکل دیے
پھر بھی ہے سامنے پیار کا راستا
اب سفر کو نیا عزم درکار ہے
عظمتِ امن اے رہبرِ ایشیا
آ، کہ ہر بزم تیری طلب گار ہے

آ، کہ ہر بزم تیری طلب گار ہے

دلیپ سنگھ

۴۹/۳۔ راجندر نگر۔ دہلی

ہم نے ترے نقش قدم پر چل پڑے تھے ایک دن

میری تعلیم کا آغاز ہمارے گاؤں کے اسکول میں ہوا تھا۔ یہ اسکول پانچویں یا چھٹی جماعت تک تھا۔ ہمارے گاؤں کے زیادہ تر لوگ جن میں میرے والد بھی شامل تھے، سمجھتے تھے کہ عام آدمی کے لیے اتنی تعلیم کافی ہوتی ہے اس لیے کسی نے اس اسکول کو مڈل یا ہائی اسکول بنوانے کی کوشش نہ کی۔ لیکن میرے ننھیال میں تعلیم کا بہت دور دورہ تھا۔ میرے والد کہا کرتے تھے کہ ان بے چاروں کے پاس زمین نہیں ہے کہ کاشت کروا سکیں۔ اس لیے سوائے پڑھائی کر کے ملازمت ڈھونڈنے کے وہ لوگ کر بھی کیا سکتے ہیں۔

میرے نانا ۱۹۰۰ کے گریجویٹ تھے۔ گریجویشن کے بعد انھوں نے لاء کا امتحان پاس کیا اور گوجرانوالہ کی ضلع کچہری میں وکالت کرنے لگے۔ میرے والد جب بھی سسرال گئے یہی دیکھا کہ میرے نانا ہمیشہ صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس رہتے ہیں اور لوگ انھیں جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔ یہ دیکھ دیکھ کر میرے والد کو خیال ہوا کہ تعلیم میں کوئی خوبی تو ہوگی جو لوگ ان کی اتنی عزت کرتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی اولاد کو اعلیٰ تعلیم دیں گے۔

بڑے لڑکے کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کا آسان طریقہ انھوں نے یہ نکالا کہ اسے ننھیال میں بھیج دیا۔ لیکن جب میں نے گاؤں کے اسکول سے پرائمری کا امتحان پاس کر لیا تو ان کے غرور کو گوارا نہ ہوا کہ مجھے ننھیال بھیج کر اپنے سسر کے سامنے زیر بار ہوں۔ چنانچہ وہ مجھے گاؤں کے قریبی شہر حافظ آباد لے گئے اور وہاں ایک ہائی اسکول میں داخل کرا دیا۔ میرے رہنے کے لیے اسی اسکول کے ہوسٹل میں بندوبست کر دیا۔

اس وقت میری عمر دس گیارہ برس کی ہوگی۔ گھر سے دور جا کر مجھے اچھا تو نہ لگا لیکن اس طرح جو آزادی مجھے نصیب ہوئی وہ بہت اچھی لگی۔ ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ رات آٹھ بجے اپنے گھر چلے جاتے تھے۔ ان کے جاتے ہی ہم لوگ خود مختار ہو جاتے تھے۔ چنانچہ ہم ان کے جاتے ہی شہر میں آوارہ گردی کے لیے نکل پڑتے۔ شہر میں اگر کوئی سینما یا تھیٹر آیا ہوتا تو ہم وہاں جا کر فلم یا ڈرامہ دیکھتے۔ کوئی سیاسی جلسہ ہو رہا ہوتا تو وہاں تقریریں سننے چلے جاتے۔ سینما اور تھیٹر دیکھنا تو کبھی کبھی نصیب ہوتا تھا لیکن سیاسی جلسوں میں شرکت کرنا اکثر ممکن ہو جاتا کہ ان دنوں تحریک آزادی زوروں پر تھی۔ ان جلسوں میں میں نے لوکل مقررین کے علاوہ احرار لیڈر عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب کو بھی سنا۔ کیا مقرر تھے! مجھے وہ جلسہ آج بھی اچھی طرح یاد ہے جس میں میں نے انھیں پہلی بار سنا تھا۔ وہ تقریباً دو گھنٹے بولتے رہے۔ مجھ پر ان کی تقریر کا اتنا اثر ہوا کہ میں ان کے ایک اشارے پر پوری سلطنت برطانیہ سے ٹکر لینے کو تیار ہو گیا۔

میں ان دنوں عمر کی اس منزل پر تھا کہ جو سنتا تھا وہ دل پر نقش ہو جاتا تھا۔ جب سنا کہ سبھاش چندر بوس نے ملک کو آزاد کرانے کے لیے آزاد ہند فوج بنائی ہے تو جی چاہا کہ میں بھی ان کی فوج میں شامل ہو جاؤں۔ گاندھی جی کے بارے میں سنا کہ وہ جب بھوک ہڑتال کرتے ہیں تو انگریز حکومت کے پاؤں ڈگمگانے لگتے ہیں۔ یہ سنتے ہی میرا جی چاہا کہ میں بھی ان کی طرح ایک دن بھوک ہڑتال کر کے کسی کے گھٹنے ٹکواؤں۔ ہوسٹل میں میں نے اپنے کمرے میں شہید بھگت سنگھ دت، فوجی وردی میں ملبوس سبھاش چندر بوس اور چرخہ چلاتے ہوئے گاندھی جی کی تصویریں لٹکا رکھی تھیں۔

ایک دن اعلان ہوا کہ آزاد ہند فوج کے افسران پر غداری کا مقدمہ چلایا جائے گا۔ ہم نے اس دن اپنے ہیڈ ماسٹر دینا ناتھ صاحب سے مطالبہ کیا کہ ان عظیم ہستیوں کی حمایت کے طور پر اسکول ایک دن کے لیے بند کر دیا جائے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب خود تحریک آزادی کے بڑے حامی تھے لیکن

وہ ڈسپلن توڑنے کو نہایت غلط حرکت سمجھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اسکول بند کرنے سے انکار کر دیا۔ ہم نے غصے میں آکر ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ تمام لڑکے اسکول سے ذرا پرے ایک کھیت میں جمع ہو گئے انھیں اس وقت ایک مقرر کی ضرورت تھی جو ہڑتال کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈال سکے، ان کے جذبۂ حب الوطنی کو بھڑکا سکے اور انھیں ظلم کے خلاف لڑنے کی ترغیب دے سکے۔ سیاسی تقریریں تو ہم نے خوب سن رکھی تھیں چنانچہ ایک چبوترے پر کھڑے ہو کر ہم نے بڑے بڑے لیڈروں کی طرح گرج گرج کر کہنا شروع کر دیا کہ ہم آزاد ہند فوج کے سپاہیوں کی طرح کٹ مریں گے لیکن ظلم کے آگے سر نہیں جھکائیں گے۔ ہمارے امتحان کا وقت آگیا ہے۔ جب ہمارے ساتھیوں نے تالیاں بجائیں تو ہم نے وہ شعر بھی پڑھ دیا جو ہم بے شمار جلسوں میں سن چکے تھے۔

شہیدوں کی چتاؤں پر لگیں گے ہر برس میلے
وطن پر مٹنے والوں کا یہی باقی نشاں ہوگا

جب ہم بول بول کر تھک گئے تو میٹنگ کے خاتمے کا اعلان کر دیا گیا۔ وہ بچے جن کے شہر میں گھر تھے، گھر چلے گئے۔ ہمیں مجبوراً ہوسٹل آنا پڑا کہ اور کہیں جانے کو جگہ نہیں تھی۔ ہوسٹل میں ہیڈ ماسٹر صاحب ہماری آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ انھوں نے ہمیں بینت مار مار کر شہید تو نہ کیا لیکن اتنا ضرور ہوا کہ کئی دن تک ہم قلم پکڑنے کے قابل نہ رہے۔ بینت کا بے دریغ استعمال کرتے ہوئے وہ کہتے رہے کہ سبھاش چندر بوس بننا چاہتے ہو؟ اور صرف اس لیے کہ اسکول سے ایک دن کے لئے بھاگ سکو؟ اگر عمر اور عقل نے ساتھ دیا تو کبھی اس عظیم انسان کی زندگی پر کوئی کتاب پڑھنا۔ تمھیں پتہ چل جائے گا کہ نیتا جی نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی۔ لیکن ان کا مقصد دیش کی آزادی تھا، تمہاری طرح ایک دن کی چھٹی نہیں۔

رات بھر ہاتھ سینکتے ہوئے ہم نے فیصلہ کیا کہ ہمیں کھیت میں جلسہ کرنے کی بجائے گاندھی جی کی طرح بھوک ہڑتال کرنی چاہیے تھی۔ اگر ہم بھوک ہڑتال کرتے تو ہیڈ ماسٹر صاحب ہمیں پیٹنے کی بجائے ہماری خوشامد کر رہے ہوتے کہ بچو کھانا کھا لو۔ ہم تمہارا مطالبہ ماننے کو تیار ہیں۔

اسکول میں تو گاندھی جی کے نقشِ قدم پر چلنے کا ہمیں موقع نہ ملا۔ لیکن گرمیوں کی چھٹیوں میں جب گھر گئے تو ایک موقع ہمیں میسر آگیا۔

گاؤں میں ایک چودھری نے اپنے لڑکے کی شادی کی خوشی میں شہر سے ایک طوائف بلا رکھی تھی۔ ہم اس کا مجرا سننے کے لیے جانا چاہتے تھے لیکن والد صاحب نے انکار کر دیا۔ اس دن ہمارے نانا بھی گاؤں میں آئے ہوئے تھے۔

ہم نے ان کا انکار سنا اور اسی وقت فیصلہ کیا کہ ان کے گھٹنے ٹکوانے کے لیے ہم بھوک ہڑتال کریں گے۔ ہم نے سوچا صبح سے بھوک ہڑتال شروع کر دیں تاکہ شام تک والد صاحب راہِ راست پر آجائیں اور ہم رات کو مجرا دیکھ سکیں۔ چنانچہ دوپہر کو جب سارا خاندان کھانا کھانے کے لیے بیٹھا تو ہم شامل نہیں ہوئے۔ نانا جی نے پوچھا کہ دیپ کیوں نہیں کھا رہا تو والد صاحب نے منہ میں نوالہ رکھتے ہوئے کہا کہ شاید اسے بھوک نہیں ہوگی۔

دن کا وقت تو ہم نے کسی نہ کسی طرح نکال لیا لیکن شام ہوئی تو آنکھوں کے آگے روٹیاں رقص کرنے لگیں۔ ہم نے ہمت کی اور شام کو بھی کھانے میں شریک نہ ہوئے۔ نانا نے پھر پوچھا کہ دیپ کیوں نہیں کھا رہا تو والد صاحب بولے کہ طبیعت اس کی کچھ ناساز ہے اور فاقہ ہی اس بیماری کا بہترین علاج ہے۔ یہ سنتے ہی ہم چلا اٹھے کہ ہماری طبیعت اچھی بھلی ہے، ہم اس لیے نہیں کھا رہے کہ ہم بھوک ہڑتال پر ہیں۔ میرے والد بھی عجیب مسخرے ثابت ہوئے۔ کہنے لگے جب ہڑتال ختم کر لو تو کھا لینا۔ روٹیاں یہاں پڑی ہیں۔

رات کو ہم کھلی چھت پر چارپائیاں بچھا کر سو رہے تھے۔ میں، میرے والد اور میرے نانا۔ بھوک کے مارے ہمارا برا حال تھا لیکن کھائیں کیسے کہ بھوک ہڑتال پر تھے۔ یکایک ہمارے آنسو بہنے لگے۔ سسکیاں سن کر ہمارے نانا ہمارے پاس آگئے اور پیار سے ہمارے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ اس محبت کے زیرِ اثر ہم اور بھی زور سے رونے لگے۔ اور روتے روتے نانا سے پوچھا کہ جب گاندھی جی بھوک ہڑتال کرتے ہیں تو پوری سلطنتِ برطانیہ ہل جاتی ہے لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے والد پر ذرا بھر

ڈاکٹر شیوانند نوٹیال



مہاتما گاندھی اور اُن کے رام

البرٹ آئنسٹن نے مہاتما گاندھی کے بارے میں لکھا ہے "آنے والی نسلیں مشکل سے ہی اس بات پر یقین کریں گی کہ گاندھی جیسا گوشت پوست کا پتلا کبھی اس سرزمین پر پیدا ہوا ہوگا" آئنسٹن نے شاید یہ بات اس لئے کہی تھی کہ مہاتما گاندھی کی نادر شخصیت کو نئی نسل کے لوگ سمجھنے سے قاصر ہوں گے کیونکہ مہاتما گاندھی نے ایسے کارنامے انجام دیے ہیں کہ جن کو سن کر تعجب ہوتا ہے اور فوراً یقین نہیں ہوتا کہ واقعی کسی شخص نے ایسے حیرت انگیز کارنامے انجام دیے ہوں گے؟

اس لئے آئنسٹن نے آئندہ نسل کے شبہات کا اندازہ لگا کر یہ بات کہی ہوگی مہاتما گاندھی نے سیکڑوں حیرت انگیز کارنامے انجام دیے جن میں کچھ اس طرح ہیں۔ استحصال کی شکار انسانیت کو نجات دلاکر اسے آزادی کا پیغام دیا انہوں نے صدیوں سے بے جان پڑے ہوئے بھارت کو بیدار کیا اور اس کے جمود کو توڑ کر نئی حرکت پیدا کی۔ انہوں نے ظلم و استبداد کرنے والی برطانوی حکومت کے مقابلے میں برسرِکار ہونے کے لئے ہندستانی عوام کو اکسایا اور جہدِ آزادی میں ان کی فعال ذمہ داری کو یقینی بنایا۔ ہوا بھی ایسا ہی کہ آخرش ہندستان نے اپنی صدیوں کی غلامی کی زنجیر کو توڑ ڈالا اور ملک آزاد ہوگیا ہندستان کے لئے ان کا یہ ایک خاص تحفہ تھا ہندستان کے ذریعہ ان کا آزادی کے لئے عدم تشدد کا پیغام دنیا کے کونے کونے تک پہنچا جس نے انہیں عہد ساز شخصیت کا مالک بنا دیا۔ لاٹھی گولی اور اسلحوں سے لیس برطانوی حکومت کے خلاف نہتے بھارتی عوام کو یہ فتح گاندھی جی کی انہی خوبیوں سے نصیب ہوئی تھی گاندھی جی کی ان خصوصیات کی اہمیت کا تجزیہ کرتے ہوئے فرینسس نیلسن نے اپنی اہم تخلیق "ٹریزری آف یورپ" میں لکھا ہے۔

"گاندھی بے مثال ہے دیگر کسی اور شخص کا ذکر نہیں ملتا جس نے ان کے جیسے حالات میں حکومت کو چنوتی دی ہو۔ کارکردگی میں ڈایوزینس، شرافت میں سنٹ فرانسس۔ ملیشا میں سقراط کی طرح انہوں نے زمانے پر یہ ظاہر کر دیا ہے کہ سیاست داں اپنے نشانوں کو پورا کرنے کے لئے جن ذرائع کو استعمال کرتا ہے وہ کتنے چھوٹے ہوتے ہیں..... اس جدوجہد میں روحانی طاقت کی فتح جسمانی طاقت کے مقابلہ میں ہوئی ہے"

گاندھی اپنے زمانے کی عظیم شخصیتوں میں سے ایک تھے ان کی آواز میں ان کی شخصیت میں ان کے مس میں اور ان کی نظر میں ایک حیرت انگیز جادو تھا جب کوئی بھی شخص ان کے سامنے آتا تھا تو اس کا سر خود بخود جھک جاتا تھا۔

ان کی قدآور شخصیت سے متاثر ہوکر ان کے عزیز ترین دوست ہنری پولک نے لکھا تھا "ہم یہ نہیں بتا سکتے کہ گاندھی کیا چیز ہیں لیکن اتنا یقینی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ وہ یہاں ہیں وہاں ہیں"۔ ہنری پولک کے الفاظ میں اتنی وسعت ہے کہ انہیں گاندھی کی شکل ہر جگہ دکھائی دیتی تھی گاندھی کی شکل میں انہیں ایک ایسی شخصیت نظر آتی تھی جو دنیا میں رہنمائی کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ دراصل گاندھی جی بھارت کے ارتقار کی جیتی جاگتی تاریخ تھے۔

گاندھی جی بچپن سے ہی بہت مذہبی تھے اسلام، عیسائی اور جین مذاہب کی اخلاقی قدروں کا ان پر گہرا اثر تھا حالانکہ بنیادی طور پر گاندھی جی ہندو تھے اور ہندو کہنے کہلانے میں انہیں کبھی کوئی جھجھک نہیں ہوتی تھی اپنے کو ہندو ہونے کا اقرار کرتے ہوئے انہوں نے "ینگ انڈیا" میں لکھا تھا۔

"میں اپنے کو سناتنی ہندو کہتا ہوں کیوں کہ میں ویدوں، اپنشدوں، پرانوں اور ہندو مذہب کی کتابوں میں یقین رکھتا ہوں اس لئے اوتاروں اور تناسخ میں بھی یقین رکھتا ہوں۔ میں ورن آشرم کے مذہب پر یقین رکھتا ہوں اس کے بنیادی اصولوں میں یقین رکھتا ہوں نہ کہ آج کے رائج بھونڈے مذہب میں۔ میں گائے کے تحفظ میں یقین رکھتا ہوں لیکن میں اس کے پس پشت جو خیال رکھتا ہوں وہ بہت ہی وسیع ہے میں بت پرستی پر یقین نہیں رکھتا"

گاندھی جی کے ان خیالات سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ پوری طرح سے ہندو تھے۔ منسا، واچا اور کرمنا سے وہ ہندو مذہب کے معتقد تھے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ گاندھی جی کے مذہب میں کسی قسم کی تنگ نظری نہ تھی بلکہ ان کا مذہب ایک فعال مذہب تھا۔ انہوں نے مذہب کے سلسلے میں لکھا ہے۔

"مذہب دراصل دماغ سے محسوس کرنے کی چیز نہیں ہے بلکہ دل سے محسوس کرنے کی چیز ہے وہ ہم سے الگ کوئی چیز نہیں لیکن وہ ایسی چیز ہے جسے ہمیں اپنے

"اندر سے ہی اجاگر کرنا ہے وہ ہمیشہ ہمارے دل میں ہی ہے..... مذہب ایک ذاتی مجموعہ ہے وہ مذہب مذہب نہیں جو عوامی چیز ہو وہ ایک نظریہ حیات ہو سکتا ہے۔"

ینگ انڈیا ۲ر مارچ ۱۹۲۵ء کے شمارے میں گاندھی نے خدا کے وجود کے سلسلے میں اپنے نظریہ کا اظہار اس طرح کیا تھا۔

"جو صرف ذہن کو تسکین دے وہ خدا نہیں ہے خدا ہونے کے لئے خدا کے دل پر حکومت کرنا اور اس کو نئی شکل دینا ضروری ہے۔"

گاندھی کی نظر میں:

"میرے لئے خدا حق اور محبت ہے۔ خدا اصول ہے اور لائحہ عمل خدا جو بے خوف ہے حیات ہے اور وجودیت کی روح ہے وہ مقدس ہے وہ قادر مطلق ہے وہ ہمارے اندر بھی ہے اور ہم سے الگ بھی ہے وہ دہریوں کے لئے دہریت بھی ہے۔"

خدا کے سلسلے میں پہلے گاندھی جی کا نظریہ تھا کہ ایشور ہی ستیہ ہے لیکن جب انہوں نے خدا کے بارے میں گہرائی سے غور کیا تب انہوں نے کہا کہ ایشور ستیہ نہیں ہے بلکہ ستیہ ہی ایشور ہے۔

ایشور کے اوتار لینے کے سلسلے میں گاندھی جی نے اپنی تصنیف "ہندو دھرم" کے صفحہ ۱۳۱ پر لکھا ہے۔

"ایشور کی کوئی شکل نہیں ہے انسانی شکل میں زمین پر ایشور کے اوتار لینے کا مطلب صرف یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اوتاری شخص خدا نہیں بلکہ خدا سے قریب کوئی شخص ہے کیوں کہ خدا تو عقل و استدلال اور بحث سے بہت ہی بلند طاقت ہے۔"

گاندھی کے رام

خدا کے وجود کے سلسلے میں گاندھی جی کے خیالات کا مطالعہ کرنے کے بعد اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ گاندھی جی کا رام کے بارے میں کیا خیال تھا۔

بچپن سے ہی گاندھی جی کو رام نام جپنے کی تعلیم ملی تھی بچپن میں ہی ابھا نامی ان کی دائی نے انہیں رام نام کا منتر دیا تھا ان کی ماں نے انہیں وشنوں اور رام کی تعلیم دی تھی آگے چل کر ان پر تلسی داس کے رام چرتر مانس کا بھی گہرا اثر پڑا اور دھا مہاراج کی تقریروں نے بھی گاندھی جی کو متاثر کیا رام نام انہیں اتنا عزیز تھا کہ وہ رام کے نام کو سب کچھ مانتے تھے گاندھی جی نے رام نام کا ورد اس وقت بھی نہیں چھوڑا جب انہیں یہ خیال آیا کہ رام کوئی تاریخی کردار یا دشرتھ کی اولاد نہیں ہیں۔ ۱۸ر اپریل ۱۹۴۶ء کے ہریجن میں انہوں نے لکھا۔

"میرے رام تاریخی رام نہیں ہیں وہ تو یقیناً ہمیشہ سے اور بے مثال رام ہیں میں صرف انہیں کی عبادت کرتا ہوں۔"

گاندھی جی نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اپنی روزمرہ کی عبادت میں رگھوپتی رادھو راجا رام ایشور اللہ تیرے نام کو گانا شروع کر دیا تھا اور جب گاندھی جی کو گولی لگی تب بھی ان کے آخری الفاظ "ہے رام" ہی تھے۔

گاندھی جی اپنے آشرم کے لوگوں کے ساتھ مل کر جو بھجن صبح و شام گاتے تھے وہ تلسی داس، سور داس، میرا بائی اور نرسنگھ مہتا جیسے وشنو سنتوں کے ہی بھجن ہوتے تھے۔ نرسنگھ مہتا کا وشنو جگ تو تیرے کہئے ان کا پسندیدہ بھجن تھا۔ ان بھجن کے ساتھ رویندر ناتھ ٹیگور، دیگر عیسائی اور مسلمان سنتوں کے ذریعہ لکھے گئے کچھ بھجن بھی انہیں بے انتہا پسند تھے۔ گاندھی جی کی اس وسیع القلبی اور ان کی ایشور بھگتی نے تمام مذاہب کے لاکھوں افراد کے دلوں کو متاثر کیا تھا۔

گاندھی جی پر تلسی داس کا اثر تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انہوں نے تلسی داس کی تمام باتوں کو پوری طرح سے مان لیا تھا درحقیقت تلسی اور کبیر دونوں نے ہی گاندھی کو متاثر کیا تھا لیکن پوری طرح سے وہ کسی ایک سے متفق نہ تھے دشرتھ پتر رام ایشور نہیں تھے اس کا ذکر انہوں نے ینگ انڈیا کے ۱۱ر اگست ۱۹۲۴ء کے ایک مضمون میں اس طرح سے کیا تھا۔

"میں چاہتا ہوں کہ ہندوستان اس بات کو محسوس کرے کہ اس کا اپنا ایک وجود ہے جس کو مٹایا نہیں جا سکتا"۔.....

ایک انسان (رام) کا بندروں کی فوج لے کر دس سر والے طاقتور راون سے مقابلہ کرنے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے اس کا مطلب سیدھا سیدھا یہ ہے کہ یہ روحانی طاقت کی جسمانی طاقت پر فتح تھی۔ ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ گاندھی راون کو ماننے والے رام کو روحانی طاقت والا انسان مانتے تھے لیکن وشنو کا اوتار نہیں۔

دراصل رام کی دو شکلیں ہیں ایک خدائی نہ نظر آنے والا اور ہر جگہ رہنے والا اور دوسرے انسانیت کا تحفظ کرنے والے کی شکل میں جب کہ تلسی داس نے ان دونوں شکلوں کو ایک ہی میں ملا دیا تھا گاندھی رام کو ایک اوتاری مہاپرش مانتے ہیں پوری طرح سے برہم نہیں اور اس طرح کا خیال ان کا کرشن کے سلسلے میں بھی ہے۔

گاندھی جی کے رام اپنے خیالوں کے رام ہیں اور وہ انہیں کی عبادت بھی کرتے ہیں اس سلسلے میں انہوں نے صاف طور پر لکھا ہے۔

"ہم جن رام کے گن گاتے ہیں وہ رام بالمیکی کے رام نہیں ہیں تلسی کے بھی رام نہیں ہیں جب کہ مجھے تلسی کے رام پسند ہیں اور رام چرتر مانس کو میں ایک بے مثل کتاب سمجھتا ہوں لیکن میرا رام ان کتابوں سے بالکل مختلف رام ہے

جس کی میں عبادت کرتا ہوں اور پریشان حال لوگوں سے بھی کہتا ہوں کہ رام نام لو اگر نیند آتی ہے تو بھی میں کہتا ہوں کہ "لو رام نام" لیکن ہما رام کو دشرتھ کا بیٹا یا سیتا کے شوہر کی شکل میں نہیں مانتا کیونکہ میرا رام جسم رکھنے والا رام نہیں ہے جو نہ کسی سے پیدا ہوا ہے بلکہ اس نے دنیا کی تخلیق کی ہے دنیا کو پیدا کیا ہے۔ جو دنیا کا مالک ہے اسے یاد رکھنا چاہئے اس لئے خیال رہے کہ یہ رام ہمارے خیالوں کے رام ہیں دوسروں کے نہیں۔"

انہوں نے شکل وصورت کا جامہ پہن کر اوتار لینے والوں کی اہمیت وافادیت کو تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"ہمارے سامنے اگر کوئی شک وشبہہ میں مبتلا ہو کر آئے تو اس سے کہو کہ ہم کسی جسم رکھنے والے رام کی پوجا نہیں کرتے ہم تو اپنے "نرنجن نرا کار رام" کو پوجتے ہیں ان کے پاس سیدھے نہیں پہنچ سکتے اس لئے جس گیتا اور بھجنوں میں خدائی شکل کا تصور کیا گیا انہیں بھجنوں کو گاتے ہیں۔"

گاندھی جی رام نام کے اثرات سے بخوبی واقف تھے۔ ۲۰ر اپریل ۱۹۲۵ کے نوجیون میں انہوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا۔

"رام نام کے اثرات سے پتھر تیرنے لگے رام نام کی طاقت سے بندروں کی فوج نے راون کے چھکے چھڑا دئے .... راکشسوں کے گھر میں کئی برس رہنے پر بھی سیتا اپنی عصمت کو بچا سکیں اس لئے تلسی داس نے کہا کہ رام رام جپو۔ اس لئے اپنی تقدیس کے لئے دل سے رام کا نام لینا چاہئے زبان اور دل کو باہمی طور پر ہم آہنگ کرتے ہوئے رام نام لینا چاہئے میں اپنا تجربہ بتاتا ہوں۔ میں دنیا میں اگر بوالہوس بننے سے بچا ہوں تو رام نام کی بدولت میں نے دعوے تو بڑے بڑے کئے ہیں لیکن اگر میرے پاس رام نام نہ ہوتا تو خواتین کو بہن کہنے کے قابل نہ رہتا جب جب مجھ پر مصیبتیں پڑی ہیں تو میں نے رام نام لیا ہے اور میں بچ گیا۔"

گاندھی کے رام ایسے ہی رام تھے رام نام پر ان کا زبردست اعتقاد تھا جو دکھائی نہ دے ہر جگہ ہو نا قابل تسخیر ہو اور جو پیدا ہی نہ ہوا ہو وہ تو آنکھوں کے بغیر دیکھتا ہے اور کانوں کے بغیر سنتا ہے ایسے رام کی نہ کوئی ماں ہے نہ کوئی باپ اور نہ ہی کوئی بیٹا۔ لیکن گاندھی جی یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ بھگوان یا خدا باپ ماں بیٹے اور بیوی کی شکل میں ہی عبادت منظور کرتا ہے وہ کبیر کی طرح بت پرستی کی مخالفت نہیں کرتے۔ گاندھی جی کا یقین تھا کہ جو شخص جس طرح سے خدا "رام" کو مانتا ہے اسے اسی شکل میں خدا ملتا ہے۔

گاندھی خدا "رام" کو محدود نظر سے نہیں دیکھتے تھے ان کا یقین تھا کہ "خدا نہ کعبہ میں ہے نہ وہ کاشی میں ہے وہ ہر جگہ ہے رام ہر دل میں موجود ہے" اس لئے اس رام کی مختلف شکلوں میں عبادت کی جاسکتی ہے۔

گاندھی کے رام کی کوئی شکل نہیں ہے اور وہ ہر جگہ موجود بھی ہیں ویسے بھی خدا احترام اور عقیدے کا خدا ہوتا ہے۔ گاندھی نے رام کو استدلال، احترام اور یقین کے ساتھ خدا کی شکل میں تسلیم کیا ہے۔ عدم تشدد اور محبت سے رام نام کا ورد کر کے دنیا میں حق کی جو مثال پیش کی ہے اس کے پس پشت انہوں نے اپنے رام کا تصور پیش کیا ان کا رام حق تھا عظیم تھا قادر مطلق تھا ان کا کہنا تھا کہ صرف ان کا رام ہی سچ ہے باقی یہ دنیا محض ایک فریب اور دھوکا ہے۔

□□

ہم ترے نقش قدم پر ..... صفحہ ۵۰ کا بقیہ

اثر نہیں ہو رہا۔ اس کے علاوہ ہماری سمجھ میں یہ بھی نہیں آ رہا کہ جب ہم بھوک ہڑتال پر ہیں تو ہمیں بھوک کیوں لگ رہی ہے۔

نانا نے پلیٹ میں ہمیں روٹی ڈال کر دی اور کہنے لگے کہ پہلے یہ کھالو پھر تمہیں سمجھاؤں گا۔

روٹی کھا کر ہم ان کے گھٹنوں کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئے۔ انھوں نے پیار سے سمجھایا کہ گاندھی جی جب بھوک ہڑتال کرتے ہیں تو کسی عظیم مقصد کو لے کر کرتے ہیں۔ ان کا مقصد اتنا بلند ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف خود بلکہ ان کے ہزاروں لاکھوں پیروکار اس مقصد کے حصول کے لیے جان دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ تم اس لیے ہار گئے کہ تمہارا مقصد ایک معمولی سی ذاتی خوشی ہے۔ گاندھی جی ملک کی آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں۔ دیش کے لوگوں کی یک جہتی کے لیے لڑ رہے ہیں، عوام کی بہبودی کے لیے لڑ رہے ہیں۔ لیکن تم بھوک ہڑتال کر رہے ہو ایک طوائف کا مجرا سننے کے لیے۔ ایسے شخص میں خود اعتمادی کہاں سے آئے گی۔

اس دن پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ گاندھی جی کی بھوک ہڑتال حکومتوں کو کیوں ہلا کر رکھ دیتی ہے۔

□□

(مولانا) اسحاق سنبھلی
سنبھل، مراد آباد - ۲۴۴۳۰۲

انسانیت کے پرستار مہاتما گاندھی

پور بندر (کاٹھیاواڑ) گجرات میں ۲؍اکتوبر ۱۸۶۹ء کو پیدا ہونے والے موہن داس کرم چند گاندھی بذات خود ایک عہد تھے اور ایسے عہد جو نہ جانے کتنے ادوار اور صدیوں پر اثر انداز رہیں گے ان کا فلسفہ اور حیرت انگیز فکر وعمل رہتی دنیا تک عوام اور نسل انسانی کو روشنی دیتا رہے گا۔ ہندوستان کو آزادی دلانے والے ہندوستانی قوم کے باپو مہاتما گاندھی کی شخصیت نے تاریخ پر جتنا اثر ڈالا ہے اس زمانہ کا کوئی دوسرا رہنما اتنا اثر نہیں ڈال سکا۔ آپ کے خاندان کے افراد تین پشتوں سے کاٹھیاواڑ کی مختلف ریاستوں میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے وہ سب کے سب نہایت وضعدار اور اخلاقی قدروں کے حامل تھے۔ آپ کے دادا کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ وہ ریاست پور بندر میں وزیر اعظم تھے مگر ہم نشینوں کی سازشوں کی وجہ سے انھیں قریب کی ایک ریاست میں پناہ لینی پڑی وہاں آپ نے والی ریاست کو بائیں ہاتھ سے سلام کیا معلوم کرنے پر آپ نے نہایت خود اعتمادی کے ساتھ بتایا کہ میرا داہنا ہاتھ پور بندر کے ساتھ وفاداری کے عہد میں بندھا ہوا ہے یہ جواب سن کر سب ہی آپ کی عظمت کے قائل ہو گئے۔

مہاتما جی کے والد کابا گاندھی اپنی خاندانی شرافت کی وجہ سے بہت مشہور اور مقبول تھے آخر عمر میں آپ ریاست راجکوٹ کے دیوان مقرر ہوئے اور وہیں سے پنشن پاکر وفات پائی۔

گاندھی جی کا شمار دنیا کی ان عظیم ترین شخصیتوں میں ہوتا ہے جو کسی ایک ملک نہیں بلکہ ساری دنیا اور انسانیت سے محبت رکھتے ہیں وہ نبی نوع انسان کی مشترکہ میراث اور ان کے لئے باعث فخر واحترام تھے گاندھی جی میں جہاں ایک سچے انسان اور رشیوں کے اوصاف تھے وہیں وہ ایک کسان کی سادہ اور خستہ حالی کی زندگی سے بھی ہم آغوش تھے ایک محنت کش۔ مفلوک الحال اور دنیا کی ہر نعمت سے محروم انسان کو وہ ملک کا قیمتی سرمایہ سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے شروع جوانی سے ہی آرام و آسائش سے منہ موڑ کر زندگی میں سادگی اور خیالات میں بلندی پیدا کر لی تھی ان دونوں اوصاف نے انھیں نہ صرف ہندستان بلکہ سارے عالم میں سربلند کر دیا تھا۔

گاندھی جی کی تعلیم وتربیت مذہبی ماحول میں ہوئی آپ برہمن نہ تھے مگر علم کی دولت کئی پشتوں سے خاندان میں چلی آرہی تھی اس پس منظر کا آپ کی زندگی پر آخر تک اثر رہا جیسا کہ مہاتما جی نے خود لکھا ہے کہ وہ ایک شرمیلے طالب علم تھے کھیل کود میں ان کا دل نہیں لگتا تھا لوگوں سے ملنے جلنے سے کتراتے تھے اپنی کتاب اور سبق سے ہی کام تھا۔

سات سال کی عمر تک آپ پور بندر میں رہے وہاں سے آپ کا خاندان راجکوٹ آگیا۔ جہاں باپو کے والد کابا گاندھی دیوان ہوئے تھے اور اب آپ راجکوٹ کے ہی ہو گئے تیرہ سال کی عمر میں آپ کی شادی ایک نہایت شریف اور مشرقی تہذیب سے مالامال خاتون کستوربا جی سے ہوگئی وہ خود بھی بہت نیک اور شریف النفس تھیں گاندھی جی کی رفاقت نے ان کی ان صفات کو اور جلا بخشی۔

۱۴ سال کی عمر میں میٹریکولیشن کا امتحان پاس کر کے آپ نے شامل داس کالج بھاؤ نگر میں داخلہ لیا مگر یہاں کی زبان کچھ مختلف تھی اور پڑھانے کا طریقہ بھی کچھ الگ تھا۔ آپ نے لکھا ہے کہ کالج میں لیکچروں کو میں سمجھ بھی نہیں سکتا دلچسپی حاصل ہونا تو بڑی بات بالآخر رشتہ داروں خاص کر راجکوٹ کے بوہرہ مسلم برادری کے لوگوں نے زور دیا کہ گاندھی جی کو تعلیم کے لئے انگلینڈ بھیج دیا جائے۔ مسلم بوہروں میں آپ کا خاندان بہت پسند کیا جاتا تھا اور وہ موہن داس کرم چند کو بہت چاہتے تھے بالآخر گھر والے بھی تیار ہو گئے بوہرے لندن میں بھی خاصی تعداد میں تھے اس لئے مصارف کی کوئی فکر نہ تھی۔ مہاتما جی ستمبر ۱۸۸۷ء میں لندن گئے وہاں تعلیم مکمل کی اور جون ۱۸۹۱ء میں بیرسٹر ہو گئے۔ آپ نے انگلینڈ میں قانون کی تعلیم کے ساتھ لاطینی اور فرانسیسی زبانیں بھی سیکھیں ہندو۔ عیسائیت اور اسلام کا مطالعہ بھی کیا۔ عیسائیت میں آپ کو حضرت عیسٰی علیہ السلام کا مشہور وعظ جو انہوں نے زیتون پر دیا تھا۔ بہت پسند آیا جس میں برائی کا بدلہ بھلائی سے دینے کی تعلیم دی گئی تھی مسز اینی بسنٹ اور میڈم بلاوسکی سے ملاقاتیں کیں جن کی سماجی خدمت کے جذبہ سے آپ بہت متاثر ہوئے۔

پوربندر کی ایک تجارتی فرم نے جس کی شاخ جنوبی افریقہ میں بھی تھی آپ سے درخواست کی کہ ہماری شاخ کے ایک اہم مقدمہ میں آپ ہماری وکالت کے لئے جنوبی افریقہ چلے جائیے اس طرح آپ اپریل ۱۸۹۳ء میں افریقہ روانہ ہو گئے۔ افریقہ آپ کی زندگی میں ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔ جب آپ جنوبی افریقہ کے شہر ناٹال پہونچے تو موہن داس کرم چند گاندھی کا مہاتما گاندھی باہر آگیا۔

ناٹال میں انگریزوں کے ہندوستانیوں کے ساتھ نہایت ذلت آمیز سلوک سے آپ بہت رنجیدہ ہوئے۔ جس روز آپ ناٹال پہونچے آپ کو ڈربن میں ایک مجسٹریٹ کی عدالت میں جانا پڑا آپ کو حکم ملا کہ اپنی پگڑی اتاریئے مگر آپ نے پگڑی نہیں اتاری۔ اس واقعہ کے چند روز کے بعد آپ ٹرین سے پریٹوریا جا رہے تھے تو آپ کو ریلوے کے فرسٹ کلاس سے زبردستی اتار دیا گیا کیوں کہ اس ڈبہ میں چند انگریز سفر کر رہے تھے حالانکہ مہاتما جی کے پاس فرسٹ کلاس کا ٹکٹ موجود تھا مگر اس کا کوئی لحاظ نہیں کیا گیا۔ جب کبھی آپ کو گھوڑا گاڑی پر سفر کرنا ہوتا تو آپ کو کوچوان کے برابر بیٹھنا پڑتا پیچھے صوفہ پر بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ ان چیزوں کا آپ پر بہت اثر ہوا اور آپ نے افریقہ میں امتیاز (بھید بھاؤ) اور ذلت آمیز سلوک کے خلاف تحریک چلانی شروع کر دی مئی ۱۸۹۴ء میں آپ نے ناٹال انڈین کانگرس قائم کی۔ آپ نے ہندوستانیوں کے قومی وقار، خودداری اور ان کے حقوق کے لئے جنوبی افریقہ کے علاوہ ہندوستان میں بھی بیداری پیدا کی ۱۸۹۶ء میں چھ ماہ کے لئے آپ ہندوستان آئے جنوبی افریقہ میں مقیم ہندوستانیوں کی حمایت میں یہاں متعدد جگہ تقریریں کیں اور ایک ماہانہ رسالہ بھی نکالا گاندھی جی کی ان کوششوں سے ہندوستانی عوام بھی اپنے بھائیوں مقیم جنوبی افریقہ کی حمایت میں سرگرم ہو گئے۔

گاندھی جی انسانوں کے غمگسار، آزادی و انصاف کے علم بردار اور انسانیت کے شیدائی تھے انہوں نے جنوبی افریقہ اور ہندوستان میں سامراجیوں کے خلاف تحریکیں چلائیں اس راہ میں ہر طرح کے مظالم برداشت کئے مگر کسی نے بدلہ نہیں لیا۔ اپنے مخالف کی تکلیف دیکھ کر بھی ان کو اتنی ہی تکلیف ہوتی تھی جتنی ہم وطنوں پر ظلم و تشدد سے ان کو رنج ہوتا تھا۔

دوسری جنگ عظیم میں جب نازی جرمنی کے ڈکٹیٹر ہٹلر نے پیرس اور لندن پر بمباری کر کے دنیا کے دو عظیم شہروں کو مسمار اور دو تہذیبوں کو تباہ و برباد کر دیا تو انسانیت کے پرستار مہاتما گاندھی چلا اٹھے انہوں نے کہا کہ لندن اور پیرس کی تباہی کے خیال سے ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ حالانکہ اس وقت بھی برطانوی سامراج سے آزادی کی جنگ چل رہی تھی اور گاندھی جی اس کی قیادت کر رہے تھے۔ ایسے وقت میں عام طور پر ہر انسان اپنے مخالف کو کمزور سے کمزور تر کرنا چاہتا ہے اور اس کمزوری میں اپنی کامیابی کے امکانات تلاش کرتا ہے۔ لیکن گاندھی جی عام آدمی نہ تھے انہوں نے کبھی کسی کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی وہ مسئلہ کو ظلم و انصاف، ظالم و مظلوم کے نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے۔

گاندھی جی نے دنیا کو خاص کر مغربی تہذیب سے مرعوب عوام کو کبھی فنا نہ ہونے والا یہ فلسفہ دیا کہ:

"نیک مقصد کو حاصل کرنے کے ذرائع بھی نیک ہونے چاہئیں۔"

اس اصول پر مہاتما جی تا عمر سختی کے ساتھ عمل پیرا رہے۔ آزادی کی تحریک میں جب کبھی ان کے اس فلسفہ کے خلاف بات آجاتی، تشدد یا ناانصافی کا ارتکاب ہو جاتا تو وہ تحریک کو فوراً روک دیتے اور عوام کو نیک راستہ اختیار کرنے کے لئے تیار کرتے۔

باپو نے دنیا کو ایک اور حیرت انگیز فلسفہ یا ہتھیار دیا جو عدم تشدد کا ہتھیار تھا۔ وہ جانتے تھے کہ سامراج ہم سے بہت زیادہ طاقتور ہے ہم مسلح لڑائی کے ذریعہ کامیابی حاصل نہیں کر سکتے ہیں اس لئے انہوں نے عدم تشدد کے ذریعہ ہی آزادی کی لڑائی لڑی جس میں ان کو کامیابی ملی اور مسلح جنگ کی تباہیوں سے ملک محفوظ رہا۔

یہ فلسفہ ہندوستان کے لئے تو کامیاب ثابت ہی ہوا دنیا کے بیشتر ممالک نے بھی جو آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے تھے اس ہتھیار کو استعمال کیا انڈونیشیا اور ماریشس نے بھی یہی راستہ اختیار کیا اور آزادی حاصل کی۔ جنوبی افریقہ کے عظیم رہنما اور جنگ آزادی کے سپہ سالار ڈاکٹر نیلسن منڈیلا نے (جنہوں نے اپنی زندگی کے ۲۶ سال برطانوی سامراج کی جیلوں میں گزارے ہیں) اعلان کر کے مہاتما گاندھی کے فلسفہ عدم تشدد کو آزادی کی جنگ کے لئے اپنایا استعمال کیا اور کامیابی حاصل کی۔

مہاتما گاندھی دوست ہونے کے ساتھ نہایت فراخ دل مذہبی انسان بھی تھے خدا اور بھگوان میں ان کو پورا پورا یقین تھا ان کا اعتقاد تھا کہ "میں اپنے مالک اور آقا کا ایک آلۂ کار ہوں اور یہ بات وہی جانتا ہے کہ مجھ سے کس طرح اور کس حد تک کام لے"۔

جب ان کے رفیق کار انہیں برت رکھنے سے روکتے تھے خصوصاً ان کی زندگی کے آخری دور میں تو ان کی درخواست کو وہ بہت نرمی اور خود اعتمادی کے ساتھ یہ کہہ کر رد کر دیتے تھے کہ میرا اس حقیقت پر پورا یقین ہے کہ خدا کی مرضی کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں ہلتا ہے اگر اسے مجھ سے اور کام لینے کی ضرورت ہے تو وہ میری زندگی کو محفوظ رکھے گا۔ اس کی مرضی کے بغیر کوئی مجھے نہیں بچا سکتا (ہریجن ہندی) ہر آزمائش کے بعد خدا میں ان کا عقیدہ اور زیادہ مضبوط ہو جاتا تھا وہ فرماتے تھے:

"جب کبھی افق پر تاریکیاں چھائیں تو میں نے خدا کو ہمیشہ قریب پایا مجھے
اپنی زندگی میں ایک لمحہ بھی ایسا یاد نہیں آتا جب اس نے مجھے چھوڑ دیا
ہو یا مجھ سے منھ موڑ لیا ہو"

مہاتما جی میں انتہا درجہ کی مذہبی رواداری تھی "ینگ انڈیا" میں فرماتے ہیں ذاتی طور پر میں دنیا کے تمام مذہبوں کو سچا مانتا ہوں سب مذہبوں نے بنی نوع انسان کو فائدہ پہونچایا ہے اور آج بھی وہ یہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔" اخبار ہریجن ہندی میں لکھتے ہیں مذہب روح کی سائنس ہے یوں تو سب ہی طاقتیں اہم ہیں لیکن خدا کا وجود ہے تو روحانی طاقت سب سے بڑی طاقت ہے۔

باپو ہندو مسلم فسادات سے بہت پریشان ہوتے تھے ہندستان کے بٹوارہ کے بعد ۱۹۴۷ء میں دہلی میں جب انتہائی ہلاکت خیز فسادات ہو رہے تھے گاندھی جی نے کانگرس کے لوگوں سے فسادات رکوانے کی اپیل کی وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو تو بہت بے جگری کے ساتھ فسادیوں میں گھس جاتے اور ان کو روک دیتے تھے ان کے علاوہ مسز سبھدرا جوشی، لالہ برج کشن چاندی والا اور دوسرے لوگ بھی کام کر رہے تھے کانگریسی کارکن کچھ مبالغہ کے ساتھ اپنے کاموں کی رپورٹ دیتے تھے ایک روز کانگریسی کارکنوں کی موجودگی میں مہاتما جی نے مسٹر برج کشن چاندی والا سے پوچھا کہ فسادات کو روکنے کے لئے کانگریسی کچھ کام کر رہے ہیں انہوں نے برجستہ جواب دیا بہت کام کر رہے ہیں بقول مسز سبھدرا جوشی باپو نے معاً سوال کر دیا کہ فساد کو روکنے میں کتنے کانگریسی مارے گئے؟ اب تو سب خاموش رہ کر ایک دوسرے کا منھ دیکھنے لگے۔ مہاتما جی روزانہ مولانا حفظ الرحمان کو ملاقات کا وقت دیتے اور ان سے دن بھر کے حالات سنتے تھے (مولانا کانگریس کے ممتاز رہنما اور جمیعتہ علماء ہند کے جنرل سکریٹری بھی تھے) اس پر کچھ کانگریسی کارکنوں کو اعتراض ہو جس پر مہاتما جی نے کہا کہ تم مبالغہ کرتے ہو مولانا سچی بات بتاتے ہیں۔ گاندھی جی کی انسانیت دوستی کی اس سے بڑی اور کیا مثال ہو گی کہ جب سارا ہندستان آزادی کا جشن منا رہا تھا ہر گھر میں چراغاں ہو رہا تھا ہر شخص آزادی کی خوشی میں سرشار تھا اس وقت جنگ آزادی کا سب سے بڑا رہنما اور سپہ سالار ان تمام سرتوں سے الگ تھلگ نواکھالی (مشرقی بنگال) کے فساد زدہ اور ستم رسیدہ انسانوں کی مدد کر رہا تھا اس کے سامنے جشن کی کوئی حقیقت نہ تھی وہ انسانوں کو بچانے اور ملک میں اس آگ کو پھیلنے سے روکنے کے لئے سینہ سپر تھا۔

گیت

مرکزِ علم و فن جانِ صد انجمن
ساری دُنیا سے پیارا ہمارا وطن

رشکِ فردوس گلزار کشمیر ہے
حسن اور عشق کی تاج تصویر ہے
عزم پرتاپ عدل جہانگیر ہے
پیارے باپو کے خوابوں کی تعبیر ہے
اس کی آغوش میں پاک گنگ و جمن
ساری دُنیا سے پیارا ہمارا وطن

سُور تلسی کے، میرا کے گانے بھی ہیں
کرشن کی بانسری کے ترانے بھی ہیں
صوفیوں، سادھوؤں کے ٹھکانے بھی ہیں
لائقِ احترام آستانے بھی ہیں
اس میں سُلطان ٹیپو کا ہے بانکپن
ساری دُنیا سے پیارا ہمارا وطن

دل سے دل کو ملانے کا دن آج ہے
سارے غم بھول جانے کا دن آج ہے
پیار کے گیت گانے کا دن آج ہے
یعنی خوشیاں منانے کا دن آج ہے
آج دھرتی پہ نازاں ہے انجم گگن
ساری دُنیا سے پیارا ہمارا وطن

انجم صدیقی بہرائچی
۱۷۹، شیخاپورہ، بہرائچ
۲۷۱۸۰۱

باپو کا جمالِ افکار

رباعیات

سچ مچ میں تھے ایسے نیارے باپو
کہلائے مہاتما ہمارے باپو
جینے کا فلسفہ عجب رکھتے تھے
پیارے باپو، بڑے ہی پیارے باپو

جو کہتے تھے، سب لوگ محبت سے رہیں
مل جل کے رہیں، دور عداوت سے رہیں
باپو کے راستے پہ بھارت واسی
اے کاش چلیں اور مسرت سے رہیں

پیغام اخوت کا سنانے والے
احساس غلامی کا دلانے والے
غیروں کے بھی دکھ درد کو اپنا جانا
بھولیں گے انھیں کیسے زمانے والے

دھندلی نہ پڑے گنگ و جمن کی عظمت
بڑھتی رہے گہوارۂ چمن کی عظمت
کوشش رہی تا عمر یہی باپو کی
افلاک سے ٹکرائے وطن کی عظمت

ہم دورِ فسردگی کو ذرا یاد کریں
وہ پاؤں میں زنجیرِ بلا یاد کریں
باپو نے کیا دیش کو جس سے آزاد
کیسی تھی وہ دل سوز صدا یاد کریں

دنیا میں وطن باعثِ توقیر تو ہے
باپو کے حسیں خواب کی تعبیر تو ہے
وہ ہوں گے دکھی آج بھی اس سے لیکن
جو فرقہ پرستی ہے وہ زنجیر تو ہے

دل میں روحانیت سمیٹے نکلے
اور فقر کی چادر کو لپیٹے نکلے
باپو نہیں نکلے راہِ آزادی میں
بھارت ماں کے سچے بیٹے نکلے

ظلمت میں روشنی دکھا سکتا ہے
سارا ماحول جگمگا سکتا ہے
سچ یہ ہے کہ باپو کا جمالِ افکار
پھر ایک نئی صبح کو لا سکتا ہے

کیا لذتِ تقریر خدا نے دی تھی
کیا ندرتِ تحریر خدا نے دی تھی
وہ سحر وہ اعجاز قیامت والا
آواز میں تاثیر خدا نے دی تھی

کچھ اور بھی ہو اپنا وطن فولادی
شاداب نظر آئے سبھی آبادی
ہم اپنے مسئلے ابھی حل کر لیں
باپو کی طرح بنیں اہنسا وادی

رباب رشیدی
۶۵ - تارین، شاہجہاں پور

ڈاکٹر محمد انورالدین
صدر شعبہ اُردو حیدرآباد یونیورسٹی
حیدرآباد

اُردو نثر اور گاندھی جی

اردو نثر میں مہاتما گاندھی کے اثرات دو طرح سے سامنے آتے ہیں

۱۔ وہ تصانیف جو براہِ راست گاندھی جی پر لکھی گئیں۔

۲۔ وہ افسانے، ناول یا دیگر نثری اصناف جن میں گاندھی جی کے خیالات و افکار کا عکس جمیل نظر آتا ہے۔

یہاں صرف ان تخلیقات کا تذکرہ کیا جا رہا ہے جن کی ادبی حیثیت ہے ورنہ سچ پوچھیے تو گاندھی جی پر اتنا رطب و یابس ہے کہ اس کا احاطہ اس مختصر سے مضمون میں ممکن نہیں ہے۔

گاندھی جی پر لکھی جانے والی کتابوں میں ادبی اعتبار سے سب سے اہم اور اولین تصنیف حسن اتفاق سے ترجمہ ہے چنانچہ یہ پہلی تخلیق "تلاشِ حق" کے عنوان سے ملتی ہے۔ یہ گاندھی جی کی خود نوشت جو انگریزی میں ہے اس کا ترجمہ ڈاکٹر عابد حسین نے کیا ہے اور اس میں گاندھی جی نے جنوبی افریقہ سے واپسی تک کے واقعات بیان کیے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ گاندھی جی کے ذہنی سفر کی کہانی بھی ملتی ہے جو ہر واقعے سے مربوط ہے۔

اس کی زبان سلیس، رواں ہے اور ترجمہ کا اعلیٰ ترین معیار پیش کرتی ہے بلکہ اگر یہ نہ بتایا جائے کہ یہ ترجمہ ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے گاندھی جی نے اسے اردو میں ہی لکھا ہوگا۔

ترجمہ کے ضمن میں ایک اہم تصنیف "ڈاکٹر راجیندر پرشاد کی "باپو کے قدموں میں" ہے۔ حالانکہ اس کتاب میں مترجم کا نام نہیں درج ہے اس کو انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ نے ۱۹۵۳ء میں شائع کیا اس کے سرورق کے اندرونی حصہ میں لکھا ہے

> "صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجیندر پرشاد نے گاندھی جی کے ساتھ اپنی ابتدائی سیاسی زندگی کا حال بہت دلچسپ پیرائے میں لکھ کر دیوناگری رسم الخط میں شائع کیا تھا۔ انجمن ترقی اردو ہند نے اس کو اردو رسم الخط میں منتقل کیا ہے"۔

لیکن محترم قاضی عبدالغفار پیش لفظ میں لکھتے ہیں

> "صدر جمہوریہ محترم ڈاکٹر راجیندر پرشاد کا نیازمندانہ شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ موصوف نے مجھے اس کتاب کا ترجمہ کرنے کی اجازت عطا فرمائی"۔ (صفحہ نمبر د)

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف رسم الخط کی تبدیلی عمل میں نہیں آئی ہے بلکہ اس کا ترجمہ بھی ہوا ہے اور مترجم عبدالغفار ہیں۔ موصوف نے پیش لفظ کی تاریخ ۱۸ر اگست ۵۳ء لکھی ہے۔ دیباچہ ۲۴ر جون ۱۹۵۰ء کا ہے اور خلاصۂ کتاب کے طور پر آخری باب کے نیچے ۱۵ر اگست ۱۹۵۰ء کی تاریخ پڑی ہوئی ہے۔ اس میں گاندھی جی کے المناک سانحہ تک کے واقعات درج ہیں لیکن اس روز کی تفصیلات اس لیے نہیں ہیں کہ راجیندر بابو اس روز دہلی میں نہیں تھے اور انھوں نے یہ خبر وردھا میں سنی تھی۔

نثر میں گاندھیائی ادب کے سلسلے میں راقم الحروف کو یہ تمام کتابوں سے زیادہ اہم اس لیے محسوس ہوئی کہ راجیندر بابو نے یہ کتاب جہاں احترام و عقیدت سے لکھی ہے وہاں خود اپنی شخصیت کو بھی پیش منظر میں رکھا ہے۔ وہ پہلی بار ۱۹۱۵ء میں گاندھی جی سے ملے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب گاندھی جی جنوبی افریقہ سے ہندوستان آچکے تھے۔

راجیندر بابو اردو اور فارسی دونوں زبانوں سے نہ صرف یہ کہ باخبر تھے بلکہ اردو پر بڑی اچھی قدرت رکھتے تھے۔ بہار میں ان کے ساتھیوں میں پروفیسر عبدالباری بھی تھے اور مولوی مظہر الحق جیسے ماہرین اردو بھی۔ اس لیے یہ کتاب انداز بیان کے اعتبار سے بھی بہت ہی منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ جہاں ۲۵ برس میں جہدِ آزادی کے اہم

واقعات اس میں نظر آتے ہیں وہیں اُن کا دلکش طرزِ تحریر اسے افسانوی حیثیت بھی دیتا ہے۔ اگر کوئی کمی رہ بھی گئی ہوگی تو قاضی عبدالغفار نے اسے سنوار کر بہترین حسن بیان کے ساتھ تذکرہ جہد آزادی بنا دیا ہے۔ اس کی کچھ سطریں ملاحظہ ہوں،

"گنگا کی مقدس دھار حسبِ دستور چل رہی ہے۔
...... جس کا جتنا ظرف ہوتا ہے وہ اتنا ہی اس میں سے
پانی لے سکتا ہے۔"

ان کا طرزِ تحریر بیانیہ ہے لیکن ڈرامائیت کے ساتھ اور جہاں کہیں گاندھی جی کے فلسفہ پر انھوں نے گفتگو کی ہے وہاں بھی دلچسپی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ حالانکہ پوری کتاب کے تقریباً ۵۰، صفحے کے محور و مرکز گاندھی جی ہیں لیکن راجیندر بابو نے اس عہد کے اور اہم رہنماؤں کے کردار و کارناموں پر روشنی ڈالی ہے۔ البتہ حیرت انگیز طور پر صرف صفحہ ۲۳۹ اور ۲۸۸ پر مولانا آزاد کا نام آیا ہے۔ بعض جگہ موضوع ناصحانہ یا فلسفیانہ ہے لیکن طرزِ بیان کی دلکشی نے خشک موضوع کو بھی دلکش بنا دیا ہے۔ لکھتے ہیں،

"جیسے ہم زندگی اور موت کہتے ہیں اس میں مہاتما جی
کچھ فرق نہیں مانتے تھے۔ روح غیر فانی ہے اور جسم بدل سکتا
ہے اس لیے مرنے سے صرف جسم ہی چھوٹتا ہے۔ وہ کہا کرتے
تھے آدمی کو موت کا استقبال کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہنا چاہیے۔"

گاندھی جی نے سچائی اور اہنسا کے احترام کے لیے گیارہ اصول وضع کیے تھے۔ انھوں نے یہ اصول ایک طرح سے ہر ستیہ گرہی اور اہنسا کے پجاری کے لیے بطور عہد مقرر کیے تھے۔ یہ اصول وہ تھے جنھیں دعا کے وقت وہ دہرایا کرتے تھے۔

وہ اصول یہ ہیں: ———

(۱) اہنسا (۲) سچائی (۳) جھوٹ سے احتراز (۴) ترک لذات (۵) نفاق سے پرہیز (۶) جسمانی محنت (۷) عدم ذائقہ (۸) روحانی ترقی (۹) سب مذہبوں کی وحدت (۱۰) سُودیشی (۱۱) اچھوت۔

یہ زیادہ تر وہی فرض و اصول ہیں جو ہمارے شاستروں میں بتائے گئے ہیں۔ اس میں وقت اور جماعت کا لحاظ کر کے کچھ باتیں زیادہ کی گئی ہیں۔ ان "عہدوں" کی تفصیل خود مہاتما جی نے "منگل پربھات" نامی کتاب میں کر دی ہے۔"

ایک جگہ اور لکھتے ہیں،

"بزرگ لوگ بڑے بڑے اصولوں کو بہت آسان
بنا کر عام لوگوں کے لیے فائدہ مند کر دیتے ہیں......
سچ اور اہنسا کی پابندی کے لیے انسان کو سب قسم کی آزادی
ہونی چاہیے۔"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں،

"دنیا میں جس قدر جھگڑے انسانوں اور جماعتوں میں
آج تک ہوئے ہیں اور ہوتے ہیں وہ اس وجہ سے ہوتے ہیں
کہ ایک آدمی کی ضرورتیں دوسرے آدمی کی ضرورتوں سے ٹکراتی ہیں۔"

اس کتاب کا آخری حصہ ایک طرح کا اخلاقی وعظ ہے لیکن ڈاکٹر صاحب کا انداز تحریر یہاں بھی وعظ و نصیحت کو ایک طرح کی للکار میں بدل دیتا ہے،

"ان کی نیکی کو سامنے رکھ کر ہم سب ان کے بتائے
ہوئے اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے اپنے دلوں کو ٹٹولیں
اور ان سے پوچھیں کہ آیا ہم دوسرے کے بارے میں پریم کا
جذبہ رکھتے ہیں یا نفرت کا......؟
کیا ہمارا کام ایسا ہے جس کو ہم علانیہ طور پر کر سکتے
ہیں یا اس میں ایسی کوئی بات بھی ہے کہ دنیا کی شرم یا خوف
کی وجہ سے ہمارے لیے اس کا چھپانا ضروری ہے۔ کیا ہم اپنی
زندگی کو...... سدھار رہے ہیں یا...... بگاڑ رہے ہیں...؟"

ترجمہ کے اعتبار سے تمام تر خوبیوں کے ساتھ اکثر الفاظ حیرت انگیز طور پر کھٹکتے ہیں۔ فاضل مترجم نے گاندھی جی کے برت کے لیے جگہ جگہ روزہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شرعی اصطلاح میں مسلمانوں کے لیے لفظ صوم ہے اور رمضان ماہ صیام بھی کہلاتا ہے لیکن ہمارے اردو محاورے میں روزہ کا اطلاق صرف مسلمانوں کے لیے ہی ہوتا ہے۔ گاندھی جی برت رکھتے تھے اس کے لیے لفظ روزہ یا اُپواس یا فاقہ بھی مناسب نہیں ہے۔ برت کا مفہوم پورے طور سے

گاندھی جی کے عمل کو اپنے دائرے میں لیتا ہے اور اردو میں اسے اپنایا بھی جا چکا ہے۔

آخر میں جو چار سطریں ہیں وہ ایسا لگتا ہے جیسے ڈاکٹر راجیندر پرشاد ہم سب کو دعوت دے رہے ہیں کہ ہم اپنے اعمال کا اور اپنے سیاسی چلن کا محاسبہ کریں، سوچیں اور غور و فکر سے کام لیں۔ لکھتے ہیں

"آج ہم اپنی زندگی بھی مفید بنا سکتے ہیں جب ہم اپنے دل کے ہر کونے کو ٹٹول کر دیکھ لیں کہ اس میں کہیں گاندھی جی کی تعلیم کے خلاف کوئی چھپی ہوئی گرہ ہی تو کام نہیں کر رہی ہے۔"

یوں تو مولانا آزاد نے "انڈیا ونس فریڈم" میں تقریباً تاریخ کے ہر نازک موڑ پر گاندھی جی کو خراج عقیدت پیش کیا ہے اور ان سے اپنے روابط کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ اس کتاب کا اردو ترجمہ "ہندوستان نے آزادی جیت لی" بہت اچھا ہوا ہے لیکن اردو نثر پر گاندھی جی کی گہری چھاپ منشی پریم چند کی تحریروں کی وجہ سے پڑی۔

منشی پریم چند نے بے شمار کہانیوں میں گاندھی جی کے نظریات و افکار کو پیش کیا ہے۔ ان میں "عفو"، "دل کی رانی"، "استعفیٰ"، "آشیاں برباد"، "جیل"، "آخری تحفہ"، "قاتل"، "سمر یاترا"، "ایمان کا فیصلہ"، "نمک کا داروغہ" اور "پنچایت" وہ کہانیاں ہیں جن میں گاندھی جی کے نظریات و افکار کی گہری چھاپ ہے۔[۱۱]

اسی طرح ناولوں میں میدانِ عمل اور گئودان پر گاندھی جی کا اثر نمایاں ہے۔ گئودان میں مہتا کی گفتگو میں اس کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ رائے صاحب کی شکست اور گوبند کا ایثار ان سب کے پس پردہ گاندھی جی کے نظریات ہیں۔ اسی طرح میدان عمل میں امر کانت کے کردار یا آتما نند کے کردار کے بعض رخ میں گاندھی جی کا اثر نمایاں ہے۔

اسے اتفاق نہیں سمجھنا چاہیے کہ میدان عمل میں جیلر کے ہاتھوں سے پٹنے والا مسلسل اللہ اکبر کا نعرہ لگانے والا کالے خاں ہے اور ناول میں ماتا "پٹھانی" کی جے جے کے نعرے سنائی دیتے ہیں۔ کالے خاں اور ماتا پٹھانی دراصل سرحد میں بادشاہ خاں کی خدائی خدمتگار تحریک کا علاقائی اشارہ تھے۔ شاید یہ لکھنا ضروری نہ ہو کہ بادشاہ خاں سرحدی گاندھی تھے اور ان کا طریق کار ان کے نظریات اور افکار گاندھی جی سے متاثر تھے۔

لیکن سب سے زیادہ جس ناول پر گاندھی جی کا اثر ہے اس کا نام چوگان ہستی ہے۔ یہ ناول ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۴ء کے درمیان لکھا گیا۔ حق یہ ہے کہ تلک کے انتقال کے بعد ہندوستانی سیاست کے افق پر گاندھی جی نمودار ہوئے تو اس طرح کہ سیاست کے آسمان پر ان کے سامنے سارے سیاست داں ستاروں کی طرح ماند پڑتے گئے۔ اس زمانے میں ترک موالات کی تحریک پورے زور و شور سے چل رہی تھی اور ہندو مسلمان سب کی زبان پر گاندھی جی کا نام تھا۔ پروفیسر یوسف سرمست لکھتے ہیں:

"یہی وہ زمانہ تھا جب مہاتما گاندھی کی شخصیت اور ان کا فلسفہ عدم تشدد، روشن ترین اور نمایاں ترین صورت میں سامنے آئے۔"[۱۲]

آگے چل کر لکھتے ہیں:

"گاندھی جی کی شخصیت کے اس روپ کے اجاگر ہونے کے بعد پریم چند نے چوگان ہستی میں گاندھی جی کا عدم تشدد کا فلسفہ اس طرح پیش کیا کہ وہ چوگان ہستی کے ہیرو سورداس کی شکل میں مجسم ہو گیا۔"[۱۳]

یہ ناول ہر لحاظ سے گاندھی جی کے افکار و نظریات کی تشریح و تفسیر کرتا ہے۔ پریم چند نے کئی موقعوں پر گاندھی جی کے بارے میں کہا

"میں مہاتما گاندھی کو سب سے بڑا مانتا ہوں۔ ان کا نصب العین ہے کہ مزدور اور کسان سکھی رہیں۔ اور وہ ان لوگوں کو آگے بڑھانے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔"[۱۴]

پروفیسر جعفر رضا نے "پریم چند کہانی کا رہنما" کے حاشیے میں پریم چند اور ان کی بیوی کا مکالمہ درج کیا ہے

"آپ بولے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ میں مہاتما گاندھی کو بغیر دیکھے ہی ان کا شاگرد ہو چکا تھا۔
میں بولی۔ تو اس میں مہاتما گاندھی کی کون خاص بات ہے؟
آپ بولے۔ بات یہ ہوئی کہ جو بات وہ کرانا چاہتے ہیں

اسے میں پہلے ہی کر دیتا ہوں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ میں ان کا
بنا بنایا فطری شاگرد ہوں۔"[۶]

پروفیسر جعفر رضا نے بڑی تفصیل سے پریم چند اور گاندھی جی کے درمیان جو نظریاتی فاصلے اور سرحدیں تھیں اُن پر روشنی ڈالی ہے اس لیے کہ "میدان عمل" میں پریم چند اشتراکی نظریہ حیات سے قریب ہو گئے تھے۔ گاندھی جی سماج کے مختلف طبقات کو اپنے ساتھ لے کر چل رہے تھے ان کے ساتھ "دار و نادار" دونوں تھے۔ پروفیسر جعفر کا یہ مختصر اقتباس ملاحظہ ہو:

"مہاتما گاندھی نے دونوں زمروں کے درمیان مفاہمت
کی صورت یوں پیدا کی تھی کہ اپنی مرکزی شخصیت کے زیر سایہ
کثرت میں وحدت کے نظریاتی اصولوں پر مفاہمت کرا دی تھی۔"[۷]

اس پر سب کا اتفاق ہے کہ مہاتما گاندھی کا سب سے بڑا آدرش دھرم تھا وہ کہتے تھے اہنسا سے یکجہتی اور مساوات کی تلقین ہوتی ہے۔

پریم چند اور گاندھی جی بذات خود ایک تحقیق کا موضوع ہے پھر بھی مہاتما گاندھی کا اردو نثر میں سب سے زیادہ اثر پریم چند کی کہانیوں اور ناولوں میں نظر آتا ہے۔ پریم چند کے معاصرین میں سدرشن اور علی عباس حسینی بھی مہاتما گاندھی سے بہت متاثر رہے۔

ترقی پسند تحریک کے آغاز سے گاندھیائی لہر کم تو نہیں ہوئی لیکن اس نے دوسرا رخ اختیار کر لیا البتہ کرشن چندر نے ایک کتاب لکھی تھی جس میں مہاتما گاندھی کو کردار بنا کر پیش کیا تھا۔ یہ کہانی حالانکہ امن کے موضوع پر لکھی گئی تھی مگر اس کے پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مہاتما گاندھی کے اثرات کی جڑیں کتنی گہری تھیں۔

ناولوں کی دنیا میں حالانکہ "اور انسان مرگیا" جیسے ناول پر مہاتما گاندھی کی پرچھائیں نظر آتی ہے لیکن مکمل طور سے مہاتما گاندھی کو حیات اللہ انصاری کے ضخیم ناول "لہو کے پھول" میں دیکھا جا سکتا ہے ان کا فلسفہ، ان کے نظریات، ان کا طریقہ کار سبھی کچھ اس ناول میں ہے حامد اللہ افسر نے حکایات گاندھی کے عنوان سے ادبی انداز میں گاندھی جی کی حیات اور ان کے اصولوں کو پیش کیا ہے۔

اس مختصر سے مضمون میں اس کی گنجائش نہیں ہے کہ ہر پہلو سے اور ہر صنف پر مہاتما گاندھی کے اثر کی نشاندہی کی جا سکے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ مہاتما گاندھی نے اردو زبان و ادب کو متاثر کیا آج بھی ہماری تحریروں میں اور ہماری بول چال میں "ودیسی، سودیشی، عدم تشدد، اہنسا، ہنسا، ستیہ گرہ، ہڑتال، برت، بائیکاٹ، آندولن، چرخا، پرچار، اچھوت، ہریجن" جیسے الفاظ نظر آتے ہیں جنھیں مہاتما گاندھی کی وجہ سے ایسی معنویت ملی کہ وہ ہماری زبان اور ہمارے ادب کا ناقابل تنسیخ جزو بن گئے۔

□□

حواشی: [۱] بحوالہ پریم چند کہانی کا رہنما۔ جعفر رضا ص ۲۱۷-۲۱۶
[۲] بحوالہ بیسوی صدی اردو کی ناول۔ یوسف سرمست ص ۱۸۷ [۳] ایضاً ص ۱۸۸ [۴] پریم چند ص ۱۲۴ [۵] شبو رانی پریم چند گھر میں بحوالہ پروفیسر جعفر رضا۔ پریم چند کہانی کا رہنما [۶] جعفر رضا۔ پریم چند کہانی کا رہنما ص ۲۱۱
[۷] اردو زبان و ادب میں غیر اسلامی روایات۔ پروفیسر مجاور حسین رضوی

صبحِ درخشاں

یہ صبحِ درخشاں، یہ فضاؤں کی ہنسی دیکھ
ہر شاخِ گلستاں ہے بہاروں سے لدی دیکھ

چھیڑا تھا بہاروں نے عجب نغمۂ رنگیں
گزری جو اِدھر ہو کے صبا جھوم اُٹھی دیکھ

نازاں نہ ہو تو اس قدر انساں کے شرف پہ
کیا ہو گیا انسان کو یہ بھی تو کبھی دیکھ

اِک ایسا بھی انسان ہوا جس کے عمل سے
ہر قوم کے انسان کی تقدیر کھُلی دیکھ

جس نے کہ یہاں طوقِ غلامی کو اُتارا
اور پائے اسیری کی بھی زنجیر کٹی دیکھ

پھر نغمۂ آزادیٔ مُلک اس نے سُنایا
فرقتؔ جسے سُن سُن کے فضا جھوم اُٹھی دیکھ

عبدالقیوم فرقت
۱۵۳/۷ ٹیڑھی بازار۔ مولوی گنج۔ لکھنؤ

مظفر حسین غزالی
۱۶۱۔ ایف، جوگابائی۔ جامعہ نگر
نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

گاندھی جی کے تعلیمی تصوّرات

گاندھی جی کا اپنا ایک واضح مقصدِ حیات اور نظریۂ زندگی تھا۔ اس میں عدم تشدّد اور حق کی تلاش کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ ان کے افکار اور تعلیمی تصوّرات میں ان کا نظریۂ حیات پوری طرح کار فرما نظر آتا ہے۔ گاندھی جی کے زمانے میں روایتی انداز سے تعلیم دی جاتی تھی۔ اس میں کتاب اور حروف شناسی کو اہمیت حاصل تھی۔ نظامِ تعلیم میں عملی اور بامقصد کام کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ مدرسہ کا سماج سے رشتہ بہت کمزور تھا۔ عملی زندگی میں تعلیم کوئی رہنمائی نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ اس میں ذہنوں کی تربیت کے بجائے معلومات فراہم کرنے پر زور تھا۔ گاندھی جی کا خیال تھا کہ علم عمل کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ لہٰذا انھوں نے تعلیم میں کتاب پر کام کو فوقیت دی۔ اور دستکاری کے ذریعہ بچّوں کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے پر زور دیا۔ ان کے نزدیک قومی تعلیم میں حق اور عدم تشدّد کا مفہوم شامل تھا۔ انھوں نے اپنے اخباروں ھریجن اور ینگ انڈیا میں تعلیم کے موضوع پر متعدد مضامین لکھے اور کچھ تجاویز مرتب کیں۔ ان تجاویز کو واردھا میں منعقد ہونے والے کانگریس کے اجلاس میں منظور کر لیا گیا۔ اس کی بنیاد پر بنیادی تعلیم کی اسکیم مرتب کرنے کی ذمّہ داری ڈاکٹر ذاکر حسین کے سپرد کی گئی۔ ذاکر صاحب نے نئی تعلیم کا جو لائحہ عمل تیار کیا اسے واردھا تعلیمی اسکیم کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کی رپورٹ کو گاندھی جی نے ۲ دسمبر ۱۹۳۷ء کو منظوری دی۔ اسکیم کے بنیادی خیال کا نصابِ تعلیم کے ضمن میں اس طرح ذکر ہوا ہے:

> "دستکاری کو تعلیمی مرکز مان کر دوسرے نصابِ تعلیم علوم و فنون کو اس کے چاروں طرف مرتب کیا گیا تھا۔ اس میں مادری زبان کی تعلیم پر بہت زور ہے۔ کہا گیا ہے کہ جب تک بچّہ اپنی مادری زبان پر قدرت نہ حاصل کر لے گا وہ اس قابل نہیں ہو سکتا کہ سوسائٹی کا قابلِ قدر ممبر بن سکے۔"

مادری زبان میں تعلیم کا تذکرہ کرتے ہوئے عبداللہ ولی بخش قادری صاحب نے اپنی کتاب تعلیمی افکار و مسائل میں گاندھی جی کا یہ قول نقل کیا ہے:

> "ہماری زبان ہماری شخصیت کا اظہار ہے اور بدیسی زبان کے ذریعے تعلیم حاصل کرنا ایک قسم کی خودکشی ہے۔ کیوں کہ اس طور طبیعت کی امنگ ماری جاتی ہے اور جہانِ معنی میں انسان کی حیثیت مرغِ بے پر کی رہ جاتی ہے۔"

وہ دوسری زبانوں خصوصاً انگریزی زبان کی تدریس کے مخالف نہ تھے۔ وہ انگریزی کو بین الاقوامی تجارت اور سیاست کی زبان تصوّر کرتے تھے نیز وہ چاہتے تھے کہ اس زبان کے ادب اور اس میں پائے جانے والے خیالات کو ترجمہ کر کے اپنی زبانوں میں منتقل کیا جائے لیکن وہ انگریزی کو ذریعۂ تعلیم کے طور پر قبول کرنے کے حامی نہ تھے۔ انگریزی تعلیم کے ذریعہ انگریزوں کی نقّالی کا رجحان جس طور سماج میں بڑھ رہا تھا وہ انھیں پسند نہ تھا۔ انھوں نے غیر ملکی زبان کو ذریعہ تعلیم بنائے جانے کو ایک افسوسناک سانحہ سے تعبیر کیا ہے۔ ینگ انڈیا کے ایک مضمون میں اپنے اس خیال کو ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

> "میں نے بڑے غور و خوض کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ جس طریقہ سے ہمیں انگریزی تعلیم دی جا رہی ہے اس نے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو بالکل نکمّا کر دیا ہے اور طالب علموں کے دماغ پر بہت بڑا بوجھ ڈال کر انھیں نقّال بنا دیا ہے۔ انگریزی راج کا یہ سب سے افسوس ناک سانحہ ہے کہ ہم اپنے وطن

کی زبانوں کو چھوڑ کر ایک غیر ملکی زبان میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔"

گاندھی جی صرف مفکر نہ تھے بلکہ ایک عملی انسان تھے۔ تعلیم کے سلسلے میں انھوں نے جو بھی اپنے تصورات پیش کیے ہیں ان کی تہہ میں ان کا ایک طویل تجربہ موجود ہے۔ ان کی عملی مشق کا پہلا نمونہ ۱۹۰۳ء میں سامنے آیا۔ انھوں نے ٹرانسوال میں ایک فارم اسکول قائم کیا۔ اس کا نام ٹالسٹائے فارم تھا۔ اس اسکول میں گاندھی جی خود بچوں کو تعلیم دیتے تھے۔ اس اسکول میں بچوں کا زیادہ وقت جسمانی محنت پر صرف ہوتا تھا اور کچھ وقت پڑھائی پر۔ اس میں ذریعہ تعلیم بچوں کی مادری زبان تھی۔ کردار کی تربیت کو خاص اہمیت حاصل تھی۔

جنوبی افریقہ سے واپس ہندوستان آکر گاندھی جی نے ۱۹۱۵ء میں سابرمتی آشرم قائم کیا۔ اس میں بھی جسمانی محنت، دستکاری اور کردار کی تربیت کو اہمیت حاصل تھی۔ ۱۹۱۷ء میں چمپارن (بہار) میں انھوں نے بچوں کے لیے کئی اسکول قائم کیے۔ اس وقت اسکول کے مقاصد کا بیان کرتے ہوئے گاندھی جی نے اس زمانے کے نظام تعلیم پر تنقید بھی کی ہے:

"میں موجودہ نصاب تعلیم کو بڑی تشویش اور شک کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ بجائے اس کے کہ اس میں اخلاقی اور دماغی صلاحیتیں اجاگر ہوں وہ اور گھٹ جاتی ہیں۔ اپنے اس تجربے میں جو طریق تعلیم کی خرابیوں کو دور رکھوں گا اور اس کی اچھی چیزیں لے لوں گا۔ میرا اصل مقصد یہ ہے کہ بچوں میں اعلیٰ کردار پیدا ہو۔ اعلیٰ کردار کے مردوں اور عورتوں کا ساتھ ہی میرے نزدیک تعلیم ہے۔ صنعتی تربیت ایسی ہونی چاہیے جس کے ذریعہ وہ کچھ کمائی بھی کر سکیں۔"

دستکاری کے ذریعہ تعلیم کے پیچھے ان کے دو مقصد تھے۔ ایک تعلیم کو خود کفیل بنانا اور دوسرے بچوں کی جسمانی اور ذہنی تربیت کے ساتھ ان میں مستعدی اور احساس ذمہ داری پیدا کرنا۔ یہ دونوں ہی چیزیں آج قبول کی جا چکی ہیں۔ اول الذکر پر ماہرین نے اس وقت سخت نکتہ چینی کی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کوئی اسکول اس آزمائش میں پورا نہیں اتر سکا تھا کہ اس میں پڑھنے والے بچوں نے کچھ سامان ایسا تیار کیا ہو جو بازار میں فروخت ہو سکے۔ لیکن آج یہ بات مانی جا چکی ہے کہ تعلیم ایک صنعت ہے اور اس صنعت میں اسی طرح روپیہ لگایا جانا چاہیے جیسے دوسرے کاموں میں لگایا جاتا ہے۔ اس کو روزگار سے جوڑا جائے تاکہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد طلبہ روزگار میں لگ سکیں نیز تعلیم کے دوران جو سامان وہ تیار کریں اسے فروخت کر کے اسکول کا خرچ نکالا جا سکتا ہے۔ اس طرح تعلیم کا زندگی سے سیدھا ربط قائم ہو جاتا ہے۔ یہ بات گاندھی جی نے اس ملک کے حالات کے تحت بہت پہلے پیش کر دی تھی۔ اسی طرح دوسرے پہلو کو تعلیم میں ڈالٹن پلان کے نام سے جگہ دی گئی ہے۔ اس طریقے میں طالب علم کو ایک کام مقررہ مدت میں پورا کرنے کے لیے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ ڈالٹن نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ اس طرح بچے کی ذمہ دارانہ صلاحیتیں نشو و نما پاتی ہیں۔ گاندھی جی نے جسمانی مشقت اور دستکاری کو نصاب میں شامل کیے جانے کے سلسلے میں لکھا تھا:

"جسمانی مشقت کو اسکولوں میں رائج کرنے سے ہندوستان جیسے غریب ملک کو فائدہ حاصل ہوگا اور انھیں ایک ہنر بھی آجائے گا جو آگے چل کر ان کے کام آسکتا ہے۔ وقت پڑنے پر وہ اس سے کچھ کما بھی سکتے ہیں۔ ایسی تعلیم سے ہمارے بچوں میں خود اعتمادی پیدا ہوگی۔ قوم کے لیے کوئی چیز بھی اتنی گرانے والی نہیں جتنا کہ جسمانی مشقت کو ذلیل سمجھنا۔"

واردھا کی کانفرنس (۱۱ اکتوبر ۱۹۳۶ء) میں گاندھی جی نے جو تقریر کی تھی اس میں بھی یہ پہلو واضح تھا۔ اس میں دیہی آبادی کا درد ان کے دامن گیر تھا۔ انھوں نے اس پہلو پر زور دیا کہ شروع ہی سے بچوں کے دل میں جسمانی مشقت کی عزت بٹھائی جائے کیونکہ اگر بچے اس سے نفرت کرنے لگیں گے تو پھر وہ زراعت اور اپنے آبائی پیشوں کے لیے بیکار محض ہو جائیں گے اور یہ تعلیم کا بہت افسوس ناک پہلو ہوگا۔ اس تقریر میں انھوں نے تعلیم کا مرکز "تکلی" کو قرار دیا تھا کہ اس سے بچے سوت تیار کریں۔ کپڑا بُننا، رنگنا اور نئے ڈیزائن کا کپڑا بنانا سیکھیں۔ بچوں کی بنائی ہوئی اشیاء سے اُستادوں کی تنخواہ نکل سکتی ہے۔ دستکاری کے ذریعہ بچوں کی تعلیم اور وہ اپنے طبعی و سماجی حالات سے باخبر ہوں یہ گاندھی جی کا سوچا سمجھا نظریہ تھا۔

گاندھی جی نے مذہب کو تعلیم کا بنیادی جُز قرار دیا ہے۔ ان کا ایمان

تھا کہ علم اور لیاقت بیکار ہے اگر اس کے ذریعہ تزکیۂ نفس نہ ہو۔ اسی لئے کردار کے بغیر وہ تعلیم کو بے معنی قرار دیتے ہیں۔ اور مذہب صفائی قلب یا تزکیۂ نفس کرتا ہے۔ مذہب کی تعلیم سے ان کی مُراد اقدار کی تعلیم تھی کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ بچوں میں تمام مذاہب کا احترام پیدا ہو۔ اور تمام مذاہب کی تعلیمات کو نصاب کا جُز بنایا جائے تاکہ بچوں کی شخصیت کی تعمیر ہو اور ان میں محبت، سچائی، حق کی تلاش، عدم تشدد، ایثار، یکجہتی اور ایک دوسرے کا احترام کرنے جیسے عناصر پیدا ہو جائیں۔ اقدار کی تعلیم اس وقت ہمارے نصاب کا حصّہ نہ بن سکی لیکن بعد میں ۱۹۸۶ء میں جب نئی تعلیمی پالیسی مرتب کی گئی تو گاندھی جی کے اس مشورے کی اہمیت سمجھ میں آئی اور اقدار کی تعلیم کو قومی تعلیم کا حصّہ قرار دے دیا گیا۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد ہندستان کی تعلیمی تنظیم کے سلسلے میں سنٹرل اڈوائزری بورڈ نے تعلیم کا ایک پلان بنایا جو سارجنٹ رپورٹ کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں گاندھی جی کی بنیادی تعلیم کے کئی پہلوؤں کو شامل کیا گیا ہے۔ مثلاً ابتدائی تعلیم کو مفت اور لازمی کرنا اور عمل کے ذریعہ تعلیم کے اصول کو بھی منظوری دی گئی تھی لیکن تعلیم کو خود کفیل کرنے کے نظریہ کو اس میں اہمیت نہیں دی گئی۔ آزادی کے بعد بھی اس پر عمل نہیں ہوا بلکہ یہ کہا گیا کہ حکومت کافی روپیہ تعلیم کے لیے فراہم کر رہی ہے اس لیے اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ جبکہ گاندھی جی کا نظریہ تھا کہ اگر روپے کی فراوانی ہوتی تب بھی وہ دستکاری کے ذریعہ تعلیم کو رائج کرتے کیونکہ اس سے ان کے نزدیک بچوں میں خودداری پیدا ہوتی ہے:

"میں آپ سے یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اگر روپے کی قلت نہ ہوتی اور ہمارا خزانہ بھرا ہوا ہوتا تو بھی یہ تعلیم میں ضرور رائج کرتا ہمیں ان کو ملک کی تہذیب کا سچا نمائندہ بنانا ہے۔ یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ ابتدائی تعلیم کو خود کفیل نہ بنایا جائے۔"

تعلیم کی تنظیمِ نو کے سلسلے میں گاندھی جی کا دوسرا کارنامہ بالغوں کی تعلیم تھا۔ بالغوں کی صرف خواندگی ان کے پیشِ نظر نہ تھی بلکہ اُن کا خیال تھا کہ تعلیم کے ذریعہ ان کی سیرت کی تشکیل ہو۔ اور تعلیم ان میں خود اعتمادی پیدا کرے۔ بالغوں کو بھی وہ حرفے کے ذریعہ تعلیم دینے کے حامی تھے، وہ چاہتے تھے کہ تعلیم کے میدان میں رضاکارانہ کام کرنے والے کارکن بالغوں کے پاس جائیں اور دیکھیں کہ ان کی کیا ضروریات ہیں۔ اور ان کی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کریں۔ جب ان کی ضرورت پوری ہوگی تو وہ ان کی طرف متوجہ ہوں گے۔ اور ان کے کہنے پر عمل کرنے لگیں گے۔ بعد میں ان کو خود ان کی اپنی ضروریات کی تکمیل پر لگایا جا سکتا ہے اس طرح وہ جو کوشش کریں گے وہی ان کی تعلیم ہوگی، وہ مل کر کام کرنا سیکھیں یہ تعلیم صرف لکھنا پڑھنا سکھانے سے کہیں زیادہ موثر اور حقیقت پسندانہ ہوگی۔ بالغوں کی تعلیم کا گاندھی جی کے ذہن میں کیا خاکہ تھا ان کے اس بیان سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

"لکھنا پڑھنا اور ریاضی کبھی بھی گاؤں والوں کی زندگی کا حصّہ نہیں بن سکے اور نہ آج ہیں۔ انھیں ایسی معلومات بہم پہنچائی جانی چاہئیں جو ان کی روزانہ زندگی میں کام آئیں اور ان پر ٹھونسی نہ جائیں۔ اس کا ان میں ذوق پیدا ہونا چاہیے۔ آج جو کچھ انھیں سکھایا جاتا ہے نہ تو اس کی انھیں ضرورت ہے اور نہ شوق۔ گاؤں والوں کو گاؤں میں کام آنے والا تھوڑا سا حساب سکھانا چاہیے۔ تھوڑا سا جغرافیہ، تاریخ، ادب، لکھنا پڑھنا وغیرہ جو ان کی روزانہ زندگی میں کام آئے۔ ایسی معلومات کی وہ قدر کریں گے۔ اس کے بعد وہ دوسرے مرحلے تک پہنچنے کے قابل ہو جائیں گے۔ ان کو ایسی کتابوں سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا جو روزانہ زندگی میں ان کے کام نہ آئیں۔"

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ بالغوں کی تعلیم کا نصاب ایسا ہونا چاہیئے جو ان کی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کر سکے یا انھیں اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے قابل بنا سکے۔ گاندھی جی کے پیشِ نظر تعلیم عوام کی بھلائی اور سماجی بیداری میں معاون ہونی چاہیئے۔ ان کے نزدیک جسمانی، ذہنی اور روحانی بلکہ تمام صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا نام تعلیم ہے۔ انھوں نے انسان کی مکمل شخصیت کی تعمیر کو تعلیم کا منصب قرار دیا ہے۔ ان کا قول تھا کہ زندگی کے ذریعے تعلیم، زندگی کے لیے تعلیم اور تمام زندگی تعلیم۔ ان کا تصور تھا کہ تعلیم کا محور زندگی ہے اور حق کی تلاش اس کا جوہر۔

□□

اسرار سید

بابائے قوم - عدم تعاون تحریک اور چوری چورا

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد تاجروں کی حیثیت سے ہوئی۔ سرٹامس رو نے عہدِ جہانگیری میں تجارت کے حقوق حاصل کیے اور اسی کے ساتھ ہندوستان میں انگریز تاجروں کی تعداد بڑھنے لگی۔ ابتدا میں تو وہ محض تاجر ہی رہے لیکن دھیرے دھیرے اپنی "لڑاؤ اور حکومت کرو" پالیسی کے تحت انھوں نے دیوانی کے اختیارات بھی حاصل کر لیے اور ایک وقت وہ بھی تاریخ میں آیا کہ انگریز اس ملک کے حاکم ہو گئے اور ہم ہندوستانی ان کے محکوم۔ اور ایک طویل عرصہ تک انگریزوں کے جبر و استبداد کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ہمارے ملک کی دولت انگریزوں کے ہاتھوں لٹتی رہی اور ہمارا وقار پامال ہوتا رہا۔

یورپ کے تاجروں نے ہندوستان کے لیے اس قسم کے تجارتی اشیار تیار کرائے کہ جو ہمارے ملک کے باشندوں کو دیکھنے میں بھی اچھی لگیں اور ان کے لیے آرام دہ بھی ہوں۔ اپنے سامان کو حسین سے حسین ترین بنا کر وہ ہندوستان کے امرا و رؤسا اور نوابین کے دربار میں تحفتاً پیش کرتے تھے جس سے ان کو ایک طرف تو حکمرانوں کی خوشنودی حاصل ہوتی تھی تو دوسری جانب ان کو اس سے کثیر رقم حاصل ہوتی تھی۔ یورپ کے ان سامانوں کا سلسلہ روسار کے درمیان سے ہوتا ہوا عوام تک آیا اور ہمارے ملک کے عوام کی باہر کے سامانوں کے لیے دل چسپی اور دل کشی بڑھنے لگی۔ ایک وقت وہ بھی آیا کہ انھیں اپنے ملک کا بنا ہوا سامان کسی بھی صورت میں پسند نہیں آتا تھا۔ ہندوستانیوں کی آنکھ اس وقت کھلی جب تجارتی اشیار، یورپین لباس، کھانے پینے کا سلیقہ ان تمام چیزوں نے ہندوستان اور ہندوستانیوں کو بری طرح سے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اب ہم غلام تھے اور صرف انگریزوں کے غلام۔ نہ ہماری کوئی شناخت تھی نہ ہماری کوئی انفرادیت۔ ہمارے اذہان و قلوب بھی انگریزوں کے پابند تھے۔ ہمارا تہذیبی، ثقافتی اور علمی سرمایہ سب کچھ ختم ہو چکا تھا کیونکہ ہم کو یورپ کی تہذیب راس آنے لگی تھی لیکن اس کے بدلے میں ہمیں زبردست قربانیاں بھی دینی پڑتی تھیں۔ انگریزی دباؤ کے خلاف ہمارے دلوں میں بے اطمینانی تو تھی ہی لیکن اس کے اظہار کی ہمت عوام میں نہ تھی۔ اِدھر ہندوستانی زبوں حالی کا شکار ہوتے رہے اُدھر انگریزوں کا عوام پر جبر بڑھتا رہا۔ جب انگریزوں کے مظالم درجہ کمال کو پہنچ گئے تو پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی تیاری شروع ہوئی۔ بظاہر اس جنگ میں ہندوستانیوں کو شکست فاش ہوئی لیکن اس جنگ نے ہندوستانیوں میں تحریکِ آزادی کا بیج ضرور بو دیا جس پر مکمل پودا بیسوی صدی عیسوی کے نصف اوّل میں تیار ہوا۔

عالمی تحریکات کے اثرات بھی ہندوستان پر پڑے۔ پہلی عالمی جنگ جو ۱۹۱۷ء سے ۱۹۱۸ء کے درمیان لڑی گئی، کے اثرات نے ہندوستان میں تحریک آزادی کو کافی طاقت دی۔ ۱۹۱۷ء کے روس کے انقلاب نے محبان وطن کے دلوں میں بیداری کے جذبے کو اور بھی تقویت دی۔

گاندھی جی جو ملک کی آزادی کے لیے پہلے سے ہی بہت کوشاں تھے، ان کو پہلی جنگ عظیم کے بعد بہت ہی سازگار ماحول ملا۔ تمام ہندوستانی کانگریس کے پرچم کے نیچے اکٹھا ہو کر اپنے اپنے طریقے سے انگریزوں سے نبرد آزما ہوئے۔

پہلی جنگ عظیم میں ترکی انگلینڈ کے خلاف لڑا۔ ترکی کا خلیفہ

جو مسلمانوں کے نزدیک ایک مذہبی رہنما اور پیشوا ہوتا تھا اور بڑے اختیارات کا مالک ہوتا تھا۔ جنگ میں ترکی کی شکست کے بعد انگلینڈ نے ترکی کے خلیفہ کے حقوق بھی چھین لیے اور ترکی کی آزادی کو مسدود کر دیا۔ ترکی کے اسلامی مقدس مقامات بھی اس کے ہاتھ سے نکل گئے جس سے ہندوستان کے مسلمانوں میں زبردست بے اطمینانی پھیل گئی۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے غم و غصّے کے اظہار کے لیے ملک میں خلافت تحریک چلانے کا فیصلہ لیا۔ خلافت تحریک کا مقصد انگریزوں کے ساتھ کسی بھی طرح کا تعاون نہ کرنا تھا۔ خلافت تحریک کا انگریزوں سے مطالبہ تھا کہ اگر انگریز حکومت ترکی میں مسلمانوں کے جذبات کے خلاف اپنی پابندیاں نہیں ہٹاتی اور ان کی مراعات کو بحال نہیں کرتی تو ہندوستان کے مسلمان کسی بھی صورت میں انگریزوں کی مدد نہیں کریں گے۔ خلافت تحریک کی یہ شرط عدم تعاون تحریک کی ابتدا تھی۔ اسی درمیان ۱۹۱۹ء میں امرت سر میں بھی ایک جماعت "جماعت علمائے ہند" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس جماعت کے اغراض و مقاصد کم و بیش وہی تھے جو خلافت تحریک کے تھے جس نے بعد میں ہندوستان کی عدم تعاون تحریک میں کلیدی رول ادا کیا۔

خلافت تحریک کی ابتدا ستمبر ۱۹۱۹ء میں لکھنؤ میں ہوئی۔ گاندھی جی کو جب خلافت تحریک کے اغراض و مقاصد کے سلسلے میں پتہ چلا تو انھوں نے خلافت تحریک کی تعریف کی اور دلّی میں منعقدہ خلافت ریلی میں خود پنڈت موتی لال نہرو کے ساتھ شریک ہوئے۔ دلّی کی خلافت ریلی میں گاندھی جی نے کہا:

> "...... مجھے لگا جب تلوار سے سرکار کی مخالفت نہیں کرنا ہے تو اس کا ساتھ نہ دینے میں ہی بھی مخالفت ہے اس لیے میں نے "نان کاپریشن" لفظ کا استعمال پہلی بار اس جلسے میں کیا۔"

۱۹۱۷ء میں روس کے انقلاب میں زار پر "بال شیوک" کی فتح کی وجہ بھی یہی رہی ہے کہ انھوں نے انقلاب کے درمیان زار کی طرف سے دی جانے والی تمام مراعات کو ٹھکرا دیا تھا۔ زار حکومت کی طرف سے دیے گئے خطابات، عہدے اور سہولتیں انقلابیوں نے زار کو واپس کر کے اپنے "عدم تعاون" کا ثبوت دیا۔

انگریزوں کی غلامی سے ملک کو آزاد کرانے کے لیے جون ۱۹۲۰ء میں الٰہ آباد میں ہندوستان کی مختلف پارٹیوں کا ایک مشترکہ جلسہ ہوا جس میں گاندھی جی نے کہا کہ "بھارت کے سامنے اب عدم تعاون کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے ہم یہ جنگ اخلاقی قدروں کی بنیاد پر لڑنا چاہتے ہیں" اور یہی اخلاقی قدروں کی لڑائی بعد میں عدم تعاون تحریک کی شکل میں اُبھر کر سامنے آئی۔ اسی جلسے میں گاندھی جی کے مشورے پر عدم تعاون کمیٹی کی تشکیل کی گئی۔ اس جلسے میں خلافت تحریک کے بانیان بھی موجود تھے۔ الٰہ آباد کے اس جلسے کے بعد ملک کے مختلف شہروں میں خلافت کے جلسے ہوئے اور عدم تعاون کی تجویز منظور ہونے لگی۔ الٰہ آباد کے جلسے کے چند دنوں بعد گاندھی جی نے ۲۸ جولائی ۱۹۲۰ء کو اعلان کیا کہ وہ یکم اگست ۱۹۲۰ء سے عدم تعاون تحریک کو "پرارتھنا" اور "اپواس" سے شروع کریں گے۔ بال گنگادھر تلک نے گاندھی جی کے اس اعلان کا خیر مقدم کرتے ہوئے انھیں ہر طرح کی مدد کرنے کا وعدہ کیا۔

عدم تعاون تحریک مقررہ وقت پر شروع ہوئی۔ اس دن گاندھی جی نے وائسرائے کو لکھا "سمراٹ کی سرکار نے خلافت کے معاملے میں کپٹ، اُنیتا اور اَنیائے سے کام لیا ہے۔ ایسی سرکار کے لیے میرے من میں نہ آدر رہ سکتا ہے اور نہ سدبھاؤ" اس کے بعد کلکتہ میں ۴ ستمبر سے ۹ ستمبر ۱۹۲۰ء تک لالہ لاجپت رائے کی صدارت میں ایک جلسہ ہوا جس میں کانگریس نے عدم تعاون تحریک کے لیے حسب ذیل پروگرام طے کیے گئے:

۱۔ سرکاری خطابات کو واپس کرنا۔
۲۔ بلدیاتی اداروں کے نامزد ممبروں کو اپنے عہدوں سے استعفیٰ دینا۔
۳۔ انگریز سرکار کے جلسوں کا بائیکاٹ کرنا۔
۴۔ سرکاری اور امداد یافتہ تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ۔
۵۔ وکیلوں کا عدالتوں سے بائیکاٹ۔

۶۔ نئی قانون ساز اسمبلیوں کا بائیکاٹ۔

۷۔ غیر ملکی اشیا ر کا بائیکاٹ۔

ان پروگراموں کے تحت ہمارے محبانِ قوم نے انگریزی حکومت سے عدم تعاون کرنا شروع کر دیا۔ موتی لال نہرو، راجندر پرساد، چکرورتی راج گوپال آچاریہ اور چترنجن داس اور پنڈت جواہر لال نہرو جیسے چوٹی کے وکلاء نے اپنی بہت چلتی ہوئی وکالت کو چھوڑ دیا اور یہ تمام لوگ پورے جوش سے عدم تعاون تحریک میں کود پڑے۔

تعلیمی اداروں کو قائم کرنے کے لیے مدن موہن مالویہ اور سر سید احمد خاں وغیرہ نے بنارس ہندو یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم اورنٹیل کالج قائم کیا۔ ملک کے عوام نے بغیر تفریق مذہب و ملت اپنے سرکاری اعزازات اور خطابات کو سرکار کو واپس کر دیا۔ سُبھاش چندر بوس نے آئی۔ اے۔ ایس سے استعفیٰ دے کر کلکتہ کے نیشنل کالج کے پرنسپل کا عہدہ سنبھال لیا۔ اس طرح ملک کی آزادی کی جدوجہد کے لیے ہندو مسلمان سبھی سر پر کفن باندھ کر سامنے آ گئے۔

گاندھی جی نے عدم تعاون تحریک کے آگرہ میں منعقدہ اکتوبر ۱۹۲۱ء کے جلسے میں جس کی صدارت حسرت موہانی نے کی تھی، میں کہا تھا کہ "بھارت کو آزادی دلانے کے لیے دو باتیں بہت ہی اہم ہیں پہلا ہندو مسلم اتحاد اور دوسرا عدم تعاون تحریک۔ حسرت موہانی کی صدارت میں آگرہ میں یہ جلسہ پرنس آف ویلس کی ہندوستان آمد کو ناکام بنانے کے لیے حکمت عملی طے کرنے کے لیے ہوا تھا۔

پرنس آف ویلس کو ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ریڈنگ نے اپنی کارگزاری دکھانے کے لیے بلوایا تھا۔ ۷ار نومبر ۱۹۲۱ء کو پرنس آف ویلس بمبئی میں آئے۔ پرنس کی آمد پر بمبئی کی سڑکیں بالکل سنسان تھیں، بمبئی کی تمام دکانیں بند تھیں، اس دن نہ صرف بمبئی میں بلکہ پورے ملک میں ہڑتال تھی۔ اب کانگریس اور خلافت تحریک دونوں ایک ہوگئی تھی۔ اب دونوں کے مفاد اور نقصانات ایک تھے۔ پرنس آف ویلس کی آمد پر بمبئی میں انگریزی حکومت نے تشدد کیا جس میں ۵۳ افراد مارے گئے۔

عدم تعاون تحریک اور گاندھی جی کی درخواست کا اثر یہ ہوا کہ ملک میں انگلینڈ سے آنے والا کپڑا جو ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۷ء تک ایک ارب ۷۷ کروڑ گز تھا، اب گھٹ کر ۹۸ کروڑ ہوگیا تھا۔

گاندھی جی کی عدم تعاون تحریک کا اثر ملک کے دوسرے شہروں کے ساتھ ساتھ گورکھ پور کے سہجنواں اور چوری چورا پر بہت پڑا۔ گورکھپور سے دیوریا جانے والی سڑک پر ۳۵ کلو میٹر کے فاصلے پر واقع چوری چورا کو اس وقت غیر ملکی کپڑوں کی سب سے بڑی منڈی سمجھا جاتا تھا۔ چوری چورا کے لوگ کانگریس اور گاندھی جی سے بہت متاثر تھے۔ گاندھی جی کے گورکھپور کے پہلے سفر کے دوران جو انھوں نے ۸ر فروری ۱۹۲۱ء میں کیا تھا، گاندھی جی کا زبردست خیر مقدم کیا گیا۔ گورکھپور میں بابا راگھو داس اور رگھوپت سہائے فراقؔ گورکھپوری عدم تعاون تحریک کے فعال رضا کار تھے۔ گاندھی جی کے گورکھپور آنے پر رضا کاروں کی کارگزاری اور بھی بڑھ گئی تھی۔ انھوں نے بازاروں سے انگریزی شراب کی دکانیں بند کرا دیں، تاڑ کے پیڑ جڑ سے اکھاڑ دیے گئے۔ انگریزی کپڑوں کا بائیکاٹ کر دیا گیا جس سے انگریزی حکومت کو محصول سے ملنے والی رقم نہیں مل پاتی تھی۔ پرنس آف ویلس نے دیکھا کہ عدم تعاون تحریک کا اثر چوری چورا پر سب سے زیادہ ہے۔ کوئی بھی انگریزی سامان کی خرید و فروخت نہیں ہو رہی ہے۔ انگریزی حکومت نے پہلے تو زمین داروں اور جاگیرداروں کو احکام دیے کہ جس زمیں دار یا جاگیر دار کے علاقے میں عدم تعاون تحریک چلائی جائے گی اس کو سزا ملے گی۔ نتیجہ کے طور پر ان جاگیرداروں اور زمینداروں نے عوام کو اپنے غنڈوں سے پٹوانا شروع کر دیا لیکن یہ ایسی تحریک تھی جو سیلاب کی طرح بڑھتی ہی جا رہی تھی، رکنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ مجبور ہو کر انگریز حکومت نے پولیس کے ذریعہ ظلم کرنا شروع کر دیا۔ عدم تعاون تحریک اور ہندوستانی احتجاج کے درمیان چوری چورا کے سب انسپکٹر نے رضا کاروں کی پٹائی کرنا شروع کر دی نتیجے کے طور پر قرب و جوار کے علاقے میں انگریزوں کے ظلم کی کہانی پھیلنا شروع ہوگئی، لوگ جوق در

جوق چوری چورا کی طرف بڑھنے لگے۔ ۵ر فروری کو ایک کثیر مجمع چوری چورا تھانے کے سامنے تھا۔ رضاکاروں نے محبانِ وطن پر کی گئی زیادتیوں پر احتجاج کیا۔ پولیس والوں نے احتجاجیوں پر ہمدردی کرنے کے بجائے ظلم اور بڑھا دیے۔ رضاکاروں نے تھانے پر پتھراؤ کیا پولیس نے گولی چلادی۔ گولی کب تک چلتی رہی، کتنے راؤنڈ ختم کیے گئے اس کا اندازہ اس وقت لگا جب پولیس کے پاس کارتوس اور گولیاں ختم ہوگئیں اور تھانے کے سامنے ۲۶ رضاکاروں کی لاشیں پڑی تھیں۔ ۲۶ محبان وطن کی شہادت سے مجمع مشتعل ہوگیا اس نے تھانے کو چاروں طرف سے گھیر کر مٹی کا تیل چھڑک کر تھانے کو آگ لگادی جس میں ایک سب انسپکٹر اور ۲۱ سپاہی جل کر راکھ ہوگئے۔ سب انسپکٹر کی بیوی کو ایک ہندوستانی نے بچالیا جس کو بعد میں انگریزوں نے سزائے موت دے دی تھی۔ اس انسپکٹر کی بیوی کے علاوہ ایک چوکی دار بھی بچ گیا تھا۔

چوری چورا حادثہ کے بعد ایک ڈپٹی انسپکٹر جنرل کی نگرانی میں تحقیق شروع ہوئی جس میں لاتعداد لوگ گرفتار ہوئے اور ۲۲۸ کے خلاف مقدمہ قائم کیا گیا۔ ان ۲۲۸ قومی رضاکاروں میں ۱۰۰ رضاکاروں کو پھانسی دے دی گئی۔

چوری چورا حادثہ کی اطلاع جب گاندھی جی کو تار کے ذریعہ دی گئی تو وہ بے چین ہو اٹھے انھوں نے فوراً عدم تعاون تحریک کو واپس لے لیا۔ گاندھی جی کے عدم تعاون تحریک کو واپس لینے کے فیصلے پر کانگریس کے بہت سارے لوگ ناراض ہوگئے۔ ناراض افراد میں نرم دل کے کانگریسی بھی تھے اور گرم دل کے بھی۔ گاندھی جی کے اس فیصلے پر پنڈت موتی لال نہرو نے کہا "ایک سدور کونے میں گھٹنی گھٹنا کو آدھار مان کر نرنئے (فیصلہ) کہاں تک اوچت ہے۔"

چوری چورا حادثہ پر پنڈت جواہر لال نہرو کے تاثرات بھی کچھ اسی طرح کے تھے کہ "اگر اسی طرح کے چھوٹے موٹے حادثات کی بنا پر تحریک مسترد ہوتی رہیں تو ہم کبھی بھی کوئی تحریک نہیں چلا سکیں گے۔"

گرم دل کے لیڈروں جن میں چندر شیکھر آزاد، رام پرساد بسمل، اشفاق اللہ خاں، بھگت سنگھ وغیرہ تھے، نے بھی عدم تعاون تحریک کو واپس لینے کو ایک غلط فیصلہ مانا۔

لیکن اگر کچھ لوگ عدم تعاون تحریک کو واپس لینے کو غلط سمجھ رہے تھے تو کچھ لوگوں نے گاندھی جی کے اس اقدام کو حق بجانب بھی کہا ہے۔ راجندر پرساد نے اپنی تصنیف "بہار میں مہاتما گاندھی" میں لکھا ہے:

> "میرا تو پختہ یقین ہے کہ چوری چورا حادثہ کے بعد عدم تعاون تحریک کو مسترد کر کے مہاتما جی نے ملک پر بڑا احسان کیا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ملک میں مکمل طور پر ہنگامی کیفیت طاری ہو جاتی۔ ایک طرف سرکار نظم ونسق کے نام پر تشدد کا بازار گرم کرتی تو دوسری جانب عوام میں اشتعال پھیلتا کیونکہ دمن کے آگے سر جھکا کر اسے خاموشی سے برداشت کرنا انھوں نے تب تک سیکھا ہی نہیں تھا۔"

چوری چورا حادثہ کے بعد ہندوستان کے مختلف لیڈروں نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے جس میں بعض نے گاندھی جی کی تحریک کی موافقت کی تو بعض نے اس کی مخالفت بھی کی۔ لیکن جو کچھ بھی رہا ہو چوری چورا حادثہ اور گاندھی جی کی عدم تعاون تحریک نے ہندوستان کی آزادی کو بہت قریب لاکر کھڑا کر دیا تھا۔ عدم تعاون تحریک نے عوام میں آزادی کی جو روح پھونکی اس کا ثمرہ ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو نظر آیا۔ عدم تعاون تحریک نے نمک تحریک، سائمن واپس جاؤ تحریک اور دیگر قومی تحریکات کو جنم دیا۔ گورکھپور کے جن لوگوں نے چوری چورا حادثہ میں اپنی اور اپنے خاندان والوں کی قربانیاں دیں اس کا انھیں بالکل افسوس نہیں تھا۔ اگر وہ گاندھی جی کے اس فیصلے کو غلط سمجھتے تو اپریل ۱۹۳۰ء میں انھوں نے نمک تحریک کی حمایت کرتے ہوئے سڑکوں پر نمک بنا کر سرکاری قوانین کی خلاف ورزی نہ کی ہوتی۔ اگر گاندھی جی کی عدم تعاون تحریک غلط تھی تو ۲ر اکتوبر ۱۹۲۲ء کو گورکھپور میں گاندھی جی کی تاریخ پیدائش کو دھوم دھام اور جوش سے نہ منایا گیا ہوتا۔ اگر گاندھی جی کی عدم تعاون تحریک گورکھپور کے عوام کو پسند نہ آئی ہوتی تو انھوں نے ۴ر اکتوبر ۱۹۲۹ء کو "سیول نافرمانی" کی

پرشوتم سنگھ سیٹھی
۹۰۳-بی، سیکٹر ڈالے ماہ نگر، لکھنؤ

صلح و آشتی کے علمبردار — مہاتما گاندھی

کسی مریض کو جب ڈاکٹر خون دیتا ہے تو یہ مقصد ہوتا ہے کہ اس مریض کی جان کو بچایا جائے۔ خون دیتے وقت مریض یہ نہیں پوچھتا کہ یہ خون ہندو کا ہے یا مسلمان کا۔

اس طرح مہاتما گاندھی نے فرقہ وارانہ فسادات پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ گاندھی جی نے اکثر اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔ یہ بات انھوں نے دسمبر ۱۹۴۷ء میں اپنی قیام گاہ پر کہی تھی۔

ملک کے مختلف مقامات پر فرقہ وارانہ فسادات ہو رہے تھے۔ ہندوستان کی راجدھانی (دہلی) میں بھی بڑے پیمانے پر فسادات ہوئے تھے۔

مہاتما گاندھی نے نواکھالی اور دوسرے مقامات کا دورہ بھی کیا تھا جو مشرقی بنگال میں تھا جہاں کشت و خون کی ندیاں بہائی گئی تھیں۔ مہاتما گاندھی ان مقامات کے لوگوں کو محبت و آشتی کا پیغام سنانے گئے تھے۔

مہاتما گاندھی کو باپو کے خطاب سے پکارا جاتا تھا۔ بات چیت جاری رکھتے ہوئے کہا.... ہندو مریض کو مسلمان کا خون دیا جاتا ہے تو وہ اسے بخوشی قبول کرتا ہے اسی طرح اگر مسلمان مریض کو ہندو کا خون ملتا ہے تو وہ اس پر کسی طرح اعتراض نہیں کرتا۔

جب زندگی بچانے کے لیے ہم ایک دوسرے کا خون لے سکتے ہیں تو پھر ایک دوسرے کے ساتھ اکٹھا کیوں نہیں رہ سکتے۔

باپو جو فسادات سے دکھی تھے فرمایا۔ ایشور، اللہ، خدا اور بھگوان سب یہی سکھاتے ہیں کہ ہم بندوں سے پیار کریں، دکھ درد میں ایک دوسرے کی مدد کریں لیکن کتنے افسوس کا مقام ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے ہیں۔ جان لینے کے دشمن ہو جاتے ہیں۔

کوئی مذہب یہ نہیں سکھاتا کہ بے گناہ کو مارا جائے یا اس پر ظلم کیا جائے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ دھرم و مذہب کے نام پر فسادات کیے جاتے ہیں اور جانیں لی جاتی ہیں اور دوکانوں کو تباہ کیا جاتا ہے۔ گاڑیوں کو جلایا جاتا ہے۔

مہاتما گاندھی نے کہا.... یہ کہاں کا انصاف ہے کہ عورتوں کا سہاگ لوٹا جائے اور انھیں زندگی کی خوشیوں سے محروم کیا جائے، بچوں کو بے سہارا بنایا جائے۔

جب باپو سے پوچھا گیا کہ نواکھالی اور دوسرے فساد زدہ مقامات پر عورتوں کی بے حرمتی کے معاملے بھی ان کے سامنے لائے گئے تو وہ تھوڑی دیر تک خاموش رہے پھر کہنے لگے، انسان اتنا گر جائے گا یہ سمجھ میں نہیں آتا۔"

عورتوں کی عزت کرنا ہماری تہذیب کا ایک نمایاں پہلو رہا ہے لیکن ہم اپنی روایات کو بھول گئے معصوم بچوں اور عورتوں پر مظالم کرنے سے بھی پیچھے نہیں رہے۔ اُن کی عزت پر حملہ کرنا ہماری سوسائٹی پر ایک بدنما داغ ہے۔

باپو نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ کچھ مقامات پر انتظامیہ عملے نے ایماندارانہ کام نہیں کیا اور ان میں بھی فرقہ واریت کا اثر آ گیا۔

"ان فسادات میں کس کا فائدہ ہوتا ہے"، پوچھے جانے پر مہاتما گاندھی نے کہا "غنڈوں اور بدمعاشوں کا"۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کو بھی ہوتا ہے جو ان کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ غنڈے اور بدمعاش فسادات کے دوران لوٹ مار کرتے ہیں اور اپنے گھر دولت سے بھرتے ہیں۔ علاوہ ازیں اپنے دشمنوں کو آسانی سے ختم کر دیتے ہیں۔ فسادات کی وجہ سے شہادتوں کا فراہم کرنا مشکل ہوتا ہے اس لیے مجرموں کو سزا بھی نہیں مل پاتی۔

آپ نے کہا "کچھ سیاسی لوگ" بھی ان فسادات سے اپنا مقصد پورا کرتے ہیں، وہ اپنے حریفوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

باپو سے جب یہ کہا گیا کہ فرقہ وارانہ فساد کو دیکھتے ہوئے آپ پولیس

کی حفاظت میں کیوں نہیں رہتے یا چلتے ہیں تو انھوں نے جواب دیا "مجھے اس کی ضرورت نہیں" پھر فرمایا "مرنا تو ایک دن ہے پھر ڈروں کیوں۔ میں اہنسا میں یقین رکھتا ہوں اور اہنسا کا راستہ یہ نہیں بتاتا کہ انسان بندوقوں کے سائے میں چلے۔"

آپ نے کہا "سردار (سردار پٹیل اس وقت کے مرکزی وزیر داخلہ) نے تو مجھے کئی مرتبہ پولیس کی پیش کش کی ہے لیکن میں ہی راضی نہیں ہوں۔

جب باپو سے کہا گیا کہ وہ ملک والوں کو کیا پیغام دینا چاہتے ہیں تو فرمایا "آپس میں مل جل کر سب لوگ رہیں"

□□

عدم تعاون تحریک ... صفحہ ۹۳ کا بقیہ

تحریک نہ چلائی ہوتی۔ اگر گاندھی جی کی عدم تعاون تحریک کی مخالفت گورکھپور کے عوام نے کی ہوتی تو ۵ ر اور ۶ ر اکتوبر ۱۹۲۹ء کو گاندھی جی کے دوبارہ گورکھپور آنے پر ان کا گرم جوشی سے خیر مقدم نہ کیا ہوتا۔ صرف عدم تعاون تحریک ہی نہیں بلکہ گاندھی جی کی دیگر تحریکیں بھی صحیح تھیں جو قوم کے لیے تھیں، ملک کے عوام کے لیے تھیں، وطن کی بہبودی کے لیے تھیں اور مادرِ وطن کی آزادی کے لیے تھیں۔

مرحبا صد مرحبا بابائے قوم گاندھی جی !!



باپو ـــــــ مستقبل سے سرگوشیاں

افسانہ

ڈاکٹر بیگ احساس
ریڈر شعبۂ اردو - عثمانیہ یونیورسٹی
حیدرآباد - ۵۰۰۰۰۲

مہاتما

پنہیہ تیزی سے گھوم رہا تھا اور اس پر ڈور بھی لپٹی جا رہی تھی۔

وقت اور زندگی ـــ !!

ڈور ٹوٹ جاتی اور وہ اسے پھر سے جوڑ دیتا، پتہ ہی نہیں چلتا کہ کہاں سے ڈور ٹوٹی تھی۔

بکری کے دو بچے اگلے پیر اٹھا کر لڑنے کے انداز میں کھڑے تھے۔ ایک دوسرے پر حملہ کرنے میں وہ سنجیدہ نہیں تھے۔ ایک آدھ بار سر ٹکراتے پھر جسم چرا کر چھلانگیں لگا کر دُور تک دوڑتے چلے جاتے ـــ

تعاقب ـــ !!

بچپن ـ !

وہ اپنے ماں باپ کا سب سے چھوٹا لڑکا تھا۔ اس کے والد دیوان تھے۔ اس کے والد اور چچا کو اپنی بڑھتی ہوئی عمر کا احساس کھائے جا رہا تھا۔ وہ اپنے فرائض سے سبکدوش ہو کر آرام سے دن کاٹنا چاہتے تھے۔

شادی ـ !

وہ شادی کا مفہوم ہی نہیں جانتا تھا۔ شادی کا مطلب تھا نئے قیمتی کپڑے۔ باجا ـ بارات، اچھا کھانا۔

ٹھاکر صاحب نے والد کو چھوڑا نہیں۔ بیل گاڑی سے پانچ دن کا سفر تھا وہ تین دنوں میں سمیٹنا چاہتے تھے۔ زخمی ہو گئے۔ چہرے پر پٹیاں باندھے ہی انھوں نے شادی کی رسومات انجام دی تھیں۔ اسے ایک ایک بات یاد تھی۔ شادی کے لیے بنائے گئے منچ پر وہ کس طرح بیٹھا تھا۔ سپتا پدی کی رسم ـــ ایک دوسرے کو کنسار کھلانا ـــ

مرغ وارفتگی کے ساتھ نیم دائرے بناتا ہوا مرغی کے اطراف گھوما۔ پر لٹکائے اس نے اس میں ٹانگ چلائی اور مرغی کے گرد ایک بریکٹ کھینچ دی اور مرغی اس بریکٹ میں جیسے مسحور ہو کر منجمد ہو گئی۔

زندگی کتنے تضادات کا مجموعہ ہے ـــ ہائی اسکول میں اس کے دوست نے کہا تھا کہ انگریز ہم سے اس لیے برتر ہیں کہ وہ گوشت کھاتے ہیں اور شراب پیتے ہیں۔ اس نے بھی گوشت کھایا تھا۔ اگر کسی کو پتہ چل جاتا تو ؟۔ سگریٹ نوشی بھی کی تھی، دوستوں نے بازارِ حسن تک بھی پہنچا دیا تھا یہ اور بات ہے کہ اس کے شرمانے پر وہ عورت جھلا گئی تھی اور اسے باہر نکال دیا تھا۔

اور اب وہ خالص سبزی خور ہے۔ اپنی بیوی کو بھی اس نے سبزی خور بنا دیا تھا ـــ اب وہ پکا برہمچاری تھا۔

کیسے دن تھے وہ سولہ برس کی عمر میں جب وہ باپ بننے لگا تو اسے کتنی شرمندگی ہوئی تھی۔ لوگ کیا سوچیں گے کہ اس نے پڑھائی سے زیادہ اپنی بیوی میں دلچسپی لی۔ بیوی سے دلچسپی بھی بہت تھی۔ وہ عمر ہی ایسی تھی۔ لیکن وہ شدید کشمکش میں رہا کرتا تھا۔ شرون کمار اس کا آئیڈیل تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔ رات دیر تک وہ بڑی سعادت مندی سے اپنے والد کے پیر دبایا کرتا۔ بار بار بیوی کا خیال بھی آتا۔ جیسے ہی والد اشارہ کرتے کہ اب بس !! وہ سیدھے اپنے بستر میں جا گھستا اور گہری نیند سوئی ہوئی بیوی کو چھیڑتا۔ اس کے والد کے انتقال کے وقت بھی یہی ہوا تھا۔ وہ سخت بیمار تھے۔ اس کے چچا راجکوٹ آ گئے تھے۔ دونوں بھائیوں میں بہت محبت تھی۔ چچا نے کہا تھا کہ وہ اپنے بھائی کے پاس بیٹھیں گے سب آرام کریں۔ وہ بڑی دیر سے والد سے لگا بیٹھا تھا ان کے پیر داب رہا تھا۔ چچا کی بات سن کر بھاگا اپنے کمرے میں ـــ بیوی کو جگایا۔ ابھی پانچ منٹ بھی نہیں ہوئے کہ دستک ہوئی۔ نوکر نے بتایا اب اس کے والد دنیا میں نہیں رہے۔ ایک گھونسہ سا دل پر لگا۔ کتنی شرمندگی ہوئی تھی۔ زندگی بھر وہ اس شرمندگی کو نہیں بھول پائے گا۔ آخری لمحوں میں وہ اپنے والد کے قریب نہ رہ سکا۔ فرض پر ہوس غالب آ گئی تھی ـــ کتنے بڑے بڑے

حادثے ہوئے لیکن شاخ سے ٹوٹنے کا یہ حادثہ وہ کبھی نہیں بھول پائے گا۔

پھر تو سب کچھ بدل گیا ــــ اس کے والد کے دوست نے صلاح دی کہ اسے ولایت بھیج دیا جائے کہ وہ کم سے کم وقت میں بیرسٹر کی ڈگری حاصل کر سکے گا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس کے والد کی جگہ وہ بھی دیوان بنے۔ ماں تیار نہیں تھیں۔ بھائی کے کہنے پر راضی ہوئیں اور وہ چند مہینوں کے بچے اور اپنی بیوی کو چھوڑ کر ولایت آگیا۔ وہ اپنی برادری کا پہلا آدمی تھا جو ولایت جا رہا تھا۔ نیا نیا ماحول۔ اظہار کی شکلیں، جنٹل مین بننے کا شوق۔ دو کمروں کا گھر، ڈانس، فرنچ اور وائلن سکھانے کے لیے ماسٹر ــــ جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ یہاں وہ پڑھنے کے لیے آیا ہے ہمیشہ کے لیے رہنے یا جنٹل مین بننے نہیں آیا۔ ان چیزوں پر خرچ بھی آ رہا تھا ــــ اس نے خود کو بدلا ــــ ایک کمرے میں آ گیا۔ خود پر کم سے کم خرچ کرنے لگا۔ رات میں بیٹھ کر ایک ایک پیسے کا حساب جوڑتا ــــ یہ عادت اسے آج تک ہے۔

اب بھی وہ عمر گزشتہ کا حساب ہی تو کر رہا ہے۔

لندن میں قانون کے امتحان میں کامیاب ہوا۔ لیکن پریکٹس نہ لندن میں چلی نہ ہندوستان میں ــــ اسکول ٹیچر بننا چاہا ناکام رہا۔ عرضیاں اور یادداشتیں لکھ کر دن گزارتا رہا ــــ اگر اس کے بھائی کا شناسا وہ میمن سیٹھ ملازمت کی پیش کش نہ کرتا تو پتہ نہیں زندگی کس رخ پر بہہ نکلتی وہ سیاہ فاموں کا ملک تھا جس پر یہی گورے قابض تھے۔

اس ملک نے اس کی زندگی بدل کر رکھ دی۔ ٹرین کے اس سفر نے اس کی آنکھیں کھول دیں جس میں فرسٹ کلاس کا ٹکٹ رکھنے کے بعد بھی اسے سامان سمیت ٹرین سے پھینک دیا گیا تھا اس لیے کہ وہ گورا نہیں تھا۔ یہیں سے اس نے ناانصافی کے خلاف لڑنے کا ارادہ کر لیا۔ ایک خود اعتمادی کے ساتھ ــــ

بکری کے بچے کھیلتے کھیلتے سہم گئے اور اپنی ماں کے قریب آ کر بیٹھ گئے اس نے دیکھا ٹیلے پر ایک بڑا سا کتا بیٹھا ہوا تھا جو ان دونوں بچوں پر غرا رہا تھا ــــ

وہ سیاہ فام ملک اس کے لیے برگد کا پیڑ ثابت ہوا۔ یہیں سے وہ ستیہ گرہ اور اہنسا کی روشنی لے کر اٹھا۔ پھر یہ روشنی دور تک پھیلی ــــ اس نے زندگی اور جدوجہد کا سراغ پا لیا ــــ نفس کشی ــــ اپنی مدد آپ ــــ وہ اپنے کپڑے اپنے ہاتھوں سے دھوتا ــــ سفید فام حجام نے اس کے بال کاٹنے سے انکار کیا تو اس نے خود اپنے ہاتھوں سے بال کاٹ لیے تھے۔ اب تو سب جھنجھٹ ہی ختم ہو گیا۔ نہ سر پہ بال ہیں نہ بدن پر کپڑوں کا بوجھ۔ ایک دھوتی ــــ !! جنٹل مین بننے سے اس دھوتی تک آتے آتے کتنے مراحل سے وہ گزرا تھا۔

جب وہ اپنے ملک لوٹا تو وہ سب اس کے نام اور کام سے واقف ہو گئے تھے۔ اس کا شاندار استقبال کیا گیا تھا۔ وہ آزادی چاہتے تھے۔ جن کے پاس آزادی حاصل کرنے کا شعور تھا وہ سب آسائشوں کے عادی دولت مند لوگ تھے۔ وہ اس لڑائی کی روح تک نہیں پہنچے تھے۔ انھوں نے پارٹی بنالی تھی۔ سال بھر میں دو ایک اجلاس بھی ہوتے تھے، وہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ پورا ایک سیلون بک کروا کے اپنے دربار کے ساتھ آتے۔ نفیس کپڑے ہوتے نفیس لوگ ــــ چھوت چھات کے قائل۔ پارٹی سیشن میں الگ الگ باورچی خانے ہوتے۔ اسے بڑا دکھ ہوا۔ اسے اس لڑائی کو سمت دینا تھا۔ ان طبقات کے درمیان حدوں کو پاٹنا تھا۔

اس نے سارے لیڈروں سے ملاقاتیں کیں۔ پورے ملک کا دورہ کیا۔ ان بڑے بڑے بیرسٹروں کو بھی دیکھا، ننگے بھوکے عوام کو بھی دیکھا۔ وہ اس لیڈر سے بھی ملا جو ایک لمحہ ضائع نہیں کرتا تھا۔ ہمیشہ مصروف رہا کرتا تھا۔ وہ بڑا بیرسٹر ــــ وہ بنگالی بابو جو ماہانہ آٹھ سو روپے کماتے تھے صرف چالیس روپے اپنی ذات پر خرچ کرتے تھے اور باقی روپیہ مختلف عوام کی فلاحی اسکیموں میں خرچ کرتے تھے۔ وہ خاتون جس نے عورتوں میں بیداری کی لہر پیدا کی تھی۔

اس نے سوچا کہ بیشتر کو یہاں ابھی تو اتنا شعور بھی نہیں ہے کہ انھیں اس جدوجہد میں شامل کیا جائے۔

اسے بڑا دکھ ہوا۔ اس نے سوچا اب اسے اس لڑائی کو سمت دینا ہے اس کے لیے اتحاد، اہنسا اور ترک موالات کو اختیار کرنا ہوگا۔ وہ سارے ملک میں گھوم کر عوام سے ملنا چاہتا تھا۔ غریب دبے لبس اور بے ہنر لوگ جنھیں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ ان کا آقا کون ہے؟ ان کے پاس نہ پیٹ بھر کھانا تھا نہ تن ڈھانکنے کے لیے کپڑا ــــ ان تک پہنچنے کے لیے ان کی طرح بننا ضروری تھا۔ اس نے ریل سے تھرڈ کلاس

میں سوز کیا۔ رات رات بھر کھڑے ہو کر۔ ایک بار تو تُلی نے اسے کھڑکی کے ذریعہ اندر پہنچایا تھا۔ اس نے ان کی طرح لباس اختیار کیا۔ صرف دھوتی۔ یہ ریاضت کام آئی وہ آسائشوں سے ماورا ہو گیا۔

وہ چاہتا تھا کہ وہ خود ہی اپنے لیے کپڑا بنائیں۔ چرخے خریدے گئے ان میں مناسب تبدیلی کر کے انھیں جدید تقاضوں سے ہم آہنگ بنایا گیا۔ روئی فراہم کی گئی۔ آشرم بنایا گیا۔ اس سے جو دھوتی بنی وہ صرف تیس انچ کی تھی۔ اس نے وہ دھوتی لے لی لیکن گنگا بہن سے کہہ دیا تھا کہ اگر ایک مہینے کے اندر پینتالیس انچ کی دھوتی فراہم نہ کی جائے تو پھر اتنچا جانگھیہ دھوتی پہن کر سارا ملک گھومے گا۔ گنگا بہن نے مہینے بھر کے اندر اسے مطلوبہ دھوتی کا ایک جوڑ بھیج دیا تھا۔ کھادی ــــ!!

ان گوروں نے انگوٹھے کاٹ کر جو ظلم کیا تھا اس کا جواب اسی طرح دیا جا سکتا تھا۔ پورے ملک میں بیداری کی لہر چل پڑی۔

دونوں فرقوں کو یکجا کرنا تھا۔ خلافت تحریک چلی تو اس نے تائید کر دی۔ اسے خلیفہ کے تصور سے پیار تھا۔ سادگی، غریبوں کی دلجوئی ان کی ذمہ داری کا احساس۔ خلیفہ یہی کرتے تھے۔ اجتماعی قیادت، مرکزیت۔!

جب وہ نمک ستیہ گرہ پر چلا تو اس کے ساتھ بہتر آدمی تھے۔ یہ ہندسہ تاریخ میں خون سے لکھا گیا تھا اور فتح کا نشان تھا۔ پھر اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔

وہ سب اس کے ساتھ ہو گئے ــ وہ انقلابی شاعر ــ جس کے جذبے کی وہ قدر کرتا تھا اس سے اس نے اختلاف بھی کیا۔ وہ دُبلا پتلا لیکن مضبوط قوتِ ارادی کا انسان!! اس نوجوان کی سرزنش بھی کرنی پڑی تھی جو بے حد جوشیلا تھا اور اپنا ICS چھوڑ کر آن ملا تھا۔ وہ بے حد جذباتی انسان تھا اپنی آزاد فوج بنانا چاہتا تھا۔ اس کے مقابلے میں وہ کشمیری پنڈت نوجوان اچھا لگتا تھا۔ وہ مُسلمان دانشور جو صحافی بھی تھا وہ سب اس کے ساتھ ہو گئے ــ اب وہ علامت بن چکا تھا۔ دُبلا پتلا لاغر جسم۔ پسلیاں گنی جا سکتی ہیں ــ نفس کشی اور فقر و فاقے کی علامت!!

عینک بصیرت کی علامت تھی اور لاٹھی کو اس نے نئی معنویت دی تھی ــ لاٹھی جو وار کرنے کے لیے ہوتی ہے اس نے اسے سہارے کے طور پر استعمال کیا۔ لاٹھی سے وار کیسے بچایا جاتا ہے یہ اس نے سکھایا تھا۔

جب وہ ان گوروں کے ملک گیا تھا تو اس کا لباس دیکھ کر اخبار والوں نے "ادھ ننگا فقیر" لکھا تھا۔

اس نے قوم کو استقلال اور قوتِ برداشت کے ہتھیاروں سے لیس کیا تھا۔ قوتِ برداشت کے ذریعہ ظالم کو شکست دی جا سکتی ہے اور فاقہ د برت سے دلوں کو جوڑا جا سکتا ہے۔ ضمیر کو جگایا اور احساس کو زندہ کیا جا سکتا ہے ــ

کُتّا غرّاتا رہا لیکن بکری اطمینان سے جگالی کرتی رہی۔ اچانک ہی اس کے دو بچّے اٹھے اور پھر ایک دوسرے سے لڑتے ہوئے دُور تک بھاگے ــ کُتّے نے ان پر حملہ کیا ــ دونوں بچّے دو طرف ہو گئے۔ ایک گیٹ سے باہر چلا گیا ــ بکری بے چین ہو کر چیخنے لگی ــ اس کے دونوں بچّے بچھڑ گئے تھے۔

خون کے دریا بہے ــ دشمن نے جاتے جاتے دلوں میں دراڑ ڈال دی تھی، اس نے دلوں پر مرہم رکھا۔ زخم سینے کی کوشش کی لیکن زخم گہرے تھے وہ اُدھر بھی جانا چاہتا تھا ان کے زخم بھی سینا چاہتا تھا۔

وہ دھیرے سے اٹھا اور بکری کی پیٹھ تھپتھپانے لگا۔ اس سے کہا گیا کہ لوگ اس کے درشن کے لیے بے چین ہیں۔ وہ دو نوں خواتین کے سہارے چلنے لگا ــ ایک نے اس کی لاٹھی تھام لی تھی۔ دوسری کے پاس عینک تھی۔ اس کے درشن کو ایک بھیڑ تھی۔ یہ سب اسے بے حد چاہتے تھے۔ یہی چاہت اس کا سرمایہ ہے۔ اچانک ہی اس کی نظر بھیڑ میں چھپے بھیڑیے پر پڑی۔ اب شاید جسم کے فنا ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ جسم تو ختم ہونے کے لیے ہی ہوتے ہیں۔ اس کی لاٹھی اور عینک محفوظ ہاتھوں میں تھی ــ یہی وہ چھوڑے جا رہا ہے ــ جب تک یہ ہیں وہ نہیں مرے گا۔

گولیوں کے دھماکے ہوئے۔ بھگدڑ میں ایک نحیف سی آواز ابھری ــ ہے رام ــ اس نے دھندلے منظر کو دیکھا اور آنکھیں موند لیں۔

□□

قطعہ

از عبدالمنان صرفی

گاندھی و آزاد و قدوائیؒ، جواہر لال جی
کوششوں سے انکی بھارت کو ہے آزادی ملی
ان کے احسانات بھولیں گے نہیں اہل وطن
مل کے آزادی کھلی ہر دل کی مرجھائی کلی

محلہ پرانا ہنگلہ ۔ سیتاپور



یادگار لمحات

تحریر کنھیالال مشرا پربھاکر
ترجمہ احمد نسیم صدیقی

دو گاندھیوں کی آخری ملاقات

پورا ملک فرقہ وارانہ فسادات کی آگ میں جل رہا تھا اور کوئی بھی اس آگ کو بجھا نہیں پا رہا تھا۔ لہٰذا ملک کی تقسیم کی دہشت ماحول پر طاری تھی۔

اب امید کی ایک ہی کرن تھی کہ شاید گاندھی جی کوئی ایسا معجزہ کر دکھائیں جس سے تقسیم نہ ہونے پائے۔

گاندھی جی نواکھالی سے بہار اور نئے وائس رائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی دعوت پر بہار سے دہلی آئے تھے۔ سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں بہار ہی سے ان کے ہم سفر تھے۔ تقسیم کی وجہ سے خان صاحب بے انتہا پریشان تھے، جبکہ ۹ اپریل ۱۹۴۷ء کی پرارتھنا سبھا میں گاندھی جی نے اعلان کیا تھا:

"میں کہتا ہوں کہ زبردستی سے پاکستان تو کیا کوئی زمین کا ایک انچ ٹکڑا بھی نہیں لے سکے گا۔"

خان عبدالغفار خاں کو گاندھی جی کے اس عزم و استقلال سے تقویت حاصل ہوئی تھی اور انھوں نے ۱۱ اپریل ۱۹۴۷ء کو منو گاندھی سے کہا تھا:

"جب تک مہاتما جی ہیں، مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔"

امید و ناامیدی کے اس ماحول میں ۱۳ اپریل ۱۹۴۷ء کی صبح کا سورج نکلا۔ اس دن گاندھی جی کو بہار اور سرحدی گاندھی کو پشاور جانا تھا۔ ساڑھے آٹھ بجے کے چند لمحوں بعد دونوں گاندھی راجدھانی کے اسٹیشن پر تھے۔

میں بھی وہاں پہونچ گیا تھا۔ زندگی میں کئی مرتبہ مجھے خان صاحب کی رفاقت کا شرف حاصل ہوا تھا لیکن آج ان کے چہرے پر پریشانی و غم کا جو احساس نمایاں تھا وہ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ گاندھی جی خوشی اور مسرت، اور خان صاحب کے چہرے کی خصوصیت سکون؛ لیکن اس وقت گاندھی جی کے چہرے پر خوشی نہیں سکون تھا۔۔۔ اور خان صاحب کا چہرہ مایوسی اور غم سے سیاہ ہو رہا تھا۔

یہ غم اور مایوسی کیا تقسیم کی دہشت کا نتیجہ ہیں؟ میرے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوا۔ اتفاق کی بات اسی وقت خان صاحب نے منو بہن سے کہا:

"دیکھو، ایک بات کا خیال رکھنا کہ کوئی کچھ بھی کہے مگر باپو کو کبھی نہ چھوڑنا۔"

یہ سن کر میں حیرت میں پڑ گیا اور مجھے محسوس ہوا کہ میرے سامنے دو خان صاحب کھڑے ہیں: ایک پٹھان رہنما خان صاحب، دوسرا پیار کرنے والا خان صاحب۔ رہنما پٹھانوں کے اور عاشق گاندھی جی کے۔ انھیں یہ تشویش بھی ہے کہ پٹھانوں کا کیا ہوگا، وہ اس تقسیم میں تنہا رہ گئے ہیں، اور گاندھی جی کا کیا ہوگا۔ وہ تنہا رہ گئے ہیں اس طوفان میں۔!!

خان صاحب سرک کر گاندھی جی کے مزید قریب آ گئے ——
گاندھی جی نے ان کی جانب دیکھا، مگر خاموش رہے۔

خان صاحب نے گاندھی جی کی طرف دیکھا، مگر وہ بھی خاموش رہے۔ نظروں کے اس خاموش تبادلے میں ماضی کی کتنی یادیں تھیں اور مستقبل کے کتنے اندیشے پنہاں تھے۔

دونوں گاندھی ساتھ کھڑے تھے مگر وہ ایک دوسرے سے کتنی دور تھے۔ دونوں میں ایک دوسرے سے نظریں ملانے کی جرأت نہیں تھی، دونوں زمین کو تک رہے تھے۔

وقت ہو گیا تھا۔ گاندھی جی نے خان صاحب کا کاندھا تھپتھپایا



دھیرے سے کچھ کہا اور چل پڑے اپنے ڈبے کی طرف۔ خاں صاحب وہیں کھڑے رہے۔ ایک مجسمہ کی مانند...

ڈبے کے دروازے پر گاندھی جی کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے خاں صاحب کی جانب دیکھا۔ گاندھی جی کے چہرے پر کئی رنگ آئے گئے۔ تاہم وہ ساکت رہے۔ دونوں نے الوداعیہ سلام کیا اور گاندھی جی اپنی سیٹ پر چلے گئے خاں صاحب بھی اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑے تھے۔

گاڑی چل پڑی۔ بعض افراد کچھ دور تک ساتھ چلے مگر خاں صاحب نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ تاہم خاں صاحب وہیں کھڑے رہے۔ چند لمحات بعد وہ لوٹ پڑے۔ ان کے قدم حرکت میں تھے۔ آنکھیں زمین پر تھیں اور دل نہ جانے کہاں تھا تمام طرح کی پریشانیوں اور فکروں کا بار دل پر تھا۔

وہ دنیا ان کی آنکھوں کے سامنے برباد ہو رہی تھی، جسے نصف صدی کی جدوجہد کے بعد انھوں نے آباد کیا تھا اور نئی دنیا کا کوئی تصور، کوئی نقشہ واضح نہیں تھا۔ ان کے چاروں طرف مہیب سناٹا اور گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ طلوعِ آفتاب کا پتہ نہیں تھا۔

عالمی ادب میں جدائی کے متعدد مواقع کی تصویر کشی کی گئی ہے مگر دو گاندھیوں کی جدائی کا یہ لمحہ تاریخ میں بے مثال ہے۔

□□

"... جب میں اُردو کی بات کرتا ہوں تو ایسا سمجھا جاتا ہے کہ یہ مسلمانوں کی زبان ہے، ویسے ہی ہندی کی بات کرتا ہوں تو وہ ہندوؤں کی بھاشا ہے۔ اب یہاں تو آپ کو ایک قوم کی بھاشا سکھانے کی بات نہیں، ایک دھرم کی بھاشا سکھانے کی بات نہیں آپ میں سے کچھ لوگ جانتے ہوں گے کہ پنجاب میں سب پڑھے لکھے ہندو اور مسلمان اُردو جانتے ہیں، وہ ہندی نہیں بول سکتے۔ اسی طرح کشمیر میں بھی اچھی اُردو لکھنے والے ہندو ہیں سنسکرت بھری ہندی وہ نہیں سمجھتے۔ اس لیے میں آپ سے کہوں گا کہ یہ آپ کا دھرم ہے کہ آپ اُردو لپی بھی سیکھیں ..."

—— مہاتما گاندھی

ہندی پرچار سبھا کے جلسہ کی تقریر سے اقتباس (۲۵ر جنوری ۱۹۴۶ء)

گاندھی جی

پئے وطن سببِ افتخار گاندھی جی
وقارِ اہلِ وطن باوقار گاندھی جی
خزاں کے دور میں جانِ بہار گاندھی جی
شرفِ نگرِ اعتبار گاندھی جی

حیات وقف تھی ان کی بنامِ آزادی
انھیں کے صدقے ملا ہم کو جامِ آزادی

وہ جانتے تھے تقاضائے جذبۂ ایثار
وہ جانتے تھے کہ کیا چیز ہے حسیں کردار
وہ جانتے تھے شرافت کا دل نشیں معیار
وہ جانتے تھے ہے کیا فرضِ قافلہ سالار

کہاں کسی کو کبھی وہ اُداس کرتے تھے
بھٹکنے والوں کو منزل شناس کرتے تھے

انھیں کوئی بھی مورّخ بھلا نہیں سکتا
نقوش ان کے کوئی بھی مٹا نہیں سکتا
مقام ان کا کوئی اور پا نہیں سکتا
جواب ان کا کوئی شخص لا نہیں سکتا

وہ چاہتے تھے بُرے لوگ نیک ہو جائیں
وہ شیخ ہو کہ برہمن سب ایک ہو جائیں

جگا گئے وہ مقدر غلام بھارت کا
ہمیں وہ سونپ گئے ہیں نظام بھارت کا
بلند کرنا ہے خود ہم کو نام بھارت کا
کریں گے اور ہم اعلا مقام بھارت کا

سبق مہاتما گاندھی کا یاد ہے سب کو
نہ جھکنے دیں گے کبھی شانتی کے پرچم کو

شاعر فتح پوری

۸۹ ۸۸ جگر اکادمی۔ چمن گنج۔ کانپور

ڈاکٹر نہال احمد صدیقی
۳،۶۔ حسن منزل۔ الہ آباد

اُردو شاعری پر مہاتما گاندھی کے اثرات

شخصیتیں عارضی اور لمحاتی طور پر اپنے عہد کے ادب کو متاثر کرتی ہیں لیکن ایسا بہت کم ہوا ہے جب کوئی شخصیت اپنے معاصر ادب میں ایک علامت بن کر اُبھری ہو۔

اُردو شاعری نے یوں بھی شخصیت پرستی سے اپنے دامن کو بچائے رکھا ہے۔ اب اگر قصائد کی مثال دی جائے تو بے شک کچھ شخصیتیں جو مذہبی ہیں، ہر دَور میں قصیدہ نگاروں کا موضوع رہی ہیں، یا بادشاہوں کی مدح میں جو قصیدے لکھے گئے ہیں وہ قصائد اپنے اسلوب، پُرشکوہ لہجے اور زبردست قسم کی صناعی کی وجہ سے یاد رکھے گئے۔ وہ افراد جو ثانوی حیثیت اختیار کر گئے جن کی مدح یا ہجو میں قصیدہ تھا۔

رہ گئی بات مرثیے کی، تو وہ بالکل الگ صنف ہے جس کے کردار اتنے عظیم اور بلند مرتبت ہیں کہ انھوں نے بیشتر زبانوں میں ہر صنفِ سخن کو متاثر کیا ہے۔

اس طرح اگر غور کیجئے تو اُردو شاعری کی دُنیا میں معاصر شخصیتوں نے ادب کو متاثر نہیں کیا بلکہ ادب نے انھیں زندہ رکھا۔ مثلاً اقبال کی نظم "سید کی لوحِ تربت پر" یا داغ پر ان کی نظمیں یادگار ہیں یا سرور جہاں آبادی کی محسن الملک پر نظم۔ یہ ایسی تخلیقات ہیں جن کی ادبی تاریخ میں اس لیے جگہ ہے کہ ان سے شاعر کے جذبات کا، یا اس کی عقیدت کا اندازہ ہوتا ہے۔ چکبست نے گوکھلے اور بال گنگادھر تلک کی وفات پر تعزیتی نظمیں لکھی ہیں لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا کہ ایک مخصوص لمحے اور ایک مخصوص دور تک یہ شاعری محدود رہی۔

لیکن گاندھی جی کی شخصیت ایسی ہے جس نے ہندستان کی جدِ آزادی کی پوری تاریخ کو متاثر کرتے ہوئے اپنے عہد کے عظیم اُردو شعرا کو بھی متاثر کیا۔ حالاں کہ یہ موضوع بہت تفصیل چاہتا ہے لیکن نہایت اختصار سے یہ عرض کرنا ہے کہ اس سلسلے میں سب سے پہلا نام چکبست کا آتا ہے اس وقت جب گاندھی جی افریقہ میں ہندستانیوں کے اوپر ڈھائے گئے مظالم کے خلاف اور بدترین قسم کی نسل پرستی **Apartheid** کے خلاف لڑ رہے تھے۔ اُردو کا شاعر خاموش نہیں رہا۔ چکبست کی نظم "فریادِ قوم" کے دو بند ملاحظہ ہوں ؂

وطن سے دُور تباہی میں ہے وطن کا جہاز
ہوا ہے ظلم کے پردے میں حشر کا آغاز
سنیں تو ملک کے ہمدرد قوم کے دمساز
ہوا کے ساتھ یہ آتی ہے دُکھ بھری آواز
وطن سے دُور ہیں ہم پر نگاہ کر لینا
اِدھر بھی آگ لگی ہے ذرا خبر لینا

ٹرینسوال کے حاکم وفا شعار نہیں
کچھ ان کے قول کا دُنیا میں اعتبار نہیں
ہماری قوم پہ احساں کا اُن کے بار نہیں
یہ ظلم کیوں ہے ہم ان کے گنہگار نہیں
اگر وہ دولتِ برطانیہ کے پیلے ہیں
تو اہلِ ہند اسی آسماں کے تارے ہیں

اس سلسلے میں محترم علی جواد زیدی نے "اُردو میں قومی شاعری کے سو سال" نظم فریادِ قوم (چکبست) ص ۱۴۴ پر حاشیہ میں یوں نوٹ لکھا ہے:

"نوٹ: یہ نظم جنوبی افریقہ کے ہندستانیوں کی جو ٹرانسوال کے حکام کی غیر منصفانہ کارروائیوں سے عاجز اور پریشان تھے، حالتِ زار سے متاثر ہو کر لکھی گئی۔ گاندھی جی ان غریب الوطنوں کی حالت کو سُدھارنے میں دل و جان سے

معروف تھے۔ چنانچہ یہ نظم ایک رسالے کی شکل میں شائع کی گئی اور اسے گاندھی جی کے نام اس طرح معنون کیا گیا۔

بخدمت فدائے قوم مسٹر کرم چند گاندھی ؎

نثار ہے دلِ شاعر ترے قرینے پر
کیا ہے نام ترا نقش اس نگینے پر
چکبست لکھنوی "

اگر زمانی ترتیب کا لحاظ رکھا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ چکبست گاندھی جی سے بہت زیادہ متاثر تھے اور یہ تاثر اس وقت تھا جب ہندستانی سیاست میں گوکھلے، تلک، مسز اینی بیسنٹ اور علی برادران کے اثرات زیادہ نمایاں تھے۔ چکبست کی جنوبی افریقہ والی نظم کا ذکر ہو چکا۔ ۱۹۲۰ء سے قبل تقریباً ۱۹۱۷ء کے آس پاس اپنی مشہور نظم "وطن کا راگ" میں کہتے ہیں ؎

ہمارے واسطے زنجیر و طوق گہنا ہے
وفا کے شوق میں گاندھی نے جس کو پہنا ہے
سمجھ لیا کہ ہمیں درد و رنج سہنا ہے
مگر زباں سے کہیں گے وہی جو کہنا ہے

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

اس سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ گاندھی جی پر جب اکبر الہ آبادی نے "گاندھی نامہ" لکھنے کا ارادہ کیا اور یہ کہا کہ "یہ دورِ گاندھی نامہ" ہے تو دراصل ہندستانی سیاست میں ۱۹۲۰ء تک آتے آتے مہاتما گاندھی اس منزل پر پہونچ چکے تھے جہاں اپنے عمل و کردار سے ہر ہندستانی ذہن کو جھنجھوڑ دیا تھا۔ اسی لیے اکبر الہ آبادی نے کہا تھا ؎

مدخولہ گورنمنٹ اکبر اگر نہ ہوتا
پاتے اسے بھی اک دن گاندھی کی گوپیوں میں

گاندھی جی نے دراصل ملک کو جو تصورات بخشے تھے ان میں سب سے اہم چیز ان کے نظریے کا حربہ تھا۔ چنانچہ ان کی سودیشی تحریک پر تلوک چند محروم نے نظم لکھی۔ ان کی ایک نظم "مقاومت مجہول" کے عنوان سے بھی ملتی ہے لیکن گاندھی جی کے اس عہد میں سب سے بڑے پرستار مولانا ظفر علی خاں نظر آتے ہیں جو کہتے ہیں ؎

صبر والے چھا رہے ہیں جبر کی اقلیم پر
ہو گیا فرسودہ شمشیر و سناں کا انقلاب

ایک جگہ اور کہتے ہیں ؎

پروردگار نے کہ وہ ہے منزلت شناس
گاندھی کو بھی یہ مرتبہ پہچان کر دیا

دراصل گاندھی جی ہندستان میں یک جہتی کی علامت بن گئے تھے اور اس دور میں تقریباً ہر شاعر نے بلاواسطہ یا بالواسطہ گاندھی جی کا اثر قبول کیا تھا۔ اقبال نے گاندھی جی کو اپنی فارسی شاعری میں اپنے مخصوص انداز میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے حالاں کہ اس میں اختلاف بھی ہے کہ اس سے گاندھی مراد ہیں یا کوئی دوسری شخصیت۔ لیکن اردو میں انھوں نے جب یہ لکھا کہ ؎

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم

تو اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے مہاتما گاندھی کو رشی کا منصب عطا کیا اور یہ علامہ اقبال ہیں جن کے یہاں ہر لفظ اپنی پوری معنویت اور معانی کی تمام سطحوں کے ساتھ ابھرتا ہے۔

براہِ راست نہ سہی لیکن اس دور میں جتنی نظمیں ستیہ گرہ پر یا آزادی پر لکھی گئیں یا روِش صدیقی کی نظم باڈرولی کی ستیہ گرہ پر (جو سردار پٹیل کی رہنمائی میں کامیاب ہوئی تھی) وہ سب کامیاب نظمیں تھیں۔ اس سلسلے میں علی جواد زیدی، عرش ملسیانی، ساغر نظامی سب ہی نے نظمیں لکھیں۔ جمیل مظہری نے لکھا ؎

دیس کا ہر سیوک ہو آندھی ہر بچہ آزاد اور گاندھی

ہندستان کی تحریکِ آزادی کی یہ کہانی بڑھتے بڑھتے جب ۱۹۴۲ء تک آجاتی ہے تو وہ ساری نظمیں گاندھی جی سے متاثر ہو کر ہی لکھی گئیں جن میں قوم کو کچھ کرنے اور مرنے پر اکسایا گیا تھا۔ علی جواد زیدی کی "منزلیں" شیم کرہانی کی "کچھ دیر ذرا سو لینے دو" بہت اہم ہیں۔ علی جواد زیدی کی ایک نظم "قیدی کی لاش"۔ شیم کرہانی کی "روشن اندھیرا" اس عہد کی بہت مقبول نظمیں تھیں جس کے ہر شعر کے پس منظر میں گاندھی جی موجود تھے۔ ۱۹۴۲ء میں بہت ساری نظمیں لکھی گئیں جو ضبط ہو گئیں۔ جو ضبط شدہ نظموں کے عنوان سے ملتی ہیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔

یہاں یہ بھی عرض کر دینا بہت ضروری ہے کہ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک نے جو رُخ اختیار کیا تھا اس نے شعرا کو ذہنی طور پر مارکسزم سے اتنا متاثر کر دیا تھا کہ انہیں گاندھی جی کا فلسفہ عدم تشدد، اہنسا، چرخا کچھ بے تکا سا معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ ترقی پسند تحریک میں شامل شعرا ۱۹۴۲ء میں کانگریس کی تحریک کے ساتھ نہیں تھے۔ یہ لوگ آزادی کے پرستار تھے لیکن ان کی سمت گاندھی جی سے الگ تھی۔ لیکن جن اصولوں کے لیے گاندھی جی لڑ رہے تھے ان میں سے بہت سارے اصولوں سے ترقی پسند شعرا متفق تھے۔ مثلاً گاندھی جی چھوت چھات کے خلاف تھے، فرقہ پرستی کے خلاف تھے، غلامی کے خلاف تھے لیکن انھوں نے ان موضوعات کو اپنی شاعری کا محور و مرکز نہیں بنایا۔ اگر بنایا بھی تو گاندھی جی کی شخصیت کو سامنے نہیں لائے۔

یہ بھی تاریخ کی ایک ستم ظریفی ہے کہ مہاتما گاندھی نے جب سماج میں مساوات کے لیے اور برابری کے لیے چھوت چھات کے خلاف آواز اٹھائی تو اُردو شعرا میں سب سے پہلے مولانا ظفر علی خاں نے ان کی صدا پر لبیک کہا اور لکھا ؎

ہر ایک شودر کی لڑکی برہنی ہو جائے

اور اس سلسلے میں مہاراج بہادر برقؔ نے بھی نظم لکھی۔ یہ وہی مہاراج بہادر برقؔ ہیں جن کا ایک شعر میر صاحب سے منسوب کیا جاتا رہا ہے، شعر ہے ؎

وہ آیا بزم میں اتنا تو برقؔ نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

برقؔ نے اچھوتوں سے نفرت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ہے ؎

جو ان کا مستقر ہے وہ ہے وطن ہمارا — ہے وجہ ناز ان کو دَورِ کہن ہمارا
تہذیب ایک سی ہے یکساں چلن ہمارا — بے کار ان کو سمجھیں، دیوانہ پن ہمارا

اس خاک کے ہیں پتلے بھارت سپوت ہیں سب
گر یہ اچھوت ہیں تو ہم بھی اچھوت ہیں سب

اس لیے ۱۹۴۶ء تک گاندھی جی پر اگر نظمیں لکھی بھی گئیں تو وہ غیر اہم لوگوں نے یا پھر بالکل ہی ہنگامی موضوع پر لکھی گئیں جیسے کیفیؔ کی نظم "گاندھی جناح ملاقات پر" تھی۔ لیکن وہ جو کہا گیا ہے کہ زندہ جولیس سیزر سے مقتول جولیس سیزر زیادہ طاقت ور ثابت ہوا، وہی بات مہاتما گاندھی کے لیے بھی کہی جا سکتی ہے۔ پروفیسر مجاور حسین لکھتے ہیں :-

"۳۰ر جنوری ۱۹۴۸ء کی شام کو گاندھی جی ناتھو رام گوڈ سے کی گولی کا نشانہ بن گئے۔ مگر اس میں بھی کوئی دو رائے نہیں ہو سکتیں کہ گاندھی جی ۳۰ر جنوری ۱۹۴۸ء سے آج تک روزانہ نظریاتی اعتبار سے کسی نہ کسی گوڈ سے کی گولی کا، کسی نہ کسی عنوان سے شکار ہو رہے ہیں اور اس کے باوجود یہ بھی ایک سچائی ہے کہ ہندستان سے گاندھی جی کے نظریات اور ان کا اصول ہر لمحہ گولیوں کی بارش کے باوجود نہ فنا کیا جا سکا ہے نہ فنا کیا جا سکے گا۔ اس لیے کہ گاندھی صحیح معنوں میں قومی یک جہتی کے علمبردار تھے اور ایسی تاریخی صداقت بن گئے تھے جو ہزار ہا برس کے مشترکہ کلچر کے تسلسل کا تاریخی نتیجہ تھی اس لیے ان کی شہادت پر اظہار افسوس انسانیت کا تقاضا ہی نہیں تھا بلکہ اس بات کا اعلان بھی تھا کہ اُردو شاعر ان نظریات کا حامل ہے.... جن کے سردار گاندھی جی ہیں"۔

چنانچہ گاندھی جی کے سانحے پر اپنے اپنے انداز سے ہزار ہا نظمیں کہی گئیں۔ الہ آباد میں اسرار ناروی (ابن صفی مرحوم) کا شعر آج بھی بہت معروف ہے۔ انھوں نے کہا ؎

لویں اُداس، چراغوں پہ سوگ طاری ہے
یہ رات آج کی انسانیت پہ بھاری ہے

اقبالؔ سہیل نے گاندھی کے عنوان سے ایک طویل نظم لکھی، اس کے صرف دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

یہ عروسِ کشورِ ہند تھی، ہمہ بے کسی ہمہ بد دلی
اسے تو نے غازۂ خرمی، ترے خوں نے رنگ حنا دیا

یہ کمالِ پیرویِ علی، یہ فراخ حوصلگی تری
کہ خود اپنے دشمنِ جاں کو بھی وہی ارمغانِ دعا دیا

آنند نرائن ملّا، آل احمد سرورؔ، عمر انصاری وغیرہ نے بڑی اچھی نظمیں لکھیں۔ مجازؔ کے کچھ شعر بہت مشہور تھے مثلاً ؎

ہندو چلا گیا نہ مسلماں چلا گیا — انساں کی تلاش میں انساں چلا گیا
خوش ہے بری کمند جو نیکی پہ ڈال کے — رکھ دیں گے ہم بدی کا کلیجہ نکال کے

اپنی بات

نصف صدی نمبر اور اس کے فوری بعد گاندھی نمبر کی اشاعت ادارے کی ایسی فخریہ پیش کش ہے جس کا اعتراف ملک کے گوشے گوشے سے ہوا۔ اگر وہ تمام تبصرے اور گرانقدر آراء شائع کی جائیں تو ایک کتاب ہو جائے جو ان نمبروں کی توصیف کے سلسلے میں ادارے کو موصول ہوئے ہیں۔

ہم نے ہمیشہ اس کی کوشش کی ہے کہ ہر مضمون بلکہ ہر سطر کے بین السطور میں ایک پیغام چھپا رہے۔ یہ پیغام محبت کا رواداری کا، باہمی احترام کا اور ملک کی خوش حالی اور بہبود کا پیغام ہے اور اسی لیے نیا دور کے ہر خاص نمبر کو عوام نے قبولیت کا تاج پہنایا اور خواص نے اپنے دلوں میں جگہ دی۔ ہمارے لیے بڑے اعزاز کی بات رہی کہ ہمارے لکھنے والوں میں ہر طبقۂ خیال اور مختلف عقیدہ رکھنے والے دانشور شامل رہے لیکن اس سے بھی زیادہ ہمارے لئے باعثِ فخر یہ ہے کہ ہمارے وطن ہمارے پیارے ہندوستان کا ہر دن ایک نیا رنگ لے کر اُبھرتا ہے۔ ہر تاریخ میں ایک یادگار لمحہ چھپا ہوتا ہے۔ ہر مہینہ کسی نہ کسی رُخ سے ہماری تہذیب کے روشن خدوخال کو اور منور کرتا ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے رمضان المبارک کی ریاضت اور مجاہدۂ نفس کے مبارک دن تھے دنیا ہندوستانی زندگی میں اختلافات کا ڈھنڈورا تو پیٹتی ہے لیکن محبت کے ان مناظر کی طرف توجہ نہیں دیتی جس کا مظاہرہ ہر لمحہ ہوتا رہتا ہے اور جس کی بھرپور تصویر عید کے مُبارک موقع پر نظر آتی ہے جب ایک دوسرے سے اس طرح گلے ملتے ہیں کہ سارا گلہ جاتا رہتا ہے۔ چنانچہ عید کی مُبارکباد پیش کرتے ہوئے ہماری دُعا ہے کہ ہندستان کا ہر دن عید کی خوشیوں سے معمور اور مسرّتوں سے بھرپور ہو آمین!

دسمبر ۱۹۹۵ء کی آخری تاریخ ادبی دنیا کے لیے بے حد تکلیف دہ تھی۔ اُردو کے محقق "میر: حیات اور شاعری" کے مصنف "عمدۂ منتخبہ" کے مرتب خواجہ احمد فاروقی نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ وہ صحیح معنوں میں خواجۂ اُردو پرست" تھے۔ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کو کہکشاں کی راہ گزر بنانے میں انھوں نے بہت بڑا کردار ادا کیا تھا اور دہلی یونیورسٹی کا شعبۂ اُردو کسی زمانے میں دانشوروں سے چھلک رہا تھا، یہ خواجہ صاحب کی سعی و کاوش کا نتیجہ تھا۔

جنوری ۱۹۹۶ء میں اوپیندر ناتھ اشک جیسے تخلیق کار کا انتقال ہوا اور ابھی ان کے غم میں آنسو خشک بھی نہ ہو پائے تھے کہ پروفیسر نعیم احمد کے انتقال کی خبر ملی۔ وہ شعبۂ اردو علی گڑھ کے صدر رہے اور شہر آشوب پر ان کا مقالہ یادگار حیثیت رکھتا ہے۔ ابھی حال ہی میں انھوں نے متن کی تدریس و تعبیر پر بڑا اچھا سیمینار کیا تھا اور اس کے مضامین کتابی شکل میں شائع کرائے تھے وہ بڑے خوش اخلاق تھے اور خاکسار سے خصوصی شفقت فرماتے تھے۔ نیا دور کے نصف صدی نمبر کی تقریب میں شرکت بھی فرمائی تھی۔ ان کا انتقال اُردو ادب کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔

ڈاکٹر رضوان علوی شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر تھے۔ وہ اُردو اکادمی لکھنؤ کے کچھ عرصہ تک چیرمین بھی رہے۔ ان کی خوش اخلاقی اور ملنساری لکھنؤ کی تہذیبی زندگی کا ناگزیر جزو تھی۔

مولانا غلام حسنین کراروی یوں تو مذہبی شخصیت رکھتے تھے اور 'اصولِ کافی' کا ترجمہ کر رہے تھے لیکن وہ مشہور رسالہ العلم کی ادارت سے بھی وابستہ تھے نیز اُردو ادب سے والہانہ دلچسپی اور شغف رکھتے تھے۔

ادارہ ان تمام حضرات کے سانحۂ ارتحال پر ان کے پسماندگان کو تعزیت پیش کرتا ہے اور ان کی وفیات کو اُردو کے لیے عظیم نقصان تصوّر کرتے ہوئے دُعاگو ہے کہ پروردگار انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

——— ایڈیٹر

نظمیں

بارش کی ایک شام

شاید ہمیں مغموم کرنے
اور سوگوار انسانوں کو
جگانے کے لئے
آج کی شام
بارش کی سوغات لے کر
آئی ہے.
خنک موسم کی تندی
نشتر کی طرح چبھ رہی ہے
عجب ڈرامائی سچویشن ہے
آنکھیں ہیں کہ ساون بھادوں کی طرح
برسنا چاہتی ہیں.
وہی پرانا قصہ!
پہلی نظر کا عشق
کیوپڈ کی کارستانی

□□

عید

جب میں نے تمہیں
عید کی مبارکباد دینا چاہی
تو تم نے اسے قبول کرنے میں
گریز سے کام لیا
کاش تم نے اس طرزِ ستم ایجاد
سے پہلے یہ تو سوچا ہوتا کہ
چاند میں کون ہے.

موسم

تمہارے اندر کھلے
دھنک رنگ موسم کے گلاب
کیا محض تمہارے لیے ہیں
مجھے نہ سہی کسی کو تو
خوشہ چینی کا اختیار دو

ستم

میرا کشکول خالی ہے
اسے خالی رہنے دو
مگر یہ تو ستم در ستم ہے
کہ مجھے اپنے در پر
صدا لگانے سے بھی
روک رہی ہو.

بزدل

اُس دن کافی کے گرم پیالے پر
میں پرانے معاشقوں سے لیکر
چھٹے ورلڈ کپ کے امکانات تک
بے شمار موضوعات پر
تم سے گفتگو کرتا رہا.
مگر
یہ کہنے کی ہمت نہ جٹا سکا
کہ چلو آج کی رات ایک ساتھ
گزاریں.

یادِ ماضی

تم بھی کیا عجب لڑکی ہو!
کیسی مضحکہ خیز سچویشن میں
ڈال جاتی ہو
بالکل اسی طور جیسے
آج سے ٹھیک چالیس سال قبل
کسی نسترن دیا سمن نے
پہلی بار درد عشق کو
جگایا تھا
بن بات ہمیں رلایا تھا.

فیاض رفعت
۲۲ سی - دل کشا کالونی، لکھنؤ

علی سردار جعفری
۱۰، سیتا محل - پرنس جی پٹیٹ روڈ
بمبئی - ۴۰۰۰۳۶

زندگی کا مختصر سفرنامہ

پیدائش: بلرام پور (ضلع گونڈہ، اودھ)
۲۹ نومبر ۱۹۱۳ء

نام: علی سردار - نام کا سجع والد کے ایک دوست نے کیا۔

بجائے احمد مرسل ہوئے علی سردار

میرا نام اس اعتبار سے غیر معمولی ہے کہ آج تک اس نام کا دوسرا آدمی نہیں ملا۔ ہاں سردار علی نام کسی قدر عام ہے۔ حافظ شیرازی کے ایک قصیدے میں علی سردار اس طرح استعمال ہوا ہے کہ میرے نام کا سجع بن جاتا ہے۔ میرے والد کے کتب خانے میں جو نسخہ تھا اس میں یہ قصیدہ شامل تھا۔ اس زمانے میں مولانا قاضی سجّاد حسین صاحب نے نئی دہلی سے جو نسخہ ترجمے کے ساتھ شائع کیا ہے اس میں یہ قصیدہ شامل ہے میرے نام کا شعر یوں ہے ؎

علی امام و علی ایمن و علی ایمان
علی امین و علی سرور و علی سردار

معلوم نہیں یہ شعر میرے والد کی نظر میں تھا یا نہیں لیکن ہم قافیہ نام میرے ایک چچازاد بھائی کا تھا جو مجھ سے عمر میں چند سال بڑے تھے ـــ علی جرّار۔ میرے والد اور چچا کے نام بھی اسی طرح غیر معمولی تھے ـ سید جعفر طیّار جعفری، سید حیدر کرّار جعفری۔ سید احمد مختار جعفری۔ معلوم نہیں میرے بڑے بھائی ظفر عباس کا نام ان قافیوں سے الگ کیوں تھا۔ میں نے اپنے بچپن کی ایک رباعی میں ان ناموں کو یکجا کر لیا تھا ؎

نورِ نظرِ احمدِ مختار ہوں میں لختِ جگرِ حیدرِ کرّار ہوں میں
ہیں فتح و ظفر قوتِ بازو میرا یعنی پسرِ جعفرِ طیّار ہوں میں

میرے دادا اور چچا کے ناموں کے متعلق ایک لطیفہ مشہور ہے۔ کسی نے میرے دادا سے پوچھا:

"مہدی حسن! تم نے اپنے بیٹوں کے نام جعفر طیّار، حیدر کرّار اور احمد مختار رکھے ہیں - اب چوتھا بیٹا ہوگا تو کیا نام رکھو گے؟"

میرے دادا نے برجستہ کہا، "پاک پروردگار!"

والد کے ایک دوست فرّخ بھیّا نے میری پیدائش پر ایک شعر کہا تھا ؎

دیا حق نے جعفر کو ثانی پسر
مبارک، 'خوش اقبال' پیدا ہوا

تعلیم:

سب سے پہلے گھر پر بہار کے ایک مولوی صاحب نے اردو، فارسی اور قرآن کی تعلیم دی۔ وہ رات کو قصص الانبیاء سناتے تھے۔ اس کے بعد دینی تعلیم کے لیے سلطان المدارس لکھنؤ بھیج دیا گیا۔ وہاں جی نہیں لگا۔ ایک مولوی صاحب کے گھر پر قیام تھا، وہاں بھی جی نہیں لگا اور میں فرار ہو کر بلرام پور واپس چلا گیا۔ بلرام پور کے انگریزی اسکول لائل کالجیٹ ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ کھلی فضا تھی، اچھے استاد تھے، ہم عمر لڑکوں سے دوستیاں تھیں۔ صبح ناشتہ کر کے گھر سے اسکول جانا اور شام کو چار بجے واپس آ کر پھر ناشتہ کرنا اور میل ڈیڑھ میل دور ایک پریڈ گراؤنڈ میں پیدل جا کر دو گھنٹے کرکٹ اور ہاکی کھیلنا روز کا معمول تھا۔

اسی زمانے میں انیس کے زیرِ اثر شاعری شروع کی۔ ۱۹۳۳ء میں بیس سال کی عمر میں ہائی اسکول کی تعلیم مکمل کر کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔

یہ ایک طوفانی زمانہ تھا جب تحریکِ آزادی اپنے شباب پر تھی۔ اسی عہد کے علی گڑھ نے اردو زبان کو اختر حسین رائے پوری، سبط حسن، مجاز، جاں نثار اختر، جذبی، خواجہ احمد عباس، جلیل قدوائی، انصاری، عصمت چغتائی اور ۱۹۴۰ء کے آس پاس اختر الایمان کا تحفہ دیا۔ وہاں

خواجہ منظور حسین، ڈاکٹر عبدالعلیم، ڈاکٹر رشید جہاں، ڈاکٹر محمد اشرف وغیرہ سے تعارف ہوا اور جن کی صحبت اور فیض نے ذوقِ ادب اور آزادی کے جذبے کو جلا عطا کی۔ جدید عہد کے اردو ادب میں تقریباً ہ، فیصد علی گڑھ اور ترقی پسند تحریک کی عطا ہے۔

ایک ہڑتال میں حصہ لینے کی وجہ سے مسلم یونیورسٹی کو خیرباد کہنا پڑا اور دہلی جاکر اینگلو عربک کالج میں داخلہ لیا۔ یہ وہ تاریخی کالج تھا جو دہلی کالج کے نام سے ایک بڑا تعلیمی کردار ادا کر چکا تھا۔ وہاں داخلہ دلوانے میں جلیل قدوائی اور اختر انصاری نے مدد کی۔

جواہر لال نہرو سے اسی زمانے میں ملاقات ہوئی اور ملاقات کا یہ شرف آخر دن تک قائم رہا۔ ان کے انتقال سے دو ماہ قبل تین مورتی ہاؤس میں اندرا گاندھی نے ایک چھوٹا سا مشاعرہ پنڈت جی کی تفریحِ طبع کے لیے کیا تھا جس میں فراق، سکندر علی وجد اور مخدوم محی الدین بھی شامل تھے۔ میں نے اپنی نظم "میرا سفر" فرمائش پر سنائی تھی۔

دہلی سے بی اے کرنے کے بعد میں لکھنؤ آگیا۔ پہلے مجاز کے ساتھ قانون کی تعلیم کے لیے ایل ایل بی میں داخلہ لیا۔ ایک سال بعد اس کو چھوڑ کر انگریزی ادب کی تعلیم کے لیے ایم اے میں داخلہ لیا۔ لیکن آخری سال کے امتحان سے پہلے جنگ کی مخالفت اور انقلابی شاعری کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا، اور لکھنؤ ڈسٹرکٹ جیل اور بنارس سنٹرل جیل میں تقریباً آٹھ ماہ قید رہا اور پھر بلرام پور اپنے وطن میں نظربند کر دیا گیا۔ یہ نظربندی دسمبر ۱۹۴۱ء میں ختم ہوئی۔

لکھنؤ میں سجاد ظہیر، ڈاکٹر احمد وغیرہ کی صحبت رہی۔ وہیں پہلی بار ڈاکٹر ملک راج آنند سے ملاقات ہوئی۔ ۱۹۳۸ء میں کلکتہ میں ترقی پسند مصنفین کی دوسری کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس موقع پر شانتی نکیتن جاکر ٹیگور سے ملاقات کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ وہیں بلراج ساہنی سے ملاقات ہوئی جو ہندی پڑھاتے تھے۔

۱۹۴۱ء میں لکھنؤ ریڈیو نے ایک مشاعرہ منعقد کیا جو سارے ہندوستان میں بڑے ذوق و شوق سے سنا گیا۔ اس کا نام تھا نوواردِ شعرا کا مشاعرہ۔ جوش نے صدارت کی لیکن کلام نہیں سنایا۔ فیض، مخدوم، مجاز، جذبی اور جاں نثار اختر نے میرے ساتھ اس مشاعرے میں شرکت کی۔ ن۔ م۔ راشد کسی وجہ سے نہیں آسکے۔ یہ نئی ترقی پسند اردو شاعری کے سات سیارے تھے جن کی تابناک گردش کا نغمہ آج بھی گونج رہا ہے۔ اختر الایمان نے اس کے بعد شاعری شروع کی۔ ساحر اور مجروح بعد کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ سکندر علی وجد ہمارے احباب میں تھے لیکن حیدرآباد کی سیول سروس کی وجہ سے اس طرح کے مشاعروں میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ ان کی دو نظمیں اجنتا اور ایلورا اردو شاعری کے شاہکاروں میں شمار کی جاتی ہیں۔ جوش، جگر، فانی، اصغر، یگانہ، حسرت موہانی کی شاعری کے ڈنکے بج رہے تھے۔ فراق کا شمار ابھی بڑے شاعروں میں نہیں ہوا تھا۔ وہ عمر میں جوش اور جگر کے ہم عصر تھے لیکن شاعری میں ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر عروج حاصل کیا۔ ان کی زیادہ شہرت ۱۹۴۷ء کے بعد ہوئی۔ ویسے ان کا شمار بہت اچھے شعرا میں پہلے سے تھا۔

۱۹۴۲ء میں بمبئی آنا ہوا۔ سجاد ظہیر کے ساتھ کمیونسٹ پارٹی کے ہفتہ وار اخبار "قومی جنگ" میں صحافتی فرائض انجام دیتا رہا۔ اس عمل میں بعد کو سبط حسن، مجاز، کیفی، محمد مہدی وغیرہ شامل ہوئے، آہستہ آہستہ بمبئی اردو ادب کا مرکز بن گیا۔ ۱۹۴۹ء کے بعد بمبئی میں جوش، ساغر نظامی، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، میراجی، اختر الایمان، سجاد ظہیر، ساحر، کیفی، مجروح، حمید اختر اور بہت سارے سربرآوردہ ادیب جمع ہو گئے۔ اس زمانے کی انجمن ترقی پسند مصنفین کے ادبی اجلاس نے پوری اردو دنیا میں ایک دھوم مچا رکھی تھی۔ باہر سے آنے والے ادیب ان اجلاسوں میں بڑی مسرت سے شریک ہوتے تھے۔ پطرس بخاری سے میری ملاقات پہلی بار بمبئی میں ہوئی۔ ان کے بھائی ذوالفقار بخاری ریڈیو کے ڈائرکٹر تھے اور ان سے بہت اچھے مراسم تھے۔ میری طویل تمثیلی نظم "نئی دنیا کو سلام" اسی دور کی تخلیق ہے۔ ذوالفقار بخاری اس نظم کو ریڈیو پر ڈرامے کے انداز سے پیش کرنا چاہتے تھے لیکن ملک کی تقسیم کے ساتھ وہ یہاں سے چلے گئے۔

اس عہد کی عظیم فلمی شخصیتیں ہمارے حلقۂ احباب میں شامل تھیں مثلاً کے، ایل، سہگل۔ پرتھوی راج کپور۔ کے، این، سنگھ وغیرہ۔ بعد کو راج کپور، نرگس اور دوسرے فلمی ستارے اس دائرے میں آگئے۔

کہا گیا کہ وہ بہت داستانیں لکھنے کا موقع آئے گا ۔ یہ سب کے سب عوامی پسند ہونے کے ذمہ دار تھے۔

اودے شنکر کا گروپ جب الموڑہ میں ختم ہو گیا تو اس کے فنکار بمبئی آ گئے اور انڈین پیوپلس تھیٹر میں شریک ہو گئے۔ اودے شنکر نے بمبئی آکر رقص کے ذریعے سے رامائن کا ایک پروگرام موزوں کے لیے پردے پر پرچھائیوں کی شکل میں پیش کیا۔ ان کے بھائی روی شنکر نے "سارے جہاں سے اچھا" کی دُھن بنائی جو اب اس ترانے کی دُھن ہے۔ اس خوبصورت دور پر پھر کبھی تفصیل سے لکھا جائے گا۔

ادبی تخلیقات

نظم

۱۔ پرواز (مجموعہ) ۱۹۴۳ء
۲۔ نئی دنیا کو سلام (طویل تمثیلی نظم) ۱۹۴۸ء
۳۔ خون کی لکیر (مجموعہ۔ پرواز کے انتخاب کے ساتھ) ۱۹۴۹ء
۴۔ امن کا ستارہ (دو طویل نظمیں) ۱۹۵۰ء
۵۔ ایشیا جاگ اُٹھا (طویل نظم) ۱۹۵۱ء
۶۔ پتھر کی دیوار (مجموعہ) ۱۹۵۳ء
۷۔ ایک خواب اور (مجموعہ) ۱۹۶۴ء
۸۔ پیراہنِ شرر (مجموعہ) ۱۹۶۵ء
۹۔ لہو پکارتا ہے (مجموعہ) ۱۹۶۸ء

نثر

۱۔ منزل (افسانے) ۱۹۳۸ء
۲۔ یہ خون کس کا ہے (ڈرامہ) ۱۹۴۳ء
۳۔ پیکار (ڈرامہ) ۱۹۴۴ء
۴۔ ترقی پسند ادب ۱۹۵۲ء
۵۔ لکھنؤ کی پانچ راتیں ۱۹۶۵ء
۶۔ اقبال شناسی ۱۹۶۹ء
۷۔ پیغمبرانِ سخن (کبیر، میر، غالب)

فنی تخلیقات

۱۔ بولوا لے سنت کبیر: (ڈاکومنٹری فلم کا مسودہ) ڈائرکٹر: خواجہ احمد عباس
۲۔ ہندوستان ہمارا (ہندوستان کی پانچ ہزار سالہ تہذیب پر ڈاکومنٹری فلم کا مسودہ) ڈائرکٹر: خواجہ احمد عباس
۳۔ لٹریری اسٹارم (THE LITERARY STORM) انگریزی میں ڈاکومنٹری فلم۔ موضوع: تحریکِ آزادی میں ادب کا حصہ۔ مسودہ اور ڈائرکشن۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک۔ آسامی، بنگالی، اڑیا، ہندی، اردو، پنجابی، کشمیری، بھوجپوری، گجراتی، مراٹھی، کنڑ، تامل، تلگو، ملیالم اور انگریزی کے ادب کا کارنامہ۔ (تین حصوں میں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۰۵ء تک۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۲۰ء تک۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۷ء تک۔)
۴۔ ٹیلی ویژن سیریل کہکشاں۔ جدید اُردو شعراء کی زندگی اور شاعری، حسرت موہانی، جگر مرادآبادی، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، اسرار الحق مجاز اور مخدوم محی الدین (ڈائرکٹر جلال آغا۔ تحریر و تہذیب سردار جعفری)
۵۔ روشنی اور آواز۔ لال قلعہ۔ شاہ جہاں سے ہندوستان کی آزادی تک
۶۔ روشنی اور آواز۔ شالیمار باغ۔ سری نگر۔ جہانگیر اور نور جہاں سے آج کے عہد تک۔ اس باغ میں لیلیٰ مجنوں کی کہانی پھولوں اور پودوں کی زبانی کہی گئی ہے۔ باغ میں بہتی ہوئی نہر وقت کا استعارہ ہے۔ پانی پر تیرتے ہوئے پھول لیلیٰ کا استعارہ ہیں اور نہر پر دونوں سے جھکی ہوئی بید مجنوں کی شاخیں پھولوں کو چھو نہیں سکتیں مجنوں کا استعارہ ہیں۔ نہر کے دونوں طرف کیاریوں میں لیمو اور سنترے کے دو دو پودے جنت میں لیلیٰ مجنوں کی یکجائی کی علامت ہیں۔ ناقۂ لیلیٰ کی علامت اب باقی نہیں رہ گئی ہے۔ یہ علامت سبز گھاس کے قطعات پر ٹیلوں کی شکل میں تھی جن پر گلاب کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔

کشمیری کہانی بھونرا اور نرگس تحریکِ آزادی کی کہانی سناتی ہے جس میں بھونرا مجاہد کی علامت ہے اور نرگس (محبوبہ) آزادی کی علامت۔ جاڑوں کی برف پگھل جانے کے بعد جب زنبور بہار گنگناتا ہوا نرگس سے ہم آغوش ہو جاتا ہے تو آزادی کی بہار

آجاتی ہے۔

تین رنگ کے کشمیری کنول کے پھول۔ برہما۔ وشنو اور شیو کی علامت کے طور پر استعمال کیے گئے ہیں۔ سُرخ کنول صبحِ ازل کا طلوعِ آفتاب ہے۔ نیلا کنول کائنات کی دوپہر ہے اور سفید کنول موت کی علامت ہے جو تجدیدِ حیات کی آئینہ دار ہے۔

۷۔ روشنی اور آواز۔ تین مورتی ہاؤس۔ جواہر لال نہرو کی، آزادی کے بعد کی کہانی ہے۔

۸۔ دھنک ا آشرم۔ مہاتما گاندھی کی کہانی ہے جو ڈانڈی مارچ اور نمک ستیہ گرہ پر پہونچ کر ختم ہوجاتی ہے کیوں کہ اس کے بعد گاندھی جی احمد آباد سے منتقل ہوگئے۔

اکابرینِ عالَم جِن سے مُلاقات کا شَرَفْ حَاصِل ھوا

۱۔ ٹیگور۔ ۲۔ مہاتما گاندھی، ۳۔ جواہر لال نہرو، ۴۔ مولانا ابوالکلام آزاد، ۵۔ ستیہ جیت رے، ۶۔ پابلو نرودا، ۷۔ ناظم حکمت، ۸۔ ایالیہ اہرن برگ، ۹۔ شالوخوف، ۱۰۔ پاسترناک، ۱۱۔ فرانسیسی شاعر لوئی آراگون، ۱۲۔ جیولیو کیوری (سائنس)، ۱۳۔ خردشچوف، ۱۴۔ پال روبسن۔

سَیرُوسَیاحَتْ

پاکستان۔ تاجکستان۔ ازبکستان۔ آذربائیجان۔ روس۔ سائبیریا۔ عراق۔ یمن۔ مصر۔ یونان۔ بلغاریہ۔ برلن (مشرقی)۔ برلن (مغربی)۔ فرانس۔ چیکوسلواکیہ۔ ڈنمارک۔ سویڈن۔ ناروے۔ فن لینڈ۔ انگلستان۔ امریکہ اور کینڈا۔

اعزاز اور اکرام (۱)

۱۔ سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ (شعری مجموعہ ایک خواب اور) ۱۹۶۵ء
۲۔ پدم شری (صدر مملکت ڈاکٹر رادھاکرشنن) شاعری کے لیے ۱۹۶۷ء
۳۔ جواہر لال نہرو فیلوشپ۔ ۱۹۶۸ء۔ ۱۹۶۹ء
۴۔ سجاد ظہیر ایوارڈ (شاعری کے لیے) نہرو کلچرل ایسوسی ایشن لکھنؤ ۱۹۷۴ء
۵۔ اترپردیش اُردو اکیڈمی ایوارڈ (اقبال شناسی کے لیے) ۱۹۷۷ء
۶۔ اقبال میڈل (تمغۂ امتیاز) حکومتِ پاکستان ۱۹۷۸ء
۷۔ اترپردیش اُردو اکیڈمی ایوارڈ (شعری مجموعہ: لہو پکارتا ہے) ۱۹۷۹ء
۸۔ مخدوم ایوارڈ۔ آندھرا پردیش اُردو اکیڈمی (شاعری کے لیے) ۱۹۸۰ء
۹۔ میر تقی میر ایوارڈ۔ مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی، بھوپال۔ (شاعری کے لیے) ۱۹۸۲ء
۱۰۔ کمارن آشن ایوارڈ (ملیالی زبان کی طرف سے) تریونڈرم (طویل نغمہ ایشیا جاگ اُٹھا کے لیے) ۱۹۸۳ء
۱۱۔ خصوصی تمغہ۔ ماسکو۔ (ستر سالہ جشنِ پیدائش پر) ۱۹۸۴ء
۱۲۔ اقبال سمان۔ مدھیہ پردیش حکومت، بھوپال کی طرف سے (شاعری کے لیے) ۱۹۸۶ء
۱۳۔ ڈی۔ لٹ (اعزازی ڈکٹوریٹ ادب) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۸۶ء
۱۴۔ بین الاقوامی اُردو انعام (شاعری کے لیے) اکیڈمی آف اُردو لٹریچر ٹورنٹو۔ کینیڈا ۱۹۸۸ء
۱۵۔ گنگادھر مہتر ایوارڈ۔ سنبھل پور یونیورسٹی (شاعری کے لیے) ۱۹۹۲ء
۱۶۔ میر ایوارڈ۔ میر اکیڈمی لکھنؤ (شاعری کے لیے) ۱۹۹۳ء
۱۷۔ مولانا آزاد ایوارڈ۔ اترپردیش اُردو اکیڈمی لکھنؤ ۱۹۹۴ء
۱۸۔ خصوصی EMIRITUS فیلوشپ۔ ڈپارٹمنٹ آف کلچر، حکومت ہند۔ نئی دہلی

اعزاز و اکرام (۲)

۱۔ ممبر سینٹ (MEMBER OF THE SENATE) بمبئی یونیورسٹی ۲ بار
۲۔ پروڈیوسر ایمریٹس۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۵ء تک
۳۔ صدر۔ کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین (اُردو) ۱۹۷۷ء سے ۱۹۹۰ء تک
۴۔ جنرل سکریٹری۔ کل ہند صد سالہ جشنِ اقبال کمیٹی ۱۹۷۰ء
۵۔ وزیٹنگ پروفیسر جموں یونیورسٹی۔ اکتوبر سے دسمبر ۱۹۸۲ء تک
۶۔ صدر کمیٹی برائے جائزہ سفارشات گجرال کمیشن (اُردو) مارچ سے ستمبر ۱۹۹۰ء تک۔
۷۔ نائب صدر۔ مہاراشٹر اُردو اکیڈمی، بمبئی۔ جنوری ۱۹۹۴ء تک
۸۔ صدر۔ فلم رائٹرس ایسوسی ایشن بمبئی ۱۹۹۲ء سے ۱۹۹۳ء
۹۔ کورٹ ممبر۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی۔ نئی دہلی
۱۰۔ ٹرسٹی۔ نیشنل بک ٹرسٹ (ہند) نئی دہلی۔

□□

غزلیں

جبر و ریگستاں کے منظر کب تلک
چاہ شیریں نا میسر کب تلک

ذات کا باطن سمندر بہتر سہی
روکتے قدموں کو باہر کب تلک

ہنس کے ملتے ہو غلاموں کی طرح
آستیں میں کُند خنجر کب تلک

بُت شکن ہونا بڑا دُشوار ہے
دیکھو رہتے ہیں یہ تیور کب تلک

قیمتی ہیں اور بھی کچھ دولتیں
ہاتھ میں نیلم کا پتھر کب تلک

زندگی کی ہے عبادت کی طرح
تیغ سے اُلجھے گا یہ سر کب تلک

سیکھ لیتے زہر پینے کا ہُنر
پی گئے ہوتے سمندر کب تلک

شاعری ٹھہری اگر پیغمبری
جاہلوں کو لائے سر کب تلک

انیس انصاری
(آئی۔ اے۔ ایس)
سکریٹریٹ لکھنؤ

وہ جو فرقت میں تیری رویا ہے
بڑی مشکل سے آج سویا ہے

کیا خبر اس جنوں کی بستی میں
اُن کو پایا کہ خود کو کھویا ہے

دل کے زخموں کی بات جانے دو
ساری دُنیا کا غم سمویا ہے

تیرے کوچے میں تیرے وحشی نے
زخم اپنے لہو سے دھویا ہے

ڈھل گیا اُن کا درد آنکھوں میں
ہم نے دامن نہیں بھگویا ہے

ہم نے نوشاد اپنی کشتی کو
لا کے ساحل پہ خود ڈبویا ہے

نوشاد
"آشیانہ" کارٹر روڈ، باندرہ
بمبئی ۴۰۰۰۵۰

پروفیسر گوپی چند نارنگ
دہلی یونیورسٹی۔ دہلی

بھجن کی معنویت اور ساحر

غزل یا مثنوی کی طرح بھجن صنف اور ہیئت دونوں نہیں، فقط صنف ہے اور صنفوں کی صنف کہ گیت یا نظم کی طرح کسی بھی ہیئت میں ممکن ہے بس تھیم یا معنیاتی فضا بھجن کی ہونا چاہیے، یعنی کسی برتر اور ارفع ہستی سے خطاب، مصدر ہستی یا کلید کائنات، یا اس کی کوئی بھی تجسیم، دیوی، دیوتا، اوتار، واہگورو، پیر و مرشد، حُسنِ حقیقی یا مجازی کی کوئی شرط نہیں۔ تجسیم تجسیم ہے اور تجرید تجرید، لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی۔ اس کا بھیا راز بھجن میں کھلتا ہے، دیکھنے اور محسوس کرنے سے تعلق رکھتا ہے، عشق و ارادت، عقیدت و محبت، ٹوٹ کر چاہنے، عشق کی آگ میں اندر ہی اندر جلنے، انگ میں انگ سمانے اور جنم جنم کی پیاس بجھانے اور جل تھل ہو جانے کا تصور خاصی جاندار مجازی کیفیت رکھتا ہے۔ یہ جسم و جمال کی سرشاری اور بدنیت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ یہ وہ روحانیت ہے جو مندروں کی جسمانیت سے اُبھرتی ہے۔ ذہنی خیال لاکھ حقیقی سہی، جذبے کو فتیلہ دکھانے کے لیے تجریدیت سے کام نہیں نکلتا۔ تجسیمات کی تہ داری ضروری ہے۔ بھگتی کی سرشاری اور جذب و کیف کا سب سے بڑا رمز یہی ہے کہ اس میں پُرش اور پرکرتی ایک ہی سطح پر جلوہ آرا ہوتے ہیں۔

دوہے کی ہیئت متعین ہے اور اس کی صنفی پہچان بھی۔ بھجن وارفتگی کے باعث آزاد ہے، البتہ دوہے کی طرح بھجن کا گھر بھی ہندی اور دوسری ہندستانی زبانیں اور بولیاں ٹھولیاں ہیں۔ بھجن ان تمام ہندستانی زبانوں میں ملتا ہے جہاں جہاں بھگتی کا اثر ہے اور بھگتی کا اثر کہاں نہیں۔ لیکن اُردو کا ناتا اگر بہت گہرا ہے تو کھڑی سے یا برج سے یا اودھی، بھوجپوری، پنجابی یا راجستھانی سے۔ لیکن اردو میں ان بولیوں کے اثرات نہ ہوں، ایسا بھی نہیں ہے۔ 'بھجن کیرتن' کی ترکیب ہی سے ظاہر ہے کہ جہاں اس کا ایک سرا روحانی عقیدت سے جڑا ہوا ہے، دوسرا سرا سنگیت سے بھی جڑا ہوا ہے۔ یعنی مندروں یا عبادت گاہوں کی فضا سے جہاں انسانی روح آلائشوں سے پاک ہو کر الوہی تصور میں ڈوبنے کا جتن کرتی ہے۔ عبادت گاہوں کے تصور سے یا بھجن کے عبادت گاہوں سے وابستہ ہونے کے تصور سے بھجن سے ایک خاص طرح کی توقعات وابستہ ہو جاتی ہیں اور معنی کی ترسیل سے پہلے معنی کی پرچھائیں قاری کے ذہن و شعور کا حصہ بننے لگتی ہے جو عبارت ہے عقیدت و محبت سے، یا سرشاری و سرمستی سے یا پریم رس کی فضا سے۔ علاوہ ازیں بھجن کا تصور خاص طرح کی جھنکار کے ساتھ ذہن میں آتا ہے، سنگیت میں رچا بسا ہوا۔ یعنی بھجن کا سنگیت میں رچا بسا ہونا بھی خاص طرح کی معنیاتی فضا پیدا کرتا ہے۔ بھجن بولے جانے کی نہیں گائے جانے کی چیز ہے۔ گویا بھجن مجرد لفظ نہیں، بھجن لے اور تال ہے۔ اسی طرح بھجن فقط حکمت و موعظت نہیں، بھجن عقیدت و محبت ہے۔ بھجن فقط مستی نہیں بھجن بدمستی ہے۔ یہ عشق و محبت کا اظہار تو ہے ہی، یہ عشق و محبت کا احساس بھی ہے۔ یہ لفظ و حرف و صورت ہی نہیں، یہ سرتاسر سنگیت اور نغمگی ہے۔ یہ بات بھی نظر میں رکھنے کی ہے کہ بھجن سپردگی نہیں، عقیدت کا اثبات ہے۔ دوہا اور گیت تو اُردو میں ایسے آئے گویا اُردو کے ہو گئے، لیکن بھجن بھجن ہے۔ اگر سارا ادب ڈسکورس ہے تو بھجن کچھ زیادہ ڈسکورس ہے۔ اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

غزل یا قصیدہ ثقافتوں کے آر پار کسی بھی زبان میں ممکن ہیں، لیکن بھجن کا معاملہ الگ ہے۔ دوہے اور گیت سے اس کا کچھ جوڑ بیٹھتا ہے،

لیکن بھجن کی لفظیات بڑی حد تک بھجن کی لفظیات ہے، یہ نہ ہو تو بھجن؟ یہ نہیں تو بھجن نہیں۔ بھجن کے خاص موڈ اور خاص امیج ہیں۔ یہ ہیں تو بھجن کی خاص معنویت ہے، یہ نہیں تو بھجن بھجن نہیں۔ بھجن کی خاص معنیاتی فضا بھجن کی خاص لفظیات اور خاص امیجری سے ہے۔ اس امیجری کو بدل دیں تو پوری معنیاتی فضا بدل جائے گی اور وہ کیف و کم بھی وہ نہیں رہے گا۔

اردو شاعروں نے یوں تو ہندی اصناف یعنی گیت اور دوہے میں کیا کیا داد سخن دی ہے لیکن بھجن کی دنیا میں اردو والوں کی آمد و رفت زیادہ معلوم نہیں۔ اس لیے جب پتہ چلا کہ ساحر لدھیانوی (۱۹۲۱ء — ۱۹۸۰ء) نے اس کوچہ کی بھی ہوا کھائی تھی تو قدرے تعجب ہوا۔ بیشک ساحر قادر الکلام شاعر تھے اور انھوں نے کئی کئی اسالیب میں اور کئی کئی ہیئتوں میں اور اصناف میں کلام کیا ہے لیکن بھجن کے لیے تو الگ ذہنی فضا چاہیے، اس کے تقاضے ہی دوسرے ہیں۔ اردو گو ہندستانی ہندی پر متصرف ہوتا ہی ہے لیکن بھجن میں نیٹ ہندستانی سے کام نہیں چلتا۔ اس کے لیے تو برج یا اودھی یا راجستھانی میں پیرا ہوا آدمی چاہیے۔ یا پھر سورداس، بہاری، تلسی داس، میرا بائی کا شناسا، اور فقط شناسا نہیں ان روایتوں میں رچا بسا ہوا۔ ساحر کو نہ بولیوں شعریوں یعنی برج اور اودھی وغیرہ سے علاقہ تھا نہ ہندی سنسکرت سے۔ پھر وہ کیوں کر پار اتر سکتا تھا۔ بھجن کا تو ڈسکورس ہی الگ ہے، اس پر دسترس ہوگی تو بات بنے گی ورنہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس شبہ کے ساتھ میں نے ساحر کے بھجنوں کو ٹٹولا۔ مجموعوں میں متن نہ ملا، نمبروں میں لے دے کے ایک دو۔ مجبوراً کھوجا، سنا، متن کو جوڑا، پڑھا، دوبارہ پڑھا پھر سنا۔ گو مگو رہ گئی۔ ابتدا ان بھجنوں سے کرتے ہیں جن پر کرشن کی راس کا اثر ہے، یہ برہ کی پیڑا اور درد محبت میں ڈوبے ہوئے بھجن ہیں:

آن ملو آن ملو شیام سانورے
برج میں اکیلی رادھے کھوئی کھوئی سی پھرے

برنداون کی کنج گلین میں تم بن بیارا نہ راگے
بس دن تمہاری باٹ نہاریں بیاکل نین ابھاگے
اب ہی ایسی دشا ہے من کی کیا ہوئی کو پھیر آگے
برج میں اکیلی رادھے کھوئی کھوئی سی پھرے

آج لگا ہے جمنا تیرے مُرلی دھر بجائی
آج لگا ہے سکھین کے سنگ پھر راس رچائی
ہمرا آنگن چھوڑ کے تو ہے کون نگریا بھائی
برج میں اکیلی رادھے کھوئی کھوئی سی پھرے

رجھنوں جو نہ جیسی جوبن تیں نے کھوئی کھبریا
ہو جیسے اک برج بالا رو رو کر باوریا
دھیر بندھا جا، دھیر بندھا جا، مکھ دکھلا جا نٹ ناگر سانوریا رے
برج میں اکیلی رادھے کھوئی کھوئی سی پھرے
آن ملو آن ملو شیام سانورے

ساحر کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ ساحر کو بچپن ہی سے سنگیت سے مناسبت تھی۔ سنگیت سے مناسبت کا فائدہ بھجنوں کو پہنچنا فطری بات ہے، لیکن جو بات تعجب خیز ہے وہ یہ کہ ساحر کی بچپن کی زبان لدھیانوی پنجابی کو بھجنوں کی لفظیات سے دور کی بھی نسبت نہیں ہو سکتی۔ مندرجہ بالا بھجن کے بول برج بھاشا اور راجستھانی کے لہجے میں نہائے ہوئے ہیں۔ سوسیر کا کلیدی قول ہے کہ آج تک کسی نے کوئی سگنیفائڈ بغیر سگنیفائر کے نہیں دیکھا۔ معنیات جو بھی قائم ہوتی ہے، بغیر نشان، یعنی سائن کے نہیں۔ شیام سانورے، برج میں اکیلی رادھے، برنداون کی کنج گلین، باٹ نہاریں نین ابھاگے، جمنا تیرے مُرلی دھر بجائی، راس رچائی، یا نٹ ناگر سانوریا رے، میں کسی نشان کو بدل دیجیے، ساری معنیاتی فضا بدل جائے گی، بول تو شاید رہ جائیں، بھجن نہیں رہے گا۔ ساحر کی ساحری اسی میں ہے کہ اس نے بھجن کی لفظیات کا اس خوبی سے صرف کیا ہے کہ کرشن اور بیاکل گوپیوں کی راس لیلا سے شرابور عقیدت اور سرشاری کی جو توقعات وابستہ ہیں وہ پورے جمالیاتی کیف و کم کے ساتھ پوری ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

ہندستان میں بھگتی کے دو دھارے معلوم ہیں، کرشن بھگتی اور رام بھگتی۔ دونوں کی بنیاد عشق و محبت، جذبات کی سرشاری اور [illegible] ہے۔ لیکن کرشن کی راس جہاں رومان پروری اور رنگینی و [illegible] کا پہلو رکھتی ہے، رام کی روایت میں ارشاد و قربانی، فرض شناسی [illegible]

کی صفات نمایاں ہیں۔ ساحر نے دونوں طرح کے بھجن کہے ہیں لیکن رومانی اور انسان دوستی کی وجہ سے ساحر کو زیادہ مناسبت کرشن جی کی معنویت رکھنے والے بھجنوں سے ہے۔ بنگال کے سوامی چیتنیہ کی روایت میں کرشن کا تصور پربھو کے طور پر کیا گیا ہے۔ نیچے کا بھجن خالص کرشن بھگتی کا بھجن ہے۔ دیگر تمام ہندوستانی بھاشائی شاعری کی طرح اس کی خصوصیت خاصہ بھی اس کا برہمن کی زبان سے کلام ہونا ہے۔ جو بھگت میں بچھڑ ہجر و فراق کی اس حد تک ماری ہوتی ہے کہ برہ کی پیڑا اور دیہہ کی اگنی نے تن من کو جلا کر رکھ دیا ہے۔ بن پریتم گھر آنگن سونا ہے۔ جیون کنگنا مرجھا رہا ہے۔ پیار کے دو بول سنائی دیں تو جیون دھن مل جائے اور پھر سے آس بندھ جائے۔ اس تناظر میں میرا بائی کی روح صاف جھلکتی ہے اور بولوں میں بھی کچھ ٹکڑے اس پریم دیوانی کے درد اور اضطراب کے بھی آگئے ہیں ؎

پربھو تیرو نام، جو دھیائے پھل پائے، سکھ لائے تیرو نام

پربھو تیرو نام

تیری دیا ہو جائے تو داتا، جیون دھن مل جائے
سکھ لائے تیرو نام، جو دھیائے تیرو نام

پربھو تیرو نام

تو دانی تو انتریامی، تیری کرپا ہو جائے تو سوامی
ہر بگڑی بن جائے، جیون دھن مل جائے
سکھ لائے تیرو نام، جو دھیائے تیرو نام

پربھو تیرو نام

بس جائے مورا سونا انگنا، کھل جائے مرجھایا کنگنا
جیون میں رس لائے، جیون دھن مل جائے
سکھ لائے تیرو نام، جو دھیائے پھل پائے
سکھ لائے تیرو نام، پربھو تیرو نام

ان بھجنوں میں کرشن کا براہ راست ذکر نہیں۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ کس سچویشن کے لیے ان کو لکھا گیا ہوگا، نہ ہی ہم کو کسی سچویشن سے سروکار ہے۔ کیونکہ دوسرے ذرائع سے پیدا کی گئی معنویت سے یہاں غرض نہیں، غرض ہے تو اس معنویت سے جو متن سے متعلق ہے اور لطافت ... ہے، اس کی نوعیت کی راہ حق کے نظام نشانات کی رو سے ہے۔ پہلے دو بھجنوں کی طرح اس میں بھی مقبول عام بولوں سے کام لیا گیا ہے اور اصل فضا امیجری سے ابھاری گئی ہے۔ پچھلے بھجن کی مرکزیت گیان دھیان (جو دھیائے پھل پائے) اور نام کے جاپ (پربھو تیرو نام، سکھ لائے تیرو نام) سے تھی، جبکہ زیر بحث بھجن کا مرکزی نشان اندر کی آگ، جدائی، تپش اور پیاس کا ہے، یعنی بانہہ پکڑنے، انگ لگانے اور شیتل ہو جانے کا ہے۔ ہردے کی پیڑا / دیہہ کی اگنی / کیسی جاگی یہ اگن / جیا دھیر دھرن نہیں پائے / پیا / اتنی برسا دو / سے اشارہ پریم سُدھا کی طرف ہے۔ جنم جنم کی داسی انتر گھٹ تک پیاسی ہے۔ پریم سُدھا کی ورشا ہو تو تن من سب جل تھل ہو جائے، اور وجود جو ظاہر بھی ہے اور باطن بھی سب شیتل ہو جائے ؎

آج سجن موہے انگ لگا لو جنم سپھل ہو جائے
ہردے کی پیڑا دیہہ کی اگنی سب شیتل ہو جائے

کیے لاکھ جتن مورے من کی تپن مورے تن کی جلن نہیں جائے
کیسی لاگی یہ لگن کیسی جاگی یہ اگن جیا دھیر دھرن نہیں پائے
پریم سُدھا اتنی برسا دو جگ جل تھل ہو جائے
آج سجن موہے انگ لگا لو جنم سپھل ہو جائے

موہے اپنا بنا لو موری بانہہ پکڑ میں ہوں جنم جنم کی داسی
موری پیاس بجھا دو، من ہر گردھر میں ہوں انتر گھٹ تک پیاسی
پریم سدھا اتنی برسا دو جگ جل تھل ہو جائے
آج سجن موہے انگ لگا لو جنم سپھل ہو جائے

ساحر کے یہاں ایسے بھجن بھی ہیں جو رام کی روایت سے متعلق کہے جا سکتے ہیں۔ یہاں بحث کسی مذہبی عقیدت سے نہیں، شاعر کی ذہنی تحریک سے ہے۔ جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، رام کی مرکزیت اور معنویت کرشن کی روایت سے یکسر مختلف ہے۔ ساحر کے اس نوع کے بھجن بھی اپنے سبک، رواں اور رسیلے انداز اور مخصوص امیجری اور لفظیات کے باعث غور طلب ہیں۔ ان کا غالب رویہ اخلاقی اور روحانی ہے

[illegible] جگ میں آیا رام نے جنم لیا تب
[illegible] اور شاعر رام ہیں۔ [illegible]
[illegible] ابدی اور ازلی کرن کشش کی
تجسیم [illegible] کوشش بھی کی ہے اور لطف و اثر بھی ہے

کلجگ [illegible] ہے ست جگ کی یہ ریت
جب [illegible] ہار چکے جب اپنا تب ہو رام کی جیت
جگ بدلے پر بدل نہ پایا اب تک یہ اتہاس
جب جب رام نے جنم لیا تب پایا بن باس

رام ہر اک جگ میں آئے پر کون انھیں پہچانا
رام کی پوجا کی جگ نے پر رام کا ارتھ نہ جانا
تکتے تکتے بوڑھے ہو گئے دھرتی اور آکاش
جب جب رام نے جنم لیا تب پایا بن باس
کام کرودھ اور لوبھ کا مارا جگت نہ آیا راس
جب جب رام نے جنم لیا تب پایا بن باس

اسی طرح کا ایک اور بھجن "تورا منوا کیوں گھبرائے رے" ہے جس کا تکراری ٹکڑا ہے "رام جی کے دوار سے" جو ساری فضا کو رام کی روایت سے رنگ دیتا ہے

تورا منوا کیوں گھبرائے رے
لاکھوں دین دکھیارے پرانی جگ میں مکتی پائے رے رام جی کے دوار سے
بند ہوا یہ دوار کبھی نہ یگ کتنے ہی بیتے
سب دواروں پر ہارنے والے اس دوار پر جیتے
لاکھوں پتت لاکھوں پتتائیں پاون ہو کر آئے رے
رام جی کے دوار سے تورا منوا کیوں گھبرائے رے

ہم مورکھ جو کاج بگاڑیں رام او کاج سنواریں
ہو مہا ندا ہو کہ اہل لیہ سب کو پار اتاریں
جو سکھ دکھ کو جھوٹ لے وہ ہیرا ہو جائے رے
رام جی کے دوار سے تورا منوا کیوں گھبرائے رے

[illegible] کیفیت [illegible] پیدا [illegible]
لفظیات سے کام لیا گیا ہے جن کو ان میں سے ہر ایک ایک فضا اور کیفیت رکھتا ہے۔ اور تو اور مہا ندا اہلیہ یا بالی کی حکایتوں کی طرف اشارے کا انتخاب ساحر کی وسیع المطالعہ فکر پر دلالت کرتا ہے۔

اب آخر میں ایک نظر ان بھجنوں پر بھی جو کرشن اور رام کی شاعرانہ روایت سے ہٹ کر ہیں۔ ان کو بھی دو شقوں میں دیکھ سکتے ہیں۔ ایک وہ جو گیان دھیان یا اخلاقی تلقین یا ضبط نفس کے موضوعات سے متعلق ہوتے ہیں۔ دوسرے جو مذاہب کی برابری یا مذہبی رواداری اور اتحاد پسندی کی سیاقی فضا کو ابھارتے ہیں۔ گیان دھیان کے بھجنوں میں زیادہ زور بے ثباتی کائنات، جنم مرن اور آخرت پر ہے۔ یعنی یہ دنیا جنم مرن کا کھیل ہے۔ جو آیا ہے اس کو جانا ہی ہے۔ وہ نر مورکھ موہ جو جانے جن کا موہ کرے۔ جیون ڈھلتی دھوپ ہے جس کو ڈھلنا ہی ہے۔ غرضیکہ سوائے صبر یا دھیرج دھرنے کے چارہ نہیں ہے

من رے تو کاہے نہ دھیر دھرے
وہ نرموہی موہ نہ جانے جن کا موہ کرے
اس جیون کی چڑھتی ڈھلتی دھوپ کو کس نے باندھا
رنگ پہ کس نے پہرے ڈالے روپ کو کس نے باندھا
کاہے یہ جتن کرے
من رے تو کاہے نہ دھیر دھرے
اتنا ہی اپکار سمجھ کوئی جتنا ساتھ نبھا دے
جنم مرن کا میل ہے سپنا یہ سپنا بسرا دے
کوئی نہ سنگ مرے
من رے تو کاہے نہ دھیر دھرے

اسی طرح کا ایک اور بھجن ہے "تورا من درپن کہلائے" یہ بھی نہایت مزے کا گیان بھجن ہے جس کا مرکزی نکتہ یہی ہے کہ شیشہ جو بظاہر ہے اسی میں تو پردہ ہے۔ یہ بھگتی اور تصوف کا پرانا مسئلہ ہے کہ ذات واجب الوجود یا شعور کل شعور انفرادی سے الگ نہیں اور قلب اس کا مرکز ہے۔ قلب آئینے کی طرح ہے، اس کو صیقل کرنے ہی سے ذات کی جھلک ہے۔ ہندوستانی روایت میں چونکہ ہر شے کی تجسیم [illegible]

کی جاتی ہے ۔ اس لیے کہا ہے کہ من (قلب) ہی دیوتا من ہی ایشور، من سے بڑا نہ کوئی ہے

من ہی دیوتا من ہی ایشور من سے بڑا نہ کوئی
من اجیارا جب جب پھیلے جگ اُجیارا ہوئے
اِس اُجلے درپن پر پرانڑی دھول نہ جمنے پائے

تورا من درپن کہلائے

سُکھ کی کلیاں دُکھ کے کانٹے من سب کا آدھار
من سے کوئی بات چھپے نہ من کے نین ہزار
جگ سے چاہے بھاگ لے کوئی من سے بھاگ نہ پائے

تورا من درپن کہلائے

بھلے بُرے سارے کرموں کو
دیکھے اور دکھائے

تورا من درپن کہلائے

دوسرے بند سے ظاہر ہے کہ من کو ہر شے کا آدھار کہا ہے اور یہ کہ انسان لاکھ کوشش کرے وہ من سے بھاگ نہیں سکتا اور اچھے بُرے سب سے انسان کو آگاہ کرتا رہتا ہے ۔ گویا من ضمیر بھی ہے قلب بھی اور ذہن و شعور بھی ۔ ان بھجنوں سے ہٹ کر ساحر کا ایک معرکے کا بھجن گنگا پر بھی ہے جس کی حیثیت ہندستانی ثقافتی زندگی میں لائف لائن کی ہے ۔ گنگا وہ پانی ہے جس سے زندگی کی آب ہے ۔ ہندستانی روحانیت سے 'فکر و فلسفہ سے' اساطیر اور دیوی دیوتاؤں سے ' ویدوں' اپنشدوں' پرانوں سے' اور یوگیوں' رشی منیوں سے ۔ اور ہندستانی جمالیات اور شعریات پر بنیادی متون اور ان کے بھاشیہ اور مہا بھاشیہ لکھنے والوں سے آبِ رودِ گنگا کا جو رشتہ ہے وہ کسی وضاحت کا محتاج نہیں ۔ ساحر نے گنگا کی مہا کا جو بکھان کیا ہے اس میں پانی کے برابر بہنے کی ' وقت کے تسلسل کی اور لفظوں کے دروبست کی جو موسیقیت ہے ' بغیر کمالِ فن پیدا نہیں کی جا سکتی :

گنگا تیرا پانی اَمرت جھر جھر بہتا جائے
یگ یگ سے اس دیش کی دھرتی تجھ سے جیون پائے
دور ہمالے سے تو آئی گیت سہانے گاتی
بستی بستی جنگل جنگل سُکھ سندیش سُناتی
تیری چاندی جیسی دھارا میلوں تک لہرائے

گنگا تیرا پانی امرت جھر جھر بہتا جائے

کتنے سُورج ڈوبے اُبھرے گنگا تیرے دوارے
یگوں یگوں کی کتھا سُنائیں تیرے بہتے دھارے
تجھ کو چھوڑ کے بھارت کا اتہاس لکھا نہ جائے

گنگا تیرا پانی امرت جھر جھر بہتا جائے
یگ یگ سے اس دیش کی دھرتی تجھ سے جیون پائے

بھجنوں کی ایک زمین بھگتی کا مرکزی مسلک یعنی بین مذہبی رواداری اور اتحاد پسندی بھی ہے ۔ بنی نوع انسان کو بلا تفریق مذہب و ملت برابر جاننا / برابر سمجھنا اور سب سے برابر کا سلوک کرنا بھگتی اور تصوف کا بنیادی مسلک ہے ۔ گاندھی جی کی پرارتھنا سبھا میں بالخصوص ایسے بھجن بطور خاص گائے جاتے تھے اور اکثر سماجی تقریبات میں بھی ان کی گونج سنائی دیتی تھی ۔ افسوس کہ ایسی بہت سی باتیں سیاسی مصالح کی وجہ سے وظیفۂ لب ہو کر رہ گئی ہیں یعنی جتنا زیادہ ہم سیکولرازم کا ذکر کرتے ہیں ' اتنا ہی عملی زندگی میں یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ ان چیزوں کا ذکر کر دینا ہی کافی ہے ۔ کیونکہ مقصد ہماری نقط وردسے ہو جاتی ہے ' گفتار سے کام نکلتا ہو تو کردار کی ضرورت ہی کیا ہے ۔ ایسے میں ایشور اللہ کو ایک سمان کہنے اور سمجھنے والے معدوم ہوتے جا رہے ہیں ۔ ساحر نے یقیناً گاندھی جی کے یہاں کے بھجنوں کے بولوں میں تصرف کیا ہوگا ۔ اس طرح کے ایک نہیں دو گیت ہیں ۔ کیا مصرعے ہیں اور کیا فضا بندی ہے ؎

اللہ تیرو نام ' ایشور تیرو نام
سب کو سم متی دے بھگوان

اللہ تیرو نام

اس دھرتی کا رُوپ نہ اُجڑے
پیار کی ٹھنڈی دھوپ نہ اُجڑے
سب کو ملے داتا سکھ کا وردان
سب کو سم متی دے بھگوان

اللہ تیرو نام

او سارے جگ کے رکھوالے
نرمل کو بل دینے والے
نادانوں کو دے دے گیان
سب کو سم متی دے بھگوان
اللہ تیرو نام

(۲)

ایشور اللہ تیرے نام
سب کو سم متی دے بھگوان
سارا جگ تیری سنتان
ایشور اللہ تیرے نام
اس دھرتی پر بسنے والے
سب ہیں تیری گود کے پالے
کوئی نیچ نہ کوئی مہان
ایشور اللہ تیرے نام
ذاتوں نسلوں کے بٹوارے
جھوٹ کہاں یہ تیرے دوارے
تیرے لیے سب ایک سمان
سب کو سم متی دے بھگوان
ایشور اللہ تیرے نام

اسی طرح کا ایک بھجن اسکولی بچوں کی دعا کے طور پر بھی رائج ہے جس میں رام رحیم کرشن کریم یسوع مسیح اور ابراہیم کو یاد کیا گیا ہے' اور تمام مذہبوں کی اس تعلیم کو بنیاد بنایا گیا ہے کہ اصل چیز کرم (عمل) ہے۔ اگر عمل اچھا نہیں تو مذہب سے کیا حاصل۔ کوئی مذہب بدی یا نفرت یا تشدد کی تعلیم نہیں دیتا، اور تمام سچائیاں نیک اور صالح عمل میں ہے۔ اکثر اسکولوں میں یہ بھجن آج بھی بطور صبح کی دعا کے سنا جاتا ہے،

رام رحیم کرشن کریم
یسوع مسیح اور ابراہیم
سب کی ہے اتنی تعلیم

اچھے کرم کر دنیا میں یہ کرم ہے نیک کمائی
انہیں کرموں میں چھپی ہے سارے دھرموں کی سچائی
جس نے اچھے کرم کیے ہر دھرم کی لاج بچائی
رام رحیم کرشن کریم، یسوع مسیح اور ابراہیم
سب کی ہے اتنی تعلیم

ایشور سے اللہ الگ، اللہ سے ایشور جدا نہیں
یہ مت سوچ تیرے کرموں کا اس مالک کو پتا نہیں
سو پردوں میں پاپ کرے تو پھر بھی اس سے چھپا نہیں
رام رحیم کرشن کریم، یسوع مسیح اور ابراہیم
سب کی ہے اتنی تعلیم

بھجن کی شعری کائنات وسیع بھی ہے اور محدود بھی' وسیع اس لیے کہ روحانیات یا اخلاقیات بھی کرۂ آسمانی کی طرح ہے جو آد بھی ہے اور انت بھی۔ اور محدود اس لیے کہ شعور انفرادی کی عقیدت یا شردھا بہر حال عقیدے کا معاملہ ہے اور عقیدہ وجدانی ہوتا ہے اس میں یکتائی ہے دوئی نہیں۔ ساحر کی خوبی یہ ہے کہ ہر دو اعتبار سے اس نے بھجن کے شعری تقاضوں کا حق ادا کیا ہے اور جہاں جیسی فضا ہے ویسی معنویت قائم کی ہے۔ کرشن ہوں یا رام، یا گیان دھیان کے مسائل و مراتب ہوں یا ایشور اللہ، رام رحیم یا کرشن کریم کی، کبیر یا نانک کی ہمہ گیر اور لازوال روحانی روایت ہو ساحر نے اسے شعری طور پر کچھ اس طرح متشکل کیا ہے کہ مدتوں اس کے رس اور لطافت میں کمی نہ آئے گی۔

اختر الایمان کے تخلیقی سروکار... صفحہ ۲۲ کا بقیہ

اور کبھی نہایت سنجیدگی اور ثابت قدمی کے ساتھ خود کو ٹھہرانے کے عمل میں مصروف ہیں، لیکن اختر الایمان کا تخلیقی سفر آج بھی جاری ہے' ان کے یہاں اب تک نہ تو تھکن کے آثار پیدا ہوئے ہیں اور نہ انہیں اپنی شاعری کا زمام تصوف و روحانیت کی طرف موڑنے کی ضرورت پیش آئی ہے۔ یہ بات ان کی قوت اور اعتماد کا مظہر اور اردو نظم کے لیے فال نیک کہی جا سکتی ہے۔

غزلیں

تھامی تو دونوں ہاتھوں سے پھر بھی نہیں تھی
استاد تیرے سر پہ بھی پگڑی نہیں تھی

احسان کرنے والے بہت، شرمسار ہم
اس درجہ سرنگوں تھے کہ گٹھری نہیں تھی

ہم جیسے بے دماغ جلاتے رہے چراغ
شاید یہی سبب ہے کہ آندھی نہیں تھی

لبریز ہو رہا تھا خرابی سے میں تمام
بھاری تھا ڈول، سانس کی رسی نہیں تھی

اس کو بھی ڈوبنے کا غضب اشتیاق تھا
سیلاب چیختا رہا، کشتی نہیں تھی

تحت الثریٰ میں کوئی خوشی سے نہیں گیا
ڈھلوان راستے میں سواری نہیں تھی

تنقید کہہ رہی تھی مظفر بہت ہوا
میں آبشار تھا کہ روانی نہیں تھی

مظفر حنفی

(پروفیسر آف اقبال چیئر کلکتہ یونیورسٹی)
اے/۲ کنکور گاچھا۔ کلکتہ ۵۴

ہم لوگ سوچتے ہیں ہمیں کچھ ملا نہیں
شہروں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں

شدت کی دھوپ تیز ہواؤں کے باوجود
میں شاخ سے گرا ہوں، نظر سے گرا نہیں

تاریکیوں میں اور چمکتی ہے دل کی دھوپ
سورج تمام رات یہاں ڈوبتا نہیں

آخر غزل کا تاج محل بھی ہے مقبرہ
ہم زندگی تھے ہم کو کسی نے جیا نہیں

جس کی مخالفت ہوئی مشہور ہو گیا
ان پتھروں سے کوئی پرندہ گرا نہیں

کس نے جلائیں بستیاں، بازار کیوں لٹے
میں چاند پر گیا تھا، مجھے کچھ پتہ نہیں

بشیر بدر

اے۔۱، بادشاہ اپارٹس
کوہ فضا
بھوپال (ایم۔ پی)

سوچا ہے کہ لمحوں کو بکھرنے نہیں دوں گا
میں اپنے کسی خواب کو مرنے نہیں دوں گا

سائے کی طرح ساتھ رہو میرے سفر میں
میں تم کو کسی سائے سے ڈرنے نہیں دوں گا

اندر کا ہو ٹکراؤ کہ باہر کا تصادم
احساس کا شیرازہ بکھرنے نہیں دوں گا

آوازوں کے دبنے کا سبب جان لیا ہے
میں اپنی صداؤں کو ابھرنے نہیں دوں گا

جس راہ نے گھر بار مرا چھین لیا ہے
اس راہ سے تم کو تو گزرنے نہیں دوں گا

تنہائی میں تم ٹوٹ کے رہ جاؤ گے نظمی
میں ساتھ رہوں گا تو بکھرنے نہیں دوں گا

اختر نظمی

۱۴۱/۳۶۔ خورجہ والا محلہ
دولت گنج۔ لشکر۔
گوالیار

آیاتِ درد

"آیاتِ درد" حضرت ساحر لکھنوی کے معرکہ آرا مرثیوں کا مجموعہ کراچی (پاکستان) میں خوبصورت انداز میں شائع ہوا۔ ساحر لکھنوی کی ذات محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ وہ لکھنؤ کے مشہور خاندانِ اجتہاد حضرت غفران مآبؒ کے خاندان کے چشم و چراغ اور نوابین لکھنؤ کی تاریخ کے یادگار ہیں۔

آیاتِ درد کے ہر مرثیے کی ابتدا میں اردو کے جن معتبر ناقدین کے تبصرے شامل ہیں، ان کے نام یہ ہیں: سید محمد باقر شمس، سید محمد حسن ہاشمی، پروفیسر مظفر حسن جون پوری، پروفیسر شبیہ الحسن، پروفیسر ذوالفقار حسین، ڈاکٹر شکیل نوازش رضا اور پروفیسر محمد رضا کاظم۔

ساحر نے مرثیوں کے موضوع بھی قرار دیے ہیں۔ ذیل میں ہر مرثیے کا عنوان اور مطلع پیش ہے:

۱۔ قرآن اور وارثانِ قرآن:

⁂ جب کبریا نے خلق کیا کائنات کو — ۱۱۴ بند

۲۔ نعت و تفسیر:

⁂ تو ہی بس نقش گرِ لوح و قلم ہے یا رب — ۱۱۳ بند

۳۔ خدا کی رہبری:

⁂ خدا کی حمد ہے سرنامۂ کتابِ سخن — ۱۱۴ بند

۴۔ کعبے کی حرمت:

⁂ خدا کا شکر کہ مجھ کو یہ دن دکھایا ہے — ۱۰۰ بند

۵۔ کردارِ حسینؑ کی تشکیل اور اسلاف:

⁂ پاک ہے وہ ذات جس نے یہ جہاں پیدا کیا — ۱۱۲ بند

۶۔ کربلا اور عصرِ جدید کی رہبری:

⁂ جب روشناس نورِ جمال سے قرآں ہوا — ۹۷ بند

۷۔ عروجِ کربلا:

⁂ تمام حمد و ثنا ستائش ہے کبریا کے لئے — ۱۱۴ بند

ساحر کے مرثیے EPIC کے دائرے میں آتے ہیں اور ایپک کو اردو میں رزمیہ کہتے ہیں جو متنوع مضامین کے اعتبار سے تمام اصنافِ سخن میں افضل ترین قسم کی شاعری مانی جاتی ہے۔ ہمارے ناقدینِ ادب نے رزمیہ کی تعریف کو بہت ہی محدود کر دیا ہے۔ ان کے نزدیک رزمیہ شاعری وہ ہے جس میں میدانِ جنگ کا نقشہ پیش کیا جاتا ہے۔ دراصل ایپک (رزمیہ) اس بیانیہ نظم کو کہتے ہیں جس میں شاعر کسی تاریخی کردار کو پیش کرتا ہے جس کا مقصدِ حیات عظیم اور ارفع ہو۔ وہ کسی بلند نصب العین کی بقا کے لیے اپنی جان کا نذرانہ بھی دیتا ہے۔ ایسا شخص تاریخی اہمیت کا بھی حامل ہوتا ہے۔ جو کردار اس کے ساتھ ہوتے ہیں وہ True to Life یعنی گوشت پوست کے مالک ہوتے ہیں۔

ارسطو جس کو دنیا نے ابو التنقید کا بانی قرار دیا ہے اس نے ایپک کے لیے کچھ اصول بھی مقرر کیے ہیں۔ ان اصولوں سے کوئی بھی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ جس واقعہ کو رزم نگار نظم کرتا ہے وہ تین حصوں پر مشتمل ہونا چاہیے:

۱۔ ابتداء (Beginning)

۲۔ درمیانی کڑیاں (Middle)

۳۔ خاتمہ (End)

اگر یہ واقعہ ایک ہی نشست میں ختم ہو جائے تو بھی رزمیہ نظم کہلائے گی۔ ارسطو کے الفاظ کا ترجمہ ہے

"This condition (of being wether a single view) will be satisfied by poems on a smaller scale than the older Epics." (1)

ارسطو نے رزمیہ (ایپک) کے لیے اور بھی شرطیں مقرر کی ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں:

Reversal of Intention (انقلاب) یعنی ارادوں میں وہ تبدیلیاں جو خلافِ امید و توقع پذیر ہوتی ہیں۔ پہچان (Recognitions) وہ تبدیلی ہے جس کے باعث کسی نامعلوم واقعہ کے آثار قبل از وقت ظاہر ہوں ۔ انگریزی میں مشہور مقالہ ہے:

"Coming events cast their shadows before."

المیہ سانحات (Tragic incidents) سانحہ سے ارسطو کا مفہوم ہر جاں گداز اور المناک واقعہ سے ہے۔ مثال کے طور پر موت کا منظر جسمانی اذیت اور دوسرے لرزہ خیز واقعات۔

ارسطو نے طرزِ ادا کے لیے مبالغہ لازم و ملزوم قرار دیا ہے۔ اس سے نظم کی اثر پذیری نمایاں ہو جاتی ہے۔ مبالغہ سے قرینِ قیاس ناممکنات کو خلافِ قیاس ممکنات پر ترجیح دی جاتی ہے۔ جنگ کا عنصر بھی ضروری ہے

ذیل میں ارسطو کے مقرر کردہ اصولوں کے تحت ساحر لکھنوی کی ایک رزمیہ نظم (مرثیہ) کا جائزہ مختصر ترین الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے مطلع ہے ؎

جب روشناس، نورِ عمل سے نظر آئی ۹۷ بند

ایسا ہی ایک مرثیہ میر انیس کا ہماری نظر سے گزرا ہے۔ مطلع یہ ہے ؎

جب کربلا میں داخلہ شاہِ دیں ہوا

مرثیہ حضرت عباسؑ کے حال میں ہے اور وہی ہیرو بھی ہیں۔ اس میں ۱۴۴ بند ہیں۔ جو مضامین انیس نے بیان کیے ہیں وہی کما حقہ ساحر نے بھی باندھے ہیں۔ ساحر نے حسینؑ کی شہادت نظم کی ہے اور وہی ہیرو بھی ہیں۔ حسینؑ کا مقصد یہ تھا کہ گھر کا گھر تباہ ہو جائے، مال و اسباب لٹ جائے، خیموں میں آگ لگا دی جائے، عزیز و اقارب موت کے گھاٹ اتار دیے جائیں۔ رسول زادیوں کے سروں سے چادریں چھن جائیں مگر دینِ اسلام پر آنچ نہ آنے پائے۔

شاعر نے مرثیے میں ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ حسینؑ نے اسلام کو ایک فاسق و فاجر ملوکیت سے بچانے کے لیے اپنا گھر (مدینہ) چھوڑ دیا۔ وہ کوفہ جانا چاہتے تھے لیکن دورانِ سفر راستہ امید کے خلاف روکا گیا۔ اور وہ وارد کربلا ہوئے۔ یہاں خیمے دریا کے قریب نصب کروائے۔ دشمن ہزاروں کی تعداد میں آن پہونچا اور اس نے خیمے ہٹوانے کے لیے کہا۔ خیمے ہٹائے گئے۔ دشمن زر کا غلام تھا۔ اس کے پاس کوئی اصول نہ تھا۔ اور جنگ کرنے میں پہل کی۔ حسینؑ کے سپاہی مارے گئے اور آخر میں وہ بھی نہایت بے دردی کے ساتھ قتل کیے گئے۔

نظم میں تینوں اجزا، موجود ہیں۔ یعنی ابتدا، درمیانی حصہ اور خاتمہ۔ ابتدا میں بیان ہوا ہے کہ حسین کوفے جانے کا ارادہ کر رہے تھے۔ لیکن حالات نے ایسا مجبور کیا کہ کربلا میں اترنا پڑا۔ شاعر کہتا ہے ؎

اترا ہے ایسے دشت میں یہ حق کا کارواں
حدِ نظر کے پار بھی سبزہ نہیں جہاں
اس دشتِ بے گیاہ میں ہیں نخل بے نشاں
جب نخل ہی نہیں ہیں تو سایہ بھلا کہاں
بے سایہ دشت میں کوئی کیوں کر بسر کرے
ایسی جگہ گزر سے بھی انساں حذر کرے

حسین کے ساتھ اہلِ حرم اور اطفال بھی تھے۔ اس لیے انھیں پانی کی تلاش بھی تھی اور دریا کے قریب خیمے لگوا دیئے ؎

صحرا میں دیکھ کر لبِ دریا کی یہ فضا
ساحل پہ آکے قافلۂ اہلِ دل رکا
اترے مسافرانِ رہ منزلِ وفا
خیمے لگائے گھاٹ پہ بڑھ بڑھ کے جا بجا
دل مطمئن کہ دشت میں سایہ نصیب ہے
اس پر خدا کا شکر کہ پانی قریب ہے

درمیانی حصہ

اتنے میں دشمن کا سیلاب امڈ آتا ہے اور قافلۂ حق کے یہاں سے خیمے ہٹانے کو کہتا ہے یہ اس کا پہلا کافرانہ اقدام تھا جو اخلاقیات یا

یکسی تعلقات کے دائرے میں نہیں آتا۔ دنیا یہ اصول تسلیم کرچکی ہے کہ جو کسی بے نام و نشان مقام پر پہلے پہونچا ہے وہ اپنا جھنڈا وہاں گاڑ دیتا ہے دشمن کی اس بے جا مداخلت پر حسینؑ کے علمبردار عباسؑ کو غصّہ آتا ہے کہ کس کی جرأت ہے جو ہمیں یہاں سے ہٹا سکے۔ اگر ان کی بڑی بہن نبی زادی جناب زینبؑ عباسؑ کا غصہ ٹھنڈا نہ کرتیں تو لڑائی کی نوبت آجاتی۔ خاندان رسالت آپ کا یہ مسلّہ اصول تھا کہ

پہل بھی ہو ہم کو جنگ میں سبقت روا نہیں

آخرکار عباسؑ نے زینب کے کہلانے پر خیمے یہاں سے ہٹالئے۔ اور پھر لشکر حسینی ایک ایسے مقام پر فروکش ہوا، جہاں نہ پانی تھا اور نہ کوئی سایہ ہی تھا۔ عرفِ عام میں یہی جگہ ارض کربلا تھی۔ یہاں ہو کا عالم تھا۔ ہر طرف دھوپ ہی دھوپ، اور اس پر گرد و غبار چھایا ہوا تھا۔ بقول شاعر ؎

وہ کربلا کی دھوپ، وہ گرمی وہ قحطِ آب
وہ بیکسوں کی پیاس وہ موجوں کا اضطراب
چھپتا ہوا وہ گرد کے پردوں میں آفتاب
گھبرا کے اس تپش سے بگولوں کا پیچ و تاب
وہ گرد اٹھی کہ چھا گئی دنیا جہان پر
چڑھنے لگے زمیں کے طبق آسمان پر

درمیانی حصے میں شاعر نے جدت پیدا کرکے اپنے کمال فن کا اظہار کیا۔ وہ کربلا کو کرب و بلا اور قتل گاہِ حسینؑ کے ماورا کچھ اور بھی سمجھتا ہے۔ اس کی نظر میں کربلا بادۂ عرفاں کی مستی، درسگاہِ عشق و انسانیت شرافت انسان کی آماجگاہ اور آزادیٔ خیال کا سرچشمہ ہے۔ شاعر کا ذیل کا بند قابلِ ذکر ہے

آئینہ جمالِ شہادت ہے کربلا
حسنِ رخِ حیات کی زینت ہے کربلا
انسان کا شعورِ قیادت ہے کربلا
شبیرؑ سے ملی جو وہ دولت ہے کربلا
آزادیٔ بشر کی ضمانت اسی سے ہے
انسان کے لہو کی حرارت اسی سے ہے

۸ محرم کو دشمن نے آلِ رسولؐ پر پانی بند کردیا اور وہ آمادۂ جنگ ہوا۔ حسینؑ نے ایک رات کی مہلت مانگی تاکہ جی بھر کے عبادت کریں۔ مہلت منظور کی گئی۔ رات کا سناٹا تھا۔ حسینؑ نے شمع گل کرکے اپنے ساتھیوں سے خطاب کیا اور کہا کہ وہ چلے جائیں۔ اپنی جانیں بچالیں۔ کل دشمن کو صرف ان کے خون کی ضرورت ہے۔ ان سب نے یک زبان ہوکر اپنے بلند مقصد کی ترجمانی کی ؎

ہم اس سے کیوں ہٹیں جو رہِ مستقیم ہے
ہم جانتے ہیں آپ کا مقصد عظیم ہے

خاتمہ: مہلت کی رات جس کو عرفِ عام میں شبِ عاشور کہتے ہیں، ایک خونی منظر اور یاس و حرماں کے عالم میں گزر گئی۔ دسویں محرم کا دن اپنے دامن میں تباہی کے اسباب کے ساتھ طلوع ہوا۔ دشمن جنگی ہتھیاروں کی تیاری کرنے میں محو۔ خاصانِ خدا میں صبح کی اذان سنائی دیتی ہے اور نماز کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اتنے میں دشمن نے لڑائی لڑنے میں پہل کی۔ فوجِ حسینی اپنے بلند ترین مقصد میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرکے سرخرو ہوجاتی ہے حسینؑ تنہا رہتے ہیں اور دشمن لاتعداد ؎

لاکھوں عدو اور ایک شہِ مشرقین تھے
کتنے ستم تھے جن کا نشانہ حسینؑ تھے

انجام کار قیامت خیز جنگ ہوتی ہے۔ حسینؑ پر نت نئے حربوں سے وار کیے جاتے ہیں۔ وہ زخموں سے چور ہوکر فرس سے تپتی ریت آتے ہیں۔ آخری سجدے میں عبد اور معبود میں کچھ راز و نیاز کی باتیں ہورہی ہیں۔ اتنے میں قاتل نے سر تن سے جدا کردیا، اور حق کی شمع کو بخیالِ خود ہمیشہ کے لئے گل کردیا ؎

ہر حال میں جو پیشِ نظر حق کی تھی رضا
محوِ نمازِ عصر ہوا جانِ مصطفیٰؐ
قاتل یہ حال دیکھ کے خنجر بکف چلا
زہراؑ نے بال کھول دیئے وا مصیبتا
تڑپی سکینہ مرقدِ بے قرار سے
نکلے تڑپ کے شاہِ مدینہ مزار سے

ارسطو نے ایپک (رزمیہ) کے لیے مبالغہ کی صنعت کو لازمی قرار دیا ہے مبالغہ ہی وہ خوبی ہے جو شاعر اور مورخ میں تفاوت کرتی ہے۔

شاعر قریبِ قیاس ناممکنات (Law of Impossibilities) کو خلافِ قیاس ممکنات (Law of Possibilities) پر ترجیح دیتا ہے۔ یعنی وہ اپنی قوتِ متخیلہ سے ایسا کوئی غیر حقیقی واقعہ پیش کرتا ہے جو اصلیت میں رونما نہیں ہوتا ہے۔ پڑھنے والے کو ضرور احساس ہوتا ہے کہ ایسا واقعہ عمل میں آیا ہوگا۔

مثال میں چند بند حاضر ہیں ؎

گرمی کی شدت:

اک تو فضائے دشت کی یہ ہولناکیاں
اس پر یہ دھوپ اور یہ گرمی کہ الاماں
اڑتی ہوئی یہ خاک، یہ ذرّے شرر فشاں
جیسے ہو سارے دشت میں یہ آگ یا دھواں
حیرت تھی اس تپش پہ عجب عالمین کو
بھٹی میں کس نے جھونک دیا ہے زمین کو

تلوار کی تعریف:

تلوار سب کی تیز تھی چھوٹی ہو یا بڑی
ہر وار تھا غضب کا تو ہر ضرب تھی کڑی
بجلی سی جب کڑک کے کسی سر پہ آپڑی
برسا لہو کہ لگ گئی برسات کی جھڑی
آئی اِدھر لہو میں اُدھر لوٹ کر گئی
چھیڑا اِدھر کسی کو اُدھر چوٹ کر گئی

گھوڑے کی جست و خیز:

سرعت وہ راہوار کی وہ گرمیِ ستیز
وہ ہمہمہ کہ قہر وہ صیحہ کہ شعلہ ریز
وہ آہوؤں کا رم وہ چکاروں کی جست و خیز
فرسے اُڑا تو سن سے چلا مثلِ تیغِ تیز
چھپ کر نظر سے گوہرِ مکنون کی طرح
اترا زمیں پہ وحی کے مضمون کی طرح

ارسطو کی مقرر کردہ شرائط میں ایک شرط رزمیہ نظم کے لیے پہچان (Recognition) ہے، جس کے معنی کسی نامعلوم واقعہ کے آثار کا قبل از وقت پتہ چل جانا۔ جب حسینؑ نے کربلا میں اپنے خیمے نصب کیے تو انھیں پانی دیکھ کر مسرت ہوئی۔ جیسا کہ ان اشعار سے واضح ہوتا ہے ؎

پانی بھی حق نے بخشا ہے صحرا میں اس قدر
انساں تو کیا کہ پی کے ہوں سیراب جانور
محفوظ اب ہیں تشنہ لبی کے ہراس سے
ہوگا ہلاک اب کوئی بچہ نہ پیاس سے

یہ واقعہ خلافِ اُمید رونما ہوا۔ یعنی جب پانی کو دیکھ کر آلِ رسولؐ میں مسرت پیدا ہوئی تھی وہی پانی اُن کے کام نہ آیا۔ زینبؑ حسینؑ سے پوچھتی ہیں:

پانی بھی وقتِ ذبح ملا تم کو یا حسینؑ
پیاسے رہے یا شہید ہوئے بے خطا حسینؑ

شاعر کا زورِ بیان

جب فوجِ حسینی نے خیمے دریا کے قریب لگائے تو دشمن نے اعتراض کیا کہ یہاں خیمے نہ لگائیں۔ عباسؑ کو دشمن کے اس غیر منصفانہ طرزِ عمل پر جلال آیا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ ہمارا سر کٹ جائے لیکن حسینؑ کے اعزاز میں کسی قسم کی سبکی نہ آنے پائے۔ جب دشمن خیمے ہٹانے پر مصر رہا تو عباسؑ غیظ و غضب میں آجاتے ہیں ؎

برپا کریں گے حشر وہ ہم کارزار میں
مرحب بھی کانپ اٹھے گا مزار میں

اور پھر ؎

گرجا جو اس جلال سے شیرِ خدا کا شیر
مُردے یہ سمجھے حشر میں اب کچھ نہیں ہے دیر
زندوں کا حال یہ کہ ہوئے زندگی سے سیر
ہیبت سے مر کے رہ گئے سب نام کے دلیر
دہشت سے پھٹ کے رہ گئے سینے پہاڑ کے
تھرّائے دشت، ضیغمِ حق کی دہاڑ سے

عباسؑ کے غصے پر قابو پانا آسان کام نہ تھا۔ ہر چند زینبؑ سمجھاتی ہیں کہ ؎

بیٹا! قدم یہ جادۂ مقصد سے ہٹ نہ جائے
اُلٹو نہ آستیں کہ زمانہ اُلٹ نہ جائے

زینبؑ کی گفتگو کا یہ اثر ہوا کہ عباسؑ تھرتھرائے اور ؎

یہ سُن کے سر جُھکا کے ہٹا اک طرف وہ شیر
غصّے کو حکم حضرتِ عباسؑ نے کر کے زیر
خیمے اکھاڑنے لگا یوں جلد وہ دلیر
تعمیلِ حکم میں کہیں کچھ ہو نہ جائے دیر

دریا سے ہٹ کے مورد بیداد ہو گئے
اک دشتِ تشنگی میں سب آباد ہو گئے

مرثیے میں واقعات ہر چند لرزہ خیز و عبرت ناک ہیں، لیکن شاعر نے ایسا طرزِ ادا اختیار کیا ہے کہ رنج و غم کے ساتھ ساتھ سننے والے کے دل میں ایک روحانی کیفیت بھی پیدا ہوتی ہے۔ حسینؑ کی شہادت کے بعد جب آلِ محمدؐ کے خیمے تاراج ہوئے تو یہ لٹا ہوا قافلہ کس وقار سے شام کی طرف جاتا ہے ؎

اس شان سے چلا سوئے منزل وہ کارواں
بکھرے کجاوہ اونٹوں پہ بے پردہ بیبیاں
سجّادؑ زار قافلہ سالار و ساربان
نیزوں پہ سر شہیدوں کے قرآن بر زباں
رُخ پر وقار و شانِ شہادت لیے ہوئے
زخمی جبیں میں نورِ قیادت لیے ہوئے

مرثیے کا اسلوبِ بیان شان دار ہے۔ محاورے دُرست، ترکیبیں چُست تشبیہیں جدّت آفریں، استعارے دل آویز اور لطف آور ہیں۔ کوئی لفظ بھرتی کا نہیں ہے۔ الفاظ کا حسنِ انتخاب لاجواب، زبان رواں دواں شیریں اور کوثر و تسنیم سے دُھلی ہوئی ہے۔

ہم اس مرثیے سے اتنا لطف اندوز ہوئے کہ اسے کئی مرتبہ ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا۔ آپ بھی اس سے لُطف اٹھایئے اور میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے خاص لکھنؤ کی زبان کی داد دیجئے۔ کتاب "آیاتِ درد" جناب اختر لکھنوی، مالک قلم نشان کراچی سے ۱۵۰/ روپئے میں مل سکتی ہے۔ کتاب ہر اعتبار سے خوبصورت، مزیّن اور مجلد ہے۔ گیٹ اپ، طباعت، کاغذ بہت عمدہ ہیں۔

ہم ایسی گراں مایہ کتاب جس میں رزم نگاری کے عمدہ اور معرکہ آرا شہ پارے شامل کیے گئے ہیں، کے لئے حضرت ساحر لکھنوی کو دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں اور امید ہے کہ موصوف آئندہ بھی وہ زیرِ مرثیوں میں اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کر کے سامعین کے دلوں کو محظوظ فرمائیں گے۔ ہماری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آلِ محمدؐ کے صدقے میں ساحرؔ صاحب کے زورِ قلم کو مزید توانائی بخشے۔ □□

حاشیہ:

(1) The great critics by James Harry and Eddwinfield Parks Line 15, PP. 55.

انسان

میں نے قرآن پڑھا
مسجد میں گیا
میں نے گیتا پڑھی
مندر میں گیا
میں نے انجیل پڑھی
گرجا گیا
گروانی کا جاپ کیا
گرُدوارے بھی گیا

میں سچ بولا
تو سُولی پہ چڑھا
میں سچ بولا
تو اک زہر پیا
میں سچ بولا
تو گولی کھائی
میں مسلمان کبھی، سِکھ کبھی، ہندو کبھی عیسائی ہوں
مجھ کو جس نام سے تم چاہو پُکارو لوگو!
مجھ کو انسان نہ کہو
میں ہوں سب کچھ
مگر افسوس میں انسان نہیں!!

صابر دت

اے/۱، ناٹر روڈ۔ جوہو چرچ، ممبئی ۴۰۰۰۵۹

ڈاکٹر صادق
اے، جی ۲/۲ سی ۔ ماڈل ٹاؤن
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۹

اختر الایمان کے تخلیقی سروکار

انیسویں صدی کے نصفِ آخر میں حالی اور آزاد نے اردو نظم کی توسیع و ترقی کے خصوص میں فکری و عملی طور پر جو کار ہائے نمایاں انجام دیئے وہ ہماری ادبی تاریخ کا روشن باب بن چکے ہیں۔ بیسویں صدی کے ربع اوّل میں اقبال اور ان کے ہم عصر شعراء نے اپنے اپنے طور پر پابند نظم کے تمام امکانات کو بروئے کار لانے کی سعی کی جس کے نتیجے میں اس صنف نے استحکام کے ساتھ ساتھ عظمت اور وقار بھی حاصل کر لیا تاہم نظم کی ساخت میں کوئی بنیادی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اس راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ غزل کی وہ روایت تھی جو ایک مضبوط اور اٹل چٹان کی طرح نظم گو شعراء کے سامنے کھڑی تھی۔ ردیف و قوافی کی پگڈنڈیاں ہاتھ پھیلائے ہر نئے خیال کو اپنی طرف بلاتی اور راستہ بدلنے پر مجبور کرتی تھیں اور پھر تغزل کے طلسم سے آزادی بھی کوئی آسان بات نہ تھی۔ جوش اور اختر شیرانی کے بعد ابھرنے والے شعراء کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ اس روایت کو قبول کر کے اسی کا حصہ بن جانا یا اس سے نبرد آزما ہو کر ایک نئی روایت تعمیر کرنا۔ ن۔م۔ راشد، میراجی اور اختر الایمان ایسے شاعروں نے اپنے عہد کے اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے اول الذکر راستے پر دوسرے کو ترجیح دی۔

اختر الایمان کی شاعری غزل کی روایت سے یکسر انحراف اور اس طور ایک نئی روایت کے استحکام سے عبارت ہے انھوں نے میراجی اور راشد کی طرح اپنی تمام تر توجہ آزاد نظم ہی پر مرکوز نہیں کی بلکہ پابند اور معریٰ نظم کے دائرے میں رہ کر روایتی شعری زبان سے انحراف کیا اور روزمرّہ کی زبان سے قریب نسبتاً آسان، کھردری اور نثری زبان کو رواج دینے کی سعی کی کیوں کہ ان کے نزدیک اعلا و ارفع جذبوں کے لیے ضروری نہیں کہ الفاظ بھی ارفع اور بلند بانگ ہوں۔ الفاظ کبھی پست، مبتذل، گھناؤنے اور تکلیف دہ بھی ہوتے ہیں مگر ان کے پیچھے جو روح کارفرما ہوتی ہے اچھی شاعری اس کی گرمی اور نرمی کا احساس دلاتی ہے [1]

اختر الایمان نے فیض احمد فیض کی طرح کلاسیکی روایت کی لفظیات سے نئے معنی تخلیق کرنے کے بجائے نئے معنی کے لئے نئی لفظیات سے کام لیا۔ انھوں نے اپنی نظموں میں فضا سازی کے لیے نامانوس الفاظ کے استعمال اور مشکل پسندی سے بھی دامن بچایا ہے۔ ان کی نظموں میں اقبال جوش اور ن۔م۔ راشد کے مقابلے میں سہل پسندی کا رجحان ملتا ہے۔ گو کہ بظاہر نظر آنے والی یہ سہل پسندی بھی اپنے آپ میں آسان نہیں۔

اختر الایمان اپنی نظموں میں جذبات و خیالات پر صوتی آہنگ کو حاوی نہیں ہونے دیتے اور نہ انھیں موسیقیت سے لبریز کر کے ان سے تاثرات کو ابھارنے کا کام لیتے ہیں بلکہ ان کے اظہار کے لیے اتنا سادہ اور فطری انداز اختیار کرتے ہیں جس کے صوتی آہنگ میں گھلی ملی ہلکی موسیقیت نظموں کے تاثرات میں اضافے کا سبب بن جاتی ہے۔ ویسے انھیں مترنم الفاظ، بحر و وزن، ردیف و قوافی یا اصوات و الفاظ کی تکرار کے ذریعے پیدا ہونے والی خارجی موسیقی سے زیادہ داخلی موسیقی عزیز ہے جس میں لفظوں کی معنویت اور احساس کا حسن شامل ہو۔ اختر الایمان دوسرے شعراء کی طرح الفاظ کے آرائشی پہلو پر خصوصی توجہ صرف نہیں کرتے بلکہ ان کے تعبیری پہلو کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ ان کی نظموں میں الفاظ کے استعمال کے سلسلے میں یہ بات خاصی اہمیت رکھتی ہے ؎

اسے ڈھونڈتا ہوں میں جس نے ہر اک خوانِ نعمت پہ پہرے لگائے
زمین کو زمیں سے الگ کر دیا سینکڑوں نام دے کر

---

[1] اختر الایمان۔ پیش لفظ، بنت لمحات۔

اجارہ کی شیاء ڈالی گیا جاری پروانۂ راہ داری
بجائے حسین اعلیٰ قدروں کے تاسیسِ عالم
رکھی مصلحت پر، مفادات پر، خود پرستی پہ ساری
اور انسان کو خادم اشیاء میں تبدیل کر کے
بہت پہلے اس سے کہ انسان، انسان بنتا
اسے ایک شطرنج کا چوبی مہرہ بنا کر
مقابل کھڑا کر دیا ایک کو دوسرے کے

(کوزہ گر)

یا

میری وہ آنکھیں تڑپتا تھا کبھی جن میں شباب
جو رہا کرتی تھیں ایک درد کے مارے بے خواب
آج اس واسطے چہرے پہ ہیں بینا کہلاؤں
آج اس واسطے بینا ہوں کہ سب دیکھتا جاؤں
تم نے میرے لیے جس دن کی مانگی تھی!
یہ وہی روزِ قیامت ہے مبارک ہو تمہیں
(دُعا)

اختر الایمان کی نظموں میں علمِ بیان کے مروجہ اجزائے ترکیبی، تشبیہ، استعارہ، مجازِ مرسل اور کنایہ وغیرہ کے استعمال کے معاملے میں کفایت شعاری کا احساس ہوتا ہے۔ بعض نظموں میں یکے بعد دیگرے کئی کئی مصرعے تشبیہ اور استعارے سے عاری سپاٹ اور سادہ بیان یا کلام موزوں کی مثال معلوم ہوتے ہیں لیکن ایسی نظموں کا سارا حسن ان علامیوں میں نہاں ہوتا ہے جن کے فن کارانہ استعمال پر اختر الایمان کو قدرت حاصل ہے۔ یہ علامیے جہاں نظم کی تکمیل میں معاونت کرتے ہیں وہیں معنوی توسیع اور اسی کے تاثر میں اضافے کا کام بھی کرتے ہیں۔

ہر اچھی شاعری کی طرح اختر الایمان کی شاعری بھی غم سے خالی نہیں لیکن ان کے یہاں غم پیرِ تسمہ پا کی طرح زندگی کا بوجھ نہیں بلکہ اس کا بیش بہا سرمایہ بنتا ہے جو وقتی اداسی ضرور پیدا کرتا ہے لیکن اسے مایوسی اور بیزاری کی حدوں تک لے جا کر فراریا بے عملی کی راہ نہیں دکھاتا، زندگی کو اجیرن نہیں بناتا، اسے مفلس کی قبا نہیں سمجھتا جس میں

ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں کیوں کہ ہر غم کسی نہ کسی خوشی کے ساتھ منسلک ہوتا ہے جو گزر جاتی ہے تو نشاط کے لمحے ٹیس بن کر ابھرتے ہیں اور شاعر سوچتا ہے کہ:

ہر نئے موڑ پر دنیا ہوئی ثابت وہ بساط
جس پہ انسان فقط مہرے ہیں الٹے سیدھے
پھر بھی وہ کون سا جادو ہے جو ہر تازہ وفات
یوں بھلا دیتا ہے جی سے کہ نشاں بھی نہ ملے

اس جادو کا نام "وقت" ہے جو اختر الایمان کی اکثر و بیشتر نظموں میں کائنات کی سب سے بڑی قوت بن کر ابھرا ہے۔ وہی جسے اقبال نے "سلسلۂ شب و روز" کہہ کر نقشِ گرِ حادثات اور صیرفیِ کائنات قرار دیا تھا۔ اختر الایمان کی نظموں میں مختلف شکلیں بدل کر نئے اور اچھوتے انداز میں رواں دواں نظر آتا ہے۔ "بنتِ لمحات" کے پیش لفظ میں انھوں نے خود لکھا ہے:

"میری ان نظموں میں وقت کا تصور اس طرح ملتا ہے جیسے یہ بھی میری ذات کا ایک حصہ ہے اور یہ طرح طرح سے میری نظموں میں میرے ساتھ رہتا ہے۔ کبھی یہ گزرتے ہوئے وقت کا علامیہ بن جاتا ہے کبھی خدا بن جاتا ہے اور کبھی نظم کا ایک کردار ——— "بازآمد" میں رمضانی قصائی وقت ہے۔ "بیداد" میں خدا وقت ہے۔ "وقت کی کہانی" میں گردابِ زیست وقت ہے ... اور "کوزہ گر" میں سامری وقت ہے۔ وقت جبریل امیں ہے جو زمین سے تاحدِ نظر مسلط ہے ہماری گذرانِ حیات پر، جس کے پاؤں تحت الثریٰ سے بھی نیچے ہیں اور سر عرشِ معلّٰی سے بھی اوپر۔ ساتھ ہی یہ تصور نہ مایا کا تصور ہے نہ فنا کا۔ یہ ایک ایسی زندہ و پائندہ ذات ہے جو اننت ہے جو اگر وقت نہ ہو تو خدا سے بڑی کوئی چیز ہوتی اس لیے کہ اس کے ہاتھوں خدا کی شکل و صورت اور تصور بھی بدلتا رہتا ہے۔"

لیکن وقت کی طاقت و اہمیت تسلیم کرنے کے باوجود ان کا سرکش ذہن اس کے آگے سرنگوں ہو کر توکل کے نام پر بے عملی اختیار کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا اور وہ زندگی کی سادہ کا معصومیت اور کرب برداشت کر سکتے چلے

جانے کے باوجود کہیں بیٹھ کر زمانے پر ہنسنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ قنوطیت کا شکار ہونے کے بجائے رجائیت کی راہ پر گامزن اور مستقبل سے پر امید نظر آتا ہے۔ "ایک لڑکی کے نام" سے یہ حصہ دیکھئے ؎

ہماری دُنیا سے ان کی دُنیا   حسین تر سے حسین ہوگی
بہشت کیسا جو زمین ہوگی   ہماری آنکھوں سے جو نہاں ہے
وہ ان پہ سب آشکار ہوگا   وہ ان کی رہ کا غبار ہوگا

ہمارے بچے تمہارے بچے
نہ اجنبی ہوں گے ہم تھے جیسے

اخترالایمان کی نظموں میں عصری زندگی کے تلخ و شیریں تجربات کا اظہار بے باکی، سچائی اور فنی دیانت داری کے ساتھ ملتا ہے۔ یہ چیز ان کے پیش رو اور ہم عصر شعرا کے یہاں بھی ملتی ہے لیکن اکثر ہوا یوں کہ جذباتیت اور رومانیت کے وفور یا مخصوص سیاسی یا مذہبی عقائد سے گہری وابستگی کے باعث ان کے یہاں عموماً وہ توازن برقرار نہیں رہا جو اس راہ کی شرطِ اولین ہے۔ اخترالایمان کے نزدیک شاعری مذہب کا درجہ رکھتی ہے۔ "یادیں" کے پیش لفظ میں انھوں نے واضح طور پر لکھا ہے کہ وہ شاعری کو اپنا مذہب و ایمان تصور کرتے ہیں۔ انھوں نے کبھی زندگی اور اس کے نشیب و فراز کے ساتھ ایسا کوئی سمجھوتہ نہیں کیا جو ان کی شاعری کو مجروح کرتا ہو۔

آج کا فن کار خوف، طمع یا محض تن آسانی کے باعث زندگی کے کھرے اور سچے تجربات کے فنی اظہار سے گریزاں عموماً ان مروجہ جذبات و افکار کی پیش کش میں دل چسپی دکھاتا ہے جو اس کی اپنی زندگی یا عہد کے تجربات کے حدود سے باہر ہیں۔ ایسے فن کار اپنے معنوی تصنع آمیز اور پرکشش فن پاروں کے سہارے وقتی شہرت و مقبولیت کے حصول میں تو کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن ان کا یہ پرفریب عمل، فن کو اس کے منصب سے گرا دیتا ہے "پھر غزل خوانی کرو" اور "گریز" میں اخترالایمان نے اسی قسم کے شاعروں پر طنز کیا ہے۔ انھوں نے "شیشے کا آدمی" اور "گونگی عورت" ایسی نظموں میں عصر حاضر کے اس نام نہاد دانش ور طبقے پر بھی گہرا طنز کیا ہے جو جسم کی موت سے خوف زدہ ہو کر رہتا ہے لیکن احساس کی موت [illegible] جاتا۔ اپنے ضمیر کی بیداری کو سخت آزمائش تصور کرتا اور لیے دیے زندگی بسر کرنے ہی میں اپنی عافیت جانتا ہے۔ وہ سب کچھ دیکھتا سمجھتا اور محسوس کرتا ہے لیکن اظہار رائے کی آزادی حاصل ہونے کے باوجود اپنی زبان سے حق بات کا اظہار نہیں کرتا۔ ظلم و جبر، استحصال تعصب اور بے انصافی کے خلاف آواز بلند نہیں کرتا اور اپنے عمل کو مصلحت یا دانائی کا نام دے کر لبوں پر قفل ڈالے رہتا ہے۔ "گونگی عورت" کا اختتامیہ ملاحظہ ہو ؎

لے، میں تجھ کو اپنی گویائی دیتا ہوں
یہ میرے کچھ کام نہ آئی
میں بزدل ہوں جو ہر بے انصافی کو چپکے چپکے سہتا ہے
جس نے مقتل اور قاتل دونوں دیکھے ہیں
لیکن دانائی کہہ کر
اپنی گویائی کو گونگا رکھا

اخترالایمان کی شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت محاکات نگاری ہے، جس کی مثالوں سے اس کی شاعری پُر ہے اس خصوص میں وہ کسی کردار، منظر، واقعے، مکالمے یا احساس سے حسب ضرورت کام لے کر اس تجربے اور بصیرت تک پہونچنے میں قاری کی رہنمائی کرتے ہیں جو نظم کا اصل مقصود ہے۔ ان کی محاکاتی نظموں کے اختتامیہ مصرعے اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں کہ ان میں مختصر افسانوں کی طرح نقطۂ عروج کا التزام تاثر میں شدت پیدا کر دیتا ہے۔ محاکات کے زیر اثر ان کے یہاں اس ڈرامائی اظہار نے راہ پائی ہے جو ان کی شاعری کی ایک اور اہم خصوصیت سے عبارت ہے اور جسے چند ناقدین نے بے حد سراہا ہے۔

مہانگر یا بڑا شہر اخترالایمان کی شاعری کا وہ مانوس اور گہرا تجربہ ہے جو "قدر مشترک" "تبدیلی"، "نیا شہر"، "نظم کی تلاش" اور "عروس البلاد" کے علاوہ بھی ان کی کئی نظموں میں کار فرما نظر آتا ہے۔ اس کی طرف انھوں نے غالباً پہلی مرتبہ "تاریک سیارہ" کی ایک مختصر نظم "عہد وفا" میں ایک چھوٹی سی بچی کی انگلی کے اشارے کے ذریعے تو یہیں میں صرف یہ مصرعہ لکھ کر — "جدھر اونچے محلوں کے گنبد، ملوں کی سیہ چمنیاں آسماں کی طرف سر اٹھائے کھڑی ہیں" — متوجہ کیا تھا۔ یہ بظاہر شہر کا ایک لانگ شوٹ تھا دور کی ایک دھندلی تصویر، تاہم اس معمولی اشارے میں صنعتی دور کا کرب،

سیاسی نظام کا عذاب اور مشترک خاندانوں کے رشتے بکھرنے کا المیہ دیکھا جا سکتا ہے جبکہ شہری فضا کی اداسیوں آشامی "فردوس اسپلاو" میں نمایاں نظر آتا ہے جس کی وسعت میں چہل پہل، شور و غل، جرائم، جلسے جلوس، سازشیں اور بد عنوانیوں سے پرے ان لوگوں کی مزاریں بھی ہیں جن کے کوئی نام نہیں تھے۔ اور جو —

شہری شہر کی تسخیر کرنے آئے تھے
انھیں شکم سے بہت دور آگے جانا تھا
وہ اس جہان کی تعمیر کرنے آئے تھے
بڑے دماغ تھے، طباع تھے، ذہین تھے سب
مگر سیاستِ دنیا میں کستر یست تھے سب

اخترالایمان کی شاعری میں سیاست اور محبت شجرِ ممنوعہ نہیں تاہم عورت کے ظاہری حسن اور جسمانی اعضاء کا بیان ان کا موضوعِ سخن نہیں بنتا اور نہ وہ اسے "طبعِ شاعر کا وطن" تسلیم کرتے ہیں۔ اس رویے کے پسِ پشت غزل کی روایت سے انحراف کی شعوری کوشش یا پھر ان کے اپنے مخصوص مزاج کی کارفرمائی ہو سکتی ہے۔ یہاں ان کی ایک نظم "برندابن کی گوپی" کا ذکر بے محل نہ ہوگا جو اپنی طرز کی ایک بے حد منفرد نظم ہے اس میں کسی چہرے کے نقوش یا جسمانی خطوط کے ذکر کے بغیر پیش کی گئی، برندابن کی گوپی کی حسین و جمیل تصویر، شاعر کے جمالیاتی شعور کی بہترین مظہر اور شاعرانہ کمال کا بے مثال نمونہ ہے۔ اخترالایمان کی شاعری میں محبت کا بالغ و صحت مند نظریہ اور عہدِ حاضر کی عورت کا جو تصور ملتا ہے وہ ہماری عشقیہ شاعری میں ایک بڑی تبدیلی کا رفیع نشان ہے۔

اخترالایمان کی شاعری انسان اور انسانیت کی اعلا قدروں کو گزند پہنچانے والی طاقتوں کے خلاف ایک ردِعمل اور احتجاج کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ ہر باشعور اور بیدار ضمیر فن کار کی طرح ان کے یہاں بھی موجود سیاسی اور سماجی نظام سے بے اطمینانی اور بیزاری کا احساس موجزن نظر آتا ہے ان کی بے شمار نظمیں اسی احساس سے معمور ہیں جن میں "سبزۂ بیگانہ"، "زیست کے محل"، "پندرہ اگست"، "حمام بادگرد"، "میں ایک سیارہ"، "یوں نہ کہو"، "مزاج"، "قافلہ"، "جنگ" اور "میرا دوست ابوالہول" وغیرہ کو ان کی سیاسی بصیرت کی آئینہ دار قرار دی جا سکتی ہیں۔

کبھی تم نے مسیحا کے نئے تابُت کو دیکھا ہے
وہ جس کے ڈھیر سارے ہاتھ ہیں اُن اپنے ہاتھوں سے
کسی کو ایسا دستاویز دیتا ہے جلی حرفوں میں جس پر "امن" لکھا ہے
اسی لمحے کسی کو دوسرے ہاتھوں سے سامانِ جدل کی پیشکش بھی ہے

———— (حمام بادگرد)

یہ دُنیا تو ان شعلہ ساماں لوگوں نے آپس میں تقسیم کر لی
جو ہتھیار کی شکل میں رنج و غم ڈھالتے ہیں
یا گولہ بارود کے کارخانوں کے مالک ہیں
یا پھر ثنا خواں ہیں ان کے
ہمارے لیے صرف نعرے بچے ہیں

———— (میرا دوست ابوالہول)

جس نے آواز اٹھائی وہ ہوا نذرِ ستم
جو مسیحائی کو آیا رسن و دار ملی
ہر نیا دن نئے آفات کا مظہر ٹھہرا
صبح خون گشتہ ملی شام، سر انگار ملی
اب کہاں جائیں گے ہم قبلۂ حاجات کے بعد

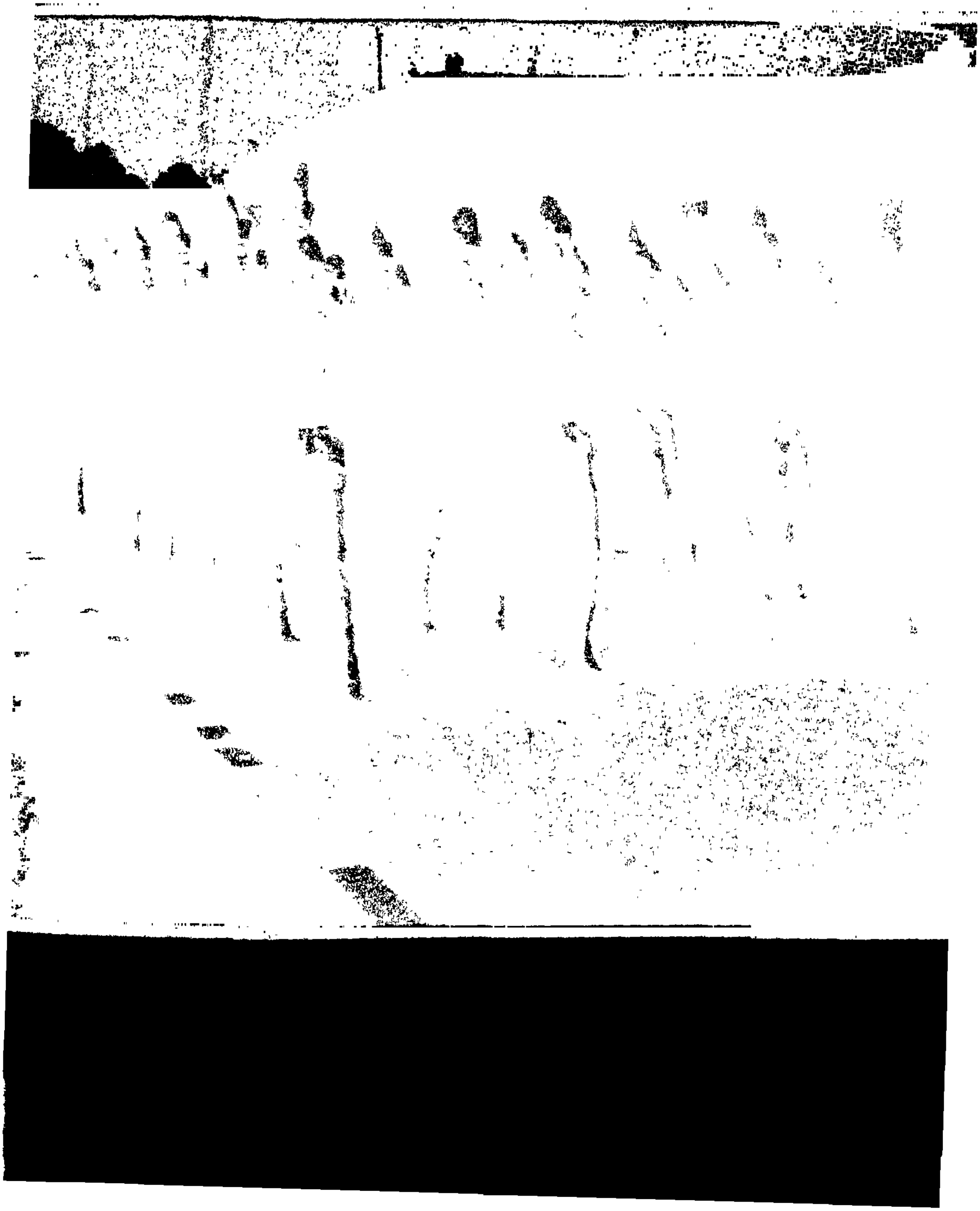
———— (میں ایک سیارہ)

اخترالایمان کی شاعری کی عمر نصف صدی سے تجاوز کر چکی ہے۔ اس پورے عرصے میں ایک طویل مدت تک مسلسل نظر انداز کیے جانے کے باوجود انھوں نے پوری توانائی، ضبط اور وقار کے ساتھ اپنا تخلیقی سفر جاری رکھا ہے۔ سیاسی، اقتصادی یا سماجی دباؤ کے باعث اپنی راہ تبدیل نہیں کی اور اپنے پیش رو اور ہمعصر شاعروں سے اثر پذیری کے معاملے میں کمالِ احتیاط اور بے نیازی کا ثبوت دیا ہے۔ اس نصف صدی میں اردو نظم مختلف تجربات و تغیرات اور تحریکات و میلانات سے گزر کر آج اس مقام پر آ پہنچی ہے جہاں سے اسے پھر ایک نیا موڑ لینا ہے۔ اس عرصے میں ان کے ساتھ اور ان کے بعد ابھرنے والے کئی نامور اور تازہ کار شاعر بڑا نے محسوس ہونے لگے ہیں بلکہ ان میں سے کوئی اپنے تخلیقی جوہر سے محروم ہو کر تقریباً خاموشی اختیار کر چکے ہیں [illegible]



[illegible] کے ایک وفد سے ملاقات کرتے ہوئے

[illegible]







حصار

زندگی اب کس قدر آسان ہے
کام ہے سارا مشینوں کے سپرد
ہر طرف کمپیوٹروں کے بال و پر پھیلے ہوئے
گھر میں ہے ٹی۔وی، فرج، واشنگ مشین
اب تصور کے لئے کچھ بھی نہیں باقی رہا
پردے پر ٹی۔وی کے تصویر بتاں
جب ذرا گردن اُٹھائی، دیکھ لی
شاعری کا ظرف بھی خالی ہوا
شعر و افسانہ، ادب، تنقید سب بازی گری
رقص و موسیقی کا افسوں
ذہن و دل پر اب اثر کرتا نہیں
ساری قدریں بہہ گئی ہیں وقت کے سیلاب میں
روح و دل زخمی پرندوں کی طرح
تک رہے ہیں آسمانوں کی طرف
شاید اُترے کوئی انجانا فرشتہ اور وہ
زخم پر مرہم لگائے، شبنم افشانی کرے
یہ جو ہے چاروں طرف برقی مشینوں کا حصار
جس میں انساں قید ہے
توڑ کر اس جال کو
باہر آنے کا عمل آسان نہیں، آساں نہیں۔

نامی انصاری
۲۹۵/۹۹ نالہ روڈ۔ چمن گنج
کانپور
۲۰۸۰۰۱

عید

عید لائی نویدِ مسرّت
چہرے چہرے پہ آئی بشاشت
عید طاقت گزاروں کا اکرام
عید ہے رب کا بندوں پہ انعام
عید ہے روزہ داروں کی اُجرت
عید تمہیدِ حُسنِ محبّت
عید صبحِ بہاراں سے منسوب
عید پیر و جواں کی ہے محبوب
عید امّی کی ممتا کا مظہر
عید ابّو کی شفقت کا پیکر
عید بھابھی کے ہونٹوں کی مُسکان
عید بھیّا کے دل کا ہے ارمان
عید معصوم بچّوں کی فطرت
عید ٹھہری یتیموں کی طاقت
عید غنچے چٹکنے کا پیغام
عید پھولوں کی خوشبو کا ہے نام
عید ہے آبِ کوثر کا اک جام
عید ہے حُسنِ اخلاق کا نام
عید آئی ہے خوشیاں مناؤ
امن و راحت کی فصلیں اگاؤ

مہدی پرتاپ گڑھی
۲۸-۱ اسکول وارڈ
پرتاپ گڑھ
۲۳۰۰۰۱

وقار ناصری
شیش محل، حسین آباد، لکھنؤ-۳

مغربی بنگال میں اُردو ڈرامے کی شناخت

مغربی بنگال کی سرزمین ہمیشہ سے ادب اور آرٹ کے منظر نامے ترتیب دیتی آئی ہے۔ یہاں کے دھنک رنگوں اور روشن تحریروں نے چراغ سے چراغ جلانے کی جو روایت قائم کی ہے وہ آج بھی اندھیروں میں کرن در کرن کہیں نہ کہیں جگنوؤں کی طرح روشنی کی لامتناہی لکیر کھینچتی دکھائی دیتی ہے۔ عہد بہ عہد، دَور بہ دَور دھان کی بالیوں اور پوکھروں کے دیس میں ہر زبان نے تخلیقی سفر کی منزلیں طے کر کے، جانے کتنے مسافروں کو گیان کے چھتنار تلے نروان دیا ہے۔ جہاں اور زبانوں نے اس دیس سے اپنے بناؤ سنگار میں نئی سج دھج پائی، وہاں اردو نے بھی اس مہکتی، لہکتی، سرسبز و شاداب سرزمین سے بہت کچھ نمو پائی ہے۔ جس طرح دلی اور لکھنؤ نے اُردو زبان کو شہرت عام اور بقائے دوام عطا کی۔ اسی طرح کلکتہ نے بھی اُردو زبان کو اعتبار اور سلیقہ بخشا۔ شاعری، افسانہ اور تنقید کے علاوہ مغربی بنگال نے اُردو ڈرامے کو جو نئی جہت دی اور جس طرح اسے زندگی اور اس کے شعور سے ہمکنار کیا وہ لائق تحسین ہے۔ اس تحسین کو برقرار رکھنے کے لئے جہاں اور بہت سے لوگوں نے ڈرامہ کو ڈرامے کے نہج پر اسلوب اور تکنیک کے تجربوں کے ساتھ ساتھ بہتر طور پر ادا کرنے کی کوششیں کیں اس میں ڈرامہ نگار، ہدایت کار ظہیر انور کی فن کارانہ صلاحیتیں بھی شامل ہیں۔

یوں تو ظہیر انور درس و تدریس کے پیشے سے منسلک ہیں لیکن ڈرامہ ان کی اصل شناخت ہے۔ انتھک محنت، فن کارانہ جستجو اور اپنے تحریر شدہ ڈراموں سے اُردو اسٹیج کی جو خدمت ظہیر انور نے کی ہے وہ شاید ہی کسی اور نے انجام دی ہو۔ وہ بھاری پتھر جسے لوگ صرف چھو کے چھوڑ دیتے تھے اُسے اُٹھانے کے لیے ظہیر انور کو کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے اور کس کس طرح کے مراحل طے کرنے پڑے اس کا روشن ثبوت خود ان کے ڈرامے ہیں۔

کلکتہ کے ایک متوسط گھرانے میں ۱۹۵۰ء کے آس پاس ظہیر انور نے آنکھ کھولی اور ہر متوسط گھرانے کی وہ فصل جو اس کے بزرگوں کے خوابوں سے عبارت ہے اسے بارآور کرنے کے لیے وہ بچپن کی دہلیز لانگھ کر تعلیم کی طرف رجوع ہوئے۔ ۱۹۷۰ء میں ہائر سکنڈری اور ۱۹۷۳ء میں بی اے کیا۔ شاعری، افسانہ اور ڈرامے سے ان کو دلچسپی لڑکپن میں اس وقت سے تھی جب یہ محض شوق تھے۔ دورانِ تعلیم ۱۹۷۲ء میں انھوں نے ایک ہوٹل میں منیجری بھی کی جہاں پیٹر مینوبل جیسے دوست اور رفاقت کی معنویت سمجھنے والے امریکن سے ملاقات ہوئی۔ ذہنی ہم آہنگی نے قرب و بُعد کے سارے فاصلے مٹا کر انھیں وہ یک سوئی عطا کی جو بڑی مشکل سے ملتی ہے۔ بی اے کے بعد ظہیر انور نے بی ایڈ کیا اور پریسی ڈنسی مسلم ہائی اسکول میں لکچرر ہو گئے۔ ۱۹۸۱ء میں ایم اے کیا۔ اس تعلیمی سفر میں بھی وہ شاعری، افسانہ اور ڈرامہ سے جُڑے رہے۔ رفتہ رفتہ شاعری اور افسانہ نگاری چھوڑ کے وہ صرف ڈرامے کے آدمی ہو کر رہ گئے اور اس کی روشنیوں میں ایسے کھوئے کہ آج بھی وہی روشنیاں ان کے اردگرد ہالے کی شکل میں نظر آتی ہیں۔

ظہیر انور کا پہلا ڈرامہ جو انھوں نے بحیثیت اداکار اسٹیج کیا وہ ان کے کالج کے ساتھی ابدیپ کمار بنرجی کے ذریعہ لکھا ہوا تھا۔ یہ ڈرامہ ۱۹۷۱ء میں سرلا ہال میں اسٹیج کیا گیا۔ اس کے بعد ظہیر انور نے اپنا پہلا المیہ ڈرامہ "انتظار اور ابھی" پیش کیا جسے مسلم انسٹی ٹیوٹ نے پروڈیوس کیا۔ اس ڈرامہ کی ہدایت کے ساتھ ساتھ ظہیر انور نے بطور اداکار بھی اس میں اہم رول ادا کیا۔ یہ اردو کا پہلا سنجیدہ ڈرامہ تھا جو مغربی بنگال میں پہلی بار اسٹیج کیا گیا۔ انگریزی اور اُردو اخبارات نے اس ڈرامہ

کی کافی تعریف کی۔ ۱۹۸۰ء، ۱۹۸۱ء میں "انگاروں کا شہر" اسٹیج ہوا اور مغربی بنگال میں اُردو ڈرامے کی بنیاد مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی۔ لوگ اُردو ڈرامے کی طرف راغب ہوئے اور اخبارات نے تبصرہ کرکے نہ صرف ان ڈراموں کی پذیرائی کی بلکہ ظہیر انور کے فن کو وہ اعتماد بخشا جس سے "صلیب" اور "فرانسیسی ڈرامے" عبارت ہیں۔

دشتِ آدم — کلکتہ۔ انسانوں کا وہ جنگل جہاں بے چہرگی کے غبار میں ہر شخص گم ہے۔ وہاں کی زندگی جو ایک طرف بے حد بجلجی، گدلی اور گھناؤنی ہے اور دوسری طرف جس کے نیون سائن فائیو اسٹار ہوٹلوں سے لے کر بڑے بڑے شاپنگ سنٹر اور جگمگاتے ایوانوں تک قطار در قطار پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے درمیان عام آدمی کیا ہے؟ کیوں ہے؟ اور اس کی شناخت کیا ہے؟ یہی سب ظہیر انور کے ڈراموں کے وہ سوال ہیں جو ذہن و دل پر دستکیں دیتے ہیں۔ ظہیر انور نے کسی آؤٹ سائڈر کی طرح ان منظروں کو نہیں دیکھا اور نہ لاحاصل سمجھ کر کسی طرح فرار کیا بلکہ وہ ڈوب ڈوب کر اس کا ساگر منتھن کرتے رہے۔ وہ اس زندگی کی زہرناکی اور کڑواہٹ کو قطرہ قطرہ سمیٹ کر اسٹیج کے اندھیروں سے روشنی تک اس لیے پھیلاتے رہے کہ ہم سب اس دائرۂ حیات میں اپنے وجود کے بے وجود ہونے کی تمیز کر سکیں اور یہ سمجھ سکیں کہ ہم آخر اس زندگی کا حاصل ہیں یا لاحاصل۔ کیا ہماری زندگی کا یہی مصرف ہے کہ "پروردگارِ زمین" اپنی لذتوں کے لیے اس کو جب چاہیں اپنی مرضی سے استعمال کریں۔ ہم اس کثافت زدہ سماج میں تازہ اور کھلی ہوا کی بھی آرزو نہ کر سکیں۔ زندگی میں ہر طرح کے رنگ بھرنے کے باوجود ہماری زندگی کتنی بے رنگ ہے، اس پر محرومیوں کے کتنے غلاف چڑھ چکے ہیں، وہ درد کے کتنے خانوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ یہ جاننے کے باوجود ہم کوئی احتجاج نہ کر سکیں کچھ نہ کہہ سکیں اور اگر کہیں ——

"آپ کی زندگی کا ایک حصّہ، وہ درد جو ہمارے اس عہد کو لپیٹ میں لے چکا ہے، وہ تنہائی جو آپ کے سینے کے اندر بول اٹھتی ہے۔ یہی سب کچھ اور بہت کچھ اس گھنی آبادی میں کم ہی ایسے لوگ ہیں جنھوں نے درد اور تنہائی کو نہ سہا ہو۔ بس ہمارا یہی منشا ہے کہ آپ تک اس درد کی تصویر پہونچا دیں۔"

تو کتنے لوگ ظہیر انور کی طرح اس درد کو "انگاروں کا شہر" بنا سکتے ہیں؛ اسی طرح "انتظار اور ابھی" میں سماجی نابرابری، ریاکاری اور ناانصافی کی وہی کہانی ہے اور وہی ڈرامہ ہے جس کے چلتے پھرتے کردار ازل سے زندگی کے اسٹیج پر آتے جاتے رہے ہیں۔ ادیناش جیسے بہت سے کردار ہمیں قریب اور دور سے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن ہماری یہ بے حسی ہے یا مجبوری کہ جانتے ہوئے بھی ہم ان کی پرچھائیوں سے بھاگتے ہیں۔ حالاں کہ وہ ہماری اپنی ہی پرچھائیاں ہیں۔ "انتظار اور ابھی" کا ادیناش ہم میں سے کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ وہ کوئی بھی ہو مگر اس کی یہ آواز ——

"آنریبل کارل مارکس، کارل مارکس۔ اس گھنی داڑھی اور بوڑھی آنکھوں نے وہ نہیں دیکھا جو میں نے دیکھا ہے۔ بتاؤ کیا تم نے سیاست گردوں کو معصوم انسانوں کا خون چوستے دیکھا ہے، نہیں دیکھا ہے۔ بتاؤ کیا تم نے مذہب کے نام پر ہزاروں انسانوں کا قتلِ عام دیکھا ہے — نہیں دیکھا، تم نے تو صرف باتیں کی ہیں۔ CLASS LESS SOCIETY ہا ہا ہا، کان کھول کر سُن لو، سماج کی دیواریں کل بھی تھیں، آج بھی ہیں اور کل بھی رہیں گی۔ Class less Society یہ خواب تمہارے ساتھ گیا، آج بھی سچائی کے ماتھے پر دھول اُڑتی ہے، سمجھے — کہیں کچھ نہیں، ہاں کچھ نہیں۔"

صحرا میں اسی اذان کی طرح ہے جس کی بازگشت فرسودہ سماج کے آہنی شکنجوں میں جکڑے ہوئے کمزور آدمی کی فریاد بن جاتی ہے۔ وہ زنجیروں کو پگھلا تو نہیں سکتا مگر اتنا تو کر سکتا ہے کہ دوسروں کو ان زنجیروں کے توڑنے کی بشارت دے سکے۔

"سحر ہونے تک" میں بھی ظہیر انور نے وہی سب کہنے کی کوشش کی ہے جو "انگاروں کا شہر" اور "انتظار اور ابھی" میں کہہ چکے ہیں لیکن فارم، تکنیک اور اندازِ تحریر میں تنوع ہے۔ "سحر ہونے تک" کا ایک کردار گوتم دوسرے کردار رشید سے اسیری خانہ میں کہتا ہے:

"بہت دُکھ ہوتا ہے دوست، بہت دُکھ ہوتا ہے
ہر طرف اونچی نیچی دیواریں، ہر طرف چھوٹے بڑے
کا بھید بھاؤ، ہر طرف آگ اور خون کا کھیل، ہر طرف
اندھیرا ہی اندھیرا ..... کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ ہم سب
اپنے بنائے ہوئے اصولوں کے بھنور میں کسی طرح
گرفتار ہیں۔ ہم سب اپنی تیار کی ہوئی صلیب پر چڑھ گئے
ہیں ...... (خموشی) ..... لیکن پھر بھی مایوسی کو زندگی
میں جگہ نہیں دینا۔ ہر شخص اپنی جگہ ایک انقلاب
بن سکتا ہے"

اصل میں ہر آدمی کی روح میں متحرک اس اسپارٹیکس کی آواز ہے جو مصلوب ہوکر بھی زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔

ان کے دوسرے مجموعے "صلیب" میں صرف دو ڈرامے "قیدی" اور "صلیب" ہیں۔ اس مجموعے کے دونوں ڈرامے زیادہ تیز دھار ہیں کیونکہ ان میں جا بجا طنز کے وہ نشتر چھپے ہوئے ہیں جو روح کے اندر اتر کر اس کرب ناک چیخ میں بدل جاتے ہیں جو کسی نہ کسی احتجاج کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ اب یہ بات اور ہے کہ وہ احتجاج "موت کی ایک ٹھٹھرتی ہوئی رات یا زندگی کی آگ میں جلتا ہوا دن بن جائے"

(قیدی ڈرامہ کی دو تبدیل شدہ سطریں)

"صلیب" زندگی کے بوجھ سے پستے ہوئے ایک عام آدمی کی کہانی ہے جو ہمارے اس پورے سماج کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ یہ ہر جگہ، ہر شہر اور ہر قریے کی کہانی ہے۔ اس کہانی کا کردار مرزا ہر گلی ہر موڑ پر زندگی کی صلیب اُٹھائے ہوئے ہمارے سامنے سے روز گزرتا ہے۔ ہم اسے اس لیے نہیں دیکھتے کہ ہم خود مصلوب ہیں جھوٹ اور ریاکاری کے درمیان ہر مصلوب مرزا ہے اور وہ مرزا ہم ہیں۔ اس کی یہ خود کلامی:

"اے میرے دل تو ناامید ہوگیا، تو زخمی پرندے
کی طرح خوف سے کیوں سسک رہا ہے، نہیں تو اکیلا
نہیں۔ ہاں اکیلا نہیں۔ یہ دُنیا یہ آگ، خون، جھوٹ اور
ریاکاری سے بھری دنیا — مرزا تو بھول گیا تھا (آواز
تیز کرتے ہوئے) بھول گیا تھا کہ یہ دُنیا اپنے خلق کرنے
والوں کو، اپنے رہنما اور پیغمبروں کو جلا دیتی ہے۔ تو اکیلا
نہیں مرزا۔ مرزا تو اکیلا نہیں ہے۔ تیرے پیچھے تاریخ
چلی ہے۔ دیکھ۔ دیکھ تو دیوار پر عیسیٰ کی تصویر کافی ہے
(ہاتھ اور جسم سے صلیب بناتے ہوئے) ہاں میں اکیلا
نہیں، یہ سارا شہر میرے اندر اتر چکا ہے، یہ لوگ،
یہ گلیاں، یہ چہرے۔ جاؤ مجھے تنہا چھوڑ دو، میں —
اکیلا نہیں (صلیب بنا کر ٹھہر جاتا ہے)"

یہ ہر اس آدمی کی آواز ہے جو اس معاشرے کی گندگی قبول نہیں کرتا۔ وہ زندگی بھر سچ کی صلیب پر تڑپتا اور سسکتا رہتا ہے کیوں کہ اس کے اردگرد جو سچ ہے وہ بھی اسی کی طرح مصلوب ہے۔

"فرانسیسی ڈرامے" ظہیر انور کا تیسرا مجموعہ ہے جس میں ان کے ترجمہ کیے ہوئے دو ڈرامے "انصاف" اور "سیلم کی شیروانی" ہیں۔ پہلا ڈرامہ البیر کامیو اور دوسرا ڈرامہ جارجے فیدو کا ہے۔ فرانسیسی ڈراموں کے یہ ترجمے بھی ظہیر انور کی ذکاوت اور فن کارانہ مہارت کی وجہ سے اُردو ڈرامے میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ترجمہ ویسے ہی مشکل فن ہے نہ کہ اُردو اسٹیج کو مدنظر رکھتے ہوئے ترجمہ کرنا۔

ظہیر انور کے ڈراموں پر لکھتے ہوئے میں نے عمداً بہت سی باتوں سے گریز کیا ہے لیکن اس کی وجہ صرف اتنی ہے کہ بہت سے رسائل اور اخبارات میں ان پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور ہر لکھنے والے نے تفصیلی گفتگو کی ہے۔

میں نے تو صرف اس پس منظر کو سامنے رکھا ہے جو ڈرامہ نگار ہدایت کار ظہیر انور کے ڈراموں کی داخلی اور باطنی سطح پر منظر سے منظر نامے تک تیرگی کی پرچھائیوں سے نبرد آزما ہے۔

□□

ماخذ:

۱. انگاروں کا شہر ۲. صلیب
۳. فرانسیسی ڈرامے (ظہیر انور)

ضمیر حسین کاظمی

پریاگ اِک شہر ہے عالم میں انتخاب

ہندستان کی دو مقدس دریاؤں گنگا اور جمنا کے سنگم پر اور دونوں کے درمیان آباد الٰہ آباد عہدِ عتیق سے لے کر مغل بادشاہ اکبر اعظم کے دور حکومت تک پریاگ کے نام سے موسوم تھا۔ ایک قدیم روایت کے مطابق مندرجہ دریاؤں کے کے درمیان زیر زمین بہنے والی سرسوتی نامی ندی بھی تھی جو سنگم تک بہتی تھی۔ اس وجہ سے اس بستی کو تربینی یا تروینی بھی کہتے ہیں۔ اس روایت سے متاثر ہو کر اردو کے مشہور شاعر شیخ امام بخش ناسخ نے ایک شعر کہا ہے:۔

تین تربینی اور دو آنکھیں میری
اب الٰہ آباد بھی پنجاب ہے

ماضی بعید کی روایتوں کے مطابق پرماتما کے ایک اوتار برہما جی نے جب کائنات کو خلق کیا تو اسی مقام پر عالمی ماحول کو مختلف قسم کی آلودگیوں سے پاک و صاف کرنے کے لئے مہایگیہ کیا تھا۔ اسی سبب سے اس کا نام پریاگ یعنی پاک و صاف جگہ رکھا گیا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ زمانہ قدیم میں پریاگ ایک عظیم تعلیمی مرکز تھا بھردواج نامی ایک مہاتما نے یہاں ایک آشرم قائم کیا تھا جہاں تقریباً دس ہزار طالب علموں کو درس دیا جاتا تھا اور وہیں ان کے قیام و طعام کا بھی انتظام رہتا تھا۔ رامائن میں درج ایک بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنے زمانۂ بن باس میں شری رام چندر جی سیتا جی اور لکشمن جی نے بھی اسی آشرم میں قیام کیا تھا لیکن بھردواج جی کے اصرار کے باوجود کہ وہ حضرات یہیں ۱۲ سال تک مقیم رہے۔ رام چندر جی اپنے والد راجہ دسرتھ جی کے حکم کی تعمیل کرنے کے لئے جنوبی ہند کے گنجان جنگلوں کی طرف چلے گئے۔

اس شہر کی اہمیت اس وقت دوبالا ہو گئی جب ماگھ میلے کے موقع پر تقریباً پانچ سو سال قبل مسیح مہاتما گوتم بدھ یہاں تشریف لائے اور اپنے مذہب کا پرچار کیا۔ ان کے انتقال کے تین سو سال بعد ہندوستان کے عظیم المرتبت شہنشاہ اشوک نے اس مقام کو مختلف متوں کے علماء کے اجتماع اور اشوک استمبھ نامی ستون کی تعمیر کے لئے منتخب کیا۔

ہندستان کی مقدس ترین جواہر مالا میں پریاگ سب سے زیادہ بیش قیمت ہیرا ہے پرانوں کے مطابق جب سب زیارت گاہوں کو ترازو کے ایک پلے اور دوسرے میں پریاگ کو رکھا گیا تو موخرالذکر کا پلہ بھاری رہا۔ متسیا پران میں پریاگ کو تیرتھ راج کہا گیا ہے اور اس کی تعریف میں ایک قصیدہ بھی شامل ہے جس میں اس کو زیارت گاہوں کا سرتاج قرار دیا گیا ہے اسی قصیدے کے مطابق یہاں سورج دیوتا اور تیاگی جاہ نو کی شکیل و جمیل بیٹیاں گنگا اور جمنا انہیں سج دھج دکھاتی ہیں اور اس عظیم تیرتھ استھان کے سر پر لافانی اور متبرک سبز پوش برگد کا شاخ دار درخت سایہ فگن ہے۔

یہاں ہر سال ماگھ (جنوری و فروری) کے مہینے میں ہونے والے دنیا کے سب سے بڑے نہان میلے کی اہمیت اور تعریف میں ہندستان کی روایات بھری پڑی ہیں۔ ہر بارہویں سال اور ہر چھٹے سال ہونے والے عظیم الشان کے تہوار کو بالترتیب کمبھ اور اردھ کمبھ کہتے ہیں جبکہ اس مقام کی اہمیت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ ان موقعوں پر رنگ برنگ لباسوں میں ملبوس اور طرح طرح کی زبان بولنے والوں کا ایک جم غفیر نہ صرف ملک کے ہر گوشے بلکہ دنیا کے مختلف ممالک سے جوق در جوق آکر جمع ہوتا ہے۔ سادھوؤں سنتوں کے رنگ رنگ اکھاڑے جو ملک کے مختلف حصوں سے یہاں جلوس کی شکل میں آتے ہیں اپنے میں ایک خاص کشش رکھتے ہیں۔

کمبھ ارت یا آب حیات سے بھرے ہوئے گھڑے کو کہتے ہیں جسکو دیوتاؤں اور دیوزادوں نے مل کر سمندر کو متھ کر نکالا تھا۔ سمندر سے نکلتے ہی دونوں طاقتور گروہوں میں امرت پینے کے لئے کشمکش شروع ہو گئی دیوتا گھڑے کو لے کر فضا میں اڑنے لگے اور دیوزادوں نے ان کا تعاقب کیا اس بھاگ دوڑ میں آب حیات

چھلک کر ہندستان کے جا مقامات ناسک، اجین، ہردوار اور پریاگ میں گرا۔ اس مشہور روایت کو مد نظر رکھتے ہوئے انھیں مقامات پر باری باری سے کمبھ اور کمبھ کے میلے لگتے ہیں ان موقعوں پر دیکھے جانے والے روح پرور مناظر کا بیان رگ وید، رامائن اور مہابھارت میں پایا جاتا ہے۔ مہاکوی کالیداس اور چینی سیاح بلدان سانگ وغیرہ نے ان کو قلم بند کیا ہے۔ اردو شعرا بھی ان متبرک مقامات خصوصاً پریاگ کی مدح سرائی میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔

اس مقام کا تقدس ہندستان کے مشہور و معروف رشیوں اور منیوں مثلاً دادا بشی، برلیش چندر، واشِشٹھ، وشوامتر، آری شنکر آچاریہ اور چیتیہ وغیرہ کو بار بار یہاں کھینچ لاتا تھا۔

جیسے جیسے ماضی کا دھند کا چھٹنے لگا اور عالم انسانیت میں تاریخ کی روشنی پھیلنا شروع ہوئی تو اس مقام پر گیانی، واتی و سنجی، بودھ سمراٹ برشی وردان کو ملک کے مختلف مذاہب و متوں کے علماء کی مجلس مباحثہ کراتے اور خاص و عام میں اپنی دولت تقسیم کرتے دیکھا گیا۔ مذہبی مباحثے اور جود و سخا کے اس عظیم الشان دمن یگیہ کا منظر ہوان سانگ نے ۶۴۴ء میں قلم بند کیا تھا۔

اس شہر کی مذہبی اور مرکزی اہمیت کا اندازہ کرتے ہوئے مغل شہنشاہ اکبر نے یہاں ۱۵۷۴ء میں اپنے ایک نو رتن مہاراجہ بیربل کی زیر نگرانی سنگم پر ایک مضبوط قلعہ تعمیر کرانے کا حکم دیا اور صوبائی دار الحکومت کو کڑے سے الہ آباد منتقل کر دیا۔ اس کے علاوہ اس مقام کی مذہبی عظمت کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کا نام الہ باس رکھا یعنی اللہ کے رہنے کی جگہ جو بعد میں الہ آباد کہا جانے لگے لیکن دونوں الفاظ ہم معنی ہیں۔

اکبر کے بیٹے و جانشین جہانگیر نے جو یہاں کا صوبہ دار تھا، الہ آباد میں ۱۶۰۸ء میں ایک نہایت پر فضا باغ بنوایا اور اس کو ایک سرنگ کے ذریعے قلعے سے ملا دیا۔ اس باغ کو جہانگیر کے بدقسمت بیٹے خسرو کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ رنگین مزاج باپ نے اپنے نیک مزاج اور لائق بیٹے کو قتل کر کے اسی باغ میں دفن کرا دیا تھا کیونکہ اکبر جہانگیر کی عیش پرستی سے عاجز آ کر خسرو ہی کو اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا۔ شہزادے کے قتل کے بعد اس کی ماں شاہ بانو نے خودکشی کر لی دونوں ماں بیٹے کی قبروں پر نقش و نگار سے مرصع اور عمر خیز فارسی اشعار سے کندہ سنگ سرخ کے قابل دید مقبرے بنے ہوئے ہیں۔ ایک اور گنبد دار مقبرہ خسرو کے مقبرے کے متصل بنا ہوا ہے اس میں کسی قبر کا نشان نہیں ہے کیونکہ

یہ اس کی بہن نثار بیگم نے اپنے دفن کے لیے بنوایا تھا لیکن وہ اپنے دادا اکبر کے سکندرہ (نزد آگرہ) میں تعمیر شدہ مقبرے میں دفن ہے۔ شاہ بیگم کے مقبرے کے مغرب جانب ایک اور سادہ مقبرہ ہے۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں اکبر ثانی شاہ دہلی کے بڑے بیٹے مرزا جہانگیر کو دفن کیا گیا تھا لیکن بعد میں اس کی لاش نکال کر دہلی میں حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار کے صحن میں دفن کر دی گئی۔ اس باغ میں داخل ہونے کے لیے پرانا راستہ ایک شاندار پھاٹک کے ذریعے ہے جو شیر شاہ سوری روڈ یا گرینڈ ٹرنک روڈ پر بنا ہوا ہے۔ اس پھاٹک پر یکہ و تانگہ والے اپنے گھوڑوں کی سلامتی کے لیے نعلیں جڑتے رہتے ہیں کیوں کہ ان لوگوں کی پشتینی روایت کے مطابق خسرو اپنے قتل کی سازش سے واقف ہوتے ہی اپنے شیر دل گھوڑے کو دوڑاتے ہوئے مقفل پھاٹک کو پار کر کے فرار ہو گیا تھا۔ لیکن کافی دور نکل جانے کے بعد بھی جہانگیر کے کسی مطیع راجہ کے ہاتھوں گرفتار کر کے پھر خسرو باغ کے اندر مقید کر دیا گیا تھا جہاں اس کو زہر دے کر ابدی نیند سلا دیا گیا۔ اسی کے مقبرے کے بائیں ایک مستطیل چبوترہ بنا ہوا ہے جس کو عوام الناس خسرو کے اسی وفادار اور بہادر گھوڑے کی قبر بتاتے ہیں۔

ملک کو انگریزوں کے پنجے سے چھڑانے کے لیے الہ آباد سے بار بار تحریکیں چلائی جاتی رہیں جن کی وجہ سے پریاگ راج کی سرزمین جانبازان وطن کے خون سے رنگین ہوتی رہی۔ سب سے پہلے ۱۸۵۷ء میں سرفروشان وطن مولوی سید لیاقت علی اور الہ آباد کے صدر الصدور قاضی سید محسن علی مرحوم (جو راقم الحروف کے جد امجد تھے) کی قیادت میں اپنی جانیں ہتھیلیوں پر لے کر جذبۂ حب الوطنی میں سرشار کرنل نیل کی توپوں اور آتشیں اسلحہ سے مسلح تربیت یافتہ فوج کے مقابلے میں چند پرانی بندوقوں اور دھار دار اسلحے لے کر صف آرا ہو گئے لیکن بے مثال دلیری سے جنگ کرنے اور پانچ ہزار انسانی جانوں کی قربانیاں دینے کے باوجود مجاہدین وطن کو شکست ہو گئی۔ مولوی لیاقت علی صاحب تو کسی صورت سے الہ آباد سے نکل کر مرہٹہ سردار نانا صاحب سے کان پور میں جا ملے لیکن قاضی محسن علی صاحب میدان جنگ میں بری طرح زخمی ہو گئے جہاں سے ان کا ایک وفادار ملازم کسی طرح ان کو اپنے

گھوڑے پر بٹھا کر نکال لایا اور ان کی کوٹھی واقع قاضی گنج بخشی بازار کے تہ خانے میں چھپا دیا جہاں ان کے زخموں کا علاج نہایت رازداری سے ہوتا تھا لیکن بدقسمتی سے ایک دن کسی غدارِ وطن نے ان کے مسکن کی اطلاع کرنل نیل کو دے دی، بس پھر کیا تھا، اس فدائے قوم کو گرفتار کر کے قلعہ کے اندر تختۂ دار پر چڑھا دیا گیا۔ اور ۲۴ سالہ نوجوان قاضی صاحب نے کلمۂ حق پڑھتے ہوئے اور اپنے وطن کی آزادی کا نعرہ لگاتے ہوئے پھانسی کا پھندہ چوم لیا۔ ظالم اور سفاک کرنل نیل نے ان کی لاکھوں روپے کی جاگیر بھی ضبط کر لی اور ان کے اہلِ خانہ کو محتاج کر دیا۔ ان کی عظیم قربانی کی یاد محلہ بخشی بازار، ان کے والد قاضی سید سرفراز علی مرحوم کی بنوائی ہوئی مسجد قاضی صاحب اور محلہ قاضی گنج اب بھی تازہ کرتے ہیں۔

جس وقت قاضی صاحب کو گرفتار کر کے لے جایا جا رہا تھا، ان کے محلے کے پچاس معصوم لیکن شیر دل بچے انگریزوں کے خلاف نعرے لگاتے ہوئے چلنے لگے۔ جب وہ بچے بار بار مارے پیٹے جانے کے باوجود نہیں بھاگے تو شقی القلب نیل نے شہر کی موجودہ کوتوالی کے پاس لگے ہوئے نیم کے درختوں پر سب کو پھانسی پر چڑھا دیا۔ اس دردناک واقعے کا ذکر ایڈورڈ تھامسن نامی ایک انگریز مورخ نے اپنی کتاب "دی آدر سائڈ آف دی میڈل" (تصویر کا دوسرا رُخ) میں بڑے رقت انگیز پیرایے میں کیا ہے۔

اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اس مقدس اور تاریخی شہر کے باشندے صبحِ آزادی تک تحریکِ آزادی بڑی شد و مد کے ساتھ چلاتے رہے اور اس کے لیے قربانیاں دیتے رہے۔ شاید اسی سبب سے یہ فخر و شرف اسی شہر کو حاصل ہے کہ اس نے آزاد ہند کی حکومت کو پانچ وزرائے اعظم دیئے۔

صدیوں سے الہ آباد علم و ادب، فنونِ لطیفہ اور آرٹ کا گہوارہ بھی رہا ہے۔ یہاں کی پرانی تاریخوں میں آچاریہ سوامی رامانند کا ذکر ملتا ہے جنہوں نے آنند بھاشی، شری بھگوت گیتا بھاشی، شری رام چرن، پدم دت وغیرہ جیسی مشہور کتابیں تصنیف کیں۔ الہ آباد سے شمال و مغرب میں ۴۷ کلو میٹر پر واقع ہے جہاں کے ایک باشندے [illegible] پراچین پریاگ کے مقبول ترین

شاعر تھے۔ ان کے روح پرور بھجن آج بھی سادھو اور عوام گاتے ہیں۔

انگریزی دورِ حکومت میں ایک بار پھر الہ آباد کی اہمیت بڑھ گئی۔ ۱۸۵۸ء میں لارڈ کیننگ نے انگلینڈ کی ملکہ وکٹوریہ کی جانب سے بحیثیت گورنر جنرل ہند دریائے جمنا کے کنارے واقع مینٹو پارک میں عام معافی کا اعلان کیا اور الہ آباد کو صوبہ ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کا دارالحکومت قرار دیا۔ اس کے قبل صوبائی راجدھانی آگرہ تھا۔ ۱۸۶۰ء میں آگرہ سے صوبائی ہائی کورٹ بھی الہ آباد منتقل کر دیا گیا۔ ۱۸۷۴ء میں یہاں شمالی ہند کی پہلی یونیورسٹی قائم کی گئی اس کے بعد سے الہ آباد ملک کی سماجی، ادبی اور سیاسی زندگی میں ایک کلیدی رول ادا کرتا رہا ہے۔

جدید ہندستانی ادب اور صحافت کی ترویج و ترقی میں بھی الہ آباد نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ سرسوتی نامی رسالہ جو پنڈت مہاویر پرشاد دویدی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا اور ہندی دنیا میں بڑا مقبول تھا۔ اردو ادب کی عظیم ہستی سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی نے اپنی طنزیہ لیکن اصلاحی اور قوم پرستانہ شاعری سے اردو دنیا میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔

موجودہ زمانے میں الہ آباد نے ہندی کے مرکز کی حیثیت سے ایک اہم مقام حاصل کر لیا ہے۔ ممتاز ہندی شعرا مثلاً نرالا، سمترانندن پنت، بچن، مہادیوی ورما، شکنتلا سروجھیا وغیرہ کا تعلق اسی شہر سے ہے۔ ان لوگوں نے ہندی شاعری کو اپنے اشعار سے مالا مال کیا ہے۔

ہندی ادب کا گہوارہ ہونے کے علاوہ الہ آباد نے اردو ادب کی ترقی میں بھی ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ اکبر الہ آبادی کے علاوہ یہاں نوح ناروی، رگھوپتی سہائے فراق، ڈاکٹر اعجاز حسین، بحر العلوم پروفیسر سید احتشام حسین، ڈاکٹر سید رفیق حسین، ڈاکٹر محمد عقیل رضوی، پروفیسر محمد ضامن علی، ڈاکٹر جعفر رضا، ڈاکٹر مجاور حسین رضوی اور ڈاکٹر سید فضل امام وغیرہ نے اس میٹھی زبان میں اور بھی مٹھاس بھر دی۔

انگریزی دورِ حکومت میں سیاست کے میدان میں بڑی بڑی نامور اور عالی مرتبت ہستیاں پیدا ہوئیں مثلاً پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو، سر تیج بہادر سپرو، پنڈت مدن موہن مالوی، مولانا سید محمد راشد فاخری عرف شاہ فاخر، علامہ سید محمد شاہد فاخری، مولوی سید حیدر مہدی

وکیل، پنڈت سندر لال، بابو پرشوتم داس ٹنڈن، سالگ رام جیسوال، نواب آغا علی خاں، سید یوسف حسین عرف یوسف کانگریسی، چودھری نونہال سنگھ سریواستو، شاہ ناصر فاخری وغیرہ اور ہندوستان کے پانچ وزرائے اعظم وعظیم قومی رہنما پنڈت جواہر لال نہرو، شری لال بہادر شاستری، شریمتی اندرا گاندھی، شری راجیو گاندھی اور راجہ وشوناتھ پرتاپ سنگھ اسی شہر میں پیدا ہوئے یا پروان چڑھے۔ ان کے علاوہ اس شہر و ضلع میں اور بھی بہت انمول رتن پیدا ہوئے جن کے حالات زندگی اور کارنامے لکھنے کے لیے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔

الہ آباد از منہ قدیم، وسطی اور جدید فن تعمیرات اور تہذیب و تمدن کا ایک حسین امتزاج ہے۔ یہاں پرانی و نئی عمارتوں، باغوں، پارکوں، عبادت گاہوں، درسگاہوں، آشرموں، درگاہوں، شاندار بنگلوں اور ہوٹلوں کی کمی نہیں ہے۔

جائے عبادت میں سب سے زیادہ قدیم اور اہم پاتال پوری مندر ہے جو اکبر کے قلعے کے اندر ہے۔ عہد عتیق کی اس یادگار میں دیوتاؤں اور دیویوں کی مورتیاں ہیں۔ اس مندر میں شری رام چندر جی کی تشریف آوری اس کی قدامت کا ثبوت ہے۔ اس عبادت گاہ کے قریب برگد کا وہ مقدس درخت ہے جس کے بارے میں ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ یہ درخت صبح ازل کو یہاں نمودار ہوا تھا اور شام ابد تک لگا رہے گا۔ فی الحال اس جگہ درخت کا تنا باقی رہ گیا ہے۔

شاید ہی کوئی یاتری بھردواج آشرم کے درشن کیے بغیر واپس چلا جاتا ہو۔ اسی آشرم میں جب رام چندر جی نے اجودھیا سے بن باس ملنے کے بعد چند یوم کے لیے قیام کیا تھا تو اس زمانے میں یہ آشرم دریائے گنگا کے کنارے واقع تھا لیکن اب دریا دور چلا گیا ہے۔ اس مقام پر جب بھردواج نے رام چندر جی کو پورے زمانۂ بن باس گزارنے کے لیے رضامند کرنے کی کوشش کی تھی تو ان دونوں کے درمیان جو جذباتی گفتگو ہوئی تھی اس کو مہاکوی والمیکی نے اپنی رامائن میں نظم کیا ہے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ موجودہ الہ آباد یونیورسٹی دنیا کی قدیم ترین دانش گاہ کے نزدیک واقع ہے۔

اکبر کا تاریخی قلعہ ۱۵۸۳ء میں سوا چھ کروڑ روپے کی لاگت سے تعمیر ہوا۔ سنگم کے کنارے تعمیر شدہ اس پرشکوہ قلعے میں بارہ پر فضا باغیچے تھے۔ جن میں خوبصورت محل بنائے گئے تھے۔ ان عمارتوں میں سب سے زیادہ خوبصورت چہل ستون ہے۔ یہ سب عمارتیں نقش و نگار سے مرصع تھیں۔ اکبر کے عالم و فاضل وزیر اعظم نے اپنی تصنیف "اکبر نامہ" میں اس قلعہ کے حسن و جمال کا تذکرہ بڑے دلچسپ پیرائے میں کیا ہے لیکن بدقسمتی سے انگریزوں نے اس کے خدوخال کو برباد کرکے اسے ایک اسلحہ خانے میں تبدیل کر دیا۔ مغل دور کی یاد دلانے کے لیے اب بارہ دری یا زنانہ محل باقی رہ گیا ہے۔

قلعہ کے اندر اشوک کی لاٹ ہے، جس پر اشوک کے فرمان کندہ ہیں اسی کے ساتھ سمندر گپت کی فتوحات کے حالات، مہاراجہ بیربل کی ہندی تحریر اور جہانگیر کی تخت نشینی کے بارے میں مختصر حالات بھی کندہ ہیں۔ یہ اہم ستون ۲۴۲ سال قبل مسیح کا بتایا جاتا ہے۔ اس کی اونچائی ۳۵ فیٹ ہے۔ زیریں گولائی دو فیٹ گیارہ انچ اور بالائی گولائی ۲ فیٹ ۲ انچ ہے۔

الہ آباد یونیورسٹی میں دو بڑے شاندار ہال ہیں ایک شعبۂ سائنس بھی ہے جس کو وجیہ نگرم ہال کہتے ہیں۔ اسی کے قریب جگی لال کملا پت انسٹی ٹیوٹ آف سائنس کی شاندار عمارت ہے۔ دوسرے وسیع ہال کو سینٹ ہال کہتے ہیں جو شعبۂ آرٹس بھی ہے۔ اپنے قیام کے وقت سے لے کر آزادی کے بعد تیس سال تک یہ یونیورسٹی ہندوستان کی بہترین درس گاہ سمجھی جاتی تھی لیکن اب اس کو یہ فخر حاصل نہیں رہا۔

۱۰ر اگست ۱۹۴۲ء میں جب آل انڈیا نیشنل کانگریس نے اپنے بمبئی کے اجلاس میں انگریزی حکومت کے خلاف ہندوستان چھوڑو تحریک کا آغاز کیا تو مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، سردار پٹیل، مولانا ابوالکلام آزاد، رفیع احمد قدوائی اور بلبل ہند سروجنی نائیڈو وغیرہ سب عظیم قومی رہنما گرفتار کر لیے گئے جس کی وجہ سے پورے ملک میں بڑے زبردست ہنگامے برپا ہوئے اور انگریزوں کے خلاف بغاوت کی صورت پیدا ہو گئی جس میں الہ آباد یونیورسٹی کے طلبا پیش پیش تھے۔ نہتے نوجوانوں نے مسلح پولیس کا بڑی پامردی سے مختلف مقامات پر مقابلہ کیا۔ پولیس نے بڑی بے رحمی سے طلبا پر گولیاں چلائیں۔ سیکڑوں طلباء و نوجوان زخمی ہوئے اور

الدین [illegible] شہید ہو گیا جس کی یاد تازہ کرنے کے لیے یونیورسٹی [illegible] ایک سنگین مجسمہ بنا ہوا ہے۔

یہاں ایک ناقابل فراموش واقعہ کا ذکر مناسب ہوگا کہ اُس موقع پر کوتوالی میں اُس وقت کے ضلع مجسٹریٹ ڈکسن کے زیرِ صدارت ضلع انتظامیہ پولیس کی [illegible] نشست ہو رہی تھی۔ سب ڈپٹی کلکٹران، کپتان پولیس اور شہر کوتوال موجود تھے (اس زمانے میں کلکٹر کے بعد سب سے بڑا حاکم سٹی مجسٹریٹ ہوتا تھا) جلسہ ہو رہا تھا کہ اس وقت کا ٹنڈن نامی اینگلو انڈین سٹی مجسٹریٹ ایک سرفروش کی لاش پولیس دین میں لے کر کوتوالی سے آیا جس کو اس نے اپنی بندوق سے شہر کے گھنٹہ گھر کے پیچھے شہید کیا تھا۔ سٹی مجسٹریٹ نے بڑے فخریہ اور طنزیہ انداز میں تمام حکام کے سامنے انگریزی میں کہا کہ وہ ایک ہندوستانی غدّار کو مار کر اس کی لاش لے آیا ہے۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ راقم الحروف کے ایک عزیز ترین ہمسایہ اور انگریزی کے استاد سید امیر رضا صاحب ڈپٹی کلکٹر بڑے غصّے میں اُٹھے اور یہ کہتے ہوئے کہ "اے انگریزوں کے کتّے!" سٹی مجسٹریٹ پر جھپٹ پڑے اور اس کو ایک تھپڑ مار دیا۔ بیچ بچاؤ ہو جانے کے بعد موصوف نے فوراً اپنا استعفا لکھ کر ضلع مجسٹریٹ کو دے دیا۔

ضلع مجسٹریٹ ڈکسن انگریز ہونے کے باوجود نرم مزاج تھا۔ اس نے امیر رضا صاحب سے کہا کہ آپ سٹی مجسٹریٹ سے معافی مانگ لیجیے اور چھٹی کی درخواست دے کر اپنے مکان چلے جائیے جو رانی منڈی میں کوتوالی کے بالکل قریب واقع تھا۔ لیکن موصوف کسی صورت اس کے حکم کی تعمیل پر رضامند نہیں ہوئے۔ ضلع مجسٹریٹ نے امیر رضا صاحب کے والد سخت حسین صاحب اور حقیر کے نانا سید باقر حسین صاحب کو کوتوالی بلوایا (دونوں حضرات کوتوالی کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے) ان حضرات کے سمجھانے کے باوجود امیر رضا صاحب اظہار معذرت کرنے اور استعفا واپس لینے پر رضامند نہیں ہوئے۔ مجبوراً ڈکسن نے ان کو چار سال کی سزا سنا کر نینی مرکزی جیل بھجوا دیا۔ آزادی کے بعد اس وقت کے یو۔پی کے وزیر اعلا پنڈت گووند بلبھ پنت نے انھیں ایک اعلا عہدے پر فائز کیا اور سب بقایا تنخواہ بھی دلوا دی۔

عہد جدید کی الٰہ آباد کی شاندار اور قابل دید عمارتوں میں جو قابل ذکر [illegible] سنگ مرمر کی بنی ہوئی الٰہ آباد ہائی کورٹ کی پُرکشش عمارت [illegible]، نہرو خاندان کی سنگ مرمر سے تعمیر کی ہوئی رہائش گاہ آنند بھون، میوہال، سنگ سرخ کی بنی ہوئی چار شاندار کوٹھیاں جن میں اکاؤنٹنٹ جنرل، محکمۂ تعلیم، صوبائی پولیس کے دفاتر اور بورڈ آف ریونیو کی عدالت قائم ہیں، اس کے علاوہ ریلوے جنکشن کی عمارت بھی قابل دید ہے۔

الٰہ آباد میں ایک بڑی پُرکشش اور پُرفضا جگہ ہے جس کو پہلے کمپنی باغ اور اب چندر شیکھر آزاد پارک کہا جاتا ہے۔ ۱۸۵۷ء تک اس وسیع باغ میں میواتی پٹھانوں کی آبادی تھی، جس کو انگریزی فوجوں نے بڑی بے رحمی سے نذرِ آتش کر دیا تھا کیوں کہ وہاں کے ہزاروں باشندوں نے انگریزوں کو الٰہ آباد سے نکالنے کے لیے بڑی بہادری سے جنگ کی تھی اور اپنے وطن پر جانیں قربان کی تھیں آج بھی وہاں مسمار شدہ ایک مسجد اور چند قبریں ان شہیدانِ وطن کی یاد تازہ کرتی ہیں۔ انگریزوں نے اس پورے میواتی محلے کو ایک باغ میں تبدیل کر دیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک زمانے میں یہ نہایت خوبصورت باغ تھا۔

کمپنی باغ کے اندر الٰہ آباد کا عجائب گھر ہے جہاں الٰہ آباد ضلع کے بھیٹا اور کوشمبی وغیرہ روایتی اور تاریخی مقامات سے نکلے ہوئے زمانۂ قدیم کے آرٹ کے نمونے اور سکّے وغیرہ کے علاوہ پنڈت جواہر لال نہرو کی متعدد آرٹ کی چیزیں وغیرہ بھی رکھی ہوئی ہیں۔ اسی باغ میں شہر کا سب سے بڑا اور پُرانا کتب خانہ ہے جس کو پبلک لائبریری کہتے ہیں اس کی عمارت بھی دیدہ زیب ہے۔ یہیں سر گنگا ناتھ جھا ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور لوگوں کی تفریحِ طبع کے لیے پریاگ سنگیت سمتی بھی ہے جہاں اکثر رقص و موسیقی اور ڈرامے کے مظاہرے ہوتے رہتے ہیں۔

۱۹۳۱ء کے ایک پُرآشوب دن کو اسی باغ میں مشہور جاں نثارِ وطن چندر شیکھر آزاد نے پولیس کے ایک دستے سے اکیلے بڑی بہادری سے مقابلہ کرتے ہوئے اپنی جان مادرِ وطن پر قربان کر دی تھی۔ ان کی جائے شہادت پر ایک سنگین مجسمہ بنا ہوا ہے اور کمپنی باغ کو ان کے نام سے موسوم کر دیا گیا ہے۔

گنگا کے بائیں کنارے پر اکبر کے قلعہ کے مقابل اور لال بہادر شاستری پل کے پورب جانب جھوسی کی آبادی ہے۔ عہدِ عتیق کے مخطوطوں میں اس کا نام پرتشٹھان پور درج ہے جو ۳ ہزار سے ڈھائی ہزار سال قبل مسیح تک سورج ونشی خاندان کی راجدھانی تھا۔ گپت سمراٹوں کے دورانِ حکومت تک سورج ونشی خاندان کی حکومت قائم رہی اس کے بعد اس کا زوال

[illegible] ایک [illegible] کے [illegible] ایک [illegible]
[illegible] الہ آباد [illegible] ان کے نام پر کہا جاتا ہے۔ اس مقام
[illegible] بابا [illegible] اور عوام میں [illegible] کی [illegible]
[illegible] بہت [illegible] ہے کہ [illegible] اور [illegible] پر
[illegible] ہیں۔

سنگم [illegible] سے متعلق زمانۂ قدیم کے یہاں کئی مقامات ہیں۔ ان کے علاوہ یہاں ایک [illegible] شیخ محمد تقی شاہ کا مزار ہے جو مرجع خلائق ہے۔ [illegible] اس شہر سے متعلق بہت سی روایتیں اور کہانیاں مشہور ہیں۔ ان میں ایک کہاوت یہ بھی ہے کہ "اندھیر نگری چوپٹ راجہ ٹکے سیر بھاجی ٹکے سیر کھاجا"۔

الہ آباد شہر سے تقریباً ۶۰ کلومیٹر جنوب مغرب میں ایک تاریخی مقام ہے جس کو کوشمبی کہتے ہیں۔ پرانوں میں بھی اس کا ذکر ہے۔ شری رام چندر جی بھی یہاں آئے تھے۔ مہابھارت کے مطابق پانڈو برادران نے اپنی جلاوطنی کے زیادہ تر ایام یہیں گزارے تھے۔ گوتم بدھ بھی یہاں [illegible] بار [illegible] ہوئے اور اپنے مذہب کی تبلیغ کی۔ بدھ راجاؤں کے زمانے میں اس شہر نے بہت ترقی کی۔ کوشمبی سے برآمد شدہ آثار قدیمہ کی چیزوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس شہر کے باشندے دست کاری میں ماہر تھے۔ یہاں سے برآمد کیے گئے تانبے کے سکوں پر ایسے راجاؤں کے نام کندہ ہیں جن کا ذکر تاریخوں میں نہیں ملتا۔ اس کو دیکھنے کے لئے دور دور سے سیاح و مورخین آتے ہیں۔

الہ آباد سے تقریباً ۷۰ کیلومیٹر شمال مغرب میں کڑا کی قدیم آبادی واقع ہے جو مسلمانوں کے دور حکومت میں اکبر اعظم تک صوبائی حکومت رہا ہے۔ یہاں زمانۂ قدیم کے سناتن دھرمیوں کے مندر دریائے گنگا کے کنارے بنے ہوئے ہیں۔ مسلم عہد کی مسمار شدہ عمارتوں اور مقبروں کی بھی باقیات ہے۔ اسی مقام پر سلطان علاء الدین خلجی نے اپنے نیک دل چچا اور خسر سلطان جلال الدین خلجی کو، دہلی کے تخت پر قبضہ کرنے کی نیت سے دھوکہ دے کر قتل کروا دیا تھا۔ یہ دل خراش واقعہ دریا میں ایک کشتی پر ہوا تھا چونکہ جلال الدین خلجی (جو اس وقت سلطان ہند تھا) کا قلم شدہ سر دھارے میں بہہ گیا تھا لہٰذا اس جگہ کو آج بھی گم سرا کہتے ہیں۔ ہوس رانی

کا یہ [illegible] ہوا تقریباً [illegible] میں [illegible]

شہر کے گرد و نواح میں اور بھی مذہبی اور تاریخی مقامات ہیں جن کی تفصیل لکھنے کے لئے ایک کتاب کی ضرورت ہے۔ ان مقامات سے برآمد شدہ زیادہ تر نوادرات الہ آباد کے عجائب گھر میں رکھے ہیں جن کو دیکھ کر حیرت ہی نہیں ہوتی بلکہ اپنے پرکھوں کے کارناموں پر فخر محسوس ہوتا ہے۔

تقریباً تیس سال قبل دنیا کے صنعتی نقشے پر الہ آباد کا نام اُبھرنا شروع ہوا جب یہاں ایک مشہور محب وطن اور قومی رہنما و صنعت کار جناب مصطفےٰ رشید شیروانی مرحوم نے ہندوستان لائٹ انڈسٹریز کی بنیاد رکھی۔ ان کی اس قابلِ تقلید پیش رفت کے بعد ہی یہاں کئی بڑے اور چھوٹے کارخانے قائم ہوئے جن میں ضروریات زندگی کی مختلف چیزیں بننا شروع ہوئیں۔

شمالی ہند میں واقع الہ آباد ملک کے ہر حصے سے بذریعہ ریل و سڑک ملا ہوا ہے۔ اسی شہر کے درمیان سے ہندوستان کی سب سے لمبی شاہراہ گرانڈ ٹرنک روڈ گزرتی ہے جس کو ملک کے منتظم فرماں روا شیر شاہ سوری نے بنگال سے پشاور تک تعمیر کرایا تھا اس کے کناروں پر تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر مسافروں کی آسائش و حفاظت کے لئے بکثرت سرائیں بھی تعمیر کرائی تھیں جہاں ہندو مسلم باورچی اور فوجی سپاہی تعینات کیے تھے۔ آزاد ہند کی حکومت نے اس عظیم شاہراہ کا نام شیر شاہ سوری روڈ رکھ دیا ہے جو ایک مستحسن قدم ہے۔

الہ آباد ۱۸۵۸ء سے ۱۹۲۳ء تک اترپردیش کا دارالحکومت رہا لیکن چونکہ یہ شہر تحریک آزادی کا سب سے بڑا مرکز بن گیا تھا اور یہاں انگریزوں کے خلاف برابر بڑے بڑے مظاہرے ہوتے رہتے تھے لہٰذا انھوں نے یہاں سے صوبائی راجدھانی لکھنؤ منتقل کر دی۔ تاہم یہاں اب بھی ہائی کورٹ اور اکاؤنٹنٹ جنرل وغیرہ کے دفاتر قائم ہیں۔

اہلِ قلم معاونین سے پھر گزارش ہے کہ وہ اپنی تخلیقات صاف، خوش خط اور کاغذ کے ایک ہی طرف تحریر کریں اور صرف ادارے کو اصل کاپی ہی روانہ کریں۔ زیراکس کاپی ہرگز نہ بھیجیں۔

مختصر افسانہ

انور خان
۲۴/۳۸ شیخ زادہ ان قمرالدین اسٹریٹ۔ بمبئی ۴۰۰۰۰۸

سمندر اور لفظ

بوڑھے کو پہلے میں نے تب دیکھا جب ساحل پر لوگ ابھی آنے شروع نہیں ہوئے تھے۔ میں نے سوچا سمندر کے کنارے یونہی تفریح کے لیے آیا ہوگا اور بیٹھا سمندر کی لہریں گن رہا ہے۔ لیکن جب ساحل لوگوں سے پٹ گیا اور جلسہ شروع ہوا تو میں نے دیکھا وہ سب سے آگے کی صف میں بیٹھا ہوا ہے۔

اسٹیج تیار کرنا اور اس کی آرائش، کرسیوں اور مائیکروفون کا بندوبست میرا روزگار ہے۔ یہاں جتنے جلسے ہوتے ہیں ان کا انتظام میں ہی کرتا ہوں۔ حالاں کہ سمندر کے کنارے کرسیاں لگانا میرے نزدیک مہمل اور غیر اخلاقی فعل ہے۔ سمندر اور انسان کا رشتہ ایسا مقدس اور پُراسرار رشتہ ہے جسے ہم کبھی پوری طرح سمجھ نہیں سکتے۔

ساحل اتنا وسیع ہے کہ اس میں لاکھوں لوگ سما سکتے ہیں، اسی لیے شہر کے تمام بڑے اور اہم جلسے یہیں ہوتے ہیں۔ جب کسی جلسے کا اعلان ہوتا ہے لوگ کھنچے چلے آتے ہیں۔ انسانی سروں کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے لیکن جب میں جوشیلی، غصیلی، زہریلی تقریریں سنتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سمندر کے کنارے ہزاروں کیڑے مکوڑے جمع ہو کر سمندر کی آواز پر غالب آنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ میں اپنے کان بند کر لیتا ہوں اور مقررین کے چہروں پر نظر جماتا ہوں۔ جو بڑے مضحکہ خیز معلوم ہوتے ہیں یا جلسہ ختم ہونے تک سمندر کے پاس جا کر بیٹھ جاتا ہوں اور اس کی سرگوشیاں سننے لگتا ہوں۔

مقررین کے مضحکہ خیز چہروں سے اکتا کر میں نے مجمع کی طرف دیکھا تو بوڑھے پر نظر پڑی جو بڑے غور سے تقریریں سن رہا تھا۔ بوڑھے نے ایک چادر اوڑھی تھی اور ہاتھ میں ایک لاٹھی جو اس وقت اس کے گھٹنوں پر رکھی تھی۔ موٹی سی عینک کے پیچھے اس کا چھوٹا سا گول چہرہ اور گنجا سر کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ تقریریں سنتے ہوئے لوگ کبھی ہنستے، کبھی غصے میں آتے، کبھی نعرے لگاتے اور کبھی تالیاں بجانے لگتے۔ بوڑھا تعجب سے کبھی مقررین کو دیکھتا کبھی سامعین کو۔

تقریروں میں ایسی کیا خاص بات تھی؟ میں مقرروں کو سننے لگا۔ وہی باتیں تھیں، الفاظ کے جادوگر کرشمے دکھا رہے تھے۔ الفاظ کبھی کپاس کی طرح ہلکے ہو جاتے۔ مقرر انھیں دھنکتا تو روئی کے گالوں کی طرح فضا میں بکھرنے لگتے۔ پھر دوسرا مقرر آیا اور لفظوں کو رنگین غباروں کی طرح اُڑانے لگا۔ غبارے اڑے اور دیکھتے دیکھتے سب کی دسترس سے دور بادلوں میں غائب ہو گئے۔ پھر تیسرا مقرر آیا اور الفاظ پتھروں کی طرح برسنے لگے۔ پھر ایک شخص آیا۔ اس نے ہاتھ جوڑے اور کچھ کہا اور سب اُٹھ کر جانے لگے۔ ان کے چہرے بے رونق تھے اور بال بکھرے۔ بھوک ان کے چہروں پر لکھی تھی۔

میدان خالی ہو گیا۔ میرے آدمی سامان سمیٹنے لگے۔ تبھی میں نے دیکھا، بوڑھا اسی طرح بیٹھا ہوا ہے۔ کسی سوچ میں گم۔

"کیا بات ہے بابا، آپ گئے نہیں؟"

بوڑھے نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی بے بسی تھی۔

"چائے پیو گے؟" میں نے ملازم سے ساحل کی کسی دوکان سے چائے لانے کے لیے کہا۔

بوڑھے نے میری طرف دیکھا، جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو — پھر رُک گیا۔

"آپ کچھ کہہ رہے تھے بابا، رُک کیوں گئے؟" میں نے کہا "کہیے نا۔"

... رک گیا۔

... میں نے پوچھا۔

"یہ خریدار آپ کو کبھی کیوں نہیں؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"پتہ نہیں بابا۔ میں تو ترتیب قریب روز ہی ایسی تقریریں سنتا رہتا۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے لفظ بولنے والوں کے دل میں اترتے ہی نہیں وہ حلق میں ہی رہ جاتے ہیں۔ اس لیے سننے والوں کے دلوں تک نہیں پہنچتے۔"

"لیکن لوگ زندگی بھر کی جستجو میں چند لفظ لے تھے جو دلوں کو روشن اور روح کو سیراب کر دیتے تھے۔"

"یہ بھی تو وہی الفاظ دہرا رہے تھے۔"

"ہاں لفظ تو وہی تھے، لیکن ان کے پیچھے یقین کی وہ قوت کہاں تھی جو زندگی کے تجربے سے حاصل ہوتی ہے۔"

میں لاجواب ہو گیا۔

ملازم چائے لے آیا تھا۔ ہم دونوں چائے پینے لگے۔

میدان اب بالکل خالی تھا۔ اندھیرا اس پر قابو پا چکا تھا لیکن پوری طرح گہرا نہیں تھا۔ ساحل پر حرکت کرتے انسان پرچھائیوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ ہر طرف خاموشی تھی اور سمندر کا نغمہ جو اب صاف سنائی دے رہا تھا۔

بوڑھا اٹھا اور لکڑی ٹیکتے ہوئے آگے بڑھا۔

"بابا" میں نے اسے آواز دی۔

"کیا آپ کو ایسا نہیں لگتا کہ جب سمندر کا نغمہ سنائی دے رہا ہو تو لفظ غیر ضروری ہو جاتے ہیں..؟"

بوڑھا رک گیا۔ چند لمحے خاموش رہا جیسے سمندر کا نغمہ سن رہا ہو۔ پھر بولا:

"تم ٹھیک کہتے ہو۔"

آہستہ آہستہ چلتے ہوئے بوڑھا اندھیرے میں تحلیل ہو گیا۔ اب صرف سمندر کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

□□

عید آئی ہے

پھر بزمِ طرب فروزاں ہے
گرمیِ عیش جلوہ افشاں ہے
لالہ و گل سے پُر گریباں ہے
دہر عکس سے جنوں نمایاں ہے
راہ دیوانگی نے پائی ہے
لوگ کہتے ہیں عید آئی ہے

دن ڈھلا چاند مسکرانے لگا
ابرِ عیش و نشاط چھانے لگا
لطف تازہ ہر ایک پانے لگا
کوئی پینے کوئی پلانے لگا
بزمِ ساقی نے پھر سجائی ہے
لوگ کہتے ہیں عید آئی ہے

ترکِ رسمِ تکلفات کے بعد
چمکا سورج اندھیری رات کے بعد
گردشِ چشمِ التفات کے بعد
آنکھوں کیا چشمۂ حیات کے بعد
ہم زباں آج اک خدائی ہے
لوگ کہتے ہیں عید آئی ہے

اس آرائش کے آ کے دیکھ تو لو
اس کو اپنا بنا کے دیکھ تو لو
حوصلہ آزما کے دیکھ تو لو
تم بھی جوہرِ وفا کے دیکھ تو لو
عزمِ قسمت آزمائی ہے
لوگ کہتے ہیں عید آئی ہے

آتش لکھنوی

افسانہ

آفتاب عالم بیگ
۳۰ - کے اسکوائر لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

ہجرت

باغ فردوس سے آدم کی ہجرت کیا ہوئی کہ یہ آدمی کا مقدر بن گئی ۔ خیر پہلے آپ فلیش بیک میں یہ منظر دیکھئے ۔

یہ وہی مکان ہے جہاں داداجان رہا کرتے تھے مگر اب بہت بدل چکا ہے ۔ مجھے لگتا ہے شاید میں اس مکان میں بچپن میں بھی رہ چکا ہوں ۔ گاؤں میں اس مکان کو بڑی عزت حاصل تھی ۔ جب کبھی باہر سے کوئی افسر یا سرکاری اہل کار آتا تھا تو سب سے پہلے اسی مکان پر آتا ۔ داداجان سبھی کا پُرتپاک خیر مقدم اور خاطر مدارات کیا کرتے ۔ برآمدے میں تخت اور کرسیاں پڑی رہتیں ۔ ایک طرف داداجان کی آرام کرسی ہوتی یا کبھی کبھی وہ تخت پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھتے ۔ گھر کے ٹھیک سامنے مسجد تھی جس کے بلند مینار آسمان سے گفتگو کرتے نظر آتے اور وہ اکثر انھیں چپ چاپ دیکھا کرتے ۔ لوگ آتے ، بیٹھتے اور ان سے باتیں کرتے ، یا دکھ درد بیان کرتے ۔ ان کے پاس سے ہر شخص خوش ہو کر جاتا ۔ وہ ہمیشہ گاؤں والوں کی بھلائی کے لیے ہی کام کرتے رہے ۔

مکان کے عقب میں کھلا احاطہ تھا جس کے دو طرف کافی بڑے اور گہرے تالاب تھے جن میں یوں تو سال بھر پانی بھرا رہتا تھا ۔ برسات کے دنوں میں معلوم ہوتا دونوں تالاب ایک ہو گئے ہیں اور وہ دیسی کنول کے پتوں اور پھولوں سے ڈھک جاتے ۔ آبی مرغیاں اور بطخیں شب بھر تیرا کرتی تھیں ۔ تالاب کے ایک طرف بے حیا اور سرکنڈوں کے بڑے بڑے جھنڈ تھے جن میں بن مرغیاں بھی آجاتیں اور لڑکوں کے غول دن بھر غلیلیں لیے چڑیوں اور بن مرغیوں کی تلاش میں پھرتے رہتے ۔ تالاب سے کنول کے پھول نکالتے اور ان کے نرم ڈنٹھلوں کو گنڈیریاں کاٹ کر بنا لیتے اور گلے میں ڈالے پھرتے ۔ احاطے میں بیر کا بڑا پرانا درخت بھی تھا جس کی ڈالیاں دور تک پھیلی ہوئی تھیں ۔ لڑکے ڈھیلے مار مار کر بیر توڑتے ۔ بیر کا یہ درخت گاؤں بھر میں مشہور تھا کیوں کہ اس کے پھل میٹھے اور بڑے بڑے ہوتے تھے ۔

مکان کا اندرونی صحن کافی وسیع تھا ، ایک کونے میں انار کا درخت اور پاس ہی میں پپیتے کا بھی پیڑ تھا جن کے پھل پڑوس کے گھروں میں تحفتاً بھیجے جاتے تھے ۔ مکان سے کچھ ہی فاصلے پر املی کا ایک بہت پرانا اور چھتنار درخت تھا جو بہت اونچا اور چاروں طرف دور تک پھیلا ہوا تھا ۔ گاؤں سے قریب ہی کچی پکی سڑک تھی ۔ آنے جانے والوں کو وہ درخت سب سے پہلے نظر آجاتا تھا ۔ سفر پر جاتے وقت یہی درخت آخری طور پر الوداع کہتا اور واپسی پر وہی سب سے پہلے استقبال بھی کرتا ۔ دور سڑک سے آتی ہوئی بس پر سے املی کا یہ درخت نظر آنے لگتا اور اُسے کھڑکیوں سے جھانک کر بہت خوشی ہوتی اور اطمینان کا سانس لیتے کہ چلو اب ہم اپنے گھر پہونچ گئے ۔

املی کا یہ درخت اتنا پرانا تھا کہ گاؤں کے بزرگ بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے ۔ وہ بھی بس یہی کہتے کہ ہمارے دادا کو بھی اس درخت کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا کہ یہ کب سے ہے ۔ بہت پوچھنے پر بس اتنا بتا پاتے کہ فلاں مغلیہ حکومت میں جب ہمارے بزرگ یہاں آئے تھے تب بھی یہ درخت یوں ہی موجود تھا ۔ بہت پرانا ہونے کی وجہ سے املی کا یہ درخت کافی پراسرار ہو گیا تھا ۔ اس کے بارے میں بہت سے قصے مشہور تھے ۔ بڑی بوڑھیاں املی کے اس درخت سے متعلق جنوں اور بھوتوں کی کہانیاں بچوں کو سناتی تھیں ۔ بہت سی کہانیاں آج بھی یاد ہیں ۔ یہ کہانیاں خوف ناک بھی ہوتی ہیں اور دل چسپ بھی ۔ زیادہ تر کہانیاں ایسی ہوتی ہیں جن میں بھوت پریت لوگوں کو طرح طرح سے پریشان کیا کرتے تھے ۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی جان پر بھی بن آتی تھی ۔ اُن میں سے

[illegible] سے [illegible] میرے [illegible]
[illegible] کوئی [illegible] انسان [illegible]
[illegible] سے اور کسی کو [illegible]۔ ایسی [illegible]
[illegible] سے کسی کی حوصلہ افزائی پیدا ہوتی
[illegible] کبھی نہ ہو سکے۔

گاؤں کے اجتماعی کام کاج اسی درخت کے نیچے کئے جاتے تھے۔ شادی بیاہ کے موقع پر لوگ اسی درخت کی چھاؤں میں جمع ہوتے۔ مداری اپنے کھیل تماشے اسی درخت کے نیچے دکھاتے۔ بندر، ریچھ اور بھالو کا ناچ، تماشہ، رسّی پر چلنا اور کبھی کبھی جادو کے کھیل تماشے بھی ہوتے۔ بچے بوڑھے، جوان، مرد اور عورتیں سارے کام کاج چھوڑ کر بڑی دلچسپی، حیرت اور خوشی سے یہ تماشا دیکھتے۔ کھیل ختم ہونے پر انہیں پیسے یا اناج دیا جاتا۔ گاؤں کی پنچایت بھی اسی درخت کے نیچے لگتی۔ گرمی میں دن بھر لوگ اسی درخت کے نیچے جمع ہوتے۔ تعزیے اسی درخت کے نیچے بنے چوک پر رکھے جاتے۔

شام ہوتے ہی نوجوان جھوم جھوم کر اور گھوم گھوم کر ڈھول تاشے اور جھانجھ بجاتے۔ عجیب پر جوش سماں ہوتا۔ ان دنوں میں گاؤں کافی بھرا بھرا لگتا تھا کیونکہ شہر میں مزدوری، کاروبار یا نوکری کرنے والے ہر طبقے اور فرقے کے افراد محرم میں گاؤں ضرور واپس آ جاتے۔ لوگ ساری رات بھر جاگ کر مجلسوں میں شامل ہوتے۔ جگہ جگہ چائے اور شربت کی سبیلیں لگائی جاتیں جہاں میل ملاقات اور ہنسی مذاق کا بھی موقع مل جاتا۔

اسی املی کی ایک بڑی شاخ ہمارے مکان کے آنگن میں آتی تھی اور اس کے اوپر سے گزرتی ہوئی چھت کے پاس تک جاتی۔ رات میں دادی اماں سے جنوں اور بھوتوں کی کہانیاں سنتے تو یہی شاخ خوفناک معلوم ہوتی۔ اس وقت اس کی طرف دیکھتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا اور ادھر سے گزرنے پر بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ املی کا بھوت ابھی ہمارے اوپر کود پڑے گا۔ ہم آنکھ بند کر کے سو جاتے مگر دن میں بڑے بڑے ڈھیلے کر اسی شاخ سے دیر تک املی کے پتے توڑتے رہتے۔ پکی ہوئی املیوں کا تو مزہ ہی کچھ اور ہوتا۔

[illegible] ایک [illegible] خوبصورت پرندہ [illegible] خوبصورت
[illegible] شاخ [illegible] اپنے [illegible] پھر پھڑاتا [illegible]
[illegible] تماشا [illegible] کی ڈالیاں [illegible] تھے۔ یوں تو املی درخت
پر نہ جانے کب سے طرح طرح کے پرندے صبح و شام آتے رہتے تھے۔ ان کے چہچہانے سے گھر کی چہل پہل بڑھ جاتی تھی۔ لیکن یہ پرندہ کچھ الگ قسم کا تھا۔ پہلے کبھی ایسا پرندہ نہیں دیکھا گیا تھا۔ صوفی نے چہکتے ہوئے اس کی طرف اشارہ کیا تو ہم نے املی ہوئی ڈالیوں کی طرف دیکھا۔ وہ عجیب و غریب قسم کا پرندہ جسامت میں کافی بڑا تھا۔ ڈوبتے سورج کی لالی اس پر پڑ رہی تھی جس سے اس کے ڈینے چمک رہے تھے۔

"ارے کتنا خوبصورت ہے یہ!"

"ہاں۔ تم نے اسے پہلے کبھی دیکھا ہے؟"

"نہیں۔ میں تو یہی سوچ رہی ہوں کہ یہ پہلی بار اس درخت پر اترا ہے۔"

"دادا جان کہہ رہے تھے آج کل پرندوں کی آمد کا موسم ہے۔"

"یہ بھی باہری کا معلوم ہوتا ہے۔"

"ہاں، وہ دیکھو، ادھر ہی دیکھ رہا ہے۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ آنگن میں اتر آئے۔"

"آنگن ہی میں تو ہے وہ۔"

"مگر میں اسے پالنا چاہتی ہوں۔"

"ایسے پرندوں کا کیا بھروسہ صوفی۔ آج یہاں، کل کہیں اور۔"

"نہیں، ایسا نہیں ہے، سبھی پرندے ایسے نہیں ہوتے۔"

"مگر اس پر تمہیں کیسے یقین ہے؟"

صوفی کچھ کہے بغیر اٹھی اور کوٹھری سے پرندوں کے لیے رکھی ہوئی دانوں کی کٹوری اٹھا لائی۔ اس نے دانے [illegible]
بکھیر دیئے، جہاں وہ پرندوں کے لیے دانے ڈالا کرتی تھی۔ [illegible] شام
بہت سے چھوٹے چھوٹے پرندے دانا چگ کے [illegible]
والے بچے [illegible] سے [illegible]
[illegible]

ایک ایک پر پر پھیلا کر چہچہاتے تو وہ مسکرا دیتی۔ یہ اس کا معمول بن چکا تھا۔ جس دن پرندے دانا چگنے نہ آتے تو وہ مغموم سی ہو جاتی تھی۔

جانا نہ کچھ کر وہ پرندہ ڈال سے نیچے چبوترے پر اتر آیا۔ صوفی نے مسکرا کر دیکھا، جیسے اسے کوئی بڑی نعمت مل گئی ہو۔ اجنبی پرندے نے پہلے اِدھر اُدھر دیکھا پھر دانے پر ٹوٹ پڑا۔ جلدی جلدی دانے چگنے سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بہت بھوکا ہے۔ صوفی خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

"کیا سوچ رہی ہو تم؟"

"کچھ نہیں۔ اس کے پر کتنے چمک دار ہیں؟"

"تم اسے پالو گی نا؟"

"ہاں۔ مگر یہاں رُکے تب نا۔ کتنا اچھا پرندہ ہے۔"

"تمہارے پاس ضرور رُکے گا۔"

"وہ کیسے؟"

"دوستی کر لو۔"

صوفی ہنسنے لگی۔ اس نے پرندے کی طرف دیکھا جیسے وہ رک ہی تو گیا ہے۔ سورج ڈوب چکا تھا لیکن افق پر لالی ابھی پھیلی ہوئی تھی۔ پرندوں کے غول گھونسلوں کی طرف جا رہے تھے۔ چبوترے پر دانا ختم ہوتے ہی پرندے نے ڈینے پھڑپھڑائے اور تیزی سے اُڑ گیا۔ صوفی نے چونک کر دیکھا، لیکن وہ جا چکا تھا۔ صوفی کو جیسے جھٹکا سا لگا۔ اسے پرندے کے یوں چلے جانے کا بہت افسوس ہوا۔

کچھ ہی دن بعد وہی پرندہ پھر املی کے درخت پر نظر آ گیا۔ صوفی نے اسے بیٹھے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ خوشی سے اچھل پڑی جیسے کوئی کھوئی ہوئی قیمتی شے واپس مل گئی ہو۔

"وہ آ گیا۔" صوفی چلائی۔

"کون؟"

"وہی پرندہ، جو اس دن چلا گیا تھا۔ واپس آ گیا ہے۔"

"کہاں ہے وہ؟" میں نے باہر آتے ہوئے پوچھا۔

"درخت کے بالکل اوپر... وہ اُدھر۔" صوفی نے آہستہ سے اُدھر کیا کہ پرندہ اُڑ نہ جائے مگر وہ بیٹھا رہا۔

صوفی نے دانے کی کٹوری بھری اور چبوترے پر ڈال آئی۔ پرندے نے محتاط نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور ایک ہی اُڑان میں اسی شاخ پر آ گیا جو آنگن تک پھیلی ہوئی تھی۔ چبوترے پر بکھرے دانوں پر نظر ڈالی، ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھا اور چبوترے پر اتر آیا۔ وہ بلا جھجک دانے چگنے لگا۔

دھیرے دھیرے وہ پرندہ صوفی اور مکان سے مانوس ہوتا گیا اور اب اکثر وہ وہاں آنے لگا۔ پرندوں کو دانا کھلانے صوفی کو بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ چبوترے پر پرندوں کے لیے دانے ڈالنا کبھی نہ بھولتی۔ پھر یہ پرندہ روز آنے لگا اور صوفی سے اتنا بے خوف ہو گیا تھا کہ جب چاہتی اسے آسانی سے گود میں اٹھا لیتی۔ پیار سے اس کے پروں پر ہاتھ پھیرتی اپنی ہتھیلی پر دانے رکھ کر اسے کھلاتی اور کٹوری سے پانی پلاتی۔ صوفی کو پرندے سے بہت پیار ہو گیا تھا۔ دھیرے دھیرے وہ پرندہ گھر کے ایک فرد کی طرح ہو گیا تھا۔

موسم بدلا۔ کڑاکے کی سردی پڑنے لگی۔ ایک دن جب میں گھر میں داخل ہوا تو صوفی آنگن میں کچھ کرتی نظر آئی۔

"یہ تم کیا کر رہی ہو صوفی؟"

"مٹی گوندھ رہی ہوں۔" وہ دھوپ میں بیٹھی مٹی، پانی اور گھاس پھونس کو ملا رہی تھی۔

"مگر کیوں...؟"

"وہ پرندہ جو ہے نا۔" اس نے میری طرف دیکھے بغیر اپنا کام جاری رکھا۔

"کیا ہوا اس کو؟"

"کچھ نہیں۔ سردی جو بڑھ گئی ہے۔"

"تو...؟"

"میں اس کے لئے ایک گھروندا بنا رہی ہوں۔ اسے بہت سردی لگتی ہوگی۔"

میں زور سے ہنسنے لگا تو صوفی نے میری طرف گھورتے ہوئے کہا،

"ہنس کیوں رہے ہیں؟"

[illegible]

[illegible] بہت اچھا ہے۔ تمہارے [illegible]

[illegible]

صوفی نے چبوترے کے پاس ہی مٹی کا ایک گھروندا بنا دیا تھا۔ [illegible] بیٹھنے کے لیے اس میں لکڑی کا پیڑ بھی لگا دیا۔ [illegible]

ایک دن صوفی کو بخار آ گیا۔ میں نے اسے دوا لا کر دی تو اس نے پوچھا کہ جو پرندے جنگلوں میں رہتے ہیں ان کا علاج کون کرتا ہے؟ اس نے اس طرح سوال پر مجھے مسکرا دیا۔

صوفی نے ایک بار مجھ سے ایسا چھلا لانے کے لیے کہا جسے وہ اس پرندے کے پیر میں ڈالنا چاہتی تھی۔ میں اس کے لیے ایک چھوٹا سا سنہرا چھلا لے آیا جس پر صوفی اور اپنے ملک کا نام کندہ کرا دیا تھا۔ صوفی چھلے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ اس نے پرندے کی ٹانگ میں وہ چھلا ڈال دیا۔

"اب یہ کھوئے گا نہیں" صوفی نے بڑے اطمینان سے کہا۔

کئی برس گزر گئے۔ پتہ بھی نہ چلا۔ جیسے یہ سب کل ہی کی باتیں ہوں۔ دادا جان اب بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ اکثر بیمار رہنے لگے تھے اور زیادہ تر لیٹے رہتے۔ پلنگ کے پاس ہی ان کی خوبصورت چھڑی رکھی رہتی تھی۔ ایک چھتری بھی تھی جس کا استعمال اب بہت کم ہوتا تھا۔ طاق میں ان کی دوائیں رکھی رہتی تھیں۔ صوفی انہیں وقت سے دوا کھلاتی اور ہر وقت دادا جان کی دیکھ بھال میں لگی رہتی۔

تعلیم کے سلسلے میں جب میں باہر تھا تو صوفی کے خط مجھے برابر ملتے رہتے تھے۔ ایک خط میں اس نے لکھا کہ دادا جان کی طبیعت اب دن بدن بگڑتی ہی جا رہی ہے۔ دوائیں جیسے بے اثر ہو چکی ہیں۔ پھر ایک دن اچانک جب مجھے دادا جان کے انتقال کی خبر ملی تو میں جیسے سکتے میں آ گیا۔ جیسے سب کچھ ٹھہر گیا ہو۔

میں گھر پہنچا تو دالان کے اس ویرانے نے جیسے استقبال

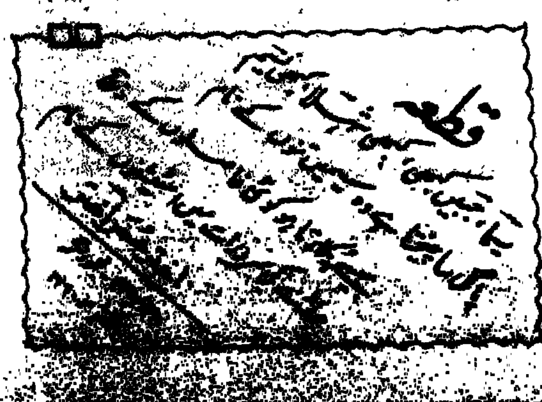
[illegible]

[illegible] صوفی نے [illegible] [illegible] جیسے [illegible] گیا۔ [illegible] ان دنوں [illegible]

دادا جان [illegible] رکھی تھی۔

[illegible] ایک دن پہلے جو کبھی آدمی [illegible] گر گیا۔ مکان کا ایک حصہ بھی جو شاخ سے ٹوٹا تھا اسے چکا تھا اور وہ پرندہ بھی کہیں غائب ہو چکا تھا جسے صوفی نے اتنے دنوں سے پال رکھا تھا۔ صوفی نے آخر میں لکھا تھا کہ پتہ نہیں وہ پرندہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ معلوم نہیں آندھی میں اس کا کیا ہوا۔

کئی برس بیت گئے۔ پھر ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ بات ان دنوں کی ہے جب میں یورپ میں تھا۔ میرے ایک دوست نے ایک دن شکار کا پروگرام بنایا اور ہم لوگ ایک جھیل کی طرف چل دیئے جہاں بڑی تعداد میں پرندے آیا کرتے تھے۔ ہم ایک محفوظ جگہ پر آڑ میں بیٹھ گئے۔ بہت سے پرندے آ چکے تھے۔ میرے دوست نے نشانہ لگا کر گولی چلا دی۔ زور دار آواز کے ساتھ ہی پرندوں نے پوری قوت سے بازو پھڑپھڑائے اور ہوا میں اڑ گئے۔ ان میں سے ایک پرندہ تھوڑی دیر ہوا میں معلق رہنے کے بعد زمین پر گر گیا۔ ہم اس کی طرف دوڑ پڑے۔ زخمی پرندے کو اٹھایا تو ہمیں یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوا کہ پرندے کی ٹانگوں میں کئی طرح کے چھلے پڑے ہوئے جن پر مختلف لوگوں اور ملکوں کے نام کندہ تھے۔ ایک پر صوفی کا نام بھی تھا۔



اقلیتی طبقے کے ہنرمند نوجوانوں کے لئے

نجی روزگار کی بہتر سہولتیں

اترپردیش جو اس ملک کی سب سے بڑی آبادی والا صوبہ ہے جہاں گوناگوں تہذیبوں، مذاہب، عقائد، خیالات و نظریات کے حامل لوگ رہتے ہیں، جن کی اپنی مختلف زبانیں بھی ہیں۔ جمہوری روایت اور ہر مذہب وعقیدے کے تئیں رواداری اس ریاست کا خاص وصف ہے حکومت نے آئین کے مطابق تمام شہریوں کو مساوی حقوق وحیثیت دی ہے آئین کی نظر میں ہندوستان کا ہر شہری برابر ہے۔ تاہم آئین نے کمزور طبقات درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کا خاص خیال رکھا ہے، اور ان کی ترقی، فلاح وبہبود کے لیے خصوصی تجاویز بھی رکھی ہیں۔ چنانچہ حکومت اترپردیش ان طبقات کے ساتھ ہی اقلیتی طبقے کی فلاح وبہبود کے لئے بھی کوشاں رہی ہے اور اس سمت میں مختلف النوع اقدامات بھی کرتی آئی ہے۔

اقلیتی طبقہ کی سماجی اور اقتصادی پسماندگی کو دور کرنے نیز ان کی ہمہ جہت ترقی کے لیے حکومت اترپردیش اقلیتی مالیاتی وترقیاتی کارپوریشن کے توسط سے مختلف پروگرام اور اسکیمیں چلا رہی ہے۔ اقلیتی بہبود کے محکمہ میں اس کارپوریشن کو شامل کرنے سے ایک نئی جہت ملی ہے۔

اقلیتی طبقہ کے ان ہنرمند نوجوانوں کو، جو تکنیکی نظر سے اپنے پیشے میں ماہر ہیں اور جو بینک سے قرض حاصل کرنے کے لیے حسب ضرورت مارجن منی کا انتظام نہیں کر پاتے، قرض حاصل کرنے میں کسی طرح کی دقت پیش نہ آئے اس سلسلے میں گورنر شری موتی لال وورا نے اس کارپوریشن کے ذریعے چلنے والی مارجن منی قرض اسکیم کی مدت کو ۳۱ مارچ ۲۰۰۴ء [illegible] فیصلہ کیا گیا ہے۔

[illegible] کے تحت ۱۵۰۰۰ سے ۲۵۰۰۰ روپے تک کی امداد [illegible] پر خرچ ہونے والی رقم کا ۱۵ فی صد بینک کے ذریعہ حسب ضرورت مارجن منی کا ۱۵ فی صد جو بھی کم ہو، ان حدود کے تحت فراہم کرائی جاتی ہے۔

اقلیتی طبقے کے بے روزگار نوجوانوں کو خود روزگار سے جوڑنے اور دیگر چھوٹی صنعتیں لگانے کے لیے تکنیکی ومالی امداد فراہم کرنے کی غرض سے یہ اسکیم ۱۹۸۵ء میں پہلی مرتبہ شروع کی گئی تھی اس اسکیم کے پہلے مرحلے کے ۹ سال کی مدت میں بینک کے ذریعے ۲۸،۲ لاکھ روپے کا قرض فراہم کیا گیا اور ۸۳۹ لاکھ روپیہ مارجن منی کارپوریشن کے ذریعے تقسیم کیا گیا۔ اسکیم کے دوسرے مرحلے کے مالیاتی سال ۹۶-۱۹۹۵ء میں ۵۲۰۱ درخواستیں بینکوں کو بھیجی گئیں جن کے مقابلے ۵۲۲ لاکھ روپے منظور ہوئے اور ۱.۵ لاکھ روپیہ مارجن منی کے طور پر تقسیم کیا گیا۔

قومی اقلیتی ترقیات اور مالیاتی کارپوریشن کے ذریعے اترپردیش اقلیتی مالیاتی وترقیاتی کارپوریشن کو چیلنجنگ ایجنسی قرار دیا گیا ہے۔ اترپردیش اقلیتی مالیاتی وترقیاتی کارپوریشن کو ۴ کروڑ روپے کی رقم ٹرم لون کے طور پر تقسیم کرنے کے لئے فراہم کرائی گئی ہے جس میں سے ۲۶۲.۳۰.۴۰.۱۲۳ روپے کی رقم سبھی اضلاع کو بھیجی جا چکی ہے۔

اس اسکیم کے تحت تقریباً ۱۵۹۲۶ درخواستیں موصول ہوئی تھیں جن میں سے ۲۵۱۸ درخواستیں منظور ہوئیں اور ۱۲۶۹۲۲۵۳۸ روپے کی رقم منظور کی گئی جن میں سے ۹۴۰ لوگوں کو ۱۲ء۳۹۷ لاکھ روپئے کی رقم تقسیم کی جا چکی ہے۔ مالیاتی سال ۹۶-۱۹۹۵ء میں رقم ریلیز کرنے کے لیے قومی اقلیتی ترقیات اور مالیاتی کارپوریشن کو ۱۳ء۸۶ کروڑ روپے کی اسکیمیں بھیجی گئی ہیں جن کے جلد منظور ہونے کی امید ہے۔

ٹرم لون اسکیم کا مقصد صوبے میں خط افلاس سے نیچے زندگی بسر کرنے والے اقلیتی طبقے کے (جنرل/تکنیکی) بے روزگار نوجوان

لڑکے اور لڑکیوں کو مختلف پیشہ / تجارت / صنعت قائم کرنے اور انھیں کم شرح پر قرضہ فراہم کرکے امداد کرنا اور ان کو اقتصادی طور پر خود کفیل بنانا ہے۔

کارپوریشن اقلیتوں کی پیداوار کی فروختوں کے معقول و موثر انتظام اور انصرام کے لیے ان طبقات کی تکنیکی و پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو جلا بخشنے میں بھی مددگار ثابت ہو رہا ہے۔

کارپوریشن کے توسط سے اقلیتی طبقہ کے لڑکوں اور لڑکیوں کو مختلف پیشوں میں مختصر مدتی ٹریننگ فراہم کرکے انھیں خود روزگار شروع کرنے کے لیے پیشہ ورانہ ٹریننگ پروگرام چلایا جا رہا ہے۔ کارپوریشن کے ذریعہ اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لیے چلائے جا رہے مختلف پروگراموں پر عمل آوری کرتے وقت ایسا محسوس کیا گیا ہے کہ اقلیتی طبقہ کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں کثیر تعداد میں بے روزگار ہیں جبکہ ان کے اندر تکنیکی صلاحیت موجود ہے۔ اتنی کثیر تعداد میں ان بے روزگاروں کو سرکاری نیم سرکاری یا پرائیویٹ اداروں میں ٹریننگ دینا ناممکن ہے۔ اسی پہلو کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ ان میں خود روزگار پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا ان کی سماجی اور اقتصادی ترقی کسی حد تک کی جا سکتی ہے اور بے روزگاری کا مسئلہ کسی حد تک کم کیا جا سکتا ہے اسی مقصد سے کارپوریشن نے یہ اسکیم چلائی ہے۔

اس اسکیم کے تحت اعلا تعلیم یافتہ، نیم تعلیم یافتہ لڑکے لڑکیوں کو مختلف پیشوں جیسے کمپیوٹر، اسٹینو ٹائپنگ، بیوٹیشین، اے سی ریفریجریشن، سلائی کڑھائی اور بنائی، الیکٹریشین، زری ورک، چیچ ورک، گلاس ورک، پلمبر، موٹر ڈرائیونگ، ویلڈنگ، وائرمین، ٹرنر، قالین بافی، کلاتھ پینٹنگ اور آٹو موبائل وغیرہ میں ان کی اہلیت اور دلچسپی کے مطابق سرکاری، نیم سرکاری اور پرائیوٹ اداروں کے توسط سے ٹریننگ فراہم کی جاتی ہے۔

موجودہ مالیاتی سال ۹۶-۱۹۹۵ء میں اس اسکیم کے تحت ۳۵۰۰ کنبوں کو مستفید کیے جانے کا نشانہ رکھا گیا ہے، جس کے مقابلے میں ۳۲۰۰ کنبوں کو مستفید کیا جا رہا ہے اور ۵۰۰ نوجوانوں کے انتخاب کی کارروائی کی جا رہی ہے۔ اس اسکیم کے تحت آخری مرحلے میں فروری سے ٹریننگ ۵۰۰ نوجوانوں کا انتخاب کیا جائے گا۔ اس طرح ۵۰۰ کے نشانے کے مقابلے میں ۵۰۰ لوگوں کو مستفید کیے جانے کا پروگرام ہے۔

کارپوریشن کے توسط سے اقلیتی فرقے کے نوجوانوں کو پولیس، پی اے سی اور فوج میں جانے کے لیے قبل از وقت ٹریننگ کا معقول انتظام کیا جاتا ہے۔

حکومت اترپردیش اقلیتی فرقے کے کمزور طبقوں کی فلاح و بہبود پر نظر رکھے ہوئے ہے اور اس ضمن میں تمام تر سہولیات فراہم کرانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ کارپوریشن کے ان پروگراموں کے ذریعہ اقلیتی طبقہ کے بے روزگار افراد کو روزگار فراہم کرانے اور انھیں اقتصادی طور پر خود کفیل بنانے میں حکومت اترپردیش کا منشا پورا ہو رہا ہے۔

احتشام حسین

غزل

تارے گنتا ہوں آہ بھرتا ہوں
زندگی یوں تباہ کرتا ہوں

وصل کا انتظار کرتا ہوں
روز جیتا ہوں، روز مرتا ہوں

جس نے برباد کر دیا مجھ کو
دل ہے ناداں اسی پہ مرتا ہوں

راہِ الفت میں اب یہ عالم ہے
دو قدم چلتا ہوں ٹھہرتا ہوں

بارشیں پتھروں کی ہوتی ہیں
ان کی گلیوں سے جب گزرتا ہوں

جو بنا دے عقیل کی قسمت
وہ ستارہ تلاش کرتا ہوں

زرینہ عقیل بنارکا
۱۹/۹۳ - اندرا نگر لکھنؤ

اقلیتی طبقہ کی تعلیم پر خصوصی توجہ

کسی بھی ملک کی سب سے بڑی دولت تعلیم ہوتی ہے۔ جو عطیہ یا خرچ کرنے سے گھٹتی نہیں ہے بڑھتی ہے۔ علم تقسیم کرنے سے ہمیشہ بڑھتا ہے۔ اس لیے دولت سے زیادہ قیمتی علم کو تسلیم کیا گیا ہے۔ عالم کو ہر جگہ عزت و شہرت سے نوازا جاتا ہے جبکہ دولت مند کے ساتھ ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا۔

ہمارے ملک یعنی ہندستان میں آزادی سے قبل تعلیم کا معیار بہت پست تھا۔ لارڈ میکالے نے انگریزی حکومت کی بُنیاد کو مضبوط کرنے کے لیے تعلیمی نظام کو مستحکم کرنے کی تحریک چلائی تھی لیکن وہ صرف اپنی حکومت کو چلانے کے لیے تھی، جس سے کسی ہندستانی کی کسی قسم کی ذہنی و اخلاقی ترقی نہیں ہوئی۔ سماج کا کثیر طبقہ جہالت کی تاریکیوں میں بھٹکتا رہا۔ تہذیب کی روشنی اس کی جھونپڑیوں میں کبھی داخل نہیں ہو سکی۔

ملک کی آزادی کے بعد اس سمت میں عالموں، سماجی خدمت گاروں ریفارمروں اور فلاسفروں نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ غور و خوض کر کے ایک ایسی تعلیمی پالیسی بنائی جس سے سماجی بیداری کے ساتھ لوگوں کو خواندہ نیز تعلیم یافتہ بنانے اور انھیں بہتر زندگی فراہم کرنے کے پیش نظر ترقی دینا تھا جس سے کہ وہ اپنے سماج اور کنبہ کی ترقی کے لیے ملک کے ترقیاتی امور میں اپنی حصہ داری نبھا سکیں۔

اتر پردیش حکومت نے بھی تعلیم کی ترقی اور فروغ میں تعلیم کو گھر گھر پہونچانے کے لیے ہمہ جہت اقدام کیے ہیں تعلیم کو کئی حصوں میں تقسیم کر کے اسکولوں کی تعمیر کرائی۔ بیسک، ثانوی، بالغان اور اعلا تعلیم کے توسط سے سماج کے ہر طبقے کو تعلیم حاصل کرنے کا اخلاقی حق عطا کر کے انھیں ملک کا ایک مہذب اور تعلیم یافتہ باشندہ بننے کا موقع فراہم کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تعلیم کے ذریعہ ہی باشندوں میں برابری، آزادی، انصاف اور بھائی چارے جیسے انسانی اور اخلاقی صفات پیدا ہوتے ہیں۔ ریاست کے گورنر جناب موتی لال وورا کی قیادت میں صدر راج کے دوران نظم و نسق اور ترقیاتی امور کے ساتھ ہی ساتھ تعلیم کے میدان میں جو نمایاں کارنامے انجام دیے گئے ہیں اب ان کے نتائج بھی برآمد ہونے لگے ہیں۔ حکومت نے اس قلیل مدت میں مختلف انقلابی تبدیلیاں لا کر معاشرے کی بنیاد کے لیے تعلیمی نظام کو مستحکم اور فعال بنانے کی سمت میں اہم فیصلے کیے ہیں۔

ریاستی حکومت نے اقلیتی طبقے کی فلاح و بہبود اور ان کے تحفظ نیز ان کی تعلیمی پسماندگی دور کرنے کے لیے جو فیصلے کیے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت ان طبقوں کے لیے بیدار اور پُر عزم ہونے کے ساتھ ساتھ مخلص بھی ہے۔

حکومت کے ایک فیصلے کے مطابق ۱۲۵ غیر امداد یافتہ مستقل تسلیم شدہ عربی اور فارسی مدرسوں کو پانچ لاکھ روپیے کی شرح سے سالانہ امداد دی جائے گی اس کے نتیجے میں ۶۰ مدرسوں کو رواں مالیاتی سال سے اور باقی ۶۷ مدرسوں کو آئندہ مالیاتی سال سے امداد دی جائے گی۔ یہ امداد ایک ہیڈ ماسٹر، بارہ اساتذہ، ایک کلرک اور چوتھے درجہ کے ملازم کی تنخواہ کے لئے کافی ہوگی۔

حکومت نے اقلیتی فرقے کے طالب علموں کے وظائف کی اسکیم کو منظوری دے دی ہے جن کے والدین کی آمدنی قلیل ہے۔ اس اسکیم کے لیے ۱۵٫۸۹ کروڑ روپئے کی رقم فراہم کی گئی ہے۔ پہلی جماعت سے دسویں تک کے طالب علموں کو وظیفے دینے کا طریقہ بھی طے کر دیا گیا ہے۔ اسکیم کے تحت وظیفہ کی رقم پہلی سے پانچویں جماعت تک بارہ روپیہ ماہانہ چھٹی جماعت سے آٹھویں تک بیش روپیہ اور نویں سے دسویں جماعت تک

تحت ہر سال ۱۲۰ وظیفے دیئے جائیں گے۔ وظیفے کے لیے طالب علموں کا انتخاب تحریری امتحان اور کلام و تقریری معیار کے مطابق اس کے لیے تشکیل کی گئی کمیٹیاں انجام دیں گی۔

پرائمری اسکولوں میں طالب علموں کی تعداد میں اضافہ کرنے اور اسکول چھوڑنے کی عادت پر روک لگانے کے مقصد سے وزیراعظم کی دیہی علاقوں کے بچوں کے لیے دوپہر کی مقوی غذا اسکیم، جو گزشتہ ۱۵ اگست سے اترپردیش کے ۸۰ ضلعوں کے ۲۲۸ بلاکوں میں چلائی جا رہی ہے، اس کے تحت عربی فارسی مدرسوں کو بھی اس اسکیم سے مستفید کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ مرکزی حکومت کی ہی ایک اسکیم کے ذریعہ اترپردیش کے ۲۰۰ مدرسوں میں جدید مضامین پڑھانے کے لیے امداد فراہم کی گئی ہے تاکہ اقلیتوں کے اکثریتی علاقوں میں ۵۰۰ پرائمری اور ۱۲۸ جونیئر ہائی اسکول کھولنے کی منظوری دی جا چکی ہے۔

اقلیتی فرقہ کے طالب علموں کے لیے حکومت نے پرائمری اور جونیئر ہائی اسکولوں میں داخلے کو آسان کر دیا ہے تاکہ ان کے داخلوں میں اضافہ ہو سکے اور وہ روایتی مدرسوں اور مکتبوں کی جگہ پر ان اسکولوں کی طرف راغب ہوں۔ اس کے لیے سال ۹۵-۱۹۹۴ء میں ۴۱۸۲ اسامیوں پر اردو اساتذہ کی تقرری کی گئی تھی۔

سال ۹۶-۱۹۹۵ء میں بھی پانچ ہزار اسامیوں پر تقرری کی کارروائی کے احکام دیئے گئے تھے۔ موصول اطلاعات کے مطابق ۲۶۱۳ اسامیوں پر تقرری ہو چکی ہے۔ سال ۹۷-۱۹۹۶ء میں بھی پانچ ہزار اسامیوں پر اردو اساتذہ کی تقرری کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

اترپردیش سرکار نے اقلیتوں کی تعلیم کے لیے چلائے جانے والے فلاحی پروگراموں کی عمل آوری اور ان کی پیش رفت کا تجزیہ کرنے کے مقصد سے ایک ۲۳ رکنی کمیٹی کی تشکیل کی ہے۔

اعلا تعلیم کے میدان میں ریاست میں اقلیتی طبقوں کے ذریعے چلائے جا رہے بارہ ڈگری کالجوں کو اقلیتی ادارہ کا درجہ دیا گیا ہے بلاشبہ اس فیصلے سے اقلیتی فرقہ کے لوگوں کو فائدہ پہونچے گا۔ حکومت نے ریاست کے اقلیتوں کے لیے گورنمنٹ آئی۔ ٹی۔ آئی میں ہونے والے داخلہ امتحان کے لئے مفت کوچنگ کا انتظام کیا ہے۔ وزیراعظم کے اقلیتوں کی فلاح کے لئے اعلان شدہ پندرہ نکاتی پروگرام کے تحت آئی۔ ٹی۔ آئی ڈائرکٹوریٹ کے تحت قائم اداروں میں جون اور جولائی میں منعقد ہونے والے داخلہ امتحان کے لیے انتظام کیا گیا ہے۔ مفت کوچنگ سبھی اضلاع کے مراکز کے ذریعہ اپریل ۱۹۹۶ء سے جولائی ۱۹۹۶ء تک دی جائے گی۔ اس فیصلے سے آئی۔ ٹی۔ آئی اداروں میں اقلیتی طبقہ کے بچوں کی تعداد بڑھے گی۔

گورنر موتی لال ووہرا نے اقلیتی طبقے کی ترقی کے تئیں اپنے عہد کو دہراتے ہوئے ریاست میں اقلیتوں سے متعلق چلائے جانے والے پروگراموں نیز اسکولوں کو اور زیادہ فعال بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ بلاشبہ ان فیصلوں اور کارگزاریوں سے اقلیتی طبقہ کا تعلیمی، سماجی اور اقتصادی معیار بلند ہوگا اور ان کے حقوق کا تحفظ بہتر طریقے سے ممکن ہو سکے گا۔

ڈاکٹر خورشید ظفر

غزل

مجھے یقیں ہے سپے انتقام آئے گا
وہ شخص صبح نہ آیا تو شام آئے گا

کبھی تو شامِ غریباں کا چیر کر سینہ
کبھی تو صبح کا دل کش پیام آئے گا

بہا رہے ہو جسے بے گناہ گلیوں میں
یہی لہو کبھی سرحد پہ کام آئے گا

وطن کی راہ میں جو بھی شہید ہوں اُن پر
ملائکہ کی صفوں سے سلام آئے گا

پڑیں گی جب بھی سروں کی ضرورتیں کاوش
تمھارے لب پہ ہمارا ہی نام آئے گا

کاوش الہ آبادی

۲۳۰/۱۷۰ نمبر شاہ گنج - الہ آباد ۲۱۱۰۰۳

نقد و تبصرہ

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب: اُلجھن (ناولٹ)
مُصنف: زیڈ۔ ایم۔ خاں قیمت: پینتالیس ۴۵ رُوپے
ملنے کا پتہ: (۱) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی
(۲) ظہور محمد خاں، ریٹائرڈ کنٹرولر، ۵/۱۰۹۔ ہاتھی خانہ فتح گڑھ (یوپی)

مدّت سے جناب زیڈ، ایم، خاں (ظہور محمد خاں) کے افسانے ملک کے مختلف موقر جرائد کی زینت ہو رہے ہیں۔ ان کے افسانے زندگی سے بہت قریب ہوتے ہیں جن میں روزمرّہ کے سماجی، اخلاقی اور ذاتی مسائل نہایت سلاست سے پیش کیے گئے ہیں۔ ان کے افسانے لطف اندوز بھی ہیں اور سبق آموز بھی ۔۔ اور ادب برائے زندگی کی جیتی جاگتی مثال ہیں۔

"الجھن" (ناولٹ) ان کا دوسرا مطبوعہ شاہکار ہے۔ یہ ایک لطیف الجھن کی داستان ہے :- اسلم جو ڈائریکٹر کا پی۔اے ہے، کے اسکوٹر پر ڈائریکٹر کی بیوی لتا کو دیکھ کر، اس کی بیوی ریشماں غلط فہمی میں مبتلا ہو گئی۔ حالانکہ اسلم کو ایک ایکسیڈنٹ کی وجہ سے لتا کو بہت عجلت میں میڈیکل کالج پہونچانا پڑا تھا۔ مگر یہ الجھن بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ ریشماں کی جان پر آ بنی۔

"الجھن" ایک عجیب مگر لطیف الجھن کی داستان ہے۔ زبان و بیان اور پلاٹ اتنا دلچسپ ہے کہ قاری اگر پڑھنا شروع کرے تو اسے بالاستیعاب پڑھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب ہے۔ مجموعی اعتبار سے یہ ناولٹ اساطیری ادب میں گرانقدر اضافہ ہے۔

—— راجندر بہادر موج

نام کتاب: "ابھی تو درد باقی ہے" (افسانوی مجموعہ)
افسانہ نگار: بشیشر پردیپ قیمت: نوّے رُوپے
ملنے کا پتہ: نصرت پبلشرز۔ حیدری مارکیٹ، امین آباد لکھنؤ

زیر تبصرہ کتاب "ابھی تو درد باقی ہے" کے علاوہ اب تک ڈاکٹر بشیشر پردیپ کے افسانوی مجموعے پیاس (۱۹۵۸ء)، کاجل اور دھواں (۱۹۶۴ء)، پھر سے اجنبی (۱۹۷۳ء)، پہلی بار (۱۹۷۷ء) ٹکڑے ٹکڑے آئینہ (۱۹۸۱ء)، وہ سب باتیں (۱۹۸۳ء) ۔۔ اور ۔ تم صرف تم (۱۹۸۷ء) شائع ہو چکے ہیں۔ تقریباً چار دہائیوں سے زیادہ عرصے سے بشیشر پردیپ افسانہ نگاری کر رہے ہیں۔ موصوف کے بعض افسانے مختلف زبانوں مثلاً انگریزی، ہندی، بنگالی، آسامی، تیلگو، کنڑ اور پنجابی میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔

"ابھی تو درد باقی ہے" میں افسانوں کی کل تعداد بائیس ۲۲ ہے۔ ان افسانوں میں سے اکثر افسانے سادہ اور بیانیہ انداز میں لکھے گئے ہیں لیکن ان میں پیش کردہ واقعات، حادثات اور کردار، افسانہ نگار کے عمیق مشاہدے، انسانی نفسیات کے پختہ شعور نیز سماجی زندگی سے مضبوطی سے جُڑے ہونے کا وافر ثبوت پیش کرتے ہیں۔ معمولی معمولی واقعات اور روزانہ زندگی میں رونما ہونے والے چھوٹے چھوٹے حادثات ان افسانوں کو حرکت اور توانائی عطا کرتے ہیں نیز فن سے افسانہ نگار کی گہری وابستگی ان افسانوں کو فنی حسن سے آراستہ کرتی ہیں۔

"ابھی تو درد باقی ہے" میں شامل اکثر افسانے پیچ در پیچ سماجی زندگی کی تلخ و شیریں صداقتوں کی فن کارانہ اور خلاقانہ تفسیر پیش کرتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ بعض افسانے اس قدر معمولی نوعیت کے قصوں اور حادثوں کو لے کر تخلیق کیے گئے ہیں کہ فن کی کسوٹی پر انھیں کامیاب افسانہ کہنا مشکل ہے، لیکن اس نوع کے افسانے بھی عام قاری کو متاثر ضرور کرتے ہیں۔

بشیشر پردیپ ان افسانہ نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں جنھوں نے بغیر کسی تقلید کے فن افسانہ نگاری میں اپنی علاحدہ شناخت

بتاتا ہے۔ وہ محسوس کرتے ہیں ایک سچے اور مخلص فنکار کی طرح اسے کہانی کا پیکر عطا کر دیتے ہیں۔

مجموعی طور پر "ابھی تو درد باقی ہے" ایک قابلِ قدر کتاب اور لائقِ مطالعہ افسانوی مجموعہ ہے۔

——— جعفر عسکری

نام کتاب: "متاعِ نورِ سحر" (شعری مجموعہ)
شاعر: سید احمد سحر شاہجہانپوری قیمت: ۵۰/ روپے
ملنے کا پتہ: سید احمد سحر محلہ خلیل غربی۔ شاہجہانپور (یو۔ پی)

اردو شاعری فکری و فنی اعتبار سے وہی قابلِ قبول کہی جا سکتی ہے جس میں ذاتی تجربات و احساسات کے آئینے سے عوامی نظریات کی داخلی و خارجی سچائیاں منعکس ہوں۔

"متاعِ نورِ سحر" سے پیشتر سید احمد سحر صاحب کے تین مجموعہ کلام آئینۂ سحر (۱۹۸۴ء)، سحر رنگ (۱۹۸۶ء) اور سحر نشاں (۱۹۹۰ء) زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ سنینِ اشاعت کے مابین کم تفاوتِ مدت غماز ہے کہ سحر صاحب نہ صرف ایک اچھے شاعر ہیں بلکہ زود گو بھی ہیں۔ اور یہ دونوں صفتیں بیک وقت، فنکاروں میں کم پائی جاتی ہیں۔

"متاعِ نورِ سحر" اول الذکر تینوں شعری مجموعوں کے تناظر میں سحر صاحب کی فن کارانہ کاوشوں کی ایک نکھری ہوئی تخلیق ہے۔ اس مجموعۂ کلام میں موصوف کی شاعری کو جن مشاہیر نے مختلف پہلوؤں سے سراہا ہے ان کی واقعیت مسلم ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ سحر صاحب احساسات کے سلسلے میں داخلی و خارجی کیفیات کے ساتھ ساتھ نفسیاتی اور رومانوی جذبات کی حس بھی رکھتے ہیں اور غالباً ان کی شاعری کی رنگا رنگی اور فکری تنوع کے یہی اسباب ہیں جو ان کے شکوۂ دوراں میں بھی کارفرما ہیں ؎

کون کہے، کس سے کہے، کیا کہے
شور میں سنتا ہی بھلا کون ہے

سحر صاحب نے جدیدیت کو بھی قبول کیا ہے اور اس سے متاثر نظر آتے ہیں لیکن اس حد تک کہ ان کا ادبی اور تاثراتی رشتہ اپنے ماضی سے نہ ٹوٹے ؎

بہت عزیز ہیں دل کو تمازتیں غم کی
یہ اور بات کہ جلتی ہے برف کی دیوار

"متاعِ نورِ سحر" جدید نظمات، رباعیات و قطعات سے بھی مزین ہے۔ امید ہے کہ دنیائے ادب میں سحر صاحب کا یہ شعری مجموعہ بھی خاطر خواہ پذیرائی حاصل کرے گا۔ کتابت و طباعت خاصی اور گٹ اپ مناسب بہتر ہے۔

——— شمیم عثمانی

نام کتاب: "برگ و ساز" (شعری مجموعہ)
شاعر: فاخر جلال پوری۔ قیمت: پچاس روپے
ملنے کا پتہ: نصرت پبلشرز۔ حیدری مارکیٹ، امین آباد لکھنؤ

"برگ و ساز" فاخر جلال پوری کا تیسرا شعری مجموعہ ہے۔ اس سے قبل آپ کے نعت و منقبت سے متعلق دو دیگر مجموعے "آیاتِ حرم" اور "لبِ فرات" شائع ہو کر اہلِ علم سے اپنی قدر و قیمت اور افادیت منوا چکے ہیں۔ "برگ و ساز" موصوف کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔

فاخر صاحب نے "پیشِ کلام" کے عنوان سے ہر دور میں غزل کی مقبولیت اور اس کے حسنِ تغزل پر اختصار کے ساتھ اپنے خیالات کہی ہے، اس میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔ یوں تو موصوف ہر صنفِ سخن پر قدرت رکھتے ہیں لیکن غزل میں ان کے فکر و فن کے جوہر اور بھی نمایاں ہوئے ہیں۔

فاخر جلال پوری بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں، وہ غزل کی نفاست، شائستگی اور اس کے فن کو برتنے کا بھرپور شعور و ادراک رکھتے ہیں۔ ان کی نظر قوتِ مشاہدہ سے بھرپور اور ان کا دل احساس و جذبات کا ابلتا ہوا چشمہ ہے قدیم و جدید خیالات کی آمیزش اس دور کے اکثر شعراء کے یہاں ملے گی لیکن جراتِ اظہار اور طنزیہ لب و لہجہ نے ان کے اشعار میں زندگی پیدا کر دی ہے۔

ان کی غزلوں کے بیشتر اشعار احساس کا نشتر لیے ہوئے ہیں۔

اے کیا چیز ہے محبت بھی
دور رہ کر وہ میرے پاس لگے

فاخرؔ صاحب غزل کے مزاج سے بخوبی آشنا ہیں۔ وہ الفاظ کے رکھ رکھاؤ، لوچ اور لطافت میں کہیں فرق آنے نہیں دیتے۔ سادہ سادہ الفاظ میں جذبے کی شدت نے تاثیر پیدا کردی ہے۔ کہیں کہیں اظہار بیان میں تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی غزلیں سوز و درد اور کیف و نشاط سے ہم آہنگ ہیں۔ فاخرؔ کی غزل میں کسی فلسفیانہ ندرت نگاہی یا فکر کی گہرائی نظر نہیں آتی لیکن زندگی کے کئی روپ ان کی شاعری میں اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔

برگ و ساز کی کتابت و طباعت میں نفاست سے کام لیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے قیمت زیادہ نہیں ہے۔ اُمید ہے ارباب ذوق برگ و ساز کے مطالعے سے فرحت اور تازگی محسوس کریں گے۔

——— طفیل انصاری

نام کتاب: "عرفانِ محبّت"
شاعر: پرکاش ناتھ پرویز　　قیمت: انیس روپے
ملنے کا پتہ: پرکاش ناتھ پرویز معرفت فونڈکس پرنٹنگ پریس، جی ٹی روڈ
گورایا ضلع جالندھر

"عرفانِ محبّت" پرکاش ناتھ پرویز کا چوتھا شعری مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ان کے تین شعری مجموعے "شفق زار" (۱۹۵۹ء) "جادۂ منزل" (۱۹۶۲ء) اور "خوابوں کے گلاب" (۱۹۷۹ء) منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی ایک اور کتاب "یادِ ضیا" (مطبوعہ ۱۹۸۸ء) بھی شائع ہو چکی ہے۔ "عرفانِ محبت" کی اشاعت کے سال ۱۹۹۱ء میں ان کی تین کتابیں زیرِ ترتیب تھیں۔ امید ہے کہ وہ تصنیفات و تالیفات بھی اب ۱۹۹۵ء تک تکمیل کو پہونچ کر شائع ہو چکی ہوں گی۔

پرویز نے شاعری کی ابتدا ۱۹۴۴ء میں کی تھی۔ گزری ہوئی اس نصف صدی میں ان کی تخلیقات کے وسیلے سے صاحبان فکر و نظر کو بہت کچھ حاصل ہو چکا ہے۔

گزشتہ چھ دہائیوں میں جہاں شاعری کے دو بہت ہی ہنگامی دور گزرے ایک ترقی پسندی کا اور دوسرا جدیدیت کا، وہیں اُردو کلاسیکی شاعری کا جادو بھی سر چڑھ کر بولتا رہا ہے۔

پرویزؔ کے اکثر اشعار میں "ترقی پسندی اور جدیدیت" کا رجحان بھی ملتا ہے لیکن اُردو غزل میں کلاسیکی شاعری ان کا سرمایۂ افتخار ہے۔ وہ یقیناً قادر الکلام شاعر ہیں۔ جذبے کی گرمی، زبان و بیان کی دل آویزی، تغزل کی رنگا رنگی اور مسکراہٹوں کے پردے میں غموں کو چھپانے کی کوشش ان کے زیرِ نظر مجموعۂ کلام میں بدرجۂ اتم دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ؎

ہمیں یہ علم کہاں تھا کہ عشق کیا شے ہے
تری نگاہ نے معنی بتائے ہیں کیا کیا

کتابت، طباعت کاغذ اور گٹ اپ بہت عمدہ ہے اور قیمت صرف انیس روپے ہے جو موجودہ گرانی کو دیکھتے ہوئے کم ہے۔

——— توقیر جمال نجیب آبادی

نام کتاب: "آفتابِ سحر" (شعری مجموعہ)
شاعر: خواب اکبرآبادی۔　　قیمت: ۲۱/- روپے
ملنے کا پتہ: کملا نگر　　آگرہ - ۴

"آفتابِ سحر" خوابؔ اکبرآبادی کا پہلا شعری مجموعہ ہے جس میں کچھ بہت قیمتی اشعار ملتے ہیں۔ ان کی غزلیں سلاست، روانی، برجستگی اور زبان و بیان کی دلکشی کے ساتھ ساتھ عصری حسیت کا بہترین نمونہ ہیں کہیں کہیں ایسا لگتا ہے کہ زندگی اور کائنات کا مطالعہ کرنے کے لیے شاعر کی فکر پیروی کی بندشوں سے آزاد ہو کر ایک نیا نہج بنانے میں کوشاں ہے۔

شاعری محسوسات کی عکاسی کا نام ہے۔ آفتابِ سحر میں یہ کیفیت جا بجا نظر آتی ہے۔ شعر ملاحظہ ہو ؎

مفلسوں نے آہ بھر کر یہ کہا
روٹی کپڑا اور مکاں ہے زندگی

"آفتابِ سحر" میں غزلوں کے علاوہ رُباعیات، نظمیں اور گیت بھی شامل ہیں اور کچھ نظمیں اور گیت بہت دل آویز ہیں خاص طور پر 'مزدور'، 'تمہیں گمان ہے' اور 'ہمارا وطن' وغیرہ۔

مجموعی طور پر 'آفتابِ سحر' ایک اچھا مجموعہ ہے اور یہ امید کی جا سکتی ہے کہ ادبی حلقوں میں بھی روشن نظروں سے دیکھا جائے گا۔

——— آصف لکھنوی

نام کتاب: "دُکھوں کا سمندر سکھوں کا جزیرہ"
شاعر: شاغل ادیب۔ قیمت: ۴۵/- روپئے
ملنے کا پتہ: آندھرا پردیش اُردو اکادمی، اے۔سی۔گارڈز
حیدر آباد

"دُکھوں کا سمندر سُکھوں کا جزیرہ" شاغل ادیب کا پہلا شعری مجموعہ ہے اس کے علاوہ ذکرِ اعظم اور دربارِ کرم نعتوں اور منقبتوں کا مجموعہ شائع ہو چکے ہیں اور خاصی مقبولیت بھی حاصل کر چکے ہیں۔

زیرِ نظر مجموعہ آزاد اور پابند منظومات، غزلیات، دوہوں، قطعات سانیٹ اور رباعیات پر مشتمل ہے۔ حمد۔ نعت۔ سلام۔ مرثیہ اور منقبت بھی پیش کی ہے۔

ان کی نظمیں اور غزلیں پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ قوتِ مشاہدہ کے ساتھ اگر اظہار بیان پر قدرت ہو تو اچھے شعر کہے جا سکتے ہیں۔ شاغل کے یہاں اخلاقی و رُوحانی قدروں کے زوال، رشتوں کی بے معنویت، انتشار اور سناٹا، مسائل کا ادراک، فردی کا درد اور مصائب کا ذکر تو ہے لیکن ناساعد حالات سے ہار ماننے والے نہیں ہیں شاغل ؎

ملیں گے ٹوٹ کے مجھ سے اُجالے دیکھو گے
مجھے گپھاؤں سے باہر نکال کر دیکھو۔

نظم چادر آجکل کے حالات پر تیکھی چوٹ کرتی ہے۔ "تیرگی کا زہر" پنڈت جواہر لال نہرو کی وفات پر لکھا گیا۔

شاغل کے اشعار میں شائستگی، ہنرمندی اور فکری اُٹھان ہے لیکن چند غزلیں اور نظمیں اگر اس مجموعہ میں شامل نہ کرتے تو بہتر ہوتا۔

کتاب خوبصورت چھپی ہے، کاغذ عمدہ اور سرورق دیدہ زیب ہے۔

ـــــــــــ ظفر حسین

نام کتاب: "روشن عبارت"
شاعر: سعید رحمانی قیمت: ۲۱/- روپئے
ملنے کا پتہ: دیوان بازار، کٹک ۔ ۷۵۳۰۰۱
(اڑیسہ)

"روشن عبارت" جو سعید رحمانی کی نعتوں، منقبتوں، غزلوں اور نظموں پر مشتمل ہے۔ سعید رحمانی اڑیسہ کے اردو داں طبقے میں معدودے چند ساتھیوں کے ساتھ اردو کی شمع فروزاں کیے ہوئے ہیں۔

رحمانی صاحب نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شعر و شاعری سے کیا۔ جون ۱۹۵۴ء میں ان کی پہلی نظم "معصوم آرزو" بچوں کے رسالے "چاند" ناگ پور میں شائع ہوئی تھی اس وقت ان کا تخلص بدر تھا۔

سعید رحمانی کی نعتوں میں پاکیزگی کا عنصر بھی ہے اور عقیدت و محبت کی چاشنی بھی آج کی شگفتہ غزل کاری کے ہُنر کے ساتھ نعت کہنا بھی ایک فن ہے اور اس فن میں سعید رحمانی کافی حد تک کامیاب ہیں۔

شعر ملاحظہ ہوں ؎

شوقِ دیدار، مدینے کی مسافت دے گا
اسمِ احمدؐ ہی مرے قلب کو راحت دے گا

نظارے حُسنِ طیبہ کے عجب تاثیر رکھتے ہیں
نگاہوں کے لیے تسکین کی جاگیر رکھتے ہیں

"روشن عبارت" ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتابت صاف ستھری ہے، طباعت بھی بہتر ہے۔ سرورق کافی خوبصورت اور قیمت بھی مناسب ہے۔

ـــــــــــ سیّد علی احمد

عنوانات

اپنی بات	ایڈیٹر	۲
دوہے	ناوک حمزہ پوری	۳
خودنوشت	وارث کرمانی	۴
یقین (نظم)	ساجد حمید	۱۰
زیرک (نظم)	باقر مہدی	۱۱
موسم (نظم)	رفعت سروش	۱۱
تصوف کا نظریاتی پہلو	عنوان چشتی	۱۲
غزلیں	شجاع خاور	۱۸
	نذیر فتحپوری۔ شکیب رضوی	۱۸
رام لعل نابھوی (۲)	سبط محمد نقوی	۱۹
غزل	ملک زادہ جاوید	۲۴
طنز و مزاح کا ایک منفرد شاعر، شوق بہرائچی	راحت علی خاں	۲۵
پاسبان (افسانہ)	علی امام نقوی	۳۱
غزل	فاطمہ وصیہ جائسی	۳۴
فارسی زبان اور ہندستان	بشیر النساء بیگم	۳۵
اترپردیش، روشنی کی سمت تیز رفتار سفر	رباب رشیدی	۳۹
ہولی (نظم)	عبدالمنان صدیقی	۴۰
مسلم حکمران اور ہولی	جنارون داس	۴۱
غزل	علی باقر زیدی	۴۲
نقد و تبصرہ	ولی الحق انصاری۔ احمد ابراہیم علوی	۴۳
	امیر احمد صدیقی۔ خورشید ملک	۳
	عابد نظر۔ اخلاق احمد	۴۶
غزل	رشید قریشی	۴۶
نصف صدی نمبر: تاثرات کے آئینے میں	قارئین	۴۷

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اترپردیش ان سے بہرحال متفق ہو

اپنی بات

ایران میں موسم بہار کا آغاز ۲۱ مارچ سے ہوتا ہے اور ہمارے یہاں ہولی کی بہار نئے لطف اور نئے رنگ سے آشنا کرتی ہے۔ یہ رنگین تہوار صرف فضا میں ہی رنگ بکھیرنے کا نام نہیں ہے، اس میں گلے شکوے مٹ کر دل ملتے ہیں، پیار ملتا ہے اور کیا نہیں ملتا! وہ مٹھائیاں بھی ملتی ہیں جن کی مٹھاس بھائی چارے اور پیار کی آئینہ ہوتی ہے۔

عام طور سے ہولی کے لیے یہ سوچا جاتا ہے کہ اردو شاعری میں اس کا نقطہ آغاز نظیر اکبرآبادی ہوں گے۔ لیکن دکنی میں جو بسنت پر یا نوروز پر نظمیں لکھی گئیں ان سب کے پس منظر میں ہولی کا رنگ جھلکتا ہے۔ ذاتی طور پر راقم الحروف کو میر صاحب کی ہولی بیحد پسند ہے کہ:

ہولی کھیلا آصف الدّولہ وزیر

اس ایک مصرعے پر اگر غور کیجیے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہولی کسی ایک طبقے کا تہوار نہیں تھا۔ اودھ میں امیر کبیر تک ہولی محدود نہ تھی اور صرف ہندو ہولی نہیں مناتے تھے بلکہ جو سربراہ حکومت تھا وہ خود ہولی کھیلتا تھا۔ اس لیے کہ

پھر دیکھ بہاریں ہولی کی

پڑھتے ہوئے مجھے محترم علی جواد زیدی کا مصرعہ بے اختیار یاد آ رہا ہے کہ وہ ہولیاں ہی اور تھیں — شاید ایک دور کا خاتمہ اور ایک دور کا آغاز ہولی کے تہوار سے ہوتا ہے۔ ایک بات ضرور کہنے میں آتی ہے کہ عہد حاضر میں ہمارے شعراء اور ادیب ہمارے تہواروں کی طرف اب متوجہ نہیں ہیں حالاں کہ ہندستانی تہوار عالمی تہذیب میں اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں اور اپنی انفرادیت کی وجہ سے انھیں کے لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ساری دنیا کی تہذیبی قدریں متزلزل ہوگئیں مگر ہندستان کی باوقار تہذیب انھی تہواروں کی وجہ سے امر ہے — زندہ ہے اور مستقبل کو بھی زندگی بخشتی رہے گی۔

ہمارے ہر تہوار کے پس منظر میں جو پیار کا پیغام ہے اسے ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے۔ ابھی کچھ دن پہلے ہم عید ملے تھے اور ہم نے عید ملن کے جلسے کیے تھے اور اب ہم ہولی میں گلے مل رہے ہیں اور جو برفانی ہوائیں اور رگوں میں خون جما دینے والی سردی تھی، اسے رخصت کر کے اب پیار کی گرمی اور حرارت کے ساتھ سرسوں کے زرد کھیتوں اور مٹر کے سبز خوشوں کو سر اٹھائے دیکھ رہے ہیں۔ یہ رنگ ہماری تہذیب کی علامت ہیں۔ یہ رنگ اور ہماری ہولی دونوں زندہ باد!

اردو کے ممتاز و معروف شاعر اختر الایمان کا گذشتہ ۹ مارچ کو اسی برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ ان کا شمار برصغیر کے نمایاں شعراء میں ہوتا ہے ان کے منفرد لب و لہجہ، تخیل کی بلندی اور معنی کی ندرت نے انھیں اردو شاعری میں ایک اہم مقام دیا۔ ان کی ادبی خدمات کے پیش نظر انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، غالب ایوارڈ، اقبال سمان، مہاراشٹر اسٹیٹ ایوارڈ اور ابوالکلام آزاد ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ان کی بعض نظموں کا ترجمہ متعدد غیر ملکی زبانوں میں کیا گیا۔ ادارہ نیا دور اختر الایمان کے انتقال کو اردو ادب کے لیے زبردست نقصان تصور کرتے ہوئے ان کے پسماندگان کو تعزیت پیش کرتا ہے۔

ممتاز شاعر، عوامی رہنما اور سماجی کارکن، زندہ دل، شگفتہ مزاج، ادب دوست جناب حمید قیصر الہ آبادی بھی ۱۷ فروری ۹۶ء کو داغ مفارقت دے گئے مرحوم اپنی دل کش اور دلنواز شخصیت کی بنا پر بذات خود ایک انجمن تھے۔ انتقال کے دن تک وہ چلتے پھرتے رہے۔ ۱۷ کو شام کو جب وہ افطار کے لیے سامان تیار کر رہے تھے تو اچانک انھوں نے کہا: "کہا سنا معاف کرنا، خدا حافظ"۔ ادارہ قیصر صاحب کے پسماندگان کو تعزیت پیش کرتے ہوئے، ان کی وفات کو الہ آباد کے لیے ناقابل تلافی نقصان سمجھتا ہے۔

— ایڈیٹر

دوہے

سہل نہیں اس عہد میں، افہام و تفہیم
افلاطوں کے ہیں چچا، سارے نیم حکیم

مدت سے جو شخص تھا، اپنا خاص حلیف
آج وہی ثابت ہوا، سب سے بڑا حریف

ہنرورى کا راستہ ہے دشوار گذار
قدم قدم پر کھائی ہے، پگ پگ پر دیوار

ہے جینے کی آرزو، دنیا میں تا دیر
پیمانے سے عمر کے، ہوا نہ کوئی سیر

کیا کھوٹا ہے کیا کھرا، بتلائے گا وقت
منصف ہے اس دہر میں، سب سے اچھا وقت

کمزور اتنی ہوگئی، جسمانی دیوار
سانسوں کا اب بوجھ بھی سہنا ہے دشوار

باتیں ہیں خوشبو بھری، لہجہ برگِ گلاب
یارب! عہدِ شباب ہے، یا ہے جامِ شراب؟

ٹیڑھے میڑھے راستے، قدم قدم پر موڑ
"باز آیا اے زندگی، میرا پیچھا چھوڑ"

ناوک حمزہ پوری
(بہار)

خود نوشت

پروفیسر وارث کرمانی
اشروالی کوٹھی۔ سول لائنس، دودھ پور
علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

سرگذشت (مختصر خاکہ)

میری ولادت ۱۵ر نومبر ۱۹۲۷ء اور جائے ولادت دیوا شریف ضلع بارہ بنکی (یو۔پی) ہے۔ میرے مورث اعلیٰ کا نام مولانا عبدالسلام تھا جو درسِ نظامیہ فرنگی محل کے بانی ملا نظام الدین سہالوی کے استاد بھی تھے اور سترھویں صدی عیسوی میں مغل دربار کی طرف سے ایک ممتاز عہدے پر فائز تھے۔ مغل شہنشاہ شاہ جہاں بذاتِ خود ان کا بڑا احترام کرتا تھا۔ مولانا عبدالسلام کے پرپوتے ملا عبدالسلام صاحب عارفِ باکمال بھی تھے اور ان کا عرس عید کے مہینے میں ۱۴ر تاریخ کو اب بھی ہمارے یہاں ہوتا ہے جس میں قصبہ کے رہنے والے اور اہلِ خاندان شریک ہوتے ہیں اور محفلِ سماع سے فیض اٹھاتے ہیں۔ میرے والد واجد علی صاحب ریاست شیخ پور کے تعلقدار تھے اور میرے نانا نورالعزیز صاحب کیننگ کالج یعنی موجودہ لکھنؤ یونیورسٹی میں فارسی کے استاد تھے۔ ان کا وطن قصبہ لہرپور ضلع سیتاپور تھا۔ میرے والدین کا انتقال میری نابالغی کے زمانے میں ہو گیا تھا اس لیے میرا تعلقہ کورٹ آف وارڈس کی نگرانی میں آگیا تھا اور ضلع مجسٹریٹ میرا گارجین تھا۔ تنہا وارث تعلقہ ہونے کی وجہ سے حکامِ ضلع نے عزیزداروں کی طرف سے میری جان کا خطرہ محسوس کیا اس لیے میری پرورش و پرداخت ضلع مجسٹریٹ نے سید نثار حسین زیدی صاحب ڈپٹی کلکٹر کے سپرد کی اور میں اسی خاندان کا ایک فرد ہو گیا۔ ۱۹۴۰ء میں ہائی اسکول پاس کیا اور ۱۹۴۱ء میں لکھنؤ کرسچین کالج میں انٹرمیڈیٹ (سالِ اول) میں داخلہ لیا۔ تعلیمی سال کے شروع میں چند ہفتے جہانگیر آباد پیلس حضرت گنج میں رہا۔ مہاراجہ سر محمد اعجاز رسول خاں صاحب نے میری تعلیم و تربیت سے خصوصی دل چسپی لی تھی پھر ان کے پیلس کے پیچھے کیمپ روڈ لالباغ میں ۶ نمبر کی ایک چھوٹی سی کوٹھی میں جو اب بھی موجود ہے، مستقل طور سے رہنے لگا۔ میرے ساتھ میرے گارجین کے بیٹے (جسٹس جرار حیدر مرحوم) بھی وکالت کی ٹریننگ کے لیے رہتے تھے۔ اس زمانے کی یادیں مجھے بہت عزیز ہیں وہ لکھنؤ آج کے مقابلے میں حسین خوابوں کا شہر معلوم ہوتا ہے۔ کم آبادی، صاف ستھرا ماحول۔ ہماری کوٹھی کے چاروں طرف انگریز اور اینگلو انڈین رہتے تھے یا پھر رئیسوں اور تعلقداروں کی رہائش گاہیں تھیں قریب ہی بیگم اختر فیض آبادی رہتی تھیں۔ یہی زمانہ تھا جب مجھے پہلے پہل شعر و ادب سے دل چسپی پیدا ہوئی۔ کرسچین کالج میں اردو اور فارسی کے استاد ڈاکٹر جعفر حسین شاعری کے بڑے دلدادہ تھے اور میر انیس کے عاشق تھے۔ فرماتے تھے میر انیس سے بڑا دنیا میں کوئی شاعر نہیں ہوا۔ ان کے ہزاروں اشعار جھوم جھوم کر کلاس میں سنایا کرتے تھے وہ سب مجھے زبانی اب تک یاد ہیں۔ میرے ہم جماعت بھی شاعری سے بہت دل چسپی رکھتے تھے۔

کاکوری شریف کے مرتضےٰ مرحوم اور قدیر، فرنگی محل کے عبدالرحمٰن انصاری مرحوم، محبوب بارہ بنکی کے وسیم رضوان، لکھنؤ کے مہیش کمار، احسن جلیل اور عبدالباری وغیرہ، جوش ملیح آبادی، اختر شیرانی، مجاز اور جگر کے تازہ اشعار سناتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی استاد کے آنے یا دیر سے آنے پر کلاس روم میں مشاعرہ ہو جاتا تھا، جس کا سہرا ہمیشہ عبدالرحمٰن انصاری کے سر ہوتا تھا۔ کیوں کہ وہ اپنی جسامت اور عمر میں بڑے ہونے کی وجہ سے ہم سب پر چھا جاتے تھے اور ہم لوگوں سے کچھ عقیدت اور کچھ ہیبت کی ملی جلی کیفیت میں زبردستی خراجِ تحسین وصول کر لیتے تھے۔ ترنم بھی ان کا اچھا تھا، اسکول میں

کلاس میں سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے ہوٹ ہوجاتا تھا۔ اسی لیے ایک بار غصے میں آکر میں نے ایک نظم کہدی تھی جس کا پہلا شعر درج ہے

عجب ذلیل ہیں اہلِ کرسچین کالج
گرے ہر ایک پر آکر خدا کرے فالج

کیپر روڈ لال باغ میں ہماری کوٹھی کے سامنے اکثر جوشؔ صاحب مجازؔ کے ساتھ نو دس بجے دن میں سڑک پر جاتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ مجازؔ دبلے، لمبے اور نوجوان تھے۔ جوشؔ صاحب موٹے، میانہ قد اور سن رسیدہ تھے۔ اسی زمانے میں سردار جعفری، علی جواد زیدی اور سبط حسن نے ایک نیا رسالہ نکالا تھا۔ غرضکہ لکھنؤ میں اردو کے بڑے ادیبوں اور شاعروں کا اجتماع تھا۔ دوکانوں اور بازاروں، کالجوں اور ریڈیو وغیرہ پر اردو زبان چھائی ہوئی تھی۔ مسز وجے لکشمی پنڈت، مسز سروجنی نائیڈو، سر تیج بہادر سپرو، پنڈت جواہر لال نہرو اور ملک کے بڑے بڑے سیاسی رہنما اردو زبان میں اپنی تقریریں کرتے تھے اور اردو اشعار کا استعمال سیاسی مقاصد کے لیے کرتے تھے۔ امین آباد کا کشادہ بازار چمپا، جوہی اور چنبیلی کے ہاروں کی مہک سے شام کے وقت باغِ عدن بن جاتا تھا اور امین آباد سے نخاس جانے والی سڑک پر اودھ کے بہترین یکے، تانگے کرائے پر چلتے تھے جن پر کرتے، پاجامے، شیروانیاں پہنے مرد اور سیاہ برقعوں میں عورتیں شام کے وقت سیر کو نکلتے تھے۔ اس وقت تک رکشوں کا رواج جاپان یا کلکتہ تک محدود تھا۔ موٹریں بہت کم تھیں۔ ریل گاڑیوں پر بھیڑ بالکل نہیں ہوتی تھی۔

لکھنؤ میں میری ادبی نشوونما کے سلسلے میں سید سجاد حیدر یلدرم کے گھر کا ذکر بھی ضروری ہے جہاں اکثر میں جایا کرتا تھا۔ یلدرم صاحب اس زمانے میں سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوکر مہاراجہ صاحب محمودآباد کے پرائیوٹ سکریٹری ہوگئے تھے اور فیض آباد روڈ پر ایک کوٹھی میں رہتے تھے۔ گھر میں بھی وہ زیادہ تر سوٹ پہنتے تھے، ان کا سفید کالر بہت سخت ہوا کرتا تھا، اور سوٹ پر ترکی ٹوپی لگاتے تھے۔ ان کی بیگم نذر سجاد حیدر صاحبہ بھی اپنی ناول نگاری کی وجہ سے شوہر کی ہی طرح مشہور تھیں۔ انگریزی بال تھے، سایہ پہنتی تھیں۔ ان کی بیٹی قرۃ العین حیدر اس وقت اسکول میں پڑھتی تھیں، میرا خیال ہے تیرہ چودہ سال کی عمر رہی ہوگی۔ ماں باپ دونوں کے مقابلے میں ان کا رنگ کچھ سانولا تھا وہ بھی اپنی ماں کی طرح انگریزی بال کے ساتھ گھٹنوں تک سایہ پہنتی تھیں ان کے بھائی مصطفےٰ حیدر جو ان سے اور خود سے عمر میں پانچ چھ سال بڑے ہوں گے، مجھے بہت اچھے لگتے تھے۔ پڑھنے لکھنے میں کمزور مگر زندہ دل آدمی تھے۔ یہ لوگ بالکل انگریزوں کی طرح رہتے تھے۔ ان کے ملازمین بھی یونیفارم پہن کر ڈیوٹی پر آتے تھے اور ان کے گھر کا فرنیچر بہت اسٹرماڈرن ہوا کرتا تھا۔ یلدرم صاحب اپنی نثر نگاری کے لیے مشہور ہیں لیکن ان کا مزاج رومانی اور شاعرانہ تھا اور شعروں کے برمحل استعمال کے علاوہ شعر گوئی پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے گھر میں ہم لوگوں کو مومنؔ کے ایک شعر پر اپنی تضمین سنائی تھی جس کے چند مصرعے جو مجھے یاد رہ گئے ہیں یہاں لکھ رہا ہوں۔ یہ اشعار غالباً کہیں چھپے نہ ہوں گے۔

افسوں تخیلات کا مجھ پر رہا مدام	دیکھا کبھی نہ اصل کو افسانہ چھوڑ کر
لیکن ہوا ہوں جب سے کہ میں عازمِ حجاز	سب مال و زر بہ ہمتِ مردانہ چھوڑ کر
نوشن رہا ہوں چار طرف سے یہی صدا	دیکھو تو گمرہی بت و بتخانہ چھوڑ کر

مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

بدقسمتی سے لکھنؤ میں میرا قیام زیادہ نہ رہ سکا کیوں کہ میرے گارجین سید نثار حسین زیدی صاحب کا تبادلہ بارہ بنکی سے بہت دور سہارن پور ہوگیا تھا اور انھوں نے مجھے اس نواح میں تنہا چھوڑنا مناسب نہ سمجھا اور میرے ایک دبنگ اور رعب والے عزیز کی بیٹی سے ستر سال کی عمر میں میری شادی کردی تاکہ وہ میرے محافظ بن سکیں۔ شادی شدہ ہونے کے بعد میں بغرض اعلیٰ تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی آگیا۔ مجھے اپنا ہوسٹل اور کمرہ نمبر ۸ ایس ایس ایسٹ اب تک یاد ہے ؎

دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا
وہ مرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا — عزیزؔ لکھنوی

علی گڑھ میں میری طالب علمانہ زندگی صرف ہوسٹل تک محدود نہ تھی کیوں کہ سجاد حیدر یلدرم صاحب کے چھوٹے بھائی سید نصیر الدین حیدر صاحب کی فیملی یہاں دودھ پور میں بتّا لاج موجودہ گُل خنداں کوٹھی نزد

لکھر ڈکیت میں عام تھیں اور ان کی بیگم اور بچے یہاں زیر تعلیم تھے۔ میں زیادہ تر وقت وہیں گزرتا تھا۔ ان کے بچے عذرا، ظہیر حیدر حیدرو، زہرہ، خالدہ اور صلاح الدین حیدر کی صحبت نے میرے ذوقِ ادب کو پروان چڑھایا۔ ان میں خالدہ اور صلاح الدین میرے ہم سن تھے اور ہم لوگ آپس میں بہت شرارتیں کرتے تھے۔ ایک بار آپا عذرا جو بڑے ہونے کی وجہ سے گھر چلاتی تھیں، میرے عتاب کی زد میں آئیں اور میں نے ان کی ہجو لکھ ڈالی۔ شروع کے دو شعر درج ہیں ؎

آپا عذرا جو کام میں ہیں دخیل — ہو گیا ہے یہ انتظام ذلیل
گھر میں طوفانِ بے تمیزی ہے — جیسے طغیانیوں میں رودِ نیل

یہ بات ۱۹۴۱ء کی ہے۔ ٹھیک پچاس سال بعد جب ان کی چچا زاد بہن قرۃ العین حیدر کو گیان پیٹھ ایوارڈ ملا اور انھوں نے مجھے اس کی اطلاع خود نہیں دی، تو ان کی بھی ہجو اُسی زمین اور قافیہ ردیف میں میں نے لکھ ڈالی۔ پہلا شعر درج ہے ؎

قرۃ العین ہیں ادب میں دخیل
جیسے مُلکِ عرب میں اسرائیل

کیا خبر تھی کہ اس یونیورسٹی میں میری آئندہ زندگی گزرنے والی ہے میرے اہل و عیال یہاں مستقل طور سے آباد ہوں گے اور میں خود اس یونیورسٹی کی اکیڈمک برادری کا پنشن یافتہ بزرگ بن جاؤں گا۔ لیکن ابھی تو علی گڑھ کا قیام لکھنؤ کی طرح مختصر ہونا تھا، کیوں کہ میرا تعلقہ کورٹ آف وارڈس سے چھوٹ گیا اور مجھے پڑھنا چھوڑ کر کورٹ آف وارڈس سے چارج لینے بارہ بنکی آنا پڑا۔ پھر کیا تھا۔ جائداد میرے زیر انتظام تھی۔ نو عمری کا زمانہ، احباب کی صحبت۔ چودہ سال مسلسل اپنے گھر ردولی شریف میں گزر گئے۔ یہاں خالص دیہاتی ماحول تھا۔ زمینداری، مقدمہ بازی، فوجداری ایک طرف تو دوسری طرف سیر و شکار، شاعری اور رقص و موسیقی کی محفلیں۔ اس زمانے میں نواب لائق علی خاں ڈپٹی کلکٹر، ان کے بیٹے ممن میاں، ایس کے ڈی سنگھ بابو شہور اکی چیمپئن اور میرے چچا زاد بھائی شبن میاں اور رشید بھائی (روپی ٹیہہ بہرایچ) وغیرہ سیر و شکار کی زندگی میں کچھ میرے رفیق اور کچھ میرے استاد رہے۔ بڑے لہو لعب کا زمانہ تھا

اس کا بھی کیا بیان کرے ؎

عذرا کی یاد وہ ایام شور و شر گزرے
وہ جن سوار تھا سر پہ کہ سر سے در گزرے (یگانہ)

بہر حال یہ جن یا جنون ۱۹۵۲ء میں خاتمۂ زمینداری کے ساتھ اُترا۔ ملک تقسیم ہو چکا تھا اور ہم بھارت ورش میں سابق زمیندار بلکہ سابق مسلمان زمیندار کی حیثیت سے زندگی گزار رہے تھے۔

۱۹۵۵ء میں بعمر اٹھائیس سال میں نے لکھنؤ یونیورسٹی میں ایم اے انگریزی میں داخلہ لیا۔ اب لکھنؤ بدل چکا تھا اور میں بھی تقریباً مفلس ہو چکا تھا۔ ایک مختصر سے مکان میں کرائے پر بیوی بچوں کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا۔ اس زمانے میں ترقی پسند تحریک اپنے عُروج پر تھی بلکہ نقطۂ عروج کو پار کر چکی تھی۔ سرور صاحب اور احتشام صاحب لکھنؤ میں اس تحریک کے رُوحِ رواں تھے۔ ان اُستادوں کے مکان پر ترقی پسند مصنفین کے جلسے ہوتے تھے جن میں ہر اتوار کو میں بھی شریک ہوتا تھا مکین احسن کلیم، کمال احمد صدیقی، باقر مہدی، حیات اللہ انصاری، منظر سلیم، مسیح الحسن رضوی، سجاد ظہیر، رضیہ آپا، نیاز حیدر، تقی حیدر، عثمان غنی، اقبال مجید، قمر رئیس، عابد سہیل اور بہت سے لکھنے والوں سے ملاقاتیں اور صحبتیں رہتی تھیں۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں راؤ صاحب، مسز امنا رمیش موہن صاحب، جمیل صاحب اور نریش چندر صاحب میرے اساتذہ میں تھے لیکن ایک میرے استاد اگر غائبانہ نہیں تو پس پردہ بھی اس دور میں رہے ہیں اور بفضلہ اب تک میری رہنمائی کرتے ہیں۔ کم سخن، خاموش طبیعت اور خاصی حد تک گوشہ نشین پروفیسر نور الحسن ہاشمی جو خوش قسمتی سے میرے رشتہ دار بھی ہیں۔ پسِ پردہ استاد میں نے اس لیے کہا کہ میں ان کے کلاس میں کبھی نہیں رہا۔ لیکن ان کے ادبی ذوق اور فکری بصیرت سے میں نے بہت کچھ حاصل کیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ میرے قریب ترین دوست ہمیشہ ادیبوں کے حلقے کے باہر رہے ہیں۔ چنانچہ لکھنؤ میں احسن جلیل اور ان کے بھتیجے خالد کمال میرے بہت گہرے دوست رہے ہیں۔ یہ لوگ لکھتے تو نہ تھے لیکن ان کا ادبی ذوق، ظرافت و نفاست، علمی استعداد اور خاص طور سے خالد کمال کی مکتوب نگاری بہت سے ادیبوں کے مقابلے میں بہتر تھی۔ یہ لوگ میرے ہم مذاق بھی تھے۔

فرق صرف یہ ہے کہ ان لوگوں میں مجھ جیسی رندی اور خود فراموشی نہ تھی۔ اسی لیے وہ لوگ وقت کے ساتھ بدل گئے، بزرگ اور سنجیدہ ہوتے گئے اور میں اب تک اسی مزاج کی تلاش میں ان سے ملا ہوں اور مایوس ہوا ہوں۔ یہ لوگ چالیس سال بعد اب تک وہیں رہتے ہیں لیکن نہ جانے کہاں چلے گئے۔

اواخر ۱۹۵۷ء میں انجمن ترقی اردو کے مرکزی دفتر علی گڑھ میں 'ہماری زبان' اخبار کے ایڈٹ کرنے کے لئے انجمن کے جنرل سکریٹری پروفیسر آل احمد سرور نے خاص طور سے مجھے لکھنؤ سے بلوایا۔ وہاں کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد مجھے یونیورسٹی پالی ٹیکنک میں انگریزی کے استاد کی جگہ مل گئی۔ اب میں اپنے کنبے کے ساتھ علی گڑھ میں سکونت پذیر ہو چکا تھا اور آج تک وہیں ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تیس پینتیس سال کا عرصہ چشم زدن میں گزر گیا۔

علی گڑھ کے ادبی حلقوں میں انگریزی کے مقابلے میں اردو اور فارسی کے استادوں کا زیادہ لحاظ اور استقبال کیا جاتا تھا بلکہ ہندستان کے باہر روس، امریکا اور یورپ میں بھی برصغیر کے اردو فارسی اور اسلامک اسٹڈیز کے استادوں کا انگریزی کے استادوں کے مقابلے میں زیادہ احترام کیا جاتا ہے کیوں کہ باہر والے ان زبانوں کو ہماری مادری یا تہذیبی زبان سمجھتے ہیں اور ہماری نگارشات کو معتبر و مستند مانتے ہیں۔ اس کے علاوہ فارسی میرے اجداد کی مادری زبان تھی اور آج بھی یہ میری تہذیبی اور خاصی بڑی حد تک مذہبی زبان ہے۔ میرے والد مرحوم کو اس زبان سے بڑا تعلق تھا چنانچہ فارسی زبان کا ذوق میں نے ورثہ میں پایا ہے۔ اسی لیے میں نے یونیورسٹی میں انگریزی کے بجائے شعبۂ فارسی سے دلچسپی پیدا کی اور ایک دوسرا ایم۔ اے فارسی زبان میں کر کے فارسی کی لکچررشپ حاصل کی۔ اس سے مجھے حقیقتاً بڑا سکون مل گیا۔ گویا "موجِ آوارہ بہ تسکین خانۂ ساحل رسید"

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اتنے عشق اور جذباتی تعلق کے باوجود شروع میں اپنی پوری توجہ فارسی زبان و ادب کی طرف میں نہ دے سکا کیوں کہ اردو ادیبوں کی دوستی اور شعبۂ اردو سے جذباتی وابستگی کی بنا پر میں زیادہ تر اردو نظم و نثر میں اپنی تخلیقات پیش کرتا رہا اور اردو کے شاعر و نقاد کی حیثیت سے ملک میں جانا پہچانا جانے لگا۔ اس زمانے میں انگریزی کے پروفیسر محمود حسین اور پروفیسر اسلوب احمد انصاری، اردو کے پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر خورشید الاسلام جذبی صاحب، خلیل الرحمٰن اعظمی مرحوم، اختر انصاری صاحب، وامق جونپوری، راہی معصوم رضا، قاضی عبدالستار، شہریار، سید امین اشرف، ساجدہ زیدی، مونس رضا مرحوم اور دوسرے ادب دوستوں اور ادیبوں سے ہمہ وقت ملاقاتیں رہا کرتی تھیں۔ اردو کی میری بہترین نظمیں اور غزلیں اسی زمانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اردو میں جو تنقیدی مضامین، انشائیے اور سفرنامے ہیں اور جو اب کتابی شکل میں افکار و انشا کے نام سے چھپ گئے ہیں، ان میں بھی زیادہ تر مضامین اسی زمانے میں لکھے گئے تھے۔

۱۹۷۴ء میں مجھے اکیڈمی آف سائنسز ماسکو کی طرف سے سوویت یونین کا دورہ کرنے کی دعوت دی گئی۔ یہ سال میری ادبی زندگی میں ایک موڑ کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ روس کے دو ماہ کے قیام کے دوران مجھے تاجکستان میں بھی کافی عرصے تک رہنے کا موقع ملا۔ تاجکستان میں فارسی بولی جاتی ہے اور وہاں فارسی کے ادیبوں اور شاعروں کا بڑا اچھا اجتماع تھا۔ مشہور ترقی پسند شاعر مرزا ترسون زادے اس وقت تک حیات تھے۔ انھوں نے اپنی سخت گاڑھی ترقی پسندانہ نظمیں مجھے سنائیں۔ آج وہ نظمیں باطل اور گمراہ کن ہو کر رہ گئی ہیں۔ ترسون زادے ہندستان یعنی برصغیر کے ترقی پسند شاعروں کے بہت مداح تھے۔ فیض کا نام بھی انھوں نے بہت بڑے مردِ مجاہد اور کمیونزم کے علمبردار کی حیثیت سے اپنی ایک نظم میں لکھا ہے جس میں اپنی بیوی کو سمجھایا ہے کہ مجھے باہر کانفرنسوں اور مشاعروں میں جانے سے روکا نہ کرو۔ میں گھر کے کام کاج یا بیوی بچوں کی نگہداشت سے کہیں بڑھ کر ملک و قوم اور انسانیت کی خدمت میں لگا ہوں۔ تم مجھے بہت پریشان نہ کیا کرو۔ فرماتے ہیں ؎

جان شیریں این قدر جنگم مکن
این قدر بیہودہ دلتنگم مکن

[illegible]ستان میں فیض کا نام لیتے ہیں کہ دیکھو یہ شاعر کیسا ہر وقت ماسکو [illegible] امیر دیت اور دوسری جگہوں پر گھر بار سے بے نیاز خدمت خلق میں مصروف ہے۔ اتفاق سے قیام ماسکو کے دوران فیض سے تقریباً ہر شام ملاقات رہتی تھی اور ان کی "خدمت خلق" کو بھی میں دیکھا تھا۔ بیرحال فیض اچھے شاعر تھے لیکن ایسے شاعروں کے بارے میں کیا کہا جائے جنھوں نے ظالم کو مظلوم اور مظلوم کو ظالم بنا رکھا تھا ایسے ہی کسی شاعر کے چند مصرعے مجھے ماسکو میں بہت یاد آئے جب میں نے امیر بخارا کو وہاں دیکھا۔ پہلے شعر سنیے ؎

اے امیر اب نہ بخارا کی طرف رُخ کرنا
بیلیں انگوروں کی زنجیر لیے بیٹھی ہیں

مرد شمشیر بکف تیری پذیرائی کو
عورتیں جذبۂ تحقیر لیے بیٹھی ہیں ٭

یہ غریب "امیر بخارا" یا امیر بدخشاں ماسکو میں Architect کی حیثیت سے اپنی روزی کماتے تھے اور ان پر پابندی عائد تھی کہ وہ بخارا کسی بھی حالت میں نہیں جا سکتے تھے کیونکہ حکومت ڈرتی تھی کہ ولایت بدخشاں یا بخارا کے لوگ اپنے امیر کو دوبارہ دیکھ کر اسے اپنا حکمراں نہ بنالیں۔ لیکن ہمارے ہندستانی شاعر بالکل اُلٹا راگ الاپ رہے تھے۔ اب تو ہم سب نے بخارا اور بدخشاں کا انجام خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔ بقول شخصے ؎

آنرا کہ عیان است چہ حاجت بہ بیان است

بہرحال یہ تصویر کا صرف ایک ہی رُخ ہے۔ دوشنبہ میں ایسے ادیبوں سے بھی ملاقات ہوئی جو درحقیقت اپنے ضمیر کی آواز ہی کو بیان کر رہے تھے۔ مشہور ناول نگار الغ زادے صاحب کا تفصیلی ذکر میں نے اپنی کتاب "افکار و دانش" میں کیا ہے۔ بڑے ذہین، خوبصورت اور سن رسیدہ دانشور تھے۔ ایسے ہی اس زمانے کے نوجوان شاعر مومن قناعت فارسی کے استاد ناقد عبدالقادر نیازوف اور عاصمی صاحب وغیرہ بھی تھے جنھوں نے ذہن شیطونہ ہوئے سچ کو ادب بنانے سے انکار کیا تھا۔ تاجکستان کے حسن اور وہاں کے اخلاق و محبت سے متاثر ہو کر میں نے ایک فارسی نظم بھی کہی تھی جو "تاجکستان" کے عنوان سے میرے شعری مجموعہ "شاخ مرجاں" میں شامل ہے۔ تاجکستان سے واپس آنے پر مجھے بار بار یہ احساس ستانے لگا کہ میں استاد تو شعبۂ فارسی میں ہوں لیکن میرا تخلیقی کام زیادہ تر اردو زبان و ادب سے متعلق ہوتا ہے۔ ۱۹۷۵ء میں امریکہ جانے پر اس احساس کو عملی شکل مل گئی۔ وہاں مجھے فارسی کے استاد اور انڈو مسلم کلچر کے نمائندہ کی حیثیت سے مدعو کیا گیا تھا چنانچہ ڈیوک یونیورسٹی، شکاگو یونیورسٹی اور ہارورڈ یونیورسٹی میں فارسی ادب سے متعلق میں نے لکچر دیے اور وہاں کے مستشرقین سے تفصیلی ملاقاتیں رہیں۔ ان میں ہارورڈ یونیورسٹی کی پروفیسر انماری شمل اور ڈیوک یونیورسٹی کے پروفیسر بروس لارنس سے میری گہری دوستی ہو گئی جو بحمداللہ اب تک باقی ہے۔ فارسی ادب اور تصوف کی طرف مجھے مائل کرنے کا سہرا دراصل پروفیسر بروس لارنس کے سر ہے اور پروفیسر انماری شمل کی تجویز پر میں نے برصغیر کے فارسی شاعروں کا انتخاب کلام ان کی سوانح عمری اور تاریخی پس منظر مع مقدمہ و حواشی تیار کیا۔ اس میں فارسی کے اولین شاعر ابوالفرج رونی اور مسعود سعد سلمان یعنی گیارھویں صدی عیسوی سے لے کر علامہ اقبال (وفات ۱۹۳۸ء) تک تقریباً نوے شاعر شامل ہیں۔ یہ کتاب اب سے دس سال پہلے ۱۹۸۴ء میں DREAMS FORGOTTEN کے نام سے چھپ چکی ہے۔ اس ضخیم کتاب کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا سو جلدیں حکومت ایران نے خریدیں اور تقریباً اتنی ہی جلدیں امریکہ اور انگلستان میں فروخت ہو گئیں۔ دو سال بعد اس کا دوسرا ایڈیشن چھپا جو اب فروخت ہو رہا ہے۔ بروس لارنس دو سال تک میرے ساتھ علی گڑھ میں رہے۔ ان کی فرمائش پر غالب پر ایک مونوگراف Tradition and Rationalism in Ghalib میں نے لکھا جو امریکہ میں ایک سیمینار میں میں نے پڑھا اور وہیں شائع بھی ہوا۔ یہ مونوگراف ہندستان میں بھی چھپ چکا ہے۔ اس کے علاوہ غالب پر میرا پی ایچ ڈی کا تھیسس 'Evaluation of Ghalib's Persian Poetry' پہلے ہی چھپ چکا تھا۔ اب میں نے منحرف ہو کر فارسی ادب پر مسلسل لکھنا شروع کر دیا۔

٭ بہت عرصہ کی بات ہو گئی ہے۔ شاید بخارا کے بجائے بدخشاں ہو لیکن اس ردوبدل سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ شاعر بھی ٹھیک سے یاد نہیں۔

جس کے نتیجے میں حافظ، فیضی، امیر خسرو، اقبال، سبک ہندی اور بہت سے دوسرے تنقیدی مضامین میں نے لکھ ڈالے جو ہندستان اور ہندستان کے باہر سیناروں میں پڑھے گئے اور رسالوں میں چھپتے رہے گویا میں مستشرقین کے زمرے میں آگیا جو عربی، فارسی اور اسلامیات کے متعلق انگریزی زبان میں تحقیق کرتے رہے ہیں۔ لیکن اپنی تلون مزاجی کو کیا کہوں اب مجھ پر پھر نا آسودگی اور تشنہ کامی کا دورہ پڑا جس کی اقبال اکثر شکایت کرتے تھے ؎

چو نظر قرار گیرد بہ نگار خوب روئی
تپد آن زمان دل من پئے خوب تر نگاری

اس بار میرے ضمیر نے میری ایک اور دکھتی رگ پکڑی وہ یہ کہ میں فارسی کا استاد ہوتے ہوئے انگریزی زبان میں کیوں لکھتا ہوں۔ فارسی زبان میں کیوں نہیں لکھتا۔ یہ احساس تقریباً ساٹھ برس کی عمر کے بعد پیدا ہوا جب نئی عادت مشکل سے پڑتی ہے۔ لیکن اتفاق سے ریٹائرمنٹ کے فوراً بعد مجھے ایران میں ایک سمینار میں مدعو کیا گیا۔ وہاں کے استاد اور ادیب انگریزی زبان سے زیادہ واقف نہیں ہوتے ہیں اس لئے مجھے اپنی انگریزی دانی اور انگریزی مضامین پر خاصی کوفت ہوئی۔ بقول کسے ؎

زبانِ یار من ترکی و من ترکی نمی دانم

خوش قسمتی سے میری فارسی شاعری نے وہاں میری عزت رکھ لی۔ ہم سبھی ہندستانی فارسی شعر خوب کہہ لیتے ہیں لیکن فارسی بول نہیں سکتے اور نثر بھی زیادہ اچھی نہیں لکھ سکتے۔ اس کی سب سے روشن مثال علامہ اقبال ہیں۔ بہر حال میرے اشعار اور اندازِ شعر خوانی پر وہاں کی محفلوں میں مجھے خوب داد ملی۔ فارسی بولنے اور تنقیدی مضامین لکھنے کا محرک ایک اور بھی سبب ہوا۔ یہ سبب مرزا غالب کی فارسی مہارت میں بھی کارفرما تھا۔ یعنی انھیں ملا عبدالصمد جیسا استاد مل گیا تھا جو ایرانی النسل تھا اور فارسی اس کی مادری زبان تھی۔ بعض محققین نے اسے غالب کی دماغی اختراع کہا ہے۔ ان کے مطابق غالب نے اپنے ہم عصروں پر اپنی فارسی دانی کی فوقیت جتانے کے لیے عبدالصمد کو ایجاد کر لیا تھا۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ مجھے بھی فارسی استاد مل گیا، لیکن آگرہ کے بجائے شیراز میں ملا۔ خدا جانے سو دو سو برس بعد کوئی نقاد میرے اُستاد کو بھی میری دماغی اختراع کہہ دے۔ ابھی تو میرے بہت سے دوست میری صداقت کے گواہ ہیں۔ استاد سے ملاقات بالکل اتفاقیہ ہوئی۔ سمینار میں شرکت کے بعد جب ہمیں حکومت کی طرف سے شیراز لے جایا گیا تو وہاں ایک ایرانی طالب علم سے ملاقات ہوئی تہران اور کرمان کی ایک محفل میں اس نے مجھے شعر سناتے ہوئے دیکھا تھا۔ شیراز میں مزار حافظ پر میرے قریب آکر اس نے وہی اشعار لکھ کر دینے کی فرمائش کی۔ اِں ضمناً یہ بتادوں کہ اسی وقت میں حافظ کی قبر پر فاتحہ پڑھ چکا تھا اور خیر و برکت کے لیے صاحبِ مزار سے مخاطب ہو کر انھیں کا یہ شعر بھی دل ہی دل میں پڑھا تھا ؎

آنانکہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشۂ چشمی بما کنند

(وہ لوگ جو خاک کو اپنی نظر سے کیمیا بنادیتے ہیں
کاش گوشۂ چشم سے مجھے بھی دیکھ لیتے۔)

فرمائش شدہ اشعار لکھ کر دینے کے بعد میں نے اس طالب علم سے یونہی کہا کہ تمھیں بھی کوئی شعر اگر پسند ہو تو سناؤ۔ اس نے مسکراتے ہوئے مندرجہ ذیل شعر مجھے سنایا۔ سُنانے کی حالت میں معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی پیرِ طریقت ہے جس کی نگاہیں میرے دل کے آرپار ہو جائیں گی

ما خاکِ راہ را بہ نظر کیمیا کنیم
صد درد را بگوشۂ چشمی دوا کنیم

(ہم خاکِ راہ کو اپنی نظر سے کیمیا بنا دیتے ہیں، اور
سیکڑوں درد کا گوشۂ چشم سے علاج کر دیتے ہیں۔)

میں حیرت زدہ ہو کر اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔ جب ہوش و حواس درست ہوئے تو میں نے پوچھا،

"قربان شما یہ شعر تم نے مجھے کیسے اور کیوں سنایا۔ آخر تم کون ہو اور یہ شعر سنانے سے تمھارا کیا مطلب ہے؟"

اس نے جواب دیا کہ یہ شعر خواجہ حافظ کے پیر و مرشد حضرت شاہ نعمت اللہ کا ہے۔ چوں کہ آپ کو حافظ سے عقیدت ہے اس لیے میں نے ایسے شاعر کا شعر سنانا مناسب سمجھا جس سے خود حافظ کو عقیدت تھی"۔ مجھے اس کی وضاحت سے تشفی نہیں ہوئی۔ اگرچہ اب اس کے

سے بھی کچھ کہہ رہے ہیں۔ پھر اس نے کہا کہ آپ اتنے اچھے شعر کہتے ہیں کہ کوئی ایرانی بھی نہیں کہہ سکتا۔ افسوس ہے کہ آپ کو فارسی بولنے میں دقت ہوتی ہے آپ زبان، محاورہ یعنی روزمرہ کی زبان مجھ سے سیکھ سکتے ہیں۔

میں نے جواب دیا کہ ایک ہفتے میں میں بہت دور اپنے وطن چلا جاؤں گا۔ جواب ملا: "وہاں بھی آموزش جاری رہ سکتی ہے۔"

میں چپ ہو گیا اور سوچنے لگا کہ اتنے فاصلے پر یہ کیسے ممکن ہے میرے سکوت کو دیکھ کر اپنی بات سمجھانے کے لیے اس نے پھر ایک شعر پڑھا ؂

میتوان رفت بیک چشم پریدن تا مصر
بوئے پیراہن اگر قافلہ سالار شود

(ایک چشم زدن میں مصر تک پہونچا جا سکتا ہے
اگر پیراہن کی خوشبو رہنمائی کرے۔)

پھر وضاحت کرتے ہوئے اس نے کہا کہ اگر آپ مجھے خط و کتابت کی اجازت دیں تو روزمرہ کی زبان میں آپ کو مہارت ہو جائے گی۔ چنانچہ تین سال کی خط و کتابت میں اب مجھے فارسی بولنے اور لکھنے پر پوری دسترس حاصل ہو گئی ہے اور میرے تنقیدی مضامین بھی شعروں کے علاوہ ایران کے ادبی جرائد میں چھپنے لگے ہیں اور میں ایرانی اساتذہ سے بے تکلف فارسی میں گفتگو کر سکتا ہوں۔ یہ ایک عجیب فیض تھا جو ایک ایرانی النسل سے مجھے پہنچا۔ برصغیر کے فارسی استادوں میں بہت کم لوگوں کو یہ مہارت حاصل ہوتی ہے۔

میری تصنیفات کو تین حصوں میں بآسانی تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ابتدائی عمر میں زیادہ تر اردو زبان میں لکھا اور پھر درمیانی عمر میں انگریزی زبان میں مضامین اور کتابیں لکھیں اور اب بیشتر شاعری، مکاتیب، اور تنقیدی ادب فارسی زبان میں پیش کر رہا ہوں۔ اب زندگی پر شام کی پرچھائیاں پڑ رہی ہیں۔ جو کچھ ادبی سرمایہ کاتبِ تقدیر نے میرے قلم سے وابستہ کر رکھا ہے اس کا زیادہ حصہ عوامی ملکیت بن چکا ہے لیکن قلم اب بھی چل رہا ہے بلکہ پہلے سے زیادہ انہماک کے ساتھ۔ ادبی مزاج اور تخلیقی کاموں کی مصروفیت کے آگے گردشِ ماہ و سال نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ آفات و آلام کے ہجوم میں خوشدلی و خوشی بنی نہیں جاتی، جیسے محبوب ترین ہستی سے ملاقات کرنا باقی ہے۔ میں مستقبل سے کیسے ناامید رہوں؟ بہت دن ہوئے میں نے کچھ شعر کہے تھے جو آج میرے ترجمان بن گئے ہیں ؂

گرد میں صورتِ اُمّید چھپی جاتی ہے
زندگی ریگِ رواں بن کے اُڑی جاتی ہے
تشنہ کامی سے جہاں سانس رُکی جاتی ہے
آ گئے آ گئے کوئی ہاتھوں میں لیے جام تو ہے
اک حسیں چاند خراماں سرِ لبِ بام تو ہے

۱۔ بحیثیت شاعر میں نے جوش ملیح آبادی، غالب دہلوی اور حافظ شیرازی سے اثر قبول کیا ہے۔
۲۔ ٹالسٹائی، منصور حلاج اور افلاطون کے افکار نے میرے دل و دماغ اور ادبی شعور پر زبردست اثر ڈالا ہے۔
۳۔ ادیبوں میں شیخ سعدی میری محبوب ترین شخصیت ہیں۔

□□

یقین

کچھ تم سوچو
کچھ میں سوچوں
جب ہم سب مل کر سوچیں گے
آنکھوں میں تارے چمکیں گے
دل میں اُجالے مہکیں گے
جو دُھند ہے چھٹتی جائے گی
جو داغ ہیں مٹتے جائیں گے

ساجد حمید
اے۔ سی۔ ایف
ہنوا پالیپ۔ شیوگڑھ ۲۴۱۵۰۴

زیرک ؟

ٹھوکر کھا کے ـــ بھوکے رہ کر ـــــ
جینا کتنا مشکل ہے ؟
اور اگر ـــ ان سب سے بچ کر ـــــ
کوئی بوڑھا ہو کے جیئے ؟
دُنیا والے اس کو "زیرک" کہتے ہیں !

میں لیکن اتنا ہوں سمجھتا ـــــ
جینا بھی بے کار عمل ہے !
ہوگا ایک زمانے میں ـــــ ایک ہُنر !
آج تو ساری دُنیا میں ـــ "ذات فروشی" کا سودا ہے !

خاموشی کی گود میں بیٹھا ننھا بچہ ـــ کیا جانے ؟

صدیوں سے اک کھیل ہے جاری ـــــ
طاقت ور جیتا کرتے ہیں !
کبھی کبھی ـــ بھولے سے سرکش مر مٹتے ہیں -!

اونچی ذات کے لوگ چتر ہیں ـ "اَن داتا" بن کر جیتے ہیں
یہ سب جان کے کیا ہوتا ہے ـ لڑ کر مرنے میں بھی مزا ہے !
لیکن تارا ٹوٹ بھی جائے ـ پھر اک تارا آ نکلے گا !

"زیرک" بن کر، بے کس کو تم بھول گئے ؟
بولو ! ـــــ آخر کچھ تو بولو ـــــ !

باقر مہدی
ای/۱ روبی درشن ـ کارٹر روڈ ـ باندرہ (ویسٹ)
بمبئی ـ ۴۰۰۰۵۰

موسم

قدرت کے موسموں کا
اک دائرہ ہے جس میں
ہوتا نہیں تغیّر
اک ڈور سے بندھے ہیں
آتے ہیں باری باری
سُورج کی شوخ کرنیں،
بُنتی ہیں تانا بانا

لیکن یہ میری دُنیا
دو دن کی زندگانی
دستور ہے جاری
جب سے کھُلی ہیں آنکھیں
سُورج کھڑا ہے سر پر
برسا رہا ہے شعلے
محسوس ہو رہا ہے
یہ آفتوں کا سُورج
یونہی رہے گا سر پر
اور ایک دن اچانک
ہوگا غُروب ایسا
برسے گی برف دل پر
یخ بستہ ہوں گی سانسیں
بے نُور ہوں گی آنکھیں

□□

رفعت سروش
اے ـ ۸۰، سیکٹر ۲۷
نوئیڈا
۲۰۱۳۰۱

پروفیسر عنوان چشتی
اے ۱۰۰۱، جامعہ نگر، نئی دہلی
۱۱۰۰۲۵

تصوف کا نظریاتی پہلو

تصوف ایک اخلاقی اور روحانی نظریہ اور رویہ بھی ہے یہ ایک عالمی انداز نظر ہے اور اس کو عملی نظام زندگی بھی کہا جا سکتا ہے یہ ایک طرف فرد کی عملی، اخلاقی اور روحانی شخصیت کی تشکیل کرتا ہے اور دوسری طرف ایک صالح اور بے لوث معاشرے کی تعمیر پر زور دیتا ہے۔ تصوف مادے اور مادی وسائل کو مقصد نہیں ذریعہ قرار دیتا ہے اس لئے وہ دنیا سے نفرت یا فرار نہیں سکھاتا بلکہ وہ مکروہات دُنیا سے گریز پر اصرار کرتا ہے۔ تصوف ترک، ترک تہذیب شرافت یا ترک زندگی ورندانہ نہیں بلکہ بداخلاقیوں اور غیر روحانی افکار و اقدار کی نفی کرتا ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ دنیا کی مثال سانپ جیسی ہے جو اوپر سے چکنی اور اندر سے زہریلی ہوتی ہے اس کو اپنانے میں اس بات کا خیال رکھنا چاہئے۔ ترک انا یا ترک خودی ترک ذات و کائنات نہیں بلکہ دل سے ہوا و ہوس، تکبر و غرور گرد کدورت اور ماسوا کا ترک ہے۔ اور ان منفی مضر اور فضول و لغو کیفیات کی جگہ دل کو محبت، اخلاص اور نور سے بھرنا ہے۔ اس لئے تصوف بنیادی طور سے ایک عملی، اخلاقی اور روحانی انسان کی تشکیل کرتا ہے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے اپنی ایک مجلس میں فرمایا تھا کہ صوفی و شیخ) کو بیک وقت "ولایت" اور "ؤلایت" دونوں اعزاز حاصل ہوتے ہیں۔ جو معاملہ صوفی اور خدا کے درمیان ہوتا ہے، اس کو "ولایت" کہتے ہیں اور جو معاملہ بندوں اور خدا کے درمیان ہوتا ہے اس کو "ؤلایت" کا نام دیا جاتا ہے۔ اسی انداز کی ایک بات شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ نے لکھی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جب صوفی خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس پر عبد و معبود کے پراسرار روحانی رشتوں کی حقیقت واضح ہوتی ہے تو وہ فنا فی اللہ ہو جاتا ہے۔ اسی کیفیت اور انداز کا نام ولایت ہے لیکن جب صوفی فنا فی اللہ کے بعد بقا باللہ کی منزل میں گامزن ہوتا ہے یعنی انسانوں کی طرف ان کی اخلاقی اور روحانی تربیت کے خیال سے رجوع کرتا ہے تو منزل نبوت میں گامزن ہوتا ہے۔ یہاں نبوت کی اصطلاح سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ ابن عربی نے یہ اصطلاح ایک مخصوص معنیٰ میں استعمال کی ہے۔ یہ اس تصور کی نفی نہیں کرتی جو عرف عام میں پیغمبری یعنی نبی منصوص من اللہ کے معانی میں استعمال ہوتی ہے۔ ابن عربی کا خیال یہ ہے کہ جب صوفی خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس کی وجدانی، روحانی کیفیات بیکراں ہوتی ہیں وہ تخلقوا باخلاق اللہ کے مصداق خدائی اخلاق و صفات سے متصف ہو جاتا ہے اس لئے اس کا درجہ روحانی نقطۂ نظر سے بہت بلند ہوتا ہے۔ صوفی کی زندگی میں ارتکاز اور مراقبہ کے لمحے تجلی اور نزول اکرام خداوندی کے لمحے ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جب وہ انسانوں کی طرف رخ کرتا ہے تو اس کی اخلاقی اور شعوری طاقت نمایاں ہوتی ہے اس کا رخ روحانیت سے مادیت کی طرف اور باطن سے ظاہر کی طرف ہوتا ہے اس لیے اس لمحے میں روحانی رشتے کمزور ہو جاتے ہیں جس طرح خدا کی طرف متوجہ ہونے میں مادی اور خارجی علائق کمزور اور بے بس ہو جاتے ہیں۔ اس گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ تصوف ایک طرف فرد کی داخلی شخصیت کی تشکیل کرتا ہے اور دوسری طرف ایک صالح معاشرہ کی تعمیر پر زور دیتا ہے۔ ایک طرف انسان کو عملی، اخلاقی اور روحانی انسان بنانے پر زور دیتا ہے

دوسری طرف اس کے عمل اور اجتماعی شعور کو بیدار کرتا ہے حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے لکھا ہے کہ تصوف کی ابتدا علم، اس کا اوسط عمل اور اس کی انتہا عشق اور عطائے الٰہی ہے۔ اس تعریف کی رو سے تصوف کے تین مدارج ہیں۔ پہلا علمی دوسرا عملی اور تیسرا کشفی اور وہبی ہے۔ علم تصوف کی پہلی منزل ہے باب العلم سے گذر کر ہی مدینۃ العلم تک پہنچا جا سکتا ہے۔ اس لئے عالم متکلم، مفسر، محدث، دانشور اور فقیہہ اپنی اپنی جگہ پیکر علم ہی مگر یہ صوفی نہیں ہیں لیکن جو صوفی ہے اس کا عالم، متکلم، مفسر محدث اور فقیہہ ہونا ضروری ہے۔ مختصراً یہ کہ ہر عالم صوفی نہیں ہو سکتا لیکن ہر صوفی عالم ہو سکتا ہے بلکہ اس کو عالم ہونا ہی چاہئے قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ اللہ سے وہی بندے ڈرتے ہیں جو عالم ہوتے ہیں۔ [انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء (ترجمہ) اللہ سے ان کے بندوں میں وہی ڈرتے ہیں جو علماء ہوتے ہیں لیکن ایک جگہ اللہ جل شانہ یہ بھی فرماتا ہے کہ اولیا اللہ کو کوئی خوف و خطر نہیں ہوتا۔ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ (ترجمہ) بے شک اولیاء اللہ کو (کوئی) خوف ہے نہ غم۔ یعنی ان کی حفاظت خود خدا کرتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ علم پر تصوف کو یا عالم پر صوفی کو یک گونہ فضیلت حاصل ہوتی ہے تصوف صرف علم سے اگلی منزل کا نام ہے۔ نبی مکرم محمد رسول اللہ نے فرمایا ہے۔ مثل ما بعثنی بہ من الھدیٰ والعلم "اس شے کی مثل جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے مجھے مبعوث فرمایا وہ ہدایت اور علم ہے"

اس حدیث شریف سے ثابت ہے کہ حضور اکرم، ہدایت اور علم کا پیکر ہیں۔ صوفیاء بھی سنت رسول پر چل کر علم اور ہدایت کا بدرجہ اتم حصول کرتے ہیں۔ لیکن یہ نکتہ اہم ہے کہ علماء اور صوفیا کا انداز نظر تصور ذات اور طریقہ کار قدرے مختلف ہوتا ہے ان اختلافات میں تضاد نہیں بلکہ تعلق ہے اور اگر کوئی فرق ہے تو وہ [illegible] ہے۔ مثال کے طور پر چند بنیادی تصورات [illegible] اشارے کئے جاتے ہیں۔

تصوّر توحید

اسلام کا سنگ بنیاد تصوّر توحید ہے۔ قرآن کریم کی تعلیم کا انحصار تصوّر توحید ہے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ یا اِلٰہٌ واحِدٌ جیسی آیات قرآن کریم میں موتیوں کی طرح بکھری ہوئی ہیں۔ تصوّر الٰہ کی تشریح متعدد جگہ الگ الگ انداز سے کی گئی ہے۔ حضرت سیّد علی ہجویری داتا گنج بخشؒ نے علم کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ ایک علم ظاہری اور دوسری علم باطنی۔ علم ظاہری میں کلمۂ شہادت اور اسلام کے بنیادی اصولوں اور ارکان سے واقفیت شامل ہے اور علم باطنی میں معرفت الٰہی کی تحقیق شامل ہے جس کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ علم ظاہری کی بنیاد فقہ اور علم باطنی کی بنیاد تصوف پر ہے[1] جیسا کہ میں نے عرض کر دیا ہے کہ تصوّرِ الٰہ پر اسلام کی بنیاد ہے۔ حضرت جامی نے توحید کے چار مراتب۔ توحید ایمانی، توحید علمی، توحید حالی اور توحید الٰہی کا ذکر کیا ہے۔ حضرت غوث علی شاہ قلندرؒ نے توحید شریعت توحید طریقت، توحید معرفت اور توحید حقیقت کا ذکر کیا ہے۔ حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ نے وحدت الوجود اور حضرت مجدّد الف ثانیؒ نے وحدت الشہود کا ذکر فرمایا ہے۔ حضرت شاہ ناصر عندلیبؒ اور حضرت خواجہ میر دردؒ کے دور میں وجودی اور شہودی توحید پر بحث و تمحیص کا بازار گرم تھا۔ تمام ان حضرات نے توحید کا ایک طوان یا اوسط (درمیانی) تصور پیش کیا اور فرمایا۔ ہمارا تصوّرِ توحید وجودی ہے نہ شہودی بلکہ محمدی ہے اور انھوں نے یہ دعوا بھی فرمایا کہ ان کے بانیٔ تصور حضرت ناصر عندلیب کو یہ تصور توحید محمدی حضرت امام حسنؓ نے خواب میں تشریف لا کر تلقین فرمایا ہے حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ نے اپنے تصور توحید کو اپنے مکتوب میں مزید وسیع کیا اور کہا کہ ہندستان کے بت پرستوں پر مشرکین مکہ پر قیاس نہیں کرنا چاہئے۔ ہندستان کے بت پرست بھی ایک مخصوص انداز کا تصور الٰہ (یا تصور توحید) رکھتے ہیں۔ اس تصور کو موجودہ زمانے میں علامہ اخلاق حسین دہلوی اور اخلاق احمد قاسمی نے دلائل کی نئی بنیاد فراہم کی۔

وحدت الوجود

اہل سنت والجماعت معتزلیوں کی راہ پر نہیں بلکہ اشاعرہ کے رستے پر ہیں۔ اس لیے انھوں نے اشاعرہ کے تصوّر توحید کو بھی بڑی حد تک قبول کر لیا۔ اشاعرہ کے یہاں ذات و صفات کا تصوّر کارفرما ہے۔ علامہ سید رضی نے ۔نہج البلاغہ۔ مرتب کی اور اس کو حضرت ولایت پناہ مولائے کائنات کی تصنیف قرار دیا۔ اس میں لکھا ہے کہ ذات کے ساتھ الگ سے تصوّر صفات کا شائبہ بھی گمراہ کن ہو سکتا ہے۔ ایک تو صوفیا نے اشاعرہ و شیعان علی کرم اللہ وجہہ کے تصوّرات وجود یا تصوّرات الہ کے مضرات سے اور نتائج سے دور رہنے کی کوشش کی۔ دوسرے اہل یونان کے فلسفے کی یورش کا مقابلہ کرنے کے لیے لا الٰہ الا اللہ کی ایک نئی اور امتیازی تشریح اختیار کی اور اس کی بنیاد قرآنی تصوّر توحید پر رکھی۔ چنانچہ صوفیوں کا تصوّر الٰہ بھی دوسرے مسلکوں کی طرح اسلامی تصوّر توحید کی ایک تفسیر و تشریح ہے۔ حضرت علامہ محی الدین ابن عربی نے اس تشریح کو مرتب اور منضبط انداز میں وحدت الوجود کے نام سے پیش کیا۔ وجودی فکر میں وجود اور موجود ایک سے زیادہ نہیں۔ بقول علامہ سکش اکبر آبادی ۔ محبت اور خودی کے حسین ترین موصوف اگر عقل و دانش میں نہ آئے تو خدا اور دل و نظر میں سما جائے تو انسان ہے۔ وجودی فکر میں بھی۔ وہ لمحہ ہے جہاں ایک طرف وجود اور دوسری طرف موجود ہے یا ایک طرف ذات اور دوسری طرف کائنات ہے۔ کائنات میں عالم ارواح، عالم امثال اور عالم اجسام (نباتات، جمادات حیوانات وغیرہ) شامل ہیں۔ اس خارجی ظہور کو شیخ اکبر نے علم حق کا خارجی ظہور قرار دیا ہے۔ یعنی حق تعالیٰ کے وجود خارجی کی تخلیق لفظ ۔کن۔ سے ہوئی ہے۔ ۔کن۔ امر کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں ہو جا۔ اس لفظ کی برکت سے کائنات وجود پذیر ہوئی ہے۔ فلسفے میں عدم کی تعریف یہ ہے کہ اس سے وجود نہیں ہو سکتا۔ اور وجود کی تعریف یہ ہے کہ ۔یہ۔ معدوم نہیں ہو سکتا اس لیے ابن عربی کا خیال ہے کہ باری تعالیٰ نے ۔عدم و وجود۔ سے تخلیق کائنات نہیں کی بلکہ حق تعالیٰ نے اعیان ثابتہ پر لفظ کن سے تجلی فرمائی۔ تجلی کو تکرار نہیں

ایک معنی یہاں ایک اور بھی تجلی لازمی ہے اور وہ معنی اپنے امکانات، حضرات اور تفصیلات و جزئیات کے ساتھ خارجاً بھی ظہور پذیر ہو جاتا ہے۔ صوفیا کا عقیدہ ہے کہ تخلیق کا سبب حق تعالیٰ کی خواہش خود بینی ہے جس کے پردے میں محبت کارفرما ہے۔ حدیث قدسی میں ارشاد ہوا ہے کہ میں ایک پوشیدہ خزانہ (کنز) تھا جب میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں تو میں نے کائنات کی تخلیق کی یعنی کائنات کو اللہ جل شانہ نے اپنے جمال کا آئینہ بنایا ہے۔ اللہ جمیلٌ و یحبّ الجمال اس پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے۔ اردو کے بعض شاعروں نے اس نکتے پر تخلیقی انداز سے اظہار خیال کیا ہے۔ مثلاً۔

شخص و عکس اس آئینے میں جلوہ فرما ہو گئے
ان نے دیکھا آپ کو ہم اس میں پیدا ہو گئے
(درد)

عالم آئینہ ہے جس کا وہ مصوّر بے مثل
ہائے کیا صورتیں پردے میں بناتا ہے میاں
(میر)

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتیِ راز نہاں ہوں
(میر)

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں
(غالب)

صوفیا کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ موجودات متحرک اور متغیر ہیں عالم ہر آن فنا ہوتا ہے اور ویسا ہی دوسرا پیدا ہو جاتا ہے لیکن ظاہر بین نگاہ کو اس کا فنا ہونا اور دوبارہ وجود پذیر ہونا دکھائی نہیں دیتا جو تغیر کا عمل موجودات یعنی اعیان خارجہ میں ہوتا ہے جو حادث ہے اور اعراض کا مجموعہ ہے اس لئے یہ تغیر بھی حق تعالیٰ کی تجلی سے ہے۔ حق تعالیٰ مرتبۂ قدیم یعنی باطن میں اعیان ثابتہ پر تجلی فرماتا ہے تو اس تجلی سے اعیان خارجہ وجود میں آتے ہیں۔ یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ ۔کہ ازل سے تا بہ ابد ایک آن ہے۔ کے مصداق میں تخلیق جاری ہے۔ تجلی کا عمل مسلسل ہے۔ تجلی کو تکرار نہیں (یعنی حق تعالیٰ ایک عین پر دو بار تجلی نہیں فرماتا) اور ایک ہی انداز میں دو اعیان پر یکساں طور پر تجلی نہیں ہوتا۔ حضرت ابن عربی نے تجلی کو عطائے الٰہی کہا ہے اور اس کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ پہلی

عطایائے ذاتیہ ہے جو ہمیشہ تجلّی الٰہی سے وابستہ ہوتے ہیں یعنی اعیانِ ثابتہ پر اسماء وصفات کا ظہور ہوتا ہے۔ دوسری عطایائے آئینہ جسے محض پر تجلی الٰہی اعیانِ ثابتہ کی استعداد اور اقتضائے باطن کے مطابق ہوتی ہے۔ حضرت ابن عربی نے تجلّی کے اظہار کو تجلی ذاتی، تجلّی صفاتی اور تجلّی فعلی بھی کہا ہے [۴]۔ اس نکتے کا تخلیقی رنگ بھی دیکھئے۔ مثلاً۔

ہر آن یہاں واردات دل پر   آتا ہے یہ قافلہ کہاں ہے

——————— (درد)

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز   پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

——————— (غالب)

گر کون و مکاں مظہرِ نیرنگ نہ ہوتا   ہر آن میں اس کا یہ نیا ڈھنگ نہ ہوتا

——————— (شاہ نیاز بریلوی)

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید   کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

——————— (اقبال)

صوفیوں میں چشتیوں پر وحدت الوجودی اندازِ فکر غالب ہے خاص طور پر، خود شاہ نیاز بریلوی اور علامہ سید محمد علی شاہ میکش اکبرآبادی کے یہاں یہ رنگ بہت کھلتا ہوا اور گھلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

(۲) نظریہ وحدت الشہود

عام لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ وحدت الوجود کی طرح وحدت الشہود بھی اسلامی تصوف کا ایک نظریہ ہے۔ اس غلط فہمی کو دو طرح عام کیا گیا۔ ایک تو بعض مسلمان دانشوروں، مفکروں عالموں نے اس نظریہ کی زبردست تبلیغ کی اور باور کرایا کہ یہی اسلامی توحید ہے۔ دوسرے بعض مستشرقین نے ایسے حضرات کی تبلیغ سے متاثر ہو کر یقین کر لیا کہ یہی اسلامی یا صوفیانہ توحید ہے اور اس نظریہ کی تبلیغ میں منہمک ہو گئے۔ علامہ سید محمد علی شاہ میکش اکبرآبادی رقم طراز ہیں۔

(الف) "نظریۂ شہود تصوف کی تاریخ میں بہت اہم واقعہ ہے۔ نظریۂ شہود کے بانی حضرت شیخ احمد سرہندی جو بعد میں مجدّد الف ثانی کہلائے پہلے صوفی ہیں جنہوں نے اپنے تصوف کی بنیاد وحدت الوجود کی مخالفت پر رکھی۔ نظریۂ شہود کے دو پہلو ہیں۔ ایک علمی، دوسرا کشفی۔ علمی اعتبار سے یہ کوئی نئی دریافت نہیں ہے اسلام کے اکثر فرقوں میں اور اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب میں بھی عالم کو خدا کا غیر تسلیم کیا گیا ہے [۵]۔ البتہ کشفی اعتبار سے مجدد صاحب پہلے صوفی ہیں جنہوں نے علماء ظاہر کی تائید میں اپنا کشف پیش کیا۔ ان سے پہلے کسی صوفی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ہم نے از روئے کشف عالم کو غیر حق معلوم کیا (ج) حضرت مجدد صاحبؒ نے اپنے معارف کی بنیاد متکلمین کے مذہب پر رکھی ہے علم کلام دو چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے (۱) اسلامی عقائد کا اثبات (۲) فلسفۂ ملاحدہ اور دوسرے مذاہب کا رد۔ (اشاعرہ، معتزلہ، جبریہ اور قدریہ وغیرہ متکلمین کے مشہور فرقے ہیں) [۶]

اس تجزیہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ تصوف کے دائرے میں اگرچہ توحید شہودی کا ذکر بھی آتا ہے مگر توحید وجودی ہی دراصل توحید تصوف ہے اور وحدت الشہود میں کائنات اور خدا موجود اور وجود کی دوئی پر خاصا زور دیا جا رہا ہے۔ خواجہ میر درد نے توحید شہودی کو تخلیقی آب و رنگ دے کر پیش کیا ہے۔

آواز نہیں قید میں زنجیر کی ہرگز
ہر چند کہ عالم میں ہوں عالم سے جدا ہوں
ہر جز کو کل کے ساتھ یعنی ہے اتصال
دریا سے در جدا ہے پہ ہے غرقِ آب میں

(۳) نظریہ مایہ

اس نظریہ کو "ویدانت" بھی کہتے ہیں۔ ویدانت کو ویدوں کے انتم حصے بھی کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر داس گپتا نے رگ وید کے فکری ارتقاء کو بیان کرتے ہوئے اس کے حسب ذیل مدارج کا

خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

(۱) عالم کائنات۔ برہما (اللہ) ایک جُزی ذات اعلیٰ ذات سے ظاہر ہوا ہے۔

(۲) یگیہ۔ یگیہ کے ذریعہ انسانی مقاصد پورے ہوتے ہیں جس کے چلن سے دیوتاؤں کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔

(۳) مظاہر پرستی کے رجحان میں کمی آئی اور وحدت پرستی کا چلن بڑھا۔

(۴) روح (آتما) کے بارے میں یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ موت کے بعد بدن سے الگ ہو جاتی ہے اور دوسرے عالم میں سزا و جزا پاتی ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ یگیوں اور قربانیوں کی جگہ "مراقبوں" نے لے لی اور جو دنیاوی فائدے یگیہ سے حاصل کئے جاتے ہیں مراقبوں سے حاصل کئے جانے لگے۔ یعنی ہندو سماج، ویدوں سے ویدانت کی طرف سفر کرنے لگا۔ بقول علامہ سید محمد علی شاہ اکبرآبادیؒ

"(الف)۔ اُپنی شد الہامی ویدوں کے اختتامی حصے ہیں اس لیے ویدانت کہلاتے ہیں۔

(ب)۔ ویدوں کا راستہ فرائض کا راستہ ہے جسے کرم مارگ کہتے ہیں۔ اپنشدوں کے خلاف "گیان مارگ" یعنی راہ معرفت کی طرف ہدایت کرتے ہیں۔

(ج) اپنشدوں کی رو سے عابد اور معبود کے درمیان کوئی تعلق نہیں ہے۔ نہ عبادت خدا کے حضور پیش ہوتی ہے بلکہ صرف صداقت عالیہ کی تلاش ہی اعلیٰ ترین اور تنہا مقصد ہے۔"[۴]

اس نظریہ کے مدوّن اور مفسّر اگرچہ سری آدی شنکراچاریہ ہیں مگر ان سے قبل سری گوڈپادؔ نے اپنی شدوں میں وحدت الوجود کا نظریہ دریافت کر لیا تھا۔ سری شنکراچاریہ نے بعض اپنشدوں اور گیتا کی شرح اسی نقطۂ نظر سے کی ہے۔ نظریۂ مایا یا ویدانت یہ ہے کہ وجود حقیقی صرف برہم کا ہے۔ برہم آنند ہے اور ناقابل تغیر ہے۔ نظر آنے والا عالم مایا ہے جو اگیان یعنی جہل کی وجہ سے نظر آتا ہے۔ عالم اگیان کے ذریعہ دل و نظر سے جہل کا پردہ ہٹا دیا جائے تو پھر اصل شے یعنی برہم نظر آنے لگتا ہے۔ اس نظریہ میں تین چیزیں خاص ہیں (الف) وجود حقیقی برہم کا ہے۔ (ب) صورت عالم مایا یعنی دھوکا ہے اور اس کا کوئی وجود نہیں ہے (ج) مایا نظر آنے یعنی دھوکا کھانے کی وجہ جہل (اگیان) ہے جس کو عرفان (یعنی علم گیان) سے دور کیا جا سکتا ہے۔

اردو شاعری میں اس نقطۂ نظر کا شعری و جمالیاتی اظہار بھی ملتا ہے۔

عنقا کی طرح میں کیا بتاؤں
جز نام مرا نشاں نہیں ہے (درد)

آئینۂ عدم ہی میں ہستی ہے جلوہ گر
ہے موجزن تمام یہ دریا سراب میں (درد)

شاہد ہستیٔ مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں (غالب)

یاں کھا یو مت فریب ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے پر نہیں ہے (غالب)

توحید کے تینوں نظریے سامنے ہیں۔ ان میں صوفیا کا نظریہ توحید صرف توحید وجودی کا ہے۔ توحید شہودی کا نظریہ بھی بعض علماء قسم کے صوفیا نے اپنایا ہے۔ نظریۂ مایا تو ہندو سادھوؤں کا پسندیدہ نظریہ ہے لہٰذا اقبال، ابوالکلام آزاد اور ابوالاعلیٰ مودودی صاحبان کی مخالفت کا راز ان کی ذہنی تربیت یا رجحان طبع میں پنہاں ہے واضح رہے کہ ان تینوں نظریوں کے امتیازات، نظریۂ فنا میں واضح ہوتے ہیں۔

نظریۂ فنا

حضرت شیخ کلیم اللہ ولی شاہ جہاں آبادیؒ کا قول ہے کہ فنا ولایت کے لئے شرط اولین ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے لکھا ہے کہ فنا اور معرفت لازم ملزوم ہیں۔ یعنی فنا میں جو جتنا کامل ہے معرفت میں بھی اتنا ہی کامل ہے۔ حضرت خواجہ بہاء الدین

نقش بغداد نے فرمایا کہ ہر لمحہ وجود طبعی کی نفی کرنی چاہئے اور معبود حقیقی کا اثبات کرنا چاہئے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا کہ بدن اور اس کے اعضا کی نفی کرنا اور خواہشات نفسانی سے دل کو پاک کرنا۔ فنا کی منزل ہے اور خدا کو موجود دیکھنا بقا باللہ کی منزل ہے یہ درست ہے کہ فنا منزل ولایت ہے مگر فنا ہے کیا؟ ۔ الجیلی کا خیال ہے کہ اپنا اور اپنے لوازم ذات کے شعور کا معدوم ہو جانا ہی فنا ہے۔ اس کو از خود رفتگی یا جذب کی منزل قرار دیا جا سکتا ہے۔ مولانا جامی کا خیال ہے کہ باطن میں خدا کی ہستی کے ظہور کے غلبہ کے علاوہ کسی چیز کا ہوش نہ رہے اور فنا الفنا یہ ہے کہ اس بے شعوری کا بھی شعور نہ رہے یعنی کامل استغراق ہی فنا کی منزل ہے۔ حضرت شیخ کلیم اللہ شاہجہاں آبادی نے لکھا ہے۔

"(سلوک) سیر حد فنا فی اللہ پہنچ کر خدا کی بقا سے باقی ہو جائے۔ پہلی سیر (فنا فی اللہ) کو سیر الی اللہ کہتے ہیں اور دوسری سیر (بقا باللہ) کو سیر فی اللہ کہتے ہیں"[۵]

اس نقطۂ نظر کو حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے اس طرح بیان فرمایا ہے۔

"واصلین کے دو گروہ ہیں۔ اول وہ مشائخ صوفیا ہیں جنہوں نے حضرت محمد رسول اللہ کی پوری اتباع اور کامل تقلید سے خاص مرتبہ حاصل کیا ہے اور اس کے بعد انہیں مخلوق کی ہدایت پر مامور کیا گیا ہے یہ لوگ کامل اور مکمل کہلاتے ہیں کیونکہ یہ لوگ فضل اور عنایت ازلی سے عین جمع و توحید کے دریا میں ڈوب کر امتیاز کے ساحل پر پہنچے ہیں اور فنا کے بعد انہوں نے بقا حاصل کی ہے تاکہ خلق کو نجات کا راستہ دکھائیں اور بلند درجات تک پہنچائیں۔ دوسرا گروہ ان واصلین کا ہے جو واصل ہونے کے بعد اس عالم کی طرف لوٹ کر نہ آئے اور فنا فی اللہ کے بعد بقا باللہ تک پہنچے بقام جمع میں اس طرح ڈوب گئے اور مستہلک ہو گئے کہ ان کی خبر تک نہ آئی"[۶]

منزل فنا سے متعارف ہونے کے بعد وجودی، شہودی اور ویدانتی فنا کے امتیازات پر ایک نظر ڈال لینا چاہئے۔

(الف) وحدت الوجودی فنا۔ میں تبدیلی خیال کا نام فنا ہے۔ یعنی خود کو غیر حق سمجھنا غلط اور گمراہ کن ہے۔ وجودی صوفیا کو بار بار اس بات کے یقین کی طرف مراجعت کرنی پڑتی ہے کہ وہ غیر حق کی حیثیت سے موجود نہیں ہے۔ جوں ہی یہ عرفان مکمل ہوتا ہے، ویسے ہی فنا کی تکمیل اور اس کا عمل بھی مکمل ہو جاتا ہے۔ یہ بظاہر آسان مگر بہ باطن ایک دقت طلب امر ہے۔

(ب) وحدت الشہودی فنا میں انسان چونکہ غیر حق ہے اس لیے اس کو عبادت و ریاضت کی سیڑھی کے ذریعہ ذات وحدہٗ لاشریک تک جانا پڑتا ہے اور راستے کے خطرات اور مشکلات کو انگیز کرنا پڑتا ہے اکثر لوگ راہ میں گم ہو جاتے ہیں۔ اگر اکا دکا کوئی طالب وہاں پہنچتا ہے تو وہ لوہے کے ٹکڑے کی طرح آگ میں داخل ہو جاتا ہے۔ اگرچہ لوہا بھی آتش رنگ اور آتش مزاج ہوتا ہے مگر لوہا لوہا ہی رہتا ہے اور آگ آگ ہی رہتی ہے۔ لوہا ٹھنڈا ہونے کے بعد بالکل سخت اور اپنی اصل پر واپس آجاتا ہے۔ اس لئے شہودی فنا میں فنائے مطلق کا رنگ ہے جو ویدانتی فنا سے ملتا جلتا ہے۔

(ج) ویدانتی فنا میں سالک کو ترک ارادہ، ترک خواہش اور ترک عمل کے ذریعہ اپنا موجودہ چولا چھوڑنا پڑتا ہے اور مر کر اس ذات میں حلول ہونا پڑتا ہے یا اس دریا میں تحلیل ہونا پڑتا ہے جس کو برہم کہتے ہیں۔ یہ تصور فنائے مطلق کا ہے جس کے اثر سے وحدت الشہودی فنا کی طرف پہنچتے ہیں۔ بدھ ازم میں بھی فنائے مطلق کا تصور کارفرما ہے۔

اس طرح الگ الگ نظریوں کو ماننے والے صوفیا کے یہاں فنا کے تصورات، مضمرات اور نتائج بھی الگ الگ ہیں۔

اسلام کی بنیادی اقدار اور تعلیمات تو ایک ہی ہیں مگر متعدد مقامات پر ان کی ذیلی اور فروعی تشریحات اور تفسیرات، یہ لتیازات بعض مقامات پر اتنے متضاد اور متصادم ہیں کہ ان کی بنیاد پر الگ الگ مسلک وجود میں آگئے ہیں۔ یہاں یہ بات خاص طور پر کہنے کی ہے کہ یوں تو اسلام کا فقہی نظام بہت واضح اور وسیع

(جاری)

غزلیں

مصلحت ایسی بھی کیا میں تو غضب کرتا ہوں
جن کا سر چاہیے ان کا بھی ادب کرتا ہوں

کون جانے گا ترا ذکر میں کب کرتا ہوں
پہلے ان ہونٹوں کو سی لیتا ہوں تب کرتا ہوں

اپنی خلوت میں تری بزم سجاتا ہوں میں
پھر تری بزم میں خلوت کو طلب کرتا ہوں

آپ بس شاعری کرتے رہیں ایسے، جیسے
مجھے طب آتی نہیں پھر بھی مطب کرتا ہوں

دل میں سب کچھ ہے مگر ذکر غزل میں تیرا
نہ کبھی پہلے کیا اور نہ اب کرتا ہوں

شجاع خاور

۱۔ پارک سلیس،
تال کٹورہ پارک، نئی دہلی

شبنمی موسم کا یوں اظہار بن جاتے ہیں لوگ
جب نمو پاتے ہیں تو گلزار بن جاتے ہیں لوگ

بے سبب ہی صاحبِ کردار بن جاتے ہیں لوگ
موسمِ گل میں بھی اکثر خار بن جاتے ہیں لوگ

کچھ سفینوں کو ڈبو دیتے ہیں اپنے آپ ہی
کچھ سفینوں کے لیے پتوار بن جاتے ہیں لوگ

اتفاقاً دھوپ کے موسم میں مل جاتے ہیں جب
سایہ تو بنتے نہیں دیوار بن جاتے ہیں لوگ

خواب اپنے ڈھالتے ہیں پتھروں کے جسم میں
اپنے جی میں اس طرح شہکار بن جاتے ہیں لوگ

رات میں سوتے ہیں جو گمنامیوں کو اوڑھ کر
صبح جب اٹھتے ہیں تو اخبار بن جاتے ہیں لوگ

گرمیوں میں دھوپ کی یلغار کرتے ہیں نذیر
سردیوں میں برف کی بوچھار بن جاتے ہیں لوگ

نذیر فتحپوری

مدیر اسباق ۱۱۴۳ نیتا پارک ایرنڈوَنا
پونہ ۴۱۱۰۰۶

سماعتوں پہ گراں بے زبانیاں اس کی
اسیرِ دیدہ و جسم لامکانیاں اس کی

ہر ایک چہرے پہ بے چہرگی کے سائے ہیں
گرفت میں نہیں آتیں نشانیاں اس کی

اسی کا کاسۂ سر بھی اسی کا پتھر بھی!
لہو اسی کا لہو میں روانیاں اس کی

وہ سیلِ کارِ جہاں تھا کہ اس کو بھول گیا
مجھے سنا کے پھر آ کر کہانیاں اس کی

وہ ہم پہ کرتا رہا اپنی نعمتوں کا نزول
ہمیں سے ہو نہ سکیں قدردانیاں اس کی

شکیب رضوی

کرائسٹ چرچ انٹر کالج
کانپور

سبط محمد نقوی
چیف ایڈیٹر 'ہماری توحید' (ہندی)
۱۱ باڑہ غفران مآب۔ چوک۔ لکھنؤ

رام لعل نابھوی (۲)

اس عنوان پر میری ناچیز تحریر نیا دور کے جون ۱۹۹۵ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی، اس میں یہ اشارہ میں نے کیا تھا کہ اس مضمون کی دوسری قسط بھی پیش کی جائے گی، لیکن کوئی ایسا محرک نہیں ہوا کہ وہ قسط لکھنے میں عجلت برتی جاتی، لیکن میرے مضمون کی اشاعت کے بعد نابھوی صاحب آں جہانی کے متعلق ایسی معلومات مہیا ہوئی ہیں جن کو قارئینِ کرام کے ملاحظے میں اس لیے بھی پیش کرنا ضروری ہے کہ پہلی قسط میں جو کمی تھی وہ بہ حدِّ امکان پوری ہو جائے اور جو غلط اطلاع راہ پا گئی ہے وہ دور ہو جائے، اس لیے یہ سطریں نذرِ ناظرین ہیں، پہلی قسط لکھتے وقت جو کچھ دوسری قسط میں پیش کرنے کا ارادہ تھا، اس کا بیشتر حصہ پھر بھی ناگفتہ رہ جائے گا اور اس کے لئے تیسری قسط کا انتظار کرنا ہوگا۔

میں نے جناب نابھوی کی قدر دانی کے سیاق میں عرض کیا تھا:۔

"......اسے ایک المیہ سمجھنا چاہیے کہ اس دانش مندِ یگانہ نے خود اپنے قلم کی بدولت اپنا نام جتنا بھی روشن کیا ہو، ان کے کام کی قدر شناسی کا میدان صاف ہے۔ بس ایک استثنا جس کی خبر اب تک ان سطروں کے قلیل الاطلاع راقم کو ہے وہ ہمارے لکھنؤ کی میر اکادمی ہے جس نے نابھوی صاحب کو غالباً ۱۹۸۸ء میں اعزاز پیش کیا...."

میرے یہ تاثر خود نابھوی صاحب کے اظہارِ خیال پر مبنی تھے مگر جب روزنامہ قومی آواز لکھنؤ نے اپنی ۱۶ر جولائی ۱۹۹۵ء کی اشاعت کے ضمیمے میں 'نابھوی صاحب کی مرحوم سعادت علی صدیقی سے ایک گفتگو' شائع کی تو پتہ چلا کہ اُن کے تاثرات میں کچھ مبالغے کی بھی آمیزش تھی، اس گفتگو کا مسودہ خود نابھوی صاحب کے پاس ہی تھا، صدیقی صاحب کی رحلت کے بعد انھوں نے تعزیتی کلمات کے ساتھ اسے بھیجا، سعادت صاحب کے اس ضمن کے سوال پر نابھوی صاحب نے فرمایا:۔

" انعامات لینے کے کچھ طریقے اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ میں کسی گروہ میں شامل نہیں ہوا۔ اکیلا تھا، اکیلا ہوں شاید اس لیے کہ اللہ بھی اکیلا ہے۔ گروہ بازی، مشاعرہ بازی، پینترے بازی اور باہمی تعریف و توصیف کا کاروبار میں نے نہیں سیکھا نہ کسی نے سکھایا نہ میں سیکھ سکتا تھا۔ وہ حربے جو انعامات حاصل کرنے کے لئے کام میں آتے ہیں، وہ میرے ہاتھ نہیں آئے۔ پھر طبیعت میں بغاوت 'انعام کون دیتا ہے' لیکن پھر بھی ۸ انعامات ملے، شاید آپ اسے بھی سننا چاہیں....

۱۔ آم کے آم پر حکومتِ ہند سے پہلا انعام، بہار اردو اکادمی سے اور ہریانہ ساہتیہ اکادمی سے انعام [illegible] اکادمی سے خواجہ احمد عباس ایوارڈ۔ ۲۔ بہار اردو اکادمی سے اردو ادب پر مجموعی خدمات پر خصوصی انعام۔ ۳۔ محکمۂ السنہ پنجاب سے 'آم کے آم' کی اعلا طباعت پر انعام...."

اتنا ہی نہیں، سرکاری میڈیا نے بھی نابھوی صاحب کی قدر دانی کی، جیسی کہ ان کے ہم پلہ محققوں کے کام کی عام طور سے نہیں ہوتی۔ اس کی تفصیل بھی انھیں کے الفاظ میں دیکھنا دلچسپ ہوگا، بتاتے ہیں:۔

"....جی ہاں، میں شعر بھی کہتا ہوں، میں نے کسی اُستاد سے کچھ نہیں سیکھا۔ دُور درشن اور ریڈیو اسٹیشن پر مشاعروں میں کلام سنایا ہے۔ اردو سروس۔ اردو مجلس پر انٹرویو ہوئے کلام بھی سنایا۔ لیکن دور درشن پر جو نمایاں کام ہوئے وہ یہ ہیں کہ حکومتِ ہند کے حکم سے کوی اور کویتا' پروگرام میرے مکان پر ریکارڈ ہوا۔ وہ نیشنل پروگرام میں دکھایا گیا۔

پھر دوردرشن جالندھر والے میری لائبریری پر فلم بنانے کے سلسلے میں آئے ابھی وہ فیصلہ کر ہی رہے تھے کہ حکومت کی ایما پر میری لائبریری کی فلم بنائی گئی جو میرے انٹرویو کے ساتھ دور درشن لکھنؤ سے ٹیلی کاسٹ ہوئی۔ پھر یوں ہوا کہ دور درشن جالندھر پر خشیل شاعروں میں طنزیہ و مزاحیہ کلام دو تین بار سنایا گیا۔ واہی صاحب نے پٹنے سے ایک خط میں مجھے لکھا کہ ہندوستان میں طنزیہ و مزاحیہ نظم اور نثر لکھنے والے آپ ہی ہیں، شعری مجموعہ زیر ترتیب ہے۔

س۔ ع۔ ص۔ تخلیق شعروادب کے علاوہ آپ کی خدمات؟

ر، ل، ن۔ حکومت ہند نے مجھے دور درشن جالندھر کی ایڈوائزری کمیٹی کا ممبر نامزد کیا یہی نہیں پھر ایک چینل طنز و مزاح کا وہیں بنایا اور اس کا بھی مجھے ممبر نامزد کر دیا۔ ہم دور درشن کی ایڈوائزری کمیٹی کی میٹنگ میں حرف گیری کرتے۔ متظلمین سنتے کیونکہ انھیں سننا پڑتا تھا لیکن ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتے کیونکہ یہ حق انھیں کا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پھر موقع ہی نہیں ملا۔"

رام لال صاحب کے اس بیان کو غور سے دیکھیں تو صاف پتہ چلتا ہے کہ قدر دانی میں کمی نہیں تھی۔ یہ بات اپنی جگہ پر ہے کہ وہ جس اعزاز و اکرام کا اپنے کو مستحق سمجھتے رہے ہوں اس کے بہ قدر یہ نہ رہی ہو۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کے ہی پائے کے دوسرے محققوں اور ادیبوں کے ساتھ اتنا بھی نہیں ہوا ہے۔

سعادت علی صدیقی صاحب کے انٹرویو کی اشاعت سے پہلے راقم کو نابھوی صاحب کے حالات سے قطعی لاعلمی تھی۔ یہ بھی حسنِ اتفاق پیش آیا کہ میری ناچیز تحریر ملاحظہ فرما کے ادیبِ شہیر کالی داس گپتا رضا نے مجھے سرفراز نامہ بھیجا، جس میں اپنے ایک مضمون کا حوالہ دیا۔ مضمون مجھے مالک رام صاحب کے رسالے تحریر میں دست یاب بھی ہو گیا۔ اس لیے اس وقت نابھوی صاحب کے تفصیلی سوانح پیش کرنے کی استطاعت ہوئی ہے۔ ہم بقدرِ گنجائش اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ نابھوی صاحب نے صدیقی صاحب کو جو کچھ بتایا ہے۔ رضا صاحب نے اس سے کہیں زیادہ تفصیل مہیا کی ہے لہٰذا ہم یہاں رضا صاحب کا اقتباس پیش کرتے ہیں لیکن یہ عرض کر دیں کہ ہم یہاں داستان منشی گوبند رام سے شروع کر رہے ہیں۔ یہ نابھوی صاحب کے پردادا تھے۔ علمی روایت انھیں سے شروع ہوتی ہے۔ رضا صاحب کے بیان کے مطابق لالہ گوبند رام، لالہ گوکل چند کے چھوٹے بیٹے تھے اور ۱۲ دسمبر ۱۸۲۹ء کو پیدا ہوئے تھے۔ فاضل مضمون نگار نے یہ بات نابھوی صاحب کے والد حکیم ہری داس صابر کی مرتبہ کتاب "گوبند پرکاش" مطبوعہ تنائی پریس، نوبستہ لکھنؤ کے حوالے سے کہی ہے۔ یہ پریس اردو کے مشہور ادیب، شاعر اور صحافی منشی رام سہائے تمنا کا تھا۔ اب آگے کی روداد آپ رضا صاحب کی لفظوں میں ملاحظہ کریں:

"منشی گوبند رام صرف پانچ برس کے تھے، جب اُن کے والدِ محترم کا انتقال ہو گیا اور یہ یتیم بے سہارا ہو کر رہ گئے۔ جیسا کہ انھوں نے خود شرح گل کشتی کے دیباچے میں لکھا ہے، ان کی پرورش بڑے بھائی تلسی رام کے زیر سایہ ہوئی، جو ضلع بادل، ریاست نابھا میں تحصیلدار کے عہدے پر فائز رہے۔ منشی صاحب کا خاندان کوئی علمی ادبی گھرانا نہیں تھا، بنج بیوپار کو اعلا لکھائی پڑھائی سے کیا سروکار! اتنی ہی شد بد کافی سمجھی جاتی تھی جو حساب کتاب اور ساہوکارے کی ضرورتیں کو پورا کر سکے۔ چنانچہ انھوں نے پٹیالہ ہی میں ہندی پڑھنی شروع کی اور بارہ سال کی عمر تک اس قابل ہو گئے کہ اپنے ایک دُور کے چچا لالہ اندرسین ساہوکار کی دکان کا کام بطریقِ احسن انجام دینے لگے۔ لالہ اندرسین ان کی لیاقت اور کارگزاری سے خوش تھے اور ان سے اپنی اولاد کی طرح محبت کرتے تھے۔ مگر قضائے الٰہی سے ان کی سمبت ۱۹۲۱ (۱۸۶۳-۱۸۶۴ء) میں وفات ہوئی۔ منشی گوبند رام نے اس کے بعد بزازی اور پنسار کی دکان کھول لی، لیکن اس میں طبیعت نہ لگی۔ آخر عمر ہی کیا تھی، مزید تعلیم کا شوق دل میں چٹکیاں لینے لگا۔ بالآخر سمبت ۱۹۲۳ (۱۸۶۶-۱۸۶۷ء) میں وہ جگادھری کے ایک گاؤں کے رہنے والے پچھمن شاستری صاحب سے سنسکرت پڑھنے لگے۔ ان

سے شریمد بھگوت گیتا اور وشنو سہسر نام کی تعلیم پائی اور دیوبانی کی تکمیل کے لیے سنسکرت دیاکرن یعنی لگھو کومدی وغیرہ حفظ کر ڈالے۔ وہیں دھرم شاستر کی رُو سے یگیو پویت (جنیو) پہنا اور سندھیا بھی پڑھی ...... یہ وہ زمانہ ہے، جب آہستہ آہستہ اردو کا بول بالا ہو رہا تھا اور فارسی کی قدر و قیمت کم ہونے لگی تھی۔ تاہم ہنوز فارسی کے بغیر آگے بڑھنے کے مواقع کم تھے۔۔ ہندوؤں میں معاد کے لیے بیشک سنسکرت علوم کا جاننا ضروری خیال کیا جاتا ہے، مگر معاش کے لیے فارسی پڑھے بغیر کسی اعلیٰ مرتبے پر پہنچنا مشکل تھا۔ ابھی تک نہ شمالی ہندوستان کے مسلمان اُردو اور فارسی کو صرف اپنی زبانیں سمجھتے تھے۔ نہ ہندو انھیں پرائی بھاشائیں کہتے تھے۔ انگریزی کی طرح جو بھی یہ زبانیں سیکھ گیا، اس کی تعلیم مکمل خیال کی جاتی تھی۔ گوبند رام کے محلّے کے چند ساتھی لڑکوں نے جو مدرسے میں فارسی پڑھتے تھے، انھیں بھی فارسی پڑھنے کی طرف راغب کیا چنانچہ سمبت ۱۹۲۵ (۱۸۶۸ - ۱۸۶۹ء) میں فارسی کی بسم اللہ ہوئی۔ اس کے چھ ہی مہینے بعد انھیں نابھہ آنا پڑا۔ یہاں بعض کج فہموں نے انھیں اس عمر میں فارسی پڑھنے سے باز رکھنے کی کوشش میں کچھ طعنہ زنی بھی کی، مگر علم کی پیاس طعنوں کے زہر سے نہیں، محنت کے پسینے سے بجھتی ہے۔ منشی صاحب نے اپنی عرق ریزی اور جانگدازی سے تین ہی سال میں متداول مکتبی کتابیں ابوالفضل اور سکندر نامہ وغیرہ سے فراغت حاصل کر لی اور پھر تین چار ماہ پٹیالہ میں مشہور خوشنویس مرزا عباد اللہ دہلوی کی خدمت میں رہ کر خوشنویسی کی مشق کی اور اس کے بعد نابھہ چلے آئے۔ یہاں آکر خیال آیا کہ فارسی بغیر عربی کے طعام بے نمک معلوم دیتی ہے۔ چنانچہ سمبت ۱۹۳۰ (۱۸۷۳ء - ۱۸۷۴ء) میں عربی شروع کر دی۔ سوا سال میں کافیہ تک تعلیم پائی اور کافیہ ازبر کیا، پھر شرح ملا بحث حروف تک پڑھی۔ پھر کتبِ منطق شروع کر کے تصنیف قطبی (میر قطبی) تک پڑھا ..... معلوم ہوتا ہے کہ اُردو، عربی فارسی کے فاضل ہونے کے باوجود ان کی سنسکرت سے دلچسپی کم نہیں ہوئی۔ چنانچہ انھوں نے چند سال میں کھرڑ (ضلع انبالہ) کے فاضل سنسکرت اور شری دھر ٹیکا (شرح شریمد بھاگوت) کے مصنف پنڈت نبسی دھر سے سارسوت، میگھ دوت، ترک سنگرہ، پد کرت چندرودے، منوسمرتی وغیرہ گرنتھ پڑھے۔ بعد ازاں سمبت ۱۹۶۹ (۱۹۱۲ - ۱۹۱۳ء) تک متعدد مضامین کے علاوہ انھوں نے ہندی اور سنسکرت میں یہ کتابیں تصنیف کیں :

"تتیہ شوچ بدھی۔ سندھیا بدھی۔ اسنان بدھی۔ گنگا نہان بدھی۔ سنکلپ بدھی وغیرہ۔ وہ سمبت ۱۹۷۰ (۱۹۱۳ - ۱۹۱۴ء) میں ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔ اس کے بعد بھی ہمہ وقت شغلِ تصنیف و تالیف میں مصروف رہے، اسی زمانے میں آئینِ اکبری کے ایک فقرے پر مجدد الشرقیہ سید احمد حسن شوکت میرٹھی سے ایک علمی مناظرہ ہوا۔ اس بحث کا آغاز شوکت میرٹھی کے ایک مضمون سے ہوا جو انھوں نے اخبار 'عام' لاہور کے ۱۲ اگست کے شمارے میں بعنوانِ 'آئینِ اکبری کا ایک فقرہ' لکھا تھا ...... اس بحث نے طول کھینچا اور گھمسان کا رن پڑا۔ جمہور کی رائے یہی تھی کہ میدان منشی صاحب کے ہاتھ رہا۔ سمبت ۱۹۷۲ (۱۹۱۵ - ۱۹۱۶ء) میں ان کی دھرم پتنی نے رحلت کی۔ اس کے سال بھر بعد سمبت ۱۹۷۳ (۱۹۱۶ - ۱۹۱۷ء) میں ان کا رسالہ رَوم اگروالاں طبع ہوا۔ اب وقتِ آخر آپہنچا تھا۔

سمبت ۱۹۷۴ جیٹھ سُدی (جون ۱۹۱۷ء) نرجلا اکادشی کے روز سکل پکش اترایَن بیتی پات یوگ میں عین دوپہر کے ½۱۱ بجے دھرم چرچا کرتے ہوئے اڑسٹھ برس کی عمر میں سُوَرگ باش ہو گئے۔ رام سہائے تمنا لکھنوی نے انتیس شعر کا تاریخی قطعہ کہا، جو منشی صاحب کے اوصاف و اطوار پر بہت روشنی ڈالتا ہے ......"

رضا صاحب نے اس قطعے کے کئی اشعار نقل کیے ہیں۔ لیکن ہمارے لیے طول دینا ممکن نہیں ہے آپ بس دو متعلقہ بیتیں ملاحظہ فرمائیں ؎

اسے تمنّاؔ سالِ رحلت کے لیے   پیشِ ہاتف سر جھکا کر کو سلام
مصرعۂ تاریخ یہ دو بار پڑھو   "رام ہی میں رَم رہیں اب گوبند رام"

(۲ × ۹۸۷ = ۱۹۷۴ سمبت)

رضؔا صاحب نے بہت سیر حاصل مضمون لکھا ہے اور وہ بجا اور محل بھی ہے کیونکہ اول کا موضوع ہی منشی گوبند رام تھے، ہم ممدوح کے حالات اس خیال سے پیش کر رہے ہیں کہ وہ علمی روایت جو رام لال نابھوی صاحب تک پہنچی، قارئین کی نظر میں آجائے، اس لیے جو کچھ مضمون میں منشی صاحب کے شعری کمال کی نسبت ہے، اسے قلم انداز کرتے ہوئے ان کے نثری خدمات سے متعلق اقتباس پیش کر رہے ہیں :

"....منشی صاحب تمام عمر تصنیف و تالیف میں مشغول رہے، اُس عہد میں آریہ سماج نیا نیا میدان میں اُترا تھا اور احمدی فرقہ بھی حال ہی میں معرضِ وجود میں آیا تھا، دونوں نے خاص و عام کے فکر و نظر کو اپنے اپنے ڈھنگ سے متاثر کیا تھا، مذہبی مناظرے اور مباحثے عام طور پر ہونے لگے، منشی صاحب بھی سناتن دھرم کے دفاع کے لیے اس کارزار میں کود پڑے اور سچ تو یہ ہے کہ ان کے علم و فضل کا بیشتر حصّہ اسی لڑائی کی نذر ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں مناظرانہ رنگ بہت ملتا ہے۔ تاہم اُن کی بہت سی کتابوں میں سے ذیل کی تصانیف علمی، ادبی طور پر بھی ان کے نامِ نامی کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں :

ا۔ نصابِ مثلث (قلمی) ۱۲۹۷ھ (۱۸۷۹ء)
(علمِ لغت و صرف سے متعلق ہے)
۲۔ شرحِ قصائدِ عرفی۔   ۳۔ شرحِ گل کشتی
۴۔ بہتانِ سعدی۔   ۵۔ رسالہ تحقیقاتِ الفاظِ متداولہ۔"

کالی داس رضؔا نے اس کے بعد منشی جی کی کتابوں کے تعارف میں دادِ تحقیق و تنقید دی ہے، جو اصحابِ ذوق اس کے مطالعے کے مشتاق ہوں وہ رضؔا کے مجموعے "سہو و سراغ" میں یہ مضمون ملاحظہ فرما سکتے ہیں، اب ہم آگے قدم بڑھاتے ہیں، رضؔا صاحب بتاتے ہیں :

"....منشی گوبند رام صاحب کی دو اولادیں ہوئیں۔ ایک بیٹا، ایک بیٹی، لڑکی ودّیا دیوی..... لالہ جگت رام کے فرزند لالہ ہری داس خدا کے فضل سے ابھی تک حیات ہیں فارسی پر عبور حاصل ہے۔ بہت اچھے شاعر ہیں اور صابؔر تخلص کرتے ہیں۔ تاریخ گوئی میں بڑا ملکہ ہے۔ منشی رام سہائے تمنّاؔ لکھنوی کے شاگرد ہیں۔ ۱۲ ساڑھ ۱۹۵۳ بکرمی (۲۶ جون ۱۸۹۶ء) کو پیدا ہوئے اور ابھی تک باقاعدہ علمی، ادبی کارناموں میں سرگرم ہیں...."

براہ کرم یہ بات پیشِ نظر رکھی جائے کہ یہ اقتباس رضا صاحب نے ۱۹۹۱ء کی مطبوعہ کتاب سے لیا ہے۔

"صابؔر صاحب کے تین صاحبزادوں میں ایک صاحبزادے رام لعل ہیں، جو مشہور مزاح نگار رام لال نابھوی کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ اپنے اور دوسروں کے خاکے اڑانے میں کمال حاصل ہے۔ میرے ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں :

..... چالیس سال سے فلمیں دیکھ رہا ہوں۔ کوئی فلم آئے اور مجھ سے بچ کر نکل جائے، یہ ناممکن ہے
..... شادی کی، عشق نہیں کیا۔ کسی کوٹھے پر جانا نصیب نہیں ہوا کہ ان لوگوں کی زندگی کو سمجھ سکتا۔ گھر کا سناتن دھرمی ماحول یہ تھا کہ پیاز تک کھانے کی ممانعت۔ بھائی خاکے اور افسانے گھر بیٹھ کر نہیں سوجھتے..... میرے پاس عقل کی کمی سہی مگر باتوں کی کمی نہیں.....

اس وقت (۱۹۹۲ء) ہریانہ سرکار میں گزیٹڈ عہدے پر مامور ہیں۔ عمر ۷۵ سال (سالِ ولادت ۱۹۱۷ء) ہے۔ دو لڑکے ہیں اور ایک لڑکی۔ سب اپنی اپنی جگہ خوش ہیں۔ رام لال نابھوی اُردو کسمپرسی کے اس دَور میں بھی منشی گوبند رام مرحوم کے نام کی بزم سجائے ہوئے ہیں۔ اُن کی لَے نہ سہی جو منشی صاحب مرحوم کی تھی، مگر ساز و نغمہ وہی ہے یعنی سازِ علم و ادب اور نغمۂ اردو۔"

مجھے نابھوی صاحب کا سنہ ولادت ۱۹۱۱ء ہونے میں شک ہے۔ کیونکہ انھوں نے ڈاکٹر نریندر بہادر شریواستو کے نام اپنے مکتوب مورخہ ۱۹ ستمبر ۱۹۸۹ء میں لکھا تھا کہ "آج ۷۰ ویں سال میں قدم رکھا ہے"۔ اس طرح اگر ۸۹ میں سے ۱۱ کی نفی کی جائے تو ۷۸ آتے ہیں۔ اس لیے میری ناقص رائے میں رام لعل نابھوی کی ولادت ۱۹ ستمبر ۱۹۱۱ء کو ہوئی۔

بہر کیف ہم نابھوی صاحب کے اسلاف کی سرگذشت کالی داس گپتا رضا سے معلوم کر چکے۔ اب آپ بیتی خود ان کی زبانی سنیے:

"..... مجھے بچپن سے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ اسکول میں ہی ناولوں کا چسکا پڑ گیا، دیوکی نندن کھتری کے دو ناول چندر کانتا سنتتی اور بھوت ناتھ اردو میں ہاتھ آئے۔ یہ کئی جلدوں میں تھے لیکن اتنے دلچسپ کہ کتاب ہاتھ سے چھوٹنے کو جی نہیں چاہتا تھا پھر فسانۂ آزاد، سیر کوہسار، پڑھے۔ مجھے جلسوں میں تقریریں سننے کا شوق بھی جنون کی حد تک تھا۔ چنانچہ آریہ سماج، سناتن دھرم کے جلسوں، سکھ پرب اور میلاد النبی سب میں جاتا۔ ایک دن ایک تقریر سنی اور گھر آکر یادداشت سے لکھ دی۔ دوسرے دن دوسری تقریر لکھ ڈالی والد صاحب کو دکھائیں۔ انھوں نے شاباشی بھی دی اور لائل پور کے پرچے 'جاگرت' میں چھپوا دیں۔ یہ ۱۹۲۵ء کی بات ہے، ۱۹۶۲ء میں دو مضامین ہندی میں لکھے۔ ایک میں سنسکرت کے حوالے دیئے۔ وہ دونوں مضامین 'اپشوارادھا' چنڈی گڑھ میں چھپ گئے۔

سب سے پہلا مزاحیہ خاکہ 'بولئے' لکھا۔ ۱۹۶۰ء میں اردو مجلس آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر ہوا۔ یہی خاکہ ۱۹۶۰ء میں شائع بھی ہوا۔ اب یہ اندازہ ہوگیا کہ ہم لکھ سکتے ہیں اور دونوں صحیح۔ پھر ہم نے مڑ کر نہیں دیکھا اردو سروس، اردو مجلس، فوجی سروس دہلی کے بعد دس بارہ ریڈیو اسٹیشنوں سے خاکے نشر ہوئے۔ غرض کہ خاکے نشر ہوتے رہے، چھپتے رہے۔

اسی بیچ اردو سروس سے 'انشائیہ' موضوع ملا۔ ہم نے انشائیہ کا نام تو سن رکھا تھا لیکن اس بلا کے متعلق معلومات صفر تھیں۔ لغات سے معنی نکالے، ڈکشنریاں ایسے پڑھے۔ حسب نسب کا پتہ لیا۔ انشائیہ نگاروں کو پڑھا۔ پاکستان میں انشائیہ کی تحریک کو سمجھا اور ایک اچھوتا مضمون لکھ ڈالا، اب انشائیوں کا سلسلہ چلا تو دور درشن دہلی کے بزم پروگرام میں دو بار انشائیہ پر مذاکرے میں حصہ لیا۔ پھر دیگر دور درشن کیندروں کے مذاکروں میں شریک ہوا۔ غرض کہ انشائیے لکھتا چلا گیا۔ چھپتے رہے، نشر ہوتے رہے۔

آیئے اب ایک نظر تصنیفات، تالیفات اور تراجم پر، مجموعی طور پر میری پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ۱۔ طنزیہ مزاحیہ خاکے "تبسم" ۲۔ آم کے آم (انشائیے) ۳۔ تلوک چند محروم (تنقید) ۴۔ پوتر پاپی (ناول کا اردو ترجمہ۔ ۵۔ چکبست (تنقید)

اول الذکر تین کتابوں کے متعدد ایڈیشن چھپے۔ تلوک چند محروم ساہتیہ اکاڈمی دہلی اور چکبست حکومت ہند کی ایما پر لکھی گئیں۔ پوتر پاپی محکمۂ السنہ نے شائع کی۔

ان کتابوں کے علاوہ تقریباً دو سو مضامین لکھے، ان میں کچھ ایسے مضامین بھی ہیں جو علم و ادب کی دنیا میں پہلی بار لکھے گئے مثلاً اقبال کا فلسفۂ شاہین، شیخ سعدی کا ہندوستان آنا، عربی فارسی اردو میں رامائن، فارسی اردو میں یوگ واششٹ، عربی فارسی اردو میں گیتا، فارسی اور اردو میں مہابھارت، رامائنوں میں قومی یک جہتی، تلسی داس کی ہندی شاعری، افق لکھنوی کی یک قافیہ رامائن، پنجاب میں فارسی ادب، فارسی کے ہندو انشاپرداز، عربی ادب میں ہندوؤں کا حصہ، عربی فارسی ادب میں سکھ گورو اور سکھ پوتھیاں وغیرہ میں نے تقریباً ڈیڑھ درجن ان شخصیتوں پر جو دنیائے ادب کے درخشندہ ستارے ہیں۔ پہلی بار قلم اٹھایا۔ ان میں سے سات مضامین ملک کے مقتدر پرچے 'معارف' میں چھپے۔ کچھ پاکستان میں چھپے، انٹرویو چھپے ۵ ممالک میں مضامین و خاکے چھپے، دوسری زبانوں میں

تراجم ہوئے۔ ساہتیہ اکاڈمی کی کتاب 'انسائیکلوپیڈیا آف انڈین لٹریچر' میں انگریزی میں دو مضامین چھپے۔ ساہتیہ اکاڈمی کی کتاب 'اے ... ہسٹری آف راماین اسٹڈیز ان دی ورلڈ والیوم فرسٹ' میں میرا نام اسکالرز کی لسٹ میں درج ہے، دوسری جلد میں مضمون شائع ہوگا۔ انگریزی میں مضامین چھپے۔ پنجابی میں دو کتابوں کے علاوہ جو پنجاب یونیورسٹی نے شائع کیں، کچھ اور مضامین بھی چھپے۔ مختلف رسالوں، پرچوں میں مضامین چھپے۔ ریڈیو اسٹیشن سے تقاریر کیں۔ ۵ کے قریب تبصرے لکھے۔

ہندی میں پنجاب یونیورسٹی کی کتاب میں مضمون شامل ہوا۔ مختلف رسالوں، پرچوں میں مضامین چھپے، کچھ کتابوں پر تبصرے بھی چھپے۔ اردو میں پچاسوں کتابوں پر تبصرے چھپے، اس زبانوں میں بھی اصناف پر کام کیا...."

یہاں یہ عرض کرنا مضمون نگار کی مجبوری ہے کہ نابھوی صاحب کا "شیخ سعدی کے سفرِ ہندوستان کو ایسے مضامین میں شامل کرنا" جو علم و ادب کی دنیا میں پہلی بار لکھے گئے تھے مطابقِ واقعہ نہیں ہے۔ ابھی آپ کالی داس گپتا رضا کے اقتباس سے ملاحظہ کر چکے ہیں کہ "بہتانِ سعدی" کے نام سے نابھوی صاحب کے پردادا منشی گوبند رام کی ایک تصنیف موجود ہے۔ اس کتاب کے تعارف میں رضا صاحب نے جو کچھ بتایا ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ نابھوی صاحب کے مضمون مطبوعہ معارف اعظم گڑھ بابت جنوری ۹۲ء سے بہت زیادہ شرح و بسوط ہے۔ رضا صاحب بتلاتے ہیں کہ:۔

"..... منشی صاحب کی تحقیق مکمل تو نہیں کہی جاسکتی۔ تاہم آپ نے ایک ایسے نکتے کی طرف توجہ دلائی ہے جو سعدی کے بیان کی تغلیط کے لیے کافی ہے اور بلا شک و شبہ اس نکتے کا کریڈٹ صرف منشی صاحب ہی کو جاتا ہے...."

اب مجھے سلسلۂ بیان اگلی قسط کے لیے ملتوی کرنا چاہیے۔ جو ادارۂ نیا دور کی فرمائش پر جلد ہی پیش کیا جاسکتا ہے۔ پچھلی قسط (نیا دور جون ۹۵ء) کے بعض مندرجات کی اصلاح درکار ہے۔ مثلاً اس میں عرض کیا گیا ہے کہ نابھوی صاحب کا انتقال ہماچل پردیش میں اپنی صاحبزادی کے گھر پر ہوا۔ اب رضا صاحب کے مکتوبِ عنایت سے انکشاف ہوا کہ وہ اپنی صاحبزادی کے گھر سے اٹھ آئے تھے اور چنڈی گڑھ میں اپنے بھتیجے کے مکان یا اسپتال میں دم توڑا۔

اس طرح نابھوی صاحب کے بچوں کا جس طرح ذکر آیا ہے اس سے ایسا لگتا ہے کہ صرف ایک ہی صاحبزادے ہیں۔ رضا صاحب نے تصریح کی ہے کہ نابھوی صاحب کے دو بیٹے ہیں۔ نابھوی صاحب نے ڈاکٹر نریندر کو اپنے ۲؍دسمبر ۹۴ کے خط میں لکھا ہے:۔

"..... مکان درست ہوتا تو بلاتا۔ اب تک ٹوٹا پڑا ہے۔ مکان لڑکی کو دے دیا ہے جو اس پر اپنی پسند کرائے گی۔ بیوی اور دو لڑکے فارن میں ہیں۔ نہ انھیں میرا پتہ نہ مجھے ان کا پتہ....."

آخر میں ایک بات اور عرض کر دوں، وہ یہ کہ نابھوی صاحب کو مکتوب نگاری کا بڑا ذوق تھا۔ کثرت سے خط لکھتے۔ زیادہ تر پوسٹ کارڈ۔ ایک پر بات تمام نہ ہوتی تو پھر دوسرے اور تیسرے کارڈ کا استعمال کرتے۔ کالی داس گپتا رضا اور دارالمصنفین (اعظم گڑھ) کے ذخیروں سمیت میرے علم میں ان کے تقریباً ڈیڑھ ہزار خط آچکے ہیں۔ ان کی جمع آوری پر غور ہونا چاہیے۔

□□

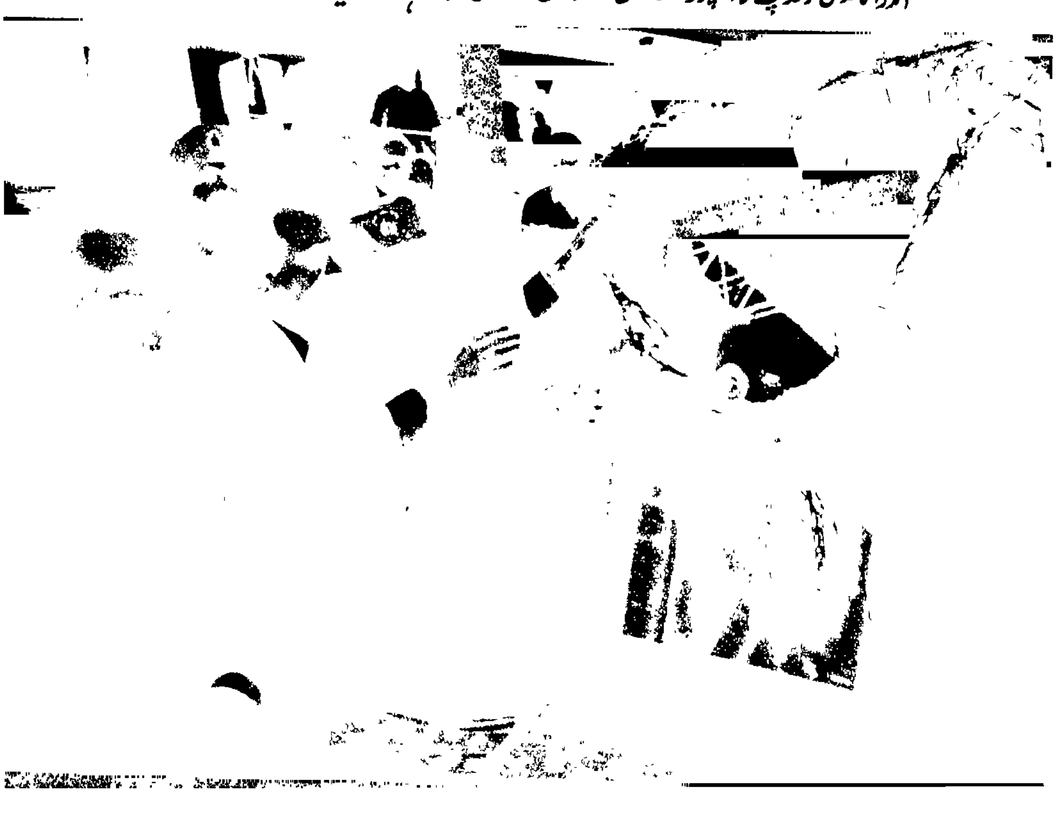
غزل

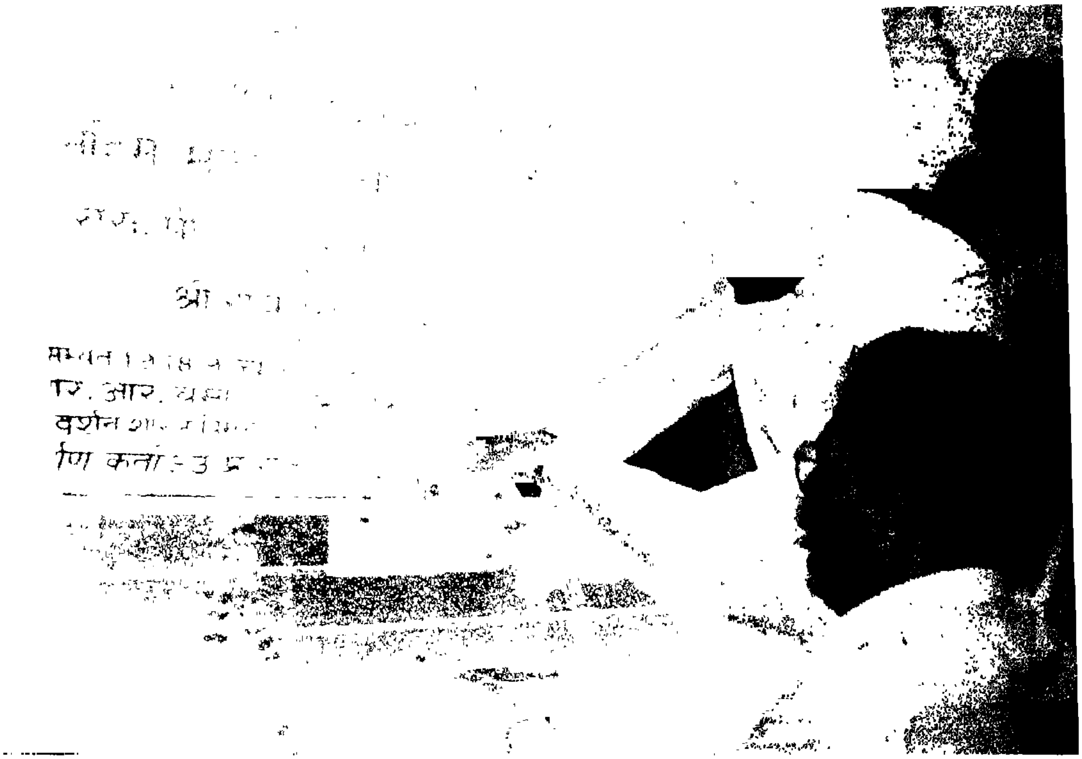
اپنا بزمِ سخن میں چرچا ہے
مختلف دوسروں سے لہجہ ہے
بجھ گئے قمقمے حویلی کے
جھونپڑی میں چراغ جلتا ہے
میرے البم میں باوفا ہیں سب
ایک ہی بے وفا کا چہرا ہے
اب کہاں آگئی ہے یہ دنیا
آدمی آدمی سے ڈرتا ہے
اپنا سب کچھ لٹا کے اے جاوید
شاہ زادہ کوئی بھٹکتا ہے



گورنر شری موتی لال ووراآل انڈیا یونیورسٹی اساتذہ ایسوسی ایشن (یو پی زون) کی تقریب کے موقع پر سووینیر کی رسم اجرا انجام دیتے ہوئے

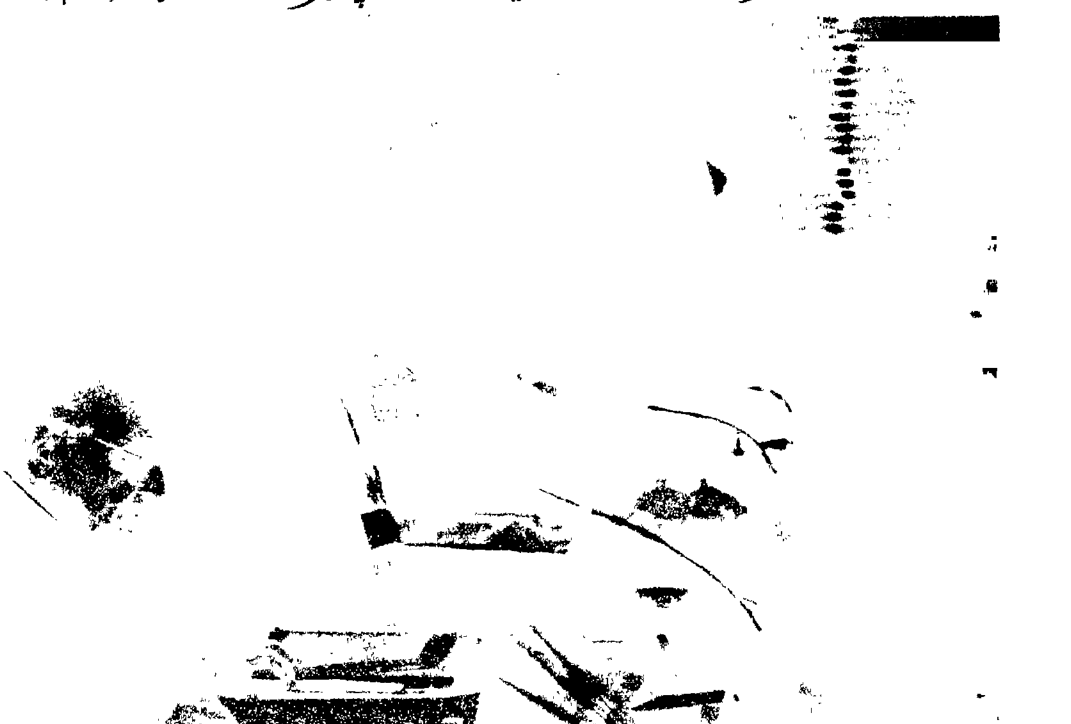
اندرا گاندھی گولڈ کپ کا اسپورٹس کالج لکھنؤ میں افتتاح کرتے ہوئے ریاست کے گورنر شری موتی لال وورا





گورنر اترپردیش شری موتی لال وورا لکھنؤ یونیورسٹی میں گرلس ہاسٹل کا سنگِ بنیاد رکھتے ہوئے

گورنر شری موتی لال وورا لکھنؤ کے یوجنا بھون میں کارپوریٹروں سے خطاب کرتے ہوئے





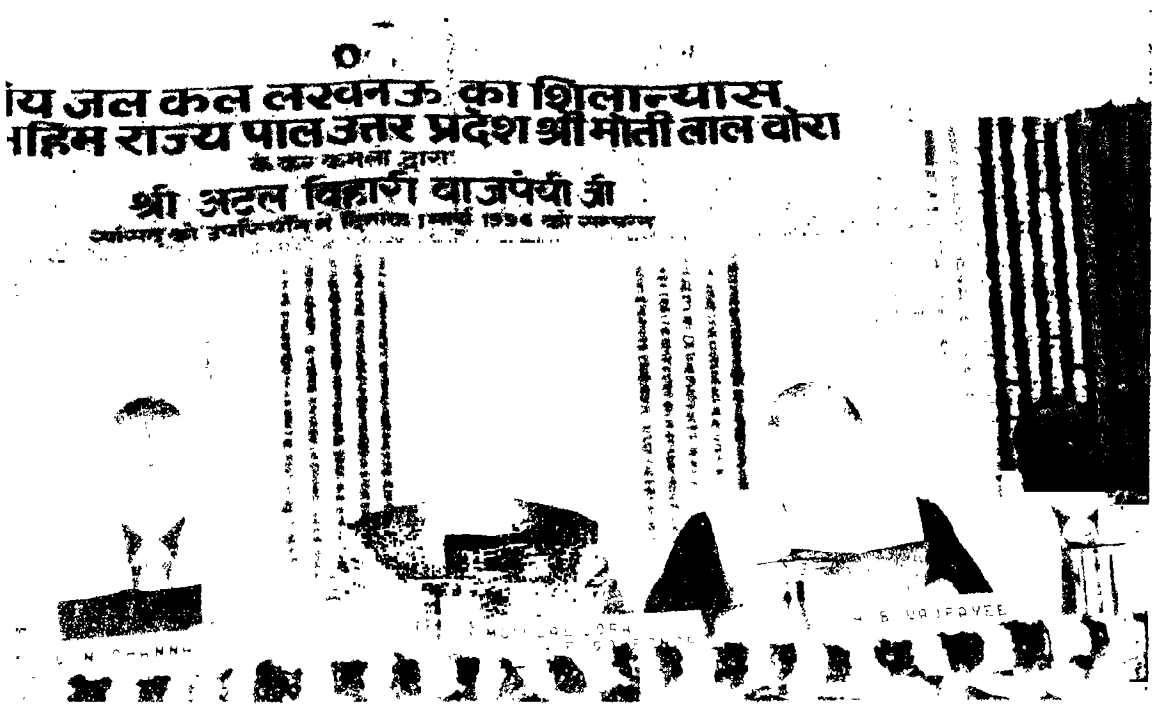
گورنر شری موتی لال وورا اینکالوجی شعبہ کی ساتویں دو سالہ کانفرنس کا شمع روشن کر کے افتتاح کرتے ہوئے

گورنر شری موتی لال وورا راج بھون لکھنؤ میں دوسری جنگ عظیم کے مجاہدین کو پنشن تقسیم کرتے ہوئے





گورنر شری موتی لال ووراؔ لکھنؤ یونیورسٹی کے کانووکیشن تقریب کے موقع پر ایک ہونہار طالبہ کو تمغہ دیتے ہوئے



گورنر شری موتی لال ووراؔ چنہٹ لکھنؤ میں تیسرے واٹر ورکس کا سنگِ بنیاد رکھنے کے بعد ایک جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے۔

راحت علی خاں
"کاشانۂ راحت" ۔ قلعہ نان پارہ۔ بہرائچ

طنز و مزاح کا ایک منفرد شاعر ◻ شوق بہرائچی

یادش بخیر منشی ریاست حسین شوقؔ بہرائچی صفِ اول کے اُن اُردو مزاح نگاروں میں سے تھے جنھوں نے اپنے انوکھے اندازِ بیان، ایک خاص طرزِ ادا اور ایک منفرد لب و لہجہ کی چھاپ اردو کی مزاحیہ شاعری میں چھوڑ کر اپنے کو زندۂ جاوید بنا دیا ہے، اس لیے جب بھی مزاح نگاری پر گفتگو ہوگی اور جب اردو کے بزلہ سنج شاعروں اور مزاح نگاروں کے تذکرے ہوں گے، شوقؔ بہرائچی کی یاد ہمارے دلوں کو ضرور گدگدایا کرے گی اور شاید اسی احساس کے پیشِ نظر خود انھوں نے اپنی خود اعتمادی کا مظاہرہ اپنے اس شعر میں کیا ہے کہ

مرکر بھی جہاں میں لوگوں کو اے شوقؔ ہنساتا جاؤں گا
دنیا سے اگر میں اٹھ بھی گیا موجود مرا دیوان تو ہے

افسوس مرحوم کے ورثا کی عدم توجہی اور لاپرواہی سے ان کا مجموعۂ کلام منظرِ عام پر نہ آسکا اور ضائع ہوگیا۔ زیرِ نظر مضمون محض اپنی یادداشت پر سپردِ قلم کر رہا ہوں۔

بہرحال یوں تو اردو شاعری طنز و مزاح سے تہی دامن نہیں اور اس میدان کے شہسواروں کی تعداد بھی کم نہیں۔ لیکن غزل کی تمام رعنائیوں اور بانکپن کو سموئے ہوئے فقط ایک لفظ سے طنز و مزاح کے نشتر چھوڑنے اور قہقہوں کے ڈونگرے برسانے والا ایسا بھی ایک شاعر ہے جسے ہم شوقؔ بہرائچی کے نام سے اکثر و بیشتر یاد کیا کرتے ہیں۔

شوقؔ بہرائچی اودھ (اترپردیش) کے قدیم تہذیبی اور مذہبی شہر فیض آباد کے محلہ "سیدواڑہ" کے ایک متوسط خاندان میں، میر سلامت علی کے گھر [illegible] ہجری میں پیدا ہوئے۔ بچپن کے ایام، تعلیم و تربیت کے منازل اور جوانی کے سیل و نہار گزار کر فکرِ معاش میں سرگرداں اودھ ہی کے ایک دوسرے تہذیبی اور روحانی شہر بہرائچ میں مقیم ہوگئے جہاں ممتاز صوفی اور شہید حضرت سید سالار مسعود غازیؒ کا آستانہ اور شہر سے تقریباً ۵ کیلو میٹر دور بدھ مذہب کے بانی مہاتما گوتم بدھؒ کی تیرتھ گاہ شراوستی واقع ہے اور خود شہر بہرائچ بھی حضرت امیرماہؒ اور سلسلۂ نقشبندیہ کے کئی بزرگ افراد کے انوار و برکات سے جگمگا رہا ہے، اس طرح یہ شہر اور ضلع روحانی اقدار کا حامل اور قومی یکجہتی کا ایک بڑا مرکز بنا ہوا ہے اور پھر اسی شہر میں آباد ہو کر شوقؔ صاحب بھی عشقِ بتاں میں ایسے محو ہوئے کہ یادِ رفتگاں بن کر اسی شہر کو اپنی ابدی آرام گاہ بنالیا۔

اتفاق سے یہی زمانہ اودھ کے تعلقہ داروں کے عروج کا بھی تھا، اور یہ ضلع بھی ان راجاؤں اور نوابوں کے وجود سے تہذیب و ثقافت کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ اور خود شہر بہرائچ بھی ان تمام تعلقہ داروں کی ایک طرح سے مشترکہ راجدھانی کی حیثیت اختیار کر گیا تھا اسی باعث فنونِ لطیفہ، تہذیب و اخلاق اور سیاست کا بھی مرکز بنا ہوا تھا، ان میں لاہور (پنجاب) کے قزلباش خاندان کی ایک نمایاں شخصیت نواب نوازش علی خاں قزلباش تھے جو ایک چھوٹی ریاست (تعلقہ داری) نواب گنج علی آباد کے تعلقہ دار تھی (یہ تعلقہ داری موصوف کو انگریزی سامراج کی وفاداری میں ملی تھی)۔ نواب صاحب ذی علم اور اردو زبان و ادب کے ساتھ فارسی اور انگریزی بھی خوب جانتے تھے، ان کی ریاست میں شوقؔ صاحب مختارِ عام ہوگئے، اس طرح شوقؔ صاحب کو اپنی افتادِ طبع کے جوہر دکھانے کے مواقع بھی حاصل ہوگئے۔

اس ماحول میں شوقؔ صاحب یہاں کے ادبی افق پر چھاگئے، یہ زمانہ غزل کے بناؤ، سنگار اور نکھار کا بھی تھا اس لیے انھوں نے بھی اسی صنفِ سخن کو اپنی فکری صلاحیتوں کی جولاں گاہ بنایا لیکن بزلہ سنجی اور

تغزل کا مزاج انھیں بہت جلد غزل سے مزاح کی طرف لے گیا اور پھر انہی کی زلف گرہ گیر کا ایسا اسیر بنا دیا کہ آخری دم تک اسی کی دوستی کا دم بھرتے ہوئے ۱۹۶۱ء میں ع

خاموش ہو گیا یہ چمن بولتا ہوا

اس سلسلہ میں ایک واقعہ عرض کرنا ضروری ہے کہ عمر کے آخری ایام میں دمہ کے دائم المریض اور ستم ہائے روزگار کے مارے اس خوددار شاعر کا زندگی گزارنا دشوار ہو گیا، ضلع کے سرکاری معائنے اور ایک مخصوص تقریب میں شرکت کی غرض سے مرحوم وزیر انصاف سید علی ظہیر صاحب تشریف لائے اور شوق صاحب کی بیماری کا حال سن کر ان کی عیادت کے لیے پہنچے تو موصوف شوق صاحب کسمپرسی اور علالت سے سخت متاثر ہوئے اور انھوں نے شوق صاحب سے علاج و معالجہ میں امداد اور تا زندگی انھیں پنشن دلانے کا وعدہ بھی کر لیا لیکن اپنے سیاسی مشاغل میں منہمک ہونے کی وجہ سے شوق صاحب کی علالت سے غافل ہو گئے تو شوق، سید صاحب کی خدمت میں ایک قطعہ بھیج کر جاں بحق ہو گئے، وہ شعر یہ تھا ؎

سانس پھولے گی، کھانسی سوا آئے گی
لب پہ جانِ حزیں بار ہا آئے گی

مگر ؎

دارِ فانی سے جب شوق صاحب اٹھ جائے گا
تب مسیحا کے گھر سے دوا آئے گی

چنانچہ سید علی ظہیر صاحب اس واقعہ پر بڑے شرمندہ رہے اور افسوس کرتے رہے۔ خیر! اس پس منظر کے ساتھ جب شوق صاحب نے بہرائچ سے اپنا ادبی سفر شروع کیا تو یہاں بھی شعر و شاعری کا عام چرچا تھا۔ اور جگر بسوانی کے ہمعصر رافت بہرائچی، حکیم محمد اظہر وارثی، جمال بابا۔ لاڈلی پرشاد حسرت، سورج نرائن آرزو، مولانا سید سجاد حسین طور جونپوری (ثم نانپاری) پیارے صاحب رشید لکھنوی کے شاگرد سید محمد اصغر نان پاروی، ابو الفضل شمس لکھنوی، حکیم نبی احمد نجم خیر آبادی، تعلقہ دار وصی حیدر رجبری کی غزل گوئی چھائی ہوئی تھی جو شہر بہرائچ اور نان پارہ و جرول جیسے مردم خیز اور ادب نواز قصبوں میں پھیلے ہوئے تھے، اسی ادبی فضا میں جب شوق بہرائچی نے ایک طرحی مشاعرے میں یہ شعر پڑھا کہ ؎

بزمِ ادب بھی کیا کوئی آئینہ طور ہے
لگ آ رہے ہیں ہاتھ میں جوتا لیے ہوئے

تو شائقینِ ادب کو اس آواز نے چونکا دیا جو تغزل سے بھرپور اور شائستہ مزاح کی حامل تھی۔ اسی زمانہ میں شہر بہرائچ میں بلرام پور اسٹیٹ کی ڈگ ڈگی ہاؤس کے پاور ہاؤس سے بجلی دوڑائی جا رہی تھی اور جا بجا بجلی کے کھمبے نصب ہو رہے تھے، شاعر جو دلوں کا ترجمان واردات قلبی کا آئینہ دار اور بڑا ہی حساس ہوتا ہے اس کو کیسے بھلا سکتا تھا چنانچہ اسی مشاعرے میں اور اسی زمین اور بحر و قافیہ میں یہ شعر بھی سنایا گیا کہ ؎

بجلی کی روشنی میں چلے آئیے کلیم
کھمبے ہیں راہ میں یدِ بیضا لیے ہوئے

اب تو مشاعرہ کی حالت دگرگوں ہو گئی اور سامعین نے بھی شوق صاحب کو ہاتھوں ہاتھ لیا، اسی دور کا ایک شعر اور سنتے چلئے ؎

سرور و کیف سب پیدا ہوئے ہیں دخترِ رز سے
یہ لڑکی تو کبھی لڑکوں کی ماں معلوم ہوتی ہے

اب کوئی مشاعرہ بغیر شوق صاحب کی شرکت کے بے جان سمجھا جانے لگا اور اب ان کی آواز بہرائچ سے نکل کر دور دور تک پہونچنے لگی، لیکن صحیح معنوں میں اردو دنیا سے انھیں روشناس کرانے کا فرض روزنامہ قومی آواز لکھنؤ نے انجام دیا۔

ایک زمانہ تھا کہ سنی سنٹرل وقف بورڈ کا نظام اس کے سکریٹری محبوب عالم صاحب (ڈپٹی کلکٹر) کی انتظامی صلاحیتوں سے چاق و چوبند تھا۔ محبوب صاحب کو اردو شاعری محبوب تھی اسی لیے انھوں نے اپنے دور میں وقف بورڈ میں طرحی مشاعروں کو رواج دیا، اسی زمانہ کا ایک آل انڈیا طرحی مشاعرہ یقیناً بقیدِ حیات سامعین اور شعراء کے ذہنوں میں محفوظ ہوگا۔ ممتاز سیاسی شخصیت اور اس وقت کے وزیر اوقاف حافظ محمد ابراہیم صاحب اس مشاعرے کے صدر تھے اور غزل کے صاحبِ طرز شاعر اصغر گونڈوی کا مصرعہ ع

جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

موضوع آزمائش تھا، شفیق جونپوری نے اس طرحی مشاعرے میں بڑی اچھی غزل سنا کر تقریباً مشاعرہ لوٹ لیا تھا اور ان کا یہ شعر آج بھی زباں زد

ہے کہ ؎

خدا جانے مرے گلشن ترا انجام کیا ہوگا
جسے مالی بناتا ہوں وہی صیاد ہوتا ہے

شوق بہرائچی بھی اس مشاعرے میں مدعو تھے، لکھنؤ اور بیرونجات کے ممتاز شعراء اپنا اپنا کلام سنا چکے تو حسبِ روایت ناظمِ مشاعرہ نے شوق بہرائچی کو دعوتِ سخن دی اور جیسے شوق صاحب اپنا کلام سنانے ڈائس پر پہنچے تو جسٹس آنند نرائن ملاّ محفل سے اٹھنے لگے جیسے انھیں مزاح سے خدا واسطے کا بیر تھا، یہ دیکھ کر غالباً پروفیسر آل احمد سرور نے انھیں روکا اور کہا، ملاّ صاحب شوق بہرائچی کے مزاحیہ کلام سے محرومی ایک ادبی سانحہ ہوگا۔ ملاّ صاحب فوراً بیٹھ گئے اور گوش بر آواز ہوئے، اب شوق صاحب نے پڑھنا شروع کیا اور جب اس شعر پر پہنچے کہ ؎

یہاں ہر چیز اب میراث اپنی سمجھی جاتی ہے
یہاں جو وقف ہوتا ہے علی الاولاد ہوتا ہے

وقف کی مناسبت یہ ایسا بھرپور طنز اور رعایتِ لفظی کا ایسا نادر استعمال تھا کہ ساری محفل قہقہہ زار بن گئی اور داد و تحسین کا یہ عالم تھا کہ کان پڑے آواز سنائی نہیں دیتی تھی، خود ملاّ صاحب باغ و بہار بنے ہوئے تھے لیکن اس شعر کو اور شوق صاحب کے اس مزاحیہ اندازِ بیان کو دوسرے دن کے قومی آواز میں جس آب و تاب کے ساتھ مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی (اسٹاف رپورٹر) نے اجاگر کیا اس نے شوق صاحب کی شہرت کو چار چاند لگا دیے، اب کیا تھا شوق صاحب "میڈیا" میں بھی موضوعِ گفتگو بن گئے۔

یہ تو شوق بہرائچی کے تعارف کا ایک مختصر اور اجمالی خاکہ تھا جو میں نے زیبِ داستاں کے لیے عرض کیا۔ مناسب ہوگا کہ ان کی کلام آفرینی اور ظرافت سے لطف اندوز ہونے کے لیے ان کے دیگر اشعار کی ایک جھلک بھی دکھاتا چلوں۔

گالی بہرحال گالی ہے اسے سماج اور مذہب میں جس حقارت سے دیکھا جاتا رہا ہے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے لیکن پنجاب میں ایک گالی ایسی بھی ہے جسے وہاں کے عوام بلاتکلف بولتے ہیں، شوق صاحب نے بھی اس گالی کا استعمال کیا ہے لیکن کس خوبی سے، اسے آپ بھی ملاحظہ کریں

کہتے ہیں کہ ؎

کیا شیخ و برہمن کا چرچا کیا گورے ہیں کیا کالے ہیں
یہ لوگ بھی جانے بوجھے ہیں یہ لوگ بھی دیکھے بھالے ہیں
اللہ و غنی اس دنیا میں سرمایہ پرستی کا عالم
بے زر کا کوئی بہنوئی نہیں زردار کے لاکھوں سالے ہیں

اور اسی تناظر میں یہ واقعہ بھی ملاحظہ کریں۔

مولانا انور صابری مترنم لب و لہجہ کے ایک خوش فکر شاعر تھے اور برجستہ اور برسرِ محفل فی البدیہہ اشعار کہنے میں اپنا جواب خود تھے لیکن شعراء کو ڈائس پر سے "ہوٹ" کرنے کا ذوقِ سلیم بھی رکھتے تھے۔ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم نواب زادہ لیاقت علی خاں کی دوسری بیگم گل رعنا کے سوم ان کی کوٹھی کے سبزہ زار پر جہاں ان دنوں پاکستان کا سفارت خانہ قائم تھا شاعرِ مشرق علامہ اقبال کی یاد میں ایک انڈو پاک بزمِ سخن آراستہ تھی۔ یہ تقریبِ مشاعرہ راجہ غضنفر علی خاں سفیر پاکستان کے اہتمام میں آنجہانی مرکزی وزیر داخلہ ڈاکٹر کیلاش ناتھ کاٹجو کی صدارت میں ہو رہی تھی جس کے مہمان خصوصی وزیر اعظم ہندوستان پنڈت جواہر لال نہرو تھے اس وقت ممتاز شاعر روش صدیقی غزل سرا تھے اور اپنے مخصوص انداز میں یہ شعر پڑھ رہے تھے کہ ؎

ہمیں تو عشق کا آزار ہے اے ہم نشیں لیکن
یہ اہلِ ہوش کیوں ہیں زندگی سے تنگ کیا کہیے

فضا داد و تحسین سے گونج رہی تھی کہ ایک کونے سے ایک آواز نے حاضرینِ محفل کو چونکا دیا کہ ع

روش آیا ہے پی کر لکھنؤ سے بھنگ کیا کہیے

لیکن یہ محض آواز نہ تھی بلکہ مولانا انور صابری کی "ہوٹنگ" کا ایک مظاہرہ جو مصرعہ کا لبادہ پہن کر محفل میں گونج رہی تھی، اس آواز کو پنڈت جی نے بھی سنا پھر گردن اٹھا کر مولانا صابری کی طرف دیکھا اور فوراً کسی کام کے بہانے اپنے پاس بلا لیا۔

قصہ مختصر کیسی ہی محفل کیوں نہ ہو صابری صاحب "ہوٹ" کرنے سے باز نہ آتے تھے، ایسا ہی ایک بار فیض آباد کے ایک آل انڈیا مشاعرہ میں پیش آیا، یہاں صاحبِ طرز ناثر نسر عمر قریشی صاحب اپنی

ظرافت کے جوہر دکھا رہے تھے کہ اسی دوران مولانا انور صابری مشاعرہ گاہ میں داخل ہوئے اور ڈائس پر پہنچ گئے اور قریشی صاحب سے مائک لے کر خود شعرا کا تعارف اپنے برجستہ اور فی البدیہہ شعروں سے کرانے لگے کہ انھوں نے اسی عالم میں فہرست کے مطابق شوق بہرائچی کو دعوتِ سخن دی اور ایک شعر کے ساتھ۔ اس وقت مجمع پر سکوت طاری تھا اور وہ شوق صاحب کا منتظر تھا کہ دیکھئے شوق صاحب اس موقع پر کیا گل افشانی کرتے ہیں کہ جواباً شوق صاحب نے فرمایا کہ ؎

اگر تم ابنِ آدم ہو تو وہ بھی بنتِ آدم ہے
مری بیوی نے تم کو کہہ دیا بھائی تو کیا ہوگا

ساری محفل قہقہہ زار بن گئی اور مولانا صابری مجمع کے ساتھ ہنسنے پر مجبور ہو گئے، یہ مذکورہ گالی کا مخفی استعمال تھا۔

دبستانِ دہلی کے ممتاز غزل گو داغ دہلوی کے شاگرد نوح ناروی سہل اور آسان لفظوں کے استعمال اور زبان و بیان کے قادر الکلام شاعر تھے لیکن ان کا ایک کمال یہ بھی تھا کہ انھوں نے مہمل لفظوں کو شعر کا جامہ پہنا کر اسے خاصے کی چیز بنا دیا ہے مثلاً کہتے ہیں ؎

جو دل دل کے لینے کا ڈھب جانتے ہیں
وہ ترکیب ورکیب سب جانتے ہیں

اب اسی ذیل میں آپ شوق صاحب کو ملاحظہ کریں کہ انھوں نے حالاً کو کیا تازگی بخشی ہے، کہتے ہیں کہ ؎

نہ تم اپنے دوست اور دشمن کو سمجھو، نہ اپنے پرائے کی تمیز تم کو
تمھاری بھی واللہ کیا کھوپڑی ہے نہ الا اللذی ہو نہ اولا اللذی ہے

اپنے دور کے جید عالم، ادیب اور صحافی مولانا عبد الماجد دریابادی نے ایک مشاعرے کی روداد کے سلسلے میں لکھا ہے کہ ایک طرحی مشاعرہ جس کا قافیہ "عمل" تھا طنز و مزاح کے صاحبِ طرز شاعر اکبر الہ آبادی نے اپنا کلام سناتے ہوئے جیسے ہی یہ مصرعہ پڑھا کہ ع

"قرآن ہے شاہد کہ خدا حُسن سے خوش ہے"

تو مجمع پر حیرت و استعجاب کا عالم طاری ہو گیا اور محفل میں موجود علماء کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ اکبر الہ آبادی کی مزاح نگاری اس حد تک آگئی، اکبر الہ آبادی نے سامعین کا رجحان اور علما کی ناگواری کو محسوس کرتے ہوئے مصرعہ پھر دہرایا اور شعر یوں پورا کیا کہ ؎

قرآن ہے شاہد کہ خدا حُسن سے خوش ہے
کس حُسن سے یہ بھی تو سنو حُسنِ عمل سے

تو پورا ماحول داد و تحسین سے گونج اٹھا اور علما بھی جوشِ مسرت سے کھِل اٹھے اور رئیس کاکوری منشی احتشام علی صاحب نے انھیں گلے سے لگا لیا۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی عظمت کا اعتراف اور مصلح انداز میں اکبر الہ آبادی کی قادر الکلامی کی ایک مثال ہے۔ کوئی مقابلہ کی بات نہیں۔ کہاں راجہ راؤ کہاں گنگو اتیلی" پھر بھی اس سیاق و سباق میں آپ شوق صاحب کو بھی ملاحظہ کریں کہ انھوں نے کس رُخ سے خامہ فرسائی کی ہے، کہتے ہیں ؎

کون ہے روح جو پھونکا کرے ایوانوں میں
سارے قرآن دس جکڑے ہوئے جزدانوں میں

اور دوسری جگہ یوں رطب اللساں ہیں کہ ؎

جاہل ہے یوں کلام خدا کا لیے ہوئے
جیسے کوئی بیٹر ہو اندھا لیے ہوئے

نعت گوئی اردو شاعری کی ایک ممتاز صنفِ سخن ہے لیکن بڑی نزاکت اور احتیاط کی حامل ہے اور اس کو ادا کرنے میں بڑے بڑے شاعروں کو پسینہ آگئے ہیں اور پھر اس صنفِ سخن میں کسی مزاحیہ شاعر کا اپنی شوخی اور جودتِ طبع کا مظاہرہ کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے بایں وصف و احتیاط اردو شاعری اس صنف سے خالی نہیں۔

مزاح کا ذکر بعد میں آئے گا پہلے ان نعت گو کو ملاحظہ کریں جنھوں نے تغزل کے آداب کے ساتھ اپنی حسن عقیدت کے جلوے دکھلائے ہیں، اس موقع پر میں ممتاز شعراء کے بجائے گمنام شاعروں کے تذکرہ سے اس کا اظہار کر رہا ہوں۔

اودھ کی ایک ریاست (تعلقہ داری) نانپارہ کے ایک شاعر جو پیشے کے اعتبار سے بہشتی کہلاتے تھے اور مطلق پڑھے لکھے نہ تھے لیکن شعر گوئی ان کے مزاج میں داخل تھی، ہمیشہ مشاعروں اور شعری نشستوں میں نعت ہی پڑھتے تھے، حاجی غلام رسول نام اور تخلص اثر تھا، عرفیت "بدھو" تھی انھوں نے ایک مشاعرہ میں جو والی ریاست راجہ سید سعادت علی خاں مرحوم کے "سعادت پیلس" میں ہو رہا تھا جب یہ شعر سنایا ؎

سنگریزوں نے پڑھا آپ کا کلمہ لیکن
ضد سے بوجہل نے دل کو لیا پتھر اپنا

تو محفل سبحان اللہ اور صل علیٰ کی صدا سے گونج اٹھی اور حاجی صاحب کی سخندانی سے سامعین حیرت زدہ تھے۔

شہر بہرائچ کے نامور وکیل بابو جاجن نرائن کے بھائی بابو سورج نرائن آرزو جو کہنہ مشق شاعر ہونے کے ساتھ گورنمنٹ کالج میں استاد تھے جب ایک مشاعرہ کا آغاز انھوں نے اس نعت سے کیا جس کا یہ قطعہ بہت کامیاب رہا کہ ؎

کوئی ہے ایٹمی طاقت پہ نازاں
کسی کے ہاتھ سے مُردے جئے ہیں
کوئی اب چاند تک پہونچے نہ پہونچے
کسی نے چاند کے ٹکڑے کئے ہیں

اسی ضمن میں لکھنؤ کے ایک مشاعرہ کی رودادبھی ملاحظہ کریں کہ جہاں ؎

شاگرد ہوں میں نوحؔ سے طوفانی کا
استاد ہوں میں عرفی و خاقانی کا

کی تعلّی جاننے والے اور نوحؔ ناروی کے شاگردِ رشید منشی سکھدیو پرشاد بسملؔ الہ آبادی نغمہ سرا تھے، جب انھوں نے اپنے جذبات واحساسات کی ترجمانی اس عقیدت واحترام سے کی کہ ساری محفل جھوم اٹھی اور ان کا یہ شعر کہ ؎

اٹھائے حشر بھی مجھ کو تو اب میں اٹھ نہیں سکتا
بڑی مشکل سے ڈیوڑھی ہاتھ آئی ہے محمدؐ کی

تو اہلِ لکھنؤ کی زبانوں پر آج بھی چھایا ہوا ہے۔

ان مثالوں کا مقصد محض اتنا ہے کہ نعت گوئی اگرچہ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل' ہے پھر بھی اس صنفِ سخن نے اپنی ایک حیثیت بنا رکھی ہے۔ شوقؔ بہرائچی نے اس کوچہ میں قدم رکھا تو اسے بھی تشنہ داد نہ چھوڑا۔

بستی کے ایک مشاعرے میں جس میں کپتان پولیس بھی رونقِ مشاعرہ تھے۔ شوقؔ صاحب نے پڑھا کہ ؎

وزدیدہ نگاہی نے بدنام کیا ان کو
پکڑے گئے چوری میں کپتان ارے توبہ

—— تو سامعین کے ساتھ ان کی مسز بھی کھکھلاکے ہنس پڑیں۔

اسی زمانہ کے ایک وزیر آنجہانی ٹھاکر حکم سنگھ ایک مشاعرے کے صدر تھے، ٹھاکر صاحب بھی بذلہ سنج، حاضر جواب اور اپنے مسخرہ پن کے لیے مشہور تھے، بہرائچ ان کا وطن تھا اور پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے اور زمانہ کے رواج کے مطابق اردو شاعری سے بھی تھوڑا بہت لگاؤ رکھتے تھے، کچھ دن کے لیے جب نواب نوازش علی خاں قزلباش کی تعلقداری میں انقلاب آگیا اور اسی خاندان کے اور سابق وزیر پنجاب نواب مظفر علی خاں قزلباش کے حق میں ایک عدالتی فیصلہ کے مطابق یہ چھوٹی موٹی ریاست واگزار ہوگئی تو شوقؔ صاحب کو وہاں سے ہٹنا پڑا، اس لئے شوقؔ صاحب کچھ دنوں کے لیے پروفیسر اطہر حسین رضوی مرحوم (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کے والد مسٹر ارشاد حسین رضوی وکیل کے محرّر ہوگئے۔ ارشاد صاحب اور ٹھاکر صاحب کا مکان ایک دوسرے سے ملا ہوا تھا اور دونوں قیصر گنج (بہرائچ) کی مانی جانی شخصیتوں میں شمار ہوتے تھے، اسی باعث ٹھاکر صاحب شوقؔ صاحب کی مزاحیہ شاعری سے بھی واقف تھے، اس لئے جب شوقؔ صاحب اس مشاعرے میں (جس کے صدر ٹھاکر صاحب تھے) جب اپنا کلام سنانے کے لیے آئے تو حسبِ عادت ٹھاکر صاحب نے کوئی فقرہ چست کیا تھا، شوقؔ صاحب کو بھی طنز ومزاح کی پھلجھڑی چھوڑنے کا موقع مل گیا اور انھوں نے ابتدا اس مطلع سے کی کہ ؎

دل میں غمِ روزگار دیکھئے کب تک رہے
تھانہ میں یہ تھانہ دار دیکھئے کب تک رہے

پھر دوسرا شعر جو ان کے مسخرہ پن کی غمازی کر رہا ہے وہ بھی سنیئے ؎

خندہ لبی میں نہاں، ترش مزاجی بھی ہے
ہانڈی میں یہ بند اچار دیکھئے کب تک رہے

الغرض یہ سبھی اشعار جو اپنی ظرافت' بذلہ سنجی کے ساتھ ساتھ مرصع کاری اور حُسنِ بیان کا اعلا نمونہ بھی ہیں، اب اسی سلسلہ میں یہ شعر بھی ملاحظہ کریں جو غزل کے رنگ وآہنگ، زبان وبیان، نازک خیالی

یہ پاس آ کے تصور میں کون بیٹھ گیا
خدا کی مار ہو انگلی کچل گئی میری

شاید ایسے موقعوں کے لیے شاعر نے کہا ہے کہ ؎

بندش الفاظ جڑنے میں نگیں سے کم نہیں
شاعری بھی نام ہے آتش مرصع ساز کا

دہلی کے ایک مزاحیہ شاعر ہجرت کے ارادے سے پاکستان گئے لیکن کراچی میں کچھ دن قیام کرنے کے بعد ہندستان واپس آگئے دوستوں کے اصرار پر کراچی میں اپنے قیام کا تذکرہ کرتے ہوئے جب انھوں نے یہ شعر پڑھا ؎

مسلم مہاجرین کی کیا عزّ و شان ہے
بندے ہیں اس خدا کے جو خود لامکان ہے

تو یہ طنز و مزاح سے بھرپور شعر سامعین کے افسوس کا باعث بن گیا شوق بہرائچی نے ہندستان میں رہنا پسند کیا تھا لیکن آئے دن یہاں بھی مکانوں کی قلت رہا کرتی ہے اور یہاں کا شہری پریشان رہتا ہے، شوق صاحب کے جادو نگار قلم نے اس موضوع کو بھی کورا نہ چھوڑا، فرمایا کہ ؎

ہم زندوں سے مُردے بہتر ہیں، رہنے کا کوئی امکان تو ہے
ہم ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں ان کے لیے قبرستان تو ہے

اردو زبان کی وسعت، ہمہ گیری اور اس کی شیرینی کے بارے میں شاعروں نے دفتر کے دفتر سیاہ کر دئے ہیں ان میں غیر مسلم شعرا کا بھی ایک ریکارڈ ہے اس لیے یہ زبان فرقہ وارانہ الزام کے باوجود آج بھی قومی یک جہتی کی حامل ہے۔ □□

تصوف کا نظریاتی پہلو ...... صفحہ ۱۷ کا بقیہ

ہے مگر سر دست صرف پانچ فقہوں کی پیروی ہوئی ہے تصوف ان پانچ فقہوں کا احترام کرتا ہے ان کی پیروی کو نظر استحسان سے دیکھتا ہے۔ مگر تصوف کے دائرے میں فقہی مسائل نہیں آتے نہ ہی وہ فقہ سے کوئی منفی یا مثبت تعلق رکھتا ہے۔ اگر ایک صوفی فقیہ کو اور دوسرا صوفی دوسرے فقیہ کو مانتا ہے تو تصوف اس کو منع نہیں کرتا ہے مگر اس کی بنیادی مسائل کی اپنی تعبیرات اور تشریحات ہیں جو ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کر دیا۔ ان تعبیرات و تشریحات کو تسلیم کرنا ضروری ہے۔ اس ضمن میں بعض ایسے صوفیا بھی ملے ہیں، جو خلط مبحث کے ماہر ہیں۔ اللہ معاف فرمائے۔ اس لیے میں ایک بار پھر اپنی ایک پرانی تحریر کی طرف مراجعت کرتا ہوں۔

• اسلام کی وہ تعبیر جس میں اعمال ظاہری پر حکم لگایا جاتا ہے مگر اعمال باطنی کی نفی نہیں کی جاتی فقہ کہلاتا ہے اور اسلام کی وہ تعبیر جس میں اعمال باطنی پر زور دیا جاتا ہے لیکن اعمال ظاہری کی نفی نہیں کی جاتی تصوف کہلاتا ہے۔ ابتدا میں شریعت کا تحفظ دونوں پر محیط تھا مگر بعد میں جز متعلق بظاہر نام فقہ اور جز متعلق بہ باطن کا نام تصوف ہو گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فقہ اور تصوف میں تضاد نہیں بلکہ تعلق ہے اعمال باطنی کے طریقوں کو طریقت کہہ سکتے ہیں اور ان طریقوں سے باطن اور دل میں جو صفا پیدا ہوتا ہو اور اس سے انسان حقائق الہیہ اور کونیہ سے واقف ہوتا ہے نیز اس پر آفاقی اور روحانی کے اسرار کھلتے ہیں ان مکشوفات کا حقیقت اور انکشاف کا نام معرفت ہے۔ □□

حواشی:

۱۔ کشف المحجوب (ترجمہ) غلام معین الدین نعیمی نوری بک ڈپو لاہور ص ۴۳ تا ۵۵
۲۔ نصوص الحکم (ترجمہ) عبدالقدیر صدیقی۔ الکتاب لاہور (۱۹۷۹) ص ۱۲۵۔
۳۔ نقد اقبال (۱۹۶۴) دہلی ص ۱۶۲، ۱۶۴
۴۔ ایضاً " " "
۵۔ کشکول کلیمی دہلی۔ ص
۶۔ بحوالہ نقد اقبال (۱۹۶۴) دہلی ص ۱۱۹

افسانہ

علی امام نقوی
۱۰۳/۳۴۵ - نیا نگر، سی ایچ سوسائٹی
میرا روڈ (ایسٹ)۔ تھانے ۴۰۱۱۰۷

پاسبان

کوئی دَم سے کودا تھا اور اس کے بند لبوں سے چیخ نکلنے کو مچل رہی تھی۔ اس کی رگ رگ میں طوفان موج زن تھا۔ قدموں کی چاپ کچھ اور قریب آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اندر پورے وجود میں طوفان تباہی مچائے ہوئے تھا۔ چاپ کچھ اور قریب آکر خاموشی کا حصّہ بن گئی۔ ایک لمحے کے لیے طوفان تھا۔ پھر ذہن میں در آیا۔ گنگناتے ہوئے آنکھ کھل گئی۔

سماعت کے تمام دروازے کھول کر، اس نے سُن گُن لینی چاہی۔ کوئی آہٹ، کوئی چاپ، کوئی دھمک۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ اس کا پورا جسم پسینے میں تر ہے۔ اس نے چھت میں نصب پنکھے کو دیکھا۔ وہ پوری رفتار سے چل رہا تھا۔ پھر بائیں پلنگ پر محوِ خواب اپنی ان بچیوں کو دیکھا جو تمام مقدس معصومیت کے ساتھ جوانی کی سرحد کے قریب کھڑی تھیں۔ دوسری نظر اس نے دائیں طرف بچھے نواڑ کے پلنگ پر ڈالی، جس پر اس کا بڑا لڑکا، اپنے چھوٹے بھائی کے گلے میں بانہیں ڈالے نیند کی مسافتیں طے کر رہا تھا۔ پہلو بدل کر اس نے دوپٹہ درست کیا اور اپنے ننگے پیر زمین پر رکھ دیے۔ ایک لمحہ کو کچھ سوچا۔ پھر دروازہ کی طرف بڑھی۔ کواڑوں کی درار سے دوسری جانب دیکھا، اور ذرا سی مطمئن ہونے کے بعد خود ہی بڑبڑائی ——

"باؤلی"۔

اس کے بعد اس نے اپنے بڑے بیٹے کے پلنگ کا رُخ کیا آہستہ سے اسے تھپ تھپا کر جگایا۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھ بیٹھا حیرت سے اس نے ماں کو دیکھا۔

"میرے ساتھ آؤ۔"

"کیا بات ہے ممّی؟"

"کچھ نہیں۔ بس تم میرے ساتھ آؤ۔"

دونوں دروازے کی طرف بڑھے، چٹخنی گرائی۔ باہر چھوٹا سا دالان سُونا پڑا تھا۔ گلی میں جھینگر جائیں جائیں کر رہے تھے۔ دالان عبور کرنے کے بعد اس نے زینے کا رُخ کیا۔ بیٹا اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ تھوڑی سی غنودگی اور اس سے کچھ زیادہ بیداری کے عالم میں باہر کا قفل دیکھ کر اس نے مڑنے کے بعد بیٹے سے نیچے چلنے کو کہا۔ اب بیٹا آگے تھا اور ماں پیچھے۔ زینے کی آخری سیڑھی سے اُترتے ہوئے ماں نے صدر دروازے کے ہضمی قفل پر نظر ڈالی اور کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ دروازہ بند کرنے کے بعد اس کی نگاہ بچیوں پر پڑی۔ اب دونوں بہنیں ایک دوسرے سے لپٹی پڑی تھیں، وہ مسکراتے ہوئے پلنگ کی طرف بڑھی۔ اس سے پہلے ہی بیٹا پلنگ پر لیٹ کر پلکیں موند چکا تھا۔ خود اس نے پلنگ پر لیٹنے سے پہلے کارنس پر رکھی شوہر کی تصویر کو دیکھا۔ ایک ہُوک سی دل میں اٹھی ــ غیر ارادی طور پر اس کی نظریں پلکیں موندے بیٹے پر گئیں۔ ٹھیک اسی لمحے ایک لمبی سانس اس نے لی، پھر اسے مخاطب کیا۔

"سو گئے اَفّی"

"اُوں۔ نہیں۔ پر۔ کوشش کر رہا ہوں۔" بیٹے نے آنکھیں کھول کر جواب دیا۔

"کچھ باتیں ہی کرو۔"

"کیا؟" بیٹے کے سوال پر ماں نے چند ثانیے کچھ سوچا، پھر مسکراتے ہوئے بولی۔

"کچھ اپنی، کچھ اپنے پاپا کی۔ اچھا یہ بتاؤ، تمہیں اپنے پاپا کی کون سی بات اچھی لگتی ہے؟"

"بس ایک بات اچھی نہیں لگتی — ان کا غصّہ۔ کیوں کہ پھر ہماری شامت آجاتی ہے۔"

"اسے تو تم ہی، میرا مطلب ہے تم خود ہی بلاتے ہو۔"

ہاں! بلاتے تو — ہم ہی ہیں۔ پر۔ ہمیں پتہ نہیں ہوتا کہ ہم — ہٹائیں بھی۔ اور اب آپ سو جائیں۔"

"نیند نہیں آرہی ہے۔"

"کیوں؟"

"میں .... ڈ.... ر.."

وہ کہتے کہتے رک گئی کہ میں ڈر کے جاگ گئی تھی۔ عین اسی پل پھر ایک مرتبہ اس کی نظر اپنے شوہر کی تصویر پر پڑی۔ اس نے غور سے جوان ہوتے ہوئے بیٹے کو دیکھا۔ اسے اشارے سے اپنے پاس بلالیا۔ جب وہ آنے کے بعد پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گیا، تب اس نے بیٹے کو کھینچ کر اپنے برابر ہی لٹا لیا اور اسے چمٹاتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔

"ممی۔"

"ہوں۔"

"آپ — آپ تو پسلیاں .... ارے ...."

"توبہ ہے۔ اتنی زور سے لپٹاتے ہیں۔ یوں لگتا ہے پسلیاں چٹخ گئیں۔"

"سچ؟"

یقین میں گندھا ہوا شک۔"

"مطلب؟"

مطلب وطلب کیا۔ یہ رشتہ ہی ایسا ہوتا ہے۔ شوہر ایک ذرا سا ظالم ہوتا ہے۔ اس کی فلاں فلاں حرکت سے بیوی کو اذیت پہونچے گی، جانتا ہے۔ پھر بھی چاہتا ہے اسے اس لذت آمیز اذیت میں مبتلا کیا جائے۔"

"سو تو ہے۔"

"اور — اس کے اندر کے وحشی کو بڑھاوا خود عورتیں دیا کرتی ہیں۔"

"اب نزلہ عورتوں پر گرے گا۔"

"ان ہی بے چاریوں پر تو گرتا ہے نزلہ۔"

"ہٹو بھی۔"

"سچ کہہ رہا ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ ایک فطری خواہش انھیں مجبور کیا کرتی ہے۔"

"نہیں، نہیں۔"

"اب مت بنو، سوں سوں بھی کرتی رہتی ہیں عورتیں اور مرچیں بھی کھاتی ہیں۔ آخر تم — اسے کیا کہوگی؟"

"میں تو صرف سنوں گی۔"

"ممی! میری پسلیاں۔"

اس کی باہنوں کی گرفت ڈھیلی ہوتی چلی گئی۔ خجالت کا احساس۔ اسے بیٹے سے نگاہیں چرانے پر مجبور کر رہا تھا۔

کافی دیر بعد اس نے بیٹے سے سوجانے کو کہا تو وہ کہنے لگا۔

"پہلے تو اٹھوا دیا۔ تھوڑی بہت نیند آنے لگی تھی تو پسلیاں چٹخا کے اسے بھی بھگا دیا۔"

"تو پھر باتیں کرو۔"

"باتیں .... کیا باتیں کروں؟"

"پاپا ری کی باتیں کرو"

"پاپا — آپ کو تو صرف پاپا کی باتیں اچھی لگتی ہیں یا پھر ہماری پڑھائی کی فکر ستانے لگتی ہے۔ کرکٹ کیا ہے؟ آپ کو نہیں معلوم۔ ہاکی کسے کہتے ہیں؟ آپ نہیں جانتیں۔ فلم آپ نے کبھی دیکھی نہیں!"

"ارے پگلے! جب بڑا ہوگا اور تیرے بچے ہوں گے تب پوچھوں گی کہ کرکٹ اور ہاکی کیا ہوتے ہیں۔"

"ہاں ہاں پوچھیے گا۔ آپ تو یوں کہہ رہی ہیں جیسے ہم بڑے ہو کے بھول ہی تو جائیں گے۔"

"بھول ہی جاؤ گے چاند!"

"کیسے؟"

"جب تک باپ کو باپ کہو، ہر تفریح اچھی لگتی ہے۔ اور جب کوئی باپ کہنے والا آجاتا ہے تو ہر تفریح کو بھلانا پڑتا ہے۔"

"آپ تو فکر پالنے لگیں۔ چلیے پاپا ہی کی باتیں کرتے ہیں۔ یہ بتایئے پاپا کب آرہے ہیں؟"

"اگلے مہینے۔ چھٹیوں میں۔"

"وہ یہیں کوئی کام کیوں نہیں کرتے؟"

"یہاں کیا کریں گے؟ اس شہر میں ان کے مطلب کا کام مل بھی جائے تو پیسے کم ملیں گے۔"

"تو کیا ہوا۔ ہم ساتھ تو رہیں گے نا۔"

"یہی تو میں نے کہا تھا، مگر وہ مانیں جب نا۔"

"کیوں نہیں مانتے؟ اب کے آنے پر، ان سے میں خود کہوں گا۔"

"وہ کہیں گے کہ یہاں رہ کر ضرورتیں پوری نہیں ہوں گی۔"

"یہ بڑی بڑی باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔"

"اسی لیے تو وہ بڑے شہر میں کام کر رہے ہیں۔"

"مگر شہر تو یہ بھی ہے۔"

"ہاں! شہر تو یہ بھی ہے۔ لیکن ....."

"یہاں چوریاں بہت ہوتی ہیں ممی۔"

ماں کے اطمینان بھرے دل کی جھیل میں بیٹے نے خوف کا پتھر پھینک دیا۔ بے اختیار اس کی نظریں بند دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔

"کل اسکول میں لڑکے کہہ رہے تھے کہ ابو پورہ میں کسی کے گھر میں چور اتر آئے۔ گھر والوں کو مارا پیٹا اور سب لے گئے۔"

"چپ رہو۔"

"سنیں تو مزے کی بات۔ دوسرے روز پاس پڑوس کی عورتیں افسوس کو آئیں۔ پوچھا کیا رہ گیا، اور کیا کیا گیا۔ بڑی بی نے ایک بڑھیا سے کہا "کیا کہوں بہنو! میں تو روز سونے سے پہلے حصار کھینچ دیا کرتی تھی۔ اللہ نبی نے کرم کیا زیور رہ گیا۔ اوٹ مرے اور سب لے گئے۔"

"حصار۔ ہمیں بھی بتا دو۔ کیا پڑھو ہو؟"

"پڑھتی کیا بہنو! آیۃ الکرسی، تیس قرآن، تو ہی توکل۔ تو ہی رحمٰن آڑے آنا، جادو ٹونا ساٹا۔ کوٹ بجر کا تالا۔ اللہ نبی، تو ہی رکھوالا۔ بس یوں ہی پڑھوں تھی۔ اور بہنو! وہ تو اللہ نے کرم کیا۔ نبی جی کے صدقہ جو زیور ادکھلی میں چھپا رکھے تھے وہ سارے بچ گئے۔ ورنہ جوان مرے وہ بھی نہ چھوڑتے ——— اور ممی! اس سے اگلے دن پھر اسی گھر میں چوری ہوئی اور ....."

"چپ رہو ———" دائرے پھیلتے ہی جا رہے تھے۔

"آپ تو ڈر رہی ہیں ممی ———" بیٹے نے ہنس کر کہا۔ "اپنے پاس ہے ہی کیا؟ دو چار پلنگ، دو ٹرنک، تھوڑے سے برتن، وہ بھی جرمن کے۔ چور آئے بھی تو سُوروں کو کرایہ اپنے پلے سے دینا پڑے گا۔"

"تم چپ رہو گے یا نہیں؟"

اس نے بچیوں کی طرف دیکھتے ہوئے اونچی آواز میں بیٹے کو تنبیہ کی۔

چاروں بچے نیچے والے کمرے میں سو رہے تھے، اور وہ دونوں بالا خانے پر — جو یا تو سردیوں میں استعمال ہوا کرتا تھا، یا پھر ان دنوں جب اس کا شوہر گھر لوٹتا۔ ان دنوں وہ چھٹیوں پر آیا ہوا تھا۔ شروع کی چند راتیں باتوں میں گزری تھیں۔ کھٹی میٹھی۔ بیوی نے بچوں کی باتیں خاصی تفصیل سے سنائیں۔ بچے اپنے مطالبات پورے کروانے میں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنا چاہتے تھے، اور دونوں بڑی لڑکیاں طرح طرح کے پکوان کھلانے میں لگی ہیں کہ جانتی تھیں کہ باپ ایک بڑے شہر میں، ہوٹلوں میں کھاتا پیتا ہے۔ اسے کہیں چوتھے روز بیوی سے کھل کر باتیں کرنے کا موقع ملا۔

"تمھاری وزارت کے سکریٹریوں کو ٹالنے میں چار دن گزر گئے۔"

"سکریٹری نہیں، داروغہ کہیے۔ رشوت بتا ٹل کے نہ دیجیے اب دیکھیے نا۔ آپ کے آنے سے پہلے مکھن لگایا جاتا رہا۔ پاپا سے یہ دلوا دیجیے گا۔ ان سے فلاں چیز منگوانا، اور جانے کیا کیا انٹ شنٹ۔"

"انٹرسٹنگ۔" شوہر مسکرانے لگا۔
"جی۔"
اچھا لگتا ہے۔ کم بخت زندگی بھی تو انٹرسٹنگ ہے۔"
"ہے تو مگر ــــــ وہ کچھ سوچنے لگی۔
"مگر کیا؟"
میں سوچ رہی تھی، میں بھی کچھ کہوں، انٹرسٹنگ۔"
"کہو کہو، بالکل کہو۔"
"آپ ملّوپورہ میں مکان دیکھ لیں۔ یہ بستی ..... کچھ ٹھیک نہیں ہے"
"کیوں کیا ہوا۔؟"
"آئے دن یہاں چوریاں ہوتی ہیں۔"
"چوریاں تو ملّوپورہ میں بھی ہوتی ہوں گی۔"
"پھر بھی وہاں اپنے تو ہیں۔ یہ، یہ محلہ تو کوجڑوں سے بھرا پڑا ہے۔"
تم نے صرف کوجڑوں کا ذکر کیا ہے۔ اپنے محلے میں رانگڑ، شیخ کلال، کھٹیک اور پٹھان۔ سب ہی رہتے ہیں۔ سیّد کی کمی تھی، سو ہم نے پوری کر دی۔"
"آپ تو بالکل ہی عجیب سی باتیں کرنے لگے۔"
"بالکل تو نہیں۔ ہاں تھوڑی سی عجیب ضرور ہیں۔ دیکھو گل گلزار بات دراصل یہ ہے کہ جب تک ہم ایک دوسرے پر بھروسہ نہیں کریں گے ہنگامے ہوتے رہیں گے۔ تم نے ایسی بھی بستیاں دیکھی ہوں گی جہاں صرف ایک قوم بستی ہوگی۔ مجھے بتاؤ، وہاں چوریاں ڈکیتیاں نہیں ہوتیں خون خرابے نہیں ہوتے۔؟"
"آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ سیّد کو سیّدوں میں نہیں رہنا چاہیے۔"
"نہیں۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ ہمیں جانوروں کی طرح غول بنا کے نہیں رہنا چاہیے۔ ہمیں مل جل کے رہنا چاہیے۔"
"اس کے لیے رانگڑ، کوجڑ اور پٹھان ہی رہ گئے۔؟"
"تم تو بحث کر رہی ہو۔ میں سال بھر بعد بحث کرنے نہیں آیا۔ میری ایک بات گرہ میں باندھ لو۔ اس محلے میں رہتے ہوئے تم رانگڑوں کوجڑوں کو یہ احساس کبھی نہ دلانا کہ وہ رانگڑ اور کوجڑ ہیں بلکہ ان کے دلوں میں یہ بات بٹھا دو کہ ہم تمہارے اپنے ہیں۔ پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔"
اک ذرا سی دیر کے لیے ماحول گمبھیر ہوا تھا، پھر تھوڑی دیر بعد ہی وہ دونوں معتدل خطوط پر سوچنے لگے تھے۔ نیچے بچّے سوئے ہوئے تھے۔ اور اوپر کمرے کی دیواروں سے ان کی دبی دبی ہنسی کی آوازیں ٹکرا رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد ہی وہ دونوں تھک کر چور ایک دوسرے کے وجود میں سمائے سو رہے تھے۔

وہ دھماکے کی آواز پر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔ سماعت کے تمام دروازے کھول لینے کے بعد اس نے سن گن لینی چاہی۔ کوئی آہٹ کوئی چاپ، کوئی دھمک۔ پھر اس نے محسوس کیا، اس کا پورا جسم پسینے میں تربتر ہے۔ سہمی سہمی نظروں سے اس نے چھت میں نصب پنکھے کو دیکھا اور پھر اس کی نگاہ داہنی طرف بستر پر پڑے شوہر پر پڑی جو چت پڑا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی اعصابی تناؤ کی گرہیں خود بخود کھلنے لگیں۔ اس نے داہنی کہنی پر اپنے سارے وجود کو سہارا۔ جھکی اور محوِ خواب شوہر کے سینے پر سر رکھ کر آنکھوں کے در بند کر لیے۔

□□

غزل

فاروق صفی پوری

واقف نہیں جو لوگ بہاروں کی چبھن سے
کیوں سمجھیں گے کیا ربط خزاں کو ہے چمن سے
اُترے تھے یہیں قافلے ایثار و وفا کے
آتی ہے یہ آواز ابھی گنگ و جمن سے
تعریف کچھ اس طرح سے کی اہلِ قلم نے
تاروں کی چمک ماند ہوئی رنگِ سخن سے
واعظ نہ سُنا جنّت و دوزخ کے فسانے
واقف ہیں بہت ہم بھی ترے طرزِ کہن سے
نفرت کے دیئے آپ بجھائیں کہ ہمارا
روشن ہے مرا دل تو محبت کی کرن سے
یاد اُن کو نہ فرصت ہوئی اک پل بھی وطن سے
یوں عمر گزاری تو گئی لاکھ جتن سے

ڈاکٹر سیدہ بشیر النساء بیگم
صدر شعبہ فارسی جامعہ عثمانیہ
حیدرآباد (اے پی)

فارسی زبان اور ہندستان

• فارسی شکرات • کون ہے، جو اس حقیقت سے واقف نہیں بقول پروفیسر امیر حسن عابدی :

"Persian language possess a peculiar charm & grace, and even foreigners like Turks & Mangols adopted it as their court language & consequently its lit flourished during their reign, which lasted for centuries and extended far beyond the frontiers of Iran."

خاص طور پر ہمارے ملک ہندستان سے اس کی وابستگی کی تاریخ کوئی ایک صدی یا دو صدی کی نہیں بلکہ اس کی عمر بھی بہت طویل ہے جیسا کہ خود علی اصغر حکمت نے اپنے مقالے تحول و تکامل زبان فارسی در ہند میں لکھا ہے: ہنگامے کہ زبان فارسی همراہ لشکر غزنوی و غوری بعد ہا ہمچناں با سپاہیان بابری در سرزمین ہندوستان نمود، از اوائل قرن پنجم ہجری (یازدہم میلادی) تا اواخر قرن سیزدہم ہجری (نوزدہم میلادی) یک دورۂ تحول و تکامل تدریجی در طی کرد۔ ایں زبان شیریں کہ در آغاز چوں وارد بیگانہ بود، اندکی بر نیامد کہ در ہندوستان توطن اختیار کرد و در طول مدت ہشت قرن پیوستہ بوجود کار روانہائے علماء و صوفیا و شعراء و بالآخرہ قوافل مہاجرین کہ بطمع مال و منال و بہوائی کسب نوال از مغرب بر مشرق بیامدند، آں نہال جواں دائما پرورش می یافت و در آں بوستاں ریشہ می دوانید تا سرانجام درختی برومند گشت۔ و در زمینۂ لغت، یک نوع لہجۂ تکلم خاص ہندی بوجود آمد کہ آنرا "فارسی ہندی" گفتند و در عالم شعر یک مکتب خاص ہندی بوجود آمد کہ آں را "سبک ہندی" نام نہادند" ہندوستان میں فارسی زبان کے ارتقا کے بارے میں اس مختصر اور جامع Quotation سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس زبان کی ابتدا اس زمانے میں ہوئی جب ایران و ہند کے درمیان نہ تو جغرافیائی اور سیاسی حدود حائل تھے اور نہ ادبی و معاشرتی۔ گویا ڈاکٹر وحید مرزا کے خیال کے مطابق جو انھوں نے "Life & Works of Amir Khusooru." میں لکھا ہے۔ فارسی زبان کی بہترین روایات جن میں شیرۂ شیراز کی چاشنی بھی تھی اور نبات سمرقند کا ذائقہ بھی۔ ہندوکش اور سندھ کو پار کر کے پہلے لاہور پہنچیں اور پھر وہاں سے دہلی۔ ان روایتوں کو قائم اور برقرار رکھنے کے وہ گہرے تعلقات ضامن تھے جو ایران اور ہندوستان میں اس زمانے میں تھے اور مغل بادشاہوں کے زمانے تک برابر رہے۔ اور بالفرض مرور زمانہ سے اگر ہندوستان کی فارسی زبان میں تھوڑا نمک ہندی بھی شامل ہو گیا تو اس کی وجہ سے نہ تو زبان کی خوبی زائل ہوئی اور نہ فارسی زبان کی ضرب المثل شیرینی میں کوئی خلل واقع ہوا۔ خصوصاً امیر خسرو اور خواجہ حسن جیسے شاعروں کی زبان ویسی ہی پاکیزہ خالص تھی جیسی کہ ایران کے بڑے بڑے شعراء کی جس کی صداقت کو ثابت کرنے کے لیے خسرو کا یہ شعر

خسرو سرمست اندر ساغر معنی بریخت
شیرہ از خمخانۂ سعدی کہ در شیراز بود

اس طرح اس سرزمین میں قدم جمانے اور یہاں کی شے سے توانائی حاصل کرنے کے بعد اس کا دائرۂ عمل وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا اور اس کی قدر و اہمیت اور بڑھی اور اس کی ترقی کی رفتار برابر جاری رہی۔ نتیجتاً اس نے یہاں کے رہنے والوں کی طرز معاشرت کو متاثر کیا چنانچہ پنڈت جواہر لعل نہرو نے "Indo-Iranian Studies" کے حاشیہ پر لکھا ہے

"Among the many people & races who have in contact with & influenced India's life & culture, the oldest and most persistant have been the Iranians."

تصوف جو فارسی شاعری کی جان ہے۔ صوفیانہ مضامین اس قدر کثرت کے ساتھ غالباً کسی دوسری زبان میں نہیں مل سکتے مثنوی مولانا روم، مخزن الاسرار نظامی، منطق الطیر عطار، گلشن راز شبستری، کشف المحجوب ہجویری، رباعیات ابوسعید ابوالخیر، قطعات ابن یمین اور دیوان حافظ مثال کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔ رزمیہ مثنوی شاہنامہ، ایلیڈ اور مہابھارت کا ہم پلہ تصور کی جاتی ہے اور دنیا کی تقریباً ہر زبان میں ان کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ حافظ اور سعدی جیسے شاعر دنیا کی مہذب اور ترقی یافتہ زبانوں کے بڑے بڑے شاعروں کے ہم رتبہ ہیں۔ تاریخ جہانگشائی جوینی، جامع التواریخ، تاریخ گزیدہ حبیب السیر بڑی بڑی زبانوں کی مستند تاریخوں کے مماثل ہیں اس طرح یہ زبان صرف ایران تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ اس نے عالمگیر شہرت بھی حاصل کر لی اور یورپ و امریکہ میں بھی اس کے جاننے والوں اور قدر دانوں کی کافی تعداد موجود ہے۔ اس کی تہذیب و تمدن اور تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں ایسے مستشرقین گذرے ہیں جنہوں نے فارسی زبان و ادبیات پر اپنی دولت اور عمریں صرف کر دیں اور جنہوں نے ذاتی شغف اور قابلیت سے اپنا نام ہمیشہ کے لئے جریدۂ عالم پر ثبت کر دیا جن میں پروفیسر براؤن خاص طور پر قابل ذکر ہیں جنہوں نے اتنی تصنیفیں اور تالیفیں یادگار چھوڑی ہیں کہ کسی ایرانی علامہ نے بھی کم لکھی ہوں گی۔ یہ ہیں فارسی زبان و ادبیات کی اہمیت اور جاذبیت کے اثرات۔

جب مسلمان بادشاہ افغانستان و ایران سے ہندوستان آئے تو ان کی مادری زبان فارسی تھی۔ پہلی مرتبہ سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں ستلہء کے ربع اول میں فارسی زبان سے شمالی ہندوستان کے باشندوں کے کان آشنا ہوئے۔ مغل سلطنت کے بانی ظہیرالدین بابر کے عہد یعنی سولہویں صدی عیسوی کے ربع اوّل میں مستقل طور پر ہندوستان میں اس کا رواج عام ہونے لگا اور اس زبان شیریں نے ہندوستانیوں کے دلوں کو موہ لیا اور ہندوستان اس کا دوسرا گھر بن گیا۔ مسلمان اور ہندو دونوں نے اس کو اپنا لیا۔ بابر کے جانشین ہمایوں کا زمانہ، اس کا عہد طفلی تھا لیکن اکبر و جہانگیر کے عہد حکومت میں وہ معراج کمال پر پہونچ گئی۔ چونکہ ہر زمانے میں حکومت کی زبان میں کمال حاصل کرنا اور اس کو اظہار خیال کا ذریعہ فیشن اور قابل فخر تصور کیا جاتا ہے اس لئے تعلیم یافتہ طبقہ نے اس نئی زبان کو سیکھا اور بعض نے اس میں کمال حاصل کیا۔ دفاتر سرکاری میں، معاشرتی جلسوں میں، خط و کتابت میں، تصنیف میں تالیف میں غرضیکہ ہر جگہ فارسی بولی اور لکھی جانے لگی۔ اکبر اور جہانگیر کے عہد میں صدہا شعراء، أدیب و مؤرخ پیدا ہوئے اور سیکڑوں کتابیں مختلف علوم فنون میں تصنیف و تالیف ہوئیں۔

شاہ جہاں کے عہد حکومت میں جب اردو زبان کی داغ بیل ڈالی گئی اور بعد کے مغلیہ دور میں جب اسکی ترقی ہوئی تو اس نئی زبان کے متعلق بھی جو کچھ لکھا جاتا۔ وہ اکثر فارسی زبان ہی میں ہوتا تھا۔ چنانچہ اردو شاعروں کے تذکرے بھی فارسی ہی میں لکھے گئے مثلاً تذکرہ گلشن بے خار۔ مصنفہ مصطفیٰ خاں شیفتہ۔ چمنستان شعراء۔ لچھمی نرائن: تذکرہ ہمیشہ بہار کشن چند اخلاص اور تاریخی کتابیں اسی زبان میں لکھی گئیں۔ مثلاً بادشاہ نامہ عبدالحمید لاہوری، اقبال نامہ جہانگیری۔ معتمد خاں، تاریخ فیروز شاہی۔ ضیاء الدین برنی، تاریخ ظفیر دکن گردھاری۔ گلستان ہند۔ راجہ درگا پرشاد۔ دوسرے فنون میں بھی تصنیف و تالیف فارسی میں ہوئی مثلاً خزینۃ الاصفیا غلام سرور، ریاض الاولیا۔ بختاور خاں۔ سفینۃ الاولیا۔ دارا شکوہ ترجمہ مہابھارت، علامہ ابوالفضل۔ ترجمہ رامائن، امیر سنگھ

کتابی مشہور در فن ریاضی موسوم بہ لیلاوتی تالیف بھاسکر اچاریہ کا فیضی نے فارسی میں ترجمہ کیا۔ علاوہ ازیں امیر خسرو، فیضی، ابوالفضل بدایونی، گرشاداس ۔ مرزا منوہر توسنی، نعمت علی خاں اور متاخرین میں غالب اور اقبال فارسی نمونہ از خروارے ہیں ۔

علامہ شبلی نے شعرالعجم لکھ کر ایران والوں اور ایرانی زبان و ادب پر بڑا احسان کیا چنانچہ یہ تصنیف ایران میں بھی بڑی قدر کی نظر سے دیکھی گئی یہاں تک کہ استاد محترم پروفیسر آقائی کلیم اللہ حسینی سابق رئیس بخش فارسی دانشگاہ عثمانیہ کے حوالے سے یہ حقیقت بھی سامنے آئی ہے کہ ان کے قیام تہران کے زمانہ میں تہران یونیورسٹی کے پروفیسر آقائی سعید نفیسی نے رودکی کے حالات کا جو شبلی مرحوم نے شعرالعجم میں لکھے ہیں ان سے ترجمہ کروایا اور اپنی تالیف ، احوال و اشعار رودکی ، میں شامل کیا ہے۔ پروفیسر براؤن نے بعض جگہ شعرالعجم کے حوالے سے بعض شاعروں کے متعلق شبلی مرحوم کی رائے کے اقتباسات درج کئے ہیں۔ شعرالعجم کی اہمیت کے لحاظ سے اس کا ترجمہ ایران میں ہوا اور زیور طبع سے آراستہ ہوا ۔

مغل بادشاہوں کے زمانے میں یوں تو فارسی زبان پایۂ تخت کے علاوہ مختلف صوبوں میں رائج تھی لیکن بعض صوبوں میں اسکو اعلیٰ مدارج حاصل ہوئے۔ کشمیر میں تو مقامی مسلمانوں کی زبان تقریباً وہی تھی اور ہندو اور ان کے پنڈت بھی اس میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ بیجاپور میں عادل شاہی بادشاہوں کی علم پروری اور فیضان کے انوار ہر طرف چھائے ہوئے تھے تاریخ عادل شاہی، مصنفہ نوراللہ، تاریخ بیجاپور ابراہیم پور زبیری اس زمانے کی یادگاریں ہیں اور ملا ظہوری کا نام ان بادشاہوں کی یاد تازہ کرتا رہے گا

قطب شاہی بادشاہوں کی درباری زبان بھی فارسی تھی ۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کو فارسی زبان سے خاص لگاؤ تھا۔ اس نے شاعروں، انشاپردازوں اور عالموں کا ایک حلقہ بنا رکھا تھا۔ یہ فارسی میں قطب شاہ تخلص کرتا تھا۔ اسکی فارسی غزلیں اور قصیدے سلاست و روانی کا اچھا نمونہ ہیں ۔

سلطان قطب شاہ بھی فارسی کا اچھا شاعر تھا اور ظل اللہ تخلص کرتا تھا۔ کلام سے بلند خیالی اور پختگی ظاہر ہوتی ہے اس بادشاہ کی طرف چند تالیفیں اور تصنیفیں جو فارسی زبان میں منسوب کی جاتی ہیں مثلاً قدرت نامہ، روح القدس وغیرہ ۔ اور تاریخ قطب شاہی، تاریخ سلاطین دکن اور تاریخ دکن اسی دور کی یادگاریں ہیں۔

عبداللہ قطب شاہ کا دور بھی علمی سرگرمیوں کا منبع تھا۔ دربار میں علماء جمع رہتے تھے۔ مختلف علوم و فنون میں تصنیفیں و تالیفیں ہوئیں جس سے قطب شاہی خاندان کو بڑا امتیاز حاصل ہوا۔ اسی عہد میں جامع عباسی کے حوالے لکھے گئے۔ کتاب المصباح کا فارسی میں ترجمہ ہوا ۔ برہان قاطع بھی اسی عہد میں لکھی گئی۔

قطب شاہی سلاطین کے علاوہ ان کے ہندو وزیروں کو بھی فارسی زبان سے خاص لگاؤ تھا۔ گویا بادشاہوں کے خیالات کا عکس ان میں پایا جاتا تھا۔ چنانچہ اکنا وزیر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کو فارسی شعر و سخن سے بڑا لگاؤ تھا۔ اس زمانے میں دوسرے ہندو خاندانوں میں بھی اس کا ذوق موجود تھا ۔

سلاطین آصفیہ کی علمی سرپرستیوں نے فارسی زبان کی وسعت و ترقی اور شاعروں، ادیبوں اور عالموں کی قدردانی و حوصلہ افزائی کی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ وزیروں اور امیروں میں بھی ان چیزوں سے دلچسپی پیدا ہوئی چنانچہ امیروں سے بعض مثلاً صمصام الدولہ صارم صمصام الدولہ، شاہنواز خاں شہید کے فرزند آصف جاہ ثانی کے زمانے میں اور خواجہ بہاء الدین عظام جنگ دارا سکندر جاہ بہادر کے زمانے میں گذرے ہیں۔ آصف جاہی دور حکومت میں فارسی زبان کے سیکڑوں شاعر، ادیب اور علماء پیدا ہوئے جن میں سے بعض کے لیے تو مستقل عنوان درکار ہے۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔ نعلی شاہ فضل اللہ اورنگ آبادی، میر مومن مشہور عالم، بزرگ اور شاعر ہوئے ہیں۔ عاجز شاہ تجلی، عسرتی، دردمند سراج جن کا فارسی کلام بھی اردو کی طرح بہت دلکش ہے۔ گرامی استاد اعلیٰ فصاحت جنگ جلیل بھی قابل ذکر ہیں۔ ان کی وجہ سے

فارسی کا ذوق یہاں حیدرآباد میں بہت ترقی پایا۔ انکی صد ہا نوشتہ چیزیں یہاں مرحوم سید اشرف شمسی اور جمال الدین نوری وغیرہ تھے۔

آصف جاہی عہد میں نہ صرف مسلمانوں میں فارسی کا ذوق تھا بلکہ ہندو بھی اس زبان کے حشر دار تھے۔ دولت راے مثلاً مہر موف تاریخ آصفی، راجہ گردھاری پرشاد مؤلف کنوز التواریخ پیر ایہ عروض و کلیات باقی، کبھی نارائن شفیق۔ متعدد کتابوں مثلاً ماثر آصفی تذکرہ گل رعنا، چمنستان شعرا وغیرہ کے مصنف و مؤلف ہیں۔ دکن کے فارسی گو شعرائے ہنود کے لیے بھی ایک مستقل عنوان درکار ہے۔

حکومت آصف جاہی کی دفتری زبان بھی ابتدا میں فارسی ہی تھی۔ یہاں بلا لحاظ مذہب وملت جس کا اسوقت کوئی سوال ہی نہ تھا یہی زبان خط وکتابت، مراسلت، فرامین وتصنیف وتالیف کا ذریعہ تھی۔ شائستہ خاندانوں میں خصوصاً اور دیگر ہندو خاندانوں میں بھی ابتدائی تعلیم کے ساتھ فارسی کی تعلیم بھی ضروری سمجھی جاتی تھی۔

حیدرآباد دکن میں دارالعلوم، علوم مشرقیہ کی عرصہ دراز تک ضیا پاشی کرتا رہا اس کا تعلق پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ مشرق سے تھا اور اسی درسگاہ کے فارغ التحصیل بڑے بڑے علما گذرے ہیں جن میں سید اشرف شمسی، جمال الدین نوری، عبدالقدیر صدیقی حسرت وغیرہ ہوئے۔

تقریباً پچاس ساٹھ سال ہوئے کہ دفتری زبان فارسی کی جگہ اردو نے لے لی اور فارسی کا اثر ونفوذ کم ہوتا چلا گیا اور وہ کسمپرسی کے عالم میں تھی کہ خدائے تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے اس غرق ہونے والی کشتی کا ناخدا پیدا کر دیا اور اعلیٰ حضرت سلطان العلوم میر عثمان علی خاں بہادر اصفہانی ساح کی سرپرستی اور علم پروری نے فارسی زبان کو پھر سے زندہ کر دیا اور اپنے فارسی کلام فصاحت التیام سے مردہ جسموں میں تازہ روح پھونک دی۔

زندہ کردی چوں مسیحا علم وفن را در دکن
زندہ باد اے میر عثمان علی خاں زندہ باد

مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد کا نام گرامی فارسی کے محسنوں میں شمار ہوگا جن کا دربار ہمیشہ علما وشعرا کا ماویٰ وملجا رہا کرتا تھا۔ خود فارسی کے شاعر ہونے کے علاوہ شعرا کی بڑی تعداد شرکت مشاعروں کا اور قدردانی سے کی ہے۔ اس کا ایک نمونہ دیوان حسن دہلوی ہے جس کو فاضل محقق مسعود علی محوی نے نہایت کاوش وجانفشانی سے مرتب کیا ہے اور اس پر فاضلانہ مقالہ لکھا اور مہاراجہ کے الطاف سے زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ اعلیٰ حضرت سلطان علی نے جامعہ عثمانیہ کے قیام سے جہاں قدیم وجدید علوم وفنون کی حفاظت وترقی کا استحکام فرمایا وہیں فارسی زبان کی ترویج وترقی کے لیے بھی انتظام فرمایا۔

خلاصہ یہ کہ فارسی زبان توانا اور زندہ زبان ہے جسے آج بھی ایران کی ملی، ادبی اور سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہے۔ فارسی شعروادب تاریخ کے ذخیرے نہ صرف ایران بلکہ ترکی، ہندوستان، پاکستان اور کئی یورپی ممالک کے کتاب خانوں میں اس کے ہزاروں، لاکھوں نادر نسخے اور قلمی نسخے موجود ہیں جن پر نظر ڈالنے سے ہم فارسی کی عظمت وسعت کا اندازہ لگا سکتے ہیں خصوصاً آج کی تیز رفتار ترقی یافتہ دنیا میں ہمسایہ ممالک کے ساتھ دوستانہ تعلقات کو استوار کرنے کے لیے مؤثر قدم اٹھائے جا رہے ہیں۔ ہمارے ارباب حل وعقد کو اس زبان کی اہمیت، افادیت اور معنویت کو ہرگز پس پشت نہیں ڈالنا چاہیے جبکہ نئے ہندوستان کے معمار پنڈت جواہر لعل نہرو نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے اور لکھا ہے:

"World developments & common interest are forcing Asiatic Countires to look at each other again, the prd of European Domination is passed over as a bad dream & memoirs of long ago remend them of old friendships & common adventures. There can be no doubt that in the near future india will draw closer to iran."

References :—
1) Hist of Persian lit (Brown)
2) Legacy of Persian Arberry
3) Indo Iran Studies (Mujtabai)
4) Life & Works of Amir Khusuro (Dr. Waheed Mirza)
5) Sherul Ajam
6) Maqala-e-Ali Asgar Hikmat.

اتر پردیش ▫ روشنی کی سمت تیز رفتار سفر

شری موتی لال وورا کی سرپرستی میں جس نئے اتر پردیش کے خدوخال ابھرنے لگے ہیں وہ ہمارے خواب کی تعبیر کا رخ اختیار کرتا جا رہا ہے۔ جب وہ یہاں گورنر کی حیثیت سے تشریف لائے تو ریاست کی دھماکہ خیز صورتحال کو دیکھتے ہوئے کچھ زیادہ خوش فہمی کا موقع نہیں تھا۔ مدھیہ پردیش کے وزیر اعلیٰ کے روپ میں ان کا کام یقیناً پیش نظر تھا۔ مگر جلد ہی یہ ثابت ہو گیا کہ مرکزی قیادت نے بہت مدبرانہ فیصلہ کیا تھا۔ وہ ناخوشگوار حالات پر قابو پانے کا وسیع تجربہ رکھتے تھے۔ انھوں نے راج بھون کو رونق بخشتے ہی عوام کے دکھ درد کو سننے کے لئے "جنتا دربار" کا آغاز کیا۔ اور عوام کی شکایتوں پر موثر کارروائی سے آنکھوں کے آنسوؤں کو ہونٹوں کی مسکراہٹوں میں تبدیل کرنے کا عمل تیز تر کر دیا۔ وورا جی کی محبوبیت و دلنوازی نے جیسے دلوں کو جیت لیا۔ جو مقبولیت و شہرت ان کے حصے میں آئی ہے وہ ہر ایک کو کہاں ملتی ہے۔ انسانیت کی اعلیٰ قدروں کو اپنا دھرم ماننے والے اور خدمت خلق کے جذبے سے سرشار گورنر آج ریاست کے گوشے گوشے میں بڑی محبت سے یاد کئے جاتے ہیں۔ ان کی سحر انگیز شخصیت اپنا دائرہ وسیع سے وسیع تر کرتی جا رہی ہے۔ صوفی سنتوں سے عقیدت رکھنے والے موتی لال وورا جی ایک دردمند دل رکھتے ہیں۔ ان کے فیصلے دور رس نتائج کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ کہا جائے کہ چارہ سازی کے فن میں وہ ماہر ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

اب جبکہ ریاست میں "صدر راج" کا نفاذ ہے اور راج پال عملاً خود مختار ہیں تو انھیں اپنی صلاحیتوں کو نمایاں کرنے کا بہترین موقع حالات نے فراہم کر دیا ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ بجلی کی سرعت سے وہ ہر اس کام کی تکمیل میں مصروف کار ہیں۔ جس سے اس پسماندہ ریاست میں مسرت کی ایک لہر دوڑ جائے اور خوشحالی کا ایک نیا باب کھل جائے۔ ایسا باب جو اطمینان و آسودگی کی طرف ذہنوں کو منتقل کر دے۔ ابھی حال ہی میں حزب اختلاف کے ایک ممتاز قائد نے برملا ان کی تعمیری کوششوں کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ آج اتر پردیش میں جو عافیت کا ایک ماحول نظر آتا ہے وہ بہت بڑی بات ہے۔ ہم بھی اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے یہی دعا کرتے ہیں کہ روشنیوں کا یہ قافلہ اسی طرح بڑھتا رہے۔ اتر پردیش اپنی تہذیب و ثقافت کے لحاظ سے سارے ملک میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ واقعی بھارت کا دل ہے۔ مسلمان بھی یہاں دوسری ریاستوں کے مقابلہ میں زیادہ ہیں جن کے بزرگوں کا یہاں کی رنگا رنگ تہذیب و روایات بنانے سنوارنے میں بڑا ہاتھ رہا ہے۔ ایک زمانے میں محبت و رواداری میں یہ سرزمین عدیم المثال تھی۔ اقلیت کے مسئلوں پر جس انداز میں وورا جی توجہ دے رہے ہیں۔ اس سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ اقلیت و اکثریت ایک ہی سکے کے دو پہلو ہیں۔ دونوں کی اہمیت مسلم ہے۔ صوبہ کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ قومی ہم آہنگی کو فروغ دیا جائے، بڑھتے ہوئے فاصلوں کو گھٹایا جائے۔ خیرسگالی، محبت، یگانگت اور رواداری کے جذبہ کو پھر بیدار کیا جائے۔ تاکہ یہاں غربت و افلاس، بیروزگاری جیسے جان لیوا مسئلوں کو مل جل کے حل کیا جا سکے۔ اسی لئے ان دنوں چست درست انتظامیہ نظم و نسق پر بڑی گہری نظر رکھے ہوئے ہے۔ عوام آج کل ذہنی آسودگی کے ساتھ اپنے اپنے کاموں میں پوری طرح منہمک ہیں۔ طلبا اپنی تعلیم میں مگن ہیں، کسان اپنے کھیتوں میں سونا اگا رہے ہیں، اور محنت کش طبقہ خوشیوں کی گھڑ گھڑاہٹ میں ایک نئے اتر پردیش کا خواب دیکھ رہا ہے۔

مہاتما گاندھی سے شری وورا روحانی تعلق رکھتے ہیں — وہ باپو کے آدرشوں کو اپنانے میں ہمہ وقت پیش پیش نظر آتے ہیں۔ گاندھی جی کی تعلیمات نے ان کی زندگی کچھ زیادہ ہی نکھار دی ہے۔ ہم ہر اس کام میں ان کی دلچسپیاں

کو زیادہ وہ پاتے ہیں اس کا ان کو ہمیشہ فخر رہا ہے۔ ہندی زبان و ادب کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب سے ان کی گہری وابستگی ہے۔

اس مختصر تحریر میں اتر پردیش کی ہمہ گیر ترقی کا جائزہ لینے کا موقع نہیں ہے۔ مگر جو اہم اعداد و شمار دیکھا جائے کہ ریاست کی دیہی ترقی کی اسکیموں پر تیزی سے عمل درآمد شروع ہو گیا ہے۔ زراعت میں بہترین پیداوار کے لئے کاشتکاروں کو سہولتوں کو بروئے کار لایا جا رہا ہے۔ مرکزی قیادت کے تحت چلنے والا پندرہ نکاتی پروگرام جو ایک زمانے میں اقلیتوں کے لئے وضع کیا گیا تھا اس کو بلا تاخیر نافذ العمل بنانے کے احکامات جاری ہو گئے ہیں۔ شہروں میں پینے کے پانی کا ایک بڑا مسئلہ بڑھتی آبادی نے پیدا کر دیا ہے۔ اور بجلی کی کمی بھی عوام کی پریشانیوں کا بڑا سبب ہے۔ ان دونوں مسئلوں کو حل کرنے کے لئے بھی اقدامات کئے جا رہے ہیں۔ بجلی کی پیداوار میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔ اقلیتوں کے سلسلے میں گورنر صاحب فلاحی اسکیموں پر خصوصی توجہ دے رہے ہیں۔ وہ اس امر سے باخبر ہیں کہ اقلیتی طبقہ غربت و جہالت کا زیادہ شکار ہے۔ جس کے سبب وہ زندگی کی دوڑ میں پیچھے ہے۔ اور جو فلاحی پروگرام سرکار مرتب کرتی ہے۔ اسی سبب سے اس کا بھرپور فائدہ وہ نہیں اٹھا پاتا ہے۔ پھر جو عربی مدارس ہیں ان کے اساتذہ بھی معقول تنخواہ پانے کی وجہ سے صحیح فرائض انجام نہیں دے پاتے۔ اس لئے سنسکرت اساتذہ کے مساوی عربی اساتذہ کو بھی مراعات دینے کے احکامات صادر ہو گئے ہیں، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ عربی، فارسی مدرسوں میں انگریزی ہندی کے ساتھ سائنس اور حساب بھی پڑھانے کا انتظام کیا جائے تاکہ بچے دنیوی ضرورتوں کو باعزت پورا کرنے کے اہل بنیں۔ اتر پردیش کے ۲۲۲ اسکول میں کمپیوٹر تعلیم اسکیم چل رہی ہے جس میں سے صرف دو اقلیتی ادارے اس سے مستفیض ہو رہے ہیں۔ وہ ابھی اسے انتہائی ناکافی سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اسے پھیلایا جائے تاکہ اقلیتی طبقہ کے بچے زیادہ سے زیادہ جدید ٹیکنالوجی سے فائدہ اٹھا سکیں۔ ایک زمانے سے بہت سے اسکول، کالج اقلیتی کردار کے حصول کے لئے کوشاں تھے۔ سو موتی لال ووہرا کے ایک حکم کے ذریعہ ایسے بہت سے اسکول کالج اقلیتی ادارہ کا درجہ پا چکے ہیں۔ مگر اوقاف کی ناقص کارکردگی کو ٹھیک بنانے کے لئے اس کا بہتر معیار بنانے کا عزم بھی دہرایا ہے۔ اسی طرح اقلیتی مالی کارپوریشن کو گورنر صاحب نے اپنی دلچسپی کا مرکز بنایا ہے۔

غرض کہ تمام پروگرام ساری اسکیمیں جو مرتب ہو رہی ہیں۔ وہ لمبے عرصے کے لئے التوا میں ڈالنے کے لئے نہیں ہیں بلکہ چند ماہ کے اندر بہت سے نتائج ہمارے سامنے آ جائیں گے۔ اور ہمارے یقین نہ کرنے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایک مضبوط و آہنی ارادہ والے شخص کی قیادت اس ریاست کو اس راہ پر گامزن کرے گی۔ وہ راہ جو ترقی و خوشحالی اور عافیت کی منزل کی طرف جاتی ہے۔

——— رباب رشیدی

ہولی

ہولی آئی اب خوشی کا ہر طرف ہے اژدہام
پی رہے ہیں اہلِ بھارت بادۂ عشرت کے جام
گلستانِ ہند میں چلنے لگی بادِ نسیم
کھل گئیں کلیاں خوشی سے ہر طرف پھیلی شمیم
شاد آتے ہیں نظر طفل و جوان و پیر سب
ہے محبت کی ہر اک کے پاؤں میں زنجیر اب
صبح سے تا دوپہر ہیں کھیل کی تیاریاں
کھیلتے ہیں رنگ ہاتھوں میں لیے پچکاریاں
کھیلنا باہم دگر پچکاریوں سے رنگ کا
خوش نما پھولوں کا ہو جیسے کوئی گلشن کھلا
جذبۂ الفت ہے ان سب کی رگوں میں موجزن
شمع ہے اخلاص کی ان کے دلوں میں ضو فگن
شادماں ہو کر گلے ملتے ہیں شیخ و برہمن
دور ہو جاتے ہیں اس سے دل کے سب رنج و محن
اتحادِ باہمی کا یہ بڑا تہوار ہے
مخزنِ عیش و طرب ہے دافعِ افکار ہے
جشنِ ہولی دیکھ کر منّان تو مسرور ہے!
تیرا دل فرطِ خوشی سے کس قدر معمور ہے

عبدالمنان صدیقی
محلہ ... پور (یو پی)

جنار دن داسے

مسلم حکمراں اور ھولی

کیف و مستی اور رنگ و بو کا تہوار ہولی ایک ایسا سرشاری کا تہوار ہے جو ہم سب کو اپنے رنگوں میں شرابور کر ڈالتا ہے۔ یہ تہوار مذہب، ذات و فرقہ کی تفریق کو مٹا کر قومی جذبہ کو مضبوط کرتا ہے۔ پرانے زمانے میں ہندوؤں کی طرح مسلم بادشاہ اور نواب بھی اس تہوار میں شریک ہوا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ مغل بادشاہ بھی ہولی کا مزہ لینے میں پیچھے نہیں رہے۔ اس رنگ رنگیلے تہوار کا بیان ہندو شاعروں کے ساتھ رسکھان، رحیم جیسے مسلم شعراء اور شیخ، تاج، مشتری جیسی کرشن کی معتقد شاعرات نے بھی دلی طور پر کیا ہے۔ تبھی تو "ان مسلمان ہری جنن پر کوٹک ہندو وارئے" لکھ کر بھارتیندو ہریش چندر نے ہمارے دیش کی تہذیبی و ثقافتی اتحاد کو روشن کر دیا ہے۔

در اصل ہولی کا تہوار مغل بادشاہوں کے حرم میں بھی اپنایا گیا۔ شہنشاہ اکبر کی حکومت میں، جو مذہبی رواداری کے مسلک پر عمل پیرا ہونے کے سبب ہندو رسم و رواج کا احترام کرتا تھا، اس کے حرم میں بیگمیں ہندو دیوی دیوتا کی پوجا کرتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاہی حرم ہولی کے موقع پر لال و گلال سے شرابور رنگین نظر آتا تھا، اس کی رونق دیکھتے ہی بنتی تھی۔ حرم کی بیگمیں شہنشاہ کو حرم میں بلا کر انھیں رنگ سے تر کر دیتی تھیں۔ سارا ماحول مسرت سے بھر جاتا تھا۔ اکبر کے زمانہ سے لے کر آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر تک نے ہولی کا جشن منایا۔

مغل بادشاہ آب پاشی (پانی پھینک کر ہنسی مذاق کرنے کی رسم) کی شکل میں بھی رنگوں کا جشن مناتے تھے۔ عرق گلاب کا خاص طور سے استعمال ہونے کی وجہ سے اسے عید گلابی بھی کہا جاتا تھا۔ اس دن بھی امیر سردار، جواہرات سے مزین برتنوں میں رنگین گلاب اور آب زعفران بھر کر بادشاہ کو بطور تحفہ پیش کرتے تھے۔ کچھ خوبصورت لڑکیاں بھی اسی وقت مدعو کی جاتی تھیں۔ یہ روایت فارس سے چلی آئی تھی۔ فارس میں یہ تہوار پارسی لوگ بارش کے شروع میں اس کے استقبال کے لئے مناتے تھے۔ فارس میں اس موقع پر صرف عرق گلاب ہی چھڑکنے کا رواج تھا۔ ہندوستان میں، ہولی کے رنگ کے اثر سے اس تہوار میں رنگینی آگئی۔ ولادت کی سالگرہ پر بادشاہ آب زعفران خود پہ چھڑکوانے لگے۔ اس سے کچھ دقیانوسی لوگ اکبر سے ناراض بھی ہو گئے تھے، لیکن بادشاہ نے اس کی پرواہ نہیں کی اور عرق گلاب یا حام پانی میں دھڑتے سے رنگوں کا بھی استعمال ہونے لگا۔

جہانگیر کی حکومت میں ان کے حرم میں ہولی کا تہوار منائے جانے کا تذکرہ اس کی خود نوشت "تزک جہانگیری" میں تفصیل کے ساتھ ملتا ہے۔ کچھ پینٹنگ کے نمونے، جو لندن کے کتب خانہ میں آج بھی موجود ہے، ان سے واضح ہوتا ہے کہ کس طرح پہلے جہانگیر رنگ بھری پچکاری نور جہاں پر چلاتے تھے اور پھر نازنین رنگ کی پچکاریاں ایک دوسرے پر چلاتی تھیں۔ ایک تصویر میں تو جہانگیر اور نور جہاں کے ساتھ ساتھ دربار کی چند خواتین کو بھی رنگ و گلال کھیلتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

فن و ثقافت کا عظیم عاشق شاہجہاں بھی ہولی کی کشش سے نہ بچ سکا۔ اس کی حکومت کے دوران ہولی کا تہوار بڑی خوشی اور اہتمام کے ساتھ منایا جاتا تھا۔ اس دن خوبصورت لڑکیاں اپنی پچکاریوں میں رنگ بھر کر

شہنشاہ پر رنگ پھینکتی تھیں۔ رنگ، گلال اور عبیر سے حرم کی ساری فضا رنگین ہو جاتی تھی۔ خوبصورت حسین، شفاف لباس میں بیگموں کو ہولی کھیلتے دیکھ کر شہنشاہ بھی اپنا ہوش کھو بیٹھتا تھا۔ پٹنہ خدابخش لائبریری میں موجود پینٹنگ ان ساری باتوں کی گواہ ہے۔ یہاں تک کہ نماز روزہ کا پابند کٹر بادشاہ اورنگ زیب بھی ہولی کھیلنے میں کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ اس کی رعایا اس تہوار کو پوری رنگینی کے ساتھ مناتی رہی۔ اس کے ہولی کھیلنے سے متعلق کچھ شعر بھی ملے ہیں۔

اورنگ زیب کا فرزند شاہ عالم اور عیش و عشرت کی زندگی گزارنے والا پوتا جہاندار شاہ کے وقت میں بھی اسی طرح ہولی کا جشن چلتا رہا۔ شاہ عالم ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ ان کی شاعری میں ہولی کے مناظر کی عکاسی بڑے حقیقی پیرائے میں پیش ہوئی تھی۔ محمد شاہ رنگیلے تو رنگین طبیعت کے تھے ہی۔ وہ چاندی کی پچکاری سے اپنی بیگموں کے ساتھ ہولی کھیلتے۔ انھوں نے ہولی کو ایک نیا انداز دیا۔

دہلی کے آخری مغل بادشاہ ظفر کی شاعری میں بھی ہولی کا ذکر کئی مقام پر آیا ہے۔ ان کے وقت میں بھی ہولی کا تہوار کیف و مستی کے ساتھ منایا جاتا تھا۔ برج بھاشا میں انھوں نے "شوق رنگ" تخلص سے نظمیں لکھی تھیں۔ ایک نظم میں اس عہد ہندوستان کی حالتِ زار کی حقیقی عکاسی ملاحظہ ہو ؎

ہند میں کیسا بھاگ مچوری، جورا جوری
پھولن کا نکہت بند بنا تھا، کیسر کی سی کیاری
کیسو پھوٹیوں بھاگ ہمارے، لٹ گئی باگ ہماری
گولن کے گلال بنائیو، تو پیٹ کے پچکاری
آئی ری اسگری کمو پر ایسی تک تک ماری

اودھ کے نواب بھی اس رنگین تہوار سے خود کو اچھوتا نہ رکھ سکے۔ آخری نواب واجد علی شاہ جمالیات و فطرت کے عاشق ہونے کے ساتھ شاعر بھی تھے۔ ہولی کے روز شاہی حرم میں محفلیں منعقد ہوتیں جشن ہوتے اور ڈرامے اسٹیج کئے جاتے۔

وہ "نوروز" کا تہوار بھی ہولی کی طرح مناتے تھے۔ یہ تھی رنگیلے بادشاہوں اور نوابوں کی رنگین ہولی جس کی خوشبو کئی دنوں تک فضا میں تیرتی رہتی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس وقت کوئی بھی شخص مذہب یا ذات کے نشے میں چور ہو کر ہولی کے تہوار کو بدمزہ نہیں کر سکتا تھا۔

نواب آصف الدولہ کے زمانے کا ایک واقعہ تو تاریخ میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ ان کی حکومت میں ایک بار ہولی اور محرم دونوں ایک ہی روز پڑ گئے۔ ایک غم کا تہوار اور دوسرا خوشی کا۔ اب کیا ہو؟ ملک بس دپیش میں، ہندوؤں نے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس نہ پہونچانے کے خیال سے ہولی کا تہوار نہ منانے کا فیصلہ کیا۔ جب یہ بات نواب کے گوش گذار ہوئی تو انھوں نے سارے صوبہ میں اسی وقت اعلان کرا دیا کہ تعزیے بارہ بجے تک ہر صورت میں دفن کر دیئے جانے چاہئیں کیونکہ اس کے بعد ہولی منائی جائے گی۔ فوراً حکم کی تعمیل کی گئی۔ یہاں تک کہ خود نواب آصف الدولہ نے بھی اس بار ہولی میں شرکت کی۔ □□

غزل

فطرت کے تقاضوں کو بدلتے نہیں دیکھا
سورج کبھی مغرب سے نکلتے نہیں دیکھا

اس دَورِ خرابات میں حق گوئی کا سکہ
ہم نے کہیں بازار میں چلتے نہیں دیکھا

گرگٹ سیاست کی طرح ہم نے کسی کو
ہر رُت میں نیا رنگ بدلتے نہیں دیکھا

پھولوں کو تو دیکھا ہے جھلستے ہوئے لیکن
خوشبو کو کبھی آگ میں جلتے نہیں دیکھا

جس مہرِ محبت کی ضیا سب پہ ہو یکساں
باقرؔ اسے ہم نے کبھی ڈھلتے نہیں دیکھا

علی باقر زیدی
ایل ۱۳۸ سیکٹر ۱۸ علی گنج لکھنؤ

نقد و تبصرہ

تبصرے کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

نام کتاب، "مصحفِ عُمر" (شعری مجموعہ)
شاعر: عمر انصاری قیمت ۱۲۵/- روپے
ملنے کا پتہ، مکتبۂ فردوسِ ادب، ۳۰۔ امین آباد پارک لکھنؤ

عمر انصاری صاحب کی عمر شاعری ۶۵ سال سے بھی تجاوز کر چکی ہے اور "مصحف عمر" ان کی دسویں شاعرانہ تخلیق ہے۔ جو ۱۹۸۶ء سے ۱۹۹۴ء تک کے کلام پر مشتمل ہے۔ عصر حاضر میں وہ اردو کے بزرگ اور ممتاز شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں اور اساتذۂ لکھنؤ میں ان کا نام سرِ فہرست ہے۔

عمر انصاری کی ادبی دانش مندی ہی ان کے فن کو آبرو بخشتی ہے اور مصحف عمر کے مشمولات اعلیٰ شاعرانہ قدروں کے حامل ہیں۔ وہ شاعرانہ قدریں جو اعلیٰ فنی شعور پر مبنی ہوتی ہیں اور اس کی عکاسی کرتی ہیں۔

مصحف عمر میں غزلیں بھی کافی تعداد میں ہیں اور نظمیں بھی جو مصنف کی قادر الکلامی اور فن پر شاعر کی مضبوط گرفت کی کہانی سناتی ہیں۔ نظموں میں "ہم تم"، "گڑیا"، "وادیٔ خوف" اور "امین آباد" کا شمار اردو کی بہترین نظموں میں کیا جاتا ہے اور ان کی غزلیں سچے نئے پن کی وہ خوبصورت تشکیلیں ہیں جو حرفِ تازہ کی تلاش کے بغیر اپنا موجودہ زندہ وجود نہیں پا سکتی تھیں۔ ان کی غزل میں زندگی کی ہنرمندیوں کی اور ایک منفرد لہجے کی وہ قوت ہے وہ وحدت موجود ہے جو کسی ایک عہد کی پہچان نہیں ہوتی بلکہ ہر زمانے میں اس کی سچائی کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔

کتاب زیر تبصرہ میں ہر خیال کے قاری کے لیے ذہنی غذا موجود ہے۔ پہلے حصّہ کی پہلی نظم "اللہ" کو ایک بہترین حمد سمجھا جا سکتا ہے اور آئندہ دو نظمیں بھرپور نعتیہ مضامین پر مشتمل ہیں جن میں شاعر کے فنی کمالات اپنے انتہائی عروج پر دکھائی دیتے ہیں اور قاری کے لیے یہ تصور کرنا محال ہو جاتا ہے کہ شاعر کس مقام سے شعر کہہ رہا ہے۔ کتاب کے آخری حصّے میں "نقوشِ فروزاں" کے عنوان سے موتیوں کی طرح بکھرے ایسے ایسے منتخب اشعار پڑھنے کو مل جاتے ہیں جو زبانِ حال سے گویا ہوتے ہیں کہ

"کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست"

لیجئے اب چند اشعار سے لطف اٹھائیے:

زمال و زر نہ مجھے حرص جاہ دے اللہ — سمجھ سکے جو تجھے وہ نگاہ دے اللہ
سفر ہے سخت ہوگا مختصر آہستہ آہستہ — بڑھائے جاؤ قدم یونہی عمرؔ آہستہ آہستہ
نگل تھا وہ نرگسِ گلعذار جیسا تھا — بس اک خیال تھا لیکن بہار جیسا تھا
پناہ دینے لگا ہے مسافروں کو بہت — یہ پیڑ اب مجھے کتنا دکھائی دیتا ہے

یہ تبصرہ بالکل نامکمل رہے گا اگر عمر صاحب کی اس غزل مسلسل کی طرف اشارہ نہ کیا جائے جو درج شعر سے شروع ہوتی ہے اور جو گویا ایک قومی مرثیہ ہے۔

پتھر یہ نہیں تھے یہ دا اختر تھے ہمارے
ملبے کے یہی ڈھیر کبھی گھر تھے ہمارے

کتابت، طباعت، کاغذ، گٹ اپ سبھی اعلیٰ درجہ کے ہیں اور ان کے پیش نظر قیمت ۱۲۵/- روپیہ کچھ زیادہ نہیں ہے۔

محمد ولی الحق انصاری

نام کتاب، "فلسطین کے چار ممتاز شعراء"
مُصنّف: عبدالحق حقانی القاسمی قیمت: ۶۰/- روپے
ملنے کا پتہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی وکیل کوچہ پنڈت لال کنواں دہلی ۶

"فلسطین کے چار ممتاز شعراء" میں حقانی صاحب نے نہ صرف چار ممتاز شعراء یعنی ابراہیم طوقان، محمود درویش، فدوی طوقان، سمیع القاسم کی شعری خدمات پر روشنی ڈالی ہے بلکہ فلسطینی تحریک پر بھی روشنی

ساتھ ہی ساتھ مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اس لیے یہ کتاب ان تمام افراد کے لیے مفید اور دلچسپ ہے جو کہ تحریکِ فلسطین سے دلچسپی رکھتے ہیں اور تاریخی حقائق کی روشنی میں مسائل کو سمجھنا چاہتے ہیں۔

حقانی صاحب نے یہ بھی بڑا مفید کام انجام دیا ہے کہ فلسطینی تحریک اور شاعری کا طائرانہ جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ اردو شاعروں کی وہ تخلیق بھی پیش کر دی ہیں جن سے فلسطینی حریت پسندوں سے اظہار ہمدردی و یک جہتی صاف صاف ظاہر ہے۔ اس طرح اردو شاعری میں فلسطینی تحریک کا بھی ایک سرسری جائزہ لے لیا گیا ہے جو مفید بھی ہے اور اہم بھی۔ اس کے لیے یقیناً عبد الحق حقانی صاحب مستحق مبارکباد ہیں۔

فلسطین کا تاریخی و سیاسی پس منظر اس کتاب کا ایک اہم باب ہے اس سے ایک قاری کو بہت کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

اردو کے باذوق قارئین فلسطینی تحریک سے جذباتی وابستگی رکھتے ہیں اسی لیے وہ ان کی جد و جہد اور شعری کاوشات کو خلوص اور عقیدت سے دیکھتے رہے ہیں وہ محمود درویش کے نام اور ان کی شعری کاوشوں سے بھی واقف ہیں لیکن سلمیٰ الخضراء الجیوسی اور فدوی طوقان سے کم واقف ہیں۔ حقانی صاحب نے ان کی شعری تخالیق سے واقف کرا کے ایک بڑی ضرورت پوری کی ہے۔

اس کتاب میں حقانی صاحب نے فلسطین کے چار نامور شعرا ابراہیم طوقان، محمود درویش، فدوی طوقان اور سلمیٰ الخضراء کا مکمل تعارف کر کے بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اس سے ان شعراء کی جد و جہد اور شعری خدمات پوری طرح عیاں ہو جاتی ہیں۔

بحیثیت مجموعی یہ کتاب دلچسپ، اہم اور قابلِ مطالعہ ہے۔

—————— احمد ابراہیم علوی

نام کتاب :	"غزالانِ کامل"
شاعر :	عبد الرؤف کامل سہارنپوری
ملنے کا پتہ :	عبد الرؤف کامل رحیمی ڈیری پل بنجاران —— سہارنپور ——

"غزالانِ کامل" عبد الرؤف سہارنپوری کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو ایک حمد، نعت شریف اور چند سلام کے علاوہ چالیس غزلوں پر مشتمل ہے۔ کامل سہارنپوری ایک نوجوان ابھرتے ہوئے شاعر ہیں وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور غزل کے اسرار و رموز سے پوری طرح واقف معلوم ہوتے ہیں۔ غزل بے حد مقبول صنفِ سخن ہونے کے ساتھ ساتھ مشکل ترین بھی ہے۔ ایک اچھا شعر کہنا جو شاعرانہ حسن و خوبی کے اعلا ترین معیار پر پورا اترے جوئے شیر لانے سے کم نہیں کسی شاعر کا صرف ایک ہی اچھا شعر جو زبان زدِ خاص و عام ہو جائے اسے حیاتِ جاودانی بخشنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ چنانچہ رام نرائن موزوں نے صرف ایک ہی شعر سے اردو ادب میں اپنا مقام بنا لیا ہے اور اسی ایک شعر سے وہ دنیائے شعر و ادب میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ وہ شعر یہ ہے۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گذری

کامل صاحب نے زندگی کے نشیب و فراز، تلخ تجربات، رومانی کیفیات اور وارداتِ حسن و عشق کو نہایت سادہ اور دلکش شعری پیکر عطا کیا ہے۔ ان کی شاعری انسانیت کے اعلیٰ مقام کی ترجمانی بھی کرتی ہے۔ ان کو اپنے خیالات اور جذبات کو صاف و سادہ اور پر اثر انداز میں بیان کرنے کا ملکہ حاصل ہے۔ عصری تقاضوں پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ اگر انھوں نے اپنے شعری سفر کو اسی طرح جاری رکھا تو وہ بہت جلد اردو ادب میں اپنی جگہ بنا لیں گے

کتابت و طباعت صاف ستھری اور معیاری ہے۔ امید ہے کہ کامل صاحب کا یہ شعری مجموعہ ادبی حلقوں میں نہ صرف قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا بلکہ شرفِ قبولیت بھی حاصل کرے گا۔

شعر ملاحظہ ہو ؎

ہمارا ساتھ وہی راستے میں چھوڑ گئے
کہ جن کو ہم نے شریکِ سفر بنایا تھا

—————— امیر احمد صدیقی

نام کتاب: "روشنی اے روشنی"
شاعر: نامی انصاری قیمت: ۸۰/ روپئے
ملنے کا پتہ: نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ
امین آباد لکھنؤ

نامی انصاری دنیائے اردو کی نامی گرامی شخصیت کا نام ہے گزشتہ کئی دہائیوں سے ان کی شناخت بحیثیت شاعر اور نقاد مستحکم طریقے سے قائم ہے۔ زیر تبصرہ کتاب ان کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔

ہر اہل علم کا اہم ترین فریضہ ہے کہ ادب میں ایسے شہ پارے تخلیق کرے جو ملک و قوم کی سالمیت، انسانی نشوونما اور معاشی زندگی کو بہتر بنانے میں موثر کردار ادا کر سکیں۔ نامی انصاری نہایت خوش سلیقگی اور خوش اسلوبی سے اس فریضہ کو انجام دے رہے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ صرف شاعری ہی نہیں بلکہ سارے فنون لطیفہ کا محور صرف انسان ہے۔ مزید یہ کہ ادب کسی صورت میں اور کسی زمانے میں خارجی اثرات سے نہیں بچ سکتا۔

انھوں نے اپنی شاعری کے کینوس کو محدود نہیں کیا اور تقریباً ہر موضوع پر طبع آزمائی کی ہے۔ ہر اچھے اور قد آور شاعر کی طرح انھوں نے بھی زندگی کی تلخ و شیریں حقیقتوں اور صداقتوں پر اپنی خصوصی توجہ مرکوز رکھی ہے۔ انھوں نے روایت اور جدیدیت کا خوبصورت امتزاج نئے آہنگ اور منفرد اسلوب کے ساتھ پیش کیا ہے کیونکہ انھیں بخوبی علم ہے کہ مستقبل کی شاعری کا انحصار اسی پر قائم ہوگا۔

نامی انصاری کے چند اشعار ہی اس حقیقت کی غمازی کریں گے کہ وہ ایک بہت ہی اچھے اور خوش فکر شاعر ہیں۔

ان کو شاید اب بھی پتھر کے زمانے یاد ہیں
جو یہ کہتے ہیں کہ پھولوں کی زباں کچھ بھی نہیں

یہی بھلے تو تیسد لفظ و معنی میں نہیں آتے
دو بیسرا ضبط غم کرنا، وہ ان کا مسکرا دینا

یہ کتاب اردو اکادمی اترپردیش کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے — سرورق سادہ مگر پرکشش ہے۔ کتابت طباعت معیاری ہے۔

نامی انصاری کا پہلا پڑاؤ "برگ سرسبز" تھا۔ مجھے پوری امید ہے کہ دوسرے پڑاؤ "روشنی اے روشنی" کا ادبی حلقوں میں اور بھی زیادہ گرم جوشی سے استقبال کیا جائے گا۔

——— خورشید ملک

نام کتاب: "شناخت" (شعری مجموعہ)
شاعر: کریم مودھوی
ملنے کا پتہ: خرام پبلی کیشنز، فہیم آباد کالونی
کانپور

زیر نظر کتاب کریم مودھوی کا پہلا شعری مجموعہ ہے ان کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ ان کا فن برائے ادب ہے برائے معاش نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اشعار میں ایک خاص کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ خود کہتے ہیں کہ اگر میں شعر نہ کہتا ہوتا تو کب کا مر گیا ہوتا۔ شعر کہنا میری فطرت ثانیہ ہے۔ کتاب پر ممتاز ادیب و شاعر عشرت ظفر کی معتبر رائے موجود ہے اس میں انکی شاعری کی صحت کا تعین بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے غزل کے اسلوب میں کچھ واضح تجربے کئے ہوں لیکن انھوں نے اسالیب کی ان قدروں کو قبول کیا ہے جس کی گرفت میں آج کی غزل ہے۔ میں اس سے اتفاق کرتا ہوں مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے کلام میں تفاخر، شاعرانہ تعلی و کبر نفسی کا امتزاج ملتا ہے۔

غم کی میراث پر قائم ہے اکیلا ہی کریم
سارے دریاؤں کی گہرائی ہے دیکھی بھالی
ہم کو معلوم ہے کس کس میں ہے کتنا پانی

ان اشعار میں کبر نفسی اور عزت نفسی کی سربلندی موجود ہے وہ جس قلعہ شاعری کی فصیل سے گذرے نشانات چھوڑتے گئے۔ انھوں نے جن اساتذہ فن سے استفادہ کیا ان میں اقبال، میر، غالب اور جگر جیسے اہم شعراء ہیں۔ چنانچہ ان کے خیالات ان کی شاعری میں

ور آتے ہیں۔ لیکن ان کا اپنا فطری لب و لہجہ برقرار ہے۔

کلام میں تشبیہ، استعارہ، کنایہ، تلمیح، تجنیسات مراعاۃ النظیر دیگر صنعتوں کا حسب ضرورت استعمال کیا گیا ہے لیکن استعاراتی عمل نے اشعار کو جاندار بنا دیا۔ رعایت کی پاسداری کے ساتھ اشعار میں تنوع پیدا کرنے کی کامیاب کوشش ملتی ہے۔ سماجی برائیوں پر صحت مند طنز بھی ملتے ہیں۔ اس قبیل کے اشعار خاصی تعداد میں ہیں۔

اب تو یہ حالت ہے ہر سو ایک پیوند و شگاف
جامہ تہذیب اتنا پہلے بوسیدہ نہ تھا

کھو گئیں کتنی زلیخائیں دیارِ عشق میں
کتنے یوسف حسن کے بازار میں گم ہو گئے

تو نقاب کر نہ حجاب کر نہ سر بزم آ کے خطاب کر
کوئی آنکھ تجھ سے ملا سکے یہ کہاں کسی کی مجال ہے

کبھی شکایت تشنہ لبی نہیں کرتے
جو لوگ فطرت ابر کرم سے واقف ہیں

اشعار میں صوتی ہم آہنگی کے علاوہ تہہ داری بھی ہے۔ ۱۵۲ صفحات پر مشتمل اس شعری مجموعہ کی کتابت، طباعت اچھی ہے۔ کچھ خامیاں تھیں انھیں درست بھی کیا گیا۔

————— عابد نظر

نام کتاب: "ضیاء نجم"
مُرتّب: سیّد حسن احمد رضوی
قیمت: دس رُوپئے

سید حسن احمد رضوی کی مرتبہ کتاب "ضیاء نجم" مولوی سید ضیاء الحسن رضوی کی فرمائش کا نتیجہ ہے جو مفتی نجم الحسن صاحب کی حیات مقدسہ کے اجمالی خاکہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں تمام اہل علم حضرات کے مضامین جو مولانا مفتی سید نجم الحسن صاحب رضوی کی حیات، سلسلہ نسب اور ان کی زندگی کے تمام شعبوں کو بڑے دلکش انداز میں اجاگر کیا گیا ہے اس کے مطالعہ سے نہ صرف مفتی صاحب کے عقیدت مند علماء نیز مہمان صوفیائے کرام کی حیات طیبہ واضح ہو جاتی ہے اور پوری انسانیت کے لیے مشعل راہ کا کام کرتی ہے۔

ضیاء نجم۔ میں جن صوفی علماء کے مضامین شامل ہیں ان میں مفتی صاحب کی بیٹی، شاہ سلطان محمود صاحب سجادہ نشین مخدوم شیخ سارنگ، شاہ حامد علی مینائی عارفی سجادہ نشین مخدوم شاہ مینا، شاہ سجاد حسین سجادہ نشین مخدوم شیخ سعد الدین وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مذکورہ اہل علم حضرات نے مفتی صاحب کی زندگی کے حالات جس طرح دیکھے ہیں یوں کے توں قلم بند کئے ہیں جس سے انکی زندگی کے تمام گوشے سامنے آگئے ہیں۔ مفتی صاحب ایک صاحب علم ادب نواز، عابد و زاہد اور نیک انسان تھے۔ وہ اودھ کی تہذیبی روایات کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ ان کی پوری زندگی صوفیائے کرام کے اس قول۔ با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا، کی آئینہ دار ہے مفتی صاحب شرع کی پوری پابندی کرتے تھے۔

کتابت و طباعت مناسب ہے کہیں کہیں کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں۔

————— اخلاق احمد

غزل

آنکھوں کے سامنے کے ستم دیکھتے رہے
جو لکھنا چاہیے تھا وہ ہم دیکھتے رہے

کچھ لوگ اپنے نقش قدم چھوڑ بھی گئے
کچھ لوگ صرف نقشِ قدم دیکھتے رہے

بربادیوں کا اپنی ہمیں کوئی غم نہیں
افسوس یہ ہے اہل قلم دیکھتے رہے

دنیا ترقیوں کی منازل میں ہے مگر
کچھ لوگ صرف اپنے صنم دیکھتے رہے

دانشورانِ شہر کو کیا ہو گیا رشید
اپنی بیاض اپنا قلم دیکھتے رہے

رشید قریشی
[illegible] الہ آباد

نصف صدی نمبر

تاثرات کے آئینے میں

سید صاحب!

کیا اچھا نصف صدی نمبر نکالا ہے آپ نے۔ دیکھ کر آنکھوں کی روشنی بڑھ گئی اور پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ ایک ایسا رسالہ جو اصلاً اطلاعات اور رابطۂ عامّہ کے محکمے کا ترجمان ہے، اُسے ایسا پُروقار ادبی رسالہ بنا دینا معمولی بات نہیں اور ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ یہ خاص نمبر ایسے پچھلے نمبروں سے بڑھ گیا ہے۔ اپنے زمانے میں آپ نے ایسے شان دار نمبر مرتب کیے ہیں کہ ان کو مثال میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ یہ خاص نمبر بھی پڑھنے اور محفوظ کر لینے کی چیز ہے۔

ڈاکٹر گیان چند جین کا مضمون خاصے کی چیز ہے۔ ان کے وسیع المطالعہ ہونے کا تو ہم میں سے ہر شخص قائل ہے، مگر اس مضمون میں جس سلیقے کے ساتھ بہت سی معلومات کو یک جا کیا گیا ہے اس کی خاص طور پر داد دی جانا چاہیے۔ اس ایک مضمون سے قاری کو اردو کی ادبی تحقیق سے متعلق بہت سی معلومات یکجا مل جاتی ہیں اور نصف صدی کے سفر کی داستان حسنِ اختصار کے ساتھ سامنے آ جاتی ہے۔ اختصار کے باوجود ضروری وضاحت کی کمی کہیں محسوس نہیں ہوتی۔ اتنی بہت سی معلومات اس حسنِ ترتیب کے ساتھ بہت مشکل سے یکجا ہو پاتی ہیں۔

کالی داس گپتا رضا صاحب غالب شناسی میں اس وقت بہت وقیع اور منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ حسبِ معمول ان کی یہ تحریر بھی توجہ طلب ہے۔

جوگندر پال نے اہم موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ ان کا یہ قول:

"اچھی زبان بھی اس وقت بُری لگتی ہے جب بلاوجہ اپنی طرف متوجہ کر کے ہمیں ڈسٹرب کیے جانے پر اُتر آئے۔ کسی بُت کو دیکھ کر اگر بار بار اس کے پتھر کی بہتر کوالٹی کی طرف دھیان دیا جائے تو ہم کیونکر باور کر پائیں گے کہ وہ ذی جان ہے۔" بجائے خود خوب ہے۔

اس سلسلے میں اگر باشعور قاری یہ کہے کہ اچھے لکھنے والے کو غیر ضروری طور پر "ڈسٹرب" اور "ذی جان" جیسے پیوند اپنی تحریر میں نہیں لگانا چاہیے کہ اس سے روانی میں خلل پڑتا ہے، تو یہ بات بھی بجائے خود خوب ہوگی اور توجہ طلب بھی۔ غیر ضروری صنعت گری اور بے جوڑ پیوندکاری اچھی زبان کو دونوں باتیں راس نہیں آتیں۔ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ معیار پر غیر مناسب اصرار بھی اسی قدر ناقابلِ قبول ہے، مگر معیار کے کسی بھی تصور سے لاتعلقی کا اظہار بھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔

پروفیسر مجاور حسین رضوی کا مضمون قومی یک جہتی کی روایت پر اچھی تحریر ہے۔ انھوں نے لفظ 'یک جہتی' کے ابتدائی استعمال پر اور پھر اس کے وسیع معانی و مفاہیم پر جس طرح روشنی ڈالی ہے، اس سے بات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور اُردو شاعری کا بہت روشن پہلو سامنے آتا ہے۔ انھوں نے بار بار اس کی وضاحت کی ہے کہ کثرت میں وحدت کے تصور کا صحیح مفہوم کیا ہے اور سیکولرازم کی تعریف میں کیا شامل نہیں، یہ بہت ضروری تھا۔ اس وقت جو حالات ہیں اور ذہنوں پر غلط فہمیوں کی پرچھائیاں جس طرح کانپتی رہتی ہیں، اس کے پیش نظر یہ وضاحت بہت ضروری تھی۔

عقیل صاحب نے 'میرا الٰہ آباد' میں الٰہ آباد کے ماضی قریب کی بڑی اچھی تصویر کشی کی ہے۔ یہ بہت دل چسپ تحریر ہے۔ دل چسپی کے ساتھ معلومات سے بھی معمور ہے۔ انھوں نے اُردو کے ساتھ ہندی کے ادیبوں کا بھی تذکرہ کیا ہے اور اس سے مضمون میں وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ ایسی چھوٹی چھوٹی تحریریں بہت سی باتوں کو ذہن نشین کر دیا کرتی ہیں اور کچھ دیر کے لیے چلتی پھرتی تصویریں سامنے آ جاتی ہیں۔

ص ۹۱ سے ۹۰ تک رسالہ نیا دور سے متعلق جو مضامین ہیں وہ خاصے معلوماتی ہیں۔ شخصیات کے حصّے میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اور صباح الدین عمر صاحب پر مختصر مضامین ان دونوں قابلِ ذکر شخصیتوں کی یاد کو ذہن میں تازہ کر دیتے ہیں۔ اور ہاں 'فرخ آباد کا ادبی سفر' بھی خوب ہے۔ راجندر بہادر موج صاحب نے مناسب اختصار کے ساتھ وہاں کی متحرک تصویر پیش کر دی ہے۔ ایسی تحریروں کی یوں زیادہ اہمیت ہے کہ عام طور پر ادبیات سے متعلق حضرات چھوٹے چھوٹے

شہروں کے ادبی کوائف سے اچھی طرح واقف نہیں ہوتے۔ ادبی اور شعری روایت جب تک ہر سطح پر کارفرما رہے، تب تک اس میں توانائی نہیں آپاتی۔ بڑے شہروں کی طاقت ور ادبی روایت کی تشکیل ارتقا اور فروغ میں چھوٹے شہروں اور چھوٹے چھوٹے علاقوں کا بہت حصہ ہوتا ہے۔ جب تک ان بنیادی اجزا کی شیرازہ بندی نہ ہو اس وقت تک مرقعے کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔ کیا اچھا ہوتا کہ ایسے مزید دو چار مقامات کے مختصر جائزے بھی اس خاص نمبر میں شامل ہوتے۔

ابھی کہنے کو تو بہت کچھ ہے، مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ خط مضمون بنتا جا رہا ہے، اس لیے اسے یہیں ختم کرتا ہوں۔ اس عمدہ معلوماتی اور وقیع نمبر کی ترتیب پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

——— رشید حسن خاں
شاہ جہاں پور

برادرم سید امجد صاحب!

نیا دور کا نصف صدی نمبر ملا، جو آپ نے خاص ایلچی کے ذریعہ بھیجا ہے۔ بے حد ممنون ہوں۔ اس کا رنگ روپ اور حسنِ طباعت دیکھ کر سچ مچ آنکھیں روشن ہوگئیں۔ یہ خاص نمبر بھی آپ نے بہت سلیقے سے ترتیب دیا ہے۔ بلاشبہ آپ کا دور نیا دور کا عہد زریں ہی کہا جائے گا۔ مجھے احساس ہے کہ پرچہ کی ترتیب اور طباعت پر آپ کتنا وقت اور کتنی انرجی صرف کر رہے ہوں گے۔

نیا دور کا ہر خاص نمبر ایک یادگار دستاویز بن جاتا ہے۔

——— (پروفیسر) قمر رئیس
دہلی۔ ۹۵

عزیزم امجد صاحب۔ نیا دور کا نصف صدی نمبر ملا۔ شکر گزار ہوں اسلئے بھی کہ آپنے اپنی عنایت کا سلسلہ میری لاپروائی کے باوجود جاری رکھا۔ سرکاری نوعیت کے کسی رسالے کا معیار اور اس کی شناخت قائم کرنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ آپ کی محنت اور سلیقے کا ہی نتیجہ ہے کہ نیا دور نے اپنی پہچان بنالی ہے۔ یہ نمبر تو بہت خوبصورت ہے۔ اودھ نمبر کے دونوں حصے بہت اچھے تھے۔ اگر آپ اودھ کی ثقافتی روایت پر توجہ باقی رکھیں تو نیا دور سے دلچسپی میں غالباً مزید اضافہ ہوگا۔

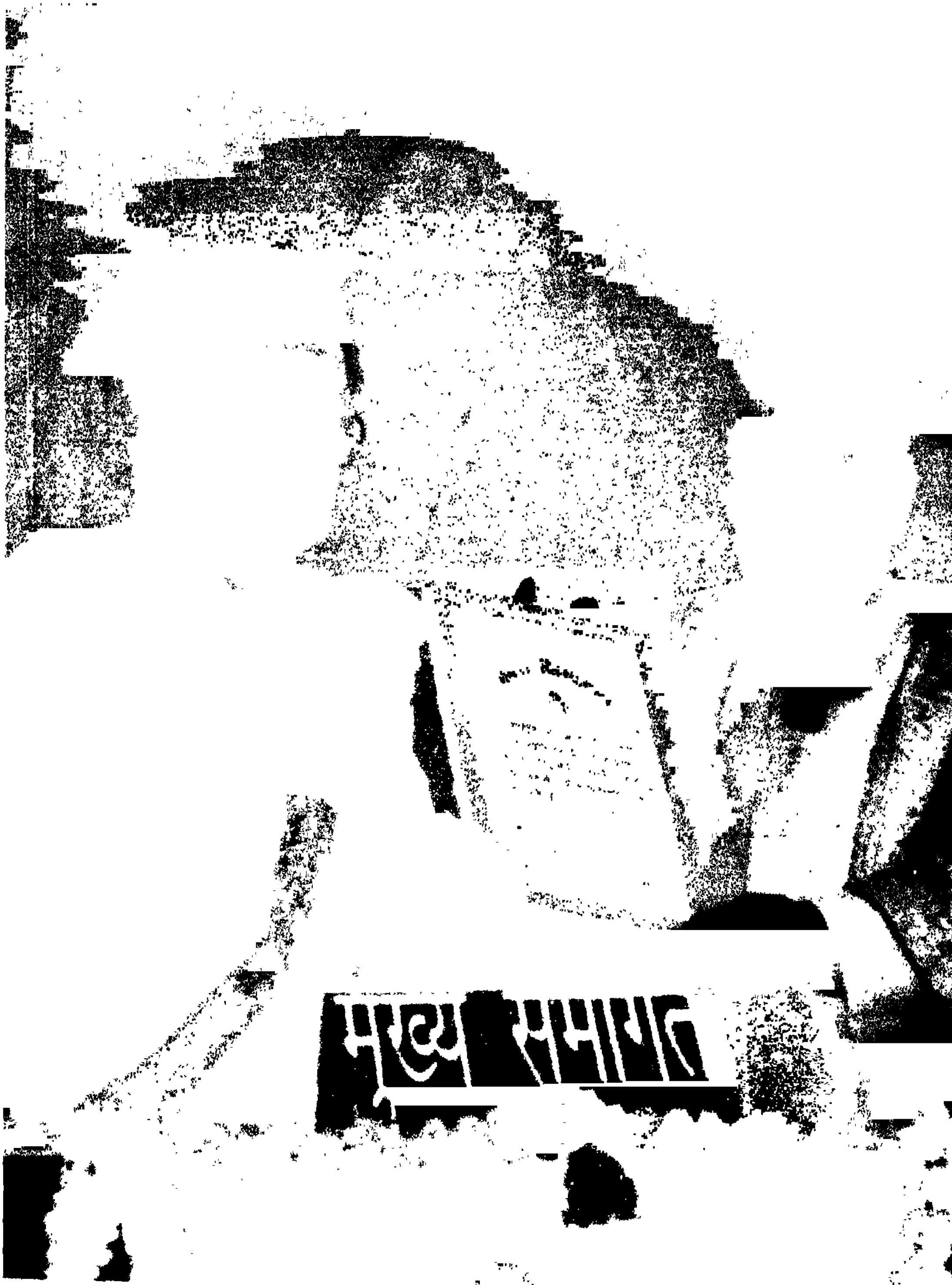
——— ڈاکٹر (پروفیسر) شمیم حنفی۔ نئی دہلی

پریس رجسٹریشن آف بکس ایکٹ ۱۸۶۷ء (۱۹۵۶ء میں ترمیم شدہ)
کی دفعہ ۱۹-ڈی کے قاعدہ نمبر ۸ کے مطابق
ماہنامہ نیا دور لکھنؤ
کی ملکیت وغیرہ کے بارے میں مندرجہ ذیل تفصیلات شائع کی جارہی ہیں:

(۱) مقام اشاعت: لکھنؤ
(۲) وقفۂ اشاعت: ماہوار
(۳) پرنٹر کا نام: شری راجیو اروڑا
قومیت: ہندستانی
پتہ: یونائیٹڈ بلاک پرنٹرس، گوتم بدھ مارگ لکھنؤ
(۴) پبلشر کا نام: شری روہت نندن
قومیت: ہندستانی
پتہ: ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش لکھنؤ
(۵) ایڈیٹر کا نام: شری سید امجد حسین
قومیت: ہندستانی
پتہ: ایڈیٹر نیا دور۔ محکمہ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش لکھنؤ
(۶) ان اصحاب کے نام اور پتے جو اس رسالہ کے مالک یا اس کے تمام سرمایہ کے ایک فیصد سے زیادہ کے حصہ دار ہیں: "نیا دور" سرکاری جریدہ ہے

میں روہت نندن اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

(دستخط)
روہت نندن
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش
لکھنؤ



گورنر شری موتی لعل ووہرا الٰہ آباد یونیورسٹی کی کانووکیشن تقریب میں جسٹس اے این آنند کو
ڈی لٹ کے اعزاز سے نوازتے ہوئے

Vol. 50 No. 12
March, 1996
Rs. 3.00

Urdu Monthly

NAYA DAUR

POST BOX NO. 146, LUCKNOW-226 001

R.N.
Annual Su
Rs. 3
LW/NP/44

